

دیر دل

ننید عزیز



اس کے قدم شکستہ تھے! کہتے ہیں کہ انسان کی اندرونی کیفیات صرف چہرے سے ہی نہیں اس کے قدموں سے بھی عیاں ہوتی ہیں۔ جیسے انسان کے چہرے کے اثرات آنکھیں اور زبان بولتی ہے۔ بالکل اسی طرح انسان کے قدم بھی بولتے ہیں۔ اپنے جذبات اپنی کیفیات ظاہر کرتے ہیں جیسے کہ انسان خوش ہو تو سرشار قدم، غم زدہ ہو تو بو جھل بیمار ہو تو تھال قدم، غمگین ہو تو تیز قدم، شے میں ہو تو ہلکے قدم، ناکام ہو تو ناپوس قدم، بچہ ہو تو لڑکھڑاتے قدم، جوان ہو تو مضبوط قدم، بوڑھا ہو تو کمزور قدم، پر عزم ہو تو ثابت قدم اور زندگی کے کسی اہم مقام پہ آکر بار ہو تو شکستہ قدم، اور آج وہ بھی ایک بار ہوا انسان تھا۔ آج اس کے قدم بھی شکستہ تھے۔

آج سے پہلے زندگی میں اس کے قدموں نے بھی ہزاروں ڈانٹے جھگڑے تھے۔ کئی بار سرشار ہوئے تھے تو کئی بار بو جھل کئی بار تھال ہوئے تھے اور کئی بار ہلکے بھی تھے۔ لیکن شکستہ پہلی بار ہوئے تھے۔ کیونکہ وہ ہمارا پہلی بار تھا۔ وہ اس وقت پوری طرح سے ہمارا ہوا ایک شکست خوردہ انسان لگ رہا تھا اور اس وقت وہ کچھ کہنے اور کچھ کرنے کی پوزیشن میں ہرگز نہیں تھا اس وقت وہ صرف سوچ سکتا تھا کیونکہ اس وقت سوچنے کے علاوہ اس میں اور کوئی سکت نہیں تھی اس کی ہمت و حوصلہ ڈوب چکا تھا شکست کی کسی اٹھاء گہرائی میں۔

وہ اپنے بے دم شکستہ قدموں پہ اپنی غم زدہ بو جھل ذات کا بوجھ بمشکل اٹھا کر ہسپتال کے پراسیوٹ روم کی چوکھٹ میں آکھڑا ہوا اور دور تک پچھی کشادہ راہداری میں دیکھنے کی کوشش کی تھی اور اس کوشش کے بعد وہ



منضوط انسان دھواں دھواں ہو کے رہ گیا تھا اور اس دھوئیں کی تاریکی اسے سر پہ اپنے حصار میں گھیرنے لگی تھی وہ اس چوکھٹ میں بول کھڑا تھا جیسے اس کی دنیا یہیں ختم ہو گئی ہو اور اس چوکھٹ سے باہر اس کے لیے کچھ بھی نہیں بچا ہو۔ حالانکہ اب سے تھوڑی دیر پہلے تک وہ کافی حد تک مطمئن تھا۔ شاید اس لیے کہ اس کے دل میں کہیں نہ کہیں ایک چھوٹی سی ایک مدھم سی "امید" سانس لے رہی تھی۔ اسے جانے والے بہت زیادہ نہ سہی تھوڑا بہت "مان" ضرور تھا لیکن اسے تھوڑی دیر پہلے تک یہ خیال چھو کے بھی نہیں گزرا تھا کہ مان "اکثر" ٹوٹ جایا کرتے ہیں اور امیرین ہمیشہ دم توڑنے کے لیے ہی ہوتی ہیں۔

اگر اس چیز کا خیال اسے ذرا سا پہلے ہو جاتا تو یہ یقیناً "کبھی بھی اس پہ مان نہ کرتا۔ مگر اب۔ اب کیا ہو سکتا تھا؟ اب تو وہ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ بہت تنہا ہو گیا تھا۔ آج اس کی امید نے ہی دم نہیں توڑا تھا بلکہ اس کا مان بھی ختم ہو گیا تھا اس کی موبوم سی خوشی بھی بجھ کر رکھ ہو گئی تھی۔ وہ اس پرائیویٹ روم کی چوکھٹ میں کھڑا بھی تک کشادہ راہداری کو دیکھ رہا تھا جو تھوڑی دیر پہلے اتنے زیادہ لوگوں کی بدولت تنگ پڑ رہی تھی اور اب بالکل خالی اور ویران نظر آرہی تھی بالکل اس کی ذات کی طرح!



"سر کیا میں یہ روم صاف کر سکتی ہوں؟" ہسپتال کی ملازمہ مریض کے ڈسچارج ہوتے ہی روم کی صفائی ستھرائی کے لیے فوراً "حاضر" ہو گئی تھی شاید اب اس روم میں کسی نئے مریض کو شفٹ کرنے کی تیاری ہو رہی تھی اس لیے ان کو یہ روم از سر نو صاف کرنے کی جلدی تھی۔ وہ جواباً "کچھ بھی کہے بغیر چوکھٹ پہ رکھا اپنا ہاتھ ہٹا کر خود بھی وہاں سے ہٹ گیا تھا۔ لیکن اس کے قدم اس کا ساتھ نہیں دے پارہے تھے وہ اپنے شکست خوردہ قدموں سے چل کے بمشکل باہر نکلتا تھا۔

پارکنگ میں تھوڑی دیر پہلے اس کی گاڑی کے علاوہ اور بھی چند گاڑیاں کھڑی تھیں مگر اس وقت صرف اس کی براؤن مودو تھی۔ اپنی گاڑی کا لاک کھولتے ہوئے اسے اپنے ہاتھوں میں ہلکی سی لرزش محسوس ہوئی تھی شاید تنہا واپسی کے احساس نے اس کی تھکن اس کی تنہائی اس کی شکستگی میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔ کھلے کھلے انداز سے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس کی نظر پچھلی سیٹ کی سمت اٹھی تھی جس پہ سرخ خون کے دھبے اب سیاہی مائل ہونے لگے تھے لیکن اس کے ذہن میں وہ منظر وہ لمحہ وہ وقت آج بھی پہلے دن کی طرح تازہ تھا اس کی سماعتوں میں اس کی دردناک چیخ آج بھی محفوظ تھی اور وہ اس کی تکلیف سوچ کر آج بھی تڑپ اٹھتا تھا آج بھی اس کا دل کسی انمولی شے کے خیال سے جیسے مٹھی میں آجاتا تھا وہ نجانے اور کتنی دیر یوں گزران موڑے پچھلی سیٹ کو دیکھتا رہتا کہ اچانک اس کے سیل فون پہ ہونے والی وابریشن نے اسے چونکا دیا تھا مگر چونکنے کے بعد بھی اس نے سیل فون نکال کر دیکھنے یا کال ریسیو کرنے کی زحمت نہیں کی تھی بلکہ لب بلیج کر سر جھٹکتے ہوئے اسٹیئرنگ تھام لیا تھا اور اگلے ہی لمحے گاڑی آگے بڑھائی تھی۔

ہسپتال سے گھر کے گیٹ تک اگر بھی اس کی کیفیت میں رتی برابر فرق نہیں آیا تھا وہ اک ٹرانس کی سی کیفیت میں گھر تک پہنچا تھا اور ایسی حالت میں کسی اور چیز کی طرف دھیان دینا ہرگز ممکن نہیں تھا۔

"سلام صاحب۔" چوکیدار نے اس کی گاڑی دیکھ کر فوراً ہی گیٹ کھول دیا تھا جبکہ وہ اس کے سلام کا جواب تک نہ دے سکا تھا اور خاموشی سے گاڑی اندر بڑھانے لگا تھا حالانکہ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا کہ وہ اپنے کسی ملازم کے سلام کا جواب نہ دیتا۔ اگر کبھی عرصے یا پھر غم کی حالت میں بھی ہوتا تو ہاتھ کے اشارے سے یا پھر سر کے اشارے سے ہی سہی مگر جواب ضرور دیتا تھا۔ لیکن نظر انداز نہیں کرتا تھا۔ شاید اسی لیے آج اس کے چوکیدار کو

"سلام صاحب جی۔" اس کی ملازمہ ڈرائنگ روم کے صوفوں پہ رکھے کفن ترتیب سے رکھ رہی تھی اچانک اسے آتے دیکھ کر ارٹ ہو گئی تھی مگر وہ بہت نڈھال نظر آ رہا تھا ملازمہ اسے اس طرح شکستہ حال میں دیکھ کر جھٹک اٹھی تھی چوکیدار کی طرح اسے بھی اپنے مالک کی کیفیت کا فوراً اندازہ ہو گیا تھا۔ کیونکہ اس پہ چھائی مایوسی اور شکستگی اس کے آنک انک سے جھٹک رہی تھی وہ آج حقیقتاً "دیکھنے والوں کو بھی" تنہا لگ رہا تھا۔ اپنی کپڑیوں کو منسلک ہونے اس نے ملازمہ کو بیڈ روم سے سگریٹ کا پیکٹ لاسٹر لانے کا کہا تھا اور پھر چند سیکنڈز میں ہی اس نے سگریٹ کو اپنے جیکے کٹاؤ دار عنابی ہونٹوں میں دبا کر لاسٹرز سے شعلہ دکھادیا تھا اور اس سے ایک گھراش لے کر دھواں فضا میں چھوڑ دیا تھا اور پھر رفتہ رفتہ سگریٹ کا دھواں ڈرائنگ روم میں ہی نہیں اس کی ذات میں بھی بھرنے لگا تھا۔ ہر سو دھوئیں کے مرغولے پھیلتے جا رہے تھے اور ہر سو اس کی تنہائی رقص کرنے لگی تھی ایک کے بعد ایک سگریٹ سلکتا رہا اور دھواں بڑھتا رہا۔

گزشتہ چند دنوں سے وہ اسموکنگ سے کافی حد تک گریز کر رہا تھا وہ اپنی عادت اپنی طلبہ کنٹرول کرنا سیکھ رہا تھا مگر آج اچانک سب کچھ پہلے جیسا ہو گیا تھا۔ اس کی سوچیں اور وہی عادتیں عود کے سامنے آئے کو بے تاب ہو گئی تھیں آج پھر سگریٹ اس کی شکستہ ذات کو اپنے دھوئیں کی چادر میں لپیٹ رہے تھے اور وہ پور پور دھوئیں میں ڈوب رہا تھا ڈرائنگ روم کا فرش مازول دیکھتے ہی دیکھتے جس زہ ہو گیا اور اس کے ملازم اسے اس حال میں دیکھ کر بہت ریشان ہو رہے تھے کیونکہ وہ اپنے مالک سے بہت پی تھے اس کا اچھا برا انہیں بھی متفکر کر دیتا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ نہ تو آگے بڑھ کے اسے روک سکتے تھے اور نہ ہی دچھوچھ سکتے تھے کیونکہ وہ اس وقت اپنی ہی ذات کے نہاں خانوں میں اترا ہوا تھا اور فی الحال اسے ڈسٹرب کرنا ہرگز مناسب نہیں تھا البتہ اس کے حال پہ وہ اندر ہی اندر جلنے گڑھتے رہے تھے۔

وہ شام سے ڈرائنگ روم کے صوفے پہ ایک ہی پوزیشن میں بیٹھا ہوا تھا اور مسلسل سگریٹ پھونکتے ہوئے اذیت ناک کا یہ کھیل بھی جاری تھا اور شام سے مسلسل اس کے قریب پڑی کرشل فیل پہ رکھا موبائل لگا ہوا ہونے والی وابریشن سے تھرک رہا تھا یوں جیسے کال کرنے والا اس کے لیے تڑپ رہا ہو اور وہ موبائل اسکرین دیکھے بنا بھی جانتا تھا کہ یہ "تڑپ" کیا کس کی ہے؟ لیکن اس وقت وہ اپنے لیے تڑپنے والے سے بھی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس وقت وہ صرف اپنے آپ کے ساتھ رہنا چاہتا تھا وہ اپنی تنہائی اپنی شکستگی کی حد دیکھنا چاہتا تھا اپنے آپ کو آزمانا چاہتا تھا اور اسی لیے اس نے متواتر بجنے والی کال ریسیو نہیں کی تھی اور ایک بار پھر سر جھٹک کر سگریٹ الٹن ٹرے میں مسل کر دوبارہ نیا سگریٹ سلا گیا تھا آج نہ تو اس کے ذہن پہ سواری جو کم ہو رہا تھا اور نہ ہی رات آگے سرک رہی تھی ہر چیز پہ اک جمود سا طاری تھا سب کچھ جیسے ٹھہر گیا تھا۔ لمحات ساکت ہوئے لگ رہے تھے۔



بڑی چوبلی کے انتہائی بلند اور مضبوط دروازہ سوچ کی نوخیز سنہری کرنیں اپنے وجود میں کئی رنگ سمیٹ کر بے دن نئی صبح کی سرلی سی دستک دے رہی تھیں اور اس دستک کی ٹھنک پورے لان میں محسوس کی جا رہی تھی چوبلی کا وسیع و عریض کش گرین لائن دھوپ کے پھیلے رنگوں سے سب سے حد بڑھا ہوا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی خوبصورتی اور تازگی ابھر کر سامنے آ رہی ہو انتہائی لطافت اور اک ترتیب سے سجے گملوں میں پورے طرح طرح کے پھولوں سے لدے ہوئے تھے اور سب سے حد محنت اور خوبصورتی سے سجائی گئی کیریاں بھی اپنی گود میں نوخیز صبح کی

نشانیوں لیے ہوئے تھیں ہر طرف تازہ پھولوں کی مہک اس طرح پھیلی تھی کہ تمام آنے جانے والوں کو بھی اسے حصار میں لے رہی تھی ایک پل کے لیے گزرنے والوں کی سائیں مسکور ہو کے رہ جاتی تھیں اس خوشبو کو مہک نے پورے لان کا احاطہ کر رکھا تھا مگر اس وقت کسی کے پاس اتنی فرصت نہیں تھی کہ وہ چند لمحے ٹھہر کر اس خوشبو کی بولہ بول سرگوشیاں ہی سن لیتا۔

صرف ایک بوڑھا مالی بابا ہی جو صبح سے شام تک ان خوشبوؤں اور ان پھولوں سے باتیں کرتا تھا پورے لان میں چکر اتار رہا تھا اس کے پاس اور کوئی کام ہی نہیں تھا سوائے ان پودوں کی دیکھ بھال کے۔ اور وہ پورا دن ان کی دیکھ بھال میں ہی گزار دیتا تھا۔ بلکہ دن تو کیا؟ اس نے تو پوری زندگی ہی گزار دی تھی بس ایک اسی لان کو سجاتے سجاتے عمر بیت گئی تھی۔

وہ بچپن سے مالی بابا کو جو ملی کا یہ لان ہی سجاتے سنوارتے دیکھتی آ رہی تھی اس کے علاوہ کبھی کوئی اور کام کرتے نہیں دیکھا تھا۔

”علیڑے!“ وہ بڑی محویت سے مالی بابا کے کام کا جائزہ لے رہی تھی جب اچانک اسے عقب سے پکارا گیا تھا وہ فوراً پیچھے پلٹی تھی۔

”جی بابا!“ وقار آندھی اسے پکارنے کے بعد قدم پر بھاٹے ہوئے اس کے قریب آگئے تھے۔

”میں کب سے دیکھ رہا ہوں کہ تم کتنی دیر سے یہاں کھڑی مالی بابا کو دیکھے جا رہی ہو کیا بات ہے؟ کیا دیکھ رہی تھیں؟“ وقار آندھی نے بہت محبت اور فکر مندی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

”بابا! میں صرف یہ دیکھ رہی ہوں کہ ہم لوگ ہمیشہ یہی سمجھتے ہیں کہ ہمارا لان بس ایسی ہی ہمیشہ ہر وقت سجا سجا رہتا ہے میں بھی یہ خیال بھی نہیں آیا کہ اس لان کو سجانے سنوارنے میں مالی بابا کی محنت اور لگن کا کتنا پرانا ہاتھ ہے؟ اس لان کو سنوارنے میں ان کا خون پیٹنا ایک ہو جاتا ہے۔“ علیڑے نے وقار آندھی کو دیکھتے ہوئے اپنی سون چلیان کی بھی اور وقار آندھی بیٹی کی اتنی گہری بات پہ ہلکے سے مسکرائے تھے۔

”کچھ بڑا ہمیشہ چیز کو سجانے کے پیچھے بھی کسی کا ہاتھ ہوتا ہے اور چیز کو بگاڑنے کے پیچھے بھی کسی کا ہاتھ ہوتا ہے بس فرق اتنا ہے کہ اس دنیا میں کچھ ہاتھ سنوارنے کے لیے بنائے گئے ہیں اور کچھ ہاتھ بگاڑنے کے لیے۔ اور یہ مالی بابا کی خوش قسمتی ہے کہ اللہ نے ان کے ہاتھوں کو کچھ سنوارنے کا ہنر بخشا ہے۔“ علیڑے آندھی کا سوال اچھا تھا تو وقار آندھی کا جواب بھی کمال تھا۔

”آپ کا اپنے ہاتھوں کے بارے میں کیا خیال ہے بابا؟“ اس کا سوال دلچسپ اور گہرا تھا مگر وقار آندھی خود بھلا اپنے ہاتھوں کے بارے میں کیا کہہ سکتے تھے؟ بس اس سوال پہ مسکرا کے رہ گئے تھے نظراپنے ہاتھوں پہ تھی۔

”بتائیے بابا!“ اس نے ضد کی تھی اور ضد اس کی فطرت میں چکی تھی۔

”میری جان میں خود اپنے ہاتھوں کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں بھلا؟ البتہ تم جو چاہے کہہ سکتی ہو میرے ہاتھوں کے بارے میں۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے مجرموں کی طرح اپنے ہاتھ بیٹی کے سامنے پھیلا دیے تھے۔ اور علیڑے نے چند سیکنڈ ان کے ہاتھ دیکھنے کے بعد بے ساختہ ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے تھے۔

”میرے بابا کے ہاتھ بہت بہت پیارے ہیں یہ ہاتھ بھی اللہ نے کچھ سنوارنے کے لیے بنائے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ان ہاتھوں نے ہمیشہ سنوارا ہی ہے بگاڑا کچھ بھی نہیں۔“ علی بابا آپ بہت اچھے ہیں آپ میرے آئیڈل ہیں آئی ایم کی براؤڈ آف یو۔“ وہ ان کے ہاتھوں کو محبت اور عقیدت سے بوسہ دیتی ہوئی ان کے سینے سے لگ گئی تھی اور اپنی اولاد کی اتنی والمانہ محبت دیکھ کر وقار آندھی کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں کتنی ہی دیر وہ کچھ کہہ نہ سکے تھے۔

ان کے دو بیٹے تھے لیکن جتنی محبت ان کی بیٹی ان سے کرتی تھی اتنا کوئی بھی نہ کرتا تھا۔ وقار آندھی کی زندگی بھی اپنی بیٹی سے شروع ہو کر بیٹی ہی ختم ہوتی تھی دونوں باپ بیٹی کی محبت ایک مثالی محبت تھی۔

”السلام علیکم وعلیٰ آندھی ایک پیٹ اور وائٹ شہی شرٹ میں ملبوس اپنی ڈینٹ سی شخصیت کو مزید اجاگر کرتے ہوئے ان کے سامنے آکھڑا ہوا تھا وقار آندھی کو بیٹے کی سیر پر سائل ہی بہت پرکشش لگتی تھی اس وقت بھی ان کی نظروں میں آؤر کے لیے ستائش تھی۔

”والسلام اتنی جلدی کہاں جا رہے ہو؟“ انہوں نے اپنی مضبوط کلائی موڑتے ہوئے ٹائم دیکھتے ہوئے پوچھا تھا اس وقت صبح کے سات بج رہے تھے۔ اور وہ لوگ آؤر کے لیے آٹھ ٹو بج گھر سے نکلتے تھے۔

”مجھے بہت افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ ڈیڈ آپ بوڑھے ہو گئے ہیں۔“ آؤر کی بات پہ وقار آندھی کے ساتھ ساتھ علیڑے نے بھی حیرت سے اسے دیکھا تھا انداز دونوں کا استغما یہ تھا۔

”ابھی رات کو ہی ڈیڈ کو بتانے ان کے کمرے میں بھی گیا تھا کہ میں صبح فیکٹری کی مشینری کا کچھ سامان لینے کراچی جا رہا ہوں اور اس کام میں تین چار دن لگ جائیں گے لیکن ڈیڈ اتنے بوڑھے ہو چکے ہیں کہ انہیں اس وقت کچھ بھی یاد نہیں۔“ آؤر کے جواب پہ وقار آندھی بے ساختہ مسکرائے تھے۔

”ہاں اولاد جوان ہو جائے تو ماں باپ بوڑھے ہی ہو جاتے ہیں۔“ انہوں نے آؤر کا کندھا تھپکا تھا۔

”لیکن ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمیشہ جوان ہی رہیں۔“ آؤر کی بات پہ علیڑے ہنسی تھی۔

”رے میں بیٹا جوانی بہت بری شے ہے۔ بہت سی برائیوں کی جڑ ہے یہ جوانی۔ اگر انسان پہ یہ جوانی ہمیشہ رہتی تو دنیا میں بہت کم لوگ بچے رہتے اور کیا فساد ہوتے اور کیا کیا مہمیں آتیں۔ شکر ہے کہ یہ خطرناک شے اللہ نے گزر جانے کے لیے بنائی ہے یہ گزر جاتی ہے تو انسان سکون مہر اور برداشت کے لہارے میں آجاتا ہے جیسے کسی طوفان کسی آندھی کے بعد سکون اور سناٹا چھا جاتا ہے کچھ ایسا ہی حال جوانی کے بعد بھی ہو جاتا ہے۔ جوانی جو کہ یہ ہو تو دو سروں کو ڈراتی ہے وحشت کا قی ہے رلاتی ہے اور جو جوانی ڈھل جاتی ہے تب دو سروں سے ڈرتی ہے خوف زدہ ہوتی ہے اور روتی ہے۔ اور روئے کا مطلب ہے عاجزی۔ اور عاجزی اللہ کو بہت پسند ہے میرے بچے۔“ وقار آندھی بہت گہرائی سے بولے تھے اور ان دونوں نے بھی انہیں بہت گہرائی سے سنا تھا۔

”صبح صبح اتنی اچھی بات بتانے کے لیے تھنکس مجھے اجازت دیجیے میں اب چلتا ہوں۔“ آؤر ہاتھ ملا کر جانے کے لیے پلٹا۔

”علیڑے۔۔۔!“

”جی بھائی؟“

”کچھ منگوانا ہے کراچی سے؟“ وہ جہاں بھی جاتا تھا علیڑے سے ضرور پوچھتا تھا۔

”جی منگوانا ہے۔“ وہ آستکی سے بولی تھی۔

”کیا؟“ آؤر کو خوشی ہوئی تھی کہ وہ کچھ منگوا رہی ہے۔

”سمندر۔“ وہ مسکرا کر شرارت سے بولی تھی۔

”یعنی تم لاہور کو ڈوننا چاہتی ہو؟“

”نہیں میں خود ڈوننا چاہتی ہوں۔“

”تمہارے لیے تو ایک گلاس پانی بھی کافی ہے ڈوبنے کے لیے۔“ آؤر نے چھیڑا تھا۔

”نہیں میں ایسی جگہ ڈوننا چاہتی ہوں جہاں سے میرا کوئی اتنا بھی نہ ملے۔“

”تو پھر سمندر کو لاہور لے کر آنے کی کیا ضرورت ہے تم میرے ساتھ کراچی چلو۔“ آؤر اس کی باتوں کا جواب

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ پیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریٹخ
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↩ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↩ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

دلچسپی سے دے رہا تھا۔
”مگر میں چاہتی ہوں کوئی خود مجھے ڈوبنے کے لیے آئے۔“ علیزبے کا لہجہ عجیب سا ہوا تھا۔
”یہ تم سمندر کی بات کر رہی ہو یا کسی انسان کی؟“ آڈر ٹھٹکا تھا۔
”بات تو ایک ہی ہے آڈر بھائی ڈوبنے والا بھی ظالم ہوتا ہے اور ڈوبنے والا بھی ظالم۔ یعنی سمندر بھی ظالم اور انسان بھی۔“ علیزبے کا لہجہ ہنوز تھا۔
”لگتا ہے پاگل ہو گئی ہو۔“ وہ ہلکے سے مسکراتے ہوئے اس کے سر پر چیت لگا کر آگے بڑھ گیا تھا اور علیزبے مایہ بابا کے پاس جا کر باتیں کرتے تو قار آندری کے پاس آئی تھی۔
”چلیں پیلا نا شتا کرتے ہیں مجھے بھوک لگ رہی ہے۔“ وہ ان کا بازو پکڑتے ہوئے بولی تھی اور وہ اپنی بات ختم کر کے ہی بیٹی کے ساتھ قدم بڑھاتے اندر ڈائننگ روم میں آگئے جہاں باقی فوج بھی جمع ہو چکی تھی۔

آج موسم بے حد سرد تھا پچھلے کئی دنوں سے انگلینڈ کے تمام شہروں میں لگاتار ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی اور یہ بارش تمام شہریوں کے لیے ایک معمول بن گئی تھی جیسے یہ بھی ان کی روٹین کا حصہ ہو اور اس بارش کے باوجود وہ اپنے روزمرہ کے کام بہت ہی اچھے طریقے سے نبھاتے تھے ایسی بارشیں ان کی صحت اور کام پر ذرا اثر نہیں ڈالتی تھیں۔ لیکن آج رات ہونے والی اندھا دند برف باری نے تمام نظام درہم برہم کر کے رکھ دیا تھا۔ روزمرہ کی روٹین دُشرب ہو گئی تھی تمام سڑکیں تمام راستے بند ہو چکے تھے۔
آج اندرون اور بیرون ملک جانے والی تمام فلائٹس بھی کینسل ہو چکی تھیں بہت سے شہری اپنے گھروں سے نکلنے سے بھی قاصر تھے کیونکہ ان کے کھڑکیوں دروازوں کے آگے بھی برف کے پہاڑے گھڑے تھے آج برف چھ سات فٹ تک پڑی تھی اور گورنمنٹ کے ملازمین صبح سے سڑکوں اور گھروں کے سامنے سے برف ہٹانے میں جتے ہوئے تھے اور یہ ان کی پھرتی اور بہادری تھی کہ وہ ہر ایک بچے تک گھروں کے سامنے سے برف ہٹانے میں کافی حد تک کامیاب ہو گئے تھے بہت سے لوگ برف کے پتے ہی قیدیوں کی طرح گھروں سے باہر نکلے تھے اور ان قیدیوں میں ایک وہ بھی تھی جو گھر سے نکلنے کے لیے نے تاب ہو رہی تھی۔ اس نے گرم مقرر سر اور کانوں پر لپیٹے ہوئے چونک کر دروازے کی سمت دیکھا جہاں فائر بیگم کھڑی اسے دیکھ رہی تھیں۔
”کہاں جا رہی ہو؟“ مقرر لیٹ کر وہ اپنے ہاتھوں پر بلیک گھر کے گرم گلوڑ چڑھانے لگی تھی۔
”میں کیا کہہ رہی ہوں مدحیہ؟“ فائر بیگم نے سختی سے کہا۔
”پسے فریڈز کے ساتھ جاری ہوں مام۔ کسی کے ساتھ بھاگ نہیں رہی آپ فکر نہ کریں۔“ مدحیہ دروازے کی سمت بڑھتے ہوئے خفگی اور ناگواری سے بولی تھی۔
”نیل تمہارا پاسپورٹ مانگ رہا تھا فریڈز نے کو ہم لوگ پاکستان جا رہے ہیں اس نے ٹکٹ کنفرم کروانے ہیں۔“ فائر بیگم کی آواز پر اس کے قدم ٹھٹک گئے تھے۔
”میں نے آپ کو کل ہی بتا دیا تھا کہ میں پاکستان نہیں جاؤں گی آپ نے میرا جواب نیل بھائی کو بتایا نہیں؟“ وہ بیرونی دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھے اپنے انٹی سرکش لہجے میں بات کر رہی تھی۔
”بتایا تھا مگر وہ کہتا ہے تم ایک بار پھر سوچ لو تم کہاں رہنا پسند کرو گی؟ پاکستان میں یا پھر انگلینڈ میں اگر پاکستان میں رہو گی تو سب اپنوں کے درمیان رہو گی اور اگر انگلینڈ میں رہو گی تو ان کی رہ جاؤ گی کیونکہ انگلینڈ رہ جانے کی صورت میں تمہیں ہم سے ہمیشہ کے لیے غلطی ختم کرنا ہو گی۔“ فائر بیگم نرم مزاج خاتون تھیں مگر جب ان کا

مزاج سخت ہوتا تھا تو پھر نرمی کا شائبہ تک نہیں ملتا تھا اور ایسا ہی مزاج ان کے بیٹے نبیل حیات کا بھی تھا نبیل نرم خور اور تحمل پسند آدمی تھا جبکہ مدحیہ اسے باپ کی کالی بھی خود سرخندی اور ہٹ دھرمی اتنی جیسی بات کر کے سننے والے کو ایک پتھو جاتی تھی یہاں تک کہ وہ باپ کا بھی کوئی لحاظ نہیں کرتی تھی البتہ نبیل غصے میں ہوتا تو اس سے دب جاتی تھی اور ایسا بھی کبھاری ہوتا تھا۔

”آپ لوگ مجھ کو دھمکی دے رہے ہیں؟“

”نہیں ہم حقیقت بتا رہے ہیں۔“

”تو پھر آپ لوگ میری حقیقت کیوں نہیں سمجھتے؟ میں پاکستان نہیں جاسکتی میں وہاں کبھی بھی ایڈجسٹ نہیں کر سکتی پاکستان ازناٹ مانی کنٹری۔“ مدحیہ پاؤں پر کرجی تھی۔

”یہ بات تم نبیل کو بتانا۔ شاید وہ تمہاری حقیقت سمجھ جائے۔“ قاریہ بیگم سیٹھ سے انداز میں کہہ کر لیٹ کے اپنے بیڈروم میں چلی گئی تھیں اور مدحیہ غصے سے بیرونی دروازہ - دھڑام سے بند کر کے گھر سے باہر نکل آئی تھی۔

”ہائے میڈی۔“ کرشمینا اسے دیکھتے ہی قریب آگئی۔

”ہائے“ مدحیہ نے آہستگی سے جواب دیا تھا۔

”کہاں جا رہی ہو؟“

”آج شیفے اور برائے کا برتھ ڈے ہے اس لیے مارکیٹ سے گفٹ لینے جا رہی ہوں۔“ وہ دونوں روڈ پہ ایک ساتھ پیدل چل رہی تھیں اور دونوں نے ہی اسے ہاتھ لانگ کوٹ کی جیبوں میں پھنسا رکھے تھے۔

”میں نے تو ان کورات کو ہی دوش کر دیا تھا۔“ کرشمینا فخریہ بولی۔

”کل میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے رات کو جلدی ہو گئی تھی اور دیے بھی پارٹی تو کن ہی ہے نا؟“

”مدحیہ بہت ہی نارمل سے تھے میں بات کر رہی تھی اور ایسا تب ہی ہوتا تھا جب کہیں ابھی بولی ہوتی تھی۔“

”طبیعت تو تمہاری اب بھی خراب لگ رہی ہے۔“ کرشمینا نے اسے غور سے دیکھا۔

”میں بہت ڈسٹرب ہوں کرٹی۔“ بالا خراس نے کہہ ہی دیا تھا اور پھر شام کو شیفے اور برائے کی برتھ ڈس پارٹی میں بھی مدحیہ کی ڈسٹربنس کی ہی باتیں ہو رہی تھیں۔

”یہ لو ساری ڈسٹربنس کا حل۔“ جیزی نے واٹن کا گلاس اس کے سامنے رکھ دیا تھا جیزی اس کا بہت کھوز فریڈ تھا وہ مدحیہ کی براہم جانتا تھا۔

”نہیں یار موڈ نہیں ہے۔“ اس نے گلاس پیچھے ہٹا دیا تھا۔

”ایک بار ہونٹوں سے ٹو لگاؤ موڈ خود بخود بدل جائے گا۔“ جیزی نے اسے پھیڑا تھا۔

”جیزی پلیز میرے مسئلے کا حل نشے میں نہیں ہے بلکہ کچھ سوچنے میں ہے مجھے سوچنے دو۔“ مدحیہ جڑ پڑی ہو رہی تھی۔

”یار وہ دیکھو وہ لوگ بھی کچھ دیر پہلے بہت پریشان تھے اب کیسے بے فکر ہو کر زندگی کے مزے لوٹ رہے ہیں۔“

جیزی نے ایک لڑکی اور لڑکے کی بہت اشارہ کیا جو اس ہال کے ایک کونے میں کھڑے نشے میں بے سندھ تمام حدود کو اس کرچکے تھے اور یہی حال موجود تمام یگ لڑکے لڑکیوں کا بھی تھا۔

”تم جانتے ہو جیزی مجھے ایسا کچھ بھی پسند نہیں ہے۔“

”ایک بار یہ چکھ لو پھر سب کچھ پسند آجائے گا۔“ وہ اسے شراب پینے پر اکسارہا تھا۔

”ایم سوری۔“ اس نے پھر انکار کر دیا اور پھر جیزی لایروالی سے گندھے اچکا کر وہاں سے ہٹ گیا تھا اور

☆ ☆ ☆

تیری اس ادا سے بھی ہوں آشنا، تجھے اتنا جس پہ غور ہے
میں جیوں گا تیرے بغیر بھی مجھے زندگی کا شعور ہے
جو سمجھ لیا تجھے بے وفا تو پھر اس میں تیری بھی کیا خطا؟
خلل ہے میرے دل کا یہ میری نظر کا قصور ہے
کوئی بات دل میں وہ ٹھکان کے نہ ابھڑے تیرے شان سے
وہ نیاز مند جو کہ سرہ خم کئی دن سے تیرے حضور ہے
میں نکل کے بھی تیرے دام سے نہ کروں گا اپنے مقام سے
میں قتل جو رہا ستم سہی مجھے تم سے عشق ضرور ہے!
مجھے تم سے عشق ضرور ہے

مجھے تم سے عشق ضرور ہے

ڈائری کے خوبصورت صفحات یہ وہ اپنے پسندیدہ اشعار لکھتے لکھتے آخری جملے پھر سی گئی تھی اور اس کا پین اسی ایک جملے کو بار بار تحریر کرنا جا رہا تھا ”مجھے تم سے عشق ضرور ہے“ یہ جملہ اس کا پین ہی نہیں اس کی دھڑکنیں بھی دل کے کاندھ پہ بار بار لکھتی جا رہی تھیں اس کا دل اس جملے پہ ہمک رہا تھا اور وہ اس جملے کو بار بار لکھنے سے باز نہیں آ رہی تھی۔

”محترمہ اب بس کرو کتنا لکھو گی اس جملے کو؟“ نگارش نجائے کب چکے سے کمرے میں داخل ہوئی اور دبے قدموں سے چلتی اس کے پیچھے آکھڑی ہوئی تھی اور وہ اپنی ڈائری میں شاعری لکھنے میں ایسی محو تھی کہ اس کی آند کا زرا احساس نہیں ہوا تھا اور نگارش کی اچانک ابھرنے والی آواز پر بری طرح گڑبڑا گئی تھی اور اس گڑبڑا ہٹنے سے کام خراب کر دیا تھا اس کا ہاتھ ٹھٹکنے سے پورا صفحہ داغ دار ہو گیا تھا اتنی خوبصورتی اور نفاست سے لکھے اشعار بد نما سے نظر آنے لگے تھے جس پر نگارش کو تو بے حد افسوس اور ندامت بھی ہوئی تھی مگر وہ چپ چاپ عجیب سی نظروں سے دیکھتی رہ گئی اس کی آنکھوں میں ہلکے سے دکھ کا عکس تھا۔

”زری ایم سوری یار ایم ریکی وری سوری۔“ مجھے ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنی محبت سے لکھ رہی ہو۔“

نگارش کو گہری شرمندگی نے گھیر لیا تھا۔

”اس اوکے بھابھی چند لفظی تھے نا جو مٹ گئے کون سا قسمت کا لکھا مٹا ہے جس پر افسوس کیا جائے؟“ زری

چند لمحے بعد بغور لفظوں کی بگڑی حالت دیکھتی رہی پھر سر جھٹک کر نگارش کی سمت متوجہ ہوئی تھی۔

”آپ میرے بیڈروم میں بدروحوں کی طرح کیوں چکر رہی ہیں؟ عبد اللہ بھائی کہاں ہیں؟“ اس نے سوال کرتے ہوئے نبیل پر بکھری شاعری کی کتابیں سیٹھا شروع کر دیں۔

”وہ نیچے نبیل بھائی کے پاس بیٹھے ہیں۔“ نگارش چلتی ہوئی زری کی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آرکی تھی جہاں وہ نیچے نبیل بھائی کے پاس بیٹھے ہیں۔

بہت ہی قریب رفیومز کا کلیکشن سجا تھا وہ پونی رفیومز اٹھا اٹھا کر چیک کرنے لگی تھی۔

”یار یہ“ ماسیٹ فرینڈ“ کی خوشبو تو بدبو ش کر کے رکھ دیتی ہے۔“ نگارش رفیوم اپنی آستین پہ اس پرے کرتے

ہوئے مسکراتے لہجے میں بولی تھی۔

”لیکن جس نے یہ خوشبودی ہے وہ کبھی بھی مدہوش نہیں ہونے دیتا نہ اپنی قرمت میں نہ اپنی محبت میں اور نہ اپنی فرقت میں۔“ زری نگارش کے ہاتھ میں موجود پر فوم کی خوبصورت سی شیشی دیکھ کر بس سوچ کے رہ گئی تھی۔

”زری یہ پر فوم برتھ ڈسپے تمہیں کس نے گفٹ کیا تھا؟“ نگارش نے بے ساختہ پوچھ لیا تھا۔

”جی نہیں اتنے زیادہ گفتگو تھے اب تو ٹھیک سے یاد بھی نہیں ہے۔“ حالانکہ اس کے دل پہ لکھا تھا کہ یہ پر فوم کس نے دیا ہے۔

”ہوں ویسے ہے بہت قیمتی اور بہت کمال کی خوشبو ہے۔“ نگارش نے دوبارہ تعریف کی لیکن زری اسے اتنا بھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ تمہیں پسند ہے تو تم رکھ لو۔

”نیل کے ساتھ مدحیہ نہیں آئی؟“ زری بات ٹالنے کو بولی تھی۔

”مدحیہ آتی تو اس وقت تمہارے سامنے ہوتی۔“

”یعنی نیچے دونوں مرد حضرات اکیلے ہیں؟“

”جی جناب اکیلے ہیں اور میں ان دونوں میں مس فٹ تھی اس لیے تمہارے پاس آگئی۔“ نگارش ڈریسنگ ٹیبل سے ہٹ کر سیدھے آگئی تھی۔

”مدحیہ بہت دنوں سے ہمارے گھر نہیں آئی کیا مسئلہ ہے؟“ زری کو تشویش ہوئی تھی کیونکہ بہت دنوں سے نیل ہی دو تین بار آیا تھا مدحیہ نے تو شکل بھی نہیں دکھائی تھی۔

”مسئلہ گھبر ہے یار۔“ نگارش سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی تھی جبکہ زری ٹھنک سی گئی۔

”کیا مطلب؟“

”نیل بھائی اور فائزہ آئی پاکستان شفٹ ہو رہے ہیں نیل بھائی نے اپنا سارا برنس وائمنڈ اپ کر لیا ہے اور فرائڈز کے لیے ٹکٹ بھی کنفرم کر دیا ہے ہیں مدحیہ اپنا پاسپورٹ نہیں دے رہی وہ پاکستان نہیں جانا چاہتی اس نے صاف انکار کر دیا ہے ان کے گھر میں کافی مسئلہ چل رہا ہے آج کل۔“ نگارش کے ساری بات بتانے پر زری خاصی پریشان ہو گئی تھی۔

”وہ پاکستان کیوں نہیں جانا چاہتی؟“

”یار یہ تو وہ بتا سکتی ہے کہ وہ کیوں نہیں جانا چاہتی؟“ نگارش نے کندھے اچکائے تھے۔

”تھیں کوئی اور مسئلہ تو نہیں ہے؟“ زری نے پرسوج انداز میں کہا۔

”سوچا تو میں نے بھی یہی ہے۔“ نگارش نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

”لیکن بھائی اگر وہ کسی کو پسند کرتی تو مجھے ضرور بتاتی۔ وہ اپنی باتیں چھپاتی نہیں ہے۔“ زری ڈانوا ڈول تھی۔

”پھر بتا نہیں کیا چکر ہے اس نے فائزہ آئی کو صاف انکار کر دیا ہے کہ وہ پاکستان نہیں جائے گی۔“

”ہوں! میں بات کر رہی تھی اس سے اگر وہ نہ آئی تو میں صبح خود جاؤں گی اس سے ملنے۔“ زری چھوٹا سا کشن گود میں لے کر نیچے نکل کر کشن پہ بیٹھ گئی تھی۔

”تم بھی تو پاکستان جانا چاہتی ہو تم کب جاؤ گی؟“ نگارش نے اس پہ نظریں جماتے ہوئے ذہنی لہجے میں پوچھا تھا اور زری کی نظریں بے ساختہ اس جملے جھک گئی تھیں۔

”کیا مجھ سے شک آگئی ہے؟“ وہ ہنسنے ہوئے بولی۔

”ارے میری جان دل والوں سے کون شک آسکتا ہے؟“ نگارش نے بیڈ پہ بیٹھے بیٹھے ذرا سا جھک کر زری کا

گال چھینچا تھا۔

”وہ انجان بنے ہوئے بولی تھی۔“ وہ کسی مطلب دل والوں سے؟ ”وہ دل والا نہیں دل والا ہے وہ داغ سے سوچتا اور داغ سے ہی مطلب یہ کہ تم دل والی ہو لیکن افسوس یار“ وہ دل والا ہے وہ داغ سے سوچتا اور داغ سے ہی مطلب یہ کہ تم دل سے سوچتی ہو اور دل سے کرتی ہو۔ بے شک وہ سراپا دل ہے مگر پھر بھی اس پہ داغ جاوی رہتا کرنا ہے اور تم دل سے اور تم محبت کی چیز یا ہو بہت دلچسپ جوڑی ہے۔“ نگارش نے وہ سب کہہ ڈالا جو زری دل سے وہ سوچ کا پرندہ ہے اور تم محبت کی چیز یا ہو بہت دلچسپ جوڑی ہے۔“ نگارش نے وہ سب کہہ ڈالا جو زری دل سے لے پھری تھی زری کو حال دل عیاں ہو جانے پر بڑی حیرت ہوئی تھی۔

”بھائی آپ کو کیسے؟“ اس سے کچھ بولا ہی نہیں گیا تھا۔

”سوٹ ہارٹ تم بھول رہی ہو کہ میں بھی ایک دل والی“ ہی ہوں میری تمہارے بھائی سے لومینج ہوئی ہے میں نے بھی محبت کی ہے میں بھی محبت کے استاد کی شاگردہ چکی ہوں بس فرق اتنا ہے کہ ہمیں ڈگری مل گئی ہے اور تم ابھی زیر تعلیم ہو۔ تمہارا امتحان ابھی باقی ہے۔“ نگارش کی شاعرانہ سی باتوں پہ زری کو خوشگوار حیرت اور خوشی ہوئی۔ ”گویا اسے کوئی راز داراں کوئی نمکسار مل گیا تھا! اب وہ بھی سب کی طرح اپنے دل کی باتیں کہہ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر سکتی تھی اب وہ بھی گھٹ گھٹ کے جینے کی بجائے کھل کے سانس لے سکتی تھی۔“

”بھائی آئی تو یو سوچ یار آئی تو یو سوچ۔“ زری بے ساختہ اٹھ کر نگارش سے لیٹ گئی تھی۔

”بھائی لڑکی تم خود ہی اس بات کو چھپاتی تھیں اس لیے کبھی میں نے بھی ذکر نہیں کیا۔“ نگارش نے اس کے گال پہ ہاتھ مار لیا تھا۔

”میں۔ میں ڈرتی ہوں بھائی مجھے تشویش ہونا اچھا نہیں لگتا اور پھر عبداللہ بھائی کا خیال دامن پکڑ لیتا ہے۔ وہ کیا سوچیں گے میں ان کے دوست سے۔“ زری کہتے کہتے لب بھینچ گئی تھی۔

”زری تمہیں بتا رہے ہیں نا جس دوست کی تم بات کرتی ہو وہ نیل اور عبداللہ کی جان ہے وہ تینوں دوست اک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں ایسے میں اگر وہ تمہیں پسند کرتا ہے یا تم سے شادی کرتا ہے تو مجھے پتا ہے عبداللہ بہت خوش ہوں گے اس سے بڑھ کر اور خوشی بھلا کیا ہوگی کہ ان کی بہن بہن کے ان کے دوست کے گھر جائے۔“

نگارش نے بات کرتے ہوئے زری کی آنکھوں میں دیکھا اس کی آنکھوں میں بہت سی چاہت کے ویسے روشن تھے۔

”مگر بھائی وہ بہت ہی پتھر انسان ہے اس نے کبھی مجھے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا کبھی میرے لیے اپنے ہونٹوں سے اک حرف تک ادا نہیں کیا۔“ اسے شکایت ہوئی دل کے وہم و سوسے دل سے نکل کر چہرے پہ پھیل گئے تھے۔

”وہ تمہاری عزت کرتا ہے اس لیے ایسا کرتا ہے۔“ نگارش نے سچ کہا تھا لیکن زری کو اس سچ سے کوفت اور بے زاری ہوئی تھی۔

”اتنی عزت؟ صرف میری ہی کیوں؟ مدحیہ کی کیوں نہیں کرتا؟ مدحیہ بھی تو نیل کی بہن ہے۔ اسے دیکھتا بھی ہے اس سے باتیں بھی کرتا ہے اس کے ساتھ ہنستا بھی ہے اور اس پہ غصہ بھی کرتا ہے۔“ زری کی شکایتوں کا بند کھلا تو یکدم پھری گئی۔

”جس پہ نگارش بے ساختہ قہقہہ لگا کے ہنسی تھی۔“

”سچ کہتے ہیں محبت میں تو ہواؤں سے بھی رقابت ہو جاتی ہے یہ تو پھر مدحیہ ہے اس کی منہ بولی بہن۔“ نگارش ابھی بھی نہیں رہی تھی۔

”لگتی اگر تم غور کرو تو مدحیہ رشتے میں تمہاری منہ ہوگی کیونکہ وہ مدحیہ کو بہن سمجھتا ہے اور یہ مدحیہ جو آج کل فائزہ آئی اور نیل کے بھائی کے قابو میں نہیں آ رہی مجھے پورا یقین ہے کہ اگر وہ یہاں ہوتا تو مدحیہ کب کی پاکستان

جائے گے لیے مان چکی ہوتی۔ "زری نگارش کی بات یہ اپنا سامنے لے کر دہ گئی تھی کیونکہ وہ بھی تو کہہ رہی تھی اس کی اپنی کوئی بہن نہیں تھی وہ شروع سے مدد دینے کو ہی بہن سمجھتا آ رہا تھا اور مدد دینے بھی اس سے خاصی فریفتہ اور کلوز تھی لیکن زری شکایت کرتے ہوئے یہ بھول گئی کہ وہ کس رشتے پہ شکوہ کر رہی ہے؟

"کیا ہوا چپ کیوں ہو گئی ہو؟" نگارش نے اسے چھیڑا۔

"بس ایسے ہی۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"یہ 'ہیٹ فرینڈ' اسی نے گفت کیا ہے نا؟" اس کے انداز میں شرارت تھی اور زری نے مسکراتے ہوئے سر ہلادیا تھا۔ جس پہ نگارش ایک بار پھر کھلکھلا کر ہنسی تھی اور زری نے خفت سے چہرہ جھکا لیا تھا۔

وہ رات کو سونے سے پہلے صبح چھ بجے کا الارم سیٹ کر کے سویا تھا اسے پتا تھا کہ وہ بے حد تھکا ہوا ہے اس لیے ہو سکتا تھا کہ صبح آنکھ دیر سے کھلتی۔ جس کے ذریعے اس نے پہلے سے ہی انتظام کر لیا تھا لیکن ہوا وہی تھا جس کا اسے ڈر تھا وہ اتنی گہری نیند سویا تھا کہ اس کی آنکھ الارم کی تیز آواز پہ بھی نہیں کھلی تھی یہاں تک کہ سورج کی تیز نوکیلی کرنیں برآمدے میں اس کے بستر تک بھی آگئی تھیں مگر دنیا جہاں سے بے خبر لمبی ماں کے گہری نیند سو رہا تھا حالانکہ گھر میں موجود اس کی امی اور بہنیں ناشتا کرنے کے بعد گھر کے چھوٹے موٹے کام بھی بند چکی تھیں لیکن پھر بھی ان لوگوں نے اسے جگانے کی کوشش نہیں کی تھی وہ بھی جانتی تھیں کہ وہ اتنے دنوں سے تھکا ہوا ہے۔

صبح گھر سے نکلتا ہے اور شام کو مایوس تھکا ہوا واپس آتا ہے لیکن نوکری کی نوید کہیں سے نہیں ملتی۔ لیکن میں دھڑام کی آواز پہ وہ یکدم ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا تھا اس نے غائب باغی سے سارے ماحول کو سمجھنے کی کوشش کی تھی کیونکہ اس کے خیال میں اس وقت صبح چھ بجے کے مطابق ہونا چاہیے تھا جبکہ یہاں تو ہر طرف سورج صاحب کارانچ نظر آ رہا تھا۔

"کیا ٹائم ہوا ہے امی؟" اس نے آگے پیچھے جھوٹا سا الارم کلاک دیکھتے ہوئے پوچھا تھا جو وہ قریب ہی چھوٹی سی تپائی پہ رکھ کے سویا تھا۔ مگر اس وقت کلاک بھی غائب تھا اور تپائی بھی۔

"نوں رہے ہیں بیٹا تم سمجھتے ہوئے تھے اس لیے تمہیں نہیں جگایا تم اٹھ کر منہ ہاتھ دھو لو مریم تمہارا ناشتا بنا دیتی ہے۔" عابدہ خاتون نے نرمی سے کہا تھا۔

"وہ میرے خدا یا۔ آپ نے یہ کیا کیا امی؟ مجھے ایک جگہ انٹرویو کے لیے جانا تھا اتنے دنوں سے میں آج کے دن کا انتظار کر رہا تھا۔" اسے افسوس نے شکنجے میں لے لیا تھا وہ بالوں میں انگلیاں پھنساتے اپنے بستر پہ ہی بیٹھا رہ گیا آندہ دھاگے کا بنا کھیس ابھی بھی آدھا اس کی ٹانگوں پہ پھیلا ہوا تھا۔

"دیکھو بیٹا ہوتا ہی ہے جو قسمت میں ہوتا ہے تم لاگہ اس دن کا انتظار کرتے لیکن اس دن بھی وہی ہوتا ہے جو اللہ نے شروع سے ازل سے لکھ دیا ہے۔ آج تمہاری قسمت میں انٹرویو دینا نہیں لکھا تھا اسی لیے تم گہری اور بے فکر نیند سوئے رہے۔" عابدہ خاتون نے دوزانہ تم ہی تو صبح اٹھ کر کام کی تلاش میں چلے جاتے ہو۔ آج تمہیں زیادہ تو نہیں تھی؟ بس یہ سمجھو کہ آج قسمت نہیں تھی۔"

عابدہ خاتون نے بہت بار اور محل سے بیٹے کو سمجھایا تھا جو نیند سے اٹھتے ہی افسوس کی حالت میں بیٹھا تھا۔ ماں کی استنبہ چپ کا چپ رہ گیا تھا۔

"بھائی آپ کے لیے ناشتا بناؤں؟" مریم بچن سے نکلتے ہوئی بولی وہ ابھی ابھی بچن کے کام نہ کر فارغ ہوئی تھی

اس سے چھوٹی چارویں بہنیں اسکول اور کالج کے لیے نکل چکی تھیں جبکہ وہ آج کل انگریز امی سے فارغ ہو کر گھر واری میں مصروف تھی اور ماں کے ساتھ مل کر اپنی غربت اور مفلسی پہ صبح و شام جاتی کر حتی رہتی تھی۔

"نہیں رہنے دو۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے اچانک کھیس ہٹا کر بستر سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور اپنی چپل پہن کر تیزی سے غسل خانے میں چلا گیا۔ ٹھنڈے پانی کے دو تین چھپکے مارنے کے بعد گیلیا ہاتھ بالوں میں پھیرتے ہوئے غسل خانے سے نکل کر کمرے میں آگیا تھا۔ جلدی جلدی کپڑے بدلے گھڑی باندھی اور فائل اٹھا کر بغل میں دبائی اپنی استیں کے بن بند کرتا ہر نکل آیا تھا۔

"بیٹا ناشتا تو ہے۔" وہ ان سے دعا لینے کے لیے ان کے سامنے جھکا اور پھر اتنی ہی تیزی سے ساتھ والے کمرے میں چلا آیا۔

"السلام علیکم ابا! کام کے لیے جا رہا ہوں دعا کیجیے گا۔" وہ یہاں باب کے قریب جھکا اور ان کا ہاتھ چوم کر ان کی کمزوری مسکراہٹ سمیٹ کر گھر سے نکل گیا تھا۔ اور مریم اپنے بھائی کے بغیر ناشتے۔ چلے جانے کا بوجھ دل پہ لے لے تھکے تھکے قدموں سے چلتی اندر آکر اکیلی کم سمیٹھی تھی ایسا ہی کچھ بوجھ عابدہ خاتون کے دل پہ بھی تھا مگر وہ ایک باہمت خاتون تھیں وہ ایک دکھ دل میں چھپا کر دوسرے دکھ کو بھلانے آگئی تھیں ان کا شوہر دواڑے کی بہت ہی دیکھ رہا تھا کہ شاید کوئی اندر آئے اور ان کی تنہائی کٹے۔

"وہ آج پھر کام ڈھونڈنے چلا گیا ہے حالانکہ میں نے اسے منع بھی کیا ہے کہ آج گھر پہ رہو اور تھوڑا آرام کر لو۔" وہ شوہر کی آنکھوں کے سوال اسی طرح پڑھ لیتی تھیں جیسے کاغذ پہ لکھی تحریر۔

"نہیں اس نے ناشتا نہیں کیا ایسے ہی اٹھ کر چلا گیا ہے۔" وہ ان کے اک اک خاموش سوال کا جواب دے رہی تھیں۔

"ہاں آپ بھی دعا کرو اللہ اسے مایوس نہ کرے۔" عابدہ خاتون آہستہ آہستہ شوہر کے پاؤں اور ٹانگیں دبائے لگی تھیں۔

"جی مریم دو سرے کمرے میں بیوہ بھی اپنے بھائی کے بارے میں سوچ رہی ہوگی بن رات اکیلی بیٹھی اپنا خون جلاتی رہتی ہے۔" وہ سارے جواب خود ہی دیتی جا رہی تھیں اور ان کے شوہر نے آہستہ سے تھکے تھکے انداز میں آنکھیں موند لی تھیں۔ اس گھر میں موجود تینوں نفوس ایک ہی فرد کے متعلق سوچ رہے تھے اور اس ایک کے متعلق سوچتے سوچتے جب دوسرے کا خیال آتا تھا تو دل دکھ سے بھر جاتا تھا۔

آج اسے تین چار دن ہو گئے تھے نوکری کے لیے بڑی حویلی کے چکر لگاتے ہوئے لیکن اس کی بد قسمتی کہ اسے حویلی پہ کوئی بھی نہیں ملا تھا سوائے "مبارک خان" کے۔ مبارک خان وقار آندی کا خاص ملازم تھا حویلی کے تمام اہم کام مبارک خان کے ذمے تھے تمام ملازموں کی گزرائی کرتا بھی اسی کی ذمہ داری تھی۔ اس کی سب سے بڑی نظر ہوئی تھی۔ گھر کی عورتوں کو کہیں آنا جانا ہوتا کوئی شاپنگ وغیرہ کرنی ہوتی کوئی بیمار ہوتا تو ان سب کو اپنی ذمہ داری پہ اپنے ساتھ لے کر جاتا بھی مبارک خان کے کاموں میں شمار ہوتا تھا اور اکثر وہ گھر کے علاوہ وقار آندی کے آفس کے کام بھی نبھالیتا تھا اور ضرورت کے وقت وہ وقار آندی کے ڈرائیور کے فرائض بھی سر انجام دے لیتا تھا وقار آندی بزنس کے سلسلے میں شہر سے کہیں باہر جاتے تو بھی مبارک خان کو ساتھ لے کر جاتا نہیں بھولتے تھے مبارک خان ان کا رانیٹ پینڈ تھا بہت سے کام مبارک خان کے ذمے لگا کر وہ خود اکثر لایا ہوا جاتے تھے کیونکہ

انہیں پتا ہوتا تھا کہ جو کام انہوں نے کہہ دیا ہے وہ اسے کر کے ہی دم لے گا اور دوبارہ کہنے کی ضرورت بھی نہیں آئے گی اور ہوتا بھی ایسا ہی تھا وہ اپنا کام بہت محنت اور ایمانداری سے کرتا تھا۔

حویلی کے تمام ملازموں کے ساتھ وہ بہت سخت اور روکھا پھیکا تھا، اپنے مالکان کے سامنے وہ بہت مودب اور منڈب ہوتا تھا اور عام لوگوں کے لیے بے حد نرم اور رحم دل سا تھا وہ کسی کو دکھ اور پریشانی میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے آج تک وقار آفندی سے کہہ کر بہت سے لوگوں کے مسائل حل کر دیے تھے۔ بہت سے غریبوں کی مدد کو آئی تھی اور کئی لوگوں کو نوکریاں بھی دلوائی تھیں اور جس جس کو نوکری دلوائی تھی وقار آفندی اس بھی تعریف کرتے تھے کہ وہ لوگ اچھا کام کر رہے ہیں اور مبارک خان وقار آفندی کی طرف سے ملنے والی تعریف پر خوش ہو جاتا تھا اس کی بڑی بڑی منوچھیں خوشی اور فخر سے اور بھی پھول جاتی تھیں وہ دونوں طرف سے شاباشیں لگتا تھا اور اسی شاباش اور لوگوں کی بھلائی کے چکر میں آئے روز وہ لوگوں سے ہزاروں وعدے کر لیتا تھا اور ایسا ہی ایک وعدہ اس نے اس کے ساتھ بھی کیا ہوا تھا کہ وہ وقار آفندی سے اسے نوکری ضرور دلانے کا لیکن آج تین چار دن ہو گئے تھے اسے حویلی کے گیسٹ ہاؤس میں آئے ہوئے مگر وقار آفندی ملتے ہی نہیں تھے۔

دو روز سے وہ شہر سے باہر تھے اور دو روز سے وہ کسی میٹنگ یا پریس کانفرنس کے لیے نکل جاتے تھے لیکن آج وہ بھی ارادہ کر کے آیا تھا کہ ان سے ملے بغیر ہرگز نہیں جائے گا چاہے پورا دن باہر گھومتا رہے کیوں نہ کرنا پڑے۔

ابھی بھی اسے آئے ہوئے آدھا گھنٹہ ہو گیا تھا اور جو کیدار کے ہاتھ مبارک خان کو پیغام بھیجے بھی آدھا گھنٹہ گزر چکا تھا مگر اس وقت نہ تو مبارک خان کے کچھ آثار نظر آ رہے تھے اور نہ ہی حویلی کے مکیوں کی آمد کا دور دورہ تک کوئی امکان لگتا تھا وہ باہر جو کیدار کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھا انتظار کی سولی پر لٹکا ہوا تھا جو کیدار بار بار اس سنجیدہ سے لیے دیے انداز والے خوبو نوجوان کو سر ہلایا غور سے دیکھ رہا تھا لیکن اس نے ایک بار بھی جو کیدار کی سمت توجہ کی نظر سے نہیں دیکھا تھا بس اپنے مخصوص انداز میں سر جھٹکے شرافت سے بیٹھا رہا۔ کافی دیر گزر جانے کے بعد اس نے ایک بار پھر گھری۔ نظر دوڑائی تھی اب آدھے گھنٹے سے بڑھ کے پچاس منٹ ہو چکے تھے اسے یہاں بیٹھے ہوئے اور مبارک خان ابھی تک حویلی سے برآمد نہیں ہوا تھا۔

”ارے میاں میری مانو تو آج چلے جاؤ۔ آج مہینے کا آخری دن ہے آج سارے راشن پانی اور نوکروں کا حساب کتاب چکانا ہے۔ مبارک خان مہینے بھر کا حساب دینے میں مصروف ہے۔“ جو کیدار نے اسے بیٹھے بیٹھے مفید مشورہ دیا تھا۔

”مہینے بھر کا حساب دینے میں مصروف ہے؟ کون سا موت کے بعد زندگی بھر کا حساب دے رہا ہے؟“ وہ اپنے مخصوص ٹیکھے کھٹ دار لمبے میں بولنے سے باز نہیں آیا تھا حالانکہ اس کی کوشش یہی تھی کہ وہ اپنے لہجے اور اپنے انداز پر کنٹرول رکھے کیونکہ لوگ اس جیسے مزاج کے آدمی کو بطور ملازم ہرگز پسند نہیں کرتے تھے لوگ ملازم ایسا چاہتے تھے جو دب کے رہے نہ کہ دبا کے رکھے۔ اور وہ بھی یہی سوچتا تھا کہ اگر اسے کام مل جائے تو وہ ہمیشہ دب کے رہے گا کیونکہ اسے کام کی ”ضرورت“ تھی اور ضرورت کے لیے تو انسان ”کچھ“ بھی کر لیتا ہے یہ تو پھر محض اس کی عادت تھی۔

”کوئے کدھر گیا وہ آدمی؟“ مبارک خان اچانک گیسٹ ہاؤس سے نمودار ہوا اور جو کیدار سے استفسار کیا تھا۔
 ”وہ بیٹھا ہے۔“ جو کیدار نے سائیڈ پر رکھی کرسی کی سمت اشارہ کیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ مبارک خان اس کے قریب آتا وہ اس کی آواز سن کر خود ہی اٹھ کر قریب آ گیا تھا۔
 ”السلام علیکم۔“ اس نے مبارک خان سے ہاتھ ملایا تھا۔

”ہاں ہاں“ عظیم السلام چلو اندر چلو میں نے صاحب سے بات کی ہے تمہاری نوکری کے لیے لیکن وہ کہتے ہیں کہ پہلے اس آدمی سے مل لیں اسے دیکھ کر کھلیں پھر کام پر رکھیں گے۔ مبارک خان اسے بتاتے ہوئے ساتھ لے کر اندر داخل ہوا تھا اور بڑی حویلی کے گیٹ سے اندر قدم رکھتے ہوئے ایک بار اس کے قدم اپنی جگہ پر جم گئے تھے اور وہ سرے ہی پل وہ بمشکل اپنے قدموں سے جیسے بھاری پتھر باندھ کر چلتا آگے بڑھ آیا تھا عالیشان حویلی کی تین بان اس کے درو دیوار سے جھٹک رہی تھی اس نے اس حویلی کو ہزاروں بار دیکھا تھا مگر باہر سے اور دور دور سے۔

آج پہلی بار اس جنت نما حویلی کو دیکھنے کا موقع نصیب ہوا تھا حویلی جتنی باہر سے خوبصورت نظر آتی تھی اس سے سو گنا زیادہ اندر سے خوبصورت تھی کئی کنال پہ تو اس کا لان پھیلا ہوا تھا اور لان کا سبزہ نظروں کو نرم نرم سا سکون بخش رہا تھا ایک سائیڈ پر پچھلی نما فوارہ بہہ رہا تھا اور فوارے سے نکلنے والا پانی لان کے درمیان سے چھوٹی سی ندی کی طرح چکر کھا کر حویلی کے سائیڈ والے لان کی طرف جا رہا تھا البتہ لان کی دونوں سمت آنے جانے کے لیے ایک خوبصورت چھوٹا سا گولائی کی شکل میں پل بنایا گیا تھا اور اس پل سے گزر کر ہی لان کی اس سائیڈ پر جایا جاسکتا تھا۔

وقار آفندی اس وقت لان چیمبرز پر لان کی وسط میں بیٹھے کسی سے باتیں کر رہے تھے جب ان کی نظر مبارک خان اور اس کے ساتھ آتے آدمی پر پڑی تھی اور ان کے پیچھے تک وقار آفندی کی مقابل چیمبرہ بیٹھی علیحدہ سے چیمبرہ کھیل کر کھڑی ہو گئی تھی اس کی آنے والوں کی سمت پشت تھی۔

”اوکے بیانیس ویٹ کرتی ہوں آپ فارغ ہو کر جلدی آجائیں۔“ وہ جھک کر ٹیبل پر رکھی اپنی بکس اور میگزین اٹھا کر اندر کی سمت بڑھ گئی تھی اس کی متوازن چال اور قدموں کی تمکنت وہ دور تک دیکھا تھا البتہ اس حسینہ کی شکل دیکھنے سے محروم رہ گیا تھا مگر اتنا اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ وہ وقار آفندی کی بیٹی ہے کیونکہ اس کے انداز سے کا سب اس کا لفظ ”بیانیس“ تھا۔

”سلام صاحب۔“ اس نے قریب آ کر سلام کیا تھا جبکہ وقار آفندی سوالیہ نظروں سے مبارک خان کو دیکھ رہے تھے۔

”صاحب یہی ہے جس کے لیے آپ کو کام کا کہا تھا بہت ہی مجبور ہے بے چارہ۔“ مبارک خان نے وضاحت دی حالانکہ اس آدمی کے سامنے لفظ بے چارہ خود ”بے چارہ“ لگ رہا تھا اس کی ہائیٹ اور سیلج اکثر لوگوں کو ٹھنکاتا دیتی تھی کوئی اس کی مجبوریوں کا تعین ہی نہیں کرتا تھا۔

”اوہ ہاں۔ تو تم اس کے لیے کام کا کہہ رہے تھے؟“

”جی صاحب۔“ مبارک خان تیزی سے بولا۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“

”جی منصور حسین۔“ وہ مختصر بولا تھا۔

”ہاں تو منصور حسین کیا تعلیم ہے تمہاری؟“

”میٹرک تک پڑھا ہے صاحب جی لیکن میٹرک پاس نہیں کر سکا جن دنوں امتحان تھے ہمارے گھر میں بڑی مصیبت آگئی تھی میں اتنے دن اسکول ہی نہیں جاسکتا تھا۔“ اپنی طرف سے اس نے سچ بتانا ضروری سمجھا تھا۔

”کیا میٹرک بھی پاس نہیں کیا؟“ وقار آفندی کو حیرت ہوئی تھی اتنا خوبو نوجوان تھا مگر تعلیم ندار۔ البتہ حال چلے سے وہ واقعی۔ غریب لگ رہا تھا یہ بات اور بھی کہ شکل و صورت نوابوں کی طرح تھی۔ بے شک اس کے چہرے پر یہ مسکینی چھائی ہوئی تھی فکر کے سائے تھے کئی دنوں کی بڑھی ہوئی شیو تھی لیکن پھر بھی گدڑی میں

”نعل“ کی طرح پہچانا جا رہا تھا۔

”سرمیزک پاس ہو تا تو یقیناً“ آج کسی افسر کے دفتر میں پرچیاں بنا رہا ہوتا یا پھر کسی ڈاک خانے میں ڈاکیا ہی لگ چکا ہوتا۔ مگر افسوس کہ سرمیزک پاس نہیں ہوں اسی لیے جگہ جگہ دھکے کھا رہا ہوں بڑے بڑے دفتر والے تو مجھے پوچھتے بھی نہیں ہیں اس لیے سوچا ہے کہ کسی گھر میں نوکری ڈھونڈوں چاہے کوئی چوکیدار مالی یا پھر ڈرائیور ہی رکھ لے لیکن میری مشکل حل کروے۔“ اس نے وضاحت پیش کی تھی لیکن وقار آفندی شش و پنج کا شکار نظر آ رہے تھے۔

”صاحب کوئی مسئلہ ہے کیا؟“ مبارک خان نے وقار آفندی کو کشمکش سے نکالنے کی کوشش کی تھی۔

”دیکھو منصور حسین دراصل ہمیں فی الحال گھر کے لیے کسی کام کرنے والے کی ضرورت نہیں ہے چوکیدار مالی اور ڈرائیور پہلے سے موجود ہیں اور مالی اچھا کام کر رہے ہیں لہذا ہمیں بلاوجہ کام سے نکالا بھی نہیں جاسکتا اس طرح تو ان کے بیوی بچوں کی روزی روٹی یہ بھی لات مارنے والی بات ہوگی اس لیے ہم سوچ رہے ہیں کہ تمہیں اپنے آہن یا پھر فیکٹری میں کسی کام پہ رکھ لیتے ہیں بس تم تھوڑے دن انتظار کر لو ان شاء اللہ کام تمہیں ضرور مل جائے گا۔“ وقار آفندی نے اسے تسلی دی تھی لیکن وہ چند دن کا سن کر یوں ہو گیا تھا۔

”صاحب تھوڑے دنوں میں تو بہت کچھ ہو جاتا ہے میرے گھر کے حالات بہت خراب ہیں آپ پلیز زور دیر نہ کریں۔“ منصور حسین نے التجا کی تھی حالانکہ وہ التجا کرتے ہوئے عجیب لگ رہا تھا۔

”دیکھو بر خوردار کچھ سوچ سمجھ کر کوئی جگہ خالی دیکھ کر ہی تمہیں رکھنا ہے تاہنا ضرورت کے تو نہیں رکھ سکتے؟ تم مبارک خان کو اپنا گھر کا پتہ دے جاؤ جب کام نکل آیا تو وہ تمہیں بلا لے گا۔“ وقار آفندی بات ختم کر کے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

”صاحب آپ جیسا چاہیں گے میں ویسا کام کروں گا اللہ کے لیے مجھے کام پہ رکھ لیں۔“ وہ پھر لوٹے سے باز نہیں آیا تھا۔

”منصور حسین چپ رہو اگر صاحب نے کہہ دیا ہے تو وہ تمہیں ضرور کام دیں گے۔“ مبارک خان نے اسے مزید گلے پڑنے سے روک دیا تھا اور وہ وقار آفندی کو اندر جاتے دیکھ کر یوں ہو گیا تھا انداز میں تنہا اتر آئی تھی۔

”کیا کر سکتے ہو؟ کیا کام ڈھونڈ رہے ہو آخر؟“ اس آدمی نے اس کے تھکے تھکے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے کافی بے تکلفی سے پوچھا تھا۔

میں کسی سوئو کا کام کرنے کو بھی تیار ہوں مجھے لوگوں کے واش روم دھونا پڑیں۔ تو وہ بھی کر لوں گا۔“ اس کا لہجہ بے حد سادہ اور کچھ بھیگا ہوا تھا لہجے کی نمی اپنی مجبوری پہ تھی اور لہجے کی تلخی اپنی بے بسی پہ تھی۔ کیا وہ اتنا ہی قسمت کا مارا تھا کہ کوئی بھی اسے کام پہ نہیں رکھ رہا تھا حالانکہ ہر بندے کے سامنے التجا کرتا پھر رہا تھا۔ اس کو اتنے دن ہوئے تھے وہ لوگوں سے ”کام“ بھیک کی طرح مانگتا پھر رہا تھا مگر اسے یہ بھیک کسی ایک در سے بھی نصیب نہیں ہوئی تھی ہر ایک نے ”سوری“ کا سٹنل دے کر اسے دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا اور وہ پورا دن اپنے قدموں سے ٹاپ کے شام ڈھلے سروک کے کنارے بنے اسے ڈھابے کی ایک بیچ پہ آ بیٹھا تھا جہاں اس وقت چند اور لوگ بھی چائے اور سگریٹ سے شغل فرماتے میں مصروف تھے لیکن خود اس کی جیب میں دس روپے بھی نہیں تھے کہ وہ دن بھر کا بھوکا پیاسا خالی پیٹ کو چائے کے ڈبریل سے غور دینے کے لیے ایک کپ چائے کا پی لیتا۔

”اوتے باوجی کیا لے کر آؤں آپ کے لیے؟“ ڈھابے کا ملازم صفائی ستھرائی والا میلا پچلا کپڑا پہن کر پھیرنے کے بعد اپنے کندھے پہ ڈالتے ہوئے بڑے اسٹائل سے ہوا تھا۔ لیکن وہ اپنی جیبوں کے خالی پن سے واقف تھا

جیسا خاموش رہا تھا۔

”باوجی میں آپ سے بات کر رہا ہوں کیا لیتا ہے؟“ اس ڈھابے کے میٹرنے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لڑایا تھا۔

”کچھ نہیں لیتا۔“ اس نے فوراً ”نہی میں گردن ہلائی تھی اور اس کے جواب پہ جہاں میٹر کو حیرت ہوئی تھی وہیں قریب بیٹھے ایک دوکاندار بے ساختہ ہنس پڑے تھے وہ لوگ روزانہ شام پانچ بجے کی چائے اپنی دوکان میں بند کر کے اسی ڈھابے سے آکر پیتے تھے کیونکہ اس ڈھابے کی چائے بہت خالص اور مزے دار ہوتی تھی وہ کڑک سی چائے لی کر دن بھر کی تھکن بھول جاتے تھے۔

”باوجی کچھ نہیں ہے تو یہاں کیا کر رہا ہے؟“ میٹر لچاٹھی سے گویا ہوا تھا۔

”اوتے کم بخت تیری زبان کو آرام نہیں ہے کچھ کتنی بار کہا ہے کوئی نیا گاہک آجائے تو تو اپنی زبان بند رکھا کر۔“ گاہک ایسے ہی نہیں بن جاتے گاہک بنانے کے لیے بڑے پارہیلناڑتے ہیں۔

”ہاں باوجی آپ نے کچھ نہیں بھی لیتا پھر بھی آرام سے بیٹھو آرام کرو اسے اپنا ہی ہوٹل سمجھو۔“ ہوٹل کا مالک اپنے ڈھابے سے نکل کر صحن میں آگیا تھا جہاں وہ لوگ۔ کرسیاں اور ٹوٹی پھوٹی سی چارپائیاں ڈالے بیٹھے تھے۔

”شکریہ ایک گلاس پانی مل سکتا ہے؟“ اس نے ہوٹل کے مالک کی نرمی محسوس کر کے پانی مانگ لیا تھا۔

”اوتے کیوں نہیں باوجی۔ ابھی پانی پو چل شیدے جا کر صاف ستھرے گلاس میں مازو پانی لے کر آ۔“ اس نے اپنے ملازم کو حکم جاری کیا تھا۔

”جی استاذ ابھی لے کر آیا۔“ شید اب جی جی کر رہا تھا آخر اپنے مالک کا رعب اور دبہہ تھا اس پہ۔

”کیوں باوجی کیا پریشانی ہے؟ برا تھکا ہوا پریشان نظر آ رہا ہے؟“ اس آدمی نے بڑی اپنائیت سے پوچھا تھا جیسے برہمن کی جان پہچان ہوا ان دونوں کی۔

”چاہا میری پریشانی بھی وہی ہے جو آج کل کے ہر نوجوان کی ہے اے روزگاری نے جینا مشکل کر رکھا ہے جی چاہتا ہے کسی کنویں میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر لوں۔“ اس کا لہجہ زہر خند ہو رہا تھا۔

”اللہ معافی دے پتر۔۔۔ ایسا ہرگز مت کرنا اللہ بہتر کرے گا۔ تو یہ بتاؤ کام کیا کر سکتا ہے؟“ ان لوگوں کے قریب بیٹھا ایک اور نرم مل سا آدمی اچانک بول پڑا تھا۔

”فی الحال میرے کام سے میرے گھر والوں کو دو وقت کی روٹی بھی مل جائے تو میرے لیے یہ ہی اللہ کا بڑا کرم ہو گا۔“

”تو پھر میرے ساتھ کام کر۔“ وہ آدمی دوسری چارپائی سے اٹھ کر اس کے برابر آ بیٹھا تھا وہاں موجود باقی دوکاندار بھی انہی کو دیکھ رہے تھے آخر ان لوگوں میں فاصلہ ہی کتنا تھا کہ وہ ان کی گفتگو نہ سن سکتے۔

”آپ کے ساتھ کام؟“ اس نے بے یقینی سے سر اٹھایا تھا۔

”ہاں میرے ساتھ مجھے بھی بہت عرصہ سے کسی ایسے آدمی کی تلاش تھی جو منہتی اور قابل بھروسہ بھی ہو اور مجھے لگتا ہے تم میرے معیار پہ پورے اترو گے۔“ وہ آدمی اس سے زیادہ خوش ہوا تھا اور اس وقت ان دونوں کی خوشی دیدنی تھی جس کو دیکھ کر ہوٹل کا مالک بھی خوش ہو گیا تھا۔

”لو باوجی پانی ہو اللہ نے بیٹھے بیٹھے مسئلہ حل کر دیا ہے باؤ امتیاز بہت چنگا (اچھا) بندہ ہے خوب گزرے گی تم دونوں کی۔“ ان کی بات پہ وہ بھی سچ کچ خوش ہوا تھا باؤ امتیاز سے خوش خوشی ان کا ایڈریس لے کر کل صبح کام پہ آنے کا وعدہ کر کے وہاں سے رخصت ہو گیا تھا اسے اس وقت گھر جانے کی جلدی تھی اور اس جلدی اور اس خوشی

میں وہ "کام" پوچھنا بھی بھول گیا تھا یہ بات اسے گھر میں داخل ہوتے ہوئے یاد آئی تھی کہ آخر اسے کام ملا ہے؟ اور اس کشمکش میں اس کی خوشی آدھی رہ گئی تھی۔
 "السلام علیکم۔" اس نے آہستگی سے سلام کیا تھا۔

"والسلام بیٹا بھٹو میں پانی منگوائی ہوں۔" عابدہ خاتون نے صحن میں پچھی چارپائی کی سمت اشارہ کیا تھا وہ چارپائی پہ بیٹھنے کی بجائے اندر ابائی کے کمرے میں چلا آیا تھا۔

"السلام علیکم اب۔" وہ اپنی ہنسی پرانی شرٹ کے بٹن کھولتے ہوئے وہیں ان کے قریب کرسی پہ بیٹھ گیا تھا اور انہوں نے اپنی آنکھوں کی جھب سے اس کے سلام کا جواب دیا تھا اک خاموش سا۔
 "وعلیکم السلام۔" اس تک پہنچ گیا تھا۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک ہے نا؟ اب استین کے بٹن کھول کر شرٹ اتارنے لگا تھا شرٹ کے نیچے اس نے وائٹ بنیان پستی ہوئی تھی جو فی الحال وہی کافی تھی۔
 "مجھے کام مل گیا ہے آج۔" اس نے ذرا بھر کراہیں خوش خبری سنائی تھی اور اس خوش خبری پہ ان کے چہرے

اک خفیف سی مسکراہٹ دوڑ گئی تھی اب ایسی مسکراہٹ جو ان کے لبوں پہ نہیں پھیل سکتی تھی مگر ان کی آنکھوں اور چہرے کے تاثر میں اپنا عکس دکھائی تھی وہ زندگی کی ایسی تلخ اور اذیت ناک اسٹیج تھے کہ وہ رو تو سکتے تھے مگر کسی خوشی پہ ہنس نہیں سکتے تھے ان کے لب مسکرا نہیں سکتے تھے ان کی آنکھوں سے ظاہر ہوتی تھی اور ایسا ہی اک دکھ آنکھیں بھی جھیل رہی تھیں کیونکہ اگر وہ روئے بھی تھے تو اپنے آنسو خود نہیں پونجھ سکتے تھے اور اس سے بستر تھا کہ ان کے آنسو کسی اور کو پونجھنا پڑتے وہ روئے سے احتراز کرتے تھے وہ اپنے آنسو پی جاتے تھے۔

"مجھے ابھی یہ تو نہیں پتا کہ کام کیسا ہے؟ مجھے کیا کرنا ہے؟ اس کی کافی ہے کہ مجھے کہیں کام تو مل گیا ہے نا؟"
 اس نے لا پرواہی سے بتایا تھا۔

"پھر تو بہت بہت مبارک ہو آپ کو۔" مریم اس کے لیے چائے کا کپ لے کر اندر چلی آئی وہ بھی یہ خوش خبری سن چکی تھی۔

"خیر مبارک بس تم دعا کیا کرو۔" وہ چائے کا کپ تھامتے ہوئے کافی ہلکے پھلکے لہجے میں بولا تھا۔

پچھلے پانچ منٹ سے ڈورنل متواتر بچ رہی تھی لیکن گھر میں موجود دونوں افراد میں سے ایک بھی اٹھ کر دروازہ کھولنے کا نام نہیں لے رہا تھا حالانکہ رات بوجھے بھی وہ اسی طرح جاگ رہے تھے جیسے دن کے دو بجے کا وقت ہو۔
 نیل حیات چاہ رہا تھا کہ فائزہ بیگم اٹھ کر دروازہ کھولیں تاکہ وہ اس کا سامنا کرے جبکہ دوسری طرف فائزہ بیگم چاہ رہی تھیں کہ نیل اٹھ کر دروازہ کھولے تاکہ انہیں اس کے ساتھ جی جی نہ کرنی پڑے۔ اور اسی کشمکش میں وہ اپنی اپنی جگہ پہ اٹھنے اور نہ اٹھنے کا فیصلہ ہی نہیں کر پارے تھے بالا خرہ ڈورنل پہ ہاتھ رکھ کے ہٹانا بھول گئی تھی اور آخر کار نیل حیات کو رانگ جیر سے اٹھنا ہی پڑا تھا۔

مضبوط قدموں سے چلتے ہوئے بیڈ روم کا دروازہ کھول کر وہ نیچے اتر آیا تھا۔ اس کے قدم جتنے مضبوط اتنے ہی بھاری بھی محسوس ہو رہے تھے اس نے لب بچھتے ہوئے آگے بڑھ کے ڈور کھول دیا۔ سامنے ہی وہ نئے کی حالت میں کھڑی اپنا تو اذن برقرار نہ رکھتے ہوئے تقریباً "ڈول رہی تھی۔ نیل کو اسے سامنے دیکھ کر ذرا اٹھکی۔
 "ہائے۔" اس نے نوہن کھڑے کھڑے ہاتھ ہلا کر اس کی سمت ہلکی سی مسکراہٹ اچھال گئی۔

"مدحیہ" نیل یکدم غصے سے دھار اٹھا اس کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو گئی تھیں وہ کافی سخت تیوروں سے اس کی سمت بڑھا تھا۔

"نیل رکو۔" فائزہ بیگم یکدم وہل گئی تھیں تھوڑی دیر پہلے وہ بھی اٹھنے سے گریز کر رہی تھیں مگر جب نیل کے پیرھیاں اترنے کی آواز آئی تو نہ چاہتے ہوئے وہ بھی اٹھ آئی تھیں کہ کہیں دونوں ہن بھائی میں زیادہ بد مزگی نہ پیرھیاں اترنے کی آواز آئی تو نہ چاہتے ہوئے وہ بھی اٹھ آئی تھیں کہ کہیں دونوں ہن بھائی میں زیادہ بد مزگی نہ ہو جائے۔

"مہر آپ پلیز اس معاملے سے دور رہیں اب میں خود نبٹا لوں گا" آخر یہ کیا چاہتی ہے؟ یہ ایسا کیوں کر رہی ہے؟
 "کیا پلان ہے اس کا؟" اس کا بازو اپنے جار جانہ ٹکٹے میں دوپٹے ہوئے اسے چھینچتا ہوا اندر لے آیا تھا اور لا کر ڈرائنگ روم کے صوفے پہ دھکیل دیا تھا وہ لڑکھڑاکے منہ کے بل صوفے پہ گری گئی اور کتنے ہی لمحے سنبھل نہیں پائی تھی۔
 "نیل کیا کر رہے ہو؟ جاؤ اپنے کمرے میں" میں اسے دیکھتی ہوں۔" فائزہ بیگم لپک کر پھر اس کے پیچھے ڈرائنگ روم میں آئی تھیں۔

"نہیں میں آج اس سے فائنلی بات کر کے جاؤں گا اسے ایک آخری فیصلہ کرنا ہی ہوگا۔" نیل صوفے پہ جھکی ہوئی مدحیہ کی طرف دوبارہ بڑھنے لگا کہ اچانک تیزی سے فائزہ بیگم نے اسے بازو سے پکڑ کر روک لیا۔

"کیا بات کر رہے اس سے؟ وہ تو ہوش میں ہی نہیں ہے۔" انہوں نے تنہی سے اس کے بے حس و حرکت وجود کی سمت اشارہ کیا تھا کیونکہ اگر وہ ہوش میں ہوتی تو یقیناً "اب تک سنبھل کر سیدھی ہو چکی ہوتی مگر وہ ابھی بھی اوندھے منہ گری ہوئی تھی۔ اور نیل خیالت غصے اور بے بسی سے درمیانی میز کو پاؤں کی ایک زوردار ٹھوک مار رہا ہوا واپس پلٹ گیا تھا۔

"ابھی تو یہ ہوش میں نہیں ہے لیکن صبح اس کے سارے ہوش و خواص ٹھکانے آچکے ہوں گے آپ بس اسے اتنا باریجیے گا کہ کل میرے اٹھنے سے پہلے وہ کہیں مت جائے اسے جو بھی فیصلہ کرنا ہے وہ کل صبح ہو جانا چاہیے میں اب اور زیادہ برداشت نہیں کروں گا بس۔" وہ جاتے جاتے سیرھیلوں سے پلٹ کر ماں کو اپنا فیصلہ سنا آیا تھا لیکن پھر بھی اس کے اندر کا غصہ اور بے بسی کم نہیں ہو پارہی تھی وہ اضطرابی انداز میں اپنے کمرے میں ادھر سے ادھر پھرتے لگا تھا سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس لڑکی کے ساتھ کیا کرے؟ وہ اتنے دنوں سے کسی لاش پہ نہیں آ رہی تھی اور فائزہ بیگم اس کے ساتھ بحث و تکرار کر کے تھک چکی تھیں۔ البتہ وہ خود بھی ایک بار بھی اس کے روبرو نہیں ہوا تھا وہ چاہتا تھا کہ یہ معاملہ اک دوسرے کے سامنے آئے بغیر ہی نبٹ جائے لیکن اس لڑکی نے اس کی پروا نہ کیا یہ نہ لبریز کر رہا تھا وہ ان لوگوں کی ناک میں دم کر چکی تھی اور وہ مارے عزت و غیرت کے کسی کے سامنے کھل کے اپنا مسئلہ بھی نہیں رکھ سکتے تھے۔

نیل اس کے ذکر سے بچنے کے لیے حتی الامکان کوششیں کرتا رہتا تھا مگر پھر بھی کہیں نہ کہیں سے اس کا ذکر نکل ہی آتا تھا اور وہ اب اس کے چال چلن سے اپنی تحمل مزاجی کا دامن چھوڑنے لگا تھا وہ غصہ بہت کم کرنا تھا مگر آج کل غصہ اس پہ حاوی رہنے لگا تھا صرف اس کی وجہ سے حالانکہ وہ کافی کول سا بندہ تھا۔ کمرے میں سلتے ہوئے بلکہ پکراتے ہوئے اسے ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ اس کے سیل فون پہ رنگ ٹیون بجنے لگی اس نے چونک کر سیل فون اٹھایا۔

پاکستان سے اس کے دوست کی کال تھی۔
 اس نے گھڑی پہ ٹائم دیکھا دن بچ رہے تھے تو اس کا مطلب تھا کہ پاکستان میں اس وقت صبح سات بجے کا وقت تھا۔

(باقی آئندہ شمار میں ملاحظہ فرمائیں)



نبیلہ عزیز

دردِ دل

حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علی بنے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت متاثر ہے۔

فائزہ بیگم کا اصرار ہے کہ مدیہ انجیل کے ساتھ پاکستان شفٹ ہو جائے مگر اس پر وہ قطعی راضی نہیں اور اس انکار کی وجہ سے فائزہ بیگم جہاں حیران ہیں وہی انجیل کا غم بھی عروج پر ہے۔

زارا کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست آاز سے محبت ہے۔ مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عمریل چار سال سے نوکری کی تلاش میں ہے مگر اسے کامیابی کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ اور مایوسی کے اندھیرے ہر طرف سے گھیر لیتے ہیں۔ خود کشی کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔ ایسے میں اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باوا اعیاز مل جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے۔ جس پر منصور کمالی خوش ہوتا ہے اور اسی خوشی میں کام کے بابت پوچھنا بھولی جاتا ہے۔

فائزہ بیگم کو مدیہ کی طرف سے جو خدشہ تھا جس کے پیش نظر وہ پاکستان شفٹ ہونا چاہتی تھیں وہ درست ثابت ہو گیا۔ مدیہ انگلینڈ کی رینگنوں میں مکمل طور پر رچا بس گئی ہے۔ رات کے پندرہ بجے اس کے حوالے سے قدم بھل کر اس کی سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

دوسری قسط



”السلام علیکم۔“ اس نے ذرا غصہ کر اپنے اعصاب کو کنٹرول کرتے ہوئے تقریباً ”پانچ سیکنڈ کے لیے کچھ سوچا اور پھر کال ریسیو کر لی تھی۔ لیکن اپنے اعصاب کو کنٹرول کرنے کے باوجود وہ اپنے لیے کچھ بھاری بوجھل پن کنٹرول نہیں کر سکا تھا جبکہ ریسیور کے دوسری طرف موجود شخص بھی حد سے زیادہ کانیاں تھا وہ انسانوں کو صرف چروں سے ہی نہیں بلکہ لہجوں سے بھی پہچاننے اور پرکھنے کا فن جانتا تھا اس کی شخصیت حس بہت تیز تھی اور نیل اس کی اس خاصیت سے باخبر ہی واقف تھا۔

”نیل کیا بات ہے؟ اس وقت کیوں جاگ رہے ہو؟“ اس کا پہلا تشویش بھرا سوال اٹھا تھا اور نیل اس فکر مند سے انداز پر ذرا دیر کے لیے چپ سا ہو گیا تھا۔ اب وہ اسے کیا بتا کہ آج کل گھر میں اس کی بہن نے کیا تماشا بنا رکھا ہے؟ اور وہ حد سے زیادہ باغی ہو چکی ہے؟

”کیا سوچ رہے ہو نیل؟“ ریسیور کے ایر پیس سے دوبارہ اس کی گھبرائی ہوئی آواز بھری تھی اور اس آواز میں حد درجہ پریشانی کا رس گھل رہا تھا۔ نیل سر جھٹک کر اس کی آواز کی سمت متوجہ ہوا تھا۔

”کچھ نہیں سوچ رہا یہاں تم سناؤ آج صبح مجھے کیسے یاد کر لیا؟“ نیل کا ارادہ اس کی بات گول کر لے گا تھا۔

”نیل مجھے ٹالو مت صاف صاف بتاؤ کیا مسئلہ ہے۔“ وہ نیل کی بات جھٹک کر دوبارہ پوچھ رہا تھا اور نیل جانتا بھی تھا کہ وہ اپنے اس دوست سے کبھی نہیں چھپ سکتا پھر بھی چھپنے کی کوشش کر رہا تھا اور یہ کوشش سراسر بے سود کوشش تھی۔

”ارے یا رکھنی مسئلہ نہیں ہے تمہیں کوئی دھم ہو رہا ہے شاید۔“ نیل نے اسے ٹالنے کی ایک اور کوشش کر دیکھی تھی کہ شاید وہ ٹل ہی جائے مگر وہ ایسا انسان تھا کہ کوئی اس کے سامنے اپنی کھال بھی اتار کے رکھ دیتا تو وہ مطمئن نہیں ہوتا تھا۔

”نیل تم شاید بھول رہے ہو کہ میں وہم و گہم میں نہیں ہوں۔“ نیل نے اس کی بات اور غصہ کرتے ہوئے کہا۔

شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ تم اس وقت پریشان ہو مگر پتہ چار ہے۔ وہاں اگر تم بتانا میں چاہے یا پھر کوئی برسل میٹر ہے تو اس اوکے میں اصرار نہیں کرتا۔“ اس نے وہ ٹوک کتے ہوئے اپنی طرف سے بات ختم کر کے نیل کو شش درجہ سے ٹالنے کی کوشش کی تھی لیکن نیل اس شش درجہ سے ٹکٹے کی بجائے مزید الجھن کا شکار ہو گیا تھا اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا بتائے؟ اور کیا چھپائے؟ اور بہت سوچنے کے بعد اس نے کہہ ہی دیا تھا۔

”مدھیہ پاکستان نہیں جانا چاہتی اس نے انکار کر دیا ہے۔“ مدھیہ کے معاملے میں نیل سے ایک جملہ بولنا بھی مشکل ترین ہو جاتا تھا کل اتنی دیر عبد اللہ کے پاس بیٹھا رہا تھا مگر پھر بھی کچھ نہیں کہہ سکا تھا البتہ اس کا ذہن بنانے کی خاطر عبد اللہ کافی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں سناتا رہا لیکن پھر بھی اس کے ذہن پر رکھا بوجھ کم نہیں ہوا تھا۔ اور اب اسے رات کے اس پرنس کی حالت میں دیکھ کر تو اس کے اعصاب کی طنائیں مزید کھینچ گئی تھیں یعنی جس خدشے کے تحت فائزہ بیگم نے اسے پاکستان شفٹ ہونے کا کہا تھا وہ خدشہ اب سچ ثابت ہونے لگا تھا؟ اس کے آثار اب آئے روز نظر آنے لگے تھے۔

”میں نے تم سے کیا کہا تھا نیل؟“ دوسری طرف اس کی آواز گھبرائی نہیں اب کچھ پر سوچ ہو چکی تھی العجب غصہ ہوا تھا۔

”بس میں اس وقت اس چیز کو سمجھ نہیں سکا تھا میں یہ ہی سوچتا تھا کہ اور بھی تو ہزاروں لڑکیاں ایسی ہیں جو پاکستان سے آکر یہاں رہ رہی ہیں وہ یہاں رہ کر بھی اپنی مشرقیت کو نہیں بدلتیں اب تم نگارش بھائی اور زری کو ہی دیکھ لو۔“ نیل اپنی غلطی پر چچھتا رہا تھا۔

”مدھیہ اور ان لوگوں میں بہت فرق ہے نگارش ایک مذہبی گھرانے کی لڑکی ہے بے شک وہ یورپ میں پلی

بڑھی ہے مگر اس کی تعلیم و تربیت پہ کڑی نگاہ رکھی گئی ہے تم نے دیکھا تو ہو گا ہی کہ جیسے ہی اس کا رجحان عبد اللہ کی سمت ہوا تھا اس کے گھر والوں نے چپ چاپ شرافت سے اسے عبد اللہ کے ساتھ رخصت کر دیا۔ تاکہ وہ کسی غلط سمت پر نہ چل نکلے اور وہی زری کی بات تو یہ بھی سن لو کہ اس کی نگاہ بھی سمت خستہاتوں میں ہے بے شک عبد اللہ براؤن سنڈو ہے لیکن زری کے معاملے میں اس کی سلی جاگیر دارانہ حس جاگ اٹھتی ہے زری انگلینڈ جا کر بھی بالکل ایسے ہی رہتی ہے جیسے وہ اپنی حویلی میں رہتی تھی اور اس چیز میں سب سے بڑا ہاتھ عبد اللہ کا ہے وہ صرف اس کی تعلیم کے معاملے میں آزاد خیال ہے اور کسی چیز میں نہیں جبکہ تم نے اور ممتاز انکل نے آج تک اپنے بزنس سے ہٹ کے کچھ سوچا ہی نہیں ممتاز انکل نے اپنی بیوی اپنی بیٹی کے لیے کچھ نہیں سوچا اور تم نے اپنی ماں اور اپنی بہن کے لیے کچھ نہیں سوچا۔ تم لوگوں نے ان کو اتنا ٹائم ہی نہیں دیا کہ وہ تمہاری عزت اور غیرت کو کچھ سمجھ سکیں۔

اب اگر وہ اپنی من مانی کرتی ہے تو تمہیں اتنی تکلیف کیوں ہوتی ہے؟ حالانکہ میں نے تمہیں بتا دیا تھا کہ جیسی تم دونوں باپ بیٹے کی رو میں ہے تم لوگ کچھ چھتاؤ گے تمہاری ماں اور بہن کو صرف تمہارے پیسے کی ضرورت نہیں ہے انہیں تمہاری بھی ضرورت ہے لیکن تم کبھی میری بات نہیں سمجھ سکتے اب بھٹو اب جو وہ کہتی ہے وہ کرو اب وہ اختیار ہے اور تم بے بس۔“

اس کی ایک ایک بات حرف با حرف سچ تھی اس نے نیل کو حقیقت کا آئینہ دکھایا تو وہ مزید چپ اور سپاٹ ہو کے رہ گیا تھا اور اس کی یہ چپ دوسری طرف بھی محسوس کی جا رہی تھی لیکن وہ اس وقت نیل کے حق میں ہرگز نہیں تھا اس کی نظر میں مدھیہ اپنی جگہ پر درست تھی جس لڑکی کو کبھی باپ اور بھائی کے ہوتے ہوئے بھی ان کے ہونے کا مان نہ ملتا ہو اس کا ایسا ری ایکشن تو ہونا ہی تھا وہ اگر کسی غلط روش پر چل رہی تھی تو اس کے

تو اس کی ایک ایک بات حرف با حرف سچ تھی اس نے نیل کو حقیقت کا آئینہ دکھایا تو وہ مزید چپ اور سپاٹ ہو کے رہ گیا تھا اور اس کی یہ چپ دوسری طرف بھی محسوس کی جا رہی تھی لیکن وہ اس وقت نیل کے حق میں ہرگز نہیں تھا اس کی نظر میں مدھیہ اپنی جگہ پر درست تھی جس لڑکی کو کبھی باپ اور بھائی کے ہوتے ہوئے بھی ان کے ہونے کا مان نہ ملتا ہو اس کا ایسا ری ایکشن تو ہونا ہی تھا وہ اگر کسی غلط روش پر چل رہی تھی تو اس کے

وہ صرف اس لیے خوش ہوتی ہے کہ میں جب اس کے ساتھ ہوتا ہوں تو ”صرف اس کا“ بھائی ہوتا ہوں اس وقت میرے لیے میری بہن اہم ہوتی ہے مدھیہ اہم ہوتی ہے میں اپنے ضروری کام بھی کچھ دیر کے لیے ترک کر دیتا ہوں صرف اس لیے کہ وہ مجھے بھائی کہتی ہے اور میں اسے ایک بھائی ہونے کا بھرپور احساس دلا سکوں اور میں جب اسے بھائی ہونے کا احساس دلاتا ہوں تو وہ مجھ سے پیچھے نہیں رہتی وہ بھی مجھے ہنوں سا ایکسان دیتی ہے خوشی دیتی ہے لیا کبھی تم نے اس کے ساتھ ایسا کیا ہے؟ کبھی اسے ٹائم دیا ہے؟ کبھی اس کی خوشی محسوس کی ہے؟“

وہ جو کچھ بھی کہہ رہا تھا سو فیصد سچ تھا نیل اپنے مقام پر غلط تھا اس لیے چپ چاپ سب سن رہا تھا وہ اس کی کوئی بھی بات جتنا نہیں سکتا تھا اور نہ ہی کیا وقت ہاتھ آسکتا تھا کہ وہ سب کچھ پیچھے لے جا کر اسے اپنی پسند کے مطابق بحال سکا۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب اختیار کی حد ختم ہو چکی تھی۔

”نیل بیٹیوں کے کردار بنانے اور بگڑنے میں باپ اور بھائی کا بھی بہت برا عمل دخل ہوتا ہے اور اسی بھی نظر چوک جائے پورا باطن داغ دار ہو جاتا ہے اور تمہاری خوش قسمتی ہے کہ وہ آخری حد تک جا کر بھی اپنی حد میں ہے اس نے تمہاری عزت پہ کوئی داغ نہیں لگایا اگر عزت کا جھلا چاہتے ہو تو اسے سچ چکا پاکستان لے آؤ ورنہ پالی تمہارے سر سے گزر جائے گا۔“

”مگر کیسے لے آؤں؟ میں ایسا کیا کہوں کہ وہ جانے کے لیے تیار ہو جائے؟“ نیل اچانک اس کی بات کاٹھ کے

یو لاقھا اور وہ دوسری طرف خاموش ہو گیا تھا وہ نمیل کی ذہنی مینشن باخوبی سمجھتا تھا اس لیے اسے مزید باہر جہ کرنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے باہر مل انداز میں لوٹ آیا۔

”ٹھیک ہے تم رہے دو میں خود جیہ سہا ت کروں گا۔“ اس نے خیال کو تسلی دی تھی۔

”میں صبح تک کسی کفرم کروانے کا سوچ رہا ہوں اور یہ کہ کاپا سپر رشید جیہ کیپاس ہی ہے۔“

”اُس اوکے“ وہ بھی دے دے گی، تم اب آرام کرو، ڈنٹ دینی مان جائے گی۔“ اس نے کال بند کرنے سے پہلے خیمل کو یقین دلایا تھا اور خیمل اس کی باتوں کو سوچتا بیٹھ پہنچ گیا۔

”دلِ آفر شاہ سے ملاقات ہو سکتی ہے؟“ وہ لڑکی ان کے گھر کے ٹینٹ کے سامنے کھڑی چوکیدار سے پوچھ رہی تھی۔

”کیا تم ہو کون؟ اور کیوں ملنا چاہتی ہو دل اور شاہ سے؟“ چوکیدار نے تیکھے اور کڑے انداز میں اس لڑکی کو سرتاپا دیکھا تھا۔ مکتبے سے کپڑوں میں ملبوس وہ لڑکی اپنے حال طبع سے ہی کافی غریب اور مجبور لگ رہی تھی لیکن اس کی غریبی اور مجبوری دیکھ کر اسے اندر تو نہیں بھیج سکتا تھا؟ جبکہ وہ لڑکی ہاتھ جوڑ کے کھڑی ہو گئی تھی۔

”اللہ کے لیے مجھے ایک بار دل اور شاہ سے ملنے دو، میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں تمہارے چپاوس پکڑتی ہوں۔ میں۔ میں۔ میں تمہارا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی مجھے صرف ایک بار۔ صرف ایک بار ان سے ملنے دو۔ میں دور دراز انصاف کے لیے بھٹک رہی ہوں مجھے ایک بار دل اور شاہ کے سامنے اپنا حال سنانے دو خدا کے لیے میرے ہاتھوں کو دیکھو مجھ پر ترس کھاؤ۔“ وہ لڑکی کہتے کہتے ابدیدہ ہو گئی تھی اس کی آواز بھگ گئی تھی اور حلق میں آنسوؤں کا گولا انک گیا تھا چوکیدار بے چارہ تو برا بھلا تھا مگر اس لڑکی سے کہتا کہ صاحب کمرے میں ہیں۔ میری رہ بھانہ ہی سمجھتی اور اگر اسے بغیر کسی پوچھ پچاہ کے انتظار کرنے کے لیے بٹھا لیتا تو بھی اسے صاحب کی ذات کا خدشہ تھا اور غصہ الگ۔ ہوتا پڑتا۔ اور ابھی اس لڑکی سے کچھ کہنے کے لیے کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ دور سے اسے دل اور شاہ کی گاڑی آتی دکھائی دی تھی اور اس کی گاڑی کو دیکھ کر چوکیدار دل ہی دل میں بے پناہ خوش ہوا کہ چلو اپنا ہے اس لڑکی کی ملاقات کسی بھی اجازت کے بغیر ہی ہو جائے گی اور وہ بھی بھانہ کرنے سے بچ جائے گا۔

”جیسے کچھ نہ کہو وہ صاحب کی گاڑی آرہی ہے ان سے کہو۔“ چوکیدار نے آہستگی سے کہتے ہوئے آنکھوں سے اسے گاڑی کی سمت اشارہ کیا تھا۔ وہ لڑکی بے تابی سے پیچھے پلٹی تھی اتنے میں دل اور شاہ کی چچھاتی ہوئی ڈارک گرے کھڑکی گاڑی سیدھی گیٹ کے سامنے روش پہ آرکی تھی چوکیدار نے فوراً ”اے سلام کیا تھا اور وہ اس کے سلام کا جواب دے کر اس لڑکی کی طرف متوجہ ہوا تھا۔“

”کون ہے یہ لڑکی؟“ دل تو رشا نے اس لڑکی کو دیکھتے ہوئے چوکیدار سے استفسار کیا تھا۔

”چنانچہ صاحب کون ہے؟ لیکن بہت دیر سے آپ سے ملنے کے لیے اصرار کر رہی ہے۔ اللہ کے واسطے رہی ہے۔“ چوکیدار نے ایک بار پھر ملٹ کر اس لڑکی کو دیکھا تھا اور پھر اپنی گاڑی دوبارہ اشارت کرتے ہوئے اسی تہ چوکیدار کو اشارہ کیا تھا۔

”اے اندر بقیع دو۔“ وہ اپنی گاڑی اندر بڑھائے گیا اور جو کیدار نے اس لڑکی کو اجازت کا پروانہ تھکایا تھا جو ابھی تک دل اور شاہ کی پر سنائی سے مرعوب کھڑی تھی اس شخص کے سامنے بولنے کی ہمت ابھی اس میں نہیں

ہو رہی تھی تو بعد میں بھلا کیا ہو سکتی تھی؟ وہ بمشکل اپنے آپ کو سنبھالتی اندر پہنچی تھی۔ وہ پہلے سے ڈرائنگ روم میں کھڑا اس لڑکی کے آنے کا انتظار کر رہا تھا جو آہستہ آہستہ درے سے قدم اٹھاتی وہاں تک پہنچی تھی۔
 ”ہینے۔“ وہ کافی سنجیدگی سے کھڑا صوفے کی سمت اشارہ کر رہا تھا۔ لیکن اس لڑکی کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ وہاں بیٹھ جائے۔ ایک تو اس کی شخصیت اور دوسرا اس کا نپا تلا سا انداز۔ کہیں بھی کوئی چلک نظر نہیں آ رہی تھی۔

”نکھیر لی لی آپ دُورے مت بیٹھ جائیے۔ بیٹھ کے بات کریں کیا کہنا ہے آپ کو؟ کیا مسئلہ ہے آپ کے ساتھ؟“ وہ معمول سے ہٹ کے کلنی نرمی سے گویا ہوا تھا مگر اس کی دو ٹوک نرمی میں بھی نرمی لگتی تھی۔

”شاہ! کون سے بیٹا؟ کس سے باتیں کر رہے ہو؟“ بتول شاہ اس کی آواز سے اندازہ لگا چکی تھیں کہ ڈرائنگ روم میں اس کے علاوہ بھی کوئی ہے اسی لیے وہ ملازمہ کو کچن میں بھیج کر خود ڈرائنگ روم میں آگئی تھیں۔ لیکن وہاں ایک ڈری سیمی لڑکی کو دیکھ کر یکدم ٹھنک گئی تھیں جبکہ ڈرائنگ روم میں کسی خاتون کے وجود کو داخل ہوتے دیکھ کر اس لڑکی کو بہت ڈھارس ملی تھی اس کی تھمی تھمی سی سانسیں فوراً ”ہموار ہو گئی تھیں۔ اسے بتول شاہ کا وجود اس وقت بہت بڑی وصال محسوس ہوا تھا اب وہ دل اور شاہ کے سامنے کھل کے اپنا دکھ اپنا نقصان اپنی اذیت و بے بسی بیان کر سکتی تھی۔ وہ دل اور شاہ کو اپنی سمت متوجہ دیکھ کر ڈرائنگ روم میں تھمی اور فوراً ”صوفیہ نک گئی تھی۔“

”اماں جان آپ بھی بیٹھے گھڑی کیوں ہیں؟“ اس نے بتول شاہ کو بھی بیٹھنے کا کہا تھا جو اسے ابھی تک سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھیں مگر وہ خود اس لڑکی کو نہیں جانتا تھا اس لیے ان کے کسی بھی سوال کا جواب بنی الحال نہیں دے سکتا تھا اسی لیے ان کے سوال سے انظر ہٹا کر اس کی سمت متوجہ ہوا تھا۔

”تی فرمائیے؟ کس لیے مجھ سے ملنا چاہ رہی تھیں آپ؟“ بتول شاہ کے برابر والے صوفے پر براجمان ہوتے ہوئے اس نے کالی گہری آنکھوں سے دیکھتے ہوئے سوالات کا آغاز کیا تھا۔

”سب سے پہلے مجھے یہ جاننا ہوگا کہ میں کون سا ملک چھوڑ کر یہاں آیا ہوں۔“

انصاف نہیں مل رہا میں غریب ہوں، مجبور اور بے بس ہوں، میرے ہاتھ میں پیسوں کی گندیاں نہیں ہیں اس لیے کسی کو احساس ہی نہیں ہوتا کہ مجھ پر ظلم ہوا ہے۔ آج اگر میں کسی امیر باپ کی بیٹی ہوتی تو کب کا انصاف مل چکا ہوتا بلکہ میرا مجرم اپنے انجام کو پہنچ چکا ہوتا مگر اور بہت سی بد نصیبیوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی بد نصیبی ہے کہ میں ایک غریب باپ کی بیٹی ہوں اور میری عزت اتارنے والا ابھی تک بڑی شان سے جی رہا ہے۔ ”وہ لڑکی کہتے ہوئے تڑپ تڑپ کے روئی تھی اور بتول شاہ کے ذہن کو ایک گہرا شدید دھچکا لگا تھا انہیں اس لڑکی پر ہونے والا ظلم سن کے جیسے کرنٹ چھو گیا تھا انہوں نے بے ساختہ اس لڑکی سے نظریں ہٹا کر دل اور شاہ کو دیکھا، جو بہت سچ کر ان سے نظر نہ اٹا تھا اس کے چہرے کے تاثرات سرور پڑ گئے تھے جبکہ وہ لڑکی مزید بولے جا رہی تھی۔

”میں انصاف کے لیے جہاں بھی ہوں اُلتا مجھے ہی لوگوں نے غلط اور گندی نظروں سے دیکھا ہے کسی نے بھی میرے حال کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی کسی نے مجھے انصاف دلانے کا نہیں سوچا یا تو سبھی بھاری فیس مالتے ہیں یا پھر اس بد معاش کا نام بن کر ہاتھ صیغ لیتے ہیں شاید تھک ہارے کے اپنا معاملہ رب پہ چھوڑ دیتی لیکن مجھے تھانے سے نکلتے ہوئے اسپیکٹر شہباز نے مشورہ دیا تھا کہ میں ایک بار آپ سے ضرور ملوں نہ میں اپنا معاملہ رب پہ چھوڑنے کے ساتھ ساتھ رب کے بندے کے سامنے بھی دامن پھیلانا چاہتی ہوں خدا کے لیے مجھے انصاف دلا دیں۔ مجھے برباد کرنے والا سکھ کی غیند سوتا ہے یہی سوچ کر میری رات کانٹوں پہ بسر ہوتی ہے میں آگ پہ سوتی ہوں اور میرا داغ دار وجود راکھ کا ڈھیر بن جاتا ہے۔ خدا کے لیے مجھ یہ رحم کر۔“

وہ لڑکی اچانک اپنا رویہ بدھ گیا کہ اس کے قدموں میں گرنے کے لیے انداز میں آہستہ آہستہ تھپی اور زلزلے کی زد پر

رکھال اور شاہ کا داغ یکدم جھنجھٹا اٹھا تھا اس نے فوراً اپنے پاؤں پیچھے کھینچ لیے تھے وہ لڑکی ہنوز وہ پٹہ پھیلائے بیٹھی رہ رہی تھی اور وہ مٹھیاں اور لب بھیجنے بجائے کون سے طوفان کے ابال کو ضبط کرنے کی کوشش میں تھا اب یہ طوفان اختیار سے باہر ہوا تو وہ یکدم اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا لیکن وہاں سے جانے سے پہلے وہ اس لڑکی کا وہ پٹہ اٹھا کر اس کے سر پہ ڈال گیا تھا گویا اسے امید اور تسلی دے گیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ ہے۔

دوسری طرف بٹول شاہ سائنت وصامت سی سیٹ چہو لیے بیٹھی تھیں ان کے داغ میں اس لڑکی کی آواز گونج رہی تھی اور ساتوں میں سائیں سائیں ہو رہی تھی وہ لڑکی ابھی بھی دو زانو قائلین پہ بیٹھی آنسو بہا رہی تھی اور اس لڑکی کے آنسو بٹول شاہ کو اپنے دل پہ گرتے محسوس ہو رہے تھے وہ عورت تھیں عورت کا دکھ جانتی تھیں انہوں نے بہت ہی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا تھا اور پھر اعصاب یکجا کرتے ہوئے اٹھ کر اس لڑکی کی سمت آئی تھیں۔ "ٹھو مینا اوپر صوفے پہ بیٹھو۔" اسے کندھوں سے تھام کر کہا تھا۔

"چپ ہو جاؤ۔ میرا دل اور شاہ تمہارا کس ضرور لڑے گا چاہے کچھ بھی ہو جائے۔" ان کے لہجے میں تسلی دلاسا مان بھروسہ، یقین سب کچھ تھا کیونکہ وہ دل اور شاہ کی "ماں" تھیں اور ایک ماں ہونے کے ناتے وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ ان کا "مینا" کیا کچھ کر سکتا ہے؟



آسمان کا شفاف نیلا رنگ رفتہ رفتہ اس قدر گہرا ہو گیا تھا کہ اب تاحد نظر پھیلا آسمان سرمئی رنگ میں ڈھل چکا تھا اور اسی سرمئی رنگ پہ زرد رنگ کا اداس چاند چھوٹی چھوٹی بے ضرور بدلیوں سے الجھتا اپنا داغ من چھڑاتا آتے بڑھنے کی کوششیں کر رہا تھا مگر بڑے بڑے بادلوں کی شدت سے چھڑتی یہ بدلیاں بار بار چاند کے راستے میں حائل ہو کر اسے چھین کر اس کی اداسی میں غفل ڈال رہی تھیں جس پہ چاند کی اداسی اور بے زاری میں قطرہ قطرہ اشناذ ہو رہا تھا وہ ان بدلیوں کو جھٹک جھٹک پیچھے ہٹا رہا تھا بار بار جھٹک رہا تھا مگر اتنی شراقت تھی کہ اس کا راستہ جھوڑنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں بلکہ ان کی شرارتوں اور کھیلوں میں اور بھی ٹوٹا ہوا بدلیاں شامل ہو چکی تھیں اور چاند کے گرد گھیرا تنگ کر چکی تھیں اس کا جی چاہا وہ فوراً "جائے اور اداس سے بے زار چاند کو ان ٹھنڈے باز آوارہ بدلیوں کے گھیرے سے نکال کے اپنے پاس لے آئے اور پھر آرام سے مسہولت سے مطمئنانہ تہہ بیٹھ کر اس چاند سے اس کی اداسی کا سبب پوچھے۔

تم اور کسی کو نہ سہی صرف مجھے اپنا سمجھو کے کیا راز داں اپنا غم تسار سمجھو کہ یہ بتاؤ کہ تم اتنے اداس کیوں ہو؟ کس بے مہر نے تمہیں دکھ پہنچایا ہے؟ کس نے تمہیں اداسی کا رنگ بخشا ہے؟ کون ہے وہ؟ کہاں ہے وہ؟ میں اس سے پوچھتی ہوں میں اس سے لڑتی ہوں۔ آخر کیوں کیا اس نے ایسا؟ حالانکہ تم تو اتنے اچھے ہو کہ جن کو بھی تھا دیکھتے ہوئے اس کے ہی ہو جاتے ہو۔ جبکہ یہ بے مہر بے مروت لوگ تمہاری اس ادا کو اس وفا کو بھی "ہرجائی" کا نام دیتے ہیں حالانکہ لوگ خود ہرجائی ہیں۔

وہ چپ کی زباں میں چاند سے باتیں کرتی نہ جانے کیا کیا کہہ رہی تھی اور کیا کیا سوچ رہی تھی کہ اچانک اس کے رخسار پہ بارش کی پہلی بوند نے بوسہ دیا تھا۔ اس نے بری طرح جھٹک کر اپنے گال پہ ہاتھ رکھ کے اس بوند کو چھو کر محسوس کیا تھا اور ایک بوند کو محسوس کرتے کرتے اور بوندیں بھی اس کو چھینتی ہوئی گزر گئی تھیں۔ تو کیا چاند چھپ گیا؟ تھک گیا ان بدلیوں سے لڑتے لڑتے؟ اس نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا جس پہ چاند کا نام و نشان تک نہیں تھا البتہ بدلیاں قہقہے لگاتی پھر رہی تھیں اب آسمان کے فراخ سینے پہ ان کا راج تھا وہ اداؤں کے سنگ ادا کی پھر رہی تھیں جیسے چاند کو وہاں سے بھگا کر جشن منا رہی ہوں۔ اور اب چاند کی اداسی اس پہ اثر آئی تھی اب چاند

کے لیے وہ اداس ہو رہی تھی!

"میں جانتی ہوں تم کس کے لیے اتنی اداس ہو رہی ہو۔" کوئل اپنے دھیان اپنی اداسی میں ایسی محو کھڑی تھی کہ اس کی آواز پہ گڑبڑا کے رہ گئی تھی۔

"حرمت تم؟" کوئل نے اپنے دل پہ ہاتھ رکھتے ہوئے گھور کے کہا تھا۔ "ہاں میں۔ کیا تم کوئی اور سمجھتی ہیں؟"

حرمت کا اندازہ معنی تھا جس پہ کوئل کو مزید غلطی ہوئی تھی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" اس کے ماتھے پہ سلوٹیں بڑھ چکی تھیں۔

"میرا مطلب ہے کہ رات کے وقت بارش میں بھینکنا ٹھیک نہیں ہے۔ بیمار پڑ جاؤ گی۔" حرمت نے بیوہ میانی

میں بارش میں بھینکتی کوئل کو بارش کی سمت متوجہ کیا تھا اور اپنی بات کوئل کر دی تھی۔

"اتنی نازک نہیں ہوں کہ بارش کی بوندوں سے بیمار پڑ جاؤں۔" وہ اپنے بال پیچھے ہٹاتے ہوئے سر جھٹک کر بولی

تھی۔

"تم جتنی نازک ہو میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ خیر چھوڑو اس بات کو چلو نیچے چلتے ہیں سہمی ڈرائنگ روم میں

نیویں دیکھتے ہوئے اتنا انجوائے کر رہے ہیں اور تم یہاں بور ہو رہی ہو۔" حرمت نے کوئل کا بازو پکڑ کر اسے ٹیرس

سے کھینچ کر کمرے میں دھکیلا تھا اسے پتا تھا کہ وہ اتنی جلدی وہاں سے نہیں ہٹے گی۔

"تم سے کس نے کہا کہ میں بور ہو رہی تھی؟" کوئل اس وقت اس کے ساتھ نیچے نہیں جانا چاہتی تھی اسی لیے

جرح کر رہی تھی۔

"اوکے بابا مان لیا کہ تم بور نہیں ہو رہی۔ بلکہ انجوائے کر رہی تھیں۔ لیکن میری جان ہم چاہتے ہیں کہ تم

اکہلی انجوائے نہ کرو بلکہ ہمارے ساتھ مل کے انجوائے کرو۔ نیچے چلو ہم سب نے آس کریم منگوائی ہے زن

آس کریم سہلے کر آچکا ہو گا۔" حرمت کے باوجود اس کا کہنا نہ کوئل کو اٹھ ہی پڑا تھا۔ ڈرائنگ روم میں داخل

ہوتے ہی کوئل کی سب سے پہلی نظر علیزہ کے پیڑی تھی جو شاید دانیال یا پھر احمد کی کسی بات پہ ہنس رہی تھی اور یہ

بات اس حویلی کی تاریخ کی اہم ترین بات تھی کہ علیزہ نے آئندہ سب کے ساتھ اتنی بے تکلفی سے بیٹھی ان کی

باتوں پہ ہنس رہی تھی اور یہ بات وہاں موجود لوگوں کے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں تھی کہ علیزہ نے ان کے ساتھ

ان کے درمیان بیٹھی باتیں کرتی ہنس رہی ہے۔ مسکرا رہی ہے۔ اس کی مسکراہٹ دیکھ دیکھ کر ان لوگوں کا خون

برہہ رہا تھا۔

"ہونہ؟" کوئل کو دیکھ کر کوفت ہوئی تھی نہ جانے کیا بات تھی کہ علیزہ نے باقی سب کو جتنی عزیز تھی کوئل کو اتنی

ہی خارجی طرح پیچھتی تھی۔

"کوئل کھڑی کیوں ہو بیٹھو۔" دانیال نے ایک نظر حرمت کو دیکھ کر کوئل کو بیٹھنے کا کہا۔

"کیا ہو رہا ہے؟" کوئل نے اپنے چہرے کے تاثرات کنٹرول کرتے ہوئے نارمل سے لاریڈا لہجے میں پوچھا تھا۔

"مست ہو چھو کہ کیا ہو رہا ہے؟" دانیال نے مسکراتے ہوئے جس انداز میں نفی میں گردن ہلائی تھی اس پہ

زبردست سا قہقہہ پڑا تھا اور اس قہقہے میں جویریہ مدحت 'لوشہ اور احمد بھی شامل تھے جبکہ عون اور عدید تو ہنس

ہنس کے نہ ہرے ہو رہے تھے۔

"عون اور عدید اپنی علیزہ سے آبی کو طرح طرح کی پیلیاں بوجھوا رہے ہیں اور وہ نہ جانے کیسے کیسے جواب

ڈھونڈ کے لاریڈا ہے کہ ہم بھی ایسی معلومات سے بے خبر ہیں۔ اب تم یہی سوال دیکھ لو کہ ایک مشہور شخصیت کا

ہم لے کر پوچھ رہے ہیں۔ ان کی قبر میں کون دفن ہے؟" دانیال نے دل کھول کے ہنستے ہوئے ان لوگوں کا سوال بتایا

تھا اور کوئل اس سوال پہ چونک گئی تھی۔

"اب تم ہٹاؤ کوئل۔" دانیال نے شرارت سے کہا تھا۔

"ظاہر ہے بھئی جس کی قبر ہے وہی دفن ہوں گے اور کون ہو سکتا ہے بھلا؟" کوئل نے حیرانی سے دیکھتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"کریکٹ۔" دیکھا محترمہ علیزے ایسے ہوتے ہیں ذہین بچے فوراً "جواب حاضر۔" دانیال نے کوئل کو داد دیتے ہوئے علیزے کو شرم دلائی جو عون اور عید کے اس سوال پہ بے ساختہ پوچھ بیٹھی تھی کہ "کون دفن ہے؟" یہ چیٹنگ ہے دانیال بھائی پہلے آپ نے عون اور عید کے ساتھ مل کر مشورہ کیا اور پھر مجھے بے وقوف بنایا اور ان کے سوال پہ ایسے حیرانی ظاہر کی کہ مجھے بھی ان کا سوال سن کے حیرانی ہونے لگی اسی لیے میں اس سوال کو سیریس لینے لگی۔ کیونکہ یہ پاکستان ہے، یہاں صرف ہم دھماکے اور خود کش حملے ہی نہیں ہوتے یہاں دھوکے اور فراڈ بھی ہوتے ہیں جن سے آج کل قبرستان بھی محفوظ نہیں ہیں۔ یہاں تو ہوتا نہیں کس کس کی قبر میں کون کون دفن ہے؟" بچوں کی مذاق میں کسی بات اتنی سنجیدگی کا رویہ لے گئی تھی کہ وہاں موجود کسی لوگ چپ کے چپ رہ گئے تھے۔ وہ سچ ہی تو کہہ رہی تھی بلکہ وہ بیٹھے بیٹھے ان کو اپنے ملکی حالات کا آئینہ دکھا گئی تھی اس کی بات پہ حسی کہ بھی اعتراض یا اختلاف نہیں ہوا تھا۔

"ہاں میں اتنی خاموشی کیوں ہے جی؟" زین نے ڈرتے ڈرتے ڈرائنگ روم میں قدم رکھا تھا اور ان سب کو خاموش دیکھ کر ٹھنک گیا۔ حالانکہ وہ آئس کریم لے کر اچھلتا کودتا آئس کرتا، یہاں تک آیا تھا، کیونکہ تھوڑی دیر پہلے وہ داخل بے حد خوش گوار چھوڑ کے گیا تھا۔

"لاؤ میں آئس کریم نکالتی ہوں۔" حرمت نے اٹھ کر اس کے ہاتھ سے شارپ قلم لیے تھے اور جب وہ باؤنڈری میں آئس کریم سہائے واپس ڈرائنگ روم میں آئی تو وہاں سب موجود تھے لیکن علیزے جا چکی تھی۔

آج وہ صبح ہی صبح سب سے پہلے اٹھ کر بیٹھ گیا تھا کیونکہ اسے پتا تھا کہ اگر آج وہ خوشی کی طرح عید کے مزے لیتا رہ گیا تو بہت پیچھے رہ جائے گا۔ بلکہ بچھتا مار جائے گا۔ آج اس کو نوکری کی خوشی اور دولہے نے ٹھیک سے سونے ہی نہیں دیا تھا۔ آج رات کے بارہ بجے ہی اس کا دل چاہ رہا تھا کہ صبح کے ساتھ صبح جائیں، تاکہ اسے مزید سات گھنٹوں کے انتظار کی کوفت نہ اٹھانا پڑے۔ لیکن وقت ایسا مل گیا تھا کہ وہ چاہے اڑیاں بھی رگڑ لیتا ہے اصول اپنے مقام اپنے اوقات سے آگے یا پیچھے نہیں سرک سکتا تھا، وقت ایک ایسا گھوڑا تھا جس کی ہلکام خود اللہ کے ہاتھ میں تھی اور وہ اللہ کی حکم عدولی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اللہ کی رضا کے مطابق بڑی سبک رفتاری سے چل رہا تھا۔ بارہ گھنٹوں میں رات کا سفر طے کرنا تھا اور بارہ گھنٹوں میں دن کی مسافت ختم کرنا تھا۔ کبھی ایک منٹ یا ایک سیکنڈ بھی ادھر سے ادھر نہیں ہونے پاتا تھا۔ وجہ کیا تھی؟ "خدا کے ہاتھ میں لگام" اور بس۔

"ناشتا نہیں کرو گے؟" وہ نہ جانے کس دھیان میں کم تھا کہ عابدہ خاتون کی آواز بھی نہ سن سکا تھا۔ "میں تم سے پوچھ رہی ہوں بیٹا، ناشتا کرو گے نا؟" انہوں نے قریب آکر اسے متوجہ کیا تھا، وہ چونک کر سیدھا ہوا تھا۔

"جی ہاں ناشتا کر کے ہی جاؤں گا" آج پہلا دن ہے وہاں پتا نہیں کیا ملتا ہے اور کیا نہیں؟ "عدل نے سمجھ داری سے کام لیا تھا، کیونکہ پہلے وہ صرف نوکری تلاش کرنے جاتا تھا، کبھی ناشتا کر لیتا تھا، کبھی چھوڑ دیتا تھا۔ مگر آج وہ کام پہ جا رہا تھا، دن بھر کام میں مصروف رہنے کے ساتھ ساتھ اگر بھوکا بھی رہتا تو یقیناً "کل دوبارہ کام پہ جانے کے لیے ذرا بھی سکت نہ رہتی۔"

"ٹھیک ہے تم باہر آ کے بیٹھو، مریم ناشتا لگا رہی ہے تمہارا۔" وہ اس کا کندھا تھپک کے باہر نکل گئی تھیں اور وہ بھی ان کے پیچھے پیچھے برآمدے میں چلا آیا تھا، مریم چھوٹی سی خیل پہ ناشتا لگانے لگی۔ اور تھوڑی دیر بعد وہ ناشتا کر کے عابدہ خاتون اور مریم سے دعا لے کر باپ کے پاس آیا تھا، ان کی خاموش دعا دامن میں سمیٹ کر فوراً گھر سے نکل گیا۔ اب اسے مطلوبہ ایڈریس پہ پہنچنے کی جلدی تھی، بس اسلپ پہ آکر پانچ منٹ بس کا انتظار کیا تھا اور ٹھیک تھا کہ چھ منٹ میں بس کی ٹوٹی پھوٹی سی شکل نظر آئی گئی تھی۔

لیکن لوگ اس ٹوٹی پھوٹی بس کو بھی بخشنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ بس کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اتنے بڑے شہر میں صرف ایک ہی بس رہ گئی تھی۔ جیسے ہی بس قریب آکر رک کی پورے بس اسلپ پہ اک شور اک کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ کچھ سواریاں بس سے اترنے کے لیے بے چین تھیں اور کچھ اس بس میں سوار ہونے کے لیے بے تاب ہو رہی تھیں اور ان بے تاب لوگوں میں وہ بھی سرگرم رہتا تھا۔

وہ بھی اس بس میں سوار ہونے کے لیے راستہ تلاش رہا تھا۔ مگر لوگوں کا ہجوم اتنا زیادہ تھا کہ اسے لگ رہا تھا کہ آج بس کی وجہ سے اپنی اتنی مشکلوں سے ملنے والی نوکری سے محروم ہو کے رہ جائے گا۔ جبکہ نوکری سے محرومی کا خیال ہی اتنا سہانہ روح تھا۔ وہ بھی اپنا مذہب بن اور تمیز لائے طاق رکھتے ہوئے اس ہجوم اور دھکم پیل میں شامل ہو گیا تھا اور تقریباً "سات" آٹھ منٹ کی مسلسل تک دو دو کے بعد وہ بس میں سوار ہوئے اور ایک منٹ سیٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا تھا۔ اس نے ایک بے چینی کی نظر اپنی مضبوط کلائی پہ بندھی گھڑی پہ ڈالی تھی اور اتنے سے توقف میں اسے گاڑی اشارت ہونے کی آواز سنائی دی تھی اور اس نے یکدم جیسے شکر کا سانس لیا تھا۔ اور یونہی وقفے وقفے سے گھڑی دیکھتے ہوئے اس کا باقی کا سفر گنا اور ٹھیک آدھے گھنٹے بعد وہ اپنے مطلوبہ ایڈریس پہ پہنچ چکا تھا۔ لیکن اس ایڈریس پہ پہنچ کر اس کے قدم اپنی جگہ پہ جمے رہ گئے تھے۔ اس کی نظریں سڑک کنارے بس اسٹاپ پر پڑیں جس کے نیچے ایک کاشمیری کٹا ہوا بیگ تھا۔ اس وقت اس بورڈ پہ درج چاچا امتیاز کے نام لکھے تھے، بلکہ کاشمیری اور پیر کے مجید لکھا تھا اور وہ ابھی تک اسے ہی بار بار پڑھے جا رہا تھا۔ "چاچا کا درکشاپ"

تو گویا اسے درکشاپ میں کام کرنا تھا؟ اس کے ذہن میں تسخیرانہ مسائل ابھرا تھا۔ جیسے وہ خود ہی اپنے آپ کا مذاق اڑا رہا ہو۔ اگر یہ ہی کرنا تھا تو وہ اتنے دنوں سے اپنی ڈگری فائل میں سجائے کیوں گھوم رہا تھا؟ کیا حاصل تھا اس کا جس کو حاصل کرنے کے لیے اس نے اتنے سال دن رات پڑھائی کی تھی، مولی مولی کتابوں سے مغز باری کی تھی، اتنے امتحان پاس کیے تھے اور اپنی کامیابی کے لیے اتنی دعائیں مانگی تھیں۔ لیکن آج سب کچھ دھڑک دھڑک کر ہٹ گیا تھا، بلکہ "چاچا کا درکشاپ" کا بورڈ بڑے تسخیرانہ انداز میں اس کے ہاتھ میں پکڑی فائل کا منہ جزا رہا تھا، جیسے وہ گھر سے نکلتے ہوئے بڑی احتیاط اور بڑی خوشی کے ساتھ اپنے ساتھ لے آیا تھا، تاکہ ضرورت پڑنے پہ وہ اس کی کوالیفیکیشن بھی دکھا لیں۔ مگر ضرورت بھلا کیا پڑ سکتی تھی؟ ضرورت سے پہلے ہی اس کی ڈگری منہ چھپانے پہ مجبور ہو گئی تھی، وہ سڑک کنارے کھڑا اپنی فائل کو بے بسی سے تھامے زخمی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"وئے باؤ عدل تم آگے؟" چاچا امتیاز اچانک درکشاپ کے احاطے سے باہر نکلے تو پہلی نظر اسی پہ پڑی تھی جو اپنی جگہ پہ جامد کھڑا اور کشاپ کے اندر جانے کی ہمت مجتمع کر رہا تھا اور پچھا امتیاز کی آواز پہ یک دم چونک کر اپنے حواسوں میں واپس آیا تھا اور گہری سانس کھینچی تھی۔

رات کے تین بجے کا وقت تھا جب اچانک ان کی آنکھ کھلی تھی اور وہ بے ساختہ ہی کسی احساس کے تحت اٹھ

کر کمرے سے باہر نکل آئی تھیں، ان کا رخ کچن کی طرف تھا، کیونکہ کچن کی جلتی ہوئی لائٹ کے ساتھ ساتھ برتنوں کی کھڑکی کی آوازیں بھی آ رہی تھیں اور کچن کے دروازے میں پہنچ کر انہیں وہی نظر آیا تھا جس کی وہ توقع کر رہی تھیں۔

”جوہر!“ ان کی آواز میں سختی کا عنصر نمایاں تھا اور وہ جواب دہ صوفیہ میں گھس کر بڑی احتیاط کے ساتھ اپنے لیے کھانا نکال کر گرم کر رہا تھا ان کی آواز پر ذرا سا چونک کر سیدھا ہوا تھا۔

”جی ہاں؟“ اس نے اپنے تاثرات کنٹرول کرنے میں سیکنڈ کا وقت لیا تھا۔
”یہ کون سا وقت ہے گھر آنے کا؟“ ان کے لہجے کی سختی مزید گہری ہوئی تھی، کیونکہ اگر وہ اس طرح سختی سے پیش نہ آتیں تو کل کو باقی گھروالوں کے ساتھ ساتھ ان کے بڑے بیٹے اور شوہر کا زیادہ التزام ان ہی پر آتا کہ انہوں نے ہی اسے بگاڑا ہے کیونکہ وہ اس کی ماں تھیں اور اکثر اولاد کے بگڑنے کا سبب لوگ ماں کو ہی گردانتے ہیں، چاہے اس میں ماں کا رتی برابر بھی قصور نہ ہو۔

”جوہر!“ میں کیا بوجھ رہی ہوں تم سے؟“ اب کی بار ان کی آواز دہلی ہوئی، مگر لہجہ کافی تیز تھا۔
”مام گھر آنے کا کبھی کوئی وقت ہوتا ہے؟ گھر تو گھر ہے، جب چاہے، آؤ، جب چاہے جاؤ، نوٹیشن؟“ وہ انتہائی لا پرواہی سے کتا فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل اور رانٹے کا ہاؤل نکال کر ٹیبل کی سمت آگیا اور دائیں بائیں کی مدد سے کرسی گھسیٹ کر کھانا کھانے کے لیے بیٹھ گیا تھا۔

”یہ روٹین گھر کی نہیں ہوٹل کی ہوتی ہے، جب چاہے آؤ اور جب چاہے جاؤ، جہاں کسی کو کوئی پروا نہیں ہوتی کہ کون آ رہا ہے؟ اور کون جا رہا ہے؟ وہاں تمہارا یہ ”نوٹیشن“ بھی سوٹ کر جاتا ہے اور تم شاید بھول رہے ہو کہ یہ گھر ہے، یہ بڑی حویلی ہے، یہاں آج تک ایسی آوارہ گردی کسی نے بھی نہیں کی جیسی تم کر رہے ہو، اگر تمہاری ان حرکتوں کا بھالی صاحب (وقار آندہ) کو پتا چلے گا تو وہ اک لمحے کی بھی تاخیر کے بغیر تمہیں گھر سے نکال دیں گے، پھر کرتے رہنا جی بھر کے آوارہ گردی۔“
ثروت بیگم کا انداز بے حد تیز اور سخت تھا، وہ جوہر کو ہر ممکن طریقے سے ان حرکتوں سے باز رکھنا چاہتی تھیں، جیسی ان کا لیکچر رات کے تین بجے بھی جاری تھا، جس کا ہر حال جوہر آندہ کی بد ذرا بھی اثر نہیں تھا، وہ بے نیازی سے کھانا کھانے میں مصروف تھا، اس نے سلاؤ کی پلیٹ سے کھیرے کا ٹکڑا اٹھا کر منہ میں رکھتے ہوئے ثروت بیگم کی خاموشی نوٹ کی تھی اور فوراً ہی استفہامیہ نظروں سے ان کی سمت دیکھا تھا، وہ لب بٹھپتھپتہ ست کڑی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

”آپ خاموش کیوں ہو گئیں مام؟ کچھ اور بھی کہیے نا، میں سب سن رہا ہوں ڈونٹ وری۔“ اس نے اپنی ماں کو پھر سے بولنے پر اکسایا تھا۔
”یعنی تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ آپ بھونکتی رہیں مجھ پر کوئی اثر نہیں ہو گا؟“ ثروت بیگم نے غصے اور ملامت کی حد کر ڈالی تھی۔

”آف خدا یا۔ اللہ معافی دے، آپ کیوں رات کے اس پہر مجھے گناہ گار کرنے پر تلی ہوئی ہیں؟ آپ میری ماں ہیں، آپ کا اک اک لفظ میرے لیے قابل احترام ہے، میں بھلا کیوں ایسا کہنے لگا؟“ اس نے توبہ توبہ کرتے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگائے تھے۔

”اس وقت تم کون سا کوئی نیک کام کر کے آرہے ہو جو تمہیں گناہ گار ہونے سے ڈر لگ رہا ہے؟“ وہ جیسے تانا غصے کی بہت تیز تھیں اور زندگی میں انہیں سب سے زیادہ غصہ جوہر نے ہی دلا ہوا تھا۔ حالانکہ ان کے بالی بچوں بچے بھی تھے، آؤد، حرمت اور مدحت! انہوں نے کبھی بھی ماں کو اس طرح تنگ نہیں کیا تھا جیسے جوہر کرتا تھا۔

جوہر ہر وہ کام کر کے رہتا تھا جس سے اسے منع کیا جاتا تھا، وہ ذہن بھی تھا لائق بھی تھا، لائق بھی تھا، مگر اچھا بچہ نہیں تھا، اس نے آج تک کوئی بھی اچھے بچوں والا کام نہیں کیا تھا، سوائے تعلیمی ریکارڈ کے، اچھی پوزیشن لینا اس کا ریکارڈ تھا اور وہ بھی صرف اس لیے تھا کہ ہر بار ایگزامز کے دنوں میں اس کا اپنے کزنز دانیال، زین، احمد اور حماد وغیرہ سے کمپیشن ہو جاتا تھا، جس کے لیے وہ دن رات محنت کرتے ہوئے فرسٹ پوزیشن کو اپنا ٹارگٹ بنا لیتا تھا اور ہر بار یہ ٹارگٹ جیت کر وہ اپنے ماں باپ اور تایا جان (وقار آندہ) جن کو وہ سب ”ڈیڈ“ کہتے تھے، کو لاشعوری طور پر بے پناہ خوش کر دیتا تھا۔ اگر کبھی اسے یہ احساس ہو جاتا کہ گھر والے اس کی اس کامیابی پر کس قدر خوش ہوتے ہیں تو یقیناً ”وہ اگلے ہی سال ان کی یہ خوشی ملیا میٹ کر کے رکھ دیتا۔“

”آپ کیسے کہہ سکتی ہیں کہ میں اس وقت کوئی برا کام ہی کر کے آ رہا ہوں؟“ وہ اتنے مضبوط لہجے میں بولا کہ ثروت بیگم ٹھنک گئیں۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس کی بات کو مذاق سمجھ کر سر جھٹک دیا تھا۔

”تو تم کون سا اس وقت تہجد پڑھ کے آرہے ہو؟ تمہارا تو بس ایک ہی کام ہے، دو چار آوارہ دوست، شراب، کلب اور دوستوں کی تحریک کا اس الزام ڈال دینا، اور بس، اس سے آگے کا تم سوچ ہی نہیں سکتے۔“ ان کا لہجہ انتہائی تمسخرانہ ہو گیا تھا جس نے جوہر نے کھانا ختم کر کے اٹھتے ہوئے بڑے غور سے اپنی ماں کے تئیں دیکھے تھے۔
”مام صرف تہجد پڑھنا ہی نیک کام نہیں ہے، نیک کاموں کی فہرست بہت طویل ہے، اگر اس وقت آپ کو مگوانے کا خواہ ہو گیا تو مجھے یقین ہے کہ صبح کا سورج طلوع ہو کر کل شام تک غروب بھی ہو جائے گا۔ لیکن وہ فہرست ختم نہیں ہوگی۔ لہذا آپ کے لیے مختصر تاریخ ہوں کہ مجھے راستے میں ایک بوڑھی عورت مل گئی تھی، بہت مجبور اور بے بس تھی، اس کے بیٹے کا کس اہکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ مگر اس کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ وہ اپنے بیٹے کے پاس جاسکتی، جس کے لیے وہ جگہ جگہ بھیک مانگتی پھر رہی تھی، مجھ سے بھی اس نے بھیک مانگی اور اپنی ہاتھ پائی شو مین روٹیں منہ میں رکھ کر منہ پر ڈال کر چلے گئی، اور اس وقت میں اس عورت کو اس کے بیٹے کے پاس لے گیا، اب وہ پھر پڑنے لگی، اس کا بیٹا شدید زخمی تھا اور اسپتال میں تھا۔ اس لیے وہاں سے واپسی میں اتنی دیر ہو گئی اور آپ جانتی ہوں گی کہ لاہور سے اسلام آباد کا سفر کتنا طویل اور کتنے گھنٹے کا ہے؟ اور اگر پھر بھی آپ کا کوئی شک باقی رہ جائے تو صبح فون کر کے اس بوڑھی عورت سے میری اس داستان کی تصدیق بھی کر لیجیے گا اور اس کے بیٹے کی عیادت بھی۔“

وہ ساری بات نے تلے لفظوں میں بیان کر کے اپنا موبائل فون یہ کہہ کر ان کے ہاتھ پر رکھ کے چلا گیا کہ سب سے پہلا نمبر اس اسپتال کا ہے، آپ وہاں سے پتا کر لیجیے گا۔ اور ثروت بیگم حیرت اور بے یقینی سے گنگ کھڑی رہ گئی تھیں۔ وہ کبھی اپنے ہاتھ پر رکھے جوہر کے موبائل کو دیکھ رہی تھیں اور کبھی کچن سے باہر جہاں جوہر غائب ہو گیا تھا۔ اور اب غصے سے نکلتے ہی انہیں وہی روایتی ماؤں سا بچھتاوا ہوا تھا کہ انہوں نے غصے میں اپنے بیٹے کو ٹھیک طرح سے کھانا بھی نہیں کھانے دیا تھا۔ حالانکہ وہ اتنا لمبا سفر طے کر کے تھکا ہوا گھر آیا تھا۔ ان کی ان ہی سوچوں میں فجر کی اذان بھی ہونے لگی تھی اور حویلی کے بیشتر لوگ نماز کے لیے اٹھنے لگے تھے اور سب سے پہلے انھنے والی آسیہ آندہ تھیں۔

”ثروت! تم یہاں کیوں کھڑی ہو؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ وہ بھی کچن کی لائٹ جلتی دیکھ کر ادھر ہی آگئی تھیں، لیکن ثروت بیگم کو کچن کے پتھوں پہ کسی اسٹیچو کی طرح کھڑے دیکھ کر ٹھنک گئیں۔

”ہوں ٹھیک ہوں، بس وہ نماز پڑھنے جا رہی تھی۔“ ثروت بیگم نے گہری سانس لیتے ہوئے جوہر کا موبائل مٹھی میں دبا کر ہاتھ نیچے کر دیا تھا۔

”ٹھیک ہے تو پھر وضو کرو، میں بھی وضو کرنے ہی جا رہی ہوں۔“ آسیہ آندہ ان کا کندھا تھپک کر چلی گئیں اور

ثروت بیگم جوت کا موبائل رکھنے کے لیے اس کے بیڈ روم میں آگئیں جہاں وہ تھکن کے باعث اتنی سی دیر میں ہی بے سہ سوراہا تھا۔

وہ چائے کا پراساگ ہاتھ میں لیے چائے پینے کے ساتھ ساتھ نیوز پیپر کی ہیڈ لائنز پر بھی نظر دوڑا رہا تھا جب اچانک ڈور بیل کی آواز نے ذرا سا چونکا دیا تھا۔

”اس وقت کون ہو سکتا ہے؟“ اس نے خود سے سوال کرتے ہوئے بے ساختہ وال کلاک کی سمت دیکھا تھا جہاں اس وقت صبح کے آٹھ بج رہے تھے اور یہاں لندن میں صبح آٹھ بجے کا وقت بھی رات کے چار بجے کا وقت سمجھا جاتا تھا اس لیے اس وقت کسی کی آمد پر حیران ہونا ایک لازمی امر تھا کیونکہ یہ وقت یہاں کے باسیوں کے سونے کا وقت ہوتا تھا۔ یہاں لوگ عموماً ”دن کے گیارہ بجے“ بے دار ہونا شروع ہوتے تھے اور بے داری کا یہ سلسلہ دن کے تین چار بجے تک جاری رہتا تھا یعنی ان لوگوں کی صبح دن کے تین یا چار بجے ہوتی تھی۔ خصوصاً عورتوں کی صبح کیونکہ بچوں اور مردوں کو جلدی اٹھنا ہوتا تھا۔ بچے اسکول جانے کے لیے جلدی اٹھنے پر مجبور ہوتے تھے اور مرد اپنے کام پر جانے کے لیے اہلہ جو مرد حضرات لیٹ کام پر جاتے تھے وہ بیویوں کے ہمراہ لیٹ ہی بے دار ہوتے تھے اور جو جلدی اٹھنے پر مجبور تھے وہ اپنا ناشتا بھی خودی بناتے۔ یہ مجبور ہوتے تھے کیونکہ رات کے ڈھائی تین بجے سونے والی ماؤں اور بیویوں کے پاس اتنا لاڈ پیار ہرگز نہیں ہوتا تھا کہ وہ صبح آٹھ کر اپنے بچوں اور شوہروں کے نخرے اٹھائیں اور انہیں ناشتا بنا کر کھلائیں لہذا اپنی مدد آپ کے تحت وہ لوگ خودی روٹھا پیکا ناشتا کر کے گھروں سے نکل کھڑے ہوتے تھے اور یہ بات یقینی تھی کہ ان لوگوں نے آج تک صبح صبح کسی عورت کے ہاتھ سے بنے پرائے اور چائے کا ذائقہ بھی نہیں چکھا تھا وہ چاہتوں سے بھرے ذائقوں سے محروم زندگی رہے تھے ان کے یہاں کھانے پینے میں بھی ناز و نیاز نہیں ہوتا تھا۔

وہ نیوز پیپر سائیڈ میں رکھ کر دروازہ کھولنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا اہلہ ذہن میں ابھرتی حیرانی اور ہاتھ میں پکڑا چائے کا مک ساتھ ساتھ تھے جب تک وہ دروازے تک پہنچا ڈور بیل تیسری بار بج چکی تھی۔ چند سیکنڈز کے توقف سے اس نے دروازہ کھول دیا تھا۔ لیکن حیرانی ختم ہونے کی بجائے مزید بڑھ گئی تھی جس کی وجہ سامنے کھڑی ہستی تھی۔

”آپ؟“ بے ساختہ منہ سے نکلا تھا۔

”السلام علیکم! وہ بھی اسے سامنے دیکھ کر تھوڑا جھجکی تھی۔

”وعلیکم السلام! آپ اس وقت یہاں؟“ نبیل حیات سے اپنی حیرانی چھپائے نہیں چھپی تھی۔

”جی وہ میں مدیہ سے ملنے آئی تھی۔“ اس نے آہستگی سے اپنے گھرے ہوئے مخصوص دھیمے پن سے جواب دیا تھا۔

”وہ اندر آئیے۔“ نبیل حیات فوراً سامنے سے ہٹ گیا تھا اور وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اس کے پیچھے ہی اندر آگئی تھی۔ ڈرائنگ روم میں بغیر والیوم کے ٹی وی چل رہا تھا۔ ناشتے کی پلیٹ درمیانی ٹیبل پر رکھی تھی چائے کا مک اس کے ہاتھ میں تھا۔ گویا اس وقت وہ اکیلا بیٹھا ناشتا کر رہا تھا اور بانی؟

”مدیہ اور آنی وغیرہ کہاں ہیں؟“ اس نے ڈرائنگ روم کا جائزہ لینے کے بعد استفسار کیا تھا جبکہ نبیل حیات کی نظریں اس کے احرام میں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ اس کی سمت دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔ ہمیشہ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ اس کی نظر نہ پھٹے۔

”مام ذرا لیٹ اٹھتی ہیں اور مدیہ کے اٹھنے کا کوئی ٹائم مقرر نہیں۔ لیکن پھر بھی اس وقت دونوں سو رہی ہیں۔ آپ پلیز بیٹھے میں آپ کے لیے چائے لے کر آتا ہوں۔“ وہ کہتے ہوئے کچن کی سمت پلٹا۔

”نہیں۔ نہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں ابھی گھر سے ناشتا کر کے ہی نکلی ہوں۔ وہ ان لمحات عبد اللہ بھائی نے کسی کام سے آج برٹنکم جانا تھا۔ اس لیے میں نے کہا کہ جانے سے پہلے مجھے ڈراپ کر جائیں بعد میں کوئی ڈراپ کرنے والا نہیں ہو گا۔ اس لیے کافی صبح صبح ہی آگئی ہوں اور آپ کو بھی ڈسٹرب کر دیا ہے۔“ اس نے اپنی آمد کی وضاحت بیان کی اور نبیل حیات کی نظراڑتے اڑتے بھی اس کے چہرے کو چھو آئی تھی۔ حالانکہ ایسا اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا نظری یہ حرکت بے اختیاری تھی سو فیصد۔

”ڈسٹرب؟“ وہ زیر لب برسرِ پایا۔

”کیا میں مدیہ کے بیڈ روم میں جا سکتی ہوں؟“ وہ نبیل حیات کی خاموشی سے اکتا کر بولی تھی کیونکہ وہ چپ چپ لگ رہا تھا اور بستر تھا کہ وہ وہاں سے جلدی ہی ہٹ جائے۔

”ہاں کیوں نہیں۔“ وہ اب کی بار بھی آہستگی سے بولا تھا۔ اس کی اجازت یا کر زری فوراً ”ہی سیڑھیاں عبور کر رہی تھی“ جبکہ وہ وہیں کا وہیں کھڑا تھا چپ سوچ میں گم اور کسی غیر مرئی نقطے کو گھورتا ہوا۔ یقیناً ”وہ زری کے متعلق ہی سوچ رہا تھا۔ وہ عبد اللہ کی بہن تھی پڑھی لکھی، خوب صورت، مشرقیت سے مالا مال، ہر لحاظ سے پرفیکٹ۔ اور ایک اس کی بہن تھی پڑھی لکھی، خوب صورت، مغربی رنگ و ہنک میں پور پور ڈوبی، ہر لحاظ سے ان کمپلیٹ، جتنی زری سلیبھی ہوئی تھی۔ اتنی ہی مدیہ بگڑی ہوئی تھی اور اس میں قصور کس کا تھا؟ اس سوال کا جواب وہ اپنے آپ کو نہ دے سکا۔ کیونکہ جواب دینے کے لیے اسے پچھلے کھاتے کھول کے دیکھنا پڑتے جو فی الحال وہ نہیں کر سکتا تھا۔

www.edigestpk.blogspot.com

”مبارک خان! مبارک خان۔“ وہ حویلی کی پچھلی سائیڈ میں بنی انیکسی سے نکل کر حویلی کی بائیں سائیڈ عبور کرتی ہوئی مرکزی حصے کی طرف آتے ہی پکاری تھی ”اس کی آواز خاصی بلند تھی اور قدم ٹکلتے بھرے لگ رہے تھے وہ لان کی نرم گھاس اپنے سینڈلر کی ٹیل سے چلتے ہوئے بڑی تیزی سے دائیں سائیڈ میں بنے سرونٹ کو اررز کی سمت بڑھ رہی تھی۔

”مبارک خان۔“ اس نے ایک بار پھر آواز دی مگر مبارک خان موجود ہوتا تو جواب دیتا جبکہ موجود ہی نہیں تھا تو جواب کیسے آسکتا تھا؟

”مبارک خان!“ اس نے سرونٹ کو اررز کے کونے میں کھڑے ہو کر ایک بار پھر چیخ کر پکارا تھا اس کا جی چاہ رہا تھا کہ مبارک خان سامنے ہو تو اس کا گلا گھونٹ دے آخر وہ کہاں غائب ہو گیا تھا۔

”علیہ کی کیا بات ہے؟ مبارک خان کو کیوں بلارہی ہو؟“ آؤر آؤر کی آواز پر علیہ نے تیزی سے پیچھے مڑی تھی۔

”آؤر بھائی آپ کب آئے؟“ علیہ کے چہرے سے پریشانی کا عکس صاف دکھائی دے رہا تھا۔ آؤر مزید پریشان ہوا تھا وہ ابھی ابھی حویلی واپس آیا تھا۔ گاڑی سیاہ پتھروں سے بنی روش پہ گولا کی شکل میں گھومتی ہوئی پور ٹیکو کی سمت آئی تو آؤر کی پہلی نظر علیہ سے پہنچی تھی جو کافی ٹکلتے بھرے انداز میں سرونٹ کو اررز کی سمت بڑھ رہی تھی اور مبارک خان کو آوازیں دے رہی تھی جس پہ فوراً ”ہی آؤر کو کسی پریشانی“ کسی گڑبڑ کا احساس ہو گیا تھا۔

”بس ابھی آیا ہوں“ تم بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟ کیوں آواز دے رہی: وہ مبارک خان کو؟“ آذر نے ذرا سختی سے دہرا کے پوچھا تھا۔

”بے غناشہ پھوپھو کی طبیعت خراب ہے“ انیس ڈاکٹر کے پاس لے کر جاتا ہے۔“ علیزے آذر کے خیر و کھیر کر ٹھیک گئی تھی وہ لڑکیوں کے معاملے میں بہت سخت تھا۔ لیکن اس نے یہ سختی اور خفگی کبھی علیزے سے ظاہر نہیں کی تھی کیونکہ وہ ان کی سب سے چھوٹی اور لاڈلی کزن تھی۔ باقی سب کی طرح وہ بھی اسے بہت پیار کرتا تھا اور علیزے آذر سے کافی کھوز بھی تھی۔

”باقی سب کہاں ہیں؟“ اس کے کنبے کی سختی ہنوز تھی۔

”کوئی بھی گھر نہیں ہے۔“ علیزے آستلی سے بولی۔

”کیوں دانیال، زین اور جودت وغیرہ کہاں گئے؟“ آذر کا انداز تفتیشی تھا حالانکہ آذر کافی بڑا بابر قسم کا آدمی تھا۔ وہ اپنے تمام کزنز میں سے سب سے بڑا تھا۔ اس کے اپنے ماں باپ ہی نہیں اس کے چچا اور تایا بھی اس سے ہی انحصار کرتے تھے بلکہ وہ اس کی عزت اور قدر کرتے تھے کیونکہ وہ ان کا بہت سمجھ دار لائق فائق اور ہونہار سپہ سالار تھا۔ محل اور سمجھ داری اس کی شخصیت کے دو اہم رکن تھے وہ اپنے سے چھوٹے کزنز پر بلاوجہ اپنا براہین اور رعب ہمانے کی کوشش کرتا تھا نہ ہی اس نے کبھی دوسرے کزنز یا پھر اپنے بہن بھائیوں کی پراسیوں کی یا معاملات میں انٹرفیر کیا تھا۔ بس جو جیسا ہے ٹھیک ہے کہہ کر اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ وہ عزت کرتا بھی جانتا تھا اور کر دیتا بھی! البتہ لڑکیوں کے معاملے میں تھوڑا روڈ تھا لیکن اس کے باوجود اس نے لڑکیوں پر بھی کبھی زیادتی بے وجہ روک ٹوک ہرگز نہیں کی تھی یہ ہی وجہ تھی کہ اس کے تمام کزنز حقیقتاً اس کی بہت عزت اور احترام کرتے تھے کوئی بھی بات کہہ دیتا وہ فوراً حکم بحال لاتے تھے شاید وہ اس کی خاموشی اس کی چپ سے خائف رہتے تھے کہ وہ کیس پھٹ نہ پڑے۔ حالانکہ ایسا ہرگز نہیں تھا وہ ایک نارمل اور ہنسینٹ برین تھا۔

”مجھے کیا پتا کہ کہاں گئے؟“ علیزے نے گھبراہٹ سے جواب دیا۔

”تم چلو میں آ رہا ہوں میں پھوپھو کو اسپتال لے جاتا ہوں۔“ آذر علیزے کا چپ ہونا بھانپ گیا تھا۔

”پھوپھو کی طبیعت زیادہ خراب ہے وہ اکیلی آپ کے ساتھ نہیں جاسکتیں میں ماما کو بھیجتی ہوں؟“ وہ کہتے ہوئے حویلی کے اندرونی مرکزی دروازے کی طرف بڑھ گئی تھی اور آذر صرف دیکھ کر رہ گیا تھا۔ وہ جان چکا تھا کہ علیزے نے اس کے سخت کنبے کو کافی قیل کیا ہے۔

وہ سر جھٹک کر اس مسئلے کو چہرہ بھی پہٹال کے انکسی کی سمت بڑھ آیا تھا جہاں پہنچ کر اسے علیزے کی پریشانی کا باخولی اندازہ ہو گیا تھا۔ کیونکہ غناشہ پھوپھو کی کافی سیریس کنڈیشن تھی اور ان کے پاس سوائے انوشہ (غناشہ پھوپھو کی بیٹی) کے اور کوئی بھی نہیں تھا اور انوشہ ان کے سرہانے بیٹھی مسلسل روتے ہوئے اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ کر سسلا رہی تھی۔ غناشہ پھوپھو اس وقت نیم بے ہوشی کی حالت میں تھیں آذر نے انوشہ کو تسلی دیتے ہوئے غناشہ پھوپھو کو اپنے بازو کے سہارے اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ وہ شوگر اور بلڈ پریشر کی مریضہ تھیں اور کبھی کبھی ان دنوں مرنس میں سے کوئی ایک بھی ان پر حاوی ہو جاتا تو ان کی حالت اسی طرح غیر ہو جاتی تھی اس وقت بھی نہ جانے ان کا بی بی لہو ہو گیا تھا یا پھر شوگر ہائی ہو چکا تھا جس کی وجہ سے ان کے ہاتھ پیر بے ہوش ہو رہے تھے وہ اپنے قدموں پر کھڑی ہونے اور چلنے کے قابل بھی نہیں تھیں ان کی سکت ختم ہو چکی تھی۔ وہ انہیں لے کر اپنی گاڑی تک پہنچا تو آسیہ آندھی کو پہلے سے خنکرایا تھا۔

”توڑ! غناشہ کی طبیعت تو پہلے سے بھی زیادہ خراب لگ رہی ہے۔“ آسیہ آندھی نے گاڑی میں بیٹھ کر غناشہ آندھی کا سر گود میں رکھتے ہوئے تشویش کا اظہار کیا تھا۔

”جی مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔“ وہ گاڑی نکالتے ہوئے فکر مندی سے بولا تھا اور پھر جیسے ہی گاڑی روڑ پہ ڈالی اس نے فوراً ڈرائیو سے اٹھ کر دانیال کا نمبر ڈائل کیا تھا۔ اس نے دوسری ہی رنگ پہ کال ریسیو کر لی تھی۔

”عائشہ پھوپھو کی طبیعت خراب ہے، تم ابھی اسپتال پہنچو، میں انہیں لے کر اسپتال ہی آ رہا ہوں۔“ آڈر نے ایک ہی سانس میں بات ختم کر کے اس کا جواب سنے بغیر کال بند کر ڈالی تھی اور ساتھ ہی گاڑی کی اسپید بڑھادی تھی اسے پتا تھا کہ دانیال ماں کی طبیعت کا سن کر ان سے بھی پہلے اسپتال پہنچ چکا ہو گا۔ کیونکہ ان تینوں بھائی بہن دانیال، زین اور انوشہ کے لیے ان کی ماں ہی سب کچھ تھی۔



”لیلیٰ آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں۔“ ملجوبے چمک سا تھا۔

”جی نمونہ!“ وہ آہستہ سے بولی تھی۔

”ہاں تو نمونہ لیلیٰ میں نے فیصلہ کیا ہے میں آپ کا کیس لڑنے کے لیے تیار ہوں۔“ وہ مضبوط اور پر عزم لہجے میں بولا تھا اور اس لڑکی کے چہرے پر زندگی چمک اٹھی تھی۔

”لیکن ایک شرط۔“ اس کی اگلی بات نے اس لڑکی کے چہرے کی چمک بلکہ زندگی فوج جی تھی۔ اس نے مذہم و سوسوں میں گھر کر دیل اور شاہ کے سر دوسیاٹ پتھر لیے تاثرات والے چہرے کی سمت دیکھا تھا۔

”کیا اس کی شرط بھی باقی دو کیوں جیسی تھی؟“

”کہ آپ کسی بھی موڈ پر جا کر قدم پیچھے نہیں ہٹائیں گی، چاہے آپ پر کتنی ہی مشکل اور مصیبت کیوں نہ آجائے، آپ نے پھر بھی ہمیشہ ثابت قدم رہنا ہے، کسی بھی چیز سے ٹھہرنا نہیں ہے اور اگر ایسا کرنا ہے تو ایم سو رنی میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکتا، آپ اپنا کیس لڑیں اور سب کچھ اٹھالیں، میں آپ کی سب سے بڑی مددگار ہوں گی۔“ اس نے دو ٹوک کہتے ہوئے اپنی سوچ کا اظہار کیا تھا اور اس نمونہ نامی لڑکی کا رگڑا ہوا سانس بحال ہوا تھا اس کے چہرے کی چمک اور زندگی واپس اپنے مقام پر آگئی تھیں۔

”ڈکیل صاحب ایک شریف اور عزت دار لڑکی کے لیے اس کی عزت ہی سب کچھ ہوتی ہے اور جب وہ عزت بھی نہیں رہتی تو کچھ بھی نہیں رہتا، پھر کسی مشکل، مصیبت اور آفت سے ڈر بھی نہیں لگتا۔ میں بھی ہر روز سے عاری ہوں اور کبھی بھی قدم پیچھے نہیں ہٹاؤں گی۔ کیونکہ ثابت قدم رہنے کے لیے اور انصاف پانے کے لیے میں نے بھی بہت سے لوگوں کے قدم پکڑے ہیں۔ بہت سے لوگوں کے پاؤں بڑی ہوں۔ بہت دھتکے کھانے کے بعد آپ کے سامنے بیٹھی ہوں اس وقت۔“ اس لڑکی کا لہجہ اور انداز بہت مضبوط تھے اور دل اور شاہ کی تسلی ہو گئی تھی، وہ ایک دم صوفے سے کھڑا ہو گیا تھا۔

”ٹھیک ہے، پھر آپ کل ہی میرے آفس آکر اپنا کیس ریکارڈ کروادیں، باقی کا کام میں دیکھ لوں گا۔“ وہ کہتے ہوئے جانے کے لیے ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے کی سمت بڑھا تھا، لیکن اچانک کچھ یاد آنے پہ ٹھہر گیا تھا اور دوبارہ واپس پلٹ آیا۔

”ایم سو رنی مجھے یہ بتانے کا تو خیال ہی نہیں آیا کہ میرا آفس لاہور میں ہے، آپ اسلام آباد سے لاہور کیسے جائیں گی؟“ اس کا انداز متشکر تھا۔

”جی میں بھی لاہور کی رہنے والی ہوں، لاہور کے ساتھ ہی میرا گھر ہے، میں یہاں اسلام آباد صرف آپ کے لیے آئی ہوں، مجھے کسی نے بتایا تھا کہ آپ آج کل اپنے اسلام آباد والے گھر پر ہی ملیں گے، کیونکہ آپ اپنی ماں

جان سے ملنے کے لیے گئے ہوئے ہیں۔“ اس نے وضاحت دی تھی۔

”ہوں پھر ٹھیک ہے، آپ لاہور پہنچ کر میرے خشی سے رابطہ کر لیجئے گا۔“ وہ جیب سے کارڈ نکال کر اسے تھما گیا تھا اور اندر داخل ہوتی بٹول شاہ کچھ ریلیکس ہو گئی تھیں، انہیں اب یقین ہو گیا تھا کہ اس لڑکی کو انصاف ضرور ملے گا۔ اول تو دل اور شاہ کوئی بھی ایسا سا کیس ہاتھ میں نہیں لیتا تھا اور اگر لیتا تھا تو پھر کبھی مارنے کا سوچا بھی نہیں تھا۔ لاہور ہائی کورٹ میں اس کی اپنی ایک ساکھ تھی، لوگ جس کیس پہ دل اور شاہ کا نام دیکھ لیتے تھے اس کیس کے مدعی یا مجرم کو بنا کیس لڑے ہی جیتا ہوا تصور کرتے تھے، جیسے اس وقت بٹول شاہ کر رہی تھیں۔



اس نے اپنے بھاری اور بو جھل سر کو بمشکل حرکت دیتے ہوئے گردن سیدھی کی اور آنکھیں کھول کر کمرے کے قریب کھڑی زری کو دیکھنے کی ٹاکام کو شش کی۔ اس کا سر اور دل غریب بھاری نہیں ہو رہے تھے، بلکہ آنکھوں کے پونے بھی بھاری اور بو جھل محسوس ہو رہے تھے، جس کی وجہ سے آنکھیں کھل ہی ہی نہیں رہی تھیں اور اس کی یہ مشکوک سی ہنسی حالت زری نے بھی محسوس کی تھی۔ ٹھہر اپنے شک کو جھٹک رہا تھا۔

”مدحہ کیا بات ہے؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک سے نا؟“ زری نے جھک کر اس کی پیشانی پہ ہاتھ رکھا تھا اور زری کے ٹھنڈے ہاتھ کا لمس یک دم اس کے جسم میں کپکپی ڈاگیا تھا۔ اس نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔ لیکن پھر بھی بو جھل ذہن کو ٹھکانے لانے کے لیے اسے چند منٹ لگے تھے۔

”آریو تل رائٹ مدحہ۔“ اس نے ذہرا کے پوچھا ساتھ ہی کھوجتی ہوئی گہری نظر اس پہ مرکوز کر دی تھی۔

”لیس آئی ایم فائن؟“ مدحہ نے اپنا توازن برقرار رکھنے کی کوشش کی اور کمر ہٹا کر پاؤں بستر سے نیچے اتار لیے تھے۔ رات کو وہ اپنے کمرے میں آگئی تھی اور اس سے بے گانہ ہو گئی تھی، پھر سرد گرم سے بے نیاز ہو کر لیکن اس کے قریب کھڑی ناگہان شام اس کی ماں تھیں۔ انہوں نے نوباد اسے سرد گرم سے بچایا تھا۔ محفوظ رکھا تھا۔ پھر اب اسے کیسے اس کے حال پہ چھوڑ کے پیچھے ہٹ جاتیں، وہ نہ سکیں اور جیسے تیسے جھٹک لیں اسے سارا دے کر بند روم میں چھوڑ گئی تھیں۔ یہاں تک کہ اس کی جیکٹ اور جاگرز بھی انہوں نے ہی اتار کر رکھے تھے اور کمرے بھی وہی اوڑھا کر گئی تھیں۔

”تم سناؤ تم کیسی ہو؟“ مدحہ نے شدید قسم کی انگڑائی روکتے ہوئے اپنے تھکھارے بالوں کو دونوں ہاتھوں سے

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

خوبصورت ناول
لوہے سے پہلی
میں ہو گیا
آفت جبر

تتلیاں، پھول اور خوشبو راحت جبین قیمت: 225 روپے
بھول بھولیاں تیری گلیاں فائزہ افتخار قیمت: 500 روپے
محبت بیاں نہیں لہنی جہان قیمت: 250 روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

سمیٹ کر پیچھے کیا تھا۔ اب وہ زری کے سامنے کھڑے ہوئے گا سوچ رہی تھی کہ کیسے اپنا توازن قائم رکھے گی۔
اس کو اپنے لڑکھڑانے کا اندیشہ پہلے سے ہی تھا۔

"میں ٹھیک ہوں، لیکن تم ٹھیک نہیں لگ رہیں؟" زری کا لہجہ شکی تھا۔
"اور یار فکر نہ کرو میں ٹھیک ہوں، بس آج ذرا لیٹ سوتی تھی شاید دو تین گھنٹے ہوئے ہیں مجھے سوئے ہوئے"
اس لیے اچانک غیند نوٹنے پہ ذہن ٹھکانے پہ نہیں آ رہا، تم جیسو میں آتی ہوں۔" مدحیہ ہنسنے پر ہی اٹھ کھڑی ہوئی
تھی اور لڑکھڑانے کے ذریعے تیز تیز قدم اٹھاتی واش روم میں بند ہو گئی تھی۔ وہ جلد از جلد چہرے پہ پانی کے چھینٹے
مار کر دانت برش کرنا چاہتی تھی، تاکہ اس کے منہ سے شراب کی بو نہ آئے جو یقیناً "زری کو ناگوار گزرتی۔ اس نے
دو سے تین بار برش کیا اور پھر ہاتھ واش سے پورا منہ حلق تک واش کر ڈالا تھا۔ جب منہ سے خوشبودار سانس
خارج ہوئی تب اسے اطمینان ہوا تھا اور وہ چہرہ دھو کر واش روم سے باہر نکل آئی، جہاں اپنے ذہن اپنی سوچت
ابھی زری اس کی فکری نشی تھی۔

زری جس چیز کے متعلق سوچ رہی تھی اس چیز کے متعلق کچھ بھی کہنا نہیں چاہتی تھی اور کہنے نہ کہنے کی کوشش
ہی اسے الجھا رہی تھی۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" مدحیہ تو لیے سے چہرہ اونچے کر ڈرنگ ٹیبل کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی اور آئینے میں نظر
آتے زری کے عکس کو دیکھتے ہوئے ہیر برش اٹھا کر بال سلجھانے لگی، جواتنے گھنے اور گھنگھریالے تھے کہ بمشکل ہی
سلجھتے تھے۔

"سوچ رہی ہوں کہ آج کل تم کہاں بڑی ہوتی ہو؟" زری نے اچانک کہہ دیا تھا مدحیہ کے ہاتھ لحد بھر کور کے
تھے اور پھر سے رداں ہو گئے۔

"جہاں پہلے ہوتی تھی۔" جواب کور تھا۔
"پہلے تو تم مجھ سے بھی کانٹا کٹ رکھتی تھیں، مگر اب بھی آنا جاتا تھا اب تو تم نے اتنے دنوں سے سب کچھ ہی
چھوڑ دیا ہے اپنی خیر خبر نہ ہماری۔" انداز کھوٹا ہوا، لیکن لہجہ شکوے سے بڑھا۔

"بس میرے فریڈز برائن اور شینے کا کل رات برتھ ڈے تھا، بہت دنوں سے اس برتھ ڈے پارٹی کی آرٹ
منٹ میں لگے ہوئے تھے اس لیے فریٹ نہیں ملی۔" وہ اپنے بالوں کو سختی سے بینڈ میں جکڑتے ہوئے بیڈ کے
سامنے رکھے صوفے پر دھنس کر بیٹھ گئی تھی۔ انداز بے حد لاپرواہ تھا جو زری کو ہرگز اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

"پاکستان کب جا رہے ہیں آپ لوگ؟" اب کی بار اس نے سیدھا سیدھا سوال کیا تھا اور اس کے سوال پہ
مدحیہ کے بوجھل تاثرات ایک دم سرو سپاٹ ہو کر سختی میں ڈھل گئے تھے۔ وہ زری سے جس بات کی توقع کر رہی
تھی اس نے وہی کی تھی۔ اس کی سوچ سچ ثابت ہوئی تھی۔

"میں پاکستان نہیں جا رہی۔" جواب دو ٹوک تھا۔
"کیوں؟" سوال بھی مختصر آیا۔

"جس نے تمہیں پاکستان جانے کا بتایا ہے اس نے میرے نہ جانے کا بھی بتایا ہو گا اس لیے یہ "کیوں" اور
"کیا" کے سوال کرنا بے کار ہے۔" مدحیہ بہت بے لگ رہی تھی۔
"لیکن مدحیہ اس طرح بات کو ٹال کر تم اس بات کو دبا نہیں سکتیں۔ تمہیں کچھ تو بتانا ہی ہو گا؟" زری کافی سیریس
ہو چکی تھی۔

"کیا بتانا ہو گا؟" اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا اس کی نظریں سوالیہ تاثر کے علاوہ ہر تاثر ہر اثر سے غاری

تھیں۔

"پاکستان نہ جانے کی وجہ۔ آخر کیا وجہ ہے کہ تم پاکستان نہیں جانا چاہتیں؟" ایک کے بعد ایک سوال تھا۔
"کوئی وجہ نہیں ہے۔" اس نے نفی میں گردن ہلادی۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ ہر چیز کے پیچھے کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے اور میں تم سے وہ وجہ جانا چاہتی ہوں؟"
زری نے اپنی فریڈز شپ کے مل بوتے پہ زور دیا تھا۔

"ہر چیز کے پیچھے آپ لوگوں کا وہم بھی تو ہو سکتا ہے؟" مدحیہ کا انداز ابھی بھی عجیب سا ناں سیریل تھا۔
"ایک بندے کو وہم ہو سکتا ہے، لیکن سب کو تو نہیں۔" زری اپنی بات پہ قائم تھی۔

"طرز فکر ایک ہی ہو تو سب کو وہم بھی ایک ہی ہو گا۔" مدحیہ کا جواب ابھی درست تھا۔ لیکن اس کی بات کو
ماننے والے بہت کم تھے اکثر تبھی اس کی بات سے اختلاف ہی کرتے نظر آتے تھے۔ سوزری کو ابھی بھی اس کی
بات سے اختلاف ہی ہوا تھا۔

"سب کا طرز فکر ایک نہیں ہے، بلکہ تمہاری سوچ سب کے لیے ایک سی ہو گئی ہے، تم سب کو ابھی نظر
سے دیکھنے لگی ہو۔ تمہاری نظر میں شیشے اور زرین ملک میں کوئی فرق نہیں ہے۔ تم دونوں کو ایک ہی ترازو میں
توالتی ہو۔" زری نے اپنے مخصوص دھیمے پن سے ہٹ کے بہت تیزی سے جواب دیا تھا۔ جس پہ مدحیہ لحد بھر کے
لیے خاموش سی ہوئی تھی۔

"زری میں تمہاری عزت کرتی ہوں۔" اس کا لہجہ مضبوط تھا اور دو ٹوک بھی۔
"صرف عزت؟" زری بھی برکت بولی تھی۔

"اور کیا چاہتی ہو؟ عزت سے بڑھ کے کچھ ہے؟" مدحیہ سنجیدگی۔ آگئی۔
"میں نے محبت مانا اور شہر میں بھی محبت مانا ہے۔" مدحیہ نے کہا تھا۔

آپ چھاپو مت بلکہ عیاں کرو۔ میں تمہارے اور اپنے درمیان ایسے رشتے کا مان چاہتی ہوں کہ تم نے اپنی بہن
سبھ کے سب کچھ کہہ دو۔" مدحیہ چپ چاپ گہری نظروں سے زری کی اپنائیت دیکھ رہی تھی، اس کا لہجہ جابج
رہی تھی کہ اچانک سائیڈ ٹیبل پہ رکھا اس کا موبائل گنگنا اٹھا تھا۔ زری نے چونک کر مدحیہ کے موبائل کی سمت
دیکھا تھا۔ جو اس کے قریب ہی رکھا ہوا تھا اور جس کی اسکرین پہ جگمگاتی تصویر نے اک پل میں اس کو پوری ہستی
بل ڈالی تھی اس کی دھڑکنیں بھانگ بھاگ چل نکلی تھیں اسے بھول گیا کہ اس کے سامنے کون بیٹھا ہے؟

وہ کیا بات کر رہی تھی؟ اور وہ کہاں موجود تھی۔
"نکس کا فون ہے؟" مدحیہ نے زری سے استفسار کیا تھا۔ لیکن زری کا دھیان کہیں اور تھا وہ جب نہ دے
سکی۔ لہذا مدحیہ نے اٹھ کر خود ہی کال اٹینڈ کر لی تھی۔

"ہیلو بھائی؟" اس کے انداز میں محبت، اپنائیت اور احرام تھا قدر تھی۔ زری اسے دیکھتی رہ گئی مدحیہ فون پہ
بات کرتے ہوئے یکسر مختلف مدحیہ لگ رہی تھی، جس کے لفظ لفظ سے پیار کا رس چھلک رہا تھا، کسی بات پہ
انکاری تھی، جبکہ دوسری طرف سے یقیناً۔۔۔ اصرار کیا جا رہا تھا، جس پہ وہ اگلے چند لمحوں کے لیے چپ سی
ہو گئی تھی۔

(باقی آئندہ ملاحظہ فرمائیں)

دردِ دل

بڑی حویلی کے تمام ٹکین و قار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیلہ جیات دو ہی بہن بھائی ہیں مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے وہ انگلینڈ کی رنگینوں میں مکمل طور پر رنگ چکی ہے جس کے پیش نظر فاروق بیگم، نبیلہ کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے جس پر نبیلہ اور فاروق بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پھپھو رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا ہے یہی اور مجبوری سے تنگ آخر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باوا احمیاز مل جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے انہی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میسرک پاس آدمی ہے وہ مہارکت خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل اور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پر بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔



اس کی اتنی طویل اور گہری چپ اس کے اقرار کا اعلان کرنے لگی تھی۔ جتنی اس کی چپ گہری تھی اتنی ہی اس کی سوچ اور سوچ کی ایندھن گہرائی اسے بہت ہی نازک مقام تک لے گئی تھی جہاں سے اس کے انکار کی ذرا سی بھی گنجائش نہیں نکلتی تھی اور اب یہ بات طے تھی کہ وہ انکار نہیں کر سکتی تھی کیونکہ مقابل اس کا بھائی تھا۔

بے شک لوگوں کی نظر میں اس کا اور دل اور شاہ کا رشتہ منہ بولے بہن بھائی کا تھا، لیکن اس رشتے کی قدر وہ سب سے زیادہ کرتے تھے۔ انہوں نے ہمیشہ ہر مقام پر اس رشتے کے حوالے سے اک دو سرے کا مان برہنہ کیا تھا اور کبھی بھی اس رشتے کی اہمیت کو کم نہیں ہونے دیتا تھا ان دونوں کو اپنائیت اور چاہ دیکھ کر کبھی یہ محسوس ہی نہیں ہوا تھا کہ ان کا رشتہ خون کا رشتہ نہیں بلکہ منہ بولا رشتہ ہے اور اس کی بڑی وجہ یہ ہی تھی کہ وہ دونوں سب سے بہن بھائیوں سے بڑھ کے اک دو سرے کو چاہتے اور عزت و احترام کرتے تھے۔ مدیحہ کو بہن بنانے کے بعد دل اور شاہ اپنی زندگی میں بہن جیسی کمی کو ہمیشہ کے لیے بھول گیا تھا اور دوسری طرف مدیحہ بھی اس رشتے کے بعد اپنے آپ کو وہ بھائیوں کی بہن سمجھنے لگی تھی۔ وہ زندگی میں فیملی حیات کی بات تو ٹال سکتی تھی، لیکن دل اور شاہ کی تمہیں کیونکہ مدیحہ کے معاملے میں وہ خود بھی ایسا ہی کرتا تھا وہ بھی ہمیشہ مدیحہ کی بات کو ہی فوقیت دیتا تھا اس کے مقابل چاہے کوئی بھی ہوتا وہ صرف اور صرف مدیحہ کی بات کو ہی اہم جانتا تھا تو پھر اب اب یہ کیسے ممکن تھا کہ مدیحہ اسے انکار کر کے فون بند کر دیتی؟

موبائل فون کی دوسری طرف وہ بالکل خاموشی سے اس کے انکار اور اقرار کا منتظر تھا جبکہ مدیحہ اپنے ضدی اور ہٹ دھرم خیالات کو آواز دہرائے میں لگی ہوئی تھی وہ اپنے ذہن میں پلنے والی ضد کو چلنے کی کوشش کر رہی تھی جو کچھ اس نے سوچ رکھا تھا وہ سب مٹی کا ڈھیر ہوتا نظر آ رہا تھا اس کے سرکش عزم اور سوسے رہ گئے تھے صرف اور صرف دل اور شاہ کا مان رکھنے کی خاطر۔

اور اس لمحے اسے محسوس ہوا تھا کہ کسی رشتے کا مان رکھنا کتنا مشکل ہوتا ہے یہاں تک کہ انسان کو زہر کا گھونٹ بھی پینا پڑ جاتا ہے اور آج اس نے بھی یہ ذائقہ چکھ لیا تھا اپنے اندر کی ضد اور جنون کو اپنے بھائی کی محبت کا لبادہ اوڑھنا ہے ہوئے فیصلے کا اختیار دل اور شاہ کو سونپ دیا تھا اور ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے فون بند کر کے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور قریب بیٹھی زہری دیکھتی رہ گئی تھی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ مدیحہ دل اور شاہ کی کتنی عزت کرتی ہے۔

دانیال حسب توقع ان لوگوں کے پیچھے سے پہلے ہی بڑی حویلی کے مخصوص فیملی ہاسپتال میں موجود تھا جہاں سے وہ اپنے مخصوص ڈاکٹر سے اکثر علاج معالجہ کرواتے تھے اور وہی ڈاکٹر ان کے بطور فیملی ڈاکٹر بھی کام کرتے تھے اور ان ہی میں سے ایک ڈاکٹر ظفر بھی تھے جو عائشہ آفندی کے معالج تھے اور کافی عرصہ سے وہی ان کا علاج کر رہے تھے اور اس وقت وہ انہیں ڈاکٹر ظفر کے پاس ہی لے کر آئے تھے۔

آذر کی گاڑی دیکھتے ہی دانیال ایک کے قریب آیا تھا۔
”کیا ہوا ہے امی کو؟ اتنی اچانک طبیعت کیسے خراب ہو گئی؟“ اس کے چہرے پر پریشانی سے ہوائیاں اڑ رہی

تھیں، آذر کے گاڑی سے اترنے سے پہلے ہی وہ پچھلی سائڈ کا دروازہ کھول چکا تھا۔

”یہ تو ہمیں بھی نہیں پتا کہ اتنی جلدی طبیعت کیسے خراب ہو گئی؟ وہ تو علینہ سے انکیسی کی طرف مٹی تو پتا چلا کہ عائشہ کی طبیعت خراب ہے اور گھر پہ کوئی بھی نہیں ہے اس لیے آذر اسے لے کر اسپتال جا رہا ہے۔“ آسیہ آفندی دانیال کو بتاتے ہوئے گاڑی سے اتر آئی تھیں جبکہ عائشہ آفندی کو آذر اور دانیال نے مل کر سہارا دیا تھا اور پارکنگ سے اندر اسپتال تک لے کر آئے تھے ڈاکٹر ظفر اس وقت آن ڈیوٹی تھے انہوں نے عائشہ آفندی کی حالت کے پیش نظر فوری ٹیسٹ منٹ شروع کر دی اور ساتھ ساتھ انہوں نے یہ بھی انکشاف کر دیا تھا کہ آذر تھوڑی دیر اور وہ لوگ ان کو لے کر نہ آتے تو یقیناً ”عائشہ آفندی کی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے“ کیونکہ ان کا بی بی خطرناک حد تک بوجھ گیا تھا جس کی وجہ سے ان کے جسم سے جیسے جان ختم ہو چکی تھی ان کے ہاتھ پاؤں بے جان ہوتے لگ رہے تھے اور ان کی ایسی سنگین حالت کے بارے میں جان کر وہ تینوں خاموش ہو کے رہ گئے تھے۔

”تم کہاں تھے اس وقت؟“ آذر نے پھرے ہوئے لہجے میں دانیال سے استفسار کیا تھا۔
”ماموں کے ساتھ آفس میں تھا۔“ دانیال متفکر سا سر جھکائے بیٹھنا ہی دل میں ہاں کے لیے دعا گو تھا۔
”اور باقی سب؟“ آذر کو نہ چاہتے ہوئے بھی تمام لڑکوں کی غیر موجودگی یہ غصہ آ رہا تھا۔ مگر اس وقت وہ غصہ ضبط کرنے پر مجبور تھا۔

”ماتی سب مجھے بتا کر تو نہیں جاتے؟“ دانیال خفگی سے بولا۔
”لیکن زین تو تمہیں بتا کر جا سکتا ہے نا؟ تو تم سے چھوٹا ہے خبر رکھا کرو۔“ آذر نے اسے تنبیہ کی۔
”کیا جودت اپنی خبر رکھنے دیتا ہے؟ یا پھر جہاں جاتا ہے بتا کر جاتا ہے آپ کو؟ چھوٹا تو وہ بھی ہے؟“
دانیال کے طنزیہ جواب آذر کو سلا کر رکھ گئے تھے۔

”تم میری بات کا اتنا مطلب کیوں لے رہے ہو۔“
”کیونکہ آپ الٹی بات کر رہے ہیں جو لوگ آپ کے سمجھانے سے باز نہیں آتے وہ میرے سمجھانے سے کیسے باز آجائیں گے؟ ان کے نزدیک جو ویلیو آپ کی ہے وہ میری نہیں ہے پھر بھی وہ بات نہیں مانتے اس میں کس کا قصور ہے؟ میرا یا آپ کا؟“ دانیال سو فیصد درست کہہ رہا تھا جس کا اندازہ آذر کو بھی ہو گیا تھا آج کی سسل بھلا کس کے قابو میں تھی؟ یہاں ہاں باب کی بات سنی ان سنی کر دی جاتی تھی وہ تو پھر بھائی کے عہدے پر تھے اور بھائی ہونے کے ناتے وہ لوگ ان کی عزت کر لیتے تھے تو یہ بھی ان کا احسان تھا آذر چپ ہو چکا تھا۔ دانیال اٹھ کر آئی سی یو کی سمت آگیا جہاں عائشہ آفندی کا ٹیسٹ منٹ جاری تھا۔

”بھائی امی کو کیا ہوا ہے؟“ دانیال کے عقب سے زین کی پاپتی ہوئی آواز ابھری تھی وہ شاید بہت غلٹ میں یہاں تک آتا تھا اس کے چہرے پر بھی وہی پریشانی رقصاں تھی جو دانیال کے چہرے کو گھیرے ہوئی تھی۔ وہ زین کے چہرے کو دیکھ کر رہ گیا تھا اور اس کے ایک گھٹنے میں ڈاکٹر زین کی حالت خطرے سے باہر تائی تھی۔ لیکن اس کے باوجود ان کو جو ہمیں گھٹنے کے لیے ایڈمٹ کر لیا گیا تھا۔ اور ان کی طبیعت کی خرابی کا سنتے ہی ان کے تینوں بھائی وقار آفندی، سرار آفندی اور اظہار آفندی فوراً ہی اسپتال پہنچ چکے تھے۔

وقار آفندی نے عائشہ کی طبیعت معلوم کرنے کے بعد دانیال اور زین کو بطور خاص قریب بلا کر قسبی دلاسا دیا تھا اور انہیں حوصلہ مضبوط رکھنے کا کہا تھا اور وقار آفندی کے یہ سلیباں دلا سے اور پیار محبت تو وہ بچپن سے لیتے آ رہے تھے جب بھی کوئی ایسی ایسی بات ہوتی تو وہ اپنی بھانجی اور بھانجیوں کو اسی طرح جاس بلا کر بٹھا کر پیار اور تسلی سے سمجھاتے تھے اور ان کی اتنی محبت اور توجہ یہ وہ لوگ سچ بچ سمجھ بھی جاتے تھے اس وقت بھی ان دونوں

یوں کو ان کی موجودگی سے بہت ڈھارس ملی تھی، حالانکہ بانی دونوں ماموں شی بے حد اچھے تھے، لیکن بڑے ماموں کی تو بات ہی اور تھی جس کو وہ بھی باقی سب کی طرح ڈیڑھی کہتے تھے۔

☆ ☆ ☆

دور کشاپ کے اندر قدم رکھتے ہی اس نے سارے میں اک طائرانہ سی نگاہ دوڑائی تھی۔ سارا ماحول اور سب کچھ وہی تھا جو کسی بھی دور کشاپ کا ہونا چاہیے تھا، وہی پٹرول اور ڈیزل کی ہٹا گواریدو وہی ٹولی پھولی سی مرمت کے انتظار میں کھڑی گاڑیاں، وہی ٹائر ٹیوب اور پمپنگ لگانے کا سامان اور وہی گاڑیوں کی سروں کے لیے ایک کونے میں مخصوص جگہ! وہاں سب کچھ فٹ اور ریفریکٹ تھا۔ سوائے عدیل نیازی کے جو ابھی بھی ایک نظروں کشاپ کو ایک اور نظریاتی فائل کو دیکھ رہا تھا اور ایک نظروں دیکھنے میں ہی اس کا خون جل کر رکھ ہوئے لگا تھا، یہی اس نے باوقار کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے اپنی فائل کو بے کے کیل پر زوں سے اتنی شلیٹ یہ ڈال دی تھی اور اس پر آمد بے نما کھلے سے کمرے میں بیٹھ گیا جہاں باوقار کے چھوٹے (ملازم) نے کرسی ڈال کر دی تھی۔

”یہ چھوٹا ہے اس دور کشاپ کا سب سے اہم اور کارآمد پرزہ۔“ باوقار نے چھوٹے کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے مسکرا کر اس کا تعارف کروایا تھا۔

”اس کے بغیر یہ دور کشاپ بے رنگ ہے۔“ دل میں رونق ہے تو اسی۔ عدیل نے ان کے لفظ ”بے رنگ“ اور ”رونق“ پر حیرت سے ایک بار پھر دور کشاپ کے احاطے میں سر دوڑائی کہ باوقار نے کس چیز کو رنگ اور رونق کا نام دیا ہے؟ وہاں ایسی کون سی چیز تھی جس پر اس وقت رنگ تھا اور وہ چھوٹے کے بغیر بے رنگ ہو جاتی تھی، اسے تو چاروں اطراف ٹولی پھولی گاڑیوں اور پرانے ٹائروں کے علاوہ کچھ بھی نظر نہیں آیا تھا۔

”باوقار عدیل کسی کے دم سے جو رونق اور رنگ ہوتے ہیں نا وہ انسان۔ کہ دل میں ہوتے ہیں ماحول میں نہیں، تمہارے دل میں رونق ہوئی تو تمہیں یہ کاٹھ کپڑے سے اٹا اور کشاپ بھی جنت سے کم نہیں لگے گا۔“ عدیل کے ذہن میں اچھتی مسخرانہ سی حیرت باوقار نے اک پل میں ٹوٹ کر اور اس کا جواب بھی دے مارا تھا جس پر عدیل مزید حیرت سے دوچار ہوا تھا اور شرمندہ بھی۔

”تمہیں ایسی کوئی بات نہیں، میں تو یہ دیکھ رہا تھا کہ آپ نے چھوٹے کا تعارف کروایا بھی تو کیسا؟ آپ اسے ایک اہم اور کارآمد پرزے سے تشبیہ دے رہے ہیں۔“ عدیل کو اپنی بے ربط اور کھوئی کھوئی سی کیفیت سے نکل کر اپنے اعصاب ٹھکانے پر لانے پڑے تھے جب یہاں آئی کیا تھا تو یہاں کے ماحول کو قریب سے جاننا اور سمجھنا بھی ضروری تھا۔ جیسی اپنے انداز و اطوار کو سنبھالا دیا تھا۔

”پرزہ اس لیے کہا ہے کہ آج کل ہم ایک مشینی زندگی جی رہے ہیں، ہمارا انسانوں کے بغیر تو گزارا ہو جاتا ہے، لیکن مشینوں اور ان کے پرزوں کے بغیر نہیں ہوتا اور یہ چھوٹا تو ماشاء اللہ ایک ایسا پرزہ ہے جو کسی بھی وقت کہیں بھی فٹ ہو جاتا ہے، تم اگر گاڑی کے نیچے لیٹ کر اسے ٹھیک نہیں کر سکتے تو یہ ہی پرزہ ہے جو گاڑی کے نیچے گھس کر تمہاری مشکل حل کر دے گا، بغیر گاڑی کو جیک لگائے بھی یہ گاڑی کے نیچے جاسکتا ہے۔“ انہوں نے فخریہ انداز میں چھوٹے کی خوبیاں بیان کی تھیں اور عدیل بے ساختہ اس سے متاثر ہونے والے انداز میں مسکرایا تھا۔

”کیا اس کے علاوہ کوئی اور پرزہ بھی ہیں یا نہیں؟“ اس نے جان بوجھ کر پرزے پر زور دیا تھا اور باوقار نے اس کی شرارت پر مسکرا دیے تھے۔

”ہاں، یہ ہیں، پرزے ہوں گے تو دور کشاپ چلے گا؟ اوئے جیدی، سلو اوہر اوئے انچارج سے ملو، کل ہی دریافت ہوا ہے۔“ انہوں نے ایک بلند اور حیرت آواز سے کچھ دور گاڑی ٹھیک کرتے دوڑکوں کو قریب بلایا تھا۔

”جی، استاد ابھی آئے۔“ وہ فوراً ہاتھوں میں پکڑے اور اڑ ایک طرف ڈالتے ہوئے ان کا حکم بجالا دے تھے اور ہاتھوں اور کپڑوں کو ہٹا دتے ہوئے قریب آگئے۔

”السلام علیکم۔“ انہوں نے نئے چہرے کو کافی احترام سے سلام کیا تھا۔

”والسلام۔“ عدیل نے اٹھ کر دونوں سے ہاتھ ملایا۔

”یہ جیدی ہے اور یہ سلو ہے، سلو کو تم اگر پورے نام سے پکارنا چاہو تو سلمان خان بھی کہہ سکتے ہو، کیونکہ سلو کی داوی کو بہت شوق ہے کہ لوگ اسے سلمان خان کہہ کے پکاریں، دراصل اس کی داوی اپنی جوانی سے ہی سلمان خان کی بہت بڑی فین ہیں، یوں سمجھ لو دونوں ”ہانی“ (ہم عمر) ہی ہوں گے، یہ تو اس کی داوی نے شادی کر لی اور بڑھی نظر آنے لگی، ورنہ وہ بھی سلمان خان کی طرح بڑھاپے میں بھی جوان رہتیں، آخر پیکر لا کف بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔“ باوقار نے کی دلچسپ وضاحت اور سلو کے تعارف یہ باقی سب کی طرح وہ بھی ہنس دیا تھا۔ وہاں موجود جیدی، سلو اور چھوٹا بے تحاشا ہنس رہے تھے اور عدیل سب کے بے فکرے چہرے دیکھ کر دیکھتا تھا۔ بے شک وہ سب بھی کسی نہ کسی مجبوری اور ضرورت کے تحت ہی یہاں کام کر رہے تھے، لیکن پھر بھی چروں سے آزاد اور بے فکر لگ رہے تھے، شاید اس لیے کہ ان کے کندھوں پر ویسے بوجھ نہیں تھے، جسے عدیل نیازی کے کندھوں پر تھے، جن کی وجہ سے اس کے کندھے ہی نہیں بلکہ سر بھی ہمہ وقت جھکا رہا تھا، وہ کھل کے ہنس نہیں سکتا تھا، وہ کھل کے بول نہیں سکتا تھا، کیونکہ اس کے احساسات آزاد نہیں تھے، وہ سوچ کی مضبوط مٹھی میں جکڑے تھے، اس کے اعصاب یہ اس کے حالات کا پھر تھا، جن سے ہٹ کے وہ کچھ کر ہی نہیں سکتا تھا، اپنی کیفیت کا ظہار بھی نہیں۔

”جو دست!“ وہ ڈرنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا پر فوم اسپرے کر رہا تھا، جب کوئل دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی، جو دست اس کی آواز پر فوراً اس کی سمت پلٹا۔

”جی، آئی۔“

”کیا فرمی ہو اس وقت؟“ کوئل نے اس کی تیاری دیکھتے ہوئے فوراً ہی بھانپ لیا کہ وہ کہیں جانے کے چکر میں ہے۔

”آپ کے لیے فراغت نکالتے کون سا دیر لگتی ہے، جس حکم کو آپ۔“ وہ پر فوم کی شیشی پر کپ چڑھا کر واپس ڈرنگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے انتہائی سعادت مندی سے بولا۔ ”وہ انوشہ کو اسپتال چھوڑنا تھا۔“

”ہیں؟ یہ انوشہ نے اسپتال کب سے جوائن کر لیا؟“ وہ کافی غیر سنجیدہ لگ رہا تھا۔

”جو دست!“ کوئل نے سرزنش کرنے والے انداز سے کہا۔

”جی جان جو دست؟“ وہ اک اداسے بولا اور کوئل خفگی سے گھورنے لگی۔

”حالانکہ میں جانتا ہوں آپ میری نہیں کسی اور کی جان بننا چاہتی ہیں۔ اپنی دے ہماری جان کوئی اور بن جائے گی۔“ وہ مذمونی لہجے میں کہتا عین کوئل کے سامنے آکھڑا ہوا تھا اور اس کی بات پر کوئل کی نظر جھک گئی، مبادا کچھ عیاں نہ ہو جائے۔

”فکر نہ کریں میں آپ کے راز افشا نہیں کروں گا، ویسے جہاں آپ نے ہاتھ مارا ہے نا وہاں آپ کو کچھ بھی نہیں ملنے والا، جہاں لوگوں کے دل دھک دھک کرتے ہیں وہاں ان کا دل کام، کام اور صرف کام ہی کرتا رہتا ہے۔“ جو دست نے کوئل کو چھیڑتے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں میں کئی اشارے کر ڈالے تھے، وہ بڑے دنوں بعد نظر آئی تھی، اسی لیے اس زنج کرنے یہ تلا ہوا تھا، بلکہ وہ ایسا اکثر ہی کرتا تھا، اس کا مذاق اڑاتا تھا۔

”فکر نہ کریں میں آپ کے راز افشا نہیں کروں گا، ویسے جہاں آپ نے ہاتھ مارا ہے نا وہاں آپ کو کچھ بھی نہیں ملنے والا، جہاں لوگوں کے دل دھک دھک کرتے ہیں وہاں ان کا دل کام، کام اور صرف کام ہی کرتا رہتا ہے۔“ جو دست نے کوئل کو چھیڑتے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں میں کئی اشارے کر ڈالے تھے، وہ بڑے دنوں بعد نظر آئی تھی، اسی لیے اس زنج کرنے یہ تلا ہوا تھا، بلکہ وہ ایسا اکثر ہی کرتا تھا، اس کا مذاق اڑاتا تھا۔

”فضول مت بولا کرو، چلو نیچے انوشہ انتظار کر رہی ہے۔“ کومل اس کی باتوں کو نظر انداز کر گئی۔
”آپ کی محبت کا ذکر اگر فضول ہے تو ٹھیک ہے، نہیں کرتے۔“ وہ الٹی سیدھی ہانکنا کومل کے پیچھے ہی بند روم سے نکل آیا تھا۔

”کہاں جا رہے ہو۔“ سیڑھیاں اترتے ہوئے احمد نے پوچھا۔
”کومل آیا جہاں لے جائیں۔“ وہ کندھے اچکا کر شرارت سے بولا اور کومل نے آگے چلتے ہوئے ایک دم پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے اسے گھورا اور اتنے میں وہ بڑی طرح کسی سے ٹکرائی تھی۔ آذر اچانک ہی ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے سے باہر آیا تھا اور اندر داخل ہوئی کومل کو نہ دیکھ سکا۔ فکر اور خاصا شدید تھا۔ جودت اپنی پوٹھلاہٹ اور ہنسی چھپانے کے لیے رخ موڑ گیا تھا، جبکہ چکراتے دماغ کو سنبھالتی کومل آذر کو دیکھ کر مزید چکرائی تھی۔ احمد کے سامنے ایسا تضاد گھبراہٹ اور خفت کا باعث تھا اور خفت تو اسے آذر اور جودت سے بھی ہو رہی تھی۔
”آرہو آل رات؟“ آذر نے ذرا گھبراہٹ سے تصدیق چاہی، کیونکہ کومل اپنی پیشانی سسلارہی تھی اور وہ سرا ہاتھ اپنی ناک پر رکھا ہوا تھا، پیشانی سے بھی زیادہ چوٹ اس کی ناک پر لگی تھی۔
”جی میں ٹھیک ہوں۔“ اس نے فوراً ”سنبھلتے ہوئے“ کہا اور اتنی سخت چوٹ پہ آنکھوں میں آجانے والے پانی کو جلدی سے ہاتھ کی پشت سے رگڑ کر پونچھ دیا تھا۔
”ایم سو ری میں دیکھ نہیں پایا۔“ آذر نے معذرت کی، حالانکہ غلطی کومل کی تھی جو آگے بڑھتے ہوئے پیچھے کی طرف جودت کو دیکھ رہی تھی۔
”نہیں اور کے۔“ کومل بمشکل کہہ پائی، اسے اس وقت تین لوگوں کی نظروں کا مرکز بننے ہوئے کو فٹ اور بے زاری ہونے لگی تھی۔ اسی لیے وہ مزید وہاں رکے بغیر اندر چلی گئی تھی اور آذر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا تھا، لیکن کچھ خیال آجانے پہ اگلے ہی پل گھر بھی گیا تھا۔

”کیا پوچھ سکتا ہوں آپ جناب کہاں جا رہے ہیں؟“ اس نے احمد اور جودت کو بیک وقت مخاطب کیا۔
”میں تو اس وقت جم جا رہا ہوں، البتہ جودت کا کیا ارادہ ہے؟ کچھ کہہ نہیں سکتا۔“ احمد نے کندھے اچکا کر کہا۔
”جی آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ کہاں جا رہے ہیں؟“ آذر کا لہجہ طنزیہ ہو چکا تھا۔
”وہ میں انوشہ کو اسپتال ڈراپ کرنے جا رہا ہوں، وہ پچھو سے ملنا چاہتی ہے۔“ جودت نے شرافت سے جواب دیا۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے جانے کی، پچھو گھر آچکی ہیں۔“ آذر کہہ کر سیڑھیاں چڑھ گیا اور احمد کو ریڈور کی سمت مڑ گیا، جبکہ جودت وہیں سیڑھیوں کے پاس کھڑا رہ گیا تھا، لیکن پھر کچھ یاد آنے پہ قدم ڈرائنگ روم کی سمت بڑھا دیے۔ لیکن جو کچھ وہ دل میں ٹھان کے اندر داخل ہوا تھا وہ سب اسے فوری ہی ملتوی کرنا پڑ گیا تھا، کیونکہ وہاں ایک آدھ نہیں پورا ٹولا موجود تھا، حرمت، برکت، کومل، جویریہ اور انوشہ! انوشہ کو دیکھ کر اسے آذر کی بات یاد آگئی۔

”پچھو گھر آچکی ہیں شاید“ وانیال انہیں سیدھا انیکسی میں ہی لے گیا ہے۔“ جودت کی اطلاع پہ وہاں ایک دم ہلچل مچ گئی تھی اور سب سے پہلے صوفے سے چھلانگ لگا کر انوشہ والی انوشہ تھی۔ جلدی اور عجلت میں وہ اپنی چپل کی بجائے جویریہ کی چپل پاؤں میں پھنساتی وہاں سے بھاگ نکلی تھی۔ اپنی ماں کی آمد کی خبر سننے ہی پہ سب کچھ بھول بھال گئی تھی اور جودت وہیں کھڑا دیکھتا رہ گیا تھا۔

وہ بچھلے یا نچ دن سے مسلسل تھکن اور رت جکھے کا شکار تھا، اس کے ذہن پہ کوئی مینشن سوار تھی اور وہ اس

منشن کا اب کوئی حتمی حل نکالنا چاہتا تھا اور اس کے لیے جو فیصلے اور جو عزم وہ کر چکا تھا ان پہ ایک بار پھر غور کر رہا تھا اور اسی غور و فکر نے اس کی آنکھوں سے نیند کا تعلق ختم کر رکھا تھا۔ اسے پتا تھا کہ اسے پرسکون نیند اسی وقت آئے گی جب وہ کوئی حتمی فیصلہ کر لے گا اور آج کی رات فیصلے کی رات تھی اور اس نے اپنے آگے عمر کے ارادوں پہ آخری فیصلے کی سرگامی بھی۔

جس کے بعد وہ حقیقتاً ”تھوڑی دیر کے لیے ریلیکس ہو گیا تھا“ کیونکہ فیصلہ ہو چکا تھا، ایک مضبوط فیصلہ۔ وہ گہری سانس خارج کرتے ہوئے راکنگ چیئر سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور کھڑکی کی طرف بڑھتے ہوئے تمام پردے ہٹا دیے تھے، صبح کا سورج نمودار ہونے کے لیے انگڑائیاں لے رہا تھا اور تمام پردے اک نئی صبح آگ نئے تھے یہ اللہ کی حمد و ثنا کرتے اس کی ذات کا شکر ادا کر رہے تھے، زندگی چند گھنٹوں کے وقفے کے بعد پھر سے جاگ اٹھی تھی، نئی امیدیں، نئے عزم و تمنا میں لے کر صبح کی نرمائیں ہر چہرے سے عیاں تھیں، اس کی نظر کو آرٹرز کی سمت اٹھی۔

گل اپنے کو آرٹرز سے نکلتے ہوئے اپنا دوپٹہ درست کرتی گھر کی اندرونی سمت میں آرہی تھی جہاں سے اس کے دن بھر کے کاموں کا آغاز ہوتا تھا اور اس آغاز کے لیے وہ پہلا قدم کچن میں رکھتی تھی، کیونکہ وہ صبح صبح جاگنگ وغیرہ کا عادی تھا۔ اس لیے جاگنگ اور ایکسرسائز کے بعد اسے جوس کی فوری اور شدید طلب ہوتی تھی۔ لہذا گل پہلا کام جوس بنانے کا ہی کرتی تھی، لیکن پچھلے چار پانچ روز سے نہ تو وہ جاگنگ پہ گیا تھا اور نہ ہی ایکسرسائز کی تھی، اسی لیے گل کو اس سے یہ پوچھنا پڑا تھا۔

”صاحب آپ کے لیے چائے بناؤں یا جوس؟“ دروازے پہ دستک دے کر گل آج بھی یہی سوال لے کر آئی تھی۔

”چائے۔“ وہ آہستہ سے کتا کھڑکی سے جھٹ گیا تھا۔
”منو گلاب خان کہاں ہے؟“ اس نے باہر نکلتی گل سے پوچھا۔
”صاحب دو اپنی بیوی پہ ہے۔“ گلاب خان چوکیداری پہ مامور تھا۔
”بہن ٹھیک ہے، اسے کواخبار دے جائے۔“

”جی ٹھیک ہے، کہہ دیتی ہوں۔“ وہ سعادت مندی سے سر ہلا کر دروازہ بند کرنے لگی۔
”کھسو۔“

”جی صاحب؟“
”بانی کام تم بعد میں کرنا، پہلے گلاب خان سے کومل ڈوگ کو اس کی خوراک دے، میرا خیال ہے اس نے ابھی اسے دودھ نہیں پلایا۔“ اس نے پلٹ کر کھڑکی سے نیچے جھانکا اور اک نظر بل ڈوگ کو دیکھا، جس کی بے چینی بھوک کا اعلان کر رہی تھی۔

”جی ٹھیک ہے۔“ گل کہہ کر چلی گئی اور وہ پلٹ کر واش روم میں آگیا۔
آج کوڈ میں اس کے ایک کیس کی آخری سماعت تھی، کیس اہم تھا اس لیے جانا ضروری تھا۔ شاور لے کر وہ کافی حد تک فریش ہو چکا تھا۔ وہ تیار ہو رہا تھا جب اس کا سیل بجنا۔
”اسلام علیکم۔“ کال ریسیو کرتے ہی اس نے کہا۔ دوسری طرف لاء جیمبر سے اس کے منشی قادر کا فون تھا۔ وہ اس کے آگے نہ آنے کے متعلق پوچھ رہا تھا۔

”آ رہا ہوں میں، تم کیس کی غلطی تیار رکھو۔“ اس نے مختصر کرتے ہوئے فون بند کر دیا تھا۔
”صاحب چائے اور اخبار۔“ گل نظر جھکائے ہوئے اندر داخل ہوئی، یہ کی شرم و حیا کا سب سے برا ثبوت

تھا وہ تھی ہی ایسی نیک اور شریف ایک ملازمہ ہونے کے باوجود دل اور شاہ اس کی بہت عزت کرتا تھا اور اس چیز یہ گلاب خان کو بھی اعتبار تھا، جسے تو اپنی جوان چہان خوب صورت بیوی کو گھر کے اندر کام کرنے کی اجازت دے رکھی تھی، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کا مالک سخت تنگنا اور غصیلالو ہے، مگر نظر باز نہیں۔

”کرکھ جاؤ اور آج ناشتا مت بنانا، مجھے ذرا جلدی نکلتا ہے۔“ وہ چائے کی ٹرے میز پر رکھنے کا اشارہ کر کے خود اپنے شوز نکال کر پہنے لگا۔

”جیسے آپ کی مرضی۔“ وہ ہنسی سے کہہ کر چلی گئی اور وہ شوز پہننے کے بعد چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے اخبار بھی سامنے پھیلا دیا تھا۔ وہی روزمرہ کی سیاست، کرائم اور شوز کی سنسنی خیز خبریں تھیں جو ہر روز تھوڑی بہت تبدیلی کے بعد اخبار کی زینت بنادی جاتی تھیں اور اخبار پڑھنے کے شوقین لفظوں اور جملوں کے اس ہیر پھیر سے ہی خوش ہو کر چٹکارے لیتے رہتے تھے اور اگلے روز وہی اخبار روی میں جا کر سمو سے پکڑے، برگر اور نان وغیرہ لیٹنے کے کام آجاتا تھا، گویا اخبار کا اتنا ہی کام تھا، مزہ بھی لے لیا اور کام بھی چلا لیا۔

وہ گھر سے نکل رہا تھا جب بتول شاہ کا فون آگیا، جن دنوں وہ لاہور میں ہوتا تھا وہ روزانہ صبح کے وقت اسے کال کرتی تھیں، دل اور شاہ کے لیے ان کی کال بھی روٹیں کا حصہ تھی جو کبھی مس نہیں ہوتی تھی۔

”جی میں کورٹ کے لیے نکل رہا ہوں دعا کیجیے گا۔“

”ان شاء اللہ فتح پاؤ گے، اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔“ انہوں نے دل سے دعا دی، وہ ان کا فون سنتے ہوئے گاڑی کا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال چکا تھا اور گلاب خان نے گاڑی اسٹارٹ ہوتے دیکھ کر گیسٹ کھول دیا۔

”آپ گھر پہن یا کالج میں؟“ اس نے بتول شاہ سے استفسار کیا تھا۔

”میں ابھی تو ناشتا کرنے لگی ہوں اندھ جس پر ہے کہ میں کالج تھوڑا لیٹ جاتی ہوں۔“ بتول شاہ نے اسے یاد دلایا۔

”آگھر جب میں اسلام آباد میں ہوتا ہوں تب تو آپ کافی جلدی چلی جاتی ہیں؟“ اس کی حیرت اور اعتراض پہ بتول شاہ بے ساختہ مسکرا اٹھے۔

”پاکل میں جلدی نہیں جاتی، بلکہ تم لیٹ اٹھتے ہو اور جب تم اٹھتے ہو اس وقت میرے جانے کا نام ہو چکا ہوتا ہے، اس لیے تمہیں لگتا ہے کہ میں جلدی جا رہی ہوں۔“ ان کے جواب پہ وہ ٹھٹک سا گیا تھا اور ان کی وضاحت سمجھ میں آتے ہی مسکرا دیا وہ غلطی پہ تھا۔

”سوری۔“

”سوری کس لیے؟ آئندہ میں اس چیز کا خیال رکھوں گی، جب تم یہاں ہو گے تو اوپر زیادہ لیٹ جایا کروں گی، تاکہ میرے بیٹے کو شکوہ نہ ہو۔“ وہ ان کی اتنی چاہ، اتنی ممتا، یک دم چپ ہو گیا تھا۔

رشتوں کے نام پہ ان کے پاس اور تھا ہی کون، سوائے دل اور شاہ کے؟ اور اس بھری دنیا میں دل اور شاہ کا بھی اور کوئی اپنا نہیں تھا سوائے ان کے۔ ان دونوں کے اپنے اور سنگے رشتے بس اک دوسرے پہ ہی حتم ہوتے تھے، کوئی اپنا کوئی تیسرا نہیں تھا، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ تیسرا تھا تو سہی، مگر کوئی اسے نکل گیا تھا۔ وہ کوئی ”کون“ تھا؟ یہ سوچ کر ہی اس کے ذہن و دل چلتے تندور میں جا کرے تھے، اس کے ہاتھوں کی گرفت اسٹیرنگ پہ سخت ہو گئی تھی، یہاں تک کہ اس کے ہاتھوں کی رگیں ابھر آئی تھیں۔ لب بچھ کر اس طرح دانت پہ دانت، تھالیے تھے کہ چیز ٹوٹ جانے کا خدشہ ہو چکا تھا، غصے کے باعث آنکھوں میں سرخ ڈورے تیرنے لگے تھے، یوں جیسے خون آنکھوں میں جم گیا ہو۔ بات کرتے کرتے اچانک اس کی خاموشی اور خاموشی کے بعد اس کی موجودہ کیفیت قبول شاہ نے آنکھوں سے اوٹھ کر بھی جان لی تھی۔

وہ کسی اہم کیس کے لیے جا رہا تھا اس لیے وہ اسے ہواوے کر مزید شعلہ نہیں بنانا چاہتی تھیں، جیسی زبان پہ آیا ذکر بھی پوچھ پلٹ دیا تھا اور ساتھ ہی اسے ریلیکس کرنے کے لیے کسی اور کا ذکر پھیر دیا۔ جس کا ذکر اس کے بعد آتا تھا یعنی ہاں اور پھر بس! پہلے تول شاہ پھر مدیحہ حیات۔

”مدیحہ سے بات ہوئی تمہاری؟ کیسی ہے وہ؟“ اس ٹھنڈے ٹھنڈے رشتے کے ذکر سے ہلانے اور دھیان بٹانے کی کوشش کی گئی تھی۔ لیکن چوٹ گہری اور درد شدید ہو تو بھٹنا آسان نہیں ہوتا۔ دل اور شاہ کا زخم تازہ نہیں تھا۔ مگر جب جب کھرنڈ اترتا تھا باسی زخم تازہ زخم کو بھی بات دے جاتا تھا۔ ٹیسس ناقابل برداشت ہو جاتی تھیں اور ایسے عالم میں وہ اکثر پاگل ہو جاتا تھا اور اپنے اس پاگل پن کے ہاتھوں شاید وہ دوسروں کو بھی پاگل کر ڈالتا، اپنے جنون کی بھینٹ چڑھا دیتا اگر اسے سنبھالنے والی تول شاہ نہ ہوتی تو وہ اس کی سب حالتوں اور سب کیفیتوں سے واقف تھیں، اسی لیے چاہے مشکل سے ہی سہی مگر اسے ہنڈل فز کر لیتی تھیں۔

”میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں شاہ؟“ موڈ لاڈیلا کا ہوتا تو وہ اسے شاہ پکارتی تھیں۔

”ہوں؟ کیا کہا آپ نے؟“ وہ اپنے جنون کو ٹھہراتے ہوئے بولا۔

”مدیحہ کا پوچھ رہی ہوں۔“ انہوں نے اپنی بات پہ زور دیا۔

”دوست ہاں پاکستان آرہے ہیں وہ لوگ۔“ دھیان کی طنائیں ان کی بات کی طرف موڑتے ہوئے وقت ہو رہی تھی اسے۔

”ہیں؟ کب؟ تم نے پہلے تو نہیں بتایا۔“ تول شاہ کو سن کر خوشی ہوئی تھی، کیونکہ ایک نیل کی ہی توفیلی تھی جن کے ساتھ وہ خوش ہوتا تھا اور جن کے ذکر پہ اس کے چہرے پہ حقیقی خوشی دیکھنے کو ملتی تھی۔

”ان کا پروگرام کبھی بن رہا تھا، کبھی کینسل ہو رہا تھا، اس لیے نہیں بتایا۔ کب آرہے ہیں؟ کنفرم تو نہیں ہے، لیکن نیل کی کوشش ہے کہ اس مہینے کے لاسٹ فرائیڈے تک آجائے۔“

”ہوں نہ کون کون آرہا ہے؟“ تول شاہ اپنے سوالات کا سلسلہ بڑھا رہی تھیں۔

”نیل مدیحہ اور فائزہ آئیں۔“

”اور بھائی صاحب؟“ ان کا سوال دل اور کو بھی خاموش کر گیا۔ اور اس کی خاموشی سے وہ ممکنہ جواب اخذ کر چکی تھیں۔

”کہاں ہوتے ہیں آج کل؟“ ان ہی کے متعلق دو سوالات۔

”دینڈا۔“ اس کا لہجہ سرد تھا۔

”کہاں آئیں پتا ہے کہ نیل لوگ کیا کتنا شدت کر رہے ہیں؟“

”آئی ڈونٹ نو، میں نے پوچھا ہی نہیں۔“ اس نے سر جھٹکا۔

”چلو اللہ انہیں خیریت سے لے کر آئے۔“ وہ صدق دل سے بولیں۔

”آمین۔“ وہ جواباً آہستگی سے بولا۔

”ٹھیک ہے اماں، میں فون بند کرتا ہوں، میں اس وقت جیمبر پہنچ چکا ہوں۔“ اس نے گاڑی پارک کرتے ہوئے بتول شاہ سے الوداعی کلمات کہے اور فون بند کر کے ہینڈ فری بولڈس بورڈ پہ ڈال دیا تھا۔

فائزہ بیگم دروازے پہ دستک دے کر اندر چلی آئی تھیں، ان کی نظروں کا مرکز زری تھی۔
”زری بھی آئی ہے؟“ انداز میں شوق اور یار تھا اور لہجے میں ہلاکی زری تھی، وہی زری جس سے مدیحہ کو چڑا اور

کوفت ہوتی تھی، بلکہ اب تو غصہ بھی آجاتا تھا۔

”اسلام علیکم آئی، آپ اٹھ گئیں؟ میں نے آپ کا پتا کیا تھا، آپ سو رہی تھیں۔“ مقابل ہستی کے انداز و اطوار کی نرمیاں بھی کچھ کم نہیں تھیں، وہ بھی آخر زرین ملک تھی، جس کو اس کے گھر والے ”موسم کی گڑیا“ اور ”مٹی کا مادھو“ بھی کہتے تھے۔ ہر ایک کے لیے اچھی ہر ایک کے لیے پیاری سب کے لیے اپنے دل میں نرمی اور چاہ کا جذبہ رکھتی تھی، کوئی کچھ بھی کہہ دیتا برا نہیں مناتی تھی اور اگر مناتی تھی تو ظاہر نہیں کرتی تھی، ہمہ وقت سکون اور ٹھہراؤ کا لبادہ اوڑھے نہ جانے کیسے جی لیتی تھی؟ مدیحہ سوچتی تو وحشت سے بدک جاتی تھی کہ سب کچھ دل میں رکھ کے نہیں جیا جاسکتا۔ اور یہ کام مشکل ہی نہیں ناممکن بھی تھا۔

کسی اور کے لیے نہیں صرف مدیحہ حیات کے لیے جو اپنی باتیں اپنے فیصلے اپنے ارادے یا ٹکدیل کہہ دیتی تھی، جس نے چپ رہ کے اور بات دل میں رکھ کے جینا نہیں سیکھا تھا، جو ہر بات ڈسٹکے کی چوٹ پہ کہہ دیتی تھی، بات منہ پہ کہہ دیتا اس کی عادت تھی اور ایسا کرتے ہوئے وہ سامنے والے کا نہ کوئی ڈر رکھتی تھی، نہ لحاظ دوسرے لفظوں میں اس چیز کو بے مروتی بھی کہا جاسکتا تھا اور اس بات کا تو وہ خود بھی اعتراف کرتی تھی کہ۔

”سوری میں مروت نہیں بھاسکتی۔“ اور یہ اعتراف کرتے ہوئے وہ خاصی لا پرواہ اور بے نیاز ہوتی تھی، لیکن اس کے برعکس زرین ملک ایسا بھی نہیں کر سکتی تھی، وہ شفاف خاموش اور سبک بندی کی مانند لڑکی مدیحہ جیسی ضدی ہنس و ہرم اور جنگجو لڑکی کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔

دونوں تصویر کے دور رخ تھے اور دونوں کو اپنے علاوہ دوسرا رخ پسند نہیں تھا، لیکن اس کے باوجود دونوں اک دوسرے سے بے حد قریب تھیں، مزاج کے تضادات کے باوجود دونوں کی فریڈ شپ قائم و دائم تھی، لیکن ایک بات بڑی عجیب تھی، دونوں ہی اک دوسرے کے دل کے حال سے انجان اور ناواقف تھیں۔ البتہ یہ بات اور بھی

کہ مدیحہ کے قول کا کوئی ”خال“ سرے سے تھا ہی نہیں، وہ دل اور دل کے حال سے فی الحال دور تھی نہ اور جو حال زری کے دل کا تھا وہ اس نے مدیحہ سے دانستہ بھیاں کھا تھا۔ صرف اس ڈر سے کہ اپنی عادت اور فطرت سے مجبور مدیحہ کبھی بھی اس کا راز راز نہیں رکھے گی، بلکہ کسی نیوز کی طرح خبر نشر کرتی پھیرے گی اور زری فی الحال اپنے آپ کو نشر کرانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھی، جیسی مدیحہ کی نگاہ سے بچ کے رہتی تھی، اسے محسوس نہیں ہونے دیتی کہ میرے دل کی دھڑکنیں صرف دھڑکنیں نہیں رہیں، بلکہ کسی کے نام کا راگ بھی لاپے لگی ہیں، جہاں اس کے نام کی بڑور چھوٹتی ہے وہیں پہ ایک دھڑکن بھی چھوٹ جاتی ہے۔

”مجھے نیل نے بتایا ہے کہ زری آئی ہے، خود تو کہیں باہر چلا گیا ہے، میں نے سوچا ناشتا بعد میں بتاتی ہوں پہلے تم سے مل آؤں، تم بتاؤ کہاں تھیں اتنے دنوں سے؟“ میں انتظار ہی کرتی رہی کہ تم آؤ گی، عبد اللہ کے ساتھ، لیکن وہ کئی بار آیا، کئی بار گیا، مگر اکیلا۔“ انہوں نے افسوس اور محبت سے شکوہ کیا۔

”بس میرے فائنل ایکزامز ہو رہے تھے اس لیے بڑی تھی۔“ زری ان کے محبت بھرے شکوے پہ مسکرائی، اور مسکرائی تو مدیحہ بھی تھی، مگر مسخرانہ جیسے کہہ رہی ہو۔

”واہ زری مروت۔“ کسی کی یاد چاہے آئے، چاہے لے، لیکن جب وہ ملے تو مروتا کہہ دو، ”جناب میں آپ کو ہی یاد کر رہا تھا، بڑی لمبی عمر ہے آپ کی۔“ سامنے والا بے ساختہ خوش ہو جائے گا۔ یعنی مروت بھی گئی، ٹھیک ٹھاک طریقے سے، یہی حال اس وقت بھی تھا زری اور فائزہ بیگم کے، مدیحہ مسکرائی نہ تو اور کیا کرتی؟

”نگارش کہاں ہے تم اسے بھی ساتھ لے آئیں؟“

”بھابھی کی طبیعت تھوڑی خراب تھی، وہ ریسٹ کرنا چاہتی تھیں، اس لیے نہیں آئیں۔“

”کیوں خیریت کیا ہوا اسے؟“ وہ متفکر ہوئیں۔
 ”ہاں وہ سردی کی وجہ سے ان کی کمر میں درد ہو جاتا ہے، پہلے بھی کئی بار ہو چکا ہے، لیکن وہ کوڑا مول لے کر کچھ دیر لیٹ جائیں تو ٹھیک بھی جلدی ہو جاتی ہیں۔“ زری نے وضاحت دی۔
 ”لیکن بیٹا تمہیں میرا کتنا تو برا لگے گا، مگر میں پھر بھی کہہ رہی ہوں کہ تمہیں اس کے پاس رہنا چاہیے تھا۔“
 ان کی دلی دلی سی سرزنش پر زری مسکرا کر سر اثبات میں ہلانے لگی۔
 ”نہ شک آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں، لیکن آنٹی مجھے یہاں بھا بھیجے، خود بھیجنا ہے، حالانکہ میں نے آنے سے انکار بھی کیا تھا، لیکن وہ کہہ رہی تھیں کہ میں اتنے دنوں سے مدیہ سے اور آپ سے نہیں ملی، اس لیے میرا جانا ضروری ہے، کیونکہ چند ہی دنوں میں آپ یہ ملک چھوڑ کے پاکستان جاری ہیں، بعد میں بتائیں کب ملاقات ہو، اس لیے آج کے دن سے فائدہ اٹھالیا جائے۔“ اس نے کہتے ہوئے گردن ترچھی کر کے مدیہ کو دیکھا جو پاکستان کے ذکر پر ہلکا ہلکا کر رہی تھی اور اس کی اس حرکت پر فائزہ بیگم نے بھی ایک نظر اسے دیکھا تھا، پھر اس کا انکار اور رات والی حرکت یاد آگئی تھی اور پھر ان سے مزید اس کے بیڈ روم میں ٹھہرنا مشکل ہو گیا تھا، وہ نہ جانے زری سے کیا کہہ کر فوراً ہی واپس آگئی تھیں۔

”لب کیا سوچ رہی ہو؟“ مدیہ کو لب بھینچے خاموش بیٹھے دیکھ کر زری قریب آگئی، جبکہ مدیہ اک جھٹکے سے اٹھی اور اپنی وارڈروپ تک چلی گئی۔ وارڈروپ کا چوتھے نمبر والا بٹ کھول کے بلیک لیدر کا بیوٹی بکس نکال کر تین ہندسوں کا پاس ورڈ ڈائل کیا اور کلک کے ساتھ بیوٹی بکس کا لاک اوپن ہو گیا۔ اس نے اپنے کالج یونیورسٹی کے ڈاکو منٹس بینک کے کاغذات اور کریڈٹ کارڈز کے ساتھ ساتھ اپنا پاسپورٹ بھی اسی میں سنبھال رکھا تھا، کوئی بھی ایمر جنسی پڑنے کی صورت میں وہ اپنا یہ بیوٹی بکس اٹھا کر کبھی بھی جاسکتی تھی، باقی لوگوں کی طرح اپنے ضروری کاغذات اور اشیاء ڈھونڈنے کی کوفت میں اٹھانا پڑتی تھی۔ اس نے بیوٹی بکس کی اندرونی پاکٹ کی زپ کھول کر اپنا پاسپورٹ نکالا اور خود پر بڑا ضبط کرتی ہوئی پلٹ کر زری تک آئی تھی۔
 ”یہ تو نیل بھائی کو دے دینا۔“ اس نے جیسے اپنے پرکٹ کے زری کے ہاتھوں میں تھما دیے تھے، زری اس کا پاسپورٹ دیکھ کر اندر سے خوش ہوئی کہ چلو ان لوگوں کا تو مسئلہ حل ہوا نا۔ لیکن مدیہ کا انداز اور اس کے تاثرات دیکھ کر اسے برا بھی لگا تھا۔

”تم تو ایسے دے رہی ہو جیسے احسان عظیم کر رہی ہو؟“
 ”ہاں احسان عظیم ہی ہے، اگر یہ لوگ مجبور نہ کرتے تو میں یہ احسان بھی کبھی نہ کرتی۔“ وہ تلخی اور سختی کا رنگ لیے ہوئے تھی۔

”ان لوگوں نے تمہیں کب مجبور کیا؟ تم تو۔۔۔“ زری کچھ کہتے کہتے رک گئی۔
 ”ہاں میں دل اور بھائی کے کہنے پر مجبور ہوئی ہوں، لیکن تم یہ بتاؤ ان کو یہ بات کہنے کے لیے کسی نے کہا؟ کس نے مجبور کیا؟ صرف اور صرف میرے گھر والوں نے! ان کو کوئی الہام تو نہیں ہوا تھا نا؟ بس خوش قسمتی ہے ان کی کہ سچ میں دل اور بھائی آگئے۔ لیکن۔۔۔ لیکن زری یہ مجھے کبھی سدھار نہیں سکتے۔ میں پاکستان تو چلی جاؤں گی، لیکن یہ لوگ چھتا میں گئے، مجھے وہاں لے جا کر بھی چھتا میں گئے۔ مدیہ مدیہ ہی رہے گی، چاہے پاکستان میں رہے، چاہے انگلستان میں۔“ وہ اپنے غصے اور نفرت کا اظہار کرتے ہوئے پھنکاری بھی اور زری حقیقتاً اس کے ارادوں سے خائف ہو گئی تھی۔

”مدیہ پلین یہ کیا پاگل بن ہے؟ کیوں بس بوقوف بن رہی ہو؟“ زری نے اسے باز رکھنا چاہا۔
 ”یہ تو وقت آنے پر پتا چلے گا کہ کون یا گل ہے؟ میں یا پھر یہ لوگ۔“ اس کے عزائم ٹیک نہیں تھے، زری چپ

ہو کے رہ گئی، اسے بھلا کتنا بھاتی؟ اور اگر سمجھاتی بھی تو وہ کون سا سمجھنے والی تھی؟ تھوڑی دیر اور اس کے پاس بیٹھنے کے بعد زری جانے کے لیے کھڑی ہو گئی۔
 ”کس کے ہاتھ جاوگی؟“ مدیہ کو بتا تھا کہ عبد اللہ شہر میں نہیں ہے، اس لیے اسے پک کرنے نہیں آئے گا۔
 ”تمہارے ساتھ۔“ زری نیل کے ساتھ جانے کا سوچ کر جھجک گئی تھی، اسی لیے فوراً اپنی ذمہ داری مدیہ پر ڈال دی۔

”یعنی میرا ہی سر اور میرے ہی جوتے، مجھ سے ملنے آئی ہو اور اب میں ہی چھوڑ کر آؤں؟“ مدیہ معنوی حلقے سے کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور زری مسکراتے ہوئے اس کے بیڈ روم سے باہر آگئی۔ دونوں آگے پیچھے سیرھیان اترتی نیچے آئیں، سامنے ہی نیل اور فائزہ بیگم دونوں مل کر کوئی چیز خاکی رنگ کے کارٹن میں بند کر کے اوپر سے پینکٹ ٹیپ لگا کر اسے مزید مضبوط پینکٹ کی شکل دے رہے تھے، پچھلے دو روز سے وہ اپنی ضروری چیزیں اور سامان سمیٹنے میں لگے ہوئے تھے۔

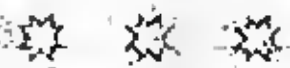
”ارے تم جا بھی رہی ہو؟ اتنی جلدی، بیٹھو تو سہی۔“ فائزہ بیگم سب چھوڑ چھاڑ کے قریب آ گئیں۔
 ”آنٹی تین چار گھنٹے تو گزار لیے، اب اور کتنا بیٹھوں گی؟“

”لیکن بیٹا۔“ وہ اسے زیادہ اصرار اور مجبور کرنے سے رک گئیں، ان کی نظر زری کے ہاتھوں میں پکڑے پاسپورٹ پر ٹھہر گئی تھی اور ان کی آنکھوں میں بے یقینی پھیل گئی، یہ پاسپورٹ یقیناً مدیہ کا تھا۔ یہ تو رنگ کا پاسپورٹ برٹش ہونے کا ثبوت تھا اور اس ثبوت کو وہ پچھلے کئی دنوں سے التجاؤں سے مانگ رہے تھے۔ لیکن اس نے نہیں دیا تھا اور آج؟ حیرت کا مقام تھا۔ وہ مان گئی تھی؟

”یہ مدیہ کا پاسپورٹ ہے، آپ اس کی ٹکٹ کنفرم کروا سکتے ہیں۔“ مدیہ کے کہنے پر زری نے پاسپورٹ نیل کی سمت ہی بڑھایا تھا اور نیل نے اس کے ہاتھ سے پاسپورٹ لیتے ہوئے بے ساختہ مدیہ کی طرف دیکھا، وہ نظر پھیر گئی تھی۔ اسے یہ احساس ہی نہیں تھا کہ زری کے ہاتھ سے اس کا پاسپورٹ لیتے ہوئے نیل کو کتنی سیکی اور ہلک کا احساس ہوا تھا۔

گو کیا اسے اپنی بہن پر ہی اختیار نہیں تھا، وہ دوسروں سے سفارشیں کروا تا پھر رہا تھا اور وہ سب کی بات ماننے کو تیار بھی سوائے ان کی۔ فائزہ بیگم اور نیل چپ کے چپ رہ گئے، نیل کو پتا تھا کہ اس نے کس کے کہنے پر پاسپورٹ دیا ہے؟

”چلو زری مجھے دیر ہو رہی ہے، میں نے اپنے فریڈز سے بھی ملنے جانا ہے۔“ مدیہ اسے متوجہ کرتی خود بیرونی دروازے کی سمت بڑھ گئی، مجبوراً زری کو ان دونوں ماں بیٹا سے نظر حرا کر اجازت لینا پڑی اور اس کے پیچھے باہر نکل آئی تھی، مدیہ اپنی جینز سے گاڑی کی چابی نکال کر لاک کھول رہی تھی، زری خاموشی سے آکر گاڑی میں بیٹھ گئی۔



وہ کالج سے واپسی پر سب سے پہلے شاور لیتی تھی اور پھر لچ کرتی تھی۔ جتنی دیر میں وہ شاور لیتی، اتنی دیر میں اس کی خاص ملازمہ رجوا اس کا کھانا نکال کر گرم کرتی اور تازہ روٹی پکا کر دیتی تھی، البتہ یہ اور بات تھی کہ روٹی وہ بہت کم کھاتی تھی، اس کی زیادہ دلچسپی چائیز اور راکس وغیرہ میں ہوتی تھی، ویکی نیل بھی شوق سے کھاتی تھی اور اس کی پسند کے کھانے پکانے کے لیے اس کی ملازمہ رجو مخصوص تھی، صبح سے لے کر شام تک علیینے کا کوئی بھی کام ہوتا وہ رجو نے ہی نبھانا ہوتا تھا، صبح سویرے فریش جوس سے لے کر رات سونے سے پہلے دودھ کا گلاس دینے کی

وہمہ داری بھی رجوئی بھی علیزے اپنی ملازمہ کو بھی بنا سوار کے رخصتی تھی اس کے پیرے جوئے اور دیگر اشیاء اسے خود منگوا کر دیتی تھی وہ اپنی ملازمہ کو گندے مندرے حلیے میں برداشت نہیں کر سکتی تھی لہذا باقی تمام ملازمین میں سب سے زیادہ فریش اور تازہ دم رہنے والی ملازمہ صرف رجوئی تھی۔

بڑی حویلی میں مبارک خان کے بعد قابل ذکر اور اہم مقام رجو کا ہی تھا شاید اس لیے کہ مبارک خان وقار آئندی کا خاص ملازم تھا اور رجو علیزے آئندی کی خاص ملازمہ کہلاتی تھی دونوں باب بھی کے ٹھانڈے ہی نہ تھے کافی شاہانہ طرز زندگی تھا باقی سب سے ہٹ کے وہ شاد رہے کرتی تو لہجہ تیار تھا پانچ دس منٹ میں ہی وہ لہجے سے فارغ ہو کر اپنے بیدروم میں سونے کے لیے آگئی۔ اسے سوئے ہوئے نہ جانے کتنی دیر گزری تھی کہ اچانک کسی نے زوردار دھکم دھالی وہ ہڑپا کے اٹھی اور تنگ پائوں لپک کر دروازے تک آئی اور دروازہ کھول دیا۔

”عون؟“ اس نے اپنے اعصاب کنٹرول کرتے ہوئے آنکھیں پوری طرح سے کھول کر حیرت سے عون کو دیکھا وہاں کے ساتھ ساتھ نیند کی وجہ سے آنکھیں بھی بو جھل ہو رہی تھیں۔ اسے اس وقت عون کی موجودگی کی توقع ہرگز نہیں تھی۔

”علیزے آئی وہ ڈیڈ آپ کو بلا رہے ہیں باہر لان میں بیٹھے ہیں۔“ عون نے پیغام دیا۔
”مجھے بلا رہے ہیں؟ اس وقت؟ خیریت؟“ علیزے نے ”اس وقت“ پہ ایسے زور دیا جیسے اس وقت آدمی رات کا وقت ہو۔

”کیوں اس وقت نہیں بلا سکتے؟“ عون کو حیرت ہوئی اور اس کی حیرت پہ علیزے تجھوڑا سا ٹھٹک گئی اس نے گردن موڑ کر اپنے بید کی سامنے والی دیوار کے ساتھ نصب وال کلاگ کو دیکھا جہاں اس وقت شام کے چھ بج رہے تھے علیزے اپنا سر تھام کے رہ گئی۔ یعنی وہ اتنی گہری نیند سوئی تھی کہ اسے دن رات یا پھر صبح شام کا فرق بھول گیا تھا اور وہ سراپہ کہ اس کے بیدروم کی دیوار میں بھی ساؤنڈ پروف تھیں باہر اندر کیا ہو رہا ہے کچھ پتا نہیں چلتا تھا پورے برابر ہوتے تو دن میں بھی رات اند آتی تھی۔

”علیزے آئی ہوش میں تو ہیں آپ؟“ عون نے اس کا بازو پکڑ کر بلایا۔
”ہاں ٹھیک ہوں تم چلو میں آتی ہوں۔“ وہ اپنے ہاتھوں سے بال پیچھے ہٹاتی پلٹ کر واپس آگئی عون کندھے اچکا کر چلا گیا تھا وہ دواش روم سے تو لے کر چہرہ پوچھتی ہوئی باہر نکلی۔
”باؤ۔“ ایک دم اس کے عقب سے ہاؤ کی آواز ابھری علیزے ڈر کے یکدم پیچھے ہٹی۔
”اے۔“

”اے! آپ ڈر گئیں؟“ وہ ہنس رہا تھا بے تحاشا اور علیزے تلملا کے رہ گئی۔
”عزیز یہ کیا بد تمیزی ہے؟ واٹ نان سیمپل۔“ وہ اپنا غصہ کنٹرول نہیں کر پاری تھی حالانکہ وہ بلا وجہ غصہ کرنے والی اور چیخنے چلانے والی لڑکی نہیں تھی لیکن اس وقت اسے حقیقتاً غصہ آیا ہوا تھا۔ پہلے عون کے دروازہ دھڑھڑانے کی حرکت اور اب یہ عذیبہ وہ ایک ہی وقت میں دوبار دہل چکی تھی۔
”یہ بد تمیزی نہیں ہے یہ تو کسی کو ڈرانے کا ایک انداز ہے علیزے آئی۔“ اس نے جیسے اپنی ”علیزے آئی“ کی کم عقلی پر افسوس کیا۔

”ٹھٹ آپ۔“ جسٹ ٹھٹ آپ ایک تو بد تمیزی اور بے ہودگی کرتے ہو اور پھر مسخرے بنتے ہو؟“ علیزے نے عذیبہ کو اچھا خاصا جھڑک دیا تھا۔

”علیزے یہ کون سا طریقہ ہے بات کرنے کا؟“ آسیہ آئندی بیٹی کے تیور دیکھ کر حیران ہو گئیں۔
”مما آپ نہیں جانتیں یہ دونوں حد سے زیادہ بد تمیز ہو چکے ہیں اس پاس کچھ بھی نہیں دیکھتے اور مذاق کرنے

کھڑے ہو جاتے ہیں۔“ علیزے سچ مچ تپ گئی تھی۔

”عزیز کیا کیا ہے تم نے؟“ آسیہ آئندی عذیبہ کی سمت پلٹیں علیزے کو اپنے دونوں بھائی بہت عزیز تھے دونوں جڑواں تھے دونوں کی عمر چودہ سال تھی کافی ذہین اور لائق تھے لیکن دونوں ہی حد درجہ شرارتی تھے اپنی شرارتوں سے وہ ہمہ وقت کسی نہ کسی کو ستائے رکھتے تھے بڑی حویلی میں بہت سالوں بعد ان کے دم سے رونق چائی تھی ابھی ان کی شرارتوں اور چھیڑ خانی کو انجوائے کرتے تھے لیکن اگر کبھی وہ اوپر ہو جاتے تو ہلکی پھلکی ڈانٹ بھی کھالیتے تھے اور اکثر اوقات یہ ڈانٹ انہیں علیزے سے ہی کھانے کو ملتی تھی کیونکہ سب سے زیادہ تنگ وہ اسی کو کرتے تھے وہ درگزر بھی کرتی تھی مگر کبھی کبھی تو پھر یہ بھی ضروری ہو جاتا تھا۔

”سوری بولو آئی کو۔“ آسیہ آئندی نے خفگی سے کہا عذیبہ کا چہرہ اتر ا ہوا تھا۔
”سوری!“ وہ کہہ کے فوراً کمرے سے باہر نکلی گیا اور علیزے اس کی سوری پہ چونک کر سیدھی ہوئی تب تک وہ جاچکا تھا۔

”مما۔“ وہ خفگی سے تالیف پتھر کر جھنجھلائی۔
”اس اوکے ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ کہتے ہوئے واپس چلی گئیں علیزے بال سنوار کر برے برے منہ ہٹاتی آف موڈ کے ساتھ نیچے آگئی۔ اس کا رخ لان کی طرف تھا۔
”کہاں کے ارادے ہیں؟ گزرتے گزرتے حرمت نے پوچھ لیا۔
”باہر لان میں۔“
”کوئی خاص وجہ؟“

”نپانے بلایا ہے۔“ وہ وضاحت دے کر آگے بڑھ آئی۔
ہمیشہ کی طرح وقار آئندی لان کی وسط میں جیسے زڈالے آڈر اور اسرار آئندی کے ساتھ بیٹھ باتیں کر رہے تھے۔
”السلام علیکم۔“ اس نے قریب آکر آہستگی سے سلام کیا۔

”والسلام“ او بیٹھو بیٹا، کیسی ہو؟“ وقار آئندی سے بھی زیادہ محبت اور گرجوشتی اسرار آئندی کے لہجے میں سنائی ہوئی تھی۔ علیزے مسکرائے کی محض کوشش کرتے ہوئے وقار آئندی کے بائیں طرف رکھی چوٹھی کرسی پہ بیٹھ گئی۔

”عون نے ڈسٹرب تو نہیں کیا تمہیں بلا کر؟“ وقار آئندی اک نظر میں اس کے چہرے کے تاثرات نوٹ کر چکے تھے اس کا موڈ آف لگ رہا تھا۔
”نہیں۔“ اس نے نفی میں گردن ہلای۔

”طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ وقار آئندی کا رواں رواں متفکر ہوا تھا۔
”جی ٹھیک ہوں۔“ اس کے نیچے تلے مختصر سے جوابات یہ آڈر نے بھی ٹھٹک کر اس کی سمت دیکھا بظاہر تو وہ بالکل ٹھیک تھی لیکن پھر بھی کچھ گریز ضرور تھی موڈ خراب لگتا تھا۔

اس سے پہلے کہ وقار آئندی مزید تشویش کا اظہار کرتے اچانک مبارک خان وہیں چلا آیا۔
”سلام صاب! وہ مردان خانے میں آپ سے کوئی ملنے آیا ہے۔“
”کون ملنے آیا ہے؟“ آڈر نے سوال کیا۔

”ایس ڈی مپنی کے مینجر اور ایم ڈی صاحب ہیں آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔“ مبارک خان نے وقار آئندی کی سمت اشارہ کیا۔
”صدیقی صاحب ہم سے ملنا چاہتے ہیں؟ خیریت؟“ وقار آئندی نے کہتے ہوئے آڈر اور اسرار آئندی کو دیکھا

”آئیے دیکھتے ہیں، کس سلسلے میں مانا جا رہا ہے۔“ اسرار آفندی کھڑے ہو گئے، جبکہ وقار آفندی علیزے کو دیکھ رہے تھے، جس کو ملا کر اب وہ خود اٹھ کر نہیں جانا چاہ رہے تھے۔
”آپ جالیے بیٹا، بالکل ٹھیک ہوں، اور ہو سکتا ہے ان لوگوں کو آپ سے زیادہ ضروری کام ہو؟“ علیزے ان کی پریشانی بھانپ گئی تھی۔
”آریو شیور؟“
”یہس بابا۔“

”ٹھیک ہے ہم چلتے ہیں، بیٹھو تم لوگ۔“ وہ اٹھتے ہوئے علیزے کا گال پیار سے تھپک گئے تھے، جبکہ اسرار آفندی نے اس کا سر تھکا تھا۔ ان کے جانے کے بعد لان میں وہ دونوں رہ گئے تھے، آذر کافی دلچسپ نظروں سے علیزے کو دیکھ رہا تھا، لیکن علیزے نے اس کی بجائے گردن ترچھی کر کے گیٹ کی طرف دیکھنے میں مصروف تھی، جہاں سے ابھی ابھی زمین اپنی بایک لے کر اندر داخل ہوا تھا اور اپنی دھن میں کی چین اچھا سا اندرونی مین دور کی سمت رہ رہ گیا تھا۔

”ہمارا غصہ ہو؟“ آذر کے سوال میں بھی دلچسپی تھی۔
”کیوں؟“ علیزے نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔
”تم جانتی ہو۔“

”کیا؟“

”یہ ہی کہ تم کیوں ناراض ہو۔“
”آپ کو لگتا ہے کہ میں ناراض ہوں؟“

”ہاں۔“

”جب آپ کو یہ پتا ہے کہ میں ناراض ہوں تو پھر آپ کو یہ بھی پتا ہو گا کہ آپ کی بات اور آپ کا رویہ غلط تھا اس روز؟“ علیزے کو وہ بات پھر سے یاد آئی تو خفگی نے گھیر لیا تھا۔
”ہاں، تھوڑا بہت۔“ وہ اعتراف کر رہا تھا۔

”تھوڑا بہت نہیں، بہت زیادہ کہیں۔ اس وقت عائشہ پیچھو کی جو حالت تھی اس کو دیکھتے ہوئے جو میں کر رہی تھی وہی صحیح تھا۔ عائشہ پیچھو کو اسی حال میں چھوڑ کر میں ایک بار جو ملی کے اندر آئی، یار باری سبھی کے بیڈ رومز چیک کیے، مگر کوئی بھی نہیں تھا، دوبارہ پھر واپس گئی، انوشہ کو ان کے پاس بٹھایا اور ایک بار پھر اوپر آگئی۔ اپنے ڈرائیور کا پتا کیا، لیکن وہ گاڑی کی سروس کروانے گیا ہوا تھا، اس لیے پھر سوچا کہ مبارک خان کا پتا کر لی ہوں، مگر وہ سن ہی نہیں رہا تھا۔ اور آپ تھے کہ۔“ علیزے کہتے کہتے تھک گئی۔

”میں اور کچھ نہیں کہہ رہا تھا، میرا صرف یہ مطلب تھا کہ اگر مبارک خان کو بلا نا ہی ہے تو تم کسی اور کو بھی کہہ سکتی تھیں، کسی بڑی بزرگ کو یا پھر کسی ملازمہ کو۔“ وہ صفائی دے رہا تھا، علیزے کی ناراضی وہ انورہ نہیں کر سکتا تھا، اسی لیے مٹانے کے جتن کیے جا رہے تھے۔

”آذر بھائی جب اچانک اتنی ایمر جنسی پڑ جائے تو انسان کچھ بھی نہیں سوچتا، بس جو ذہن میں آتا ہے وہ کرتا جاتا ہے اور ہاں ایک بات اور سبب جب آپ لوگوں نے ملازموں پر اعتبار کرتے ہوئے ان کو خوبی میں رکھ ہی لیا ہے تو پھر ان پر پورا اعتماد کریں، ہمارے تمام ملازم بہت اچھے ہیں، آٹھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے، عزت کرتے ہیں، بس

اور بیٹیوں کی طرح۔“ علیزے واقعی اپنے گھر کے تمام ملازمین سے مطمئن بھی، آذر اس کی بات پر خاموشی سے سر ہلا کر رہ گیا تھا۔
”اوپر کے ایم سو ری۔“ وہ آہستہ سے بولا۔

”ارے آذر بھائی۔۔۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ مجھے شرمندہ کرنے کا ارادہ ہے؟“ علیزے کو بے ساختہ، خفگی اور ندامت کا احساس ہوا تھا، آذر اس کے لیے بڑے بھائیوں کی جگہ تھا، قابل قدر اور قابل احترام، وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آذر اس سے سو ری کرے۔

”یار شرمندہ تو میں ہوں، خواہ مخواہ اتار دو، ہو گیا اپنی دے آئندہ احتیاط کروں گا، لیکن تم یہ بتاؤ تمہارا اس وقت موڈ کیوں آف تھا؟“ آذر کی بات سے وہ مسکرائی اور غون اور عید کی حرکت بتانے لگی، جسے سن کر آذر قہقہہ لگا کے ہنسا تھا اور اپنے اتنے جاندار قہقہے کی بدولت وہ کسی کی نظروں کی زد میں آگیا تھا اور عجیب سی بات بھی کہ آذر نے بھی بے ساختہ ہی ٹیرس کی سمت دیکھا تھا، لیکن اب وہاں کوئی بھی نہیں تھا، وہ سر جھٹک کر پھر سے علیزے کی سمت متوجہ ہو چکا تھا۔



مبارک خان فارغ تھا اسی لیے اپنی فراغت دور کرنے کی غرض سے چوکیدار کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔
”زبے نصیب جی آج تو مبارک خان خود ہمارے پاس آیا ہے، کیا باتوں مٹھائی یا لڈو؟“ چوکیدار نے مبارک خان کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بولا، مبارک خان زیادہ تر وقار آفندی کے کاسوں میں مصروف رہتا تھا، اسی لیے باقی ملازموں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا کم ہی تھا۔ جس کو باقی ملازم مغزوری کا نام دیتے تھے، مبارک خان عارف کی بات نہ ہنس دیا۔

”یار ایسا تو آج تک تیری بھر جالی نے نہیں کہا جیسا تو کہہ رہا ہے، مٹھائیاں بات رہا ہے۔“
”یار بھر جالی تو تب کے کی جب تو اس کے پاس جائے گا؟ جب جانا ہی نہیں تو پھر کہنا کیا خاک ہے؟“ عارف جل کے بولا، کیونکہ مبارک خان اتنے دن اپنے گاؤں نہیں جاتا تھا اسے دو دو تین تین مہینے گزر جاتے تھے اپنے گھر والوں کی شکل دیکھے ہوئے۔

”یار مجھے کیا پتا کہ اچھا تو کر بننے کے لیے بھی بڑے بڑے پارہیلنا پڑتے ہیں، اپنا سب کچھ پیچھے چھوڑتا ہوں تو تب بڑے صاحب آگے جگہ دیتے ہیں۔ ورنہ باقی سب کی طرح میں بھی کہیں پیچھے پڑا ہوتا۔ آگے آنے کے لیے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے یار۔“

”ہاں یار یہ تو ٹھیک کہا تم نے، نوکری ملنا اور پھر نوکری کرنا دونوں ہی مشکل کام ہیں، اپنے مالکوں کو خوش کرنا آسان نہیں ہوتا۔“ عارف سنجیدہ اور افسردہ سا ہو گیا تھا۔

”ارے نوکری سے یاد آیا وہ آدمی دوبارہ نہیں آیا کیا؟“ مبارک خان نے تیزی سے پوچھا۔
”کون آدمی؟“ عارف بھول چکا تھا۔

”ارے وہی منصور حسین۔“ مبارک خان کے یاد دلانے پر عارف کو اس کی شکل و صورت کے ساتھ ساتھ نام بھی یاد آگیا۔

”میں یار دوبارہ کبھی اسے دیکھا ہی نہیں ہو سکتا ہے اسے کہیں کام مل گیا ہو؟ اتنے دن ہو گئے ہیں اسے آئے ہوئے عارف نے کندھے اچکانے کے ساتھ ساتھ قیاس آرائی بھی کی۔

”ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے، لیکن یار آج کل کام ملنا اتنا بھی آسان نہیں ہے، پڑھے لکھے ہاتھوں میں ڈگریاں لے کر دھکے کھاتے پھر رہے ہیں، وہ تو پھر صرف چار جماعتیں پاس ہے۔ مجھو ہمارے جیسا ہی ان پڑھ ہے۔“ مبارک

خان افسوس سے کہہ رہا تھا۔

”تمہارے پاس اس کا فون نمبر تو ہو گا؟ تم فون کر کے پتا ہی کر لیے کہ کیا بنا اس کا؟“ عارف نے مبارک خان کو مشورہ دیا۔

”فون کیسے کر لیتا؟ صاحب نے اس کے لیے کوئی کام بتایا ہی نہیں، خواہ مخواہ فون کروں گا تو اس بے چارے کی اس بھی ٹوٹ جائے گی۔“ اس کے انداز میں بے چارگی تھی۔

”بس یا رہے لوگوں کے بھی خمرے ہی ہوتے ہیں، مرضی ہو تو جس کو دل چاہے پکڑ کر کام پہ رکھ لیں اور مرضی نہ ہو تو اپنے اتنے پرانے اور وفادار ملازم کو بھی اٹھا کر باہر بھیج دیں۔“

”بس اللہ نے ان کو دے جو رکھا ہے وہ بے جا راستے دن آتا رہا، منتیں کرتا رہا، مگر صاحب نے۔“ عارف کو بھی افسوس نے ہی گھیر رکھا تھا، لیکن اس سے پہلے کہ مبارک خان کچھ کہتا اس کی جیب میں رکھا موبائل بجا، اس نے نمبر دیکھا، کوئی انجان نمبر ہی تھا۔ اس نے کال ریسیو کر لی۔

”ہیلو السلام علیکم۔“ پہلے ہیلو، پھر السلام علیکم عارف، مبارک خان کی کم عقلی پہ ہنس۔

”مبارک خان منصور حسین بات کر رہا ہوں۔“ دوسری طرف سے مرجھائی ہوئی تھکی تھکی آواز سنائی دی۔

”اے منصور حسین اللہ بھلا کرے بڑی لمبی عمر ہے تمہاری، ابھی کچھ ہی یاد کر رہے تھے۔“ مبارک خان کو بڑی خوشی ہوئی تھی یہ ہی حال عارف کا تھا۔

”کاش لمبی کی بجائے مختصر ہوتی، منجبات تو ملتی۔“ منصور حسین کا لہجہ تلخ تھا اور جن حالات سے وہ گزر رہا تھا ان کے بعد ایسی کئی چیز ان کی بات تو نہیں تھی یہ تو فطری عمل تھا۔ مبارک خان کے دل کو کچھ ہوا، بنیادی طور پہ وہ خاصا نرم دل انسان تھا، کسی کو مشکل اور پریشانی میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔

”ایسا نہ کہ منصور حسین اللہ رحم کرے گا، صبر سے کام لو۔“

”ہو نہ! صبر سے کام؟ پیٹ خالی ہو تو صبر سے کام لینا بھی برا مشکل ہوتا ہے مبارک خان۔ صبر کرنے کے لیے پیٹ کا بھرا ہونا ضروری ہوتا ہے، صبر کرنے کے لیے انسان کو برداشت، ہمت اور سکنت کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ چیزیں انسان کے معدے میں کچھ ہوتی ہیں، آسکتی ہیں، ہم میرے گھر آؤ اور میرے گھر کے حالات دیکھو، تب تمہیں میری بے صبری کا احساس ہو گا۔ تم نے تو بس وعدہ کر لیا اور بھول گئے، لیکن میں کیا کروں جو اتنے دنوں سے اس لگائے بیٹھا ہوں؟ اگر تم کچھ نہیں کر سکتے تو مجھے انکار کر دو، تاکہ میں نہیں اور جوتیاں گھساولوں؟“ منصور حسین اس سے آخری فیصلہ سننا چاہ رہا تھا، جبکہ مبارک خان سوچ میں پڑ گیا تھا۔

”مبارک خان جو بھی جواب دینا ہے جلدی دو، میں کسی کے فون سے فون کر رہا ہوں۔“ وہ کچھ یاد آئے نہ بولا۔

”تو تمہارا اپنا فون کہاں ہے؟“ مبارک خان کو پتا تھا کہ منصور حسین کے پاس ایک موبائل ہے، بے شک وہ کافی مستساہی تھا۔

”دو روز پہلے گھر میں کچھ بھی نہیں تھا، ابھی کے پیٹ خالی تھے۔ صبر سے کام لینا ناممکن ہو چکا تھا، صرف ایک موبائل تھا، بچا دیا، تیرہ سو روپے میں۔“ مبارک خان کے سوال پہ اس نے طنزیہ قہقہہ لگاتے ہوئے بتایا، لفظوں میں بڑی چیخیں اور کاک تھی۔ جواباً وہ کچھ نہ کہہ سکا، بلکہ مزید شرمندگی ہوئی تھی، جیسے اس کے گھر کے حالات کا ذمہ دار وہی تھا۔

”ٹھیک ہے منصور حسین تم برسوں نہیں برسوں نہیں بلکہ کل ہی صاحب کے آفس آ جاؤ، میں بھی وہاں ہی ہوں گا۔ پھر صاحب سے بات کریں گے کہ وہ ہمیں کام پہ رکھنا چاہتے بھی ہیں کہ نہیں؟“ مبارک خان نے اسے

تسلیم دی اور منصور حسین کو پھر سے آس بندھ گئی تھی، اس نے فون بند کر دیا۔

”مما! عون اور عدید کہاں ہیں؟“ وہ کافی عجلت میں تیار ہو کر نیچے آئی اور چھوٹے ہی ان کے بارے میں استفسار کیا تھا۔

”وہ تو اسکول چلے گئے۔“

”کب؟ ابھی تو ان کی آواز ڈانٹنگ روم سے آرہی تھی؟“

”ہاں ابھی ابھی نکلے ہیں۔“

”لو کے میں بھی چلتی ہوں، ہائے۔“ وہ تیزی سے آگے بڑھ کے ممنا کو پیار کرتی کوریڈور کی سمت لگی تھی، شیشے کی طرح چمکنے پتھر کے فرش پہ چلتے ہوئے وہ بمشکل اپنے آپ کو گرنے سے بچاتے ہوئے تیز تیز چلتی کوریڈور کے داخلی دروازے سے باہر نکل آئی تھی۔

”عون! عدید روکو، پلیز جسٹن منسٹ۔“ وہ اونچی آواز سے پکاری تھی اور مبارک خان کی گاڑی کی سمت بڑھتے وہ دونوں ایک دم ٹھہر گئے تھے۔ مبارک خان ان کے اسکول بیک اپنی گاڑی میں رکھ رہا تھا، روزانہ صبح وہی ان کو اسکول ڈراپ کرتا تھا اور پھر وقار آندی کو آفس چھوڑنے جاتا تھا۔

”جی؟“ وہ عجلت میں پھولی ہوئی سانسوں کو ہموار کرتی ان تک پہنچی تھی اور اس کے قریب آنے پہ انہوں نے بڑا مختصر سا ”جی“ کہا تھا، جس سے ان کی ناراضی اور لا تعلقی صاف ظاہر ہو رہی تھی، علیحدہ ان کو یونیفارم پہنے تک سب سے تیار خفا خفا سے انداز میں دیکھ کر بے ساختہ مسکرائی اور دونوں کے باری باری گال چوم لیے تھے، ان کی خفگی کی پروا کیے بغیر۔

”سوری میری جان! میں کل غصے میں کچھ زیادہ کہہ گئی۔ ان لیکٹ اچانک نیند سے اٹھنے کی وجہ سے کچھ پتا نہیں چلا کہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔ اتنی زیادہ ڈانٹ کے لیے اکیس سوری۔“ اس نے دونوں کے گال چھو کر کہا اور وہ دونوں اک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے، آنکھوں آنکھوں میں کچھ کہا، پھر علیحدہ کو دیکھا۔

”ٹھیک ہے ہم آپ کی کل والی ڈانٹ بھول سکتے ہیں، مگر ایک شرط پہ۔“ کافی شاہانہ انداز تھا ان کا۔

”کیسی شرط؟“

”آپ آج واپسی پہ ہمیں آکس کریم بھی بھلا میں گی اور شاپنگ بھی کروائیں گی، اپنی گاڑی میں اپنے ڈرائیور کے ساتھ۔ مطلب کہ سب کچھ آپ کا ہی ہو گا؟“ دونوں کی شرط پہ وہ ایک بار پھر مسکرائی۔

”اے کے منظور ہے۔“

”ٹھیک ہے، پھر ہم بھی راضی ہیں۔“ انہوں نے علیحدہ کو گڈ بائے کہا اور فلائنگ کس کرتے وہاں سے چلے گئے۔

”کیا ہو رہا ہے؟ کالج نہیں جاتا؟“ آؤر اور دانیال آفس جانے کے لیے نکل رہے تھے، علیحدہ کو گاڑیوں کے قریب روش پہ کھڑے دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔

”جانا ہے۔“

”تو پھر یہاں کیوں کھڑی ہو؟“ ان کی چرائی بجا تھی۔

”بس وہ عون اور عدید کے لیے کھڑی تھی۔“ اس کے کہنے پہ آؤر معاملہ سمجھ کے مسکرا دیا تھا۔

”لو کے چلتی ہوں گڈ بائے۔“ وہ اپنی گاڑی کی سمت بڑھ گئی، اس کا ڈرائیور گاڑی لیے تیار کھڑا تھا۔ آؤر اور

دانیال اپنی گاڑی کی طرف آگئے۔ ان لوگوں کی گائیاں اک دوسرے کے آگے پیچھے حویلی کے گیٹ سے باہر نکلی تھیں۔



وقار آفندی اخبار پڑھتے ہوئے مبارک خان کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ عین اور عید کو دراپ کر کے ابھی نہیں آیا تھا۔ اُسے مقررہ ٹائم سے دس منٹ لیٹ ہو چکا تھا اور اس کے لیٹ ہونے کا مطلب تھا کہ وہ یقیناً "ٹرینک جام" میں پھنس گیا تھا۔ صبح صبح لاہور کی سڑکوں پہ ٹرینک کا رش بھی بے انتہا ہوتا تھا، کالج یونیورسٹیز اور الیمنز کے لیے نکلنے والوں کا اڑدھام ہوتا تھا۔ اپنے وقت پہ مطلوبہ جگہ پہنچ جانا ناممکن ہو جاتا تھا۔ خود وقار آفندی بھی آفس جاتے ہوئے کئی بار اس اڑدھام میں پھنس چکے تھے، جس کے باعث وہ کئی بار آفس سے لیٹ ہو جاتے تھے۔ آج بھی انہیں ایسا ہی کچھ لگ رہا تھا۔ لیکن ابھی وہ گھڑی دیکھ ہی رہے تھے کہ مبارک خان بھی آگیا۔ ملازمہ ان کا بریف کیس گاڑی تک چھوڑ آئی تھی۔

"سلام صاحب۔" مبارک خان نے ان کو دیکھتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔

"وا سلام لیٹ کیوں ہو گئے تھے؟"

"ٹرینک جام تھا صاحب۔" ان کی حسب توقع جواب آیا تھا۔ اسگے چالیس منٹ میں وہ آفس پہنچے تھے، حالانکہ تیس منٹ کا راستہ تھا، شکر تھا کہ دس منٹ لیٹ ہوئے تھے۔ وہ کافی فریش موڈ کے ساتھ آفس میں داخل ہوئے تھے۔ لیکن انہیں پتا نہیں تھا کہ ان کا یہ فریش موڈ محض کچھ دیر کے لیے ہے۔ آذر اور دانیال آج فیکٹری کے راؤنڈ پہ نکلنے والے تھے، اسی لیے آفس کا کام ذرا جلدی بنانے کی کوشش میں تھے۔

"اوکے ڈیڈ ہم چلتے ہیں۔" آذر اجازت طلب لمحے میں بولا۔

"ٹھیک ہے، جاؤ تم لوگ اور اظہار سے کہو صید بقی صاحب کا کام ضرور کروادے دو کافی سنا ان کا موبائل بجنے لگا تو بات ادھوری رہ گئی، کسی لینڈ لائن نمبر سے کال تھی۔"

"ایک منٹ۔" انہوں نے آذر وغیرہ کو روکنے کا اشارہ کر کے کال ریسیو کر لی، وہ دونوں ٹھہر گئے۔

"وقار آفندی۔" سنا ہے تمہاری ایک بی بی ہے؟" دو سری طرف کا لہجہ کافی پراسرار اور ڈنگ قسم کا تھا۔

"کون ہو تم؟"

"تمہاری بی بی کا عاشق ہرگز نہیں ہوں۔" لفظوں میں حقارت تھی۔

"میں پوچھ رہا ہوں کون ہو تم؟" وہ بری طرح پریشان ہوا۔ اُسے تھے اور ان کی پریشانی آذر اور دانیال کو بھی چونکا گئی تھی۔

"میری فکر چھوڑو، اپنی بی بی کی فکر کرو، سنا ہے ابھی ابھی اس کے کالج روڈ پہ اس پہ فائرنگ ہوئی ہے، پتا نہیں بے چاری کس حال میں ہوگی؟ ایک بی بی ہے تمہاری۔ وہ بھی نہ رہی تو؟" کافی طنز اور سفاکی سے کہنے کے بعد فون بند کر دیا گیا تھا۔ وقار آفندی پتھر اگے تھے، زبان لڑکھڑا گئی۔

"علمو سے یہ فائرنگ؟"

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

دردِ دل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدھیہ اور نیل حیات دو ہی ہیں، بھائی ہیں، مدھیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے، وہ انگلینڈ کی ریجنیوں میں مکمل طور پر رنگ چکی ہے، جس کے پیش نظر فائزہ بیگم، نیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں، لیکن مدھیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے، جس پر نیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

ذری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے، مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے، مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، بے بسی اور مجبوری سے تنگ آخر خود کشی کرنے کا سوچا ہے، لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باؤا قیاد مل جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے، جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے، اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میسرک پاس آدی ہے، وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے، وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل اور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے، وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے، اس نے کبھی بارگاہ نہیں سیکھا، اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پر بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ وہاں سروس کو بھی دیتی ہیں۔



چوتھی قسط

”واٹ؟ علیزے یہ فائرنگ؟“ آذر اور دانیال کے لیے یہ خبر کسی دھماکے سے کم نہیں تھی وہ تڑپ کر ان کی ٹیبل کے قریب آئے تھے۔ وقار آندری کا داغ ماؤف ہو چکا تھا وہ خالی الذہنی سے ان دونوں کے چہرے دیکھ رہے تھے ان کی حالت چھرائی ہوئی لگ رہی تھی۔

”ڈیڈ بتائیے؟ کیا ہوا ہے؟ کس کا فون تھا؟“ آذر اپنی پریشانی کنٹرول کرتے ہوئے ذرا تحمل سے پوچھ رہا تھا لیکن اس کے باوجود اس کی پریشانی اس کے چہرے سے ہویا تھی۔

”وہ... وہ کالج کے روڈ پر۔“ انہوں نے بتانے کی کوشش کی مگر بات مکمل کرنے کا حوصلہ نہیں ہوا تھا۔

”کیا ہوا ہے کالج کے روڈ پر؟ پلیز ڈیڈ جلدی بتائیے ورنہ... ورنہ کچھ ہونہ جائے؟“ دانیال نے آگے بڑھ کے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا اور بات مکمل کرنے کے لیے ان کا حوصلہ بڑھایا تھا۔

”علیزے یہ فائرنگ ہوئی ہے، پتا نہیں وہ کس حال میں ہے؟“ وقار آندری کہتے کے ساتھ ہی ڈھسے گئے تھے ان کی حالت بھی ان دونوں کے لیے پریشانی کا باعث بن گئی تھی اس عجیب سی صورتحال کو ہینڈل کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

”دانیال! یہ لو چالی تم گاڑی نکالو میں ڈیڈ کے پاس مبارک خان کو چھوڑ کے ابھی آتا ہوں۔“ آذر نے پینٹ کی جیب سے چالی نکال کر دانیال کی سمت اچھالی۔

”اوکے جلدی آؤ۔“ دانیال چالی لے کر تیزی سے دروازہ عبور کر گیا۔ آذر نے پلٹ کر ڈیڈ کو دوبارہ دیکھا۔

”ڈیڈ پلیز حوصلہ رکھیں اور اللہ سے دعا کریں ان شاء اللہ علیزے کو کچھ نہیں ہوگا۔“ آذر نے ان کے ساتھ ساتھ جیسے اپنے آپ کو بھی تسلی دی تھی۔

”میں ابھی جا کر مبارک خان کو بھیجتا ہوں اور پلیز ڈیڈ اس چیز کا آفس میں کسی کو بھی پتا نہیں چلنا چاہیے لوگ ہزاروں باتیں بنا لیتے ہیں۔“ آذر نے ایسی پریشانی اور غلٹ کے عالم میں بھی اس نازک پہلو پر غور کر لیا تھا۔

”آذر میں بھی چلتا۔“

”نہیں ڈیڈ آپ کہیں نہیں جائیں گے، میں اور دانیال جو جا رہے ہیں وہاں جا کر آپ کو سب کچھ بتا دیں گے، ہو سکتا ہے یہ بات جھوٹ ہو، کسی نے ہمیں ستانے کے لیے ایسا کیا ہو؟“ آذر کی بات سچ تھی لیکن اس وقت ایسے ایسے وہم اور ہول اٹھ رہے تھے کہ کچھ بھی ماننا مشکل ہو رہا تھا مگر پھر بھی انہیں آذر کی بات کو اہمیت تو دینی ہی تھی اسی لیے جوں کے توں بیٹھے رہے۔

آذر وہاں سے سیدھا اسٹاف روم میں گیا مبارک خان توقع کے مطابق وہیں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا اسے وقار آندری کے روم میں بھیج کر وہ تیز تیز قدم اٹھاتا آفس بلڈنگ سے باہر نکل آیا تھا۔ اس کے بیٹھے ہی دانیال نے گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔

”اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو علیزے کے ڈرائیور نے فون کر کے ہمیں اطلاع تو ضرور دینی تھی؟“ آذر پر سوچ انداز سے بولا، نظریں سامنے وینڈاسکرین پر تھیں۔

”تو ذرا کس بات کی ہے؟ اس نے فون نہیں کیا تو ہم خود کر لیتے ہیں، تم ٹرائی کرو اس کا نمبر۔“ دانیال نے صاف روڈ پر آتے ہی اسپید بڑھا دی تھی آذر کو اس کی بات خاصی معقول لگی تھی اس نے فوراً ”موبائل نکال کر علیزے کے ڈرائیور کا نمبر ڈائل کیا تھا۔ دوسری طرف رنگ جا رہی تھی لیکن کوئی ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ اس نے دو تین بار لگا کر ٹرائی کیا مگر اسے کوئی رسپانس نہیں ملا تھا۔

”علیزے کے نمبر چیک کرو۔“ دانیال نے ایک اور مشورہ دیا لیکن آذر کی دونوں طرف کوشش کے جواب میں ”تو آنسرنگ“ کی مستثنیٰ آواز موصول ہوئی تھی اور ایسی پتویشن میں آذر کی پریشانی پہ سچ سچ پسینہ پھوٹ پڑا تھا۔

اس کے وہم و وسوسے یقین کی شکل اختیار کر گئے تھے۔

”دیکھو، بیٹا تم پریشان مت ہو، اب یہاں کوئی بھی نہیں ہے، تم میرے ساتھ چلو، یہ ساتھ ہی تو کالج ہے، میں ابھی فون کر کے تمہارے پیرنس کو بلا لیتی ہوں۔“ اس جاملے کے بعد اتفاقاً ”گزر رہے علیزے کی پچھڑا سے دیکھ کر اپنی گاڑی سی اتر آئی تھیں اور ہراساں سے انداز میں گاڑی سے باہر نکل کر ادھر ادھر دیکھتی علیزے کو انہوں نے ہی سنبھالا تھا رفتہ رفتہ اور لوگ بھی جمع ہو گئے تھے اور لوگوں نے ہی مل جل کر علیزے کے ڈرائیور کو گاڑی سے نکالا تھا جو ایک گولی کی زد میں آتے ہوئے زخمی ہو گئے تھے ان کا خون پانی کی طرح بہہ رہا تھا اور علیزے کی ان پر نظر پڑتے ہی چیخیں اٹھ پڑی تھیں۔

”خیر بابا؟“ وہ ان کی حالت دیکھ کر خوف زدہ ہو گئی تھی اور میڈم عالیہ سے اس کو سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔

”ریلیکس۔“ ریلیکس بیٹا انہیں کچھ نہیں ہوگا، وہ صرف زخمی ہوئے ہیں۔ پریشانی والی بات نہیں ہے۔“ انہوں نے بڑی مشکل سے اسے قابو کیا تھا کسی آوی نے ایمبولینس کو کال کر دی۔ انجان لوگ علیزے کو بھی دیکھ رہے تھے اور خیر و بابا کی حالت کو بھی۔ ہر زبان پر طرح طرح کی باتیں چل رہی تھیں۔ اور علیزے اتنے زیادہ لوگوں کی نظروں سے اور باتوں سے وحشت زدہ ہوئی جا رہی تھی اس کے خوف و ہراس میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

”علیزے...؟“ دانیال اور آذر بڑی سرعت سے لوگوں کو پیچھے ہٹاتے ہوئے سامنے آئے تھے جہاں میڈم عالیہ علیزے کو وہاں سے چلنے کے لیے ہلکا پھسلا رہی تھیں۔

”علیزے...؟“ اب کی بار آذر نے قریب آکر اسے پکارا اور اس کا بازو پکڑ کر اسے سامنے کیا تھا وہ میڈم عالیہ کے عقب میں گھڑی تھی جیسے چھپنے کی کوشش کر رہی ہو۔

”آذر بھائی۔“ علیزے اسے دیکھ کر چیخ اٹھیں تھیں اور تڑپ کر اس کے کندھے سے لگ گئی تھیں۔

”علیزے پلیز۔“ پلیز سنبھالو اپنے آپ کو ہم آگے ہیں نا۔ کچھ نہیں ہوگا پلیز ریلیکس۔“ آذر نے اتنے لوگوں پہ طائرانہ سی نگاہ ڈالتے ہوئے بہت دھیمی آواز میں اسے سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔

”بھائی وہ... وہ خیر و بابا۔“ وہ تڑپ تڑپ کر روئی، آذر بری طرح چونک گیا تھا۔ علیزے کو سامنے دیکھ کر وہ خیر و بابا کو تو بھول ہی گیا تھا۔

”کہاں ہیں خیر و بابا؟“ اس نے فوراً ”استفسار کیا۔“

”وہ... ان کو گولی۔“ علیزے سے آگے کچھ بولا ہی نہ گیا تھا۔

”یہ کیا کہہ رہی ہو؟ کہاں ہیں وہ؟“ آذر کی پریشانی دیدنی تھی۔

”دیکھو بیٹا وہ کافی زیادہ زخمی ہو گئے تھے ان کا خون بھی کافی بہہ رہا تھا اس لیے ان کی حالت دیکھتے ہوئے دوڑ کے ایمبولینس میں ان کو ہسپتال لے گئے ہیں اور اتنی زیادہ فائرنگ اور اپنے ڈرائیور کی تشویشناک حالت دیکھ کر یہ بہت خوف زدہ ہو گئی ہے آپ اسے فوراً گھر لے جائیں۔“ میڈم عالیہ نے آذر کو بتاتے ہوئے مشورہ دیا تھا آذر ان کو پہچانتا تھا وہ ایک دوبار علیزے کو ڈراپ کرنے کالج آیا تو گیٹ پہ میڈم عالیہ سے بھی ٹکراؤ ہوتا رہتا تھا۔ وہ سر اثبات میں ہلکا کر دانیال کی سمت پلٹا۔

”دانیال تم علیزے کو لے کر گاڑی میں بیٹھو میں ابھی آتا ہوں۔“ آذر علیزے کو دانیال کے حوالے کرتے ہوئے علیزے کی گاڑی کی سمت بڑھا تھا جس پہ گولیوں کے نشان دور سے ہی نظر آرہے تھے اور رائٹ سائیڈ کی دونوں کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ چکے تھے کانچ سڑک سپر بکتر ہوا تھا اور خون کی دھاریں بھی زمین پر وافر مقدار میں نظر

آ رہی تھیں آذر ایسے وحشانہ اور خطرناک حملے پہ اندر ہی اندر متفکر ہوتا گاڑی کے اندر گھس گیا اس نے علیزے کا موبائل اس کا بیگ اور فائل وغیرہ نکال لی تھیں پھر ڈیش بورڈ سے خیر و بایا کا موبائل بھی اٹھالیا تھا جو ان لوگوں نے علیزے سے کانٹیکٹ میں رہنے کے لیے دے رکھا تھا اس نے بڑی سوچ بچار کے بعد تمام ضروری اشیاء گاڑی سے نکال لی تھیں تاکہ کسی بھی قسم کی انوسٹی گیشن کے دوران وہ چیزیں انوالونہ ہوں وہ چند ہی منٹوں میں کچھ فاصلے پہ کھڑی اپنی گاڑی کے قریب آیا تھا۔

”یہ لو یہ علیزے کا سامان ہے احتیاط سے لے جاؤ اور اسے چپ کرواؤ۔“ اس نے کھڑکی سے جھکتے ہوئے بیگ انیال کے حوالے کیا اور علیزے کو دیکھا جو ابھی تک رو رہی تھی۔

”لیکن آذر تم اکیلے یہاں؟“ انیال کو فکر نے آن گھیرا۔

”ڈونٹ وری میں یہاں سب کچھ سنبھال لوں گا خیر و بایا کے پاس ہاسپتال بھی جاتا ہے ابھی۔“ آذر نے اسے تسلی دی۔

”لیکن تمہارے پاس تو گاڑی بھی نہیں ہے۔“

”انیال پلیز تم میری فکر نہ کرو تم علیزے کو یہاں سے لے کر نکلنے کی کوشش کرو یہ سراسر پولیس کیس ہے“ ہو سکتا ہے ابھی نہیں تو تھوڑی دیر تک پولیس بھی آجائے میں ابھی اس پاس دیکھنے والے لوگوں سے کچھ پوچھ کچھ کرتا ہوں آخر کون لوگ تھے جنہوں نے فائرنگ کی؟ کسی نے تو دیکھا ہی ہو گا؟“ آذر کی بات سمجھ کر انیال بھی چپ ہو گیا تھا۔

”ٹھیک ہے میں علیزے کو حویلی ڈراپ کر کے دوبارہ آتا ہوں۔“ انیال نے گاڑی آگے بڑھادی اور آذر پلٹ کر دوبارہ جانے وقوعہ پہ آگیا تھا ابھی وہ ایک دو آدمی سے بات کرنے کا ارادہ باندھ ہی رہا تھا کہ پولیس کی گاڑی آئی دکھائی دی اور لوگ پولیس کو دیکھ کر شرم کی مکیوں کی طرح اڑتے چلے گئے تھے جیسے کسی نے ان کے چہرے پر پتھر مار کر ان کو اڑا دیا ہو۔

اور وہاں میڈم عالیہ اور دو تین ادھیڑ عمر مرد بھی کھڑے رہ گئے تھے یا پھر ذرا فاصلے پہ آذر اکیلا کھڑا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کبھی بھی وقت یہ نہ پہنچنے والی پولیس اب کیا کارروائی دکھاتی ہے؟ پولیس کی گاڑی قریب پہنچنے تک آذر وقار آفندی کا نمبر ڈائل کر چکا تھا دوسری طرف کل ریسیو کرنے والا مبارک خان تھا آذر کے کہنے پہ اس نے موبائل وقار آفندی کی سمت بڑھا دیا تھا۔

علیزے پہ قاتلانہ حملے کی خبر بڑی حویلی کے در و دیوار ہلا کر رکھ گئی تھی چھوٹے بڑے سبھی چکرا کے رہ گئے تھے علیزے انیال کے ساتھ گھر پہنچی تو اس کی کھٹی کھٹی چیخوں کو کھل کر باہر آنے کا رستہ مل گیا تھا وہ بلند آواز سے رو رہی تھی اور اس کی حالت ایسی تھی کہ آسید آفندی نے دیور اور دیورانی کے مشورے پہ اسے کچھ دیر کے لیے ٹرینکولا نر دے کر سلا دیا تھا وہ ایسی پوزیشن میں ہرگز نہیں سمجھی کہ سب کے تشویش بھرے سوالات کے جواب دے سکتی لہذا اسرار آفندی نے اسے کچھ دیر سکون دینے اور اس حادثے کو اس کے دماغ سے ذرا دیر کے لیے محو کرنے کے لیے یہی آئیڈیا سوچا تھا اور قریب متفکر سی کھڑی ثروت بیگم نے بھی شوہر کی ہاں میں ہاں ملائی تھی علیزے کو اپنے کمرے میں سلا کر جیسے ہی آسید آفندی کمرے سے باہر آئیں انہیں راہداری سے وقار آفندی آتے دکھائی دیے ساتھ احتیاطاً ان کے سارے کے لیے مبارک خان بھی تھا جو ان کا بازو تھامے ہوئے تھا۔

”علیزے کہاں ہے؟“ انہوں نے آسید آفندی کو دیکھ کر چھوٹے ہی استفسار کیا تھا۔

”اللہ کا شکر ہے وہ ٹھیک ہے میں نے اسے تھوڑی دیر کے لیے سلا دیا ہے وہ کافی اپ اسیت ہو چکی تھی۔“ انہوں نے شوہر کو تسلی دی۔

”آسید! تم ٹھیک کہہ رہی ہو نا؟“ وہ بے یقین لگ رہے تھے حالانکہ آذر فون پہ ان کو اچھی خاصی تسلی دے چکا تھا اور ساری صورت حال بھی بتا چکا تھا۔

”آپ خود دیکھ لیں۔“ آسید آفندی نے مڑ کر دروازے کا ہینڈل گھما کر دروازہ کھول دیا تھا۔ اور وہ اتنے غیر مطمئن تھے کہ انکار نہیں کر سکے اور کمرے میں آگئے مبارک خان باہر ہی کھڑا رہ گیا۔

”علیزے میری جان۔“ وہ بے ساختہ بیڈ پہ لیٹی علیزے کے قریب آئے اور جھک کر اس کی پیشانی چوم لی تھی بے شک علیزے نیند اور گولیوں کے زیر اثر سو گئی تھی لیکن اس کا ذہنی انتشار اس کے سوئے ہوئے چہرے سے بھی عیاں ہو رہا تھا بے تحاشا رونے کی وجہ سے اس کی پللیں جڑی ہوئی تھیں اور پوٹے سرخ اور سو جن زدہ ہو رہے تھے وقار آفندی کا سر مٹھی میں آگیا تھا انہوں نے بچپن میں بھی علیزے کو کبھی رونے نہیں دیا تھا وہ ذرا سا ”اف“ بھی کرتی تو ہزاروں لوگ الرٹ ہو جاتے تھے اور آج وہ اکیلی اتنا سنگین منظر اتنا ہولناک واقعہ خود پہ سہہ آئی تھی۔!

”میری جان میری علیزے۔“ وہ اس کے قریب بیٹھے اس کے بال سہا رہے تھے اور ان کا وہاں سے اٹھنے کا کوئی ارادہ بھی نہیں تھا۔

”وقار!“ آسید آفندی نے آگے بڑھ کے ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھ دیا۔

”میں باہر چلیں باہر سب پریشان ہو رہے ہیں اور ہم یہاں کمرے میں آکر بیٹھ گئے ہیں پلیز سنبھالیے اپنے آپ کو علیزے اگر آپ کو اس طرح کمزور دیکھے گی تو اور زیادہ تنہا ہو جائے گی۔ پلیز حوصلے اور ہمت سے کام لیں۔“ آسید آفندی نے ان کے کندھے پہ دباؤ ڈالتے ہوئے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔ جواباً انہوں نے کچھ بھی نہ کہا اور علیزے کا گال تھپک کر ان کے ساتھ باہر نکل آئے تھے۔

”رجو کہاں ہے؟“ انہوں نے علیزے کی ملازمہ کا پوچھا۔

”علیزے کا بیڈ روم صاف کر رہی ہے شاید۔“ انہوں نے ٹائم کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا تھا۔

”اسے کہو علیزے کے پاس آکر بیٹھے۔“ انہوں نے رک کر آرڈر دیا تھا۔

”لیکن علیزے تو سو رہی ہے۔“ آسید آفندی نے حیرانی سے کہا۔

”اسی لیے تو کہا ہے وہ جب اٹھے گی تو خود کو کمرے میں اکیلے دیکھ کر کہیں خوف و ہراس میں نہ آجائے“ رجو اس کے سامنے ہو گئی تو اس کی تسلی ہو جائے گی۔“ وقار آفندی نے وضاحت دی لیکن آسید پھر بھی تذبذب کا شکار تھیں۔

”جاؤ اسے کہو سارے کام چھوڑ کر وہ علیزے کے پاس آکے بیٹھے اور اس کا خیال رکھے۔“ اس کی بارہ انکار نہ کر سکیں اور پلٹ کر رجو کو بلانے آگئیں۔ اور وہ خود ڈرائنگ روم میں چلے آئے جہاں باقی سب بھی موجود تھے۔

”میڈی پاکستان جا رہی ہے۔“ کمرہ ٹھکانے آتے ہی اپنے گروپ میں شو شا چھوڑا تھا اور اس گروپ میں سب سے زیادہ چونکنے والا جیزی ہی تھا۔

”کب؟ تمہیں کس نے بتایا؟“ اس کے سوال میں بے چینی سی تھی۔

”بتایا تو اس نے خود ہی ہے ابلتہ کب جا رہی ہے؟ اس کا نہیں بتا“ اس نے لاپرواہی سے کندھے اچکائے۔

”وہ تمہیں خود ملی ہے یا فون پہ بتایا ہے؟“ جیزی کے سوال نے ساختہ تھے وہ خود کو روک نہیں پایا تھا۔
 ”ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی فون پہ بتایا ہے، ہو سکتا ہے وہ ادھر کی طرف بھی آئے۔“ جیزی جتنا کانٹشس ہو رہا تھا کرسمٹینا اتنی ہی لاپرواہ دکھائی دے رہی تھی اسے مدحیہ کے آنے اور جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔
 ”لیکن وہ تو کہہ رہی تھی کہ وہ کبھی پاکستان نہیں جائے گی؟“ یونیورسٹی کے لان میں گھاس پہ بیٹھی بیٹھی نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

”ہو نہ! یہ ان پاکستانیوں کی صرف باتیں ہی ہیں، ہوکتے ہیں وہ کرتے نہیں اور جو کرتے ہیں وہ کہتے نہیں۔ ان کے لیے بڑی بڑی باتیں کر لیتا تو آسان ہے لیکن بڑی بڑی باتوں پہ عمل کرنا بہت مشکل۔“ کرسمٹینا اور اس کی فیملی پاکستانیوں سے متنفر تھی یہ تو اس کی مجبوری تھی کہ مدحیہ ان کے گروپ کا حصہ تھی اس لیے برواشت کرنا پڑتا تھا اور ویسے بھی وہ پاکستانی مردوں سے متنفر تھی عورتوں کے لیے ابھی کوئی رائے قائم نہیں کی تھی اس لیے جیسی تھی ہی سہی مدحیہ سے فریڈ شپ چل رہی تھی۔

”ہیلو اپوری ہاؤی؟ کیا ہو رہا ہے؟“ تھوڑی ہی دیر میں کرسمٹینا کے عقب سے مدحیہ کا چہرہ نمودار ہوا تھا۔

”ہائے! آ“ بھی نے اسے دوش کیا تھا لیکن جیزی تو یہ بھی نہیں کر سکا تھا۔
 ”گلتا ہے کوئی سیریس ٹاپک چل رہا ہے؟“ بیٹھتی مدحیہ نے بھی کے چہرے اک نظر میں بھانپ لیے تھے۔

”اس وقت تو تم ہی ٹاپک ہو۔“ کرسمٹینا نے عجیب سے انداز میں مسکرا کر کہا۔

”کیوں؟ کوئی ریزن؟“ مدحیہ نے تیکھی نظروں سے کرسمٹینا کی مسکراہٹ کا جائزہ لیا۔

”نہیں کوئی خاص وجہ نہیں، بس وہ جیزی تمہیں مس کر رہا تھا، تمہارے پاکستان جانے کا سن کر پریشان ہو گیا ہے۔“ کرسمٹینا کا انداز ہنوز لاپرواہی لیے ہوئے تھا جبکہ اس کی بات پہ جہاں مدحیہ چونکی وہیں جیزی گڑبڑا کے رہ گیا تھا وہ کرسمٹینا کے ایسے حسن کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا۔
 ”کیوں؟ میرے جانے سے جیزی کو کیا پرالہم ہے؟“ مدحیہ نے براہ راست جیزی کی طرف رخ موڑا وہ اپنے تاثرات کنٹرول کرنے میں لگا ہوا تھا۔

”جیزی کو تمہارے جانے سے یہ پرالہم ہے کہ ہمارے گروپ کی ایک بہت اچھی فرینڈ ہم سے دور ہو جائے گی اور اس کی کمی ہمیں ہمیشہ قفل ہوگی۔“ بیٹھنے نے درمیان میں بولتے ہوئے بات سنبھالی تھی اور جیزی نے بیٹھنے کو ممبروں نظروں سے دیکھا تھا۔ مگر کرسمٹینا کو دیکھ کر دل چاہ رہا تھا اس کا گلا دبا دے۔
 ”یہ تو ٹھیک کہہ رہے ہو تم لوگ، کمی تو مجھے بھی بہت محسوس ہوگی آپ لوگوں کی۔“ لیکن اتنا پریشان ہونے والی بات بھی نہیں ہے ہم لوگ فون پہ اور نیٹ پہ ہمیشہ کانٹیکٹ میں رہیں گے بلکہ تم لوگ اگر بھی چٹھیوں میں چاہو تو مجھ سے ملنے پاکستان بھی آسکتے ہو، اینڈ آئی ہوپ کہ تم سب انجوائے بھی کرو گے۔“ مدحیہ نے بے ساختہ ہی ان لوگوں کو مہمان نواز میزان کی طرح دعوت دی تھی اور اس دعوت پہ سمجھی نے مسکرا کر سر ہلایا تھا سوائے کرسمٹینا کے!

”میڈی میرا وعدہ ہے کہ کوئی اور آئے نہ آئے میں ضرور آؤں گا۔“ برائن نے کتاب سے سر اٹھا کر پہلی بار لب کشائی کی تھی۔

”میں ویٹ کروں گی۔“ مدحیہ کے چہرے پہ ہلکی سی مسکراہٹ در آئی تھی۔

”تم جا کب رہی ہو؟“ بیٹھنے نے سوال کیا۔

”نہیں کھینچا۔“

”ٹکٹ کنفرم ہو گیا تمہارا؟“

”ہاں! آج ہی ہوا ہے۔“ مدحیہ نے کہہ کر سر جھٹکا لیا تھا۔

”کیا پاکستان جا کر شادی کرنے کا ارادہ ہے؟“ برائن کے سوال میں سنجیدگی تھی۔

”نہیں، شادی کی پلاننگ تو دور دور تک بھی نہیں ہے۔“ وہ اپنی میں گردن ہلا رہی تھی۔

”ارے ابھی نہیں ہے نا؟ پاکستان جا کر ضرور ہو جائے گی۔“ سمجھنے پہلی نظر میں ہی کسی اکڑے ہوئے سینے اور

پھولے ہوئے بازوؤں والے ہیرو سے محبت ہو جائے گی، جو بات بھی کرے گا چھت پھاڑ کے۔“ کرسمٹینا نے مسخر سے کہتے ہوئے پاکستانی فلموں کے ہیرو کا نقشہ کھینچا تھا۔

”اب میرا ٹیسٹ اتنا برا بھی نہیں ہے کیوں جیزی؟“ مدحیہ نے چپ بیٹھے جیزی کو بھی گفتگو میں کھینچا۔

”ہال یار میڈی ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے اس کا ٹیسٹ تو اتنا اعلیٰ ہے کہ یہاں لندن جیسے شہر میں رہتے ہوئے بھی ابھی تک اسے کوئی پسند نہیں آیا، کوئی اپنے معیار کا ہی نہیں لگا، نہ کوئی مسلم، نہ کوئی کرسچن۔“ جیزی ڈائریکٹ مدحیہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولامدحیہ کی نیت صاف تھی اس لیے وہ نظر جڑانے کی بجائے مسکرا دی۔

”یہ تو تم ہنڈ رڈ پر سینٹ درست کہہ رہے ہو اور یہی بات سمجھی میں خود بھی سوچتی ہوں کہ مجھے یہاں رہتے ہوئے اتنی زیادہ آزادی بھی تھی کوئی مسئلہ، کوئی روک رکاوٹ بھی نہیں تھی مگر پھر بھی مجھے کوئی اچھا نہیں لگا؟ کسی نے بھی اس دل کو ٹیچ نہیں کیا۔“ وہ اپنے دل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عجیب سے انداز میں بولی تھی۔

”لیکن یہ تو ہو سکتا ہے تاکہ تم کسی کے دل کو ٹیچ کر گئی ہو؟“ جیزی نے ذومعنی بات کی۔

”تو پھر یہ کسی کے دل کا مسئلہ ہے، میرا نہیں۔“ وہ بے نیاز تھی۔

”کوئی تمہیں چاہتا ہے کیا تمہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا؟“ جیزی اسے کھوج رہا تھا۔

”نہیں مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ مجھے کوئی بھی چاہ سکتا ہے اور میں ہر ایک کے لیے فکر اور تجسس نہیں پال سکتی۔“ اس کے انداز میں لاپرواہی ہنوز تھی اس نے جیزی کی بات کا نوٹس ہی نہیں لیا تھا۔

”تو پھر تم کس کے لیے فکر اور تجسس پال سکتی ہو؟ کون ہو گا وہ خوش نصیب؟“ جیزی نے ہمت نہ ہاری اور کھوج کا سلسلہ جاری رکھا۔

”وہ خوش نصیب وہ ہو گا جو ”صرف“ مجھے چاہے گا، بس کی زندگی میں پہلے اور بعد میں، میرے سوا کوئی نہیں ہو گا، جو ادھر ادھر منہ ماری نہیں کرے گا۔“ مدحیہ کی بات پہ جیزی پل بھر کے لیے چپ سا ہو گیا تھا کیونکہ مدحیہ کے سامنے ہی وہ ایسے منہ ماری کرنے کے ہزاروں کارنامے سرانجام دے چکا تھا۔

”کج کل ایسا خوش نصیب ملنا بہت مشکل ہے میڈی، بالکل فینئر آوی تمہیں کہیں بھی نہیں ملے گا۔“ جیزی نے مدحیہ کو اس کی شرائط سے باز رکھنا چاہا۔

”ہو نہ! مشکل ہو سکتا ہے ناممکن نہیں، اللہ کی دنیا بہت وسیع ہے اور اس وسیع دنیا میں ہر قسم کے انسان آباد ہیں۔“ اس نے یقین سے کہا تھا۔ اور وہ مزید کچھ نہ کہہ سکا۔ لیکن بہت پہلے زری کے منہ سے سنا ہوا شعر

بے ساختہ ہی مدحیہ کے لبوں پہ چل گیا تھا۔

ہم تو محبت میں بھی توحید کے قائل ہیں۔۔۔ فراز

ایک ہی شخص کو محبوب بنائے رکھنا!

انہوں نے مدحیہ کے اس شعر پہ نا سمجھی سے اسے دیکھا تھا اور مسکراتے ہوئے اس نے شعر کو انگلیں میں ٹرانسلیٹ کر دیا تھا۔

”ہوں! انٹر سٹنگ، برائن نے ایک بار پھر کتاب سے نظریں ہٹا کر مدحیہ کی حوصلہ افزائی کی اور اسے داد دی

تھی۔ ”تمہیں کیسا لگا؟“ وہ جیڑی سے مخاطب تھی۔
 ”اچھا لگا۔“ وہ آہستگی سے کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا تھا اور باقی سبھی اسے دور جاتا ہوا دیکھنے لگے۔



وہ تقریباً دو بجے کورٹ سے فارغ ہوا تھا اور کورٹ سے فارغ ہونے کے بعد اس کا ارادہ گھر جانے کا تھا لیکن جب اس کے لیڈر نے بتایا کہ آفس میں کافی زیادہ کام ہے تو پھر اس نے کچھ دیر کے لیے آفس کا چکر لگایا بھی مناسب سمجھا تھا۔ ابھی وہ پارکنگ کی سمت جا ہی رہا تھا کہ انسپکٹر شہناز سے ٹکراؤ ہو گیا وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی اسے دیکھ کر مسکرائی تھی اور اس کی مسکراہٹ بھی ہمیشہ والی شوخی و شرارت لیے ہوئے تھی۔
 ”سلام شاہ جی۔“ اس نے اپنی خوشی کے اظہار کے طور پر دل اور شاہ کو سلوٹ کیا تھا۔

”سلام کیسی ہیں آپ؟“ وہ چاہتے ہوئے بھی بے مروتی نہ دکھاسکا کیونکہ اسے پتا تھا وہ کبھی پیچھا نہیں چھوڑے گی۔

”ایک دم فٹ ہوں شاہ جی، لیکن آپ آج کل کچھ الجھے بکھرے دکھائی دے رہے ہیں؟“ وہ قریب آکھڑی ہوئی۔

”یہ بھی لوگوں کی نظر کا دھوکا ہے۔“ دل اور شاہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا یوں جیسے وہ انسپکٹر شہناز کے سوال سے غفلت ہوا ہو۔

”اور! تو آپ یہ مان رہے ہیں کہ آپ دھوکا بھی دیتے ہیں۔؟“ انسپکٹر شہناز کا انداز معنی خیز تھا۔
 ”صرف دھوکا ہی نہیں دیتا ہوں۔“ وہ جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر سگریٹ ہونٹوں میں دباتے ہوئے بولا اور ساتھ ہی لائیکٹر سے سگریٹ کو شعلہ دکھا دیا۔

”کام تو دونوں ہی خطرناک ہیں۔“ وہ ہونٹ سکیڑ کر بولی۔
 ”اسی لیے تو کہتا ہوں بچ کے رہا کریں۔“ دل اور شاہ نے اسے ڈرایا اور وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بے ساختہ کھلکھلا کر ہنسی تھی۔

”شاہ جی یہ بھی خوب کہی آپ نے۔“ وہ ہنستے ہوئے بولی۔
 ”ظاہر ہے میرا فرض بنتا ہے کہ میں آپ کو باز رکھوں، آگ سے کھیلنا خطرناک ہی تو ہے۔“ وہ سگریٹ کا کش لے کر دھواں فضا میں اڑانے جا رہا تھا انداز دونوں کا غیر سنجیدہ تھا۔
 ”آپ بھول رہے ہیں شاہ جی، آگ جہاں بھی ہو پتنگ ضرور آتا ہے۔“

”ہاں جانتا ہوں وہ پتنگا جل کے مر بھی جاتا ہے۔“
 ”لیکن شاہ جی مرنے سے پہلے آگ کو چھو تو لیتا ہے نا۔ چھونے کی حسرت دل میں لے کر نہیں مرنے چاہیے کچھ بھی ہو جائے اپنی حسرت تمام کر لیتا ہے۔“ انسپکٹر شہناز کو اس کی باتوں سے اختلاف تھا۔
 ”اور یعنی آپ بھی حسرت تمام کرنا چاہتی ہیں؟“ دل اور نے اسے جان بوجھ کر چھیڑا۔

”میں حسرت تمام نہیں کرنا چاہتی بلکہ تمام حسرتیں کرنا چاہتی ہوں۔“
 ”ماشاء اللہ کیا خیالات ہیں میڈم کے۔“ اس نے سراہا۔

”میڈم بلاوا آچکا ہے۔“ اچانک ایک لیڈی کا نیپیل تیزی سے قریب آئی اور اپنی میڈم کو اطلاع دی۔
 ”چلیں شاہ جی آج کے لیے بخشا آپ کو پھر ملاقات ہوگی۔“ اس نے جیسے عنایت کی تھی۔

”بڑی مہربانی ہے میڈم، بخشے کا شکریہ الگ ہے۔“ دل اور نے عاجزی سے کہا اور وہ مسکراتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ وہ گہری سانس کھینچ کر زمین پر پھینک کر پاؤں سے مسلتا ہوا اپنی گاڑی کی طرف آگیا تھا۔
 جیسے ہی وہ آفس پہنچا اس کا لیڈر الرٹ کھڑا تھا اس نے رفتہ رفتہ تمام کیسز کی تفصیلات نکال کر سامنے رکھنا شروع کر دیں۔

”اب سے تمام کیسز کی ڈیش نو مبر کے بعد کی ہونی چاہیں میں دو تین کیسز کے سلسلے میں کراچی جا رہا ہوں جن کو نمٹاتے ہوئے چند دن تو لگ ہی جائیں گے بلکہ ہو سکتا ہے زیادہ عرصہ لگ جائے۔“ اس نے لیڈر کو سب کچھ سمجھاتے ہوئے اطلاع دی۔

”لیکن سر دو تین کیسز کی تو نو مبر سے پہلے۔“
 ”ہوں! جانتا ہوں تم بس تمام کیسز کی تاریخیں لیتے جانا، کوئی فرق نہیں پڑے گا، باقی جو ہوگا بعد میں دیکھا جائے گا۔“ وہ چند کانڈوں پر سائن کرنے کے بعد اپنے لیڈر کا در کوبتا جا رہا تھا۔

”آپ جاکر رہے ہیں؟“ قادر تھوڑا پریشان ہو چکا تھا۔
 ”ابھی کچھ فائل نہیں ہے آج ڈسکشن ہوگی پھر ہی کچھ پتا چلے گا۔“
 ”سر کل ایک لڑکی آئی تھی آفس میں۔“

”پھر؟“
 ”اپنا کیس ریکارڈ کروا کے گئی ہے۔“
 ”کیا نام تھا؟“ اس نے مصروف سے انداز میں پوچھا۔

”مومنہ بی بی۔“
 ”اوہ ہاں! مومنہ بی بی پھر تم نے کیس ریکارڈ کیا؟“
 ”جی کر لیا تھا۔“ قادر سوڈب سے لہجے میں بولا۔

”اس کی کیس کی ایک کاپی مجھے دے دو۔“
 وہ فائل منڈ کرتے ہوئے بولا اور بین پہ کیپ چڑھا کر نیپل پہ ڈال دیا۔
 ”جی سر ابھی تیار کروا لیتا ہوں۔“ قادر اٹھ کر ایک کی سمت بڑھ گیا۔ ”بس پانچ منٹ میں مکمل کرو سب کچھ۔“

اور ہاں وہ لڑکی اپنا کوئی کالٹیکٹ نمبر وغیرہ دے کر گئی ہے یا نہیں؟“ اس نے کچھ یاد آنے پہ پوچھا۔
 ”نہیں سر! نمبر وغیرہ تو کوئی نہیں دیا۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔
 ”اوکے! اب اگر وہ دوبارہ آئے یا پھر کوئی رابطہ کرے تو اس سے نمبر ضرور لے لینا اور میرے نمبر پر فارورڈ کر دینا“

میں اس سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
 ”جی سر! کروں گا۔“ قادر دوبارہ سر ہلاتے ہوئے پلٹ گیا تھا۔
 اور وہ خود گھڑی دیکھتے ہوئے ایک اور کیس کی فائل نکال کر چیک کرنے لگا اسے ابھی کیس چیک کرتے ہوئے

بس منٹ ہی گزرے تھے کہ اس کا سیل فون بجنے لگا۔
 ”السلام علیکم۔“ فال ریسیو کرتے ہی سلام کرنا اس کی عادت تھی۔
 ”وعلیکم السلام کیسے ہو؟“ نیپل کی آواز آج کچھ نارمل اور ریلیکس لگ رہی تھی۔

”کیسا ہو سکتا ہوں؟“ وہ کرسی کی بیک سے نیک لگاتے ہوئے بولا۔
 ”بھانگنا۔“ نیپل قہقہہ لگاتے ہوئے ہنسا تھا اور اس کے انداز پہ خود دل اور کے چہرے پہ بھی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں؟

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رزیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹخ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ پریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریٹخ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

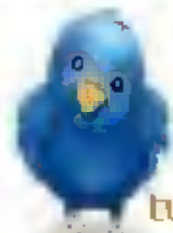
اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

”یہ بات تم میری اماں کے سامنے کہو تو وہ تمہیں اس بات کا مڑا چکھائیں۔“ دل آور نے جیسے اسے دھمکی دی تھی۔
”ارے یار ماؤں کا کیا ہے؟ اچھے خاصے رہسلا بیٹے کو دیکھ کر بھی کہہ دیں گی۔ بے چارہ کمزور ہو گیا ہے۔ اتنا سامان نکل آیا ہے نہ جانے کس کی نظر لگ گئی ہے؟“ نیل نے جس لمحے میں کہا دل آور اپنا تقسیمہ نہ روک سکا۔
”ارے یہ عبد اللہ کے انداز و اطوار تم نے کہاں سے سیکھ لیے؟“ اس نے ہنستے ہوئے پوچھا تھا۔
”عبد اللہ کے ساتھ رہوں گا تو اسی کے انداز سیکھوں گا نا؟“ نیل بھی ہنس رہا تھا۔
”یعنی میرے ساتھ رہو گے تو میرے سیکھو گے؟“ دل آور نے معنی نکالے۔
”اف! توبہ کرو یا اس دنیا میں ایک ہی دل آور شاہ کافی ہے کہاں میں بے ضرر سا! مسکین سا آدمی اور کہاں تم جیسا بھلے۔“

نیل نے توبہ توبہ کرتے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگائے۔
”کیا اتنا برا ہوں یا ر؟“ دل آور کا لہجہ ایسا تھا کہ نیل فوراً ”سنبھل گیا۔“
”ارے نہیں یار تم تو اپنی جان ہو یہ سب تو ایک مذاق ہے۔“
”دیکھا اس طرح سیدھی لائن پہ لاتے ہیں؟“ اب کی بار دل آور کا لہجہ غیر سنجیدگی میں بدل چکا تھا اور نیل اس کی شرارت سمجھ کر اسے برے برے القاب سے نوازنے لگا۔
”لو کہے۔ اوکے یہ سب بعد میں بھی ہوتا رہے گا تم یہ بتاؤ نکلت کون سی ایسٹ کے کنفرم ہوئے ہیں؟“ دل آور نے بات سمجھتے ہوئے پوچھا۔
”اس ماہ کی اٹھائیس کے۔“

”ہاں اٹھائیس فرائڈے ہی ہو گا۔“ اس نے بھی اندازہ لگایا۔
”تم نے گھر میں سب کچھ چیک کر لیا؟“ نیل اپنے گھر کے متعلق پوچھ رہا تھا۔
”ہاں میں کل گیا تھا پورے گھر کی صفائی نئے سرے سے کروائی ہے، بچن کا سامان بھی میں نے گلاب خان کے ہاتھوں بھجوا کر سارا بچن سیٹ کروایا ہے، آپ لوگوں کے بیڈ رومز میں نے خود چیک کیے ہیں سب کچھ پرفیکٹ ہے، لیکن پھر بھی کوئی کمی رہ جائے تو میری طرف سے معذرت۔“ دل آور کا لہجہ ابھی سے معذرت خواہانہ تھا۔
”میں تمہاری ایسی بکواس پہ کان دھرنے والا نہیں ہوں۔“ نیل نے لاپرواہی سے کہہ کر اللہ حافظ بولا اور فون بند کر دیا اور وہ اپنے بند موبائل کو دیکھ کر مسکرا دیا تھا۔

”استاد! باؤ عدیل اس کام کے قابل تو نہیں تھا جس کام میں تم نے ڈال دیا ہے۔“ چھوٹے کے پیٹ میں کوئی بات اور دماغ میں کوئی خیال کبھی نکلتا نہیں تھا فوراً ”زبان پہ آجاتا تھا۔ چاہے اچھا ہو چاہے برا۔ ابھی بھی وہ اپنے استاد کو ہی افسوس بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”مالا لقی! میں نے اسے اس کام میں نہیں ڈالا وہ خود اس کام میں پڑا ہے۔ مجھے ایک سمجھ دار اور ایماندار آدمی چاہیے تھا اور اسے گھروالوں کے لیے دو وقت کی روٹی، مجھے میری مرضی کا آدمی مل گیا اور اسے دو وقت کی روٹی۔ اور دیتے بھی وہ تو اتنا مجبور تھا کہ سڑکوں پہ جھاڑو لگانے اور باتھ روم صاف کرنے کے لیے بھی تیار تھا تو کیا یہ کام برا ہے ان کاموں سے؟“ باؤ اقیانوس بھی بے چارہ سچ کہہ رہا تھا لیکن پھر بھی سب کو عدیل کی قسمت پہ افسوس تھا اتنا پڑھنے لکھنے کے بعد بھی اس کی قسمت میں بے شمول اور ڈیزل کی کانک ہی لکھی تھی تو بہتر تھا کہ وہ ان پڑھ ہی رہتا دل

میں کچھ بننے کا خواب تو نہ پیدا ہوتا تھا!۔
”لگتا ہے اس ورکشاپ میں آپ دونوں کے راز و نیاز کچھ زیادہ ہی ہوتے ہیں؟“ عدیل ان دونوں کے قریب چلا آیا تھا۔

”نومہ داریاں بھی تو ہم دونوں پر زیادہ ہیں۔“ چھوٹے نے گروں اکڑا کے کہا۔
”اویس کم بخت گروں ڈھیلی رکھا کر ٹوٹ جائے گی، سوکھے سڑے تیلے کی طرح تو ہے۔“ باوا امتیاز نے اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا اور عدیل بمشکل اپنی مسکراہٹ روکنے میں کامیاب ہوا تھا بھی چھوٹے کا منہ سن گیا۔
”تو کچھ استاد کام وام اپنی جگہ اور عزت بے عزتی اپنی جگہ، میں اپنی انسلٹ برداشت نہیں کر سکتا بتا رہا ہوں تجھے۔“ چھوٹے نے اپنے استاد کو دھمکی دی۔

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، جاؤ صاحب سے چائے لے کر آ۔“ باوا امتیاز لا پرواہی سے بولا۔
”جاتا ہوں جاتا ہوں، پہلے ڈھابے والے کا پہلا کھانا تو صاف کرو، دو سو روپے دینا ہے اس کا، روز جاتا ہوں تو وہ پیسوں کا پوچھنے لگتا ہے، کل بھی پوچھ رہا تھا۔“ چھوٹا اپنی جگہ سے کھڑا ہو چکا تھا لیکن جانے سے پہلے باوا امتیاز کے ساتھ کب نہ کا کرنا چاہتا تھا۔

”اویس منحوس! کل تو میں خود گیا تھا۔۔۔؟“
باوا امتیاز نے اسے کوسا اور چھوٹا پہلے چونکا پھر کھسکا، واقعی غلطی ہو چکی تھی۔
”نہیں نہیں استاد میں شام کی نہیں دن کی بات کر رہا ہوں۔“ اس نے بات سنبھالی۔
”اچھا تو تو پھر اکیلا چائے پینے گیا ہو گا؟“ باوا امتیاز نے تیور بدلے تو چھوٹے کو لائن پہ آنا پڑا۔
”ارے استاد کل نہیں پر سولہ دن کی بات۔“

”جاتا ہے یا ماروں کچھ؟“ باوا امتیاز نے گھورتے ہوئے جھٹ کر قریب بڑی لوبے کی ہتھوڑی اٹھالی اور چھوٹا ورکشاپ سے گدھے کے سر سے سینک کی طرح غائب ہو گیا اب کی بار عدیل بھی نہیں روک پایا تھا۔
”آپ نے سچ ہی کہا تھا کمال کا پرزہ ہے یہ بھی۔“ عدیل اس کی باتوں اور حرکتوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔
”اسی لیے تو کہا تھا کہ اسی کے دم سے رونق ہے۔“ باوا امتیاز مسکرا دیے۔
”واقعی اس میں کوئی شک نہیں۔“ عدیل کو ان سے اتفاق تھا۔

”جلو اللہ خیر رکھے تم بھی رفتہ رفتہ سب سے واقف ہو جاؤ گے، آج کا دن بھی آخر ختم ہو ہی گیا، یہ تو تمہاری پہلی دہائی۔“ باوا امتیاز نے جیب سے کچھ روپے نکال کر اس کی سمت بڑھائے، پہلی کمائی کی صورت میں۔
”دہائی؟ لیکن میں نے تو آج کا پورا دن کوئی کام ہی نہیں کیا؟“ عدیل نے تعجب بھری نظروں سے دیکھا۔
”بے شک نہیں کیا، لیکن آج کے دن سے تم اب اس ورکشاپ میں شامل ہو چکے ہو، تمہارا حصہ بھی سب کے ساتھ ہی ہو گا۔“ انہوں نے انصاف سے کام لیا۔

”لیکن چاچا۔“ عدیل متذبذب تھا۔
”ارے چھوڑو، آج پہلا دن ہے، خالی ہاتھ گھر جائے گا تو گھر والے کیا سوچیں گے؟ تو ایسا کر آج ان پیسوں سے گھر والوں کے لیے کچھ کھانے پینے کی چیزیں لے جا۔“ باوا امتیاز نے زبردستی وہ پیسے اس کی جیب میں ڈال دیے۔

”اور ہاں آئندہ کام کرے گا تو دہائی ملے گی ورنہ ایسی عیاشی روز روز نہیں ہوگی۔“ انہوں نے اسے ساتھ ساتھ آگاہ کرنا بھی ضروری سمجھا تھا جس پر عدیل ممنونیت سے مسکرا دیا تھا اتنے میں سلو اور جیدی بھی پاس آگئے اور چھوٹا بھی چائے لے کر حاضر ہو گیا تھا۔

”بھائی!۔“

”ہوں؟“

”آپ نے جھوٹ کیوں بولا؟“

”کون سا جھوٹ؟“ وہ انجان بنا۔

”جواب دالا۔“ مریم اس کے کپڑے نکالتے ہوئے آستنگی سے پوچھ رہی تھی۔

”جواب دالا؟ کیا مطلب؟“ عدیل نظریں پڑائے ہوئے بات کر رہا تھا۔

”ارے یا رجا بلی ہے تو سب کچھ لے کر آیا ہوں نا۔؟“

”نہیں مانتی ہوں آپ کو جاب ملی ہے لیکن وہ نہیں ملی جو آپ نے ابا جی اور امی کو بتائی ہے۔“ عدیل کھانے پینے کی چیزیں اور کچھ گھر کی ضرورت کی اشیاء لے کر گھر میں داخل ہوا تو سبھی بہت خوش ہوئے تھے انہوں نے فوراً اس کے کام کی نوعیت پوچھی تھی اور وہ اپنی نوکری کی بابت بتاتے ہوئے کترا گیا تھا اس لیے جھوٹ بول دیا کہ ایک کمپنی میں ملازمت ملی ہے لیکن محدود مدت کے لیے اور اس وقت اس کے گھر والوں کے لیے محدود مدت بھی کسی نعمت سے کم نہیں تھی۔ چار دن تو اچھے گزر رہے جاتے۔ لیکن مریم اس کے جھوٹ سے مطمئن نہیں ہوئی تھی۔
”تو پھر کون سی ملی ہے؟“ عدیل اس کے ہاتھ سے کپڑے لیتے ہوئے گھور کے بولا۔

”یہ تو آپ ہی بتا سکتے ہیں، مجھے المام تو نہیں ہو گا نا؟“

”جب اتنا برا شک ظاہر کر رہی ہو یہ کبھی تو کسی المام کی بنا پر ہی کر رہی ہونا؟“

”نہیں بھائی یہ شک نہیں یہ میرا یقین ہے۔“ مریم المام کی ہند کر کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

”کیا کرو گی شک اور یقین کو الگ کر کے؟“

”دھوکے کی خوشی سے بچ جاؤں گی، جو آپ نے امی، ابا کو دی ہے، منہ ایک جھوٹی خوشی۔۔۔۔۔۔“ مریم تلخی سے بولی۔

”لیکن یا رمجھے کام تو مل ہی گیا ہے نا؟ اب اتنا پریشان ہونے والی کیا بات ہے؟“ عدیل نے اسے ہلانا چاہا۔

”لیکن کام کا پتا تو چھپے؟“

”مریم! عدیل نے خشکی سے کہا۔

”آپ مجھے بتادیں میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔“ وہ ہلنے والی نہیں تھی۔

”کل صبح جانے سے پہلے بتا دوں گا۔“

”نہیں ابھی بتائیں۔“ مریم کے انداز میں بچوں کی سی ضد تھی۔

”کیا اپنے تک رکھو گی؟“

”ہاں۔“ اس نے سر ہلایا۔

”وہ دراصل مجھے ورکشاپ میں کام ملا ہے۔“ عدیل رخ موڑتے ہوئے بولا وہ اپنے چہرے کے تاثرات نہیں دکھانا چاہتا تھا۔

”ورکشاپ؟“ مریم کی نظروں میں پورا کمر اچکرا کے رہ گیا تھا اس کا اتلا لاق فائق بھائی کسی اچھی سیٹ پہ کام کرنے کی بجائے ورکشاپ میں کام کرنے کا؟

”آہستہ بولو امی نے سن لیا تو پریشان ہو جائیں گی۔“

”لیکن بھائی۔۔۔“ مریم نے کچھ کہنا چاہا۔
 ”نہیں مریم ناشکری مت کرنا ہمارے لیے یہ بھی بہت بڑی نعمت ہے، اللہ کا احسان ہے ہم پر۔“ عدیل نے اسے کچھ کہنے سے روک دیا تھا اور خود نہانے کے لیے غسل خانے میں چلا گیا مگر مریم ابھی تک بے حس و حرکت کھڑی تھی اس کی نظموں میں غام و رکشاہوں کے مناظر گھوم گئے جہاں کوئی بھی کام کرنے والا اپنی اصلی حالت میں نہیں ملتا تھا جہاں ہر وقت ٹھوکھا لگنے کی آوازیں اور ڈیزل کی بدبو سنا پڑتی تھی

تمہیں دل لگی بھول جانی پڑے گی
 محبت کی راہوں میں آکر تو دیکھو
 تڑپنے پہ میرے نہ پھر تم ہسو گے
 کبھی دل کسی سے لگا کر تو دیکھو
 وفاؤں کی ہم سے توقع نہیں ہے
 مگر ایک بار آزما کر تو دیکھو

کمرے میں گونجتی نصرت فتح علی خان کی آواز گمرے کے ماحول کو خاصا سوز بخش رہی تھی اور اس سوز کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کرتی زری اپنی سوجوں اور اپنے خوابوں کے ہمراہ کہیں سے کہیں پہنچی ہوئی تھی اس کی روح کسی کی یاد کی مہک طاری تھی اور وہ اس مہک سے مسحور ہوتی موجودہ ماحول سے دور ہوتی چلی گئی تھی وہ بھی کبھی فرصت سے اسے دل کے تحت پہ بٹھا کر خود اس کے سامنے اس کے قدموں میں بیٹھتی تو اسے دیکھتے دیکھتے دو عالم بھول جاتی تھی اور اس وقت بھی اس کا یہی حال تھا وہ راکنگ چیر پہ بیٹھی آنکھیں بند کیے تصور کا جہان آباد کیے ہوئے تھی جہاں وہ اکیلی نہیں تھی جہاں اس سے محبتیں وصول کرنے والا اس کی خواہشوں کی گہرائی میں اس کے قدم سے قدم ملا کر چل رہا تھا جہاں وہ اسے محبت پاش نظموں سے دیکھ رہا تھا اور وہ شرم و حیا سے مغلوب اس سے ٹھوڑا ہٹ کے چل رہی تھی اور لبوں پہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

انہی چال چلتے ہیں یہ دیوانگانِ عشق
 آنکھوں کو بند کرتے ہیں دیدار کے لیے!

اس کی بند آنکھوں اور مسکراتے لبوں نے نگارش کو شکر کہنے پہ مجبور کر دیا تھا زری چونک کر سیدھی ہوئی تھی اور سامنے نگارش کو دیکھ کر وہ جھنجھلا سی گئی۔

”بھابھی۔۔۔“ اس کا لفظ بھی جھنجھلا یا ہوا تھا۔

”جی میری جان؟“ نگارش نے اس کی کیفیت سے حظ اٹھایا۔

”آف! کیا آپ کو ابھی آتا تھا؟“ اس نے منہ بنا کر کہا۔

”کیوں؟ کیا تم رو مینس میں مصروف تھیں؟“ نگارش کی بات پہ اس کا چہرہ اسخ پڑ گیا۔

”پلیز! ابھی کچھ تو خیال کریں۔“ وہ ہنس ہوئی لگ رہی تھی۔

”کیسا خیال؟“

”میرے رو مینس کا۔“ وہ بھی شرارت سے بولی تو نگارش کھکھلا کے ہنس پڑی تھی۔

”ویسے یہ تو بتاؤ رو مینس تم کر رہی تھیں؟ کیا وہ کر رہا تھا؟“ نگارش نے اسے مزید چھیڑا۔

”بھابھی۔“ زری نے اسے شکر دے مارا تھا اور نگارش ہنستے ہنستے بیک پر انہی کی طرف بیٹھ گئی۔

”ویسے یار میں تمہیں ایک بات بتانے آئی تھی۔“ نگارش نے تجسس پھیلا یا۔
 ”کیا؟“ زری کے انداز میں فطری بے ساختگی تھی۔

”عبداللہ اس سے نیٹ پہ بات کر رہے ہیں۔ اسے بیڈ روم میں بیٹھا ہے بہت چار منگ لگ رہا ہے، چلو تمہیں بھی دکھاؤں۔“ نگارش نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اٹھنے کا کہا۔

”کون چار منگ لگ رہا ہے؟“ زری نے ناگہبی سے پوچھا۔

”مستمرہ آپ کے دل اور شاہ صاحب اور کون بھلا؟“ نگارش نے گھورا زری اس کے اس طرح نام لینے پہ گھبرا گئی تھی۔

”پلیز! آہستہ تو بولیے۔“

”اچھا چلو تمہیں دکھاتی ہوں۔“ نگارش نے پھر اس کا ہاتھ کھینچا۔

”نہیں نہیں میں نہیں جاسکتی۔“

”کیوں؟ تم کیوں نہیں جاسکتیں؟“

”بس اچھا نہیں لگتا اس طرح۔“

”لیکن یار تم میرے ساتھ چل رہی ہو۔ اس میں بھلا کیا برائی ہے؟“

”برائی کچھ نہیں ہے لیکن میرے جانے سے وہ بڑی جلدی کیمرہ آف کر دے گا۔“

”تو کر دے، کم از کم تم دیکھ تو لو گی؟“

”دیکھنے کو چھوڑیں آپ ہی بتا دیں کہ کیسا لگ رہا ہے؟“ زری دلچسپی سے بولی۔

”جیسا ہمیشہ لگتا ہے۔“

”کیا کر رہا ہے؟“

”چائے پی رہا ہے۔“ نگارش خفگی سے بول رہی تھی۔

”چائے کے بعد یقیناً“ سگریٹ پیے گا۔“ زری کو اس کی عادت کا پتا تھا وہ اس کی اک اک حرکت بڑے غور سے نوٹ کرتی تھی۔

”ظاہر ہے یہ تینوں دوست سگریٹ بہت پیتے ہیں، کئی بار عبداللہ سے کہہ چکی ہوں پلیز اسموکنگ ختم کر دیں لیکن مانتے ہی نہیں ہیں کہتے ہیں جس روز باقی دونوں نے بھی ختم کر دی اس دن میں بھی کر دوں گا۔“ زری والی خفگی کا رخ عبداللہ کی اسموکنگ کی طرح مڑ چکا تھا۔

”تو آپ باقی دونوں سے کہہ دیں کہ وہ اسموکنگ ختم کر دیں۔“ زری نے اسے چھیڑتے ہوئے آئینہ یادایا۔

”ہاں! ہاں! اراوند اراں جب تمہاری شادی ہوگی تو پھر پوچھوں گی تم سے کہ شوہر کی اسموکنگ کرنے کی عادت سے کتنی چڑھوتی ہے۔“ نگارش نے گھورتے ہوئے کہا تھا۔

”مجھے اپنے شوہر کی کسی بھی عادت سے چڑ نہیں ہوگی کیونکہ اس کی تمام عادتیں مجھے پسند ہیں، میرے دل پہ لکھی ہوئی ہیں۔“

زری نے مسرور سے انداز میں جواب دیا۔

”ماشاء اللہ شادی سے پہلے میں بھی یہی کہتی تھی۔“ اب مذاق اڑانے کی باری نگارش کی تھی۔

”آپ! آپ ہیں اور میں! میں ہوں۔“ زری کو اپنی محبت پہ یقین تھا۔ لیکن نگارش پھر بھی متفق ہونے والی نہیں تھی کیونکہ اسے پتا تھا کہ شادی کے بعد میاں بیوی ایک دوسرے کے لیے کتنے خندی اور ڈھیٹ ہو جاتے ہیں۔ اک دوسرے کی بات ماننا گناہ سمجھتے ہیں۔

”چلو وقت آنے لگا دیکھیں گے۔“ نگارش نے چیلنج کیا تھا۔

”ان شاء اللہ۔“ زری نے مسکرا کر کہا۔

”نگارش؟“ اچانک عبداللہ بجلت میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تھا۔

”جی؟“ وہ دونوں متوجہ ہوئیں۔

”دل اور تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔“ عبداللہ کے کہنے پہ نگارش نے زری کو دیکھا وہ فوراً ”نظر چھٹائی۔“

”جی آری ہوں۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اور ہاں زری تم میرے لیے ایک کپ چائے لے آؤ۔“ عبداللہ نے جاتے جاتے کام بھی کہہ دیا اور زری بری طرح ٹھٹھکی گئی تھی۔ جس کام سے کتراری تھی وہی کام سامنے آگیا تھا مجبوراً ”انٹھنے کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آیا تھا لیکن اس نے انٹھنے کے ساتھ ساتھ حل بھی سوچ لیا تھا۔ سوہنے سکون اور اطمینان سے چائے بنانے آئی تھی۔ اس نے تین کپ چائے بنائی۔ نگارش اور عبداللہ کے لیے دو کپ ٹرے میں رکھ کر ان کے کمرے تک آئی اور دروازے پہ دستک دی۔

”آجاؤ زری۔“ عبداللہ کی آواز میں لاپرواہی تھی لیکن زری کو اپنی بے اختیاری یہ کوئی اختیار نہیں تھا اس لیے وہ اندر نہیں جانا چاہتی تھی اسے پتا تھا کہ وہ اسے دیکھتے ہوئے باقی سب کچھ فراموش کر بیٹھتی تھی اور اس کی نظروں کی محویت یقیناً ”گڑبڑ“ کر سکتی تھی۔ لہذا احتیاط ہی بہتر تھی۔

”بھائی چائے لے لیں میں نیچے چو لہا کھلا چھوڑ آئی ہوں میں نے نیچے جانا ہے۔“ اس نے سوچا ہوا ہمانا گھڑا۔

”چو لہا کیوں کھلا چھوڑ دیا۔“ عبداللہ دروازہ کھول کے باہر نکلا۔

”بھوک لگ رہی تھی کباب تلنے لگی ہوں۔“ اس نے ٹرے عبداللہ کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے واپس بھاگنے کی سوچی۔

”تو پھر مجھے بھی دے جانا۔“ عبداللہ نے پیچھے سے آواز دی اور زری ٹھٹھکی۔

”میں اب کباب تلنے پر دس گئے؟“ زری کا جھوٹ اس کے اپنے ہی گلے پر دیا تھا وہ منہ بتاتی فریج سے کباب نکال کر چو لہا جلانے لگی۔ رات کے بارہ بجے وہ اپنے جھوٹ کے ہاتھوں مجبور بن کر کھڑی کباب تل رہی تھی۔

پورے فلیٹ میں اتنی خاموشی اور اتنا سا ناگوار تھا کہ اس کی سانسوں کا ارتعاش بھی شور مچا لگ رہا تھا۔ وہ تکیے پہ سر رکھ کر ہنسنے لگا۔ لیٹا دیا وہ جہاں سے بے خبر گمری نیند کی آغوش میں بے سدھ پڑا تھا پورے کمرے میں پھیلاوا ایسا تھا کہ یوں لگ رہا تھا مہینہ بھر روزانہ صفائی ستھرائی ہوگی تو یہ پھیلاوا اسٹے گا۔ سگریٹ کے ٹکڑے، شراب کی خالی بوتلیں، جوس اور کولڈ ڈرنک کے خالی کین، استعمال شدہ ٹشو، قالین پہ بکھری ہوئی سی ڈیز، کشنوز اور تکیے اور ایسی ہی اور بھی بے شمار اشیاء تھیں جن کو دیکھ کر دماغ گھوم کے رہ جاتا لیکن وہ اس سب کے باوجود اتنے پھیلاوے میں بھی سکون کی نیند سو رہا تھا اور اس کی اس نیند اور سکون میں خلل اس کی مام نے ڈالا تھا۔

تکیے کے نیچے رکھے موبائل کی واٹرپروٹیکشن اتنی تیز تھی کہ نیند کے باوجود وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا تھا۔ اور پھر اس سارے ماحول کو سمجھنے کی کوشش کی۔ چند سیکنڈ غور کرنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ وہ اپنے دوست سائیم کے فلیٹ پہ ہے اور رات سے یہیں پہ ہے آج تو وہ رات کو بھی جوبلی نہیں گیا تھا اور جوبلی کا خیال آتے ہی وہ تھوڑا محتاط ہو گیا تھا اس نے لپک کے تکیے کے نیچے سے اپنا موبائل نکال لیا۔

”ہیلو۔“ اس نے کال اٹینڈ کر لی۔

”جوہر؟“ ان کے لہجے کا غصہ اور کاسٹ وہ با آسانی محسوس کر رہا تھا۔

”پیس مام؟“ وہ آہستگی سے بولا۔ اور دوسری طرف ثروت بیگم اس کی نیند سے بوجھل آواز کو فوراً ”بھانپ گئیں وہ ابھی سو کر اٹھا ہے۔“

”رات سے کہاں ہو؟ گھر کیوں نہیں آئے؟“ ان کا زری سے عاری لہجہ جوہر کو بہت جلد نیند کے شکنجے سے نکال کر اس کے انہی ہٹو ہٹو اور لا پرواہ انداز میں لے گیا تھا۔

”آپ اتنی فکر مند کیوں ہو رہی ہیں؟ جہاں بھی ہوں زندہ ہوں۔“ وہ بالوں میں ہاتھ پھیرتا دوبارہ بیڈ پہ لیٹ گیا تھا۔

”مجھے بھی پتا ہے زندہ ہو، اسی لیے تو کال سن رہے ہو، مگر میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ تم رات گھر کیوں نہیں آئے؟“ ثروت بیگم کو احساس تھا کہ وہ دن بہ دن اور زیادہ بگڑتا جا رہا تھا اس کی سرکشی بڑھتی جا رہی تھی اور وجہ یہ تھی کہ جوبلی کے مروجہ حضرات اس کی ایسی اوفرانہ حرکات سے بے خبر تھے ابھی تک انہوں نے اس کے آنے جانے کا اور یا رد دستوں کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا تھا اسی لیے وہ تھوڑا آزا اور بے فکر ہو کر یہ سب کچھ کرتا پھر رہا تھا۔

”وجہ بتانا میں ضروری نہیں سمجھتا۔“ اس کی آنکھوں میں رات کے مناظر گھوم گئے۔

”وجہ میں جانتی ہوں۔“ وہ چبا کے بولیں۔

”پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہیں؟“ وہ ماں کی ذہانت پہ چونکا مگر پھر سنبھل گیا تھا۔

”تمہارے منہ سے سنا چاہتی ہوں۔“ انہوں نے زور دے کر کہا۔

”دیکھو جوہر، شرافت سے گھر آجاؤ، اور بھی آنے والا ہے وہ پہلے ہی پریشان ہے صبح سے دھکے کھاتا پھر رہا ہے۔ اگر اسے تمہاری رات بھر کی غیر موجودگی کا پتا چلا تو بہت برا ہو گا۔“ ثروت بیگم زیادہ دیر اپنی پریشانی چھپا نہیں سکتی تھیں۔

”آؤ بھائی پریشان کیوں ہیں؟ اور صبح سے دھکے کس لیے کھا رہے ہیں؟“ اس کے لہجے کی ٹاپروائی ہنوز تھی البتہ اندر سے وہ بھی ٹھٹھکی رہا تھا۔

”کیا تمہیں ابھی تک نہیں پتا چلا؟“ ثروت بیگم کو حیرانی ہوئی حالانکہ جانتی بھی تھیں کہ وہ ابھی سو کر اٹھا ہے۔

”کیا مطلب؟“ مام آپ بتائیں نا کیا ہوا ہے۔“ وہ ابھن آمیز انداز سے بولا۔

”آج صبح علیزے کالج جا رہی تھی جب اچانک راستے میں دو موٹر سائیکل سوار آئے اور گاڑی پہ فائرنگ کر کے بھاگ گئے۔“

”میں؟ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ جوہر تیکدم اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

”ٹھیک کہہ رہی ہوں خیر بابا ہسپتال میں ہیں ان کو گولی لگی ہے، زندگی اور موت سے لڑ رہے ہیں، علیزے ابھی تک وہشت اور خوف کے مارے روئے اور چلائے جا رہی ہے یہ بھی کافی بے حال ہو چکی ہے، آؤ پولیس اور پریس والوں کی طرف بھاگ دوڑ کر رہا ہے احمد اور دانیال وغیرہ بھی ہسپتال میں ہیں خیر بابا کے پاس، عمون، عدید اور زین وغیرہ تو ہیں ہی پتھوئے وہ بھلا کیا کر سکتے ہیں؟ اور ایک تم ہو جس کو کچھ خبر ہی نہیں ہے، جس کی لاپرواہیاں خود ایک مصیبت بن چکی ہیں۔“ ثروت بیگم کی بات پہ جوہر نے اندر ہی اندر ان لوگوں کی پریشانی اور اپنی کوتاہی کا احساس ہوا تھا وہ حقیقتاً ”گھر اور گھر والوں سے بے خبر اور لا تعلق“ رہنے لگا تھا۔

”خیر بابا کس ہسپتال میں ہیں؟“ جوہر نے تیزی سے اٹھتے ہوئے پوچھا اس کا رخ ہاتھ روم کی طرف تھا وہ شاہ ولیا چاہتا تھا۔

”تم ہسپتال جانے کی بجائے گھر آؤ۔“

”کیوں؟ اس نے اچھے سے دیکھا۔

”کیونکہ گھر پہ کوئی نہیں ہے صرف تمہارے ڈیڈ اور ڈیڈی وغیرہ ہیں، ہو سکتا ہے کوئی کام ہی رہ جائے؟ کسی لڑکے کا حویلی میں ہونا ضروری ہے۔“ ثروت بیگم نے اسے سمجھایا اور پچھ دیر کے لیے تو وہ واقعی سمجھ بھی گیا تھا۔

”ٹھیک ہے میں گھر ہی آ رہا ہوں۔“ اس نے اثبات میں جواب دیا تو انہوں نے فون بند کر دیا تھا۔ لیکن ان کی کال بند ہو جانے کے بعد بھی اس کا ذہن ان کی باتوں کے گرد ہی چکر اتار رہا تھا وہ بڑے الجھن بھرے انداز میں علیز سے یہ ہونے والی فائرنگ کے متعلق سوچتا شور لے کر تیار ہوا اور فلیٹ سے باہر نکل آیا تھا۔

”ارے کہاں جا رہے ہو؟“ سامنے سے آتے سامنے نے حیرت سے استفسار کیا تھا۔

”حوالی۔“

”لیکن کیوں؟ تم تو کہہ رہے تھے آج بھی یہیں رکو گے؟“ سام نے آج رات کے لیے بھی کافی بندوبست کر رکھے تھے اسی لیے متشکر ہو رہا تھا۔

”نہیں یاد رکھو، اب ہم ہو گیا ہے گھر جانا ضروری ہے۔“ جودت کو اس وقت کسی چیز سے بھی دلچسپی نہیں تھی۔

”کیا مطلب؟ کیسی پر اہم؟“ سام ٹھٹکا۔

”ابھی تو مجھے خود بھی ٹھیک سے نہیں پتا بس مام کی کال آئی تھی۔“ جودت نے چابی نکال کر سام کے حوالے کی۔

”تو وہ تمہارا رات والا پروگرام؟“

”یاری کنسل کرو۔“ جودت جھنجھلا کر بولا اور پھر سام کو ایک طرف بنا کر خود سیڑھیاں اتر گیا تھا وہ کسی چیز کا نوٹس نہ لیتا تو کبھی نہ لیتا لیکن اگر لے لیتا تھا تو پھر پوری طرح سے انوالو ہو کر نوٹس لیتا تھا عام طور پر وہ بھی حویلی والوں کی کوئی فکر اور قدر نہیں کرتا تھا لیکن کچھ رشتے ایسے تھے کہ جن سے وہ حقیقتاً ”انسیبیت“ رکھتا تھا اور ان کی عزت اور قدر کرتا تھا اس کی کزنز کو مل اور علیز سے بھی انہی رشتوں میں شمار ہوتی تھیں لہذا علیز سے کی پریشانی پریشان ہونا اس کے دل کی بے اختیاری حرکت تھی۔

وہ گھر پہنچا تو سب سے پہلے علیز سے ملنے ہی گیا تھا مگر وہ سو رہی تھی سو مجبوراً ”نیچے ڈرائنگ روم میں چلا آیا جہاں باقی سب بھی بیٹھے ہوئے تھے اپنی الجھن اور پریشانی میں کسی نے بھی اس کی آمد پر دھیان نہیں دیا لیکن اسرار آفندی کے برابر بیٹھی ثروت بیگم کی ملا متی نظرس اسی پر تھیں وہ کھسیا کر ان سے نظرس چرا تا کوئل سے ساری تفصیل پوچھنے لگا جس پر اسرار آفندی نے ان سب کو ڈرائنگ روم سے باہر بھیج دیا تھا۔

آذر کی سرتوڑ کوشش تھی کہ اس معاملے کو اخبارات اور نیوز چینلز سے دور رکھا جائے تاکہ لوگوں کو کرایڈے اور انگلی اٹھانے کا موقع نہ ملے اور نہیں بھی ملک کے مشہور و معروف بزنس مین وقار آفندی کی بیٹی علیز سے آفندی کا نام غلط انداز سے نہ لیا جائے۔ اور اسی لیے وہ صبح سے ہزاروں جگہوں پر ادھر سے ادھر بھاگ رہا تھا پھر رہا تھا کبھی خیرو بابا کے پاس ہسپتال جاتا، کبھی پولیس اسٹیشن، کبھی پولیس والوں کے دفتر اور کبھی کہیں۔ اسی چکر میں صبح سے شام اور شام سے رات ہو گئی تھی اس نے اس ایک دن میں لاکھوں روپے بھی خرچ کر دیے تھے صرف اس لیے کہ یہ معاملہ دوبارہ اور کسی کے علم میں نہ آئے۔

ایسے معاملوں میں لوگوں کے منہ صرف پیسے دے کر ہی بند کیے جاتے تھے سو اس نے یہ منہ پوری تسلی سے بند کیے تھے ہسپتال سے لے کر پولیس اسٹیشن اور پولیس والوں تک اس نے پیسے کے لڈو بانٹ دیئے تھے اور پیسے کے

لڈو کھانے کے بعد کوئی بھی بولنے کے قابل نہیں تھا اور وہ خود مطمئن ہو کر گر جانے کے لیے ہسپتال سے نکلا تھا۔ خیرو بابا کے پاس وانیال اور احمد کو چھوڑ دیا تھا تاکہ خیرو بابا کو — کسی چیز کی ضرورت پڑے تو وہ لوگ بروقت پہنچاویں۔ آذر کا دھیان ڈرائیونگ کے دوران بھی اسی مسئلے کی طرف تھا اس کے ذہن میں صبح سے کئی سوال چل رہے تھے اور ان سوالوں کے جواب صرف ڈیڈ اور علیز سے کے پاس تھے اسی لیے وہ یہ سوال ذرا فرصت سے کرنا چاہتا تھا تاکہ کسی بخش جواب لے سکتا کیونکہ ان سوالوں کے جواب وہ فون پر نہیں لیتا چاہتا تھا بلکہ رو برو پوچھنا چاہتا تھا۔

رات کے بارہ بجے کا ٹائم تھا جب اس کی گاڑی حویلی میں داخل ہوئی تھی اس وقت بھی تقریباً ”سب ہی افراد جاگ رہے تھے سب ہی کو آذر کا ہی انتظار تھا خصوصاً“ وقار آفندی کو۔

”سلام علیکم۔“ اس نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھتے ہوئے موجود افراد پر طائرانہ سی نگاہ ڈرائی۔

”وعلیکم السلام۔“ وقار آفندی اسے دیکھ کر کھڑے ہو گئے اور اس کے قریب چلے آئے تھے۔

”آؤ بیٹھو، تم ٹھیک تو ہو؟“ وہ اس کے چہرے کی سنگین بھانپتے ہوئے بولے۔

”اس اوکے ڈیڈ میں ٹھیک ہوں۔“ وہ ان کے ساتھ آگے بڑھ کے صوفے پر بیٹھ گیا۔

”جھوک گئی ہے تو کھانا لگو آؤ؟“ ثروت بیگم بیٹے کے لیے فکر مند ہو رہی تھیں۔

”نہیں ابھی نہیں۔“ اس نے نفی میں گردن ہلانی۔

”چائے لو گے؟“

”نہیں کھانے کے بعد لے لوں گا، ابھی کچھ نہیں چاہیے۔“ اس نے دوبارہ انکار کر دیا۔

”خیرو بابا! کیسے ہیں؟ کچھ ہوش آیا؟“ آسیہ آفندی بھی خاصی پریشان تھیں۔

”ہاں پہلے سے ٹھیک ہیں وہ لیکن دوائیوں کی وجہ سے غنوی کی چھائی ہوئی ہے، ان شاء اللہ صبح تک مکمل ہوش میں آجائیں گے۔“ اس نے ان کو تسلی دے دی وہ دیکھ کر بھی ملازمین کی بہت کینز کرتی تھیں۔

”شکرانے کے نفل پڑھوں گی جب وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔“ آسیہ آفندی نے اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے کہا۔

وہ صبح سے خیرو بابا کے لیے متشکر تھیں وانیال وغیرہ سے کئی بار ان کی خیریت پوچھ چکی تھیں۔

”ہوں اچھی بات ہے۔“ اس نے سر ہلایا۔

”آسیہ! تم علیز سے کیسا جاؤ اسے کچھ کھانا وغیرہ دو۔“ وقار آفندی نے ان دونوں خواتین کو وہاں سے جانے کا ایک سا اشارہ دیا تھا وہ خاموشی سے اٹھ کر باہر چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد وہ آذر کی طرف متوجہ ہوئے۔

”کچھ سرا ملا؟“ ان کا انداز تجسس تھا۔

”ڈیڈ سرا ہو تو سراغ ملتا ہے اور یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔“ آذر تخفیف سے بولا۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ بس دو لوگ موٹر سائیکل پہ آئے اور علیز سے کی گاڑی پہ اندھا دھند فائرنگ کر کے بھاگ گئے، ان دونوں کو کسی نے نہیں دیکھا کیونکہ دونوں کے چروں پر روباں بندھے ہوئے تھے وہ کس طرف سے آئے اور کس طرف چلے گئے؟ کچھ پتا نہیں۔ ان کی موٹر سائیکل کا نمبر وغیرہ کیا تھا؟ کچھ پتا نہیں۔ وہ خود ہمارے دشمن تھے یا

محض کرائے کے غنڈے تھے؟ یہ بھی پتا نہیں۔ اور جب ہمیں کچھ بھی پتا نہیں تو سراغ کیسے ملے گا؟“ آذر بے بسی سے لفظ چبا کر بات کر رہا تھا۔ لیکن کچھ یاد آنے پر ٹھنک گیا۔

”ڈیڈ آپ کا سیل کہاں ہے؟“

”کیوں؟“ وقار آفندی چونکے۔

”بس کچھ یاد آگیا ہے۔“ آذر کے انداز میں بے چینی در آئی۔
 ”یہ لو۔“ انہوں نے صوفے کی سائیڈ پر رکھی چھوٹی کرشل ٹیبل سے سیل اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا۔ آذر نے تیزی سے ریسیو ڈکالا کر ریکارڈ چیک کیا۔
 ”صبح جس نمبر سے آپ کو کال آئی تھی کیا وہ لینڈ لائن نمبر تھا؟“ آذر ایک نمبر پر ٹھہرتے ہوئے بولا وہ کفرم کرنا چاہ رہا تھا۔

”ہاں لینڈ لائن نمبر تھا۔“ انہوں نے یاد کرتے ہوئے سر ہلایا۔
 ”اس آدمی نے آپ سے کیا کہا؟“ آذر کے سوال پر وہ چونک گئے اس سوال کا جواب ذرا مشکل تھا ان کے چہرے کی رنگت سرخ پڑ گئی۔
 ”ویڈیو پلیر کھل کے بتائیے کچھ بھی چھپانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے ان کی ہمت بندھائی اور مجبوراً وقار آفندی کو بتانا پڑا نظریں جھکی ہوئی تھیں وہ آدمی ان کی بیٹی کے لیے اتنی ہنگ اور حقارت سے بات کر رہا تھا کہ اس کو دوبارہ سوچتے ہوئے وقار آفندی کے سینے میں آگ لگ گئی تھی۔ اور اس کو سن کر آذر کا چہرہ بھی لال ہو گیا تھا۔

”آپ کے خیال میں یہ آدمی کون ہو سکتا ہے؟“
 کیا آج کل بزنس میں ہماری کسی سے ان بن چل رہی ہے؟“ اس نے وقار آفندی اسرار آفندی اور اظہار آفندی کو ایک ساتھ سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
 ”میں ایسا تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ اسرار آفندی نے نفی میں گردن ہلاتی۔
 ”آپ لوگ ایک بار پھر سارے معاملات کو غور اور دھیان سے سوچ لیں، کبھی کسی سے کوئی جھڑپ کوئی جھگڑا کوئی تو تینوں میں یا پھر کوئی نا انصافی ہوئی ہو؟“ آذر نے ان کو اپنا اپنا حافظہ کھگانے کا مشورہ دیا تھا اور وہ لوگ آذر کی بات پر چونک گئے تھے۔
 ”ہاں میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ہو سکتا ہے کہ کسی پرانی رنجش کی بنا پر ایسا ہوا ہو؟“ آذر ہر پہلو پر سوچ رہا تھا۔
 ”لیکن بیٹا تم جانتے تو ہو کہ ہماری تو کسی سے کوئی دشمنی کوئی مخالفت بھی نہیں ہے سب کچھ تمہارے سامنے ہی تو ہے؟“ وقار آفندی الجھ گئے تھے۔

”لیکن ویڈیو بغیر وجہ کے کوئی ایسا کیوں کرے گا؟“ آذر کے سوال بھی الجھے ہوئے تھے۔
 ”بیٹا صبح سے ہم لوگ بھی تو ’وجہ‘ ہی سوچ رہے ہیں نا؟ آخر کسی نے ایسا کیوں کیا؟ اس کے پیچھے کوئی مقصد ہے تو اپنا مقصد بتائے۔“ اسرار آفندی بھی پر سوچ اور متفکر سے انداز میں بولے تھے۔
 ”تم اس نمبر کا پتا کرو او یہ نمبر کس کا ہے؟“ اظہار آفندی نے سیل کی طرف اشارہ کیا۔
 ”وہ تو میں صبح ہوتے ہی کرواؤں گا لیکن مجھے یقین ہے یہ نمبر کسی کا ذاتی نمبر نہیں ہے کوئی اپنے گھر کے نمبر سے ایسی حرکت کبھی نہیں کر سکتا یقیناً یہ نمبر کسی بی بی او یا پھر کسی پبلک پلےس کا ہو گا۔“ وہ بہت زیادہ سوچ بچار سے کام لے رہا تھا وہ لوگ بھی اس کی بات سے متعلق تھے۔

”تو پھر کیا کیا جائے؟“
 ”سوچتے ہیں کچھ کہ کیا کرنا ہے؟“ آذر نے سر ہلایا اور پھر وقار آفندی کی طرف متوجہ ہوا۔
 ”علیٰ زے کہاں ہے؟“
 ”اپنے بیڈ روم میں کیوں؟“
 ”میں نے اس سے کچھ پوچھنا ہے۔“

”لیکن وہ تمہارے سوالوں کے جواب نہیں دے پائے گی۔ وہ بہت اپ سیٹ ہے۔“ وقار آفندی نے نگر بندی سے کہا وہ علیٰ زے کے معاملے میں ماؤں سے زیادہ حساس ہو جاتے تھے ہر لمحہ اس کی فکر میں مبتلا رہتے تھے۔

”میں اسے اپ سیٹ نہیں ہونے دوں گا۔“ آذر کو پتا تھا کہ وہ علیٰ زے کو ہینڈل کر لیتا ہے، اور وہ اس سے ساری بات با آسانی پوچھ لے گا۔
 ”اوکے جیسا تم مناسب سمجھو۔“ انہوں نے اجازت دے دی۔
 ”آپ زیادہ نیشن نہ لیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ آذر نے انہیں تسلی دی۔
 ”ان شاء اللہ۔“ انہوں نے دل سے کہا۔ لیکن اس سے پہلے کہ آذر وہاں سے اٹھ کر علیٰ زے کے بیڈ روم میں جاتا وقار آفندی کے سیل پر میسج ٹون بجی آذر صوفے سے اٹھتے اٹھتے دوبارہ بیٹھ گیا تھا اور وقار آفندی کی بجائے سیل بھی اسی نے اٹھایا تھا اور پھر میسج اوپن کیا۔
 ”وقار آفندی میری ایک جھلک تم آج صبح دیکھ چکے ہو، اور وہ سری جھلک تم کل صبح دیکھو گے، انتظار میں رہنا۔“ میسج پڑھتے ہی آذر کے چہرے پر تناؤ آگیا تھا اس کے لب بچھ گئے تھے اس نے فوری اسی نمبر پر کال ملائی لیکن دوسری طرف وہ نمبر آف جا رہا تھا۔

”آذر کیا بات ہے؟ کس کا میسج ہے؟“ اسرار آفندی بیٹے کے چہرے پر پریشانی کے سائے دیکھ چکے تھے۔
 ”کچھ نہیں، آپ لوگ آرام کریں۔“ وہ میسج ڈیلیٹ کر کے وہاں سے نکل گیا اور پیچھے وہ تینوں بھائی دیکھتے رہ گئے تھے انہیں اندازہ ہو چکا تھا کہ کوئی پریشانی والی بات ہے۔ لیکن کیا ہے؟



منصور حسین ہر بات سے بے نیاز اور بے خبر صبح ہی صبح حویلی کے گیٹ پر پہنچ گیا تھا حویلی کا چویدار عارف اسے دیکھ کر خوش بھی ہوا اور پریشان بھی۔
 ”کیسے ہو منصور حسین؟“ اس نے مصافحہ کرتے ہوئے پوچھا۔
 ”جیسا نظر آ رہا ہوں۔“

”نا شاء اللہ نظر تو ٹھیک آرہے ہو، صحت بھی اچھی خاصی ہے۔“ عارف نے اسے سر تاپا جانچا۔
 ”پیدا کئی صحت مند ہوں، ادھر ادھر سے کھا کر صحت مند نہیں ہوا۔“ اس نے خفگی سے کہا۔
 ”ہاں یہ تو لگ رہا ہے، ورنہ اتنی غروت میں ایسی صحت کہاں رہتی ہے؟“ عارف نے اس کی بات سے اتفاق کیا۔
 ”تم یہ بتاؤ مبارک خان کہاں ہے؟“ وہ اپنے مطلب کی بات نہ آگیا۔
 ”مبارک خان تو حویلی میں ہی ہے لیکن تمہیں آج نہ تو مبارک خان ملے گا اور نہ ہی کوئی کام دے گا۔“ عارف مایوسی سے بولا۔

”کیوں حویلی کے اندر کوئی آفت آگئی ہے کیا؟“ منصور حسین جل کے بولا تھا۔
 ”ارے یار آفت ہی سمجھو۔“ عارف افسوس کا اظہار کر رہا تھا اور منصور حسین چونک گیا۔
 ”کیوں؟ کیا ہوا ہے؟“ اس کا سوال بے ساختہ تھا۔

”وہ کل علیٰ زے بی بی۔“ عارف کچھ کہتے کہتے اچانک رک گیا اسے بے دھیانی میں خیال آیا کہ وہ حویلی کا پرنسپل معاملہ کسی اجنبی کے گوش گزار کرنے لگا ہے، اور یہ خیال آتے ہی اس نے اپنی زبان روک لی تھی۔
 ”بتاؤ نا کیا ہوا؟ اور علیٰ زے بی بی کون ہے؟“ منصور حسین ایک فطری تجسس کے ہاتھوں پوچھ رہا تھا لیکن

عارف یہ غلطی نہیں کر سکتا تھا۔
 "کوئی نہیں تم کوئی اور بات کرو۔" عارف کے بات بدلنے پہ منصور حسین کو غصہ آیا مگر اس سے زبردستی تو نہیں بوجھ سکتا تھا؟ سو اسے بھی بات بدلنی ہی پڑی تھی۔
 "مبارک خان کو بلاؤ۔" وہ کافی سختی سے بولا تھا مبارک خان سے اس کی اچھی خاصی گپ شپ تھی جبکہ عارف کو اس کے انداز پر حیرانی ہوئی تھی۔
 "وہ ابھی اپنے کام پہ تھیں آیا ہوگا اپنے کوارٹر میں ہوگا۔"
 "تو تم کو کوارٹر سے بلاؤ۔"
 "نہیں نہیں میں گیت خالی چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔"
 "تمہیں میرے اندر آجانے کا ڈر ہے تو ایسا کرو گیت اندر سے بند کر کے چلے جاؤ۔" اس نے ذہانت کا ثبوت دیا۔

"میں نہیں جانے والا تم چلے جاؤ بعد میں آجاتا۔" عارف بے زاری سے بولا۔
 "مہو نہ! جانے والا تو میں بھی نہیں ہوں جاؤں گا تو مبارک خان سے بات کر کے جاؤں گا، آخر وہ مجھے کس کھاتے میں اتنے لارے لگا کے خوار کر رہا ہے؟" منصور حسین بھی شاید اپنے نام کا ایک ہی تھا اس روز کی طرح آج بھی عارف کی کرسی گھسیٹ کر خود ہی بیٹھ گیا۔
 "دورے تو تو بڑا ڈانڈا آدمی ہے۔" عارف حیرت سے بولا۔
 "اب چپ کر کے بیٹھ جاؤ ورنہ اپنا ڈانڈا اپن تمہیں دکھا بھی دوں گا۔" منصور حسین مزاج کے لحاظ سے غصے کا تیز لگتا تھا اور ایسے لوگ کچھ بھی کر سکتے ہیں یہی سوچ کر عارف دوسری کرسی لے کر خود بیٹھ گیا۔
 "عارف! آذر صاحب کہاں گئے ہیں؟" مبارک خان کسی کام سے آیا تو سامنے منصور حسین کو بیٹھا دیکھ کر ٹھنک گیا۔

"منصور حسین؟" وہ قریب چلا آیا۔
 "ہاں منصور حسین ہی ہوں غور سے دیکھ اور پہچان لو تمہارے انتظار میں لیلیٰ یا مجنوں تو نہیں بن گیا؟"
 منصور حسین کا لہجہ طنز پر تھا۔
 "دیکھو منصور حسین میں تمہیں ساری بات بتاتا ہوں تم بس۔"
 "تم مجھے ساری بات نہ بتاؤ صرف اتنا بتاؤ کہ مجھے کام مل رہا ہے یا نہیں؟" منصور حسین روٹوک لہجے میں بولا۔
 "ابھی کیسے بتاؤں؟ کل میں صاحب کے آفس میں بیٹھا تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا کہ اچانک ایک مصیبت بن گئی۔ صاحب اسی وقت گھر آگئے اور میں تمہارا فون بھی نہ سن سکا۔" مبارک خان نے صفائی پیش کی۔
 "تم فون نہیں سن سکے؟ کل میں پورا ایک گھنٹہ آفس کے باہر انتظار کرتا رہا پھر تمہارے نمبر پر کال کر کے تھک گیا مگر تم نے بات ہی نہیں کی مبارک خان اگر تم نے بھی مجھے اسی طرح ڈیل و خوار کرنا تھا تو پھر بہتر تھا کہ میں کہیں اور جا کر ڈالرت، نکالتا۔" منصور حسین بے بسی سے بولا عارف اور مبارک خان لمحہ بھر کے لیے چپ سے ہو گئے تھے۔

"دیکھو یا ایک مسئلہ ہو گیا ہے وہ ٹھنڈا ہو جائے تو ان شاء اللہ تمہیں نوکری ضرور دلاؤں گا۔" مبارک خان نے وعدہ کیا۔
 "یہاں کیا ہو رہا ہے؟" آذر کی آواز ان لوگوں کے عقب سے ابھری تھی انہوں نے چونک کر دیکھا وہ جاگنگ پہ گیا ہوا تھا اور ابھی جاگنگ سے ہی واپس آ رہا تھا اس وقت وہ جاگ کر اپنے ٹریک سوٹ میں ملبوس رات کے مقابلے

میں تھوڑا فریش لگ رہا تھا شاید ذہن سے کچھ دیر کے لیے بوجھ اور پریشانی ہٹی ہوئی تھی۔
 "صاحب یہ۔ یہ منصور حسین ہے بڑے صاحب سے ملنا چاہتا ہے پہلے بھی ایک بار مل چکا ہے۔" عارف تیزی سے بولا تھا لیکن آذر کے ماتھے پہ ہل پڑ گئے تھے۔
 "یہ کون سا وقت ہے ملنے کا؟"

"صاحب یہ روز آتا ہے لیکن صاحب سے ملاقات نہیں ہو پاتی اس لیے آج صبح آ گیا ہے۔" مبارک خان نے بھی وضاحت دی۔

"اوکے۔ اوکے ہو جائے گی ملاقات لیکن آج نہیں کچھ دن صبر کرو۔" آذر منصور حسین سے مخاطب ہوا تھا۔
 مبارک خان انظر جھرا گیا اسے منصور حسین کی مایوس نظروں سے شرمندگی ہو رہی تھی۔ وہ ایک بار پھر واپس جانے کے لیے پلٹ گیا تھا۔
 "منسو۔" آذر نے آواز دی۔

"جی؟" وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔
 "تم کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہو؟" آذر نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا۔
 "صاحب اپنے لیے کام ڈھونڈ رہا ہوں ان سے کام نہ لے آیا تھا۔"
 "اچھا! انچھا! میں سمجھا۔" آذر اس کے جواب سے تھوڑا ریلیکس ہو گیا ورنہ وہ کل والے معاملے کے لیے خانا مشکوک ہو رہا تھا۔ منصور حسین کے جانے کے بعد وہ لوگ اندر آ گئے۔ لیکن اندر آذر کے لیے ایک اور دھماکا منتظر تھا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

www.pkdigest.com

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

شائع ہو گئے ہیں

خوبصورت ناول

خوبصورت ناول

مقبولہ جلد

آؤٹ پیم

☆ ستاروں کا آنگن، نسیم سحر قریشی	قیمت: 400 روپے
☆ درد کی منزل، رضیہ جمیل	قیمت: 180 روپے
☆ اے وقت گواہی دے، راحت جبین	قیمت: 350 روپے
☆ تیرے نام کی شہرت، شازیہ چودھری	قیمت: 200 روپے
☆ امر نیل، عمیرہ احمد	قیمت: 450 روپے

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

دو دلی

بڑی جوتلی کے تمام بکسوں و گاڑا لکھدی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیحدہ سے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

ماہیہ اور نیکل حیات وہی ہیں بھائی میں خدجید اختیاتی بکس جوتلی اور غور سر لڑکی ہے وہ لکھدی کی دیکھنیوں میں مکمل طور پر رنگ بکلی سے بکس کے بکس نظر کا تڑو سکھ بکس کی بکس شفت ہونے کا مشورہ دیتی ہیں لیکن وہ جیسا کہ کتابت جاتے سے انکار کر دیتی ہے جس پر نیکل اور لاکڑا بکس بہ حد پر کتابت ہیں۔

بڑی کو اپنے بھائی علیہ اللہ کے دوست سے محبت ہے مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرتا چاہتی اور یہ جذبہ انکار دیتی انکار پسند رہا ہے۔

بھائی کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے مگر ہر روز بھوتی اور ناگامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا ہے کسی اور بھووری سے بکس آخر خود بھی کہنے کا سوچتا ہے لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھانپے میں چائے پیتے ہوئے پاؤ اختیار کر لیا جاتا ہے جو اسے کام کی فکر کر رہا ہے جس پر بھائی کافی خوش ہوتا ہے اسی خوشی میں وہ کام کی بات پر بحث شروع کر دیتا ہے۔

مشہور حسین ایک غریب اور بیکار پاس آوی ہے وہ مہارگ خان کے توسط سے بڑی جوتلی میں دو گاڑا لکھدی سے نوکری مانگنے آتا ہے تو گاڑا لکھدی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ بھوتی سے روڈ میں لوٹ جاتا ہے۔

دن کو رات کا شمار بکس کے بکس اور بکسوں میں ہوتا ہے وہ اپنے قتل و قتل کا منت کا آوی ہے اس نے کسی بار نہ نہیں سیکھا اس کی اس بھائی مراد کو اپنے بکس کی قابلیت اور اپنا منت بہت بھروسہ ہے اور اس کا بکس دو سو روپے کو بھی دیتی ہیں۔



یہ سچ ہے کہ اس خبر کو چھپایا جا۔ ہم نے ان کے لاکھوں روپے ایک

وہی دہشتی رہی اور ایک لمحے کو سوچا اٹھ گیا اور ابھی سب کچھ چھوڑے کہ جاری ہے؟ کیا وہ پاکستان جاسکے؟ لیکن

مٹی ہے؟ کیا وہ واقعی مشرقی لڑکیوں کی طرح ہتھیار ڈال چکی ہے؟
 ”درجہ! کیا دیکھ رہی ہو؟“ کانرہ بیگم کی آواز نے اسے چونکا دیا تھا وہ آنچ اپنی آواز اپنے لیے سے ہی بہت پرانیس
 اور سکون محسوس ہو رہی تھیں۔
 ”کچھ نہیں۔“ وہ کہہ کر اندر آئی۔

”عبداللہ آیا ہوا ہے؟“ اپنی بیٹی کے ساتھ۔ ”انہوں نے پیچھے سے اسے اطلاع دی تھی کہ درجہ کے قدم لٹک گئے۔“
 ”زری بھی؟“
 ”ہاں زری بھی آئی ہے۔“ انہوں نے اثبات میں جواب دیا۔

”ہوں! وہ شخص ہوں میں جو اب درجہ کے روبرو آئی۔“
 وہ لوگ ٹی وی ٹیبلٹ کے تھیں جیسے ہوئے تھے اس لیے درجہ کو نہ دیکھ سکے۔
 ”کون تھا؟“ ہیل نے عبداللہ سے بات کرتے کرتے کانرہ بیگم سے استفسار کیا تھا۔

”جیسا آئی؟“ کانرہ نے اب؟ ”زری نے فوراً اپنے اوپر اڑنے اس کے انتظار کا اظہار کیا تھا۔
 ”اور پھر پھر نے پہنچ کر نے مٹی ہے ہمارے میں بیٹھے ہوئے تھے۔“ انہوں نے اندازہ لگاتے ہوئے کہا اور وہاں اگر
 نگارش کے پاس پہنچ گئیں سلسلہ کلام یہاں سے منقطع ہوا تھا وہیں سے پھر شروع ہو گیا وہ نگارش کو کسی ڈاکٹر
 پاس چلے گئے کا مشورہ دے رہی تھیں اور نگارش ان کے مشورے پر اپنی خاصی حلقہ مٹی کی کج کل اپنی شادی
 شہدائے کف کے اسی پہلو پر سوچ رہی تھیں۔

”ہیلو اور بی بی ڈاؤ آ رہا؟“ اس نے خاصی اونچی آواز سے سب کو متوجہ کیا تھا۔
 ”ہیلو! تم کیسی ہو؟“ نگارش نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا اور درجہ کے گلے ل کر ہاتھ داس کے رخسار پر
 پار کیا تھا۔

”خوش! میں فائن! آپ سنائیں! آج آپ کو فرصت کیسے مل گئی؟“ حیرت کی بات تھی آج درجہ کیسے سے ٹھکا
 کر رہی تھی۔
 ”میں تو فرصت مل گئی! لیکن تمہیں تو وہ بھی نہیں ملی۔“

”ارے نہیں اب ایسی بھی بات نہیں ہے! میرا کاراں تھا کہ جانے سے پہلے آپ سے مل کر باتوں کی! آپ نہ
 بھی آئیں تو میں خود آجاتی۔“
 ”ہاشم اللہ! ہم سے زیادہ مٹی تو نگارش ہے! میں کا درجہ کو احساس یا قدر تو ہے۔“ عبداللہ نے مداخلت کرتے
 ہوئے کہا۔

”بھابھی کی قدر ہے تو بھائی کی کیوں نہیں ہوگی؟“ درجہ ان کی جوش پہ مسکرائی۔
 ”شہا! اصل سے سوچو سارا ہوتا ہے؟“ عبداللہ نے توجیہ پیش کی۔

”لیکن پھر بھی دیکھا جائے تو اصل حاصل ہی ہوتا ہے انسان دونوں چیزوں سے ہاتھ کھینچ سکتا ہے اصل سے اور
 نیز اصل کے ساتھ ملنے والے سوتے۔“ درجہ کا کانا بھی سوتلے درست تھا عبداللہ کو اسے بھی پتی۔
 ”آکستان جانا کیسا لگ رہا ہے؟“ عبداللہ کے سوالوں کا رخ درجہ کی طرف تھا اور وہاں موجود ہائی افراز بھی انہی
 کی طرف متوجہ تھے۔

”میرے جواب نہ دیتے تو گستاخی میں شمار تو نہیں کیا جائے گا؟“ اس کی اوردوں کے ساتھ ایسی تیز گئی شائستگی
 ہیل کو حیرانی اور رشک میں ڈال جاتی تھی۔

”جو اب نہ دیتے کی وجہ؟“ عبداللہ نے ہنسیوں ایک کھنکھائی۔
 ”میں اس طرح صبر کے درمیان اپنی حلیہ کا اظہار کروں گی تو میرے گھروالوں کو گراں گزرے گا۔“ وہ بات
 واضح نہ کر کے بھی کر گئی تھی۔

”اس اوسکے ڈر ہم سوال بدل دیتے ہیں! تم یہ بتاؤ کہ تمہیں اس پر بھائی دل اور کے پاس جانا کیسا لگ رہا
 ہے؟“ عبداللہ کے واسطے سے چھانچا آسان نہیں ہو تھا۔
 ”چھانگ رہا ہے بہت اچھا۔“ وہ محبت سے مسکرائی۔
 ”ہوں! یہ کی ہے تا کام کی بات۔“ عبداللہ خود بھی مسکرایا تھا بلکہ باقی سب کے ہوں پہ بھی مسکراہٹ پھری گئی تھی۔

”اس سے بات ہوئی؟“
 ”جی آج تمہیں ان کی کل آئی تھی۔“
 ”وہاں جا کر سب سے پہلا کام کیا کرو گی؟“
 ”شادی۔“ وہ بے ساختہ بولی۔
 ”کیا؟“ وہ سب ہی چونکے۔

”ہی نہیں مل اور بھائی کی۔“ اس نے فصیح کی۔
 ”اچھا! اچھا! ایسے مل اور صاحب کے ساتھ ساتھ آکر اپنے ٹیبل سامنے یہ بھی نظر ڈال لو تو کیا ہی کہنے ہیں؟“
 عبداللہ خود شادی کر چکا تھا اس لیے اسے باقی دونوں کی آزادی اور بچکارا کف محسوس نہیں ہوتی تھی وہ وقت
 فون! بھول شاد اور فائز بیگم کو مشورے دیتا رہتا تھا کہ وہ اپنے اپنے بیٹروں کے لیے لڑکی ڈھونڈنے کی ہم شروع
 کر لیں لیکن وہ دونوں مائیں اس معاملے میں بالکل ہی ٹھنڈی تھیں جبکہ اس کی اپنی ماں جو اس کی شادی کے لیے
 اکثر بے چین رہتی تھیں اس نے شادی کر کے ان کو خود ہی ٹھنڈا کر دیا تھا وہ دونوں دوست شادی کے معاملے میں
 ایسی گھٹ پٹا کر اس کا رفق اڑاتے تھے۔

”جس روز ہماری شادیاں ہوں گی اس روز تم اپنے بچوں کے ہمہ بدن رہو گے! تمہیں شادیاں اینڈ کرنے
 کی بھی فرصت نہیں ملے گی۔“ فون کی بات اس کے ذہن میں جاکی تو بے اختیار ہنس دیا۔
 ”کیا یاد کر کے ہنس رہا ہے؟“ ہیل بیگم ہنس رہا۔
 ”نہل تو رہے کی بات کو!“ عبداللہ کا بوجھ محبت پاش تھا۔
 ”وہی بھیر والی؟“ ہیل ہنسا۔

”ہاں۔“ عبداللہ نے اعتراف کیا وہ اب اپنی باتوں میں لگ چکے تھے زری اور نگارش کی آنکھوں پر درجہ کے
 ساتھ شروع ہو چکی تھی ساتھ ساتھ فائز بیگم بھی شامل ہو جاتی تھیں آستے میں اینڈ لائن فون کی کل بھی ساتھ درجہ بیگم
 اٹھنے لگتی تھیں درجہ خود کھڑی ہو گئی۔

”میں! بھئی ہوں۔“ وہ کہہ کر لاؤنچ سے نکل گئی اور دراز لگ دم میں فون اینڈ کے پاس آگئی رنگ متواتر بیچ
 رہی تھی۔

”ہیلو! اس نے ہاتھ برسا کر فوراً فون اٹھا لیا کہ کہیں کل بڈت ہو جائے۔“
 ”گوں درجہ؟“ وہ سری طرف کا بھاری بار صبر لہو اور آواز درجہ کو خاموش کرنے کے لیے کافی تھی۔
 ”ہیلو! وہ مٹی سے پہلو اٹھتے ہوئے اس کی موجودگی کا یقین چاہ رہے تھے۔
 ”میں رہی ہوں۔“ درجہ کا بوجھ سوتلے تھا۔

”ہاں کہاں ہے تمہاری؟“ میں کانچہ بھی کچھ کم نہیں تھا لکڑی اور خشک۔

”یہ پوچھیں کہ کپ کی پوری کہاں ہے۔“

”ہاں ہاں جو بھی ہے بڑاؤ اس کو۔“ وہ بے زاری سے بولے۔

”چالی ہوں کپ کی رہنا یا کو۔“ وہ کہہ کر رہ پور ایک سائڈ میں ڈال کر انہیں لادائی میں آگئی۔

”کپ کے مالک کا فون ہے۔“ وہاں کے قریب اگر کچھ اس طرح ہوں کہ صرف ظاہر دیکھ ہی من اور سمجھ سکی تھیں۔

”حیات کا فون ہے؟“ تو فوراً کھڑی ہو گئیں مگر میرے جواب دینے کی بجائے لالچاقی سے رخ پھیر لیا تھا وہاں سے چلی گئیں۔

”کھڑی کیوں ہو چھوٹا؟“ زوری نے حیرت سے پوچھ کر کے متوجہ کیا۔

”مہولہ۔ تم سناؤ تمہارا کسٹان کب آئی؟“ زوری نے کہا اس صوفے پر ٹپک گئی۔

”ظاہر ہے اسٹری کھیل ہو گئی تو میں بھی پاکستان آجواں کی۔ بہت رہ لیا یہاں بھی۔“ زوری نے بے لگ سے مسکرا کر کہا نگارش نے تو جتنی نظروں سے زوری کو دیکھا تھا وہ ان کی نظروں سے انجان بن گئی اتنے میں فیملی پہلو بدل کر بیٹھا تو نظر سامنے بیٹھی زوری کی طرف اٹھ گئی وہ شاید جیسا نگارش کی بہت کچھ گزاری تھی جگہ سوٹ کے ساتھ تنگ بڑا سا ڈیوٹ پیٹنے اور کچھ جوتے پہننے کے سرب یک اسکاٹ لینڈ سے تھی مذہب اور پوسے میں لگ رہی تھی اس کا خوب صورت گول چرائیک اسکاٹ لینڈ کے ہالے میں دیکھ رہا تھا کسی بھی قسم کے نیک اسپی سے عاری چرائیک لیاں پھیر رہا تھا چھند از جلد اس کی فریٹل نہیں کاہنہ پوتا ثبوت تھی کوئی اسے کچھ کر دہلی نظریں ہی ندا ہو سکتا تھا۔

”تم نے فون میں فون من کے آگے اور۔“ عبداللہ اپنے بیل پہ کسے دانی کل انیڈ کر رہا تھا اسے اٹھ گیا اور ٹیبل اپنی نظر کی محنت سے کن پھر گزرا گیا تھا۔

”اگر عبداللہ دیکھ لیتا تو۔“ گوراس ”کو“ کے آگے اسے شرمندگی ہی شرمندگی نظر آتی تھی وہ سر جھٹک کر کھڑا ہو گیا۔

”کپ کہاں جا رہے ہیں ٹیبل بھائی؟“ نگارش نے رفور فوسب کو اٹھتے دیکھ کر پوچھا۔

”آپ لوگ آرام سے بیٹھ کر باتیں کریں ہم کمرے میں بیٹھ جاتے ہیں۔“ ٹیبل نے خفی سے جواب دیا اور وہاں سے چلا گیا۔

اب وہ لڑکیاں ہی رہ گئی تھیں سو ٹیبل کی بات چیت کر سکتی تھیں۔ ان کی آج شام آٹھ بجے کی خلافت تھی اس لیے وہ لوگ ان سے ملنے گور ان کے ساتھ گزرا رہے کی غرض سے صبح ہی آگے تھے۔ فون بیگم فون من کر چکی تھی سی فون میں آگئیں اور عبداللہ غیسو کے لیے کھانے پینے کی چیزوں کا انتظام کرنے لگیں یہاں اور باقی فاسٹ فوڈز کے لیے ٹیبل نے ہوم ڈیلیوری کا آرڈر کر دیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد نگارش بھی اگر ان کی اینپ کر دینے لگی حالانکہ انہوں نے صبح بھی کیا تھا۔



وہ کچن سمیٹ کر گھر کے باقی کاموں کی طرف آئی تو سارے کام بناتے بناتے وہاں کے پارویج گئے اور اسے ابا کے لیے جتنی بڑے کا خیال کیا تو سر بیٹ لیا۔

”ف ایس اتنی لاپرواہ ہو گئی تھی تمام کاپڑا ہی نہیں چلا انہوں نے صبح بھی کچھ نہیں کھایا؟“ وہ دلی دلی میں

اپنے کاموں کو کوئی ہونے لیا کے کمرے میں چلی آئی۔

”ابا۔ ابا۔“ اس نے ذرا ٹھہر کر انہیں دوبارہ پکارا تھا وہ اس کے پکارنے پر متوجہ نہ ہوئے تو وہ ان کے قریب آگئی۔ ان کی آنکھیں بند تھیں۔ اس کا دل بڑی طرح جوڑا تھا۔

”ابا! ابا!“ اس نے کان لگا کے سنا اور تسلی ہوئی۔ ان کی سانسوں کا ارتعاش اس کے لیے دھماکا بن گیا تھا وہ سو رہے تھے پہلے اس کے دل میں خیال آیا کہ ان کو جگانے پھر سوچا پہلے کھانے کے لیے کچھ خالوں پھر انہیں جگانے ہوں۔ اور اپنے دو سرے خیال پر عمل کرتی رہا پر ٹکل آئی۔ گوشت پیٹنے سے صاف کسے رکھا ہوا تھا اسے ایک بار پھر تسلی سے اچھی طرح دھوا اور کھنی کے لیے جڑا دیا ساتھ ساتھ ان کے لیے آدھ سٹاؤ روٹیاں اور ان کا رات کا سچا ہوا پیڑی سا ان گرم کر کے رکھ کر لیا تھا کچھ ہی نہیں ان کا کیا کھانے کو دل چاہ رہا ہو۔

”جی تو جی ان کے لیے انسانی خوراک بلکہ انسانی نعمت تھی حالانکہ ڈاکٹر نے یہ نصیحت اس کے لیے لی تھی چارٹ میں سب سے پہلے تجویز کی تھی۔ مگر۔۔۔ جی تو یہ تو تیار کر کے دیا کہ کمرے میں چینی تو کتنے میں دوا تھی بے دوا ہو چکے تھے فارسی نیازی کی آنکھوں میں بھی اس کے لیے محنت چکی وہ جیوینا اس وقت جو ک ہی عسوس کر رہے تھے۔

”اسلام علیکم کپ اٹھ گئے ہیں تھوڑی دیر پہلے آئی تھی لیکن تب سو رہے تھے۔“ اس نے اباحت کا اظہار کرتے ہوئے نرے ٹیبل پر رکھی اور پھر ان کو انتہائی مضبوطی سے تھام کر ذرا سا اٹھایا اور سنگل بیڈ کے بیڈ کر ان کے ساتھ ٹیبل کے سوار سے ہم دروازہ اٹھا دیا پھر پانی لے کر ان کو کھلی کروائی اور کھانا کھانے کے لیے بڑھ گئی۔

”جی کاپا لہو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں اشتہار جاگا۔ گویا وہ چھوٹا چاہ رہے تھے کہ گوشت کہاں سے آیا؟

”تو ٹکل بدل بھائی لے کر آئے تھے۔ ای نے کہا گوشت کا ساں ساں بھائی کے لیے کر بھائی نے منع کر دیا وہ کہنے لگے کہ یہ گوشت ابا کی کے لیے تھی جانے کے لیے لیا ہوں اسے رکھ دو گوشت لایا تو کچن پانی نہ تھیں گے ایس اور ایمل نہ غیسو کو بہت پسند ہے۔“ مریم کافی کم گوشت لگی لیکن شب بھی فارسی نیازی کے پاس آگئی وہ خوب خود دہنا شروع ہو جاتی تھی شاید وہ انہیں ان کی خاموشی ان کی کی کا حساس نہیں ہونے چاہتی تھی مگر وہ اسے سننے ہونے لگی محرومی اپنی بے بسی کو بھول جاتی۔

”کپ گئی وہاں کی بات من کر خوش ہوئے تھے اور ساتھ ساتھ مریم کے ہاتھ سے نوالے کھانے لگے۔ چند نوالے لینے کے بعد ان کا پی اچاٹ ہو گیا تو مریم نے ان کی بے زاری محسوس کرتے ہوئے کھنی پٹا شہر شروع کر دی۔

”میرے دار ہے۔“ اس نے ان کے چہرے کے تاثرات نوٹ کیے وہ اس کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے لیکن صرف آنکھوں کی جھٹکت سے۔

”ٹکل بھی بنا کر دوں گی“ تھوڑا گوشت بچا کے رکھ دیا ہے۔“ اس نے اپنے گھروں پر اور کٹھنیت شعاری کا ثبوت پیش کیا فارسی نیازی ان دیکھی مسکراہٹ سے مسکراتے تھے وہ واقعی ان کے لیے ہر وقت فکر مند رہتی تھی اور سب سے زیادہ خیال بھی دیتی رہتی تھی۔ ان کا دل مریم کے لیے دعاؤں سے بھرا ہوا تھا۔

”کیا سوچ رہے ہیں؟“ مریم نے انداز لگایا تھا لیکن وہ مزید کھنی اشتہار نہ کر سکی باجوہ وہاں سے پر دستک ہونے لگی۔

”ابا آپ ایک منٹ انتظار کریں میں ابھی آئی۔“ وہ بیاہر کچھ کے چھوٹے تو لیے سے ان کا رخ پوچھ کر باہر گئی۔

”ارے کون ہے؟“ مریم نے گویا۔ ”وہ جیوینا تو مریم سے دو واڑے تک پہنچی۔

”خاطر؟“ مریم اپنی دوست کو دیکھ کر کھل پڑی۔

”خیر کوئی نیار۔“ مریم نے پیچھے ہٹتے ہوئے اسے راستہ دیا اور پھر اس سے ہاتھ ملایا۔
 ”کیسی ہو؟“ طاہر نے مریم کے سر پر ہاتھ پڑھنے کی نگاہ ڈالی۔
 ”اللہ کا شکر ہے ہم اندر آ جاؤ میں اپنا کوئی پڑا ہی نہیں۔“ مریم اسے اشارہ کرتی خود بھی غافلانہ زیادتی کے پاس
 آگئی۔
 ”اسلام علیکم۔“ اس نے اس کا دھڑا سا سر جھکا کر کہا۔
 ”علیکم السلام۔“ مریم نے جواب دیا۔

”کل کی طبیعت اب کیسی ہے؟“ طاہر ان کی طبیعت کو بخوبی جانتی تھی پھر بھی غار مٹی بھاری تھی محض چند
 دن کی قیود سے جسے اسے پہچان آئے ہوئے تھے۔ ”خیر چند دنوں میں بھلا کیا فرق آسکتا تھا؟“
 ”ابن شائد اللہ اللہ بہتر کرنے والا ہے۔“ مریم شکر گزاری سے کام لے رہی تھی۔
 ”باقی سب کہاں ہیں؟“ آئی نظر نہیں آتیں؟“ اس نے بات تبدیل کرنے کے لیے ہسپتال گئی ہوئی ہیں اور باقی سب اپنے
 ”گھر پر پہنچنے کی ایک جگہ پہنچے ہیں۔“ ای ان کی میزبانی کے لیے ہسپتال گئی ہوئی ہیں اور باقی سب اپنے
 اپنے اسکول پہنچ گئے۔“ مریم ساتھ ساتھ جواب بھی دیتی جا رہی تھی۔
 ”ابن شائد اللہ اللہ بہتر کرنے والا ہے۔“ مریم شکر گزاری سے کام لے رہی تھی۔
 ”باقی سب کہاں ہیں؟“ آئی نظر نہیں آتیں؟“ اس نے بات تبدیل کرنے کے لیے ہسپتال گئی ہوئی ہیں اور باقی سب اپنے
 ”گھر پر پہنچنے کی ایک جگہ پہنچے ہیں۔“ ای ان کی میزبانی کے لیے ہسپتال گئی ہوئی ہیں اور باقی سب اپنے
 اپنے اسکول پہنچ گئے۔“ مریم ساتھ ساتھ جواب بھی دیتی جا رہی تھی۔

”خیر کوئی نیار۔“ مریم ہڈا سا رکھی۔
 ”جی ہاں آپ کے بھائی بھائی۔“ طاہر طعنے بولی۔
 ”ابن شائد اللہ اللہ بہتر کرنے والا ہے۔“ مریم شکر گزاری سے کام لے رہی تھی۔
 ”باقی سب کہاں ہیں؟“ آئی نظر نہیں آتیں؟“ اس نے بات تبدیل کرنے کے لیے ہسپتال گئی ہوئی ہیں اور باقی سب اپنے
 ”گھر پر پہنچنے کی ایک جگہ پہنچے ہیں۔“ ای ان کی میزبانی کے لیے ہسپتال گئی ہوئی ہیں اور باقی سب اپنے
 اپنے اسکول پہنچ گئے۔“ مریم ساتھ ساتھ جواب بھی دیتی جا رہی تھی۔

”خیر کوئی نیار۔“ مریم ہڈا سا رکھی۔
 ”جی ہاں آپ کے بھائی بھائی۔“ طاہر طعنے بولی۔
 ”ابن شائد اللہ اللہ بہتر کرنے والا ہے۔“ مریم شکر گزاری سے کام لے رہی تھی۔
 ”باقی سب کہاں ہیں؟“ آئی نظر نہیں آتیں؟“ اس نے بات تبدیل کرنے کے لیے ہسپتال گئی ہوئی ہیں اور باقی سب اپنے
 ”گھر پر پہنچنے کی ایک جگہ پہنچے ہیں۔“ ای ان کی میزبانی کے لیے ہسپتال گئی ہوئی ہیں اور باقی سب اپنے
 اپنے اسکول پہنچ گئے۔“ مریم ساتھ ساتھ جواب بھی دیتی جا رہی تھی۔

”خیر کوئی نیار۔“ مریم ہڈا سا رکھی۔
 ”جی ہاں آپ کے بھائی بھائی۔“ طاہر طعنے بولی۔
 ”ابن شائد اللہ اللہ بہتر کرنے والا ہے۔“ مریم شکر گزاری سے کام لے رہی تھی۔
 ”باقی سب کہاں ہیں؟“ آئی نظر نہیں آتیں؟“ اس نے بات تبدیل کرنے کے لیے ہسپتال گئی ہوئی ہیں اور باقی سب اپنے
 ”گھر پر پہنچنے کی ایک جگہ پہنچے ہیں۔“ ای ان کی میزبانی کے لیے ہسپتال گئی ہوئی ہیں اور باقی سب اپنے
 اپنے اسکول پہنچ گئے۔“ مریم ساتھ ساتھ جواب بھی دیتی جا رہی تھی۔

”خیر کوئی نیار۔“ مریم ہڈا سا رکھی۔
 ”جی ہاں آپ کے بھائی بھائی۔“ طاہر طعنے بولی۔
 ”ابن شائد اللہ اللہ بہتر کرنے والا ہے۔“ مریم شکر گزاری سے کام لے رہی تھی۔
 ”باقی سب کہاں ہیں؟“ آئی نظر نہیں آتیں؟“ اس نے بات تبدیل کرنے کے لیے ہسپتال گئی ہوئی ہیں اور باقی سب اپنے
 ”گھر پر پہنچنے کی ایک جگہ پہنچے ہیں۔“ ای ان کی میزبانی کے لیے ہسپتال گئی ہوئی ہیں اور باقی سب اپنے
 اپنے اسکول پہنچ گئے۔“ مریم ساتھ ساتھ جواب بھی دیتی جا رہی تھی۔

تھی؟ قاطرہ مزید فضا ہوتی۔

”میرے نہیں بار اسی بات نہیں ہے وہ دراصل خود کو کرنا چاہتے تھے وہ برصغیر اور سفارش کے بغیر چلنا چاہتے تھے۔“ مریم نے خود سے بات بتائی کہ نہ عدیل نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا بلکہ وہ صرف یہ کہنا تھا کہ کسی اپنے با دوست کا اور کسی جاننے والے کا احسان کسی مست لوہہ احسان بیٹھ کے لیے جارہے تھے بڑا تاجہ اور ہمیں نظر نہکانے پر مجبور کر رہا ہے بلکہ اس کے مقابلے میں کسی انجان اور اجنبی شخص کا احسان کے لائق تو نہ ہوتا ہے۔ کم از کم بار احسان منانے کے لیے تب کے گھر تو نہیں آئے گا؟“

”جس ایک توبہ مل گلاس لوگوں کی نام نہاد خود داری میں جاتی کہ وہ کس درجہ ہوگی بھر بھی کہیں گے سرتو نہیں جھکاؤ؟“ قاطرہ آج شاید اپنی بھڑاس نکالنے ہی آئی تھی۔

”قاطرہ یاد نہیں اس وقت تم سے کوئی بھی بحث نہیں کرنا چاہتی کہ جسے وہیں دھڑکتی ہو کر ام سے جھٹھو کوئی بات کرو بلکہ ایسا کرو نہیں کہ تباہ ہو میں تمہارے لیے چاہے کہ کتنی ہوں۔“ مریم اچھے لگتی۔
”نہیں چاہے رہے ہو میں زیادہ نہیں نہیں لگتی۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔
”کیوں آج میرے ہاتھ کی چاہے بھی کڑی ہوگی؟“ مریم نے قاطرہ کو ناراضی سے دیکھا۔
”نہیں ایسی بات نہیں ہے۔“
”تو پھر کیسی بات ہے؟“

”میرے کیا رہا تو نے کو چاہے؟“ قاطرہ نے ہار مانا۔
”ٹھیک ہے تم اس بار کچھ منہ نہ کرو۔“ مریم مسکراتی ہوئی کہن میں عدیل کی اور اس کے لیے چاہے بیٹے لگتی۔

جب قاطرہ اکثر مریم گھر کا دروازہ بند کر کے باہر چلی جاتی تھی اس لیے دروازے کی کڑی کھلی ہوئی تھی عدیل نے دستک نہ چاہی کہ دروازہ کھلا چلا گیا تھا جس سے وہ حیران ہو کر رہ گیا۔
”مریم! اس نے کتنی دور تھک چلی وہ کچھ کیسے کرے۔“
”جی بھائی؟“ فوراً کچن سے نمودار ہوئی تھی۔

”کیا ہو رہا ہے؟ دروازہ کیوں کھلا چھوڑ کر چلا؟“ اس نے ہاتھ میں پکڑے شاپرا سے تھلائے۔
”پتا نہیں شاید بار نہیں رہا۔“ وہ شاپروں میں جھانکنے لگی کہ شاید کوئی ایسی چیز مل جائے جو چاہے کے ساتھ قاطرہ کو پیش کر سکے۔

”تمہارے لیے ہر گز اور باقی سب کے لیے سہو سے لایا ہوں اور رات کی ہفتا کا سامان بھی ہے۔“
”مرگ؟“ مریم کو خوشی ہوئی کہ چلو قاطرہ کے لیے تو کچھ مل ہی گیا۔
”ہاں نہیں بے گریہ نہ ہے نا؟“
”جی ہاں۔“

”جی کہیں ہیں؟“ عدیل اپنے کمرے کی سمت بڑھتے ہوئے بولا۔
”جی خالہ تیرا کچا کرتے لگی ہے کہا اپنے کمرے میں ہیں اور میں قاطرہ کے لیے چاہے رہا ہی ہوں۔“ اس نے ساری تفصیل بتائی۔

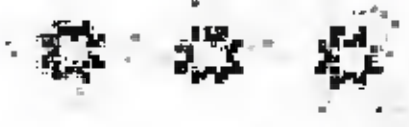
”قاطرہ؟“ عدیل کے کمرے کی طرف بڑھتے دم تم گئے۔
”جی ناہ اندر کمرے میں ہے۔“ اس نے اشارہ کیا۔
”ٹھیک ہے تم چاہے ہو میں اس کے پاس بیٹھتا ہوں۔“ وہ یہی سے پلٹ گیا۔

”اسلام علیکم“ قاطرہ اس کی آواز سن کر کمرے سے باہر نکل آئی جی بھر میں سنا کہ وہ کھڑکے۔
”مریم! سلام! آجی ہیں آپ؟“ اس نے قاطرہ کو سرسری نظروں سے دیکھا۔
”خیریت ہے ہوں آپ کیا لیا سائیں؟“ جی گزری ہے؟“ قاطرہ نے اسے سر تپا کر کھانسی دھکا لگا رہا تھا۔
”جو گزری ہے وہ اچھی ہی گزری ہے۔“

”ہاں اچھی بھگے تو نہیں بھی نظر میں آ رہی؟“ قاطرہ نے طنز کیا۔
”اچھی آتی اچھی بھی نہیں ہے کہ تب جیسے صاحب حیثیت لوگوں کو نظر آسکے جس آتی اچھی ہے کہ ہم لوگ رات کو بیٹھ بھر کے سو رہے ہیں اور صبح سکون سے اٹھتے ہیں بھوک کی بے چینی سے وقت سے پہلے ہی بے دار نہیں ہوتا نا اور ہمارے لیے کچ کل پوری چیز اور بھوک کے مقابلے میں کھانا مانا ہی اللہ کی ان نعمتوں میں سے ہے جن کو ہم بھٹکا نہیں سکتے۔“ عدیل نے مسکرتے سے اتراؤ میں جواب دیا تھا۔

”لیکن یہ اچھی بیٹ اچھی بھی ہو سکتی تھی اگر آپ جناب میری بات مان لیتے تو۔“ قاطرہ کا ہوا ہوا غصہ ظہور و تشہر میں دھل چکا تھا۔

”اگر تب کی بات مان لیتا تو اس وقت سراٹھا کر اپنے حالات کا تذکرہ نہ کر رہا ہوتا بلکہ آپ کی عزت سے سر جھکا کر معذور و متنب ہو رہا ہوتا۔“ عدیل کی بات بھی اٹھانے والی نہیں تھی لیکن وہ مزید کچھ کہہ نہ سکی کیونکہ اچھی کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ مریم نے اٹھا کر چلی گئی۔
”مرے اتم اچھی تنک نہیں کڑی ہو؟ چلو اندر چلے بیو۔“ قاطرہ کا دل چاہا انکار کر کے چلی جائے لیکن پھر مریم کے خیال سے باز آگئی تھی عدیل پلٹ کر ابا جی کے پاس چلا گیا تھا مریم اسے بھی چاہے گا کہ دے گی تھی۔



”سنو۔“
”جی صاحب؟“ وہ بیڑھیوں پر بیٹھ کر تھکے ہوئے چہرے اور فوراً پلٹ کر آکر کہہ دیا۔
”علیہ زے کہاں ہے؟“ اس نے اپنی آستین کاٹن بند کرتے ہوئے پوچھا وہ اچھی اچھی اپنے کمرے سے تیار ہو کر نکلا تھا۔
”جی! اپنے کمرے میں ہیں۔“

”جواب دے رہی ہے؟“
”جی صاحب! کالی دیر ہے۔“
”ہوں! چلو تم۔“ وہ سر ہلا کر کچھ سوچتا ہوا اور اٹھ کر ابا جی کی طرف آخری والا بیڑی دھکے دے گا تھا اس نے دروازے پر کھڑے ہوئے جی کی دھکے دے دی۔
”جی! تمہیں؟“ اس کی دھمکی آواز سنائی دی کہ وہ دروازہ دھکے دے گا تھا اور دروازہ کھلیں کر اندر آ گیا۔
”گٹھا رکھو۔“ گٹھ لے آئی تو آواز اور جیسے کو قدر سے فریٹ کر رہا تھا۔

”اگر بھائی؟“ علیہ زے اپنے بیڈ پر کھیل میں کالی کسٹل سے دی کی ہوتی تھی اسے دیکھ کر فوراً اٹھ بیٹھی۔
”کیسی طبیعت ہے تمہاری؟“ وہ کافی تری اور رمان سے پوچھ رہا تھا۔
”کالی بہتر ہوں۔“ علیہ زے ہنسکتی سے بولی۔
”بہتر؟ نہیں کیا اچھی؟“

”تو پھر اٹھو ایک ساتھ کرتے ہیں۔“
”نہیں ابھی دلی نہیں چاہ رہا۔“

”مگر یہ اصل تو چاہ رہا ہے نا؟“
”جو آپ کریں ہاشم۔“ علیزے نے مسکرا کر کہا۔

”صرف ہاشم کرنے کو نہیں چاہ رہا تمہارے ساتھ ہاشم کرنے کو چاہ رہا ہے۔“ کور نے اپنی بات پر غور کیا۔
”پلیز اور بھائی غصہ نہیں ہے میں نے راجہ کو بھی انکار کر دیا ہے۔“

”یعنی تمہاری نظر میں میری حیثیت راجہ کی ہے؟ تم نے اس کو انکار کر دیا تو مجھے بھی انکار کر دیا؟“ کور نے اسے اسی طرحی ہانک کر بھونک دیا۔

”تو کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“ علیزے ٹھٹھکی گئی۔
”ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہوں تمہاری بات کا یہی تو مطلب ہے۔“ کور بارگاہی سے کتا صوفے پر بیٹھ گیا اور

علیزے پریشان ہو گئی۔
”میں نے ایسا کیا کیا؟“

”تو تم نے ہاشم کرنے کا بھی تو نہیں کہا؟“
”آپ! آپ تو مانڈ کر گئے؟“ وہ سر جھٹک کے بولی۔

”تم نے بات ہی ایسی کی ہے۔“
”جویم سو رہی؟ آپ کو انکار کیا۔“

”سو رہی نہیں چلے گی۔“
”تو پھر؟“ وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”ہاشم۔“ کور نے ہر بات کو ہی
”جو کہ؟“ چلتی ہوں۔“ وہ بے ساختہ آتی ہوئی کہل ہٹا کر اٹھ گئی رنگ کمر کے ایک لیسن سلیم پر سے اور کمر مقرر

لیٹتی اس کے ساتھ بیٹھ رہے۔
”وہوں ایک ساتھ بیٹھ چکیاں اترتے ہیچے ڈانٹنگ ہال میں پہنچے تو وہاں باقی سب بھی موجود تھے تقریباً۔“ بھی نے

”میں بیک وقت دیکھا تھا۔“
”ہاشم! ٹھیک۔“ اس نے اہستہ سے سلام کیا۔

”تم انہیں گھنیں؟“ آئینہ آئینہ سے دیکھ کر فوراً ”تو یہ آئینے۔“
”اگلی نہیں ہوں اٹھایا کیا ہے۔“ اس نے کور کو شکایتی نظروں سے دیکھا۔

”اگر میں نہیں اٹھا کر ساتھ نہ لانا تو اس وقت کئی خوش کیسے ہوتیں؟“ وہ آئینہ آئینہ کے چہرے کو دیکھ رہا تھا
”جو علیزے کو مار ڈال کیفیت میں دیکھ کر واقعی خوش ہو رہی تھیں کیونکہ کل صبح سے علیزے کی حالت بہت

خواب تھی وہ شہت اور خوف کے مارے نہ کچھ کھا رہی تھی اور نہ ہی کوئی بات کر رہی تھی جبکہ آؤر نے کل دلی
بات کا کوئی بھی ذکر کیے بغیر اس سے اتنی مار ڈال بات چیت کی کہ وہ خود بھی اس بات کے حصار سے نکل گئی تھی۔

”گزارشنگ۔“ وہ جوت کو دیکھ کر مسکرائی۔
”آج تو لگتا ہے ڈانٹنگ روم میں تمام ہماری ایک ساتھ آئی ہیں۔“ جوت نے کور علیزے کو مل کر حیرت

اور حیرت کی سمت دیکھتے ہوئے خوش گواریت کا اظہار کیا۔

”ہاں آج تمام جو نظر آرہے ہوں۔“ حیرت نے گھور کے کہا۔
”جس اپنی قابلیت ہی کچھ اور ہے جہاں بھی گئے داستان چھوڑ گئے۔“ انہوں نے غصے کا اظہار کیا۔

”کیسی داستان؟ کچھ نہیں بھی تو پڑا چلے؟“ حیرت نے شرارت سے کہا اور جوت سیٹھا گیا اس نے گھور کے
حیرت کی سمت دیکھا۔

”آرام سے ہاشم کرو۔“ کور بھائی اور مشرب ہو رہے ہوں گے۔“ اس نے جان بوجھ کے کور کا حوالہ دیا اور پھر نظر
کوئل پر جا پھری۔ خاموشی سے سر جھٹکے ہاشم کر رہی تھی۔

”کل کوئل آپ اپنی چپ چپ ہیں؟“ علیزہ اور انداز میں خیریت کوئل کو دیکھ کر میو میو ہوئی۔
”میں نے پوری سنی سے گیسٹ ہو رہی ہوں اس لیے جلدی ہاشم کر رہی ہوں۔“

”آپ جلدی کی کیا ضرورت ہے۔“ آپ اٹھ کھڑے ہاشم کریں اور بھائی واپس کریں گے آپ کو۔“
جوت نے لاپرواہی سے کہا کوئل اور حیرت دونوں ٹھٹھکی گئیں کور کا کئی سنجیدگی اور کمن سے انداز میں ہاشم کر رہا

تھا۔
”بھائی آپ کوئل کیا کوئل آپ کریں گے؟“ وہ گیسٹ ہو رہی ہیں۔“ کوئل کے انکار سے پہلے ہی جوت نے کور

سے بھی پرچہ لیا جو جوت تک کر متوجہ ہوا پہلے جوت کو اور پھر آگ نظر کوئل کو دیکھا وہ پریشان سی دیکھ رہی تھی۔
”ہوں؟“ کور نے گ۔“ اس نے اٹھ کھڑے ہو کر چلے گا کپ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔

”تو کیا؟“ ہو گیا نامستکہ حل؟ آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہی تھیں۔“ حیرت نے آنکھ دہائی۔ تھوڑی دیر بعد کور
کوئل پر گیا۔

”چلیں۔“ اس نے کوئل سے کہا اور باٹ کر علیزے کو دیکھا۔
”کوئل کے ذہن میں آئی کے ساتھ باٹیں کرو۔“ ہم لوگ سچے ہو رہے ہیں۔“ کور نے اسے ہانک چھٹکے اور اسے کہا

”اور ڈانٹنگ ہال سے نکل گیا کوئل ہونٹوں کی جوت اور کور کی پشت کی سمت دیکھ رہی تھی۔
”چلیں۔“ حیرت مسٹر آؤر آؤر گاڑی اشارت کر چکے ہیں۔“ جوت نے ہاتھ لہرا کر کوئل کو پکارا۔

”جوت پٹ جاؤ گے مجھ سے۔“ کوئل اپنا بیگ اور کتا لے کر اٹھا جوت کو گھور کر دیکھ رہی تھی اس نے اس
کے جانے کے بعد جوت کی ڈیوڑھی کاٹ کر علیزے کی سمت ہو گیا آئینہ آئینہ سے دیکھ رہی تھی۔

”وہ گاڑی اشارت کر کے ہارن دیتے ہی والا تھا کہ حویلی کے مرکزی دروازے سے کوئل باہر نکلی دیکھائی دی وہ
دونوں ہاتھ اسٹیرنگ پر جا کے اس کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا کیونکہ حویلی کے کمن ڈور اور ڈور اسٹوپر کے

درمیان اچھا خاصا فاصلہ تھا دائیں طرف کا پورا المان محوم کے آگے آگیا اور ڈور اسٹوپر سے ٹک آئے۔ کئی چند
منٹ تک ہی چلتے تھے اس نے ڈور اسٹوپر کو دیکھ کر سرسری سا پلڑا کا دروازہ کھول دیا کوئل اگر کھلے دروازے سے اندر

چلے گی تو کیدار نے ہراساں گشتہ کر دیا تھا وہ گاڑی بیک کرتے ہوئے گیسٹ سے نکلا اور پھر گاڑی روڈ پر ڈال دی۔
جیسے ہی گاڑی روڈ پر آئی اس کی اسپر میں بھی ہاشم ہو گیا تھا۔ چند سیکنڈ گزرے تو کور کو گاڑی کے اندر کی

خاموشی عجیب سی لگنے لگی اور اس خاموشی کا احساس ہونے ہی اس نے بات شروع کی۔
”کوئل سے ایڑیں ہوں؟“

”تھا حل ایڑیں۔“ کوئل نے ہاشم تمام جواب دینے کی ہمت جمع کی تھی۔
”تھا حل ایڑیں؟“ نہیں پوچھ رہی ہیں ایڑیں؟“ اس لیے تو پوچھ رہی حیرت ہوا ہے؟“

”تین سال کا عرصہ کچھ ہی عرصہ نہیں ہوا۔“ کوئل نے تارو سے کر کہا۔
”تین سال؟“ واقعی وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا؟“ مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میں چند روز پہلے ہی تمہارا

ایڈیشن کروا کے آیا ہوں۔ "کونل کا ایڈیشن گورنر نے ہی کر دیا تھا اسی لیے وہ وقت یاد کر کے وقت کے جلدی گزار چاہتے تھے جرنل کی پوری تھی۔

"ہم نے تین سال بڑھتے ہوئے اور ایک سو پچاس روپے گوارے ہیں اس لیے ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ وقت کیسے گزرا۔" کونل نے کھڑکی سے باہر دیکھ کر کہا اندر دیکھنے کی ہمت نہیں سگی اس کی۔

"کون سا سسٹر ہاؤس رہا ہے؟"

"سہ ماہی مینی فاسٹل ایڈر کا فرسٹ سسٹر۔"

"ہوں! گویا انہی ایک سال کا وقت ہے اسٹوری سے فاسٹ ہوئے ہیں؟"

"ہاں! تقریباً۔" کونل نے سر ہلایا۔

"اس کے بعد کیا ارادہ ہے؟"

"مجھے سوچا نہیں تھی سے دست کش کروں گی۔"

"تو کون سا انکار کریں گی؟" گورنر کو سوجھ بوجھ سے ساختہ مسکرا دیا تھا وہ رشتے میں تو ان سب کی چچی تھیں لیکن انہوں نے بھی چھی چھی ہونے کا جواں نہیں دلا دیا تھا یہ شہ فریش اور فریشٹل سوئیں نظر آتی تھیں کالی ہنس کو اور سافٹ پچری کیس اور وہ سری بات یہ کہ وہ آدھ کی چچی ہی نہیں خالہ چچی تھیں ثروت جگم اور نمونہ جگم نہیں تھیں اس لیے گورنر اور ثروت قیوم کا کونل سے "سیر" کا رشتہ بھی نکلا تھا۔

"آپ علیحدہ کے لیے بہت پریشان ہیں نا؟"

"نہا ہر ہے یہ معاملہ ہی پریشانی والا ہے۔"

"کچھ مسئلہ حل ہوا؟" کونل نے خستہ عرصے میں پہلی بار سر اٹھا کر ذرا نیچے کرتے ہوئے پوچھا۔

"ایک دن میں کیا مسئلہ حل ہو سکتا ہے؟" کونل بکھر دار لگی تھیں لیکن اس سے سب سے بڑی تھی ای سیس کے اختلاف اور گورنر کو یہ سب سے بڑا مسئلہ تھا۔

"علیحدہ کے لیے کچھ بنایا نہیں؟"

"نہیں میں نے پوچھا ہی نہیں انہی وہ شوڑی منہل جانے پھر بات کریں گا" چچی کی بات چھڑونا تو وہ مزید دھڑک رہی تھی۔ "گورنر کو اس کے آرام اور سکون کا بھی کتنا خیال تھا؟ کونل نے ہر شک سے مدد کیا۔

"تجربہ مشرب نہیں ہیں کیا؟"

"سیری ڈسٹرکٹس کچھ اور نوٹس کی ہے اور علیحدہ کے کی کچھ اور۔"

"لیکن ڈسٹرکٹس تو ہے نا؟"

"ہوں! رگہ سکتی ہوں۔" گورنر بہت باریک بات کر رہا تھا کونل کی گھبراہٹ کم ہو چکی تھی اور اسی لیے تو وہ بات بھی کر رہی تھی اور ابھی وہ کچھ اور کہنے کا ارادہ بھی کر چکی تھی کہ گورنر کا سیل بجایا۔ اسرار انندی کی کال تھی۔

"چی ہائی؟"

"تم ہسپتال پہنچو۔ وہ جھڑپ ہوئے ان کے پیچھے شور مچا تھا۔

"کیوں تیرے؟" اس کا تھا اٹھنا۔

"میں خیر دیا کی خیریت معلوم کرنے اسپتال آیا تھا اور میرے پیچھے میڈوا واسے بھی پہنچ گئے۔" وہ کچھ پریشان لگ رہے تھے۔

"آپ کو کس نے کہا تھا کہ اسپتال جائیں؟ میں نے رات کو کہا بھی تھا کہ آپ لوگوں کو ہسپتال وغیرہ کے چکر لگنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے ہم لڑکے ہی کالی ہیں اس کام کے لیے ایک خیر دیا باقی ہیں نا؟ ہم سنبھال لیں

کے ان کہ۔

"اسے یاد رکھنا صاحب نے آئے کو کہا تھا۔" اسرار انندی جھنجھلائے۔
"تو مجھے میرا خیال ہے کہ کچھ کرنے سے پہلے سوچتے نہیں ہیں؟" گورنر تھا وہ ہاتھ اٹھا کر خیر دیا کے لیے پریشان تھے۔

"میں نہیں تو ہم سب ہیں تو اس کا کیا مطلب؟" اسپتال میں ڈیڑھ ڈال کے بیٹھ جائیں؟ صرف ایک سٹازن ہی ہوا ہے پورا گھر لگی نہیں ہوا اس پر کب لوگ آتے ہر حواس ہو رہے ہیں اپنی دوسری میں آیا ہوں آپ ویت کریں۔" اس نے کہہ کر فون بند کر دیا اور گاڑی کی اسپینڈر مزید بڑھادی اس نے سب کچھ سے بچ کر کچھ کچھ کونل سے کہتے ہوئے اس وقت چوکی جب اس نے فون بند کرنے کے سامنے پرکھ دیا تھا۔

"متھک بڑ۔" گاڑی سے اترنے کے بعد متھک بڑ کہہ رہی تھی کہ گورنر گاڑی جھٹکے سے آگے بڑھانے لگا تھا اس کے پاس ٹائم کم تھا وہ ایسی بڑا اٹھاتی تھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ احتیاطی ریش ڈرائیونگ کر رہا تھا حالانکہ صبح کے وقت ایسی ڈرائیونگ خطرے سے خالی نہیں تھی لیکن اس کا اسپتال پہنچنا ضروری تھا اسے جلدی مانگنا تھا۔



وہ کن بہت عرصے بعد دن کے وقت سوا تھا رات کو خیر دیا پوری نہیں ہوتی تھی اور دن میں کام پچھا نہیں چھوڑتے تھے لہذا ایک عرصہ اور فریش موڈ خواہ وہ خیال ہو کے رہ گئے تھے۔

کچھ اس نے گورنر نہیں جانا تھا اس لیے تقریباً "فارغ" تھا۔ صبح اٹھا ایک دو ضروری کام بنایا اور کمر آگیا اپنے کمرے میں فارغ ٹھہرتے ہوئے پورے ہونے لگی تو خیر کو ترجیح دی اور پھر وہ لٹائی تھا کہ خیر اس پر مہربان ہوگی۔ وہ دن کے بارے میں سوچا تھا اور شام کے پانچ بجے آگے کل گئی پانچ بجے کی خیر کچھ کم نہیں تھی وہ خود بخود فریش اور ہلکا پھلکا ہو چکا تھا۔ شاد رہنے کر کے آیا تو ان کے مائے اعلیٰ چھٹے تھے مشرب کی طرف دوسرے سوئیں کی بے دم سی شعا میں مشرق کو اوجھلے کہہ رہی تھیں اسے لان میں دیکھ کر اس کا دل دھوکا اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور یہ بھیجی سے دانتیں بائیں ٹھٹھا اپنی تھوڑی دیر کی برائی کی فریاد کرنے لگا۔ دل گورنر نے آگے چھو کے اسے تھپکا کر دلوک دوسرے کے ہونے سے کھٹکے سے بڑھ گیا تھا اور اس کو دیکھتے سے بڑھ گیا تھا وہ کھوٹا گھر کی دیوار میں ٹھہر گیا جسے یہ دن اور بڑی سے مضبوط کیا گیا تھا تاکہ بل ڈرگ چاہے کچھ بھی ڈور آرائی کر لیتا اس کو نہ کوئے۔

اندر میں تین ڈسکس کے ساتھ ساتھ اور

☆ ٹیلیاں، پھول اور خوشبو	راحت نہیں قیمت: 225 روپے
☆ پھول ٹیلیاں تیری گلیاں	فائزہ افکار قیمت: 500 روپے
☆ محبت جیاں نہیں	لجی جیون قیمت: 250 روپے

32216351

نبیلہ عرس



بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیحدہ تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدیہ اور نبیلہ حیات دینی بہن بھائی ہیں مدیہ انتہائی بڑی دلوں اور خود سر لڑکی ہے وہ انگلینڈ کی ریٹائرڈ میں مکمل ہو رہی رنگ بچی ہے جس کے پیش نظر فائزہ بیگم نبیلہ کو پاکستان منتقل ہونے کا مشورہ دیتی ہیں لیکن مدیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے جس پر نبیلہ اور فائزہ بیگم بہ حد پریشان ہیں۔

ذری کو اپنے بھائی عبد اللہ کے دوست سے محبت ہے مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرتا چاہتی ہو یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے مگر ہر روز مایوسی اور ناامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا ہے بسی اور مجبوری سے تنگ آخر خود کشی کرنے کا سوچتا ہے لیکن ایسے میں ایک روز اسے دعا ہے میں چاہنے پیتے ہوئے پاؤ اختیار کر چکا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میسرک پاس کوئی ہے وہ مبارک خان کے توہن سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگے آتا ہے وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں پورے دو ماہوں سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

اب اور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکٹوں میں ہوتا ہے وہ اپنے قوی و فحل کا بہت بکا آدمی ہے اس نے کبھی ہار نہیں سیک اس کی ماں بخوش شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پر بہت بھروسہ ہے اور اس کا تین دو سروں کو بھی دیتی ہیں۔



لوہرا دن اکٹھے گزارا تو ٹائم نذر نے کایا ہی نہیں چلا، مدحیہ اس وقت ٹھنک کے رہ گئی جب نگارش نے اسے تیار ہونے کا کہا۔

"تمہارے بھائی صاحب کہہ رہے ہیں کہ ٹائم کم رہ گیا ہے، ایئر پورٹ بھی پہنچنا ہے پھر سامان وغیرہ کی چیکنگ میں بھی ٹائم لگے گا، اٹھو جلدی سے چینیج کر کے آؤ اور ایک بار پھر اپنی تمام چیزیں یاد کرو کہ تم نے بیگ میں رکھ لی ہیں نا؟" نگارش سمجھ دار ہنوں جیسا برتاؤ کر رہی تھی زری مسکرائی۔

"چلو جاؤ اب۔" زری نے مدحیہ کو اٹھایا اور وہ خاموشی سے چپ چاپ اوپر آگئی کپڑے چینیج کیے، اپنا بیڈ روم دیکھا، بیڈ روم کی میبلنگ دیکھی اور سر جھکا کر اپنا بیگ اٹھالیا۔ بانی کا سامان وہ لوگ پہلے ہی گاڑی میں رکھوا چکے تھے۔

"کوئی گفٹ نہیں بھیجا تم نے؟" گھر سے نکلتے ہوئے نگارش نے زری سے سرگوشی کی۔

"کیا بھیجتی؟" زری بھی آستلی سے بولی۔

"اپنا دل۔"

"ہو نہ! دل کو دل بھیجتی؟"

"ہاں! تاکہ دل کو دل سے راہ ہو جاتی۔"

"میرا دل نرم ہے اور وہ دل سخت۔" زری اس کا تصور کرتے ہوئے بولی۔

"سخت کو نرم ہونے میں بھی دیر نہیں لگتی بس اثر ہونا چاہیے۔" نگارش نے گہرائی سے کہا۔

"اثر ہونے کے لیے وقت چاہیے، بھولی انگلی نہیں ہے۔" زری جواب دیتی یا ہر نکل آئی لیکن باہر کا موسم ہنوز خراب تھا بارش کی اسٹریٹ لائٹس بھی اس برقی موسم کی وجہ سے دھندلی سی لگ رہی تھیں اور اس جھنڈ کی وجہ سے تمام لائٹس کی روشنی سرخ نظر آرہی تھی۔

"مدحیہ کہاں ہے؟" زری نے گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے پوچھا۔

"وہ ہم سب سے پہلے جا کر بیٹھ گئی ہے، تم بھی جینہ جاؤ، قحقی بن جاؤ گی۔" نگارش نے خفگی سے کہا تھا اور یوں وہ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے ایئر پورٹ کے لیے روانہ ہوئی تھیں اس میں ایئر پورٹ پہنچتے ہوئے ایک جھٹکے لگ گیا تھا اور فلائٹ کا ٹائم بھی کم رہ گیا تھا۔

"میڈی۔" مدحیہ سر جھٹکائے چپ چپ سی بیٹھی تھی جب ایک شناساسی توازیہ چونک کر سراٹھایا۔

"جیڑی؟" اس نے حیرت سے جیڑی کو دیکھا۔

"تمہارا بھائی جا رہی ہو؟" وہ بے یقینی سے پوچھ رہا تھا لہجے کی افسردگی نمایاں تھی۔

"آف کورس۔"

"واپس نہیں آؤ گی؟" سوال میں آس تھی۔

"شاید۔" وہ کوئی بھی جواب ٹھیک سے نہ دے پائی۔

"تم ہم سے ملے بغیر جا رہی ہو؟ ہمیں بتایا بھی نہیں؟ آج بھی اگر کر سٹینا نہ جاتی تو ہمیں پتا ہی نہ چلتا۔" وہ شکوہ کر رہا تھا۔

"جب چھوڑ کر جانا ہی ہے تو پھر اتنے اہتمام سے چھوڑ کر جانے کا کیا فائدہ؟ دو گھڑی کا یہ ملنا بھی کس کام کا؟" مدحیہ کے لہجے میں سختی اور آلی بانج قدم کے فاصلے پہ نگارش، زری اور فائزہ بیگم کھڑی تھیں البتہ نیل اور عبد اللہ سامان وغیرہ کلیئر کر رہے تھے۔

"تم ہمیں مس نہیں کر رہی؟"

"شاید۔" وہ عجیب سی بے بسی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

"بانی سب سے نہیں ملو گی؟" جیڑی افسردہ لگ رہا تھا فائزہ بیگم نے بیگ لائنگ کوٹ پہنے اور لائنگ شووز چڑھائے جیڑی کو ناگوار سی دیکھا تھا۔

"بانی سب؟" وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"میڈی؟" اچانک نہ جانے کہاں سے برائٹن شیشے، کر سٹینا اور جیڑی نمودار ہوئے تھے اور مدحیہ کو دیکھ کر چلا اٹھے تھے مدحیہ ان لوگوں کو اچانک دیکھ کر خوش بھی ہوئی اور اس بھی۔

"ممود کیوں آف ہے؟" شیشے اس کی بیسٹ فرینڈ تھی اس لیے اس کی اداسی اور افسردگی بھی شیشے نے ہی محسوس کی تھی۔

"تو کیا اس وقت اس جگہ پہ کھڑے ہو کر میرا موز آؤں ہو نا چاہیے؟" مدحیہ نے شیشے کو خفگی سے دیکھا۔

"ڈونٹ وری یار ہم لوگ ضرور ملیں گے۔" برائٹن نے انہیں تسلی دی وہ شیشے کا بھائی تھا اسی وجہ سے مدحیہ کی اس کے ساتھ بھی کافی اونچی فرینڈ شپ تھی دونوں بہن بھائی بے حد سو فرینڈ شپ کرتے تھے۔

"اے! ان شاء اللہ۔" مدحیہ بے ساختہ بولی۔

"یہ کیا کہا؟" برائٹن نے الجھ کر پوچھا۔

"میں نے کہا ہے کہ اللہ نے چاہا تو ہم ضرور ملیں گے۔" مدحیہ نے ناگش میں بتایا تو وہ سر ہٹا کر رو گئے۔

"ہوں! ان شاء اللہ۔" برائٹن نے دہرا کے کہا اور مدحیہ مسکرا دی۔

"مدحیہ چلو۔" فائزہ بیگم نے قریب آکر سختی سے کہا۔

"جسٹسٹن منٹ، بام پیئر۔" اس نے انہیں روکا اور کر سٹینا کو دیکھا۔

"کر سٹی! تم کچھ نہیں کہو گی؟" مدحیہ نے خاموش کھڑی کر سٹینا کے قریب آکر زری سے پوچھا۔

"سب کچھ نہ کہہ رہے ہیں، میرا کہنا ضروری تو نہیں ہے؟" وہ لا پرواہی سے بولی۔

"اگر ضروری نہیں ہے تو اتنی دیر سے اتنی ٹھنڈ میں یہاں کیوں آئی ہو؟" مدحیہ کے استفسار پہ

کر سٹینا جواب ہو گئی۔ اور فلٹر چلائی تھی۔

"میں جانتی ہوں کر سٹینا تمہاری فیملی کسی پاکستانی کی وی ہوئی چوٹ سے بلبلاتی ہوئی ہے اور یہی چوٹ تم لوگوں کو بانی پاکستانیوں کی طرف بڑھنے نہیں دیتی لیکن ایک بات سوچو جس طرح تمام یورپین ایک جیسے نہیں ہیں اسی طرح تمام پاکستانی بھی ایک جیسے نہیں ہیں، اتنے برے لوگ ہر جگہ ہر ملک میں پائے جاتے ہیں ایک کی سزا دوسرے کو دینا نہیں ہے بھی انصاف نہیں کہلاتا۔ اور تمہیں آج چپ نہیں بلکہ خوش ہونا چاہیے کہ تمہارے گروپ کی وہ لڑکی جا رہی ہے جو تمہیں بیٹھ ناگوار گزرتی تھی۔" مدحیہ اس کے روبرو کھڑی کہہ رہی تھی اور کر سٹینا کا چہرہ اُٹھ گیا تھا۔ تو کیا مدحیہ اس کی ناگواری اور فیملی کی سختی کے متعلق بھی جانتی تھی؟ حالانکہ اس نے کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ کر سٹینا کے اندر کا حال جانتی ہے۔

"میڈی تم۔" تم۔" کر سٹینا بول ہی نہ پائی۔

"مدحیہ چلو بھی۔" اب کی بار زیادہ سختی سے پکارا گیا تھا۔

"آئی مس یو میڈی۔" کر سٹینا نم آنکھوں سے اس کے گلے لگ گئی اور مدحیہ کا گل جوم لیا شیشے اور جیڑی مسکرا دیئے۔

”ایڈیٹر ایم سوری قاری بالی ہو میرے“ گرسٹینا نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔
”میں اس کے بارے میں تجھے خوشی ہو رہی ہے کہ تم مجھ سے ملنے کے لیے آئی ہو بلکہ ان سب کو لے کر آئی ہو۔
تھینک یو سوچ۔۔۔“ اس نے خوشی کا اظہار کیا تھا پھر باقی سب سے مل کر ہاتھ ہلاتی وہ زری اور نگارش کے پاس آئی۔

”پتا نہیں ان سب سے دوبارہ ملنا ہو گا بھی یا نہیں اس لیے جلدی جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ تم سے تو ملاقات ہوئی جائے گی اس لیے امید ہے کہ تم نے مائنڈ نہیں کیا ہو گا۔“ اس نے زری کے گلے ملتے ہوئے کہا۔
”اور بھائی آپ بھی جلدی پاکستان آنے کی کوشش کیجیے گا۔“ وہ نگارش سے ملی تو ساتھ تاکید بھی کر ڈالی۔
”ہیلے تم تو جاؤ۔۔۔“

”اگلی جلدی ہے آپ کو؟“
”ہاں! جلدی تو ہوگی ایک گھنٹے سے اتنی سردی میں کھڑے کھڑے ہڈیوں کا گودا بھی جیسے جم گیا ہے۔“

نگارش مصنوعی خفگی سے بولی۔
”فکر نہ کریں میں عبد اللہ بھائی سے کہتی ہوں گھر جاتے ہی آپ کی ہڈیاں ادون میں رکھ دیں۔“ مدحیہ شرارت سے بولی اس کا موڈ پہلے سے قدرے خوشگوار ہو چکا تھا۔
”ادون میں رکھنے کی کیا ضرورت ہے وہ خود کسی ادون سے کم ہیں کیا؟“ نگارش کا ذوق معنی لہجہ مدحیہ اور زری کو بننے پر مجبور کر گیا تھا۔

”یہ تو اور بھی اچھی بات ہے جناب۔“ مدحیہ نے سراہا۔

”مدحیہ۔“ نیل نے قریب آکر کہا اور پھر نگارش اور زری کو دیکھا جس اک طائرانہ سی نظر کا موقع تھا اور اک نظر میں اس کے چہرے کا ایک آخری لمبے تھوڑے لمبے سمیٹ کر مدحیہ کے ساتھ اللہ حافظ کہتا آگے بڑھ گیا سب سے آخر میں عبد اللہ سے ملاقات ہوئی تھی دونوں دیر تک بخل گیر ہوئے تھے پھر سب چلے گئے سبھی بھی وہیں کھڑا تھا اور زری وغیرہ بھی۔ شاید جہاز پرواز کر چکا تھا۔



ہسپتال میں میڈیوا لے کھینوں کی طرح بھینٹا رہے تھے اور اسرار آفندی ان کے گھیرے میں تنگ آئے ہوئے تھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ انہیں کی تاک میں بیٹھے ہوئے ہیں جیسے وہ خبر دیا یا کی خیریت معلوم کرنے کے لیے ہسپتال پہنچے وہ سب بھی سمندری ریلے کی طرح لڈ آئے انہوں نے لاکھ کوشش کی وہاں سے نکلنے کی مگر اتنے جھوم میں راستہ ملنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔

”کل آپ کی بیٹی پہ قارئنگ ہوئی“ آپ لوگوں کا ڈورا میوز نمی ہو گیا تھا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ کام کس کا ہو سکتا ہے؟ آپ کو کسی پہ شک ہے؟“ ایک صحافی نے ایک سامنے کرتے ہوئے سوال کیا تھا۔
”آفندی صاحب سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ آپ کی بیٹی کیوں زخمی نہیں ہوئی؟“ دوسرے صحافی نے اپنی سوچ کا اظہار کیا تھا۔

”کل سے وقار آفندی صاحب آپس بھی نظر نہیں آئے کیا وہ خوف کی وجہ سے ملک چھوڑ گئے ہیں؟ یا پھر اپنے کمرے میں بند ہو چکے ہیں؟“

”شٹ اپ! یہ کیا تمہارا رکھا ہے آپ لوگوں نے؟“ آذر جیسے ہی سب کو ہٹاتا ہوا سامنے آیا اس کے کانوں میں اس صحافی کا مستحضرانہ سا سوال گونجتا تھا۔



”بند کرو یہ کیمرے۔“ اس نے غصے سے خونخوار آنکھوں سے دیکھا۔
”سری کیمرے بند کر دیتے سے آپ پورے شہر کی آنکھیں تو بند نہیں کر سکتے نا؟“ صحافی کو کچھ زیادہ ہی تیز تھے۔
”سری ہم نے تو سنا ہے کہ آپ نے یہ معاملہ دبانے کی پوری پوری کوشش کی ہے؟“ آذر کا جی چاہا ایک زوردار مکا ان کے منہ پر دے مارے لیکن اسرار آفندی نے اس کا بازو پکڑ کر اس کو ایسی کسی لمبی حرکت سے باز رکھا تھا خون کا گھونٹ لی گزر گیا تھا۔

”چلیں ڈیڈی۔“ وہ اسرار آفندی کو ساتھ لے کر اس جھوم کو چیرتا ہوا وہاں سے نکل گیا تھا اسرار آفندی کا ڈورا میوز تیار کھڑا تھا ان کے آتے ہی گاڑی اسٹارٹ کر دی اور خود آذر بھی اپنی گاڑی نکال لے گیا تھا کیوں کہ اگر یہاں ٹھہرنا تو بھی یہی کچھ ہونا تھا ہر تھا کہ کچھ پر نظروں سے اوچھل رہے تھے۔
اس نے اپنا سیل نکالتے ہوئے وقار آفندی کا نمبر ڈائل کیا تھا۔

”السلام علیکم۔“ وہ کال ریسپونڈ کرتے ہوئے بولے۔
”و علیکم السلام۔“ وہ غصہ ضبط کرتے ہوئے آہستگی سے بولا۔

”خیریت؟“
”خیریت آپ کو ڈیڈی بتا دیں گے“ آپ ایسا کریں کہ مبارک خان کو خبر دیا کہ پاس بھیج دیں وہ ان کی دیکھ بھال کر لے گا۔“ اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا تھا۔

”مبارک خان کو؟ مگر حویلی میں بھی تو کوئی کام۔“

”ڈیڈی حویلی کے کام ہم سنبھال لیں گے آپ اسے ہسپتال بھیج دیں“ انیال تو صبح ہی ہسپتال سے گھر چلا گیا تھا اب ان کے پاس احمد اور زین بیٹھے ہوئے ہیں احمد بھی رات سے تھک چکا ہو گا اسے گھر بھیج دیتا ہوں تاکہ وہ ریسٹ کر لے۔“ آذر کا دھیان ہر طرف رہتا تھا اسی لیے احمد کے آرام کا خیال کرتے ہوئے مبارک خان کو طلب کیا تھا۔

”ٹھیک ہے میں اسے بھیجتا ہوں۔ لیکن تم کہاں ہو؟“
”میں اظہار انکل کے پاس آفس جا رہا ہوں“ واپسی پہ خبر دیا با سے مل کر آؤں گا“ کچھ ہی کر لیا گا۔“
”ار کے اللہ حافظ۔“ انہوں نے فون رکھ دیا تھا اور فون بند ہونے کے بعد آذر کی سوچ کا در کھل گیا تھا اس کا دھیان اس نمبر کی طرف چلا گیا جس نمبر سے کل وقار آفندی کو کال آئی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے آفس جانے کا ارادہ بدلنا اور گاڑی ملی فون ایکسچینج کی طرف موڑ دی وہ اس نمبر کی پوری انکو انری کروانا چاہتا تھا اس کے لیے اس نے ایک پور فل سفارش بھی کروائی تھی کیونکہ کسی کے نمبر کی معلومات حاصل کرنا اتنا آسان بھی نہیں تھا۔
ملی فون ایکسچینج پہنچ کر اس نے سپروائزر سے ملنے کا کہا اور تھوڑی دیر بعد ہی وہ ان کے سامنے بیٹھا تھا۔
”سپروائزر خوشدلی سے بولا۔“

”تھینک یو سرب۔ دراصل کل ہمیں ایک نمبر سے کال موصول ہوئی تھی۔ میں اس نمبر کی ڈیٹیلز اور لوکیشن وغیرہ جاننا چاہتا ہوں“ انہذا مقصد کسی کو نقصان پہنچانا نہیں ہے“ میں ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ہمارا دشمن کون ہے؟ جس سے ہم خود بھی بے خبر ہیں“ لیکن وہ ہم پر وار کیے جا رہا ہے۔“ آذر نے تمہید باندھی۔

”جی۔ جی میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں آپ وہ نمبر دے دیں میں تھوڑی دیر تک آپ کو اس نمبر کی تمام ڈیٹیلز فراہم کر دوں گا۔“ سپروائزر بھی اس کی پراہم سمجھ چکا تھا آذر چاہتا تو یہ کام پولیس کے ذریعے بھی کروا سکتا تھا لیکن اگر یہ بات بھی سامنے آجائی کہ علیحدہ آفندی پہ قارئنگ کرنے والے نے وقار آفندی کو فون کال کر کے خود

فائرنگ کی اطلاع دی تھی تو نہ جانے اور کتنے افسانے بنائے جاتے؟ اس لیے آذر نے یہ نمبر پولیس کو انکوائری کے لیے دینے کی بجائے خود اس کی پوچھ گچھ کرنا ہی مناسب سمجھا تھا تبھی وہ اس کام کے لیے خود آیا تھا کسی اور کو نہیں بھیجا تھا۔

”سر رات کو ایک موبائل نمبر سے کچھ میسجز بھی تھے اس نمبر کا کچھ پتا چل سکتا ہے؟“ آذر نے ”ایک“ میسج کہنے کی بجائے ”کچھ“ میسجز کا اضافہ کیا تھا۔

”موری آذر صاحب آپ کو اس نمبر کا وہاں سے پتا چل سکتا ہے جس موبائل کمپنی کا وہ نمبر ہے آپ اس کمپنی کے سروس سینٹر کال کریں یا پھر اس کے کسی قریبی فریجنڈز میں جا کر ساری صورت حال سے آگاہ کریں۔ وہ آپ کو اس کا حل بتا دیں گے۔“ سر رات نے آذر کو مشورہ دیا اور پھر لینڈ لائن کا نمبر لے کر اپنے کسی ملازم کو دیا اس نمبر کا ریکارڈ لکھا وہ انہوں نے ملازم کو کام سونپا وہ کانڈیپ لکھا ہوا نمبر لے کر چلا گیا تھا تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو آذر سمیت وہ بھی اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

”سر! آخر صاحب کہہ رہے ہیں اس نمبر کا ریکارڈ کچھ دیر بعد ملے گا۔“ اس نے اگر بیخام دیا۔

”کتنی دیر بعد؟“ آذر نے خڑی دیکھی۔

”خفہ خفہ، ڈیڑھ گھنٹہ تو لگ ہی جائے گا۔“

”اور پھر تو کافی لیٹ ہو جائے گا؟“ آذر کو پریشانی ہوئی۔

”ڈونٹ وری آذر صاحب میں یہ ریکارڈ آپ کے گھریا آپ کے آفس بھجوا دوں گا یا پھر آپ اپنا آئی ڈی دے جائیں آپ کو میل کروں گا۔“ سر رات نے کالی انجے مزاج کا تھا آذر مل کر خوش ہوا تھا اور پھر اپنا کارڈ نکال کر دیکھا گیا تاکہ وہ اسے میل کر سکے۔



”اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟“ وہ آفس کا ایک چکر لگا کر واپسی پہ ہسپتال آیا تھا۔

”اللہ کا بڑا کرم ہے صاحب۔“

”خیر و بابا نے فحاشت سے کہتے ہوئے اللہ کا شکر ادا کیا تھا۔“

”کیسا محسوس کر رہے ہیں؟ میں درد وغیرہ تو نہیں ہے؟“ آذر نے ان کے بازو پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کافی اپناہیت اور ہمدردی سے پوچھا تھا۔

”صاحب چوت لگی ہے تو درد تو ہو گا نا؟“

”مگر زیادہ درد ہے تو میں ڈاکٹرز سے بات کرنا ہوں وہ کور کریں۔“

”نہیں صاحب جب تک زخم نہیں بھرے گا درد ٹھیک نہ ہوگا“ آپ فکر نہ کرو آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گا۔“ خیر و بابا کافی باہمت اور بہادری سے اتنی تکلیف سہہ کر بھی ان کے ماتھے پر شکن تک نہیں تھی۔

”ان شاء اللہ آپ جلدی ٹھیک ہو جائیں گے۔“ وہ انہیں تسلی دے رہا تھا۔

”علیٰ علی بی کیسی ہیں؟ وہ ٹھیک ہیں نا؟“ انہیں اب بھی علیٰ علی کی فکر تھی۔

”اللہ کا شکر ہے کہ وہ ٹھیک ہے اس کو بچاتے بچاتے آپ خود زخمی ہو گئے“ آپ کو اپنے لیے بھی احتیاط کرنی چاہیے تھی۔“

”نہ صاحب آپ تو میرا فرض بنتا تھا بی بی کی حفاظت میرے ذمے ہی تو تھی ساری زندگی بڑے صاحب کا نمک کھایا ہے ان کی بی بی کو کچھ ہو جاتا تو میں ان کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا اور میری زندگی کا کیا ہے؟ آج ہے کل نہیں ہوئی۔ علیٰ علی بی تو ابھی بچی ہے اس نے ابھی دکھا ہی کیا ہے؟ میں تو اپنی پوری زندگی برت چکا ہوں۔“

انہوں نے آذر کے ہاتھ پہ اپنا نمبر سا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں خیر و بابا اپنی اپنی جگہ ہر ایک کی زندگی ضروری اور اہم ہے آپ ہمارے لیے قابل احترام ہیں علیٰ علی کی جان بچا کر آپ نے ہم سب کو اپنا احسان مند کر لیا ہے ہم لوگ آپ کا یہ احسان کبھی نہیں اتار سکتے۔“

”یہ احسان نہیں ہے صاحب یہ تو میرا فرض اور محبت ہے“ آپ سب کو تو میں نے اپنے ہاتھوں سے پالا پوسا ہے کھلایا سکھایا ہے اپنے بچوں کی طرح پیار کیا ہے اور کون ایسا انسان ہے جو اپنے بچے کو چوٹ لگتے خاموشی سے دیکھ سکتا ہے؟ انسان چاہتا ہے اس کے بچے کو لگنے والی چوٹ بھی اسے لگ جائے۔“ خیر و بابا کی بات پہ آذر کو اطمینان کے ساتھ ساتھ خوشی ہوئی تھی۔

”واقعی آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں یہ آپ کی محبت اور خلوص ہے کہ آپ اس طرح سمجھتے ہیں ورنہ آج کل اتنی محبت اور خلوص ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل سکتے۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”بڑے صاحب نے کچھ کہا تو نہیں؟“

”نہیں وہ بھلا کیا کہیں گے؟ آپ کی خیریت پوچھ رہے تھے کافی پریشان بھی تھے آپ کے لیے آپ کی دیکھ بھال کے لیے مبارک خان کو بھیجا ہے انہوں نے۔“ اس نے خیر و بابا کو اطمینان دلایا۔

”یہی تو ان کی اچھائی ہے وہ ہر ایک کا خیال رکھتے ہیں اپنے ملازموں کو بھی نہیں بھولتے۔“ انہوں نے وقار اتھڑی کی تعریف کی آذر مسکرا دیا۔

”اگر آپ کچھ بہتر محسوس کر رہے ہیں تو آپ سے کچھ سوال پوچھ سکتا ہے؟“ اس نے تھوڑا ہجک کے کہا۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں صاحب آپ پوچھو گیا پوچھنا ہے؟“ خیر و بابا نے بشاشت ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

”آپ کو کیا لگتا ہے وہ موٹر سائیکل سوار آپ کے پیچھے گاڑی کو فالو کرتے ہوئے آئے تھے یا پھر سامنے سے آکر حملہ کیا تھا؟“

”صاحب وہ ہمارا پیچھا کرتے ہوئے نہیں آئے تھے اور نہ ہی سامنے سے آکر حملہ کیا تھا“ آپ کو پتا ہو گا کہ علیٰ علی بی بی کے کانچ روڈ پہ جائیں تو ایک روڈ مغرب کی طرف سے بھی لکھا ہے وہ لوگ اسی روڈ سے اچانک نکلے اور گاڑی پہ فائرنگ کر دی لیکن میں نے گاڑی پھر بھی نہیں روکی اور علیٰ علی بی کو کہا کہ وہ سیٹ پہ لیٹ جائیں وہ یکدم چیخنے چلانے لگی تھیں میری بات پہ دھیان نہیں دیا اور اسی طرح سیٹ پہ بیٹھی رہیں۔ میں نے پھر مزکر انہیں کہا کہ سیٹ پہ لیٹ جائیں ان کو کوئی لگ جائے گی اور علیٰ علی بی بی یکدم سیٹ پہ گر گئیں لیکن میں سیدھا ہو کر بیٹھا تو سامنے ایک گولی میرے آگے اور گاڑی میرے قابو سے باہر ہوئی میں نے فوراً ”بریک“ لگا دیئے تھے اور میں بریک نہ بھی لگا تا تو گاڑی رک جاتی کیوں کہ انہوں نے آخر میں ٹائروں پہ بھی فائر کر دیئے تھے اور وہاں سے بھاگنے سے پہلے انہوں نے ایک بار رک کر علیٰ علی بی بی کو دکھا تھا وہ رو رہی تھیں وہ ان کو دیکھ کر چلے گئے تھے وہ چاہتے تو علیٰ علی بی کو مار سکتے تھے ان کے ہاتھ میں اسلحہ بھی تھا لیکن انہوں نے کچھ نہیں کہا اور چلے گئے پھر مجھے ہوش نہیں رہا کہ بعد میں کیا ہوا؟“ خیر و بابا نے تفصیل سے بتایا تھا۔

”کیا آپ ان کو پہچان سکتے ہیں؟“

”نہیں صاحب ان کے چہرے یہ روالہ مندھے ہوئے تھے۔“ خیر و بابا نے نفی میں سر ہلایا۔

”آپ کی نظر ان کی موٹر سائیکل یا نمبر پلیٹ پہ گئی ہو؟“ وہ ہر طرح سے تصدیق اور تسلی چاہتا تھا۔

”صاحب! جب موت سر پہ کھڑی ہو تو ان چیزوں کا ہوش کسے رہتا ہے؟“ وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہے تھے آذر چند لمحوں کے لیے خاموش ہو کے رہ گیا تھا اس کے ذہن میں بن چھ کے رہ گئی تھی کہ ان لوگوں نے کچھ دیر رک کر

قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

قرآن مجید کی مقدس آیات اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی ربی معصومہ میں امنائے اور تحش کے لیے شان کی جانی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے غرمتی سے محفوظ رکھیں۔

”تھینک یو سوئی تم نے مجھے یاد رکھا میرا انتظار کیا بھوک برداشت کی تھینک یو سوچ۔“ وہ آہستگی سے اس کا کال چھوتے ہوئے کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا تھا و قار آندی اسرار آندی اور ان کی نیگات بھی وہیں موجود تھیں۔ حرمت مدحت جو پر یہ انیہ اور احمد بھی وہیں بیٹھے ہوئے تھے آذر نے کلاک کی سستہ کھاتین بج رہے تھے گویا وہ بھی اپنے وقت پہ کالج لور یونیورسٹی سے آئے تھے بس وہ لیٹ پینچا تھا۔

”وانیال کہاں ہے؟“ اس نے کھانا شروع کرنے سے پہلے پوچھا۔

”نیکسی میں۔“ جواب احمد نے دیا تھا۔

”کیوں کیا کر رہا ہے؟“ آذر نے اپنے سامنے ٹیبل کن پھیلاتے ہوئے کہا۔

”آرام۔“ اس نے آرام سے زور دیا۔

”بھی ٹیک ٹیکل نہیں اتری؟“

”رات کی تحکلن رات ہی اتار سکتی ہے دن میں چاہے جتنا بھی آرام کرو وہ کی پوری نہیں ہوتی۔“ احمد نے جواز پیش کیا۔

”مگر تم کی رات دوبارہ جانا پڑ گیا تو؟“ آذر نے آخر کو پوچھا کہ رکھ دیا تھا۔

”نہیں۔“ آذر بھائی ایک رات میں ہی کمر تختہ بن گئی ہے اگر آج کی رات بھی لگ گئی تو سمجھیں ہم آپ کو ”تحت“ نظر آئیں گے سیدھے اکڑے ہوئے اور ٹھنڈے۔“ احمد نے ہولناک سافٹشہ کھینچا تھا۔

”آج کچھ تو سوچ سمجھ کر بولا کرو۔“ ثمنو بیگم نے بیٹے کو سرزنش کی۔

”مہی آپ بھی تو دیکھیں ہم کون سا ظلم ہو رہا ہے۔“ احمد نے منمنائے کہا۔

”یہ ظلم ہے؟“ وہ گھورنے لگیں۔

”تو اور کیا ہے؟“ زور دہانسا ہونے لگا۔

”یہ کسی بیمار کی عیادت اور خدمت کا موقع ہے قائدہ اٹھاؤ اور ثواب حاصل کرو۔“

”یہ قائدہ اور ثواب پوری حویلی میں کوئی اور کیوں نہیں حاصل کر رہا؟“ اس کا انداز ایسا تھا کہ آذر ہنسی پھپھانے کے لیے پانی کا گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگانے پہ مجبور ہو گیا تھا جبکہ حرمت وغیرہ ہنسی نہیں روک سکی تھیں وقار آندی بھی مسکرا رہے تھے کیونکہ ان کی علیزہ جو ہنس رہی تھی اس کی ہنسی ان کی رگوں میں زندگی دوڑا دیتی تھی۔

وہ لوگ ہنسی مذاق میں لچ کر رہے تھے اتنی ٹینشن اور پریشانیوں کے باوجود تھوڑی دیر کے لیے خوشگوار ماحول کافی اچھا لگ رہا تھا جب اچانک آذر کے سیل پہ پیسج کیون گئی۔ اس نے فوراً ”سیل نکال کر دیکھا۔“

”آذر آندی کیا خیو بابا نے یہ نہیں بتایا کہ جن لڑکوں نے قازنگ کی تھی وہی ان کو ہسپتال میں لے کر گئے تھے؟“ پیسج پڑھ کر رنگ رہ گیا تھا۔

گاڑی میں جھانک کر علیزہ کو دیکھا اور کچھ بھی کہے بغیر چلے گئے؟ اگر وہ چاہتے تو علیزہ کو مار سکتے تھے نہ جی یا نقصان پہنچا سکتے تھے۔ اس کی جان لے سکتے تھے؟ مگر اس مگر نے توڑ کی انجمنوں میں اضافہ کر دیا۔ مگر انہوں نے کچھ نہیں کیا اور علیزہ کی زندگی بخش کر چلے گئے؟ آخر کیوں؟ کیا وجہ تھی؟ کیا مقصد تھا ان کا؟ وہ جتنا ہی سوچتا اتنا ہی الجھتا گولی سرا ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔

”ایک سوال اور۔“

”کیا پہلے بھی علیزہ کو پک اینڈ ڈراپ کرتے ہوئے ڈرائیونگ کے دوران یا کالج کے آس پاس کوئی مشکوک آدمی نظر آیا؟ جس کو آپ نے دو تین بار لگا مار دیکھا ہو؟“

”صاحب انہی لوگوں کو دیکھتا تھا جو اپنی بچیوں کو چھوڑنے آتے تھے کسی کے ساتھ بھائی ہوتا تھا کسی کے ساتھ باپ کوئی گاڑی۔ آتے تھے کوئی موٹر سائیکل پہ۔ میں بھلا کس کس کو یاد رکھ سکتا ہوں؟“ آذر کو آخری سوال کا جواب بھی مل گیا مگر وہ بھی باقیوں جیسا۔

”ہوں! کوئی بات نہیں آخر بتا چل ہی جائے گا۔“ آذر کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”آپ آرام کریں میں مبارک خان کو اندر بھیجتا ہوں۔“ وہ ان کا ہاتھ تھپک کر باہر نکل آیا۔ باہر کشادہ رانداری میں رکھے پیچھے بیٹھا مبارک خان اخبار پڑھ رہا تھا تو رست قدموں سے مبارک خان کے پاس آکھڑا ہوا مبارک خان اسے دیکھ کر فوراً ”کھڑا ہو گیا تھا۔“

”جی صاحب! حکم؟“ وہ سر جھکا کے مودب کھڑا تھا۔

”اندراجاؤ خیو بابا کے پاس۔“ آذر نے آہستگی سے کہا پیشانی پہ شکنیں تھیں مبارک خان اسے دیکھ کر متفکر ہوا تھا۔

”خیریت تو ہے صاحب؟ آپ مت پریشان لگ رہے ہیں؟“

”ہوں! نہیں کوئی پریشانی نہیں تم خیو بابا کا خیال رکھو اور کسی بھی چیز کی ضرورت پڑے مجھے فون پہ بتا دینا“ شام کو وانیال اور جودت چکر لگائیں گے تم آج رات ہمیں رکو گے۔“ اس نے اپنے خیالات اپنی سوچوں کے دائرے سے نکلتے ہوئے اسے دیا تویں۔

”ٹھیک ہے صاحب جیسے آپ کا حکم۔“ وہ فوراً ”حکم بجالایا۔ اور آذر ہسپتال کے احاطے سے نکل آیا تھا اس کا رخ ہڈی حویلی کی طرف تھا لیکن سوچوں کے رخ نچانے کہاں سے کہاں جا رہے تھے کوئی کہیں تو کوئی کہیں پہنچا ہوا تھا۔ ریسیم کی کھسی تھی جو سلجھ رہی تھی النامیغ شل ہو کے رہ گیا تھا۔

یہ تو اس کی ہمت بھی کہ کل سے لگا تار الجھ بھی رہا تھا اور بھاگ دوڑ بھی کر رہا تھا یہاں تک کہ سب کا خیال بھی رکھ رہا تھا ہر اونچ نیچ پہ نظر تھی ہر اچھے برے کا احساس تھا کیا ظاہر کرتا تھا اور کیا چھپا کے رکھتا تھا اس پہ بھی اس کا دھیان تھا اور یہ سب اس کی خوبیوں اور بلند حوصلے کی نشانی تھی وہ گھر پہنچا تو وہ لوگ نیچ پہ اس کا ریٹ گرتے نظر آئے تھے لیکن جتنا فریش وہ صبح نظر آ رہا تھا اس وقت اتنا ہی سست اور الجھیا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

”آذر بھائی! تالیٹ کر دیا آپ نے؟ مجھے کب سے بھوک لگ رہی تھی۔“ علیزہ اسے دیکھتے ہی بے چارگی سے بولی۔

”تو تم کھا لیتیں نا؟“ آذر سوچوں کا بوجھ تھوڑی دیر کے لیے جھٹکتے ہوئے نرمی سے بولا۔

”آپ نے صبح میرے بغیر ناشتا نہیں کیا تو میں کچھ کیسے کر لیتی؟“ علیزہ کا جواب بھی کھرا تھا آذر اتنی ٹینشن کے باوجود مسکرا دیا۔

اس کا داغ چکرا گیا تھا اور کانوں میں سے جیسے دھواں نکلتا ہوا محسوس ہوا تھا وہ ششدر سا بیٹھا موبائل اسکرین پر نظر آتے الفاظ کو دیکھ رہا تھا اس کے ایک ہاتھ میں کھالے کا چمچہ تھا اور ایک ہاتھ میں موبائل فون۔ لیکن دونوں چیزوں کو تھامنے کے باوجود اس کے دونوں ہاتھ اپنی اپنی جگہ پر ساکت ہوئے لگ رہے تھے اور یہی حال اس کی نظروں کا بھی تھا جو موبائل اسکرین پر جمی ہوئی تھیں۔

”آؤر! کیا بات ہے؟ کیا ہوا ہے؟“ اس کی یہ متحد سی کیفیت سب سے پہلے وقار آفندی نے ہی نوٹ کی تھی جس پر باقی سب بھی آؤر کی سمت متوجہ ہوئے تھے اور آؤر یکدم چونک گیا تھا۔

”خیریت تو ہے نا؟“ آؤر کے چہرے پر پریشانی اور الجھن کے سائے صاف نظر آ رہے تھے۔

”جی سب خیریت ہے ڈونشوری۔“ اس نے بمشکل اپنے آپ کو کمپوز کیا تھا۔

”میسیج کس کا تھا؟“

”میرے ایک دوست کا تھا۔“ اس نے بہانا بنا دیا۔

”تو پھر اتنے پریشان کیوں لگ رہے ہو؟“ وقار آفندی اسے کرید رہے تھے۔

”اس کی طبیعت ٹھیک نہیں اس لیے پریشانی ہو رہی ہے۔“ آؤر کو اپنا جھوٹ نبھانے کے لیے مزید جھوٹ بولنا پڑا۔

”اور! تو اس سے مل آؤ جا کر۔“

”ابھی میں تھکا ہوا ہوں آرام کروں گا۔“ آؤر لا پرواہی سے کہتا چمچہ رکھ کر پانی پیتے ہوئے فوراً ہی کھڑا ہو گیا تھا ان کی حیران سی نظریں آؤر پر ہی تھیں لیکن ان میں سے صرف علیزے کی نظریں ایسی تھیں جن میں حیران نہیں بلکہ خوف اور دہشت کی لہری تیر رہی تھی۔ آؤر اس کی نظروں سے تھوڑی دیر کے لیے نظریں چرا تا وہاں سے چلا آیا تھا اس کا رخ اپنے بیڈ روم کی طرف تھا وہ بڑی تیزی سے میڑھیاں ملے کر اپنے بیڈ روم میں آیا تھا اور سب سے پہلے موبائل نکال کر وائیاں کا نمبر ڈائل کیا تھا۔

”ہیلو۔“ وائیاں کی فینڈ سے بوجھل آواز سنائی دی۔

”وائیاں! میں آؤر بات کر رہا ہوں۔“

”ہاں میں نمبر دیکھ چکا ہوں کہاں ہو تم؟“

”میں حویلی میں ہی ہوں تم ابھی بیڈ روم میں آؤ نہیں نے تم سے بات کرنی ہے۔“ آؤر کا لہجہ غلٹ بھرا تھا۔

”کیا؟ تم حویلی میں ہو؟“ اب کی بار وائیاں کو اچنبھا ہوا تھا کہ وہ حویلی میں موجود ہو کر بھی فون پر رابطہ کر رہا ہے آخر کیا وجہ ہے؟

”ہاں حویلی میں ہوں تم جلدی آؤ اور ہاں کسی کو بتانا مت کہ میں نے تمہیں بلایا ہے۔“ آؤر نے فون بند کرنے سے پہلے تاکید کی تھی۔

”اوکے۔“ وائیاں نے فون بند کر دیا اور آؤر اپنے بیڈ روم میں بے چینی سے ٹھلتے ہوئے اس کا انتظار کرنے لگا تھا اور اگلے دس منٹ میں وائیاں اس کے بیڈ روم میں اس کے سامنے تھیں۔

”سب خیریت تو ہے نا؟“ وائیاں نے چھوٹے ہی سوال کیا۔

”خیریت ہوتی تو تمہیں فینڈ سے نہ جگاتا۔“ آؤر کے انداز و اطوار سے اضطراب جھٹک رہا تھا۔

”کیوں؟ کیا ہوا ہے؟“ وائیاں بھی متحکماً ہنسنے لگا تھا۔

”میں آج خیر و باہا سے ملنے ہسپتال گیا تھا۔“ اس نے جیسے اپنے اضطراب کو بیان کرنے کے لیے تمہید باندھی۔

”پھر؟“

”پھر میں نے ان سے حائل چال پوچھنے کے بعد ان سے چند سوال پوچھے اور انہوں نے وہی جواب دیئے جو وہ جانتے تھے۔“

”کیسے سوال پوچھے تھے؟“

”میں نے جن دو لڑکوں نے فائرنگ کی وہ ان کو پہچان سکتے ہیں یا نہیں؟“

”پھر کیا کہا انہوں نے؟“

”وہی جو ہم پہلے ہی جانتے ہیں کہ ان کے چہروں پہ رومال بندھے ہوئے تھے اس لیے پہچانا بہت مشکل کام ہے۔ بلکہ وہ تو یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ ان کو ہسپتال کون لے کر گیا تھا؟“

”تو اب تمہیں کیا بات پریشان کر رہی ہے؟“ دانیال آذر کے پریشان چہرے کو دیکھتے ہوئے بولا۔

”یہ دیکھو۔“ اس نے موبائل دانیال کے سامنے کر دیا۔

”آذر آندری کیا خیرو بابا نے یہ نہیں بتایا کہ جن لڑکوں نے فائرنگ کی تھی وہی ان کو ہسپتال بھی لے کر گئے تھے؟“ دانیال بھی بیچ پر دھ کر شاید شاکر دہ گیا تھا۔ بیسج اب سے بیس منٹ پہلے کا تھا یعنی تازہ ترین۔ اس کے کانوں سے بھی دھواں اسی طرح نکلا تھا جیسے آذر کے کانوں سے نکلا تھا۔

”اس نمبر پر ٹرائی کیا تم نے؟“ دانیال نے اسکرین پر نظر آتے نمبر کو دیکھا۔

”یقیناً آف ہو گا۔“ آذر کو یقین تھا۔

”ٹرائی تو کرو۔“

”تم خود کر کے دیکھ لو۔“ اس نے موبائل دانیال کو پکڑا دیا۔ اور پھر بیچ بیچ نمبر پاور آف ملاتا تھا۔

”اب کیا سوچ رہے ہو تم؟“ دانیال اس کا پرسوج انداز بھانپ چکا تھا۔

”میں سوچ رہا ہوں کہ صرف فائرنگ ہی مسئلہ نہیں ہے بلکہ اور مسئلہ بھی سامنے آرہے ہیں ایک ہی مسئلہ کی کئی شاخیں نکل رہی ہیں۔“ آذر کا انداز ہنوز پرسوج سا تھا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ دانیال الجھا۔

”یار مطلب کو نہ دیکھو تم غور کرو علیزے یہ فائرنگ ہوئی لیکن علیزے کو نقصان نہیں پہنچا فائرنگ کے اور بعد ڈیڈ کو ان کے پرستل نمبر پہ اطلاع دی گئی۔ حالانکہ ڈیڈ کا نمبر حادثے کے وقت نہ علیزے نے کسی کو دیا تھا

خیرو بابا نے یعنی نمبر پہلے سے موجود تھا؟ پھر میڈیا والوں کو خرید لیا گیا یعنی جتنا پیسہ میں نے دیا تھا اس سے زیادہ یہ اس آدمی نے دیا ہو گا؟ ڈیڈ صبح خیرو بابا کی عیادت کے لیے ہسپتال گئے تو میڈیا والے بھی ان کے پیچھے پہنچ گئے

میں انہیں خبر کی گئی تھی؟ پھر میں ہسپتال گیا تو بھی خبر ہو گئی کہ میں خیرو بابا سے ملنے گیا ہوں یہاں تک کہ میرے پرستل نمبر سے بیسج بھی بیچ دیا ہے۔ اور اس ساری صورت حال سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ آدمی کس حد تک

غیر بے اور کسی حد تک ہم پر نظر رکھے ہوئے ہے؟“ آذر نے اپنی سوچ کا اظہار کافی تفصیل سے کیا تھا۔

”یہ تو تمہارا فی ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن کیا کیا جاسکتا ہے اب؟“ دانیال بھی اس کی سوچ پہ متفق تھا۔

”میں کہ ہم حد سے زیادہ محتاط ہو جائیں کوئی بات کسی سے ڈسکس نہ کریں ہر بات اپنے تک محدود رکھیں جو بھی قدم اٹھائیں اس کا کسی کو بھی علم نہ ہو۔ یہاں تک کہ ہمارے بھائی کو بھی نہیں کیونکہ ہمارے بڑے ان بات کو نہیں چھپا سکتے اور آج کے بعد ہر بات میرے اور تمہارے درمیان رہے گی کوئی تیسرا کچھ بھی نہ

ہے۔“ آذر نے اسے اچھی طرح سمجھایا۔

”لو کے ایڑیووش۔“ دانیال نے سر جھکا دیا۔

”اور اب میرا خیال ہے کہ جو بھی پوچھ کر پتہ نہ ہو گا وہ تمہارے ہسپتال جاؤ اور پتہ کرنے کی کوشش کرو کہ

جن لڑکوں نے خیرو بابا کو ایڈمٹ کر دیا تھا انہوں نے اپنا نام موبیلا درج کر دیا تھا؟“ آذر نے اسے کام سونپا۔

”اس کے میں پتا کرنا ہوں۔“

”ٹھیک ہے پھر مجھے بتاؤ۔“ آذر نے تاکید کی۔

”اس نمبر کا کیا بنا جس سے کل ڈیڈ کے نمبر پہ کال آئی تھی؟“ دانیال جاتے جاتے پھر واپس پلٹا۔

”میں نیلی فون ایسکس بیچ گیا تھا۔ سپروائزر سے ملاقات ہوئی تھی وہ کہتے ہیں کچھ دیر تک ساری انفارمیشن میل کر دیں گے۔“ آذر نے سلی دی اور دانیال باہر نکل گیا تھا۔



”گوئل! وہ بیڑھیاں چڑھ رہی تھی جب بیچھے سے حرمت کی آواز سنائی دی۔

”ہوں؟“ اس نے پلٹ کر دھم سے کہا۔

”بیچ نہیں کرو گی۔“

”نہیں بھوک نہیں ہے۔“

”کیوں آج بھوک کہاں آڑ گئی؟“ حرمت کا لہجہ معنی خیز تھا۔

”کیوں؟ میری بھوک کیوں آڑے گی؟“ گوئل نے اسے گھورتے ہوئے دیکھا۔

”بس ویسے ہی۔“ اس نے کندھے اچکائے

”تم ملازمہ سے کو کھانا لگائے میں بیچ کر کے آرہی ہوں۔“ گوئل کہہ کر اوپر بیڈ روم چلی گئی تھی اور حرمت حسب توقع ٹیبلہ لے کر اب بیڈ روم کی کچن میں آگئی۔ کچھ ہی دیر کو گوئل بھی وہیں چلی آئی۔

”کھانے میں کیا بنا ہے آج؟“ وہ کرسی ٹھیکتے ہوئے بولی۔

”مٹن رائس اور مٹن کرنا ہی اور ساتھ میں باقی لوازمات۔“

”افسار آج پھر مٹن؟“ گوئل کو کھانے میں چکن پسند تھا۔

”آذر بھائی اور ڈیڈ نے کھیر ہی بیچ کرنا تھا اس لیے ان کی پسند کو د نظر رکھا گیا تھا۔“ حرمت نے آگاہ کیا۔

”اور علیزے نے؟“ گوئل کو آذر اور ڈیڈ کے بعد علیزے کا خیال آیا۔

”اس کا کھانا تو پہلے ہی رچوئے تیار کرنا ہوتا ہے یقیناً کوئی بیجی ٹیبل ہی بنائی ہوگی یہ مٹن اور چکن تو اسے پسند ہی نہیں ہیں۔“ حرمت سالاد کی پلیٹ میں سے مولیٰ کی قاش اٹھاتے ہوئے بولی۔

”ہاں یہ تو میں بھول ہی گئی۔“ گوئل سمجھنا نہ سابی اور کھانا نکالنے لگی۔

”تمہارا سفر کیسا رہا؟“ حرمت بالا خراپے مطلب کی بات پہ آگئی تھی۔

”کون سا سفر؟“ وہ انجان بنی۔

”جس پر تمہیں بھیجا تھا۔“

”آخری سفر؟“ گوئل بے ساختہ بولی۔

”جو مت اصراف صاف بتاؤ سفر کیسا رہا اور کیا کیا باتیں ہوئیں؟“ حرمت کو بے چینی ہو رہی تھی۔

”یار کیسا سفر اور کیسی باتیں چھوڑو کوئی اور بات کرو۔“ گوئل کھانا کھانے میں مصروف تھی۔

”کیوں کوئی اور بات کروں تم کچھ تو بتاؤ نا۔“ وہ اصرار کر رہی تھی۔

”تمہیں مایوسی ہوگی۔“ گوئل کا انداز لاہروا سا تھا اور بات بھی خامے نارمل سے انداز میں کر رہی تھی۔

”وہ کیوں؟ آخر تمہیں کس لیے بھیجا تھا؟“ حرمت کو تاؤ آگیا تھا۔

”کس لیے بھیجا تھا؟“ کوئل نے پانی گلاس میں اٹھٹپتے ہوئے پوچھا۔

”باتیں کرنے کے لیے۔“ وہ زور دے کر بولی۔

”کیسی باتیں؟“ چھوٹی آنکھوں پر ہنس۔

”کوئل پلینز۔“ حرمت جھنجھلا گئی۔

”یار پوچھ رہی ہوں تاکہ کیسی باتیں؟“ کوئل نے پھر سوال دہرایا۔

”تمہاری باتیں اور ان کی باتیں۔“ اب کی بار حرمت چپا کر بولی تھی۔

”نہیں! یعنی ہماری باتیں؟“ وہ کچھ حرمت میری باتیں یہ تھیں کہ میری اسٹڈی کیسی جا رہی ہے اور میں کون سے

ایئر میں ہوں؟ اور ان کی باتیں یہ تھیں کہ وہ علیزے کے لیے بہت پریشان ہیں اور علیزے آج کل ڈسٹرب

ہے۔ بس اس کے بعد فون گاں آئی اور باتیں ختم۔ کوئل نے کافی استراٹجی سے لہجے میں بتایا تھا۔

”بس یہ باتیں؟“ حرمت کو افسوس ہوا۔

”بس یہ سفر۔“ کوئل نے ساتھ لقمہ دیا۔

”لیکن کوئل۔“

”پلینز حرمت اب کوئی صفائی مت دینا میں سب جانتی ہوں۔“ وہ کرسی دھکیل کر کھڑی ہو گئی۔

”کوئل یار سنو تو۔“ حرمت نے پکارا۔ مگر وہاں رکے بغیر چلی گئی تھی اس کا سوڈ آف ہو چکا تھا۔

”استاد میں بڑے دنوں سے ایک بات سوچ رہا ہوں لیکن مجھے سمجھ نہیں آ رہی۔“ چھوٹا پرائے کپڑے سے

اپنے تیل سے اٹے ہاتھ پونچھتا ہوا عدیل کے پاس آ بیٹھا۔ عدیل بورکشاپ کے لیے نئے پرزے منگوانے کے لیے

لسٹ بنا رہا تھا لیکن چھوٹے کی بات پہ تھک گیا۔

”کیا بات سوچ رہے ہو۔“ عدیل نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”پہلے وعدہ کرو کہ جواب ضرور دو گے۔“ چھوٹے نے پہلے وعدہ لیا عدیل کو حیرت ہو رہی تھی۔

”او کے ضرور دوں گا۔“

”تو پھر بتاؤ کہ“ منی کیوں بدنام ہوئی؟“ چھوٹا سنجیدہ سامنے بنا کے بولا تھا۔

”پہلے؟“ عدیل کو مزید حیرت نے آگھیرا اور وہ کھڑے سلو اور جیدی کو دیکھ کر وہ چھوٹے کی شرارت سمجھ گیا تھا وہ

دونوں ہنس رہے تھے۔

”بتاؤ استاد منی کیوں بدنام ہوئی۔“ چھوٹے نے اصرار کیا۔

”ڈار لنگ حیرے لیے۔“ اس نے بے ساختہ کہا تھا اور چھوٹا خوشی اور فتح کے احساس سے قبضے لگا تاٹھ کر سلو

کے پاس جا کھڑا ہوا تھا۔

”دیکھا استاد کو بھی بتا ہے“ منی میرے لیے بدنام ہوئی ہے تم تو صرف نام کے سلمان خان ہو۔“ اس نے سلو کو

چڑایا تھا۔

”تیرے لیے بدنام ہونے سے بہتر تھا کہ منی مر رہی جاتی۔“ سلو چھوٹے کو پرے دھکیلتا ہوا گاڑی کے انجن پہ

جھک گیا تھا۔

”یار تو شیل کی جوانی گنا شروع کر دے۔“ جیدی نے سلو کو تھپکی دی۔

”اور یہ پھر کسے گا کہ شیل تو اس کی منگیتر رہی ہے۔“ سلو نے چھوٹے کو گھور کے دیکھا تھا اور عدیل لن کی

شرارتوں اور چپٹر جھاڑ پہ مسکراتا ہوا دوبارہ لسٹ کی طرف متوجہ ہوا تھا ان لوگوں کی بورا دن کسی نہ کسی گانے یا فلم
بجٹ اور نوک جھوک ہوتی ہی رہتی تھی اور کچھ نہ بس چٹا تو ایکٹرس اور ایکٹرز کو گفتگوں کیسٹ لائے تھے اور جو
جس کا دیوانہ ہوتا تھا اس کے بارے میں معلومات کا خزانہ بھی رکھتا تھا۔ اور ایسے چکر میں اگر ورکشاپ کا کوئی
کام اوجھڑا رہ جاتا تو باؤ امتیاز کے ہاتھوں ان کی شامت آجاتی تھی اس وقت بھی کچھ ایسا ہی حال نظر آ رہا تھا۔

”یار باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ کام بھی کر لیا کرو یہ گاڑی آج ہی ٹھیک کر کے شیخ صاحب کے گھر پہنچانی ہے
استاد تاکید کر کے گئے ہیں۔“ عدیل نے بالا خزان کو ٹوک ہی دیا تھا۔

”اور استاد نے یہ بھی تاکید کی ہے کہ شیخ صاحب پیسے نہ دیں تو گاڑی اسی طرح واپس ورکشاپ ہی لے
آئیں۔“ چھوٹے نے ہنستے ہوئے کہا۔

”پھر شیخ صاحب خود گاڑی کی طرح بھاگتے ہوئے پیچھے آئیں گے۔“ سلو نے بھی حصہ لیا اور عدیل چاہتے
ہوئے بھی اپنی مسکراہٹ نہیں روک سکا تھا۔

”چلو اب باتیں بعد میں کرنا پہلے کام ختم کرو۔“ اس نے سنجیدگی طاری کرتے ہوئے کہا۔

”استاد سارا دن کام ہی تو کرتے رہتے ہیں۔“ جیدی نے بے زاری سے کہا۔

”پہلے تم بخت سارا دن کام کرتے ہو تو کیا کام کے پیسے نہیں لیتے؟“ باؤ امتیاز نے اندر آتے ہوئے اس کی بات
سن لی تھی اور جیدی یکدم اچھل پڑا تھا۔

”نہیں استاد میں تو ویسے ہی کہہ رہا تھا۔“ اس نے فوراً صفائی پیش کی۔

”میں اچھی طرح جانتا ہوں تو کتنا بڑا حرام ہے کام چور ہے تو۔“ باؤ امتیاز کو موقع مل گیا اسے کھری کھری سنانے
کا جیدی سر جھکانے سنا رہا اور باقی دونوں بڑی شرافت اور محنت کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود بہ خود اپنے اپنے کام

میں لگ گئے تھے ان کو باتیں سنا کر باؤ امتیاز عدیل کے قریب آ کر کے
”میں گئی لسٹ؟“

”جی ہاں۔“ عدیل اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا۔

”کتنا خرچہ آئے گا؟“ وہ ٹوٹل حساب پوچھ رہے تھے۔

”تقریباً“ نہیں سے چونتیس ہزار کا سلمان ہو گا یہ سارا۔“ عدیل نے اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

”میں! تو پھر ایسا کرو کہ یہ سلمان کل گوجرانوالہ جا کر لے آؤ“ باؤ حمید کی ہار کیٹ میں جانا اور میرا نام لینا وہ سارا
سلمان سستے ریت میں دیں گے۔“ انہوں نے اسے سمجھایا۔

”ٹھیک ہے میں جا کر لے آؤں گا“ آپ سب کچھ سمجھا دیتے تھے۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ہوں! شام
تک سب سمجھاؤں گا اور سلمان کے لیے رقم بھی دے دوں گا۔“ باؤ امتیاز کو اس پر بھروسہ تھا اسی لیے اب ہر

چھوٹے موٹے کام کی ذمہ داری اسے ہی سونپتے تھے۔

”جیسے آپ کی مرضی۔“ وہ سعادت مندی سے بولا۔

”اور ہاں ایک بات بتاؤ تمہارے لابی کیسے ہیں؟“ باؤ امتیاز کچھ یاد آنے پر واپس مڑتے ہوئے ٹھہر گئے تھے۔

”اب لابی کی طبیعت کے لیے میں کیا کہوں؟“ عدیل نے بے بسی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کیونکہ ان کی طبیعت ویسی ہی ہے جیسی پچھلے دو سالوں سے چلی آ رہی ہے اب کون سا علاج کروا رہے ہیں جو
اتنی جلدی فرق آجائے گا؟“ عدیل جیسے اپنے آپ پہ طنز کر رہا تھا حالانکہ وہ بڑا صاحبزادہ تھا مگر ساہمہ تھا۔

”تو علاج کیوں نہیں کروا رہے؟“ باؤ امتیاز کا سوال بہت بے ساختہ تھا عدیل باؤ امتیاز کو دیکھتا رہ گیا۔ ”چپ

”کیوں ہو گئے ہو؟“

یوں ہوتے ہو؟
 "استاد آپ صرف اتنا جانتے ہیں کہ میرے ابا جی بیمار ہیں، نہ چل پھر سکتے ہیں، نہ خود کچھ کھا پی سکتے ہیں لیکن آپ یہ نہیں جانتے کہ میری پانچ بہنیں بھی ہیں جن کی ذمہ داری بھی ظاہر ہے کہ میری ہی ذمہ داری ہے ایسے میں گھر کا نظام چلے یا پھر کسی بیماری کا علاج؟" عدیل نے ان کو سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا باؤ امتیاز چپ کے چپ رہ گئے تھے اور انہیں یہ بھی احساس ہو گیا تھا کہ عدیل اتنا خاموش خاموش اور سنجیدہ سنجیدہ سا کیوں رہتا ہے؟
 "دیکھیے استاد میں درکشاپ میں کام کر رہا ہوں، جنازہ کا انجینئر نہیں ہوں کہ ایک دم سے میرے گھر کے سارے مسئلے حل ہو جائیں، پورا مہینہ گاڑیوں کی مرمت ہوگی تب جا کر تنخواہ ملے گی، انٹی دسے آپ پریشان نہ ہوں، اللہ بہتر کرے گا بس اللہ سے بہتری کی دعا کرنی چاہیے۔" اس نے باؤ امتیاز کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا انہیں تسلی دی تھی۔

”باوجود اکتوبر واقعی بڑے حوصلے اور بڑے صبر والا ہے؟“ باؤ امتیاز آہستہ سے سر اسنے والے لہجے میں بولا تھا۔
 ”استاد مشکلیں اور مصیبتیں خود ہی انسان کو صبر اور حوصلہ سکھاتی ہیں اس میں کسی کی تسلی اور ہدایت کی
 ضرورت بھی نہیں پڑتی سب کچھ خود بخود آجاتا ہے۔“ عدیل کا انداز ٹھہرا ہوا تھا۔
 ”اللہ تمہیں اس صبر کا اجر دے گا۔“ انہوں نے اس کا کندھا تھکا۔
 ”آمین۔“ وہ آہستہ سے کہہ کر کام کی طرف متوجہ ہو گیا لیکن باؤ امتیاز کا دھیان کافی دیر اسی کی طرف لگا رہا تھا۔

وہ آج صبح کافی جلدی اٹھ گیا تھا اور جاگنگ پہ جانے کی بجائے شاور لینے باتھ روم میں چلا گیا۔ دس منٹ بعد شاور لے کر باہر نکلا تو دروازے پہ دستک ہوئی تھی۔

”مہوں! آجاؤ۔“ اسے پتا تھا ہر کون ہو گا؟

”جی صاحب کس وقت نکلنا ہے؟“ گلاب خان حکم کی تعمیل کے لیے تیار کھڑا تھا۔

”سات بجے ایئر پورٹ پہنچنا ہے“ آٹھ بجے کی فلائٹ ہے اور صبح پنج اتار رش ہوتا ہے کہ راستے میں لیٹ ہونے کی بجائے ستر ہے کہ ہم ذرا پہلے پہنچ جائیں۔“ وہ اپنے بالوں میں تولیہ رٹرتے ہوئے بولا۔

”جی صاحب یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ گلاب خان نے اتفاق کیا۔

”اس کے تم گل سے کہو کہ وہ جلدی سے ناشتا بنا کر تیار ہو جائے، ہم راستے میں اسے ٹیبل کے گھر ڈراپ کر جائیں گے۔“ اس نے وارڈ روم کھول کر اپنے کپڑے نکالے۔

”جی صاحب کہہ دیتا ہوں۔“ گلاب خان سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”اور زلفی سے کہو اب تمہاری صرف ٹائٹ ڈیوٹی نہیں بلکہ فل ٹائم جاب ہوگی۔“ اس نے ایک اور حکم دیا۔

”فل ٹائم؟“ گلاب خان کو حیرت ہوئی۔

”ہاں یار! تمہیں ہزاروں کاموں کے لیے اوہر سے اوہر بھاگنا پڑتا ہے اور آج کل کے حالات ایسے ہیں کہ ذرا دیر کے لیے بھی میٹ کو خالی نہیں چھوڑا جاسکتا“ اس لیے بستر ہے کہ زلفی کو پکا پکا داغ مین رکھ لیا جائے تمہاری رات بگ اور بھاگ دوڑ کم ہو جائے گی اور وہ بھی ایک جگہ ٹک جائے گا۔ کیا خیال ہے تمہارا؟“ اس نے آخر میں غلاب خان سے استفسار کیا۔

”مناحب میرا خیال آپ کے خیال سے اچھا نہیں ہو سکتا“ آپ نے جو بھی سوچا ہے بہتر سوچا ہے۔“ اسے بھلا
کیا اعتراض ہو سکتا تھا؟

”ٹھیک ہے جاؤ تم گاڑی تیار کرو“ میں آ رہا ہوں بس۔“ اس نے غلاب خان کو اجازت دی اور خود تیار ہونے لگا دس منٹ میں وہ تیار ہوا اور ناشتا کیا تھا۔ جب تک وہ گاڑی میں بیٹھا گل بھی چادر لے کر آگئی تھی۔ غلاب خان اس کے لیے بیک ڈور کھول، ہاتھ وہ پیچھے بیٹھنی اور خود آگرو راسیونگ سیٹ سنبھال لی۔ آج گیٹ پہ غلاب خان کی بجائے زلفی تھا جیسے ہی گاڑی اشارت ہوئی اس نے گیٹ کھول دیا تھا۔ اور ساتھ ہی ہاتھ کے اشارے سے دل آور شاہ کو سلام کیا جوا یا ”وہ بھی اشارے سے والسلام کہتا نہیں بھولا تھا۔“

”اسپیڈ بڑھاؤ یار۔“ اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

”صاحب ہم سات بجے ان شاء اللہ ائیر پور شپ ہوں گے۔“ قطب خان کو اپنی ڈرائیو ٹنگ پہ یقین تھا۔ دل تو رونا مونا کل نکال کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔

”السلام علیکم سب“ دوسری طرف اس کا منشی قادیان تھا۔

”میں آج کورٹ نہیں آ رہا، تم آفس کا چکر لگالیں۔“

”سر آج جو بہت اہم کیس ہے۔“

”قادور! میں جانتا ہوں یہ کیسے کرتا، ہم ہے؟ لیکن میرے دوست نہیں سے زیادہ اہم نہیں ہے میں اگلی تاریخ پر سب ہینڈل کروں گا۔ تم بس تاریخ لے لو۔“ اس نے منشی کو سچایا۔

دل اور شہزاد نے کبھی بھی اپنے کسی کام میں کوتاہی نہیں کی تھی اور نہ ہی اپنے گناہوں کو خوار کرتا تھا اس آج کل اس کی مصروفیت ہی ایسی بڑھ گئی تھی کہ اسے یہ سب کرنا پڑ رہا تھا۔

”آپ کل ٹیگورٹ آئیں گے نا؟“

”کچھ کہہ نہیں سکتا“ قل کا کام تمہیں کل ہی بتاؤں گا۔“

”سر! وہ مہر منگنی ہے۔“

”پلیز قادر میں اس وقت کسی بھی مومنہ بی بی کو ٹوکس نہیں کر سکتا یہ کام پھر کبھی پہ اٹھار کھو“ اس نے قادر کو روک دیا۔

”مسوری سر“

”لو کے رات کو مجھے فون کر کے ساری تفصیل بتا دیتا۔“

”ٹھیک ہے سر اللہ حافظ۔“ اس نے فون بند کر دیا تھا۔

اور اگلے پانچ منٹ میں محل کو میل کے گھر ڈراپ کرنے کے بعد وہ لوگ ایئر پورٹ کی سمت روانہ ہو چکے تھے اور غلاب خان کے قول کے مطابق ٹھیک سات بجے وہ لوگ ایئر پورٹ پہ موجود تھے۔ غلاب خان گاڑی میں ہی بیٹھ رہا جبکہ وہ اندر چلا گیا فلائٹ کی ٹائم ٹیگ کا ایک بار پھر بتا کر رہا تھا۔

آؤر نے صبح اٹھتے ہی سب سے پہلے اپنا لیپ ٹاپ آن کرتے ہوئے اٹنی میلز چیک کی تھیں اور ایک میل پہ
س کی نظرس جمائی تھیں وہ بری طرح چونکا تھا۔ یہ فیملی فون ایکس چینج کے سپروائزر فیضان حامد نے کی تھی
س میں انہوں نے آؤر کے مطلوبہ نمبر کا ڈیٹا بتایا تھا وہ نمبر اس ہسپتال کا نمبر تھا جہاں اس وقت خیر بایا ایڈمٹ
تھے۔

آؤ اس نے انکشاف پہ ایک بار پھر ساکت سا بیخار گیا تھا یہ ساری مہنتیں اس قدر ابھی ہوئی تھیں کہ سلجھنے کا یہی نہیں لے رہی تھی کوئی سراہا تو ہی نہیں آ رہا تھا۔

”اب کس کس چیز کا کیا جائے؟“ وہ لپ لپ اسی طرح چھوڑ کر بیڈ سے کھڑا ہو گیا تھا اور کمرے میں کافی اضطرابی انداز میں کھینچنے لگا تھا پھر نجانے کیا سوچ کر بیڈ روم سے باہر نکل آیا۔ اس وقت صبح کے چھ بجے کا وقت تھا اور چوٹی میں چل پل کی خاصی کمی تھی آئیہ آندی ڈرائنگ روم میں قرآن پاک پڑھ رہی تھیں۔

”سلام علیکم۔“ اس نے آہستگی اور احترام سے سلام کیا۔ جواباً انہوں نے اک نظر اسے دیکھ کر سر ہلایا تھا۔ آذر کا ارادہ اتنی سی میں جا کر وانیال کو جگانے کا تھا لیکن پھر اس کے آرام کا خیال کر کے رک گیا اور اپنا ذہن کچھ ریلیکس کرنے کے لیے چائے پینے کا سوچا۔

وہ وسیع و عریض کچن کے دروازے سے اندر داخل ہوا ہی تھا کہ قدموں پر ٹھٹھک گئے۔ کوئل چو لہے پہ چائے کے لیے پانی رکھ رہی تھی۔

”کیا ایک کپ چائے کا مجھے بھی مل سکتا ہے؟“ آذر کی آواز یہ کوئل یکدم اس کی سمت پلٹی تھی آذر دروازے کے نیچوں پہ کھڑا تھا دھیلے ڈھالے ٹراؤزر شرٹ میں ملبوس سادہ سلیپر پہنے تھے ترتیب سے ہینر اسٹائل کے ساتھ وہ اس کے دل کو اور بھی بدصرا کا گیا تھا۔

”یہ کیا گل بن ہے؟“ آذر نے آگے بڑھ کے جھٹکے سے کوئل کو اپنی سمت کھینچ لیا تھا کوئل چکر لگتی تھی وہ اس حملے کے لیے تیار نہیں تھی۔ آذر نے اس کا دوش کھینچ کر پرے پھینک دیا تھا۔

”کھڑے کھڑے کہاں کم ہو جاتی ہو؟“ آذر سختی سے اسے جھڑک رہا تھا اور کوئل پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی آذر کو اور کبھی فرش پہ جلتے اپنے دوشے کو دیکھ رہی تھی جب آذر کی سمت پلٹی تو دوشے کا پلو چو لہے سے جا ٹکرایا تھا۔

”دوشے کی بجائے کپڑوں کو الگ لگ جاتی تو؟“ کچن میں آتی ہو تو احتیاط کیا کرو۔“ اس نے ہاتھ بڑھا کے چولہا بھی بند کر دیا تھا۔

”یہ کیا ہوا ہے؟“ شمو بیگم کچن میں داخل ہوئیں لیکن وہاں کی صورت حال دیکھ کر تڑپ گئیں۔

”دوشے کو پیچھے سے الگ لگ گئی تھی وہ تو شکر ہے کہ میں نے دیکھ لیا۔“ آذر نے ان کو بتایا۔

”اف خدا یا۔ کوئی نقصان تو نہیں ہوا؟“ انہوں نے آگے بڑھ کے کوئل کو تھام لیا۔

”اسے پانی پلائیں اس کے حواس ٹھکانے پہ نہیں ہیں۔“ اس نے خود ہی گلاس میں پانی اندیل کر شمو بیگم کی سمت بڑھایا۔

”یہ بدبو کیسی ہے؟ کیا جل رہا ہے؟“ ثروت بیگم بھی اندر آ گئیں۔

”ڈونشوری کچھ نہیں ہوا۔“ آذر ان کو تسلی دیتا ہوا باہر نکل گیا اور کوئل اسے پیچھے ہٹ کر بھرتی رہ گئی۔

اپنے لیے اس کو اس قدر فکر مند ہوتا دیکھ کر جیسے دل کو ایک قرار سا آ گیا تھا اپنی ذات کے لیے اس کی پریشانی کوئل کو روح تک سرشار کر گئی تھی ایک لمحے میں ہی وہ کتنا کانش ہو گیا تھا؟ شمو بیگم ثروت بیگم اور باقی سب اس کے لیے متشکر ہو رہی تھیں لیکن وہ اندر ہی اندر خوشی سے رقص کر رہی تھی۔ اور وہ جو کسی ارادے سے اپنے بیڈ روم سے نکلا تھا جوں کا توں واپس لوٹ آیا تھا۔ اب اسے آٹھ نو بجے تک وانیال کے اٹھنے کا انتظار کرنا تھا لیکن اس انتظار کے دوران اس کے دماغ میں طرح طرح کی سوچیں ناچتی رہی تھیں۔



”ی۔ امیرم کہا ہے؟“

”کچن میں۔“

”فارس ہے؟“

”وہ بھلا کب فارسی ہوتی ہے؟“ عابدہ خاتون مسکرائیں۔

”یمن وغیرہ کہاں ہیں؟“

”کھانج کے لیے نکل گئی ہیں۔ کیوں کیا کام ہے؟“ انہوں نے عدیل کو تذبذب کا شکار دیکھا تو پوچھ لیا۔

”یہ کپڑے استری کروانے تھے۔“ وہ شرمندگی سے بولا۔

”کون سے کپڑے؟“ مریم فوراً کچن سے نمودار ہوئی۔

”یہ گرے۔“ اس نے کپڑے برآمدے میں نکال کر رکھے ہوئے تھے۔

”یہ کیا کرنے ہیں؟“ وائٹ پین جائیں۔

”میں وائٹ خراب ہو جائیں گے۔“

”خراب؟“

”ہاں سفر کے دوران گاڑیوں میں ہزاروں دلغ لگ جاتے ہیں ایک ہی نیا سوٹ ہے وہ بھی خراب ہو جائے گا۔“ عدیل نے مریم کو آنکھوں ہی آنکھوں میں چپ رہنے کا اشارہ کیا وہ سمجھ گئی تھی۔

”جانا کہاں ہے؟“ عابدہ خاتون نے بے ساختہ پوچھ لیا۔

”وہ امی دراصل آفس کے کسی کام سے گوجرانوالہ جانا ہے شام تک واپس آجاؤں گا۔“ اس نے فوراً ”ہاں کو تسلی دی۔

”آپ صبح گوجرانوالہ جا رہے ہیں؟“ مریم اس کے کپڑے اٹھا کر اندر آئی تو مشکوک سے لہجے میں پوچھا تھا۔

”صبح سے کیا مطلب ہے تمہارا کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں؟“ عدیل نے اسے خفگی سے دیکھا۔

”آپ صبح بھی تو نہیں بول رہے تھے؟“

”مریم میں واقعی گوجرانوالہ جا رہا ہوں۔“

”میں کیسے مان لوں؟“ وہ بے یقین ہو رہی تھی۔

”یہ دیکھو پیسے یہ استاد نے دیئے ہیں وہ رشاب کے لیے کچھ ضروری سامان لانا ہے وہاں سے۔“ اس نے اپنے تکیے کے نیچے رکھا پیسوں کا لفافہ نکال کر سامنے کیا۔

”لو کے اوتارے مجھے یقین آ گیا ہے۔“ مریم پیسے دیکھ کر فوراً ”مان گئی تھی۔ اور استری کا پلگ لگا کر کپڑے استری کرنے بیٹھ گئی۔

”کچھ منگوانا ہے گوجرانوالہ سے؟“ عدیل نما کر آیا تو وہ کپڑے استری کر چکی تھی اور فرش سے استری اور کھیں اٹھاتے ہوئے وہ یکدم ہنس پڑی تھی۔

”آپ تو اس طرح پوچھ رہے ہیں جیسے انگلینڈ یا امریکہ جا رہے ہوں؟“

”یار ہم غریبوں کے لیے یہی انگلینڈ اور امریکہ ہے۔“

”ہاں یہ غریبوں کا انگلینڈ یا امریکہ ہے نا اسی لیے یہاں نہ بجلی مل رہی ہے نہ پانی نہ آٹا نہ چینی یہاں موت بھی ملتی ہے تو یہ حماکے کی صورت میں۔“ مریم دیکھتے ہی دیکھتے رخ ہوئی تھی عدیل جو اب ”کچھ نہ کہہ سکا“ وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی۔

”ناشتا بنا چکی ہو؟“

”جی“ آپ جلدی سے آجائے۔“ وہ سر جھٹکتی ہوئی باہر نکل گئی عدیل کو ہاتھ مریم حد سے زیادہ حساس ہے اس لیے وہ اس کا خیال سب سے زیادہ رکھتا تھا البتہ وہ خود بھی کافی کیئرنگ تھی ہر ایک کا خیال رکھتی تھی ہر ایک کے لیے ہنگام ہوتی رہتی تھی۔

”اچھا امی میں چننا ہوں۔“ عدیل ماں سے مل کر باجی کے پاس گیا پھر مریم کو اللہ حافظ کہتے ہوئے گھر سے نکل گیا تھا۔

”نی امان اللہ۔“ مریم دھیسے سے کھتی ہوئی دروازے بند کر کے برآمدے میں آگئی۔

”مریم۔“ ساتھ والے گھر سے کوثر کی آواز سنائی دی۔

”جی باجی؟“ مریم نے فوراً پوچھا۔

”تمہاری سیلی کا فون ہے جلدی آؤ ہو لڈیہ رکھا ہے۔“ کوثر بلند آواز سے پیغام دے رہی تھی۔

”امی وہ فاطمہ کا فون ہے؟“ مریم نے ماں کو دیکھا۔

”جاؤ سن آؤ جا کر۔“ عابدہ خاتون نے اجازت دی اور مریم دوپٹ پھیلا کر اوڑھتی ہوئی دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ وہ کچھ لمبے وقت تک کھڑی رہی اس کا کسی کے گھر بھی آنا جانا نہیں تھا کبھی کبھار ضرورت کے وقت ہی کوثر باجی کے گھر آتی تھی۔

”السلام علیکم۔“ اس نے گھر میں داخل ہوتے ہی سامنے صحن میں کھڑی کوثر باجی کو سلام کیا تھا۔

”وعلیکم السلام جلدی جاؤ۔“ انہوں نے کمرے کی طرف اشارہ کیا جہاں ان کا فون سیٹ رکھا تھا۔

”ہیلو۔“

”کہاں مرگئی تھیں؟ دوبارہ دنیا میں آتے آتے دیر ہو گئی کیا؟“ فاطمہ اس کی آواز سننے ہی چڑ گئی تھی۔

”یار آج تک دوبارہ دنیا میں کون آیا ہے جو میں آؤں گی؟“ مریم ہنسی تھی اسے پتا تھا کہ فاطمہ غصے میں ہے۔

”مجھے تو یہی لگ رہا تھا کہ تم دنیا سے رخصت ہو گئی ہو؟“

”چلو یار یہی سمجھ لو کہ میں دنیا سے رخصت ہو گئی ہوں اب بولو تمہیں میری یاد کیسے آئی؟“ مریم نے مطلب کی بات پوچھی۔

”مریم کیا واقعی تم میری دوست ہو؟“ فاطمہ نے ذرا افسوس سے پوچھا۔

”تمہیں کوئی شک ہے؟“ مریم سنجیدہ ہو چکی تھی۔

”ہاں۔“ فاطمہ نے اثبات میں جواب دیا۔

”صرف اس لیے کہ برسوں تمہارا برتھ ڈے ہے اور میں بھولی ہوئی ہوں؟“ مریم نے سوال کیا اور فاطمہ حیرت سے منگ رہی تھی۔

”مریم کو اس کا برتھ ڈے یاد تھا۔“

”تمہیں یاد تھا؟“ وہ آستکی سے بولی۔

”یاد تو مجھے پچھلے سال بھی تھا بس کسی مجبوری کی وجہ سے بھولنا پڑا۔“ مریم کا لہجہ استغناء سے تھا۔

”لیکن اس بار میں کوئی مجبوری نہیں دیکھوں گی میں نے تمہیں انوائٹ کرنے کے لیے فون کیا ہے تم نے

پر سولہ شام کو میرے گھر آنا ہے۔“ فاطمہ نے حکم دیا۔

”لیکن فاطمہ۔“

”لیکن لیکن کچھ نہیں میں گاڑی بھجواؤں گی۔“

”مگر یار!“ مریم نے بولنا چاہا۔

”میں نے کہا یار میں کوئی ہمانا نہیں سنوں گی۔“ فاطمہ اپنی مرضی چلا رہی تھی۔

”لیکن فاطمہ مجھے امی اور بھائی سے تو پوچھ لینے دو۔“

”ان سے بھی میں ہی پوچھ لیتی ہوں۔“

”نہیں۔“ امی تو باجی کے پاس بیٹھی ہوئی ہیں اور بھائی گھر میں نہیں ہیں۔“ مریم نے اطلاع دی۔

”بھائی صاحب کہاں ہیں تمہارے؟“ فاطمہ کو ذرا ٹھہر کر اس کا خیال آیا تھا۔

”وہ کسی کام سے گوجرانوالہ گئے ہیں۔“

”گوجرانوالہ میں کون سا کام نکل آیا؟“ فاطمہ کو حیرت ہوئی۔

”آفس کا کوئی کام تھا شاید۔“ مریم کو ہمانا پانا پڑا۔

”آفس کا کام گوجرانوالہ میں؟ یقیناً کوئی لوہا وغیرہ خریدنا ہو گا؟ لوہا وہاں سے سستا مل جاتا ہے تا اس لیے۔“ فاطمہ نے ذرا اذایا۔

”ہاں نہیں یار۔“ مریم کو کوفت ہونے لگی۔

”امی دے، تم باقی باتوں کو چھوڑو اور میرے گھر آنے کی تیاری کرو اور ہاں کسی گنٹ وغیرہ کے چکر میں مت پڑنا

درندہ جوں کا توں تمہارے ساتھ واپس بھیج دوں گی مگر میرے لیے تمہارا میری پارٹی میں چلے آنا ہی سب سے بڑا

تحفہ ہو گا۔“ فاطمہ بہت اپنائیت سے بولی تھی اور مریم اس کی بات پہ مسکرا دی۔

”ممنون۔“

”اوکے اللہ حافظ میں ویٹ کروں گی تمہارا اور گاڑی بھی بھجواؤں گی۔“ فاطمہ نے تاکید کرتے ہوئے فون بند

کر دیا تھا اور مریم ریسیور ہاتھ میں لیے چپ چاپ سی بیٹھی رہ گئی تھی۔

وہ تو کوئی انکار کوئی برانا بھی سننے کو تیار نہیں تھی اور گھر کے حالات اقرار بھی نہیں کرنے دے رہے تھے وہ خاموشی سے اٹھ کر گھر آئی۔

”خیریت ہے نا؟ فاطمہ نے فون کیوں کیا؟“ عابدہ خاتون مریم کو چپ چاپ سا دیکھ کر پریشان ہو گئی تھیں۔

”جی خیریت ہے۔“

”پھر تم کیوں پریشان ہو؟“

”مرسول فاطمہ کی سالگرہ ہے اس نے آنے کی دعوت دی ہے، پچھلی بار بھی میں نہیں گئی تھی اور نہ اسے دوش

کیا تھا۔“ مریم اندر ہی اندر متکبر سی تھی۔

”کوئی بات نہیں بیٹا چلی جانا۔“

”چلی جاؤں؟ مگر کیسے؟“ مریم حلق سے بولی۔

”کیسے جانا چاہتی ہو؟“

”خالی ہاتھ نہیں جانا چاہتی۔“ وہ تلخی سے کہتی چا پائی۔ بیٹھ گئی۔

”تو میں کب کہہ رہی ہوں کہ خالی ہاتھ جاؤ اللہ بستر سب نکالے گا میں عدیل سے بات کروں گی۔“

”نہیں امی بھائی سے کچھ مت کہیے گا۔“ اس نے منع کر دیا۔

”کیوں؟“

”خواتین کو پریشان کریں گی۔“

”چلو اللہ بستر کرے گا ابھی کل کا دن تو ہے نا۔“ وہ مریم کا سر تھپکتے ہوئے بولیں اور اٹھ کر اندر چلی گئیں لیکن

مریم وہیں بیٹھی سوچوں میں گم ہو گئی تھی اسے فکر نے گھر رکھا تھا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

☆ ☆

منصور حسین ایک غریب اور میسر کسپاس آدمی ہے، وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آندری سے لڑکی مانگنے آتا ہے، وقار آندری کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا گندہ والیس بھیج دیتے ہیں اور وہ ابوری سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل نور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور سچے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے، وہ اپنے قتل و قتل کا بہت بکا آدمی ہے، اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا، اس کی ماں بڑی شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور بہادری پر بہت فخر و مسرت ہے اور اس کا حسین وہ دوسرا کو بھی دیتی ہیں۔



شیلہ عزیز
دکھ

سائیں قیدیں



بڑی حویلی کے تمام کمین وقار آندری سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیز سے تو اپنے بہا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔
مدحہ اور نیکل حیات روح، کمین بھائی ہیں، مدحہ استانی گزری ہوئی اور خود سرور کی ہے، وہ انگلٹون کی رقیبتوں میں مکمل طور پر رنگ چکی ہے جس کے پیش نظر فائزہ بیگم، نقیل کو پاکستان شہت ہونے کا مشورہ دیتی ہیں، لیکن مدحہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے، جس پہ نقیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔
زوری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے، مگر وہ کسی کو بھی اس واقعہ میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پیپ رہا ہے۔
عدیل کافی عرصہ سے لڑکی کی تلاش میں ہے، مگر ہر روز، ابوری اور نانی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا ہے، بی بی اور مجبوری سے ملک آخر خود کشی کرنے کا سوچتا ہے، لیکن ایسے میں ایک روز اسے وحالے میں چائے پیتے ہوئے یاد آتا ہے اور ازل جاتا ہے، اسے کام کی آفر کرتا ہے جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے، اسی خوشی میں وہ کلمہ کی بابت پوچھتا ہے اور ازل جاتا ہے۔



”دل اور شاہ آپ ہیں؟“ کسی نے اس کے عقب سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا اور وہ اس جالی پہچانی کی آواز پر ایک جھٹکے سے بھاگتا تھا۔

”نیل!“ اس کی آواز اور سچے سچے خوشی کا اس ٹھیک رہا تھا۔

”دل اور!“ وہ دونوں ایک دوسرے سے بھٹک کر ہوئے تھے۔

”کیسا ہے شہزادے؟“ دل اور اس کو پہچنے ہوئے بولا تھا۔

”زیادہ لو کیا ہوں؟“ نیل نے اس کو جواب دیا ان دونوں کی اس قدر محبت بھری اور جذباتی ملاقات پہ کئی لوگوں نے ہاتھ قاعدہ بھر کر ان کی اس ملاقات کا سینہ دیکھا تھا۔

”شاہو اندر سے جوان ہو گیا ہے۔“ دل اور کا جملہ نیل کو قہقہہ لگانے پر مجبور کر گیا تھا۔

”نیری کی باتیں تو مجھے یاد تھیں۔“ مجبور کر رہی ہیں۔“ نیل شرارت سے بولا۔

”اس بات کا بھی حساب لے لوں گا تم سے تم یہ بتاؤ مدد دینا اور آئی کہاں ہیں؟“ دل اور اس کے عقب میں دیکھتے ہوئے بولا۔

”وہ ابھی اندر ہیں، سامان کی چیکنگ ہوئی ہے ابھی۔“ نیل نے اشارہ کیا۔

”یار چیکنگ میں تو تم لوگوں کا سارا سامان خراب ہو جائے گا میں کچھ کرتا ہوں۔“ اس نے کچھ سوچتے ہوئے اپنا نیل کا لالہ اور کسی کا نمبر ڈال کر کیا تھا اور واقعی اس کی سفارش کام آئی تھی ان کا سامان چیکنگ کے عذاب سے بچ گیا تھا اور وہ لوگ جلد ہی باہر آ گئے تھے۔

”بھائی!“ مدد دینے والے انداز میں اس کی طرف بڑھی تھی۔

”بھئی کرنا۔“ وہ سینے سے لگی مدد سے کام لیتے ہوئے تری سے مسکرایا تھا اس وقت اگر اس کے کو لیگنڈ سے دیکھ لیتے تو حیران رہ جاتے۔ اسے دیکھ کر کہیں سے بھی نہیں لگ رہا تھا کہ یہ وہ دل اور شاہ ہے جو کورٹ میں کھڑا ہوا تھا تو انھوں کی جگہ آگ اٹھاتا تھا اور شہنشاہی لہر سے لہر لہا جاتا تھا۔

”کیسی ہو؟“ وہ اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

”میں ٹھیک ہوں آپ سنا میں کیسی ہیں؟ اور آئی کہاں ہیں؟“ مدد نے نیل شاہ کا پرچھا تھا۔

”میں ٹھیک ہوں میری جان! اماں اسلام آباد میں ہیں ان کے کالج میں آج کل ایک کام ہے۔“ مدد نے اس لیے مصروفیت کی وجہ سے نہیں آ سکیں۔“ دل اور نے اس کو جواب دیا اور آگے بڑھ کے فائرنگ کی بات کی۔

”اسلام علیکم آئی۔“ اس نے ان کے سامنے سر جھک کر کیا تھا اور انہوں نے دل اور کی پیشکش قبول کر لی تھی۔

”جیتے رہو، خوش رہو اللہ ہم پر دراز کرے۔“ انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے دعا مانگی دیں۔

”آمین۔“ نیل نے شرارت سے تبسم کیا۔

”بچہ! تم سے تو میں بند میں بات کروں گا ابھی گھر چلو بروی ہوا ابھی۔“ نیل نے دل اور مدد کے ہاتھ سے سامان سے لڑی ٹرائی دھکیلتا ہوا آگے بڑھا دو سری ٹرائی نیل دھکیل رہا تھا وہ لوگ وہاں سے اپنے گھر کی ضرورت کے لیے کالی سامان لے کر گئے تھے۔

”نیل صاحب! گلاب خان ایک کے قریب آیا۔“

”نیل صاحب کی پہلی کمرہ۔“ اس نے اشارہ کیا۔

”اسلام صاحب! گلاب خان نے نیل کو سنا کر۔“

”وہیکم اسلام!“ نیل سمجھ گیا کہ وہ دل اور کا لازم ہے۔

”اسیے صاحب بھی رکھتا ہوں گا۔“ گلاب خان نے ڈرائی کے پیش اس کے ہاتھ سے تھام لیے تھے۔

”گلاب خان میں نے دین ہانڑی ہے تم اس دین میں سارا سامان لے کر نیل صاحب کے گھر پہنچو گاڑی میں جو ڈرائیو کر لوں گا۔“ دل اور نے سامان زیادہ دیکھ کر گاڑی تک کروالی تھی۔

”میں صاحب جیسے آپ کا حکم۔“ گلاب خان سعادت دہری سے بولا۔

”چلو رکھو اس سامان گاڑی میں۔“ دل اور نے اپنی گزالی میں سارا سامان احتیاط کے ساتھ گاڑی میں رکھوایا تھا۔

”یار ہر چیز کے معاملے میں دست کھینک ہو تم۔“ نیل کے اصرار پر سنا۔

”ابا ابا۔“ میں دوست تو دوست دشمن کی بھی ہوتی کہیں کرنا ہوں۔“ وہ قہقہہ لگاتا ہوا اپنی گاڑی کی سمت بڑھا اور نیل اس کی گاڑی کے قریب آکر ٹھہر گیا تھا۔

”تو جناب نے آج کل ’سرف‘ کر رہی ہو؟“ نیل سلور کلر کی چھچھاتی ہوئی گاڑی کو ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”میں جو غریبوں کو پتہ آجائے۔“ وہ عاجزی سے کہتا ہوا ڈرائیو تک بیٹھ گیا وہ سری سائیڈ سے دروازہ کھول کر نیل بھی فریٹ بیٹھ بیٹھ گیا تھا۔

”اے یار! یہ براؤن رنگ تو در پکار اور سرف میں کوئی خاص فرق تو نہیں ہے؟“ نیل واقعی ٹھیک کہہ رہا تھا اس گاڑی کی چھپ چھپ بھی براؤن اور لیڈر کروڑ بھی ہی تھی۔

”جے جے فرق نہ ہو لیکن یار میرے کا اور نام کافر تو ہے نا؟“ دل اور نے مسکرا کر فرق سے آگاہ کیا۔

”ہاں یہ تو ٹھیک کہا تم نے پاکستان میں چیزوں کا دیکھا تو زیادہ ہی ہوتا ہے چاہے وہ مہیا کل فٹن ہو چاہے گاڑی چاہے ٹریکوں کے پیڈریک۔“ سب کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ اس کی چیز باتوں سے منفرد نظر آئے۔“ نیل نے اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔

”ایک سیات کہوں نیل؟“ دل اور نے گاڑی روک ڈالنے سے منع کیا۔

”کہو۔“

”گاہو پاکستان کا دل ہے اور دل میں اگر ایسی باتیں مت کرو کہ دل کو ناگوار گزرے اس لیے بہتر ہے کہ کوئی اور بات چھیڑو۔“ اس نے دبی نری اور بڑے طریقے سے نیل کو سمجھایا تھا۔

”اوہ! ابھی سچے اور بکے کتنا ہو؟“ نیل سچی خیزی سے بولا۔

”بھئی سمجھ لو اور اس میں کوئی شک بھی نہیں ہے۔“ اس نے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

وہ دونوں اتنے عرصے بعد ملے تھے اس لیے ان کی باتوں کو بے پروائی سے نہ سمجھا جاتا تھا۔ جبکہ نیل بیٹھ بیٹھ کے ساتھ بیٹھ بیٹھ چپ چاپ لاہور کے مناظر دیکھ رہی تھی سڑکوں پر خاصی چل چل اور گھبراہٹ بھی سب کچھ دیکھنا نظر آ رہا تھا جو وہ لوگ غریبوں اور ڈرائیو میں دیکھتے تھے وہی سڑکیں وہی راستے وہی لوگ وہی بازار۔

”آف! اب یہاں ان لوگوں کے ساتھ رہنا پڑے گا؟ جن کو کسی بھی چیز کی قیمت نہیں ہے؟“ اسے سوچ کر ہی کوفت اور بے زاری ہونے لگی تھی وہ گاڑی میں بیٹھ بیٹھ بدل کر وہی سڑکیں اور اس کی بے زاری صورت تک دوپہر سے ہی دیکھ چکا تھا اور کچھ بھی کہنے کا ارادہ ہی نہ کرتے ہوئے نیل کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”سبحان اللہ کیا تھا؟“

”خفت ثابت ہے یار۔“

”اور نگار ش بجا بھی؟“

”وہ بھی ٹھیک ہیں۔ ساری نیلی ہیں ابیورٹ ہی آگے کرتے آئی تھی۔“ نیل بارل سے انداز میں بولا اس

نے یہ بھی قوت نہ کیا کہ دل اور نے عید اہل اور نگارش بھائی کا حال پوچھ لیا ہے لیکن زری کا کیوں نہیں پوچھا وہ بھی تو عید اہل کی پہلی کا حصہ تھی؟

”میں کا کوئی باران نہیں سہا پاکستان چکر لگاتے؟“ دل اور گاڑی کا سوز کاٹتے ہوئے بولا۔
”زری کی اسٹڈی کنسلٹ ہو گئی تو پھر ہی کوئی پروگرام بنے گا اس کا زری اور نگارش بھائی کو ایسے چھوڑ کر تو نہیں آسکتا وہ“ نیل نے اندازاً جواب دیا تھا۔
”میں ہنسی اٹھی کہ عید کے گئے؟“

”ہاں یقیناً۔“ نیل نے اس کی بات کی تائید کی۔
”خیر تم آگے ہو تو وہ بھی آجائے گا یا زری عیدت پاتی۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔
”ویسے یا ایکسپریس کا بہت افسوس ہو رہا ہے۔“ وہ افسوس بھرے لہجے میں بولا۔
”کس چیز کا؟“

”تیرے پہلو میں کوئی گوری میم نہیں ہے اس لیے۔“ اس نے افسردگی اور مایوسی کا اظہار کیا۔
”جب تو لندن سے آیا تھا تو کیا تمہارے پہلو میں گوری میم تھی؟“ نیل نے گھور کے پوچھا۔
”یہاں سے کیا لڑکیاں مر گئی تھیں جو میں گوری میم کو لے کر آتا؟“ دل اور چالنے والے انداز سے بولا۔
”یعنی تمہارے لیے یہاں لڑکیاں زندہ ہیں اور میرے لیے مر گئی ہیں؟“ نیل نے اس کی بات کا مطلب افہام کیا۔
”جی ہاں۔“ وہ ایک بار پھر فلک کا گف افسوس لگا کر بٹھا تھا آج اس کی رتی خوشی کا اظہار اس کے قہقروں سے ہو رہا تھا۔

”دل اور باز آجا۔“ نیل نے گھور کے کہا یہ ان کا آپس میں بات کرنے کا ایک مخصوص اسٹائل تھا۔ دل اور نے رپائی ایریا میں پہنچتے ہوئے ان کے گیٹ کے سامنے ہارن دیا تھا۔ چونکہ دار نے فوراً اسلام کرتے ہوئے گیٹ کھول دیا۔ سو گاڑی اندر لے آیا۔
سب ملازمین اور کی ہدایت پر ان کے انتظار میں ڈرائیور پر ہنسی کھڑے تھے ان کے گاڑی سے اترتے ہی انہوں نے سلام کرنا شروع کر دیا۔

”شکر ہے تیری ذات کا جس نے اتنے سالوں بعد ہمیں اپنے گھر کی چار دیواری دیکھنی نصیب کی ہے۔“ قائم بیگم نے اور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے اللہ کا شکر ادا کیا تھا۔ ان کی آنکھوں میں اس وقت بھی شکر کے آنسو تھے لیکن ان سے چند قدم دور کھڑی مدحیہ اس گھر کے ملازمین کو اور اس گھر کے ڈرائیور کو اپنی نظروں سے دوکھ رہی تھی اس کا چہرہ بالکل سرو سیاہ ہو رہا تھا کی وہ گھر تھا جو اس کے باپ ستاؤ حیات نے اپنی کھلی سے بنایا تھا اور یہی وہ گھر تھا جہاں اس کی ماں کا آخری حیات واپس بن کے آئی تھیں اور اس گھر سے گھر والے سے بہت ارمان وابستہ کیے تھے اور بہت سے خواب سجائے تھے لیکن اتنے دیر سارے خوابوں میں سے صرف دو خواب زندہ رہ پائے تھے۔

ایک نیل حیات اور ایک مدحیہ حیات اور ان دونوں کے سوا باقی سارے خواب مر گئے تھے بکھر گئے تھے مگر یہی کچھ ہو گئے تھے۔ کیونکہ ان کے خوابوں کے بل کو پہنچنے والا خودیافتی ہو گیا تھا اور اب یہی دھڑکا انہیں بیٹی کی طرف سے بھی نگار بٹھا تھا۔

”نام اندر چلیں بیڑ۔“ نیل نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے انہیں سوچوں کے گرداب سے نکالا۔
”جی ہاں۔“ وہ آنکھوں کی نمی پونچھ رہی تھی اس کے ساتھ اندر آگئیں دل اور مدحیہ کے ساتھ بیٹھا ہاتھیں کر رہا تھا۔

وہ بیڑ پہنچو اور اسے لپٹے تھے جب دروازہ کھلی ہی دھک دیا۔

”نیل کم ان۔“ ان کی اجازت سے علیز سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تھی۔
”علیز۔“ وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گئے۔
”اسلام علیکم السلام۔“

”علیکم السلام اور خیر بخیر ہوں۔“ انہوں نے بیڑ پر اپنے قریب بیٹھنے کا کہا۔
”آپ کی طبیعت ٹھیک ہے نا۔“

”ہاں ٹھیک ہوں دون آفس نہیں گیا اس لیے آج آفس میں فاسر غور کر بھی سکتی ہوئی ہے۔“
”تو آپ کوئی میٹلٹ لے لیتے؟“

”نیل بیٹا میٹلٹ کی ضرورت نہیں ہے مجھے سے ہی سکتی ہو جانے لگی۔“
”آپ آرام کریں میں سنی جاتی ہوں۔“ وہ اٹھ گئی۔

”خیر میری جان بیٹو غور یہ جاؤ کہ کس کام سے آئی ہو؟“ انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا دیا تھا۔
”آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے بھرات کر لوں گی۔“ اس نے اٹھا کر دیا۔

”کیا میری طبیعت کو کچھ کھنکھن ہوا ہے ذرا سی سکتی ہے وہ بھی اتر جائے گی تمہارا کیا کہنے آئی ہو؟“ انہوں نے اس کا ہاتھ چپکا۔ علیز۔۔۔ ان کے چہرے کو دیکھتے ہی وہ اسی کی طرف متوجہ تھے۔
”بیٹا وہ میں نے آپ کو بتانا تھا کہ۔“
”آپ بڑا بڑا ہو؟“

”وہ بھرتے اب گرامر ہونے والے ہیں میری ایک کلاس فیلو نے بتایا ہے کہ بچہ زکی ڈیٹ شیٹ آگئی ہے شاید۔“
”کس ڈیٹ؟“ علیز نے۔
”ایک پریشیا کی وجہ بیان کی۔“

”بھرتے؟“ وہ قار آگئی کو بھی سن کر کافی پریشانی ہوئی تھی۔

”یہ کیا میں اب کالج نہیں جاسکتی؟“ علیز نے کافی سسے ہوئے انداز میں پوچھا تھا۔

”اورے نہیں بیٹا کیوں نہیں جاسکتی؟ ان شاء اللہ تم کالج ضرور جاؤ گی۔“ وہ قار آگئی نے اسے تسلی تو دے دی لیکن اندر سے خود بھی فکر اور پریشانی میں گھر گئے تھے۔
”تم پھر اسکے روز کالج جاؤ گی یا پھر نہیں؟“

”بیٹا پھر اسے پہلے ہونے والے بیچر تو زیادہ اہم ہوتے ہیں۔“ بیچر تو اینڈ کرنا ہی ہوں گے؟“ علیز نے خود بھی پریشانی اور تذبذب کا شکار تھی کہ آج کل کے مسئلے کے بعد اسے جانا چاہیے یا نہیں۔

”سب سے پہلے تو تمہاری گاڑی کا مسئلہ ہے اور فاسر نہیں تھا اور وہی شوروم چلا جاتا، فاسر اس کام کے لیے تو تھوڑا نام نکال ہی لے گا لیکن اس کے بعد سب سے بڑا مسئلہ ہے تمہارے لیے ڈرائیور رکھنے کا۔ خیر بیٹا کافی پوچھ رہے ہو چکے ہیں اور اب اس معاملے کے بعد تو اور بھی کمزور ہو گئے ہیں ان کی عزت بکھر چکے کی ہے ڈرائیور لگب کرنے کی نہیں۔“

”لیکن بیٹا کسی ڈرائیور کے ساتھ کیسے سب کچھ سنبھالو گا؟“

”میری تو میں سوچ رہا ہوں کہ بیٹا ڈرائیور رکھنا یا اس پر اعتماد کرنا آسان بھی نہیں ہے۔“

”پھر کیا ہو گا؟“ علیز نے فکر مند تھی۔

”کچھ ہوئی جائے گا تم جاؤ آرام کرو اور جاتے جاتے آؤ کو میرے بیڑ روم میں بیچو۔“ انہوں نے علیز سے کہا۔
”کوہاں سے؟“
”خوڑی ہی پر بعد آؤ ان کے سامنے تھا۔“

"میں نے سوچا تھا کہ وہ راتیں میرا دل لے کر چلے گا۔"

"تو اس نے تم سے کہا؟"

"جی ہاں، غریب تھا۔"

"مجھے تو نہیں آتی؟"

"نہیں۔"

"دانیال کہاں ہے؟"

"معاذ اللہ! مجھ کو کچھ آپ کے لیے ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا ہے۔"

"آج کل بڑی اندراشیڈنگ ہے تم دونوں میں؟" وہ چھینٹنے والے انداز سے بولے۔

"کیا نہیں ہوتی چاہیے؟" وہ بھی ہنس کر آیا۔

"اے رے کیوں نہیں بیٹا ہوتی چاہیے اور ضرور ہوتی چاہیے، تم دونوں بھائی ہو، گزرتی ہو اور یہ رشتہ بہت ہی خوب صورت رشتہ ہے، جو دوست تم سے چھوٹا ہے اور دین دانیال سے چھوٹا ہے اس لیے تم دونوں کی اندراشیڈنگ ان کے ساتھ تو ہو نہیں سکتی تھی اس لیے ستر ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کو سمجھ لو ویسے بھی دانیال بہت سمجھ دار اور سعادت مند لڑکا ہے ہر اور کچھ سمجھتا ہے۔" وقار آندری اس کی تعریف کر رہے تھے۔

"ڈیڈ آپ کی بات درمیان میں ٹوکنے کے لیے سو رہی تھیں پلیر آپ بات کریں جس کے لیے مجھے یہاں بلا دیا ہے۔" آذر شاہنشاہی سے بولا۔

"میرے ہو گئے ہو؟"

"نہیں اور نہیں ہوا، اس ٹیٹ ہو گیا ہوں۔" آذر نے ریمان سے کہا۔

"ٹیت کس لیے؟"

"آفس کا کچھ ضروری کام رہا تھا۔"

"بیٹا آفس کے کام کے علاوہ بھی اور بہت سے ضروری کام ہمارے والے پڑے ہیں۔"

"کون سے کام؟" آذر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"علیحدہ کے لیے نئی گاڑی لگوانی ہے، اس کے لیے کسی ڈرائیور یا کسی گارڈ کا بندوبست بھی کرنا ہے، اس کے ایگزیکٹو امز سب آگئے ہیں۔" وقار آندری نے اپنی پریشانی بیان کی۔

"کیا مطلب؟ کب ایگزیکٹو امز؟" آذر چونک گیا۔

"نیکسٹ ویک۔"

"اوہ لیہ تو اتنی براہم ہو گئی ہے۔"

"اسی لیے نہیں بلایا ہے کہ اس پر اہم کارکنی حل نکالو۔"

"کیا اس معاملے کے بعد علیحدہ ذاتی طور پر کلچر جانے کے لیے تیار رہے؟" آذر کو یہ تھا کہ وہ اندر سے کتنی ڈری سہی ہوگی۔

"یقیناً، سب ہی ہوگی وہ خود میرے پاس آئی تھی کہ اس کے ایگزیکٹو امز کی ڈیوٹی شیڈ آگئی ہے۔"

"گاڑی کا مسئلہ تو کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے جب تک شوروم سے گاڑی لگے گی تب تک گھر سے کوئی اور گاڑی بھی استعمال میں لائی جاسکتی ہے، اصل مسئلہ تو ڈرائیور کا ہے۔"

"لیکن ڈیڈ یہ کام تو مبارک خان بھی کر سکتا ہے؟" آذر بات کرتے کرتے ان سے سوال کر رہا تھا۔

"مبارک خان یہ کام کر تو سکتا ہے لیکن اگر اسے علیحدہ کی گاڑی ڈرائیج کرنے پر مامور کر دیا تو جوہلی کے اور

افس کے بہت سے کام رک جائیں گے؟ اس نے بہت سی داریاں اٹھا رکھی ہیں۔" وقار آندری بھی اپنی جگہ ٹھیک ہی سوچ رہے تھے، وہ کام مبارک خان انچارج دیتا تھا، کوئی اور ملازم نہیں کر سکتا تھا۔

"تو پھر اتنی چلدی کوئی نیا ملازم ملنا بھی تو بہت مشکل کام ہے؟ وہ بھی کوئی ایجنڈا کارڈ؟" آذر اور وقار آندری کی پریشانی ایک ہی تھی۔

"بس رتہ رتہ ایجنڈا کارڈ۔"

"یہ کام بھی مبارک خان کر سکتا ہے۔" وقار آندری کا حیلان اس آوی کی طرف چلا گیا جسے کافی روز پہلے مبارک خان کوئی کام ملائے کی غرض سے اپنے ساتھ لے کر چلی گیا تھا۔

"مبارک خان؟ اور کیسے؟"

"اس کے پاس کوئی آوی ہے اسے کام کی ضرورت ہے ایک بار مجھ سے مل بھی چکا ہے عام بھی دیتا تھا اس نے لیکن میرے ذہن سے محو ہو چکا ہے، میرے خیال میں وہی بند ٹھیک رہے گا؟" وقار آندری فیصلہ کر چکے تھے۔

"کون کوئی ہے؟ کچھ اچھا؟"

"وہ بھی پتا چل جائے گا، میں مبارک خان سے کہتا ہوں وہ صبح ہی اسے بلا لے گا۔"

"ٹھیک ہے آپ بلا لیجئے گا لیکن پہلے ساری تسلی کر لیجیے گا۔" آذر صوفی سے کہہ رہا تھا۔

"اور گاڑی؟"

"مجھ کوئی کام آپ پر سونپ رہے ہیں ہو سکتا ہے کہ مجھے کل کام کے سلسلے میں کراچی جانا پڑے۔ البتہ میں کل گاڑی کی کنگ کر دیا ہوں گا۔" آذر نے انہیں تسلی دی۔

"آزادیات سنو۔"

"جی ڈیڈ۔"

"اوہر آؤ۔"

"جی کیسے؟"

"اتنے دن ہو گئے، تم نے کوئی بات نہیں بتائی؟ کیا اس معاملے کا؟" وقار آندری فائرنگ والے معاملے کا پوچھ رہے تھے۔

"ڈیڈ مجھے کوئی بات بتانی تو میں بتاتا، فی الحال تو کوئی سرایا تھ نہیں آیا۔" اس نے کندھے اچکا۔

"وہ دلوڑ کے جو خیر و بیا کو پستان لے کر گئے تھے ان کا کچھ پتا چلا؟" وقار آندری نے پوچھ ہی لیا تھا۔

"آپ کو کس نے بتایا؟" آذر ٹھٹھک رہا تھا، بات تو اس نے چھپائی تھی ان سے۔

"کیا تم نہیں بتاؤ گے تو ہمارا دشمن بھی نہیں بتائے گا؟" انہوں نے اپنے موبائل کی طرف اشارہ کیا، یعنی وہی میسج جن کے نمبر پر بھی آیا تھا۔

"اوہ۔" اس نے گہری سانس خارج کی تھی۔

"نہ ان لڑکوں کا پتا چلا ہے اور نہ ہی ہسپتال کے رجسٹریشن سے کل کرنے والے آوی کا۔" جن لڑکوں نے اپنا نام دینا غلط سمجھا یا تھا۔ آذر اور دانیال اندر ہی اندر کافی بھاگ دوڑ کر چکے تھے لیکن ابھی تک کچھ بھی حاصل نہیں ہوا تھا اور اب گزشتہ دو دن سے ہر طرف سکون ہی سکون نظر آ رہا تھا، دونوں سے کوئی میسج اور فون کال موصول نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی کوئی اور ایکشن سامنے آیا تھا۔

"ٹھیک ہے بیٹا تم لیا وہ میسج نہ لو اور آرام کرو۔"

"اچانک گزرا تھا۔" آذر ان کو گڈنائٹ کہتا کرے سے باہر نکل گیا تھا۔

ایم سو ری اٹھائی۔

سو ری۔

پس شوئی منہ سے نکل گیا ایم سو ری۔

ایم سو ری نے کہا کہ۔ اور یہ بوجہ اور بات ہے بات غصہ نہیں کرتا تھا لیکن جب کرتا تھا تو۔
 ہم شام تک نہیں بلکہ کل میرے آنے تک بیٹھیں رہو گے اور خبر دیا کا ہر طرح سے خیال رکھو گے کوئی
 شکایت نہیں ہونی چاہیے۔ اور نہ اسے سڑکے ساتھ ساتھ وارنٹ بھی دی گئی۔
 آپ جب تک کہیں گے میں نہیں رہوں گا۔ وہ سو پست انداز میں بولا تھا۔
 ٹھیک ہے یہ رکھ لو کوئی بھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اور نہ اسے ڈالٹ سے ہزار ہزار کے نوٹ نکال کر
 اسے چھوڑ دینے اور وہاں سے چلا گیا تھا۔ جو تپ پیسوں کو دکھاتا رہا اس کا اپنا ڈالٹ پیسوں سے بھرا ہوا تھا۔ اسے
 بھلا ان پیسوں کی کیا ضرورت تھی؟ لیکن اور اس سے بڑا تھا اس کا فرض تھا کہ وہ ہر چیز کا دھیان رکھتا تھا اس نے
 کی کیا تھا۔ جو تپ سڑک تک کر اندر خبر دیا کہ پاس آگیا وہاں یہوں کے زیر اثر سو رہے تھے۔

آج کا دن منصور حسین کے لیے بہت ہی مبارک دن تھا شاید وہ اپنی ہی اہل سے مبارک خان کو فون کرنے کی تھا
 اور جیسے ہی مبارک خان نے اس کی آواز سنی فوراً خوشی کا اظہار کیا تھا۔
 "لوئے منصور حسین تو جلدی حویلی پہنچے میں تجھے کب سے فون کر رہا ہوں مگر تیرا نمبر ہی بد تھا۔ مبارک خان
 کے ذہن سے یہ نکل گیا تھا کہ منصور حسین نے اپنے اسوئے عمل بچا دیا ہے۔
 "کیا میرے لیے کام مل گیا؟" منصور حسین کے لہجے میں بھی خوشی اور آئی تھی۔
 "مجھو مل گیا ہے، میں ایک بار صاحب سے ملنا ضروری ہے۔"
 "اور سے میں مل تو چکا ہوں تیرے صاحب سے؟"
 "منصور حسین وہ ملنا اور تھا یہ ملنا اور ہے۔"
 "کیوں کیا اب میری امن سے رشتہ داری ہوئے والی ہے؟"
 "اے یا منصور حسین ایک تو تیری زبان بھی تلواری ہے تلواری کٹ دینے کو تیار رہ۔ مبارک خان سر جھٹ
 کے بولا تھا۔

"تو کام کا بند ہے، تجھے نہیں کالے گی۔" منصور حسین نے اسے تسلی دی۔
 "اچھا چھوڑ اس بات کو تو یہ بتا حویلی کب پہنچ رہا ہے؟" مبارک خان سارا کام جلدی جلدی کرنا چاہتا تھا اس
 کی کسی کوشش تھی کہ منصور حسین کو جیسا بھی سہی بس کام مل جائے۔
 "تو فون رکھ میں ابھی پہنچا۔" اس نے فون بند کر دیا اور پھر حویلی کی طرف چل پڑا تھا ایک اسٹاپ تک
 اسے رکشا کا سارا لینا پڑا اپنی رستہ اس نے پیدل طے کیا اور جب وہ حویلی کے سامنے پہنچا اس کی پیشانی
 سے پیشے کے قطرے گر رہے تھے۔

"لوئے خاتماں خراب تو پھر آگیا ہے؟" عارف نے اسے دیکھ کر ٹھٹھک گیا تھا۔

"آپا نہیں ہوں بلایا گیا ہوں۔" اس نے چہرہ کر جواب دیا تھا۔

"کیا مطلب ہے؟"

"مطلب آپ نے صاحب سے پوچھو۔"

میں؟ صاحب نے بلایا ہے؟" عارف کو حیرت ہوئی۔

نکلے ایک گلاس پانی بلاؤ پھر پیتا ہوں۔" وہ آج پھر عارف کی کرسی سمجھ کے بیٹھ گیا تھا۔

"لوئے منصور حسین تیری وجہ سے میں بھی ڈالٹ پڑتی ہے اس روز تو صاحب بھی تھا سو رہے تھے تو میں
 یہاں سے۔" عارف نے بے مروتی دکھائی۔

"آج تو یہاں سے نکلنے سے پہلے یا تو میرے جانوں گایا پھر اس کے۔" منصور حسین آج مرتے مارنے پہل گیا تھا۔

"یہاں یہ ظالم انسان ہے تو۔" عارف نے اسے گھور کر

"ظالمیوں کے ساتھ ظالم ہونا ہی پڑتا ہے۔" اس نے عارف کو خوشخوار نظروں سے دیکھا۔

"لوئے یاد رہے لوہائی پو اور جان پھوڑو۔" عارف نے اسے پانی کا گلاس تھمایا۔

"شکریہ۔" اس نے گلاس فوراً اٹھا کر پیا تھا۔

"اب اندر اطلاع کرو کہ منصور حسین آگیا ہے۔" اس نے نیا حکم جاری کیا۔

"لیکن۔۔۔"

"جو کام کہا ہے وہ کرو۔" اس نے عارف کو ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"کرنا ہوں۔" اس نے اندر اٹھ کر اپنے اطلاع کردی تھی۔

"اسے اندر بھیج دو۔" مبارک خان کی طرف سے اجازت ملی۔

"تو اندر جا کر کہہ دو۔" عارف نے اشارہ کیا۔

"جی ہاں۔" منصور حسین سسکا کر کھتا ہوا اندر داخل ہوا تھا اور اس جھٹ نما حویلی میں قدم رکھتے ہی اس کی
 ساری نگاہیں اٹھ کر حویلی کی دیواروں پر جم گئیں۔

"لوئے ہر آہا صاحب مروان خانے میں ہیں۔" مبارک خان سامنے ہی کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا اسے اپنے
 ساتھ لے کر مروان خانے میں داخل ہوا تھا۔

ادارہ خواجہ محمد رفیع کی طرف سے بہترین کے لیے خوبصورت ماحول

نیم صحت مرچیں

نیم صحت مرچیں

میتھو جالند

آٹھ بجے

☆ ستاروں کا آنگن،	نیم صحت مرچیں	قیمت: 450 روپے
☆ درو کی منزل،	رضیہ جمیل	قیمت: 500 روپے
☆ اے وقت گواہی دے،	راحت جمیل	قیمت: 400 روپے
☆ حیرے نام کی شہرت،	شازیہ چودھری	قیمت: 250 روپے
☆ امرتیل،	عمیرہ احمد	قیمت: 550 روپے

شعبہ کتبہ عمران ڈسٹری بیوٹرز، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

”اسلام علیکم صاحب۔“ منصور حسین نے آہستگی سے سلام کیا تھا۔

”وعلیکم السلام“ آؤ بیٹھو سناں۔“ وقار آندری اس کی آواز پر چڑھ گئے تھے اور اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے اذہار رول کر کے سائڈ پر رکھ دیا تھا۔

”جی ایس نہیں ٹھیک ہوں۔“ اس نے پیٹنے کی بجائے کھڑے رہنے کو ترجیح دی تھی۔

”آئی دیر کہاں کھڑے رہو گے؟ بیٹھ جاؤ۔“ انہوں نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

”جی شکریہ۔“ منصور حسین کو بیٹھنا ہی پڑا تھا۔

”کیا ہام بتایا تھا تم نے؟“

”منصور حسین۔“

”تعلیم کتنی ہے؟“

”میرنگ مل۔“ اس نے کھرا جواب دیا۔

”کرتے کیا ہو؟“

”ٹوکر کی تلاش۔“

”اس کے علاوہ کیا کرتے ہو؟“

”اس کے علاوہ فرصت ہی نہیں ملتی۔“

”کتنے عرصے سے بے روزگار ہو؟“ وقار آندری ایک ایک بات پوچھ رہے تھے۔

”جتنے عرصے سے آپ کی حویلی کے چکر لٹ رہا ہوں۔“ اس کے بے تلبے سے جوابات پر وقار آندری نے مبارک خان کی طرف دیکھا تھا جو اپنا ”مبارک خان“ لے کر انہیں تسلی رکھنے کا اشارہ دیا تھا۔

”رہتے کہاں ہو؟“

”میں لاہور میں رہتا ہوں۔“ اس نے پتہ بتایا۔

”کلیہ کام کر سکتے ہو؟ اگر تمہیں کوئی بڑی ذمہ داری سونپی جائے تو؟“

”ذمہ داری نبھا کر دکھاؤں گا صاحب شکایت کاموں میں نہیں دل لگتا۔“ اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔

”ڈرائیونگ کر لیتے ہو؟“

”جی صاحب آٹھویں بند کر کے ڈرائیونگ کرنے کا کبھی کے توفیق بھی کر لوں گا پورا عرصہ ایکس ڈرائیور کے ساتھ واسطہ رہا ہے۔“ اس نے ان کی تسلی کرائی۔

”ڈرائیونگ سیکھ لائے ہو؟“

”صاحب ہر چیز کا لائسنس ہے آپ بائیں تو مہی۔“ اس نے سیدھے ٹکری پت کہا۔

”ہوں یہ تو ابھی بات ہے لیکن ہم چاہتے ہیں کہ تم ڈرائیونگ کے ساتھ ساتھ ایک گارڈ کے فرائض بھی سر انجام دو۔“ انہیں چھ وقت ہماری پیش کے ساتھ رہنا ہو گا اس کی مخالفت کرنی ہوگی اور اس کے لیے تمہیں اپنے ساتھ رہنا پڑے گا۔“ وقار آندری نے اپنی گود میں رکھا رہا اور اٹھا کر سامنے ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔ منصور حسین نے چونک کر وقار آندری اور مبارک خان کو دیکھا تھا۔

”یہ کیسی نوکری مل رہی تھی اسے؟“ اس کی سرور پر انہیں پھر ہنسی تھی!!!

وہ کافی مہر سوری تھی جب سڑکی سائڈ پر رکھے موبائل پر رنگ ہونے لگی تھی اور اس کی گھڑی خیر



اتسلسل ٹوٹ گیا تھا۔ اس نے موبائل اٹھا کر نمبر دیکھا اور پھر کد م چونک کر اٹھ بیٹھی تھی پاکستان سے بی بی جان کی کال تھی۔

”اسلام علیکم۔“ کال ریسیو کرتے ہی سلام کرنے کی عادت تھی اس نے کسی خاص بندے سے نہیں تھی۔

”وعلیکم السلام بی بی جان؟“ بی بی جان نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”میں ٹھیک ہوں بی بی جان آپ کیسی ہیں؟“ اور پوچھا کیسے ہیں؟“ وقار آندری سے اٹھتے ہی اپنی جان کی کواڑ میں کڑخوش ہو گئی تھی۔

”میرے بچے کو بڑی جلدی خیال آگیا ہے اب بی بی جان اور آپ بابا کا حال پوچھنے کا؟“ ان کی ممتا شکوہ کر رہی تھی۔

”میریم سوری بی بی جان دراصل کچ کل کی لڑکی ہے۔“ میریم سوری نے سزا دے تھیں رات کو

ارادہ کر کے سوئی تھی کہ صبح اٹھ کر آپ کو کالیں ضرور کروں گی۔“ کئی سویر بی بی جان میں کچ آپ کو کال کرنے والی

تھی۔“ اس نے انہیں یقین دلائے کی کوشش کی۔

”ہاں بی بی جان اب بابا کی رات رو گئی ہے کہ بچے انہیں اتوار کے اتوار یاد کرتے ہیں آگے چھپے کے دیوں

میں تو انہیں غم ہی نہیں ملتا۔“ ان کا یہ شکوہ بجا تھا جس پر زری شرمندہ تھی اسی لیے کچھ کہہ نہ سکی اور چپ

ہو گئی۔

”میریم سوری بی بی جان اب بابا کی رات رو گئی ہے کہ بچے انہیں اتوار کے اتوار یاد کرتے ہیں آگے چھپے کے دیوں

میں تو انہیں غم ہی نہیں ملتا۔“ ان کا یہ شکوہ بجا تھا جس پر زری شرمندہ تھی اسی لیے کچھ کہہ نہ سکی اور چپ

ہو گئی۔

”میریم سوری بی بی جان اب بابا کی رات رو گئی ہے کہ بچے انہیں اتوار کے اتوار یاد کرتے ہیں آگے چھپے کے دیوں

میں تو انہیں غم ہی نہیں ملتا۔“ ان کا یہ شکوہ بجا تھا جس پر زری شرمندہ تھی اسی لیے کچھ کہہ نہ سکی اور چپ

ہو گئی۔

”میریم سوری بی بی جان اب بابا کی رات رو گئی ہے کہ بچے انہیں اتوار کے اتوار یاد کرتے ہیں آگے چھپے کے دیوں

میں تو انہیں غم ہی نہیں ملتا۔“ ان کا یہ شکوہ بجا تھا جس پر زری شرمندہ تھی اسی لیے کچھ کہہ نہ سکی اور چپ

ہو گئی۔

”میریم سوری بی بی جان اب بابا کی رات رو گئی ہے کہ بچے انہیں اتوار کے اتوار یاد کرتے ہیں آگے چھپے کے دیوں

میں تو انہیں غم ہی نہیں ملتا۔“ ان کا یہ شکوہ بجا تھا جس پر زری شرمندہ تھی اسی لیے کچھ کہہ نہ سکی اور چپ

ہو گئی۔

”میریم سوری بی بی جان اب بابا کی رات رو گئی ہے کہ بچے انہیں اتوار کے اتوار یاد کرتے ہیں آگے چھپے کے دیوں

میں تو انہیں غم ہی نہیں ملتا۔“ ان کا یہ شکوہ بجا تھا جس پر زری شرمندہ تھی اسی لیے کچھ کہہ نہ سکی اور چپ

ہو گئی۔

”میریم سوری بی بی جان اب بابا کی رات رو گئی ہے کہ بچے انہیں اتوار کے اتوار یاد کرتے ہیں آگے چھپے کے دیوں

میں تو انہیں غم ہی نہیں ملتا۔“ ان کا یہ شکوہ بجا تھا جس پر زری شرمندہ تھی اسی لیے کچھ کہہ نہ سکی اور چپ

ہو گئی۔

”میریم سوری بی بی جان اب بابا کی رات رو گئی ہے کہ بچے انہیں اتوار کے اتوار یاد کرتے ہیں آگے چھپے کے دیوں

میں تو انہیں غم ہی نہیں ملتا۔“ ان کا یہ شکوہ بجا تھا جس پر زری شرمندہ تھی اسی لیے کچھ کہہ نہ سکی اور چپ

ہو گئی۔



”کیوں بی بی جان خیریت ہے؟“ زری کو ان کے لہجے میں افسروگی کی جھلک نظر آئی تھی۔

پس بیٹا نہ دے ایسا آگیا ہے انبیاءِ اہلِ حق بیٹیوں سے خوف آنے لگے ہے۔ وہ واقعی اندر سے ڈری ہوئی لگ رہی تھیں۔

”پھر کیا ہے؟“ زری کو بے چینی ہوئی۔

”مہرنا کیا ہے بیٹا؟“ وہ سوچی کی بیٹی نے زہریلی گولیاں کھا کر خود کشی کر لی ہے چار بھائیوں کی ایک ہی بہن شہی اب چاروں بھائی بھی بیٹھے رو رہے ہیں اور ماں باپ بھی۔ ”وہ سوچی کی بیٹی؟“ کیا نام تھا اس کا؟ ہاں یاد آیا وہ بیچا نام تھا۔ زہری سے ذہن پہ قورۃ العیا اور سب یاد آ گیا تھا۔

”میں نے لیلی جان کے ساتھ بہت اچھی لڑائی کی تھی۔ لیکن وہ بلی اور بھلے مندر تھی۔“ زری کے فارغی اسکرین پر
 لیلی کا خاکہ نمودار ہو چکا تھا۔ زری کی ہم عمری تھی اور کئی بار زری سے ملنے کو ملی بھی آئی تھی۔

”جیسا کہ جو محبت نام کی بیماری ہے نا سب سے پہلے بندے کی عقل ہی تو مارتی ہے اور رفتہ رفتہ بندہ خود بھی مر جاتا ہے۔ لیکن زہریلی گولیاں کھا کر کبھی نہیں کوڑ کر اور کبھی کبھر دانوں کی خاطر کسی ان چاہے کی دوا میں بیٹھ کر بس فرق اتا ہے کہ زہل خانے کسی کی دوا میں بیٹھنے والی خود کبھی نہیں کی بلکہ گولیاں کھا کر خود کبھی کرتا ہے۔“ یہی لی جان کی بات زہری کے ہل میں تراژڈ ہو گئی تھی۔

”لیکن بابی جان رنجاک کی شخصیت اس کے بچپن کے پیشے کے ساتھ ہرچکی تھی۔ ”زری کو اک اک بات یاد آ رہی تھی۔“

ایسا جس کے ساتھ منگنی ہوئی تھی اس کے ساتھ محبت نہیں ہوئی اور جس کے ساتھ محبت ہوئی تھی اس کے ساتھ منگنی نہیں ہوئی تھی اس لیے کہ منگنی کی دلیل میں بیعتی اور نہ محبت کی دلیل میں۔ بی بی جان بتاتے ہوئے افسردہ ہو رہی تھیں۔

”اس کے گھر والوں کو اس کی محبت کا پتا تھا۔“

”سب جتا تھا، باب کو بھی اور بھائیوں کو بھی، لیکن سب کی ایک ہی خند تھی کہ اسے یہاں کر ہی نہیں لیں گے۔ اور وہ بھی انہی کی اولاد تھی اس کی بھی ایک ہی خند تھی یا ڈولی یا جتا۔ آج اس کا جتانہ اٹھتا تو وہی تھی۔ آخر کسی ایک کی خند تو پوری ہوئی ہی تھی انہی بات کے کہ سبھی تھے اور آج سبھی بڑے ہیں۔ انہیں اپنی بات وہ رہے ہیں کہ اس کی جیت ہے؟ کیا ہوا اگر مان جاسے؟ کون کی طرح کر لائی پھر تھی اس کے سانس نہ کر کوئی بھی نہیں ملتا تھا۔ اب نہ اس نے کام کر بھی رہے ہیں تو اس تندی کے کس کام کا؟ انہی نے یہاں بے بسوں کے چھپنے والے پھوڑے تھے اور زردی چپ پیادھے سب سن رہی تھی۔“

اب دوسری سیکی کے فرض سے بھی قاضی کو متاثر نہ ہونا عظیم ہے کہ جب کیا ہو جائے کچھ پتا نہیں یہ ملک "فناوری کے لیے بنا کر دی گئیں۔ ذری کچھ بھی نہ کہہ سکی تھی۔

”نہی۔“ انہوں نے اس کی چپ محسوس کرتے ہوئے زار زحار کی۔

تجلیاتی ہوتا ہے۔

مکتبہ اسلامیہ

100

”چھوٹے بچے ایسی باتوں کو دل پہ نہیں لیتی“ (2) کہیں سے کہا۔

”فلکی کی باتوں کو دل پہ نہ لیں، غراور دیا کریں؟ آج محبت کے قلیبے کا ایک فرو مر گیا، تو کیا اس کا افسوس بھی نہ

۱۰۰

زیریں؟ زری کے بچے میں اویسی رہی تھی بی بی جان کو غور لگھا کی موت پہ بے حد رونا اور افسوس تھا اس لیے مزید بچہ نہ کیا۔

”لی جان کیا محبت اتنی ہی نامراد ہوتی ہے؟“ اس نے عجیب سے انداز میں پوچھا۔

[illegible]

”یہاں جان آپ کی بیٹی بھی محبت کی باری میں سے لگا چکی ہے۔ اب رہنمائی ہے کہ میں نے کون سی خودکشی کرنی ہے؟“ وہ خود کھائی کے لیے اجازت میں بولی تھی۔ اور اٹھ کر باہر نکل آئی۔ لیکن سے برتنوں کی کھڑکی کو اواز سنائی دے رہی تھی۔ نگار نے اٹھ کر دیکھی شاید!

گندھار تنگ ہو چکی۔ ”تیری لے کچن میں داخل ہو گئے ہوئے کہا۔

گنڈا رنگ سے نہایت۔ "نگار ش نے خوشی سے مسکراتے ہوئے بڑی کا گل چھوا تھا۔

افہم کی زندگی کسمپاسی۔

Figure 1

”میں نے خود بے جا تو ہر ایک کے لئے اس کے لئے اسے گال کو سہارا۔“

مطلب میں گرم ہاتھ کہاں سے لادیں؟ نگار شمس کے انداز میں شرارت تھی۔ لیکن زری نے ان کی شرارت پہ کھنکھاتا ہوا ہنس دیا تھا۔

”کھانا تو ہے زری؟“ نگار نے آنچ دیکھی کرتے ہوئے پوچھا، وہ آلیٹھا چٹاری تھیں۔

”کوئی نہیں رہا۔“ زوی آگے بڑھ کے اپنے لیے چائے بنا لے گی۔

۳۹۔ "انکارش نے اس کے اندر سے لی بھوک کا پخت تمام لیا تھا وہ مسکراتے چائے پینا رہی تھی۔"

1997

1992

“**إسلام**”

1997

”پھر تم“
 ”میں نے آج خود کشی کر لی ہے۔“ وہ اسبستی سے پہلی آواز دینے لڑ رہی تھی۔

میں نے اس کے لئے ایک اور کام کیا ہے۔

یوں اس کے طور پر یوں ہے: گارنٹی دینے والی کمپنی۔

”یہ سچا محبت کا ”جھنڈا“ ہے۔“

"ہاں ایک اور نئی محنت کے سہ" زری نے کہا۔

”یہ قطعا ہے زوری ایسا نہیں کرنا چاہیے ان لڑکے اور لڑکیوں کو اپنی زندگی کے مصلحت سمجھانا چاہیے یہ حرام موت ہے گیا حاصل ہو یا نہ ہو ایسا کر کے پتہ ننگا رہے مخالفت کی گئی۔

”لیلی جان ہمارے تھیں کہ یہ جو محبت نام کی بیماری ہے، اسب سے پہلے بندے کی عقل ہی کو ہارتی ہے اور رفت

19 134

رفتہ بندہ خود بھی مر جاتا ہے۔ آپ خود سوچئے جس بندے کی عقل ہی مر جاتی ہے وہ اپنی زندگی کے حقائق کیسے سمجھ سکتا ہے؟ اسے کیسے احساس ہو سکتا ہے کہ یہ حرام موت ہے؟ وہ تو حاصل اور لاحقہ حاصل کی فکر سے بھی بے نیاز ہو چکا ہوتا ہے؟ زہری نے بھی دل کے پچھو لے پھوڑے تھے۔

”میں پھر بھی یہی کہوں گی کہ یہ سب غلط ہے غلط کیا ہے اس لڑکی نے؟“ نگارش نے سر جھکا۔
”دعا کیجئے بھائی یہ غلط کام آپ کی زہری کو نہ کرنا پڑے۔“ زہری ان کے ہاتھ سے ایکٹ لے کر دوبارہ چائے کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

”بالکل ہو گئی ہو تم؟“ نگارش کو شاک لگا تھا۔

”مختل مر جائے تو بندہ پاگل ہی ہو جاتا ہے۔“

”اسٹاپ اسٹ آئیندہ ایسے بیات کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔“

نگارش نے اسے جھڑکا۔

”ڈونٹ ڈری بھائی! میں اس محبت کے دور سے اتنی باتیں نہیں ہوں میں ابھی امید باقی ہے اس باقی ہے دعا کیجئے محبت میں میرا عقیدہ بھی آپ جیسا ہی ہو جو چاہا وہ پایا۔“ اس نے نگارش کے ہاتھ تھام کے کہا تھا اور نگارش اپنی گہری نظروں سے زہری کے چہرے کو کھوجتے لگی تھی۔

”بیات کروں تمہارے بھائی سے؟“

”کیسی بیات؟“

”تمہارے رشتے کی تمہاری شادی کی۔“

”مگر اس میں بھائی بھالا کیا کر سکتے ہیں؟ اور جو کر سکتا ہے وہ تو اتنی دور پیشا ہے کہ لا تعالیٰ اور انجان بھی بھولے سے بھی خیال نہیں کیا اسے۔“ زہری کے لہجہ پر شکوہ چل گیا تھا۔

”ابن شائد اسے ہی خیال آئے گا میں ہمارے پاکستان جانے کی پر ہے سارے خیال وہی کرے گا۔“ نگارش نے اسے تسلی دے کر ہلایا۔

”اللہ آپ کی زبان مبارک کرے۔“ وہ گہری سانس کھینچ کے بولی تھی۔

”آمین مدحہ کی کوئی کال وغیرہ آگے۔“ فریڈ نے کوہلوگ کے تھکاتے منہ پر ہور ہے ہیں۔

”میں مدحہ کی تو نہیں میں اور قارئین آئی کی کال آئی تھی عبداللہ بھائی بتا رہے تھے۔“

”مدحہ نے کیوں نہیں کی؟“

”اس کے پاس اپنا ذاتی نمبر نہیں ہے اس لیے۔“

”او اچھا۔“ نگارش اپنے کام کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔ اور زہری بھی ان کے قریب بیٹھی چائے کا کپ تھامے باتوں میں مشغول ہو گئی تھی۔

”واہیٹ شے چلو گی۔“ نگارش نے پوچھا۔

”کیوں؟“

”بھئی شاپنگ کرنے کے لیے تم فارغ ہو؟“

”میں بھائی آج سو نہیں ہے۔“ اس نے انکار کر دیا۔

”سو؟ کہاں ہے؟“

”اپنے گاؤں کے دوستوں کے گھر میں۔“ اس کے جواب پر نگارش چوکی اور پھر چپ ہو گئی تھی اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ زہری کا پورا دل اب اس کی بات کے زیر اثر اس اور افسردہ گزرتے گا وہ بچہ بھی کرے۔

وہ نماز پڑھ کے چپ چاپ چھتہ پہنچ گئی تھی اور آگلی ہی چھتہ پہنچنے لگی۔ اس نے الجھا ہوا تھا اس لیے شمالی کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی تو اس کا ہنسنے کے بعد جب تھک گئی تو چھتہ پہنچ کر بھی چارپائی پر لیٹ گئی اور نظر آسمان کے نظاریوں سے جا ابھی تھی۔ آسمان کا کشادہ سید روشن ستاروں سے بھرا ہوا تھا لیکن اس بیٹے سے چاند کی صورت عکاس ہوئی تھی۔

”اللہ تعالیٰ نے انسان کے علاوہ باقی ہر چیز کو بے فکر کیا ہے۔“ وہ ستاروں کی عثمانی روشنی دیکھ کر سوچتے پوچھ رہی تھی۔

”چاند رات کو سبے لکری سے نکلتا اور دن چڑھنے سے پہلے غائب ہو جاتا ہے۔ سورج دن کو سبے لکری سے ظہور ہوتا اور شام کو ڈوب جاتا ہے۔ نہ کوئی جھگڑا نہ کوئی سمجھوتہ بس ایک ہی لکری بندھی رہتی ہے۔ لیکن انسان کا ہر دن پہلے دن سے مختلف ہوتا ہے۔ اور ہر رات بھی رات ہوتی ہے۔ نئی لکریں اور نئی سوچیں لے کر۔ انسان ہر روز لیکن ہوتا رہتا تھا اور باقی ساری کائنات جیسے لکری رات ہی ہے۔“ وہ ستاروں کو دیکھتے ہوئے سمجھنے لگا تھا کہ کیا سوچے جا رہی تھی کہ

”پچھلے دن کے دوران بے پروا نہ رہے۔“

”کیوں ہے؟“

”دورانِ غفلت۔“

”یہاں سے عدیل کی آواز سنائی دی۔“

”سونا اور عدیل نے اندر سے بھاگتی ہوئی لگی تھیں لیکن سونے دروازہ کھول دیا تھا اور جیسے

”ای عدیل اندر داخل ہوا وہ دونوں اس سے لپٹ گئیں دونوں بھولی ہو گئیں۔“

”کیسی ہو میری جان۔“ عدیل ان کے بال سہلاتے ہوئے بولا۔ لیکن اس کے ہاتھ سے شاپر وغیرہ و تمام ہتھی

”آپ کیا لے کر آئے ہیں بھائی؟“ ان دونوں نے اشتیاق سے پوچھا اور عدیل ان کی مصو میٹھتے مسکرایا۔

”متم لوگوں کے لیے کھانے کی چیزیں لے کر آیا ہوں میری جان۔“ مریم سے کہوہ تھیں وہ دونوں میں نکلتے

”اس نے سونا کا سر تھکا۔“

”میں نکال داتی ہوں۔“ اس نے بچن۔ کی طرف اشارے ہوئے کہا۔

”کیوں؟ مریم کہاں ہے؟“ عدیل جو نکلا سب سے بھی مریم کی غیر موجودگی اوش کر چکا تھا۔

”وہ تو شاید اوپر چھتہ پہنچے۔“

”کیوں؟“

”جس ایسے نماز پڑھی تو اوپر چلی گئی۔“

”مریم نے قریب آتے ہوئے جواب دیا وہ نیچے اتر آئی تھی۔“

”مطہ جت تو ٹھیک ہے نا؟“

”عدیل کو اپنی چھتہ پنن کی طرف سے فکر ہوئی تھی۔“

”جی بالکل ٹھیک ہوں میں شاید کپڑے دھوئی رہی ہوں اس لیے تھکن ہو گئی ہے۔“

”اچھا! کیا تمہیں بھی تھکن ہوئی ہے؟“ عدیل نے غصے سے کہا تھا وہ جانتا تھا کہ مریم دن بھر کاموں میں مصروف رہ کر اپنی فراغت کم کرنے کی کوشش میں لگی رہتی ہے۔

”ہر قسمی سے انسان ہی ہوں۔“ تھکن ہو بھی سکتی ہے۔“ وہ سنا کر کہتی لیکن سے شاپر وغیرہ و تمام کے بچن کی

طرف ہوئی۔

”آج اتنی قومیت کس لیے؟ خیر تو ہے؟“ عدیل کے بغیر نہ رہ سکا۔

”خیر ہی ہے، گپ پریشان نہ ہوں۔“ اس نے سر جھٹک کر کہا۔

”یہ وہ ایڈیٹ والا شمار تم رکھ لو تمہارے لیے ہے۔“ اس نے مریم کو اشارہ کیا وہ ہاتھ میں پکڑے شاپرڈ میں سے واپس شاپرڈ دیکھتے گئی۔

”ابھی رہنے والے میں دیکھ لیتا۔“ عدیل کا اشارہ وہ سمجھ گئی تھی لیکن اندر سے حیران بھی ہوئی تھی کہ ایسا بھی کیا ہے کہ وہ سب کے سامنے دیکھتے۔ منع کر رہا ہے؟ پھر عدیل ای ای ای کی طرف آگیا اور مریم ان سب کو غصہ جات وغیرہ ہلٹوں میں ڈال کر دینے لگی۔ اور کالی دیر بعد کمرے میں آئی تو عدیل بھی آگیا۔

”یہ کیا ہے بھائی؟“ بلا غراں نے پوچھ ہی لیا تھا۔

”تمہارے لیے سوٹ ہے۔“ گو جراتوالہ میں کپڑوں کی بہت اچھی دکان تھی اور کافی سستے بھی تھے یہ سوٹ یونٹی تمہارے لیے پسند کر لیا، سوچا اگر دوبارہ آتا ہوا تو انہیں اور حدیث وغیرہ کے لیے لے کر آؤں گا۔“ عدیل ای ای کہہ رہا تھا اور مریم اپنی سوچ رہی تھی اس کے سامنے انتہائی نفیس ماضیوں کا سوٹ تھا اور وہ بیان خاطرہ کی برتھ ڈسے کی طرف تھا جامع جوڑ توڑ کرنے میں لگا ہوا تھا۔

”کیا بات ہے رہنبر نہیں آیا؟“ عدیل نے اسے چپو کی طرح پوچھا۔

”نہیں۔“ نہیں بھائی ایسی تو کوئی بات نہیں ہے نہت خوبصورت سوٹ ہے ٹھیک پو سوچ۔“ مریم کے دلخیز پر بھی سوچوں کا بوجھ قدرے کم ہو گیا تھا اور عدیل بھی اس کے چہرے پر مسکراہٹ ہو گئی کہ خوش ہو گیا تھا پھر اس کا سر جھٹکتے ہوئے منہ ہاتھ دھوئے چلا گیا۔

”رہو الور؟“

”ہاں یہ رہو الور تم رکھو گے۔“ وقار آندری نے منصور حسین کی طرف اشارہ کیا تھا۔

”لیکن صاحب اس کو رکھنے کی کیا ضرورت ہے؟“ منصور حسین نا اگلی سے پوچھ رہا تھا۔

”اس کو رکھنے کی ہی تو ضرورت ہے۔“ اور اگر ایوانی کے وقت نہیں چلاؤ گے کی گاڑی کے آگے اس کوئی بھی مٹھلوک تو ہی نظر آئے گا تو کوئی بار نہ ملے۔“ انہوں نے اسے اجازت دی تھی۔

”تو اتنی گولی مار دوں؟“ وہ حیرت سے وہ ہرا کر بولا تھا۔

”ہاں لو اتنی گولی مارو نہ۔“ وہ بھی زور دے کر بولے تھے۔

”مگر کوئی مریا تو؟“

”تو مریا جانے دشمن کے ساتھ رعایت کرنا خود اپنے ساتھ دشمنی کرنے کے برابر ہوتا ہے۔“

”یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، میں بھی ایسی بات کا قائل ہوں، کوئی رعایت نہیں، کوئی مٹھلوک نہیں۔“ منصور حسین نے ان کی بات میں ہلکا سا لٹائی گئی۔

”مجھے اپنی بیٹی کی زندگی سے زیادہ کوئی زندگی نہیں۔“ وقار آندری کے چہرے پر سختی اتر گئی تھی۔ منصور حسین اور مبارک خان ان کی طرف دیکھتے رہ گئے۔

”رہو الور چلا سکتے ہو؟“

”چلا کر دکھاؤں؟“ اس نے ہاتھ جوڑا کر ٹیبل پر رکھا رہو الور اٹھا لیا تھا اور پھر رہو الور کی بات میں بھی سی پھونک

دیکھ کر 194

باری تھی۔

”نہیں رہاں نہیں، مولیٰ میں غازی آواز سے سب پریشان ہو جائیں گے۔“ انہوں نے منع کر دیا۔

”نہیں کیا ہے؟“

”جواب رہو الور چلاؤں گا نہیں تو میرے نشانے کا پتہ کیسے چلے گا؟“ منصور حسین نے بے ہوش سے کہا تھا۔

”اسے کال لائنس ہے؟“ انہوں نے کچھ یاد کرنے پر پوچھا۔

”جی صاحب ہے تو کسی نمبر پر منہ کر دے والا ہے۔“

”تو کرو اور؟“ کئی چندوں میں تو ضرورت ہے۔“

”دکرو الوں گا سر، لیکن پاس لائنس کی فیس بھرے گئے لیے پیسے نہیں ہیں ابھی۔“ اس نے اصل مسئلہ بیان کیا تھا۔

”گوٹ وری، مبارک خان تمہارے ساتھ چلے گا اور سارا کام کروا دے گا۔ مبارک خان نے اپنا لائنس بھی برقیو کروانا ہے شاید؟“ وقار آندری نے مبارک خان کی سمت دیکھا۔

”جی صاحب میں نے کئی آج اور کل میں ہی کروانا ہے۔“ مبارک خان نے فوراً تائید کی تھی۔

”تو ٹھیک ہے، پھر منصور حسین کو بھی ساتھ لے جانا۔“

”جی لے جانا گا۔“

”تمہارا کئی بی گارو کہاں ہے؟“

”ماخیر ہے صاحب۔“ منصور حسین نے جیب سے شاخنی کارڈ نکال کر ان کے سامنے رکھ دیا تھا وہ اس کا شاخنی کارڈ دیکھ کر مطمئن ہو گئے تھے۔

”صاحب اس کے پاس موبائل بھی نہیں ہے ہم اس سے رابطہ کیسے کریں گے؟“ مبارک خان نے گئے ہاتھوں ایک اور کی بیان کی تھی۔

”وہ بریف کیسے اٹھا کر اوپر رکھو۔“ وقار آندری نے کاؤچ پر رکھے بریف کیس کی سمت اشارہ کیا تھا مبارک خان نے بریف کیس اٹھا کر ان کے سامنے ٹیبل پر رکھ دیا تھا انہوں نے بریف کیس کھلا کر دیکھا اور لاک اور کھول کر لیا تھا پھر ایک موبائل سیٹ بعد چار بجے نکال کر منصور حسین کے سامنے رکھا۔

”یہ موبائل تمہارے لیے ہے اسے تم رکھو گے، ہم کارڈ ہم خود لائٹ کروا کے دیں گے اور ہاں موبائل جو میں سمجھنے آں رہنا چاہیے، فل چارجر، فل سکل، فل کیڈٹ، کسی چیز میں بھی کوئی کمی نہیں ہونی چاہیے۔“

انہوں نے دو نوک سمجھایا تھا۔

”ابن شاء اللہ صاحب کوئی کمی نہیں آئے گی موبائل ہی نہیں میں خود بھی چو میں سمجھنے آں رہوں گا۔“ اس نے وقار آندری کو تسلی دی تھی۔

”مبارک خان سرورٹ کو آرٹر صاف کروا دے گا تمہارا شفٹ ہو جانا اپنا کوئی مسلمان لانا چاہتے ہو تو وہ بھی لے آتا۔“ وقار آندری اصرار کن انداز میں کہتے ہوئے بریف کیس بند کر کے کھڑے ہو گئے تھے۔

”تو کمری کی ہے صاحب؟“ منصور حسین نے ایک بار پھر تصدیق چاہی تھی۔

”ابن شاء اللہ۔“ انہوں نے بھی اسے تسلی دی تھی اور وہاں سے چلے گئے تھے۔ منصور حسین اور مبارک خان پیچھے اکیلے رہ گئے۔

”شکریہ مبارک خان۔“ منصور حسین اس کا شکریہ ادا کیا۔

”کس بات کا؟“

دیکھ کر 194

”نیل باری؟“
”میں اسلام آباد کے لیے نکل رہا ہوں۔“
”تمہارے لیے؟“

”ہوں ناں سے ملنے جا رہا ہے۔“
”یار ان سے تو میں نے بھی ملنا تھا؟“

”ابھی تم اپنا گھر سیٹ کر دینا میں سے بھی مل لیتا۔“ دل تو نے مشورہ دیا۔
”گھر سیٹ کرنے کے لیے ہی تو تمہیں بلایا ہے۔“ نیل خشکی سے بولا۔
”کیوں کیا مسئلہ ہے؟“

”کوئی ایک مسئلہ ہو تو بتاؤں گا؟“ سارے مسئلے بکھرے پڑے ہیں۔“
”نیل؟“

”نیل! یہ کہ اسے لیے گاڑی نکالانی ہے نہ جدید کے لیے گاڑی نکالانی ہے کہ بچے لیے نام کے لیے اور جدید کے لیے موبائل فون کے سم کارڈ لینے ہیں اور پینک اکاؤنٹ اوپن کروانا ہے مگر کسی بھی چیز کو دینی ہے بلکہ اور بھی ہزاروں کام ایسے پڑے ہیں جن کے بغیر ہم بے کار بیٹھے ہیں۔“ نیل نے کامیابی کی لہجہ نکالی۔
”ایک دن ممبر گرو نکل تمہارے سارے کام ہو جائیں گے میں کل واپس آجاؤں گا۔“ دل تو نے اسے تسلی دی۔

”یار اس میں میری بات کہاں سے آگئی یہ سب ضرورت کی چیزیں ہیں اور ہم ہاتھ پہ ہاتھ رکھے بیٹھے ہیں“
”صرف لیڈ لائن نمبر کا شمار ہے۔“ نیل نے جھجھکا کر جواب دیا تھا۔

”چھ ماہیں ایک کام کرتا ہوں گلاب خان کو تمہاری طرف بھیج دیتا ہوں تم اس کے ساتھ کسی بھی موبائل کمپنی کی فرنیچر خریدیں جاؤ اور اپنی مرضی کے نمبر لایو کرو الو اگر کمیشن کی ضرورت ہے تو وہ بھی بھیج دیتا ہوں اور کچھ دن کے لیے میری دوسری گاڑی بھی تم اپنے پاس رکھ لو۔“ اس نے نیل کے مسائل کا مختصر اور فوری حل سوچا تھا۔
”نیل باری؟“ نیل نے بچہ کہنا چاہا۔

”لیکن ویکن کس لیے؟“ میں بھیجتا ہوں گلاب خان کو چھوٹے موٹے کام بنانا باقی میں آجاؤں تو بیکر کر لوں گا۔“ دل تو نے اسے ہدایت دی۔

”نیل آجاؤ گے؟“

”ہوں!۔“

”اگر کے بھیج دو گلاب خان کو۔“

”وہ تو میں بھیج دیتا ہوں لیکن دھیان رکھنا اس کی کل تمہارے گھر میں ہے تو گاڑی دیر کی تلافی کی ضرورت ہوگی اچھا۔“ دل تو نے کالجہ شرارتی تھا اور نیل بدک گیا تھا۔
”نیل باری؟“

”میں نے کہا ہے کہ وہ کل سے چھڑے ہوئے ہیں انہیں ملنے کا موقع دے دو۔“ وہ اپنی شرارت سے باز نہیں آیا تھا۔

”بڑا ایکسپیرینس ہے وہ لوگوں کے ملنے اور چھڑنے کا۔“ نیل نے تو معنی انداز سے پوچھا۔

”یہ بحث بکھر رہی تھی۔“ دل تو نے اسے دیا۔

”دل تو نے؟“

”جی جی جان؟“

”نیل رہے ہو؟“
”میں باریس بحث لمبی ہو گئی تو میں لیٹ ہو جاؤں گا اس لیے پھر کبھی۔“ دل تو نے سنجیدہ ہو کر کہا تھا اور نیل کو یہ بتا دیا۔

”خیر کب تک راز کو راز رکھے گا؟“ کبھی تو سامنے آئے گا نا؟“ نیل نے دوسری بار پوچھا۔
”جب آئے گا تب تک کھا جائے گا۔“

”اگر کے اللہ حافظ۔“ نیل نے کہہ کے فون رکھ دیا تھا اور دل تو نے سوچا کل کو ملنا تھا نیل کی بات سوجھنا وہ کیا تھا۔
”یار اس ماہ کا ڈائجسٹ کس کے پاس ہے؟“ حرمت اندر داخل ہوئے ہی کافی جلد سے گھر کے اندر میں انتظار کر رہی تھی۔

”تو شہ کے پاس۔“ جویریہ نے لا پر دانی سے کہہ دیا۔ ڈائجسٹ کو نا محسوس طریقے سے کشن کے پیچھے چھپا دیا تھا۔

”لیکن انوشہ تو کہہ رہی تھی کہ یہ کوئل کے کمرے میں ہی چھپوا دینی تھی۔“ حرمت نے ادھر ادھر تلاش کی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ابھی کیا خاص بات ہے اس کے ڈائجسٹ میں؟“ جویریہ آنکھیں حلقہ کے پوچھ رہی تھی کوئل نے حجت اور اپنے اپنی سکرپٹ پر شکل دیکھائی تھی۔

”وہ سلیپ ڈرائنگ کی ماسٹرسٹ فیملی تھی۔“

”تو تو تو تھی۔“ جویریہ نے بے ساختہ کہا تھا۔

”میں؟“ اس نے کیسے پتا؟ تم نے پڑھ لی ہے؟“ حرمت ٹھک رہی تھی۔

”میں ابھی پڑھنے والی تھی کہ تم آگئیں۔“ کوئل نے آنکھوں سے قلم دیا تھا۔

”کیا کیا؟“ حرمت چیخ اٹھی اور جویریہ فوراً کشن کے پیچھے ڈائجسٹ چھپٹ کر بھاگ کر بیٹھی ہوئی تھی۔

”وہ جو حرمت میں قلم پڑھنا شروع کر چکی ہوں۔“ نیل نے پڑھ لیتے ہوئے پھر تم پڑھ لیتا۔“ جویریہ حرمت اور انوشہ

نیل کی ڈائجسٹوں کی روایتی شکل پر ہنسنے لگی تھی ہر جیسے تھوڑے نیل نے باری باری ڈائجسٹ منگوانا ہوتے تھے اور جس میں سے جو

ڈائجسٹ منگواتی تھی اس میں سے اسی کی اجازت دینی ہوتی تھی۔ اس بار حرمت کی باری تھی سارے ڈائجسٹ اسی

نے منگوائے تھے اسی لیے اسی کی اجازت دینی تھی۔

”میں نے اپنے سارے پیسے صرف اس ایک قلم کے لیے ہی تو خرچ کیے ہیں اور تم کہہ رہی ہو کہ ابھی نہ

دعویٰ؟“ حرمت نے قلم کے کہا تھا۔

”یار توڑی پور بعد پڑھو گی تو ابھی تمہارے پیسے پورے ہو جائیں گے۔“ جویریہ نے اسے تسلی دینے کا کہا۔

”تو پھر وعدہ کر کہ جب تک میں قلم نہ پڑھ لوں تم کوئی بھی بات نہ کہیں نہیں کرو گی؟“ اس طرح سارا چارم ختم

ہو جاتا ہے۔“ منجانب سے کیوں اور کیسے حرمت مان گئی تھی پورے وہ ناول کے معاملے میں بے حد کڑی تھی۔

”لو کہہ دو۔“ جویریہ نے خوشی خوشی وعدہ کیا تھا۔

”چلو تم بیٹھو میں تب تک پڑھ لوں۔“ جویریہ خاصی خوش ہوئی تھی اور حرمت اپنی بے چینی پر کشید کرتے

ہوئے کوئل کے قریب لکڑی کشن پر ٹک گئی تھی۔

”کیا ملتا ہے ان ناولز اور ڈائجسٹوں سے؟“ کوئل نے تعجب سے پوچھا۔

”جو کل کے معاشرے سے نہیں ملتا۔“ حرمت نے دھڑک کہا۔

”ابھی مطلب؟“

”مطلب ان نادوں اور ڈانچوں سے ہمیں نصیحت ملتی ہے، نرمی جینے کا تھوڑا بہت دھنگ ملتا ہے، مسرت ملتی ہے اور سب سے بڑی بات کہ چھ لکھوں کی خوشی اور راحت ملتی ہے۔ جو آج کل حقیقت کی دنیا میں بالکل ہی نہیں ہے۔“ حرمت کے جواب پر کول واقعی چپ ہو گئی تھی۔

”یہ سب انسانی باتیں ہیں یا رہ۔“ مدحت نے سر جھٹک کر تمسخرانہ کہا تھا۔

”تمہارے بچے اور میرے بچے میں بہت فرق ہے یا رہ، تم ہر چیز کو غمزدگی سے دیکھتی ہو اور میں نہیں۔“ حرمت نے اپنی بہن کو حقیقت سے آگاہ کیا تھا۔ مدحت بڑے سکون سے نیکی اپنے ہاتھوں کے ناشوں کی تراش فراش میں لگی ہوئی تھی۔

”حرمت۔“ باہر سے ثروت عظیم کی آواز سنائی دی تھی۔

”جی ہاں۔“

”وہ بچہ انیال آیا ہے اسے کھانا کال دو۔“ انہوں نے کول کے بیڑیہ دم کاغذ رکھ لیتے ہوئے اسے کام سونپا۔

”انیال کو کھانا؟“

”ہاں وہ عاتقہ باقی اور انوشہ مارکیٹ تک گئی ہیں انکیسی میں کوئی نہیں تھا اس لیے میں نے اسے کہا کہ کھانا کھا کر چل جائے۔ جاؤ وہ انتظار کر رہا ہو گا۔“ انہوں نے اشارہ کیا۔

”اس بات کو بھی غور کر لیجیے گا۔“ مدحت نے پیچھے سے آواز دی تھی اور حرمت اسے کھاجانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے باہر نکل گئی تھی۔ وہ جگہ میں آئی تو انیال واقعی انتظار کر رہا تھا لیکن شکر تھا کہ وہ نیکیا نہیں تھا اس کے ساتھ احمد بھی بیٹھا ہوا تھا احمد شاید ابھی ابھی انیال کی بول سے پانی اندر کر رہا تھا اور انیال اس کے ساتھ ٹھوٹھوٹھا حرمت نظروں کے حصار سے بچ گئی تھی ورنہ وہ انیال کی چپ اور لہجے آگھوں سے خائف ہو جاتی تھی۔

”ہیکم صاحب آج کھانے میں کیا بنا ہے؟“ ملازمہ ان کے پیچھے ڈراٹھک دوم میں ہی چلی گئی تھی۔

”قیمہ کر لیتے۔“ چول شاد کے کچے میں تھکام تھا۔

”آج اچھے دنوں بعد میرا گھر آ رہا ہے تو کھانا بھی ماسی کی پشہ کا ہو گا۔“

”ہیکم صاحبہ وہ قیمہ کر لیتے؟“

”تم جا کر مسالا تیار کر دیتے اور کر لیتے ابھی آجائیں گے مشکور لے کر آئی ہو گا۔“ چول شاد نے حکم جاری کیا تھا آج وہ اس کی کند گاسن کر بہت خوش ہوئی تھیں اور کالج بھی نہیں گئی تھیں اس بار وہ کافی دنوں بعد آ رہا تھا۔ اور وہ کافی دنوں سے اس کے لیے اس بھی ہو رہی تھیں لیکن وہ اپنے کاموں میں بڑی تھا اسی لیے اسے آتے کا نہیں کہا تھا لیکن آج جب اسے فرصت ملی تو اس نے سب سے پہلے ان سے ملنے کا فی سوجا تھا اور فون کر کے انہیں اطلاع بھی دے دی تھی انہوں نے اس کا بیڑیہ دوم از سر نو صاف کر لیا اور ملازمہ کو اس کی لیورٹ ڈشٹر بنانے کا آرڈر بھی دے دیا تھا پورا دن بیٹے کی آمد کی تیاریوں میں ہی گزر گیا تھا شام کے سائے ڈھل رہے تھے جب گیسٹ اس کی گاڑی کا باران سنائی دیا وہ تیز قدموں سے رہاڑی عید کر گئی ہوئی باہر نکل گئی تھیں ہاتھ میں وہ بھی گاڑی سے اتر آیا تھا۔

”السلام علیکم اہاں۔“ وہ ان کے سامنے جھک گیا اور چول شاد نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے اسے سینہ سے لگا لیا۔

”میری جان جیتے رہو خوش رہو۔“ وہ اس کے کندھوں اور بالوں پر ہاتھ پھیر رہی تھیں اور دوبارہ ہمار اس کے ماتھے پر بوسہ دیا تھا۔

بیکرن 200

”کیسی ہیں آپ؟“ وہ ان کے دونوں ہاتھ چوم کر آنکھوں سے لگاتے ہوئے بولا۔

”تمہیں دیکھتی ہوں تو جوان ہو جاتی ہوں سارے غم بھول جاتی ہوں۔“ ان کی آواز ہی نہیں آنکھیں بھی ٹپک رہی تھیں اور دل اور شاہان کو اپنے ہاتھوں کے گھیرے میں لے کر اندر لے آیا تھا۔

”یہ دن آپ کے اداس ہونے کے دن نہیں ہیں یہ تو آپ کی خوشی کے دن ہیں خوش رہا کریں اور اللہ کے رنگ دیکھتی جائیں۔“ اس نے ان کو صوفے پر بٹھاتے ہوئے کہا اور ان کے ہاتھوں کو اپنے کسلی دی تھی۔

”میری خوشیوں کے دن تو اسی روز ختم ہو گئے تھے جس روز باہر شاہ کی موت ہوئی تھی۔“ چول شاد کے کچے میں لٹکی ہوئے ایک رنگ رنگی پل اور نے لب پہنچنے لے لیے اور سر جھٹک گیا اس کے جھکے ہوئے سر کو دیکھ کر چول شاد کو اپنے کو کنٹرول کرنا پڑا تھی غلطی کر رہی تھیں وہ خود اپنے سفر طے کر کے آیا تھا اور آتے ہی انہوں نے اس کی جھٹک میں اضافہ کر لیا تھا وہ اپنی غلطی کا احساس ہونے لگی تھی اور کھڑی ہوئی تھیں۔

”کہاں جا رہی ہیں؟“

”تمہارے لیے جو سب لے آئی ہوں۔“

”ارے نہیں اہاں آپ۔“ انہوں نے لول گایا پھر ملازمہ کو آواز دے دیجیے۔“ اس نے ان کا ہاتھ پکڑ کر روکنا چاہا۔

”ملازمہ کو کہیں؟“ انہیں غور سے کرتی ہوئی۔ ”وہ نرمی سے کہہ کر کچن میں چلی گئی تھیں اور چند منٹ کے وقفے کے بعد اس کے لیے انار کا جوس لے آئی تھیں۔

”آپ سب سے پیارے بیٹھیں۔“ اور یہ بتائیں کہ آپ اتنی کمزور کیوں لگ رہی ہیں؟“

”میں کمزور لگ رہی ہوں؟“ وہ حیرت سے پوچھیں۔

”کیون میں تو اپنے آپ کو بالکل فٹ محسوس کر رہی ہوں۔“ وہ مسکراتے لگیں۔

”لگتا ہے آپ کالج کو زیادہ ناگوار لگ رہی ہیں؟“

”ارے پھر تو ناگوار کو تمہیں بتاؤ نہیں اور یہ کیسے ہیں؟“ چول شاد نے سر جھٹک کر اعتراض کیا تھا۔

”وہ بھی فٹ فٹ ہیں۔“ نیل آپ کو یاد کر رہا تھا آپ سے ملنا چاہتا تھا۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا تھا۔

”ہاں میری بات ہوئی تھی، ناگوار بھائی سے وہ پاکستان آگئے بہت خوش ہیں، لکھنے کے بیڑے شکرانے ادا کر رہی تھیں۔“ چول شاد نے کل خانہ ہیکم کو یاد خور فون کیا تھا اور اسے سالوں بعد وطن واپس آنے پر مبارکباد دی تھی۔

”ہاں نیل بھی بہت خوش ہے۔“ دل تو بڑے اثبات میں سر ملایا۔

”اور یہ؟“

”مدحیہ بھی ٹھیک ہے بس پہلی بار پاکستان آئی ہے اس لیے اسے ایڈجسٹ ہوتے ہوئے کچھ عرصہ لگے گا۔“ اس نے مدحیہ کی خوشی کا جواب دیا۔

”محبوب اللہ اور اس کی فیملی کیسی ہے؟“ وہ دل اور کے چہرے کو غور دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔

”وہ بھی ٹھیک تھا کہ میں محبوب اللہ سے بھی بات ہوتی رہتی ہے۔“ اس نے ٹارٹل سے انداز میں کہتے ہوئے لکھنے اچکا کئے اور جوس کا گلاس منہ سے لگا لیا تھا۔

”نرمی سے بھی بات ہوتی ہے؟“ ان کے اس اچانک اور گرمے سوال پر دل اور نے سب سے ساختہ جھٹک کر دیکھا تھا۔

”باقی آج کل تمہارے میں ملاحظہ فرمائیں“

بیکرن 201

دل اور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور مجھے ہوئے و کیوں میں ہوتا ہے وہ اپنے قول و فعل کا بہت بکا آدمی ہے اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پر بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔

آنکھوں کی قیامت



نیلہ عزیز



بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیحدہ تو اپنے بابا کی شخصیت سے بسی متاثر ہے۔
ماجیدہ اور نیلہ حیات دہی بہن بھائی ہیں ماجیدہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے وہ انگلینڈ کی رنگینوں میں مکمل طور پر رنگ چکی ہے جس کے پیش نظر فائزہ بیگم نیلہ کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں لیکن ماجیدہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے جس پر نیلہ اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔
زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔
عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے مگر ہر روز مایوسی اور ناامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا ہے بی بی اور مجبوری سے تنگ آخر خود کشی کرنے کا سوچتا ہے لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھانے میں چائے پیتے ہوئے باؤ اقیانوس مل جاتا ہے وہ اسے کام کی آفر کرتا ہے جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔
منصور حسین ایک غریب اور میسر کپاس آدمی ہے وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔



بتول شاہ اس کی سمت ہوتی گہری نظر سے دیکھ رہی تھیں، دل تو رہے چند سیکنڈ میں ہی اپنے چہرے کے تاثرات کنٹرول کر لے گئے تھے۔ مگر وہ کوئی بھی نتیجہ اخذ نہ کریں۔
 ”مشکل سوال تو نہیں کیا میں نے؟“ انہوں نے دل اور کے چہرے پر فوس کر رکھا تھا۔ لیکن وہ بھی اس کام میں باہر تھا چہرے کے تاثرات چھانا اور کسی کو نظر کا دھوکا دینا اس کے لیے مشکل تو نہیں تھا۔
 ”میں نے کب کہا کہ سوال مشکل ہے؟ میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ آپ کو اچانک زری کا خیال کیسے آیا؟“ اس نے ہنسی مہارت سے بات کا رخ بدل دیا۔

”اس میں سوچنے کی کیا بات ہے؟ درجہ کا خیال آسکتا ہے، نیل کا آسکتا ہے، عبداللہ کا آسکتا ہے تو پھر زری کا کیوں نہیں آسکتا؟ وہ بھی تو عبداللہ کی نیلی کا حصہ ہے، بہن ہے اس کی؟“ وہ بھی اسی کی اماں تھیں چھوٹی مولیٰ بات سے بھٹکتی ہوئی نہیں تھیں، دل تو رکھ کر مزید سمجھتا رہا۔

”دراصل آپ کی زری کے ساتھ زیادہ بات چیت نہیں ہے اس لیے کہہ رہا ہوں۔“
 ”تمہیں کس نے کہا کہ میری زری کے ساتھ زیادہ بات چیت نہیں ہے؟“ وہ دلچسپی سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟ یعنی آپ کی اس سے بات ہوئی ہے؟“ دل اور کو واقعی اس کا اندازہ نہیں تھا۔ جب ہی تو حیرانی ہو رہی تھی۔

”بھی تمہارے آنے سے پہلے ہی ہوئی ہے۔“ انہوں نے کندھے اچکا کر بے نیازی سے کہا، دل اور کو یقین نہیں آیا تھا کہ ان کا آپس میں کانٹہ کٹے ہے۔

”چھا! کب سے چل رہا ہے یہ سلسلہ؟“
 ”کیوں تمہیں برا لگا؟“

”مجھے کیوں برا لگے گا؟“ اس نے سر جھٹک کر کہا۔
 ”تمہارے چہرے سے تو یہ ہی لگ رہا ہے؟“

”میرے چہرے پر نہ جایا کریں، سرا سہو کہہ دیتا ہے۔“
 ”میں تمہاری ماں ہوں تمہارے دھوکے بھی سمجھتی ہوں۔“ انہوں نے یقین سے کہا۔

”تو پھر یہ بھی سمجھ لیں کہ مجھے آپ کا اور زری کا کانٹہ کٹے کس لحاظ سے برا لگے عجیب لگ رہا ہے۔“ اس نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے جوس کا گلاس خالی کیا اور ذرا آگے جھکتے ہوئے نیل پر رکھ دیا تھا۔

”کیا تمہیں زری پسند نہیں ہے؟“ ان کا یہ سوال واقعی مشکل تھا۔ لیکن جواب تو دینا ہی تھا، چپ رہنا تو وہاں قرار سمجھتیں۔

”پسند ہاں پسند کا قصہ ابھی رہنے دیں۔“
 ”کیوں رہنے دوں؟“

”بس ابھی دل سے اس کی پسند اور ناپسند پوچھی ہی نہیں۔“ اس کا انداز ہنوز سنجیدہ ہی تھا۔
 ”تو پوچھو نا۔“

”میں اماں ابھی پوچھنے کا وقت نہیں ہے۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔
 ”کب آئے گا وقت؟“

”جب میں آپ کی نظروں میں سرخو ہو جاؤں گا۔“ اس نے بڑا کہا تھا اور بتول شاہ اسے دیکھتی رہ گئیں، اس کا چوبال نکل سا پٹ تھا۔ لیکن آنکھوں میں قیامت بکھوڑے لے رہی تھی، ان کا کیجہ بدل گیا۔ وہ اس قیامت کو

روکنا بھی چاہتیں تو نہیں روک سکتی تھیں، سب کچھ اختیار سے باہر تھا۔
 ”آپ بیٹھیں، میں ذرا فریش ہو کر آتا ہوں۔“ وہ ان کی چپ سے دامن بچا کر کھڑا ہو گیا اور بتول شاہ اسے سیر حیاں چھتے ہوئے دیکھتی رہیں۔
 ”کھانا کھاؤں، یکم صاحبہ؟“ ملازمہ کی گوازیہ وہ چونک کر متوجہ ہوئیں اور اثبات میں سر ہلادیا تھا۔

”بھائی۔“

”ہوں۔“

”آپ سے اجازت لینا تھی۔“ اس نے دھجے سے کہا، عدیل چونک گیا، وہ نما کر اپنے کام پہ جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا جب مریم اس کے پیچھے کمرے میں چلی آئی۔

”کیسی اجازت؟“

”وہ کل فاطمہ کی برتھ ڈے ہے، اس نے فون کر کے انوائٹ کیا تھا، میں نے جانے کے لیے ہاں تو نہیں بھری، لیکن وہ بہت اصرار کر رہی تھی۔“ مریم نے آہستگی سے بتایا۔

”تو اس میں اتنا ڈرنے والی کیا بات ہے؟“ عدیل کو حیرانی ہوئی۔

”آپ سے اجازت لینا تھی کہ کیا میں کل اس کے گھر جا سکتی ہوں؟“

”ہوں! لیکن ان کا فنکشن تو رات میں ہوگا؟“ عدیل نے کچھ خیال آنے پہ پوچھا۔

”جی۔“ مریم نے اثبات میں سر ہلایا۔

”تو پھر کیسے جاؤ گی تم؟“ آنے جانے میں مسئلہ ہوگا؟

”وہ گاڑی بھیج دے گی۔“

”وہ گاڑی بھیج تو دے گی، لیکن تم رات کے وقت ڈرائیور کے ساتھ اکیلے تو نہیں آ جا سکتیں؟“ عدیل کو اس کے جانے کی نہیں بلکہ پک اینڈ ڈراپ کی فکر ہو رہی تھی۔

”تو پھر کس کو ساتھ لے کر جاؤں؟“ مریم کو بریشالی ہو رہی تھی۔

”میں تمہیں چھوڑ آؤں گا۔“ اس نے مریم کو تسلی دی۔

”آپ؟ لیکن آپ کیسے چھوڑ کے آسکتے ہیں؟ آپ تو شام کو تھکے مارے آتے ہیں، مجھے چھوڑنے کیسے جائیں گے؟ آپ کے ساتھ تو خود ڈرائیور کا مسئلہ ہے۔“

”تم میرے مسئلے کو چھوڑو، اپنی فکر کرو، تم نے کل فاطمہ کے گھر جانا ہے تو بس فکر چھوڑو۔“ وہ مریم کو ڈراپ کرنے کے لیے طریقہ سوچ رہا تھا اور اس کی سوچ کی سوچی سلوکی موٹر سائیکل پہ جا کر ٹھہر گئی تھی۔ وہ اگر چھوڑی دیر کے لیے سلو سے موٹر سائیکل مانگ لیتا تو یقیناً ”وہ انکار نہ کرتا اور اس طرح مریم آسانی سے جا بھی سکتی تھی اور آ بھی سکتی تھی۔“

”لیکن بھائی۔“ اس نے کچھ کہنا چاہا۔

”لیکن وہ یکن چھوڑو اور کل جانے کی تیاری کرلو۔“ اس نے بالوں میں کنگھا پھیرتے ہوئے کہا اور مریم سر ہلا کر پلٹ آئی۔

”سنو۔“ اس نے گوازیہ۔

”جی؟“ وہ ٹھہر گئی۔

”مگر اس کی برتھ ڈیے یہ جانا ہے تو کچھ لے کر بھی تو جانا ہے؟“ جو پریشانی مریم کو جانے کا سن کر ہوئی تھی وہی پریشانی عدیل کو بھی ہوئی تھی۔
 ”جی یہ تو ہے۔“ اس نے اذیت میں سر ہلایا۔
 ”تو کیا لے کر جاؤ گی؟“ اس کے سوال پہ مریم نے چہرہ کھلایا تھا۔
 ”کیا بات ہے؟ چپ کیوں ہو گئیں؟“ عدیل اب پوری طرح سے اس کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔
 ”وہ دراصل اور کوئی گفت نہیں تھا دینے کے لیے اتنے دنوں سے اسی کاسلائی کا کام بھی ڈاؤن جا رہا ہے اس لیے میں نے سوچا کہ آپ کل جو سوٹ لائے تھے وہ میں فاطمہ کو گفت کروں گی اتنا پیارا سوٹ ہے اسے پسند آئے گا۔“ مریم نے ڈرتے ڈرتے کہا تھا اور عدیل چپ ہو گیا۔
 ”کیا بات ہے آپ کو برا لگا؟“ مریم پریشانی سے پوچھ رہی تھی ”آخر وہ اتنی محبت اور اتنے شوق سے لے کر آیا تھا۔“

”ظاہر ہے برا تو لگے گا۔“

”لیکن بھائی وقت بھی تو گزارنا ہے مگر کے حالات ایسے نہیں ہیں کہ ہم اپنے فریڈز کے لیے کوئی اچھا گفت خرید سکیں نہ تو آپ اتفاقاً میرے لیے سوٹ لے آئے ہیں اور میں نے گفت دینے کا سوچ لیا اور نہ یہ بھی نہ ہوتا تو میں بھی جانے کا سوچتی بھی نہیں۔“ اس نے عدیل کو دیکھا۔
 ”آپ کو یاد ہو گا کہ چھٹی بار بھی میں نے اسے دوش نہیں کیا تھا اور وہ مارے گھر آکر کتنا خفا ہوئی تھی اس بار بھی میں نے گفت نہ ہونے کی وجہ سے اسے دوش نہیں کیا تھا۔ اور یہاں تو دیکھا کہ مجھے یاد نہیں رہا تھا۔“ مریم اسے ساری صورت حال سے آگاہ کر رہی تھی۔

”لیکن پھر بھی اگر آپ کو برا لگ رہا ہے تو میں اسے منع کر دیتی ہوں کہ میں نہیں آسکتی کیونکہ گفت کے بغیر خالی ہاتھ جانا بھی تو مناسب نہیں ہے۔“ مریم نے سعادت مندی سے کہا کہ اگر اسے پسند ہے تو ٹھیک آکر نہیں تو وہ اپنا جانا نینسل کر دے گی۔ عدیل نے نظر اٹھا کے اس کے چہرے کی سمت دیکھا اور پھر آگے بڑھ کے اس کے سر پہ ہاتھ رکھ دیا تھا۔

”میں تمہارا بھائی ابھی زندہ ہوں نا؟ ایک تو کیا دوس سوٹ لا کر دوں گا تم اگر اپنی دوست کو گفت دے کر خوش ہو تو میں تمہاری خوشی میں خوش ہوں۔ یہ سوٹ میں نے تمہاری خوشی کے لیے لیا ہے لیکن اگر تمہاری خوشی کسی اور طرح سے حاصل ہوتی ہے تو یوں ہی سہی۔“ اس نے مریم کا سر تھپکتے ہوئے کہا تھا اور مریم کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

”تھینک یو بھائی تھینک یو سوچ۔“ اس کے سر سے بوجھ ہٹ گیا تھا۔

”سینٹن ٹائٹ ڈیر۔“ جو اب بھی مسکرا رہا تھا۔

”تو پھر میں کل کے لیے تیاری کر لوں؟“

”بالکل کر لو لیکن اتنا بتا دو کہ آج جہان شاہ طے گا یا نہیں؟“ عدیل نے دلچسپی سے کہا۔

”وہ سوری بھائی میں بس پانچ منٹ میں آپ کا ناشٹل اگاری ہوں آپ فوراً آجائیے۔“ وہ کہہ کے جلدی سے باہر نکل گئی اور عدیل بھی مسکراتا ہوا باہر آ گیا تھا۔

وہ بے زاری سے بیٹھا میگزین الٹ پلٹ کر رہا تھا جب اچانک ڈاکٹر زخیر بابا کے چیک اپ کے لیے اندر آ گئے

38

اور آڈر کی ہدایت کے مطابق وہ فوراً لارٹ ہو گیا تھا۔
 ”اسلام علیکم۔“ اس نے سلام کیا تھا۔ ڈاکٹر اس کے سلام کا جواب دے کر خیو بابا کے چیک اپ میں مصروف ہو گئے تھے ان کے زخم کا تفصیلی معائنہ کرنے کے بعد انہوں نے چند دوائیاں تجویز کیں اور انہیں ڈسچارج کرنے کا کہہ دیا۔

”اب کیسی طبیعت ہے ان کی؟“ جوڈت ڈاکٹر کو آپس میں باتیں کرتے دیکھ کر قریب آ گیا تھا۔
 ”آج ان کو ڈسچارج کر دیا گیا ہے آپ انہیں گھر لے جاسکتے ہیں۔“ ڈاکٹر نے اسے خوشی کی خبر سنائی تھی۔

”آف کورس۔“ ڈاکٹر نے کندھے اچکائے۔

”تھینک یو ڈاکٹر۔“ جوڈت نے بڑی گرجوشی سے ڈاکٹر سے ہاتھ ملایا تھا۔

”مسٹر آڈر آؤدی کہاں ہیں؟“ ڈاکٹر کی آؤد کے ساتھ واقعیت تھی اس لیے اسی کا پوچھا تھا۔

”جی وہ کسی کام کے سلسلے میں کراچی گئے ہیں کل تک آجائیں گے۔“ جوڈت کا دل اندر ہی اندر قلابا بایاں کھا رہا تھا کہ وہ اس اسپتال کی قید سے آزاد ہو گیا تھا۔ صبح سے بیٹھے بیٹھے کراچی بھی اور پورے الگ سے۔

”ٹھیک ہے آپ انہیں بتا دیجیے گا۔“ ڈاکٹر کہہ کر اپنے راولپنڈی چلے گئے اور جوڈت خیو بابا کو گھر لے جانے کا سوچنے لگا لیکن وہ اکیلا انہیں لے کر نہیں جاسکتا تھا۔ لہذا کسی دوسرے کی مدد ضروری تھی اور آؤد کے بعد سلا خیال دانیال کے سوا اور بھلا کس کا آسکتا تھا؟ اس نے اپنا سیل نکالا اور دانیال کا نمبر ڈائل کر لیا۔

”اسلام علیکم۔“ دانیال کی آواز خاصی مصروف تھی۔

”و علیکم السلام دانیال بھائی میں جوڈت بات کر رہا ہوں۔“

”جوڈت؟“

”جی اسپتال سے بات کر رہا ہوں۔“ اس کی اطلاع پہ دانیال چونک گیا تھا۔

”ہاں! کہو؟“

”وہ خیو بابا کو ڈاکٹر نے ڈسچارج کر دیا ہے ان کو حویلی لے کر جانا ہے لیکن میں یہاں اکیلا ہوں۔“ اس نے مسئلہ بیان کیا۔

”ڈونٹ وری یار تم ویٹ کرو میں آ رہا ہوں۔“ دانیال نے جگت میں کہتے ہوئے فون بند کر دیا تھا اور اگلے چند منٹ میں وہ اس کے پاس اسپتال میں موجود تھا۔ اس نے اگر تمام بلز کا پیئر کیے۔ پھر وہ فون مل کر انہیں سہارا دے کر گاڑی تک لائے وہ کافی بہتر ہو چکے تھے۔ آہستہ قدموں سے چل پھر سکتے تھے اس لیے کوئی وہیل چیئر یا پھر اسٹریچر استعمال نہیں کیا تھا۔ دانیال کی گاڑی ڈرائیور آپس لے گیا تھا۔ اس لیے جوڈت کی گاڑی میں ہی خیو بابا کو لے کر گھر پہنچے تھے اور گھر میں خیو بابا کی واپسی کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی تھی، جتنی خوشی وقار آؤدی اور آسید آؤدی کو ہوئی تھی اتنی شاید خود خیو بابا کو بھی نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے گھر کے فرد کی طرح ان کی آؤ بھگت کی تھی یہ احساس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ وہ ان کے ملازم اور معمولی سے ڈرائیور ہیں۔

وہ یونیورسٹی کے لان میں بیٹھی اپنے اگلے پیپر کی تیاری کر رہی تھی جب اسے اپنی کتاب پر کسی کا سایہ پڑا ہوا محسوس ہوا اس نے چونک کر دیکھا سامنے وہی سنہری بالوں اور سنہری آنکھوں والا لڑکا کھڑا تھا جو اس روز سب فریڈز کے ساتھ مدیجہ کو ایئر پورٹ سی آف کرنے آیا تھا۔ زری کو اس کے نام کا پتا تھا لیکن فی الحال یاد نہیں آ رہا

39

تھا کہ اس کا نام کیا ہے؟ اور شاید وہ بھی زری کی انجمن بھانب گیا تھا۔
 ”جس جیڑی ہوں میڈی کا دوست۔“ اس نے مدحیہ کے حوالے سے اپنا تعارف کروایا تھا۔
 ”جی کیجیے؟“
 ”میڈی پاکستان میں ٹھیک تو ہے نا؟“
 ”کیا مطلب ہے آپ کا؟“

”مطلب یہ کہ ہم سب فرینڈز کو میڈی کے حوالے سے بہت پریشانی ہو رہی ہے، وہ ہم سے کانٹیکٹ کرنے کا وعدہ کر کے گئی تھی، لیکن اس نے ابھی تک کوئی کانٹیکٹ نہیں کیا؟“ جیڑی مدحیہ کے لیے حد سے زیادہ متشکر ہو رہا تھا۔
 ”تو اس میں اتنی پریشانی والی کیا بات ہے؟ کانٹیکٹ تو اس نے مجھ سے بھی نہیں کیا۔“ زری نے بھنویں اچکائیں۔

”پریشانی والی بات کیوں نہیں ہے؟ پاکستانی لوگ اکثر لڑکیوں کو پاکستان لے کر جاتے ہیں تو ان پر بہت زیادہ تشدد کرتے ہیں، انہیں پاکستان میں رہنے پر مجبور کرتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ میڈی کے ساتھ ابھی ایسا ہی ہو؟“ جیڑی نے اپنی سوچ کا برملا اظہار کیا تھا جس پر زری کے ماتھے پر تل پڑ گئے تھے اور وہ کتابیں سمیٹ کر کھڑی ہو گئی تھی۔
 ”جسٹ قاریور کا منڈ انٹاریشن مشن جیڑی مدحیہ اپنی مرضی سے پاکستان گئی ہے، اگر اسے زبردستی پاکستان لے کر جانا ہوتا تو آج سے دو سال پہلے لے جاتے اس کی مرضی کا انتظار نہ کرتے، وہ پاکستان میں بالکل ٹھیک ٹھاک اور خوش باش ہے، آپ کو اس کے لیے فکر پالنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور آپ کے دل میں پاکستان کے خلاف جو ذہن رہ رہا ہے، پلیز وہ دور کر لیجیے، پاکستان ایسا بھی برا نہیں جیسا آپ نے بنالیا ہے، اگر پاکستان میں میڈیوں پر ایسا ہی تشدد ہو رہا ہو، تو میں اس وقت آپ کے سامنے نہ ہوتی، جو پاکستان کے ایک گاؤں سے یہاں پڑھنے کے لیے آئی ہوں۔“ اس نے جیڑی کی اچھی خاصی نگاہ اس لے ڈالی تھی۔

”میرا مقصد آپ کو اموشنل کرنا نہیں تھا۔“ جیڑی نے سر جھکاتے ہوئے معذرت کی۔
 ”لیکن میرا مقصد آپ کو سمجھانا تھا، یقیناً“ آپ سمجھ گئے ہوں گے۔“ ہمیشہ کل کل رہنے والی زری اس وقت کافی تپتی ہوئی لگ رہی تھی اور جیڑی خاصا محتاط ہو گیا تھا۔
 ”اوکے آئی بائزر اسٹینڈ۔“ اس نے سر ہلایا۔

”نیوے میں مدحیہ کو آپ کا پیسج ہو گیا۔ ابھی اس کے پاس اپنا سیل نمبر نہیں ہے، جب ہو گا تو آپ سے کانٹیکٹ کر لے گی۔“ زری نے اپنا غصہ کنٹرول کرتے ہوئے آہستگی سے کہا۔
 ”کیا اس کا لینڈ لائن نمبر مل سکتا ہے؟“ جیڑی کو کچھ زیادہ ہی بے چینی ہو رہی تھی۔
 ”مل سکتا ہے، ضرور مل سکتا ہے، لیکن اگر مدحیہ اجازت دے تو۔“ زری نے سر ہلایا۔
 ”اجازت؟“ اسے سمجھ نہ آیا۔

”مدحیہ سے پوچھ لیں، میں اس کا نمبر آپ کو نہیں دے سکتی۔“ اس نے کندھے اچکائے۔
 ”اوکے تو آپ اس سے پوچھ لیجیے۔“

”میں آپ کو کل بتا دی تھی یا پھر مدحیہ آپ سے کانٹیکٹ کر لے گی۔“
 ”متھیک یو میم۔“ جیڑی خوش ہو گیا تھا اور زری سر ہلا کر لائبریری کی سمت بڑھ گئی۔ وہ کتابیں ایڈو کروا کے وہ واپسی کے لیے یونیورسٹی کے احاطے سے باہر نکل آئی تھی۔ عید اللہ اسے پک کرنے کے لیے پہنچ چکا تھا۔
 ”اسلام علیکم بھائی۔“ وہ ڈور کھول کر فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔



”وعلیکم السلام! پھر کیا رہا؟“ وہ گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔
 ”تجا رہے مجھ سے پوچھیں گے تو میں اچھا ہی کہوں گی۔“ وہ ڈور آسا مسکرا کے بولی۔
 ”اور ظاہر ہے کہ پھر تمہارا ہے تو تم ہی سے پوچھیں گے نا؟“ عبداللہ بھی مسکرا کے بولا۔
 ”ہاں یہ بات بھی سوچنے کی ہے۔“ زری ہنس پڑی۔
 ”نگارش بھائی بھی حل نہیں؟“

”ہاں ابھی تھوڑی دیر پہلے اسے ہی ڈراپ کر کے آیا ہوں، میرا پورا دن تو تم لوگوں کی ڈرائیوری میں گزر جاتا ہے، کام میں لے کیا خاک گرنا ہے؟“ عبداللہ مصنوعی خفگی سے جھنجھلا کر بولا تھا۔ زری اپنی مسکراہٹ دیا گئی۔
 ”آپ ہماری اتنی کیمز کرتے ہیں اللہ آپ کو ڈھیر ساری خوشیاں اور کامیابی عطا کرے گا۔ ان شاء اللہ اوپر والا آپ کو اجر دے گا، میرا کہ یہ سب نہ ملے میں آپ کا بہت بڑا بھائی ہے، ورنہ میں بھی آج جاپانی لڑکیوں کی طرح میٹرک پاس کر کے گاؤں کی چوٹی کے ایک کونے میں پڑی ہوتی، آپ کا احسان تو میری پوری زندگی پہ محیط ہے۔“ زری گنتے کہتے سنجیدہ ہو گئی تھی۔

”ارے پاگل اس میں احسان کہاں سے آیا؟“ عبداللہ نے اسے منع کرتے ہوئے سر جھٹکا۔
 ”احسان ہی تو ہے آپ نے میری خاطر سب سے ناراضی مول لے لی، بھلا کون راضی تھا میرے یہاں آنے پر؟“
 ”یابا جان تو تعلیم کے خلاف تھے کجا کہ ہائر اسٹڈی کے لیے کسی دوسرے ملک جانا؟ تصور ہی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ لیکن آپ نے اس ناممکن کو ممکن بنالیا، آج گاؤں کی لڑکیوں کے لیے اور حوٹلی کی لڑکیوں کے لیے میں ایک مثال ہوں کہ کوئی آگے بھی بڑھ سکتا ہے، جس بہت کرنے کی دیر ہے۔“ زری سنجیدگی سے بول رہی تھی۔

”ہاں یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو، تعلیم ایک زیور ہے اور اس زیور کے لیے سب کو لڑنا چاہیے، اس زیور کا حصول سب کے لیے ضروری ہے، چاہے وہ گاؤں کی لڑکی ہو یا شہری۔“ عبداللہ نے اثبات میں سر ہلایا۔
 ”لیکن بھائی اس زیور کے حصول کے لیے آپ جیسے بھائیوں کی بھی اشد ضرورت ہے، ہمارے معاشرے کو بچو اپنی بہنوں کی تعلیم کے رستے میں رکاوٹ نہ بنیں، بلکہ ان کے لیے دھماکا ثابت ہوں، کاش مشرقی ممال کی سوچ آپ جیسی ہو جائے۔“ زری نے حسرت سے کہا تھا اور عبداللہ مسکرا دیا۔ وہ دونوں کمر بچھ چکے تھے، نگارش آج اپنے میکے گئی ہوئی تھی۔



دل تو رشاہ واپس لاہور جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا، جب بتول شاہ اس کے بیڈ روم کا دروازہ کھیل کر اندر داخل ہوئیں۔

”جار ہے ہو؟“ ان کے لمبے میں کیا کچھ تھا، دل اور بخولی سمجھتا تھا۔
 ”نہ جاؤں؟“ اس نے پلٹ کر ان کو بغور دیکھا، لیکن ان کے چہرے کے تاثرات یک دم بدل گئے تھے۔ وہ اور سے اور ہو گئی تھیں، ان کے چہرے پر سرورف کے سوا اب کچھ بھی نہیں تھا۔
 ”میں نے کب کہا کہ تم نہ جاؤ؟“ آپ کی بار لہجہ بھی کچھ اور تھا۔
 ”تو پھر میری کامیابی کی دعا کے ہمراہ مجھے رخصت کیجیے۔“

”خیر سے جاؤ اور خیر سے آؤ، تمہاری کامیابی کے انتظار میں ہی تو اپنی آنکھیں پتھر کر لی ہیں، اب پتا نہیں یہ آنکھیں پتھر سے دوبارہ آنکھیں کب بنیں گی؟“ ان کا لب و لہجہ عجیب سا ہو رہا تھا، ان کے اندر کا درد ان کی کواڑ میں کھل رہا تھا اور اذیت کی لہر دل اور شاہ کی رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی۔



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ سہولت کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف
- ✧ سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سیریم کوالٹی مائیل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور
- ✧ ابن صفی کی مکمل ریخ
- ✧ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے
- ✧ کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

”آپ کی آنکھوں کو آنکھیں بنانے کے لیے میں پوری دنیا کو پتھر کروں گا یہ میرا وعدہ ہے آپ سے۔“ اس نے بتول شاہ کو کندھوں سے تھام کے اپنی گرفت کی مضبوطی کا احساس دلایا تھا۔

”تمہارے وعدوں پہ نہیں تمہاری آس پہ جی رہی ہوں میری جان اللہ تمہیں لمبی زندگی عطا کرے۔“ انہوں نے دل توڑ کی پیشانی چوم لی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ناشتے سے فارغ ہو کر وہ جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

”آپ میں اسلام آباد نہیں آؤں گا بلکہ اب آپ لاہور آئیں گی اپنی تیاری رکھیے گا۔“

”اے اللہ! اللہ ضرور آؤں گی۔“

”او کے اللہ حافظ۔“ وہ ان سے مل کر گاڑی میں آ بیٹھا اور پھر ان کو ہاتھ ہلا کر گاڑی نکل لے گیا۔ اس نے نیل کے ساتھ وعدہ کر رکھا تھا کہ وہ کل واپس آکر اس کے مسائل حل کر دے گا اس لیے وہ آج اسلام آباد سے جلدی نکل آیا تھا۔ لیکن ابھی اسلام آباد کی حدود سے نکل ہی رہا تھا کہ کسی نے ہاتھ کے اشارے سے سامنے آتے ہوئے گاڑی روک دی اسے بریک لگانے پڑے۔

”اسپیکٹر شہناز آپ؟“ وہ حیرانی سے کہتا ہوا گاڑی کا دروازہ کھول کے نیچے اتر آیا۔ اسپیکٹر شہناز سڑک کے کنارے کھڑی بیل بائک رہی تھی۔

”دراصل میری گاڑی خراب ہو گئی ہے میں لاہور جا رہی تھی تو حاتمہ ہو گیا ہے ڈرائیور کو مکینک کے پاس بھیجے لیکن ابھی تک نہیں آیا۔“ وہ چہرے سے پریشان لگ رہی تھی۔

”کیا خرابی ہو گئی ہے گاڑی میں؟“

”جتنی نہیں انجن بند ہو گیا ہے۔“

”چیک کیا ہے؟“

”ہاں ڈرائیور سارا انجن چیک کر کے گیا ہے مکینک کے بغیر ٹھیک ہونے والی نہیں ہے اور میں پریشان ہو رہی ہوں مجھے ذرا جلدی لاہور پہنچنا تھا۔“ اسپیکٹر شہناز نے ہاتھ میں پکڑے موبائل سے ٹائم دیکھ کر کہا۔

”چلیے پھر آپ کی پریشانی حل کیے دیتے ہیں آئیے میرے ساتھ چلیے۔“ دل توڑنے اسے آفر کی۔

”لیکن شادی۔“ اسپیکٹر شہناز کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

”کیوں کوئی ڈر ہے؟“ دل توڑ نے معنی خیزی سے کہا۔

”ڈر ہونا بھی چاہیے، مرد کا کیا بھروسہ؟“ وہ بھی جواباً مسکراتے ہوئے معنی خیزی سے بولی۔

”غیر بھروسے کی تو آپ بات نہ ہی کریں تو بہتر ہے بھروسہ تو عورت کا بھی نہیں ہے۔“ اس نے سر جھٹکا۔

”کیوں شادی کون کم بخت دھوکہ کر گئی آپ کے ساتھ؟“

”دل توڑ شاہ کو دھوکہ دینے والی ابھی کوئی پیدا ہی نہیں ہوئی۔“ دل توڑ شاہ نے ہنس کر کہا تھا۔

”اور جو پیدا ہوئی ہیں ان میں آپ نے نظر عنایت ہی نہیں بخش۔“

”کوئی سراپا التجا بھی تو نہیں ہوا انہی تک؟“ وہ بے نیازی سے کہہ رہا تھا۔

”کبھی کبھی مجھے لگتا ہے شادی آپ بہت بے رحم ہیں۔“ اسپیکٹر شہناز کا لہجہ عجیب سا ہو گیا تھا اور دل توڑ شاہ

یکدم فلک شگاف قہقہہ لگا کے ہنسا تھا۔

”کبھی کبھی کیوں لگتا ہے؟ یہ تو اکثر لگنا چاہیے۔“ وہ اس کی بات سے محظوظ ہو رہا تھا۔

”کثرت تو آپ اچھے ہی لگتے ہیں بس کبھی کبھی اچھی رائے بدل جاتی ہے اور لگتا ہے کہ آپ۔“

”آپ بہت برے ہیں۔“ دل توڑ نے اسپیکٹر شہناز کا دھواں اجملہ مکمل کیا تھا۔

”اب میں آپ کو برا بھی تو نہیں کہہ سکتی شادی۔“ اسپیکر شہناز کا انداز خاصا دوستانہ سا تھا۔
 ”واہ کیا پالیسی ہے؟ بے رحم کہہ لیا، لیکن برا نہیں کہہ سکتیں“ آپ پولیس والوں سے بھی اللہ ہی پناہوے آپ کے بھی اپنے ہی قانون ہوتے ہیں۔“ وہ ابھی تک اس کی بات انجوائے کر رہا تھا۔
 ”اصل قانون وان تو آپ ہیں شاہجی ہماری غلطیوں کو بھی میسٹ کی طرح پکڑ لیتے ہیں۔“ اسپیکر شہناز ہنسی تھی۔

”سلام میڈم! مینک کو لے آیا ہوں۔“ اس کے عقب سے ڈرائیور کی آواز سنائی دی۔ جب تک مینک نے اس کی گاڑی چیک نہ کی ڈرائیور کے ساتھ دل آور بھی وہیں کھڑا رہا۔
 ”میڈم ایک گھنٹہ لگ جائے گا گاڑی ٹھیک ہونے میں۔“ مینک نے اسے اطلاع دی۔
 ”اوہ تو۔“ اسپیکر شہناز نے سر جھٹکا۔

”آپ کا آج کا سفر میرے ساتھ لکھا ہے میڈم۔“ دل آور نے اپنی گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔
 ”دیکھ لیجئے گا شاہجی میں آج پولیس والی نہیں ہوں۔“ اسپیکر شہناز نے اس کی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا وہ اپنی گاڑی ڈرائیور کے حوالے کر آئی تھی۔

”رعب تو اب بھی ہے نا۔“ وہ گاڑی اشارت کرتے ہوئے بولا۔

”اب کیا پتا کہ آپ کا رعب مجھ پہ ہے یا میرا رعب آپ پہ۔“ وہ ہنسی۔

”نہیں میڈم آپ کا ہی رعب ہے اور آج تو کچھ زیادہ ہی اچھی لگ رہی ہیں۔“ اس نے اسپیکر شہناز کو سر تپا دیکھتے ہوئے تعریف کی تھی وہ خوب صورت تو تھی ہی، لیکن آج راتل بلیو طرکی پارڈروالی ساڑھی اور شولڈر کٹ بالوں کے ساتھ کچھ زیادہ ہی گڈ لکینگ لگ رہی تھی۔ ورنہ اکثر وہ یونیفارم میں ہی نظر آتی تھی۔
 ”تھینک یو۔“ وہ مسکرا رہی تھی۔

”ویسے آپ آج اسلام آباد میں کیا کر رہی تھیں؟“

”میری کرن کی شادی تھی میں دو روز سے اسلام آباد آئی ہوئی تھی آج واپس جا رہی ہوں۔“

”تو ہمیں ہی شادی میں انوائٹ کر لیتیں۔“ اس نے افسوس سے کہا۔

”مجھے کیا پتا تھا کہ آپ بھی اسلام آباد کو رونق بخشنے ہوئے ہیں؟“

”خیر آئندہ کسی کرن کی شادی ہو تو یاد رکھیے گا۔“ دل آور خاصا موڈ میں تھا۔ اسپیکر شہناز کو حیرانی ہو رہی تھی۔

”یہ آپ ہی ہیں نا شاہجی؟“ اس نے اپنی حیرانی کا اظہار بھی کر دیا تھا۔

”کیوں میڈم آپ کو کوئی ڈاؤن ہے؟“ دل آور نے دلچسپی سے اسپیکر شہناز کا چہرہ دیکھا۔

”ڈاؤن تو نہیں، لیکن آپ کو کبھی اتنے خوش گوار موڈ میں دیکھا بھی تو نہیں ہے۔“

”آج کل میرا بہت قریبی دوست پاکستان آیا ہوا ہے شاید اسی کی ملاقات کا جشن منا رہا ہوں۔“

”اوہ یعنی آپ ”جشن بہاراں“ منا رہے ہیں؟“

”جشن بہاراں نہیں ”جشن یاراں“ منا رہا ہوں میڈم۔“ اس نے خوش گواری سے جواب دیا۔

”کیا میں آپ کے اس دوست سے مل سکتی ہوں؟“ اسپیکر شہناز نے کافی ایکسٹنشن کا اظہار کیا تھا۔

”کیوں؟“

”اس خوش نصیب کی خوش نصیبی یہ رشک کرنا چاہتی ہوں۔“

”وہ آپ جیسی چیزوں سے دور بھاگتا ہے پر ہیز کرتا ہے بہت سادہ دل انسان ہے۔“ دل آور نے نیل کی تعریف میں کہا۔

— 44 —

”آپ کا دوست سادہ دل؟“ اس نے اچھٹے سے کہا۔

”آپ نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے میڈم؟“ دل آور کے سوال پہ اسپیکر شہناز قہقہہ لگا کے ہنسی تھیں اور جواباً اس نے بھی مسکراتے ہوئے اسپید برعادی تھی۔

”علیڑے۔“

”جی ہاں؟“ وہ بیڑھیاں اتر رہی تھی جب وقار آتندی کی آواز پہ قدم تھم گئے تھے۔

”کہاں جا رہی تھیں؟“

”بس ایسے ہی عائنہ پھوپھو کی طرف۔“ اس نے کندھے اچکائے وقار آتندی بیڑھیاں اترتے ہوئے اس کے برابر آگے اور اس کے کندھے کے گرد بازو پھیلاتے ہوئے اسے اپنے ساتھ ڈرائنگ روم میں لے آئے۔
 ”بیٹھو۔“ خود بیٹھے تو اسے بھی ساتھ بٹھالیا تھا۔
 ”خیر بیٹھو؟“

”ہاں بیٹھا جانی سب خیریت ہے، وہ دراصل ہم نے تمہیں اطلاع دینی تھی کہ ہم نے تمہارے لیے ڈرائیور رکھ لیا ہے اور ان شاء اللہ آج آؤرواپس آگیا تو تمہاری گاڑی کا انتظام بھی ہو جائے گا، تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ انہوں نے علیڑے کو پاس بٹھا کر اس کا کندھا ٹھپکتے ہوئے کہا تھا، علیڑے کی جان میں ان کی جان تھی اس کی پریشانی ان کا خون خشک کر دیتی تھی۔ ان کے دو بیٹے ان کے لیے اتنی اہمیت نہیں رکھتے تھے، جتنی علیڑے اہمیت رکھتی تھی انہوں نے اپنی پوری عمر کی محبت صرف علیڑے پر لٹائی تھی، کبھی کبھی تو آسیہ آتندی ان کی اس قدر محبت پہ حیران پریشان رہ جاتی تھیں اور ان کی حیرانی اور پریشانی کی وجہ علیڑے کی آئندہ کی زندگی کا خیال ہوتا تھا، انہیں پتا تھا کہ باپ اتنی محبت دے گا تو وہ شوہر میں بھی اتنی ہی محبت تلاش کرے گی اور اگر ذرا سی بھی کمی بیشی ہوئی تو زندگی بھر کے لیے مسئلہ بن جائے گا اور اس چیز کا اظہار انہوں نے ایک بار وقار آتندی سے بھی کیا تھا جس پہ جواباً وہ مسکرا رہے تھے۔

”ہم اس کی شادی ہی اس سے کریں گے جو ہم سے بھی زیادہ محبت دے گا اسے۔“ ان کا لہجہ بھی مسکرا رہا تھا۔

”آپ جیسی محبت کون کر سکتا ہے اس سے؟“ آسیہ آتندی کو یقین نہیں تھا۔

”وقت آنے پہ پتا چلے گا تمہیں۔“ انہوں نے ہوی کو تسلی دی۔

”آپ کی محبت کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا وقار، کبھی کبھی مجھے احساس ہوتا ہے میں علیڑے کی ماں ہوں، لیکن مجھ سے بھی زیادہ آپ اس سے محبت کرتے ہیں میری محبت بھی آپ کی محبت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔“ آسیہ آتندی سنجیدگی سے کہہ رہی تھیں اور اس وقت بھی وہ ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے میں کھڑی باپ اور بیٹی کا محبت بھرا انداز دیکھ رہی تھیں کیوں ہی باپ سے باتیں کرتے کرتے علیڑے کی نظریاں کی طرف اٹھتی۔

”ارے سام آبیہاں کیوں کھڑی ہیں؟“ اس کی آواز پہ وقار آتندی نے بھی آسیہ آتندی کو دیکھا تھا۔

”آپ دونوں کو دیکھ رہی تھی۔“ وہ اندر آ گئیں۔

”اس طرح چھپ چھپ کے تو آپ نے جوالی میں بھی نہیں دیکھا، ہمیں۔“ وقار آتندی مسکرائے علیڑے بھی ہنس پڑی تھی۔

”آپ نے جوالی میں کبھی دیکھنے کا موقع ہی نہیں دیا، ہمیشہ کاروبار کی فکر میں ہی رہتے تھے یہ تو اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے مجھے مصروفیت کے لیے تین عدد بچے دے دیے ورنہ میں تو اب بھی بیٹی آپ کا آفس سے

— 45 —

واپس کا انتظار ہی کرتی رہتی۔ ”آسیہ آندری نے مصنوعی خفگی کا اظہار کیا تھا۔
 ”تو گویا آپ کی بات کا یہ مطلب ہوا کہ اب آپ کو ہماری آفس سے واپس کا کوئی انتظار نہیں ہوتا؟“ وقار
 آندری کافی اہم نقطہ اٹھانے لائے تھے۔ ”آسیہ آندری جربز ہی ہو گئیں۔ علیزے اپنے پیرش کی ایسی دلچسپ
 بحث و تکرار سے لفٹ اندوز ہو رہی تھی۔
 ”بیانیے نا بیگم صاحبہ اب ہماری کوئی قدر نہیں ہے آپ کی نظر میں؟“ انہوں نے آسیہ قدری کو بولنے پہ اکسایا
 تھا اور وہ بے ساختہ مسکراتے ہوئے وقار آندری کے پہلو میں بیٹھ گئیں۔
 ”آپ کی قدر یا تو آسیہ کا دل جانتا ہے یا آسیہ کا خدا۔“ انہوں نے کتنی نرمی سے کتنی مری بات کہی تھی وقار
 آندری کا دل شانت ہو گیا تھا۔
 ”تھینک یو آسیہ۔“ انہوں نے آسیہ آندری کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا اور علیزے مسکراتی ہوئی اٹھ کھڑی
 ہوئی تھی۔

”کہاں جا رہی ہو بیانیہ؟“
 ”آپ لوگ باتیں کریں میں انیکسی کی طرف جا رہی ہوں۔“ وہ کہہ کے باہر نکل آئی تھی اس کا رخ انیکسی کی
 طرف ہی تھا اور جیسے ہی وہ انیکسی میں پہنچی اسے خوش گوار حیرت کا سامنا کرنا پڑا تھا باقی لڑکیاں بھی اتفاقاً وہیں
 تھیں۔
 ”اسلام علیکم۔“ اس نے اونچی آواز میں سلام کیا۔
 ”علیزے۔“ انوشہ لپک کے پاس آئی تھی علیزے کبھی کبھار ہی تو اس طرف آتی تھی اور وہ بھی انوشہ کی
 وجہ سے۔

”کیسی ہو؟“
 ”جی ٹھیک ہوں۔“
 ”تو نا علیزے اندر آؤ۔“ انوشہ نے اسے اندر آنے کا کہا وہ اندر آگئی۔
 ”ہیلو! کیا ہو رہا ہے؟“ اس نے سبب سے نظر دوڑائی۔
 ”دیکھ بیجے کیا ہو رہا ہے؟“ کول کی آواز نے علیزے نے چونک کر کول کی سمت دیکھا۔
 ”کول آئی کیسی ہیں آپ؟“ علیزے کا لہجہ اور انداز نارمل بلکہ اپنا ہی لہجہ تھا۔
 ”جیسی تم ہو فکسی میں ہوں۔“ کول نے سر جھٹک کے کہا۔
 ”کیا مطلب؟“
 ”مطلب کہ جیسے تم ٹھیک ہو ویسے میں بھی ٹھیک ہی ہوں۔“ کول کی وضاحت پہ باقی سب ہنس پڑی تھیں۔
 ”اوہ اچھا۔“ علیزے نے سر ہلایا۔
 ”بڑی جلدی سمجھ آ گیا ہے؟“
 ”آپ کے سمجھانے کا طریقہ اچھا ہے۔“ علیزے معصومیت سے کہہ رہی تھی۔
 ”تو پھر ساری باتیں کیوں نہیں سمجھ لیتیں تم؟“ کول کے لہجے میں ہلکے طنز کا عنصر نمایاں تھا۔
 ”میں سمجھی نہیں کول آئی؟“ علیزے نے الجھن آمیز نظروں سے دیکھا تھا۔
 ”کچھ باتیں سمجھتی ہو اور کچھ نہیں سمجھتی عجیب بات ہے؟“ کول کا لہجہ ابھی بھی طنزیہ لہجے میں تھا۔
 ”کول۔“ محرمات اس کے قریب ہی بیٹھی ہوئی تھی اس نے کول کو سرزنش کرنے والے انداز میں ٹوکا تھا۔
 ”ارے تو میں کیا کہہ رہی ہوں؟ اپنی سوئٹ سی کزن سے باتیں ہی تو کر رہی ہوں؟“ کول نے تعجب سے دیکھا۔

”تو باتیں کرو نا ملیر تو نہیں۔“ محرمات نے دبے الفاظ میں خفگی سے کہا جسے صرف کول ہی سن سکی تھی۔
 ”آؤ علیزے بیٹھو یہاں۔“ کول نے اپنے قریب صوفے پہ اشارہ کیا تھا علیزے اس کے انداز کو بالکل بھی
 نہیں سمجھ پائی تھی اور خاموشی سے اگر اس کے برابر بیٹھ گئی۔
 ”آج کل تم کھربہ نظر آرہی ہو کلن کچھ ٹھوڑا بے کیا؟“
 ”نہیں کلن کیوں کچھ ٹھوڑا کی بھلا؟“
 ”تم مسلسل اتنے روز سے کھربہ ہو اس لیے میں نے سوچا کہ شاید۔“
 ”وہ دراصل مجھے پک اینڈ ڈراپ کرنے کا مسئلہ تھا۔ کوئی ڈرا سیور تھا اور نہ ہی میری گاڑی تھی لیکن بیانیہ نے
 کہا ہے کہ کل تک سارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔“ اس کا بیانیہ کا انداز اب بھی معصوم سا تھا۔
 ”بیانیہ کل تک سیور ڈرا سیور اور نئی گاڑی اور بیج ہو جائیں گے؟“
 ”جی ہاں فی کسٹ یہ مسئلہ آج بھی حل ہو سکتا تھا لیکن آؤ بھائی کھربہ نہیں تھے شوروم سے گاڑی انہوں نے
 ہی نکلائی تھی آج وہ آجائیں گے تو ان شاء اللہ کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔“ وہ بے فکری سے کہہ رہی تھی اور کول کا
 خون جل گیا تھا۔ وہ آؤ کا اس طرح ذکر کرتی تھی جیسے وہ ہی اس سے زیادہ قریب تھی حالانکہ اگر کول دل سے
 سوچتی تو علیزے ہی آؤ سے زیادہ قریب تھی وہ خود بھی تو اسی سے زیادہ توجہ دیتا تھا اور علیزے اس کی ملاؤٹی اور چہیتی
 کزن تھی۔

”بائی واوے وہ گئے کہاں ہیں؟“
 ”کراچی۔“
 ”کیوں؟“
 ”کام سے۔“
 ”آئیں گے کب؟“
 ”آج۔“
 ”اوہ اچھا۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر چپ ہو گئی تھی محرمات نے علیزے کو اپنی طرف متوجہ کر لیا
 تھا۔

 ”نبیل۔ نبیل۔“ وہ اندر داخل ہوتے ہی نبیل کو آواز دینے لگا۔
 ”سلام صاحب۔“ گل بگن سے نکل کر اس کے سامنے آگئی۔
 ”والسلام! گل کیسی ہو تم؟“ دل تور کا انداز خوش گوار تھا لیہے ہوئے تھا وہ الیکٹرک شہناز کو ڈراپ کر کے سیدھا
 بیٹھ آیا تھا۔
 ”اللہ کا کرم ہے صاحب۔“
 ”گلاب خان کہاں ہے؟ کل آیا تھا؟“
 ”جی! صاحب آیا تھا۔“
 ”ملاقات ہوئی اس سے؟“ اس کے سوال پہ گل کا چہرہ شرم سے جھک گیا تھا۔
 ”گل بیانیہ میں نے صرف ملاقات کا پوچھا ہے۔“ وہ اپنی بات بہ زور دے کر پوچھ رہا تھا۔
 ”یار کیوں اسے کٹھن میں کھڑا کر رکھا ہے؟ کسی کو تو بخش دیا کرو۔“ نبیل میز پڑھیاں اترتے ہوئے قریب آگیا

تھا۔ کوئی خود ہی کمرے میں کھڑا ہونے والی باتیں کرے تو میں کیا کروں؟“ وہ نیل سے مصافحہ کرتے ہوئے شرارت سے مسکرا کے بولا۔

”جاؤ گل اپنے صاحب کے لیے کچھ کھانے کے لیے لے کر آؤ۔“ نیل نے گل کو اشارہ کیا۔

”نی الحال کچھ نہیں چاہیے میں نے لچ کٹی لیٹ کیا تھا۔“ دل نے اور نے منع کر دیا۔

”تو پھر کچھ پینے کے لیے لے آؤ۔“ نیل نے دوبارہ گل کو مخاطب کیا تھا۔

”پینے کے لیے کیا؟“ گل نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”چائے لے آؤ۔“ دل نے اور نے خود ہی کہہ دیا اور دونوں ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔

”سلام آباد کا چکر کیسا رہا؟“

”بس یار ملاں سے ملنا تھا مل کر آگیا۔“ اس نے نارمل سے انداز میں کہا۔

”ملاں کیسی ہیں؟“

”ٹھیک ہیں وہ تمہارا اور مدیہ کا پوچھ رہی تھیں۔“

”ہوں! میں فون کروں گا انہیں ویسے یار تم نے کتنی غلطی کی ہے تم انہیں اپنے ساتھ لاہور ہی لے آتے ہم سب کی ملاقات ہو جاتی؟“ نیل نے انوس کا اظہار کیا تھا۔

”وہ مصروف ہیں آج کل۔“ دل نے اور نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”مصروف تو تم بھی ہو؟“

”ہاں یار! کام ہی کچھ ایسا ہے۔“

”کام ایسا نہیں ہے تم خود ہی کچھ ایسے ہو تمہیں کس نے کہا تھا کہ وکالت کی طرف جاؤ؟“

”یہ میرے بابا کا خواب تھا یار! انہیں شوق تھا کہ میں وکیل بنوں وہ میرے نام کے ساتھ ایڈوکیٹ اور بیرسٹر کا لفظ دیکھنا چاہتے تھے۔“

”ماشاء اللہ اور تم نے ان کا خواب پورا کر دیا۔“ نیل نے مسکرا کے ستائشی لہجے میں کہا۔

”خواب تو پورا کر دیا لیکن وہ خواب کو تعبیر ہوتے نہ دیکھ سکے کاش کہ وہ دیکھ سکتے کہ میں نے ان کے خواب کو شرمندہ تعبیر کر دیا ہے۔“ دل نے اور کے لہجے میں دکھ بول رہا تھا اور نیل کو اس کے دکھ کا احساس ہو گیا تھا، لیکن اب بات کا رخ خیر لانا بھی مشکل تھا۔

”بھائی۔“ اچانک مدیہ کی آواز سنائی دی دل نے اور نے چونک کر بیڑھیوں کی سمت دیکھا اور نیل نے شکر ادا کیا کہ چلو اس کا دھیان تو ہٹ گیا تھا۔

”بھائی کی جان کیسی ہو؟“ دل نے اور سر جھٹکتے ہوئے جی جان سے متوجہ ہوا تھا۔

”بالکل پور۔“ اس نے بے زاری کا بھرپور اظہار کیا تھا۔

”کیوں بھی؟“

”دو دن سے پاکستان آکر اپنے بیڈ روم میں بند ہوں باہر نکلو تب بھی پوریت دور کرنے کے لیے کچھ سالان نہیں ہے نہ موبائل نہ گاڑی نہ فریڈز اور نہ ہی آپ۔ پوریت نہ ہو تو اور کیا ہو؟“ اس نے ایک ایک چیز گنواؤالی۔

”او کے بابا او کے کب میں آگیا ہوں تو سب آجائے گا موبائل بھی گاڑی بھی اور تمہاری پوریت کے لیے کہنی بھی۔“ اس نے مدیہ کو تسلی دی۔

”آپ کہاں تھے میں نے آپ کے نمبر پر فون بھی کیا تھا۔“

”سوری یار میں اسلام آباد گیا ہوا تھا۔“

”ہوں! سنا ہے اسلام آباد بہت خوب صورت شہر ہے؟“ مدیہ نے آن ذرا اپنے خول سے نکل کر بات چیت کر رہی تھی۔

”خوب صورت تو نہیں ہے بس جب میں جاتا ہوں تو تب ہو جاتا ہے۔“ اس کی بات پہ نیل یک دم قہقہہ لگا کے ہنسا تھا اور مدیہ بھی اپنی مسکراہٹ نہ روک سکی۔

”یار تم تو جہاں بھی جاتے ہو چار چاند لگا دیتے ہو۔“ نیل ہنس رہا تھا۔

”کوئی شک ہے تمہیں؟“ اس نے محو میں اچکا کے نیل کو دیکھا۔

”کوئی شک نہیں ہے یار! کوئی شک نہیں ہے۔“ اس نے ہنستے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

”چلو پھر آج تم لوگوں کو لاہور دکھلاؤں۔“ اس نے نیل اور مدیہ کو آفر کی۔

”اس وقت؟“ نیل نے ٹائم دیکھا۔

”یار شام اور رات ہی تو لاہور کی رونقیں دیکھنے والی ہوتی ہیں آج ہی تو تم لاہور کے نظارے دیکھو گے۔“ اس نے مسکرا کے کہا۔

”خیر کوئی موڈ نہیں ہے تمہاریہ کو لے جاؤ اس نے پاکستان نہیں دیکھا اسے دیکھنے کی ضرورت ہے۔“ نیل نے انکار کر دیا۔

”کیوں تمہارا موڈ کیوں نہیں ہے؟“

”بس ایسی۔“

”یہ جو“ اس ایسی ہی ہوتا ہے نا؟ یہ ہی بہت ”خاص“ ہوتا ہے۔“ دل نے اور نے معنی خیزی سے کہا۔

”سوری یار مجھے خیال نہیں رہا کہ میں ایک سو کیل کے سامنے بات کر رہا ہوں۔“ نیل نے ہتھیار ڈال دیے کیونکہ اسے پتا تھا کہ وہ باتوں باتوں سے اپنے مطلب کی بات نکال لے گا اس کے سامنے انکار بھی فضول تھا۔

ادارہ خیرات و احسان کی طرف سے بہترین خدمت کے لیے خیرات و احسان کا ناول

☆ ستاروں کا آنگن،	نیم سحر قریشی	قیمت: 450 روپے
☆ درو کی منزل،	رضیہ جمیل	قیمت: 500 روپے
☆ اے وقت گواہی دے، راحت جبین		قیمت: 400 روپے
☆ تیرے نام کی شہرت،	شازیہ چودھری	قیمت: 250 روپے
☆ امر نیل،	عمیرہ احمد	قیمت: 550 روپے

32216361 فون

”چلو اٹھو پھر“ دل گور کھڑا ہو گیا۔
 ”لیکن وہ چائے“ بیل نے گل کی طرف اشارہ کیا۔
 ”چائے پھر سی۔“ اس نے ٹال دیا اور تھوڑی دیر بعد وہ ان دونوں کو ساتھ لیے گاڑی نکال لے گیا تھا شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا اور روشنیاں جاگ اٹھی تھیں پورے لاہور کی رونقیں عروج پر تھیں مدیہ دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔

”کیا بات ہے استاد! کچھ پریشان نظر آتے ہو؟“ چھوٹا گاڑی کا پتھر لگاتے ہوئے بار بار عدیل کو دیکھ رہا تھا اور جب پتھر لگا کر فارغ ہو گیا تو سیدھا عدیل کے پاس آگیا۔
 ”ہاں یار! پریشان تو میں ہوں، لیکن سمجھ نہیں آ رہا کہ یہ پریشانی حل کیسے ہوگی؟“
 ”کیا مطلب ہے استاد؟ کھل کے بول۔“ چھوٹے نے پراسن دکھایا۔
 ”یار وہ دراصل مجھے کل کچھ دیر کے لیے عدیل کتے کہتے رک گیا۔“
 ”کل کچھ دیر کے لیے؟“ وہ زیر لب دہرا کے بولا۔
 ”کیا چھٹی چاہیے؟“ اس نے اندازاً پوچھا۔
 ”نہیں یار چھٹی نہیں چاہیے بلکہ وہ پھر رک گیا۔“

”ارے استاد تاؤ بھی تم تو ایسے شرار ہے ہو جیسے لڑکی چاہیے؟“ چھوٹے نے خفگی سے کہا تھا اور عدیل کو بتانا ہی پرانا۔
 ”یار مجھے نہ تو چھٹی چاہیے اور نہ ہی کوئی لڑکی چاہیے بلکہ مجھے بائیک چاہیے وہ بھی کل شام تھوڑی دیر کے لیے۔“
 ”بائیک؟“ چھوٹے کو کافی حیرانی ہوئی تھی۔

”ہاں یار! بس کل شام کسی کلم سے جانا ہے پک اینڈ ڈراپ کا مسئلہ تھا میں نے سوچا سلو سے کہوں گا اس کی بائیک ہے لیکن یار اب اسے کتے ہوئے مجھے عجیب لگ رہا ہے دل نہیں مان رہا۔“
 ”استاد تیرا دل مانے یا نہ مانے لیکن میرا تو مانے کا نا؟“
 ”کیا مطلب؟“

”مطلب کہ میں اس سے کہتا ہوں تم بے شک نہ کہو۔“ چھوٹے نے اس کی مشکل حل کرتے ہوئے اسے نیشن فری کر دیا تھا۔
 ”واقعی؟“

”اوتے آف کورس استاد۔“ چھوٹے نے آف کورس کو بھی زبان سے خلاصہ گڑ کے ادا کیا تھا۔
 ”تھینک یو یار تھینک یو سوچی۔“ عدیل کا چہرہ کھل اٹھا تھا اور پھر واقعی دوسرے روز چھٹی سے پہلے چھوٹے نے سلوگی بائیک کی چابی لا کر عدیل کو تھما دی تھی اور عدیل اس کا بار بار شکریہ ادا کرتا ہوا بائیک لے کر گھر آ گیا تھا وہ نہاد ہو کر فریٹش ہوا تو مریم بھی جانے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔

”چلیں بھائی۔“ وہ چادر اوڑھ کر ہر نکل آئی ہاتھ میں فاطمہ کے گفٹ کا شاپر تھا اس نے اس سوٹ کو کافی خوب صورت پینٹنگ کی شکل دے لی تھی۔

”چلو“ عدیل ای ابو کو اللہ حافظ کتابا ہر آگیا اور دونوں بن بھائی فاطمہ کے گھر کے جانے کے لیے روانہ ہو گئے اور ٹھیک چندرہ منٹ بعد وہ فاطمہ کے گھر کے سامنے پہنچ چکے تھے عدیل نے بائیک باہر ہی روک دی حالانکہ گیٹ کھلا ہوا تھا مریم بائیک سے اتر گئی۔

”بیک کرنے کے لیے کب آؤں؟“ اس نے مریم سے پوچھا۔
 ”مجھی تو آئی ہوں مجھے کیا پتا کہ ان کی پارٹی کا کیا نام لکھا ہے؟“ مریم نے رسائیت سے کہا۔
 ”ٹھیک ہے میں آئے سے پہلے فون کر کے بتا کر لوں گا۔“ اس نے سر ہلادیا اور مریم پلٹ کر اندر آ گئی۔

”و علیکم السلام“ کیسی ہو؟“ فاطمہ مریم سے گلے ملی تھی ”آج وہ باقاعدہ پارلس سے تیار ہو کر آئی تھی اس کی خوب صورتی لشکرے مار رہی تھی مریم کو وہ نظر لگ جانے کی حد تک خوب صورت اور پیاری لگی تھی۔
 ”میں ٹھیک ہوں تم تاؤ؟“

”میں کیا تاؤں؟ تم تاؤ کہ تم اکیلی آئی ہو؟“ فاطمہ نے اسے اکیلے دیکھ کر زرا مایوسی سے کہا تھا۔
 ”نہیں عدیل بھائی ڈراپ کر کے گئے ہیں۔“
 ”وہ گیٹ تک آکر چلا گیا؟“ اندر بھی نہیں آیا؟“ فاطمہ کو اور زیادہ ملال ہوا۔

”وہ کام سے تھکے ہوئے آئے تھے بس مجھے چھوڑنے کے لیے آگئے ابھی واپس جا کر انہوں نے کھانا بھی کھانا تھا۔“
 ”تو کیا یہاں اسے کھانا نہیں مل سکتا تھا؟“ فاطمہ بحث کرنے لگی تھی اسے عدیل پہ وہ نہ کر غصہ آ رہا تھا۔

”فاطمہ پلیز! چھوڑو بھی کوئی اور بات کرو۔“ مریم نے بات کو ٹالنے کی کوشش کی۔
 ”کیا یہ چھوڑنے کی بات ہے؟ اسے اتنی توفیق بھی نہ ہوئی کہ مجھے اپنی زبان سے وش ہی کر دے؟“ فاطمہ کے دل میں افسوس اور صدمہ ہلکورے لے رہا تھا۔
 ”وہ جلدی میں تھے یار۔“

”ہو نہ! اس کی جلدی میں کتنی سمجھتی ہوں اسے صرف بھاگنے کی جلدی تھی خیر تمہیں یک کرنے بھی تو آئے گا دیکھ لو! کی تمہیں کیسے لے کر جانا ہے۔“ فاطمہ کے عزائم یہ مریم بے ساختہ مسکرا اٹھی تھی اور اسے میں وہاں کھڑے کھڑے ہی اوپن ایئر جیپ اندر آرکی جس کی ہیڈلائٹس کی روشنی میں فاطمہ اور مریم نہما گئی تھیں اور ان دونوں نے ہی چونک کر دیکھا تھا جیپ سے تین چار لڑکے ایک ساتھ اترے اور ان کی طرف دیکھتے ہوئے ان کی طرف ہی بڑھ آئے تھے مریم نامحسوس انداز میں اپنی چادر درست کرتے ہوئے سمٹ گئی جبکہ فاطمہ مسکرا کر دیکھ رہی تھی۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رٹریوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ کے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف
- ✧ سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ پیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور
- ✧ ابن صفی کی مکمل رینج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے
- ✧ کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

نبیلہ عزیز



بڑی حوصلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہیں۔

مدھیہ اور نبیلہ حیات دو ہی بس بھائی ہیں مدھیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پر رنگ چکی ہے جس کے پیش نظر فائرہ بیگم، نبیلہ کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں، لیکن مدھیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے جس پر نبیلہ اور فائرہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پسپا رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے مگر ہر روز مایوسی اور ناامیدی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا ہے، بی بی اور مجبوری سے تنگ آخر خود کشی کرنے کا سوچتا ہے، لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باؤا قیاض مل جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے، اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حوصلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر اپنی بی بی سے کہتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

اب اور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے اس نے کسی بار بار نہیں سیکھا اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پر بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو کی جاتی ہیں۔

9

نویں قسط

جودت کی نظریں مسکرا کر دیکھنے والی فاطمہ یہ نہیں بلکہ چادر درست کرتے ہوئے سمٹنے والی مریم پہ تھیں وہ سائیم اور کامی وغیرہ کے ساتھ چلتا ہوا قریب آگیا تھا۔
”ہیلو سائیم! یہی برتھ ڈے اینڈ مینی مینی ابھی ریٹرن آف دی ڈے۔“ سائیم دونوں بعد گھر آیا تھا اس لیے اسے بہن کو دوش کرنے کا موقع ابھی مل رہا تھا۔

”میری طرف سے بھی ابھی برتھ ڈے۔“ کامی نے شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا۔
”بس؟“ فاطمہ نے آنکھیں پھیلائیں۔

”کیوں؟ کچھ اور بھی کہنا چاہیے؟“ کامی نے معصومیت سے پوچھا۔ سائیم مسکرا ہٹ دیا گیا۔
”کہنا نہیں چاہیے بلکہ دینا چاہیے۔“

”کیا دینا چاہیے؟“ کامی انجان بن رہا تھا۔

”گفٹ میرا برتھ ڈے کا گفٹ۔“ وہ زور دے کر بولی۔

”اچھا! برتھ ڈے یہ گفٹ بھی دیتے ہیں؟“ وہ حیرانی سے کہہ رہا تھا۔

”ہاں! اس نے کبھی کسی کو دیا ہو تب نا؟“ سائیم نے چوٹ کی۔

”بس بس زیادہ طنز مت کر دے دوں گا تمہارے سارے گفٹس لوٹا دوں گا۔“

”کب؟“ سائیم تیزی سے بولا۔

”جب میں اپنے پیروں پہ کھڑا ہو گیا۔“ اس نے سکون سے جواب دیا۔

”تو کیا اب تو ہاتھی کے پیروں پہ کھڑا ہے؟“ سائیم کاٹ کھائے کو دوڑا تھا۔

”تو مجھے چھوڑ اس کی بات کر جو ہر وقت دل کے پیروں پہ کھڑا رہتا ہے جس طرف دل چاہتا ہے اسی طرف چل پڑتا ہے۔“ کامی نے معنی خیزی سے آنکھ دباتے ہوئے سائیم کے کان میں سرگوشی کی تب سائیم نے چونک کر دیکھا اور اسے جودت کی چپ اور محویت کا احساس ہوا تھا۔ سائیم کو دیکھنے پہ فاطمہ بھی متوجہ ہوئی۔
”جودت! سائیم نے اسے کہنی مارتے ہوئے متوجہ کیا۔
”ہوں؟“

”فاطمہ کو دوش نہیں کرو گے؟“ سائیم چبا کے کہہ رہا تھا۔

”ہوں۔“ ہاں ابھی برتھ ڈے۔“ اس نے چونکتے ہوئے ان کو دیکھا اور پھر فاطمہ کو دوش کرنے کی فارمیٹلی نبھائی۔

”تھینک یو۔“ فاطمہ کا تھینکس خفگی لیے ہوئے تھا۔

”تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”ہوں! ابھی تک تو ٹھیک ہی تھی، لیکن اب۔۔۔“ وہ بات ادھوری چھوڑتے ہوئے سر جھٹکنے لگا۔

”آئیے تو پھر اندر چلتے ہیں۔“ فاطمہ نے اندر کی طرف اشارہ کیا اور مریم کو ساتھ لے کر اندر آگئی اس نے ان لوگوں کا مریم کے ساتھ تعارف بھی نہیں کروایا تھا اور مریم جو وہاں کھڑے کھڑے اس لڑکے کی بے باک نظروں سے بچنے کی ناکام کوششیں کر رہی تھی وہاں سے بہتے ہی اس نے شکر ادا کیا تھا۔ ان کے پیچھے سائیم اور کامی بھی اندر کی طرف بڑھ رہے تھے کہ جودت نے سائیم کو شرٹ سے پکڑ کر پیچھے کھینچ لیا۔

”بات سنو۔“ جودت سنجیدگی سے بول رہا تھا۔

”سناؤ۔“

”یہ لڑکی کون ہے؟“

”فائلر کی فرینڈ ہے۔“
”ہاں تو کبھی نہیں دیکھا؟“
”پہلے کبھی آئی بھی تو نہیں مگر آتی بھی ہے تو سالوں بعد۔“ سائیم نے کندھے اچکائے۔
”ٹائل کلاس سے لگتی ہے۔“ جودت نے اندازہ لگایا۔
”تمہیں کوئی پرابلم ہے؟“

”پرابلم تو ہے ٹائل کلاس کی لڑکیاں مشکل میں ڈال دیتی ہیں۔“ جودت نے بال کھجاتے ہوئے کہا۔
”جودت اپنی سوچ کو لگام دو۔“ سائیم نے اسے سرزنش کرتے ہوئے باز رکھنا چاہا۔ جبکہ جودت ڈھٹائی سے مسکرا دیا تھا۔

”میری سوچ کو بے لگام کرنے والے بھی تو تم ہی ہو؟“ جودت اسے کچھ جتا رہا تھا۔

”خیر چھوڑو اس بات کو چلو اندر چلتے ہیں۔“ سائیم بات کو ٹال رہا تھا۔

”چلتے ہیں پہلے نام بتاؤ۔“ جودت ہنوز اپنی جگہ پہ کھڑا تھا۔

”نام۔۔۔“

”ہوں! اس لڑکی کا۔“ جودت نے اندر کی طرف اشارہ کیا۔

”جودت یہ کیا بے ہودگی ہے؟“

”نام پوچھنا بے ہودگی ہے۔ حیرت ہے؟“ جودت حیرانی سے کہہ رہا تھا۔

”ارے چلو یا رگس نکھار میں الجھ گئے ہو؟“ کامی پلٹ کر ان دونوں کے پاس آگیا۔

”اس سے نام پوچھ رہا ہوں لیکن یہ بتا ہی نہیں رہا۔“ جودت اپنی بات پہ ڈٹا ہوا تھا۔

”تمہیں نام سے کیا مطلب؟“ سائیم گھور رہا تھا۔

”تم نام بتاؤ مطلب میں بتا دوں گا۔“ وہ انتہائی سکون سے کہہ رہا تھا سائیم کو غصہ تو آیا لیکن پھر دبا گیا تھا۔

”اگر نہ بتاؤں تو؟“

”تو میرا اندر جانے کا کوئی فائدہ نہیں میں یہیں سے واپس چلا جاتا ہوں۔“ وہ بھی اپنی ضد کا کاکا تھا سائیم جھنجھلا گیا۔

”اوہ کم آن یا رڈر اسی بات کو خواہناؤ ایڈیوٹا رہے ہو تم۔“

”ایڈیوٹ میں نہیں تم بتا رہے ہو اس لڑکی کا نام ہی تو پوچھا ہے، دام تو نہیں پوچھا۔“ جودت بھی جھنجھلا کے بولا تھا۔

”جودت۔“ سائیم نے پھر غصے سے دیکھا۔

”نام بتاؤ فائدے میں رہو گے۔“ جودت مسکرا رہا تھا۔

”یار وہ بہن کی دوست ہے کچھ شرم کرو۔“

”او کے میں شرم کر لیتا ہوں چلا جاتا ہوں یہاں سے۔“ اس نے لا پرواہی سے کہا۔ اور قدم واپس موڑ لیے تھے۔

”مریم نام ہے اس کا۔“ سائیم نے بالا خرہ ہتھیار ڈال دیئے تھے وہ جودت کی ناراضی مول نہیں لے سکتا تھا دونوں کی بچپن کی دوستی تھی ایک دوسرے کا اچھا برا بھی برداشت کرنا پڑ ہی جاتا تھا جیسے اس وقت جودت کی ضد کے آگے ہارنا ناگزیر تھی اور نہ چاہتے ہوئے بھی اسے نام بتانا پڑا تھا۔

”تھینک یو یا ر! تم واقعی ایک اچھے دوست ہو۔“ جودت اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے مسکرایا۔

”لیکن تم ذرا بھی اچھے دوست نہیں ہو، بات بات پہ تڑی دکھاتے ہو۔“ سائم وائٹ پیس کے بولا تھا۔ جواباً
جوڈت قہقہہ لگاتے ہوئے اس کے ساتھ اندر آگیا تھا اور مہمانوں کی آمد بھی شروع ہو چکی تھی۔



وہ انہیں سیدھا فوڈ اسٹریٹ لے کر آیا تھا اور لاہور کے فوڈ اسٹریٹ تو ماشاء اللہ حیران کن حد تک بارونق اور گہما
گہمی سے مالا مال تھے جگمگانی روشنیاں طرح طرح کے لوگ اور طرح طرح کے کھانے مدیجہ واقعی حیرت سے دیکھ
رہی تھی۔ جبکہ کھانوں کی منگ نے سوئی ہوئی بھوک کو بگاڑ دیا تھا۔

”بیٹھو یہاں۔“ دل آور نے ایک کرسی کھینچ کر مدیجہ کو بیٹھنے کا کہا۔

”تھنک یو۔“ وہ حیران سی کہتی ہوئی کرسی پہ بیٹھ گئی۔ پھر وہ دونوں بھی بیٹھ گئے تھے۔

”کیا دیکھ رہی ہو؟“ دل آور نے پوچھا چہرے پہ مسکراہٹ تھی۔

”یہ سارا ماحول اور یہاں کی ارجنٹ منٹ وغیرہ دیکھ رہی ہوں۔“ اس نے اپنی حیرانی کا اظہار کیا۔

اس کی حیرانی کی وجہ یہاں کی عورتیں اور لڑکیاں تھیں، فیشن ایبل اور ماڈرن، بغیر کسی دوشے کے اور بغیر کسی
جواب کے کسی نے ہاف سیلو زپن رکھی تھی اور کئی سیلوئس تھیں۔ ان کی شرٹس کے گلے بیک اور فرنٹ سے
ایک جیسے ڈیپ تھے، ٹراؤزر کے پائینچے ٹخنوں سے کئی انچ اوپر تھے اتنے کہ گوری پنڈلیاں کئی منچلوں کے دل بہلا
رہی تھیں، کھلے بال اور میک اپ سے سجے چہرے، مدیجہ کو بلکا سا شاک لگا تھا کہ یہ پاکستان ہے؟

”اگر پاکستان کا یہ حال ہے تو پھر یورپ کو کیوں بدنام کر رہا ہے کہ وہاں بے حیائی ہو رہی ہے؟ کیا یہ ہیں وہ مشرقی
عورتیں جن کی مغرب میں دھوم مچی ہوئی ہے؟ مشرقی عورت، مشرقی عورت اور مشرقی عورت۔؟ کمال ہے ایسی
مبالغہ آرائی؟“ مدیجہ مسلسل سوچ میں گم تھی۔

”مدیجہ کیا سوچ رہی ہو؟“ دل آور نے ٹیبل بجا کر اسے متوجہ کیا تھا۔

”صرف سوچ ہی نہیں رہی دیکھ بھی رہی ہوں۔“ وہ استہزائیہ بولی۔

”کیا دیکھ رہی ہو؟“

”آپ کی فیورٹ عورتیں، یعنی مشرقی عورتیں۔“ اس نے تمسخرانہ لہجے میں کہہ کر اشارہ کیا دل آور نے چونک
کر اس کی نظر کے تعاقب میں دیکھا تھا ایک لڑکی اور ایک لڑکا ایک ہی پلیٹ میں کھانا کھاتے ہوئے منس رہے تھے
اور ان کی آپس میں چھیڑ چھاڑ بھی جاری تھی دل آور کے چہرے کی رنگت سرخ پڑ گئی تھی۔

”تم اُدھر میری جگہ پہ آجاؤ۔“ وہ اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا یہ بات ٹیبل کہتا تو شاید وہ ضد پہ اڑ جاتی لیکن کہنے والا
دل آور شاہ تھا۔

”کیا جگہ چینیج کرنے سے ماحول بھی چینیج ہو جائے گا؟“ وہ طنز کرنے سے باز نہ آئی۔

”دیکھو مدیجہ پورا پاکستان ایک جیسا تو نہیں ہے نا؟ یہ امیر گھروں کی بگڑی ہوئی لڑکیاں ہیں۔“

”تو آپ مجھے کسی ایسی جگہ لے جاتے جہاں غریب گھروں کی سبھی ہوئی لڑکیاں ہوتی ہیں؟“ مدیجہ اپنی طرف سے
طنز کر رہی تھی کہ سب ایسی ہی ہیں۔

”مجھے تو لگ رہا ہے پاکستان نے فیشن کے سوا اور کسی کام میں ترقی نہیں کی؟ وہ دل کھول کے بھڑاس نکال رہی
تھی۔

”یہ بحث کا وقت نہیں ہے میری جان کھانا کھاؤ۔“ دل آور بحث کو ٹال گیا تھا ورنہ وہ تو ہر تھا اس کام میں اسے
تو بس موقع چاہیے تھا۔

”اپنا موبائل دیں گے مجھے؟“ وہ کھانا کھا کر فارغ ہوئے تو مدیجہ نے اس کا موبائل مانگا تھا۔



تمہیں غیروں سے کب فرصت ہم اپنے غم سے کب خالی

چلو بس ہو چکا ملنا، نہ تم خالی، نہ ہم خالی

اپنی ڈائری سے شعر پڑھتے ہوئے اس کے دل سے عجب ہوک نکلی تھی اور وہ ڈائری بند کر کے رائٹنگ ٹیبل کے
سامنے سے اٹھ گئی اس کا رخ ویدو کی طرف تھا۔ اس نے آگے بڑھتے ہوئے دونوں پٹ کھول دیئے باہر دن میں
رات چھائی ہوئی لگ رہی تھی گہرے سرمئی بادلوں نے پورے ماحول کو سرمئی بنا دیا تھا۔ زری اس سرمئی ماحول کو
دیکھتی ہوئی بے وجہ ہی اداس ہونے لگی تھی شاید اسے اس سرمئی رنگ سے کسی کے سرمئی رنگ کے لباس کا
خیال آگیا تھا اور لباس کے ساتھ اور بہت کچھ بھی، جن کو سوچتے ہوئے اس نے کھڑکی کے کھلے پٹ سے سر نکاتے
ہوئے آنکھیں موند لی تھیں۔

”تنی ٹھنڈ میں کیوں کھڑی ہیں؟ کیا بیمار ہونے کا ارادہ ہے؟“ وہ جاتے جاتے دوپل کے لیے ٹھہرا تھا اس کے
پاس اور زری کو لگا اس کے پاس پوری کائنات ٹھہر گئی ہو اور اس نے پلکیں اٹھا کر اس کو دھڑکتی نظروں سے دیکھا
تھا۔

”بیمار ہو بھی جاؤں تو کون سا میری عیادت کو کوئی آجائے گا۔“ بس زری کا اتنا سا کہنا تھا کہ اس نے نظریں چرائی
تھیں۔

”کسی کی عیادت کے لالچ میں خود کو بیمار کرنا سراسر بے وقوفی ہے۔“ کوئی کہہ اس طرح ہماری طویل بھی ہو سکتی ہے،
میرا مطلب ہے کہ عیادت کرنے والا نہیں بھی آسکتا۔“ وہ اپنی بات پہ زور دے کر بولا۔

”آجائے گا تو کیا بگڑے گا اس کا، بلکہ کسی کی طبیعت ہی سبب سے جانی گئی؟“ زری اپنی بات پہ زور دے رہی
تھی۔

”طبیعت سنبھل جائے گی لیکن حالات بگڑ جائیں گے۔“

”حالات؟“ وہ ناگہجی سے پوچھ رہی تھی۔

”خیر چھوڑیں آپ نہیں سمجھیں گی اندر چلی جائیں ٹھنڈ بہت ہے۔“ وہ واپس ہار ہا تھا زری اس کے ہاتھ میں
گاڑی کی چابی دیکھ چکی تھی۔

”ٹھنڈ تو واقعی بہت ہے آپ بھی تو باہر جا رہے ہیں؟“ زری نے فوراً کہا لیکن وہ غناؤش ہی رہا۔

آج وہ سرمئی رنگ کے شلوار قمیض میں ملبوس اپنی تمام مردانہ وجاہتوں سمیت عبداللہ اور ٹیبل کے ساتھ
بیٹھ ہوئے بھی نمایاں لگ رہا تھا زری کا دل کئی بار دھڑکنے پہ مجبور ہوا تھا۔ اور اس وقت بھی وہ اسے ہی سوچنے پہ
مجبور تھی دل کسی اور طرف راغب ہی نہیں ہوتا تھا۔ اور ابھی نجانے وہ اور کتنا سوچتی کہ اس کے موبائل پہ ٹیبل
ہونے لگی پہلے وہ آگور کرتی رہی لیکن جب مسلسل رنگ ہوئی تو اسے کھڑکی سے ہٹ کے بیڈ کے قریب آنا ہی پڑا
لیکن جیسے ہی اس نے موبائل اسکرین پہ نمبر دیکھا اس کی آنکھیں بے یقینی سے پھیل گئی تھیں اسے یقین نہیں
آ رہا تھا۔ ”دل اور شاہ کالنگ“ وہ موبائل اسکرین کو ہی دیکھے جارہی تھی دل کی دھڑکنیں معمول پہ آئیں تو وہ کال
سننے کا سوچتی اور بالا خر کال خود ہی بند ہو گئی۔

”ہیں؟ یہ کیا ہوا ہے۔“ اس کا دل وھک سے رہ گیا وہ پاس آ کے چلا گیا زری کے روئیں روئیں میں بے چینی کا

ایسا اٹھا تھا۔ لیکن شکر تھا کہ کال دوبارہ آگئی اس نے ایک ہاتھ سینے پر رکھا اور سنبھل کے بیڈ پر بیٹھ گئی کیونکہ ٹانگوں میں خوشی کے مارے سکت نہیں رہی تھی۔ اور یونہی دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے یس گاٹن پریس کیا تھا۔

”السلام علیکم۔“ اس کا سلام بھی لرز رہا تھا۔
 ”وعلیکم السلام یہ مدیحہ آپ کو کال کر رہی تھی۔ اس سے بات کر لیں۔“ وہی دل پہ دھمک چھوڑتی ہوئی بھاری گنبد آواز کی ذرا سماعتوں میں اتری اور گم ہو گئی۔
 ”ہیلو۔“ اب مدیحہ کی آواز سنائی دی تھی۔
 ”السلام علیکم۔“ زری نے مشکل خود کو کمپوز کیا تھا ورنہ دل و دماغ تو منتشر ہی تھے۔ وہ اس کے دل و دماغ کو ستا کے رکھ گیا تھا۔
 ”وعلیکم السلام! کیسی ہو؟“

”او اس۔“
 ”کیوں؟ او اس کیوں؟“
 ”بس اکیلے دل نہیں لگ رہا۔“
 ”پاکستان آجاؤ۔“
 ”کوشش تو یہی ہے بس ایگزامز کا انتظار ہے۔“ زری او اسی سے بولی۔

”خیر تم سناؤ اتنے دنوں بعد آج کانٹیکٹ کر رہی ہو؟ کیا وجہ تھی؟“ زری نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔
 ”میرے پاس ابھی میرا پناہیلا نمبر نہیں ہے ہو سکتا ہے آج ہی لے لوں، آج ہم دل اور بھائی کے ساتھ لاہور گھومنے کے لیے نکلے ہوئے ہیں ابھی ابھی نوڈ اسٹریٹ سے کھانا کھایا ہے اور لاہور کے دلچسپ نظارے دیکھے ہیں۔“ مدیحہ کتے کتے استہزائیہ انداز پر اتر آئی تھی۔
 ”دلچسپ نظارے کیا مطلب؟“

”ارے وہی جن کو آپ لوگ مشرقی نظارے کہتے ہیں۔“ مدیحہ ایک ہی بات پہ اڑی ہوئی تھی۔
 ”مدیحہ تم بھول رہی ہو کہ ہر ملک میں رہنے والے لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے، اتنے برے انسان تو ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔“ زری نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔
 ”مجھے مت سمجھاؤ زری میں سمجھنے والی نہیں ہوں میں نے تو تمہیں اس لیے کال کی ہے تاکہ تمہیں تمہارے پاکستان کا حال لائیو سناؤں۔“ مدیحہ کا انداز طنزیہ ہوئے تھا۔

”چار سالوں میں میری یادداشت اتنی کمزور نہیں ہوئی کہ میں اپنے وطن کا حال بھول جاؤں۔ بے شک میں یہاں رہ رہی ہوں لیکن میری جڑیں تو پاکستان میں ہی ہیں نا؟ میں نے لوٹ کر تو وہیں آنا ہے نا؟ اب اپنی فیملی کو ہی دیکھ لو، کتنے سال یہاں گزارے لیکن اپنے اصل کی طرف لوٹ گئے پاکستان ہمارا اصل ہے اور اصل چاہے اچھا ہو چاہے برا، آخر قبول کرنا ہی پڑتا ہے۔“ محبت کی باتیں کرنے والی زری ملک کی باتیں کر رہی تھی مدیحہ کو سن کر تعجب ہوا تھا۔

”ماشاء اللہ کافی اچھا بول لیتی ہو۔“
 ”تھینک یو۔“ زری نے اس کے طنز کا جواب خفگی سے دیا تھا۔
 ”بانی سب کیسے ہیں؟“ مدیحہ کو سب کا پوچھنے کا خیال آئی گیا تھا۔
 ”سب ٹھیک ہیں عبد اللہ بھائی آفس گئے ہیں بمبائ بھی اپنے پیرنس سے ملنے اور میں گھر پہ۔“

”او اس! تم اپنی بور ہو رہی ہوگی؟ شاید او اسی بھی اسی لیے ہے؟“
 ”او اس! او اسی کسی کے لیے ہے کسی کو بتا ہی نہیں۔“ وہ دھمکے سے بولی۔
 ”اب اسٹاپ! مدیحہ چونک گئی۔“

”اب اسٹاپ کسی کے سمجھانے سے سمجھ نہیں آتا مدیحہ جانی۔“ زری ہلکے سے ہنسی۔
 ”تم اپنا پارہ ہی ہو زری؟“
 ”میں نے ہونے کو چھپانا کیسا؟“

”لیکن زری تم نے جوابات کیسے دے دے۔“
 ”ارے مدیحہ یاد آیا کہ مجھے یونیورسٹی میں وہ جیسی ملا تھا۔“ زری بات ٹال دینا چاہتی تھی۔
 ”جیسی کو گولی مارو اپنی بات کہو۔“

”میری کوئی بات ہوگی تو تمہیں ہی بتاؤں گی۔“
 ”ٹھیک ہے زری تم مجھے ٹال رہی ہو اور میں ٹال جاتی ہوں، لیکن اتنا یاد رکھنا کہ اگر تمہیں کچھ کہنا ہو تو مدیحہ حاضر ہے۔“ مدیحہ نے بڑے سیر سے لب و لہجہ اور انداز میں کہا تھا زری کو اس کے انداز پہ بے ساختہ پیار آ گیا تھا۔

”تھینک یو سوچ ڈیر اینڈ آئی مس یو زری رچ۔“ زری نے کھل کے اظہار کیا تھا۔

”سیم ہیر۔“ وہ بھی جواباً آہستہ سے بولی۔
 ”تمہارے فرینڈز بھی تمہیں بہت مس کر رہے ہیں جیسی تمہارا پوچھنے آیا تھا میں نے اسے کہا کہ مدیحہ تم لوگوں سے خود کانٹیکٹ کر لے گی وہ تمہارے گھر کا لینڈ لائن نمبر مانگ رہا تھا لیکن تمہاری اجازت کے بغیر میں نے اسے نمبر نہیں دیا۔“ زری اسے تفصیل سے بتا رہی تھی۔
 ”او کے اچھا کیا ہے۔“
 ”او کے۔“ زری دھمکے سے بولی۔

”اچھا زری ہم ذرا مارکیٹ کی طرف نکل رہے ہیں تم سے بعد میں بات کروں گی دل اور بھائی میری باتوں کے ختم ہونے کا انتظار کر رہے ہیں۔“ مدیحہ الوداعی کلمات ادا کرتے ہوئے بولی۔
 ”او کے ایریووش سب کو میرا سلام کہنا۔“

”ٹھیک ہے کہہ دوں گی لیکن یاد رکھنا کہ ایک شعر تو سناؤ۔ بہت دنوں سے میں تمہارے اشعار کو مس کر رہی ہوں۔“ مدیحہ تیزی سے بولی زری کا دل مدھم مدھم ہل رہا تھا۔

”تم سے کیا کہیں جاؤں اس قدر مہمیلے میں ہو سکے تو سن جاؤ ایک دن اکیلے میں دھیمی بوجھل آواز میں کہہ کر اس نے فون بند کر دیا لیکن اسے یہ نہیں پتا تھا کہ مدیحہ کے پاس کھڑے دل آور نے بھی اس کا یہ شعر یا آسانی سنا ہے کیونکہ فون کا ویڈیو بلنڈ تھا اتنے شور مچانے میں مدھم ویڈیو سے بات بھی تو نہیں سنی جاسکتی تھی؟ لیکن جو کچھ بھی تھا آج وہ اس کی آواز کے ذرا سے امرت سے ہی جی اٹھی تھی۔“



”فاطمہ میری بات سنو۔“ مرم نے پاس سے گزرتی فاطمہ کا ہاتھ پکڑ کر روک دیا تھا وہ اپنے مہمان انینڈ کرتی پھر رہی تھی اور مرم کو نے والی کرسی پہ بیٹھی اس لڑکے کی نظروں سے بچنے کی کوششیں کر رہی تھی جو مسلسل اسے ہی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم غاص کیوں ہیں؟

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڑیوم ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیگر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

دیکھ جارہا تھا۔

”کیا بات ہے؟“ فاطمہ ذرا ٹھہر کر متوجہ ہوئی۔

”میں نے عدیل بھائی کو فون کرنا تھا وہ مجھے پک کرنے آجاتے۔“

”اس کے پاس موبائل ہے؟“

”نہیں! کوثر باجی کے گھر فون کر کے پیغام دیتا تھا۔“

”ان کو زحمت دینے کی کیا ضرورت ہے، تھوڑی دیر بعد مہمان کھانا کھالیں تو میں خود تمہیں ڈراپ کر آؤں گی۔“

”نہیں عدیل بھائی نے کہا تھا کہ وہ مجھے لینے کے لیے آجائیں گے۔“

”تو ٹھیک ہے پھر انتظار کرو ان کے آنے کا۔“

”لیکن فاطمہ میں اکیلی بیٹھی کیا کروں گی؟ تم کیک کاٹ چکی ہو اس لیے مجھے اب گھر جانا چاہیے۔“ مریم اسے کیا بتاتی کہ اس جودت نام کے لڑکے نے اسے دیکھ دیکھ کر اپنی نظروں سے ہی زنج کر دیا ہے۔

”کھانا کھالیا تم نے؟“

”نہیں میں کھانا کھا کر آئی تھی۔“

”کیوں؟ میرے گھر کے کھانے میں زہر ملا ہوا تھا کہ تمہارا بھائی بھی بھاگ گیا اور تم بھی کھانا کھائے بغیر جا رہی ہو۔“ فاطمہ جب غصے میں ہوتی تو اسی طرح جومہ میں آتا کہہ جاتی تھی۔

”پلیز فاطمہ! کیوں ذرا اسی بات پہ اتنی بدگمان ہو جاتی ہو؟“ مریم خفگی سے بولی۔

”تم جب غیرت برتنے ہو تبھی مجھے بدگمانی ہوتی ہے۔“ فاطمہ کا غصہ عروج پر تھا۔

”دیکھو فاطمہ میں اگر غیرت برتنے تو تمہارے بلائے۔ اس وقت تمہارے گھر نہ آئی حالانکہ تم جانتی ہو کہ میں

کبھی بھی آتی جاتی نہیں ہوں خصوصاً رات کے وقت تو تصور بھی نہیں کیا جاسکتا لیکن پھر بھی تمہاری غیاطر آگئی اور تم ہو کہ ابھی بدگمان ہو رہی ہو؟“ مریم نے افسوس سے کہا تھا فاطمہ کچھ دیر کے لیے چپ ہو گئی تھی۔ مریم

اگر اس کے لیے اس وقت یہاں تک آگئی تھی تو بڑی بات تھی۔

”ہیلو ڈیئر! کیا ہو رہا ہے؟“ فاطمہ کی ایک اور فرینڈ پاس آگئی تھی۔

”نتھنگ! چیٹل، تم سناؤ کھانا کھالیا؟“

”آف کورس کھانا کھا کر ہی تمہارے پاس آئی ہوں۔“ اور ذرا فاصلے پہ کھڑا جودت اپنے دھیان میں آگے بڑھا

تھا کہ دیر سے ٹکرا گیا اور کولڈ ڈرنک کے گلاسوں سے جی رے جودت پہ ہی الٹ گئی تھی اس کی شرٹ رنگ برنگے

مشروب لٹنے سے رنگین ہو گئی تھی۔

”یہ کیا بد تمیزی ہے؟ تم دیکھ کر نہیں چل سکتے؟“ جودت نے اپنی غلطی بوشر کے سر ڈال دی۔

”جودت کول ڈاؤن یا ر سارے مہمان دیکھ رہے ہیں۔“ سائٹ لپک کے پاس آیا تھا اور اسے مزید غصہ نکالنے

سے روکا۔

”میری ساری شرٹ خراب ہو گئی ہے اور تمہیں۔“

”یار پلیز! کیوں تماشا بنا رہے ہو؟ تم میرے بیڈ روم میں جا کر میری شرٹ پہن لو، آؤ میرے ساتھ۔“ سائٹ نے

بشکل اسے ٹھنڈا رکھنے کی کوشش کی۔

”غلطی تمہاری تھی، تمہاری نظریں کہیں اور لگی ہوئی ہیں اس کا بھلا کیا تصور ہے؟“ سائٹ نے جودت کو مزید

کچھ کہنے سے پہلے ہی روک دیا تھا۔ اور پھر اپنے ساتھ بیڈ روم میں لے گیا۔

”بی بی جی! باہر کوئی عدیل صاحب آئے ہیں۔“ ملازمہ نے اندر آکر فاطمہ کو اطلاع دی۔
”ان سے کہو اندر آجائیں۔“

”کہا تھا بی بی جی، لیکن وہ کہتے ہیں کہ وہ جلدی میں ہیں۔ مریم بی بی کو باہر بھیج دو۔“ ملازمہ نے عدیل کا جواب ایڈوانس میں ہی پوچھ لیا تھا۔

”میں چلتی ہوں فاطمہ۔“ مریم نے جانے کے لیے برتن لے۔

”چلو۔“ فاطمہ اسے اشارہ کرتی اس کے ساتھ باہر نکل آئی تھی۔

”السلام علیکم۔“ مریم کے ساتھ فاطمہ کو آتے دیکھ کر عدیل سیدھا کھڑا ہو گیا۔

”وعلیکم السلام مجھے دراصل آپ کا شکریہ ادا کرنا تھا اس لیے یہاں تک آئی ہوں۔“ فاطمہ کا انداز طنزیہ تھا۔

”شکریہ کس بات کا؟“

”مریم کو لے کر آنے کا۔“

”اس میں شکریہ کی کیا بات ہے؟ آپ دونوں فریڈز ہیں ایک دوسرے سے ملنے کا حق بنتا ہے۔“ عدیل نے نارمل سے لہجے میں کہا۔

”کیا انسانوں کے حقوق بھی جانتے ہیں آپ؟“

”فاطمہ کافی نام ہو چکا ہے ہمیں اب چلنا چاہیے۔“

مریم نے بیچ بچاؤ کرانے کی کوشش کی۔

”واقعی چلنا چاہیے“ اوکے گڈ بائے۔“ فاطمہ پلٹ گئی۔

”نہیں۔“ عدیل نے اپکارا۔

”وش یو بھی برتھ ڈے۔“ جاتے جاتے وہ اس کا شکوہ دور کر گیا تھا فاطمہ پیچھے دیکھتی رہ گئی وہ بایک کو لک لگاتے ہوئے چند سیکنڈ زبعد نظروں سے اوچھل ہو گیا وہ بھی کھڑی تھی کہ اتنے میں جودت غلبت میں تقریباً بھاگتا ہوا باہر آیا تھا لیکن باہر فاطمہ اکیلی کھڑی تھی۔ گویا وہ جاچکی تھی جودت اپنی گاڑی کے بونٹ پہ مکار سید کر کے رہ گیا اور دوسری ٹھوکر تاسر کو دے ماری تھی اس کا چانس مس ہو گیا تھا۔

سبز گھاس پہ شبنم کے قطرے رات بھر رونے کی نشانی تھی اور وہ رات کے آنسوؤں میں پاؤں بھگوئی پورے لان کی گھاس کو اپنے سفید کبوتر سے پاؤں کا نرم لمس بجھتے ہوئے مسلسل چل قدمی میں مصروف تھی۔ سبز گھاس کا قلعین اس کے پیروں تلے دب رہا تھا اور پھولوں کی دلفریب خوشبو اس کے پیروں کی پازیب بنی جا رہی تھی جس طرف قدم اٹھ رہے تھے اسی طرف مکہ کے جھونکے چل رہے تھے۔

”کوئی کانٹا لگ جائے گا علیزے۔“ آذرا سے منع کیے بغیر نہ رہ سکا۔

”یہاں کوئی کانٹا نہیں ہے آذر بھائی۔“ علیزے اس کی آواز پہ مسکرا کر پیش تھی۔

”تمہیں کیسے پتا کہ یہاں کوئی کانٹا نہیں ہے؟“

”میں کافی دیر سے یہیں ٹہل رہی ہوں۔“

”لیکن ننگے پیر ٹہلنے کی کیا ضرورت ہے؟“

”آپ بھی ایک بار جوتے اتار کے دیکھیں پھر آپ کو پتا چلے گا کہ ننگے پیر ٹہلنے کی کیا ضرورت ہے۔“

علیزے نے مسکراتے ہوئے اسے مشورہ دیا۔

”میں جوتے اتار کے دیکھوں؟“ آذر دلچسپی سے ہنسا۔

”آپ کو رس آپ سے ہی کہہ رہی ہوں۔“ علیزے نے اصرار کیا تھا اور آذر نے بھی دلچسپی سے مسکراتے

اپنے جاگزا اتارے اور اس کے ساتھ گھاس پہ ننگے پیر ٹہلنے لگا۔

”سندھی شبنم کے قطرے پیروں میں گد گدی کرنے لگے دھیمی مسکراہٹ آپ ہی آپ لبوں کا احاطہ کرنے لگی

تھی اور اسے دیکھ کر علیزے ہنس پڑی۔

”کیسا لگ رہا ہے؟“

”بہت اچھا۔“

”کبھی کبھی میرا موڈ اچھا ہوتا میں یونہی ننگے پیر چل قدمی کرتے ہوئے بہت انجوائے کرتی ہوں۔“

”اوپہ تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ آج تمہارا موڈ اچھا ہے؟“

”ہوں۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”وجہ؟“

”نہیں ایسے ہی۔“

”حیرت ہے بغیر وجہ کے موڈ فریش ہے؟“

”بس کبھی کبھی انسان کی کیفیت ایسی ہو ہی جاتی ہے۔ نہ اپنی اداسی کا سبب پتا چلتا ہے اور نہ ہی خوشی کا۔“ اس

نے کندھے اچکائے۔

”لگتا ہے تم کالج جانے کے لیے خوش ہو؟“ آذر نے اس کے دلکش چہرے کو اک نظر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”لیکن ابھی تو میرے کالج جانے کا کوئی انتظام ہی نہیں ہوا۔ نہ گاڑی نہ ڈرائیور اور دو روز سے آپ بھی گھر پہ

نہیں تھے۔“

”آج گاڑی کا انتظام بھی ہو جائے گا، ڈرائیور کے لیے نوڈیڈ نے کسی کو کہہ دیا ہے، ہو سکتا ہے کہ آج ڈرائیور

بھی آجائے اس نے شام کو آنے کا کہا ہے۔“ آذر نے اسے تسلی دی۔

علیزے جلتے جلتے ٹھہر گئی تھی اور آذر اسے دیکھ کر ٹھہر گیا تھا۔

”کیا ہوا؟“ آذر اس کے چہرے پہ پریشانی کی پرچھائی دیکھ چکا تھا۔

”ایک بات پوچھوں آذر بھائی؟“ اس کا لہجہ سنجیدہ تھا۔

”ہاں ہاں ضرور پوچھو۔“ آذر سمجھتا ہوا۔

”آپ کو ابھی تک اس آدمی کا پتا نہیں چلانا جس نے فائرنگ کروائی تھی؟“ علیزے نے پھر آذر کے چہرے کو

دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی آذر ایک پل کے لیے تذبذب کا شکار ہو گیا تھا لیکن اس وقت اگر وہ علیزے کے سامنے

واقعی ناکامی اور مایوسی ظاہر کرتا تو یقیناً ”وہ اندر سے پریشان اور ہراساں ہو جاتی اور آذر اسے ہراساں نہیں کرنا چاہتا

تھا کیونکہ وہ کمزور دل کی لڑکی تھی دوسرے لفظوں میں ڈروک اور بزدل بھی کہا جاسکتا تھا۔

”آذر بھائی۔“ اس کی آواز آذر کو ہوش کی یونیا میں لے آئی۔

”ہوں؟“

”میں نے سوچا پوچھا ہے اس کا جواب دے۔“

”ایلیو علیزے ایسی باتیں سب کے سامنے شو کرنے والی نہیں ہوتیں، ایسے معاملوں میں بہت احتیاط

رہنا پڑتا ہے۔ عورتوں کو بات بتانے سے بات پھیل جاتی ہے اسی لیے میں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا۔“

آذر کا انداز تسلی دینے والا تھا۔

”مطلب کہ آپ کو دشمن کا پتا جل چکا ہے؟“
 ”بالکل۔“ آذر کو علیزے کی خاطر جھوٹ بولنا پڑا تھا۔
 ”کون ہے وہ؟“

”ایم سوری میری جان یہ نہیں بتا سکتا۔“

ایم سواری سیر کی جان یہ ہیں بنا سنا۔
 ”آپ یہ کیوں نہیں کہتے کہ آپ کو خود بھی پتا نہیں ہے؟“ علیزے بلا جھجک کہہ گئی آذر چونک گیا تھا۔
 ”یعنی تمہارے خیال میں میں جھوٹ بول رہا ہوں؟“ وہ الٹا اس پہ خفا ہونے لگا تھا۔
 ”نہیں میں یہ تو نہیں کہہ رہی۔“ علیزے کو اپنی بے ساختگی اور بے یقینی یہ ندامت ہوئی تھی۔
 ”بہر حال تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے بہت جلد وہ آدمی سامنے آجائے گا۔ بس کوشش یہی ہے کہ سارے ثبوت ہاتھ آجائیں۔“ وہ بار بار علیزے کو تسلی دیتے ہوئے سمجھا رہا تھا۔
 ”اوکے دیکھتے ہیں کہ کیا ہوتا ہے؟“ اس نے کندھے اچکا دئے۔
 ”ہوں! چلو اندر چلتے ہیں کافی ٹائم ہو رہا ہے میں نے ابھی آفس کے لیے تیار بھی ہونا ہے۔“ آذر اسے کہتے ہوئے واپسی کے لیے پلٹا لیکن سامنے کوئل کو دیکھ کر ٹھنک گیا تھا۔
 ”کوئل۔“

”جی وہ میں آپ کو بلانے آئی تھی“ آنی بلارہی ہیں ناشتا تیار ہے۔“ کوئل نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا اس کی نظریں جھکیں تو ان دونوں کے پیروں پہ جا کر ٹھہر گئیں وہ دونوں گھاس پہ ننگے پیر کھڑے تھے علیزے کو تو نہیں البتہ آذر کو کوئل کی نظریں بہت محسوس ہوئی تھیں۔ وہ آذر کے جواب سے پہلے ہی پلٹ کر اندر چلی گئی تھی جبکہ علیزے اس کے ساتھ ہی اندر آئی تھی۔

نبیل ابھی ناشتا کر کے فارغ ہوا ہی تھا کہ گیٹ پہ دل اور کی گاڑی کا بارن سنا دیے لگا وہ جلدی جلدی چائے کا کپ خالی کر کے کھڑا ہو گیا۔
 ”آپ کو اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے ابھی بتا دیجیے۔ آتے ہوئے لے آؤں گا۔“ نبیل جاتے جاتے ٹھہر گیا۔
 ”نہیں بیٹا مجھے بھلا کس چیز کی ضرورت ہوگی؟ بس اپنے گھر کی ضرورت تھی اور گھر مل گیا۔“ فائزہ بیگم گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولیں۔

”پلیز نام اداس نہ ہوا کریں۔“ نیل ان کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔
 ”جس ماں کا تم جیسا سمجھو اور محبت کرنے والا اور لائق فائق بیٹا ہو اسے بھلا اداس ہونے کی کیا ضرورت ہے؟“ وہ اس کا ہاتھ چھتے ہوئے بولیں۔
 ”مجھے پتا ہے آپ کس لیے اداس ہوتی ہیں، لیکن مام آپ کو کتنی بار کہہ چکا ہوں کہ اس اداسی اور اس انتظار کا کوئی فائدہ نہیں ہے، کچھ حاصل نہیں ہوتا ایسے انتظار اور اداسی سے۔“ وہ ماں کی کیفیت کو کافی گہرائی سے سمجھتا تھا وہ جانتا تھا کہ وہ ممتاز حیات کی بے گانگی کا غم دل میں دھڑکن کی طرح لیے پھرتی ہیں جب جب دل دھڑکتا ہے تب تب غم بڑھتا ہے۔

”اویس! اب تو مجھے گالیاں بھی دے رہا ہو گا۔“ نیل سر پہ ہاتھ مارتے ہوئے پلٹا اور کرسی پہ رکھا اپنا نیوی بلیو۔

اس کا جواب کیس اٹھا کر باہر کی سمت لپکا تھا لیکن سامنے سے اس کا چوکیدار کو ریڈور عبور کرتے ہوئے اندر آ رہا تھا۔

”صاحب وہ دل آور صاحب کہہ رہے ہیں کہ کیا آپ زندہ ہیں؟“ جو کیدار نے ذرا جھجکتے ہوئے کہا تھا جس نے بیل بے ساختہ ققمہ لگا کر ہنسا تھا اور جو کیدار کے ساتھ ہی یا ہر نکل آیا تھا گیٹ کے سامنے ہی وہ اپنی طرف لیے کھڑا تھا چہرے پر غصہ تھا۔

”دل اور صاحب سے کو نبیل صاحب زندہ ہیں اور آگئے ہیں۔“ نبیل نے چوکیدار کو اشارہ کیا اور ذرا اونچی آواز سے کہا تھا تاکہ گاڑی میں بیٹھادل اور بھی سن لے۔

”اب اور کتنا لیٹ کرو گے؟“ وہ بالا خرہ نہ سکا اور غصے سے بول رہا۔

”یہ تم تو ہر وقت جلدی میں ہی رہتے ہو، میں سوچتا ہوں اپنی بیوی کے ساتھ نجانے کیا کرو گے؟ نہ بہار کرو گے، نہ اظہار کرو گے، نہ ہی اس کا انتظار کرو گے، بے چاری روئے کی اپنے نصیب پہ۔“ نیل فرنٹ سیٹ پہ بیٹھا دل اور کی ہونے والی بیوی یہ افسوس کر رہا تھا۔

”اور بڑی خوش نصیب ہوگی تمہاری بیوی، ہر وقت اس کے گھٹنے سے لگ کے بیٹھے رہو گے، کبھی گھر سے ہی نہیں نکلے گی۔“

”اللہ معافی دے یار! بڑھکے چھپے لفظوں میں مجھے زنِ مرید تو نہ کہو! اللہ ایسی نوبت نہ لائے۔“

نبیل نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا اب بننے کی باری دلِ آور کی تھی اور یونہی باتوں باتوں میں وہ کرنسی چینیج کروانے کرنسی ایکس چینج گئے وہاں سے بینک کا رخ کیا اپنا اکاؤنٹ اوپن کروایا اور اے ٹی ایم کارڈ اپلائی کروادیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بینک سے بھی فارغ ہو گئے تھے پھر ایک۔ دو بائیل کمپنی کی فرنیچر لگے اور مدیہ اور فارزہ یکم کے اپنی پسند کے ممبر ایڈ کروائے تھے۔

دو روز پہلے نبیل مہتاب خان کے ساتھ آگرا پہنچے لیے ممبر لے چکا تھا۔ لیکن مدیہ وغیرہ کے ابھی باقی تھے سارے

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوابسورت ناول

فوائد بصیرت مردود

خواب و سورت پھیپھائی

نافع ہو گئے ہیں

منشیو جلد

انفد

☆ ستاروں کا آنگن،	نسیم سحر قریشی	قیمت: 450 روپے
☆ درد کی منزل،	رضیہ جمیل	قیمت: 500 روپے
☆ اے وقت گواہی دے، راحت جہیں		قیمت: 400 روپے
☆ تیرے نام کی شہرت،	شازیہ چودھری	قیمت: 250 روپے
☆ امر نیل،	عمیرہ احمد	قیمت: 550 روپے

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

کاڑی دل آور نے ہی پسند کی تھی اور پھر نبیل کے تمام کام نبٹانے کے بعد وہ اپنے کام نبٹانے کے لیے چل دیا تھا وہ اس پس پہ کام کر رہا تھا وہ بہت اہم تھا۔

”اندر چلا جاؤں چوکیدار صاحب؟“ منصور حسین کی آواز عقب سے ابھری تو چوکیدار بدک کے پیچھے پلٹا تھا وہ کندھے سے بیگ ڈالے بڑے دل جلانے والے انداز میں پوچھ رہا تھا۔

”تم آگئی گئے منصور حسین؟“ عارف اس کا بیگ دیکھ کر بولا۔

”آگیا ہوں جناب۔ آگیا ہوں دروازے کھول دو گھر کے بھی دل کے بھی۔“ منصور حسین کو جب سے نوکری ملی تھی خوش باش نظر آنے لگا تھا۔ ”مجھے تو لگتا ہے بڑے صاحب نے ڈرائیور نہیں رکھا بلکہ عذاب رکھا ہے۔“ عارف نے اپنا ہاتھ پیٹتے ہوئے کہا۔

”کیوں دل جلاتے ہو باو شاہو صحت پر اثر پڑتا ہے۔“ منصور حسین نے عارف کے کندھے پہ ہاتھ رکھ دیا تھا۔ ”تم اندر ہی چلے جاؤ تو اچھا ہے۔“ عارف نے جھنجھلا کر چھوٹا گیت کھول دیا تھا اور منصور حسین مسکراتے ہوئے اندر آگیا تھا۔

مغرب کا وقت تھا شام کا اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ حویلی کے لیمپ پوسٹ روشن ہو چکے تھے گیٹ ڈرائیوے اور کوریڈور تک روشنیاں ہی روشنیاں تھیں رات میں دن کا سماں تھا۔ منصور حسین ہمیشہ کی طرح ایک ہی جگہ کھڑا حویلی کی خوب صورتی دیکھ رہا تھا۔

”منصور حسین۔“ مبارک خان اسے دور سے ہی دیکھ چکا تھا اسی لیے آواز دی تھی۔

”یار کھڑے کھڑے کیا دیکھنے لگتے ہو؟“

”اللہ کے رنگ۔“ وہ آہستگی سے بولا۔

”اللہ کے رنگ؟“

”ہاں یار دیکھتا ہوں کہ اللہ نے اگر کسی کو نوازا ہے تو بے بہا تو ازا ہے اور جس کو نہیں نوازا اسے حسرت سے نوازا دیا ہے تاکہ وہ دوسروں کو حسرت سے دیکھتا رہے۔“ منصور حسین آہ بھر کے بولا اس کا دوازا اس کا چکا تھا۔

”اللہ نوازے گا یار سب کو نوازے گا دل چھوٹا نہیں کرتے تم آؤ میرے ساتھ میں تمہیں تمہارا کوارٹر دکھا دوں۔“ مبارک خان اسے تسلی دیتے ہوئے اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ مبارک خان کے ساتھ والا کوارٹر منصور حسین کے لیے صاف کروایا گیا تھا۔ مبارک خان نے آگے بڑھ کے کوارٹر کی کنڈی کھول دی۔

منصور حسین اندر آگیا اس کمرے میں ایک چارپائی دو کرسیاں ایک ٹیبل اور ایک الٹاری تھیں ٹیبل اور بجلی کا انتظام بھی اچھا تھا کمرے کا فرش اور دیواریں صاف ستھری اور جگہ کار سی تھیں گویا ملازموں کا بھی کافی خیال رکھا گیا تھا منصور حسین کو یہ بات بڑی پسند آئی تھی۔ وہ ٹیبل پہ بیگ رکھ کر چارپائی پہ بیٹھ گیا چارپائی کڑکڑا کے رہ گئی۔

”یار یہ تو ابھی سے احتجاج کرنے لگی ہے۔ میرا وزن سہہ بھی پائے کی یا نہیں؟“ منصور حسین پیچھے کی طرف ہار پائی پہ ہاتھ جماتے ہوئے اس پہ دباؤ ڈال کر چارپائی کی مضبوطی چیک کر رہا تھا کہ کہیں وہ ٹوٹ ہی نہ جائے۔ (باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

کام کرنے کے بعد ان کا رخ شوروم کی طرف تھا جہاں سے نبیل نے بیک وقت تین گاڑیاں نکلوانی تھیں دل آور اسے اس شوروم میں لے کر آیا جہاں اس کی پرانی جان پہچان بھی شوروم کے مالک اکرام مجید کچھ عرصہ پہلے کسی الزام کی زد میں آگئے تھے اور ساتھ ہی انہیں گاڑیوں کے جعلی لین دین کے کیس میں ملوث کر دیا گیا تھا تب اکرام مجید ہر طرف سے ناکام اور مایوس ہو کر دل آور شاہ کے پاس پہنچے تھے اور اس نے محض تین ماہ میں انہیں اس کیس سے باعزت بری کر دیا تھا جس کی خوشی میں انہوں نے دل آور کو ایک گاڑی تحفے میں بھجوائی تھی لیکن اس نے یہ تحفہ لینے سے انکار کر دیا تھا وہ اپنے کلائنٹس سے صرف اپنی فیس لیتا تھا ”چائے پانی“ کے نام پہ اضافی پیسے لینا حرام سمجھتا تھا یہ اور بات تھی کہ کوئی عام شہری اس کی فیس انورڈ نہیں کر سکتا تھا اسے بس بڑی بڑی آسامیاں ہی ہائر کر سکتی تھیں جیسے اکرام مجید!

”واؤ کیسا شاندار شوروم ہے۔“ نبیل شوروم کے احاطے میں داخل ہوتے ہی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکا تھا کیونکہ شوروم کی سجاوٹ پارکنگ تک نظر آرہی تھی۔

”اندر چلو اندر سے اور بھی شاندار لگے گا۔“ دل آور گاڑی لاک کر کے اس کے ساتھ اندر آگیا تھا۔ لیکن اندر داخل ہوتے ہی اس کی نظر دوسرے گلاس ڈور سے باہر نکلتے آؤمی پہ ٹھہر گئی۔ دل آور اس آؤمی کو دیکھ بھی چکا تھا اور پہچان بھی چکا تھا لیکن وہ آؤمی اتنی عجلت میں تھا کہ دل آور شاہ کو نہ دیکھ سکا البتہ اکرام مجید گلاس وال سے دل آور شاہ کو دیکھ کر خود ہی گلاس ڈور کے پاس آگئے۔

”السلام علیکم شاہ جی! باہر کیوں رک گئے؟ اندر آئیے۔“ اکرام مجید پیچھے جا رہے تھے۔ لیکن دل آور اس آؤمی کو دیکھے جا رہا تھا اس کی نظروں نے پارکنگ تک اس آؤمی کا پیچھا کیا تھا۔

کس کو دیکھ رہے ہو؟“ نبیل نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا لیکن اسے کچھ نظر نہیں آیا تھا۔ ”کسی کو نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا اور پھر اکرام مجید سے ہاتھ ملا کر اندر آگیا۔

”کیا لیں گے شاہ جی ٹھنڈا یا گرم؟“ وہ انہیں اپنے آفس روم میں لے آئے۔

”ٹھنڈا۔“ وہ مختصر بولا۔

”اتنا ٹھنڈا کہ سینے کو کچھ دیر کے لیے ٹھنڈا کر دے۔“

”جیسے آپ کی مرضی شاہ جی! آج ہمارے غریب خانے کو رونق کیسے بخشی؟“

”بس میرے دوست کا کچھ خریدنے کا موڈ تھا سوچا آپ کی دکان ہی اچھی رہے گی۔“ اس نے وسیع و عریض کشادہ اور جگمگاتے شوروم کو بیٹھے بیٹھے دکان کا نام دے دیا تھا یہی تو اس کا شاہانہ پن تھا۔

”اچھا تو یہ آپ کے دوست ہیں؟ کیسے ہیں سر؟“ اکرام مجید نے نبیل حیات سے دوبارہ ہاتھ ملایا۔ اور چند اور باتیں کرنے کے بعد وہ لوگ اٹھ کر گاڑیاں پسند کرنے لگے ایک ساتھ تین گاڑیاں اکرام مجید سن کر ہی مرعوب ہو گئے تھے۔ نبیل اپنے لیے گاڑی پسند کر رہا تھا لیکن دل آور کی نظریں بلیک چمچاتی مرسدیز پہ تھیں۔

”یہ گاڑی سیل ہو چکی ہے۔“ مینجر نے آگے بڑھ کے اطلاع دی۔

”اندازہ ہے مجھے۔“ دل آور نے سر جھٹکتے ہوئے کہا اور پلٹ کر نبیل کے برابر آکھڑا ہوا جس کی نظر انتخاب پر آؤپی ٹھہری ہوئی تھی۔

”یہ کیسی رہے گی؟“

”ہوں اچھی ہے۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا کراؤمی اور نبیل نے وہی اوکے کر دی۔ بدجیہ کے لیے سلور کرولا پسند کی تھی اس نے دل آور کو تاکید کی ہوئی تھی کہ اس کی گاڑی سلور کمر میں ہی ہونی چاہیے۔ سو اس کی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے
- ☆ کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف
- ☆ سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سپریم کوالٹی، تارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور
- ☆ ابن صفی کی مکمل ریخ
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے
- ☆ کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

شمیلہ عزیز



بڑی حوصلی کے تمام کلین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدھیہ اور نیل حیات دہی بہن بھائی ہیں مدھیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سرز کی سبب وہ انگلینڈ کی رہائشیوں میں مکمل طور پر رنگ چکی سبب جس کے پیش نظر فائزہ بیگم، نیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں لیکن مدھیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے جس پر نیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

ذری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پھنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے مگر ہر روز مایوسی اور ناامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، بے بسی اور مایوسی سے شک آخر نوکری کرنے کا سوچتا ہے لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باؤ اقبال مل جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے اسی کوئی میں وہ کام کی بابت پوچھتا ہوں جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میسرک پاس آدمی ہے وہ مبارک خاں کے توسط سے بڑی حوصلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

ال اور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے اس نے اسی بار نا اہل سیکھا اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پر بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو کی جاتی ہیں۔

۱۰

دسویں قسط

”خدا سے زیادہ وزن ڈالو گے تو کیسے سہ پائے گی۔ بے چاری ٹوٹ ہی جائے گی نا۔“ مبارک خان اس کے انداز پر ہنس کر بولا تھا۔

”تو پھر ایسا کرو اس کی جگہ کوئی مضبوط سی چارپائی لا کر رکھو، ورنہ یہ سچ بچ ٹوٹ ہی جائے گی۔ میں بڑی ”تھری“ فینڈ سوتا ہوں۔“ منصور حسین نے مبارک خان کو پہلے سے اطلاع دی تھی۔

”رنگے پائیوں والا بڑا پلنگ منگوالوں تمہارے لیے؟“ مبارک خان کا لہجہ استہزائیہ تھا۔

”ارے یار! اس سے بڑی نیکی اور کیا ہوگی؟ نواڑی پلنگ پہ سونے کا بھی اپنا ہی مزا ہے، ہر کروٹ پہ ڈھیلا پڑتا ہے۔“ منصور حسین مزالیتے ہوئے بولا۔

”وہ بے یار آپس کی بات ہے اگر تم بڑے صاحب کے سامنے رنگے پائیوں والے نواڑی پلنگ کی فرمائش کرو گے تو وہ یہ فرمائش بھی پوری کر دیں گے۔“ مبارک خان نے آہستہ آواز میں کہا۔

”وجہ؟“ منصور حسین نے حیرت سے پوچھا۔

”آخر تم علیزے بی بی کے ڈرائیور ہو، ان کے ملازم ہو، کیا یہ وجہ کم ہے؟“ مبارک خان اس گھر کا خاص ملازم تھا وہ علیزے اور اس کے ملازموں کی اہمیت خوب جانتا تھا اس کے ملازموں کی بھی گھر میں بڑی قدر اور اہمیت جانی جاتی تھی۔

”اوہ! اچھا! اچھا۔“ منصور حسین نے سمجھتے ہوئے سر ہلایا تھا۔ لیکن اتنے میں ان دنوں کو کسی کے کراہنے کی آواز سنائی دی وہ دنوں ہی چونک گئے مگر مبارک خان فوراً ہی ریلیکس ہو گیا۔ اسے آواز کی سمجھ آگئی تھی۔

”یہ کس کی آواز ہے؟“ منصور حسین انجان تھا اسی لیے پوچھ رہا تھا۔

”خیر و بابا کی۔“

”کون خیر و بابا؟“

”علیزے بی بی کے ڈرائیور۔“

”ڈرائیور؟“ منصور حسین کو اچنبھا ہوا۔

”چند روز پہلے تک وہی علیزے بی بی کے ڈرائیور تھے۔“

”یار! صاف صاف بات کرو۔“ شے سے کیا مطلب ہے تمہارا۔“

”مطلب کہ اب تم ہو، وہ نہیں ہیں۔“

”لیکن کیوں؟“

”کیونکہ چند روز پہلے۔“ مبارک خان بات بتاتے بتاتے رک گیا تھا۔

”چند روز پہلے کیا ہوا؟“

”وہ پوچھ رہا تھا اور مبارک خان تذبذب کا شکار تھا کہ اسے بتائے یا نہ بتائے۔“

”کیا کوئی راز کی بات ہے؟ منصور حسین نے اس کے چہرے پہ کھوجا۔“

”خیر جو بھی بات ہے تمہیں بتانی تو پڑے گی، آخر تمہیں اسی لیے تو اس نوکری پہ رکھا گیا ہے۔“ مبارک خان

ایک کرسی گھسیٹ کر اس کے قریب ہی بیٹھ گیا تھا۔

”اچھا۔ بتاؤ پھر۔“

”بتانا ہوں یار۔“ مبارک خان نے خود کو سب بتانے کے لیے تیار کیا تھا۔

”بچپن سے علیزے بی بی نے جب اسکول میں ایڈمیشن لیا تھا خیر و بابا تب سے ان کے ڈرائیور ہیں ان کو یک

ایند ڈراپ کرنا ان کی ذمہ داری تھی، علیزے بی بی نے کہیں اور بھی آنا جانا ہوتا تھا تو وہی لے کر جاتے تھے لیکن

پندرہ روز پہلے وہ علیزے بی بی کو کالج ڈراپ کرنے گئے تو راستے میں گاڑی پہ فائرنگ شروع ہو گئی، خیر و بابا بہت وفادار ملازم ہیں خود زخمی ہو گئے لیکن علیزے بی بی پہ ذرا سی بھی آج نہیں آنے دی، پچھلے کئی دنوں سے ہسپتال میں داخل تھے کل ہی واپس آئے ہیں، ابھی کمزور ہیں، اٹھتے بیٹھتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے اسی لیے دروسے کراہتے ہیں۔“ مبارک خان نے اسے تفصیل سے بتایا۔

”اوہ! یہ تو واقعی پریشانی کی خبر سنائی ہے تم نے، لیکن یار سوچنے کی بات ہے، فائرنگ کروائی کس نے تھی۔ کیا تمہارے بڑے صاحب کی کسی سے کوئی دشمنی وغیرہ چل رہی ہے؟“ منصور حسین پر سوچ انداز میں پوچھ رہا تھا۔

”ارے نہیں یار! اس حویلی کے بھی افراد بہت نیک، شریف اور سلجھے ہوئے لوگ ہیں، نمازی اور پرہیزگار ہیں، کسی سے کوئی دشمنی نہیں ہے، اگر دشمنی ہوتی تو فوراً پتا چل جاتا کہ فائرنگ کروانے والا کون تھا۔؟ یہ تو پتا نہیں اچانک کون دشمن اٹھ کھڑا ہوا ہے، جس کا کوئی اتا پتا ہی نہیں ہے۔“ مبارک خان اس بات سے خود بہت پریشان ہو رہا تھا۔

”ہوں! یہ تو اور بھی پریشانی کی بات ہے یار، پھر کیا سوچا ہے تمہارے صاحب نے؟“

”ارے سوچنا کیا ہے بس چھان بین میں لگے ہوئے ہیں ابھی اب دیکھو کہ کب مسئلہ حل ہوتا ہے؟“ مبارک خان پریشانی سے سر ہلا کر بولا۔

”انتہا بڑا واقعہ ہونے کے بعد تمہارے صاحب پھر اپنی بیٹی کو باہر بھیجنے کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔ انہیں ڈر نہیں لگتا؟“ منصور حسین تعجب سے پوچھ رہا تھا۔

”ڈر کس کو نہیں لگتا؟ ماں باپ ہیں آخر علیزے بی بی بڑی منتوں مرادوں کے بعد ملنے والی اولاد ہیں ان کی وہ تو اس دنیا کی ہوا بھی نہ لگنے دیں، پر مجبوری ہے، بڑھنے کے لیے تو بھیجنا ہی ہے۔ ان کے امتحان سر پہ پہنچ چکے ہیں، کالج نہیں جائیں گی تو پورے سال کی محنت کا نقصان ہوگا، اسی لیے تو امیر جنسی میں انہوں نے تمہیں ڈرائیور رکھ لیا ہے، ورنہ کوئی اور حالات ہوتے تو سو سو طرح کی چھان بین کرتے اور پھر بھی مطمئن نہ ہوتے۔“ مبارک خان صاف صاف بات کر رہا تھا۔

”اور کیسی چھان بین کرنا تھی انہوں نے؟ شناختی کارڈ، لائسنس، نام و پتا، گھریا سب پوچھا ہے انہوں نے؟“ منصور حسین کو حیرت ہوئی تھی۔

”یار بے شک پوچھا ہے انہوں نے لیکن پھر بھی وہ مطمئن ہونے والے نہیں، خیر شاید اللہ نے تمہاری دعا سن لی تھی اسی لیے تمہارے لیے نوکری کا سبب بنا دیا۔“

”ہاں یار! میرے لیے تو سبب بن گیا لیکن خیر و بابا کا کیا ہوگا؟ وہ بے چارے تو بے روزگار ہو گئے نا؟“ اسے افسوس ہو رہا تھا۔

”خیر و بابا کی فکر نہ کرو صاحب نے ان کے لیے بڑا اچھا انتظام کر دیا ہے۔“

”انتظام؟ کیا انتظام؟“ منصور حسین کو سمجھ نہ آیا۔

”بڑے صاحب خیر و بابا کو ان کے گوٹھ بھجوا رہے ہیں۔ جہاں ان کے بیٹے پیٹیاں اور پوتے پوتیاں رہتے ہیں وہ بھی اب انہی کے پاس رہیں گے اور ان کو بغیر کوئی کام کیے، گھر بیٹھے ہر مہینے تنخواہ ملتی رہے گی۔ اس طرح ان کا بچپن بھی سکون میں گزرے گا اور ماہانہ خرچ بھی ملتا رہے گا۔“ مبارک خان نے مزید اطلاع دی تھی اور منصور

کے سچ بچ مرعوب ہوا تھا۔

”پھر تو تمہارے بڑے صاحب واقعی نیک آدمی ہیں۔ اپنے ملازموں کے لیے بھی اتنا اچھا سوچتے ہیں، نرم دل رکھتے ہیں سینے میں۔“ منصور حسین تو صیفی لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”ان کے اچھا سوچنے کے لیے ہمارا اچھا بننا ضروری ہے منصور حسین ورنہ لوگ برے کے ساتھ برائی پیش آتے ہیں۔ اور مجھے امید ہے کہ تم اچھے بن کے ہی رہو گے۔“ مبارک خان نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے اسے تھکی دی اور منصور حسین اس کی بات پہ دلچسپی سے مسکرایا تھا۔

”میں ہوں ہی اچھا مجھے بننے کی کیا ضرورت ہے؟“ اس کے دلچسپ انداز پہ مبارک خان بھی مسکرایا تھا اور اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

”کہاں جا رہے ہو؟“

”خیر وہاں کی طبیعت پوچھنے لگتا ہے وہ اکیلے ہیں اس وقت؟“ مبارک خان نے اندازہ لگایا۔

”تو مجھے بھی ساتھ لے چلو میں بھی ان کی عیادت کر لوں گا۔“ منصور حسین کھڑا ہو گیا تھا اور پھر مبارک خان کے ساتھ اپنے کوارٹر سے نکل کر خیر و بابا کے کوارٹر میں آ گیا۔

”السلام علیکم۔“ اس کی بھاری دنگ سی اجنبی آواز پہ خیر و بابا نے چونک کر آنکھیں کھولی تھیں اور مبارک خان کے ساتھ کسی اور کو دیکھ کر انہیں حیرانی ہوئی تھی۔

”السلام علیکم خیر و بابا۔“ مبارک خان قریب آ کے بولا۔

”وعلیکم السلام۔“ انہوں نے نقاہت زدہ آواز میں سلام کا جواب دیا۔

”اب کیسی طبیعت ہے؟“ منصور حسین نے پوچھنے میں پہل کی تھی جبکہ وہ اجنبی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

”یہ منصور حسین ہے خیر و بابا، علیز بے بی کا نیا ڈرائیور۔“ مبارک خان نے ان کی مشکل آسان کی۔

”اچھا اچھا یہ ہے نیا ڈرائیور؟ ماشاء اللہ بڑا گھبرو جوان ہے۔“ انہوں نے بڑی محبت سے اسے دیکھا اور سراہا تھا۔

”شکریہ۔“ منصور حسین نے ان کی ستائش بھری نظروں پہ سر جھکا لیا تھا۔

”اللہ تجھے زندگی دے پتر چرے سے ہی بہادر لگتے ہو“ آئندہ بھی بہادر بن کے ہی رہنا۔“ انہوں نے منصور حسین کو نصیحت کی وہ ان کے قریب ہی کرسی چھینچ کے بیٹھ گیا تھا۔

”میں بہت شرمندہ ہوں آپ سے۔“ اس نے خیر و بابا کے ہاتھ تھام لیے عجبہ واقعی شرمندگی لیے ہوئے تھا۔

”کیوں پتر؟ میرا اور تیرا تو ایسا کوئی واسطہ ہی نہیں کہ تجھے شرمندہ ہونا پڑے۔“ خیر و بابا کو حیرت ہوئی۔

”بس اوپر والا کسی نہ کسی سے کوئی نہ کوئی واسطہ بنا ہی دیتا ہے میں بہت دنوں سے نوکری کے لیے دھکے کھاتا پھر رہا تھا لیکن کہیں کوئی خالی جگہ ہی نہیں مل رہی تھی صاحب نے بھی انکار کر کے مجھے واپس بھیج دیا لیکن اب جب آپ زخمی ہوئے ہیں تو صاحب کو آپ کے بڑھاپے کا خیال آ گیا ہے اسی لیے انہوں نے آپ کے بڑھاپے کی جگہ میری جوانی کو نوکری پہ رکھ لیا ہے۔ میری جوانی اور طاقت سے آپ کا بڑھاپا مات کھا گیا ہے آپ کو ہٹا دیا گیا ہے اور مجھے رکھ لیا گیا ہے خیر و بابا کی جگہ منصور حسین کو اوکے کر دیا گیا ہے۔ اسی لیے منصور حسین کو شرمندگی ہو رہی ہے کہ اس نے آپ کی جگہ لے لی ہے۔“ منصور حسین نے ان کے ہاتھ تھامے اپنی شرمندگی کا جواز پیش کیا تو خیر و بابا اور مبارک خان حیرت سے اسے دیکھنے لگے وہ کتنا حساس ہو رہا تھا ورنہ اسے تو اس نوکری پہ خوش ہونا چاہیے تھا مگر خیر و بابا کا سن کر اس کی خوشی ماند پڑ گئی تھی۔

”یہ کیسی بات کر رہے ہو پتر؟ سب کے اپنے نصیب ہوتے ہیں میں نے اپنے نصیب کا کمال لیا ہے اب تجھے تیرے نصیب کا ملے گا اور ویسے بھی اللہ کسی کا حق نہیں چھوڑتا صاحب نے مجھے نوکری سے الگ کیا ہے مجھے میرے نصیب سے تو الگ نہیں کیا اللہ نے ان کے دل میں رحم ڈال دیا ہے میرے لیے میرے حصے کا رزق مجھے ملتا رہے گا۔“ خیر و بابا بھی بہت صابر و شاکر تھے انہوں نے منصور حسین کی شرمندگی کو کم کر دیا تھا۔

”یہ تو انہوں نے واقعی بہت اچھا کام کیا ہے مجھے سن کر بڑی خوشی ہوئی ہے۔“ منصور حسین نے ان کے بند بے کو سراہا تھا۔

”خوشی تو مجھے بھی بہت ہوئی ہے اچھا ہے اپنے بچوں کے پاس اپنے گوتھ میں رہوں گا ساری عمر شہر میں کام کرتے ہی گزار دی۔“ خیر و بابا نے گہری سانس کھینچی اور اپنا گزر اوقت یاد کرنے لگے منصور حسین کو ان کے پاس بیٹھنا اور باتیں سننا بہت اچھا لگا تھا وہ کافی دیر تک اپنی جوانی کے قصے سناتے رہے اور وہ دونوں سنتے رہے۔



”جو دست۔!“ وہ گاڑی سے اتر کر ڈھیلے ڈھالے قدموں سے چلتے ہوئے روش سے لان کی سیر ڈھیوں کی سمت بڑھ رہا تھا جب لان کے بائیں حصے سے ابھرنے والی کول کی آواز پہ تھک کر رک گیا تھا۔

”کول آیا؟“

وہ اسے غور سے دیکھتے ہوئے پڑھیوں سے اتر کر چھوٹی سی ندی کے پل سے گزر کر لان میں آ گیا تھا۔

”جی ہاں کول آیا۔“ اس نے مراثیات میں ہلا کر اعتراف کیا کہ میں ہی ہوں۔

”زات کے اس پر یہاں کیوں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”یہی سوال اگر میں تم سے کر دوں تو؟“ کول نے جو دست کو سر ہٹا گھورتے ہوئے پوچھا تھا۔

”میں تو لوفر آوارہ ہوں یقیناً اس وقت آوارہ گردی ہی کر کے آیا ہوں گا۔“ اس نے کندھے اچکائے۔

”لگ تو نہیں رہا کہ تم اس وقت آوارہ گردی کر کے آئے ہو۔؟“

”تو پھر کیا لگ رہا ہے آپ کو کہ کیا کر کے آیا ہوں۔“ وہ استہزائیہ ہنسا۔

”تھکے تھکے لگ رہے ہو کیا بات ہے؟“

”آپ بتائیں آپ کیا کھوجنا چاہتی ہیں؟“

”یہی کہ آج تمہاری چال کیوں بدلی ہوئی ہے؟“

”آپ کے خیال میں میری چال کیوں بدلی ہوئی ہے؟“ وہ الٹا اسی سے پوچھنے جا رہا تھا۔

”کوئی لڑکی چھوڑ کر چلی گئی ہے نہیں۔“ کول نے برملا کہہ دیا وہ بہت بری طرح چونک گیا تھا اس کا اندازہ کافی حد تک درست ہی تو تھا۔

”آپ کو کیسے پتا؟“

”تمہاری چال بتا رہی ہے۔“

”کافی تیز نظر ہے آپ کی۔“ وہ مسکرایا۔ ”اسی بات کا تو ردنا ہے۔“ کول نے سر جھٹک کر آہستگی سے کہا۔

”خیر یہ بتاؤ کون چھوڑ کر گئی ہے اور کیوں گئی ہے؟“ اس نے بات ٹال دی۔

”پتھر کر گئی بھی ہے اور نہیں بھی۔“

”ایسا مطلب؟“

”مطلب کہ ابھی اسے صرف دیکھا ہے، ہیلو ہائے نہیں ہوئی، اگر ہیلو ہائے ہو جاتی تو اس طرح چھوڑ کر نہ ہوتی۔“ وہ بات کرتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔

”کون ہے وہ؟“

”کی تو بتا کرنا ہے ابھی اور اسی سوچ نے تو چال کا رنگ بدل دیا ہے۔“

”اے! اے! مالہ ابھی صرف نظروں تک ہے؟“

”نظروں تک نہیں، نظر تک ہے، صرف میری نظر تک، اک نظر کا معاملہ دوسری نظر تک پہنچے تو بھی نظروں کا معاملہ کہلاتا ہے اور فی الحال اس کی نظر میری نظر کے ساتھ شامل نہیں ہے، لیکن ان شاء اللہ بہت جلد شامل ہو ہی جائے گی۔“ جودت شرارت سے کہہ کر ہنسا تھا۔

”برا یقین ہے؟“

”ہاں! کیوں نہیں، جسے خود یہ یقین نہ ہو وہ بھی کوئی آدمی ہے بھلا۔؟“

”اور تمہاری بات سن کے مجھے بھی ایک بات پہ یقین ہو گیا ہے۔“ کومل نے گہری سانس کھینچتے ہوئے کہا۔

”کیسا یقین۔؟“

”یہی کہ جس نے تم سے آج نظر نہیں ملائی وہ تم سے کل بھی نظر نہیں ملائے گی۔“ کومل کے انداز میں یقین تھا جودت سن کر بے ساختہ ہنس دیا۔

”میں پرانے دور کی لڑکی کی بات نہیں کر رہا، آج کے دور کی لڑکی کی بات کر رہا ہوں۔“

”میں بھی آج کے دور کی لڑکی کی بات کر رہی ہوں، اگر وہ واقعی۔“ نظر نہ ملانے والی شریف گھرانے کی لڑکی ہے تو۔“ کومل نے اپنی بات یہ زور دے کر کہا۔

”غلط فہمی ہے آپ کی کومل آبا۔“

”تم خود ہی تو کہتے ہو کہ میری نظر بھی تیز ہے اور اندازہ بھی درست ہے؟“ کومل نے اسے جتایا تھا۔

”ضروری نہیں کہ ہر بار درست ہی ہو؟“ جودت ماننے کو تیار نہیں تھا۔

”اوکے تو پھر ایسا کرنا جب وہ لڑکی تم سے نظر ملائے تم مجھے آکر ضرور بتانا۔“ کومل نے اسے ہلکا چلا چلیج دیا۔

”اوکے منظور ہے۔“

”مگر نہ ملائے تب بے شک نہ بتانا۔“ اس نے اپنی طرف۔ جودت کے سامنے راستہ رکھا۔

”مہوں۔!“ وہ صرف ہوں کر کے رہ گیا تھا۔

”اندر چلو گے؟“ کومل نے اندر جانے کے لیے پر تو لے۔

”ہوں! چلیں۔“ وہ اس کے ساتھ ہی چل پڑا تھا۔

”تھوڑی دیر پہلے ثروت آئی تمہارا ہی پوچھ رہی تھیں۔“

”آپ نے کیا کہا؟“

”یہی کہ تم ابھی تک نہیں آئے۔“ اس نے کندھے اچکائے۔

”پھر انہوں نے کیا کہا؟“

”تمہارے خیال میں کیا کہا ہوگا انہوں نے۔؟“

”برا بھلا۔“

”ہا ہا ہا۔!“ کومل اس کے جواب پہ یکدم کھلکھلا کے ہنسی تھی اور حویلی کی پرسکون خاموش دیواریں اس کی ہنسی کی جگمگاہٹ سے چمک اٹھی تھیں سناٹے میں آواز کا شگاف پڑتا چلا گیا تھا۔

”تمہارا بھی اندازہ درست ہے۔“ اس کی بات پہ جودت بھی ہنس پڑا تھا۔

”اوکے گڈ نائٹ۔“ میڑھیوں کے قریب جا کر وہ رک گیا تھا کومل نے پلٹ کر اسے دیکھا ایک ہاتھ میڑھیوں کے لکڑی سے بنے موٹے سے ستون پہ تھا اور ایک قدم پہلی میڑھی پہ!

”کہاں جا رہے ہو اب؟“

”کچن میں۔“

”ایوں؟“

”ہی! کھانا کھانے اور کیوں؟“

”بہناں سے آرہے ہو وہاں سے کھانا نہیں ملا؟“ کومل نے خفگی سے کہا۔

”ملا تھا، لیکن میں نظر سے نظر ملانے کے چکر میں کھانا کھانا بھول گیا تھا۔ جب ہوش آیا تب سارے مہمان کھانا کھا چکے تھے۔“ جودت نے وجہ بتائی اور کومل خفگی سے گھورتی ہوئی اس کے پیچھے کچن میں ہی آگئی۔

”نیٹھو! میں کھانا نکال دیتی ہوں۔“ اس نے کرسی کی سمت اشارہ کیا اور خود فریج کی طرف بڑھ گئی۔

”آج کل کیا مصروفیات ہیں موصوف کی۔؟“ جودت نے ریموٹ اٹھا کر کارنر میں رکھائی وی آن کر لیا۔

”موصوف؟ کس کی بات کر رہے ہو؟“ وہ فریج سے سالن کا ڈونگا نکال کے پلٹی تو جودت سے پوچھا تھا۔

”اس گھر میں صرف ایک ہی ”موصوف“ ہیں، باقی سب تو لڑکے لڑکیاں ہیں پیاری آپا۔“ وہ چھینٹل سرچ کرتے ہوئے لاپرواہی سے کہہ رہا تھا۔

”مجھے ان کی مصروفیات کی کیا خبر۔؟ خبر تو تمہیں ہونی چاہیے، تم ان کے بھائی ہو۔“ وہ اوون آن کرتے ہوئے بولی۔

”اب مجھے اتنا برا وقت بھی نہیں آیا کہ میں اپنی گرل فرینڈز کو چھوڑ کر آپ کے موصوف کی خبر رکھنے لگوں، یہ کام آپ ہی جتا ہے۔“

”مجھے پتہ کیوں جتا ہے؟ میرا کیا تعلق ان سے؟“ اس نے بے گانگی اور لاپرواہی ظاہر کی۔

”ارے تعلق کیوں نہیں ہے؟ آخر کزن ہیں آپ کے۔“

”وہ صرف میرے ہی کزن نہیں ہیں، اور بھی بہت سے کزن ہیں ان کے۔“ وہ سالن گرم کر کے قریب آگئی۔

”اچھا! تو آپ ان کو ”صرف اپنا“ دیکھنا چاہتی ہیں؟“ جودت نے مطلب نکالا۔

”لیکن افسوس ایسا نہیں ہو سکتا، البتہ ایک حل ہے ان کو صرف اپنا دیکھنے کے لیے۔“ وہ پلیٹ میں سالن نکالتے ہوئے مزے سے بولا، کومل اسے مسلسل گھور رہی تھی۔

”ان کے ساتھ رشتہ بدل لیں، کوئی نیا رشتہ استوار کریں پھر وہ صرف ایک کے۔“

”جودت! آرام۔“ اور خاموشی سے کھانا کھاؤ، رات کے اس پیر بھی تمہاری زبان ایسے چل رہی ہے جیسے دن ایسی شروع ہوا ہو۔“ کومل نے اس کی بات درمیان میں ہی کاٹ دی۔

”کیوں کچھ غلط کہہ دیا میں نے؟“ وہ معصومیت سے بولا۔

”کھانا کھا کر بیوی اور کچن بند کر دینا ورنہ صبح ڈانٹ پڑے گی، میں اب سونے کے لیے جا رہی ہوں۔“ وہ کہہ کے باہر کی سمت چل دی۔

”یہ کیسے کہ میں اب جاگنے کے لیے جا رہی ہوں۔“ اس نے پیچھے سے آواز دی۔

”اب ایسی بھی نوبت نہیں آئی کہ میں کسی کے لیے اپنی نیندیں قربان کرتی پھوں۔“ کومل نے پلٹ کر اسے جواب دیا تھا۔

”آجائے گی نوبت، فکر نہ کیجیے۔“ وہ بلند آواز سے بولا اور کومل مسکرا کر سر جھٹکتی ہوئی باہر نکل گئی تھی۔

”وا! وا! وا! فل۔“ وہ روش پہ سلور کھر کی جگمگاتی کرولا دیکھ کر بے ساختہ خوش ہوئی تھی اور نیل حیات اس کی لہریں لہر کرنا شروع ہو گیا تھا۔

”تھینکس گاڈ! تمہیں پسند تو آئی۔“ اس نے سکون کا سانس لیا تھا۔

”میں اسے ڈرائیو کر سکتی ہوں۔“ وہ گاڑی کے قریب آکر پوچھ رہی تھی۔

”وائے ٹائٹ۔“ نیل حیات نے ہاتھ میں پکڑی چابیوں میں سے ایک چابی نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔

”واؤ! تھینک یو۔“ وہ خوشی سے بہت نارمل ری ایکٹ کر رہی تھی۔

”یو ویلکم۔“ نیل بے ساختہ مسکرایا اور مدیہ گاڑی کا ڈور کھول کر اندر بیٹھ گئی تھی۔

”کہاں جا رہی ہوں مدیہ۔“ قازم بیگم اچانک باہر آئی تھیں اور صبح صبح مدیہ کو گاڑی اشارت کرتے دیکھ کر ٹھٹھکی گئیں۔

”لاہور کی سڑکوں پہ گاڑی اڑانے۔“ اس نے شیشہ فولڈ کرتے ہوئے ماں کو جواب دیا۔

”لیکن اس وقت اس حلیے میں؟“ انہوں نے تعجب سے پوچھا مدیہ ابھی سوکرا تھی اس نے ابھی تھکنے

ایسا وائٹ ڈھیلا ڈھالا ٹراؤزر اور بے بی پنک ہاف سلیو ٹاپ پہنا ہوا تھا۔ پیروں میں پنک کمر کی نرم سی قینچی چپل تھیں اور سیاہ گھٹنے گھنگھریالے بال چہرے کا احاطہ کیے شانوں پہ بکھرے ہوئے تھے وہ اس کا حلیہ دیکھ کر جزبز ہو رہی تھیں۔

”کیوں اس حلیے کو کیا ہوا ہے؟“ اس نے لا پرواہی سے پوچھا۔

”لیکن مدیہ! ٹائٹ ڈریس، ٹائٹ ڈریس ہی ہوتا ہے۔“ چینیج کرلو پھر حلی جانا۔“ قازم بیگم نے اسے ٹوکا تھا۔

”مام پلیز! میرے فریش موڈ کو خراب مت کریں، جینز اور ٹاپ کی بجائے ٹراؤزر اور ٹاپ پہننے میں کیا حرج ہے؟“

”مگر مدیہ۔“

”پلیز نام۔“ اس نے ماں کو روک دیا کہ وہ مزید اعتراض نہ کریں۔

”لیکن جا کہاں رہی ہو؟“

”دل اور بھائی کے گھر۔“ اس نے گاڑی اشارت کرتے ہوئے کہا۔

”لیکن وہ تو گھر پہ نہیں ہے۔“ اب کی بار نیل نے جواب دیا تھا۔

”کیا مطلب؟ کہاں ہیں وہ۔؟“ وہ ٹھٹھکی۔

”وہ کراچی گیا ہے کسی کیس کے سلسلے میں چند دن میں آجائے گا۔“

”مجھے تو تمہیں بتایا انہوں نے۔۔۔؟“

”فون کیا تھا اس نے لیکن تمہارا نمبر بڑی تھا اور اس کی فلائیٹ کا ٹائم بھی ہو چکا تھا۔“

”گئے کب ہیں؟“

”کل شام کو آج شاید اس کے کیس کی پہلی پیشی ہے۔“

”ہوں! اوکے میں ان سے فون پہ بات کر لوں گی۔“ وہ کہہ کے گاڑی اشارت کرتے ہوئے گاڑی نکال لے گئی تھی۔ اور جاتے جاتے ان دونوں کو ہاتھ بھی ہلایا تھا۔

لندن کی سڑکوں پہ تو اس نے بارہا ڈرائیونگ کی تھی لیکن آج اسے لاہور کی سڑکوں پہ ڈرائیونگ کرنے کا شوق

ہو رہا تھا وہ بھی شاید اس لیے کہ نیل، عبداللہ اور دل اور اسے کئی بار یہ بات بتا چکے تھے کہ پاکستان کی سڑکوں پہ

ڈرائیونگ کرنا جان جو کھم میں ڈالنے والی بات ہوتی ہے کیونکہ یہاں ٹریفک کا کوئی نظام نہیں ہے کوئی قانون نہیں

ہے اسی لیے تو پاکستان میں ایکسیڈنٹ زیادہ ہوتے ہیں۔ اسے راستوں کا صحیح پتا نہیں تھا اسی لیے تو گاڑی

بے سمت دوڑا رہی تھی لیکن یونہی بے ارادہ ہی ایک بڑی سی سوئس شاپ دیکھ کر اسے بھوک کا احساس ہوا اور ناشتے

لی ٹوری کے تین بل توغذ میں بھی نہیں جاتے، ہوش تو پھر ہوش ہے گویا انسان نیند میں ہوتا ہے بھی غصے میں ہی رہتا ہے۔" عدیل نے اسے جواب دیا تو وہ دنگ رہ گئی بھی وہ بایک اٹھا کر سیدھی کرنے لگا اور پھر اسے اشارت کرتے ہوئے سوار ہو گیا تھا۔

"ایم سوری میم میری جیسے اس وقت واقعی خالی ہیں۔ اگر بھری ہوتیں تو آپ کا نقصان کھڑے کھڑے ہی پورا کر دیتا۔ خیر پھر بھی ٹکرایے گا تب آپ کا سارا نقصان پورا کر دوں گا اور آئندہ کوشش کروں گا کہ میری جیسے بھری رہیں ورنہ کل کو آپ جیسی کوئی اور حسینہ غریبی کا طعنہ دے کر دھتکار دے گی۔" وہ بایک لے کر اس کے پاس سے گزر کر آگے بڑھ گیا تھا مدحیہ ہکا بکا کھڑی تھی ابھی اس نے اپنے قدم واپس موڑے ہی تھے کہ وہی بایک اس کے قریب دوبارہ آ کرکی تھی۔

"ایک بات کہنا تو بھول ہی گیا کہ آپ بے شک لندن پلٹ ہیں لیکن اپنے لندن پلٹ ہونے کا یوں پرچار تو مت کیجیے۔" اس نے مدحیہ کے ٹاپ کی طرف اشارہ کیا اس کا ٹاپ بے حد ٹائٹ تھا اور اس کے فرنٹ بہ بڑے بڑے حروف میں یو کے لکھا ہوا تھا جو دیکھنے والے کو پہلی نظر میں ہی اپنی طرف متوجہ کر لیتا تھا جیسے عدیل کو گیا تھا لیکن وہ نظر چڑا گیا تھا مدحیہ ضروری تو نہیں تھا کہ ہر دیکھنے والا نظر چڑا لیتا؟

"اصل یو کے تو پاکستانی ہی مشکل سے دیکھ پاتے ہیں، لیکن اس یو کے کو ہر کوئی دیکھے گا، کسی کی نظر کو دیزے کی ضرورت نہیں پڑے گی، اس لیے احتیاط کیجیے اللہ حافظ۔" وہ کہہ کے بایک کو کک لگاتا ہوا ہو گیا اور مدحیہ غصے سے لال بڑ گئی تھی اس نے بل کھا کے اپنی ہی گاڑی کو ٹھوکر دے ماری تھی۔

"باسٹرڈ! مجھتا کیا ہے اپنے آپ کو؟ ایڈیٹ۔" مارے غصے کے جو اس کے منہ میں آیا کہتی گئی۔

کسی نئی جگہ پہ ہونے کی وجہ سے رات بھر نیند کا تسلسل نہیں بن سکا تھا وہ تھوٹے تھوٹے وقفے سے نیند ٹوٹتی رہی اسی لیے وہ فجر کے وقت ہی اٹھ گیا تھا اچھلے ڈھالے قدموں سے کوارٹر کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا تھا اس کا راز یہاں بڑی ٹک جانے کا تھا اسی لیے وائس سائیڈ میں بنے کوارٹرز اور وسیع لان عبور کر کے روش۔ آیا تو قدم تھم گئے تھے گاڑیوں کی لمبی قطار لگی ہوئی تھی اور اس قطار میں بلیک مرسیڈیز یوں جگمگا رہی تھی جیسے انجینی شوروم سے لا کر کھڑی کی ہو۔ اس کی چمک دمک ہی زالی تھی۔

"یہ علیزے لی بی کی نئی گاڑی ہے، رات ہی شوروم سے آئی ہے، تم ہی نے یہ گاڑی ڈرائیو کرنی ہے۔" مبارک خان اس کے عقب سے نکل کر سامنے آیا تو اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تھا اور اسی لیے اسے گاڑی کا تعارف کروا دیا تھا۔

"یعنی زیرو میٹر ڈرائیو کروں گا؟" منصور حسین مسکرا کر بولا۔

"بالکل جی ہمیشہ ہیں تمہارے۔" مبارک خان نے کندھے اچکائے۔

"پرانی چیز یہ عیش کیسے بات؟" اس نے گاڑی کی وینڈاسکرین پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"بے شک پرانی ہے۔ لیکن اختیار تو تمہارا ہی چلے گا نا؟ تمہارے پاس رہے گی تو تمہاری ہی نظر آئے گی۔"

"چل بار دل کو بھلانے کے لیے خیال اچھا ہے۔" منصور حسین سر جھٹک کر ہنسا اور مبارک خان کے ساتھ گیت سے نکل آیا تھا۔

"السلام علیکم۔" چوکیدار عارف نے ان دونوں کو دیکھ کر سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام! کیسے ہو؟" منصور حسین بڑی تمیز سے پوچھ رہا تھا۔

کا خیال آیا تھا اور اسی خیال کے تحت اس نے گاڑی کو یکدم بریک لگائے تھے اس کی گاڑی کے بائزر چرچرا کے رہ گئے۔ لیکن ساتھ ہی یکدم ایک "ٹٹھا" کی آواز کے ساتھ مدحیہ کی گاڑی بل کے رہ گئی تھی خود مدحیہ ڈیش بورڈ سے ٹکراتے ٹکراتے بجی تھی۔ اس نے پیچھے گردن موڑ کر دیکھا کسی لڑکے نے اس کی گاڑی کو اپنی بایک دے ماری تھی۔ وہ دیکھ کر غضب ناک ہوئی ہوئی خوشخوار تیور لیے اپنی گاڑی سے نکل آئی اور گاڑی کے سامنے سے گھوم کر وندائی ہوئی پیچھے کی طرف آئی تھی۔

"ایڈیٹ! اندھے ہو گئے ہو؟ تمہیں اتنی بڑی گاڑی دکھائی نہیں دی؟" سلوکی بایک کو سنبھالتے عدیل نے اسے تیز آواز پر چونک کر اسے دیکھا۔ نظریں ٹھٹھکی گئی تھیں۔ اس کے سامنے غضب کا حسن تھا یا غضب کی جوانی تھی وہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا۔

"کتاب تمہیں سنائی بھی نہیں دے رہا؟" وہ تلملا کر بولی تھی۔

"غلطی آپ کی ہے میم، میرا تو کوئی قصور نہیں ہے۔" عدیل نے معصومیت سے کہتے ہوئے کندھے اچکائے۔

"میری غلطی۔؟ تم ہوش میں تو ہو؟ میں نے کہا تھا کہ میری گاڑی کو بایک دے مارو؟"

"میم! آپ نے یہ بات کہی نہیں ہے لیکن اس پر عمل ضرور کیا ہے، بیچ سڑک میں اچانک بریک لگانا اپنے ایکسیڈنٹ کے ساتھ ساتھ کئی اور ایکسیڈنٹ کروانے کے مترادف ہے، ابھی تو شکر ہے کہ میرے پیچھے اور کوئی گاڑی نہیں آرہی تھی۔ ورنہ مجھے کچلتے ہوئے آپ کو بھی اڑا کے لے جاتی۔" عدیل نے اسے اچانک بریک لگانے کا نقصان بتایا۔

"مجھے ٹالو مت، تم نے میری گاڑی کا نقصان کیا ہے۔ نقصان پورا کرو۔" اس نے چٹکی بجاکے اسے اشارہ کیا تھا۔

"اور جو میرا نقصان ہوا ہے وہ کون پورا کرے گا۔؟" عدیل بایک کو دیکھ کر بولا۔

"آئی ڈونٹ نو، لیکن میں تمہیں ایسے نہیں جانے دوں گی، میری نئی ٹیوٹر، زیرو میٹر گاڑی برباد کر ڈالی ہے تم نے۔"

"آپ کو کس نے کہا تھا کہ زیرو میٹر گاڑی لے کر کے صبح صبح روڈ پہ آجائیں۔؟" عدیل آج خلاف مزاج بول رہا تھا۔

"مجھے زیرو میٹر گاڑی لے کر روڈ پہ آنے کے لیے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ سمجھتے تم؟" اس نے انگلی اٹھا کر غصے سے کہا تھا۔

"جی سمجھ گیا، آپ دیکھنے میں ہی خدائی فوجدار لگ رہی ہیں، آپ کو بھلا کس کی اجازت کی ضرورت ہے۔؟"

"اوہ پوشت! یہ۔؟" وہ عدیل کے استہزاء پر اندازہ سلگ اٹھی تھی۔

"کچھ اور نہیں کر سکتے تو کیا اس بھی نہ کرو، میں تو تمہاری شکل دیکھ کر ہی پہچان گئی تھی کہ تم کتنے پانی میں ہو؟ بس بایک۔ سوار خالی جیسے لے کر ہیرو بنے پھر رہے ہو، میرا نقصان بھلا کہاں سے پورا کرو گے؟" مدحیہ نے اس کو شرمندہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

"آپ کی غلط فہمی سے میم! میں بایک پہ سوار ہیرو بننے کی ہرگز کوشش نہیں کر رہا تھا۔ بس یہ بایک کسی سے ایک دن کے لیے ادھار مانگی تھی وہی دینے جا رہا تھا کہ آپ بیچ میں آ گئیں ویسے جو کچھ آپ کہہ رہی ہیں اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں ہے، وہ کیا کہتے ہیں کہ خدا جب حسن دیتا ہے تو نزاکت آتی جاتی ہے۔ امیر لوگ غریبوں پہ غصہ بھی نہ کریں تو اور کیا کریں؟ پھر انہیں امیر کون کہے گا بھلا۔؟ اور انسان کے غصے کا کیا ہے، کہتے ہیں کہ انسان

”ٹھیک ہوں۔“ اس نے مختصر سا کہا۔

”لگتا ہے ناراض ہو مجھ سے۔“ اس کی بات پر مبارک خان مسکرا ہٹ دیا گیا تھا۔

”میں نے کیوں ناراض ہونا ہے بھلا؟“ عارف نے کندھے اچکائے۔

”چلو جو بھی ہے ایسا کرو کہ پچھلی خفگی والی باتوں کو بھول کر آج سے دوستی کر لیتے ہیں اب تو ہم لوگ نے ساتھ ہی رہنا ہے۔“ منصور حسین نے عارف کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”ہوں! یہ بھی اچھی بات ہے عارف کر لو دوستی منصور حسین دل کا برا نہیں ہے بس غصے کا اور زبان کا تیز ہے۔“ مبارک خان نے ہاں میں ہاں ملائی اور عارف نے جزیبہ ہوتے ہوئے منصور حسین سے ہاتھ ملا لیا تھا۔

”شام شا۔“ مبارک خان نے اسے پھکی دی۔

”مبارک خان۔!“ آذر جاگنگ کے لیے نکلا تو گیٹ پر آج پھر ان لوگوں کو کھڑے دیکھ کر ٹھٹک گیا تھا۔

”جی صاحب؟“

”یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے۔“

”کچھ نہیں صاحب! ابھی ابھی سوکراٹھے ہیں تو باہر زرا تازہ ہوا کھانے کے لیے آگئے۔“

”تازہ ہوا کھانے کے لیے تم لوگوں کو گیٹ کے سوا کوئی اور جگہ نہیں ملی؟“ اسے ان سب کا گیٹ پر کھڑے ہونا اچھا نہیں لگا تھا۔

”صاحب ہم پارک تک جانے والے تھے کہ عارف کو دیکھ کر اس کے پاس رک گئے۔“ مبارک خان صفائی پس کر رہا تھا۔

”ٹھیک ہے جہاں جانا ہے جاؤ لیکن یہاں لوگوں کی طرح کھڑے ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اس پاس کے لوگ دیکھیں گے تو کیا سوچیں گے؟“ آذر نے اسے جھڑک دیا تھا۔

”جی صاحب ابھی چلے جاتے ہیں۔“ مبارک خان نے سر جھکا کر کہا۔

”ہوں! جاؤ۔“ اس نے سر ہلایا اور پھر زرا ٹھہر کر انہیں دیکھا۔

”رکو! ادھر آؤ۔“ اس نے ان دونوں کو ہاتھ کے اشارے سے قریب بلایا تھا۔

”تم کون ہو۔“ آذر نے چند روز پہلے بھی اسے گیٹ پر دیکھا تھا لیکن نام بھول گیا تھا۔

”جی! میں منصور حسین ہوں۔“

”کون منصور حسین؟“

”علیٰ علی نے لی لی کا نیا ڈرائیور ہے یہ منصور حسین۔“ مبارک خان ہر بار اس کی مشکل آسان کر دیتا تھا۔

”علیٰ علی کا ڈرائیور؟“ آذر کو حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔

”لیکن علیٰ علی کا ڈرائیور۔“ آذر کچھ کہتے کہتے رک گیا تھا۔

”بڑے صاحب نے اسے کام پر رکھا ہے علیٰ علی کی حفاظت کے لیے پستول بھی دیا ہے۔“

”ہیں۔۔۔؟ یہ سب کیا چکر ہے؟“ آذر سوچ میں پڑ گیا تھا۔

”ہم جا میں صاحب؟“

”ہوں۔“ وہ محض سر ہلا کے رہ گیا تھا۔ منصور حسین اور مبارک خان چلے گئے جبکہ آذر جاگنگ جانے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے اندر آگیا تھا اس کا رخ آنی اور ڈیڈ کے کمرے کی طرف تھا۔ وہ دستک دے کر اجازت ملنے کا انتظار کرنے لگا۔

”یس کم ان۔“ وقار آفندی کی آواز سنائی دی تھی آذر دروازہ کھیل کر اندر آگیا تھا۔

”السلام علیکم۔“

”و علیکم السلام! خیریت تم اس وقت یہاں؟“ نہیں صبح صبح آذر کو اپنے بیڈ روم میں دیکھ کر حیرانی ہوئی تھی۔

”جی خیریت ہی ہے آپ آرام سے تیاری کر لیں میں انتظار کر لیتا ہوں۔“ وہ صوفے کی طرف بڑھ گیا۔

”میری تیاری ہوئی رہے گی۔ تم بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟“ وہ اپنا کوٹ اور ٹائی بیڈ پر ڈال کے اس کے سامنے آ بیٹھ۔

”آپ نے علیٰ علی کے لیے ڈرائیور رکھ لیا ہے؟“

”ہوں! رکھ لیا ہے۔“

”مطمئن ہیں آپ؟“

”آف کورس بیٹا! مطمئن ہوں تبھی تو رکھا ہے۔“

”لیکن ڈیڈ ایم سوری میں مطمئن نہیں ہوں۔“ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

”غیر مطمئن ہونے کی وجہ؟“

”بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں آپ بس اسے فارغ کریں ہم کوئی اور ڈرائیور رکھیں گے۔“ آذر کے لمبے میں خفگی اور ناگواری تھی۔

”تو وہ وجوہات بیان کرونا بیٹا! بغیر کسی ٹھوس وجہ کے میں اسے نہیں نکال سکتا کام پر رکھا ہے اسے زبان دی ہے کل سے آیا ہوا ہے، حویلی میں رات گزار چکا ہے اب صبح اٹھ کر بغیر کسی وجہ کے میں اسے کہہ دوں کہ ہم تمہیں کام پر نہیں رکھ سکتے تم اپنا بوریا بستر سمیٹو اور چلتے پھرتے نظر آؤ کیا یہ سب اچھا لگے گا۔؟“ انہوں نے آذر کو سمجھانے کی کوشش کی اور آذر انہیں سمجھانے کی کوششوں میں تھا۔

”دیکھیے ڈیڈ! میں اتنے جوان جہان مرد کو کام پر رکھنے کے حق میں نہیں ہوں گھر میں جوان بیٹیاں ہیں اور علیٰ علی سے کیا وہ اکیلی اس کے ساتھ آیا جایا کرے گی؟“ اس کی ایک وجہ سن کر وقار آفندی بے ساختہ مسکرا دیے تھے۔ انہیں اس کی بات سمجھ آگئی تھی کہ اصل مسئلہ منصور حسین کی جوانی ہے۔!

”دیکھو بیٹا میں نے اسے اسی لیے کام پر رکھا ہے کہ وہ ”جوان جہان مرد“ ہے اگر خدا نا خواستہ پھر علیٰ علی پر کوئی حملہ ہو جاتا ہے تو وہ ڈٹ کر دشمن کا مقابلہ تو کر سکتا ہے نا؟ خیر وہ بابا بوڑھے اور کمزور تھے انہیں تو یہ بھی بتا نہیں چلا کہ حملہ آور ہی انہیں اٹھا کر ہسپتال لے جا رہا ہے، منصور حسین جوان اور بہادر مرد ہے میں نے اس کی چند باتوں سے اسے جج کیا ہے وہ بے خوف اور نڈر ہے، مشکل وقت پڑ گیا تو جھکے گا نہیں، ڈٹ جائے گا، تم بے فکر رہو، رہی بات اس کے جوان ہونے کی تو ایک بات یاد رکھو شریف اور ایماندار آدمی کا جوانی کبھی کچھ نہیں بگاڑ سکتی، اور وہ مجھے ایماندار لگا ہے۔“ وقار آفندی نے آذر کو تفصیل سے سمجھاتے ہوئے تسلی دی تھی۔

”ڈیڈ! کسی کے ماتھے پر نہیں لکھا ہوتا کہ وہ ایماندار ہے۔“

”لیکن بیٹا! ایماندار کی آنکھوں میں ضرور لکھا ہوتا ہے کہ وہ ایماندار ہے، ایماندار کی آنکھ کبھی نہیں جھکتی، میں نے منصور حسین کی نظر جھکتے ہوئے نہیں دیکھی۔“

”آپ اس کے اتنے حامی کیوں ہو رہے ہیں؟“

”بیٹا! اس کے خلاف ہونے کی وجہ بھی تو نہیں ہے؟“

”گویا آپ اسے کام سے نہیں نکالیں گے؟“

”یقیناً۔“ ان کے جواب پر آذر لب بٹھکتے ہوئے کھڑا ہو گیا تھا۔

”مبارک خان کو کام پر رکھتے ہوئے بھی تمہیں ایسے ہی وہم اور اعتراض ہوئے تھے اور آج وہی مبارک خان

ہے جس پہ ہمیں تمام ملازموں سے زیادہ اعتماد ہے اور اس کے بغیر ہمارے سارے کام ادھورے ہیں۔“ وقار آندی نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اس کا کندھا تھپکا تھا۔

”لیکن ڈیڈ۔“

”پلیز مائی سن! چند روز اس کا کام دیکھو، اس پہ چیک رکھو، پھر کچھ برا لگے تو بے شک کام سے نکال دیتا، بس چند دن میری زبان کا پاس رہنے دو۔“ انہوں نے کچھ اس انداز سے کہا کہ آذر مزید کچھ نہ کہہ سکا۔

”وقار! اتالیق کیوں ہو گئے ہیں آپ؟ ناشتا لگ چکا ہے، علیزے اور۔۔۔“ آسیہ آندی اپنے دھیان میں بولتی ہوئی اندر آئی تھیں لیکن ان کے ساتھ آذر کو دیکھ کر رگ گئی تھیں۔

”گڈ مارننگ۔“ آذر نے آہستگی سے انہیں دس کیا۔

”ٹو یو مائی سن! کیا بات ہے تم اس وقت یہاں۔؟“ وہ صبح صبح اسے اپنے کمرے میں دیکھ کر پریشان ہوئی تھیں۔

”ڈونٹ وری! کسی کام سے آیا تھا، اوکے ڈیڈ چلتا ہوں اب۔“ آذر نے آسیہ آندی سے کہہ کر وقار آندی سے کہا تھا۔

”اور ناشتا۔؟“ آسیہ آندی نے پیچھے سے آواز دی۔

”جی میں آ رہا ہوں بس شاور لے کر تیار ہو جاؤں۔“ اس نے پلٹ کر جواب دیا اور باہر نکل گیا تھا۔

”وقار کیا بات ہے؟ کوئی پریشانی کوئی مسئلہ ہے کیا؟“ آسیہ آندی کو بھی اب ہر وقت کھٹکائی لگارتا تھا۔

”ارے! اس نے تمہیں بتایا تو ہے کہ کوئی بات نہیں ہے، بس کسی کام سے آیا تھا۔“ وہ اپنی ٹائی اٹھا کر آئینے کے سامنے آکھڑے ہوئے تھے، آج ان کی میننگ تھی اسی لیے کافی اہتمام سے تیار ہو رہے تھے۔

”آپ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں۔“

”اگر تم ایسا سمجھ رہی ہو تو ایسا ہی سہی۔“ وہ ذرا متبسم سے انداز میں بولے تھے۔

”وقار! میں واقعی پریشان ہو رہی ہوں۔“ انہوں نے خفگی سے کہا تھا۔

”مجھے حیرت ہو رہی ہے یہ دیکھ کر کہ وقار آندی کی بیوی اتنی بے وقوف اور کم عقل بھی ہو سکتی ہے۔؟ وہ ٹائی کی ناشتہ درست کرتے ہوئے آسیہ آندی کی طرف پلٹے۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ وہ نا سمجھی سے دیکھ رہی تھیں۔

”کم عقل خاتون! اگر علیزے کے حوالے سے کوئی پریشانی والی بات ہوتی تو کیا میں تمہیں اس طرح بے فکر اور ریلیکس نظر آتا۔“ انہوں نے آسیہ آندی کے کندھوں پہ ہاتھ رکھ کر جس قدر پر سکون انداز میں کہا وہ واقعی مطمئن ہو گئی تھیں۔

”شکر ہے اللہ کا، ورنہ میں تو ڈر ہی گئی تھی۔“

”کم عقل جو ہو۔“ وہ مسکرا کر بولے۔

”محبت کم عقل بنا دیتی ہے۔“ آسیہ آندی کہہ کر پیچھے پیٹ گئیں اور وہ مسکراتے ہوئے باہر نکل آئے تھے وہ پیچھے ان کا کوٹ اور بریف کیس بھی اٹھا کے نیچے لے آئی تھیں۔



وہ دیکھو م سے قالین اور کارپٹ صاف کر کے فارغ ہوئی ہی تھی کہ باہر ڈور بیل بجنے لگی، کچن میں جانے کا ارادہ ملتی کرتے ہوئے وہ مختصر سا کوریڈور عبور کر کے بیرونی مین ڈور کے پاس آگئی اور ہول سے دیکھتے ہوئے باہر جھانکا تھا۔ سامنے نگارش کا چہرہ نظر آیا تھا زری کھل اٹھی تھی اس نے جھٹ سے دروازہ کھول دیا تھا۔

”بھابھی۔“ اس نگارش کو اندر بھی نہ آنے دیا اور وہیں اس سے پلٹ گئی تھی۔

”اللہ خیر کرے، کب ہو گیا ہے؟ اتنی بے قرار کیوں؟“ نگارش نے حیرانی سے اسے پھپکتے ہوئے پوچھا۔

”آئی ریٹکی مس! زری نے بچوں کی طرح بڑی معصومیت سے اظہار کیا تھا۔

”ریٹکی۔؟“ نگارش نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا۔

”آف کورس۔“ ان نے اثبات میں سر ہلایا۔

”یقین تو نہیں آ رہا،“ نگارش بے یقینی سے کہتی ہوئی اندر آگئی عبد اللہ اسے گھر ڈراپ کر کے کام پہ چلا گیا تھا۔

”بے یقینی کی وجہ یہ کہہ سکتی ہوں۔؟“

”جو بندہ ہر وقت لکھ، ہر آن کسی ایک کی یاد میں قید رہتا ہو، اس سے یہ توقع کیسے کی جاسکتی ہے کہ وہ کسی دوسرے کے لیے اس کے حصار سے باہر آیا ہو گا؟ اسے ایک یاد سے فرصت ملے گی تو وہ دوسرے کو ٹائم دے گا نا؟“ نگارش سچ ہی تو کہہ رہی تھی، لیکن جھوٹی تو زری بھی نہیں تھی۔ اس نے حقیقتاً اسے بہت مس کیا تھا۔

”یعنی میں آپ سے جھوٹ بول رہی ہوں۔؟“ زری کا انداز خفگی لیے ہوئے تھا۔

”غیر جھوٹ تو تم نہیں بول رہی، لیکن سچ ماننے یہ دل آمادہ بھی نہیں ہے۔“ نگارش نے کندھے اچکائے۔

”جائیے میں آپ سے نہیں بولکتی۔“ وہ ناراضی سے پلٹ کر کچن میں چلی گئی۔

”ارے میری جان اس میں ناراضی والی کیا بات ہے؟ جو سچ ہے وہی تو کہا ہے، تم اسے یاد کرتی ہو تو اپنا آپ بھول جاتی ہو، پھر کیسے کہہ سکتی ہو کہ تمہاری یادوں کی راہ گزر سے ہم غریبوں کا بھی گزر ہو سکے۔؟“ نگارش نے آکر اس کے رخسار کو چھو کر اسے پھیڑا تھا۔

”ایسی بات نہیں ہے بھابھی، جو مقام آپ کا ہے، وہ صرف آپ کا ہے، محبت اپنی جگہ اور رشتے اپنی جگہ۔ اور ضروری نہیں کہ جس راہ گزر سے ایک گزرے اس سے دوسرا نہ گزرے، آخر راہ گزر کا نام کیا ہے؟ راہ گزر۔ یعنی اس سے کبھی بھی گزر سکتا ہے، سب کے لیے یکساں ہوتی ہے، آپ گزرو، وہ گزرے، کوئی اور گزرے، بس فرق اتنا ہے کہ کبھی بھی کوئی گزرنے والا اپنے قدموں کی دھمک چھوڑ جاتا ہے وہ بھی ایسا ہی گزرنے والا ہے جو اپنے قدموں کی دھمک بوڑ گیا ہے۔“ زری دھیمے سے بولی رہی تھی اور نگارش اس کی بات کی گہرائی میں کھوسی گئی تھی۔

”کتنا خوش قسمت ہے دل اور شاہ۔“ نگارش کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔

”بھابھی۔؟“ زریوں بیا بگ دہل اس کا نام سن کر لرز گئی تھی۔

”کب تک چھپاؤ گئی؟“

”جب تک وہ چھپے۔“

”وہ ساری عمر چھپے؟“

”تو میں ساری عمر چھپوں گی۔“

”زری کبھی گہرائی جا کر سوچا ہے تم نے کہ اگر کبھی خلاف آرزو کچھ ہو گیا تو؟“ نگارش نے ڈرتے ہوئے سوال کیا تھا۔

”تو دنو موجی کی زلزلہ کی یاد ہے مجھے۔“

”پاگل ہو گئی ہو کیا؟“

”سیانے جب کسی ایسا نا سمجھنا چھوڑ دیتے ہیں تو وہ پاگل ہی ہو جاتا ہے۔“ زری نے سر جھٹکا، نگارش اس کی بات پہ اسے دیکھتی رہ گئی۔

”تم ہوش میں تو ہو۔۔۔؟“

”آپ جانتی بھی ہیں کہ جب وہ میرے حواسوں پہ طاری ہوتا ہے تو میرے ہوش میرے ساتھ نہیں رہتے۔“ وہ کچن سمیٹتے ہوئے ہلکے سے مسکرائی۔

”کسی سے اندھا دھند محبت کرتے ہوئے یہ بات بھی نظر میں رکھنی چاہیے کہ جس سے تم محبت کرتے ہو وہ کس سے محبت کرتا ہے؟ آپ سے؟ یا آپ کے کسی رقیب سے؟“ نگارش نے سمجھانے کے لیے دلیل دی۔

”وہ میرے سوا کسی اور سے محبت نہیں کر سکتا۔“

”اتنا یقین کس بات پہ ہے؟“

”میں نے اس کی کاٹھ دار آنکھوں کو کئی بار اپنے لیے جھکتے ہوئے دیکھا ہے۔“

”ہو سکتا ہے تمہارے احترام میں جھک جاتی ہوں۔؟“

”ہرگز نہیں! وہ میری محبت کے بوجھ سے جھک جاتی ہیں۔“

”تو پھر ابھی تک اس نے کوئی پیش رفت کیوں نہیں کی۔؟“ نگارش وہموں میں پڑی ہوئی تھی۔

”شاید اس لیے کہ اسے پتا ہے کہ زری صرف اسی کی ہے جب بھی ہاتھ بڑھائے گا کھنچی چلی آئے گی۔“ آج زری کی سرشاری اس کے انگ انگ سے بول رہی تھی۔

”کیا بات ہے؟ میرے پیچھے کوئی خاص بات ہوئی ہے کیا؟“ نگارش اسے بغور دیکھتی ہوئی پاس چلی آئی تھی۔

”آپ بیٹھیں میں آپ کے لیے چائے بنااتی ہوں۔“ زری نے الیکٹرک کپل آن کرتے ہوئے کہا۔

”اوہ! یعنی واقعی کوئی بات ہوئی ہے؟“ نگارش کو سسٹل مل گیا تھا۔

”کوئی بات نہیں ہوئی بھابھی جی۔“

”کوئی تو بات ہوئی ہے نندیتی! سرخ ہونٹوں پہ گلابی تبسم محبوب کی کسی اور کی شافی معلوم ہوتا ہے خاموش ہونٹوں پہ مسکراہٹ بے معنی نہیں ہوتی۔“ نگارش نے ٹھوڑی سے پکڑ کر اس کا چہرہ سامنے کیا تھا۔ زری نہ پلکیں اٹھا سکی اور نہ ہی اپنی مسکراہٹ روک سکی تھی۔

”بتاؤ بھی۔“ اس نے اصرار کیا۔

”اس کا فون آیا تھا۔“

”ہیں۔؟“ نگارش اچھل پڑی تھی۔

”کب؟“

”دو دن پہلے۔“

”فون کس لیے آیا تھا؟ کیا کہا اس نے؟“

”کہا تو کچھ نہیں سوائے اس کے کہ مدحیہ مجھ سے بات کرنا چاہتی ہے۔“ وہ دھیمے سے بولی۔

”مدحیہ بات کرنا چاہتی ہے؟ کیا مطلب ہے اس کا؟“

”مدحیہ اور نبیل اس کے ساتھ ہی تھے مدحیہ مجھ سے بات کرنا چاہتی تھی لیکن اس کے پاس اپنا سیل نہیں تھا اس لیے مدحیہ نے اس کے نمبر سے مجھے کال کی“ اتنی دیر میرا سیل بجتا رہا اور اسکرین پہ اس کا نام جگمگاتا رہا میں دیکھتی ہی رہی اور کال بند ہو گئی پھر اس نے دوبارہ کال کی میں نے ڈرتے ڈرتے ریسیو کی تو دوسری طرف وہی پھاری گھیسر آواز تھی جو دل کے نہاں خانوں میں ہر لمحہ گونجتی رہتی ہے۔“ زری اس کا ذکر نہیں کرتی تھی ورد کرتی تھی ایک دن میں لاکھوں بار۔!

”بس اتنی سی بات تھی۔۔۔؟“ نگارش مایوس ہو گئی۔

”یہ اتنی سی بات ہے؟“

”تو اور کیا ہے؟“ نگارش گھور کے بولی۔

”بہت کچھ ہے میرے لیے میں نے اس کی اور اس نے میری آواز تو سنی ہے نا؟“

”صرف آواز سنی ہے بات تو نہیں کی نا؟“

”بات کا کیا ہے وہ تو ہم دونوں میں ہزاروں بار کرتے ہیں۔“ وہ آہستگی سے مسکرائی۔

”اف! ایک تو تم اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی پاگل کر دی۔“ نگارش نے اپنا ماتھا پیٹ لیا تھا۔

”بھابھی! محبت تو آپ نے بھی کی ہے ایسا پاگل پن آپ پہ کیوں سوار نہیں ہوا۔؟“ وہ معصومیت سے سادگی سے پوچھ رہی تھی۔

”کیونکہ میں تمہاری جیسی بے وقوف نہیں تھی۔“

”میں بے وقوف ہوں؟“ زری آنکھیں پھیلا کر بولی۔

”تو سیاتی کہاں سے ہو؟“

”یہاں سے۔“ اس نے اپنے دل پہ ہاتھ رکھ دیا۔

”اوکے اوکے تم جیتیں میں ہاری جلدی سے چائے لے آؤ میرا سر درد کرنے لگا ہے۔“ نگارش اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھتی ہوئی باہر نکل گئی تھی اور زری اس کے انداز پہ یکدم کھلکھلا کر ہنسی تھی اور دوپوں میں چائے انڈیل کر باہر اس کے پیچھے ہی چلی آئی تھی۔

”میری محبت کی تذکرے یہ ہی آپ کا سر درد کرنے لگا ہے؟“ وہ اسے کپ تھماتی ہوئی بولی۔

”تمہاری محبت آگے نہیں بڑھ رہی بس یہی سوچ سوچ کر سر درد کرنے لگا ہے کوئی نشوونما نہیں ہو رہی اس کی۔“ نگارش کی بات نہ زری کی ہنسی چھوٹ گئی تھی۔

”یہ کس چیز سے تشبیہ دے دی میری محبت کو۔“ اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

”بچے سے۔“ اس کا جواب مختصر تھا۔

”بچے سے؟“ زری کو اچنبھا ہوا۔

”بچہ پیدا ہوتا ہے محبت بھی پیدا ہوتی ہے بچہ آنکھیں کھولتا ہے تو دنیا کو دیکھتا ہے محبت آنکھیں کھولتی ہے تو محبوب کو دیکھتی ہے بچہ دنیا کو دیکھ کر روتا ہے ڈاویل کرتا ہے محبت محبوب کو دیکھ کر مسکراتی ہے لجائی ہے پھر بچہ بڑا ہونے لگتا ہے پھر محبت بھی بڑھنے لگتی ہے بچہ سالوں میں بڑا ہوتا ہے محبت دنوں میں بڑھتی ہے دونوں کے قد نکلنے لگتے ہیں پاؤں پاؤں چلنے لگتے ہیں بچے کی ضدیں بڑھتی ہیں اور محبت کی خواہش بڑھتی ہے دونوں کو دیکھو تو ایک جیسے ہی دکھائی دیتے ہیں ضدی بھی اور معصوم بھی۔ بچوں کی نشوونما رک جائے تو ماؤں کو فکر ہو جاتی ہے ڈاکٹر ز کو دکھائی ہیں ان کی خوراک بڑھانی ہیں۔ اسی لیے تم سے کہہ رہی ہوں تمہاری محبت کی نشوونما رکی ہوئی ہے اس کو ڈاکٹر کو دکھاؤ اور خوراک بڑھاؤ۔“ نگارش نے اسے طویل مثال دی اور ساتھ میں مشورہ مفت۔!

”کون ڈاکٹر؟“ زری نے نا سمجھی سے پوچھا۔

”ڈاکٹر دل اور شاہ۔“

”واٹ؟ ڈاکٹر دل اور شاہ؟“

”آف کورس یار! بے شک وہ وکیل ہے لیکن تمہارے مرض کا وہی ڈاکٹر ہے اسے اپنی محبت کا مرض دکھاؤ“ ان کا بیان کرو وہ خوراک بڑھا دے گا باہمی مشورے سے بڑا فائدہ ہو گا تمہیں دیکھ لینا۔“

”بھابھی کیا کہنا چاہتی ہیں آپ؟“
”میں چاہتی ہوں کہ تمہارا علاج شروع کیا جائے۔“

”علاج؟“

”مطلب شادی۔“ نگارش نے علاج کے لفظ کا مفہوم بتایا۔

”مگر بھابھی۔“

”بس کوئی اگر مگر نہیں میں آج عبد اللہ سے ضرور بات کروں گی۔“

”لیکن ابھی یہ سب مناسب نہیں ہے بھابھی۔“ زری پریشان ہوا تھی۔

”غیر مناسب بھی نہیں ہے، محبت کے کسی بھی معاملے میں دیر نہیں کرنی چاہیے، تمہیں کیا پتا۔ محبوب کتنے جلد باز ہوتے ہیں۔؟“

نگارش نے اسے سمجھایا تھا۔

”مگر وہ بی بی جان اور بابا جان۔؟“ زری متفکر تھی۔

”ان کو عبد اللہ ہینڈل کر لیں گے، ڈونٹ ڈری، ٹرائی تو کر لیں وہ عبد اللہ بھلا اس معاملے میں کیا کہتے ہیں؟“
نگارش کی بات پہ وہ جزبہ ہوتی، چپ ہو گئی تھی وہ مطمئن نہیں تھی جبکہ نگارش نے ارادہ باندھ لیا تھا۔
”بتول آئی سے بھی بات کروں گی۔“

”آپ ہوش میں تو ہیں؟ ان سے کیا بات کرنی ہے؟“ وہ بدک گئی۔

”یہی کہ وہ بیٹے کی شادی کے معاملے میں ہاتھ پہ ہاتھ رکھے کیوں بیٹھی ہیں؟“

”بھابھی! ان کا بیٹا ہے وہ بہتر جانتی ہوں گی کہ کب کیا کرنا ہے؟“

”ان کا بیٹا ہماری بیٹی کے دل کا چور ہے ہمارا ہونے والا داماد ہے، ہم کیوں نہ بات کریں اس کے بارے میں؟“
تھوڑی دیر پہلے نگارش اسے سمجھا رہی تھی اور اب خود اس کے ساتھ مل کر سہانے خواب سجانے میں مدد کر رہی تھی۔ داماد کے لفظ پر زری لال ہو گئی تھی۔

”اگر میں اپنے فیشن میں کامیاب ہو گئی تو کیا انعام دوں گی؟“ نگارش شرارت اور معنی خیزی سے پوچھ رہی تھی۔

”اے دس تو لے کے کنگن آپ کی کلاسیوں میں سجا دوں گی۔“ زری نے سرشاری سے کہا۔

”واؤ! پھر تو بیٹھے بیٹھے امیر ہو جاؤں گی۔“ وہ شرارت سے ہنسی۔

”ویسے یار آپس کی بات ہے آج کل دس تو لے کے کنگن کتنی مالیت کے ہوں گے۔“ نگارش نے رازدارانہ انداز میں پوچھا اور زری اس کے انداز پہ ہنس پڑی تھی، نگارش اب پتا نہیں کیا کیا منصوبے بنا رہی تھی۔

آج صبح اس کی آنکھ ذرا دیر سے کھلی تھی اسی لیے نماز کا وقت لیٹ ہو گیا تھا لیکن پھر بھی وہ عجلت میں اٹھی اور سیدھی واش روم میں چلی گئی۔ جلدی جلدی وضو کیا اور قضا نماز ادا کرنے کھڑی ہو گئی تھی لیکن گہری نیند سے اچانک ہڑپا کر اٹھنے اور فوری طور پر وضو کرنے سے اس کی طبیعت پہ برا اثر پڑا تھا چند منٹوں میں ہی اسے چھینک لیں شروع ہو گئی تھیں اور چھینکوں کے ساتھ زکام کے اثرات بھی اجاگر ہونے لگے تھے۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ یقیناً ”تھوڑی دیر اور بستر میں لیٹ کر آرام کر لیتی، لیکن وہ پہلے ہی لیٹ اٹھی تھی اسے آج کالج بھی جانا تھا اس لیے مزید لیٹ ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا وہ جیسے تیسے ہی سہی کالج کے لیے تیار ہونے لگی تھی۔ یونیفارم پہنا، سینڈل پہنے، اسکا رفل لیٹا، اپنا سارا بیگ چیک کیا اور پھر مطمئن ہو کر نیچے آگئی، لیکن چھینکوں نے ابھی بھی اس کا برا حال کر رکھا تھا کچھ ہی دیر میں آنکھیں اور ناک سرخ ہو گئی تھیں اور اس کی یہی حالت دیکھ کر ڈانگ روم میں موجود تقریباً ”بھی افراد پریشان ہو گئے تھے۔“

”ایا بات ہے بیٹا تم ٹھیک تو ہو؟“ وقار آندھی اپنی کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

”ڈونٹ ڈری بابا! میں بالکل ٹھیک ہوں، بس وہ شاید ٹھنڈے پانی سے وضو کرنے کی وجہ سے فلو ہو گیا ہے۔“ وہ لڑکھائی سے آنکھیں اور ناک پوچھتی ہوئی انہیں تسلی دے رہی تھی۔

”ٹھنڈے پانی سے کیوں؟“ رجو نے گہرے آن نہیں کیا تھا، رجو! ادھر آؤ۔“ وہ پریشانی سے غصے میں آگئے تھے۔ اس اوکے بابا، تھوڑی دیر میں ٹھیک ہو جاؤں گی، رجو کو گیسر آن کرنے سے میں نے ہی منع کیا تھا۔ موسم چینیج ہو چکا ہے، اب گرم پانی اچھا نہیں لگتا۔“ علیزے نے رجو کی بچت کرا دی اور نہ واقعی اس کی شامت آجاتی، موسم چاہے جیسا بھی ہو ماعلیزے کو زیادہ ٹھنڈا پانی سوٹ نہیں کرتا تھا اور رجو آج گیسر آن کرنا بھول گئی تھی۔

”ڈاکٹر کو بلا لوں؟ میڈیسن سے جلدی ٹھیک ہو جاؤ گی؟“ پریشانی ان کے چہرے سے ہویدا تھی۔

”بابا! ایم فائن، پلیر کول ڈاؤن۔“ اس نے ان کا بازو تھام لیا تھا۔

”بیٹھے اور ناشتا کیجئے۔“ اس نے انہیں کرسی پہ بٹھادیا اور خود بھی کرسی کھینچ کے بیٹھ گئی تھی۔

”آج ناشتے میں جوس مت لو، پانی بوا کل انڈے کے ساتھ ڈرائی کیلک یا شمد لے لو۔“ وقار آندھی اپنا ناشتا بھول کر اس کے ناشتے کی فکر میں تھے۔

”نہیں! ملک شیک ہی ٹھیک ہے۔“ آچھ“ کتنے کتنے اسے چھینک بھی آگئی۔

”لیکن بیٹا۔۔۔؟“

”تو بابا! پلیرز موڈ نہیں ہے۔“ اس نے لجاجت سے کہا اور پھر رجو کو ملک شیک ملانے کا آرڈر دیا تھا۔

”جی ابھی لے کر آئی۔“ رجو پلٹ گئی تھی۔

”اگر طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو کالج مت جاؤ، کل چلی جانا۔“ آزر نے بھی لب کشائی کی تھی، کوئل نے بے ساختہ پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا تھا وہ اسے دیکھ رہا تھا اس کا من جل اٹھا، وہ اس روم میں کانٹے سے چبھنے لگے تھے۔

”نہیں! آج بہت اہم کلاسز ہیں، میں اپنی فرینڈ کو بتا چکی ہوں کہ آج میں کالج آ رہی ہوں۔“ اس نے انکار کر دیا۔

”تو پھر اپنا بہت سا خیال رکھنا بیٹا، چھوٹی سی تو ہو، ہمیں تو ڈر ہی لگا رہتا ہے۔“ اسرار آندھی تاکید کرتے ہوئے مسکرا کر بولے تھے اور کوئل وہاں سے جلتی بھرتی ہوئی سب سے پہلے اٹھ گئی تھی۔ اس کے بعد اسرار آندھی اور احمد بھی چلے گئے علیزے بھی جوس ختم کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”میں ڈراپ کر دیتا ہوں نہیں۔“ آزر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”میں تھوڑی دیر کے لیے پک اینڈ ڈراپ لے کر اپنی عادت نہیں لگاڑ سکتی، میری گاڑی اور میرا ڈرائیور تیار ہیں میں چلی جاؤں گی، آپ فکر نہ کریں گڈ بائے۔“ وہ آہستگی سے مسکرا کر کہتی ان سب کو ہاتھ ہلا کر باہر نکل آئی۔

”میرا بیگ۔۔۔؟“ اس نے پلٹ کر رجو کو دیکھا۔

”جی! میں گاڑی میں رکھ آئی ہوں۔“ اس کا بیگ گاڑی تک پہنچانے کی ذمہ داری بھی رجو کی تھی۔ علیزے سر ہلا کر کوریڈور کی سمت بڑھ گئی۔ طویل دعوٰی کو ریڈور عبور کر کے باہر نکلی تو اپنی گاڑی کی تلاش میں نظر ڈورائی تھی اور بہت سی گاڑیوں میں بلیک مرسیڈیز اسے دور سے ہی نظر آگئی تھی وہ روش کا اتنا لہبا راونڈ لے کر گاڑی تک پہنچی اور گاڑی کا ڈور کھولنے کے لیے ڈرائیور کو متوجہ کیا تھا جو گاڑی کی چھت پہ بازو نکالے اس کی سمت پشت کیے جانے کس سوچ میں غرق تھا کہ آواز ہی نہ سن سکا۔ اور وہ دوبارہ پکارنے پہ مجبور ہوئی تھی۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ کریں)



پڑی ہوئی کے تمام مکین و قار آمدی سے بڑی محیرت اور محبت رکھتے ہیں اور خدیوہ کے واسطے باپ کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

بدھ اور نیکل حیات وہی بہن بھائی ہیں بدھ انسانی نگاہی اور خود مرئی ہے کہ انسانی زندگی و زندگیوں میں نیکل جو رہا رنگ و جلی ہے جس کے پیش نظر کو بہن نیکل کو پاکستان شہر ہونے کا مشورہ دیتی ہیں نیکل ہر جہاں گشتاں جائے سے انکار کر دیتی ہے جس پر نیکل اور فخریہ گم بہ ہر پریشان ہے۔

زندگی کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرتا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر چھپ رہا ہے۔

قدیل کالی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے مگر ہر روز اپنی اور ناکالی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا ہے ہی اور مجبوری سے ملک آخر خود کشی کرنے کا سوچتا ہے نیکل ایسے میں ایک روز اسے دھوکے میں چائے پیتے ہوئے پاؤ اتھار ازل چاٹا ہے جو اسے کام کی آخر کرتا ہے جس پر قدیل کالی خوش ہوتا ہے اسی خوشی میں وہ کام کی پارت پوچھتا پھیل جاتا ہے۔

منصور حسین ایک نوید اور بھڑک پارس اوکی ہے کہ مہارک بھائی کے توسط سے بڑی ہوئی ہیں بدھ آمدی سے نوکری مانگے آتا ہے و قار آمدی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ کسے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ بھڑک سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل اور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور مجھے ہوئے کیوں میں ہوتا ہے کہ اپنے قول و فعل کا بہت بکا آڑی ہے جس سے



ایسی باتیں سمجھا اس کی ماں بھائی شاہ کو اپنے بچے کی قابلیت اور قدامت پر بہت بھروسہ ہے اور اس کا بھائی و دو بہنوں کو بھی دیتی ہیں۔



خلیق کے کی کو از دوبارہ پکارنے کی وجہ سے اور احمق لیے ہوئے تھی، جبکہ انہی سوچ، کسپہ و حیلان میں ہم منظور حسین نسوانی کو از پیکر ہر چہ کر رہا تھا اور گاڑی کی بھٹ کے اوپر سے ہی گاڑی کی دوسری سائیڈ میں کھڑی اس "پھولن دلائی" کو دیکھا جس کا ذکر پہلے کئی دنوں سے مبارک خان و قار احمدی "تور" "اسیہ افندی" چونکید اور خیر و بایا کے منہ سے ملتا آ رہا تھا اور اس ذکر میں اتنی شدت اتنی محبت اتنی حرمت ہوتی تھی کہ کئی بار چلاوچ ہی منظور حسین کا است دیکھنے کو مل چاہتا تھا کہ آخر وہ چیز کیا ہے؟

اور آج۔۔۔ اس نے اسے یہ اعتراف کرنا پڑا تھا کہ وہ واقعی اس چیز کا حق رکھتی تھی کہ بڑی حویلی کا ہر فردی اس کا ذکر کرے اور اسے ہی چاہتا اور وقار افندی اسے چہا چہا کے اور بھٹ، بھٹ کے رکھتے اور ہر وقت انہیں اسی کی طرف سے دھڑکا لگا رہتا ہے۔ یوں لگتا تھا جیسے اللہ نے اسے بڑی فرصت اور بڑے اہتمام سے بنایا تھا اور اسے بنانے کے بعد خوب صورتی کے تمام ورندہ کھپے ہوں گے۔ یہ دیکھ کر وہ اپنی نظر میں ہی یہ احساس آ رہا تھا کہ جیسے اللہ نے وہ کوشی کا مارا خزانہ اسی پہ لٹا دیا ہو اور اس خزانے کی ہلک دھلک ہر دیکھنے والی آنکھ کو خوب کر ڈالتی تھی۔ اسے ٹھہر کر دیکھنے والے منظور حسین کا کوئی قصور نہیں تھا بلکہ اسے ہی دیکھنا تھا اسی طرح زچہ ہو جاتا تھا۔

"دردان کھولو" علی نے اسے لہجے سے ناگواری جھلک رہی تھی اسے لوگوں کا اپنی طرف دیکھنا اور یوں ٹھہر کر دیکھنا سخت ناگوار گزرتا تھا۔

"تو راتیں رہا میں نے گاوردان کھولو" علی نے اسے موجود نہ ہوتے دیکھ کر خفگی سے جھنجھلا کر کہا تھا۔

"لوگوں سا دروازہ" منظور حسین کے منہ سے بے ساختہ پھسلا۔

"گاڑی کا دروازہ" وہ زچہ ہوتے ہوئے بولی۔

"اور اپنا گاڑی تک" منظور حسین اچھی اور خوب صورت چیز دیکھ کر خوش بھی ہوا تھا اور سراپا بھی تھا لیکن مرغوب اور فریفتہ نہیں ہوا تھا چاہے وہ چیز کتنی ہی خاص کیوں نہ ہو، وہی وجہ تھی کہ وہ علی سے کوئی دیکھ کر خوش بھی ہوا تھا اور سراپا بھی تھا لیکن مرغوب اور فریفتہ نہیں ہوا تھا جیسا سر جھٹک کر سیدھا ہوا اور گھوم کر اس کی سائیڈ پہ آیا اور گاڑی کا ایک ڈور کھول دیا تھا۔

"یاد رکھو" اس نے مہذب سے انداز میں علی سے کوئی اشارہ کیا، علی نے اس کی سہمت دیکھی۔

کے گاڑی میں بیٹھ گئی اور منظور حسین اس کی سائیڈ کا ڈور بند کر کے اپنی سائیڈ میں آیا اور ڈور اپنے ہاتھ سے کھولا لیا اور جیسے ہی گاڑی اسٹارٹ کی تھی حویلی کا بڑا سا گیت فوراً ہی کھل گیا تھا گاڑی بالائی میں چھل کی طرح چھلکتی ہوئی گیت عیور کر رہی تھی۔ سر سید پڑا رہا یہ کہتے ہوئے منظور حسین اپنے آپ کو دیکھ رہا تھا اور اسی لیے بہت مسرور بھی ہو رہا تھا اور ان کیونٹ میں اسے دیکھتے ہی بہت مہارت تھی۔ اسی لیے اسے کوئی براہ کرم نہیں ہوتی تھی اتنی شریف کے باوجود وہ گاڑی کھل لے گیا تھا اور بہت سرشار اور خود بخود اس کے گارڈ کے گیت تک پہنچا تھا لیکن جیسے ہی اس نے بریک لگا دی وہ یکدم ٹھہر گیا تھا اس کے ہاتھ ہی آگے اس کی گاڑی نے بھی ہر ایک لگائے تھے۔

"صاحب! آپ یہاں؟" وہ گاڑی پارک کر کے بچے بچے آیا تھا۔

اس نے میں "تور" بھی اپنی گاڑی سے بچے بچے آیا۔

"کیوں میرے آپ یہاں رہی ہیں؟" "تور" نے اسے دیکھ کر اس کے منہ سے دیکھ کر پوچھا۔

"ارے نہیں صاحب! یہاں رہی ہیں۔۔۔" علی نے اسے دیکھا کہ وہ اس کے کونٹوں کو اس لیے لہے کہ رہا تھا کہ کوئی کام تھا تو بھیجی کہ وہ دیکھے، منظور حسین نے اسے دیکھا۔

"کام نہیں ہے والا" میں چاہتا تھا کہ علی کوئی کام ہے اس لیے آ رہا ہوں۔"

"نہیں آپ واقعی آپ والا کام ہے؟" علی نے اسے دیکھ کر اس کے منہ سے دیکھ کر پوچھا۔

پلاتے ہوئے کھانا اور کچھ علی نے اس کی سائیڈ گاڑی کا ڈور کھولا دیا تھا وہ بھی بچے بچے آ رہی تھی۔

"صاحب! کبھی طبیعت ہے تمہاری؟" "تور" نے بھونٹتے لگا علی سے اس کی طبیعت پوچھی تھی اور اس کے پوچھنے سے سناٹہ ہی منظور حسین کی نظر بھی علی نے اس کی سائیڈ گاڑی کی طرف اٹھایا تھا کہ آخر اس کی طبیعت کو کیا ہوا ہے؟ اس کی پائلیں چھلکی ہوئی تھیں جس کی وجہ سے وہ اس کی آنکھوں کی کھل اور کی نہیں دیکھ سکتا تھا جو کام اور چیزوں کی حویلی منت۔

کچھ بہتر ہوں آپ۔۔۔" وہ آستین اور زری سے بولی تھی۔

"دیکھو اندر بیٹھیں۔" "تور" نے کچھ کے کچھ کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"آپ میرے ساتھ چلیں گے۔" "تور" نے کہا۔

"ہاں! اس کام تھا۔"

"کس سے کام ہے آپ؟" "تور" نے اسے دیکھ کر اس کے منہ سے دیکھ کر پوچھا۔

"تمہارے بہتر ہونے۔"

"میرے بہتر ہونے۔"

"تو علی نے اسے سوال کر رہی ہو؟"

"نہیں، صاحب! یہاں ہے جو نہیں۔" علی نے اسے دیکھ کر اس کے منہ سے دیکھ کر پوچھا۔

"کوئی خاص بات نہیں ہے میری جان! کبھی کم پریشان مت ہو میں تو بس ایسے ہی چلا آیا ہوں۔" "تور" نے

علی سے کہا تھا تھا ہے، بڑے نرمی سے اس کا رخسار تھا تھا اور چار قدم کے فاصلے پہ گاڑی سے اپنی پشت لگائے

کھڑا منظور حسین حیرانی اور حجب سے ان کی اتنی اپنا بھیت دیکھ رہا تھا۔

"تو یہاں بیٹھتے ہو؟" آپ بلاوجہ نہیں آسکتے ضرور کوئی بات ہے۔" علی نے چڑیا کا سانپ رکھتی تھی حویلی

میں سہم بھی جا تھا اور خوف نہ تھا بھی ہو جاتا تھا وہ پریشانی سب نہیں ہوتی تھی۔

"میری جان! میری جان! میں پہلے بھی تو تمہارے شجر سے کئی بار ملے آیا ہوں؟ آج کوئی کبلی بار تو نہیں آیا؟"

"نہیں! آپ پہلے ہی اسی وقت شجر سے ملنے کے لیے آتے ہیں جب کوئی بات ہوتی ہے۔" وہ دانت کو تیار نہیں

تھی۔

"واق میری جان! کبھی اتنی پریشان ہو رہی ہو؟" "تور" نے اسے دیکھ کر اس کے منہ سے دیکھ کر پوچھا۔

"کیونکہ آپ مجھ سے باتیں پچھاتے ہیں تاکہ میں پریشان نہ ہو جاؤں۔" "تور" اس کی "مہویت" سے مسکرا رہا تھا

آگے دانت اس کا رنگ کے ہالے ہیں، لہذا اس کا چہرہ بھی بہت معصوم لگ رہا تھا "تور" کو یہ سنا تھا اس پہ پیار آیا تھا۔

"میری کوئی بات نہیں ہے تم آؤ میرے ساتھ۔" وہ اسے کہہ کر اس کے قدام کے آگے بڑھا لیکن علی نے اس کی

نظر سے سنا تھا ہی رہی اس نے اس سے اس کی جس طرف اس کی گاڑی پہ فائرنگ ہوئی تھی اور ایک دم سے اس کی

انگلیوں میں وہ نظر تازہ ہو گیا تھا اس لیے بے اختیار "تور" کا بازو روک لیا تھا۔

"علی نے کیا دیکھ رہی ہو؟" "تور" نے اس کی زبردستی پر گت بھانپ چکا تھا۔

"کس سے کچھ نہیں ہے۔" اس نے اس میں گھون پھانسی تھی۔

"اس طرف کیا ہے؟" "تور" نے اسے دیکھ کر پوچھا۔

"نہیں! اس کو نہ دیکھو۔" "تور" نے اس کے الفاظ سے دیکھ کر اس کے خوف نہ

لہجے پہ گہری ماس اس بچے کے رو گیا تھا اس نے اس کے قدم روک لیے تھے۔

”اس سے بہتر ہے کہ تم کلچ کی بجائے گھر چلو جب طبیعت اچھی طرح ٹھیک ہو گئی تب آجانا۔“ اس نے عجلت سے کی حالت کے پیش نظر حل دیا۔

”ہاں! اب گھر۔“

”من نہیں لو اب گھر نہیں آئے گا سزاخیزہ کرنی ہے۔“ اسے ایک دم سے اپنی کلا سزا بھی خیال آ گیا تھا۔ ”لو کیا تم نے اس حالت میں کلا سزاخیزہ کرنی دیں؟“ اور نے اشارہ کیا اس کی پیشانی پر باریک سے سوتیلوں کی طرح بیٹنے کے قطرے چمک رہے تھے۔ عجلت سے بے ساختہ اپنی پیشانی کو چھو کر وہ لڑائیوں کی پوری م ہو گئی تھیں اس نے تیزی سے اپنے بیک سے نشوونگالا اور اپنی پیشانی کے ساتھ ساتھ پورا چہرہ نشوونگالا تھا اور ساتھ ہی اپنے اعصاب ڈھیلے چھوڑنے کی کوشش کی تھی۔

”ایم فائن۔“ اس نے بڑی ہمت کر کے خود کو رہائش دیکھ کر کہا تھا۔

”وہی مطلب؟ آپ نہیں آئیں گے؟“

”نہیں۔“

”تمہارے بچے سے بچہ بھی مل لوں گا؟“ اس سے ریشہ ہو رہا ہوں اس نے اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

”خوش ہو رہی ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”تک نہیں کھڑا ہوں۔“ اور نے اسے بچوں کی طرح ہلکا کر تیلی دی اسے پتا تھا کہ عجلت سے پورا ہونا کی سوجھ بوجھ کر پریشان ہو رہی ہے کی کہ وہ اس کے بچے سے کیوں ملتے کیے گیا ہے۔ اس لیے یہی دیکھ رہا تھا کہ وہ آج بچہ سے ملنے کا رونا ہوتی گزرتا ہو اس سے کہہ گیا تھا۔ وہ چہرہ سیکڑ کر لڑی اسے دیکھتی رہی پھر سر جھکا کر دل کڑا کر کے تیز تیز قدم اٹھاتی گئی کے اندر غائب ہو گئی تھی اور آواز بھی چند لمحوں کے بعد گہرا گہراٹ کر اپنی گاڑی کی سمت آگیا لیکن گاڑی کالا کھولتے ہوئے منصور حسین پر نظر پڑی تو اس کے قریب آگیا تھا۔

”منو! منصور حسین۔“

”وہی صاحب جی؟“

”جی صاحب جی۔“ وہ فوراً گاڑی سے پشت دھا کر سیدھا ہوا تھا۔

”عجلت سے کا خیال رکھنا اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ اس نے منصور حسین کو ہاتھ دھونے کا کہا۔ اگر آپ کی طبیعت اچھی ہو تو تم ٹھیک گھر رہے ہو لیکن میرے لئے کام ٹھیک ہے۔ اگر اس کی طبیعت زیادہ خراب ہو تو تمہیں کال دیکھ کرے تو تم اسے فوراً چھوٹی سلاخان پر چھوڑے۔“ اور نے محل سے اسے سچایا۔

”جی! بہتر ہے صاحب جی۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اس سے انداز میں سرفرم کیا تھا۔“

”اور ہاں! اب یہ تم اسے لے کر گھر جانا۔“ اس نے اسے اسے چھوڑی خوف زدہ نہ ہو سکتا ہے کہ مزید پریشان ہو جائے اس لیے بہتر ہے کہ چند روز اس راستے سے آنا چاہو۔“ اور واپس

طرف کے روڈ کی سمت اشارہ کر رہا تھا۔

”ٹھیک ہے صاحب! لیکن صاحب ہم ابھی ابھی تو اس روڈ سے گزرنے کے آئے ہیں؟“ وہ حیرانی سے پوچھ رہا تھا۔

”وہ شاید بے حیرانی میں تھی اس لیے اس نے نوٹس نہیں لیا۔“ لیکن اب اس کا دھیان ہو چکا ہے وہ اب بھی پریشان ہو رہی ہے کی اس سے بہتر ہے کہ ہم ہی کوئی احتیاط کر لیں۔“ اور نے کچھ داری سے کام لے رہا تھا۔ منصور حسین نے فوراً ”اٹھاتے میں سر ہلایا۔“

”ٹھیک ہے صاحب جی۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اب آگے اور آگے سے ہی آگیا جا کر لوں گا۔“ اس کے لب و لہجے میں سادہ سادگی اور محنت تھی۔

”ہوں! اشارہ!۔“ پر ریکو نو پانی دھو کر لیں۔“ اور نے جیب سے وائٹ نکال کر دیکھا اور چہرہ سرخ ہوٹا۔ احتیاط سے نکال کر منصور حسین کے ہاتھ پر رکھ دینے منصور حسین کی منہ پر چوڑی مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ نوٹ بہت چھوٹے رنگ کے تھے۔

”یہ کیا ہے صاحب جی؟“ اس نے ان سے نوٹوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”یہ کامیہ تمہارے پاس ہے۔“ تمہارے پاس جیب فریج بالکل بھی نہیں ہوگا۔“ نوٹوں کو دیکھتے ہوئے اس نے پورا اہمیت دے کر اسے کہا۔ ”اور نے پورے محنت کا سوچ ڈالا تھا منصور حسین کو بڑی حیرت ہوئی تھی۔

”اب اس سے اور اہمیت گزرتا ہے؟“ وہ اپنی عقل پر بکے نوٹ دیکھ کر ہلا۔

”یہ اہمیت تو تمہیں البتہ پورا دن ضرور گزر سکتا ہے۔“ تم آج کا دن کل دیکھا جائے گا۔“ اور اپنی زری کی ہمت ملتا تھا لیکن نہیں آگیا تھا۔

”لیکن صاحب جی تو تمہارے اوپر کے پیسے ہوتے نا؟ میں یہ نہیں لے سکتا۔“ صاحب کو یہ چلے گا تو کیا سوچیں گے؟ میں ایمانداری اور حق حلال کی کمالی کمانا چاہتا ہوں۔“ اس نے انکار کر دیا۔

”اور یہ یاد اس میں بے ایمانی کہاں سے آئی؟ یہ میں اپنی خوشی سے دے رہا ہوں۔“ صاحب تمہیں تمہارے ملے تب نہیں ہوں گا۔“ اور نے ہنسنے لگا۔ ”اب اسے اصرار کر رہا تھا مجبوراً منصور حسین کو وہ پیسے رکھنے پر مجبور تھے اور اللہ حافظ کہ وہاں سے چلا گیا تھا اور وہ نوٹ دیکھتا رہا۔

اسے واقعی ہوی حیرانی ہو رہی تھی کہ جو ملی کے تمام فرد حیرت میں آتے تھے ہیں جو تار اتھری سے لے کر اور آفندی تک۔

یادت ختم ہوا چہرے پر تے اور میں اپنے رستے۔ "اس نے مارمل سے انداز میں کہتے ہوئے کھٹکے اچانک اپنے منہ سے۔
 "اس میں ختم کیا ختم کیسے ہوئی ہے استفسار۔ اس طرح حقیقت شریع ہوئی ہے، تم اس کی کڑی گھڑی باتوں کو یاد
 رکھو گے اور وہ تمہاری گھڑی باتوں کو سوچ کر پیچھے رہے گی، پھر تم اس کے رستے اور وہ تمہارے رستے مارمل
 دو ٹول کی ایک ہی ہوگی۔"

بجہ سے نہیں مل سکتا بلکہ نگر اور کاسار انڈسٹری کی سہولتوں سے

”بڑے خوش قسم ہر دم لوگ۔“ ”میریل نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہتے ہوئے سر جھٹکا۔

”میں نے اس خوش فہمی کے علاوہ اور کچھ نہیں سیکھا۔“

”نیکو یار! اشی خوش قسمتی تھی تو محک نہیں۔ چہنا کہ غریب کسی شہزادی کو اپنا تعویذ دیں جس سے اس کے خواب پر کھٹے گئے۔ تبدیل نے اعتراض کیا۔“

”خدا کسی غریب کی لڑکی کو اٹھا کر محل میں بچا سکتا ہے تو کسی شہزادی کو اٹھا کر جھوٹری میں بھی بٹھا سکتا ہے۔“

”وہ وقت اور ہوتے تھے جب ایسے مجنوں، بد نما ہوتے تھے یہ وقت کہ زمانہ اور ہے آپ ایسا کچھ نہیں ہوتا۔“ تبدیل نے استہزا سے لہجہ میں کہا۔

”یہ وقت اور اس لیے ہوتے تھے کہ اس وقت لوگوں کا ایمان مضبوط ہوتا تھا ایمان کو مضبوط رکھنے کے لئے اللہ سے کچھ باتیں تھیں تو اللہ کو مجھ کو کھانا پی پڑا تھا کیونکہ اس کے بندوں کا اس پر ایمان مضبوط ہوتا تھا یقین ہوتا تھا اللہ کی ذات پر۔ لیکن اب اس زمانے میں ایسا کچھ اس لیے نہیں ہوتا کہ اب لوگوں کے ایمان کمزور پڑ گئے ہیں اللہ کی ذات پر یقین اور محروسہ نہیں رہا اللہ سے کچھ باتیں ہیں جس تو سے یقین ہو کہ تو کچھ ایسے ہیں اللہ مجھ سے کہے گا تو کس کے لیے۔؟ کمزور ایمان والوں کے لیے۔؟ سب یقین لوگوں کے لیے۔؟ ان کے لیے جنہیں اس پر محروسہ ہی نہیں ہے۔؟“

چھوٹے بولنا کیا شروع کیا ان سب کی حیرت سے آنکھیں کھل گئی تھیں کہ اتنی بڑی بڑی اور گہری باتیں کرنے والا چھوٹا ہی ہے۔

”استراوا! اس وقت کوئی غریب کسی شہزادی کو چاہتا تھا تو اپنی چاہستہ کی ”جیر“ کروڑا تھا یہاں تک کہ ایک شہزادی اپنا تخت و تاج چھوڑ کے اس کی جمو پڑی میں آنے پر مجبور ہو جاتی تھی اور اسی طرح اگر کسی شہزادے کو محبت ہو جاتی تھی تو وہ اپنی محبت اپنے عشق میں موزور بن جاتا تھا صرف ایک لڑکی کی خاطر۔ غریب جمو پڑی والی لڑکی کی خاطر۔“ اس نے اک اک بات یوں بیان کی جیسے اس پر سب بیت چکا ہو۔

”لوئے پھر کسے عشق و محبت کی نئی کہاں ایندھ کے پر ہستار ہے تو۔۔۔“

”عشق و محبت کی اپنی لائق سب کو اس کے پیٹ سے ہی بڑھانے کے لئے بنایا ہے جس میں ان کا ہے کہ کسی کو یہ اپنی لڑائی
 یاد ہو جاتی ہے اور کوئی بھول جاتا ہے، مجھے یاد دلائی اور تم بھول گئے۔ تم نے اپنی لڑائی سے کہہ دیا ہے اچھا ہے
 اور آگے بڑھنے کے لیکن یہ لڑائی یہ نظر دینی اور کہیں کیا تھا۔“

”کیونکہ استاد اشترادق کو چاہا ہو یا شہزادے کو، لیکن امتیاز چاہو کہ وہ اس مقام سے پیشتر مجبور ہو جائیں مغرور چل کے تمہارا پیاس آجائیں۔ یہ پنجویں نمبر ہے اس کے لئے تم پر ہاتھ پڑتے ہوئے کہا کہ

جب تک کسی کی چاہت ہوگی تا کہ حضورؐ سے محبت کرے گا۔ "تدوین کے بیان کا رخ بدلتا ہے۔

”مجھ سے مشورہ نہ کرنا لیکن ایک بار فرحت سے مل کر اپنے دل سے مشورہ ضرور کر لینا۔ دل نہ مارے تو نارغ سے رجوع کرنا۔ اپنے دل سے مل کر سے ایک میٹنگ ضرور رکھنا۔ اکثر چاہت اور محبت کے معاملے میں یہ

لوگوں! کہ میرے کے خلاف ہو جاتے ہیں، دونوں جنگ اختیار کر لیتے ہیں اس لیے ستر ہے کہ دونوں کو پہلے سے کوئی شخص کر لیا جائے۔ ”پھر وہ سوال سے بول رہا تھا عدیل نے جو تک کہہ دیا۔

”تمہاری بالکونیشن کیا ہے۔“ عدیل کو اس کی باتوں سے کچھ شک ہوا تھا۔

”یہ کیا ہوتا ہے؟“ پھر وہ انہیں دیکھتے ہوئے بولا۔

مجلس شورای اسلامی

”جیانا ہو، تو کہاں ہو گا۔۔۔۔۔“ اس نے پور کتاب کی کڑاوی کی سمت اشارہ کر کے کہا۔

”میں بھی تو رسالت ہی ہوں۔“ محمدؐ نے اپنے ایک ساتھی کو دیکھ کر کہا۔

آئے ہیں کہ سب سے پہلے یہ

۱۰۰

پھر دیکھنا ہے کہ ہمارے ہاں کیا ہے۔ کیا ہوا اس سے ٹھیک اور مٹایا گیا۔ یا پھر چھپا کیوں رہے ہو۔ کیا کوئی کیا

میں نے اس کے لئے ایک نیا نام رکھا ہے۔

[illegible]

پھر ڈاکٹر اس نے اگر مرنے کو توجہ دی تو مرنے کی بجائے تھیں اور مرنے کی بجائے تھیں پھر ڈاکٹر اس نے اگر مرنے کو توجہ دی تو مرنے کی بجائے تھیں پھر ڈاکٹر اس نے اگر مرنے کو توجہ دی تو مرنے کی بجائے تھیں

100-443887-100

اس کی چٹائی دیکھ کر چونکے اور نے فوراً ہی گیسٹ کھول دیا تھا گاڑی فرارے بھرتی اندر آدمی تھکی۔ اس نے
بریک لگا کر دیکھا کہ تاشیر پر سے زبرد سے چڑھا کے رہ گئے تھے۔ اور باسروں کی پیچھے چڑھا کر اندر ڈاکنگ روہم
تک پہنچی تھی وہ گاڑی کھڑی اور ہوا سے بند کرتی ہوئی اندر کی طرف بڑھی تھی وہ انکی تک اندر ہی اندر کھول
رہی تھی اندر ابھی تک اس آدمی کو گالیوں سے نوازا رہی تھی جس نے اس کی گاڑی سے بانگ کی کھڑائی تھی۔

درجہ کیا جائے۔ کیا ہوا ہے۔؟ یہی اپنا جانشین اور مورث چھوڑ کے الٹنگ روہم سے نقل آیا تھا۔ کچھ شہر
کراس کر کے اوپر اسے پڑھ روہم میں جا رہی تھی۔

مجلس شورای اسلامی

”میں نے تو یہ سوچا تھا کہ اس کے چہرے کی حسنِ رخسار گلتا ہے۔ یہی اس کے غصے کو جھٹلاتا ہے۔“

میں نے اپنے روزنامہ میں اپنی اس بات کی تصدیق کی کہ اگر سوشلسٹوں کی بہت بڑی کمی ہے۔

”میرے پاس نہیں ہے۔ وہ ہمارے پیچھے سے آواز دی۔ لیکن وہ ہونکی نہیں تھی۔ سیدھی اور پریکٹک تھی۔۔۔ نہیں گاؤں چلایا۔ اس کے پیچھے اور پیچھے لیکن اسے یہ تھا کہ وہ اس کی بات نہ دیتی تھی۔ وہ نہیں دھانکے گی۔“

”کیا بات ہے؟ اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہو۔۔۔؟ مدد کیسے کہاں ہے؟“ لاکو نے حکم بھی اس کے پیچھے آگھڑی

ہو نہیں۔
 "جانتا نہیں کیا ہوا ہے؟ گھر سے تو ٹھیک ٹھاک گئی تھی واپس پہلے میں لگ رہی ہے؟" نیل نے اپنی پریشانی ظاہر کی۔
 "تم نے پوچھا نہیں اس سے؟ کسی سے پوچھ کر تو نہیں آئی۔" قاتر نے غم کو کسی اور حد سے بڑھایا تھا۔
 "نہ پوچھا تو ہے لیکن اس نے بتایا نہیں کہ کیا ہوا ہے؟" وہ شکر ہو رہا تھا۔
 "خیر جو بھی ہے بتا جائے گا تم اپنا ناشتا کرو۔" انہوں نے اسے بڑا خشک دم میں چلنے کا اشارہ کیا تھا۔
 "نیل اس بھوک نہیں ہے صرف جوس کا گلاس دے دوں" اس نے کھڑے کھڑے لٹن سے جوس مانگا تھا۔
 "ہو نہ۔ اس لڑکی نے تو ہماری بھوک بیاں اڑا کے رکھی ہے نہ وہاں لیٹن لیٹنے دیا نہ اسے ہاں جھٹک لینے دے گی۔" انہوں نے ہنسنے لگے ہوئے گلاس میں جوس اٹھایا اور نیل کی سمت بڑھا دیا۔
 "مام پلیز اس کے سامنے ایسی باتیں نہ کہو کہ اس کو اور بھی غصہ دی اور چڑھ جائے گی۔"
 "کیوں نہ کہوں؟ تم ہر وقت اسی کے لیے ہنگام اور پریشان ہوتے رہتے ہو اور وہ ہے کہ اسے پرواہی نہیں ہوتی۔"
 "نیل بات نہیں مام اس کا حق نہ ہے کہ وہ اپنی غصہ میں منہ مارتے ہوئے ہے۔" نیل نے تڑپ سے کہا۔
 "تو رو پیسے بھی اگر میں اس پر غصہ کروں گا تو تکلیف آپ کو ہی ہوگی یاد ہے نا اس دن آپ ہی بچ بھلا کر لے آ گئی تھی۔" نیل نے مسکراتے ہوئے انہیں وہ راست یاد دلانی حسبِ ذہن کہہ کر غصہ ہو رہا تھا اس روز وہ نشے کی حالت میں کھڑی تھی۔
 "نیل یہ تو نہیں کہتی کہ تم اس پر ہاتھ اٹھاؤ نہیں اس پر چاہتی ہوں کہ تم اس پر اپنی گرفت مضبوط رکھو اپنا غصہ کرو کہ یہ فیئر اجازت کے ایک قدم بھی نہ اٹھائے۔"
 "ہا ہا ہا۔۔۔ آپ ہاں میں نا اس لیے غصے میں بھی نرمی کا پلور گھٹایا جاتی ہیں اور میری کوشش یہ ہے کہ میری گرفت اس پر مضبوط رہے لیکن اس مضبوط گرفت کے لیے غصہ کرنا ضروری نہیں ہے اس کے لیے تو میرا کچھ کمال اور سے میں نے یہ کیا تو سیکھا ہے وہ گرفت رکھتا ہے لیکن پیار سے۔" نیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔
 "ہوں نا بھی بات ہے۔" انہوں نے ان بات میں سر ہلایا۔
 "تو کے میں چلتی ہوں تھوڑی دیر تک واپس آ جاؤں گا۔" وہ ال ٹھاک ٹھاک دھڑکتے ہوئے چلا۔
 "کہاں جا رہے ہو؟"
 "میں اپنے کاروبار کے سلسلے میں کچھ معلومات اکٹھی کرنا چاہتا ہوں۔"
 "اگر تمہیں کامیاب کرے۔" انہوں نے پیسے کو دعا دی اور وہاں سے غصہ کر رہا ہرنگں آیا تھا لیکن اپنی گاڑی لٹکاتے ہوئے اس کے ہاتھ ٹھٹھک گئے تھے اس نے فوراً اپنی گاڑی کا پیسٹہ فٹ کر کے جیسے کی گاڑی دیکھی تھی۔
 "اس کی گاڑی کی ایک سائیڈ پر ڈسٹ پڑا ہوا تھا جسے دیکھ کر نیل کی پریشانی بڑھ گئی تھی۔
 "میری گاڑی کس ڈسٹ ہے؟" وہ پریشانی سے غصہ ہو کر اپنی گاڑی سے نکل آیا تھا اور اس کی گاڑی کو گھوم پھر کر اس کے پیچھے سے دیکھتا تھا اس کا کچھ لاشعور نہ تھا نیل بے ساختہ واپس گھر کے اندر چلا گیا تھا۔
 "کیا ہو بیٹا؟" اس نے کہا۔
 "نہ اڑیں کہہ کر اپنی پریشانی ان سے چھپانی چاہی۔"

"کیا کام؟ خیر نہ تو ہے۔" وہ پھر بھی اس کی پریشانی بھانپ گئی تھی۔
 "میں درجہ سے مل لوں پھر بتا ہوں آپ کہ۔" وہ ان سے گھر کے کور آ گیا تھا جہاں سیکڑے دم کے درد اڑنے پہ دستک دی اور اجازت کا انتظار کرنے لگا۔
 "درجہ جس میں اس کے دو سو ہیں آئی تھی اس میں اجازت ملنا دشوار تھا لہذا وہ ایک بار مزید دستک دینے کے بعد اندر چلا آیا تھا۔
 "درجہ" اس نے نرمی سے اسے پکارا وہ صوفے پر کھڑی رہی باقی غصہ تو اس میں تھا بے لب بھج کر اپنا غصہ ضبط کرنے کی کوشش میں لگ رہی تھی۔ نیل خود اس کے اس کے برابری صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔
 "اگر غصہ کیوں کر رہا ہے تمہیں۔" وہ نرمی سے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔
 "اتنا غصہ اس لیے کہ رہا ہے کہ میری ایک غصہ کے ساتھ ایک سٹڈنٹ۔" درجہ ہنسنے لگے کہ یہ کیکم ہو کر گئی تھی اس نے ہاتھ بٹ بٹ کر لے لیے تھے۔
 "میں جانتا ہوں درجہ تمہارا ایک سٹڈنٹ ہوا ہے لیکن یہ تو بتاؤ ہوا کیسے ہے؟ تم خود تو خیر بہت سے سٹڈنٹ نیل اس کا سر جھٹکتے ہوئے گویا درجہ نے نیل کے لیے محبت اور اپنا محبت بھرے انداز اپنی ذرا کی ذرا بھٹک کر دیکھا تھا۔
 "نیل کے سر پر اس کو بے پناہ شفقت نظر آئی تھی وہ بھی چند لمحوں کے لیے خود بخود نرم ہو گئی تھی۔
 "ہو ہا ہا۔۔۔ ٹھیک ہوں لیکن گاڑی کو نقصان ہوا ہے تو سٹڈنٹ پر کیا ہے۔" اس نے شکر سے انداز میں بتایا۔
 "نیل اس کے بٹ بٹ کر ہو جائے گا شکر ہے کہ تمہاری بچت ہو گئی۔" نیل بوا آئی شکر ادا کر رہا تھا۔
 "شکر ہے کہ میرے ہاتھوں اس کی بچت ہو گئی وہ سٹڈنٹ اور ٹھیک تو تھا لیکن اس کے گھر کے رکھ دیتی آپ نے اپنی شکل اور شناخت بھی بھول جاتا۔" وہ تھلا کے اٹھ کھڑی ہو گئی تھی۔
 "زیلیکس، زیلیکس گولڈ فائن میری جان یہ پاکستان ہے انگلینڈ نہیں کہ تم لوگ کسی کی غلطی پر سب فریڈز کے ساتھ مل کر کسی کی بدحالی اور نیکیاں پھولتی پھولتی باتوں کا بھی پروا دیاں رکھنا پڑتا ہے ذرا سی بات لے کر میں جاتی ہے خصوصاً لڑکیوں کے معاملے تو کچھ زیادہ اچھا لے جاتے ہیں۔" نیل نے اسے سمجھانا چاہا۔
 "لیکن بھائی اس نے غلطی کیا پھر بھی وہ اپنی غلطی مانتے کو تیار نہیں تھا بلکہ اس نے تو مجھ سے سواری تک نہیں کیا۔" درجہ کو عدل کی باتیں مددہ کر سکا رہی تھیں مگر چاہے تو تھا ایک بار پھر اس کے سامنے آتا تو اسے واقف فوج کھسٹ ڈالتی وہ اس وقت بھوکے تیری کی طرح چکر رہی تھی۔
 "غلطی کس کی تھی؟"
 "اس کی غلطی تھی بھائی۔"
 "وہ کیسے۔۔۔؟"
 "میں نے ایک سوئس شاپ دیکھ کر رک لگائے تھے اور اس نے پیچھے سے ہانک دے ماری۔" اس نے غصے سے بتایا۔
 "تم نے راستے میں بریک لگائے ہوں گے اس لیے اس نے غصہ ماری تمہاری گاڑی کے پیچھے وہ بھی نل اسپڈ سے آ رہا ہو گا۔" جسے ہی تمہاری گاڑی رک کر وہ گاڑی سے گر گیا۔
 "نیل نے پیچھے اٹھ کر دیکھا اس کا اندازہ درست تھا لیکن درجہ نے کو تیار نہیں تھی اس کے غصے کی اصل وجہ عدل کی طرز اور اسٹریٹ باتیں تھیں۔
 "اس طرح اس کی کوئی غلطی نہیں ہے تمہیں بریک لگاتے ہوئے خود سوچنا چاہیے تھا اور دیکھنا چاہیے تھا کہ تم کہاں بریک لگا رہی ہو۔"
 "مگر بھائی۔" وہ تھلا کے پیچھے۔
 "چھوڑ میری جان کسی زیادہ نقصان سے بچ گئے ہیں یہی بات ہے اللہ کا شکر ادا کر دو۔" نیل اپنی جگہ سے کھڑا

ہو گیا تھا۔

”تم تھوڑی دیر کے لیے قریش ہو کر بیٹھے تھے، جلدی ہو رہی تھی۔“ وہ اسے سمجھا رہا تھا اور وجہ غصے سر ہلانے کے روٹی تھی۔ بھیل اس کا سر تھپک کے باہر نکل گیا تھا۔ اپنے بڑے روم کے قہقہوں کی آواز سن کر بھرپور ساختہ قدم اٹھاتی ہوئی ڈور تک بھیل کے سامنے آکر کھڑی ہوئی تھی اور اپنے سر پر اسے کون سا کپڑا تھا اس کے پیچھے بڑے بڑے حروف میں L.R. لکھا تھا جو ٹاپ ٹک ہوئے کی وجہ سے بے حد نمایاں ہو رہا تھا بلکہ اس کا تو بڑا فخر تھا۔ بھیل نے اس کا سر تھپک کے لیے جھک کر اس کی آواز سنائی دی تھی۔ ”اگر تم نے آج کوئی کام کرنا ہے تو جلدی ہو کر آؤ۔“ وہ بھیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

اس نے گھر سے نکلنے ہی سے سامان کا نمبر و کل کیا تھا۔ ”میلوں“ سامان کی بھاگی ہوئی سی آواز سنائی دی تھی۔ ”پائے۔“ جوڑت کی آواز پیچیدہ تھی۔ ”سہ۔“ سامان اس کی آواز پر ٹھٹھا۔ ”بال شہ۔“ وہ دو ٹوک بول رہا تھا۔

”خیریت؟ اس وقت کیوں کل کی۔“ آج تو ہمارا یوم پورشی ہے آف ہے شاید۔“ سامان کے لیے میں حیرانی تھی۔

”میں تم سے ملنے تمہارے گھر آ رہا ہوں۔“ ”میرے گھر؟ اس وقت؟“ ”سامان کو یقیناً“ چاہیہ ہوا تھا۔ ”سب آکر تازوں لگ۔“ اس نے مختصراً کہا۔

”لیکن جوڑت اس وقت کی ڈیڑھ گھنٹہ پہلے ہوئے ہیں تم۔“ سامان نے اسے روکنا چاہا تھا۔ ”کچھ نہیں کہیں گے۔ میں کوئی بھانا کر دوں گا۔“ جوڑت نے اسے تسلی دی۔ ”سامان نے کچھ بھی نہ سنے اخیر فلن بند کر دیا اور اپنی دوسری ہانچ کی اسپر بوجھادی۔ اس کا رخ سامان کے گھر کی طرف تھا۔ آج یوم پورشی ہے آف تھا اس لیے وہ بھی اپنے اپنے گھر میں آگئی تھی۔ لیکن جوڑت کو ایسا بے چینی لگتی تھی کہ وہ رات بھر سو نہیں پایا تھا اور اگر تھوڑی دیر کے لیے گھر میں آگئی تھی تو وہ لڑکی اس کے خواب میں بھی چلی آئی تھی اور وہ سبہ چٹکی سے رہا ہوا تھا۔ بیٹھا تھا اس کا سر تھپک ہو چکا تھا تو وہ سر ہلکا کیوں نہ کرتا۔ ”اگلے دس پندرہ منٹ میں وہ سامان کے گھر میں موجود تھا۔

”جوڑت تم ہو۔“ ”؟“ قاطعہ یوم پورشی کے لیے نکل رہی تھی۔ ”جوڑت کو یہاں دیکھ کر اپنی گاڑی کا ڈور کھولتے کھولتے رک گئی۔

”سامان سے ملنے آیا ہوں، میرے کچھ نوٹس دے گا۔“ ”کیا اس کو یوم پورشی سے آف ہے؟“ اس نے اسے سوچا کہ کچھ تیاری کر لوں۔

”ماشا اللہ بڑے لائق ہو گئے۔“ ”سامان نے اسے سراہا دیکھا۔

”میں کچھ دیر کے لیے۔“ ”جوڑت نے اسے دیکھ کر دیکھ کر اس کے پیش تھی۔

”واقعی درست کہنا۔“

”اپنی طرفوں اور خاموشی سے ابھی میں جو آف ہوں اس لیے۔“ ”میں انٹر سٹنگ“ قاطعہ نے اسے سراہتی ہوئی نظر دیا۔ ”کیا؟“ ”ایک بات کہیں آپ سے؟“ ”جوڑت روتہ سا اور بے ساختہ کہہ گیا۔ ”میں انٹر سٹنگ کہتا ہے؟“ قاطعہ نے اجازت دی تھی کہ وہ اس سے مزید کہہ سکے۔ ”میں۔“ ”اور کیسے؟“ ”جس کی خاموشی دیکھ کر قاطعہ نے اسے پھر متوجہ کیا تھا۔ ”جس کیسے؟“ ”کہاں کہا کہنا ہے۔“ ”اس کی خاموشی دیکھ کر قاطعہ نے اسے پھر متوجہ کیا تھا۔ ”جس کیسے؟“ ”کہاں کہا کہنا ہے۔“ ”اس کی خاموشی دیکھ کر قاطعہ نے اسے پھر متوجہ کیا تھا۔

”جوڑت نے اس کی خاموشی دیکھ کر قاطعہ نے اسے پھر متوجہ کیا تھا۔“ ”میں انٹر سٹنگ کہتا ہے؟“ ”کہاں کہا کہنا ہے۔“ ”اس کی خاموشی دیکھ کر قاطعہ نے اسے پھر متوجہ کیا تھا۔ ”جوڑت نے اس کی خاموشی دیکھ کر قاطعہ نے اسے پھر متوجہ کیا تھا۔“ ”میں انٹر سٹنگ کہتا ہے؟“ ”کہاں کہا کہنا ہے۔“ ”اس کی خاموشی دیکھ کر قاطعہ نے اسے پھر متوجہ کیا تھا۔

”جوڑت نے اس کی خاموشی دیکھ کر قاطعہ نے اسے پھر متوجہ کیا تھا۔“ ”میں انٹر سٹنگ کہتا ہے؟“ ”کہاں کہا کہنا ہے۔“ ”اس کی خاموشی دیکھ کر قاطعہ نے اسے پھر متوجہ کیا تھا۔

”جوڑت نے اس کی خاموشی دیکھ کر قاطعہ نے اسے پھر متوجہ کیا تھا۔“ ”میں انٹر سٹنگ کہتا ہے؟“ ”کہاں کہا کہنا ہے۔“ ”اس کی خاموشی دیکھ کر قاطعہ نے اسے پھر متوجہ کیا تھا۔

”جوڑت نے اس کی خاموشی دیکھ کر قاطعہ نے اسے پھر متوجہ کیا تھا۔“ ”میں انٹر سٹنگ کہتا ہے؟“ ”کہاں کہا کہنا ہے۔“ ”اس کی خاموشی دیکھ کر قاطعہ نے اسے پھر متوجہ کیا تھا۔

”جوڑت نے اس کی خاموشی دیکھ کر قاطعہ نے اسے پھر متوجہ کیا تھا۔“ ”میں انٹر سٹنگ کہتا ہے؟“ ”کہاں کہا کہنا ہے۔“ ”اس کی خاموشی دیکھ کر قاطعہ نے اسے پھر متوجہ کیا تھا۔

”جوڑت نے اس کی خاموشی دیکھ کر قاطعہ نے اسے پھر متوجہ کیا تھا۔“ ”میں انٹر سٹنگ کہتا ہے؟“ ”کہاں کہا کہنا ہے۔“ ”اس کی خاموشی دیکھ کر قاطعہ نے اسے پھر متوجہ کیا تھا۔

”جوڑت نے اس کی خاموشی دیکھ کر قاطعہ نے اسے پھر متوجہ کیا تھا۔“ ”میں انٹر سٹنگ کہتا ہے؟“ ”کہاں کہا کہنا ہے۔“ ”اس کی خاموشی دیکھ کر قاطعہ نے اسے پھر متوجہ کیا تھا۔

تم کسی اور کے بارے میں سوچ لو جس ہر طرح سے تمہارا ساتھ دوں گا۔" مہم جھوٹے اس کے سامنے آگیا تھا۔

"میں صرف مہم فاروق نیازی کے بارے میں سوچ رہا ہوں اور جب تک وہ مل نہیں جاتی کسی کے بارے میں سوچتا ہوں گا۔" مہم نے لفظ لفظ پر زور دیا تھا مہم نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر بات مہم کو گھبراہٹ میں لے کر آگئی۔

"مہم نے اب میں تم سے اسی روز ملوں گا جب اس کے بارے میں محل افکار میں لے لوں۔" وہ کہہ کر باہر نکل گیا تھا۔

مہم اپنے کمرے کے وسط میں کھڑا پریشان مہم چپ رہ گیا۔ اسے پتا تھا کہ جو بات کتا ضروری اور بہت مہم ہے اپنی ضد میں آکر وہ کچھ بھی کر گزرتا تھا اس نے آج تک جو کہا تھا وہ پورا کیا تھا۔ وہ بے حد تیار اور بے خوف لڑکا تھا جس کو اور وقار آخری کے سامنے ان کی عزت اور احترام کے بارے میں کتا چاہی رہتا تھا اور اس نے آسانی سے کوئی بات مان لینا ہرگز نہیں سیکھا تھا۔ وہ خاصا منہ پھٹ اور بے باک بھی تھا بل کی بات دل میں ڈرا کہ وہی رہتا تھا جیسے اس وقت نہیں رکھ سکتا تھا۔

وہ کافی دور تک بیٹھا اپنا ایک کیس اسٹڈی کرتا رہا اور جب بیڈ میں سوار ہوئی تو بے ساختہ گھڑی دیکھ کر رات کے وقت پہنچے گا تا کہ وہ رہا تھا اور صبح جلدی اٹھنے کے خیال سے اس کے دل پر مزید شکن سوار ہو گئی اسی لیے سب کچھ سمیٹ کر احتیاط سے ساڑھ میں رکھا اور نگیدہ رستہ کر کے سونے کی تیاری کر لے گا۔ لیکن ابھی اسے سوئے ہوئے دس منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ اس کے بیل پر دھمکائی ہوئی گئی وہ اکثر بیل کو دھمکائی رہی رہتا تھا۔ اس نے جانے سوئے سے ابرا میں بیل اٹھا کر کان سے لگا لیا تھا۔

"میں دل اور شاہد کنگ۔" مہم جو محل گواڑ میں بھی سوز و جد و غم تھا کنگت بھی رو رہا تھا۔ "جناب انجیل حیات بات کر رہا ہوں۔" بیل کی آواز پر وہ چونک گیا تھا۔ "تم اس وقت کل کر رہے ہو؟" دل اور کو اٹھانے ہوا تھا مہم سے اس کی آنکھیں مڑنا ڈوبوں سے بھرنے لگی تھیں۔

"فارغ ہے اس وقت ہوا ہوں اور ویسے بھی میں نے سوچا کہ کراچی میں لوگ انجیل جلدی نہیں کرتے اس لیے یقیناً تم بھی چاک رہے ہو گے؟"

"جاگ رہا تھا دس چند رو منٹ پہلے میں بھی جاگ رہا تھا۔ لیکن کیس اسٹڈی کر کے آگئی۔" دل اور ایک ہاتھ سے مہم کل کان سے لگائے ہوئے ہاتھ سے آنکھوں کو مسکتے ہوئے کنگ کے بل اٹھ بیٹھا تھا۔ "اچھا تو پھر سو جاؤ۔" بیل کو جیسے اس کی شکن پر رحم آگیا تھا۔

"ارے نہیں یاد آ رہا تو میں سن رہا ہوں۔" اس نے بیل کو کل رہ کر کہنے سے روکا۔ "میں نے صرف پوچھنے کے لیے فون نہیں کیا تھا میں نے کنگ کے فون کیا ہے۔" بیل نے زور دے کر کہا۔ "ارے کنگ! باتیں تو کس کو تم لو تو سوچی باتوں کے لیے تمہارے لہجہ ہوتا ہے۔" دل اور نے ایک ہاتھ سے جک سے گلاس میں پانی اڑھ لیا اور گلاس اٹھا کر منہ سے لگا لیا تھا مہم گلاس پانی پینے کے بعد اس نے سگریٹ کا پکٹ اور اسٹریٹ لیا تھا ایک ہاتھ سے سگریٹ اٹھا کر مہم کو دیا اور ایک ہاتھ سے اس سگریٹ کو لا سٹریٹ سے شعلہ دکھایا تھا۔

"مہم کنگ کر رہے ہو۔" بیل نے کنگ کی بات کو جان گیا تھا۔

"ہوں! انجیل کو دیکھانے کا ارمان میرا ہے۔" مہم سے بات بھی تو کرنی ہے؟ وہ بیل سے بات کرتے ہوئے مہم دراز سا بیٹھ گیا تھا۔

"اس چیز سے صرف بیڈ ہی نہیں بھاگتی لڑکیاں بھی بھاگتی ہیں۔" بیل شرارت سے بولا دل اور کے ہونٹوں کو بھی مسکراہٹ بھونگی تھی۔

"بیڈی سگریٹ لڑکیوں کے لیے مہم نہیں کتا مہم سے بیل اور انگلیوں میں وہ بے سگریٹ کو دیکھ کر مسکرایا اور بیل سے مہم سے ہاتھ لگا کے بٹھا تھا۔

"سگریٹ مہم میں اور شراب مہم میں کتا ہے۔" بیل نے ہاتھ سے ہاتھ سے روکا۔

"تو تم نے ہی بھول گئی تھی۔" دل اور ابھی بھی شرارت مہم سے بیل میں کہہ رہا تھا۔

"اور تم نے حد کر لی تھی۔"

"حد نہیں کی تھی۔" دل اور لگا گیا ہے۔ ویسے یاد آگئی کی بات ہے لڑکیاں سگریٹ سے بھاگتی ہیں۔

"اسو گنگ ہم کر سکتے ہیں۔" دل اور آگاہی نہیں ہوتی ہے۔ "وہ۔" دل اور کے بھرپور معنی خیز سوال کو

کتنے ہی لمحے کے بعد بیل نے جواب دیا۔ "میں اس بات سے بے حد غصہ ہو رہا ہوں۔"

"جب شادی ہوگی تو وہی سے ہوا سوال کہی پوچھوں گا۔" بیل نے بھر کے انجیل سے کہا تھا۔

"سگریٹ سلاگ کے پوچھو گے یا بھلا کے۔" دل اور نے لقمہ دیا۔

"بھلا کے پوچھوں گا سلاگ کے پوچھا تو وہ قریب نہیں آئے گی۔" بیل نے خندہ بیان کیا۔

"تو کنگ ہے تم بھلا کے پوچھنا میں سلاگ کے پوچھوں گا۔" دل اور کی بات پر ایک اور لقمہ پڑا تھا۔

"تمہارا فنی سلاگ کے پوچھنے والے آوی ہو۔" بیل کو اتار دیا۔

"گویا تم اعتراف کر رہے ہو کہ تم بھلا کے پوچھنے والے آوی ہو۔" دل اور نے چھیڑا تھا۔

"میں بیل حیات ہوں میری جان دل اور شاہ نہیں۔" بیل نے اسے بتایا۔

"تم دل اور شاہ ہو بھی نہیں سکتے میری جان دل اور شاہ بننے کے لیے مت برا بھلا چاہیے۔" دل اور کے

لہجے میں زیادہ بھری گئی اند آگئی تھی۔

"وہاں ہی دل اور شاہ صرف ایک ہی ہے، کبھی کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔" بیل نے خطے دل سے اعتراف کیا تھا۔

"انجیل نے تم پر تاؤرات کے اس پھر کال کیوں کی ہے؟" دل اور سر جھٹک کر سگریٹ کا شعلہ لیتے ہوئے بولا۔

"مہم سے کچھ ڈسکس کرنے کے لیے۔"

"کیا ڈسکس کرنا ہے؟" وہ سگریٹ پہ سگریٹ پھونک رہا تھا۔

"مہم کے سینیٹر میں کچھ ڈسکس کرنا ہے یا۔"

"مہم بولو میں رہا ہوں۔"

"یار جب سے میں تمہارے ساتھ شوروم گیا ہوں میری پہلی شوروم۔" انجیل نے بولی۔

"کیا مطلب؟ تم شوروم پہننا چاہتے ہو۔" دل اور اس کی بات کا مفہوم سمجھ گیا تھا۔

"مہم۔"

"یا کل ہو گئے۔ تم اتنے اچھے بزنس میں ہو کتا وسیع کاروبار بننا شروع کر رہے ہو اور اب تم ایک شوروم

پہننا کر کے بیٹھ جاؤ گے؟ گاڑیوں کی خرید و فروخت میں لگے رہو گے؟" دل اور کو اس کا اندیشہ کچھ خاص پسند

میں آیا تھا۔

”لیکن یار مجھے بہت شوق ہو رہا ہے شوروم بنانے کا۔“ ٹیل ڈانٹ آج کل اسی شوق کا شکار تھا۔
 ”شوروم بنانا بہت آسان کام ہے یار، لیکن شوروم کی سٹاک پرانا بہت مشکل ہے جتنا خریدا جیسی اس کی سٹاک
 بنانے میں لگے گا اسے عرصہ میں تمہارا دل الیہ ہو جائے گا۔“

”کام ایسا شروع کرو جو تمہیں شروعات میں ہی راجت دینا شروع کر دے، تاکہ یا کہیں میں تمہارے قدم ہم
 جا میں اور جب ہم جان لو گے کہ تمہارے قدم ہم چکے ہیں تو پھر بے شک ایک چھوڑے کو جس شوروم بناتے رہا۔“
 ”دل اور نے اسے اچھے طریقے سے سمجھایا ٹیل تدریب کا شکار ہوئے گا۔“

”اگر ہمیں شوروم بنانے کی بجائے کھانا بنانا چاہئے تو؟“

”پہلی مرتبہ کھانا کھانا پاتا کبھی۔“ ٹیل اور بے حد بخیر ہو رہا تھا۔

”صاف بات کی ہے کہ وہ کھانا کھانا میری طاقت اکرام پھیرتے ہوئی تھی۔“ ٹیل نے گھر شروع کیا۔

”پھر اس نے مجھے پھان لیا تھا تمہاری وجہ سے کافی پردہ کو دل دے رہا تھا چاہے بھی پانی میں۔“ اور کچھ دیر
 ”پھر کبھی نہیں بھی کرتا رہا۔“

”کبھی یا نہیں۔“

”میں شوروم کے سلسلے میں۔“

”پھر پھر۔“

”پھر کیا یار؟ مجھے اس کی باتوں سے ہی لگا ہے کہ وہ شوروم چھوڑنا چاہتا ہے اس لیے میں نے سوچا کہ اگر وہی شو
 روم میں خریدوں تو؟“ ٹیل نے اصل بات چلی دل اور کچھ بھر کے لیے چپ ہوا پھر بولنا شروع کیا۔

”لیکن ٹیل! تم جو بھی کام کرنا چاہتی ہو مجھ سے کرو نہیں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالنا چاہتا لیکن پارٹی یہ بھی نہیں
 چاہتا کہ تمہارے ساتھ کوئی فراڈ ہو تمہارا کسٹمر میں ابھی سے بے آگے ہو تم یہاں کے گاہک شکاریوں کو نہیں
 سمجھ سکتے یہاں جو بھی مال دلا اور ہوئی آسانی نظر آئی ہے لوگ اسے گھیرنے کے لیے بڑے بڑے جال بناتے ہیں
 اکرام مجید تم سے مل چکے ہے اور وہ یہ بھی جان چکا ہے کہ تم کتنی بڑی آزمائی ہو اور وہ سرے پر کہ یہاں اس کے
 سے اور انجان ہو لیکن اکرام مجید ابھی یہ نہیں جانتا کہ وہ دل اور شاہ کے دوست کو گھیرنے کی کوشش کر رہا ہے وہ
 تمہارے ساتھ کوئی فراڈ کرے اس کی جگہ کی کسی کڑوں گا۔ تم اسے یہ نہ کہو کہ میں نے شوروم خریدنا ہے بلکہ
 تم اسے یہ کہو کہ دل اور شاہ نے یہ شوروم خریدنا ہے۔ پھر کھانا یا اثرات ہوں گے کہ اسے دل اور نے
 کتے ہوئے سنگت سے مل دیا تھا اور ٹیل اس کی بات پر مسکرا اٹھا۔

”یار اب تو مجھے بھی پتا ہے کہ تمہارے ہوتے ہوئے میرے ساتھ کوئی بھی فراڈ نہیں کر سکتا۔“ ٹیل کے لیے
 میں غراور لیجی تھا۔

”دل اور ہے۔“ ٹیل نے اچانک پکارا۔

”ہوئی۔“

”میرے ذہن میں ایک آئیڈیا آیا ہے۔“

”ہوئی۔“

”مجھے شوروم بنانے کا شوق ہو رہا ہے اور تمہیں پھر ان کرنے کا۔ کیوں نا ہم دونوں کام مل کر شروع کر لیں
 یار شریک کے اصولوں پر۔“

”مطالبہ۔“



”مطلب کہ تم اپنے شیئرز میرے ساتھ شروع کرو۔ شروع میں ڈوئل سٹ کرنا اور میں تمہارے ساتھ بڑھوں میں ڈوئل سٹ کرنا ہوں۔“ نیل بہت پر جوش ہو رہا تھا۔
 ”وہ سب تو ٹھیک ہے یا نہیں؟ تم جانتے ہو کہ میرا پروڈکشن مجھے بزنس کو ٹائم لینے کی اجازت نہیں دیتا۔ بڑا مشکل ہو جائے تو یہ تو ٹائم ٹائم نکالنا۔“
 ”اگرے یا راکم کیوں پریشان ہوتے ہو؟ میں ہوں ناں سب سنبھال لیتے۔ اس لیے میں بزنس کو ٹائم دوں گا اور تم شو روم کو۔“ نیل سارے پلان خود ہی بنائے جا رہا تھا اور اس نے دل اور کوکوش کر لیا تھا۔
 ”اگرے یا راکم کیسے تمہاری مرضی قبول چاہتا ہے؟ کرو لیکن کسی سیدھ کو کہتے کھانا۔“ اگلے کچھ دنوں میں نیل نے اس کا پیار۔
 ”خیر یہ سناؤ۔ حیدر اور آئی کیسی ہیں۔“
 ”ٹھیک ہیں یا راکم تین روزہ کے لیے حیدر کا ایک سٹینڈ بھارت ہوا تھا۔“
 ”واٹ؟ ایک سٹینڈ؟“ دل اور حیدر اٹھ بیٹھا۔
 ”ڈوئل دوری یا راکم انہی نقصان نہیں ہوا تھا شکر ہے کہ حیدر خود بخود آئی نہیں گاڑی ہے کچھ فراشیں آئی ہیں۔“

نیل نے اسے تسلی دی۔
 ”تو اسے ابھی اتنی جلدی ڈراؤ کہ اس کی ضرورت ہی کیا تھی؟“ یہ عقلی سے کہہ رہا تھا۔
 ”جی گاڑی دیکھ کر سب کو ڈراؤ کیونکر کرنے کا شوق ہو جاتا ہے۔“ حیدر نے جواب دیا۔
 ”یا راکم انہی جوش سے کام لے رہا ہے جوش سے نہیں سمجھتا اسے۔“ دل اور نے تاکید کی۔
 ”کچھ عرصہ اور گزار لو خود بخود سمجھ جائے گی۔“
 ”خیال رکھا کرو اس کا۔“ دل اور کے کہنے پر نیل مسکرایا۔
 ”مسکرا کیوں رہے ہو؟“ وہ جان چکا تھا کہ نیل مسکرا رہا ہے۔ ان لوگوں کے ایک دوسرے کے بارے میں

ابراز سے اتنے درست ہوتے تھے کہ کوئی دیکھ لیتا تو حیران رہ جاتا۔ وہ نیل دوست کوں میں ایک دوسرے کی حرکتیں آنکھیں بند کر کے بھی جان لیتے تھے۔
 ”تمہاری بات ہے مسکرایا ہوں۔“
 ”کس بات ہے؟“ دل اور ناگہی سے بولا۔
 ”خیال رہے والی بات ہے یا راکم؟“ نیل نے بڑی حیرت ہوئی ہے کہ میں سب کا خیال رکھتا ہوں لیکن میرا خیال کوئی بھی نہیں رکھتا۔ تم بھی نہیں دیکھتے۔“ نیل نے شکوہ کیا اور دل اور نے چند لمحے کے لیے اس کی بات کو سنا کر دیکھا۔
 ”تمہیں کیا پتا۔ میں ہی تو تمہارا خیال رکھتا ہوں۔“ دل اور کا جواب تھا۔ اس نے ایک جیاسٹریٹ سٹاکر کو اشارہ کیا اور وہ دونوں حضرات پر چڑھ کر دو موٹروں کے پیچھے سے گئے۔

”کیسے؟“
 ”یہ صرف اللہ جانتا ہے۔“
 ”ایسا کیا ہے جو میں نہیں جانتا۔“ نیل کو تجسس ہوا۔
 ”ایسا بہت کچھ ہے جو تم نہیں جانتے ہو۔“ دل اور نے جواب دیا۔
 ”کمال اور نے اتنا سندر سے کہا تھا کہ اس کی راکم کی کھانسی کی آواز سن کر وہ لڑکھاتا ہے۔“ نیل نے اس کی بات کو سنا۔

”یہ صرف اللہ جانتا ہے۔“
 ”ایسا کیا ہے جو میں نہیں جانتا۔“ نیل کو تجسس ہوا۔
 ”ایسا بہت کچھ ہے جو تم نہیں جانتے ہو۔“ دل اور نے جواب دیا۔
 ”کمال اور نے اتنا سندر سے کہا تھا کہ اس کی راکم کی کھانسی کی آواز سن کر وہ لڑکھاتا ہے۔“ نیل نے اس کی بات کو سنا۔

تم ڈوبنے کے خیال سے ہی اور جانتے ہو اور تم ڈوبنے کے خیال سے ہی ڈوب جاتے ہیں۔ میں تمہارا خیال رکھتا ہوں۔
 ”کھڑے تھامنا دیکھتے رہو کہ اندر کیا ہو رہا ہے؟ سندر نے کہا۔ گزرا تھا ہے؟ کشتی پر کیا گزرا ہے؟ کشتی اور سندر سمندر سے کیسے نکلیں گے؟ میں دیکھتا جاؤ اس سمندر میں میری موت ڈوب جاؤ گی۔“
 ”دل اور کا جواب بھی عجیب تھا اور باتیں بھی عجیب تھیں۔ اس کا جواب تھا کہ اس کشتی کی موت تھا جو بے رحمی میں اس کا خیال رکھتے گئے۔ سندر میں اتنی کشتی کی موت کا کوئی راستہ نہیں مل رہا تھا سندر چاہتا تو مل میں اسے اتنی مدد دے کہ اس کے دل سے سندر کا خیال نکلتا۔ لیکن سندر نے کہا کہ سندر بھی اس کشتی کی موت کو دیکھ رہا تھا جو بغیر کسی سارے اور اس کے دل میں بھی اور سندر بھی اس کشتی کو دیکھ رہا تھا۔
 ”ساحل پر کھڑے تھامنا دیکھتے رہو کہ اندر کیا ہو رہا ہے؟ سندر نے کہا۔ گزرا تھا ہے؟ کشتی پر کیا گزرا ہے؟ کشتی اور سندر سمندر سے کیسے نکلیں گے؟ میں دیکھتا جاؤ اس سمندر میں میری موت ڈوب جاؤ گی۔“

”جہاں تم کھڑے ہو۔“ نیل کی آواز نے اسے کمری سے متوجہ کیا تھا۔
 ”جہاں تم کھڑے ہو۔“ اس کی بات پر ہم بھی۔
 ”میں کہاں کھڑا ہوں؟“ نیل کو حیرانی ہوئی۔
 ”یہ تو تمہیں پتا ہے کہ تم کہاں کھڑے ہو۔“ دل اور نے لاپرواہی ظاہر کی۔
 ”میں تو تمہیں پتا ہے کہ تم کہاں کھڑے ہو۔“ نیل نے اسے یاد دلایا۔
 ”نیل کی اس بات پر سندر نے کہا کہ سندر بھی اس کشتی کو دیکھ رہا تھا۔

”نیل کی اس بات پر سندر نے کہا کہ سندر بھی اس کشتی کو دیکھ رہا تھا۔“
 ”نیل کی اس بات پر سندر نے کہا کہ سندر بھی اس کشتی کو دیکھ رہا تھا۔“
 ”نیل کی اس بات پر سندر نے کہا کہ سندر بھی اس کشتی کو دیکھ رہا تھا۔“
 ”نیل کی اس بات پر سندر نے کہا کہ سندر بھی اس کشتی کو دیکھ رہا تھا۔“

”نیل کی اس بات پر سندر نے کہا کہ سندر بھی اس کشتی کو دیکھ رہا تھا۔“
 ”نیل کی اس بات پر سندر نے کہا کہ سندر بھی اس کشتی کو دیکھ رہا تھا۔“
 ”نیل کی اس بات پر سندر نے کہا کہ سندر بھی اس کشتی کو دیکھ رہا تھا۔“
 ”نیل کی اس بات پر سندر نے کہا کہ سندر بھی اس کشتی کو دیکھ رہا تھا۔“

”نیل کی اس بات پر سندر نے کہا کہ سندر بھی اس کشتی کو دیکھ رہا تھا۔“
 ”نیل کی اس بات پر سندر نے کہا کہ سندر بھی اس کشتی کو دیکھ رہا تھا۔“
 ”نیل کی اس بات پر سندر نے کہا کہ سندر بھی اس کشتی کو دیکھ رہا تھا۔“
 ”نیل کی اس بات پر سندر نے کہا کہ سندر بھی اس کشتی کو دیکھ رہا تھا۔“

”نیل کی اس بات پر سندر نے کہا کہ سندر بھی اس کشتی کو دیکھ رہا تھا۔“
 ”نیل کی اس بات پر سندر نے کہا کہ سندر بھی اس کشتی کو دیکھ رہا تھا۔“

جسبھی ملتا ہے کوئی شخص ہماروں جیسا؟
 مجھ کو ختم کیسے بھلا دے ہو، کہاں ہوتے ہو؟
 مرد راتوں میں خنجر کیسے بھلا سکتا ہوں؟
 آگ سیول میں لگاتے ہو، کہاں ہوتے ہو؟
 مجھ سے چھڑے ہو تو عجیب نظر ہو کس کے؟
 آج کل کس کو مٹاتے ہو، کہاں ہوتے ہو؟

”میں ہاؤس کہاں ہوتا ہے؟“ گارٹن بھانجی صوفے کے پیچھے کھڑی درزی کے عتب سے اس کی گود میں رکھی شاعری پڑھ رہی تھی اور درزی کو خبری نہیں تھی جیسے ہی دیوار کی درزی بیکدم چونکا گئی تھی۔

”بھانجی آپ... اس نے فوراً گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

”تو یہ کونسا اعتراض ہے؟“ نگارش حویلی کی سائیڈ سے نکل کر مامنے آگئی تھی۔
 ”تو یہ کونسا اعتراض ہے؟“ نگارش حویلی سے پوچھ رہی تھی۔ نگارش اطمینان سے اس کے مقابل والے حویلی سے پوچھ گئی تھی۔

”تجسس ہی شہر نہیں ہوتی۔ اور محبت کرنے والوں کی سب سے بڑی غلطی یہ ہوتی ہے کہ وہ ہر بات سے ہرجے سے بے خبر ہوتے ہیں تمہاری طرح۔“ وہ سکون سے گہمہ رہی تھی۔
”جیسا بے خبری و دلرب۔“

”یہ وہاں ہے کہ تمہیں تو یہ سب ہی پتا نہیں ہوتا کہ وہ کس کس کے لئے والا آج کل کہاں ہوتا ہے؟“
 ”کیا مطلب؟ کہاں ہوتا ہے؟“ زری نے جانتے سے جو کلمہ کہہ کر متوجہ ہوئی۔
 ”مہینے اس سوال سے ہی سمجھ جاؤ کہ تم بے خبر ہو۔“ زری گرج مگر لگتی۔
 ”بتائے نا بھائی؟ کہاں ہے وہ۔“ زری کے آنکھوں سے بے چینی پوچھ پڑی تھی۔
 ”آج کل جناب کراچی میں ہوتے ہیں کسی کیس کے سلسلے میں۔“
 ”آپ کو کس نے بتایا ہے؟“

"تکب۔" "اچھی تھوڑی دیر ملے۔"
 "ہاں! اس نے خود غصہ کیا تھا۔"
 "اور کیا کتا ہے؟"

”نکلتا ہے میری طرف سے زہری کو ایک زور کا پیار ہے تاہم میں اس کو پسند نہیں کرتی۔“

اندر از میں شرارت شہی زہری غفلت سے اسے گھوڑے لگی۔

”پیارا احمق کیوں رہی ہو؟ پیار رہنے ہی تو آئی ہوں۔“

”تو تو یہ کہیں! مجھے ایسے پیار کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر پیار میں غلطی ہے تو یہ خود آکر دے۔“ کہتے ہوئے اس کا چہرہ گلابی ہو گیا تھا۔

”اگر اللہ کا ارادہ تھا تو اللہ نے اسے اپنا کر لیا۔“ ان کا جواب تھا۔

”بھائی! بی بی زائے مجھے کشمیری قرآن مست کیا کریں۔“
”تو پھر کیا کروں۔“

”میری شاہی خواہا“ زری بھی شرافت سے بولے۔
 ”ہر...؟“ ”نکارش اچھل پڑی۔“

”لو کیا میں بھائی گمروں کی ہوں۔“ زوی بھی اسی کے ساتھ اڑھیں بولتا۔
”تو پھر میں بات کریوں عید اٹھائے۔“

”اب کرس کی؟“ یہ مدد دینی غصے کا ظہور تھا۔ وہی تھا۔
”آج کرس کی؟“ اسی کرس کی ڈیڑھ گھنٹہ پہلے جس نے کرس کی تھی۔

”نگار شہزادہ“ عبدالرشید کے قریب آئے ہوئے پکارا تھا۔
”جی ہاں۔“ جس نے چاہے وہ اپنے لیے بھی تھا۔

”سورج! میں تیری کسی بات کو کبھی آزادی ہوں۔“ کاوش خود را ”کھڑی ہو گئی تھی عبد اللہ وہاں سے ہٹ کر پندرہ بیس میں چلا گیا تھا۔“

”آج مجھے شادی کے ارادے ٹیک نہیں گئے، عشق سے ہی نگارش نگارش بکا رہا ہے۔“ نگارش نے شراب خانہ سے کاناوری کے چہرے پر مسکراہٹ سمجھی۔

”آج میری پونٹیں رنرہوئے والی تھیں۔“
”آپ کی پونٹیں انہی کے پاس جا کے رنرہوئی۔“

”آج تھماڑے بھائی کا راولو کچھ اور ہے اور میرا راولو کچھ اور ہے۔“
 ”آپ کا راولو کیا ہے؟“

تو اس نے کہا کہ یہ تو میں نہیں کہہ سکتا۔

یہ بات ماننے کے۔ نگارش دومتی اول ری تھی لیکن لڑی۔ نگارش گوار کھانا جانتی تھی تو کہہ رہی ہوں یا سپردا اچھا موقع ہوتا ہے ہوں کے لیے کوئی بات کرنے کا بہتر ذریعہ سیٹ جانتی تھی۔

”چھوٹا سا! تم بھی نابینا؟“ کچھ کرتے ہوگی خود کچھ کرو گی؟“ حجاز حقی سے کہہ کر یگان میں گئی اور

میں نے ان کے پاس سے گزرتے ہوئے ان کے ہاتھ میں سے ایک ٹکڑے کا پتہ لے لیا۔

میں نے اسے دیکھا تھا۔

”ابھی وقت نہیں ہے تمہارے بھائی صاحب میرے بچے ہیں اور یہ وہل گئے تمہاری بات پر میں سنوں گی۔“

[illegible]

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں ایلوڈنگ
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ پیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
- ✧ ایڈفری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک ویکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety7

نیکلہ عزیز



بڑی حوصلی کے تمام لیکن وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیہ ذلے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدھیہ اور فیملی حیات دینی، بن بھائی ہیں، مدھیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے، وہ انگلینڈ کی رہائشیوں میں مکمل طور پر رنگ چکی ہے، جس کے پیش نظر فائزہ بیگم، فیملی کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں، لیکن مدھیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے، جس پر فیملی اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے، مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پھنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے، مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، سبے بسی اور مجبوری سے ٹک آخر خود کشی کرنے کا سوچتا ہے، لیکن ایسے میں ایک روز اسے دھماکے میں چائے پیتے ہوئے پاؤں اٹھا کر مل جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے، جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے، اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میسرک پاس آئی ہے، وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حوصلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگے آتا ہے، وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل اور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے، وہ اپنے قول و فعل کا بہت یگانہ آئی ہے، اس نے

کئی بار نہیں سیکھا، اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پر بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو دیتی ہیں۔

۱۲
بازوین قیام

قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہذا ان صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے خرمی سے محفوظ رکھیں۔

”زری کے لیے فون کیا ہے؟ خیریت۔“ اس کے لبو لہجے میں بھی سنجیدگی اتر آئی تھی۔

”اسے پاکستان کب بھیج رہے ہو؟“

”پاکستان۔ کیا مطلب ہے اب کا؟ میں سمجھا نہیں؟“ وہ واقعی نہیں سمجھا تھا۔

”کیا ساری زندگی اسے کنواری ٹھکانا چاہتے ہو؟“ انہوں نے طنز یہ کہا۔

”نیکھے بابا جان! آپ جو کہنا چاہتے ہیں صاف صاف کہیں، مجھے پسلیاں سمجھ نہیں آتیں۔“ اس نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔

”برخوردار! بات ویسے ہی صاف صاف ہے، اس کی شادی نہیں کرنی کیا؟ اس کے لیے رشتہ آیا ہے، اسے پاکستان بھیجو، رشتہ طے کرنا ہے اس کا، شادی کرنی ہے اس کی۔“ وہ کافی سخت اور دنگ انداز میں بول رہے تھے۔

عبداللہ ان کی بات سن کر ٹھٹھک گیا تھا۔

”زری کے لیے رشتہ آیا ہے؟“ وہ جیسے دہرا کے بولا تھا اور اس کے قریب ہی بیڈ پہ جاگئی سوئی سی نگارش بھی اس بات پر یک دم اٹھ بیٹھی تھی۔

”ہاں! اس کے لیے رشتہ آیا ہے، پہلے بھی دو تین اچھے رشتے آئے تھے، لیکن اس کی پڑھائی کے شوق اور تمہاری ضد کی وجہ سے ان رشتوں کو انکار کر دیا تھا، لیکن اب یہ رشتہ ایسا ہے کہ اس سے انکار نہیں ہو سکتا، اس لیے اسے ایک مہینے کے اندر اندر واپس پاکستان بھیجو، بہت ہو گئی پڑھائی، پانچ سال ہونے والے ہیں آخر۔“ وہ زری کی واپسی کا حکم جاری کر رہے تھے۔

”ایم سوہی بابا جان! وہ اپنی پانچ سال کی محنت اور شوق اور اچھے اسٹیج پر چھوڑ کے نہیں آسکتی، اس کا لاسٹ سمسٹر چل رہا ہے اور ایکسٹرنز بھی بس چند روز میں اشارٹ ہونے والے ہیں، ایک مہینے سے زیادہ ٹائم لگ جائے گا، آپ انتظار کر سکتے ہیں تو ٹھیک ہے، ورنہ اس رشتے سے بھی انکار کر دیں۔“ عبداللہ زری کے معاملے میں کوئی کمپروماز نہیں کرتا تھا، زری اسے بہت عزیز تھی، کیونکہ وہ بھی ایسی خرم اور ٹھنڈی بیٹھی شہد آگئیں لہجے والی صابر اور شاکر، وہ اس کے ساتھ کوئی زبردستی یا نا انصافی نہیں ہونے دے سکتا تھا۔

”یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ عورت ذات ہے وہ، اس کے لیے شادی ضروری ہے یا پڑھائی۔“ وہ غصے سے بولے تھے۔

”دونوں چیزیں ضروری ہیں، پہلے پڑھائی، پھر شادی۔“ عبداللہ نے اطمینان سے جواب دیا تھا۔

”نام چل گیا ہے تمہارا، ولایت کے آزاد ماحول میں رہ کر عزت اور غیرت کے نام کو بھی بھول گئے ہو، بہن کو اپنے نقش قدم پر چلانا چاہتے ہو۔“ وہ فون میں ہی دھاڑنے لگے تھے۔ ان کی آواز ایریز میں سے باہر تک سنائی دینے لگی تھی۔

”تو کیا آپ کے نقش قدم پہ پلنے دوں؟ عزت، غیرت اور جاگیر کے نام پہ دلوں کو اجاڑ دوں؟ نام نہاد عزت، نام نہاد غیرت اور نام نہاد جاگیر کی خاطر اپنے سگے اور قابل احترام رشتوں کو خوف زدہ کر دوں؟ بری نظر رکھوں؟ یا پھر یا پھر شہرین کی طرح اسے بھی کسی چوہدری کی چوہدری میں دے دوں؟ تاکہ وہ اس چوہدری کی پسلی بیویوں اور ان

نگارش بیڈ روم کا دروازہ کھلیں کر اندر داخل ہوئی تو عبداللہ سامنے ہی بیڈ پہ بیٹھا اسی کا انتظار کرتا دکھائی دیا تھا۔ نگارش کے لبوں پہ وہی سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ وہ دروازہ بند کر کے بیڈ کے قریب آئی اور چائے کا کپ عبداللہ کی سمت بڑھادیا تھا۔ لیکن عبداللہ نے کپ تھاما، مگر اس کی کلائی سمیت۔

”آرام سے عبداللہ چائے گر جائے گی۔“ نگارش نے اسے روکا، لیکن وہ اسے گھور کے دیکھ رہا تھا۔

”میں ہمیشہ ہر معاملے میں آرام سے ہی پیش آتا ہوں، لیکن تم میرے اس آرام اور تحمل کا ناجائز فائدہ اٹھاتی ہو۔“ وہ نگارش کے ہاتھ سے کپ لے کر بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھ چکا تھا۔

”میں ناجائز فائدہ اٹھاتی ہوں؟ کیا مطلب ہے آپ کا؟“ نگارش اپنی مسکراہٹ دبا کے بولی تھی۔

”جب بھی کسی کام سے جاتی ہو واپس آنے کا نام نہیں لیتیں، اور اگر آتی بھی ہو تو دیر لگا کے۔“ عبداللہ نے اسے آہستگی سے کھینچ کے بیڈ پہ بٹھالیا تھا۔

”اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں ہے، بیڈ روم کے اندر آپ ہوتے ہیں اور بیڈ روم کے باہر آپ کی بہن ہوتی ہے اور ظاہر ہے میں نے تو دونوں کو نام نہاد ہے۔“ اس نے لاپرواہی سے کہتے ہوئے کندھے اچکائے۔

”ارے! اس میں اس کا کیا قصور ہے؟ وہ تو چاروں کی مہمان ہے، چند دنوں تک چلی جائے گی، تم اپنی بات کرو، تم کیا کرو گی پھر؟“

”پھر میں وہی کروں گی جو آپ کہیں گے۔“ وہ ہلکے سے مسکرائی۔

”عبداللہ! مجھے کچھ کہنا تھا آپ سے۔“ اس نے بمشکل اپنے ہوش و حواس قابو میں رکھتے ہوئے کہا تھا، ورنہ

عبداللہ اپنے جذبات سمیت اس پہ حاوی ہو رہا تھا۔

”میں بھی نہیں، پھر کبھی۔“ وہ گمبیر لہجے میں بولا۔

”لیکن عبداللہ۔“

”نگارش پلیز! اس وقت تمہارے سوا کوئی بات اچھی نہیں لگ رہی، اس لیے میں اگر کچھ کہہ دوں تو سر کے اوپر سے گزر جائے گا، اس لیے اپنی بات کل کے لیے اٹھا رکھو۔“ عبداللہ کے کہنے پر

نگارش کے کچھ کہنے کی نجاشی ہی نہیں رہی تھی، اس نے مجبوراً ہتھیار ڈال دیے تھے۔

صبح سٹنڈے تھا، اس لیے جلدی اٹھنے کی فکر نہیں تھی، وہ دونوں خوب گہری نیند سوئے اور ابھی نہ جانے کتنی دیر تک سوتے کہ اچانک بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھا عبداللہ کا موبائل بجنے لگا، رنگ ٹیون کا میوزک بجتے ہی اس کی نیند ٹوٹ گئی تھی، اس نے موبائل اٹھا کر نمبر دیکھا تو اسکرین پہ بابا جان کا نمبر جلتا، جھٹکا دکھائی دیا، جسے دیکھ کر عبداللہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا تھا، وہ یک دم اٹھ بیٹھا تھا۔

”السلام علیکم بابا جان۔“ اس نے محبت اور اشتیاق سے لبریز لہجے میں کہا تھا۔

”وعلیکم السلام۔“ وہاں سے پاتلا سا جواب آیا تھا۔

”بابا جان کیسے ہیں آپ؟ آج جسے آج میں اتنا خوش قسمت کیسے ہو گیا؟“ اس کی خوشی اس کی آواز اور لہجے سے جھلک رہی تھی۔

”ہم نے تمہیں تمہارے لیے فون نہیں کیا، ہم نے تمہیں زری کے لیے فون کیا ہے۔“ انہوں نے اس کی خوشی پل میں ختم کر ڈالی تھی۔ وہ چپ کا چپ رہ گیا تھا اور چند ثانیے تو کچھ کہہ ہی نہیں سکا تھا، لیکن وہ ان کے سامنے جذباتی ہو کر کمزور نہیں پڑنا چاہتا تھا، اسی لیے اپنے آپ کو کنٹرول کرتے ہوئے آپے میں ہی رہنا پڑا۔

کے بچوں کو پالتی رہے؟ ہونہ! یہ خوش فہمی ہے آپ کی، آپ زری پہ کوئی زور زبردستی نہیں کر سکتے، میں اسے ساری زندگی کنواری بٹھا کر اس کی ذمہ داری اٹھا سکتا ہوں، لیکن اسے کسی چوہدری کے پاؤں کی ہوتی نہیں بنا سکتا۔“ وہ بے لہجے میں چبا کر بولا تھا۔

”تو تم اپنے باپ سے متھا لگاؤ گے۔“ وہ غرا کے بولے تھے۔

”میری اپنی مجال کہاں بابا جان؟ میں بھلا کون ہوتا ہوں آپ سے متھا لگانے والا؟ آپ والد محترم ہیں، ہمارے آپ کا ہر حکم سر آنکھوں پہ، لیکن میں معذرت چاہتا ہوں آپ سے، زری کے معاملے میں، میں آپ کا کوئی حکم نہیں مان سکتا، وہ پاکستان آئے گی تو اپنی اسٹڈی کمپلیٹ کر کے اور دوسری بات کہ شادی اس کی پسند اور مرض کے بغیر نہیں ہوگی، شہرین والا معاملہ زری کے ساتھ نہیں ہوگا۔“ اس نے بابا جان کو واضح الفاظ میں بتا دینا لبر کشا دینا ضروری سمجھا تھا۔

”تم جانتے ہو تم کیا کہہ رہے ہو؟“ وہ سخت انداز میں بولے۔

”جی! کافی اچھی طرح جانتا ہوں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔“

”تم بھول رہے ہو کہ میں تمہارا باپ ہوں، اگر ضد پہ آگیا تو ولایت مجھ سے دور نہیں ہے، میں وہاں بھی سکتا ہوں۔“ انہوں نے گویا دھمکی دی۔

”شوق سے آئیے، لیکن یہ بھی یاد رکھیے کہ ہو گا وہی جو زری چاہے گی، یہ ملکہ الزبتھ کی ریاست ہے، آپ کی جاگیر نہیں ہے، یہاں عورت کی ویلو ہے، مرد کو تو کوئی جانتا بھی نہیں، یہاں صرف عورت ایک فون کال کرنا ہے اور مرد جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہوتا ہے، آپ سوچ لیجیے کہ آپ نے کیا کرنا ہے؟ اگر آپ زری کے لیے آنا چاہتے ہیں تو کبھی آنے کا سوچے گا بھی مت اور اگر آپ ہم سے ملنے کے لیے آنا چاہتے ہیں تو آپ کا رزٹن لٹ میری طرف سے۔“ عبد اللہ بھی ان ہی کا بیٹا تھا، اس نے باتوں باتوں میں انہیں بہت کچھ بتا دیا تھا، اسے مگر انہوں نے یک دم غصے سے فون منٹھا اور عبد اللہ کو دھمکا دیا تھا۔ پھر کمری سانس کھینچتے ہوئے مسابیل سائیڈ ٹیبل پہ ڈال دیا تھا۔

”کیا بات ہے عبد اللہ؟ بابا جان کیا کہہ رہے تھے؟“ نگارش نے پریشانی سے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ اس نے نفی میں گردن ہلائی اور سگریٹ کا پکٹ اور لائٹس اٹھا کر سگریٹ سلگا لیا تھا۔

”آپ زری کے بارے میں بات کر رہے تھے، آپ زری کو پاکستان بھیج دیں گے؟“ نگارش عبد اللہ سے بھی زیادہ متشکر ہو رہی تھی۔

”ارے یار نہیں بھیج رہا۔“ عبد اللہ سر جھٹکتے ہوئے جھنجھلا کر بولا تھا اور نگارش اس کا موڈ دیکھ کر پت پت تھی، وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے سگریٹ پھونک رہا تھا، وہ اسے اس کے حال پہ چھوڑ کے اٹھ کر دواشمارہ میں چلی گئی، کافی دیر بعد شاہرے کر باہر نکلی تو عبد اللہ کھڑکی میں کھڑا نظر آیا تھا، وہ ڈرائنگ ٹیبل کے سامنے آؤٹری ہوئی اور اپنے بال سنوارنے لگی، عبد اللہ ہنوز گمری سوچ میں گم تھا۔

”آپ شاہرے لے لیں، میں ناشتا بناتی ہوں۔“ وہ دوشہ اٹھا کر پھیلاتے ہوئے عبد اللہ سے مخاطب ہوئی تھی۔

”ٹھہرو۔“ عبد اللہ کی آواز پہ اس کے قدم ٹھہر گئے تھے۔

”جی؟“

”ادھر آؤ۔“ اس نے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا، وہ خاموشی سے قریب آگئی۔

”رات کو تم کچھ کتنا چاہتی تھیں؟“

”جی! مگر ابھی مناسب نہیں۔“

”کیا بات ہے؟“

”کیا ہی بات ہے جیسی آپ چھپا رہے ہیں۔“

”کچھ طب ہے تمہارا؟“

”کیا نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”نگارش۔“ عبد اللہ نے خفگی سے اسے دیکھا۔

”معتذر آپ بتائیں، کیا مسئلہ ہے بابا جان کیا کہہ رہے تھے؟ زری کے رشتے کی بات کر رہے تھے آپ لوگ؟“ نگارش بھی جواباً ”خفگی سے بولی تھی اور عبد اللہ چند ثانیے کے لیے خاموش سا ہو گیا، پھر اسے ساری بات نگارش کو بتانا پڑا جسے سن کر نگارش بدگ گئی تھی۔

”وہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟ وہ یہاں سے بڑھ لکھ کر جائے اور وہاں کسی پینڈو جاہل اور اجڈ کی خدمت گزاری کرے، ان چیزوں کو سننے والی نہیں ہے، آپ نے بابا جان کو بتایا کیوں نہیں کہ زری شہرین نہیں ہے، وہ شہرین تھی، جب کچھ سہہ گئی، یہ تو ایک دن میں مرجائے گی، ہاں اسے مارنا چاہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہے، پھر جیسا چاہیں کر سکتے ہیں۔“ نگارش زری کے لیے تڑپ اٹھی تھی اور عبد اللہ بے ساختہ نگارش کو دیکھے گیا تھا، وہ اس کے دیکھنے پہ ٹھٹھکی تھی۔

”وہ کیسے رہے ہیں؟“

”وہ اب رہا ہوں کہ اتنی محبت ہے زری سے؟“ عبد اللہ کی بات پہ اس کے تے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے تھے اور سچ بھلا لیا تھا۔

”سچ ہے عبد اللہ، میں زری کو اب کی بہن نہیں اپنی بہن سمجھتی ہوں اور اپنے بہن بھائیوں کے لیے کوئی بھی نہیں سوچ سکتا۔ بلکہ میں تو شروع سے ہی زری کے لیے کچھ اور سوچتی ہوں۔“ نگارش نے بالا خر کہہ ہی دیا تھا۔ عبد اللہ نے چونک کر اس کے چہرے کی سمت دیکھا۔

”ابھ اور؟ کیا مطلب؟“ مطلب کہ اس کی شادی کے حوالے سے، وہ آہستگی سے بولی۔ ”کیا سوچتی ہو اس کی شادی کے حوالے سے؟“ وہ سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا اور نگارش بھی اس کے برابر کھڑکی سے لگ کے کھڑی ہو گئی، ابھر کا موسم آج پھر ابر آلود ہوا تھا۔

”ٹیل بھائی اور دل آور بھائی کسی بھی لڑکی کے لیے آئیڈیل شوہر ثابت ہو سکتے ہیں، میں جب بھی ان دونوں کو دیکھتی ہوں تو مجھے زری کا خیال آتا ہے اور مجھے لگتا ہے زری کی جوڑی دل آور بھائی کے ساتھ ہی جگ سکتی ہے کسی اور کے ساتھ نہیں۔“ نگارش نے بات کرتے ہوئے ٹیبل کا ذکر بھی شامل کر لیا تھا، تاکہ عبد اللہ کو شک نہ گزرے اور دوسری طرف عبد اللہ نگارش کی بات سن کر ششدر سا کھڑا تھا۔ نگارش کتنی بڑی بات کہہ گئی تھی۔

عبد اللہ! کیا زری کی شادی دل آور بھائی سے نہیں ہو سکتی۔ وہ تو جس کا بھی نصیب نہیں گے خوش قسمت کہلے گی۔“ نگارش اس سے اچھ رہی تھی اور عبد اللہ کچھ کہنے کی بجائے گم سم سا اسے دیکھ رہا تھا۔

عبد اللہ! آپ چپ کیوں ہوئے؟ کیا میں نے کچھ غلط کہہ دیا ہے؟“ نگارش نے اس کا بازو ہلایا تھا۔

ایسا کیسے ہو سکتا ہے نگارش! ک ناممکن سی بات کہہ رہی ہو تم۔“

اس جہان میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے عبد اللہ! بس کرنے کی نیت ہونی چاہیے۔“ وہ اسے اکسار ہی تھی کچھ کہنے اور کچھ کرنے۔

نگارش! دل آور میرا دوست ہے، ہم اک دوسرے کے سامنے سر اٹھا کر رہتے ہیں اور آنکھ سے آنکھ ملا کر بات کرتے ہیں، نہ تو وہ میری بہن کے بارے میں اس حوالے سے سوچ سکتا ہے اور نہ ہی میں اسے کچھ کہہ سکتا

ہوں۔ وہ حیرانی اور بے یقینی سے کہہ رہا تھا۔

”ٹھیک ہے آپ کچھ نہیں کر سکتے، لیکن اگر وہ کچھ کے تو پھر آپ کی کیا رائے ہوگی۔؟“ وہ اس کا عتبہ جاننا چاہتی تھی۔

”میں فی الحال اس ٹاپک پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میرے لیے جتنی زری اہم ہے اتنا ہی دل آور بھی اہم ہے۔ لیکن ان دونوں کے بارے میں کبھی سوچا نہیں ہے اس لیے رائے دینا مشکل کام ہے، پلیز میں پہلے ہی سینسر ہوں مجھے مزید نہ الجھاؤ۔“

”ٹھیک ہے میں آپ کو ڈسٹرب نہیں کرتی لیکن جب آپ زری کی شادی کا سوچیں تو دل آور بھائی کو بھی سوچیں گے۔“ نگارش نے زور دے کر کہا اور وہاں سے ہٹ گئی تھی لیکن عبداللہ نے نئی سوچ کے درد کو گئی تھی وہ نہ چاہتے ہوئے بھی سوچنے پہ مجبور ہو گیا تھا اور دوسری طرف ذہن بابا جان کی باتیں گردش کر رہی تھیں۔

”منصور حسین۔! تجھے دیکھ کر میں اک بات سوچ رہا تھا۔“ عارف نے بیٹی دلچسپی سے کہا تھا۔ منصور حسین ابھی ابھی نہا کر آیا تھا پرانی سی جینز پر بد رنگ سی بنیان پائی ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود اس کی دمکتی رنگت اور کسرتی جسم کے مضبوط مسلز بے حد نمایاں ہو رہے تھے جن کو دیکھ کر عارف کی نظروں میں ستائش اتر آئی تھی۔ اور وہ کے بغیر رہ نہیں سکا تھا۔

”کیا سوچ رہے تھے مجھے دیکھ کر۔؟“ منصور حسین نے دلچسپی سے پوچھا اور توپے سے بال رگڑتا ہوا کمرے میں لٹکے چھوٹے سے شیشے کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔

”تمہارے چہرے کی دائرہ صاف کروا کے، تمہارے بالوں کی کٹنگ کروا کے، تمہیں نئے اور امیروں والے کپڑے پہنا کر سامنے لایا جائے تو قسم سے مجھے پورا یقین ہے تمہارے جیسا جوان پورے شہر میں نہیں ہوگا۔“ عارف نے بڑے شوق اور بڑے جوش سے کہا تھا جس پر منصور حسین یکدم قلم شگاف قہقہہ لگا کے ہنسا تھا اور اس کے قہقہے کی گونج کافی دور تک گئی تھی۔

”اچھا! تو تم مجھے تصور کی آنکھ سے امیروں والے حلیے میں دیکھتے ہو۔؟“ منصور حسین کو عارف کی بات ات دلچسپ لگی تھی۔

”ہاں یار! تمہاری چال و حال ہی ایسی ہے، لیکن تمہیں دیکھ کر افسوس ہوتا ہے، تمہیں کسی امیر گھرا نہیں پیدا ہونا چاہیے تھا، بس غلطی سے غریب گھرانے کے فرزند بن گئے ہو۔“ عارف افسوس سے کہہ رہا تھا لیکن منصور حسین کو کوئی افسوس نہیں تھا وہ جس گھرانے میں پیدا ہوا تھا وہ اسی پر خوش تھا۔

”یار! امیری اور غریبی پر اتنا افسوس یا خوشی نہیں ہونی چاہیے یہ سدا رہنے والی چیزیں نہیں ہیں نہ کوئی بٹہ امیر رہتا ہے اور نہ کوئی ہمیشہ غریب رہتا ہے، وقت اور حالات بدلتے رہتے ہیں، اللہ میرا ساتھ دے تو میں اپنے پورے اپنے حالات بدل سکتا ہوں اور جو چیز بدل سکتی ہے اس پر افسوس کیسا۔؟“ منصور حسین کی بات ہی ایسی تھی کہ عارف کو متاثر ہونا پڑا تھا اور اثبات میں سر ہلایا تھا۔

”ہاں یار! یہ بھی تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو، لیکن یار میں جو کیدار ہوں اور تم ڈرائیور اب تم یہ بتاؤ کہ جو کیداری کر کے یا ڈرائیوری کر کے حالات کہاں تک بدلے جاسکتے ہیں۔؟“ عارف کے لب و لہجے میں مایوسی کا رنگ تھا۔ ”تو کس نے کہا ہے کہ ساری زندگی جو کیداری کرتے ہی گزار دو اس سے اچھا اور بہتر کام ملے تو وہ کر لو، میں لی دیکھتا ہوں کہ اس ڈرائیوری میں میرے گھر کے حالات کہاں تک بدلتے ہیں؟ اگر نہ ہوا تو نہیں اور ہاتھ پاؤں ار

لوں گا۔“ اس نے لاپرواہی سے کہتے ہوئے سر جھٹکا۔

”یار! تم جانتے تو ہو کہیں اور ہاتھ پاؤں مارنا آسان نہیں ہے۔ آج کل کام کہاں ملتا ہے اور اگر ملتا ہے تو حالات بدلنے والا نہیں ملتا۔“ عارف نے گہری سانس کھینچی تھی۔

”عارف صاحب! تم اللہ کے بندے ہو، اور اللہ کے بندے سے مایوس نہیں ہوتے، اور وہ کیا کہتے ہیں کہ کوشش کرنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے تم کام کی بات کرتے ہو۔؟ کوشش کرو میری جان تمہیں سب کچھ ملے گا، خدا بھی اور خدا کی خدائی بھی۔“ منصور حسین نے پلٹ کر عارف کے کندھے پر ہتھکی دی تھی اتنے میں مبارک خان اس کے کوارٹر میں داخل ہوا تھا جسے دیکھ کر منصور حسین مسکرایا تھا۔

”دیکھو مبارک خان بھی تو ہے نا، جو کبھی مایوس نہیں ہوا۔“ اس نے مثال دی عارف بھی سر ہلا کر مسکرایا تھا۔ ”کیا ہوا ہے اسے۔؟“ اس نے عارف کا پوچھا۔

”چند منٹوں کے لیے حالت افسوس میں گیا ہے بس، پریشانی والی کوئی بات نہیں ہے ابھی اس حالت سے نکل آئے گا۔“ منصور حسین نے مبارک خان کو تسلی دی۔

”حالت افسوس میں کیا کیوں تھا۔؟“ مبارک خان نے وجہ پوچھی۔

”غریب بندہ ہے، کبھی بھی وقت حالت افسوس میں جاسکتا ہے اس پر پابندی تو نہیں ہے نا۔“ منصور حسین عارف کی طرف اشاری کر رہا تھا۔

”پچلو پھر غریب بندے کی دلجوئی بعد میں کر لینا پہلے اپنے کام پہ جاؤ۔“ اس نے منصور حسین کو اشارہ کیا تھا۔ ”کام پہ۔؟“

”ہاں، وہ علیزے بی بی نے کہیں جانا ہے شاید۔“ مبارک خان اسے بلانے آیا تھا۔

”جانا کہاں ہے۔؟“

”شاہنگ پہ جانا ہے شاید ساتھ میں عون اور عدید صاحب بھی ہیں۔“ مبارک خان نے اطلاع دی۔

”ٹھیک ہے پھر تم جاؤ میں آ رہا ہوں۔“ منصور حسین الرٹ ہو گیا تھا فوراً ”شرٹ پہن کر اپنے جوتے پہننے کے لیے بیٹھ گیا۔“

”جلدی آؤ وہ ڈرائنگ روم میں تیار بیٹھی ہیں۔“ مبارک خان کہہ کر پلٹ گیا تھا اور عارف کے ساتھ وہ بھی کوارٹر سے نکل آیا تھا وہ سیدھا گاڑی تک پہنچا تھا۔

اتنے میں مبارک خان کی اطلاع پہ علیزے بھی دونوں بھائیوں کے ساتھ حویلی کے مرکزی مین ڈور سے باہر آگئی تھی منصور حسین نے انہیں دیکھتے ہی گاڑی کے ڈور کھول دیئے تھے۔ علیزے اور عدید بیک سیٹ پہ بیٹھے تھے جبکہ عون خود ہی ڈور کھول کر فرنٹ سیٹ پہ بیٹھ گیا تھا منصور حسین گاڑی کے تمام ڈور بند کر کے دوسری طرف سے گھوم کے آیا اور ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھ گیا تھا اس نے گاڑی اسٹارٹ کی ہی تھی کہ مین گیٹ بھی دھوا ہوا گیا گاڑی فرارے بھرتی روڈ پہ آگئی تھی۔

”علیزے آئی! پہلے کہاں جانا ہے؟ آؤں کریم پارلر یا شاہنگ سینٹر۔؟“ عون نے گردن موڑ کر پیچھے بیٹھی علیزے کو دیکھا تھا۔

”یہ تو تم دونوں کی پسند پہ ڈپنڈ کرتا ہے کیونکہ میں تم دونوں کے کہنے پہ ہی تو آئی ہوں۔“ علیزے نے لاپرواہی ظاہر کی۔

”اوہ! یعنی ہم جو چاہیں کر سکتے ہیں؟ ہمیں کھلی چھوٹ ہے۔؟“ عون نے چمکتے ہوئے علیزے کو چھیڑا تھا۔ ”زیادہ بھی کھلی چھوٹ نہیں ہے، بس آؤں کریم یا پھر شاہنگ، اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں، میں نے انہی

دونوں چیزوں کا وعدہ کیا تھا۔ "علیز نے ان کو ہری جھنڈی دکھائی تھی۔

"آئی صاحبہ! آپ نے اپنا وعدہ ایسا کرنے میں اتنے دن لگا دیئے ہیں اب تو قرض کے ساتھ سود بھی کافی بن چکا ہے، شاپنگ اور آئس کریم کے ساتھ ساتھ گھومنے پھرنے کا بھی حق بنتا ہے ہمارا اور آپ ہمیں ہمارے حق سے محروم نہیں کر سکتیں۔" عدید نے بھی گفتگو میں حصہ لیا تھا۔

"تم دونوں چیٹنگ کر رہے ہو، تم لوگوں نے کہا تھا کہ صرف آئس کریم کھانی ہے یا پھر شاپنگ کرنی ہے، اب یہ تیسرا حق کہاں سے نکل آیا۔؟" علیز نے ان دونوں کی بے ایمانی پر احتجاج کیا تھا۔

"ٹھیک ہے ہم کچھ بھی نہیں کرتے، ہم واپس چلتے ہیں ڈرائیور! گاڑی واپس لو۔" پیچھے سے عدید نے شور مچا دیا تھا اور منصور حسین ان کے شور پر گاڑی روکنے پر مجبور ہو گیا تھا اور بے ساختہ بیک ویو مرر سے علیز سے کوئی کھانا اس کی ویفریب سی صورت پر پریشانی کے سائے پھیل رہے تھے وہ ہکا بکا سی ان دونوں کی چالاکی دیکھ رہی تھی۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم لوگ۔؟"

"ظاہر ہے خالی خالی شاپنگ کرنے کا بھلا کیا فائدہ؟ وہ تو ہم کسی کے ساتھ بھی جا کر کر سکتے ہیں، آپ ہمارے ساتھ نہیں جانا چاہتے تو بہتر ہے واپس چلے جاتے ہیں۔" عون نے کندھے اچکائے اور علیز نے ان دونوں کی چالاکی اور ہوساری دیکھ کر بے بس ہو گئی تھی۔ گھر سے اتنی دور آکر وہ واپس بھی جاتے تو اچھا نہ لگتا اور اگر واپس چلے بھی جاتے تو علیز کے کو معلوم تھا کہ وہ دونوں ساری زندگی وعدہ نہ نبھانے پر طعنے دے کر رو دیتے اس لیے بہتر تھا کہ ان کی بات مان لیتی جو مشکل تو تھی لیکن ناممکن نہیں تھی۔

"پچلو ڈرائیور۔" علیز نے اشارہ کیا۔

"کہاں؟" وہ ابھی بھی بیک ویو مرر سے دیکھ رہا تھا علیز کے کی نگاہ انہی تو اسے اپنی سمت دیکھتے پا کر چہرے پر ناگواری بکھر گئی تھی۔

"مارکیٹ۔" وہ ناگوار لہجے میں ہی بولی تھی۔

"صرف مارکیٹ۔؟" عون نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں! جہاں تم لوگ کہو گے وہاں بھی۔" وہ چڑکے بولی۔

"ہائو۔" انہوں نے یکدم نعرہ لگایا تھا اور منصور حسین نے گاڑی آگے بڑھا دی علیز نے دو تین بار پھر وقفہ وقفہ سے مرر کی سمت دیکھا تھا لیکن اسے دوبارہ منصور حسین کی نظریں جھکی ہی نظر آئی تھیں بیک ویو مرر اس کی آنکھوں سے خالی تھا اور وہ اپنے آپ کو اطمینان دلائی دوبارہ سے عون اور عدید کے ساتھ باتوں میں لگ گئی تھی "پس" کے سامنے گاڑی پارک کی تو وہ تینوں بہن بھائی گاڑی سے اتر گئے تھے اور منصور حسین نے وہیں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے بیٹھے جب سے سگریٹ کی ڈبیا اور ماچس نکال کر سگریٹ سلگالیا اور تیلی کو پھونک مار کے بجھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا تھا لیکن آگے بڑھتے ہوئے بلا ارادہ ہی عون کی نظر منصور حسین پر پڑی تو اس کے قدم ٹھم گئے وہ آگے بڑھنے کی بجائے واپس منصور حسین کی سائیڈ پر آکا تھا۔

"ایکسکیوز می۔" اس نے اسے متوجہ کیا منصور حسین نے چونک کر دیکھا تھا۔

"جی! کیسے؟" وہ الرٹ ہو گیا۔

"آپ اس گاڑی میں سگریٹ نہیں پی سکتے۔" عون جیسے حکم صادر کر رہا تھا۔

"کیوں؟ کیا یہ گاڑی موم کی بنی ہے یا پھر اس میں بم فٹ ہے۔؟" منصور حسین بھی عادت سے مجبور تھا کہ بغیر نہ رہ سکا یہ دیکھے اور سوچے بغیر کہ جس سے وہ بات کر رہا ہے وہ اس کے مالک کا بیٹا ہے، کچھ بھی کہہ سکتا ہے اور کچھ بھی کر سکتا ہے۔

"نہ موم کی بنی ہے نہ بم فٹ ہے، یہ گاڑی علیز نے آبی کی ہے اور انہیں سگریٹ کی بو سے سخت الرجی ہے" ان کی وجہ سے آنا تنگ حویلی میں کسی مرد نے اسوکنگ نہیں کی اس لیے پلیز آپ بھی احتیاط کیجیے، ورنہ یہ اسوکنگ آپ کو جاب سے نکال بھی سکتی ہے۔" عون اتنا برا نہیں تھا لیکن اس لمحے علیز کے کو خود سے کئی سال بڑا اور ذہین محسوس ہوا تھا۔

"اور ہاں! میری بات کو مائنڈ مت کیجیے گا۔" مجبوری ہے، آپ کو اگر اسوکنگ کی زیادہ ضرورت محسوس ہو رہی ہے تو گاڑی سے یار آجائیے۔" اس نے منصور حسین کو سگریٹ بننے کا حل بتایا تھا اور پلٹ کر علیز کے اور عدید کے پاس آگیا جو چند قدم کے فاصلے پر کھڑے اس کی بات سن رہے تھے منصور حسن چند لمحے پونہ بیٹھا رہا، پھر گہری سانس کھینچ کر گاڑی سے نکل آیا تھا۔ لیکن اس نے انگلیوں میں دبے سگریٹ کو بجھانے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ دور جاتے عوں کو پیچھے تک دیکھا تھا جس کی چال ڈھال اور بات کرنے کے انداز میں ہی امیری کا زعم تھا اور منصور حسین اس بچے سے کئی سال بڑا ہونے کے باوجود بھی اس کے سامنے بے بس تھا کیونکہ غرت اس کی مجبوری تھی ایسی مجبوری جس پر کبھی دیر پہلے عارف افسوس کر رہا تھا اس کے افسوس کی وجہ منصور حسین کو محسوس ہو ہی گئی تھی کہ کبھی کبھی بندے کجاں بولنے کو دل چاہے وہ مجبوری کے مارے بول بھی نہیں سکتا۔!



آنے سے اس کے آئے باز جانے سے اس کے جائے بہار

بڑی مستانی ہے میری محبوبہ میری زندگی گلی ہے میری محبوبہ

عدیل کے سامنے فٹ پاتھ پہ چلتے ہوئے چھوٹا بڑی ترنگ میں گانا گنگنا رہا تھا اور چھیڑتی ہوئی معنی خیزی نظریں عدیل پر ہی مرکوز کر رکھی تھیں۔ عدیل جانتا تھا کہ وہ جان بوجھ کر اسے چھیڑنے کے لیے گنگنا رہا ہے۔ اسی لیے وہ سنی ان سنی کرتا، اصرار دیکھ رہا تھا مڑکوں۔ تو جیسے گاڑیوں کا سیلاب اٹھ آیا تھا اور اس سیلاب میں سے گزرنا اور اپنے لیے راستہ بنانا بے حد شہوار ہو رہا تھا، جیسی وہ دونوں موقع کی تلاش میں تھے کہ کب وقفہ پڑے اور وہ دونوں سڑک کر اس کر کے دوسری فٹ پاتھ پہ جائیں جہاں سے دوسرا بس اسٹاپ قریب تھا کیونکہ ان کے روٹ کی بس دوسرے بس اسٹاپ سے با آسانی مل جاتی تھی۔

"استاد! اتنے دن ہو گئے آپ کا اس حسینہ سے دوبارہ کوئی ٹکراؤ نہیں ہوا۔" چھوٹے نے اسے چھیڑی دیا عدیل نے گردن موڑ کر اسے دیکھا لیکن گھورنی ہوئی نظروں سے۔

"اس قیامت خیز ماحول میں ہمیں وہ حسینہ یاد آرہی ہے۔؟" عدیل کی بات پر چھوٹا بے ساختہ ہنس دیا تھا۔

"تمہیں کیا یاد استاد قیامت خیز ماحول میں اگر کوئی حسینہ یاد آجائے تو وہ بھی جنت خیز ہو جاتا ہے، یہ بد نما آوازوں والی گاڑیاں بھی خوش نما تنلیاں لگنے لگتی ہیں۔" چھوٹا سرور لیتے ہوئے بولا تھا اور عدیل اس کے انداز پر بے ساختہ اٹھنے والا مسکراہٹ نہیں روک سکا تھا جس کو دیکھ کر چھوٹا خود بھی ہنس پڑا۔

"ناگل ہو تم لوگ بھی۔" عدیل نے کہتے ہوئے سر جھٹکا اور مسکرا دیا۔

"پاگل نہیں ہم لوگ درویش ہیں درویش جو بات کہہ دیں وہی ہوتی ہے اور میں نے تو پہلے روز سے ہی کہہ دیا ہے کہ وہ لندن ہٹ حسینہ ہمارے استاد کی ہے، اور دیکھ لینا استاد ایسا ہی ہو گا اور جس دن ایسا ہوا میں وانا اور بار جا کر حاضری دوں گا اور زردے کی بیٹھی دیگ چڑھاؤں گا وہ بھی اپنی محنت مزدوری کی کمائی سے۔" چھوٹا بڑے جوش و خروش سے اور عزم لہجے میں کہہ رہا تھا اور عدیل اس کی خوش فہمیوں پر مسکراتا ہوا چھوٹے کا ہاتھ پکڑ کے سڑک کر اس کرنے کے لیے تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا تھا لیکن انتہائی تیز رفتار گاڑی کے ٹائیر بڑے زور سے

اک عجیب سا لودیتا ہوا احساس تھا جو عدیل کے سینے کو چھو گیا تھا بس لوگوں سے کچھ کچھ بھری ہوئی تھی بیٹھنے کے لیے سیٹ نہیں تھی کھڑے ہو کے سفر طے کرنا تھا اور بھی کئی لوگ کھڑے تھے اور ان میں وہ بھی شامل تھا مگر اک دلکش سا احساس لیے عجیب سے محبت سے مجھے جذبے کے ساتھ۔ اپنے جذبات کو لیے وہ گھر آیا تھا اور جیب سے وہ دلکش سا احساس نکال کر احتیاط سے اور آستکی سے اپنے بستر کے سرہانے رکھ دیا تھا اور خود کپڑے اٹھا کر نہانے کے لیے باتھ روم میں چلا گیا تھا لیکن جذبات اب بھی اس کے ساتھ ساتھ تھے۔



شاپنگ کرنے اور کئی جگہوں پہ گھومنے پھرنے کے بعد وہ فارغ ہو چکے تو آکس کریم کے لیے شور مچا دیا تھا لیکن علیزے کی ٹانگیں جواب دے چکی تھیں۔

”پلیز عیون! اب گھر چلتے ہیں۔“ ڈائریارک سے نکلتے ہوئے علیزے نے تھکے تھکے سے انداز میں کہا تھا۔

”بس اب صرف آکس کریم ہی تو رہ گئی ہے۔“ وہ لاپرواہی سے بولے۔

”دیکھو پلیز! میں بہت تھک گئی ہوں۔“ وہ مذہال سے انداز میں کہتی قریب آئی تو منصور حسین نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس نے منصور حسن کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا اسے منصور حسین کی کاٹ دار اور بے باک آنکھیں ناگوار گزرتی تھیں۔

”لیکن ہم تو ابھی بھی نہیں گئے۔“ عدید نے کندھے اچکائے۔

”میں تم دونوں کی شکایت کروں گی بابا۔“ اس نے دھمکی دی۔

”کوئی بات نہیں بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔“ وہ دونوں ہنس رہے تھے اور وہ انہیں گھور کے رو دگی۔ جیسے ہی منصور حسین نے گاڑی اشارت کی علیزے کا دھیان اسموننگ کی طرف چلا گیا اسے گاڑی میں سگریٹ کی بدبو محسوس ہوئی تھی اور اس کی پیشانی پہ سلو میں بڑگی تھیں۔

”پلیز ڈرائیو! ایر فریشر آن کرو گاڑی میں سگریٹ کی اسمیل ابھی بھی ہے میرا دماغ بھاری ہو رہا ہے۔“ اس نے اپنی کپٹیوں کو سہلاتے ہوئے کہا تھا عیون اور عدید نے چونک کر علیزے کی سمت دیکھا وہ دونوں پریشان ہو گئے تھے جبکہ منصور حسین حیران پریشان رہ گیا تھا گاڑی میں ذرا سی بھی اسمیل نہیں تھی جو تھی وہ کب کی ختم ہو چکی تھی لیکن اس کی حس۔ ایسی تیز تھی کہ وہ ذرا سی اسمیل بھی برداشت نہیں کر پار رہی تھی اور یہ حیرت، تعجب اور بے یقینی کا ہی تو مقام تھا اتنی نازکی بھی تو نہ کبھی دیکھی تھی نہ کبھی سنی تھی اسے تو روز حیرت کے جھٹکے لگتے تھے۔

”ڈرائیو! آپ ایر فریشر آن کر کے گاڑی کے تمام شیشے فولڈ کر دیں۔“ عیون نے تیزی سے کہا تھا اور حیران پریشان منصور حسین نے تیزی سے ایر فریشر کا بٹن ہٹا دیا اور تمام کھڑکیوں کے شیشے فولڈ کر دیے تھے باہر کی تازہ ہوا اندر آنے لگی تھی تب جا کے اس کا دماغ کچھ ٹھکانے پہ آیا تھا۔

”کسی کو لڈ کارنر پہ گاڑی روکو۔“ علیزے نے حکم جاری کیا تھا منصور حسین نے دائیں بائیں دیکھا قریب ترین کوئی بھی کو لڈ کارنر نہیں تھا۔ تھوڑا آگے جا کر اسے آکس کریم پارک رکھائی دیا تھا اور وہ گاڑی کی اسپید بڑھا کر وہاں تک فوراً پہنچا تھا۔

”آپ آکس کریم لیں گی یا کو لڈ ڈرنک۔“ منصور حسین خود ہی گاڑی سے اتر گیا تھا۔

”ملک شہک ہوا کے لے آؤ علیزے آپ کو لڈ ڈرنک نہیں لیتیں۔“ عدید نے جواب دیا تھا۔

”اور آپ کے لیے؟“ اس نے عیون اور عدید دونوں کو دیکھا۔

”نہیں! ہمیں کچھ نہیں چاہیے۔“ وہ بے چارے دونوں ہی سسم چکے تھے منصور حسین بھی کافی پریشان ہوا تھا

تیزی سے اندر گیا اور اس کے لیے ملک شہک ہوانے کے ساتھ ساتھ عیون اور عدید کے لیے مینگو فلیور آکس کریم بھی لے آیا تھا۔ ان تینوں بہن بھائیوں کو چھوٹی سی ٹرے گاڑی کے اندر ہی مہیا کی تھی اس نے۔

”آپ نے کچھ نہیں لیا۔؟“ عیون اور عدید وغیرہ کو شروع سے خیر و بابا اور مبارک خان کے ساتھ بے تکلفی کی عادت تھی اسی لیے منصور حسین کے ساتھ بھی وہ اسی طرح سے پیش آرہے تھے۔

”ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے انکار کر دیا تھا۔

”آکس کریم ضرورت کے لیے نہیں کھائی جاتی بلکہ شوق سے کھائی جاتی ہے۔“

”مجھے شوق بھی نہیں ہے۔“

”تو کیا آپ کو صرف اسموننگ کا شوق ہے۔؟“

”ہاں! شوق تو ہے لیکن لگتا ہے کہ چھوڑنا پڑے گا۔“

منصور حسین نے کہتے ہوئے اک نظر علیزے کی سمت دیکھا جس کے حواس ٹھکانے پہ آئے تو چہرے سے ہی فریش لگنے لگی تھی۔

”چھوڑ دیں تو اچھی بات ہے۔“

”اچھی بات تو ہے لیکن آہان بات نہیں ہے نا۔“

”کو شش کرنے سے سب کچھ ہو جاتا ہے۔“ عیون نے بڑے بزرگوں کی طرح دلیل دی۔

”ہوں! کروں گا کو شش۔“ اس نے کہتے ہوئے سر ہلایا تھا اور اتنے میں علیزے نے ملک شہک کا گلاس خالی کر کے ٹرے منصور حسین کی طرف بڑھا دیا تھا وہ احتیاط سے ٹرے اور بل لے کر واپس چلا گیا تھا واپس گاڑی میں آیا تو وہ تینوں بہن بھائی دایسی کے لیے تیار بیٹھے تھے منصور حسین نے گاڑی اشارت کر کے روڈ پہ ڈالی ہی تھی کہ علیزے کا موبائل بجنے لگا۔

”مہیلو آذر بھائی۔“

”السلام علیکم! علیزے۔“ کہاں ہو تم؟“ آذر نے پریشانی سے پوچھا وہ اک بل بھی ادھر ادھر ہو جاتی وہ سب کے سب متفکر ہو جاتے تھے۔

”جی وہ میں عیون اور عدید کے ساتھ آئی تھی انہوں نے مجھ سے شاپنگ کا وعدہ لیا تھا اس لیے پورا کرنا پڑا۔“

”علیزے! باگل ہو گئی ہو تم؟ جانتی بھی ہو کہ حالات کیسے ہیں۔ پھر بھی تم ان بچوں کے ساتھ چلی گئیں۔؟“

آذر کو بلا کا غصہ آیا تھا۔ اور اس کے ذرا سے غصہ ہی علیزے کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔

”آذر بھائی! میں ان کے ساتھ اکیلی تو نہیں ہوں ڈرائیو بھی ساتھ ہے آپ اور بابا خود ہی تو کہتے ہیں کہ جب ڈرائیو ساتھ ہو تو تمہیں ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ روہانے۔

”نہجے میں بولی تھی اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس سے بہت بڑی غلطی ہو گئی ہو اور آذر بھائی اس کی غلطی پہ اس سے خفا ہو گئے ہوں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن تمہیں ٹائم کا اندازہ ہے کوئی؟ شام ڈھل چکی ہے اور اندھیرا بھی بس گہرا ہونے والا ہے۔؟“ آذر اس کے لیے اتنا فکر مند ہو رہا تھا کہ بے دھیانی میں یہ بھی خیال نہ رہا کہ وہ الٹا علیزے کو پریشان کر چکا ہے اس کے آنسو بہ نکلتے تھے وہ خود کو روکنے سے روک نہیں پاتی تھی۔

”علیٰ زے پلنزیار! روؤ مت، میں تمہیں ڈانٹ نہیں رہا تمہیں صرف واپسی کا احساس دلا رہا ہوں۔ ڈیڈ بھی تمہارا بوجھ رہے تھے انہوں نے ہی مجھے فون کرنے کو کہا ہے۔“

”لیکن بھائی! ہم تو واپس ہی آرہے ہیں۔۔۔“

”اوکے! پھر فون بند کرو، میں انتظار کر رہا ہوں۔“ آذر نے بات سمیٹتے ہوئے کہا اور فون بند کر دیا تھا اور علیٰ زے نے بھی فون بند کر دیا مگر اس کے آنسو بند نہیں ہوئے تھے اس کا ذرا سا تھول تھا اونچی آواز کی دھمک بھی نہیں سہہ پاتا تھا۔ منصور حسین، عون اور عدید تینوں خاموش بیٹھے تھے وہ اس کانچ کی گڑیا کو کب تک بھلاتے۔۔۔؟ اور دوس منٹ بعد خدا خدا کر کے وہ لوگ واپس بڑی حوصلی پہنچے تو شکر کا سانس لیا تھا۔ گاڑی گول روش پہ گھوم کر گیراج کی طرف آئی تو آذر بھی قریب آگیا تھا۔ منصور حسین نے فوراً ”اتر کر گاڑی کا دروازہ کھولا تھا ندھال سی علیٰ زے تھکے تھکے قدموں سے باہر نکل آئی تھی۔“

”علیٰ زے! آریو آل رائٹ۔۔۔؟“ آذر نے فوراً ”اسے کندھوں سے تھام کے سہارا دیا تھا۔“

”مم۔۔۔ مجھے اندر جانا ہے۔“ وہ اندر کی طرف بڑھنے لگی عون اور عدید بے چارے سہمے ہوئے کھڑے تھے کہ زیادہ ٹائم ویسٹ کرنے پہ انہیں اب ضرور ڈانٹ پڑے گی۔

”آؤ میرے ساتھ۔“ آذر اسے ساتھ لیے اندر کی طرف بڑھ گیا تھا عون اور عدید بھی پیچھے پیچھے ہی گئے تھے جبکہ منصور حسین ڈگی کھول کے ان کے — پیچھونکالنے لگا عون عدید اور علیٰ زے عینوں نے ہی ڈھیر ساری شاپنگ کی تھی اس لیے پیچھونک بھی کافی زیادہ تھے وہ سارے پیچھونک اپنے دونوں ہاتھوں میں سنبھال کر پلٹا تو مبارک خان عین دور سے باہر آمادہ کھائی دیا۔

”یہاں کیوں کھڑے ہو منصور حسین۔۔۔؟“ مبارک خان نے رک کر پوچھا۔

”یہ علیٰ زے لی بی کے شاپنگ پیچھونک ہیں کیا کروں۔۔۔؟“ اس نے اپنے ہاتھوں کی طرف اشارہ کیا اس کے مضبوط ہاتھوں کی انگلیاں شاپنگ پیچھونک کے بوجھ سے لدی ہوئی تھیں۔

”علیٰ زے لی بی کے شاپنگ پیچھونک ہیں تو اندر پہنچا کر آؤ وہ خود تو یہاں لینے نہیں آئیں گی نا؟ تھوڑا بہت خود بھی عقل سے کام لے لینا چاہیے۔“ مبارک خان نے اسے سرزنش کی تھی منصور حسین چپ ہو گیا۔

”جاؤ ان کا سامان اندر رکھ کے آؤ۔“ اس نے راستے سے ہٹے ہوئے کہا اور منصور حسین سر ہلا کر اندر آگیا۔ اس نے حوصلی کے اندرونی حصے میں پہلی بار قدم رکھا تھا اور آنکھیں چکا چوند ہو گئی تھیں آہنوسی مین ڈور سے لے کر کوریڈور کے سنگ مرمر سے مزین چکنے فرش تک ہر چیز کمال تھی۔

طویل کوریڈور میں تقریباً ”پانچ درمیانے سائز کے فانوس لٹکے ہوئے تھے اور پانچوں کا ایک ہی ڈیزائن تھا دیواروں کے ساتھ کچھ قدیمی اور کچھ جدید دور کے مناظر کی فریم شدہ سیریاں اور تصاویر سجی ہوئی تھیں وقفے وقفے سے چارپانچ آہنوسی لکڑی کے ڈیکوریشن کارنر رکھے ہوئے تھے جن پہ کچھ کرشل پیسز اور کچھ جانوروں کے آرٹ فیٹل اجسام سجائے تھے جن میں شیر اور ہرن سرفہرست تھے بڑے بڑے قیمتی گلدانوں میں مختلف قسم کے ان پودر پلانٹس بھی موجود تھے اور منصور حسین سوچ رہا تھا کہ جن کا کوریڈور اتنا لکڑی ہے ان کے بیڈرومزاورباتی گھر کا کیا حال ہوگا۔۔۔؟ وہ کوریڈور کی خوبصورتی میں مگن کب کوریڈور کے آخری سرے پہ پہنچ گیا۔ پتا ہی نہ چلا تھا چونکا تو وہ اس وقت جب اس کی سماعتوں سے وقار آفندی کی آواز ٹکرائی تھی لیکن آواز اتنی حلیم اور چاستی لیے ہوئے تھی کہ منصور حسین پلٹ کر دیکھنے پہ مجبور ہو گیا تھا۔

”میری جان، میری گڑیا، آذر نے تمہیں بھلا کب ڈانٹا ہے؟ وہ تو صرف تمہارے لیے پریشان ہو رہا تھا، شام گہری ہو چکی تھی اور تم لوگ واپس ہی نہیں آرہے تھے، پہلے بھی تمہارے ساتھ اتنا سنگین حادثہ پیش آچکا ہے اب پھر

کچھ ہو جاتا تو۔؟“ وقار آندی ڈرائنگ روم کے چماڑی ساز صوفے پہ بیٹھے علیزے کا سراپہ کندھے سے لگائے تھپک رہے تھے اور وہ سکیوں سے رو رہی تھی۔

”علیزے! دیکھو اگر تم اب بھی چپ نہ ہو میں واقعی ناراض ہو جاؤں گا تم نے ذرا سی بات مجھے مجرم بنادیا ہے میں گٹھی فیل کر رہا ہوں۔“ آذر اور وقار آندی اسے منانے بہلانے اور چپ کرانے کی کوششیں کر رہے تھے جس پر آسیہ آندی بے ساختہ مسکرا اٹھی تھیں اور نجانے کیوں ان کی نظریں آذر پہ ٹھہری گئی تھیں لیکن نظروں کے ٹھہرنے کا مقصد کچھ اور تھا۔ وہ کب سے علیزے کو منارہا تھا۔ بہلا رہا تھا اس کی خوشی کے لیے بار بار سوری کر رہا تھا اور اس کے انداز میں اتنی چاہ اور اتنی محبت تھی کہ آسیہ آندی کی نظروں سے اس کے جذبات چھپے ہوئے نہیں رہ سکے تھے علیزے اس کی دھمکی پہ چپ ہو گئی تھی اور آذر اپنی دھمکی کے اثر پہ بے اختیار مسکرا دیا تھا، آسیہ آندی بھی انہیں مسکراتے دیکھ کر ڈرائنگ روم سے باہر نکل آئی تھیں لیکن باہر منصور حسین کو کھڑے دیکھ کر ٹھنک کر رک گئیں۔

”کیا بات ہے؟ یہاں کیوں کھڑے ہوئے؟“

”جی وہ علیزے بی بی کا سامان رکھنے آیا ہوں۔“ اس نے شاپنگ بیگز دکھائے۔

”جاؤ اس کے بیڈ روم میں رکھ آؤ۔“

”بیڈ روم میں۔؟“ وہ حیران ہوا۔

”ارے نہیں! ایک منٹ ٹھہرو۔“

”جی! وہ رک گیا۔“

”رجو۔ رجو۔ کہاں گئی ہو۔؟“ انہوں نے کچن میں کام کرتی رجو کو پکارا تھا وہ نہی سکن سے ہاتھ پونچھتی بھاگتی ہوئی آئی تھی۔

”جی بیگم صاحبہ۔؟“

”اس کے ساتھ جاؤ اور علیزے کا سامان اس کے بیڈ روم میں رکھو آؤ۔“ انہوں نے منصور حسین کی طرف اشارہ کیا تھا رجو نے پلٹ کر منصور حسین کو دیکھا اور دیکھ کر آنکھوں کا رنگ بدل گیا وہ جو کوئی بھی تھا دل کے تار ہلا دینے والوں میں سے تھا۔ ”رجو“ آسیہ آندی نے سختی سے پکارا وہ ٹھنک کر حواسوں میں لوٹ آئی۔

”جی بیگم صاحبہ۔“

”کھڑی کھڑی کیا دیکھ رہی ہو؟ جو کہا ہے وہ سنائی نہیں دیا تمہیں؟“

”جی بیگم صاحبہ جاری ہوں میں۔“ وہ فوراً آگے بڑھی۔

”جاؤ تم بھی۔“ انہوں نے منصور حسین کو اشارہ کیا۔

”جی بہتر۔“ وہ کہہ کے رجو کے پیچھے ہی چل پڑا تھا کشادہ میڑھیوں کی تعداد بھی کافی زیادہ تھی رجو اس کے آگے آگے میڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ اور وہ اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ آخری پورشن پہ پہنچ کر وہ دائیں طرف سڑ گئی دائیں طرف کے آخر والا بیڈ روم علیزے کا تھا وہ بیڈ روم کے دروازے کے پاس جا کر ٹھہر گئی۔

”علیزے بی بی کے بیڈ روم میں اور کوئی ملازم نہیں جاسکتا۔ صرف میں جاتی ہوں۔ اس لیے تم یہیں ٹھہرو“ میں باری باری سامان اندر رکھ دیتی ہوں۔“ رجو نے اسے اندر آنے سے روکا تھا وہ وہیں دروازے کے باہر ہی ٹھہر گیا وہ اکتایا ہوا اور بے زار ہو رہا تھا۔ اس لیے جلد از جلد اس بوجھ سے آزاد ہونا چاہتا تھا جو چارپانچ بیگ لے کر اندر گئی اور قالین پہ رکھ آئی تھی۔ پھر دوبارہ لے کر گئی اور دوبارہ بھی رکھ آئی تھی بیگمز سے ہاتھ آزاد ہوئے تو ہاتھ جھاڑ کے واپسی کے لیے پانا تھا۔

”سنو۔“ رجولیک کے بیڈ روم سے باہر آئی تھی۔

”جی سنائیں۔؟“ وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”منصور حسین۔“

”اچھا نام ہے۔“

”جی شکریہ۔“

”علیزے بی بی کے ڈرائیور ہوئے۔؟“

”جی! خوش قسمتی سے۔“ اس نے اثبات میں جواب دیا۔

”اور میں علیزے بی بی کی خاص ملازمہ ہوں۔“

”اور میں خاص ڈرائیور۔“ منصور حسین نے دلچسپی سے مسکرا کر کہا تھا۔

”خاص تو تم دور سے ہی لگ رہے ہو۔“ رجو عام سی اک لڑکی تھی عام سے جذبات تھے اپنا ہم پلہ مردہ دکھا تو

نورا ہی رعبہ گئی تھی۔

”قریب سے دیکھتے ہو اور بھی خاص لگتا ہوں۔“ منصور حسین کے جواب پہ وہ شرمائی تھی حالانکہ منصور حسین نے نام سے لہجے میں کہا تھا۔

”ابھی میں فارغ نہیں ہوں فارغ ہو کر بات کروں گی۔“

”نہ بھی کرو تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ وہ کندھے اچکا کے لاپرواہی سے بولا تھا۔

”چھ بات سنو، تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتانا مجھ کو۔“ رجو نے آفر کی۔

”روٹی پانی کے علاوہ کوئی ضرورت نہیں ہے اپنی اور وہ ٹھیک ٹھاک طریقے سے پوری ہو رہی ہے۔ اللہ اللہ خیر صلا۔“ وہ اب بھی بے نیازی سے کہہ رہا تھا رجو چپ ہو گئی تھی برا عجیب بندہ تھا اس کی طرف دیکھ کر بغیر ہی چلا گیا تھا۔

مبد اللہ ناشتا کرنے کے فوراً بعد ہی گھر سے نکل گیا تھا۔

”دونوں جب سے اپنے بیڈ روم سے باہر نکلے تھے وہ بار بار کن انکھیوں سے ان کے چہروں کی سمت دیکھ رہی تھی بونے حد سنجیدگی لیے ہوئے تھے۔ ناشتا بھی خاموشی سے کیا تھا اور عبد اللہ اسی خاموشی سے اپنا موبائل اور گاڑی کی چابیاں لے کر گھر سے چلا گیا تھا ان کی خاموشی، سنجیدگی اور سپاٹ چہروں کو دیکھ کر زری کی توجان نکلی جا رہی تھی۔

”بھابھی! کیا بات ہے۔؟ کیا ہوا ہے۔“ زری مین ڈور لاک کر کے سیدھی نگارش کے پاس آئی تھی نگارش ٹیبل سے برتن سمیٹ کر ٹیبل صاف کر رہی تھی۔ زری نے آتے ہی اس کے ہاتھ تھام لیے تھے نگارش بھی چپ تھی وہ زری کو بتاتی بھی تو کیا۔؟

”بھابھی بولے نا؟ آپ چپ کیوں ہیں۔؟“ زری کی آواز میں انجانے خدشوں کی وجہ سے لرزش اتر آئی تھی۔

”بات اچھی نہیں ہے سن کر کیا کرو گی۔؟“ زری دھک سے رہ گئی تھی۔

”بھابھی میرا دل برباد کرنا ہے تو کچھ سوچ کر کیجیے گا زری مر جائے گی اپنے شاہ کے بغیر۔“ اس کے آنسو تھے کہ لب

بام آگے سینے میں قید پنجھی پھر پھڑا رہا تھا۔ جیسے اندر اس کا دم گھٹ رہا ہو اور رہائی کے لیے ہاتھ پیر مار رہا ہو۔
 ”آج صبح پاکستان سے بابا جان کا فون آیا تھا۔“ نگارش نے بات کی ابتدا کی۔
 ”بابا جان کا فون...؟“ زری کو حیرت کا جھٹکا لگا۔

”ہاں! اور انہوں نے فون تمہارے لیے کیا تھا۔“ نگارش کا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ یکدم ہی زری پر ہم پھوڑا دے۔

”میرے لیے؟ مگر کون...؟“ اب پہلے سے زیادہ حیرت ہوئی تھی۔

”تمہیں واپس پاکستان بلا رہے ہیں تمہارے لیے کسی کا رشتہ آیا ہے تمہاری شادی کرنا چاہتے ہیں۔“
 نگارش نے کہہ ہی دیا اور زری یکدم چار قدم پیچھے ہٹی تھی نگارش کے ہاتھ اپنے ہاتھوں سے جھوڑ دیئے تھے۔ اور لب بام آئے موتی کر کر زمین بوس ہو گئے تھے۔ اک دھڑ دھڑ کرتی ٹرین تھی جو شور اٹھاتی ہوئی اس کے دل کو پٹری سے روند کر گزر گئی تھی۔

”زری پلیز! میری پوری بات تو سن لو۔“ نگارش نے آگے بڑھ کے اس کے ہاتھ تھام لیے جو پل میں ٹخنڈے اور پنج ہو چکے تھے۔

”میں تو... میں تو بات سن لوں گی مگر میری بات کون سے گا۔؟“ آنکھوں سے دو موتی کیا گرے کہ باقیوں کو روتے ہی مل گیا تھا ہستے چلے جا رہے تھے۔

”سب سیں گے میری جان سب سیں گے“ عبد اللہ تمہارے ساتھ ہیں انہوں نے بابا جان کو صاف انکار کر دیا ہے کہ وہ تمہیں ابھی پاکستان نہیں بھیجیں گے تم ابھی بڑھ رہی ہو تمہارے انگیزا مز سربہ ہیں اور تم اپنی اسٹڈی ان کمپلیٹ جھوڑ کر نہیں آسکتیں۔“ نگارش اسے سمجھا بھٹا کر تسلیاں دے رہی تھی۔
 ”لیکن بھابھی! اک دن تو واپس جانا ہی ہے؟ کب تک یہاں رہوں گی اور اپنے دل کو زمانے کے سرو گرم سے بچا کے رکھوں گی۔؟“ زری کی آواز جیسے سرو سپاٹ پھرائی ہوئی لگ رہی تھی آنسوؤں کا ٹمکین پانی اس کے عارض بھگور رہا تھا۔

”جانا ضرور جانا، لیکن کسی حتمی فیصلے کے بعد اور مجھے پورا یقین ہے عبد اللہ تمہیں اکیلے نہیں جانے دیں گے، وہ تمہارے ساتھ خود جا میں گے اور تمہاری پسند اور مرضی کے بغیر کچھ بھی نہیں ہو گا۔“ نگارش نے اسے سمجھایا۔

”بھابھی! میرے گاؤں کے دینو موچی نے اپنی بیٹی کی پسند اور مرضی پر سر نہیں جھکا یا تو یہ تو پھر میرے بابا جان ہیں اونچے شلے والے ملک ہیں جاگیر دار ہیں دو سروں کی بیٹیوں کی زندگی کے فیصلے پنچایت میں بیٹھے بیٹھے کرا لیتے ہیں اپنی بیٹی تو ان کے سامنے کوئی چیز ہی نہیں ہے۔“ زری متواتر رو رہی تھی۔

”زری! تم بھول رہی ہو کہ دینو موچی کی بیٹی کا کسی نے بھی ساتھ نہیں دیا تھا نہ ماں نے نہ باپ نے نہ بہن بھائیوں نے جبکہ میں اور عبد اللہ تمہارے ساتھ ہیں بابا جان بات کے پلے ہیں تو عبد اللہ بھی انہی کے بیٹے ہیں اول تو ضد نہیں کرتے اور جب کرتے ہیں تو ضد کو پورا کیے بغیر پیچھے نہیں ہٹتے جو کچھ شہرین کے ساتھ ہوا وہ عبد اللہ کو آج بھی نہیں بھولتا اور اس کے بعد وہ تمہاری زندگی داؤ پہ نہیں لگنے دیں گے چاہے کچھ بھی ہو جائے۔“

نگارش نے اسے حوصلہ افزا لفظوں میں سمجھایا تھا۔
 ”اور ایک بات اور۔“ نگارش آخر میں مسکرا کے بولی۔
 ”اللہ خیر۔“ زری نے دل پہ ہاتھ رکھ کے دل کو سنبھالا دیا۔
 ”میں نے عبد اللہ سے تمہاری اور دل اور بھائی کی بات کی ہے۔“ نگارش نے ایک اور انکشاف کیا۔

”کیا...؟“ زری یکدم اچھل پڑی تھی۔

”ہاں یار! اب یقیناً وہ اسی بات کے متعلق سوچ رہے ہوں گے۔“ وہ مسلسل مسکرا رہی تھی۔
 ”بھابی! اگر آس کا یہ دیا بھی مجھ گیا تو زری کی سانسوں کی لو بھی بجھ جائے گی۔“ زری کو اپنے چاروں اطراف میں خطرے کی گھنٹیاں بجتی محسوس ہوئی تھیں دل پہ سیاہ بادلوں نے گھیرا ڈالا لیا تھا اور وہ متوحش ہرنی کی مانند ان دھڑوں کی لپک سے جان بچانے کی کوششوں میں لگ گئی تھی۔

”اللہ نے ہا ہا تو یہ آس کا دیا نہیں بجھے؟“ کبھی نہیں بجھے گا ہمیشہ جلتا ہی رہے گا میری دعا میں اس دیئے کے ساتھ ہیں تحفظ کا حصار لے ہوئے۔“ نگارش نے اس کے نرم گداز دو دھیا ہاتھوں کو نرمی سے دباتے ہوئے ہلکے سے اس کا رخسار بھی تھپکا تھا اور زری یونہی نڈھال سی ہو کر ڈائمنڈ چیرہ کرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئی تھی۔

”میں یہاں سر رہی ہوں میری جان نکل رہی ہے اور اسے... اسے پتا ہی نہیں ہے کتنا بے خبر اور کتنا پر سکون ہے وہ؟ کیا اسے میری محبت کا ذرا احساس نہیں ہے؟ میں اکیلی یا گل ہو رہی ہوں...؟ ہائے میں مرجاؤں۔“ وہ خود کا می کے سے انداز میں کہتی اپنے دل پہ ہاتھ رکھ کے رو پڑی اور اسے رونا دل اور شاہ کی بے خبری اور سکون پہ آیا تھا۔

”زری پلیز! کیوں لگی بن رہی ہو...؟ پلیز سنبھالو اپنے آپ کو ابھی تو صرف بات ہوئی ہے کون سا نکاح ہو گیا ہے؟ یا پھر رشتہ طے ہو گیا ہے۔ ابھی کچھ نہیں بگڑا سب کچھ تمہارے اختیار میں ہے۔“ نگارش اسے سمجھا بھٹا کر تنک لگتی تھی۔

”میرے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے بھابھی کچھ بھی نہیں ہے میرا سب کچھ بگڑنے والا ہے۔ میں... میں...“
 ”نہانے والی ہے۔“ وہ روہائے لمحے میں کہتی ہوئی اٹھ کر تیز تیز قدموں سے چلتی اور اپنے بیڈ روم میں آگئی تھی لیکن بیڈ پہ بیٹھ کر روتے روتے نہ جانے دل میں کیا سامی کہ اس نے اپنا موبائل فون اٹھا کر دل اور شاہ کا نمبر ڈائل کر لیا تھا۔

اس کے دل و دماغ کا بے چینی اور اضطراب سے عجب حال تھا اس کا دل چاہ رہا تھا آج دل اور شاہ اس کے سامنے کھڑا ہو اور وہ اس کے سینے میں سما جائے ساری دنیا اور سارے خدشوں سے چھپ جائے اس کی مضبوط بانہوں کے حصار میں خود کو قید کر لے یا پھر اس کے نام کی چادر اوڑھ کر ہر چیز سے بے فکر اور بے خبر ہو جائے۔ لیکن ایسا تو تب ہو تا جب وہ ملتا اور اس کے سامنے ہوتا۔! دوسری طرف رنگ جا رہی تھی۔ لیکن وہ ریسو نہیں کر رہا تھا۔ اس نے نمبر ری ڈائل کر ڈالا تھا اور کال ریسو ہونے کا انتظار کرنے لگی۔

زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ زری کا نمبر دل اور شاہ کے نمبر پہ بجا تھا۔
 موبائل اس کے ہاتھ میں تھا۔ وائبریشن مسلسل ہو رہی تھی موبائل جیسے تھرک رہا تھا اور صاف پتا چلتا تھا کہ وہ بچارن تڑپ رہی ہے البتہ وہ اتنا تڑپ کیوں رہی ہے یہ پتا نہیں تھا۔! مگر یہ بھی سچ تھا کہ اس کی تڑپ پہ دل اور شاہ بھی تڑپ گیا تھا مگر وہ کال ریسو کر کے نہ اس کی تڑپ سن سکتا تھا نہ اپنی سن سکتا تھا۔ اسے پتا تھا کہ آج اگر کال ریسو کرے تو اس بچارن کی تڑپ کو دھارس مل جائے گی اور جہاں اسے دھارس ملتی وہیں وہ اپنی تمام کشتیاں بلا دیتی، جو فی الحال وہ نہیں چاہتا تھا وہ جانتا تھا کہ جن راستوں پہ زری چل رہی ہے ان میں ابھی... تین و خم ہیں بڑے نشیب فراز ہیں اور ان راستوں سے گزرتا اتنا آسان بھی نہیں تھا مگر پھر بھی وہ چل رہی تھی اور اس کی یہی مسافت کئی مرتبہ دل اور کے دل میں بے چینیاں بھرتی تھی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ اکیلی ان راستوں پہ چل چل کے تھک جائے گی نڈھال ہو کے گر جائے گی ہو سکتا ہے بے دم بھی ہو جاتی اور اگر ایسا ہوتا تو وہ بھلا سکون سے نہ رہ سکتا تھا۔؟

ادھر اس کی کال بج رہی تھی اور ادھر وہ بے چین اور مضطرب سا کمرے میں ٹہل رہا تھا، بے سکونی سی بے سکونی تھی۔ یونہی ملتے ملتے اس نے اپنے ہاتھ بالوں میں پھنسا لیے تھے اس کا دھیان زری کے ارد گرد کرو میں لے رہا تھا۔

”نجانے ایسی کیا بات ہے کہ وہ میرے نمبر پر کال کرنے پر مجبور ہو گئی ہے۔؟“ نجانے کیا انتہا ہو گئی ہے آج۔؟ وہ کیوں کر رہی ہے کال۔؟ کیوں اپنی اور میری چپ کا تالا توڑ رہی ہے۔؟ کیا چاہتی ہے وہ۔؟؟“ ”اف کیا کروں۔؟“ وہ بے کل سا کمرے میں ادھر سے ادھر پھر رہا تھا وہ فون کر کر کے تھک گئی تو موبائل اسکرین پر دس مسڈ کالز کا ریکارڈ دکھائی دینے لگا تھا وہ دس بار مچلی مچلی تھی وہ دس بار تڑپتی تھی اور دل اور شاہ نے دس بار اسے آگور کیا تھا لیکن دس بار ہی بے سکون ہوا تھا وہ تڑپ کا سلسلہ بند کر چکی تھی لیکن دل اور کے تجسس کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا وہ اسی کے متعلق سوچ رہا تھا جب اس کے موبائل پر ایک بار پھر رنگ ہوئی اس نے ٹھٹک کر دیکھا لیکن کال کرنے والی زری ملک نہیں بتول شاہ تھیں۔ اس نے بو جھل سے انداز میں کال ریسیو کی تھی۔

”السلام علیکم اماں!“

”وعلیکم السلام! کیسے ہو؟“

”ٹھیک ہوں۔“

”اچھا! مگر تمہاری آواز تو کچھ اور سی کہہ رہی ہے۔؟“ وہ اس کی آواز کا بو جھل اور سبے چین اتار چڑھاؤ بھانپ چکی تھیں۔

”جی ہاں! میں اس وقت بہت ڈسٹرب ہوں بہت زیادہ۔“ وہ اپنی انگلیوں سے اپنی کپٹی مسلتے ہوئے بولا۔ اس پریشانی تھی کہ آج زری نے صبر و ضبط کا دامن چھوڑا ہے تو کیوں چھوڑا ہے۔؟ ”کیوں کسی کیس کا مسئلہ ہو گیا ہے کیا۔؟“ بتول شاہ نے فکر مندی سے پوچھا حالانکہ وہ جانتی تھیں کہ وہ بڑے سے بڑے پیچیدہ کیس پر بھی نہیں گھبرا آتا بلکہ وہ سہول کو گھبرا کے رکھ دیتا ہے۔ ”نہیں اماں! مجھے صرف ایک ہی کیس پریشان کرتا ہے جب بھی اس کیس پر سوچتا ہوں فکر کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔“

”کس کیس کی بات کر رہے ہو؟“

”اس کیس کی جو انگلیں چھوڑ آیا تھا۔“

”کیا؟ زری کی بات کر رہے ہو؟ کیا ہوا ہے اسے؟“ بتول شاہ چونک اٹھی تھیں۔

”یہ تو مجھے بھی نہیں بتا بس کال آئی تھی اس کی۔“ اس نے آہستگی سے بتایا۔

”کیا کہتی ہے وہ؟“

”میں نے کال ریسیو نہیں کی۔“ اس نے مجرمانہ سے انداز میں جواب دیا۔

”اف! دل اور شاہ تم بھی کبھی حد کر دیتے ہو۔“ وہ غصے میں ہوتیں تو اسے پورے نام سے مخاطب کرتی تھیں۔

”اماں! میں حد رکھنا چاہتا ہوں مگر وہ حد توڑ رہی تھی لگ رہا تھا کہ پاگل ہو رہی تھی وہ۔“ وہ بتول شاہ کو ساری تفصیل بتا رہا تھا۔

”نہیں چاہے گی تو پاگل ہی ہوگی بے چاری لیکن دل اور شاہ دل پہ پھر رکھ لینا اچھی بات ہے مگر دل کو پتہ نہ ہوگا اچھی بات نہیں ہوتی۔“

”مگر اماں! آپ نہیں جانتیں۔ میں اگر دل کو پتہ نہ بناؤں تو کوئی اور بے چارہ ایسا تو پاگل ہو جائے گا یا پھر۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہو تم کون ہے وہ بے چارا؟“ وہ ٹھٹک گئیں۔

”جو بھی ہے برجان سے عزیز ہے اس کے لیے تو دل اور شاہ کا سر بھی حاضر ہے۔“

”نیل۔؟ نیل کی بات کر رہے ہو۔؟“

”نہیں اماں! اس ٹائیک پہ پھر بات کریں گے۔“ دل اور نے سر جھٹک دیا تھا۔

”تم کراچی سے واپس کب آرہے ہو۔؟“

”چند دن لگیں گے دعا کیجئے گا کہ میں یہ کیس جیت جاؤں۔“ وہ تھکے تھکے سے انداز میں کہہ رہا تھا اور بتول شاہ

”بس ہو گئیں ان کا دھیان زری، نیل اور دل اور شاہ کو سوچ رہا تھا اور خود دل اور شاہ بھی یہی کچھ سوچ رہا تھا بتول شاہ کا فون بند ہو چکا تھا۔ لیکن زری کی یاد کا سلسلہ بند نہ ہوا وہ ساری رات سو نہیں پایا تھا۔

اس نے نیو سم خریدی تھی اور اسے خود ایکٹیویٹ کیا تھا یہ نمبر سب کے لیے نیو اور ان فون تھا۔ اس نمبر کو اس کے سوا اور کوئی نہیں جانتا تھا اور یہ نسلی ہی کافی تھی اس نے وہ سم دوسرے موبائل میں لگائی اور موبائل چپ میں ڈال کے بائیک اڑا لے گیا تھا۔ اس کا رخ سام کے گھر کی طرف تھا حالانکہ اسے پتا تھا کہ سام اس وقت اپنی گرل فرینڈ اور بانی دوستوں کے ساتھ اپنے فلیٹ پہ موج مستی میں مصروف ہے اور یہی موقع اس کے لیے اچھا موقع تھا اگر فاطمہ گھر پہ ہوتی تو۔۔۔!

”ہیلو۔“ اس نے ان کے گیٹ پر پہنچ کر جو کیدار کو مخاطب کیا۔

”سلام صاحب۔“

”والسلام! کیسے ہو؟“

”اللہ کا کرم ہے صاحب۔“

”سام صاحب سے کہو جو دست صاحب بلارہے ہیں۔“ اس نے ڈرامہ کیا۔

”سام صاحب تو نہیں ہیں گھر پہ۔“ جواب عین توقع کے مطابق موصول ہوا تھا۔

”اچھا! کون ہے گھر پہ؟“

”جی صرف فاطمہ بی بی ہیں۔“

”اوہ! سام کب آئے گا۔؟“

”پتا نہیں صاحب۔“

”چلو میں اس کے موبائل پہ پتا کر لیتا ہوں۔“ جودت نے سر ہلایا۔

”جی جیسے آپ کی مرضی۔“

”او کے اللہ حافظ۔“ وہ کہہ کے پلٹ گیا تھا اور بائیک کو کک لگا کے اڑا لے گیا مگر صرف ان کی کوٹھی کے کونے تک ذرا اوٹ میں جا کے اس نے بائیک روک لی تھی اور موبائل نکال کر میسج ٹائپ کیا تھا۔ میسج سینڈ کرنے کے ٹھیک سات منٹ بعد ان کے گھر کا گیٹ کھلا تھا اور فاطمہ کی گاڑی تیز رفتاری سے باہر نکلی تھی۔ جودت نے بڑی پھرتی سے بائیک کے اسٹینڈ پہ لٹکا بلیک کٹر کا ہیلمیٹ سر پہ چڑھا لیا تھا اور فاطمہ کی گاڑی کے پیچھے ہی اپنی بائیک کی اسپنڈ بڑھادی تھی وہ بہت غلٹ میں تھی اور کافی رش ڈرامیو کر رہی تھی اس کے پیچھے وہ بھی اتنی ہی تیزی سے اسے فالو کر رہا تھا اور اپنے پلان کی کامیابی پہ دل ہی دل میں دل کھول کے مسکرا رہا تھا!!

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

کسی راز میں سیکھا اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت محو رہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی تھیں۔

۱۳ تیسویں قسط



نبیلہ عزیز



بڑی حویلی کے تمام کمین و قار آئندہ سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیحدہ سے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نیل حیات دینی بہن بھائی ہیں مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سرزنی ہے وہ انگلش کی رنگینوں میں مکمل طور پر رنگ چکی ہے جس کے پیش نظر فائزہ سلیم انیل کو پاکستان شہت ہونے کا مشورہ دیتی ہیں لیکن وہ چاہے پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے جس پر نیل اور فائزہ قلم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے مگر کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر چھپ رہا ہے۔

عذیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا ہے یہی اور مجبوری سے ٹھک آخر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے لیکن ایسے میں ایک روز اسے دعا ہے میں چائے پیتے ہوئے پاؤں تھپا کر جا رہا ہوں اسے خواہ سے کام کی آفر کرتا ہے جس پر عذیل کافی خوش ہوتا ہے اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میڈیک پاس آوی ہے وہ مبارک خان کے قریب سے بڑی حویلی میں وقار آئندہ سے نوکری مانگنے آتا ہے وقار آئندہ کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیجتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

بل تور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آوی ہے اس نے



فاطمہ ہر دو منٹ کے وقفے گاڑی کی اسپینڈ مزید بڑھاتی تھی اس کے ہاتھ پھول رہے تھے وہ جلد از جلد مریم کے گھر پہنچنا چاہتی تھی اور اس سے بھی زیادہ جلدی جودت کو تھی وہ بھی جلد از جلد اپنی منزل پہ پہنچنا چاہتا تھا اس کی منزل اس سے دور نہیں تھی اور یہی سرشاری اس کی روح کو خطرے کے دے رہی تھی وہ پانچ ڈرائیو کرتے ہوئے بھی جھوم رہا تھا۔ اگلے دس منٹ کی مسافت طے کرنے کے بعد فاطمہ کی گاڑی نے دائیں طرف ٹرن لیا تھا اور اس کے پیچھے جودت کی بانٹک نے بھی!

پہلی دو گھنٹیں کافی کشادہ تھیں اس لیے فاطمہ کی کار با آسانی ٹیک ٹلی کے کنٹرول آئی تھی اور قلی کے ٹوٹنے پہ گاڑی پارک کرنے کے بعد وہ تیزی سے گاڑی سے نیچے اتر آئی تھی اور انتہائی عجلت سے گاڑی لاک کر کے بائیں سائیڈ والی قلی میں مڑی۔ البتہ جودت کو بانٹک سے اترنے کی ضرورت نہیں تھی وہ بانٹک سمیت ہی اس قلی میں جا سکتا تھا اس لیے بانٹک کی اسپینڈ کم رکھتے ہوئے بھی اسی قلی میں مڑ گیا تھا بانٹک کسی اور کی لے کر آیا تھا اور سہ پہر بیارٹ چڑھا کر کھاتا تھا اس لیے پہچانے جانے کا کوئی ڈر نہیں تھا۔

فاطمہ اس قلی کے پانچویں نمبر والے گھر کا دروازہ دروازہ پر پڑی تھی اور جودت کی نظریں اس کے تعاقب میں اس دروازے تک گئی تھیں اور وہیں پہنچ کر کھڑی ہو گئیں۔ گھر کی دیوار میں دروازے کے قریب ہی چھوٹی سی نیم پلیٹ نصب تھی جس پر بے رنگ اور دھندلے دھندلے سے لفظوں میں گھر کا ایڈریس اور "قاریق نیازی" کا نام لکھا ہوا تھا۔

جس کو پڑھنے کے بعد اس کی باقاعدہ قلی ہو گئی تھی اور وہ بانٹک کو لگ لگا کے آگے بڑھ گیا تھا۔



یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے حواس باختہ ہو کر ان کے گھر کا دروازہ پیٹ ڈالا ہو۔ مریم ابھی ابھی مغرب کی نماز پڑھ کے فاسخ ہوئی تھی امی اور ایمین نماز ادا کرنے کے بعد دینا مانتے میں مصروف تھیں اس لیے ایمان ذرا فاسخ بھی اسی نے آگے پیچھے کے دروازہ کھول دیا تھا۔ لیکن سامنے فاطمہ کو دیکھ کر ٹھنک گئی تھی۔

"فاطمہ آئی آپ۔؟" اس نے بدحواس سی فاطمہ کو حیرت اور اچھے سے دیکھا تھا۔

"عدیل کہاں ہے۔؟" مریم کہاں ہے۔؟ سب ٹھیک تو ہیں نا۔؟ کیا ہوا ہے گھر میں۔؟" فاطمہ ایمین کو پیچھے دھکیلی کر سیدھی اندر آئی تھی اور بدحواسی سے کئی سوال ایک ساتھ پوچھ ڈالے تھے عدیل بے چارے اپنے گھر کے تھکن میں کسی کی بلند آواز سن کر وہ بھی نیچے اتر آیا تھا لیکن فاطمہ کی حالت دیکھ کر ٹھنک گیا وہ عدیل کو بیڑھیاں اترتے دیکھ کر لبک کے قریب آئی تھی۔

"تم۔ تم ٹھیک ہو نا؟" کیا ہوا تھا؟ کیا بنگامہ ہوا ہے گھر میں؟ مریم کہاں ہے۔؟ کبھی ہے؟ انکل تو ٹھیک ہیں نا۔؟

وہ کسی کی بھی پروا نہ تھی عدیل کا بازو دونوں ہاتھوں میں دبوچے خاصی بلند آواز سے سب کا پوچھ رہی تھی لیکن کہیں پوچھ رہی تھی یہ گھر کے کسی بھی فرد کو سمجھ نہیں آیا تھا عدیل نے اس کے ہاتھ اپنے بازو سے ہٹاتے ہوئے مریم کو آگ نظر دیکھا تھا۔

"مریم! لگتا ہے کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں رہے ان کو آرام سے بٹھاؤ اور پانی پلاؤ۔" عدیل نے فاطمہ کے ہاتھ پیچھے ہٹا کر مریم کو اشارہ کیا تھا مریم فوراً بٹھاتی تھی وہ ابھی ابھی جائے نماز سے اٹھی تھی اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ اپنے گھر کے گرد ہالے کی صورت میں بٹھ جائے مگر فاطمہ نے عدیل کو دیکھنے کے بعد مریم کو دیکھا تھا ان دونوں کے چہروں پہ حیرانی ضرور تھی لیکن پریشان اور ڈر نہ تھا کھانا نہیں دے رہی تھی جس پہ فاطمہ برقی ٹھنک گئی تھی۔

"مریم! تو میرے ساتھ۔" مریم نے آکر اس کا بازو تھام لیا تھا لیکن فاطمہ اپنی جگہ سے اٹھ بھی نہیں سکی تھی۔

"فاطمہ! کیا بات ہے۔؟ کیا ہوا ہے۔؟ اتنی پریشان کیوں لگ رہی ہو۔؟"

مریم نے نرمی سے اس کے کندھے پہ دو سر ہاتھ رکھتے ہوئے رہبانیت سے پوچھا اور سامنے کھڑا عدیل بھی اسے حوالہ نظروں سے دیکھ رہا تھا فاطمہ نے گہری سانس کھینچے ہوئے کندھے سے اپنا شولڈر بیگ اتارا اور زپ کھول کر اپنا موبائل نکالا اور مسیج اوپن کر کے موبائل عدیل کی سمت بڑھا دیا تھا۔ عدیل ابھن آمیز انداز میں اس کا موبائل تھام کے مسیج پڑھنے لگا۔

"فاطمہ! کہاں ہو۔؟ کیا تمہیں کچھ خبر نہیں ہے؟ کل رات ہمارے گھر پہ قیامت گزر گئی، میں بہت پریشان ہوں، تمہاری ہمدردی ضرورت ہے، پلیز میرے پاس جلدی پہنچو، تمہاری دوست مریم۔"

مسیج پڑھ کے عدیل کے ہاتھ پہل پڑ گئے تھے۔

"آپ کیوے؟ مسیج کس نے بھیجا ہے؟" اس کا سوال بھی الجھا ہوا تھا۔

"میں تو یہی سمجھتی تھی کہ مریم نے بھیجا ہے؟" فاطمہ اپنی جگہ حیران پریشان اور الجھی الجھی سی کھڑی تھی۔

"مالا نکہ آپ جانتی ہیں کہ ہمارے گھر میں فون اور موبائل کی سمولت نہیں ہے۔" عدیل نے اسے ایک اور غلطی کا احساس دلایا۔

"مگر پریشانی کے بارے مجھے کچھ یاد نہیں رہا تھا کہ آپ لوگوں کے پاس موبائل فون کیا نہیں۔؟ مجھے تو یہ پڑھ کر شاک تھا کہ کل رات آپ کے گھر پہ کوئی مصیبت گزر گئی ہے۔ میں نے وقت کا احساس کیا اور نہ تو یہ جاننے کی رحمت کی کہ نمبر کس کا ہے؟" فاطمہ پریشانی سے کہتی دونوں ہاتھوں میں سر تھام کے چارپائی پہ بیٹھ گئی تھی۔

سچیت کوئی قدم اٹھانے سے پہلے جاننے کی رحمت ضرور کر لینی چاہیے "شام کا وقت ہے گندھیرا گہرا ہو رہا ہے اور آپ اپنی غور ذات ہو کر گھر سے نکل کھڑی ہوئیں وہ بھی صرف ایک مسیج پڑھ کے سوچے اگر آپ کو کوئی حادثہ پیش آ جاتا تو۔" عدیل نے اسے سخت کلمے میں سمجھایا تھا اور فاطمہ اس کی بات کی گہرائی جان کر متوحش سی ہو گئی تھی وہ واقعی سچ ہی تو کہہ رہا تھا آج کل ملک اور شہر کے حالات ہی ایسے تھے کہ دن کے وقت گھر سے نکلنا محال ہو جاتا تھا یہ تو پھر شام کا وقت تھا۔

"بھائی! آرام سے بات کریں نا۔ وہ پہلے ہی اتنی پریشان ہے نہ جانے کس ضیعت نے یہ گھٹیا مذاق کیا ہے۔"

مریم نے عدیل کو غصہ کرنے سے باز رکھا تھا۔

"میں بھی ان محترمہ کے لیے ہی بات کر رہا ہوں۔ اگر خود ان پہ کوئی مصیبت آ جاتی تو؟" عدیل ہنوز سخت ست بنا رہا تھا اور اس بار فاطمہ نے اسے نظریں اٹھا کر دیکھا تو نظریں مسکرا رہی تھیں۔

"ناش کہ کوئی مصیبت آئی جاتی تو اچھا تھا کم از کم آپ میرے لیے پریشان تو ہوتے رہتے۔" اس نے دل میں آئی بات زبان کی نذر کر ڈالی تھی اور عدیل اس کی بات پہ بری طرح سٹپٹا گیا تھا اس نے بے ساختہ مریم کی سمت دیکھا تھا مریم اپنی مسکراہٹ دبا کر جو جھٹکا تھی۔

"اتنی فرصت نہیں ہے میڈم کہ دو سوال کے لیے بھی پریشان ہوتے پھر میں۔" وہ کہہ کے پلٹ گیا تھا۔

"دوسرے بھی تو آپ کے لیے پریشان ہوتے ہیں مشورہ عدیل عمر؟" اس نے پیچھے سے آواز دے کر کہا تھا۔

"دو سوالوں کو ہم نے نہیں کہا کہ ہمارے لیے پریشان ہوتے ہیں اپنے لیے پریشان ہونے کے لیے ہم خود ہی کافی ہیں۔" وہ پلٹ کر اسے جواب دیتا ہوا باہر نکل گیا تھا اور فاطمہ نے گردن موڑ کر مریم کو دکھائی نظروں سے دیکھا تھا۔

"میں نے بھائی صاحب کی باتیں سن رہی ہوں۔؟ پھر تم مجھے الزام دیتی ہو کہ میں ایسا ویسا کہہ جاتی ہوں۔" فاطمہ مریم کو کھور رہی تھی اور مریم بے ساختہ مسکرائی تھی۔

"ارے بابا! انہیں دیتی الزام بھائی واقعی غلط کہہ رہے ہیں میں بات کہوں گی ان سے۔" فاطمہ نے اندر آجاؤ یہاں کیوں بیٹھ گئی؟" مریم اس کی طرف داری کرتے ہوئے بولی اور فاطمہ کا ہاتھ پکڑ کے اسے اندر کمرے میں لے آئی تھی۔

"ایمان! فاطمہ کے لیے ٹیبلٹ اپانی لے کر آؤ۔" مریم نے کمرے سے اپنی آواز دی تھی فاطمہ بے وحشیانی میں عدیل کے بستر پر ہی ٹک کر بیٹھ گئی اور مریم نے اس کے سامنے کرسی کھینچ لی تھی۔ اتنے میں ایمان چھوٹی سی ٹرے میں اپنی کٹکٹاں لے آئی تھی۔ فاطمہ نے گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا تھا۔

"تھینک یو۔" اس نے خالی گلاس واپس ٹرے میں رکھتے ہوئے ایمان کو دھتکتکس کہا تھا۔

"اباں اب بڑا کیا مسئلہ ہوا ہے؟" مریم نے قہقہے سے پوچھا تھا۔

"یار! میں یونہی رو رہی ہوں، کئی یونیورسٹی سے آتب ہوا تو لاہور چلی گئی وہاں اتنا ناگم کر رہا کہ احساس ہی نہ ہوا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے کھر پکئی تھی مشاورت لیا اور پکڑے چھینچ کر کے فارغ ہوئی تھی کہ تمہارا میسج۔ میرا مطلب ہے کہ یہ میسج ملا اور میسج پڑھنے کے بعد تو مجھے کچھ سوچنے سمجھنے کا بھی ہوش نہیں رہا تھا۔ میں فوراً گاڑی لے کر گھر سے نکل آئی۔" فاطمہ نے اسے تفصیل سے بتایا تھا۔

"لیکن فاطمہ یہ بھی تو سوچو تمہارے ساتھ یہ مذاق کس نے کیا ہو گا۔؟ کون ہے جو تمہاری اور میری دوستی کو جانتا ہے اور میرا نام لے کر تمہیں بلیک میل کر رہا ہے؟ یہ تو سراسر دھوکے کا کیس ہے یا تم اس نمبر کی چھان بین کرو آؤ۔" مریم نے اسے مشورہ دیا ہے۔

"وہ تو میں ضرور کرواؤں گی لیکن یا ربات پھر وہیں ہے کہ آخر میرے ساتھ یہ مذاق کیوں اور کس لیے کیا ہے۔؟

"کس نے مجھے دھوکا دیا ہے؟ آخر مقصد کیا ہو سکتا ہے؟" فاطمہ خود بھی الجھ رہی تھی اور اسی الجھنے الجھنے دھیان میں مریم کا خیال اس لڑکے کی سمت چلا گیا جسے فاطمہ کا بھائی رحوت کے نام سے بلاتا تھا اور اسی رحوت تائی لڑکے کی نظریں پورے کنکشن میں مریم پر ہی جمی رہی تھیں وہ سب سے بڑے نیاز ہو کر اسے دھتکتا رہا تھا۔ کبھی یہ سب اس کا کارنامہ تو نہیں تھا۔؟ مریم نے بے اختیار سوچا تھا اور بالکل صحیح سوچا تھا لیکن وہ اپنی اس سوچ کا اظہار فاطمہ کے سامنے نہیں کر سکتی تھی۔

"یہ تو تم چھان بین کرواؤ گی تو مقصد کا پتا چلے گا۔ خیر تم کچھ دیر بیٹیں وہ دور کھانا کھا کر لجانا۔" مریم سر جھٹک کر کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"ارے نہیں یا ر! میں نے لڑکائی لیٹ کیا تھا اس لیے اب بھوک نہیں ہے۔ اب ٹوایٹ ٹاویٹ ہی کھانا کھاؤں گی" اب تہ آپ لوگوں نے کھانا کھانا ہے تو کھائیں میں ابھی بیٹیں رکھتی ہوں۔"

ساتھ کو فون کرتی ہوں دیکھو مجھے پک کر لے گا۔

فاطمہ اب خود بھی اکیلی واپس نہیں جانا چاہتی تھی اسی لیے وہیں ٹھہر گئی تھی۔

"زیادہ نہ کھاؤ تھوڑا سا کھاؤ۔" مریم نے اصرار کیا۔

"نہیں یا ر! اسٹمٹ مت کرنا میرا موڈ نہیں ہے کھانے کا۔" فاطمہ نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا تھا مریم چپ ہو گئی۔

"تم بیٹھو میں ساتھ کو فون کروں۔" اس نے اپنے بیک سے دوبارہ موبائل نکالا اور ساتھ کانبروڈائل کیا تھا لیکن

اس کانبروڈائل جا رہا تھا۔ دو تین بار ٹرائی کرنے کے بعد اس نے خفگی سے موبائل سائیڈ پر رکھ دیا تھا لیکن موبائل رکھت ہوئے بھی اس کی نظر عدیل کے ٹیکے کے نیچے سے جھانکتی تھی چمکتی ہوئی چیز جا پڑی تھی اس نے بے ساختہ ہاتھ بیٹھا کر وہ چیز یا ہرنگال لی اور بلیک کٹر کے لیڈر گلاسز دیکھ کے اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔

"لیڈر گلاسز؟ عدیل عمر کے ٹیکے کے نیچے۔؟" وہ ہکا بکا اور حیران پریشان دیکھ رہی تھی اور کچھ ایسی ہی کیفیت مریم کی بھی، بولی تھی اسے بھی یہ گلاسز دیکھ کر حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔

"یہ کس کے گلاسز ہیں۔؟" فاطمہ نے ڈائریکٹ مریم سے پوچھا تھا۔

"میں تو میں سوچ رہی ہوں۔۔۔؟"

مریم کی آواز بھی قدرے کھوئی ہوئی تھی۔

"اوہ تو مسٹر عدیل عمر کا کسی کے ساتھ گالی چمک رہا ہے ربات؟" فاطمہ نے خود سے ہی اندازہ لگایا تھا۔

"بھائی! کسی کے ساتھ کھانے کیلئے ہو سکتا ہے بھلا۔؟" مریم بے یقین بھی تھی۔

"تو پھر کس مختصر سے؟" فاطمہ نے جز کر کا سزا اس کے سامنے لہرائے تھے۔

"یہ تو تو حق بتا سکتے ہیں کہ یہ کس کے ہیں لیکن جس کے بھی ہیں کافی خوبصورت اور اسٹائلش ہیں۔" مریم نے تعریف کی اور فاطمہ نے اسے مزید کھور کے دیکھا تھا۔

"اسٹائلش لڑکیاں ہی اسٹائلش گلاسز پہنتی ہیں لہذا تم یہ نہ سوچو کہ صرف گلاسز ہی اسٹائلش ہیں بلکہ یہ بھی سوجہ کہ ان کو پہنتے والی لڑکی بھی ماڈرن اور اسٹائلش ہے اور وہ کون ہے؟ یہ بھی بتا کر دو۔" فاطمہ نے اپنی بات پر زور دے کر کہا تھا۔

"میں بھلا کیسے بتا کر سکتی ہوں؟"

"تو کیا میں بتا کروں؟"

"تو کر لے۔"

"یو نہ! میں کروں گی تو پٹنے لگ جائیں گے تمہارے بھائی کو۔" وہ برا سامنے بنا کر بولی تھی۔

"تمہیں بھی تو لگ رہا ہے۔؟" مریم نے چھیڑا۔

"میرا مشورہ مانو تو یہ گلاسز اپنے ساتھ لے جاؤ ان کی انوشی گیشن کرواؤ کہ آخر یہ کس حسینہ کے ہیں۔ کون اپنے چمکتے دتے سنے گور گلاسز میرے بھائی کے ٹیکے کے نیچے چھوڑ گئی ہے؟ آخر کس کی رسائی ہوئی یہاں تک۔۔۔؟"

"مریم مسکرا کر کہتی ہوئی باہر نکل گئی تھی اور اتنے میں عدیل بھی واپس آیا تھا اس کے ہاتھ میں کولڈ ڈرنک کی ڈیزل لیٹر کی دو بوتلیں تھیں کوک اور سپرائیٹ اس نے دونوں بوتلیں مریم کی سمت بڑھا دیں۔ مریم سمجھ گئی تھی کہ وہ فاطمہ کے لیے ہی لے کر آیا ہے۔

"تو ٹھنکس! اس ٹکف ٹی کوئی ضرورت نہیں ہے میں گھر جا رہی ہوں۔" فاطمہ ہیٹ کی طعن عدیل کی آواز سن کر کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔

"گھر؟" پھر تم اکیلی گھر سے جاؤ گی۔؟" مریم ٹھٹک گئی۔

"جلی جاؤں گی کچھ نہیں ہوتا۔"

اس نے ٹک کے جواب دیا تھا۔

"ارے نہیں دینا! تم بیٹھو عدیل تمہیں چھوڑ آتا ہے۔"

عدیل کی امی نماز پڑھ کے فائن ہو چکی تھیں فاطمہ کا سارا مسئلہ ایمان کی زبان سے چکی تھیں اس لیے فاطمہ کو

اکیلے جانے سے روک دیا تھا جس پر عدیل نے ایک بار پھر شپٹا کے دیکھا تھا۔
 "نہیں آنٹی! میں تیلی جاؤں گی خواتین کو پریشان کرنے کا کیا فائدہ؟" اس نے انکار کر دیا۔
 "اے بیٹا! تم ہماری پریشانی میں یہاں تک چلی آئی ہو تو کیا ہم تمہیں اسی طرح واپس بھیج دیں؟ جاؤ بیٹا
 فاطمہ کو اس کے گھر تک چھوڑ آؤ۔"

انہوں نے اشارہ کیا اور عدیل سب کے سامنے ماں کے حکم سے انکار نہ کر سکا اور خود بخود ہی قدم بہ قدم دروازے
 کی سمت بڑھا دیئے تھے۔

"جاؤ! جواب۔؟" مریم نے فاطمہ کو اس کے پیچھے دھکیلا اور فاطمہ اپنے دل کی خوشی دل میں دباتی عدیل کے
 پیچھے چلی گئی تھی وہ کافی ست قدم اٹھا رہا تھا جبکہ فاطمہ کے قدم بہت فریٹش اور سرشار سی کیفیت کی
 نشاندہی کر رہے تھے وہ بڑی خوشی خوشی اس کے برابر قدم اٹھا رہی تھی اور اس کے ساتھ چلتے ہوئے دل بھی بری
 طبعی جو حرکت رہا تھا۔

گاڑی کے قریب پہنچ کر عدیل رگ گیا اور انتظار کرنے لگا کہ وہ گاڑی کالاک کھولے لیکن فاطمہ نے چابی اس کی
 سمت بڑھا دی تھی۔

"بچہ سے ڈراؤ نہیں ہوگی تم ڈراؤ کہو۔" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔
 "لایم سوری! میں نہیں کر سکتا۔ آپ خود کریں۔" اس نے چابی تھانے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھایا تھا بلکہ گردن
 نفی میں ہلا کر انکار کر دیا تھا۔

"میں خود تو کر لوں گھر مارے ہوتے ہوئے میرا دھیان کسی اور طرف ڈرا کم
 ہی جائے گا۔" اس نے کندھے اچکا کر لڑائی ظاہر کی۔

"دیکھیے! یہ وقت یہاں کھڑے ہو کر باتیں بنانے کا نہیں ہے۔ گاڑی نکالیں اور شرافت سے گھر چلیں۔" عدیل
 نے اسے حق سے اشارہ کیا تھا۔

"تم ڈراؤ کہو تو ٹھیک ہے ورنہ یہاں کھڑے ہو کر باتیں کرنا بھی برا نہیں ہے۔" اس نے بے نیازی سے کہا
 اور عدیل نے رنج و کراہ کے ساتھ سے چابی چھینی اور لاک کھول کر ڈراؤ کہو سیٹ پر بیٹھ گیا تھا فاطمہ جلدی سے
 لپک کے دوسری سائیڈ پر آئی تھی اور فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی عدیل نے گاڑی بیک کی اور واپسی کے لیے پین روڈ پر
 ڈال دی فاطمہ اسے اپنی گاڑی ڈراؤ کہو کرتے دیکھ کر خوش ہو رہی تھی وہ لوگ کافی راستے طے کر آئے تھے جب فاطمہ
 کو کوئی خیال جمو کے گزرا تھا۔

"اگ بات پوچھوں تم سے؟" وہ بے ساختہ پوچھ بیٹھی۔
 "پوچھیں۔" اس نے موڑ کاٹتے ہوئے سنجیدگی سے اجازت دی۔ اور فاطمہ نے گھر کے لیے گھمسی گئی تھی۔

"تو مجھے فاطمہ صاحبہ؟" اس کی چپ پر عدیل نے اسے خود متوجہ کیا تھا۔
 "وہ گلاسز کس کے ہیں؟ آخر کار پوچھ ہی ڈال۔"

"گلاسز؟" وہ سمجھا نہیں تھا۔
 "وہی گلاسز جو تمہارے بستر کے تکیے کے نیچے بڑی احتیاط سے رکھے ہیں اور یقیناً ان کی وجہ سے تم تکیے پر
 رکھ کے نہیں سو تے ہو گے کہ کہیں وہ گلاسز ٹوٹ ہی نہ جائیں۔" فاطمہ نے اسے گردن موڑ کر دیکھتے ہوئے کہا
 تھا اور عدیل ان "گلاسز" کا خیال آتے ہی مستحضر آتا تھا اس کے خیال کے پردے پر مدحیہ کا تھکا اور پر غور سامرا لا
 ہوا گیا تھا۔

"کیوں مسکرا رہے ہو۔؟"

"نہیں آپ نے کسی کی یاد دلادی اور میں مسکرا دیا۔" اس نے شائے اچکا ہے۔
 "کون ہے وہ لڑکی۔" فاطمہ کی آواز جیسے کس یا مال سے سنائی دی تھی۔
 "یہاں ضروری نہیں ہے۔" اس نے ٹال دیا۔

اس کے جواب پر فاطمہ کا دل مزید جل کر رہ گیا تھا ابھی تو وہی پیر پہلے ہی تھی اور ابھی پل بھر میں
 ہی اس کی خوشی غارت ہو چکی تھی۔

"یعنی آپ چھپا رہے ہیں؟" وہ دوبارہ سے "تم سے اب تک" چھٹی تھی۔
 "ایسی باتیں چھپانے والی ہی ہوتی ہیں۔" وہ جانتے کیلئے مکتوبہ ہو رہا تھا اور فاطمہ چپ کی چپ رہ گئی تھی اس
 کے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں تھا عدیل نے اس کے گھر کے سامنے بیک اگائے تھے اور فوراً سے پشتر گاڑی سے
 اتر گیا تھا۔

"میری ذمہ داری آپ کو گھر تک چھوڑنے کی تھی میں نے آپ کو گھر تک چھوڑ دیا ہے اب آپ جا سکتی
 ہیں۔" وہ کھوم کے دوسری طرف گیا تھا اور فاطمہ کی سائیڈ پر گھر کی کی سمت جھکتے ہوئے کہا تھا لیکن وہ جواباً کچھ بھی
 نہ بولی۔

"اللہ حافظ۔" وہ کہہ کے پلٹ گیا تھا لیکن چند قدم دور جا کر دوبارہ واپس مڑ آیا تھا۔
 "ویسے میرا بڑا شک کرنے کی ضرورت نہیں ہے میرا کسی کے ساتھ کوئی چکر نہیں چل رہا میرا امن بھی
 صاف ہے اور دل بھی وہ گلاسز کس کے ہیں؟ یہ تو میں خود بھی نہیں جانتا امانت ہیں کسی کی واپس لوٹانے
 ہیں۔" اس نے گھر کی میں جھکتے جھکتے کہا اور دوبارہ واپس چلا گیا تھا۔

"آؤ۔" اس نے رکتے والے کو اشارہ کیا تھا اور اگلے پل وہ رکشا میں سوار ہو گیا تھا۔ فاطمہ تعجب سے اسے
 دیکھتی رہ گئی پھر ذرا تسلی ہوئی تو مسکرا اٹھی تھی۔

وہ اپنے پائین کی کامیابی پر سرشار سا تھا جیسے ٹھکانا ہوا کی ہیں تھماتا میٹر دھیاں چڑو کے ساتھ کے پلیٹ کے
 سامنے آ رہا تھا اور بڑی قرتک میں دستک دی تھی ساتھ نے اسے ہول سے دیکھ لیا تھا اسی لیے دروازہ کھول دیا تھا۔
 "یہ بیوی باڑی۔" اس نے اندر داخل ہو کر ہاتھ ہلایا تھا۔

"ہائے! ہاں تھے تم؟" مالک لپک کے اس کے قریب آئی تھی اور دونوں بازو اس کے گلے میں ڈال دیئے
 تھے۔

"لگتا ہے تم مجھے بہت مس کر رہی تھیں؟" وہ مالک کے سلی شولڈر کمنٹ بالوں کو چھیرتے ہوئے بولا تھا۔
 "آف کورس یار! تمہارے بغیر میں ہمیشہ ہی بھڑکتی ہوں۔" وہ منہ نہ کر بولی۔

"چلو پھر تم لوگوں کی پورست دور کرنا ہوں۔"

"ہیں؟ ویسے۔؟" وہ سب کورس میں لو لے تھے۔
 "شیشہ کلب چلتے ہیں پارٹی میری طرف سے۔"

"پارٹی؟" فاطمہ نے خوشی میں "یہ سوال کئی کا تھا۔"
 "خوشی کا بھی پتا نہیں جائے گا پہلے تم لوگ تو چلو۔" سہمی لڑکے لڑکیاں اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور جوت کی
 دعوت پر یہ قافلہ سیدھا شیشہ کلب پہنچا تھا کبھی کبھی وہ سب دوست اگر خوشی اور موڈ میں ہوتے تو ایک دوسرے کو
 شیشہ پینے کی (جو کہ ایک قسم کا نشہ ہے) دعوت دیتے تھے اور اس وقت بھی وہ لوگ جوت کی دعوت پر اس گلے سے

اندھیرے والے کیمن میں بیٹھے شیشہ لی کر مسرور ہو رہے تھے جو دت اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ شیشہ شیر کر رہا تھا اور کامی اور سائٹم وغیرہ اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ شیر کر رہے تھے۔
 "ہوں! اب بولو کس خوشی میں دعوت دی ہے۔" سائٹم نے ذرا سا دھواں فضا میں پھوڑتے ہوئے کہا اور جو دت کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے اسے متوجہ کیا تھا۔
 "میں نے مریم فاروق نیازی کے گھر کا پتا کر لیا ہے۔" اس نے سائٹم کا سارا ایشہ ہرین کر دیا تھا سائٹم اسے ششدر سا دیکھ رہا تھا۔

"مریم کے گھر کا پتا۔" "اس نے دہرا کر اور زور دے کر کہا تھا البتہ چہرے پر فتح مندی کا سرشار سا احساس بکھرا ہوا تھا۔
 "تھکر کیسے؟" سائٹم کو بے چینی ہوئی تھی۔
 "کیسے تو چھوڑو جس میری کامیابی پر مبارکباد دیجئے۔" جو دت سرشاری سے بولا۔

"لیکن جو دت تم۔" "ہاں یا ربس! کوئی اہمیت نہیں اور کوئی ہدایت نہیں بس اب صرف یہ سوچو کہ جو دت آندھی مریم فاروق نیازی سے ملاقات کیسے کرے گا۔ ملاقات، مطلب ملنا سمجھ گئے نا تم۔" "وہ تو حق ہے مجھے میں کہہ رہا تھا اور سائٹم چپ سا ہو گیا جو دت آندھی واقعی بہت خبیث ثابت ہوا تھا۔



صبح یارو بجے کا وقت تھا جب سو کر اٹھی تھی۔ اسے سی کی کوئٹ کی وجہ سے وہ کافی گھری اور سکون کی نیند لے کر بے وار ہوئی تھی لیکن باہر آگ اگلے سوون نے حشر اٹھا رکھا تھا تیز دھوپ لوگوں کے سروں پر چڑے کے ناچ رہی تھی اور اس دھوپ اور گرمی کو برداشت کرنے والوں کا برا حال تھا اس نے ذرا کی ذرا کھڑکی سے پرہیز ہٹا کر دیکھا تھا اور آنکھیں چند حیا لگی تھیں جس سے اندازے پر پشیمانی بارہا واپس کر دیا تھا اور دھولے ڈھالے انداز میں انگڑائی لیتی ہوئی شاہد لینے کے لیے گیس پکڑنے کے بعد موٹر فریش ہو کر تیار ہو کر نیچے آگئی تھی اتنے میں ہاتھ میں پکڑا سیل فون تھا اس نے آنکھیں بند کر کے دیکھا تو سکر اکر مت پہنچا تھا۔

"وہ رتی جینڈی اس وقت بات کرنے کا موڈ نہیں ہے۔" اس نے کال دس گھنٹے کرتے ہوئے دل ہی دل میں جینڈی سے معذرت کی تھی اور باقی کی دو تین بیڑھیاں بھی اتر آئی۔
 "ڈرائنگ۔" اس نے سامنے سے آتے ٹیل کو فریش انداز میں دیکھا تھا۔
 "مارنگ۔" وہ کافی سنجیدگی اور کافی آہستگی سے کہہ کر پاس سے گزر کے اوپر چلا گیا تھا جس پر درجہ کو بے حد اچھٹا ہوا تھا اس نے حیرانی سے مڑ کر ٹیل کی پشت کو دیکھا تھا کہ آٹھویں بکھر کچھ کے پاس سے کیوں گزر گیا ہے۔ حالانکہ وہ ایسا نہیں تھا تو پاس ٹھہر کر حال چال پوچھنے اور یاد کرنے والا آدمی تھا۔ یقیناً "کچھ" وہ تھا اسے جو وہ اس طرح چپ چاپ گزر گیا تھا۔

"کیا مسئلہ ہو گیا ہے آخر؟" اب تو میں نے بھی کچھ نہیں کیا جس کا انہیں قصہ ہو گا۔ وہ سوچتی ہوئی وہاں سے ڈرائنگ روم میں آگئی۔
 "نام۔! وہ ٹیل بھائی کو کیا ہوا ہے؟ وہ اتنے چپ۔" کہتے کہتے اچانک اس کی نظر دائیں طرف کے صوفے کی

سمت اٹھی تھی اور منہ کے الفاظ منہ ہی رو گئے تھے بلکہ لیدر کے دن مٹی مونس نے اس کے والد محترم ممتاز حیات بڑے شہانہ انداز میں براہِ جان تھے جن کو دیکھ کر مدحیہ کے قدم زمین نے جکڑ لیے تھے وہ کھڑے کھڑے سیات پتھر کی صورت بن گئی تھی۔

"دیکھی ہو بیٹا؟ کیا دیکھ رہی ہو؟" انہوں نے اسے یوں مخاطب کیا جیسے بڑا صبح کا معمول ہو جیسے بڑا سال بعد ملنا تو کوئی خاص معنی نہ رکھتا ہو مگر ان کے مخاطب کرنے پر مدحیہ کے اندر غموں سے لہلہا اٹھنے لگتے تھے اس کا چہرہ نفرت سے سرخ ہو گیا تھا۔ نظروں میں کئی ایسے مناظر گھوم گئے تھے جن کی وجہ سے اس کا فشارِ خون بلند ہونے لگا تھا اور شدتِ غلبہ سے اس نے اپنے ہاتھوں کی مٹھیاں کچلی تھیں اور ایسی کیفیت میں ہنسنے لگا تھا کہ وہاں سے چلی جاتی۔

"مدحیہ! سلام کرو اپنے بابا کو؟" وہاں ایس پلٹ رہی تھی جب فائزہ بیگم کی توازیہ اس کے قدم مقیم گئے تھے۔

"ایم سوری مام! سلام کا مطلب ہوتا ہے کسی پر سلامتی بھیجنا جو میں نہیں بھیج سکتی اور ویسے بھی سلام اسے کیا جاتا ہے جسے سلام کا پتا ہو۔" نفرت اور حقارت اس کے لب و لہجے سے ہی اندر ہی تھی۔ فائزہ بیگم اس کے جواب پر سٹپ کر گئیں جبکہ ممتاز حیات کے چہرے پر غصے کی سرخی دوڑ گئی تھی۔

"مدحیہ! یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟ تمیز سے بات کرو بابا ہیں تمہارے۔" انہوں نے جی کو سرزنش کی تھی جس پر مدحیہ کو اور بھی تپ چڑھی تھی۔

"ہو نہ سوٹ مام! مست بھولی ہے و قوف اور نادان عورت ہیں آپ ہر بڑا سال بعد حتمی ہمارے کے لیے کمر آجاتے ہیں تو آپ عزت کا احترام اور تمیز کے ساتھ ان کی خدمتوں میں لگ جاتی ہیں تبھی ان سے یہ جی تو پوچھ لیا کریں کہ وہ دو سال یا دو بڑا سال کہاں اور کن کاموں میں گزار کے آتے ہیں؟ کیا پھر آپ یہ ہی پوچھ لیا کریں کہ یہ عزت کا احترام اور تمیز کے قابل ہیں یا نہیں۔" وہ نفرت سے طنز اور انتہائی انداز پر اتر آئی تھی۔

"مدحیہ! ممتاز حیات ایک دم دھڑاڑا گئے تھے لیکن یہ بھول گئے تھے کہ مقابل ان کی اپنی ہی اولاد ہے جو پورے والی یا چھٹنے والی ہرگز نہیں تھی۔

"مست ممتا صاحب! آہستہ آواز میں بولیں ورنہ مجھے آپ سے بھی زیادہ اونچی آواز میں بولنا آتا ہے۔" وہ اٹھ کھڑی ہو کر وارننگ دینے والے انداز میں بولی تھی۔

"مدحیہ! یہ کس لمحے میں بات کر رہی ہو اپنے بابا کے ساتھ۔" فائزہ بیگم بھی مونس سے اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔

"پلیز مام! مجھے بار بار یہ احساسِ مت والا میں کہ یہ میرے بابا ہیں مجھے نفرت ہوتی ہے یہ سوچ کر کہ میں ان کی اولاد ہوں لیکن آتی ہے اپنے آپ سے بھی بڑا سال ہو گیا ہے مجھے اپنے آپ سے محبت آتے ہوئے بڑا سال سے جن رہی ہوں، صرف یہ سوچ سوچ کر کہ میں اس انسان کی اولاد ہوں اور اس انسان کا گھٹیا اور گندہ خون میری رگوں میں دوڑ رہا ہے۔" وہ کہتے کہتے یکدم پھٹ پڑی تھی اور فائزہ بیگم ششدر ہو گئیں۔

"مدحیہ! یہ بے ہوش لڑکی تمہیں جرات کیسے ہوئی کہ تم اپنے باپ سے اس کلمے میں بات کرو۔" وہ اسے شعلہ بار نظروں سے دیکھتے ہوئے قریب آئے تھے۔ مگر وہ بھی پیچھے ہٹنے کی بجائے ان کے سامنے ٹوٹ کے کھڑی رہی۔

"میں آپ کو اپنا باپ کہتے ہوئے اپنی تو بہن نہیں کہتی ہوں آپ کی عزت میری نظریں میں بڑا سال پہلے کینڈا کے ایک بول کی راہ داری میں ختم ہو گئی تھی اس روز میں نے آپ پر فاتحہ پڑھی تھی مگر مجھے آپ میرے لیے آپ کی عزت، آپ کا وقار، آپ کا احترام سب مر گیا تھا اس دن۔ اور یقیناً آپ کو خبر ہوئی کہ مرے ہوئے جذبات، مرے ہوئے احساسات اور مرے ہوئے انسان زندہ نہیں ہوتے؟ آپ بھی مر گئے ہیں۔"

مجھے آپ؟" وہ یکدم اونچی آواز میں دھڑکی تھی۔

"اشاپ! اشاپ! جسٹ اشاپ! اشاپ!" انہوں نے جواباً غرا کے کہتے ہوئے ہاتھ اٹھایا تھا لیکن اشاپ نہیں مانتے آگیا تھا۔

"پلیز بابا! انٹرول پور سیٹ۔ کیا کر رہے ہیں آپ؟"

"آپ ان کو کرنے دیں میں بھی دیکھتی ہوں کہ کیا کرتے ہیں؟ اور یہ سال سے انتظار تھا اس گھڑی کا کہ کبھی میرا اور ان کا بھی سامنا ہو۔" مدحیہ یک دم دوبارہ سامنے آئی تھی۔

"مدحیہ! پلیز اپنے بیڈروم میں جاؤ۔" نیل نے اسے اشارے سے بھیج دیا۔

"ہرگز نہیں! میں آج ان کو آئینہ دکھا کر ہی جاؤں گی، آخر ان کو پتا تو ہے کہ وہ کس حد تک گر چکے ہیں؟" وہ اونچی اور بلند آواز میں چلا رہی تھی۔ نیل نے اسے بازوؤں میں کھیرتے ہوئے بمشکل پیچھے کھینچا تھا۔ وہ عجیب جھنکی سی ہورہی تھی اس کا انداز دیوانی سا تھا۔

"مدحیہ! اگل صبح ہوئی کیا طریقہ ہے بات کرنے کا۔" نیل اسے ذرا تنگ رو م سے ہار کھینچ لایا تھا۔

"اس انسان کے ساتھ یہ کیسی طریقہ ہو سکتا ہے بات کرنے کا؟ یہ ورنہ صفت انسان ہمارا باپ نہیں ہو سکتا۔"

"چیخ رہی تھی اور نیل اسے زبردستی کھینچ کے بیڈروم تک لایا تھا۔

"میں جو مام! کھیل رہی ہوں؟" وہ بھیج دیا۔ نیل نے اسے بیڈروم بخاتے ہوئے نکلی سے کہا تھا۔

"ان کی اہلیت گنا کا جو روپ میں نے دیکھا ہے وہ آپ نے نہیں دیکھا اسی لیے پاگل ہو رہی ہوں آپ دیکھ لیتے تو شاید اسے اس نام نہاد باپ کو اٹھا کر اس گھر سے باہر پھینک دیتے جو ہمارا باپ اور ہماری ماں کا شوہر کہلائے جانے کے بھی ناواقف نہیں ہے۔" مدحیہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا سے کیا کر ڈالے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ ممتاز حیات کو کوئی سے اڑا دے۔ اس کے اندر پلنے والی نفرت آج عموں کے سامنے آئی تھی۔ وہ حشر اٹھا دینے کے لیے تھی۔

"والہ اللہ کسی حد تک نیل حیات بھی اپنے باپ کے کڑوت چاہتا تھا۔ مگر جو کچھ مدحیہ دیکھ چکی تھی اگر واقعی نیل بھی دیکھ لیتا تو جیتے ہی مرنا کیا پھر اپنے باپ کو مار دیتا۔

"یہ شخص اگر ایسا ہے تو میں بھی اسی گندے شخص کی اولاد ہوں میں بھی انہیں دکھاؤں گی کہ عیاش ہونا کیا ہوتا ہے۔" وہ جو منہ میں آ رہا تھا بولے جارہی تھی۔

"یہ لو پانی پیو۔" نیل نے جب سے پانی ابل ڈیل کر گلاس اس کی سمت بڑھایا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے اس کی میرے دل و دماغ میں جاتی آگ اس پانی سے بجھنے والی نہیں ہے۔" وہ نیل کا ہاتھ ہٹا کر کھڑی ہو گئی تھی۔

"مدحیہ! فائزہ بیگم نے اندر داخل ہوتے ہوئے اسے پریشان نظروں سے دیکھا۔

"مام! پلیز! مجھ سے کچھ مت کہیے گا میرا دل پہلے ہی ماؤف ہو رہا ہے اور کچھ سنا تو پوچھ جائے گا۔" اس نے اپنی کنپٹیوں کو سلالتے ہوئے کہا تھا اور اتنے میں دوبارہ اس کا سیل فون بجا تھا۔ مدحیہ نے پلٹ کر بیڈروم سے اپنا سیل اٹھا کر نمبر دیکھا اور اس بار کال ریسیو کرتے ہوئے سیل کان سے اگاتا تھا۔

"ہائے جیسی ہلاؤ آریو۔" اس نے بلاخوفہ خطرات کی تھی۔

"ایم فائن، تم سناؤ بار بار فون کیوں کر رہتے ہو؟" مدحیہ بات کرتے ہوئے بیڈروم کے دروازے کی سمت بڑھی تھی۔

"ارے دادا تم پاکستان آ رہے ہو؟ امیڑنگ یا رنخوب انجوائے کریں گے بس جلد ہی یہ آجاؤ میں بھی بہت مس کر رہی تھی بہت بوری ہوئی ہے یہاں۔" وہ ہانک دلی کہتی ہوئی کمر سے نکل گئی تھی فائزہ بیگم اور نیل اک دو سرے کو دیکھ کے رو گئے تھے۔ وہ مدحیہ جو ایک نارمل مدحیہ کے روپ میں داخل رہی تھی ممتاز حیات کی

اچانک آدھ دو بارہ سے بچھلے خول میں اتر گئی تھی۔ خیال کو بے پناہ لذت کا احساس ہوا تھا وہ بے بس سا کھڑا تھا۔

”عبداللہ! کو فون کر دیا نہ کر دیا؟“

وہ صبح سے اسی ایک گفتگو کا شکار تھا اور یہی سوچے جا رہا تھا اس کا سارا دھیان زری کی طرف تھا اور اسی وجہ سے وہ رات بھر سو نہیں پایا تھا کیونکہ یہ ایک ایسا معاملہ تھا جسے وہ اپنے دونوں دوستوں کے ساتھ بھی شیئر نہیں کر سکتا تھا۔ عبداللہ کے ساتھ اور نہ ہی خیال حیات کے ساتھ کیونکہ زری ایک کی عزت تھی تو ایک کی محبت۔ دل اور شاد اپنا راز دیا ہوتا تھا تو کس کو؟ اس لیے سو دو زیاں کا سودا طے کرنا تھا تو خود ہی طے کرنا تھا یہاں اس کے دوستوں کی دوستی کام نہیں آسکتی تھی۔ البتہ اسے دوستی کا بھرم ضرور رکھنا تھا تاکہ دونوں میں سے کسی ایک کو بھی دل اور شاہ سے شکایت نہ ہو پالی۔ اور ان ہی کو ششوں میں دو زریں ملک کا دل نیزے کی االی میں پروئے جا رہا تھا۔ دل اور شاہ کا زری کو نظر انداز کرنا زری کے لیے کسی جان لیوا مرض سے کم نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کل رات سے اس کا کیا حال ہوا ہو گا؟ اور اسی حال کو مزید جاننے کے لیے وہ عبداللہ یا نگار شش بھائی کو کال کرنا چاہ رہا تھا اور کر نہیں پا رہا تھا۔ لیکن عبداللہ شاید اس سے بھی زیادہ پریشانی میں مبتلا تھا۔ جب ہی تو اس کا خود فون آیا۔ دل اور نے ایک بات سے گاڑی ڈرا سیہ کرتے ہوئے اس کی کال ریسپونڈ کی تھی۔

”السلام علیکم۔“

”وعلیکم السلام! کیسے ہو؟“ عبداللہ ذرا سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

”ہمیشہ کی طرح فٹ فائن ہوں تم اپنی سناؤ تم فٹ میں لگ رہے؟“ دل اور نے گاڑی موڑتے ہوئے اپنی بات بھی اپنے مطلب کی سمت موڑ دی تھی۔

”ہاں یار! بہت ڈپر ہوں میں۔“ عبداللہ نے اعتراف کیا تھا اور دل اور ہمہ تن گوش ہوا تھا کہ آخر ان دونوں بہن بھائی کے ساتھ کیا مسئلہ ہو گیا ہے؟ دونوں ہی اسے فون کرنے پہ مجبور ہو گئے تھے۔ بس فرق یہ تھا کہ بہن نے رات کو کیا تھا اور بھائی نے دن میں۔

”ڈپر ہونے کی وجہ؟“ اس نے بڑے سکون اور چل کا مظاہرہ کیا تھا۔ وکیل تھا آخر بات پوچھنے کا ڈھنگ خوب جانتا تھا۔

”پاکستان سے بابا جان کا فون آیا تھا کل۔“ عبداللہ نے بات شروع کی۔

”تو؟“

”تو وہ زری کو پاکستان واپس بھیجنے کا اصرار کر رہے تھے۔“

”کیوں؟“

”کیونکہ وہ زری کی شادی کرنا چاہتے ہیں اس کے لیے کوئی پروپوزل آیا ہوا ہے۔“

”اور تو یہ پیریشن ہے۔“ دل اور نے ہونٹ یکسر تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

”یہ تو پیریشن کچھ کم نہیں ہے دل اور! بہت بڑا مسئلہ ہے میں ابھی زری کو پاکستان نہیں بھیجنا چاہتا جبکہ وہ خدیجہ الہیہ سے ہیں میری بات سے تو وہ ویسے ہی غار کھاتے ہیں۔“ عبداللہ پریشانی کا شکار تھا۔

”کیا بات کہی ہے تم نے؟“

”بس میں نے تو یہ ہی کہا ہے کہ میں زری کو اس کے لاسٹ ایگزٹ از سے پہلے نہیں بھیجوں گا اور اگر بھیجوں گا بھی تو شادی زری کی پسند سے ہوگی اور نہ نہیں ہوگی۔“ عبداللہ نے اپنی بات دہرائی۔

46

”بات تو یہی انقلاب کی ہے تم نے مگر کیا یقین ہے کہ تم اس پہ قائم بھی رہو گے؟“ دل اور شاہ اس کی ثابت قدمی کا یقین چاہ رہا تھا۔

”دل اور صاحب! میں تمہارا دوست ہوں اور اپنے دوست کو تمہارے ساتھ چھوڑ دینا میرے لیے ضرورت ہے؟“

”لیکن کتنا ہی معافی! ایک بات کہنا چاہوں گا تم سے۔“ دل اور نے آخر کار کہا تھا۔

”اپنی بہن کو میرا مطلب ہے کہ زریں ملک کو تم اس کی پسند کی آزادی دے رہے ہو اگر یہ ہی آزادی تمہارے لیے مشکل بن گئی تو؟“ دل اور ایک بک شاپ کے سامنے گاڑی پارک کرتے ہوئے ایک پوائنٹ کی بات پوچھ رہا تھا۔

”ہرگز نہیں! زریں ملک میری بہن ہے یہیں اسے اچھی طرح جانتا ہوں وہ میری بسااہ سے زیادہ باتیں نہیں پھیلاتے گی! وہ خود تو مشکل میں پڑ سکتی ہے لیکن میرے لیے مشکل کھڑی نہیں کر سکتی۔ جو کون کا رو مانے کی۔“ عبداللہ کے لبے میں یقین تھا۔

”ہوں! یہ تو بہت اچھی بات ہے لیکن کسی کے دل کا حال تو کوئی بھی نہیں جانتا کبھی کسی کی پسند پروری کرنا بے حد مشکل ہو جاتا ہے۔“

”جو مشکل کام ہم اپنے لیے کر سکتے ہیں وہ بہن اور بیٹیوں کے لیے بھی کر سکتے ہیں! میں ہائر اسٹڈی کے لیے انگیڈ آیا تھا اور زری کی بھی خواہش تھی کہ وہ ہائر اسٹڈی کے لیے جائے سو کچھ لو میں نے اس کی خواہش پوری کر دی چاہے اس کے لیے مجھے اپنی ساری پیمالی کی مخالفت مول لینی پڑی تھی میں نے لے لی اور دیکھ لیتا اس معاملے میں بھی ایسا ہی ہو گا۔“ عبداللہ کی بات اور لہجے کی مضبوطی سے دل اور کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ زری کے لیے ڈٹ جائے گا لیکن اصل مسئلہ تو یہ تھا کہ زری کسی اور کی پسند بھی اور پسند کسی اور کو کرتی تھی۔ عبداللہ کو اگرچہ چاہتا تو وہ کس کا ساتھ دیتا۔ زری کا یا پھر خیال کا؟ فیصلہ کرنا بے حد مشکل تھا۔

اس ٹاپک پر اگر سوچا بھی جاتا تو داغ تل ہو جاتا تھا اور دل اور اکثر اس سارے معاملے سے دامن بچا کے گزر جاتا بات زری کی، نوٹی یا خیال کی وہ اکثر نظر انداز کر دیتا تھا۔

”ان شاہ! اللہ! اللہ! بستر کرے گا تم زیادہ مینشن مت او۔“ وہ اس کے ساتھ موبائل پہ بات کرتا ہوا ڈی سے نکلی آیا تھا۔

”یار! مینشن تو ہوگی سارا معاملہ ہی بہت سنگین ہے اب دیکھو کہ اگر ایگزٹ از کے بعد زری پاکستان جاتی ہے تو بابا جان کی یہ ای کو شش ہوگی کہ وہ اس کی جلد سے جلد شادی کر دیں جبکہ میں ایسا نہیں چاہتا میں چاہتا ہوں کہ وہ پہلے پاکستان جائے وہاں دوبارہ سے ایڈجسٹ کرے پھر یہاں چلے گا کہ وہ جاگیرداروں اور حویلی والوں سے شادی کر کے نباہ سکتی ہے یا نہیں۔“

”تو پھر یہ سب کیسے ہو سکتا ہے؟“ دل اور گاڑی الاک کر کے مضبوط قدم اٹھا تاکہ شاپ کی طرف آسکے۔

”یہ سب اسی طرح ہو سکتا ہے کہ میں بھی کچھ عرصہ کے لیے پاکستان آ جاؤں۔“ عبداللہ نے اپنا ارادہ ظاہر کیا۔

”تم پاکستان آ جاؤ گے اور نگار شش بھائی؟“

”وہ بھی میرے ساتھ ہی آئیں گی۔“

”لیکن تمہارے گھر والے تو انہیں قبول کرنے پہ تیار نہیں ہیں؟“

”جانتا ہوں اور اسی لیے چاہتا ہوں کہ تمہاری طرح لاہور میں اپنا گھر لے لوں اور میں نے تمہیں اسی لیے فون کیا۔“

47

کیا ہے کہ تم میرے لیے کوئی اچھا سا گھر نہ کھو۔

”اور اتنی معاملہ ہے؟“

”ہاں یار! مجبوری ہے زری اکیلی ان لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکے گی تو بیل میں ہتھیار ڈال دے گی میرا اس کے ساتھ ہونا ضروری ہے۔“

”ہوں! واقعی ٹھیک کہہ رہے ہو اچھا ارادہ ہے تمہارا میں بات کروں گا کسی سے گھر کرائے پہ لیتا ہے یا داتی؟“

”نہیں یار! میں کرائے کا جینٹ نہیں پال سکتا ذاتی ہی لوں گا اگر دوبارہ انگلینڈ آیا تو اس گھر کی ذمہ داری تم ہی سنبھالو گے۔“ عبد اللہ نے پہلے سے ہی اطلاع دے دینا ضروری سمجھا تھا جس پر دل اور کے تیر بدل گئے تھے۔

”کیوں؟ میں تم دونوں کا منیجر ہوں؟ سیکرٹری ہوں؟ یا چوکیدار؟ پہلے تم دونوں کو چیرس لے کر دیں پھر ان کی حفاظت بھی کروں! واہ کیا بات ہے جناب؟ ساری زندگی تم دونوں کے کاموں میں گزار دیں اور اپنا کچھ نہ کروں۔“

دل اور نے اسے کھری کھری سنا ڈالی تھی۔ عبد اللہ اس کی بات پہ یکدم قہقہہ لگا کے ہنسا تھا۔

”اپنا کیا کرنا ہے تم نے؟“ وہ غصے میں تھا اور عبد اللہ اسے چھیڑ رہا تھا۔

”جنازہ جائز کرنا ہے جیسے تم نے کیا ہے۔“

”صرف جنازہ ہی جائز کرنا ہے؟ شادی نہیں کرنی تم نے؟“ عبد اللہ نے دوبارہ پھینکا۔

”عبد اللہ صاحب! تم اس وقت خون پہ ہو میرے سامنے ہوتے تو میں تمہیں بتاتا کہ میں نے کیا کیا کرنا ہے؟ اور میرے کرنے کا سن کر تمہارے کانوں سے جھول نہ نکل جاتا تو میرا نام بھی بدل اور شاد نہیں تھا۔“ وہ اک اک لفظ غصے اور خفگی سے چبا کر بولا تھا جس پر عبد اللہ کو جیسے ہنسی اور قہقہوں کا دھڑ بڑ گیا تھا۔

”اسی لیے تو کہتے ہیں ابھی ہمارے کام ختم ہو چکا ہے ہمیں فرست دیں کب لے گی بھلا؟“

”ایسی کی تمہیں تمہارے کاموں کی؟ بس تمہیں گھر لے کر دیں گا بعد میں جو بھی چاہے کرتے رہنا سمجھے تم؟“

دل اور نے اسے ہری جھنڈی دکھائی۔

”ارے یار! تم جانتے ہو تمہارے سوا ایسے کام کوئی نہیں کر سکتا اسی لیے تم سے ہی کہنے پڑتے ہیں مجبوری ہے ہماری۔“

”کیوں؟ کیا میں پراپرٹی ڈیلر ہوں؟ کسی نے گھر لیتا ہے کسی نے شوروم بنانا ہے ایک کے ہاں صاحب کیسٹ اس پاکستان آئے ہیں تو وہ پریشان ہے ایک کے ہاں جان پاکستان سے انگلینڈ جانا چاہ رہے ہیں تو وہ پریشان ہے ایک کو مدیہ حیات نے سنا رکھا ہے تو وہ سرسبز زمین ملک کے لیے ستایا جا رہا ہے وہ میرے دوستوں اور ان کے بچوں میں الجھ گئے ہو؟“ دل اور در حقیقت ان کا مذاق اڑا رہا تھا جس پر عبد اللہ بھی اپنی بے ساختہ اٹھنے والی ہنسی نہیں روک پایا تھا۔

”ہاں یار! یہ تو تم جی ہی کہہ رہے ہو بہت الجھ گئے ہیں ہم لوگ تو دیکھ رہے ہیں کہ اللہ تمہیں بھی الجھا دے شادی کے چکروں میں۔“

”ہو نہ! مجھے! مجھے! اپنے اوگے تو میں الجھوں گا نا۔ جب تک تم دونوں میرے پیچھے پڑے ہو میرا کچھ نہیں بننے والا۔“ ان دل اور شاد کو روک دے کے اپنا خیال آ رہا تھا۔

”کیا بات ہے جناب آج بار بار اپنے لیے یہی باتی جا رہی ہے کوئی خاص وجہ؟“ عبد اللہ نے متنی خیزی سے پوچھا۔ جس پر دل اور قہقہہ لگا کے ہنسا تھا۔

”وجہ کیا ہوئی یار؟ آج سچو شادی کا دل کر رہا ہے۔“ دل اور اس سے بھی زیادہ متنی خیزی سے بولا تھا۔

”اوسے ہوئے! بڑے بے تاب لگتے ہو؟ بتول آئی سے بات کروں کہ ان کے بیٹے کا شادی کرتے کا دل کر رہا ہے جوانی منہ کو آ رہی ہے صبر نہیں ہو رہا شزاوے سے؟“

”تمہاری بتول آئی کو خود ہی پتا ہے کہ ان کا بیٹا کیسا ہے؟ میں نے بتانے کی ضرورت نہیں ہے اور ہاں ایک بات اور جوانی کو بھی اتنا بے صبر بھی نہیں ہونے دیا کہ وہ منہ نہ دے سکے بس میں ہر چیز کو ایک حد تک رکھنے کا قائل ہوں۔“ دل اور نے استہزاء سے جواب دیا تھا۔

”ویسے ایک بات تو یاد آ رہی ہے؟ تمہیں کوئی پسند بھی ہے یا نہیں؟“

دل اور نے جواب دیا کہ وہ نے بے ساختہ ہی یہ سوال کر دیا تھا اور دل اور کے فر فر کرنے والے ہونٹوں پہ چپ کا تالا پڑ گیا تھا۔ وہ عجیب تذبذب کا شکار ہو گیا تھا۔

”کیا بات ہے دل اور؟“ چپ کے دل ہو گئے ہو؟ کیا میں زیادہ پرستل ہو گیا ہوں؟“ عبد اللہ نے سنجیدگی سے اسے مخاطب کیا تھا۔

”ارے نہیں یار! ایسی کوئی بات نہیں ہے ابھی اس پسند اور تائید والے معاملے پہ دھیان نہیں دیا، لیکن جب دیا تو تمہیں ضرورتاً کوئی گناہ آئے اور نہ شائستگی سے بات مانی تھی۔“

”کیا پوچھ سکتا ہوں کہ اگر تم نے اس معاملے پہ دھیان دیا تو تمہاری پسند تمہارا انتخاب کیسی لڑکی ہوگی؟“ عبد اللہ کا ایک اور کھوتا سوال آیا تھا اور دل اور کی آنکھوں کے سامنے اک نرم ہوا دم اور دلکش ماسر اپا پوری آہو تپ کے ساتھ جگ گیا تھا۔ محبتوں اور مٹھاس سے گندھا ہوا دل اور شاد کے عشق میں پور پور ڈوبا ہوا۔

”کیا پھر کچھ غلط پوچھ لیا میں نے؟“ عبد اللہ نے پھر متوجہ کیا تھا اسے۔

”میری پسند میری اماں بہتر جانتی ہیں ہو سکے تو ان سے پوچھ لو۔“ دل اور نے بات ہی ختم کر ڈالی تھی اور عبد اللہ اس کے جواب پہ بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

”کیا تم اپنی اماں کی پسند سے شادی کر دے گے؟“

”ہاں کہہ سکتے ہو گندہ نا۔ میری اور میری اماں کی پسند تقریباً ایک ہی ہوگی۔ جس سے وہ کہیں کی میں شادی کر لوں گا۔“ دل اور کے جواب پہ عبد اللہ نے تیری سانس کھینچی تھی اور پھر چند اور باتوں کے بعد فون بند کر ڈالا۔ لیکن دل اور کے ذہن میں ہزاروں سوچیں اور ہزاروں الجھنیں چھوڑ گیا تھا اس کا دل غلو جھل اور منتشر ہو رہا تھا وہ بوجھل قدم اٹھا تا بک شاپ کے اندر آیا تھا کچھ کتابیں لینی تھیں۔

پھر ایک لیلی گھری ہوئی ہے سنے زمانے کی تلخیوں میں پھر ایک وعدہ امر ہوا تو مٹیوں کا پتا چلے گا ابھی تو پھرتے ہو دوستوں میں عزیز کوئی جدا نہیں ہے کوئی اوھر سے اوھر ہوا تو مٹیوں کا پتا چلے گا مٹیوں میں تو پتھروں کو بھی موم ہوتے سنا ہے لیکن تمہارے دل پہ اثر ہوا تو مٹیوں کا پتا چلے گا وہ جس کی خاطر زمانے بھر کو بنا رہے ہو تم اپنا دشمن وہی نہ اپنا اگر ہوا تو مٹیوں کا پتا چلے گا

نکارش کسی کام سے باہر نکلی تھی لیکن گھر کے چھوٹے سے لان میں اسے سفید کانڈ جا بجا بکھرے ہوئے نظر

آئے تھے اس نے آگے بڑھ کے ایک کانڈ اٹھا کر بڑھا۔ زرمی کی ہینڈ رائٹنگ میں چند اشعار تحریر تھے جن کو پڑھ کے نگارش نے چوبک کر زرمی کے پیڑے روم کی کھڑکی کی سمت دیکھا تھا جہاں سے اور بھی کانڈ زمین کی طرف چلے آ رہے تھے۔ اس نے بائیں پھاڑا لی گئی شاید۔

آ رہے تھے۔ اس نے بائیں پھاڑی کی سائیڈ۔
 "اومائی گاؤ یہ کیا کیا اس نے؟" نگار ش چکراہنی تھی وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے اندر کی طرف بھاگی اس کا رخ
 زوری کے بیڑ روم کی طرف تھا اس نے آتے ہی دروازہ دھڑام سے کھولا تھا۔
 "زوری۔!" نگار ش نے ٹوپ کے پکارا تھا اسے اور تیر کی سی تیزی سے اس کے پاس آئی تھی اس نے
 بے تحاشا آنسو برساتی پنکھیوں سے روٹی، روٹی زوری کو دونوں بازوؤں سے تھام لیا تھا۔
 "یہ کیا کر رہی ہو تم؟" نگار ش نے اسے جھنجھوڑا لیا تھا۔

”یہ کیا کر رہی ہو؟ ہم کیا مل ہو گئی ہو لیا؟“ انکار میں اس نے اسے بوجھوڑا دیا۔
 ”ہاں بالکل، دوستی ہوں میں، تڑپ مٹا رہی ہوں اپنے اندر کی، یہ لفظ صرف لفظ نہیں ہیں یہ اس شخص کی یاد اس
 کی تڑپ اس کی طلب ہیں جب اس کے لیے مڑی، وہں تب تب میں نے لفظ تحریر کیے ہیں، جب جب اسے
 یاد کیا ہے تب تب اپنے دل کا حال لکھا ہے اور وہ شخص میری تڑپ میرے دل کا حال ہی نہیں جانتا، انجان
 پھر رہا ہے مجھ سے، جیسے میرا۔ میرا تو کوئی وجود ہی نہیں ہے، جیسے اس کے انجان پر اسے مجھے تو دور ہی نہیں، وہ“
 مجھے تو اکلنٹ ہی نہیں ہوتی، پورا ایک سال ہو گیا ہے اسے دیکھے ہوئے اس سے بات کیے ہوئے آج میں نے
 دل کے باتوں پر جو رو کر اسے فون کر لیا تو وہ میرا دیوتا بن بیٹھا اس کے سامنے ایڑیاں رگڑتی رہی لیکن اس نے
 فون کو آون کر کے کان سے اٹکانے کی زحمت نہیں کی۔ جانتی ہیں آپ کتنی بار فون کیا ہے میں نے۔ دس بار پورے
 دس بار، اور دس بار اس نے تڑپ کا تماشا دیکھا ہے، ایک ٹین۔ ٹینس ایک ٹین دیا کر اس تڑپ کو کان سے لگا کر
 قرار نہیں دیا، صرف یہ سوچ کر کہ کہیں زری اس قرار اس تسلی کی عادی نہ ہو جائے۔ کہیں اس سے عمر بھر کا ساتھ
 نہ ملے لے، بہا بھی میری بات کا تہہ لکھے کے رہیں، وہ شخص دو سچیاں بھانے والا شخص ہے، محبتیں نہیں، وہ
 کبھی میری محبت پہ ترس نہیں کھائے گا، کبھی گلے نہیں لگائے گا، وہ کبھی بھی زریں ملک پہ اپنی نگاہ یا رکی برسات
 نہیں برساتے گا اور میں ترس ترس کر یہاں سے حیرانی مانند ہو جاؤں گی۔“ زری رو رہی تھی اور ساتھ ساتھ دل تو
 شاہ کے فکرتہ سے آگاہ بھی کر رہی تھی نگار شمس سے اس کو سنبھالنا مشکل ہو لیا تھا۔

”زوری پلین! اس اتنی بدنگن! زور ہی ہو؟ ہو ملتا ہے اسے تمہاری کل کا چا ہی نہ چلا ہو؟ ہو ملتا ہے وہ سو رہا ہو؟ یا پھر سیل ہی اس کے پاس نہ ہو؟“ نگارش نے اس کی تسلی کے لیے کئی بمانے و سمونڈے تھے جس پر زوری بے ساختہ ہنسی سے مسکرائی تھی۔

”کبھی وہ بھی نہیں سکتا کہ اس کے پاس سیل نہ ہو، سیل اس کے پاس تھا، اس کے ہاتھ میں تھا، پھر بھی اس نے کالی ریسیو نہیں کی، اس نے میرے گئے میری ہی کالی ریسیو نہیں کی، ”ظہر انداز محمدی“ اس کے سیل پہ دائیویشن ہوئی رہی اور وہ دھتکارا، ”میری رتوب کا تماشا دیکھتا رہا۔“ زری باک اک بات یوں عارضی بھی جیسے وہ اس کے سامنے کھڑی رہی، ”میری یا پھر اسے الہام ہوا ہو،“ ایسے عالم میں اگر دل اور شاہد اس کی باتیں سن لیتا تو یقیناً ”ششدر رہ جاتا“ اس کی باتیں اور اس کی عادتیں تو وہ ایسے جانتی بھی جیسے اس کے اندر دستی بھی اور ہمد وقت اس کے ساتھ رہتی تھیں۔

”لیکن ڈری! اسے بھلا کیا پرالم تمہی کال ریسیو کرنے میں؟“
 ”پرالم تمہی بھابھی پرالم ہی تو تمہی! آپ نہیں سمجھتیں کی اس باموت شخص کی پراہلہز کس۔“ اس نے دکھ سے کہتے ہوئے سر جھٹکا تھا۔

”مکرم زری! تم غواخواہ اپنا ہی، چار ہی، دو ٹول اور بھائی تمہارے ہی ہیں اور تمہارے ہی رہیں گے“ نکارش

حوصلہ نہیں کرتے دیتی تھی زری بے تحاشا روئے کے بعد رائیگ چیمبر گرنے کے سے انداز میں بڑھے کئی تھی لیکن اچانک بجنے والے اس کے میل نے اسے بری طرح چونکا دیا تھا کانٹوں نے لپک کے اس کا میل بیڈ سے اٹھایا تھا اور اس کا چہرہ یکدم کھل اٹھا تھا۔

”زری! بھول آئی کی کل ہے۔“ نگارش نے چمکتے ہوئے پرچہ پیش سے انداز میں کھینچا اور زری نے ہنسکی ہنسکی آنکھوں سے بے یقینی سے دیکھا تھا لیکن نگارش نے اسے پیش کی کل آن کر کے مہربان زری کے کان سے لگا دیا تھا۔

”السلام علیکم۔“ زری نے بمثل اپنے آپ کو کیوں دیا تھا۔

”وینکم السلام ایسی ہو گیا۔“ بتول شاہکار سکونِ نغمہ راہِ العجہ اور محبتِ بھری آواز سنا دی تھی۔

”جی ٹھیک ہوں میں۔“ زورق اوروں کتنی بھی تو لیا۔؟

”اے اچھا! تو تم نے بھی میرے دل کی طرح جھوٹ بولنا سیکھ لیا ہے۔“ ان کی بات پہ زری کا دل زور سے دھڑکا تھا کہ انہیں میرے حال میری کنڈیشن کا کیسے پتا چلا ہے۔“

”ایم سوری آئی! میں آپ کی بات سمجھی نہیں۔“

”وہ بھی یوں کہتا ہے کہ لالہ نکہ بات پل میں سمجھ جاتا ہے۔ پھر بھی کہتا ہے کہ میں سمجھا نہیں۔“ بترل شاہوڑا مسکراتے ہوئے کہتا ہے۔

”آپ کون کی بات کر رہی ہیں۔؟“ زمری نے انجان بننے ہوئے کہا۔ ”۴۰ سی کی جس سے تم بات کرتا“ چاہ ”رہی تھیں جس کو تم نے دس بار کر لیا ہے دس بار ضرب لگائی ہے تم نے۔“ جہول شاہ کی بات سن کر زمری دھچک سے رو گئی اس کے ہاتھ سے سیل فون چھوٹے چھوٹے پھاٹکا اسے یہ جان کر حیرت ہوئی تھی کہ دل اور شاہ نے اپنی اہل مال کو ایسے بنا دیا۔؟

”بیٹا! اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں ہے، وہ مجھ سے اپنی کوئی بات نہیں چھپاتا، میں اس کی ماں ہی نہیں ہمارا
بھی ہوں اس کی ہر بات جانتی ہوں، اور یہ بھی جانتی ہوں کہ تم نے کل رات زندگی میں پہلی بار اس کے نمبر پر فون
کیا تھا۔ لیکن وہ من نہیں رکھا، لیکن بیٹا اس کے فون نہ سننے پہ دل برداشتہ مت ہونا، اس کی کوئی مجبوری بھی تو
ہو سکتی ہے۔ وہ تمہاری کال سے بہت ڈر رہا تھا، پریشان تھا کہ گنج زری اپنی چپ کیوں توڑ رہی ہے؟ آخر کیا وجہ
ہے؟ اور یقیناً“ اسی پریشانی میں وہ رات بھر سویا بھی نہیں ہو گا؟“ بتول شاہ بات کر رہی تھیں اور زری کے دل پہ
پیار برس رہی تھی اس کے لیے یہ احساس ہی بڑا دلکش تھا کہ دل اور شاہ نے اسے کسی کے ساتھ نہ ملنے دیا
ہے نا؟ کسی کے سامنے اس کا نام لیا ہے؟ اس کا ذکر کیا ہے؟ کال بے شک نہیں سنی مگر کال پریشان تو رہا ہے؟
رات بھر سویا نہیں نیاک کر چھتے سوچا تو ہے نا۔؟ وہ بے ساختہ پلکیں موند کر رہی تھی اس میں تشکر کا احساس لیے خدا
کے حضور جھک گئی تھی دل سجدے سے سجدہ کر رہا تھا۔۔۔ روح شانت ہو چکی تھی۔

لئے کے بازو میں جسے میں اس کے چہرے پر بکھرے والے سکون اور اطمینان کے رنگ نگارش کی نظروں سے چٹنی نہیں رہ سکے تھے نگارش اس کے قریب آئی اور ذری نے شدت جذبات اور خوشی کے احساس سے مغلوب ہوتے ہوئے نگارش کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں قلم لیا تھا!

”تمہارا کسٹن کب آ رہی ہو؟“ ہنول شاہین نے ذرا ٹھہر کر سوال کیا۔

"ٹیکسٹ مٹھے سے میٹر فاسٹل ایگزامز سٹارٹ ہو رہے ہیں، مہینہ یا پھر دو مہینہ لگ جائے گا میری دلچسپی کو۔"

”اچھی بات ہے جلدی سے آجاؤ میں بھی اپنی بیٹی سے ملنا چاہتی ہوں۔“

”جی ضرور کہیں نہیں۔“ زری سے کوئی بات ہی نہیں ہو رہی تھی۔

”نگارش کیسی ہے۔“

”جی نگارش بھانسی بھی ٹھیک ہیں میرے پاس ہی ہیں۔“

”ارے واہ! بات کرو اور میری۔“ انہوں نے خوشی کا اظہار کیا تھا اور زری نے اللہ حافظ کہتے ہوئے فون نگارش کو تھما دیا تھا۔

”السلام علیکم آئی۔“

”وعلیکم السلام“ جی ربو کیسی ہو؟“

”جی اللہ کا احسان ہے ٹھیک ٹھاک ہوں۔“

”بیٹا پاکستان کا پکڑنا تو تم لوگ کیا اٹکھنڈ کے ہی ہو کے رہ گئے ہو۔“

”اے اللہ! یہ سب جلد ہم لوگ پاکستان آجیں گے۔“

عبداللہ خود بھی کہہ رہے تھے کتنی عزم ہو گیا ہے اور اب تو مل کی طرح نیل بھائی بھی پلے گئے ہیں۔ عبداللہ بہت اکیلا لگتا تھا جیسے اپنے آپ کو۔

”اکیلا بندہ اکیلا ہی ٹیل کرتے گا۔“

”بس جلد سے آجاؤ۔“

”ضرور آئیں گے آئی“ آپ دعا کیجئے بس کچھ پریشانیاں ہیں اللہ کرے کہ یہ پریشانیاں دور ہو جائیں۔“

”اے اللہ! اللہ اللہ کرم کرے گا۔“ بھول شاہ نے تسلی دی اور پھر کافی دیر نگارش کے ساتھ باتوں میں مصروف رہی تھیں۔ اور جیسے ہی فون بند ہوا۔ نگارش زری پر چڑھ دوڑی تھی۔

”اب بواو مجھ پر کیا کہا تھا میں نے؟ کب سے سمجھا رہی ہوں تسلیاں دے رہی ہوں، لیکن تم ہو کہ پاگل ہیں کی حد کر ڈالی تھی“ تڑپ تڑپ کر میرا کالج بھی تڑپا ڈالا تھا۔ تھوڑی دیر اور تو مل آئی کا فون نہ آتا تو میں خود رونے لگتی۔

”نگارش نے اسے چیت رسید کرتے ہوئے کیا اور زری کھکھلائی ہوئی، ہنسی ہوئی مسوری ہو رہی تھی۔“

”بس بھانسی اس نے مجھے نظر انداز بھی تو ایسے ہی کیا تھا کہ میرے دل میں اک بات کا خوف پیدا کیا تھا۔“

”کس بات کا خوف۔“ نگارش نے ٹھٹھک کے پوچھا۔

”بقول شاعر۔“

جسے اپنا یار کہتا اسے چھوڑنا بہنور میں

یہ حدیث دلبراں ہے یہ کمال دلبری ہے

زری نے شعر کہتے ہوئے نگارش کو دیکھا۔

”بس اسی بات سے ڈر گئی تھی کہ میرا دلبر بھی مجھے بہنور میں چھوڑ دے گا۔“

”ہو نہ! بھانسی کئی تمہاری شاعری سرور کر ڈالا ہے۔“ نگارش اسے سمجھنے کے کشن مارتی ہوئی باہر نکل گئی تھی اور زری ایک بار پھر کھکھلائی تھی اور سرشار سی رائیگ تیرپہ جھولنے لگی، ہونٹ بوجھ ہی مسکراتے تھے۔

”ہی! کہاں جا رہی ہیں آپ۔“ لڑکھائی کے دورہ اڑے کی سمت بڑھ رہی تھیں کہ پیچھے سے وانیال کی آواز

پہلے کرن 52

سنائی دی۔ عائشہ آنندی کے قدم ٹھہر گئے تھے۔

”حوالی کی طرف۔“

”کیوں؟“

”ارے! کیوں کا کیا مطلب ہے۔“

”کیوں کا مطلب ہے کہ آپ کی اپنی طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو پھر کیوں جا رہی ہیں آپ؟“ وانیال عشاء کی نماز پڑھ کے آیا تھا اور ابھی بچن سے اپنی بی کر نکلا تھا اب ان کو نہیں باہر جاتے دیکھ کر رک گیا تھا۔

”میری طبیعت کتنی بہتر ہے ایک ہی جگہ رہ رہ کر داغ بھی ٹھٹھک گیا ہے اور جسم بھی بے شک بھی باری باری میرے پاس آتے رہتے ہیں لیکن میں تو ایک ہی جگہ کی ہو کر رہ گئی ہوں۔“ وانیال دیکھتے سے کہہ رہی تھیں اور وانیال ان کی بات پر اتفاق کرتے ہوئے سراباٹ میں بلائے۔ مجبور ہو گیا تھا۔

”ہوں! ٹھٹھک کہہ رہی ہیں آپ جانا چاہیے آپ کو انوشہ کہاں ہے؟“

”انوشہ بھی ہیں، وہ کیوں کہیں گی۔“

”تو پھر میں اکیلا کھڑا کیا کروں گا“ خلیے میں بھی چلتا ہوں۔“ وہ تعجب سے کہتا ہوا ان کے ساتھ دھلیا اور عائشہ آنندی بے ساختہ اس کی بات پر مسکرا اٹھی تھیں۔

اور وہ دو قبل ماں بیٹا ایک ساتھ حویلی میں داخل ہوئے تھے ڈرائنگ روم میں قدم رکھا ہی تھا کہ سہی

میں چٹک اٹھے تھے۔

کوئل اور آنندی ان کے بڑے بھتیجی اور بھتیجی تھے اور وہی دونوں سب سے زیادہ خوش ہو کر ان کی طرف آئے تھے اور دونوں ہی اپنی اس بے ساختگی پر بل بھر کے لیے ٹھٹھک سے گئے۔ کوئل نے آنڈ کو دیکھ کر چہرہ بھکایا تھا جبکہ آنڈ نے آگے بڑھ کے عائشہ پھوپھو کا بازو تھام لیا تھا۔

”کیے پھوپھو یہاں بیٹھے۔“ آنڈ نے اپنی جگہ پیش کی تھی اور وہ زری سے مسکراتے ہوئے بیٹھ گئی تھیں۔

ادارہ خواجہ حسین ڈائجسٹ کی طرف سے پیش کردہ ناول

☆ قیمت: 450 روپے

☆ قیمت: 500 روپے

☆ قیمت: 400 روپے

☆ قیمت: 250 روپے

☆ قیمت: 550 روپے

☆ ستاروں کا آنگن، نسیم سحر قریشی

☆ درد کی منزل، رضیہ جمیل

☆ اے وقت گواہی دے، راحت جبین

☆ تیرے نام کی شہرت، شازیہ چودھری

☆ امرنیل، عمیرہ احمد

تلفون: 32216367، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216367

پہلے کرن 53

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شاندار پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں۔

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں ایڈیڈنگ
- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریریٹیو مائیل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود سب او کی چیٹنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ دیب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ عمران میریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
- ☆ ایڈ فرنی لکس، لکس کو میس کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واعدویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورم سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

قرآن مجید کی ہر آیت اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی دینی مسموعات میں احسان اور تخلیق کے لیے بنائی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہذا انہیں "محرمات" پر آیات و روایات میں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے غرضی سے منظر رکھیں۔

"کیا بات ہے، بھیجی، آج کیا محفل لگا رکھی ہے؟" انہوں نے آواز سے پوچھا تھا جو اس ایک پارٹی میں ذرا کم ہی نظر آتا تھا اس کا زیادہ تر وقت کاروباری سلسلوں میں گزرتا تھا، گھر پر دو تائب بھی دو قار آتندی، اسرار آتندی اور اظہار آتندی کے ساتھ ہی کچھ نہ کچھ ڈسکس کرنے میں مصروف نظر آتا تھا۔

"بھئی بھئی! دراصل یہ محفل میں نے نہیں لگائی بلکہ لگوائی تھی ہے اور اس میں سب سے زیادہ ہاتھ ہماری اس شرارتی ملی کا ہے۔" آواز نے قالین پر بیٹھی انوشہ کے سر پر ہلکی سی چست لگائی تھی۔

"اچھا؟ وہ کیسے؟" انہیں اور وانیال کو حیرت بھی ہوئی تھی اور دھچکی بھی۔ "وہ ایسے کہ میں اپنے عشاء کی نماز پڑھ کے اپنے بندروں میں سونے کے لیے جا رہا تھا جب یہ مجھے میزاجیوں سے پکڑ لائی ہے اور اپنی بات منوانے کی خمد کر رہی ہے مگر اس کی بات ماننا ذرا مشکل کام ہے اس لیے میں فیصلہ نہیں کیا کہ کیا کروں اور کیا نہیں۔"

آواز اپنی پھوپھی زانو کرن الوش کو دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا جو معصوم اور مسکین سی صورت بنائے بیٹھی تھی۔ "کیسی بات؟ کیسی خمد اور کیا فیصلہ؟" عائشہ آتندی کو تجسس ہوا تھا کہ ان کی بیٹی ان کے نتیجے سے کیا منانا چاہ رہی ہے، بھئی بھئی اتنے لوگوں کے ساتھ مل کر۔

"آواز بیٹی! میں آواز فیر آپ ہمارا پلان لیک آؤٹ کر رہے ہیں۔" آوش خفگی سے منہ ہٹا کر بولی تھی۔ "دیکھو! اس پلان کو تم لوگوں نے سیکرٹ رکھنا ہے۔" آواز کو حیرانی ہوئی۔

"نہیں سیکرٹ تو نہیں رکھنا، لیکن پہلے آپ کی اجازت تو مل جائے" پہلے آپ تو مان جائیں گے۔ "کام بہت مشکل ہے میرا ماننا آسان نہیں ہے میں سمجھ لوئیے ایک رسک ہے اور میں اگلا اتنی عوام کا رسک نہیں لے سکتا۔" آواز نے عوام کہتے ہوئے لڑکیوں کی سمت اشارہ کیا تھا جس پر وانیال اور اچھے مسکرا دیے تھے۔ "تو آپ وانیال بھائی کو اور اچھے بھائی کو اپنے ساتھ شامل کر لیں۔"

انوشہ بھرپور طریقے سے تیس لڑکیوں تھی۔ ساری لڑکیوں نے مل کر اس کی ہمت اور حوصلے کی داد دی تھی۔ "اوکے! میں اگر اجازت دے بھی دیتا ہوں تو ڈیڈ سے اجازت کون لے گا۔" آواز نے دوسرے ہماڑ کا ذکر کیا جس کو سر کرنا واقعی سب کے لیے مشکل تھا۔

"ان سے صرف وہی لوگ اجازت لے سکتے ہیں۔" آوشہ نے فوراً کہا۔ "ایک آپ اور ایک علیزبے۔" اس نے خود کی سمت اشارہ کیا تھا لیکن اس کی بات پر کول نے چونک کر دیکھا تھا! اس کے چہرے پر جو رنگ اچھا تھا، خود کی آنکھوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکا تھا اور آواز یہ رنگ دیکھ کر حیرت زدہ سا رہ گیا تھا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

بھی ہارنا نہیں سیکھا اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔

۱۲
چودھویں قسط

نبیلہ عجزیہ

دکھلا

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت بہت ہی متاثر ہے۔

مدھیہ اور نبیلہ حیات دہی بہن بھائی ہیں مدھیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے وہ انگلنڈ کی رنگینیوں میں کھوپہ رنگ چکی ہے جس کے پیش نظر فائزہ بیگم نبیلہ کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں لیکن مدھیہ پاکستان جا سے انکار کر دیتی ہے جس پہ نبیلہ اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا بے بسی مجبوری سے تنگ آخر خود کشی کرنے کا سوچتا ہے لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باؤ امتیاز جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔ منصور حسین ایک غریب اور میسرک پاس آدمی ہے وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکرائے مانگے آتا ہے وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوس سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے وہ اپنے قول و فعل کا بہت یکا آدمی ہے اس



کومل کے چہرے پہ اک واضح ناگواری تھی جو کسی اور کو تو نہ سہی لیکن آذر کو بڑی شدت سے محسوس ہوئی جس کی وجہ سے وہ اتنے سارے لوگوں کی موجودگی کے باوجود ڈائریکٹ کومل کے چہرے کی سمت دیکھنے پہ مجبور ہوا تھا اور دوسری طرف کومل بھی اپنے چہرے پہ اس کی نظروں کی تپش اور اک الجھی ہوئی کھوج محسوس کر چکی تھی ذرا سا پہلو بدل کر چہرے کا رخ موڑ لیا۔ لیکن آذر نے اپنی نظروں کا پہلو پھر بھی نہیں بدلا۔

”آذر۔۔۔“ دانیال نے اسے ٹوکا دیا۔
”ہوں۔۔۔؟“ وہ بڑے الجھے ہوئے انداز میں متوجہ ہوا کیونکہ وہ ہنوز کومل کی سمت ہی دیکھ رہا تھا۔
”انوشہ تم سے کچھ کہہ رہی تھی شاید۔۔۔؟“ دانیال نے اسے یاد دلایا۔

”ہوں! سن رہا ہوں اور سب دیکھ بھی رہا ہوں مگر سمجھ نہیں پا رہا۔“ آذر کا لہجہ پرسوج اور مبہم سا تھا اس دوبارہ اک اچھتی سی نظر کومل پہ ڈالی وہ اپنے قریب بیٹھی حرمت اور انہی کی سمت متوجہ ہو چکی تھی۔
”کیا مطلب ہے آپ کا۔۔۔ کیا سمجھ نہیں پا رہے۔“ انوشہ کو آذر کی بات سمجھ نہیں آئی تھی مگر دانیال نے سمجھ چکا تھا۔

”یہی کہ آپ لوگوں کا پروگرام کینسل ہونا چاہیے یا پھر اوکے؟“ آذر بہت ٹھہر کے بات کر رہا تھا۔
”آذر بھائی پلیز! ہمارا پروگرام اوکے ہونا چاہیے کینسل نہیں ملے گی تو آپ کے سامنے یہ عدالت لگا رہے پلیز کچھ رحم کریں فیصلہ ہمارے حق میں ہونا چاہیے۔“ انوشہ انتہائی لجاجت سے بولی۔
”تو پھر میرا خیال ہے کہ آپ لوگوں کو یہ کام علیزے سے کہنا چاہیے ڈیڈ مجھے تو انکار کر سکتے ہیں لیکن علیزے کو نہیں۔“ آذر نے کومل کے چہرے کے تاثرات دوبارہ جانچنے کے لیے جان بوجھ کر علیزے کا نام لیا لیکن اس بار شاید وہ اسے تاثرات کنٹرول کر چکی تھی اس کا چہرہ نارمل تھا۔

”علیزے سے؟“ لیکن وہ تو سوچ چکی ہوگی؟“ انوشہ نے وال کلاک دیکھا پونے بارہ بجے کا ٹائم ہو رہا تھا علیزے تو عشاء کی نماز پڑھنے کے فوراً بعد ہی سونے کے لیے چلی جاتی تھی۔
”تو کوئی بات نہیں صبح کا انتظار کر لو صبح بات کر لیتا۔“ آذر نے کندھے اچکائے۔
”علیزے جاگ رہی ہے۔“ زین نے اندر داخل ہوتے ہوئے گڈ نیوز سنائی۔
”ج۔۔۔؟“ انوشہ چمکی تھی۔

”ج۔۔۔“ زین نے بھی اسی کے۔ انداز میں جواب دیا تھا۔
”مگر تمہیں کیسے پتا کہ علیزے جاگ رہی ہے۔۔۔؟“ انوشہ کو ایک اور سوال سوچا تھا۔
”علیزے کی لاڈلی رچوا بھی ابھی اس کے بیڈ روم سے نکلتی ہوئی دکھائی دی ہے جس کا مطلب ہے کہ شہزاد علیزے اپنی خواب گاہ میں ابھی جاگ رہی ہیں آپ نے اپنی کوئی عرضی پیش کرنی ہو تو کر سکتی ہیں۔“ زین۔
صوفیہ بیٹھ کے آلتی پالتی مارتے ہوئے شاہانہ انداز میں جواب سے نوازا تھا۔
”ارے واہ! یہ تو کمال ہو گیا آج تو علیزے بھی جاگ رہی ہے۔۔۔؟“ احمد مسکرا کر بولا۔

”میں ابھی علیزے کو بلا کے لاتی ہوں۔۔۔“ انوشہ فوراً اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی اور وہ سب انوشہ کی پھرتی ہنس پڑے تھے اب تو عائشہ آفندی کی طرح آذر اور دانیال بھی سارا تماشائی بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ تھوڑا دیر بعد انوشہ علیزے کا ہاتھ پکڑے اسے اپنے ساتھ لیے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔

”عائشہ پھوپھو کیسی ہیں آپ؟“ علیزے سب کو سلام کرنے کے بعد سیدھی عائشہ آفندی کے پاس آئی تھی۔
”اللہ کا شکر ہے بیٹا میں بالکل ٹھیک ہوں تم سناؤ کیسی ہو؟“ انہوں نے نرمی اور شفقت سے کہتے ہوئے اسے ہاتھ پکڑ کے اسے اپنے پاس ہی بٹھالیا۔

”میں بھی ٹھیک ہوں“ بس سونے کی تیاری کر رہی تھی کہ انوشہ آپی نے بلا لیا۔ ”علیزے ان سب لوگوں کو اک نظر دیکھتے ہوئے آہستہ سے بولی۔

”تمہاری انوشہ آپی نے تمہیں کسی کام کے لیے بلایا ہے۔“ عائشہ آفندی مسکرا کے بولیں۔
”کسی کام کے لیے۔۔۔؟“ علیزے نے سوالیہ نظروں سے انوشہ کی سمت دیکھا۔
”جی ہاں! کام کے لیے بلایا ہے کیونکہ یہ کام تمہارے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا۔“ انوشہ نے تمہید باندھی۔
”کیسا کام۔۔۔؟“ علیزے کو حیرانی ہوئی۔

”ارے ڈیر! کوئی ایسا ویسا کام نہیں ہے بس یوں سمجھ لو کہ اب وہاں تبدیل کرنے کا کام ہے۔“ احمد نے بھی مداخلت کی۔

”کیا مطلب۔۔۔؟ میں سمجھی نہیں۔“ علیزے ان کی پسیلیاں نہیں بوجھ سکتی تھی۔
”مطلب کہ ان سب لوگوں کا گھومنے پھرنے کا پروگرام ہے۔“ آذر نے اس کی مشکل آسان کی تھی۔
”اوہ اچھا۔۔۔ تو اس میں مشکل کیا ہے؟“ وہ حیرت سے پوچھ رہی تھی۔

”مشکل یہ ہے کہ ان کا پروگرام مری اور اسلام آباد گھومنے کا ہے لاہور کی سڑکوں سے نکل کر اسلام آباد کی سڑکوں پہ پھرنا چاہتے ہیں۔“ آذر نے مزید اطلاع پہنچائی تھی جس پہ علیزے کو بھی اچنبھا ہوا تھا۔
”ری۔۔۔؟“

”آف کورس یار! اگر تم ساتھ دے دو تو؟“ انوشہ کو خود میدان میں اترنا پڑا تھا۔
”میں ساتھ دے دوں۔۔۔؟ وہ کیسے۔۔۔؟“ اس نے نا سمجھی سے پوچھا۔
”ڈیڈ سے اجازت لے کر۔“ انوشہ نے مدعا بیان کیا۔
”اوہ! تو یہ کام ہے؟“ علیزے نے سر ہلایا۔

”ہاں یار! یہی کام ہے اور یہی سب سے مشکل کام ہے جو صرف تم کر سکتی ہو۔“
”ہوں! وہ تو ٹھیک ہے لیکن۔۔۔“ علیزے چپ ہو گئی۔
”لیکن کیا۔۔۔؟“ انوشہ بے صبری سے بولی۔
”لیکن اگر پاپا نہ مانے تو؟“ اس نے انکار کا خدشہ ظاہر کیا۔

”یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ تم کوئی کام کہو اور وہ انکار کریں۔“ انوشہ کو کامل یقین تھا کہ وہ مان جائیں گے۔
”تو پھر آذر بھائی سے کہیں کہ وہ پاپا سے اجازت لینے میں میرا ساتھ دیں وہ میرے ساتھ چلیں۔“ علیزے نے معصومیت اور سادگی سے کہا تھا لیکن ذرا فاصلے پہ بیٹھی کومل نے سانپ کی طرف پھنکار کے سر اٹھایا تھا اس کی نظروں میں کسی تلوار کی سی کاٹ تھی۔

”ارے ہاں! یہ بھی اچھا آئیڈیا ہے آپ لوگوں کو ڈیڈ سے ایک ساتھ اجازت مانگنی چاہیے وہ آپ دونوں کو انکار نہیں کریں گے آذر بھائی پلیز انھیں جائیں ورنہ ڈیڈ سو جائیں گے۔“ انوشہ ہر طرف بس جلدی ہی مچا رہی تھی۔
”تو اچھا ہے نا صبح بات کریں گے۔ ڈیڈ کا موڈ بھی فریش ہو گا۔“ آذر نے اسے روکنا چاہا۔

”نہیں صبح نہیں ابھی بات کریں۔“ وہ ضد پر اڑی ہوئی تھی اور اس کی ضد سے مجبور ہو کے آذر کو بالا خراٹھنا ہی پڑا تھا انوشہ بھی آج اس کی نرمی کا بھرپور فائدہ اٹھا رہی تھی اور آذر بھی اسے اس لیے انکار نہیں کر پایا تھا کہ وہ اس کی اگلی پھوپھو کی اگلی بیٹی تھی اور اس نے آج تک ان سے کچھ بھی نہیں مانگا تھا آج بھی نجانے کس موڈ میں تھی کہ یہ انوکھی فرمائش کر بیٹھی تھی۔ اور آذر سے انکار کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

”چلو علیزے تم بھی ساتھ جاؤ اور سنو اجازت لے کر ہی آنا۔“ اس نے علیزے کو آذر کے ساتھ بھیجا اور۔

ساتھ ساتھ تاکید کرنا بھی ضروری سمجھا تھا وہ دونوں ایک ساتھ ڈرائنگ روم سے نکلے تھے لیکن باقی لڑکیوں کے ساتھ بیٹھی کوئل نے ڈرائنگ روم سے باہر نکلتے آذر اور علیزے کو کافی تیز اور سلگتی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا اس کے دل میں رقابت کی چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا سے کیا کر ڈالے۔

”کوئل! کیا دیکھ رہی ہو؟“ حرمت نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے متوجہ کیا تھا وہ یکدم چونک اٹھی تھی۔

”کچھ نہیں۔۔۔“ وہ مختصر سا جواب دیتی اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

”کہاں جا رہی ہو؟“ حرمت نے دوبارہ استفسار کیا۔

”میرا سر درد کر رہا ہے“ اپنے بیڈ روم میں جا رہی ہوں۔“ وہ اپنی کپٹی سہلاتے ہوئے بڑے ضبط سے کہتی وہاں سے چلی گئی اور حرمت پیچھے دیکھتی رہ گئی کیونکہ اتنے لوگوں کی موجودگی میں وہ اسے اصرار کر کے روک بھی نہیں سکتی تھی اور نہ ہی اسے سمجھا سکتی تھی اس کا موڈ پہلے ہی خراب تھا غصے میں کچھ بول دیتی تو خواہ مخواہ تماشیاں جاتا جیسی مجبوراً حرمت کو چپ ہو کے بیٹھنا پڑا تاکہ وہاں موجود اور لوگوں کو بھی کوئل کے رویے کی خبر نہ ہو۔ لیکن حرمت یہ نہیں جانتی تھی کہ دانیال بھی سب کچھ جانتا ہے اور اس وقت کوئل کی تمام حرکتیں نوٹ کر رہا ہے بالکل اسی طرح جس طرح حرمت کرتی تھی۔

”ایلیز! ان جائیں نا۔“ علیزے نے التجائیہ انداز میں دہائی دی تھی۔

”دیکھو بیٹا! میں نے ان لوگوں کو اجازت دے دی ہے کیا یہ کافی نہیں ہے۔!“ وقار آفندی کافی سنجیدگی سے پوچھ رہے تھے۔

”تو پھر مجھے اجازت کیوں نہیں دے رہے آپ؟“

”بس تمہارے لیے کوئی اجازت نہیں ہے تم گھر میں ہی ٹھیک ہو۔“ وہ دونوں لہجے میں بولے۔

”کیوں؟ میرے لیے اجازت کیوں نہیں ہے؟ میں بھی گھر سے نکلتا چاہتی ہوں گھومنا پھرنا چاہتی ہوں سب لڑکیوں کی طرح انجوائے کرنا چاہتی ہوں“ ایلیز۔ ”پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ علیزے کی چیز پر ضد کر رہی تھی اور وقار آفندی مان نہیں رہے تھے حالانکہ علیزے کے ایک بار کہنے پہ انہوں نے سب کو جانے کی اجازت دے دی تھی سوائے علیزے کو۔

”دیکھو بیٹا! تم اتنا طویل سفر کرو گی تو تھک جاؤ گی دوسرے وہاں کا موسم بھی تمہیں سوٹ نہیں کرے گا اور سب سے اہم بات کہ میں تمہیں اپنی آنکھوں سے دور بھیجنے کا رسک نہیں لے سکتا جب تک تم گھر سے باہر ہو گی مجھے بے چینی ہوتی رہے گی مری کے پہاڑ کھائی اور دشوار ترین راستے اف توبہ میں تمہیں وہاں بھیجنے کا بھی سوچ بھی نہیں سکتا۔ ہرگز نہیں۔“ وہ سختی سے کہتے ہوئے نفی میں گردن ہلا رہے تھے علیزے نے رد ہانے انداز میں آذر کی سمت دیکھا وہ خاموشی اور دلچسپی سے دونوں باپ بیٹی کی بحث و تکرار سن رہا تھا لیکن علیزے کی گولڈن براؤن کانچ سی آنکھوں میں تیرتے شفاف پانیوں کو دیکھ کر اس کے دل کو کچھ ہوا وہ فوراً سیدھا ہو بیٹھا۔

”دیکھیے ڈیڈ! اگر علیزے نہیں جائے گی تو ہم بھی نہیں جائیں گے۔“ آذر نے ایک دم سے فیصلہ سنایا تھا۔

”یہ کیا کہہ رہے ہو تم۔۔۔؟“ وقار آفندی آذر کو علیزے کے حق میں بولتے دیکھ کر خفگی سے گویا ہوئے۔

”تو اور کیا کہوں۔۔۔؟ ہم سب چلے گئے تو وہ اکیلی پیچھے کیا کرے گی۔“ آذر کی بات پہ علیزے کو دھارس بندھ گئی تھی کہ چلو کوئی تو ہے میرا ساتھ دینے کے لیے۔

”تو یہ وہاں جا کر بھلا کیا کرے گی۔“ وہ ہنوز خفگی سے پوچھ رہے تھے۔

162

”نئے لوگ“ نئے شہر نئی جگہیں دیکھے گی گھومے پھرے گی باقی سب کی طرح انجوائے کرے گی اور بھلا کیا کرنا ہے اس نے؟“ آذر نے اس کی بھرپور حمایت کی تھی۔

”لیکن آذر تم جانتے ہو کہ۔۔۔“

”ڈونٹ وری ڈیڈ! کچھ نہیں ہو گا ہم سب ہیں نا ساتھ اس کی ذمہ داری آپ مجھے سونپ دیں جیسے لے کر جاؤں گا ویسے لے کر بھی آؤں گا یہ صرف آپ کی ہی علیزے نہیں ہے ہماری بھی ہے، جتنی فکر آپ کو ہوتی ہے اتنی ہمیں بھی ہوتی ہے اسی لیے آپ کو پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے میں آپ کو گارنٹی دیتا ہوں کہ میں علیزے کو آج بھی نہیں آتے دوں گا۔“ آذر نے وقار آفندی کو کچھ بھی کہنے کی گنجائش نہیں چھوڑی تھی

”چپ سے ہو گئے تھے۔“

آذر ڈرائنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی آسیہ آفندی اپنے ہاتھوں سے سونے کی چوڑیاں اتارتے ہوئے ان لوگوں کی سمت دیکھ کر مسکرا رہی تھیں کیونکہ وقار آفندی ابھی بھی اجازت دینے سے پہلے تذبذب کا شکار تھے جبکہ آذر انہیں اجازت طلب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”ڈیڈ! کیا خیال ہے آپ کا۔۔۔؟“ اس نے انہیں سوچوں سے نکالا آسیہ آفندی اور علیزے مسکراہٹ دبا گئی تھیں۔

”ٹھیک ہے! یہ بھی جاسکتی ہے لیکن۔۔۔“ انہوں نے دل پہ پتھر رکھتے ہوئے بالا خراسے بھی اجازت دے دی تھی۔

”لیکن کیا۔۔۔؟“ آذر نے ان کی ادھوری بات پر استفسار کیا۔

”کچھ نہیں بعد میں بتاؤں گا ابھی تم لوگ جا کر آرام کرو۔“ وہ سر جھٹکتے ہوئے بولے تھے۔

”ٹھیک ہے ڈیڈ! تھینک یو سوچ۔“ آذر فوراً صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اس کے ساتھ ہی علیزے بھی کھڑی ہو گئی تھی۔

”گڈ نائٹ پاپا! گڈ نائٹ ماما۔“ وہ ان دونوں سے مل کر آذر کے ساتھ ہی باہر نکل آئی تھی اور جیسے ہی وہ دونوں واپس ڈرائنگ روم میں پہنچے وہاں یکدم ہی اک پچھل سی گج گئی تھی سب کا جوش عروج پہ تھا۔

وہ بڑے بڑے سرخ رنگے پایوں والی مضبوط نواڑی چارپائی پہ اونٹھے منہ لیٹا کافی گہری نیند سو رہا تھا جب باہر کو اڑنے کے دروازے پہ زور دار دستک ہوئی اور نیند گہری ہونے کی وجہ سے پہلے تو اسے سمجھ ہی نہیں آیا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ اور یہ دستک کی آواز کہاں سے آرہی ہے۔ لیکن چند سیکنڈ نیند سے بے وار ہوتے ذہن پہ زور ڈال کے سوچا تو اور آگ ہوا کہ وہ بڑی حویلی کے سروٹ کو اڑنے میں محو خواب ہے اور جیسے ہی اس کا ذہن اور اعصاب ٹھکانے پہ آئے تو اسے فوراً ہی اپنی کوتاہی کا احساس ہو گیا تھا کہ وہ ڈیوٹی سے لیٹ ہو چکا ہے، جیسی تو وہ یکدم ترپ کے اٹھ بیٹھا تھا ادھ کھلی کھڑکی اور دروازے کے نیچے سے روشنی اپنا رستہ بنائے اندر چلی آرہی تھی جس کا مطلب تھا کہ باہر سورج پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا اور ٹائم بھی کافی زیادہ ہو چکا تھا جس پہ منصور حسین کو پورا یقین تھا کہ مبارک خان اس کی کلاس لینے کے لیے آیا ہے اور اس طرح دھڑ دھڑ دروازہ بجارہا ہے لہذا منصور حسین نے اک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر باہر نکلنے کے لیے کوارٹر کا دروازہ کھول دیا۔ لیکن مبارک خان کی بجائے شہزادی علیزے کی خادمہ کو دیکھ کر اس کے واپس مڑتے قدم ٹھم گئے تھے۔

”السلام علیکم۔“ رجو نے بڑی تمیز سے سلام کیا تھا۔

163

”وعلیکم السلام۔۔۔! فرمائیے کیا پیغام لائی ہیں آپ؟“ منصور حسین نے کافی ٹھہرے ہوئے اور پرسکون دریافت کیا تھا۔

”اندر آجاؤں؟“ رجو اس کے کوارٹر کے دروازے سے باہر کھڑی اندر آنے کی اجازت طلب کر رہی تھی۔

”نہیں۔“ منصور حسین نے جواباً ”انکار کر دیا تھا“ دو ٹوک اور کھرا انکار۔

”کیوں منصور حسین؟ میں اندر کیوں نہیں آسکتی؟“ رجو نے خفگی سے پوچھا تھا۔

”کیونکہ میں تمہیں اندر بلا کر مشکوک نہیں ہونا چاہتا، اس لیے جس کام سے آئی ہو، وہ کام پتاؤ۔“

حسین کے انداز میں کوئی چٹک اور کوئی نرمی نہیں تھی رجو کو تو وہ اس اکھڑے انداز میں بھی دل کو لگ رہا تھا۔

”تمہارے ماتھے پہ بل جتے ہیں شاید اسی لیے ماتھے پہ بل ڈال کے بات کرتے ہو؟“ وہ پھر بھی اسے م سے باز نہیں آئی تھی۔

”مطلب کی بات کرو بی بی، کیوں آئی ہو؟“ منصور حسین ایسی باتوں میں آنے والا نہیں تھا لیکن رجو تو اس مٹی تھی۔

”مطلب کی بات ہی تو کر رہی ہوں منصور حسین، پر تم آنکھ ہی نہیں ملارہے؟“ رجو جیسے ناراضی سے بولی۔

”دیکھو بی بی! میں یہاں نوکری کرنے آیا ہوں، کسی سے آنکھیں ملانے نہیں، میں بندہ بڑا کھرا ہوں یا تو کام ہوں یا کام کی بات سنتا ہوں، فضول میں وقت ضائع نہیں کرتا، اس لیے بہتر یہی ہے کہ کام کی بات کرو، کیوں آ رہا ہے؟“ اس نے بھیجا ہے؟

اس نے ایک بار پھر استفسار کیا تھا لیکن رجو صدمے کی سی کیفیت میں کھڑی اس دیکھ رہی تھی کتنا روکھا، کتنا کھوڑا اور کتنا بے مروت ثابت ہوا تھا۔۔۔ اور ایک وہ بھی جو اتنے دنوں سے اسے دیکھ کر ہی خوش اور فدا ہو رہی تھی۔

”اللہ حافظ۔۔۔“ منصور حسین نے فیصلہ کن انداز میں کہتے ہوئے کندھے اچکائے اور دروازہ بند کر ڈالا تھا۔

باہر رجو کی توں کھڑی رہ گئی تھی لیکن بند دروازے کو دیکھ کر اسے دوبارہ کچھ یاد آیا تو دروازے پہ ایک بار پھر وہ دے ڈالی لیکن منصور حسین نے دروازہ کھولنے کی زحمت نہیں کی تھی۔

”تمہیں بڑے صاحب نے بلایا ہے منصور حسین، ان کی بات سنو جا کر۔“ رجو نے مجبوراً ”باہر سے ہی آ دے کر پیغام دیا تھا۔

”کیوں بلایا ہے۔۔۔؟“ اب کی بار اس نے فوراً ”دروازہ کھول دیا تھا وہ کندھے پہ تولیہ رکھے ہوئے تھا یقیناً نہانے کے لیے ہاتھ روم کی سمت جا رہا تھا۔

”ان ہی سے جا کر پوچھ لو۔۔۔“ رجو کہہ کر پلٹ گئی تھی۔

”ہوں! یہ بھی ٹھیک ہے۔“ اس نے پرسوج سے انداز میں کہتے ہوئے سر ہلایا۔ وس منٹ بعد وہ تیار ہو سیدھا وقار آئندی کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔

”سلام صاحب!“

”وعلیکم السلام! منصور حسین کیسے ہو۔۔۔؟“ وہ علیزے کا ملازم تھا اس لیے وقار آئندی اسے ایک الگ پروٹوکول دیتے تھے۔

”اللہ کا کرم ہے صاحب۔“ وہ شکر گزاری سے بولا۔

”کوئی پریشانی کوئی تنگی تو نہیں ہے نا یہاں؟“

”نہیں صاحب! سب ٹھیک چل رہا ہے۔“

”کسی چیز پہ کوئی اعتراض یا پریشانی ہو تو بتا دیتا۔“

”جی ضرور۔“

”گاڑی سروس کروائی تم نے؟“

”نہیں صاحب! ابھی تک تو نہیں کروائی، ایک دوبار مبارک خان اور عارف وغیرہ کے ساتھ مل کر خود ہی گاڑی کو چکالیا تھا۔“ اس نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

”جو کام جس کا ہو اسے ہی اچھا لگتا ہے، نئی گاڑی ہے اسے پر اپر طریقے سے سروس کروانا چاہیے تھا تمہیں۔“

”آپ کہتے ہیں تو آج ہی کروالیتا ہوں۔۔۔؟“ وہ مٹو دب سے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

”ہوں! اس لیے تو تمہیں بلایا ہے کہ تم آج کا دن تمام ضروری کام بنالو، کل تو تم لوگوں نے نکلنا ہو گا۔“ وقار آئندی کافی آرام اور سکون سے بات کر رہے تھے لیکن منصور حسین ان کی بات پہ بری طرح چونک گیا تھا۔

”آج کے دن کام بنالوں؟ کیا مطلب ہے آپ کا۔۔۔؟“ اس نے نا سمجھی سے استفسار کیا تھا۔

”ارے بھئی! میرا مطلب ہے کہ کل جانا ہے آپ لوگوں نے۔“

”کہاں جانا ہے؟“

”مری اور اسلام آباد۔“

”کیوں صاحب؟ خیریت۔“ اس نے ٹھٹھک کے پوچھا تھا۔

”منور حسین! تم بھی شاید پاگل ہی ہو، مری اور اسلام آباد لوگ کیوں جاتے ہیں بھلا۔۔۔؟“

”ہنی مون منانے۔“ منصور حسین کا برکتہ جواب آیا تھا جس پہ وقار آئندی بھی سٹپٹا گئے تھے تب منصور حسین کو بھی احساس ہو گیا۔ کہ وہ بے ساختگی میں کافی غلط بات کہہ گیا ہے۔

”میرا مطلب ہے کہ لوگ تو ہنی مون منانے بھی جاتے ہیں، پکنک منانے بھی جاتے ہیں اور وہ انگلش کا کیا لفظ ہے۔۔۔؟ ہاں وہ کیا کہتے ہیں کہ ہالیدیز بھی منانے جاتے ہیں۔“ منصور حسین نے فوراً ”بات سنبھالی تھی بھی وقار آئندی بھی تھوڑا ریلیکس ہو گئے تھے۔

”ہاں یہ سب بھی ہالیدیز منانے جارہے ہیں، میں نے تو علیزے کو منع کیا تھا لیکن وہ ضد کر رہی تھی اس لیے مجبوراً اسے بھی بھیج رہا ہوں، لیکن تمہاری ذمہ داری پہ۔“ انہوں نے منصور حسین کی سمت اشارہ کیا تھا۔

”میری ذمہ داری پہ۔۔۔؟“

”ہاں! تمہاری ذمہ داری پہ، تمہیں اس کی حفاظت کرنا ہوگی، اس کے آس پاس کڑی نظر رکھو گے اور اس کے آس پاس ہی رہو گے، جو بھی ٹوئس کرو گے فوراً بتا دینا ایسی کسی کوئی براہم بن جائے تو تم اسلحہ بھی استعمال کر سکتے ہو، ریوالتور تو پہلے ہی تمہارے پاس ہے یہ گولیاں بھی رکھ لو، اس میں کچھ اور سامان بھی ہے احتیاط سے رکھنا۔“

وقار آئندی ایک چھوٹا سا بیگ اس کی سمت بڑھا رہے تھے۔

”لیکن صاحب! گاڑی میں یہ سب کیسے جاسکتا ہے۔۔۔؟“

”کچھ نہیں ہو گا، تم بے فکر ہو، علیزے کی گاڑی کو کسی بھی چیک پوسٹ پہ نہیں روکا جائے گا میں نے سارا انتظام کر دیا ہے اور ویسے بھی تمہارے پاس لائسنس بھی تو ہے نا؟ تم کون سا کوئی غیر قانونی چیز لے کر جا رہے ہو۔۔۔؟ یہ سب تو علیزے کی حفاظت کے لیے ہے، تمہارا ریوالتور جو بیس گھنٹے لوڈ ہونا چاہیے، اس معاملے میں ذرا سی کوتاہی بھی معاف نہیں ہوگی۔“ وقار آئندی اس کی برین واشنگ کر رہے تھے اور منصور حسین ہر بات پہ سر ہلا رہا تھا۔

”ابھی تم گاڑی سروس کروا کے آؤ، باقی باتیں تمہیں بعد میں سمجھاتا ہوں۔“ انہوں نے منصور حسین کو جانے دیا۔

کا اشارہ کیا جس پر وہ فوراً کھڑا ہو گیا تھا۔

”جی ہمت۔“

”گڈ! اب تم جاسکتے ہو۔“

”مہربانی صاحب۔“ وہ کہہ کے پلٹ گیا تھا۔

”اور سنو۔“

”جی۔“

”کسی کو یہ پتا نہ چلے کہ تم اسلحے سے لوڈ ہو، خود علیزے کو بھی پتا نہیں چلنا چاہیے۔“ انہوں نے اسے تاکہ کی تھی۔

”جیسے آپ کا حکم۔“ اس نے سر جھکا دیا۔

”اوکے! جاسکتے ہو تم۔“ انہوں نے کہہ کر اخبار اٹھا لیا تھا اور منصور حسین اس مردان خانے سے نکل آیا۔ لیکن وہ ان لوگوں کے اس اچانک پروگرام پر سخت کوفت اور بے زاریت کا شکار ہوا تھا کیونکہ اسے اندازہ تھا کہ اتنے طویل سفر، مسلسل خاموشی اور اتنے گھٹنے لگا مار ڈرائیونگ سے کیا حال ہو گا۔ اور اسی حال کو سوچتے ہوئے اس کا موڈ آف ہو گیا تھا۔

”کہاں جا رہے ہو منصور حسین۔“ مبارک خان اسے گاڑی کی سمت بڑھتے دیکھ کر قریب آ گیا تھا۔

”گاڑی سروس کروانے۔“ اس نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے جواب دیا۔

”اوہ اچھا۔! علیزے بی بی نے مری جانا ہے نا اس لیے۔“ مبارک خان کو شاید پہلے سے پتا تھا اس لیے منصور حسین کے بتانے سے پہلے ہی بول پڑا تھا۔

”جی ہاں! مری جانا ہے اس لیے۔“ اس کا موڈ آف تھا اسی لیے کوفت زدہ سے انداز میں بولا تھا۔

”کیا بات ہے یار؟ تمہارا موڈ کیوں خراب ہو رہا ہے۔“ مبارک خان نے دلچسپی سے پوچھا تھا۔

”یار تم خود سوچو! اتنا طویل سفر، اتنی تھکاوٹ اور حاصل و وصول کچھ بھی نہیں، ایسے میں موڈ تو خراب ہو گیا۔“ منصور حسین کے چہرے پر ہلکے غصے کا اثر تھا مبارک خان گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا اسے۔

”حاصل و وصول کیوں نہیں ہے؟ اس کام کے؟ اس نوکری کے پیسے نہیں لیتے تم۔؟ ماہانہ تنخواہ لیتے ہو آخر

کس لیے۔؟ اس کام کے لیے نا۔؟ تو پھر یہ بے زاری اور غصہ کیوں ہے۔ کون سا مفت میں کام کر رہے ہو۔

۔۔۔ اگر یہ ڈرائیونگ اتنا ہی مشکل کام ہے تو نوکری چھوڑ دو، کہیں اور نوکری کر لو، کسی بینک یا کسی آفس میں۔“

مبارک خان کی ڈیوٹی تھی کہ وہ گھر کے ضروری کاموں کے علاوہ تمام ملازموں پر نظر رکھے اور انہیں ہدایت سے نوازتا رہے، جبھی آج منصور حسین کا موڈ دیکھ کر بھی وہ چپ نہیں رہ سکا تھا بے شک منصور حسین کے ساتھ اس کی کافی اندر اسٹینڈنگ اور دوستی ہو چکی تھی لیکن اصول پھر بھی اصول تھے وہ ذات کا پٹھان تھا حق بات کہنے سے باز نہیں آ سکتا تھا۔ جبکہ منصور حسین اس کی شکل دیکھ رہا تھا جیسے یقین نہ آ رہا ہو کہ مبارک خان نے اتنے سخت لہجے میں اسے کھری کھری سنائی ہیں۔

”میں تو مذاق کر رہا تھا مبارک خان، ورنہ میں بھی جانتا ہوں کہ یہ میری ڈیوٹی ہے، علیزے بی بی جہاں بھی

جائیں مجھے ان کے ساتھ جانا ہو گا۔“ منصور حسین افسوس سے کہہ رہا تھا اسے مبارک خان کی بات پر دکھ ہوا تھا

نئی جلدی ڈانٹ دیا تھا اس نے۔

”لیکن میں مذاق نہیں کر رہا۔ میں سنجیدگی سے بات کر رہا ہوں۔“ مبارک خان کا انداز اب بھی نپا تلا سا تھا

”میں تو مذاق کر رہا تھا مبارک خان، ورنہ میں بھی جانتا ہوں کہ یہ میری ڈیوٹی ہے، علیزے بی بی جہاں بھی

جائیں مجھے ان کے ساتھ جانا ہو گا۔“ منصور حسین افسوس سے کہہ رہا تھا اسے مبارک خان کی بات پر دکھ ہوا تھا

نئی جلدی ڈانٹ دیا تھا اس نے۔

”لیکن میں مذاق نہیں کر رہا۔ میں سنجیدگی سے بات کر رہا ہوں۔“ مبارک خان کا انداز اب بھی نپا تلا سا تھا

”ہوں! بہت اچھا کیا ہے تم نے۔“ اس نے سر ہلایا۔

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے تم جاؤ اب کام کرو اپنا۔“ مبارک خان کہہ کے اندر چلا گیا تھا اور منصور حسین بے دلی

سے گاڑی میں بیٹھ گیا تھا گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اسے خود بخود ہی رجحان کا خیال آ گیا تھا۔

صبح اٹھتے ہی خود اس نے بھی تو رجحان کے ساتھ ایسا ہی رویہ اپنایا تھا اس بے چاری کو بھی تو اتنا ہی افسوس اور دکھ

ہوا ہو گا۔؟ اللہ نے چند منٹوں میں ہی اس کا بدلہ لے لیا تھا اور منصور حسین کو فوراً ہی احساس ہو گیا تھا کہ جیسا

سلوک ہم کسی کے ساتھ کرتے ہیں ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ لہذا اس نے آئندہ کے لیے اللہ سے

معافی مانگ لی تھی۔



”بھائی۔۔۔! بھائی۔۔۔! پلیز جلدی! ٹھیک نہیں ہے۔“ عدیل دن بھر کا تھکا ہارا چہرہ

چارپائی ڈالے کالی گہری نیند سو رہا تھا جب اچانک ایمین نے آکر اسے جھنجھوڑ کے جگا دیا تھا۔

”اباجی کی طبیعت؟ کیا ہوا ہے انہیں؟“ عدیل بھی اس اچانک افتادہ گھبرا گیا تھا۔

”ان کے سینے میں بہت شدید درد ہے، بہت تکلیف میں ہیں وہ۔“ ایمین کی آواز بھرا گئی تھی اور عدیل یکدم

چادر پر بے پھینک کے اٹھ کھڑا ہوا تھا اپنے چپل پہن کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا پانچ سیکنڈ میں سیڑھیاں اتر آیا تھا۔

”امی! کیا ہوا ہے اباجی کو۔؟“ عدیل کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

”ابھی تھوڑی دیر پہلے تک تو بالکل ٹھیک ٹھاک سو رہے تھے، میری بھی آنکھ لگ گئی تھی، لیکن جیسے ہی کروٹ

بدلی تو ان کی طرف نظر اٹھ گئی تب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ تکلیف میں ہیں اور کراہ رہے ہیں، اٹھ کر پتا کیا ہے تو اپنے

سینے کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ سینے میں درد ہے، اب تو ان سے کراہنا بھی مشکل ہو گیا ہے۔“ امی بھی اباجی کو

تکلیف میں دیکھ کر رو رہی تھیں مریم اور ایمان اباجی کے قریب جھکی ان کا سینہ سہلا رہی تھیں لیکن ان کے چہرے

پر تکلیف کے آثار کم نہیں ہو رہے تھے بلکہ اور بڑھ رہے تھے۔

”آپ حوصلہ رکھیں میں ابھی ٹیکسی لے کر آتا ہوں، انہیں ہسپتال لے چلتے ہیں۔“ عدیل عجلت سے کہتا لے

پاؤں باہر نکل گیا تھا۔

رات کے دو بجے کا وقت تھا گلیوں میں ہونے والی چہل پھل اور شور ہنگامہ ماند پڑ چکا تھا لوگ اب اپنے اپنے

گھروں میں سکون کی نیند سو رہے تھے عدیل اپنی گلی سے تقریباً بھاگتا ہوا مین روڈ تک آیا تھا۔ مین روڈ

روشنیوں سے بھرا پڑا تھا بے فکرے لوگ موزن فستی میں مگن تھے ایسے میں وہ اکیلا فکر مند سا ٹیکسی کی تلاش میں

مسلسل اوہرا دھردیکھ رہا تھا۔

”ٹیکسی۔“ اس نے اک ٹیکسی کو قریب آتے دیکھا تو فوراً سامنے آ گیا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے بمشکل بریک

لگائے تھے۔

”دیکھیے بھائی صاحب! میرے والد صاحب کی طبیعت بہت خراب ہے انہیں ہسپتال لے کر جانا ہے پلیز۔“

عدیل دیکھ چکا تھا کہ ٹیکسی میں پہلے سے دو سواریاں موجود ہیں پھر بھی التجا کر ڈالی تھی۔

”معذرت چاہتا ہوں صاحب، میں نے یہ سواریاں ایئر پورٹ چھوڑی ہیں ان کی فلائیٹ مس ہو جائے گی۔“

ٹیکسی ڈرائیور نے انکار کر دیا تھا۔

”دیکھیے کسی کی زندگی اور موت کا سوال ہے پلیز کچھ خیال کریں۔“ عدیل روہانسا ہو گیا تھا۔

”دیکھو صاحب! خواہ مخواہ گلے مت پڑو، جاؤ کسی اور ٹیکسی لے لے سے کہو۔“ ٹیکسی ڈرائیور نے ٹیکسی اک جھٹکے سے

آگے بڑھائی عدیل اچھل کے پیچھے ہوا تھا اور نہ یقیناً "فشپا تھ" چا کرتا۔
"ٹیکسی۔۔۔" اچانک اک اور ٹیکسی اس کے سامنے سے گزری تھی لیکن اس نے بھی عدیل کی آواز نہیں سنی تھی۔

"آؤ۔۔۔" اب کی بار اسے سڑک کی دوسری جانب ایک رکشا دکھائی دیا اور عدیل اندھا وند اس رکشے سمت دوڑ پڑا۔

"ہیلو بھائی صاحب! ہسپتال چلنا ہے۔" اس نے رکشے میں آڑے ترچھے سوئے ڈرائیور کو بازو دھلا کر متوجہ کیا وہ نیند سے کسمسا کر بمشکل سیدھا ہوا تھا۔

"کیا بات ہے باؤجی۔۔۔؟" رکشا ڈرائیور نے اپنی ٹوپی سیدھی کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہسپتال جانا ہے ایک مریض کو لے کر بہت ایمر جیسی ہے پلیز۔"

اس مصیبت کے عالم میں تو یوں لگ رہا تھا جیسے شہر کا شہر ویران اور سنسان ہو گیا ہو جہاں وقت پڑنے پہ کو سواری ہی نہ مل رہی تھی۔

"معاف کرنا باؤجی! میرا رکشا تو صبح سے خراب ہے یہ کم بخت ٹھیک ہوتا تو میں اتنے آرام سے یوں نہ سو ہوتا، تمہیں ضرور ساتھ لے چلتا۔" اس رکشا ڈرائیور نے بھی معذرت کرتے ہوئے معذوری ظاہر کی تھی اور عدیل کے ماتھے پر پریشانی سے پسینہ پھوٹ پڑا تھا کہ نجانے گھر میں تکلیف کے مارے اباجی کی کیا حالت ہو رہی گی اور اسے یہاں کوئی ٹیکسی یا رکشا وغیرہ ہی نہیں مل رہا تھا۔ اس نے بے بسی سے اپنے دونوں ہاتھ بالوں میں پھنسا لیے اور روہانے سے انداز میں اوپر آسمان کی سمت دیکھا تھا آنکھوں کے گوشے بھیگ چکے تھے اور دل گہرائیوں سے فریاد نکلی تھی۔

"یا اللہ۔۔۔! رحم فرما۔۔۔" اس نے اس مشکل اور کڑے وقت میں اپنے رب کو نیکارا۔ جو کبھی بھی کسی کو مایوس نہیں کرتا۔ اس کے الفاظ بھی اس کے منہ میں ہی تھے کہ اس کے پیچھے اچانک کسی گاڑی کے ٹائرس جڑا۔

تھے اور زوردار ہارن بجا۔ کیونکہ وہ اپنی بے دھیانی میں سڑک کے نیچوں بچ چل رہا تھا۔
عدیل نے گاڑی کے ہارن پہ یکدم تڑپ کے اپنے پیچھے دیکھا تھا اور آنکھیں چندھیا گئی تھیں گاڑی کی لائٹس کی روشنی سیدھی اس کے چہرے پہ پڑ رہی تھی جس کی وجہ سے گاڑی ڈرائیور کو دیکھ نہیں پایا اور لپک کے گاڑی کے قریب آگیا تھا لیکن ڈرائیورنگ سیٹ پہ براجمان لڑکی کو دیکھ کر اس کی رہی سہی امید بھی توڑ گئی تھی عدیل کو اس لڑکی سے ہونے والی پچھلی دونوں ملاقاتیں بخوبی یاد تھیں اس لیے اس سے توقع رکھنا فضا تھا جیسی وہ کچھ کہنے سے پہلے ہی جب ہو گیا تھا۔

"لگتا ہے کسی گاڑی کے نیچے آکر مرنے کا بہت شوق ہے تمہیں۔۔۔" وہ غصے سے چبا کر بولی تھی لیکن عدیل جواباً کچھ بھی کہے بغیر قدم پیچھے ہٹا لیے تھے۔

"او مسٹر ہیرو۔۔۔! میں تم سے کچھ کہہ رہی ہوں؟" وہ گاڑی سے نکل کر اس کے سامنے آگئی تھی۔
"مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا۔" عدیل بڑے کرب سے بولا تھا اپنے اندر کے بے بسی کے غبار کو وہ بمشکل نہ کر رہا تھا۔

"بہرے ہو گئے ہو۔۔۔؟"

"ہاں! اندھا بھی ہو گیا ہوں۔" اس کے لہجے میں اذیت تھی جو فی الحال مدحیہ حیات محسوس کرنے سے قاصر تھی۔

"تو پھر اندھے اور بہرے ہو کر سڑکیں کیوں چھان رہے ہو۔۔۔ کوئی گاڑی روند کے گزر جائے گی۔" وہ طنز سے

رہی تھی۔

"اس وقت ہر گاڑی مجھے روند کر ہی گزر رہی ہے میڈم۔۔۔" عدیل کی آواز کوکھ سے لرز رہی تھی اور شکست خوردہ سالجہ بھی چھپ نہیں رہا تھا پہلی بار مدحیہ نے چونک کر دیکھا تھا۔

"وجہ پوچھ سکتی ہوں؟"

"وجہ پوچھ کر کیا کریں گی؟"

"یہ تو بعد کا مسئلہ ہے نا پہلے وجہ تو بتاؤ۔"

"میرے بابا کی طبیعت خراب ہے، وہ بہت تکلیف میں ہیں اور مجھے کوئی رکشایا ٹیکسی نہیں مل رہی، پچھلے پندرہ بیس منٹ سے اسی سڑک پہ چکرا رہا ہوں۔" اس نے بالآخر کہہ ہی دیا تھا اور مدحیہ اس کی بات پہ ٹھک گئی تھی اس نے عدیل کو سر تاپا گہری نظروں سے دیکھا تھا اس کا حلیہ بتا رہا تھا جیسے ابھی ابھی سوتے سے اٹھ کر آیا ہو۔

"تم کوئی ڈرامہ تو نہیں کر رہے۔۔۔؟" وہ مشکوک سے لہجے میں بولی تھی اور عدیل کا ضبط جواب دے گیا تھا وہ پھٹ پڑا تھا۔

"میں ایک مجبور اور بے بس انسان ہوں، اس وقت اپنے باپ کی موت کے خوف سے سڑکوں پہ مارا مارا پھر رہا ہوں اور آپ جیسے امیر اور عیاش لوگ اپنی گاڑیوں میں گزرتے ہوئے یہ سمجھ رہے ہیں کہ میں کوئی آوارہ کوئی موالی شاید ڈرامے کرتا پھر رہا ہوں، آپ لوگ کبھی ایسے حالات سے دوچار ہوئے ہوں تو آپ کو کسی دوسرے کا احساس ہوتا۔۔۔؟ ہر چیز کی سہولت نے آپ لوگوں کے اندر بے حسی پیدا کر دی ہے، زیرو میٹر گاڑی میں بیٹھ کر پیدل چلنے والوں کو آپ لوگ کیڑے مکوڑے سمجھتے ہیں، جنہیں روند کر گزرنے پہ بھی کوئی پروا نہیں ہوتی آپ کو میں نے اسی لیے کہا تھا آپ سے کہ وجہ مت پوچھیں، اگر پوچھ بھی لیں گی تو کیا کریں گی آپ۔۔۔؟ ڈرامہ باز کہہ کر گزر جائیں گی، بس اور کیا کریں گی۔۔۔؟ جائیں گزر جائیں جہاں پورے شہر کی گاڑیاں گزر رہی ہیں وہاں آپ کی بھی گاڑی گزر گئی تو کوئی فرق نہیں پڑے گا، زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے، اگر میرے اباجی کی زندگی باقی ہے تو کوئی بھی چیز انہیں موت کے منہ میں نہیں ڈھکیل سکتی۔" عدیل کا سارا غصہ اور سارا غبار مدحیہ پہ نکل گیا تھا اور وہ حیران پریشان اس کی صورت دیکھتی رہ گئی تھی مگر وہ نئی سے سر جھٹک کر آگے بڑھ گیا تھا۔

"ٹیکسی۔۔۔" ایک بار پھر وہ کسی ٹیکسی کے پیچھے بھاگا تھا لیکن یہاں بھلا کون سننے والا تھا۔۔۔ تیز رفتار ٹیکسی زناتے سے گزر گئی تھی اور عدیل شکستہ سا واپس گھر کی سمت چل پڑا تھا ابھی کچھ دور آیا تھا کہ پیچھے ایک بار پھر ہارن بجا۔ عدیل بغیر رکے چلتا رہا لیکن اب کی بار مدحیہ نے ہارن پہ ہاتھ رکھ کے ہٹایا نہیں تھا عدیل نے نئی سے پلٹ کر دیکھا۔

"کیا مسئلہ ہے میڈم۔۔۔؟" وہ زہر سے بھرا ہوا تھا۔

"بیٹھو گاڑی میں۔" اس نے کہتے ہوئے فرنٹ ڈور کھول دیا تھا اور عدیل گاڑی کے کھلے ہوئے دروازے کو دیکھ کر ڈالواں ڈول سا ہو گیا تھا کوئی اور وقت ہوتا تو شاید منہ موڑ کے آگے بڑھ جاتا لیکن اس وقت وہ غصے کے باوجود بھی ایسا نہیں کر سکتا تھا خاموشی سے کھلے ہوئے دروازے سے اندر بیٹھ گیا تھا اور دروازہ بند کر دیا تھا۔

"اپنے گھر کا راستہ بتاؤ۔" وہ سنجیدگی سے پوچھ رہی تھی اور عدیل سنجیدگی سے اسے راستہ سمجھانے لگا۔ وہ گاڑی کی اسپڈ بڑھا چکی تھی اور چند منٹ بعد ہی وہ اس کی مطلوبہ گلی کے ٹرنپ گاڑی کھڑی کر کے سیدھی ہوئی تھی۔

"اب۔۔۔؟" اس نے عدیل کو سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

"آپ یہیں ٹھہریں، میں انہیں لے کر آتا ہوں۔" عدیل کہہ کے عجلت سے نیچے اتر آیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اپنے گھر کے دروازے پہ آ رہا تھا۔

”ای! اوروازہ کھولیں۔“ اس نے دستک دی یا پناچ سیکنڈ میں ہی وروانہ کھل گیا تھا۔
 ”بھائی! اتنی دیر لگا دی آپ نے۔“ مریم کے چہرے پہ بدحواسی ناچ رہی تھی۔
 ”ٹیکسی نہیں مل رہی تھی، ابھی کسی کی گاڑی ملی ہے، ٹیکسی نہیں ملی۔“ وہ بتاتے ہوئے اباجی کی طرف
 تھا وہ نیم بے ہوشی کی سی حالت میں تھے عدیل نے انہیں بازوؤں میں اٹھالیا تھا۔
 ”میں ساتھ چلوں۔۔۔؟“ عابدہ خاتون آگے بڑھیں۔
 ”نہیں امی! گھر پہ کوئی بھی نہیں ہے، رات کے اس پیر یہ سب اکیلی کیسے رہیں گی، حالات تو ویسے ہی بد
 خراب ہیں۔“ عدیل نے منع کر دیا۔
 ”تو پھر میں ساتھ چلتی ہوں، آپ اکیلے کہاں کہاں بھاگ دوڑ کریں گے۔“ مریم عابدہ خاتون کو رکستے دیکھ کر
 تیار ہو گئی تھی۔
 ”لیکن مریم۔“ عدیل نے روکنا چاہا۔
 ”ٹھیک کہہ رہی ہے مریم، وہ ساتھ چلی جاتی ہے جاؤ مریم چاور لے آؤ۔“ عابدہ خاتون نے اشارہ کیا تھا اور پڑ
 عدیل کے پیچھے پیچھے مریم بھی نکل آئی۔

وہ ڈرائیونگ سیٹ سے پشت نکائے بیٹھی اس شخص کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی جس کے نام سے بھی واقف
 نہیں تھی لیکن پھر بھی اس کا انتظار کر رہی تھی، نجانے اسے کیا ہوا تھا کہ وہ بنا سوچے سمجھے اس کے ساتھ چلی آ
 تھی ورنہ اتنی نرم اور حساس تو وہ کبھی بھی نہیں تھی جتنی آج ثابت ہوئی تھی اور وہ اپنے اس اقدام پہ خود بھی بہرہ
 حیران تھی لیکن جو بھی تھا وہ کسی کو یوں مصیبت میں چھوڑ کر نہیں جاسکتی تھی اس شخص کی پریشانی سن کر وہ اپنا دا
 بھر کا غم و غصہ بھی بھول گئی تھی اور ساتھ یہ بھی بھول گئی تھی کہ اس شخص کے ساتھ ہونے والی پہلی دو ملاقاتیں
 کیسی گزری تھیں۔

جن کے بعد وہ اس شخص کا خون بہا جانے کے درپے ہو جاتی تھی، اسے پورا پورا دن گالیوں سے نوازتی رہتی
 بلکہ اس کا پس چلتا تو وہ اسے یقیناً ”قل بھی کر ڈالتی“ لیکن آج وہ اسی شخص کو اپنی گاڑی میں اپنے ساتھ اپنے برا
 بٹھا کے لائی تھی وہ بھی محض اس کی مدد کرنے کی خاطر۔

وہ انہی سوچوں میں گم چپ بیٹھی سامنے دند اسکرین کی سمت دیکھ رہی تھی جب وہ شخص گلی سے نکل کر گاڑی
 کی سمت آتا دکھائی دیا تھا مدحیہ اسے دیکھ کر گاڑی سے اتر آئی اور گاڑی کا بیک ڈور کھول دیا۔

”تھینک یو۔“ عدیل نے اسے تھینکس کہہ کر بمشکل نیچے جھکتے ہوئے اباجی کو پچھلی سیٹ پہ لٹایا اس کے
 پیچھے مریم بھی آرکی لیکن وہ گاڑی کے قریب کھڑی مدحیہ کو دیکھ کر ٹھٹھک کے رک گئی۔

”مریم! تم پیچھے بیٹھ جاؤ۔“ عدیل اباجی کو لٹا کے سیدھا ہوا تو مریم کو بیٹھنے کا کہا جو حیران نظروں سے مدحیہ کو دیکھ
 رہی تھی البتہ مدحیہ نے اسے بڑے نارمل بلکہ سرسری سے انداز میں دیکھا اور پیچھے ہٹ گئی۔
 ”چلیں۔۔۔؟“ عدیل نے مدحیہ کی سمت دیکھا۔

”اوکے۔۔۔“ وہ کندھے اچکا کر دوسری سائیڈ سے گھوم کے ڈرائیونگ سیٹ پہ آ بیٹھی اور گاڑی اشارت کر دی
 مریم اور عدیل بھی بیٹھ چکے تھے وہ گاڑی بیک کرتے ہوئے مین روڈ تک لے آئی تھی۔

”کون سے ہاسپٹل جانا ہے۔“ مدحیہ نے سنجیدگی سے پوچھا لیکن مریم چونک گئی تھی اس لڑکی کے لب و لہج
 سے ہی لگ رہا تھا کہ وہ لندن پلٹ ہے مریم پچھلی سیٹ پہ بیٹھی ہوئی تھی اسی لیے مدحیہ اسے صرف ایک سائیڈ سے
 ہی دکھائی دے رہی تھی مریم کی نظر اس کی گداز دودھیا کلائی اور مخروطی ہاتھوں پہ ٹھہر گئی تھی۔
 اس کی کلائی میں خوب صورت اور نفیس سے دو ہرسلٹ سجے ہوئے تھے اور نفاست سے ترشے ہوئے ناخنوں

شاگنگ پنک کلر کی نیل پالش اس کے دودھیا ہاتھوں کو دو آتشہ بنا رہی تھی۔ اس کا ایسا جائزہ تو عدیل نے بھی
 نہیں لیا تھا جیسا مریم لے رہی تھی۔ جبکہ مدحیہ کو خبر بھی نہیں تھی کہ پیچھے بیٹھی لڑکی اتنے غور سے اسے دیکھ رہی
 ہے۔

”بنائیے ناکماں جانا ہے آپ نے؟ کون سے ہسپتال کی طرف ٹرن لوں۔۔۔؟“ مدحیہ نے ایک بار پھر عدیل کو
 مخاطب کیا تھا۔

”میو ہسپتال یہ یہاں کا سب سے بڑا سرکاری ہسپتال ہے۔“ عدیل نے بتایا اور ساتھ ہی راستہ بھی بتانے
 لگا۔ جس پہ مدحیہ نے چونک کر دیکھا تھا گویا وہ لوگ کسی پرائیویٹ ہسپتال کا خرچہ بھی انورڈ نہیں کر سکتے تھے؟ مدحیہ
 اس شخص کے حالات پہ حیران ہو رہی تھی اور مریم اس لڑکی پہ۔۔۔! وہ اتنی پریشانی کے باوجود اس لڑکی کے متعلق
 سوچ رہی تھی بلکہ گاڑی میں موجود وہ تینوں نفوس ہی کچھ نہ کچھ سوچ رہے تھے اور ان کی سوچوں کا تسلسل مدحیہ
 کے موبائل کی رنگ نے توڑا تھا ڈیش بورڈ پہ رکھے موبائل کی نیلی لائٹس بار بار روشن ہو رہی تھیں مدحیہ نے
 موبائل اٹھا کر کال ڈس کنکٹ کر دی لیکن پناچ سیکنڈ کے وقفے سے دوبارہ رنگ بجنے لگی کال کرنے والا نبیل تھا جو
 اسے۔۔۔ دوسرے تقریباً سو مرتبہ کال کر چکا تھا اور مدحیہ اسے ایک ہی جواب دے کر فون بند کر دیتی اس وقت بھی
 اس نے موبائل آن کر کے بولنے کی زحمت نہیں کی تھی بلکہ ان کے بولنے کا انتظار کیا تھا۔

”مدحیہ پلیز! رات بہت ہو گئی ہے، گھر واپس آ جاؤ، جو بھی بات کہنی ہے، گھر آ کر کہو، پلیز میری بات مان لو۔“
 نبیل اسے نرمی سے سمجھا رہا تھا۔

”ایم سوری بھائی! میں نے آپ کو پہلی کال میں ہی بتا دیا تھا کہ جب تک وہ اس گھر میں ہیں، میں نہیں آؤں گی،
 بس بات ختم آپ انہیں نکال دیں، میں ابھی آجاتی ہوں۔“ مدحیہ نے سرد سے لہجے میں لاپرواہی سے کہا تھا جس پہ
 عدیل نے ٹھٹھک کر اس کی سمت دیکھا کتنی سخت تھی وہ لڑکی اس کی کال ٹو اس کے منہ نقوش سے ہی ظاہر ہو جاتی
 تھی، معاف کرنے والوں میں سے تو ہرگز نہیں تھی۔ پھر بھی عدیل کے ساتھ آگئی تھی۔ عدیل کو حیرت نے چھوا
 تھا۔

”دیکھو مدحیہ! وہ بابا ہیں ہمارے، میں کیسے ان کو گھر سے نکال سکتا ہوں۔۔۔؟“
 ”اوکے! میں تو گھر سے نکل چکی ہوں نا۔۔۔؟ آپ کیوں بار بار کال کر کے مجھے ڈسٹرب کر رہے ہیں۔۔۔؟ دوبارہ
 کال نہ کیجیے گا اللہ حافظ۔“ اس نے کہہ کے کال بند کی اور موبائل ڈیش بورڈ پہ پٹخ دیا تھا وہ دونوں بہن بھائی چپ
 چاپ اس کی گفتگو سنتے رہ گئے اور اس نے میو ہسپتال کی پارکنگ میں گاڑی اک جھٹکے سے لاکے پارک کی تھی اور
 گاڑی کے آئوٹنک لاک کھول دیے تھے عدیل تیزی سے نیچے اتر گیا۔ اور پھر آتا ”فانا“ وہ لوگ اپنے اباجی کو
 اسٹریچر پہ ڈال کے اندر لے گئے اور مدحیہ وہیں پارکنگ میں کھڑی رہ گئی اور اپنی بھاگ دوڑ میں عدیل کو اس کا خیال
 ہی نہ رہا تھا۔

اپنا پن ہی اک بیگانے پن میں ہے
 پورا عالم اک دیوانے پن میں ہے
 یہ جو میں تم سے انجان بنا پھرتا ہوں
 ساری بات ہی اسی انجانے پن میں ہے

عبداللہ کی ڈائری میں تحریر یہ شعر پڑھتے پڑھتے زری کی آنکھیں خوشی اور بے یقینی سے چمک اٹھی تھیں وہ

عبداللہ کے چھوٹے سے اسٹڈی روم سے نکل کر ننگے پاؤں نیچے کی طرف بھاگی تھی۔
”بھا بھی۔۔۔! بھا بھی۔۔۔! کہاں ہیں آپ!“ وہ سیڑھیاں اترتے ہوئے زور زور سے پکارتی ہوئی نیچے آ رہی تھی۔

”یا اللہ خیر۔۔۔! کیا آفت آگئی ہے؟“ نگارش گھبرا کر دل پہ ہاتھ رکھتی ہوئی کچن سے باہر نکلی آئی اس کے ہاں میں چمچہ تھا وہ کچن میں کھانا بنا رہی تھی اور باقاعدہ ایپرن بھی باندھ رکھا تھا۔
”یہ شعر۔۔۔ یہ شعر بڑھا آپ نے؟“ اس نے عبداللہ کی ڈائری نگارش کے سامنے لہرائی اور نگارش نے اس بات پر تلملا کر اپنا ماتھا پیٹ لیا تھا۔

”آف اللہ! تمہارے یہ شعر۔۔۔ کیا کروں میں ان شعروں کا۔۔۔ دن رات انہی میں چکراتی رہتی ہو، بلکہ مجھے یہ چکر کے رکھ دیا ہے۔“ نگارش نے خفگی سے کہتے ہوئے اسے گھور کے دیکھا تھا۔

”دل کو بھلاتی ہوں بھا بھی۔ خوب صورت لفظوں کے اظہار سے دل کو سکون رہتا ہے۔“
”لیکن یار کیسا سکون۔۔۔ کون سا وہ خود تمہیں شعر سناتا ہے، جنہیں سن کر تمہارے دل کو سکون رہتا ہے؟“ نگارش کبھی کبھی اس کی اس قدر دیوانگی پہ جھنجھلا جاتی تھی۔

”بھا بھی۔۔۔! یوں سمجھ لیں کہ وہ خود ہی مجھے شعر سناتا ہے، اگر یقین نہیں آتا تو یہ شعر بڑھ کے دیکھ لیں۔“
نے پھر ڈائری سامنے کی تھی اور مجبوراً ”نگارش کو وہ شعر بڑھنا پڑا اور شعر کے نیچے دل اور شاہ کا نام لکھا ہوا تھا اور ساتھ میں ٹائم اور ڈیٹ بھی تحریر تھی۔

”اوہ! تو اس شعر کی بات کر رہی ہو؟“ نگارش نے یہ ڈائری پہلے سے بڑھ رکھی تھی یہ ڈائری عبداللہ کی تھی لیکر اس میں شعر تینوں دوستوں نے اپنی اپنی ہینڈ رائٹنگ میں تحریر کر رکھے تھے۔

”بھا بھی۔۔۔! یہی شعر تو دنیا کا خوب صورت ترین شعر ہے۔“ زری اس شعر کے لفظوں اور دل اور کے نام ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑی سرشاری اور بڑی چاہ سے بولی تھی۔

”اس سے اگلا شعر بھی تو بڑھو۔“ نگارش کہتے ہوئے واپس کچن کی طرف پلٹ گئی۔
”اگلا شعر۔۔۔؟ وہ کس کا ہے؟“

”بڑھو تو سہی پتا چل جائے گا۔“ نگارش نے کچن سے ہی جواب دیا تھا اور زری نے تجسس کے ہاتھوں اگلا صفحہ پلٹ دیا تھا۔

تیرے خیال سے دامن بجا کے دیکھا ہے
دل و نظر کو بہت آزما گئے دیکھا ہے۔۔۔
نشاطِ جاں کی قسم تو نہیں تو کچھ بھی نہیں
بہت دنوں سے تجھے ہم نے بھلا کے دیکھا ہے

زری نے زیر لب یہ شعر بڑھا تھا الفاظ واقعی دل کو چھو گئے تھے لیکن شعر کے نیچے لکھا ”نبیل حیات“ کا نام اس کے دل کو چھونے والا نہیں تھا وہ دل اور شاہ کی داسی تھی اس کی پجاری اس کی جو گن تھی پیر کے ناخن سے اس کے سر کے بالوں تک اس کے عشق میں ڈوبی ہوئی، تن بھی گھائل، من بھی گھائل، کسی اور طرف دیکھتی بھی نہ کیسے۔۔۔؟

وہ تو سوتی بھی اسی خیال سے تھی کہ خواب میں وہ ملے گا اس سے ملاقات کی آس پلوں پہ نیند بٹھا جاتی تھی اس کا سونا جاگنا دل اور شاہ کے لیے تھا اس کا پہننا اور ڈھنڈل اور شاہ کے لیے تھا اس کا جینا مرنا دل اور شاہ کے لیے تھا اور جب اس کا سب کچھ دل اور شاہ کے لیے تھا تو اسے دل اور شاہ کے پہلو میں کھڑا نبیل حیات کیسے

دکھائی دے سکتا تھا۔۔۔؟ اس کا نام زری کی نظروں میں بھلا کیسے چھ سکتا تھا۔۔۔؟ کبھی ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ اس کی نظریک انچ بھی دل اور شاہ سے ہٹ کے ادھر سے ادھر دیکھ لے اور اس وقت بھی ایسا ہی ہوا تھا اس نے دوبارہ صفحہ پلٹ کے نظریں دل اور شاہ کے لکھے ہوئے شعر پر جما دی تھیں۔

”شعر بڑھا تم نے۔۔۔؟“ نگارش ایپرن کھولتے ہوئے دوبارہ کچن سے نکل آئی۔
”ہوں! پڑھا ہے، لیکن دل کو نہیں لگا۔“ زری نے لاپرواہی سے کہتے ہوئے سر ہلایا تھا ”نگارش نے حیرت سے اسے دیکھا اور پھر مسکرا دی۔

”بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو تم، جس دل کو ”دل اور شاہ“ لگ جائے اس کو کوئی اور شے لگ سکتی ہے بھلا؟“
”ڈیفنی فینٹلی آف کورس بھا بھی۔۔۔! ایسا ہی ہے، وہ اتنا دل کو لگ گیا ہے کہ اب تو میرا دل بھی دل اور شاہ بن گیا ہے، بے رخ اور بے نیا نس۔ مجھ سے آنکھ ہی نہیں ملتا بالکل اسی کی طرح، وہی چال چلن ہیں میرے دل کے جیسے اس کے تھے۔“ زری بولتے ہوئے جیسے چپک رہی تھی۔

”اپنے دل کو اتنا نہ سر پہ چڑھاؤ، پچھتاؤ گی، دل بڑ جائے تو قابو کرنا مشکل ہو جاتا ہے، لگام ڈالو اسے۔“ نگارش اسے شرارت سے سمجھا رہی تھی۔

”بھا بھی۔۔۔! بہت دیر ہو چکی ہے اب تو اس بے لگام کو وہی لگام ڈال سکتا ہے جس کے لیے یہ بے لگام ہوا ہے۔“
”وہ خود بے لگام ہے، تمہارے دل کو بھلا کیا لگام ڈالے گا؟“ نگارش نے مذاق اڑایا تھا اور زری بھی بے ساختہ ہنس پڑی تھی۔

”بے لگام تو بھائی بھی بہت تھے، لیکن دیکھ لیں آج کتنے قابو میں ہیں۔“ زری نے نگارش کو چھیڑا۔
”محترمہ! تمہارے بھائی کو قابو کرنے کے لیے بڑی محنت کی ہے میں نے اپنا دل، اپنی جان، اپنی زندگی اور زندگی بھر کی تمام خد متیں ان کے نام لکھی ہیں میں نے تب جا کے آج وہ میرے قابو میں ہوئے ہیں۔“

”اوہ! تو اسی لیے انہوں نے یہ شعر لکھا ہوا ہے۔۔۔؟“ زری نے تیسرا صفحہ پلٹ کے عبداللہ کا لکھا ہوا شعر سامنے کیا تھا۔
اب او اس کیوں پھرتے ہو، سردیوں کی شاموں میں
اس طرح تو ہوتا ہے، اس طرح کے کاموں میں
دوستی کا دعوا کیا، عاشقی سے کیا مطلب
میں تیرے فقیروں میں، میں تیرے غلاموں میں
اس نے بلند آواز سے شعر سناتے ہوئے نگارش کو معنی خیز اور شوخ نظروں سے دیکھا تھا۔

”ارے یار! ان تینوں دوستوں کے کیوں کچے چٹھے کھول رہی ہو۔۔۔ عبداللہ کو یہ ڈائری بہت عزیز ہے وہ ہمیشہ اپنے ساتھ اپنے بریف کیس میں رکھتے ہیں، آج نجانے کیسے نبیل پہ بھول گئے ہیں، لاؤ میں واپس رکھ آؤں۔“
نگارش نے زری کو ڈائری الٹنے پلٹنے سے باز رکھا۔

”ارے۔۔۔ رے۔۔۔ اب کہاں؟ یہ انمول خزانہ اب میرے پاس رہے گا۔“ زری نے ڈائری پیچھے کر لی۔
”ارے بالکل ہو گئی ہو؟ عبداللہ واپس آتے ہی اس ڈائری کو تلاش کریں گے، ایک بار میں نے بھی یہ ڈائری

نبیل سے اٹھا کر دراز میں رکھ دی تھی اور انہوں نے پورا گھر الٹ پلٹ دیا تھا۔“
نگارش نے اسے ڈائری چھپانے والی حرکت سے روکنا چاہا لیکن وہ بھی زری تھی دیوانگی کی حد تک دیوانی۔ دل اور شاہ کے ہاتھوں سے لکھے ہوئے الفاظ کو وہ اتنی آسانی سے کسی اور کو نہیں سونپ سکتی تھی چاہے وہ اس کا سگا

بھائی عبداللہ ہی کیوں نہ ہوتا۔۔۔ کیونکہ اس ڈائری میں لکھے ہوئے الفاظ ایسے تھے جن سے اس شخص کے اظہار جھلک رہے تھے اور وہ تیسرے صفحے پہ لکھے اس کے اظہار کو دل کی گہرائیوں سے پڑھنا چاہتی تھی اور محسوس چاہتی تھی۔

”ایم سوری بھابی! آج سے میں چور بھی بن گئی۔“ اس نے نگارش کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا۔

”زری۔۔۔“ اس نے گھور کے دیکھا۔

”پلیز۔۔۔“ وہ جواباً التجائیہ سا بولی تھی۔

”عبداللہ کو بتا جل جائے گا یا ر؟“ انہیں پتا ہے کہ آج کل تم ہی اپنے ایگزائمز کی تیاری کے لیے اسٹڈی میں جا رہی ہو۔“

”تو کوئی بات نہیں آپ کہہ دیجئے گا کہ میں اب اسٹڈی میں نہیں جاتی۔“ زری نے لاپرواہی سے کندہ اچکائے۔

”اف خدایا۔۔۔!“ نگارش نے سر ہٹا لیا تھا۔

”تھینک یو۔“ زری مسکرا کر کہتی ہوئی پلٹ گئی تھی۔

”میں شکایت کروں گی۔ عبداللہ سے کہ یہ اپنے پیپرز کی تیاری نہیں کر رہی بلکہ آج کل کے دنوں میں ہم پوسٹری پڑھنے میں مصروف ہے۔“

”اوکے کر دیجئے گا شکایت۔“ وہ ریلیکس تھی کیونکہ اسے یقین تھا کہ نگارش کچھ بھی نہیں کرے گی۔

”میں واقعی کروں گی۔“

”آپ واقعی کر دیجئے گا۔“ زری ہنستے ہوئے اپنے بیڈ روم میں چلی آئی تھی۔

وہ شکستہ سے انداز میں رائنگ چیمبرہ جھولتے ہوئے مسلسل چھت کو گھور رہا تھا اس کی آنکھیں رات بھر جاگ کی وجہ سے بوجھل اور سرخ ہو رہی تھیں، سر تھا کہ سوچوں کے عذاب سے پھٹا جا رہا تھا اور دل و دماغ پہ اک عجیب سا بوجھ مسلط ہو چکا تھا۔ ابھن اور پریشانی ایسی تھی کہ سلجھائے نہ سلجھ رہی تھی کوئی حل نہیں مل رہا تھا وہ اس آگ اور عذاب میں اکیلا ہی بھٹک رہا تھا کہ اچانک اس کا سیل بجنے لگا۔ اتفاقاً ”سیل اس کے ہاتھ میں ہی دبا ہوا تھا جبھی اس نے تھکے تھکے سے انداز میں سیل اسکرین اپنے سامنے کی تھی۔ اسکرین پہ ”دل کالنگ“ کے لفظ جگڑ رہے تھے دل اور شاہ کی کال تھی۔ لیکن نبیل حیات میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس سے بات کرے کیونکہ اگر وہ اس سے بات کرتا تو ساری بات بتانی پڑتی۔ نبیل کی نظر انداز سے اس کی ایک کال مسدود ہو چکی تھی۔ اور وہ سیکنڈ کے وقفے سے ہی دوبارہ سیل بجنے لگا نبیل کو یہ بھی پتا تھا کہ اگر اب بھی کال پک نہ کی تو وہ پریشان ہو جائے گا بلکہ ہو سکتا تھا کہ گھر کے نمبر پہ فون کھڑا کرتا اس لیے بہتر تھا کہ وہ خود ہی کال ریسیو کر لیتا۔

”سیلو۔۔۔!“ اس نے بمشکل ہیلو کہا تھا۔

”السلام علیکم۔۔۔“ اس نے جواباً ”سلام کیا تھا۔“

”وعلیکم السلام۔۔۔“ نبیل بولنے کی فارمیٹھی نبھایا تھا۔

”کہاں ہو؟“ دل اور شاہ کی گفتیش شروع ہو چکی تھی۔

”گھر۔۔۔“

”تو پھر کال کیوں ریسیو نہیں کر رہے تھے؟“

”ہمت نہیں تھی۔“

”ہمت۔۔۔ کیا مطلب ہے تمہارا۔۔۔ تم ٹھیک تو ہو؟“ دل اور کو اس کی آواز سن کے ہی پریشانی ہو چکی تھی۔

”ہمارے گھر میں کبھی کبھار ٹھیک بھی ہوا ہے؟“ نبیل کا لہجہ تلخی لیے ہوئے تھا۔

”کیا بات ہے نبیل۔۔۔ کیا ہوا ہے۔۔۔ کیا کوئی مسئلہ ہو گیا ہے۔۔۔؟“ دل اور کی پریشانی میں اور بھی اضافہ ہوا تھا۔

”ہو نہ! کسی کی عزت اور غیرت سے بڑا مسئلہ اور کیا ہو سکتا ہے بھلا؟ بس یوں سمجھ لو کہ میں بھی اسی سولی پہ چڑھا ہوا ہوں، بے غیرتی کے گھونٹ پی رہا ہوں، ذلت کی زندگی جی رہا ہوں، ایسی زندگی جینے سے تو بہتر ہے کہ میں خود کو گولی مار دوں۔“ نبیل جس اذیت سے دوچار تھا یہ صرف وہی جانتا تھا۔

”یہ کیا کہہ رہے ہو تم۔۔۔ کیا مدحیہ نے کچھ کہا ہے؟“ دل اور کا پہلا خیال مدحیہ کی طرف ہی گیا تھا اور نبیل کے لب سختی سے بھج گئے تھے کپٹی کی رگیں پھٹنے لگی تھیں۔

”مدحیہ کہے گی تو تب جب گھر پہ ہوگی۔“ انا اور غیرت کا سر پھل کے بالا خراس نے کہہ ہی دیا تھا کیونکہ کہے بغیر کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا گھر کی کوئی بھی بات کوئی بھی مسئلہ دل اور سے چھپا ہوا نہیں تھا وہ سب جانتا تھا۔

”مدحیہ گھر پہ نہیں۔۔۔ کیا مطلب؟ کہاں ہے وہ؟“ نبیل کی شکست اس کے لہجے سے عیاں ہو رہی تھی وہ بہت بکھرا ہوا لگ رہا تھا۔

”نبیل۔۔۔ مجھے صاف صاف بتاؤ کیا ہوا ہے؟ مدحیہ کہاں ہے؟“ دل اور کے انداز میں سختی اتر آئی تھی۔

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں دل اور نے مجھے نہیں بتا کہ وہ کہاں ہے۔۔۔؟ وہ صبح سے گھر سے نکل ہوئی ہے اور ابھی تک گھر نہیں آئی۔“

”مگر کیوں؟ کیوں نہیں آئی وہ؟“ دل اور کی آواز میں غصہ تھا اس کی کپٹیوں کا لہو بھی دھک اٹھا تھا۔

”وہ چاہتی ہے کہ میں بابا کو گھر سے نکال دوں۔“

”واٹ؟ کس لیے؟“ دل اور کو حیرت کے جھٹکے لگ رہے تھے۔

”اس لیے کہ اسے بابا سے نفرت ہے، وہ انہیں ناپسند کرتی ہے، وہ اس گھر میں رہیں گے تو وہ نہیں رہے گی اور اسی ضد پہ اڑی ہوئی ہے اور وہ اکیلی لڑکی گاڑی لے کر صبح سے گھر سے نکل ہوئی ہے۔“ نبیل شکست خوردہ سا رو دینے کو تھا۔

”تو تم مجھے اب بتا رہے ہو؟“ اس نے گہری سانس کھینچتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

”کیا بتاتا تمہیں۔۔۔؟ یہ کہ میری بہن کی سرکشی دیکھو یا میرے باپ کی عیاشی دیکھو۔۔۔؟ اتنے اتنے مہینے باہر عیاشی کرتے ہیں اور جب تھک جاتے ہیں تو تھکن اتارنے گھر آ جاتے ہیں اور سالوں ان کا انتظار کرنے والی میری ماں، شکایت کا لفظ زبان پہ لائے بغیر ان کی خدمت میں لگ جاتی ہے، صرف اسی بات پہ خوش ہو جاتی ہے کہ وہ گھر تو آئے ہیں نا؟ اور میں انہیں پکڑ کے گھر سے ہی نکال دوں۔“

”کیا ایسا کرنا مجھے زیب دیتا ہے۔ کیا میری ماں یہ سب سہہ پائے گی؟ تو پھر تم بتاؤ یا میں کیا کروں؟ بہن کو گھر لے کر آؤں؟ یا باپ کو گھر سے نکالوں؟“ نبیل دکھ سے کہتا چلا گیا اور اس کی بات سن کے دل اور بھی خاموش ہو گیا تھا بے بسی کی انتہا پہ کھڑا نبیل حیات ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا وہ کیا کر سکتا تھا آخر۔۔۔ دل اور نے جواباً ”کچھ بھی کہے بغیر فون بند کر دیا تھا اسے اس وقت مدحیہ پہ غصہ تھا اور غصہ بھی غضب کا تھا۔“

”حرمت۔۔۔! میں نے کہہ دیا تھا کہیں نہیں جاؤں گی، پلیز مجھے فورس مت کرو، تم لوگوں نے جانا ہے تو جاؤ“

مگر مجھے میرے حال پہ چھوڑ دو۔“ کومل کی تیز اور تلخ آواز پہ وہ اندر داخل ہوتے ہوئے دلیپ نہ ہی ٹھہر گیا لیکن کومل اور حرمت اسے دیکھ چکی تھیں۔

”بھائی آپ۔۔۔ آئے نازک کیوں گئے ہیں؟“ حرمت نے سر پہ دوپٹہ درست کیا تھا جبکہ کومل ہنوز ضدی سے انداز میں گردن اکڑائے بیٹھی رہی۔

”کیا مسئلہ ہے؟ کون کہاں نہیں جا رہا؟“ آذر کی گہری کھوجتی ہوئی نظریں کومل پہ جمی ہوئی تھیں۔

”وہ بھائی دراصل کومل کو طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے وہ کہہ رہی تھی کہ میں نہیں جاؤں گی تم لوگ چلے جاؤ۔“ حرمت نے کومل کا بھرم رکھتے ہوئے بہانہ کیا تھا۔

”تو کوئی بات نہیں جب ان کی طبیعت ٹھیک ہوگی تب چلے جائیں گے ابھی پروگرام کینسل کر دیتے ہیں۔“ آذر نے لاروائی سے کہتے ہوئے کندھے اچکائے۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔؟“ کومل نے چونک کے دیکھا تھا کہ کیا وہ اس کی خاطر اس کا احساس کر رہا تھا یا پھر اسے کچھ بتا رہا تھا۔؟

”کیوں نہیں ہو سکتا۔؟ میں ابھی سب کو منع کر دیتا ہوں ہمارے لیے آپ اہم ہیں یہ پروگرام نہیں۔“ آذر نے واپس قدم موڑے۔

”لیکن؟“ کومل نے تیزی سے اسے روکا۔

”لیکن۔۔۔؟“ آذر نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”لیکن سب کو اچھا نہیں لگے گا سب کی تیاری مکمل ہو چکی ہے۔“

”آپ کو تو اچھا لگے گا نا؟ آپ کی طبیعت جو خراب ہے۔“

”نن۔۔۔ نہیں میری وجہ سے سب کا پروگرام کینسل نہیں ہونا چاہیے۔“

”تو پھر کیا ہونا چاہیے؟“

”جانا چاہیے سب کو۔“ کومل نے کہتے ہوئے چہرہ جھکا لیا۔

”سب میں آپ بھی تو شامل ہوتی ہیں۔۔۔؟“

”مگر میری طبیعت۔۔۔ وہ بات ادھوری چھوڑتے ہوئے چپ ہو گئی تھی۔

”ڈاکٹر کو بلا لیتے ہیں اور دیسے بھی ابھی تو پوری رات اور پورا دن ہم لوگ گھر پہ ہی ہیں کل صبح کھانا ہے ہم نے تب تک یقیناً آپ ٹھیک ہو جائیں گی۔“ آذر بڑے سکون سے اسے تسلی دے رہا تھا اور کومل جزبزی ہو گئی۔

”کیا خیال ہے آپ کا؟ کل تک طبیعت ٹھیک ہو جائے گی نا آپ کی۔۔۔؟“ آذر کہتے ہوئے اسے اب بھی گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا اور کومل نے اثبات میں سر ہلادیا تھا حرمت کھاتے ہوئے اپنی مسکراہٹ چھپا کر رخ موڑ گئی۔

”گڈ۔! آپ بھی اپنی تیاری کر لیجیے اللہ حافظ۔“ وہ کہہ کے وہاں سے چلا گیا اور پیچھے حرمت کو ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔

”کیا ہوا ہے تمہیں؟ تم کیوں دانت نکال رہی ہو؟“ کومل اندر سے نجل تو ہو چکی تھی لیکن جان بوجھ کر انجان بن گئی۔

”واہ محترمہ داہ! میرے سامنے کیسے غصے سے اکڑا کر بات کر رہی تھیں اور ان کے سامنے ایک دم بھیگی ملی بن گئیں؟ انہیں بھی انکار کرتیں تاکہ میں نہیں جاؤں گی۔“ حرمت نے کھور کے کہا۔

”کیسے انکار کرتی؟ پہلی بار تو انہوں نے کچھ کہا ہے اب جانا تو پڑے گا نا؟“ کومل نے معصوم بن کے کہا۔

”ارے بھئی! کہاں جانے کی باتیں ہو رہی ہیں؟“ جودت ان کی بات سنتے ہوئے اندر آ گیا۔

”ہم نادرن ایریا ز جا رہے ہیں۔“ حرمت نے فوراً چمک کے بتایا تھا۔

”نادرن ایریا ز؟ کون کون جا رہا ہے؟“

”تمام یکس پارٹی۔“

”مطلب کہ میں بھی۔۔۔؟“ اس نے اپنی طرف اشارہ کیا۔

”آپ گھر پہ ہوں گے تو جائیں گے نا؟“ وہ خفگی سے بولی۔

”ارے یار! آہستہ بولو کیوں مروانا چاہتی ہو؟“ جودت نے حرمت کو چپٹ لگاتے ہوئے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

”تو اچھا ہے نا“ آپ کی کلاس ہوئی چاہیے آخر رات رات بھر کہاں رہتے ہیں آپ؟ رات کو بھی آپ گھر پہ نہیں تھے اسی لیے آپ کو ہمارے اس پروگرام کی خبر نہیں ہے۔“ حرمت پھر بھی چپ نہیں ہوئی تھی۔

”کومل آیا۔“ جودت نے کومل کو مدد طلب نظروں سے دیکھا۔

”کومل آپا کی تو خود کلاس لگنے والی ہے آپ بس اپنی خیر منائیں۔“ حرمت نے جس انداز سے کہا تھا کومل یکدم کھلکھلا کے ہنس پڑی تھی۔

”ماشاء اللہ، ماشاء اللہ حسن کے چمن میں آج تو بڑے شگوفے پھوٹ رہے ہیں۔ کیا ماجرا ہو گیا آج؟“

جودت نے ذومعنی لہجے میں کہا تھا۔

”اف! تم سب بن بھائی ایک سے بڑھ کے ایک ہو۔“ کومل نے کانوں کو ہاتھ لگائے جس پہ وہ دونوں ہی ہنس پڑے تھے اور کچھ دیر بعد وہ بھی اپنی اپنی تیاریوں میں لگ گئے تھے اب تو کومل بھی اپنی تیاری پورے جوش و خروش سے کر رہی تھی اور بالی سب لڑکیاں اس کا مذاق اڑا رہی تھیں۔

زری یونیورسٹی سے پیپروے کے گھر آئی تو فریش ہونے کے لیے ہاتھ روم چلی گئی اور نگارش اس کے لیے کھانا گرم کرنے لگی۔ دس منٹ بعد ہی زری پیسج کر کے نیچے چلی آئی تھی۔

”پیسر کیسا رہا؟“ نگارش کھانا ٹیبل پہ لگاتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

”شکر ہے اللہ کا بہت اچھا رہا۔“ زری کھانا کھانے کے لیے بیٹھ چکی تھی۔

”عبداللہ کو بتایا؟“

”جی ہاں! سب سے پہلے انہوں نے ہی پوچھا ہے۔“ وہ پلیٹ میں سالن نکال رہی تھی جب باہر ڈور بیل سنائی دی۔

”میں دیکھتی ہوں۔“ زری اٹھنے لگی لیکن نگارش نے روک دیا۔

”تم کھانا کھاؤ میں دیکھ لیتی ہوں ساتھ دالی فیملی سے کوئی ہو گا۔“ نگارش کرسی کی بیک سے دوپٹہ اٹھا کر پھیلاتی ہوئی دروازے تک آئی اور دروازہ کھول دیا تھا لیکن ایک ہلکی سی چیخ سے ذرا سا اچھل کے پیچھے ہوئی تھی اور اس کی آواز پہ کھانا کھاتی ہوئی زری لپک کے کچن سے باہر نکلی تھی۔

”بھابھی! کیا ہوا ہے؟ کون ہے۔۔۔؟“ وہ ہراساں سی نگارش کی پاس آئی لیکن دروازے کے پاس آکر اس کے قدم بھی جیسے زمین نے جکڑ لیے تھے اس کی ٹانگوں میں لرزش آگئی تھی۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

کبھی ہمارا نہیں سیکھا، اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔

۱۵ پندرہویں قسط



نیکلہ عزیز

دکوان

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدھیہ اور نبیل حیات دو ہی بہن بھائی ہیں، مدھیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے، وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل حوریہ رنگ چکی ہے، جس کے پیش نظر فائزہ بیگم، نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں، لیکن مدھیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے، جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے، مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنب رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے، مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، بے بسی اور مجبوری سے تنگ آخر خود کشی کرنے کا سوچتا ہے، لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے پاؤ اتیاز مل جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے، جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے، اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میسرک پاس آدمی ہے، وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے، وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل اور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے، وہ اپنے قول و فعل کا بہت ریکا آڈمی ہے، اس نے



اس کی رنگت یک لخت زرد پڑ گئی تھی، یوں جیسے کسی نے اچانک اس کے ہزاروں حصے میں اس کے جسم کا سارا خون پھوڑ لیا ہو۔ وہ شدید سی کھڑی پھٹی پھٹی آنکھوں سے دروازے سے باہر دیکھ رہی تھی، اس کے ہاتھ پاؤں برف کی طرح ٹھنڈے پڑ چکے تھے اور دل کی حالت ایسی تھی جیسے کسی نے سگریٹ کی طرح اپنے پیروں تلے قفل دیا ہو جس کی افیت اس کے پورے جسم و جاں میں سرایت کر گئی تھی اور ہونٹ محض کپکپا کے رہ گئے تھے۔

”اسد بھائی آپ؟“ یہ مختصر سا تین لفظی جملہ زبان سے ادا کرنے میں بھی اسے دانتوں پیسنہ آگیا تھا اور اس کی خوب صورت پیشانی حقیقتاً ”عرق آلود ہو گئی تھی“ وہ اپنے قدموں پہ بمشکل کھڑی تھی اسی لیے لرزے ہاتھوں سے سہارے کے لیے نگارش کا بازو تھام لیا تھا۔ حالانکہ وہ بھی اپنے سامنے کھڑے اس کرخت شکل آدمی کو دیکھ کر کافی گھبرائی ہوئی تھی، لیکن زری جیسی حالت تو پھر بھی نہیں تھی، البتہ جب زری نے اس آدمی کو اسد بھائی کہا تھا تو نگارش بری طرح چونک گئی تھی تب اسے پتا چلا کہ وہ آدمی کوئی اور نہیں عبد اللہ اور زری کے بڑے بھائی اسد اللہ ہیں جن کو یارہ تصویروں میں دیکھا تھا، لیکن آج جب اچانک انہیں حقیقت میں اپنے سامنے دیکھا تھا تو وہ پہچان نہیں پائی تھی، بلکہ ان کی ہائٹ اور ان کا حلیہ دیکھ کر ڈر گئی تھی تب ہی تو وہ یک دم چیخ کے پیچھے ہٹی تھی۔

ان کے کرخت چہرے کو ان کی بڑی بڑی مونچھیں اور بھی سفاک اور بے رحم بنا رہی تھیں، وہ اپنی موٹی موٹی سرخ خونخوار آنکھوں سے ان دونوں کا کافی گہرائی سے جائزہ لے رہے تھے زری کے لیے ان کی خونخوار آنکھوں کے تیور نے نہیں تھے البتہ نگارش ضرور انجان تھی۔ اسی لیے اندر سے سہمی ہوئی تھی۔

”کیا اس عیاش ملک اور سفید چہرے والے لوگوں میں رہ رہ کر اینٹوں کی شکل بھی بھول گئی ہے تمہیں؟ اتنے غور سے کیوں دیکھ رہی ہو؟“ وہ بولے تو ان کی بارعب اور دنگ آواز پہ وہ دونوں ہی کانپ کے رہ گئی تھیں۔

”نہیں نہیں بھائی۔ ایسی تو کک کوئی بات نہیں ہے بس۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ آپ کو اچانک دیکھ دیکھ کر۔۔۔ یقین نہیں آ رہا تھا۔“ زری نے بے ربط سے انداز میں تقریباً ”ہکلاتے ہوئے“ کہا تھا اور دوپٹے کے پلو سے فوراً پیشانی سے پسینہ پونچھا تھا۔

”اسلام علیکم بھائی! آئیے آپ اندر آجائیے۔“ نگارش نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے متانت سے انہیں سلام کیا اور اندر آنے کے لیے راستہ دیا تھا، کیونکہ وہ دونوں دروازے میں ہی کھڑی تھیں، لیکن ملک اسد اللہ نے نہ تو اس کے سلام کا جواب دیا تھا اور نہ ہی اپنے رسم و رواج اور روایات کے مطابق ان دونوں کے سر پہ ہاتھ پھیلا تھا، نگارش کو اندر سے خفت تو ہوئی تھی، لیکن یہ خفت اس نے ظاہر نہیں کی تھی، کیونکہ پتویشن ہی کچھ ایسی تھی کہ کچھ کہنا سننا ہی بے کار تھا۔

”راستہ دو۔“ انہوں نے ہنوز سامنے کھڑی زری کو پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا تھا، وہ فوراً ”پیچھے ہٹ گئی تھی اور اس کے پیچھے ہٹتے ہی ملک اسد اللہ مضبوط قدم اٹھاتے اندر آ گئے تھے۔ نگارش نے حیرت سے دروازے سے باہر دیکھا تھا، ان کے ساتھ کوئی سامان وغیرہ نہیں تھا۔ وہ خالی ہاتھ تھے اور اکیلے تھے حیرت کی بات تھی وہ پاکستان سے بغیر سامان کے آئے تھے؟

”بھابھی! زری نے خوف کے مارے نگارش کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا تھا، جسے کبھی نہ چھوڑنے کا ارادہ ہو۔“ ڈونٹ ویری! کچھ نہیں ہوگا، تم ان کے پاس چلو، میں عبد اللہ کو فون کر کے بتاتی ہوں۔“ نگارش نے زری کو پھکی دے کر تسلی دلائی تھی۔

”نہیں بھابھی۔ اب تو عبد اللہ بھائی بھی کچھ نہیں کر سکتے، بلکہ اب تو کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔“ زری کی آواز وہاں ہی ہو رہی تھی۔

”زری پلیز! اتنی جلدی حوصلہ مت ہارا کرو، یہ دنیا میں کبھی بھی کچھ بھی ہو سکتا ہے، یہاں ہر بات ہر

کام ہر سوچ ممکن ہے، یہ مت سوچو کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا، اسد بھائی بھی انسان ہیں، کوئی جن بھوت نہیں ہیں جو چند منٹوں میں ہی تمہیں اپنے بیٹوں میں دبوچ کر پاکستان لے جائیں گے، تمہیں پاکستان لے کر جانا ان کے لیے اتنا آسان ثابت نہیں ہوگا، بہت سے مراحل سے گزرنا ہوگا اور سب سے بڑی بات کہ تمہارا پاسپورٹ عبد اللہ کے پاس ہے اور بغیر پاسپورٹ کے لے کر جائیں گے تو خود ان پہ کیس بن جائے گا، اس لیے تم بے فکر رہو، تم محفوظ ہو، ان کے سامنے جاؤ اور ریلیکس طریقے سے بات کرو، بوکھلانے کی اور گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، یہ معاملہ تم نہیں عبد اللہ ہنڈل کریں گے، اس لیے تمہیں اس مسئلے پہ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی ڈرنے کی ضرورت ہے۔“ نگارش نے اسے ذرا سا ڈانٹ کے سمجھایا تھا اور زری کو اثبات میں سرہلاتے ہوئے اس کی بات ماننا پڑی تھی، لیکن اسد بھائی کے سامنے جانے کا حوصلہ اور ہمت پھر بھی نہیں ہو رہا تھا۔

”ایم سوری بھابھی۔ میں ان کے سامنے نہیں جاسکتی، مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے۔“ اس نے پھر بھی انکار کر ڈالا تھا۔

”اگر اتنی ہی ہمت تھی تو محبت جیسی آگ دہکانے کی کیا ضرورت تھی؟“ نگارش تلملا گئی۔

”بھابھی پلیز! آہستہ بولیے۔“ زری اور بھی گھبرا گئی۔

”تو پھر جاؤ اندر، ان سے کھانا۔ اور چائے وغیرہ پوچھو۔“ نگارش نے اسے اندر کی سمت دھکیلا۔

”مگر بھابھی وہ۔۔۔“

”زری! باگل ہو گئی ہو کیا؟ وہ اندر بیٹھے کیا سوچ رہے ہوں گے؟ اس طرح اکیلے بیٹھے بیٹھے تو انہیں اور بھی غصہ آئے گا، حالانکہ ہمیں تو ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔“ نگارش اسے ہر طرح سے سمجھا رہی تھی، لیکن وہ ابھی بھی ڈر رہی تھی۔

”تو پھر آپ میرے ساتھ آئیے۔“ زری نے نگارش کو بھی اپنے ساتھ گھسیٹا۔

”لیکن میں عبد اللہ کو فون تو کر لوں؟“

”بعد میں کر بیچے گا، پہلے اندر تو آئیے۔“ زری اپنی جگہ سے ہلنے کو بھی تیار نہیں تھی، اس لیے نگارش کو اس ساتھ ہی آنا پڑا، لیکن اپنا اعتماد بحال کرنے کے بعد۔

وہ دونوں ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں تو ملک اسد اللہ انہیں فون پہ کسی سے محو گفتگو دکھائی دیے تھے، ان کو اک نظر دیکھنے کے بعد وہ دوبارہ اپنی بات کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔

”وہ ابھی مصروف ہیں، تم یہیں ٹھہرو، میں عبد اللہ کو فون کر کے ابھی آتی ہوں۔“ نگارش نے کافی مدد ہم آواز میں سرگوشی کی اور زری کا ہاتھ چھوڑ کر پلٹ گئی۔

”ٹھہرو لڑکی۔“ نگارش کے عقب سے ان کی گرج دار آواز ابھری تھی اور نگارش کے قدم دبلیں پہ ہی رک گئے تھے۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی گھبرا گئی تھی۔

”واپس آؤ۔“ انہوں نے اسے واپس آنے کا حکم جاری کیا تھا۔

”جی کہیے؟“ نگارش عبد اللہ کے بڑے بھائی ہونے کے ناتے ان کا احترام کرتی ہوئی مودب سی آکھڑی ہوئی تھی۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے اسے فون کرنے کی، اسے خود آنے دو، آخر ہمیں بھی تو پتا چلے کہ اس کے آنے جانے کی روٹین کیا ہے؟ کتنی فکر رکھتا ہے وہ، بہن اور بیوی کا۔“ وہ غصے سے طنز بول رہے تھے۔

”وہ شام سات بجے آئیں گے۔“ نگارش نے اس کے آنے کا ٹائم پہلے سے بتا دیا۔

”اوہ اچھا! تو شام سات بجے واپس آتا ہے، چاہے اس کے پیچھے اس کی بہن اور بیوی جو جی چاہے گل کھلاتی

رہیں؟“ ملک اسد اللہ اپنے باپ کی طرح جب بولتے تھے تو اچھا برا کچھ بھی نہیں دیکھتے تھے بلکہ بولتے ہوئے تو ان کی سوچ بھی مفلوج ہو کے رہ جاتی تھی کہ کیا بولنا ہے اور کیا نہیں بولنا؟
”یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“ نگارش کو ان کی بات کوئی کی طرح کلی تھی وہ یک دم بلبلا اٹھی تھی۔
”مجھ سے دھیمی آواز میں بات کرو لڑکی میں کچھ غلط تو نہیں کہہ رہا اس انجان ملک اور انجان شرمیں دو جوان لڑکیاں گھر پہ اکیلی ہوں تو کبھی بھی کوئی بھی گھر پہ آسکتا ہے اگر میں آسکتا ہوں تو کوئی اور بھی آسکتا ہے۔ اور یہ بات ملک عبد اللہ نے شاید کبھی سوچی ہی نہیں ہے؟ ان کی بد مزاجی کا تو نگارش کو پتا تھا، لیکن وہ شکی مزاج بھی ہیں یہ ان کی باتوں سے اور طرز فکر سے ظاہر ہو رہا تھا۔

”نمبر ایک! میں کوئی ایسی ویسی لڑکی نہیں ملک عبد اللہ کی بیوی اور آپ کی بھانج ہوں میں اگر آپ سے دھیمی آواز میں بات کروں گی تو آپ کو بھی مجھ سے تمیز سے بات کرنا ہوگی“ نمبر دو“ آپ جب سے آئے ہیں غلط ہی تو کہہ رہے ہیں یہ ملک اور یہ شرم آپ کے لیے انجان ہو گا ہمارے لیے تو نہیں؟ ہم اس ملک اور شرم کے پاس ہیں یہاں دو جوان لڑکیوں کی بجائے اگر ایک جوان لڑکی بھی گھر پہ ہوگی تو کبھی بھی کوئی بھی گھر پہ نہیں آسکتا کیونکہ آنے والا بخوبی جانتا ہو گا کہ اس کا کیا حشر ہو گا؟ آپ کو بھی ہم نے خود آنے دیا ہے ورنہ میری ایک فون کال ہی آپ کو اس گھر اس شرم سے تو کیا اس ملک سے بھی نکلوا سکتی ہے آپ پانچ منٹ کے اندر اندر اس ڈرائنگ روم کی بجائے جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہوں گے اور نمبر تین وہ ہی بہنیں اور بیویاں مرد کے گھر سے جانے کے بعد گل کھلاتی ہیں جن کو پابند کر کے اور قید کر کے رکھا جاتا ہے جن پہ اعتماد نہیں کیا جاتا جن کو دنیا سے کاٹ کے دیواروں سے لگا دیا جاتا ہے لیکن اللہ کا شکر ہے کہ عبد اللہ ایسے نہیں ہیں انہیں بیوی پہ بھی اعتماد ہے اور بہن پہ بھی لہذا آپ کو اس حوالے سے فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے لیکن اس سب کے باوجود میرے لیے ایک بات بڑی اہم ہے کہ آپ عبد اللہ کے بڑے بھائی ہیں اس رشتے کے حوالے سے آپ میرے بھائی بھی ہیں اور جیٹھ بھی آپ کا احترام سر آنکھوں پہ جب تک عبد اللہ نہیں آجاتے آپ بیٹھے آرام کیجئے اور حکم کیجئے کہ آپ نے کیا کھانا ہے؟ تب تک میں آپ کے لیے چائے لے کر آتی ہوں۔“ نگارش بولنے پہ آئی تو کمال کر دیا تھا۔ زری حیرت زدہ تھی آنکھیں پھیلانے نگارش کو دیکھتی رہ گئی نگارش اتنی اسٹراٹجک تو کبھی بھی نہیں لگی تھی جتنی اس وقت لگ رہی تھی تو گویا زری کے مقابلے میں وہ کسی کے بھی سامنے ڈٹ جانے کا حوصلہ رکھتی تھی؟ ملک اسد اللہ نے جواباً ”ہوں۔ تو اس نمبر دو بیوی سے شادی کی ہے ملک عبد اللہ نے؟“ وہ زری لب طنزیہ سے لہجے میں بولے تھے۔
”نگارش بھابھی ایسی نہیں ہیں بہت اچھی ہیں وہ۔“ زری نے بھی اس کی طرف داری میں ذرا تاخیر نہیں کی تھی۔

”ہونہ! جتنی اچھی ہے میں دیکھ رہا ہوں اور ہاں ہمارے خاندان میں اسی عورت کو بھانج کہا جاتا ہے جو خاندانی ہو، اعلا حسب نسب کی ہو، اس کے آگے پیچھے بھرا برا خاندان ہو، ہم پہلہ اور ہماری نگر کی ہوئی جہاں سے ہماری ہو۔ کسی دو ٹکے کے خاندان کی دو ٹکے کی لڑکی ہماری ہو نہیں سکتی اور نہ ہی ہم اسے بھانج مانتے ہیں۔“ وہ پھر بولے تھے اور بنا سوچے سمجھے ہی بولے تھے۔ زری نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ انہوں نے ہاتھ اٹھا کے اسے روک دیا تھا۔

”بس بس۔ زیادہ طرف داری کرنے کی کوشش مت کرو ہم بنا کہے ہی سب کچھ جانتے ہیں۔“ ان کا لب و لہجہ نفارت لیے ہوئے تھا۔ جس پہ زری کو کافی تکلیف ہوئی تھی۔ لیکن دوبارہ بولنے کی جرات نہیں کر سکی تھی اتنے اس نگارش بھی چائے لے کر وہاں آچکی تھی۔

مسلل دو گھنٹے کی بھاگ دوڑ اور ڈاکٹر زکی ٹریٹ منٹ کے بعد صبح چھ بجے کے قریب اباجی کو ذرا سا ہوش آیا تو ان لوگوں کے دماغ ٹھکانے پہ آئے تھے آدھے گھنٹے بعد انہیں آئی سی یو سے ایمر جنسی وارڈ میں شفٹ کر دیا گیا تھا مریم تیزی سے آگے بڑھ کے ان کے سر پہ آنکھری ہوئی تھی وہ ان کا ہاتھ تھام کے ہاتھ سہلانے لگی۔
”آپ لوگوں کی قسمت اچھی تھی کہ آپ انہیں بروقت ہسپتال لے آئے ورنہ پندرہ منٹ یا آدھا گھنٹہ اور لیٹ ہو جاتے تو یہ انیک ان کی جان بھی لے سکتا تھا۔“ ڈاکٹر رضوی ان کا پی چیک کرنے کے بعد عدیل کے پاس آکھڑے ہوئے تھے۔

”اللہ کا شکر ہے جس نے کسی کو فرشتہ بنا کر ہماری مدد کے لیے بھیج دیا ورنہ۔“ عدیل ورنہ سے آگے کچھ کہہ ہی نہ سکا اس کا دھیان اچانک مدیہ کی طرف چلا گیا تھا جو انہیں اس مشکل وقت میں یہاں تک چھوڑنے آئی تھی لیکن پارکنگ میں اترنے کے بعد عدیل کو اس کا خیال ہی نہیں رہا تھا یہاں تک کہ اس کا شکریہ ادا کرنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی اور اب اس کا خیال آتے ہی عدیل کو اپنی سنگین ترین کوتاہی کا احساس ہوا تھا۔
”اوہ مائی گاڈ۔! یہ کیا غلطی ہو گئی مجھ سے؟“ عدیل سر پہ ہاتھ مارتا ہوا ڈاکٹر کو وہیں چھوڑ کے باہر کی سمت بھاگا۔
اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ ڈاکٹر رضوی کیا سوچیں گے۔ وہ ہسپتال کے طویل ترین احاطے سے بھاگتا ہوا پارکنگ تک آیا اور ادھر ادھر متلاشی انداز میں نظروں دوڑانے لگا۔

وہ لوگ رات تقریباً ساڑھے تین بجے یہاں آئے تھے اور اس وقت خاصا گہرا اندھیرا تھا ہر طرف الیکٹرک پول اور لیمپ پوسٹ روشن تھے لیکن اس وقت صبح کے چھ بجے کا وقت تھا دکھتا سورج فی الحال اپنی نوخیز کرنوں میں نرمیاں سمیٹے ہوئے انگڑائیاں لیتا ہے وار ہو رہا تھا۔ سورج کی ہلکی ہلکی کسمبسا ہٹ ماحول پہ اک عجیب سا سحر طاری کیے ہوئے تھے نئے دن کی شروعات ہو چکی تھی زندگی ایک بار پھر جاگ اٹھی تھی اور عدیل اس جاگے سوئے وقت میں نئے دن کی روشنیاں لے کر مدیہ حیات کو تلاش کرتا پھر رہا تھا جیسے یقین ہو کہ وہ اب بھی وہیں ہوگی۔ لیکن ہر طرف نظروں دوڑانے پہ بھی جب وہ کہیں نظر نہ آئی تو وہ مایوسی سے واپس مڑ گیا دل میں پشیمانی ہلکورے لے رہی تھی وہ سر جھٹکتا ہوا پارکنگ باؤنڈری سے نکل رہا تھا جب اچانک دائیں طرف نگاہ اٹھی اور وہ بے یقینی سے دیکھتا رہ گیا تھا۔

وہ اپنی گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑی چپ چاپ ادھر ادھر آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہی تھی اور عدیل اسے دیکھ کر بے ساختہ مسکرا اٹھا تھا۔ اس کے قدم مدیہ کی سمت اٹھنے لگے وہ کافی دور کھڑی تھی۔ لیکن عدیل کو بے حد قریب لگ رہی تھی اتنی قریب کہ عدیل کی سانسیں معطری ہو گئی تھیں۔ اس پاس کا سارا ماحول ہی مہک اٹھا تھا کسی دلکش سے جذبے نے سب کچھ مہکا کے رکھ دیا تھا۔ وہ مضبوط قدموں سے چلتا ہوا۔ اس کے سامنے آکھڑا ہوا تھا اور نظریں اس کے چہرے پہ جمادی تھیں۔

”اسلام علیکم۔“ عدیل کا لہجہ بھی کچھ اور ہی ہو رہا تھا۔ مدیہ نے چونک کر اپنے سامنے دیکھا اور اسے دیکھ کر دوبارہ نظریں ہٹا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی جیسے اس نے اس کی آمد کا کوئی نوٹس نہ لیا ہو۔

”ایم سوری۔“ وہ دوبارہ بولا مگر اب کی بار تو مدیہ نے دیکھا بھی نہیں تھا کہ وہ سوری کے کہہ رہا ہے۔
”دیکھیے میڈم۔! میں آپ سے مخاطب ہوں اپنی غلطی پہ معافی مانگتا ہوں“ آپ جو جی چاہے سزا دیں بندہ حاضر ہے۔“ اس نے ذرا سا سر خم کرتے ہوئے کہا تھا مدیہ نے اس کے جھکے ہوئے سر کو گھور کے دیکھا۔
”کیسی معافی۔؟ اور کیسی سزا؟“ اس کی طرح اس کا لہجہ بھی تیکھا تھا اور الفاظ بھی تیکھے تھے۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں؟

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سلیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ سپریم کوالٹی، ہارڈ کوالٹی، کمپیوٹر کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور این صفی کی مکمل ریٹخ
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

”اپنی پریشانی میں آپ کو ہمیں بھول گیا۔“ عدیل کی نظریں اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے اس کی گھٹی مڑی ہوئی سیاہ پلکوں پر کھمبے کی شخصیت کا تیکھا پس اس کی پلکوں سے بھی مچاں ہو رہا تھا۔

”مسٹر! میں کوئی بے جان چیز نہیں ہوں جسے آپ جہاں چاہے بھول جائیں۔“ وہ طنزیہ انداز میں چبا کر بولی

”اس وقت تو آپ مجھے بے جان چیز ہی لگ رہی ہیں جسے جہاں چھوڑ کے گیا تھا وہیں یہ ہے اگر جاندار ہوتی تو اپنی جان کا استعمال کرتے ہوئے یہاں سے وہاں ہو چکی ہوتی۔“ عدیل کا لہجہ دلچسپ اور متنبہم سا تھا مدحیہ نے یکدم سر اٹھا کے اسے دیکھا تھا وہ ڈائریکٹ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ مدحیہ کو اس کی آنکھوں میں اک لودنہا ہوا احساس اپنی سمت ہمکتا ہوا محسوس ہوا تھا تبھی وہ نظریں چرا کر اپنی جینز کی پاکٹ سے گاڑی کی چابی نکالنے لگی۔

”کہاں جا رہی ہیں؟ اندر نہیں چلیں گی۔؟ میرے ابا جی کو ہوش آچکا ہے۔ اور یہ سب آپ کی مہربانی سے ہی ہوا ہے۔“

”مہربانی جب بھی ہوتی ہے اوپر والے کی ہوتی ہے کوئی بندہ کبھی بھی مہربان نہیں ہوتا جب تک کہ اوپر والا نہ چاہے۔“

”ناشاء اللہ! ایسی باتیں بھی کر لیتی ہیں آپ؟“ عدیل کو مدحیہ سے ایسی بات کی توقع نہیں تھی اسی لیے کئے بغیر رہ نہیں سکا تھا۔

”کیا مطلب ہے آپ کا...؟“ وہ غصے سے اس کی سمت پلٹی۔

”مطلب کہ ایک بار پھر مجھ سے گستاخی ہو گئی۔ معافی چاہتا ہوں۔“ عدیل مسکراہٹ دباتے ہوئے بولا کیونکہ اس کے تیور خاصے جارحانہ تھے۔

”دیکھو مسٹر! میرے پاس معافی کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی اس لیے بہتر ہے کہ آپ اپنی بکواس اپنے تک ہی رکھیں۔“

”اوکے اوکے! اپنے تک ہی رکھوں گا، لیکن آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اس مسٹر کا ایک نام بھی ہے جسے لوگ ”عدیل عمر“ کہتے ہیں۔ اب آپ کی مرضی کہ آپ مجھے عدیل کہتی ہیں یا عمر۔؟“ عدیل نے مسکراتے ہوئے اسے اپنا نام بتایا تھا مدحیہ نے اسے استہزائیہ نظروں سے سرتاپا دیکھا تھا۔

”مجھے آپ کے نام سے کیا لینا دینا...؟“ وہ کندھے اچکا کے بولی۔

”لیکن مجھے تو آپ کے نام سے لینا دینا ہے نا، میڈم کہہ کہہ کے بوریٹ ہونے لگی ہے، پلیز یور گڈ نیس۔؟“

عدیل نے انتہائی عاجزانہ انداز میں اس کا نام پوچھا تھا جس پہ مدحیہ نے کافی تیکھی اور تیز نظروں سے اسے گھورا تھا۔

”آپ کو میرے نام سے کیا لینا دینا...؟“

”میڈم۔! ساری باتیں بتانے کے لیے نہیں ہوتیں، کچھ باتیں بس سمجھنے کے لیے ہوتی ہیں، آپ اپنا نام بتادیں میں کسی ایسی جگہ آپ کا نام لکھ دوں گا جو کورے کاغذ سے بھی زیادہ کوری ہوگی۔“ نہ جانے عدیل کس موڈ میں تھا کہ بے ساختہ ہی کہہ گیا تھا اور مدحیہ کے تیور اور بھی بگڑ گئے تھے۔

”کس خوش فہمی میں ہیں آپ۔؟“ وہ پھنکار کے بولی تھی جبکہ عدیل پھر بھی مسکرا دیا۔

”صرف اس خوش فہمی میں کہ جو انسان بے جان چیز بن کے میرے لیے اتنے گھٹنے ایک ہی جگہ پہ کھڑا رہ سکتا ہے تو اگر وہ جاندار بن جائے تو کیا ہوگا۔؟“ عدیل نے برملا اظہار کیا تھا۔

”شٹ اپ۔ جسٹ شٹ اپ! میں یہاں آپ کے لیے نہیں آپ کے فادر کے لیے کھڑی ہوں صرف اس لیے کہ شاید آپ کو دوبارہ کوئی کام پڑ جائے اور آپ کو دوبارہ ٹیکسی اور آٹو کے پیچھے نہ بھاگنا پڑے، لیکن یہاں تو میرا

خیال ہے کہ کسی کی مدد کرنا بھی محال ہے لوگ اپنے مطلب کے لیے ہمارا مطلب نکال لیتے ہیں۔ ”مدحیہ نے اسے جھاڑ کے رکھ دیا تھا۔

”طریقہ غلط ہو تو غلط مطلب ہی نکلے گا نامیڈم۔؟ آپ کو اگر میرے فادر کا اتنا ہی خیال تھا تو آپ کو اندر آکر ان کی خیریت پوچھنی چاہیے تھی، آپ کو پتا تھا کہ ان کی اتنی سیریس کنڈیشن ہے پھر بھی آپ آرام سے پارکنگ میں کھڑی ہیں اندر جانے کی بجائے واپس جا رہی ہیں تو میں اس چیز کو کیا سمجھوں۔؟ یہی نا کہ آپ میرے لیے میرے انتظار میں کھڑی تھیں۔؟ میں آیا ہوں تو آپ جا رہی ہیں۔؟ میرے فادر کی عیادت تو آپ نے پھر بھی نہیں کی؟“ عدیل نے جیسے شکوہ کیا تھا اور مدحیہ اس کی باتوں پر ایک بار پھر دھیمی پڑ گئی تھی۔

وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا اگر وہ یہاں اس کے فادر کے لیے کھڑی تھی تو اسے ان کے لیے اندر بھی جانا چاہیے تھا اگر وہ یہاں اتنا انتظار کرنے کے بعد بھی واپس پلٹ جاتی تو خود بخود ہی غلط مطلب نکل آتے، اس میں عدیل کی تو کوئی غلطی نہیں تھی۔ غلطی اس کی اپنی تھی جسے رفع کرنے کے لیے وہ سر جھکا کر ڈھیلے ڈھالے قدموں سے اس سمت چل پڑی جہاں سے عدیل اس کی طرف آیا تھا اور اسے ہسپتال کے اندرونی حصے کی سمت بڑھتے دیکھ کر عدیل بھی مسکراتے ہوئے اس کے ہمراہ ہو لیا تھا۔

پارکنگ سے ایمر جنسی وارڈ تک کا فاصلہ ان دونوں نے خاموشی سے طے کیا تھا دونوں ایک ساتھ اندر داخل ہوئے تو مریم کی نظریں ان دونوں پہ ٹھہری گئی تھیں وہ لڑکی جو بھی تھی لیکن عدیل کے ساتھ چلتی ہوئی بچ رہی تھی۔

”ہیلو۔“ مدحیہ نے قریب آ کے کافی آہستگی سے کہا تھا۔

”السلام علیکم۔“ مریم اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی تھی۔

”یہ مریم ہے میری چھوٹی بہن اور مریم یہ۔“ عدیل اس کا تعارف کرواتے ہوئے رک گیا تھا۔

”مدحیہ حیات۔“ مدحیہ نے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے اپنا تعارف کروایا اور عدیل اس کے نام پہ مسکرا دیا۔

”مدحیہ۔“ وہ زیر لب دہرا کے بولا اور پھر اباجی کے قریب جا کھڑا ہوا تھا وہ بھی مدحیہ کو ہی دیکھ رہے تھے نظروں کا تاثر سوالیہ سا تھا۔

”اباجی! ان کا نام مدحیہ حیات ہے عدیل بھائی کی دوست ہیں۔ رات ان کی گاڑی میں ہی آپ کو ہسپتال لے کر آئے تھے۔“ مریم نے قریب جا کے انہیں تفصیل سے بتایا تھا فاروق نیازی کے چہرے اور آنکھوں سے شفقت کا احساس ابھرا تھا جبکہ مدحیہ اور عدیل لفظ ”دوست“ پر ہی حیران اور جربز ہو رہے تھے۔

”السلام علیکم! کیسے ہیں آپ۔؟“ مدحیہ سر جھٹک کر ان سے مخاطب ہوئی۔

”سوری مدحیہ جی! یہ بول نہیں سکتے۔“ مریم نے آہستگی اور کافی دکھ سے کہا تھا جس پہ مدحیہ نے بری طرح چونک کر دیکھا تھا۔

”کیوں؟“

”کیونکہ یہ بیمار ہیں پیرالائز ہیں اور ان کی یہ کنڈیشن پچھلے چار سال سے ایسی چلی آرہی ہے۔“ مریم کا لہجہ بھیگ گیا تھا۔ اور مدحیہ جیسے دم بخود سی کھڑی رہ گئی اس نے کافی ششدر سے انداز میں مریم اور عدیل کے چہروں کی سمت دیکھا تھا۔

مریم چہرہ جھکائے اپنے آنسو پینے کی کوشش کر رہی تھی جبکہ عدیل ایک دم چپ کھڑا تھا جیسے اس کے پاس کہنے کو کچھ بھی نہ ہو۔ مدحیہ تو رات سے یہی سمجھ رہی تھی کہ اس کے اباجی کی ویسے ہی تھوڑی بہت طبیعت خراب ہوئی ہے تو ان شاء اللہ صبح تک ٹھیک ہو جائیں گے، لیکن وہ اذیت اور تکلیف کی کس اسٹیج پر ہیں۔؟ یہ تو وہ اس وقت

جان ہی نہیں پائی تھی۔ یہ تکلیف تھی یا زندگی بھر کا عذاب تھا۔؟ خود ان کے لیے بھی اور ان کے گھروالوں کے لیے بھی۔ چار سال کا عرصہ کچھ کم نہیں ہوتا۔ اور چار سال کسی کا ایسی تکلیف اور اذیت کو بھیلنا بھی کم نہیں تھا جس کو سوچ کر ہی مدحیہ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے اور دل و دماغ میں دکھ اور افسوس کی لہر دوڑ گئی تھی۔

”آپ کھڑی کیوں ہیں بیٹھیے نا۔؟“ مریم اپنے آنسو پوچھتے ہوئے اپنے آپ کو کافی حد تک سنبھال چکی تھی اور بیڈ کے قریب کھڑی مدحیہ کو بیٹھنے کا کہا تھا۔

”ایم سوری۔! مجھے ان کی تکلیف کا اس حد تک اندازہ نہیں تھا۔ میں تو سمجھ رہی تھی کہ معمولی سی طبیعت خراب ہے ان کے سینے میں تھوڑا بہت ہیں ہو رہا ہے تو یہ صبح تک ٹھیک ہو جائیں گے لیکن یہ سب تو۔“

مدحیہ حیرت زدہ سی بات اور زری چھوڑتے ہوئے خاموش ہو گئی تھی۔

”اٹس اوکے! پہلی بار دیکھنے پہ کسی کو بھی صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ خیر آپ پریشان نہ ہوں اللہ رحم کرے گا“

آپ بیٹھیے آرام سے بات کیجیے۔ آپ بھی رات سے ہمارے ساتھ ہی جاگ رہی ہیں ابھی تو ناشتا بھی کرنا ہو گا آپ نے۔؟“ مریم کافی نارملی بات کر رہی تھی یوں جیسے پہلے سے جان پہچان ہو جبکہ مدحیہ نے ناشتے کا سن کر بے ساختہ اپنے سیل فون سے ٹائم چیک کیا تھا پونے سات بجے کا وقت ہو رہا تھا گویا رات تمام ہو چکی تھی اور وقت کی رفتار گھوم پھر کے دوبارہ وہیں پہ آگئی تھی جب کل صبح وہ اپنے گھر سے نکلی تھی کل صبح شاید نو دس بجے کا ٹائم تھا اور اب صبح کے سات بج رہے تھے۔

”خیریت۔۔۔ کیا ہوا ہے۔؟ کچھ کہنا چاہتی ہیں آپ۔؟“

عدیل اس کے دیکھنے کا انداز سمجھ گیا تھا۔

”ہوں! آئی تھنک مجھے اب چلنا چاہیے۔“ ٹائم بہت ہو چکا ہے۔“ وہ مریم اور فاروق نیازی کو دیکھتے ہوئے عدیل سے مخاطب ہوئی تھی۔

”ایز پووش میڈم“ آئیے میں آپ کو پارکنگ تک چھوڑ آؤں۔“ عدیل اسے روک بھی تو نہیں سکتا تھا تبھی تو فوراً ”سرخم کر دیا تھا۔

”اوکے مریم جی! ٹانگس ٹومیٹ یو۔ اللہ حافظ انکل۔“ مدحیہ نارمل سے انداز میں کہتی ہوئی مریم سے ہاتھ ملا کر پلٹ گئی تھی۔

”آپ دوبارہ کب آئیں گی؟“ مریم نے شاید اپنے بھائی کے دل پہ لکھا سوال پڑھ لیا تھا جسے سن کر مدحیہ کے قدم یکدم ٹھم گئے تھے اس نے پلٹ کر مریم کو دیکھا۔

”نی الحال کچھ کہہ نہیں سکتی“ آپ کی یاد میں اثر ہوا تو ضرور آؤں گی“ مدحیہ اسے جواب دے کر ٹھہری نہیں تھی باہر نکل آئی اس کے پیچھے عدیل بھی لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا نکل آیا تھا۔

”ایک بات پوچھ سکتا ہوں آپ سے۔“ عدیل نے اس کے برابر چلتے ہوئے سنجیدگی سے کہا تھا مدحیہ نے چلتے چلتے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

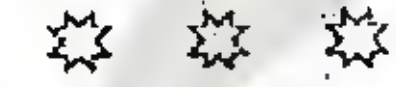
”پوچھیے۔“ اس نے اجازت دی۔

”رات کے دو بجے آپ تھما سڑکوں پہ کیا کر رہی تھیں؟“ عدیل کے ذہن میں رات سے دبا ہوا سوال اٹھ آیا تھا جس پہ مدحیہ کے قدم ٹھٹک کر رک گئے تھے اور پیشانی پہ ناگوار بل پڑ گئے اور اس کا انہی غصہ عمو کے سامنے آیا تھا۔

”میرا اور آپ کا ایسا کوئی تعلق نہیں ہے کہ آپ مجھ سے کوئی پرسنل سوال پوچھیں، میری ذرا سی نرمی سے شاید آپ اپنی حد بھول گئے ہیں، میں رات کے دو بجے تھما سڑکوں پہ کیا کر رہی تھی۔ یہ میرا اور میرے گھروالوں کا مسئلہ

ہے۔ آپ کو اس فکر میں ہلکان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، مجھے آپ سے؟ اس نے پل میں عدیل کو کھری کھری سنا ڈالی تھیں اور عدیل اس کے اس قدر جلدی بدلتے روپ کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا اس نے مزید کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی تھی عدیل اور کچھ کہتا بھی تو کیا کتا...؟ سوائے معذرت کرنے کے...!

”ایم سوری میڈم! میں واقعی پر سنل ہو گیا تھا یا پھر یہ کہنا چاہیے کہ میں آپ کی ذرا سی نرمی پہ اپنی اوقات اپنی حد بھول گیا تھا۔ جس یہ میں بہت شرمندہ ہوں۔ ایم ریسی سوری۔“ وہ معذرت خواہانہ لہجے میں معذرت کر رہا تھا اور مدحیہ اس پہ ایک نگاہ غلط ڈالے بغیر تنقادی ہوئی آگے بڑھ گئی تھی۔ اور عدیل وہیں راستے میں کھڑا رہ گیا مدحیہ نے پلٹ کر اسے دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی اپنی جینز کی پاکٹ سے چابی نکال کے لاک کھولا اور گاڑی نکال لے گئی تھی حالانکہ اسے خود بھی پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے؟



وہ دن بھر کی تھکن اور رات بھر کے رت جگمگ سے کافی بچھ سی گئی تھی لیکن اپنی ضد سے پیچھے نہیں ہٹ رہی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے ہی فائزہ بیگم کی بھی کال آئی تھی وہ اسے واپس آنے کے لیے واسطے دے رہی تھیں لیکن مدحیہ کی ایک ہی شرط تھی اور اس کی یہ شرط ماننا ان کے لیے مشکل تھا جبھی مدحیہ نے یکدم فون بند کر دیا تھا اور اپنے پیٹ کی بھوک کا بندوبست کرنے کے لیے ”آواری“ کا رخ کیا تھا۔

اس نے رات سے کچھ نہیں کھایا تھا اس لیے اس نے کافی ہیوی ناشتا آرڈر کیا تھا۔ اس نے ناشتا پوری رغبت سے کیا تھا بھی ناشتے کے بعد طبیعت فریش ہو گئی تھی لیکن ریسٹورنٹ سے نکل کر وہ اپنی گاڑی تک پہنچی ہی تھی کہ ساری فرہشیں ہوا ہو گئی گاڑی کالا کھولتے ہوئے اس کا سیل گنگنا رہا تھا اور جیسے ہی اس نے نمبر دیکھا اس کے ہونٹ پیچھے گئے تھے اور اعصاب میں تناؤ آگیا۔ کیونکہ کال کرنے والا دل آرزو شاہ تھا۔

”ہیلو! مدحیہ کی اتنی جرات نہیں تھی کہ اس کی کال ڈس کنیکٹ کرتی۔“

”دل آرزو شاہ بات کر رہا ہوں۔“ اس کے غصے کی لپک اس کی بات سے ہی ظاہر ہو گئی تھی۔

”جی! میں جانتی ہوں۔“

”صرف جانتی ہونا پہنچا جانتی نہیں ہو۔“

”پہنچا۔ بھی ہوں۔“

”تم اگر پہنچا جانتی تو پوری رات اور پورا دن گھر سے باہر نہ گزاریں؟ جس لاہور کی سڑکیں بھی دل آرزو شاہ کو سلام کرتی ہیں تم انہی سڑکوں پہ دل آرزو شاہ کا سر نیچا کرتی پھر رہی ہو۔“ وہ غصے اور غضب سے بھرا ہوا تھا۔

”میں نے ایسا کچھ نہیں کیا کہ آپ کا سر نیچا ہو۔“

”سٹ اپ مدحیہ جسٹ سٹ اپ! اپنی زبان کو لگام دو، تم جو کچھ کر چکی ہو، میرا سر نیچا کرنے کے لیے وہی کافی ہے۔“

”بھائی آپ کو چوٹ لگی ہے تو آپ کس قدر بلبلارہے ہیں؟ اسی طرح آپ میری چوٹ کا بھی توا اندازہ کیجیے۔“ وہ دبے لہجے میں چبا کر بولی تھی دونوں بہن بھائی کے میٹر گھومے ہوئے تھے۔

”تمہیں جو چوٹ لگی ہے وہ ہمیں بتاتی کیوں نہیں ہو۔؟“

”فسوس! میرے پاس وہ الفاظ نہیں ہیں جو میری چوٹ اور میری اذیت کو بیان کر سکیں، جس کے بعد یقیناً“

آپ بھی اور میرا معصوم اور سادہ لوح بھائی ٹیل بھی منہ چھپانے سے مجبور ہو جائیں گے، لیکن میں بیان کروں بھی تو کیسے؟ اسی لیے تو کہتی ہوں کہ اس شخص کے ہوتے ہوئے میں اس گھر میں نہیں رہ سکتی اگر میں وہاں رہی تو بہت

بڑا ہنگامہ ہو جائے گا۔“

وہ انتہائی نفرت اور حقارت سے بات کر رہی تھی۔

”دیکھو مدحیہ! میں نے اس وقت تم سے کوئی بحث کرنے کے لیے فون نہیں کیا بلکہ صرف یہ کہنے کے لیے فون کیا ہے کہ اگر تمہیں میری عزت اور میری غیرت کا ذرا سا بھی احساس یا کوئی پروا ہے تو تم جہاں کہیں بھی ہو ابھی اور اسی وقت گھر واپس چلی جاؤ۔ میں اگر خود لاہور میں ہوتا تو تمہیں اپنے گھر لے جاتا، لیکن تمہارا اکیلے گھر میں جانا بھی مناسب نہیں ہے۔ اس لیے تمہیں واپس اپنے گھر ہی جانا ہو گا۔ ٹیل تمہارا انتظار کر رہا ہے۔“ دل آور نے فیصلہ مدحیہ پہ چھوڑ دیا۔

”لیکن دل آور بھائی میں وہاں۔“

”میں نے تمہیں فورس کرنے کے لیے فون نہیں کیا بس یہ کہا ہے اگر تمہیں میری عزت اور میری غیرت کا ذرا سا بھی احساس ہے تو واپس گھر چلی جاؤ۔ نہیں تو آج کی رات بھی یا ہر سڑکوں پہ ہی گزار لینا، میں دوبارہ تمہیں کچھ نہیں کہوں گا،“ اوکے اللہ حافظ۔“ دل آور نے دو ٹوک لہجے میں کہتے ہوئے فون بند کر دیا تھا اور مدحیہ جوں کی توں کھڑی رہ گئی۔ دل آور شاہ ایک بھائی ہونے کے ناتے ہر بار اس کے آڑے آجاتے تھے اور وہ ان کی وجہ سے ہر بار بے بس ہو جاتی تھی اس وقت بھی اسے خون کے گھونٹ پی کر ہتھیار ڈالنے پڑے تھے۔



بڑی حویلی میں آج جیسے پر جوش سی بلچل مچی ہوئی تھی یکم جنریشن نے اک اودھم سا مچا رکھا تھا ساری تیاری افزا تقریر کے سے عالم میں ہو رہی تھی اور یہ افزا تقریر زیادہ تر لڑکیوں کو پلیٹ میں لیے ہوئے تھی۔ کوئی دوپٹہ میچ کر رہی تھی تو کوئی اپنے جوتے کسی کو سوٹ سے میچنگ بیگ چاہیے تھا، تو کسی کو میچنگ جیولری کی ضرورت تھی۔

انوشہ اور حرمت مبارک خان کو ساتھ لیے پارکیٹ گئی ہوئی تھیں انہوں نے اپنی کچھ ضروری شاپنگ کرنا تھی، کومل اور جویریہ کو بوٹی پارکر جانے کی ضرورت تھی اس لیے وہ دونوں جوڈت کے پیچھے پڑ گئیں حالانکہ جوڈت ہاتھ آنے والا نہیں تھا۔ لیکن اسے اپنی کومل آپا سے بڑی انیسیت تھی زیادہ دیر انکار نہ کر سکا اس لیے ہاتھ ہی بنی۔

”لیکن میرے پاس تو بایک ہے۔ آپ بایک پہ کیسے جائیں گی۔؟“

”تو کسی سے گاڑی لے لو نا۔“

”ایم سوری! میری ڈرائیونگ کے پیش نظر کوئی بھی مجھے اپنی گاڑی نہیں دیتا۔“ جوڈت شرارت سے ہنسا۔

”تو پھر؟“ کومل اور جویریہ پریشان ہو گئیں۔

”پھر یہ کہ گاڑی آپ مانگیں تو مل سکتی ہے۔“ جوڈت نے آنکھوں آنکھوں میں۔ آڈر کی سمت اشارہ کیا تھا جو باہر لان میں بیٹھا چائے پیتے ہوئے میگزین دیکھ رہا تھا۔

”میں مانگوں۔؟ کومل بدگ گئی۔“

”جانا بھی تو آپ نے ہے، بالوں کی کٹنگ، تھریڈنگ اور فیشل بھی تو آپ نے کروانے ہیں کون سا میں کروانے جا رہا ہوں۔“ جوڈت نے لا پرواہی سے کہتے ہوئے کندھے اچکائے تھے اور کومل یکدم تلملا گئی تھی۔

”تم بہت خبیث ہو جوڈت۔“

”جی! میں جانتا ہوں۔“ وہ اتنی سعادت مندی سے بولا کہ جویریہ سے مسکراہٹ دینا مشکل ہو گیا۔ ”جاؤ نا گاڑی مانگو ان سے۔“ کومل نے اشارہ کیا۔

اور کومل سر ہلا کر وہاں سے چلی گئی تھی، جو دت اور جویریہ پودوں کی اوٹ میں کھڑے کومل کو دیکھ کر ہنس رہے تھے۔

”یہ لوزیل انسان۔“ اس نے چابی اس کی ہتھیلی پہنچ دی۔
”لوزیل انسان نے آپ کی ملاقات کروادی اور کیا چاہیے آپ کو؟“ جو دت اسے چھیڑتا ہوا گاڑی کی سمت بڑھا تھا اور پھر انہیں ساتھ لیے گاڑی نکال لے گیا تھا۔ حویلی میں اب مدحت اُنیہ اور علیزے ہی رہ گئی تھیں۔

مدحت اور اُنیہ اپنے تمام ڈریسز ملازمہ سے پرئیں کروا کے بیگ میں رکھوا رہی تھیں اور ساتھ ساتھ اپنے ماسک اور مساج بھی جاری تھے جبکہ علیزے ان سب چیزوں سے بے نیاز تھی، اسے نہ تو کسی ماسک اور مساج کی ضرورت تھی اور نہ ہی بیولی پارلر کی اور اس کے ڈریسز بھی پہلے سے ہی اتنے موجود تھے کہ وہ مہینہ بھر بھی کہیں رہنے کے لیے جاتی تو روز نیا ڈریس زیب تن کر سکتی تھی، اس لیے باقی سب کے مقابلے میں وہ کافی ریلیکس اور سکون میں تھی، البتہ اسے اپنے ملازموں کا کافی خیال تھا، اس نے رجو کو پیسے دے کر شاپنگ کے لیے بھیجا ہوا تھا، لیکن کوشش کے باوجود اسے منصور حسین کہیں بھی دکھائی نہیں دیا اور اسی کو ڈھونڈنے کے خیال سے وہ باہر نکل آئی تھی۔

”السلام علیکم آذر بھائی۔“ علیزے آذر کو دیکھ کے وہیں چلی آئی تھی۔
”علیکم السلام! آؤ بیٹھو۔“ آذر کے چہرے پہ خوشگوار ہنس چھا گئی تھی۔
”آپ یہاں اکیلے کیوں بیٹھے ہیں؟“ علیزے اس کے مقابل والی کرسی پہ بیٹھ گئی۔
”میں اکیلا کب ہوں؟“ آذر نے دلچسپی سے مسکرا کے کہا۔
”کیا مطلب؟ کون ہے آپ کے ساتھ؟“

”میں۔“ علیزے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے حیران ہوئی، لیکن پھر اس کی بات سمجھ کر مسکرا اٹھی۔
”اوہ! تو آپ ابھی کی بات کر رہے ہیں؟“

”شاید۔“
”ہوں! لگتا ہے کافی خوش گوار موڈ میں ہیں؟“
”ہنڈرڈ پرسینٹ۔“ آذر نے اثبات میں سر ہلایا۔
”ریزن۔“ علیزے نے فوراً پوچھا۔
”وڈ آؤٹ ریزن۔“

”آئی کانٹ بلیواٹ۔“ وہ ماننے کو تیار نہیں تھی۔
”بلیوی۔“ آذر نے مسکرا کے کہا۔
”اوکے! بٹ۔“

”اینی وے سویٹ ہارٹ، تم یہ سب چھوڑو، یہ بتاؤ کہ کس کام سے آئی ہو۔“ آذر نے بات بدلی۔
”آپ سے ڈرائیور کا پوچھنے آئی تھی۔“

”کسی ڈرائیور کا؟“

”اے بے ڈرائیور کا۔“

”اوہ! منصور حسین کا؟“

”جی! اسی کا پوچھنے آئی ہوں، کہاں ہے وہ؟ صبح سے ڈھونڈ رہی ہوں؟“

”اُن سے۔۔۔؟“ جو دت نے آنکھیں مشکائیں۔

”ہاں! ان سے۔“ وہ زنج ہو چکی تھی۔

”توبہ کومل! آپا توبہ! میرے باپ دادا کی بھی توبہ میں اوکھلی میں سر نہیں دے سکتا، یہ کام کرنا ہے تو آپ نے خود ہی کرنا ہے، ورنہ میں گیا تو میری کلاس شروع ہو جائے گی، اس لیے پلیز۔“ اس نے کومل کو راستہ دیا۔
”مگر میں۔۔۔“

”یار! چلی جاؤ، پہلے ہی اتنا ٹائم ویسٹ ہو چکا ہے۔“ جویریہ ان کی بحث سے جھنجھلا اٹھی تھی۔

”جائیسے نا۔“ جو دت نے معنی خیزی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”کبھی نہ کبھی تمہیں بھی کوئی کام پڑ ہی جائے گا جو دت، لیکن دیکھنا تم سے بدلہ نہ لوں تو میرا نام بھی کومل آندی نہیں۔“ وہ اسے وارن کرتی ہوئی اپنا دوشہ شانے پہ درست کرتے ہوئے لان میں نکل آئی تھی۔

”السلام علیکم۔“ اس نے آذر کے قریب جا کے سلام کیا تھا۔

”والسلام۔“ آذر نے میگزین سے نظریں ہٹا کر کومل کی سمت دیکھا تھا۔

”آپ فارغ ہیں؟“ کومل کو پوچھتے ہوئے کافی جھجک محسوس ہوئی تھی۔

”جی! کیوں؟ خیریت؟“

”آپ نے کہیں جانا تو نہیں ہے۔“ اس نے ہمت کر کے اگلا سوال پوچھا۔

”فی الحال تو کوئی کام نہیں ہے، اس لیے ابھی کہیں نہیں جانا، آپ کو کوئی کام ہے کیا؟“ آذر حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”جی۔۔۔ وہ دراصل آپ کی گاڑی چاہیے تھی کچھ دیر کے لیے۔“

”وہ کس لیے؟“ اس نے بھنویں اچکا میں۔

”وہ ہم لڑکیوں نے بیولی پارلر جانا تھا۔“

”تو مبارک خان کہاں ہے اس کے ساتھ چلی جائیں۔“

”وہ حرمت اور انوشہ کو لے کر مارکیٹ گیا ہوا ہے، انہوں نے کچھ شاپنگ کرنی تھی۔“

”اوہ اچھا۔“ آذر کو چپ ہونا پڑا تھا۔

”ساتھ کون جا رہا ہے؟“

”جو دت۔“

”اوکے! آپ چابی لے جائیں، لیکن جو دت سے کہیے گا کہ گاڑی ہوش و حواس میں رہ کر ڈرائیور کرے۔“ آذر نے کہتے ہوئے سامنے ٹیبل پہ اپنے موبائل کے ساتھ رکھی کی چین اٹھا کر کومل کی طرف بڑھا دی۔

”تھینک یو، تھینک یو سوچ۔“ کومل چابی لے کر اس کا تھینکس کہتی ہوئی۔ پلٹ گئی۔

”کومل۔“ آذر نے پیچھے سے آواز دی۔

”جی! کومل جی جان سے واپس مڑی تھی۔“

”آپ کی طبیعت کیسی ہے اب۔“ اس کے پوچھنے پر کومل یکدم سٹپٹا گئی۔

”ٹھیک ہوں۔“

”انشاء اللہ بڑی جلدی ٹھیک ہو گئی ہیں۔“ وہ متبسم سے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

”تھوڑی دیر پہلے ٹیبلٹ لی تھیں۔“

”اوکے! اچھی بات ہے، جاسکتی ہیں آپ۔“ آذر نے نارمل سے انداز میں مسکراتے ہوئے اسے اجازت دی

”گاڑی سروس کروانے گیا ہوا ہے، تھوڑی دیر تک آجائے گا کوئی کام ہے کیا؟“
 ”نہیں! کچھ خاص کام نہیں ہے، بس اسے مارکیٹ بھیجنا ہے۔“ علیزے نے کندھے اچکائے۔
 ”تمہاری تیاری مکمل ہو گئی۔“

”نہیں پکنگ ابھی کرنی ہے، رجو مارکیٹ سے آئے گی تو پکنگ کر دے گی۔“
 ”نوہ منصور حسین بھی آگیا۔“ آذر کی نظریٹ کی سمت اٹھی تھی اور چمکتی دمکتی لشکارے مارتی مرسیڈز گیٹ سے اندر آرکی منصور حسین گاڑی سے اتر رہی تھا کہ آذر نے اشارے سے قریب بلا لیا تھا وہ بھاری قدم اٹھاتا سبز گھاس بوٹوں تلے روندتا ہوا ان کے پاس آکھڑا ہوا۔
 ”السلام علیکم صاحب۔“

”وعلیکم السلام! کہاں تھے تم؟“

”جی گاڑی سروس کروانے گیا ہوا تھا۔“

”تو اتنی دیر کیوں لگادی؟ دوسرے نکلے ہوئے ہو تم؟“

”گاڑی ورکشاپ چھوڑ کر اپنے گھر والوں سے ملنے چلا گیا تھا، اتنے دن ہو گئے تھے گھر گئے ہوئے کافی اداسی ہو رہی تھی ماں جی اور بابا جی بھی اداس تھے ان سے مل آیا ہوں تو خوش ہو گئے ہیں وہ کہہ رہے تھے یہ نوکری چھوڑ دو، جس میں تم ہمیں بھی بھول گئے ہو۔“ منصور حسین بتاتے ہوئے بھی اداس اور بو جھل بو جھل سا لگ رہا تھا۔ آذر چاہ کر بھی مزید کچھ نہ کہہ سکا، اتنے میں آذر کا سیل فون بج اٹھا تھا اور وہ کال انینڈ کرتا ہوا علیزے سے الیکس کیوز کر کے اٹھ کر لان کی دوسری سائیڈ پر چلا گیا تھا۔

”کیا تمہارے پاس نئے کپڑے نہیں ہیں؟“ علیزے نے پہلی بار منصور حسین کو سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا تھا، اس کے سستے سے بے رنگ کپڑے علیزے کی طبیعت کے خلاف تھے، وہ تو اپنے ملازموں کو بھی خوشبوؤں میں بنا ہوا دیکھتا چاہتی تھی، فریش اور تازہ دم، منصور حسین ویسے تو صاف ستھرا، دھلا دھلایا سا رہتا تھا، بس اس کے کپڑے پرانے اور بد رنگ سے تھے جن کو وہ ہر بار دھو کر پہنتا تھا، لیکن ان میں پھر بھی کوئی خاص چمک دمک نہیں آتی تھی۔

”تمیں بی بی جی! نئے کپڑوں کی کیا ضرورت ہے؟ تین جوڑے ہیں وہ ہی کافی ہیں، کل صاحب سے تنخواہ ملی تھی وہ آج اپنے گھر والوں کو دے آیا ہوں، ان شاء اللہ آئندہ تنخواہ ملی تو نیا جوڑا لینے کی کوشش کروں گا۔“
 ”یعنی نیا سوٹ لینے کے لیے مہینہ بھر انتظار کرو گے؟“

”جی، اتنا اور کیا کروں؟“ منصور حسین کے چہرے پہ تلخی مسکراہٹ بکھر گئی۔

”تم ایسا کرو کہ ابھی مارکیٹ جاؤ اور اپنے لیے کپڑے لے کر آؤ، پیسے میں تمہیں دیتی ہوں۔“ علیزے کی بات پر منصور حسین نے بری طرح چونک کر اپنی علیزے بی بی کی طرف دیکھا تھا کہ یہ عنایت بھلا کس لیے؟
 ”کپڑے؟“ منصور حسین کو یقین نہیں آیا تھا۔

”ہاں کپڑے! رجو کو بھی بھیجا ہے، وہ بھی اپنے کپڑے لینے گئی ہوئی ہے، تم بھی جا کر لے آؤ۔“ علیزے نے جانے کیا کہہ رہی تھی منصور حسین کے کچھ بے تمہیں پڑا تھا۔

”لیکن بی بی جی کپڑے کس لیے لینے ہیں؟“ وہ نا سمجھی سے پوچھ رہا تھا۔

”کیا کل بیچ کر پیسہ نہیں جانا؟“

”جی ہاں! جانا ہے۔“

”تو اسی لیے تمہیں اور رجو کو کہہ رہی ہوں تاکہ تم دونوں بھی نئے کپڑے لے لو، سب نے نئے کپڑے لیے ہیں!“

رجو بھی چلی گئی ہے، صرف تم رہ گئے ہو۔“ علیزے کو اب اپنے ڈرائیور کی فکر تھی کہ وہ نئے کپڑوں میں نہیں ہوگا تو برا لگے گا۔

”اوہ اچھا! تو اس لیے کہہ رہی ہیں آپ؟“ منصور حسین دھیمہ بڑ گیا تھا۔

”ہوں! آؤ میرے ساتھ۔“ علیزے کہتی ہوئی کرسی سے اٹھ کر آگے بڑھ گئی اور منصور حسین نے بے دلی سے قدم اس کے پیچھے ہی بڑھا دیے تھے۔

وہ آگے آگے چلتی ہوئی چھوٹے سے بل سے گزر کر لان کر اس کر کے مین ڈور کے سامنے والے حصے کی سیڑھیاں طے کرتی ہوئی اندر کوریڈور میں داخل ہوئی تھی اور منصور حسین بھی اس کے پیچھے آ رہا تھا۔ سیڑھیوں کے قریب جا کر علیزے ٹھہر گئی۔

”تم یہیں ٹھہرو، میں ابھی آتی ہوں۔“ وہ کہہ کے سیڑھیاں چڑھ گئی اور منصور حسین وہیں کا وہیں اسٹیجیوں کے کھڑا ہو گیا تھا، لیکن ابھی چند سیکنڈ گزرے ہی تھے کہ وقار آفندی اور عائشہ آفندی دونوں بہن بھائی ڈرائنگ روم سے نکلتے ہوئے دکھائی دیے تھے۔

منصور حسین وقار آفندی کے ساتھ چلتی سا رہ اور نفیس سے لباس میں ملبوس اس خوب صورت اور گرلیں فل سی عورت کو دیکھ رہا تھا، جس سے بات کرتے ہوئے وقار آفندی کے چہرے پہ شفقت اور ملائمت بالکل اسی طرح پھیلی ہوئی تھی جیسے علیزے سے بات کرتے ہوئے ان کی پوری شخصیت پہ طاری ہو جاتی تھی، وہ عورت جو بھی تھی اس کی شخصیت بھی وقار آفندی سے کم نہیں تھی، ان کی تمکنت ان کا وقار ان کی چال ڈھال سے ہی جھلک رہا تھا۔

”یہ یقیناً بڑے صاحب کی بہن ہوں گی؟“ منصور حسین نے دل ہی دل میں اندازہ لگایا۔

”سلام صاحب۔“ اتنے میں وہ دونوں قریب آچکے تھے اس لیے منصور حسین کو فوراً سلام کرنا پڑا۔

”والسلام! تم یہاں کیوں کھڑے ہو؟“

”وہ علیزے بی بی نے بلایا تھا۔“

”کیوں؟“

”شاید کہیں بھیجنا ہے۔“

”اوہ اچھا اچھا! اس نے تمہیں کپڑے لینے کے لیے بھیجنا ہوگا؟ صبح سے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔“ وقار آفندی کو جیسے یاد آگیا تھا۔

”جی! شاید اسی لیے۔“ منصور حسین نے سر ہلایا۔

”ہوں! ٹھیک ہے، لیکن گاڑی سروس کروائی تم نے؟“

”جی! کروائی ہے۔“

”سامان وغیرہ چیک کیا؟“

”نہیں صاحب! سامان رات کو چیک کروں گا اور رات کو ہی رکھ لوں گا۔“

”ہاں! یہ بھی ٹھیک ہے۔“ وہ بھی اس کی بات سمجھ چکے تھے کہ ایسا کام سب کے سامنے کرنا ٹھیک نہیں وہ رات کو ہی سب کچھ کر لیتا تو ہی ٹھیک ہوگا۔

”اور ان سے ملو، یہ علیزے کی اکلوتی پھوپھی اور ہماری اکلوتی، ہمیشہ ہنس، عائشہ آفندی، یہ بھی ٹرپہ ساتھ جائیں گی، ان کا بھی خیال رکھنا۔“ منصور حسین نے چونک کر دیکھا تھا اس کا اندازہ درست ثابت ہوا تھا وہ وقار آفندی کی بہن ہی تھیں۔

”سلام بیگم صاحبہ۔“ اس نے مرعوب سے انداز میں سلام کیا، حالانکہ وہ مرعوب ہوتا نہیں تھا۔

”والسلام! کون ہے یہ؟“ عائشہ آفندی نے وقار آفندی کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”علیزے کا ڈرائیور ہے، منصور حسین۔“ انہوں نے سرسری سا بتایا۔

”منصور حسین؟“ عائشہ آفندی نے زیر لب دہراتے ہوئے اسے سر تپا دیکھا تھا وہ واقعی کرنل جوان مروت تھا وہ کتنا بہادر اور کتنا مضبوط تھا یہ اسے دیکھ کر ہی احساس ہو جاتا تھا، لیکن پھر بھی آنکھیں اور گردن جھکائے کھڑا تھا۔

”ڈرائیور! یہ لو پیسے۔“ علیزے کی مداخلت پہ تینوں نے چونک کر دیکھا تھا۔

”پیسے؟“ منصور حسین کی تنخواہ کے علاوہ پیسے لینا ہمیشہ ہی عجیب لگتا تھا اس کا ضمیر ہی گوارا نہیں کرتا تھا کہ کوئی اس پہ ترس کھائے یا ہمدردی کرے۔ وہ بس محنت کر کے کھانے پہ خوش ہوتا تھا اس کے لیے یہ ہی کافی تھا کہ صاحب نے اسے نوکری دے دی ہے۔

”ہاں! جاؤ جا کر اپنے کپڑے لے آؤ۔“ علیزے نے اسے پیسے تھماتے ہوئے کہا، منصور حسین نے وقار آفندی کو دیکھا۔

”ہاں! منصور حسین رکھ لو اور جا کر کپڑے خریدو، تمہارے کپڑے خاصے پرانے ہیں۔“ انہوں نے بیٹی کی ہاں میں ہاں ملائی۔

”ٹھیک ہے صاحب اور بی بی جی مہربانی آپ کی۔“ وہ سر ہلا کر کتا ہوا ان تینوں کو اللہ حافظ کہہ کے کوریڈور کی طرف بڑھ گیا تھا اور علیزے نے مطمئن سی ان کے ساتھ باہر نکل آئی۔

”گڈ مارننگ ڈیڈ۔“ وقار آفندی اس وقت ڈائننگ ہال میں عون اور عدید کے ساتھ اکیلے بیٹھے باتیں کر رہے تھے جب آؤر بھی چلا آیا تھا۔

”مارننگ مائی سن مارننگ! آؤ بیٹھو۔“ انہوں نے اپنی بائیں سائیڈ والی کرسی کی سمت اشارہ کیا تھا، کیونکہ دائیں سائیڈ پہ عون اور عدید بیٹھے ہوئے تھے۔

”بائی سب کہاں ہیں؟“ آؤر کو صبح صبح ڈائننگ ہال میں پھیلے سناٹے پہ حیرت ہوئی تھی۔

”سب اپنی اپنی تیاری کو فائنل ٹچ دے رہے ہیں۔“ عدید نے شرارت سے جواب دیا تھا، جس پہ وقار آفندی اور آؤر بے ساختہ ہنس پڑے تھے۔

”گڈ مارننگ ڈیڈ۔“ گوئل کی آواز پہ ان چاروں نے بیک وقت سر اٹھا کر ڈائننگ ہال کے داخلی دروازے کی سمت

دیکھا، وائٹ اور فیروز بی بارڈر والی وائٹ لائٹ شرٹ اس کے پاؤں کو چھو رہی تھی، لائٹ سے میک اپ اور جیولری کے ساتھ اس کی تیاری بھی کمال کی تھی، آؤر نے سرسری سا ہی لیکن اسے سر تپا دیکھا تھا اور گوئل کی کھڑے کھڑے ہی اپنی تیاری پہ کی گئی محنت وصول ہو گئی تھی۔

”سیم ٹوبیٹا! بیٹھو نا، ناشتا کرو۔“ انہوں نے آؤر کے برابر والی کرسی کی سمت اشارہ کیا، لیکن وہ اس کے برابر بیٹھنے کی ہمت نہیں رکھتی تھی اس لیے عون اور عدید کے برابر بیٹھ گئی۔

”گڈ مارننگ۔“ جووت نے اندر داخل ہوتے ہوئے بلند آواز سے کہا۔

”گڈ مارننگ ڈیڈ۔“ احمد اور حماد بھی چلے آئے۔

”گڈ مارننگ ڈیڈ۔“ حرمت، مدحت، جویریہ اور انیہ بھی ایک ساتھ اندر داخل ہوئی تھیں، رفتہ رفتہ پورا ہال فل ہو گیا۔ اسرار آفندی اور ثروت بیگم بھی آپکے تھے، البتہ ثروت بیگم اور اظہار آفندی گھر پہ نہیں تھے۔ وہ کراچی گئے ہوئے تھے۔

”گڈ مارننگ بابا۔“ اتنی بہت ساری آوازوں میں علیزے کی نرم سی آواز ابھری تو ساری آوازیں ختم گئی تھیں۔

”ارے بابا کا بیٹا، بابا کا جانو، آگیا۔“ وقار آفندی نے بازو دکر دیے تھے، آج علیزے گھر سے باہر جا رہی تھی اس لیے ان کا انداز ان کا لہجہ بے حد دلہانہ سا تھا۔ علیزے ان کے سینے سے لگ گئی۔

”بس کریں بابا! علیزے آپ کی اکیلی تو نہیں جا رہی؟ باقی سب بھی تو جا رہے ہیں۔“ عون نے انہیں ٹوکا۔

”باقی سب تو نہیں نہ کہیں جاتے ہی رہتے ہیں، لیکن میرا بچہ تو پہلی بار جا رہا ہے۔“ وقار آفندی نے اس کی پیشانی چومتے ہوئے کہا۔

”تو پھر آپ اپنے بچے کو یا تو گھر پہ رکھ لیں یا پھر خود ساتھ چلے جائیں۔“ آسیہ آفندی نے بھی خفگی سے مداخلت کی تھی، جس پہ وہ سب ہنس پڑے تھے اور اسی ہنس مذاق میں انہوں نے ناشتا کیا اور روانگی کے لیے اپنی گاڑیوں تک پہنچ گئے۔

جانے سے پہلے وقار آفندی نے رجو اور منصور حسین کو بلا کر ایک بار پھر ہدایات جاری کی تھیں اور تب ان سب کو رخصتی کا پروانہ دیا تھا وہ سب اپنا اپنا سامان پہلے ہی گاڑیوں میں رکھوا چکے تھے اس لیے سب سے مل کر اپنی اپنی گاڑیوں میں آ بیٹھے تھے۔ البتہ وقار آفندی، علیزے کو خود گاڑی تک چھوڑنے آئے تھے۔ وہ رخصت ہوئی تو وہ اندر گئے تھے۔

چار گاڑیوں پہ مشتمل یہ قافلہ انجان اور ان دیکھی منزل کی سمت گامزن تھا، سب سے آگے علیزے کی گاڑی تھی، جس میں منصور حسین، رجو اور علیزے تھے، اس کے پیچھے آؤر کی گاڑی تھی، جس میں وہ چاروں بہن، بھائی تھے، آؤر، جووت، حرمت اور مدحت۔ ان کے پیچھے احمد کی گاڑی تھی، جس میں وہ پانچوں بہن، بھائی موجود تھے۔ احمد، حماد، گوئل، جویریہ اور انیہ، اور سب سے آخر میں دانیال کی گاڑی تھی، جس میں دانیال، زین، انوشہ اور ان کی والدہ محترمہ عائشہ آفندی تھیں۔

عائشہ آفندی اکثر بیمار رہتی تھیں، جس کی وجہ سے ڈاکٹرز اکثر ہی انہیں آپ وہاں تبدیل کرنے کا مشورہ دیتے تھے، لیکن وہ اپنے بھائیوں کے اصرار کے باوجود بھی کبھی شہر سے باہر نہیں گئی تھیں، لیکن اس بار جب سب بچوں نے ہالی وڈز منانے کا پروگرام بنایا تو وقار آفندی نے باقاعدہ انہیں بلا کر ساتھ جانے کا مشورہ دیا تھا اور اس بار چاہتے

ہوئے بھی وہ انکار نہیں کر پائی تھیں کہ اب وہ اکیلی نہیں تھیں سب بچے ساتھ تھے اور یہ ہی احساس ان کی طبیعت کو اور بھی تازگی بخش گیا تھا وہ ساتھ چلنے کے لیے مان گئی تھیں اور اب انجوائے بھی کر رہی تھیں اور انجوائے تو علیزے بھی کر رہی تھی جیسے ہی گاڑی لاہور کی ہنگامہ خیز سڑکوں سے نکل کر موٹروے پہ آئی تو ان سب کی طبیعت پہ خوش گوار سا اثر پڑا تھا۔

”علیزے بی بی۔“ رجو نے بے ساختہ اسے مخاطب کیا تھا۔

”ہوں۔“ علیزے گاڑی سے باہر کے مناظر و منظر سے دیکھ رہی تھی۔

”آپ پہلی بار مری جا رہی ہیں؟“ رجو کو چپ بیٹھنا عذاب لگ رہا تھا۔ جب ہی بولنے کے لیے راستے نکالا۔

”ہاں پہلی بار جا رہی ہوں۔“ علیزے نے اثبات میں جواب دیا ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھا ڈرائیو کرتا منصور حسین ان دونوں کے سوال جواب یا آسانی سن رہا تھا۔

”تو آپ پہلے کبھی کیوں نہیں گئیں؟ حالانکہ امیر لوگوں کے بچے تو ہمیشہ گرمیوں میں ہالی ڈیز منانے مری ضرور جاتے ہیں؟“ رجو کو سب پتا بھی تھا پھر بھی حیرت کا اظہار کر رہی تھی۔

”وہ امیر لوگوں کے بچے ہوتے ہیں بڑی حویلی کے نہیں۔“ رجو علیزے کے جواب پہ متاثر تو ہوئی، لیکن چپ نہیں ہو سکی۔

”بے شک بڑی حویلی کے بچوں پہ پابندی ہے، لیکن علیزے بی بی آپ پہ تو کوئی بھی پابندی نہیں ہے آپ تو ہر جگہ جاسکتی ہیں۔“

”ارے! تمہیں کس نے کہا کہ مجھ پہ کوئی پابندی نہیں ہے؟ مجھ پہ جتنی پابندیاں ہیں کبھی میرے پیلا سے تو پوچھو وہ ہی تمہیں بتائیں گے۔“ علیزے کو رجو کی کم عقلی پہ حیرت ہو رہی تھی۔

”لیکن علیزے بی بی! وہ پابندی تو نہ ہوئی نا؟ وہ تو احتیاط ہے بڑے صاحب کو پتا جو ہے کہ آپ ذرا اسی بات کا اثر لے لیتی ہیں طبیعت خراب ہو جاتی ہے آپ کی نازک مزاجی کے لیے ہی تو احتیاط کرتے ہیں وہ؟“

”مجھے نازک مزاج بھی تو انہوں نے ہی بنایا ہے نا۔“ علیزے ہلکے سے مسکرائی تھی اور رجو کے ساتھ ساتھ منصور حسین نے بھی دل ہی دل میں اس کی بات کی تائید کی تھی منصور حسین کو کچھ ہی عرصہ ہوا تھا اس حویلی میں آئے ہوئے، لیکن وہ اس کچھ ہی عرصے میں جان چکا تھا کہ اس پوری حویلی میں جو اہمیت علیزے بی بی کی ہے وہ کسی اور کی نہیں ہے اس کا رہن سہن شہزادیوں سے کم نہیں تھا۔ وہ بڑی حویلی کی ریاست کی شہزادی تھی اور شہزادیوں کی سی زندگی گزار رہی تھی منصور حسین کو کبھی کبھی بڑی حیرت ہوتی تھی کہ اس چھوٹی سی لڑکی میں آخر ایسا کیا تھا جو اسے باقی سب سے ممتاز اور منفرد بنا رہا تھا۔

شاید یہ کہ وہ وقار آفندی کی بیٹی تھی، لیکن وقار آفندی کے دو بیٹے بھی تو تھے، انہیں تو کبھی ایسا پروٹوکول نہیں ملا تھا جیسا علیزے کو ملتا تھا۔ یا پھر یہ کہ وہ سب کزنز سے چھوٹی تھی، لیکن نہیں بات تو پھر وہیں پہ آ جاتی تھی کہ چھوٹے تو عون اور عدید بھی تھے جو علیزے سے بھی چھوٹے تھے اور ایسے ناز خیز تو کبھی ان کے بھی نہیں اٹھائے گئے جیسے ہر روز علیزے کے اٹھائے جاتے تھے؟ یا پھر یہ کہنا چاہیے کہ اس سارے پروٹوکول کی وجہ اس کی حد درجہ خوب صورتی تھی ایسی خوب صورتی جو منصور حسین نے اپنی اچھلتی سالہ زندگی میں آج تک نہیں دیکھی تھی، بلکہ جو دیکھی تھی وہ ساری خوب صورتی ایک طرف اور علیزے آفندی کی خوب صورتی ایک طرف تھی، بلکہ پھر بھی دیکھا جاتا تو علیزے کے حسن کا پلڑا بھاری ہی رہتا کیونکہ وہ بلا شک و شبہ ایک حسین ترین لڑکی تھی۔ اس کی دودھیار نگت سے لے کر زعفرانی ہونٹوں تک دلکشی کی ہماریں سجدہ ریز ہوتی نظر آتی تھیں اس کے معصوم رخساروں پہ کئی دلوں کی دھڑکنیں بوسہ دیتی تھیں اور کئی دل اس کی نوک پلک پہ ٹھہرتے تھے، شیشے سی

شفاف آنکھوں میں کوئی اپنا عکس دیکھ لیتا تو اپنی دنیا ہار دیتا اور اسی دنیا کے خوف سے وقار آفندی اسے چھپا کے سنبھال سنبھال کے رکھتے تھے اور اسے دیکھ کر یہ اعتراف کرنا پڑتا تھا کہ واقعی وہ ایسی چیز تھی جس کی حفاظت کرنا ضروری تھا اور یہ بھی ضروری تھا کہ اسے سینت سینت کے رکھا جاتا اور الگ پروٹوکول دیا جاتا، لیکن حیرت کی بات تھی کہ اس بار وقار آفندی نے اسے چھپا چھپا کے رکھنے کی بجائے سب کے ساتھ ٹرپ پہ بیٹھ دیا تھا۔

”تو پھر صاحب نے آپ کو ٹرپ پہ کیوں بیٹھ دیا؟“ منصور حسین کے ذہن میں آئے سوال کو رجو نے زبان دے دی۔

”وہ تو اب بھی نہیں بھیج رہے تھے بس میں نے تھوڑی ضد کی اور تھوڑا آڑ بھائی نے ساتھ دیا تو مجبوراً انہیں ماننا پڑا۔“ علیزے کی ایک اور بڑی خولی تھی کہ وہ حد سے زیادہ معصوم اور سادہ تھی، نیک نیت اور صاف دل لڑکی تھی رجو کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے بھی اس کی معصومیت ہنوز تھی۔

”بڑے صاحب آپ سے پیار بھی تو بہت کرتے ہیں، ان کی توجہ ان ہے آپ میں۔“ رجو نے مسکرا کے کہا تھا۔

جواباً علیزے بھی مسکرائی۔

”میری بھی جان ہے ان میں، ان جیسا باپ کوئی ہو ہی نہیں سکتا، وہ ہیں تو میں ہوں، میرے پیلا میرا فخر ہیں۔“ علیزے کے چہرے پہ محبت کے سائے اتر آئے تھے اور وہ بے ساختہ اپنا ٹیل فون اٹھا کر انہیں شیش لکھنے لگی اور پھر ”آئی مس یو اور آئی لویو“ کے کئی مسج ایک ساتھ وقار آفندی کے نمبر پہ سینڈ کر ڈالے تھے، جن کے فوری بعد ان کی کال آگئی تھی۔

”رسکی پیلا! میں پہلی بار شہر سے باہر جا رہی ہوں، بہت عجیب بھی لگ رہا ہے اور بہت اچھا بھی، لیکن اس کے باوجود میں آپ کو بہت مس کر رہی ہوں، ابھی رجو کے ساتھ بھی آپ کی ہی باتیں کر رہی تھی۔“ علیزے شاید پہلی بار اتنے جوش سے بول رہی تھی، دوسری طرف وقار آفندی ہنس رہے تھے کہ ان کی بیٹی کو باہر جا کر بولنا آگیا ہے۔

”آئی لویو پیلا۔“ علیزے نے بے ساختہ اظہار کیا تھا اور اس کے ایسے رجوش سے انداز پہ منصور حسین نے بلا ارادہ ہی اسے بیک ویو مرر سے دیکھا تھا، وہ بے پناہ خوش تھی اور کچی خوشی کے رنگ اس کے پورے چہرے پہ بکھرے ہوئے تھے۔

”اللہ نظر بد سے بچائے۔“ منصور حسین نے دل ہی دل میں کہتے ہوئے گاڑی کی اسپید بڑھادی تھی، کیونکہ آؤر پیچھے سے ہارن پہ ہارن دے رہا تھا۔



”نگارش۔۔۔ نگارش۔۔۔ کہاں ہو؟ یہ دروازہ کیوں کھلا ہوا ہے؟“ شام سات بجے عبد اللہ گھر آیا تو گھر کا دروازہ خلاف معمول کھلا ہوا ملا تھا۔ جس پہ اسے اچھی خاصی تشویش ہوئی تھی۔

”نگارش۔۔۔“ وہ نگارش کو پکارتا ہوا آ رہا تھا۔

”کہاں ہو تم؟ اور یہ دروازہ؟“ جیسے ہی عبد اللہ نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھا تھا اس کی زبان کو بریک لگ گئے تھے۔ کیونکہ سامنے کا منظر ہی کچھ ایسا تھا نا قابل یقین۔

ملک اسد اللہ اپنی سختی اور جاہ جلال سمیت سامنے ہی صوفے پہ براجمان تھے اور ان کے مقابل والے صوفے پہ زری اور نگارش خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی تھیں، یوں جیسے انہوں نے باندی بنا کے بٹھا رکھا ہو۔ لیکن اس ساری سچویشن سے ہٹ کے عبد اللہ مرو تھا، مضبوط اعصاب کا مالک اس نے چند سیکنڈ میں ہی اپنے تمام تاثرات

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹنج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سلیشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں ایلوڈنگ
- ✧ سیریم کوالٹی، مارل کوالٹی، کمپریڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریٹنج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

کور کر لیے تھے وہ کوئی بھی گھبراہٹ اور بوکھلاہٹ ظاہر کر کے انہیں خود پہ حاوی ہونے کا موقع فراہم نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے سمجھ داری کا ثبوت دیتے ہوئے اس نے حیرت کے باوجود بھی اپنی حیرت ظاہر نہیں کی تھی بلکہ ایک دم پرسکون اور مطمئن سا نظر آنے لگا تھا تب ہی قدم آگے بڑھا دیے تھے۔

”والسلام علیکم۔“ وہ اس سے بغل گیر ہونے کے لیے نہیں اٹھے تھے، بس ہاتھ ملا کر مصافحہ کرنے پہ اکتفا کیا تھا۔

”والسلام! کیسے ہو؟“

”اللہ کا احسان ہے، ٹھیک ٹھاک ہوں، آپ سنائیں آج ہمارے غریب کدے کو رونق کیسے بخش دی؟“

عبداللہ بریف کیس ٹیبل پہ رکھ کے صوفے پہ بیٹھ چکا تھا۔

”بس پاکستان میں گرمی اور لوڈ شیڈنگ ہو رہی تھی اس لیے سوچا ہم بھی ذرا انگلینڈ کی فضاؤں سے لطف اٹھا لیں۔“ وہ صوفے کے پتے پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے تھے۔

”اور یقیناً آپ نے ابھی تک انگلینڈ کی فضاؤں سے لطف نہیں اٹھایا ہو گا؟“ عبداللہ خفیف سا مسکرایا تھا۔

”اٹھائیں گے ہمارے لطف اٹھائیں گے، پہلے تم لوگوں سے مل ملا تو لیں۔“ ان کا انداز مبہم سا تھا۔

”اوکے! ملتا بھی ہوتا رہے گا، پہلے آپ یہ بتائیں کہ کھانا وغیرہ کھایا آپ نے؟“ عبداللہ ساری باتیں چھوڑ کے مسمان نوازی پہ اتر آیا۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے کھانے کی، کھانا ہم وہیں سے کھائیں گے جہاں سے پچھلے دو دن سے کھا رہے ہیں۔“ انہوں نے انکار کر دیا تھا۔

”یعنی آپ کو یہاں آئے ہوئے دو دن ہو گئے ہیں؟“ عبداللہ نے پوائنٹ کی بات نوٹ کی تھی۔

”بالکل۔“

”تو دو دن پہلے کیوں نہیں بتایا آپ نے؟“

”بس کوئی ضروری کام نمٹانا تھا۔“

”تو نمٹ گیا کام؟“

”ایک نمٹ گیا ہے اور ایک رہ گیا ہے۔“ انہوں نے کہتے ہوئے نظریں زری پہ جما دی تھیں اور عبداللہ ان کی بات اور ان کی نظروں کا مفہوم با آسانی سمجھ گیا تھا۔

”جو رہ گیا ہے اسے رہنے ہی دیں۔“

”کیوں؟ آخر کیوں رہنے دیں؟“

”کیونکہ اسی میں آپ کی بھلائی ہے۔“ عبداللہ نے کھلم کھلا انہیں دھمکی دی تھی اور ان کا بیٹھے بیٹھے خون کھول اٹھا تھا وہ ایک دم دھاڑاٹھے تھے۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ کریں)

✧ ✧

بسی ہارنا نہیں سیکھا اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔

۱۶
سولہویں قسط



نئی سلسلہ عزیز

دول

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدھیہ اور نبیل حیات دینی بہن بھائی ہیں مدھیہ انتہائی بڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل حوریہ رنگ چکی ہے جس کے پیش نظر فائزہ بیگم نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں لیکن مدھیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پینپ رہا ہے۔

عذیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا بے بسی اور مجبوری سے تنگ آخر خود کشی کرنے کا سوچتا ہے لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باؤ اختیار مل جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے جس پر عذیل کافی خوش ہوتا ہے اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میسرک پاس آدمی ہے وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل اور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے وہ اپنے قول و فعل کا بہت ریکا آدمی ہے اس نے



تم ہمیں دھمکی دے رہے ہو ہمیں۔۔۔؟ ملک اسد اللہ کو؟ ان کی بلند اور گرجدار آواز درو دیوار ہلا دینے کی پوری صلاحیت رکھتی تھی لیکن اس وقت تو ان کی آواز نے درو دیوار کے ساتھ ساتھ زری اور نگارش کو بھی ہلا گئے رکھ دیا تھا، کیونکہ ان کی خوشخوار آنکھوں میں حقیقتاً ”خون اتر ا ہوا تھا وہ تو جیسے ان تینوں کو اپنی آنکھوں سے ہی نکل جانے کے درپے ہو رہے تھے اور ان کا پہلا ہدف عبداللہ ہی تھا۔

”ہمارے درمیان ایسی تو کوئی بات ہی نہیں ہوئی جس پہ میں آپ کو دھمکی دوں گا۔“ عبداللہ نے کندھے اچکاتے ہوئے لاپرواہی سے کہا۔

”بات نہیں ہوئی لیکن تم نے بات کا اشارہ ضرور دیا ہے۔“ وہ غصے سے چبا کر بولے تھے۔

”اوہ! تو آپ اشارہ بھی سمجھتے ہیں؟“ اس نے حیرانی کا اظہار کیا جس پہ ملک اسد اللہ اور بھی بھڑک اٹھے۔

”تم کہنا کیا چاہتے ہو۔۔۔؟“ ان کا مزاج برہم اور تیور خاصے خطرناک ہو رہے تھے۔

”آپ خود سمجھ دار ہیں، میرا اشارہ سمجھ چکے ہیں کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں بالکل ایسے جیسے میں آپ کا اشارہ سمجھ چکا ہوں، کیونکہ میں بھی آپ کا ہی بھائی ہوں، سمجھ داری ورثے میں ملی ہے۔“ عبداللہ کا اطمینان اور سکون برقرار تھا۔

”لیکن تمہاری سمجھ داری کا وقت ختم ہو چکا ہے، اب ہماری باری ہے، اب وہی ہو گا جو ہماری سمجھ داری کے گی۔“ انہوں نے دائیں ہاتھ سے اپنی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا! تو پھر کیا کہتی ہے آپ کی سمجھ داری؟ کیا ہونا چاہیے؟“ وہ بھنویں سکڑتے ہوئے انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”جیسا کہ تمہیں کہ ہماری سمجھ داری کیا کہہ رہی ہے۔۔۔؟“ وہ سختی سے پوچھ رہے تھے۔

”جی حضور! میں ہمہ تن گوش ہوں۔“ عبداللہ نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔

”تم دونوں اندر جاؤ۔“ انہوں نے زری اور نگارش کو بیڈ روم میں جانے کا اشارہ کیا۔

”نہیں! یہ دونوں کہیں نہیں جائیں گی، یہیں رہیں گی، یہ دونوں پڑھی لکھی اور سمجھ دار لڑکیاں ہیں، چھوٹی بچیاں نہیں ہیں کہ ان سے کوئی بڑی بات چھپائی جائے، آپ نے جو بات کہنی ہے صاف صاف کہیے، ہم سب سن رہے ہیں۔“ عبداللہ نے ان دونوں کو جانے سے روک دیا تھا حالانکہ زری وہاں سے اٹھ جانا چاہتی تھی اس کی جان سولی پہ لٹکی ہوئی تھی وہ ایسی سنگین سچویشن فیس نہیں کر سکتی تھی اس کی حالت غیر ہو رہی تھی لیکن نگارش وہاں سے اٹھنے کے لیے تیار نہیں تھی وہ ان دونوں بھائیوں کی جنگ لائیو دیکھنا چاہتی تھی کیونکہ معاملہ بہت نازک اور گہیر ہو چکا تھا۔

”تم سب سن نہیں رہے بلکہ یہ کہو کہ تم سب بے حیا ہو گئے ہو، بے غیرت ہو گئے ہو تم۔“ وہ عبداللہ کی سمت دیکھتے ہوئے غضب ناک انداز میں دھاڑے تھے۔

”خبردار بھائی صاحب! بہت ہو گئی عزت اور غیرت کی تکرار۔۔۔ میں آپ کو مزید اپنی انسٹلٹ کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا، میں اگر بے غیرت ہوں تو آپ کہاں کے غیرت مند ہیں۔۔۔؟ کیا ملک حق نواز کے ہاتھ میں اپنی بہن کا ہاتھ تھما دینا غیرت کہلاتا ہے آپ کی نظر میں؟ وہ ملک حق نواز جو سات سال پہلے آپ کی ہمشیرہ شہرین بی بی کا ہاتھ آپ کی کوشش کے باوجود دھتکار چکا ہے، ٹھکرا چکا ہے آپ کی بہن کو اور آپ اب اسی ملک حق نواز کے ہاتھ میں اپنی دوسری بہن کا ہاتھ تھانا چاہتے ہیں۔۔۔؟ کیا یہی غیرت مندی کا ثبوت ہے۔۔۔ کیا میں بھی آپ جیسا غیرت مند بن جاؤں؟ نام نہاد غیرت مند جس نے اپنی جاگیر اور اپنی پارٹی بڑھانے کے لیے اپنی بہنوں کی زندگیاں برباد کرنے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔۔۔؟

اگر آپ کو اپنی بہنوں سے کوئی ذاتی پر خاش بھی تو آپ کو چاہیے تھا کہ آپ انہیں زہرے کرار دیتے کم از کم وہ ایسی ذلت کی زندگی جینے سے توجہ جاتیں۔“ اب کی بار عبداللہ نے جواب دیا تو انہی کے سے انداز میں وہ سیر کو سوا سیر ثابت ہوا تھا۔

”جس کی قسمت جس کا مقدر جہاں لکھا ہو گا وہیں شادی ہوگی نا؟ اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔۔۔؟ ہر انسان کا نصیب تو پہلے سے لکھا جا چکا ہے۔“ ملک اسد اللہ نے جیسے دامن جھاڑا تھا اور سارا الزام ان کی قسمت اور ان کے نصیب کے ذمے ڈال دیا تھا۔

”ہونہ! اگر ہر انسان کا نصیب اس کا مقدر پہلے سے لکھا جا چکا ہے تو پھر آپ کو اتنا تردد کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ سب کچھ مقدر پہ چھوڑ دیں، جو جس کا مقدر ہو گا اسے مل جائے گا۔“ عبداللہ نے انہیں لا جواب کر ڈالا تھا لیکن وہ پھر بھی ہار ماننے والے نہیں تھے۔

”لیکن زرین ملک کا نصیب ملک حق نواز کے ساتھ لکھا جا چکا ہے اور اس نصیب کو جڑنے سے کوئی نہیں روک سکتا، نہ تم نہ کوئی اور۔“ انہوں نے اک قہر بھری نظر عبداللہ پہ اور دوسری زری پہ ڈالی تھی وہ ساکت و صامت سی بیٹھی تھی، ملک حق نواز کا نام اس کے کانوں میں پھلے ہوئے سیسے کی مانند اتر ا تھا، شہرین کو ٹھکرانے والے کے ساتھ زرین کو جوڑا جا رہا تھا، یہ رشتہ تھا یا عمر بھر کا پھندا۔۔۔؟

”ملک حق نواز ایک بار مرے اور دوبارہ پیدا ہونے کے بعد ہر گناہ سے پاک صاف ہو کر بھی سامنے آئے تو میں تب بھی اپنی بہن کا نصیب اس کے ساتھ جڑنے نہیں دوں گا“ آپ چاہے جتنے مرضی جتن کر لیں، زری کی شادی ملک حق نواز کے ساتھ ہرگز نہیں ہوگی، چاہے اس کے لیے آپ مجھے گولی مار دیں۔“ عبداللہ نے دو ٹوک کہتے ہوئے انہیں اپنا فیصلہ سنایا تھا اور ملک اسد اللہ اپنی جگہ سے اٹھ کر عبداللہ کے سامنے آکھڑے ہوئے تھے۔

”ضد اور انا کا مسئلہ آجائے تو گولی مارنا ہمارے لیے مشکل بھی نہیں ہے ملک عبداللہ صاحب، سامنے چاہے تم جیسا جوان گھبرو بھائی ہو، چاہے زرین ملک جیسی جوان بہن ہو، ہماری گولی بس نشانہ دیکھتی ہے، رشتہ یا تعلق نہیں دیکھتی۔“ انہوں نے عبداللہ کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے دہرایا تھا۔

”اور آپ کو یہ بھی پتا ہو گا کہ گولی سے ڈرنے والے جراثیم ہم میں بھی نہیں ہیں، اگر آپ حق بات کو ضد اور انا کا مسئلہ بنا رہے ہیں تو ایسے ہی سہی۔“ اس نے کندھے اچکائے تھے۔

”اے پاکستان بھیجو، سارے فیصلے خود بخود ہو جائیں گے۔“

”اے پاکستان بھیجوں گا نہیں، اے پاکستان لے کر جاؤں گا، خود اپنے ساتھ۔“ عبداللہ نے اپنی طرف اشارہ کیا اور ملک اسد اللہ چونک اٹھے تھے وہ خود پاکستان جانے کا کہہ رہا تھا تو گویا وہ واقعی اس مسئلے میں پوری طرح ٹانگ اڑانا چاہتا تھا۔

”تم پاکستان جاؤ گے؟“

”جی! آپ کو کوئی اعتراض ہے؟“

”تم حویلی میں قدم بھی نہیں رکھ سکتے۔“

”تو آپ سے کس نے کہا کہ میں حویلی میں قدم رکھوں گا؟“ عبداللہ کا انداز ان سے بھی زیادہ روکھا اور نپا تلا سا تھا۔ وہ اس کی بات پہ ایک بار پھر چونکے تھے۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”میرا مطلب کیا ہو سکتا ہے بھائی صاحب، مطلب تو سارے آپ کے ہوتے ہیں، آپ لوگوں نے ہی تو شرط رکھی ہے کہ میں اپنی بیوی کو طلاق دوں گا تو تبھی حویلی میں قدم رکھ سکوں گا، اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ میں اپنی بیوی

کو طلاق دوں اور یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ میں حویلی میں قدم رکھ سکوں، لیکن اس بات پہ تو پابندی نہیں ہے تاکہ میں پاکستان میں بھی قدم نہیں رکھ سکتا، اتنا بڑا پاکستان آخر کس کام آئے گا؟ پاکستان میں دل اور شاہ اور نبیل حیات کے اپنے گھر ہو سکتے ہیں تو ملک عبداللہ کا اپنا گھر بھی ہو سکتا ہے اور اس گھر میں ملک عبداللہ کی بہن ساری زندگی بھی رہنا چاہے تو با آسانی رہ سکتی ہے، اپنی بہن کا بوجھ اٹھا سکتا ہوں میں، اللہ کے کرم سے بہت دم ہے بازوؤں میں کمزور یا لاغر نہیں ہوں۔“ عبداللہ نے انہیں اپنے ارادوں سے آگاہ کیا تھا۔ اور وہ تپ گئے تھے۔

”تم غلط کر رہے ہو ملک عبداللہ، انہوں سے ٹکر لینے میں ہمیشہ نقصان ہوتا ہے۔“

”یہی تو میں کہہ رہا ہوں آپ سے کہ اپنے سے ٹکر نہ ہی لیں تو اچھا ہے، ورنہ نقصان ہی ہو گا۔“ وہ بھی ان کی باتوں کے گھیرے میں آنے والا نہیں تھا۔

”ہم یہاں زرین کو لینے کے لیے آئے ہیں اور اپنے ساتھ لے کر ہی جائیں گے، تم چاہے کچھ بھی کر لو۔“ انہوں نے دانت پیس کے کہا اور اپنا رخ زرین کی سمت موڑ لیا تھا۔

”اور تم بھی کان کھول کر سن لو، آج تمہارا پہلا پیپر تھا، اسی لیے ہم آج تمہیں یہی بتانے آئے ہیں کہ ہم تمہارے آخری پیپر کا انتظار کر رہے ہیں، ختم کر دینا پڑھائی کا کھیرا اور واپس پاکستان چلو، ورنہ کیا ہو گا تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔“ وہ کہہ کر بیٹے اور ڈرائنگ روم سے نکل گئے تھے عبداللہ چاہنے کے باوجود انہیں روک نہیں سکا تھا اور زرین ان کی دھمکی پہ خاک کا ڈھیر ہو گئی تھی اس کا جسم سوکھے پتے کی طرح لرز رہا تھا نگارش الگ پریشان تھی اور عبداللہ ڈرائنگ روم کے بیچ بیچ کھڑا گہری سوچ کا شکار تھا اسے اپنے سامنے ایک کھلی جنگ نظر آ رہی تھی اور ضد اور انا کی اس جنگ میں کیا نفع تھا کیا نقصان؟ یہ تو کوئی نہیں جانتا تھا۔

”بھائی۔۔۔ کیا دیکھ رہے ہیں آپ۔۔۔؟“ جو دت نے سامنے وعدا اسکرین پہ نظریں جمائے ڈرائیو کرتے آذر سے سوال کیا تھا۔

”کیا مطلب۔۔۔؟“ آذر نے ذرا کی ذرا گردن موڑ کر جو دت کو دیکھا جو اس کے برابر ہی فرنٹ سیٹ پہ بیٹھا ہوا تھا

”مطلب کہ منصور حسین ڈرائیونگ میں کمال کی مہارت رکھتا ہے، اس کی ڈرائیونگ دیکھ رہے ہیں آپ۔۔۔“

گاڑی روڈ پہ نہیں پانی پہ پھسلتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے، لگتا ہے بہت ماہر ہے اس چیز میں؟“ جو دت پچھلے تین گھنٹے سے اس فرنٹ سیٹ پہ بیٹھا یہی ایک چیز نوٹ کر رہا تھا اور آخر سراسر بغیر رہ نہیں سکا تھا۔

”ہوں! میں بھی یہی دیکھ رہا تھا، واقعی بہت مہارت ہے اسے، اور اس کی مہارت نظر بھی آرہی ہے، جس رش سے گاڑی نکالنا ہمارے لیے بھی مشکل ہو جاتا ہے، وہ وہاں سے بھی آسانی سے نکل جاتا ہے، اس نے ایک بار بھی گاڑی کے ٹائروں کو بے ربط نہیں ہونے دیا، بالکل برابر جا رہے ہیں۔“ آذر نے بھی اس کی تعریف کرتے ہوئے بگل سے کام نہیں لیا تھا بلکہ کھل کر سراہا تھا۔۔۔ ان دونوں بھائیوں کی نظریں سامنے روڈ پہ پھسلتی علیزے کی گاڑی پہ ہی تھیں جو کبھی کبھی تیز رفتاری کی وجہ سے ان کی آنکھوں سے اوچھل بھی ہو جاتی تھی۔

”آخر ڈرائیور کس کا ہے؟ مہارت تو ہوگی۔۔۔؟“ ڈیڈ نے بھی تو چن کے ڈرائیور رکھا ہو گا اسے۔“ جو دت مسکرا کے کہہ رہا تھا۔

”بھائی۔۔۔! حرمت نے آذر کو پکارا۔

”جی؟“

”کون۔۔۔؟“

”وہ کون کو بھوک لگی ہے، کچھ کھانا چاہتی ہے۔“ حرمت نے آہستگی سے بتایا۔

”کون کو بھوک لگی ہے۔۔۔؟ تمہیں کیسے پتا؟ ان کی گاڑی تو پیچھے آ رہی ہے۔۔۔؟“ آذر نا سمجھی سے پوچھ رہا تھا۔

”اس نے میرے نمبر پہ میسج کیا ہے۔“ حرمت نے کونل کے بتانے کا ذریعہ بتایا۔

”اوہ اچھا۔۔۔“ آذر نے سمجھتے ہوئے سر ہلایا تھا۔

”کونل آگے کی بہت تیز اور بھوک کی بہت کچی ہیں، اس لیے جلدی انتظام کر لیجیے بھائی جی۔“ حرمت نے ہنسنے دوئے چھیڑا تھا لیکن آذر اس کی فو معنی بات کی گہرائی تک نہیں جاسکا تھا بلکہ اس کا انداز بہت سرسری سا تھا۔

”اب تو اسلام آباد پہنچ کر ہی کچھ ہو گا، یہاں نزدیک تو کوئی ریسٹورنٹ نہیں ہے۔“ آذر نے نفی میں گردن ہلائی۔

”اسلام آباد پہنچنے میں کتنا تاخیر ہے۔“ حرمت نے کونل کا دوسرا میسج پڑھ کے آذر سے پوچھا تھا۔

”بس تھوڑا تاخیر ہی رہ گیا ہے۔“ آذر نے گہری دیکھتے ہوئے کہا اور اسے تسلی دی تھی۔

”بھوک تو مجھے بھی لگ رہی ہے اور اسلام آباد کے سیور سے کھانا کھانے کا موڈ ہو رہا ہے۔“ جو دت نے انڈرائی لیتے ہوئے سستی سے کہا۔

”سیور کا کھانا نہیں بریانی مشہور ہے اور بریانی بھی ہر قسم کی۔“ آذر نے اس کی بات کی تصحیح کی تھی۔

”جی ہاں! میں بھی بریانی کھانے کا ہی کہہ رہا تھا وہاں کی بریانی ہی تو مشہور ہے۔“ جو دت بھی جانتا تھا کیونکہ اپنے دوستوں کے ساتھ وہ پہلے بھی کئی بار اس طرف آیا تھا اور ہمیشہ وہ لوگ سیور پہ ضرور جاتے تھے۔

”چلو پھر آج سیور پہ ہی سہی۔“ آذر بھی وہیں جانے پہ آمادہ تھا اور گاڑی کی اسپیڈ بڑھادی تھی اور ساتھ ہی موبائل اٹھا کر منصور حسین کو بھی سیور پہ جانے کی اطلاع دی تھی تاکہ وہ اسی سائیڈ پہ ٹرن لے، اس نے سعادت مندی سے اوکے کہتے ہوئے فون بند کر دیا تھا۔

سیور سے اپنی پسند کی بریانی کھانے کے بعد ان لوگوں نے بیکرز کا رخ کیا تھا جو سیور سے زیادہ دور نہیں تھا وہاں کی کولڈ کافی آذر کو بہت پسند تھی وہ جب بھی کسی کام کے سلسلے میں اسلام آباد آتا تھا بیکرز سے کافی پیے بغیر نہیں جاتا تھا وہ چاروں گاڑیاں پارکنگ میں پارک کرنے کے بعد گاڑیوں سے اتر آئے تھے البتہ لڑکیاں گاڑیوں میں ہی بیٹھی ہوئی تھیں۔ آذر نے پارکنگ میں پھرتے ویٹرز کو آرڈر لینے کے لیے گاڑیوں کی سمت اشارہ کیا، ویٹرز مینوبک ہاتھ میں لے کر الٹ کھڑے تھے اشارہ ملتے ہی سر خم کر دیا اور فوراً ہی گاڑیوں کی سمت بڑھ گئے، البتہ آذر خود علیزے کی گاڑی کی سمت آگیا۔ منصور حسین نے آذر کو دیکھتے ہی علیزے کی سائیڈ کاشیشہ فولڈ کر دیا تھا۔

”کافی پیو گی۔۔۔“ اس نے کھڑکی میں جھکتے ہوئے علیزے سے پوچھا۔

”آپ کو پتا ہے میں کافی نہیں پی سکتی، اتنی کڑواہٹ مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔“ اس نے منہ بنایا تھا۔

”کولڈ کافی ہے یا س۔۔۔“ آذر مسکراتے ہوئے اسے کافی پینے پہ آمادہ کر رہا تھا۔

”ہے تو کافی نا۔۔۔؟“ وہ کافی پینے کو تیار نہیں تھی۔

”یار! بہت بزدل ہو تم کافی پینے سے بھی ڈرتی ہو، ایک بار رٹائی کر کے تو دیکھو۔“ وہ اسے اکسار رہا تھا۔

”او کے! لے آئیں۔“ بالآخر وہ مان گئی تھی۔
”منصور حسین! تم کیا لو گے؟“

”ضرورت نہیں ہے صاحب جی ابھی تو کھانا کھایا ہے۔“ اس نے انکار کر دیا تھا۔
”او کے!“ آڈر پلٹ کر اندر چلا گیا احمد، حماد، جوہت، دانیال اور زین پانچوں اس کے پہنچنے تک اپنا آرڈر تیار کروا چکے تھے۔
”ایک کپ علیزے کے لیے بھی۔“ دانیال کے ہاتھ سے اپنا کپ تھامتے ہوئے آڈر نے دانیال کو ایک اور کپ تیار کروانے کا کہا۔
”علیزے اور کافی۔؟ دو متضاد چیزیں ہیں یا۔؟“ دانیال کو حیرانی ہوئی۔
”آئی نو یار! بٹ میں نے کہا ہے تو وہ ضرور پیے گی۔“ آڈر کافی کے برے سے کپ میں اسٹرا اور اسپون انسٹ کرتے ہوئے مسکرا کے بولا۔
”اوہ! تو وہ تمہارے کہنے پہ کافی پی رہی ہے۔؟“ دانیال نے آڈر کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے کافی ذمہ معنی لہجے میں پوچھا تھا۔

”کیوں نہیں پیتی چاہیے؟“ الٹا آڈر نے اس سے پوچھ لیا تھا۔
”ارے نہیں نہیں یار! پیتی چاہیے ضرور پیتی چاہیے، لیکن یار اتنا ضرور یاد رکھنا کہ ابھی آدھا سفر باقی ہے، کوئی مسئلہ نہ کھڑا ہو جائے۔“ دانیال بھی اپنے آکس شیک سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
”ڈونٹ وری یار! میں نے سوچا وہ پتلی بار ہمارے ساتھ آئی ہے، کھائے پیئے انجوائے کرے، صرف گھومنا پھرنا ہی تو ایڈونچر نہیں ہے اس کے لیے تو کافی پینا بھی ایڈونچر ہی ہو گا۔“ آڈر علیزے کو اس ٹرپ کے تمام رنگ قریب سے دکھانا اور انجوائے کروانا چاہتا تھا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ اسے اپنے ساتھ ہر کام میں شامل کیا جاتا چاہے زبردستی اور اصرار کر کے ہی سہی۔

”بیجے میم! آپ کی کافی۔“ آڈر نے علیزے کی سائیڈ پر کھڑکی میں جھکتے ہوئے کہا تھا۔
”تھینکس۔“ علیزے نے مسکراتے ہوئے کپ تھام لیا تھا۔
”او کے انجوائے کرو۔“ آڈر تمام آرڈرز کا بل بے کرنے کے لیے واپس پلٹ گیا تھا۔
لیکن جیسے ہی علیزے نے اسٹرا کے ذریعے کولڈ کافی اپنے حلق سے نیچے اتاری تھی اس کے چہرے کے زاویے بگڑ گئے تھے اسے یوں لگا جیسے اس نے زہریلی لیا ہوا ہے بہت زور کی ابکائی آئی تھی وہ اک جھٹکے سے گاڑی کا دروازہ کھول کے نیچے اتر آئی اس نے منہ میں بھرا ہوا مشروب نیچے اگل دیا تھا اور کڑواہٹ کی وجہ سے اس کے منہ کا ذائقہ بھی خراب ہو گیا اور اسے ابکائی آنے لگی تھی اس کی زور زور سے ابکائی کی آواز پہ اندر کی سمت بڑھتا آڈر یکدم کرنٹ کھانے کی پیچھے کی طرف پلٹا تھا۔
”علیزے۔“ وہ اسے پارکنگ کے فٹ پاتھ کے قریب جھکی ابکائی کرتی ہوئی نظر آئی تھی اور وہ اسے دیکھ کر گھبرا گیا تھا۔

”اوہ مائی گاڈ! یہ میں نے کیا کر دیا؟“ وہ اپنے آپ کو سرزنش کرتے ہوئے لپک کے اس کے قریب آیا تھا اتنے میں رجو بھی گاڑی سے نکل کر علیزے کو تھام چکی تھی۔
”کیا ہو علیزے؟ تم ٹھیک تو ہو؟“ آڈر نے اس کا دوسرا بازو تھام لیا تھا۔
”وہ۔۔۔ وہ کافی اتنی کڑوی۔“ علیزے کو اپنی زبان اپنا منہ بے حد کڑوا محسوس ہو رہا تھا۔
”رجو! گاڑی سے پانی کی بوتل لے کر آؤ۔“ آڈر نے رجو کو اشارہ کیا۔

”یہ لو۔“ آڈر نے ڈھکن کھول کر بوتل اس کی سمت بڑھا دی اور علیزے نے کلی کرنے کے بعد پانی پیا تھا لیکن اس کے منہ کا ذائقہ پھر بھی بہتر نہیں ہوا تھا۔

”کیا ہوا ہے اسے؟“ اتنے میں دانیال اور جوہت وغیرہ بھی وہیں آ گئے تھے۔ وہ علیزے کی سمت متفکر سی نظروں سے دیکھ رہے تھے آڈر نے ایک ہاتھ میں منیل واٹر کی بوتل تھام رکھی تھی اور دوسرے ہاتھ سے اپنی جیب سے رومال نکال کے اس کی سمت بڑھا رہا تھا۔ نیچے فرش پہ کولڈ کافی کا کپ اونڈھا پڑا تھا جس کی وجہ سے فرش گندا ہو رہا تھا عجیب سی بتجوشن تھی یہاں لیکن دانیال بغیر تائے ہی جان چکا تھا کہ یہاں کیا ہوا ہے۔
”میں نے کہا تھا نا آڈر صاحب! ابھی آدھا سفر باقی ہے۔؟“ دانیال نے اسے متوجہ کرتے ہوئے چوٹ کی تھی اور کافی چھیڑنے والے انداز میں اسے دیکھا تھا۔
”یہ باتیں بعد میں کرنا پہلے اس کے لیے جوس لے کر آؤ۔“ آڈر نے دانیال کو گھور کے دیکھا تھا اور دانیال مسکرا دیا۔ وہ کندھے اچکا کر پلٹ کے اندر چلا گیا تھا۔
”کیا ہوا ہے علیزے کو۔۔۔؟“ عائشہ آندھی ان کو علیزے کی گاڑی کے قریب کھڑے دیکھ کر اپنی گاڑی سے اتر آئی تھیں۔

”کچھ نہیں ہوا پھوپھو، ٹھیک ہے یہ۔“ آڈر خود ہی سب کو تسلیاں دے رہا تھا کیونکہ غلطی اس سے ہوئی تھی اس لیے ہینڈل بھی اسی نے کرنی تھی اور علیزے آڈر کے چہرے کے گھبرائے ہوئے تاثرات دیکھ کر اس کی پریشانی سمجھ گئی تھی اس لیے اسے اس گھبراہٹ اور پریشانی سے نکالنے کے لیے اسے اپنا آپ کنٹرول کرنا پڑا تھا۔
”لیکن کچھ تو ہوا ہے نا۔؟“ عائشہ آندھی بھی پریشان ہو چکی تھیں۔
”اے اس او کے پھوپھو! میں بالکل ٹھیک ہوں، بس یہ تھوڑی سی کافی پی ہے تو اچھی نہیں لگی، اس لیے آڈر بھائی نے اب جوس منگوایا ہے۔“ علیزے نے انہیں مطمئن کرنے کے لیے خود انہیں سلی دی تھی۔
”بیجے جناب جوس حاضر ہے۔“ دانیال جوس لے کر بہت جلدی واپس آیا تھا۔
”تھینک یوس۔“ علیزے نے مسکراتے ہوئے کہا اور جوس کا گنگ تھام لیا تھا۔
”اسی طرح مسکراتی رہا کرو یار، تمہاری ذرا سی تکلیف ہماری جان نکال دیتی ہے۔“ دانیال بھی جواباً ”مسکرا کے بولا تھا۔

”میں بہت کوشش کرتی ہوں کہ آپ لوگوں کی جان نہ نکالوں، مگر پھر بھی۔۔۔“ وہ جملہ ادھورا پھوڑتے ہوئے دلچسپی اور شرارت سے ہنس پڑی تھی۔
”مگر پھر بھی نکال ہی دیتی ہو۔“ دانیال اس کا ادھورا جملہ مکمل کرتے ہوئے یکدم قہقہہ لگا کے ہنسا تھا جس پہ علیزے عائشہ آندھی، آڈر اور جوہت بھی اپنی مسکراہٹ روک نہیں پائے تھے۔
”آپ لوگ گاڑی میں بیٹھیں میں تب تک بل کلیر کروا کے آتا ہوں۔“ آڈر کہہ کے وہاں سے چلا گیا اور گاڑیوں سے نکلی ہوئی عوام دوبارہ اپنی اپنی جگہ سنبھال چکی تھی لیکن اپنی گاڑی کی طرف بڑھتی ہوئی علیزے کو دیکھ کر جوہت کے دل میں نہ جانے کیا سمجھا کہ وہ اس سے لفٹ مانگ بیٹھا تھا۔
”کیا میں بھی مریسیڈیز کا مزالے سکتا ہوں؟“ وہ شرارت سے کہتے ہوئے علیزے سے پوچھ رہا تھا۔
”ارے کیوں نہیں جوہت بھائی، آپ ہمیں جوائن کر سکتے ہیں۔“ علیزے خوش ہو کر بولی تھی اسے اپنے سارے کزنز سے محبت تھی کیونکہ سب کزنز کو اس سے جو محبت تھی اتنا چاہتے تھے اسے۔! منصور حسین نے گاڑی کی لیفٹ سائیڈ کی طرف جھکتے ہوئے فرنٹ ڈور کھول دیا تھا۔

”آہا! اس میں بیٹھنے کا تو مزہ ہی کچھ اور ہے۔“ جودت نے کھل کے اظہار کیا تھا۔
 ”گاڑی نکالو منصور حسین۔“ آذر نے اندر سے آتے ہی ان لوگوں کو نکلنے کا سگنل دیا تھا اور منصور حسین نے
 گاڑی کے پیشے چڑھاتے ہوئے گاڑی اشارت کر لی تھی۔

”اب کہاں چلنا ہے صاحب۔۔۔؟“ منصور حسین نے گاڑی روڈ پہ ڈالنے سے پہلے جودت سے پوچھا تھا۔
 ”مجھ سے نہیں اپنی میڈم سے پوچھو میں تو اس گاڑی میں مہمان ہوں۔“ جودت نے لاپرواہی سے کہتے ہوئے
 کندھے اچکائے تھے اور منصور حسین کی نظروں کا اور سوال کا رخ علیزے کی طرف ہو گیا تھا اس نے بیک ویو
 مرر سے علیزے کی سمت دیکھا تھا۔

”اب کہاں جانا ہے میڈم۔۔۔؟“
 ”مجھے کیا پتا کہ کہاں جانا ہے۔۔۔؟ میں کون سا یہاں آتی جاتی رہتی ہوں۔۔۔؟ آپ نے پوچھنا ہے تو آذر بھائی
 سے پوچھیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے لاعلمی ظاہر کی تھی۔
 ”چلیے جناب! اب آذر بھائی سے پوچھیں۔۔۔“ جودت نے منصور حسین کو شرارت سے اشارہ کیا تھا اور منصور
 حسین کی مجبوری تھی اس کو پوچھنا ہی پڑا۔ وہ اپنی گاڑی سے اتر کے آذر کی گاڑی کے پاس آ گیا تھا۔
 ”کس طرف جانا ہے صاحب۔۔۔؟“ وہ ان کے اگلے پڑاؤ کا پوچھ رہا تھا۔

”یہاں سے شاہ فیصل مسجد قریب ہے پہلے وہاں چلتے ہیں پھر بعد میں لوک ورثہ شکر پڑیاں، لیک ویو پارک اور
 چھتر پارک کی طرف نکلتے ہیں۔“ آذر نے بالترتیب سب جگہوں کے نام گنوائے تھے کہ ان سب جگہوں پہ جانا ہے۔
 ”آپ نے سب پکنک اسپاٹ ایک ہی دن میں دیکھنے ہیں؟“ منصور حسین کو حیرت ہوئی تھی۔

”بالکل! کیونکہ ہم نے یہ پکنک اسپاٹ صرف دیکھنے ہیں یہاں ڈیر اڈال کے نہیں بیٹھنا مری کے لیے بھی نکلتا
 ہے۔“ آذر نے منصور حسین کی بات مذاق میں اڑائی تھی۔
 ”ٹھیک ہے صاحب! جیسے آپ کی مرضی، لیکن ایسا ممکن نہیں ہے، آپ کو ایک ایک جگہ پہ ہی اتنا ٹائم لگ
 جائے گا کہ آپ یہیں ٹھہرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔“

”ہم یہاں نہیں ٹھہر سکتے، ہم نے یہاں کوئی بنگ نہیں کروائی، اس لیے ہمیں اپنے بنگلے پہ پہنچنا ہے رات
 وہیں ٹھہرنے کا انتظام ہے، سمجھے تم۔۔۔؟“ آذر نے اسے وجد بتائی۔
 ”جی صاحب! یہ بھی بہتر ہے۔۔۔“ منصور حسین سر ہلا کے واپس آ گیا تھا اور بھرڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔

”تھوڑی دیر پہلے راستے میں آذر بھائی کو میں بھی یہی سمجھا رہا تھا کہ شام ہو جائے گی لیکن وہ کہتے ہیں کہ بے شک
 شام ہو جائے، ہم نے یہ رات مری میں ہی بسر کرنی ہے جیسے وہاں ان کے لیے کوئی دلہن بیٹھی انتظار کر رہی ہو۔“
 جودت مذاق کے موڈ میں تھا۔

”اچھا! تو یہ بات تھی۔۔۔؟ مجھے تو پتا ہی نہیں تھا؟“ منصور حسین نے پہلی بار مذاق میں کسی کا ساتھ دیا تھا۔
 ”جودت بھائی! میں بتاؤں گی آذر بھائی کو کہ آپ ان کا مذاق اڑا رہے ہیں۔“ علیزے نے دھمکی دی۔
 ”بتانا ضرور بتانا لیکن مری پہنچ کر۔۔۔“ جودت نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تھا اور منصور حسین اپنی مسکراہٹ
 روک نہیں پایا تھا۔

”جودت بھائی! وہ ہم سے بڑے ہیں۔“
 ”ہا ہا ہا! وہ صرف تم سے بڑے ہیں۔ تمہیں ہی بچوں کی طرح ٹریٹ کرتے ہیں۔ تم آذر بھائی کی اور ڈیڈ کی
 ”کاکی“ ہو۔“ جودت کہتے ہوئے خوب ہنس رہا تھا۔

”آپ اب میرا مذاق اڑا رہے ہیں؟“ علیزے نے اسے خفگی بھری نظروں سے دیکھا۔
 ”میں ایسی گستاخی کا سوچ بھی نہیں سکتا، توبہ توبہ، تم تو اتنی پیاری ہو کہ تمہارے گیت گانے کو دل چاہتا ہے۔“
 وہ جھوم کے بولا۔

”گیت! ارے ہاں جودت بھائی آپ کا گٹار کہاں ہے؟ آپ ساتھ نہیں لائے۔۔۔؟“ علیزے کو اچانک اس
 کے گٹار کا خیال آیا تھا۔

”لایا ہوں یار، سب کچھ لایا ہوں، لیکن مری چلی کے۔۔۔“ جودت نے پھر شرارت سے کہا تھا اور ہنستے ہوئے
 سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا منصور حسین بھی جو کتنا اور ہوشیار ہو کے بیٹھ چکا تھا کیونکہ شاہ فیصل مسجد کی طرف جانے
 والے روڈ پہ پولیس گاڑیوں کی چیکنگ کے بعد آگے جانے کی بریڈن دے رہی تھی، سیکورٹی کافی ٹائٹ تھی اور
 منصور حسین کی گاڑی میں اسلحہ تھا لیکن منصور حسین کے لیے یہ ڈھارس ہی کافی تھی کہ گاڑی میں رجو اور
 علیزے بی بی بھی ہیں، کیونکہ لیڈر کی موجودگی میں گاڑی کی چیکنگ والا نہیں تھی۔

”علیزے بی بی آپ اور رجو کھڑکی کے ساتھ ہو کر بیٹھیں۔“ منصور حسین نے ذرا سی گردن ترچھی کر کے
 پیچھے کی طرف دیکھا تھا۔
 ”کیوں۔۔۔؟“ کیوں کا سوال اٹھانے والا جودت تھا۔

”اس طرح گاڑی کی چیکنگ نہیں ہوگی۔“
 ”تو اس میں ہمیں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟ گاڑی کی چیکنگ ہو یا نہ ہو، ہم کون سا اسلحہ یا غیر قانونی سامان
 لے کر جا رہے ہیں؟“ جودت نے لاپرواہی سے کہا۔

”وہ تو ٹھیک ہے صاحب لیکن خواہ مخواہ یہ لوگ ہمارا ٹائم برباد کریں گے، منصور حسین نے سر جھٹکا۔
 اتنے میں ایک پولیس کانسٹیبل قریب آچکا تھا لیکن گاڑی میں رجو اور علیزے کو دیکھ کر گاڑی کو پاس کا سگنل
 دے دیا تھا اور اس کے پیچھے باقی تین گاڑیوں کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا تھا منصور حسین کو جس چیز کا ڈر تھا وہ اس سے
 بچ گیا تھا آخر وقار آندے نے اسے تاکید کر کے بھیجا تھا کہ کسی کو بتانا نہیں چلنا چاہیے کہ وہ اسٹے سے اوڑھ ہے اور
 اس نے ایسا ہی کیا تھا۔

”لو جی جناب! پہنچ گئے ہم شاہ فیصل مسجد۔“ جودت نے مسجد کی پارکنگ میں پہنچتے ہی نعرہ لگایا تھا اور رنتہ رنتہ
 بھی اپنی گاڑیوں سے اتر آئے تھے۔

”واؤ۔۔۔“ جودت نے ایک لڑکی کو پاس سے گزرتے دیکھ کر بے ساختہ اظہار کیا تھا۔
 ”واؤ نہیں کہتے جودت بھائی، سبحان اللہ کہتے ہیں۔“ علیزے نے معصومیت سے اسے ٹوکا۔
 ”کسے دیکھ کر؟“ وہ شرارت سے بولا۔

”مسجد کو دیکھ کر۔“ جودت اس کے جواب پہ قہقہہ لگا کے ہنسا تھا۔
 ”تمہیں کس نے کہا کہ میں نے مسجد کو دیکھ کے واؤ کہا ہے۔۔۔؟“
 ”تو پھر۔۔۔؟“ علیزے ہونٹ سی اسے دیکھ رہی تھی۔

”میرے واؤ کا مرکز وہ ہے، بلیک جینز اور ریڈ ٹاپ والی۔“ جودت نے اشارہ کیا تھا اور علیزے اس لڑکی کو دیکھ
 کر سیٹھا گئی تھی اس کی پنڈلیاں اور بازو برہنہ تھے اس کا لباس بے حد چست تھا وہ اپنی کسی دوست سے تصویریں بنوا
 رہی تھی اور وہاں موجود لڑکوں کا اسی کی طرف دھیان تھا۔

”جودت! تم یہاں کھڑے کیا دیکھ رہے ہو؟“ آذر نے قریب آتے ہی خفگی سے پوچھا۔
 ”جو بھی دیکھ رہے ہیں۔“ اس نے کندھے اچکائے۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ پیریم کوالٹی، نارل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

”جودت۔“ آذر نے سختی سے پکارا تھا جس سے جودت گھبرا کے متوجہ ہوا۔
”جی چلے! میں تو مذاق کر رہا ہوں۔“ وہ سر جھٹکتے ہوئے آگے بڑھ گیا اور علیزے، انوشہ اور حرمت وغیرہ کے گروپ میں شامل ہو گئی تھی ان سب لڑکیوں نے سر پہ ڈوپٹے اوڑھ لیے تھے علیزے تو اندر آکر حیران و پریشان رہ گئی جگہ جگہ لڑکوں کے گروپ کھڑے تھے ہنس رہے تھے، قہقہے لگا رہے تھے، کچھ قصوریں بنوا رہے تھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہاں موجود لوگ مسجد میں نہیں کسی پارک میں کھڑے ہوں، بے ادبی کا تو کسی کو خیال ہی نہیں رہا تھا لڑکیاں ننگے سر گھوم پھر رہی تھیں لڑکے شرارتیں کر رہے تھے انہوں نے مسجد کے حکنے فرش کو ریپ سمجھ رکھا تھا اور ان کی یہی سمجھ تو ملک میں تباہی کا باعث تھی علیزے کو سوچ کر ہی جھرجھری سی آگئی تھی۔
”لوگوں نے اللہ کے گھر کو پنک اسپاٹ بنا رکھا تھا، جہاں لوگوں کو زیارت کرنے کے لیے آنا چاہیے تھا وہاں لوگ تفریح اور سیر کے لیے آرہے تھے آذر بھائی واپس چلیں۔۔۔؟“ علیزے مزید وہاں کا ماحول برداشت نہیں کر سکی تھی۔

”واپس۔۔۔؟“ آذر کے ساتھ ساتھ باقی سب کو بھی حیرت ہوئی تھی۔
”جی! یہاں بہت رش ہے میرا دل گھبرا رہا ہے۔“ علیزے کو واقعی یہاں آکر الجھن سی ہوئی تھی۔
”تو تم ایسا کرو کہ تم جا کر اپنی گاڑی میں بیٹھو اتنے میں ہم مسجد گھوم پھر کے دیکھ لیں۔۔۔ کوئل کسی کے بھی بولنے سے پہلے خود بول پڑی تھی۔
”لیکن آپ لوگ یہاں کیا۔۔۔“

”ہم لوگ یہاں اتنی دور سے مسجد دیکھنے کے لیے آئے ہیں اور دیکھ کر ہی جائیں گے، تمہاری طبیعت فریش نہیں ہے اس لیے تم جا کر تھوڑی دیر آرام کرو، موڈ فریش ہو جائے گا۔“ کوئل نے بڑی اپنائیت سے اسے وہاں سے ہٹانا چاہا تھا اور علیزے تو بھی ہی سادہ طبیعت، فوراً ”مان گئی“ تھی اور رجو کے ساتھ واپس پارکنگ میں آگئی لیکن وہاں کا منظر دیکھ کر اس کا دماغ گھوم گیا۔

”درا سیر۔۔۔ وہ غصے سے اور زور سے پکاری تھی منصور حسین اپنی بے دھیانی میں گاڑی میں بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا جب علیزے کی آواز پہ بری طرح چونک گیا تھا۔

”عون نے تمہیں گاڑی میں اسموکنگ کرنے سے منع کیا تھا لیکن تم پھر بھی باز نہیں آئے۔۔۔؟“ علیزے نے آگے بڑھ کے اس کے دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں دبا ہوا سگریٹ جھپٹا اور زور سڑک پہ پھینک دیا تھا جبکہ منصور حسین شجتم کے پیکر میں بھڑکتے ہوئے شعلے کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا کتنی جرات، کتنے غصے سے اس نے اس کے ہاتھ سے سگریٹ چھین کر زور اچھا ل دیا تھا حیرت کی بات تھی وہ ایسی لگتی تو نہیں تھی جیسی لگ رہی تھی۔

”معافی چاہتا ہوں بی بی جی! یاد نہیں رہا میں ابھی ایئر فریشنز آن کرتا ہوں۔“
”شٹ اپ! غلطی کر کے معافی مانگنے والے لوگ مجھے قطعاً اچھے نہیں لگتے۔“ علیزے کا مسجد میں موجود پبلک کا غصہ منصور حسین پہ نکل گیا تھا۔

”میں نے غلطی جان بوجھ کے نہیں کی بی بی جی۔“ منصور حسین کا سر جھکا ہوا تھا۔
”کی تو ہے نا۔۔۔؟“ وہ غصے سے بھری ہوئی تھی اور زندگی میں شاید پہلی بار اس نے کسی پہ غصہ کیا تھا وہ بھی منصور حسین پہ۔

”اسی لیے تو معذرت بھی کر رہا ہوں۔۔۔“ منصور حسین ایئر فریشنز آن کر کے گاڑی سے باہر نکل آیا تھا۔
”رجو! اسے کہو کہ اپنی زبان بند رکھے، مجھے اس وقت کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔“ علیزے چڑچڑی ہو رہی تھی اور منصور حسین اس کے نرم و ملائم نقوش پہ غصے کی چھاپ دیکھ کے رہ گیا تھا۔

شاہ کی رگوں میں اتر رہا تھا وہ رات کے اس پر نما کر۔ شرٹ پہنے بغیر کندھوں پہ تولیہ ڈالے کھڑکی سے ٹیک لگائے کھڑا چائے سے لطف اندوز ہو رہا تھا اور اس لطف اور سرور کے موسم میں تصور جاناں کا ج جانا بھی اک لا شعوری عمل تھا، لیکن اس عمل میں بھی کوئی مداخلت کر بیٹھا تھا اس کے سیل پہ وابٹریشن ہونے لگی تھی اس نے اپنی پیٹ کی جیب سے سیل نکال کے دیکھا نمبر انجانا تھا۔ چند سیکنڈ وہ دیکھتا رہا پھر بالآخر کال انیڈ کر ہی لی تھی۔

”السلام علیکم۔۔۔!“ اس کی آواز اور لہجہ کافی سنجیدہ سے تھے۔
”وعلیکم السلام! آپ کون بات کر رہے ہیں۔۔۔؟“ دوسری طرف سے کافی گھبرائی ہوئی سی نسوانی آواز سنائی دی تھی۔

”دل اور شاہ اسپیکنگ۔۔۔“ اس نے اس نسوانی آواز کو یقین دلایا تھا۔

”مم۔۔۔ میں۔۔۔ مومنہ بی بی بات کر رہی ہوں سر۔“ جواباً ”اس نے بھی اپنا تعارف کروایا تھا اور دل اور چند ثانویہ کے لیے خاموش ہو گیا تھا لیکن اس خاموشی میں اس کا پہلا خیال صرف اس طرف گیا تھا کہ وہ رات کے اس پر فون کیوں کر رہی تھی۔

”جی کیسے بی بی! آپ نے رات کے اس پر فون کیوں کیا ہے؟ آپ ٹھیک تو ہیں نا۔۔۔؟“ دل اور کو حقیقتاً ”تشویش ہوئی تھی۔

”سر۔۔۔ اس وقت تک تو ٹھیک ہوں لیکن آئندہ کے لیے کوئی بھروسہ نہیں ہے، اس خبیث کو بتا چل گیا ہے کہ میں اس پہ کیس کر رہی ہوں اس لیے اس نے اپنے بندوں کو میرے پیچھے لگا دیا ہے، میں تین دن سے چھپتی پھر رہی ہوں اب تو مجھے کوئی بھی اپنے گھر میں داخل بھی نہیں ہونے دیتا، وہ کسی بھی وقت مجھے قتل کروا سکتا ہے، لیکن سر میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑ کے درخواست کرتی ہوں، میں مز بھی جاؤں تو اسے اس کے انجام تک ضرور پہنچائیے گا۔“ مومنہ بی بی روہانے لہجے میں کہتے ہوئے رو پڑی تھی اس کی آواز ہانپی ہوئی تھی اور لہجہ دھیمہ اور دبا دبا سا لگ رہا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے وہ چوری اور چھپ کے فون کر رہی ہو۔

”یہ کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ۔۔۔؟ کچھ نہیں ہوگا آپ کو، آپ حوصلہ رکھیں۔“
”نہیں سر۔۔۔! ایسا ممکن نہیں ہے، اس کے بندے کتوں کی طرح میری بوسوگتے پھیر رہے ہیں انہیں جہاں بھی میری خبر مل گئی مجھے گولی مار دیں گے۔“ وہ روتے ہوئے بمشکل اپنی بات مکمل کر پار ہی تھی اور دل اور کے ذہن نے ہمیشہ کی طرح فوری کام کیا تھا۔
”میں کہہ رہا ہوں نا کہ کچھ نہیں ہوگا آپ کو، آپ بس اتنا بتا دیں کہ آپ اس وقت کہاں ہیں۔۔۔؟“ اس نے کچھ سوچتے ہوئے استفسار کیا تھا۔

”مم۔۔۔ میں۔۔۔؟“ وہ بتاتے ہوئے ذرا ہچکچا گئی تھی۔
”مومنہ بی بی! مصیبت اور مشکل کے وقت اللہ کے بعد آدمی کو اپنے ڈاکٹر اور اپنے وکیل پہ بھروسہ رکھنا ہی پڑتا ہے، وہ سب بتانا پڑتا ہے جو ہم نے باقی سب سے چھپا رکھا ہوتا ہے، کیونکہ اس کے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں رہتا، بیماری بتائے بغیر ڈاکٹر زندگی اور موت کی جنگ نہیں لڑ سکتا، اور راز بتائے بغیر وکیل انصاف اور ہار جیت کی جنگ نہیں لڑ سکتا، اب یہ آپ پہ ڈیپنڈ کرتا ہے کہ آپ نے کیا کرنا ہے۔۔۔ اپنی زندگی بچانی ہے یا پھر اس خبیث کے ہاتھوں قتل ہونا ہے۔“ دل اور کالجہ سنجیدگی کے ساتھ ساتھ سخت ہو گیا تھا۔ اور مومنہ بی بی اس کی بات سن کر لاجواب اور شرمندہ ہو گئی تھی۔

”سر! میں۔۔۔ میں اس وقت اوکاڑہ میں ہوں، یہاں میری ایک سہیلی رہتی ہے اس کی یہاں شادی ہوئی ہے لیکن اب۔۔۔ اب تو دو روز سے اس کے سہیل والے بھی باتیں کرنے لگے ہیں اور مجھے ڈر ہے کہ یہ لوگ میری خبر

میرے گاؤں ہی نہ پہنچا دیں۔“

”نہیں نہیں ایسا نہیں ہوگا، آپ اطمینان رکھیں، صبح ہونے سے پہلے پہلے آپ محفوظ ہاتھوں میں پہنچ جائیں گی۔“ دل اور نے تسلی دلائی۔
”لیکن سر۔۔۔!“

”آپ باقی باتیں کسی اور وقت کے لیے رہنے دیں، فی الحال مجھے اس جگہ کا ایڈریس لکھوا دیں جہاں آپ رہ رہی ہیں، آپ کو تھوڑی دیر تک پک کر لیا جائے گا، دل اور کی تسلی اور حوصلے پہ مومنہ بی بی بے یقین سی ہو گئی تھی اسے یقین نہ آیا کہ اتنا بڑا وکیل اس کے کیس میں اس حد تک انوالو ہو رہا ہے۔ وہ بھی بغیر کسی فیس اور معاوضے کے۔۔۔؟

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سر۔۔۔؟“

”دیکھیے بی بی! میں نے آپ سے کہا کہ اس وقت کوئی اور سوال جواب مت کریں۔“ دل اور نے خفگی سے اسے ٹوک دیا تھا اور مومنہ بی بی نے جلدی جلدی اسے ایڈریس لکھوا دیا تھا۔
”معافی چاہتی ہوں سر، تھوڑی دیر کے لیے دل میں بدگمانی آگئی تھی کہ کیس وہ آپ تک نہ پہنچ جائے۔“ وہ ندامت اور شرمساری سے کہہ رہی تھی۔

”ہو نہ۔۔۔! وہ مجھ تک نہیں پہنچے گا بلکہ میں اس تک پہنچوں گا اور معافی مانگنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اپنی زندگی ہر ایک کو عزیز ہوتی ہے ہر انسان اپنی زندگی محفوظ ہی رکھنا چاہتا ہے، آپ کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو یقیناً ایسا ہی سوچتا۔“ اپنی دے آپ فون بند کریں تھوڑی دیر تک آپ کو کال آجائے گی کہ آپ کو کون پک کرنے آ رہا ہے۔۔۔؟“

”آپ کا شکریہ سر! بہت شکریہ۔“ مومنہ بی بی نے فون بند کر دیا تھا اور دل اور نے گہری سانس کھینچتے ہوئے اپنے ہاتھ میں پکڑے سرو چائے کے کپ کو دیکھا تھا۔

بھاپ اڑاتی چائے برف ہو چکی تھی اور برف تو اس کا جسم بھی ہو چکا تھا لیکن بچت یہ تھی کہ اس کے جسم میں دوڑتا لبو بہت گرم تھا جو باہر کی سردی ذرا کم ہی محسوس ہونے دیتا تھا۔ اس وقت بھی وہ سردی سے بے نیاز چائے کا کپ نیبل پہ رکھ کے پلٹا، کھڑکی بند کی، اپنی شرٹ پنی، تولیہ صوفے پہ پھینکا، بال برش کیے اور پھر اس دوران سوچتے ہوئے کسی حتمی فیصلے پہ پہنچ کر اپنا سیل فون دوبارہ اٹھالیا تھا حالانکہ نمبر ڈائل کرتے ہوئے اسے پتا تھا کہ وہ کسی کو نیند سے ڈسٹرب کر رہا ہے، لیکن اس کے بغیر کوئی حل بھی تو نہیں تھا۔

”ہیلو! انسپکٹر شہناز اسپیکنگ۔“ دوسری طرف سے نیند سے بو بھل آواز سنائی دی تھی اس نے یقیناً ”اس کا نمبر نہیں دیکھا تھا۔“

”السلام علیکم! دل اور شاہ بات کر رہا ہوں۔“ دل اور نے کافی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔
”ارے شاہ جی آپ اس وقت؟“ انسپکٹر شہناز کی نیند جیسے ہوا ہو گئی تھی یوں لگا جیسے وہ بستر سے اٹھ کے بیٹھ گئی ہو۔

”شرمندہ ہوں آپ کو نیند سے ڈسٹرب کر دیا۔“ دل اور کالجہ معذرت خواہانہ ہو رہا تھا۔
”ارے! نہیں نہیں شاہ جی ایسی کوئی بات نہیں ہے، آپ سو بسم اللہ کر کے ڈسٹرب کرو، ہم غریبوں کے تو ماتھے پہ شکن تک نہیں آئے گی۔“ انسپکٹر شہناز کی خوشی اس کے لب و لہجے سے ہی محسوس ہو رہی تھی۔

”آپ کہاں ہیں اس وقت؟“ دل اور کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے گہری نیند سے جگا کر لاہور سے اوکاڑہ جانے کے لیے کیسے کہے؟

”ایسی کیا بات ہو گئی آخر۔۔۔ آج میرے شاہجی کچھ پریشان لگتے ہیں؟“ انسپکٹر شہناز اس کی سنجیدگی سے اس کی پریشانی بھانپ چکی تھی۔

”وہ دراصل میں نے آپ کو کسی کام کے لیے فون کیا تھا۔“ دل آور نے بات شروع کی۔
 ”جانتی ہوں شاہجی آپ نے کسی کام کے لیے ہی فون کیا ہے ورنہ ہمارے ایسے نصیب کہاں کہ آپ کو ہماری یاد آئے۔ ہمارا فون کھڑا کیا ہے تو آپ کی مجبوری۔ خیر اللہ بھلا کرے اس مجبوری کا جس نے آپ کو فون کرنے پہ مجبور کر دیا۔“ انسپکٹر شہناز نے شکر ادا کیا تھا۔
 ”آپ جانتی ہیں انسپکٹر شہناز میرا پروفیشن مجھے کسی کو یاد کرنے کے لیے بھی ٹائم نہیں دیتا میرے دوستوں کو مجھ سے شکوے ہوتے لگتے ہیں۔“

”جانے دیجئے شاہجی آپ بہانہ کرتے ہوئے اور صفائی دیتے ہوئے اچھے نہیں لگتے۔“
 ”حالانکہ میرا کام ہی یہی ہے۔۔۔“ وہ ہلکے سے مسکرایا تھا۔
 ”ارے کون کہتا ہے کہ آپ صفائی دیتے ہیں۔۔۔ میں نے تو ہمیشہ آپ کو جج کے سامنے شعلے اگلتے ہوئے اور گرجتے برستے ہوئے ہی سنا ہے۔“ اس نے حیرانی سے کہا تھا۔

”بس کورٹ کی حد تک۔۔۔“ دل آور نے نارمل سے انداز میں کہا۔
 ”ہرگز نہیں! آپ کورٹ سے باہر بھی ویسے ہیں، روکھے پھیکے اور سڑیل سے۔۔۔ مجال ہے جو کبھی آنکھ بھر کے یہ بھی دیکھا ہو کہ پولیس ڈیپارٹمنٹ میں ایک خوب صورت اور حسین و جمیل لڑکی بھی کام کرتی ہے جو آتے جاتے ہوئے بڑی آس سے دیکھتی ہے کہ شاید دل آور شاہ اسے لائن ہی مار دے۔“ انسپکٹر شہناز جل کے بولی تھی اور دل آور کا فلک شگاف قہقہہ بہت دور تک گونجا تھا۔

”لائن تو ہماری دونوں لیکن میڈم آزاد پنچھی ہوں، حوالات سے ڈرتا ہوں، آپ لوگ اندر کرتے ہوئے دیر نہیں لگاتے۔“ وہ دلچسپی سے بولا تھا۔

”شاہجی! آپ ایک بار لائن تو مارو، آپ کو اپنے دل کے اندر رکروں گی، حوالات کے اندر نہیں۔“
 حوالات کے اندر کرنے کے لیے اور جو ہیں۔“ انسپکٹر شہناز نے اسے آفر کی تھی۔
 ”سوری میڈم! قید آخر قید ہی ہوتی ہے چاہے دل کی ہو یا حوالات کی، میرا تو دم گھٹتا ہے، میں تو کسی کے دل میں بھی نہیں رہ سکتا۔“ دل آور نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

”اچھا۔۔۔! کسی کے دل میں رہ نہیں سکتے، لیکن کسی کو دل میں رکھ تو سکتے ہوتا؟“
 ”یہ کام بھی کافی مشکل ہے۔۔۔“ وہ شرارت سے بولا تھا اور انسپکٹر شہناز اس کی چالاکی پہ مسکرائی تھی۔
 ”آپ بندہ گھما دیتے ہو بات گھانا کون سا مشکل کام ہے۔۔۔؟“
 ”بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ، میں نے اس وقت آپ کو گھمانے کے لیے ہی فون کیا ہے۔“
 ”اوکے! فرمائیے پھر۔۔۔؟“ وہ پوری طرح سے متوجہ تھی۔
 ”آپ کو اس وقت اوکاڑہ جانا ہوگا۔“

”اوکاڑہ۔۔۔؟ اس وقت۔۔۔؟“ اسے اچنبھا ہوا تھا۔
 ”جی! میں نے کسی عام سی خوب صورت اور حسین و جمیل لڑکی کو فون نہیں کیا بلکہ ایک لیڈی پولیس آفیسر کو فون کیا ہے جس کے لیے ”اس وقت“ اور ”اس وقت“ کوئی معنی نہیں رکھتے، یہ کسی کی موت اور زندگی کا سوال ہے، آپ کا پہنچنا ضروری ہے۔“ دل آور نے زور دے کر کہا تھا۔
 ”لیکن شاہجی۔۔۔؟“

”آپ جارہی ہیں یا نہیں۔۔۔؟“ وہ دو ٹوک پوچھ رہا تھا۔
 ”ہول! جارہی ہوں۔۔۔“ اس نے اثبات میں جواب دیا۔

”ٹھیک ہے آپ نکلنے کی تیاری کریں میں تھوڑی دیر بعد دوبارہ کال کرتا ہوں۔“ اس نے کہہ کے فون بند کر دیا اور مومنہ بی بی کو بتا دیا کہ انسپکٹر شہناز اسے لینے کے لیے آ رہی ہے۔

کل رات مری پیچھے ہی انہیں تھکن کے مارے کچھ ہوش نہیں رہا تھا کہ وہ کہاں ہیں اور کہاں نہیں؟ نیند اور دن بھر کی تھکن کی وجہ سے انہیں کھانا کھانا بھی یاد نہیں رہا تھا بس انہیں بستر کی طلب تھی اور جیسے ہی انہیں بیڈ روم نظر آئے وہ دیوانہ وار لپکے تھے البتہ آذر نے اپنی ٹگرانی میں سب کا سامان نکلا کے ان کے کمروں میں بھجوا دیا تھا گیسٹ بند کروایا تب اپنے بیڈ روم میں گیا تھا سب سے پہلے بستر پہ ڈھیر ہونے والی علیز نے ہی تھی عائنہ آئینہ سے دیکھنے کے لیے آئیں تو وہ سو رہی تھی اس لیے انہوں نے رجو کو بھی اس کے کمرے میں بھیج دیا تھا اور منصور حسین کو بھی کمرے میں جا کر آرام کرنے کے لیے کہا تھا ہر طرف سے مطمئن ہونے کے بعد وہ خود بھی اپنے کمرے میں آگئی تھیں۔

وہ لوگ تقریباً ”رات کے بارہ بجے“ سوئے تھے اور اس وقت صبح کے بارہ بجے کا وقت ہو رہا تھا لیکن ابھی تک ان میں سے کوئی ایک بھی بے دار نہیں ہوا تھا کیونکہ باہر صبح سے بارش اور برف باری ہو رہی تھی اور پہلی نظر دیکھنے پہ یہی احساس ہو رہا تھا کہ ابھی رات ہے ماحول میں پھیلا ملک جاسا اندھیرا اور غبار شام کا سماں پیدا کر رہے تھے۔
 ”منصور حسین! اچائے پیو گے؟“ رجو کچن کی طرف جارہی تھی جب مین ڈور کے پیچوں پہ کھڑے منصور حسین کو دیکھ کر ٹھہر گئی تھی۔

”ہاں بناؤ۔“ منصور حسین دھیمے لہجے میں بولا۔
 رجو سر ہلاتی ہوئی فوراً ”پلٹ گئی“ پھر وہ چائے لے کر آئی تو اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ اور خود ہی ادھر ادھر کی بے تکی باتوں میں اس کا سر کھانے لگی۔

”رجو۔۔۔! رجو۔۔۔! علیزے رجو کو یکارتی ہوئی اپنے بیڈ روم سے برآمد ہوئی تھی۔
 ”جی علیزے بی بی۔۔۔“ رجو منصور حسین کو وہیں چھوڑ کے بھاگی بھاگی آئی تھی۔
 ”اتنا ٹائم ہو گیا تم نے مجھے جگایا کیوں نہیں۔۔۔؟“ علیزے اپنے ارد گرد شال پھیلتے ہوئے کافی سستی سے بولی تھی۔

”بھوجا گے تھے بی بی جی ایسا موسم دیکھ کر وہ بھی سو گئے اس لیے میں آپ کو بھلا کیا جگاتی۔۔۔“
 ”وہ سامنے کون بیٹھا ہے؟“
 ”منصور حسین۔۔۔“ رجو نے مسکرا کے بتایا۔

”منصور حسین؟“ علیزے نے دوبارہ دیکھا کیونکہ منصور حسین نے اپنے ارد گرد چادر لپیٹ رکھی تھی اور دائیں ہاتھ میں پکڑے کپ سے چائے پی رہا تھا کو ریڈور کی سمت اس کی پشت تھی اس لیے دور سے پہچانا مشکل ہو رہا تھا۔ ”ناشتا بناؤں آپ کے لیے؟“

”ہول! بناؤ۔۔۔“ وہ اسے کہہ کے برف باری دیکھنے کے شوق میں خود بھی باہر نکل آئی تھی۔
 ”سلام بی بی۔۔۔“ منصور حسین اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔
 ”والسلام۔۔۔ تم یہاں کیوں بیٹھے ہو؟ اندر جاؤ۔“ اس نے اسے وہاں سے جانے کا اشارہ دیا تھا۔

”جی بہتر۔۔۔“ وہ سر جھکا کے پلٹ گیا تھا۔ اور علیزے خود وہاں بڑے سے ستون کے پاس کھڑی ہو کر برف باری دیکھنے لگی تھی۔ اس کے چہرے یہ ایسے قدرتی منظر کو دیکھتے ہوئے خوشی اور اشتیاق کے رنگ بکھرے ہوئے تھے۔

”گڈ مارنگ بے بی۔“ دانیال بھی اس کے قریب ہی آن کھڑا ہوا تھا۔
”سیم ٹو بھائی۔“ وہ اسے دیکھ کر خوش دلی سے مسکرائی تھی۔
”رات کیسی گزری۔؟“

”کچھ بتائیں۔“
”کیا مطلب؟“

”مطلب کہ نیند نے کچھ خبر نہیں ہونے دی میں تو فوراً ہی سو گئی تھی۔“

”ایسی کوئی بات نہیں جناب ہم بھی فوراً ہی سو گئے تھے البتہ کچھ خوابوں نے بہت ستائے رکھا تھا۔ بات کرتے کرتے دانیال کا ٹریک بدل گیا تھا، علیزے چونک کر دیکھا وہ قریب آتی حرمت کو دیکھ کر کہہ رہا تھا حالانکہ اس کا انداز کافی غیر محسوس قسم کا تھا۔ لیکن حرمت محسوس کر چکی تھی اور اس کے چہرے پہ شرم کا گلابی عکس لہرا رہا تھا۔

”کس کے خوابوں نے۔۔۔؟“ علیزے نے جان بوجھ کے جھپٹا تھا۔
”بتادیا تو تھا ہوگی۔“

”اور نہ بتایا تو میں خفا ہو جاؤں گی۔“

”ارے میری جان! تمہارا کیا ہے چھوٹی سی چیز یا ہو، جب چاہے پکڑ کر منالو۔“ دانیال نے علیزے کے کندھے پہ بازو پھیلاتے ہوئے کہا تھا۔

”حرمت آئی! دانیال بھائی آپ کو چیز یا کہہ رہے ہیں، کہتے ہیں جب چاہے پکڑ لو۔“ علیزے نے شرارت سے کہا تھا اور دانیال گھبرا گیا تھا۔

”علیزے! میں نے ایسا کب کہا؟“

”میں بھی ابھی کہا تو ہے۔“

”یار! میں نے تو تمہیں کہا ہے وہ جھنجلا گیا تھا۔“

”میں جانتی ہوں آپ نے مجھے کہا ہے۔“ علیزے سرگوشی سے بولی تھی اور حرمت اس کی یہ بلند سرگوشی سنتے ہوئے یکدم کھٹکھٹلا گئے تھے تھی دانیال نے علیزے سے نظر بچا کے حرمت کی ہنسی کو اپنی نظروں میں سمیٹا تھا۔

”اوہ تو تم شرارتی ہو گئی ہو؟“

”بس کل سے ہو گئی ہوں ورنہ پرسوں تک تو ٹھیک تھی۔“ علیزے کا موڈ کافی خوش گوار ہو رہا تھا اور اس کے موڈ کی یہ خوش گواریت پورا دن یونہی طاری رہی تھی رفتہ رفتہ سب نیند سے بے وار ہو چکے تھے اور ایسا شان دار موسم دیکھ کر باہر نکلنے کے لیے محل گئے تھے عائشہ آندنی نے کافی روکا لیکن ان سب کا کہنا تھا کہ وہ یہاں گھومنے پھرنے اور انجوائے کرنے کے لیے آئے ہیں اندر بیٹھنے کے لیے نہیں۔ البتہ عائشہ آندنی نے کہیں بھی جانے سے انکار کر دیا تھا ایک تو وہ کل سے تھکی ہوئی تھیں اور دوسرے باہر بہت زیادہ ٹھنڈ تھی۔ طبیعت خرابی کی وجہ سے وہ اتنی ٹھنڈ بھی برداشت نہیں کر سکتی تھیں اس لیے اپنی ٹیبلٹ لے کر کمرے میں آ کے لیٹ گئی تھیں اور ان لوگوں کا چار گاڑیوں پہ مشتمل قافلہ ایک بار پھر روانگی کے محل میں تھا۔ آج حرمت اور مدحت نے کوئل کو اپنی گاڑی میں بٹھنچ لیا تھا اور اسے فرنٹ سیٹ پہ آذر کے برابر بیٹھنے کا موقع فراہم کیا تھا کیونکہ جودت آج پھر علیزے کی گاڑی میں منصور حسین کے ساتھ انجوائے کر رہا تھا۔
وہ جب اپنے بنگلے سے نکلے تھے تب دن کے تین بجے کا ٹائم تھا اور تین بجے کا ٹائم کب شام آٹھ بجے میں تبدیل

ہو گیا تھا ان لوگوں کو احساس ہی نہ ہوا۔ احساس تو اس وقت بوجھ جودت نے ان لوگوں کو فلم دیکھنے کا آئیڈیا دیا تھا۔
”تو سے بارہ کا شویار۔“ جودت نے احمد اور زین کے کندھے پہ ہاتھ مار کے کہا۔
لیکن لڑکیاں احمد جزیرہ سا ہو گیا۔

”فلم اچھی ہوئی تو دیکھ لیں گے نہ ہوئی تو واپس چلیں گے۔“ اس نے شانے اچکائے۔

”یہ ٹھیک ہے چلو۔“ زین ان سے پہلے آگے بڑھ گیا تھا لیکن آذر فلم دیکھنے کے لیے تیار نہیں تھا مگر سب لڑکے لڑکیوں کو تیار دیکھ کر وہ زیادہ دیر انکار نہیں کر سکا تھا مگر علیزے تھکی ہوئی تھی اس نے واپس بنگلے پہ جانے کا ارادہ کر لیا تھا۔

”لیکن علیزے تم۔۔۔“ آذر کو خفگی ہوئی۔

”آئی ایم سوری بھائی! میں کل سے بھی تھکی ہوئی ہوں مسلسل تین گھنٹے بیٹھنے کی ہمت نہیں ہے میں آرام کرنا چاہتی ہوں سونا چاہتی ہوں بہت نیند آرہی ہے۔“ علیزے کو فلم دیکھنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لیے بہتر تھا کہ وہ گھر جا کر آرام کر لیتی اس کے چہرے پہ بھی تھکن کے آثار تھے آذر اسے مزید اصرار کر کے زبردستی نہیں روک سکا تھا۔

”اوکے جاؤ تم آرام کرو۔“ آذر نے اس کا رخسار تھک کے کہا اور وہ مسکراتی ہوئی پلٹ آئی تھی رجو اور منصور حسین گاڑی میں اس کا انتظار کر رہے تھے اس کے بیٹھتے ہی منصور حسین نے گاڑی اشارت کر دی ابھی وہ راستے میں ہی تھے جب اس کے نمبر پہ آذر کی کال آگئی تھی۔

”ہمارے آنے تک تم سونا مت، علیزے اکیلی ہے خیال رکھنا اس کا، پھپھو تو کھانا کھا کر سو گئی ہیں میں نے ابھی کال کی ہے انہیں مگر وہ ریسو نہیں کر رہیں۔“ آذر نے اسے تاکید کی تھی۔

”جی صاحب جیسے آپ کا حکم، آپ کو تو ساری رات نہیں سوؤں گا۔“ منصور حسین نے تابعداری سے کہا۔
”گڈ۔۔۔! بعد میں ملتے ہیں۔“ آذر نے کہہ کے فون بند کر دیا اور اتنے میں منصور حسین نے بنگلے کے سامنے بریک لگائے تھے چونکہ آذر نے گیٹ کھول دیا تھا وہ ایک جھٹکے سے گاڑی اندر لے آیا۔

”میں آپ کے لیے دودھ لے کر آئی ہوں بی بی جی۔“ رجو گاڑی سے اترتے ہی بچن کی طرف بڑھی تھی۔

”نہیں رہنے دو میں سونے جا رہی ہوں۔“ علیزے شمال سنہالتی ہوئی اپنے کمرے کی سمت آگئی اور رجو اپنے کمرے کی سمت چلی گئی۔ جبکہ منصور حسین وہیں کھڑا رہ گیا تھا کیونکہ اسے جانے کا حکم ملا تھا اور اس نے اس حکم کی تعمیل کرنی تھی وہ اسی ستون کے پاس کھڑا سگریٹ پھونکنے لگا۔ باہر کی سردی اور اندر کی سوچ دونوں اپنے عروج پہ تھیں وہ کہیں سے کہیں پچھتاہوا تھا۔

”منصور حسین! تم سوئے نہیں ابھی تک؟“ رجو نہ جانے کہاں سے نمودار ہو گئی تھی۔
”نہیں! آذر صاحب نے جاگنے کے لیے کہا ہے۔“

”اوہ اچھا! پر وہ رہے ہو؟“

”ہوں۔۔۔“ ”میں بھی دوں؟“ رجو شرارت سے بولی۔

”نہیں! تم جاؤ جا کر سو جاؤ۔“ اس نے اسے اپنے ساتھ جاگنے سے منع کر دیا تھا۔
”لیکن۔۔۔“

”میں نے کہا نا جا کر سو جاؤ۔“ منصور حسین نے سختی سے منع کیا تو وہ فوراً پلٹ کر چلی گئی۔ اور وہ خود بھی اپنے کمرے کی طرف آگیا تھا موبائل کو چار جنگ پہ لگا کر وہ دوبارہ گرم چادر اوڑھے باہر آکر ٹھنڈے لگا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ کریں)

اس بار نہیں سیکھا اس کی ماں بھول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پر مست بخور رہے اور اس کا یقین وہاں سربل کو
کھائی تھا۔

میں
سترہویں قسط

نبیلہ عزیز

دری

11 بڑی دلی کے تمام مکین وقار آندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور حلیوں سے تو اپنے بابا کی شخصیت سے
بہت ہی متاثر ہیں۔
مدھیہ اور نیل حیات دہی بہن بھائی ہیں مدھیہ انتہائی بڑی ہوتی اور خود سر لڑکی ہے وہ انگلیں کی رتینوں میں عمل
خوپر رنگ چکی ہے جس کے پیش نظر فائزہ بیگم نیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں لیکن مدھیہ پاکستان جانے
سے انکار کر دیتی ہے جس پر نیل اور فائزہ بیگم بہ حد پریشان ہیں۔
زوری کو اپنے بھائی مہد آندہ کے دوست سے محبت ہے مگر کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر
ہی اندر چھپ رہا ہے۔
عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا ہے یہی اور
مجبوری سے تنگ آخر خود کشی کرنے کا سوچتا ہے لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھانے میں جاکے پیتے ہوئے پاؤں اتار مل
جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔
منصور حسین ایک غریب اور میسر کپاس آوی ہے وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی دلی میں وقار آندی سے نوکری
مانگنے آتا ہے وقار آندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی
سے واپس لوٹ جاتا ہے۔
دل آدر شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور سچے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے وہ اپنے قول و فعل کا بہت بڑا پیروی ہے اس نے



رات بہت سرد تھی۔

یہ فکری بلکی بلکی کی پھر ارباب بھی جاری تھی اور اس شخص کو اپنے والے موسم میں کو رہنڈور سے باہر میں ڈور سے لٹکے والے جسے میں سکتے منصور حسین کی ٹانگیں شل ہو چکی تھیں وہ کل اور آج کی مسلسل ڈور ایسے سے کافی ہوا تھا اور اوپر سے سردی نے ہر حال کر رکھا تھا تھینڈ اور شخص کی بوجہ سے اس کی آنکھیں بھی کافی بو جھل ہو رہی تھیں وہ سر جھکائے چادر پیٹنے والی بائیں شل رہا تھا اسے پتا تھا کہ اگر وہ تھوڑی دیر کے لیے بھی اپنے کمرے میں گیا تو اسے نیند آجائے گی اور آذر صاحب خواہاں اس پر خفا ہوں گے اس لیے وہ اپنی ڈیوٹی ایما داری سے بچا ہوا اپنے آپ کو سردی کے حوالے کیے ہوئے تھا۔

”منصور حسین۔“ اپنے عقب سے اجنبی آرازن کر منصور حسین چونک کر پلٹا سامنے کوئی اور نہیں اس نے کہا۔
”چوکیدار کھڑا تھا جس کے ساتھ منصور حسین کی صبح بھی ملاقات ہو چکی تھی۔
”ہوں۔“ اس نے صرف ”ہوں“ کہنے پر اکتفا کیا تھا۔

”یہاں تو بہت لمبے ہیں؟“
”ہاں! جانتا ہوں۔“
”پھر یہاں کیا شل رہے ہو۔“ چوکیدار نے حیرانی سے پوچھا۔

”مجبوری ہے“ آذر ملا ہے یہاں لمبے کا۔“ منصور حسین کا لہجہ طنزیہ اور تلخ سا ہو گیا۔
”اچھا۔“ لیکن اتنی لمبے میں کب تک اس طرح کھٹے رہو گے؟“ کر کوٹو کو ٹکوں والی انگلیشی لادوں نے چوکیدار کو اتنی سردی میں کھٹے منصور حسین سے کافی ہمدردی محسوس ہوئی۔

”میں بھی تھوڑی دیر پہلے ہی میری گھر والی نے کوٹے کا کپڑا پہنا ہے۔ تم کہتے ہو تو لے آتا ہوں۔“ چوکیدار کافی دل کا اور مہمان نواز لگتا تھا اس سے منصور حسین کی سردی بدکھی نہیں جا رہی تھی۔

”ارے نہیں یار! تمہاری مہمانی میں ایسے ہی ٹھیک ہوں تمہاری گھر والی نے تمہارے لیے کوٹے کا کپڑا پہنا ہے تم بھی تھکے ہوئے ہو گے“ کر کوٹو کو ٹکوں والی نے چوکیدار کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے تھپکا اور اس شکر یہ ادا کرتے ہوئے اس کی پیشکش سے انکار کر دیا۔

”ارے یار! ہم تو روزیہ کمانڈ لیتے رہتے ہیں اور اگر نہ بھی لیں تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم تو اس موسم کے عادی ہو چکے ہیں لیکن تم یہاں نئے ہو“ تم عادی نہیں ہو“ اس لیے ڈر ہے کہ موسم تم پر اثر نہ کر جائے۔ چوکیدار کے متفکر سے خیال پر منصور حسین کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

”کیا مجھے دیکھنے کے بعد بھی نہیں یہ لگ رہا ہے کہ موسم مجھ پر اثر کر جائے گا۔“ منصور حسین کا اشارہ اپنی صحت کی طرف تھا۔

”کیوں منصور حسین تم انسان نہیں ہو کیا؟ جس پر موسم اثر نہیں کر سکتا؟“ چوکیدار کا سوال بھی بجا تھا۔
”انسان ہوں یار لیکن ایک موہوں اور موہے موسم اثر نہیں کرتے“ موہے غور سے اثر کرتی ہے صرف عورتیں اور موسم عورتیں اثر کرتے ہیں ان تینوں کا نزل سے آئی جیل ہے کہیں میں موہے عورت اور موسم تینوں کو کبھی ایک جگہ اکٹھا کر دو تو قیامت کا پاگل پن اٹھائیں گے“ منصور حسین کا جواب بھی بجا تھا چوکیدار واقعی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

”کیا بات کہی ہے منصور حسین دل خوش ہو گیا ہے اور اسی خوشی میں تمہارے لیے چائے کا ایک کپ بھی ہو گیا۔“ چوکیدار منصور حسین کو شاباش دیتے ہوئے پلٹ کر چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد ہی وہ اس کے لیے دیکھ کر کوٹوں والی انگلیشی لے آیا تھا اور پھر اسے انگلیشی کے قریب کرسی بھی کھینچ دی۔

”تم بیٹھ کر ہاتھ سینکھو میں چائے لے آؤں۔“ وہ دوبارہ اسے کو آؤں کی سمت چلا گیا اور منصور حسین کرسی پر بیٹھنے لگے۔
”آگ کی پیش سے لطف اندوز ہونے لگا تھا کہ سرخ انگور کے انگلیشی میں جیسے بھڑک رہے تھے اور وہ ان بکٹے بکڑے کوٹوں پر نظر جمائے نہ جانے ان میں کیا کھوج رہا تھا کہ اسے چوکیدار کی واپسی کا بھی احساس نہیں ہوا۔“
”تو منصور حسین چائے پیو۔“ چوکیدار نے چائے کا بھاپ اڑا کر اس کے چہرے کے سامنے کیا تھا وہ اپنی دلی سے کرما کر مٹا دیا چائے سوا کے لایا تھا منصور حسین نے چونک کر اسے دیکھا پھر مسکرا دیا۔
”سہرا بی بی! یہ کالی زحمت کی ہے تم نے۔“ وہ اس کے ہاتھ سے کپ تھامتے ہوئے کافی ممنون سے لہجے میں

”ارے! زحمت کیسی؟“ تم مہمان ہو یہاں اور دوسری بات کہ تم ملازم ہو اور ایک ملازم کی حالت کو ایک ملازم کی سمجھ سکتا ہے“ مالک لوگ اپنا تو خیال کر لیتے ہیں تمہارے اور میرے جیسے ملازموں کا نہیں کرتے“ اس لیے ایک دو سرے کا خیال اور احساس ہمیں خود کرنا چاہیے“ مالکوں سے ایسی امید فضول ہوتی ہے۔“ چوکیدار مسکرا کر کہتے ہوئے دوسری کرسی کھینچ کے اس کے مقابلے میں بیٹھ گیا۔
”ارے نہیں یار! ایسی کوئی بات نہیں ہے“ ہمارے مالک لوگ اتنے برے بھی نہیں ہیں کافی خیال رکھتے ہیں“ اب بھی دیکھ لو میں نے یہاں آنا تھا اور میرے پاس گرم کپڑے بھی نہیں تھے اس لیے علیحدہ سے لی بل نے پیسے دیے اور میں جا کر اپنے لیے گرم کپڑے اور یہ گرم چادر لے آیا اب اگر یہاں سردی میں میں اپنی ڈیوٹی نبھا رہا ہوں تو میرے پاس گرم کپڑوں کا تھوڑا بہت سارا تو ہے نا۔“ کر کوٹو کو ٹکوں والی نے چوکیدار کو اس سے اب تم ہی اندازہ لگاؤ کہ ہمارے مالک اچھے ہیں یا برے۔“ منصور حسین نے اپنے مالکوں کی طرف داری کی اور چوکیدار مزید کچھ نہیں کہہ سکا وہ اس کے جواب پر خاموش ہو گیا لیکن تھوڑی دیر بعد منصور حسین اسے دیا دے اپنے ساتھ باتوں پر تان کر چکا تھا ان باتوں کی کچھ دیر کے لیے محفل جم گئی تھی۔
”تم سگریٹ کھینچو پیتے ہو۔“ چائے کے بعد منصور حسین نے سگریٹ اور ماچس کی ڈیا لٹا لی تو چوکیدار نے بے ساختہ پوچھ لیا۔
”ہاں یار! شراب منگنی ہے وہ نہیں لی سکتا سگریٹ سستا ہے اس لیے لی لیتا ہوں۔“ اس نے سگریٹ کو دیکھتے ہوئے استہزائیہ سے انداز میں کہا اور پھر سگریٹ کو ہونٹوں میں دیا کر ماچس کا شعلہ جلا لیا۔ لیکن سردی اور سرد ہوا کے باعث ماچس کی تیلی کا یہ نیخا سا شعلہ فوراً بجھ گیا تھا وہ ایسے سرد موسم کی تاب نہیں لایا تھا اس لیے منصور حسین کو ایک اور تیلی جلائی پڑی لیکن اب کی بار منصور حسین نے اس شعلے کو ہاتھ کی آؤٹ کا سارا دیا اور اپنے ہاتھ کی سمت ذرا سا جھکے ہوئے سگریٹ کا کش لیا اور سگریٹ سٹکالیا۔
”یہ بھی نہ پھا کرو۔“ چوکیدار نے منع کیا تھا۔
”جس روزیہ بھی منگا ہو گیا اس روز میں یہاں گا۔“ اس نے انگلیوں میں دبے سگریٹ کو دیکھ کر سر جھٹک دیا۔
”اچھی بات ہے۔“ چوکیدار مسکرایا۔ اور منصور حسین اور مراد ہر دیکھنے لگا چوکیدار کی باتیں اور سوال جواب اب بھی جاری تھے ان کی نشست کافی دیر قائم رہی تھی۔

مری میں کوئی سینما نہیں تھا جہاں وہ فلم دیکھنے کے لیے جاتے یہاں کسی نے اپنی رہائش گاہ کو سینما کا دیویدے رکھا تھا بڑے سے وسیع و عریض ڈرامنگ روم کو ہر چیز سے خالی کر کے پورے ہال میں کرسیوں کا انتظام کر رکھا تھا

اے میں طرف کھٹنے والی کھڑکی کا ایک پتہ کھلا ہوا تھا اور پردے پہ کسی آدمی کا سایہ لہرا رہا تھا اور وہ بھی مل رہا تھا علیزے کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور اس کے دل و دماغ میں خوف کی ایک لہر سرایت کر گئی تھی۔

"الگ سے کون ہے؟" اس نے خوف زدہ سے لہجے میں پوچھنے کی کوشش کی لیکن اس پہ ایسی دہشت سوار ہوئی تھی کہ حلق سے اس کی آواز ہی نہ نکل سکی اور اس میں اتنی امت بھی نہیں تھی کہ وہ اپنے بستر سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس جاتی اور دیکھ لیتی کہ باہر کون ہے؟

"ہائے۔" علیزے نے کھٹی کھٹی سی آواز میں اپنے پاپا کو پکارا جیسے وہ اس کے پاس بیٹھتا ہے۔ فوراً اس کے پاس پہنچا ہائیں کے علیزے کو اپنی موت اپنے بہت قریب محسوس ہو رہی تھی دل تھا کہ اتھاہ گمراہیوں میں پڑتا جا رہا تھا اور خوف تھا کہ اس کی روح کھینچ رہا تھا علیزے کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے باہر سے سرگرمیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی اور ان سرگرمیوں میں کوئی کیا کہہ رہا تھا اسے کچھ خبر نہیں تھی۔

"آؤ بھئی۔" اس کی دوسری پکار آؤ بھائی کے لیے تھی لیکن وہ اپنے پاپا کو اور آؤ بھائی کو یہاں بستر میں بیٹھے دیکھ کر نہیں بلا سکتی تھی، انہیں بلانے کے لیے اسے فون کی ضرورت تھی لیکن اسے یہ بھی یقین تھا کہ آؤ بھائی کے آنے تک وہ زندہ نہیں رہے گی لیکن پھر بھی لرزے کانپتے ہاتھوں سے وہ موبائل ٹھونکنے لگی اور سائڈ ٹیبل سے موبائل ٹھونکتے ہوئے پانی کا جگہ حرام سے زمین پہ گرا اور پکنا چور ہو گیا تھا علیزے سے خود بھی چیخ کے اٹھ بیٹھی تھی اس نے وحشت زدہ ہو کر کدیم کھڑکی کی سمت دیکھا جیسے کسی نے ہاتھ اندر دیر بھا کر کھڑکی کا پتہ زور سے بند کر دیا تھا اور اس منظر پر علیزے کی چیخ بڑی بے ساختہ تھی وہ کیم بستر سے چھلانگ مار کے اتری اور دروازہ کھول کے باہر بھاگ نکلی تھی۔

لھندے فرش پہ نکلے پیر اور ننگے سر بھاگتی ہوئی وہ چیخ رہی تھی اس کا سرخ کوریڈور کی سمت تھا اور کوریڈور سے باہر لہجہ منصور حسین بھی اس کی چیخوں کی آواز پہ بری طرح چونک گیا تھا۔

"علیزے علی بی۔" وہ اندر کی چویشن سے پریشان اپنی جیب سے ریوالت نکال کے کوریڈور کی سمت لگا لیکن علیزے کوریڈور کا تمام فاصلہ طے کرتی ہوئی آئی اور سامنے سے آتے منصور حسین سے بری طرح ٹکرائی۔ اور منصور حسین اس کے اس طرح چلنے سے سکتا نہ سمجھا وہ گیواہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا علیزے کی پل اس نے سینے سے آگلی تھیں۔؟ حیرت تھی کہ قیامت تھی کچھ اور ہی عالم تھا علیزے کا چہرہ منصور حسین کے گرد لپٹی گرم چادر میں چھپ گیا تھا اتنا کہ منصور حسین کے سینے سے لگ گیا تھا۔

"علیزے علی بی۔" منصور حسین نے اپنے مضبوط اعصاب اور بلند کردار کا ثبوت دیتے ہوئے اسے احتیاط سے توجہ کیا تھا۔

"نہیں۔ ڈرائیور! وہ۔۔۔ میرے کمرے میں۔ کوئی۔ کوئی۔ آدمی کھٹنے کی۔ لگے۔ کوشش۔ کر رہا تھا۔" علیزے بے ربط سے لہجے میں بمشکل بول پاتی تھی۔ منصور حسین یکدم ہلک گیا تھا۔

"کوئی آدمی۔؟ کب؟ آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔؟" منصور حسین نے اسے پیچھے ہٹا کر اس کے کمرے کی سمت بڑھتا چاہا تھا لیکن علیزے اس سے الگ ہو کر پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہیں تھی منصور حسین ہنسنا کیا اس نے علیزے کو دونوں کندھوں سے تمام کے اسے خود سے الگ کیا وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی۔

"آپ میرے پاس کیوں بھپ رہی ہیں؟ میں آپ کا ملازم ہوں ملازم آپ کا ڈرائیور منصور حسین کچھ اور ات پیچھے مجھے۔" اس نے علیزے کو ڈراسا سمجھوڑ کے اسے ہوش دلایا تھا تاکہ اس کے حواس ٹھکانے پہ

اور ایک صاف دیوار پہ پروجیکٹر کے ذریعے فلم دکھائی جاتی تھی یہاں کا ماحول بھی ان سب کو خاموش پسند کا تھا ان کے علاوہ اور بھی چند منجیلے اور بے فکر لوگ موجود تھے۔

"حرمت! تم لوگ کھانے کے لیے کچھ لوگ۔؟" یہاں موجود ہر قومی کے ہاتھ میں کھانے کے لیے کوئی نہ کوئی چیز ضرور تھی جسے دیکھ کر تڑکڑکیوں کا خیال آگیا تھا۔

"جی! اب باب کارن لوگ۔" حرمت نے فوراً اپنی پسندیدہ بھاری باری سب سے اپنی پسند آؤر کو بتائی۔ آؤر سر ہلا کر ہلٹ گیا لیکن کچھ یاد آئے یہ وہ بارہ ان کی سمت پلٹا تھا۔

"اے کوئل! آپ نے تو کچھ بتایا ہی نہیں۔؟" اس نے انوش کے ساتھ ایک سائیڈ پہ کھڑی کوئل سے حیرت سے استفسار کیا تھا۔

"آپ نے کچھ پوچھا بھی تو نہیں۔؟" کوئل نے آہستگی سے کہتے ہوئے کندھے اچکائے تھے۔

"پوچھا تو میں نے انوش اور جویریہ سے بھی نہیں پھر بھی انہوں نے اپنی پسند بتا دی ہے۔" آؤر کے جواب پہ کوئل کا جواب ہو گئی تھی۔

"اپنی پسند بتاؤنا اچھا ہوتا ہے سامنے والے کو بندے کی پسند اور ناپسند کا پتا تو چل جاتا ہے نا؟ اور اس طرح دوسرا بندہ آگاہ بھی ہو جاتا ہے بڑے فائدے ہوتے ہیں پسند بتا دینے کے۔" انوش نے فوراً مداخلت کی تھی اور کوئل نے چونک کے دیکھا۔ انوش کی بات خود معنی تھی۔

"بھائیے اپنی پسند میں سن رہا ہوں۔" آؤر انتظار میں کھڑا تھا۔

"آؤر کریم۔" کوئل نے آہستگی سے کہا۔

"آؤر کریم۔؟ اس موسم میں۔؟" آؤر کو اچھا ہوا۔

"جی! اس موسم میں۔" کوئل نے سر ہلایا۔

"لیکن کوئل اس موسم میں آؤر کریم سے گلا خراب ہو جائے گا بیمار پڑ جاؤ گی۔" آؤر نے اسے باز رکھنا چاہا۔

"اس موسم میں ہی تو آؤر کریم کھانے کا مرا آتا ہے" آپ بھی نرالی کر کے دیکھیں۔" کوئل بے ساختہ کہنے ہوئے مسکرائی تھی۔

"اؤ کے ایڑیوں پر۔" اس نے کندھے اچکائے اور ذہن کو ساتھ لے کر باہر نکل گیا تھا اس گھر سے باہر ہی چھوٹی سی کینٹین بنی ہوئی تھی وہیں پہ کھانے پینے کی ہر چیز دستیاب تھی تھوڑی دیر بعد وہ ان سب کی پسند کی تمام چیزیں لے لیا تھا لڑکے پہلے ہی کچھ نہ کچھ کھاتے پھرتے تھے اور اتنے میں فلم بھی اشارت ہو گئی وہ سب اپنی اپنی جگہ پہ لگے کینٹین کے تھے کوئل آؤر کے ساتھ ہی بیٹھی آؤر تھی۔

علیزے اپنے روم میں آتے ہی گہری نیند سو گئی تھی سردی اور حلق کی وجہ سے جیسے ہی اسے بستر کی نرمی اور کمرے میں موجود ہوشی گرائش میسر آئی اس کی پلکیں فوراً ہی بند ہونے لگیں اور چند سیکنڈز میں ہی وہ پرسکون اور گہری نیند کی دلدلیوں میں اتر گئی تھی اسے یہ بھی خبر نہیں تھی کہ باہر موسم اپنی کن جولانہ لہر پہ ہے۔؟ وہ جس کمرے میں آئی تھی وہاں اسے اسی کمرے پہ گزر گئی تھی بہت دیر گزر جائے کے بعد اسے نیند میں ہی حلق کی احساس ہوا تو اس نے دائیں طرف سے بائیں طرف کمرے کی طرف دیکھا اور کمرے کے بعد اسے نیند میں ہی حلق کی احساس ہوا تو اس نے سر سر سے انداز میں دیکھا اور دوبارہ پلکیں موندی تھیں لیکن پلکیں موندنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ اس نے کوئی غیر معمولی چیز دیکھی ہے جس کی وجہ سے علیزے نے یکدم پرست سے آنکھیں کھول دی تھیں۔

آجائیں کیونکہ منصور حسین کو ہوا تھا کہ وہ ایسی حرکت بدحواسی میں کر رہی ہے اور اس کے چھوڑنے پہ واقعی ہوش میں آگئی تھی اور ہوش میں آتے ہی اسے پہلا خیال منصور حسین کے ہاتھوں کے لپس کا آیا تھا وہ یکدم مہدک کے پیچھے ہٹی اور اس کے پیچھے پہنچے ہی منصور حسین کو اس کی بدحواسی کا مزید احساس ہوا تھا وہ بھاگنے اور نکلنے سر کھڑی تھی۔ منصور حسین اپنی گرم چادر اس کی سمت بڑھاتے ہوئے اس سے نکل کر اس کے کمرے کی طرف بڑھ گیا علیزے کو بھی اپنے ڈوپٹے کی کمی کا احساس ہوا تھا اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی چادر اپنے ارد گرد اوڑھ لی اور کوریڈور میں تنہا کھڑے رہنے کی بجائے وہ بھی منصور حسین کے پیچھے اپنے کمرے میں چلی آئی وہ اس کے کمرے کی تمام لائٹس جلا دیا تھا۔

"کہا ہوا ہے یہاں؟ کہاں وہ کھاتا ہے؟" منصور حسین اس کے پورے کمرے میں جائزہ لیتے ہوئے کھوجتی نظروں سے دیکھ رہا تھا بید کے قریب فرش پر پانی گرا ہوا تھا اور پیسے کے جگ کے ٹوٹے ہوئے کاچ کافی دور تک بکھرے ہوئے تھے قریب ہی علیزے کا موبائل بھی پانی میں گرا ہوا تھا۔

"وہاں کھڑکی کے پاس۔" علیزے نے ڈرتے ڈرتے اشارہ کیا۔ منصور حسین کاچ کے ٹکڑوں کو اپنے پونوں سے روندتا ہوا کھڑکی کے قریب چلا آیا کھڑکی کے پتے تیس میں سے ہوتے تھے لیکن کھڑکی کا کھدواقی کھلا ہوا تھا اس نے پردہ ہٹا کر اپنا ریو اور ریڈی کیا اور یکدم دونوں پتے کھول دیئے لیکن باہر کوئی بھی نہیں تھا منصور حسین نے کھڑکی سے باہر سر نکال کے دیکھتے ہوئے دائیں بائیں دیکھا۔ لیکن وہاں تو دور دور تک کسی کا نام و نشان تک نہیں تھا ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔

"یہاں تو کوئی نہیں ہے علیزے بے بسی۔" اس نے پلٹ کر دم سارھے کھڑی خوف زدہ سی علیزے کو دیکھا۔ "وہ یہاں ہی کھڑا تھا اس نے اس نے جگ کرنے کی آواز سن کر کھڑکی بند کر دی وہ بھاگ گیا ہو گا۔" علیزے کہتے ہوئے دھڑکی تھی اس کا پورا جسم لرز رہا تھا وہ سری بار ایسا ہوا تھا کہ وہ کسی بڑے حادثے سے بچ نکلی تھی لیکن ہر بار تو ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔؟

"تو کون تھا۔؟ کیسے آیا اور کیسے بھاگ گیا۔؟" ایکٹ کے سامنے اور بیداری کے باہر تو میں پہو دے رہا تھا۔؟ منصور حسین کو حیرت اور پریشانی ہو رہی تھی اس کی موجودگی میں علیزے بے بسی کو کچھ ہو جاتا تو وہ کار آئندگی کے سامنے اسے ہی جوابدہ ہونا پڑتا انہوں نے علیزے کی حفاظت اسی کے ذمے لگا کر بھیجا تھا منصور حسین سوچ کر ہی معاملے کی سنگینی کا احساس ہو گیا اسی لیے وہ زیادہ پریشان ہو رہا تھا۔

"آپ نہیں میں ابھی آتا ہوں۔" وہاں ہر نکلنے لگا۔ "جیس ڈرائیور اٹم کیس نہیں جاؤ گے۔" علیزے اکیلے پن سے ڈر رہی تھی۔ "کیا مطلب ہے آپ کا؟" وہ گھبرا گیا۔ "مجھے اکیلے ڈر لگ رہا ہے۔" "اور مجھے آپ کے ساتھ ڈر لگ رہا ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہو تم؟" "کچھ نہیں۔" منصور حسین کہہ کے باہر نکل گیا اور وہ لان کے اس حصے کی طرف آیا جہاں علیزے کے کمرے کی کھڑکی کھلی تھی کھڑکی سے باہر لان کی رو عری ہوئی گھاس سے لگ رہا تھا کہ واقعی وہاں کوئی آیا تھا اس نے اس جھلے کی چھوٹی چھوٹی دیواروں کو دیکھا جہاں سے کوئی بھی کود کر با آسانی اندر آ سکتا تھا منصور حسین ان دیواروں سے جھانک کے بھی دیکھ آیا تھا لیکن اسے کوئی مشکوک آدمی نظر نہیں آیا بلکہ منصور حسین سوچ رہا تھا کہ جو بھی یہاں آیا تھا اس کی اسپید بہت تیز تھی جو اتنی جلدی مقابہ ہو گیا۔

"کوئی ملا۔؟" وہ واپس آیا تو علیزے نے چھوٹے ہی استفسار کیا تھا۔ "اگر کسی نے ملنا ہو آتا تو ہانگنے کی ضرورت کیا تھی بھلا۔؟" وہ واپس سے کہہ رہا تھا۔ "اب کیا ہو گا۔؟" علیزے سے پوچھتے ہوئے بھی ڈر رہی تھی وہ کافی خوف زدہ اور ڈری سہی سی لگ رہی تھی اور اوپر سے ٹھنڈکی وجہ سے اس کی رگت لگ بلی بلی ہو رہی تھی۔ "میں آؤر صاحب کو کال کر کے گھر بلا آؤں۔"

"نہیں نہیں۔" تم ان کو کال مت کرو۔" علیزے نے بے ساختہ اسے روک دیا۔ "کیوں علیزے بے بسی۔؟" اتنی بڑی بات ہو گئی ہے اور آپ نے؟ منصور حسین کو حیرت ہوئی۔ "اس سے پہلے اس سے بھی بڑی بات ہو چکی ہے اور تمہیں نہیں پتا کہ اس بات کا کتنا اثر ہوا تھا؟" کتنے پریشان اور شش ہوئے تھے اتنے دن حوٹلی کے سب لوگ اسی پریشانی کے زیر اثر رہے تھے اور اب بھی یقیناً ایسا ہی ہو گا۔" علیزے پریشان اور کشمکش کا شکار تھی۔ منصور حسین کو اس کی بات پہ تعجب ہوا تھا۔ "لیکن علیزے بے بسی۔"

"پلیز ڈرائیور! میں بہت پریشان ہوں کیونکہ میں اپنی وجہ سے کسی کو پریشان نہیں کرنا چاہتی پہلے ہی سب میری وجہ سے اتنا پریشان رہتے ہیں اور اب میری وجہ سے ان کا پروگرام خراب ہو میں یہ نہیں چاہتی۔" علیزے کا لہجہ بدلتا ہوا تھا اس کے حلق میں آنسوؤں کا گولا سا انگ گیا وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھام کے سو فیہ بیٹھ گئی۔

"تو اس میں آپ کا کیا قصور ہے علیزے بے بسی۔؟" "میرا کوئی قصور نہیں ہے تو اس میں وہ سبوں کا کیا قصور ہے کہ میری وجہ سے وہ سب بھی ڈسٹرب ہو۔" "علیزے کی آواز ٹھک رہی تھی۔ "اس میں ڈسٹرب ہونے کی کیا بات ہے۔؟"

"تم سمجھ نہیں رہے اس میں ڈسٹرب ہونے کی ہی تو بات ہے پاپا کو یا آؤر بھائی کو پتا چلے گا تو فوراً واپس کا آؤر دے دیں گے اور یہ سب جو اتنی خوشی خوشی کھوئے پھر کے لیے آئے ہیں ان کا موڈ خراب اور پروگرام مڑا ہو کے رہ جائے گا بلکہ آئندہ کبھی بھی اجازت نہیں ملے گی ہمیشہ کے لیے سب پہ پابندی لگ جائے گی۔" علیزے نے بنیادی طور پہ ایک ڈری سہی اور ڈرپوک سی لڑکی تھی اس وقت بھی اس کے دل میں خوف پوری طرح سے موجود تھا لیکن وہ اپنے اندر کے اس خوف کو پانی ہوئی پانی سب کا خیال کر رہی تھی اسے پتا تھا کہ پاپا کا غصہ پانی سے پہ ہو گا اور اسے ساتھ لائے والے آؤر بھائی کو بھی پاپا کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے گا۔ "لیکن علیزے بے بسی! اگر کوئی نقصان ہو گیا تو۔؟" منصور حسین کو اندر ہی اندر پریشانی ملا حق تھی اسے بھی بار بار یاد کار آئندگی کا ہی خیال آ رہا تھا۔

"نہیں ہو گا نقصان" تم رجو سے کہو اگر میرے کمرے میں سو جائے میں اب بلاٹ جلا کر سوؤں گی اور سنو! تم صرف کیٹ کی طرف ہی نہیں باقی گھر کی طرف بھی دھیان رکھنا ڈرائیو اس کافی چھوٹی ہیں۔" اس نے منصور حسین کو تائید کی اور منصور حسین اسے دیکھ کے رہ گیا وہ چھوٹی سی کم عمر اور کسن سی لڑکی وہ سبوں کے خیال سے اپنے اندر کا خوف اندر ہی دبا کر مہاروی اور سمجھ داری کا ثبوت دے رہی تھی۔ منصور حسین کو اس لیے معصوم سی لڑکی چاہا تھی اور بہت سی داری لگی وہ بے ساختہ اسے ہی دیکھنے گیا۔

"آؤر ایوب۔" علیزے نے اسے دیکھ کر کھڑے ہو کر متوجہ کیا۔ یہ یکدم چونک گیا۔ "میں نے تم سے کچھ کہا ہے نہ تم نے۔"

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی ویب سائٹ

یہ تمام پاکستانی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں؟

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر پو پو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیٹنگ اور ایچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور معنفین کی کتب کی مکمل ریٹ
- ☆ ہر کتاب کا الگ نیلشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں ایڈوڈنگ
- ☆ پیرنٹ ڈائریکٹری والی آن لائن پبلیکیشن
- ☆ عمران سیریز از مظہر ظہیم اور ابن صفی کی تفصیل ریٹ
- ☆ ایڈیٹری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرف نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

۱۰۰ ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

☆ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

☆ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے نہیں اور جانے کی ضرورت نہیں، ہری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

"جج تھی۔ سب سن لیا ہے ابھی بھیجنا ہوں۔" وہ فوراً اس کے کمرے سے باہر نکل آیا اور رجو کو دنگا علیزے کے کمرے میں بھیج دیا مگر اس کے باوجود منصور حسین کی پریشانی اور سوچ کم نہیں ہوئی تھی وہ اب زیادہ جو کس ہو کر جاگ رہا تھا اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اچانک یہ سب کیا ہوا ہے؟

"کیا علیزے نے بی بی کا دشمن اتنا یا خبر ہے کہ وہ ان کے پیچھے مری بھی بھیج گیا ہے تو کیا واقعی علیزے نے بی بی کی جا کو خطرہ ہے؟ لیکن ان کے دشمن نے انہیں ابھی تک کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ بہو سکتا ہے وہ سوچ کی تلاش میں ہو۔" منصور حسین کے ذہن میں طرح طرح کی سوچیں اور طرح طرح کے سوال اٹھ رہے تھے اسے اس مسئلے کا کوئی سریر نظر نہیں آ رہا تھا اور شیم کی تھکی کی طرح ہر دوی ابھی ہوئی تھی اور سلجھنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

وہ نرم بستہ اوٹھ می لٹھی مہری غند سوری تھی جب اچانک اس کے سیل۔ اولڈ رنگ بجنے لگی۔ اس نے اس رنگ کی آواز سے بچنے کے لئے تکیہ اٹھا کر اپنے سر پہ رکھ لیا تاکہ اس کی غند سوری نہ ہو۔ دوسری طرف والا شاید کچھ زیادہ ہی ذہین یا مجبور تھا جو اسے بار بار رنگ کر رہا تھا مدحیہ سے بالا خرغے سے ہوتا ہوئے تکیہ پر بے چین اور سیل اٹھا کر کان سے لگا لیا۔

"سیل؟" اس کا غصہ اور بے زاریت اس کی ایک سیل میں ہی سمٹے ہوئے تھے۔

"میڈی! میں جیڑی بات کر رہا ہوں۔" دوسری طرف کی آواز سن کر اسے مزید غصہ آیا۔

"یہ بھی کوئی وقت ہے بات کرنے کا۔"

"میڈی! میں اس وقت مشکل میں ہوں۔" وہ بے جا راپریشان لگ رہا تھا۔

"مشکل میں؟ کیا مطلب؟" وہ کڑوت بول کر سیدھے ہوتے ہوئے بولی۔

"میں نے تمہیں بتایا تھا میں پاکستان آ رہا ہوں۔ تو اب میں اس وقت پاکستان میں ہوں۔"

"واٹ؟ پاکستان میں؟" وہ کرنٹ کھا کے اک جھٹکے اٹھ بیٹھی۔

"ہاں پاکستان میں۔"

"مگر کہاں ہو؟"

"لاہور ایئر پورٹ میں ہوں۔"

"اف مائی گاڈ! اٹم نے مجھے بتایا بھی نہیں؟" مدحیہ ایک تو فیئڈ سے اٹھی تھی اور ایک جیڑی کی اچانک آمد وہ حقیقتاً پریشان ہو گئی اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرنا چاہیے؟

"میں نے سوچا تھا کہ تمہیں اچانک سربراہان کا لیکن یہاں آکر مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ کہاں جاؤں اور کون؟ تمہارے گھر کا پتہ مجھے معلوم ہے اسی لیے پریشان ہو کر تمہیں کال کی ہے۔" جیڑی خود بھی شرمے ہو رہا تھا۔

"کیا بات ہے میڈی؟ تمہیں میرا آنا اچھا نہیں لگا؟" مدحیہ کو خاموش دیکھ کر جیڑی نے ساختہ پوچھا تھا۔

"ہوں؟ نہیں انکی بات نہیں ہے ہم دیں تھو میں ابھی آ رہی ہوں۔" مدحیہ نے کہہ کر فون بند کر دیا اور کبل پر سے ہٹا کر بستر سے اٹھ کئی باتھ روم میں جا کر چہرے پانی کے چھپا کے مارے اور تولیے سے چہرہ پونچھا ہوئی باہر نکل آئی، بلیک بڑاؤز پر اس نے ڈائسٹ ہاف سلپوس ٹاپ پہن رکھا تھا اور ٹاپ کے اوپر ہی اس نے بلیک لائنگ جرسی پہن لی، ہاتھ کو پونی میں جکڑ کے اپنا کمرے ٹکر کا کمر نظر کھینچا اور اپنے سر اور گردن کے ارد گرد لپیٹ لیا۔

نہ جو کر دے گاڑی کی چابی، موبائل اور بیگ اٹھائے اور کمرے سے نکل آئی وہ کافی عجلت سے بیڑھیال ہاتری تھی جس سے ڈرائنگ روم میں کھلتے ممتاز حیات سے چونک کر دیکھا انہیں اسے گھر میں اتنی جلدی کسی کے اٹھنے کی ہرگز امید نہیں تھی لیکن مدحہ کو دیکھ کر انہیں اچنبھا ہوا تھا وہ بھی انہیں دیکھ چکی تھی لیکن انہیں نظر انداز کر کے ہوئی آگے بڑھ گئی تھی۔

”کو کہاں جا رہی ہو تم۔“ ان کی آواز یہ مدحہ کے قدم ٹھہر گئے تھے وہ ان کے سوال پہ بہت خوش ہوئی تھی۔ اس نے ایڑیوں کے بل گھوم کر انہیں دیکھا۔

”ایئر پورٹ۔“ مختصر سا جواب دیا تھا۔

”ایئر پورٹ۔“ انہوں نے جواباً دہرایا تھا۔

”جی ایئر پورٹ“ اپنے بوائے فرینڈ کو لینے کے لیے جا رہی ہوں، اگلیٹھ سے کیا ہے، صرف مجھ سے ملنے کی خاطر۔“ اس نے اک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے جواب دیا۔

”یہ کیا بکواس کر رہی ہو تم؟“ ٹیل کہاں ہے۔“ اسے تمہاری بے ہودہ حرکتوں کا پتا نہیں ہے شاید۔“

”کی تو مجھے انسو ہے کہ ٹیل بھائی کو آپ کی بے ہودہ حرکتوں کا بھی پتا نہیں ہے شاید، ورنہ وہ آپ کو کب کا کامل چاہتا تھا وہ اپنے بدکردار باپ کو آگ لگا کر جلا دے، مجسم کر ڈالے ان کو، لیکن اس کی بے بسی بھی کہ اس کا بس نہیں چلتا تھا۔“

”اپنی زبان کو نگاہ دو۔“

”آپ جیسے گھٹا اور بے رگام انسان کی اولاد ہوں میں، مجھے کون لگام ڈال سکتا ہے بھلا۔“ وہ ممتاز حیات کو دیکھ کر اس سے۔

”ایم سوری میں لیٹ ہو رہی ہوں، جھڑی ایئر پورٹ پہ میرا انتظار کر رہا ہوگا، آپ کی یہ تکرار پھر بھی سی۔“ مدحہ ان کا خون جلاتی ہوئی اطمینان سے پلٹ کر کو ریڈور عبور کر گئی اور پیچھے ممتاز حیات کا خون کھول دیا۔

”ممتاز حیات کو اس کے بوائے فرینڈ کا سن کر غصہ آیا تھا مدحہ کے لیے یہی بہت بڑی بات تھی اس کا مطلب تھا کہ جون سوچتی تھی جون چاہتی تھی وہ کر سکتی تھی۔“

”ہوں جھڑی بہت اچھا لگا کہ تپا کستان آگے۔“ وہ ڈرائیو کرتے ہوئے جھڑی کو دل ہی دل میں شاباش دے رہی تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ ایئر پورٹ پہ موجود تھی اور جھڑی کو ڈھونڈ رہی تھی۔

”میڈی۔“ وہ ایئر پورٹ پہ موجود تمام سٹے پینجرز میں جھڑی کو ڈھونڈ رہی تھی جب اسے اپنے عقب سے جھڑی کی گواہی سنائی دی۔

”جھڑی۔“ وہ بے ساختہ پیچھے پلٹی۔

”اے۔“ جھڑی نے بہت سی دھیس سے لیجے میں کہا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے اندر المیہ والی خوشی اور جذبے کو بار بار ہو۔

”کیسے ہو۔“

”کچھ پتا نہیں۔“ جھڑی نے ہلکے سے مسکراتے ہوئے کندھے اچکا دیے تھے۔

”لگتا ہے پاکستان آکر تو اس گم ہو گئے ہیں تمہارے؟“ مدحہ نے دلچسپی سے اسے دیکھا تھا۔

”پتا نہیں۔“

”آف جھڑی۔“ مدحہ اسے گھورتے ہوئے چچا اٹھی تھی اور جھڑی یکدم قہقہہ لگا کے ہنس پڑا جس پہ مدحہ کی اپنی مسکراہٹ رنگ نہیں پائی۔

”اچھی لگ رہی ہو۔“ اس نے مدحہ کو دیکھتے ہوئے تعریف کی۔

”ستے دنوں بعد دیکھ رہے ہو اس لیے ورنہ اتنی اچھی بھی نہیں لگ رہی، میں نیو سے اٹھ کے ایسے ہی آگئی ہوں۔“ مدحہ نے منہ ہانک کے کہا تھا۔

”کیونکہ تمہیں پتا تھا کہ تم ایسے بھی اچھی ہی تھتی ہو۔“ جھڑی کی بات پہ مدحہ یکدم کھلکھلا کے ہنسی تھی ہاں موجود کئی لوگ بار بار پلٹ کر انہیں دیکھ رہے تھے اور لوگوں کو دیکھنے کی وجہ سے جھڑی تھا پاکستانی مسلم لڑکی کے ساتھ انگریز لڑکا سب کے لیے دلچسپی اور تجسس کا باعث تھا۔

”ہوں ایہ بھی ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

”وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن کیا اب مجھے بیس ایئر پورٹ پہ کھڑا رکھو گی۔“ کالی تھک چکا ہوں میں۔“ جھڑی نے خود ہی اسے احساس دلایا تو مدحہ نے بے ساختہ ہنس پڑی تھی۔

”اے اے اے اچلو میرے ساتھ۔“ وہ ہنستی ہوئی اسے کہہ کر آگے بڑھ گئی اور جھڑی اپنے سامان والی ٹرال ہکیلا ہوا اس کے پیچھے پیچھے آیا تھا۔ مدحہ نے گاڑی کی بوگی کھول کر اس کا سامان رکھوایا اور خود فرنٹ ڈور کھول کر ڈرائیو ٹیگ سیٹ پہ بیٹھ گئی ساتھ ہی جھڑی کے لیے اپنے برابر والی سیٹ کا ڈور کھول دیا تھا۔

”ٹھیک ہو۔“ جھڑی نے بیٹھتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا اور مدحہ پر کنگسے گاڑی نکالنے لگی۔

”کتنے بچے کی فلائٹ تھی تمہاری۔“ وہ ایئر پورٹ کے وسیع و عریض احاطے سے گاڑی نکالتے ہوئے جھڑی کی سمت متوجہ ہوئی۔

”پانچ بجے کی۔“

”اور تم نے مجھے چھ بجے کال کی؟“ اسے غم بھی یاد تھا۔

”ہاں! ایک گھنٹہ تو باہر نکلنے میں ہی لگ گیا تھا۔“

”ہوں اور سناؤ برائے شہنے اگر شہناؤ فیو کیسے ہیں۔“ وہ ایک روڈ سے یوٹرن لیتے ہوئے ہوئی۔

”سب ٹھیک ہیں اور سب ہی جیسے مس کرتے ہیں؟“ جھڑی بہت خوش نظر آ رہا تھا۔

”لیکن تم جیسا مس تو نہیں کرتے نا۔“ تم نے مجھے مس کیا اور ملے جلے آئے۔“ مدحہ مسکرا رہی تھی۔

”میرے مس کرنے کی شدت کو جانتی ہو۔“ جھڑی کا لبہ دھیرا مگر سوال بہت گہرا تھا مدحہ ایسے سوال اور ایسی باتیں اکثر اٹھور کر جاتی تھی۔

”شدت ہی تو ہے جو تمہیں اس تک آگئے ہو۔“ مدحہ نے جواب تو دیا تھا مگر سرسری سے انداز میں۔

”یعنی تمہیں شدت کا احساس نہیں ہے۔“ جھڑی نے خود کھائی کے سے انداز میں کہا۔ مدحہ نے سن کر بھی ان سنی کر دیا اس معاملے پہ اگر مدحہ نے جھڑی کی بھی بھی پذیرائی اور حوصلہ افزائی نہیں کی تھی وہ اپنی حدیں بٹ کر رہ جاتی تھی۔

"میں کسی اوٹل میں رہنا چاہتا ہوں۔"

"ہوٹل میں کیوں؟" مدحیہ نے اسے قہقہہ سے دیکھا۔

"میں ہوٹل میں ایڑی پٹل کروں گا۔"

"تو میرے گھر میں کیا پرائیم ہے؟"

"پرائیم کچھ بھی نہیں ہے جس میں آزاد اور ریلیکس رہنا چاہتا ہوں پلینز تم کسی اچھے سے ہوٹل کا رخ کرو۔" جمزدی اسے کھپکھپاتا تھا۔

"کیا تم میری فیملی کی وجہ سے ایسا کہہ رہے ہو؟"

"نہیں میں اپنی وجہ سے ایسا کہہ رہا ہوں۔" وہ نہیں ہانتا رہا تھا۔

"جمزدی! تم میرے مہمان ہو۔ تمہیں میرے ساتھ گھر چلنا چاہیے۔" وہ بھی ہانسنے کو تیار نہیں تھی۔

"دیکھو میڈم! میں تمہارا ہی مہمان ہوں چاہے تمہارے گھر جاؤں یا نہ جاؤں۔"

"یہ کیسے مہمان ہو تمہیں؟"

"جس تم سمجھ کر بھی نہیں سمجھو گی۔" جمزدی نے فوراً کہہ دیا۔

"بالکل۔"

"بہت ضدی ہو تم۔"

"تمہیں اب ہٹا چلا ہے؟" وہ ہنسی تھی۔

"بہت پہلے سے جانتا ہوں۔"

"لیکن پھر بھی ٹھیک طرح سے نہیں جانتے۔" وہ مایوسی سے سر ہلا رہی تھی اور پھر جمزدی کے اصرار پر مجبوراً اسے ہوٹل کا رخ کرنا پڑا وہ اسے شہر کے مختلف ترین ہوٹل میں لے آئی مگر اس کے لیے کمر ایریز دے کر دیا اور اسے کمرے میں تھوڑے آرام کرنے کا کہہ کر واپس آگئی تھی۔

عذیل کو تین چار دن ہو گئے تھے وہ کام پہ نہیں جاسکا تھا لیکن اس نے فون کر کے باؤ امتیاز کو اپنی غیر حاضری کی وجہ ضرورتاً دی تھی وہ بھی سن کر بہت پریشان ہوئے تھے انہوں نے اسپتال آنا بھی چاہا تھا لیکن عذیل نے انہیں منع کر دیا کیونکہ ای اور اباجی کو اس نے بتایا ہی نہیں تھا کہ وہ کسی ورکشاپ میں کام کرتا ہے اگر باؤ امتیاز اباجی کی عیادت کے لیے آجائے تو یقیناً اس کا راز کھل جاتا اس لیے اس نے انہیں روک دیا تھا لیکن وہ دوسروں کو روکنا بھول گیا اباجی آج ہی اسپتال سے ڈسچارج ہو کر گھر آئے تھے اور وہ تینوں بھی ان کی عیادت کے لیے آج ہی آگئے تھے عذیل اباجی کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا جب باہر روزے دھتک ہوئی تھی۔

"میں دیکھتا ہوں۔" وہ عابدہ خاتون کو اٹھنے سے منع کرتے ہوئے خود اٹھ کر باہر نکل آیا۔

"کون ہے؟" اس نے پوچھتے ہوئے دروازہ بھی کھول دیا۔

"السلام علیکم۔" سب سے پہلے جمھونے نے سلام میں پہل کی تھی اور عذیل ٹھٹک گیا تھا۔

"وعلیکم السلام۔" عذیل انہیں دیکھ کر قدرے پریشان ہو گیا تھا اس نے ان سے کافی پریشان سے انداز میں ہاتھ ملایا تھا۔

"کیسے ہو استاد؟ چاہا جاتی کیسے ہیں؟" سلو نے ہاتھ ملاتے ہوئے اس کا حال پوچھا تھا۔

"ہوں! ٹھیک ہوں۔" عذیل نے کافی مختصر سا جواب دیا تھا۔

"لیا بات ہے؟ کوئی پریشانی ہے استاد؟" چھوٹا بھی اس کا متفکر سا چہرہ بھانپ چکا تھا۔

"نہیں نہیں! ایسی کوئی بات نہیں ہے،" کوتم لوگ اندر آجائے۔" عذیل اب انہیں واپس تو نہیں لوٹا سکتا تھا اس لیے خود کو تھوڑے کرتے ہوئے سامنے سے ہٹ گیا تھا وہ تینوں آگے پیچھے اندر داخل ہوئے تھے ان تینوں کے ہاتھ میں

ایمر مارے شار تھے وہ کافی زیادہ فروٹ اور کھانے پینے کی چیزیں لائے تھے۔

"یار! اس تکلف کی کیا ضرورت تھی؟" عذیل نے وہی کھانا اساروا جی جملہ دہرایا۔

"یہ ہم تمہارے لیے نہیں اپنے انکل کے لیے لائے ہیں۔" چھوٹے نے مسکرائے کہا۔

"انکل؟" عذیل نے چھوٹے کے اشارے پر حیرت سے اسے دیکھا۔

"جیس انکل! تمہارے دادا ہمارے انکل ہی تو ہیں۔" چھوٹے کا لب لبو بدل گیا سلوا اور جیدی سبے ساختہ مسکرا

آئے تھے۔

"عذیل! ہاں ہر کون سے بیٹا؟" عابدہ خاتون نے آواز دے کر پوچھا تھا۔

"السلام علیکم! آئی! ہم ہیں عذیل صاحب کے کولیک۔" سلو نے آگے بڑھ کر انہیں سلام کیا اور اپنا تعارف

کر دیا تھا۔

"وعلیکم السلام! آؤ بیٹا بیٹھو تم لوگ۔" عابدہ خاتون فوراً اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئیں اور عذیل ان تینوں کے

انداز دیکھ کر حیران رہ گیا تھا انہوں نے عذیل کا بھرم رکھ لیا تھا ورنہ تو ان کی آمد پہ بری طرح پریشان ہو گیا تھا۔

"مختصک ہو آئی! انکل کیسے ہیں؟"

"اللہ کا شکر ہے بیٹا! آپ تو پہلے سے بہت بہتر ہیں۔"

"ہم تو بہت دنوں سے آنا چاہ رہے تھے لیکن عذیل صاحب نے خود ہی منع کر دیا ہمارے سینئر ہیں یہ اس لیے

ان کی بات سے انحراف بھی نہیں ہو سکتا۔ مگر آج سوچا کہ اپنی مرضی ہی کر لیں۔" چھوٹے نے مسکرائے کہا تھا

اور عذیل غش کھا کے کرنے کو تھا ان تینوں کو آگے پیچھے پھیلانے کے لیے وہ کھانا کھلا کر رکھا تھا اور کھانا کھاتے تھے

اور اس وقت کیا نظر آ رہا تھا؟ عذیل کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔

"بیٹا! آپ لوگ بیٹھو باتیں کرو میں چائے بھجوا رہی ہوں۔" وہ وہاں سے باہر نکل گئیں اور وہ تینوں فاروق نیازی

کی سمت متوجہ ہو گئے فاروق نیازی انہیں دیکھ کر خوش ہوئے تھے۔

"انکل۔! آپ کا بیٹا بہت ذہین اور بہت اچھا ہے، ہم آفس میں انہیں اپنا استاد مانتے ہیں کیوں

استاد؟" چھوٹے نے شرارت سے کہتے ہوئے عذیل کی سمت دیکھا تھا۔

"لیکن حقیقت میں تو تم خود استاد ہو۔" عذیل کو اعتراف کرنا ہی پڑا کہ چھوٹا ہی سب کا استاد ہے ہر کام میں

ماہر ہر بات میں آگے۔

"مان گئے! استاد؟" چھوٹا یکدم قہقہہ لگا کے ہنسا تھا ان کی ہلکی پھلکی چیمڑ چھاڑ اور نوک جھوک میں فاروق

نیازی کا دل پہل گیا تھا ان کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ خوش ہوئے ہیں۔

"مان گئے جناب! مان گئے! آج تو تم تینوں کی ڈرنگ بھی بہت کمال کی ہے۔" عذیل نے ان کی پیٹ شرت کی

طرف اشارہ کیا تھا۔

"عذیل صاحب! آپ جانتے تو ہیں ہماری ڈرنگ تو ہر روزی کمال کی ہوتی ہے اب ورکشاپ کے ممکنہ کون

نی طرح گندے کپڑے پہن کر تو نہیں محوم کیے جاتے؟" وہ باتوں باتوں میں سب کچھ کہہ بھی گیا تھا اور عذیل اس کی

اس چالاکی پہ اپنی مسکراہٹ روک نہیں پایا تھا۔

"چاہئے۔" وہ چاروں خوش گہیوں میں مصروف تھے جب نسوانی آواز پہ یکدم بریک لگ گئے عذیل نے گہن

چاہئے۔" وہ چاروں خوش گہیوں میں مصروف تھے جب نسوانی آواز پہ یکدم بریک لگ گئے عذیل نے گہن

”ارے آپ؟ کیسے ہیں؟“ زری کی الجھن حل ہو گئی تھی۔

”جیسی آپ ہیں؟“

”کیا مطلب؟“

”مطلب اس۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“

”نیل میں نہیں کہہ رہا آپ کی آواز کہہ رہی ہے۔“

”میری آواز؟“ زری کھنکی۔

”آپ کی آواز کہہ رہی ہے کہ آپ روکی ہیں آپ کی آواز پہ آنسوؤں کا بوجھ ہے۔“ نیل تو یوں کہہ رہا تھا جیسے اس کے سامنے بیٹھ کے اسے دیکھتا رہا ہو۔

”آپ کو شاید کوئی بوہم ہو رہا ہے؟“ زری نے سر جھٹکا

”تو آپ میرا دم دور کر دیں نا۔؟ کہہ دیں کہ آپ او اس نہیں ہیں اور آپ روکی بھی نہیں ہیں آپ جھوٹ

بھی کہیں گی تو میں مان جاؤں گا میں دل تو نہیں ہوں جو بیچ بات بھی نہیں مانتا۔“ نیل نے بات کرتے کرتے

ایک مثال کے طور پر دل اور کا نام لیا تھا مگر زری سمجھی کہ اس کا دل دھڑک دھڑک گیا بلکہ اس کے نام پہ تو زری کا

رواں رواں دھڑکتا تھا۔ اگر اس کی یہ دھڑکن نیل حیات بن لیتا تو یقیناً ”دوسری بات نہ کرتا۔“

”آپ نے شاید عبداللہ بھائی سے بات کرنے کے لیے فون کیا ہے؟“ زری بات ٹال گئی۔

”ہوں۔ شاید۔“ نیل نے اسے تسکلی سے کہا۔

”نہ گھر۔ نہیں ہیں۔“

”آپ تو ہیں نا۔“

”آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا مطلب ہے آپ کا۔؟“ زری پہلے ہی پریشان تھی نیل کی مہم سی باتوں پہ اور بھی

الجھنے لگی تھی۔

”میرا مطلب ہے کہ آپ کو پیغام تو دے سکتا ہوں نا؟ آپ گھر پہنچ رہے ہیں نا۔؟“ نیل نے اپنی بات سنبھالی کیونکہ

اس کی آواز کے بعد چھانے والی خوشگوارت کے باعث وہ بے ساختہ سا حلق کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

”جی! ضرور دے سکتے ہیں۔“ ”تو دراصل عبداللہ نے دل توڑ کو کوئی گھر دیکھنے کے لیے کہا تھا دل اور تو شر

میں نہیں ہے اس لیے اس نے گھر دیکھنے کے لیے مجھے بھیج دیا میں کل ہی وہ گھر دیکھ کر آیا ہوں گھر کالی اچھا ہے“

آپ عبداللہ سے کہیے گا مجھے کال کر لے میں اسے ساری لوکیشن خود بتا دوں گا۔“ نیل نے اسے پیغام دیا تھا۔

”اوکے کہہ دوں گی۔“

”ٹھیک ہے پھر میں فون بند کرتا ہوں۔“ نیل نے بات ختم کی۔

”ایک منٹ پلیز۔“ وہ بے اختیار دل اٹھی تھی اور اس کی اس بے اختیاری پہ نیل کا دل تھم گیا تھا دھڑکنیں

بھی ہمہ تن گوش ہو گئی تھیں کہ وہ کچھ کہنے والی ہے۔

”جی! میں سن رہا ہوں۔“ اس نے ذرا وقف سے کہا تھا۔

”آپ نے جو گھر دکھایا ہے کیا وہ آپ لوگوں کے گھر سے قریب ہے؟“ زری پوچھتا تو یہ جانتی تھی کہ آپ نے جو

گھر دکھایا ہے کیا وہ دل اور کے گھر سے قریب ہے؟ لیکن وہ چاہنے کے باوجود بھی اتنا واضح سوال پوچھ نہیں پائی

تھی۔ مجبوری اور مصلحت آڑے آگئی اور اسی مصلحت نے نیل حیات کو خوش قسمی کی دنیا میں دھکیل دیا تھا۔

”آنسوؤں کہ وہ گھر میرے گھر سے قریب نہیں ہے بلکہ دل اور کے گھر سے قریب ہے۔“ نیل کے جواب نے

سوڑ کر رکھا ایمن ٹرے لیے کھڑی تھی۔

”۲۔ میں۔! عدیل فوراً کھڑا ہو گیا تھا اور جھولی سی نیل کھینچ کے ان تینوں کے سامنے رکھنے لگا لیکن اپنے

دھیان اور اپنی ترنگ میں جستے جھولنے کی نظریں بلا ارادہ ہی ایمن پہ جا پھری تھیں۔

جھولی بھالی معصوم سے چہرے والی ساہی لڑکی جھولنے کو ایک بل میں جھولنے سے بڑا بگڑ گئی تھی اس کی ہنسی

تھم چکی تھی۔

”کیا بات ہے شہرار صاحب؟ آپ چپ کیوں ہو گئے؟“ سلو نے جھولنے کو اس کے پورے نام سے مخاطب

کرتے ہوئے شو کا دیا۔

”من نہیں۔ کچھ نہیں۔“ اس نے یکدم چوکتے ہوئے نشی میں گردن ہلائی تھی۔

”شہرار؟“ عدیل نے بھی بے ساختہ چونک کر کہا تھا وہ جھولنے کا اصلی نام پہلی مرتبہ سن رہا تھا۔

”دیکھیے انکل۔ عدیل صاحب ایسے ری ایکٹ کر رہے ہیں جسے اپنے کو لیک کے نام کا بھی پتا نہ ہو۔“ جھولنے

نے چہرے پر سنبھالی تھی اور عدیل سنبھل گیا تھا۔

”تھینک یو۔“ جھولنے نے ایمن کے ہاتھ سے چائے کا کپ پکڑتے ہوئے شکریہ ادا کیا کیونکہ عدیل فاروق

نیازی کی سمت متوجہ تھا شوشے ان کا منہ صاف کر رہا تھا۔ سلو اور جیدی نے بھی شکریہ ادا کیا تھا ایمن خاموشی سے

کچھ بھی کہے بغیر ہر کھل گئی لیکن جھولنے کے دل و دماغ میں اپنا نقش چھوڑ گئی اور جھولنے کی کیفیت باقی دوزوں سے

بھی بچی ہوئی نہیں رہ سکی تھی وہ اب سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

تو یقین کر لیتیں کہ وہ رائیگاں نہ رہیں گی

میری زندگی سے نکل گیا جو کچھ تیرے خیال کا

اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو اس کی کلنیوں سے لکیر بناتے ہوئے اس کے بالوں میں جذب ہو رہے

تھے وہ بے آواز مدد رہی تھی شاید اسے خود بھی احساس نہیں تھا کہ وہ مدد رہی ہے اس کی بذاتہ روح کا عالم تھا اور

اس عالم میں وہ بے طرح یاد آ رہا تھا اتنا کہ اس کے بغیر زری کو اپنی سانسیں بھی سینے کا بوجھ لگنے لگی تھیں یوں لگ

رہا تھا جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہو۔ وہ بے دم سے انداز میں راکٹ پیسٹ جھول رہی تھی جب پورے گھر کے

سنالے میں لینڈ لائن فون کی کلنی گونج اٹھی۔ لیکن زری میں اتنی سکت نہیں تھی کہ اٹھ کر فون اٹینڈ کرتی تو جیسے

تھی ویسے ہی بڑی رہی۔

”زری۔“ فون اٹینڈ کرنا میں قر تن پاک بڑھ رہی ہوں۔“ لگاؤش نے اپنے بیڈ روم سے اسے آواز دی اور

مجبوراً ”زری کو اپنے آپ کو سنبھالتا پڑا اور نہ یقیناً“ لگاؤش کا قصہ اور ناراضی سہا پڑتی تھی لے وہ گھری سانس

کھینچتی ہوئی راکٹ پیسٹ سے اٹھی اور اپنے آنسو پونچھ کر فون میٹ کے پاس آگئی تھی۔

”السلام علیکم۔“ دل تو ریشہ کی طرح سلام میں پھل کرنے کی عادت تھی اس کی لیکن اس کی آواز سن کر

دوسری طرف خاموشی چھا گئی تھی نیل کو یقین کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ اس کا فون زری نے ریسیو کیا ہے۔

”السلام علیکم۔“ زری نے اس خاموشی کو توڑنے کے لیے دوبار سلام کیا تھا۔

”و علیکم السلام۔“ ایسی ہیں آپ۔؟“ دوسری طرف کی آواز اوروے رہی تھی۔

”کون۔؟“ زری نے اس مدھم اور پھری ہوئی آواز کو پہچاننے کی کوشش کی۔

”نیل حیات۔“

مایوس اور اداس بڑی زوری کوئل میں خوش کر دیا تھا۔

"او کے! میں فون بند کرتی ہوں۔"

"ایک منٹ پلیز" اب کی بار جمیل نے اسے روک لیا تھا۔

"ایک بات پوچھوں آپ سے؟" جمیل نے ذرا سا حوصلہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں۔"

"آپ اور اس کیوں نہیں؟" وہ جمیل کے سوال پر ہلکی پھر مسکرا دی تھی۔

"پہلے تھی، مگر اب نہیں ہوں۔" زوری کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ خوش ہے، تھوڑی دیر پہلے والی اداسی ختم ہو چکی تھی۔

"اب کیوں نہیں ہیں؟"

"بس کچھ نہیں، میں فون بند کر رہی ہوں، اللہ حافظ۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور فون بند کر دیا، اس کے

لیے اتنی خوشی ہی کافی تھی کہ پاکستان میں ان کا گھر ملے اور اس کے گھر سے قریب ہو گا۔ وہ فون ہائینڈ کے پاس کھڑی اپنی

خوشی سے بے جا رہی تھی، جب فون کی گھنٹی دوبارہ بجنے لگی، زوری کو یقین تھا کہ جمیل ہی فون ہے، اسی لیے اس نے

دوبارہ ریسیو نہیں کیا، لیکن اسے یہ پتا نہیں تھا کہ کبھی کبھی انسان کا یقین بھی اسے دھوکا دے جاتا ہے، وہ فون سیٹ

کے پاس کھڑی تھی۔ دل اور شاہ کا نمبر جھگڑا رہا تھا۔ لیکن اس نے اس یقین پر ریسیو نہ کیا کہ وہ سبزی طرف جمیل

حیات ہے۔ وہ وہاں سے ہٹ کے اپنے کمرے میں آگئی، لیکن کافی دیر بعد نگار ش کی بات سے اسے چکر اٹنے لگا۔

"دل اور بھائی کی کال کب آئی؟" وہ زوری سے پوچھ رہی تھیں۔

"دل اور کی کال؟" زوری کو اچنبھا ہوا۔

"ہاں! اسی اہل آبی پہ تو انہی کا نمبر ہے، کیا تم نے ریسیو نہیں کیا۔" نگار ش کو بھی تعجب نے گھیرا تھا۔

"اسی اہل آبی پہ اس کا نمبر؟" وہاں کی گاؤں۔" اس نے سر پہ ہاتھ مارتے ہوئے فون کی طرف دوڑ لگائی اور اس کا نمبر

دیکھ کر تونل منجمدی میں آگیا۔

"ہاں میں سرگئی! یہ میں نے کیا کر دیا؟ اس کا فون تو اتنی دیر بجا رہا اور میں سمجھی کہ جمیل۔" وہ کہتے کہتے چپ

ہو گئی اور دونوں ہاتھوں میں سر قحام کے رہ گئی تھیں۔

"اب روئے سے کیا ہو گا؟ بلکہ یہ سوچو کہ عشق میں عاشق لوگوں کا اتنا نقصان دینا یا دوسرے لوگ نہیں کرتے،

جتنا نقصان وہ خود اپنا کرتے ہیں۔ کبھی جلد بازی میں، کبھی لاپرواہی میں اور کبھی شدت میں اور بعد میں تمہاری

طرح سر ہٹ کر جینے کے روئے ہیں، مگر اسی روئے سے حاصل کچھ نہیں ہوتا، نہ تو دل اور بھائی کی دوبارہ کال آ سکتی

ہے اور نہ ہی تم اپنی غلطی کی تلافی کر سکتی ہو، اس لیے بستر ہے کہ یہ روئے دھو تا بند کرو۔" نگار ش کو اس پہ غصہ آ رہا

"بھابھی! مجھے نہیں پتا تھا میں تو سمجھی تھی کہ جمیل۔"

"تو کیا جمیل انسان نہیں ہے؟ کیا تم اس کی کال نہیں سن سکتیں؟" نگار ش نے اسے جھڑک دیا۔ اور زوری اپنی

غلطی پہ دل مسوس کے رہ گئی، اس نے کال کیوں کی تھی؟ اسے تو یہ بھی پتا نہیں تھا۔

اس نے بیڈ کراؤن سے نیک لگا کر بیٹھے ہوئے ساری رات جاگ کر گزار دی تھی، رات کو فوراً ہی سو گئی، لیکن

علیٰ سے غیند کے باوجود بھی سو نہیں سکی، اسے یوں لگتا تھا جیسے وہ آنکھ جھپکے گی اور کوئی وحشی اسے دبوچ لے گا اور

اسی وحشی کے خوف نے اسے سکون کی غیند سونے ہی نہیں دیا تھا، حالانکہ اسے پتا تھا کہ باہر منصور حسین پہلے سے

زیادہ جوکس ہو کر سو رہے رہا ہے اور اندر جو اس کے پاس ہے، لیکن پھر بھی وہ غیند سے آنکھ نہیں ملا پاتی تھی۔

نجر کے وقت ابھی وضو کیا اور نماز پڑھنے کے لیے گھڑی ہو گئی، کچھ وقت عبادت میں گزار تو دیا، مگر جلد ہی خوف

کم ہو گیا، تسبیح ختم کر کے اٹھی اور جائے نماز سمیٹنے لگی، لیکن یوں ہی جائے نماز سمیٹتے ہوئے اس کی نظر اپنے بیڈ

پر رکھی منصور حسین کی بلیک کلر کی چادر پر پڑی تھی۔

"اگر یہ چادر کسی نے میرے پاس دیکھ لی تو؟" سب سے پہلی سوال کریں گے، وجد پوچھیں گے کہ کیا ہوا ہے؟ اور نہ۔" وہ

جائے نماز الماری میں رکھ کے فوراً بیڈ کے قریب آئی تھی اور اپنے کپڑے میں بھانپتی ہوئی وہ چادر کھینچ لی تھی، وہ

اس چادر کو گول مول کر کے لپٹتی ہوئی باہر نکل آئی، اس کا سر منصور حسین کے کمرے کی طرف تھا، علیٰ سے کو

منصور حسین کے کمرے کا پتا تو نہیں تھا، لیکن اندازہ ضرور تھا کہ وہ کسی بلاسٹ والے بیڈ روم میں ہے اور اس نے

لاسٹ والے بیڈ روم کے دروازے پر ہی دستک دی، چند سیکنڈ بعد دروازہ کھولنے والا منصور حسین ہی تھا، اس کے

سر پہ بندھا ہوا ردیاں تھیں، وہ بھی وضو کی حالت میں ہے اور اس نے بھی ابھی نماز ادا کی ہے۔ اس نے

علیٰ سے کو دیکھ کر منصور حسین کی نظرس جھک گئی تھیں۔

"تیرا مری چادر دینے آئی ہوں۔" اس نے چادر منصور حسین کی سمت بڑھاتے ہوئے کہا۔

"شکریہ لی لی۔" اس نے جھکی نظر سے کہتے ہوئے چادر تھام لی تھی۔

"تم سوئے نہیں رات بھر؟" علیٰ سے کو احساس ہو چکا تھا کہ وہ بھی جاگتا رہا ہے۔

"نہیں۔"

"کیوں۔"

"بس پریشانی میں غیند نہیں آئی۔" وہ آسکی سے بول رہا تھا۔

"تمہیں کیا پریشانی تھی؟"

"جیسے بڑے صاحب کی طرف سے پریشانی تھی، انہوں نے آپ کی ذمہ داری آپ کی حفاظت مجھے سونپی تھی،

اس لیے آپ کی پریشانی میری پریشانی اور آپ کا نقصان بھی میرا نقصان ہے۔"

"لیکن میں تم سے یہ کہنے کے لیے آئی ہوں کہ تم اس بات کا ذکر کسی سے بھی مت کرنا، نہ بیانات نہ اور بھائی

سے۔" علیٰ سے نے اسے منع کیا تھا۔

"میں ممانی پاتا ہوں لی لی، جی میں بڑے صاحب سے اتنی بڑی بات نہیں چھپا سکتا، یہ میرے اصول کے

خلاف ہے۔" منصور حسین نے انکار کر دیا تھا۔

"تمہاری بی بی، بولی اتنی بڑی بات پروری حولی میں پریشانی کا پڑاؤ کھڑا کر دے گی، کیا میرا کالج جانا اور گھر سے باہر

لانا، اندر گھومنے کے، توڑ بھانی پھرت ان ذمے دشمن کی کھوج میں لگ جائیں گے اور بی بی سب افراد چپ ہو کے

جائیں گے۔" علیٰ سے نے اسے اس بات کے سائیڈ الیکٹ بتائے تھے۔

"لیکن علیٰ سے بی بی، بات چھپا لیتا مسکا کا حل تو نہیں ہے؟" اس طرح آپ کو کوئی نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔

"مور حسین ہے حد پریشان اور ابھنا ہوا تھا۔"

"نہیں نے مجھے نقصان پہنچانا ہوتا تو اب تک پہنچا چکا ہوتا۔" علیٰ سے نے خفگی سے کہا تھا اور منصور حسین

ہوٹا کیا تھا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟"

منصور حسین کی اس چادر پہ۔ "کول کو پہلی بار کوئی ایسا موقع ہاتھ آیا تھا کہ وہ شمالی میں علیزے کو نشتر چھو سکتی۔
"کول آپلیہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟" علیزے اب بھی اس کے کاشدار لفظوں کے مضمون سمجھنے سے قاصر تھی۔

"میں جو کہہ رہی ہوں تم اس سے انجان بن رہی ہو۔" کول نے کافی چبا کے کہا تھا۔
"آپ نے جو کہتا ہے صاف صاف کہیں، مجھے آپ کی ایسی باتیں سمجھ نہیں آرہیں۔" علیزے پریشان سی الجھنے لگی تھی۔
"تم اس وقت۔"

"ارے کول، علیزے تم لوگ یہاں کیوں کھڑی ہو؟" اپنے بیڈ روم سے نکلتی عائشہ آندری کو دیکھ کر کول کی ادھوری بات منہ میں ہی رہ گئی تھی۔

"پچھو میرے کمرے میں جائے نماز نہیں تھی، میں وہ لینے کے لیے نکلی ہوں تو علیزے، منصور حسین کے کمرے سے آ رہی تھی۔ اسے اس کی چادر دے کر وہ بھی اس وقت جب سارا عالم تاریکیوں میں ڈوبا ہوا ہے۔"
کول نے چھوٹے ہی عائشہ آندری کو باتوں باتوں میں اصل بات کا اشارہ دے دیا تھا اور اس کی اس بات پہ ان کی مدح گائب انہی تھی۔

"کول! تم کیا بول رہی ہو، تمہیں شاید خود بھی اندازہ نہیں ہے؟" عائشہ آندری کا لہجہ سخت تھا۔
"پچھو! میں نے کچھ غلط۔"

"بس! اپنے کمرے میں جاؤ تم۔" انہوں نے کول کو مزید کچھ بولنے کی مصلحت نہیں دی تھی اور کول، علیزے پہ ایک طنزیہ سی نظر ڈالتی ہوئی اپنے کمرے میں گھس گئی۔

"عائشہ پچھو بھول یہ کول آپلیہ یہ کیا کہہ رہی تھیں؟" علیزے کا لہجہ روہانسا ہونے لگا تھا۔ کول کی بات کے مضمون کو وہ تھوڑا بہت سمجھ ہی چکی تھی، لیکن پھر بھی ذہن ایسا معصوم اور کورا تھا کہ وہ اس بات کو جھٹلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"چھو! اس بات کو چاہتا نہیں کہ کیا کہہ رہی ہے،" او تم اپنے کمرے میں آ جاؤ، باہر بہت ٹھنڈ ہے۔" وہ علیزے کو بازو سے تھامتے ہوئے اپنے ساتھ لیے اس کے کمرے میں آگئی تھیں، وہاں صوفے پر جو بھی گھبل اوڑھے سو رہی تھی۔

"رجو میں کیوں سو رہی ہے؟" نہیں حیرت ہوئی، علیزے کسی کو بھی اپنے کمرے میں سونے نہیں دیتی تھی۔
"میں رات کو سوتے میں ڈر گئی تھی، اس لیے جو کو اپنے کمرے میں بلا لیا تھا۔"
"ہوں! اچھا کیا تم نے، اگر مجھے کمرے میں تو میں آجاتی، تمہارے پاس۔" وہ اس کا ہاتھ سہلا رہی تھیں، لیکن علیزے کول کی بات پہ الجھی ہوئی تھی ذہن منتشر سا ہو رہا تھا۔



اک موسم کی گزرا ہے، اک پریم کمانی ہے
اک شاخ ہے، نازک سی
کلیوں کی جوانی ہے
دھوپول کی تپ ہے
شعلہ ہے کہ پانی ہے

"میرا مطلب ہے کہ کوئی ہمیں محض ہراساں کرنا چاہتا ہے، نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔" علیزے نے کافی گہری بات کی تھی منصور حسین کا تو اس طرف دھیان ہی نہیں کیا تھا، وہ ٹھٹھکی ہوئی کہہ رہی تھی۔

"لیکن بی بی جی۔ یہ صرف آپ کا اندازہ بھی تو ہو سکتا ہے، دشمن کو کبھی کمزور نہیں سمجھنا چاہیے اور نہ ہی دشمن سے بے خبر ہو کر رہنا چاہیے، جو لوگ دشمن کو کمزور سمجھتے ہیں اور اس سے بے خبر ہو کر رہتے ہیں وہ لوگ نقصان اٹھاتے ہیں، آپ لا بروا کی اور غفلت سے کام مت لیں، بڑے صاحب کو تادیب، وہ یقیناً "سارے مسئلے کو کور کر لیں گے۔" منصور حسین اسے سمجھا رہا تھا۔

"جب مناسب لگا تب بتاؤں گی، فی الحال نہیں دیا سکتی اور اس بات کا تم بھی مستہیانا۔"
"لیکن بی بی جی! صاحب کو چاہتا تھا تو مجھے نوکری سے نکال دیں گے اور آئندہ کے لیے وہ مجھے اعتبار بھی نہیں کریں گے۔" منصور حسین بے بس اور تذبذب کا شکار تھا۔

"اور اگر تباؤ کے تو میں تمہیں نوکری سے نکال دوں گی۔" علیزے نے اسے دھمکی سے نوازا تھا۔
"یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟"

"ٹھیک کہہ رہی ہوں، اس مسئلے کو اپنے تک رکھو گے تو بہتر ہے۔" گ۔
"نہی۔" وہ محض جی کہہ کے رہ گیا تھا۔

"اور سناؤ، سب کب آئے تھے رات کو؟" وہ جاتے جاتے پھر پھر مٹی تھی۔
"وہ بچے آئے تھے۔"

"ٹھیک ہے، سب سو رہے ہیں، تم بھی سو جاؤ۔" علیزے اسے کہہ کے واپس پلٹ گئی اور منصور حسین اندر چلا گیا، وہ رات بھر سے جاگ رہا تھا، اب نماز کے بعد اسے نیند آنے لگی تھی، اس کا ارادہ سونے کا تھا اور علیزے بھی اب سونے کا ارادہ لے کر پلٹی تھی، لیکن توجہ شاید نیند اس کے نصیب میں نہیں تھی۔

"علیزے،" کول کی جھجکتی ہوئی آواز پہ علیزے کے قدموں کے کدوئیں ٹھٹھکی گئیں۔
"ارے کول آپلیہ! آپ جاگ رہی ہیں۔" علیزے نے تارمل سے اندازہ میں کہا، لیکن کول کا انداز تارمل نہیں تھا۔

"جاگ بھی رہی ہوں اور دیکھ بھی رہی ہوں۔" کول کے لب دلبے میں شک بول رہا تھا، لیکن علیزے اس کے اس شک سے بے خبر تھی۔

"کیا دیکھ رہی ہیں؟" اس نے لا بروا کی سے پوچھا تھا۔
"منصور حسین کے کمرے میں گیا کر رہی تھیں تم؟" کول کے سوال پہ علیزے ٹھٹھکی گئی تھی کہ کول نے اسے دیکھ لیا ہے۔

"ف۔" وہ ڈرائیو کی چادر، یہاں کوریڈور میں گہری ہوئی تھی، وہی اٹھا کر اسے دے کے آئی ہوں۔"
علیزے نے فوراً وضاحت دی تھی، تاکہ اسے اصل بات کا پتہ نہ چلے، لیکن کول رقاہت کی جلن میں کچھ برا سوچنے سے بھی باز نہیں آئی تھی۔

"اتنی اہم کئی وہ چادر۔" اس کا لہجہ طنزیہ ہو گیا تھا، نظروں میں ہلکی سی کٹ تھی۔
"کول آپلیہ! وہ چادر ہمارے لیے اہم نہ سہی، لیکن اس کے لیے تو اہم ہے نا؟" علیزے نے پھر بھی کافی سادگی سے جواب دیا تھا۔

"اتنی اہم کہ بڑی جوتی کی لادائی اور نخرلی بنی جس نے کبھی اپنی چادر بھی زمین سے جھک کر نہیں اٹھائی ہوگی، وہ اپنے ڈرائیو کی چادر اٹھا کر اس کے بیڈ روم میں پٹیا کے آ رہی ہے؟" راہ یار، حیرت ہو رہی ہے اور رشک آ رہا ہے

ہے شان سندر کی
لوگوں کی روانی ہے
وہ نور سحر ہے یا اک شام سہانی ہے
دیکھوں تو پتا ہے
سوچوں تو کہانی ہے

کیا نام رکھوں اس کا کیا بات کہوں اس سے؟
وہ دن کا ابالہ ہے نہ رات کی رانی ہے
اک موسم کی گزریا ہے اک پریم کہانی ہے

"واؤ جوت بھائی! آپ نے تو کمال کر دیا ہے۔" انوشہ حرمت اور انیہ وغیرہ نے دونوں ہاتھوں سے تالیاں
بجاتے ہوئے اسے ستائشی انداز میں سراہا تھا۔ اس نے ان سب کی فرمائش پر یہ لکھم لکھم گٹار کی دھن پر سنائی
تھی اور اس کی آواز اور یہ دھن اتنی خوب صورت اور بار بار تھیں کہ ان سب کو سن کر مڑا گیا تھا بلکہ سب
سراپے بغیر نہیں رہ سکے تھے سزا قاصد۔ جیسا آواز بھی مسکرا رہا تھا۔
"یہ لکھم میں نے اسپتلی علیڑے کو ڈنڈی کیٹ کی ہے اور مجھے لگتا ہے یہ لکھم کسی نے علیڑے کے لیے
ہی لکھی ہے۔" جوت نے اعلانیہ کہا تھا اور وہاں موجود سب ہی لوگ ہنس پڑے تھے علیڑے کالی چپ چپ
چٹکی بھی لیکن ان سب کو اپنی طرف متوجہ پا کر چہرہ جھکا لیا تھا۔
"کیا بات ہے؟ موسم کی گزریا آج اس اور چپ چپ سی لگتی ہے۔" ذانیال نے علیڑے کو شرارت سے چھیڑا
تھا۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے بھائی۔"

"تو پھر خاموش کیوں بیٹھی ہو؟"

"کچھ نہیں بہن بابا کو مس کر رہی تھی۔" اس نے آہستگی سے کہا تھا۔

"اؤ تو یہ بات ہے تو تم ایسا کرو تاہا کو فون کر لو۔" ذانیال نے مشورہ دیا۔

"کہا تھا لیکن ان کا سیل بڑی تھا۔"

"کوئی بات نہیں، تھوڑی دیر بعد کر لیتا۔" انہوں نے اسے تسلی دی تھی۔ اس نے اثبات میں سراہا یا تھا۔

"لیکن اس سے پہلے کہ تم فون کرو اتنی دیر میں ہم بیت بازی کھیلتے ہیں۔" جوت کا نیا آئیڈیا سامنے آیا تھا۔

"مجھے پوٹری نہیں آتی۔" اس نے جیسے شرمندگی سے کہا تھا۔

"لو جی قصہ ہی ختم ہوا۔" جوت نے گٹار سائیڈ پر رکھتے ہوئے ہاتھ تھما ڈسے تھے۔

وہ لوگ اس وقت الگ الگ پتھروں پر بیٹھے ہوئے سورج کی مدھم اور کمزوری کرنوں سے لطف اندوز ہونے کی
فکام کو ششیں کر رہے تھے وہ صبح سے کھڑے ہوئے تھے پہلے وہ مری کے مال روڈ پر اور ہم جاتے رہے اور
جب بہت زیادہ گھومنے پھرنے کے بعد تھک گئے تو اس پناہ کی اس سڑک پر آٹے جہاں ان کے تھوڑی دیر بیٹھے
اور محفل بنانے کی جگہ دستیاب ہو رہی تھی یہاں چھوٹے بڑے ڈھیر سارے پتھر بھی تھے جن پر انہوں نے
با آسانی اپنی اپنی نشستیں بنال لی تھی اور وہاں ہی جوت کو۔ گٹار بجانے کا خیال آیا تھا اور شاید اس کا گٹار
بجانے کا موڈ بھی ہو رہا تھا سب ہی بہت اچھا بچا یا تھا۔

"آؤ جو! تم میرے ساتھ چلو ہم تھوڑی دیر واک کر لیں۔" عائشہ آندھی سب بچوں کو ہنسی مذاق پہ تان رہی تھی کہ
وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

"پھوپھو! میں چلوں آپ کے ساتھ۔" آؤ راچی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔
"ارے نہیں بیٹا! تم جتنوں میں کون سا دور جا رہی ہوں؟ ابھی آجاتی ہوں تم لوگ انجوائے کرو۔" وہ آؤ کو منع
کرتی ہوئی رہو کو ساتھ لے کر گئے بڑے گئی تھیں وہ جب سے یہاں آئی تھیں ان لوگوں کے ساتھ ایک بار بھی
باہر نہیں نکلی تھیں موسم بہت زیادہ خراب تھا اس لیے انہوں نے سردی میں ڈھننے کا رسک نہیں لیا تھا لیکن آؤ
بارش اور برف باری نے تھوڑا وقت دیا تھا۔ تب ہی وہ بھی ان لوگوں کے ساتھ باہر آگئی تھیں۔

"تب اپنا ہاتھ مجھے پکڑا دیں کہیں آپ کا ہیرہ پھسل جائے۔" ایک دھلوانی رخ سے اترتے ہوئے رجو نے
احتیاطاً "تھمر کر ان کا ہاتھ پکڑنا چاہا تھا لیکن اس دھلوانی رخ سے اترتے ہوئے بلا ارادہ ہی ان کی نظر اس پناہ کی
کے نیچے والی سڑک پر جا پڑی تھی اور ان کی نظروں میں پوری دنیا کھوم کے رہ گئی تھی۔ ان کو لگا جیسے زمین آسمان
ایک ہو گئے ہوں اور ان کے اس تصادم سے عائشہ آندھی گنگ سی ہو گئی تھیں۔ وہ ایک سی جگہ۔ جامد ہو چکی تھیں۔
"کیا ہوا ہے بی بی جی؟ آپ رک کیوں گئی ہیں؟" رجو نے انہیں بازو ہلا کر متوجہ کیا تھا اور عائشہ آندھی حواسوں
میں آتے ہی یکدم سچ اٹھی تھیں۔

"زہرہ!" وہ اتنی بلند آواز سے چیخ کے پکار رہی تھیں کہ اس پاس کی فضا میں بھی ان کی آواز گونج کے رہ گئی
تھی۔

"زہرہ! رکو! زہرہ۔" وہ ایک دم رجو سے ہاتھ چھڑا کر تیزی سے اترنے کے لیے لپکی تھیں لیکن اتنی غفلت اور
بے دھیالی کی وجہ سے ان کے قدم غیر متوازن ہو گئے تھے اور جیسے ہی ان کے قدموں نے توازن کھویا وہ لڑھکتی ہوئی
زمین پر آگری تھیں۔

"زہرہ! رکو! رجو خدا کے لیے روکو اسے! وہ جا رہی ہے! زہرہ!" عائشہ آندھی گرنے اور اتنی شدید چوٹ کے
بازو پھرتے پکارنے سے لپکے اٹھی تھیں لیکن ان کی پکار ان کی زہرہ کے علاوہ اور سب نے ہی سنی تھی اور اسے

دور جانے دیکھ کر عائشہ آنندی سرخ ہل کی مانند تڑپیں۔
”اڑھوا“ ان زمین سے اٹھ کر اس کے پیچھے جانے کے لیے لپک رہی تھیں، جب اچانک پیچھے سے دانیال اور آذر
وغیرہ نے تھام لیا تھا۔

”یہ کیا ہوا ہے؟“ کہاں جا رہی ہیں آپ؟“ دانیال ان کے منہ سے خراب ہونے کیڑے دیکھ کر پریشان ہو گیا
تھا۔

”فصہ نہ زہرہ زہرہ کو دیکھا ہے میں نے“ دانیال ”جاؤ“ جاؤ اسے روکو بیٹا۔ اسے کو عائشہ بلا رہی ہے۔“ وہ تو
جیسے اگل ہو چکی تھیں اور آذر کے ساتھ ساتھ دانیال بھی حیران رہ گیا تھا۔

”زہرہ آئی؟“ ان دونوں نے حیرانی سے زیر لب دہرایا تھا۔

”ہاں زہرہ! میری زہرہ“ عائشہ آنندی کہتے ہوئے نیٹے ہاتھ رکھ کے تڑپ تڑپ کے رو رہی تھیں۔
”آپ دو میں مت ہم دیکھتے ہیں۔“ آذر اور دانیال انہیں باقی سب کے حوالے کر کے بھاگ کھڑے ہوئے
تھے، لیکن مطلوبہ جگہ یہ بار بار تلاش کرنے کے باوجود بھی وہ انہیں کہیں نظر نہیں آتی تھیں، آذر اور دانیال دونوں
کے ذہن میں زہرہ آئی کے نقش زد تھے، لیکن اتنے سالوں بعد ان میں نقوش میں کیا فرق کیا تھا یہ تو بھی نہیں
جانے تھے، لیکن اگر عائشہ آنندی نے انہیں پہچان لیا تھا تو وہ دونوں بھی پہچان سکتے تھے اور اس چیز سے پتا چلتا تھا کہ
ان میں زیادہ فرق نہیں آیا تھا سب ہی تو انہوں نے جلدی اور آسانی سے پہچان لیا تھا۔
”سورہ پھو پھو! تو کہیں بھی نہیں ہیں۔“ آذر نے واپس آتے ہوئے باپ کی سے نفی میں سر ہلایا تھا اس کی
سانس پھولی ہوئی تھی۔

”وہ چلی گئی تو میرے دیکھتے دیکھتے تو بھلی گئی ہے۔“ عائشہ آنندی بے تحاشہ رو رہی تھیں اور پھر وہاں سے سب
انہیں بمشکل واپس منگولے لے کر آئے تھے۔

”یہ ابس کریں ٹا کیوں اتنا رو رہی ہیں بیمار پڑ جائیں گی۔“ دانیال نے ان کا ہاتھ مار دیا۔
”تم تم بھائی بھائی صاحب کو کال ملاؤ میں انہیں بتاتی ہوں۔“ انہوں نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا اور مجبوراً
دانیال کو کال کرنا ہی پڑی تھی۔

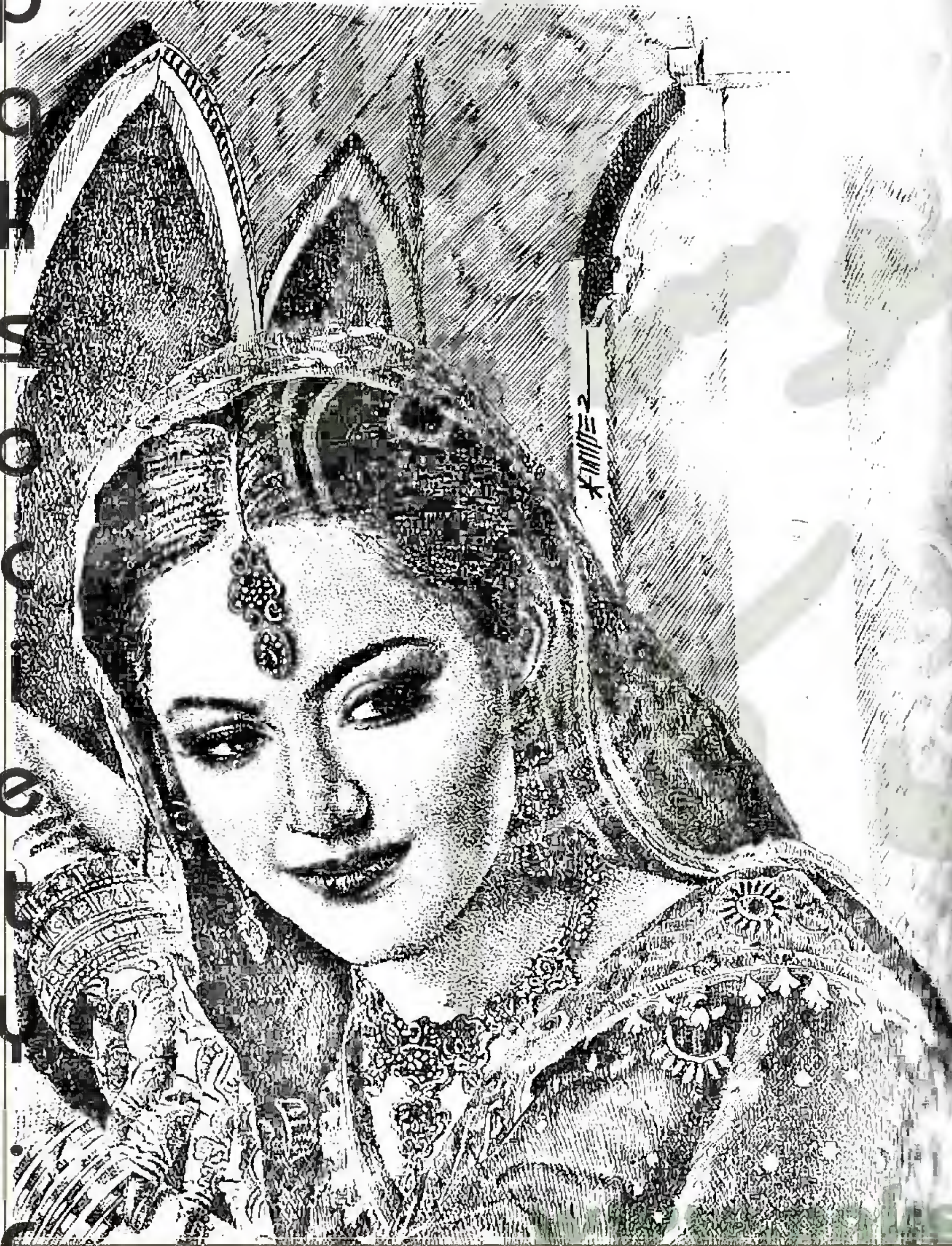
”جیلو“ وقار آنندی کی تو اذیت نہیں سے سنائی دی تھی۔
”بھائی صاحب! میں عائشہ بات کر رہی ہوں۔“ وہ آنسوؤں سے رنڈھی ہوئی تو انہیں بولی تھیں۔
”عائشہ! تم رو رہی ہو کیا ہوا ہے؟“ وہ پریشان ہوا سمجھتے تھے۔
”بھائی صاحب! میں نے میں نے زہرہ کو دیکھا ہے“ ابھی کہہ رہے تھے، ”تھوڑی دیر پہلے۔“ وہ تھکتے ہوئے پھر سے
رونے لگی تھیں۔

”اڑھو کو؟“ وقار آنندی کی آواز کسی کمرے پاتال میں ڈل رہی ہوئی محسوس ہوئی تھی، ریسیور میں سناٹا چھا گیا تھا۔
(دانیال آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

✻ ✻



آٹھ سو وینت



بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی غنیمت بہت ہی متاثر ہے۔

مدیہ اور نبیلہ حیات دو ہی بہن بھائی ہیں مدیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں غرق ہو رہی ہے جس کے پیش نظر فائزہ بیگم نبیلہ کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں لیکن مدیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے جس پر نبیلہ اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ انہی اندر پنب رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا بے بسی اور مجبوری سے تنگ آخر خود کشی کرنے کا سوچتا ہے لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باوا اچھا لگا جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدی ہے وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ واپس سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آدر شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے وہ اپنے قول و فعل کا بہت ریکا آؤمی ہے اس



اور یہ سنا کافی دیر ہوئی ہی چھایا رہا تھا۔

وقار آندھی کی آواز کہیں گم ہو چکی تھی جبکہ اس چیز سے بے خبر عائشہ آندھی اپنی ہی کے جاری تھیں۔
”ہاں! میں نے زہرہ کو دیکھا ہے بھائی صاحبہ۔ وہ۔ وہ۔ میری زہرہ ہی تھی۔ وہ میرے سامنے ہی گاڑ
بیٹھ کر چلی گئی اور میں۔ میں اسے پکارتی رہ گئی اس نے تو مجھے دیکھا بھی نہیں میری آواز بھی نہیں سنی
رکی بھی نہیں اور چلی گئی۔“ عائشہ آندھی گھرے صدمے کے زیر اثر تھیں اسی لیے ان کے منہ سے
الفاظ نکل رہے تھے۔

اور گھرے صدمے کے زیر اثر تو شاید وقار آندھی بھی تھے جن کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل رہا تھا۔
”عائشہ! تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے شاید؟“ انہوں نے سوال کیا تھا، لیکن بمشکل۔
”نہیں! ہرگز نہیں مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی اتنے سال ہو گئے پہلے کبھی ایسی غلط فہمی نہیں ہوئی تو آج
ہوئی تھی بھلا؟ میں اپنے پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ زہرہ تھی وہ سر سے پاؤں تک زہرہ تھی زہرہ
دل پہ لکھی ہے میں اسے کیسے بھول سکتی ہوں بھلا؟“ عائشہ آندھی کے ساتھ ساتھ آنسو بھی بہہ رہے تھے
وقار آندھی کو یقین بھی دلدار ہی تھیں۔

”لیکن عائشہ۔“ انہوں نے کچھ کہنا چاہا تھا مگر عائشہ آندھی نے ان کی بات کاٹ دی تھی۔

”نہیں بھائی صاحب! اب کوئی تسلی یا دلاسا مت دیجیے گا وہ یہیں کہیں ہے میرے آس پاس بس آپ
ایک بار پھر اسے تلاش کرنا ہے وہ اسی ملک میں ہے وہ ضرور مل جائے گی بس ایک بار۔ صرف ایک بار اس
پوچھنا ہے کہ وہ اپنی عائشہ کو اس طرح اچانک بغیر بتائے کیوں چھوڑ کر چلی گئی؟ اس نے اگر کسی کے ساتھ
کر لی تھی تو مجھے بتا کر جاتی غیروں کی طرح اجنبیوں کی طرح کیوں چلی گئی؟“ عائشہ آندھی روتے ہوئے کہہ
تھیں اور دوسری طرف سے ریسور رکھ دیا گیا تھا کال بند ہونے کی آواز پہ عائشہ آندھی چونک گئیں۔ انہوں
فورا ”وانیال کی سمت دیکھا تھا۔“

”فون بند کیوں ہو گیا ہے؟“

”ای! یہاں سنگلز کا مسئلہ ہے کال ڈراپ ہو جاتی ہے۔“ وانیال انہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا وہ
سے پریشان حال سی رو رہی تھیں اور وانیال ان کی طرف سے متفکر ہو رہا تھا اسے پتا تھا کہ ان کی صحت
پڑے گا، لیکن وہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ اس وقت زہرہ کے سوا کچھ بھائی نہیں دے رہا تھا۔
سالوں بعد وہی جوانی والی بے صبری آنکھری تھی۔

ان کی زبان پہ صرف زہرہ کا نام تھا۔

ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ زہرہ کو کہیں سے ڈھونڈ کے اپنے سامنے لے آئیں اور وہ سب کچھ پوچھ ڈالے
وہ اتنے سالوں سے اپنے دل و دماغ میں لیے پھر رہی تھیں۔ لیکن ان کا بس چلتا تب نا؟ وانیال ان کی حالت کے
نظر ان کی میڈیسن لے آیا تھا۔

”پلیزی میڈیسن کھالیں طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔“ اس نے زبردستی انہیں میڈیسن کھلائی تھیں
ان کی میڈیسن میں نیند کی دوا بھی شامل تھی جس کے بعد وہ یقیناً ”تھوڑی ریلیکس ہو جائیں گی اسی لیے وہ
کے بیڈ روم میں لے آیا تھا۔ اور انہیں کمرے سے باہر نکل آیا تھا۔ باہر آذر بھی ٹپکتے ہوئے
بات کو سوچ رہا تھا۔

وقار آندھی کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا اور ان کی سماعتوں میں سائیں سائیں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

ان کے دماغ کے پرچے اڑ گئے تھے ان کی سوچیں ان کے خیالات اور ان کا سکون سب کچھ برباد اور منتشر
ہو گیا تھا ان کا ذہن ہر چیز سے مفلوج ہوا تھا تو انہوں نے عائشہ آندھی کا فون بغیر کچھ کے ہی پیند کر دیا تھا
اس وقت ان کے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا ان کی قوت گویائی بھی جیسے سلب ہو چکی تھی وہ جہاں
الائی بیٹھے رہ گئے۔ ان کی ذات دھواں دھواں ہو رہی تھی اور اس دھوئیں کے مرغولے آسمان کی سمت اٹھ
گئے ایک اذیت ناک اور تلخ سا غبار تھا جو ان کے اطراف میں بہت تیزی سے پھیلتا جا رہا تھا اور وہ اس
تلخ غبار میں ڈوبتے جا رہے تھے اور انہیں اس کیفیت میں نہ جانے اور کتنی دیر گزر جاتی کہ اچانک
ان کا خان آفس روم کے دروازے پہ دستک دے کر اندر چلا آیا۔

”صاحب! آج! وہ نیچے وزیننگ روم میں معینہ ہمدانی آپ کا انتظار۔“ مبارک خان کی کہتے کہتے اچانک ان کی
الائزہ بھی تھی اور وہ بے ساختہ چپ ہو گیا۔ قیامت گزر جانے کے آثار صاف دکھائی دے رہے تھے وہ دیکھ
اٹھا ہوا تھا۔

”صاحب! آپ ٹھیک تو ہیں؟“ مبارک خان ان کی ٹیبل کے قریب آگیا تھا، لیکن وہ پھر بھی متوجہ نہیں ہوئے
اور مبارک خان کی تشویش اور برہم گئی تھی۔

”صاحب! کیا بات ہے؟ آپ ٹھیک نہیں لگ رہے؟“ اس نے آگے بڑھ کے ان کے کندھے کو ہلایا اور وقار
کی ایک دم جیسے کسی سکتے سے باہر آئے انہوں نے چونک کر مبارک خان کی سمت دیکھا ان کی آنکھیں خالی
الائی رہی تھیں۔

”صاحب! آپ کچھ بولتے کیوں نہیں؟ کیا ہوا ہے آپ کو؟“ مبارک خان ان کی طرف سے بے حد پریشان
ہوا اور وقار آندھی کچھ بھی بولنے سے قاصر نظر آ رہے تھے اس نے کچھ سوچتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا اور پھر
پانی انڈیل کر گلاس ان کی سمت بڑھا دیا تھا۔

”صاحب! پیانی پیانی۔“ اس نے ان کی حالت کے پیش نظر فوراً ”انہیں پانی نکال کے دیا تھا۔“

”ایس! اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ انکار کرتے ہوئے اپنی چیر سے اٹھ کھڑے ہوئے اور مٹھیاں بھینچتے
گھرے میں ادھر سے ادھر ٹھنکنے لگے ان کے ہر انداز سے بے سکونی بے چینی اور اضطراب جھلک رہا تھا۔
”صاحب! آپ کچھ بتائیے؟“

”اس کرو مبارک خان! بس کرو چپ ہو جاؤ۔“ وقار آندھی ایک دم غصے سے دھاڑ اٹھے تھے اور مبارک خان
الائی کرج پہ گر پڑا کہ وہ گیا وقار آندھی کا غصہ اور وہ بھی اس انتہا کا؟ مبارک خان حیرت زدہ سا ہو رہا تھا
الائی کا یہ روپ اس کے لیے بالکل نیا تھا۔ حیرت تو لازماً ہوئی تھی۔

”کاڑی نکالو ہمیں حویلی جانا ہے۔“ انہوں نے اپنا کوٹ اور موبائل اٹھاتے ہوئے حکم جاری کیا۔

”ای۔۔۔۔۔۔“ وہ حیرت کے باوجود ان کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے گلاس ٹیبل پہ رکھ کے باہر نکل گیا اور اس کے
وہ بھی باہر نکل آئے آفس میں کیا ہو رہا تھا اور وہ کیا کیا کام ادھورے چھوڑ کر جا رہے تھے انہیں کوئی
اس نہیں تھا ان کی ذات پہ کیا بیت رہی تھی یہ صرف وہی جانتے تھے مبارک خان نے بہت غلٹ میں

الائی اور ان کے نیچے پہنچنے تک وہ ان کے لیے گاڑی کا دروازہ بھی کھول چکا تھا اور جیسے ہی وہ اندر بیٹھے
لے کارڈ نے آگے بڑھ کے دروازہ بند کر دیا اور دوسرے ہی بل مبارک خان نے گاڑی آگے بڑھا دی تھی اور
الائی راہیو کرتے ہوئے حویلی کا رخ کیا تھا وقار آندھی کی حالت گاڑی میں بھی کافی مضطرب محسوس ہو رہی

مبارک خان کو تجسس تو ہو رہا تھا، لیکن وہ اب دوبارہ کچھ کہہ کر ان کا ضبط نہیں آزمانا چاہتا تھا اسی لیے چپ
الائی رہا اور بہت جلد حویلی کے بڑے سے گیٹ کے سامنے آکر ریک لگائے تھے۔ عارف نے وقار آندھی کی

روک دیا۔

”یہ میں اپنی خوشی سے دے رہا ہوں، رکھ لو۔“ اس نے باقاعدہ خودبول کر اپنی خوشی کا اعلان کیا تھا۔
”صاحب! بہت مہربانی ہے آپ کی، اللہ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔“ ملازم اور ملازمہ دعائیں دیتے ہوئے پلٹ گئے تھے، لیکن نبیل ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے کی دہلیز میں کھڑی مدحیہ کو دیکھ کر ٹھنک گیا، کیونکہ وہ ایک ایسی کی سمت دیکھ رہی تھی اور اس کے دیکھنے کا انداز خاصا گہرا تھا۔
”کیا دیکھ رہی ہو؟“ نبیل نے اپنے تاثرات کا کافی حد تک کمپوز کر لیے تھے۔
”آپ کی خوشی۔“ وہ سنجیدگی سے کہتی ہوئی دہلیز سے ہٹ کے نبیل کے ساتھ والے صوفے پہ آ بیٹھی۔
”کیا مطلب؟ میری خوشی؟“ وہ جان بوجھ کر انجان بن گیا۔
”خوشی آپ کی ہے، مطلب بھی آپ جانتے ہوں گے، آپ ہمیں نہ بتانا چاہیں تو یہ الگ بات ہے۔“ مدحیہ نے سنجیدگی سے کھوج رہی تھی۔

”ارے مدحیہ! کیسی باتیں کر رہی ہو؟ میں کیا نہیں بتانا چاہتا؟“ نبیل حیران ہوا تھا۔
”جب اپنی خوشی کی۔“ مدحیہ کا لہجہ مضبوط تھا اور نظریں نبیل پہ جمی ہوئی تھیں۔
”ادھوری خوشی بتانے کا مزہ نہیں آتا، پوری خوشی بتاؤں گا تو تمہیں بھی خوشی ہوگی۔“ نبیل بہت ٹھہرے اور انداز میں کہہ رہا تھا، البتہ جرے پہ اس کی خوشی کا عالم اب بھی وہی تھا جو زری کی کال سنتے ہوئے تھا۔
”تو آپ ادھوری خوشی میں اتنے خوش ہو رہے ہیں کہ ملازموں میں پیسے بانٹتے پھر رہے ہیں؟“ مدحیہ نے اس سے سیکڑتے ہوئے کہا۔

”ہاں! صرف اسی لیے کہ شاید کوئی غریب خوش ہو کر دل سے دعا دے دے اور میری ادھوری خوشی پوری خوشی تبدیل ہو جائے۔“ نبیل بڑے دل سے کہہ رہا تھا اور مدحیہ اس کے لہجے کی شدت پہ اسے دیکھتی رہ گئی۔
”آپ کسی سے محبت کرتے ہیں؟“ آپ نے کبھی بتایا کیوں نہیں؟“ مدحیہ کو حقیقتاً ”نبیل کے اس جذبے کا جان کر بہت حیرانی اور تعجب ہوا تھا۔

”میں کسی سے محبت کرتا ہوں، مجھ سے کبھی کسی نے پوچھا ہی نہیں، نہ میری ماں اور بہن نے نہ میرے دونوں بھائیوں نے۔“ نبیل کے منہ سے بلا ارادہ ہی شکوہ پھسلا تھا اور مدحیہ کو اس شکوے نے گردن جھکانے پہ مجبور کر دیا تھا۔

”ایم سوری! میں نے کبھی اس بارے میں سوچا ہی نہیں، میں سمجھتی تھی کہ آپ بھی میری طرح اس جذبے کا احساس سے خالی، بس جیسے جارہے ہیں، آپ کی کسی بھی لڑکی سے شادی کر دیں گے اور آپ کا گھر بس جائے گا۔“ مدحیہ جو سوچتی تھی وہی کہہ رہی تھی۔ نبیل اس کی بات پہ استہزائیہ انداز میں مسکرایا تھا۔

”میری جان! میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا، جن لوگوں کے دل بس جاتے ہیں، ان لوگوں کے گھر بڑی مشکل سے خالی رہتے ہیں۔“ نبیل نے خاصی گہری بات کہی تھی، مدحیہ اس کی باتوں پہ حیران رہ گئی۔

”اور لوگ لو میرج کر لیتے ہیں؟ وہ تو اپنا گھر بھی بسا لیتے ہیں اور دل بھی؟“ مدحیہ نے اپنے اندازے کے مطابق کہا۔

”اگر ان کا منہ نہیں ہے تمہاری، کبھی قریب سے مشاہدہ کرنا، پھر تمہیں پتا چلے گا کہ گھر بسانے کی کوشش میں دل کیسے دھڑکتا ہے، اور جن لوگوں کا گھر بھی بستا ہے اور دل بھی وہ لوگ دنیا کے خوش قسمت ترین لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔“ نبیل کی بات پہ مدحیہ کو اتفاق کرنا ہی پڑا تھا، کیونکہ اس نے سو فیصد درست بات کہی تھی۔

گاڑی دیکھتے ہوئے ایک لمحے کی بھی تاخیر کے بغیر پھرتی سے اٹھ کر گیٹ کھول دیا۔ وقار آندری کی اپنے وقت پہلے آفس سے واپسی سب کے لیے ہی حیرانی اور تشویش کا باعث تھی۔

آسیہ آندری اپنی دونوں دیوارنیوں ثروت بیگم اور تمویج بیگم کے ساتھ لان میں بیٹھی باتیں کرتی ہوئی چائے رہی تھیں، جب اچانک اندر داخل ہونے والی وقار آندری کی گاڑی دیکھ کر چونک گئیں۔
”وقار آج بھی گئے؟“ وہ ہاتھ میں پکڑا چائے کا کپ نیل پہ رکھتے ہوئے کھڑی ہو گئیں۔

”آپ لوگ بیٹھیں، میں کچھ دیر میں آتی ہوں۔“ وہ معذرت کرتی ہوئی وہاں سے چلی گئیں، اتنے میں وقار آندری لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے کوریڈور تک پہنچ چکے تھے اور ان کے پیچھے آسیہ آندری بھی تیز تیز قدم اٹھاتی قریب آ گئیں۔ وقار آندری کوٹ بازو پہ ڈالے کوریڈور میں چلتے ہوئے ہی اپنے گلے سے ٹائی کی ٹاٹ کھولنا شروع ہو گئے تھے۔

”وقار! آپ آج جلدی آگئے ہیں، کیا بات ہے؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ آسیہ آندری ان کے بازو سے ان کا کوٹ تھامتے ہوئے کافی فکر مندی سے بوجھ رہی تھیں۔

”ہوں ٹھیک ہوں۔“ انہوں نے بمشکل فحشہ سے جواب سے نوازا تھا۔
”لیکن آپ مجھے ٹھیک نہیں لگ رہے؟ سب ٹھیک تو ہیں نا؟ علیزے کیسی ہے؟“ آسیہ آندری کا پہلا خیال علیزے کی سمت گیا تھا۔

”ہاں! ٹھیک ہیں، سب ٹھیک ہیں، علیزے بھی ٹھیک ہے، ڈونٹ وری۔“ وہ اپنے بیڈروم کا دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہو گئے اور آسیہ آندری بھی ان کے پیچھے پیچھے تھیں۔
”لیکن آپ ٹھیک نہیں ہیں، آپ۔۔۔“

”آسیہ! پلیز مجھے کچھ دیر کے لیے تنہا چھوڑ دو۔“ وقار آندری نے آسیہ آندری کی سمت پلٹتے ہوئے نہ جانے کتنا انداز، کس لہجے میں کہا تھا کہ آسیہ آندری حیرت اور بے یقینی سے پتھر کی طرح ایک ہی جگہ پہ جم کے رہ گئی تھیں۔
”تنہا چھوڑ دوں۔“ وہ خود کلاہی کے سے انداز میں بولی تھیں، اور وقار آندری ٹھنک گئے۔

”آسیہ! میں اس وقت بہت الجھا ہوا اور بہت پریشان ہوں، پلیز ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ، مجھے تنہائی کی ضرورت ہے۔“ اس بار انہوں نے ذرا ٹھہر کے سمجھایا تھا اور آسیہ آندری وقار آندری کی اجنبی سی صورت، اجنبی سا لہجہ دیکھتی ہوئی باہر نکل گئیں، وہ گلے پڑنے والی اور بحث و تکرار کرنے والی بیویوں میں سے نہیں تھیں، اسی لیے میں اسیستے ہزاروں سوال، وسوسے اور وہم و گم میں ہی دباتی ہوئی چلی گئیں اور وقار آندری راکنگ چیرپہ ڈھکے تھے، دل دماغ میں ایک اٹھانچ سی مچی ہوئی تھی۔

سوکھے پیڑ پہ بہا آجائے تو ہرے پیر بھی اسے حیرانی اور حسد سے دیکھتے ہیں کہ یہ مرتے مرتے جینے کیسے لگا اور اس پہ بہا آئی ہے تو کیوں آئی ہے؟ آخر وجہ کیا تھی؟ وہ سوکھے سے ہر ایسے ہو گیا؟ اس کی شادی کا راز کیا ہے؟ سب ہی اس راز کو جاننا چاہتے ہیں، بالکل ایسے ہی جیسے مدحیہ قاتلہ بیگم اور ممتاز حیات جاننا چاہتے تھے، نبیل حیات جیسے سوکھے اور خشک پیڑ پہ آج بہا آئی لگ رہی تھی اور اس بہار کو سب ہی نے محسوس کیا تھا، حالانکہ کہ ملازموں نے بھی، کیونکہ نبیل نے آج انہیں بلا وجہ ہی مقررہ تنخواہ سے زیادہ پیسے دیے تھے، حالانکہ ملازموں نے تو کہا بھی نہیں تھا، وہ سب زیادہ پیسے دیکھ کر حیران ہوئے تھے۔
”صاحب! یہ پیسے؟“ ان کے ملازم نے پیسے دیکھتے ہوئے کچھ کہنا چاہا، لیکن نبیل نے ہاتھ اٹھا کر ملازم کو روک دیا۔

”اللہ کرے کہ آپ کا بھی ان ہی لوگوں میں شمار ہو۔“ مدحیہ نے روایتی بہنوں کی طرح دعا دی تھی۔
”آمین۔“ نبیل نے صدق دل سے آمین کہا۔

”تو پھر اب بتا دیں تاکہ کون ہے وہ لڑکی جس سے آپ محبت کرتے ہیں؟“ مدحیہ نے اپنے مطلب کا سوال پوچھ ہی لیا تھا اور نبیل اس کی بات پہ بے ساختہ مسکرا دیا تھا۔

”صبر میری جان صبر دل اورے کو آنے دو پھر سب پتا چل جائے گا تمہیں۔“

”کیا مطلب؟ دل اور بھائی کو بھی اس سلسلے کا پتا ہے؟“

”نہیں پتا! کیونکہ میں نے کبھی کسی کو بتایا ہی نہیں ہاں اب وہ آئے گا تو ضرور شیئر کروں گا۔“

”اوہ تو یعنی آپ سب سے چھپائے پھر رہے ہیں؟“ مدحیہ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”ہاں کہہ سکتی ہو۔“ اس نے بھی اثبات میں جواب دیا تھا۔

”اوکے! ایز یوش دل اور بھائی کے آنے کا ہی انتظار کر لیتے ہیں۔“

”بالکل! میں بھی اس کی واپسی کا انتظار کر رہا ہوں۔“ نبیل جیسے کوئی ارادہ باندھے بیٹھا تھا۔

”نہیک ہے پھر میں چلتی ہوں آپ سے بعد میں ملاقات ہوتی ہے۔“ مدحیہ اپنی گاڑی کی چابی اٹھاتے ہوئے نور بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”مدحیہ۔“

”جی بھائی؟“ نبیل کی آواز پہ اس کے قدم ہٹ گئے تھے۔

”میں نے سنا ہے جیڑی پاکستان آیا ہوا ہے؟ کیا یہ سچ ہے؟“ نبیل کا لہجہ اور انداز سنجیدہ ہو چکے تھے۔

”جی! آپ نے ٹھیک سنا ہے وہ کل ہی پاکستان آیا ہے ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے میں اس وقت اسے ہی یک کرنے جا رہی ہوں۔“ اس نے بغیر جھجکے اور بغیر رکے اسے صاف صاف بتا دیا تھا۔ نبیل کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن کہہ نہیں پاتا تھا۔

”ڈونٹ وری! وہ ہمارے نام نہاد بابا جیسا برا اور بدنیت نہیں ہے اس کا کریکٹر ہمارے بابا کے کریکٹر سے لاکھ درجہ بہتر اور اچھا ہے۔ بد کروار نہیں ہے وہ اتنے برے کی تمیز رکھتا ہے عزت کرنا بھی جانتا ہے۔ میرے اور اس کے درمیان ایسا کوئی ریلیشن نہیں ہے جس کی وجہ سے آپ کو شرمندہ ہونا پڑے اور گردن جھکانی پڑے وہ میرا محض ایک دوست ہے اس کے علاوہ اور کچھ مت سمجھیے گا اس وقت وہ پاکستان میں ہمارا مہمان ہے اور مہمان نوازی کرنا ہمارا حق بنتا ہے مجھے یہ حق نبھانے سے مت روکیے گا۔“ مدحیہ نے نبیل کے سامنے ہر بات واضح کر دی تھی اور نبیل اس کی ساری بات سمجھ گیا تھا اسی لیے سر کے اشارے سے اسے جانے کی اجازت دے دی تھی وہ جان چکا تھا کہ مدحیہ اتنی سرکشی دکھاتی ہے تو کیوں؟ وہ غلط نہیں تھی بس طریقہ غلط تھا۔

”زومیہ! زومیہ نیچے آؤ دونوں۔“ مریم نے صحن میں کھڑے ہو کر چھت پہ کھیلتی دونوں بہنوں کو آواز دی تھی۔

”جی آئی۔“ وہ دونوں اچھلتی کودتی نیچے اتر آئیں۔

”دونوں اپنا ہوم ورک ختم کرو۔“ مریم نے برآمدے میں تخت پہ رکھے ان کے اسکول بیگ کی طرف اشارہ کیا۔

”آئی! رات کو ختم کر لیں گے۔“ زونی نے لجاجت سے کہا۔

”ہرگز نہیں! رات کو لائٹ نہیں ہوتی اندھیرے میں تم لوگوں سے پڑھا نہیں جاتا نیند آجاتی ہے اس لیے

ابھی بیٹھو اور ختم کرو شاباش۔“ اس نے انہیں برآمدے کی سمت دھکیلا تھا اور خود کچن کی سمت آگئی کیونکہ رات کے کھانے کے لیے تیاری بھی تو کرنی تھی۔

”امی! اس سے تو بہتر ہے کہ میں کالج چھوڑ دوں۔“ کچن سے سنائی دیتی ایمن کی آواز پہ مریم کے قدم باہر برآمدے میں ہی رک گئے تھے۔

”تو بیٹا تم بتاؤ میں اور کیا کروں؟ اگر میرے پاس کچھ پیسے ہوتے تو میں تمہارے ابا جی کی دوائی ہی لے آتی کل سے انہوں نے دوائی نہیں لی اور میں نے عدیل اور مریم کے سامنے بھی ذکر نہیں کیا کہ ان کی دوائی ختم ہو چکی ہے۔“ دونوں بھی پریشان ہوں گے عدیل اپنی تنخواہ پہلے ہی ایڈوائس لے چکا ہے اور کہاں سے لے گا بھلا؟“ عابدہ خاتون کی پریشان اور متفکر سی آواز پہ مریم جیسے منجھدی ہو گئی تھی۔ ابا جی نے کل سے دوائی نہیں کھائی تھی اور ان لوگوں کو پتا ہی نہیں تھا؟ مریم سوچ کر ہی پریشان ہو گئی۔

”اگر وہ دوائی نہیں لیں گے تو ٹھیک کیسے ہوں گے؟ اب کیا ہوگا؟ عدیل بھائی بھی ایڈوائس لے چکے ہیں اف! کیا کریں اب؟“ مریم کی پریشانی کا گھوڑا بے سمت دوڑ پڑا تھا اب اسے چین نہیں تھا۔

”امی! اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ میں کالج چھوڑ دیتی ہوں یہ فیس میں اور کتابوں کا خرچہ سب فضول ہے ایمان! کالج چھوڑ دے گی اس طرح کچھ تو بوجھ کم ہوگا۔“ ایمن الٹا امی کو سمجھا رہی تھی اور مریم ٹھکے ٹھکے قدموں سے چلتی ہوئی کمرے میں آکر بستر پہ ڈھسے سی گئی۔

اس مسئلے کا کوئی حل بھائی نہیں دے رہا تھا صرف ایک کمانے والا تھا اور پورا گھر کھانے والا تھا۔ اور اس کی باب بھی ایسی تھی کہ بمشکل گزارا ہوتا تھا اوپر سے ابا جی کی بیماری ان کا علاج آخر کیا کچھ ہو سکتا تھا کیلے بندے سے۔“ مریم سوچ سوچ کر ہلکان ہونے لگی۔

”مریم آئی! وہ فاطمہ آئی آئی ہیں۔“ ایمان نے کمرے میں جھانکتے ہوئے اطلاع دی اور مریم یک دم اٹھ بیٹھی۔

”فاطمہ آئی ہے؟“ اسے حیرانی ہوئی تھی۔

”جی ہاں! فاطمہ آئی ہے کیونکہ آپ جو نہیں آتیں۔“ فاطمہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہی سلام کی بجائے ان کو دیکھا تھا۔

”السلام علیکم۔“ مریم اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی۔

”وعلیکم السلام! آج حجرہ نشین کیوں ہوئی بیٹھی ہو؟“ فاطمہ نے چارپائی کے ساتھ رکھی کرسی پہ بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”آج دل پہ تھوڑا بوجھ آگیا ہے یا ہر نکلنے کو دل نہیں چاہ رہا۔“ مریم بے ساختہ کہہ گئی تھی۔

”دل پہ بوجھ آگیا ہے؟ مگر کس قسم کا؟“ فاطمہ کو حیرانی ہوئی تھی کہ مریم پہلی بار اس سے کچھ ڈسکس کر رہی

”جو تم سمجھ رہی ہو ایسا کچھ نہیں ہے فاطمہ! میں بس اپنے گھر کے حالات کی طرف سے پریشان ہوں چند دن پہلے ابا جی کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہو گئی تھی وہ ہاسپٹل نرے ہیں کافی خرچہ اٹھانا پڑا عدیل بھائی کو اب گھر لے آئے اور اسکول کالج کے ہی اخراجات اتنے زیادہ ہیں کہ کیا بتاؤں تمہیں۔“ مریم اتنی پریشان تھی کہ سب کہہ دیا

”الہا! ان کے پہلو وہ اپنے گھر کے حالات بھی چھپا کے رکھتی تھی لیکن آج اس سے صبر نہیں ہو رہا تھا۔“

”اوہ تو یہ بات ہے؟“ فاطمہ نے ہونٹ سیکڑتے ہوئے سر ہلایا۔

”یہ بات اتنی چھوٹی نہیں ہے فاطمہ۔“

”میں جانتی ہوں یہ بات اتنی چھوٹی نہیں ہے اسی لیے تو تمہارے لیے ایک آفر لے کر آئی ہوں باوجود اس کے

کہ تم اور تمہارا بھائی پہلے بھی ایک آفر ٹھکرا چکے ہو۔" فاطمہ کی بات پر مریم نے یک دم جھٹکے سے سر اٹھا کر دیکھا۔
 "آفر؟ کیسی آفر؟" مریم نے اچھٹے سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔
 "تمہارے لیے جاب کی آفر۔" فاطمہ نے مختصراً بتایا۔

"میرے لیے جاب کی آفر؟ فاطمہ یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟" مریم کو وقفے وقفے سے حیرت کے جھٹکے لگ رہے تھے۔
 "میں جو کہہ رہی ہوں، تم سن رہی ہو، کیا خیال ہے کروگی جاب؟" فاطمہ نے بھی سنجیدگی سے پوچھا۔
 "میں جاب۔۔۔" مریم کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"اگر گھر کے حالات بہتر کرنا چاہتی ہو تو تمہیں یہ آفر قبول کرنی چاہیے، ایک آدمی آج کل کے منگائی کے بازار میں گھر نہیں چلا سکتا، بیماریوں کے علاج، گھر کے اخراجات، اسکول اور کالج کی فیسیں اور دیگر ضروریات واقعی ایک آدمی سے ہینڈل نہیں ہو سکتی، گھر کے باقی افراد کو بھی اس کام میں ہاتھ بٹانا چاہیے، اور میرا خیال ہے کہ یہ موقع اللہ نے تمہیں دیا ہے، اب کی بار ٹھکرانا مت، ورنہ پچھتاؤ گی۔" فاطمہ اسے سمجھا رہی تھی اور وہ سمجھ رہی تھی۔
 مریم کو احساس ہو چکا تھا کہ فاطمہ ٹھیک کہہ رہی ہے، حالانکہ مریم نے پہلے بھی ایک دوبار جاب کرنے کی بات کی تھی، لیکن عدیل نے سختی سے منع کر دیا تھا، لیکن آج کل گھر کے جو حالات جارہے تھے، ان کے پیش نظر ضروری تھا کہ وہ اس معاملے میں اپنے مقام پر ڈٹ جاتی، ورنہ عدیل اکیلا ہی اس چکی میں پستار تھا۔

"اب کیا سوچ رہی ہو؟" فاطمہ نے خفگی سے ٹوکا دیا۔
 "سوچ نہیں رہی، فیصلہ کر رہی ہوں۔" مریم بے حد سنجیدہ تھی۔
 "کیسا فیصلہ؟"

"جاب کرنے کا۔"

"ہوں! اچھی بات ہے، کرنا چاہیے۔" فاطمہ نے اس کی ہمت بندھائی تھی اور مریم نے آخر کار فیصلہ کر لیا تھا۔
 "ٹھیک ہے، مجھے یہ آفر قبول ہے، تم بتاؤ جاب کیا ہے؟" مریم ایک مضبوط فیصلہ کرنے کے بعد قدرے مطمئن ہو چکی تھی۔

"ارے جاب تو بہت ہی ایزی ہے تمہارے لیے، میری آنٹی کی ایک پرائیویٹ انگلش اکیڈمی ہے، انہیں ایک اچھے مزاج کی فی میل ٹیچر کی ضرورت ہے، وہ تو آج اخبار میں اشتہار دیتا چاہ رہی تھیں، لیکن میں نے انہیں روک دیا کہ ایک بار مجھے ٹرائی کر لینے دیں، مجھے سب سے پہلا خیال تمہارا ہی آیا تھا، اکیڈمی کا ماحول بہت ہی اچھا ہے اور سیکری بھی بہت اچھی ہوگی، تمہیں شکایت نہیں ہوگی، اور یہ جاب ایسی ہے کہ تمہیں کسی بھی انٹرویو کی کوئی فکر نہیں اٹھانا پڑے گی، وہ تو تمہیں فوراً اپائنٹ کر لیں گی، بس تمہارے ہاں بھرنے کی دیر ہے۔" فاطمہ اس کے لیے ڈھال بن گئی تھی، مریم کو اور بھلا کیا چاہیے تھا، اس نے ہاں بھر لی تھی اور فاطمہ اس کے فیصلے پر بے حد خوش ہو گئی۔

اس کا پیر ختم ہو چکا تھا، وہ فارغ ہو چکی تھی، اس لیے اپنے فیکسٹ پیپر کی تیاری کے لیے وہ کمپیوٹر لیب میں جہاں اسٹڈی کرتے کرتے اسے ٹائم گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا اور جب ہوش آیا تو اپنے سر پر ہاتھ مار کے رہ گئی۔
 "اف خدا! اتنا ٹائم ہو گیا ہے؟" اس نے اپنے موبائل سے ٹائم چیک کرتے ہوئے پریشانی سے کہا۔
 "عبداللہ بھائی کی کال بھی نہیں آئی؟" وہ سارا پھیلوا سمیٹتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور کمپیوٹر لیب سے

ال عبداللہ کا نمبر ڈائل کیا تھا، دوسری طرف پہلی رنگ پہ ہی کال ریسیو کر لی گئی تھی۔
 "ہیلو۔۔۔؟"

"السلام علیکم بھائی! آپ آئے کیوں نہیں؟ اور نہ ہی کال کی ہے آپ نے؟"

"اتنا ٹائم ہو رہا ہے۔" زری ٹائم دیکھ کر پریشان ہو رہی تھی۔ ڈونٹ وری کچھ نہیں ہوتا، مجھے پتا تھا کہ تم پیپر کی تیاری کر رہی ہو، اس لیے تمہیں ڈسٹرب نہیں کیا، اب تم تیار ہو، میں بس آ رہا ہوں۔" عبداللہ نے اس تسلی دیتے ہوئے فون بند کر دیا۔ زری اپنا دوپٹہ اور اسکارف اچھی طرح اوڑھتی ہوئی یونیورسٹی کا طویل ترین احاطہ تیز تیز قدموں سے طے کرتی ہوئی گیٹ سے نکل آئی، اسے پتا تھا کہ عبداللہ کو پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی، وہ جس بینک میں کام کرتا تھا وہ اس کی یونیورسٹی سے زیادہ دور نہیں تھا، اس لیے وہ زری کو آسانی سے پک اینڈر اپ کر دیتا تھا، زری کو ابھی وہاں کھڑے پانچ منٹ ہی گزرے تھے کہ یک دم اس کا رنگ فق ہو گیا، اس کے دائیں طرف سے ملک اسد اللہ کی آواز ابھری تھی۔

"کہاں تھیں اتنی دیر سے؟ ہم کب سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں؟ اتنا لمبا ہو گیا تھا تمہارا پیپر؟" وہ عین اس کے سامنے آکھڑے ہوئے تھے اور انہوں نے زری کو سر تاپا قہر آلود نظروں سے دیکھا تھا، وہ اپنی جگہ پہ کانپ کے رہ گئی تھی۔

"وہ۔۔۔ میں اپنے فیکسٹ پیپر کی تیاری کے لیے لیب میں چلی گئی تھی، عبداللہ بھائی کو میں نے صبح ہی بتا دیا تھا۔" اس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے بمشکل جواب دیا تھا کہ کہیں جواب نہ دینے پر وہ مزید غضب سے نہ بھر جائیں۔

"اپنے عبداللہ بھائی کی بات ہم سے نہ ہی کرو تو بہتر ہے، خیر چھوڑو اس قصے کو، آؤ ہم تمہیں ڈراپ کر دیتے ہیں۔" انہوں نے زری کو کہتے ہوئے ذرا فاصلے پہ کھڑی اپنی گاڑی کی سمت اشارہ کیا۔

"نہیں۔۔۔ نہیں! ٹھیک ہے، عبداللہ بھائی مجھے لینے کے لیے آرہے ہیں، ابھی فون پہ بات ہوئی ہے ان سے۔" زری ان کے ساتھ جانے کا بھی مر کے بھی نہیں سوچ سکتی تھی، وہ اسے آتے جاتے اپنی موت کے فرشتے کی طرح دکھائی دیتے تھے، اور اپنی موت کے فرشتے کے ساتھ اپنی مرضی سے کیسے جاسکتی تھی بھلا؟

"ہم بھی تو تمہیں ہی لینے کے لیے آئے ہیں؟" وہ کافی سخت اور بر فیلے لہجے میں کہہ رہے تھے۔

"جی! وہ تو۔۔۔ ٹھیک ہے، لیکن۔۔۔ وہ عبداللہ بھائی بھی بس پہنچنے ہی والے ہیں۔" اس وقت زری پہ ایک ایک لعاب عذاب گز رہا تھا، ان کی دہشت ہی اتنی تھی کہ ایسے ٹھنڈے اور بخ بستہ موسم میں وہ اور بھی ٹھنڈی ہو گئی تھی، اس کے ہاتھ پاؤں بالکل بخ ہو رہے تھے اور ماتھے پہ بھی ٹھنڈے پسینے آرہے تھے۔

"کوئی بات نہیں، اسے منع کر دو، ہمارے ساتھ چلو۔" انہوں نے اسے دوبارہ جلنے کا کہا۔

"ایم سوری بھائی! میں آپ کے ساتھ نہیں جاسکتی۔" اس نے انکار کر دیا تھا اور ملک اسد اللہ ایسے صاف انکار الٹ کی طرح بھڑک اٹھے تھے۔

"تم ہمارے ساتھ جلنے سے انکار کر رہی ہو؟" ان کی غضب ناک دھاڑ پہ اس پاس کے لوگ بھی ٹھہر گئے تھے، اسی نے شرمندگی اور خوف سے چہرہ جھکا لیا، وہ ان کے اس قدر غیض و غضب کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔

"دیکھتے ہیں کہ کیسے نہیں جاتی ہو تم۔" انہوں نے دو قدم آگے بڑھتے ہوئے زری کا بازو دبوچا اور اسے کھینچتے اپنے اپنی گاڑی تک لے آئے تھے۔

"نہیں بھائی صاحب! اس طرح تو نہیں نا۔" عبداللہ نے ان کا بازو تھام کے انہیں روک دیا تھا، وہ اپنی گاڑی کا دروازہ کھول رہے تھے۔

”جتنی دیر آپ کو اپنی بے چینی بتانے میں لگے گی۔“ زری تو جیسے اسے ستا رہی تھی۔
 ”ٹھیک ہے، پھر میں چلتا ہوں۔“ وہ صوفے سے کھڑا ہو گیا اور قدم باہر کی سمت بڑھا دیے تھے۔
 ”مجھے آپ سے یہ امید نہیں تھی کہ آپ بھی نظر چرانے والوں میں سے ہوں گے۔“ زری کی آواز پہ دل اور
 کے قدم ہٹ گئے تھے۔
 ”مجھے بھی آپ سے یہ امید نہیں تھی کہ آپ نظر جانے والوں میں سے ہوں گے۔“ دل اور نے واپس پلٹتے
 ہوئے برجستہ جواب دیا تھا اور زری بے ساختہ ہنس پڑی تھی اور اس کی ہنسی کا سحر ایسا تھا کہ دل اور نے وہاں سے
 ہٹ جانا ہی مناسب سمجھا تھا لیکن ان کے گھر سے نکلنے کے بعد بھی اس کی سماعتوں میں زری کی اس ہنسی کی کھنک
 پاتی رہی تھی وہ عبد اللہ سے ملنے آیا تھا، لیکن عبد اللہ و اش روم میں شاور لے رہا تھا اور نگارش اپنے میکے گئی ہوئی
 تھی اسی لیے وہ زری کے پاس زیادہ دیر تنہا نہیں بیٹھا تھا وہ آج جس سوڈ میں بھی وہ دل اور شاہ کو بھی بے چین
 کر رہی تھی اسی لیے تو وہ اٹھ آیا تھا، لیکن گاڑی اشارت کرتے ہوئے بھی اس کا دھیان زری کی طرف ہی تھا۔
 اور اس وقت بھی اس کا دھیان اسی کی طرف تھا جب اس دھیان کے تسلسل کو فجر کی اذان نے توڑ دیا تھا۔
 دل اور نے چونک کر دیکھا اس کا لیپ ٹاپ بیڈ پر ہنوز آن ہی پڑا ہوا تھا اور ہاتھ کی انگلیوں میں سگریٹ سلگ
 رہا تھا اس نے سر جھٹکتے ہوئے سگریٹ جھک کر الٹیش ٹرے میں مسلّا اور خود پاتا تھا روم کی سمت بڑھ گیا اذان ہو چکی
 تھی۔ اس لیے اس نے وضو کر کے اب نماز بھی پڑھنی تھی جب ہی اپنے بو جھل اور تھکے تھکے ذہن سے ہر بات
 جھٹک ڈالی تھی اور پھر نماز کے بعد دعا میں اپنے لیے چین اور سکون مانگا تھا اللہ سے صبر اور اطمینان عطا کرنے کی
 درخواست کی تھی وہ آج حقیقتاً اس اداس اور بچھا بچھا سا تھا شاید زری والی اداسی اس کے اندر اتر آئی تھی وہ اسے
 بے وجہ ہی یاد کر رہا تھا دل کو بے کلی لاحق تھی۔

مری کا موسم آج بھی بہت اچھا ہو رہا تھا۔
 سب ہی اپنے وقت بے دار ہو گئے تھے، لیکن صرف علیزے تھی جو ابھی تک سو رہی تھی اس کی آنکھ نہیں
 کھلی تھی اس لیے اس کی نماز بھی قضا ہو چکی تھی اب تو دن کے ساڑھے گیارہ کا ٹائم ہو رہا تھا اسی لیے عائشہ
 آندری نے رجو کو اسے جگانے کے لیے بھیجا۔ رجو نے باقاعدہ اس کے بیڈ روم کے دروازے کو زور زور سے پیٹا تھا
 تب جا کے علیزے کی آنکھ کھلی تھی۔
 ”کون ہے؟“ اس کی نیند سے بو جھل آواز سنائی دی۔
 ”بی بی جی! میں ہوں رجو، دروازہ کھولیں بی بی جی بہت ٹائم ہو رہا ہے دن کے بارہ بج رہے ہیں۔“ رجو نے باہر
 سے ہی اپنا اعلان جاری رکھا تھا۔
 ”بارہ بج گئے؟“ علیزے نے دروازہ کھولتے ہوئے حیرت سے کہا اس کا سر بہت بھاری ہو رہا تھا اور قدم بھی
 تھوڑے غیر متوازن لگ رہے تھے کل وہ بہت ڈسٹرب رہی تھی اس لیے رات کو ٹرنکولا ٹرنز لے کر سوئی تھی جب
 ہی اس وقت اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے ذہن بو جھل ہو رہا تھا۔
 ”جی! بارہ بج گئے ہیں“ آپ فریش ہو کر آجائیں عائشہ بی بی آپ کا ہی انتظار کر رہی ہیں۔“ رجو کہہ کر چلی گئی اور
 علیزے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئی باتھ روم میں آگئی اور دیوار گیر آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے
 آپ کو عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگی اک عجیب سا احساس اسے اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا وہ اپنے ہاتھ پاؤں
 اپنا چہرہ اپنی گردن چھو چھو کر دیکھ رہی تھی اتنی دیر سونے کی وجہ سے سارا جسم سویا سویا سا لگ رہا

142

لہا۔ ”علیزے۔“ اس کے بیڈ روم سے آذر کی آواز سنائی دی۔
 ”جی آذر بھائی آ رہی ہوں۔“ اس نے جلدی جلدی برش کیا اور منہ ہاتھ دھو کر باہر نکل آئی۔ ”اتنی دیر لگا دی تم
 نے طبیعت تو ٹھیک ہے نا“ آذر کو تشویش ہو رہی تھی۔
 ”جی ٹھیک نہیں رات ٹرنکولا ٹرنز لے کر سوئی تھی اس لیے جلدی آنکھ نہیں کھلی بلکہ اب بھی جسم تھکا تھکا سا
 لگ رہا ہے۔“ وہ سر جھکائے آہستگی سے کہہ رہی تھی۔
 ”ڈونٹ وری! ابھی فریش ہو جاؤ گی باہر سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں کیا آج گھومنے کا ارادہ نہیں ہے؟“ آذر
 اسے فریش کرنے کے لیے پوچھ رہا تھا۔
 ”جی! ابھی آتی ہوں۔“ وہ انکار کر کے ان لوگوں کا موڈ نہیں خراب کرنا چاہتی تھی اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی
 ہائی بھر لیتی تھی۔
 ”اوکے! جلدی آجاؤ۔“ وہ اس کا ہاتھ تھپک کے باہر نکل گیا اور علیزے گرم کپڑے پہننے لگی وہ تھوڑی دیر
 میں باہر آئی تو واقعی سب ہی منتظر تھے۔
 ”جیسے شہزادی علیزے آچکی ہیں اب قافلے کو روانگی کی اجازت دیجیے۔“ کومل کا لہجہ دھیما لیکن طنزیہ اور
 کاٹ دار تھا آذر نے آج پھر اسے چونک کر دیکھا تھا کیونکہ وہ زیادہ دیر نہیں کھڑا تھا یا آسانی سن سکتا تھا۔ اور اس کی
 بات سن کر آذر کو آج بھی سخت الجھن اور حیرت ہوئی تھی کومل کا رویہ علیزے کے ساتھ ایسا کیوں تھا آخر؟
 ”کیا بات ہے آج اتالیٹ کیوں ہو گئیں۔“ عائشہ آندری کو بھی اس کی طرف سے تشویش ہو رہی تھی۔
 ”بس نیند گہری تھی اس لیے وقت کا احساس نہیں ہوا، ایم سو رہی کہ آپ سب کو میری وجہ سے انتظار کرنا
 پڑا۔“ علیزے نے بے حد آہستگی سے کہتے ہوئے کومل کی سمت دیکھا تھا۔ جس کے چہرے کی ناگواری وہ پہلے تو
 نہیں لیکن اب با آسانی محسوس کر سکتی تھی کیونکہ وہ کومل کے اندر کی کاٹ اور ناگواری کی جھلک دیکھ چکی تھی۔
 ”ارے ایسی کوئی بات نہیں ہے ڈیر تم پورا دن بھی سوئی رہتیں تو ہم پورا دن انتظار کر سکتے تھے۔“ دانیال نے

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

☆	ستاروں کا آنگن، نسیم سحر قریشی	قیمت: 450 روپے	☆
☆	درد کی منزل، رضیہ جمیل	قیمت: 500 روپے	☆
☆	اے وقت گواہی دے، راحت جبین	قیمت: 400 روپے	☆
☆	تیرے نام کی شہرت، شازیہ چودھری	قیمت: 250 روپے	☆
☆	امر تیل، عمیرہ احمد	قیمت: 550 روپے	☆

☆ خوبصورت سرورق

☆ خوبصورت چھاپا

☆ شائع ہو گئے ہیں

☆ مضبوط جلد

☆ آفٹ پیپر

☆ 32216361 فون: کراچی۔ اردو بازار، 37- ڈائجسٹ، مکتبہ عمران

143

مسکرا کر اس کا سر پھٹکتے ہوئے کہا۔
”تھینک یو بھائی! اٹس مائی پلیرس۔“ علیزے کا لہجہ سنجیدہ تھا وہ کل سے کچھ چپ چپ سی تھی اسے کومل کا شک اندر ہی اندر کسی پن کی طرح چھب رہا تھا۔

”چلو پھر جلدی سے ناشتا کرو“ آج تھیا گلی کے لیے نکلتے ہیں۔“ وانیال نے اسے ناشتایا دولا یا۔
”نہیں مجھے بھوک نہیں ہے“ آپ چلیں میں راستے سے کچھ لے لوں گی۔“ علیزے کو واقعی بھوک نہیں تھی اس نے انکار کر دیا تھا اور اس کے انکار پر سب کھڑے ہو چکے تھے ان کا رخ باہر گاڑیوں کی سمت تھا عائشہ آفندی کے ساتھ علیزے بھی دھیسے اور ست قدم اٹھاتی یا ہر نکل آئی تھی۔

سامنے ہی روش پہ منصور حسین گاڑی کا دروازہ کھولے الٹ کھڑا تھا علیزے کی ڈائریکٹ نظر اسی پہ پڑی تھی اور اتفاقاً منصور حسین نے بھی اسی بل نظر میں اٹھا کر اندرونی مین ڈور کے سامنے والی سیڑھیاں اترتی علیزے کی سمت دیکھتا تھا نظروں کا یہ تصادم علیزے کے لیے خفت کا باعث تھا اسے جب بھی اپنا منصور حسین سے لپٹنا یا آنا تھا وہ شرمندگی سے زمین میں گر جاتی تھی یہی وجہ تھی کہ کل سے اس کا منصور حسین سے نظر ملنا محال ہو گیا تھا ایک کومل والی بات اور دوسری اپنی بدحواسی میں کی گئی حرکت دونوں ہی اس کے ڈوب مرنے کے لیے کافی تھیں منصور حسین نے بھی اسے دیکھ کر نظریں جھکا لی تھیں اور چپ وہ اس کے پاس سے گزر کر گاڑی میں بیٹھی تو وہ دروازہ بند کر کے اپنی سائیڈ پہ آگیا دوسری گاڑیاں رفتہ رفتہ نکل چکی تھیں۔

وہ بھی گاڑی بیک کرتے ہوئے گیٹ سے باہر لے آیا تھا آج عائشہ آفندی علیزے کے ساتھ تھیں اور رجو منصور حسین کے ساتھ فرنٹ سیٹ پہ بیٹھی ہوئی تھی۔

”کیا بات ہے علیزے بیٹا۔؟ تم آؤ اس اور چپ چپ سی لگ رہی ہو؟“ عائشہ آفندی پوچھتے بغیر نہیں رہ سکیں علیزے کی خاموشی سب ہی کو محسوس ہو رہی تھی۔

”ارے پھوپھو! میں نے بتایا تو ہے کہ میں بالکل ٹھیک ہوں بس تھکن ہو رہی ہے، کبھی اتنا سفر جو نہیں کیا اور پھر پورا پورا دن گھومنا پھرنا میری توانائیوں اور پائوں کی ایڑیوں میں درد ہونے لگتا ہے میں بہت جلدی تھک جاتی ہوں۔“ علیزے انہیں مطمئن کرنے کے لیے تسلی دی۔

”تو کسی روز ریسٹ کر لو نا۔“ انہوں نے اپنے ہاتھ سے علیزے کے چہرے پر آئے بال پیچھے ہٹائے تھے۔
”میرا ریسٹ کرنا دوسروں کو ناگوار گزرتا ہے۔“ علیزے کا لہجہ ذرا سا بھگ گیا اس سے کومل کی ناگواری برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

”کس کو ناگوار گزرتا ہے؟“ عائشہ آفندی کو اچنبھا ہوا۔
”ہوں! کسی کو بھی نہیں۔“ اس نے نفی میں گردن ہلائی تھی اور اپنی طرف سے بات ٹالنے کی کوشش کی تھی۔
”مگر بیٹا۔“

”پلیز آپ اس بات کو رہنے دیں زیادہ کریدنے سے زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔“ علیزے نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا اور عائشہ آفندی چپ ہو گئی تھیں وہ بھی تو زہرہ سے ملنا چاہتی تھیں اسے کریدنا چاہتی تھیں کیا اسے بھی اس کریدنے سے تکلیف ہو سکتی تھی؟ لیکن عائشہ آفندی کو اس طرح یہ پتا تو چل سکتا تھا نا کہ وہ انہیں بنا بتائے سب کچھ چھوڑ کر کیوں چلی گئی؟ کیوں کبھی پلٹ کر بھی نہیں دیکھا؟ کبھی یہ بھی نہیں پوچھا کہ پیچھے عائشہ پہ کیا گزری ہے؟ کیا جیتی ہے اس کی ذات پہ؟ عائشہ آفندی کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

”میری اس مثال کا اشارہ علیزے اور کومل کی طرف ہے کومل سورج سے بڑی حویلی کی بڑی بیٹی اس نے اپنے تمام گزرنے میں راج کیا ہے لیکن جیسے ہی علیزے پیدا ہوئی پورے گھر کی توجہ اور بیا رحبت علیزے کی سمت منتقل ہو گیا پورا دن سورج کی دھوپ میں گزارنے والے لوگ چاند کے شیدا لی ہوئے تو سورج کو بھی شکایتیں اونے لگیں اسے چاند سے حسد اور جلن محسوس ہوتی تھی بڑی حویلی میں علیزے چاند تھی تو کومل بھی سورج کا

”پھوپھو! کیا سوچ رہی ہیں؟“

”کچھ نہیں بیٹا! انہوں نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے آہستگی سے کہا اور علیزے کا کندھا تھپکتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

”جس طرف بھی دیکھ رہا ہوں ہر طرف سوچیں ہی سوچیں نظر آرہی ہیں کیا بات ہے؟ تم بھی سوچ میں گم ہو گئے؟“ وانیال خفگی سے کہتا ہوا آذر کے برابر ایک پہاڑی کے اوپر بنی ریٹنگ کے قریب آکھڑا ہوا۔
”کیا کہنا چاہ رہے ہو تم؟“

”میں کہنا چاہ رہا ہوں کہ میں اس وقت ہر چہرے پہ گہری سوچ کے سائے دیکھ رہا ہوں امی بھی سوچ میں گم ہیں، علیزے بھی چپ اور سوچ سی ہے کومل کے چہرے کا بھی یہی حال ہے اور اوہر تم بھی اسی مرض کا شکار ہوئے کھڑے ہو۔“ وانیال کی خفگی ہنوز تھی۔

”وانیال! تم نہیں جانتے کہ میں کیا سوچ رہا ہوں؟“ آذر بے حد الجھا ہوا تھا۔
”ہونہ! تمہارے جیسا بے خبر نہیں ہوں میں۔“ وانیال استہزائیہ انداز میں ہنسا تھا آذر نے چونک کر اس کے چہرے کی سمت دیکھا۔

”میرے جیسا بے خبر؟ کیا مطلب۔؟“
”تم کومل کے بارے میں سوچ رہے ہو نا۔؟“ وانیال کے انداز پر آذر کی آنکھیں حیرت اور بے یقینی سے پھیل گئیں کہ اس نے اس قدر درست اندازہ کیسے لگا لیا؟

”وانیال۔! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“ آذر حیران پریشان تھا۔
”میں کہہ رہا ہوں کہ تم کومل کے بارے میں سوچ رہے ہو کہ کومل کا رویہ علیزے کے ساتھ اتنا کھدرا کیوں ہے؟“ وانیال تو اسے کسی نجومی کی طرح سب کچھ پرفیکٹ بتا رہا تھا۔

”وانیال۔؟“ وہ حیرت کے مارے مزید کچھ نہیں کہہ پایا تھا اور وانیال نے مسکراتے ہوئے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا اور پہاڑوں کے اس پار ڈوبتے سورج کو دیکھا اور آذر کو وضاحت دی تھی۔
”دن شروع ہوتا ہے تو سب سے پہلے سورج بے وار ہوتا ہے اور یہ سورج پورا دن پوری کائنات پہ راج کرتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ سورج ڈوب جاتا ہے اور آسمان کے سینے پہ چاند جگمگانے لگتا ہے ٹھنڈی میٹھی روشنیوں والا چاند سب ہی اس چاند کو اس کی نرمی اور مٹھاس کی وجہ سے پسند کرتے ہیں اور لوگوں کی اس پسندیدگی کی وجہ سے سورج کو چاند سے جلن ہونے لگتی ہے اسے اپنے آپ پہ بھی غصہ آتا ہے کہ وہ غروب کیوں ہوتا ہے۔؟ کیوں چاند کو ابھرنے کا موقع دیتا ہے۔؟ لیکن یہ ڈوبنا اور ابھرنا ایک فطرت ہے اور یہ فطرت ازل سے اب تک جاری رہے کی اسی طرح سورج کی چاند سے جلن بھی ہمیشہ قائم رہے گی۔“ وانیال آذر کو ایک مثال دیتے ہوئے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن آذر پھر بھی نا سمجھی سے دیکھ رہا تھا۔

”میری اس مثال کا اشارہ علیزے اور کومل کی طرف ہے کومل سورج سے بڑی حویلی کی بڑی بیٹی اس نے اپنے تمام گزرنے میں راج کیا ہے لیکن جیسے ہی علیزے پیدا ہوئی پورے گھر کی توجہ اور بیا رحبت علیزے کی سمت منتقل ہو گیا پورا دن سورج کی دھوپ میں گزارنے والے لوگ چاند کے شیدا لی ہوئے تو سورج کو بھی شکایتیں اونے لگیں اسے چاند سے حسد اور جلن محسوس ہوتی تھی بڑی حویلی میں علیزے چاند تھی تو کومل بھی سورج کا

سامقام رکھتی تھی اس لیے یہ پر خاش اس کے دل میں بچپن سے چلی آرہی ہے کسی بھی بچے نے کومل کی حیثیت کو کم نہیں کیا تھا سوائے علیزے کے۔ اور بات یہیں تک ختم نہیں ہوئی آذر صاحب نے معاملہ بہت سنگین ہے یہ قصہ بہت دور تک جاتا ہے۔ ”دانیال آج شاید آذر کی آنکھوں سے نا سنجھی کی پٹی اتارنے کے درپے تھا۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب کہ کومل کے ساتھ دل کے معاملے میں بھی ایسا ہی سلوک ہوا ہے کومل جس کو پسند کرتی ہے وہ علیزے کو پسند کرتا ہے۔“ دانیال کے اس دھماکے پہ آذر دو قدم دور اچھلا تھا وہ دانیال کو ششدر سا دیکھ رہا تھا وہ ایسے انکشاف کر رہا تھا کہ آذر رنگ رہ گیا تھا۔

”کومل شاید بچپن کی ساری باتیں انور کر کے علیزے کے ساتھ نارمل کزنز کی طرح ہی ہو کرتی لیکن آذر آندہ کی محبت اسے ایسا کرنے سے روک دیتی ہے، کیونکہ کومل آذر کو دیکھ دیکھ کر جیتی ہے اور آذر علیزے کو دیکھ کر اس پہ قربان ہوتا ہے، ایسے عالم میں تم بتاؤ کہ کومل کا رویہ علیزے کے ساتھ درست کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ کیسے علیزے کے ساتھ دوستوں کی طرح اور کزنز کی طرح رہ سکتی ہے؟ کیسے بڑی بہنوں کا سا سلوک کر سکتی ہے؟ علیزے اور کومل کے درمیان تم کھڑے ہو میرے دوست اور فیصلہ بے پناہ مشکل ہے کہ کس کو کس طرف جانا چاہیے؟“ دانیال نے آج اس قصے کا سارا کچا چٹھا کھول کے رکھ دیا تھا اور آذر نے بے ساختہ ریٹنگ کو مضبوطی سے تھام لیا کہ مبادا وہ کہیں گر ہی نہ جائے۔

”اور ہاں! ایک بات اور اس سارے قصے میں علیزے بے گناہ اور انجان ہوتے ہوئے بھی اس چکی میں پس رہی ہے اس کا کوئی قصور نہیں ہے لیکن پھر بھی قصور وار ٹھہرائی جا رہی ہے۔“ دانیال اسے ہر بات سے آگاہ کر رہا تھا۔

”کومل مجھے پسند کرتی ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟“ آذر نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔

”کیوں؟ یہ کیوں نہیں ہو سکتا بھلا؟ کیا اس چیز پہ کوئی پابندی ہے؟“ دانیال نے اس کے بچکانہ سے سوال پہ خفگی سے کہا۔

”مگر دانیال۔۔۔“

”کیا تم نے اپنے ماتھے پہ لکھوا رکھا ہے کہ تم علیزے کو پسند کرتے ہو اور کوئی تمہیں پسند نہ کرے؟“ دانیال کو آذر کی لاپرواہی اور نادانی پہ چڑھ رہی تھی۔

”میں علیزے کو پسند کرتا ہوں؟ دانیال تم غلط فہمی کا شکار ہو، میں علیزے کو۔۔۔“

”ہاں! تم علیزے کو محض اپنی کزن سمجھتے ہو؟ نا؟ ہو نہ! کزنز تو پھر اور بھی بہت ہیں۔ صرف علیزے کے لیے ہی اتنے ہلکان کیوں ہوتے ہو؟ وہ تمہارے لیے اتنی ایشیئل کیوں ہے؟ مان لو میرے بار کہ جو میں کہہ رہا ہوں وہ سب سچ ہے، تم علیزے کو پسند کرتے ہو اور کومل تمہیں پسند کرتی ہے۔ اور پسند کا یہ چکر کچھ مناسب نہیں ہے کیا بنے گا آخر؟“ دانیال خود بھی متفکر ہو رہا تھا جبکہ آذر تو مزید کچھ کہہ ہی نہ سکا۔ وہ سب واپسی کا شور مچا رہے تھے اور آذر جیسے مرے مرے قدموں سے چلتا ہوا گاڑی تک آیا تھا۔

وہ اپنے دھیان میں بیڈ روم کا دروازہ کھول کے بیڈ روم میں داخل ہوئی تھیں، لیکن اندر داخل ہوتے ہی انہیں شدید کھانسی کا دورہ پڑ گیا تھا، بیڈ روم سگریٹ کے دھوئیں سے دھواں دھواں ہو رہا تھا اور اس قدر زہریلے دھوئیں

سے ان کا دم گھٹ گیا۔

وہ کھانستے ہوئے بمشکل کھڑکی تک گئی تھیں اور کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیے تھے۔

”وقار! یہ آپ اسموکنگ کر رہے ہیں؟ اتنی زیادہ؟ ہر چیز دھواں دھواں ہو گئی ہے۔“ آسیہ آندہ ان کے عین سامنے آکھڑی ہوئی تھیں وہ راکنگ چیئر پہ جھول رہے تھے۔

”کھڑکی بند کرو آسیہ۔“ انہوں نے بے حد گنہگار اور بوجھل آواز سے کہا تھا۔

”کیسے بند کروں کھڑکی۔؟ پورا بیڈ روم جس زندہ ہو رہا ہے آپ کا دم نہیں گھٹ رہا؟“ آسیہ آندہ پریشانی سے بہتلا رہی تھیں۔

”دم گھٹ رہا ہے اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ کھڑکی بند کرو۔“ وقار آندہ کا لہجہ بہت عجیب ہو رہا تھا، آسیہ آندہ بے بس سی کھڑی تھیں آج پورا ایک ہفتہ ہو گیا تھا ان کو اس حال میں دن رات تمام کرتے ہوئے، اور ان کو پورا ایک ہفتہ ہو چکا تھا ان سے اس حال کی وجہ پوچھتے ہوئے وہ جب زیادہ اصرار کرتی تھیں تو وقار آندہ غصے سے ڈانٹ دیتے تھے اور وہ ہزاروں الجھنیں ذہن میں لیے پلٹ جاتی تھیں۔

”ایسی کیا بات ہے آخر جو آپ مجھ سے شیئر نہیں کرتے؟“ آسیہ آندہ ان کے قریب آگئی تھیں اور وقار آندہ نے ان کے سوال کو نظر انداز کر کے سگریٹ ایش ٹرے میں مسکتے ہوئے کچھ کہنے کے لیے ہنکارا بھرا۔

”علیزے کے برتھ ڈے میں صرف پانچ دن رہ گئے ہیں، ان لوگوں کو کو صبح واپس آجائیں۔“ ان کو اس حال میں بھی علیزے کا برتھ ڈے یاد تھا، اتنے دنوں بعد کوئی بات کی بھی تھی تو علیزے کی۔ آسیہ آندہ چپ سی ہو گئیں۔

”علیزے کا برتھ ڈے یاد ہے آپ کو؟“

”ہو نہ! تمہیں کس نے کہا کہ میں بھول گیا ہوں؟“ وہ استہزائیہ ہنستے تھے۔

”علیزے انیس سال کی ہو رہی ہے، اس کی انیس برتھ ڈیز سلیبیوٹ کی ہیں میں نے، کوئی ایک بھی بھولا ہوں تو بتاؤ مجھے؟“ یہ ان کا ریکارڈ تھا کہ انہوں نے علیزے کا ایک بھی برتھ ڈے مس نہیں کیا تھا وہ ہمیشہ ہر سال کہیں ملک سے باہر بھی ہوتے تھے تو اس کے برتھ ڈے پر گھر واپس آجاتے تھے اور کافی دھوم دھام سے سلیبیوٹ کرتے تھے تو اس بار کیسے ہو سکتا تھا کہ اس کا برتھ ڈے سلیبیوٹ نہ ہوتا اور مس ہو جاتا؟

”لیکن مجھے لگ رہا تھا کہ اس بار برتھ ڈے مس ہو جائے گا، کوئی سلیبیوٹیشن نہیں ہوگی۔“ آسیہ آندہ اپنے خیالات کا اظہار کر رہی تھیں۔

”نہیں! ایسا نہیں ہو سکتا، وقار آندہ کی زندگی میں علیزے کی کوئی بھی خوشی مس نہیں ہو سکتی ان شاء اللہ اب تک زندہ ہوں یہ سلسلہ چلتا ہی رہے گا۔“ وہ پر عزم سے لہجے میں کہتے ہوئے راکنگ چیئر سے اٹھ کھڑے ہوئے اور ذرا فریٹش ہونے کے لیے با تھ روم کا رخ کیا۔ اور آسیہ آندہ آذر کو فون کرنے کے لیے چل دیں۔

وقار آندہ نے اتنے دنوں بعد اپنی چپ کا روزہ توڑا تھا اس لیے آسیہ آندہ کے لیے فی الحال یہ بھی کافی تھا کہ ہمارا انہوں نے کسی کام میں دلچسپی تولی ہے نا؟ اسی لیے انہوں نے فوراً ”فون کر کے اپنی فوج کو واپسی کا آرڈر دے دیا۔“

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

بہتر بارنا نہیں سیکھا اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔

۱۹ سینسویں قسط



تبیہ غریز



بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدھیہ اور نیل حیات دہی، بسن بھائی ہیں، مدھیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے، وہ انگلنڈ کی رنگینوں میں مکمل حور پہ رنگ چکی ہے، جس کے پیش نظر فائزہ بیگم، نیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں، لیکن مدھیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے، جس پہ نیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے، مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے، مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، بے بسی اور مجبوری سے تنگ آخر طوق کٹی کرنے کا سوچتا ہے، لیکن ایسے میں ایک روز اسے اچانک میں چائے پیتے ہوئے پاؤ اتیازل جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے، جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے، اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔ منصور حسین ایک غریب اور میسرک پاس آدی ہے، وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے، وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے، وہ اپنے قول و فعل کا بہت ریکا آڈی ہے، اس نے



"غلط کہہ رہے ہو تم، میں تو مارنگ سے بھی زیادہ فریش اور اٹریکٹو ہوں۔" مدحیہ کاموڈ آج کچھ فریش تھا۔
اس لیے وہ اپنی فریش نیس کا اظہار بھی کافی فریش انداز میں کر رہی تھی۔
"ہوں ایم ایگری و دیو۔" جیزی نے اس کی شوخی سے اتفاق کیا۔
"جو سچ ہے، جو حقیقت ہے، اس سے ایگری تو ہونا ہی پڑے گا نا؟" مدحیہ نے لاپرواہی سے کندھے اچکائے تھے۔

"ہوں ابھی ٹھیک ہے۔" جیزی ناشتا کرتے ہوئے مسکرایا، اور مدحیہ بھی ہنستی ہوئی پلٹ کر بیڈ پہ آ بیٹھی۔
"ارے! یہ کیا ہے؟" اس کی نظر بیڈ پہ بکھرے پھیلاوے کی سمت اب گئی تھی۔
"تمہارے لیے گفٹس ہیں۔" اس نے بھی لاپرواہی سے جواب دیا۔
"میرے لیے گفٹس؟ کیا مطلب؟" اسے حیرت ہوئی تھی۔
"لیس! برائن، شہسے، کرسٹینا اور باقی فرینڈز نے بھیجے ہیں۔" جیزی۔ ناشتا ختم کر کے نیپکن سے ہاتھ پونچھتا ہوا بولا۔
"ارے واؤ! تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔" مدحیہ کو حقیقتاً "بہت زیادہ خوشی ہوئی تھی کہ اس کے فرینڈز نے اسے گفٹس بھیجے ہیں وہ بھی اتنے شوق اور اتنی محبت سے۔"
"تم پہلے مجھے ملی کب ہو؟" وہ صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔
"ملی تو تھی؟" مدحیہ برائن کا بھیجا ہوا گفٹ الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔
"تو کیا آتے ہی بتا دیتا؟"

"ہاں! بتا دیتے" اس میں کیا حرج تھا بھلا؟ وہ گفٹ سپر کھول چکی تھی اس نے مدحیہ کے لیے بہت قیمتی پرفیوم بھیجا تھا، مدحیہ اس پرفیوم کی مہک سے مسحور ہو گئی تھی۔
"حرج تھا یا ر، کیونکہ کل میں ذہنی طور پر تیار نہیں تھا۔" جیزی اپنی پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ پھنسائے عین اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔
"کیا مطلب؟ کس لیے ذہنی طور پر تیار نہیں ہو۔" مدحیہ نے چونک کر جیزی کی سمت دیکھا وہ ڈائریکٹ اسے ہی دیکھ رہا تھا اور اس کی لودیتی آنکھیں بول رہی تھیں وہ سب سن رہی تھیں جو مدحیہ سننا نہیں چاہتی تھی۔ "اس گفٹ کے لیے جس کے لیے تم بھی ذہنی طور پر تیار نہیں ہو۔" جیزی نے اپنی جیب سے چھوٹی سی سرخ رنگ کے ٹمپلی سی ڈیٹا نکال کر مدحیہ کے سامنے کی تھی اور مدحیہ اس سرخ رنگ کی ڈیٹا کو دیکھ کر گنگ ہو گئی، بے شک وہ ڈیٹا بند تھی، لیکن اس میں موجود گفٹ مدحیہ کے ذہن اور سوچ سے چھپا ہوا نہیں تھا، کیونکہ وہ گفٹ پوشیدہ ہو کر بھی پوشیدہ نہیں تھا۔

"جیزی! یہ۔۔۔ کیا کہہ رہے ہو تم؟" مدحیہ کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا، وہ کیا بولے اور کیا نہ بولے؟
"میں جو کچھ کہہ رہا ہوں تم اچھی طرح سمجھ رہی ہو، لیکن دیکھو میڈی میری تم سے ایک ریکونسٹ ہے کہ تم پلیز اس وقت اس گفٹ کو مت ٹھکرائو۔ ابھی میرے پاس بہت ٹائم ہے، تم مجھے سوچو، مجھے پرکھو، پھر جو فیصلہ کرو تو مجھے بتا دینا، ابھی یہ گفٹ تم اپنے پاس رکھو، اگر تم نے کبھی یہ گفٹ پس لیا تو میں سمجھوں گا تم نے مجھے قبول کر لیا، اور اگر مجھے واپس کر دیا تو میں سمجھوں گا تم نے مجھے ٹھکرا دیا ہے، میں نہ تم سے سوال کروں گا نہ جواب ہمیشہ کے لیے سامنے سے ہٹ جاؤں گا، بس یہ میرا تم سے وعدہ ہے اور عہد بھی۔" جیزی نے جو کچھ کہا تھا اس پر کسی اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی تھی۔ مدحیہ نے لب بچھتے ہوئے اک نظر جیزی کو اور اک نظر اس کے ہاتھ کی سمت دیکھا اور پھر گہری سانس کھینچتے ہوئے وہ گفٹ تھام لیا اور جیزی کے چہرے پہ امید کے کئی رنگ آنکھڑے

"کیا۔۔۔؟ ہم واپس جا رہے ہیں؟" علیزے نے آذر کے منہ سے واپسی کا سن کر کافی بے یقین اور تر سے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ وہ تو جب سے آئی تھی تب سے ہی واپس جانا چاہ رہی تھی، لیکن ان سب کی خاطر خاموش تھی کہ اس کی وجہ سے وہ سب خواہ مخواہ بد مزہ ہوں گے، لیکن اس وقت اچانک واپسی کی خبر سن کر جیسے اس کے دل کی مراد بر آئی تھی۔

"ہوں۔۔۔ ہم واپس جا رہے ہیں۔" آذر نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلایا۔
"لیکن بھائی! اتنی جلدی۔۔۔؟" واپسی کی اطلاع پہ سب سے پہلے اعتراض اور خفگی انوشہ کو ہوئی تھی، وہ سب اس وقت ڈرائنگ روم میں اپنی اپنی نشست سنبھالے بیٹھے تھے اور ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے سے اندر کھڑا آذر سب کی نظروں کا مرکز تھا اور سب کی نظریں سوالیہ تھیں۔
"آئی کی کال آئی تھی ڈیڈ نے خود واپسی کا آرڈر دیا ہے کہ صبح تم سب کو حویلی میں موجود ہونا چاہیے اب یہ جلدی ہے یادیر۔ یہ میں نہیں جانتا، آذر نے سب کو باری بار وضاحتیں اور جواب دینے کی بجائے صاف صاف بتا دیا کہ یہ آرڈر اوپر سے آیا ہے اس لیے اس میں اعتراضات کی اور خفگی کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اور پھر واقعی ایسا ہی ہوا تھا وہاں موجود سب ہی افراد چپ ہو کے رہ گئے تھے، ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی ان لوگوں میں کافی گپ شپ اور ہنسی مذاق ہو رہا تھا، مگر واپسی کا سن کر علیزے کے سوا سب مجھ سے گئے تھے۔"
"کیا بات ہے؟ یہاں اتنی خاموشی کیوں ہے؟" عائشہ آندھی عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد وہیں ڈرائنگ روم میں چلی آئیں، لیکن ان سب کو خاموش دیکھ کر انہیں حیرت ہوئی تھی۔
"ہم لوگ صبح واپس جا رہے ہیں ڈیڈ نے واپسی کا کہا۔" آذر نے ان کی سمت پلٹتے ہوئے جواب دیا۔
"اچھا۔۔۔؟ خیر بہت تو ہے نا؟" عائشہ آندھی کو تسلیش دیتی۔

"کیا اپنے گھر جانے کے لیے خیریت ہونا ضروری ہو، ہے؟" آذر نے بے تاثر سے انداز میں پوچھا تھا عائشہ آندھی ٹھنک کے رک گئیں۔
"میں بنا اب بات نہیں ہے میں تو پیچھے والوں کی خیریت معلوم کرنا چاہ رہی تھی، آج اچانک واپسی کا حکم دے دیا ہے تو کہیں کوئی مسئلہ تو نہیں ہے نا۔" انہوں نے وضاحت دی تھی۔ "میں کوئی مسئلہ نہیں آپ لوگ بس واپسی کی تیاری کریں، صبح یہاں سے نکلنا ہو گا، اس لیے اپنے اپنے سامان کی پیکنگ ابھی سے کر لیں، تاکہ صبح ہم لوگ لیٹ نہ ہوں۔" وہ کھڑے کھڑے ان سب کو ہدایات دے کر واپس پلٹ گیا اور وہ سب مجھے مجھے سے انداز میں اٹھ کر اپنے اپنے کمرے کی سمت چل دیے سب نے کافی پھیلاوا سمیٹنا تھا۔

"ہیلو! گڈ مارنگ۔۔۔" وہ دروازے کے ہینڈل پہ ذرا سا دباؤ ڈالتی ہوئی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔
"ہائے! ایم ٹو پو میڈی۔" جیزی اپنے روم میں بیٹھا ناشتا کر رہا تھا، جب مدحیہ اچانک اندر چلی آئی اور وہ اسے دیکھ کر فوراً "کھڑا ہو گیا۔"
"ٹس! اوکے! بیٹھو ناشتا کرو تم۔" مدحیہ اسے اشارہ کرتی ہوئی خود کھڑکی کی سمت بڑھ گئی اور کھڑکی کے تمام پردے اک جھٹکے سے ہٹا دیے تھے، چمکتے سنہرے دن کی روشنی لپک کے اندر داخل ہوئی اور پورا کمرہ کھل اٹھا۔
"کیسی لگی یہاں کی صبح؟" مدحیہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔
"ٹانس ویری ٹانس! اٹریکٹو اینڈ فریش مارنگ، ایز لائیگ یو۔" جیزی نے بھی جواباً "کھلے دل سے اظہار کیا۔ مدحیہ ایک دم کھلکھلا اٹھی۔

تھے اور ہونٹوں کو مسکراہٹ چھو گئی تھی۔

”تھینک یو میڈی۔“ وہ آہستگی سے بولا اور مدھیہ بیڈ سے کھڑی ہو گئی اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”چلیں؟“ جمیزی نے خود ہی استفسار کیا۔

”ہوں! چلو۔“ وہ سرخ ڈبیا مٹھی میں دباتی ہوئی اٹھ کر باہر نکل آئی اور اپنی الجھن اور بے دھیانی میں باقی کے گفتگو بھی اٹھانا بھول گئی تھی اس لیے وہ سارے گفتگو جمیزی خود اٹھا کر اس کے پیچھے باہر نکل آیا تھا۔

مریم کی بات پر پورے کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

عابدہ خاتون نے یک دم فاروق نیازی کی سمت دیکھا اور وہ بھی بستر پر لیٹے ان ہی کی سمت دیکھ رہے تھے، مریم اپنی بات کر چکی تھی اس لیے اب ان کے بولنے کی منتظر تھی، عابدہ خاتون خود اس وقت حیرت اور بے یقینی کے شکنجے میں تھیں کہ مریم نے اتنا برا فیصلہ کیسے کر لیا؟ وہ یہ قدم کیوں اٹھانا چاہتی ہے؟ آخر بیٹھے بیٹھے کیا ہوا ہے اسے؟ کیا سوچ سائی ہے اس کے ذہن میں؟

”بابائی! میں نے آپ دونوں سے اجازت مانگی ہے، آپ کو خاموش ہونے کا نہیں کہا۔“ مریم نے پھر سے بات چھیڑ دی۔

”لیکن بیٹا! تم یہ جاب کیوں کرنا چاہتی ہو؟“ فاروق نیازی کے اشارے پر عابدہ خاتون نے استفسار کیا۔

اور ان کے استفسار پر مریم نے سر اٹھا کر ان کے چہرے کی سمت دیکھا۔

”آپ! آپ جانتی ہیں کہ میں یہ جاب کیوں کرنا چاہتی ہوں؟ بے شک خود میری کوئی خواہشیں، کوئی بہت زیادہ ضرورتیں نہیں ہیں، لیکن ایمان، ذونہ اور ذویہ کی ضرورتیں ہیں نا؟ کیونکہ وہ ابھی پڑھ رہی ہیں، انہیں اور کچھ نہ سہی، لیکن اسکول اور کالج کے لیے تو پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے، فیسز کے علاوہ بھی ہزاروں خرچے ہوتے ہیں اور یہ خرچے عدیل بھائی کیسے پورے کر رہے ہیں؟ یہ آپ لوگ بھی اچھی طرح جانتے ہیں، گھر کے اخراجات، اور اباجی کی بیماری کا علاج بھی ٹھیک طریقے سے ہو جائے تو ہمارے لیے اللہ کا بڑا احسان ہوگا، لیکن ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنا بھی ٹھیک نہیں ہے، گھر میں اور کوئی ایسا فرد نہیں ہے جو عدیل بھائی کا ہاتھ بٹا سکے، کوئی بھائی نہیں ہے جو برابر چل کے مدد کر سکے، ایسے میں اگر میں کچھ کر سکتی ہوں تو مجھے کرنا چاہیے، آپ مجھے روکیے مت، بلکہ خوشی خوشی اجازت دیجیے، میں وعدہ کرتی ہوں کہ عدیل بھائی کا بھائیوں کی طرح ساتھ دوں گی، آپ پلیز! میرے بارے میں نہیں، عدیل بھائی کے بارے میں سوچیں، وہ کتنے پریشان رہتے ہیں، کتنا بوجھ ہے ان پر، پلیز! جی! آپ گھر کے حالات بخوبی جانتے ہیں، مجھے اجازت دینے سے بہت بہتری آجائے گی۔“ مریم نے ان کا بے جان سا ہاتھ تھام لیا اور انہیں متفق کرنے کی پوری کوشش کی تھی، ان کی بے تاثر آنکھیں اس وقت آنسوؤں کے بوجھ سے جھکی ہوئی تھیں۔

ان کی بیماری نے ان کے بچوں کو پریشانوں اور تفکرات میں ڈال دیا تھا، وقت سے پہلے بڑا بنا دیا تھا، لڑکیاں جس عمر میں اپنی خواہشیں اور خواب پورے کرنے کا سوچتی ہیں، ان کی بیٹیاں گھر کے حالات اور ضرورتیں پوری کرنے کا سوچ رہی تھیں۔ ان کے آنسو بہہ کر ان کی کپٹیوں میں جذب ہو گئے اور انہوں نے سر اثبات میں ہلاتے ہوئے مریم کو اجازت دے دی، کیونکہ مریم نے جو کچھ کہا تھا وہ سب سچ تھا، سب کچھ ان کے سامنے ہی تو تھا۔

”لیکن عدیل نہیں مانے گا۔“ عابدہ خاتون کو عدیل کی طرف سے ڈر تھا۔

”ان کو میں منالوں گی۔“ مریم اپنے آنسو پونچھتی ہوئی سیدھی ہوئی اور اباجی کا ہاتھ دباتے ہوئے ان کے ہاتھ پہ

بوسہ دیا۔

”تھینک یو ابا۔“ وہ ان کا شکریہ ادا کرتی وہاں سے اٹھ گئی، اس نے امی اور اباجی کو تو منالیا تھا، لیکن ابھی عدیل کا مسئلہ باقی تھا اور اگلی صبح ایسا ہی ہوا تھا عدیل کو مریم کے جاب کرنے کا سن کر جیسے کرنٹ چھو گیا تھا۔

”مریم جاب کرے گی؟ لیکن کیوں؟“ عدیل نے ناشتا اور میان میں ہی پچھوڑ دیا۔

”بیٹا! اچھی آفر ہے، اچھی سیکری ہے، اور مریم بھی تو پورا دن گھر میں فارغ اور ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کے بیٹھی رہتی ہے، اس لیے میں نے اور تمہارے اباجی نے سوچا ہے کہ وہ جاب کر لے، کم از کم تمہاری ہی کچھ پیسہ ہو جائے گی۔“ عابدہ خاتون نے عدیل کو بہت طریقے سے سمجھانے کی کوشش کی تھی، لیکن عدیل کا مزاج ہر ہم ہو چکا تھا۔

”اب میں اپنی پیسہ بہنوں سے کرواؤں گا۔“

”دیکھو بیٹا! بہن کوئی طعنہ نہیں ہے، جس پر مرد کو غصہ آجائے، بہن پر اعتماد کرو، اس پر بھروسہ رکھو تو بھائیوں سے کم ثابت نہیں ہوتی، کئی ایسی مثالیں ہیں جن میں بہنوں نے بھائیوں کے ساتھ دیے ہیں، تمہیں کیوں اعتراض ہے۔“ مریم کے کہنے پر عابدہ خاتون پورا پورا اس کا ساتھ دے رہی تھیں۔

”امی! آپ کس زمانے کی اور کن مثالوں کی بات کر رہی ہیں؟ آپ آج کل کے معاشرے کو اور آج کل کے حال چلن کو نہیں جانتیں، یہاں مرد عورت کو نکلنے کے لیے تیار کھڑا ہے، کوئی بہت ہی قسمت والی یا عزت والی عورت ہوگی جو مرد کے شکنجے سے بچ نکلتی ہوگی، ورنہ عورت کو بچتے ہوئے کم ہی دیکھا ہے۔“ عدیل سخت انکاری لہجہ لہا۔

”کیا آپ کو اپنی بہن پر اعتماد نہیں ہے؟“ مریم بچن کی دہلیز پر آکھڑی ہوئی اور اس کے سوال پر عدیل چونک گیا۔

”بتائیے نا بھائی! کیا آپ کو اپنی بہن پر اعتماد نہیں ہے؟“ وہ کافی دو ٹوک اور سنجیدگی سے پوچھ رہی تھی۔

”مریم! میں یہ بات نہیں کر رہا، میرا یہ مطلب نہیں ہے۔“

”بھائی! میں آپ سے آپ کی بات کا مطلب نہیں پوچھ رہی، میں یہ پوچھ رہی ہوں کہ آپ کو مجھ پر اعتماد ہے یا نہیں؟“ وہ ضدی بچے کی طرح ایک ہی سوال پر اڑ چکی تھی۔

”مریم! یہ کیسی بات کر رہی ہو تم؟“ عدیل اپنی جگہ سے کھڑا ہوا۔

”آپ! بس میرے سوال کا جواب دیں، آپ کو مجھ پر اعتماد ہے یا نہیں؟ اگر اعتماد ہے تو مجھے جاب کرنے دیں، اور اگر اعتماد نہیں ہے تو مجھے منع کر دیں، میں کبھی جاب کرنے کا ذکر بھی نہیں کروں گی، بلکہ کبھی گھر سے باہر قدم بھی نہیں نکالوں گی۔“ مریم نے عدیل کے سامنے بہت کڑا سوال رکھ دیا تھا، وہ نہ ہاں میں جواب دے سکتا تھا اور نہ ہی نا میں، وہ تذبذب کا شکار ہو چکا تھا۔

”سوچ کیا رہے ہیں؟ جواب دیں مجھے؟“ مریم نے کبھی اس طرح ضد میں آکر بات نہیں کی تھی، لیکن آج اس کے تور بھی بدلے ہوئے تھے۔

”دیکھو مریم! مجھے تم پر اعتماد ہے، خود سے بھی زیادہ اعتماد ہے، لیکن یہ معاشرہ اعتماد کے قابل نہیں ہے، میں تم پر تو اعتماد کر سکتا ہوں، لیکن اس معاشرے پر نہیں کر سکتا۔“ اس نے مریم کو کندھوں سے تھام لیا۔

”آپ کو مجھ پر اعتماد ہے نا؟ تو پھر آپ بے فکر ہو جائیں، آپ کی عزت کو میں نے سنبھال کے رکھنا ہے، اس معاشرے نے نہیں۔“ مریم نے اسے پورا یقین دلایا تھا اور یہ اس کا یقین اور لہجے کی مضبوطی تھی کہ عدیل اسے مزید منع نہیں کر سکا اور مریم کی آنکھوں میں آنسو آگئے، وہ بے ساختہ اس کے کندھے سے لگ گئی اور عدیل اس کا سر پکڑتے ہوئے اسے بھائیوں سا بھرپور مان بخشا تھا، عابدہ خاتون کی آنکھیں بھی نم ہو چکی تھیں۔

”اب بس کرو، ناشتا ٹھنڈا ہو رہا ہے، کام پر بھی جانا ہے تم نے۔“ انہوں نے دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھتے

ہوئے انہیں آواز دی اور عدیل پلٹ کر دوبارہ ناشتا کرنے کے لیے آ بیٹھا، پھر جیسے ہی عدیل گھر سے رخصت ہوا، مریم بھی فاطمہ کی بتائی ہوئی آکڑی جانے کے لیے تیار ہونے لگی وہ آج پہلی بار جا رہی تھی اس لیے کافی اچھی طرح تیار ہوئی تھی، حالانکہ اس کی تیاری میں بھی سادگی کی جھلک تھی، لیکن پھر بھی بہت اچھی لگ رہی تھی وہ امی اور اباجی سے مل کر گھر سے نکل آئی یہ اس کا گھر سے نکلنے والا پہلا قدم تھا، لیکن اس کے ارادے بہت مضبوط تھے، حوصلہ بلند اور نیت نیک تھی اس لیے کامل یقین تھا کہ اللہ اس کا ساتھ بھی دے گا اور اس کی عزت کی حفاظت بھی کرے گا کیونکہ سب کی عزتوں کا محافظ اور رکھوالا تو وہی تھا۔ اور دالا۔!



علیٰ زے مری سے عجیب سے احساسات لے کر جا رہی تھی۔

آؤر کے ذہن پہ بھی دانیال کا کیا گیا انکشاف جادی تھا۔

عائشہ آفندی کے دل پہ زہرہ سے نہ ملنے کا رنج طاری تھا۔

اور کول آؤر کی توجہ نہ ملنے پہ اندر ہی اندر گیلی لکڑی کی طرح سلگ رہی تھی اس کا بس چلتا تو علیٰ زے کو منظر سے ہٹا دیتی۔ وہ علیٰ زے جو ہر طرح سے بے ضرر تھی جو کسی کے لیے برا نہیں سوچتی تھی جو کسی کے ساتھ کچھ برا ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔

جس کے لیے آؤر سمیت سب کمزور برابر تھے، جو نہ حسد کرتی تھی نہ دل میں میل رکھتی تھی بس اپنی ذات کے دائرے میں رہتی تھی، وقار آفندی یا باقی حویلی والے اسے اتنا اذیت دیتے تھے تو اس میں اس کا کیا قصور تھا بھلا؟ وہ خود تو نہیں کہتی تھی کہ سب اسے پروا نہ ہو، لیکن پھر بھی کول اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتی تھی وہ علیٰ زے کو اپنا رقیب سمجھتی تھی، اسی لیے اب وہ اپنی اس جلن اور رقابت کو اپنے لفظوں تک لے آئی تھی اپنے لہجے اور انداز سے اظہار کرنے لگی تھی اور اس کے اسی اظہار کا بوجھ علیٰ زے اپنے دل پہ لیے بغیر کچھ سمجھتی سی واپسی کے سفر کے لیے روانہ ہوئی تھی۔

بلکہ اس سفر میں کئی لوگ کچھ کچھ سے اور مایوس سے تھے، لیکن جودت، ہنوز ہشاش بشاش اور خوش تھا اور اس کا نشانہ آج بھی منصور حسین تھا۔

”کیا بات ہے منصور حسین! تم بھی چپ چپ سے ہو؟“ اس نے گردن موڑتے ہوئے منصور حسین کی سمت دیکھا۔

”میرا کام ہی ایسا ہے کہ مجھے چپ رہنا پڑتا ہے۔“ منصور حسین نے گہری سانس کھینچی تھی۔

”کیوں یار! باتوں کے دوران ڈرامیوٹک نہیں ہو سکتی؟“

”ہو سکتی ہے، لیکن یہ کام مالکوں کا ہے، وہ باتیں بھی کرتے ہیں اور ڈرامیوٹک بھی، لیکن ہم ملازم لوگوں کا کام ہوتا ہے چپ رہنا اور چپ رہ کر کام کرنا۔ ہمارے بولنے پہ اعتراض ہوتا ہے۔“ منصور حسین کے جواب ہمیشہ کھرے ہی ہوتے تھے۔

”یار منصور حسین! تم ہمیشہ اتنی جلی کٹی سی باتیں کیوں کرتے ہو؟ یوں لگتا ہے جیسے تم سے یا محبت چھن گئی ہے یا عزت؟“ جودت کی بات پہ پوری گاڑی کھوم کے رہ گئی تھی گاڑی کے ٹائر چرچا اٹھے تھے منصور حسین کے ہاتھ کسی فولاد کی طرح اسٹیرنگ پہ جم گئے تھے۔

”بے شک میں ملازم ہی سہی جودت صاحب! لیکن اپنی عزت اور محبت پہ بات کرنے کی اجازت میں کسی کو بھی نہیں دے سکتا، چاہے وہ آپ ہوں، چاہے کوئی اور۔“ منصور حسین کا لہجہ بہت سخت اور پتھر پلا ہو رہا تھا۔ جودت

نے حیرت سے منصور حسین کی سمت دیکھا۔ اس کے تپور ٹھنکا دینے کی حد تک بگڑے ہوئے تھے۔

”آپ میری ذات پہ بات کریں، میری ذاتی باتوں اور معاملات پہ بات نہ کریں، کیونکہ میں یہ بات پسند نہیں کرتا۔“ منصور حسین نے جودت کو ایک حد میں رہنے کا اشارہ دیا تھا اور یہ اشارہ بہت واضح تھا، جس پہ منصور حسین کو کوئی شرمندگی بھی نہیں تھی، اس لیے وہ سر جھٹک کر گاڑی دوبارہ سے اشارت کر چکا تھا، جودت نہ جانے کیوں کچھ بھی کہے بغیر چپ ہو گیا تھا۔ شاید اس لیے کہ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا، کیونکہ اس نے واقعی ایک غلط بات کہی تھی اور منصور حسین ایک غیر متند آدمی تھا، جس سے یہ بات برداشت نہیں ہوئی تھی، جب ہی جودت بھی منصور حسین کی خفگی سمجھ گیا۔

”ایم سوری یار۔“ جودت نے آہستگی سے سوری کیا اور منصور حسین کی نظر بے ساختہ بیکس ویو مرر کی سمت اٹھ گئی۔

”علیٰ زے بی بی کہتی ہیں کہ غلطی کر کے معافی مانگنے والے لوگ مجھے قطعاً اچھے نہیں لگتے۔“ منصور حسین نے علیٰ زے کی بات دہرائی۔

”کیا مطلب؟ کیا کہنا چاہتے ہو تم؟“ جودت کو سمجھ نہیں آئی تھی، لیکن علیٰ زے سمجھ چکی تھی کہ وہ اسے اس کا غصہ اور اس کی بات یاد دلانا رہا ہے۔

”میرا مطلب ہے کہ میں بھی علیٰ زے بی بی کی بات سے متفق ہوں، مجھے بھی غلطی کر کے معافی مانگنے والے لوگ اچھے نہیں لگتے اور معافی دینے کو دل بھی نہیں چاہتا۔“ منصور حسین نے اپنے غصے پہ قابو پالیا تھا، اس لیے قدرے نارمل انداز میں بات کر رہا تھا، ورنہ ایک بل میں اس کا پارہ کہاں سے کہاں جا پہنچا تھا، وہ برداشت نہیں کرتا تھا، کسی کی بات سمجھ نہیں پاتا تھا، اسی لیے اکثر لوگ اس سے ٹاللاں ہی رہتے تھے، رجو عارف اور مبارک خان کی طرح۔!

”اچھا؟ علیٰ زے نے یہ بات کہی ہے؟ لیکن علیٰ زے اتنی سخت تو نہیں ہے؟ کیوں علیٰ زے یہ کیا سن رہا ہوں میں؟“ جودت نے گردن موڑ کر علیٰ زے کو دیکھا۔

”جی! ٹھیک سن رہے ہیں آپ۔“ وہ ذرا سنبھل کے بیٹھ گئی۔

”ارے واقعی؟ تم اتنی سخت تو نہیں ہو؟“ جودت حیرت کا اظہار کر رہا تھا۔

”میں اتنی نرم بھی نہیں ہوں، جودت بھائی! آپ میری نرمی پہ مت جائیں، بات اصول کی آجائے گی تو اصول کی کروں گی، میں یہ سوچتی ہوں جن لوگوں نے بعد میں معافی مانگنی ہوتی ہے وہ پہلے غلطی ہی کیوں کرتے ہیں؟“ علیٰ زے نے سنجیدگی سے کہا۔

”غلطی کرنے سے پہلے سوچنا کون ہے یار؟“

”لیکن سوچنا چاہیے نا، میں کہتی ہوں کہ غلطی کرنے سے پہلے سوچو، اور اچھا کام کرنے سے پہلے ایک بار بھی مت سوچو، بس میرا تو یہی پوائنٹ آف ویو ہے۔“ اس نے کندھے اچکائے اور جودت حیران ہوا تھا کہ علیٰ زے بھی ایسی باتیں کر سکتی ہے۔

”خیر ابی الحال اس بات کو چھوڑو اور اپنے ڈرائیور سے کہو کہ میرا سوری قبول کر لے۔“ جودت نے سفارش کے لیے کہا۔

”نوا میں یہ نہیں کہہ سکتی، یہ اس کی اپنی مرضی پہ ڈپینڈ کرتا ہے۔“ علیٰ زے نے نفی میں سر ہلایا اور منصور حسین کو علیٰ زے کی یہ بات اور انداز بہت اچھے لگے تھے اس نے دل ہی دل میں علیٰ زے کو سراہا تھا۔

”کیوں منصور حسین! پھر کیا ارادہ ہے تمہارا؟“ جودت علیٰ زے کی طرف سے رخ موڑ کر سیدھا ہوا تھا۔

”اگر اس روز میری غلطی پہ علیزے بی بی نے مجھے معاف کر دیا ہوتا تو شاید اس وقت میں بھی آپ کو معاف کر دیتا۔“ منصور حسین نے موڑ کاٹتے ہوئے کہا۔

”تو تم علیزے کا بدلہ مجھ سے لو گے؟“ جو دت کو اچنبھا ہوا۔

”نہیں صاحب! بدلہ نہیں لے رہا، بلکہ ان کے اصول پہ چل رہا ہوں، آخر ڈرائیور ہوں ان کا۔“ منصور حسین نے کافی اطمینان سے جواب دیا۔

”سوچ لو منصور حسین! غلطی کر رہے ہو، معافی نہ دے کر۔“ جو دت نے اسے دھمکایا۔

”دیکھیے صاحب! اگر آپ صاحب ہونے کے ناتے کہہ رہے ہیں تو پھر آپ کو معافی مانگنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، آپ مالک ہیں اور میں ملازم اور اگر آپ انسانیت کے ناتے کہہ رہے ہیں تو پھر معافی میری مرضی سے ہی ملے گی۔“ منصور حسین بھلا کب کسی سے دبنے والا تھا، جو دت اسے دیکھ کر رہ گیا۔

”میں معافی تمہاری مرضی سے چاہتا ہوں۔“ وہ بھی آخر جو دت تھا زچ کر دینے والا۔

”ٹھیک ہے سوچوں گا۔“ منصور حسین نے سکون سے کہتے ہوئے گاڑی کی اسپید بڑھا دی، وہ لوگ مری اور اسلام آباد کی حدود سے نکل آئے تھے اب ان کا رخ لاہور کی سمت تھا۔



پورے گھر میں خاموشی اور سناٹا چھایا ہوا تھا اور وہ دونوں اس — خاموشی کے دوران گھر کی چیزیں سمیٹتی پھر رہی تھیں، نگارش نے پیکنگ کا کام ابھی سے شروع کر دیا تھا کیونکہ عبداللہ نے لکھنؤ کنفرم کر دیا تھا۔ اور آج زری بھی اپنے انگیزامز سے فارغ ہو گئی تھی اس لیے اب ان کی واپسی کنفرم ہو چکی تھی۔

”کیا بات ہے اتنی خاموش کیوں ہو؟“ نگارش ریک میں بھی کتابیں ایک کارٹن میں بند کر کے رکھتے ہوئے زری کی سمت متوجہ ہوئی۔

”ڈر لگ رہا ہے۔“ زری رائٹنگ ٹیبل سے ساری چیزیں سمیٹتے ہوئے بہت بے دل اور ست لگ رہی تھی۔

”کس چیز سے؟“ نگارش ٹیبل اور کرسیوں پہ وائٹ کورچر بٹھا رہی تھی۔

”پاکستان سے۔“ زری کی آواز دھیمی تھی۔

”کیوں؟“

”مجھے لگتا ہے پاکستان مجھے نکل جائے گا، میں پاکستان کی سرزمین پہ نہیں بلکہ کسی دلدل میں قدم رکھنے والی ہوں، جس میں میں دھنس جاؤں گی، بے بس ہو جاؤں گی اور یہی بے بسی سوچ کر میرا دل ڈوب رہا ہے، نہ جانے کیا ہونے والا ہے۔“ زری کی حالت خاصی عجیب سی ہو رہی تھی اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

”کیا تمہیں عبداللہ پر بھروسہ نہیں ہے؟“ نگارش نے خفگی سے پوچھا۔

”بھروسہ ہے بھابھی، ان پہ تو پورا بھروسہ ہے، لیکن جو وہاں میری ٹاک لگائے بیٹھے ہیں، ان پہ بھروسہ نہیں ہے۔“ زری روہانسی ہو گئی۔

”وہاں دل آور بھی تو ہے؟ کیا اس پہ بھی بھروسہ نہیں ہے؟“ نگارش نے جان بوجھ کر دل آور کا ذکر کیا تھا۔

”وہاں ملک حق نواز بھی تو ہے بھابھی؟ کیا دل آور شاہ ملک حق نواز سے چھین لے گا مجھے؟ کیا مجھے اس سے بچالے گا؟ کیا میرے بھروسے پہ پورا اترے گا وہ؟ ہزاروں لوگوں کے لیے لڑتا ہے، کیا ملک حق نواز سے لڑے گا میرے لیے؟ اگر وہ میرے لیے لڑنے کو تیار ہے تو میں آج ہی پاکستان جانے کے لیے تیار ہوں۔ مگر بھابھی مجھے پورا یقین ہے وہ ایسا کچھ نہیں کرے گا، وہ سب کے لیے لڑ سکتا ہے، مگر میرے لیے نہیں۔“ زری کے آنسو اس

کے رخساروں پہ بہہ رہے تھے اور نگارش چپ کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔
 ”دل اور اتنا بڑا بڑول نہیں ہے جتنا تم سمجھ رہی ہو یہ کبھی ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ تمہیں یا عبد اللہ کو کسی محاذ پہ اکیلا چھوڑ دے مجھے پوری امید ہے کہ وہ ہم لوگوں کا ساتھ دے گا ملک حق نواز اس کے سامنے کچھ بھی نہیں ہے بس چند دن کی بات ہے تم خود دیکھ لینا کیونکہ دل اور تمہارا ساتھ دے یا نہ دے لیکن عبد اللہ کا ساتھ ضرور دے گا عبد اللہ کی بات ہوئی تھی دل اور سے وہ کہہ رہا تھا کہ وہ ہمیں ریسیو کرنے کے لیے خود آئے گا عبد اللہ کو کسی بھی کام کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ نگارش نے زری کو حوصلہ اور یقین دلایا تھا اور زری کا دل جیسے ٹھہر سا گیا۔ نگارش بھابھی کی تسلی پہ ذرا سی دھارس ہوئی تھی اسے۔
 ”بھابھی! یہ آپ۔“

”بس بس! یہ ساری باتیں یہیں رہنے دو اور کام کرو میرے ساتھ میری ہیلپ کروانے کی بجائے الٹا مجھے ٹینشن دے دے کر مار رہی ہو۔“ نگارش نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا اور زری اپنے آپ کو سنبھالتی بمشکل کام کی طرف متوجہ ہوئی تھی ورنہ خدشے اور وسوسے اب بھی اس کے دل و دماغ میں ہلکورے لے رہے تھے مگر وہ کنٹرول کر گئی۔

”کیا میں اپنی ذاتی گاڑی لے سکتا ہوں؟“ جیڑی کو بیٹھے بیٹھے گاڑی کا خیال آیا تھا آخر وہ کب تک مدحیہ کی گاڑی پہ ڈپنڈ کر سکتا تھا؟

”پتا نہیں۔“ مدحیہ نے لاپرواہی سے کندھے اچکائے۔

”ارے! کیوں پتا نہیں ہے؟ تمہارے بھائی صاحب شوروم بنا رہے ہیں اور تمہیں پتا ہی نہیں ہے؟“ جیڑی نے حیرت سے کہا۔

”میرے بھائی صاحب شوروم بنا رہے ہیں تو اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ میں گاڑیوں کی انفارمیشن ساتھ لیے پھر رہی ہوں شوروم ان کا ہے کام ان کا ہے مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ میں گاڑیوں کی معلومات رکھتی پھوں؟“ مدحیہ نے کافی خفگی سے جواب دیا۔

”تو پھر میں کس سے معلومات لوں؟“
 ”معلومات کی کیا ضرورت ہے؟ تمہیں چاہیے کہ تم گاڑی رینٹ پہ لے لو۔“ مدحیہ نے اسے ایک مفید مشورے سے نوازا۔

”گاڑی رینٹ کیا ہے؟“

”ہاں! ظاہر ہے تم نے زیادہ عرصہ تو یہاں نہیں رہنا ایسے میں اگر تم نیوز رو میٹر گاڑی لیتے ہو تو اس میں سراسر تمہارا نقصان ہے پندرہ بیس لاکھ کی گاڑی اگر تم جانے سے پہلے سیل بھی گرو گے تو وہ سیکنڈ ہینڈ کہلائے گی اور سیکنڈ ہینڈ گاڑی کوئی بھی پندرہ بیس لاکھ میں تم سے نہیں خریدے گا تمہیں پانچ چھ لاکھ کا نقصان ضرور ہوگا اس لیے اتنے بڑے نقصان سے بہتر ہے کہ تم کوئی اچھی سی گاڑی رینٹ پہ لے لو ڈرائیو تم خود کر لو گے۔“ مدحیہ کا انداز اب بھی لاپرواہ تھا جبکہ جیڑی نہ جانے کیوں ہنس رہا تھا۔

”کیا بات ہے؟ کیوں ہنس رہے ہو؟ ایسا کیا کہہ دیا ہے میں نے؟“ مدحیہ نے دائیں طرف ٹرن لیتے ہوئے کہا۔
 ”اس لیے ہنس رہا ہوں کہ تمہیں تو گاڑیوں کی معلومات ہی نہیں ہے پھر بھی اتنا کچھ بتا دیا؟“ جیڑی نے اسے چھیڑنے کے سے انداز میں کہا تھا اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی مدحیہ کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

”نیک گاڈ! تمہارے چہرے پہ مسکراہٹ آئی۔“ جیڑی نے شکر ادا کیا۔
 ”اے اے! اے! اب یہ تو بتاؤ کہ جانا کہاں ہے؟“ مدحیہ نے گاڑی کی اسپید کم رکھتے ہوئے پوچھا۔
 ”گاڑی کاپتا کرتے ہیں کہاں سے ملے گی؟“ جیڑی آج کے دن میں گاڑی کا مسئلہ حل کرنا چاہتا تھا۔
 ”اڈھونڈتے ہیں جہاں سے بھی مل گئی۔“ مدحیہ نے کندھے اچکائے تھے اور پھریوں ہی اپنی موج و مستی میں اپنے ملنے والی گاڑیاں دیکھنے چل دیے تھے۔

”کی کوئی مل گیا تھا
 کی کوئی مل گیا تھا
 سر راہ چلتے چلتے
 سر راہ چلتے چلتے

”ہاں! ناخاسی سر ملی آواز میں یوں لہک لہک کر نکلتا رہا تھا جیسے لہم میں گانا بھی اسی پہ پکچرا کر گیا کیا ہو۔“
 ”اے! اے! اے! کیا کمال کا گاتے ہو یار! لیکن کیا بات ہے یار آج تمہارے گانے کا اثر نہیں ہو رہا؟“ سلو نے اس کا نام کرتے ہوئے درمیان میں لقمہ دینا ضروری سمجھا۔ وہ درحقیقت عدیل کو پھینک رہے تھے جبکہ عدیل چپ لانا دوشی سے اپنے کام میں مصروف تھا آج ورکشاپ میں کام زیادہ تھا اس لیے عدیل خود ساتھ مل کر کام کر رہا تھا۔ دو تین گاڑیوں کا کام بیک وقت ہو رہا تھا۔ گاڑیوں کے انجن کھلے پڑے تھے اور ڈیرل سے ان کے پائزے ابتر ہو رہے تھے۔

”اثر ہو رہا ہے یار بالکل ہو رہا ہے بس ظاہر آہستہ آہستہ ہوگا۔“ چھوٹے نے مطمئن سے انداز میں کہا۔
 ”ارے یار! اثر کیا ہوتا ہے بھلا؟ تم گانے ہی او اس گارے ہو۔“ جیڑی نے منہ بنا کے کہا۔

”ہیں؟ یہ وجہ ہے؟“ چھوٹے نے بھنوس اچکائیں۔
 ”تو اور کیا؟ کوئی دل کو چھونے والا گاؤ گے تو اثر ہو گا نا؟“
 ”ہاں یار! یہ تو تم ٹھیک کر رہے ہو میں بھی نرا گواڑا ہی ہوں۔“ چھوٹے نے اپنے سر پہ ہاتھ مارتے ہوئے خود کو سرزنش کی۔

”چلو کوئی بات نہیں اب اپنا ٹریک بدل لیتا ہوں۔“ اس نے کسی نئے گانے کے لیے اپنے آپ کو تیار کیا۔
 ”شباباش۔“ جیڑی اور سلو نے ہمت بندھائی۔

موسم ہے عاشقانہ — موسم ہے عاشقانہ
 اے دل کہیں سے ان کو ایسے میں ڈھونڈ لانا
 چھوٹے نے ایک نیا سر لگایا اور بے ساختہ عدیل کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ اٹھ آئی وہ اس کی اس مسکراہٹ کے لیے ہی تو اتنے جتن کر رہے تھے۔
 ”ہر سہ۔“ انہوں نے عدیل کو مسکراتے دیکھ کر نعرہ لگایا۔
 ”بہت کینے لوگ ہو تم۔“ عدیل نے رنج سے گاڑی کے ٹائر کا پچ کتے ہوئے سر جھٹکا۔ البتہ چہرے کی مسکراہٹ ہنوز تھی۔

”ہم لفٹے بھی ہیں استاد۔“ سلو معنی خیزی سے کہہ کر ہنسا تھا۔
 ”جاننا ہوں بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔“ وہ کام کرنے کے ساتھ ساتھ ساتھ باتیں بھی کر رہے تھے

”استاد! اب آپ جیسا شریف بھی تو نہیں ہوا جاسکتا کہ بندہ کسی کو یاد بھی کرے اور تائے بھی نہ؟“ چھوٹے نے اسے چھیڑا۔

”ارے! میں کس کو یاد کرنے لگا بھلا؟“ عدیل نے تعجب سے کہا۔

”یہ تو آپ کو ہی پتا ہوگا استاد! اگر نہیں پتا تو اپنے دل سے پوچھ لو۔“ چھوٹا معنی خیزی سے بات کر رہا تھا، عدیل ہنس دیا۔

”میں نے پہلے بھی تمہیں کہا تھا کہ خوش فہمیاں پالنا اچھی بات نہیں ہے، اس سے بہتر ہے کہ بندہ اپنا کام کر لے۔“ عدیل نے چھوٹے کو گاڑی کے نیچے گھسنے کا اشارہ کیا، کیونکہ اس گاڑی کا کچھ کام نیچے لیٹ کر کرنے والا تھا، گاڑی کو انہوں نے پہلے ہی جیک پہ لگا رکھا تھا۔

”سوری استاد! میرا موڈ آج بہت اچھا ہے، آج نیچے جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے، یہ کام سلویا جیدی سے کہو۔“ چھوٹے نے پہلی بار کسی کام سے انکار کیا تھا اور عدیل بھی نہ جانے کس موڈ میں تھا کہ کسی سے بھی کہنے کی بجائے خو نیچے لیٹ کر گاڑی کے نیچے گھس گیا۔

”ارے! رے استاد! یہ کیا کر رہے ہو؟ آپ نکلوا ہر میں خود کر لیتا ہوں۔“ چھوٹے نے عدیل کو کام کرتے دیکھ کر منع کیا۔ مگر عدیل اب ادھورا کام کیسے چھوڑ سکتا تھا۔

”کوئی بات نہیں، کام تو کرنا ہی ہے، چاہے جس طرح بھی کرنا پڑے۔“ عدیل کی آواز گاڑی کے نیچے سے آ رہی تھی۔

”ہیلو! کیا ہمیں کوئی گاڑی ریوینٹ مل سکتی ہے؟“ سنبیدہ سی نسوانی آواز پہ وہ چاروں ہی چونک گئے تھے، پھوٹے نے ایک دم گردن موڑ کر دیکھا تھا اور مدیحہ کو دیکھ کر بری طرح ٹھٹھا تھا۔

”آپ...؟“ وہ اسے پہچان چکا تھا، لیکن مدیحہ اسے نہیں پہچانی تھی۔

”میں آپ سے کچھ پوچھ رہی ہوں مسٹر؟“ مدیحہ نے حیران حیران سی نظروں سے دیکھتے چھوٹے کو دوبارہ متوجہ کیا اور اب کی بار اس آواز پر عدیل بھی چونک گیا، اس نے گاڑی کے نیچے سے ہی جھانک کر دیکھنے کی کوشش کی تھی، ذرا سے فاصلے پہ اسے دودھیا پاؤں بلیک کلر کے باریک ڈوریوں والے سینڈلزمین مقید نظر آئے تھے اور ان کے ساتھ جو گرز والے پاؤں بھی نظر آ رہے تھے، یعنی اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا؟ عدیل سب کچھ وہیں چھوڑ چھاڑ کے گاڑی کے نیچے سے نکل آیا۔

”السلام علیکم میڈم!“ عدیل اپنے کپڑوں سے دھول مٹی جھاڑتا ہوا سامنے آکھڑا ہوا، اب کی بار مدیحہ نے چونک کر دیکھا تھا اور عدیل کو اس ماحول اور اس جلے میں دیکھ کر اس کی آنکھیں بے یقینی سے پھیل گئی تھیں۔

”تم یہاں؟“ وہ اپنے تاثرات پہ کنٹرول نہیں کر پائی تھی اور بے ساختہ بول اٹھی، اس کے سوال پہ عدیل کے لبوں کو اک خفیف سی مسکراہٹ چھو گئی تھی۔

”جی ہاں! میں یہاں میرے جیسے بے کار لوگوں کا یہی ٹھکانا ہے۔“ عدیل نے لا پرواہی سے کہا، لیکن مدیحہ تو جیسے کسی شک میں آگئی تھی، وہ ہکا بکا سی عدیل کا حلیہ دیکھ رہی تھی۔

”لیکن تم ایہ کام کیسے؟“ مدیحہ یوں بات کر رہی تھی جیسے پہلو میں کھڑا جیزی نہیں سامنے کھڑا عدیل اس کا دوست ہو، اور اسے اس کے کام پہ افسوس ہو رہا ہو۔

”کیوں میڈم؟ اس کام میں کیا برائی ہے بھلا؟“ عدیل نے استہزائیہ سے انداز میں کہتے ہوئے کندھے اچکائے تھے۔

”برائی نہیں ہے، لیکن...“ مدیحہ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔

”سلو! میڈم اور صاحب کے لیے کرسیاں لے کر آؤ۔“ عدیل نے سلو کو اشارہ کیا تھا۔

”جی! استاد! ابھی لایا۔“ سلو نے جواباً بڑی پھرتی کا مظاہرہ کیا۔

”بیٹھے۔“ عدیل نے مدیحہ اور جیزی کو بیٹھنے کی آفر کی، حالانکہ عدیل کو خود مدیحہ کے ساتھ جیزی کو دیکھ کر نہ جانے کیوں بہت عجیب سا فیل ہوا تھا، لیکن وہ اس چیز کا اظہار نہیں کر سکتا تھا، کیونکہ اس کے پاس نہ ایسا کوئی حق تھا، نہ تعلق۔

”تو تھینکس! بیٹھے کا وقت نہیں ہے۔“ مدیحہ نے انکار کر دیا۔

”تو آپ آئی کیوں ہیں؟“ عدیل ڈائریکٹ اس کے چہرے کی سمت دیکھ رہا تھا۔

”پتا نہیں کیوں آئی تھی۔“ مدیحہ نے نفی میں سر ہلایا۔

”کس چیز کی ٹینشن لے رہی ہیں آپ؟“ عدیل نے بغور اس کے تاثرات نوٹ کیے تھے۔

”کہانا کچھ نہیں، چلو جیزی واپس چلو۔“ مدیحہ کہتے ہوئے یک دم پلٹ گئی۔ جیزی بھی اس کے ساتھ واپس پلٹ گیا تھا۔

”میڈم! آپ کو ریوینٹ پہ گاڑی مل سکتی ہے، آپ ٹھہریں تو سہی۔“ عدیل نے پیچھے سے آواز دی، لیکن مدیحہ بغیر کچھ سنے اور بغیر کچھ کہے وہاں سے نکل گئی، وہ سب دیکھتے رہ گئے۔

مدیحہ کوشش کے باوجود اپنی کیفیات پہ کنٹرول نہیں کر پائی تھی، اس لیے اسے وہاں ٹھہرنا مناسب نہیں لگا تھا اور وہ وہاں سے آگئی تھی، لیکن اس کا ذہن الجھا ہوا تھا، اسی الجھن نے اسے وہاں ٹھہرنے نہیں دیا، جیزی کو بھی مدیحہ کے ری ایکٹ پہ حیرت ہوئی تھی اور حیرت تو عدیل وغیرہ کو بھی ہو رہی تھی کہ وہ آئی بھی اور چلی بھی گئی۔

متراس دی چھتری توں اڈھ گئی
امبراں نے لاندی اے اڈاریاں

پھل کوئی ولایت والا لے گیا
پڑا میں رہ گیا کیاریاں

چھوٹے نے ایک اور موقع کی مناسبت سے گانا ڈھونڈ لیا تھا، اب کی بار عدیل نے اسے گھور کے دیکھا تھا اور چھوٹا اپنی مسکراہٹ دہاتے ہوئے رخ موڑ گیا۔

”ویسے استاد! اللہ جھوٹ نہ بلوائے آج صاف لگ رہا تھا کہ میڈم کے دل میں اتر گئے ہو، اس ڈیزل اور دھول مٹی سمیت، آج تو میڈم کے منہ سے کوئی شرارہ بھی نہیں پھوٹا۔“ چھوٹے نے دوبارہ عدیل کی سمت رخ موڑتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

”لیکن یار! میڈم کے پہلو میں وہ مسٹر کون تھا؟“ سلو کا وہ بیان جیزی کی طرف تھا۔

”اپنے استاد کا رقیب اور کون؟“ چھوٹے نے جھٹ سے بیان دیا۔

”بکومت جو منہ میں آتا ہے بول جاتے ہو۔“ عدیل نے اسے جھٹک دیا۔

”بول نہیں جاتا استاد! کھٹک تو تم بھی گئے ہو۔“ چھوٹا بھی اپنے نام کا ایک ہی تھا، عدیل زچ ہو گیا۔

”ہاں! ہاں! کھٹک گیا ہوں، پھر؟“ اس نے چڑکے پوچھا۔

”پھر لڑیاں پاواں۔“ چھوٹے نے قہقہہ لگاتے ہوئے بھنگڑا ڈالا اور اس کے ساتھ جیدی اور سلم بھی شامل آگئے تھے اور عدیل بھی اتنے غصے کے باوجود اپنا قہقہہ نہیں روک پایا۔

عصر اور مغرب کا درمیانی وقت تھا جب ان لوگوں کی گاڑیاں فراٹے بھرتی ہوئی حویلی میں داخل ہوئی تھیں اور ان کو دیکھتے ہی حویلی میں جیسے یکدم ہلچل سی مچ گئی سب سے پہلے عون اور عدید بھاگتے ہوئے باہر آئے تھے اور علیزے کو گاڑی سے اترتے دیکھ کر بے ساختہ اس سے لیٹ گئے۔
”آئی مس یو علیزے آپ! آئی مس یو سوچ۔“ وہ دونوں بڑی مخصوصیت سے باری باری اپنی بے تابی کا اظہار کر رہے تھے۔

”آئی مس یو جانو۔“ علیزے نے ان کی پیشانی پر پیار کیا اتنے میں وقار آندی، آسیہ آندی، ثروت بیگم، ثمرہ بیگم اور اسرار آندی بھی باہر نکل آئے اور سب ہی بچوں سے بہت محبت اور بہت خوشی سے ملے، لیکن جب وہ سب لوگ اندر آئے تو ان کی حیرت اور خوشی سے آنکھیں چمک اٹھیں تھیں۔

”ارے علیزے کے برتھ ڈے کی تیاری ہو رہی ہے نا۔“ دانیال نے گھر میں ہونے والی تیاری دیکھ کر فوراً ہی جان لیا تھا سامنے ٹیبل پر انویٹیشن کارڈز بھی بکھرے ہوئے تھے جو لوگوں میں تقسیم کرنے تھے۔
”ہوں بالکل۔“ چودہ نومبر کا دن تم لوگ بھول سکتے ہو مگر میں نہیں چودہ نومبر کا دن میری زندگی کا خوبصورت ترین دن تھا۔“ وقار آندی علیزے کو اپنے بازو کے حصار میں لیے کھڑے تھے۔

”چودہ نومبر کا دن تو ہم بھی نہیں بھول سکتے اللہ نے ہمیں اتنی پیاری اتنی کیوٹ سی کزن سے نوازا تھا۔“ دانیال نے شرارت سے کہتے ہوئے علیزے کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی دانیال انوشہ اور زین بھی حقیقتاً ”علیزے سے بہت زیادہ پیار کرتے تھے“ آخر ان لوگوں کا تو علیزے سے وہ ہر رشتہ تھا۔

”کزن کزن علیزے، علیزے، ہونہ! بھاڑ میں گئی علیزے، مکان پک گئے ہیں اس کا نام سن سن کر۔“ کوئلہ بمشکل خود پر قابو نہ کر سکی ہوئی منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی ہوئی وہاں سے پلٹ کر سیڑھیاں چڑھ گئی۔ حرمت اور آذر دونوں بہن بھائی نے بیک وقت کوئلہ کی سمت دیکھا تھا وہ بہت تیزی سے سیڑھیاں طے کر گئی تھی۔ آذر گہری سانس کھینچ کے رہ گیا البتہ باقی سب بڑے زور و شور سے اپنے ٹرپ کی روداد سنانے میں مصروف تھے۔

بڑی حویلی میں پھر سے رونقیں جاگ اٹھیں لیکن ان رونقوں اور ہنگاموں کے باوجود وقار آندی کا سارا دھیان عائشہ آندی کی طرف تھا۔ عائشہ آندی ہنسنے اور مسکرانے کے باوجود کافی اداس اور الجھی جھجھی سی لگ رہی تھیں اور یہ بات آسیہ آندی نے بھی نوٹ کر لی تھی اسی لیے وہ عائشہ آندی کے پاس آ بیٹھی تھیں۔

”کیا بات ہے عائشہ؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔؟ اتنی تھکی تھکی سی کیوں لگ رہی ہو۔؟“ آسیہ آندی کو پریشانی ہو رہی تھی۔

”میں تو سالوں سے تھکی ہوئی ہوں بھابھی! بس کسی کو محسوس نہیں ہوتا۔“ عائشہ آندی کا لہجہ اور آواز کافی کمزور سے تھے۔

”کیوں کیا ہوا ہے؟“

”کچھ پتا نہیں کیا ہوا ہے۔؟“ عائشہ آندی بے بس اور ناامید سی ہو رہی تھیں۔

”عائشہ! کیوں اتنی مایوس اور ناامید ہو رہی ہو۔؟ ہوا کیا ہے؟ کچھ بتاؤ تو۔؟“ وہ ان سے بصد اصرار پوچھ رہی تھیں۔

”میری مری میں زہرہ آئی کو دیکھا تھا اس لیے اداس ہیں۔“ زین نے لاپرواہی سے کہتے ہوئے آسیہ آندی کی مشکل آسان کی تھی لیکن آسیہ آندی بھی زہرہ کا نام سن کر تھک گئی تھیں۔

”کیا؟ زہرہ کو دیکھا تھا؟ لیکن کب؟ کہاں؟“ آسیہ آندی نے ایک ہی سانس میں کئی سوال پوچھ ڈالے تھے۔
”میری میں دیکھا تھا“ آٹھ دس دن ہو گئے ہیں دل پہ یہی بوجھ لیے پھر رہی ہوں۔“ عائشہ آندی کے لہجے سے

”مبارک رہی تھی کیوں لگ رہا تھا جیسے وہ بہت زیادہ تڑپا ہوا ہو چکی ہوں۔“
”مگر تم اس سے ملی تھیں؟“ آسیہ آندی کا اگلا سوال اٹھا۔
”جی تو شاید دل پہ یہ بوجھ نہ رہتا۔“

”ابا مطلب ہے عائشہ؟ سب صاف صاف بتاؤ نا؟“ وہ الجھ گئیں۔ اور پھر عائشہ آندی نے زہرہ کو دیکھنے کی ساری روداد سنا ڈالی جسے سن کر آسیہ آندی چند ثانیے کے لیے خاموش ہو گئی تھیں۔
”اوس کا مطلب ہے کہ زہرہ ہمیں کہیں بھارت نہیں؟“

”ہاں! وہ نہیں ہے۔“ اب عائشہ آندی کے گہجے میں یقین شامل ہو چکا تھا۔
”ہوں! تم فکر نہ کرو“ میں وقار سے بات کروں گی، ہم اسے دوبارہ ڈھونڈنے کی کوشش کریں گے۔“ آسیہ آندی نے انہیں تسلی دی اور پھر جج رات کو جب وہ سونے کے لیے بیڈ روم میں آئیں تو انہوں نے سب سے پہلا ذکر اہرہ کا ہی پھیرا تھا۔

”ابا! آپ کو پتا ہے عائشہ نے زہرہ کو دیکھا ہے۔؟“ وہ بیڈ پر بیٹھے ہوئے کبل درست کر رہی تھیں وقار آندی بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر بیٹھے کوئی ضروری فائل دیکھ کر رہے تھے جب ان کی بات پر ٹھہر گئے۔

”ہاں! پتا ہے سب پتا ہے، لیکن پلیز میں آج کل کے دنوں میں اپنے گھر میں کوئی ایسا ذکر نہیں سنا چاہتا جس کی وجہ سے گھر میں ٹینشن اور بد مزگی پیدا ہو“ اس لیے عائشہ سے بھی کہہ دو کہ فی الحال اس بات کو ہمیں رہنے دے۔“ وقار آندی نے ان کو سختی سے منع کر دیا تھا اور آسیہ آندی چپ رہ گئی تھیں وہ اب اور کیا کہہ سکتی تھیں بھلا؟ اسی لیے خاموشی سے سونے کے لیے لیٹ گئی تھیں۔ البتہ وقار آندی کا ذہن پھر سے بھٹک چکا تھا وہ فائل سائیڈ پر رکھتے ہوئے بستر سے اٹھ گئے سگریٹ اور دھو میں کا سلسلہ پھر سے شروع ہو گیا تھا۔



علیزے کے برتھ ڈے کی ارتخ منٹ حویلی میں ہی ہو رہی تھی اور اس ساری ارتخ منٹ کی ذمہ داری مبارک خان پر تھی مبارک خان نے دن رات ایک کر رکھا تھا ہر کام اپنی نگرانی میں کروا رہا تھا اور منصور حسین اسے ڈھونڈتا پھر رہا تھا اس وقت بھی وہ اسے کھوجتا ہوا حویلی کی چھت پہ آگیا تھا کیونکہ حویلی کے چاروں اطراف ریڈنگ پل لائٹنگ کا کام ہو رہا تھا حویلی کو دلہنوں کی طرح سجایا جا رہا تھا۔

”السلام علیکم۔“ منصور حسین نے کافی آہستگی سے سلام کیا۔

”وعلیکم السلام! او، او منصور حسین بیٹھو یہاں۔“ مبارک خان نے کرسیوں کی سمت اشارہ کیا۔

”نہیں یار! میں بیٹھنے نہیں آیا میں کسی کام سے آیا ہوں۔“ منصور حسین کافی سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔

”کس کام سے؟“ مبارک خان بھی پوری طرح سے متوجہ ہوا تھا کیونکہ منصور حسین اس وقت سنجیدہ اور بے لچک نظر آ رہا تھا۔

”مجھے دو دن کی چھٹی چاہیے میں جب سے کام پہ آیا ہوں ایک دن بھی چھٹی نہیں لی، لیکن اب مجھے ضرورت ہے میں نے گھر جانا ہے۔“ منصور حسین کافی تھکا ہوا تھا شاید گھر جا کر آرام کرنا چاہتا تھا۔

”یہ کیا کہہ رہے ہو منصور حسین؟ تم جانتے بھی ہو کہ آج کل گھر میں کتنا کام ہے، کتنی مصروفیت ہے اور تم چھٹی لینا چاہ رہے ہو؟“ مبارک خان نے کافی خفگی سے اسے دیکھا۔

”مبارک خان! یہ کام تو کبھی ختم نہیں ہوں گے، تو کیا کبھی گھر نہیں جاؤں گا؟“ منصور حسین کو اس سے بھی زیادہ خفگی ہوئی تھی۔

بی بی کی وجہ سے ڈسٹرب ہے، کیونکہ آؤر جتنا علیزے سے کلوز نظر آتا تھا آج کل اتنا ہی دور نظر آ رہا تھا، جس کے پیچھے یقیناً کوئی بڑی وجہ ہی تھی۔ منصور حسین نے اپنی سوچوں کو ذہن سے جھٹکتے ہوئے گاڑی سیدھی چائاور کشاپ کے اندر لا کھڑی کی اور خود گاڑی سے اتر آیا تھا۔

”وعلیکم السلام علیکم۔“ اس نے سامنے کھڑے عدیل سے ہاتھ ملایا۔
”وعلیکم السلام! آئیے بیٹھے منصور صاحب۔“ عدیل نے کرسی کی سمت اشارہ کیا اور منصور حسین آگے بڑھ کر کرسی کی طرف آگیا۔

”شکریہ۔“ وہ شکریہ ادا کرتے ہوئے جیب سے سگریٹ اور لائٹرن کال کر کرسی پر بیٹھ گیا، اسے حویلی میں ہوتے ہوئے سگریٹ پینے کا موقع ذرا کم ہی ملتا تھا، اس لیے وہ جب بھی حویلی سے نکلتا اپنا شوق اپنی عادت پوری کر لیتا تھا۔

”کہیے؟ کیا حکم ہے ہمارے لیے؟“ عدیل گاہک کو بڑے ہار اور بڑے احترام سے پوچھتا تھا۔
”گاڑی سروس کروانی ہے۔“ اس نے سگریٹ نکال کر سلاکے ہوئے کہا۔

”اتنی جلدی؟ ابھی چند روز پہلے ہی تو آپ نے سروس کروانی تھی؟“ عدیل کے بولنے سے پہلے ہی چھوٹا بول

”دو ہفتے پہلے کی بات ہے، اور دو ہفتے میں تو انسان کو سروس کی ضرورت پیش آجاتی ہے، تم گاڑی کی بات کر رہے ہو؟“ اس نے استہزائیہ انداز میں کہہ کر سگریٹ کا کش لیتے ہوئے دھواں فضا میں اڑا دیا۔

”ارے باؤ منصور! یہاں لوگ دو دو سال گاڑی سروس نہیں کرواتے، آپ دو ہفتے کی بات کر رہے ہو؟“ چھوٹا کون سا کم تھا۔

”یہ گاڑی کس کی ہے، تمہیں پتا نہیں ہے شاید؟“ منصور حسین کے لہجے میں تمسخر تھا۔
”کس کی ہے جناب؟“ چھوٹے نے بھی جھٹس سے پوچھا تھا۔

”آفندی انڈسٹریز کے مالک وقار آفندی کی بیٹی کی گاڑی ہے۔“ منصور حسین نے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے جواب دیا اور چھوٹے نے ہونٹ سیکڑ لیے تھے۔

”اور اچھا! پھر تو ان کا حق بنتا ہے کہ جب چاہیں گاڑی سروس کروائیں۔“
”بالکل! میں بھی تو یہی کہہ رہا تھا۔“ منصور حسین نے اثبات میں سر ہلایا۔

”تو اس کا مطلب ہے کہ آپ ان کی بیٹی کے ڈرائیور ہیں؟“ چھوٹے کا ذہن اب کہیں اور جا پہنچا تھا۔
”ظاہر ہے، اسی لیے تو اس وقت تمہارے سامنے ہوں۔“ منصور حسین باؤں سیدھے کر کے بیٹھ گیا۔

”پھر تو بڑے خوش قسمت ہو باؤ منصور۔“ چھوٹے نے رشک کا اظہار کیا۔
”ارے بھئی میں ڈرائیور ہوں ڈرائیور خوش قسمت کیسے ہو گیا بھلا؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”باؤ منصور! اتنے بھولے نہ بنو لوگ یہاں وقار آفندی سے ملنے کے لیے ترستے ہیں مہینوں پہلے ٹائم لیتے ہیں اور آپ ان کے گھر میں رہتے ہو ان کی بیٹی کے ڈرائیور ہو، یہ خوش قسمتی کی بات نہیں تو اور کیا ہے؟“ چھوٹا خفگی سے کہہ رہا تھا جس پر منصور حسین نے لاپرواہی سے سر جھٹکا۔

”میں ایسی خوش قسمتی کو دل پہ نہیں لیتا شہیار صاحب! اور نہ ہی چھوٹی موٹی خوش قسمتی پہ خوش ہوتا ہوں۔“ منصور حسین کا اپنا انداز بڑا شاہانہ تھا جسے دیکھ کر عدیل بے ساختہ مسکرا دیا اور اس کی بات سے متاثر بھی ہوا تھا بالکل ٹھیک کہا منصور صاحب آپ نے میں بھی کچھ ایسے ہی خیالات رکھتا ہوں کسی امیر کبیر آدمی اور خوب

”اب میں کیا کہہ سکتا ہوں بھلا؟ مجبوری کے مارے سب کچھ کرنا ہی پڑتا ہے، مجھے دیکھ لو، چھ مہینے ہو گئے ہیں میں گھر نہیں گیا، میرے بھی ماں باپ ہیں، بہنیں ہیں، بھائی ہے، بیوی ہے، کیا میرا دل نہیں چاہتا گھر جانے کے لیے؟“ مبارک خان کا لہجہ بھی قدرے اواس ہو گیا، جس پر منصور حسین کونہ چاہتے ہوئے بھی خاموش ہونا پڑا۔
”دیکھو منصور حسین! یہ فنکشن ختم ہو لینے دو، پھر تم آرام سے چھٹی لے لیتا اور گھر جا کر ریسٹ کر لیتا۔“ مبارک خان نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”ہوں! ٹھیک ہے، لیکن صرف اس فنکشن تک۔“ منصور حسین کو ماننا ہی پڑا تھا، ورنہ وہ چھٹی لینے کا پکارا راہ کر کے آیا تھا۔

”ٹھیک ہے ایسا ہی ہوگا۔“ مبارک خان نے اسے تسلی دی اور منصور حسین سر ہلا کر پلٹ گیا۔
”اور سنو منصور حسین۔“ اس نے پیچھے سے اسے پکارا۔
”ہوں! کہو؟“ وہ ٹھہر گیا۔

”بڑے صاحب نے کہا ہے، علیزے بی بی کی گاڑی سروس کروالو، گیراج میں کھڑی ہے، کافی گندی لگ رہی ہے۔“ مبارک خان نے پیغام دیا تھا۔

”ٹھیک ہے، کروالو! ہوں۔“ وہ کہہ کر چلا گیا اور ابھی وہ نیچے آیا ہی تھا کہ علیزے نے پکار لیا۔
”جی بی بی! کہیے؟“ وہ سر جھٹکائے کھڑا تھا۔

”میں نے بوتھ تک جانا ہے۔“ وہ بھی کافی دھیمی آواز میں بولی تھی، جب سے مری میں اس کے ساتھ وہ واقعہ پیش آیا تھا وہ منصور حسین سے آنکھ ملا کر بات ہی نہیں کرتی تھی۔

”معذرت چاہتا ہوں بی بی، اپنی انال میں گاڑی سروس کروانے کے لیے جا رہا ہوں۔“
”تو پھر میں کیسے جاؤں گی؟“

”آپ انتظار کر لیں، بعد میں چلی جائے گا، تب تک گاڑی لے کر آجاؤں گا۔“ منصور حسین بھی آہستگی سے جواب دے رہا تھا۔

”کس نے جانا ہے؟“ آؤر اور وانیال بھی ڈرائنگ روم سے نکل آئے تھے۔
”میں نے بوتھ تک جانا ہے، لیکن ڈرائیور گاڑی سروس کروانے کے لیے جا رہا ہے، اس لیے سوچ رہی ہوں کہ اب کس کے ساتھ جاؤں؟“ علیزے پریشانی سے کہہ رہی تھی۔

”آؤر کے ساتھ چلی جاؤ، یہ بھی مارکیٹ کی طرف ہی جا رہا ہے۔“ وانیال نے فوراً مشورہ دیا۔
”نہیں! میں نے کسی کام سے کہیں اور بھی جانا ہے، میں اپنے ساتھ نہیں لے کر جا سکتا، تم اپنے ساتھ لے جاؤ۔“ آؤر نے بھی فوراً ہی انکار کر دیا، وہ علیزے کے قریب ہو کر اسے خواہ مخواہ دوسروں کی نفرت اور حقارت کا نشانہ نہیں بنوانا چاہتا تھا، اسی لیے بچھلے کئی دلوں سے اس سے کترا رہا تھا۔

”لیکن میں۔۔۔“ وانیال نے کچھ کہنا چاہا۔
”تم فارغ ہو وانیال، تم لے جاؤ، میں فی الحال بڑی ہوں۔“ آؤر نے وانیال کو درمیان میں ہی ٹوک دیا، وانیال چپ ہو گیا، اب وہ انکار کیسے کرتا؟ سو مجبوراً ”جانے کے لیے مان گیا، تب کہیں منصور حسین بھی آزاد ہوا اور گاڑی لے کر حویلی سے نکل آیا، وہ بھی آؤر اور علیزے کے متعلق ہی سوچ رہا تھا، منصور حسین کی نظر بڑی گہری نظر تھی، پہلی نظر اور پہلی ملاقات میں ہی پہچان جاتا تھا کہ کون کیسا ہے؟ کس مزاج کا ہے؟ کیا کہتا ہے؟ اور کیا چاہتا ہے؟ اور یہی حال آؤر سے مل کر بھی ہوا تھا، وہ آؤر کی چاہت، اس کا مزاج، اس کی طبیعت سب جان گیا تھا اور یہ بھی جان چکا تھا کہ آؤر پچھلے چند روز سے کچھ چپ اور ڈسٹرب سا ہے اور اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ وہ علیزے

صورت لڑکی کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور دعا سلام کو اپنی خوش قسمتی تصور کرنا انسان کی سب سے بڑی بے وقوفی اور کم عقلی کی علامت ہے اور یہ علامت ہمارے چھوٹے میں بے ہدائی جاتی ہے۔ ”عدیل ذرا فارغ تھا اس لیے کرسی کھینچ کر خود بھی منصور حسین کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ منصور حسین پہلے بھی ایک دفعہ ان کے پاس آچکا تھا۔ اس لیے ان میں تھوڑی بہت بے تکلفی بھی ہو چکی تھی۔“

”اس کا کوئی قصور نہیں ہے یا وعدیل یہ عمر ہی ایسی ہے خوش فہمیوں میں ڈالنے والی۔“ منصور حسین نے مذاق اڑایا اور اسی ہنسی مذاق میں وہ گاڑی سروس کرنے میں لگ گئے البتہ عدیل کافی دیر منصور حسین سے باتوں میں مصروف رہا تھا۔



جووت کافی دیر سے ڈرائنگ روم میں بیٹھا مسزیدر کا انتظار کر رہا تھا وہ شاید اوپر اپنے بیڈ روم میں تیار ہو رہی تھیں، عاصم، سائم اور فاطمہ گھر پہ نہیں تھے شاید اسی لیے ان کی کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی اور جووت انتظار کرتے ہوئے بور ہونے لگا۔

”ارے جووت تم یہاں؟“ سائم اچانک ڈرائنگ روم میں داخل ہوا اور جووت کو صوفے پہ بیٹھا دیکھ کر بے ساختہ حیرت اور خوشی کا اظہار کیا تھا۔

”جی ہاں! میں ہی ہوں میری آتما نہیں ہے۔“ جووت نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔

”ہاں! تمہاری آتما تو مری اور اسلام آباد پہنکنے کے لیے گئی ہوئی تھی واپسی کب ہوئی۔“ سائم مسکراتے ہوئے بیٹھ گیا۔

”دون پہلے۔“

”اچھا! تو تم نے بتایا کیوں نہیں؟“

”سوچا پہلے کھلن اتار لوں پھر بتا دوں گا۔“ جووت نے کندھے اچکائے۔

”کیسی کھلن؟“ سائم کا سوال معنی خیز تھا۔

”ارے نہیں! ایسی ویسی کھلن نہیں تھی ساری فیملی کے ہوتے ہوئے ایسا سوچنا بھی گناہ ہے۔“ جووت نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

”اچھا! اتنا احترام کرتے ہو فیملی کا۔“

”آف کورس یار! جب بہنیں اور بھائی ساتھ ہوں تو احترام کرنا ہی پڑتا ہے۔“

”بچلو شکر ہے کسی کا تو احترام کرتے ہوتا۔“ سائم نے شکر ادا کیا تھا اور جووت قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

”ہیلو مائی سن! کیا ہو رہا ہے؟“ مسزیدر تنک تنک سے تیار ساڑھی کا پلو سنبھالتی ہوئی اندر داخل ہوئیں۔

”ہائے آنٹی! کیسی ہیں آپ؟“ جووت فوراً کھڑا ہو گیا۔

”بالکل ٹھیک ہوں تم سناؤ آج کیسے آنا ہوا؟ مجھے پتا چلا ہے کہ تم کافی دیر سے انتظار کر رہے ہو؟“ وہ جووت کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود بھی بیٹھ گئیں۔

”جی! وہ آنٹی نے آپ کے لیے یہ کارڈ بھیجا ہے۔“ جووت نے کارڈ ان کی سمت بڑھا دیا۔

”اوہ تو علیزے کی ہر تھ ڈے ہے؟“ مسزیدر کارڈ دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھیں۔

”جی! اور آنٹی نے آپ کو اسپیشلی انوائٹ کیا ہے اسی لیے یہ کارڈ مجھے دے کر بھیجا ہے۔“

”ہاں! ہاں! کیوں نہیں بھیجی میں ضرور آؤں گی۔“ انہوں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ہامی بھری اور

جووت ان کا شکریہ ادا کرتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

”ارے اتنی جلدی کہاں جا رہے ہو؟ بیٹھو نا؟“ سائم اور مسزیدر نے بیک وقت اسے روکا تھا۔

”ایم سوری! انی الحال بیٹھنے کا ٹائم نہیں ہے میں نے ابھی کہیں اور بھی جانا ہے کارڈ دینے کے لیے۔“ اس نے معذرت چاہی تھی۔

”کہاں جانا ہے؟ میں بھی چلتا ہوں۔“ سائم بھی کھڑا ہو گیا۔

”مسزیزاق کی طرف۔“ جووت نے سائم کی آنٹی کا نام لیا۔

”ارے وہ تو اس وقت اکیڈمی میں ہوں گی؟“ سائم نے اطلاع دی۔

”تو کوئی بات نہیں میں اکیڈمی چلا جاتا ہوں ان فیکٹ یہ کام مجھے آنی نے سونپا ہے اس لیے اسے پورا کرنا ضروری ہے اور میں ذرا بھی کوتاہی نہیں کر سکتا۔“ جووت نے اصل وجہ بتائی۔

”اوکے! چلو پھر میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔“ سائم جانے کے لیے تیار تھا۔

”لہٹس کو۔“ جووت کہتے ہوئے پلٹا اور مسزیدر کو اللہ حافظ کہہ کر سائم کے ساتھ باہر نکل آیا۔

”اور سناؤ کوئی نئی ناہ؟ تمہارے دن کیسے گزرے؟“ جووت ہائیک اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

”سو بورنگ یار! کوئی مزا نہیں آ رہا، موسم بے رنگ سا گزر رہا ہے۔“ سائم نے منہ بنایا۔

”اچھا۔۔۔ یہ سب تم کہہ رہے ہو؟“ جووت نے مذاق اڑاتے ہوئے تعجب کا اظہار کیا۔

”ہاں یار! طبیعت فریش نہیں ہے۔“ سائم نے اعتراف کیا۔

”تو پھر کریں فریش؟“ جووت نے چھیڑا۔

”تم تو کر لو گے، لیکن میں کیا کروں گا؟“ سائم منہ بنا کے بولا تھا۔

”یار! جیسے میں اپنی طبیعت فریش کرنا چاہتا ہوں ویسے ہو نہیں رہی نا؟“ جووت کے جواب پہ سائم اس کا مفہوم سمجھ گیا تھا اسی لیے چپ بھی ہو گیا اور اتنے میں جووت نے ہائیک اکیڈمی کی پارک میں لا کھڑی کی تھی۔

جووت اور سائم کو جو کیدار پہلے سے جانتا تھا اس لیے فوراً ٹیٹ کھول دیا۔ وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے اندر داخل ہوئے تھے اور قدم پر نپل کے آفس روم کی طرف بڑھا دیے تھے۔

”ویسے یار! رنگارنگ خوشبو میں اور رنگارنگ نظارے دیکھنے ہوں تو بندہ گر لڑکا لیا اکیڈمی کا رخ کرے۔“

جووت کے لہجے اور آنکھوں میں شرارت تھی وہ کلاس روم سے نکل کر میزٹھیاں اترتی لڑکیوں کو دیکھ رہا تھا۔

”جووت! انسان بنو! آنٹی کو پتا چلا تو ناراض ہوں گی۔“ سائم نے اسے ٹھوکا دیا تھا اور مجبوراً ”جووت نے سر جھکا لیا۔

لیکن جب وہ مسزیزاق کو کارڈ دے کر واپس آ رہے تھے کہ کلاس روم کے سامنے سے گزرتے ہوئے جووت کے قدم اچانک ٹھٹک گئے وہ ایک سرسری نظر میں ہی پہچان گیا تھا کہ وہ کون ہے؟

”جووت۔!“ سائم نے اسے اپنے ساتھ نہ پا کر فوراً پیچھے پلٹ کر دیکھا تھا۔

”میں شاید اپنا سیل بھول آیا ہوں تم چلو میں لے آؤں۔“ جووت اپنی جیبیں ٹٹولتا ہوا ہمانا بنا کر پلٹ گیا اور سائم اس کی چالاکی سے بے خبر گیٹ عبور کر گیا۔

اس کی کلاس آف ہو چکی تھی اس لیے وہ اپنی چیزیں سمیٹتی ہوئی پلٹ رہی تھی جب کسی کو کلاس روم کے دروازے کی چوکھٹ کے پتوں پہ کھڑے دیکھ کر ٹھٹک گئی لیکن جیسے ہی اس کے چہرے پہ نظر گئی اس کا رنگ فق ہو گیا۔

”ہائے! کیسی ہیں آپ۔۔۔؟“ جووت اسے اپنی گہری نظروں کی زد میں رکھتے ہوئے قدم بڑھاتا ہوا قریب آ گیا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آف لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف
- ✧ مسائروں میں اپلوڈنگ
- ✧ سیریم کوالٹی، تارل کوالٹی، کیریڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور
- ✧ ابن صفی کی مکمل رینج
- ✧ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیگر مستعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

”آپ کون ہیں؟ میں آپ کو نہیں جانتی۔“ مریم نے اپنی چادر درست کرتے ہوئے ناگواری سے کہا۔
”آپ کا گھاتل ہوں، بس جاننے کے لیے یہی کافی ہے۔“ جودت جتنے قدم بڑھا کے قریب آیا تھا، مریم اتنے ہی قدم اٹھا کر پیچھے ہٹ گئی۔
”شٹ اپ! تمیز سے بات کریں، آپ کون ہیں؟ کیا ہیں؟ مجھے یہ جاننے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔“ مریم کافی پر اعتماد لڑکی تھی وہ جودت سے متاثر ہونے والی نہیں تھی۔
”لیکن مجھے تو بتانے کی ضرورت ہے نا مریم فاروق نیازی؟“ جودت نے اس کا پورا نام لیا، جس پہ مریم نے چونک کر دیکھا اور جودت اس کے ری ایکٹ پہ بے ساختہ مسکرا دیا۔
”کہتے ہیں کہ شکر خورے کو شکر مل ہی جاتی ہے، آج اس پہ بھی یقین آگیا ہے، راستے میں آپ کی ہی طلب کر رہا تھا اور یہاں آپ مل گئیں، اللہ کا شکر ادا کرنے کے علاوہ اور کیا کر سکتا ہوں بھلا۔“ جودت اس کے چہرے پہ نظریں جمائے اسے بغور دیکھ رہا تھا اور مریم نے کچھ کہنا ہی چاہا تھا کہ جودت نے اسے روک دیا۔
”نی الحال کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے، میں ذرا جلدی میں ہوں، آپ سے پھر ملوں گا“ اللہ حافظ۔“ وہ اسے چپ رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے بے باک نظروں سے دیکھتا پلٹ کر چلا گیا اور مریم وہیں کی وہیں کھڑی دیکھتی رہ گئی۔

”شہناز بی! آپ سے کوئی ملنے کے لیے آیا ہے۔“ انسپکٹر شہناز ڈیوٹی پہ جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی جب ملازمہ کی اطلاع پہ اس کے ہاتھ رک گئے۔
”کون ملنے کے لیے آیا ہے؟“ اس کا سوال کھوتا ہوا تھا۔
”بتا نہیں کون ہے، آپ سے ملنے پہ بھند ہے۔“ ملازمہ نے لاعلمی کا اظہار کیا۔
”ٹھیک ہے، بٹھاؤ اس کو، میں آرہی ہوں۔“ اس نے اجازت دیتے ہوئے اپنے آپ پہ ایک طائرانہ سی نگاہ ڈالی اور شوز پینے کے بعد اپنی گاڑی کی چابی اور موبائل لے کر خود بھی نیچے آگئی، لیکن ڈرائنگ روم میں چار پانچ گارڈز کے ساتھ اس آدمی کو دیکھ کر انسپکٹر شہناز بری طرح ٹھک گئی تھی، اس کی پیشانی پہ بل پڑ گئے تھے۔
”السلام علیکم۔“ اس سے دیکھ کر وہ آدمی کھڑا ہو گیا۔
”وعلیکم السلام! بیٹھے۔“ مجبوراً اس سے فارملیٹی نبھانی ہی پڑی۔
”شکریہ میڈم بہت شکریہ۔“ وہ آدمی بیٹھ گیا۔
”کیسے؟ کون ہیں آپ اور کس سلسلے میں آئے ہیں؟“ اس کا لب و لہجہ پروفیشنل ہو چکا تھا۔
”ملک حق نواز نام ہے میرا، مومنہ بی بی کے کیس کے سلسلے میں آیا ہوں۔ دل آور شاہ اور مومنہ بی بی سے ملنا چاہتا ہوں، ملاقات کروادیں۔“ اس نے اپنا تعارف کروایا تھا۔ نپے تلے انداز میں۔
”ملک حق نواز؟“ انسپکٹر شہناز دنگ رہ گئی تھی۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)



بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور غلیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیل حیات دو ہی بہن بھائی ہیں، مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے، وہ انگلینڈ کی رنگینوں میں مکمل حور پہ رنگ چکی ہے، جس کے پیش نظر فائزہ بیگم، نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں، لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے، جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے، مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنب رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے، مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، بے بسی اور مجبوری سے تک آخر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے، لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باؤ اقیانوس مل جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے، جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے، اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔ منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے، وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے، وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آدر شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے، وہ اپنے قول و فعل کا بہت ریکا آڈمی ہے، اس نے

بیسویں قسط



ہاں، گا۔ انسپکٹر شہناز نے مومنہ بی بی کے متعلق مکمل لا تعلقی کا اظہار کیا تھا جس پر ملک حق نواز کی ہنسی اُڑا کر کے باعث بل پڑ گئے تھے۔

انسپکٹر شہناز! آپ کی معلومات ناقص اور محدود ہو سکتی ہے لیکن ملک حق نواز کی نہیں، میں نے آپ سے پوچھا تھا کہ آپ مجھے دیکھ کر مجھے سمجھ گئی ہوں گی، لیکن آپ تو کچھ بھی نہیں سمجھیں۔ ملک حق نواز آپ کے گھر کی اس چار دیواری میں بیٹھ کر اس چار دیواری تک ہی محدود نہیں ہے، بلکہ یہاں بیٹھ کر بھی آپ کے پورے گھر کے بارے میں بتا سکتا ہوں جس کے ثبوت کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ مومنہ بی بی اس وقت اسی چار دیواری میں موجود ہے، میں چاہوں تو ایک منٹ میں اسے نکال کے باہر لے آؤں۔ سمجھیں آپ۔؟ ملک حق نواز نے کافی سخت لہجے میں کہتے ہوئے انسپکٹر شہناز کے سامنے چٹکی بجائی تھی اور انسپکٹر شہناز نے خو کو ایسا کنٹرول کیا تھا کہ اپنا رنگ فق نہیں ہونے دیا ورنہ اگر یہاں اس کا رنگ فق ہو جاتا تو ساری بازی پلٹ جاتی، ملک حق نواز نے غصے سے پتھر پھینکا تھا کہ لگ گیا تو لگ گیا نہ لگا تو نہ سہی۔

”ملک صاحب! میں نے بھی آپ سے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ میں آپ کی حیثیت، آپ کا مرتبہ سب سمجھ چکی ہوں، آپ کے اثر و رسوخ کا اندازہ بھی ہو چکا ہے پھر بھی سب کچھ دیکھتے ہوئے میں آپ سے جھوٹ کیسے بول سکتی ہوں۔؟ آپ اس وقت یا اختیار ہیں، کچھ بھی کر سکتے ہیں، ایسے میں میں غلط بیانی سے کام لے کر معاملہ کیوں بگاڑوں گی بھلا۔؟ میں تو وفادار نہیں ہوں، اس وقت میرے لیے آپ کی بات اہم ہے، آپ میرے گھر آئے ہیں، اچھے طریقے سے بات کر رہے ہیں، کوئی غصہ نہیں ہے، کوئی دھمکی نہیں، پھر بھی اگر میں آپ کے ساتھ جھوٹ بولوں گی تو یہ الٹا میرے لیے نقصان دہ ہو گا آپ کے لیے نہیں۔ ہاں اگر آپ کو شک ہے کہ مومنہ بی بی میرے پاس ہے، میرے گھر میں ہے تو پلیز میں آپ سے کہوں گی کہ آپ اپنا شک دور کر لیں، میرا گھر کھلا پڑا ہے، آپ تلاشی لے سکتے ہیں، حالانکہ میرے گھر کی تلاشی لینے کا آپ کو کوئی حق نہیں ہے، آپ کے لیے قانوناً جرم ہے یہ، لیکن پھر بھی آپ کو میری طرف سے اجازت ہے، آپ اپنی تسلی کر لیں۔“ انسپکٹر شہناز کے اعتماد کے آگے ملک حق نواز کا پھینکا گیا پتہ بے کار گیا تھا وہ بھی خود پر اعتماد رکھ کے اتنی بڑی بات کہہ گئی تھی کہ ملک حق نواز خاموش رہ گیا۔

”دیکھیے انسپکٹر شہناز! میں اس وقت آپ کے گھر کی تلاشی لینے کے ارادے سے نہیں آیا، میں تو آپ کو صرف یہ بتانے کے لیے آیا ہوں کہ مجھے انجان مت سمجھیے گا؟ میں انجان نہیں ہوں، دل اور شاہ سے کہہ ہیے گا کہ مجھ سے غافل مت رہے، کہیں مومنہ بی بی کو انصاف دلاتے دلاتے اپنا نقصان نہ کر لے، کیونکہ دل اور شاہ کی وجہ سے یا پھر مومنہ بی بی کی وجہ سے میری ساکھ خراب ہوئی تو اچھا نہیں ہو گا، آج کل الیکشن کے دن ہیں، میری بدنامی سے میری پارٹی کو نقصان پہنچا تو سب کا انجام برا ہی ہو گا، اتنا برا کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔“ ملک حق نواز نے انگلی اٹھا کر وارننگ دی تھی اور پھر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

”اور ہاں! جو بھی اس معاملے میں شریک ہو گا سب پلیٹ میں آئیں گے، معافی کسی کے لیے بھی نہیں ہو گی۔“ اس نے جاتے جاتے ایک اور وارننگ دی اور اپنے گارڈز کو اشارہ کرتے ہوئے خود بھی قدم باہر کی سمت بڑھا دیے۔

”معاف کرنے والا تو دل اور شاہ بھی نہیں ہے ملک صاحب۔“ انسپکٹر شہناز کی آواز پر ملک حق نواز کے قدم قائم ہو گئے تھے اس نے یکدم پلٹ کر انسپکٹر شہناز کی سمت دیکھا۔

”آپ مجھے دھمکی دے رہی ہیں۔؟“ ملک حق نواز نے اپنی سمت اشارہ کرتے ہوئے بے یقینی سے پوچھا۔

”میں دھمکی نہیں دے رہی ملک صاحب! آپ کو صرف یہ بتا رہی ہوں کہ اگر آپ بے قصور ہیں تو دل اور شاہ

یہ نام اس کی سماعتوں پر کسی ہم کی طرح پھٹا تھا۔ لیکن اس نے ایک ذہین اور سمجھ دار آفیسر ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے تمام تاثرات لمحے کے ہزاروں حصے میں کنٹرول کر لیے تھے، کیونکہ یہاں اس کا مشتعل ہونا خود اس کی ذات کو ہی نہیں اس گھر میں موجود اس کے ماں باپ اور مومنہ بی بی کو بھی کسی مشکل میں ڈال سکتا تھا، کیونکہ اس وقت وہ اکیلی تھی اور سامنے کھڑے افراد مسلح تھے، وہ ڈری نہیں تھی، بس قدرے محتاط ہو گئی تھی ایسے ہزاروں کمزور سے روزانہ ان کا واسطہ پڑتا تھا جن میں الٹا خود پولیس آفیسرز کو یا پھر ان کے گھر والوں کو نقصان اٹھانا پڑتا تھا اس لیے وہ کسی عظیم نقصان کے خیال سے ہی کچھ دھیمی پڑ گئی۔

”اوہ تو آپ ہیں ملک حق نواز صاحب؟“ اس نے حیرت اور تعجب کا اظہار کیا۔

”کیا بات ہے میڈم؟ کیا میرا نام پہلی بار سنا ہے آپ نے؟“ ملک حق نواز نے انسپکٹر شہناز کو گہری اور کھوجتی ہوئی نظر سے دیکھا۔

”ارے نہیں ملک صاحب۔۔۔! نام پہلی بار نہیں سنا، دیکھا پہلی بار ہے۔“ انسپکٹر شہناز کافی خوش اخلاقی سے بات کر رہی تھی۔

”ہوں! تو پھر مجھے دیکھا ہے تو مجھے سمجھ بھی گئی ہوں گی آپ۔۔۔؟“ ملک حق نواز جیسے انسپکٹر شہناز کو کچھ باور کروا رہا تھا اور ناواں تو وہ بھی نہیں تھی، البتہ یہ الگ بات تھی کہ وہ ناواں بن رہی تھی کیونکہ صورت حال ہی کچھ ایسی تھی۔

”جی، جی بالکل! بہت اچھی طرح سمجھ چکی ہوں، آپ کی حیثیت، آپ کا مرتبہ سب سمجھ میں آچکا ہے، بس آپ یہ بتائیے کہ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟“ انسپکٹر شہناز نے کافی عاجزی اور ملنساری سے کام لیتے ہوئے کہا۔

”دیکھیے میڈم شہناز! آپ نے شاید غور نہیں کیا۔۔۔؟ میں اپنی عرض تو پہلے جملے میں ہی واضح کر چکا ہوں، لیکن کوئی بات نہیں، ایک بار پھر سہی۔“ ملک حق نواز آج اپنے مزاج کے خلاف بڑے ٹھہراؤ سے بات کر رہا تھا۔

”جی کہنے! میں سن رہی ہوں۔“ انسپکٹر شہناز نے اپنی ساری توجہ ملک حق نواز کی سمت مرکوز کر رکھی تھی۔

”دل اور شاہ اور مومنہ بی بی سے ملاقات کرنا چاہ رہا ہوں، لیکن دونوں ہی کہیں میسر نہیں آ رہے، البتہ یہ سننے میں ضرور آیا ہے کہ ان دونوں کا آپ سے پر سنی کانٹیکٹ رہتا ہے، اس لیے سوچا ہے کہ آپ سے ہی کہا جائے کہ ملاقات کی کوئی کمیل نکالیں، تاکہ کچھ وہ اپنی کہہ سن لیں اور کچھ میں اپنی کہہ سن لوں۔۔۔ کہنے کیا خیال ہے آپ کا؟“ ملک حق نواز بڑے طریقے سے بات کر رہا تھا لیکن انسپکٹر شہناز سب سمجھتی تھی وہ نا سمجھ پن کی نہیں تھی جو اس کی چٹکی چڑی باتوں میں آجاتی اس نے بھی کچھ بولنا تو تھا لیکن بہت سوچ سمجھ کر۔

”دیکھیے ملک صاحب! دل اور شاہ ایک بہت اچھے، بہت ذہین اور سمجھ دار دیگیل ہیں، میرا ان کے ساتھ کوئی پرسنل ریلیشن شپ نہیں ہے جس کی وجہ سے پرسنل کانٹیکٹ ہو گا، بس ہمارا پرسنل ریلیشن ایسا ہے کہ کبھی کبھار آنا سامنا ہو جاتا ہے، جس کی وجہ سے وعاسلام بھی ہوتی رہتی ہے، لیکن اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے، البتہ دل اور شاہ کے بارے میں اتنا ضرور بتا ہے کہ آج کل وہ اپنے کسی کیس کے سلسلے میں کراچی گئے ہوئے ہیں اور امید ہے کہ دو تین روز تک واپس لاہور آجائیں گے لیکن یہ بات پھر بھی کنفرم نہیں ہے، ہو سکتا ہے وہ لیٹ ہو جائیں یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ جلدی واپس آجائیں اس لیے یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا اور رہی بات مومنہ بی بی کی تو ان کے بارے میں بھی میری معلومات کچھ ایسی ہی ہیں، کیونکہ مومنہ بی بی دل اور شاہ کا کیس ہے، اس لیے ان کے بارے میں زیادہ معلومات دل اور شاہ کو ہی ہوگی، آپ ان کی واپسی کا انتظار کر لیں، آپ کا سارا مسئلہ حل ہو

کبھی آپ سے ٹکر نہیں لے گا اور اگر آپ واقعی قصور وار ہیں تو دل اور شاہ کے عتاب سے بچنا اتنا آسان نہیں ہو گا آپ کے لیے میری یہ بات آپ بے شک لکھ کر رکھ لیں، معافی کی گنجائش ان کے پاس بھی نہیں ہوتی۔“ انسپکٹر شہناز نے ملک حق نواز کو دل اور شاہ کے متعلق تھوڑا بہت بتا دیا ہی مناسب سمجھا تھا کہ کہیں وہ دل اور شاہ کو ایری غیری شخصیت ہی نہ سمجھتا پھرے۔

”یہ دھمکی نہیں تو اور کیا ہے...؟“ ملک حق نواز نے انسپکٹر شہناز کو کافی سخت نظروں سے دیکھا تھا۔
”اگر یہ اتنی سی بات آپ کو دھمکی لگ رہی ہے تو پھر دھمکی ہی سی۔“ اس نے کندھے اچکائے اور ملک حق نواز مٹھیاں بھینچ کے رہ گیا کیونکہ ایک پولیس آفیسر کے گھر پہ ان کا کوئی ہنگامہ برپا کرنا بھی ان کے حق میں ٹھیک نہیں تھا لہذا ضبط ہی بہتر تھا۔

”ہوں! ٹھیک ہے پھر اللہ حافظ۔“ انسپکٹر شہناز کے تنے ہوئے اعصاب اور بھی تن گئے تھے ملک حق نواز کی نظریں چھید دینے والی تھیں لیکن پھر بھی وہ لب بھینچتی ہوئی زہر کا گھونٹ پی کے رہ گئی وہ آج اگر ملک حق نواز کے سامنے خاموش ہوئی تھی تو کھن مومنہ بی بی کی وجہ سے، کیونکہ وہ اپنے غصے اور اشتعال کی وجہ سے مومنہ بی بی کی زندگی خطرے میں نہیں ڈال سکتی تھی ملک حق نواز آج کل اپنی ساکھ برقرار رکھنے کے لیے اسے جان سے بھی مار سکتا تھا اسی لیے تو وہ جگہ جگہ اس کی بوسو گھتا پھر رہا تھا اور دو سری طرف دل اور شاہ نے مومنہ بی بی کی حفاظت کی ذمہ داری اسے سونپی ہوئی تھی اس لیے اسے یہ ذمہ داری ہر حال میں نبھانی بھی چاہیے کچھ بھی ہو جاتا۔

”شہناز! کیا بات ہے بیٹا...؟ کون تھے یہ لوگ؟“ قیوم رضوی کی آواز پہ انسپکٹر شہناز یکدم چونک گئی۔
”کیا ہوا ہے؟ پریشان لگ رہی ہو؟“ انہوں نے دوبارہ استفسار کیا وہ بی بی کے چہرے سے ہی پریشانی بھانپ چکے تھے۔

”کچھ نہیں ابی جان! بس وہ مومنہ بی بی کی طرف سے پریشانی ہو رہی تھی ملک حق نواز میرے گھر تک پہنچ گیا ہے۔“ انسپکٹر شہناز نے ان کی سمت پلٹتے ہوئے متفکر سے انداز میں جواب دیا۔

”اچھا! تو یہ ملک حق نواز تھا...؟“ انہوں نے پر سوچ سے انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا وہ ابھی ابھی گھر میں داخل ہوئے تھے اور ملک حق نواز ان کے گھر سے نکل رہا تھا جسے دیکھ کر ان کے ماتھے پہ سلوٹیں پڑ گئی تھیں۔
”جی ہاں! یہ وہی خبیث ہے۔“ انسپکٹر شہناز غصہ ضبط کرتے ہوئے بولی۔

”کیا بات ہے؟ اس نے کچھ کہا ہے کیا...؟“

”جی ہاں! اسے شک ہو چکا ہے کہ مومنہ میرے پاس ہے اور میرا دل اور شاہ سے پرسنل کانٹیکٹ بھی ہے۔“ انسپکٹر شہناز کبھی اپنی مٹھیاں بھینچ رہی تھی اور کبھی پیشانی مسل رہی تھی۔
”اوہ! تو یہ مسئلہ ہے...؟“

”جی یہی مسئلہ ہے اور اس مسئلے کا کوئی حل سمجھ نہیں آ رہا۔“ انسپکٹر شہناز پریشانی کے مارے ڈرائنگ روم میں دائیں سے بائیں ٹہل رہی تھی اسے مومنہ بی بی کے لیے کوئی ٹھکانہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

”تو بیٹا! تم دل اور سے بات کرو نا اسے ساری صورت حال سے آگاہ کرو وہ یقیناً کوئی حل سوچ لے گا۔“ انہوں نے بی بی کو مشورہ دیا۔ لیکن انسپکٹر شہناز کا دل نہیں مان رہا تھا کہ وہ دل اور شاہ کو پریشان کرے، آخر وہ کیا سوچے گا کہ انسپکٹر شہناز اتنی جلدی ذمہ داری سے گھبرا گئی ہے۔؟

”نہیں ابی جان! میرا دل نہیں مان رہا میں دل اور شاہ کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا چاہتی۔“ اس نے نفی میں گردن ہلاتی۔

”لیکن بیٹا! اس طرح تو مسئلہ حل نہیں ہو گا نا۔ اب تو مومنہ بی بی کے ساتھ ساتھ خود تمہاری زندگی کو بھی خطرہ

”اسی وجہ کا ہے ملک حق نواز سامنے آچکا ہے آخر؟“ عبدالقیوم رضوی بی بی کو ساری اور بچ بچا ہوا سمجھا رہے تھے۔
”لیکن ابی جان! آپ یہ بھی تو سوچئے کہ ملک حق نواز اگر میرے گھر تک پہنچ سکتا ہے تو وہ کہیں بھی پہنچ سکتا ہے۔“ مومنہ بی بی نے تو کسی دارالامان میں رہ سکتی ہے نہ کسی ہاسٹل میں اور نہ ہی کسی ہوٹل میں، کیونکہ ان جگہوں پہ وہ ہرگز نہیں رہ سکے گی اور رہی بات گھر میں رکھنے کی تو کوئی بھی اسے اپنے گھر میں نہیں رکھے گا، کیونکہ مومنہ بی بی کو اپنے گھر میں رکھنا اور پناہ دینا خطرے سے خالی نہیں ہے اور آج کل کسی اور کی وجہ سے کون خطرہ مول لیتا ہے؟
”اے! انسپکٹر شہناز حقیقتاً پریشان ہو رہی تھی۔“

”تو بیٹا! پھر چھوڑو اور دل کی بات تم اسے رہنے دو وہ یہیں رہے گی، ہم سمجھیں گے کہ ہماری ایک نہیں دو بیٹیاں ہیں۔“ عبدالقیوم رضوی نے بڑی فراخ دلی سے کہا تھا وہ ریٹائرڈ آرمی آفیسر تھے بہت بہادر و وسیع ظرف اور رمنڈل جی، پہلے دن جب انسپکٹر شہناز نے ان کو مومنہ بی بی کے متعلق بتایا تھا تو انہوں نے بڑی خندہ پیشانی سے مومنہ بی بی کو خوش آمدید کہا تھا اور اپنے گھر میں پناہ دی تھی لیکن آج ملک حق نواز آڑے آگیا تھا۔

”تھیں ابی جان! اب مومنہ بی بی گایاں رہنا مناسب نہیں ہے، کیونکہ میں اور میرا گھر ملک حق نواز کی نظریں آچکے ہیں وہ مجھ پہ اور میرے گھر پہ چیک رکھے گا اسی لیے مومنہ بی بی کو کہیں اور شفٹ کرنا پڑے گا جہاں اس کی سوچ بھی نہ جاسکے۔“

انسپکٹر شہناز اس کے لیے کسی محفوظ جگہ کا سوچ رہی تھی اور اس کی سوچیں، تفکرات اور پریشانی باہر کھڑی مومنہ بی بی کو ندامت کے کنویں میں دھکیل گئی تھیں اس کی وجہ سے سب پریشان ہو رہے تھے وہ سب کے لیے مسیت بن گئی تھی کیوں اس نے اپنی وجہ سے دو سروں کو بھی آزمائش میں ڈال رکھا تھا...؟ اس کی سوچیں اور خیالات اسے چپ کرا گئے تھے اب اس نے چپ رہ کر ہی کچھ اور سوچنا تھا اور فیصلہ کرنا تھا وہ دو سروں پہ بوجھ کب تک بنتی؟ آخر کب تک تنگ کرتی؟



”عدیل عمر...!“ سوچتے سوچتے اچانک ایک کپکپی کی سی صورت میں اس کا نام اس کے لبوں سے ادا ہوا اور وہ اس نام پہ خودی چونک گئی۔

”عدیل عمر...؟“ اس نے اپنے آپ سے تصدیق کے لیے دوبارہ نام دہرایا اور دوبارہ بھی اسے یہی لگا کہ یہ نام اس کے دل سے ادا ہوا ہو۔ اور دل سے ادا شدہ ”عدیل عمر“ مدحیہ حیات کو کم سم کر گیا تھا۔

وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ یہ نام اس کے دل سے ادا ہوا ہے تو کیوں ہوا ہے۔؟ وہ اپنے آپ کو ٹٹول رہی تھی اپنے دل کو کھوج رہی تھی اور جو سمجھ آ رہا تھا وہ ناقابل یقین سا لگ رہا تھا۔

”تو کیا محبت...؟“ یہ خیال ذہن میں آتے ہی وہ سر تھام کے بیڈ پہ بیٹھ گئی اور اس کی سماعتوں میں دور دور تک اس کی اپنی ہی ”نہیں نہیں“ کی آواز گونجتی ہوئی سنائی دے رہی تھی۔

”کیا مدحیہ حیات کو کسی سے محبت بھی ہو سکتی ہے۔“ وہ خود اپنی ذات سے سوال کر رہی تھی اور جواباً ”پھر اسے ای کی کم سم سی خاموشی سنائی دے رہی تھی چپ چپ اور حیران پریشان۔“

”مدحیہ! تم ابھی تک جاگ رہی ہو بیٹا؟“ فائزہ بیگم اس کے بیڈ روم کی لائٹ جلتی دیکھ کر اندر آگئی تھیں اور مدحیہ کو بیڈ کی پائنتی کی طرف ایک کنارے پہ بیٹھ دیکھ کر انہیں اور بھی تشویش کا احساس ہوا تھا۔

”مدحیہ! اس طرح کیوں بیٹھی ہو؟ کیا ہوا ہے؟“ انہوں نے قریب آتے ہوئے مدحیہ کے کندھے پہ ہاتھ رکھا اور مدحیہ چونک گئی اس نے یکدم سر اٹھا کر فائزہ بیگم کو جیسے خالی خالی نظروں سے دیکھا۔

”مدحیہ! تم ٹھیک تو ہو۔۔۔ اس طرح کیا دیکھ رہی ہو۔۔۔؟“ انہوں نے مدحیہ کی آنکھوں سے گھبرا کر پوچھا۔
 ”کک۔۔۔ کچھ نہیں ہوا مجھے۔“ اس نے یکدم نفی میں سر ہلاتے ہوئے اپنے چہرے پہ ہاتھ پھیرا اس کی پیشانی
 پہ نامحسوس سے پسینے کے قطرے تھے جو اس نے دونوں ہاتھوں سے پونچھ ڈالے تھے۔
 ”رات کے اس پہر اس طرح کیوں بیٹھی ہو۔۔۔؟ آخر کیا ہوا ہے تمہیں؟ تمہاری حالت اتنی غریب کیوں ہو رہی
 ہے؟“ قانزہ بیگم اس کی حالت دیکھ کر دہل چکی تھیں ان کا دل مٹھی میں آگیا۔
 ”مام! میں نے کیا نا کچھ نہیں ہوا مجھے بس سوچتے سوچتے نہ جانے دھیان کہاں چلا گیا تھا کہ میری کیفیت کنٹرول
 سے باہر ہونے لگی تھی۔“ مدحیہ نے بمشکل اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے انہیں ٹالنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن
 قانزہ بیگم کی تسلی نہیں ہوئی تھی وہ ابھی تک گھبراتی ہوئی تھیں۔
 ”آریو شیور۔۔۔؟“

”بس مام! ایم شیور اینڈ پلیریلوی الون۔“
 اس نے اپنی کپڑیوں کو سہلاتے ہوئے کہا اور قانزہ بیگم اسے دوبارہ اس کے مزاج میں دیکھ کر قدرے مطمئن ہو
 گئی تھیں اسی لیے اثبات میں سر ہلادیا۔
 ”اوکے! تم آرام کرو گڈ نائٹ وہ مدحیہ کا گال تھک کر چلی گئیں اور مدحیہ عدیل عمر سے محبت کا ادراک لیے
 جوں کی توں بیٹھی رہ گئی۔ اور پھر نہ جانے کتنی دیر گزر گئی کہ وہ یکدم سے ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔
 ”یہ نہیں ہو سکتا یہ۔۔۔ یہ میرے دل کا پاگل پن ہے، یہ صرف میرے دماغ کا خلل ہے، ورنہ وہ کون ہے؟ کیا
 ہے؟ میں کچھ بھی نہیں جانتی، محض ایک دوبارہ دیکھ لینے سے بھی کبھی محبت ہوئی ہے بھلا۔۔۔ محبت کے لیے تو ایک
 عمر چاہیے ہوتی ہے، یہ اک بار دیکھنے کا یا پھر اک بار ملنے کا کھیل تو نہیں ہے نا، یہ تو پوری زندگی کی بازی ہے اور
 بازی اتنی آسانی سے تو نہیں لگ جاتی؟ بس مجھے اس کا ورکشاپ میں کام کرنا اچھا نہیں لگا، اس سے زیادہ تو اور کچھ
 نہیں۔۔۔ وہ مرے باجیسے میری بلا سے مجھے ہلکان ہونے کی کیا ضرورت ہے بھلا۔۔۔؟ عدیل عمر صرف عدیل عمر ہے
 اور کچھ نہیں، کچھ نہیں، کچھ نہیں۔“ اس نے بری طرح عدیل کی ذات کی نفی کرتے ہوئے سردا میں بائیں جھٹکا
 تھا اور عدیل کا بھوت سر سے اتار پھینکا تھا وہ جب سے عدیل کو ورکشاپ میں کام کرتے دیکھ کر آئی تھی تب سے
 مسلسل سوچوں میں اور اپنے آپ سے جنگ میں پھنسی ہوئی تھی لیکن اب اس نے سب کچھ ذہن سے جھٹک ڈالا
 تھا اور اپنے چہرے کی کیفیت مٹانے کی غرض سے واش روم میں گھس کر چہرے پہ ٹھنڈے پانی کے چھپا کے مارنے
 لگی تاکہ اس کے تپتے ہوئے اعصاب کچھ ڈھیلے پڑیں اور پھر بارنچ منٹ بعد وہ واش روم سے نکل کر ڈریسنگ ٹیبل
 کے سامنے آکھڑی ہوئی اور ابھی وہ تو لیے سے اپنا چراغ خشک کر رہی تھی جب اس کی نظر ڈریسنگ ٹیبل پہ رکھی سرخ
 رنگ کی غٹلی ڈیبا پہ جا پڑی۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر وہ ڈیبا اٹھالی اور پھر آہستگی سے اس ڈیبا کو کھول بھی لیا تھا۔۔۔ اس ڈیبا میں جگمگاتی ڈائمنڈ
 رنگ مدحیہ کے لیے جیزی کی طرف سے ایک سوالیہ نشان تھا ہاں یا نہ؟
 اور مدحیہ فی الحال اس ہاں یا نہ کا فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی اس لیے اس نے سختی سے لب بھینچتے
 ہوئے وہ ڈیبا دوبارہ بند کی اور ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں پینچ ڈی تھی اور بیڈ روم کی تمام لائٹس آف کر کے بیڈ پہ ڈھیر
 ہو گئی۔

سناٹا ہر سو پھیل چکا تھا رات گہری سے بھی گہری ہو رہی تھی اندھیرا بھگ رہا تھا اور خیال بھٹک رہے تھے جا
 بجا دل سے دماغ تک، یہاں سے وہاں تک، ورکشاپ سے اس کے بیڈ روم تک، اس کی ذات سے اس کی محبت
 تک، ہر طرف ہر سو بس خیال ہی خیال تھے صرف اور صرف عدیل عمر کے۔ گویا وہ دماغ سے جھٹک دینے سے

اسی ہلکا نہیں گیا تھا۔



”کیا دیکھ رہے ہو منصور حسین۔۔۔؟“ وہ کافی دیر سے روشنیوں میں ڈوبی حویلی کی مضبوط اور بلند عمارت کو ٹھنکی
 ہانڈے دیکھ رہا تھا جب عارف نے اس کے کندھے پہ ہاتھ مارتے ہوئے اسے متوجہ کیا تھا۔
 ”شان و شوکت دیکھ رہا ہوں۔“ وہ واقعی دانیوں کی طرح سچی حویلی کو حیرت اور انجھٹے سے دیکھ رہا تھا۔
 حویلی کی شان و شوکت دیکھنی ہے تو کل دیکھنا، جب علیزے بی بی کا برتھ ڈے ہو گا اور امیر کبیر لوگ اپنی بیگمات
 کے ساتھ یہاں وہاں ٹہلتے ہوئے دکھائی دیں گے۔“
 عارف حویلی کا کافی پرانا ملازم تھا اس لیے حویلی کی شان و شوکت سے بھی کافی اچھی طرح واقف تھا جبکہ منصور
 حسین نیا تھا اور اس کے لیے حویلی کی شان و شوکت بھی نئی تھی۔
 ”ہو نہ! حویلی کی شان و شوکت دیکھنی ہے تو پرسوں دیکھنا، جب تمہیں یہاں وہاں کوئی بھی ٹہلتا ہو او دکھائی نہیں
 دے گا۔“ منصور حسین نے کافی تمسخرانہ انداز میں کہا تھا جس پہ عارف کو کچھ سمجھ نہیں آئی تھی۔
 ”کیا مطلب ہے منصور حسین۔۔۔؟“

”مطلب ہے کہ جب کوئی فنکشن ہوتا ہے تو بڑی رونق ہوتی ہے، بڑی روشنیاں ہوتی ہیں، بڑی چل پھل
 ہوتی ہے، لیکن جب فنکشن ختم ہو جاتا ہے تو ہر طرف سنائے چھا جاتے ہیں، دیرانی اور بے رونقی سی ہو جاتی ہے
 اب کچھ بھی اچھا نہیں لگتا، اپنی شان و شوکت سے بھی بندھ آتا جاتا ہے۔“ منصور حسین نے اسے وضاحت سے
 بتایا اور عارف کو سر اثبات میں ہلاتے ہوئے اس سے اتفاق کرنا ہی پڑا تھا۔
 ”ہوں! ٹھیک کہہ رہے ہو یار! ایسا ہی ہوتا ہے۔“

”ارے! تم لوگ یہاں بیٹھے باتیں بنا رہے ہو۔ اتنا نہیں سوچتے کہ آکر میرا ہاتھ ہی بٹاؤ۔“ مبارک خان گیٹ
 کی طرف جاتے جاتے ان دونوں کو دیکھ کر رک گیا۔
 ”کیا تم ہمارا ہاتھ بٹاتے ہو؟ کبھی عارف کی جگہ چوکیداری کی تم نے؟“ کبھی میری جگہ ڈرائیوری کی تم نے۔۔۔
 کبھی تمہیں ہماری تھکن کا احساس ہوا۔۔۔ نہیں نا؟ تو پھر ہم تمہارا احساس کیسے کریں؟ تمہارا ہاتھ کیوں ہٹائیں ہم؟
 منصور حسین نے مبارک خان کو کھری کھری سنائی تھی اور مبارک خان جھنجھلا گیا۔
 ”یار! تم سے تو بات کرنا ہی فضول ہے نہ جانے کس مٹی سے بنے ہو تم، روکے اور سڑیل، سامنے والے کا لحاظ
 بھی نہیں کرتے۔“ مبارک خان بہت بد مزہ ہوا۔

”اس زمانے میں کوئی کسی کا لحاظ نہیں کر رہا مبارک خان صاحب۔۔۔ یہاں سب کو اپنی اپنی پڑی ہے، کسی سے
 شکوہ کرنا سب سے بڑی غلطی ہے یہاں اور آئندہ اس غلطی سے پرہیز کرنا، کیونکہ یہاں سب نے اپنا اپنا کام خود کرنا
 ہے۔ اس لیے ہاتھ بٹانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور ویسے بھی بڑے صاحب کے خاص ملازم تم ہو، ہم نہیں،
 تم کسے کر سکتے ہو وہ ہم کیسے کر سکتے ہیں بھلا۔۔۔؟“ منصور حسین تو ہندے کا دماغ دھوکے رکھ دیتا تھا مبارک خان تو
 شکوہ کر کے پچھتایا۔

”منصور حسین۔۔۔! منصور حسین۔“ رجو دور سے ہی آوازیں دیتی ہوئی آ رہی تھی اس نے گردن موڑ کر اپنی
 طرف آتی رجو کو دیکھا۔
 ”فرمائیے کینز! کیا پیغام لائی ہیں؟“ منصور حسین کا انداز استہزائیہ تھا جس پہ مبارک خان نے اسے گھور کے
 دیکھا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ پیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا
- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

”بڑے صاحب نے بلایا ہے تمہیں۔“ رجنے اپنی سانس ہموار کرتے ہوئے کہا۔
”اور کچھ؟“

”ان سے جا کر پوچھ لو وہ بتاویں گے اور کچھ۔“ رجنے خفگی سے کہا۔

”ارے! کیا ہو گیا ہے تم سب کو؟ سب مجھ پہ ہی اکڑ رہے ہو۔؟ میرا قصور تو بتاؤ؟“ منصور حسین نے حیرت سے کہا۔

”اپنے قصور بعد میں پوچھنا پہلے بڑے صاحب کی بات سن لو جا کر وہ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“ مبارک خان کا لہجہ بھی خفگی لیے ہوئے تھا منصور حسین کندھے اچکا تا ہوا کھڑا ہو گیا اور رجو بیغام دے کر خود گوار رز کی سمت بڑھ گئی۔

”پلیز آؤ بھائی! آپ اس طرح نہیں جاسکتے، پہلے آپ مجھے بتائیں کہ آپ مجھ سے کس لیے ناراض ہیں۔“ علیزے کی آواز یہ منصور حسین کے قدم ٹھہر گئے اس کی آواز بائیں طرف والے لان کے کونے سے آرہی تھی گویا اس کے ساتھ آؤر بھی تھا۔

”میں تم سے ناراض نہیں ہوں یا رجنے کیوں اتنی ٹینشن لے رہی ہو؟“ یہ نرم سی آواز آؤر کی تھی۔
”تو پھر آپ مجھ سے سیدھے منہ بات کیوں نہیں کرتے۔؟ جہاں میں ہوں آپ چلے جاتے ہیں؟ ابھی بھی میں آئی ہوں اور آپ اندر جا رہے ہیں۔؟ یہ ناراضی نہیں تو اور کیا ہے؟“ علیزے کی آواز ٹھیک رہی تھی اور لہجہ روہانسا ہو رہا تھا۔

”یہ ناراضی نہیں ہے میری جان! ضروری نہیں کہ انسان اسی وقت کتراتا ہے جب ناراض ہوتا ہے، کسی سے کترانے کے لیے کچھ اور وجوہات بھی ہو سکتی ہیں، میرا تم سے کترانا تمہارے حق میں ہی بہتر ہو گا۔“ منصور حسین دیکھ رہا تھا آؤر علیزے کو سمجھانے کی خاطر اس کے دونوں ہاتھ تھام کے نرمی سے ٹھیک رہا تھا کیونکہ چھوٹے سے دل کی علیزے آؤر کی ذرا سی بے رخی اور لا تعلقی پہ پھم پھم نیر بہا رہی تھی وہ کب سے آؤر کو ڈھونڈتی پھر رہی تھی لیکن وہ اسے میسر ہی نہیں آ رہا تھا اور جیسے ہی وہ اسے لان میں ٹھلکا ہوا دکھائی دیا وہ فوراً اس کے پیچھے لان میں آگئی تھی۔

”مجھے میرے حق میں ایسی بہتری نہیں چاہیے جو آپ کی لا تعلقی اور بے رخی کی وجہ سے آئے“ آپ جیسے پہلے تھے آپ کو میرے ساتھ ویسا ہی رہنا ہے میں کبھی کسی کی بھی ناراضی اور لا تعلقی برداشت نہیں کر سکتی، آپ تو پھر آپ ہیں۔“ علیزے آنسوؤں کے درمیان جھنجھلاتے ہوئے کہہ رہی تھی اور آؤر اس کی بات پہ اس کی اتنی محبت اور اس کی معصومیت بے ساختہ مسکرا دیا۔

”اوکے اوکے! نہیں ہوتا میں تم سے لا تعلق“ بس تم اپنے یہ آنسو ختم کرو اور پیاری سی مسکراہٹ سے مسکرا دو۔“ آؤر نے پیار سے کہتے ہوئے اس کا گال تھپکا اور علیزے روتے روتے مسکرا دی تھی وہ دونوں لان میں کھڑے تیز روشنیوں میں صاف دکھائی دے رہے تھے منصور حسین نے ان سے نظریں ہٹا کر سر جھٹکا اور قدم دوبارہ اندر کی طرف بڑھا دیے تھے۔

”السلام علیکم! اس نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھتے ہوئے کافی دھیمی آواز میں سلام کیا کیونکہ ڈرائنگ روم میں چھائی خاموشی اسے پہلے قدم پر ہی محسوس ہو گئی تھی۔
وعلیکم السلام! آؤ بیٹھو۔“ عبدالقیوم رضوی نے اسے سامنے والے صوفے پہ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”جی! کیسے۔۔۔“ انسپکٹر شہناز کا دل دھڑک رہا تھا کہ نہ جانے کیا ہو گیا ہے جس کے لیے انہوں نے اسے فون کر کے وقت سے پہلے ہی گھر بلا لیا تھا۔

”یہ لیٹر ہے تمہارے لیے۔“ انہوں نے ہاتھ پکڑا کاغذ بیٹی کی سمت بڑھا دیا۔

”میرے لیے لیٹر۔۔۔؟ کس نے بھیجا ہے؟“ انسپکٹر شہناز کو اچنبھا ہوا۔

”خود دیکھ لو“ وہ خود سے کچھ بھی نہیں بتانا چاہتے تھے اس لیے کاغذ ہی اسے تھمایا تھا اور اگلے پانچ سیکنڈ میں مختصر سی تحریر پر نظر دوڑاتے ہوئے انسپکٹر شہناز یکدم اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

”واٹ؟ مومنہ بی بی چلی گئی؟“ انسپکٹر شہناز کو مومنہ بی بی کا لیٹر بڑھ کر شاک لگا تھا۔

”لیکن ابی جان! آپ نے اسے جانے کیوں دیا ہے؟“ انسپکٹر شہناز کا پریشانی کے مارے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔

”وہ ہمیں بتا کر جاتی تو ہم اسے روکتے۔۔۔؟ اس نے ہمیں بتایا ہی نہیں بس چپ چاپ بغیر کچھ بتائے اٹھ کر چلی گئی۔“

عبدالقیوم رضوی خود بھی بے حد پریشان اور متفکر نظر آرہے تھے۔

”تو چوکیدار کہاں مر گیا تھا۔۔۔؟ وہ تو اسے روک سکتا تھا یا پھر اسی وقت مجھے بتا سکتا تھا؟“ انسپکٹر شہناز کا غصہ عود کے آیا تھا وہ یونہی کاغذ ہاتھ میں پکڑے دندناتی ہوئی باہر نکل آئی چوکیدار کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اسے پتا تھا کہ اس کی شامت ضرور آئے گی۔

”بی بی جی! مجھے نہیں پتا تھا کہ وہ چلی جائیں گی میں گیٹ بند کر کے نہانے کے لیے چلا گیا تھا انہوں نے خود ہی گیٹ کھولا اور خود ہی چلی گئیں۔“ چوکیدار نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

”تو کیا چار گھنٹے تم نہاتے ہی رہے ہو کہ تمہیں پتا نہیں چلا۔۔۔؟“

انسپکٹر شہناز غصے سے بھرک رہی تھی اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کیا کر ڈالے۔

”نہیں بی بی جی! مجھے تو بس دس منٹ ہی لگے تھے اور دس منٹ بعد میں واپس آیا تو گیٹ کھلا ہوا تھا۔“ چوکیدار اسے صفائی دے رہا تھا۔

”دس منٹ میں وہ کہاں تک جاسکتی تھی بھلا۔۔۔؟ تم نے اس کا پیچھا بھی نہیں کیا؟“ انسپکٹر شہناز مٹھیاں بھیجنے رہی تھی اور چوکیدار پہ غراری تھی وہ بے چارہ برا پھنسا تھا۔

”ہمیں بتانے تک دس منٹ نہیں بلکہ بیس پچیس منٹ گزر چکے تھے اور بیس پچیس منٹ میں تم جانتی ہو کہ آدمی کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے اس لیے اس کا پیچھا کرنا فضول تھا ہم نے ہی اسے اس کے پیچھے جانے سے روکا تھا۔“ عبدالقیوم رضوی چوکیدار کے لیے ڈھال بن گئے تھے جبکہ انسپکٹر شہناز اپنے والد صاحب کی لاجک پہ اپنا سر پیٹ کے رہ گئی تھی۔

”ابی جان! یہ کیا کر دیا آپ نے۔۔۔؟ وہ بیس پچیس منٹ میں بھی کہیں نہیں جاسکتی تھی، کیونکہ اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔“ ایک روپیہ بھی نہیں تھا اس نے جہاں بھی جانا تھا پیدل جانا تھا اور پیدل چلنے والا اتنی دیر میں بھلا کہاں تک جاسکتا ہے۔۔۔؟“ انسپکٹر شہناز جھنجھلا رہی تھی اور عبدالقیوم رضوی بھی اپنی اس غلطی پہ ذرا ویر کے لیے خاموش ہو گئے تھے۔

”اب۔۔۔ اب میں اسے کہاں تلاش کروں۔۔۔؟ اور۔۔۔ اور دل اور شاہ کو کیا جواب دوں گی کہ ایک پولیس آفیسر ہونے کے باوجود مجھ سے ایک لڑکی تک نہیں سنبھالی گئی۔۔۔؟“ انسپکٹر شہناز بمشکل اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے پاؤں پختی ہوئی گاڑی کی سمت بڑھی اور ایک جھٹکے سے گاڑی اشارت کرتے ہوئے گاڑی نکال لے گئی تھی

اور عبدالقیوم رضوی دیکھتے رہ گئے تھے۔

رات کو نوب کے کاٹم تھا اندھیرے کا راج گہرا ہو چکا تھا اور اس اندھیرے کا غلام پورا شہر مصنوعی روشنیوں کے زیر اثر جگمگا رہا تھا بے شک روخیاں بہت تھیں لیکن رات بھی آخر رات تھی اور اس رات میں کسی کو ڈسوںڈنا آسان کب تھا بھلا۔۔۔؟ لیکن انسپکٹر شہناز پھر بھی یہ مشکل کام کرنے کے درپے تھی اور اس کام میں وہ چاہ کر بھی پولیس کی مدد نہیں لے سکتی تھی کیونکہ ساتھ ساتھ ملک حق نواز کا دھڑکا بھی لگا ہوا تھا اس لیے اسے یہ کام خاموش رہ کر کرنا تھا۔

رات کے سوانوب کے کا وقت تھا جب اس نے ایک روڈ سے دوسرے روڈ پہ یوٹرن لیا تھا اور ساتھ ہی اسپید بڑھا دی تھی، لیکن اگلے ہی پل اسے بریک پہ پاؤں رکھنا پڑ گیا اور گاڑی کے ٹائر زور سے چر چرائے تھے کیونکہ کوئی اس کی گاڑی سے ٹکرا کر یکدم دور جا کر اٹھا جس پہ نیبل حیات کا داغ چکرا گیا تھا۔

”اوہ مائی گاڈ! یہ کیا ہو گیا ہے۔۔۔؟“ نیبل حیات گھبرائے ہوئے انداز میں بہت عجلت کے ساتھ گاڑی سے نکل آیا تھا گاڑی کی ہیڈلائٹس آن تھیں اس لیے اسے دور سے ہی پتا چل گیا تھا کہ گاڑی سے ٹکرانے والی لڑکی ہے اس نے کافی بڑی سی چادر اوڑھی ہوئی تھی جو اس ایکسیڈنٹ سے گرنے کی وجہ سے اس کے اوپر سے سرک گئی تھی۔

”آپ۔۔۔ آپ ٹھیک تو ہیں نا۔۔۔؟“ نیبل نے ذرا جھٹکتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر اسے سیدھا کیا لیکن وہاں اتنی ہمت اور اتنی تسک نہیں تھی کہ اس کے سوال کا جواب دیا جانا وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں تھی کیونکہ اس کے سر پہ شدید چوٹ آئی تھی۔

”ہیلو پلیز آنکھیں کھولیں۔“ نیبل کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ ایسی پچویشن پہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔

”ارے صاحب! بے چاری کے چوٹ لگی ہے، مہرجائے گی فوراً“ ہسپتال لے جاؤ ورنہ سختی سے چڑھا دیے جاؤ گے۔“ اس کے قریب سے دو آدمی گزرتے ہوئے ٹھہر گئے تھے انہوں نے نیبل کو اس حادثے کی سنگینی سے آگاہ کیا ورنہ کوئی اور لوگ ہوتے تو اتنا شور مچاتے کہ نیبل کی جان کو آجاتے یہ دونوں آدمی اتنے تھے اس لیے مخلصانہ مشورہ دیا تھا۔

”تھینک یو! میں ابھی انہیں ہسپتال لے جاتا ہوں۔“ نیبل نے اس پہ جھٹکتے ہوئے اسے دونوں بازوؤں میں اٹھایا اور تیزی سے گاڑی کی سمت بڑھا گاڑی کا ڈور بند تھا اس لیے ان دو آدمیوں میں سے ایک نے آگے بڑھ کے ڈور کھولا اور اس لڑکی کو گاڑی میں ڈالنے کے لیے مدد دی تھی۔

”اور ہاں صاحب! آپ شکل سے شریف اور اس شہر سے انجان لگتے ہیں۔“ اس لیے آپ کے لیے ایک اور مشورہ ہے۔“ اس آدمی نے ڈور بند کرتے ہوئے کہا۔

”جی! کیسے۔۔۔“ نیبل فرنٹ ڈور کھولتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھ گیا تھا۔

”اس لڑکی کی حالت دیکھ کر لگتا ہے کہ اسے زیادہ نقصان نہیں پہنچا اس لیے ہسپتال میں ڈاکٹر کی پوچھ پڑتال اور جھنجھٹ میں پڑنے سے بہتر ہے کہ آپ انہیں اپنے کسی پرسنل ڈاکٹر میرا مطلب ہے کہ فیملی ڈاکٹر سے ٹریٹ منٹ کروالیں ورنہ ہسپتال والے آپ کی جان نہیں چھوڑیں گے۔“ اس آدمی نے ایک اور مشورہ دیا جس پر نیبل واقعی اس آدمی کا مشکور ہوا اور ہاتھ گاڑی سے نکالتے ہوئے اس سے ہاتھ ملایا۔

”تھینک یو سوچ بھائی صاحب بہت مدد کی آپ نے میری۔“

”اُس اوکے سرا انسانیت کے ناتے یہ سب کچھ بھی نہیں ہے؟“ اس آدمی نے انکساری سے کہا اور پھر قدم پیچھے ہٹا لیا۔

”اللہ حافظ۔“ نبیل نے اللہ حافظ کہتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی لیکن اب اس آدمی کے مشورے سے اس کا ہسپتال جانے کا ارادہ بدل گیا تھا اس کا رخ اب گھر کی طرف تھا اس نے اسپید مزید بڑھاتے ہوئے ذرا کی ذرا گرون تر چھی کر کے پچھلی سیٹ پہ پڑی اس لڑکی کو دیکھا تھا وہ ہلکی ہلکی آواز میں کراہ رہی تھی شاید اس کے سر پہ چوٹ آئی تھی اس لیے یقیناً اس کے سر میں درد ہو رہا تھا لیکن بے ہوشی کے باعث وہ نہ تو کچھ دیکھ پا رہی تھی اور نہ ہی حرکت کر رہی تھی بس اس کے حلق سے عجیب و غریب آواز نکل رہی تھی جس پہ نبیل کی پریشانی اور بھی بڑھ گئی وہ کشمکش کا شکار ہونے لگا کہ اسے ہسپتال لے کر جائے یا پھر اپنے گھر؟

لیکن پھر اس آدمی کے مشورے کو ترجیح دیتے ہوئے اس نے گھر جانے کا ہی فیصلہ کیا اور اگلے چندرہ منٹ بعد وہ اپنے گھر کے پورج میں گاڑی پارک کر چکا تھا اور گاڑی سے اتر کر تیزی سے پچھلی سیٹ کی طرف آیا اور ڈور کھول کر اس لڑکی کو گاڑی سے نکال کر اندر کی سمت قدم بڑھا دیے تھے۔ وہ راہداری سے گزر کر ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ رہا تھا جب سامنے سے سیڑھیاں اترتی مدحیہ ٹھٹھک کر رک گئی تھی۔

”بھائی! یہ کیا ہوا ہے۔۔۔؟ کون ہے یہ لڑکی۔۔۔؟“ مدحیہ پہلے رکی تھی پھر تیزی سے قریب آگئی لیکن نبیل کوئی بھی جواب دیے بغیر ڈرائنگ روم میں داخل ہوا اور اس لڑکی کو صوفے پہ ڈال دیا تھا۔

”بھائی! کون ہے یہ؟“ مدحیہ اس لڑکی کی حالت دیکھ کر پریشان ہو رہی تھی۔

”یار! مجھے خود نہیں پتا کہ یہ کون ہے۔۔۔؟ بس میں گھر آ رہا تھا اور یہ لڑکی اچانک راستے میں میری گاڑی سے ٹکرا گئی، ابھی تو شکر ادا کرو کہ اس کی جان بچ گئی ہے ورنہ اس وقت کوئی اور مصیبت کھڑی ہو جاتی۔“ نبیل اپنے موبائل سے ڈاکٹر کا نمبر ڈائل کرتے ہوئے مدحیہ کو بھی بتا رہا تھا۔

”تو آپ اسے ہسپتال لے کر کیوں نہیں گئے۔۔۔؟“

”ہسپتال لے کر جانا خود مصیبت میں ٹانگ اڑانے کے مترادف ہے اس لیے ڈاکٹر کو گھر بلا رہا ہوں۔“ نبیل اس وقت اپنی عقل سے نہیں کسی اور کی عقل سے کام لے رہا تھا مدحیہ کو بڑی الجھن ہوئی تھی کہ وہ ایک چلتا پھرتا پولیس کیس اٹھا کر گھر لے آیا ہے کہیں کوئی اور مصیبت نہ پڑ جائے۔۔۔؟

”بھائی! مصیبت کیسی بھلا۔۔۔؟ اس لڑکی کی جان بچ گئی ہے، دیکھنے میں بھی ٹھیک ٹھاک ہے، پھر ہسپتال سے کترانے کی وجہ۔۔۔؟“ مدحیہ کو جوابات اچھی نہیں لگی تھی وہ اس کی وضاحت چاہ رہی تھی۔

”وجہ یہ ہے کہ اس وقت رات کا وقت ہے اور یہ ایک لڑکی کا معاملہ ہے وہ لڑکی بے ہوش تھی اور میں اسے بے ہوشی کی حالت میں ہسپتال چھوڑ کر نہیں آ سکتا تھا کیونکہ قانونی لحاظ سے دیکھا جائے تو جب تک یہ لڑکی ہوش میں نہ آجائی ہسپتال والے مجھے وہاں سے ہٹانے کی بھی اجازت نہیں دے سکتے تھے مجھے اس کے ساتھ وہاں ہی بندھ کے رہنا پڑتا اور دوسری بات کہ پتا نہیں جب یہ ہوش میں آتی تو اس ایکسیڈنٹ کا سارا الزام مجھ پہ رکھ دیتی اور پولیس والے میرے سر ہو جاتے اور تیسری اور اہم بات یہ ہے کہ یہ لڑکی بہت غڈ ہال اور تھکی تھکی لگ رہی تھی اپنا پورا جسم اور چرا ڈھانپ رکھا تھا اس نے گوریہ خالی ہاتھ تھی اس کے پاس اپنے آپ کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ پہلے سے کسی مصیبت میں مبتلا تھی اس لیے میں اسے ڈاکٹر زیا پھر پولیس والوں کے حوالے کر دینا بھی ٹھیک نہیں تھا لہذا سب کچھ سوچنے کے بعد میں اسے گھر لے آیا ہوں، دیکھنے سے ہی محسوس ہو رہا ہے کہ یہ لڑکی بے ضرر ہے، ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی ڈونٹ وری۔“ نبیل نے مدحیہ کو کافی اچھی طرح ویل اور وضاحت سے سمجھایا تھا اور شکر تھا کہ وہ سمجھ گئی تھی اور سمجھنے کے ساتھ ہی اسے اس لڑکی

۔۔۔ ہمدردی محسوس ہوئی تھی۔

”نبیل بیٹا! تم اتنے لیٹ کیوں۔۔۔“ قانزہ بیگم کچھ کہتے ہوئے اندر داخل ہوئی تھیں لیکن صوفے پہ پڑی ہے اس حالت لڑکی کو دیکھ کر ٹھہر گئیں۔ ان کے چہرے کے تاثرات بھی ایسے ہی تھے جیسے تھوڑی دیر پہلے مدحیہ کے آئے تھے۔

”مدحیہ! تم مام کو ساری بات بتاؤ میں تب تک ڈاکٹر ہاشمی کو ریسو کرتا ہوں۔“ نبیل مدحیہ کا کندھا تھپک کر ہر اہل کیا اور دس منٹ بعد ڈاکٹر ہاشمی ان کے گیٹ پہ موجود تھے، نبیل انہیں اپنے ساتھ لیے اندر آگیا ڈاکٹر ہاشمی نے اس لڑکی کا تفصیلی چیک اپ کیا اور درد کے انجکشن اور کچھ ٹیبلٹس دینے کے بعد چلے گئے تھے، نبیل نے ان کے سامنے یہی ظاہر کیا تھا کہ وہ لڑکی ان کی کزن ہے اور اچانک سیڑھیوں سے گر گئی ہے اسی لیے ڈاکٹر ہاشمی کی تسلی ہو گئی تھی اور ویسے بھی وہ جانتے تھے کہ نبیل حیات دل اور شاہ کا دوست ہے اور اس حوالے سے قابل اعتبار بھی ہے، نبیل ان کو رخصت کرنے کے بعد واپس آیا اور صوفے پہ ڈھے گیا۔

”اف! اتنی تھکن پورا دن اتنے کام نبٹاتے ہوئے نہیں ہوئی جتنی اس ایک گھنٹے میں ہو گئی ہے۔“ نبیل نے اپنے دونوں ہاتھ بالوں میں پھنسا لیے تھے۔

”چائے لیں گے۔۔۔؟“ نہ جانے کیوں اور کیسے مدحیہ کو اس کی تھکن کا احساس ہوا تھا اور اس نے خود ہی اس سے چائے کا پوچھ لیا تھا۔

”ضرور لوں گا، لیکن اگر تم خود بنا کر لاؤ تو۔۔۔“ نبیل نے آنکھیں کھولتے ہوئے ڈائریکٹ مدحیہ کی سمت دیکھا۔

”جی! ابھی بنا کر لاتی ہوں۔“ مدحیہ اٹھ کر چلی گئی۔

”دیکھو بیٹا! اس لڑکی کا اس طرح ڈرائنگ روم میں پڑے رہنا مناسب نہیں ہے، تم اسے کسی روم میں شفٹ کر دو۔“ قانزہ بیگم کو اس لڑکی کا صوفے پہ پڑے رہنا کافی غیر مناسب اور معیوب لگا تھا اسی لیے کہہ بھی دیا۔

”گیسٹ روم میں شفٹ کر دوں۔۔۔؟“

”گیسٹ روم میں کیسے شفٹ کرو گے، گیسٹ روم کے دروازے کالا ک خراب ہے، چارپانچ روز ہو گئے ہیں میں نے چیک کیا تھا لاک ہی نہیں کھل رہا۔“ قانزہ بیگم نے اسے براہم بتائی۔

”تو پھر کہاں شفٹ کرنا ہے اسے۔۔۔؟“ نبیل ماں سے پوچھ رہا تھا۔

”میرے بیڈ روم کے ساتھ والا بیڈ روم خالی ہے اسے وہاں شفٹ کروں، میں رات کو اس کے پاس ہی رہ لوں گی۔“ مدحیہ نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے کہا اور چائے کا کپ نبیل کو تھما دیا۔

”لیکن بیٹا! تم کیسے اس کے پاس رہ سکتی ہو؟ یہ پتا نہیں کون؟“

”اوہ کم آن ماما! ایسی چھوٹی پھوٹی باتوں کی ٹینشن نہیں لیتی چاہیے، کچھ نہیں ہوتا، یہ لڑکی خود زخمی ہے بیمار حالت میں ہے اور ہمارے ہی رحم و کرم پہ ہے، یہ ہمیں نقصان نہیں پہنچا سکتی اور ویسے بھی کسی نہ کسی نے تو اس کے پاس رہنا ہی ہے نا۔۔۔ تو پھر یہی بہتر ہے کہ میں ہی رہ لوں، مجھے تو ویسے بھی رات گئے تک نیند نہیں آتی، میں آسانی سے جاگتی رہوں گی، اب یہ کام نبیل بھائی تو نہیں کر سکتے؟ وہ خود ٹھکے ہوئے آئے ہیں اب آرام کریں گے اور آپ بھی ماشاء اللہ اپنے ہنرینڈ کے ساتھ ہوتی ہیں اس لیے آپ کے رہنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لہذا

تکوم پھر کے بات مجھ پر ہی آجائی ہے، سو میں حاضر ہوں۔“ مدحیہ کے جواب پہ وہ دونوں ماں بیٹا دیکھتے رہ گئے تھے کہ یہ کیا ماجرا ہو گیا ہے۔۔۔؟ کیا وہ اپنے علاوہ بھی دوسروں میں انٹرست لے سکتی ہے۔۔۔؟

”اوکے! میں اس لڑکی کو وہاں ہی شفٹ کر دیتا ہوں، تم وہ بیڈ روم کھلو دو۔“ نبیل نے اس کی بات سے کوئی اختلاف نہیں کیا تھا اور اسے اجازت دیتے ہوئے چائے کے سبب لینے لگا۔

”ہوں! چائے بہت اسٹرانگ ہے۔“ نیل کو چائے کا ٹرک ڈالنے پہلے سب یہی محسوس ہو گیا۔

”اسٹرانگ چائے اور اسٹرانگ چاہ

بندے کے دل و دماغ کے سارے کس بل نکال کے رکھ دیتی ہے، بندہ فریض ہو کے رہ جاتا ہے۔“ مدیحہ مسکرا کر کہتی ہوئی پلٹ گئی۔

”یہ تو دل آورے والی سوچ ہے۔“ نیل ہلکے سے مسکرایا۔

”بالکل! سوچ انہی کی ہے، بس بیان میں کر رہی ہوں۔“ وہ بھی جواباً مسکرا کر بولی۔

”کیوں۔۔۔؟“ وہ چائے کے سب لیتے ہوئے لطف اندوز ہو رہا تھا کیونکہ وہ اسٹرانگ چائے اس کے اعصاب کو واقعی تقویت پہنچا رہی تھی۔

”کیونکہ ان کی سوچ میری سوچ سے ملتی ہے۔“

”ہوں! یہ تو میں بھی مانتا ہوں۔“ وہ کپ خالی کر کے رکھتے ہوئے کھڑا ہو گیا اور مدیحہ باہر نکل گئی اس نے ملازمہ کو بلا کر کمر کھلوایا تھا اور بستر وغیرہ ٹھیک کر دیا، آگنی پھر نیل نے اس لڑکی کو اوپر مدیحہ کے ساتھ والے بیڈ روم میں شفٹ کر دیا اور خود اپنے بیڈ روم میں چلا گیا اب اس لڑکی کی ذمہ داری مدیحہ حیات پہ تھی۔ اب اس نے رات بھر جاگنا تھا اور اس لڑکی کی دیکھ بھال کرنی تھی۔

”دانیال! کہاں جا رہے ہو تم۔۔۔؟“ آذر اندرونی مین ڈور کی سمت بڑھ رہا تھا لیکن انیکسی کی طرف سے نکل کر گاڑیوں کی سمت بڑھتے دانیال کو دیکھ کر قدم رک گئے۔

”مارکیٹ۔“ دانیال نے گاڑی کی چابی لہراتے ہوئے اسے اشارہ دیا۔

”کیوں۔۔۔؟ اس وقت کیوں جا رہے ہو؟“ آذر کو اچھٹا ہوا۔

”ارے یار! اس وقت کو کیا ہوا ہے۔۔۔؟ ابھی تو دس بجے ہیں۔“ دانیال نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

”اوہ ہاں! لیکن تم جا کیوں رہے ہو۔۔۔؟“ آذر نے بھی اپنی گھڑی سے ٹائم دیکھ لیا تھا اسی لیے حیرت قدرے کم ہو گئی تھی، آج کل دراصل سرائیکی لمبی راتیں شروع ہو چکی تھیں اس لیے رات کے دس گیارہ بجے بھی آدھی رات کا سا گمان ہوتا تھا۔

”آج آؤ، بتاؤ! تمہارے پھر۔۔۔“ دانیال گاڑی کا ڈور کھولتے ہوئے بولا۔

”میں کیوں آجاؤں؟ میرا کیا کام بھی بھلا۔۔۔؟“ آذر نے دور سے ہی انکار کر دیا۔

”ارے آجاؤ یار! اپنے بیڈ روم میں بیٹھ کر بھی تو پورے ہونا ہے تم نے۔۔۔؟“ دانیال نے ذرا خفگی سے کہا جس پہ نہ چاہتے ہوئے بھی آذر کو اتنا ہی پڑا، دانیال نے خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے اس کے لیے فرنٹ ڈور کھول دیا تھا اور آذر اس کے برابر فرنٹ سیٹ پہ براہمان ہو گیا اور جیسے ہی گاڑی کی ہیڈلائٹس آن ہوئیں چوکیدار نے فوراً ”گیٹ کھول دیا تھا۔“

”ہاں اب بتاؤ؟ کہاں جا رہے ہو؟ اور کیوں جا رہے ہو؟“ گاڑی مین روڈ پہ آتے ہی آذر نے سوال داغ دیا۔

”مارکیٹ جا رہا ہوں یار! علیزے کے لیے برتھ ڈے گفٹ لینے کے لیے۔ دانیال نے کافی سکون سے جواب دیا تھا جبکہ آذر اس کے جواب پہ چپ ہو گیا تھا۔

”کیا بات ہے؟ چپ کیوں ہو گئے ہو؟“ دانیال نے قدرے توقف سے اسے دوبارہ متوجہ کیا تھا۔

”نہیں! کچھ نہیں۔۔۔“ اس نے آہستگی سے نفی میں گردن ہلائی۔

”کیا تم نے گفٹ نہیں لیا علیزے کے لیے۔؟“ دانیال نہ جانے کیوں اسے کھونج رہا تھا۔

48

”میں اس کے لیے گفٹ لوں گا تو افسانہ بنے گا۔“ آذر نے تلخی سے کہتے ہوئے سر جھٹکا۔

”کوئی افسانوی بات ہو تو افسانہ بنتا ہے نا؟“ دانیال نے ہلکے سے چوٹ کی تھی۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ آذر نے یکدم دانیال کی سمت دیکھا۔

”میرا مطلب ہے کہ ہمارے گفٹس کا افسانہ کیوں نہیں بنتا۔۔۔؟ صرف تمہارا ہی کیوں۔۔۔؟“ دانیال کا سوال بھی بجا تھا۔

”یہی تو میں کہتا ہوں کہ صرف میرا ہی افسانہ کیوں نہیں بنتا ہے۔۔۔؟“ آذر جھنجھلا رہا تھا۔

”کیونکہ تمہاری ساری حرکتیں افسانوی سی لگتی ہیں، تم اتنے پیٹڈ سم ڈیشننگ اور ریزرو سے بیک مین ہو ہمیشہ اپنے کام سے کام رکھتے ہو، سب کمزور سے بڑے ہو، اس لیے کافی ذمہ دار اور سمجھ دار بھی ہو، لیکن اس کے باوجود علیزے کی کیڑے کیڑے کرتے ہو جیسے تمہیں اور کوئی کام ہی نہ ہو، ایسے میں دیکھنے اور سننے والوں کو تھوڑا دل میں کالا تو لگے گا نا۔۔۔؟ آخر دیکھنے اور سننے والے بھی دماغ، عقل اور سوچ رکھتے ہیں۔۔۔؟ جس سے وہ کوئی بھی افسانہ بنا سکتے ہیں، اس لیے ان کی سوچ اور افسانے کا قصور نہیں ہے یا۔۔۔ بلکہ تمہارا اپنا قصور ہے۔“ دانیال آج پھر اشارت ہو چکا تھا۔

”میرا قصور ہے۔۔۔؟“ آذر نے حیرت اور اچھٹے سے اپنی طرف اشارہ کیا۔

”قصور ہے نا، سارا قصور ہی تمہارا ہے، وہ بات وہ راز وہ جذبات جو تم نے کب سے دل میں دبائے پھر رہے ہو، وہ تمہیں بہت پہلے ظاہر کر دینے چاہیے تھے تاکہ دوسروں کو بھی تمہارے جذبات کا پتا چل جاتا اور کوئی تمہارے بارے میں سوچنے کی کوشش بھی نہ کرتا۔“ دانیال کا اشارہ کوئل کی طرف تھا۔

”یار! ایسا کچھ نہیں ہے جیسا تم کہہ رہے ہو۔“ آذر اب بھی انکاری تھا۔

”تو پھر قسم دو مجھے کہ ایسا کچھ نہیں ہے، تمہارے دل میں علیزے کا خیال تک نہیں ہے۔۔۔ تمہارے ہاتھ میں اگر کوئل کا ہاتھ تھمایا جائے تو تم تمام لوگ۔۔۔؟ تمہیں اور تمہارے دل کو ذرا پروا نہیں ہوگی؟“ دانیال نے آذر کو بری طرح گھیرے میں لے لیا تھا وہ نہ ہاں کر سکتا تھا نہ نا کر سکتا تھا، وہ ایک آزمائش، ایک امتحان میں مبتلا ہو چکا تھا، جواب دینا بھی تو کیا دیتا۔۔۔؟

”بتاؤ نا؟ تمہیں اور تمہارے دل کو ذرا پروا نہیں ہوگی۔۔۔؟ کوئی فرق نہیں پڑے گا تمہیں اور تمہارے دل کو؟“

دانیال اسے آزماتا تھا اور آذر گہری سانس کھینچتے ہوئے سیٹ کی بیک سے سرٹکا کر رہ گیا۔

”دانیال! مجھے اور میرے دل کو فرق پڑے یا نہ پڑے لیکن ڈیڈ کو ضرور فرق پڑتا ہے، کیونکہ ڈیڈ نے ہمیشہ علیزے کے ساتھ مجھے دیکھا ہے اور اسی چیز کا وہ کئی بار باتوں باتوں میں اظہار بھی کر چکے ہیں۔“ آذر نے دانیال کو ڈیڈ کے ارادے سے آگاہ کرنے کی کوشش کی تھی۔

”میں جانتا ہوں اور بہت اچھی طرح جانتا ہوں، لیکن یا ر اس وقت میں ڈیڈ کو فرق پڑنے کی نہیں، تمہیں فرق پڑنے کی بات کر رہا ہوں۔۔۔ تم سے یہ کہہ رہا ہوں کہ اگر علیزے کو چاہتے ہو تو اس چاہت کو دل میں مت دباؤ، بلکہ اظہار کرو، صاف اور واضح اظہار۔“ دانیال۔۔۔ اسے کسی ایک اور حتمی فیصلے پہ اکسارہا تھا۔

”لیکن یار! کیسے اظہار کروں۔۔۔؟ علیزے ابھی بہت چھوٹی ہے۔۔۔ وہ ابھی اس چیز کو نہیں سمجھتی۔۔۔؟ میں کیوں اس کی معصومیت کو داغ دار کروں؟“ آذر خفگی سے کہہ رہا تھا۔

”کیا کہا۔۔۔؟ علیزے ابھی بہت چھوٹی ہے۔۔۔؟ واہ! کیا کہنے ہیں تمہارے۔۔۔؟ ارے محترم! ذرا عقل پہ زور، تو تمہیں احساس ہو کہ علیزے آفندی آج رات بارہ بجے کے بعد پورے بیس سال کی ہو جائے گی، اور بیس سال کی لڑکی ہو یا لڑکا ایسے جذبات سے بے بہرہ نہیں رہتا، اٹھارہ سال کی لڑکی شادی کے قابل ہو جاتی ہے اور تم

بیس سال کی لڑکی کو محبت کے قابل نہیں سمجھ رہے؟ یہ تو عمر ہوتی ہے محبت کا بیج ہونے کے لیے اور تیس سال کی عمر تک یہ بیج پوری طرح سے پروان چڑھ جاتا ہے اب تم خود سوچ لو کہ تم نے کیا کرنا ہے؟ علیحدہ کو انجان رکھنا ہے؟ یا پھر خود کو مل سے انجان رہنا ہے؟ دانیال کی باتیں خاصی گہری تھیں، آذر سوچنے پر مجبور ہو گیا۔

”تو پھر کیا کروں؟“

”اظہار کرو بھائی! اظہار کرو۔“

”مگر کیسے؟“ آذر کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

”ارے یار! اہل اس کا برتھ ڈے ہے، موقع اچھا ہے، تم کوئی ایسا گفٹ لو اس کے لیے کہ وہ سب کچھ خود بخود ہی سمجھ جائے۔“ دانیال نے گاڑی شاپنگ مال کے سامنے پارک کرتے ہوئے کہا۔

”ایسا گفٹ کیا ہو سکتا ہے بھلا؟“

”اندر آ جاؤ، بتاتا ہوں تمہیں۔“ دانیال گاڑی سے اتر گیا اور اس کے پیچھے آذر بھی گاڑی سے اتر آیا تھا۔

ہونا تو وہی ہے جو مقدر میں میرے ہے
لیکن لمحہ میرے خواب، میرے خواب، میرے خواب

”آپ کی ہر بات بجالی جان! لیکن آپ اگر سوچیں تو بیٹیاں بھی تو انسان ہی ہوتی ہیں نا۔ ان کے سینے میں بھی بد قسمتی سے دل ہی دھڑکتا ہے، اس دل میں ہزاروں حسرتیں ہوتی ہیں، ہزاروں خواہشیں، ہزاروں خواب ہوتے ہیں، اور ان ہزاروں خوابوں اور خواہشوں کو ایک دم سے گلا گھونٹ کر مار دینا اتنا آسان نہیں ہوتا، ان کو مارتے مارتے انسان خود مر جاتا ہے اور مجھے لگتا ہے کہ میں بھی مر جاؤں گی، ایک دن ایسا ہو کے ہی رہے گا۔“ آج پھر زری کے لیے بی بی جان کا فون آیا ہوا تھا، وہ اس سے واپسی کا پوچھ رہی تھیں اور زری کے دل کی دھڑکنیں پھر سے لرزنے لگی تھیں اس کے دل کے نہاں خانوں میں چھپا خوف پھر سے اُٹھ آیا تھا۔

”خدا کا خوف کرو لڑکی! ایسی باتیں کر رہی ہو۔“ بی بی جان واپل گئیں۔

”بی بی جان! اگر یہی بات میں آپ سے کہوں تو۔؟ آپ لوگ خدا کا خوف کیوں نہیں کرتے۔ بیٹیوں کی زندگیوں سے بھی کھیلے ہیں اور دلوں سے بھی؟“

نہ جانے آج کیا بات تھی کہ زری سے ضبط نہیں ہو رہا تھا وہ رخساروں پر آنسوؤں کی طرح بکھر رہی تھی، اس کے حوصلے پگھل رہے تھے۔ آج کل اس کا دل بے وجہ ہی بے چین اور مضطرب رہنے لگا تھا۔ اس کے اندر ابال اٹھتے تھے، وہ اندر ہی اندر ہونے لگتی تھی اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ پاکستان جانے کی بجائے کہیں صحراؤں کی طرف نکل جائے جہاں صرف وہ ہوتی، اس کا دل ہوتا، اس کی ذات ہوتی اور اس کا عشق ہوتا۔ کوئی دوسرا کبھی اس کی ذات اور اس کے عشق میں مداخلت نہ کر پاتا۔

”ہیلو۔۔۔ ہیلو۔۔۔ ہیلو زری بیٹا؟“ ریسپور میں سے بی بی جان کی آواز سنائی دے رہی تھی لیکن بے آواز روتی ہوئی زری انہیں کوئی جواب نہیں دے پائی تھی اور ریسپور کریڈل پہ ڈال دیا اور لاؤنچ کی وہیلز میں کھڑا عبد اللہ اندر آ گیا۔

”زری۔۔۔“ عبد اللہ کی سنجیدہ، پنی تلی اور بھاری آواز زری کے بہت قریب سے ابھری تھی، زری یکدم گڑبڑا گئی۔

”عبد اللہ بھائی آسے۔ آپ؟“ وہ بوکھلا کر اپنی جگہ سے کھڑی ہو چکی تھی۔

”بیٹھو۔۔۔“ عبد اللہ نے اسے اس کی سابقہ جگہ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”جی۔۔۔ جی؟“ زری کی رنگت متغیر ہونے لگی تھی اس نے خود کو بمشکل کرسی پر بیٹھنے کے قابل کیا تھا، ورنہ ٹانگوں کی جان تو پہلے مرحلے پر ہی ٹوٹ چکی تھی۔

”کس کا فون تھا۔؟“ وہ جانتا تھا مگر اس کے منہ سے سینے کے لیے پوچھ رہا تھا۔

”بی بی جان کا۔۔۔“ زری کی آواز بے حد دھیمی ہو چکی تھی۔

”کیا کہہ رہی تھیں۔۔۔؟“ عبد اللہ کے انداز پر زری کی جان نکل رہی تھی کہ نہ جانے اسے کیا ہوا ہے۔؟ نہ

بانے اس نے کیا بات سنی ہے کہ وہ اس حد تک نپا تلا اور سرو سپاٹ نظر آ رہا ہے۔

”واپسی کا پوچھ رہی تھیں۔“ زری نے سر جھکا رکھا تھا۔

”پھر تم نے کیا کہا؟“

”یہی کہ ہم واپس آ رہے ہیں۔“

”بس یہی کہا تم نے۔۔۔؟“

”جی۔۔۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”تو پھر روٹی کس بات پر ہو۔۔۔؟“ عبد اللہ اپنے مطلب کے سوال پر آگیا۔

”نہیں۔۔۔ نہیں کسی بات پر نہیں روٹی۔“ اس نے فوراً نفی میں گردن ہلائی۔

”دیکھو زری! دل کی بات دل میں رکھنے والے لوگ خسارے میں رہ جاتے ہیں، اور میں نہیں چاہتا کہ تم کسی

خسارے میں رہو، اس لیے بہتر ہے کہ تم بولو اور بتاؤ مجھے کہ تم کیوں روٹی ہو۔۔۔؟“ عبد اللہ کو زری کی باتوں سے لگا

تھا کہ اس کے دل میں کوئی ہے اور اس ”کوئی“ کو جاننے کے لیے وہ ساری نام نہاد عزت اور غیرت بالائے طاق

رکھتے ہوئے اس سے پوچھنے کے لیے بیٹھ گیا تھا۔

”اپنے نام کے ساتھ ملک حق نواز کا نام سن کر روٹی ہوں، اور اس لیے روٹی ہوں کہ میری ماں کو بھی میرا احساس

نہیں ہے، وہ بھی مجھے ملک حق نواز کے ساتھ رخصت کرنے پر خوش ہیں۔“ زری کی آواز پھر سے بھرا گئی تھی۔

”بس یہی بات تھی یا کوئی اور۔؟“ عبد اللہ اس کے جھٹکے ہوئے سر پر نظریں جمائے بیٹھا تھا زری نے گہرا کر

عبد اللہ کی سمت دیکھا اور پھر فوراً نظریں جھکا لی تھیں۔

”میں کیا پوچھ رہا ہوں زری۔۔۔؟ بس یہی بات تھی یا کوئی اور۔۔۔؟“ عبد اللہ نے پھر اپنی بات پر زور دیا۔

”جی! بس یہی بات تھی۔“ زری نے مرے مرے لہجے میں جواب دیا۔

”ہوں! ٹھیک ہے، یہ تو طے ہے کہ ملک حق نواز کا نام تمہارے نام کے ساتھ نہیں آئے گا، اس لیے اس بات

پر رونا فضول ہے۔ لیکن اگر کوئی اور بات ہے تو پھر یہ تمہارا مسئلہ ہے، بعد میں مجھے کوئی الزام مت دینا کہ عبد اللہ

بھائی نے میرا ساتھ نہیں دیا۔“ عبد اللہ نے زری کے کسی اور مسئلے سے واضح لا تعلقی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں عبد اللہ بھائی! آپ کو الزام دینے کا میں کبھی مرے بھی نہیں سوچ سکتی، آپ نے تو ہمیشہ میرا ہی ساتھ دیا

ہے، اتنا تو کوئی ماں باپ بھی کسی کا ساتھ نہیں دیتا، جتنا آپ نے میرا دیا ہے۔“ زری کا لہجہ بے حد دھیمہ ہو رہا تھا۔

”میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا، یہ سب تمہارا حق ہے، تم میرے لیے بہن بھی ہو اور بیٹی بھی، میں تمہیں

ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتا ہوں اور تمہاری خوشی اور بہتری کی خاطر ہی میں اپنے خاندان والوں سے ٹکر لے رہا ہوں،

ورنہ اور تو کوئی اختلاف ہی نہیں ہے، میرے اور ان کے درمیان۔۔۔؟ اس لیے میں سوچ رہا ہوں کہ اگر میرے اتنا

کچھ کرنے کے بعد بھی تمہیں کوئی مسئلہ رہے تو یہ اچھی بات نہیں ہے، تمہیں اپنے اندر کی بات صاف صاف

بتانی چاہیے، اگر نہیں بتاؤ گی تو زمرہ دار تم خود ہو گی۔“ عبد اللہ اسے کرید رہا تھا۔

”نہیں بھائی! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔۔۔“ زری نے اپنے بے اختیار اور بے قابو دل کو دباتے ہوئے بمشکل اس حقیقت سے انکار کیا تھا، وقت سے پہلے ہی وہ اپنے بھائی کی عزت، تعمیر اور انا کو آنا کش میں نہیں ڈال سکتی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اگر وہ اس وقت اس سے کچھ پوچھ رہا ہے تو اپنی رگوں میں دوڑتی غیرت کو اپنے پاؤں تلے کچل کر پوچھ رہا ہے، ورنہ کون ایسا بھائی ہو سکتا تھا جو اپنی بہن سے اس کی پسند، اس کی محبت اور اس کے دل کی بات پوچھے۔۔۔؟ اور اگر پوچھ رہا تھا تو یہ اس کا اچھا پن تھا، یہی تھی بڑائی تھی اس کی، ورنہ وہ نہ بھی پوچھتا تو وہ کیا کر سکتی تھی بھلا۔۔۔؟

”ٹھیک ہے پھر! ختم کرو یہ رونا دھونا اور اپنی پیلنگ اور تیاری مکمل کرو، جو ہو گا چار دن بعد دیکھا جائے گا۔“
عبداللہ اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور زری کا سر تھک کر باہر نکل گیا، زری جویں کی تون بیٹھی رہ گئی۔
آج سے چار دن بعد اٹھارہ نومبر کو این کی فلائیٹ تھی، سب تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں، سارے بندوبست بھی ہو چکے تھے پھر بھی..... پھر بھی ایک وہ تھی کہ اس کا دل بس ڈوبتا ہی جا رہا تھا، اتنی تسلیاں، اتنے دلا سے، اتنے پختہ یقین کے بعد بھی وہ مایوس کی مایوس ہی تھی نہ جانے ایسا کون سا حوصلہ شکن احساس تھا جو اسے اس کی ڈور ہی نہیں تھا منے دے رہا تھا.....!

”مریم۔! جی امی۔۔۔؟“ عابدہ خاتون کی آواز پہ مریم بری طرح چونک کر متوجہ ہوئی۔

”دھیان کہاں ہے تمہارا؟“ عابدہ خاتون نے بغور اس کے چہرے کی سمت دیکھتے ہوئے پوچھا جس پہ مریم یکدم سٹیٹائی اور اپنے اڑے اور بکھرے ہوئے اعصاب کو یکجا کرنے کی فوری اور ناکام کوشش کی تھی۔

”تکسیر کیا مطلب ہے آپ کا...؟ میرا دھیان کہاں ہونا ہے بھلا...؟“

مریم ماں کی نظروں کی کھوج سے بوکھلا گئی تھی وہ انہیں اپنی پریشانی سے آگاہ نہیں کرنا چاہتی تھی، اگر جودت آفندی کے متعلق انہیں بھنک بھی پڑ جاتی تو وہ ساری مجبوریاں اور گھر کے حالات مالائے طاق رکھتے ہوئے اسے فوراً ”گھر بٹھا لیتیں“ وہ ہر مشکل وقت میں صبر و شکر کرتے ہوئے گزارا کر سکتی تھیں، لیکن ان کی عزت پہ کوئی حرف آئے یہ برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔

”تم مجھے دو روز سے کچھ پریشان پریشان سی لگ رہی ہو۔۔۔؟ اور میں اسی انتظار میں ہوں کہ تم مجھے اپنی پریشانی بتاؤ گی، لیکن نہیں! تم پریشانی بتانے کی بجائے الٹا چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔“ عابدہ خاتون نے بیٹی کا صحیح جائزہ لیا تھا اور مریم ان کے اتنے درست انداز سے یہ مزید محتاط ہو گئی تھی۔

”نہیں امی! پریشانی کی تو کوئی بات نہیں ہے، بس میں یہ سوچ رہی تھی کی فی الحال گھر میں کچھ بھی نہیں ہے اور مجھے حجاب جو اس کیے ہوئے ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔۔۔۔۔؟ ایسے میں میں مسرزاق سے اپنی تنخواہ کے لیے کہوں گی تو کیسے۔۔۔۔۔؟ وہ کیا سوچیں گی آخر۔۔۔۔۔؟ اور ادھر پورا مہینہ پڑا ہے ابھی۔۔۔۔۔ اتنے دن گزارا کیسے ہوگا بھلا؟“ مریم نے جیسے تیسے ہی سہی کوئی بہانا بنا ہی لیا تھا اور اس کے جواب پہ عابدہ خاتون کی کھوجتی ہوئی جائزہ لیتی ہوئی نظریں ہیلی پڑ گئی تھیں۔ ”اللہ مالک ہے بیٹا سب اس کی ذات پہ چھوڑ دو گزارہ کیسے ہو گا یہ اس کی ذات بہتر جانتی ہے وہ لک ہے ہمارا، ہم اس کے بندے ہیں اسے ہماری فکر ہم سے بھی زیادہ ہوتی ہے اس لیے ہمیں پریشان ہونے کی ضرورت ہی نہیں ہے جو بھی ہو گا اس کی مرضی اور اس کی رضا سے ہو گا، تم بس اس کا رحم اور اس کی رضا مانگو، ان شاہ اللہ ہر مسئلہ حل ہو جائے گا۔“ عابدہ خاتون نے مریم کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے تھیکا اور اسے سمجھایا تھا۔

حقیقتاً "تھوڑی دیر کے لیے مریم کامل سنبھل گیا تھا ورنہ تو اسے جو دت آفتدی کی طرف سے دھڑکا ہی لگا ہوا تھا۔"

”بس امی! آپ ہمارے لیے دعا کرتی رہا کریں۔“ اس نے ماں کے دونوں ہاتھ تھام لیے تھے۔

”ارے بیٹا! یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے.....؟“ عابدہ خاتون نے اسے اپنے ساتھ لگایا۔
 ”ارے! یہ صبح اتنا لاڈلیاں کیوں ہو رہا ہے.....؟ آج کوئی خاص دن تو نہیں؟ کوئی برتھ ڈے وغیرہ یا تہوار؟“
 عدیل ناشا کرنے کی غرض سے باورچی خانے کی طرف آیا تو پلیز میں ہی ٹھہر گیا اور کافی حیرت کا اظہار کیا تھا جس پر
 مزیم اور عابدہ خاتون بے ساختہ مسکرائیں۔

”اپنے بچوں کو پیار کرنے کے لیے کیا کسی خاص دن یا تہوار کی ضرورت ہوتی ہے؟“ عابدہ خاتون نے عدیل کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”آج کل زندگی اتنی مصروف ہو گئی ہے کہ اپنی اولاد اپنے بچوں کو پیار کرنے کے لیے بھی لوگوں کو خاص دن کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ عام دنوں میں تو وقت ہی نہیں ملتا۔“ عدیل کا کہنا بھی سب کا تھا لیکن غلط تو عابدہ خاتون بھی نہیں تھیں۔

”یہ امیر اور بڑے لوگوں کی باتیں ہیں بیٹا! اور نہ ہم غریب لوگوں کے پاس اولاد اور بچوں کے سوا اور ہوتا ہی کیا ہے؟ ہم دولت کو نہیں اولاد کو دیکھ دیکھ کر جینے والے لوگ ہیں کیونکہ ہماری جمع پونجی تو ہماری اولاد ہی ہوتی ہے۔“

ان کے کچے میں ————— متا بول رہی تھی عدل آہستگی سے مسکرایا۔

”یہ تو آپ واقعی سمجھ رہے ہیں، لیکن امی چند ایسے امیر اور بڑے لوگ بھی ہیں جو آج بھی دولت کو نہیں اپنی اولاد کو دیکھ دیکھ کر جیتے ہیں، جن کی اولاد ہی ان کا سب کچھ ہے، ہمارے شہر کے بہت بڑے بزنس میں ہیں وقار آفندی، آفندی، انڈسٹریز کے مالک، آج ان کی بیٹی کا برتھ ڈے ہے، آپ اس برتھ ڈے کی آرینجمنٹ کا ہی سن لیں تو تیراں رہ جائیں گی، ان کی بیٹی کے ڈرائیور سے ملاقات ہوئی تھی وہی ساری تفصیل بتا رہا تھا، وقار آفندی اپنی بیٹی سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا، لوگ تو محاورا ”کہتے ہیں ناکہ اولاد کو دیکھ دیکھ کر جینا، لیکن وہ تو یقیناً“ اپنی بیٹی کو ہی دیکھ دیکھ کر جیتے ہیں۔“ عدیل کے ذہن میں منصور حسین کی باتیں گردش کر رہی تھیں۔

”بس بیٹا! ایسی محبت وہی کر سکتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے بہت زیادہ نوازا ہے، لیکن میں تو پھر بھی یہی سوچتی ہوں کہ اللہ ہم سب کو اپنی عاجزی میں ہی رکھے۔“ عابدہ خاتون کافی عاجزی سے کہہ رہی تھیں اور عدیل ناشتا کرنے کے لیے کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا لیکن عدیل کے لیے ناشتا گرم کرتی مریم کے ذہن میں ایک اور ریشم کا دھاکہ لگھ گیا تھا وہ وقار آفندی اور جودت آفندی کی ادھیڑ بن میں لگ گئی تھی تو اس کا مطلب تھا کہ جودت آفندی اور وقار آفندی ایک ہی فیملی سے لی لائگ کرتے تھے؟ اور مریم سوچ سوچ کر پاگل ہو رہی تھی کہ آخر وہ اتنے امیر کبیر ملی اور اپر کلاس سے تعلق رکھنے والا لڑکا اس کے پیچھے کیوں پڑ گیا ہے؟ اس کے لیے تو ایک سے بڑھ کر ایک لڑکی وجود تھی۔ ماڈرن اسٹائلش، خوب صورت اور پڑھی لکھی لڑکیاں تو اسے بے شمار مل سکتی تھیں، پھر اس کی طرز انتخاب مریم پہ ہی کیوں ٹھہری تھی۔۔۔ وہ ایسے ہی اس طرح کیوں دیکھتا تھا۔۔۔؟ اس کی نظریں اتنی بے باک ہوتی تھیں کہ مریم اندر ہی اندر سمٹ کے رہ جاتی تھی اور اب تو اسے اور بھی دھڑکا لگ گیا تھا کہ وہ جو ابھی ایک بار اس کے سامنے آیا ہے اب وہ بار بار سامنے آئے گا اور بار بار اس کے راستے کی رکاوٹ بنے گا اور وہ جو اپنے گھر کے حالات بہتر کرنے کا عزم لے کر گھر سے نکلی تھی اس کا کیا بنے گا آخر۔۔۔؟ اور اسی ”آخر“ پہ اگر اس کی بیشانی اور تفکرات کے سائے شروع ہو جاتے تھے جو اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے لگتے تھے۔

تیرہ نومبر اور چودہ نومبر کی درمیانی شب لے کر اب تک سب کزنز اسے باری باری وش کر رہے تھے۔ سب سے پہلے رات کے بارہ بجے اسے آذر نے وش کیا تھا اور سب سے پہلا گفٹ بھی آذر نے ہی دیا تھا اس کے بعد وقار آفندی اور آسیہ آفندی اسے وش کرنے کے لیے اس کے بیڈ روم میں آئے تھے ان کے جانے کے بعد باقی سب نے مل کر مدھم تالیوں کی دھن پہ اسے اتنے خوب صورت انداز میں وش کیا تھا کہ علیز نے خوشی سے چمک اٹھی تھی۔

حرمیت نے اس کے لیے ایک بیک کیا ہوا تھا اور رات سو بارہ بجے اس نے وہی ایک کاٹ کر سب کا منہ میٹھا کروایا تھا اور اسی طرح صبح نہ ناشتے کے لیے ڈانگ روم میں آئی تو ڈانگ روم تازہ پھولوں سے سجا ہوا نظر آیا۔ ”یہ میری طرف سے لولی، پریٹی، سوٹی اینڈ بیوٹی فل ڈارلنگ علیز کے لیے۔“ حرمیت نے اچانک سامنے آتے ہوئے ایک سرخ رنگ کا تازہ گلاب اس کے سامنے پیش کیا یوں جیسے کوئی بوائے فرینڈ بڑے اسٹائل سے اپنی گرل فرینڈ کو پیش کر رہا ہو، علیز کے ساتھ ساتھ باقی سب بھی اس کے انداز پہ مسکرا رہے تھے۔

”تھینک یو ہینڈ سم چارمنگ اینڈ ڈیشنگ برادر۔“ علیز نے اسی کے سے اسٹائل میں کہتے ہوئے پھول اس کے ہاتھ سے تھام لیا جس پہ ڈانگ روم میں موجود سبھی افراد یکدم ہتھم لگا کر بیٹھے تھے اور ان میں سب سے بلند ہتھم وقار آفندی کا ہی تھا وہ بیٹی کی شوخی و شرارت پہ بے پناہ خوش ہو رہے تھے اور ان سب کی انہی شوخیوں اور شرارتوں میں انہوں نے ناشتا کیا اور پھر سب اپنے اپنے کاموں اور اپنی اپنی تیاریوں میں لگ گئے تھے۔ ہر طرف گہما گہمی کا سماں تھا ملازمین کی الگ دوڑ لگی ہوئی تھی مبارک خان سب کے سر پہ سوار اپنی نگرانی میں کام کروا رہا تھا تاکہ کوئی کمی نہ رہ جائے اور کوئی کوتاہی نہ ہو وقار آفندی مبارک خان کے کام سے بہت خوش تھے وہ اپنا ہر کام محنت، لگن اور پورے دھیان سے مکمل کرتا تھا اور اس طرح کبھی کسی کو اس سے کوئی شکایت نہیں ہوتی تھی۔

شام کو جیسے ہی فنکشن اشارت ہوا دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ رہ گئی تھیں، کئی کنال پہ پھیلی ہوئی وسیع و عریض بڑی حویلی اس وقت روشنیوں کا ایک پورا جہان لگ رہی تھی اور روشنیوں کا یہ جہان اس وقت صرف اور صرف شہزادی علیز کے کی خوشی میں آیا تھا اور آج یہاں اس خوشی میں شہر کے بڑے بڑے امیر کبیر لوگوں نے شرکت کرنی تھی اور اس کی شروعات ہو چکی تھی سب سے پہلے آسیہ آفندی کی دوست مسزید اپنی فیملی کے ساتھ آئی تھیں عاصم، سائم، فاطمہ اور مسزیدر کمال بھی ساتھ تھے۔

”ہائے آئی! کیسی ہیں آپ۔۔۔؟“ فاطمہ آگے بڑھ کے آسیہ آفندی سے کافی شوق سے ملی تھی۔
فائن بیٹا! آپ سناؤ کہاں ہوتی ہو۔۔۔ بڑے عرصے بعد دیکھا ہے؟“ آسیہ آفندی نے پیار سے گلے ملاتے ہوئے پوچھا۔

”بس! یونیورسٹی کی وجہ سے بہت بڑی ہوتی ہوں، لیکن آج سوچا کہ علیز کے کوئی دیکھ آؤں، آج کے دن تو علیز کے کی چھب دیکھنے والی ہوتی ہے۔“ فاطمہ نے کھلے دل سے تعریف کی اور اس کی اس تعریف میں کوئی مبالغہ آرائی بھی نہیں تھی کیونکہ ہمیشہ سادہ رہنے والی علیز بے جیب اپنی برتھ ڈے کے روز اتنے سارے لوگوں کی وجہ سے ہلکا پھلکا میک اپ کرتی تھی اور نازک سی جیولری پہنتی تھی تو یوں لگتا تھا جیسے وہ ہزاروں سنگھار کر کے سامنے آ گئی ہو۔

”بس بیٹا! یہ تو تمہاری محبت ہے، ورنہ تم خود اتنی خوب صورت اتنی پیاری ہو۔“ انہوں نے اس کی ٹھوڑی کو چھوا اور فاطمہ مسکرا دی۔

”اچھا تو علیز اب کہاں ہے۔۔۔؟“ فاطمہ علیز کے کوئی دیکھنے کے لیے بے چین ہو رہی تھی۔

”اے بیڈ روم میں ہے، تھوڑی دیر تک آجائے گی۔“ انہوں نے اسے تسلی دی تھی۔

”اوئے! لیکن کوئل اور حرمت بھی نظر نہیں آرہیں۔۔۔؟“

”تم اندر چلی جاؤ، تمہیں سب نظر آجائیں گی۔“ آسیہ آفندی نے مسکرا کر اندر کی سمت اشارہ کیا اور فاطمہ بھی بولبا۔ مسکراتے ہوئے سر ہلا کر اندر کی سمت بڑھ گئی۔

”ہوں! تو آج کل کیا مصروفیت ہے آپ لوگوں کی۔۔۔؟“ آذر سائم اور حرمیت سے پوچھ رہا تھا جس پہ عاصم نے ساختہ مسکرا دیا کیونکہ اس نے ان لوگوں کی مصروفیت کا تھوڑا بہت اندازہ پہلے سے ہی تھا اسی لیے پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ گھساتے ہوئے ہلکے سے کھنکارا تھا۔

”ہماری مصروفیت وہی ہے جو پہلے تھی، یونیورسٹی، یونیورسٹی اور یونیورسٹی۔۔۔ بس اور تو کچھ نہیں۔“ حرمیت نے کندھے اچکاتے ہوئے ذرا لاپرواہی سے جواب دیا تھا جس پہ سائم نے چہرہ کالیا۔

”بس اور تو کچھ نہیں نا۔۔۔؟“ آذر نے دہرا کے پوچھا کیونکہ آج وہ دونوں بڑے عرصے بعد اکٹھے نظر آئے تھے۔
”جی ہاں! اور کچھ نہیں۔“ دونوں نے نفی میں گردن ہلائی تھی۔

”کیوں عاصم صاحب! کیا یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔۔۔؟“ آذر نے عاصم کو مخاطب کیا۔
”اتنے اچھے انداز میں کہہ رہے ہیں تو ٹھیک ہی کہہ رہے ہوں گے۔۔۔؟“ عاصم نے بھی جواباً ”کندھے اچکائے تھے اور آذر بس دیکھ کے رہ گیا۔

”ارے آذر صاحب! جانے دیجئے، کیوں رنگ میں بھنگ ڈال رہے ہیں۔۔۔؟ آج انہیں انجوائے کرنے دیں، یہ انوشی کیشن کل کے لیے رہنے دیں۔“ عاصم نے نرمی سے کہتے ہوئے ان کی جان بخشی کروائی تھی اور وہ بڑی سہولت سے وہاں سے کھسک گئے تھے، اور اتنی سی دیر میں ہی ان کا پورا لان لوگوں سے بھر چکا تھا حویلی کے گیٹ سے لے کر اندر ڈرائنگ روم تک ریڈ کارپٹ بچھا ہوا تھا اور اس خوب صورت اینٹجمنٹ کو مدھم سروں میں بچتا میوزک اور بھی دل فریب اور سحر انگیز بنا رہا تھا ہمیشہ کی طرح آج بھی لوگوں کی نظروں میں ستائش تھی اور کئی لوگوں نے باقاعدہ سراہا بھی تھا۔ اور اس چیز کا سارا کریڈٹ مبارک خان کو جاتا تھا جس پہ وقار آفندی بھی خوش تھے اور مبارک خان بھی خوش تھا اتنے سارے لوگوں کی تعریف پہ اس کی ساری محنت وصول ہو گئی تھی۔

”مبارک خان! ایک آچکا ہے یا نہیں۔۔۔؟“ آسیہ آفندی اچانک کچھ یاد آنے پہ اپنے قریب کھڑی خواتین سے ایکسکیوز کرتی ہوئی۔ مبارک خان کی طرف آگئی تھیں۔

”جی بیگم صاحبہ! ایک تو ایک گھنٹہ پہلے ہی منگوا لیا تھا میں نے۔“ مبارک خان نے کافی احترام اور تابعداری سے جواب دیا تھا۔

”ہوں شاباش! میں نے سوچا کہ کہیں آرڈر لیٹ نہ ہو جائے۔“ وہ نرمی سے بولی تھیں۔
”بڑی حویلی سے کوئی آرڈر ہو اور وہ لیٹ ہو جائے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے بیگم صاحبہ؟ میں ایک چیک کرنے کے لیے تین بار گیا ہوں، یوں سمجھیں کہ پاس کھڑے ہو کر تیار کروایا ہے، ان شاء اللہ سب مہمانوں کو پسند آئے گا۔“ مبارک خان کو جیسے پورا یقین تھا۔

اور آسیہ آفندی جواباً ”کچھ کہنے ہی والی تھیں کہ احمد پاس آگیا تھا۔“

”آئی! وہ کچھ خواتین آپ کو یاد کر رہی ہیں۔“ احمد نے ایک ٹیبل کی طرف اشارہ کیا تھا اور آسیہ آفندی نے فوراً گردن موڑ کر دیکھا ان کی کچھ جاننے والی خواتین بیٹھی ہوئی تھیں جنہیں ثروت بیگم کمپنی وے رہی تھیں۔

”اچھا! میں آرہی ہوں، اور مبارک خان ٹھیک ہے تم جاؤ اپنا کام کرو۔“ آسیہ آفندی کہتے ہوئے ان عورتوں کی سمت بڑھی تھیں انہوں نے آج گرے کلر کی خوب صورت ٹیسی اور انتہائی قیمتی ساڑھی زیب تن کر رکھی تھی

جس میں ان کی گریں فل شخصیت بہت متاثر کن لگ رہی تھی تھوڑی دیر پہلے وقار آندے کے پہلو میں کھڑی بیچ رہی تھیں اور فوٹو گرافر نے ان کی کئی تصویریں بنا ڈالی تھیں۔

”زری۔۔۔ زری بیٹا۔۔۔ ادھر آ جاؤ، چوٹ لگ جائے گی۔“ یہ آواز آسیہ آندے کی سماعتوں سے اچانک ٹکرائی تھی اور ان کے قدم بے ساختہ ٹھہر گئے تھے انہوں نے اس آواز کی سمت تڑپ کر دیکھا ایک عورت اپنی تین چار سالہ بچی کو پکار رہی تھی جولان میں کھیلتے ہوئے ادھر ادھر بھاگ رہی تھی، آسیہ آندے اس پیار سی بچی کو دیکھ کر رہ گئیں۔

”زری۔۔۔؟“ انہوں نے دھیمے اور کھوئے ہوئے انداز میں زیر لب دہرایا تھا اور یوں لگا جیسے ان کا دل مٹھی میں آگیا ہو، زری کے نام پہ ان کے دل سے ہوک نکلی تھی۔

”آئی! دیکھیں علیزے آگئی ہے۔“ ان کے قریب ہی انوشہ بے تحاشا چمک کر بولی تھی اور آسیہ آندے نے اس بچی سے نظریں ہٹا کر علیزے پہ مرکوز کر دیں، علیزے انہی کی سمت آرہی تھی اور علیزے کے ایک ایک قدم پہ ہزاروں نگاہیں اٹھ رہی تھیں۔

بلیک کلر کے جدید تراش خراش کے انتہائی قیمتی اور خوب صورت لباس میں ملبوس علیزے آندے اس وقت ہزاروں نگاہوں کے نیچے بسنے والے دلوں کی دھڑکنیں بے ترتیب کر گئی تھیں اور آندے کے سینے میں تو کئی ہارٹ بیٹ مں ہوئی تھیں اور پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ اسے دیکھ کر آندے کے سینے میں دھڑکتے ایک جاندار نے کچھ بوکھلائی ہوئی حرکتیں سرزد کی تھیں۔ بے اختیار اور اچانک۔۔۔ شاید اس لیے کہ آج وہ پہلی بار سیاہ رنگ پہن کر آئی تھی۔۔۔ یا شاید اس لیے کہ وہ پہلی بار اتنے دل سے تیار ہو کر آئی تھی۔۔۔ لیکن جو بھی تھا سب کو مبہوت کرنے کے لیے کافی تھا، بلیک کلر کی لانگ شرٹ پہ بلیک دھاگے کا کافی نفیس کام کیا گیا تھا، سامنے دامن پہ اور بازوؤں کی پٹی پہ سلور کرشل کے نگ جڑے ہوئے تھے اور یہی نگ اس کے دوپٹے کی چاروں اطراف میں نظر آ رہے تھے، چوڑی دارباجاے کے نیچے بلیک پنل ہیل والے سینڈل اس کے خوب صورت اور متناسب سراپے کو اور بھی نمایاں دکھا رہے تھے، اسٹائلیش اور یونیک سے ہیرا شائل کے پاؤں علیزے نے دوپٹہ کافی سلیقے سے سر پہ اوڑھ رکھا تھا۔ یہ اس کی عادت تھی وہ کبھی ننگے سر سامنے نہیں آتی تھی، البتہ اسے ننگے سر کسی نے دیکھا تھا تو وہ صرف منصور حسین تھا اسی لیے تو وہ اب کہیں نظر آتا تھا تو وہ نظریں جڑا جاتی تھی۔

”مما! کیا دیکھ رہی ہیں؟“ علیزے نے پاس آگیاں کے ہاتھ تھام لیے تھے آسیہ آندے یکدم چونک گئیں۔

”دیکھ رہی تھی کہ میری بیٹی ماشاء اللہ اب جوان ہو چکی ہے، شادی کے قابل ہو چکی ہے۔“ انہوں نے پیار سے کہتے ہوئے علیزے کی نظر اتاری اور اسے اپنے ساتھ لگایا تھا علیزے بری طرح جھینپ گئی۔

”مما۔۔۔!“ اس نے خفگی کا اظہار کیا تھا۔

”اچھا! ادھر آؤ مہمانوں سے ملو، سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“ آسیہ آندے اسے ساتھ لے کر مہمانوں سے ملوانے لگیں اور رفتہ رفتہ کیک کاٹنے کا نام بھی آن پہنچا تھا بڑے سے کیک پہ اس کا نام اور برتھ ڈے لکھا ہوا تھا، چھوٹی چھوٹی کیک کینڈلز کو گل کرتے ہی فضا میں ایک دم سے ابھی برتھ ڈے اور تالیوں کی آواز گونجنے لگی یہاں تک کہ حویلی کے درودیوار بھی گنگنا اٹھے تھے۔

علیزے نے سب سے پہلے وقار آندے اور آسیہ آندے کو کیک کھلایا تھا لیکن یہی کیک وقار آندے کے حلق میں اٹک گیا تھا ان کے میل پر ایک میسج موصول ہوا۔

”بیٹی کی سالگرہ مبارک ہو وقار آندے، لیکن اتنا یاد رکھو آج تم اپنی بیٹی کی بیسیوں اور آخری سالگرہ منا رہے ہو، آئندہ کہیں موقع نہیں ملے گا۔ ان شاء اللہ!“

وقار آندے کے ہاتھ میں موبائل لرز کے رہ گیا اور ان کے چہرے کی رنگت یک لخت زرد پڑ گئی، لیکن اسے سارے لوگوں میں اور اس ہنگامے میں کوئی بھی ان کی سمت متوجہ نہیں تھا وہ مرے مرے بے جان قدموں سے چلتے ہوئے مرکزی حصے سے تھوڑا ہٹ گئے تھے، لیکن ان کی ایسی شکستہ سی حالت دیکھ کر گیٹ کے پاس کھڑا منصور حسین فوراً لپک کے ان کے قریب آیا۔

”ارے صاحب! آپ ٹھیک تو ہیں نا۔۔۔؟ کیا ہوا ہے آپ کو؟“ اس نے وقار آندے کو تھام کر قریب ہی کرسی پہ بٹھایا تھا۔

”ایک گلاس پانی لاؤ۔“ انہوں نے اپنی کپٹی اور سینے کو سہلاتے ہوئے کہا۔

”جی ابھی لایا۔“ وہ فوراً گلیا اور پانی لے آیا تھا۔۔۔ وقار آندے ایک ہی سانس میں پورا گلاس پی گئے تھے۔

”اب ٹھیک ہیں آپ؟“ منصور حسین فکر مندی سے پوچھ رہا تھا۔

”ہوں ٹھیک ہوں۔“ وہ ابھی بھی اپنا سینہ سہلا رہے تھے اور اپنی کیفیت کو دبائے کی کوشش کر رہے تھے کیونکہ اس وقت یہاں ہزاروں لوگ جمع تھے اور اتنے لوگوں میں ان کی ذرا سی بات بھی ایشیون سکتی تھی اور رسوائی کے بھی بے پناہ امکان تھے اسی لیے ضبط کر جانا، اور خاموش ہو جانا ہی بہتر تھا، کیونکہ اس وقت کچھ بولنے کا یا ظاہر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا بلکہ الٹا نقصان تھا۔

ان کی اپنی ہی جگہ ہنسائی ہوئی تھی کہ کسی نامعلوم اور ان دیکھے دشمن نے ان کی نیندیں اور ان کی زندگی حرام کر رکھی تھی اور وہ کچھ نہیں کر پارہے تھے بلکہ اس کے سامنے ہر طرح سے بے بس تھے۔

اور پھر فنکشن ختم ہونے تک وہ اسی طرح قدرے گم سم اور چپ چاپ سے رہے اور فنکشن ختم ہونے کے بعد بھی ان سب نے پوچھا تو طبیعت خرابی اور سر درد کا کہہ کر اپنے بیڈ روم میں چلے گئے تھے اس لیے پانی سب نے بھی خاموشی سے اپنے اپنے بیڈ رومز کا رخ کیا تھا اور ویسے بھی سب تھکے ہوئے تھے سب کو نیند آرہی تھی اس لیے کسی نے بھی اس مسئلے پہ زیادہ غور نہیں کیا تھا۔

”ابھی۔۔۔ برتھ ڈے۔۔۔ ٹوبو
 ابھی۔۔۔ برتھ ڈے۔۔۔ ٹوبو
 ابھی۔۔۔ برتھ ڈے۔۔۔ ٹوبو
 مائی ڈیر علیزے ڈارلنگ!“

وہ ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے بیٹھی اپنی جیولری اتار رہی تھی جب کوئی دھیمے سے گنگنا کر اسے دس کرتے ہوئے اندر داخل ہوا تھا، علیزے نے چونک کر آئینے میں نظر آتے عکس کو دیکھا اور پھر یکدم اسے کرنٹ چھو گیا وہ ایک سیکنڈ میں تڑپ کر سیدھی ہوئی تھی۔

”ڈرا سیور! تم یہاں۔۔۔؟ میرے بیڈ روم میں؟“ علیزے نے یہ تو جیسے حیرت اور اچھٹے کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا رات کے اس پہر اپنے بیڈ روم میں کسی ملازم کو اتنے استحقاق سے داخل ہوتے دیکھنا بھی تو سر پہ پہاڑ ٹوٹنے کے ہی برابر تھا۔

”جی ہاں! میں یہاں۔۔۔ شہزادی علیزے کی خواب گاہ میں۔“ اس نے کہتے ہوئے انتہائی سکون اور سہولت سے دروازے کا لاک لگا کر لوٹ بھی چڑھا دیا۔

”ڈرا سیور! یہ۔۔۔ یہ کیا کر رہے ہو تم۔۔۔؟ تمہاری جرات کیسے ہوئی میرے بیڈ روم میں آنے کی۔“ علیزے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رٹروم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سلیشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سیریم کوالٹی، نارل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیگر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے عزتی سے محفوظ رکھیں۔

اسے دروازہ بند کرتے دیکھ کر پاگل ہوا اٹھی تھی لیکن ساتھ ہی اس پہ خوف بھی طاری ہو چکا تھا کیونکہ وہ مضبوط قدم اٹھاتا اس کی سمت آ رہا تھا۔

”یہ جرات میں ہزاروں بار کر چکا ہوں جان ڈرائیور! جرات کا قصہ نہ چھیڑو۔“ وہ بڑی دلکشی سے کہتا ہوا عین اس کے سامنے آرکا، علیزے اس کے تیور دیکھ کر برف کی مانند ٹھنڈی ہونے لگی تھی اس کی خوب صورت پیشانی پہ ٹھنڈے سینے کے قطرے نمودار ہو چکے تھے کیونکہ منصور حسین آج منصور حسین نہیں کچھ اور ہی لگ رہا تھا صاف ستھرا خوشبوؤں میں بسا ہوا، اس کی ڈرائنگ بھی بے تحاشا قیمتی نظر آ رہی تھی اور علیزے کے چاروں اطراف خوف و خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگی تھیں وہ یکدم کسی متوحش ہرنی کی مانند بدحواس ہو کر دروازے کی سمت بھاگی تھی لیکن دوسرے ہی پل اس کی کلائی جکڑ کر اسے بیڈ کی سمت دھکیل دیا گیا تھا وہ بری طرح چکر اگئی تھی۔

”ڈرائیور! وہ چیخ اٹھی تھی۔

”میں ڈرائیور نہیں ہوں تمہارا۔“ اس نے اپنی جیب سے سگریٹ اور لائٹرز نکالتے ہوئے سکون سے جواب دیا تھا۔

”تو پھر کک کون ہو تم؟“ علیزے یکدم بیڈ سے اٹھ بیٹھی۔

”شوہر ہوں تمہارا۔“ اس کا سکون ہنوز برقرار تھا اسے اپنی آنکھوں کے سامنے دنیا گھومتی ہوئی نظر آتی تھی۔ ”شوہر؟ کیا مطلب ہے تمہارا کون ہو تم۔ تم بتاتے کیوں نہیں۔“ علیزے خو میں بمشکل ہمت پیدا کرتی ہوئی اس کے سامنے آکھڑی ہوئی وہ عجیب سے انداز میں مسکراتے ہوئے سگریٹ سلاگانے لگا تھا اور پھر گراکش لے کر دھواں علیزے کے چہرے پہ چھوڑ دیا تھا۔

”دل آور شاہ!“ اس نے دھواں علیزے کے چہرے پہ چھوڑنے کے ساتھ ساتھ اپنا نام بھی اس کے چہرے پہ پھونک دیا تھا۔

”دل آور شاہ۔۔۔؟“

”ہوں! دل آور شاہ۔۔۔ اور تم دل آور شاہ کی بیوی ہو۔“ اس نے کہتے ہوئے علیزے کا ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب کر لیا اور پتھر کی مورتی کی طرح پتھرائی ہوئی علیزے کے کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی تھی۔ ڈرائیور، منصور حسین، دل آور شاہ، شوہر، بیوی یہ سب اس کے ذہن میں گڈمڈ سے ہو رہے تھے۔

(باقی آئندہ ماہ ملاحظہ کریں)

☆☆

کبھی ہارنا نہیں سیکھا، اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔

۲۱

ایک سو پندرہ



نہیلہ عزیز



بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدھیہ اور نیل حیات دو ہی بہن بھائی ہیں، مدھیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے، وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل حور پہ رنگ چکی ہے، جس کے پیش نظر فائزہ بیگم، نیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں، لیکن مدھیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے، جس پہ نیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے، مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پھنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے، مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، بے بسی اور مجبوری سے تنگ آخر خود کشی کرنے کا سوچتا ہے، لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باؤ اقمیاز مل جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے، جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے، اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدی ہے، وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے، وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل اور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے، وہ اپنے قول و فعل کا بہت ریکا آؤمی ہے، اس نے



اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا۔

”بیوی...؟“ ان سب لفظوں پر اور ان سب ناموں پر یہ ایک نام بھاری ہو گیا تھا اور اس لفظ کا یہ بھاری پن علیزے کے نازک دل و دماغ اور نازک اعصاب سے سہارا نہ ہو گیا اس کے حواس اس کا ساتھ چھوڑنے لگے تھے اور اس سے پہلے کہ وہ لڑکھڑا کر نیچے زمین پر آگرتی دل اور شاہ نے احتیاط سے اسے بازو سے پکڑتے ہوئے بیڈ پر بٹھادیا اور خود بھی اس کے بے حد قریب بیڈ پر ہی بیٹھ گیا۔

”ایک شوہر اپنی بیوی کو حاصل کرنے کے لیے کبھی اتنی جدوجہد اور اتنا صبر نہیں کرتا جتنا میں نے کیا ہے۔ انتظار ہی کرتا رہا کہ کب تم میں سال کی ہوگی اور کب میری دسترس میں آؤ گی؟ تمہیں پانے کے لیے تو میں نے رانجھا بننے میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اب دعا کرو کہ کوئی کیدو پیدا نہ ہو؟“ دل اور نے انتہائی سکون اور نرمی سے کہتے ہوئے اس کا نازک دودھیا نچلی سا ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھ میں لیتے ہوئے بلکے سے دبایا تھا اور علیزے اس کے مضبوط ہاتھ کے دباؤ اور حدت سے یک دم جیسے پھر سے حواسوں آگئی تھی اسے کرنٹ چھو گیا تھا۔

”چھوڑو میرا ہاتھ...“ وہ اس کے ہاتھ کے نیچے سے اپنا ہاتھ کھینچتی ہوئی جھٹکے سے کھڑی ہو گئی لیکن دوسرے ہی پل وہ دل اور کے بلکے سے جھٹکے سے ہی اس کے اوپر آ رہی تھی۔

”اتنا احتجاج کس لیے میری جان...؟ احتجاج کرنے سے پہلے کم از کم یہ ضرور۔ سوچ لینا چاہیے کہ ہم آخر کتنے پانی میں ہیں...؟ ڈٹ جائیں گے یا بہ جائیں گے؟“ وہ اسے احتیاط سے سمیٹ چکا تھا وہ تڑپتی تھی۔ مایہ بے آب کی مانند۔

”ڈرا یور پلینز۔ اچھوڑ دو مجھے تم کون ہو...؟ کیا ہو...؟ میں بالکل بھی نہیں جانتی، پلینز۔“ علیزے کے حلق میں بے بسی کے مارے آنسوؤں کا گولا سا ٹنک گیا۔

وہ اپنے ہی گھر میں اپنے ہی بیڈ روم میں اتنی بے بس ہو چکی تھی کہ اپنے بہت اپنوں کو بھی مدد کے لیے نہیں پکار سکتی تھی کیونکہ بیڈ روم کی دیواریں ساؤنڈ پروف تھیں۔ اور علیزے نے بس۔

”جان ڈرا یور! میں کون ہوں...؟ کیا ہوں...؟ تم یہ سب جاننے لگو گی لیکن دو گھڑی پاس تو بیٹھو، دھڑکنوں کا دھڑکنوں سے تال میل تو ہونے دو، کچھ ڈرا یور کی سمجھو اور کچھ ڈرا یور کو سمجھاؤ، مسئلے تو تب ہی حل ہوتے ہیں جب باہمی مشورے اور مذاکرات کیے جائیں اس طرح اٹھ اٹھ کر بھاگنے سے سوائے کھینچا تانی کے اور کچھ نہیں ہوتا۔“ دل اور نے اسے دوبارہ بیڈ پر بٹھادیا۔

اور سگریٹ کا آخری کش لے کر سگریٹ کو قالین پر پھینکا اور اپنے بوٹوں تلے مسل دیا۔

”سوری! تمہارے بیڈ روم میں ایش ٹرے نہیں ہے نا اس لیے قالین کو زک پہنچانی پڑی۔“ اس نے ساتھ ساتھ معذرت کے آداب بھی پورے کیے تھے اور پھر ذرا سا ترچھے انداز میں بیٹھتے ہوئے پوری توجہ سے اس کی سمت متوجہ ہوا۔

”بتاؤ کیا جانا چاہتی ہو...؟ کیا بتاؤں تمہیں...؟“ وہ جیسے اب اپنے اصل روپ اور اصل مزاج میں آ گیا تھا اس کے دیکھنے کا انداز اور بولنے کا لہجہ بدل گیا تھا علیزے چونک گئی۔ اور ایک پل کے لیے اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی سی دوڑ گئی اور خوف سے روح بھی کپکپا اٹھی۔

”خیر وہ بابا یہ فائرنگ کروانے سے لے کر اب تک کیا کیا ہوا ہے...؟ سب بتاتا ہوں تمہیں، اک بات بھی نہیں چھپاؤں گا پہلے یہ لفافہ کھول کر چیک کر لو اس میں نکاح نامہ بھی ہے اس کی بھی تسلی کر لو اور جان لو کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں...؟“ دل اور شاہ نے بچے تلے سر دو پاٹ سے لہجے میں کہتے ہوئے اپنی پینٹ میں اڑسا ہوا لفافہ نکال کر علیزے کی گود میں رکھ دیا۔

یوں جیسے اسے منہ دکھائی پیش کی ہو اور علیزے کی رنگت متغیر ہو گئی، خیر وہ بابا یہ فائرنگ کا ذکر سن کر تو اس کے رہے سے اوسان بھی خطا ہو گئے تھے اس لیے گود میں رکھا لفافہ اٹھا کر کھولنے کی تو اس میں ہمت ہی نہیں تھی، خوف لہجہ بہ لہجہ قطرہ قطرہ اس کی رگوں میں پھیلتا جا رہا تھا اور اس خوف کی لرزش اس کے ہاتھوں سے نمایاں نظر آ رہی تھی اس کے ہاتھ بری طرح کپکپا رہے تھے لیکن پھر بھی اسے وہ لفافہ تو کھولنا تھا سو بڑی مشکل سے اپنی ہمتیں مجتمع کرتے ہوئے اس نے ہاتھ بڑھا کر وہ لفافہ اٹھایا اور چاک کر دیا۔

دھڑام کی آواز سے کچھ گرا اور گر کر ٹوٹ گیا۔ اور ٹوٹ کر بکھرنے کی یہ آواز بہت دور تک گئی تھی اتنی دور کہ سننے والے دہل گئے تھے۔

”زری...! کچھ گرا ہے...؟“ نگارش نے سیڑھیوں کی ریلنگ سے جھکتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں...“ زری کی بے یقین اور سہمی ہوئی۔ آواز سنائی دی۔

”کیا گرا ہے...؟“ نگارش نے دوبارہ پوچھا۔

”میرا دل...“ زری کی سہمی ہوئی سی آواز کو نگارش مذاق سمجھی تھی۔

”اچھا...! تو کیا ٹوٹ گیا؟“

”ہاں بھابھی! ٹوٹ گیا... ٹوٹ گیا میرا دل۔“ اب کی بار زری کی آواز میں آنسوؤں کا غلبہ تھا وہ شاید رو پڑی تھی اور نگارش ٹھنک کر سیدھی ہوئی اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی سیڑھیاں اتر آئی زری لاؤنج میں لگے ریک کے پاس کھڑی تھی اور کافی شدت سے رو رہی تھی اور اس کے رونے کی وجہ نگارش کو لاؤنج کے فرش پر ہی بکھری نظر آئی تھی جس پر نگارش کا دل بھی دھک سے رہ گیا۔

بلیک کمر کا کافی مگ بڑی بے دردی سے ٹوٹ کر ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکا تھا یہ مگ تین چار سال پرانا تھا زری ایک بار مدیہ کے ساتھ مارکیٹ گئی تھی اور ہاں اسے یہ مگ بہت پسند آئے تھے تب اس نے تین مگ ایک ساتھ خریدے تھے دل اور شاہ، نبیل حیات اور عبد اللہ کے لیے۔

اپنی پسند سے اس نے بلیک کمر کا مگ دل اور شاہ کے لیے سلیکٹ کیا تھا جبکہ عبد اللہ کا نیوی بلو کمر اور نبیل حیات کا چاکلیٹی کمر میں تھا۔ ان کے کلرز مختلف لیکن ڈیزائن اور شیمپ ایک جیسے ہی تھے جو ان تینوں کو بہت پسند آئے تھے اور یہی وہ مگ تھا جس میں پہلی مرتبہ اس نے کافی بنا کر دل اور کو دی تھی اور وہ پہلی مرتبہ ہی چونک گیا تھا۔ اسے اس مگ سے لپٹی خوشبو اور چاہت کا احساس ہو گیا تھا اور پھر یہ احساس ہمیشہ بڑھتا ہی رہا۔ جب بھی وہ تینوں دوست ان کے گھر میں اکٹھے بیٹھتے تھے تو نگارش اور زری انہیں انہی میں کافی یا چائے بنا کر دیتی تھیں اور جب سے دل اور اور نبیل پاکستان گئے تھے عبد اللہ نے بھی اپنے مگ میں کافی پینا چھوڑ دیا تھا۔ اس لیے نگارش نے وہ تینوں مگ صاف کر کے لاؤنج کے ریک میں سجادیے تھے اور آج زری کو خیال آیا کہ وہ یہ مگ پیک کر کے دیگر سامان میں رکھ دے، تاکہ پاکستان جا کر وہ لوگ پھر اپنی کافی کی یاد تازہ کر لیتے، لیکن دو مگ پیک کرنے کے بعد جب اس نے تیسرے کو اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو نہ جانے کیا ہوا وہ بلا وجہ ہی اس کے ہاتھوں سے پھسل گیا۔ جس کا صدمہ اسے پچکیوں سے رلا گیا۔

”زری پلینز... کنٹرول میری جان، اب اتنی سی بات پہ کیا رونا...؟ کانچ کی چیز تو ہوتی ہی ٹوٹنے کے لیے ہے۔“ نگارش نے آگے بڑھ کے اسے اپنے ساتھ لگایا۔

”بھابھی...! اس کانچ کی چیز میں میری محبت کا پہلا لمس، پہلا احساس بسا تھا... بکھر گیا وہ احساس، گر کر ٹوٹ

گیا۔ ”زری کا دل یوں تھا جیسے کسی نے اپنے ہاتھ کی دونوں مٹھیوں میں بڑے زور سے بھیج رکھا ہو جس سے اس کے دل کا دم گھٹ رہا تھا اور جان ٹوٹ رہی تھی۔

”ارے نہیں پاگل۔۔۔ اب اپنی محبت کو اس بے جان چیز سے تو مشروط مت کرو، محبت کسی کی نشانیوں کی محتاج نہیں ہوتی۔“ نگارش نے اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے سہلایا۔

”محبت نشانیوں کی نہیں لیکن احساس کی محتاج تو ہے نا؟ اور اس کانچ کے مک میں تو میری محبت کے کئی احساس پوشیدہ تھے؟ یہ احساس بکھرے ہیں تو میرا دل بھی تو بکھرے گا نا؟“ زری کے دل پہ ممکنہ دکھ کے الہام اتر رہے تھے اور اس کی کیفیت کچھ ایسی ہو رہی تھی کہ جسے دیکھ کر نگارش کا دل بھرنے لگا۔

”پلیز زری۔۔۔! سنبھالو خود کو کچھ نہیں ہوا، صرف مک ہی تو ٹوٹا ہے؟ ہم دل آور بھائی کے لیے نیا اور اس سے زیادہ اچھا مک لے آئیں گے جو تمہاری طرف سے ان کے لیے گفت ہی ہو گا۔“ نگارش نے اسے بہلانے کی کوشش کی تھی۔

”نہیں بھابھی۔۔۔! یہ صرف مک نہیں ٹوٹا، اس مک کے ساتھ تو بہت کچھ ٹوٹا ہے لوگ کہتے ہیں کہ جب کانچ کی کوئی چیز ٹوٹتی ہے تو سمجھو کوئی انہونی ہونے والی ہے اور آپ۔۔۔ آپ جانتی ہیں کہ میرا دل کوئی بھی انہونی سننے والا دل نہیں ہے، ادھر کچھ ہو گا، ادھر یہ مرجائے گا۔“ وہ رو رہی تھی، بلک رہی تھی اور نگارش اسے بچوں کی طرح سنبھال رہی تھی۔

”زری۔۔۔! صرف تین چار روز کی بات ہے، ان شاء اللہ ہم پاکستان جائیں گے تو تمہارے سارے وہم اور وسوسے دور ہو جائیں گے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ نگارش اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے اسے تسلی دے رہی تھی۔

لیکن آج کل نہ جانے کیوں زری کے دل کی اتنی عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی کہ لاکھ سمجھانے اور بہلانے سے بھی نہیں بہل رہا تھا۔ بہت دیر بعد وہ چپ ہوئی تھی اور رو دھو کر لاؤنج میں بکھرے کانچ کے ٹکڑے اٹھانے لگی، لیکن یہ کانچ کے ٹکڑے اٹھاتے ہوئے اس کا دل لہو لہان ہو رہا تھا۔ مگر وہ بمشکل ضبط کرتی ہوئی ٹکڑے سمیٹ کر اپنے بیڈ روم میں آگئی۔ یہاں اس وقت سوانوبجے کا وقت تھا اور پاکستان میں رات کے سوا دو بج رہے تھے۔

پاکستان میں رات کے سوا دو بجے ایسا کیا ہوا ہے جس نے زری کے دل کو اپنی مٹھیوں میں لے کر بری طرح مسل ڈالا تھا؟ زری کے پاؤں کے تلوے زمین پہ نہیں لگ رہے تھے وہ اضطراب کے مارے دائیں بائیں چکرارہی تھی۔ اس کے دل و دماغ پہ بے کلی اور بے چینی سوار ہونے لگی تھی۔ لیکن وہ فی الحال یہ معلوم نہیں کر سکی کہ آخر ہوا کیا ہے؟ یوں بیٹھے بیٹھے اس کے دل کی حالت اتنی غیر کیوں ہو گئی ہے؟ صرف مک ٹوٹ جانے پہ تو ایسا نہیں ہو سکتا تھا؟ زری ہر طرف سے بے بس ہو کر کھڑکی میں آکھڑی ہوئی۔ باہر موسم بہت سرد ہو رہا تھا اور اس کے اندر آتش دہک رہا تھا، شعلے اگلتا ہوا اور زری اس ٹھنڈے اور گرم موسم کی زد میں کھڑی سب کچھ اپنے دل پہ سہار رہی تھی، بڑی ہمت اور بہادری کے ساتھ۔



پندرہ نومبر کا سورج طلوع ہو چکا تھا۔

علیٰ زری اور دل آور شاہ نے رات جاگ کے گزار دی تھی۔ ایک ہی بیڈ پہ آمنے سامنے بیٹھ کر۔۔۔ آنکھوں آنکھوں میں رات بیت گئی تھی اور اسی رات میں یوں لگ رہا تھا جیسے دونوں کی ذات بیت گئی تھی۔ ایک سراسر علیٰ زری کے ہاتھوں میں تھا اور ایک سراسر دل آور شاہ کے ہاتھ میں۔ وہ ساری باتیں اور سارے

ثبوت اس پہ واضح کر چکا تھا جن کو جاننے اور دیکھنے کے بعد علیٰ زری نے آفندی چپ ہو گئی تھی۔ بلکہ چپ لگ گئی تھی، چپ کا تالا لگ گیا تھا اور اس تالے کی کنجی اور اسے کھولنے کا اختیار اب صرف دل آور شاہ کے پاس تھا۔ تو کیا اس ایک رات میں وہ سارے اختیار دل آور شاہ کو سونپ چکی تھی؟ اس نے اپنا سب کچھ اس کے ہاتھ میں دے دیا تھا؟ وہ جو بھی چاہتا کر سکتا تھا؟ تو اس کا مطلب تھا کہ گزشتہ رات محض ایک رات نہیں تھی۔ بلکہ قیامت کی رات تھی۔

اور اس قیامت کی رات نے علیٰ زری کی ذات کے سارے غور چھین لیے تھے۔ اس کی معصومیت کو دھجی دھجی بکھیر ڈالا تھا۔ اس رات کے بعد وہ تو علیٰ زری کی ذات کے قدموں کی خاک بھی نہیں رہی تھی۔ اس کے سارے ناز، سارے غور مٹی میں مل گئے تھے۔ وہ آج منہ کے بل گری تھی اور یہ گرنے سے توڑ کے رکھ گیا تھا۔ وہ اٹھنے اور سنبھلنے کے قابل نہیں رہی تھی اور اسی گم سم حالت میں صبح ہو گئی اور صبح کے انتظار میں بیٹھا دل آور شاہ آہستگی سے اس کے بیڈ سے اٹھ کھڑا ہوا اور پھر گم سم بیٹھی علیٰ زری کے سامنے اپنا مضبوط ہاتھ پھیلا دیا تھا۔ علیٰ زری اس کے ہاتھ کو دیکھتے ہوئے چونکی تھی، بلکہ اپنے سامنے پھیلے ہوئے اس کے ہاتھ کا مفہوم سمجھتے ہوئے خاموشی سے اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا اور دل آور نے اپنے ہاتھ کے زور پہ اسے بیڈ سے اٹھنے میں مدد دی تھی۔

اور پھر بڑی احتیاط سے اسے اپنے ساتھ لیے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آکھڑا ہوا۔ علیٰ زری اس کے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہونے کا مطلب بھی سمجھ گئی تھی۔ یعنی وہ اسے فریش دیکھنا چاہتا تھا اور علیٰ زری اس کے چاہنے کے مطابق اپنے چہرے کو نشو سے صاف کرتے ہوئے بالوں میں پرش پھیرنے لگی اور یوں ہی بالوں میں پھیرتے ہوئے اچانک اس کی نظر ٹیبل پہ رکھے ان گفتگو کی سمت اٹھی تھی جو کل اسے سب لوگوں نے اور کزنز نے دیے تھے اور جو اس نے ابھی تک کھول کر دیکھے ہی نہیں تھے اور انہی گفتگو میں گولڈن ریپر اور گولڈن ربن سے سجا ہوا آذر آفندی کا گفت بھی، ہنوز بیکنگ میں بند رہا تھا۔

”دیر ہو رہی ہے ہمیں۔“ دل آور شاہ نے گھڑی دیکھتے ہوئے اسے متوجہ کیا اور علیٰ زری سے۔۔۔ کو ان گفتگو سے نظریں چرائی پڑ گئیں۔ بال سمیٹ کر وہ اس کی سمت پلٹی۔ اس کی ڈریسنگ البتہ رات والی ہی تھی۔ وہی سیاہ سوٹ۔۔۔ کسی کی قسمت سے بھی زیادہ سیاہ۔ اسی ڈریس کے نیچے اس نے سیاہ سینڈل پہنے تھے اور سینڈلز کے اسٹریپس بند کرنے کے بعد وہ سیدھی کھڑی ہو چکی تھی۔

”چلیں۔۔۔؟“ وہ کافی سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔ لیکن علیٰ زری کو جواب دینے میں بڑی دقت ہوئی تھی۔ ”ہوں! چلیں۔۔۔“ اس کی آواز تھی یا ہوا کا دھیمہ جھونکا، جو غیر محسوس انداز میں چھو کے گزر گیا اور دل آور شاہ نے اس کے برابر کھڑے ہوئے اپنا دایاں بازو اس کے کندھوں کے گرد حائل کر دیا اور وہ نازک کانچ کی گڑیا اس کے بازو کے حصار میں آگئی تھی اور تب دل آور شاہ نے اپنے نمبر سے ایک کال ملائی تھی۔ اسی حویلی کے ایک نمبر پہ۔۔۔!



وقار آفندی ڈاننگ ہال میں بیٹھے اپنے الجھے بکھرے اور منتشر سے ذہن کو اخبار کی سرخیوں میں گم کرنے کی کوششیں کر رہے تھے۔ جب ٹیبل پہ رکھے ان کے سیل پہ رنگ بجی تھی اور اس قدر اچانک اور غیر متوقع انداز میں بجی تھی کہ اخبار ان کے ہاتھ میں لرز گیا۔ حالانکہ یہ لرزش تو ان کے ہاتھوں میں رات سے ہی ہو رہی تھی۔ اس وقت تو رنگ ٹیون کا محض بہانا بنا تھا۔ انہوں نے جلدی سے سیل اٹھا کر دیکھا تھا۔ نمبر وہی رات والا تھا جس

سے انہیں وہ مسیح موصول ہوا تھا اور وہ اسی نمبر سے کال دیکھ کر اندر سے ٹھٹھہر کے رہ گئے۔ لیکن کال کرنے والے کو جاننے کے لیے کال ریسیو کرنا بے حد ضروری تھا۔ اس لیے انہوں نے فوراً کال ریسیو کر لی تھی۔

”ہیلو! کون...؟“ اتنی بڑی شخصیت ہونے کے باوجود وقار آفندی کے لہجے میں خوف بول رہا تھا۔

”تمہارا داماد۔“ جواب مختصر مگر کاٹ ڈالنے والا تھا۔

”کون ہو تم...؟ اور کیا بکواس کر رہے ہو؟“ وقار آفندی سے اس وقت مشتعل ہونے کی امید نہیں تھی، لیکن پھر بھی وہ مشتعل ہو رہے تھے۔

”میں وہی ہوں جسے تم اتنے عرصے سے اندر ہی اندر پانگلوں کی طرح تلاش کر رہے ہو اور تمہاری بیٹی مجھے پہلو میں لیے پھر رہی ہے۔“ اس آواز میں طنز تھا، تسخر تھا، ایسا سب کچھ تھا جس سے وقار آفندی کی ہستی تڑپ اٹھتی۔

”یقیناً نہیں آتا تو اپنی بیٹی کے بیڈ روم میں آکر دیکھو، میں تمہیں وہیں ملوں گا۔“ اتنا کہنے کے بعد کال ڈس کنیکٹ ہو گئی اور وقار آفندی پاگل ہوا اٹھے تھے۔ علیزے کا خیال آتے ہی ان کا دل مٹھی میں آگیا۔ وہ سیل اور اخبار وہیں چھوڑ کے یک دم اٹھ کر لپکے تھے۔ جس کی وجہ سے انہیں کرسی سے ٹھوکر بھی لگی تھی۔ وہ بمشکل گرنے سے بچے۔ کیونکہ بروقت دوسری کرسی کی بیک کا سہارا لے لیا تھا۔ لیکن وہ دو منٹ سنبھلنے کے لیے بھی نہیں ٹھہرے۔ انہیں لگ رہا تھا کہ جیسے بہت دیر ہو چکی ہے۔ وہ ایک سیکنڈ کے اندر اندر علیزے کے بیڈ روم تک پہنچنا چاہتے تھے۔ لیکن بڑی حوصلے کے تین پورشنز کا طویل ترین زینہ طے کرتے ہوئے ان کی ساری ہمتیں جواب دے رہی تھیں۔ ان کا ہر قدم شکستگی کی سمت بڑھ رہا تھا اور اپنے بیڈ روم سے نکلتے آؤرنے ان کو دیکھا اور وہ یہی سمجھا کہ ڈیڈ یقیناً علیزے کے بیڈ روم میں اسے جگانے کے لیے جا رہے ہیں۔ اس لیے ذرا لاپرواہی سے کام لیتے ہوئے نیچے اتر آیا اور وقار آفندی اوپر علیزے کے بیڈ روم کے سامنے پہنچ گئے۔ بیڈ روم کے دروازے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ان کا ہاتھ کانپ رہا تھا اور جیسے ہی وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے تھے ان کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں۔

سامنے کا منظر قیامت سے کم نہیں تھا۔ اس منظر میں حشر پاتا تھا۔ کیونکہ علیزے جس کے بازو کے حصار میں کھڑی تھی وہ کوئی اور نہیں ان کے اپنے گھر کا ملازم اور علیزے کا ڈرائیور منصور حسین تھا۔

”منصور حسین...؟“ وقار آفندی کے دماغ کی رگیں تن گئیں، جبکہ دل اور شاہ کی موٹی موٹی آنکھوں میں سرخ ڈورے ہلکورے لپٹے گئے تھے۔ غضب اس کے چہرے کے عین نقوش میں اتر آیا تھا۔ لیکن پھر یہ سوچ کر کہ جب علیزے اس کی تھی اس کے ساتھ تھی تو پھر یہ غیض و غضب بھلا کس لیے...؟ اس نے اپنے اندر کے پھرے ہوئے زخمی شیر کو سلا دیا تھا، تھپک دیا تھا تھوڑی دیر کے لیے۔

”منصور حسین نہیں! منصور حسین کا پوتا ہوں میں۔“ منصور حسین شاہ کا پوتا۔ اور بابر شاہ کا بیٹا۔ دل اور شاہ ہوں میں۔ دل اور شاہ۔“ اس نے اپنی سمت انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے چبا چبا کر اتنے ٹھوس اور اٹل انداز میں تعارف کرا دیا کہ اس کے تعارف میں کوئی شک نہیں رہ گیا تھا اور وقار آفندی کھڑے کھڑے اس بڑی حویلی کے تین پورشنز سے نیچے گرے اور حویلی کی مضبوط ترین عمارت کے بلبے تلے دب گئے تھے۔ جہاں سے نکلنا اب ان کے بس کی بات نہیں تھی۔

”دل اور شاہ...؟“ یوں جیسے ان کے ہونٹوں نے اس کا نام لینے کی کوشش کی تھی، ہلکی سی جنبش کے ساتھ۔

”ہاں دل اور شاہ! تمہاری بیٹی کا ڈرائیور نہیں، تمہاری بیٹی کا شوہر، جس کی تصدیق کے لیے تم نکاح نامہ بھی دیکھ سکتے ہو اور تسلی کے لیے اپنی بیٹی سے بھی پوچھ سکتے ہو، بلکہ یہاں ہی نہیں تم اسے اکیلے لے جا کر بھی پوچھ سکتے ہو، میری طرف سے اجازت ہے۔“ دل اور شاہ نے وقار آفندی کی بلبے تلے دبی ہوئی لاش کو اور بھی زمین کے اندر دبا دیا تھا۔ لیکن اک لاش نما فاش شدہ وقار آفندی نے نہ جانے کس طرح علیزے کی سمت دیکھا تھا کہ ان کی

حوالہ نظروں کے سوال پہ علیزے نے آہستگی سے سر جھکا لیا۔

”جی بیا! یہ سچ ہے، میں اس سے شادی کر چکی ہوں، میرا اس کے ساتھ نکاح ہو چکا ہے، اب یہ میرا شوہر ہے، پہلے آپ کو اس لیے نہیں بتایا کیونکہ مجھے آپ کے ری ایکشن کا پتا تھا۔ لیکن آج اس لیے بتا رہی ہوں کہ میں آج اپنی مرضی، اپنی رضا سے یہ حویلی چھوڑ کر اپنے شوہر کے ساتھ اس کے گھر جا رہی ہوں، لہذا مجھے روکنے کی اور میرے سامنے رکاوٹ بننے کی کوئی بھی کوشش نہ کرے، آپ نہ کوئی اور۔“

علیزے آفندی کی آواز پہ جہاں آذر آفندی کے قدم دروازے میں ہی رک گئے تھے وہیں وقار آفندی کی شریانوں میں گردش کرتا خون بھی رک گیا تھا۔ نبضیں تھمنے لگی تھیں اور دل بند ہو رہا تھا۔ چہرے پہ مرگ کا عالم تھا اور اسی عالم مرگ میں آذر آفندی بھی دم بخود اور ششدر سا کھڑا تھا۔ وہ ابھی ابھی نیچے ڈانٹنگ ہال میں گیا تھا اور وہاں گرا ہوا اخبار اور ڈیڈ کاسیل دیکھ کر وہ چونک گیا اور جیسے ہی سیل چیک کیا تو رات والا میسج سامنے آیا تھا۔ تب ہی وہ پریشانی سے پلٹا اور ان کے پیچھے چلا آیا تھا۔ لیکن علیزے کے بیڈ روم کے دروازے میں پہنچ کر اس کے قدم زمین نے جکڑ لیے تھے اور اس میں کچھ بھی کہنے کی صلاحیت نہیں رہی تھی۔ آذر آفندی کی سماعتوں کے پر خچے اڑ گئے تھے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی علیزے کو اور کبھی دل اور شاہ کو دیکھ رہا تھا جو اس کی نظر میں اب بھی منصور حسین ہی تھا۔ البتہ منصور حسین کی اصلیت کیا تھی یہ تو صرف وقار آفندی ہی جانتے تھے۔

”چلیں...؟“ دل اور شاہ نے علیزے سے کہتے ہوئے وقار آفندی اور آذر آفندی کی سمت دیکھا۔

”ہوں...“ علیزے نے آہستگی سے سر ہلایا اور پھر دل اور شاہ کے بڑھتے ہوئے قدم کے ساتھ قدم ملانا پڑا۔

”منصور حسین...“ آذر ان کو دروازے کی سمت بڑھتے دیکھ کر یک دم پھر گیا۔

”خبردار آذر آفندی! اپنی جگہ سے ایک انچ بھی آگے بڑھے تو گولیوں سے چھلنی کر دوں گا۔“ دل اور شاہ نے یک دم ریوالتور سامنے کرتے ہوئے اسے منجمد کر ڈالا۔ وہ ان سب کو بے بس کرنے کے پورے پورے انتظام کر کے آیا تھا۔ علیزے۔ اس کے ریوالتور کی زد میں آذر آفندی کو دیکھ کر دھک سے رہ گئی۔

”پلیز آذر بھائی! میں نے آپ سے کہا تھا کہ کوئی بھی میرے راستے کی رکاوٹ نہ بنے، تو پھر کیوں آپ خوا خواہ ہنگامہ کرنا چاہتے ہیں، ہر لڑکی اپنے شوہر کے ساتھ جاتی ہے۔ میں بھی جا رہی ہوں، پلیز آپ روکنے کی کوشش مت کریں۔“ علیزے نے کافی سخت لہجے میں آذر کو منع کر دیا اور آذر ساکت و صامت رہ گیا تھا۔

”علیزے۔“ وہ بے یقینی سے بولا۔

”مرچکی ہے آپ کی علیزے... میں اب آپ کی علیزے نہیں ہوں۔ نہیں ہوں میں آپ کی علیزے۔“ وہ بھی یک دم پھر گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اٹتے آنسو آؤرنے واضح محسوس کیے تھے۔ لیکن پھر بھی وہ کچھ نہ کر سکا تھا۔ دل اور شاہ اسے ساتھ لے کر بیڈ روم سے نکل گیا۔

”علیزے...!“ وقار آفندی کے منہ سے محض اس کا نام سنائی دیا تھا اور وہ کھڑے قد سے یک دم تیور کے نیچے زمین پہ آگرے۔

”ڈیڈ...!“ ان دونوں کے پیچھے نکلتا آذر یک دم وقار آفندی کے گرنے کی آواز سن کر ان کی سمت لپکا۔

”علیزے! ڈیڈ...“ آذر دوڑا تو نیچے زمین پہ بیٹھتے ہوئے اپنی پوری قوت سے چیخا تھا۔

”علیزے...! ڈیڈ مرجائیں گے۔“

آذر زور، زور سے چیخ رہا تھا اور اس کے چیخنے کی آواز باقی گھر والوں کے ساتھ ساتھ سیڑھیاں اترتی علیزے کی سن چکی تھی، تب ہی دل اور شاہ کے ہاتھ میں دبا اس کا ہاتھ تھا اور قدم ٹھک کے رکے تھے۔ لیکن دل اور شاہ نے اسے روکنے نہیں دیا اور وہ چاہ کر بھی رک نہیں سکی تھی۔

اور ان دونوں کو سیڑھیاں اترتے دیکھ کر پورا گھر جیسے پتھر کا ہو گیا تھا۔ جودت، گول، دانیال، احمد، آسیہ آفندی، ثروت بیگم، اسرار آفندی سب کے سب اپنی اپنی جگہ پہ پتھر کے بت ہو گئے تھے۔ اور اوپر سے آذر کے چلانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ان سب چیزوں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے دل اور شاہ سیڑھیاں اتر کر کوریڈور کی سمت بڑھ گیا اور علیزے اس کے ساتھ ٹھسٹی ہوئی جا رہی تھی۔ وہ اسے ساتھ لیے کوریڈور سے باہر روش پہ نکل آیا۔

”گلاب خان! گاڑی اندر لے کر آؤ۔“ اس نے محض دو سیکنڈ کی کال کی تھی اور گیٹ پہ اس کی گاڑی کا ہارن سنائی دینے لگا تھا جیسے ہی عارف نے گیٹ کھولا اس کی پچھمائی ہوئی ”سرف“ بڑی حویلی کی روش پہ آکھڑی ہوئی جس کی ڈرائیونگ سیٹ پہ گلاب خان براجمان تھا، مستعد اور جو کس۔

”منصور حسین! یہ کیا کر رہے ہو تم۔؟ یہ کیا بد تمیزی ہے۔؟“ مبارک خان اپنے کوارٹرز سے نکل کر ادھر ہی آ رہا تھا۔ لیکن دل اور شاہ کے ہاتھ میں دیو چا ہوا علیزے کا بازو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

”خبردار! زیادہ ہمدرد بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ جہاں ہو وہیں کھڑے رہو۔“ دل اور شاہ نے اس کی سمت بھی ریوالور تان لیا اور مبارک خان کے ساتھ چوکیداری پہ مامور عارف بھی چونک گیا۔

”منصور حسین تم یہ سب کیوں؟“ مبارک خان نے کچھ کہنا چاہا۔

”میں منصور حسین نہیں تمہاری علیزے بی بی کا شوہر ہوں۔ سمجھے تم؟“ دل اور شاہ نے جس انداز میں کہا تھا اس پہ مبارک خان اور عارف ہکا بکا رہ گئے۔

”علیزے بی بی کا شوہر۔؟“

”ہاں! اسی لیے تمہاری علیزے بی بی کو اب اپنے ساتھ اپنے گھر لے کر جا رہا ہوں۔“ اس نے کہتے ہوئے جن نظروں سے علیزے کی سمت دیکھا تھا وہ اپنے قدموں پہ کھڑی نہیں رہ سکی تھی۔ یک دم لڑکھڑائی۔ اس کا جسم بے جان ہونے لگا تھا۔ وہ دل اور شاہ کے ہاتھ سے مٹھی میں دبی ریت کی مانند پھسلنے لگی تھی اور اس سے پہلے کہ وہ زمین بوس ہو جاتی دل اور نے اسے بانہوں میں سنبھال لیا۔

”یابا۔۔۔“ بے ہوشی کی وادی میں اترتے ہوئے علیزے کے لبوں نے اپنے باپ کو ہی پکارا تھا، لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی وقار آفندی بہت پیچھے رہ گئے تھے بہت پیچھے۔

”گلاب خان! دروازہ کھولو۔“ دل اور شاہ نے اسے اشارہ کیا اور گلاب خان نے ایک سیکنڈ کی پھرتی سے دروازہ کھول دیا۔ لیکن جیسے ہی دل اور شاہ علیزے کو بانہوں میں اٹھا کر گاڑی کی سمت بڑھا تھا عارف نے یک دم اس پہ بندوق تان لی۔

”میں تمہیں علیزے بی بی کو ایسے نہیں لے جانے دوں گا، تم یہاں سے ایک قدم بھی نہیں ہل سکتے۔“ عارف ایک وفادار ملازم تھا۔ تب ہی تو اس کے سامنے ڈٹ گیا اور مبارک خان عارف کی ذہانت پہ پہلے چونکا، پھر خوش ہوا تھا، دل ہی دل میں اسے شاباش دی۔

”اگر میں یہاں سے نہ گیا تو تمہاری علیزے بی بی کی یہاں سے لاش جائے گی۔“ دل اور شاہ نے گلاب خان کی سمت اشارہ کیا تھا۔ جس نے ریوالور علیزے کی گتھی پہ رکھ دیا۔

”تم ایسا نہیں کر سکتے منصور حسین۔“ مبارک خان علیزے بی بی کے لیے تڑپا تھا۔

”اپنے مطلب کے لیے اگر میں خیر و بابا پہ گولی چلا سکتا ہوں تو تمہاری علیزے بی بی کی کھوپڑی بھی اڑا سکتا ہوں، میرے ملازم تم لوگوں سے بھی زیادہ وفادار ہیں، ابھی اشارہ کروں تو تم اپنے قدموں پہ کھڑے بھی نہیں رہ سکو گے، تم گولی چلاتے ہوئے پھر بھی ڈر جاؤ گے، لیکن میرے ملازم نہیں ڈریں گے، میں خود نڈر ہوں تو میرے ملازم بھی

نڈر ہیں۔“ دل اور شاہ کا ایک ایک لفظ سر دوساٹ اور زہر میں بجھا ہوا تھا، جسے سن کر وہ ساکت ہو گئے تھے۔ ”خیر و بابا پہ گولی تم نے چلائی تھی۔؟“ مبارک خان پاگل ہو جانے کی حد تک حیرت زدہ ہو رہا تھا۔

”ہاں! میں نے چلائی تھی، تم سب کو بے وقوف بنانے کے لیے۔“ وہ تمسخرانہ انداز میں ہنسا تھا اور ان دونوں کے چہروں پہ ہوائیاں اڑنے کی تھیں۔ صبح صبح ایسے انکشافات پہ عقل مفلوج ہو گئی تھی۔ دل اور نے آگے بڑھ کے علیزے کو گاڑی میں ڈالا اور پھر خود بھی گاڑی میں سوار ہو گیا تھا۔ گلاب خان نے گاڑی اشارت کرتے ہوئے ذرا سا بیک کیا۔

”میں نے کہا تھا عارف! پرسوں تمہیں اس حویلی میں دور دور تک کوئی بھی ٹھٹھا ہوا دکھائی نہیں دے گا، کوئی شان و شوکت نہیں رہے گی یہاں۔“ دل اور نے کھڑکی کا شیشہ فولڈ کرتے ہوئے اسے یاد دلایا تھا اور پھر مسکراتے ہوئے ان کو آخری سلام کیا۔ ہاتھ ماتھے تک لے جا کر۔

”رہ راکھا۔“ اور پھر اس کے بعد اس کی گاڑی پھسلتی ہوئی گیٹ سے باہر نکل گئی۔

مبارک خان اور عارف بے یقین سے کھڑے تھے۔ کیونکہ منصور حسین وہاں سے جا چکا تھا۔ لیکن اپنے پیچھے ایک قیامت چھوڑ گیا تھا، ایسی قیامت جو بڑی حویلی کے درو دیوار پہ پہلے کبھی نہیں اتری تھی اور جب اتری تھی تو بنیادیں بھی ہلا کے رکھ گئی تھی۔ وقار آفندی کی حالت یہ وہ علیزے والی حیرت اور بے یقینی بھی بھول گئے تھے۔ انہیں وقار آفندی کی زندگی کی فکر لاحق ہو چکی تھی۔ حویلی کے اندر شور مچا ہوا تھا۔ کسی کو کچھ بھٹائی نہیں دے رہا تھا۔ فی الحال ان کی یہی کوشش تھی کہ وقار آفندی کو جلد از جلد اسپتال پہنچایا جائے۔ اسی لیے مبارک خان کو پہلا آرڈر گاڑی نکالنے کا ہی ملا تھا اور اس کے پیچھے کئی اور گاڑیاں بھی تیار تھیں۔



مدحیہ نے رات جاگ کر گزاری تھی۔ بے شک وہ اس لڑکی کی خاطر ہی جاگنے کے لیے بیٹھی تھی، لیکن دھیان اس کا عدیل عمر کی طرف ہی بھٹکتا رہا تھا۔ اس کا دھیان پلٹ پلٹ کر چائنا ورکشاپ میں کام کرتے عدیل عمر کی طرف جاتا اور وہاں جا کر بے بس ہو جاتا، کیونکہ اسے ورکشاپ سے نکالنا بے حد مشکل کام تھا۔ بے شک اس کی اس سے بہت مختصر اور کم ملاقاتیں ہوئی تھیں، لیکن پھر بھی وہ جان چکی تھی کہ وہ کتنا خود دار ہے؟ اور اس کی یہی خودداری مدحیہ کے ہر دھیان کے آڑے آ رہی تھی۔ اسے پتا تھا کہ وہ اسے کبھی کچھ بھی نہیں کرنے دے گا۔ جبکہ وہ اسے نہ جانے کیوں اس ورکشاپ میں برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔ شاید اس کے اندر ہمکنے جذبے کا پہلا تقاضا ہی یہی تھا۔

محبوب کو حالت شہنشاہی میں دیکھنا، اپنے محبوب کو فقیرانہ حالت میں بھلا کون برداشت کر پاتا ہے؟ ہر صاحب محبت اور صاحب جذبہ اپنے محبوب کے لیے تاج محل کے خواب ہی دیکھتا ہے۔ سو وہ بھی دیکھ رہی تھی۔ حالانکہ محبت کے وجود سے انکاری تو اب بھی تھی اور سوچ کی تان اسی جملے پر آکر ٹوٹی تھی۔

”میں اور محبت۔؟ وہ بھی عدیل عمر سے۔؟ نہیں، نہیں، ہرگز نہیں۔“ اور جہاں اس کی سوچ کی تان ٹوٹی تھی وہیں اس کی محبت کا دھاگہ مضبوط سے بھی مضبوط تر ہوتا تھا۔ بے شک وہ اعتراف نہیں کرتی تھی، لیکن اس حقیقت کا اور اک تو اس پہ بھی ہو چکا تھا کہ عدیل عمر اس کے دل کا قلعہ تسخیر کر چکا ہے۔ چار چھ ملاقاتوں میں ہی فتح کیا تھا۔ لیکن بس مسئلہ یہ تھا کہ ہر انسان کی طرح فطری طور پہ اس کے لیے بھی ہار ماننا بہت مشکل تھا۔ اس لیے وہ مان ہی نہیں رہی تھی۔ حالانکہ جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ باقی تو کچھ نہیں رہا تھا۔ سوائے نام نہاد خود سری کے۔ وہ سر بھی اور وہ خود دار تھا۔ اور مسئلہ بھی بس یہی تھا۔ دونوں اپنی اپنی ذات میں سر بلند رہنا چاہتے تھے۔ اس بات

سے بے خبر کہ محبت تو جھکی گردنوں کا ہار ہے۔ انہی پہ بھنا پسند کرتی ہے۔

”آہیہ۔“ اس لڑکی کی کراہی پہ اس نے یک دم چونک کر دیکھا۔ رات کی سیاہی دن کے سنہرے اجالوں میں تبدیل ہو رہی تھی۔ صبح چھ بجے کا وقت تھا۔ وہ لڑکی ہوش میں آچکی تھی اور جیسے ہی اس نے سر کو حرکت دینے کی کوشش کی اس کے سر میں درد کی شدید ٹیسس اٹھنے لگی تھیں، درد پھیلنے لگا تھا۔

”ہیلو! گڈ مارنگ۔“ مدیحہ نے اسے متوجہ کرنے کے لیے اسے وش کیا اور اس کی توقع کے عین مطابق اس لڑکی نے مدیحہ کی سمت چونک کر دیکھا۔ اس کی خالی خالی آنکھوں میں حیرت اور الجھن کے تاثرات ابھرنے لگے تھے، کیونکہ اس کمرے کا ماحول اور مدیحہ کا چہرہ اس کے لیے یکسر اجنبی تھا۔ وہ انجان تھی اور بے یقین بھی۔ اس کی بے یقینی مدیحہ کی سمجھ سے بالا تر تھی۔

”کیسی ہیں آپ؟ کیسا فیل کر رہی ہیں؟“ مدیحہ نے بڑی بروہاری سے کام لیتے ہوئے پوچھا۔ لیکن وہ لڑکی شاید جواب دینے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھی۔ اس کی چپ اس کی بے یقینی اس کی حیرت اور اس کی الجھن ہنوز تھی۔ ”دیکھیے مس! میں آپ سے مخاطب ہوں، آپ سے کچھ پوچھ رہی ہوں، اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟“ مدیحہ نے اب کی بار کافی بے تامل اور دو ٹوک سے لہجے میں پوچھا اور وہ لڑکی پھر بھی جواب دینے کی بجائے اٹھنے کی کوشش کرنے لگی، جس پر مدیحہ کو خاصا غصہ آیا تھا۔

”اسٹاپ! میں نے آپ کو یہاں سے اٹھنے کے لیے نہیں کہا، آپ کی طبیعت پوچھی ہے؟“ ”میری طبیعت کو کچھ نہیں ہوا، ٹھیک ہوں، زندہ ہوں، آپ کو بھی نظر آ رہا ہے، بس رات گزر گئی، آپ کی بڑی مہربانی، اب مجھے جانے دیجیے۔“ اس لڑکی نے بول کر مدیحہ کو حیران پریشان کر دیا تھا۔ اتنی تلخی تھی اس کے لہجے میں کہ مدیحہ دیکھتی رہ گئی۔ اتنے میں نبیل بھی دروازہ کھول کر اندر چلا آیا۔ ”گڈ مارنگ۔“ وہ بھی وقت سے پہلے ہی اٹھ گیا تھا۔ اسے بھی رات سے اس لڑکی کی طرف سے پریشانی ہو رہی تھی۔

”ارے۔! آپ کہاں جا رہی ہیں؟“ نبیل اس لڑکی کو بیڈ سے اترتے دیکھ کر چونک گیا۔ ”اس شہر کی سڑکوں پہ اس شہر کی گلیوں میں۔“ وہ لڑکی اس حد تک تلخ ہو گئی، ان دونوں بہن بھائی کو اندازہ نہیں تھا، اسی لیے اب ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے تھے۔ ”کیوں؟ آپ کا گھر نہیں ہے کیا؟“ نبیل پوچھے بغیر نہیں رہ سکا۔

”میرا گھر ہوتا تو میں سڑکوں پہ یوں ماری ماری نہ پھر رہی ہوتی۔“ اس لڑکی کا لہجہ بھیگ گیا تھا۔ اس کی ساری تلخی اس کے لہجے کی نمی میں چھپ گئی تھی۔ ”کیا مطلب ہے آپ کا؟ آپ کا گھر کیوں نہیں ہے؟“

”میرا گھر اس لیے نہیں ہے، کیونکہ میرے پاس عزت نہیں ہے، عزت دار لڑکیوں والا غور نہیں ہے، میرا ریپ ہوا ہے، میری عزت لوٹی گئی ہے، مجھے برباد کیا گیا ہے اور پھر بھی۔ پھر بھی میرا مجرم ہر جگہ دندنا پھر رہا ہے، کوئی اسے اس کے انجام تک پہنچانے والا نہیں ہے اور میں جب اس کے خلاف آواز اٹھاتی ہوں تو بے گھر کر دی جاتی ہوں۔ میرے اپنے گھر والے مجھے اپنے گھر میں رکھتے ہوئے ڈرتے ہیں اور آپ جان سکتے ہیں جس لڑکی کا بوجھ اپنے گھر والے نہیں اٹھا سکتے اس کا بوجھ دوسرے لوگ کیسے اٹھا سکتے ہیں بھلا؟ میں تو ایسی مصیبت بن گئی ہوں کہ پولیس والوں سے بھی سنبھالی نہیں جا رہی اور آپ کے گھر سے اس لیے جا رہی ہوں کہ ساری حقیقت جاننے کے بعد آپ نے بھی تو مجھے اپنے گھر سے نکالنا ہی ہے نا؟ تو پھر کیوں نہ میں خود ہی چلی جاؤں؟“ اس لڑکی کی بیان کی گئی حقیقت اور اس کے سوال پہ ان دونوں کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ مدیحہ کا رنگ سفید لٹھے کی مانند

ہو چکا تھا۔ وہ چکر اگنی تھی اور خود نبیل کے ماتھے پہ بھی پسینے کے قطرے نمودار ہو چکے تھے۔
ماہ نومبر کی ایک سرد صبح میں ماتھے پہ پھوٹے پسینے کے قطرے داغی انتشار کا نتیجہ اور باقاعدہ ثبوت دے رہے تھے۔ وہ اس لڑکی کی سمت دیکھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ کیونکہ وہ بھی تو ایک ”مرد“ تھا اور دوسرے کسی مرد کی درندگی اور ہوس پہ شرمسار اور نام نہاد تھا۔ اس لڑکی سے نظر ملانے کی ہمت نہیں رہی تھی اور وہ ان دونوں کو خاموش اور گم سم سا دیکھ کر بمشکل بیڈ کا سہارا لے کر کھڑی ہوئی اور نقاہت زدہ کمزور قدموں کو بڑی ہمت مجتمع کر کے زمین پہ جماتی ہوئی دروازے کی سمت بڑھی۔ وہ نبیل کی سائیڈ سے ہو کر گزری تھی اور دروازے کے ہینڈل پہ رکھتے ہوئے دروازہ کھول لیا۔

”ٹھہریے۔!“ نبیل کی آواز متوازن اور لہجہ مضبوط تھا۔ مدحیہ اس کے انداز پہ چونک گئی۔ اسے اور اک ہو چکا تھا کہ نبیل کوئی فیصلہ کر چکا ہے۔

”آپ یہیں رہیں گی، کہیں نہیں جائیں گی میں دوں گا آپ کو تحفظ۔ تب تک۔۔۔ جب تک میں زندہ ہوں۔۔۔ آپ کو اس گھر سے نہ کوئی نکالے گا نہ آپ نکل سکتی ہیں یہ میرا وعدہ ہے، نبیل حیات کا وعدہ۔“ نبیل کی زندگی کا یہ شاید پہلا وعدہ تھا جو اس نے کسی سے کیا تھا۔ وہ بھی اتنے مضبوط اور اٹل انداز میں۔۔۔ وہ لڑکی اسے دیکھتی رہ گئی۔ دروازے کے ہینڈل پہ رکھا اس کا ہاتھ لرز گیا تھا، جبکہ مدحیہ نہ جانے کیوں وہاں سے روتی ہوئی باہر نکل گئی تھی۔ حالانکہ نبیل حیات کے فیصلے پہ زندگی میں پہلی بار اسے اپنے بھائی پہ فخر ہوا تھا۔ لیکن ساتھ ساتھ اسے اپنی دوست میری کا دکھ بھی رلا گیا تھا۔ اس کے ساتھ بھی تو رہا ہوا تھا۔ اس کی عزت بھی لوٹی گئی تھی۔ اسے بھی برباد کیا گیا تھا۔ مدحیہ روتی نہ تو اور کیا کرتی؟



دل اور شاہ کی گاڑی فرار لے بھرتی ہوئی اپنے گھر کے گیٹ کے سامنے آکر رکی تھی۔ اس کے ملازم زلفی نے فوراً ”گسٹ کھول دیا اور گلاب خان ایک جھٹکے سے گاڑی اندر روش پہ لے آیا تھا اور گیٹ بند کر کے زلفی بھاگتا ہوا گاڑی تک آیا اور گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔“ سلام صاحب۔۔۔ اس نے دل اور کو گاڑی سے اترتے دیکھ کر احتراماً سلام کیا۔

”والسلام! کیسے ہو زلفی۔۔۔؟“ دل اور نے کافی اپنائیت سے پوچھا تھا۔

”ٹھیک ہوں صاحب! آئیے اندر آئیے نا۔۔۔“ زلف خان عرف زلفی گلاب خان کی بیوی گل کا بھائی اور گلاب خان کا سالاد تھا۔ عمر میں پندرہ سال کا، لیکن مزاج میں تیس سالہ سنجیدگی رکھتا تھا۔ دل اور شاہ کی غیر موجودگی میں گلاب خان پہ کافی ذمہ داریاں تھیں جن کی وجہ سے اسے اکثر و بیشتر گھر کے کام نبٹانے کی غرض سے گھر سے باہر بھی جانا پڑتا تھا اور گل کو گھر میں اکیلے رہنا پڑتا تھا۔ اس لیے دل اور شاہ کی پریشانی زلفی کو یہاں لایا گیا تھا۔ زلفی ایک دوبار پہلے بھی یہاں آچکا تھا۔ اس لیے دل اور شاہ کو اس کے بارے میں پتا تھا۔ تب ہی اس کے آنے پہ کوئی اعتراض نہیں کیا تھا اور آج زلفی بھی اسے اتنے دنوں بعد دیکھنے پر بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ اسے دل اور شاہ کا مزاج، اس کی شخصیت، اس کا رہن سہن، سب بہت پسند تھا۔ وہ دل اور شاہ کو آئیڈل رائز کرتا تھا، لیکن دل ہی دل میں۔

”آ رہا ہوں یار! آ رہا ہوں۔“ دل اور گاڑی سے اتر آیا۔ لیکن اس کے اترنے کے بعد جیسے ہی زلفی کی نظر گاڑی کے اندر گئی وہ ساکت اور مبسوت رہ گیا۔ وہ لڑکی تھی یا پھر سر تپا حسن کا مجسمہ؟ یا پھر ہوش ربا قیامت؟ یا کسی ریاست کی شہزادی۔۔۔؟ یا۔۔۔ یا پھر کوہ قاف کی راہ بھٹکی ہوئی پری؟ وہ جو کچھ بھی تھی دل اور شاہ نے اسے بڑی

لا پرواہی، بڑی بے دردی اور بڑی کمال بے نیازی سے اپنی گاڑی کی سیٹ پہ ڈال رکھا تھا۔

”گلاب خان! بیسمنٹ کا لاک کھول دو جا کر۔“ دل اور شاہ نے بے ہوش پڑی علیزے کو گاڑی سے نکالتے ہوئے اپنا اگلا حکم جاری کیا۔

”بیسمنٹ۔۔۔؟“ گلاب خان ٹھٹکا، لیکن کچھ کہنے کی جرات نہیں کر سکا۔ تب ہی سر ہلا کر آگے بڑھ گیا اور دل اور شاہ اس کے پیچھے پیچھے اندر آ گیا تھا۔ لیکن زلفی کے پیٹ میں مروڑاٹھنے لگے تھے۔

”تو کیا صاحب اتنی خوب صورت لڑکی کو بیسمنٹ میں ڈالنے کے لیے لے کر آیا ہے۔“ زلفی کے ذہن میں آنے والا یہ سوال گل کے ذہن میں بھی آیا تھا۔ وہ کچن سے نکل کر دل اور شاہ کو سلام کرنے کے لیے سامنے آئی تھی۔ لیکن اس کے حصار میں کسی بے ہوش لڑکی کو دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی۔ اس لڑکی کا ملکوٹی حسن ان سب کی آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا۔

”سلام صاحب۔۔۔!“ وہ بمشکل اسے سلام کر پائی تھی۔

”والسلام۔۔۔!“ وہ اسے سنجیدگی سے جواب دیتا ہوا آگے بڑھا اور اوپر جانے والی سیڑھیوں کے پیچھے بیسمنٹ کے دروازے میں داخل ہو گیا تھا۔

یہ بیسمنٹ نہیں علیزے آفندی کا قید خانہ تھا اور دل اور شاہ نے اس قید خانے میں آکر علیزے کو بڑی بے رحمی سے اپنی بانہوں سے جھٹک دیا تھا۔ کسی انتہائی ناگوار بوجھ کی مانند۔ اور یوں زور سے گرنے کی وجہ سے علیزے کا سر زمین سے ٹکرایا تھا۔ جس پہ وہ بے ہوشی کے باوجود کراہ اٹھی تھی اور اس کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔

”پاپا۔۔۔!“ جیسے ہی اس کے ذہن میں سارا واقعہ تازہ ہوا اسے پہلا خیال وقار آفندی کا ہی آیا تھا۔

”ہو نہہ پاپا۔۔۔“ وہ نفرت اور حقارت سے دیکھتے ہوئے سر جھٹک کر پلٹ گیا اور علیزے اس کے قدموں کی چاپ پہ کرنٹ کھا کے سیدھی ہوئی تھی۔ دل اور سیڑھیوں کی سمت بڑھ رہا تھا۔

”ڈرا نیور۔۔۔“ وہ اسے وہاں سے جاتے ہوئے دیکھ کر چیخی۔

”ڈرا نیور! کو میری بات سنو۔ ڈرا نیور پلیز۔“ علیزے نے چیختے ہوئے اسے روکنے کی اور خود زمین سے اٹھنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ دونوں کام ناکام ہو گئے تھے۔ نہ وہ خود اٹھ سکی تھی نہ وہ رکا تھا اور علیزے چیختی اور روتی بلکتی ہوئی رہ گئی۔ وہ بہت بلند آواز سے چیخ رہی تھی۔ لیکن یہاں سننے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ جیتے جی زندہ سلامت قبر میں اتار دی گئی ہو اور اسے تو یہ بھی نہیں پتا تھا کہ اس کے لیے یہ قبر کھودی کس نے ہے؟ اگر پتا چل جاتا تو وہ واقعی مرجاتی۔

لیکن فی الحال وہ انجان تھی اور انجانے میں اور اندھیرے میں سر ٹکرا رہی تھی، باہر سب کے لیے صبح تھی، لیکن اس کے لیے ہر طرف رات ہو چکی تھی۔



دل اور شاہ نے قید خانے کا دروازہ بند کر کے دروازے میں تالا ڈال دیا۔

اور اسی قید خانے کے دروازے میں تالا ڈالنے کے بعد واپس پلٹتے ہوئے دل اور شاہ کی چال بہت عجیب سی ہو رہی تھی۔ اس کی چال میں کیا کچھ نہیں تھا؟ فحش شکستگی، سرشاری، اذیت، سرخوئی، ندامت، آزادی، لا پرواہی یا پھر اعصاب پہ بوجھ کا احساس سب کچھ مل کر اس کی چال میں اتر آیا تھا۔ اس کے ایک ایک قدم کے کئی معنی تھے، کئی مفہوم تھے۔ وہ ڈھیلے ڈھالے انداز میں چلتا ہوا ڈرائنگ روم کے صوفے پہ آکر بیٹھ گیا اور اپنا سر صوفے کی

بیک سے نکال کر اپنے دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف موڑ کے گدی کے نیچے رکھتے ہوئے اس نے آنکھیں موند لی تھیں۔ ساری رات کی جاگی آنکھوں میں تھکن اور رت جگمگے کی جلن ہونے لگی تھی۔ حالانکہ پوری رات جاگ کر گزارنے کا تجربہ اس کے لیے نیا نہیں تھا۔ لیکن اس طرح کا جاگنا آنکھوں میں جلن چھوڑ گیا تھا۔ اگر اس ایک رات میں اس کی آنکھیں جل رہی تھیں تو پھر علیزے آندہ کی آنکھیں تو اس ایک رات میں لہو رس رہی ہوں گی؟

”صاحب... ناشتا کریں گے؟“ اس کی بند آنکھوں کے پار زلفی کی آواز ابھری تھی اور دل اور شاہ برسوں کی مسافت سے واپس پلٹ آیا۔

”ہوں! کروں گا“ لیکن اماں کے ساتھ بس وہ لاہور پہنچنے ہی والی ہیں۔“ اس نے گہری سانس کھینچتے ہوئے جواب دیا اور پھر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”ٹھیک ہے صاحب! بتا دیتا ہوں گل باجی کو۔“ زلفی سر ہلا کر پلٹ گیا۔

”صاحب! میں نے سارا سامان کمرے میں پہنچا دیا ہے۔“ گلاب خان سیڑھیاں اتر کر ڈرائنگ روم کی طرف آگیا۔

”ہوں ٹھیک ہے! اور ہاں تمہیں یاد ہے نا میں نے تمہیں کیا تاکید کی تھی؟“

”جی صاحب! یاد ہے بہت اچھے سے یاد ہے۔“

”زلفی اور گل کو بھی سمجھا دینا، میرے دوست، میرے کو لیگز، میرے جاننے والے کبھی کوئی بھی آئے کسی کو بھی اس لڑکی کے بارے میں بتا نہیں چلنا چاہیے“ آپ لوگوں کی کسی بھی حرکت سے یہ احساس نہ ہو کہ یہاں گل کے علاوہ کسی لڑکی کا کوئی وجود بھی ہے۔“ اس کی وارننگ واقعی وارننگ ہوتی تھی اور یہ بات اس کے سارے ملازم بخوبی جانتے تھے اور سمجھتے بھی تھے۔

”جی صاحب! جو حکم“ گلاب خان نے سر خم کر دیا۔

”اوکے! جاؤ اپنی ڈیوٹی سنبھالو اماں پہنچنے والی ہی ہوں گی۔“ وہ اسے کہتے ہوئے خود صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا اور تھوڑی دیر پہلے خود پہلے غالب آجانے والے تمام احساسات اور کیفیات کو پرے جھٹک دیا تھا۔

اپنے بیڈ روم میں آکر اس نے بوٹ اتارے، اپنی جیبیں خالی کیں، گھڑی اتار کر رکھی اور نئے پریس شدہ کپڑے لے کر شور لینے کے لیے چلا گیا تھا اپنے چہرے کو داڑھی سے آزاد کرنے کے لیے اس نے شیو کی آفٹر شیو لگایا اور پھر اپنی اصلی حالت میں لوٹ آیا تھا۔ منصور حسین والا رہا سہا چولا بھی اتار پھینکا تھا۔ شور لینے اور ڈریس اپ ہونے کے بعد وہ دل اور شاہ کی شان دار شخصیت کو پوری طرح سے اجاگر کرتا ہوا نظر آیا تھا۔

وہی دل اور شاہ آن اور انا والا۔

وہ بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھی اپنی گھڑی اٹھا کر اپنی مضبوط کلائی پر باندھ رہا تھا۔ جب باہر گیٹ پہ بتول شاہ کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا اور گھڑی کا لاک بند کرتے ہوئے دل اور شاہ کا ہاتھ کانپ گیا تھا۔

بائیس سال بعد بتول شاہ نے اپنے آبائی شہر لاہور میں قدم رکھا تھا اور بائیس سال بعد رکھے جانے والے اس قدم پہ لاہور کی زمین کا بھی کلیجہ شق ہو گیا تھا۔ دل اور شاہ کے ہاتھ کی طرح جیسے زمین بھی کانپ گئی تھی۔ شاید اس لیے کہ بتول شاہ کے دل سے اور دامن سے بندھا ہوا دکھ بہت عظیم اور اذیت ناک تھا۔ جس کا بوجھ صرف بتول شاہ سینے میں دبائے ہوئے پھر رہی تھیں۔ ورنہ یہ بوجھ تو زمین بھی نہیں سہار سکتی تھی جو انہوں نے سہارا ہوا تھا۔

ان کی ہمت اور ان کے حوصلے تو دل اور شاہ سے بھی کئی گنا بڑھ کے تھے۔ وہ بلاشبہ ایک بہادر اور چٹان نما عورت تھیں۔ ان کی اتنی مضبوطی اور بہادری پہ تو دل اور شاہ بھی چند ٹانفے کے لیے چپ ہو جاتا تھا۔

گاڑی کے ایک ہارن کے بعد دوسرے ہارن کی نوبت نہیں آئی تھی اور گیٹ کھل گیا تھا۔ اسی لیے دل اور ایک بار پھر اپنے ذہن سے سارے خیالات جھٹک کر بیڈ روم سے باہر آگیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا سیڑھیاں بھی اتر آیا۔ ان کے گاڑی سے اترنے تک وہ گاڑی تک پہنچ چکا تھا۔

”السلام علیکم اماں۔“ اس نے بتول شاہ کا ہاتھ پکڑ کر انہیں گاڑی سے اترنے میں ہلکی سی مدد دی۔ اور بتول شاہ نے اسے سینے سے لگا لیا۔

”میرے بچے، میرے جوان، جیتے رہو۔“ وہ اسے آغوش میں بھینچے ہوئے کافی گلو گیر لمبے میں بولیں اور ان کے دکھ، ان کی اذیت پہ دل اور شاہ کا دل بھی بھگ گیا تھا۔ اس لمحے انہیں باہر شاہ کی یاد آ رہی تھی، کیونکہ اس لمحے انہیں باہر شاہ کی صورت دل اور شاہ میں نظر آ رہی تھی، انہیں لگ رہا تھا جیسے ان کے سامنے اس وقت باہر شاہ کھڑا تھا، سر اٹھائے، سر خرو سا انداز لیے۔

”میں... میں... خوش نہیں ہوں اماں، میرے سینے کی آگ پہ ابھی... بھی کوئی پانی نہیں پڑا، میں... میں وقار آندہ کو زندہ چھوڑ آیا ہوں۔ مجھ سے... مجھ سے یہ احساس برداشت نہیں ہو رہا کہ میں وقار آندہ کو زندہ چھوڑ آیا ہوں، وہ ابھی تک جی رہا؟ وہ سانس لے رہا ہے؟ وہ ابھی بھی زمین کے اندر نہیں، زمین سے باہر ہے، میں نے جب جب اسے دیکھا ہے، مرم کے جیا ہوں، دل چاہتا تھا اپنے دونوں ربو اور اس کے سینے پہ خالی کر دوں،

پر نیچے اڑا دوں وقار آندہ کے، مسمار کر دوں بڑی حویلی کو، ان کا بچہ بچہ زندہ در گور کر ڈالوں... یہ... یہ علیزے آندہ میرے سینے کی آگ کو ٹھنڈا نہیں کر پائے گی، یہ تو کچھ بھی نہیں ہے، میرے اندر بھڑکتے شعلوں پہ اک بوند بھی نہیں ہے، یہ علیزے آندہ۔

میں پاگل ہو رہا ہوں اماں، میں بڑی حویلی والوں کو زندہ چھوڑ آیا ہوں۔“ دل اور شاہ کے اندر کا غبار انہیں دیکھتے ہی باہر اُٹ آیا تھا اور بتول شاہ نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنے ہاتھوں سے تھپکے تھے۔

”غلط فہمی ہے تمہاری۔ کہ بڑی حویلی والے زندہ ہوں گے... ہونہیں... ہو ہی نہیں سکتا... مر چکے ہیں بڑی حویلی والے... زندہ در گور ہو چکے ہیں اور وقار آندہ اب اپنی موت بھی مانگے گا تو رب سے اسے اپنی موت بھی نہیں ملے گی۔“ بتول شاہ اسے سمجھاتے ہوئے انتہائی نفرت اور حقارت سے بولی تھیں، ان کے لمبے سے زہر ٹپک رہا تھا۔

”لیکن میں اسے اپنے ہاتھوں سے مارنا چاہتا تھا تاکہ حشر کے روز اپنے بابا کے سامنے سر خرو ہو پاؤں تاکہ ان کا رہ جانے والا کام ان کے بیٹے نے کر دیا ہے۔“ دل اور شاہ کے لمبے میں عجیب سی اذیت اور عجیب سی شدت محسوس ہو رہی تھی۔

”بس کرو شاہ! میرے حوصلے بلند ہی رہنے دو، ورنہ تمہاری اماں ریت کی طرح بکھر جائے گی اور تم سمیٹ نہیں پاؤ گے۔“ بتول شاہ کے انداز میں تھکن اتر آئی تھی اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی دل اور شاہ کو خود پہ کنٹرول کرنا پڑا اور ان کے گرد بازو لپیٹے ہوئے انہیں اپنے بازو کا سہارا دیے اندر آگیا۔

”السلام بیگم صاحبہ...“ گل بڑے احترام سے آگے بڑھی تھی۔

”والسلام! جیتی رہو۔“ انہوں نے اس کا سر تھکا تھا۔

”السلام علیکم بیگم صاحبہ!“ زلفی بھی صوفے کی چھیلی سائیڈ سے نکل کر سامنے آگیا۔

”والسلام! جیتے رہو، خوش رہو۔“ وہ کافی خوش مزاجی اور شفقت سے پیش آ رہی تھیں۔

”بیگم صاحبہ! کیا لیں گی آپ؟ میں کیا لے کر آؤں آپ کے لیے؟“ آج پہلی بار اپنے گھر آئی ہیں؟ آپ کو دیکھ کر آپ سے مل کر بہت خوش ہو رہی ہے ہمیں۔“ گل واقعی ان کی آمد پہ بہت خوش ہوئی تھی اور اس کی

خوشی کا اظہار اس کے لہجے سے ہی ہو رہا تھا۔
”مجھے بھی اپنے گھر آکر اور تم لوگوں سے مل کر بہت خوشی ہو رہی ہے اب آگئی ہوں تو یہاں رہوں گی بھی اور تمہارے ہاتھ کے بنے ہوئے کھانے بھی کھاؤں گی۔“ بتول شاہ نے بہت نرمی سے جواب دیا اور گل ان کی بات پہ خوش ہو گئی۔

”بہت شکریہ بیگم صاحبہ! مجھے تو آپ کے لیے کھانے بنا کر بھی بہت خوشی ہوگی آپ یہاں ہی رہیں ہم آپ کی خدمت کریں گے۔“ دل اور شاہ نے ان کو بتایا تھا کہ گل بہت اچھی لڑکی ہے سو بتول شاہ کو اس کے کسے پہ یقین آگیا تھا۔ وہ واقعی اچھی لڑکی تھی سمجھ دار اور بردبار قسم کی۔
”صاحب! ناشتا لگا دوں؟“ وہ دل اور سے پوچھ رہی تھی۔

”ہوں! لگا دو۔“ اس کی اجازت ملتے ہی گل نے منٹوں میں ناشتا لگا دیا۔ اور وہ دونوں ماں بیٹا ناشتا کرنے بیٹھ گئے تھے۔ ان دونوں کے درمیان فی الحال خاموشی تھی اور اس خاموشی میں خلل نبیل حیات نے ڈالا تھا۔ اس کی کال آگئی تھی۔ نبیل پہ رکھے اس کے سیل پہ واٹریشن ہو رہی تھی اور دل اور نبیل کا نمبر بھی دیکھ چکا تھا۔
”کس کی کال ہے؟“ بتول شاہ نے پوچھ ہی لیا۔

”نبیل کی۔“
”ارے! تو پھر ریسیو کرو نا۔“ انہیں حیرانی ہوئی۔
”ہوں! کرتا ہوں۔“ اس نے نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا اور سیل اٹھا کر کال ریسیو کر لی۔
”السلام علیکم۔“ اس نے کافی سکون سے سلام کیا تھا۔
”وعلیکم السلام! کہاں ہو؟ تم نے تو کہا تھا کہ تم پندرہ کو واپس آ جاؤ گے؟“ نبیل کا لہجہ اور انداز بے حد سنجیدہ

تھے۔
”تو میں نے کب انکار کیا ہے کہ میں پندرہ کو واپس نہیں آ سکتا؟“
”تو پھر۔۔۔؟“

”تو پھر یہ کہ دراصل میں اس وقت اپنے گھر میں ہوں اور اماں کے ساتھ بیٹھا ناشتا کر رہا ہوں۔“ دل اور نے اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا۔ کیونکہ اسے نبیل کے ری ایکشن کا پہلے سے اندازہ تھا۔
”کیا۔۔۔؟ تم آپکے ہو۔۔۔؟ تم ناشتا کر رہے ہو۔۔۔؟ اور تم نے مجھے بتانے کی زحمت بھی نہیں کی۔۔۔؟“ نبیل تو جیسے دنگ رہ گیا۔

”بس یار! بھوک لگی ہوئی تھی اس لیے سوچا کہ تمہارے آنے سے پہلے پیٹ پو جا کر لوں۔“ دل اور نے اسے چھیڑا۔
”تو ٹھیک ہے پھر تم کھاؤ اور مرو، لیکن مجھ سے بات مت کرو۔“ نبیل نے غصے سے کہتے ہوئے فون بند کر دیا اور دل اور بے ساختہ ہنس پڑا۔

”کیا بات ہے؟ کیا کہہ رہا تھا نبیل۔۔۔؟“
”کہنا کیا ہے؟ بس گالیاں دے رہا ہے مجھے۔“ دل اور ہنستے ہوئے دوبارہ ناشتے کی طرف متوجہ ہوا۔
”کیوں۔۔۔؟“

”کیونکہ میں نے اپنی واپسی کا اسے کیوں نہیں بتایا؟“
”ہاں تو بتا دیتے نا؟“ انہوں نے نبیل کی سائیڈ لی۔
”ماں! کیسے بتا دیتا؟ ابھی ایک گھنٹہ پہلے ہی تو آیا ہوں میں؟“ وہ بھی درست کہہ رہا تھا۔ بتول شاہ سر ہلا کے رہ

گئیں۔ اتنے میں نبیل کی کال دوبارہ آنے لگی۔
”اب اسے آپ کا خیال آیا ہے۔“ دل اور نے پیش گوئی کی۔
”السلام علیکم۔“ اس نے دوبارہ سلام کیا تھا۔

”تم نے کہا کہ تم اماں کے ساتھ بیٹھ کر ناشتا کر رہے ہو تو اس کا مطلب ہے کہ آنٹی لاہور آئی ہوئی ہیں؟“ نبیل کی اری پیس سے سنائی دیتی آواز پہ بتول شاہ کے چہرے پہ مسکراہٹ بکھر گئی تھی اور دل اور یک دم قہقہہ لگا کر ہنسا۔
”میں نے تم سے کچھ پوچھنے کے لیے فون کیا ہے۔ تمہارے قہقہے سننے کے لیے نہیں۔“ نبیل جل بھن گیا۔
”اوہ سوری سوری! ہاں اماں لاہور آئی ہوئی ہیں ابھی ابھی آئی ہیں ہم دونوں ماں بیٹا تقریباً۔۔۔“ اس سے پہلے کہ دل اور کی بات مکمل ہوتی نبیل نے پھر فون بند کر دیا تھا اور دل اور پھر ہنس دیا تھا۔



وقار آفندی بے ہوش تھے۔ وہ آئی سی یو میں تھے۔ ان کی حالت بہت زیادہ خراب تھی۔ لیکن ان سے بھی زیادہ خراب حالت ان کی تھی جو ہوش میں تھے اور آئی سی یو کے باہر کھڑے تھے۔ بڑی حویلی کے ایک ایک فرد کے چہرے پہ ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ لیکن ان میں سے ایک چہرہ ایسا تھا جس پہ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے خود مٹھیاں بھر بھر کے مٹی ڈال دی ہو اور اس مٹی کے ساتھ وہ چہرہ بھی مٹی ہو چلا تھا۔ وہ چہرہ وقار آفندی کا نہیں تھا۔ وہ چہرہ عون اور عدید کا بھی نہیں تھا۔ وہ چہرہ صرف اور صرف ”آذر آفندی“ کا تھا۔ جو پہلے قدم پہ ہی ٹھوکر کھا کر منہ کے بل گرا تھا اور چہرے کے سارے نقوش زخمی اور بد وضع ہو گئے تھے۔ جن کی اذیت اور درد اس کے دل میں ہی نہیں اس کے پورے جسم میں پھیل رہا تھا۔ کسی سرطان کی طرح۔

”آذر۔۔۔! تم گھر چلے جاؤ۔“ اس کی حالت ایسی تھی کہ دانیال کو نہ چاہتے ہوئے بھی اسے کہنا پڑا۔ جس پہ آذر نے اسے جن نظروں سے دیکھا تھا دانیال کو چپ ہونا پڑا۔ اس کی آنکھوں کا زخمی پن اور نظروں کی کاٹ دانیال کو خاموش کروانے کے لیے کافی تھیں۔

”ہاں! دانیال ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تم گھر چلے جاؤ، تمہاری طبیعت بھی ٹھیک نہیں لگ رہی اور ویسے بھی حویلی میں اور کوئی نہیں ہے۔“ اسرار آفندی نے بیٹے کی حالت کے پیش نظر اسے گھر جانے کا مشورہ دیا تھا۔ لیکن آذر کو کسی کے مشورے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تو جیسے بہرہ ہو چکا تھا۔ وہ اسپتال کی راہ داری میں دیوار کے ساتھ لگے صوفے پہ سر جھکائے بیٹھانچے چکنے فرش پہ کسی نا دیدہ نقطے کو پچھلے تین گھنٹے سے لگا تار گھورے جا رہا تھا۔ چہرہ مسلسل جھکا ہوا تھا۔ لب بھینچے ہوئے تھے اور آنکھوں میں سرخی اتری ہوئی تھی۔ وہ سر اٹھانے کے قابل نہیں تھا۔ کسی سے بات کرنے اور نظر ملانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ بلکہ خود کسی کر لینے کو دل چاہ رہا تھا۔ اتنی تذلیل کے بعد جینا بھی کوئی جینا تھا؟

آذر کے دل میں ابال اٹھ رہے تھے جن کو بھینچنے کے لیے وہ اپنے ہونٹ اور ہاتھوں کی مٹھیاں بھیج رہا تھا۔ باقی سب بھی کھڑے تھے۔ باقی سب بھی چپ تھے۔ باقی سب بھی پریشان تھے۔ لیکن جس طرح آذر اندر ہی اندر مر رہا تھا۔ ایسا تو کوئی بھی نہیں ہو رہا تھا۔

اچانک آئی سی یو کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر ندیم اقبال باہر آ گئے۔ اسرار آفندی اور اظہار آفندی کے ساتھ ساتھ باقی سب بھی لپک کے ڈاکٹر کے قریب گئے۔

”ایم سوری سر! فی الحال ان کے بچنے کے چانسز بہت کم نظر آ رہے ہیں کیونکہ ان پہ فالج کا شدید ترین انٹیک ہوا ہے۔ جس میں ان کا پورا جسم مفلوج ہو چکا ہے۔ اس لیے ان کا دل بند ہونے کا خطرہ ہے۔ کیونکہ لیفٹ سائیڈ

یہ فالج کا انٹیک بہت خطرناک ثابت ہوتا ہے اور ان کی لیفٹ سائیڈ بھی حد سے زیادہ متاثر ہوئی ہے۔ ایسے کیسز میں مریض کے بچنے کے چانسز محض نائنٹین پر سینٹ ہوتے ہیں۔ اگر مسٹر وقار آندری نیکسٹ ٹوئنٹی فور آورز میں اس انٹیک کو اپنی دل پاور پر برداشت کر لیتے ہیں تو پھر ان کی زندگی کی کچھ امید کی جاسکتی ہے اور امید یہ تو دنیا قائم ہے۔ دعاؤں سے تقدیر بھی بدل جاتی ہے، آپ سب ان کے لیے دعا کیجئے۔ ڈاکٹر ندیم اقبال ان کا کندھا تھپک کر ان کی سماعتوں پر ایک اور بم گرا کر آگے بڑھ گئے تھے اور وہاں موجود تمام افراد دھواں دھواں ہو گئے تھے۔ سب کے سب دم بخود اور ششدر کھڑے تھے۔ یہ دن ان کے لیے کون کون سی قیامتیں لے کر طلوع ہوا تھا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے بڑی حویلی کے عروج کا ستارہ ڈوب چکا تھا۔ وقار آندری کی تباہی بڑی حویلی کی تباہی تھی ایک عظیم تباہی۔

وہ لان میں بیٹھا بتول شاہ کے ساتھ باتیں کر رہا تھا جب اس کے سیل پر واٹس اپیشن ہونے لگی۔
”لگتا ہے آج سب کو خبر ہو چکی ہے۔“ وہ سیل اٹھاتے ہوئے مسکرا کر بولا اور پھر اسکرین پر نمبر دیکھا۔
جہاں نمبر کی بجائے انیسٹر شہناز کا نام جگمگا رہا تھا۔
”السلام علیکم۔“ اس نے فوراً ”کال ریسیو کی تھی اور بتول شاہ سے ایکسکیوز کر کے لان کی اک سائیڈ پر آگیا۔
”وعلیکم السلام! کیسے ہیں شاہ جی۔“ انیسٹر شہناز کا لہجہ تھوڑا سنجیدہ اور بچھا بچھا سا تھا۔
”اللہ کا بڑا کرم بڑا احسان ہے میڈم! لیکن کیا بات ہے آج شہنار اں میں اس قدر اداسیاں کیوں۔“ ”دل آور اس کے لہجے کی سستی بھانپ چکا تھا۔
”شاہ جی! کہاں ہیں آپ؟ میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔“ انیسٹر شہناز کی پریشانی اس کے لہجے سے عیاں تھی۔

”کیوں؟ خیریت۔“

”میں بہت پریشان ہوں شاہ جی۔“

”اللہ رحم کرے میڈم! آپ جیسے بہادر محافظ پریشان ہونے لگیں گے تو ہم جیسے شہریوں کا کیا بنے گا۔؟ دشمن نکل جائیں گے ہمیں۔“ دل آور نے اسے پریشانی سے نکالنے کے لیے کہا۔
”آگ لگے دشمن کو شاہ جی! آپ کی دھڑکنوں پہ تو ہماری نبض حرکت کرتی ہے۔“ انیسٹر شہناز کے بے ساختہ کہنے پہ دل آور بھی بے ساختہ ہنس پڑا۔

”ہوں! اب لگے کہ انیسٹر شہناز ہی بات کر رہی ہیں۔“ وہ خوش دلی سے کہہ رہا تھا۔

”تو پھر کب ملیں گے آپ۔؟“

”ارے میڈم! میں نے انکار کب کیا ہے؟ آپ جب چاہو منہ ناجیز حاضر ہے۔“

”اچھا! تو اس کا مطلب ہے کہ آپ واپس آچکے ہیں کراچی سے۔؟“

”جی بالکل آچکا ہوں۔“

”تو کیا میں آپ سے ملنے کے لیے آسکتی ہوں۔؟“ انیسٹر شہناز کو جیسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

”آسکتی ہیں بالکل آسکتی ہیں گھر کے دروازے کھلے ہیں۔“

”ٹھیک ہے شاہ جی! میں ابھی پہنچ رہی ہوں۔“ انیسٹر شہناز نے کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔ اور اگلے دس منٹ

میں وہ واقعی اس کے گھر کے گیٹ پہ پہنچ چکی تھی گلاب خان اسے پہچانتا تھا اس لیے فوراً ”گیٹ کھول دیا انیسٹر شہناز کی گاڑی اندر روش پہ آرکی۔“ دل آور اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔
”السلام علیکم۔“ اس کے سلام پہ دل آور نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔ جبکہ انیسٹر شہناز کی نظریں بتول شاہ پہ تھیں۔

”ان سے ملیے یہ میری اماں جان ہیں اور اماں جان یہ ہیں انیسٹر شہناز، کرنل عبدالقیوم رضوی کی صاحبزادی۔“ دل آور نے بہت اچھے طریقے سے ان کا ایک دوسرے سے تعارف کروایا۔ بتول شاہ بھی اپنی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں کیونکہ انیسٹر شہناز بھی انہی کی سمت بڑھی تھی۔

”السلام علیکم آنٹی! کیسی ہیں آپ؟“ وہ آگے بڑھ کے ان سے گلے ملی تھی انہوں نے بھی شفقت سے گلے لگا کر اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔

”وعلیکم السلام بیٹا! میں ٹھیک ہوں، جیتی رہو، خوش رہو، بیٹھو یہاں۔“ انہوں نے قریبی کرسی کی سمت اشارہ کیا۔

”تھینک یو آنٹی۔“ وہ اس وقت یونیفارم کی بجائے پنک کلر کی خوب صورت اور نفیس سی ساڑھی میں ملبوس تھی اور اس کی پرسنالٹی بہت پر اثر لگ رہی تھی دل آور اسے ضرور سراہتا اگر بتول شاہ پاس نہ ہوتیں کیونکہ وہ اپنی ماں کا بہت احترام اور عزت کرتا تھا اس لیے ان کے سامنے تو وہ مذاق میں بھی ایسی بات نہیں کہہ سکتا تھا۔

”شاہ جی۔! میں تو سمجھتی تھی کہ آپ ہی اپنے ماں باپ کا شاہکار ہیں، لیکن آنٹی کو دیکھ کر تو لگ رہا ہے کہ آپ کی پوری فیملی ہی شاہکار ہوگی۔؟“ انیسٹر شہناز نے بتول شاہ کی گریس فل پرسنالٹی اور خوب صورتی دیکھ کر دل میں آئی بات دل میں نہیں رکھی تھی لیکن اس کی بات پہ بتول شاہ کے چہرے پہ ایک سایہ ساہرا گیا تھا جودل آور کی نظروں سے چھپا ہوا نہیں رہ سکا تھا۔

”تھینک یو میڈم! یہ آپ کی نظر کا ذوق ہے، ورنہ آج کل شاہکاروں کی کمی نہیں ہے، خیر چھوڑیں اس بات کو آپ یہ بتائیں کہ آپ کس لیے اتنی پریشان تھیں کہ آپ کو اتنا رجسٹ مجھ سے ملنا پڑا۔؟“ دل آور پوری سنجیدگی کے ساتھ اس کی سمت متوجہ ہو چکا تھا۔

”وہ مجھے دراصل مومنہ بی بی کے سلسلے میں بات کرنا تھی۔“ انیسٹر شہناز بات کرتے ہوئے ہچکچائی اسے دل آور شاہ کو اپنی کوتاہی کا بتاتے ہوئے شرمندگی ہو رہی تھی۔

”ہاں ہاں! کہیے کیا بات ہے۔“ انیسٹر شہناز جھجکنے والی نہیں تھی اسی لیے دل آور کو اس کی جھجک پہ حیرت اور اچنبھا ہو رہا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ انیسٹر شہناز اپنی بات بتانا شروع کرنی اچانک گیٹ کھلا اور دو گاڑیاں آگے پیچھے اندر روش پہ آرکی تھیں جن کو دیکھ کر دل آور فوراً ”کھڑا ہو گیا کیونکہ آنے والے اس کے عزیز از جان تھے۔ مدیحہ اور بیٹل۔“

”بھائی۔! مدیحہ بڑے والہانہ انداز میں قریب آئی اور دل کے کندھے سے لگ گئی۔

”آنٹی مس یو سوچ بھائی۔“ مدیحہ کے لہجے اور انداز سے محبت اپنائیت اور بے ساختگی جھلک رہی تھی اور ہمیشہ کی طرح اتنے دنوں بعد ملنے پہ دل آور نے اپنی لاڈلی کے ماتھے پہ بوسہ دیا اور اس کا سر تھپکا تھا۔

”آنٹی مس یو ٹو ڈارلنگ! آنٹی ریلی مس یو۔“ دل آور شاہ کے نرم اور پر شفقت انداز پہ انیسٹر شہناز اور بتول شاہ دیکھتی رہ گئی تھیں کیا یہ بوپ بھی دل آور شاہ کا تھا۔؟ اتنا میٹھا اتنا شیریں کہ دیکھنے والی نظروں کے دل کو چھو گیا تھا بتول شاہ کی آنکھوں میں نمی جبکہ انیسٹر شہناز کی آنکھوں میں رشک اتر آیا تھا۔!

”اماں سے ملو۔“ دل آور نے آہستگی سے کہتے ہوئے مدیحہ کو متوجہ کیا تھا۔

”او ہاں سوری! ہم انہی سٹلنے کے لیے آئے ہیں۔“ وہ اپنی بے دھیانی پہ مسکراتی ہوئی بتول شاہ کی سمت آگئی۔
”السلام علیکم ماما!“ وہ بڑی محبت سے کہتی ہوئی ان کے گلے لگ گئی۔ اور اس کے بعد کہیں نبیل کی باری آئی تھی۔

”میں یہاں صرف آپ کے لیے آیا ہوں، ورنہ یہ بے مروت اور ظالم شخص یہاں اکیلا ہوتا تو میں ہرگز نہ آتا۔“ نبیل نے اپنی آمد کا مقصد فوراً ہی کیلٹر کر دیا۔
”تم نہ بھی بتاؤ تو نہیں پتا ہے کہ تم ان کے لیے ہی آئے ہو، میں انہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔“ دل آور نے مداخلت کی۔

”یہی تو تمہاری چالاکیاں ہیں۔“ نبیل جل کر بولا تھا جس پہ سب کے چہروں پہ مسکراہٹ بکھر گئی۔
انسپکٹر شہناز بھی اپنی مسکراہٹ نہیں روک پائی تھی۔
”انسپکٹر شہناز! ان سے پہلے یہ میرا بہت اچھا دوست، میرا جگر، میری جان نبیل حیات ہے، اس کی دوستی کے بغیر دل آور شاہ کچھ نہیں ہے۔“ دل آور نے خفا خفا سے نبیل حیات کا تعارف دست دل سے کروایا تھا۔
”اور یہ میری اکلوتی لاڈلی بہن ہے مدیحہ حیات۔“ اس نے قریب کھڑی مدیحہ کا ایک بار پھر سر تھپکا تھا اور پھر انسپکٹر شہناز کا تعارف بھی کروایا۔ وہ سب ہی آپس میں مل کر بہت خوش ہوئے تھے اور خوش تو آج بتول شاہ بھی بہت زیادہ تھیں، ان کے بیٹے نے آج بائیس سال بعد انہیں لاہور کی زمین پہ قدم رکھنے کے قابل کر دیا تھا۔
”بیٹا! تم لوگوں کی باتوں کا ناٹم اشارت ہو رہا ہے تم باتیں کرو، میں تمہارے لیے چائے بھجوا کر نماز پڑھ لوں، ظہر کا وقت نکلا جا رہا ہے۔“ بتول شاہ نبیل کا کندھا تھپک کر اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔
”لیکن جلدی آئیے گا، ہم آپ کے لیے ہی آئے ہیں۔“ مدیحہ نے انہیں تاکید کی تھی۔

”اچھا بیٹا! نماز پڑھ کے آتی ہوں۔“ وہ مسکراتے ہوئے اس کا گال سہلا کر اندر چلی گئیں۔ اور دل آور دوبارہ سے انسپکٹر شہناز کی سمت متوجہ ہو چکا تھا کیونکہ انسپکٹر شہناز کی بے چینی اسے واضح محسوس ہو رہی تھی۔
”جی میڈم! آپ کچھ کہہ رہی ہیں۔؟ شاید مومنہ بی بی کے بارے میں۔۔۔“ اس کے استفسار پہ انسپکٹر شہناز نے نبیل حیات اور مدیحہ کی طرف دیکھا تھا اور دل آور اس کے دیکھنے کا مفہوم بھی سمجھ گیا تھا۔
”ارے نہیں نہیں میڈم۔۔۔ ڈونٹ وری۔۔۔ آپ بے فکر رہیں۔ جو بھی بات کہنی ہے کھل کے کہیے؟“ دل آور شاہ کی تسلی پہ انسپکٹر شہناز قدرے ریلیکس ہو گئی۔

”سوری سر! کچھ معاملات ایسے ہوتے ہیں جن میں بندہ نہ چاہتے ہوئے بھی بے اعتباری پہ آجاتا ہے پلیز سائڈ مت کیجیے گا۔“ انسپکٹر شہناز نبیل سے معذرت کی تھی۔
”جی میڈم۔۔۔! سمجھ سکتا ہوں میں، آپ بے فکر ہو کر اپنا مسئلہ ڈسکس کر سکتی ہیں۔“ نبیل نے کافی سنجیدگی اور تحمل سے جواب دیا۔

”تھینک یو۔“ وہ نبیل کا شکریہ ادا کرتے ہوئے دل آور کی سمت متوجہ ہوئی۔
”شاہ جی! وہ دراصل ملک حق نواز مومنہ بی بی کی بوسو گھٹا ہوا میرے گھر تک پہنچ گیا تھا، اسے خبر ہو چکی تھی کہ مومنہ بی بی میرے پاس ہے اس لیے وہ کل صبح میرے گھر آگیا تھا۔“ انسپکٹر شہناز کی بات پہ دل آور کے ماتھے پہ بل پڑ گئے تھے۔

”تو پھر بچ کے نکل گیا۔۔۔“
”تو اور کیا کر سکتی تھی شاہ جی۔؟ میرے گھر میں اس وقت مومنہ بی بی موجود تھی میرے ذرا سے غصے اور ری ایکشن پہ وہ کچھ بھی کر سکتا تھا، مومنہ بی بی کو جان سے مارنا مشکل نہیں ہے اس کے لیے اسے اگر بھنک بھی پڑ جاتی

کہ وہ یہاں ہے تو اس وقت یقیناً“ پروجیکشن کچھ اور ہوتی۔ وہ تو میں تھی جس نے اس کے سامنے اعتماد کا دامن نہیں چھوڑا اور اسے صاف کہہ دیا کہ میرے گھر کی تلاشی لے لے جس پہ وہ تھوڑا دھیمپا پڑ گیا اور اس کا یقین شک میں تبدیل ہو گیا کہ شاید اس کے پاس اطلاع غلط پہنچی ہوگی، حالانکہ اس کو ملنے والی اطلاع ہنڈ رڈ پر سینٹ درست تھی وہ بالکل ٹھیک جگہ پہ پہنچا تھا اور اس کا یہ پہنچنا خطرے سے خالی نہیں جاسکتا تھا اگر میں نہ ہوتی۔۔۔ لیکن شاہ جی! سب کچھ کور کر لینے کے باوجود ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔“ انسپکٹر شہناز پھر دھیمی پڑ گئی تھی۔

”کیسا مسئلہ۔۔۔؟“ دل آور کی سنجیدگی عروج پہ تھی۔
”میں ڈیوٹی پہ تھی، امی اور ابی جان گھر پہ تھے لیکن انہیں پتا ہی نہیں چلا اور مومنہ بی بی انہیں بتائے بغیر گھر چھوڑ کر چلی گئی۔ جاتے ہوئے یہ تحریر چھوڑ گئی تھی۔“ اس نے رقعہ نکال کر دل آور کی سمت بڑھادیا تھا جس کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔

”میں نے کل شام سے اب تک اسے بہت ڈھونڈا ہے، ساری رات سرکوں پہ گزار دی لیکن وہ کہیں بھی نہیں ملی۔“ انسپکٹر شہناز متفکر ہو رہی تھی اور دل آور لب بھینچے اس کی تحریر پہ نظریں جمائے ہوئے تھا۔
”فیروز کی رنگ کا سوٹ اور کالے رنگ کی چادر میں ملبوس تھیں۔“ نبیل کی لب کشائی پہ دل آور اور انسپکٹر شہناز نے یکدم چونک کر دیکھا

”آپ کو کیسے پتا نبیل صاحب؟“
”کیونکہ وہ مومنہ بی بی کل رات میری گاڑی سے نکلرائی تھیں۔“ نبیل کے انداز میں اطمینان تھا۔
”یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ اب کہاں ہے وہ؟“ انسپکٹر شہناز کو بے چینی ہو چکی تھی وہ نبیل کی سمت بے صبری سے دیکھ رہی تھی۔

”اب وہ وہاں ہیں جہاں کوئی ملک حق نواز نہیں پہنچ سکتا۔ میں نے مومنہ بی بی کو پورا پورا تحفظ دینے کا وعدہ کیا ہے، اور وہ میرے گھر میں ہی رہیں گی اور ان کی ہر ذمہ داری میں پوری کروں گا۔“ نبیل کہہ رہا تھا اور دل آور اسے نا سنجھی سے دیکھ رہا تھا کہ نبیل نے یہ فیصلہ کیوں کیا ہے؟ کیونکہ یہ فیصلہ کوئی عام اور معمولی فیصلہ نہیں تھا اور دل آور کے اس طرح دیکھنے پہ نبیل اسے کیا بتاتا کہ اس نے اپنے ضمیر پہ رکھے ایک بوجھ کو کم کرنے کے لیے یہ فیصلہ کیا ہے، ایک ایسا بوجھ جو اس نے خود نہیں اس کے باپ نے اس کے ضمیر پہ ڈال دیا تھا جس کی وجہ سے مدیحہ بھی اکثر روتی اور تڑپتی ہوئی بولائی بولائی پھرتی تھی۔

نبیل کو اپنے باپ کے کرتوتوں کا اندازہ تھا لیکن وہ ان کا مداوا نہیں کر سکتا تھا لیکن اب جب ایک ایسی لڑکی سامنے آکھڑی ہوئی تھی جسے ان کے سہارے کی ضرورت تھی، جو ان کے باپ جیسے انسان کی ڈسی ہوئی تھی تو پھر وہ اسے سہارا کیوں نہ دیتا؟ کیوں مداوا نہ کرتا؟ ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ اس لڑکی پہ بیتی ساری حقیقت جان لینے کے بعد اس سے نظریں چرا لیتا۔ اور اگر وہ ایسا کر بھی لیتا تو مدیحہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ وہی بوجھ مدیحہ کے ضمیر پہ بھی تو تھا۔ اتنا ہی وزنی اور اتنا ہی اذیت ناک، جس کو تھوڑا سا کم کرنے کے لیے نبیل نے زندگی میں پہلی بار ایسا فیصلہ کر لیا تھا جس میں کسی کی بھی پسند نہیں ہو چھی تھی اور کسی سے مشورہ بھی نہیں مانگا تھا، اور اس کے اس فیصلے پہ مدیحہ کے سوا شاید اور کوئی خوش بھی نہیں تھا لیکن نبیل کو اس معاملے میں کسی کی خوشی کی پروا نہیں تھی اسے پتا تھا کہ سب کا رد عمل وقتی ہو گا، اور وقت کے ساتھ ساتھ سب کچھ بدل جائے گا۔ اسی لیے وہ مطمئن تھا۔“

”کیا بات ہے؟ تمہیں میرا فیصلہ اچھا نہیں لگا۔“ نبیل نے دل آور کو ٹٹولا۔
”برا کیوں لگے گا بھلا۔۔۔“ دل آور نے بھنویں سکڑتے ہوئے کہا۔

قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

حالانکہ وہ دن بھر رونے کی وجہ سے بے حد نڈھال ہو رہی تھی۔

”بی بی جی! آپ میرا ایک مشورہ مانیں، آپ نے جو بھی کہنا ہے، کل صبح کہہ لیجیے گا، ابھی رہنے دیں، ابھی مت چھیڑیں۔“ گلاب خان نے بہت روتے ہوئے کہا تھا اسے لیکن اس کی ایک ہی رٹ تھی کہ وہ خود یہاں آئے اور مجبوراً گلاب خان پیغام لے کر اس کے سامنے پہنچ گیا تھا جسے سن کر دل اور شاہ کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گیا۔

”ٹھیک ہے تم جاؤ، کام کرو، میں جاتا ہوں اس کے پاس۔“ دل اور نے ٹیبل کے قریب آکر انگلیوں میں سلگتا ہوا سگریٹ ذرا سا جھٹکتے ہوئے ایش ٹرے میں مسل دیا۔ اور پھر گہری سانس خارج کرتے ہوئے لب بھینچ کر کمرے سے نکل آیا۔

”شاہ! رکو بیٹا۔“ بتول شاہ نے اسے سیڑھیاں اترتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور اس کے عزائم بھی بھانپ لیے تھے کیونکہ اس کے تیور بہت خطرناک ہو رہے تھے، لیکن وہ ان کے روکنے پر بھی نہیں رکا تھا اور اگلے چند سیکنڈز میں وہ عین علیزے آفندی کے سامنے کھڑا تھا۔

علیزے ایک بل کے لیے ٹھک سی گئی وہ اسے دیکھ کر پہچان نہیں پائی تھی کیونکہ وہ اپنے چہرے کی داڑھی وغیرہ صاف کرچکا تھا اس کا پرکشش چہرہ اور تیکھے کاٹ دار نقوش واضح ہو چکے تھے اب وہ مکمل دل اور شاہ کے روپ میں تھا اور ہاں اب منصور حسین کا شائبہ تک نہیں تھا، وہ اس کے سامنے کھڑا ڈائریکٹ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا اور علیزے اس کی آنکھوں کے غضب سے نہ جانے کسے بے خوف اور نڈر ہو گئی تھی۔

”کھانا بھیجا تھا، کھایا تم نے؟“ اس کا بوجھ برف، علیزے گھٹھری تھی لیکن سہہ گئی۔

”نہیں کھاؤں گی۔“ ہٹ دھرم سا جواب موصول ہوا۔

”کیوں نہیں کھاؤ گی؟ کیا وجہ ہے آخر؟“ اس کے لفظ بے حد نپے تلے سے نکلے۔

”اس لیے کہ تم مجھے زبردستی یہاں لے کر آئے ہو، تم نے مجھے پر غماں بنایا ہے، تم نے مجھ سے ٹانگ کر دیا ہے، جھوٹ بلوایا ہے مجھ سے، دھوکا دیا ہے مجھے اور میرے گھر والوں کو ڈرامہ کیا ہے تم نے۔ کیوں آخر کیوں؟ کیوں کیا تم نے ایسا؟ کیوں لے کر آئے ہو مجھے یہاں؟ آخر کیا گناہ ہے میرا؟“ وہ یکدم پھٹ پڑی تھی اور دل اور لب بھینچے اس کی سمت خاموشی سے دیکھتا رہا جس پہ علیزے اور بھی جذباتی ہو گئی اور اسو تو اتر سے بہہ نکلے تھے۔

”بولو! تم بولتے کیوں نہیں ہو؟ تم نے یہ سب کیوں کیا ہے آخر؟“ وہ روتے بلکتے ہوئے چیختی تھی جس پہ دل اور کا پارہ بھی ہائی ہو گیا تھا۔

”تڑاخن! اس کے بھاری مضبوط ہاتھ کا تھپڑ علیزے آفندی کا دماغی نظام درہم برہم کر گیا تھا وہ توازن نہیں رکھ پائی تھی۔ سیدھی فرش پہ جاگری تھی۔

”یہ سب مجھ سے نہیں اپنے اس خبیث باپ سے پوچھو جس نے مجھے آٹھ سال کی عمر میں لاوارث کر کے اس شہر سے نکلنے پہ مجبور کر دیا تھا، آٹھ سال کی عمر سے تمہارے باپ کا پاپا بھانا سور سینے میں لیے پھر رہا ہوں اس ناسور کو

”تو پھر خاموش کیوں ہو؟“

”میرا اور انسپکٹر شہناز کا مسئلہ تمہارے گھر پہنچ جانے پہ خاموش ہوں، اللہ انسان کو ٹھوکروں سے اٹھا کر ٹھکانے پہ بھی پہنچا دیتا ہے اور ہم تم جیسے لوگ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔“ دل اور نے گہری سانس کھینچتے ہوئے پشت کرسی کی بیک سے نکادی۔

”اللہ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور پوشیدہ ہوتی ہے، شاید کہ اس کام میں بھی ہو؟“ نیل سکون سے کہہ رہا تھا۔

”بالکل! ہوگی ضرور ہوگی بس اور اک بعد میں ہوتا ہے، جیسے اللہ کے اس کام میں مصلحت تھی کہ میں اس وقت شاہ جی سے ملنے ان کے گھر پہ آؤں اور وہاں آپ سے بھی ملاقات ہو اور آپ میری رات بھر کی پریشانی کو ایک بل میں دور کر دیں، اسی کو اللہ تعالیٰ کی مصلحت کہتے ہیں، سبحان اللہ۔“ انسپکٹر شہناز نے صدق دل سے کہا تھا اور وہ تینوں بھی اتفاق کرتے ہوئے سبحان اللہ کہہ چکے تھے۔ اتنے میں گل چائے اور دیگر لوازمات لے کر حاضر ہو چکی تھی، نومبر کا مہینہ تھا، موسم بہت ہلکا پھلکا اور خوش گوار ہو رہا تھا دل اور نے اپنے مہمانوں کو آج خوب کمپنی دی تھی جس پہ انسپکٹر شہناز بھی بہت خوش تھی اور نیل بھی بہت فریش نظر آ رہا تھا۔ پھر شام ڈھلے وہ لوگ وہاں سے اٹھ کر واپس گئے تھے۔

اس بیسمنٹ کے گہرے تاریک ماحول میں اس کی جان سوکھے پتے کی طرح لرز رہی تھی۔

اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اٹھ کر کسی دیوار سے ٹیوب لائٹ کا بٹن ٹٹول کر لائٹ ہی آن کر لیتی وہ اسے جہاں پھینک کر گیا تھا وہ صبح سے وہیں۔ بیٹھی رو رہی تھی وہ جب بھی گھٹنوں سے سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھنے کی کوشش کرتی اسے اندھیروں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا اور وہ سہم کر پھر سے چہرہ چھپا لیتی، رورو کر اس کا حشر ہو چکا تھا، وقار آفندی کی لاڈلی کی آنکھیں آنسوؤں سے زخمی ہو رہی تھیں، مسلسل رو رہی تھیں اور وقار آفندی کو خبر ہی نہیں تھی وہ ہسپتال میں خود سے بھی بے خبر پڑے تھے۔ انہیں پتا ہی نہیں تھا کہ ان کی علیزے پہ کیا بیت رہی ہے؟ رات بہت گہری ہو چکی تھی جب ہلکی سی آہٹ سے بیسمنٹ کا دروازہ کھلا اور کوئی اندر داخل ہوا۔

”ڈرائیور۔“ علیزے اپنی ساری ہمتیں مجتمع کرتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔ اور آنے والے نے دروازے کے قریب ہی نصب کی بورڈ سے لائٹس جلا دی تھیں اتنے اندھیرے سے یکدم اتنی تیز روشنی ہو جانے پہ علیزے کی آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔

”یہ کھانا کھالیں بی بی جی۔“ یہ آواز اس کے ڈرائیور کی نہیں بلکہ گلاب خان کی تھی۔

”ست۔ تم۔ لک کون ہو؟“ علیزے کے پورے جسم میں نقاہت ہو رہی تھی۔

”میں صاحب کا ملازم ہوں، چوکیدار ہوں بی بی جی۔“ گلاب خان نے سر خم کرتے ہوئے کہا۔

”وہ۔ وہ۔ خود کہاں ہے، بلاؤ اسے۔“ علیزے کے بھگے بھگے لمحے میں وہی مالکوں والا رعب در آیا تھا۔

”وہ نہیں آسکتے بی بی جی۔ وہ اس وقت اپنے کمرے میں ہیں۔ اور کسی گہری سوچ میں گم ہیں۔ سگریٹ بھی بہت پی رہے ہیں۔“ گلاب خان نے اسے اس کی کیفیات سے آگاہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن علیزے پتا نہیں کیوں اور کیسے اتنی سرکش ہو رہی تھی کہ اپنی ہی کہے گئی۔

”میں کچھ نہیں جانتی۔! وہ جہاں بھی ہے، جس حالت میں بھی ہے، اسے کہو وہ یہاں آئے۔ وہ مجھے میرا گناہ بتائے۔ میں جانا چاہتی ہوں کہ یہ سزا کس گناہ کے بدلے میں دی جا رہی ہے مجھے؟“ وہ روتے روتے چیخ اٹھی تھی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ تمام پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریجن
- ✧ ہر کتاب کا الگ سلیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں ایپلوڈنگ
- ✧ پیریم کوالٹی، ہارل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریجن
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

کتنے میں بائیس سال لگے ہیں علیزے آفندی۔ بائیس سال اور بائیس سال میرے اندر یہ زہر پھیلا ہے۔ میرے جسم کی رنگت سفید سی لیکن میرے دل کی رنگت نیلو نیل ہو رہی ہے، میرا سینہ اندر سے سیاہ ہے، اور یہ سیاہی تمہارے باپ نے بخشی ہے، میں دل اور شاہ دنیا کے لیے ایک آئیڈل شخصیت سی لیکن اندر سے میں خاک ہوں خاک۔ اور میں نے قسم کھائی ہے وقار آفندی کو بھی خاک میں ملا کر چھوڑوں گا، جیتے جاگتے اسے خاک میں ملا دوں گا یہ میرا میری ماں سے عہد ہے، اور تمہیں یہاں لانا میرے عہد کا پہلا مرحلہ ہے، تم سمجھ دار ہو، تم سوچ سکتی ہو کہ اس وقت وقار آفندی کا کیا حال ہو گا جب اسے یہ پتا چلے گا کہ اس کی بیٹی دل اور شاہ کے پاس بغیر نکاح کے رہ کے آئی ہے، جس کا کوئی نکاح نہیں ہوا تھا، سب کچھ جعلی تھا، جھوٹ تھا، صرف وقتی طور پر سب کو دکھانے کے لیے وہ جعلی نکاح نامہ تیار کروایا تھا تاکہ کوئی بھی اس کام میں رکاوٹ نہ ڈال سکے۔

تمہارے باپ نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ اگر میں منصور حسین کے نام سے شناختی کارڈ اور لائسنس بنوا سکتا ہوں تو نکاح نامہ بھی بنوا سکتا ہوں، تمہیں بغیر نکاح کے اپنے پاس رکھ سکتا ہوں، تمہیں برت سکتا ہوں، تمہیں عرش سے اٹھا کر فرش پہ بیٹھ سکتا ہوں۔ یہ سب باتیں تمہارا باپ کبھی نہیں سوچے گا کیونکہ اسے دل اور شاہ کے نام کی تکرار سے ہی فرصت نہیں ملے گی اور اگر ملے گی تو مرجائے گا۔ اس سوچ سے ہی مرجائے گا کہ اس کی علیزے دل اور شاہ کی دسترس میں ہے۔ اور اگر وہ اس سوچ سے بھی نہیں مرے تو میں تمہیں اس کے پاس بھیج کر مار دوں گا، وہ جب اپنی کنواری بیٹی کی واپسی کا حال دیکھے گا تو کیا کرے گا؟ یہ بھی سوچ لو تم! تمہارے باپ کو مارنے کے بہت ہتھیار ہیں میرے پاس اب فیصلہ یہ کرنا ہے کہ کون سا ہتھیار فائدہ مند رہے گا؟

میں اگر چاہتا تو تمہیں کڈنیپ بھی کروا سکتا تھا بڑی آسانی سے، مگر کڈنیپ کرنے میں وہ مزا نہیں تھا جو تمہیں سب کے سامنے لے آنے میں تھا سو میں نے ایسا ہی کیا اور تم جانتی ہو میں کیا کیا کر سکتا ہوں؟ میری رسائی کہاں تک ہے؟ تم سے بہتر تو کوئی بھی نہیں جان سکتا جان ڈرائیور۔ اس نے ذرا سا جھکتے ہوئے علیزے کا بازو دوچا اور اسے اپنے سامنے کھڑا کر دیا تھا اس کے پھول سے چرے پہ انگلیوں کے نشان ثبت تھے اور جہاں جہاں انگلیوں کے نشان ثبت تھے وہاں وہاں سے رخسار ابھر آیا تھا وہ سب کچھ جاننے کے باوجود اسے پتھرائی ہوئی اور ششدر سی دیکھ رہی تھی ولا اور شاہ زہرا گل رہا تھا ایک ایسا زہر جواب علیزے کا جسم نیلا کر رہا تھا۔

”لیکن اس سارے قصے میں مجھے بڑی تکلیف ہوئی ہے، بہت اذیت محسوس کر رہا ہوں، وقار آفندی کی بیٹی کو اپنی بیوی ظاہر کر کے خود اپنی نظروں میں گر گیا ہوں، اپنے مقام سے بہت نیچے آ گیا ہوں میں، مجھے یہ کب زیب دیتا تھا کہ جھوٹ میں ہی سہی مگر وقار آفندی کی بیٹی کو بیوی کا لقب دوں۔ سچ پوچھو تو بڑی توہین ہوئی ہے میری۔“ وہ انتہائی نفرت اور حقارت سے چبا چبا کر کہہ رہا تھا اور علیزے کو اپنی جان نکلتی ہوئی محسوس ہوئی ایسی نفرت ایسی بے رحمی اور ایسی سفاکی کا عالم اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اس لیے وہ چکرا رہی تھی لیکن پونہی چکراتے سر کے ساتھ اس کی نظر اٹھی اور ہیسمنٹ کی سیڑھیوں پہ کھڑی بتول شاہ پہ ٹھہر گئی تب ہی اس کے دیکھنے کے انداز پہ اس کی نظروں کے تعاقب میں دل آور نے بھی گردن موڑ کر پیچھے دیکھا تھا اور — وہیں منجمد ہو گیا۔ دل پہ ایک عجیب حالت آن وارد ہوئی تھی۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

✧ ✧

کبھی بارنا نہیں سیکھا، اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور زہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔

۲۲
بائیسویں قسط



نبیلہ عزیز



بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدیہ اور نبیلہ حیات دو ہی بہن بھائی ہیں، مدیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے، وہ انگلنڈ کی رنگینوں میں مکمل جو رہے رنگ چکی ہے، جس کے پیش نظر فائزہ بیگم، نبیلہ کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں، لیکن مدیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے، جس پہ نبیلہ اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے، مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، بے بسی اور مجبوری سے تنگ آخر خود کشی کرنے کا سوچتا ہے، لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باؤ امتیاز مل جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے، جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے، اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے، وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے، وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے، وہ اپنے قول و فعل کا بہت ریکا آڈمی ہے، اس نے



یہ کیسا مقام تھا اس کی زندگی میں۔
اس کے ایک طرف بتول شاہ کھڑی تھیں اور ایک طرف علیزے آندی۔
ایک کی طرف دیکھتا تو مرجاتا، ایک کی طرف دیکھتا تو مارتا۔

گویا اذیت اس کے دونوں طرف تھی؟ وہ کچھ کہنے اور کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ فی الحال۔ البتہ ان دونوں کی کیفیات اور تاثرات اس سے بالکل مختلف تھے بتول شاہ کو دیکھتے ہوئے علیزے اجنبی، نا سمجھ اور خالی خالی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ جبکہ علیزے کو دیکھتے ہوئے بتول شاہ کی آنکھیں پتھریلی ہو گئی تھیں۔

ان کے چہرے پہ بائیس سال رقم تھے اور ان بائیس سالوں میں ایسا کچھ تھا جس کا کرب ناک احساس زہری طرح ان کی رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا۔ علیزے کی دلکش سی صورت ان کی آنکھوں میں مرچیں سی بھر گئی تھی اور ان کی پتھریلی سپاٹ آنکھیں جلنے لگی تھیں اور اس جلن سے ان کی آنکھیں — سرخ ہونے کے ساتھ ساتھ تمکین پانیوں سے لبریز ہو چکی تھیں۔ ہاتھوں کی مٹھیاں سختی سے بچنے، مضبوط قدموں پہ کھڑی وہ صبر و ضبط کے کن مراحل سے گزر رہی تھیں یہ ان کا اللہ جانتا تھا یا پھر دل آور شاہ۔

لیکن اس سے پہلے کہ ان کے صبر کا پیالہ چھلکتا اور وہ یہاں بائیس سالوں کی اذیت، بچھا دیتیں، انہوں نے ایک بار پھر اپنے اندر کے غضب کو کچلا اور قدم واپس موڑ لیے تھے۔ یہاں ٹھہرنا ان کے اختیار سے باہر بھی ہو سکتا تھا، جبکہ وہ اپنے اختیار سے باہر نہیں ہونا چاہتی تھیں۔ اس لیے ان کا مر جانا ہی بہتر تھا۔ لیکن وہ وہاں سے پلٹ کر سیڑھیاں چڑھتے ہوئے لڑکھڑاسی کنیں۔ وہ کرنے کو تھیں، لیکن بروقت دیوار کا سہارا لیتے ہوئے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔

”اماں۔۔۔ دل آور شاہ نے بے ساختہ تڑپ کے پکارا اور یک دم علیزے کا بازو جھٹک کر ان کے پیچھے لپکا۔
”اماں۔۔۔ پلیز رکیں۔“ لیکن وہ علیزے آندی کی صورت دیکھنے کا عذاب دل پہ لیے بیسمنٹ کی سیڑھیاں چڑھ گئی تھیں اور دل آور کے پیچھے تک وہ اپنے بیڈروم میں بند ہو چکی تھیں اور وہ ان کے بیڈروم تک آکر بھی بند دروازے کو دھتکارا گیا۔ اس وقت بتول شاہ پہ کیا گزر رہی تھی وہ سب جانتا تھا۔ اسی لیے وہ دروازے پہ دستک دے کر انہیں مزید تکلیف سے دوچار نہیں کرنا چاہتا تھا اور یوں ہی عجیب جھکے جھکے قدموں سے آکر لاؤنج کے صوفے پہ ڈھیر ہو گیا۔ وہ بند دروازے کے پار بتول شاہ کے گرنے والے آنسو اپنی روح پہ گرتے ہوئے محسوس کر رہا تھا اور اس کی روح پہ بتول شاہ کے آنسوؤں سے آبلے پڑتے تھے، جن کی تکلیف دل آور شاہ کا رواں رواں تڑپا رہی تھی۔

”گلاب خان۔۔۔ گلاب خان۔“ وہ مٹھیاں بھینچتے ہوئے دھاڑا۔

”جی صاحب! حاضر ہوں۔“ وہ فوراً سامنے آکھڑا ہوا۔

”بند کرو بیسمنٹ کا دروازہ۔ اور تالا ڈال کے چابی کہیں دور پھینک دو۔“ وہ شدت غضب سے کہہ رہا تھا اور گلاب خان کی آنکھیں تحیر سے پھیل گئی تھیں۔ لیکن وہ اس کے غصے اور غضب کے پیش نظر کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ حالانکہ وہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ چابی کہاں پھینکے؟
لیکن پھر بھی گلاب خان دل میں افسوس لیے بیسمنٹ کا دروازہ بند کرنے چلا آیا تھا اور علیزے کے قید خانے کو ایک بار پھر تالا ڈال دیا گیا تھا۔

”منصور حسین کے ساتھ اس کا چکر آج سے نہیں بہت پہلے سے چل رہا تھا۔“ کومل کے زہر خند لہجے پہ آذر

نے اک جھٹکے سے سراٹھا کر دیکھا تھا اور کومل کا دل ٹھنڈک سے بھر گیا تھا۔
”کومل۔۔۔! شرمو بیگم نے بیٹی کو سرزنش کرنے والے انداز میں دیکھا۔

”منصوری مئی۔۔۔! یہ صرف میرے منہ کی بات نہیں ہے۔ اس کا ایک منظر تو عائشہ پھوپھو بھی دیکھ چکی ہیں۔“
کومل نے سب کے چوکنے اور دیکھنے پہ بڑے سکون سے عائشہ آندی کی سمت دیکھا جو بڑی چوٹی کی بریادی پہ ماتم کناں سی بیٹھی تھیں اور وقار آندی کو ملنے والے دکھ اور اذیت پر رو کر آنکھیں سوچی ہوئی تھیں۔

”بتائیے نا پھوپھو۔۔۔! وہ منظر جب مری میں ایک روز فجر کے وقت محترمہ علیزے بی بی کو اپنے ڈرائیور منصور حسین کے بیڈروم سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا اور اسے دیکھ کر صاف پتا چلتا تھا کہ علیزے نے وہ رات منصور حسین کے بیڈروم میں ہی گزار دی تھی۔ کیونکہ ہمیں دیکھ کر وہ گھبرا گئی تھی۔“ کومل نے جیسے انہیں یاد دلانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن عائشہ آندی کا ذہن پے در پے ملنے والے جھٹکوں کی وجہ سے ٹھکانے پہ نہیں تھا کہ وہ کومل کی اتنی سنگین اور گھٹیا بات کا مفہوم سمجھتیں یا پھر علیزے کے دفاع میں کچھ بولتیں۔ بلکہ انہوں نے تو شاید اس کی بات سنی ہی نہیں تھی۔ اسی لیے چپ کی چپ بیٹھی رہیں اور ان کی چپ پہ آذر کے دماغ کی شریانیں پھٹنے کے قریب ہو گئی تھیں۔ کسی بھی غیرت مند مرد کے لیے ایسی بات سن کر ڈوب مرنے کا مقام تھا۔ احمد حماد اور زین وغیرہ کی گردنیں اور نظریں جھک گئی تھیں۔ لیکن ان سب کے درمیان ایک فرد ایسا بھی تھا جس کا دل یہ سب ماننے سے انکاری تھا۔

”علیزے! ایسی نہیں تھی۔“ یہ مضبوط لہجہ اور دعوا دانیال کا تھا۔ جس پہ کومل کے ساتھ ساتھ باقی سب نے بھی بیک وقت دانیال کی سمت دیکھا تھا۔

”کوئی کچھ بھی کہے، لیکن میں کہتا ہوں کہ علیزے ایسی نہیں تھی۔ وہ ایسی ہو ہی نہیں سکتی۔ مجھے علیزے کی پاکیزگی پہ اتنا ہی یقین ہے جتنا اپنے اللہ کے ہونے پہ یقین ہے۔“ دانیال مضبوط لب و لہجے میں بولتے ہوئے ان سب کی سوچوں کو ڈانوا ڈول کر گیا تھا۔

”یعنی آپ کے کہنے کا مطلب ہے کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں۔ غلط بیانی سے کام لے رہی ہوں یا پھر علیزے نے الزام لگا رہی ہوں۔“ کومل نے ناگواری سے کہا۔

”بھئی بھئی انسان کی زندگی میں کچھ ایسے لمحات بھی آجاتے ہیں جو الزام نہ ہوتے ہوئے بھی الزام بن جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے علیزے کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوا ہو؟ ورنہ میری نظر میں تو وہ اب بھی پاک اور صاف ہے، ہر غلطی اور گناہ سے دھلی ہوئی۔“ دانیال اب بھی علیزے کے خلاف نہیں اس کے حق میں تھا۔ اس کا یقین دیکھ کر آذر ہونٹ بھینچ کے رخ پھیر گیا۔

”میں علیزے پہ الزام لگا سکتی ہوں، لیکن آپ کی ماں تو علیزے پہ الزام نہیں لگا سکتی نا؟“

”جس روز میری ماں نے علیزے پہ الزام لگایا اس روز سمجھ لیجئے گا کہ انہوں نے انوشہ پہ الزام لگا دیا، کیونکہ ایک ماں اپنی بیٹی پہ کبھی الزام نہیں لگا سکتی۔“ کومل کی باتیں دانیال پہ اثر نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ علیزے کے حوالے سے اس کی باتوں میں آنے والا نہیں تھا۔

”کیا اس طرح کرنے سے حقیقت چھپ جائے گی؟“ وہ طنزیہ بولی تھی۔

”تو کیا آپ اس طرح کر کے افسانہ بنالیں گی؟“ جواب دو بدو تھا۔

”آپ اسے غلط کہنے کی بجائے الٹا مجھے غلط کہہ رہے ہیں؟“ کومل کے چہرے سے ہلکا غصہ جھلک رہا تھا۔

”کیونکہ وہ غلط ہے یا نہیں ہے، لیکن آپ اسے غلط ثابت کرنے پہ تلی ہوئی ہیں۔ اس لیے میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ یہ سب ثابت کر کے کیا ظاہر کرنا چاہتی ہیں؟“ دانیال کے سوال پہ کومل سٹپٹا گئی۔ لیکن اپنے محاز سے

ہی نہیں۔

”کچھ نہیں۔! آپ تیار ہیں تو آئیے چلتے ہیں کافی ٹائم ہو رہا ہے۔“ وہ بات ٹال گیا تھا۔
 ”آؤ! گھر پر رہے گا؟“ انہوں نے صوفیہ سر جھکا کر بیٹھے آؤر کی سمت دیکھا۔
 ”نہیں! میں بھی چلوں گا۔“ بالا خروہ بھی گھڑا ہو گیا۔ انہوں نے اسپتال جانا تھا۔ وہ لوگ گھر پر کپڑے چنچ کرنے آئے تھے اور اسپتال میں مبارک خان، اظہار آندری اور جودت کو چھوڑ آئے تھے۔ اس لیے اب واپس اسپتال جا رہے تھے۔ اس وقت رات کے ایک بجے کا وقت تھا جب وہ گھر سے نکل آئے تھے۔

صبح ناشتے کی ٹیبل پہ ان دونوں ماں بیٹے کے درمیان مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔
 بتول شاہ نے ساری رات بیڈ روم میں بند جلتے ہوئے گزار دی تھی تو سکون میں دل اور شاہ بھی نہیں رہا تھا۔
 رات اس کی بھی کانٹوں پر بسر ہوئی تھی۔ ساری رات ڈرائنگ روم میں ادھر ادھر کھلتے ہوئے اس کے پاؤں کے تلوے بھی جلنے لگے تھے اور لگا تار پھیلنے والے سگریٹوں کے دھوئیں کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ اس دھوئیں کی کڑواہٹ اس کی آنکھوں میں زہر بن کے اتر رہی تھی اور چہرے پہ شدت کرب کا عالم تھا۔

رات تھی کہ عذاب تھا؟ ٹلنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ اس رات کو بیٹنے میں ایک پیدت لگ گئی تھی۔ تب جا کے سویرے کا کنارہ نظر آیا تھا اور اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش شروع کی تھی اور اس کوشش میں پہلا کام اس نے نماز پڑھنے کا کیا تھا۔ اسے پتا تھا کہ اس کے اندر بھڑکتے شعلے وضو کے پانی سے ہی سرد ہوں گے۔ ورنہ اس کے اندر کا دھماکا لاوا تھی آسانی سے ٹھنڈا پڑ جاتا یہ ممکن ہی نہیں تھا۔ اس کے دماغ میں حشر برپا کرتی نفرت زمین پہ پیشانی ٹکا کر اللہ کو کیے جانے والے سجدے سے ہی معدوم ہو گئی تھی اور نماز کے آخری سجدے تک وہ سر سے لے کر پاؤں تک قدرے شانت ہو چکا تھا۔ اشتعال دھیمہ پڑ گیا تھا اور رگوں میں بھرے ہوئے لہو میں ہمواری آگئی تھی اور مسجد سے واپس گھر آتے ہوئے وہ رات کے مقابلے میں خاصا سکون لگ رہا تھا۔ پیدل چلتے ہوئے گھر میں داخل ہوا تو قدموں میں ایک توازن تھا اور ایسا ہی ایک توازن بتول شاہ کے مزاج میں بھی آچکا تھا۔ وہ رات کی اذیت رات کے ساتھ گزار آئی تھیں۔ اس لیے ان کا چہرہ بھی اس وقت ہر احساس اور ہر تاثر سے عاری تھا۔ وہ نماز پڑھ کے نیچے آئیں تو اتنے میں گل بھی آچکی تھی اور ان کے کہنے پہ فوراً ہی ناشتا بنانے چلی گئی اور جب دل اور گھر آیا تب تک ناشتا تیار ہو چکا تھا۔ جس پہ اسے تھوڑی حیرانی بھی ہوئی، لیکن ڈرائنگ روم میں بیٹھی اخبار پڑھتی بتول شاہ کو دیکھ کر اسے سمجھ آ گیا تھا کہ یہ جلدی بتول شاہ کے حکم پہ ہو رہی ہے۔ وہ متوازن قدموں سے چلتا وہیں آگیا۔

”السلام علیکم ماں جان۔!“ اس کی بھاری آواز پہ انہوں نے آہستگی سے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ کیونکہ ان کی توجہ اخبار پہ تھی۔

”وعلیکم السلام۔! جیتے رہو۔“ اس کے سلام کا جواب دے کر انہوں نے نظریں دوبارہ اخبار کے صفحے پہ مرکوز کر دی تھیں اور نہ جانے کیوں دل اور مزید کچھ بول ہی نہیں سکا اور گل اتنے میں ناشتا لگا گئی۔ سونا شتے کے دوران بھی ان میں خاموشی حائل رہی تھی۔

اور جب وہ ناشتا ختم کر چکا تو بتول شاہ فوراً ہی کرسی دھکیل کر کھڑی ہو گئی تھیں۔
 ”ڈرائیور سے کو گاڑی نکالے۔“ بات مختصر تھی، لیکن دل اور چونک گیا تھا۔
 ”کیوں۔!“

”میں یہ ظاہر کرنا چاہتی ہوں کہ یہ سب کیا دھرا علیزے کا ہے۔ اس کا چکر بہت پہلے سے چل رہا تھا۔ منصور حسین کا یہاں آنا ان دونوں کی ملی بھگت تھی۔ انہوں نے ہم سب کو بے وقوف بنایا تھا۔ آپ کی نظریں وہ جتنی پاکیزہ اور شفاف ہے، حقیقت میں وہ اتنی پاکیزہ اور شفاف نہیں ہے۔ اس کی پہلے سے ہی منصور حسین کے ساتھ ٹکٹ منٹ تھی۔ کیا آپ کو یاد نہیں کہ ہم لوگ جب مری میں گھومنے پھرنے کے لیے نکلتے تھے تو علیزے محکم کا ہانا بنا کر بنگلے پہ ہی رک جاتی تھی اور اس کے ساتھ اس کے نام نہاد ڈرائیور منصور حسین کو بھی بنگلے پہ ہی رک پڑتا تھا۔ اب ہمارے پیچھے بنگلے پہ کیا ہوتا تھا؟ یہ ہمیں کب پتا تھا؟ لیکن سچ کہتے ہیں ایسی باتیں چھپی ہوئی نہیں رہتیں۔ اک نہ اک دن سامنے آ جاتی ہیں اور دیکھ بیٹھے اب تو سب کے سامنے آگیا ہے سب کچھ۔ اب تو کوئی شک اور شبہ بھی نہیں رہا۔؟ آپ سب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے منصور حسین کا ہاتھ پکڑ کے چلی گئی ہے۔ کیا یہ بھی میرا الزام ہے؟ ہونہ! یہ کیوں نہیں کہتے کہ آج بڑی حویلی کی بریادی اور رسوائی علیزے بی بی کی بے جالاؤ اور پیار کا نتیجہ ہے۔ اب اس اکیلی کے کپے کا بھگتان پوری حویلی کو بھگتنا پڑے گا، لوگوں کی باتوں اور انگلیوں کا نشانہ سب کو منار پڑے گا۔ سب کی نظر جھکے گی سب کا سر نیچا ہو گا، کیونکہ اس نے سب کی غیرت کا جنازہ نکالا ہے۔ اس لیے ماتم بھی تو سب نے کرنا ہے؟

اپنے آپ کو اور باقی گھر والوں کو محض جھوٹی تسلیاں دینے اور قیافے لگانے سے کچھ نہیں ہو گا۔ جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا ہے۔ منہ کالا کر گئی ہے منصور حسین کے ساتھ جو نہ جانے کب سے اس کا عاشق تھا اور اس کے عشق میں بھیس بدل کر بھی آگیا۔“ ماحول لوہے کی طرح گرم تھا۔ اس لیے کوئل کے الفاظ کی ضربیں سب کے ذہنوں کے کس بل نکال سکتی تھیں۔ سو اس نے یہ ضربیں لگانے میں دل کھول کے نشتر نما الفاظ کا استعمال کیا تھا اور کافی حد تک کامیاب بھی ٹھہری تھی۔

وہاں موجود سننے والے افراد کے ذہن کسی نہ کسی حد تک پر آگندہ ہو ہی چکے تھے اور وہ ان سب کو اس حد تک متفر کر دینا چاہتی تھی کہ وہ سب مل کر ہمیشہ ہمیش کے لیے علیزے پہ بڑی حویلی کے دروازے بند کر دیتے، اگر کبھی خدا نا خواستہ وہ بھولی بھٹکی آ بھی جاتی تو اسے یہاں کوئی بھی قبول نہ کرتا۔ بلکہ اسے دھکے دے کر یہاں سے نکال دیا جاتا اور اسی مقصد کو ذہن میں رکھتے ہوئے وہ سب کے سامنے بڑھ چڑھ کے بول رہی تھی اور اسے اب کسی کا کوئی ڈر بھی نہیں تھا۔ جن کا ڈر تھا وہ اسپتال کے بستر پہ بے ہوش اور لاچار پڑے تھے اور یہ لاچاری اب ڈاکٹرز نے ان کی آئندہ زندگی کا حصہ قرار دے دی تھی۔ وہ اگر ٹھیک ہو بھی جاتے تو بستر سے اٹھ نہیں سکتے تھے۔ ان کا پورا جسم مفلوج ہو چکا تھا۔ وہ بڑی حویلی کو قائم رکھنے والا ایک اہم ستون تھے اور یہ ستون گر چکا تھا۔ زمین بوس ہو چکا تھا اور بڑی حویلی کا شیرازہ بکھرنا شروع ہو گیا تھا۔ مضبوط دیواروں کی اینٹیں اکھڑ رہی تھیں اور بنیادیں زمین میں دھنسنے کے امکان صاف دکھائی دے رہے تھے اور یہی غم تو آسیہ آندری کو کھائے جا رہا تھا۔ وہ اپنے بیڈ روم میں نڈھال اور بے جان سی پڑی روئے جا رہی تھیں۔ عون اور عدید اپنے باپ اور اپنی ماں کی حالت دیکھ کر بے حال ہو چکے تھے۔ ان کے معصوم ذہنوں پہ بڑا اثر ہوا تھا۔ لیکن یہاں بھلا کس کو پروا تھی کہ کس پہ کیا اثر ہوا ہے؟ حالات کی گروٹ بہت نقصان دہ ثابت ہوئی تھی۔ سب کچھ بدل گیا تھا۔ یہاں تک کہ اپنے بھی۔

”کیا ہو رہا ہے یہاں؟“ اسرار آندری نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا تھا۔ کیونکہ وہاں سب کے چہروں پہ سوچ کے جال بچھے ہوئے تھے۔

”جو بھی ہو رہا ہے غلط ہو رہا ہے۔“ دانیال گہری سانس خارج کرتے ہوئے صوفیہ سے کھڑا ہو گیا۔
 ”کیا مطلب؟ کیا ہوا ہے؟“ وہ پہلے ہی پریشان تھے دانیال کی سنجیدگی پہ تشویش ہونے لگی۔

”کیا پوچھنے کی ضرورت ہے؟“ ان کے لہجے میں نامحسوس سی تلخی تھی۔
”لیکن اماں۔۔۔“

”فی الحال مجھے جانے دو، میں پھر آؤں گی۔ اپنی زری سے ملنے۔ اس کی خاطر تو میں نے آنا ہی ہے؟“ ان کے لہجے میں ایسا کچھ تھا کہ وہ انہیں دوبارہ رکھنے پر اصرار نہیں کر سکا تھا چپ رہ گیا۔
اس نے ڈرائیور سے گاڑی تیار کروائی اور انہیں رخصت کرنے کے لیے گیٹ تک آیا۔ گلاب خان، زلفی اور گل ان کی اتنی جلدی واپسی پہ اداس ہوئے تھے۔ لیکن وہ انہیں دوبارہ آنے کا وعدہ دے کر رخصت ہوئی تھیں اور جاتے جاتے گل کی منہ میں چند ہزار ہزار کے نیلے نوٹ بھی تھما دیے تھے اور خود اپنی ذات پہ کبھی نہ ختم ہونے والی اذیت اور دکھ کی چادر اوڑھ کر وہاں سے چلی گئی تھیں اور دل اور خود پہ ضبط کیے اندر چلا آیا تھا۔ ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ اس کے منشی قادر کا فون آگیا۔ وہ بے چارہ کام سے بوکھلایا ہوا تھا۔ اس لیے دل اور کو خود آؤں جانا پڑا۔

آج اس کا موڈ بہت فریش تھا۔

شاید اس لیے کہ آج وہ اپنے بستر سے ایک ارادہ لے کر اٹھی تھی اور یہ ارادہ کچھ ایسا تھا کہ اس کے انگ انگ سے سرشاری سی پھوٹ رہی تھی۔ دل، دماغ میں اک تازگی آن بسی تھی۔ جس کے ہمراہ اس نے شاور لیا تھا۔ نئے کپڑے پہنے تھے۔ پرفیوم اسپرے کیا تھا۔ بال سنوارے تھے۔ کلائیوں میں برسلسٹ اور پاؤں میں ہائی ہیل سینڈل پہننے کے بعد اپنے آپ کو ڈریسنگ ٹیبل کے بڑے سے آئینے میں تنقیدی نگاہ سے دیکھا تھا۔ کمی بیشی کہیں بھی نہیں تھی۔ اسی لیے مطمئن ہو کر گلے میں مفلر ڈالتی ہوئی اپنا بیگ اور سیل فون لے کر بیڈ روم سے نکل آئی اور یوں ہی سیڑھیوں کی سمت بڑھتے اس کا دھیان اپنے بیڈ روم کے ساتھ والے بیڈ روم کی طرف چلا گیا اور بے ساختہ ہی وہ اس بیڈ روم کی طرف آگئی تھی۔ اس نے ہینڈل کھما کر دروازہ کھولا تو سامنے ہی بیڈ پہ گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے بیٹھی مومنہ بی بی نظر آئی۔

”ہیلو! گڈ مارننگ۔۔۔“ مدحیہ کافی فریش انداز سے کہتی ہوئی اندر چلی آئی اور مومنہ بی بی نے چونک کر دیکھا۔
”مدحیہ باجی۔۔۔؟“ وہ اسے دیکھ کر سیدھی ہو بیٹھی۔

”ارے یار! میں نے کل بھی تمہیں کہا تھا کہ میرے نام کے ساتھ ”باجی“ وغیرہ کادم چھلا لگا کر میرے نام کو زنی مت کرو، جیسے تم نے اچھی خاصی خوب صورت اور رنگ سی مومنہ کو ”بی بی“ بنا کے رکھ دیا ہے۔ ویسے ہی مجھے ”باجی“ بنانا چاہتی ہو؟“ مدحیہ نے اسے مصنوعی خفگی سے ٹوکا تھا اور مومنہ بی بی اسے دیکھ کے رہ گئی۔
”دیکھو یار! ظاہر سی بات ہے۔ کیا تمہاری اور میری عمر ہے؟“ باجی یا بی بی ”والی؟“ اب کے مدحیہ نے ذرا فریٹل سا انداز اپنایا اور مومنہ بی بی نے حیرت سے اس کی شکل دیکھی تھی۔ بات تو اس کی بھی سچ تھی؟ لیکن وہ بے چاری کیا کہہ سکتی تھی؟ ان پڑھ سیدھے سادھے دیہاتی ماں باپ نے اسے بی بی بنا دیا تھا اور وہ بن گئی تھی۔ اس کے لیے تو شناختی کارڈ پہ بھی مومنہ بی بی ہی لکھا ہوا تھا۔ نوے فیصد دیہاتی عورتوں کی طرح وہ بھی بی بی کے زمرے میں آتی تھی اور یہ بی بی اب اس کی پہچان بن چکا تھا۔

”اس میں میرا کیا قصور ہے مدحیہ باجی؟ یہ تو ماں باپ کے سوچنے کی بات تھی۔ وہ مومنہ بی بی کی بجائے میرا پورا نام مومنہ محمد بخش بھی لکھ سکتے تھے۔ جیسے آپ کا نام مدحیہ حیات ہے۔ لیکن یہ عقل پڑھے لکھے ماں باپ کو ہوئی ہے۔ ان پڑھ ماں باپ کو نہیں جو کسی قسم کا بھی کوئی فارم لکھواتے ہیں تو اس میں خاوند یا باپ کے نام سے زیادہ

بی بی کو اہم بنا دیتے ہیں۔ اس لیے بی بی ہماری مہربن جاتی ہے۔“ مومنہ بی بی کے جواب پہ مدحیہ نے کافی دلچسپی اور خیرانی سے دیکھا۔ وہ تھیک ہی تو کہہ رہی تھی مدحیہ کے تمام ڈاکو منٹس میں اس کا نام مدحیہ حیات ولد ممتاز حیات لکھا ہوا تھا۔ بی بی کا لفظ تو کہیں بھی نہیں تھا؟

”یعنی گاؤں میں سب لڑکیوں کے ناموں کے ساتھ بی بی ہوتا ہے؟“ اس نے تعجب کا اظہار کیا۔
”جی ہاں بالکل۔۔۔ باپ کا نام ہونہ ہو بی بی ضرور ہوتا ہے۔ آپ کو گاؤں میں کئی بی بیاں ملیں گی، سیکنہ بی بی، کوثر بی بی، رسولہ بی بی، مومنہ بی بی یا پھر صرف بی بی۔“ مومنہ بی بی نے مدحیہ کو حیرت اور دلچسپی میں ڈال دیا۔
”ہوں۔۔۔ امیزنگ۔۔۔ گویا یہ بی بی والے جراثیم بہت دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ میرے ختم کرنے سے ختم نہیں ہوں گے۔“ اس نے پر سوچ سے انداز میں کہا۔

”جی بالکل! بہت مشکل کام ہے۔“ مومنہ نے اثبات میں سر ہلایا۔
”خیر! اتنا بھی مشکل نہیں ہے۔ گاؤں کی تمام عورتوں کو نہ سہی، تمہیں تو صرف مومنہ کہا ہی جاسکتا ہے؟“
”ہوں! جیسے آپ کی مرضی باجی۔“ مومنہ بی بی نے ہامی بھری تھی۔
”اف! پھر باجی۔۔۔؟“ مدحیہ جھنجھلا گئی تھی۔

”دیکھو! آج سے تم مومنہ اور میں مدحیہ۔۔۔ نوبی بی۔۔۔ نوبی جی۔۔۔ اوکے۔۔۔؟“ مدحیہ نے انگلی اٹھا کر جس انداز سے کہا تھا اس پہ مومنہ بی بی بے ساختہ مسکرائی تھی۔
”جی! اوکے۔“ اس نے سر ہلایا۔

”ہوں! گڈ گرل۔۔۔“ مدحیہ بھی جواباً ”مسکرائی تھی۔“
”اور اب یہ بتاؤ کہ میں ذرا باہر جا رہی ہوں۔ اگر کسی چیز کی ضرورت ہے تو بتا دو واپسی پہ لے آؤں گی؟“ مدحیہ نے کافی نرمی اور خلوص سے پوچھا تھا اور مومنہ بی بی ان دونوں بہن بھائی کی اتنی ہمدردی خدا ترسی، اپنائیت اور وسیع ظرفیہ کل سے کئی مرتبہ انہیں حیران نظروں سے دیکھ چکی تھی۔ اسے ان کے ماتھے پہ شکن تک نظر نہیں آئی تھی۔ وہ بلا مبالغہ کھلے دل اور کھلے ظرف کے حامل تھے۔

”کیا سوچ رہی ہو مومنہ۔۔۔؟“ مدحیہ نے اسے چپ ہوتے دیکھ کر ٹھوکا دیا۔
”کچھ نہیں۔۔۔! میں تو بس یہ سوچ رہی ہوں کہ مجھے کس چیز کی ضرورت ہو سکتی ہے بھلا؟“ مومنہ بی بی کے لہجے میں اپنی ذات کے لیے ہی مسخر تھا جو مدحیہ کو اچھا نہیں لگا۔

”کیوں نہیں ہو سکتی بھلا؟ کیا تم لڑکی نہیں ہو؟ کیا تمہاری ضرورتیں نہیں ہیں؟ کیا پننٹا اوڑھنا جرم ہے؟ یا پھر تم نے ایک ہی لباس میں عمر گزارنے کا عہد کر رکھا ہے۔“ مدحیہ نے خفگی سے ٹھوکتے ہوئے پوچھا۔

”لیکن مدحیہ باجی۔۔۔! آپ جانتی ہیں کہ اس وقت میری ضرورت یہ چھت ہے۔ یہ چار دیواری ہے اور اس سے بڑھ کے کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہے مجھے تن پہ کپڑا بھی ہے اور معدے میں غذا بھی۔ اس لیے گزارہ ہو ہی جائے گا۔ میں خواہ مخواہ آپ کے اخراجات بردھاؤں یہ ضروری نہیں ہے۔“ مومنہ بی بی کے لہجے میں عاجزی اور بے بسی تھی۔

”ہم نے اپنے اخراجات اور اپنے وسائل دیکھ کر ہی تمہاری ذمہ داری اٹھائی ہے۔ اگر اتنی حیثیت نہ ہوتی تو شاید ہم تمہاری ذمہ داری بھی نہ اٹھاتے؟ اللہ نے کسی کی ذمہ داری اٹھانے کی توفیق دی ہے تو پھر گریز کیسا؟ شاید تمہارے صدقے اللہ ہماری بے سکون زندگی کو سکون بخش دے۔ شاید کسی کے گناہ کو دھوئے دھوئے ہمارے گناہ دھل جائیں؟“ مدحیہ کے لہجے میں بولتے بولتے کرب سا اتر آیا تھا۔
”یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“ مومنہ بی بی کو حیرت اور الجھن ہوئی تھی۔

”ہاں! ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ آخر ہم بھی تو انسان ہیں۔ گناہ سے پاک کیسے ہو سکتے ہیں؟ لیکن گناہ سے پاک ہونے کی اور گناہ کو دھونے کی کوشش تو کر سکتے ہیں نا؟“ مدحیہ کا لہجہ تلخ ہو چکا تھا۔ لیکن پھر فوراً ہی سر جھٹک دیا۔ ”اُنیس! تمہیں اخراجات کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ نے بہت نوازا ہے۔ تمہارے استعمال کر لینے سے سب ختم نہیں ہو جائے گا اور ویسے بھی تمہاری ذمہ داری نبیل بھائی نے اٹھائی ہے اور تمہارے اخراجات تمہاری ضرورتیں بھی وہی پوری کریں گے۔ کون سا میں اپنی جیب سے خرچ کروں گی؟ میں نے تو بس ان کو بتانا ہے اور ان سے کیش وصول کرنا ہے۔“ اس نے لاپرواہی ظاہر کرتے ہوئے کندھے اچکائے تھے اور مومنہ بی بی کے چہرے نہ چاہتے ہوئے بھی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ کیونکہ مدحیہ کا انداز ہی کچھ ایسا تھا۔

”پھر کیا خیال ہے تمہارا؟“ اس نے دوبارہ پوچھا۔

”نی الحال کچھ سمجھ نہیں آرہا۔“ مومنہ بی بی نے بے چارگی سے کہا تھا۔

”اوکے! ایز یوش۔۔۔ جب سمجھ میں آجائے تب بتا دینا۔“ مدحیہ کہہ کے پلٹ گئی۔

”مدحیہ باجی۔۔۔!“ اس نے پیچھے سے بے ساختہ پکارا تھا اور مدحیہ نے یک دم پلٹ کر اسے جن نظروں سے دیکھا تھا۔ مومنہ بی بی نے فوراً اپنی زبان دانتوں تلے دبالی تھی۔ وہ پھر باجی کہنے کی غلطی کر بیٹھی تھی۔ حالانکہ تھوڑی دیر پہلے بھی اس نے بات کے دوران اسے باجی کہا تھا۔ لیکن مدحیہ نے غور نہیں کیا تھا۔ مگر اب۔۔۔

”میں معافی چاہتی ہوں مدحیہ باجی! لیکن سیانے کہتے ہیں کہ امیر اور غریب اتنی جلدی گھل مل نہیں سکتے۔ تھوڑا ٹائم لگتا ہے۔ میں اتنی جلدی نہ تو آپ کے برابر آسکتی ہوں اور نہ ہی آپ کو اپنے برابر لاسکتی ہوں۔ اس لیے تھوڑا برداشت کیجیے رفتہ رفتہ باجی کہنا چھوڑ دوں گی۔“ مومنہ بی بی نے کافی معذرت خواہانہ لہجے میں کہا تھا۔ جس پر مدحیہ نے مزید بحث میں الجھنے کی بجائے سر جھٹک دیا تھا۔

”اوکے! تم یہ بتاؤ تم نے مجھے آوازیوں دی ہے؟“ مدحیہ نے اس کے روکنے کی وجہ پوچھی تھی۔

”وہ میں نے پوچھنا تھا کہ آپ کہاں جا رہی ہیں؟“

مومنہ بی بی کے اس سوال پر نہ جانے کیوں مدحیہ پل بھر کے لیے جھجک سی گئی۔ اسے سمجھ نہ آیا کہ وہ اسے کیا جواب دے؟ کیا کہے کہ وہ کہاں جا رہی ہے؟

”کیوں تمہیں کوئی کام ہے؟“ وہ اس کے سوال کا جواب گول کر گئی تھی۔

”نہیں! بس یہ کہنا تھا کہ جہاں بھی جا رہی ہیں ذرا جلدی واپس آجائیے گا۔“

”کیوں؟ کیا تمہیں یہاں ڈر لگ رہا ہے؟“

”نہیں مدحیہ باجی! ڈر کیسا؟ ڈر تو ان کو ہوتا ہے جن کے پاس کچھ ہو؟ میرے پاس کیا ہے بھلا؟ سب کچھ تو پہلے ہی گنوا چکی ہوں؟ بس اس لیے کہہ رہی تھی کہ تنہا بیٹھے بیٹھے دل گھبرانے لگتا ہے۔ آپ ہوتی ہیں تو دل کو ڈھارس دیتی ہے۔“ اس کی بات پر مدحیہ چند ثانیے کے لیے چپ ہوئی پھر گہری سانس کھینچتے ہوئے سر ہلا دیا۔

”اوکے! جلدی آجاؤں گی! لیکن اگر زیادہ گھبراہٹ ہو تو تم بیڈروم سے باہر بھی آسکتی ہو۔ مام کے ساتھ بیٹھ کر باتیں بھی کر سکتی ہو۔ گھر کی چار دیواری کے اندر تمہیں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ تم آزاد ہو یہاں۔“ مدحیہ نے اسے ریلیکس کرنے کی پوری کوشش کی تھی اور مومنہ بی بی نے تشکر آمیز نظروں سے دیکھا تھا۔

”شکریہ۔ بہت بہت شکریہ مدحیہ باجی۔“

”اوکے! گڈ بائے۔“ وہ کہہ کر باہر نکل آئی تھی۔ لیکن سیڑھیاں اترتے ہوئے فائزہ بیگم سے سامنا ہوا تھا۔

”کہاں جا رہی ہو؟“ وہی ایک فطری سا سوال بار بار اس کے آڑے آرہا تھا۔

”بس ایک کام سے جا رہی ہوں۔“ مدحیہ کہہ کر ان کے سامنے ٹھہری نہیں تھی۔ بے شک جو بھی تھا۔ لیکن وہ

ایک ماں تھیں اور وہ ماں کی گہری نظروں کے سامنے عیاں نہیں ہونا چاہتی تھی۔ اسی لیے ذرا کترا کے جواب دیا تھا۔

”ہام۔۔۔! میری واپسی تک مومنہ کا خیال رکھیے گا! میں جلدی آجاؤں گی۔“ سیڑھیاں اترنے کے بعد اسے خیال آیا تو اس نے مڑ کر فائزہ بیگم کو تاکید کی تھی۔

”خوش قسمت ہے مومنہ بی بی جس کے خیال تمہیں ستارے ہیں۔“ فائزہ بیگم نے رشک کا اظہار کیا اور مدحیہ مسکراتی ہوئی کوریڈور عبور کر گئی۔ ابھی اس نے گھر کے گیٹ سے گاڑی نکال کر روڈ پہ ڈالی ہی تھی کہ اس کا سیل فون بج اٹھا تھا۔

”ہیلو۔۔۔“ اس نے بنا دیکھے ہی کال ریسیو کر لی تھی۔

”کیسی ہو۔۔۔؟“ دوسری طرف جیسی تھا۔

”ایک دم فٹ! تم سناؤ تم کیسے ہو؟“ مدحیہ کے لہجے میں بے پناہ ہلاکت تھی۔

”کیسا ہونا چاہیے مجھے؟ کیا تمہیں میری کچھ خبر ہے؟ کیا اس کو مہمان نوازی کہتی ہو کہ دوبارہ پلٹ کر خبر بھی نہ لو کسی کی؟“ جیسی شکوہ کر رہا تھا۔ مدحیہ تو اسے سچ بچ بھولی ہوئی تھی۔

”سوری یار! ایم ریٹلی سوری۔۔۔ ان فیکٹ دو دن پہلے نبیل بھائی کا کسی لڑکی کے ساتھ ایکسپینڈنٹ ہو گیا تھا۔ اس لیے گھر میں کچھ مصروفیت تھی اور کل دل آور بھائی اپنے گھر آئے ہوئے تھے تو ہم ان سے ملنے چلے گئے۔ تب ہی تم سے ملنے کا ٹائم نہیں ملا۔“ وہ ڈرا سیو کرتے ہوئے اسے جواب دے رہی تھی۔

”اور اس وقت کہاں جا رہی ہو؟“ جیسی کے کہنے پر مدحیہ چکر اگئی۔

”اف! کیا ہو گیا ہے تم سب کو؟ میں کہیں جانے کے لیے کیا نکلی ہوں کہ شہر کا شہر پیچھے پڑ گیا ہے۔ ہر طرف ایک ہی سوال سنانی دے رہا ہے۔ کہاں جا رہی ہو؟ کہاں جا رہی ہو؟“ اس نے جیسے سر پیٹ لیا۔

”تو تم بتاؤ کہ تم کہاں جا رہی ہو؟“ جیسی سکون سے کہہ رہا تھا اور مدحیہ ٹھہری گئی۔

”کسی سے ملنے جا رہی ہوں۔“ اب کی بار اس کا ہلاکت آمیز لہجہ دھیمہ پڑ چکا تھا۔

”کس سے ملنے جا رہی ہو؟“ یہ سوال جیسی چاہتے ہوئے بھی نہیں پوچھ سکا تھا، کیونکہ مدحیہ کا دھیمہ لہجہ اسے ٹھنکا گیا تھا اور وہ یہ سنا کر اپنے وہم پر یقین کی مہر نہیں لگانا چاہتا تھا۔

”ہیلو جیسی!“ مدحیہ نے اس کی خاموشی پر اسے پکارا تو وہ چونک کر متوجہ ہوا۔

”ہوں! سن رہا ہوں۔“ اب اس کا لہجہ دھیمہ ہو چکا تھا۔

”چپ کیوں ہو گئے ہو؟“

”کچھ کہنے کے لیے بھی تو نہیں ہے؟ اپنی دے۔ تم جہاں جا رہی ہو، جاؤ واپسی پر تم سے بات ہوگی مگر بھولنا مت یہ بھی یاد رکھنا کہ میں منتظر ہوں۔“ جیسی نے کہہ کر فون بند کر دیا اور مدحیہ فون کو دیکھ کے رہ گئی تھی کیونکہ جیسی اپنی بات کا مفہوم واضح کر گیا تھا۔

اوماڑا اے تے ماڑا سہی یار تو ہے

کج دی ہوئے او ساڈا پیار تو ہے

کیوں مامے دا کیوں ڈھولے دا گلہ کراں

میں تاں لکھ واری بسم اللہ کراں۔۔۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ تمام پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رزروم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ پیریم کوالٹی، نارل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور
- ✧ این صفی کی مکمل رینج
- ✧ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

اب ہم اللہ کراں۔
ورکشاپ کے گرد آلودہ آمدے میں لکڑی کے بیچ پہ رکھے کالے رنگ کے ٹوٹے پھوٹے سے ٹیپ ریکارڈر میں فل والیوم سے گونجتی ملکوی آواز عدیل کے اعصاب پہ ٹینشن کی طرح سوار ہو رہی تھی وہ پہلے ہی کافی بے زار تھا، ملکوی کے ان چونچلوں پہ اور بھی کوفت اور بے زاریت ہونے لگی تھی اس نے دو تین بار چھوٹے کو ٹیپ ریکارڈر بند کرنے کے لیے بھی کہا تھا لیکن وہ یہ رسک لینے کو تیار نہیں تھا کیونکہ یہ ٹیپ ریکارڈر سالوں سے بند رہا تھا اور دو دن پہلے چھوٹے نے اسے کاٹھ کباڑ سے دریافت کر کے اسے دس روپے کا نیا سوچ لگا کر تقریباً "پچاسی جھٹکے دیئے تھے اور تب جا کے وہ اشارت ہونے پہ آمادہ ہوا تھا اور چھوٹا خوشی سے بھاگتا ہوا جا کر ساتھ والے چائے کے ڈھابے سے یہ کیسٹ اٹھالایا حالانکہ اس نے جب یہ کیسٹ لاکر ٹیپ ریکارڈر میں فٹ کیا تھا تو ٹیپ ریکارڈر نے ابکائی کرنے والے انداز میں فوراً "وہ کیسٹ باہر اگل دیا تھا کیونکہ ٹیپ ریکارڈر کے کیسٹ ڈالنے والے فریم ٹوٹے ہوئے تھے اس لیے بغیر کسی فریم یا بغیر کسی سہارے کے کیسٹ کا ٹھہرنا مشکل تھا لیکن دوسری طرف ٹھہرانے والا بھی آخر "چھوٹا" تھا۔

اس نے کیسٹ ٹیپ ریکارڈر میں ڈال کے اس کے دائیں بائیں ماچس کی تیلیاں پھنسا دی تھیں اور اوپر سے ٹیپ ریکارڈر پہ ایک زوردار پیٹھر رسید کیا اور تب سے اب تک ملکوی گا گا کر ہلکان ہو گیا تھا کیونکہ چھوٹے نے اسے بند کرنے کی زحمت نہیں کی تھی بس جب بجلی آف ہوتی تو اسے ذرا دم لینے کا وقفہ ملتا تھا ورنہ تو نان اسٹاپ چلتا رہتا اور اگر بھی درمیان میں ٹیپ ریکارڈر اٹکنے لگتا تھا تو چھوٹا اسے پیٹھر مار کے پھر سے اس میں پھریری سے بھر دیتا اور اس پہ ستم کہ ٹیپ ریکارڈر کا والیوم بھی کم نہیں ہوتا تھا کیونکہ اس کا والیوم والا بٹن ہی غائب تھا اور اس کا یہ اعصاب شکن مشغلہ عدیل کی برداشت سے باہر ہو رہا تھا لیکن پھر بھی وہ ضبط کیے اپنے کام میں مصروف رہا تھا تاکہ اس کے کچھ سخت ست بولنے پہ کوئی بد مزگی پیدا نہ ہو، لیکن چھوٹا تھا کہ باز ہی نہیں آ رہا تھا۔

اساں ناں چن کے یار بنایا شوقاں دا

ہورے کھڑا اٹل لگدا اے اپناں لوکاں دا؟

چھوٹے نے شاید عدیل کو زچ کرنے کا پورا پورا پروگرام بنا رکھا تھا کیونکہ اب وہ خود بھی ساتھ ساتھ گانا شروع ہو چکا تھا جس پر عدیل کو اور بھی ناؤ آ رہا تھا۔

"دیکھ چھوٹے! یہ ہاتھ میں پکڑا ہوا رینج تمہارے سر پہ دے ماروں گا اس لیے بہتر ہے کہ شرافت سے اپنا اور اس کا منہ بند کرو ورنہ تم دونوں کو اٹھا کر باہر پھینک آؤں گا۔" عدیل کی برداشت جواب دے چکی تھی اس نے خونخوار نظروں کے ساتھ چھوٹے کو اور اس کے دریافت شدہ دھکا اشارت ٹیپ ریکارڈر کو بیک وقت دیکھا تھا۔
"استاد! تم تو یوں غصہ کر رہے ہو جیسے ملکوی تمہیں چھیڑ رہا ہو۔" چھوٹے نے چوٹ کی تھی جس پہ عدیل تھملا گیا تھا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"ارے استاد! مطلب والی باتیں ہمیں نہیں آتیں ہم تو بغیر مطلب والی بات کرتے ہیں۔ ویسے استاد! آپس کی بات ہے یہ جو پار ہوتے ہیں یہ ماڑے کیوں ہوتے ہیں؟" چھوٹے نے آخر میں معصومیت سے سوال داغ دیا اور عدیل نے اسے گھور کے دیکھا۔

"تم آخر کتنا کیا چاہتے ہو؟"

"اللہ کی قسم استاد! میں بھی وہی چاہتا ہوں جو تم چاہتے ہو لیکن کیا کریں؟ رنگ میں بھگ تو وہ ولایت والا (جمیزی) ڈال گیا تھا جب بھی یاد آتا ہے کھوپڑی گرم ہو جاتی ہے اچھا بھلا استاد کا کام سیدھا ہو رہا تھا لیکن وہ نہ

جانے کہاں سے بچ میں آگیا لیکن استاد کوئی بات نہیں تیری ٹانگ میں اگر دم ہوا تو وہ میڈم ضرور آئے گی کیونکہ یہ تو ایک فطری سی بات ہے کہ جس طرح دیسی کو ولایتی میں بڑی کشش ہوتی ہے اسی طرح ولایتی کو بھی دیسی میں بڑی کشش محسوس ہوتی ہے، خصوصاً ولایتی عورت تو دیسی مرد کی طرف کھینچی چلی آتی ہے اور تم بھی ماشاء اللہ دیسی مرد ہو، مشرقی مرد ہر لحاظ سے مکمل کشش سے مالا مال ممکن ہی نہیں کہ وہ ولایتی میڈم تمہارے سحر سے بچ نکلے۔

چھوٹے کی بات یہ عدیل نے ناگواری سے سر جھٹکا۔

”میرے دل میں اس کا خیال تک نہیں ہے تمہیں خواہ مخواہ ایٹو بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنے کام سے کام رکھا کرو۔“

”ہو نہ استاد! تمہارے دل میں اس کا خیال تک نہیں ہے تو پھر دماغ میں یہ گرمی کس لیے ہے؟ جو تم ہم پہ نکال رہے ہو۔“ چھوٹے کا انداز معنی خیز سا تھا۔

”تمہارے کرتوت ہی ایسے ہوتے ہیں کہ خواہ مخواہ دماغ گرم ہونے لگتا ہے۔“

”میرے کرتوت یا پھر؟“ چھوٹے نے بات ادھوری چھوڑتے ہوئے اسے دیکھا تھا اور عدیل نے سمجھتے ہوئے یکدم اسے مارنے کے لیے رینچ گھمایا تھا اچانک ورکشاپ کے احاطے میں ایک گاڑی جھٹکے سے آن رکی۔ سلور کلر کی چمپاتی ہوئی یہ گاڑی عدیل کے لیے اجنبی نہیں تھی اس کا ہاتھ یکدم نیچے پیلو میں آگرا تھا۔

”مرد یہ دیسی شراب اور عورت یہ دیسی مرد بڑا اثر کرتے ہیں استاد۔ آزمائش شرط ہے۔“ چھوٹا اس کے قریب سرگوشی سے کہتا ہوا پاس سے گزر کر ورکشاپ کی پچھلی سائیڈ پہ چلا گیا جہاں جیدی اور سلو کسی گاڑی کی مرمت میں مصروف تھے۔ وہ گاڑی سے اتر کر اس کے قریب آگئی۔

”پیلو!“ آواز تھی یا مٹھاس جس کا احساس عدیل کو روح تک محسوس ہوا تھا۔

”السلام علیکم۔“ اس نے بھی کافی ٹھہرے ہوئے لہجے میں سلام کیا تھا۔

”کیسے ہیں آپ؟“ اس وقت وہ احساسات اور جذبات سے گندھی ہوئی ایک نارمل لڑکی نظر آرہی تھی جس کے وجود میں بھرکتا غصہ اس لمحے کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا وہ سر سے پاؤں تک تسخیر پہ آمادہ تھی اور اس لمحے عدیل کو اس کی ذات کے آئینے میں اپنے آپ کے سوا اور کوئی نظر نہیں آیا تھا اسے اس کے وجود میں اپنا آپ دکھائی دے رہا تھا وہ اس وقت اس کے سامنے کھڑی ”مدیحہ حیات“ نہیں بلکہ ”عدیل عمر“ لگ رہی تھی شاید اسی لیے کہ عدیل عمر کے سامنے آنے کے لیے اسے مدیحہ حیات کو پیچھے چھوڑ کے آنا پڑا تھا شاید اپنے اسی بستر میں جہاں سے وہ عدیل عمر سے ملنے کا ارادہ لے کر اٹھی تھی اور اب اس کے سامنے کھڑی وہ مدیحہ ”مدیحہ“ ہی نہیں لگ رہی تھی جس کو دیکھ کر عدیل عمر کا دل بھی اپنی جگہ سے اس کی سمت ہلکنے لگا تھا اور اس نے ہاتھ میں پکڑا رینچ ایک سائیڈ پہ ڈال دیا۔

”میں ٹھیک ہوں! آپ سنائیں کیسی ہیں؟“ عدیل کا دل اس کے لہجے پہ حاوی ہو رہا تھا ”آج دے رہا تھا۔“

”میں آپ کے سامنے ہوں۔ اب آپ فیصلہ کریں کہ میں کیسی ہوں؟“ وہ آج پہلی بار دل کی رضا سے آئی تھی اس لیے سب کچھ دل کی رضا پہ چھوڑ رکھا تھا صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ اس کی چھوٹ پہ دل اپنی رضا سے کیا کیا کرتا ہے؟ کیا گل کھلاتا ہے؟ کون سا چاند چڑھاتا ہے؟ کہاں تک جاتا ہے؟ کتنا ہلکتا ہے اور کتنا سمبھلتا ہے؟ یہی جاننے کے لیے اس نے دل کو خاصی ڈھیل دے رکھی تھی اور وہ عدیل عمر کے حضور آن پہنچا تھا کسی سدھائے ہوئے بے زبان جانور کی طرح۔!

”آپ اپنے فیصلے دو سروں پر بھی چھوڑتی ہیں؟“ عدیل کا سوال دلچسپی لیے ہوئے تھا۔

”کثر نہیں، کبھی کبھی۔“ وہ بھی خوشگواریت سے بولی۔

”کبھی کبھی کیوں؟“

”کیونکہ دل کبھی کبھی موج و مستی پہ آمادہ ہوتا ہے۔“ اس نے لاپرواہی سے کہا۔

”یعنی آپ اس وقت موج و مستی پہ آمادہ ہیں؟“ عدیل کے معنی خیز لہجے پہ مدیحہ بری طرح چونکی تھی وہ اس کی بات کو ذرا معنی سمجھ رہی تھی۔

”نہیں! ایسی بات نہیں ہے۔“ مدیحہ جیسی شعلہ صفت لڑکی کا یوں گڑبڑا جانا عدیل کو لطف دے گیا تھا

اس کے دماغ کی گرمی دور ہو گئی تھی۔

”تو پھر کیسی بات ہے؟ کس موج میں ہیں آپ؟ اور کس مستی کی بات کر رہی ہیں؟“ اس کے رنگ اس کے انداز دیکھ کے عدیل خود مستی میں آگیا تھا۔ اور مدیحہ نظریں چراگئی۔

”کیا بیٹھنے کو نہیں کہیں گے؟“ اس نے عدیل کی بات کو سنی ان سنی کرتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔

”ارے کیوں نہیں! سو بسم اللہ، سر آنکھوں پہ آئیے بیٹھیے۔“ عدیل نے چونکتے ہوئے فوراً ”پلاسٹک کی کرسی کھینچ کر اس کے سامنے رکھ دی اور دو سری کرسی اپنے لیے کھینچ لایا۔

”ارے بے فکر رہیں! کرسی گندی نہیں ہے بس حالات اور ماحول نے اسے بد وضع اور بے رنگ بنا دیا ہے۔“

عدیل نے اسے تسلی دی تھی اور مدیحہ تجل ہوتی ہوئی بیٹھ گئی۔

”اب بتائیے! کیا لیں گی آپ؟“ وہ عین اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور مدیحہ کو یوں اس کے رویہ بیٹھنے پہ جھجک سی ہو رہی تھی۔

”نہیں! کچھ نہیں۔“ اس نے نفی میں گردن ہلائی تھی۔

”کیا ناشتا کر کے آئی ہیں؟“

”نہیں۔“

”ارے! تو پھر انکار کس لیے ہے؟ یہاں ناشتا کریں گرما گرم حلوہ پوری، چنے اور لسی کے ساتھ دماغ کی خشکی دور ہو جائے گی۔“ عدیل نے اسے ناشتے پہ اصرار کیا تھا۔

”نہیں! اتنا ہیوی ناشتا میں نہیں کر سکتی۔“ وہ اتنا بھاری بھر کم ناشتا کرنے پہ تیار نہیں تھی۔

”اتنا بھی ہیوی نہیں ہے بس آپ کو نام سن کر ایسا لگ رہا ہے اس نرم گرم سے موسم میں یہ ناشتا بہت گرمائش دیتا ہے۔“ عدیل کا اصرار ہنوز تھا۔

”ایم سوری! اتنا ہیوی ناشتا تو نہیں لیکن چائے لے سکتی ہوں۔“ اس نے چائے پہ رضامندی ظاہر کی تھی اور مجبوراً ”عدیل کو اپنے اصرار سے ہٹنا پڑا۔

”اوکے! ابھی منگواتا ہوں۔“ اس نے کہتے ہوئے گردن موڑ کر سلو کو آواز دی تھی۔

”سلو! اوئے سلو۔“ اس نے بلند آواز سے پکارا۔

”جی استاد؟“ سلو فوراً ہاتھ جھاڑتا ہوا حاضر ہوا تھا۔

”دو کپ چائے پکڑو ڈھابے سے۔“ اس نے اشارہ کیا تھا۔

”استاد! سلام تو کر لینے دیں۔ سلام میڈم! کیسی ہیں آپ؟“ سلو نے عدیل کو خفگی سے کہا تھا اور ساتھ ہی مدیحہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”وعلیکم السلام! ٹھیک ہوں اللہ کا شکر ہے۔“ مدیحہ نے آہستگی سے کہا اور اس کے انگلش لب و لہجے میں ”اللہ کا شکر“ آدا کرنا بہت اچھا لگا تھا۔

”چلیں شکر ہے اللہ اپنا کرم ہی رکھے، آپ بیٹھیں میں ابھی چائے لے کر آتا ہوں۔“ سلو خوشدلی سے کہتا ہوا

45

www.paksociety.com

چلا گیا۔ عدیل کو پتا تھا کہ وہ تینوں لوگوں سے بہت تنگ کریں گے اسی لیے تو اس نے بڑے لوفر ”چھوٹے“ کو نہیں بلایا تھا جو صرف نام کا چھوٹا تھا، کام کا نہیں، کام تو اس کے بڑے بڑے تھے، ”خصوصاً“ اس کی عقل بہت بڑی تھی، کافی دور کی سوچ رکھتا تھا۔ اور اس کا اور اک عدیل کو کافی اچھی طرح سے ہو چکا تھا۔

”اور سنائیں کیسے آنا ہوا آپ کا؟ میرے لائق کوئی خدمت۔“ عدیل دوبارہ سے اس کی سمت متوجہ ہو چکا تھا اور مدحیہ کو اس وقت کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے؟ اور کیا بتائے کہ وہ یہاں کیوں آئی ہے؟ کیونکہ اس کے پاس کوئی وجہ ہی نہیں تھی یہاں آنے کی۔

”وہ دراصل میں نے آپ کے گھر جانا تھا“ آپ کے فادر کی خیریت معلوم کرنے کے لیے لیکن مجھے آپ کے گھر کا پتا نہیں تھا اس لیے یہاں آنا پڑا ہے۔“ مدحیہ کو بروقت ایک بہانا سوچھ ہی گیا تھا اور عدیل اس کا یہ گریز فوراً ہی سمجھ گیا۔

”وہ اچھا اچھا۔! تو آپ اباجی کی عیادت کے لیے یہاں آئی ہیں؟“ اس نے اپنی ذمہ داری سی مسکراہٹ کو چھپانے کے لیے دور سے آتے سلو پے نظریں جمادیں تاکہ مدحیہ سے نظروں کا تصادم نہ ہو۔

”آپ مجھے گھر کا پتا بتادیں“ میں چلی جاؤں گی۔“ وہ بھی بات کرتے ہوئے کافی جھجکی اور کترائی کترائی سی لگ رہی تھی اپنے سابقہ شعلہ جوالہ انداز سے قطعی مختلف نظر آ رہی تھی۔

”ارے نہیں نہیں! جب تک میں آپ کو اپنے گھر لے کر نہیں جاؤں گا آپ کیسے جائیں گی بھلا؟ آپ کے ساتھ میرا ہونا ضروری ہے۔“ عدیل کے جواب پر اس نے بے ساختہ پلکیں اٹھا کر دیکھا اور عدیل اس کی گہری سیاہ آنکھوں کے وار سے گھائل ہو کے رہ گیا تھا اس کی آنکھوں کی دھار بہت تیز تھی۔

”استاد! چائے۔“ سلو آنکھوں کی آنکھوں تک رسائی کا یہ منظر دیکھ چکا تھا اسی لیے گلا کھنکار کے متوجہ کیا۔

”ہوں! لاؤ دو ادھر۔“ عدیل نے نظروں کا دامن چھڑا کر سلو کے ہاتھ سے دونوں کپ تھام لیے تھے۔

”میں جاؤں استاد؟“

”ہوں! جاؤ۔“ عدیل نے سلو سے نظر ملائے بغیر کہا تھا۔

”ٹھیک ہے استاد! کرلو موجد۔“ سلو آہ بھر کے کتا ہوا واپس چلا گیا اور اس کی یہ سرگوشی نما آہ سن کر عدیل مسکراہٹ دبا گیا۔

”یہ لیجئے چائے۔“ اس نے کپ مدحیہ کی سمت بڑھا دیا تھا۔

”تھینکس۔“ مدحیہ نے دو دھیا ہاتھ بڑھاتے ہوئے چائے کا وہ چھوٹا سا کپ تھام لیا اور عدیل اس کے ہاتھ کی خوبصورتی دیکھ کے رہ گیا۔ دودھ کی طرح سفید ملائم اور گداز ہاتھ عدیل کی نظروں کو بھٹکا گئے تھے۔

”ہوں! اچھی چائے ہے اور اسٹرانگ بھی۔“ مدحیہ نے چائے کا سب لپٹنے کے فوراً بعد تعریف کی تھی۔

”تنی زیادہ محنت اور تھکن کے بعد اسٹرانگ چیزیں ہی ہماری ترجیح ہوتی ہیں جو تھکے ہارے جسم سے ساری تھکن نچوڑتی ہیں اور دل و دماغ ہلکے پھلکے ہو جاتے ہیں۔“ عدیل نے بھی چائے کا سب لپٹ لیا۔

”آپ اتنی محنت کیوں کرتے ہیں؟“ مدحیہ کے ذہن میں انکا ہوا سوال باہر آیا تھا۔

”کیونکہ میں اپنے گھر کا واحد کفیل ہوں پانچ بہنوں کا بھائی اور ماں باپ کا ایک ہی بیٹا ہوں۔ اس لیے محنت تو مجھے فرض ہے۔“ وہ لا پرواہی ظاہر کر رہا تھا۔

”لیکن آپ کوئی اور کام بھی تو کر سکتے ہیں؟“ وہ فوراً بولی۔

”بہت کوشش کی تھی کرنے کی، یہاں تک کہ خود کشی بھی، لیکن اللہ کو خود کشی کرنا پسند نہیں ہے اس لیے اس نے مجھے خود کشی کے کام سے ہٹا کر یہاں بھیج دیا شاید اسے میرے لیے یہی پسند تھا۔“ اس نے کندھے جھٹکے تھے۔

”لیکن یہ کام آپ کو سوٹ نہیں کرتا۔“ وہ بے ساختگی سے بولی تھی۔

”ہمیں زندگی میں بہت سے کام ایسے کرنے پڑتے ہیں جو ہمیں سوٹ نہیں کرتے، جیسے آپ یہی دیکھ لیں کہ آپ کا یہاں آنا سوٹ نہیں کرتا، لیکن پھر بھی آپ کو آنا پڑا ہے کیونکہ آپ کے پاس کوئی اور چارہ نہیں تھا بالکل ایسی طرح میرے پاس بھی یہاں آنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔“ عدیل کے لہجے میں ہلکی تلخی کی آمیزش تھی۔

”لیکن کام کا کوئی اسٹینڈرڈ تو ہونا چاہیے؟“

”دیکھیے میڈم! ایسی بات وہی بندہ سوچ سکتا ہے جو ہر لحاظ سے آزاد ہو، بے فکر ہو، حالات اور مشکلات میں پھنسا ہوا آدمی یہ سب نہیں سوچ سکتا اس کی عقل اور شعور تو مسائل سے ہی مفلوج ہو چکے ہوتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ مجبوری معیار نہیں دیکھتی۔ مجبوری یہ نہیں سوچتی کہ کیا معیاری ہے؟ اور کیا غیر معیاری ہے؟ مجبوری کہتی ہے کرو۔ وہ سب کرو جو تمہارے اختیار میں ہے۔ چاہے وہ معیاری ہے یا غیر معیاری! اچھا ہے یا برا حلال ہے یا حرام؟ بس تم نے کرنا ہے کیونکہ میرا نام مجبوری ہے اور محبت کی طرح مجبوری بھی اندھی ہوتی ہے کچھ بھی نہیں دیکھتی، مقام، مرتبہ، معیار بھی نہیں دیکھتی سب کروالیتی ہے بلکہ وہ کام بھی کرواتی ہے جو کام انسان سے کبھی محبت بھی نہیں کرواپاتی اس لیے اور دیگر مجبوروں کی طرح میں بھی اس مجبوری کے ہاتھوں مجبور ہوں وہ سب کرنے کے لیے جو شاید میرے معیار کا نہیں ہے۔“ عدیل کے تفصیلی اور رخ سے جواب پر مدحیہ چپ چاپ سی اسے دیکھتی رہ گئی۔ اس کے لفظ لفظ میں سچائی اور چھین تھی وہ اب کچھ کہتی بھی تو کیا کہتی۔؟

”خیر! چھوڑیں اس بات کو۔ آپ کو ایک بات بتانا ہوں۔“ عدیل نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔ اور چائے کا سب لپٹے ہوئے مدحیہ کو کچھ بولتی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا۔

”کیا...؟“ مدحیہ نے بھی چائے کا سب لپٹے ہوئے بے ساختہ پوچھا۔

”آپ اس وقت بہت ”اپنی“ سی لگ رہی ہیں۔“ عدیل اظہار کے بنا نہیں رہ سکا اور مدحیہ نے یکدم پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا تھا وہ مسکرا رہا تھا اس کی مسکراہٹ میں کئی رنگ تھے کئی معنی تھے۔ وہ نظر جھکانے پر مجبور ہو گئی۔ عدیل اس کی حرکت پر قہقہہ لگاتا، اگر اسے مدحیہ کا ڈرنہ ہوتا وہ کسی بھی وقت اپنا ٹیبلووز کر سکتی تھی اسی لیے وہ سنبھل گیا اور اپنا قہقہہ دبا گیا اور ہمیشہ اعتماد سے بات کرنے والی انتہائی بولڈ سی مدحیہ نہ جانے کیوں اس لمحے نروس ہو گئی تھی۔

”اوکے! میں اب چلتی ہوں۔“ وہ چائے کا خالی کپ رکھتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

”آئندہ کی امید بھی رکھ سکتے ہیں یا نہیں؟“ وہ بلا ارادہ پوچھ بیٹھا۔

”کیا آئندہ بھی آنا چاہیے؟“

”یہ سوال تو آپ کو اپنے آپ سے کرنا چاہیے۔“

”لیکن! میں یہ سوال آپ سے کر رہی ہوں۔“ وہ عدیل پہ نظریں جما چکی تھی۔

”کیا میرے جواب کی اہمیت ہے آپ کی نظر میں؟“

”ہے تو پوچھ رہی ہوں نا۔“

”تھینک یو۔! پھر میں تو کموں گا آپ کا جب بھی دل چاہے آپ آئیں میرے گھر سے دل تک تمام دروازے کھلے ہوئے ملیں گے آپ کو۔“ اس نے خوشدلی سے بازو پھیلا کر کہا۔

”وجہ؟ اتنی عنایت کس لیے؟“ وہ اسے کھوجنا چاہتی تھی۔

”آئی جاتی رہیں گی تو وجہ بھی پتا چل جائے گی۔“ وہ مسکراہٹ چھپا نہیں سکا۔

”او کے! گڈ بائے۔“ وہ کہہ کے پلٹ گئی اور اپنے گلاسز والوں میں اٹکا لیے تھے اور گاڑی کے قریب جا کر دوبارہ پلٹ کر اسے دیکھا۔ وہ بھی اسے ہی دیکھ رہا تھا اور پھر وہ گاڑی بیک کرتے ہوئے روڈ تک لے گئی۔ عدیل اسے دور تک دیکھتا رہا جیسے ہی اس کی گاڑی آنکھوں سے اوجھل ہوئی وہ واپس پلٹا تھا لیکن یکدم گڑبڑا گیا کیونکہ وہ تینوں عین اس کے پیچھے کھڑے تھے اور عدیل کو گھور رہے تھے وہ جان بوجھ کر بال سہلانا ہوا کتر کے ان کے پاس سے گنگناتا ہوا گزر کر آگے بڑھ گیا۔

کیوں باہر سے دائیوں ڈھولے دا نگلہ کراں
او میں تان لکھ واری بسم اللہ کراں۔
”استاد۔“ اس کے گنگناتے پہ چھوٹا یکدم چیخ اٹھا اور خونخوار انداز میں اس کی سمت لپکا تھا اور جواباً ”وہ اپنا بچاؤ کرتے ہوئے قہقہہ لگا کے ہنسا تھا۔“

”پلیز بھابی! ایک منٹ میں کچھ بھول گئی ہوں۔“ زری گھر کی دہلیز سے باہر قدم رکھتے ہوئے یکدم رک گئی۔
عبداللہ سارا سامان گاڑیوں میں رکھوا رہا تھا دو گھنٹے بعد ان کی فلائٹ تھی۔

”کیا بھول گئی ہو؟“ نگارش بھی ٹھنک کے رک گئی۔
”جائے نماز۔“ زری نے کہتے ہوئے قدم واپس موڑ لیے۔
”جائے نماز۔“ نگارش کو حیرت ہوئی تھی۔

”ہاں بھابی! میری جائے نماز جس پہ میں نماز پڑھتی ہوں۔“
”لیکن زری! جائے نماز تو پاکستان سے بھی مل جائے گی؟“
”یہ جائے نماز کہیں سے بھی نہیں ملے گی بھابی۔“ زری گھر کے کوریڈور میں داخل ہو چکی تھی۔
”کیا مطلب؟“ نگارش کو بھلا کیا پتا تھا۔

”مطلب آکر بتاتی ہوں۔“ زری بغیر رکے اور بغیر پیچھے پلٹے کہتی ہوئی کوریڈور عبور کر گئی اور نگارش وہیں دہلیز میں کھڑی دیکھتی رہ گئی۔

”نگارش! کھڑی کیوں ہو؟ گاڑی میں بیٹھو۔“ گاڑی کے قریب کھڑے عبداللہ نے آواز دی۔
”وہ زری آجائے تو۔“ نگارش بات ادھوری چھوڑتے ہوئے چپ ہو گئی۔
”کیوں؟ زری کہاں گئی ہے؟“ عبداللہ بھی زری کی غیر موجودگی پہ چونکا۔
”اندر گئی ہے کچھ بھول گئی تھی شاید۔“

”اسی لیے میں نے تم لوگوں سے کہا بھی تھا کہ سب کچھ دوبارہ چیک کر لینا تاکہ بعد میں مسئلہ نہ ہو۔“ عبداللہ خفگی سے کہتا گاڑی میں بیٹھ گیا۔ سامان والی گاڑی اس نے خود ڈرائیو کرنی تھی اور جس گاڑی میں زری اور نگارش نے جانا تھا وہ گاڑی نگارش کے بھائی نے ڈرائیو کرنا تھی۔

”آئی! آپ بیٹھیں تب تک وہ بھی آجاتی ہیں۔“ شیراز (نگارش کا بھائی) نے آگے بڑھ کے نگارش کو بیٹھنے کا کہا۔ لیکن نگارش کو بے چینی ہو رہی تھی کہ کہیں زری دیر نہ لگا دے اور وقت کی کمی کی وجہ سے عبداللہ غصہ نہ کر بیٹھے۔ اسی لیے وہ وہیں کی وہیں کھڑی رہی تھی۔

”بیچے بھابی! میں آگئی۔“ زری تیزی سے قدم اٹھاتی گھر سے باہر نکل آئی تھی اور تب جا کے نگارش کا سانس بحال ہوا تھا۔ اور دونوں نے قدم گاڑی کی سمت بڑھا دیے تھے شیراز ان کے پیچھے گھر کا دروازہ لاک کیا اور آکر

گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔
”اب بتاؤ ایسا کیا ہے اس جائے نماز میں کہ عین ٹائم پہ تمہاری جان اٹک گئی تھی؟“ گاڑی میں روڈ پہ آتے ہی نگارش کا سوال بھی سامنے آگیا۔

”اس جائے نماز میں میری زندگی کا قیمتی اثاثہ ہے۔“ زری نے نیلے رنگ کی دبیز رووالی ویلوٹ کی مٹلی جائے نماز پہ بڑی عقیدت۔ اور محبت سے ہاتھ پھیرا۔
”کیسا اثاثہ؟“ نگارش کے کچھ پلے نہیں پڑ رہا تھا۔

”آج سے تین سال پہلے اسی جائے نماز پہ اس نے (دل آور شاہ) نماز پڑھی تھی، آپ کو یاد ہوگا عبداللہ بھائی کا ایک سیڈنٹ ہو گیا تھا کافی چوٹیں آئی تھیں اور اس دن وہ اور نیلے ہمارے گھر ہی گھر گئے تھے، آپ دوسرے بیڈ روم میں تھیں، جلدی سو گئی تھیں لیکن میں جاگ رہی تھی وہ عبداللہ بھائی اور نیلے کے ساتھ باتیں کر رہا تھا اس کی آواز مجھے سنائی دے رہی تھی تو میں کیسے سو سکتی تھی بھلا؟ اور جب ان کی باتوں کا سلسلہ ختم ہوا تو وہ اٹھ کر باہر نکل آیا، وہ نماز پڑھنا چاہتا تھا اور جائے نماز ڈھونڈ رہا تھا اس نے پہلی بار کوئی چیز مانگی تھی اور وہ بھی جائے نماز وہ وضو کر کے آیا تھا اور میں نے اسے اپنی جائے نماز دی تب اس نے اس جائے نماز پہ عشاء کی نماز پڑھی تھی، اللہ کو سجدہ کیا تھا، وہ اللہ کے حضور جھکا تھا اور میرا دل اس کے حضور جھک گیا تھا اس وقت ان لمحات میں مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ جائے نماز بچھا کے نہیں۔ بلکہ میرے دل کو بچھا کے میرے دل پہ قدم جما کے کھڑا اپنے رب کو سجدہ کر رہا ہے، دل میرا تھا۔ قدم اس کے تھے اور سجدہ اللہ کا تھا۔ کتنی خوش قسمتی کی بات ہے نا وہ میرے دل پہ کھڑا اللہ کو سجدہ کر رہا تھا اور تب سے اب تک اس کے قدم میرے دل پہ ہیں، میرا دل نیچے ہے اور اس کے قدم اوپر۔ وہ جب جب قدم اٹھا کے چلتا ہے میرا دل تب تب نیچے ہی نیچے دوتا چلا جاتا ہے اس جائے نماز میں اور میرے دل میں بس اتنا ہی فرق ہے کہ اس کا رنگ نیلا ہے اور میرے دل کا رنگ سرخ۔“ زری انتہائی مدنم و دھیمی اور سحرانگیز آواز میں بولتی ہوئی نگارش کو ششدر سا کر چکی تھی نگارش کے دل و دماغ سے دھواں نکل گیا تھا۔ یہ عشق اور جنوں کی کون سی منزل تھی جہاں پہ زری جا پہنچی تھی؟ اور اس منزل پہ پہنچنے کے بعد حاصل کیا تھا؟ ایک اور مسافت؟ یا ایک اور منزل۔؟ نگارش کا دل اس سوچ سے ہی دھل گیا تھا اسے جھرجھری سی آگئی تھی۔

”یا اللہ! اس بچی پہ اپنا رحم فرما۔“ اس نے دل ہی دل میں دعا کی۔

”آپ میرا اثاثہ پوچھتی ہیں، کیا یہ اثاثہ کم ہے کہ اس جائے نماز پہ اس کے سجدے کا لمس ہے اس کی پیشانی کا غور ہے اس میں۔ میرے ہزاروں سجدے اور اس کا ایک سجدہ ہے اس جائے نماز میں اس سے بڑھ کر میرا اثاثہ اور کیا ہو سکتا ہے بھلا؟ اور میں اسے ہی یہاں بھول جاتی؟ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟“ زری نے بڑی محبت بڑی چاہ اور بڑے جذب سے کہتے ہوئے اس جائے نماز کو اپنے ہاتھ میں پکڑے۔ بیک میں رکھ دیا۔

”یہ بیک ایر پورٹ پہ جا کر میں نے اپنے اپنی میں رکھنا ہے تاکہ محفوظ رہے۔“ وہ پہلے سے ارادہ باندھ رہی تھی اور نگارش کو یاد آ رہا تھا کہ زری نے یہ جائے نماز کبھی کسی کو نہیں دی تھی اس پہ صرف وہ خود نماز پڑھتی تھی۔ اور آئندہ بھی اس نے اسی میں نماز پڑھنا تھی اسی لیے تو وہ ساتھ لے کر جا رہی تھی۔

آدھے پون گھنٹے میں وہ لوگ ایر پورٹ پہنچے تھے، نگارش کے پیرئس اور بہن بھائی پہلے سے وہاں موجود تھے بس شیراز ان کے ساتھ تھا، نگارش چہلی بار پاکستان جا رہی تھی اس لیے وہ سب ہی سی آف کرنے آئے تھے، فلائٹ میں ٹائم کم رہ گیا تھا اس لیے عید اللہ اور شیراز کو کافی بھاگ دوڑ کرنا پڑی تھی سامان کلینر کروا کے خود بھی ان ہونا تھا اس لیے کافی جلدی مچی ہوئی تھی اور سب کچھ اوکے ہوتے ہی وہ سب مل کر ایر پورٹ کے اندرونی حصے کی سمت بڑھ گئے تھے، زری بار بار انگلیٹڈ کی فضاؤں میں دیکھ رہی تھی انگلیٹڈ اس کی محبت کی جائے پیدائش تھی، وہ

نہیں ہو پار ہی تھی اس کی زبان پہ ایک ہی فریاد تھی پانی اور صرف پانی! اور اس کی یہ حالت اور اس کی پیاس کا یہ عالم دیکھ کر گلاب خان کانپ کے رہ گیا۔ اس کا دل مٹھی میں آگیا، ذات کا پٹھان تھا، خالص پٹھان، اس لیے اس کے حمیر میں نرمی اور سختی کا تناسب برابر پایا جاتا تھا اور اس وقت اس کی ذات پہ نرمی اور خوف خدا کا سایہ تھا اس کے دل کی عجیب سی حالت تھی۔

”بی بی جی! بی بی جی! آنکھیں کھولیں بی بی جی! میں پانی لے کر آیا ہوں آپ کے لیے۔“ گلاب خان دوزانو اس کے قریب نیچے فرش پہ بیٹھ گیا اور نیم بے ہوش بڑی علیزے کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی قبر میں دبی ہوئی ہے اور کوئی اسے قبر سے باہر کھڑا آوازیں دے رہا ہے جس کی بہت مدھم سی آواز اس کی سماعتوں تک بمشکل پہنچ رہی تھی اس کا چہرہ فرش پہ تھا اس کے چہرے کی ایک سائید فرش سے جڑی ہوئی یوں جیسے اس کے چہرے کا ایک حصہ اور فرش کی سطح آپس میں پیوست ہو چکے ہوں اور فرش کی ساری ٹھنڈک اس کے چہرے میں منتقل ہو چکی تھی جس کی وجہ سے اس کے چہرے کی رنگت برف کی طرح سرد اور ہونٹ نیلے ہو رہے تھے اور وہی نیلے ہونٹ پیاس کی شدت سے لرز رہے تھے۔

”پانی! پانی! پانی! مجھے پانی!۔۔۔۔۔“ اس کے منہ سے نامحسوس سی آواز نکل رہی تھی جو بمشکل سنی جاسکتی تھی۔

”بی بی جی! میں پانی لے کر آیا ہوں نا آپ کے لیے۔ آپ اٹھیں پانی پی لیں۔“ گلاب خان نے دوبارہ کہا تھا لیکن اس میں کچھ کہنے سننے کی سکت ہوتی تو وہ جواب دیتی نا اور خود سے اٹھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کا جسم نقاہت سے بے جان ہو چکا تھا اور اتنی طاقت نہیں تھی کہ اس فرش سے کروٹ بدل کر سیدھی ہو جاتی۔

”گلاب خان! لگتا ہے کہ کبھی کبھی ہی عقل سے کام لیتے ہو؟ کیا تمہیں لگتا ہے کہ یہ خود اٹھ سکتی ہیں؟“ گلاب خان کے قریب ہی گل کی آواز سنائی دی تھی اور گلاب خان چونک گیا۔

”ہاں! میں یہاں۔“

”لیکن! تم یہاں کیوں آئی ہو۔ صاحب غصہ کریں گے۔“ اس نے گل کو خفگی سے گھورا تھا۔

”میں بس یہ دیکھنے آئی تھی کہ یہ بی بی جی زندہ ہیں یا مر گئیں؟“

”اللہ معافی دے! یہ کیا بول رہی ہو؟ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟“ گلاب خان نے جھرجھری سی لی۔

”کچھ نہیں ہوا مجھے لاؤ میں انہیں اٹھاتی ہوں۔“ گل سر جھٹک کر آگے بڑھی اور پھر نیچے بیٹھ کر علیزے کو مضبوطی سے سہارا دے کر سیدھا کیا تھا اور ایک ہی پوزیشن میں اتنے گھٹنے پڑے رہنے کے بعد جسم کو حرکت ملی تو وہ تکلیف سے کراہ اٹھی تھی اس کو سیدھا کر کے دیکھا تو اس کے چہرے کا زاویہ ٹیڑھا ہوا لگ رہا تھا۔ گل نے اپنے دوپٹے سے اس کی پیشانی رخسار اور ہونٹ صاف کیے تھے جن پہ فرش کی گرد جم گئی تھی۔

”ہپ! پانی!۔۔۔“ اس کی ہونٹوں کی جنبش پہ گل نے گلاب خان کو دیکھا تھا۔

”گلاب خان! ان کی حالت تو بہت خراب ہے؟“ گل نے کافی تشویش سے کہا تھا۔

”جو کچھ بھی کرنا ہے یہیں کرنا ہے، ڈاکٹر کی امید مت رکھو، اتنی اجازت نہیں ہے ان کے لیے۔“ گلاب خان اپنی بیوی کی بات کا مطلب سمجھ چکا تھا۔

”یہاں پہ کیا ہو سکتا ہے بھلا؟“ گل مایوس ہوئی تھی۔

”کوشش کریں تو سب ہو سکتا ہے، تم فوراً جاؤ اور ان کے لیے چائے بنا کر لاؤ، چائے کی گرمائش سے یہ قدرے ہوش میں آجائیں گی لیکن ٹھہرو۔ پہلے انہیں یہ پانی پلا دو۔“ گلاب خان نے جگ سے پانی انڈیل کر گلاس

گل کو تھما دیا تھا۔

”بی بی جی! ذرا آسرا لیں اور یہ پانی پی لیں۔“ اس نے علیزے کو ذرا سا سہارا دے کر اونچا کیا اور گلاس اس کے منہ سے لگا دیا تھا، علیزے کو یہ بھی نہیں پتا تھا کہ پانی کا گلاس اس کے منہ سے لگا ہوا ہے۔ گل نے خود ہی اس کے منہ میں پانی ڈالا تھا اور چند گھونٹ اسے پانی پلانے کے بعد اس کا چہرہ اور اس کے بازو سہلانے لگی تھی اس کے جسم کو تھوڑا تھوڑا کر گرمائش میں لانے کی کوشش کی تھی۔

”گلاب خان! ان کے لیے بستر کا ہونا بھی بہت ضروری ہے، یوں ٹھنڈے فرش پہ تو ٹھنڈے ہی مرجائیں گی۔“

گل کو ہر چیز کا خیال آ رہا تھا۔ ”میں بھی کچھ یہی سوچ رہا تھا۔“

”سوچو مت! آکرو جاؤ لے کر آؤ۔“ گل کافی اتاؤلی ہو رہی تھی۔

”لیکن گل وہ صاحب؟“

”ارے! صاحب کچھ نہیں کہیں گے اگر کہا بھی تو تم میرا بتاؤ، مجھ پہ غصہ نہیں کریں گے وہ۔“ گل نے اسے سمجھایا اور گلاب خان پریشانی سے سر ہلاتے ہوئے اٹھ کر چلا گیا۔ پھر اس نے نیچے بچھانے کے لیے فوم کا گدا اور سنگل کمبل لا کر کر دیا تھا اور گل نے بڑی دقت سے علیزے کو فرش سے گھسیٹ کے گدے پر لٹایا تھا اور اوپر کمبل اوڑھ دیا تھا۔

”تم یہاں بیٹھو میں ان کے لیے دودھ گرم کر کے لاتی ہوں، بعد میں چائے کے ساتھ انڈے بوا کر کے لے آؤں گی تب تک یہ ہوش میں آجائیں گی۔“ گل کہتی ہوئی گلاب خان کو وہاں بٹھا کر چلی گئی تھی اور گلاب خان اس لڑکی کی بد قسمتی پہ سوچ رہا تھا وہ کتنے بڑے گھر کی بیٹی تھی، کتنی امیر تھی، کتنی لاڈلی تھی لیکن پھر بھی بد قسمت تھی، اپنے باپ کا بویا کاٹ رہی تھی، اتنی آسانٹوں میں زندگی گزارتے ہوئے اسے کیا پتا تھا اسے آگے جا کر اپنے باپ کے کیے کا بھگتنا بھی بھگتنا ہے؟ اسے کیا خبر تھی کہ جو آسانٹیں اور مراعات اسے اس کے باپ نے دے رکھی ہیں وہ اس کے باپ کی وجہ سے ہی چھن جائیں گی؟ وہ مخملی بیڈ سے زمین کی سخت سطح پر آجائے گی اس کا نرم و نازک وجود زمین کی سختی سہہ نہیں پائے گا بلکہ اس کے لیے عذاب بن جائے گا۔ اور اس پہ یہ عذاب دیکھ کر گلاب خان کو بہت دکھ اور افسوس ہو رہا تھا۔

”گلاب خان! گل کی آواز پہ وہ بری طرح چونکا تھا۔ وہ چھوٹی سی ٹرے لیے کھڑی تھی۔

”کیا سوچ رہے ہو؟ بی بی جی کو دیکھو۔ وہ ہوش میں آرہی ہیں شاید۔“ اس نے گلاب خان کو متوجہ کیا۔

”ہاں! ہاں! تم ان کو یہ دودھ پلاؤ، ٹھیک ہو جائیں گی یہ۔“ اس نے فوراً کہا تھا اور گل دوبارہ علیزے کے پاس بیٹھ گئی۔ پھر اس نے چیمبر کے ساتھ آہستہ آہستہ اس کے منہ میں دودھ ڈالنا شروع کیا تھا دودھ نیم گرم تھا جس کی تراوٹ سے علیزے کے سن ہوئے حواس واپس آنے لگے تھے اور لگا تار دو گھنٹے کی دیکھ بھال کے بعد وہ مکمل ہوش میں آچکی تھی۔ اب اسے خوراک کی ضرورت تھی کیونکہ معدہ خالی تھا۔

”آج زلفی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے میں نے اس کے لیے دال چاول بنائے تھے آپ کو اگر بھوک لگی ہے تو آپ کے لیے لے آؤں؟“ گل نے اسے تکیے کے سہارے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھاتے ہوئے استفسار کیا تھا اور کھانے کے لیے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے علیزے کے حلق میں آنسوؤں کا گولا سا ٹک گیا دو تین دن پہلے اس نے دل اور شاہ کی طرف سے بھیجا ہوا کھانا ٹھکرا دیا تھا اور کھانا سے منہ موڑ کر کبھی نہ کھانا کھانے کا عزم کیا تھا لیکن آج وہ اس نوبت اس حال کو پہنچ چکی تھی کہ کھانے کے سوا اور کسی چیز کی طلب یا ضرورت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

آج وہ کھانے کے لیے ترس رہی تھی، وہ جو بھی لے آتے وہ کھانے کے لیے تیار تھی، کیونکہ پیٹ کا دوزخ اگر

سرے تک چلا گیا۔

”صاحب! بل ڈوگ یہ جب آپ توجہ دیتے ہیں تو اس کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہیں رہتا۔“ زلفی مسکرا کر کہتا ہوا قریب آگیا اتنے دنوں سے زلفی ہی بل ڈوگ کی دیکھ بھال کر رہا تھا لیکن اتنے دنوں میں اس نے ایک بار بھی بل ڈوگ کو اتنا خوش نہیں دیکھا تھا جتنا اس وقت دیکھ رہا تھا۔

”اے مجھ سے پیار ہی بہت ہے اسی لیے تو اسے انگلیٹڈ سے اپنے ساتھ ہی لے آیا تھا۔“ دل اور مسکرایا تھا۔
”حالانکہ آپ کو انگلیٹڈ سے اسے لانے کی بجائے ایک میم لانی چاہیے تھی۔“ زلفی کی بات پہ دل اور قہقہہ لگا کے ہنسا تھا۔

”میم اس لیے لے کر نہیں آیا کہ شاید میم اتنی وفادار نہ ہوتی جتنا یہ وفادار ہے۔ وہ دوبارہ واپس جانے کی ضد کرتی، شور کرتی، ہنگامہ کرتی جبکہ اس نے ہمیشہ میرے ساتھ رہنے کی ضد کرنی ہے اس ملک کا ہر سردو گرم اس نے میرے ساتھ ہی سہنا ہے اور میری ذرا سی توجہ پہ یوں خوشی کا اظہار کرتا ہے کہ جیسے پہلے کبھی خوش ہی نہ ہوا ہو۔“ دل اور کی ویل پہ زلفی خوب متاثر ہوا تھا۔

”صاحب! آپ کی تو کیا ہی بات ہے۔ اسی لیے تو کبھی کبھی بڑا دل چاہتا ہے کہ کاش میں ”دل آر شاہ ہوتا؟“ زلفی کی خواہش سن کر اس کا فلک شکاف قہقہہ گونجا تھا جس پہ قریب آتا گلاب خان کافی حیران ہوا تھا۔
”یعنی تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ کاش میں ”زلف خان“ ہوتا؟“ دل اور نے ہنستے ہوئے دلچسپی سے زلفی سے کہا تھا۔

”صاحب! میں نے یہ تو نہیں کہا؟“ وہ کھسیانا ہوا تھا۔
”تو پھر اور کیا کہا ہے مار؟ اگر تم دل اور شاہ ہوتے تو ظاہر سی بات ہے کہ پھر میں زلف خان ہوتا۔ زلف خان نہ ہوتا تو گلاب خان ہوتا۔ لیکن جو بھی ہوتا یا ر لیکن دل اور شاہ نہ ہوتا۔ دل اور شاہ ہونے میں بڑی اذیت ہے۔ تم نہیں جانتے۔“ کہتے کہتے دل اور کالجہ بجھ گیا اس کی زبان پہ تلخی آگئی تھی لیکن اس سے پہلے کہ یہ تلخی بڑھتی اس کے سیل فون پہ واٹس ایپشن ہونے لگی۔

”گلاب خان! بل ڈوگ کے لیے دودھ لے کر آؤ اس کا بریک فاسٹ دوا سے۔“ دل اور نے اسے ہدایت دیتے ہوئے کال ریسیو کر لی تھی زلفی بھی وہاں سے چپ چاپ پلٹ گیا۔

”السلام علیکم۔“
”وعلیکم السلام! گڈ مارنگ۔“ دوسری طرف کی آواز نیل کی تھی۔
”صبح بخیر۔“ دل اور کا انداز سنجیدہ تھا۔

”کیا ہو رہا ہے؟“ نیل نے کافی فریش لہجے میں پوچھا۔
”کیوں؟ کیا ہونا چاہیے؟“ دل اور نے الٹا اس سے سوال کر ڈالا تھا۔
”بے چینی۔“ نیل کی آواز بھی کچھ مضطرب اور بے چین ہی لگ رہی تھی۔
”بے چینی؟ مطلب؟“ دل اور سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

”یار! کیا تمہیں نہیں پتا کہ آج عبد اللہ آ رہا ہے؟“ نیل خفگی سے جھنجھلایا تھا اور دل اور کو ہر چیز سمجھ میں آگئی تھی۔

”اوہ اچھا! عبد اللہ۔“ اس نے لفظ کو کافی لمبا کھینچا تھا۔
”ہاں یار عبد اللہ! کیا تمہیں نہیں یاد تھا؟“ نیل کو حیرت ہوئی تھی۔
”یاد تھا! لیکن بے چینی نہیں تھی۔“ دل اور سکون سے بولا۔

بھرا نہ جائے تو بڑے بڑے ہڈیوں کو شکست خورہ، ندھال، کمزور اور بے جان کر ڈالتا ہے اور وہ تو تھی ہی نازک اندام سی موم کی گڑیا جس نے کبھی ایک منٹ بھی بھوک برداشت نہیں کی تھی جس کے ایک اشارے پہ رجو کھانے کے تمام لوازمات اور تمام ڈالنے پیل پہ سجادیتی تھی ایک وقت کے کھانے میں کئی ڈشز تیار ہوتی تھیں اور وہ محض برائے نام کھانا کھاتی تھی لیکن آج اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ خوب پیٹ بھر کے کھانا کھائے اور اس کے بے جان جسم میں پھر سے طاقت اور توانائی آجائے کیونکہ وہ پیٹ کے دونخ کا یہ عذاب سہار نہیں پارہی تھی ایک ایسا عذاب جو لوگوں سے قتل کروالیتا تھا چوری اور ڈاکے پہ مجبور کر ڈالتا تھا صرف اس لیے کہ پیٹ کا یہ دونخ خالی نہ رہے نہ انسان کا اپنا نہ انسان کے اپنوں کا۔ پیٹ کی آگ ایسی آگ تھی کہ انسان ہر آگ میں کودنے کے لیے تیار ہو جاتا تھا کیونکہ بھوک اللہ نے ایک ایسی چیز بنائی ہے جس کے سامنے طاقت ور اور کمزور انسان یکساں ندھال ہو جاتے تھے جس کو سہنا کسی بھی ذی روح کے بس میں نہیں تھا اس میں اتنی طاقت تھی کہ انسان کی اتنا غیرت، عزت، غرور اور آن سب کچھ دھیر ہو سکتا تھا یہاں تک کہ انسان خود بھی!

”لے جی بی جی۔! کھانا کھا لیجئے۔“ گل نے کھانے کی ٹرے لا کر اس کے سامنے نیچے فرش پہ ہی رکھ دی تھی اور علیزے نے چونک کر زمین پہ رکھی ٹرے اور ٹرے میں رکھے وال چاول کی پلیٹ دیکھی تھی اور علیزے کے حلق میں آنسوؤں کا پھندا سا پڑ گیا۔ گل نے پلیٹ اٹھا کر اس کے ہاتھ میں پکڑا دی تھی اور علیزے نے اپنی کم مائیگی کے باوجود بڑے بے صبر سے انداز میں چاول کھانا شروع کر دیے تھے لیکن اس کے ہاتھ لرز رہے تھے اس سے چچہ نہیں پکڑا جا رہا تھا ہاتھ میں پکڑی پلیٹ بھی لرز رہی تھی بلکہ یہاں تک اس کے حلق نوالہ بھی نیچے نہیں اتر رہا تھا گمروہ پھر بھی پلیٹ تھوڑی دیر کے لیے رکھ دینے پر آمادہ نہیں تھی یوں جیسے اس سے یہ کھانا بھی چھن جائے گا اور پھر تین چار نوالے کھانے کے بعد جب اس کی ہمت جواب دے گئی تو اس نے تھک کے پلیٹ واپس نیچے فرش پر رکھ دی اور لرزتے کانٹے وجود کے ساتھ وہ بے ساختہ اپنے حال اپنی کیفیت پہ رو پڑی اور کھانا چھوڑ کر اپنے چہرے پہ ہاتھ رکھے وہ یوں بلک بلک کر روئی تھی کہ گل اور گلاب خان کے دل بھی کانپ گئے۔ گل کافی دیر اسے تسلی اور دلا سے دیتی رہی لیکن علیزے کی ہچکیاں رکنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اسے کئی خیال رلا رہے تھے جن میں یہ خیال سرفہرست تھا کہ وہ وقار آفتدی کی بیٹی ہو کر کھانا کھانے کے لیے ترس رہی ہے؟ اس کے پیپا کو بتا چلے گا تو وہ مرجائیں گے۔ ان کی علیزے بھوکی تھی۔ ان کے لیے یہ احساس مرجانے کے برابر تھا! علیزے نہ جانے کتنی دیر تک پونہ روئی رہی اور پھر بہت بعد میں گل اور گلاب خان اسے تسلی دے کر چلے گئے تھے البتہ جاتے جاتے کھانا اور پانی وغیرہ پاس رکھ گئے تھے جس کو دیکھ کر علیزے کی آنکھیں پھر سے پانیوں سے بھر گئی تھیں۔ اتنی آسائشوں کے بعد غریبی کا یہ وقت کاٹنا بے انتہا مشکل تھا۔ اس کا رونا بلکنا بجا تھا۔

وہ فجر کی نماز پڑھ کے واپس گھر آیا تو بل ڈوگ نے اسے دیکھ کر بھونکنا شروع کر دیا تھا۔
اس نے ٹھٹک کر دیکھا تھا بل ڈوگ اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے بے چین ہو رہا تھا اتنے دن ہو گئے تھے اس نے بل ڈوگ پہ کوئی توجہ نہیں دی تھی اور یہی سوچ کر وہ اس کی جانب آگیا اور بل ڈوگ اسے دیکھ کر بڑے لاڈ سے دم ہلانے لگا تھا۔ اس کے اوہرا دھر ٹھٹکنے کی چال بھی بدل گئی تھی۔

”کسے ہو شیرو؟“ اس نے بل ڈوگ کے قریب آکر اسے سہلایا تھا اور اس کی کھسائی ہوئی سی غرغراہٹ سنائی دینے لگی گویا وہ اس موٹے سنگل سے آزاد ہونا چاہتا تھا کہ دل اور نے آگے بڑھ کر دیوار میں نصب کھونٹے سے اس کی سنگل کھول دیا تھا۔ اور بل ڈوگ خوشی کے اظہار کے طور پہ لان کے ایک سرے سے بھاگتا ہوا دوسرے

تھی جو جہاں تھا وہ وہیں رہ گیا تھا جہازوں کی پروازیں جہاں تھیں وہیں ساکت ہو گئی تھیں، ایئر پورٹ پہ آنے جانے والے ہزاروں مسافر اپنی اپنی جگہ پر منجمد ہو چکے تھے، ایئر ہو سٹس، پائلٹ اور دیگر عملہ جامد ہو گئے تھے تمام ذی نفس اپنی سانسیں روک چکے تھے کیونکہ زری کا عشق ان سب کو اس وقت ایسے حال میں ہی تصور کر رہا تھا۔ گویا وہ وہاں اکیلی تھی اور اس کے سامنے وہ بھی اکیلا کھڑا تھا باقی ساری دنیا پتھر کی ہو گئی تھی۔ انسانوں سے مجسموں میں تبدیل ہو گئی تھی اور مجسموں کے سامنے وہ کچھ بھی کر سکتی تھی دنیا سے بے نیاز ہو کر اسے دیکھتے ہوئے سیراب بھی ہو سکتی تھی حالانکہ وہ یہ بھول گئی تھی کہ پوری کائنات حالت حرکت میں ہے سوائے اس کے۔

وہ دوسروں کو پتھر کے مجسمے تصور کر رہی تھی حالانکہ خود اس وقت پتھر ہوتی کھڑی تھی۔ اس کا عشق دل اور شاہ کو اپنی آنکھوں سے چوم رہا تھا اس کی آنکھوں نے اس کے اک اک نقش پہ بوسہ دیا تھا اس کے پاؤں پہ اس کے ہاتھوں پہ اس کے ماتھے پہ اس کے چہرے پہ اس کے بالوں پہ اک اک نقش کو چوم کر دل میں اتار لیا تھا اور دل کی دھڑکنیں جہاں تیز ہوئی تھیں وہیں انہیں اک قرار آ گیا تھا رگ و پے میں طمانیت اتر گئی تھی۔ وہ اس کے سامنے تھا اس کی نظروں میں تھا، آنکھوں میں بسا ہوا تھا، دل میں دھڑک رہا تھا، ایسے عالم میں زری کو اور کیا چاہیے تھا؟

اس کی محبت اس کا عشق اس کی چاہ بس ایک ہی تھی۔ دل اور شاہ۔ اور یہ دل اور شاہ! السلام علیکم! وہ عین اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ زری جو پتھر بنی کھڑی تھی اس کی آواز پہ اس کے گھبیر لہجے پہ اس کے انداز پہ یکدم چپ کے پتھر پہلے حواسوں سے ہوش میں آئی تھی اور اسے دیکھنے کے بعد اس کے دل کی حالت نازک تھی کیونکہ دل اور شاہ اس کے سامنے اس کے قریب کھڑا ہے ہی دیکھ رہا تھا!!!

(باقی آئندہ ماہ ملاحظہ کریں)

☆☆

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

خوبصورت مرد

خوبصورت چھپائی

شائع ہو گئے ہیں

مضبوط جلد

آفٹ پیپر

☆ ستاروں کا آنگن، نسیم سحر قریشی	قیمت: 450 روپے
☆ درد کی منزل، رضیہ جمیل	قیمت: 500 روپے
☆ اے وقت گواہی دے، راحت جبین	قیمت: 400 روپے
☆ تیرے نام کی شہرت، شازیہ چودھری	قیمت: 250 روپے
☆ امر نیل، عمیرہ احمد	قیمت: 550 روپے

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

”کیوں نہیں تھی؟“
”کیونکہ تمہیں جو ہے۔“ دل اور کے جواب پہ نیل ٹھٹک گیا۔
”کیا تمہارا دوست نہیں ہے؟“
”صرف دوست ہے نا۔“ اس کا ہر جواب الٹا تھا۔
”تو میرا اور کیا ہے؟“

”یہ تو تمہیں پتا ہونا چاہیے جسے بے چینی ہو رہی ہے۔“
”اف! میں نے غلط کیا صبح صبح تمہیں فون کر کے۔“ نیل زچ ہو گیا۔
”تو تمہیں کس نے کہا تھا کہ تم اتنی صبح صبح فون کر کے مجھ سے میری بے چینی پوچھو؟ ویسے اگر میں نے تمہیں اپنی بے چینی بتادی تو تمہاری ساری بے چینی ختم ہو جائے گی۔“ دل اور کا لہجہ مبہم تھا نیل کے کچھ پلے نہیں پڑا تھا۔
”اچھا خیر! یہ بتاؤ کہ ان کو ریسیو کرنے کے لیے گھر سے کب نکلتا ہے؟“ نیل نے اگلا سوال کیا۔

”نوبجے۔“
”ارے کیوں؟ نوبجے کیوں؟ آٹھ بجے نکلتے ہیں، نوبجے لیٹ ہو جائیں گے۔“ نیل کو جلدی اور بے چینی ایک ساتھ لاحق ہوئی تھیں۔

”کیوں ایئر پورٹ پر جا کر میں نے پروازوں کی گنتی کرنی ہے جو آٹھ بجے ہی پہنچ جاؤں؟ ہاں اگر تمہیں اتنی جلدی اور اتنی بے چینی ہے تو ٹم جاسکتے ہو، میں بعد میں آ جاؤں گا۔“ دل اور کے جواب پہ نیل بے چارہ ٹھنڈا پڑ گیا لیکن اندر ہی اندر اس نے تکیلا بھی رہا تھا مگر افسوس کہ کچھ نہیں سکتا تھا۔

”اوکے! نوبجے ہی چلیں گے۔“ اس نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔
”گڈ! جلدی عقل آگئی تمہیں۔“ دل اور مسکرا کے بولا تھا۔
”دل اور! تو بڑا ذلیل ہے! اللہ کرے کہ تیرا حال بھی کبھی میرے جیسا ہو۔“
”کیوں؟ تمہارے حال کو کیا ہوا ہے؟ کوئی خاص وجہ؟“ اس کے انجان بن کے کہے جانے والے سوال پہ نیل گڑبڑا گیا۔

”من نہیں! کچھ نہیں ہوا بس ایسے ہی۔“ نیل ٹال گیا تھا۔
”ٹھیک ہے پھر! اللہ حافظ۔“ دل اور نے بات سمیٹی تھی۔
”اوکے! لڈ بائے۔“ نیل نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا لیکن اندر رہا ہداری کی سمت بڑھتے ہوئے دل اور نیل ہی سوچ رہا تھا کیونکہ نیل اس کو سوچ رہا تھا جو دل اور کو سوچ رہی تھی۔

☆☆☆

یہ عالم شوق کا دیکھنا نہ جائے
وہ بت ہے پا خدا دیکھنا نہ جائے
یہ آج کن نظروں سے تو نے دیکھا
کہ تیرا دیکھنا دیکھنا نہ جائے۔

زری کی نگاہیں تھیں اور دل اور شاہ مجسم تھا۔ یہ حقیقت تھی یا افسانہ تھا؟ وہ عالم تھے جو زری کی نگاہوں میں ایک ہو کر پھرنے لگے تھے، پوری کائنات پر اسم محبت پھونک دیا گیا تھا۔ پوری کائنات اس اسم کے طلسم میں جکڑی



کبھی بار بار نہیں سیکھا اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔

۲۳
تیسویں قسط



بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدیہ اور نیل حیات دہی بہن بھائی ہیں مدیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے وہ انگلینڈ کی رنگینوں میں مکمل حوریہ رنگ بیکلی ہے جس کے پیش نظر فائزہ بیگم نیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں لیکن مدیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے جس پہ نیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پھنپ رہا ہے۔

عریل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا بے بسی اور مجبوری سے تنگ آخر خود کشی کرنے کا سوچتا ہے لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باوا قیاض مل جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے جس پر عریل کافی خوش ہوتا ہے اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔ منصور حسین ایک غریب اور میسرک پاس آؤی ہے وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آذر شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے وہ اپنے قول و فعل کا بہت ریکا آؤی ہے اس نے



اس کی نظریں زری کے چہرے پر تھیں اور زری پر نزع کا عالم تھا۔

اس کی قوت گویائی سلب کرنے کے لیے یہ احساس ہی کافی تھا کہ وہ اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کا رواں دواں دل اور شاہ کی نظروں کی خوشبو سے منک اٹھا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے کھڑے کھڑے اس کا پورا بدن خوشبودار ہو گیا ہو۔ وہ صندل کی طرح مہکنے لگی تھی۔

لیکن خود اس میں اتنی جرات نہیں تھی کہ ایک سیکنڈ سے بھی زیادہ اس کے چہرے کی سمت دیکھ پاتی۔ دل اور شاہ کی آنکھوں کا سامنا کرنا بہت مشکل تھا۔ اس کی دیوار جاں کی طرح اس کی پلکیں بھی لرز رہی تھیں۔ وہ موم جیسا سر تپا موم اور دل اور شاہ کی نظروں کی گرمی سے اس کے سامنے کھڑی پھل رہی تھی۔ یوں ہی قطرہ قطرہ پکھلتے ہوئے شاید اس کی پوری ذات پکھل جاتی۔ اگر درمیان میں نبیل حیات نہ آ جاتا۔

”السلام علیکم۔ ایسی ہیں آپ؟“ نبیل نے قریب آتے ہی سلام کیا تھا۔ جس پر زری کے ساتھ دل اور شاہ بھی چونک گیا تھا اور اپنے اس طرح چونکنے پر خود دل اور کو بھی حیرت ہوئی تھی۔ کیا وہ زری کو اتنی محبت سے دیکھ رہا تھا کہ پل بھر کے لیے سب کچھ فراموش کر بیٹھا تھا؟ یہاں تک کہ عبد اللہ اور نبیل کو بھی؟ افسوس یہ کیا کر بیٹھا تھا۔

اس نے اپنے آپ کو سرزنش کی تھی اور سر کو بری طرح جھٹکا تھا۔ اس کی ذات پر وہ بپاؤں اک بے اختیاری کا لمحہ آیا تھا۔ سوہیت گیا تھا۔ اب پھر وہ مشتاق تھی اور وہ بے زار۔ اسے تعلق سے لا تعلق ہوتے ہوئے محض چند سیکنڈ لگے تھے۔ زری نے اسے نظریں اور قدم پیچھے ہٹاتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ پاس آ کے اسے خوشبوؤں میں بسا کے بنا کچھ کے واپس مڑ گیا تھا اور اس کا یوں واپس مڑنا زری کی تڑپ اور پیاس کو اور بھی بڑھا گیا تھا۔ وہ بھلا کب سیراب ہو پائی تھی؟ دل اور شاہ صدیوں بھی اس کے سامنے کھڑا رہتا تو اس کی پیاس نہیں بجھ سکتی تھی۔ وہ عشق کا صحرا تھی۔ اتنی جلدی سیراب نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کی تشنگی مٹانا آسان نہیں تھا۔ وہ اس پر ساون کی طرح حوث کر سکتا تو کوئی بات بھی تھی۔

اور ادھر نبیل حیات تھا۔ دل کے کشکول میں محبوب کی نظر عنایت کے چند سکے اور فقیر راضی۔ زری اگر کبھی یہ نہیں دیکھ پائی تھی کہ نبیل حیات اسے دیکھتا ہے تو نبیل حیات بھی کبھی یہ نہیں دیکھ پاتا تھا کہ وہ کسے دیکھتی ہے۔ دیکھ لیتا تو شاید کشکول اس کے قدموں میں ہی تو ڈرتا۔

”لگتا ہے آپ ذہنی طور پر ابھی تک انگلینڈ میں ہی ہیں؟“ نبیل نے اس کی طرف سے جواب نہ پا کر دلچسپی سے کہا تھا اور زری نے ایک بار پھر چونک کر دیکھا تھا۔

”کیا مطلب؟ میں سمجھی نہیں؟“ اس کے انداز میں نا سمجھی سی تھی۔

”مطلب کہ نہ سلام کا جواب نہ خیریت کی تسلی یہاں ہو کر بھی یہاں نہیں لگ رہیں آپ؟“ نبیل نے مسکراتے ہوئے اس کے چہرے کی سمت دیکھا۔ سادگی میں بھی بلا کا وقار تھا۔ نبیل کا دل چاہا وقت گھر جائے اور وہ یوں ہی کھڑا سب سے بے نیاز ہو کر اسے دیکھتا رہے۔

”تو پھر کہاں لگ رہی ہوں آپ کو؟“ زری نے بھی جواب دلچسپی سے پوچھا تھا۔

”میرے دل میں۔“ نبیل کا دل چاہا کہ دے۔ لیکن وقت اور جگہ مناسب نہیں تھے۔

”زری۔! مدحیہ نگارش اور عبد اللہ سے مل کر لپک کے اس کے پاس آئی اور اس سے پٹ مٹی تھی۔

”مدحیہ تم؟“ زری اس کے اتنے شوخ اور فریض انداز پر حیران رہ گئی تھی۔

”ہاں میں۔ کیوں کیا تمہیں یقین نہیں آ رہا؟“ مدحیہ شرارت سے مسکرائی تھی۔

”ارے! یقین کیسے آئے؟ کہاں تو تم پاکستان آئے؟ خوش ہی نہیں تھیں اور کہاں پاکستان آخر اتنی خوش ہو کہ

مسکراہٹ ہی نہیں رک رہی۔“ زری نے اپنی حیرت کا برملا اظہار کیا تھا جس پر مدحیہ اور بھی ہنسی تھی۔

”ڈونٹ دہری۔ تم آگئی ہو تو یقین بھی آجائے گا۔“ مدحیہ نے مزید شرارت سے اس کا ہاتھ تھپکا تھا اور اس کی اس شرارت پر نبیل بھی بے ساختہ ہنسا تھا۔

”کیا آپ لوگوں نے ہمیں کھڑے رہنا ہے؟“ نگارش دل اور کے پاس سے ہٹ کے ان لوگوں کے پاس آگئی تھی اور دل اور عبد اللہ کے ساتھ اس کے سامان کی طرف بڑھ گیا۔

”ارادہ تو یہی ہے۔“ نبیل نے نگارش کی بات پر کافی دلچسپی سے جواب دیا تھا۔

”لیکن آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ آپ کے گھر کا لان نہیں ہے جہاں آپ کا مزید کھڑے رہنے کا ارادہ ہے۔ یہ پبلک پلس ہے۔ یہاں کھڑے رہنا کافی معیوب لگتا ہے۔“ نگارش کے ٹوکنے پر نبیل نے حیرت اور خفگی سے دیکھا تھا۔

”وہ اچھا۔ تو آپ نے بھی بھابیوں والے طور طریقے سیکھ لیے ہیں؟“ نبیل کے انداز پر نگارش بے ساختہ ہنسی تھی۔

”ظاہر ہے بھی! بھابی ہوں تو بھابیوں والے طور طریقے بھی تو سیکھوں گی نا؟ یوں بیچ راستے میں کھڑے ہونا بھی کوئی اچھی بات ہے بھلا؟ جس پر آپ لوگوں کو شاباش دوں؟“ نگارش کے لہجے میں مصنوعی خفگی تھی۔

”اف تو بس۔ آپ تو واقعی بھابی بن گئی ہیں۔“ نبیل نے توبہ توبہ کرتے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگائے تھے اور نگارش کے ساتھ ساتھ زری اور مدحیہ بھی ہنس پڑی تھیں۔

”نبیل! عبد اللہ کی آواز پر نبیل نے فوراً پلٹ کر دیکھا تھا۔

”چلیں اب۔“ سامان کیلٹر ہو کے باہر آچکا تھا۔ اس لیے اب وہ یہاں سے جانے کے لیے تیار تھا۔

”چلیں اب بھی۔ آپ کے سر تاج آپ کے ملک صاحب بلا رہے ہیں۔“ نبیل نے نگارش وغیرہ کو چلنے کا اشارہ دیا۔

”ان کے بلانے تو میں کہیں بھی جاسکتی ہوں۔“ نگارش بھی اس وقت کافی شرارتی اور فریض موڈ میں تھی۔

”اوہ۔ بہت خوب۔“ نبیل نے بھی جواباً چھیڑا اور یوں ہی ایک دوسرے کے ساتھ چھیڑ چھاڑ اور ہنسی مذاق کرتے ہوئے وہ لوگ ایر پورٹ کے مرکزی حصے سے پارکنگ ایریا کی سمت بڑھے تھے۔

”کہاں جانے کا ارادہ ہے؟“ دل اور نے عبد اللہ کے ساتھ چلتے ہوئے کافی سنجیدگی سے پوچھا تھا۔ سامان کافی زیادہ تھا۔ تین ٹرالیاں سامان سے لدی ہوئی تھیں اور وہ تینوں سامان کی یہ ٹرالیاں دھکیلتے ہوئے تقریباً ایک ساتھ ہی چل رہے تھے۔ اس لیے دل اور کے پوچھنے پر نبیل کو اچنبھا ہوا تھا۔

”کیا مطلب؟ کہاں جانا ہے اس نے؟“

”اپنے گھر یا اپنی حویلی؟“ دل اور نے اپنا سوال واضح کیا تھا۔

”وہ اچھا۔ تو یہ پوچھ رہے ہو تم؟“ نبیل نے سمجھنے والے انداز میں سر ہلایا۔

”کیا بات ہے؟ تم چپ کیوں ہو؟“ عبد اللہ کو چپ دیکھ کر دل اور کو الجھن ہوئی تھی۔

”میں فیصلہ نہیں کر پا رہا کہ میں کیا کروں؟ اپنے گھر جاؤں یا حویلی۔“ عبد اللہ بھی اس معاملے پر آکر کافی الجھا ہوا تھا۔

”فیصلہ اتنا مشکل تو نہیں ہے۔“ دل اور نے نارمل سے لہجے میں کہا تھا۔

”یہ تم کہہ سکتے ہو مگر میں نہیں۔ یہ فیصلہ میرے لیے مشکل نہیں ہے۔ مگر زری کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ فیصلہ ایک رسک ثابت ہو گا۔ زری کو لے کر سیدھا اپنے گھر جاؤں تو تب بھی بابا جان کو غصہ آئے گا کہ میں

پسے حویلی میں کیا؟ اور اگر یہاں سے سیدھا حویلی جاؤں تو تب بھی ان کا غصہ کہ میں نگارش کو حویلی لے کر
گیوں آیا ہوں؟ اس لیے کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ میں کیا کروں؟" عبد اللہ واقعہ پریشانی اور کشمکش کا شکار تھا اور نبیل
کو سن کر حیرت ہوئی تھی کہ زری کا کیا معاملہ ہے۔ آخر ایسا کون سا مسئلہ ہے جس کی اسے خبر ہی نہیں؟
"میں کچھ کہہ سکتا ہوں اس معاملے میں؟" دل اور کی سنجیدگی بتا رہی تھی کہ معاملہ سنگین تھا۔ نبیل کو بے
چینی ہونے لگی تھی۔

"ہوں۔ کوئی بات نہیں تم سے ہی تو پوچھ رہا ہوں کہ کیا کروں؟" عبد اللہ نے فوراً اثبات میں جواب دیا تھا۔
"میرا مشورہ ہے کہ تم پہلے حویلی جاؤ وہاں سب سے اچھے طریقے سے ملو، صلح جو انداز اپناؤ۔ تمہاری بی بی جان
نے اتنے سالوں سے تمہیں نہیں دیکھا۔ وہ تم سے ملیں گی، تمہیں دیکھیں گی، تمہارے ساتھ ساتھ بھابھی کو
دیکھیں گی اور ہو سکتا ہے کہ اس دیکھنے اور ملنے ملانے کے چکر میں ان کا دل کچھ نرم ہو جائے اور معاملہ سلجھ جائے
اور جب تمہارا اپنا معاملہ سلجھ گیا تو تم بعد میں دوسرا معاملہ بھی سلجھا سکتے ہو۔" دل اور شاہ کا مشورہ وہ کبھی نظر
انداز نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن عبد اللہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کا خاندان اور اس کی فیملی کیسی ہے؟ اس فیملی میں
زری نام کو نہیں تھی۔ بس جو تھی وہ عبد اللہ اور زری میں تھی۔ اسی لیے وہ اپنے گھر والوں سے بالکل مختلف تھے۔
"تمہاری بات ٹھیک ہے دل اور! لیکن یہ بھی یاد رکھو کہ اگر میں وہاں رہ نہ سکا تو وہاں سے نکل بھی نہیں سکوں
گا۔ کیونکہ میں زری کو وہاں نہیں چھوڑنا چاہتا اور وہ دوبارہ زری کو میرے ساتھ بھیجنے پر تیار نہیں ہوں گے۔ اس
بات پر خون خرابا بھی ہو سکتا ہے۔" عبد اللہ نے اسے پہلے سے آگاہ کرنا چاہا تھا۔

"اس کا انتظام بھی ہے میرے پاس، تم فکر مت کرو، بس حویلی جاؤ، تاکہ بعد میں وہ لوگ تم پر یہ اعتراض نہ
کریں کہ تم حویلی نہیں گئے۔" دل اور اسے آئندہ کے لیے ایک پوائنٹ سمجھا رہا تھا۔
"دل اور! میں وہاں زری کو ایک بل کے لیے بھی نہیں چھوڑنا چاہتا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ وہ راتوں رات
زری کی زاری کا ناک چڑھانے سے بھی گریز نہیں کریں گے۔" عبد اللہ کو صرف اور صرف زری کی فکر تھی اور
اس فکر کے بارے میں جان کر نبیل جیسے گنگ سا ہو گیا تھا۔

"زری کا نکاح؟ مگر کس سے؟" نبیل کی حیرانی عروج پر تھی۔ اس کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ اسے ایسا واقعی سمجھ
نہیں آرہی تھی کہ وہ دونوں کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ اور یہ سب کیا چکر ہے؟ بات زری کے متعلق تھی۔ اس لیے
عبد اللہ کے سامنے وہ کھل کے استفسار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن دل اور ایک نظر میں اس کے چہرے پر اڑتی
ہوئیاں دیکھ چکا تھا وہ نبیل کی کیفیت محض ایک نظر میں ہی بھانپ گیا تھا۔
"میں نے کہا تھا تم فکر نہ کرو، تم لوگ جیسے جاؤ گے، ویسے ہی واپس آؤ گے، تم گاڑی میں بیٹھو، تمہیں ساری
تفصیل سمجھا دیتا ہوں۔" وہ لوگ گاڑیوں کے پاس آکر ٹھہر گئے تھے ان کو دیکھتے ہی گلاب خان گاڑی سے نکل
آیا۔

"اسلام علیکم صاحب۔" گلاب خان نے عبد اللہ کو سلام کیا تھا۔
"وعلیکم السلام! کیسے ہو گلاب خان؟" عبد اللہ دیکھتے ہی پہچان گیا تھا کہ وہ دل اور کا لازم گلاب خان ہے۔
"ٹھیک ہوں صاحب! اللہ کا کرم ہے۔ لائیں سامان گاڑی میں رکھ دوں۔" اب سامان رکھنے کی ذمہ داری
گلاب خان کی تھی۔ وہ ذمہ داری پوری کرنے لگا۔

"ملک عبد اللہ ہم سے نہیں ملو گے کیا؟" دل اور اپنی گاڑی کا دروازہ کھول رہا تھا۔ جب اس آواز پر ٹھہر گیا وہ
جو بھی تھا عبد اللہ سے مخاطب تھا۔ لیکن اس کی زہریلی نظریں سب پر تھیں۔ زری بھی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے رک
گئی تھی۔ اس نے بھی جب پیچھے مڑ کر دیکھا تو پتھر کی ہو گئی تھی۔ ملک اسد اللہ کے پہلو میں زری کی موت کا فرشتہ

کھڑا تھا، جسے کچھ کر وہ زبردستی تھی اور اس پر سر تپا کیکی طاری ہو گئی تھی۔
"ملوں گا، ضرور ملوں گا، آپ سے ملنے کے لیے ہی آیا ہوں۔" عبد اللہ گاڑی سے پاؤں نیچے اتارتا ہوا ان کے
قریب آگیا تھا اور پھر خود ہاتھ آگے بڑھا کے اس سے ہاتھ ملایا تھا۔
"آپ لوگ گاڑی میں بیٹھیں۔" دل اور نے مدھیہ اور نگارش کو اشارہ کیا تھا۔

"دل اور بھائی۔" نگارش سہم گئی۔
"ڈونٹ وری! کچھ نہیں ہوتا، آپ لوگ گاڑی میں بیٹھیں، یہاں کھڑے ہونا ٹھیک نہیں ہے۔" دل اور کا لہجہ
سخت تھا۔ اس لیے مجبوراً ان تینوں کو گاڑی میں بیٹھنا پڑا اور دل اور نے گاڑی کا دروازہ بند کر دیا۔
"مجھے ملک حق نواز کہتے ہیں۔" یہ جملہ دل اور کی سماعتوں پر کسی چابک کی طرح پڑا تھا۔ وہ ایک دم دوبارہ پلٹا
تھا۔ ملک حق نواز، نبیل کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے اپنا تعارف کروا رہا تھا۔

"ملک حق نواز؟" اس نے زری لب دہرایا اور پھر نبیل سے ہاتھ ملاتے ملک حق نواز کو ایک قبر بھری نظر سے
دیکھا تھا اور مضبوط قدم اٹھاتا ان کے قریب آگیا۔

"اور مجھے دل اور شاہ کہتے ہیں۔" اس نے بھی ملک حق نواز کے سے انداز میں ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے اپنا
تعارف کروایا تھا، جس پر ملک حق نواز نے بری طرح ٹھٹھک کے دیکھا تھا۔ ملک حق نواز کے چہرے کی بدلتی کیفیت
دیکھ کر عبد اللہ اور نبیل کو بیک وقت حیرت ہوئی تھی۔ دل اور کے تعارف نے اس کے چہرے کے تاثرات بدل
کے رکھ دیے تھے سارا اتفاقاً سرور پڑ گیا تھا۔

"مجھے امید نہیں تھی ملک صاحب کہ آپ میرے تعارف کو یوں دل پہ لے لیں گے۔" دل اور ملک حق نواز
کو کافی گہری اور کا شدار نظروں سے دیکھتا چوٹ کرنے سے باز نہیں آیا تھا۔

"جو لوگ ہمارے دماغ میں گھڑی کی سوئیوں کی طرح ٹپک ٹپک کرتے رہتے ہیں وہ اگر سامنے آجائیں تو ان کے
تعارف کو دل پہ لینا ہی پڑتا ہے۔" ملک حق نواز نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا اور دل اور سے ہاتھ ملایا تھا۔

"چلیں یہ بھی جان کر خوشی ہوئی کہ میں آپ کے دماغ میں ٹپک ٹپک کرتا رہتا ہوں یعنی ہر دم آپ کے ساتھ ہی
رہتا ہوں؟" دل اور کا انداز استہزائیہ تھا۔ جو ملک حق نواز کو کافی ناگوار گزرا۔

"اور میں آج کل اس ٹپک ٹپک کو بند کرنے کی کوشش میں ہوں، امید ہے جلد ہی بند ہو جائے گی۔" ملک حق
نواز کافی چپا کے بولا تھا۔

"اور مجھے یقین ہے یہ ٹپک ٹپک بند نہیں ہوگی اور بڑھے گی، اتنی کہ ملک صاحب نیند کو ترسیں گے۔" دل اور کا
لہجہ مضبوط اور مستحکم تھا۔

"یہ تو وقت آنے کی بات ہے شاہ صاحب؟" ملک حق نواز کچھ حیرا رہا تھا۔

"وقت آچکا ہے ملک صاحب اور کس وقت کا انتظار ہے آپ کو؟ اپنا بندوبست کر رکھیں، بلاوا کسی وقت بھی
آسکتا ہے۔" دل اور نے بھی اسے اشارہ دے دیا تھا۔

"یہ بلاوا جتنا میرے لیے نقصان ثابت ہوگا، اتنا آپ کے لیے بھی ہوگا۔" ملک حق نواز نے ڈھکی چھپی
دھمکی دی تھی۔

"میں قائل، زانی اور شرابی نہیں ہوں۔ میں غریبوں کا گوشت کھانے والا بھیڑیا نہیں ہوں، بلکہ میں تم جیسے
بھیڑیوں کو دنیا کے سامنے لانے والا آدمی ہوں۔ تم جیسے دس بھی آجائیں تو میرا نقصان نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اوپر
والا جانتا ہے، کون کتنا غلط ہے۔" دل اور کے چہرے پر غصہ اتر آیا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا ملک حق نواز کے
نکڑے کر دے۔ ایسے لوگوں کو دیکھ کر تو اس کا پارہ ویسے ہی ہانکی ہو جاتا تھا اور ملک حق نواز تھا کہ الٹا اسے دھمکی

دے کر اور رعب جاکر بات کر رہا تھا اور دل اور کا خون کھول اٹھا تھا۔

”دل اور پلینز کول ڈاؤن! کیا مسئلہ ہے آخر؟“ عبد اللہ نے دل اور کا غصہ اٹھاتے دیکھا تو فوراً اس کا بازو تھام لیا تھا۔

”مسئلہ تم ان ہی سے پوچھنا کہ ان کے کروت اور کارنامے کیا ہیں؟“ دل اور نے انتہائی غضب اور حقارت سے ملک حق نواز کو دیکھتے ہوئے عبد اللہ کے ہاتھ سے اپنا بازو چھڑایا تھا۔

”حق نواز چلو تم گاڑی میں بیٹھو بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔“ ملک اسد اللہ نے ملک حق نواز کو وہاں سے ہٹا دیا۔

”چلو! تم بھی گاڑی میں بیٹھو۔“ عبد اللہ نے دل اور کو اشارہ کیا تھا۔

”جار رہا ہوں میں بھی فی الحال کوئی بد مزگی نہیں چاہتا“ لیکن ملک حق نواز اتنا یاد رکھنا کہ تمہاری گردن اور انصاف کا پھندا ایک دوسرے سے دور نہیں ہیں۔“ اس نے جاتے جاتے ملک حق نواز کو دارنگہ دی تھی اور پھر پلٹ کر دوبارہ گاڑی تک آگیا۔

”دل اور پلینز! کچھ بتاؤ تو سہی؟ آخر آپ لوگوں کے درمیان کیا مسئلہ چل رہا ہے؟“ عبد اللہ کو تجسس ہو رہا تھا۔

”بعد میں بتاؤں گا؟ ابھی تم گاؤں جاؤ۔“ اس نے بتانے سے گریز کیا تھا۔

”اے نہیں یار! تم سمجھ نہیں رہے میں صرف اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ اگر ملک حق نواز کے حوالے سے کوئی اور ویک پوائنٹ ہے تو کم از کم مجھے حویلی جانے سے پہلے بتاؤ ہو؟ تاکہ میں اس پر کچھ بول تو سکوں۔“ عبد اللہ ملک حق نواز کے بارے میں کچھ اور معلومات چاہتا تھا۔ دل اور نے اس کی بات پر پہلے نیل کو پھر دوبارہ عبد اللہ کو دیکھا اور گہری سانس کھینچی تھی۔

”اس نے ایک لڑکی مومنہ بی بی کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ آج سے تقریباً دس عیارہ ماہ پہلے کی بات ہے۔ مومنہ بی بی! انصاف چاہتی ہے۔ اس کا کس میرے ہاتھ میں ہے اور مومنہ بی بی آج کل نیل کے گھر میں رہ رہی ہے۔ اس گھٹیا انسان سے جھپ جھپ کے جی رہی ہے کہ کہیں یہ اس کے الزام سے بچنے کے لیے اس کا قتل ہی نہ کر دے۔“ دل اور نے غصہ ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اسے بتایا تھا اور عبد اللہ اور نیل شدید رونا دھونے لگے تھے۔

نیل کے دماغ کو ایک اور جھٹکا لگا تھا کہ یہ وہی ملک حق نواز ہے جس کے بارے میں اس روز اسپیکٹر شہناز بتا رہی تھی اور جو مومنہ بی بی کا مجرم تھا۔ جس نے مومنہ بی بی کی زندگی برباد کر کے رکھ دی تھی۔ وہ کتنے دھڑلے سے دندنا پھر رہا تھا؟ لیکن ایک بات اور تکلیف دہ تھی کہ وہ عبد اللہ کا رشتہ وار تھا بلکہ زری کا بھی۔

”دل اور تم سچ کہہ رہے ہو؟“ عبد اللہ تو جیسے شرمندگی سے مرگیا تھا۔

”میرے سچ کی تصدیق کرنی ہے تو مومنہ بی بی کے پاس جاؤ، نیل کے گھر پہلے گی۔“ دل اور نے تلخی سے اشارہ کیا۔

”اف خدایا! میرے خاندان میں ذالت اب اس حد تک برپا ہو گئی ہے۔“ عبد اللہ کا دماغ پھٹنے کے قریب تھا۔ اس نے سر تھام لیا۔

”تم خاندان کی بات کرتے ہو میرے تو اپنے گھر میں ہی ذالت پائی گئی ہے۔“ نیل کا خیال اپنے باپ کی طرف چلا گیا تھا اور دل میں اک اذیت کا ابال سا اٹھا تھا۔

”خیر چھو! اس مسئلے کو۔ میں نبٹ لوں گا“ تم جاؤ اب۔“ دل اور نے اپنے اعصاب ٹھکانے پہ لاتے ہوئے

عبد اللہ کا کندھا تھپکا تھا۔

”لیکن یار۔ میں ان ظالم اور بے حس لوگوں میں زری کو لے کر کیسے جاؤں؟“ اس ندی میں پیر ہی نہیں ڈال رہا تھا۔

”یہ لو۔ یہ اپنے پاس رکھ لو کام آئیں گے۔“ دل اور نے ایک موبائل فون اور ایک ریو الور عبد اللہ کو تھمایا تھا۔

”اس موبائل میں میرے نمبر کے علاوہ گلاب خان، نیل، اسپیکٹر شہناز اور ایس پی کامران اور پولیس اسٹیشن کا نمبر بھی سیو ہے۔ ہمیں فوری طور پر جس کی بھی مدد کی ضرورت ہو تم کال کر سکتے ہو اور یہ بھی لوڈ ہے اس کو استعمال کرنے کی نوبت آئے تو کسی کے سینے پر مت استعمال کرنا سیدھا سیدھا قتل کا کیس ہو گا اس لیے استعمال کرنا پڑا تو کسی کی ٹانگ یا بازو پر استعمال کرنا تاکہ کسی کی جان نہ جائے ہوش و خواہش بے شک چلے جائیں۔“ دل اور نے اسے ہر طرح سے سمجھا دیا ضروری سمجھا تھا اور عبد اللہ اس کا مشکور ہو گیا تھا۔

”تھینک یو یار۔ تھینک یو سوچو۔ اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ وہ سب میرا کچھ نہیں لگاڑ سکتے کیونکہ تم میرے ساتھ ہو۔“ عبد اللہ بے ساختہ اس سے بغل گیر ہو گیا اور دل اور نے غصہ جھٹک کر اس کو تسلی دی اور گلاب خان کو اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار کیا تھا۔

اور گاڑی میں بیٹھی زری کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اسے آنے والے وقت سے خوف آرہا تھا کہ نہ جانے آگے کیا ہونے والا ہے۔ دل اور عبد اللہ اور نیل گاڑی سے باہر کھڑے نہ جانے کیا کیا پلان بنا رہے تھے کہ نگارش کو بھی پریشانی اور بے چینی ہونے لگی تھی۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ دل اور ان کو گاڑی میں بٹھا کے گیا تھا۔ اس لیے نہ تو وہ گاڑی سے نکل سکتی تھیں اور نہ ہی ان کو اپنے پاس بلا سکتی تھیں۔ لیکن شاید اللہ کو ہی ان کی حالت پر رحم آگیا تھا کہ وہ تینوں گاڑی کے قریب آگئے اور نیل نے آگے بڑھ کے گاڑی کا دروازہ کھولا تھا۔

”مدد جیسے تم اپنی گاڑی میں آجاؤ ان لوگوں نے گاؤں جانا ہے۔“ نیل کے کہنے پر زری نے ایک دم ہراساں سے انداز میں نگارش کو دیکھا تھا۔

”گاؤں؟“ اس کی سانسیں اٹکنے لگی تھیں۔

”کچھ نہیں ہو گا! یوں سمجھ لیں کہ ہم لوگ آپ کے ساتھ ہی ہیں۔“ نیل نے تسلی دی تھی اور مدد جیہ زری اور نگارش سے مل کر گاڑی سے اتر آئی تھی۔

زری نے بے اختیار گاڑی سے باہر کھڑے عبد اللہ سے بات کرتے دل اور کو دیکھا تھا۔ زری کے دل کی تو پیاس بھی نہیں بجھی تھی اور وہ لوگ گاؤں جانے کے لیے تیار ہو گئے تھے؟ زری کے دیکھتے دیکھتے ہی نیل نے گاڑی کا دروازہ بند کر دیا۔ پھر ڈرائیونگ سیٹ گلاب خان نے سنبھال لی تھی اور دل اور سے رخصت ہو کر عبد اللہ بھی فرنٹ سیٹ پر آ بیٹھا تھا۔ دل اور اور نیل وہیں کھڑے تھے اور گلاب خان گاڑی نکال لے گیا تھا۔ اس کے پیچھے مدد جیہ بھی گاڑی نکال لے گئی تھی اور رفتہ رفتہ وہ دونوں بھی وہاں سے نکل آئے تھے۔



وہ نما کر نکلا اور تویلیے سے بال رگڑتا ہوا اپنے کمرے میں آگیا تھا جہاں مریم پہلے سے موجود کمرے کی صفائی کرنے میں مصروف تھی۔ عدیل کو گنگنائے دیکھ کر اس کے ہاتھ ٹھہر گئے تھے۔ وہ کل سے کافی خوش اور فریض لگ رہا تھا۔

”یہ گانا آپ نے سنا پہلی بار ہے؟ یا اچھا پہلی بار لگا ہے؟“ مریم کے سوال پر عدیل گنگنائے ہوئے رک گیا۔

”کیا مطلب؟“ عدیل نے تولیہ کھونٹی سے لٹکا کے اپنی شرٹ — پہنتے ہوئے مریم کو نا بھی سے دیکھا تھا۔

”مطلب کہ آپ کل سے جب سے کام سے واپس آئے ہیں مسلسل یہی گانا گنگنا رہے ہیں؟ کیا یہ گانا زیادہ اچھا لگ گیا ہے آپ کو۔“ مریم کے کہنے پر عدیل یکدم اک بے ساختہ سا قہقہہ لگا کے ہنسا تھا۔ تو گویا مریم کل سے اسے نوٹس کر رہی تھی؟

”یہی سمجھ لو کہ اچھا پہلی بار لگا ہے۔ ورنہ سنا تو پہلے بھی تھا۔“ عدیل نے بھی دلچسپی سے مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا۔

”اوہ اچھا اچھا۔ تو جس کی وجہ سے اچھا لگا ہے اس کا نام بتا سکتے ہیں؟“ مریم جاننا چاہتی تھی۔

”میرے بتانے کی کیا ضرورت ہے؟ تم خود جانتی ہو اسے۔ بلکہ مل بھی چکی ہو۔“ عدیل اپنی خوشی اپنے دل کی کیفیت مریم سے نہیں چھپا سکتا تھا۔

”یعنی مدیہ حیات؟“ مریم نے بستر کی چادر سے سلوٹیں دور کرتے ہوئے بے ساختہ خوشی کا اظہار کیا تھا۔

”ہوں۔ وی۔“ عدیل اثبات میں جواب دیتا آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بالوں میں برش پھیرنے لگا۔

”سچ؟ مجھے یقین نہیں آ رہا؟“ مریم چادر کا گونا چھوڑ کے پوری طرح سے عدیل کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

”کیوں؟ اس میں ناقابل یقین کیا ہے؟ کیا اپنے بھائی کی پر سنائی پہ کوئی شک ہے؟“ عدیل نے مریم کو چھیڑا تھا۔

”ارے نہیں، نہیں! مجھے اپنے بھائی کی پر سنائی پہ پورا یقین ہے۔ بس اس لیے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ تو شاید لندن پلٹ ہے اور تھوڑی اکھڑ مزاج بھی ہے۔ آپ کا اور اس کا یہ جوڑ میل۔۔۔؟“ مریم بات ادھوری چھوڑ کے چپ ہو گئی تھی۔

”لندن پلٹ ہے تو کیا ہوا؟ کیا اس کے پاس دو آنکھیں اور ایک دل نہیں ہے؟ کیا وہ دیکھ کر محسوس نہیں کر سکتی؟ کیا وہ لڑکی نہیں ہے؟ اور ہاں وہ اکھڑ مزاج اور ضدی ضروری ہے، لیکن اندر سے بہت حساس اور نرم ہے۔ اس کو آئینے کی طرح دیکھ چکا ہوں میں۔ اتنی شفاف بھی کہ مجھے اس میں اپنا آپ صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ ناریل کی طرح ہے، باہر کا خول بہت سخت سہی، لیکن اندر سے کچی گری (کچے ناریل) کی طرح ہے نرم اور میٹھی۔“

عدیل نے مدیہ کے حوالے سے دل کھول کے اظہار کیا تھا اور مریم اس کے اظہار پہ مسکرا اٹھی تھی۔

”یعنی آپ گئے کام سے؟“ اس کے سبب میں شرارت تھی۔

”ہاں۔۔۔ کہہ سکتی ہو۔“ عدیل نے بھی جواباً شرارت سے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور اپنے بال سلائے تھے۔

”تو کیا یہ گلاسز بھی اسی کے ہیں؟“ مریم نے عدیل کے سنکے کے نیچے رکھے گلاسز نکالے، جو کافی عرصے سے عدیل کے سنکے کے نیچے ہی پائے جاتے تھے۔

”آف کورس۔۔۔ اور کس کے ہو سکتے ہیں بھلا؟“ عدیل یوں لاپرواہی سے کہہ رہا تھا جیسے اس کا مدیہ کے ساتھ صدیوں سے کوئی ریلینشن چلا آ رہا تھا۔

”اوہ۔۔۔ مجھے تو پہلے ہی شک تھا۔۔۔ خیر آپ یہ بتائیں کہ آپ ان سے ہماری ایک پر اپر طریقے سے مہذب اور پر تکلف سی ملاقات کب کروا رہے ہیں؟“ مریم نے فرمائش کی تھی۔

”جب مجھے سیلری ملے گی۔“ عدیل کے چہرے سے ابھی تک مسکراہٹ جھلک رہی تھی۔

”اوہ ہونہ۔۔۔ سیلری ملنے میں تو ابھی دس بارہ دن باقی ہیں؟“ مریم نے بد مزہ ہوتے ہوئے برا سامنا بنایا۔

”تو کیا یوں ہی خالی گھر میں لے آؤں؟ آج کل کے دنوں میں تو گھر میں ہمارے کھانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔“

کسی مہمان کو کیا کھلائیں گے بھلا؟“ عدیل نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا اور مریم ڈرا دیر کے لیے چپ سی ہو گئی تھی۔ پھر ذرا توقف سے گویا ہوئی۔

”میں کوشش کروں گی کہ مجھے جلدی سیلری مل جائے، پھر انہیں انوائٹ کروں گی۔“ مریم کے لہجے میں اک عجیب سی چاہ تھی۔ وہ مدیحہ سے جس رشتے کے حوالے سے ملنا چاہتی تھی اس کو سمجھتے ہوئے عدیل کے چہرے پہ نرمی بکھر گئی اور پھر مریم کے قریب آتے ہوئے اس کا سر تھکا تھا۔

”ان شاء اللہ اللہ بہت بہتر کرے گا۔“ کبھی وہ وقت بھی آئے گا، جب مہمان جس وقت بھی آئے گا، ہمیں پریشانی نہیں ہوگی کہ ہمارے پاس خاطر مدارات کے لیے چائے اور کولڈ ڈرنک کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ جب ہمیں تمہارے لیے لایا ہوا برگر کسی اور کو نہیں دینا پڑے گا۔“ عدیل اس کا سر تھکتے ہوئے اسے تسلی دے رہا تھا۔ سمجھا رہا تھا اسے۔ اور مریم اپنے آنسو ضبط کرنے کے لیے سر جھکا گئی تھی۔

”عدیل! تمہارے بابا کو تیار کر دیا ہے میں نے۔“ برآمدے سے اسی کی آواز سنائی دی۔ انہوں نے آج اباجی کے چیک اپ کے لیے جانا تھا۔ اس لیے عدیل نے آج ورکشاپ سے چھٹی کی تو مریم بھی اکیڈمی جانے کی بجائے گھر پہ رہ گئی تھی۔ تاکہ عدیل کے ساتھ اسپتال جاسکے، کیونکہ عدیل اکیلا ان کے ساتھ بھاگ دوڑ نہیں کر سکتا تھا۔ سرکاری اسپتالوں میں ڈاکٹرز کے پیچھے بھاگنا، چیک اپ کے لیے نمبر لگوانا اور ساتھ ساتھ مریض کو سنبھالنا اتنا آسان نہیں تھا۔ اسی لیے مریم عدیل کی مدد کے خیال سے گھر پہ ہی رک گئی تھی اور اب ان دونوں بہن بھائی نے ساتھ ہی جانا تھا۔

”بچلو۔ جلدی کرو، تم بھی تیار ہو جاؤ، تب تک میں ٹیکسی لے آتا ہوں۔“ وہ نرمی سے اس کا سر تھیک کے باہر نکل گیا تھا اور مریم ہاتھ میں پکڑے گلاسز دوبارہ اس کے۔ ٹیکسی کے نیچے رکھ کے بستر کی چادر درست کر کے باہر نکل آئی تھی۔ اور چادر اوڑھ کے تیار ہو گئی تھی۔ اتنے میں عدیل واپس بھی آگیا۔ ٹیکسی گلی کی ٹکڑی کھڑی تھی۔ عدیل اباجی کو بازوؤں میں اٹھائے گاڑی تک لے گیا اور اس کے پیچھے پیچھے مریم بھی ٹیکسی میں آ بیٹھی تھی۔



اس کی گاڑی اپنے آفس کے سامنے ایک جھکے سے رکی تھی اور اس کے پیچھے نیل کی۔ دل اور گاڑی سے اترتا اس کے پیچھے نیل بھی اتر آیا تھا۔ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے آفس روم میں داخل ہوئے تھے۔

”بتاؤ اب کیا مسئلہ ہے؟“ دل آور نے موبائل اور چابیاں نیل پہ ڈالتے ہوئے نیل کو دیکھا۔ نیل کرسی کے ہتھکڑیوں پہ بے چینی سے ہاتھ جمائے بیٹھا تھا۔ اس کے سوال پہ فوراً ہی بے چینی سے کھڑا بھی ہو گیا۔

”مسئلہ میں نے بتانا ہے یا تم نے بتانا ہے؟“ آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ ملک حق نواز کا کیا سلسلہ ہے؟ اور وہ نکاح کی کیا بات کر رہے تھے تم لوگ؟“ نیل بے چینی سے شلتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

”آرام سے بیٹھو گے تو بتاؤں گا نا؟“ دل آور اپنی چیئر وٹھیل کر بیٹھ گیا تھا اور بے چین اور بے کل سے شلتے نیل کو سر ہاپا دیکھا تھا۔ نیل پہ کیا گزر رہی تھی دل آور بخوبی جانتا تھا۔ اسی لیے تو اس نے اپنی بے چینیوں کو سینے کے سب سے سرد خانے میں دفن کر دیا تھا۔ صرف ایک کا بے چین رہنا ہی اچھا تھا۔ کیونکہ اگر دونوں ہی بے چین رہتے تو شاید ایک دوسرے کے دوست ہی نہ رہتے۔

اور اس وقت ان دونوں کے درمیان سچویشن اور کنڈیشن کچھ اور ہوتی، اور یقیناً ”ایک دوسرے سے نظر بھی نہ ملا پاتے۔ شاید اسی لیے دل آور شاہ بہت پہلے ہی ان بے چین اور بے کل کردینے والی راہوں سے قدم واپس موڑ

چکا تھا۔ وہ اس منزل کو نہیں پانا چاہتا تھا۔ جس کو پانے کے لیے نیل کے قدم بھی رواں دواں تھے۔ جس کو پانے کی چاہ نیل کے دل میں بھی ہسکتی تھی۔ وہ ایسا کیسے کر سکتا تھا کہ خود وہ منزل پالیتا اور نیل کو نامراد ٹھہراتا۔ اس کی مسافت رائیگاں کر دیتا، اسے مایوس لوٹنے پہ مجبور کر دیتا؟ وہ ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا، کیونکہ دل آور شاہ جیسا بھی تھا لیکن خود غرض نہیں تھا۔ یہ سچ تھا کہ اسے یہ سارے رشتے اپنی ذات سے بھی زیادہ عزیز تھے۔

”ہوں... بتاؤ؟“ نیل اپنی بے چینی کنٹرول کرتا ہوا دوبارہ کرسی پہ بیٹھ گیا اور دل آور اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے گہری سانس خارج کرنا خود بھی سیدھا ہو بیٹھا تھا۔

”ملک حق نواز کو جانتے ہو۔ وہ کون ہے؟“ دل آور نے آغاز سوال کرنے سے کیا تھا۔

”نہیں۔“ نیل کا جواب حسب توقع تھا۔

”وہ ملک شرافت علی کا چچا زاد کزن ہے۔“

”ملک شرافت علی؟“ نیل کا دماغ اس وقت آدھا حاضر۔ آدھا غیر حاضر تھا۔

”عبداللہ کے بابا جان۔“

”واٹ!؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟“ دل آور کے انکشاف پہ نیل دنگ رہ گیا تھا۔

”مجھے بھی اسی طرح شک لگا تھا۔ خیر آگے سنو۔“ دل آور نے بات کا سلسلہ جاری رکھا۔

”ملک حق نواز، ملک شرافت علی کا سب سے چھوٹا کزن ہے عبداللہ سے آٹھ دس سال بڑا اور ملک اسد کا

تقریباً ہم عمر ہی ہوگا۔ ملک حق نواز ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا اس لیے اس کے چاؤ چونچلے بھی کچھ زیادہ ہی تھے اور ان

چاؤ چونچلوں میں بڑے بزرگوں نے بنا سوچے سمجھے عبداللہ کی بڑی بہن شرین کو ملک حق نواز کے ساتھ منسوب

کر دیا۔ لیکن ملک حق نواز شروع سے ہی ایک خبیث انسان ثابت ہوا ہے اس نے جوانی کے منہ زور گھوڑے پہ

سوار ہوتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ شرین کے ساتھ اپنا رشتہ توڑ دیا، پتا نہیں یہ شرین کی خوش قسمتی تھی کہ بد قسمتی

البتہ ملک حق نواز اپنے چچا زاد۔ کی بیٹی کے ساتھ بندھ کے نہیں رہنا چاہتا تھا حالانکہ بہت لوگوں نے اسے

منانے کی کوشش بھی کی تھی یہاں تک کہ ملک شرافت علی نے خود بھی اسے راضی کرنے کی کوشش کی تھی

کیونکہ ملک شرافت علی کی ملک حق نواز پہ نہیں اس کی جاگیر اس کی جائیداد پہ نظر تھی، کیونکہ وہ اکلوتا جو تھا۔ مگر

اکلوتا ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ضدی، بد لحاظ اور ایک نمبر کا گھٹیا آدمی تھا، وہ نہیں مانا اور اپنی من مانی کرتا رہا،

شراب اور حرام کاری اس کا شوق بن چکے ہیں، وہ کسی کی عزت کو عزت نہیں سمجھتا، اس پاس کے گاؤں والے اور

اس کے اپنے گاؤں والے ہر وقت اس سے خوف زدہ رہتے ہیں۔

دوبارہ الیکشن میں بھی حصہ لے چکا ہے اور دونوں بار حیت بھی چکا ہے ملک شرافت علی کی بیٹی کو ٹھکرانے کے

بعد بھی وہ ان کا منظور نظر ہے اور اب زری سے شادی کا خواہش مند ہے، کیونکہ وہ اپنی طرف سے شرین کو

ٹھکرانے کا ازالہ کرنا چاہتا ہے۔ اور عبداللہ مسلسل احتجاج کر رہا ہے کہ یہ ازالہ ہے یا ظلم۔؟ وہ اپنے گھر والوں

کے اس فیصلے کے خلاف ہے۔ وہ زری کی شادی زری کی پسند سے کرنا چاہتا ہے، اس لیے یوں سمجھو کہ عبداللہ

آج اپنے گاؤں اپنی حویلی میں جنگ لڑنے گیا ہے۔ اب یہ جنگ کیا نتائج سامنے لاتی ہے یہ تو رات کو پتا چلے گا

۔ یا پھر گل۔۔۔؟“ دل آور نے نیل کو ساری تفصیل سے آگاہ کرتے ہوئے کندھے اچکائے تھے اور نیل دم بخود سا

بیٹھا سب سن رہا تھا۔

”ملک حق نواز زری سے شادی کا خواہش مند ہے۔؟“ یہ سوچ ہی نیل کی رگوں کو کاٹ دینے کے لیے کافی

تھی نیل کا دل چاہ رہا تھا ملک حق نواز دوبارہ اس کے سامنے آجائے تو وہ اسے گولی سے اڑا دے، اس کے دماغ کی

”وہ سہہ کیا کہتی ہے اس بارے میں۔“ نیل کو زری کا خیال آیا تھا جس پہ دل اور کے دل و دماغ کا سکون منتشر ہو گیا تھا وہ اپنی کرسی چھوڑ کے اٹھ گیا۔

”مجھے کیا پتا کہ وہ کیا کہتی ہے؟ میں کون سا اس کے ساتھ ہوتا ہوں؟ یا پھر اس کے دل کی خبریں رکھتا ہوں؟“ دل اور کہتے ہوئے رخ موڑ گیا تھا۔

”لیکن دل اور! تم جانتے ہو نا کہ میں۔“ نیل کافی بے بسی سے بولا تھا لیکن بات ادھوری رہ گئی تھی کیونکہ دل اور کا مٹی قادر و روازے پہ دستک دے کر اندر آ گیا تھا۔

”سرلوہ آپ کے سیالکوٹ والے کلائنٹ آئے ہیں قتل کے کیس والے آپ سے ملنا چاہ رہے ہیں۔“ قادر اس کی اجازت طلب کر رہا تھا۔

”پانچ منٹ بعد انہیں اندر بھیج دو۔“ دل اور نے قادر کو جانے کا اشارہ کیا اور نیل کے قریب آکھڑا ہوا۔

”مجھے پورا یقین ہے کہ عبد اللہ کچھ نہیں ہونے دے گا۔ اس لیے تم بھی یہ یقین اپنے ساتھ رکھو۔ ان شاء اللہ سب بہتری ہو گا۔“ دل اور نے اپنا مضبوط ہاتھ نیل کے کندھے پہ جماتے ہوئے اسے تسکین دی تھی۔ اور دل اور کے ایسے مضبوط لہجے اور انداز پہ نیل کو کافی حد تک تسلی ہوئی تھی اسی لیے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس سے ہاتھ ملا کر چلا گیا تھا کیونکہ دل اور کے کلائنٹ اس کے انتظار میں تھے۔

وقار آفندی پوری طرح سے ہوش و حواس میں آچکے تھے لیکن اس کے باوجود وہ ساکت و صامت سے لگ رہے تھے۔

ان کی آنکھوں کے سامنے سارے ہی چہرے موجود تھے اور دانیال، جودت، احمد، محمد، زین، عون، عدید، ۴ سرار آفندی، اظہار آفندی سب چہرے باری باری ان سے ملنے کے لیے ان کے سامنے آتے رہے۔ لیکن جس چہرے کو ان کی پھرائی ہوئی آنکھیں دیکھنا چاہتی تھیں وہ سامنے ہی نہیں آ رہا تھا وہ دکھائی ہی نہیں دے رہا تھا۔ ان کے وجود کے ساتھ ساتھ آنکھیں بھی پتھر ہو گئی تھیں۔

”وقار! ان کے قریب سے گلو گھر اور آنسوؤں کے بوجھ سے بھیگی اور بوجھل آواز ابھری تھی اور اس آواز کو سنتے ہی ان کے دل پہ لرز طاری ہو گیا تھا۔

”آسیہ! ان کا دل زور سے دھاڑا تھا اور پھر دھاڑیں مار مار کے رو رہا تھا۔ زبان سے وہ پکار نہیں سکتے تھے اور دل سے پکارنے پہ آسیہ آفندی سن نہیں سکتی تھیں۔ وقار آفندی کا دل بھر آیا تھا۔

”وقار! مجھے دیکھیں نا۔ میں ہوں آپ کی آسیہ۔ آپ۔ آپ مجھ سے منہ موڑے یہاں ہسپتال میں کیوں پڑے ہیں؟ آپ کو نہیں پتا آپ کے بغیر میرا کیا حال ہو گیا ہے؟ آپ کی آسیہ چار دن میں ہی بوڑھی لگنے لگی ہے۔ یقین کریں وقار! آسیہ آپ کے بغیر کچھ بھی نہیں ہے میں تو سب کچھ آپ پہ وار چکی ہوں۔ آپ کو کچھ ہو گیا تو میرا کیا بنے گا؟ کیا کروں گی میں۔؟ یہاں کوئی کسی کا نہیں ہوتا۔ میرا کون ہو گا؟“ آسیہ آفندی وقار آفندی کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامے بے تحاشا رو رہی تھیں اور ان کے اس طرح رونے پہ وقار آفندی کی پتھر آنکھوں سے بھی آنسو بہہ نکلے تھے۔ ان کا پورا جسم بے جان تھا اور بے جان جسم کی پتھر آنکھوں سے آنسو بہہ کر خود بخود ہی ان کی کینٹیوں سے لڑھک کر بالوں میں جذب ہو رہے تھے۔

”وقار! آپ کو میرا خیال کیوں نہیں آتا؟ آپ ٹھیک کیوں نہیں ہو رہے؟ آپ۔ آپ میرے لیے نہ سہی میرے بچوں کے لیے ٹھیک ہو جائیں۔ میرے عون اور عدید کے لیے ٹھیک ہو جائیں۔ میری۔ میری علیزے

کے لیے ٹھیک ہو جائیں۔ وقار آپ سن رہے ہیں نا؟ میں آپ سے کیا کہہ رہی ہوں۔ آپ کو ہم سب کی خاطر ٹھیک ہونا ہے۔“ آسیہ آفندی تڑپ تڑپ کے کہہ رہی تھیں اور وقار آفندی کے آنسو خاموشی سے بہتے جا رہے تھے۔ وقار آفندی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا ان کے سوالوں کا ان کے پاس صرف خاموشی تھی۔ لمبی اور گہری خاموشی سوال کرنے والوں کو نہ حال کر دینے والی خاموشی۔ عمر بھر کی خاموشی۔

”آئی پلیز! آپ باہر آجائیں۔“ دانیال آسیہ آفندی کو دونوں کندھوں سے تھام کے ان کے روم سے باہر لے آیا تھا جو بچکیوں سے رو رہی تھیں۔

”ہم آپ کو اس لیے ساتھ لے کر آئے تھے کہ آپ ان کو تسلی دیں، دلا سادیں، ان کی ہمت برہائیں تاکہ ان کی طبیعت پہلے سے زیادہ خراب نہ ہو۔“ دانیال خفا ہو رہا تھا۔

”دانیال! عون اور عدید کو بھی آئی کے ساتھ واپس گھر بھیج دو۔“ احمد نے عون اور عدید کو دانیال کی طرف بھیجا دانیال تھوڑی دیر آئی کو تسلی دلا سادینے کے بعد مبارک خان کے ہمراہ واپس گھر بھیج کر دوبارہ روم میں آیا تو وقار آفندی کی حالت کافی تشویشناک پائی تھی ڈاکٹر زائیک دم سے پریشان نظر آنے لگے تھے اور ان کا ٹریٹ منٹ نئے سرے سے شروع ہو گیا تھا۔

”یہ اچانک کیا ہوا ہے ان کو؟“ ڈاکٹر پریشانی سے آگے بڑھا تھا۔

”انہوں نے کوئی کمری ٹینشن لی ہے، دل بہت کمزور ہو چکا ہے، سبہ نہیں پا رہا۔“ ڈاکٹر پریشانی سے جواب دے رہا تھا۔

”یہ میڈسن فوراً چاہئیں۔“ ڈاکٹر نے تیزی سے کاغذ قلم تھام کے نسخہ لکھا اور کاغذ آزر کی سمت بڑھا دیا تھا۔

”ہسپتال کی ڈسپنری سے یہ میڈسن ختم ہو چکی ہیں اس لیے آپ کو کسی اور جگہ سے تلاش کرنا پڑیں گی۔“ ساتھ ساتھ ڈاکٹر نے بتا بھی دیا تھا اور آزر وہ نسخہ ہاتھ میں تھامے پرائیویٹ روم سے باہر نکل آیا تھا۔

”لایئے! یہ میڈسن میں لے آنا ہوں۔“ جودت نے آزر کو روک دیا تھا اور وہ نسخہ خود تھام لیا تھا۔

”لیکن تم۔؟“ آزر نے کچھ کہنا چاہا تھا۔

”میرے پاس بائیک ہے۔ میں جلدی لے کر آجاؤں گا۔“ جودت نے اسے یقین دلایا تھا۔

”اوکے! لے آؤ لیکن پھر وہی بات کہ جلدی پہنچنا ڈیڈ کی کنڈیشن خاصی سیریس ہے۔“ آزر نے پھر بھی اسے تاکید کرنا ضروری سمجھا تھا۔

”اوکے! جلدی پہنچوں گا۔“ جودت اسے تسلی دے کر پلٹ گیا تھا۔

”چلو میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔“ جودت کا دوست کامی بھی ڈیڈ کی عیادت کے لیے ہسپتال آیا ہوا تھا جودت کو میڈسن لانے کے لیے تیار رکھا تو وہ بھی ساتھ ہی آ گیا تھا۔

”ڈاکٹر نے یہ میڈسن اور انجکشن لکھ کر دیے ہیں تم اباجی کے پاس ٹھہرو میں یہ سب لے آؤں۔“ عدیل ڈاکٹر کے روم سے باہر نکلا تو اس کے ہاتھ میں سفید پرچی تھی وہ موم کوتا کر میڈیکل اسٹور پہ جانے والا تھا کہ مریم نے اسے روک دیا تھا۔

”ٹھہریں! آپ ایسا کریں کہ اباجی کو کچھ دیر کے لیے کسی وارڈ کے بیڈ پہ لٹا دیں وہ زیادہ دیر اس ویل چیرہ نہیں بیٹھ سکتے، ٹھک جائیں گے۔“

”لیکن مریم! کوئی خالی بیڈ ڈھونڈنے میں نائم لگے گا ڈاکٹر نے یہ انجکشن فوری منگوائے ہیں۔“ عدیل پریشانی

سے بولا۔
”اُمیں! یہ میڈسن اور انجکشن میں لے آتی ہوں۔“ اس نے عدیل کے ہاتھ سے پرچی تھام لی تھی اور پھر پلٹ کر ہسپتال کے اندرونی حصے سے باہر نکل آئی اور اپنی بے دھیانی میں وہ عدیل سے دو ایوں کے لیے پیسے لینا بھی بھول گئی تھی۔
تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی وہ ہسپتال کے باہر بنے میڈیکل اسٹورز میں سے ایک اسٹور کی طرف بڑھی تھی۔
”پلیز! یہ میڈسن دے دیں۔“

اس نے سفید پرچی پہ لکھا نسخہ میڈیکل اسٹور کے سامنے والے کاؤنٹر پہ رکھا اور سیلز مین کو جلدی دیا
نکلنے کا کہا تھا وہ اپنے دھیان میں تھی اپنے قریب کھڑے جو دت کو بھی نہ دیکھ سکی البتہ جو دت کے ساتھ کھڑے کامی نے اسے ضرور دیکھ لیا تھا۔
”جو دت۔!“ اس نے جو دت کو ٹوک دیا۔
”ہوں۔؟“ پریشانی میں جو دت کو بھی اس پاس کا کوئی دھیان نہیں تھا۔
”دھرو کھو؟“ کامی نے اشارہ کیا تھا۔

اور جو دت نے اپنی سائیڈ پر دیکھا اس سے تین قدم کے فاصلے پر مریم کھڑی تھی جو دت اس کو دیکھتے ہی چونک گیا تھا۔

”مریم۔؟“ اس نے خود کلامی کے سے انداز میں اس کا نام لیا تھا۔
”بات کرو گے؟“ کامی کو بتا تھا کہ یہ لڑکی جو دت کی کمزوری ہے وہ اپنی لہلہکنگ کا کئی بار سرعام اظہار کر چکا تھا۔
”نہیں۔! نام نہیں ہے مجھے میڈسن لے کر جلدی پہنچنا ہے۔“ جو دت کو بتا تھا کہ اگر ذرا ابھی لیٹ ہو گیا تو آؤر کے ہاتھوں اس کی شامت آجائے گی۔
”لکناہل ہے ان کا۔؟“ مریم دو ایوں کا شمار دیکھتی ہوئی بولی۔
”دو ہزار۔“ سیلز مین نے ذرا الاروائی سے بتایا تھا۔
”دو ہزار۔؟“ مریم ہری طرح ہنسی تھی۔

اس کے پاس تو پیسے ہی نہیں تھے اس نے ذرا پریشانی اور غلٹ میں اپنا پرس کھنگالا پرس میں صرف پندرہ سو روپے تھے جو اس نے اپنے اکیڈمی آنے جانے کے کرائے کے لیے رکھے ہوئے تھے ان میں سے بھی پانچ سو روپے کم تھے میڈسن دو ہزار کی تھیں۔

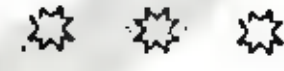
”موری سر! میں پیسے بھول آئی ہوں“ آپ یہ میڈسن سیور رکھیں میں ابھی آکر لے لیتی ہوں؟“ مریم غلٹ سے کتنی ہوئی پلٹ کر میڈیکل اسٹور سے نکل آئی تھی۔

”آپ میڈسن لے جائیں عمل میں پے کر دیتا ہوں؟“ جو دت اچانک اس کے راستے میں آگیا تھا مریم جہاں اسے دیکھ کر ہنسی بھی دہیں چکرا بھی گئی وہ نہ جانے کہاں سے نمودار ہوا تھا؟
”دیکھیں۔ میں اس وقت خود پریشانی میں ہوں“ آپ کو تنگ نہیں کرنا چاہتا ہوں آپ کی ہیلپ کرنا چاہتا ہوں“ آپ پلیز میڈسن لے جائیں۔“

جو دت کافی مذہب طریقے سے بات کر رہا تھا لیکن مریم اس کی کسی بھی ہیلپ کے چکر میں پڑنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

”تھینک یو سوچ! مجھے آپ کی کسی بھی ہیلپ کی ضرورت نہیں ہے“ پیسے بھائی کے پاس ہیں اس لیے زیادہ پریشانی کی بات نہیں ہے یہ میڈسن میں خود ہی آکر لے جاؤ گی۔“ مریم نے کافی سختی اور بے گامگی سے اس کی آفر

مسترد کر دی تھی اور وقت کی نزاکت دیکھتے ہوئے جو دت مزید کچھ کہے بغیر اس کے راستے سے ہٹ گیا تھا، مریم تیزی سے سڑک کر اس کے ہسپتال کے اندر چلی گئی اور جو دت پلٹ کر میڈیکل اسٹور کے اندر آگیا تھا ان کی مطلوبہ میڈسن بھی مل چکی تھیں میڈسن کا پیل کیلٹر کروا کے وہ کامی کے ساتھ رخصت ہو گیا تھا لیکن مریم جب پیسے لے کر وہاں پہنچی تو سر تھاں کے رہ گئی تھی جو دت اس کی میڈسن کا بھی پل پے کر گیا تھا اور مریم کو لگا وہ اسے مقروض کر گیا ہے۔ لیکن وہ کسی بھی صورت اس کا یہ احسان نہیں رکھ سکتی تھی۔



گاڑی مین روڈ سے گاؤں کی چھوٹی سڑک کی سمت مڑی تو زری کا دل دھک دھک کرنے لگا۔
گاؤں میں داخل ہوتے ہی ایک شان دار سا ڈیرہ نظر آتا تھا یہ ڈیرہ ملک شرافت علی کا ہی ڈیرہ تھا یہاں ہر وقت پنچائیت لگی رہتی تھی اس پاس کے علاقے والوں ملنے ملائے والوں اور دوست احباب کا ہر وقت یہاں آنا جانا لگا رہتا تھا گاؤں کا غریب طبقہ بھی اپنے مسائل حل کروانے زمینوں اور لڑائی جھگڑوں کے معاملات طے کروانے کے لیے یہاں ہی پایا جاتا تھا۔ اس لیے اس ڈیرے سے لوگوں کی محفل کبھی ختم نہیں ہوتی تھی۔ آئے روز دروازے کے علاقوں سے ان کے مہمان آتے رہتے تھے اور مہمانوں کی خاطر مدارات کا انتظام بھی یہیں ہوتا تھا رات گئے تک محفلیں جمتی تھیں اور اس وقت بھی یہی حال تھا گاڑی ڈیرے کے قریب سے گزری تو عبداللہ نے ڈیرے کے اندر نظر دوڑائی تھی۔

ملک اسد اللہ اور ملک حق نواز کی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ لوگ یہاں ہی تھے اور یقیناً ابھی ابھی ہی پہنچے تھے۔ عبداللہ گہری سانس کھینچتا ہوا لب بلب کر سیدھا ہو بیٹھا تھا وہ اکیلا ہوتا تو یقیناً پہلے اس ڈیرے پہ ہی اترتا۔ لیکن فی الحال زری اور نگارش اس کے ساتھ تھیں وہ یہاں نہیں ٹھہر سکتا تھا گاڑی آگے پانچ منٹ میں ان کی حویلی کے سامنے موجود تھی گاڑی کی فرنٹ سیٹ پہ عبداللہ کو دیکھتے ہی حویلی کے دونوں چوکیداروں نے بڑا سا لکڑی کا پھانک داکر دیا تھا۔ گلاب خان عبداللہ کے اشارے پہ گاڑی اندر لے آیا تھا کشادہ اور طویل ترین ڈرائیو ہے۔ سلو اسپید سے چلتی گاڑی حویلی کے مرکزی برآمدے کے عین سامنے آرکی تھی اور عبداللہ گاڑی سے نیچے اتر آیا تھا اور ساتھ ہی اس نے گاڑی کا پچھلا دروازہ بھی کھول دیا تھا عبداللہ سب کے سامنے ہر طرح سے ڈٹ جانے کے لیے تیار تھا جبکہ زری اور نگارش اپنی اپنی جگہ پہ دونوں سہمی بیٹھی تھیں زری کی حالت تو کچھ زیادہ ہی خراب تھی کہ اپنے ہی گھر میں قدم رکھتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔

”زری۔!“ زری کو کسی سوچ میں گم پا کر عبداللہ نے متوجہ کیا تھا۔
”جج جی؟“ وہ چونک کر متوجہ ہوئی اور عبداللہ کو انتظار میں کھڑے دیکھ کر فوراً ”نیچے اتر آئی تھی۔“

یہاں سب کو خبر تھی کہ عبداللہ اور زری دونوں بس بھائی آج واپس پاکستان آرہے ہیں لیکن پھر بھی حویلی یوں نظر آرہی تھی جیسے صدیوں سے ویران پڑی ہو ہر طرف گہرا سناٹا تھا۔ حالانکہ شام سے پہلے کا وقت تھا شام بس ڈھلنے کو تھی، کچھ کچھ ہوائ اپنے اپنے آشیانوں کو لوٹ رہے تھے وہ بھی اپنے آشیانے میں لوٹ کر آئے تھے مگر یہاں شاید کسی کو بھی ان کا انتظار نہیں تھا شام کے وقت حویلی میں خاصی چل پھل ہوتی تھی لیکن آج ایسا کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا اور عبداللہ اس خاموش ”ویلم“ کو بخوبی سمجھ سکتا تھا۔ لیکن پھر بھی سر جھٹک کر قدم آگے بڑھا دیا تھا۔

”عبداللہ۔!“ نگارش کی آواز پہ عبداللہ نے چونک کر نگارش کو دیکھا اور قدم ٹھہر گئے تھے۔
نگارش کی آنکھوں اور چہرے پہ ایک عجیب سا خوف بلکورے لے رہا تھا اور یہ خوف عبداللہ کی نظروں سے

پوشیدہ نہیں رہ سکتا تھا اور بے ساختہ ایسے حالات میں بھی مسکرا دیا تھا۔ زری نہ ہوتی تو شاید وہ نگارش کے اس انداز اس خوف زدہ سی ادراپہ اسے بانہوں میں بھر لیتا لیکن فی الحال اس کا ہاتھ ٹھیکنے پہ اکٹفا کیا تھا۔

”پانگل! محبت کرتا ہوں تم سے اور محبت انسان کے قدم اکھڑنے نہیں دیتی۔ تم نے یہ سوچ بھی کیسے لیا کہ کہیں میں تمہیں چھوڑ نہ دوں؟“

عبداللہ کے انداز میں سرزنش تھی وہ کافی آہستگی سے اس سے مخاطب ہوا تھا اس لیے ذرا فاصلے پہ رخ پھیر کے کھڑی زری نہیں جان سکی تھی کہ ان کے درمیان کیا بات ہوئی ہے؟

”بی بی جی! بی بی جی! چھوٹے ملک صاحب آگے باہر دیکھیں۔ چھوٹے ملک صاحب آگے۔“

ایک نو عمر ملازمہ برآمدے کی بائیں طرف سے نکل کر اپنے دھیان میں ادھر ہی آرہی تھی جب عبداللہ اور زری کو دیکھتے ہی اس کے وجود میں بجلی سی بھڑکنی تھی۔ اور بی بی جان کو اطلاع دینے کی غرض سے زور زور سے چلاتی ہوئی ان سے پہلے ہی راہداری میں گم ہو گئی تھی۔

”چلو! تم بھی چھوٹے ملک صاحب کی ملکانی صاحبہ ہو اندر جانا ہے؟“ عبداللہ نگارش کو نیشن فری کرنے کی خاطر کافی شرارت سے کہا تھا اور پھر تینوں اندر آگئے تھے۔

”میں بسم اللہ! میں صدقہ! میں داری! میرے کلچر دی ٹھنڈک! میری اکھاں دا چان۔“

بی بی جان بے تحاشا ممتا سے مغلوب اپنے خالص پیار کا خالص پنجابی میں اظہار کرتیں اپنے شاہانہ تخت سے فوراً اٹھ کھڑی ہوئی تھیں اور قریب آتے عبداللہ کو آگے بڑھ کے سینے سے لگا لیا تھا۔

”کیسی ہیں بی بی جان؟“ عبداللہ کا لہجہ بھی ماں کی ممتا کے سامنے نرم ہو گیا تھا۔

”جھجھک لیا ہے تو سمجھو کہ میں ٹھیک ہی ہوں۔“ وہ عبداللہ کی پیشانی پہ بوسہ دیتی ہوئی بولی تھیں۔

”بی بی جان! عبداللہ کے عقب سے زری کی آواز سنائی دی تھی اور بی بی جان نے اپنی بھگلی آنکھیں پونچھتے ہوئے بازو اکڑو کر دیکھے تھے اور زری بچوں کی طرح لپک کے ان کے سینے سے لگی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی وہ آج اپنی ماں سے پانچ سال بعد مل رہی تھی اور ان پانچ سالوں میں یوں لگ رہا تھا جیسے بہت کچھ بدل گیا تھا اپنے بھی اپنے نہیں رہے تھے اور اپنوں کے رائے ہونے کا دکھ ہی اسے یوں بے پناہ رہا تھا۔

”زری! کسی اور کو بھی ملنے دو گی یا نہیں؟“ عبداللہ نے مصنوعی خفگی سے کہا تھا اور پھر بی بی جان کو کندھوں سے تھام کے زری سے الگ کیا تھا۔

”بی بی جان! یہ آپ کی بہو ہے نگارش۔“ عبداللہ نے نگارش کی طرف اشارہ کیا تھا۔

اور بی بی جان اتنی خوبصورت اور پیاری سی لڑکی کو اپنے سامنے دیکھ کر ٹھک گئی تھیں۔ کافی باوقار سی لڑکی تھی عبداللہ کے پہلو میں کھڑی سج رہی تھی۔

”اسلام علیکم بی بی جان! نگارش نے کافی جھجکے اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں سلام کیا تھا۔

بی بی جان نے ایک نظر عبداللہ کو دیکھا اور پھر دوبارہ نگارش کو دیکھا تھا وہ اپنے دل کو پھر نہیں بتا سکی تھیں انہوں نے نگارش کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے بھی سینے سے لگا لیا تھا۔

”جیتی رہو۔ خوش رہو۔ اللہ سدا سدا گن رکھے۔“ انہوں نے اسے دعاؤں سے نوازا تھا اور نگارش کی پلکیں بھیگ گئی تھیں۔ عبداللہ کے حوالے سے زری کے بعد یہ دوسرا رشتہ تھا جو اس سے اس طرح محبت سے پیش آیا تھا اور اسے بہت اچھا لگا تھا دل کو سکون محسوس ہوا تھا۔

”کو بیٹھو تم لوگ۔ تھک گئے ہو گے؟“ بی بی جان نے تخت پہ رکھی سیج دوبارہ تھام لی تھی اور۔۔۔ صوفے کی طرف اشارہ کیا تھا۔

”ان کے بیٹھنے کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے یہاں۔“ ملک شرافت علی کی کرخت آواز پہ صوفے کی سمت اٹھتے عبداللہ کے قدم یکدم ٹھہر گئے تھے اس نے فوراً پیچھے پلٹ کے دیکھا تھا۔

”بابا جان! عبداللہ بے ساختہ ان کی طرف بڑھا تھا۔

”بس! اس کی ضرورت نہیں ہے جہاں ہو وہیں کھڑے رہو۔“

انہوں نے سختی سے منع کر دیا تھا اور عبداللہ دم بخود سا کھڑا رہ گیا تھا اسے اپنی سماعتوں پہ یقین نہیں آ رہا تھا کہ بابا جان نے اسے اس طرح کہا ہے؟

بے شک ان لوگوں میں ہزاروں اختلافات سہی ہزاروں رنجشیں اور گلے شکوے ہی سہی لیکن پھر بھی وہ ان کا بیٹا تو تھا؟ اتنے عرصے بعد واپس آیا تھا۔ کم از کم ان کو اس سے ایک بار ملنا تو چاہیے تھا؟ بعد کی بعد میں دیکھی جاتی لیکن انہوں نے تو کوئی گنجائش ہی نہیں رکھی تھی۔ چہرے پہ جاہ جلال لیے دونوں ہاتھ پشت پہ باندھے وہ عبداللہ کو بڑی خونخوار نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

”ملک صاحب! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ میرا بچہ اتنے سالوں بعد آیا ہے آپ اسے دم تو لینے دیں۔“ بی بی جان تڑپ گئی تھیں۔

”اتنے سالوں بعد آیا ہے تو اسی طرح آنا جس طرح ہم نے کہا تھا؟“ ملک شرافت علی کا اشارہ نگارش کی طرف تھا ان کی شرط تھی کہ عبداللہ جب بھی واپس آئے نگارش کو طلاق دے کر واپس آئے ورنہ اس حویلی میں عبداللہ کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوگی۔

”چھوٹے ملک صاحب نے پہلے کب آپ کی کوئی بات مانی ہے جواب مانیں گے؟“ ملک اسد اللہ کی آواز بھی داخلی دروازے کی سمت سے ابھری تھی آواز میں طنز اور تمسخر تھا۔ عبداللہ نے چونک کر دیکھا تھا دونوں باپ بیٹا برابر کھڑے تھے دونوں کی طرز زندگی اور قول و فعل ایک سے ہی تھے انیس بیس کا بھی فرق نہیں تھا دونوں میں اور کسی ایک سے بھی کسی قسم کی گنجائش کی امید رکھنا فضول تھا۔ یہاں کوئی بھی عبداللہ کا طرفدار نہیں تھا کیونکہ بی بی جان بھلا کب شوہر کے سامنے ٹھہر سکتی تھیں۔ اس لیے عبداللہ نے اس میدان میں اکیلے ہی اترنا تھا۔

”چلیں! آج ایک فیصلہ کرتے ہیں۔ جو میں منوانا چاہتا ہوں وہ آپ مان لیں جو آپ منوانا چاہتے ہیں وہ میں مان لیتا ہوں جو اپنی بات سے ہٹ جائے وہ مرد نہیں کہلائے گا؟“ عبداللہ کا لہجہ بھی ان جیسا ہی کرخت ہو چکا تھا اور آنکھوں کا رنگ بھی سنگین تیوروں میں بدل گیا تھا۔

”کیسا فیصلہ؟“ اب کی بار ملک اسد اللہ چونک کر دیکھا تھا۔

”بیوی کو طلاق دینے کا فیصلہ؟“ عبداللہ کا لہجہ کاٹدار اور دونوک تھا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیا کہنا چاہ رہے ہو تم؟“ بابا جان سمجھ نہیں پائے تھے۔

”مطلب کہ انہی قدموں پہ کھڑے کھڑے ملک اسد اللہ اپنی بیوی کو طلاق دے دیں تو میں بھی ابھی بیس کھڑے کھڑے اپنی بیوی کو طلاق دے دوں گا اور وہی کروں گا جو آپ کہیں گے۔“ عبداللہ نے گویا ملک اسد اللہ کے گلے میں پھندا ڈالا تھا۔ بابا جان ملک اسد اللہ اور بی بی جان کے ساتھ ساتھ زری اور نگارش بھی دنگ رہ گئی تھیں۔

”یہ کیسی شرط ہے بھلا؟“ ملک اسد اللہ کو غصہ آیا تھا۔

”مجھ سے میری بیوی کو طلاق دلانے کے لیے میری یہی شرط ہے؟“ عبداللہ کا انداز استہزائیہ تھا۔

”اس کا مطلب ہے تم طلاق دینے کے لیے تیار نہیں ہو؟“ وہ کافی چبا کے بولے تھے۔

”میں تو تیار ہوں۔ بس آپ کے تیار ہونے کا انتظار ہے؟ کیا خیال ہے پھر گاؤں کے نکاح خواں سے دو طلاق

ناموں کے پیپر زنگواؤں؟“ عبداللہ سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”بکواس بند کرو اپنی۔ اور زبان سنبھال کے بات کرو۔ تم اپنی بیوی سے میری بیوی کا مقابلہ کر رہے ہو؟“ ملک اسد اللہ بھڑک اٹھے تھے ان کے لہجے میں واضح حقارت تھی۔

”اگر نام نہاد رشتے کو دیکھا جائے تو آپ کی بیوی میری بھابھی ہوتی ہیں اس لیے میں ان کے لیے کوئی غیر مناسب الفاظ استعمال نہیں کرنا چاہتا۔ مگر اتنا ضرور پوچھوں گا کہ کیا آپ کی بیوی کسی اعلا قسم کے میڈیکل سے تیار ہوئی ہیں جن کا کسی سے کوئی مقابلہ نہیں ہے؟ جتنا اعلا حسب نسب ہے ان کا وہ میں بھی اچھی طرح جانتا ہوں۔“ عبداللہ بھی کچھ کم نہیں تھا۔

”غیر واس! میری بیوی کے بارے میں کچھ کہنا تو۔“ ملک اسد اللہ یکدم دھاڑے تھے۔

”تو پھر آپ کون ہوتے ہیں میری بیوی کے لیے کچھ کہنے والے؟ جس روز میرے کہنے پہ آپ نے اپنی بیوی کو طلاق دی اس روز مجھ سے کوئی بات پیچھے گا کوئی حق نہیں ہے آپ کو میری بیوی کے بارے میں کچھ کہنے کا۔ اب ایک لفظ بھی کہنا تو بہت برا ہو گا آپ کے لیے۔“ عبداللہ نے رنگ بدل کے بات کی تھی اور ملک اسد اللہ اور بابا جان کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔

”تم اس لڑکی کی خاطر ہم کو چھوڑ رہے ہو؟“ بابا جان کے لہجے کی کرختگی ہنوز تھی۔

”آپ یہ کیوں نہیں کہتے کہ اس لڑکی کی وجہ سے آپ مجھے چھوڑ رہے ہیں؟“ عبداللہ کے جواب دوہرو ہوتے تھے۔

”ہم نے ہمیشہ اس لڑکی کی جگہ وجاہت علی کی بیٹی کو دیکھا ہے تمہاری دلہن وہی سب سے تو اچھا ہے۔“ انہوں نے اپنے مرحوم بھائی وجاہت علی کا ذکر کیا تھا۔

”جانتا ہوں۔! بڑی اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ آپ کی بھتیجی ہے اسی لیے تو آپ اسے یہاں لانا چاہتے ہیں لیکن بابا جان آپ کو اس معاملے میں بھی مجھ سے مایوسی ہوگی۔ میں اتنا ظالم نہیں ہوں کہ کسی کی اچھی بھلی زندگی تباہ کر کے رکھ دوں۔ مجھے یقین ہے کہ چچا وجاہت علی کی بیٹی جہاں بھی ہوگی خوش ہوگی اور خوشحال زندگی گزار رہی ہوگی میں اس کی زندگی برباد نہیں کر سکتا۔ اگر ایسا کرنا ہی ہوتا تو آج سے پانچ سال پہلے کر لیتا۔“ عبداللہ کا طنز اور خنی بابا جان کو طیش دلا گئے تھے۔

”تو پھر تم یہ بھی بھول جاؤ کہ ہم تمہاری لائی ہوئی اس دو ٹکے کی لڑکی کو قبول کریں گے۔ ہمارے گھر میں نہ تمہارے لیے کوئی جگہ ہے اور نہ ہی اس لڑکی کے لیے۔ اس لیے بہتر ہے کہ جن قدموں پہ کھڑے ہو انہی قدموں پہ واپس لوٹ جاؤ۔ تم ہمارے لیے مر گئے۔ ہم تمہارے لیے مر گئے۔“ انہوں نے توانہما کردی تھی۔

”جو انسان آپ کا مطلب پورا نہیں کرتا وہ آپ کے لیے مری جاتا ہے یہ بات بھی بڑی اچھی طرح جانتا ہوں میں۔“ عبداللہ تلخ سا ہنسا تھا۔

”اسے کہو! ہماری نظروں سے دور ہو جائے چلا جائے یہاں سے نکل جائے اس حویلی سے۔“ بابا جان غصے سے بی بی جان کی طرف دیکھتے ہوئے بلند آواز سے دھاڑے تھے اور ان کی اتنی بلند آواز پہ حویلی کے دیگر مکین بھی ڈرانگ روم میں آگئے تھے جن میں ملک اسد اللہ کے بیوی اور بچے بھی تھے۔

”جار رہا ہوں! اور اس ظلم کدے میں میں رہنا بھی نہیں چاہتا۔ اور نہ ہی میں یہاں رہنے کا ارادے سے آیا تھا۔ یہ مکین گاہ آپ کو مبارک۔“

وہ بھلا کب ہمارے نوالا تھا بابا جان کا دماغ ٹھوم گیا تھا۔

”یعنی تمہارا پلان تھا کہ تم نے یہاں نہیں رہنا؟“ بابا جان سے پہلے ملک اسد اللہ بول پڑے تھے۔

”بے شک میرا پلان تھا۔ لیکن آپ میں دم ہے تو آپ میرا پلان بدل بھی سکتے ہیں میرے پلان کو ناکام بھی بنا سکتے ہیں بس ذرا سی ہمت اور حوصلے کا کام ہے آپ اپنی بیوی کو طلاق دے دیں میں اپنی بیوی کو دے دیتا ہوں پھر آپ کی پسند کی بیوی لاؤں گا اور یہیں ڈنکے رہوں گا آپ کے ساتھ آپ کے شانہ بہ شانہ۔“ عبداللہ کہتے ہوئے اپنی بھابھی کو ایک نظروں دیکھا تھا وہ عبداللہ کی بات پہ سٹپا گئی تھیں۔

”اور ہاں! میں جانتا ہوں کہ آپ کی ایک بیوی نہیں کئی بیویاں ہیں کچھ ایسی جن سے آپ نے شادیاں کر رکھی ہیں اور کچھ ایسی جن سے شادیاں نہیں کیں لیکن میں نے ان کو طلاق دینے کا نہیں کہا میں نے تو آپ کی اعلا حسب نسبا بیوی کو طلاق دینے کا کہا ہے تاکہ آپ کو پتا تو چلے تاکہ آپ نے کس کو طلاق دی ہے؟“

اب سٹپانے کی باری ملک اسد اللہ کی تھی وہ عبداللہ کو کھانچا جانے والی خوشخوار نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

”ملک عبداللہ! بہت غلط کر رہے ہو تم بھائی بھائی کا شریک ہوتا ہے اور تم شریک کو اور شریک (دشمن) بنارہے ہو۔“ ملک اسد اللہ کے لہجے میں عجیب سی دھمکی تھی۔

”میں برٹش امبیسی میں کمپلین لکھوا کے آیا ہوں کہ پاکستان میں قیام کے دوران مجھے میری بیوی کو اور میری بہن کو اگر ذرا سا بھی نقصان پہنچے تو ذمہ دار ملک شرافت علی ملک اسد اللہ اور ملک حق نواز ہوں گے۔ اس لیے میرا شریک بننے سے پہلے سوچ پیچھے گا کہ آپ نے اگر شریک بننا ہے تو کس حد تک بننا ہے؟ کیونکہ میں نے اپنے نقصان کی کوئی بھی معافی نہیں لکھوائی سیدھی سزا کی درخواست کی ہے۔“ عبداللہ نے اسے وارن کر ہی دیا تھا کہ کہیں وہ اپنے ہی زعم اور غصے میں نہ رہیں۔ وہ سارا بندوبست کر کے آیا ہے ”بہن کے ساتھ اب تمہارا کیا علیک سلیک ہے وہ گھر آگئی ہے بس بات ختم۔“ بابا جان چونک کے بولے تھے۔

”بات ختم کہاں ہوئی ہے بابا جان؟ جب میں اس گھر میں نہیں رہ سکتا تو میری بہن بھی نہیں رہ سکتی۔ مجھے آپ سب یہ اب کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ آپ کچھ بھی کر سکتے ہیں آپ راتوں رات اس کی شادی بھی کر سکتے ہیں اور بربادی بھی۔ آپ کے لیے کوئی بھی کام مشکل نہیں ہے۔“ عبداللہ بوے سکون سے کہہ رہا تھا جبکہ ان کا سکون منتشر ہو گیا تھا اور زری کی جان بھی جیسے لٹھی میں آگئی تھی۔

”یہ میری بیٹی ہے۔“ بابا جان نے دانت پیس کر حتمی تھا۔

”آپ کی بیٹی ہے تو کیا آپ کو قتل کا اختیار دے دیا جائے؟“ وہ زیادہ سنگین لہجے میں بولا تھا۔

”میں اس کا قتل بھی کروں تو مجھے کسی کے اختیار کی ضرورت نہیں ہے۔“

”تو اس کا مطلب ہے کہ آپ خدا بن بیٹھے ہیں جس کو کسی کے اختیار کی ضرورت نہیں ہے جو خود ہی اتنا با اختیار ہے کہ کچھ بھی کر دیتا ہے؟“ اس کے جواب پہ وہ لا جواب ہو گئے تھے مگر پیچھے تو کسی نے بھی نہیں ہٹا تھا۔

”زری! اتم اندر جاؤ۔“ ملک اسد اللہ نے اشارہ کیا۔

”زری! اندر نہیں جائے گی بلکہ میرے ساتھ میرے گھر جائے گی۔“ عبداللہ نے روک دیا تھا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟“ وہ دونوں باپ بیٹا تو اور زیادہ بھڑک اٹھے تھے۔

”یہ بھی بوے اچھے طریقے سے ہو گا کیونکہ میرے ساتھ اس وقت پولیس فورس ہے اور پولیس فورس کے ساتھ ایکدم الرٹ میڈیا۔ جو آپ کے ذرا سے ہنگامے اور میرے ایک اشارے کے منتظر ہیں۔ اور اگلے دس منٹ میں آپ کے یہ سفاک اور بے رحم چہرے پوری دنیا کے سامنے ہوں گے اور آپ لوگوں کے وہ کروت بھی سامنے آئیں گے جو آج تک کسی کی بھی نظروں سے نہیں گزرے۔“ عبداللہ کی دھمکی پہ ان کے رنگ بدل گئے تھے۔

”یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ تمہارا گل ہو گئے ہو کیا؟“ بابا جان پھر کر رہے تھے۔

”ہاں! پائل ہو گیا ہوں۔ جب آپ کے پاس میرے لیے کوئی گنجائش کوئی رعایت نہیں ہے تو میرے پاس بھی نہیں ہے جو انسان اپنوں کا اپنا نہیں بن سکتا وہ بے چاری غریب عوام کا اپنا کیسے ہو سکتا ہے؟“ عبداللہ جھمی مکمل اجنبیت سے اتر آیا تھا۔

”ملک عبداللہ! تم حد سے بڑھ رہے ہو۔“ ملک اسد اللہ کا بس چلتا تو عبداللہ کو گولی مار دیتا۔

”آپ نے مجبور کیا ہے مجھے۔“ وہ کندھے اچکا کے بولا تھا۔

”اسد اللہ! گاؤں کی باہر والی سڑک پہ پولیس کی دو گاڑیاں کھڑی ہیں کیا تمہیں پتا ہے کہ پولیس کی گاڑیاں یہاں کیا کر رہی ہیں؟“

ملک حق نواز کہتا ہوا اندر داخل ہوا تھا اور ان سب پہ نظر پڑتے ہی خاموش ہو گیا تھا زری غیر محسوس طریقے سے نگارش کی اوٹ میں ہو گئی تھی کہ ملک حق نواز کی غلیظ اور گندی نظر اس پہ نہ پڑے جبکہ اوہ رہا بابا جان اور ملک اسد اللہ حیرت زدہ سے رہ گئے تھے کہ عبداللہ انہیں محض دھمکی نہیں دے رہا تھا بلکہ سچ کہہ رہا تھا پولیس اور میڈیا ساتھ لے کر آیا تھا۔

”یہ پولیس کی گاڑیاں تو فی الحال ہماری سیکیورٹی کے لیے یہاں آئی ہیں لیکن آپ فکر نہ کریں جس روز آپ کو گرفتار کرنے آئیں گی اس روز وہ نہیں بلکہ چار گاڑیاں آئیں گی۔ آخر اللہ نے ایک روز مومنہ بی بی کا بھی تو انصاف کرنا ہے“ عبداللہ کا رخ اب ملک حق نواز کی طرف تھا بابا جان ٹھنک گئے تھے کہ عبداللہ کو مومنہ بی بی کے معاملے کا بھی علم ہے؟

”میں جانتا ہوں کہ تم یہ سب دل اور شاہ کی شبہ پہ کر رہے ہو۔ اور دیکھو لینا مومنہ بی بی کے اس چکر میں کسی روز میری گولی سے دل اور شاہ مارا جائے گا۔“

”آہ! ملک حق نواز کی بے رحم دھمکی پہ نہ جانے کیسے زری کے منہ سے ایک ہچکی نما آہ نکل گئی تھی کہ نگارش نے یکدم گھبرا کے دیکھا تھا۔

”اور اس روز میری گولی سے ملک حق نواز مارا جائے گا۔ کیونکہ آپ لوگ خود کہتے ہیں قتل کے بدلے قتل اور عزت کے بدلے عزت۔ اور فی الحال تو آپ کسی کی عزت کا قرض ہے۔ جو آپ سے دل اور شاہ ہی وصول کرے گا اور ایسا وصول کرے گا کہ کبھی کسی عورت کو نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھیں گے بلکہ اپنی بیوی کو بھی بہن سمجھو گے آپ“ عبداللہ نے تمسخرانہ انداز میں کہا تھا۔

”ملک عبداللہ!“ اس کی بات پہ ملک اسد اللہ یکدم غرا کے اس کی طرف بڑھا تھا لیکن ملک حق نواز نے اسے دبوچ کر روک لیا تھا۔

”چھوڑو میں انہیں! دیکھتا ہوں میں کہ کیا کرتے ہیں یہ؟“ عبداللہ نے جیب سے ریوالت نکالتے ہوئے اس کا بولٹ چڑھایا تھا۔

اور اس کو ریوالت مانے دیکھ کر بی بی جان زری نگارش کے ساتھ ساتھ ملک اسد اللہ کے بیوی بچے بھی چیخ اٹھے تھے۔

”ملک حق نواز! چھوڑو مجھے۔“

ملک اسد اللہ غرایا تھا۔

”عبداللہ! پلیز چلیں یہاں سے۔ پلیز عبداللہ! ہم لوگ اگر اور یہاں ٹھہرے تو اور زیادہ ہنگامہ ہو گا۔“ نگارش نے روتے ہوئے لپک کر عبداللہ کا بازو تھام لیا تھا۔

”جاؤ بیٹا! چلے جاؤ یہاں سے۔ تمہارا یہاں رکنا ٹھیک نہیں ہے۔“ بی بی جان بھی رو پڑی تھیں۔

اور بی بی جان کو روتے دیکھ کر عبداللہ کے اشتعال و عیسا پڑ گیا تھا اس نے ریوالت والا ہاتھ نیچے کر لیا تھا۔

”ٹھیک ہے جا رہا ہوں! لیکن آپ سب لوگ ایک بات کان کھول کے سن لیں کہ زری کی شادی اس درندے سے کبھی مر کے بھی نہیں ہوگی اس کے ساتھ شادی کرنے سے بہتر ہے کہ میں زری کو خود گولی مار دوں اس لیے آپ لوگ اس شادی کا خیال دل سے نکال دیں تو اچھا ہے باقی آپ کی مرضی۔“

عبداللہ نے جاتے جاتے ایک بار پھر وارن کیا تھا۔

”چلو! اس نے زری اور نگارش کو گلے کا اشارہ کیا تھا۔

وہ دونوں ایک ساتھ چلتے ہوئے باہر نکل گئی تھیں اور زری کو یوں لگا جیسے ملک حق نواز کی چبھتی ہوئی نظریں اس کے ساتھ اس کے پیچھے تک آگئی ہوں۔

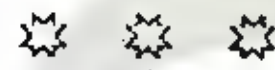
”تم زری کو دنیا کے کسی بھی کونے میں لے جاؤ لیکن شادی اس کی ملک حق نواز سے ہی ہوگی یہ ملک حق نواز کا دعو ہے یاد رکھنا۔“

ملک حق نواز کی آواز پہ داخلی دروازے کی سمت بڑھتے عبداللہ کے قدم یکدم رک گئے تھے۔

”اور جس دن ایسا ہو گا وہ دن یا تو آپ کی زندگی کا آخری دن ہو گا یا میری زندگی کا یا پھر زری کی زندگی کا۔ یہ بھی یاد رکھیے گا۔ اللہ حافظ۔“ وہ کہتا ہوا سب پہ ایک طائرانہ سی نظر ڈالتا ہوا باہر نکل گیا تھا زری اور نگارش پہلے ہی گاڑی میں بیٹھی ہوئی تھیں عبداللہ کے آتے ہی گلاب خان نے گاڑی اشارت کر دی تھی۔

ہر سو اندھیرا پھیل چکا تھا شام سے رات ہو چکی تھی۔ وہ لوگ مسلسل سفر میں تھے۔ انگلینڈ سے لاہور اور لاہور سے اپنے گاؤں اور اب پھر گاؤں سے لاہور کا سفر جاری تھا۔ نیند، تھکن اور ذہنی دباؤ سے برا حال ہو رہا تھا۔ عبداللہ نے تھکے تھکے انداز میں سر سیٹ کی بیک سے ٹکا دیا تھا۔

گلاب خان ان کے آتے ہی ایس بی کامران کو اطلاع دے چکا تھا کہ وہ لوگ باخیریت حویلی سے نکل آئے ہیں تب ایس بی کامران نے پولیس فورس کو واپسی کا آرڈر دے دیا تھا۔ یہ کام انہیں دل اور شاہ نے کہا تھا اور وہ دل اور شاہ کی بات ٹال نہیں سکتے تھے کیونکہ دل اور شاہ بھی ان کے ایسے ایسے کام نکلاؤں تھا جو کوئی اور نہیں کر سکتا تھا اس لیے یہ لین دین تو چلتا ہی رہتا تھا لیکن آج عبداللہ کو دل اور کی وجہ سے خاصی بیک سپورٹ حاصل ہوئی تھی وہ اس کی ذہانت اور داؤ پیچ کا معترف ہو گیا تھا۔



وہ آج کافی لیٹ گھر آیا تھا۔

گاڑی کے ہارن پہ زلفی نے گیٹ کھولا تھا اور وہ گاڑی اندر لے آیا تھا زلفی گیٹ بند کر کے بھاگتا ہوا اس کی گاڑی کے قریب آیا تھا۔

”سلام صاحب!“ زلفی کے انداز کی طرح اس کا سلام بھی بڑا پر جوش قسم کا ہوتا تھا۔

”سلام! کیسے ہو؟ خیریت؟“ دل اور گاڑی سے اتر آیا تھا۔

”جی صاحب! خیریت ہی ہے“ وہ گلاب خان نہیں آیا آپ کے ساتھ؟“ زلفی نے دل اور کو اکیلے دیکھ کر استفسار کیا تھا۔

”گلاب خان کسی کام سے گیا ہوا ہے اس نے فون پہ بتایا نہیں تھا تم لوگوں کو؟“ وہ اپنا بریف کیس نکال کے اندر کی طرف بڑھا۔

”بتایا تو تھا لیکن میں سمجھا کہ آپ کے ساتھ ہی کام سے گیا ہو گا۔“ زلفی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

”نہیں۔! میرے ساتھ نہیں، میرے دوست کے ساتھ گیا ہوا ہے۔“
”آپ کا دوست جو آج انگلینڈ سے آیا ہے؟“ زلفی کو دل آور سے باتیں کرنے کا شوق تھا اسی لیے بات کو طول دیتا تھا۔

”ہاں وہی۔! دل آور کہہ کے سیڑھیوں کی سمت بڑھا تھا۔“
”کھانا کھائیں گے؟ گل کو بلاؤں؟“ اس کے پوچھنے پہ دل آور سیڑھیاں طے کرتے ہوئے ٹھہر گیا تھا اور پلٹ کر زلفی کو دیکھا جو سیڑھیوں کے پاس کھڑا تھا۔

”گل تمہاری کیا لگتی ہے؟“
”جی۔! بس۔“
”تم سے بڑی ہے کہ چھوٹی؟“

”جی۔! بڑی ہے۔“
”تو تمہیں اس کو کیا کہنا چاہیے؟“
”جی۔! باجی۔“ زلفی نے اس کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے سر جھکا لیا تھا۔

”تو پھر؟“
”معافی چاہتا ہوں صاحب۔! غلطی ہو گئی ہے، میں انہیں گل باجی ہی کہتا ہوں بس ویسے ہی منہ سے پھسل گیا تھا۔“ اس کے انداز پہ دل آور مسکرا دیا تھا۔

”اوکے۔! لیکن دھیان سے رہا کرو یا ر۔! اتنے بدحواس کیوں ہو جاتے ہو؟“
”جی نہیں صاحب۔! مجھے کیا ہو جاتا ہے؟“ زلفی سر کھجاکے رہ گیا۔
”ٹھوڑے اور ذمہ دار ہو جاؤ میں تمہیں اپنے ساتھ رکھا کروں گا؟“

دل آور پلٹ کے دوبارہ سیڑھیاں طے کرنے لگا۔
”سچ کہہ رہے ہیں صاحب؟“ وہ پیچھے سے چکا تھا۔
”ہاں دل کے سوا میں کسی کو جھوٹی تسلیاں نہیں دیتا۔“ وہ سر جھٹک کر کتا سیڑھیاں طے کر گیا تھا اور زلفی کی خوشی کا ٹوٹو کوئی ٹھکانہ ہی نہیں تھا گل سامنے ہوتی تو وہ اسے بھی ضرور بتاتا۔

☆☆☆

میرے باپ کا اونچا محل
میرے ساجن کی گلیاں تنگ
میں پھولوں کی رہنے والی
مجھے ماما ہے کانٹوں کا سنگ

وہ اپنے گمشدوں کے ارد گرد دونوں بازو پیٹے دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی بے آواز آنسوؤں سے رو رہی تھی اور اس کے قریب ہی فرش پہ بیٹھی گل اسے چپ کروانے اور تسلیاں دلا سے دینے میں مصروف تھی۔ گل آج ذرا فارغ تھی اس لیے شام سے ہی علیزے کے پاس آکر بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے بیٹھنے میں کتنا نام گزر گیا تھا اس کی دونوں کوئی خبر نہیں تھی۔

”دیکھو بی بی جی۔! یہ وقت اللہ نے شروع سے ہی آپ کی قسمت میں لکھ دیا تھا یہ وقت آپ نے دیکھا ہی تھا اس لیے اس طرح رونے دھونے سے کیا ہو گا؟ ہونا تو وہی ہے جو ازل سے لکھا جا چکا ہے۔“ گل بار بار اسے سمجھا

”دیکھو بی بی جی۔! یہ وقت اللہ نے شروع سے ہی آپ کی قسمت میں لکھ دیا تھا یہ وقت آپ نے دیکھا ہی تھا اس لیے اس طرح رونے دھونے سے کیا ہو گا؟ ہونا تو وہی ہے جو ازل سے لکھا جا چکا ہے۔“ گل بار بار اسے سمجھا

راہی تھی۔
”لیکن مجھے کم از کم پتا تو چلے کہ میرے ساتھ یہ سب کیوں ہوا ہے؟ یہ سزا کس گناہ کی سزا ہے؟ مجھے کیوں اس قبر میں اتار دیا گیا ہے؟ وہ مجھے بتانا کیوں نہیں؟“ علیزے روتے روتے اچانک چیخ اٹھی تھی اور پھر اچانک ہی اس کی چیخ حلق میں ہی پھنس گئی تھی اور وہ ایک بل کے لیے خوف سے کانپ کے رہ گئی تھی بیسٹ کی سیڑھیوں کے پاس ہی دل آور شاہ کھڑا تھا جس کو دیکھ کر گل کے ہاتھوں کے توتے بھی اڑ گئے تھے وہ بھی لرز اٹھی کیونکہ اس کے تیور بہت سنجیدہ تھے۔

”سلام صاحب۔! گل بمشکل بہت مجتمع کرتی ہوئی اٹھی اور اسے سلام کرتے ہوئے سیڑھیوں کی سمت بڑھ گئی دل آور نے شخص سر ہلانے پہ اکتفا کیا تھا اور گل دل ہی دل میں علیزے کی خیریت کی دعا مانگتی ہوئی وہاں سے چلی گئی تھی۔

دل آور خاموشی سے اسے دیکھتا ہوا ذرا فاصلے پہ رکھی کرسی کھینچ کر عین اس کے سامنے لے آیا تھا اور اس کے سامنے کرسی رکھ کے اس کے روبرو بیٹھ گیا۔ وہ اس کے سامنے دیوار سے ٹیک لگائے نیچے زمین پہ بیٹھی ہوئی تھی دل آور کی کٹ داڑ آکھیں اسی کو اپنے حصار میں لیے ہوئے تھیں اور علیزے سر سے پاؤں تک جل اٹھی تھی۔

اس کے چہرے کے ناگوار تیور دیکھتے ہوئے دل آور نے اپنی نظریں پھیلی تھیں اور جیب سے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر نکالتے ہوئے سگریٹ سلگا لیا تھا۔

”اگر میں تمہیں بتا دوں کہ تمہارے ساتھ یہ سب کیوں ہوا ہے؟ یہ سزا کس گناہ کی سزا ہے؟ اور تمہیں کیوں اس قبر میں اتار دیا گیا ہے تو مجھے یقین ہے کہ تم جس زمین پہ بیٹھی ہو اسی زمین میں سما جاؤ گی جو اذیت میں سہہ رہا ہوں وہی اذیت تم سہہ لو یہ کبھی ہو ہی نہیں سکتا سنو گی تو مر جاؤ گی اور میں تمہیں وقت سے پہلے نہیں مارتا چاہتا۔“

دل آور نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے دھواں فضا میں چھوڑا اور نظروں کا زاویہ دوبارہ علیزے کی سمت بدل لیا تھا۔

”لیکن میرا کیا گناہ ہے آخر؟“ اس کی آواز پھر سے بھرا گئی تھی۔
”ہو نہ ہو۔! اس کے سوال پہ دل آور طنز سے ہنسا تھا۔

”اس دنیا میں تمہارا صرف ایک ہی گناہ ہے کہ تم وقار آفتدی کی بیٹی ہو۔ بس اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔“
اس کا فیصلہ دو ٹوک تھا کافی سکون اور اطمینان بھرا۔

ادارہ خواتین کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت اور

☆ تتلیاں، پھول اور خوشبو راحت جیبیں قیمت: 225 روپے

☆ بھول بھلیاں تیری گلیاں فائزہ افتخار قیمت: 500 روپے

☆ محبت بیاں نہیں لینی جدون قیمت: 250 روپے

32216361 فون۔ کراچی۔ اردو بازار۔ 37۔ مکتبہ عمران دانش

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی ویب سائٹ

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہر ای ٹیک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای ٹیک کا پرنٹ پریویو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی پیمنٹنگ اور ایجنٹ پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی سب کی مکمل رینج
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای ٹیک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں ایلوڈنگ
- ☆ سیریم کوالٹی ہارڈ کاپی، کمپیوٹر ڈاٹا
- ☆ عمران سیریز اور مظہر کلیم اور
- ☆ ابن صفی کی مکمل رینج
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

ماہانہ ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فوراً سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

”تمہاری میرے پیار کے ساتھ کیا دشمنی ہے؟“ وہ اس سے ڈری ہوئی تھی اتنی کہ دل اور ٹانگ پہ ٹانگ چڑھانے کے لیے سیدھا ہوا تو اس کی چیخ نکل گئی وہ اس کے ایک تھپڑ سے ہی خوف زدہ ہو چکی تھی۔
”وہ سوال نہ کرو کہ جن سے تمہارا اور میرا یوں آنے سامنے بیٹھنا بھی محال ہو جائے۔“ دل اور نے اسے ٹوکا تھا۔

”پلیز ڈرائیو۔! میں۔! میں۔! تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ پلیز مجھے یہاں سے جانے دو مجھے میرے گھر جانے دو۔ میں یہاں نہیں رہ سکتی۔ مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ مجھے نیند نہیں آتی۔ میں سو نہیں پاتی۔ پلیز مجھے جانے دو۔“ علیزے کہتے ہوئے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی تھی۔ دل اور نے اس کے اس طرح رونے پر خفگی سے سر جھٹکا تھا۔

”تو چلی جاؤ۔ تمہیں روکا کس نے ہے؟ سارے دروازے کھلے ہیں تم جب چاہے جا سکتی ہو میں نے تمہارے پیروں میں زنجیریں تو نہیں ڈال رکھیں؟“ دل اور نے بڑی لاپرواہی کا اظہار کیا تھا۔

لیکن علیزے اس کی لاپرواہی کا مفہوم بھی اچھی طرح سمجھتی تھی اسی لیے تو اپنی بے بسی پہ اور زیادہ رونا آیا تھا۔ وہ اور زیادہ روئی تھی۔

اور اس سے پہلے کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے مزید کچھ کہتے اچانک دل اور کے سیل پہ وابھرشن ہونا شروع ہو گئی تھی یہ کال گلاب خان کے نمبر سے تھی۔
”السلام علیکم۔!“

”وعلیکم السلام صاحب۔! کافی دیر سے فون کر رہا ہوں مگر کال ہی نہیں مل رہی تھی۔“ گلاب خان شاید ساتھ ساتھ ڈرائیو بھی کر رہا تھا۔

”میں ہسپتال میں ہوں شاید اس لیے۔“

”آپ کی آواز نہیں آرہی صاحب؟“

”مجھے تمہاری آواز صاف سنائی دے رہی ہے تم کو کیا کہنا ہے۔“

دل اور سگریٹ بوٹوں تلے مسل کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”ہم لوگ واپس آرہے ہیں۔“

”چھ۔! کون کون آرہے ہو؟ سب خیریت ہے نا؟“

”صاحب۔! کچھ سنائی نہیں دے رہا۔“ گلاب خان خاصی اونچی آواز میں بولا تھا۔

”ارے یا۔! میں پوچھ رہا ہوں کہ عبداللہ اور زری وغیرہ ٹھیک ہیں؟ سب خیریت ہے نا؟ کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی؟“ اس نے اب باقاعدہ نام لے کر اور دہرا کے پوچھا تھا۔ جس پر علیزے نے روتے روتے چونک کر دیکھا تھا۔

”عبداللہ اور زری؟“ علیزے کے ذہن میں جھماکا ہوا تھا یہ نام اس کے لیے اجنبی نہیں تھے یہ نام تو آسیہ آندی کی زبان سے اس نے کئی بار سنے تھے۔

”بھروسہ! میں ہسپتال سے باہر جاتا ہوں۔“ دل اور کہتا ہوا سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا تھا اور علیزے کے یکدم کسی سے باہر آئی تھی۔

”ڈرائیو۔! کو میری بات سنو ڈرائیو پلیز۔“ علیزے بمشکل گرتے پڑتے اٹھی اور اس کے پیچھے بھاگی تھی لیکن اتنے میں وہ باہر جا چکا تھا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ کریں)

محبوبہ بارہ شہیں سیکھا اس کی ماں بھولی شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پر بہت محروم رہا اور اس کا یقین وہ وہی رہا کہ وہ بڑی ہوگی۔

۲۴ چوبیسویں قسط



نبیلہ غنیز

دردِ دل

بڑی بھولی کے تمام یکن وقار آئندہ سے ہواں عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیحدہ تو اپنے باپ کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

ہمید اور نبیلہ حیات دینی بہن بھائی ہیں نہ جہ انسانی بھولی اور خود مراد کی ہے اور ان کی زندگی رشتہ داری میں مکمل ہو رہی ہے۔ رنگ بھٹی ہے جس کے پیش نظر جائزہ دیکھ نبیلہ کو پاکستان شفقت دے گا مشہور ہو رہی ہیں انہیں جہ پاکستان جانے سے انکار کر رہی ہے جس پر نبیلہ اور فائزہ دیکھ رہے ہیں۔

زہری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر رہنا پسند کرتا ہے۔

بہن کا کافی عرصہ سے غرض کی تلاش میں ہے مگر ہر روز مایوسی اور ناامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا ہے۔ اب بھی اور مجبور بنی سے تنگ آخر خود کشی کرنے کا سوچتا ہے لیکن ایسے میں ایک روز اسے دعا ہے میں چائے پیتے ہوئے پاؤں اٹھا کر مل جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے اسی خوشی میں وہ کام کی بات پر مٹھا بھال جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور تینک پاس آدمی ہے اور مبارک خان کے توسط سے بھولی میں وقار آئندہ سے نوکری مانگنے آتا ہے وقار آئندہ کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ واپس سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

بارہ شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے اور اپنے قول و فعل کا بہت بڑا قوی ہے اس نے



رات خاصی گہری اور تاریک ہو چکی تھی جب ان کی گاڑی دوبارہ پور کی حدود میں داخل ہوئی تھی۔
زندہ داناں شہر جاگ رہا تھا اور زندہ دل شہر کے زندہ دل باسی جاگتے اور رنج و گماں و دھام سے مٹانے میں
مصروف تھے اور اس رنج و گماں کی رویتیں ریڈ لائٹ امیرات شرفائی گلیوں تک اپنے عوٹ پہ گھس اور سڑکوں
جا بھا بکھرے مناظر دیکھنے سے محنت رکھتے تھے۔

کوئی اور وقت ہوتا تو نگارش ان مناظر کو حقیقتاً دلچسپی سے دیکھتی اور انجوائے کرتی کیونکہ وہ پہلی بار پاکستان
تھی اور پہلی بار یہ سب دیکھ رہی تھی لیکن افسوس کہ اس وقت ان کے دل بے سکون اور مایوس نظر آتے تھے
نگارش کے ساتھ ساتھ زری اور عبداللہ کا بھی یہی حال تھا سوچیں گہری اور ابھری ہوئی گلیوں اور ان کی سڑکوں کے
دوران ساری رویتیں اور سارے مناظر دیکھ چکے تھے اور ان کی گاڑی اپنے گھر کے سامنے آئی گئی عبداللہ
نے چونک کر دیکھا تھا۔

گھر واپس لوٹنے پر عبداللہ نے فریاد اٹھائی کہ اس نے خرید لیا تھا اور اس نے اس گھر کی حسب ضرورت تھوڑی سی
وغیرہ گروائی تھی اور ملازم بھی رکھے تھے عبداللہ تو اس گھر کو پہلی بار دیکھ رہا تھا اور پہلی نظر دیکھ کر ہی اسے اندازہ
ہو گیا تھا کہ بیٹھ کی طرح دل توڑ کا یہ انتخاب بھی شاید ار تھا گھر کی خوبصورتی رات کے اندھیرے اور مٹے ہوئے
روشنیوں میں بھی اجاگر ہو رہی تھی۔

عبداللہ نے دل ہی دل میں سراہا تھا اور اتنے میں گلاب خان کے ایک ہی ہارن پہ کیٹ فوراً کھل گیا تھا اور
گاڑی سبک رفتاری سے آگے بڑھتی اندر پورے گھر میں آرکی گئی جہاں دل اور شاہ کی سرگ پہلے سے موجود تھی۔
کا مطلب تھا کہ وہ ان کا انتظار کر رہا تھا۔

"دل تو رہیں ہیں؟" عبداللہ کو حیرت ہوئی تھی۔ "جی۔! صاحب بیس ہیں وہ سامنے بیٹھے آپ کا انتظار
کر رہے ہیں۔" گلاب خان نے لان کے بائیں طرف اشارہ کیا تھا جہاں ایک ٹیبل اور چار کرسیاں چھپی
تھیں اور انہی میں سے ایک کرسی پہ دل اور شاہ بیٹھا تھا۔ "اے! بھاری وجہ سے وہ بھی بے آرام ہو رہا ہے۔
عبداللہ شرمندگی اور افسوس سے کہتا گاڑی کا دروازہ کھول کے نیچے اتر گیا تھا اور اس کے پیچھے زری اور نگارش
بھی اتر آئی تھیں۔

"مبارک ہو۔! بچے کے آگئے ہو۔" دل اور مسکراتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ "تم نہ ہوتے تو
آسکتا تھا بچے کھاگ شکاری تھے۔" عبداللہ نے اعتراف کیا تھا۔

"بابا! مجھے پہلے سے ہی پتا تھا کہ بڑے کھاگ شکاری ہیں اسی لیے میں ہمیشہ ایسے کھاگ شکاریوں کو
رہتا ہوں جن کو لکنا بھی مشکل ہو جائے اور اگلا بھی اور آج تم بھی ان کے لیے ایسا ہی شکار ثابت ہوئے ہو۔
تکلیف ہوئی ہوگی ان کو۔ دانت کھنکھا کے رہ گئے ہوں گے؟" دل تو عبداللہ کے اعتراف پہ قہقہہ لگا کر
اور زری کی جان لے گیا تھا اس کے قہقہے پہ ختم سی گئی تھی اور نظریں نمائی پھر اس کے دیدار کے لیے اس
ذات کی ہر کشت پہ جا بیٹھی تھیں اور اپنا خالی اور عاجت منہ دامن پھیلا دیا تھا۔

وہ سفید شلوار سوٹ میں لمبوس اپنے پورے قد سے کھڑا عبداللہ سے مخاطب زری کے دل کو اس کی ہر
سمیت سنا کے رکھ گیا تھا وہ دیکھتی رہی تھی اس کے چہرے کی رنگت دکھ رہی تھی وہ صاف ستھرا اور فریش
آ رہا تھا اس کی صحت بھی پہلے سے کافی اچھی محسوس ہو رہی تھی وہ شلوار سوٹ سے کم پہنتا تھا مگر جب
اسے بست سوٹ کرتا تھا اس کی برساتی گریس فل اور شاندار رنگت لگتی تھی ایسے میں اس کے مقابل
اسے دیکھنا زری کے لیے بہت مشکل ہو جاتا تھا اس وقت بھی کچھ بھی حال تھا وہ بھی شکلوں سے دل کھاندا
دل کڑا کر کے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس صورت پہ تو وہ قریان تھی۔ وہ آخر کیوں نہ دیکھتی؟ وہاں کے سامنے

کھڑا تھا اور کچھ دیکھ کر دل ہی نہیں بھرنا تھا تو وہ کیا کرتی؟ مجبور تھی اسے دیکھنے پہ اسے چاہیے اور مجبور کرنے والا
اس کا شوق تھا۔ منہ زور اور بے لگام جھول اور شاہ کی سمت ہی سر نہ بھاگے جا رہا تھا جسے یہ بھی پروا نہیں تھی کہ
اگر راستے میں ٹھوکر کھا کے گرا تو چوٹ کتنی گہری آئے گی؟ سبھل بھی پائے گا یا نہیں؟ اور زری بھی شوق کی ریت
سوار تھی جس طرف بھی لے جاتا اس نے توجہ نہ دیا تھا۔ مجبور ہو گئی لیکن اس وقت تو وہ کچھ زیادہ ہی مجبور گئی اتنی
کہ عبداللہ سے بات کرنا دل توڑ بھی محسوس کر رہا تھا لیکن اس نے زری کی سمت دیکھ کر اسے نزوس نہیں کیا تھا
بس اپنے دھیان میں بات کرنا رہا اور اپنے دھیان میں کھولی رہی تھی۔ "زری! نگارش بھی اس کی محبت
بجانب بھی گئی ای لے اسے ڈو کا دیا تھا۔

"آف! میرا بے زری۔ جب بھی کم بخت دل میرا بے ہونے کی کوشش کرتا ہے زری کی یہ پکار ہمیشہ خلل
دل دیتی ہے۔" وہ دل ہی دل میں جھنجھلا کے رہ گئی تھی۔

"پتہ! ہم اندر چلتے ہیں۔" نگارش نے اندر کی سمت اشارہ کیا تھا جس پہ عبداللہ اور دل کو بھی متوجہ ہوئے
تھے۔

"ٹھیک ہے یار۔! آپ لوگ آرام کریں میں بھی اب چلتا ہوں کافی ٹائم ہو رہا ہے۔" دل تو نے اپنی مضبوط
کلائی پہ بندھی گھڑی سے ٹائم دیکھتے ہوئے اجازت چاہی تھی۔

"آرے! اتنی جلدی کیوں؟ کچھ بیرونی مضمون۔" عبداللہ کو اس کے اجازت طلب کرنے پر اچھا ہوا تھا۔
"نہیں یار۔! صبح کورٹ بھی جانا ہے اور ابھی ایک فائل۔ کام بھی کرنا ہے اور ٹائم کی کھجور ات کے باوجود رہے
ہیں اس لیے اب چلنا چاہیے تم بھی ٹھیک گئے ہو کے کھانا کھاؤ اور اب آرام کرو! پانی باتیں بعد میں ہوں گی
لی۔" اس نے عبداللہ سے اذیتاں باتھ لایا تھا اور اسے تسلی دی تھی۔

"اوکے! اپنے تمہاری مرضی۔" عبداللہ نے سر ہلایا تھا اور دل تو رخدا حانہ کھتا ہوا وہاں سے جانے کے لیے
پلٹ گیا تھا لیکن زری اور نگارش کے پاس سے گزرتے ہوئے اس کے قدم ٹھکے تھے زری کے لمبوس سے اٹھتی
"گائٹ فرینڈ" کی خوشبو نے اسے اپنا آپ یاد دلایا تھا۔ گھریل اور وہاں ٹھہرا نہیں تھا کیونکہ اس کے وہاں ٹھہرنے کا
کوئی جوا نہیں بنتا تھا۔ اس لیے وہ بغیر رگے آگے پیچھے گیا تھا۔

"صاحب! میں بھی چلوں؟" چونک کر اس کے پاس بیٹھا گلاب خان اسے دیکھ کر قریب آ گیا تھا۔ "عبداللہ! دل
تو نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے رک کر آواز دی تھی۔

"تھم جناب۔" عبداللہ بھی بی جان سے متوجہ ہوا تھا۔
"مجھے اپنے ذرا تیور کو ساتھ لے جانے کی اجازت ہے یا نہیں؟" کافی عاجزی سے پوچھا گیا تھا۔

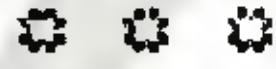
"تو میرے پاس کون رہے گا۔" عبداللہ کو پریشانی ہوئی تھی۔
"آس پاس خواتین نہ ہوں تو میں تمہیں بتاؤں کہ تمہارے پاس کون رہے گا۔" دل تو کا مسکراتا ہوا وہاں سے
لبہ عبداللہ کو اس کی بات کا مفہوم سمجھا گیا تھا جس پہ عبداللہ بیٹھا گیا تھا۔

"دل تو! ابھی تو شرم کر لیا کرو۔" اس نے سرزنش کی تھی۔
"شرم ہی تو کی ہے۔" دل تو رہتا تھا۔

"اوکے! اوکے! اجاؤ اب اور اپنے ذرا تیور کو بھی لے جاؤ! لیکن گاڑی چھوڑ جانا۔" عبداللہ نے جان چھڑائی
تھی۔

"اوکے! جناب! اللہ حافظ۔" دل تو مسکراتے ہوئے کہہ کر گاڑی کی فرٹ میٹ پہ بیٹھ گیا تھا اور گلاب خان
نے ذرا تیور تک میٹ سنبھال لی تھی۔ اس کی وہ گاڑیاں تھیں صرف اور براؤن۔ جن میں سے وہ اپنے استعمال میں

"ٹھیک ہو جائیں گے انشاء اللہ جلدی ٹھیک ہو جائیں گے آپ دعا کریں بس۔" مبارک خان نے آگے بڑھ کر سائیڈ ٹیبل پر رکھا سوپ والا باؤل اٹھایا اور ان کے بیڈ کے قریب کرسی بھیج کے بیٹھ گیا تھا اور انہیں خود سوپ پلانے کا تھا اور ساتھ ساتھ نشو سے ان کا منہ بھی صاف کرتا جا رہا تھا اور آسیہ آندھی اس کی اتنی اپنائیت پہ دیکھ کے رہ گئی تھیں۔ حالانکہ یہ کام اس کی ملازمت کا حصہ نہیں تھا مگر پھر بھی یہ سب کر رہا تھا اسی لیے آسیہ آندھی کو ان کمرے وقت میں اگر کسی کی وضع داری اور خلوص پہ یقین آیا تھا تو وہ صرف مبارک خان تھا۔



وہ آج بہت نوبل بعد جیڑی سے ملنے کے لیے آئی تھی اور جیڑی اسے دیکھ کر مت خوش ہوا تھا۔
 "واہ! مین نی؟" اس نے اپنے روم کا دروازہ کھولتے ہوئے اچانک خوشی کا اظہار کیا تھا۔ "کیسے ہو؟" مدحیہ نے اندر داخل ہوتے ہوئے کافی سنجیدگی سے پوچھا تھا۔
 "ٹھیک: دوں قیقا" اس نے دونوں بازو پھیلاتے ہوئے اپنے ٹھیک ہونے کا ثبوت دیا تھا۔
 "کیا ہو رہا تھا؟" مدحیہ پورے روم میں اک طائرانہ سی نظر پڑاتے ہوئے صوفے پہ بیٹھ گئی تھی۔
 "جھٹ: ہو رہی تھی۔" جیڑی نے لیپ ٹاپ کی سمت اشارہ کیا تھا جو صوفے کے سامنے ہی ٹیبل پہ رکھا تھا اور اس کی اسکرین روشن تھی۔
 "کس سے جھٹ ہو رہی تھی؟"

مدحیہ نے لیپ ٹاپ کا سرخذر اسکرین پر مت موڑتے ہوئے پوچھا تھا۔
 "دیکھو! کس سے ہو رہی تھی۔" جیڑی اور مدحیہ جوں کا توں اٹھا کر کھولتے ہوئے مدحیہ کے برابر ہی صوفے پر آہٹیا تھا اور ایک فن مدحیہ کی سمت بوجھ رہا تھا۔ برائن کرسٹینا اور مائیکل چارول بیک وقت فن لائن تھے مدحیہ انہیں ان لائن دیکھ کر مت خوش ہوئی تھی اور پھر بے ساختہ ہی اس کی انگلیاں کی پیڑ پہ حرکت کرنے لگی تھیں اور فوراً ہی اسے ان کے لہلائی موصول ہونا شروع ہو گئے تھے۔
 "کیسی ہو میڈی؟ پاکستان کیسا لگا؟" یہ سوال کرسٹینا کی طرف سے آیا تھا۔
 "میں بھی اچھی ہوں اور پاکستان بھی اچھا ہے۔" مدحیہ نے مسیح کے جواب میں ایک اسمائل کا آئی کون بھی پاس لیا تھا۔

"اچھا۔ جس کر حیرت ہوئی۔" فوراً پہلائی آیا تھا جس کے ایڈ میں ایک حیرت زدہ سا آئی کون لایا تھا۔
 "حیرت کس لیے ہوئی؟" مدحیہ نے تعجب کا اظہار کیا تھا۔ "کہ پاکستان اچھا کب سے ہو گیا ہے؟" کرسٹینا نے پھر استہزاء سے سا کر کٹر سٹڈ کیا تھا۔

"جب سے محبت ہوئی ہے۔" مدحیہ یہ جملہ ٹائپ کرتے ہوئے ذرا سا جمبکی تھی لیکن پھر سٹڈ کر رہی دیا تھا۔
 "محبت؟" کرسٹینا نے اس لفظ کو کافی لمبا کھینچ کے لکھا تھا۔
 "بال۔ محبت۔" مدحیہ نے اقرار کیا تھا۔

"کس سے۔؟" جیڑی سے؟" کرسٹینا کے اگلے سوال یہ مدحیہ ٹھیک تھی۔ اس کی انگلیوں کی حرکت مدحیہ پر مبنی تھی۔ مدحیہ نے اک نظر اپنے قریب جیڑی کو سر ہٹا دیا تھا وہ اس وقت ٹائٹ ڈریس میں تھا ہنسنوں تک شارٹ پنڈٹ ڈاؤر اور وائٹ ساہی شے گریبان کی بی شرٹ میں لمبوس ڈھیلے ڈھالے لاہور انڈاز میں بیٹھا جوں سے مائل فرما رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن کی اسکرین پہ مدحیہ عمر کی شبیہ لڑائی تھی جو چند روز پہلے ورکشاپ کے گرد آہ اور کانٹھ کہاڑ والے ماحول میں بھی ان کے مقابل کسی پرانی کرسی پہ بیٹھا اس کے ساتھ

زیادہ تر صرف ہی رکھتا تھا اور پراڈ بھی کبھی استعمال میں آتی تھی اس لیے اسے جب عبد اللہ آیا تھا تو اس کے پاس فی الحال کوئی گاڑی نہیں تھی اس لیے ملے پر اڈا اس کے لیے بھیج دی تھی کہ جب تک عبد اللہ گاڑی لے لیتا تب تک اسی کے استعمال میں رہتی جبکہ عبد اللہ کا دل چاہ رہا تھا کہ گلاب خان بھی اسی کے پاس رہے۔
 ناممکن ہی بات تھی کیونکہ گلاب خان دل تو کراہت خاص آوی تھا اس لیے وہ زیادہ دیر اسے نہیں بھروسہ کرتا تھا لہذا اپنے ساتھ لے کر ہی رخصت ہوا تھا۔



اداخل دمبر کے دن تھے۔

موسم بھی لوگوں کے مزاج کی طرح ہونے لگا تھا اور ہوا تیار رہا تھا راتیں لمبی اور دن چھوٹے ہو چکے تھے۔ جون جولائی تو جیسے کسی جمود کا شکار تھی جہاں یوں محسوس ہوتا تھا کہ پندرہ نومبر کی بجائے کلا وقت ہی بیٹھ بیٹھ کے لیے تھا ہونے آگے بڑھ رہا تھا اور نہ پیچھے سرک رہا تھا جس اس ہونے میں یہ فرق آیا تھا کہ وقار آندھی ہسپتال سے ہسپتال ہو کر گھر آگئے تھے اور اب آسیہ آندھی کی آنائش کا وقت شروع ہو چکا تھا کیونکہ وقار آندھی اب اللہ کی ذات کے بعد صرف آسیہ آندھی کے رحم و کرم پہ ہی تھے اور وہی ان کی دیکھ بھال کر رہی تھیں سفاح کے مریض و مریضوں زیادہ تکلیف ہوتی تھی اس لیے ان کا زیادہ خیال رکھنا پڑ رہا تھا اور آسیہ آندھی تو چار دن میں ہی ٹھکنے لگی تھیں شاید اس لیے کہ ان کے سینے بہت زیادہ غم کا بوجھ تھا۔ جی کا غم اور شہر کا غم۔ دونوں غم ہی امتداد کے تھے وہ اس سے بے حال ہو چکی تھیں۔ سہ قس پارسی تھیں اسی لیے بات بات پہ رو پڑتی تھیں۔ اس وقت بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا وقار آندھی کے لیے چکن سوپ بنا کر لائی تھیں لیکن وہ بندہ لے گئے تھے اور آسیہ آندھی سے ان کو اٹھانا انہیں تکلیف کے سارے نیک لگا کر بٹھانا مشکل ہو گیا تھا انہوں نے لاکھ کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی تھی اور اسی بے بسی پہ ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے وہ رو پڑی تھیں۔

"ارے بیگم صاحبہ! کیا کر رہی ہیں آپ؟ لائے میں کمرتا ہوں۔" مبارک خان دروازے پہ دستک دے کر اندر داخل ہوا تھا اور آسیہ آندھی کو بے حال ہوتے دیکھ کر لپک کے قریب آیا تھا۔ آسیہ آندھی روتے ہوئے پیچھے ہٹ گئی تھیں اور اچھے خاصے صحت مند مبارک خان نے فوراً ہی وقار آندھی کو سارا دے کر انہیں سے نیک لگا کے بٹھا دیا تھا۔

"پلیز بیگم صاحبہ! آپ روم میں مت مبراور حوصلے سے کام لیں۔ آپ حوصلہ رکھیں گی تو صاحبہنی بھی ٹھیک رہیں گے اس طرح روتے سے تو آپ خود بھی بیمار پڑ جائیں گی اور آپ کو یہ ہے کہ صاحبہنی کو آپ کی ضرورت ہے آپ بیمار نہیں تو ان کو کون سنبھالے گا؟" مبارک خان ایک تجدد اور وقار ملازم تھا اسے پتہ تھا کہ وقار آندھی پہ تن قل مشکل وقت تھا۔ اس لیے وہ ان کے اس مشکل اور کمرے وقت میں ان کا برابر کا شریک تھا ان کے ساتھ ایک ملازم کی طرح نہیں بلکہ ایک ساتھی کی طرح پیش آ رہا تھا اس وقت بھی اسے کوئی کام نہیں تھا صرف ان کی خاطر وہاں آیا تھا لیکن آسیہ آندھی کو دیکھ کر بہت افسوس ہوا تھا اسی لیے گھر کے ایک قلم اور ایک فیملی ممبر کی طرح انہیں سنبھالنے کی کوشش کی تھی لیکن اس سنبھالنے میں بھی ایک عزت تھی احرام تھا عقیدت تھی جس کی وجہ سے اس کی نظریں جمی ہوئی تھیں وہ سر جھکا کے بات کر رہا تھا۔

"مبارک خان! ان سے کمر جلدی ٹھیک ہو جائیں مجھ سے ان کی یہ حالت برداشت نہیں ہو رہی ہے۔ ٹھیک نہ ہوئے تو مجھے کچھ ہو جائے گا۔" آسیہ آندھی ہلکا سا ہنسی ان کا حلق آنسوؤں کے بوجھ سے بے بند ہو رہا تھا۔

چائے پیتے ہوئے بھی کافی بیانت دار اور پرکشش لگ رہا تھا۔ ان دنوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ رہن سہن کا بھی اور آسٹینس کا بھی۔

اور مدحیہ نے ان میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا اور یہ فیصلہ یہ انتخاب اس کے لیے مشکل نہیں تھا کیونکہ اس کا دل بہت پہلے ہی آسٹینس بند کر کے عدلیہ میں مکر کا انتخاب کر چکا تھا۔ بس مشکل یہ تھا اس انتخاب کا اظہار کرنا۔ لیکن یہ بھی نہ کبھی ذکر مانی تھا تو پھر کر سٹینا کے سامنے ہی سہی۔

مدحیہ نے کمری سانس کھینچی اور سامنے اسکرین کی سمت دیکھا تھا۔

"جیڑی۔؟" کرسٹینا دوبارہ پوچھ رہی تھی۔

"نہیں۔" اس نے سینڈ کری دیا تھا۔

"تو پھر کس سے؟"

"ایک پاکستانی سے۔"

"پاکستانی سے؟"

"ہاں۔ پاکستانی، محنت اور مزدوری کرنے والا پاکستانی، اپنا حق من مارنے والا پاکستانی، محبت اور عزت کرنے والا پاکستانی۔"

مدحیہ نے غرے جواب لکھا تھا۔

"لیکن تم تو؟"

"میں غلط تھی۔" مدحیہ نے اعتراف کیا تھا۔

"تو پھر جیڑی وہاں کیا کر رہا ہے؟"

"یہ میں نہیں جانتی۔" سناں آتا اور سناں رہتا اس کا اپنا فیصلہ تھا۔ میں نے اسے کوئی امید نہیں دلائی تھی اور

ویسے بھی وہ سناں مہمان ہے۔ میں اسے مزید سنی رہاں سے واپس تو نہیں بھیج سکتی تھی۔"

"لیکن وہ تو صرف تمہارے لیے تمہاری محبت میں وہاں رہ رہا ہے؟" کرسٹینا کو حیرت ہو رہی تھی۔

"وہ میرے ملک میں رہے، میرے شہر میں رہے، لیکن میری محبت میں نہ رہے کیونکہ میں خود کسی کی محبت میں

رہ رہی ہوں۔" مدحیہ کا جواب دھوکہ تھا۔

"آف بیڈی۔" اتم نے مجھے چکرا کے رکھ دیا ہے، مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیا کہوں؟"

"اوکے! پھر بات ہوگی۔" مدحیہ نے بات سمیٹنی تھی۔

"اوکے۔" بائے!

کرسٹینا بھی قف لاؤن چلی گئی تھی اور مدحیہ نے بھی لپ ٹاپ پیچھے سر کا دیا تھا۔ اس نے لپ ٹاپ اپنی بائیں

ذرا ترچھا کر کے رکھا ہوا تھا۔ اس لیے جیڑی نہیں دیکھ پایا تھا کہ ان کی آپس میں کیا بات ہوئی ہے۔

"کیا ہوا؟ پھر کمری نے کچھ کہہ دیا؟" جیڑی نے مدحیہ کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا۔

"نہیں۔" اس نے کچھ نہیں کہا۔ "اس نے انہی میں گرجن بھائی تھی۔"

"اوکے۔" چھوڑو اس بات کو، یہ لو جو ہیں۔" اس نے مدحیہ کو دوبارہ جوس کی طرف متوجہ کیا تھا۔

"تو نہیں کہیں۔" وہ نہیں سہہ۔" اس نے انکار کر دیا تھا۔

"کیس باپ چلیں؟"

"نہیں، پھر کسی وقت چلیں گے؟" ابھی میں گھر جا رہی ہوں۔"

مدحیہ کمرے کے اندر کھڑی ہوئی تھی اور اس کے موز کے پیش نظر جیڑی چاہ کر بھی اسے روک نہیں سکا تھا۔

تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی وہاں سے نکل آئی تھی اور جیڑی ابھا سا رہ گیا تھا۔

سلسلے تین گھنٹے کی میٹنگ کے بعد نشست برخواست ہوئی تو رفتہ رفتہ سب ہی میٹنگ ہال سے باہر نکل گئے

تھے۔ لیکن صرف آڈر تھا جو وہاں کھڑے بیٹھا رہا تھا۔ اس نے اپنا سر کرسی کی بیک سے ٹکا دیا تھا۔ یوں جیسے تھک گیا

تھا۔ اور اس کو وہیں بیٹھ دیکھ کر وہ انیال بھی وہاں سے نہیں جا سکا تھا۔

پورا میٹنگ ہال خالی ہو چکا تھا اور صرف وہ دونوں وہاں بیٹھے تھے اور ان کے درمیان مکمل خاموشی تھی۔ انیال

نے آگ نظر آڈر کو دیکھا تھا اور پھر لب بلیچ لیے تھے۔ ایک دوسرے سے بات کرنے کے لیے بات کا اور الفاظ کا

کوئی سراہی بات تو نہیں آ رہا تھا۔ اتنے دنوں سے ان لوگوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ ایک تو سا ایک

تکریر سامعہ اہل تھا لیکن یہ مسئلہ کامل تو نہیں تھا؟ آخر کبھی نہ کبھی کوئی نہ کوئی بات تو کرنی ہی تھی یہی سوچ کر

ونیال بھی وہیں فصر کیا تھا۔ لیکن آڈر اسے بیٹھ دیکھ کر وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"آڈر پلیز۔" وہ کو میری بات سنو۔" وانیال نے اسے روکا تھا۔

"بوسہ۔" تمہارے پاس کوئی بات ہوئی تو میں ضرور سننا وانیال صاحب۔ لیکن افسوس کہ تمہارے پاس کوئی

بات نہیں ہے۔ صرف تسلیاں ہیں تسلیاں۔ جھوٹی اور خوش قسم تسلیاں۔ بے بنیاد تسلیاں۔ جن کو میں پہلے

بھی سن چکا ہوں لیکن اب مزید نہیں سننا چاہتا۔ اب جو کچھ جیسے چل رہا ہے اسے چلنے دو کیونکہ اب کچھ کتنے

سننے کے لیے ہمارے پاس کچھ بھی نہیں رہا۔"

آڈر کافی جا کر بات کر رہا تھا اس کا لہجہ کافی تیز اور طعنے سا ہو رہا تھا۔

"آڈر، تمہارے پاس کتنے سننے کے لیے بہت کچھ ہے لیکن تم سمجھنے کی کوشش تو کرنا۔ اس سارے قصے میں

ایسا کچھ ضرور ہے جو ہم سے پوشیدہ ہے۔ جو ہم سے چھپا ہوا ہے جسے ہم نہیں جانتے جسے علیحدے جانتی ہے یا پھر

ڈیڈ اور منسور حسین جانتے ہیں۔ ہمیں خود بخود ہونا چاہیے کہ علیحدے ایسا نہیں کر سکتی تھی اور اگر اس نے ایسا

کیا ہے تو ضرور کوئی وجہ ہوگی؟ کوئی بیوی وجہ۔ کوئی استاد ہے کی وجہ؟" وانیال کے ذہن میں جو سوچیں کلبا رہی

تھیں وہ ان سب کے سامنے لانا چاہتا تھا۔ لیکن کوئی بھی سمجھنے اور غور کرنے پہ تیار ہی نہیں ہو رہا تھا۔

"بوسہ۔" کہاں تمہارے پاس کوئی بات نہیں ہے، صرف تسلیاں ہیں جھوٹی خوش قسم اور بے بنیاد تسلیاں۔"

آڈر نے مسخرانہ سے انداز میں کہتے ہوئے سر ہٹا دیا تھا۔

"آڈر، تم تو علیحدے کے بہت قریب تھے۔ بہت خیال رکھتے تھے اس کا بہت چاہتے تھے اسے ہم سب

سے زیادہ انداز اسٹینڈ کرتے تھے اس کو۔ اور تم ہی اس کو سمجھ نہیں پائے؟ تم ہی سب سے زیادہ بدظن ہوئے پھر

رہے ہو اس سے؟ کیا تمہیں اس پر ذرا بھی افسوس نہیں تھا؟" وانیال کے لبے میں تاسف تھا۔ وہ تھا اور بے یقینی

بھی۔ "مجھے اس پر سب کچھ تھا۔ اعتبار تھا، بھروسہ تھا اس سے محبت تھی اس سے ہمارا تھا کیا کچھ نہیں تھا اس

سے۔ لیکن اس نے سب ختم کر دیا۔ خود ختم نہیں کیا اس نے۔ میری آنکھوں کے سامنے سب مٹا دیا اس

سنے اس کے ہوا الفاظ میں نے سنے ہیں وہ میں جانتا ہوں تم سننے تو اس وقت اس کی حمایت میں ایک لفظ بھی نہ

کہتے جاؤ۔ کچھ ڈیڈ کو کچھ جو کچھ میں نے سنا تھا وہ سب ڈیڈ نے ہی سنا تھا۔ میں نے کیا اور بھی کیا وہ نہیں

تھے اس لیے ہی نہیں کہے۔ وہ ظاہر سے مفلوج ہوئے ہیں میں باطن سے مفلوج ہوا ہوں ان کا جسم بے الار ہو

ہے اور میرے دل، دماغ، ہڈیاں، ہڈیاں ہو گئے ہیں۔ بس فرق اتنا ہے کہ وہ بستر تے لگ گئے ہیں اور میں چل پھر رہا ہوں۔"

وہ اپنے جسم سے کام نہیں لے سکتے اور میں اپنے دل و جان سے کام نہیں لے سکتا۔ ٹاکا ہو گئے ہیں ہم لوگ۔ ٹاکا رہ گئے ہو اس کا مطلب؟" آؤر نے سچی سے کہتے ہوئے وانیال کو دیکھا تھا۔

"آؤر علیزبے اب بھی واپس آجائے تو۔"

"بس وانیال بس۔ اب اور نہیں۔ عزت کوئی لباس نہیں ہے جسے اتار کر دھو کر پونچھ کر دوبارہ پہنا جاسکا ہے۔ عزت عزت ہی ہوتی ہے۔ اگر تیری سوا تو کئی دوبارہ بحال نہیں ہو سکتی اگر ایسا کرنے کی کوشش بھی کر دے تو بھی دل میں آئینے کی طرح بال رہ جائے گا اور جس چیز میں بال رہ جائے اسے نوزلے کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔" آؤر نے وانیال کی بات کاٹتے ہوئے غلطی اور سچی سے کہا تھا۔ اب تو اس کا سبب ہمہ وقت ہی رہتا تھا۔

"لیکن آؤر علیزبے کے ساتھ۔"

"پلیز وانیال۔ میں کچھ نہیں سنتا چاہتا۔ میرے سامنے کسی کا نام مت او۔" آؤر نے ہاتھ اٹھا کر اسے منع کیا تھا۔

"میں نام نہ لوں؟ کیا اتنے ہی لا تعلق اور بے حس ہو گئے ہو تم؟"

"ہاں ہاں۔ ہو گیا ہوں بے حس اور کیا سنتا چاہتے ہو تم۔ جو کچھ وہ کر کے مٹی ہے کیا وہ بے حس ہونے کے لیے کافی نہیں ہے۔ تم کہتے ہو اس کے ساتھ ضرور کچھ ہوا ہو گا۔ لیکن میں کہتا ہوں کیا ہوا ہو گا بھلا کیا ہو منصور حسین اسے گن پوائنٹ لے گیا ہے یا پھر وہ اسے بے ہوش کر کے کڈھ کر لے کر گیا ہے؟ وہ اپنے بیز روم میں تھی ٹھیک ٹھاک ٹیلے میں تھی وہ بھی اس کے ساتھ تھا اس کے بیز روم میں تھا۔ وہ چاقو وچ بند تھا تو وہ بھی اپنے ہوش و حواس میں تھی۔ اس کی پہنچی۔ میں نے تو کوئی گن نہیں دیکھی تھی جس کے ہاؤس میں آکر وہ اس کے ساتھ جاتی۔ بلکہ وہ تو اعتراف کر رہی تھی کہ وہ اپنی مرضی سے حویلی چھوڑ کر اپنے شوہر کے ساتھ جا رہی ہے۔ اگر وہ کسی ہاؤس میں ہوتی تو ہمیں کوئی اشارہ بھی دے سکتی تھی۔ وہ سکتی تھی پتلا سکتی تھی اس منصور حسین کی بھی اتنی جرأت نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ اس کے بیز روم میں جس کمرے کے سامنے زبردستی۔ اپنے ساتھ لے جاتا اور اس کی مرضی کے بغیر۔ سب کر لیتا۔ اگر اس نے زبردستی ہی اسے لے کر جانا ہوتا تو بہت پہلے ہی اسے اپنے ساتھ لے جاتا۔ آخر وہ اس کے ساتھ آتی جاتی تھی۔ وہ اس کا ڈرائیور تھا مگر چاہتا تو بڑی آسانی سے اسے کڈھ کر سکتا تھا۔ لیکن نہیں۔ اس نے ایسا نہیں کیا۔ کیونکہ یہ معاملہ زور زبردستی کا نہیں تھا۔ یہ جو کچھ بھی ہوا ہے وہ لوگوں کی باہمی رضا سے ہوا ہے۔ اس لیے میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ علیزبے آؤر سے چھوڑ کر پندرہ نومبر کی درمیانی شب کوئی آفت آئی تھی جو اسے منصور حسین کے ساتھ اڑا کر لے گئی ہے۔" آؤر نے سچی سے کہتے ہوئے قصے سے کرسی کو ٹھوکر ماری اور اپنا بریف کیس اٹھا کر باہر نکل گیا تھا۔ اس کے اندر بال بال اٹھ رہے تھے اور داغ کی شریانیں پھٹنے کو تھیں۔ اس لیے وہ مزید آفس میں رکے بغیر وہاں سے نکل آیا تھا۔ وہ جیسے میں تھا اور کافی رش ڈرائیو کرنا ہوا حویلی پہنچا تھا۔

"السلام علیکم۔" میز حیاں اترتی کوبل کے چہرے پر رنگ آگئے تھے۔ لیکن آؤر نے کوئی بھی جواب نہیں دیا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات کافی عجیب اور غیر معمولی ہو رہے تھے جنہیں دیکھ کر وہ چونکی گئی تھی۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" کوبل انانیت کا پیکر بنی آگے بڑھی تھی۔

"ٹھیک ہوں۔" وہ روکے سے انداز میں کہہ کر میز حیاں طے کر گیا تھا۔ اس کا رخ علیزبے کے بیز روم کی طرف تھا۔ کوبل کو دیکھ کر متحنا لگا تھا۔

وہ اس کے بیز روم کا دروازہ آک زوردار جھٹکے سے کھول کر اندر داخل ہوا تھا اور علیزبے کا خوب صورت سما سجایا لٹواری بیز روم جیسا وہ چھوڑ کر گئی تھی ویسا ہی جوں کا توں نظر آ رہا تھا۔ یوں جیسے علیزبے ابھی ابھی بیز روم

سے نکل کر باہر گئی ہو۔ آؤر نے اوپر اوپر نظروں ڈالی تھی اور پھر اسے دائیں سائیڈ کی دیوار سے لگے صوفے پر اور صوفے کے سامنے وانیال علیزبے کی برتنہ ڈال کے تمام گفتگوں، نوز پیکنگ میں بند ہونے نظر آئے تھے اور صوفے کے ساتھ وانیال چھٹی کرسی پر ٹھیک ٹھیک ایک تھلک آؤر کاویا ہوا آؤر کاٹ رکھا تھا اور باقی سب کی طرح وہ بھی نوز پیکنگ میں ہی تھا۔ تو کیا علیزبے نے آؤر آؤر کے جذبات کھول کر بھی نہیں دیکھے تھے یہ بھی زحمت نہیں کی تھی کہ وہ کولڈن ریم پتلا کر دے؟ لیکن اسے کہ وہ اس ریم کی اوٹ میں کیا لپیٹ کر لایا ہے؟ محبت لایا تھا یا محبت کا اقرار لایا تھا۔ وہ اس پر سوچتی تو تھکتا؟ آؤر کولڈن ریم میں اپنے جذبات کی بات دہری پہ مٹھیاں بچھتا ہوا سرخ چہرہ اور سرخ آنکھیں لیے اس گفت کی طرف بڑھتا تھا۔

"آئی لو یو علیزبے۔ آئی لو یو علیزبے۔" سفید پتھر سے بنے تاج محل کے اندر سے مینی سی 'مرمری' آواز میں انگمار محبت کیا جا رہا تھا اور یہ انگمار آؤر کو اور بھی کات کے رکھ گیا تھا۔ وہ یہ گفت پورے چاؤ سے بڑی مشکل سے انتخاب کر کے لایا تھا۔ محبت کی علامت اور محبت کا نشان سمجھ کے ایک محبت کرنے والے کا محبت بھرا ہوا کچھ کہہ لیکن یہاں محبت کو سمجھتا کون تھا بھلا؟ وہ نہ محبت۔ آؤر تاسف سے دیکھتا ہوا آگے بڑھا اور کھڑکی کے پت کھول کر ہاتھ میں پکڑے سفید سنگ مرمر سے بنے تاج محل کو اپنی پوری قوت سے کھڑکی سے باہر پھینک دیا تھا۔ حویلی کا معاملہ بہت وسیع تھا۔ اس لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ تاج محل حویلی کے احاطے سے باہر جاکے گرے۔

لیکن جہاں گرا تھا وہیں وانیال کی گاڑی کے ٹائر چرے چرے تھے اور وہ فوراً "گاڑی سے اتر آیا تھا اس نے کشادہ اور طویل ذرا نیوے کے ٹیچوں پر سفید سنگ مرمر کے ٹیبلٹ کھڑے ہوئے دیکھے تھے۔

"آئی لو یو علیزبے۔ آئی لو یو علیزبے۔ آئی لو یو علیزبے۔" ایک پتھر سے بڑے میں ریکارڈ یہ جملہ ابھی تک انگمارت باز نہیں آ رہا تھا۔ جس سے لگ رہا تھا کہ نونے کے بعد بھی محبت ختم نہیں ہوتی چاہے مل ٹوٹ جائے چاہے تاج محل۔

وانیال نے وہ لگتا تھا ہوا پر زہ اٹھایا اور علیزبے کے بیز روم کی کھڑکی کی سمت دیکھا تھا جہاں آؤر نے کھڑکی کے پت بند نہ ہوئے تھے اور وانیال تاسف سے دیکھتا تھا کہ میں سر ہلاتا ہوا سفید سنگی ٹیبلٹ کو یوں دیکھتا تھا جیسے چاہا انٹیکس کی سمت بڑھ گیا تھا بڑی حویلی کے حالات کشیدہ ہو چکے تھے۔ رشتوں میں ابھی خاصی بد مزگی اور بد مٹی پیدا ہو چکی تھی۔

وقت کی عدالت میں
زندگی کی صورت میں
یہ جو میرے ہاتھوں میں
ایک سوالنامہ ہے
کس نے یہ بتایا ہے؟
کس نے بتایا ہے؟
کچھ سمجھ میں آیا ہے؟
زندگی کے پرپے کے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

مجموعہ خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہر ای ٹیک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای ٹیک کا پرنٹ پر پریو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چینلنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ویڈیو نہیں
- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای ٹیک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ مابانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں ایڈورٹنگ
- ✧ میرٹھ والی انداز کو الٹی آپریٹنگ کو الٹی
- ✧ عمران سیریز اور منظر نگار
- ✧ این صفی کی مکمل رینج
- ✧ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

دعا دینا ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے لنکس اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیگر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

سب سوال لازم ہیں

سب سوال مشکل ہیں۔

علی کے قدم یڑھیاں چڑھتے ہوئے کانپ رہے تھے۔ اس لیے اس کے گرنے کے ذریعے گلے سے اے مغربی سے تمام رکھا تھا جو ان جہان لڑکی چند دن کی قید اور دو دن کے بخار سے خود ملنے پھرنے سے قاصر اور دو سوں کے ساروں کی محتاج ہو گئی تھی۔ وہ ایک قدم یڑھیاں چڑھتی تھی تو وہ سارا دم اٹھانے کے لیے اسے چند سیکنڈ اپنی ہمت مجتمع کر لی پڑتی تھی۔

اور یہ چند یڑھیاں ملے کرنے میں اسے یوں لگا جیسے مٹھنیں گزر گئے ہو ایک ہاتھ سے وہ دیوار کا سارا لے رہی تھی اور ایک ہاتھ کل نے تھا ہوا تھا اور ان دو ساروں کی مدد سے وہ اس لٹھری قبر نما ہسٹ کی یڑھیاں ملے کر کے دروازے تک پہنچنے میں کامیاب ہوئی تھی اور اس دروازے سے باہر قدم رکھتے ہوئے اس کا دل بھر آیا تھا۔ علی کے کوجب یہاں لایا گیا تھا تو وہ بے ہوش تھی اس لیے بے ہوشی کی وجہ سے اسے نہیں پتا تھا کہ اسے کن راستوں سے لاکر کہاں پہنچا گیا تھا۔ اس کے لیے تمام راستے انجان اور ان دیکھے تھے۔

"لی بی بی۔ اور آجائیں صاحب نے کہا تھا کہ آپ کو لان میں بٹھاؤں۔" گل اسے یڑھیوں کے پیچھے سے نکال کے راہداری اور دروازہ تک رو م کے مرکزی حصے کی طرف لے آئی تھی۔

"لان میں؟" علی نے بے یقینی اور حسرت سے پوچھا تھا۔

"لی بی بی۔ لان میں صاحب نے خود کہا ہے۔" گل نے اسے یقین دلایا تھا اور علی کے کویں لگا جیسے گل نے اسے زندگی کی نوید سنائی ہو۔ اور پھر آہستہ آہستہ قدموں سے چلتی وہ بھٹل گل کے سارے راہداری عبور کر کے باہر لان تک آئی تھی۔

علی نے پہلی بے تاب اور باسی نظر آسمان کی طرف اٹھائی تھی "خلاف نیلا آسمان اور آسمان کے ماتھے سجا سہری سورج علی کے آنکھیں لبالب پانیوں سے بھر گئی تھیں۔ وہ بیٹھ سورج کی دھوپ سے ذرا رخ کے رہتی تھی۔ وہ کار تھنڈی بیٹھ اٹھا کرتے تھے کہ کہیں علی کے کی رکت دھوپ کی وجہ سے متولان نہ جائے" نہیں خراب نہ ہو جائے کوئی انکیشن نہ ہو" اور آج وہی دھوپ علی کے کو اپنے جسم کے لیے ایک راحت محسوس ہو رہی تھی اور وہ پلکیں موندتے ہوئے رو پڑی تھی اس کے آنسو رخساروں پر بہ آئے تھے۔

"لی بی بی! تمک جا میں کی وہاں کر سی پہنچ جائیں۔" گل نے لان میں چھٹی کر سیوں کی سمت اشارہ کیا تھا۔ لیکن علی نے وہیں لان کی یڑھیوں پہنچ گئی تھی اور اپنی بیٹگی آنکھوں کو پوچھتے ہوئے وہاں آسمان کی طرف دیکھا تھا۔ اس کے بخار سے تپتے ہوئے جسم اور دل دھار دھار دھوپ کی وجہ سے سکون لے لگا تھا۔ ہسٹ میں بہت زیادہ لٹھری تھی اور علی نے اتنی سردی برداشت کرنے کی عادی نہیں تھی۔ اس لیے اسے لٹھری کی وجہ سے بخار ہو گیا تھا۔ گل وہ دن سے مسلسل اس کی دیکھ بھال کر رہی تھی اور جب جل اور کھتا چلا کہ اس کی طبیعت زیادہ خراب ہے تو وہ صبح آٹھ بج جانے سے پہلے خود اسے دیکھنے کے لیے آیا تھا۔ وہ بخار میں بے سہ پڑی تھی۔ اس لیے وہ جانے جاتے گل سے کہہ گیا تھا کہ باہر دھوپ لٹے تو اسے تھوڑی دیر کے لیے دھوپ میں لے جائے تاکہ اس کے جسم کو سورج کی تھوڑی حرارت مل سکے اس لیے دل تو رکے جانے کے تقریباً "دو تین گھنٹے کے بعد جب علی نے قدم بے ہوش میں آئی تھی تو گل نے اسے ہسٹ سے باہر لانے میں مدد کی تھی کہ کہیں صاحب کا یہ تخم پھر کسی فیسے میں تبدیل نہ ہو جائے۔ اور علی نے باہر آکر یوں دیکھ رہی تھی جیسے مرنے کے بعد وہاں اسے زندگی عنایت کی ہو جس کی ہر مرنے والے کی طرح اسے امید ہی نہیں تھی اور جب امید اور توقع سے بچو کے ملا تھا تو اس کی آنکھیں بار بار چمک رہی تھیں اس کا دل چاہ رہا تھا وہ یوں ہی عمر بھر اس آواز اور

کھلی فضا میں انہی میڑھیوں پر بیٹھی رہے اور اس کی عمر تمام ہو جائے۔ اس وقت علیزے کے لیے اس کھلی فضا اور قدرتی ماحول سے بچنے کے اور کوئی بھی شے قیمتی نہیں تھی۔ علیزے کو پندرہ دن میں ان سب چیزوں کی قدر و قیمت کا احساس ہو گیا تھا جن کی اہمیت پر اس نے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔ اس سورج سے نوازا اسے ریشمی گرہائش اہم محسوس ہوتی تھی۔

لیکن آج احساس ہوا تھا کہ سورج بھی انسان کے لیے مت بڑی نعمت ہے اور اس نے اس نعمت پر کبھی دھیان ہی نہیں دیا تھا اور آج جب دھیان دیا تھا تو اس کے سوا کوئی اور چیز اہم نہیں لگ رہی تھی۔

گل نے بار بار اسے میڑھیوں سے اٹھانے کی اور کرسی پر بٹھانے کی کوشش کی تھی، لیکن وہ نہیں مانتی تھی۔ لان کی میڑھیوں کا رخ مشرق کی طرف تھا۔ اس لیے مشرق کی طرف سے نکلنے والے سورج کی سنہری دیوہیلی دھوپ سیدھی علیزے پر ہی پڑ رہی تھی۔ جس سے اس کے منہ پر بڑے جسم کو کافی تعویت مل رہی تھی۔ پہلے تو وہ کافی دیر لان کو دیکھتی رہی، پھر جب تک کہ وہ اپنا سر گھٹنوں پر اٹکا دیا تھا اور پلکیں موندی گئیں۔ اور یوں ہی گھٹنوں پر سر رکھے اور پلکیں موندتے ہوئے اسے نہ جانے کتنی دیر گزرتی تھی جب گیت پر کسی گاڑی کا ہارن سنائی دیا تھا۔

گھر بخار کی وجہ سے علیزے کا سر اور آنکھیں اتنی بھاری اور بوجھل ہو رہی تھیں کہ نذر کی ذرا سراسر اٹھا کر اٹھا بھی نہ دیکھ سکی کہ آئے والا کون ہے۔

پہلے گیت نکلا تھا۔ پھر گاڑی اندر آئی تھی، پھر گاڑی روک کر کوئی گاڑی سے نیچے اتر اٹھا اور پھر رفتہ رفتہ بھاری قدموں کی چلاب اس کے قریب آتی چلی گئی تھی۔

"ہیلو۔ نیسی ہو؟" اس کی آواز علیزے کے بہت قریب سے ابھری تھی اور علیزے کا دل چاہا تھا وہ اپنی ساتھیس ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر لے تاکہ وہ کبھی اس کی آواز نہ سن سکے۔

"میں تم سے مخاطب ہوں جان وقار۔ کیسی ہو؟ کچھ اچھا چل رہا ہے؟" وہ اطمینان سے کہتا اپنی بیٹنڈرا سی گھٹنوں کے اوپر کھینچتا ہوا اس کے برابر ہی لان کی میڑھیوں پر بیٹھ گیا تھا۔

اور اب کی بار تقابوت کے باوجود علیزے نے ایک دم کرنٹ کھا کے دیکھا تھا وہ اس کے ساتھ اس کے بالکل برابر اس کے بے حد قریب بیٹھا ہوا تھا اور علیزے کو یوں لگا جیسے اس کے پورے جسم پر کسی نے تیل چھڑک کر اسے آگ لگا دی ہو اس کا رواں رواں چل اٹھا تھا۔ وہ ایک دم پیچھے ہٹی تھی، لیکن اس کا ہاتھ دل اور کے ہاتھ کے نیچے دبا رہ گیا تھا۔

"بیٹھی رہی ہو۔ برا ہو سکتا ہوں، لیکن بد نیت یا بد کردار نہیں ہو سکتا۔" وہی تو نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ کے نیچے دبا کر اسے پیچھے ہٹنے سے روکا تھا اور علیزے نے اسے اسے سرخ آنکھوں سے بڑے زخمی انداز سے دیکھا تھا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہی اس نے اس کی آنکھوں کی زخمی تحریر پڑنے والے واضح حروف میں پڑھی تھی۔

"جس چیز کو تم میری بد نیتی سمجھ رہی ہو وہ بھی میری بد نیتی نہیں تھی، اس لیے میں نے بڑی ایمان داری سے کہا تھا اتنی ایمان داری سے کہ۔" اس نے کہتے ہوئے بات اور صوری پھوڑی تھی اور علیزے کی مدد تک ترپ اٹھی تھی۔ وہ دل اور شاہ کی ادھوری بات کے آگے خاک ہوئی تھی اور اس کے ہاتھ کے نیچے سے اپنا ہاتھ کھینچ لینے کا سارا غور مٹی میں مل گیا تھا۔

میڑھیوں کے فرش پر علیزے کا بازو سا ہاتھ رکھا تھا اور اس کے ہاتھ کے اوپر دل اور کے ہاتھ کا بوجھ تھا، لیکن علیزے نے اب ہاتھ کھینچنے کی کوشش ترک کر دی تھی۔

"اٹو۔ تمہیں تو ابھی بھی بخار ہے۔" اس کو علیزے کے ہاتھ کی مدت ذرا دیر بعد محسوس ہوئی تھی۔ اس

نے علیزے کا ہاتھ پکڑ کر اس کی کلائی چھو کر دیکھی تھی۔

"ٹیمپٹ لوئی؟" اس نے علیزے کے ہاتھ کو دیکھنے کی کوشش کی تھی۔

"تمہیں۔" علیزے نے نفی میں سر ہلایا تھا۔ اس کی جگہ ہوئی آنکھیں پانیوں سے لبریز تھیں۔

لیکن دل اور نے اس کے انکار پر کوئی توجہ نہیں دی تھی اور گل کو پکار لیا تھا۔

"بی صاحب۔ کیسے؟" گل دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی ہوئی سامنے آئی تھی۔

"میرے پیڑ کی سائینڈ ٹیبل کے دروازے سے بخار کی ٹیمپٹ اور دو کپ چائے کے ساتھ ایک گلاس پانی لے کر آؤ۔ اس چائے منٹ کے اندر اندر۔" اس نے حکم جاری کیا تھا اور گل ایک دم الرٹ ہو گئی تھی۔

"بی صاحب۔ ابھی لے کر آئی۔" وہ فوراً پلٹ گئی تھی۔ لیکن چائے سے پہلے اس کی نظر میں علیزے کے ہاتھ پر لکھی تھیں، جو اس وقت دل اور کے ہاتھ میں تھا اور یہ منظر گل کے لیے ایک ناقابل یقین اور ناقابل فراموش منظر تھا۔ جس پر وہ دل ہی دل میں حیران ہوئی اندر چلی گئی تھی۔

"آج میرے ایک اہم کس کی ڈیٹ تھی اور مجھے اس میں کچھ پراہلنظر تھی۔ لیکن اللہ کی مدد سے اس کس کا رزلٹ میرے حق میں ہی نکلا ہے۔ اس لیے کورٹ سے نکلتے ہوئے میں بہت خوش تھا اور میرا ارادہ اپنے دوستوں کی طرف جانے کا تھا، لیکن نہ جانے پھر کیوں تمہارا خیال آگیا کہ تم بیمار ہو اس لیے دوستوں سے ملنے کا ارادہ ترک کر کے گھر آیا ہوں۔ صرف تمہارے خیال سے تمہاری خاطر۔" اس کا ہاتھ پکڑنے یوں غری اور اپنائیت سے تار بٹھا جیسے ان دونوں کے درمیان پیار و محبت کا بہت سی گہرا رشتہ قائم ہو گیا پھر یوں جیسے اس کی بیوی ہو گیا محبوب۔

"ایک سوال پوچھوں تم سے؟ جواب دو گے؟" علیزے نے پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا تھا، بھیگی آنکھیں سوالیہ ہو رہی تھیں۔

"اسی طرح تو جان بھی مانگو تو دے دوں گا۔ سوال کا جواب تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔" دل اور نے غار ہو جانے والے انداز میں کہا تھا۔

"کیا تم باقی لوگوں کو انصاف دلاتے ہو؟" علیزے کے لیے اور سوال میں بے یقینی تھی اور دل اور علیزے کے سوال پر غصہ مٹا گیا تھا۔

"کو شش تو یہی کرتا ہوں۔ لیکن کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوتا ہوں یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔" اس نے آنکھ اچکا کر دیکھا تھا۔

"تو پھر بتاؤ کہ میرے بارے میں تمہارا انصاف کیا کہتا ہے؟" علیزے بڑی بھاری کامٹا ہو کر اس سے سوال پر جواب کر رہی تھی۔

"تمہارے بارے میں میرا انصاف جو کہتا ہے وہ میں نہیں کر سکتا۔ کیونکہ میرا ضمیر مجھے اجازت نہیں دیتا اور مجھے اللہ سے ڈر بھی لگتا ہے۔" دل اور نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے گہری سانس خاست کی تھی اور اس کے جواب پر علیزے کی روں فز ہو گئی تھی۔ اس کا ہاتھ کانٹ گیا تھا اور پورے جسم میں کچھ کی کچھ سی ڈوڑھی تھی۔

"صاحب۔ چائے۔" اس نے گل سے معمولی سی ڈوڑھی لیے حاضر ہو گئی تھی۔

"ہو۔" دل اور چڑی رکھ دو۔" دل اور نے میڑھیوں کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"بی صاحب۔" گل نے آگے بڑھنے کے لیے میڑھی پر رکھ دی تھی۔

"اوکے۔" تمہارا جواب۔" اس کے کہنے پر گل اندر چلی گئی تھی اور دل اور نے ہاتھ پھینکا کے پانی کا گلاس اور ٹیمپٹ اٹھا کے علیزے کی سمت بڑھادی تھیں اور علیزے میں اتنی جرات نہیں تھی کہ ٹیمپٹ لینے سے

انکار کرتی۔ اس لیے چپ چاپ مل کر اکر کے اس کے ہاتھ سے گھاس اور نیباٹ لے لے لیے تھے۔ ہڈی مشکل سے نیباٹ نکلنے کے بعد اس نے منہ چاٹتے ہوئے رکھ لیا تھا۔

"ڈونٹ ورنی۔ کچھ نہیں ہونا تم یہ چاہتے ہو۔" اس نے چائے کا کپ اٹھا کر علیزے کی سمت بڑھایا تھا۔
 "میں۔ میں۔ چائے نہیں پیتی۔" اس نے ہنسنے لگا۔ اس کی نیباٹ کی وجہ سے ابکائی آ رہی تھی۔
 "تم تو کبھی فرش پر بھی نہیں سوئی تھیں، لیکن پھر بھی سو رہی ہو۔" اس نے مثال دی تو۔ علیزے نے مجبوراً اس کے ہاتھ سے کپ تھام لیا تھا۔

"ہوں گند۔ کافی سمجھ دار لڑکی ہو۔ بات کو کافی جلدی اندر اسٹینڈ کر لیتی ہو۔" دل آور نے اسے سربایا تھا اور چائے کا کپ اٹھا کر خود بھی چائے کے سبب لینے لگا۔

علیزے کو اپنا آپ اپنا دل مار کے وہ کام کرنا پڑ رہے تھے وہ اس نے پہلے کبھی نہیں کیے تھے۔ لیکن وقت تھا کہ اس سے سب کروا رہا تھا۔ یہاں تک کہ اسے دل اور کے پہلو میں بٹھا کر چائے پلو اور پھا اور وہ بیٹھے مجبور تھی۔
 "اور اتنی ہی کیسا لگتا ہے تمہیں؟" چائے پیتے ہوئے دل آور نے ایک غیر متوقع سوال کیا تھا اور علیزے نے چونک گئی تھی۔

"توڑ بھائی؟" علیزے نے حیرت اور نا سبھی سے اسے دیکھا تھا۔

"ہوں۔ تمہارا توڑ بھائی۔ وی۔ اسی کی بات کر رہا ہوں۔"

"کیوں۔ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟" علیزے کو اس کے عجیب سے سوال پر الجھن ہوئی تھی۔

"جو پوچھا ہے اس کا جواب۔ سوال مت کرو۔" وہ چائے کا سبب لینے ہوئے بولا تھا۔

"کیا مطلب تھا تمہارا؟ تم کتنا کیا چاہتے ہو؟" علیزے نے ٹھنک گئی تھی۔

"میرا مطلب ہے کہ کوئی ایسا شل فیلنگز اس کے حوالے سے۔" دل آور نے ذرا سی گردن تر بھی کر کے اپنی

سمت دیکھتی علیزے کی آنکھوں میں دیکھا تھا جس کی گولڈن براؤن آنکھوں میں تجیر پھیل گیا تھا۔

"تو ذرا نیو۔ یہ۔ یہ۔ تم کیا۔ ٹنگ۔ کہ رہے ہو۔ تھ۔ تم نے۔ یہ سوچ بھی کیسے لیا کہ۔؟"

علیزے نے حیرت نہ ہی رہ گئی تھی۔

"جو نہ مجھے کیا ضرورت ہے ایسا فضول سوچنے کی۔ یہ سوچ تو تمہارے توڑ بھائی کی ہے جو اب اپنی سوچ پر

بچتا رہا ہے۔" دل آور نے لاپرواہی سے کہتے ہوئے سر جھٹکا تھا۔

"توڑ بھائی کی سوچ۔" علیزے کے کانوں میں سائیں سائیں رونے لگی تھی۔ اسے اپنی ساتھیوں پر اور دل

آور کے کئے الفاظ پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ لیکن اسے ساتھ ساتھ یہ بھی یقین تھا کہ اس کے قریب بیٹھنا یہ آدمی مذاق نہیں کر سکتا۔

"ہوں۔ توڑ بھائی کی سوچ۔" اس نے اثبات میں سربایا تھا۔

"مہم۔ تم۔ یہ۔ یہ۔ کیسے ہو سکتا ہے بھلا وہ وہ میرے بارے میں۔ ایسا کیسے سوچ سکتے ہیں۔"

علیزے کے دل و دماغ اس حقیقت کو قبول کرنے پر تیار نہیں ہوئے تھے۔

"یہ تو ویسا ملتا ہے کہ اس نے ایسا کیسے سوچ لیا اور ایسا کیسے ہو سکتا ہے بھلا۔"

وہ بھی لاپرواہی سے کام لے رہا تھا۔

"تھ۔ تم مجھے منطقی ذمہ داری کرنے کے لیے ایسا کر رہے ہو نا؟" اس نے دل آور کو محکوک نگاہوں سے

دیکھا تھا۔

"میں تمہیں دنیا کی تمام حقیقتوں سے روشناس کرانے کے لیے ایسا کر رہا ہوں، میرے پاس رہو گی تو تمہیں

زندگی کی ہر اونچ نیچ کا پتا چل جائے گا۔ بڑی جلدی میں رو کر دنیا کو پتا تھا کہ تم کیا ہو اور اب یہاں میرے گھر میں رہ کر تمہیں پتا چلے گا کہ دنیا کیا ہے۔ دنیا بھرت بھی ہے اور دوسرے بھی۔ پہلے تم نے بھرت کا رخ نہ کیا ہے۔ اب دوسرے کا رخ کرنا چاہو گی۔" کہتے ہوئے دل آور کا لہجہ سخت ہو گیا تھا اور علیزے نے دل تھام کے رو گئی تھی۔ وہ دوسرے تک لڑ گئی تھی اور اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا اس کے منہ پر پتوں شاہ کی کال آگئی تھی اور وہاں سے اٹھ گیا تھا۔ لیکن علیزے کے پاس ہمیشہ کی طرح الجھنیں اور سوال چھوڑ گیا تھا۔ اس کا سر درد سے پھٹنے لگا تھا۔ زندگی رہشم کی ذوریوں کی طرح اچھے چلی گئی کوئی سرائی ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔

رات کا۔ جاتے کون سا ہر تھا اب کسی نے ان کے گھر کا دروازہ انتہائی زور سے دھڑکا دیا تھا۔
 عدیل کے ساتھ ساتھ باقی گھر والے بھی گہری نیند سے جاگ گئے تھے۔ وہ اپنے اوپر سے گرم لفافہ بنا کر بڑی تیزی سے اپنے بستر سے اٹھا تھا اور زید پور بلب کی روشنی میں جوتے پہن کر کمرے کا سوچ کچھ پورہ ٹولا اور لائٹ بنا کر جلدی سے دروازہ کھول کے باہر نکل آیا تھا۔ اسے میں سریم اور عابدہ خاتون بھی اپنے اپنے کمروں سے نکل آتی تھیں۔

"عدیل۔ باہر کون ہے جانا؟" عابدہ خاتون پریشان ہو چکی تھیں۔

"پتا نہیں کون ہے، دیکھتا ہوں، ابھی۔" عدیل نے کہہ کر بیرونی دروازے کی سمت بڑھ گیا تھا۔

"کون ہے؟" اس نے دروازہ کھولنے سے پہلے امتحان کیا۔ پوچھا تھا۔

"استاد۔ میں ہوں شہیار۔ دروازہ کھولو۔" عدیل کو باہر سے پھونکنے کی تواضع مل رہی تھی اور دماغ میں کسی اندویش کا اثر مہجھا تھا۔

"شہیار۔" اس نے فوراً دروازہ کھول دیا تھا۔

"کیا بات ہے، غیبت تو ہے؟" عدیل پریشانی سے پوچھ رہا تھا۔

"غیبت نہیں ہے استاد۔ درکشاپ میں آگ لگ گئی ہے سب تباہ ہو گیا ہے۔ ہم۔ ہم سب بھاڑ ہو گئے

ہیں۔" شہیار نے اس کے سر پر ہم پھوڑا دیا تھا اور عدیل کو یوں دھکیلتے ہوئے اس کے پیچھے سے زمین چھینچلی ہوئے۔

"درکشاپ میں آگ۔" عدیل کو اپنی تواضع کسی کنویں سے آتی محسوس ہوئی تھی۔ رات کے تین بجے اچانک

گہری نیند سے جڑ بھاگے اٹھا اور پھر ایسی خبر سننا دماغ کو دولا کے رکھ گیا تھا۔

"استاد۔ تم یہاں سے چلے جاؤ، تمہارا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔"

شہیار نے اسے آنے والے وقت کی تکفین سے بھاڑ کا راستہ بتایا تھا اور عدیل دم بخود رہ گیا تھا۔

"شہیار! یہ کیا کہہ رہے ہو تم تمہارا مطلب ہے کہ میں گھر سے بھاگ جاؤں۔" عدیل کا لہجہ بے یقین سا تھا۔

"وقت کی فراغت یہی کہہ رہی ہے استاد کہ آپ گھر سے چلے جاؤ۔ کچھ دن بعد میں آجائے گا۔" شہیار نے اسے

سجھانے کی کوشش کی تھی۔

"تھرکوں شہیار میں کیوں بھاگ جاؤں میں نے کیا کیا ہے بھلا۔" عدیل کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ وہ شہیار کی

بات سمجھنے اور ماننے پر تیار نہیں ہو رہا تھا۔

"بے شک آپ نے کچھ نہیں کیا استاد۔ لیکن درکشاپ کی ذمہ داری تو آپ پر ہی تھی تاہم اگر درکشاپ

میں کوئی نقصان ہو گا تو ذمہ دار بھی تو آپ کو ہی ٹھہرایا جائے گا۔"

"ورکشاپ میں تین گاڑیاں جل گئی ہیں کیا ان کا نقصان باؤ اختیار پورا کرے گا؟ ہونہ! ہرگز نہیں۔ یہ نقصان آپ کے کھاتے میں ڈال دے گا اور آپ سے نقصان کیسے پورا کریں گے؟ اگر نقصان پورا نہ ہو تو آپ کو جیل جانا پڑے گا اور اگر خدا نخواستہ آپ جیل پہنچے تو وہاں سے نکلنے کے لیے اور پیسے گھر والوں کا کیا ہوگا؟ اس لیے بہتر ہے کہ آپ یہاں سے چلے جائیں۔" شہیار نے عدیل کے ہر مسئلے پر سوچ رہا تھا اور عدیل چکر اٹھا تھا۔

"کیسے چلا جاؤں گا؟ چلا جاؤں کیا کیسے جانا؟ آسمان ہے بھلا۔ میرے گھر میں ہاں ہیں، ہمیں ہیں، منحدر اور لاچار باپ ہے، انہیں کس کے سہارے؟ چھوڑ جاؤں اور میں گھر سے باہر قدم رکھوں گا۔ اور وہ بے سہارا ہو جائیں گے، لوگ گدہ کی طرح ٹوٹنے کے لیے آجائیں گے ان کو۔ میری عزت، میری ہمیں غیر محفوظ ہو کے رہ جائیں گی۔ کون تحفظ دے گا ان کو؟ کون حفاظت کرے گا ان کی ہونہ۔ میرا گھر سے بھاگنا آسان نہیں ہے۔ پارے میں تھمزا چھانٹ نہیں ہوں کہ بھاگ جاؤں۔ میرے گھر میں میری عزت ہے۔ کل کو میں بھاگ جاتا ہوں تو کیا میرے گھر پر پولیس نہیں آئے گی؟ کیا میرے گھر کی تلاشی نہیں لیں گے؟ میری ماں بہنوں سے پوچھ پچال نہیں کریں گے؟ وہمکیاں نہیں دیں گے؟ تنگ نہیں کریں گے؟ کیا آئے روز میرے گھر کی گندی نہیں کھڑے گی۔ اگر یہ سب ہوگا تو کیا عزت رہ جائے گی میری اور کیا فائدہ میرے بھاگنے کا۔ اس لیے اس سے بہتر ہے کہ میں سامنے جا کر حالات کا مقابلہ کروں کہ آخر ہوتا کیا ہے۔"

"بس تم اگر دوست ہو تو اس برے وقت میں میرا ساتھ دو مجھے تم لوگوں کے ساتھ کی ضرورت ہے۔" عدیل نے اپنی جگہ سے ہٹنے کی بجائے جم جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ حالات کے سامنے ہٹ گیا تھا۔

"ایک بار پھر سوچ لو اسٹاؤ۔" شہیار نے آخری کوشش کی تھی۔

"تم نے سوچنے کا وقت کب دیا ہے؟ تین دن بھی توڑی اور خواب بھی۔"

عدیل شکوہ کنٹینر لے کر گستاخی سے سر جھٹک کر اندر آ گیا تھا۔ مریم اور نیادہ خاتون اتنی سردی کے باوجود بغیر کسی گرم کپڑے کے برآمدے میں ستون کے قریب کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھیں۔

"کیا بات ہے بیٹا؟ کون ہے؟ کیا ہوا ہے؟ سب ٹھیک تو ہے نا۔" نیادہ خاتون اس کے پیچھے کمرے تک تکی تھیں۔

"جی امی۔ اللہ کا شکر ہے سب ٹھیک ہے۔ بس ایک دوست ہے۔ پولیس کیس بن گیا ہے اس کے لیے جارہے ہیں آپ جا کیجیے گا کہ زیادہ مسئلہ نہ بنے۔" عدیل نے اپنی گرم چادر اٹھا کر کندھوں پر بھسلائی تھی۔

"اللہ خیر اللہ خیر! اللہ رحم کرے سب سے۔ جلدی کھر آجانا۔" وہ اس کا کندھا جھٹکتے ہوئے ہلی تھیں۔

"اے شاہ اللہ جلدی کھر آجائیں گا آپ ذرا مریم کو اندر بھیج دیں۔" اس نے بوٹ پہننے ہوئے کہا تھا اور عابدہ خاتون باہر نکل گئیں اور وہ بوٹ پہننے کے بعد کھڑا ہوا ہی تھا کہ مریم اندر آ گئی تھی۔

"کماں جارہے ہیں آپ؟" مریم کا لہجہ سنجیدہ اور نپا تھا۔ ساتھ ساتھ عدیل اس کے سوال پر رک گیا تھا اور پھر اس کے سامنے آکر اسے کندھوں سے تھام لیا تھا۔

"دیکھو مریم مجھے پتا ہے کہ تم بہت بہادر ہو، ٹیک ہو، عزت دار ہو، میرے لیے پیشہ، بس نہیں بلکہ بھائی ثابت ہوئی ہو تمہارے برابر بہت کی واؤت ہو، تم نے بھی اپنا ہمارا حوصلہ کرنے میں دیا اور مجھے امید ہے کہ آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا۔ تم اپنا بھی حوصلہ بلند رکھو کی اور باقی سب کو بھی بہت اور حوصلہ دینی خصوصاً امی اور ابائی کو۔"

عدیل نے اسے سمجھانے کے لیے تمہید باندھی تھی اور مریم کا دل کانپ گیا تھا۔

"آپ۔ یہ۔ یہ۔ سب کیوں کہہ رہے ہیں۔ آخر کماں جارہے ہیں آپ ہوا کیا ہے؟" مریم کے چہرے کا

رنگ تبدیل کیا تھا اور فکر کے سائے لہرانے لگے تھے۔

"مریم پلیز۔ تم نے پریشان نہیں ہونا اگر تم پریشان ہو گئیں تو سمجھو کہ ہمارا پورا گھر پریشان ہو جائے گا۔ ان حالات میں ہمارے گھر کو اگر کوئی چیز بچا سکتی ہے تو وہ ہے تمہاری بہت بہادری اور سمجھ داری اور مجھے یقین ہے کہ تم سب کچھ سنبھال کے رکھو گی اور سب کا خیال بھی رکھو گی یہ گھر اور اس گھر کی عزت اب تمہارے ہاتھ میں ہے۔ سنو اب بھی سکتی ہو اور بگاڑ بھی سکتی ہو۔ یہ وقت شاید ہم دونوں، بس بھائی کے لیے آزمائش کا وقت ہے۔ دنا کرو اللہ ہمیں اس آزمائش میں سرخرو کرے۔" عدیل نے کہتے ہوئے مریم کا ہاتھ تھام کے تھکا تھا۔

"لیکن آپ یہ کیوں نہیں بتا رہے کہ آپ کماں جارہے ہیں؟ کیا ہوا ہے؟" مریم صبحاڑی گئی تھی۔ اس کی جان منہ میں آئی ہوئی تھی اور عدیل تھا کہ بتانے سے گریز کر رہا تھا۔

"وہ دراصل ورکشاپ میں آگ لگ گئی ہے۔ کافی نقصان ہوا ہے اور یقیناً اس نقصان کا زخم وار مجھے ہی لہرایا جائے گا۔ اس لیے اس نقصان کی وجہ سے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ میں جارہا ہوں اگر کل وہ سہرے کھولیں نہ آیا تو سمجھ لیا کہ مجھے ذیل ہو گئی ہے۔ لیکن خیر جو بھی ہو گا میرا کوئی ایک ہے ایک شہیار نام ہے اس کا وہ اگر آپ لوگوں کو ہماری بات بتا دے گا۔"

عدیل کو بتانا ہی رہا تھا اور مریم کے توپوں تلے سے زمین سرک گئی تھی۔

"کیا۔ آپ جیل جارہے ہیں۔" مریم کو اگا جیسے کسی نے اس کے سر سے سائبان چھین کر اسے تپتے صحرا میں دھکیل دیا وہ پکرا گئی تھی۔

"کچھ کہ نہیں سکتا ابھی جاؤں گا تو بتا ملے گا کہ میرے لیے کیا مڑا ہے۔" عدیل نے علا علی ظاہر کی تھی۔

"لیکن عدیل بھائی آپ۔" مریم نے کچھ کہنا چاہا تھا لیکن عدیل نے اسے روک دیا تھا۔

"بس۔ زیادہ تاہم نہیں ہے۔ شہیار بڑا کمزور انسان ہے۔ اسے اب جو بھی ہو گا دیکھا جائے گا تمہارا گھر اور سب کو تسلی دینا۔" عدیل نے کہہ کر اس کا سر تھکا اور خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گیا تھا۔ مریم تڑپ کے اس کے پیچھے لگی تھیں۔ لیکن عدیل تب تک نیادہ خاتون سے مل کر گھر کی بلینز عبور کر گیا تھا۔

"استاد ایک بار پھر سوچو۔ ایسے معاملے لیے چوڑے ہو جاتے ہیں۔ جتنا بھی سلجھانے کی کوشش کروالنا اور اٹھتے ہیں اور آپ کے پیچھے تو اور کوئی بھی نہیں ہے جو آپ کے لیے بھاگ کر دے گا۔" پھونسنے ٹیکسی سے اترنے سے پہلے اسے ایک بار پھر سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"میرے لیے اللہ تو ہے نا سب کچھ کرنا والا۔ میری کوئی غلطی میرا کوئی قصور نہیں ہے اس لیے میرا انصاف دین کرے گا جو سب سے بڑا عادل ہے۔" عدیل نے پورے یقین اور بھروسے سے کہا تھا اور ٹیکسی سے اتر آیا تھا۔ ورکشاپ کے باہر پولیس اور فائر بریگیڈ والوں کی گاڑیاں کھڑی تھیں چند آس پاس کی دکانوں والے لوگ بھی جمع تھے اور لوگوں کے ہجوم میں امتیاز کا شیریں (باؤ اختیار) کھڑے تھے۔ عدیل مضبوط قدموں سے چلتا ہوا قریب آیا تھا۔

"باؤ عدیل آگیا۔" سب سے پہلے اس نے چائے کے ڈھابے والے بھٹی صاحب کی نظر ڈالی تھی اور پھر پورا ہجوم عدیل کی سمت متوجہ ہو گیا تھا۔ جبکہ باؤ اختیار تیزی سے اس کے پاس آیا تھا۔

"تمہارے میری بہادری کا زخم دار۔" باؤ اختیار دھاڑا تھا اور پھونسنے جیدی اور سلو کاٹی منہ میں آگیا تھا۔ پولیس کا فیشیل پک کے عدیل کو گھیر چکے تھے اور پھر وہی ہوا تھا جس سے بچنے کے لیے پھونسنے نے اسے بارہا سمجھایا تھا۔ عدیل عمر کو گر لگا کر لیا گیا تھا اور سب بکھتے رہ گئے تھے۔

(باقی سلسلہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیے)



بڑی حویلی کے تمام کمین و قار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

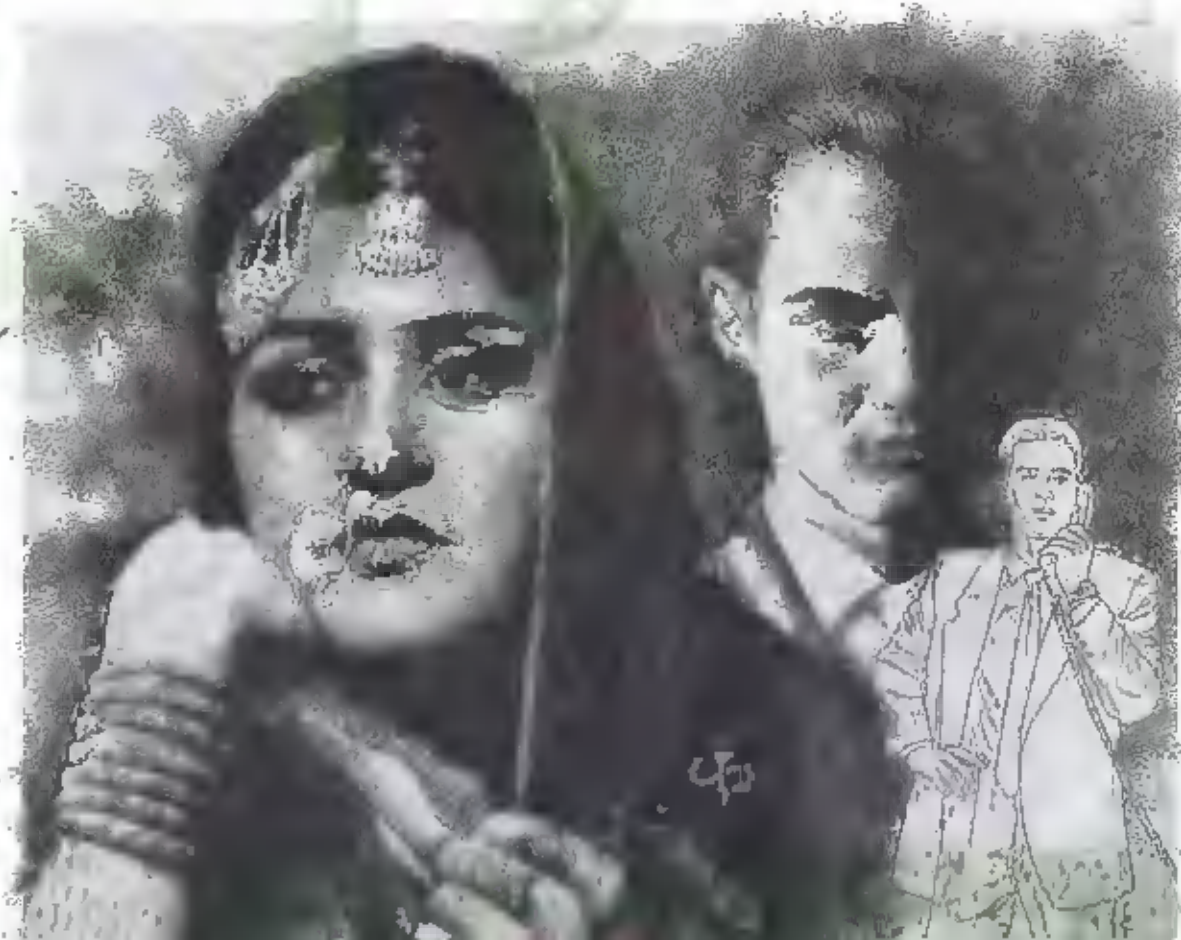
مدحیہ اور نبیلہ حیات دو ہی بہن بھائی ہیں مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے، وہ انگلینڈ کی رنگینوں میں مکمل خور یہ رنگ چکی ہے جس کے پیش نظر فائرہ بیگم، نبیلہ کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں، لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے جس پر نبیلہ اور فائرہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زوری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پیپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، بے بسی اور مجبوری سے جنگ آخر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے، لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باؤ اتھیا زل جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے، اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آوی ہے وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے، وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے، وہ اپنے قول و فعل کا بہت بکا آڑی ہے اس نے



وہ نہیں سیکھا اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پر بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو دیتا ہے۔

پچیویں قسط



”او کے۔۔۔! میں جلدی آ جاؤ گی۔ اللہ حافظ۔“ وہ چادر اوڑھ کر بیگ لیتی ہوئی کمرے سے باہر نکل آئی تھی لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ گھر سے ایک پریشانی ساتھ لے کر نکل رہی ہے تو آگے ایک اور پریشانی اس کی منتظر ہے وہ ابھی اسٹاف روم میں پہنچ کر اپنی بڑی سی چادر اتار کے اپنے سوٹ کا میچنگ دوپٹہ نکال رہی تھی جب ان کا پیون پیغام لے کر حاضر ہوا تھا۔

”میڈم! آپ سے کوئی ملے آیا ہے کافی دیر سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“ پیون نے کافی سادہ سے انداز میں اطلاع پہنچائی تھی۔

”کون؟“ شریا بے ”مریم چونک گئی تھی اس کا خیال بے ساختہ شہریار کی طرف ہی گیا تھا کیونکہ اسے اس وقت شہریار کا ہی انتظار تھا۔

”موری میڈم! انام نہیں بتایا انہوں نے۔۔۔“ پیون نے نفی میں گردن ہلائی تھی۔

”اچھا۔۔۔! میں خود دیکھ لیتی ہوں۔“ مریم اپنا بیگ اور چادر لا کر میں رکھتے ہوئے اسٹاف روم سے نکل آئی تھی اس کا رخ وزیننگ روم کی طرف تھا وہ خاصے تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی وہاں تک آئی تھی لیکن وزیننگ روم میں پہنچ کر اس کے قدم اپنی جگہ یہ جیسے جم کے رہ گئے تھے کیونکہ سامنے ہی صوفے پر جودت آندی براجمان تھا جو اسے دیکھتے ہی فوراً ”صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”ہائے۔۔۔! کیسی ہیں آپ۔۔۔؟“ جودت آج جیسے بڑی فراغت نکال کے بڑے اطمینان سے اس سے ملنے آیا تھا اسی لیے بڑے سکون سے اس سے مخاطب تھا جبکہ مریم کے چہرے کی رنگت بدل چکی تھی جودت آندی کا اس سے ملنے کے لیے آئیڈی آنا اس کے لیے کوئی بھی اسکی نڈل کھڑا کر سکتا تھا اور وہ فی الحال کوئی بھی اسکی نڈل افورڈ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی جودت آندی کی آمد مریم کی ریمپویشن پہ ایک دھبا ثابت ہو سکتی تھی اور وہ مریم بھی یہ دھبا نہیں لگوانا چاہتی تھی۔

”مجھے کیا خبر تھی کہ آپ یوں مجھے نظروں کے رستے دل میں اتارنے کھڑی ہو جائیں گی؟ پتا ہوتا تو میں پہلے ہی آجاتا؟“

جودت کا لہجہ اور انداز خاصے معنی خیز تھے جس پہ مریم سر سے پاؤں تک سلگ اٹھی۔

”جسٹ شٹ اپ! زبان سنبھال کے بات کریں مجھے ایسی بکواس پسند نہیں ہے۔“ مریم پہلے ہی کافی پریشان تھی اس لیے جودت کی معنی خیزی نہ اس کا دماغ اور زیادہ گرم ہو گیا تھا۔

”لیکن مجھے تو بہت پسند ہے چاہے وہ بکواس آپ کریں یا میں۔“ جودت نے ہنوز معنی خیزی سے مسکراتے ہوئے کندھے اچکائے۔

”آپ یہاں کیوں آئے ہیں۔۔۔؟“ مریم نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے بمشکل سوال کیا تھا۔

”پیارے انکوں کے پاس کیوں آتا ہے۔؟“ لانا جودت کا سوال مریم کو سٹپا کے رکھ گیا تھا۔

”کیا مطلب ہے آپ کا۔۔۔؟“

”ارے۔۔۔! حیرت کی بات ہے آپ ایک ٹیچر ہو کر مطلب مجھ سے پوچھ رہی ہیں۔۔۔؟ وہ بھی اتنے آسان سوال کا۔۔۔؟“

جودت بھنویں اچکاتے ہوئے ذرا سا مسکرایا تھا اور چار قدم کا فاصلہ طے کر کے دو قدم کے فاصلے پہ اس کے بے حد قریب آکھڑا ہوا تھا۔

”بھئی ظاہری بات ہے کہ پیارے انکوں کے پاس اپنی پیاس بجھانے کے لیے آتا ہے جیسے میں آپ کے پاس آتا ہوں۔“

جودت کے بے باک سے انداز پہ مریم نے بڑی مشکل سے اپنے ہاتھ کو تھپڑ مارنے سے روکا تھا ورنہ اس کا جی لگا کہ جودت آندی کے منہ پہ ایسا زنائے وار تھپڑ رسید کرے کہ اس کے چہرے پہ زندگی بھر کے لیے ایک ہر سانس نہ رہ جائے لیکن مریم کے لیے آج کا دن اذیت اور برداشت کا دن تھا وہ جودت آندی پہ ہاتھ اٹھا کے اشتعال نہیں دلانا چاہتی تھی کیونکہ اگر وہ مشتعل ہو جاتا تو اس کی پریشانیوں میں اور بھی اضافہ ہو سکتا تھا اور تب تھپڑ کے عوض مزید پریشانی نہیں خرید سکتی تھی۔

”دیکھیے جودت صاحبہ! آپ کی گھٹیا گفتگو مجھ پہ اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ آپ خواجواہ اپنا ٹائم ویسٹ کر رہے ہیں۔ اس لیے پلیز آپ کسی ایسی لڑکی کا ایڈریس لیں جو آپ کے ٹائپ کی اور آپ کی ضرورت کے مطابق ہو جس پہ ٹائم ویسٹ کرنے سے آپ کو نفع ہو نقصان نہیں۔“ مریم نے ذرا تحمل سے کام لیتے ہوئے سبھانے کی کوشش کی تھی۔

”آپ کو کیا پتا مریم جی۔۔۔؟ اس وقت آپ کو دیکھنا آپ سے بات کرنا ہی میرا اصل نفع ہے صبح اٹھنے کا اور ہر چھوڑنے کا صلہ مل گیا ہے طبیعت پہ بڑا اچھا اثر پڑا ہے دل بڑی تیزی سے حرکت میں ہے۔“ جودت نے بے سرحاز سے انداز میں اپنے دل پہ ہاتھ رکھا تھا۔

”جودت صاحبہ پلیز۔۔۔! میری آپ سے ایک ریکونسیٹ ہے کہ آپ کے دل میں میرے حوالے سے جو بھی خیال ہے پلیز آپ اس خیال کو اپنے دل سے نکال دیں کیونکہ میرے متعلق آپ کا انتخاب بہت غلط ہے میں ایسی نہیں ہوں جیسی آپ سمجھ رہے ہیں۔“

میری ذات اور آپ کی ضرورت کا کوئی جوڑ میل نہیں ہے میری ذات کچھ اور ہے آپ کی ضرورت کچھ اور ہے۔ آپ کی ضرورت تو آپ کی اپنی کلاس سے ہی پوری ہو سکتی ہے آپ اپنی کلاس سے نیچے کیوں آرہے ہیں۔“ مریم بہت زیادہ برداشت سے کام لے رہی تھی۔

”کیونکہ میں میک اپ سے بچ چوں اور رنگین بالوں سے آگیا چکا ہوں میرا دل آپ کی نیچل پیوٹی کا ہو کر رہ گیا ہے جب سے آپ کو دیکھا ہے ایک دن بھی آپ کی طلب کے بغیر نہیں گزرا سوچتا ہوں آپ کو دو قدم دور سے دیکھنے پہ میرا یہ حال ہے تو دو قدم اور قریب سے دیکھنے پہ کیا حال ہو گا۔“ جودت نے اپنے خیالات اور جذبات کا کھلے عام اظہار کیا تھا اور مریم کے صبر و برداشت خواب دے گئے تھے۔

”آپ یہاں سے خود جا میں گئے یا مجھے چیرا سی کو بلا کر بڑے گا۔۔۔؟“ وہ توج ہو چکی تھی۔

”مجھے یہاں سے نکالنے کے لیے چیرا سی کو بلا نے کی کیا ضرورت ہے بھلا۔۔۔؟ آپ خود میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے گیٹ سے باہر نکال دیں میں چپ چاپ چلا جاؤں گا۔“ جودت نے بڑی معصومیت سے اسے حل بتایا تھا اور مریم ٹھیکیاں پیچنے کے رہ گئی تھی۔

”ارے۔۔۔! جودت تم یہاں۔۔۔؟“ اچانک وزیننگ روم کے داخلی دروازے سے مسر زاق کی آواز ابھری تھی جو اس آئیڈی کی ریسل اور اوڑھنیں مریم ان کی آواز پہ چونک گئی تھی۔

”السلام علیکم آئی۔۔۔! کیسی ہیں آپ۔۔۔؟“ جودت ان کی سمت پلٹتے ہوئے پوری طرح ان کی طرف ہی متوجہ ہو چکا تھا۔

”وعلیکم السلام بیٹا! تم یہاں کیسے؟ اکیلے ہی آئے ہو۔؟ سائیم کیا ہے۔۔۔؟“ وہ اپنی ساڑھی سنبھالتی ہوئی اندر ہی آگئی تھیں اور مریم ان کی آپس میں جان پہچان پہ حیران رہ گئی تھی کہ گویا وہ جودت آندی کو اپنی مرضی سے اس آئیڈی سے نکال بھی نہیں سکتی تھی۔

”جی۔۔۔! وہ دراصل مجھے مس مریم سے کوئی کام تھا اس لیے یہاں آیا ہوں اور سائیم تو شاید یونیورسٹی چلا گیا

ہے۔“ جوڑنے کا کافی لارڈائی سے بتایا تھا جبکہ مریم اس کے جواب پہ سلگ اٹھی تھی اس نے جوڑت اکھڑی ہو
خاصی خوشخوار نظروں سے دیکھا تھا۔

”مریم سے کام تھا۔؟“ مسرزاق کو حیرت ہوئی تھی کیونکہ وہ بھی جانتی تھیں کہ مریم اس ٹائپ کی نہیں ہے۔
”جی میڈم۔! وہ دراصل چند روز پہلے میرے ابا جی کی طبیعت بہت زیادہ خراب تھی، ہم انہیں اسپتال لے
گئے تھے تب وہاں سے میڈسن لیتے ہوئے میں مل کے پیسے اپنے بھائی کے پاس ہی بھول گئی تھی اور اس وقت
اتفاق سے جوڑت صاحب بھی وہیں تھے اور میڈسن کا بل انہوں نے پے کروا دیا تھا اس لیے ان کا ادھار تھا میری
طرف یہ دی لینے آئے ہیں پلیز۔! جوڑت صاحب تھریے آپ میں ابھی پیسے لے کر آتی ہوں۔“

مریم نے بڑی حاضری دہائی سے بات کا رخ ہی پلٹ دیا تھا جس پہ مسرزاق حیران اور جوڑت ہکا بکا رہ گیا تھا۔
مسرزاق کو تعجب ہوا تھا کہ جوڑت محض کچھ پیسوں کے لیے وہاں آیا ہے۔؟ حالانکہ اتنے پیسے تو یقیناً اس
کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے۔؟ جبکہ دوسری طرف جوڑت کا بھی برا حال تھا مریم کی بات پہ وہ مسرزاق
کے سامنے شرمندہ ہو کے رہ گیا تھا۔

”لیجیے جوڑت صاحب۔! یہ آپ کے پیسے پورے دو ہزار روپے ہیں، چیک کر لیں۔! اینڈ تھینکس ایگس
آپ نے مشکل وقت میں میری ہیلپ کی میں آپ کا یہ احسان یاد رکھوں گی۔“ مریم نے کافی سلیقہ اور سمجھ داری
سے سارا معاملہ کلیئر کر دیا تھا اور جوڑت ہاتھ میں پکڑے ہزار ہزار کے نوٹ دیکھتا رہ گیا تھا۔

”اوکے میڈم۔! میں چلتی ہوں اب۔! انڈنس بھی لگوائی ہے، کلاس کا ٹائم ہو رہا ہے۔! اللہ حافظ۔“ مریم
انتہائی لارڈائی اور لاتعلقی کا مظاہرہ کرتی جوڑت کی سمت دیکھ بغیر وہاں سے چلی گئی تھی اور مسرزاق کے پاس کھڑا
جوڑت کچھ بھی نہیں کہہ سکا تھا۔

”ارے بیٹا۔! تم کھڑے کیوں ہو۔؟ بیٹھو نا۔“ مسرزاق نے سر جھٹکتے ہوئے آداب میزبانی نبھائے تھے۔
”تو تھینکس آئی۔! میں بھی اب چلتا ہوں، جس کام کے لیے آیا تھا وہ تو ہوا نہیں۔! خیر پھر سہی۔“ اس
نے کندھے اچکائے تھے۔

”کیا مطلب۔؟ کس کام کے لیے آئے تھے۔؟“ وہ تھکی تھیں۔
”نہیں۔! کچھ نہیں۔! اوکے اللہ حافظ۔“ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے خدا حافظ کہہ کر وہاں سے باہر نکل آیا تھا
لیکن کلاس رومز کے سامنے سے گزرتے ہوئے وہ ایک بار پھر ٹھہر گیا تھا۔

”اوہر آؤ۔! اس نے سامنے کری پیٹھے پیوں کو اشارہ کیا تھا۔“ جی صاحب۔؟“ وہ فوراً اس کے قریب
آیا تھا۔

”نہ لو۔! یہ تمہاری شپ ہے۔“ جوڑت نے ہاتھ میں پکڑے دو ہزار روپے اسے تھما دیے اور پیوں اس کی اتنی
عنایت پہ خوش اور حیران ہوا تھا۔ ”مہربانی صاحب۔! بہت بہت مہربانی۔“ پیوں اس کا بے خد مشکور ہو رہا تھا۔
”مہربانی بعد میں۔! پہلے میرا پیغام پہنچا کے آؤ۔“

”پیغام۔؟“
”ہاں پیغام۔! مس مریم کے لیے۔“
”جی صاحب۔! کیسے ابھی پہنچا دیتا ہوں۔“ پیوں جی جان سے الٹ ہوا تھا آخر دو ہزار کا تازہ نان تڑکا لگا تھا

اسے۔
”اوکے۔! ان سے کہو آپ سے آج کی ملاقات اچھی رہی، میں آپ سے ملنے پھر آؤں گا۔“ جوڑت نے
انتہائی اطمینان سے پیغام دیا تھا اور پیوں نے وہی پیغام جوں کا توں مریم تک پہنچا دیا تھا جس پہ مریم ایک بار پھر

بیٹان ہوا اٹھی تھی اس کے چہرے کا رنگ تبدیل کیا تھا۔!



آج موسم بے حد سرد اور ابر آلود ہو رہا تھا۔ فضا میں گہری دھند کی ایک پیرتہ چھائی ہوئی تھی اور اس دھند میں
باہل بھی جھکے آ رہے تھے۔ سیاہ بادلوں نے دن میں بھی رات کا سماں باندھ دیا تھا اور ایسے موسم میں زلفی کا بچکانہ
سن بچکانہ سی خواہش کرنے لگا تھا۔

”گل باجی۔! گل باجی۔! کہاں ہیں۔؟“ زلفی گل کو پکارتا ہوا اندر آ گیا تھا کیونکہ گیٹ پہ اس وقت گلاب
خان موجود تھا۔

”کون۔؟ کیا بات ہے۔؟“ گل کچن میں برتن دھو رہی تھی زلفی کی آواز سن کر وہیں سے جواب دیا تھا اور زلفی
بیدھا اس کے پاس پہنچ گیا تھا۔

”گل باجی۔! وہ رہا ہر بہت ٹھنڈ ہو رہی ہے۔“ زلفی نے جیسے اطلاع دی تھی۔
”ہوں۔! وہ تو میں جانتی ہوں۔! کوئی نئی بات کرو، کتنی ہے تو۔؟“ گل نے برتن دھو کر پانی کا ٹل بند کر دیا تھا اور
برتن خشک کرنے لگی تھی۔

”وہ باجی۔! وہ بارش بھی ہونے والی ہے۔“ زلفی کچھ کہنے کے لیے تمسید باندھ رہا تھا یہ بات گل فوراً ہی
بھانپ گئی تھی۔

”ہوں۔! میں یہ بھی جانتی ہوں۔! اس کے علاوہ کچھ۔؟“ وہ سارے برتن باری باری خشک کر کے ایک سائڈ
پر رکھتی جا رہی تھی۔

”وہ باجی۔! باہر ٹھنڈ بھی ہے بارش بھی بس ہونے ہی والی ہے تو ایسے موسم میں۔“ وہ پھر کچھ کہنے سے رک
گیا تھا اور گل اپنے چھوٹے بھائی کی اس جھگڑے بے ساختہ نرمی سے مسکرا دی تھی۔

”ہوں۔! بولو کیا کھاؤ گے۔؟ سموسے، پکوڑے یا کچھ اور چیز۔؟“ وہ برتن سمیٹ کر اس کی طرف متوجہ
ہوئی۔

”جی باجی۔! تمہیں بتا چل گیا۔؟“ زلفی خوشی سے چمکا تھا۔
”بے وقوف۔! بھائی کا ٹل کچھ کھانے کو چاہ رہا ہے تو سن کو بتا نہیں چلے گا تو اور کس کو چلے گا۔؟“ گل نے
اس کے کندھے چپت لگائی تھی۔

”اچھا۔! تو پھر تم بنا رہی ہو نا باجی۔؟“ زلفی نے یقین کرنا چاہا تھا۔
”ہاں ہاں۔! بناتی ہوں، لیکن اپنے کچن میں یہ صاحب کا کچن ہے، وہ آگے تو کیا سوچیں گے کہ ہم ان کے
جانے کے بعد اس طرح عیاشی کرتے ہیں۔؟“ گل کچن سے نکل آئی تھی۔

”لیکن صاحب ایسے نہیں ہیں گل باجی۔! وہ تو کھانا کھا رہے ہوں تو گلاب خان کو بھی اپنے ساتھ بٹھا لیتے
ہیں۔“ زلفی گل سے متفق نہیں تھا۔

”یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو زلفی۔! لیکن ہم کما اپنا رہے ہیں تو کھانا بھی اپنا ہی چاہیے نا کہ ضمیر زندہ رہے۔“
اس نے دلیل دی تھی۔

”ہاں۔! تو میں کب کہہ رہا ہوں کہ ضمیر کو مار دو، تم اپنے کچن میں ہی بناؤ، لیکن بناؤ تو سہی۔“ زلفی کو شاید
بھوک لگی ہوئی تھی اسی لیے زیادہ اتناؤ لا ہو رہا تھا۔

”ٹھیک ہے بناتی ہوں، سب کچھ بناتی ہوں، لیکن پکوڑوں اور چٹنی کے ساتھ نان بازار کے ہونے چاہئیں۔“

میرے بنانے تک تم بازار سے جا کر نان لے آنا۔“
”ٹھیک ہے۔! وہ تو میں لے آتا ہوں، لیکن کیا وہ پری بھی نان پکوڑے کھائے گی۔؟“ زلفی جاتے جاتے ٹھہر گیا تھا۔

”پریاں نان پکوڑے نہیں کھاتیں پنگے۔“ گل سمجھ گئی تھی کہ وہ علیزے کی بات کر رہا ہے۔
”لیکن باجی۔! مجبور اور قید پریاں سب کچھ کھالتی ہیں، کوڑے بھی اور پکوڑے بھی۔“ زلفی کی بات بھی بجا تھی گل کو اتفاق کرنا پڑا تھا۔

”ہاں۔! یہ بھی ٹھیک کہا تم نے۔ مجبوری، مفلسی اور قید سب کچھ کرواتا ہے، پرستان کی پریاں بھی خاک میں مل جاتی ہیں۔“ گل کا لہجہ دکھی سا ہو گیا تھا۔

”خیر چھوڑو باجی۔! اب رو نے مت بیٹھ جانا، آج موسم اچھا ہے، آج اس پری کو ہنسانے کی کوشش کرتے ہیں۔“ زلفی نے سر جھٹکا تھا۔

”دیکھ دل کو جکڑ کے بیٹھے ہوں تو ہونٹ ہنسنے کا سلیقہ بھول جاتے ہیں میرے بھائی۔“ گل نے ایک کمری سانس کھینچی تھی افسردہ اور اس کی۔

”گل باجی۔! رہتے رہتے وہ ہم کچھ بھی نہیں کرتے۔“ زلفی بھی دھیمادڑکا تھا۔
”ارے نہیں نہیں۔! ہم اپنے ساتھ ساتھ تمہیں اداس نہیں کر سکتے۔ تم جاؤ گلاب خان سے پیسے لے کر

نان لے آؤ۔“ گل نے فوراً ”اواہی کا حصار جھٹک دیا تھا اور پھر اس کے اصرار پر زلفی نان لینے چلا گیا تھا اور خود وہ کچن میں آگئی تھی۔



دل اور شاہ کورٹ سے فارغ ہوتے ہی سیدھا شوروم آیا تھا۔
یہ شوروم دل اور اور نیبل کی بار ٹر شپ پہ چل رہا تھا اس شوروم پہ دونوں نے برابر کے شیئرز زانو سٹ کے تھے، دونوں برابر کے حق دار تھے، لیکن دل اور کی کورٹ کی مصروفیت کی وجہ سے نیبل ہی شوروم کو زیادہ ٹائم دے رہا تھا اور دل اور کبھی کبھار ہی ٹائم دے پاتا تھا۔ لیکن آج کسی کام کے سلسلے میں نیبل کو اسلام آباد جانا پڑ گیا تھا اس لیے دل اور کو شوروم آنا پڑا تھا۔ اور وہ شوروم پہنچتے ہی اپنے سامنے موجود کسٹمر کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا اور ایسی ہی حیرانی اس کسٹمر کو بھی ہوئی تھی۔

”شاہ جی۔! آپ۔؟“ انسپکٹر شہناز کو اچنبھا ہوا تھا۔
”ہاں جی۔! میں ہی ہوں۔ لیکن آپ یہاں کیسے؟ کہیں کوئی چھاپہ وغیرہ تو نہیں مار دیا ہمارے شوروم پہ۔؟“

دل اور نے بریف کیس نیبل پہ رکھتے ہوئے حیرت اور پریشانی کا مصنوعی اظہار کیا تھا۔
”یہ آپ کا شوروم ہے۔؟“

”جی۔! یہ چھوٹی سی گاڑیوں کی دکان ہماری ہی ہے۔“ اس نے ہمیشہ کی طرح اتنے بڑے شوروم کو دکان کا نام دیا تھا۔

”لیکن شاہ جی۔! آپ نے کبھی بتایا تو نہیں؟“
”فرصت ہی کب ملے گی انسپکٹر صاحب۔؟“

”ہوں۔! اوکے تو پھر میں چلتی ہوں۔“ انسپکٹر شہناز نے کرسی پر رکھا اپنا بیگ اٹھا لیا تھا۔
”کیوں انسپکٹر صاحب۔؟ دکان پسند نہیں آئی۔؟“ دل اور کے ذمہ معنی لہجے پر انسپکٹر شہناز کے قدم تھم گئے تھے اس کی سمت پلٹی تھی۔

”یہاں سے شاہ جی۔! دکان بھی پسند ہے اور ”دکان دار“ بھی۔ لیکن افسوس کہ اس دکان دار کا بھاء بہت بڑا ہوتا ہے، میرا برس اس دکان سے خریدی ہوئی گاڑی کی قیمت انورڈ نہیں کر پائے گا۔“ انسپکٹر شہناز نے مایوسی اور بے چارگی سے سر ہلایا تھا۔

”ہاں۔! اگر دکان دار آپ سے یہ کہہ دے کہ پوری دکان ہی آپ کی ہے تو پھر۔؟“ دل اور انسپکٹر شہناز کی بات بے ساختہ توجہ دگا کے ہنسا تھا۔

”تو پھر یہ دکان دار کی کوئی نئی چال ہوگی، مجھ جیسے سادہ اور کمزور دل کسٹمر کو پھانسنے کے لیے۔“ انسپکٹر شہناز نے اپنے شکوک و شبہات کا اظہار کیا تھا۔

”چال۔؟ آپ دکان دار کے اتنے خلوص اور اتنی محبت کو بھی چال سمجھ رہی ہیں؟ افسوس کہ آپ کے ذہن سے شک کے جراثیم نہیں جاتے۔“ دل اور نے تاسف سے سر ہلایا تھا۔

”افسوس اور شک بھی تو اسی بات پہ ہے ناں شاہ جی کہ یہ دکان دار خلوص سے پیش آتا ہے، محبت سے نہیں۔! محبت سے پیش آئے تو یہ ٹکوڑی اپنی پوری زندگی کا ہی سودا نہ کر ڈالے۔؟“ انسپکٹر شہناز نے آہ بھری تھی۔

”ارے۔! اس دکان دار کا بھاء اتنا مہنگا بھی نہیں ہے کہ بدلے میں گاڑی کو اپنی پوری زندگی کا ہی سودا کرنا پڑ جائے۔“ وہ مسکرایا تھا۔

”یہ آپ کہہ رہے ہیں نا شاہ جی۔! کیونکہ آپ میری جگہ پہ نہیں ہیں، میری جگہ سے اپنے آپ کو دیکھیں نا۔“ انسپکٹر شہناز نے بات اور پوری جھوڑ دی تھی۔

”لگتا ہے موسم کا اثر ہے۔؟“ دل اور نے دلچسپی سے کہا تھا۔
”آپ کسی موسم سے کم تو نہیں ہیں۔ آپ کا ہی اثر ہے اور جس پہ آپ اثر کر جاتے ہیں پھر اس پہ کوئی اور موسم اثر نہیں کرتا۔“

”دروی والوں کے منہ سے شاعرانہ باتیں۔؟ حیرت ہوتی ہے کبھی کبھی۔“ دل اور نے مذاق کیا تھا وہ جان بوجھ کر انسپکٹر شہناز کو چھیڑ رہا تھا۔

”دروی والوں کے سینے میں بھی دل ہوتا ہے شاہ جی۔“ انسپکٹر شہناز نے اہستگی سے کہا تھا۔
”کون سا دل۔؟ دل اور شاہ والا دل یا پھر محض سینے میں قید رہ کر دھڑکنے والا دل۔؟“ اس نے پھر دلچسپی سے سوال کیا تھا۔

”جانے دیجیے شاہ جی۔! موسم پہلے ہی ابر آلود ہو رہا ہے۔“ انسپکٹر شہناز نے سر جھٹکا تھا۔
”جانے دیا انسپکٹر صاحب۔! اور کوئی حکم اس نے بری شرافت اور تابعداری کا مظاہرہ کیا تھا۔

”اُنی جان کے لیے گاڑی پسند کرنی تھی۔“ انسپکٹر شہناز نے شوروم کے چھپاتے ٹکوری پہ سچی گاڑیوں کو اک نظر دیکھا تھا۔

”موسٹ ویلکم۔! آپ گاڑی پسند کریں گاڑی آپ کے گھر پہنچ جائے گی۔“ دل اور نے ہاتھ سے گاڑیوں کی سمت اشارہ کیا تھا۔

”مجھے وہ آف وائٹ گاڑی پسند آئی ہے۔“

”او کے۔! وہی گاڑی آپ کے گھر پہنچ جائے گی۔“ دل اور نے سنجیدگی سے کہا تھا۔
 ”لیکن اس گاڑی کی قیمت۔؟ اس کی کیا ڈیل ہے آپ کی طرف سے۔؟“ انسپکٹر شہناز نے جاننا چاہا تھا۔
 ”میں عورتوں کے ساتھ ڈیل نہیں کرتا۔“ دل اور نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے انکار کر دیا تھا۔
 ”تو پھر۔؟“ انسپکٹر شہناز کو حیرانی ہوئی تھی۔

”پھر یہ ڈیل آپ کو اس شوروم کے سیکنڈ ہینڈ اور نئی خلیات کے ساتھ کرنا پڑے گی، کیونکہ فی الحال ہمارے پاس فیچر وغیرہ کی سہولت نہیں ہے اس لیے زیادہ تر ڈیلنگز ہمیں خود ہی کرنا پڑ رہی ہیں۔ لیکن آپ تسلی رکھیں آپ کے بجٹ کا پورا پورا خیال رکھا جائے گا۔“
 آخر میں دل اور نے اسے تسلی دی تھی۔

”یقین تو نہیں آتا کہ آپ میرے بجٹ کا خیال رکھیں گے۔ لیکن خیر مان لیتی ہوں۔“ انسپکٹر شہناز نے مایوسی سے کہتے ہوئے کندھے اچکائے تھے۔

”پھر وہی شک۔“ دل اور کے شکوے یہ انسپکٹر شہناز بے ساختہ کھلکھلا کے ہنسی تھی۔
 ”آپ کے کام ہی شک والے ہوتے ہیں شاہ جی۔! آپ کے کیس کی فیس ہی اتنی بھاری ہوتی ہے کہ لوگوں کو آپ کے پاس آتے ہوئے سو بار سوچنا پڑتا ہے پھر میں یہ کیسے مان لوں کہ آپ میرے بجٹ کا خیال رکھیں گے۔ اور مجھے کچھ ڈسکاؤنٹ دیں گے۔“

انسپکٹر شہناز جانتی تھی کہ دل اور کی فیس کلائنٹ کے کانوں سے دھواں نکال دیتی ہے۔ وہ شرکاء مہنگا ترین وکیل تھا۔

دیکھیے انسپکٹر صاحب۔ میں اگر لوگوں سے بھاری فیس لیتا ہوں تو ان کو مایوس بھی نہیں کرتا، میرے ہاتھ میں بیسے گئے کیس کی جیت بھی یقینی ہوتی ہے اور شاید آپ مومنہ بی بی کے کیس کو بھول گئی ہیں جس کی میں نے کوئی فیس نہیں لی بلکہ خود اس کیس پر پیسہ لگا رہا ہوں تاکہ کسی غریب کو انصاف مل سکے اور ایسے انصاف میں کئی غریبوں کو دلا چکا ہوں بس میری فیس ان ہی لوگوں کے لیے بھاری ہوتی ہے جن کے والٹ میں روپے کم اور کریڈٹ کارڈ زیادہ ہوتے ہیں۔“ دل اور نے انسپکٹر شہناز کی غلط فہمی دور کرنا چاہی تھی۔

”رے شاہ جی۔! میں تو مذاق میں کہہ رہی تھی ورنہ آپ کو مجھ سے بہتر کون جانتا ہے بھلا۔ مجھے پتا تھا کہ آپ اوپن ہارڈ ہیں اس لیے تو مومنہ بی بی کو میں نے آپ کے پاس بھیجا تھا ورنہ کسی اور کا خیال تو نہیں آیا مجھے۔“ انسپکٹر شہناز نے بھی اپنی بات کی وضاحت کی تھی۔

”پھر میری بھاری فیس کی شکایت کیوں کرتی ہیں۔؟“ دل اور نے خفگی سے کہا تھا۔
 ”میں نہیں کرتی لوگ کرتے ہیں۔“ وہ مسکرائی تھی۔
 ”یعنی۔! آپ کے لیے لوگ اہم ہیں۔“

”لوگ جائیں بھاڑ میں شاہ جی۔ میرے لیے آپ اہم ہیں، میری بلا سے اس سے بھی زیادہ بھاری فیس لیں۔ مجھے کیا تکلیف ہے بھلا۔“ انسپکٹر شہناز خفگی سے جھنجھلا کے بولی تھی اور دل اور پھر قہقہہ لگا کر ہنسنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

”ہاں ہاں۔! کیوں نہیں۔ ایسی ہی ایک فیلڈ میں آپ خود بھی تو ہیں ناں۔؟ آخر زیرو میٹر گاڑیاں ایسے ہی تو نہیں خریدی جاتیں۔“ دل اور کا اشارہ رشوت کی طرف تھا جس کو سمجھتے ہی انسپکٹر شہناز نے کانوں کو ہاتھ لگائے تھے۔

”توبہ شاہ جی۔! اب یہ الزام تو نہ دیں ہماری حق حلال کی کمائی ہے۔“

”ہوں۔! ایسے ہوتی ہے تکلیف۔ جب کوئی ہماری حق حلال کی کمائی کو کوئی الزام دیتا جاتا ہے۔“ دل اور نے اسے آئینہ دکھایا تھا۔

”او کے ایم سوری۔“ انسپکٹر شہناز نے معذرت کی تھی۔
 ”نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے آپ بیٹھے میں چائے منگواتا ہوں۔“
 ”تو تھینکس۔! چائے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے فی الحال کسی کام سے جانا ہے اور بارش اسٹارٹ ہونے سے پہلے مجھے یہاں سے نکل جانا چاہیے۔“

”او کے۔! جیسے آپ کی مرضی۔“ بانی گاڑی کی قانونی کارروائی اور پیسہ زد وغیرہ آپ کل خود آئیں گی تو نیل کروا دے گا، البتہ گاڑی پر میں سیل ٹیک لگا دیتا ہوں۔“ دل اور نے وہ گاڑی اس کے لیے یک کروادی تھی انسپکٹر شہناز کی موجودگی میں ہی اس گاڑی پر سیل کا ٹیک لگا دیا گیا تھا اور پھر وہاں سے نکل آئی تھی اور ابھی وہ انسپکٹر رخصت کر کے فارغ ہوا ہی تھا کہ اس کا سیل فون بجنے لگا تھا۔

اس نے سیل فون اٹھا کر دیکھا تو اسکرین پر عبد اللہ کا نمبر نظر آیا تھا جس پر اس نے فوراً ”کال ریسیو کی تھی۔“ السلام علیکم۔! ”وہی کال ریسیو کرنے کا مخصوص اشارہ۔“
 ”علیکم السلام۔! کہاں ہو۔؟“ عبد اللہ نے چھوٹے ہی استفسار کیا تھا۔

”شوروم میں۔! اس کا جواب مختصر تھا۔
 ”اور نیل صاحب۔؟ وہ کہاں ملیں گے اس وقت۔؟“ عبد اللہ کا لہجہ طنزیہ ہو رہا تھا۔
 ”سلام آباد میں! اس کا دوسرا جواب بھی مختصر تھا۔

”کیوں؟ سلام آباد میں کیوں؟“ عبد اللہ کو حیرانی ہوئی تھی۔
 ”کام کے سلسلے میں! اس کا تیسرا جواب بھی مختصر ہی موصول ہوا تھا۔
 ”اف یار! ایک تو میں تم لوگوں کے کام سے تنگ آ گیا ہوں کام کام ہر وقت کام یا رکبھی کام کے علاوہ بھی کچھ کر لیا کرو۔“

”مثلاً۔“ کیا کریں۔“ دل اور نے ان اس سے پوچھا تھا۔
 ”محبت کرو یا رکبھی! قسم سے یار مڑا آ جاتا ہے محبت کر کے۔ محبت کرنے والے کام کرنا بھول جاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں محبت ہی کام ہے۔“ عبد اللہ نے جھٹ سے مشورہ دیا تھا مفت اور مفید!

”ہو نہ ملک صاحب۔! آپ ٹھہرے جدی پشتی رئیس اور جاگیردار آپ کا گزارہ صرف محبت کر کے بھی ہو جاتا ہے لیکن ہمارا گزارہ صرف محبت سے نہیں ہو سکتا۔ ہمیں کام کرنا پڑتا ہے۔ آپ اب بھی فرق دیکھ لیں۔“

آپ محبت کر کے شادی رچا کر بیوی کے ساتھ بڑے سکون سے گھر پر آرام فرما ہیں اور انتہائی اطمینان اور تسلی کے ساتھ اپنے بیڈ روم میں بیٹھے یہ ابر آورد موسم یہ دھند میں لیٹا دن اور یہ بھیگا دسمبر انجوائے کر رہے ہیں جبکہ ہم دونوں چھترے چھانٹ بے چارے صبح صبح گھروں سے نکل کر کام کے لیے تنگ رہے ہیں۔ کورٹ کچہری اور آفسز کے دھکے کھاتے پھر رہے ہیں وہ اسلام آباد میں ٹھہر رہا ہے اور میں لاہور میں۔ کیونکہ آپ نہ بھی کام کریں گے تو گزارہ ہو جائے گا، لیکن کام کیے بغیر ہمارا گزارہ نہیں ہوگا۔“

دل اور کی بات یہ عبد اللہ اپنا بے ساختہ انداز والی قہقہہ نہیں روک سکیا تھا۔
 ”ہا ہا ہا۔! اسی لیے تو کہا ہے کہ تم لوگ بھی ایسا موسم گھر بیٹھے انجوائے کرنے کا سامان کر لو یعنی محبت کر لو۔“

”بس بس۔! رہنے دو۔ جب ہمارا دل چاہے گا ہم کریں گے تم اپنے مشورے اپنے پاس رکھو دل اور نے مصنوعی غصے سے کہا تھا۔

”او کے! نہ کرو محبت لیکن انجوائے تو کرو“ عبد اللہ شرارت سے کہہ رہا تھا۔

”وہ کیسے؟“

”وہ ایسے کہ نگارش آج بچن میں ہے اور وہاں سے طرح طرح کی خوشبوئیں آرہی ہیں میں نے سوچا کہ جلتی سے نہیں اترے گا۔ اس لیے تم لوگوں کو بھی بلا لیتا ہوں۔“ عبد اللہ نے اپنے فون کرنے کی وجہ بتائی تھی۔
”تو تھمتھکتے یاں! تم اکیلے ہی انجوائے کرو مجھے یہاں کام ہے۔“ دل آور نے بڑی سہولت سے انکار کر دیا تھا۔
”یہی کی تبتبتی تمہارے کام کی اس نے اتنا سب کچھ اس پیشانی تم دونوں کے لیے بنوایا ہے سب ضائع چلا جائے گا کم از کم تم تو آسکتے ہو نا؟“ عبد اللہ غصے سے بھنا گیا تھا۔

”دل! اور بھائی! میں نے یہ سب کچھ اس لیے بنایا ہے تاکہ آپ لوگ ہمارے گھر آسکیں ورنہ گھر میں یہ سب کچھ تو ہم روز بے روز بناتے رہتے ہیں۔“

عبد اللہ کے قریب سے نگارش بھابی کی آواز ابھری تھی جو دل اور کو سیل فون کے ایئر پیس سے صاف سنائی دی تھی اور دل اور کے پاس مزید انکار کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔

”او کے! میں آ رہا ہوں۔“ اس نے ہائی بھری تھی۔

”بھائی! میں جاؤ مت آؤ تم میرے بلائے پہ نہیں اپنی بھابی کے بلائے پہ آ رہے ہو۔“ عبد اللہ کاٹ کھانے کو روڑا تھا۔

”ظاہر ہے! بھابی نے ہمارے لیے اتنی محنت کی ہے! اتنا کچھ بنایا ہے تو انہی کے لیے آئیں گے نا؟ دل آور نے جواباً اسے اور چڑایا تھا اور عبد اللہ نے کھٹاک سے فون بند کر دیا تھا جس پہ دل آور بے ساختہ ہنسا تھا۔

”علیٰ بی بی! علیٰ بی بی! علیٰ بی بی!“

وہ فرش پہ بچھے بستر پہ بیٹھی سر دی سے ٹھٹھری رہی تھی اور اپنے ہاتھ پاؤں کبل میں چھپانے اور گرم کرنے کی کوشش کر رہی تھی جب زلفی کی آواز یہ اس نے چونک کر دیکھا تھا۔

”مت! تم کون۔“ اس کی آواز بھی ٹھٹھری ہوئی تھی۔

”میں! گل! گل! باجی کا بھائی ہوں بی بی جی! زلف خان نام ہے میرا مگر سب زلفی کہتے ہیں۔“ وہ پرلی اس سے مخاطب تھی زلفی خود گڑبگڑا گیا تھا۔

”گل کہاں ہے؟“ علیٰ بی بی نے اپنے آپ کو کنٹرول کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”وہ جی! وہ کچن میں ہے۔“ باہر بارش ہو رہی ہے اور بہت ٹھنڈ بھی ہے اس لیے ہم لوگوں نے گھر پہ سموے اور پکوڑے بتائے ہیں باجی نے کہا کہ آپ کو بھی دے آؤں یہ آپ کے لیے ہیں۔“ زلفی نے چھوٹی سی ٹپے نیچے فرش پہ علیٰ بی بی کے قریب ہی رکھی تھی حالانکہ وہ یہ بات گول کر گیا تھا کہ یہ سموے اور پکوڑے دینے کے بہانے اسے دیکھنے کے لیے آیا ہے کیونکہ وہ جب سے آئی تھی زلفی نے اسے دوبارہ دیکھا جو نہیں تھا اور اب اسے دیکھ کر وہاں سے ہٹنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اسے اپنے صاحبہ حیرت ہوئی تھی میرے کو مٹی میں رول رہا تھا۔

”گل سے کہنا میرے پاس آئے۔“ اس نے زلفی کو پیغام دیا تھا۔

”جی! ابھی! بھیجتا ہوں۔“ زلفی فوراً سر ہلاتے ہوئے پلٹ گیا تھا۔

اور علیٰ بی بی کی نظریں اس ٹپے پہ ٹھہر گئی تھیں ایک پلیٹ میں سموے تھے ایک پلیٹ میں پکوڑے تھے ساتھ ہی چھوٹے سے باؤل میں چٹنی اور کچھ چھپ تھا اور ایک اور پلیٹ میں اخبار میں کوئی چیز لپی ہوئی تھی وہ چیز کیا

تھی یہ تو علیٰ بی بی کو نہیں پتا تھا البتہ اس اخبار کے ٹکڑے علیٰ بی بی کی نظریں جم سی گئی تھیں۔
”وقار آندی۔“ اس نے اخبار کی سرخی میں نظر آئے نام کو زیر لب دہرایا تھا اور جب یقین ہو گیا کہ یہی نام لکھا ہوا ہے تو اس نے پلیٹ میں سے وہ اخبار کا ٹکڑا جھپٹ کر اٹھایا تھا جس میں سے دو تین نان پلیٹ میں گرے تھے اس اخبار میں نان لپیٹے ہوئے تھے حوزہ فنی جلدی میں یونی اٹھا لایا تھا۔

”شدید ترین فوج کے شکار وقار آندی کو کل صبح ہاسپتال سے ڈسچارج کر کے گھر بھیج دیا جائے گا۔“

علیٰ بی بی کی آنکھیں پٹی کی پٹی رہ گئی تھیں۔ وہ بار بار اس سرخی کو پڑھ رہی تھی اور پھر پھر راری تھی۔

”جی بی بی جی! آپ نے بلایا تھا مجھے؟“ گل کی آواز پہ علیٰ بی بی نے یکدم چونک کر دیکھا تھا۔

”گل! یہ! یہ! اخبار! یہ! اخبار کہاں سے آیا ہے کس ڈیٹ کا ہے یہ۔“ علیٰ بی بی نے تڑپ کے کھڑی ہو گئی تھی اس نے اخبار کا وہ چھوٹا سا ٹکڑا گل کے سامنے لہرایا تھا۔

”مجھے کیا پتا یہ اخبار کس ڈیٹ کا ہے بی بی جی! اس میں تو زلفی نان پلیٹ کر لایا تھا بازار سے۔“ گل نے

الاعلیٰ کا اظہار کیا تھا۔

”مجھے۔“ مجھے یہ پورا اخبار لاؤ کہیں سے پلیز گل مجھے یہ پورا اخبار لاؤ۔“ علیٰ بی بی نے اس اخبار کے ٹکڑے کو دیکھتے ہوئے رو پڑی تھی۔

”ارے بی بی جی! کیا ہو گیا ہے؟ ایسا کیا ہے اس اخبار میں؟“ گل اس کو یوں تڑپ تڑپ کے روتے دیکھ کر پریشان ہو گئی تھی۔

”میرے بیا یہ فوج کا انیک ہوا ہے اور مجھے پتا ہی نہیں۔“ علیٰ بی بی روتی ہوئی فرش پہ روزانو بیٹھ گئی تھی اور وہ اخبار کا ٹکڑا مٹیوں میں دوچ رکھا تھا جس پہ نہ ڈیٹ تھی اور نہ ہی اس سرخی کے نیچے دیا حوالہ یا تفصیل تھی۔ کیونکہ نیچے سے اخبار پھٹا ہوا تھا بلکہ چاروں اطراف سے پھٹا ہوا تھا اور علیٰ بی بی اس ٹکڑے کو دیکھ دیکھ کر رو رہی تھی تڑپ رہی تھی وہ بھی بے بس تھی اور اخبار کا وہ پھٹا ہوا ٹکڑا بھی بے بس تھا!

”فوج کا انیک۔“ گل بھی سن کر پریشان ہو گئی تھی۔

”گل! مجھے یہ اخبار لاؤ۔“ پلیز گل۔“ علیٰ بی بی ہلک رہی تھی۔

”بی بی جی! مجھے پتا تو نہیں کہ یہ اخبار کون سا ہے؟ لیکن ایک خبر مجھے پتا ہے تقریباً سارے ہی اخباروں میں آتی ہے آپ صاحب کے پرانے اخباروں میں سے دیکھ لیں۔“ شاید مل ہی جائے۔“ گل کا آئیڈیا برا نہیں تھا

علیٰ بی بی نے تڑپ کے دیکھا تھا۔

”ارے اخبار؟ کک کہاں ہیں؟“ وہ یکدم کھڑی ہو گئی تھی۔

”وہ کونے میں رکھی الماری میں پڑے ہیں اس سال کے سارے اخبار مل جائیں گے آپ کو۔“ گل نے بڑی ذہانت کا ثبوت دیا تھا اور علیٰ بی بی کے ایک کے اس الماری کی طرف بھاگی تھی اور پھر اگلے چند سیکنڈ میں وہ اخبارات سے بھری الماری فرش پہ الٹ چکی تھی اسے چندرہ اور سولہ تو میر کے اخبار کی تلاش تھی اور اس تلاش میں اسے زیادہ دور نہیں جانا پڑا تھا چونکہ نومبر سے چودہ ستمبر تک سارے اخبار اس کے سامنے تھے۔ اس کے پر تھ ڈے سے لے کر وقار آندی کے پیر الازہ ہونے تک کی تمام خبریں اخبار کی سرخیوں کی زینت بنی ہوئی تھیں اور

علیٰ بی بی نے سولہ نومبر کا اخبار ہاتھ میں آتے ہی دھاڑیں مار مار کر رونا شروع ہو گئی تھی۔

”بی بی! یہ! یہ! کیا ہو گیا ہے آپ کو؟“ علیٰ بی بی روتے روتے فرش پہ بی بی ہو گئی تھی اس کے آنسو اخبار کے ڈھیر پہ گھر رہے تھے اور اخبارات کے کاغذ کیلے ہوتے جارہے تھے۔

”بی بی جی! سنہالیے اپنے آپ کو۔“ اس طرح رونے سے تو کچھ نہیں ہو گا نا؟“ گل نے فرش پہ جھکی تڑپ

ترب کے روتی علیحدے کو سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن علیحدے کا دل غم سے چوڑھا۔ اتنی جلدی کیے سنبھل جاتی۔

میں ہم کبھی تو ایسے کہ حجاب بھول جائے
میں سوال بھول جاؤں ' وہ جواب بھول جائے
وہ کسی خیال میں ہو اور اسی خیال میں ہی
کبھی میرے رستے میں وہ گلاب بھول جائے
تیری سوچ پر ہو حاوی میری یاد اس طرح سے
کہ تو اپنی زندگی کا یہ نصاب بھول جائے

بارش دیوانہ وار برس رہی تھی۔

اور زری اندرونی مین ڈور کے سامنے والے حصے میں بڑے سے ستون سے ٹیک دگائے کھڑی بارش کی یہ دیوانگی
بڑے دل سے بڑے دھیان سے دیکھ رہی تھی اور اس دیوانی بارش میں بھگتے سبز لان ' سبز پودے اور رنگین پھول
بھی اس کی توجہ اپنی طرف مبذول نہیں کر پا رہے تھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی وجد میں کھڑی ہو وہ وہاں ہو کر بھی
وہاں نہیں لگ رہی تھی۔

اس کے دھیان اس کے گیان اس کی روح پہ دل اور شاہ کی حکمرانی تھی اور وہ اسی حکمران کے تابع کھڑی تھی
اسے بس اتنی خبر تھی کہ بارش ہو رہی ہے آپ اس بارش میں کیا کیا ہو رہا ہے؟ اسے ذرا بھی خبر نہیں تھی لیکن
جیسے ہی اس دھواں دھار رستی بارش میں ان کے گھر کا کپٹ کھلا تھا اس کا عشق کی اٹھا تھا۔

کیونکہ آنے والا دل اور شاہ تھا اور زری کو لگا یہ دیوانی بارش اس پہ برس گئی ہو اس کا من بھگ بھگ گیا تھا۔
گاڑی پور ٹیکو میں پارک کر کے وہ گاڑی سے اتر آیا تھا اور پور ٹیکو سے مین ڈور تک آتے آتے وہ دھواں دھار
بارش کی تیز بو چھاڑ سے اچھا خاصا بھگ گیا تھا اور مین ڈور کے سامنے والے حصے کی چھت کے نیچے آتے ہی اس
نے اپنی شرٹ اور اپنے بالوں پہ پڑنے والا بارش کی بوندوں کا پانی چھاڑنا شروع کر دیا تھا اور اپنے اس دھیان اور
عجلت میں وہ ستون کے قریب کھڑی زری کو نہیں دیکھ پایا تھا۔ اور وہ بھی کہ اس کی اک اک حرکت اک اک جنبش پہ
واری جا رہی تھی۔

دل چاہا اس کے چہرے اس کے بال اس کی شرٹ پہ گرنے والے بارش کے قطروں کو اپنے دپٹے میں جذب
کر لے اور دپٹے کو مغزور کر ڈالے اپنی قسمت پہ اور اپنی اوقات پہ۔ لیکن دل نے تو بس چاہا تھا۔ اور چاہت
کس کی پوری ہوتی ہے بھلا۔۔۔؟

اندر کی طرف بڑھتے دل اور شاہ کے قدم اپنے پیچھے ابھرنے والی آواز پہ ٹھٹک کر رک گئے تھے اس نے چونک
کر اس آواز کے تعاقب میں دیکھا تھا اور اسے دیکھ کر وہ ہنسم سا گیا تھا۔

آج وہ بھی کچھ اور سے کچھ اور لگ رہی تھی دل اور شاہ کی نظریں حیران رہ گئی تھیں وہ ریڈ کلر کے خوب
صورت ' ویدہ زیب اور جدید تراش خراش کے سوٹ میں ملبوس بلیک کلر کی لانگ جری پینے ' خوب صورتی اور
نفاست سے دپٹے اور ڈھے سرخ گلاب کے پھولوں کی زری اس کے بالکل سامنے ہی تو کھڑی تھی اور دل اور شاہ
انہی دیکھنے کی تاب نہیں لایا تھا اور ساختہ نظریں جھکا لی تھیں ' دل اور شاہ کی تیس سالہ زندگی میں ایسی کوئی
عورت اور ایسا کوئی مرد نہیں تھا کہ جس کے سامنے اس کی نظریں جھکی ہوں ' سوائے ایک زرین ملک کے۔!

اس کی زندگی میں زری وہ واحد ہستی تھی جس کو دیکھتے ہوئے ہمیشہ ہی اس کی نظریں جھک جاتی تھیں جس طرح
وہ اپنی کلاں دار آنکھوں سے باقی سب کو دیکھتا اور گریٹا کے رکھ دیتا تھا اس طرح وہ اسے نہیں دیکھ پاتا تھا اس کے
سامنے تو وہ ہمیشہ نظریں چرا کے اور کترا کے بات کرتا تھا ' بلکہ زری کے سامنے تو اس کا سر بھی جھک جاتا تھا اور
گردن بھی۔!

بالکل ایسے جیسے اس وقت ہوا تھا دل اور نے سر بھی جھکا لیا تھا اور نظریں بھی ' کیونکہ اگر اس لمحہ نظریں اٹھا
کر اسے دیکھ لیتا تو یقین کامل تھا کہ یا تو دل اور شاہ۔ دل اور شاہ نہ رہتا۔ یا زری۔ یا زری نہ رہتی۔ اس
مختصر لمحے میں سب کچھ بدل سکتا تھا۔ دل بھی اور دنیا بھی۔ بس اک ذرا دیکھنے کی دیر تھی۔ اور وہ اس دیکھنے
سے کترا گیا تھا۔ وامن بچا گیا تھا۔

"السلام علیکم۔۔۔! کیسی ہیں آپ؟" دل اور کو نظریں جھکانے کے باوجود ملاقات کے آداب نبھانے پڑے
تھے۔

"مگر آپ دل کے طریقے سے پوچھتے تو میں آپ کو بتاتی کہ میں کیسی ہوں؟ لیکن آپ دنیا داری کے طریقے سے
پوچھ رہے ہیں تو بتانا پڑے گا کہ اچھی ہوں ' ٹھیک ہوں ' خوش ہوں۔" زری کے لہجے اور الفاظ میں شکوے تھے
شکایتیں ' غصے ' غلے تھے ' لیکن اس نے تو جیسے ہی نہ تھے۔

"یہ تو بہت خوشی کی بات ہے کہ آپ اچھی ہیں ' ٹھیک ہیں ' خوش ہیں ' انسان کو اور کیا چاہیے بھلا۔۔۔؟" دل
اور نے سنجیدہ سے لہجے میں کہا تھا۔

"ہونہ۔۔۔! انسان کو اور کیا چاہیے بھلا۔۔۔! یہ بھی بتا دوں یا سمجھ جائیں گے۔۔۔؟" زری ہنوز ستون کے ساتھ
پشت لگائے دونوں ہاتھ اپنی جرسی کی قبضوں میں پھنسائے انتہائی سکون سے کھڑی اپنے سامنے کھڑے دل اور شاہ
جیسے مجرم کو دیکھ رہی تھی جو اس کے دل کی عدالت میں کھڑا تھا اور اقبال جرم پہ تیار نہیں تھا۔

"میرا خیال ہے کہ بہت ٹھنڈ ہے یہاں ' ہمیں اندر چلنا چاہیے؟" دل اور اس کا سوال نظر انداز کر گیا تھا کیونکہ
وہ جواب نہیں دینا چاہتا تھا۔

"وکیل صاحب! ٹھنڈ لگ رہی ہے؟ یا ڈر لگ رہا ہے؟" زری تو آج اس کے لیے دل اور شاہ ثابت ہو رہی تھی
۔۔۔ نڈر اور اٹل!

"ڈر اچھا ہوتا ہے! شعلے اگلنے والے دل اور کالج اس لمحے بہت دھیما تھا۔
"بے وقت لگے تو برا بھی ہوتا ہے۔" زری اپنے انداز دیوانی پہ قائم تھی۔

دور کا وہ سرانام عزت ہے۔ اس لیے آپ کے دل میں اور نظریں یہ ڈر ہونا ہی چاہیے ' دوسرے لفظوں میں
میرا مطلب ہے کہ عزت ہونی چاہیے ' جب ہم اپنے دل و نظیر کا یہ ڈر اتارتے ہیں تو سمجھیں کہ عزت اتارتے ہیں
۔۔۔ اور عزت اتارنا اچھی بات نہیں۔۔۔ اس نے وکیل دی تھی۔

"ہونہ! اصفائی دینا تو کوئی آپ سے سیکھے۔" زری کے انداز میں خفگی تھی۔
"کیا کروں۔۔۔؟ میرا تو کام ہی یہی ہے؟" دل اور کے لہجے میں سختی کا رس تھا۔

"جانتی ہوں! آپ کا تو کام ہی یہی ہے ' پھر بھی الجھ رہی ہوں۔" زری نے سر جھکا تھا۔
"الجھنے سے بہتر ہے کہ کوئی کام کر لیں۔ اس نے مشورہ دیا تھا۔

"میں کام نہیں کرتی۔" اس نے لا پرواہی سے جواب دیا تھا۔
"میں جانتا ہوں! آپ کام نہیں کرتیں ' آپ محبت کرتی ہیں۔ وہ سوچ کے رہ گیا تھا۔

"یہ بھی اچھا کرتی ہیں۔" اس نے لا پرواہی کا جواب لا پرواہی سے ہی دیا تھا ' گویا جانا چاہ رہے ہیں؟ وہ اسے

نظروں سے جانچ رہی تھی۔

”ہوں! عبد اللہ انتظار کر رہا ہو گا دل اور نے وہاں سے جانے کا جواز دھونڈا۔“

”جائیے۔۔۔ ضرور جائیے۔ وکیل صاحب ویسے بھی یہاں بہت ٹھنڈ ہے۔ آپ کو لگ جائے گی۔۔۔ زری نے اسے آزاد کیا تھا۔“

”تھینک یو!“ دل اور نے مزید کچھ بھی کہے بغیر اور بات کو طول دے بغیر اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے قدم دوبارہ اندر کی سمت موڑ لیے تھے کیوں جیسے اسے کٹھن سے رہائی ملی ہو۔

”سینے وکیل صاحب!“ اس نے پھر پیچھے سے آواز دی تھی اور اس کے قدم دوبارہ رک گئے تھے۔
”اگر کوئی آپ کو اپنے دل کا وکیل کر لے تو کیا خیال ہے۔ کیس جیت جائیں گے یا ہار جائیں گے۔“ اس بگڑے کے پگڑے سوال تھے لیکن دل اور اس کے اس پگڑے سوال پہ اس کی سمت پلٹا نہیں تھا بلکہ اس کی سمت پشت کی۔

”ہار جاؤں گا۔“ اس کا جواب دو ٹوک تھا۔

”کیوں۔۔۔ وکیل صاحب کیوں؟ میں نے تو سنا ہے آپ کوئی کیس نہیں ہارتے۔“ زری تڑپ ہی تو گئی تھی

”وہ دنیاوی کیس ہوتے ہیں۔ میں کسی دل کا کیس نہیں لڑ سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ میں ہار جاؤں گا۔ اس لیے کوئی بھی مجھے اپنے دل کا وکیل نہ کرے۔“ اس نے انتہائی سنجیدگی سے حقیقت سے آگاہ کیا تھا اور زری چپ کی چپ رہ گئی تھی اور دل اور نے قدم آگے بڑھا دیے تھے۔

”وکیل صاحب! آپ ایک بار کوشش تو کر سکتے ہیں نا؟“ اس کی کانپتی ہوئی آواز پھر اس کے قدموں کی زنجیر بنی تھی۔

”میں کوشش نہیں کرتا عمل کرتا ہوں۔“

”آپ عمل کریں اور ہار جائیں۔ یہ بھی تو نہیں ہو سکتا نا؟“

”مہاری زندگی میں کچھ کیس ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو ہم ہر صورت میں ہار جاتے ہیں کوشش کر کے بھی عمل کر کے بھی۔ کیونکہ یہ ہار مقدر میں لکھی ہوئی ہے جو ہمیں مل کر ہی رہتی ہے چاہے جتنی بھی تیری کمو چاہے جتنی بھی تدبیر کرو۔“ دل اور نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی اور پھر اس کی سمت پلٹ کر دیکھے بغیر اندر چلا گیا تھا۔

زری کے قدم بے ساختہ پیچھے ہٹے تھے اور وہ ستون سے لگ گئی تھی وہ بے یقین سی ہوئی تھی تو بے چین وہ بھی ہو چکا تھا۔ نگار ش بھا بھی اور عبد اللہ کے پاس ہو کر بھی وہ ان کے پاس نہیں تھا وہ تو باہر ہی ستون کے پاس کھڑا رہ گیا تھا۔۔۔ دل و جان سیت!

مغرب کا وقت تھا جب باہر دروازے پر دستک ہوئی تھی۔

مریم اور عابدہ خاتون تو صبح سے ہی اس دستک کے انتظار میں تھیں لیکن جیسے ہی یہ دستک ہوئی تھی ان دونوں ماں بیٹی کے دل دھڑک اٹھے تھے کسی انہونی کے خیال سے ہی جسم کانپ گیا تھا کیونکہ وہ دونوں ہی پہچان چکی تھیں کہ یہ دستک عدیل کی نہیں ہے۔

”آپ ٹھہریے۔۔۔ میں ویسے ہی ہوں۔“ مریم نے عابدہ خاتون کو چارپائی سے اٹھتے دیکھ کر روک دیا تھا اور عابدہ

خاتون تو پہلے ہی اندر سے عدھال تھیں مریم کے رد کرنے پہ جہاں کی تہاں رہ گئی تھیں۔

”کون ہے؟“ اس نے دروازے کے قریب آکر پوچھا تھا۔

”نہیں ہوں شہریار! عدیل صاحب نے بھیجا ہے۔“ باہر سے شہریار کی تھکی تھکی سی آواز سنائی دی تھی۔

”شہریار۔۔۔؟“ مریم نے فوراً ہی دروازہ کھول دیا تھا۔

”السلام علیکم!“ شہریار نے احتراماً ”نظر میں جھکاتے ہوئے سلام کیا تھا۔

”و علیکم السلام! عدیل بھائی کہاں ہیں؟“ مریم کے انداز میں بے چینی تھی۔

”وہ اس وقت پولیس اسٹیشن میں ہیں باؤ! امتیاز نے انہیں جیل بھجوا دیا ہے ہم صبح سے انہی کے لیے بھاگ دوڑ کر رہے تھے لیکن بارش کی وجہ سے کوئی بھی کام سیدھا نہیں ہو سکا اور کل پھر بند ہے کل بھی کچھ نہیں ہو سکے گا۔“

شہریار اسے سمجھانے اور تسلی دینے کے لیے تفصیل سے بتا رہا تھا اور مریم بمشکل اپنے قدموں پہ کھڑی رہ سکی تھی۔

”اب اب کیا ہو گا؟“ اس کی آواز لرز رہی تھی۔

”آپ پریشان نہ ہوں! بس دعا کریں اللہ سب بہتر کرے گا ہم سب باؤ امتیاز کو منانے کی کوشش کر رہے ہیں اگر وہ مان گئے تو عدیل صاحب فوراً باہر آجائیں گے ان شاء اللہ! مجھے پورا یقین ہے کہ اللہ بہتر سبب نکالے گا۔“ شہریار اسے تسلی دے رہا تھا لیکن مریم کا دل اتنی آسانی سے کیسے بہل سکتا تھا۔؟ اسے سنبھلنے کے لیے چند منٹس چند سیکنڈز چند گھنٹوں کی ضرورت تھی کچھ وقت درکار تھا تو نئی قدموں پہ کھڑے کھڑے کیسے سنبھل جاتی؟

”مریم! کیوں کھڑی ہو؟ کون ہے؟“ وہ عابدہ خاتون کی آواز پہ چونک کے متوجہ ہوئی تھی۔

”جی امی! آری ہوں۔“ اس نے اپنے اعصاب ٹھکانے نہ لائے ہوئے پلٹ کر انہیں جواب دیا تھا۔

”اچھا! میں اب چلتا ہوں دوبارہ کوئی خبر ہوئی تو دوبارہ آؤں گا بلکہ جب تک عدیل صاحب گھر نہیں آتے ہیں آپ کی خبر لینے کے لیے آتا ہی رہوں گا“ آپ کو باہر کا کوئی بھی کام ہو مجھ سے کہیے گا میں کروں گا“ آپ عدیل صاحب کی بہن ہیں تو میری بھی بہن ہیں۔ آپ کی عزت آپ کا احترام سر آنکھوں پہ۔“ شہریار نے اپنی خدمات پیش کی تھیں اور مریم اس کی مشکور ہو کر رہ گئی تھی۔

”تھینک یو۔۔۔ تھینک یو سوچ! ایم سوری امی اور باقی گھر والوں کو ابھی اس مسئلے کا علم نہیں ہے اس لیے فی الحال آپ کو اندر نہیں بلارہی جس کے لیے میں بہت شرمندہ ہوں آپ سے۔“ مریم نے شہریار کے باہر کھڑے ہونے پہ معذرت چاہی تھی۔

”ارے! نہیں نہیں۔ میں اندر نہیں آ سکتا۔ یہ مناسب نہیں ہے عدیل صاحب گھر پہ ہوتے تو اور بات تھی لیکن ان کی غیر موجودگی میں نہیں۔“ شہریار نے سمجھ داری کا ثبوت دیتے ہوئے خوبی انکار کر دیا تھا اور پھر اسے خدا حافظ کہہ کر وہاں سے چلا گیا تھا۔

اور مریم دروازہ بند کر کے اندر آگئی تھی عابدہ خاتون اسی کے انتظار میں بیٹھی تھیں اسے واپس آتے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں سوال اتر آئے تھے اور مریم کو اب ان سوالوں کے بہت محتاط اور مناسب طریقے سے جواب دینے تھے ان کو سنبھالنا بھی تھا اور سمجھانا بھی تھا جو کہ بہت مشکل کام تھا۔

صبح گھر سے نکلتے ہوئے وہ بہت فریش تھا۔

لیکن اس وقت واپسی پہ وہ بہت ڈسٹرب اور بو جھل لگ رہا تھا اس کے قدم بہت تھکے تھکے لگ رہے تھے۔ یوں جیسے کوئی طویل مسافت طے کر کے آیا ہو اور اس کی یہ تھکاوٹ گلاب خان اور گل نے بھی محسوس کی تھی۔

”سلام صاحب!“ گل نے آہستگی سے سلام کیا تھا۔

”وعلیکم السلام!“ وہ بریف کیس اور موبائل ٹیبل پر ڈالتے ہوئے خود صوفے پر ڈھیر ہو گیا تھا۔

”صاحب جی! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ گل اسے دیکھ کر متفکری ہوئی تھی اسی لیے بے ساختگی میں پوچھ لیا تھا۔

”ہوں ٹھیک ہوں! بس ایک کپ چائے لادو۔“ اس نے اپنی ٹائی کی ٹاٹ کھولتے ہوئے شرٹ کا سب سے اوپری بٹن بھی کھول دیا تھا۔

”جی! ابھی لے کر آتی ہوں“ وہ فوراً ”پلٹ کر چلی گئی تھی اور دل آور نے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹنگ لٹے ہوئے سگریٹ سلا لیا تھا۔

”وکیل صاحب! آپ ایک بار کوشش تو کر سکتے ہیں نا؟“ زری کی لرزتی کانپتی سی آواز اس کی سماعتوں پہ نقش بنی ہو گئی تھی وہ اس کے سامنے تو اس سے دامن چھڑا لیتا تھا، لیکن اس کے بعد اس سے دامن چھڑانا بہت مشکل ہو جاتا تھا۔

اس نے اپنے ذہن کو مصروف کرنے کے لیے ریہوٹ اٹھا کر ٹی وی آن کر لیا تھا اور ٹی وی کا ویلیوم انتہائی فل چھوڑ دیا تھا۔

”چائے صاحب جی!“ گل اک کپ چائے منٹوں میں بنا کر لے آئی تھی۔ لیکن ٹی وی کے فل والیوم میں اس کی آواز سنائی نہیں دی تھی۔

”صاحب جی! یہ چائے لے لیں۔“ گل صوفے کے قریب آگئی تھی اور اس پہ نظر پڑتے ہی دل آور نے ٹی وی بند کر دیا تھا۔

”صاحب جی!“ گل اس کے موڈ کے پیش نظر کچھ کہتے کہتے رک گئی تھی۔

”کہو؟ کیا کہنا ہے؟“ وہ سمجھ چکا تھا کہ گل کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن اس کی وجہ سے چپ ہو گئی ہے۔

”صاحب جی! وہ۔۔۔ وہ علیزے کی بی بی بلا رہی تھیں آپ کو۔ انہوں نے کہا تھا آپ گھر آجائیں تو آپ کو پیغام دے دیں کہ آپ ایک بار ان سے مل لیں۔“ گل نے اس کا پیغام پھنپایا تھا۔

”ہو نہ۔۔۔ اس سے کہو۔ آج تو اپنے آپ سے بھی ملنے کو دل نہیں چاہ رہا۔ تم سے کل ملوں گا۔“ دل آور نے انکار کر دیا تھا۔

اور گل اس کا انکار لے کر چلی گئی تھی، لیکن علیزے آج پھر پہلے کی طرح بھری ہوئی تھی اس نے دل آور شاہ کے انکار کو ذرا بھی کانوں پہ نہیں دھرا تھا۔

بیسمنٹ کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اخبار اس کے ہاتھ میں تھا۔ دل غم سے بو جھل اور دماغ غصے سے مشتعل ہو رہا تھا اور وہ غم و غصے سے پاگل ہوتی یونہی اخبار ہاتھ میں لیے بیسمنٹ کے کچلے دروازے سے دندنا تکی ہوئی باہر نکل آئی تھی اس وقت اس کا سارا ڈر اور خوف نجانے کہاں جاسویا تھا۔

وہ اس لمحے بہت نڈر اور بے خوف لگ رہی تھی وہ دل آور شاہ کے ہاتھوں مرجانے یا مار دینے کے درپے ہو رہی تھی اس کے تیور بہت جارحانہ تھے اور قدموں کا رخ ڈراٹنگ روم کی طرف تھا۔

”ڈرائیور۔۔۔“ وہ اسی طرح دندنا تکی ہوئی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تھی اور اپنی ذات کے بھنور میں ڈوبتے ابھرتے دل آور شاہ نے یکدم چونک کر دیکھا تھا وہ اس وقت صوفے پر براجمان اپنی ہی سوچوں میں غلطیاں سگریٹ

پینے میں مصروف تھا جب علیزے اس کی سوچوں میں خلل ڈالتی ہوئی شیشے کی ٹیبل کے اس پار عین اس کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی دل آور بیٹھا ہوا تھا لیکن اس نے اپنے سامنے کھڑی علیزے آنندی کو سرسری نظر سے مگر سر تیار دیکھا تھا اس کے سفید کبوتر سے پاؤں ننگے تھے وہ بغیر جوتوں کے بھاگتی ہوئی آئی تھی اور اس کا سر بھی ننگا تھا تیز رفتاری اور بے دھیانی میں ڈیپٹیہ سر سے ڈھلکا ہوا تھا دل آور نے ایسی لاپرواہی اس کے سراپے میں پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی وہ بڑا خیال رکھتی تھی اپنے دوپٹے وغیرہ کا۔ لیکن آج سارے خیال اور سارے خوف نجانے کہاں ترک کر آئی تھی؟

”کیوں آئی ہو؟“ دل آور کی آواز گمبیر اور لہجہ بو جھل ہو رہا تھا لیکن لہجے اور آواز میں گھبراہٹ سے زیادہ تھا۔

”تم نہیں آئے اس لیے آئی ہوں!“ اس نے کافی چبا کر کہا تھا۔

”میں نے کہا تھا تم سے کل ملوں گا؟“ اس نے اپنی بات دہرائی تھی۔

”کل تک اگر تم مر گئے تو؟ وہ غم و غصے سے یکدم خنجر اٹھی تھی۔

”تو کل تمہارے لیے جشن آزادی کا دن ہو گا۔“ دل آور نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے لاپرواہی سے جواب دیا تھا۔

”لیکن مجھے پتا ہے تم کل تک مرنے والے نہیں ہو۔۔۔“ علیزے کبھی بھی اتنی سفاک نہیں تھی لیکن اس وقت حد درجہ سفاک ہو رہی تھی جی چاہ رہا تھا اسے ابھی کے ابھی موت کے گھاٹ اتار دے۔

”تم دعا کرو شاید مر ہی جاؤں تمہاری ہی دعا قبول ہو جائے۔“ جس طرح علیزے حد درجہ سفاک ہو رہی تھی اسی طرح وہ حد درجہ عجیب ہو رہا تھا۔

”میری دعا میں اثر ہو تا تو تم اب تک زندہ نہ ہوتے۔“ وہ غصے سے بھر رہی تھی۔

”اوہ یعنی! یہ بھی آزما چکی ہو۔“ اس نے افسوس سے سر ہلایا تھا۔

”ہاں ہاں۔۔۔ سب آزما چکی ہوں۔ لیکن اللہ تم جیسے انسانوں کو موت بھی نہیں دیتا۔“

”ہوں! سچ کہہ رہی ہو۔“ دل آور نے اس کی بات سے اتفاق کیا تھا۔

”تم اپنی بکواس بند رکھو۔ میں تمہاری بکواس سننے نہیں آتی۔ میں صرف یہ پوچھنے آئی ہوں کہ تم نے مجھے یہ کیوں نہیں بتایا کہ میرے پیلا اتنے شدید بیمار ہیں؟ ان پہ فالج کا ٹیک ہوا ہے؟ وہ پیر الازم ہو گئے ہیں؟ بتاؤ مجھے آخر کیوں نہیں بتایا مجھے؟“ وہ اس پہ چیخ رہی تھی چلا رہی تھی اور وہ ہنوز ایک ہی پوزیشن میں بیٹھا بغیر کچھ کے کسی رسپانس کے اسے دیکھ بھی رہا تھا اور اسے سن بھی رہا تھا۔

حالانکہ اس کا صرف ایک پھٹریا صرف ایک بات ہی اس کا سارا غصہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا کر کے اسے ہمیشہ کے لیے خاموش کروا سکتے تھے۔ مگر نہیں اس نے ایسا نہیں کیا تھا کیونکہ وہ اسی وقت واقعی ڈسٹرب تھا اور اس موڈ میں نہیں تھا کہ اس کے غصے کے جواب میں غصہ ہوتا۔ یا پھر اس کی اتنی بدتمیزی اور زبان درازی پہ اس کی زبان کھینچ لیتا۔ یا اسے مارتا پینتا اور سزا دیتا!

بلکہ وہ تو اتنا ڈسٹرب اور بو جھل تھا کہ آج علیزے آنندی کی ساری بدتمیزیاں اور ساری باتیں سنی ان سنی کر گیا تھا یوں جیسے سر کے اوپر سے گزر گئی ہوں اور یہ علیزے کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اس وقت ڈسٹرب نہیں اور بو جھل پن کا شکار تھا۔

ورنہ رد عمل میں اس کے ساتھ کیا ہو سکتا تھا یہ بتانے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔

”بیٹھو! بیٹھ جاؤ۔۔۔ آرام سے بیٹھ کے بات کرو۔“ اس نے سگریٹ کا آخری کش لینے کے بعد سگریٹ الٹش

رُے میں مسلتے ہوئے کافی تحمل کا مظاہرہ کیا تھا اور اسے سامنے والے صوفے پہ بیٹھنے کا کہا تھا۔

241

”تمہیں کیا لگتا ہے کہ یہ سب پڑھنے کے بعد بھی میں تمہارے ساتھ بیٹھ کر آرام سے بات کر سکتی ہوں؟“ علیزے نے ہاتھ میں پکڑا اخبار شدت غضب سے دل اور کے چہرے پر دے مارا تھا جو سیدھا اس کے چہرے پر ہی لگا تھا۔

”اور یہ دل تو شاہ کی ڈسٹرنس ہو جھل پن اور شکستگی کی انتہا تھی کہ وہ اس کی اس حرکت پر مشتعل نہیں ہوا تھا“ بلکہ یہ بھی سہ گیا تھا۔

”دیکھو! ایک کام کرو۔ یا بیٹھ جاؤ یا چلی جاؤ۔ لیکن مجھے تنگ مت کرو۔“ دل اور نے کافی ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسے سمجھانا چاہا تھا۔

”جو میں پوچھ رہی ہوں اس کا جواب کیوں نہیں دیتے؟ تم نے اتنے ظلم کیوں کیے ہیں؟ کیوں ہمارے گھر کو برباد کر دیا ہے؟ میرے بچوں کو پیرالا کر دیا ہے تم نے۔ مجھے میری ہی نظروں میں گرا دیا ہے۔ میں کسی اور کو تو کیا اپنے آپ کو بھی منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی۔ صرف تمہاری وجہ سے تمہارے کیے کی وجہ سے آخر کیوں؟ کیوں بلیک میل کیا مجھے؟ استہمال کیا مجھے؟ آخر کیوں؟ ڈرائیور! کیوں؟ تم بتاتے کیوں نہیں؟“ علیزے تڑپ تڑپ کر رہی تھی اور چلا چلا کر پوچھ رہی تھی۔

”کل پوچھنا۔ کل بتاؤں گا۔“ اس کا وہی ایک جواب تھا علیزے زچ ہو گئی تھی اس کے کل سے۔ اور وہ اطمینان سے ایک اور سگریٹ سلکا چکا تھا جس سے ایک گہرا کش لیتے ہوئے اس نے دھواں فضا میں پھوڑ دیا تھا اور علیزے کی نظروں کے سامنے دھوئیں کے مرغولے اڑتے ہوئے پورے ڈرائنگ روم میں پھیل گئے تھے۔

”کل نہیں! آج ابھی اس وقت بتاؤ مجھے۔“ اس نے ضد کی تھی۔

”کیا چاہتی ہو؟“ اس نے ایش رے میں سگریٹ کا کل جھاڑتے ہوئے پوچھا تھا۔

”میں اپنے تمام سوالوں کے جواب چاہتی ہوں۔ میں اپنا اور اپنے بچوں کا گناہ جانتا چاہتی ہوں۔“ وہ اپنی بات پر زور دے رہی تھی۔ اور اس کی اسی ایک تکرار سے تنگ آکر اس نے کل کو بلا لیا تھا۔

”جی صاحب کہیے؟“ وہ فوراً حاضر ہوئی تھی۔

”دیکھو گل! اس سے کوئی تنگ مت کرے۔ کل کا انتظار کرے۔ اس کی ہر بات فرصت سے سنوں گا۔ بس آج ٹھہر جائے۔“ دل اور نے جیسے درخواست کی تھی اور گل بے چارہ جی سر ہلا کے رہ گئی تھی۔

”جی صاحب! کہہ دیتی ہوں۔“

”مگر میں کچھ سنتا نہیں چاہتی۔“ وہ چلائی تھی۔

”گل! اسے یہاں سے لے جاؤ۔“ دل اور کے ضبط اور برداشت بھی بلا کے تھے گل کو حیرت اور اچنبھا ہوا تھا کہ صاحب نے اپنی برداشت سے بھی زیادہ برداشت کیسے کیا ہے؟

”میں یہاں سے نہیں نہیں جاؤں گی۔“ وہ ٹس سے مس نہیں ہو رہی تھی بلکہ ڈٹ گئی تھی۔

”اوکے! میں چلا جاتا ہوں۔“ دل اور اپنا سگریٹ کاپیکٹ لاسٹر موبائل اور ریف کیس اٹھا کر سیڑھیوں کی سمت بڑھ گیا تھا۔

”ڈرائیور! ڈرائیور! پلیز میری بات کا جواب دے کر جاؤ۔“ وہ پیچھے چینی چلاتی رہ گئی تھی اور وہ اس کے سامنے ہی سیڑھیاں طے کر کے چلا گیا تھا اور اس کے جانے کے بعد بے بسی کے مارے وہ دھاریں مار مار کے روتی ہوئی نیچے قالین پر ہی ڈھیر ہو گئی تھی اور گل ایک بار پھر اسے سمجھانے بھانے میں لگ گئی تھی۔

آج اس کا غم حد سے سوا تھا۔ آج اپنے بچوں کی تکلیف بھلائے نہیں بھول رہی تھی اسی لیے تو وہ صبح سے تڑپ رہی تھی اور رو رو کر پل پل ہو رہی تھی لیکن اتنا رونے کے بعد بھی کوئی حل بھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہر

طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ گہرا گھور اندھیرا۔ الوندھا اور پاگل کر دینے والا اندھیرا۔ اور دل اور شاہ تھا کہ اس گہرے اندھیرے میں آگئی کی ذرا سی کرن بجھنے پہ بھی تیار نہیں تھا اور وہ پوچھ پوچھ کے ہار گئی تھی۔!



”کیا دل اور شروع سے ہی ایسا ہے؟“ نیل نے سامنے ٹیبل سے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے سوال کیا تھا۔

”کیا مطلب؟ شروع سے ہی؟“ بتول شاہ نے اپنا کپ اٹھاتے ہوئے ٹا کبھی سے دیکھا تھا۔

”مطلب کہ سخت ضدی، غصیل اور ذہین بھی؟“ نیل یہ سوال دلچسپی سے پوچھ رہا تھا۔

”ہوں! ضدی اور ذہین تو وہ اس وقت سے ہے جب سے پیدا ہوا ہے لیکن سخت۔“ نجائے کیوں وہ بتاتے جاتے رک گئی تھیں۔

”لیکن۔۔۔؟“ نیل نے اس لیکن سے آگے بھی جانا چاہا تھا۔

”لیکن سخت اور غصیل وہ تب ہوا تھا جب اس کے بابا کی ڈیٹھ ہوئی تھی۔“ بتول شاہ چائے کے کپ پہ نظریں جمائے بمشکل جواب دے پائی تھیں۔

”وہ ایم ریلی سوزی آئی! میں نے انجانے میں آپ کو اس کر دیا۔“ نیل نے بے ساختہ معذرت کی تھی اسے واقعی افسوس ہوا تھا۔

”اٹس اوکے بیٹا! یہ کوئی نئی بات نہیں ہے اداسی اور غم کے ساتھ تو بائیس سال پرانا رشتہ ہے اب تو احساس ہی نہیں ہوتا؟“ انہوں نے افسرو کی سے سر جھٹکا تھا اور نیل چپ سا ہو گیا تھا۔

”کیا بات ہے بیٹا! چپ کیوں ہو گئے ہو؟ باتیں کرو نا اتنا اچھا لگ رہا ہے میرے لیے تو آج تم نہیں سمجھو کہ میرا دل اور گہرا آیا ہوا ہے۔“ انہوں نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے نیل کو شرمندگی اور افسوس کے حصار سے نکالنے کی کوشش کی تھی۔

”اور میرے لیے بھی آپ اس کی ماں نہیں میری ماں ہیں۔“ نیل نے بھی جواباً مسکرا کے کہا تھا۔

”رے۔۔۔! یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے بیٹا! میں تم دونوں کی ماں ہوں بلکہ تینوں کی! عبد اللہ بھی تو ہے۔؟ وہ بھی تو میرا بیٹا ہی ہے نا؟“ انہوں نے کافی خوشدلی سے کہا تھا اور نیل مسکرا دیا تھا۔

”بیٹے تو آپ کے تین ہیں اور پوتے پوتیاں ابھی ایک بھی نہیں۔ کبھی اس طرف غور کیا آپ نے؟“ نیل نے ایک اور دلچسپ سوال ڈھونڈا تھا۔

”بالکل۔۔۔! غور ہی غور ہے۔ بس اب وہ فرصت سے ملے تو اس سے بات کروں گی۔“

”کیسی بات۔۔۔؟“

”یہی کہ مجھے بیس اکیس پوتے پوتیوں کی ضرورت ہے تم تین بیٹے ہو، سات سات بچے بانٹ لو، عمل کر اکیس ہو جائیں گے اور ان شاء اللہ اگلے سات سالوں تک میرا گھر ایک بھرا پر اگھر ہو گا۔ ساری تنہائی، اکیلا پن اور اداسی ختم ہو جائے گی۔“ ان کے جواب پہ نیل قہقہہ لگا کے ہنسا تھا۔

”ہا ہا! آنٹی پہلے ہمارے لیے بیویوں کا نظام کھلیں، تبھی آپ ہمارے بچوں کا یہ پولی فارم قائم کر سکیں گی۔“ نیل ان کی بات پہ خاصا مظلوظ ہوا تھا۔

”نظام میں نے کیا کرنا ہے؟ نظام تو تم لوگ خود کرتے ہو عبد اللہ نے کر لیا ہے۔“ اب تم دونوں کی باری ہے وہ خفگی سے بولی تھیں۔

”ان شاء اللہ! یہ باری بھی جلدی آجائے گی۔“ اس نے انہیں تسلی دی تھی۔

”کس کی؟“ انہوں نے بے ساختہ پوچھا۔

”میری!“ نیل نے شرارت سے کہا تھا۔

”ارے واہ! لیکن کب؟“ نہیں خوشی اور حیرانی ہوئی تھی۔

”جدا نے چاہا تو بہت جلد۔ نہ چاہا تو کبھی نہیں۔ بس ابھی سوچ میں ہوں ارادے باندھ رہا ہوں کہ پیش قدمی کیسے کروں۔“

”گڈ گڈ۔ بہت اچھی بات ہے۔ بہت خوشی ہوئی ہے سن کر۔ اللہ تمہیں زندگی دے خوش رکھے اور تمہاری مراد پوری کرے۔ آمین! انہوں نے اسے دعا دی تھی۔

”آئی! ایک بات پوچھوں آپ سے؟“ نیل کے لبوں پر مسکراہٹ میں سنجیدگی اتر آئی تھی۔

”سوال پوچھو بیٹا! اجازت کی کیا ضرورت ہے؟“

”آپ اسے کتنا جانتی ہیں؟“ نیل کا سوال بہت عجیب تھا۔

”جدا اپنے آپ کو جانتی ہوں!“ ان کا جواب بہت مضبوط تھا۔

”تو پھر آپ اس کی کیفیت اس کے جذبات سے بھی واقف ہوں گی؟“

”آف کورس بیٹا! جانتی ہوں سب جانتی ہوں ان کے انداز میں یقین تھا۔

اس کے دل میں کیا ہے؟ کس سے محبت ہے اسے؟ نیل کے سوال میں تجسس تھا وہ دل اور کے بارے میں جاننا چاہتا تھا مگر کبھی بھی جان نہیں پایا تھا۔

”تم تو ایسے پوچھ رہے ہو جیسے خود تو اسے جانتے ہی نہیں؟“ بول شاہ نے ذرا سے شجب کا اظہار کیا تھا۔

”جی آئی! یہی سچ ہے وہ ہم سب کو جانتا ہے، لیکن ہم اسے نہیں جانتے اس کے اندر کیا ہے؟ ہمیں علم نہیں ہے وہ ہم سے تو ہماری ساری سن لیتا ہے۔ لیکن ہمیں اپنی ایک بھی نہیں بتاتا۔“ نیل سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

”یہ تمہاری کمزوری ہے یا اس کی؟“

”یہ ہماری کمزوری ہے کیونکہ ہم اس کے دوست ہو کر بھی اسے کبھی نہیں جان پائے، حالانکہ جاننا چاہیے تھا۔“ نیل کو اپنے آپ پر شکوہ ہوا تھا۔

”ارے نہیں بیٹا! کبھی کبھی کچھ نہ جانتا ہی بستر ہوتا ہے کچھ باتوں کی پوشیدگی میں ہی بھلائی ہوتی ہے، لیکن تم پریشان مت ہو، وہ جس سے بھی محبت کرتا ہے اس سے کئی گنا زیادہ وہ تم سے محبت کرتا ہے، تم بہت اہم ہو اس کے لیے وقت آنے پہ سب کچھ بتا دے گا، تم لوگوں کو نہیں بتائے گا تو اور کس کو بتائے گا بھلا؟“ بول شاہ نے اسے سمجھایا تھا اور کسی بھی طرح کی بدگمانی دل میں لانے سے باز رکھا تھا۔

”جی آئی! اس میں تو کوئی شک نہیں ہے کہ وہ ہمارے لیے یا ہم اس کے لیے کتنے اہم ہیں اور کتنی محبت کرتے ہیں بلکہ اس کا خلوص اور اس کی محبت تو ناقابل بیان ہے اور کبھی کبھی تو مجھے نخر اور غرور ہوتا ہے وہ میرا دوست ہے۔“ نیل نے دل کی گہرائیوں سے اظہار کیا تھا۔

”اللہ یہ دوستی سلامت رکھے اور نظربہ سے بچائے۔“

”آمین!“ وہ مسکرائی تھیں۔

”چھا! آئی میں چلتا ہوں اب کافی ٹائم ہو رہا ہے۔“ نیل چائے کا خالی کپ واپس نیل پر رکھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”آج میں رک جائے تو اچھا تھا۔“ وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

”آج میں رک جائے تو اچھا تھا۔“ وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

”جی ضرور رک جاتا۔ لیکن مجھے کسی آدمی کے ساتھ ضروری کام ہے ملنا ہے اس سے اور اس نے ساڑھے گیارہ بجے ہوٹل میں ملنے کا ٹائم دیا ہے اس لیے میں نے اسی ہوٹل میں روم بک کر دیا ہے رات وہیں ٹھہروں گا۔“ اس نے معذرت کی تھی۔

”تو پھر صبح ناشتا ہمیں سے کرنا۔“ انہوں نے دعوت دی تھی۔

”نوتھیننگس آئی۔! صبح صبح ہی واپسی کے لیے نکل جاؤں گا، ان شاء اللہ ناشتہ لاہور جا کر ہی کروں گا۔“ اس نے دوبارہ معذرت چاہی تھی۔

”کیوں۔؟ اتنی جلدی کیوں؟“

”بس وہ دل آور آج کل کورٹ کے کاموں میں بڑی ہے اور ہمارے پاس پیجر بھی نہیں اس لیے سارا کام خود ہی دیکھنا پڑ رہا ہے۔“

”اوکے۔! ٹھیک ہے پھر۔“ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا تھا اور نیل ان سے مل کر واپس ہوٹل میں آگیا۔

آدھے گھنٹے بعد اس کی اس آدمی کے ساتھ میٹنگ تھی اور یہ میٹنگ اگلے ایک گھنٹے کے بعد ختم بھی ہو گئی تھی۔

نیل فارغ ہو چکا تھا اس نے ٹائم دیکھا ساڑھے بارہ بج رہے تھے وہ دن بھر کا تھکا ہوا تھا اس لیے تھوڑی دیر ریست کرنے کا سوچا تھا لیکن ابھی وہ اپنے روم میں جانے کے لیے سیڑھیاں چڑھ ہی رہا تھا کہ اس کے قدم سیڑھیوں پہ ہی جمے رہ گئے تھے اس کی نظر سڑک کے ساتھ والی سیڑھیوں کی سمت تھیں اور وہ سیڑھیوں کی ریلنگ پہ ہاتھ رکھے دم بخود سا کھڑا رہ گیا تھا اسے لگ رہا تھا جیسے وہ یونہی کھڑے کھڑے سیڑھیوں سے نیچے گر جائے گا۔

”پیس کم ان۔!“ وہ اپنے کچھ ضروری سامان کی پیکنگ کر رہا تھا جب بیڈ روم کے دروازے پہ ہلکی سی دستک ہوئی تھی۔ وہ سمجھا کہ حرمت ہوگی، کیونکہ اس نے تھوڑی دیر پہلے حرمت کو چائے لانے کا کہا تھا۔

”چائے؟“ وہ اپنا تولیہ، شیونگ کٹ اور پیفوم وغیرہ اپنی کیس میں رکھ رہا تھا جب کوئل کی آواز پہ یکدم کرنٹ کھا کے پلٹا تھا۔

”آپ۔“ آذر کو اپنے بیڈ روم میں کوئل کی آمد کچھ عجیب لگی تھی کیونکہ اس کی اپنی فی میل کرنز کے ساتھ کبھی بھی اتنی بے تکلفی نہیں رہی تھی کہ وہ اس کے بیڈ روم میں آئیں یا پھر وہ یوں بلا جھجک ان کے بیڈ روم میں جاتا۔

وہ سوائے علیزے کے باقی سب کے ساتھ ایک حد تک رہنے کا اور فاصلہ رکھنے کا عادی تھا اور اسے کوئل کی یہ حد کر اس کرنے کی بے تکلفی سخت ناگوار گزری تھی۔

”آپ کیوں آئی ہیں؟ میں نے تو حرمت کو چائے لانے کا کہا تھا۔“ آذر نے مروتاً بھی اپنی ناگواری چھپانے کی زحمت نہیں کی تھی۔

”میں اپنی حوٹل میں اپنے چچا زاد کزن کے بیڈ روم میں آئی ہوں کسی منصور حسین ڈرائیور کے بیڈ روم میں نہیں گئی کہ آپ کو ناگوار گزرے۔“

”کوئل۔!“ آذر نے یکدم غصے اور غضب ناک سے دھاڑتے ہوئے ہاتھ اٹھایا تھا لیکن ایک لمحے کے ہزاروں حصے کی سوچ تھی جس نے اس کا ہاتھ فضا میں ہی روک دیا تھا وہ اسے ایک زنانے دار پھنٹر رسید کرتا اگر اس پہ یہ خیال حاوی نہ ہو جاتا کہ وہ ایک عورت یہ ہاتھ اٹھا رہا ہے۔؟ اور عورت بھی وہ جس پہ اس کا کوئی حق تھا نہ اختیار۔ کیونکہ وہ ماں تھی نہ بہن۔ بیوی تھی نہ بیٹی۔ اس لیے وہ صرف کزن ہونے کے ناطے اس پہ ہاتھ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ لیکن کوئل کو اس ادھورے پھنٹر کا کس اور درد اپنے گال پہ بڑی شدت سے محسوس ہوا

تھا، یوں لگ رہا تھا جیسے آذر کے ہاتھ کی بانچوں انگلیاں اس کے چہرے پہ نقش ہو گئی ہوں۔ اور گہرا نشان چھوڑ گئی ہوں!

”مجھے خوشی ہوتی اگر آپ کے ہاتھ کا تھپڑ میرے چہرے کی زینت بن جاتا اور میرے چہرے کو رنگ بخش دیتا۔“

”کول نے شکایتی لہجے میں کہتے ہوئے سر اٹھا کر اس کے چہرے کی سمت دیکھا تھا۔

”ایم سوری! آپ یہاں سے جا سکتی ہیں اس نے اپنے ہاتھ کی مٹھی بچھتے ہوئے ہاتھ پہلو میں گرا لیا تھا۔

”کول نے اس کے! میں یہاں سے چلی جاتی ہوں۔ مگر اتنا تو بتادیں کہ آپ کو اتنی تکلیف کس بات پہ ہوئی ہے۔

”میرے بچ بولنے پہ۔۔۔ یا پھر منصور حسین کے نام پہ۔۔۔“ اس نے خامسے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا تھا۔

”دیکھئے کول! اس وقت آپ اپنی لمٹس کر اس کر رہی ہیں اور مجھے یہ چیز سخت ناپسند ہے یہ بات آپ بھی جانتی ہیں۔“

”جانتی ہوں! بہت اچھی طرح جانتی ہوں آپ کی ان تمام لمٹس کو بھی جانتی ہوں جو آپ کی آنکھوں کے سامنے ہی روندی جا چکی ہیں۔“ کول نے کافی چپا کر کہا تھا اور آذر اس کا لحاظ کرتے ہوئے چپ ہو گیا تھا۔

”میں آپ کے بیڈ روم میں نہیں آنا چاہتی تھی، لیکن مجبوراً آنا پڑا۔“ اس نے تمہید باندھی۔ اور آذر نے بے ساختہ چونک کر دیکھا تھا۔

”سنائے آپ فرار ہو رہے ہیں۔“ کول کے لہجے اور الفاظ کی کاٹ ہنوز تھی۔

”کول پلیز! اسٹاپ! اور برداشت نہیں کروں گا۔“ آذر نے سختی سے اسے وارننگ دی تھی لیکن وہ باز آنسوؤں کی بھلا کب تھی۔

”یعنی کہ میں نے بچ سنایا ہے؟“ اس نے آذر کی سمت دیکھتے ہوئے استہزائیہ لہجے میں کہا تھا۔

”دیکھئے کول! میں اپنے کام کے سلسلے میں جا رہا ہوں وہ بھی صرف ایک ہفتے کے لیے اور سب کو بتا کر جا رہا ہوں آج تک یا چوری چھپے نہیں جا رہا۔“ اس نے پلیز۔۔۔ آپ کو بلا وجہ خود سے مفروضے قائم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آذر نے اب بھی ناگواری کا اظہار کیا تھا۔

”بلا وجہ۔۔۔“ اس نے بے ساختہ اچھٹے سے کہا تھا۔

اور اس سے پہلے کہ جواباً آذر کچھ کہتا تے میں دانیال دروازہ کھیل کر اندر چلا آیا تھا۔

”آذر! یہ دونوں فائلز بھی ساتھ رکھ لو تمہیں بعد میں مسئلہ۔“ دانیال کچھ کہتے ہوئے اندر داخل ہوا تھا مگر کول کو وہاں دیکھ کر بات ادھوری رہ گئی تھی۔

”ایم سوری! میں نے بے وقت مداخلت کی۔“ دانیال معذرت کرتے ہوئے واپس پلٹا تھا۔

”رکیے دانیال بھائی! کول نے اسے پیچھے سے آواز دی تھی اور پھر اس کے قریب آکر چائے کے کپ کی چھوٹی سی ٹرے اس کے ہاتھ میں تھما دی تھی۔

”یہ چائے دیجیے ان کو۔ انہیں چائے کی طلب ہو رہی تھی۔ اور ساتھ میں ان سے یہ بھی کہیے کہ کسی کا غم منانا ہے تو جوبلی میں رہ کر ہی منالیں کسی انگلینڈ یا امریکہ جانے کی ضرورت نہیں ہے غم ہمیشہ غم ہی رہے گا چاہے کہیں بھی چلے جائیں۔“ وہ کافی طنز اور تمسخر سے کہتی وہاں سے چلی گئی تھی اور آذر نے غصے سے دانیال کے ہاتھ میں پکڑی چھوٹی سی ٹرے کپ سمیت دیوار کے ساتھ دے ماری تھی۔

☆ ☆ ☆

آج ملک حق نواز کے ڈیرے پہ کسی جشن کا سامان تھا۔

کیونکہ آج ملک اسد اللہ صوبائی اور ملک حق نواز قومی اسمبلی کی سیٹ کے لیے نامزد ہوئے تھے اور یہ خوشی ان کے لیے بہت بڑی خوشی تھی۔ اور اس خوشی میں آج ملک حق نواز کے ڈیرے کی رونقیں عروج پہ تھیں ہر طرف عیش و عیاشی اور سوج و مستی کا جہان آباد تھا کھانے پینے سے لے کر رقص کا منانے تک کا انتظام کیا تھا۔ لوگوں کے آنے جانے کا اور مبارک باد کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

ملک حق نواز اپنے علاقے کے کچھ دوستوں سے مبارک باد وصول کر رہا تھا جب ڈیرے کے احاطے میں ایک پولیس جپ آکر رکی تھی اور وہ چونک گیا تھا۔

”ملک حق نواز کہاں ہیں۔“ ایس ایچ او جمال احمد نے ڈیرے کے کمی کو قریب بلایا تھا۔

”جی۔۔۔! وہ سامنے کھڑے ہیں۔“ اس نے دائیں طرف اشارہ کیا تھا لیکن اتنے میں ملک حق نواز خود ہی قریب آگیا تھا۔

”ایس ایچ او صاحب! آج کیسے زحمت کی آپ نے؟“ اس نے ایس ایچ او جمال احمد سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا تھا۔

”ملک صاحب! آپ کے وارنٹ گرفتاری ہیں میرے پاس۔“ جمال احمد نے وارنٹ نکال کر دکھائے تھے۔

”وارنٹ گرفتاری۔۔۔؟ مگر کس جرم میں۔“ ملک حق نواز کے ماتھے پر ہلکے سے ہاتھ پڑ گئے تھے۔

”مومن بی بی کے رپ کے جرم میں۔“ جمال احمد کے بتانے پہ اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا تھا اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

☆ ☆

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

خوبصورت مرد	☆ ستاروں کا آنگن، نسیم سحر قریشی	قیمت: 450 روپے
خوبصورت چھپائی	☆ درو کی منزل، رضیہ جمیل	قیمت: 500 روپے
شائع ہوئے ہیں	☆ اے وقت گواہی دے، راحت جبین	قیمت: 400 روپے
مضبوط جلد	☆ تیرے نام کی شہرت، شازیہ چودھری	قیمت: 250 روپے
آفٹ پیپر	☆ امر نیل، عمیرہ احمد	قیمت: 550 روپے

منکوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361



کبھی بار بار نہیں سیکھا اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔

۲۶ چھبیسویں قسط



بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آندری سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔
مدیہ اور نبیلہ حیات دہی بہن بھائی ہیں، مدیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے، وہ انگلیوں کی رنگینوں میں مکمل حوریہ رنگ چکی ہے، جس کے پیش نظر فائزہ بیگم، نبیلہ کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں، لیکن مدیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے جس پہ نبیلہ اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔
زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے، مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنب رہا ہے۔
عزیز کا کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے، مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، بے بسی اور مجبوری سے تنگ آخر خود کشی کرنے کا سوچتا ہے، لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے بازو اٹھیا زل جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے، جس پر عزیز کافی خوش ہوتا ہے، اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔
منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے، وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آندری سے نوکری مانگنے آتا ہے، وقار آندری کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔
دل، آدر شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور مٹھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے، وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے، اس نے



سنا ہے! گھونسلے سے جب کوئی بچہ گرے تو
سارا جنگل جاگ جاتا ہے
ندی میں باڑا بجائے
یا کوئی تل ٹوٹ جائے
تو کسی لکڑی کے تنخے پر
گھری سناپ چیتا اور بکری
ساتھ ہوتے ہیں
سنا ہے! جنگلوں کا بھی کوئی دستور ہوتا ہے۔۔۔
خداوند! جلیل و معتبر و انا و مینا، منصف و اکبر
ہمارے شہر میں بھی اب
جنگلوں کا ہی کوئی دستور نافذ کر۔۔۔!



”ملک صاحب! ملک صاحب! ہوش میں آئیے ملک صاحب! ابھی آپ اس دنیا سے رخصت نہیں ہوئے ابھی آپ اپنے ڈیرے پر ہی موجود ہیں ابھی آپ نے اس دنیا میں دکھائی کیا ہے؟ ابھی تو ہم نے آپ کو بہت کچھ دکھانا ہے۔ بڑے حساب کتاب دینے ہیں آپ نے ابھی تو صرف بلاوا آیا ہے آپ کے لیے۔۔۔ رخصت تو آپ کو بڑے اہتمام سے کیا جائے گا۔“ ایس بی کامران مہدی نے ایس ایچ او جمال احمد کو حق سے نمودار ہوتے ہوئے کسی گھرے خیال میں ڈوبے ملک حق نواز کو اس خیال کی گہرائی سے باہر کھینچا تھا اور ملک حق نواز بری طرح چونک گیا تھا۔

”ایس بی کامران مہدی آپ۔۔۔؟“ ملک حق نواز مزید ٹھٹکا تھا۔

”جی ملک صاحب! میں ہی ہوں ایس بی کامران مہدی۔ دراصل جس روز آپ جیسی کسی معزز شخصیت کو اپنا مہمان بنانے کی زحمت دینا ہوتی ہے اس روز ہمیں خود خدمت میں حاضر ہونا پڑتا ہے اب یہی دیکھ لیں آپ کو اریسٹ کرنے کے لیے محض ایک ایس ایچ او کو بھیجنا بھی تو مناسب نہیں تھا نا۔۔۔؟ اسی لیے آپ کا احترام کرتے ہوئے میں خود آیا ہوں اور میرے ساتھ آپ کے احترام میں پولیس فورس کی پوری چار گاڑیاں آئی ہیں اور آپ کے ڈیرے کو چاروں اطراف سے گور کر لیا گیا ہے، حالانکہ پتا بھی ہے کہ آپ کہیں بھاگنے والے نہیں ہیں، کیونکہ معزز لوگ بھاگا نہیں کرتے، مقابلہ کرتے ہیں، لیکن کیا کریں ملک صاحب مجبوری ہے ڈیوٹی بھی تو نبھانی ہے آخر۔۔۔؟“ ایس بی کامران مہدی نے ملک حق نواز کو باتوں باتوں میں سب باور کروا دیا تھا کہ اس کی کسی چال یا کسی چالاک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

”لیکن میرے خلاف تو ایسا کوئی کیس نہیں تھا۔۔۔؟“ ملک حق نواز نے انجان بننا چاہا تھا۔

”آپ“ تھا“ کو چھوڑیں ملک صاحب۔“ ہے“ کی بات کریں۔ آپ کے خلاف کیس ہے تو بس ہے۔ اسی لیے نوکور شمس وارنٹ جاری ہوئے ہیں۔“ ایس بی کامران مہدی نے سر جھٹکتے ہوئے کہا تھا۔

”لیکن جب تک کسی تھانے میں کیس درج نہ ہو تب تک کورٹ سے وارنٹ کیسے آسکتے ہیں۔۔۔؟“ ملک حق نواز الجھ رہا تھا۔

”تو آپ سے کس نے کہا کہ تھانے میں کیس درج نہیں ہے۔۔۔؟“ ایس بی کامران مہدی نے دلچسپی سے دیکھا

کوشش کی تھی اور وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی تھی۔
”لو۔۔۔! یہ اب اور تھکائے گی۔“ اچھو نے خفگی سے سر جھٹکا تھا اور گاڑی میں بیٹھے باقی آدمیوں کو اشارہ کیا تھا جو اس کے ایک اشارے پر دندناتے ہوئے گاڑی سے اترے تھے، مومنہ بی بی کے تعاقب میں ان کے قدموں کی دھمک اور بھاگنے کی رفتار بہت تیز تھی۔

”ماسی برکتے! چاچا شرف۔۔۔! رکھو خدا کے لیے مجھے بچاؤ۔۔۔“ مومنہ بی بی نے اس بے بس قافلے میں موجود اپنے ہمسائے ماسی برکتے اور چاچا شرف کو آوازیں دی تھیں، چونچ اماں اور بابا کو کہہ کر آئے تھے۔
”آپ فکر نہ کریں ہم ساتھ ہی تو ہیں مومنہ کوئی اکیلی کھیتوں پہ جا رہی ہے؟ آپ کی بیٹی ہے تو ہماری بھی بیٹی ہے اور عزت سنا بھی ہوتی ہے۔“ لیکن وہ اب اماں آیا کو کیسے بتاتی کہ عزت سنا بھی نہیں ہوتی بلکہ عزت اپنی اپنی ہوتی ہے، سنا بھی عزت کتنے والے کیا یونہی سرعام چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں؟
”ماسی برکتے! رک جاؤ خدا کے واسطے مجھے بچاؤ۔۔۔“ وہ پیچھے سے چلا رہی تھی، چیخ رہی تھی، پکار رہی تھی۔ اور وہ سب سن رہے تھے۔

سب جان رہے تھے لیکن رک نہیں رہے تھے۔ اس پہ کیا بیت رہی ہے۔۔۔؟ یا کچھ دیر بعد کیا بیتے گی۔۔۔؟ سب جانتے تھے سب کو پتا تھا۔

ماسی برکتے کو بھی پتا تھا وہ بھی جانتی تھی۔ مگر مجبور تھی۔ کیونکہ ماسی برکتے کے گھر میں خود دو جوان بیٹیاں تھیں اور مومنہ بی بی کی مدد کرنے کی صورت میں خود اس کی بیٹیاں ملک حق نواز کے زیر عتاب آسکتی تھیں کیونکہ ملک حق نواز پہلے بھی ایسے ایک دو معاملے میں مدد کرنے والوں کو کڑی سزا سے نواز چکا تھا جس کے بعد سب نے کسی دوسرے کی مدد کرنے سے توبہ کر لی تھی۔ اور اسی لیے مومنہ بی بی کی چیخ و پکار کی طرف سے کان بند کرتے ہوئے اپنے میلے کچیلے دوٹے سے آنسو پونچھتی ماسی برکتے آگے بڑھتی رہی اور وہ مسلسل پیچھے تڑپتی رہی، مومنہ بی بی کے قدموں کے بھاگنے کی آواز اور اس کے پیچھے ان خونخوار درندوں کے بھاگنے کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ لیکن آخر کب تک۔۔۔؟ وہ کتنا اور کب تک بھاگ سکتی تھی۔۔۔؟ قدم ہار گئے تھے۔

بلکہ اس کے قدم نہیں اس کی قسمت ہار گئی تھی۔ بھاگتے بھاگتے اس کی چپل ٹوٹ گئی تھی اور پاؤں ٹوٹی ہوئی چپل میں الجھ کر مڑ گیا تھا اور وہ لڑکھڑاکے زمین پہ آگری تھی، دھول مٹی میں ہاتھ پاؤں اور کپڑے بھی اٹ گئے تھے اور ابھی وہ اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ درندوں کا وہ گروہ اس پہ حاوی ہو گیا تھا۔ انہوں نے اسے دبوچا اور گاڑی میں لا پھینکا تھا اور اس کی چیخوں سے وہ شام وہ منظر وہ کھیت وہ مٹی اور وہ قافلے والے سب لرز اٹھے تھے۔

سنا ہے! جنگلوں کا بھی کوئی دستور ہوتا ہے۔

سنا ہے! شیر کا جب بیٹ بھر جائے تو

وہ حملہ نہیں کرتا،

سنا ہے! جب کسی ندی کے پانی میں

بنے گھونسلے کا گندی سایہ لرزتا ہے تو

ندی کی رو پہلی مچھلیاں اس کو

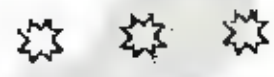
پڑوسی مان لیتی ہیں،

ہوا کے تیز جھونکے جب درختوں کو ہلاتے ہیں

تو مینا اپنے گھر کو بھول کر

کوئے کے اندوں کو پردوں میں تھام لیتی ہے

رسید کرتے ہوئے اسے پولیس کانسٹیبل کے قدموں میں پھینکا تھا اور دو تین پولیس کانسٹیبل اس کی تواضع میں لگ گئے تھے جس پہ اچھو کے گراہنے کی آوازیں بہت دور تک گئی تھیں اور پولیس کانسٹیبلوں نے اسے مارتے مارتے یونٹی گاڑی میں لا پھینکا تھا اور اس کے ملک حق نواز کو بھی سوار کر لیا گیا تھا پولیس کی گاڑیوں کے روانہ ہوتے ہی ڈیرے پہ اور پورے گاؤں میں ایک ہنگامہ مچ گیا تھا۔



”اب کیا ہو گا؟“ ایمین اور ایمان دونوں عابدہ خاتون کی سمت دیکھتے ہوئے پریشانی سے بولی تھیں لیکن عابدہ خاتون کے پاس ان کے ”اب کیا ہو گا“ کا کوئی جواب نہیں تھا وہ خود اس حقیقت کو جاننے کے بعد ایک سوالیہ نشان کی مانند بنی بیٹھی تھیں ان کا کلیجہ تو یہ سن کر پھٹ گیا تھا کہ ان کا بیٹا درکشاپ میں کام کرتا رہا ہے وہ بیٹا جسے اس کے باپ نے اتنی محنتوں اور مشکلوں سے بڑھایا لکھایا تھا اچھی تعلیم دلوائی تھی۔ تو کیا اس اچھی تعلیم کے بعد بھی اس شہر کے کسی بھی آفس میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی؟

”بھائیے نامیم آئی۔ اب کیا ہو گا؟“ عدیل بھائی جیل سے باہر کیسے آئیں گے؟ ہم کیا کریں گے؟ ہمارا تو ان کے سوا اور کوئی بھی نہیں ہے۔“ ایمان کا لہجہ یوں انا سا ہو رہا تھا وہ عدیل، مریم اور ایمین سے چھوٹی تھی، ابھی بچپن تھا اسی لیے اتنی بڑی بات سن کر زیادہ گھبرا گئی تھی۔

”پلیز ایمان۔! آہستہ بولو۔ ساتھ دالے کمرے میں اباجی ہیں انہوں نے سن لیا تو وہ یہ سب نہیں سہی پائیں گے۔“ مریم نے ایمان کو ادنیٰ آواز میں بولنے سے روکا تھا۔

”لیکن آئی۔! اب کی بار ایمین نے کچھ کنا چاہا تھا۔“

”لیکن دیکھیں کو چھوڑو۔ بس دعا کرو کہ اللہ ہماری مدد کرے اور کوئی بہتر حل نکالے۔“ مریم کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”کیا مطلب۔؟ تم کہاں جا رہی ہو۔؟“ مریم کو چادر اوڑھتے دیکھ کر ان تینوں ماں بیٹی نے چونک کر دیکھا تھا۔

”قاطر کے گھر جا رہی ہوں۔! کیونکہ کوئی اور کرے نہ کرے وہ اس مشکل وقت میں ہماری مدد ضرور کرے گی۔“ مریم چادر اوڑھ کر بیگ اٹھا چکی تھی۔

”لیکن بیٹا۔! تم اکیلے۔؟“ عابدہ خاتون مزید پریشان ہوئی تھیں۔

”آئی۔! اب ہم نے جو بھی کرنا ہے اکیلے ہی کرنا ہے یہ دنیا دار اور محلے دار آپ کی مدد کرنے کے لیے ہرگز نہیں آئیں گے اس لیے آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، آپ گھر سنبھالیں اور میں باہر سنبھالتی ہوں۔ اللہ حافظ۔! وہ کہہ کر رکی نہیں تھی اور ان تینوں پہ ایک طائرانہ سی نظر ڈالتی ہوئی باہر نکل گئی تھی اور وہ تینوں ماں بیٹی دعا کرتی رہ گئی تھیں۔



وہ گھر نہیں آیا تھا اس کی لاش گھر آئی تھی کیونکہ وہ اندر سے مرچکا تھا۔ وہیں اسلام آباد کے اس ہوٹل کی میزھیوں نے جہاں اس نے اپنے باپ ممتاز حیات کو ایک لڑکی کے ساتھ بانہوں میں بانہیں ڈالے دیکھا تھا اور وہ اس لڑکی کے ساتھ کس طرز کی چھینڑ چھاڑ کر رہے تھے یہ دیکھ کر نبیل حیات جیتے جی مر گیا تھا اور مرنے کے بعد اس نے ان میزھیوں پر سے اپنی زندہ لاش کیسے ہٹائی تھی۔؟ یہ تو صرف وہ جانتا تھا یا پھر اس کی جان کا مالک رب جانتا تھا۔

اسی ہوٹل میں جہاں وہ رات ٹھہرا ہوا تھا اس کا باپ ایک لڑکی کے ساتھ رنگ رلیاں منارہا تھا یہی سوچ اور یہی

تھا۔

”میں خود کہہ رہا ہوں کہ میرے خلاف کسی بھی تھانے میں ایسا کوئی کیس درج نہیں ہے میں پوری چھان بین کر چکا ہوں۔“ ملک حق نواز اپنے اصلی رنگ اور اصلی حالت میں واپس لوٹ رہا تھا۔

”ملک صاحب۔! آپ سمجھتے ہیں کہ سیاست آپ جیسے جاگیرداروں اور رئیس زادوں سے شروع ہو کر آپ پہ ہی ختم ہو جاتی ہے سیاست کے ساتھ تو آپ ایسے کھیلنے ہیں جیسے آپ کے ڈیرے کی باندی ہو، حالانکہ آپ پہ نہیں جانتے کہ جہاں آپ کی سیاست ختم ہوتی ہے وہاں سے ہم پولیس والوں اور وکیلوں کی سیاست شروع ہوتی ہے، آپ کے ڈیرے کی باندی کو ہم اپنی جیب میں لیے پھرتے ہیں اور آپ کو کیا پتا کہ جب وروی والے اور کالے کوٹ والے ایک ساتھ ہو جاتے ہیں تو بڑے بڑے بادشاہوں اور حکمرانوں کا تختہ الٹ دیتے ہیں آپ تو کوئی چیز ہی نہیں ہیں اس لیے آپ اپنے ذہن میں یہ بات اچھی طرح بٹھالیں کہ پچھلی دس جنوری سے تھانے میں یہ کیس درج ہے اور اب جنوری سے دسمبر آگیا ہے اس لیے آپ کا بلاوا بھی آگیا ہے لہذا آپ کو شرافت کا بارہ اوڑھتے ہوئے ہمارے ساتھ تھانے چلنا ہو گا وگرنہ بصورت دیگر ہمیں خود لے جانا بھی آتا ہے۔“ ایس پی کامران نے بھی اسے اپنا اصل روپ دکھایا تھا تاکہ وہ کسی غلط فہمی یا خوش فہمی میں نہ رہے۔

”اس کیس کی پیروی کون کر رہا ہے۔؟“ ملک حق نواز کا لہجہ سرد ہو چکا تھا۔

”بیرسٹر دل اور شام۔“ ایس پی کامران مہدی کا جواب بھی سپاٹ تھا۔

”دل اور شام۔؟“ ملک حق نواز جانتا تو پہلے سے تھا مگر اس وقت ایس پی کامران مہدی کے منہ سے دل اور شاہ کا نام سن کر اس کا خون کھول اٹھا تھا۔

”ہوں۔! تو یہ کارنامہ اس کا ہے۔؟“ ملک حق نواز نے دانت پیسے تھے۔

”جی۔! یہ کارنامہ انہی کا ہے۔ اب ہو گئی تھدیق۔؟ اب چلیے۔“ خواجہ ٹائم ویسٹ ہو رہا ہے۔“ ایس پی کامران نے اشارہ کیا تھا۔

”ایس پی کامران مہدی آپ مجھے گرفتار کریں گے۔ مجھے۔؟“ ملک حق نواز نے غصے سے اپنی سمت اشارہ کیا تھا۔

”کہا تو ہے ملک صاحب۔! مجبوری ہے۔ لیکن آپ بے فکر رہیں میں آپ کو ہتھکڑی نہیں لگاؤں گا اور نہ ہی آپ کو دھکا دے کر آگے چلنے کا کہوں گا۔ بلکہ بہت ہی باعزت طریقے سے لے کر جاؤں گا“ آپ چلیے تو سہی۔“ ایس پی کامران مہدی نے ایس ایچ او جمال احمد اور دیگر پولیس اہلکاروں کو اشارہ کیا تھا جو ملک حق نواز کے دائیں بائیں آکر الرٹ کھڑے ہو گئے تھے گویا انہوں نے ملک حق نواز کو چلنے کا سنگل دیا تھا اور اسے چلنا ہی پڑا تھا۔ اور جاتے جاتے ایس پی کامران مہدی کے قدم نجانے کیوں ٹھم گئے تھے اس نے دائیں طرف ذرا ٹھہرے دیکھا تھا۔

”دھڑ آؤ۔! اس نے ذرا فاصلے پر کھڑے آدمی کو اشارے سے پاس بلایا تھا۔

”جی ایس پی صاحب۔؟“ وہ بڑے گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا تھا۔

”نام کیا ہے تمہارا۔؟“ ایس پی کامران اسے خونخوار نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”جی۔! اشرف محمود۔“ اس نے سر جھکاتے ہوئے بتایا۔

”عرف اچھو۔ ہے نا۔؟“ ایس پی کامران نے غضب ناک سے پوچھا تھا۔

”جی۔۔۔ عرف اچھو۔! اس نے اعتراف کیا تھا۔

”فر علی۔! کرو اس کی چھترول اور بٹھاؤ اسے گاڑی میں۔“ ایس پی کامران نے سیدھا اس کے منہ پہ گھونسا

بات اس کے لیے سوبان روح ثابت ہو رہی تھی اسے اپنی رگوں میں دوڑتا خون اپنی ہی رگوں کو کاٹتا ہوا محسوس ہوا تھا اس کی آنکھیں شدت ضبط سے سرخ ہو گئی تھیں وہ اپنے لبوں اور اپنے ہاتھوں کو بھیچتا ہوا بمشکل ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن یہ بھی تو ضبط و برداشت سے باہر تھا تا کہ وہ بھی اسی ہوٹل میں قیام کرتا اور رات گزارتا۔ اسی لیے جب اس کے اختیار سے باہر ہوا تو وہ سب کچھ سمیٹ کے رات کے پونے دو بجے ہوٹل کا بل بے کر کے باہر نکل آیا تھا اور پھر باقی کی رات یونہی اسلام آباد کی سڑکوں پہ گاڑی دوڑاتے ہوئے گزر گئی تھی۔ وہ اس شہر جیسا پر سکون تھا لیکن اس وقت اسے نہ یہ شہر پر سکون لگ رہا تھا اور نہ اپنا آپ۔ اندر باہر ایک اذیت سی اذیت تھی ایک عذاب سا عذاب تھا سکون کا تو کہیں شائبہ تک نہیں رہا تھا۔

اور اسی بے سکونی اور اذیت کی آغوش میں آکر اسے احساس ہوا تھا کہ مدحیہ کیوں تڑپتی تھی؟ کیوں رات دن کسی ان ویڈیو آگ میں جلتی تھی؟ کیوں اسے کہیں چین نہیں آتا تھا؟ کیوں وہ بے کل پھرتی تھی؟ یہاں تک کہ وہ ضدی اور باغی ہو گئی تھی اور ہمہ وقت اس کے سر پہ سرکشی سوار رہتی تھی۔ وہ زندگی میں کبھی ممتاز حیات کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی اور آج ایسی ہی حالت اور کیفیت نبیل حیات کی ہو رہی تھی آج وہ بھی ممتاز حیات کی شکل نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ آج مدحیہ کی طرح اسے بھی اپنے باپ سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ اتنا درجے کی نفرت۔ آج وہ بھی چاہتا تھا کہ زندگی میں کبھی دوبارہ اسے ممتاز حیات کی شکل دیکھنا بھی نصیب نہ ہو۔ کیونکہ اسے پتا تھا کہ اگر ایسا ہوا تو یقیناً ”وہ اپنے آپ پہ کنٹرول نہیں کیاے گا۔ جیسے اس وقت اپنے آپ کو سنبھالنا اور کنٹرول کرنا مشکل ہو رہا تھا اور بالا آخر تھک ہار گئے اس نے گاڑی کا رخ لاہور کی سمت موڑ دیا تھا اور اسلام آباد سے لاہور تک کا سفر کیسے کٹا تھا۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ اسے بس یہ پتا تھا کہ وہ اسلام آباد میں بھی اذیت میں تھا اور لاہور آکر بھی اس کی اس اذیت میں۔ رتی برابر بھی فرق نہیں آیا تھا وہ اپنی زندہ لاش کو گھسیٹتا ہوا گھر میں داخل ہوا تھا۔ صبح چھ بجے کا وقت تھا، ماحول میں خنکی حد سے سوا تھی، دسمبر کا مہینہ تھا، دھند روز بہ روز گہری ہوتی جا رہی تھی اور یہ دھند اور ٹھنڈ لوگوں کو بے حد ٹھنڈا رہی تھی لیکن نبیل ایسی آگ میں جل رہا تھا کہ اسے یہ ٹھنڈا بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی وہ گاڑی سے باہر نکلا تو بھی اپنے آپ سے لا تعلق سا لگ رہا تھا۔

”سلام صاحب جی۔۔۔!“ گھر کا مالی لپک کے پاس آیا تھا۔

”والسلام۔۔۔!“ نبیل آہستگی سے جواب دیتے ہوئے آگے بڑھا تھا۔

”لایئے صاحب جی۔۔۔! میں کمرے تک چھوڑ آتا ہوں۔“ اس نے نبیل کی تھکن کا خیال کرتے ہوئے اس کے ہاتھ سے کوٹ اور بریف کیس لینا چاہا تھا۔

”تو تھینکس۔۔۔! اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے انکار کر دیا تھا۔

”ٹھیک ہے صاحب۔۔۔! جیسے آپ کی مرضی۔۔۔“ مالی فوراً ”تا بعد اری سے سرہلاتے ہوئے سامنے سے ہٹ گیا

تھا اور نبیل اپنا گوشہ بازو پہ ڈالے بریف کیس ہاتھ میں پکڑے بڑے تھکے اور شکستہ قدموں سے چلتا ہوا اندر آگیا تھا اور ابھی سیڑھیاں طے کر کے اپنے بیڈ روم کی سمت بڑھا ہی تھا کہ اس کے قدم دوبارہ زمین نے جکڑ لیے تھے اور قدموں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا تھا وہ جہاں پہ تھے وہیں پہ ٹھہر جانا چاہتے تھے کیونکہ اسے ایسا محسوس ہوا تھا کہ جیسے اللہ نے اس کے مردہ قالب میں روح چھوٹک دی ہو اور اس کی زندہ لاش زندہ وجود میں تبدیل ہو گئی ہو۔

کیونکہ اس کی بے سکون اور بے آرام ساعتوں کو قرآن پاک کی تلاوت کی آواز نصیب ہوئی تھی اور یہ روح کو شانت کر دینے والی آواز مومنہ بی بی کے کمرے سے آتی ہوئی سنائی دی تھی اور نبیل کو لگا کہ اس کی ذات پہ ایک سرور سا بخاری ہو گیا ہو، وہ جو آگ میں جل رہا تھا وہ تن من سے ٹھنڈا ہو گیا تھا اس کی رگ رگ میں ٹھنڈک اتر گئی تھی اور وہ مومنہ بی بی کے کمرے کے ادھ کھلے دروازے سے نظر آتے اس تسخیر کر لینے والے منظر کو اپنی

تھی اور یہی کہہ کر اس نے انہیں مطمئن کر دیا تھا اور اب وہ وقتاً فوقتاً کچن کے کاموں میں بھی حصہ لے رہی تھی اور فائزہ بیگم اس کے سکھانے اور طریقے سیکھنے کی معترف ہو گئی تھیں۔ وہ بڑی نفاست سے کام کرتی تھی۔ اسی لیے انہیں اس کے ہاتھ کا کام پسند آیا تھا اس کے ہاتھ میں لذت تھی ذائقہ تھا ہر چیز میں ماہر تھی وہ کھانے سے لے کر چائے بنانے تک۔ اور اس کا اعتراف ان سب نے کیا تھا۔

وہ اپنے بیڈ روم میں آتے ہی اپنا کوٹ اور بریف کیس صوفے پہ ڈال کے خود بیڈ پہ ڈھیر ہو گیا تھا اور ابھی آنکھیں بند کی ہی تھیں کہ رات کا منظر پھر سے آنکھوں کے پردے پہ آئے ہو گیا تھا اور اس منظر میں اسے ممتاز حیات اس لڑکی کے چہرے سے بال بٹاتے ہوئے اور اس کے ہاتھ پہ بوسہ دیتے ہوئے نظر آئے تھے اور نیل نے ایک دم آنکھیں کھول دی تھیں اور اک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا تھا۔ وہ اپنے بالوں کو مٹھیوں میں جکڑے بیٹھا تھا جب دروازے پہ ہلکی سی دستک ہوئی تھی۔

”کم ان۔!“ اس نے دستک یہ سراٹھاتے ہوئے آہستگی سے اجازت دی تھی۔

”جائے۔!“ اس نے پاس آکر چھوٹی سی ٹرے میں رکھا کپ اس کی سمت بڑھایا تھا۔

”تھینک یو۔!“ نیل نے قدرے بوجھل انداز میں کہتے ہوئے کپ اٹھالیا تھا۔

”کسی اور چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟“ وہ واپس پلٹتے ہوئے رکی۔

”ہوں۔۔۔ ہے ضرورت۔“ نیل نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

”جی کہیے؟“ وہ متوجہ ہوئی تھی۔

”مجھے نیند کی گولیوں کی ضرورت ہے۔ میں سونا چاہتا ہوں۔“ نیل کی ضرورت سن کر مومنہ بی بی چونک گئی تھی۔

”نیند کی گولیاں۔۔۔؟“ اسے اچنبھا ہوا تھا۔

”ہوں! نیند کی گولیاں۔۔۔ تاکہ میں سکون سے سو سکوں۔“ وہ اپنی کپٹیوں کو مسل رہا تھا۔

”لیکن نیل صاحب! آپ تو تھکے ہوئے آئے ہیں آپ کو تو خود بخود ہی نیند آجائے گی گولیاں کھانے کی کیا ضرورت ہے بھلا؟“

”میں جانتا ہوں! نیند نہیں آئے گی! آپ بس مجھے کچن سے گولیاں لا دیں۔“ اس نے خفگی سے کہا تھا۔

”جی بہتر۔!“ وہ اس کے موڈ کے پیش نظر فوراً پلٹ گئی تھی اور پھر اسے کچن سے گولیاں لا کر دی تھیں جن کے بعد وہ فوراً ہی سو گیا تھا۔

مریم نے کافی دھڑکتے دل کے ساتھ ڈور نیل پہ ہاتھ رکھا تھا۔ کیونکہ وہ آج پہلی بار یوں اکیلی فاطمہ کے گھر آئی تھی۔ ورنہ پہلے جب بھی اس نے فاطمہ سے ملنے کے لیے آتا ہوا تھا عدیل اسے خود چھوڑ کے جاتا تھا یا پھر فاطمہ خود ان کے گھر آ جاتی تھی۔ اس لیے مریم کو کبھی بھی یوں اکیلے آنے جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی، لیکن آج مجبوری اور حالات نے یہ بھی کر دیا تھا اور وہ اکیلی آئے پہ مجبور ہو گئی تھی۔

”و علیکم السلام میڈم!“ چونکہ دار نے پہلی نیل پہ ہی گیٹ کھول دیا تھا۔

”و علیکم السلام۔!“ کیا فاطمہ بی بی گھر پہ ہیں؟

”مسوری میڈم جی۔ فاطمہ بی بی تو بڑی بیگم صاحبہ کے ساتھ دی گئی ہوئی ہیں شاپنگ کے لیے۔“ چونکہ دار نے معذرت کی تھی۔

نظروں میں اتارنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

وہ سامنے قالین پہ قبلہ رخ جائے نماز بچھائے رحل میں قرآن پاک رکھے تلاوت کرنے میں مشغول تھی بڑا سا سفید روپٹہ اس نے اپنے چہرے اور سر کے گرد ایک ہالے کی صورت میں باندھ کر روپٹہ پورے جسم پہ پھیلا رکھا تھا وہ اپنے آپ کو کافی اچھے طریقے سے اور سلیقے سے ڈھانپے ہوئے تھی نیل کو محسوس ہوا جیسے قرآن پاک کے مقدس صفحات سے روشنی اور نور کی کرنیں پھوٹ رہی ہوں جو مومنہ بی بی کو اپنی پلیٹ میں لے رہی تھیں اور مومنہ بی بی کا چہرہ نور برسا رہا تھا جس پہ نیل حیات کی نظر نہیں ٹھہر رہی تھی مگر پھر بھی وہ اسے دیکھے جا رہا تھا۔ اور اس دیکھنے میں اسے یہ بھی تپنا نہ چلا کہ تلاوت ختم ہو گئی ہے۔

جبکہ مومنہ بی بی قرآن پاک جزوان میں پڑھتے ہوئے چونک گئی تھی اسے خود پہ کسی کی نظروں کا احساس ہوا تھا اور اسی احساس کے تحت اس نے گردن موڑ کر دروازے کی سمت دیکھا تھا اور نظروں کے اس تصادم پہ دونوں ہی ٹھٹھک گئے تھے نیل ہوش و حواس میں واپس لوٹ آیا تھا۔

”نیل صاحب آپ۔۔۔؟“ وہ یونہی رحل اور قرآن پاک سینے سے لگائے جائے نماز سے اتر کے نیلے پاؤں کمرے کی چوکھٹ میں آرکی تھی۔

”یم سوری۔! میں ابھی اسلام آباد سے آیا ہوں! اپنے بیڈ روم میں جا رہا تھا کہ یہاں سے گزرتے ہوئے تلاوت کی آواز سن کے رک گیا۔“ نیل نے شرمندگی سے سر جھکاتے ہوئے وضاحت دی تھی۔

”آپ شرمندہ کیوں ہو رہے ہیں نیل صاحب۔۔۔؟ میرے پاس ایسا کچھ نہیں ہے جس پہ آپ کو شرمندگی اور مجھے غصہ محسوس ہو۔ جس پہ ایسا کچھ محسوس ہوتا ہے وہ تو میں ایک سال پہلے ہی گنوا چکی ہوں۔“ مومنہ بی بی نے ذرا سی تلخی سے کہتے ہوئے سر جھکا تھا۔

”پلیز۔! آپ ایسا تو مت کہیں۔ اچھا نہیں لگتا۔“ نیل نے اسے منع کیا تھا کیونکہ وہ پہلے ہی رات بھر کا جلا ہوا تھا۔

”ہوں۔۔۔! معافی چاہتی ہوں! آپ خود تھکے ہوئے آئے ہیں میں نے خواہ مخواہ آپ کو پریشان کر دیا۔“ مومنہ بی بی نے فوراً معذرت کی تھی۔

”ایسی بات نہیں ہے۔۔۔! بس جو آپ کہہ رہی ہیں وہ غلط ہے۔“ نیل نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا تھا۔

”چھوڑیں نیل صاحب۔! اس قصے کو رہنے دیں کہ کیا غلط ہے اور کیا نہیں۔؟ آپ کو اس وقت آرام کی ضرورت ہے! آپ آرام کریں زندگی کے یہ جھیلے تو کبھی ختم نہیں ہوں گے۔“ اس نے نیل کو آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا اور وہ شکریہ ادا کرتے ہوئے سامنے سے ہٹ گیا تھا۔

”سنیے۔!“ اس نے پیچھے سے بے ساختہ پکارا تھا شاید اس لیے کہ وہ نیل حیات کے قدموں کی تھکن بھانپ چکی تھی۔

”جی۔۔۔؟“ وہ اپنے بیڈ روم کے دروازے میں جا کے پلٹا تھا۔

”چائے پیئیں گے۔؟“ نیل کو اس لمحے وہ رمز شاس لگی تھی۔

”نل جائے تو انکار نہیں۔“ نیل کو واقعی چائے کی طلب محسوس ہو رہی تھی، لیکن وہ اپنی ذہنی اذیت میں اس طلب اور اپنے سرور کو بھی فراموش کیے ہوئے تھا۔

”نیل ابھی لے کر آتی ہوں۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتی ہوئی اندر کمرے کی طرف پلٹی اور قرآن پاک احتیاط سے الماری میں رکھ کر نیچے کچن میں آگئی تھی سوہ بچھلے چند دنوں سے خود ہی ملازمہ کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔ حالانکہ فائزہ بیگم اور مدحیہ نے اسے منع بھی کیا تھا، لیکن وہ ایک رسائی اور محنتی لڑکی تھی گھر میں ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کے نہیں بیٹھ سکتی

”وہی۔۔۔؟“ مریم کے توجہ سے قدموں تلے سے زمین سرک گئی تھی۔ اس کی نظر میں تو یہی واحد امید اور آس تھی جس کے سہارے وہ عدیل کے لیے کچھ بھاگ دوڑ کر سکتی تھی، لیکن اب وہی واحد سہارا میسر نہیں تھا تو وہ کہاں جا سکتی تھی؟ کیا کر سکتی تھی؟ اس کے اختیار اس کے بس میں تو کچھ بھی نہیں تھا۔ حالانکہ وہ گھر سے سب کو تسلی دے کر نکلی تھی، لیکن اب۔۔۔

”جی ہاں۔۔۔ وہی۔۔۔“ چوکیدار نے نوہرا کے بتایا تھا۔

”کب گئی ہیں؟“ اس نے بمشکل خود کو سنبھالتے ہوئے پوچھا تھا۔

”جی۔۔۔ ایک ہفتہ پہلے۔“

”اور واپس کب آئیں گی؟“ اس نے پھر ذرا سی امید باندھی تھی۔

”جی۔۔۔ ایک ہفتہ اور لگ جائے گا۔۔۔ دو ہفتے کے کیے گئی ہیں۔“ چوکیدار کے جواب پر مریم کا روئے کو دل چاہا تھا، کیونکہ اس کی آس ٹوٹی تھی، وہ مایوس ہوئی تھی، آگے کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا، ایسے میں اسے رونانہ آنا تو اور کیا ہوتا، وہ وہاں سے قدم ہٹاتی ہوئی واپس پلٹی تھی۔

گلاب خان نے اسے دیکھتے ہی گیٹ کھول دیا تھا اور وہ گاڑی اک جھٹکے سے اندر لے آئی تھی۔ سامنے روش پہ کھڑا زلفی بھاگ کے پیچھے ہٹا تھا اور نہ یقیناً ”گاڑی کے جھٹکے سے دور جا کر تا۔“

”بھائی گھر پر ہیں؟“ اس نے گاڑی سے اترتے ہی استفسار کیا تھا۔

”جی میڈم۔۔۔ صاحب گھر پر ہی ہیں۔“ زلفی نے اپنی سانسیں ہموار کرتے ہوئے جواب دیا تھا۔

”اوکے۔۔۔ تھینک یو۔۔۔“ وہ سر ہلا کر کہتی ہوئی کی چین گھاتی اندر کی سمت بڑھی تھی، لیکن پھر جاتے جاتے رک گئی تھی اور پیچھے مڑ کے دیکھا تھا۔ زلفی اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ مدحیہ کے پلیٹ کر دیکھنے پر سٹپٹا گیا تھا۔

”سوری۔۔۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ کوئی بالکل سامنے کھڑا ہو گا۔“ شکر ہے تم بچ گئے۔“ وہ شرارت سے مسکراتی ہوئی کہہ کر اندر آگئی تھی اور پیچھے زلفی ایسی حسیناؤں اور ان کی اداؤں کو سوچتا اور دیکھتا رہ گیا تھا۔

”اے السلام علیکم یل یل۔۔۔“ گل بچن سے نکل رہی تھی۔ مدحیہ کو آتے دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی۔

”و علیکم السلام! کیسی ہو گل رانی؟“ مدحیہ نے مسکرا کے پوچھا تھا۔

”جی میں ٹھیک ہوں اللہ کا بڑا کرم ہے۔“

”ہوں! اچھی بات ہے، بھائی کہاں ہیں؟ کہیں نظر نہیں آ رہے؟“ مدحیہ نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا تھا، کیونکہ ہر طرف خاموشی تھی۔

”جی۔۔۔ وہ اپنے بیڈ روم میں ہیں، آپ بیٹھیے، میں انہیں بلا کر لاتی ہوں۔“ گل نے کہتے ہوئے ڈرائنگ روم کی طرف اشارہ کیا تھا۔

”تھینک یو۔۔۔ تم بیٹھو، میں انہیں بلا کر لاتی ہوں۔“ مدحیہ دلچسپی سے کہہ کر سیڑھیوں کی سمت آگئی تھی اور اگلے چند سیکنڈ میں وہ اس کے بیڈ روم کے دروازے پر دستکوبے رہی تھی۔

”پلیس کم ان۔۔۔“ اندر سے اس کی سنجیدہ سی آواز سنائی تھی۔

”گڈ مارننگ!“ وہ آہستگی سے دروازہ کھیل کر اندر آگئی تھی اور وہ جو بڑے مصروف سے انداز میں تیار ہو رہا تھا، اچانک مدحیہ کی آواز سے چونک گیا تھا۔

”ارے مدحیہ! میری جان، میری گڑیا، تم یہاں۔۔۔“ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے اس کی سمت بڑھا اور بڑے

والمانہ انداز میں اس کا سر اور اس کے گال تھکے تھے۔ اسے حقیقتاً ”مدحیہ کی آمد پر بہت خوشی ہوئی تھی۔“

”جی ہاں! آپ کو خود تو کبھی خیال نہیں آ سکا، اسی لیے میں نے سوچا کہ آج سنڈے ہے، آج چھاپہ بارتی ہوں، یقیناً پکڑے جائیں گے۔“ مدحیہ کی بات پر اس کا بھابھا بوجھل سا ذہن ایک دم فریش ہو گیا تھا اور وہ ہنسنے لگا۔

”ویسے تمہیں دیکھ کر میں بھی یہی سوچتا ہوں کہ تمہیں پولیس لائن میں ہونا چاہیے تھا۔ آئے روز لوگوں کی شامت آتی رہتی۔“ وہ دلچسپی سے کہہ رہا تھا۔

”اے۔۔۔ ایسا سمجھتے ہیں مجھے؟“ مدحیہ نے مصنوعی خنکی سے دیکھا تھا۔

”ارے! اس سے بھی زیادہ سمجھتا ہوں، آخر میں ہو میری میں اگر لوگوں کے ساتھ رعایت نہیں برتاؤ تو تم نے بھلا کب رعایت برتنی تھی؟“ دل آور نے اسے وضاحت دی تھی۔

”ہاں۔۔۔ یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، بڑے لوگوں کو تو میرا بھی معاف کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ دل چاہتا ہے سولہ لاکھ کے ماروں۔“ مدحیہ نے وائٹ کپکپائے تھے۔

”گڈ! میں بھی یہی چاہتا ہوں، خیر چھوڑو، یہ تاؤ ناشتا کرو گی؟“ وہ اپنے کف لٹنکس بند کرتے ہوئے بولا تھا۔

”آف کورس! اپنے بیڈ روم سے نکل کے سیدھی بیس آئی ہوں۔“ اس نے کندھے اچکائے تھے۔

”پچھو! پھر آجاؤ نیچے ناشتا کرتے ہیں۔“

”تھمر جائیں ابھی، مجھے اپنا بیڈ روم تو دیکھنے دیں۔“ مدحیہ اب بیڈ روم کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

”میری جان! میرے بیڈ روم میں کیا رکھا ہے بھلا؟ ساواہ سا تو ہے۔“

”ابھی تک اس بیڈ روم کی مالک نہیں آئی؟ اس لیے۔۔۔ ساواہ ہے، جب وہ آئے گی تو سچ جائے گا، چار چاند لگ جائیں گے اسے، اس بیڈ روم کی مالک؟“ وہ زیر لب دہرا کر رہ گیا تھا۔

”جی ہاں۔۔۔ اس بیڈ روم کی مالک۔۔۔ میری بھابھی اور آپ کی بیوی۔“ مدحیہ چمک کر بولی تھی۔

”ہوں! ویسے ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ جو دل کی مالک ہو، وہی بیڈ روم کی بھی مالک ہو۔“ دل آور نے سر جھکا دیا۔

”وائٹ۔۔۔ یہ کیا بات ہوئی بھلا؟“ مدحیہ کو جھٹکا لگا تھا۔ وہ اس کے ساتھ اس کے بیڈ روم سے نکلتے نکلتے رک گئی تھی۔

”یہی تو اصل بات ہے میری جان! اندر اور باہر کے مالک الگ الگ ہوتے ہیں اور یہ رست تو شروع سے چلی آرہی ہے، کوئی تن کا حکمران اور کوئی من کا حکمران، کسی کا تن پہ اختیار اور کسی کا من پہ اختیار، مقدر کے سکندر ہوتے ہیں وہ لوگ۔ جن کے اندر اور باہر کا مالک ایک ہوتا ہے، صرف ایک، در نہ بڑے بڑے بادشاہوں اور فقیروں کو بھی اس اندر اور باہر کی تقسیم میں بٹے ہوئے دیکھا ہے اور یہ تقسیم انسان کو کہیں کا بھی نہیں چھوڑتی، انسان نہ اندر کا رہتا ہے نہ باہر کا، اور نہ ہی اپنے آپ کا۔ کیونکہ کبھی من حاوی ہو جاتا ہے اور کبھی تن، کبھی من فقیر، کبھی تن فقیر۔ کبھی من بادشاہ، کبھی تن بادشاہ اور اس بادشاہی اور فقری کے چکر میں انسان بڑھال ہو جاتا ہے، کیونکہ انسان بھی آخر کیا کرے؟ تن بھی اس کا اپنا اور من بھی اس کا اپنا، لیکن ان دونوں میں سے خوش کس کو رکھے؟ اندر کو یا باہر کو؟ فیصلہ بہت مشکل ہے یا۔۔۔“ دل آور کے لہجے میں سنجیدگی اور بات میں گہرائی تھی۔ مدحیہ ٹھٹھک کر اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

”کیا بات ہے؟ کیا دیکھ رہی ہو؟ ایسا کچھ غلط تو نہیں کہا میں نے؟“ دل آور نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا تھا۔

”ہوں۔ نہیں۔ نہیں۔ کچھ نہیں۔“ اس نے چونکتے ہوئے نفی میں گردن ہلائی تھی۔

”تو پھر چلو! ناشتا تیار ہو چکا ہوگا۔“ دل اور نے کالی بٹاشٹ کا مظاہرہ کیا تھا۔

”جلیب۔“ وہ آہستگی سے کہتی اس کے ساتھ نیچے ڈانگنگ روم میں آگئی تھی اور دل اور نے خود کرسی پر بیٹھنے سے پہلے مدیجہ کی سائیڈ پر آکر اسے کرسی نکال کے پیش کی اور اس کے بیٹھنے کے بعد خود جا کر اپنی کرسی پر بیٹھا تھا۔

”اس گھر میں آج دوسری بار میں کسی کے ساتھ بیٹھ کر ناشتا کر رہا ہوں، پہلے اماں کے ساتھ اور آج تمہارے ساتھ، ورنہ ہمیشہ اکیلے ہی اپنی تنہائی کے ساتھ بیٹھ کر ناشتا کیا ہے۔“ دل اور کا لہجہ عجیب سا ہو رہا تھا، مدیجہ نے ذرا ٹھہر کر اسے دیکھا تھا۔

”تو آپ ماما کو یہاں کیوں نہیں لے آتے؟ وہ بھی اکیلے رہ رہی ہیں اور آپ بھی؟“

”مدیجہ! لاہور بے شک ہمارا آبائی شہر ہے، لیکن پھر بھی یہ شہر ہمیں کبھی راس نہیں آیا اور وہ یہاں آکر مزید کچھ کھونا نہیں چاہتیں۔“

”بھائی! ایک بات پوچھوں آپ سے؟“ مدیجہ نے بمشکل خود کو یہ سوال پوچھنے کے لیے تیار کیا تھا۔

”ہوں۔ پوچھو۔“ اس نے سنجیدگی سے اجازت دی تھی۔

”بابا کی ڈینٹھ کیسے ہوئی تھی؟ مرڈر سے یا۔۔۔؟“ مدیجہ نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا تھا اور سوال بھی ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ لیکن مدیجہ کا یہ سوال دل اور کی پوری ہستی کو دھواں دھواں کر کے رکھ گیا تھا اور اس کے چہرے کی رنگت پہ لہورنگ حاوی ہو گیا تھا۔ لیکن سامنے مدیجہ بھی اور اسے خود کو کنٹرول کرنا ہی تھا اور اس کے سوال کا جواب بھی دینا تھا۔ کیونکہ وہ سب کو ٹال سکتا تھا، لیکن اسے نہیں۔

”سوسائٹ سے۔“ اس نے صرف اتنا سا لفظ ادا کرنے کے لیے بمشکل اپنے جڑے کو حرکت دی تھی۔

”سوسائٹ سے۔“ مدیجہ ششدر سی رہ گئی تھی، کیونکہ وہ شروع سے ہی یہی سمجھتی آ رہی تھی کہ دل اور بھائی کے بابا کی ڈینٹھ مرڈر سے ہوئی تھی۔ سوسائٹ کا تو اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا اور نہ ہی کبھی یہ سوال پوچھنے کی ہمت کر پائی تھی، مگر آج نہ جانے کیسے بلا ارادہ ہی یہ سوال پوچھ لیا تھا۔

”خیر چھوڑو اس بات کو۔ تم یہ بتاؤ کہ تم یہاں کیوں آئی ہو؟ کوئی خاص ریزن؟“ دل اور نے بڑی جلدی خود کو کمپوز کیا تھا۔

”میں یہاں کیوں آئی ہوں؟“ مدیجہ نے جیسے یاد کرنے کی کوشش کی تھی۔

”ہاں یاد آیا! میں یہاں کسی خاص ریزن سے آئی ہوں۔“ مدیجہ بھی دل اور کی خاطر اس موضوع سے نکل آئی تھی۔

”ہاں بولو! میں سن رہا ہوں۔“ وہ پوری طرح سے متوجہ ہوا تھا۔

”ہاں ان لیکٹ میں جب سے پاکستان آئی ہوں، میں نے ایک بار بھی ٹھیک سے شاپنگ نہیں کی اس لیے میں نے سوچا کہ میں ہمیشہ ٹیلی بھائی کی جیب سے شاپنگ کرتی ہوں، کیوں نہ آج یہ شاپنگ آپ کی جیب پہ ڈال دوں؟“ مدیجہ نے شرارت سے کہا تھا۔

”ہوں۔ شاپنگ۔ ویسے کتنے میں ہوگی یہ شاپنگ؟ پانچ، دس ہزار کافی ہیں نا؟“ دل اور نے سنجیدگی سے استفسار کیا تھا۔

”واٹ۔۔۔؟ پانچ، دس ہزار؟ اس سے زیادہ تو آل ریڈی میرے بیگ میں موجود ہیں۔“ مدیجہ چیخ اٹھی تھی۔

”بھائی صاحب! آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں صرف سیٹھ نیل حیات کی بہن نہیں ہوں، بلکہ بیرسٹر دل اور شاہ کی بھی بہن ہوں اور اس لحاظ سے میرے بیگ میں رقم ہمت کم ہے۔ میرے بیگ کو تھوڑا اور وزن

ہونا چاہیے، مجھے ہلانے کی کوشش مت کریں۔“ وہ تنک کر بولی تھی۔

”اوکے۔ نہیں ہلانا، یہ بتاؤ کہ کتنے پیسے لوگی؟ بلکہ میرے ساتھ ملے کر لو، میں تمہیں ماہانہ پاکٹ منی دوں گا، جیسے نیل دیتا ہے اور ان شاء اللہ نیل سے زیادہ ہی دوں گا، تمہیں کبھی مانگنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی۔“ دل اور نے اسے کھلی آفر دی تھی۔

”میں میں نے پیسے نہیں لینے، میں نے شاپنگ کرنی ہے۔ بس۔“ مدیجہ اس کی آفر پر جھجک گئی تھی۔

”ارے بس کیوں؟ تم پیسے بھی لو اور شاپنگ بھی کرو، تم مجھ سے مانگا کرو، مجھ سے چھینا کرو، مجھے خوشی ہوگی مدیجہ، کہ میرا بھی کوئی اپنا ہے، مجھ سے حق جتانے والا اور میری کمائی کو خرچ کرنے والا میں مینے میں لاکھوں کماتا ہوں، لیکن انہیں خرچ کرنے والا کوئی بھی نہیں۔ کوئی بھی نہیں۔“ کتنے کتنے وہ پھر سے افسردہ اور بو جھل سا ہو گیا تھا، لیکن مدیجہ نے اسے زیادہ دیر اس نہیں ہونے دیا تھا۔

”ارے۔ اکیس نہیں بھائی۔ میں ہوں نا آپ کے پیسے خرچ کرنے والی ہوں آپ میرے ساتھ چلیں۔“

”ساتھ۔۔۔؟“ دل اور چونک گیا تھا۔

”ہاں ساتھ۔ میں آج یہ شاپنگ آپ کے ساتھ کرنا چاہتی ہوں، آپ نہیں جائیں گے تو میں بھی نہیں جاؤں گی۔“ اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔

”نوب میں شاپنگ کے لیے پیسے دے سکتا ہوں، مگر ساتھ نہیں جاسکتا۔“ دل اور نے نفی میں گردن ہلائی تھی۔

”تو ٹھیک ہے! آپ اپنے پیسے بھی اپنے پاس رکھیں، میں نہیں لوں گی، مجھے آپ کی ضرورت ہے، آپ کے پیسوں کی نہیں، اگر صرف پیسے ہی لے کر شاپنگ کے لیے جانا ہوتا تو مجھے یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟ میں اکیلی بھی جاسکتی تھی۔“ وہ خفا ہوئی ناشتا ختم کرتے ہی کرسی دھکیل کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”سوری میری جان! میں فارغ نہیں ہوں، مجھے کسی ضروری کام سے جانا ہے، تمہارے ساتھ پھر کبھی چلا جاؤں گا۔“ دل اور نے پچھتا چاہا تھا۔

”اوکے! آپ جاؤ، اپنے ضروری کام سے، میں آپ کو روک تو نہیں رہی؟“ اس نے کندھے اچکائے تھے۔

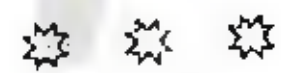
”مدیجہ پلیز! مجھنے کی کوشش کرو۔“

”سمجھ چکی ہوں، سب سمجھ چکی ہوں، آپ سبے فکر رہیں، دوبارہ نہیں کہوں گی آپ کو۔“ اس نے یوں ہی ناراضی سے کہتے ہوئے اپنا بیگ بھی اٹھالیا تھا۔

”لیکن تم جا کہاں رہی ہو؟“ دل اور نے جلدی جلدی ناشتا ختم کیا اور لیمکن سے ہاتھ پونچھتے ہوئے کرسی دھکیل کر کھڑا ہو گیا تھا۔

”واپس اپنے گھر۔“ اس کے لہجے میں ہنوز ناراضی تھی اور دل اور اس کی ناراضی نہیں سہہ سکتا تھا۔ اس نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔

”ٹھہرو۔ چلتا ہوں۔“ وہ اسے کہہ کر اپنا موبائل اور والٹ لینے کے لیے چلا گیا تھا اور مدیجہ نے نیچے کھڑی اپنی فتح مندی پہ مسکرا دی تھی۔



”کیا بات ہے ثروت؟ کیوں پریشان ہو؟“ اسرار آنندی بیوی کے چہرے کی پریشانی بھانپ چکے تھے، وہ کافی دیر سے بیڈ سے ٹیک لگا کر ایک ہی پوزیشن میں بیٹھی ہوئی تھیں اور بیوی دیکھتے اسرار آنندی نے پوچھ ہی لیا تھا۔

”میں اپنے بیٹوں کی طرف سے پریشان ہوں، جن پہ آپ نے کبھی دھیان ہی نہیں دیا، کبھی غور ہی نہیں کیا کہ وہ

کیا کر رہے ہیں اور کیا نہیں؟“ ثروت بیگم تو جیسے ان کے پوچھنے کے ہی انتظار میں تھیں، فوراً شروع ہو گئی تھیں۔

”کیا مطلب کہ بیٹوں کی طرف سے پریشان ہوں؟ کیا ہوا ہے آخر؟“ انہوں نے ٹی وی کا دیویم کم کر دیا تھا۔

”آؤر کو دیکھا ہے آپ نے؟ عجیب قنوطی سا ہو گیا ہے۔ سیدھے طریقے سے بات ہی نہیں کرتا۔ جب سے حویلی میں منصور حسین اور وہ علیزے والا مسئلہ ہوا ہے تب سے یوں دیوانہ بنا پھر رہا ہے، اس کے کہیں اپنے کی خبر ہے نہ جانے کی پہلے تو وہ بھی ایسا نہیں کرتا تھا۔“ ثروت بیگم کے لہجے میں پریشانی ہلکورے لے رہی تھی اور اسرار آفندی گہری سانس کھینچ کے رہ گئے تھے۔

”ہاں۔ جانتا ہوں وہ بہت آپ سیٹ لگ رہا ہے آج کل۔ لیکن ہم سب کیا کر سکتے ہیں اب؟ وہ مسئلہ ہی کچھ ایسا رونما ہوا ہے کہ سب کے سب ڈسٹرب ہو کے رہ گئے ہیں۔“ اسرار آفندی کا لہجہ دھیماپڑ گیا تھا۔

”سب کے سب نہیں۔۔۔ وہ کچھ زیادہ ہوا ہے اس نے زیادہ اثر لیا ہے باقی سب روئین پہ آگئے ہیں صرف وہی ہے جو ایک ہی جگہ پہ ٹھہرا ہوا ہے سب کام کرتا ہے پھر بھی لگتا ہے کہ وہ اندر سے مجھد ہے پھل نہیں رہا۔“ اسرار آفندی خود بھی فکر مند ہو رہے تھے۔ لیکن ثروت بیگم کی پریشانی دیکھتے ہوئے انہیں انٹالان کی ہمت بندھانی پڑی تھی۔

”تم پریشان مت ہو۔۔۔ ان شاء اللہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وقت خود بہت بڑا مرہم ہے گہرے سے گہرا زخم بھی مندمل کر ڈالتا ہے۔ اس حویلی کی عزت و غیرت پہ یہ زخم ابھی تازہ ہے اور تازہ زخم ہمیشہ اٹھتے بیٹھے درد دیتا ہے، تکلیف دیتا ہے اور آؤر بھی آج کل اسی تکلیف سے گزر رہا ہے جو درد زمین اور حماد وغیرہ ابھی نا سمجھ اور لالباہی دور سے گزر رہے ہیں وہ اس زخم کی گہرائی کو اور اس زخم کی تکلیف کو نہیں سمجھ سکتے، لیکن آؤر بہت حساس اور سمجھ دار لوگ ہیں اس زخم کی گہرائی سے نکل ہی نہیں رہا۔ مگر بے فکر رہو۔ وقت خود بخود ہی اسے دنیا واری کی طرف میوڑے گا۔ نارمل ہو جائے گا وہ بھی۔ مگر وقت گئے گا بس تم حوصلہ رکھو۔“ انہوں نے ثروت بیگم کے ہاتھ کو تھپکتے ہوئے تسلی دی تھی۔

”لیکن اسرار۔۔۔ ہمیں اب اولاد کے بارے میں کچھ سوچنا چاہیے، یوں سب کچھ وقت کے دھارے پہ چھوڑ دینا بھی تو ٹھیک نہیں ہے نا؟“ ثروت بیگم خاصی متفکر اور پریشان ہو رہی تھیں۔

”کیا سوچنا چاہیے؟ کیا کہنا چاہتی ہو تم؟“ وہ اب پوری طرح سے متوجہ ہو چکے تھے۔

”آؤر کی شادی کے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا؟“

”آؤر کی شادی؟ مگر ثروت یہ سب کیسے ممکن ہے؟ حویلی کے حالات تو تم خود ہی جانتی ہو ایسے حالات میں کیا ہو سکتا ہے بھلا؟“ اسرار آفندی کو ان کی بات کچھ اچھی نہیں لگی تھی۔

”حویلی کے حالات اب کبھی پہلے جیسے نہیں ہو سکتے اسرار۔ اب جو بھی کرنا ہے ہم نے انہی حالات میں کرنا ہے، جوان اولاد کو آزاد نہیں چھوڑنا چاہیے، ایک نتیجہ تو آپ لوگ دیکھ ہی چکے ہیں اور اس سے پہلے کہ باقی اولادیں بھی اپنی من مانی کریں، ہمیں خود ہی ان کو اپنے اپنے کھونٹے سے باندھ دینا چاہیے، میں نے کوئل کے لیے سوچا ہے۔ آؤر کی دلہن وہی بن سکتی ہے گھر کی بیٹی ہے، دیکھی بھالی ہے، اس کے ساتھ کھڑی اچھی لگے گی، آپ کا کیا خیال ہے؟“ ثروت بیگم نے اپنی بھانجی اور ان کی بیٹی کا نام سامنے رکھا تھا، لیکن اسرار آفندی سوچ کے رہ گئے تھے۔

”ہمارے خیال اللہ نے رد کر دیے ہیں، ہم اب کیا کر سکتے ہیں بھلا؟“ اسرار آفندی کے خیال میں علیزے کی شبیہ لہرائی تھی۔ ان کے ذہن میں جب بھی یہو کا خیال آتا تھا تو علیزے کا تصور ہی ذہن کے پردے پہ اجاگر ہوتا

تھا۔ لیکن اب وہ کیا کر سکتے تھے بھلا؟ سب کچھ الٹ ہو گیا تھا۔

”آپ چپ کیوں ہو گئے ہیں اسرار؟ کیا آپ کو اچھا نہیں لگا۔“

”نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔ بس کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے آؤر سے ضرور پوچھ لینا، زندگی اس کی ہے، اس نے بسر کر لی ہے، آخری فیصلہ بھی اسی کا ہونا چاہیے۔“ اسرار آفندی نے گہری سانس کھینچتے ہوئے ٹی وی آف کر کے لیپ جلا دیا تھا اور ثروت بیگم شوہر کی اداسی اور دلگرفتگی دیکھ کر چپ ہو گئیں۔ وہ سوئے کے لیے لیٹ چکے تھے۔



”مدھیہ۔“ دل آور نے شاہنگ بال کی پارکنگ سے گاڑی نکال کر روڈ پہ ڈالتے ہوئے اپنے ساتھ فرنٹ سیٹ پہ بیٹھی مدھیہ کو پکارا تھا اور وہ چونک گئی تھی۔

”جی بھائی۔؟“ وہ اس کی اتنی زیادہ سنجیدگی پہ ذرا پریشانی سے متوجہ ہوئی تھی۔

”مجھے ایک بات تو بتاؤ۔“ وہ ہنوز سنجیدہ تھا۔

”جی پوچھیے۔“ مدھیہ کا دل بڑی طرح سے دھڑک اٹھا تھا۔

”تم نے آج مجھے میرے کس گناہ کی سزا دی ہے۔“ دل آور کا اشارہ آج کی شاہنگ کی طرف تھا اور مدھیہ اس کی بات کا مفہوم سمجھتی ہی کھلکھلا اٹھی تھی۔

”یہ سزا ہے؟“ وہ شرارت سے چھیڑنے والے انداز میں پوچھ رہی تھی، کیونکہ اس نے واقعی آج اسے خوب تنگ کیا تھا۔

”یہ سزا نہیں تو اور کیا ہے؟ صبح ساڑھے گیارہ بجے گھر سے نکلے تھے اور اس وقت شام کے پانچ بج رہے ہیں۔“ دل آور نے اپنی گہری سانس کی تھی۔

”اف بھائی۔۔۔ ایک گھنٹہ تو آؤس کریم کھانے اور لچ کرنے میں ہی لگ گیا تھا؟“ وہ خفگی سے جھنجھلا کے بولی تھی۔

”اور باقی کے ساڑھے چار گھنٹے۔“ دل آور نے گھور کے دیکھا تھا۔

”ڈونٹ ڈری بھائی! آج آپ یہی سوچیے گا کہ آپ نے آج کا دن میرے نام کرویا ہے۔“ وہ لاپرواہی ظاہر کرتے ہوئے چکی تھی۔

”وہ تو کڑی دیا ہے۔ اب یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے بھلا؟“ دل آور نے تعجب سے کہا تھا۔

”بھائی۔۔۔“ مدھیہ اس کے انداز پہ جھج اٹھی تھی اور دل آور بے ساختہ قہقہہ لگاکے ہنسا تھا، بے شک مدھیہ نے اسے آج اپنے ساتھ بہت خوار کیا تھا۔ لیکن پھر بھی مدھیہ کی جھوٹی شرارتوں اور باتوں میں اس کا دل اچھا گزر گیا تھا۔ حالانکہ مدھیہ نے اس کا والٹ اچھا خاصا خالی کیا تھا، لیکن اسے پھر بھی کوئی پروا نہیں تھی۔ مدھیہ کے ساتھ اتنے عرصے بعد ٹائم گزار کے اسے بہت خوشی ہوئی تھی اور یوں ہی اس کی کسی بات پہ ہنستے ہوئے دل آور کی نظر چائنا ورکشاپ کے سامنے سے گزرتے ہوئے چونک گئی تھی اور اس نے اسپنڈ کم کرتے ہوئے ایک سائیڈ پہ بریک لگا دیے تھے۔ پھر رفتہ رفتہ گاڑی کو بیک کرتے ہوئے ورکشاپ کے عین سامنے لے آیا تھا۔

”ارے یہ۔۔۔ یہاں کیا ہوا ہے؟“ وہ تشویش سے کتا گاڑی سے نیچے اتر آیا اور اس کو نیچے اترتے دیکھ کر مدھیہ بھی چونک گئی تھی، کیونکہ چائنا ورکشاپ کے بورڈ پر اس کی اب نظر پڑی تھی۔ اس نے ٹھٹھک کر دیکھا۔ وہاں بہت سے لوگ جمع تھے اور پولیس بھی نظر آرہی تھی، مدھیہ کو یہ سب دیکھ کر بہت زیادہ پریشانی ہوئی تھی اور پریشانی تو

کورٹ پکھر لوں میں لوگ بیرسٹر دل اور شاہ کے نام سے جانتے ہیں۔ اس لیے اب تم بتاؤ کہ تم نے کس نام سے جانا ہے؟ وہ دیکھی سے پوچھ رہا تھا اور چھوٹے کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

”بیرسٹر دل اور شاہ؟“ اس نے زیر لب دہرایا تھا۔

”خیر چھوٹے۔ یہ وقت نہیں ہے زیادہ باتوں کا۔ یہ میرا کارڈ رکھ لو، کل مجھ سے ملنا ان شاء اللہ عدیل جلدی باہر آجائے گا۔“ دل اور نے اپنے والٹ سے کارڈ نکال کر اسے تھمایا تھا اور چھوٹے کے چہرے پہ خوشی اور بے یقینی کے رنگ دوڑ گئے تھے۔

”تھینک یو سو۔ تھینک یو سو۔“ چھوٹے نے بڑے پر جوش انداز اور ممنون لہجے میں اس کا شکریہ ادا کیا تھا۔

”ہوں۔ لگتا ہے کہ تم بھی صرف باہر کے منصور حسین ہو۔۔۔ ورنہ اندر سے تم بھی کچھ اور ہی ہو؟“ دل اور کا اشارہ اس کے بڑھے لکھے ہونے تھا۔

”سرم۔ آپ کو تو بتائی ہو گا کہ کوئی بھی منصور حسین نہیں بنتا۔ دنیا بنا دیتی ہے۔“ چھوٹے کا لہجہ خاصا گہرا تھا۔

”گڈ۔ تمہاری اس بات پہ انعام ہونا چاہیے تھا، لیکن میں اس وقت ذرا جلدی میں ہوں، میرے ساتھ میری سسٹر ہے، اسے گھر ڈراپ کرنا ہے، اس لیے تمہارا انعام ادھار رہا، ان شاء اللہ جلدی دوں گا، میں کسی کا ادھار نہیں رکھتا، پھر ملاقات ہوگی اللہ حافظ۔“

دل اور نے چھوٹے کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اسے امید دلائی تھی اور پھر گاڑی کے کھلے دروازے سے اندر بیٹھ گیا تھا اور یوں ہی دل اور کو دیکھتے دیکھتے چھوٹے کی نظر فرنٹ سیٹ کی سمت اٹھی تھی اور وہ مدھیہ کو دیکھ کر ایک بار پھر ششدر رہ گیا تھا۔

”وہ دل اور شاہ کی بہن ہے؟“ یہ اعتراف ہی اس کا مانع ہلا کے رکھ گیا تھا اور وہ سری طرف مدھیہ کا بھی برا حال تھا۔ اس کی دن بھر کی خوشی غارت ہو چکی تھی۔ عدیل عمر جیل میں ہے؟ یہ احساس اسے بے چین و بے کل کر گیا تھا۔

”کیا بات ہے میری جان؟ تم کیوں چپ ہو گئی ہو؟“ اس نے موڑ کاٹے ہوئے پوچھا تھا۔

”کچھ نہیں، بس تھک گئی ہوں۔“ اس نے چہرہ جھکا لیا تھا اور پھر دل اور نے بھی زیادہ دھیان نہیں دیا تھا اور اسپڈ بڑھا دی تھی۔



”زری۔ زری۔ تمہارے لیے گڈ نیوز ہے یار۔“ نگارش اندر سے تقریباً ”بھانگی“ ہوئی باہر آئی تھی اور باہر لان چیرز پہ بیٹھی زری نگارش بھانگی کے اتنے جوش و خروش پہ یکدم چونک گئی تھی۔

”میرے لیے گڈ نیوز؟“ زری نے ذرا حیرت کا اظہار کیا تھا۔

”ہاں۔ ایک نہیں بلکہ دو گڈ نیوز ہیں۔“ نگارش تو جیسے کھلی پڑ رہی تھی۔

”بتا میں نا؟ کیسی گڈ نیوز ہیں؟“ زری کو تجسس ہوا تھا۔

”پہلے اپنے ان خوب صورت ہاتھوں سے یہ تازہ تازہ لٹے چھیل کر نمک لگا کر پلیٹ میں سجا کے پیش کر دو تو پھر سنائی ہوں یہ گڈ نیوز۔“ نگارش اسے تنگ کرنے کے لیے اطمینان سے کہتی اس کے مقابل چیر پہ بیٹھ گئی تھی اور زری اس کی فرمائش پہ حیرت سے دیکھنے لگی تھی۔

”کیسی بھی کیا بات ہے کہ پہلے میں آپ کی خوشامد کروں اور پھر بات سنوں؟“ اس نے تعجب کا اظہار کیا تھا۔

دل اور کو بھی ہوئی تھی جو گاڑی سے اتر آیا تھا۔

”اسلام علیکم کیا ہوا ہے یہاں؟“ دل اور کی آواز پہ ایس ایچ او جمال احمد اور وہاں کھڑے باقی افراد نے چونک کے دیکھا تھا۔

”علیکم السلام! شاہ صاحب، آپ یہاں؟“ ایس ایچ او جمال احمد نے سب کو چھوڑ چھاڑ کے اس سے ہاتھ ملایا تھا۔

”بس یہاں سے گزر رہا تھا تو لوگوں کا یہ ہجوم دیکھ کر رک گیا۔ کیا ہوا ہے آخر؟“ اس نے ورکشاپ کی تباہ کن حالت دیکھتے ہوئے استفسار کیا تھا۔

”بس دو تین روز پہلے ورکشاپ میں آگ لگ گئی تھی، تین گاڑیوں کا نقصان ہوا ہے۔ اس لیے گاڑیوں کے مالکوں نے ہنگامہ اٹھا رکھا ہے اور ادھر باؤ امتیاز کا شمیری سب کچھ ایک لڑکے کے ڈال کے خود صاف دامن بچا رہے ہیں۔“ ایس ایچ او جمال احمد نے اسے ساری سچویشن بتائی تھی اور دل اور لڑکے کے ذکر پہ ٹھنکا تھا۔

”کس لڑکے کا؟“

”وہی جسے باؤ امتیاز نے سارے ورکشاپ کا انچارج بنار رکھا تھا۔ عدیل عمر نیازی۔“ ایس ایچ او جمال احمد نے اس کا پورا نام دہرایا تھا۔

”اویس۔ عدیل عمر۔؟“ دل اور کو سن کر افسوس ہوا تھا۔ عدیل کے ساتھ تو اس کی دو تین مرتبہ ملاقات بھی ہو چکی تھی۔

”کہاں ہے وہ؟“ دل اور نے مزید استفسار کیا تھا۔

”تھانے میں۔“ وہ تو اسی رات گرفتار ہو گیا تھا۔ ایس ایچ او جمال احمد کو بھی جیسے اس کی گرفتاری کا افسوس تھا۔

”کون سے تھانے میں؟“ اس کا لہجہ پُرسوج تھا۔

”دشی تھانے میں۔“ ایس ایچ او جمال احمد چھوٹے (شہر) سے عدیل کے حالات کا سارا قصہ سن چکے تھے۔ اسی لیے وہ باؤ امتیاز کے اس الزام کے خلاف تھے اور اس وقت اپنی نگرانی میں ساری انکوائری دوبارہ کر رہے تھے۔

”ٹھیک ہے پھر ایس ایچ او صاحب۔ اس وقت چلتا ہوں میں، آپ سے تھانے میں ہی ملاقات ہوگی اب۔“ مدھیہ کا خیال آتے ہی دل اور کو مزید وہاں ٹھہرنا مناسب نہیں لگا تھا اور ایس ایچ او جمال احمد سے ہاتھ ملا کر وہاں سے پلٹ آیا تھا۔ لیکن اس کو دل پس پلٹتے دیکھ کر ذرا فاصلے پہ کھڑے چھوٹے کا سکتہ ٹوٹ گیا تھا، وہ حواسوں میں لوٹے ہی دل اور کے پیچھے بھاگا تھا اور تب تک دل اور اپنی گاڑی کا دروازہ کھول چکا تھا۔

”رکے سو۔ بات سیے پلیز۔“ وہ بھاگتا ہوا اس کے قریب آیا تھا۔ دل اور چونک کے پیچھے پلٹا تھا۔

”ارے چھوٹے تم؟“ دل اور کو اسے دیکھ کر خوشی ہوئی تھی۔

”ہاں۔ مم۔ میں۔ لیکن اگر میں غلطی پر نہیں تو۔۔۔ تو آپ شاید منصور حسین۔۔۔؟“ چھوٹے نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ وہ اتنے بڑے آدمی کے سامنے بے ربط سا ہو گیا تھا وہ غلطی نہیں کرنا چاہتا تھا، حالانکہ وہ کافی دیر سے دل اور کو بار بار دیکھ رہا تھا اور ہر بار غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ ہو ہو منصور حسین تھا، بس چہرے پہ واڑ اور عام سے ساہ سے لباس کی کمی تھی، کیونکہ اس وقت جو آدمی اس کے سامنے موجود تھا اس کا چہرہ واڑمی وغیرہ سے صاف تھا اور لباس بھی قیمتی تھا۔ البتہ حال و حال تو پہلے بھی شاہانہ تھی اور اب بھی شاہانہ تھی۔

”نہیں۔ تم غلطی پر نہیں ہو۔ میں ہی منصور حسین ہوں۔ لیکن میرا اصل نام دل اور شاہ ہے۔ البتہ

”بس ایسی ہی کوئی بات ہے اور اس بات کے لیے تمہیں میری یہ خوشامد کرنا ہی پڑے گی۔“ نگارش اپنی فرمائش سے پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہیں تھی اور زری چند سیکنڈ زریوں ہی دیکھتی رہی، پھر ڈھیلے ڈھالے انداز میں سامنے نیبل پر رکھی باسکٹ میں سے مالٹے اٹھا کر چھلنے لگی تھی، پھر ان کو کاکٹ کر نمک لگا کر پلیٹ میں رکھ کے نگارش کے سامنے پیش کر دیا تھا اور نگارش اپنے سامنے رکھی پلیٹ دیکھ کر مسکرا دی تھی۔

”تو میری پیاری سزا اور پیاری بہن تمہارے لیے گڈ نیوز یہ ہے کہ تمہاری بتول آنٹی لاہور آ رہی ہیں وہ بھی صرف تمہارے لیے، تم سے ملنے کے لیے، ابھی ابھی ان کا فون آیا تھا۔“ نگارش کی بات پہ زری کے چہرے پہ ایک پل کے لیے خوشی کا رنگ ابھر کر معدوم ہو گیا تھا۔

”کیا بات ہے زری؟ تمہیں خوشی نہیں ہوئی سن کر۔“ نگارش کو زری کی طرف سے کوئی بھی رد عمل نہ پا کر حیرت ہوئی تھی۔

”خوشی؟ کیسی خوشی بھابھی؟ جب بتول آنٹی کا بیٹا ہی مجھ سے مل کر خوش نہیں ہوتا تو مجھے بتول آنٹی سے مل کر کیسے خوش ہوگی؟ کس رشتے کے حوالے سے؟ آخر خوش ہونے کے لیے کوئی رشتہ یا کوئی وجہ بھی تو ہونی چاہیے نا؟ بلا وجہ خوش ہونا بے وقوفی ہی تو ہے؟“ زری کافی تلخ ہو رہی تھی اور نگارش چونک گئی تھی۔ اسے دل اور زری کی ملاقات کا تو بتا تھا، لیکن ملاقات میں ہونے والی باتوں کا نہیں بتا تھا۔

”کیوں۔ بتول آنٹی کا بیٹا کیوں خوش نہیں ہوتا؟ اسے کیا ہوا ہے؟“ نگارش الجھن بھرے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

”ہو نہ ہو یہ تو وہی بتا سکتا ہے کہ وہ زری سے مل کر خوش کیوں نہیں ہوتا؟“ زری کے لہجے کی تلخی ہنوز تھی۔

”ارے نہیں یار۔۔۔ اب وہ اپنی خوشی کا اظہار سب کے سامنے صاف کھل کر تو نہیں کر سکتا نا؟“ نگارش کی وہی تسلیاں تھیں۔

”سب کے سامنے نہ سہی مگر میرے سامنے تو کرے نا؟“ زری اس کی تسلیوں پہ جھنجھلائی تھی۔

”ہو سکتا ہے کہ وہ ایک ہی بار اپنی خوشی کا اظہار کرنے کے قائل ہوں؟“ پھر ایک تسلی اور پھر ایک خوش فہمی زری نے سر جھٹک دیا۔

”خیر چھوڑو۔۔۔ آپ دوسری گڈ نیوز سنائیں؟ وہ کیا ہے؟“ زری نے اس بات کو سمیٹ دیا تھا۔

”تمہیں پتہ ہی نہیں ہوئی تو دوسری یہ کیا ہوگی؟“ نگارش کا جوش بھی دھیمّا ہو چکا تھا۔

”یہ تو گڈ نیوز یہ ڈپنڈ کرتا ہے کہ وہ کس کو کتنا خوش کرتی ہے؟ اگر کوئی نیوز سن کر کوئی خوش ہو جائے تو سمجھ جائیں کہ وہ واقعی گڈ نیوز ہے۔“ زری نے اسے گڈ نیوز کی پہچان بتائی تھی۔

”اوکے! مان لیتی ہوں۔ البتہ دوسری گڈ نیوز یہ ہے کہ ملک حق نواز کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ وہ مومنہ بی بی کے کیس کے سلسلے میں جیل جا چکا ہے۔“ یہ گڈ نیوز نگارش نے بہت نارمل سے انداز میں سنائی تھی جبکہ زری اچھل کے رہ گئی تھی۔

”واٹ۔۔۔ یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“ اسے تو جیسے یقین ہی نہیں آیا تھا۔

”میں وہی کہہ رہی ہوں جو تم سن چکی ہو؟“ نگارش نے کندھے اچکائے تھے۔

”لیکن بھابھی۔۔۔ اسے اسے اسٹ کس نے کروایا ہے؟“ زری کو اشتیاق ہو رہا تھا یہ جاننے کا کہ یہ سب کس کا کارنامہ ہے؟

”سی نے جو زری سے مل کر خوش نہیں ہوتا۔ وہی بتول آنٹی کا بیٹا۔“ نگارش نے لاپرواہی سے بتایا تھا۔

”ایسا کارنامہ بتول آنٹی کا بیٹا ہی کر سکتا ہے بھابھی۔۔۔ اور کوئی نہیں۔“ زری کو پل بھر کے لیے اس پہ فخر ہوا تھا۔

”اوہ۔۔۔ تو اب اچھا لگ رہا ہے؟“ نگارش نے اسے گھورا تھا۔

”اچھا نہیں بھابھی۔۔۔ پیارا اکو۔۔۔ پیارا لگ رہا ہے۔“ زری کو ملک حق نواز کے بارے میں جان کر بہت خوشی ہوئی تھی۔

”اور اگر ملک حق نواز پھر جیل سے باہر آ گیا تو۔۔۔؟“ نگارش نے چھیڑا تھا۔

”تو جس نے ایک بار اسے جیل بھیجا ہے وہ دوبارہ بھی بھیج سکتا ہے۔“ زری کا موڈ کچھ بہتر ہو چکا تھا۔

”تو تم لوگ اسے جیل ہی بھیجتے رہو گے؟“ نگارش نے مذاق اڑایا تھا۔

”وہ ہے ہی جیل بھیجنے کے لائق۔۔۔ ساری عمر جیل کی چکی میں بند رہے تو بھی کم ہے۔“ زری غصے اور نفرت سے مٹھیاں پیچھتے ہوئے بولی تھی۔

”زری۔۔۔ یقین نہیں آتا کہ تم اور عبداللہ اسی فیملی سے ہو جس فیملی سے ملک حق نواز یا پھر ملک اسد اللہ ہیں مجھے تم لوگوں کے علاوہ باقی ساری فیملی سے بہت خوف آتا ہے، بہت بے رحم لگتے ہیں سب۔“ نگارش نے ڈرتے ڈرتے ہی سہی، لیکن اپنے خیالات کا اظہار کر ہی دیا تھا۔

”ہم جیسا کوئی اور بھی تھا بھابھی! جو اس فیملی سے نہیں لگتا تھا جو بے رحم اور سنگ دل نہیں تھا جو عیاش اور بد کردار نہیں تھا جو اس فیملی میں سب سے اچھا تھا اور وہی اس فیملی کو سب سے پہلے چھوڑ گیا۔“ زری کا خیال اور سوچیں بہت پیچھے چلے گئے تھے اور دل سے ایک ٹھنڈی آہ بھری تھی۔

”گوں۔۔۔ کس کی بات کر رہی ہو؟“ نگارش نے بے ساختہ پوچھا تھا۔

”چچا وجاہت علی کی بات کر رہی ہوں، بس اب تو ان کے دھندلے دھندلے سے نقش بھی ذہن کی سلیٹ سے مٹ گئے ہیں۔ آخر بائیس سال کا عرصہ کچھ کم نہیں ہوتا اس وقت تو میں تھی بھی چھوٹی سی، لیکن مجھے یاد ہے وہ بہت پیار کرتے تھے ہم سے۔۔۔ مجھ سے بھی اور عبداللہ بھائی سے بھی۔“ زری کا لہجہ پرانی یادوں کے ذکر سے بو جھل ہو گیا تھا۔

”ان کے اپنے کتنے بچے تھے؟“ نگارش بھی سنجیدہ ہو چکی تھی۔

”تین۔۔۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی۔“ زری آستلی سے بولی تھی۔

”تو تم لوگ ان سے ملتے کیوں نہیں ہو؟ وہ کمزور ہیں تمہارے خون کا رشتہ ہے ان سے؟“ نگارش نے تعجب سے کہا تھا۔

”وہ جب ہم سے بچھڑے تھے تو بابا جان نے ان پہ واپسی کے اور ان سے ملنے کے سارے دروازے بند کر دیے تھے سب کچھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا تھا انہوں نے۔“ وہ اداس ہو چکی تھی۔

”انہوں نے تو تم لوگوں پہ بھی واپسی کے دروازے بند کر دیے ہیں؟ اور میرا خیال ہے اب چچا وجاہت علی کے بچوں کو اور تم لوگوں کو مل کر ایک ساتھ ہو جانا چاہیے۔“ نگارش نے ایک نیا مشورہ دیا تھا۔

”ہمیں کیا پتا کہ اب وہ کہاں ہیں؟ کیسے ہیں؟ کس حال میں ہیں اور وہ ہمارے بارے میں کیا سوچتے ہیں؟“ زری نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

”کیوں؟ تمہاری بچی نے کیا دوسری شادی کر لی تھی؟“ نگارش سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”کچھ پتا نہیں ان کی بعد کی لائف کے بارے میں، ہم کچھ نہیں جانتے انہوں نے شادی کی یا نہیں کی؟ کچھ علم نہیں ہے۔“ زری نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

”لیکن یار یہ سب جاننا کچھ مشکل تو نہیں ہے؟ آج کل انٹرنیٹ کے دور میں گھر بیٹھے ہی سب کچھ ممکن ہو سکتا ہے۔“ نگارش کے کہنے پہ زری محض سر ہلا کے رہ گئی تھی اور دل بے طرح اداس ہو چکا تھا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی ویب سائٹ

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم غاس کیوں ہیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو امیل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر پو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی پیفنگ اور ایچے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ☆ ہر کتاب کا الگ سلیشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ مابانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں ایلوڈنگ
- ☆ سیریم کوالٹی وائرل کوالٹی، کچر پڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور
- ☆ ابن صفی کی مکمل رینج
- ☆ ایڈفری ٹکس، ٹکس کو پیسے کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

ہم ادویہ سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

☆ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

☆ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

اس کے چہرے پہ وہ آنکھیں نہیں تھیں، وہ زخم تھے۔ ایسے زخم جن سے آنسوؤں کی جگہ خون رس رہا تھا اور اب تو وہ پلکیں بھی جھپکتی تھیں تو درد ہوتا تھا اور اس درد کی اذیت سے بچنے کے لیے وہ پلکیں جھپکنے کی بجائے آنکھیں بند کیے لیٹتی تھیں اور اپنی دونوں کلاہیاں اپنے چہرے پر رکھتی تھیں کہ اس کی آنکھیں نہیں غلطی سے بھی جھپکنے کی اور حرکت کرنے کی گستاخی نہ کریں، آخر وہ دونوں سے مسلسل رو رہی تھی اور آنکھوں کا حشر ہو چکا تھا۔ گل بھی کافی دیر سے نہیں آئی تھی اور وہ خود بھی کافی دیر سے یوں ہی بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھی۔ یوں سیدھے لیٹے لیٹے پورا جسم جیسے اکڑ سا گیا تھا۔ نیچے فرش پہ نیچے نوم کے گدے کے باوجود فرش کی ٹھنڈک محسوس ہو رہی تھی مگر پھر بھی وہ وہاں سے اٹھی نہیں تھی۔

لیکن ایک خیال تھا۔ بہت منہ زور۔ اور بہت تیز رفتار۔ ذہن میں کوندے کی طرح چلکا تھا اور وہ یک دم اٹھ کر بیٹھ گئی تھی اور پھر اس سے اس پسمٹ میں ٹھہرنا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی نیگے پیرا ہر کو بھاگی تھی۔ اس کے لیے ایک یہ بھی آسانی تھی کہ پسمٹ کا دروازہ اکثر کھلا ہی رہتا تھا۔ شاید اس لیے کہ دل اور کو پورا یقین تھا کہ وہ کبھی بھی کہیں بھاگ نہیں سکتی۔ بے شک وہ اپنے گھر کا گیٹ بھی کھلا چھوڑ کے چلا جائے تو وہ نہیں بھاگے گی اور یہ بھی سچ ہی تھا۔ اس وقت بھی وہ بھاگ نہیں رہی تھی۔ بس یہاں سے نکلنے کے لیے ہاتھ پیر مارنے کی کوشش کر رہی تھی اور اس کوشش کے لیے اسے چند سیکنڈز میں ہی بہت زیادہ ہمت مجتمع کرنی پڑی تھی۔ وہ بڑے تیز قدموں سے بھاگتی ہوئی باہر آئی تھی اور دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی کہ کسی سے بھی سامنا نہ ہو اور ایسا ہی ہوا تھا، وہ گل وغیرہ کی نظروں سے بچتی ہوئی اوپر آئی تھی۔ اسے دل اور شاہ کے بیڈ روم میں جانا تھا، لیکن اسے نہیں پتا تھا کہ اس کا بیڈ روم کون سا ہے؟ اس نے سامنے نظر آنے والے بیڈ رومز کے دروازوں کے ہینڈل گھما کے دیکھے تھے جو کہ لاک تھے اور رفتہ رفتہ سب سے لاسٹ والے بیڈ روم کا لاک اوپر ملا تھا۔ اس نے آہستگی سے ہینڈل گھمایا اور دروازہ کھل گیا تھا۔ جس پہ علیڑے کا دل کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا تھا اور ماتھے پہ پسینے کے قطرے چمکنے لگے تھے۔ وہ پہلی بار اس زندگی میں چلی بار ایسی کوئی چوریوں والی حرکت کر رہی تھی۔ تب ہی اس کا برا حال تھا۔ ہاتھ پیر کانپ رہے تھے۔ لیکن اب وہ واپس نہیں جاسکتی تھی۔ اب اسے دل اور شاہ کے آنے سے پہلے پہلے کچھ تلاش کرنا تھا۔ جس کے لیے اسے مزید ہمت کرنا پڑی اور وہ اندر آئی تھی۔

نفاس سے سجا خوب صورت اور تقریباً ساڑھ سا بیڈ روم اس کے سامنے تھا۔ وہ ادھر ادھر دیکھتی ہوئی تیزی سے الماری کی طرف بڑھی تھی اور الماری کے پٹ اس نے چوہٹ کھول دیے تھے اور کافی عجلت میں اس کی چیزوں کو الٹ پلٹ کرنے لگی تھی۔ پھر اس کی نظر اس کے بریف کیس کی سمت اٹھی تھی اور اس نے ڈاک جھٹکے سے وہ بریف کیس بھی الماری سے نکال لیا تھا اور اسے بیڈ پہ رکھ کر اس کے نمبر پر لیں کرنے لگی تھی، لیکن وہ کلک نہیں ہو رہے تھے۔ وہ بار بار کوشش کر رہی تھی، لیکن ہر بار ناکامی ہو رہی تھی۔

”دن زیروں پر لیں کرو۔ کھل جائے گا۔“ علیڑے کا اس کی آواز پہ اوپر کا سانس اوپر نیچے کا نیچے رہ گیا تھا۔ دل اور شاہ کی آواز نے اس کی روح کھینچ لی تھی۔ اسے ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی سی دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

☆ ☆



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

مجموعہ خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو امیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر ای بک کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور ایچھے پرنٹ کے ساتھ تہذیبی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں ایلوڈنگ
- ✧ سہولت کو الٹی، کچر، ریڈیو امیل
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
- ✧ ایڈ فوری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہے، ہر ویب سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک ویکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

بڑی حوصلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیحدے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدھیہ اور نیمل حیات دوائی، بسن، بھائی ہیں، مدھیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے، وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل حور یہ رنگ چکی ہے، جس کے پیش نظر فائزہ بیگم، نیمل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں، لیکن مدھیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے، جس پر نیمل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے، مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پھنپ رہا ہے۔

عربل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے، مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، بے بسی اور مجبوری سے تنگ آخر خود کشی کرنے کا سوچتا ہے، لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باؤ اقمیازل جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے، جس پر عربل کافی خوش ہوتا ہے، اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے، وہ مبارک خاں کے توسط سے بڑی حوصلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے، وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آزر شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے، وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے، اس نے

تجربہ پارا نہیں سیکھا، اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پر بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔

ستائیسویں قسط

اس کے اوسان خطا ہو چکے تھے۔

اور وہ پتھر کے بت کی طرح ساکت و صامت سی اپنی جگہ پہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ اس کی رگوں میں دردناک تابو بھی جیسے منجمد ہو چکا تھا اور وہ سر سے پاؤں تک برف کی مانند ٹھنڈی پڑنے لگی تھی۔ کیونکہ خود سے سرد ہونے والی خطا اور دل اور شاہ کی طرف سے ملنے والی سزا کے بارے میں سوچ کر ہی اس کے پیروں تلے سے زمین سرکنے لگی تھی۔

”رک کیوں گئی ہو؟ کھولنا۔ نمبر بالکل کریمٹ بتایا ہے میں سننے پر بس کر دے فوراً کھل جائے گا۔“ وہ اس کی حالت سے بے خبر لا پرواہی سے کہتا اپنے پیچھے دروازے کا بولٹ چڑھا کر قدم بہ قدم چلتا ہوا آگے بڑھ آیا تھا اور وہ اسے دروازے کا لاک لگا کر اپنی سمت بڑھتے دیکھ کر اور زیادہ خوف زدہ ہو گئی تھی وہ کانپتی ہوئی ٹانگوں کے ساتھ بمشکل قدم اٹھاتی اس سے دور رہنے کے لیے پیچھے ہٹنے لگی تھی وہ ایک ایک قدم آگے بڑھ رہا تھا اور ایک ایک قدم پیچھے ہٹ رہی تھی یہاں تک کہ بیڈ روم کی کشادگی ان دونوں کے قدموں میں سمٹ گئی تھی اور علیزے پیچھے ہٹتے ہٹتے الماری سے جا لگی تھی اور وہ اس کے بے حد قریب آ رہا تھا اور اس کی نظریں علیزے کے گلابی رخساروں کو بچھونے لگی تھیں۔

”تم آج پہلی بار میرے بیڈ روم میں آئی ہو۔ اور میں ٹھہرا مہمان نواز بندہ۔ مہمانوں کی خوب خاطر داری کرتا ہوں۔ سر آنکھوں پہ بٹھاتا ہوں۔ اور اگر مہمان تمہارے جیسا ہو تو دل میں جگہ دیتا ہوں۔ اس لیے آج ایسا کر دے۔ یہیں رہو۔ میرے پاس۔ میرے بیڈ روم میں۔ تمہاری جان کی قسم خاطر داری میں کوئی کسر نہیں چھوڑوں گا۔“

دل اور کی نظریں ہی نہیں لہجہ بھی ہلکا ہوا سا لگ رہا تھا اور علیزے کی جان فٹا ہو گئی تھی اس کے پورے جسم کے اک اک روم میں سے پسینہ ٹھوٹتا ہوا محسوس ہوا تھا اور اس کی خوبصورت پیشانی پہ پھوٹنے والے ننھے ننھے کالج کے موتیوں جیسے پسینے کے قطرے بھی دل اور کی نظروں سے چپے ہوئے نہیں رہ سکے تھے وہ اسے بڑے غور سے اور بڑے قریب سے دیکھ رہا تھا۔

”بولو۔! بنوکی مہمان۔؟“ اس نے کافی گنبد لہجے میں پوچھا تھا اس کی آواز غماز آلود ہو رہی تھی اور علیزے کے دل و دماغ کی حرکت جیسے بند ہونے لگی تھی۔

”مم۔۔۔ مجھے جانے دے۔۔۔ پلیز۔۔۔ ڈرائیور۔۔۔ مجھے جانے دے۔“ علیزے بمشکل اپنی قوت گویائی کا استعمال کر پائی تھی۔ ورنہ وہ تو جیسے اپنی ساری ہمتیں اور ساری قوتیں ہی کھو بیٹھی تھی۔

”جانے دوں۔؟ کہاں جانے دوں۔؟ رات بہت کالی اور موسم بہت سرد ہے۔ ایسے جان لیوا لمحات میں تمہیں اگر جانے دوں تو خود کدھر جاؤں۔؟“ اس کی آواز اس کی آنکھیں اور اس کا لہجہ دھڑکتی خواہشوں اور ہلکتے جذبات کے بوجھ سے بوجھل ہو رہے تھے اور علیزے مرجانے کو تھی۔

”مجھ سے غلطی ہو گئی ڈرائیور۔! مجھے معاف کر دو۔ پلیز۔ مجھے جانے دے۔ میں آئندہ تمہارے بیڈ روم میں نہیں آؤں گی۔“ علیزے کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے اور وہ کہتے کہتے رو پڑی تھی۔

اور پھر دل اور کے دیکھتے ہی دیکھتے اس کے نرم و گداز اور گلابی گلابی سے رخسار آنسوؤں کے نمکین پانیوں سے بھیگتے چلے گئے تھے۔ دل اور نے آج پہلی بار اپنی آنکھوں کے سامنے گلابی پھولوں پہ شبنم مکنے کا منظر دیکھا تھا اور اس دلفریب منظر کا فسوں اس کے چار سو پھیل گیا تھا اور وہ اس فسوں خیزی کے ہاتھوں مخمور سا ہونے لگا تھا۔

”جانتی ہو اس وقت تم جس کنڈیشن میں ہو یہ کنڈیشن مردوں کو کتنا اہل کرتی ہے؟“ دل اور نے اپنے دونوں ہاتھ علیزے کے دائیں بائیں الماری پہ جماتے ہوئے علیزے کے بچاؤ کے تمام

سے مسدود کر دیے تھے اور اس کے اس طرح دائیں بائیں ہاتھ جما کر کھڑے ہونے سے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے پورے کی پوری اس کی پانچوں کے حصار میں آگئی ہو، فرق بس اتنا تھا کہ اس حصار میں وہ اس کے سینے سے نہیں بلکہ الماری سے لگی کھڑی تھی، لیکن دل اور کی بات یہ اس نے یکدم کرنٹ کھا کے اسے دیکھا تھا اور اس کی گولڈن براؤن آنکھوں کے متوحش سے تاثر پہ دل اور نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

”روٹی بلکتی ہوئی عورت مرد کے جذبات کی آگ پہ تیل کا کام کرتی ہے اور آگ پہ تیل کا اثر تو تم جانتی ہی ہوگی؟“ سب کچھ جل کے راکھ ہو جاتا ہے۔“ دل اور کے قہجے اس کی باتوں اور اس کے تیوروں سے علیزے بری طرح نا نف ہو چکی تھی اور اس کے منہ سے گھٹی گھٹی سی سسکیاں ابھرنے لگی تھیں۔

”مجھے معاف کر دو۔ پلیز ڈرائیور۔ مجھے معاف کر دو۔ مجھے جانے دے۔“ علیزے نے بے بسی سے ایک بار پھر التجا کی تھی۔

”تم وہ واحد لڑکی ہو جس نے میرے بیڈ روم تک آنے کی جرات کی ہے اور تمہاری اس جرات کو خراج تحسین پیش کیے بغیر تمہیں جانے دوں؟ یہ بھی تو مناسب نہیں لگتا؟ کچھ تو ہونا چاہیے آخر؟“ دل اور کے عزائم خطرناک لگ رہے تھے۔

”نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ پلیز ڈرائیور نہیں۔۔۔ میں مرجاؤں گی۔۔۔“ علیزے کا خون خشک ہو چکا تھا وہ تڑپ اٹھی تھی۔

”اف یار۔! مروت میں جاؤں گا اگر میرے سامنے اس طرح کھڑی التجائیں کرتی رہو گی۔؟ اور تمہاری ان التجاؤں پہ میری میرے ہی دل سے ٹھن جانے گی و دشمن ہو جائیں گے ہم ایک دوسرے کے۔“ دل اور نے بھی بے بسی کا اظہار کیا تھا اور علیزے بھی بے بسی کے مارے رو رہی تھی اس کے آنسو زار و قطار سے چلے جا رہے تھے۔

”لگتا ہے کہ آج تم دل اور شاہ کو ڈبو کر ہی چھوڑو گی۔؟“ دل اور نے اپنا وایاں ہاتھ الماری سے ہٹا کر اپنی نگلی سے اس کی ٹھوڑی کو اٹھا کر اس کا چہرہ اونچا کیا تھا اور اس کی انگلی کا ذرا سا لمس بھی علیزے کے لیے بجلی کے کسی ننگے تار سے کم نہیں تھا اس کی سسکیاں ہچکیوں میں بدلنے لگی تھیں اور جان لبوں پہ آگئی تھی جیسے اب لگی کہ تب لگی۔

”تم اور تمہاری ذات کو رے کاغذ کی طرح ہے بالکل سادہ بالکل صاف اندر باہر سے ایک جیسی پانی جیسی شفاف بے ضرر اور بے ریاض۔ کبھی کبھی بہت اچھی لگتی ہو۔ تمہارے رحم بھی آتا ہے۔ دل چاہتا ہے تمہاری کورے کاغذ جیسی ذات پہ پورے کے پورے دل اور شاہ کو چھاپ دوں اپنا حرف حرف لفظ لفظ لکھ ڈالوں رنگ ڈالوں تمہاری ذات کو۔“ دل اور نے انتہائی گنبد لہجے میں کہتے ہوئے اسے خاصی گہری نظروں سے دیکھا تھا اور اس کی نظروں کے مغموم سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس نے ضرور کچھ ٹھان رکھی ہے جس کو دیکھ کر علیزے کو اپنے اعصاب منظرین جوتے ہوئے محسوس ہوئے تھے۔

”لیکن پھر سوچتا ہوں کہ تم وقار آئندی کی بیٹی ہو۔“ دل اور نے وقار آئندی کے نام پہ نفرت سے سر جھٹکا تھا اور علیزے اس کی اتنی نفرت سے اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

”البتہ آج یہ اعتراف ضرور کروں گا کہ تم بڑے بڑے زاہدوں کو بھی رند کرنے کی پوری پوری صلاحیت رکھتی ہو آج اس وقت اس جگہ کوئی اور ہوتا تو تمہارے قدموں میں ڈھیر ہو چکا ہوا دانٹوں پسینہ آجاتا ہے تمہیں دیکھتے ہوئے۔ تمہیں دیکھنا اور دیکھ کر اپنے آپ میں رہنا صرف دل اور شاہ کا حوصلہ ہے ورنہ ممکن ہی نہیں کہ اپنے پس میں رہا جائے۔“

”ہاری جائے گی۔“ دل آور نے علیزے کو جن نظروں سے دیکھ کر کہا تھا ان پر تو علیزے کو پورے جسم میں سنہاٹ سی دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی تھی مگر دوسری طرف عبد اللہ کچھ نہیں سمجھا تھا۔
”کون ہے؟“

”جو بھی آئے گی۔“ دل آور بات تو عبد اللہ کے ساتھ کر رہا تھا لیکن مفسوم علیزے کو سمجھا رہا تھا۔
علیزے کی کلائی ہنوز اس کے ہاتھ میں تھی اور وہ تھر تھر کانپ رہی تھی، کیونکہ وہ ایک غلطی پہ ایک اور غلطی کرنے چلی تھی پہلی کی ابھی معافی نہیں ملی تھی کہ اب ایک اور سزا کا اضافہ ہو گیا تھا۔
”بہت سفاک ہو یا۔“ عبد اللہ نے تاسف کا اظہار کیا تھا۔

”ہنازک لوگوں کے ساتھ سفاک لوگ ہی سوٹ کرتے ہیں ملک عبد اللہ صاحب۔ اور نہ نازک لوگ تو جان کو آجائیں۔“ اس نے ذرا استیغناء لہجے میں کہا تھا لیکن اب کی بار علیزے اس کی بات پہ نہیں بلکہ اس کے منہ سے نکلنے والے نام پہ چونکی تھی۔

”ملک عبد اللہ صاحب۔“ اس نے اس نام کو بے ساختہ زیر لب دہرایا تھا، لیکن دل آور کا ذہن حد سے زیادہ کوئی تھا۔

ادھر علیزے نے ہونٹوں کو جنبش دی تھی اور ادھر اس کے ذہن نے کام دکھایا تھا اس سے پہلے کہ علیزے اس نام کو دوبارہ ذرا بلند آواز سے دہراتی دل آور نے اس کی کلائی چھوڑ کر اپنا ہاتھ اس کے منہ پہ جما دیا تھا تاکہ عبد اللہ کو اس کی آواز سنائی نہ دے، کیونکہ وہ اگر اس کی آواز سن لیتا تو اور سوال کرتا اور دل آور اپنی ریپویشن خراب نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے علیزے کی آواز کا کلا گھونٹ دیا تھا جبکہ علیزے تڑپتی تھی پھر پھڑپاتی تھی روئی تھی مگر دل آور شاہ کی مضبوط چوڑی ہتھیلی اپنے منہ سے نہیں ہٹا سکی تھی اور اس کو شش میں پیچھے ہٹتے ہوئے وہ دوبارہ الماری سے جا ٹکرائی تھی۔

”ویسے تمہارے ساتھ کوئی نرم و نازک سی لڑکی نہیں بلکہ اچھی خاصی سخت اور دھانسو قسم کی لڑکی ہونی چاہیے۔“

عبد اللہ نے چڑنے والے انداز میں دانت کچکچا کے کہا تھا اور اب کی بار دل آور قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔
”نوٹیشن یا۔“ جیسی بھی ملی، چلے گی۔ کیونکہ اپنی پسند کے سانچے میں ڈھالنا مجھے آتا ہے۔ نرم و نازک سی ملی تو اسے سخت بنا دوں گا اور سخت ملی تو اسے نرم و نازک کر دوں گا۔ یہ مسئلہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ بس خود میں صلاحیت ہونی چاہیے۔“

اس نے علیزے کو مسکراتی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا اور وہ ایک بار پھر بے بس کونج کی طرح پھر پھڑپاتی تھی۔
”دل آور۔“ باز آجائے۔“ عبد اللہ نے اسے تنبیہ کی تھی۔

”اوکے۔“ آگیا باز۔ اب تم یہ بتاؤ کہ تم نے فون کیوں کیا ہے؟“ دل آور اصل سوال کی طرف آگیا تھا۔
”اے۔“ تمہاری بے ہودہ گفتگو میں یہ بھی بھول گیا کہ فون کیوں کیا ہے؟“ عبد اللہ نے جیسے اپنے سر پہ ہاتھ مارا تھا۔

”ٹھیک ہے۔“ میں فون بند کر دیتا ہوں، تم یاد کر لو کہ تم نے فون کیوں کیا ہے؟“ اس نے لا پرواہی سے کہا تھا۔

”چھا۔“ بڑی جلدی ہے تمہیں فون بند کرنے کی۔“ عبد اللہ نے مصنوعی خفگی سے کہا تھا۔
”بس میرا دم گھٹ رہا ہے، فون بند کر کے تھوڑا دیر لیکس ہونا چاہتا ہوں۔“ دل آور اپنی آڑ میں علیزے کی لہلہ زبان کر رہا تھا، کیونکہ اس کا ہاتھ ابھی تک اس کے منہ پہ جما ہوا تھا۔

دل آور نے اس کی خوبصورتی کے سحر کو بر ملا تسلیم کیا تھا، کیونکہ وہ لگی لپٹی بات کرنے کا عادی نہیں تھا۔
”مجھے جانے دو ذرا بیور۔“ پلیز۔ تمہیں خدا کا واسطہ۔ مجھے جانے دو۔ میں اب کبھی بھی تمہارے بیڈروم میں نہیں آؤں گی۔ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ پلیز مجھے معاف کر دو۔ میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔“ پلیز۔

علیزے اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے روڑی تھی اور اب کی بار ایسی دھواں دھار روئی تھی کہ سب کچھ جل تھل ہو گیا تھا، لیکن اس سے پہلے کہ دل آور مزید کچھ کہتا اچانک اس کی جیب میں موبائل کی واٹریشن ہونے لگی تھی اور اس نے فوراً موبائل جیب سے نکال لیا تھا اور عبد اللہ کا نمبر دیکھتے ہی کال ریسیو کر لی تھی۔

”السلام علیکم۔“ اس کا لہجہ اس کا انداز اس کے تیور بدل چکے تھے بالکل پہلے جیسے ہو گئے تھے جن میں نہ کوئی خمار تھا اور نہ ہی کسی قسم کا کوئی بو بھل پن تھا۔ چند منٹ پہلے کے لمحات کا تو شائبہ تک نظر نہیں آ رہا تھا۔
”وعلیکم السلام۔“ کیسے ہو؟“ عبد اللہ نے کافی بے اشت سے پوچھا تھا۔

”کیلا ہوں۔ تمہا ہوں۔ تڑپ رہا ہوں۔“ دل آور نے افسردگی سے کہا تھا اور جواباً عبد اللہ قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔

”بابا بابا۔“ تم تمہا ہو سکتے ہو۔ مگر کبھی تڑپ نہیں سکتے۔“ عبد اللہ کے لہجے میں یقین تھا۔
”کیوں۔“ کیا تم مجھے مرہ تصور کرتے ہو؟ کیا میرے سینے میں دل اور جسم میں جان نہیں ہے کہ میں تڑپ نہیں سکتا؟ کیا میری رگوں میں جذبات نہیں دوڑتے؟ یا پھر تم مجھے ہو کہ میں انسان نہیں بجلی سے بنا روٹ ہوں کوئی؟“

دل آور نے جل کے کہا تھا اور موبائل کے ایئر پیس سے عبد اللہ کے مسلسل قہقہوں کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔

”یہ جتنی حالتیں تم نے گنوائی ہیں۔“ ان میں سے صرف پہلی حالت چھوڑ کے باقی سب ریفلکٹ ہیں، میں تمہیں بالکل ایسے ہی سمجھتا ہوں کہ تمہارے سینے میں دل اور جسم میں جان نہیں ہے، اس لیے تم تڑپ نہیں سکتے۔ اور تمہاری رگوں میں جذبات نہیں صرف خون دوڑتا ہے۔ اور یہ بھی کہ تم واقعی بجلی سے بنے روٹ ہو اور بس اپنے کام پھڑکتے پھرتے ہو اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔“ عبد اللہ کی مسکراہٹ دل آور بنا دیکھے بھی محسوس کر سکتا تھا۔

”میں اس کے علاوہ بھی اور بہت کچھ ہوں ملک صاحب۔“
”یہ روٹ کتنا رومانٹک ہے۔“ یہ بات میری شاہی کے بعد میری بیوی سے پوچھنا۔“ دل آور نے کافی معنی خیزی سے کہا تھا۔ اور عبد اللہ کا ایک بار پھر قہقہہ بلند ہوا تھا۔
”بابا بابا۔“ یہ بات تو ہم پوچھتے بغیر بھی جانتے ہیں کہ تمہاری بیوی کے کانوں سے دن رات دھواں نکلا کرے گا آخر تمہاری باتیں جو ایسی ہوتی ہیں۔“ عبد اللہ نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

”اس وقت صرف باتیں نہیں ہوں گی جناب۔“ عمل بھی ہو گا۔“ دل آور نے ایک اور معنی خیز پوائنٹ بتایا تھا اور عبد اللہ کا حشر ہو گیا تھا اس کی پسلیوں میں درد ہونے لگا تھا اتنا زیادہ ہنسنے اور قہقہے لگانے کی وجہ سے۔

اور علیزے اس کو باتوں میں مصروف دیکھ کر آسٹکی سے الماری سے ہٹ کر دروازے کی سمت بڑھی تھی اور دل آور کی بے وہیلی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا لیکن وہ قدم آگے بڑھنے کے بعد ہی اس کے قدم رک گئے تھے کیونکہ اس کی کلائی دل آور کے مضبوط ہاتھ کے شکنجے میں آچکی تھی اور علیزے کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔

”او کے! اگر دیکھیں اللہ حافظ۔“ عبداللہ نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا اور دل آور نے کمری سانس کھینچے ہوئے موبائل دوبارہ اپنی جیب میں ڈال لیا تھا اور گردن موڑتے ہوئے علیزے کی سمت متوجہ ہوا تھا اور آہستہ سے اپنا ہاتھ پیچھے ہٹا لیا تھا۔

”ہوں۔! اب بولو کیا کہنا چاہتی ہو۔؟“ دل آور نے انتہائی کمری کمری سانسیں لیتی علیزے کو بولنے پہ اکرا لیا تھا۔

”عبداللہ کون ہے۔۔۔؟“ علیزے نے اپنی تکلیف کو بھلا کر بے تالی سے پوچھا تھا۔

”تمہارا اکرن۔ ملک شرافت علی کا بیٹا۔! دل آور پلٹ کر بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کی طرف گیا اور وہاں سے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر نکال کر سگریٹ سلکا لیا تھا۔

”میرا اکرن۔؟“ علیزے نے خود کلامی کے سے انداز میں بولی تھی۔

”ہاں۔! تمہارا اکرن اور میرا دوست۔“ وہ کہتے ہوئے اپنے بیڈ پر بیٹھ گیا تھا اور جھک کر دائیں ہاتھ سے اپنے بوٹوں کے تسمے کھولنے لگا تھا۔

”اور۔۔۔ نسب زری کون ہے۔؟“ علیزے نے بڑی مشکلوں سے سوال پوچھا تھا اور اس کے سوال پہ دل آور نے تسمے کھولتے کھولتے یکدم سر اوجھا کر کے اسے دیکھا تھا اس کے آنسو اب بھی بہہ رہے تھے۔

”محبت۔! اس نے بے ساختہ لفظ محبت ادا کر دیا تھا اور علیزے نے چونک کر اس کے چہرے کی سمت دیکھا تھا۔

”کیا کہا۔؟ محبت۔؟“ اس نے حیرانی سے پوچھا تھا۔

”ہاں۔ محبت۔! کیونکہ میری نظر میں اس کی یہی شناخت ہے۔“ وہ بوٹوں کے تسمے کھول کر سیدھا ہو چکا تھا۔

”کیا مطلب۔؟ میں سمجھ نہیں۔“ وہ واقعی اس کی بات کے مفہوم کو سمجھنے سے قاصر تھی۔

”تم سمجھتی سمجھو گی بھی نہیں کیونکہ یہ تمہاری سمجھ کی چیز نہیں ہے۔“ وہ بوٹ اور جرابیں اتارنے کے بعد اپنی شرٹ کی آستینوں کے بٹن کھولنے لگا تھا اور ساتھ ساتھ سگریٹ اور اس کے دھوئیں سے بھی دل بہلا تا جا رہا تھا۔

”محبت میری سمجھ کی چیز نہیں ہے۔؟“ علیزے الجھ گئی تھی۔

”محبت تمہاری پوری حویلی کی سمجھ کی چیز نہیں ہے۔“ وہ سگریٹ ہونٹوں میں دباتے ہوئے اب شرٹ کے سامنے والے بٹن کھول رہا تھا اور علیزے حیران اور الجھی الجھی سی بے دھیانی میں اسے دیکھنے جا رہی تھی۔

”مگر میں نے تم سے محبت کے بارے میں تو نہیں پوچھا۔؟“ علیزے کی بات پہ ذرے تنگ روم کی طرف بڑھنے دل آور کے قدم ٹھہر گئے تھے اور وہ یونہی کھلے گریبان سمیت پلٹ کر چلتا ہوا دوبارہ اس کے سامنے آکھڑا ہوا تھا ابھی تک الماری سے لگی کھڑی تھی۔

”مگر تم نے مجھ سے زری کے بارے میں تو پوچھا ہے نا۔؟“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

”تو تم زری کے بارے میں بتاؤ نا۔“ علیزے نے تکرار کی تھی۔

”میری سمجھ بوجھ کی دشمنی میں زری کا مطلب محبت اور محبت کا مطلب زری ہے۔ اس سے زیادہ میں نہیں جانتا۔“ اس نے اب بھی بہت مبہم سا جواب دیا تھا۔

”زری اور عبداللہ کا آپس میں کیا رشتہ ہے۔؟“ علیزے نے بڑی ذہانت کا ثبوت دیا تھا اور سوال بدل دیا تھا۔

”گڈ۔! یہ سوال اچھا ہے۔ زری اور عبداللہ بہن بھائی ہیں۔ عبداللہ ملک شرافت علی کا چھوٹا بیٹا اور زری

بھائی ہیں۔؟“ اس نے علیزے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا اور علیزے چپ کی چپ رہ گئی تھی

”بھائی اور کیا پوچھتی ہے۔؟“ اس نے آہستگی سے نفی میں سر ہلایا تھا۔

”پھر اب تم باعزت طریقے سے یہاں سے جاسکتی ہو۔“ اس کے کہنے پہ علیزے نے یکدم نظریں اٹھا کر اسے دیکھا تھا حالانکہ دل آور نے شرٹ کے نیچے بھی وائٹ کلر کی بنیان پہنی ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود علیزے اس کی شرٹ کے بٹن کھلے دیکھ کر نظریں جھکا گئی تھی۔

”کیا بات ہے۔؟ جانے کو دل نہیں چاہ رہا۔؟“ دل آور کے اگلے سوال پہ علیزے کے چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا تھا اور اس نے بے ساختہ قدم دروازے کی طرف بڑھا دیے تھے لیکن دروازے کے قریب جا کر اس کے قدم ٹپک گئے تھے اور اس نے دوبارہ پلٹ کر اسے دیکھا تھا۔

”ایک بات کہوں تم سے۔؟“ وہ اس سے اجازت طلب کر رہی تھی۔

”کوئی۔؟“ اس نے ذرا سا جھک کر ایش ٹرے میں سگریٹ مسلے ہوئے اسے اجازت دی تھی۔

”کیا تمہیں اب بھی لگتا ہے کہ میں باعزت ہوں۔؟ کیا میری کوئی عزت باقی رہ گئی ہے تمہاری نظر میں۔؟“

علیزے کی آنکھیں اور لہجہ زخمی ہو رہے تھے اور حلق میں آنسوؤں کا گولا سا ٹٹنے لگا تھا۔

”ہاں۔! مجھے اب بھی لگتا ہے کہ تم باعزت ہو۔ البتہ یہ الگ بات ہے کہ صرف میری نظر میں ہو دنیا کی نظر میں نہیں۔ حالانکہ میں نے تمہارے ساتھ کچھ بھی نہیں کیا لیکن تمہارے میکے والے سمجھتے ہیں کہ سب کچھ ہو چکا ہے اور میرا مقصد بھی یہی ہے ان کو یقین دلانا کہ سب کچھ ہو چکا ہے مگر حقیقت کیا ہے یہ تو صرف تم جانتی ہو کہ میں نے تمہیں بری نظر سے بھی نہیں دیکھا میں نے تمہیں اپنے مطلب کے لیے استعمال کیا ہے اپنی کسی لب کے لیے نہیں۔ ہاں یہ افسوس کی بات ہے کہ وقار آفندی کی صرف ایک ہی بیٹی ہے ہو سکتا ہے کہ اس کی کوئی اور بیٹی ہوتی تو میں اسے ٹارگٹ بنالیتا اور تمہیں چھوڑ دیتا لیکن یہ سب کچھ سہنا اور برداشت کرنا اب تمہاری مجبوری اور بے بسی ہے۔

بلکہ یہ بھی نہیں۔! کیونکہ تمہاری برداشت مجبوری اور بے بسی کی حد تو اس وقت شروع ہوگی جب تم یہاں سے نکلو اور واپس اپنی حویلی جاؤ گی اور تمہارا باپ تمہیں دیکھ کر مرے گا اور مرمہ کے جیسے گا تب میں تمہارے باپ سے پوچھوں گا کہ اذیت کیا ہوتی ہے۔؟ اور اس اذیت کے نامور کو دل میں دبا کر جینا کیسا لگتا ہے۔؟ زندگی موت۔ اور موت زندگی گننے لگتی ہے یہ جیتی جاگتی دنیا انسان پہ قبر کی طرح تنگ ہو جاتی ہے اور یہ دنیا وقار آفندی پہ تنگ کر دینا چاہتا ہوں۔“ دل آور کا لہجہ سخت اور بے رحم ہو چکا تھا اور علیزے ہمیشہ کی طرح دم بخود رہ گئی تھی جبکہ وہ مزید وہاں کے بغیر دوش روم میں چلا گیا تھا۔

”آج علیزے کے ساتھ جس طرح پیش آیا تھا اگر ایسا نہ کرتا تو یقیناً“ وہ آئندہ بھی نڈر ہو کر اس کے بیڈ روم میں آنے کی جرات کر سکتی تھی لیکن دل آور نے اپنے تیور بدل کر اسے خائف کر دیا تھا اور اس کا مقصد بھی یہی تھا اسے خائف کرنا لیکن علیزے اس کے ہر مقصد سے بے خبر تھی اس لیے مرے مرے قدم اٹھاتی واپس اپنے قید خانے میں آگئی تھی۔!



عبداللہ کمری نیند سو رہا تھا جب گھر کے لینڈ لائن نمبر پہ رنگ ہونے لگی تھی۔ اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دی

www.parksociety.net

www.parksociety.net

www.parksociety.net

www.parksociety.net

www.parksociety.net

www.parksociety.net

www.parksociety.net

www.parksociety.net

www.parksociety.net

www.parksociety.net

www.parksociety.net

www.parksociety.net

www.parksociety.net

www.parksociety.net

www.parksociety.net

www.parksociety.net

www.parksociety.net

www.parksociety.net

www.parksociety.net

www.parksociety.net

www.parksociety.net

”زری۔ اپانی۔“ نگارش کا حلق اور ہونٹ خشک ہو رہے تھے اسی لیے اس نے پانی مانگا تھا بخار کی وجہ سے پیاس سے برا حال تھا۔

”جی بھابھی! میں ابھی پانی لے کر آتی ہوں۔“ زری فوراً وہاں سے اٹھ گئی تھی کیونکہ ان کے بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر رکھا پانی کا جگ خالی تھا اس لیے اسے نیچے بچن میں اتار دیا تھا اور پانی لا کر بمشکل اسے سہارا دے کر پانی پلایا تھا۔ اور اتنے میں عبد اللہ شاد نے کرپٹرے چیتج کر کے واش روم سے باہر نکل آیا تھا۔

”بھابھی اسپتال نہیں جاسکیں گی ان کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہے باہر سردی ہے آپ ایسا کریں کہ ڈاکٹر گھر بلا لیں۔“ زری کو اندازہ ہو چکا تھا کہ نگارش اٹھ کر چل نہیں سکے گی اس لیے اس کی سہولت کی خاطر ڈاکٹر گھر بلائے کا مشورہ دیا تھا۔

”لیکن میں کس ڈاکٹر کو بلاؤں۔؟ مجھے تو کسی کا پتا ہی نہیں ہے۔“ عبد اللہ اس معاملے میں انجان تھا کیونکہ ابھی شہر میں اجنبی جو تھا۔

”تو آپ کسی سے پوچھ لیں نا۔۔۔؟“

”کس سے پوچھوں۔۔۔؟ دل اور تو اس وقت کورٹ میں ہو گا اور نیبل تو خود اس شہر میں میری طرح انجان ہے۔ خیر پھر بھی میں اسے ٹرائی کرتا ہوں۔“ عبد اللہ ہیر برش ڈرنگ نیبل پہ ڈال کر بیڈ کی سائڈ ٹیبل سے اپنا موبائل اٹھاتے ہوئے اس کا نمبر ڈائل کر چکا تھا۔

”ہیلو! دوسری طرف سے فوراً ہی کال ریسیو ہو گئی تھی۔

”کہاں ہو۔۔۔؟“ عبد اللہ نے سنجیدگی سے پوچھا تھا۔

”راستے میں ہوں۔۔۔ شوروم جارہا ہوں۔“ نیبل گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔

”کسی ڈاکٹر کا کنٹیکٹ نمبر ہے تمہارے پاس۔؟“

”کیوں۔۔۔؟ خیر بہت۔۔۔؟ کون بیمار ہے۔؟“ نیبل چونک گیا تھا۔

”نگارش کی طبیعت خراب ہے۔۔۔ اسے بخار ہے۔۔۔ اسے لے کر جانا مشکل ہے اس لیے سوچا ہے کہ ڈاکٹر ہمیں بلا لیتے ہیں۔۔۔“ عبد اللہ ذرا فاصلے پہ ہی کھڑا تھا اس کی باتیں زری کافی آسانی سے سن رہی تھی۔

”میں آ جاؤں۔؟“ نیبل نے عبد اللہ کی پریشانی کے خیال سے کہا تھا۔

”نہیں۔۔۔ تھینک یو یا۔۔۔ اس کی ضرورت نہیں ہے تم آرام سے آفس جاؤ اور مجھے ڈاکٹر کا نمبر سینڈ کرو۔“

عبد اللہ نے نیبل کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

”یا۔۔۔ اتنی غیریت کیوں برت رہے ہو۔۔۔؟ اگر ضرورت ہے تو میں آ جاتا ہوں اور ہم بھابھی کو اسپتال لے جاتے ہیں۔۔۔؟“ نیبل نے بصد اصرار پوچھا تھا۔

”ارے نہیں یا۔۔۔! اب اتنی بھی پریشانی کی بات نہیں ہے صرف بخار ہی تو ہے، تھوڑی دیر میں اتر جائے گا تم بس ڈاکٹر کا نام اور نمبر بتا دو۔ بعد میں اگر ضرورت پڑی تو بلا لوں گا تمہیں۔“ عبد اللہ نے ذرا تحمل کا مظاہرہ کیا تھا۔

”اوکے۔۔۔! میں تمہیں سینڈ کرتا ہوں۔ ڈاکٹر ہاشمی نام ہے ان کا۔۔۔ دل اور کے جاننے والے ہیں۔ اس کا حوالہ دو گے تو فوراً آجائیں گے۔“ نیبل نے اسے تفصیل سے بتایا تھا لیکن دل اور کے حوالے کے ذکر عبد اللہ کو صبح صبح موصول ہونے والی ملک اسد اللہ کی کال یاد آگئی تھی۔

”وہ کورٹ سے فارغ کب ہوتا ہے۔۔۔؟“ اس نے دل اور کے متعلق استفسار کیا تھا۔

”عوا! دوبارہ ایک سبب تک کورٹ سے فری ہوتا ہے، لیکن کبھی کبھی پہلے بھی فری ہو جاتا ہے، کیوں۔۔۔ تم کیوں چھ رہے ہو۔۔۔؟“ نیبل کے بیک گراؤنڈ میں گاڑی کی آواز بند ہو چکی تھی گویا وہ شوروم کی پارکنگ میں پہنچ چکا تھا۔

”مجھے اس سے ملنا ہے، ایک ضروری بات ڈسکس کرنی ہے، تم سے بھی اور اس سے بھی اس لیے دو بجے اس سے سن میں ملتے ہیں۔ اوکے۔۔۔؟“ دل اور اور نیبل کو اس کال کے بارے میں بتانا بہت ضروری تھا، اسی لیے کچھ ملنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن زری اور نیبل بیک وقت اس کی بات پہ چونک گئے تھے ایک فون کے اس پار اور ایک فون کے اس پیاس۔!

”خیر تو ہے نا۔۔۔؟ ایسی کون سی ضروری بات ہے۔۔۔؟ جو ایک ساتھ مل کر ڈسکس کرنی ہے۔۔۔؟“ نیبل نے دور ر کر زری کے ذہن میں ابھرنے والا سوال دہرایا تھا۔

”یا۔۔۔! اب ساری بات فون پہ ہی تو نہیں بتائی جاسکتی۔۔۔؟ میں فون بند کر رہا ہوں۔۔۔ دیکھتے ملتے ہیں۔۔۔ اللہ حافظ۔“

عبد اللہ نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا اور نیبل اور زری بے چین سے ہو کر رہ گئے تھے۔

بعد میں پھر عبد اللہ نے ڈاکٹر ہاشمی کو بلا دیا، نگارش بھابھی کا چیک اپ کروایا، خود ناشتا کیا، نگارش کو سوپ وغیرہ پلایا۔۔۔ سب کچھ کیا، لیکن زری کو کچھ خبر نہیں تھی کہ کیا ہو رہا ہے کیونکہ وہ عبد اللہ کی مبہم سی بات میں الجھی ہوئی تھی۔

نگارش بھابھی کو سنبھالتے ہوئے ان کے ماتھے پر ہٹیاں رکھتے ہوئے اور ان کے سارے کام کرتے ہوئے بھی وہ ذہنی طور پہ غیر حاضر ہی تھی، کیونکہ آج تو وہ نگارش سے بھی شیر نہیں کپا رہی تھی، آخر وہ خود بیمار تھی اسے مزید پریشان کیا کرنا تھا بھلا۔۔۔؟



”میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔“

مدیہ نے اپنے سامنے کھڑے شہر پار سے سنجیدگی سے کہا تھا جس پہ شہر پار بری طرح ٹھٹھک گیا تھا۔

”آپ ان سے ملنا چاہتی ہیں۔۔۔؟ مگر کیسے۔۔۔؟ وہ تو پولیس اسٹیشن میں ہیں۔۔۔؟“ شہر پار کو حیرت ہوئی تھی۔

”تو کیا میں پولیس اسٹیشن نہیں جاسکتی۔۔۔؟“ مدیہ نے اس سے زیادہ حیرت کا اظہار کیا تھا۔

”نہیں میڈم۔۔۔! آپ کا پولیس اسٹیشن جانا مناسب نہیں ہے۔“ شہر پار نے نفی میں گرلن ہلائی تھی۔

”کیوں۔۔۔؟ مناسب کیوں نہیں ہے۔۔۔؟“ مدیہ نے اسے تیکھی سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

”دیکھیے میڈم۔۔۔! یہ کورٹ پکھری اور تھانے وغیرہ جیسی جگہوں پر مرد ہی آتے جاتے اچھے لگتے ہیں، کیونکہ یہ مردوں کی جگہیں ہیں، یہاں عورتوں کا آنا جانا معیوب سمجھا جاتا ہے، خصوصاً شریف گھرانے کی عورتوں کا، آپ کو احتیاط کرنی چاہیے۔“

شہر پار نے اسے مخلصانہ مشورہ دیا تھا، لیکن مدیہ سمجھ ہی نہیں پار رہی تھی اسے بس عدیل عمر سے ملنے سے غرض تھی۔

”تو پھر میں اس سے مل کیسے سکتی ہوں۔۔۔؟“ وہ جھنجھلائی تھی۔

”بس آپ دعا کریں کہ وہ جلدی باہر آجائے، میری صبح بات ہوئی ہے دل اور صاحب سے۔“ قدرے جھنجھلا کر اوہراؤ ہو رہی تھی مدیہ نے چونک کر شہر پار کو دیکھا تھا۔

ہوئے۔
”ہیلے بھی تو میں صرف ایک کو ملاتی تھی اور تم دونوں آجاتے تھے۔“ وہاں تھیں مگر جواب کرنا آتا تھا۔
”لیکن پہلے پیلا بیمار نہیں تھے نا۔ اب ان کو ڈسٹرب کرنا اچھا نہیں لگتا۔“ عون نے پھر بھی معقول جواب دیا تھا۔

”عون۔! تمہارے پیلا پہلے بیمار نہیں تھے اور انہیں تم لوگوں کا بیڈ روم میں آنا باتیں کرنا، شرارتیں کرنا اچھا لگتا تھا، لیکن اب وہ بیمار ہیں اس لیے انہیں تم لوگوں کا بیڈ روم میں آنا باتیں کرنا اور شرارتیں کرنا زیادہ اچھا لگے گا۔ کیونکہ وہ اکیلے ہو گئے ہیں، تنہا ہو گئے ہیں، بیڈ روم سے باہر کی دنیا مر گئی ہے ان کے لیے۔ ختم ہو گئی ہے۔ کیونکہ وہ دنیا کے لیے مر گئے ہیں۔ ختم ہو گئے ہیں۔ زندہ ہو کر بھی زندہ نہیں ہیں۔ یہ بیڈ روم ان کے لیے ایک لکڑی، قبر کی مانند ہے اور تم نہیں جان سکتے بیٹا۔ قبر جتنی بھی لکڑی ہو جائے، آخر قبر ہی ہوتی ہے اور اس قبر میں پڑے ہوئے بے جان مردہ انسان یہ جب کبھی کبھار اس کے اپنے دو حرف فاتحہ کے پڑھنے کے لیے آتے ہیں تو وہ بے جان مردہ جیسے جی اٹھتا ہے اپنی موت اور بے بسی کی ساری تکلیفیں بھول کر اس پر خوشی اور سکون کی لہر دوڑ جاتی ہے بالکل ایسے ہی تم دونوں آگے تو تمہارے پیلا یہ خوشی اور سکون کی لہر دوڑ جائے گی، کیونکہ تم دونوں نہیں آگے تو اور کون آئے گا۔؟ اور ان کے پاس بیٹھے گا۔؟ وہ کھو بیٹا۔! فاتحہ اپنی اولاد ہی آکر پڑھتی ہے کوئی اور نہیں پڑھتا آگے۔“ آسیہ آفندی نے انتہائی سفاک اور بے رحم الفاظ میں کہتے ہوئے اپنے حلق اور اپنی آنکھوں میں اندھنے والے زہریلے اور تلخ آنسوؤں کو بڑی مشکل سے اندر ہی اندر پینے کی اور اپنے آپ کو ضبط کے دائرے میں رکھنے کی کوشش کی تھی۔

”پلیز ماما۔! ایسا تو مت کہیں۔؟“ عون ابھی بچہ تھا ضبط نہیں کر سکا تھا اس کے آنسو نرم رخساروں پر پھسل آئے تھے۔

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں بیٹا۔! یہی سچ ہے۔ اور سچ ہمیشہ کڑا ہوتا ہے۔ اور تم لوگوں کو اس کڑے سچ اور تلخ حقیقت کا سامنا کرنا ہی ہے۔ اس لیے میں چاہتی ہوں کہ تم دونوں آیا کرو اپنے پیلا کے پاس بیٹھا کرو باتیں کیا کرو، ان کے بے جان جسم میں جان پڑ جائے گی، کچھ ملے گی خوشی اور راحت مل جائے گی دل بمل جائے گا ان کا۔“ آسیہ آفندی نے عون کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ کر کہتے ہوئے کہا تھا اور عون بے ساختہ ان سے لپٹ کر رہ گیا تھا۔

”ایم سوری ماما۔! اب ایسا نہیں ہو گا۔ ہم روز آیا کریں گے۔ اور پیلا کے ساتھ باتیں کیا کریں گے۔ ایم ریلی سوری ماما۔! ریلی سوری۔“ عون آسیہ آفندی سے لپٹا انچکیوں سے رہا تھا اور ان کے سر کو اس کے بالوں کو چومتے ہوئے آسیہ آفندی کے آنسو بھی اس کے بالوں میں جذب ہو گئے تھے۔

”ریلیکس بیٹا۔! اڑنے سے کچھ نہیں ہو گا۔ میں بھی بہت روئی ہوں۔ مگر اب کوشش کر رہی ہوں کہ نہ رویا کروں۔ تم بھی مت رو۔“ انہوں نے اس کی پشت سہلاتے ہوئے اسے چپ کرایا تھا۔ اور اس کی پیشانی کو چومتے ہوئے اسے خود سے الگ کیا تھا۔

”یہ لو پانی پیو۔! انہوں نے صوفے کی سائیڈ والی چھوٹی ٹیبل سے پانی کے جگ سے پانی اٹھیل کر گلاس اس کی سمت بڑھا دیا تھا اور عون نے بمشکل پانی کے دو گھونٹ لیے تھے اور گلاس پیچھے ہٹا دیا تھا۔

”میں نے تمہیں رلانے کے لیے یہاں نہیں بلایا تھا، بلکہ کسی کام کے لیے بلایا تھا۔“ انہوں نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا تھا۔

”جی ماما کیسے! میں سن رہا ہوں۔“ اس نے آہستگی سے سر جھکاتے ہوئے پوچھا تھا۔

”کیا۔؟ دل اور بھائی سے بات ہوئی ہے۔؟ کیا کہا انہوں نے۔؟“ اسے تجسس ہوا تھا۔
”وہ کہہ رہے تھے کہ عدیل صاحب کی بیل کروانے کے لیے انہیں کچھ ضروری کاغذات اور معلومات کی ضرورت ہے جو انہیں صرف میں ہی لا کر دے سکتا ہوں، اس لیے مجھے ان کے آفس ٹائمنگ کے بعد ان سے ملنا ہو گا اور عدیل صاحب سے بھی ملاقات کروانی پڑے گی اور ان شاء اللہ ایک دو روز تک کام ہو جائے گا، کیونکہ انہوں نے اس کیس کی کچھ جانچ پڑتال بھی تو کرنی ہے نا۔؟“ شہیار نے تفصیلی جواب دیا تھا۔
”اوہ۔! تو تم اب ان سے ملو گے۔؟“ مدیحہ نے گہری سانس کھینچی تھی۔

”ظاہر ہے۔! ملنا تو ہے۔ ان سے نہیں ملنا تو اور کس سے ملنا ہے۔؟ ان کا بہت بڑا احسان ہے کہ انہوں نے یہ کیس ہاتھ میں لیا ہے، وہ بھی بغیر کے۔ اور بغیر کسی فیس کے۔ ورنہ عدیل صاحب کا تو کوئی مدد کرنے والا بھی نہیں تھا۔“ شہیار نے افسوس سے سر ہلایا تھا۔

”ہو نہ ہو۔! کوئی نہ بھی ہو۔ اور والا تو ہے نا۔؟ اور یہ مدد بھی دل اور بھائی نہیں۔ اور والا ہی کر رہا ہے۔ کیونکہ کسی کو کسی کا وسیلہ بنا کر وہی بھیجتا ہے، کبھی شہیار کی صورت میں، کبھی دل اور شاہ کی صورت میں۔ اپنی اسے تم میرا یہ نمبر رکھ لو، بھائی سے ملاقات میں جو بھی بات ہو مجھے بتا دینا، ورنہ میں واقعی اس سے ملنے کے لیے چلی جاؤں گی۔“

مدیحہ نے اپنا نمبر لکھ کر اس کی سمیت بڑھایا تھا اور اسے جیسے دھمکی بھی دی تھی جس پر شہیار بے ساختہ مسکرا دیا تھا اور وہ پلٹ کر گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔ ”خدا حافظ“ وہ اسے ہاتھ ہلا کر گاڑی اڑانے لگی تھی۔!



”لیس ماما۔! آپ نے بلایا تھا۔؟“ عون دروازے پر دستک دے کر اندر داخل ہوا تھا اور سوالیہ نظروں سے آسیہ آفندی کی جانب دیکھا تھا۔

”ادھر آؤ۔! میرے ساتھ بیٹھو۔“ آسیہ آفندی نے آہستگی سے الماری کا پٹ بند کرتے ہوئے عون کو اشارہ کیا اور صوفے کی طرف بڑھ گئی تھیں اور عون ان کی تقلید کرتے ہوئے ان کے برابر ہی صوفے پر آ بیٹھا تھا، خاصا چپ اور سنجیدہ تھا اور یہ چپ اور سنجیدگی تب سے چلی آ رہی تھی جب سے علیزے حولی چھوڑ کر گئی تھی، وہ دونوں بھائی ہر وقت کبوتر کی طرح اڑنے والے اور غرغروں، غرغروں کرنے والے پھولوں کی طرح چپ ہو کر مرجھا گئے تھے، ان کی باتیں اور شرارتیں سب ختم ہو گئی تھیں۔

اور اپنے بچوں کو چپ اور اداس دیکھ کر آسیہ آفندی کا دل اندر ہی اندر کڑھتا رہتا تھا، شوہر کی بیماری کی وجہ سے وہ اپنے دونوں بچوں کو بھی ٹائم نہیں دے پا رہی تھیں اور وہ بھی ان کو ڈسٹرب کیے بغیر اپنی رو میں نہ اسکل آ جا رہے تھے، ٹیوشن پڑھ رہے تھے اور اپنا قرآن پاک کا سبق بھی دہرا رہے تھے مولوی صاحب کے پاس، کیونکہ پہلے وہ ایک ایک مرتبہ قرآن پاک کا سبق پورا پڑھ چکے تھے، اب دوبارہ سے شروع کیا ہوا تھا اور آسیہ آفندی اس سب پر بہت زیادہ خوش ہو تھیں اگر یہ سب رو میں نہ گرتے ہوئے ان کی پہلے والی شوخیاں اور شرارتیں بھی زندہ ہو تیں۔ اسی لیے تو ان کو بچھا بچھا سا دیکھ کر ان کا دل بھر آتا تھا۔

”غریب کہاں ہے۔؟“ انہوں نے اپنے قریب سر جھکائے عون کی طرف رخ پھیرا تھا۔

”جی۔! وہ اپنے بیڈ روم میں ہے۔“ اس نے بونہی سر جھکائے ہوئے جواب دیا تھا۔

”وہ کیوں نہیں آیا۔؟“ انہوں نے عون کے جھکے ہوئے سر کو دیکھا اور استفسار کیا تھا۔

”آپ نے صرف مجھے بلایا تھا شاید۔“ عون نے اپنے بچپن کے برعکس جواب دیا تھا، سمجھ داری کے

”دیکھو بیٹا! تمہارے پیپا کے لیے کچھ شاپنگ کرنی ہے ان کے ٹائوٹز، ٹشووز اور ضرورت کی کئی اور چیزیں بھی لینی ہیں، میڈیسن بھی ختم ہو رہی ہیں ان کی۔۔۔ اس لیے میں وانیال کے ساتھ ذرا مارکیٹ تک جا رہی ہوں۔۔۔ دیر بھی ہو سکتی ہے۔ تمہارے پیپا سو رہے ہیں۔۔۔ اس لیے تمہیں میری واپسی تک یہیں ان کے پاس رہنا ہو گا۔ کیونکہ انہیں کسی بھی وقت کسی چیز کی ضرورت پڑ سکتی ہے اور اگر وہ اٹھ کر ٹیک لگانا چاہیں تو مبارک خان کو بلا لینا۔“ آسیہ آفندی نے اسے ہدایات دی تھیں اور اس نے سعادت مندی سے اثبات میں سر ہلادیا تھا جس پہ وہ اس کا ہاتھ سہلا کر اٹھ گئی تھیں۔

”سلام علیکم آنی۔۔۔!“ وانیال آہستگی سے دستک دے کر اندر داخل ہوا تھا۔
 ”سلام علیکم السلام! لو وانیال بھی آگیا۔۔۔ میں اب چلتی ہوں۔۔۔ جلدی لوٹنے کی کوشش کروں گی۔۔۔ اپنے پیپا کا خیال رکھنا۔ اللہ حافظ۔“

آسیہ آفندی ڈریسنگ ٹیبل پہ رکھا اپنا بیگ اٹھا کر وانیال کے ساتھ باہر نکل گئی تھیں اور ان کے پیچھے دروازہ بند ہو گیا تھا۔

عون ان کے جانے کے بعد چند سیکنڈ یونی صوفے پہ بیٹھا رہا اور پھر آہستہ قدموں سے اٹھ کر چلتا ہوا وقار آفندی کے بیڈ کے پاس آگیا تھا اور ان کو غور دیکھتے ہوئے ان کے قریب ہی بیڈ پہ بیٹھ گیا تھا۔
 وقار آفندی کی پلکیں بند تھیں، لیکن نجانے کیوں بند پلکیں بھی لرز رہی تھیں۔

”پاپا! ممما کہتی ہیں کہ ہمارے آنے سے باتیں کرنے سے اور پاس بیٹھنے سے آپ کے بے جان جسم میں جان پڑ جائے گی، کچھ بل کی خوشی اور راحت مل جائے گی، دل بھل جائے گا آپ کا۔۔۔ لیکن پاپا! ممما شاید بھول گئی ہیں کہ ان لوگوں کے آنے سے انسان کے بے جان جسم میں جان پڑتی ہے جن کو انسان اپنی جان سے بڑھ کے چاہتا ہے، انہی کو دیکھ کر خوشی اور راحت ملتی ہے اور انہی کے پاس بیٹھ کر دل بہلتا ہے۔ اور آپ کی جان تو وہی ہیں نا جو آپ کو بے جان کر کے چلی گئی ہیں چھوڑ گئی ہیں۔؟“

ہمارا اور ان کا کیا مقابلہ۔؟ ان کی کمی ہم کیسے پوری کر سکتے ہیں بھلا۔؟ ان کی کمی تو بس وہی پوری کر سکتی ہیں۔۔۔ آپ کے بے جان جسم میں تو صرف انہی کے آنے سے جان پڑ سکتی ہے۔ اور ہم انہیں کہیں سے لا بھی نہیں سکتے۔؟ وہ کھو گئی ہیں پاپا۔۔۔“ عون کا لہجہ کتے کتے بھگ گیا تھا۔

”کاش۔۔۔! وہ کہیں سے آجائیں اور۔۔۔ اور آپ کو پھر سے ٹھیک کر دیں۔۔۔ آپ بالکل پہلے جیسے ہو جائیں۔۔۔ کیونکہ آپ کو اس حال میں دیکھ کر بہت تکلیف ہوتی ہے ہمیں اسی لیے۔۔۔ اسی لیے تو ہم یہاں نہیں آتے۔ اپنے بیڈ روم میں بیٹھے رہتے ہیں۔۔۔ آپ کی اور لیزے آپ کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ کیوں ہمیں چھوڑ کر چلی گئیں۔۔۔؟ وہ ایسی تو نہیں تھیں۔۔۔؟ پاپا میرا دل کہتا ہے میری آپ ایسی نہیں ہیں۔۔۔ ان سب کو غلط فہمی ہو گئی ہے۔ لیزے آپ منصور حسین کے ساتھ نہیں گئیں، منصور حسین انہیں زبردستی لے کر گیا ہے۔۔۔ پاپا یہ سب بہت برے ہیں، بہت گندے ہیں، لیزے آپ کے لیے گندہ سوچتے ہیں۔۔۔ مجھے بہت برا لگتا ہے بہت برا۔۔۔“

عون وقار آفندی کے سینے پہ سر رکھے بے تحاشا رویا تھا اور اپنے دل کا غبار بھی جی کھول کے نکالا تھا یہاں تک کہ وقار آفندی کی بند پلکوں سے آنسو بہنے لگے تھے اور قطار در قطار بننے والے آنسو ان کی کنپٹیوں کے بالوں میں جذب ہونے لگے تھے۔

”آپ بھی چپ ہو گئے ہیں۔۔۔ کسی سے کچھ نہیں کہتے۔۔۔ ہم سے بھی نہیں۔۔۔ پاپا پلیز! کچھ تو بولیں۔۔۔ میں جانتا ہوں کہ آپ جاگ رہے ہیں، آپ ممما کی باتیں سن رہے تھے اور آپ میری بھی باتیں سن رہے ہیں۔۔۔“

لیکن آپ ہم سے بات نہیں کر رہے۔ کیوں پایا۔؟“ عون کی بات پر وقار آفندی کا دل کانپ گیا تھا مگر دکھ تو اس بات کا تھا کہ وہ اپنے سینے سے لگ کر روتے اپنے تخت جگر کو بازو میں سمیٹ کر اپنے ہونے کا احساس بھی نہیں دے سکتے تھے کیونکہ ان کے بازو بے جان تھے اور وہ خود بے بس۔

پھر بعد میں عون جتنا بھی رویا جتنا بھی تڑپا لیکن خود ہی سنبھلا تھا۔ کیونکہ سنبھالنے والا جواب کوئی نہیں تھا۔ اور اپنے بچوں کو اس قدر تنہا محسوس کر کے وقار آفندی بھی آج بہت روئے تھے۔!

وہ کورٹ سے اور اپنے چند دیگر کاموں سے فارغ ہو کر اپنے آفس پہنچا تو پارکنگ لاٹ میں نبیل اور عبداللہ کی گاڑیاں دیکھ کر چونک گیا تھا۔ اور پوچھی حیران ہوتے ہوئے وہ اندر آگیا تھا۔

”وعلیکم السلام سر۔؟“ اس کا نشی قادر اسے دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”وعلیکم السلام۔! اندر کون ہے۔؟“ اس نے اپنے آفس کی طرف اشارہ کیا تھا۔

”آپ کے دوست ہیں سر۔! نبیل صاحب اور عبداللہ صاحب۔ کافی دیر سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“

”تو پھر کے لہجے میں احترام تھا۔“

”کچھ بھیجا اندر؟ چائے وغیرہ؟“ اس نے ان کی خاطر تواضع کے بارے میں استفسار کیا تھا۔

”جی سر۔ چائے وغیرہ بھجوائی ہے۔“ اس کے نشی نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

”لو کے۔“ نبیھو تم اپنا کام کرو۔“ وہ اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود اندر آگیا تھا۔

”السلام علیکم۔“ اس نے با آواز بلند سلام کیا تھا اور وہ دونوں چونک کر متوجہ ہوئے تھے۔

”وعلیکم السلام اہل گئی فرصت؟“ عبداللہ نے خشکی سے کہا تھا۔

”جی اہل گئی کیوں؟ کیا آپ کو چاہیے؟“ دل آور نے اپنا بریف کیس اور گاڑی کی چابی نبیل کی بائیں سائیڈ پر رکھتے ہوئے کہا۔

”الحمد للہ۔ ہمارے پاس تو آل ریڈی ہے۔“ عبداللہ نے ہاتھ جھاڑے تھے۔

”لیکن افسوس کہ ہمیں کبھی کبھی ملتی ہے بلکہ ڈھونڈنی پڑتی ہے؟“ اس نے اپنے بریف کیس سے اپنا موبائل اور سگریٹ نکالتے ہوئے کہا تھا۔

”اور تم ہمیں کبھی کبھی ملے ہو بلکہ ڈھونڈنا پڑتا ہے۔“ عبداللہ نے طنز کیا تھا۔

”نگن گئی ہو تو بندہ مل بھی جاتا ہے۔“ دل آور نے سگریٹ کی ڈبیا اور لاٹران دونوں کو پیش کیے تھے۔ لیکن عبداللہ نے ہمیشہ کی طرح سگریٹ نکال کر سٹگانے کی بجائے ڈبیا ایک سائیڈ پر رکھ دی تھی۔

”نگن گئی ہو تو ملک حق نواز بھی مل جاتا ہے۔“ عبداللہ نے جان بوجھ کر اس کا ذکر کیا تھا۔

”آف کورس اہل جاتا ہے۔“ دل آور نے کندھے اچکائے تھے۔

”لیکن اگر مل جائے تو آگے کا حل بھی سوچ لیتا چاہیے۔“ عبداللہ کی بات پر دل آور ٹھنکا تھا۔

”کیا مطلب ہے؟ آگے کا حل کیا سوچنا چاہیے تھا۔“ اس نے عبداللہ اور نبیل کے رویرو اپنی چیرہ پر بیٹھ

ساری بات سمجھ لی تھی۔

”یہ صرف دو دھمکیاں نہیں ہیں یا راہان کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ ان سے کسی بھی قسم کی توقع کی جاسکتی ہے۔“

عبداللہ نے وہائی دی تھی۔

تو اس کے لیے کیا کرنا چاہیے مجھے؟ ملک حق نواز کو جیل سے نکال کر اس سے معافی مانگ کر اسے اس کے ڈیرے پہ واپس بھجو کر آنا چاہیے یا پھر مومنہ بی بی کے پاس جا کر سر جھکا کر اس سے معذرت کر لینی چاہیے کہ میں معافی چاہتا ہوں مومنہ بی بی میں آپ کا کیس نہیں لڑ سکتا میں آپ کو انصاف نہیں دلا سکتا میں حق نواز سے ٹکر نہیں لے سکتا کیونکہ وہ خطرناک آدمی ہے اس کے سامنے آنا میرے بس کی بات نہیں۔ اس لیے پلیز آپ کسی اور کی طرف رجوع کریں کوئی اور در کھٹکھٹائیں مجھے تو قتل کی دھمکی ملی ہے اور میں تو ڈر گیا ہوں دل آور نے استہزائیہ سے انداز میں کہتے ہوئے آگے کا نقشہ کھینچا تھا۔

”میرے کہنے کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ تم ایسا کرو؟ تم اگر اپنا پرست اور غیرت مند ہو تو یہ غیرت میں بھی نہیں ہوں کہ تمہیں یہ کہوں کہ مومنہ بی بی کے کیس سے پیچھے ہٹ جاؤ۔“ عبداللہ نے ذرا سخت لہجے کا استعمال کیا تھا۔

”تو پھر کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیا چاہتے ہو تم؟“ دل آور نے سگریٹ کی ڈبیا سے سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبا لیا تھا اور پھر اسے آگ کا شعلہ دکھاتے ہوئے ایک گہرا کش لیا تھا۔

”میں چاہتا ہوں کہ تم احتیاط کرو اور اپنے لیے سیکورٹی کا انتظام کرو گا روڈز رکھو اپنے ساتھ ورنہ نقصان بھی ہو سکتا ہے۔“

عبداللہ حقیقتاً دل آور کے حوالے سے پریشان تھا اور یہ جاننے کے باوجود کہ ڈر اس کی ہڈیوں کو چھو کر بھی نہیں گزرا پھر بھی اسے ڈر جانے والی احتیاطی تدابیر وغیرہ بتا رہا تھا کیونکہ وہ اپنے فکر مند دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔

”کیا نقصان ہو سکتا ہے؟ یہ سیکورٹی یہ گا روڈز یہ پیرے کیا میری موت کو روک لیں گے؟ بچا لیں گے مجھ کو؟ کیا کبھی مرے نہیں دیں گے؟ ہونست غلط فہمی ہے تمہاری موت اور مقدر سے بچنا ناممکن بات ہے یا؟ کیونکہ یہ دونوں انزل سے لکھ دیے گئے ہیں اور جو لکھی جا چکی ہے وہ ٹل نہیں سکتی اگر میری موت ملک خاندان کے ہاتھوں لکھی ہے تو ان ہی کے ہاتھوں ہوگی کسی حادثے میں لکھی ہے تو حادثے سے ہوگی اور اگر رضائے الہی سے لکھی ہے تو ان شاء اللہ رضائے الہی سے ہی ہوگی۔ حالانکہ ہر موت رضائے الہی سے ہی ہوتی ہے۔ لیکن ہر موت میں الہی کی رضا الگ الگ ہوتی ہے اس لیے میری موت کے لیے الہی کی کیا رضا ہے؟ یہ تو الہی ہی جانتا ہے۔ میں اور تم کچھ بھی نہیں کر سکتے اور نہ ہی کوئی سیکورٹی کام آسکتی ہے۔“

دل آور نے اسے ایک معقول اور مضبوط جواب سے نوازا تھا جس پر عبداللہ نے اک نظر اپنے برابر والی چیرہ پر بیٹھے نبیل حیات کو دیکھا تھا جو ان دونوں کی گفتگو کے دوران خاموش بیٹھا سب سن رہا تھا۔

لیکن اللہ نے یہ بھی تو فرمایا ہے تاکہ انسان کو اپنی زندگی اپنی جان کی حفاظت کرنی چاہیے۔ مشکل وقت آجائے تو جان بچانے کے لیے کچھ بھی کیا جاسکتا ہے؟ اب عبداللہ کی بجائے نبیل نے لب کشائی کی تھی۔

”لو کے۔ جب یہ مشکل وقت آئے گا تب میں کچھ بھی کر لوں گا لیکن فی الحال مجھے یہ ایسا کوئی مشکل وقت نہیں آیا کہ میں اپنی ہی ذات پر پیرے لگوادوں اور زندہ ہوتے ہوئے بھی اپنے دائیں بائیں فرشتے کھڑے کر لوں ایسا لوگ کر سکتے ہیں جو موت سے ڈرتے ہیں میں موت سے نہیں ڈرتا۔ میرے تمام دروازے کھلے ہیں۔ جب چاہے آسکتی ہے۔ موسٹ ویلکم بٹ آئی کانٹ ڈوس۔“ اس نے ذرا سے بازو پھیلاتے ہوئے نفی میں سر ہلایا تھا اور لب کی بار نبیل نے اک نظر اپنے برابر والی چیرہ پر بیٹھے ملک عبداللہ کو دیکھا تھا۔

وہ دونوں جو صبح سے اس کے لیے پریشان اور فکر مند ہو رہے تھے۔ اس کی باتیں سن کر خاموش سے ہو گئے تھے۔ اس نے ان کے مزید کچھ کہنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی تھی۔ اس لیے عبد اللہ مزید کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر کے گہری سانس کھینچتا ہوا کرسی پر ٹھیک کراٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”نیل! میرا خیال ہے کہ مجھے اب گھر چلنا چاہیے؟“ عبد اللہ کا لہجہ سخت اور نپا تلا سا ہو رہا تھا۔

”جی جلدی؟“ دل اور اس کے لہجے کو محسوس کر چکا تھا۔

”نگارش کی طبیعت خراب ہے۔ ڈاکٹر نے اس کے لیے میڈیسن لکھ کر دی ہیں۔ وہ لے کر گھر جانا ہے۔ خدا حافظ۔“ عبد اللہ ہنوز اسی لہجے میں کہتے ہوئے پلٹ کر دروازے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

”کیا ہوا ہے نگارش بھابھی کو؟“ دل اور نے فوراً پوچھا تھا، لیکن عبد اللہ رکنا نہیں اور نہ ہی اس نے جواب دیا تھا۔

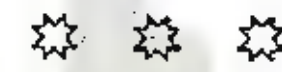
”عبد اللہ! وہ پیچھے سے اسے پکارتا رہ گیا تھا۔ لیکن عبد اللہ سنی ان سنی کرتے ہوئے وہاں سے چلا گیا تھا۔

”دیکھ رہے ہو نیل! اس نے میری بات تک نہیں سنی؟“ دل اور مارے جھنجھلاہٹ کے اپنی چیئر سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”تم نے کون سا سنی ہے؟“ نیل نے کندھے اچکائے تھے۔

”اف نیل! تم بھی؟ پلیز باریتم دونوں میری پوزیشن سمجھنے کی کوشش کرو میں اگر ایسا کروں گا تو ملک حق نواز مجھ پر حاوی ہو جائے گا۔ وہ صاف سمجھے گا کہ میں نے اس کے دُور سے اور اس سے بچاؤ کے لیے یہ حفاظتی اقدامات کیے ہیں، جبکہ میں ایسا نہیں چاہتا۔ زندگی، موت، عزت اور ذلت اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ وہ جب بھی جو بھی دے گا مجھے منظور ہوگا، لیکن یہ سب نہیں۔“

اس نے نفی میں گردن ہلائی تھی اور نیل بھی چپ سا ہو گیا تھا، کیونکہ وہ ان کا کہا ماننے کو تیار نہیں تھا! اور وہ پریشان تھے۔



عبد اللہ وہاں سے سیدھا مارکیٹ آیا تھا۔ میڈیکل اسٹور سے میڈیسن لینے کے بعد اسے یاد آیا کہ زری نے اسے کچھ فروٹ اور جو سزلانے کا بھی کہا تھا، کیونکہ نگارش کو ڈاکٹر نے فی الحال کسی ہیوی غذا سے منع کیا تھا۔ اس لیے اس نے تاکید کر کے بھیجا تھا کہ وہ اس کے لیے کچھ ہلکی ہلکی چیزیں لے کر آئے، کیونکہ فروٹ خالی پڑا ہوا تھا، جب ہی عبد اللہ کو میڈیسن لینے کے بعد ایک بڑی سی فروٹ شاپ کی طرف آنا پڑا تھا۔

اس شاپ سے فروٹ بہت مہنگا ملتا تھا۔ لیکن اس فروٹ کی یہ خاصیت تھی کہ فریش، صحت مند اور صاف فروٹ ہوتا تھا۔ عبد اللہ پہلے بھی ایک بار اس شاپ پہ آچکا تھا۔

تین کلو انار، تین کلو سیب، چار درجن کیلا اور چار درجن کینوس، شاپ کیپر نے چیزوں کی تعداد کا حساب کر کے اس گریس فل سی خاتون کو ان کا بل بتایا تھا جو عبد اللہ سے ذرا آگے کھڑی فروٹ خرید رہی تھیں اور وہ اپنی باری منتظر تھا۔

”یہ پیچھے“ انہوں نے اپنے برس سے پیسے نکال کر شاپ کیپر کو تھمائے تھے اور فروٹ کے چار شاہر بمشکل ہاتھوں میں لے کر وہاں پیسے کے لیے پٹی تھیں۔ لیکن ابھی صرف دو قدم ہی آگے بڑھی تھیں کہ کینوؤں والے شاہر سے جھانکتی ایک سبز نشی سے سیبوں والا شاہر پھٹ گیا تھا اور شاہر میں موجود سارے کے سارے سیب پیچھے

زمین پہ بکھر گئے تھے اور وہ آگے بڑھتے بڑھتے رک گئی تھیں۔

”اوم!“ عبد اللہ کے منہ سے سب سے ساختہ افسوس کا لفظ ادا ہوا تھا، کیونکہ وہ سب سے چاری پہلے ہی اتنے وزنی بیگ اٹھائے ہوئے تھیں اور اس پہ یہ نئی مصیبت۔

”ٹھہرے! میں سمیٹ دیتا ہوں“ عبد اللہ نے انہیں نیچے بیٹھنے سے روک دیا تھا اور جلدی جلدی شاہر کیپر سے نیا شاہر لے کر سارے سیب جن کر شاہر میں ڈالنے لگا تھا۔ لیکن وہ یہ نہیں دیکھ پایا تھا کہ اس کی آواز سن کر آسیہ آفندی کو یوں لگا تھا جیسے وہ بائیس سال پیچھے چلی گئی ہوں اور ان کی سماعتوں میں بالکل ایسی ہی آواز گونجنے لگی ہو۔

”بیچے! سارے اس میں ڈال دیے ہیں۔“ عبد اللہ جو نیچے بیچوں کے بل بیٹھا ہوا تھا سارے سیب شاہر میں ڈالنے کے بعد یکدم اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ لیکن اس خاتون کو یک دم اپنی سمت دیکھتے یا کر ذرا سا ٹھٹھکا گیا تھا۔

”لاٹھے۔ میں آپ کو گاڑی تک چھوڑ آتا ہوں۔“ عبد اللہ نے انہیں متوجہ کرنے کے لیے ان کے ہاتھ سے باقی شاہر بھی تھام لیے تھے اور نہ جانے کیا وجہ تھی کہ آسیہ آفندی نے بھی بغیر کسی تامل کے اسے شاہر تھام لیا تھا اور وہ ان کے ساتھ چل پڑا تھا اور ابھی وہ گاڑی کے قریب آئے ہی تھے کہ گاڑی کے ساتھ کھڑا کسی کا فون سنتا دانیال، آسیہ آفندی کو کسی اور کے ساتھ آتے دیکھ کر فوراً فون بند کر کے ان کی طرف لپکا تھا۔

”دانیال بیٹا! ان سے یہ بیگ پکڑ کر گاڑی میں رکھ لو۔“ آسیہ آفندی نے انتہائی آہستگی سے کہتے ہوئے ایک بار پھر عبد اللہ کے چہرے کو دیکھا تھا، جس کا اک اک نقش ان کے کلیجے کو کھینچ رہا تھا، لیکن اس کھنچاؤ کی وجہ کیا تھی؟ یہ انہیں خود بھی معلوم نہیں ہو رہا تھا۔

”لیکن آئی۔ آپ ٹھیک تو ہیں؟ کیا ہوا ہے آپ کو؟“ دانیال پریشان ہو گیا تھا۔

”ہاں! میں ٹھیک ہوں بیٹا! بس یہ بیگ زیادہ وزنی تھے۔ اس لیے انہوں نے پہلپ کروا دی۔“ آسیہ آفندی نے عبد اللہ کی طرف اشارہ کیا تھا۔

”اف آئی! آپ کم از کم میرے فون سننے کا ہی انتظار کر لیتیں، میں نے کہا بھی تھا کہ میں آپ کے پیچھے ہی آ رہا ہوں۔ بس آذر کی کال تھی اس لیے بات کرنا پڑ گئی۔“ دانیال خفگی سے کہتا عبد اللہ کے ہاتھ سے بیگ لے کر گاڑی میں رکھ چکا تھا اور دوبارہ اس کی طرف پلٹا تھا۔

”ٹھیک پوسٹ آپ نے اتنی پہلپ کی۔“ اس نے عبد اللہ سے ہاتھ ملاتے ہوئے شکر یہ ادا کیا تھا۔

”اوس اوکے! تھینکس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ آپ کی آئی ہیں تو میری بھی آئی ہیں۔“ عبد اللہ نے کافی خلوص سے جواب نبھائے تھے اور آسیہ آفندی نے بے ساختہ چونک کر دیکھا تھا، حالانکہ اس نے تو محض مجاورت اور اخلاقاً کہا تھا، لیکن ان کے تو سیدھا دل پہ اثر ہوا تھا۔

”اوہ شیور! تھینکس! لیکن سر۔“ دانیال نے خوشدلی سے کہتے ہوئے کندھے اچکائے تھے۔

”اوکے! یو ویلکم۔“ عبد اللہ نے ذرا سا مسکراتے ہوئے سر ہلایا تھا اور وہ قدم پیچھے ہٹ کے کھڑا ہو گیا تھا، کیونکہ آسیہ آفندی نے گاڑی میں بیٹھنا تھا اور اس کے پیچھے بیٹھ ہی دانیال نے ان کے لیے فرنٹ ڈور کھول دیا تھا۔ وہ خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گئی تھیں، لیکن گاڑی میں بیٹھنے کے بعد بھی انہوں نے عبد اللہ کی طرف دیکھا تھا اور عبد اللہ اب بھی ان کے دیکھنے سے چونک گیا تھا اور اب کی بار شیشے کے پار نظر آتی شکل و صورت اور کچھ کھوجتی ہوئی اداس آنکھیں عبد اللہ کو بھی ٹھٹھکا گئی تھیں۔ وہ یکدم الجھ گیا تھا۔

اور اتنے میں دانیال اسے ہاتھ ہلاتے ہوئے گاڑی نکال لے گیا تھا، مگر عبد اللہ اپنے دماغ پہ زور ڈالتے ہوئے الجھتا ہوا سارہ گیا تھا۔

آئی؟ دانیال؟

”تو میں کال بند کر دیتی ہوں“ آپ آرام سے ڈرائیو کر لیں میں بعد میں کال کر لوں گی۔“ زری نے کال بند کرنا چاہی تھی۔

”ارے! نہیں! نہیں! کال بند کرنے کی ضرورت نہیں ہے“ آپ بات کریں میں سن رہا ہوں۔“ نیل نے فوراً اسے روکا تھا۔

”تھینک یو۔! لیکن آپ جا کہاں رہے ہیں۔؟“ وہ بات شروع کرنے سے پہلے تمہید کا سہارا لے رہی تھی۔

”اپنے آفس۔! شروم۔“ اس نے ٹارنٹل سے انداز میں بتایا تھا۔

”لیکن اس وقت۔؟“ زری نے جان بوجھ کر حیرانی ظاہر کی تھی۔

”جی۔! وہ دراصل کسی کام کے سلسلے میں دل آدر کے آفس جانا پڑ گیا تھا“ ابھی وہیں سے واپس آ رہا ہوں۔“

”زیادہ ضروری کام تھا۔؟“ زری کرید رہی تھی۔

”ہاں۔! کہہ سکتی ہیں۔“ نیل نے کندھے اچکائے تھے۔

”کیا جان سکتی ہوں کہ کیا کام تھا۔؟“

”کیوں خیریت۔؟ آپ کیوں پوچھ رہی ہیں۔؟“ نیل نے دلچسپی سے پوچھا تھا۔

”وہ دراصل صبح عبد اللہ بھائی آپ کو کوئی بات ڈسکس کرنے کے لیے دل آدر شاہ کے آفس میں بلا رہے تھے اس لیے مجھے تب سے پریشانی ہو رہی تھی کہ نجانے ایسی کون سی بات ہے جسے ڈسکس کرنے کے لیے وہ آپ کو وہاں بلا رہے ہیں۔؟“ زری نے اپنی پریشانی کہہ ہی ڈالی تھی اور نیل اس کی پریشانی سن کر بے ساختہ مسکرا دیا تھا۔

”اُدھ! تو یہ بات ہے۔ اس پریشانی نے آپ کو فون کرنے پہ مجبور کیا ہے۔؟“ نیل نے سمجھنے والے انداز میں سر ہلایا تھا۔

”جی۔! میں واقعی بہت پریشان تھی بلکہ اب بھی ہوں کیا بات تھی۔؟ کیا وجہ تھی آخر۔؟“ اس کا لہجہ اب بھی متفکر سا تھا۔

”ارے۔! آپ پریشان نہ ہوں“ آپ کے پریشان ہونے والی کوئی بات نہیں تھی بس وہ دل آدر کا ایک مسئلہ تھا اس پہ بات کرنا تھی۔“ نیل نے لا پرواہی سے کہا تھا لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ جس مسئلے کو وہ اتنی بلا پرواہی سے لے رہا تھا وہی مسئلہ زری کی پریشانی اور فکر مندی کا اصل مرکز تھا۔ اور اس کے لیے تو وہ ہلکان ہو رہی تھی۔

”کیسا مسئلہ۔؟“ زری کو پھر پوچھنا پڑا تھا۔

”ملک حق نواز کا مسئلہ تھا وہ نیل میں ہے“ اس لیے ملک اسد اللہ آپ کے بڑے بھائی صاحب کی کال عبد اللہ کو موصول ہوئی تھی وہ دل آدر کو۔ وہ ہم کیوں سے نواز رہے تھے اور عبد اللہ نے یہی بات ڈسکس کرنے کے لیے مجھے بھی دل آدر کے آفس بلایا تھا“ لیکن وہ ماں کا شیرایا ہے کہ کچھ سننے کو ہی تیار نہیں ہو رہا تھا“ کہتا ہے‘ ہونے دو جو ہوتا ہے دیکھی جائے گی۔ اس لیے ہم دونوں بھی اٹھ کر واپس آ گئے ہیں۔ ہم نے بھی کہا۔ دیکھی جائے گی۔“ نیل کے جا رہا تھا اور زری چکرا کے رہ گئی تھی۔

”ملک اسد اللہ کی کال آورو ہم کی کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ نظر انداز کر دی جاتی یہ تو زری جانتی تھی یا عبد اللہ جانتا تھا کہ وہ محض ڈرانے کے لیے دھمکیاں نہیں دیتے بلکہ کوئی باز نہ آئے تو عمل بھی کرتے ہیں“ لیکن دل آدر کو یہ بات کون سمجھتا۔؟

”ہیلو۔! زری۔! ہیلو۔! نیل ایک دم خاموشی چھا جائے بار بار اسے پکار رہا تھا۔

”ایم سوری۔! میرا خیال ہے کہ عبد اللہ بھائی آگئے ہیں میں کال بند کرتی ہوں اس وقت“ آپ سے پھر بات

وانیال؟ آئی؟

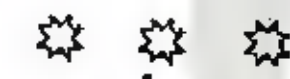
آئی۔ آئی۔ آئی! آئیہ پھوپھو؟

عبد اللہ کے ذہن میں ان دونوں کی تکرار ہو رہی تھی اور یہ تکرار ایک نام پہ آکر انگ گئی تھی اور اسے جیسے کرنٹ چھو گیا تھا۔ وانیال اور آئیہ پھوپھو۔؟ یہ۔؟ وہ دونوں تھے؟ عبد اللہ نے خود کھائی کے سے انداز میں کہا تھا اور پھر بے ساختہ گاڑی کے پیچھے بھاگا تھا۔

”وانیال۔ وانیال۔ رکو پلین۔ گاڑی روکو۔“ لیکن اب اس کے پکارنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ گاڑی آنکھوں سے اوچھل ہو چکی تھی۔ بہت دور جا چکے تھے وہ لوگ اور عبد اللہ تاسف سے ہاتھ ملتا رہ گیا تھا۔

تو کیا اتنے سالوں بعد آئی بھی اسے بار بار دیکھ کر پہچاننے کی کوشش کر رہی تھیں اور اتنی دیر میں عبد اللہ نے بھی انہیں نہیں پہچانا تھا۔

بہت بڑی گویا ہو گئی تھی اس سے وہ اپنے سگے خون کے رشتوں کو اپنے ہاتھوں سے گنوا بیٹھا تھا۔



مان لے اب بھی میری جان ادا‘ درد نہ جن کام آئی نہیں‘ پھر کوئی دعا‘ درد نہ جن میں تیرے لمس سے محروم نہ رہ جاؤں کہیں

آخری بار مجھے خود سے لگا‘ درد نہ جن کچھ نہ دے گا یہ مسائل سے اچھٹے رہنا

چھوڑ سب کچھ میری بانہوں میں سنا‘ درد نہ جن

نیل اپنے موبائل پہ بجھنے والی زری کی کال دیکھ کر اپنے دل کو سنبھالنے میں لگ گیا تھا وہ اسے کال کر رہی تھی۔ اور اس کے لیے تو یہ احساس ہی ہر احساس پہ بھاری تھا کہ وہ اس کے نمبر سے اسے کال کر رہی ہے اور اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اس احساس اور اس خوشی کے مارے وہ اپنے ہی موبائل کو سینے سے لگا لے اور وہ سینے سے لگا دھڑکتا رہے اور وہ اسے محسوس کرتا رہے۔ مگر یہ ممکن کب تھا بھلا۔؟ وہ تو اسے اس کی اجازت کے بغیر نظر اٹھا کر دیکھنے کی بھی گستاخی نہیں کر سکتا تھا‘ سینے سے لگانے کی بات تو قیامت کی بات تھی۔ اور ایسا تصور بھی حشر کا تصور تھا۔

اور حشر کے اس تصور میں اس کے دل پہ حقیقتاً‘ ایک قیامت گزر گئی تھی کیونکہ کال بجتے بجتے بند ہو گئی تھی۔

”وہ شش۔! نیل نے بے اختیار اسٹیرنگ پہ مکا دے مارا تھا حالانکہ غلطی اس کی اپنی ہی تھی کیونکہ اس کے موبائل پہ زری کی کال کافی دیر سے بج رہی تھی اور وہ ایک ہاتھ سے ڈرائیو کرتا دوسرے ہاتھ میں موبائل پکڑے اسکرین پہ نظر آتے زری کے نام کو ہی دیکھے جا رہا تھا اور اس دیکھنے دیکھنے میں ہی کال مسئلہ کالز میں شامل ہو گئی تھی اور وہ کف افسوس ملتا رہ گیا تھا۔ لیکن یہ افسوس زیادہ دیر افسوس نہیں رہا تھا بلکہ ذرا دیر بعد پھر سرشاری میں بدل گیا تھا اس کی کال دوبارہ آگئی تھی۔

”ہیلو۔؟“ نیل نے فوراً کال ریسیو کر لی تھی اور گاڑی کی اسپید کو بھی کم کر دیا تھا۔

”السلام علیکم۔! میں زری بات کر رہی ہوں۔“ اس کی آواز بے حد میٹھی تھی۔

”و علیکم السلام۔! جی میں آپ کا نمبر دیکھ چکا ہوں۔“ نیل کا لہجہ اس سے بھی زیادہ نرم ہو چکا تھا۔

”مجھے لگتا ہے کہ آپ ڈرائیو کر رہے ہیں۔؟“ زری نے گاڑی کی آواز محسوس کر لی تھی۔

”جی۔! آپ کو لگ رہا ہے تو صحیح ہی لگ رہا ہو گا میں واقعی ہی ڈرائیو کر رہا ہوں۔“ وہ ذرا سا مسکرایا تھا۔

ہوگی۔“
زری نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا تھا، لیکن نیل کے لیے اتنا بھی کافی تھا کہ اس نے زری کی آواز سن لی تھی اور وہ خوش ہو گیا تھا۔

اور ٹھیک تین روز بعد شہرار کی مدد سے وہ عدیل عمر کی ضمانت کے کاغذات تیار کروا کر پولیس اسٹیشن پہنچ گیا تھا۔ اور اسے دیکھتے ہی ایس ایچ او جمال احمد اپنی سیٹ سے کھڑے ہو گئے تھے وہ ذرا کم کم ہی پولیس اسٹیشن کے چکر لگاتا تھا اس لیے اسے دیکھ کر ہی ایس ایچ او جمال احمد احراما کھڑے ہو جاتے تھے۔
”السلام علیکم شاہ صاحب! آج کیسے رونق بخش دی اس ستم خانے کو؟“ ایس ایچ او جمال احمد نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا تھا۔

”ہمارے ایک عزیز قید کاٹ رہے ہیں آپ کے اس ستم خانے کی۔ سوچا ہمارے چند کاغذوں کے عوض آپ اگر اس کی جان بخشتے ہیں تو ایسے ہی سہی۔ ہمارا کیا جائے گا۔؟ بس چند کاغذ۔ اور ایک بے گناہ آزاد ہو جائے گا۔“

دل آور نے ایس ایچ او جمال احمد کی پیش کی ہوئی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کندھے اچکائے تھے۔
”چند بے گناہ تو آپ نے بھی قید کر رکھے ہیں شاہ جی۔ ابھی ان کو آزاد کرنے کے بارے میں تو نہیں سوچا آپ نے؟“

اپنے عقب سے ابھرنے والی انسپکٹر شہناز کی آواز پر دل آور نے سبے ساختہ چونک کر دیکھا تھا کیونکہ انسپکٹر شہناز کی بات پر اس کا پہلا خیال ہی علیحدہ کی طرف گیا تھا کیونکہ اس کے پاس تو صرف وہی قید تھی۔!
”مثلاً؟“ دل آور انسپکٹر شہناز کو دیکھ کر احراما اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”مثال آپ کے سامنے کھڑی ہے شاہ جی۔!“ انسپکٹر شہناز اس کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی اور ایس ایچ او جمال احمد مسکرا رہے تھے۔

”آپ کو شاید بتا نہیں ہے انسپکٹر صاحب۔! کہ میرا ایک اصول ہے میں کسی کو قید نہیں کرتا، بلکہ آزاد چھوڑ دیتا ہوں، البتہ یہ اور بات ہے کہ لوگ پھر بھی خود کو قید میں ہی سمجھتے ہیں۔“ اس نے انسپکٹر شہناز کو ذرا مبہم سا جواب دیا تھا۔

”جانے دیجیے میڈم۔! کن سے بات کر رہی ہیں بھلا۔؟ میرا صاحب ہیں آخر۔؟“ ایس ایچ او جمال احمد نے مسکرا کر سر جھٹکا تھا۔

”یہ اگر میرا صاحب ہیں تو ہم بھی اس وقت فل یونیفارم میں ہیں ایس ایچ او صاحب۔! کیا خیال ہے آپ کا۔؟“ انسپکٹر شہناز نے ایس ایچ او جمال احمد کی سمت دلچسپی سے دیکھا تھا۔

”ہمارے خیال تو ہمیشہ ہی اچھے ہوتے ہیں میڈم۔“ ایس ایچ او جمال احمد ان لوگوں کی نوک جھوک پہن رہے تھے۔

”ذرا سوچیے شاہ جی۔! اگر ہم آپ کو اٹھا کر حوالات میں بند کر دیں تو آپ کی ضمانت کرانے کے لیے کون آئے گا۔؟“ انسپکٹر شہناز کے سوال پر دل آور شاہ یکدم فلک شکاف قہقہہ لگا کے ہنسا تھا کیونکہ اس کا سوال ہی اتنا دلچسپ سا تھا۔

”بابا!۔! میری ضمانت کرانے کے لیے پورا شہر آئے گا میڈم۔ پورا شہر۔!“ وہ ابھی تک ہنس رہا تھا۔

”مطلب۔؟“ انسپکٹر شہناز اس کی استہزائی سی ہنسی پر سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔
”مطلب کہ پورا شہر میرا دشمن ہے، کوئی بھی مجھے دیکھنا نہیں چاہتا، اس لیے میری ضمانت کرانے کے لیے کوئی بھی نہیں آئے گا کیونکہ ویسے بھی کہا جاتا ہے کہ جو انسان سب کا ساتھ دیتا ہے، وہی اکیلا رہ جاتا ہے، اس لیے مجھے ایسا کوئی بھروسہ نہیں ہے کہ کوئی آئے گا۔“ دل آور کا لہجہ نجابانہ کیوں اچانک ہی سنجیدہ ہو گیا تھا۔
”لیکن مجھے یقین ہے کہ پورا شہر ہی آئے گا۔ پورا شہر آپ کا دشمن ہے تو پورا شہر آپ کا دوست بھی ہے شاہ جی۔! ابھی اپنے آپ کو حوالات میں بند کر کے تو دیکھیں۔؟“ انسپکٹر شہناز نے خاصے دل سے کہا تھا کیونکہ اسے واقعی یقین تھا۔

”فی الحال تو میں کسی کو چھڑوانے کے لیے یہاں آیا ہوں، آپ یہ پیپر چیک کر لیں۔“ اس نے بات بدل دی تھی۔ اور پھر ضروری کارروائی کے بعد عدیل عمر کو آزاد کر دیا گیا تھا جو شہرار کو دیکھنے اور ملنے کے بعد دل آور شاہ کو حیرت زدہ سا دیکھ رہا تھا۔

”کیسے ہو بہادر۔؟“ دل آور نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے ذرا ایشاشت سے پوچھا تھا۔
”ٹھیک ہوں۔! مگر آپ۔؟“ عدیل کچھ کہہ نہیں پایا تھا اور شہرار عدیل کی کیفیت سمجھتے ہوئے مسکرا دیا تھا۔
”ارے یار۔! باقی کے سوال بعد میں۔ فی الحال یہاں سے تو نکلے۔؟“ دل آور نے اس کے کندھے کو تھپکتے ہوئے باہر نکلنے کا اشارہ کیا تھا اور خود ایس ایچ او جمال احمد اور انسپکٹر شہناز کی طرف پلٹا تھا۔

”اوکے ایس ایچ او صاحب۔! بہت بہت شکریہ آپ کا۔ اب اجازت دیجیے۔ اللہ حافظ۔“ وہ ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا تھا اور خدا حافظ کہہ کر وہاں سے نکل آیا تھا البتہ انسپکٹر شہناز اسے چھوڑنے کے لیے گاڑی تک آئی تھی۔

”تھینک یو انسپکٹر صاحب۔! اتنے پروٹوکول کے لیے بہت شکریہ۔“ دل آور نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے پلٹ کر اسے دیکھا تھا عدیل اور شہرار بھی انہیں ہی دیکھ رہے تھے۔

”شرمندہ کر رہے ہیں نہیں۔؟“ انسپکٹر شہناز سنجیدگی سے پوچھ رہی تھی۔
”میری اتنی مجال کہاں کہ آپ کو شرمندہ کروں۔؟“ اس نے عاجزی کا مظاہرہ کیا تھا۔
”ایک اور شرمندہ کرنے والی بات۔“ انسپکٹر شہناز نے خفگی سے سر جھٹکا تھا۔

”اوکے! نہیں کرتا شرمندہ کرنے والی بات۔ اب خوش۔؟“ اس نے ہتھیار ڈال دیے تھے اور انسپکٹر شہناز مسکرا دی تھی۔

”اللہ حافظ۔!“ وہ بھی مسکراتے ہوئے کہہ کر گاڑی میں سوار ہو گیا اور عدیل کے لیے فرنٹ ڈور اور شہرار کے لیے بیک ڈور کھول دیے تھے اور ان کے بیٹھتے ہی گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی لیکن گاڑی کو بیک کرتے کرتے ایک بار پھر انسپکٹر شہناز کے قریب رک گیا تھا اور گاڑی کا شیشہ فولڈ کرتے ہوئے اس سے مخاطب ہوا تھا۔

”چند بے گناہ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ہمیشہ ہماری قید میں رہیں تو ہی اچھا لگتا ہے اور انسان کبھی بھی انہیں آزاد چھوڑنے کے بارے میں نہیں سوچتا۔ اور یہ بے گناہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن سے ہم محبت کرتے ہیں یا پھر وہ لوگ جو ہم سے محبت کرتے ہیں۔ اور ایسے لوگوں کو ہم ہمیشہ قید میں ہی دیکھنا چاہتے ہیں۔“ دل آور کی بات انسپکٹر شہناز کے ساتھ ساتھ عدیل اور شہرار کے بھی دل کو لگی تھی انسپکٹر شہناز وہ قدم اور قریب آئی تھی۔

”مثلاً۔؟“ اس نے دل آور کے سے انداز میں کہا تھا۔
”مثال میرے سامنے ہی تو کھڑی ہے انسپکٹر صاحب۔؟“ وہ دلچسپی سے کہہ کر انسپکٹر شہناز کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہراتے ہوئے گاڑی نکال لے گیا تھا اور وہ اپنی جگہ پہ جھنجھلا کے رہ گئی تھی جبکہ دل آور گاڑی روڈ پہ

”ارے چھوڑو یا۔۔۔ کوئی انسان بھی فرشتہ نہیں ہو سکتا اور کوئی فرشتہ کبھی انسان نہیں ہو سکتا“ کیونکہ فرشتے کے لیے انسان بننا مشکل ہے اور انسان کے لیے فرشتہ بننا اس لیے جو جیسا ہے اسے ویسا ہی رہنے دے۔۔۔ دل اور نے سر جھٹکا تھا۔

”مجھے اب کیا کرنا ہو گا۔۔۔؟“ عدیل نے اسے وہیں کھڑے دیکھ کر پوچھا تھا۔
”تمہیں اب کچھ نہیں کرنا“ تم اس وقت بس اپنے گھر جاؤ اور اپنے گھر والوں سے ملو اپنے ماں باپ سے اپنی بہنوں سے اور اپنے دوستوں سے اس کے بعد فریش ہونے کے لیے ریٹ کر دو اور کل صبح فل تیار سے آکر اپنی سیٹ جوائن کرو کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ باقی اسٹاف پہ تمہارا اچھا امپریشن پڑے اس لیے اس وقت اس جیلے میں تمہیں متعارف کرانا مناسب نہیں ہو گا کیونکہ اس طرح اچھا امپریشن نہیں پڑے گا۔۔۔“ عدیل اتنے دنوں سے جیل میں تھا اس کے کپڑے خاصے ملگجے اور شکن آلود ہو رہے تھے چہرے پہ سیاہ رواں بھی عجیب سا حلیہ پیش کر رہا تھا سول اور کامشورہ سو فیصد درست اور مفید مشورہ تھا عدیل نے فوراً اثبات میں سر ہلادیا تھا۔

”اوکے سر۔۔۔! جیسے آپ کی مرضی۔۔۔“ اس نے دل اور سے ہاتھ ملاتے ہوئے تابعداری سے کہا تھا۔
”ٹھیک ہے۔۔۔! میرا مقصد اس وقت تمہیں شوروم دکھانا تھا تم اب گھر جاسکتے ہو تم سے کل ملاقات ہوگی۔۔۔“ دل اور اس کا ہاتھ تھک کر پلٹ گیا تھا لیکن دو قدم آگے بڑھنے کے بعد پھر ان کی سمت پلٹا تھا۔

”اور سنو۔۔۔! یہ جو تمہارا دوست ہے نا۔۔۔ شہیار۔۔۔ یہی تمہارا اصل دوست ہے۔ سچا گھر اور مخلص۔۔۔ اس کا ساتھ کبھی مت چھوڑنا ورنہ زندگی کی جیل میں اکیلے رہ جاؤ گے اور کوئی بیل بھی نہیں کرائے گا۔“ دل اور نے شہیار کی سمت اشارہ کرتے ہوئے عدیل کو تاکید کی تھی اور وہاں سے چلا گیا تھا جبکہ عدیل نے اس کا مفہوم سمجھتے ہوئے شہیار کو گلے سے لگایا تھا کیونکہ شہیار نے واقعی اس کا دوست ہونے کا حق ادا کر دیا تھا جس کی گواہی دل اور شاہ نے بھی دے دی تھی۔! ☆ ☆ ☆

پندرہ جنوری۔! اپنے لیب ٹاپ پہ پندرہ جنوری کی ڈیٹ دیکھ کر نجائے کیوں آذر کے ہاتھ وہیں کے وہیں رک گئے تھے اور اس کا دل جیسے کسی آتھ گھرائی میں ڈوب کے ابھرا تھا۔ ایک گہرا غوطہ آیا تھا اور آذر کو یوں لگا کہ دم نکل گیا ہو۔
”دماغ؟“

اف۔۔۔! علیٰ زے کو دیکھے ہوئے دو ماہ گزر گئے۔۔۔؟“ آذر کے دل و جان پہ یہ خیال قیامت کی طرح گزرا تھا اور روح یہ ایک لرزش چھوڑ گیا تھا۔۔۔ کہاں تو اس کے بغیر دپل نہیں گزرتے تھے اور کہاں وہ مینے گزر گئے تھے کہ اس

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

☆ تئلیاں، پھول اور خوشبو	راحت جبین	قیمت: 225 روپے
☆ بھول بھلیاں تیری گلیاں	فائزہ افتخار	قیمت: 500 روپے
☆ محبت بیاں نہیں	لبنی جدون	قیمت: 250 روپے

شائع ہوئے ہیں

فخریہ صورت سروق
فخریہ صورت جمالی
مضبوط جلد
آؤٹ لیٹر

مکتبہ کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

ڈالتے ہوئے بھی مسکرا رہا تھا۔
”ہیلو! کیا دیکھ رہے ہو۔۔۔؟ دل اور شاہ یا منصور حسین۔۔۔؟“ اس نے کم سم سے بیٹھے عدیل کو مخاطب کیا تھا۔

”منصور حسین۔۔۔“ عدیل کا لہجہ عجیب سا ہو رہا تھا۔
”منصور حسین میرے ایک کپس کا حصہ تھا کپس ختم ہوا تو وہ بھی ختم ہو گیا۔۔۔“ اس نے بے نیازی سے جواب دیا تھا۔

”لیکن وہ۔۔۔ وقار آندری کی بیٹی کا ڈرائیو۔۔۔ وہ گاڑی۔۔۔ وہ حلیہ۔۔۔ وہ سب۔۔۔؟“ عدیل بے ربط سا ہونے لگا تھا اسے رفتہ رفتہ سب یاد آ رہا تھا۔

”وہ سب بھی اسی کپس کا حصہ تھا۔۔۔ بھول جاؤ اسے۔۔۔ اور یہ یاد رکھو کہ تمہارے سامنے اب کون ہے۔۔۔؟“
دل اور نے رائٹ سائیڈ پہ ٹرن لیتے ہوئے خاصے دو ٹوک لہجے میں کہا تھا جس کا مطلب تھا کہ وہ اس منصور حسین والے قصے کو دہرائنا نہیں چاہتا تھا اسی لیے عدیل جب کاچپ رہ گیا تھا۔

”جواب کرو گے۔۔۔؟“ دل اور نے چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد خود ہی سوال کیا تھا اور وہ دونوں چونک گئے تھے۔
”جواب۔۔۔؟“ عدیل حیرت اور بے یقینی سے گنگ ہو گیا تھا۔

”ہاں۔۔۔! میں نے جب تمہیں ورکشاپ میں دیکھا تھا تو تب بھی تمہاری جاب کے بارے میں سوچا تھا لیکن تب میں فارغ نہیں تھا اس لیے سوچا تھا کہ فارغ ہو کر تمہیں جاب کی آفر دیوں گا، لیکن بعد میں بھی اتنی مصروفیت رہی کہ پھر خیال ہی نہیں آیا۔۔۔! اپنی اسے تمہارا میرے لیے جاب کرو گے یا کہیں اور ارادہ ہے۔۔۔؟“ وہ ڈرائیونگ میں مصروف عدیل کی سمت دیکھے بغیر پوچھ رہا تھا اور عدیل کے پاس تو جیسے کچھ کہنے کے لیے الفاظ ہی نہیں تھے وہ اللہ کی اس قدر مہربانی اور نوازش پہ کچھ بول ہی نہیں پا رہا تھا۔

”دیکھو۔۔۔! یہ مت سمجھنا کہ میں نے تمہاری ضمانت کرا لی ہے، تمہارے لیے کچھ بھاگ دوڑ کی ہے تو بدلے میں تمہارے ساتھ کوئی ڈل کر رہا ہوں یا پھر اس میں میرا کوئی مفاد شامل ہے۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔! ایسا سوچنا بھی مت۔۔۔ میں جب کسی کی مدد کا ذمہ اٹھاتا ہوں تو اپنا نفع نقصان اور پنا منافع نہیں دیکھتا ہاں یہ ضرور سوچتا ہوں کہ کسی دوسرے کا فائدہ ہو جائے۔ اس لیے تم پوری طرح سے آزاد ہو، خود فیصلہ کر سکتے ہو کہ تم نے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں۔۔۔؟ میرے پاس منیجر کی جاب ہے، کرنا چاہو تو کر سکتے ہو۔ نہ کرنا چاہو تو زبردستی نہیں۔۔۔“ دل اور نے کہتے ہوئے گاڑی شوروم کی پارکنگ میں پارک کر دی تھی۔

”منیجر کی جاب۔۔۔؟“ عدیل نے زیر لب دہرایا تھا اور دل اور کا رونا کھول کے نیچے اتر آیا تھا اور اس کے پیچھے وہ دونوں بھی اتر آئے تھے۔

”ہاں۔۔۔! منیجر کی جاب۔۔۔ اس شوروم میں۔۔۔“ اس نے کافی سکون سے شوروم کی شاندار سی عمارت کی طرف اشارہ کیا تھا۔

”اس شوروم میں۔۔۔؟“ شہیار نے کافی اشتیاق سے کہا تھا۔
”ہاں۔۔۔! اس شوروم میں۔۔۔“ اس نے اثبات میں سر ہلادیا تھا۔

”تھینک یو سر۔۔۔! تھینک یو پوری مج۔۔۔“ عدیل کا لہجہ بے حد ممنون ہو رہا تھا اس کی آنکھیں اس کا لہجہ بھیگ گیا تھا اسے تو جیسے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی تھی اللہ نے اسے ایک مشکل، ایک آزمائش میں ڈالنے کے بعد اسے اس کے صبر کا صلہ بھی دے دیا تھا اتنا اچھا صلہ کہ وہ اللہ کے حضور جتنے بھی شکر ادا کرتا وہ کم تھے۔
”آپ۔۔۔ آپ۔۔۔ تو واقعی میرے لیے فرشتہ ثابت ہوئے ہیں سر۔۔۔“ عدیل حد سے زیادہ شکر گزار ہو رہا تھا۔

کی آواز تک نہیں سنی تھی۔
 ”تو کیا اب وہ عمر بھر نہیں ملے گی؟ تو کیا اب عمر بھر نئی تمام کرنی پڑے گی۔؟ بے کار، بے معنی اور خالی۔؟“
 آؤ سوچتے سوچتے مضطرب سا ہو گیا تھا۔
 ”وہ وہ دل سے لگا کر رکھنے والی صورت کبھی نظر نہیں آئے گی نہ؟ کبھی لباس نہیں بیٹھے گی۔؟ کبھی بات نہیں کرے گی۔؟ تو اس کا مطلب ہے کہ دل کو کبھی قرار نہیں آئے گا۔؟“ وہ پونہمی اضطراب کے عالم میں لیب ٹاپ وہیں بیڈ پر چھوڑ کے بیڈ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور اتنی شدید سردی کے باوجود کھڑکی کے شیشے کھول دیے تھے باہر پور آواٹھلکن بارش میں بھیگا ہوا تھا، لیکن زندگی پھر بھی سرکوں پہ رواں دواں تھی اور سفر جاری تھا۔
 یہاں نہ کوئی آؤر تھا اور نہ کوئی علیزے تھی۔ نہ کسی سے پھٹرنے کا غم تھا اور نہ کسی سے ملنے کی خوشی تھی۔!

یہاں تو بس انسان تھے اور ان کی ضرورتیں تھیں۔ اس سے آگے اس سے بڑھ کے تو کچھ تھا ہی نہیں۔
 وہ کس دیس آگیا تھا۔؟ وہ کیوں آگیا تھا۔؟ صرف علیزے کا غم چھپانے کے لیے یا بے حسوں کے شرمیں خود کو بے حس کرنے کے لیے۔؟ لیکن یہ بھی تو نہیں ہو رہا تھا۔؟ نہ غم چھپ رہا تھا نہ وہ بے حس ہو رہا تھا۔ بلکہ وہ تو کچھ اور زیادہ شدتوں سے یاد آنے لگی تھی
 ”آؤ۔! زندگی اس طرح نہیں گزرے گی۔ کب تک بھاگو گے۔ اور کب تک منہ چھپاؤ گے۔؟ مرنے والے۔؟ یہاں سب کو تمہاری ضرورت ہے۔ ڈیڈ کو علیزے نے نہیں تم نے اکیلا کر دیا ہے۔ ان کو تمہارے سہارے کی ضرورت ہے۔ آئی بھی کمزور ہو گئی ہیں۔ سو بڑھی لگنے لگی ہیں۔ عین اور عید اپنے پیڑروم کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ پورے گھر کا شیرازہ بکھر گیا ہے یا۔۔۔ سنبھالو آخر ڈیڈ کے بعد اس گھر کے کتنا دھرم ہو گا۔ ڈیڈ کو بہت مان تھا تم پہ بہت بھروسہ تھا تمہاری ذات پر۔ پلیز تم تو ایسا مت کرو۔ واپس آ جاؤ یا۔۔۔ واپس آ جاؤ۔“ فون کے ایئر پیس سے ابھرنے والی دانیال کی آواز ابھی تک اس کے کانوں میں گونج رہی تھی اور اس کے رخسار بھیگ رہے تھے ”آؤرنے چونک کر اپنے رخساروں کی نمی کو ہاتھ سے محسوس کیا تھا یعنی وہ رو رہا تھا
 ”کس کے لیے۔؟ ڈیڈ کے لیے۔؟ آئی کے لیے۔؟ عین اور عید کے لیے۔؟ یا پھر۔ یا پھر علیزے کے لیے۔؟“

اس نے خود سے سوال کیا تھا اور اپنے اندر سے اس سوال کا جواب موصول ہوتے ہی اس نے اپنا چہرہ پونچھ کر سر جھٹک ڈالا تھا۔
 ”نہیں۔۔۔ اب اور نہیں۔ اب اسے یاد نہیں کرنا۔ نہیں کرنا۔ نہیں کرنا۔ کبھی نہیں کرنا۔“ وہ پر عزم اور مضبوط لہجے میں کہتے ہوئے نفی میں سر ہلاتا ہوا کھڑکی کے شیشے بند کر کے پلٹا اور لائٹ کوٹ اور شوپن کر اپنے ضروری ڈاکو منٹس لے کر ہوٹل کے روم سے باہر نکل آیا تھا اس نے آج ہی پاکستان جانے کے لیے فلٹ کنفرم کروانا تھا کیونکہ وہ اب اور یہاں نہیں رہنا چاہتا تھا۔!

”سنو گل۔“ اس نے کھانے کی ٹرے لے کر ہسٹنٹ کی طرف جاتی گل کو آواز دی تھی۔
 ”یہ کیا ہے؟ کہاں جا رہی ہو۔؟“ وہ ڈرائنگ روم میں بیوی دیکھ رہا تھا جب اس کی اچانک گل پہ نظر پڑی تھی۔
 ”جی صاحبہ۔! یہ کھانا ہے۔ علیزے بی بی کے لیے لے کر جا رہی ہوں۔“ گل نے آہستگی سے جواب دیا

تھا۔

”ہوں۔! علیزے بی بی کے لیے کھانا۔؟“ اس نے ”سیکنڈ کے لیے سوچا پھر ریوٹ صوفے پہ اچھال کر صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔
 ”لاؤ۔! آج تمہاری علیزے بی بی کے لیے کھانا میں لے کر جاتا ہوں۔“ اس نے قریب آکر گل کے ہاتھوں سے ٹرے تھام لی تھی اور گل بے چارنی سر ہلا کر پیچھے ہٹ گئی تھی وہ بھلا کیا کہہ سکتی تھی۔؟
 ”تم اپنا کوئی اور کام بنالو۔“ وہ گل سے کہہ کر وہاں سے ہٹ گیا تھا اس کا رخ ہسٹنٹ کی طرف تھا، پیڑھیوں کے پیچھے بنے دروازے میں کوئی تالا تھا نہ زنجیر۔ بس جو کچھ بھی تھا علیزے کے قدموں سے لپٹا ہوا تھا، تالا بھی اور زنجیر بھی۔ جو اسے کہیں بھی بھاگنے نہیں دے رہے تھے اور وہ ہسٹنٹ کی دیوار سے لگ کر بیٹھی دیوار ہو گئی تھی اور وہ ٹرے اٹھائے پیڑھیاں اتر آیا تھا۔

اب میری ناک میں رہتے ہیں کہ قاف کے جن میں پرستان کی ملکہ اٹھا لایا ہوں۔!
 اس نے پیڑھیاں اتر کر فرش پہ بیٹھی علیزے کی سمت بڑھتے ہوئے بڑے دلکش موڈ سے یہ شعر پڑھا تھا اور اس کی آواز پہ اور اس کے شعر پہ علیزے نے یکدم اک جھٹکے سے سر اٹھا کر دیکھا تھا تب تک وہ اس کے بالکل سامنے اور قریب آچکا تھا، لیکن وہ بیٹھی ہوئی تھی سو مجبوراً ”دل اور کو بھی بیٹھنا پڑا تھا۔
 آف وائنٹ کھدر کے شلوار سوٹ میں ملبوس ڈارک براؤن گرم چادر کندھوں پہ پھیلائے نیچے فرش پہ بچوں کے بل بیٹھا وہ ڈائریکٹ اس کی زخم زخم آنکھوں میں دیکھ رہا تھا اور آج نجانے کیا بات تھی کہ علیزے بھی اسے ڈائریکٹ دیکھ رہی تھی آنکھوں سے آنکھیں چار کر کے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے دو آنکھیں پانیوں میں ڈوب گئی تھیں۔

”میں نے سوچا اتنے دنوں سے پرستان کی ملکہ کو نہیں دیکھا آج اسے دیکھ آؤں۔“ وہ بڑے دلفریب موڈ میں تھا اس نے ایک بار پھر دل اور کی سمت دیکھا وہ عین اس کے سامنے بیٹھا ہے ہی دیکھ رہا تھا۔
 ”پلیز یا۔! رو یا نہ کرو۔ میرا دل مائل ہونے لگتا ہے۔“ اس نے اپنے ہاتھوں سے علیزے کے رخساروں سے آنسو پونچھ ڈالے تھے۔
 ”دیکھو۔! میں تمہارے لیے کھانا لے کر آیا ہوں یہ رونا دھونا چھوڑو اور مزے سے کھانا کھاؤ۔ چائے بھی پلاؤں گا۔“

اس نے خود ہی نوالہ بنا کر علیزے کی سمت بڑھا دیا تھا، لیکن علیزے نے نوالہ کھانے کی بجائے دل اور کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔
 ”ڈرائیو۔! جو تم کہو گے میں کروں گی۔ ہر بات مانوں گی۔ ملکہ نہیں، کینیون کے رہوں گی۔ تمہاری باندی بن جاؤں گی۔ بس ایک بات۔ صرف ایک بات مان لو۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے رو پڑی تھی۔
 ”کیا۔؟“ وہ حیران ہوا تھا۔

”مجھ سے۔ مجھ سے۔ شش۔ شادی کر لو۔ پلیز ڈرائیو۔“ علیزے کہتے ہوئے جیسے مر گئی تھی۔!!!

(باقی آئندہ انشاء اللہ)



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

مجموعہ خاص کیوں نہیں؟

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ مایانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں ایلو ڈنگ
- ✧ ہر ای بک گاؤڈ ریکٹ اور رٹریوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر بک سٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چینلنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سٹیشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ ابن صفی کی مکمل رینج
- ✧ ایڈ فوری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے ہمیں اون جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک ویکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیز سے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحہ اور خیل حیات دینی بہن بھائی ہیں مدحہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے وہ انگلینڈ کی رنگینوں میں مکمل حورہ رنگ چکی ہے جس کے پیش نظر فائزہ بیگم، خیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں لیکن مدحہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے جس پہ خیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

ذریل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، بے بسی اور مجبوری سے تنگ آخر خود کشی کرنے کا سوچتا ہے لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باؤ اقیانوس مل جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے جس پر ذریل کافی خوش ہوتا ہے اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدی ہے وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آذر شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے وہ اپنے قول و فعل کا بہت یکا آدمی ہے اس نے

تہذیبی بار نہیں سیکھا اس کی ماں بٹول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ درمزدوں کو بھی دیتی ہیں۔

۲۸
(ٹھانسیوں قید میں)

اور مرتو جیسے دل اور شاہ بھی گیا تھا۔ کیونکہ علیزے نے وہ بات کہہ ڈالی تھی۔ جو اس کے دھم گمان میں بھی نہیں گئی جو وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا اور جس کو سن کر وہ خود بھی دم بخود سا اس کو دیکھ رہا تھا اور وہ اس کا وایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑے دکھانے اور بے بسی کی انتہا کو چھوٹی ہوئی ہچکیوں سے رو رہی تھی اور اس کے پورے جسم کے ساتھ ساتھ دل اور کے ہاتھ یہ اس کے ہاتھوں کی گرفت بھی لرز رہی تھی اور اس کی ایسی حالت اور ایسی کیفیت دیکھ کر دل اور کی اپنی حالت اور کیفیت بھی عجیب سی ہو گئی تھی اور اس کے ہاتھ میں پکڑا نوالہ بھی جیسے اپنی جگہ یہ جوں کا توں ساکت سا رہ گیا تھا۔

”شادی؟“ دل اور کے منہ سے نکلنے والا لفظ بھی جیسے بے یقین اور پریشان سا لگ رہا تھا۔

”ہاں شادی۔۔۔ پلیز ڈرائیو۔۔۔ مجھ سے شادی کر لو۔۔۔ پھر تم مجھے تمہارا ہر ستم اور ہر سزا قبول ہوگی۔۔۔ پھر تبت۔۔۔ تم مجھے جان سے بھی مار دو گے۔ تو بھی میں اف نہیں کروں گی۔۔۔ بس۔۔۔ مجھ سے۔۔۔ مجھ سے نکاح کر لو۔“ علیزے کا لہجہ بکھر رہا تھا۔ آواز میں لرزش تھی اور الفاظ بے ربط سے ہو رہے تھے۔

”پلیز ڈرائیو! مجھے مارو۔ لیکن عزت کی موت مارو۔ یوں ذلت کی موت مارو۔ میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ خدا کے واسطے میری عزت میری آبرو مجھے واپس بخش دو۔ مجھ سے نکاح کر لو۔“ علیزے نے ہچکیوں سے روتے ہوئے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے اور جواباً ”دل اور کے ہاتھ میں پکڑا نوالہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے ٹرنے میں جا کر اٹھا۔

اس کے دوا عالم لرز اٹھے تھے۔ وہ بچوں کے ہل زمین پہ بیٹھا ہوا تھا۔ لیکن اسے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اس کے قدموں کے نیچے زمین پھٹ کر دو حصوں میں بٹ گئی ہو اور وہ زمین کے اندر نیچے ہی نیچے جھنستا جا رہا ہو۔ کسی بھنور کی طرح چکرانی ہوئی زمین اسے اپنے بھنور کی لپیٹ میں لیتی۔ اپنی طرف ہی کھینچے جا رہی تھی اور اسے اس بھنور سے نکلنے کا کوئی حل بھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ ایسا ششدر ہوا تھا کہ کچھ کہہ ہی نہیں پاتا تھا اور وہ تھی کہ تڑپ کر اس کے سامنے ہاتھ جوڑتی اپنی ذات کی قبولیت کی بھیک مانگ رہی تھی۔

”ڈرائیو۔۔۔ امیں۔۔۔ میں تمہارا ہر ظلم سہہ لوں گی۔۔۔ ہر جبر برداشت کر لوں گی۔۔۔ بس مجھے دین دنیا کی نظر میں سرخو کر دو۔۔۔ مجھے بچا لو۔۔۔ سب سے چھالو۔۔۔ پلیز ڈرائیو۔۔۔ مجھے چارو روے دو۔۔۔ مجھے ڈھانپ دو۔۔۔ میں ننگے سر کھڑی ہوں۔۔۔ میری عزت رکھ لو۔۔۔ نکاح کر لو مجھ سے۔“ وہ روتے ہوئے اس قدر تڑپ رہی تھی کہ اگر اس لمحہ دل اور شاہ سے اس کی عمر بھر کی کمائی اس کی تمام جمع پونجی اور اس کے گھر بار سمیت اس کی جان بھی مانگتی تو وہ یقیناً ”دے دیتا۔“

لیکن اس لمحے جو کچھ وہ اس سے مانگ رہی تھی وہ دنیا تو دل اور شاہ کے لیے جان دینے سے بھی زیادہ مشکل کام تھا اور پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ کسی عاجز اور بے بس سوالی کا سوال سن کر دل اور شاہ کی مٹھی میں اسے دینے کے لیے خاموشی اور چپ کے سوا اور کچھ نہیں تھا اور اس ”کچھ نہیں“ کا احساس ہوتے ہی دل اور شاہ کے دل و دماغ کے ساتھ ساتھ اس کے احساسات بھی ایک دم منجمد ہو کے رہ گئے تھے۔ جس کے باعث اسے احساس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کتنا رو رہی ہے؟ کتنا تڑپ رہی ہے؟ اور کتنا گڑ گڑا رہی ہے؟ وہ اسی جامد کیفیت ”احساسات اور دل و دماغ کے ساتھ وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور قدم واپسی کے لیے موڑے۔ اور علیزے اس کی خاموشی اور اس کے قدموں کی واپسی پہ یوں تڑپ گئی تھی کہ جیسے دل اور شاہ نے چپ چاپ قدم واپس نہیں موڑے تھے بلکہ اس کی شہ رگ کٹ دی ہو اور وہ اس شہ رگ کے کالے جانے کے درد سے ہلکا کر اٹھ جھٹکے سے زمین سے اٹھی اور تیزی سے اک سائیڈ سے آگے بڑھ کر اس کے سامنے اس کے راستے میں جا کر ہو گئی تھی۔

”نہیں ڈرائیو۔۔۔ اس طرح نہیں۔۔۔ تم ایسا نہیں کر سکتے۔ تم اس طرح نہیں جاسکتے۔ تمہیں کچھ تو کہنا ہوگا۔۔۔ تمہیں کچھ تو کہنا ہوگا۔۔۔ تم مجھ پہ ظلم کرنا چاہتے ہو؟ تو کرو جتنا مرضی ظلم کرو جتنا تمہارا دل چاہتا ہے اتنا کرو مگر خدا کے واسطے مجھے ٹھکراؤ مت۔ کیونکہ تم نے اگر مجھے ٹھکرا دی تو میرا کہیں بھی کوئی ٹھکانہ نہیں رہے گا۔ میں۔۔۔ میں دو جہان سے ٹھکرا دی جاؤں گی۔۔۔ پلیز ڈرائیو۔۔۔ پلیز۔۔۔ اس نے بے تحاشا روتے ہوئے ایک بار پھر اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے اور دل اور شاہ کے قدم ایک بار پھر زمین نے جکڑ لیے تھے۔ وہ علیزے کے آنسوؤں سے بھیکے ہوئے چہرے اور جڑے ہوئے ہاتھوں کو دیکھ کر سر جھکا نے پہ مجبور ہو گیا تھا اور علیزے اس کے سر جھکانے کے انداز سے ہی سمجھ گئی تھی کہ یہ سرائکار میں جھکا ہے اقرار میں نہیں اور اس کے جھکے ہوئے سر نے علیزے کو اور بھی تڑپا دیا تھا جبکہ دل اور نے اس کے سامنے سے ہٹ کر وہاں سے گزر جانا چاہا تھا۔

مگر اب کی بار اس کے قدم زمین نے نہیں بلکہ کسی اور نے جکڑ لیے تھے اور دل اور شاہ اپنی جگہ پہ جم کے رہ گیا تھا اس کے عرش اور فرش کانپ گئے تھے اس کی پوری ہستی لرز اٹھی تھی وہ بری طرح ڈبل گیا تھا آخر بڑی حویلی کی عزت اور آن وقار آندری کی بیٹی اس کے قدموں میں جھک گئی تھی اسی نے اپنے ہاتھ اس کے پیروں پہ رکھ دیے تھے تو گویا اس نے آج اپنی اتنا اپنا غرور اور اپنی ذات دل اور شاہ کے قدموں میں ڈال دی تھی۔ تو گویا اب اس کے پاس باقی کچھ بھی نہیں رہا تھا؟ وہ خالی ہو چکی تھی۔ ہار چکی تھی۔ اور لٹا چکی تھی۔ سب کچھ اس کے پیروں میں ڈال دیا تھا۔

لوگ محبت یا نفرت کی جنگ میں دل ہارتے تھے لیکن وہ اپنا آپ ہار گئی تھی اپنی اتنا اپنا غرور اپنی ذات ہار گئی تھی صرف اور صرف اپنی عزت کی خاطر اس نے سب کچھ ہار دیا تھا۔ وہ بے بس اور پسا ہو چکی تھی اور اس کی اسی بے بسی اور پسائی کا خیال آتے ہی اس کے ہاتھوں کا لمس دل اور کو پیروں پہ کسی کرنٹ کی طرح محسوس ہوا تھا اور وہ ایک دم پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اس نے اپنے پاؤں پیچھے کھینچ لیے تھے مگر علیزے پھر بھی اس کے پاؤں چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

وہ اپنے اس عمل کے دوران کس بل صراط پر سے گزر رہی تھی؟ دل اور شاہ اس چیز کا بخوبی اندازہ کر سکتا تھا مگر وہ اس کے اس عمل کے دوران کس بل صراط پر سے گزر رہا ہے؟ علیزے آندری اس چیز کا کبھی بھی اندازہ نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ وہ علیزے کی حالت سے باخبر تھا جبکہ علیزے اس کی کیفیت سے بے خبر تھی وہ بس تڑپے جا رہی تھی اور تڑپائے جا رہی تھی۔

”پلیز ڈرائیو۔۔۔ آج۔۔۔ آج جو جی چاہے کرو۔۔۔ مگر پلیز انکار مت کرو۔ آج تم مجھے عزت دو گے، تو کل اللہ تمہیں عزت دے گا کسی کی عزت اور عیب ڈھانپنے والے۔ اللہ مہربان ہوتا ہے اس لیے اللہ تم پر بھی مہربان ہوگا تم میری عزت اور میرے پاپا کا عیب ڈھانپ دو خدا کے لیے تمہیں ڈھانپ دو اللہ تمہاری عزت اور تمہارے عیب ڈھانپے گا پلیز ڈرائیو مجھ سے نکاح کر لو۔“ دل اور کے کانوں میں جیسے سائیں سائیں کی آواز گونجنے لگی تھی اور دل پہ جیسے اک لرزا سا طاری ہو گیا تھا۔

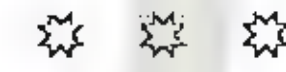
اس کی ایسی حالت تو اس وقت بھی نہیں ہوئی تھی جب اس کی اماں اس کے بابا کی لاش چار پائی پہ گھر آتے دیکھ کر تڑپ گئیں دیوانہ وار بھاگی تھیں روئی تھیں کر لائی تھیں اور وہاں سے مار مار کر روتے ہوئے اس کے بابا کی لاش سے لپٹ گئی تھیں اور اس قیامت خیز منظر نے دل اور شاہ کی معصومیت اور بچپن کو مار کر اسے اتنا سخت اور سفاک بنا دیا تھا کہ وہ آج اس مقام کو پہنچ گیا تھا کہ جہاں ایک عورت اس کے قدموں میں جھکی اس سے عزت و آبرو کی بھیک مانگ رہی تھی اور وہ اسے یہ عزت اور آبرو دینے سے قاصر تھا۔

کیونکہ علیزے کو دینے کے لیے اس کے پاس دکھ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ وہ اس کے معاملے میں اس سے

زیادہ بے بس اور لاچار تھا کیونکہ اس کی اماں کا درد اور بابا کی لاش اسے اپنے عزم اور ارادوں سے پیچھے نہیں ہٹتے دیتے تھے کیونکہ یہ بائیس سالہ عزم اور ارادے اس کے ساتھ بے رحم کر جانے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ سوئے تھے اس کے ساتھ جاگے تھے اس کی زندگی کا حصہ تھے وہ دل اور شاہ کی بیٹیوں اور خون میں رنج بس چکے تھے اس کے دماغ میں لاوے کی طرح پکتے تھے اس کی زندگی کا مقصد اور اولین ترجیح ہی یہ عزم اور ارادے تھے تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ ان سے پیچھے ہٹ جاتا یا پھر اپنے قدموں سے اکھڑ جاتا؟

ہاں اتنا ضرور تھا کہ وہ انسان تھا اس کے سینے میں دل تھا اور دل میں ایک کونا ضمیر کا بھی تھا۔ جو اس وقت اس لڑکی کی وجہ سے شرمندہ ہو رہا تھا اور اسے بھی گریہ تھا اور دل اور شاہ اپنے آپ کو بیٹھ کی طرح پتھر ثابت کرتا ہوا اس کی گرفت سے اپنے پاؤں کو آزاد کروا کے آگے بڑھ گیا تھا۔

”ڈرائیور! اور وہ ہیں فرش پہ بیٹھی ذلت اور بے بسی کے احساس سے چیخ اٹھی تھی مگر وہاں سے جا چکا تھا۔“



اس کی آنکھوں پہ سیاہی بندھی ہوئی تھی اور اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا وہ ان کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہی تھی اور پلپ، بیٹی کا یہ کھیل کافی دیر سے جاری تھا جس کو کھیلتے کھیلتے وہ بالا خر تھک گئے تھے اور وہیں لایاں چیر رہے بیٹھ گئے تھے جبکہ وہ یوں ہی ان کو ڈھونڈتی ڈھونڈتی گیٹ سے باہر نکل آئی تھی۔ لیکن اسے خبری نہیں تھی کہ وہ گھر سے باہر نکل آئی ہے اور کس راستے پہ کس طرف جا رہی ہے؟ وہ بس ہاتھوں سے ہوا میں راستے کی سمت ٹٹولتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی اور جس راستے پہ وہ آگے بڑھ رہی تھی وہ راستہ اونچائی کی طرف جا رہا تھا اتنی اونچائی کی طرف کہ جس کو دیکھ کر ہی خوف آجائے اور وہ تھی کہ دیکھ ہی نہیں رہی تھی کیونکہ اس کی آنکھوں پہ تو پٹی بندھی ہوئی تھی اسے تو کچھ بتائی نہیں تھا وہ تو بے خبری میں موت کے منہ میں جا رہی تھی۔

”پاپا! پاپا! بولیں نا۔ کہاں ہیں آپ؟ آپ چپ کیوں ہو گئے ہیں؟ کچھ بولتے کیوں نہیں؟ پلپ آپ سامنے آجائیں نا۔ میں آپ کو ڈھونڈ رہی ہوں۔“ وہ اپنی دھن اور بے خبری میں انہیں پکارتی ایک بہت سی اونچی ہواڑی کی طرف آنکلی تھی جس کے ایک طرف سمندر تھا اور ایک طرف کھائی تھی ٹھاٹھیں مارتا سمندر اور گہری کھائی اسے ننگے کے لیے تیار کھڑے تھے اور وہ ان سب سے انجان اپنے پاپا کو ہی پکار رہی تھی۔

”پاپا! اب کی بار اس نے انتہائی زور سے پکارا تھا اور تھوڑی دیر سانس بحال کرنے کی غرض سے بیٹھنے والے وقار آفندی کے لیے یہ پکار دل دہلا دینے والی ثابت ہوئی تھی وہ یک دم گھبرا کے اٹھے تھے اور اسے ڈھونڈتے ہوئے باہر آگئے تھے وہ جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے ان کے جسم سے جان ختم ہوتی جا رہی تھی کیونکہ انہیں یاد تھا کہ علیزے کی آنکھوں پہ سیاہی بندھی ہوئی تھی اور وہ کچھ بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اور اس کا نہ دیکھنا خطرے سے خالی نہیں تھا اس لیے وہ زیادہ بول کھلا رہے تھے۔

”پاپا! علیزے کی پکار بڑھتی جا رہی تھی۔“ وہ بے ساختہ اس طرف کو بھاگے تھے جس طرف سے آواز آ رہی تھی اور وہ اس طرف آہی گئے تھے اور وہاں آکر انہیں یوں محسوس ہوا تھا جیسے جسم میں رہی سہی جان بھی کسی نے ایک جھٹکے سے کھینچ کر نکال دی ہو اور وہ جہاں تھے وہیں کے وہیں کھڑے رہ گئے تھے۔ کیونکہ ان کے کلیجے کا ٹکڑا۔۔۔ ان کی زندگی۔۔۔ ان کا سرمایہ حیات۔۔۔ ان کی علیزے موت کے منہ میں کھڑی تھی اور وہ بس دور کھڑے دیکھ رہے تھے۔ بے بس اور لاچار کمزور اور عاجز۔۔۔ کچھ کرنے کی تو سکت ہی نہیں تھی اور نہ ہی کوئی اختیار تھا۔

”پاپا پلپ پلپ۔۔۔ مجھ سے یہ بیٹی نہیں کھل رہی۔ پاپا۔۔۔ مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا۔ پلپ یہ کھول دیں۔۔۔ پلپ پلپ۔۔۔“ وہ سختی سے بندھی ہوئی پٹی کو کھولنے کی کوشش میں کبھی ایک قدم آگے بڑھ رہی تھی اور کبھی پیچھے ہٹ رہی تھی۔ اور اس کی زندگی بس اسی ایک قدم آگے اور ایک قدم پیچھے کے درمیان ڈول رہی تھی۔ اگر زوراً جو تیسرا قدم اٹھا لیتی تو یقیناً ”موت کی آغوش میں پہنچ جاتی اور وقار آفندی اسے اسی تیسرے قدم سے باز رکھنا چاہتے تھے اسے پکارنا چاہتے تھے اسے بچانا چاہتے تھے مگر اچانک نہ جانے کیا ہوا تھا کہ ان کی آواز بند ہو گئی تھی۔ وہ بولنا چاہتے تھے مگر بول نہیں پارے تھے اور کوشش کے باوجود بھی ان کے حلق سے ان کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ وہ اسے روکنے سے اور پکارنے سے قاصر تھے اور یہی سوچ کر وقار آفندی کی رگوں میں اک سنسنی ہٹ سی دوڑ گئی تھی اور پورے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے وہ ان کے سامنے تھی لیکن وہ ان کے سامنے ہوتے ہوئے بھی بہت دور بہت فاصلے پہ تھی اتنے فاصلے پہ جتنے فاصلے زندگی سے موت تھی۔ یا تو لمحہ بھر کا فاصلہ۔۔۔ یا پھر عمر بھر کا فاصلہ۔ اور ادھر علیزے آفندی اپنی آنکھوں پہ بندھی پٹی سے الجھ رہی تھی اور بے بس ہو رہی تھی۔

”پاپا! پاپا! پلپ کہاں گئے ہیں آپ؟“ علیزے کی پریشان اور بھرائی ہوئی آواز انہیں یہاں تک سنائی دے رہی تھی۔ لیکن ان کی اپنی آواز اور قوت گویائی سب ہو چکی تھی اور اس کشمکش اور پریشانی کے عالم میں انہوں نے دیکھا کہ ایک تیز رفتار اور مینہ زور جھونکا علیزے کے قدم اکھاڑ گیا تھا اور وہ اتنی تازک تھی کہ ہوا کے سر پھرے جھونکے سے ہی لڑکھرائی تھی اور اس کا یہ لڑکھانا اسے موت سے قریب کر گیا تھا۔ اس کا پاؤں پھسلا تھا اور وہ سیدھی ہزاروں فٹ نیچے گہری کھائی میں جا گری تھی اور اس کی دلخراش چیخیں پوری وادی میں گونج رہی تھیں۔

”پاپا! اس کی آخری چیخ اور آخری پکار بھی یہی تھی اور وقار آفندی گھرا اٹھے تھے۔“

”علیزے۔۔۔ انہوں نے اپنی پوری قوت سے اسے پکارا تھا اور ان کی اس پکار سے بھی پوری وادی گونج اٹھی تھی۔ ان کی علیزے ان کی آنکھوں کے سامنے مگر تھی اور وہ اسے بچا بھی نہیں سکے تھے اور اسی خیال اور اسی درد کے ہاتھوں وہ سر تپا اپنے میں شرا ہو رہے تھے اور ان کا جسم مرغ لعل کی مانند ترپا تھا۔ جس کے باعث ان کے ساتھ بیڑہ سوئی آسید آفندی کی بھی آنکھ کھل گئی تھی انہوں نے فوراً ”اٹھ کر لمپ جلا دیے تھے۔“

”وقار! کیا ہوا ہے آپ کو۔ آپ ٹھیک تو ہیں نا؟“ آسید آفندی نے کافی تشویش سے پوچھا تھا کیونکہ ان کے جسم کو ہلکے ہلکے سے جھٹکے لگ رہے تھے اور وہ سر سے پاؤں تک سینے میں بھیکے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

”وقار! کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ آپ کی حالت تو بہت خراب لگ رہی ہے؟“

”رے۔۔۔ رے۔۔۔ لیز۔۔۔ علیزے۔۔۔ ان کی قاری زبانی سے بمشکل علیزے کا نام ادا ہوا تھا اور آسید آفندی ساکت وصامت سی رہ گئی تھیں۔“

”علیزے۔۔۔؟“ انہوں نے یہ نام زیر لب خود کلامی کے سے انداز میں دہرایا تھا۔ دواہ بعد ان کی مفلوج زبان نے پہلی بار حرکت کی بھی تھی تو علیزے کے نام پہ؟ وہ حیران نہ ہوتیں تو اور کیا ہوتا؟

یعنی ان کا لاچار مفلوج اور بے بس جسم علیزے کے نام پہ اور علیزے کی تکلیف پہ اب بھی ترپ اٹھتا تھا؟ تو اس کا مطلب تھا کہ ان کی یہ حالت علیزے کی ”وجہ“ سے نہیں بلکہ علیزے کے ”لے“ لیے ایسی ہو گئی تھی؟ انہیں بس علیزے کے دکھ کا دکھ تھا انہیں بس علیزے کی تکلیف کی تکلیف تھی وہ آج بھی اپنے درد پہ نہیں علیزے کے درد پہ تڑپتے تھے جیسے اس وقت ترپ رہے تھے اور رات کے اس پہران کی ایسی حالت اور ایسی تڑپ دیکھ کر آسید آفندی گھبرا گئی تھیں کیونکہ ان کی حالت رفتہ رفتہ مزید بگڑ رہی تھی۔

”رے۔۔۔ رے۔۔۔ علیزے۔۔۔ لیز۔۔۔ علیزے۔۔۔ وہ بمشکل بانپتی ہوئی سانسوں کے دوران لڑکھرائی زبان سے اس کا نام مکمل کر پار رہے تھے اور ان کا لہجہ جیسے بھگ رہا تھا۔“

”اس وقت علیزے آپ کو کیوں یاد آئی؟ کیا آپ نے اسے خواب میں دیکھا ہے؟ کیا ہوا ہے اس کو؟“ آسیہ آنندی کا اندازہ بالکل درست تھا۔ وہ جان گئی تھیں کہ ضرور انہوں نے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہے۔ لیکن ان کا یہ سوال کہ ”کیا ہوا ہے اس کو؟“ انہیں دوبارہ سے کچھ دیر پہلے کے منظر کی یاد دل گیا تھا اور وہ منظر پھر سے ان پر لرزا سا طاری کر گیا تھا اور ان کی روح بھی کپکپا گئی تھی۔

”وقار! وقار! آپ پلیز سنبھالیں اپنے آپ کو۔ میں ابھی وانیال کو بلاتی ہوں۔“ آسیہ آنندی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے اور وہ تیزی سے موبائل اٹھا کر وانیال کا نمبر ڈائل کرنے لگی تھیں۔ عاتشہ آنندی کی فیملی انیکسی میں رہتی تھی اور اپنے بیڈ روم سے نکل کر انیکسی تک جانا اور پھر وہاں سے واپس آنا بھی کسی دوسرے گھر جانے اور آنے کے برابر لگتا تھا اور اس جانے اور آنے میں کافی ٹائم بھی لگ جاتا تھا۔ اس لیے بہتر تھا کہ وہ فون کال کا سہارا لے لیتیں اور انہوں نے ایسا ہی کیا تھا۔ دوسری طرف بتل جا رہی تھی۔

”ہیلو؟“ وانیال کی آواز نیند کی وجہ سے کافی بھاری محسوس ہو رہی تھی۔

”وانیال! میں بات کر رہی ہوں تمہاری کئی۔ بیٹا۔ تمہارے ڈیڈ کی حالت بہت خراب ہے، تم جلدی پہنچو۔“ آسیہ آنندی کا خود پہ اختیار نہیں رہا تھا اور وہ رو پڑی تھیں اور ان کے رونے کی آواز سن کر وانیال کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔

”پلیز آئی۔۔۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ میں آ رہا ہوں۔“ وانیال نے عجلت اور پریشانی سے کہتے ہوئے فون بند کر دیا تھا اور پھر اگلے پانچ منٹ میں وہ ان کے پاس ان کے سامنے موجود تھا۔ لیکن وقار آنندی کی اس قدر بگڑتی ہوئی حالت دیکھ کر اس نے فوراً ان کو اسپتال لے جانے کا فیصلہ کیا تھا اور مبارک خان کو کال کر کے گاڑی نکالنے کا کہا تھا البتہ ان کے شور کی آواز سن کر بانی سب بھی بے دار ہو چکے تھے اور پوری حویلی میں ایک افراتفری سی مچ گئی تھی۔

وہ رات تھی کہ کوئی پہاڑ؟ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی آگے یا پیچھے سرکنے کو تیار نہیں تھی اور اس پہاڑ نما رات میں دل اور شاہ کو اپنا آپ بھی کسی پہاڑ کی مانند ہی لگ رہا تھا۔ ایک ہی جگہ پہ ساکت، جامد، ٹھہرا ہوا۔ لیکن مٹی کا ڈھیر۔ دیکھنے والوں کے لیے بہت کچھ۔ مگر اپنے لیے کچھ بھی نہیں بے شک وہ پتھر کی چٹان کی مانند تھا لیکن اس کی بنیاد تو آخر مٹی ہی تھی نا؟ اگر ذرا سی کمزور پڑ جاتی تو پوری چٹان ڈھیر ہو جاتی اور اس چٹان کے ڈھیر ہونے کے ساتھ ساتھ بہت کچھ زمین بوس ہو سکتا تھا۔ لیکن وہ اس وقت اس مقام پہ تھا جہاں پہ نہ چٹان بن کے رہتا آسان تھا اور نہ ہی زمین بوس ہونا آسان تھا۔ بلکہ وہ تو اس وقت اس مقام پہ تھا جہاں پہ ہر قدم اور ہر فیصلہ ہی موت اور ازیت کا فیصلہ تھا اور یہ فیصلہ بہت مشکل تھا اتنا مشکل کہ دل اور شاہ جیسا با اختیار انسان بھی بے بسی کی سولی پہ لٹک گیا تھا اور کلیجے کے اندر ریزے کی آبی گڑی رہ گئی تھی۔

وہ جب سے علیزے کے پاس سے اٹھ کے آیا تھا بس یوں ہی ایک ٹک کھڑکی میں کھڑا گھر کی بیک سائیڈ میں بنے سونمنگ پول کو دیکھ رہا تھا۔ جس کے شفاف پانی کے اوپر ہلکی ہلکی دھند اور غبار کی تہ چھائی ہوئی نظر آ رہی تھی اور ایسی ہی دھند اور غبار کی تہ دل اور شاہ کو اپنے دل پہ چھائی ہوئی محسوس ہو رہی تھی جس میں ایک چہرہ تھا جو کبھی چھپ رہا تھا اور کبھی ابھر رہا تھا کبھی او اس اور بائوس لگتا تھا اور کبھی خوش اور شاد نظر آتا تھا۔ یہ وہ چہرہ تھا جس کے رخساروں پر دل اور کادل بوسے دیتا تھا اور آنکھیں سجدہ کرتی تھیں۔ دل کے بوسے اور آنکھوں کے سجدے صرف اس چہرے کو ہی تو نصیب تھے اور دل اور کودہ چہرہ ہی نصیب نہیں تھا۔

”زری۔۔۔!“ دل اور نے ایک گہری سانس کھینچی تھی اور دل میں سسکتا ہوا لفظ ایک کپکپاہٹ کی صورت ہو نٹوں سے ادا ہوا تھا۔

”آج تم مجھے عزت دو گے، تو کل اللہ تمہیں عزت دے گا کسی کی عزت اور عیب ڈھانپنے والے یہ اللہ مہربان ہوتا ہے اس لیے اللہ تم پر بھی مہربان ہو گا تم میری عزت اور میرے پایا کا عیب ڈھانپ دو۔ خدا کے لیے ہمیں ڈھانپ دو۔ اللہ تمہاری عزت اور تمہارے عیب ڈھانپے گا۔ پلیز ڈرائیو۔۔۔ مجھ سے نکاح کر لو۔ پلیز ڈرائیو۔۔۔ مجھ سے نکاح کر لو۔ پلیز ڈرائیو۔۔۔ مجھ سے نکاح کر لو۔“ اس کے کانوں میں بس اس ایک جملے کی بازگشت سنائی دے رہی تھی اور وہ تھک ہار کے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے کھڑکی کے قریب ہی رکھی راکنگ چیر پر بیٹھ گیا تھا۔

”علیزے۔۔۔!“ دل اور کو خود بھی محسوس نہیں ہوا تھا کہ اس کے ہونٹوں نے بے دھیانی میں علیزے کے نام کو چھوا ہے۔ بس اس کے ذہن میں تو سوچوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور وہ تھا کہ اس سمندر میں پوری طرح سے ڈوبا ہوا تھا۔

”دیکھو شاہ! زندگی میں ایسا کچھ مت کرنا کہ میں تمہیں کبھی معاف ہی نہ کر پاؤں۔۔۔ تم وقار آنندی کو بچ چور ہے میں الٹا لٹکا کر گولی بھی مار دو گے تو مجھے ذرا بھی افسوس نہیں ہو گا لیکن اگر اس کی بیٹی کی عزت پہ ہاتھ ڈالو گے تو میں تمہیں کبھی معاف نہیں کر سکوں گی آخر ایک مرد کا بھگتیاں عورت کیوں بھگتے؟ وقار آنندی کی سزا وقار آنندی کو ملنی چاہیے اس کی بیٹی کو نہیں کیونکہ عورت محبت کی طرف سے ملنے والی چوٹ تو سہہ لیتی ہے لیکن عزت کی طرف سے ملنے والی چوٹ نہیں سہہ پاتی۔۔۔ ہمیشہ اس چوٹ سے بلبلاتی رہتی ہے اور یہ چوٹ اور بلبلانا نام نہیں جان سکتے۔“ بتول شاہ کی تلخ سی آواز اس کی سماعتوں میں ابھر کر معدوم ہو گئی تھی۔

”اماں۔۔۔!“ وہ بے ساختہ بے چینی سے کہتا ہوا دوبارہ راکنگ چیر سے کھڑا ہو گیا تھا اور اپنا موبائل اور گاڑی کی چابی اٹھا کر باہر نکل آیا تھا۔

اور رات کے اس پہر دل اور کو گاڑی نکالتے دیکھ کر گلاب خان پریشان سا تیزی سے قریب آیا تھا۔

”صاحب۔۔۔! آپ اس وقت کہاں جا رہے ہیں؟ سب خیریت تو ہے نا؟“ اس نے پریشانی سے استفسار کیا تھا۔

”ہوں۔۔۔ تم گیٹ کھولو۔“ اس نے آہستگی سے سہ ہلایا تھا اور گلاب خان اس کا موڈ دیکھتے ہوئے پلٹ کر گیٹ تک چلا گیا اور گیٹ کھول دیا تھا اور وہ اپنی گاڑی زنانے سے نکال لے گیا تھا۔ رات کے تین بجے کا وقت تھا اور وہ گھر سے نکل کر سڑکوں پہ آگیا تھا۔ اس کے اندر ابال انٹھ رہے تھے وہ برداشت نہیں کر پا رہا تھا اور ای بے کل اور مضطرب کیفیت کو ضبط کرتے کرتے اس نے اسٹیئرنگ پر مکاوے مارا تھا۔

”میں دنیا کا بے بس ترین انسان ہوں۔ میں کبھی کچھ بھی نہیں کر پایا۔۔۔ کسی کو محبت نہیں دے سکا اور کسی کو عزت نہیں دے سکا بلکہ یہ سب تو دور کی بات ہے، میں تو اپنی ماں کو اس کی محنت کا صلہ بھی نہیں دے سکا میں بہت بد قسمت انسان ہوں مجھ سا بد قسمت دنیا میں اور کوئی نہیں ہو سکتا، کوئی بھی نہیں۔“ وہ انتہائی رش ڈرائیو کرتے ہوئے لفی میں سر ہلا رہا تھا۔ ہاتھوں کی گرفت اسٹیئرنگ پہ اتنی مضبوط تھی کہ ہاتھوں کی رگیں ابھر آئی تھیں اور دل و دماغ میں ایک محشر پاتا تھا اور ایسے عالم میں تو اسے یہ بھی نہیں پتا تھا کہ اس کی گاڑی کا رخ کس طرف ہے؟

”شاہ۔۔۔ تم یہاں۔۔۔؟ اس وقت؟“

صبح کے ساڑھے سات بجے کا وقت تھا اور وہ تیار ہو کر ناشتا کرنے کے لیے بیڑھیوں سے نیچے اتر رہی تھیں کہ

اچانک گھر کے مختصر سے کوریڈور کے مرکزی دروازے سے داخل ہوتے دل اور شاہ کو دیکھ کر ان کے روناں قدم سر پڑھیں یہی رک گئے تھے۔ لیکن اسے خاموش دیکھ کر ذرا سے توقف کے بعد ان کے قدموں میں پھر سے روانی آگئی تھی اور وہ تیزی سے چلتی ہوئی اس کے قریب رکی تھیں۔

”شام۔ تم بول کیوں نہیں رہے؟ کیا ہوا ہے؟ تم ٹھیک تو ہونا؟“ بول شاہ نے اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے انتہائی پریشانی اور تشویش سے پوچھا تھا۔

”ٹھیک ہوں اماں! زندہ سلامت ہوں“ آپ کے سامنے ہوں“ آپ پریشان کیوں ہو رہی ہیں؟“

”شام! یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟“ انہوں نے اسے ابھی ہوئی موالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

”اماں پلیز! آپ پریشان نہ ہوں سب ٹھیک ہے میں یہاں آپ سے ملنے کے لیے آیا ہوں“ آپ کو پریشان کرنے کے لیے نہیں آیا۔“ دل اور نے خفگی سے کہتے ہوئے اپنے چہرے پہ رکھے ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے تھے۔

”تم اس وقت اتنی دور سے مجھ سے ملنے کے لیے آئے ہو؟ مگر کیوں؟ خیریت؟“ وہ بھی آخر دل اور کی ماں تھیں اس کے جواب پہ مطمئن ہونے والی نہیں تھیں جیسے وہ خود نہیں ہوتا تھا۔

”یہاں آنے سے پہلے جو آخری خیال آیا وہ آپ کا تھا اور اس خیال کے ساتھ ساتھ میں بھی آپ کی طرف آگیا۔“ وہ ان کے ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں پھنکتے ہوئے بولا تھا اور بول شاہ نے چونک کر خاصی گہری نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”پہلا خیال کس کا تھا؟“ ان کا سوال مختصر اور دو ٹوک تھا۔ جس پہ دل اور کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی اور وہ ان کے ہاتھ چھوڑ کر ان کے سامنے سے ہٹ گیا تھا۔

”تمہیں زری کے خیال آتے ہیں اور زری کو تمہارے خواب آتے ہیں تم یہ خواب و خیال کے سلسلے جوڑ کیوں نہیں دیتے؟“ انہوں نے اس کے پیچھے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے کافی مضبوط لہجے میں پوچھا تھا اور صوفے کی سمت بڑھتے دل اور کے قدم ٹھنک کر رک گئے تھے۔ گویا وہ پہلے خیال تک جا پہنچی تھیں؟

”کیونکہ مجھے اور بھی بہت سے خیال آتے ہیں۔“ وہ گہری سانس خارج کرتے ہوئے صوفے پہ بیٹھ گیا تھا۔

”کیسے خیال؟“ وہ عین اس کے سامنے آکھڑی ہوئی تھیں۔

”بس کچھ دوستوں کے اور کچھ دشمنوں کے۔“ اس نے صوفے کی بیک سے سر نکالتے ہوئے آنکھیں موند لی تھیں، جبکہ بول شاہ نے اسے چونک کر دیکھا تھا۔

”دوستوں کا خیال آتا تو محبت کی علامت ہے مگر دشمنوں کا خیال آنا کس چیز کی علامت ہے؟“ ان کا لہجہ قدرے تنکھا سا محسوس ہو رہا تھا۔

”انسانیت کی!“ دل اور کے اگلے جواب پہ وہ اور زیادہ چونکی تھیں۔

”تو کیا تمہاری انسانیت کو اس کا خیال آتا ہے جو انسان ہی نہیں ہے؟“ بول شاہ کا لہجہ چبھتا ہوا سا تھا۔

”پلیز اماں! میں کب کہہ رہا ہوں کہ مجھے وقار آفندی کا خیال آتا ہے؟“ وہ جھنجھلا گیا تھا۔

”تو پھر کب؟“ انہوں نے موالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

”مجھے اس کی بیٹی کا خیال آتا ہے۔“ دل اور کی آواز دھیمی پڑ گئی تھی۔

”اس کی بیٹی کا؟“ انہیں ایک اور جھٹکا لگا تھا۔

”ہاں! اس کی بیٹی کا۔ علیزبے کا؟“ اس نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

”مگر کیوں؟“ ان کے سوال کافی مختصر تھے اور لہجہ بھی بدل چکا تھا۔

”مگر شہ رات میں اسے کھانا دینے گیا تھا۔“ وہ بتاتے ہوئے ٹھہر سا گیا تھا۔

”پھر؟“ انہوں نے اسے بولنے پہ اکسایا تھا۔

”پھر میں نے وہ سب دیکھا جو میرے پلان میں نہیں تھا۔“ دل اور کہتے ہوئے سر جھکا کر بیٹھا ہوا تھا اور بول شاہ اس کے مزید بولنے کا انتظار کر رہی تھیں۔

”وہ! وہ! میرے قدموں میں جھک گئی تھی۔“ وہ بڑے کرب سے بتا رہا تھا اور بول شاہ کے قدموں تلے سے زمین سرک گئی تھی اور سینے کے اندر سالوں سے رکھا پتھر بھی کانپ گیا تھا وہ ہنوز سر جھکائے بیٹھے دل اور کو دیکھ کے رہ گئیں۔

”تم اپنی بتاؤ۔ تم جھکے یا نہیں؟“ وہ اس کا جواب سننا چاہتی تھیں ”میں کیسے جھک جاتا اماں؟ یہ۔ یہ۔ میرے جھکنے کا مقام نہیں ہے۔ یہاں دل اور شاہ جھکے تو بے غیرت کہلائے گا۔“ وہ بے ساختہ تڑپ کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا۔

”جس انسان نے جھکنا ہو۔ وہ ”ور“ نہیں دیکھتا دل اور شاہ! چاہے وہ در زری کا ہو، چاہے علیزبے کا۔۔۔ جب جھک ہی جاتا ہے تو پھر یہ ”ور“ کیا؟ اور وہ ”ور“ کیا؟“ وہ عجیب تنگ سے لہجے میں بولی تھیں۔

”مگر میں اس سے نکاح نہیں کر سکتا اماں۔ ہرگز نہیں۔۔۔ مگر بھی جاؤں تب بھی نہیں۔“ وہ نفی میں سر ہل رہا تھا۔

”نکاح؟“ بول شاہ نکاح کے لفظ پہ جیسے سانے میں آگئی تھیں۔

بے شک یہ انہی کا ظرف تھا کہ وہ اسے جھکنے کا کہہ رہی تھیں مگر نکاح کا لفظ سن کر ایک بار تو انہیں یوں لگا تھا کہ جیسے ان کے جسم اور ان کے دل پہ کسی نے جلتے دھتے کوئلے اندیل دیے ہوں اور ان کے جسم کے ساتھ ساتھ ان کے دل کے بھی پرچے اڑ گئے ہوں اور وہ کھڑے کھڑے دھجیوں میں بکھر گئی تھیں ان کی ذات پہ سیاہ تاریکی کے سائے لہرا گئے۔ ان کی حالت ایسی تھی جیسے کسی ہزاروں فٹ کی اونچائی سے پھینکے جانے والے شیشے کی ہوتی ہے۔ چکنا چور۔۔۔ ریزہ ریزہ۔۔۔ ٹکڑوں میں تقسیم۔

اور ان تقسیم شدہ ٹکڑوں کو دوبارہ جمع کر کے ایک شکل میں لانا انتہائی ناممکن سی بات تھی مگر وہ واقعی ایک مضبوط اور پتھریلی چٹان نما عورت تھیں وہ ناممکن کو بھی ممکن بنانے کی ہمت اور حوصلہ رکھتی تھیں ان کی حالت شیشے کے ٹکڑوں جیسے تو ہو سکتی تھی مگر ان کی طاقت شیشے جیسی کمزور نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ بہادر خاتون تھیں اور انہوں نے بہادر ہی رہنا تھا وہ اپنی زندگی کو ایک جنگ سمجھتی تھیں اور یہ جنگ انہوں نے اپنے آخری دم تک لڑنی تھی اور اس جنگ مسلسل انہوں نے کبھی اپنے رب سے شکوہ بھی نہیں کیا تھا اور وہ شکوہ و شکایت کرنے والوں میں سے تھیں بھی نہیں بلکہ وہ تو صبر و شکر کرنے والوں میں سے تھیں۔۔۔ ورنہ انہوں نے آج تک اللہ نے جو انہیں دیا تھا اس پہ شکر کیا تھا اور جو ہوا تھا اس پہ صبر کیا تھا اور آج بھی ان کی آزمائش کی گھڑی تھی آج پھر اللہ نے انہیں آزمایا تھا اور وہ آزمائش کا پیالہ پی گئی تھیں۔

”وقار آفندی مت ببول اور شاہ! بول شاہ! الہ پی پٹکی تھیں اور دل اور شاہ دم بخود سارہ گیا تھا وہ اپنے سامنے کھڑی عورت کو پٹکی پٹکی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اور انہیں کرنا چاہ رہا تھا کہ وہ واقعی ایک عورت ہیں یا پتھریلی چٹان؟ اتنا حوصلہ اتنا ظرف اور اتنا صبر تو اس نے آج تک کسی عورت میں نہیں دیکھا تھا جتنا وہ آج اپنے سامنے کھڑی عورت میں دیکھ رہا تھا۔

”اماں!؟“ دل اور کے ہونٹوں سے اوا ہونے والا یہ لفظ بھی کپکپا رہا تھا کیونکہ وہ بے یقینی کی انتہا پہ تھا۔

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں دل اور شاہ! وقار آفندی مت بنو تمہاری رگوں میں دوڑتا بار شاہ کا خون اور اس خون

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شاندار پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ کے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو
- ☆ ہر ای بک کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور ای بک کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے
- ☆ کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی متن مختلف
- ☆ سائٹوں میں ایڈونٹ
- ☆ سہجہ کو ایڈوانسڈ کیمرہ والی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور
- ☆ ابن صفی کی مکمل رینج
- ☆ ایڈٹری انکس، انکس کو پیسے کمانے
- ☆ کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

☆ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

☆ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

میں بہت بھول شاہ کی تربیت تمہیں کبھی بھی یہ اجازت نہیں دیتی کہ تم بے رحمی اور سفاکی کے راستے پہ چلو۔ یا پھر تم کسی وحشت یا درندگی کا مظاہرہ کرو، میں تمہیں ایک انسان دکھنا چاہتی ہوں، حیوان نہیں۔“ بھول شاہ کا لب و لہجہ اچھا خاصا بے لچک نظر آ رہا تھا۔

”اماں! آپ! آپ! یہ سب کیا کہہ رہی ہیں؟“ دل آور نے ان کے مقابل کھڑے ہوتے ہوئے انہیں دونوں کندھوں سے تھام لیا تھا اور ان کے احساسات سے عاری اور سپاٹ چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

”تمہیں پتا ہے میں جو کہتی ہوں وہ ایک ہی بار کہتی ہوں اور مجھے بھی پتا ہے کہ تم ایک بار میں ہی سمجھ جاتے ہو۔“ بھول شاہ قدموں سے اکھڑنے والی عورت نہیں تھیں۔ وہ ہمیشہ اپنی بات اور اپنے فیصلے پہ اٹل ثابت ہوتی تھیں۔ تب ہی تو دل آور کو سن کر اس قدر دھچکا لگا تھا کہ جو کچھ وہ کہہ رہی تھیں وہ سب گراں انتہائی مشکل بلکہ ناممکن سی بات تھیں۔ اسی لیے وہ آہستگی سے نفی میں سر ہلاتا ہوا پیچھے ہٹ گیا تھا۔

”نہیں اماں! میں یہ سب نہیں کر سکتا۔ آپ! آپ! مجھے حکم دو کہ میں اپنا سر کاٹ کے آپ کے قدموں میں رکھ دوں تو قسم ہے اس پاک ذات کی میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کروں گا۔ لیکن۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ سب نہیں کر سکتا۔“ اس نے انکار کر دیا تھا۔

”کیوں نہیں کر سکتے؟ آخر اس کو اس نوبت پہ پہنچانے والے بھی تو تم ہو۔ کہ وہ تمہارے قدموں میں جھکنے پہ مجبور ہو گئی ہے پہلے اس نے اپنے باپ کے کیے کا جھگڑا کیا تھا۔ اور اب تمہارے کیے کا جھگڑا جھگڑے گی۔۔۔ کیوں؟ کس لیے آخر؟ وہ عورت ہے اس لیے۔ یا پھر تم مرد ہو اس لیے؟ حالانکہ میں نے تمہیں کہا بھی تھا کہ تم ایسا کوئی کام مت کرنا کہ میں زندگی میں کبھی تمہیں معاف نہ کر پاؤں۔ مگر تم نے میری ایک نہیں سنی۔ تم نے تب بھی اپنی مرضی کی۔ اور تم آج بھی اپنی مرضی کر رہے ہو؟ کیا اس سب کے بعد بھی تم مجھ سے معافی کی توقع رکھو گے؟“ وہ خاصے سخت لہجہ میں بولتے ہوئے دل آور کے چہرے کو ہی دیکھ رہی تھیں۔

”مگر اماں! میں نے ایسا کچھ نہیں کیا کہ آپ مجھے کبھی معاف ہی نہ کر پاؤں۔ وہ جیسی تھی۔ ویسی ہی ہے۔ میں نے اس کے اور اپنے درمیان مرد اور عورت والی ”ہوس و نفس“ کو جگہ نہیں دی۔ وہ تو اتنی ہی پاک ہے جتنی پہلے تھی۔“ دل آور نے ماں کے سامنے گواہی دی تھی۔

”میں جانتی ہوں کہ وہ اتنی ہی پاک ہے جتنی پہلے تھی مگر یہ بات تم کس کس کو بتاؤ گے؟ اور کون کون اس بات کو مانے گا کہ وہ جیسی تھی ویسی ہی ہے۔ یہ بات تو یا تم جانتے ہو یا پھر تمہارا خدا جانتا ہے۔ لیکن خدا کی خدائی نہیں جانتی۔ کیونکہ خدائی وہی کچھ جانتی ہے جو سامنے نظر آ رہا ہو نا ہے۔ اب سامنے نظر آنے والی چیز کے پیچھے کیا ہے۔ یہ کوئی بھی جاننے کی رحمت نہیں کرتا۔“ بھول شاہ نے انتہائی دکھ سے کہتے ہوئے نفی میں گردن ہلاتی تھی۔

”اماں! آپ کی ہر بات اور ہر حکم سر آنکھوں نیسے لیکن میں اس کے لیے بس اتنا کر سکتا ہوں کہ اسے واپس بڑی جوبلی چھوڑ آؤں۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کر سکتا۔ میں مرنے کو سکتا ہوں۔ مگر وقار آئندگی کی بیٹی کو بیوی نہیں بنا سکتا۔ چاہے میرے لیے اس دنیا میں رہ جانے والی وہ آخری لڑکی ہی کیوں نہ ہو۔“ دل آور کا لہجہ بھول شاہ سے بھی زیادہ سخت اور پتھر پلا ہو رہا تھا۔

”مگر تم نے اسے واپس ہی چھوڑنا تھا تو لائے ہی کیوں تھے؟“ وہ دونوں ماں بیٹا ایک دوسرے کو دبدو جواب دے رہے تھے۔

”میں وقار آئندگی کو سزا دینے کے لیے اسے لایا تھا۔ اور وہ یہ سزا بھگت بھی رہا ہے۔ یہ دیکھیے۔ یہ میرا موبائل دیکھیے۔ اس میں وقار آئندگی پہ دورہ پڑنے کی اطلاع ہے۔ جو اسے آج رات ہی پڑا ہے۔ اور وہ اس

وقت اسپتال میں ہے۔ یہ ہے اس کی سزا۔ عبرت ناک سزا۔ جب جب سوچے گا مرے گا۔ اور میں اسے اسی طرح باروں گا۔ تپا تپا کہ۔ ورنہ میں چاہتا تو اسے گولی بھی مار سکتا تھا۔ اس کا انکسپڈنٹ کروا کر اسے اپنا ج بھی بنا سکتا تھا مگر اسے پھر بھی اتنی اذیت نہیں پہنچ سکتی تھی۔ جتنی اب پہنچ رہی ہے۔ صرف اس خیال سے اس سوچ سے کہ اس کی بیٹی دل اور شاہ کے پاس ہے۔ بار شاہ کے بیٹے کے پاس۔

آپ اندازہ بھی نہیں کر سکتیں کہ میری طرف سے ملنے والی یہ سزا و قار آفندی کی آنے والی سات نسلیں بھی یاد رکھیں گی۔ اور رہی بات علیزے آفندی کی بے بسی کی تو وہ میں ایک دون میں ختم کروں گا۔ واپس بھیج دوں گا اسے۔ اس نے کہتے ہوئے بات ہی ختم کر ڈالی تھی اور ان کے سامنے سے ہٹ کر باہر نکل گیا تھا اب اس کا رخ اپنے بیدروم کی طرف تھا اور تھوڑا سا رنگ روم کے پتھوں پہنچ کھڑی دیکھتی رہ گئی تھیں۔

وہ گھر کیا آیا تھا کہ پورے گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی ماں بھی خوش تھی اور بہنیں بھی آگے پیچھے دوڑتی پھر رہی تھیں ایک تو اس کی رہائی کی خوشی اور دوسری اس کی جاب کی خوشی نے انہیں اپنی ساری تکلیفیں بھلا ڈالی تھیں اللہ نے واقعی انہیں صبر کا پھل دے دیا تھا اور وہ تب سے اب تک دل اور شاہ کے لیے دعائیں کر رہی تھیں جس نے ان غریبوں پہ اتنا بڑا احسان کیا تھا۔

”کیا بات ہے آخر؟ آج بڑی دل لگا کر تیاری کی جارہی ہے؟ آپ نے آفس ہی جانا ہے یا کسی ڈیٹ کا پلان ہے؟“ مریم اس کا کمر صاف کرنے کی غرض سے دوبارہ اس کے کمرے میں آچکی تھی مگر وہ ابھی تک آئینے کے سامنے کھڑا تیار ہو رہا تھا جیسی تو وہ نظروں کا زاویہ بدل کر دیکھنے پہ مجبور ہو گئی تھی اور عدیل مسکراتا ہوا اس کی سمت پلٹا تھا۔

”اف یا۔۔۔ پہلی بار تو کہیں جانے کے لیے تیار ہو رہا ہوں اور آپ لوگوں کو پہلی بار ہی کھٹکنے لگا ہے؟“ اس نے مصنوعی خفگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا جس پہ مریم حیران رہ گئی تھی۔

”او۔۔۔! تو آپ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کو کھلی چھوٹ دے دیں؟ آپ پہ نظر بھی نہ رکھیں اور آپ ایک روز اچانک ہی ہماری بھر جالی گھر لے آئیں۔۔۔ وہ بھی ہمیں خبر کیے بغیر؟“ مریم نے اسے بغور جاچتی ہوئی نظروں سے دیکھ کر حیرت اور معنی خیزی کا مظاہرہ کیا تھا۔

”یہ بھی خوش فہمی ہے تمہاری۔۔۔ ورنہ اچانک تمہاری بھر جالی کو گھر لے آتا آتا آسان بھی نہیں ہے۔ جتنا تم تصور کر رہی ہو۔۔۔ یہ کام امیر لوگوں کے ہیں۔۔۔ ہم غریب لوگوں کے نہیں۔۔۔ اچانک شادیاں وہی اریج کر سکتے ہیں۔“ عدیل نے کندھے اچکائے تھے اور چارپائی کے پائے پہ پاؤں رکھ کے ذرا سا جھکتے ہوئے بچوں کے تھے باندھنے لگا تھا۔

”ایسی کرم نوازیاں اللہ کبھی کبھی غریبوں پہ بھی کردتا ہے۔۔۔ بس مایوس نہیں ہونا چاہیے۔۔۔ اس کا کرم کسی بھی وقت ہو سکتا ہے۔“ مریم کہتے ہوئے اس کے کپڑے اور جوتے وغیرہ اٹھا کر سمیٹنے لگی تھی لیکن ابھی عدیل نے کچھ کہا بھی نہیں تھا کہ باہر دروازے پہ دستک ہونے لگی تھی اور عدیل جلدی جلدی تھے باندھ کے سیدھا ہو گیا تھا۔

”ارے آج صبح کون آگیا؟“ وہ برآمدے میں لگے وال کلاک کی سمت دیکھتے ہوئے باہر دروازے کی طرف بڑھا تھا۔

”کون؟“ اس نے دروازہ کھولتے ہوئے یوں ہی پوچھا تھا اور ساتھ ہی دروازہ بھی کھول دیا تھا مگر دروازہ کھول دینے کے بعد وہ حیران پریشان اور بے یقین سا دیکھتا رہ گیا تھا اس کے سامنے مدحیہ حیات کھڑی تھی اور وہ حیرت زدہ

ساکھڑا تھا۔

”السلام علیکم۔!“ مدحیہ نے اس کی حیرانی کو نظر انداز کرتے ہوئے سلام کیا تھا۔

”ہوں۔۔۔ ہاں۔۔۔ وعلیکم السلام۔“ وہ بمشکل اپنی حیرت اور پریشانی کے گھیرے سے باہر آتے ہوئے متوجہ ہوا تھا۔

”کیا میں اندر آسکتی ہوں؟“ اس نے خود ہی اندر آنے کے لیے اجازت مانگی تھی اور عدیل اپنی بدحواسی اور کوتاہی پہ خود کو سرزنش کرتا ہوا سامنے سے ہٹ گیا تھا۔

”ایم سوری۔۔۔ آئیے آپ اندر آئیے۔“ اس نے اسے راستہ دیا تھا اور مدحیہ اندر آگئی تھی حالانکہ اندر قدم رکھتے ہوئے اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا اور وہ اندر سے جھجک جھجک رہی تھی آخر وہ عدیل عمر کے گھر پہلی بار آئی تھی جس پہ عدیل کی بھی حالت ایسی ہی تھی جیسی اس کی ہو رہی تھی۔

”ارے مدحیہ آپ یہ؟“ مریم عدیل کے کمرے سے نکلتے ہوئے مدحیہ کو دیکھ کر بے ساختہ چکی تھی اور لپک کے اس کے قریب آئی تھی۔

”السلام علیکم۔۔۔ کیسی ہیں آپ۔“ مدحیہ نے آہستگی سے کہتے ہوئے اس کی سمت ہاتھ بڑھایا تھا جبکہ مریم اس کے بدن سے ہونے والے ہاتھ کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کے گلے لگ گئی تھی۔

”رشتہ قریب کا ہو تو قریب سے ملنا چاہیے۔ اس طرح دور سے نہیں۔“ مریم نے ذمہ داری لے لے کر کہتے ہوئے عدیل اور مدحیہ دونوں کو کن آکھیں۔۔۔ دیکھا تھا اور عدیل بال کھجاتے ہوئے پیچھے ہٹ گیا تھا۔

”امی۔۔۔ امی۔۔۔ باہر آئیں۔۔۔ دیکھیں کون آیا ہے؟“ مریم نے عابدہ خاتون کو آواز دی تھی اور وہ فاروق نیازی کے کمرے سے باہر نکل آئی تھیں مگر مریم اور عدیل کے ساتھ کھڑی جینز اور لیڈرز کوٹ میں ملبوس انتہائی ماڈرن سی لڑکی کو دیکھ کر حیران رہ گئی تھیں۔

”السلام علیکم۔“ مدحیہ نے ہی سب کو سلام کرنے میں پہل کی تھی۔

”امی۔۔۔ یہ دل اور شاہ کی بہن ہیں۔۔۔ مدحیہ حیات جب اباجی کی طبیعت خراب ہوئی تھی تو یہی ہمیں اپنی گاڑی میں اسپتال لے کر گئی تھیں۔“ مریم نے اس کا تعارف کروایا تھا اور عابدہ خاتون کے چہرے پہ خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی انہوں نے مدحیہ سے ملنے سے پہلے اک نظر عدیل کی سمت بھی دیکھا تھا وہ ان کی ایک نظر سے ہی جھل سا ہو گیا تھا کیونکہ عابدہ خاتون اسے اک نظر میں ہی ”مستائش اور ماشاء اللہ“ کا احساس دلا چکی تھیں۔

”آؤ بیٹا۔۔۔ اندر آجاؤ۔۔۔ باہر کیوں کھڑی ہو؟“ وہ اسے اپنے ساتھ لیے فاروق نیازی کے کمرے میں آگئی تھیں دراصل وہ اسے فاروق نیازی سے ملوانا چاہتی تھیں۔

”میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا تھا بھائی صاحب؟“ مریم نے ان کے اندر جانے کے بعد عدیل کو چھیڑا تھا اور عدیل بے ساختہ ہنس پڑا تھا۔

”ارے یا۔۔۔ میں نے واقعی آفس جانا ہے، میرا کوئی پلان نہیں ہے۔“

”آپ کا نہ ہو، ان کا تو ہے نا؟ اور ویسے بھی اب آپ نے آفس کیا جانا ہے بھلا؟ اب تو وہ متھے لگ چکی ہیں وہ بھی پہلے ہی روز۔“ مریم نے آج پورا پورا ارادہ باندھ رکھا تھا اسے چھیڑنے اور تنگ کرنے کا جس پہ عدیل بار بار ہنس رہا تھا اور انجوائے کر رہا تھا۔

”ارے۔۔۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا یہ متھے لگنا میری قسمت ہی سنوار دے؟“ عدیل نے اپنے فائدے کا پہلو تلاش کیا تھا جس کو سن کر مریم بھی اس کی چالاکی اور ذہانت پہ ہنس پڑی تھی۔

”صبح صبح دیدار ہو گیا ہے، قسمت تو آپ کی ویسے ہی سنور گئی ہے۔“ مریم نے پھر چھیڑنے والے انداز میں دیکھا

تھا۔
 ”آہاں۔ اتنے دنوں بعد ہوا ہے یہ دیدار بھی۔“ عدیل نے جیسے آہ بھری تھی۔
 ”بھائی! مریم نے حیرت سے چلا کے پکارا تھا۔
 ”چھوڑو یا۔ اندر جاؤ۔ وہ امی اور اباجی کے پاس اکیلی ہوگی۔“ عدیل نے اسے اندر بھیجا تھا۔
 ”اور آپ؟“ مریم نے جاتے جاتے اسے دیکھا۔
 ”میں بھی آتا ہوں۔“ وہ کہہ کر اپنے کمرے میں آگیا تھا۔ لیکن ابھی اسے دو منٹ ہی گزرے تھے کہ مریم مدحیہ کو لے کر اس کے پیچھے ہی آگئی تھی۔
 ”آپ یہاں بیٹھیں۔ بھائی سے بات کریں۔ میں تب تک چائے بنا کر لاتی ہوں۔“ مریم اسے چھوڑ کر باہر نکل گئی تھی اور وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے تھے۔
 مدحیہ کمرے کی تنہائی میں نروس سی ہو گئی تھی اور اس کا یہ نروس سا انداز عدیل کی خواہشوں کو کروٹیں بدلنے پر مجبور کر گیا تھا اس کا دل اس خواہش پہ تو کچھ زیادہ ہی مچلا تھا کہ وہ اسے کندھوں سے تھام کے اپنے بے حد قریب کر لے۔ مگر خواہش تو آخر خواہش ہی ہوتی ہے نا؟ پوری ہو جائے ضروری تو نہیں۔ سو مجبوراً ”ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے اسے اپنی اس۔۔۔۔۔۔ خواہش کو دبا کر خودیہ کنٹرول کرنا پڑا تھا۔
 ”بیٹھے۔“ عدیل نے اسے کرسی پہ بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا مگر وہ بڑے اہتمام سے کرسی پہ بیٹھنے کی بجائے عدیل کے بستر پہ ہی بیٹھ گئی تھی اور اس کے بیٹھنے کے بعد وہ خود کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا تھا اور ہمیشہ کی طرح آج بھی وہ عین اس کے سامنے ہی بیٹھا تھا۔
 ”کیا آج بھی آپ میرے اباجی کی خیریت ہی پوچھنے کے لیے آئی ہیں؟“ اس نے جان بوجھ کر اسے تنگ کرنے والا سوال کیا تھا۔
 ”آف کورس۔۔۔ اور کس لیے آتا تھا میں نے؟“ لیکن اس بار مدحیہ نے بھی اپنے مزاج کے مطابق جواب دیا تھا کیونکہ جس طرح ڈٹ کے وہ اس کے سامنے بیٹھ چکا تھا اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اسے مزید نروس کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اس لیے بستر تھا کہ وہ اس ارادے کو ارادہ ہی رہنے دیتی۔
 ”سہیلی۔“ عدیل نے اور زیادہ دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔
 ”اپنی ڈاؤٹ۔۔۔؟“ مدحیہ نے ڈائریکٹ اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں بھی جیسے مسکرا رہی تھیں۔
 ”ہاں۔۔۔ ڈاؤٹ تو ہے۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔
 ”کیا؟“ مدحیہ نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔
 ”میں تو کچھ اور ہی سمجھ رہا تھا۔“ عدیل کا لہجہ بھی کچھ اور ہی ہو رہا تھا۔
 ”کیا مطلب۔؟ کیا سمجھ رہے تھے آپ۔۔۔ مدحیہ نا سبھی سے پوچھ رہی تھی۔
 ”یہی کہ آپ خیریت پوچھنے کے لیے نہیں بلکہ خیریت دیکھنے کے لیے آئی ہیں۔“ عدیل نے دیکھنے پر زور دیا تھا اور مدحیہ اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے اپنی مسکراہٹ روکنے میں ناکام ہو گئی تھی۔ آخر وہ ٹھیک ہی تو سمجھا تھا وہ اسے دیکھنے ہی تو آئی تھی۔ کیونکہ اتنے دنوں سے دیکھا جو نہیں تھا۔
 ”اوہ۔ تو یقیناً میں ٹھیک ہی سمجھا تھا؟“ عدیل اس کی مسکراہٹ سے باغ و بہار ہو گیا تھا۔
 ”آپ سے کس نے کہا کہ آپ ٹھیک ہی سمجھتے تھے؟“ مدحیہ اب اسے تنگ کرنے کے موڈ میں تھی۔
 ”آپ کے چہرے کے اک اک نقش نے۔۔۔ آپ کی آنکھوں نے۔۔۔ آپ کے ہونٹوں نے۔۔۔ آپ کی

مسکراہٹ نے۔۔۔“ عدیل نے وہیں بیٹھے بیٹھے ذرا سا آگے جھکتے ہوئے کہا تھا اور ساتھ ہی اس کی آنکھوں کے درمیان میں بھی جھانکا تھا جہاں آج بھی عدیل کو اپنا آپ ہی بسا ہوا نظر آیا تھا۔
 ”غلط فہمی بھی تو ہو سکتی ہے آپ کی؟“ اس نے کندھے اچکائے تھے۔
 ”اگر یہ غلط فہمی ہے تو پھر میں اس غلط فہمی میں ہی خوش ہوں۔۔۔ مجھے اسی غلط فہمی میں مبتلا رہنے دیں۔“ وہ دوبارہ سیدھے ہوتے ہوئے بولا تھا۔
 ”بیٹھے۔ آپ کے لیے گرم چائے اور ساتھ میں قہمہ اور پرائٹھے۔“ مریم بڑی سی شرے اٹھائے اندر آگئی تھی۔
 ”قہمہ اور پرائٹھے؟“ کل بھائی کے آنے کی خوشی میں امی نے ان کی پسندیدہ ڈش بنائی تھی، امی کو پتا تھا کہ بھائی ناشتے میں پرائٹھے کے ساتھ بھی قہمہ ہی کھائیں گے۔ ”مریم نے مسکراتے ہوئے بتایا تھا۔
 ”اوہ! تو یہ ان کا ناشتا ہے؟ میں تو ذرا ہی گئی تھی کہ کہیں مجھے نہ کھانا پڑ جائے۔“ مدحیہ قدرے ریلیکس ہو گئی تھی اور اس کی بات یہ وہ دونوں بہن بھائی نہیں پڑے تھے۔
 ”ارے۔۔۔ کھانا تو آپ کو پڑے گا۔ کیونکہ یہ صرف ان کا ناشتا نہیں ہے۔ یہ آپ دونوں کا ناشتا ہے آپ کو شیر کرنا پڑے گا ان کے ساتھ۔“ مریم نے شرارت سے دونوں کو دیکھا تھا۔
 ”نہ۔۔۔ میں پہلے بھی ایک بار ان کو بتا چکی ہوں کہ میں اتنا ہیوی ناشتا نہیں کرتی، مجھے عادت نہیں ہے۔“ مدحیہ نے نفی میں سر ہلایا تھا اور مریم نے اس کے انکار پر عدیل کی سمت دیکھا تھا کہ اب کیا کرے؟
 ”ڈونٹ دری۔۔۔ یہ آج ناشتا میرے ساتھ ہی کریں گی۔ کیونکہ یہ ناشتا کسی ہوٹل کا نہیں، بلکہ میری امی کے ہاتھ کا بنا ہوا ہے۔“ عدیل نے مریم کو تسلی دی تھی اور وہ مطمئن ہو کر مسکراتی ہوئی باہر نکل آئی تھی مریم کو بھی اکیڈمی جانا تھا۔ اس لیے وہ تیار ہونے کے لیے چلی گئی تھی۔
 ”مگر میں۔۔۔“ مدحیہ کچھ کہہ رہی نہیں تھی اور عدیل نے ناشتا شروع بھی کر دیا تھا۔
 ”جب کسی کے ساتھ چلنا ہو تو اس کے ہر کام میں اس کا ساتھ دینا پڑتا ہے۔ چاہے وہ ناشتا ہی کیوں نہ ہو۔“ عدیل بڑے سکون سے کہتے ہوئے نوالہ منہ میں رکھ چکا تھا انداز بہت لاپرواہا تھا اور مدحیہ مزید کوئی انکار نہیں کر سکی تھی اور اس کے ساتھ ناشتا کرنے میں شریک ہو گئی تھی جس پہ عدیل ناشتا کرنے کے دوران ہی مسکرا دیا تھا۔ کیونکہ وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ چلنا چاہتی ہے اور اس کی خاطر وہ اپنے آپ کو بدل بھی سکتی ہے اور یہ بات عدیل کے لیے ایک خوش آمد بات تھی۔
 ”تھینک یو۔“ عدیل نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا تھا۔
 ”تارواٹ۔۔۔“ مدحیہ چائے کا کپ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے ٹھہر گئی تھی اور حیرانی سے سوال کیا تھا۔
 ”میرا ساتھ دینے کے لیے۔“ عدیل کا لہجہ اور جواب دونوں ہی مبہم اور مبہم سے ہو رہے تھے۔
 ”میں نے یہ ناشتا اس لیے کیا ہے کہ یہ آپ کی امی نے بنایا ہے۔“ مدحیہ بھی اتنی آسانی سے اسے خوش نہیں کرنا چاہتی تھی۔
 ”اُس اوکے۔۔۔ جس لیے بھی کیا ہے۔ مگر ساتھ تو میرا ہی دیا ہے نا؟ اس لیے تھینکس اگین۔“ عدیل چائے کے سب لیتے ہوئے لطف لے رہا تھا اور جواباً ”مدحیہ خاموش ہو گئی تھی۔
 ”اوکے! میں اب چلتی ہوں۔۔۔ کافی ٹائم لے لیا آپ کا۔“ مدحیہ تھوڑی دیر بعد اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ ہی عدیل بھی کھڑا ہو گیا تھا۔
 ”ٹائم کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت کچھ لے لیا ہے آپ نے۔“ وہ آہستگی سے بولا تھا۔

”کیا کہا؟“ مدحیہ ٹھٹھکی تھی۔
 ”کچھ نہیں کہا۔ بس ریکونسلٹ کر رہا ہوں کہ اباجی کی خیریت پوچھنے کے لیے آتی رہا کریں۔ دل بہلا رہے
 گا۔“ عدیل نے آج پھر اسے تاکید کی تھی۔
 ”کس کا۔“ مدحیہ اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے رکی تھی۔
 ”آف کورس اباجی کا۔ اور کس کا بھلا؟“ عدیل کہتے ہوئے شرارت سے قہقہہ لگا کے ہنسا تھا اور مدحیہ اپنی
 مسکراہٹ دباتے ہوئے بیک لے کر باہر نکل آئی تھی اور پھر سب سے مل کر وہاں سے رخصت ہوئی تھی جبکہ
 عدیل گھر سے نکل کر گلی میں اسے گاڑی تک چھوڑنے کے لیے آیا تھا۔
 ”ویسے ایک بات پوچھنا تو میں بھول ہی گیا کہ آپ کو گھر کا پتا کیسے چلا؟“ عدیل کو اس سوال کا خیال اب آیا تھا۔
 ”آپ کے کچھ دوست احباب بھی ہوتے ہیں شاید۔“ مدحیہ مسکرائی تھی۔
 ”وہ اچھا۔ تو یہ چھوٹے کا کمال ہے۔“ وہ فوراً سمجھ گیا تھا اور مدحیہ نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔
 ”جی۔ بہت اچھا دوست ہے یہ آپ کا۔“ مدحیہ بھی آخر دل اور شاہ کی بہن بھی تعریف میں بجل سے کام
 نہیں لیا تھا بلکہ کھل کے سراہا تھا۔
 ”جانتا ہوں۔ اور اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ جس نے مجھے ورکشاپ کی جاب کے عوض ایک مخلص دوست
 عطا کر دیا ہے۔ بلکہ مجھے تو سب کچھ اسی ورکشاپ سے ہی ملا ہے۔“ عدیل اللہ کا شکر گزار ہو رہا تھا۔
 ”ہوں۔ اچھی بات ہے۔“ مدحیہ بیک سے چالی نکال کر لاک کھولنے لگی تھی اور لاک کھول کر گاڑی میں
 بیٹھتے ہوئے پلٹ کر عدیل کو دیکھا تھا۔
 ”تھینکس۔ آپ نے اتنا اچھا اور مزے دار سناٹا کر دیا۔ بہت اچھا لگا مجھے۔“ مدحیہ نے شکریہ ادا کیا تھا
 اور یہ سچ بھی تھا۔ کیونکہ اسے سناٹا بہت مزے دار لگا تھا۔
 ”یہ سناٹا میں آپ کو روز بھی کر دے سکتا ہوں۔ اگر آپ چاہیں تو۔۔۔“ عدیل اسے سر ہٹا کر نظروں سے دیکھ
 رہا تھا۔

”تھینک یو۔ میں آجایا کروں گی۔“ مدحیہ اس کی بات گول کر گئی تھی اور وہ سمجھ کر مسکرا دیا تھا۔
 ”اوکے! گڈ بائے۔“ وہ کہہ کر ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھ گئی تھی اور دروازہ بند کرنے کے بعد شیشہ فولڈ کر دیا تھا اور
 گاڑی اشارت کرتے ہوئے بیک کرنے لگی تھی۔
 ”اور ہاں آپ سے ایک بات کہنا تو میں بھول ہی گئی۔“ وہ گاڑی کو فوراً ڈرائیونگ سے ہٹا کر بولی تھی۔
 ”کیا بات؟“ وہ جی جان سے متوجہ ہوا تھا۔
 ”یہی کہ آج آپ بہت ہینڈ سم لگ رہے ہیں۔ آج مجھے لگا کہ میں غلطی پر نہیں تھی۔“ وہ کہہ کر ایک سیکنڈ کی
 بھی تاخیر کے بغیر گاڑی اڑا لے گئی تھی اور عدیل وہیں کھڑا سی گلی میں کھڑا مسکراتا رہ گیا تھا اس کے آج کے دن کی
 صبح واقعی بہت اچھی ثابت ہوئی تھی وہ پینٹ کی جیپوں میں ہاتھ پھنسا کے کافی مسرور سے انداز میں چلتا ہوا واپس
 گھر آ گیا تھا۔ جہاں عابدہ خاتون اور مریم اس کی منتظر تھیں۔

”میں بھی تمہارے ساتھ لاہور چلوں گی۔“ وہ اگلی صبح سو کر اٹھا تو وہ پہلے سے فیصلہ کیے بیٹھی تھیں اور وہ
 ڈرائنگ روم میں رکھا ان کا چھوٹا سا پیچی کیس دیکھ کر ہی سمجھ گیا تھا کہ ان کی تیاری پکی ہے مگر نہ جانے کیوں دل
 اور کوان کا فیصلہ اچھا نہیں لگا تھا وہ سن کر خوش نہیں ہوا تھا۔

”آپ لاہور کیوں جانا چاہتی ہیں؟“ دل اور سہلے نہ چاہتے ہوئے بھی استفسار کر رہی لیا تھا۔
 ”کیوں۔؟ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“ بتول شاہ نے خفگی سے دیکھا تھا۔
 ”کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ آپ فی الحال لاہور جائیں۔“ اس نے برملا اظہار کیا تھا۔
 ”مگر کس لیے؟ کچھ بناؤ تو سہی؟“ وہ جھنجھلائی تھیں۔

”اس لیے کہ ابھی میرے بہت سے کام ہیں۔“ وہ انہیں روکنا چاہتا تھا۔
 ”تم فکر مت کرو۔ تمہارے سارے کام پٹانے میں تمہارا ساتھ دوں گی مدد کروں گی تمہاری۔“

انہوں نے دل اور کو بہلایا تھا۔ مگر وہ الجھ رہا تھا اس کا دل نہیں مان رہا تھا کہ وہ لاہور جائیں۔
 ”مجھے آپ کی مدد کی نہیں۔ بلکہ دعا کی ضرورت ہے اور وہ آپ یہاں بھی کر سکتی ہیں پلیز ماں! آپ ابھی مت
 جائیں میں آپ کو بعد میں آکر لے جاؤں گا۔“ وہ انہیں مسلسل روک رہا تھا۔

”دیکھو شاہ! زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہے کب ہے اور کب نہیں ہوگی یہ بھلا کس کو خبر؟ میں نے چند روز
 پہلے زری سے ملنے کا ذرا لاہور آنے کا وعدہ کیا تھا مجھے وہ وعدہ تو پورا کرنے دے۔ کہیں ساتھ لے کر ہی نہ مر جاؤں۔“

اور میری زندگی کی طرح میری قبر یہ بھی کوئی بوجھ پڑا رہے؟“ بتول شاہ کی بات پہ دل اور بے ساختہ چپ سا ہو گیا تھا
 لیکن زری کا خیال آتے ہی اس نے دوبارہ ان کی سمت دیکھا تھا۔

”زری سے کیوں ملنا ہے آپ نے؟“ وہ تجسس سے پوچھ رہا تھا البتہ چہرے پہ الجھن تھی۔
 ”کیونکہ اس کی زندگی بھی بتول شاہ کی زندگی سے مختلف نہیں ہے درود سا بھانہ سہی۔ مگر تنہائی کا سفر سا بھانہ ہی
 ہے دونوں کا۔ پاؤں دیکھو تو آبلے ہی آبلے ہیں۔“ کہتے ہوئے لہجہ بھر گیا تھا ان کا مگر پھر وہی حقیقت کہ اپنے
 آپ کو سنبھال گئی تھیں اور دل اور مزید کچھ کہے بغیر لاہور جانے کے لیے تیار ہونے لگا تھا اب کچھ اور کہنے کی تو
 گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔

(باقی آئندہ)

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

خوبصورت سرورق

خوبصورت چھاپی

شائع ہوئے ہیں

مضبوط جلد

آئسٹ پیپر

☆ ستاروں کا آنگن، نسیم سحر قریشی	قیمت: 450 روپے
☆ درو کی منزل، رضیہ جمیل	قیمت: 500 روپے
☆ اے وقت گواہی دے، راحت حبیب	قیمت: 400 روپے
☆ تیرے نام کی شہرت، شازیہ چودھری	قیمت: 250 روپے
☆ امرنیل، عمیرہ احمد	قیمت: 550 روپے

مکمل نام: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361



بڑی حویلی کے تمام کمین و قار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نیل حیات دوی بہن بھائی ہیں، مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے، وہ انگلینڈ کی رنگینوں میں مکمل طور پر رنگ چکی ہے، جس کے پیش نظر فائزہ بیگم، نیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں، لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے، جس پر نیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پھنپ رہا ہے۔

ذریل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے، مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، بے بسی اور مجبور سے اسے تنگ آخر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے، لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باؤ امتیاز مل جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے، جس پر ذریل کافی خوش ہوتا ہے، اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میسرک پاس آوی ہے، وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے، وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دراختہ شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے، وہ اپنے قول و فعل کا بہت ریکا آوی ہے، اس نے

—۲۹—
انتیسویں قسط



وانیال کو اس کی فلائٹ کا پہلے سے ہی پتا تھا۔
 اسی لیے وہ کسی ڈرائیور کو ایئر پورٹ پہنچنے کے بجائے خود ہی اسے ریسیو کرنے کے لیے آگیا تھا۔ جبکہ دوسری طرف آذر کو بھی ڈرائیور کی ہی امید تھی لیکن ڈرائیور کی جگہ وانیال کو دیکھ کر اسے حیرت بھی ہوئی تھی اور وہ ٹھٹکا بھی تھا لیکن پھر بھی اس نے فوراً ہی اپنی حیرت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ بلکہ دبا گیا تھا۔
 ”السلام علیکم۔! کیسے ہو؟“ آذر نے ہی آگے بڑھ کر اس سے ہاتھ ملانے اور حال احوال پوچھنے میں پل کی تھی کیونکہ وانیال تو اپنی جگہ پہ خاموش کھڑا تھا۔
 ”وعلیکم السلام۔! میں ٹھیک ہوں اللہ کا شکر ہے تم اپنی سناؤ کیسے ہو؟“ وانیال نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔
 ”میں بھی ٹھیک ہوں۔! مجھے کیا ہونا ہے بھلا؟“ آذر نے لاپرواہی سے کندھے اچکاتے ہوئے کہا تھا اور قدم پارکنگ کی سمت بڑھا دیے تھے۔
 ”ہونے کو تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس میں کون سی دیر لگتی ہے۔؟“ وانیال نے استغناء سے لہجے میں کہتے ہوئے آذر کے ہاتھ سے اپنی کیس کا ہینڈل تھام لیا تھا اور اپنی کیس کو گھسیٹتے ہوئے اس کے ساتھ اس کے برابر چلنے لگا تھا۔
 ”ہو نہ۔! واقعی کچھ بھی ہونے میں دیر نہیں لگتی۔“ آذر نے آہستگی سے اعتراف میں سر ہلایا تھا۔
 ”ہاں۔! انسان آخر واپس لوٹ ہی آتا ہے تم سناؤ واپسی کا سفر کیسا رہا؟“ وانیال سامنے دیکھتے ہوئے چل رہا تھا جبکہ آذر کی نظریں چونک کر وانیال کے چہرے پہ جا ٹھہری تھیں۔
 ”واپسی کا سفر۔؟“

”ہاں۔! واپسی کا سفر۔ اور شاید علیزے سے کوئل تک کا سفر۔“ وانیال عجیب سے انداز میں کہتے ہوئے آگے بڑھ کے گاڑی کے ڈور کھولنے لگا تھا جبکہ آذر اس کی بات پہ دیکھتا رہ گیا تھا۔
 ”اب دیکھ کیا رہے ہو؟ گاڑی میں بیٹھو واپس تو تم آئی گئے ہو دوبارہ کہاں جاؤ گے؟“ وانیال نے اپنی کیس گاڑی کی ڈیگی میں رکھنے کے بعد اسے بھی گاڑی میں بیٹھنے کے لیے متوجہ کیا تھا اور آذر کی دھیان سے چونک کر بے ساختہ ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے فرنٹ ڈور کھول کر گاڑی میں بیٹھ گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی وانیال نے بھی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔
 ”گھر چلو گے یا ہسپتال۔؟“ اس نے بڑی احتیاط سے گاڑی پارکنگ سے نکال کر روڈ پہ ڈالتے ہوئے آذر سے سوال کیا تھا جس پہ آذر کو ایک بار پھر جو نکلنا پڑا تھا۔
 ”ہسپتال۔ مگر کیوں۔؟“ اس نے وانیال کی سمت دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔
 ”ڈیڈ کی طبیعت بہت خراب ہے۔ کل سے ہسپتال میں ایڈمٹ ہیں۔ میں بھی ہسپتال میں ان کے پاس ہی تھا۔ وہیں سے تمہیں ریسیو کرنے کے لیے آیا ہوں۔“ وانیال ڈرائیونگ کے دوران بڑے سکون سے اسے جواب دے رہا تھا۔

”تم نے کل تو مجھے نہیں بتایا تھا۔؟“ آذر پریشان ہو چکا تھا۔
 ”کل بتا رہا تھا تو تم کیا کر لیتے۔؟ آنا تو پھر بھی تم نے آج ہی تھا نا؟“ وانیال تو جیسے ہر بات کو ہی سکون سے لے رہا تھا۔
 ”وانیال۔! تم ہر بات میں طنز سے کام کیوں لے رہے ہو۔؟“ آذر کو جھنجھلاہٹ ہونے لگی تھی۔
 ”ہو نہ۔! مجھے کیا ضرورت ہے ہر بات میں طنز سے کام لینے کی۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ دلوں میں اور لہجوں

”وانیال۔! تم ہر بات میں طنز سے کام کیوں لے رہے ہو۔؟“ آذر کو جھنجھلاہٹ ہونے لگی تھی۔
 ”ہو نہ۔! مجھے کیا ضرورت ہے ہر بات میں طنز سے کام لینے کی۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ دلوں میں اور لہجوں

میں ذہراتر آیا ہے جن کی آمیزش ہر بات اور ہر لفظ میں محسوس ہوتی ہے۔ اس میں کوئی دانستہ عمل شامل نہیں ہے۔“ اس نے موڑ کاٹتے ہوئے حواز پیش کیا تھا اور آذر اس کی بات پہ لب بلیچ کے رہ گیا تھا۔
 ”خیر پھر بھی تمہیں طنز لگا ہے تو معذرت چاہتا ہوں۔“ وانیال نے کندھے اچکاتے ہوئے معذرت بھی کر لی تھی اور آذر مزید کچھ بھی نہیں کہہ سکا تھا اور ان کا باقی کا سفر خاموشی میں ہی کٹا تھا وانیال نے گاڑی ہسپتال کی پارکنگ میں پارک کی تھی اور آگے پیچھے دونوں ہی گاڑی سے اتر آئے تھے ان کا رخ اندر کی طرف تھا۔
 ”آئی۔! ہسپتال کی رابڈری میں داخل ہوتے ہی آسیہ آندری سے ٹکراؤ ہوا تھا اور وہ بے ساختہ ان کے سامنے ٹھہر گیا تھا جس پہ آسیہ آندری بھی اچانک اسے اپنے سامنے دیکھ کر خود پہ کنٹرول نہیں رکھ پائی تھیں۔
 ”آذر۔! میرا بیٹا۔“ وہ اس کے کندھے سے لگ کر بے اختیار ہچکیوں سے رو پڑی تھیں انہوں نے بیچ راستے کا بھی خیال نہیں کیا تھا اور آذر ان کے کندھے کے گرد بازو حائل کرتے ہوئے انہیں تسلی دینے لگا تھا۔
 ”پلیز آئی۔! سنبھالیں اپنے آپ کو ڈیڈان شاہ اللہ جلدی ٹھیک ہو جائیں گے۔ آپ بس دعا کریں ان کے لیے۔“ اس نے دوسرے ہاتھ سے ان کے سر اور کندھے کو ٹھکرتے اور سہلاتے ہوئے انہیں ڈھارس دینے کی کوشش کی تھی۔

”میری دعاؤں سے کب کچھ سنو رہا ہے۔؟ سب کچھ برباد ہو گیا ہے میں ہمیں اجڑ گئی ہوں آذر۔ میرا سب کچھ بکھر گیا ہے۔ میں تنہا ہو گئی ہوں۔“ وہ بے تحاشا روتے ہوئے اپنا درد اپنی تکلیف اور اپنا دکھ بیان کر رہی تھیں جس کو آذر بھی گہرائی سے اور کافی اچھی طرح سے سمجھتا تھا مگر کیا کر سکتا تھا بھلا۔؟ سوائے تسلی اور دلا سوں کے۔!

”میں تنہا ہو گئی ہوں آذر۔! میں بھری دنیا میں تنہا ہو گئی ہوں۔ اکیلی رہ گئی ہوں سب کے درمیان۔“ آسیہ آندری تڑپ تڑپ کے رو رہی تھیں مین کر رہی تھیں ان سے علیزے آندری کی جدائی کا اور وقار آندری کی بیماری کا دکھ برداشت نہیں ہو رہا تھا۔
 ”ایسا مت کہیں آئی۔! ہم سب آپ کے ساتھ ہیں آپ کے ہر دکھ سکھ میں آپ کے شریک ہیں آپ اپنے آپ کو اکیلا کیوں سمجھ رہی ہیں؟ کیا پہلے کبھی ایسا ہوا ہے جواب ہو گا؟ بس درمیان میں حالات کچھ ایسے ہو گئے کہ پوری زندگی کا توازن ہی بگڑ گیا تھا۔ لیکن ہمیشہ تو ایسا نہیں ہو سکتا نا؟ توازن آخر بحال ہو ہی جاتا ہے۔“ آذر نے انہیں بھرپور تسلی دینے کی پوری کوشش کی تھی اور پھر یونہی انہیں اپنے ساتھ لیے وقار آندری کے لیے ریزرو پرائیویٹ روم میں لے آیا تھا اور اس کے پیچھے کھڑا وانیال اس کی باتوں پہ غور کرتا رہ گیا تھا۔!

اس ایک خواب میں آج تک
 میں بندھا ہوں آس کے جال میں
 کوئی شہر یا روافض کا
 کبھی آئے عشق کے تخت پر
 کہیں دور شہر جمال میں
 میرے سرد جسم کو ڈھانپ دے
 وہ سلگتی سانسوں کی مثال میں
 جہاں میں ہوں اس کے جواب میں

جہاں وہ ہو میرے سوال میں

نہ ہو ایک سانس کا فاصلہ

جہاں اس کے میرے وصال میں۔

آج بہت ٹھنڈی تھی اور وہ تازہ تازہ شاہ رے لے کر باہر آئی تھی اسی لیے ٹھنڈے سینے کی خاطر اس نے بی بی لاؤنج کا بیئر آن کر دیا تھا اور ذرا سی دیر میں ہی پورے لاؤنج کا ماحول گرمائش کی لپیٹ میں آ گیا تھا رفتہ رفتہ اس کی پکی کمی ہوتی گئی اسی لیے وہ ریلیکس ہو کر صوفے پہ نیم دراز سی بی بی وی دیکھنے لگی تھی اور یونہی بی بی وی دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔

اور آنکھ لگے ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ اسے رابداری میں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی تھی چاپ بھی ایسی کہ دل پہ لگے۔ اور دل جاگ جائے اور جب انسان کا دل جاگ جاتا ہے تو اس کی دنیا سوچ جاتی ہے۔ اور اس وقت زری کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ اس کا دل جاگ چکا تھا اور دنیا سوچ چکی تھی۔

اس کے دل کی بستی کی ہر گلی میں بس اک ہی چاپ سنائی دینے لگی تھی اور یہ چاپ اس کی پوری ذات پہ حاوی ہو چکی تھی۔ وہ اس چاپ کی چاہ میں سر تاپا سماعت بن گئی تھی اور جہاں وہ چاپ ٹھہری تھی وہیں اس کا دل ٹھہر گیا تھا۔

اس کی دھڑکنیں اور سانسیں بھی ٹھہر گئی تھیں۔

دل اور شاہ اس کے پاس کیا ٹھہرا تھا کہ اس کی ذات کیا کائنات بھی ٹھہر گئی تھی۔ بس صرف احساسات اور جذبات تھے جو پچھل میں تھے باقی سب کچھ تو ٹھہرا ہوا تھا اور اسی ٹھہرے ہوئے احساس کے اثر نے زری کو کچی نیند سے جگا دیا تھا۔

وہ بے ساختہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور اس نے یکدم گردن موڑ کر صوفے کی دائیں سائیڈ کی طرف دیکھا تھا اور پھر دیکھتی رہ گئی تھی کیونکہ وہ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کی نظریں زری کے سیاہ وراڑ گھنے بالوں پہ تھیں خم آلود بال اس کے تازہ تازہ غسل کی گواہی دے رہے تھے اور دل اور شاہ ان ظالم گواہوں کی گواہی کو جھٹلا نہیں پا رہا تھا بلکہ وہ تو پورے کا پورا ان کے حق میں نظر آ رہا تھا۔

اور زری اسے ان گواہوں کے حق میں دیکھ کر صوفے سے کھڑی ہو گئی تھی اس کا ٹھہرا ہوا دل پھر سے حرکت میں آ گیا تھا اور دل کی اس حرکت کے آگے اس کے قدم بے اختیار وہ بے بس ہو گئے تھے وہ بنا سوچے سمجھے ہی اس کے قریب اور اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی اور پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ دل اور نے اسے دیکھ کر۔ نظریں جھکا لی تھیں اور نہ سر جھکا یا تھا بلکہ وہ تو اسے نظر جمائے بغور دیکھ رہا تھا حالانکہ اس طرح دیکھنا اس کا شیوہ نہ تھا وہ ساری دنیا کو اس طرح دیکھ سکتا تھا مگر زری کو نہیں۔

لیکن آج اس وقت وہ جس طرح زری کو دیکھ رہا تھا اس طرح تو اس نے کبھی کسی کو بھی نہیں دیکھا تھا آج نظریں بھی اور تھیں۔ انداز بھی اور تھا۔ اور سامنے کا منظر بھی اور تھا۔

جب سب کچھ اور تھا تو ظاہری بات تھی کہ وہ دونوں بھی کچھ اور ہی لگ رہے تھے اس لیے تو ایک دوسرے کے اتنے قریب نظر آ رہے تھے اتنے قریب کہ دھڑکنوں کو دھڑکنیں سنائی دینے لگی تھیں ایک کا دل دوسرے کے دل کی دھڑکنیں با آسانی سن رہا تھا۔

زری نے اس کے دل کی پر شور دھڑکنوں کو شانت کرنے کے لیے اپنا ہاتھ اس کے دل کی سمت بڑھا دیا تھا۔ "زری۔!" ابھی اس کا ہاتھ اس کے سینے پہ اس کے دل تک پہنچا ہی نہیں تھا کہ اس پکار پہ لرز کر رہ گیا تھا اک مانوس سی آواز تھی جو اسے دل اور شاہ کے دل تک پہنچنے سے روک گئی تھی ورنہ فاصلہ تو بس اک ہاتھ بھر کا رہ

گیا تھا۔

اور زری اس ہاتھ بھر کے فاصلے کے رہ جانے پہ ششدر سی رہ گئی تھی اس کا دل کسی اتھا گہرائی میں ڈوبتا چلا گیا تھا۔

"زری۔!" اب کی بار پکارنے کے ساتھ ساتھ اس کا دایاں گال بھی تھپکا گیا تھا اور وہ سٹپا کے ہوش میں آ گئی تھی۔

اس کی آنکھ کھل گئی تھی اور آنکھ کھلتے ہی جیسے سب کچھ سامنے آ گیا تھا اس کی کچی نیند کا خواب حقیقت کی تصویر نظر آیا البتہ یہ اور بات تھی کہ اس حقیقت میں کوئی اور چہرہ بھی موجود تھا اسی آواز کی طرح مانوس سا۔

"لگتا ہے میری جان بڑی گہری نیند سو رہی تھی۔" انہوں نے بڑی اپنائیت اور نرمی سے کہتے ہوئے اسے محبت پاش نظروں سے دیکھا تھا اور زری حقیقت میں مجسم انہیں اپنے سامنے دیکھ کر تڑپ کے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"بتول آئی۔!" وہ ہوش و حواس میں آتے ہی ان کو پہچان گئی تھی حالانکہ وہ دونوں ایک دوسرے کو پہلی بار رو برو دیکھ رہی تھیں۔

"اوہ۔! تو پہچان ہی لیا تم نے۔" بتول شاہ نے مسکراتے ہوئے اسے گلے لگا لیا تھا اور زری بھی بے ساختہ مسکرا دی تھی۔

"اپنے کو پہچاننے میں وقت نہیں لگتا۔ ان کو تو ان کے قدموں کی چاپ سے ہی پہچان لیا جاتا ہے۔" زری مسکرا کر کہتی ہوئی ان سے الگ ہوئی تھی اور ان سے ذرا فاصلے پہ کھڑا دل اور شاہ گلا کھنکھارتے ہوئے انہیں اپنی موجودگی کا احساس دلانے پہ مجبور ہو گیا تھا اور زری یکدم کرنٹ کھانے سیدھی ہوئی تھی وہ نظریں اور سر جھکائے ہوئے اس کی طرف سے تقریباً "سرخ موڑے کھڑا تھا۔

جو اشارہ تھا کہ وہ بغیر دوپٹے کے ننگے سر کھڑی ہے اور وہ اسے اس طرح اس حلیے میں نہیں دیکھ سکتا۔ اور کبھی ہو بھی تو نہیں سکتا کہ وہ زری کے سامنے اپنی نظروں کو گستاخ ہونے دیتا جیسی ہمیشہ نظریں جھکی ہوئی رہتی تھیں اور زری بھی ہمیشہ کی طرح اس کا گریز سمجھتے ہوئے سنبھل گئی تھی اور اس نے فوراً "سر پہ دوپٹا اوڑھ لیا تھا۔"

"السلام علیکم۔!" اس نے اچھی طرح دوپٹہ اوڑھ لینے کے بعد اسے سلام کیا تھا اور دل اور نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر اس کی سمت دیکھا تھا وہ دوپٹہ اوڑھ چکی تھی اور اسی کی سمت دیکھ رہی تھی۔

"وعلیکم السلام۔! عبد اللہ کہاں ہے؟" وہ سلام کا جواب دیتے ہی بات عبد اللہ تک لے گیا تھا۔

"وہ بھابھی کے ساتھ مارکیٹ تک گئے ہیں آپ لوگ بیٹھیں وہ بس آتے ہی ہوں گے۔" زری نے اسے اور بتول شاہ کو ایک ساتھ بیٹھنے کا کہا تھا اور خود سامنے سے ہٹ گئی تھی۔

"ارے۔! تم کہاں جا رہی ہو بیٹا؟" بتول شاہ نے صوفے کی سمت بڑھتے ہوئے استفسار کیا تھا۔

"بس عبد اللہ بھائی کو فون کرنے لگی ہوں کہ وہ ذرا جلدی گھر آجائیں۔" وہ کہتے ہوئے فون سیٹ کے پاس آ گئی تھی کیونکہ اس کا اپنا موبائل اوپر اس کے بیڈ روم میں رکھا ہوا تھا۔

"ارے۔! رہنے دو بیٹا۔ آجائیں گے وہ لوگ بھی۔ ابھی تم تو ہمارے پاس بیٹھو۔" بتول شاہ نے اسے فون کرنے سے باز رکھنا چاہا تھا لیکن دل اور شاہ کی موجودگی میں وہ انہیں ٹھیک طرح سے کمپنی بھی نہیں دے سکتی تھی اس لیے نگارش بھابھی اور عبد اللہ بھائی کی موجودگی ضروری تھی اور اس نے انہیں فون بھی کر دیا تھا اور پھر ملازمہ کو چائے وغیرہ کا کہہ کر دوبارہ ان کے پاس آ گئی تھی۔

"اوسر آؤ۔! ادھر میرے پاس بیٹھو۔" انہوں نے زری کو اپنے قریب بیٹھنے کا کہا تھا اور وہ نجائے کیوں دھڑکتے

دل کے ساتھ ان کے قریب بیٹھتے ہوئے اندر سے زور ہو رہی تھی شاید اس لیے کہ عین سامنے والے صوفے پر دل اور شاہ بیٹھا ہوا تھا یا پھر اس لیے کہ وہ دل اور شاہ کی ماں کے بالکل برابر میں بیٹھی ہوئی تھی لیکن جو بھی تھا اس کا دل اندر ہی اندر کپکپا رہا تھا اور چہرہ جھکا ہوا تھا۔

”کیا بات ہے اس طرح چپ کیوں بیٹھ گئی ہو؟ کیا ہمارا اچانک آنا اچھا نہیں لگا؟“ بتول شاہ نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے انتہائی نرمی اور دلچسپی سے پوچھا تھا۔

”نہیں۔۔۔ نہیں آئی۔۔۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔۔۔ بس وہ میں سو کے اٹھی ہوں شاید اس لیے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔“ اس نے کافی آہستگی سے جواب دیا تھا اور بتول شاہ اس کی بات پر مسکرا دی تھیں۔

”تو پھر ایسا کرو۔۔۔ ہم دونوں بیٹھے ہیں تم دوبارہ سو جاؤ نیند پوری ہو جائے گی تو سب سمجھ آ جائے گا۔“ بتول شاہ کی بات پر دل اور زری کے چہرے پر بیک وقت مسکراہٹ ابھری تھی اور دونوں کی نظروں کا تصادم بھی ہوا تھا کیونکہ دونوں نے ایک دوسرے کو بیک وقت دیکھا تھا اور اس مسکراہٹ کا منظر ان دونوں کے ہی دل میں اتر گیا تھا۔

”کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ آپ آئیں اور میں آرام سے سو جاؤں۔۔۔؟“ زری بڑی معصومیت اور ساوگی سے پوچھ رہی تھی اور بتول شاہ نے مسکراتے ہوئے اسے دوبارہ اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا۔

”مذاق کر رہی ہوں بیٹا اور نہ مجھے پتا ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔“ انہوں نے اس کی پیشانی چومتے ہوئے اس کے گال کو تھپکا تھا اور ان کی اتنی بے لوث محبت اور محبت کے اس اظہار پر زری کے چہرے پر سرخی بکھر گئی تھی اس کا چہرہ لال ہو گیا تھا اور وہ بے وجہ ہی اپنے ہاتھوں کو مسلتے لگی تھی اور دل اور اس کی کنفیوژن سمجھ گیا تھا اسی لیے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”آپ لوگ بیٹھیں باتیں کریں میں تب تک ایک کال کر لوں۔“ وہ اپنا سیل فون نکالتے ہوئے زری کی مشکل حل کرتا ہوا ہمانہ بنا کر وہاں سے نکل آیا تھا۔

اور پھر ہر لان میں آکر اس نے واقعی نبیل کا نمبر ڈائل کر لیا تاکہ وہ اتنی دیر میں اس سے کام کے متعلق کچھ انفارمیشن ہی لے لیتا اور دوسری طرف نبیل بھی جیسے اس کے فون کے ہی انتظار میں تھا اس نے دوسری رنگ پے ہی کال ریسیو کر لی تھی۔

”ہیلو۔“ نبیل نے کافی بے تابی سے ہیلو کہا تھا کیونکہ دل اور کل سے دستیاب جو نہیں ہو رہا تھا۔

”السلام علیکم! دل اور نے کافی سنجیدگی سے اور نئے تیلے انداز میں سلام کیا تھا۔

”وعلیکم السلام! کہاں ہو تم؟ میں کل سے تمہارے نمبر پر رٹائی کر رہا ہوں مگر تمہارا نمبر آف جا رہا تھا پھر میں نے گھر کے نمبر پر کال کی تو گلاب خان سے پتا چلا کہ تم شاید اسلام آباد چلے گئے ہو اسی لیے مجھے پریشانی ہو رہی تھی۔ سب خیریت تو تھی یا۔۔۔؟“ نبیل واقعی بے حد پریشان لگ رہا تھا۔

”ہاں! خیریت تھی۔۔۔ بس اماں سے ملنے گیا تھا۔۔۔ آج واپس آ گیا ہوں۔“ دل اور ہنوز سنجیدگی سے جواب دے رہا تھا لیکن نبیل نے ابھی تک اس کی سنجیدگی کو نوٹس نہیں کیا تھا۔

”اچھا۔۔۔! تو پھر آئی کا سنا وہ کیسی ہیں؟ تم انہیں ساتھ ہی لے آتے؟“ نبیل کو حقیقتاً خوشی ہوئی تھی۔

”ہم لوگ اس وقت عبد اللہ کے گھر پر ہیں اماں عبد اللہ کی فیملی سے ملنے کے لیے آئی ہیں۔“

”وہ اچھا اچھا! تو یہ بات ہے؟ لیکن تم یہ تو بتاؤ کہ تمہیں کیا ہوا ہے؟ تم کچھ اپ سیٹ لگ رہے ہو؟“ نبیل کا دھیان بالآخر اس کی طرف ہو ہی چکا تھا۔

”نہیں۔۔۔! کچھ نہیں ہوا اتنی دور سے ڈرائیونگ کر کے آیا ہوں اس لیے تھکا ہوا ہوں۔“ دل اور نے اسے

”بال دیا تھا۔“
”ہاں۔۔۔“ نبیل بھی بڑی سعادت مندی سے اس کے ٹالنے سے ٹل گیا تھا۔

”ٹھیک ہے! میں اس وقت کال بند کرتا ہوں میرا خیال ہے کہ عبد اللہ آگیا ہے۔“ دل اور نے کال بند کرنی چاہی تھی اور نبیل جیسے چل گیا تھا۔

”اوکے۔۔۔! پھر میں بھی آ رہا ہوں“ عبد اللہ حافظ اس نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا اور دل اور نے پلٹ کر گیٹ کی طرف دیکھا تھا جہاں سے عبد اللہ کی گاڑی اندر داخل ہو رہی تھی۔

عبد اللہ اور نگارش دونوں ہی آگے پیچھے گاڑی سے اتر آئے تھے لیکن عبد اللہ نے اس کی طرف کوئی بھی دھیان دینے بغیر اندر کی طرف قدم بڑھا دیے تھے جس پر دل اور کو پہلے تو حیرانی ہوئی تھی لیکن پھر وہ اگلے ہی پل اس کی اس اجنبیت اور لا تعلقی کی وجہ سمجھ گیا تھا یعنی وہ ابھی تک اس سے ناراض تھا اسی لیے اتنی سنجیدگی سے باوجود وہ اس کی ناراضی کا سوچ کر بے ساختہ مسکرا دیا تھا۔

”السلام علیکم دل اور بھائی! کیسے ہیں آپ؟“ نگارش عبد اللہ کو اندر جاتے دیکھ کر حیران ہوئی تھی لیکن وہ دل اور کو انور کر کے اس کے پیچھے اندر نہیں جاسکی تھی بلکہ لان میں کھڑے دل اور کے پاس آکھڑی ہوئی تھی۔

”وعلیکم السلام بھائی۔۔۔! میں ٹھیک ہوں آپ سنا میں آپ کی طبیعت اب کیسی ہے؟“ دل اور نے گیٹ بند کرتے ہوئے نگارش کی سمت دیکھتے ہوئے بڑے نارمل سے انداز میں پوچھا تھا۔

”اللہ کا شکر ہے! میں اب ٹھیک ہوں لیکن آپ یہ بتائیں کہ کیا آپ لوگوں کے درمیان کوئی مسئلہ ہوا ہے کہ آپ لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا بھی نہیں؟“ نگارش دل میں اٹھنے والا سوال زبان پر لائے بغیر نہیں رہ سکی تھی اور دل اور اس کے سوال پر ایک بار پھر مسکرا دیا تھا۔

”نہیں! میری طرف سے تو ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔۔۔ بس وہ خود ہی کسی بات پر ناراض ہے لیکن ڈونشوری جلد ہی مان بھی جائے گا۔“ دل اور نے لا پرواہی سے سر جھٹکا تھا اور نگارش دل اور کو نارمل دیکھ کر زرارہ یلیکس ہو گئی تھی۔

”اوکے۔۔۔! وہ ناراض ہیں نا۔۔۔ ہم تو نہیں؟ اس لیے پلیز اب اندر چلیے۔۔۔ میں آپ کو چائے پلواتی ہوں۔“ نگارش نے مسکراتے ہوئے کہا تھا اور دل اور نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اندر کی طرف قدم بڑھا دیے تھے اور نگارش بھی اس کے پیچھے ہی اندر چلی آئی تھی۔

”زری! دل اور بھائی بھی چائے پیس گئے۔“ نگارش نے عبد اللہ اور بتول شاہ کو چائے سو کرتی زری کو متوجہ کیا تھا اور زری نے ان دونوں کی طرف سے فارغ ہو کر دل اور کے لیے بھی ایک کپ اٹھا لیا تھا۔

”نہیں! میں چائے نہیں پیوں گا۔“ دل اور نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے انکار کر دیا تھا۔

”کیوں؟ چائے کیوں نہیں پیس گئے۔۔۔؟“ جہاں اس کے انکار پر نگارش ٹھٹکی تھی وہیں زری کے قدم بھی رک گئے تھے کیونکہ وہ اسے چائے پینے کی غرض سے نبیل کی دوسری سائیڈ سے ہو کر اسی کی طرف آ رہی تھی لیکن اس کے انکار پر اس کے قدم وہیں کے وہیں ٹھم گئے تھے۔

”جہاں گھر آئے مہمان کو سلام تک نہیں کیا جا تا میں وہاں چائے نہیں پی سکتا یہ میرا اصول ہے۔“ اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا تھا اور اس کا یہ اشارہ کس کی طرف ہے؟ یہ بات عبد اللہ بھی سمجھ چکا تھا اور نگارش بھی۔

”اچھا۔۔۔! تو الٹا ”زری“ بھی تم ہی دکھا رہے ہو؟“ عبد اللہ کو اس کی بات سن کر مزید تاؤ آیا تھا اور وہ چائے کا

سب لیتے لیتے رک گیا تھا جس پہ دل اور اپنی مسکراہٹ دیا گیا تھا کیونکہ اسے پتا تھا کہ اگر عبد اللہ نے اس کے چہرے پہ مسکراہٹ دیکھ لی تو وہ غصے سے اور زیادہ تپ اٹھے گا لیکن زری کی نظروں سے یہ مسکراہٹ مخفی نہیں رہ سکی تھی اس کی بے تاب نظریں دل اور شاہ کے چہرے کی ہی ہو کر رہ گئی تھیں۔

”مجھے کیا ضرورت ہے تڑی دکھانے کی؟ میں یہاں اماں کو چھوڑنے کے لیے آیا ہوں کوئی تڑی دکھانے نہیں آیا۔“ دل اور نے لاپرواہی کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا جس پہ عبد اللہ دانت کچکپا کے رہ گیا تھا۔

”دل اور بے! مجھے غصہ مت دلاؤرنہ اچھا نہیں ہوگا۔“ عبد اللہ بمشکل اپنے غصے پہ قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا اور بتول شاہ اور نگارش ان کی اس خفگی اور ناراضی کا منظر دیکھ کر ہنس بڑی تھیں۔

”کیا اچھا نہیں ہوگا؟ کیا کر لو گے آخر۔“ دل اور جان بوجھ کر اسے چھیڑ کر لطف اندوز ہو رہا تھا۔

”ورنہ یہی چائے تمہارے اوپر انڈیل دوں گا آرام سے خود ہی پی لو کی بہتر ہے۔“ عبد اللہ نے دھمکی دی تھی۔

”یہ چائے تو میری ہے۔“ زری اپنے دھیان میں چائے کا کپ پکڑے کھڑی تھی جو اچانک اندر آنے والے نبیل حیات نے اچک لیا تھا وہ بھی اس لیے کہ وہ عبد اللہ اور دل اور کی بات سن چکا تھا بلکہ ان کے مسئلے کی نوعیت بھی سمجھ چکا تھا جبکہ زری ہکا بکا سی دیکھتی رہ گئی تھی۔

”شاباش! بڑی اچھی انٹری ماری ہے تم نے یہ چائے اسے ملنی بھی نہیں چاہیے تھی کیونکہ یہ انکار کر چکا ہے۔“ عبد اللہ نے اسے داد دی۔

”یہ انکار کر چکا ہے نا۔؟ لیکن ہم میں انکار کا حوصلہ نہیں ہے جو بھی ملے صبر و شکر کر کے گزارا کر لیتے ہیں۔“ نبیل اطمینان سے کستا بتول شاہ کی سمت بروہ گیا تھا البتہ چائے کا کپ اس کے ہاتھ میں ہی تھا جس پہ تقریباً ”بھئی ہنس بھی رہے تھے۔

”بھائی! مجھے تو آپ نے چائے پلانے کا کہا تھا؟“ دل اور نے نگارش کو یاد دلایا۔

”ارے ہاں ہاں! کیوں نہیں میں ابھی لے کر آتی ہوں۔“ نگارش فوراً ”اٹھ کھڑی ہوئی۔“

”اب وہ کپ لے کر آئیے گا جو میری قسمت میں ہو۔ یہ میری قسمت میں نہیں تھا۔“

دل اور نے جاتے جاتے تاکید کی تھی جسے سن کر نگارش زری اور بتول شاہ تینوں ہی چونکی تھیں لیکن کسی نے بھی ایک دوسرے کو کچھ محسوس نہیں ہونے دیا تھا۔

اس کے بعد تینوں اپنی اپنی جگہ پہ خاموش ہو گئی تھیں اور دل اور سر جھٹک کر عبد اللہ اور نبیل کے ساتھ باتوں میں شریک ہو چکا تھا حالانکہ وہ یہ بھی جان چکا تھا کہ زری کے چہرے کی ساری خوشی بجھ سی گئی ہے لیکن پھر بھی اس نے زیادہ دھیان نہیں دیا تھا آخر جو چیز اس کی قسمت میں ہی نہیں تھی اس پہ دھیان دینے کا فائدہ ہی کیا تھا بھلا۔

اور ادھر وہ تھی جو اپنے خواب کے سچے ہونے پہ پچھتا رہی تھی کیونکہ ایسی حقیقت سے تو وہ خواب ہی بہتر تھا جس میں وہ دل اور شاہ کے اور دل اور شاہ اس کے سامنے قریب اور اکیلا کھڑا تھا جس میں وہ ہاتھ بڑھا کے ایک دوسرے کو چھو بھی سکتے تھے اور جس میں ان کے درمیان کوئی تیسرا نہیں تھا اور نہ ہی کسی کا ڈر تھا اور شاید اسی لیے اس کا پچھتاوا بردھتا ہی جا رہا تھا کیونکہ اسے کچھ دیر پہلے کا خواب شدت سے یاد آ رہا تھا۔!

ان لوگوں نے انہیں رات کے کھانے کے بعد ہی واپس آنے دیا تھا۔

حالانکہ دل اور نے وہاں سے اٹھنے کی بار بار کوشش کی تھی لیکن عبد اللہ اور نگارش ہر بار ہی آڑے آ گئے تھے

یہ فیصلہ بہت مشکل تھا لیکن جو بھی تھا ان کا باؤ ہیسمنٹ کی طرف ہی تھا وہ بیڑھیاں اتر کر نیچے آگیا تھا۔ رات کے تین بجے دیا موت کی سی گہری نیند سوئی ہوئی تھی ہر طرف سناٹا تھا گہرا اور گہیر سناٹا اور اتنا ہی گہرا اور گہیر اندھیرا بھی جن کو اپنے قدموں تلے روندنا ہوا وہ ہیسمنٹ کے دروازے تک جا پہنچا تھا ادھ کھلے دروازے کو اپنے دائیں ہاتھ سے دھکیل کر وہ اندر آگیا تھا اور ہیسمنٹ کی کشادہ بیڑھیاں بے آواز قدموں سے طے کرتا ہوا اس سائیڈ کی طرف آگیا تھا جس سائیڈ پر علیزے آفتندی فقیروں کی طرح — بیٹھی تھی جس کو دیکھ کر دل اور کو ایک دھچکا سا لگا تھا کیونکہ اسے یقین تھا کہ وہ اس وقت سو رہی ہوگی، لیکن اپنے یقین کو بے یقین ہوتے دیکھ کر وہ اپنی جگہ پہ حق دق سا رہ گیا تھا۔ اس کے قدم جہاں تھے وہیں کے وہیں رکے رہ گئے تھے وہ علیزے سے چند قدموں کے فاصلے پہ کھڑا جیسے گم سم اور ساکت و صامت سا ہو چکا تھا اس کی امید اس کی توقع اور اس کی سوچ تھرا اٹھی تھیں۔

کیونکہ اسے تو اس بات کا رتی برابر بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس وقت اس پر بھی جاگ رہی ہوگی۔ اسے تو اس بات کا یقین تھا کہ رات کے اس پہر دنیا کا ہر ذی نفس نیند کی آغوش میں تھا۔ چند پرندے لے کر اشرف المخلوقات تک پوری کائنات گہری نیند سو رہی تھی، پورا شہر سو رہا تھا، کیونکہ یہ وقت ہی سونے کا تھا سب سو رہے تھے۔

لیکن صرف وہ دونوں تھے۔ جو ابھی تک اس وقت اس پر بھی جاگ رہے تھے۔ آخر کیوں؟ کیا وجہ تھی آخر؟ صرف وہ دونوں ہی کیوں؟ ایسا کیا مشترکہ تھا ان میں جس نے ان دونوں کو جگا رکھا تھا؟ دل یا دل کا بوجھ؟

عجیب عجیب سوچیں تھیں اور عجیب عجیب خیالات تھے جو دل اور کے دل و دماغ میں اودھم مچا رہے تھے۔ اک کلبلا ہٹ سی تھی جو ہر سوچ اور ہر خیال میں اتر کر دل اور کے دل و دماغ کو بھی عجیب سا بتا رہی تھی اور وہ بمشکل اپنے اعصاب کو کنٹرول کرتا ہوا سر جھٹک کر آگے بڑھ آیا تھا۔

”سلام علیکم۔۔۔“ اس نے قریب آکر کافی آہستہ آواز میں سلام کیا تھا۔ اور علیزے کو یوں لگا تھا کہ جیسے اسے کسی نے قبر میں دفن کر دیا ہو اور باہر سے پکارنے والوں کی آواز اسے بہت دور سے سنائی دے رہی ہو جس کو سن کر اس نے بمشکل زانو پہ رکھا سر اٹھا کر اپنے سامنے کھڑے صیاد کو دیکھا تھا ایک ایسا صیاد جو اسے ہمیشہ کے لیے رکھنے کو بھی تیار نہیں تھا۔

حالانکہ وہ اس کی اس قید میں رہنے کے لیے بھی تیار تھی۔ وہ بھی محض ایک نام کے عوض۔! مگر وہاں تائب تا؟ جیسی اس نے تھک کر دوبارہ اپنا سر زانو پہ ٹکا دیا تھا کیونکہ اب تو اپنی گردن پہ اپنے ہی سر کا بوجھ نہیں اٹھایا جاتا تھا، دل چاہتا تھا کہ کوئی اسے بھی تن سے جدا کر دے۔ اور اس کی آنکلی ہوئی جان کو ایک ہی دفعہ ہر قید سے رہائی مل جائے اور وہ ہر دکھ اور ہر غم کے بوجھ سے آزاد ہو جائے۔

لیکن وہ کیا کرتی؟ ایسا بھی تو نہیں ہو رہا تھا۔ اسے تو جیسے موت بھی قبول کرنے کو تیار نہیں تھی اور اپنی ذات کی ایسی ناقدری یہ وہ آنسو پھر دیوانہ وار اندھے تھے اور اس کی اپنی ہی گود میں گر کر فنا ہو گئے تھے اور وہ جو اس کے سامنے کھڑا تھا اس کی مسلسل خاموشی پہ آہستگی سے اپنی پینٹ کے کپا نیچے اوپر کھینچے ہوئے بنجوں کے بل فرش پر عین اس کے سامنے بیٹھ گیا تھا۔

”علیزے۔۔۔!“ دل اور نے آج شاید پہلی بار اس طرح نارمل طریقے سے اس کو اس کے نام سے پکارا تھا جس پہ دل اور کو خود بھی بہت عجیب سا محسوس ہوا تھا، لیکن یہ وقت یہ پچویشن ایسی تھی کہ اسے پکارے بغیر اور اسے مخاطب کیے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔

صرف یہ کہہ کر کہ بول آنٹی آج پہلی بار ان سے ملنے ان کے گھر آئی ہیں اور وہ وہاں سے ڈر کیے بغیر چلی جائیں یہ بھی تو ممکن نہیں تھا نا۔؟

سو مجبوراً ان لوگوں کے اتنے اصرار کے بعد انہیں ڈر تک وہاں رکنا ہی پڑا تھا اور اب وہ تقریباً ”دس بجے واپس آئے تھے اور دل اور کے ساتھ بول شاہ کو دیکھ کر گلاب خان اور گل بہت خوش ہوئے تھے بلکہ زلفی بھی اس خوشی میں کسی سے پیچھے نہیں تھا۔

”جیتے رہو۔۔۔ خوش رہو۔۔۔ اللہ عمر دراز کرے۔“ انہوں نے زلفی اور گلاب خان کے کندھوں پہ شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے دعا دی تھی اور گل سے باقاعدہ گلے ملی تھیں انہوں نے کبھی بھی ملازموں کے ساتھ مالکانہ انداز نہیں اپناتے تھے وہ ہمیشہ ملازموں کے ساتھ بھی اپنائیت اور خلوص سے پیش آتی تھیں بلکہ یہ عادت تو ان دونوں ماں بیٹی کی مشترکہ تھی۔

”گل۔۔۔! اماں! کا بیڈ روم صاف کیا تم نے؟“ دل اور کا ارادہ اپنے بیڈ روم میں جانے کا تھا لیکن وہ جانے سے پہلے ان کے بیڈ روم کی طرف سے تسلی کرنا چاہ رہا تھا۔

”جی صاحب۔۔۔! صبح جب گلاب خان کو آپ کا میسج آیا تھا تو میں نے اسی وقت بیڈ روم صاف کر دیا تھا بیگم صاحبہ آرام سے جا کر سو سکتی ہیں۔“ گل نے فوراً اثبات میں جواب دیا تھا۔

”تھیک ہے اماں! آپ بھی جا کر آرام کریں اور میں بھی کچھ دیر ریسٹ کرتا ہوں پھر مجھے ایک کیس پہ کام بھی کرنا ہے صبح ڈیسٹ ہے۔“ وہ اپنی مضبوط کلائی پہ بندھی گھڑی سے ٹائم دیکھتا ہوا بول شاہ کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

”اوکے بیٹا۔! آرام کرو تم۔ میں بھی اپنے بیڈ روم میں جا رہی ہوں۔ گل تم میرے ساتھ آؤ بیگم سے میرے کپڑے نکال دو میں نے عشاء کی نماز کے لیے وضو کرنا ہے۔“ وہ دل اور کو گڈ نائٹ کہہ کر اس کے اطمینان کے لیے گل سے کہتی ہوئی اپنے بیڈ روم کی سمت بڑھ گئی تھیں اور دل اور ان کے بیڈ روم میں جانے کے بعد ایک گہری سانس کھینچتا ہوا اپنے بیڈ روم میں آگیا تھا اور بیڈ روم میں آکر اسے نجانے کیسی تھکن اور بوجھل بن محسوس ہوا تھا کہ وہ اتنے ہی اپنے بیڈ پہ چاروں شانے جیت ڈھیر ہو گیا تھا اور دونوں ہاتھ اپنے سر کے نیچے تکیے کی صورت رکھتے ہوئے بیڈ روم کی چھت پہ نظریں جمادی تھیں۔

وہ جب سے علیزے کے پاس سے اٹھ کے گیا تھا تب سے اپنے دل پہ ایک بوجھ لیے پھر رہا تھا اور بوجھ بھی ایسا تھا کہ جو اپنے دوستوں کے درمیان بیٹھ کر دن بھر گپ شپ کرنے کے بعد بھی دل سے ایک انچ بھی اوھر اوھر نہیں ہٹا تھا جہاں پہ تھا وہیں پہ دھرا ہوا تھا۔

اور جب انسان کا دل کسی بوجھ تلے دب جائے وہ انسان خود بھلا کب اٹھ سکتا ہے۔۔۔ اور اس وقت دل اور کے ساتھ بھی یہی صورت حال تھی اس کے دل پہ بوجھ تھا تو خود بھی کچھ کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

مگر مجبوری تھی کام تو اس نے کرنا ہی تھا اپنے دل کے سسٹلے میں وہ کسی اور کے لیے مسئلہ کھڑا تو نہیں کر سکتا تھا نا۔؟ اس لیے مجبوراً وہ اٹھا اس نے شاہ لیا، کپڑے پھینچ دیے اور اپنے اسٹڈی روم میں آگیا تھا۔۔۔ حالانکہ اس کا ذہن یکسوئی سے عاری تھا مگر پھر بھی وہ سگریٹوں کے سہارے ضروری کیس کی فائل پہ کام کرتا رہا اور رات کے پونے تین بجے وہ سب کچھ مکمل کر کے اپنی چیر سے اٹھ کھڑا ہوا اسے تھکن اور بوجھل بن سے یوں لگ رہا تھا جیسے پورا جسم اکڑ کے رہ گیا ہو اس لیے اب وہ آرام کرنا چاہتا تھا لیکن بیڈ روم میں آکر اپنی شرٹ کے بٹن کھولتے ہوئے نجانے کیوں اور کس سوچ کے تحت اس کے ہاتھ وہیں کے وہیں رک گئے تھے اور اس کا دھیان پھر سے وہاں جا پہنچا تھا جہاں سے اس کے دل پہ بوجھ رکھا گیا تھا اور وہ بے ساختہ دوبارہ اس بوجھ کو ساتھ لیے اپنے بیڈ روم سے نکل آیا اس کے قدم ہیسمنٹ کی طرف اٹھ رہے تھے اس کے قدم بوجھل تھے۔۔۔ یا اس کا دل بوجھل تھا۔؟

”مجھ سے بات نہیں کرو گی کیا۔“ اس کا لہجہ دھیمہ اور آواز گہیر تھی اور ساتھ ساتھ دل کا بوجھل پن چہرے سے بھی جھلک رہا تھا اور انداز بھی کچھ ایسا ہی تھا بوجھل بوجھل۔ تھکا تھکا سا۔! علیزے کو بھی محسوس ہوا تھا شاید۔ اس نے ایک بار پھر سر اٹھا کر اپنے سامنے دیکھا تھا وہ اس کے قریب ہی دو قدم کے فاصلے پہ عین اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور دیکھ بھی اسے ہی رہا تھا۔

”میرے پاس بات کرنے کے لیے کچھ باقی رہ گیا ہے کیا۔“ علیزے کا لہجہ لہورس رہا تھا اور لفظ زخمی ہو رہے تھے آنکھوں کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا رو کر انگارے بن گئی تھیں جن کی جلن سے آنسو بے جا رہے تھے۔

”تمہارے پاس بات کرنے کے لیے کچھ باقی نہیں رہا اور میرے پاس کچھ بھی کرنے کے لیے کچھ باقی نہیں رہا لیکن پھر بھی تم بناؤ تم کیا چاہتی ہو؟“ دل اور اسے بغور گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا اور اس کے پوچھنے پہ علیزے کے دل پہ ایک گھونسا سا برا تھا اس کی روح تک تڑپ گئی تھی۔

”میری بے بسی کا مذاق اڑا رہے ہو ذرا یورو۔“ اس کے حلق میں جیسے آنسوؤں کا گولا سا ٹنک گیا تھا۔

”کیسی کی بے بسی کا مذاق اڑانے والا میں کون ہوتا ہوں بھلا؟ میں خود ایک بے بس انسان ہوں۔“ اس نے کہتے ہوئے غمی سے سر جھکا تھا۔

”دوسروں کو بے بس کرنے والا خود کیسے بے بس ہو سکتا ہے بھلا؟“ علیزے ماننے کو تیار نہیں تھی اور دل اور کے چہرے پہ ایک انتہائی تلخی سی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

”ہونہ! تم نہیں سمجھو گی اپنی دے آؤ میرے ساتھ تمہیں کچھ سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔“ وہ اس کی نازک کانچ سی کلائی پکڑتا ہوا ایک دم اٹھ کھڑا ہوا تھا اور علیزے کو تو سنبھلنے کا بھی موقع نہیں ملا تھا وہ اس کے ساتھ کھینچتی چلی گئی تھی اور وہ اسے ساتھ لیے اس کی کلائی پکڑے میڑھیاں چڑھ گیا تھا حالانکہ دل اور کے قدموں کی رفتار بہت دھیمی اور بہت متوازن تھی۔

لیکن پھر بھی اس کے ساتھ چلتے ہوئے علیزے کی سانس پھول گئی تھی۔ اس کے قدم بھی تھک گئے تھے اور وہ ہانپنے لگی تھی جس پہ دل اور ٹھہر گیا تھا اور اس نے ملکتے سے اندھیرے میں اپنے ساتھ کھڑی علیزے کو دیکھنے کی کوشش کی تھی مگر اسے علیزے کا واضح نظر نہیں آ رہی تھی بلکہ اس کی ہانپتی ہوئی سانسوں کی آواز واضح سنائی دے رہی تھی جس کو سننے کے بعد دل اور نے ڈرائنگ روم یا اپنے بیڈ روم کی طرف جانے کے بجائے کچن کی طرف قدم بڑھا دیے کچن کا دروازہ کھول کر کچن کی تمام لائٹس جلا دیں اور پھر پلٹ کر علیزے کو دیکھا تھا جو دروازے کے پتوں پہ کھڑی تھی وہ اسے سر نہ پا دیکھ کے رہ گیا۔

کیونکہ اس وقت وہ علیزے۔ علیزے ہی نہیں لگ رہی تھی۔

کہاں وہ شہزادیوں کے سے رہن سہن والی علیزے۔ اور کہاں یہ فقیرانہ حلیہ کی مالک لڑکی۔ جس کے تن پہ کپڑے بھی اس کے اپنے نہیں بلکہ دل اور شاہ کے گھر کی ملازمہ کے تھے جن کو دیکھ کر دل اور کی نظریں جھک گئی تھیں کیونکہ اس کا یہ حال تو اس کے پاس آکر ہی ہوا تھا نا اور اسے اس نوبت تک پہنچانے والا بھی وہی تھا۔

لہذا اسے دیکھ کر نظریں نہ جھکا تا تو اور کیا کرتا؟

”آؤ ادھر بیٹھو!“ اس نے کچن میں لگی ٹیبل کے قریب آکر اس کے لیے کرسی کھینچی تھی اور علیزے نے اپنے لیے کرسی کھینچنے والے اس شخص کو عجیب بے یقینی سی نظروں سے دیکھا تھا جو ہمیشہ اس کے سامنے نفرت، حقارت غصے اور انتقام کا پیکر بنا آتا تھا، لیکن آج اس نے غور کیا تھا کہ وہ شخص بھی۔ وہ نہیں لگ رہا تھا شاید اسی لیے وہ خود میں ہمت پیدا کرتی آگے بڑھ آئی تھی اور دل اور کی پیش کی ہوئی کرسی پہ بیٹھ گئی تھی۔

”کھانا کھایا تم نے؟“ وہ کرشل ٹیبل کی دوسری طرف رکھی کرسی کے پیچھے کھڑا اپنے سامنے کرسی پہ بیٹھی علیزے سے پوچھ رہا تھا۔

”نہیں!“ اس نے جھکے ہوئے سر کو نفی میں ہلایا تھا۔

”اوکے! میں تمہارے لیے کھانا گرم کرتا ہوں وہی کھانا جو اس روز وہیں رہ گیا تھا۔“ وہ کرسی کی بیک سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے خود بھی پیچھے ہٹ گیا تھا۔

”نہیں! مجھے بھوک نہیں ہے“ علیزے نے فوراً انکار کر دیا تھا مگر دل اور نے اس کے کسی بھی انکار پہ کوئی توجہ نہیں دی تھی اور فریج سے کھانا نکال کر اس کے لیے گرم کرنے لگا اور اس دوران ان دونوں کے درمیان مکمل خاموشی چھائی رہی تھی۔

لیکن پانچ منٹ بعد وہ سب کچھ گرم کر کے اس کے سامنے رکھ چکا تھا اور اس کے مقابل والی کرسی کھینچ کے خود بھی اس کے سامنے بیٹھ گیا تھا۔

”کھانا کھاؤ!“ اس نے کافی تحمل سے اسے کھانا کھانے پہ آمادہ کیا تھا۔

”مجھے نہیں کھانا مجھے بھوک نہیں ہے۔“ اس نے پھر انکار کر دیا تھا لیکن اکثر وہ انکار نہیں سنتا تھا۔

”کیا مجھے خود کھانا پڑے گا؟“ اسے پتا تھا کہ اس کا یہ حربہ کار آمد ثابت ہو گا اور واقعی ایسا ہی ہوا تھا، علیزے کے ہاتھ خود بخود کھانے کی طرف بڑھ گئے تھے اور اس نے بمشکل لرزتے کانپتے ہاتھوں سے نوالہ بنا کر منہ میں رکھا تھا اور دل اور کی نظریں آج بار بار اسی کی طرف اٹھ رہی تھیں اس کے حال پہ اور اس کے حلیے پہ۔!

جن کو آج غور سے اور گہرائی سے دیکھا تھا تو ”اندر“ کچھ ہوا تھا۔ کچھ ایسا جو بے چین کر دینے کے لیے کافی تھا جو دل اور شاہ کے دل میں پن کی طرح چبھنے لگا تھا اور یہ چبھن اسے بار بار علیزے کی طرف متوجہ کر رہی تھی جس کی کمزور اور نشاہ زہہ حالت دیکھ کر لگ رہا تھا کہ جیسے وہ صدیوں کی بیمار ہو اس کے گولڈن براؤن بالوں کی اب بھی ہوئی نہیں اس کی پونی سے نکل کر اس کے چہرے کو چھو رہی تھیں اور اس کے چہرے کی گلابیاں بکھیرتی ہوئی رنگت بالکل زرد پڑ چکی تھی رنگین شیشے کی طرح چمکتے ہوئے شفاف ہونٹ بے رنگ ہو چکے تھے اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے بن گئے تھے جن کی وجہ سے پورا چہرہ ہی بے رونق ہو چکا تھا، کھانا کھاتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور اس سے ٹھیک طرح سے روٹی کا نوالہ بھی نہیں نگلا جا رہا تھا مگر پھر بھی وہ کھانے پر مجبور تھی۔ اور وہ اسے مجبور کرنے پہ مجبور تھا کیونکہ وہ اسے کچھ کہنے سے پہلے ریلیکس کرنا چاہتا تھا۔

”چائے بناؤں تمہارے لیے؟“ وہ اس پہ نظریں جمائے ہوئے پوچھ رہا تھا اور علیزے چونک گئی تھی۔

”بہت ٹھنڈا ہو رہی ہے اس وقت چائے پیو گی تو ریلیکس ہو جاؤ گی میں بتاتا ہوں اپنے لیے بھی اور تمہارے لیے بھی۔“ وہ کہہ کر کرسی دھکیل کے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور علیزے اس کی پشت کو دیکھتی رہ گئی۔ وہ بڑے اطمینان سے چائے بنانے میں مصروف ہو چکا تھا علیزے نے آسکی سے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیے وہ صرف اس کے ڈر کی وجہ سے کھا رہی تھی ورنہ کھانے کو دل کب چاہ رہا تھا بھلا؟

”چائے کے ساتھ کچھ لوگی۔“ وہ اپنے کام میں مصروف اس کی سمت دیکھے بغیر پوچھ رہا تھا۔

”نہیں۔“ اس کا جواب توقع کے عین مطابق تھا۔

”کھانا تو تم نے برائے نام ہی کھایا اور چائے بھی خالی ہی پیو گی تو پھر بھوک کیسے مٹے گی؟“ وہ جیسے بڑے تحمل اور بڑی اپنائیت سے استفسار کر رہا تھا۔

مگر علیزے نے اسے کوئی بھی جواب نہیں دیا تھا کیونکہ اتنا تو وہ جان ہی گئی تھی کہ وہ اس کے انکار کے باوجود بھی اپنے مرضی ہی کرے گا اس لیے انکار کرنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا بہتر تھا کہ وہ چپ رہتی۔

”او کے۔! کچھ بھی نہ کھاؤ مگر چائے تو پی لو بہت اچھی رہی ہے۔ یقیناً تمہیں بھی اچھی لگے گی ٹرائی کرو۔“ دل آور نے لاروا سے انداز میں کہتے ہوئے چائے کا کپ اس کے سامنے رکھ دیا تھا اور اپنا کپ یونہی ہاتھ میں پکڑے دوبارہ اس کے مقابل والی کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا تھا۔

اور اطمینان سے چائے کے سب لیتے ہوئے علیزے کی سمت دیکھنے لگا تھا۔
”تم نے بتایا نہیں کہ تم کیا چاہتی ہو؟“ اس نے دوبارہ وہی استفسار کیا تھا اور علیزے اس کے استفسار پر لب بھج گئی تھی۔

”کیا اپنے گھر جانا چاہتی ہو؟“ وہ چائے کا سپ لے کر کپ ٹیبل پر رکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا اور وہ اس کے اس نئے سوال پر یکدم چونک گئی تھی۔

”گھر؟“ اس کے لب کپکپاتے تھے اور اس نے بغور دل آور کے چہرے کو دیکھا جس پر واقعی سنجیدگی نظر آرہی تھی۔

”ہاں گھر۔ تمہارا گھر بڑی حویلی۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا اور علیزے کا دل جیسے کسی نے اپنے پیروں تلے دبا کر چل دیا تھا۔

”نہیں! میں نہیں جانا چاہتی میں کہیں بھی نہیں جانا چاہتی۔“ وہ الٹا فانی میں سر ہلانے لگی تھی۔
”کیوں؟ کیوں نہیں جانا چاہتیں آخر ایک نہ ایک دن تو تم نے واپس جانا ہی ہے تو اب کیوں نہیں!“ دل آور بغور اس کے چہرے کے تاثرات نوٹ کر رہا تھا۔

”نہیں ڈراؤ۔ میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ کبھی نہیں جاؤں گی جب تک تم مجھ سے شادی نہیں کرو گے میں اس گھر سے نکلنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ بے شک تم مجھے دھکے دے کر نکال دو، میں کسی گاڑی کے نیچے آکر مری جاؤں گی مگر واپس بڑی حویلی نہیں جاؤں گی کیونکہ اس طرح اپنا آپ لے کر واپس جانے سے بہتر ہے کہ میں واقعی مری جاؤں۔“ علیزے کا کہتے ہوئے لہجہ بھرا گیا تھا اور آنکھوں سے پھر آنسو رواں ہو گئے تھے۔

”ایسا نہیں ہو سکتا علیزے۔! یہ سب ممکن نہیں ہے میں تم سے شادی نہیں کر سکتا۔ لیکن تمہیں تمہارے گھر چھوڑ کے آسکتا ہوں اور یہ کام میں بہت جلد کروں گا شاید ایک یا دو روز میں یا پھر کچھ روز میں۔ لیکن فی الحال یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔“

اس نے آج علیزے کے سامنے بھی انکار کر ہی دیا تھا اور علیزے اس کا جواب سن کر گنگ سی رہ گئی۔ وہ اسے ایک یا دو روز میں واپس گھر چھوڑنے کی بات کر رہا تھا لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا بھلا۔؟ وہ اپنے گھر والوں کا سامنا کیسے کر سکتی تھی؟ ان اعتبار یقین سب کچھ تو وہ توڑ آئی تھی اب انہیں جوڑنے کے لیے کیا رہ گیا تھا اس کے پاس؟ سب کچھ تو وہ خود روند آئی تھی باقی کیا رہ گیا تھا بھلا؟

”ڈراؤ۔! ایک اور سزا مت دو مجھے۔ میں نہیں سہیاؤں گی مجھ میں اب اور ہمت نہیں ہے پلیز ڈراؤ۔! ایسا مت کرو مجھے کہیں نہیں جانا مجھے مجھے یہیں رہنے دو بس مجھ سے نکاح کر لو۔“ علیزے ہمیشہ کی طرح کہتے کہتے یکدم بلک بلک کر رو پڑی تھی اور دل آور اس کی کیفیت پر ایک بار پھر چپ ہو گیا تھا۔ لیکن پھر اسے سمجھانے کے لیے اپنی چپ کو توڑنا پڑا تھا۔

”دیکھو علیزے۔! تمہارے اور میرے راستے الگ ہیں تم میری منزل نہیں ہو بلکہ تم میری منزل کے راستے میں بھی نہیں ہو۔ میری زندگی میں بھی کہیں نہیں ہو میں تمہیں کیسے اپنا سکتا ہوں؟“

”صرف نکاح کر لینے سے کیا ہوتا ہے۔؟ ہوتا تو یہی ہے جب دل و دماغ کسی کے ساتھ آمادہ ہوں لیکن جب دل و دماغ ہی آمادہ نہیں ہیں تو نکاح کا تصور کرنا بھی فضول ہے اس لیے تم یہ بات ذہن سے نکال دو اور صرف یہ

سوچو کہ تم نے اپنے گھر جانا ہے تمہاری زندگی وہاں ہے تمہاری خوشیاں وہاں ہیں تمہارے اپنے وہاں ہیں یہ تو تم ایک مجبوری کا سودا کر رہی ہو۔ اور مجبوری کے سودے انسان کو تھکا دیتے ہیں اور کبھی کوئی فائدہ نہیں دیتے الٹا ہمارا نقصان ہی ہوتا ہے۔

اس لیے بہتر ہے کہ ہم دونوں اس سودے سے بچ جائیں اور کوئی بیچ کا راستہ نکال لیں چونکہ تمہارے لیے مشکل ہو اور نہ میرے لیے جس پر ملتے ہوئے ہمارے دل یہ اور باتوں پر آبلے نہ پڑیں۔“ دل آور نے اسے سمجھانے کی پوری پوری کوشش کی تھی لیکن وہ کیا سمجھی تھی اور کیا نہیں؟ یہ وہ نہیں جانتا تھا البتہ وہ اسے اپنی طرف سے پوری طرح سے سمجھا چکا تھا وہ بس یہی جانتا تھا۔

”لیکن ڈراؤ۔! اس نے بے ساختہ کچھ کہنا چاہا تھا مگر دل آور نے اسے ٹوک دیا تھا۔
”بس علیزے! میں نے جو کہنا تھا کہہ دیا جو سمجھانا تھا سمجھا دیا اب یہ تمہارے سوچنے اور سمجھنے پر ڈینڈ کرتا ہے کہ تم نے کیا کرنا ہے؟ کس فیصلے پر آمادہ ہونا ہے؟ اور کیا صحیح ہے اور کیا غلط! یہ بھی تم اچھی طرح سوچ سکتی ہو وہ دن ہیں تمہارے پاس۔ دراصل وقار آفندی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی وہ ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہے لیکن امید ہے کہ دو روز تک ہاسپٹل سے ڈسچارج کر دیا جائے گا اور جیسے ہی اسے ہاسپٹل سے ڈسچارج کیا جائے گا میں فوراً ہی تمہیں واپس حویلی چھوڑ آؤں گا اس لیے تم اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار رکھو کہ تم نے دو روز بعد اپنے گھر جانا ہے ہر صورت میں اور ہر حال میں!“

وہ اسے اپنے ارادے اور اپنے فیصلے سے آگاہ کرتے ہوئے کرسی پر کھیل کر اٹھ کھڑا ہوا تھا اور علیزے وہیں کی وہیں بیٹھی رہ گئی تھی اب تو اس کے پاس کہنے کے لیے الفاظ بھی باقی نہیں رہے تھے۔ کتنی بار منتیں کرتی اور کتنی بار باتوں پکڑتی؟ آخر ہونا تو وہی تھا جو قسمت میں لکھا جا چکا تھا اور وہ ناچیز قسمت کے اس لکھے کو کیسے مناسکتی تھی؟ جب تک کہ وہ اوپر والا نہ چاہتا!

”میں اپنے ہیڈ روم میں جا رہا ہوں۔ اس لیے اب تم بھی جا کر آرام کرو۔ فجر ہونے والی ہے۔“ وہ کہہ کر وہاں سے چلا گیا تھا اور علیزے کے پاس سنائے چھوڑ گیا تھا اسے اپنے آس پاس ویرانی ہی ویرانی نظر آرہی تھی اور ان ویرانیوں میں وہ اکیلی اور تنہا بیٹھی رہ گئی تھی!

لیکن آخر کب تک؟
کب تک وہ یونہی بیٹھی رہتی؟ بالا آخر اسے وہاں سے اٹھنا ہی تھا اور وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی مگر اب یہ تھا کہ اس سے قدم بھی نہیں اٹھایا جا رہا تھا وہ میرے مرے قدم اٹھاتی پاؤں گھسیٹ کے چلتی ہوئی بمشکل اپنے آپ کو حواسوں میں رکھ کر وہاں سے نکل آئی تھی اس کے بے جان قدم ہسٹنٹ کی طرف اٹھ رہے تھے جب کسی آواز پر ٹھٹھک کر اسے ٹھہرنا پڑا تھا۔
”سنو لڑکی۔!“ یہ آواز دل آور شاہ کی نہیں تھی لیکن دل آور شاہ کی آواز جیسی بارعب ضرور تھی۔ وہی دبدبہ نوی طلفظہ، غلغلے بغیر پلٹے ہی سمجھ گئی تھی کہ وہ کون ہیں۔
”میرا شاہ تمہارے باپ جیسا نہیں ہے وہ تم سے نکاح کرے گا اور ضرور کرے گا یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔“ بتولی شاہ متوازن قدم اٹھاتی۔۔۔ سائیڈ سے ہو کر اس کے سامنے آگئی تھیں۔
”یہ۔۔۔ لگ۔ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ یہ؟ یہ؟ کیسے ہو سکتا ہے؟“ علیزے کی بے یقینی سے آنکھیں پھٹ گئی تھیں اور اس کی زبان بھی لڑکھڑائی تھی اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا کہ اس نے یہ سب صحیح سنا ہے دل آور شاہ کی ماں خود نکاح کے لیے وعدہ کر رہی تھیں اور اسے یقین دل رہی تھیں کہ وہ یہ نکاح ضرور کرے گا تو علیزے نے تو حیران ہونا ہی تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

”یہ ہو سکتا ہے ضرور ہو سکتا ہے کیونکہ یہ ایک آزمائش ہے اور میرا بیٹا اس آزمائش پہ ضرور پورا اترے گا“ آخر وہ کسی وقار آندی کا نہیں بلکہ بتول شاہ کا بیٹا ہے بار شاہ کا سپوت ہے وہ اتنا کم ظرف نہیں ہے کہ کسی عورت کے سر پہ چادر بھی نہ دے سکے تم بے فکر رہو جب تک بتول شاہ زندہ ہے تمہاری عزت پہ آج نہیں آنے دے گی تم لا کھو وقار آندی کی بیٹی سی لیکن وہ بھی آخر میرا بیٹا ہے یہ پیالہ بھی پی جائے گا صرف میری خاطر۔“

بتول شاہ نے انتہائی سخت اور پتھر لے لےجے میں کہتے ہوئے علیزے کو ایک زہر آلود نظر سے سر تپا دیکھا تھا اور پلٹ کر قدم دوبارہ اپنے بیڈروم کی طرف برعکس کر رہی تھی۔

”آئی۔۔۔“ علیزے کے منہ سے بے ساختہ یہ پکار نکلی تھی اور بتول شاہ اپنی پوری ہستی سے اس کے رہ گئی تھیں ان کے قدم لڑکھڑکے تھے لیکن صورت حال ایسی تھی کہ ٹھہرنا بھی محال تھا اور وہاں سے چلے جانا بھی مشکل تھا اور وہ ہمیشہ سے مشکل کام ہی کرتی آئی تھیں اس لیے یہ بھی کر گزری تھیں اور علیزے ان کی پشت دیکھتی رہ گئی وہ پلٹ کر اسے دیکھے بغیر اور اسے جواب دے بغیر اپنے بیڈروم میں چلی گئی تھیں البتہ علیزے کے پاس ایک تسلی ایک آس اور ایک یقین ضرور چھوڑ گئی تھیں۔۔۔

وہ صبح کورٹ جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا جب اس کے موبائل پہ نیل کی کال آئی تھی اور وہ اپنی ٹائی کی ٹاٹ لگاتے لگاتے رک گیا تھا۔

”السلام علیکم۔۔۔“ اس نے ہڈ کی سائیڈ نیل سے موبائل اٹھا کر کان سے لگا لیا تھا۔

”وعلیکم السلام۔۔۔! کیسے ہو!“ نیل کافی فریش موڈ میں لگ رہا تھا۔

”ٹھیک ہوں! تم سناؤ صبح صبح کیسے یاد کر لیا!“ دل آوریوں میں موبائل ساتھ لیے دوبارہ ڈرنک نیل کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

”یار۔۔۔! ہم تو ہر وقت تمہیں یاد کرتے ہیں تم صبح صبح کی بات کر رہے ہو؟“ نیل نے خفگی سے سر جھٹکا تھا۔

”جانتا ہوں! اچھی طرح جانتا ہوں لیکن پھر بھی صاف صاف بتاؤ کہ کس لیے فون کیا ہے میں آفس سے لیٹ ہو رہا ہوں مجھے کورٹ بھی پہنچنا ہے۔“ دل آور نے اک نظر گھڑی کی سمت دیکھتے ہوئے اسے اصل مقصد بتانے پہ اکسایا تھا۔

”ارے یار! تم نے تو ہر وقت ہی کہیں نہ کہیں پہنچنا ضرور ہوتا ہے بس ہم ہلکا گل ہیں کہ جو تمہیں بار بار فون کر کے ڈسٹرب کرتے رہتے ہیں۔“ نیل خفگی سے جھنجھلا گیا تھا۔

”نیل! کچھ اس مت کرو تمہیں خود پتا ہے کہ مجھے اس وقت کورٹ پہنچنا ہوتا ہے۔“ دل آور نے اسے جھڑک دیا تھا۔

”تو میں تمہیں کب منع کر رہا ہوں کورٹ پہنچنے سے؟ اوکے تم جاؤ کورٹ پہنچو لیٹ ہو رہے ہو تم۔“ نیل نے فون بند کر دیا تھا اور اب کی بار دل آور کو تاؤ آیا تھا اس نے اسے خود کال پیک کی تھی۔

”ہیلو۔۔۔! نیل نے چارپاچ مرتبہ رنگ بچنے کے بعد کال ریسیو کی تھی۔

”نیل! پلیز یار کیوں ٹینشن دے رہے ہو!“ بتاؤ کیا بات ہے؟“ دل آور نے نجائے کیوں اپنے غصے کو نرمی میں بدل دیا تھا اور نیل اس کے انداز پہ مسکرا دیا تھا اور اسے مزید زچ کرنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔

”ارے یار! آج بتول آنٹی کی آمد کی خوشی میں ممانے تمہاری فیملی کو اور عبداللہ کی فیملی کو ڈرنپہ انوائیٹ کیا ہے تم لوگ آج ڈرنپہ ہماری طرف انوائیٹ ہو بس یہی بتانے کے لیے فون کیا ہے اب تم آنٹی کو بھی بتا دینا۔“ نیل نے

بالآخر اسے بتائی دیا تھا۔

”نیل یار! آج نہیں میں ذرا مینٹلی اپ سیٹ ہوں میں تمہاری اس دعوت کو انجوائے نہیں کر پاؤں گا اس لیے تم یہ دعوت کل پہ اٹھا رکھو پلیز یار میری بات کو مانینڈ مت کرنا۔“

دل آور نے اسے ذرا سمجھانے کی کوشش کی تھی مگر نیل بھی مجبور تھا۔

”کل؟ نہیں یار کل تو بہت مشکل ہے کیونکہ کل میں نے اور عبداللہ نے کراچی بھی جانا ہے ہم نے تو سیمینس بھی ریزرو کروالی ہیں اسی لیے سوچا تھا کہ جانے سے پہلے یہ دعوت بھی ہو ہی جائے تو اچھا ہے پھر ہماری واپسی میں بھی دو تین دن لگ جائیں گے اور ہو سکتا ہے کہ آنٹی بھی واپس اسلام آباد چلی جائیں۔ اس لیے یہ دعوت آج رات کے لیے ہی بہتر ہے تم اپنے آپ کو فریش کرنے کی کوشش کرو دے بھی میں نے آج تم سے کچھ شیئر کرنا ہے رات کو ڈرنپہ کے بعد فرصت سے بیٹھیں گے دنیا داری تو ہوتی ہی رہے گی کچھ دل داری بھی کر لیں آخر! کیا خیال ہے۔“

نیل نے آخر میں شرارت سے پوچھا تھا اور دل آور لمحے کے ہزاروں جھمکے میں ہی اس کی بات کا اور دل داری کا مفہوم سمجھ گیا تھا اور اس نے اپنے تئیں ہوائے اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیے تھے۔

”چلو ٹھیک ہے پھر۔۔۔ یہ دعوت اور یہ دل داری آج ہی سی۔“ دل آور نے گہری سانس خارج کرتے ہوئے بائی بھر لی تھی لیکن نیل حیات اس کی بات کا مفہوم نہیں سمجھ سکا تھا اور خوشی خوشی فون بند کر دیا تھا۔

لیکن دل آور شاہ اس کی اس دعوت اور دل داری پہ کم سم سا ہو کے رہ گیا تھا۔ ہاتھوں میں اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ وہ دوبارہ ٹائی کی ٹاٹ لگاتا یا پھر موبائل آف کر کے واپس نیل پہ رکھتا بلکہ وہ تو جہاں تھا وہیں کا وہیں پتھر ہو گیا تھا۔ دل کسی اتھاہ گہرائی میں ڈوبا تھا اور اس کی دھڑکنیں دیکھتے ہی دیکھتے مدھم مدھم تر ہوتی چلی گئی تھیں اور سماعتوں میں ”دعوت اور دل داری“ جیسے الفاظ گونجتے رہ گئے تھے اور اب واقعی لگ رہا تھا کہ دل اور دنیا پہ نزاع کا عالم وارد ہو چکا تھا اب بس چار سو قیامت کے آثار تھے۔ اور اس قیامت سے فرار کا راستہ کہیں بھی نہیں تھا۔ اسی لیے اسے اس قیامت کے سامنے ڈٹ جانے کے لیے دل آور شاہ بننا ہی پڑا تھا جو کسی بھی قیامت یا کسی بھی طوفان کے سامنے ڈھے نہیں سکتا تھا بلکہ ساری قیامتیں خود پہ سہا لےنے کی پوری طاقت اور حوصلہ رکھتا تھا اور اسی حوصلے کا ثبوت دیتے ہوئے وہ ایک بار پھر اٹھ کھڑا ہوا تھا اور سیدھا کورٹ جا پہنچا تھا جہاں اس کے ایک کیس کی ڈیٹ تھی اور اسے یہ کیس جیتنا ہی تھا کیونکہ ہارنا اس کا شیوہ نہیں تھا۔

اس کی نیت اور ایمان سچے تھے اور یہ اس کا اللہ جانتا تھا اس لیے وہ کبھی ہار بھی نہیں سکتا تھا!

”ہیلو میم! کیسی ہیں آپ۔۔۔؟“

وہ اکیڈمی سے نکل کر بس اسٹاپ کی طرف جا رہی تھی جب اچانک اس آواز پہ اس کے قدم ٹھٹک کر رک گئے تھے لیکن اس نے پلٹ کر دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

”اف۔۔۔! یہاں تو پلٹ کر دیکھنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کرتے یہ جان سے پارے لوگ۔“ جودت بڑی ترنگ سے کہتا اپنی بانیگ اس کی سائیڈ پہ اس کے برابر لے آیا تھا اور مریم اسے دیکھ کر کتب بھیج گئی تھی۔

”بس! تھوڑا بڑی ہو گیا تھا ڈیڈ بیمار تھے ہاسپٹل کے چکر کا شکار رہے تھے اور کچھ اپنی یونیورسٹی کے ”وخت“ بھی تھے اس لیے اتنے دن درشن کے لیے حاضری نہیں دے سکا لیکن اب آپ بے فکر ہیں یہ حاضری روز تیار ہوں گا صبح پہر شام۔“ وہ بڑی ادا سے کہتا شرارت سے سینے پہ ہاتھ رکھ کے اس کی سمت جھکا تھا جبکہ مریم اس کی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شاندار پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

مجموعہ خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چینلنگ اور ایچ پی ڈی کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹنگ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں ایپلوڈنگ
- ✧ سیریم کوالٹی، نادرل کوالٹی، کیپرینڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور امین صفی کی مکمل ریٹنگ
- ✧ ایڈ فوری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

حرکت یہ بے ساختہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی تھی اور وہ پھر بایک اس کے قریب لے آیا تھا۔
”آپ کیا سمجھی تھیں کہ جودت آئندہ جان چھوڑ گیا؟“ وہ آنکھوں پہ ہلکے گلاسز چڑھائے تبسم سے لہجے میں کہتا اسے سر ہٹا کر نظروں سے دیکھ رہا تھا اور مریم کو اس کی نظریں اپنے جسم پہ انگاروں کی طرح محسوس ہو رہی تھیں اور ان انگاروں کی جلن کو ضبط کرنا اس کے لیے محال ہو رہا تھا وہ بڑے ضبط سے اس سے مخاطب ہوئی تھی۔
”پلیز راستہ چھوڑیں۔!“ مریم نے پھر بھی ذرا تحمل سے کام لیا تھا۔

”تم اپنے تک آنے کا راستہ دے دو میں یہ راستہ چھوڑ دوں گا۔“ اس نے لارووائی سے کندھے اچکائے تھے اور مریم کا پارہ ہائی ہو گیا تھا وہ سچ راستے میں اس کی ایسی بے ہودہ باتیں اور حرکتیں ہرگز برداشت نہیں کر سکتی تھی اس کے آپ پاس اکیڈمی کی اسٹوڈنٹس بھی گزر رہی تھیں تھوڑی دیر پہلے ہی — چھٹی ہوئی تھی۔ اس لیے ابھی اسٹوڈنٹس کا رش چھٹ رہا تھا۔

”شٹ اپ جودت آئندہ! میرا راستہ چھوڑو۔ تمہارا مقصد کیا ہے؟ تم آخر چاہتے کیا ہو؟“ مریم دبے لہجے میں چیختی تھی اور جودت اس کی برہمی پہ لطف اندوز ہوتے ہوئے بے ساختہ مسکرایا تھا۔

زندہ رہنے کے لیے تیری قسم
اک ملاقات ضروری ہے صنم
اک ملاقات ضروری ہے صنم

اس نے جواباً ”گانا گنگنائے ہوئے خاصے لوفرانہ انداز میں اسے آنکھ ماری تھی اور مریم سر سے لے کر پاؤں تک جل اٹھی تھی اس کا دل چاہ رہا تھا کہ جودت آئندہ کے منہ پہ اک زوردار طمانچہ دے مارے مگر پھر بھی اپنے آپ پاس کا خیال رکھتے ہوئے اس نے اپنے ہاتھ کو بھی اپنے کنٹرول میں ہی رکھا تھا۔

”کہو؟ کیا ارادہ ہے؟ کرو گی ایک ملاقات؟ صرف ایک وہ بھی جیسی تم چاہو۔“ جودت نے خیانت کی حد کر دی تھی اور مریم کی برداشت کی بھی حد ہو گئی تھی اب کی بار وہ اپنے ہاتھ کو کنٹرول میں نہیں کر سکی تھی مگر اس کا ہاتھ اپنے چہرے پہ پڑنے سے پہلے ہی جودت نے اپنی گرفت میں سنبھال لیا تھا جس کو چھڑانے کے لیے مریم نے اپنی طرف سے ایک بھرپور سعی کی تھی مگر جودت نے اس کا ہاتھ چھوڑنے کے بجائے اپنے ہونٹوں سے لگا لیا تھا اور مریم یکدم جیسے پتھر کا بتدن گئی تھی وہ شدید سی اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔

”یہ بوسہ تمہاری جرات کا خراج ہے اور مجھے امید ہے کہ تم آئندہ کسی بھی جرات سے پہلے اس خراج کو ضرور یاد رکھو گی۔“ وہ اسے ایک بار پھر خیانت سے آنکھ دباتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

لیکن پیچھے سے دل اور شاہ کی گاڑی نے اسے بایک سمیت ٹھوکر مار کر کئی فٹ دور اچھالتے ہوئے اس کی ساری خیانت اور سارا نشہ ہرن کر دیا تھا جس پہ مریم بدک کر پیچھے ہٹ گئی تھی جبکہ دل اور شاہ اپنی گاڑی سے غضب ناکی کی علامت بنا نیچے اتر آیا تھا کیونکہ وہ جودت آئندہ کی حرکت دیکھ چکا تھا اور اس کا میٹر گھوما ہوا تھا اس وقت۔

اور مریم کو اس افتاد پہ اپنی آنکھوں کے سامنے زمین و آسمان چکراتے ہوئے نظر آئے تھے۔!

(باقی آئندہ)



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہر ای ٹک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای ٹک کا پرنٹ پریویو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیننگ اور اچھے پرنٹ سے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریش
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای ٹک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں ایلو ڈنگ
- ☆ سیریم کو ایڈیٹنگ، کپی رایت، ہائی
- ☆ عمران سیریز اور منظر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریش
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

ہم ادویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

☆ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

☆ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہمارے سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک ویکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیحدے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدھیہ اور خیال حیات دو ہی ہیں، بھائی ہیں، مدھیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے، وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پر رنگ چکی ہے، جس کے پیش نظر فائرہ بیگم، قبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں، لیکن مدھیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے، جس پہ خیال اور فائرہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے، مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پھنس رہا ہے۔

ذریل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے، مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، بے بسی اور بے روزگاری سے تنگ آخر خود کشی کرنے کا سوچتا ہے، لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھاسے میں چائے پیتے ہوئے پاؤ اتیار زمل جاتا ہے، جو اسے کام کی آفر کرتا ہے، جس پر ذریل کافی خوش ہوتا ہے، اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھتا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میسرک پاس آوی ہے، وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے، وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

رہا، آرزو شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے، وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آوی ہے، اس نے

کبھی ہارنا نہیں سیکھا، اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پر بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔

تیسویں قسط

کیونکہ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے اتنا بڑا ہنگامہ مچ گیا تھا۔
وہ آدمی کون تھا اور کون نہیں؟ مریم یہ نہیں جانتی تھی مگر وہ جو بھی تھا اس وقت اس کے عراںمہت خطرناک لگ رہے تھے وہ خاصے جارحانہ تیوروں سے جودت کی طرف بڑھا تھا اور اس نے نیچے زمین پر گرے ہوئے جودت کو اس کی شرٹ کے کنارے دوپٹے کرکے جھٹکے سے اپنے سامنے کھڑا کر دیا تھا۔
”جودت آؤدی! تم نے آج ثابت کر دیا ہے کہ تم واقعی ایک ذلیل اور گندے گھرانے کی اولاد ہو۔ مگر اتنا یاد رکھنا کہ تمہاری یہ گندی اگر کسی اور کے گھر تک پہنچی تو تمہارے اس جوانی کے نشے میں ڈوبے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کتوں کو ڈال دوں گا۔ اور تمہارے گھروالوں کو تمہارا نامو نشان بھی نہیں ملے گا۔“ اس نے جودت کو اس کی شرٹ کے گریبان سے پکڑ کر ذرا سا جھجھوڑتے ہوئے انتہائی غضبناک لہجے میں اسے وارننگ دی تھی اور جودت اپنے اعصاب ٹھکانے پر آتے ہی اس کی ہڈیوں پر نہیں بلکہ اس کی شکل و صورت دیکھ کر دم بخود سا رہ گیا تھا۔ اسے اپنی چوٹ اور افتادہ بھول گئی تھی۔ وہ بس آنکھیں پھیلائے بے یقین سے انداز میں اس کے چہرے کی سمت دیکھ رہا تھا۔

”منصور حسین! انتہا تم؟“ جودت کی زبان لڑکھرائی تھی اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے ان کی جو بی کو بریاد کرنے والا علیزے کا ڈرائیور منصور حسین کھڑا ہے۔
”ہاں! میں اور تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو لیکن اگر نہیں بھی جانتے تو کوئی بات نہیں تمہارے ڈیڈ تو جانتے ہی ہیں۔ اس لیے بہت جلد تم لوگ بھی جان جاؤ گے اور یہ بھی جان جاؤ گے کہ کسی دوسرے کی عزت کو عزت نہ سمجھنے والے کا میں کیا حال کرتا ہوں؟ کسی کی بہن یا بیٹی پر بری نظر ڈالتے ہوئے تمہیں شرم بھی آئے گی اور تمہیں برا بھی لگے گا لیکن یہ شرم تمہیں تب ہی آئے گی جب تمہیں اپنی یا کسی اور کی عزت کا خیال آئے گا۔ اور جہاں تک میرا اندازہ کہتا ہے تو وہ یہی ہے کہ تمہیں یہ خیال بھی نہیں آئے گا اس لیے میں تمہیں یہ سمجھا دیتا چاہتا ہوں کہ اگر آئندہ کبھی تم مجھے اس لڑکی کو یا پھر کسی بھی لڑکی کو چھیڑتے ہوئے یا تنگ کرتے ہوئے نظر آئے تو تمہارا وہ حشر کروں گا کہ پورا شہر تماشا دیکھے گا اور تم اپنی شناخت پر منہ چھپاتے پھوگے اور اس لیے بہتر ہے کہ تم اپنی حرکتوں سے باز آ جاؤ۔ ورنہ آج جس گاڑی سے میں نے تمہیں ٹھوکر ماری ہے کل میں تمہیں اس گاڑی سے روند کے بھی گزر سکتا ہوں۔ یہ ٹھوکر تو تمہارے لیے محض ایک اشارہ تھی تاکہ تم سنبھل جاؤ ورنہ میں تمہارے ساتھ کس طرح پیش آ سکتا ہوں تم کبھی سوچ بھی نہیں سکتے اور میں ہمیشہ کرتا بھی وہی ہوں جو کسی نے سوچا بھی نہیں ہوتا اور اس کی ایک مثال تو تم دیکھ ہی چکے ہو گے؟“ دل اور نے غصے سے بھری کالٹ دار آنکھوں سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اسے بہت کچھ باور کروا دیا تھا اور پھر اسی ایک جھٹکے سے اس کی شرٹ کا گریبان چھوڑتے ہوئے اسے پیچھے دھکیل دیا تھا اور خود واپسی کے لیے قدم موڑ لیے تھے۔ جبکہ جودت کا وہ بیان یکدم علیزے کی طرف چلا گیا تھا جو ان لوگوں کے درمیان شناسائی کا ایک حوالہ تھی۔

”علیزے! علیزے! کہاں ہے منصور حسین؟“ تم نے اس کے ساتھ ایسا کیوں کیا ہے؟ کیوں دھوکا دیا ہے ہمیں؟ کیوں؟“ جودت پیچھے سے بلند آواز میں چلایا تھا۔ دل اور نے مریم کے قریب پہنچ کر ذرا کی ذرا پلٹ کر جودت کی سمت دیکھا تھا جو چہرے پر تکلیف اور الجھن کے آثار لیے کھڑا اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔
”جودت سڑوں کی علیزے کے ساتھ ایسا کرتے ہیں ان کی اپنی علیزے کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔“ دل اور نے کافی رخ اور جھجھکتے ہوئے لہجے میں کہتے ہوئے مریم کی طرف اشارے سے اسے کچھ بتایا تھا اور پھر مزید اسے دیکھے بغیر دوبارہ مریم کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

”مگر آپ کو مسئلہ نہ ہو تو آئیے میں آپ کو ڈراپ کر دیتا ہوں۔“ اس نے مریم کو دیکھتے ہوئے اپنی گاڑی کی

طرف اشارہ کیا تھا اور مریم اپنے سامنے کھڑے اس آدمی کی شاندار پرسنالشی اور اتنی بڑی گاڑی دیکھ کر اندر سے تذبذب کا شکار ہو گئی تھی کہ وہ کیا کرے؟ انکار کر دے یا اقرار کر لے؟ آخر وہ آدمی جو بھی تھا اس کے لیے تو بالکل اجنبی ہی تھا تاہم اتنی آسانی سے کیسے اس کی گاڑی میں بیٹھ جاتی۔

”آپ پریشان مت ہوں۔ میری بھی ایک بہن ہے اس لیے دوسروں کی بہنوں کی عزت کرنا کافی اچھی طرح جانتا ہوں البتہ میں آپ سے زیادہ اصرار نہیں کروں گا اگر آپ جانا چاہیں تو ٹیکسی سے بھی جاسکتی ہیں میں آپ کو ٹیکسی ہائر کر دیتا ہوں۔“ دل اور اس کے لیے اپنی گاڑی کا بیک ڈور کھولتے کھولتے رک گیا تھا اور مریم اس کی بات پر سنبھل گئی تھی اس نے اپنے آپ کو فوراً ”کیوز کر لیا تھا۔

”من۔ نہیں! ٹیکسی کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے دل اور کو ٹیکسی کرنے سے روک دیا تھا۔ جس کا مطالبہ تھا کہ وہ اس کے ساتھ جانے کو تیار تھی اس لیے دل اور نے اس کے روکنے کا مفہوم سمجھتے ہوئے پلٹ کر دوبارہ اپنی گاڑی کا بیک ڈور کھول دیا تھا اور مریم دھڑکتے دل کے ساتھ حوصلہ بلند کرتی ہوئی آگے بڑھ کے گاڑی کے اندر بیٹھ گئی تھی اور دل اور نے اس کے بیٹھنے کے بعد گاڑی کا ڈور بند کر کے خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی اور اگلے دو منٹ میں وہ جودت کے سامنے ہی گاڑی نکال لے گیا تھا اور اس کی گاڑی کی بیک سیٹ پر بیٹھی مریم چپ کی چپ رہ گئی تھی۔

آج جو کچھ ہو چکا تھا وہ واقعی بہت غلط اور چپ ہو جانے والا تھا اسی لیے اس کے ذہن کو خاموشی کیامی تھی کہ سوچوں نے الگ شور مچا دیا تھا جس کی وجہ سے اس کے تمام محسوسات بے وار ہو گئے تھے اور اس کے ہاتھ پر مثبت جودت آؤدی کے ہونٹوں کا لمس انکارے کی طرح دہکنے لگا تھا۔ چلن دینے لگا تھا۔ اسے اپنے ہاتھ کی جلد پر کسی تیزاب کی سی تکلیف کا احساس ہونے لگا تھا اور اسی احساس کے تحت وہ لاشعوری طور پر ہی اپنے ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے مسنے لگی تھی اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اپنے ہاتھ کی جلد وہاں سے کالٹ کے پھینک دے جہاں پر اس کے ہونٹوں کا لمس سلگ رہا تھا۔ کیونکہ اس کے ہاتھ کا وہ حصہ وہ جگہ اور وہ نقش اسے ازیت دے رہے تھے وہ اندر ہی اندر جل رہی تھی کڑھ رہی تھی اور اپنے ہاتھوں کی مٹھیاں پہنچ رہی تھی اور اس سارے چکر میں اس کے ذہن سے یہ بھی نکل گیا تھا کہ وہ اس وقت ایک اجنبی کی گاڑی میں سوار ہے اور کہاں جا رہی ہے؟ وہ بے خبری میں تھی اس وقت مگر اگلے ہی پل دل اور کے موبائل کی رنگ نیون نے اس کو خبردار کرنے کے ساتھ ساتھ چونکا دیا تھا۔
”تیس دل اور شاہ اسپیکنگ۔“ اس آدمی نے کال ریسیو کرتے ہی اپنا تعارف کر دیا تھا اور مریم اس کے تعارف پر ششدر سی رہ گئی تھی اس نے اک جھٹکے سے سر اٹھا کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے اس آدمی کو دیکھا تھا جو اب اپنا تعارف کرانے کے بعد کسی سے بات کر رہا تھا۔

”ایس پی کامران مہدی بات کر رہا ہوں۔“ ایس پی کامران مہدی نے کسی لینڈ لائن نمبر سے کال کی تھی اسی لیے اسے بھی اپنا تعارف کرانا پڑا تھا۔

”اوہ! ایس پی صاحب کیسے ہیں آپ؟“ دل اور کی ساری توجہ اب ایس پی کامران مہدی کی طرف مبذول ہو چکی تھی۔

”شکر ہے اللہ کا بے شر صاحب! آپ سائیں کیا چل رہا ہے آج کل؟“ ایس پی کامران مہدی نے بھی کافی فریٹش لہجے میں جواب دیا تھا۔

”وہی سب کچھ جو آپ کی طرف چل رہا ہے۔ کام کام اور صرف کام۔“ دل اور نے ہلکے سے کندھے اچکائے تھے۔

”چلیں بے شر صاحب! اچھے کی امید رکھتے ہیں۔ اللہ کبھی ہمیں بھی تو فرصت دے گا ہم بھی کام کے علاوہ کچھ

اور انجوائے کر لیں گے۔“ ایس بی کامران ممدی نے ٹھنڈی آہ بھری تھی اور دل اور اس کے انداز پہ بے ساختہ تنقید لگا کے ہنسا تھا۔

”سنا تھا کہ امید پہ دنیا قائم ہے، مگر آج تو اس محاورے پہ یقین بھی اُٹھ گیا ہے۔ کیونکہ ایس بی صاحب بھی اسی محاورے پہ قائم ہیں۔“ دل اور نے ایس بی کامران ممدی کی بات کو خوب انجوائے کیا تھا۔

”تو پھر اور کیا کریں؟ دل کو کچھ تو تسلی دینی ہی ہے بیرسٹر صاحب۔“ ایس بی کامران ممدی نے بھی مسکرا کر جواب دیا تھا۔

”خیر ایہ تسلیاں تو ہم اپنے آپ کو دیتے ہی رہیں گے آپ یہ بتائیں کہ آج یا دیکھ کر لیا؟ کوئی نئی تازہ؟“ دل اور نے اس سے اصل بات کے لیے استفسار کیا تھا۔

”نئی تازہ یہی ہے کہ ملک حق نواز کی تیل کے لیے کچھ سرگرمیاں نظر آرہی ہیں۔ ملک اسد اللہ اور ملک شرافت علی اس سے ملاقات کے لیے بھی آئے تھے اور اس کی تیل کی بات بھی ہو رہی تھی آخر ان کا اپنا اثر در سوخ بھی بہت ہے۔ تیل تو وہ کرواہی لیں گے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ اس کیس میں میڈیا کو بھی انوالو کر لیں تاکہ یہ مسئلہ جن لوگوں کی نظروں سے چھپا ہوا ہے ان کے سامنے بھی آجائے اور ملک حق نواز کی تیل ناممکن ہو جائے ورنہ وہ بہت آسانی سے بچ کے نکل جائے گا۔“

ایس بی کامران ممدی نے اسے مسئلہ بتانے کے ساتھ ساتھ مسئلے کا حل بھی بتا دیا تھا جس پہ دل اور کے ماتھے پہ سلو میں بڑھتی تھیں اور لہجہ بھی بدل گیا تھا۔

”نہیں ایس بی صاحب! ایسا ممکن نہیں ہے۔ میں اس ذلیل انسان کو سزا دینے کے لیے مومند بی بی کو میڈیا والوں کے تنگ سوالوں کے سامنے کھڑا نہیں کر سکتا۔ میں اس کو سزا دلاؤں گا تو اپنے طریقے سے یہ طریقہ میرے معیار کا نہیں ہے۔ میں اس مظلوم لڑکی کا استعمال نہیں کر سکتا۔“ دل اور نے کافی سختی سے نفی میں سر ہلایا تھا کیونکہ وہ اس مسئلے کے لیے حل پہ تیار نہیں تھا۔ وہ مومند بی بی کو پوری دنیا کی نظروں کے سامنے نہیں لاسکتا تھا وہ ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا مگر ایس بی کامران ممدی اس کی اس سوچ کو اتنی جلدی سمجھ نہیں سکا تھا اسی لیے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

”لیکن بیرسٹر صاحب! یہ مسئلہ یہ کیس بھی تو اسی لڑکی کا ہے نا؟ آپ اسے کون سا کسی اور کیس میں انوالو کر رہے ہیں؟ وہ اس کیس میں انوالو نہیں ہوگی تو کیس مضبوط کیسے ہوگا؟ اور اگر ملک حق نواز کی تیل ہوگئی تو سب سے زیادہ مسئلہ آپ کو ہوگا وہ اب آپ کو اپنا دشمن اور اپنا ٹارگٹ سمجھ رہا ہے۔ اس کا پہلا حملہ آپ پر ہی ہوگا۔“ ایس بی کامران ممدی بھی اپنی جگہ پہ درست تھا۔

مگر دل اور کی بھی اپنی ہی منطق ہوتی تھی وہ ایسی باتوں کے ذرا کم ہی نوٹس لیتا تھا کیونکہ اس نے کرنا وہی ہوتا تھا جو اس کی اپنی مرضی ہوتی تھی اس لیے ادھر ادھر کے مشوروں پہ دھیان دینا اس نے سیکھا ہی نہیں تھا اور اس وقت بھی اس کا ایسا ہی رد عمل تھا وہ کسی بھی مشورے پہ دھیان دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

”ایس بی صاحب! اس لڑکی پہ ظلم ہوا ہے زیادتی ہوئی ہے اس کے ساتھ اسے بے چارہ اور بے آبرو کیا گیا ہے اور اسی ظلم زیادتی اور آبروریزی سے بلبلا کر اس نے انصاف کے لیے آواز اٹھائی ہے، احتجاج بلند کیا ہے یہاں تک کہ اس انصاف کی خاطر اپنے گھر اور گھر والوں کو بھی چھوڑ دیا ہے۔ گھر سے بے گھر ہوگئی ہے وہ اور آپ اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ کسی لڑکی کے لیے بے آبرو ہونا اور بے گھر ہونا کتنی بڑی اذیت ہوگی؟ کتنا برا عذاب ہوگا؟ لوں اس لڑکی نے تو یہ دونوں اذیتیں دیکھی ہیں دونوں عذاب اٹھائے ہیں اور ایسے میں میں ہی اس کے اس احتجاج کو اس کے لیے مشکل بنادوں تو آپ کا کیا خیال ہے کہ پھر کبھی کوئی بھی مظلوم عورت انصاف کے لیے آواز

اٹھائے گی؟ یا کبھی کسی زیادتی پہ احتجاج کر پائے گی؟ ہونہب! نہیں ایس بی صاحب ایسا کبھی نہیں ہوگا پھر ہر مظلوم عورت ظلم کو انصاف سے بہتر سمجھنے لگے گی، پھر کبھی کوئی عورت احتجاج نہیں کرے گی اور نہ ہی کبھی انصاف کے لیے کوئی آواز اٹھائے گی اور میں لوگوں کو انصاف دلانے والا ایسا کبھی نہیں چاہ سکتا میری وجہ سے کوئی انسان انصاف سے محروم نہ جائے اور انصاف کی طلب سے دور ہو جائے۔ اسی لیے آپ یہ خیال ذہن سے نکال دیں کہ میں اس معاملے میں میڈیا سے کوئی ہیلپ لوں گا بے شک ملک حق نواز تیل کروانے کے لاکھ اب سے باہر آجائے، مجھے کوئی پروا نہیں ہے اس کی تیل سے بھلا کیا ہوگا؟ میں اسے دیکھ لوں گا اس کی تیل کا پوائنٹ تو پہلے روز سے ہی میرے ذہن میں تھا وہ لوگ اس کی تیل تو کسی بھی وقت کسی بھی طرح کروا سکتے تھے، سر حال میں کوشش کروں گا کہ اس کی تیل کی بوتل رہ جیٹ ہو جائے۔ اس لیے آپ بھی بے فکر رہیں اور آگے آگے دیکھیے کہ کیا ہوتا ہے لیکن پھر بھی میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے انفارم کیا ہے اور امید ہے کہ آپ آئندہ بھی اسی طرح میرا ساتھ دیں گے بغیر کسی بات کو مانڈ کیے۔“

دل اور نے ایس بی کامران ممدی کو کافی اچھے طریقے سے اپنے پوائنٹ آف ویو سے آگاہ کیا تھا اور ایس بی کامران ممدی نے اس پوائنٹ آف ویو کو اچھی طرح سے سمجھ بھی لیا تھا۔ اسی لیے اسے مزید کچھ بھی سمجھانے کی کوشش نہیں کی تھی اور سارا معاملہ اس کے پوائنٹ آف ویو پر چھوڑ دیا تھا۔

”ٹھیک ہے بیرسٹر صاحب! جیسے آپ بہتر سمجھتے ہیں، آپ ویسائی کریں کیونکہ آپ اگر بغیر کسی غرض کے ایک مظلوم عورت کا ساتھ دے رہے ہیں تو اس اچھے کام میں ہم کیسے پیچھے رہ سکتے ہیں؟ ہم ان خدا اللہ ہمیشہ ایسے معاملے میں آپ کا ساتھ نبھائیں گے۔ آپ جو بھی کہیں گے ہماری طرف سے آئیں گے۔“ ایس بی کامران ممدی نے اسے اپنی طرف سے پوری طرح سے مطمئن کیا تھا اور دل اور کو اس کی بات پہ خوشی ہوئی تھی کہ چلو کسی اور نے تو اس جیسا سوچا!

”ٹھیک یو ایس بی صاحب! ٹھیک یو سوچ! مجھے آپ سے یہی امید تھی، سر حال میں اس وقت فون بند کرتا ہوں، مجھے اس وقت نہیں جانا ہے، آپ سے پھر فرصت میں بات ہوگی۔“ دل اور نے مریم کے خیال سے گاڑی کی اسپیڈ کم کرتے ہوئے ایس بی کامران ممدی سے اجازت چاہی تھی کیونکہ آخر اس نے اس لڑکی سے اس کا ٹھکانہ بھی تو پوچھنا تھا۔

”لو کے بیرسٹر صاحب اللہ حافظ! ایس بی کامران ممدی نے جلدی ہی فون بند کر دیا تھا اور دل اور فون بند ہوتے ہی بیک سیٹ پہ بیٹھی حیرت سے گنگ مریم فاروق نیازی کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

”آپ نے کس طرف جانا ہے؟ کہاں ڈراپ کروں؟“ دل اور نے بغیر اس کی طرف دیکھے ذرا نرمی سے دریافت کیا تھا اور مریم اس کے پوچھنے پہ ایک بار پھر چونک کر متوجہ ہوئی تھی۔

”جج جی! کیا کہا آپ نے؟“ اس نے غیر حاضر دماغ سے دوبارہ استفسار کیا تھا۔

”آپ نے کس طرف جانا ہے؟ کہاں ڈراپ کروں آپ کو؟“ دل اور نے دوبارہ دہرایا تھا اور مریم نے آہستگی سے اپنے گھر کا ایڈریس بتا دیا تھا کیونکہ وہ جس آدمی کو ابھی اور نبھانے کیسا سمجھ رہی تھی وہ آدمی ہی اصل اعتماد کے قائل ہے یہ تو وہ جانتی ہی نہیں تھی۔ اسی لیے اس نے بغیر کسی حیل و حجت کے اپنے گھر کا ایڈریس بتا دیا تھا اور دل اور نے ٹھیک سا بچ منٹ کے بعد گاڑی اس کے مطلوب ایڈریس پہ جا روکی تھی۔

”آگے گلی تنگ ہے؟“ دل اور نے اوپر اوپر دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

”جی! آگے گلی تنگ ہے۔“ مریم کی آواز دھیمی تھی اور دل اور نے اب کی بار گردن موڑ کر اس کی طرف سے دیکھا تھا کیونکہ مریم نیچے اترنے کے لیے دروازے کی سمت ہاتھ بڑھا رہی تھی۔

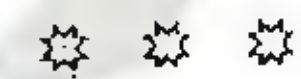
”کیسے! مجھے غلط مت سمجھے گا اور اصل آپ کو اپنے ساتھ اپنی گاڑی میں لانے کا صرف یہی مقصد تھا کہ جو تہی کو کم از کم اتنا اندازہ ہو جائے کہ آپ کی مجھ سے کوئی جان پہچان ضرور ہے اس لیے وہ آئندہ آپ کو تنگ کرنے اور آپ کی طرف دیکھنے سے بھی گریز کرے، کیونکہ آپ تو نہیں لیکن وہ مجھے اچھی طرح جانتا ہے اور اس طرح آپ کو میرے ساتھ دیکھ کر اور بھی جان جائے گا ورنہ میں آپ کے ٹیکسی سے بھی بھیج سکتا تھا بس اسی وجہ سے میں نے آپ کو اپنے ساتھ آنے کی آفر کی تھی۔“

دل آور نے اس کے جانے سے پہلے بات کی وضاحت کر دینا ضروری سمجھا تھا تاکہ وہ لڑکی اسے غلط نہ سمجھے اور اس کا ذہن کسی بھی ایسے ویسے خیال سے پاک ہو جائے حالانکہ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس لڑکی کا ذہن تو اس کا نام سن کر ہی ایسے ویسے خیال سے پاک ہو گیا تھا وہ اسے اس کے نام سے ہی پہچان گئی تھی۔

”نہیں سر! آپ ایسا مت سوچیے آپ نے مشکل وقت میں میری مدد کر کے مجھے یہ احسان کیا ہے جس کے لیے میں آپ کی شکر گزار ہوں اور ہمیشہ رہوں گی۔ آئی ایم رسل تھینکس فل ٹو یو اور ری بات آپ کو جاننے کی تو یہ سچ ہے کہ میں بھی آپ کو اچھی طرح جانتی ہوں کیونکہ آپ پہلے ہی ہماری دعاؤں میں شامل ہیں۔ میری ماں میری بہنیں اور میں خود آپ کے لیے خدا کے حضور دعا گو ہو چکی ہوں۔ اس لیے کہ آپ نے ہمارے واحد سہارے کا ہمارے اکلوتے بھائی کا ساتھ دیا ہے۔ ہمیں بے سروسامان ہونے سے بچایا ہے۔ عدیل عمر نیازی کی ضمانت کروائی ہے اور اسے آزادی دلائی ہے اور عدیل عمر نیازی کی بہن ہونے کے ناتے میں ایک بار پھر آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی سب ٹھیک ہو سوچ۔ آپ واقعی ایک اچھے انسان ہیں مجھے آپ سے مل کر اور آپ کو دیکھ کر واقعی بہت خوشی ہوئی ہے۔ اللہ آپ کو کامیابیاں و کامرانیاں عطا کرے اور آپ کی عمر روز کرے آمین۔“

مریم نے بھی جواباً ”کھل کے جواب دیا تھا اور جوں میں تھا سب کہہ دیا تھا جبکہ دوسری طرف دل آور خود بھی اس لڑکی کی بات پہ اور اس کے تعارف پہ حیران رہ گیا تھا۔ وہ عدیل عمر کی بہن تھی یہ تو اسے پتا ہی نہیں تھا۔ جسے جان کر اسے واقعی بہت حیرانی ہوئی تھی۔

”اللہ حافظ سر!“ دل آور کو اسی طرح حیران چھوڑ کر گاڑی سے نیچے اتر گئی تھی اور وہ چند سیکنڈ یونی اس لڑکی کو کلی مرستے دیکھ کر پھر گاڑی آگے بڑھا چکا تھا۔!



”اسلام علیکم سر!“ وہ ابھی شوروم کی پارکنگ میں گاڑی پارک کر کے گاڑی سے نیچے اتر رہی تھا کہ اچانک عدیل عمر اس کے سامنے آگیا تھا۔

”مرے! او علیکم السلام کیسے ہو؟“ دل آور نے جواباً ”خاصی گرجو شکی کا مظاہرہ کیا تھا جس پہ عدیل کو کافی تسلی ہوئی تھی کہ اس کا موڈ خوشوار ہے۔“

”جی! اللہ کا احسان ہے میں ٹھیک ہوں آپ سنا میں کہاں تھے اتنے دنوں سے؟ میں اتنی بار آفس آیا مگر ہر بار آپ کی غیر موجودگی کا سن کر مجھے واپس جانا پڑا آج بھی مجھے امید نہیں تھی کہ آپ سے ملاقات ہوگی لیکن پھر بھی اپنے آپ کو تسلی دے کر چلا آیا کہ شاید آج مایوس نہ لوٹا پڑے اور دیکھ لیں آج اللہ نے مایوسی کا منہ دیکھنے سے بچا لیا ہے۔ آج آپ سے ملاقات ہوئی گئی ہے۔“ عدیل نے اس سے ملاقات ہو جانے پہ خاصی خوشی کا اظہار کیا تھا جبکہ دل آور اس کی بات پہ اور اس کے انداز پہ مسکرایا تھا۔

”مستر عدیل! میں تو آپ کو خاصا سمجھ دار سمجھ رہا تھا لیکن آپ تو پہلے قدم پہ ہی سمجھ داری سے دستبردار ہو گئے ہیں بہت افسوس ہو یہ جان کر!“ دل آور نے جیسے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے نفی میں سر ہلایا تھا اور عدیل نے

اس کے افسوس پہ ابھی ہوئی اور نا سمجھ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”کیا مطلب سر! کیا کیا ہے میں نے جس پہ آپ کو اتنا افسوس ہو رہا ہے؟“

”مجبوری بھی تم بوجھ رہے ہو کہ تم نے کیا کیا ہے؟ ارے! اولاً کمال کی بات ہے یار۔ اتنے دن ہو گئے میں نے تمہیں کہا تھا کہ تم آجانا اب میں آفس میں ہوتا ہوں یا نہیں ہوتا نہیں بھلا اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ بے شک آفس میں میں نہیں تھا لیکن میرا پارٹنر تو ہے نا اور نیل حیات تو میرا پارٹنر ہی نہیں میرا بھائی بھی ہے اور میرا دوست بھی۔ اس کے سامنے تم میرا نام ہی لے لیتے تو وہ فوراً ”نہیں جاب پہ رکھ لیتا اتنے دن مس کر دیے تم نے آخر کیا فائدہ؟ اتنے دنوں میں تو تم یہاں ایڈجسٹ ہو سکتے تھے مگر سمجھ داری سے کام لیتے تبتا۔“

دل آور نے اسے جیسے سرزنش کی تھی جس پہ عدیل کو کافی شرمندگی ہوئی تھی۔

”سر! مجھے اس طرح منہ اٹھا کے ان کے سامنے جانا اچھا نہیں لگا کیونکہ میرے پاس نہ سیل فون ہے اور نہ ہی آپ کا کوئی نمبر تھا کہ میں آپ سے بات ہی کروا سکتا تھا کہ ان کو یقین آجائے کہ مجھے آپ نے ہی بھیجا ہے اور جب میرے پاس ایسا کوئی ثبوت ہی نہیں تھا تو مجھے لگا کہ میرا جانا فضول ہے اسی لیے میں باہر سے ہی واپس لوٹ جاتا تھا۔“ عدیل نے اسے اپنی سوچ اور اپنی عقل کی بات بتائی تھی جس پہ دل آور ایک بار پھر مسکرایا تھا۔

”یہ تمہاری سوچ اور تمہاری عقل کی بات ہے نا ورنہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ تم میرے پارٹنر کے پاس جاتے اور وہ اپنے سیل فون سے میرا نمبر ڈائل کر کے مجھ سے ہی بوجھ لیتا کہ میں نے کسی کو بھیجا ہے یا نہیں؟ تمہارے سیل فون اور نمبر کی تو ضرورت ہی پیش نہیں آسکتی تھی؟“ دل آور کے جواب پہ عدیل کو لا جواب ہونا پڑا تھا بلکہ یہ بھی تسلیم کرنا پڑا تھا کہ وہ ایک سو کیل سے بات کر رہا ہے جس سے جیتنا آسان کام نہیں تھا۔

”سورہی سر! میں سمجھ گیا ہوں کہ میں غلطی پر تھا۔“ عدیل نے بلا جھجکا اعتراف کر لیا تھا۔

”مرے نہیں یار! سورہی کی ضرورت نہیں ہے میں نے تو تمہیں اس لیے تمہاری غلطی کا احساس دلایا ہے کہ تم نے اتنے دن مس کر کے اپنا اور ہمارا نقصان کیا ہے کتنے دنوں میں تم سب کچھ سیکھ سکتے تھے، سمجھ سکتے تھے اور آج تم اس وقت تک میرا انتظار کرنے کی بجائے اندر آفس میں اپنی سیٹ پہ ہو سکتے تھے۔ خیر کوئی بات نہیں ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا تو میرے ساتھ میں سمجھیں ملو تا ہوں اپنے پارٹنر نیل حیات سے۔“ دل آور اس کا کندھا تھپک کر خود بھی اندر کی طرف قدم بڑھا چکا تھا اور عدیل اس کے ساتھ ساتھ چلا ہوا شوروم کے اندر آگیا تھا۔

”نیل صاحب کہاں ہیں؟“ اس نے کسی دروازے سے استفسار کیا تھا۔

”سر! نیل صاحب اور عبداللہ صاحب آفس روم میں ہیں شاید آپ کا ہی انتظار کر رہے ہیں۔“ ان کا دروازہ جواب دے کر وہاں سے ہٹ گیا تھا اور دل آور عدیل کو ساتھ لیے نیل کے روم کی طرف آگیا تھا اور باہر رک کر دروازے کو ٹاک کیا تھا۔

”طیس کم ان!“ اندر سے نیل کی ہی آواز سنائی دی تھی۔

”اسلام علیکم!“ دل آور دروازہ کھلیکا ہوا اندر داخل ہوا تھا۔

”و علیکم السلام! شکر ہے کہ آپ کو بھی اس شوروم کا خیال آیا۔“ نیل نے اسے دیکھتے ہی خفگی کا اظہار کیا تھا اور دل آور نے اس کی کسی بھی خفگی کا کوئی نوٹس لیے بغیر عبداللہ سے ہاتھ ملانے کی طرف دھیان دیا تھا۔

”لگتا ہے کہ کوئی خاص میٹنگ ہو رہی ہے؟“ دل آور نے عبداللہ کے چہرے کی سمت دیکھتے ہوئے اندازہ لگایا تھا۔

”جی جناب! میٹنگ تو ہو رہی ہے اور ارادہ تھا کہ آپ کو بھی اس میٹنگ میں شریک کیا جائے مگر آپ جناب کو فرصت ہی کہاں کہ تھوڑی دیر ہمارے ساتھ بیٹھ کر کچھ ضروری مسئلے مائل ہی ڈسکس کر لیں۔ اس لیے

مجبوری تھی یہ میٹنگ ہمیں خود ہی اشارت کرنا پڑی۔“ عبد اللہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس سے شکوہ بھی کیا تھا اور اپنی مجبوری بھی بتائی تھی۔

”خیر چھوڑو! یہ مسئلے مسائل بھی ڈسکس ہوتے ہی رہیں گے۔ تم ان سے ملو یہ ہیں عدیل عمر نیازی ہمارے اس شوروم کے نئے میجر اور عدیل عمر یہ ہیں ہمارے جگر کے ٹکڑے ملک عبد اللہ صاحب ان کی دوستی اور ان سے یاری کی وجہ سے ہی ہماری زندگی کا نظام چل رہا ہے ورنہ زندگی ہمارے لیے بالکل بے کار ہوتی۔“ دل آور نے خاصا تفصیلی تعارف کروایا تھا جس پر عبد اللہ نے اٹھ کر مسکراتے ہوئے عدیل عمر سے ہاتھ ملایا تھا۔

”اور یہ رہے اس شوروم کے اوپر اور ہمارے پارٹنر نیل حیات۔ یہ اگر نیل حیات نہ ہوتے تو ضرور ہماری محبوبہ ہوتے کیونکہ ہمیں ان سے اتنا ہی پیار ہے جتنا کسی انسان کو اپنی محبوبہ سے ہوتا ہے۔ ہر طرح سے کوشش کی جاتی ہے کہ ان کا پورا پورا خیال رکھوں مگر بتائیں کہ کامیاب ہوتا بھی ہوں یا نہیں۔ سہر حال نیل صاحبہ یہ ہیں آپ کے میجر عدیل عمر نیازی ان کے بارے میں میں پہلے بھی آپ کو بتا چکا ہوں اب خود ہی آپس میں دعا سلام بڑھائیں اور مجھے ریسٹ دیں۔“ دل آور نے تعارف کروانے کی بھی فارمیٹھی نبھادی تھی اور نیل کو اٹھ کر عدیل سے ہاتھ ملانا پڑا تھا۔

”کیسے ہو یار! پیر سٹر صاحب کے منہ سے تمہاری کافی تعریف سنی ہے انہیں یقین ہے کہ تم اپنا کام اچھے طریقے سے ہینڈل کرو گے۔“ نیل نے اس کی تعریف کا برملا اظہار کیا تھا جس پر عدیل نے ذرا نموس ہوتے ہوئے سر جھکا لیا تھا اور پھر اک نظر دل آور کی سمت دیکھا تھا۔

”سرا! ان کے الفاظ صرف تعریف نہیں ہیں بلکہ میرے لیے تو اعزاز ہیں کہ انہوں نے میرے لیے ایسا کہا ہے اور مجھے اس قابل سمجھا ہے ورنہ میں کہاں اور یہ کہاں۔“

”ارے یار! ہم لوگوں کے ساتھ رہنا ہے تو یہ ڈانٹ لاگ ہمیں کہاں اور وہ کہاں“ نہیں چلے گا ہم لوگ تو یاروں کے یار ہیں یہ ذات پات اونچ نیچ اور امیری غریبی کے چکر ہمیں نہیں آتے بس ہم بندہ دیکھتے ہیں اور بندے کا دل دیکھتے ہیں۔“ عبد اللہ نے بڑے فریڈل انڈاز میں عدیل کو تینوں دوستوں کے مزاج سے اور خیالات سے آگاہ کیا تھا جس پر عدیل کو واقعی کافی ڈھارس اور تسلی ہوئی تھی۔

”تھینک یو سرا! یہ تو آپ لوگوں کا بڑا پن ہے ورنہ آج کل لوگ ایسا نہیں سوچتے یہاں سارا چکر ہی امیری غریبی کا چل رہا ہے یہ دور نفسا نفسی کا دور ہے کسی کو کسی دوسرے کی کوئی پروا نہیں ہے اور نہ ہی کسی سے کوئی غرض ہے اور ایسے میں اگر آپ لوگ ایسی سوچ رکھتے ہیں میں آپ لوگوں کو دل سے سلام پیش کرتا ہوں۔“ عدیل نے ذرا سا سر خم کرتے ہوئے جیسے سلام کیا تھا اور دل آور نے اس کے کندھے کو ہتھکتے ہوئے اسے بیٹھنے کا اشارہ کر دیا تھا۔

”بیٹھ جاؤ! بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔“ دل آور خود بھی اس کے ساتھ والی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا تھا۔

”تھینک یو! عدیل شکریہ ادا کرتے ہوئے بیٹھ گیا تھا۔

”کیا بات ہے؟ تم کس سوچ میں ہو؟“ دل آور کے سوال کا رخ نیل کی طرف تھا۔

”میں سوچ رہا ہوں کہ میں نے انہیں پہلے کہاں دیکھا ہے؟“ نیل اپنی سوچ سے الجھ رہا تھا۔

”آپ نے مجھے وہاں دیکھا ہے جہاں آپ ایک لڑکی کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔“ عدیل پہلی نظر میں اسے پہچان گیا تھا اسی لیے اس نے فوراً ہی نیل کی الجھن بھی دور کر دی تھی۔

”وہ اچھا اچھا تو آپ وہی ہیں جنہوں نے مجھے اس لڑکی کو اسپتال لے جانے سے منع کیا تھا۔“ نیل کو بھی یاد آ گیا تھا۔

”کوئی ایسا تو پرانی جان پہچان نکل آئی ہے۔“ عبداللہ اور دل اور ہاتھ ہاتھ مارتے ہوئے ہنس پڑے تھے۔
”ویسے ایکسیڈنٹ کس لڑکی کا۔۔۔ ہوا تھا؟“ عبداللہ نے نیل کو شرارتی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

”ارے یار! مومنہ بی بی کی بات کر رہے ہیں اس روز اسی۔۔۔ کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔“ نیل نے فوراً صفائی پیش کی تھی۔

”اوہ اتنا اس ایکسیڈنٹ کی بات ہو رہی ہے۔“ عبداللہ اور دل اور دونوں بوجھے پڑ گئے تھے۔
”تو اور کیا ورنہ ہماری ایسی قیمت کہاں کہ ہمارا ایکسیڈنٹ کسی ایسی جگہ پہ ہو جہاں ہم چاہتے ہوں۔“ نیل نے جیسے اداسی سے سرو آہ بھری تھی اور دل اور اس کی اس سرو آہ سے نجانے کیوں چپ سا ہو گیا تھا۔

”تم ایکسیڈنٹ کہاں چاہتے ہو؟“ عبداللہ نے نیل کو خاصی گہری ”ڈو“ معنی اور جا چتی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا جس پہ نیل ذرا سنبھل گیا تھا۔

”بھی تیاری میں ہوں بہت جلدی بتاؤں گا تمہیں۔“ نیل نے ریلیکس انداز میں کندھے جھٹکے تھے۔
”نہیں! واقعی؟ یہ میں کیا سن رہا ہوں دل اور یہ کسی ایکسیڈنٹ کی تیاریوں میں ہے اور ہمیں پتا ہی نہیں۔“ عبداللہ نے ایک دم حیرت اور الجھے کا اظہار کیا تھا مگر دل اور نے پھر بھی کوئی خاص نوٹس نہیں لیا تھا بلکہ وہ بات ہی بدل گیا تھا۔

”تم ایکسیڈنٹ کو چھوڑو یہ بتاؤ کہ کام کی تیاری کہاں تک پہنچی ہے؟ کیا پروگرام بنایا ہے تم لوگوں نے؟“ وہ ڈائریکٹ کام کی بات پہ آ گیا تھا۔

”بس پروگرام وہی ہے جو تمہیں بتایا ہے ہم دونوں کل کراچی جا رہے ہیں اس لیے اب وہاں جا کر ہی پتا چلے گا کہ آگے کیا کرتا ہے۔“ نیل بھی کام کی بات کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔

”کچھ اندازہ ہے کہ کتنے دل لگیں گے۔“ دل اور مزید سوال پوچھ رہا تھا۔
”نی الحال تو کچھ اندازہ نہیں ہے یار! اسی لیے تو رات کو تم لوگوں کو ڈیزر انوائٹ کیا ہے کہ نجانے کتنا ٹائم لگ جائے ہمیں فرصت ملنے میں اس لیے بہتر ہے کہ ہم پہلے ہی تھوڑا بہت انجوائے کر لیں۔“ نیل نے اسے دعوت کی وجہ بتائی تھی۔

”ہوں! بہتر ہے تم یہ بتاؤ کہ میجر کی سیٹ کے لیے کچھ انتظام کرنے کو کہا تھا میں نے؟“ دل اور نے عدیل کی سمت اشارہ کرتے ہوئے نیل سے کچھ استفسار کیا تھا۔

”ہاں! کر دیا ہے انتظام۔ یہ لو۔“ نیل نے کہتے ہوئے نیل کالاک کھولا اور ایک لفافہ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا تھا جسے ہاتھ بڑھا کے دل اور نے اٹھا لیا تھا۔

”عدیل عمر! تم آج سے اس شوروم کے میجر ہو اور اس شوروم کے میجر کے لیے ہم نے کچھ سہولیات فراہم کرنے کا سوچا ہے کیونکہ ان کے بغیر نہ ہمارا کام چل سکتا ہے نہ تمہارا اس لیے یہ سہولتیں بہت ضروری ہیں باقی اس جاب کے حوالے سے جو بھی ضروری کاغذی کارروائی رہتی ہے وہ بھی تھوڑی دیر تک کمپلیٹ ہو جائے گی پہلے تم یہ چیک کرو۔“ اس نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے وہ لفافہ عدیل کے سامنے رکھ دیا تھا۔

”لیکن سربا یہ ہے کیا؟“ عدیل لفافہ اٹھانے سے پہلے ذرا دیر کے لیے ٹھہر گیا تھا۔
”خود چیک کر لو۔“ دل اور نے اشارہ کیا تھا۔

اور مجبوراً عدیل کو وہ لفافہ خود ہی کھولنا پڑا تھا اور کھولنے کے بعد وہ حیران سا دکھتا رہ گیا تھا کیونکہ اس کی نظروں کے سامنے ایک پن پیک سیل فون ایک چابی اور کچھ ہزار ہزار کے نوٹوں پہ مشتمل رقم تھی جس کی اسے کچھ سمجھ

نہیں آ رہی تھی اور اس کی نا سمجھی دور کرنے کے لیے دل اور کو ایک بار پھر بولنا پڑا تھا۔
”یہ تمہارے لیے موبائل ہے تم آج ہی نیا نمبر لو اور سیل کو آن کرو اس طرح کسی بھی کام کے حوالے سے تم ہمارے ساتھ رابطے میں رہو گے نہ تمہیں مسئلہ ہوگا نہ ہمیں اور یہ پانک کی چابی ہے تم جب تک اس جاب پہ رہو گے یہ پانک تمہارے استعمال میں رہے گی اور اگر اس جاب پہ نہیں رہو گے تب بھی یہ تمہاری ملکیت رہے گی اور یہ ہے تمہاری پہلی انڈوائس سیلری۔ اس میں کی بیشی کا تمہیں کوئی اعتراض ہو تو تم بلا جھجک بتا سکتے ہو کیونکہ ہر انسان کو اپنے رائٹ کے لیے بولنے کا پورا اختیار ہوتا ہے۔ باقی تمہاری اپنی کوئی ڈیمانڈ ہو تو وہ بھی بتا دو ہم پوری کوشش کریں گے کہ وہ ڈیمانڈ پوری کر سکیں۔“ دل اور نے اس کی پوری تسلی کروائی تھی اور اسے سب کچھ تفصیل سے بتایا تھا جس کے بعد عدیل کے پاس بولنے کے لیے الفاظ بھی نہیں رہے تھے وہ چپ کا چپ رہ گیا تھا۔

”ارے یار! اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ تم پہ کوئی احسان نہیں ہے؟ بلکہ یہ سب تو تمہاری جاب کا ایک حصہ ہے ہاں تم اچھا کام کرو گے تو پر موشن بھی ہو سکتی ہے۔“

اب کی بار نیل نے مداخلت کی تھی اور عدیل حقیقتاً ”دل اور شاہ کے سامنے اس کا دل سے مشکور ہوا تھا۔ حالانکہ عدیل نہیں جانتا تھا کہ دل اور شاہ اس وقت اس کی عزت اس کی بہن کو بھی باحفاظت گھر پہنچا کے آیا ہے جس کا مطلب تھا کہ وہ اس پہ ایک اور احسان کر کے آیا ہے مگر دل اور ایسا نہیں تھا کہ اسے اس احسان کے متعلق بھی بتاتا۔

بس جو بات دھکی چھپی تھی وہی اچھی تھی ورنہ ہو سکتا تھا کہ عدیل اپنی بہن پہ گھر سے باہر نکلنے کی پابندی ہی لگا دیتا۔ لہذا بہتر تھا کہ عدیل کو نہ ہی بتایا جاتا اور اس نے ایسا ہی کیا تھا۔ البتہ ان لوگوں کی باتیں اور کاروباری مسئلے مسائل کافی دیر تک چلتے رہے تھے۔ کیونکہ ان لوگوں نے کام کے سلسلے میں کراچی جانا تھا اس لیے بہتر تھا کہ سب کچھ پہلے سے ہی طے کر لیا جائے۔

”آپ کہاں جا رہے ہیں؟“ اسرار آندھی تیار ہو کر ڈرائنگ ٹیبل کے سامنے سے بٹے ہی تھے کہ ثروت بیگم سامنے آگھڑی ہوئی تھیں۔

”انس اور کہاں؟“ انہوں نے تعجب سے جواب دیا تھا۔
”اور اسپتال بھی جائیں گے؟“ ان کا اگلا سوال سامنے آیا تھا۔

”ظاہر ہے بھی اسپتال بھی جانا ہی ہے۔“ وہ لا پرواہی سے بولے تھے۔
”ٹھیک ہے پھر اگر اسپتال جائیں تو اپنے صاحبزادے سے کہیے گا کہ ذرا گھر کا بھی چکر لگالے ہمارے لیے تو وہ ابھی بھی ایسے ہی ہے جیسے امریکا میں بیٹھا ہوا ہے۔ کسی اور کا تو اسے خیال ہی نہیں ہوتا سوائے بھائی صاحب کی ٹیلی کے۔“ ثروت بیگم نے بر ملا اپنی خفگی کا اظہار کیا تھا اور اسرار آندھی سمجھ گئے تھے کہ وہ آذر کی بات کر رہی ہیں۔

”آجائے گا“ آجائے گا“ بس بھائی صاحب بھی دو روز میں اسپتال سے ڈسچارج ہو جائیں گے، تم فکر نہ کرو“ دانیال بھی تو ہے نا! آگے دنوں سے بھاگ دوڑ کر رہا ہے۔“ اسرار آندھی نے بیوی کو ریلیکس کرنا چاہا تھا۔

”پتا ہے! سب پتا ہے وہ اتنی بھاگ دوڑ کیوں کر رہا ہے؟ یہ بھی جانتی ہوں لیکن مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں ہے میں تو بس اسے بیٹے کی بات کر رہی ہوں کہ وہ اتنی بھاگ دوڑ کیوں کر رہا ہے آخر؟ اسے کیا مطلب ہے بھلا؟ جتنا بھائی صاحب کے ساتھ اس کا رشتہ ہے اتنا ہی باقی سب کا بھی تو ہے نا؟ اسے ان کی اتنی فکر ہے اور اپنی پرواہی نہیں ہے۔“ ثروت بیگم خاصی برہم ہو رہی تھیں اسرار آندھی ان کے توروں دیکھ کر تڑپنے لگی تھیں کہ اب ان

”صاف صاف بتاؤ کہ مسئلہ کیا ہے؟ کیوں اتنے آپ سیٹ ہو رہے ہو۔“ اب تو آذر کو بھی پریشانی ہونے لگی تھی۔
 ”کوئی خاص بات نہیں ہے بھائی، آپ پریشان نہ ہوں، ایسا کوئی خاص مسئلہ نہیں ہے، جس پہ اتنا پریشان ہوا جائے۔“ اس نے آذر کو ٹانے کی کوشش کی تھی۔
 ”لیکن مسئلہ ہے تو سہی نا؟“ آذر جھنجھلا گیا تھا۔

”ٹھیک ہے کہ کوئی مسئلہ ہے مگر جب مناسب ہوا تب بتاؤں گا۔“
 جوڑت فی الحال آذر کو کچھ بھی بتانا نہیں چاہتا تھا، جبکہ اس کے نہ بتانے پر آذر کی تشویش اور بھی بڑھ رہی تھی، کیونکہ اس نے جوڑت کو اس قدر الجھے ہوئے اور متشکر انداز میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔
 ”کسی کے ساتھ کوئی جھگڑا ہوا ہے کیا؟“ آذر بس اسی نتیجے پہ پہنچا تھا کہ وہ کسی کے ساتھ لڑ جھگڑ کر آیا ہے۔
 ”نہیں۔“ اب کی بار اس نے خاصا مختصر سا جواب دیا تھا۔

”جوڑت!“ آذر نے فوراً غصے سے اس کا بازو پکڑ کر اسے اپنی سمت دیکھنے پہ مجبور کیا تھا۔
 مگر جوڑت اس کی سمت دیکھنے کی بجائے تکلیف سے ”آہ“ کر کے رہ گیا تھا، کیونکہ جہاں سے آذر نے اس کا بازو پکڑا تھا وہیں پہ اس کے چوٹ لگی ہوئی تھی اور جوڑت اس چوٹ پہ بند توجہ بھی کروا کے آیا تھا، مگر تکلیف تو ہنوز تھی، جس کو وہ ضبط کیے صرف اور صرف ”منصور حسین“ کو سوچے جا رہا تھا، لیکن اب اس تکلیف سے بھی پرہیز اٹھ گیا تھا، آذر نے بے ساختہ اس کے منہ سے نکلنے والی ”آہ“ سے چوستے ہوئے اس کے بازو کو ایک بار پھر چھو کر ٹٹولا تھا، جوڑت کو پھر تکلیف ہوئی تھی۔

”یہ سب کیا ہے جوڑت؟ کیا ہوا ہے نہیں؟“ آذر کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔
 ”زیادہ پریشانی والی بات نہیں ہے بھائی، بس میری بائیک کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا اور بائیک سے گرنے کی وجہ سے یہ جو میں آئی ہیں، مگر اللہ کا شکر ہے کہ زیادہ نقصان نہیں ہوا، کافی بچت ہو گئی ہے۔“ جوڑت نے پھر بھی اسے تسلی ہی دی تھی۔

”صرف ایکسیڈنٹ ہوا ہے یا کچھ اور بھی؟“ آذر اسے ہر طرح سے کربید رہا تھا۔
 ”نہیں اور کچھ نہیں ہوا، بس ایکسیڈنٹ ہی ہوا ہے۔“ جوڑت اسے مطمئن نہیں کر پا رہا تھا، کیونکہ آذر یہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھا کہ جوڑت اس ذرا سے ایکسیڈنٹ اور ذرا سی چوٹ سے اتنا آپ سیٹ سا بیٹھا ہے، اسے یقین تھا کہ ضرور کوئی اور وجہ ہے جس سے وہ اتنا ڈسٹرب لگ رہا ہے۔

”آذر بیٹا! تم یہاں بیٹھے ہو، تمہیں ڈاکٹرز اندر بلا رہے ہیں۔“ آسیہ آندھی، آذر کو ڈھونڈتی ہوئی وزینگ روم میں آگئی تھیں اور آذر ان کے بتانے پہ اک نظر جوڑت کو دیکھا، وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔
 ”خیر! جو بھی ہے تم اس وقت گھر جاؤ، باقی بات بعد میں ہوگی۔“ اس نے جوڑت کا کندھا تھپک کر اسے وہاں سے جانے کا کہا تھا اور خود آسیہ آندھی کے ساتھ ڈاکٹرز کے پاس چلا آیا تھا، کیونکہ اسے پتا تھا کہ ضرور ڈاکٹر کے میسٹ کی رپورٹس آئی ہوں گی، جب ہی ڈاکٹر نے اسے خاص طور پہ بلایا ہے، اسی لیے اس نے آسیہ آندھی کو اپنے ساتھ ڈاکٹرز کے روم میں جانے سے منع کر دیا تھا اور اکیلا دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہو گیا تھا، آسیہ آندھی باہر کی باہری کھڑی رہ گئی تھیں اور انہیں پتا تھا کہ آذر نے انہیں ساتھ آنے سے کیوں منع کیا ہے۔

”چلیں؟“ وہ کافی بجھے بجھے سے انداز میں تیار ہو کر بیچے آیا تھا اور ڈرائنگ روم میں دائیں بائیں منسلکی بتول شاہ کو جانے کا سگنل دیا تھا۔

”ہولہ... چلو۔“ انہوں نے اک نظر ٹھہر کر اسے سر تپا مہری نظر سے دیکھا تھا اور پھر اس کی ہاں میں ہاں ملائی

تھی اور دل اور ان کی طرف سے جواب ملتے ہی باہر کی سمت قدم بڑھا چکا تھا۔ پھر گاڑی نکالنے تک سیدہ دونوں ماں بیٹا خاموش ہی رہے تھے، لیکن آخر کب تک، کب تک، بتول شاہ اس کی یہ خاموشی برداشت کر سکتی تھیں؟ انہوں نے کچھ تو بولنا ہی تھا۔

”کیا بات ہے اتنے خاموش کیوں ہو؟“ انہوں نے دل اور کی سمت گردن موڑتے ہوئے استفسار کیا تھا۔

”تو اور کیا کروں؟“ دل اور نے النان سے پوچھ لیا تھا۔

”جو میں نے کیا ہے وہ کرو۔“ بتول شاہ بھی جواباً ”نچے تلے سے انداز میں بولی تھیں۔

”کر تو رہا ہوں، جو بھی، جو کچھ کہہ رہا ہے، چپ چاپ سب کر رہا ہوں۔“

دل اور آج ٹیبل کی دعوت پہ جاتے ہوئے خوش نہیں ہو رہا تھا، شاید اس لیے کہ اس کے ذہن میں صبح سے ٹیبل کے الفاظ گونج رہے تھے اور دل اور صبح سے اسی ”دعوت اور دل داری“ کے گھیراؤ میں پھنسا ہوا تھا، حالانکہ اس نے دن میں ہزاروں کام بنائے تھے، سب سے بات چیت بھی کی تھی، مگر پھر بھی اس کے دل و دماغ پہ وہی دعوت اور دل داری والا قصہ سوار رہا تھا اور اس وقت بھی ذہن کی اسکرین پہ یہی سب کچھ چل رہا تھا۔

”لیکن جو کچھ میں کہہ رہی ہوں وہ تم سمجھ نہیں رہے۔“ بتول شاہ نے اسے یاد دلانا چاہا تھا۔

”میں سب سمجھ رہا ہوں اماں، پہلے مجھے زہر کا ایک پیالہ تو پی لینے دیں، دوسرے کی باری تو بعد میں آئے گی نا اور پتا نہیں تب تک یہ سینے میں چھپا کا فرزندہ بھی رہے گا یا نہیں۔“ دل اور نے غلطی اور افسردگی سے کہتے ہوئے سر جھٹکا تھا اور بتول شاہ اس کی بات کا منہ مسموم سمجھتی رہ گئی تھیں۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟ فیصلہ تو تم پہلے سے ہی کر چکے ہو، اب زہر پینے نہ پینے کی بات کہاں سے آگئی ہے؟“ وہ

اس کا موڈ دیکھتے ہوئے الجھ بڑی تھیں کہ وہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟

”ایک انسان زہر پینے کا فیصلہ کر چکا ہو تو اس کا کیا مطلب ہے کہ اسے زہر پیتے ہوئے تکلیف بھی نہیں

ہوگی؟“ دل اور نے خاصے تلخ سے انداز میں سوال کیا تھا۔

”تکلیف تو انسان کو اسی وقت ہوتی ہے جب وہ کسی بھی قسم کا زہر پینے کا فیصلہ کرتا ہے اور جب فیصلہ کر لیتا ہے

تو پھر بعد میں تکلیف کیسی؟ مجھے دیکھو، کتنے فیصلے کیے ہیں زندگی میں؟ مگر جب کر لیے تو کر لیے؟ پھر نہ درد نہ

تکلیف۔ اور نہ ہی کوئی بچھتاوا، زندگی میں ایسا کرو گے تو کبھی کسی بات پہ اور کسی کام میں مایوسی نہیں ہوگی اور

ہیش ثابت قدم رہو گے اور میں تم سے ایسی ہی امید رکھتی ہوں۔“ بتول شاہ اسے اپنے جیسا ہی دیکھنا چاہتی تھیں

”آپ نہیں سمجھیں گی اماں کہ دل کے معاملے اور دل کے فیصلے کتنے پیچیدہ ہوتے ہیں؟ یہاں درد بھی ہوتا ہے،

تکلیف بھی ہوتی ہے اور بچھتاوا بھی ہوتا ہے۔“ دل اور کا لہجہ جیسے تلخی سے رس رہا تھا، دکھ کی چاشنی اس کے اک

اک لفظ سے محسوس ہو رہی تھی۔ ”صرف دل کے معاملے اور دل کے فیصلے ہی پیچیدہ نہیں ہوتے ہیں، مگر انسان کو

کرنا ہی پڑتے ہیں، تم کو بھی کرنا ہی پڑیں گے۔ بس سب کچھ اللہ کی ذات پہ چھوڑ دو، سب کچھ ہی بہتر ہو جائے گا۔“

بتول شاہ نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بلکے سے اس کا کندھا دیا تھا، جیسے اس کا حوصلہ اور اس کی ہمت

بڑھانے کی کوشش کی ہو۔ ”چھوڑ دیا ہے، سب کچھ چھوڑ دیا ہے، زری کو چھوڑ دیا تو سمجھ لیں کہ سب کچھ چھوڑ دیا“

آج میں ٹیبل کی دعوت میں زری کو چھوڑنے ہی تو جا رہا ہوں اور ٹیبل کی یہ دعوت میں زندگی بھر بھول نہیں سکوں

گا، دل لپیہ لکھی رہے گی۔“ دل اور کا لب و لہجہ بھی دل اور کا نہیں لگ رہا تھا اور بتول شاہ اس کی کیفیت دیکھ کر چپ

ہو گئی تھیں، اتنے میں اس نے ٹیبل کے گھر کے سامنے گاڑی کو ریکنگا دیے تھے۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

☆ ☆

www.paksociety.com

۳۱
اکتوبر ۱۹۳۵

کیے تھے جس پہ نیل بس مسکرا کے رہ گیا تھا۔
 ”چلو۔۔۔ ایسے ہی پوری ہو گئی ہے اب اور کیا کرنا ہے۔“ دل اور اس سے آگے کارو گرام بوجھ رہا تھا۔
 ”پ اور کچھ نہیں کرنا بس اندر چلنا ہے۔ ہم نے خواجواہ اپنے ساتھ ساتھ آنی کو بھی لکھا کر رکھا ہے۔“
 نیل نے کہتے ہوئے اندر کی سمت اشارہ کیا تھا اور ساتھ ہی قدم بھی آگے بڑھا دیے تھے۔
 ”مگر میرے کھڑے ہونے سے تم لوگوں کے موڈ ٹھیک ہو جائیں تو میرے لیے یہی بہت ہے۔“ بتول شاہ ان دونوں کو مسکراتے ہوئے دیکھ کر قدرے ریلیکس ہو گئی تھیں اور ان کے ساتھ ہی اندر آگئی تھیں۔
 مگر ڈرائنگ روم میں قدم رکھتے ہی ان تینوں کے قدم رک گئے تھے کیونکہ ان کے قدم زری کی آواز نے جکڑ لیے تھے۔

اک تانہ دکایت ہے
 سن لو تو عنایت ہے
 اک شخص کو دکھا تھا
 تاروں کی طرح ہم نے
 اک شخص کو چاہا تھا
 اپنوں کی طرح ہم نے
 اک شخص کو سمجھا تھا
 پھولوں کی طرح ہم نے
 وہ شخص قیامت تھا
 کیا اس کی گریں باتیں
 دن اس کے لیے پیدا
 اور اس کی ہی تھیں راتیں
 کب ملنا کسی سے تھا
 ہم سے ہی تھیں ملاقاتیں
 رنگ اس کا شبابی تھا
 زلفوں میں تھیں مکاریں
 آنکھیں تھیں کہ جاوے تھا
 پلکیں تھیں کہ تلواریں
 دشمن بھی اگر دیکھیں
 سو جان سے دل باریں

یونہی انہی دھن میں نظم سناتے سناتے زری کی نظریں ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے کی سمت اٹھی تھیں اور پھر وہیں کی وہیں ٹھہر گئی تھیں دل اور کولگا کہ وہ اب خاموش ہو جائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا تھا وہ نجانے کس موڈ میں تھی کہ اس نے نظم پڑھنے کا سلسلہ پھر بھی جاری ہی رکھا تھا اور غیر محسوس طریقے سے نظم کے مصرعوں کا نشانہ بھی اسے ہی بنا رکھا تھا۔
 کچھ تم سے وہ ملتا تھا
 باتوں میں شباہتیں

چوکیدار نے اس کی گاڑی دیکھتے ہی گیٹ پورے کا پورا وا کر دیا تھا۔ اور دل اور اپنے اندر کے غبار کو اندر ہی دباتے ہوئے ایک گہری سانس کھینچتا ہوا گاڑی آگ جھٹکے سے اندر لے آیا تھا اور گاڑی باہر روش یہ پارک کرنے کے بعد گاڑی سے نیچے اتر آیا تھا اور اس کے پیچھے بتول شاہ بھی گاڑی سے اتر آئی تھیں ان دونوں کا رخ اندر کی طرف تھا لیکن نیل انہیں ریسو کرنے کے لیے خود یا ہر آچکا تھا۔
 ”السلام علیکم آئی۔۔۔ ایسی ہیں آپ؟“ نیل بے ساختہ ان کے سامنے ذرا جھک گیا تھا۔
 ”وعلیکم السلام بیٹا۔ بالکل ٹھیک ہوں اور بہت خوش بھی ہوں۔“ بتول شاہ نے بہت فریش موڈ میں جواب دیا تھا۔

”اچھا۔۔۔ وہ کیوں بھلا؟“ نیل نے بھی کافی فریش موڈ میں استفسار کیا تھا کیونکہ وہ خود بھی بہت خوش تھا۔
 ”وہ اس لیے کہ تم بہت خوش ہو اور کیا ایک ماں کے لیے یہ خوشی کافی نہیں ہے کہ اس کا بیٹا بہت خوش ہے“
 بتول شاہ نے نیل کے کندھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پھر اس کے گال کو پیار سے تھپکا تھا۔
 ”صرف ایک بیٹا خوش ہے نا؟ دوسرے کو کیا ہوا ہے؟ چہرے سے تو یوں لگ رہا ہے جیسے کسی دعوت میں نہیں بلکہ کسی وفات یہ آیا ہے۔“ نیل نے دل اور کے چہرے کی سمت اشارہ کرتے ہوئے ان سے پوچھا تھا اور بتول شاہ کا کلبوہل گیا تھا۔

”اے نہیں بیٹا۔ ایسا نہیں بولتے ہمیشہ اچھا بولنا چاہیے۔“ انہوں نے نیل کو سرزنش کی تھی۔
 ”اوکے۔۔۔ ایم سوری لیکن یہ تو بتا دیں کہ اسے آخر ہوا کیا ہے؟ صبح جب فون کیا تو تب بھی اس کا موڈ کچھ ایسا ہی ہو رہا تھا بس وہ پھر کو جب شوروم میں دیکھا تھا تب قدرے بہتر تھا یعنی کام کے وقت موڈ آن اور آگے پیچھے آتے۔“ نیل کو دل اور کے موڈ سے الجھن ہو رہی تھی۔

”تمہیں میرے موڈ کے آن اور آتے ہونے سے کیا پر اہلم ہے آخر؟ تمہارا موڈ آن ہے نا؟ بس یہی کافی ہے۔ آج کے دن آن بھی بس تمہارا ہی ہونا چاہیے ہماری خیرے تم اپنی فکر کرو۔“
 دل اور کو اپنی ذات پر وہ خول چڑھانا ہی پڑا تھا جو کبھی کسی کو نظر نہیں آیا تھا اور جس کو جڑھا کر وہ اپنے دل کو بھی روند جاتا تھا اور دیکھنے والوں کو خبر بھی نہیں ہوتی تھی یہاں تک کہ عبد اللہ اور نیل کو بھی نہیں۔
 ”یہ تو تم مجھے ٹالنے کے لیے کہہ رہے ہونا؟ ورنہ تمہیں پتا ہے کہ ہمیں اپنی اپنی فکر نہیں ہوتی جتنی ایک دوسرے کی فکر ہوتی ہے تمہارا موڈ آن یا آتے ہونے سے مجھے براہم نہیں ہوگی تو اور کس کو ہوگی؟ یا پھر اس بات سے بھی انکار ہے تمہیں؟“ نیل تو آج بغور اس کا معائنہ کرنے پہ تلا ہوا تھا اور دل اور اس کی خاطر اپنے دل پہ پاؤں رکھ کے مسکرا دیا تھا۔

”اوکے۔ اوکے۔ امان لیا کہ تمہیں پر اہلم ہے لیکن تم بھی تو یہ مان لو کہ تمہارا موڈ آج واقعی آن ہے۔“ دل اور نے بات کو شرارت اور خوشگواریت کا رخ دے دیا تھا۔
 ”اوکے۔ اوکے۔ میں نے بھی مان لیا کہ میرا موڈ آج واقعی آن ہے۔ پھر۔۔۔؟“ نیل نے بھی شرارت سے پوچھا تھا۔

”پھر تو میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا“ پہلے تم یہ بتاؤ کہ تیسرا کہاں ہے؟ اس کی گاڑی نظر نہیں آ رہی۔“ دل اور کا اشارہ عبد اللہ کی طرف تھا جس کو نیل نے فوراً ہی سمجھ لیا تھا۔
 ”بس کسی کام سے گیا ہے“ ابھی تھوڑی دیر میں آجائے گا“ ڈونٹ وری۔ اپنی فیملی ہیں چھوڑ گیا ہے بس تمہاری کمی تھی۔“ نیل آج حقیقتاً جھک رہا تھا اور یہ بات کسی سے بھی چھپی ہوئی نہیں تھی یہاں تک کہ مدحیہ مومنہ بی بی اور فائزہ بیگم نے بھی محسوس کی تھی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارے بھی

ہاں تم سہا ہی لگتا تھا
شوخی میں شرارت میں
لگتا بھی تم ہی سا تھا
وستور محبت میں

پھر بولتے بولتے نجانے کیوں اس کی آواز میں لرزش آگئی تھی اور آنکھوں کی زمین غم لگنے لگی تھی اور دل اور
کے دل کو کچھ ہوا تھا مگر وہ چپ نہیں بولی تھی۔
پتا نہیں کیوں آج اس نے نظم مکمل کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔

وہ شخص ہمیں اک دن
اپنوں کی طرح بھولا
تاروں کی طرح ڈوبا
پھولوں کی طرح ٹوٹا
پھر ہاتھ نہ آیا وہ

ہم نے تو بہت ڈھونڈا
تم کس لیے چوکنے ہو
کب ذکر تمہارا ہے
کب تم سے تقاضا ہے
کب تم سے شکایت ہے
اک تازہ حکایت ہے

سن لو تو عنایت ہے
سن لو تو عنایت ہے

زری کی یہ نظم دل اور کے لیے ایک تازہ حکایت نہیں تھی بلکہ "اک تازہ شکایت" تھی اور کسی کی تازہ شکایت
سن کر سبے چہین ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو بے چین ظاہر نہ ہونے دینا بھی صرف دل اور شاہ کا ہی کمال تھا۔
"واؤ زری! تم نے تو کمال کر دیا ہے۔ بہت ہی خوب صورت نظم ہے۔ دیری دیری نانس۔!" مدحیہ نے کافی
بھر پورا انداز میں سراہا تھا اور زری چہرہ جھکا گئی تھی۔

"ماشاء اللہ! ماشاء اللہ! بہت ہی عمدہ نطق ہے میری بیٹی کا۔ بہت اچھا لگا سن کر یہ پیلڈ لیب۔"
نبیل اور دل اور کے ساتھ اندر داخل ہوئی بتول شاہ نے بھی کافی کھلے دل سے تعریف کی تھی اور زری اپنے
لہجے کی لرزش اور آنکھوں کی نمی چھپاتے ہوئے ان سے ملنے کے لیے ان کے احترام میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی
ہوئی تھی۔

"تھینک یو آئی۔" اس نے ان کے گلے ملتے ہوئے ان کی تعریفیہ شکریہ ادا کیا تھا۔
"نگارش سے سنا تو تھا کہ تمہیں شاعری سے لگاؤ ہے مگر اس لگاؤ کے ساتھ ساتھ اتنی گہرائی اور اتنا اثر بھی ہے
یہ مجھے اندازہ نہیں تھا مگر آج ہو گیا ہے۔" بتول شاہ مسکراتے ہوئے بتا رہی تھیں اور ان کی بات پہ تقریباً "بھئی
مسکرا دے تھے خصوصاً" نبیل تو کچھ زیادہ ہی مسکرا رہا تھا۔

"اس کا ذوق تو شریع سے ہی عمدہ رہا ہے ہمیشہ ہر معاملے میں۔" قانزہ بیگم نے بھی بتول شاہ سے ملتے ہوئے
زری کی ہی تعریف کی تھی "پھر وہ نگارش مدحیہ اور مومنہ بی بی سے ملی تھیں اور مومنہ بی بی سے مل کر اسے پہچاننے

کی کوشش کی تھی انہیں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ انہوں نے اس لڑکی کو پہلے کہاں دیکھا ہے؟
"یہ مومنہ بی بی ہیں۔ ہمارے اسلام آباد والے گھر میں آئی تھیں آپ کو یاد ہو گا۔"
دل اور ان کی نظروں کی الجھن بھانپ گیا تھا اسی لیے ان کی مشکل آسان کر دی تھی کہ کہیں وہ اس الجھن میں
نہ الجھتی رہیں اور اس کے یاد دلانے پہ انہیں بھی فوراً ہی سب کچھ یاد آ گیا تھا۔

"اوہ! اچھا اچھا۔ ابیہ مومنہ بی بی ہے اتنے عرصے بعد دیکھا ہے میں اسی لیے پہچان نہیں سکی شاید۔"
انہوں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا تھا اور پھر قانزہ بیگم کے ساتھ ہی صوفے پہ بیٹھ گئی تھیں۔
"سلام علیکم۔! میں لیٹ تو نہیں ہو گیا؟" عبداللہ نے کافی عجلت میں اندر داخل ہوتے ہوئے سلام کیا تھا

کیونکہ وہ باہر ڈرائیو سے دل اور کی گاڑی دیکھ آیا تھا اس لیے اسے نہیں بتا تھا کہ دل اور ابھی آیا ہے یا پھر
کافی دیر سے آیا ہوا ہے؟ کبھی اسے اپنے لیٹ ہو جانے کی فکر ہوئی تھی۔
"تم لیٹ ہوئے ہو یا نہیں یہ تو ہمیں نہیں پتا مگر اتنا اندازہ ضرور ہو گیا ہے کہ تمہارے آجانے سے بھابھی کے
"تم لیٹ ہوئے ہو یا نہیں یہ تو ہمیں نہیں پتا مگر اتنا اندازہ ضرور ہو گیا ہے کہ تمہارے آجانے سے بھابھی کے

چہرے پہ ہمارا آگئی ہے۔ رنگ آگئے ہیں۔ رونق آگئی ہے۔ یقیناً نہیں آتا تو آنکھ بھر کے دیکھ لو۔"
دل اور نے اپنے موڈ میں چینیج لانے کے لیے توپوں کا رخ عبداللہ اور نگارش کی سمت موڑ دیا تھا شاید اس لیے
کہ وہ زری کی نظم کا اثر زائل کرنا چاہتا تھا البتہ یہ اور بات تھی کہ سبھی نے اس کی بات پہ خوب انجوائے کیا تھا اور
سب کا دھیان بھی عبداللہ اور نگارش کی طرف ہی ہو گیا تھا اور نگارش جھینپ گئی تھی۔

"بچو! کوئی تو ہے نا جس کے چہرے پہ ہمارے آجانے سے ہمارا آجاتی ہے رنگ آجاتے ہیں رونق آجاتی
ہے تم لوگوں کی طرح چھڑا چھانٹ تو نہیں ہوں نا کہ جن کے آنے اور جانے سے کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔"
عبداللہ بڑے اطمینان سے ان کو جلانے والے انداز میں کتابتول شاہ سے مل کر نگارش کے برابر جا بیٹھا تھا اور اس
کے اس طرح بیٹھنے پہ مدحیہ زری بتول شاہ اور قانزہ بیگم بھی ہنس پڑی تھیں کیونکہ اس کا انداز ہی کچھ ایسا تھا کہ
سب کو ہنسی آتی تھی جبکہ نگارش شرم سے سمٹ کے رہ گئی تھی۔

"بڑے کا فرق۔ ضرور پڑے گا۔ ہمارے آنے اور جانے سے بھی فرق پڑے گا۔ بس تم چار دن صبر تو کرو کہ
آگے ہوتا کیا ہے۔" دل اور کے جواب پہ نبیل بے ساختہ مسکرایا تھا اور زری نے بے ساختہ اس کے چہرے کی
سمت دیکھا تھا جس پہ لاپرواہی اور شرارت کے آثار نظر آ رہے تھے۔

"یعنی کہ ارادہ ہے۔ فرق لانے کا۔" عبداللہ نے بھی جواباً "تو معنی لہجے میں پوچھا تھا۔
"کیا ابھی بھی چاہتے ہو کہ ارادہ نہ بنے؟" دل اور بھی لطف اندوز ہونے والے موڈ میں تھا۔
"ارے۔! نہیں نہیں۔ میں کیوں نہیں چاہوں گا بھلا؟ بناؤ بناؤ ضرور بناؤ اس میں میرا ہی فائدہ ہے آخر
بھابھیاں بھی ملیں گی اور بیٹیجے بھی۔" واہ کیا کمال کا سین ہو گا وہ بھی ہر طرف رونق ہی رونق ہو گی۔"

عبداللہ نے بڑی فراخ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے بڑے شاہانہ انداز میں انہیں اجازت دی تھی اور اس کی اس اجازت
پہ سب تقبہ لگا کر ہنس پڑے تھے۔
"ہوں۔! واقعی عبداللہ بھائی صحیح کہہ رہے ہیں۔ آپ کو یہ ارادہ ضرور بنا چاہیے۔ مجھے بھی بھابھیوں کی کمی
محسوس ہوتی ہے۔ ابھی تو صرف ایک بھابھی ہے دو اور آجائیں گی تو رونق ہو جائے گی اور پھر اتنی دوریت بھی نہیں
ہو گی سنہ ہمیں اور نہ آپ کو۔ کیوں ممّا۔! کیا خیال ہے آپ کا؟"

مدحیہ نے کہتے کہتے بتول شاہ سے بھی مشورہ مانگ لیا تھا اور وہ بھلا اس نیک کام میں کون سا پیچھے تھیں انہوں
نے بھی فوراً "ہاں میں ہاں ملاتی تھی۔"
"ارے ہاں بھئی۔! میرا خیال تم لوگوں سے مختلف کیسے ہو سکتا ہے بھلا۔! ہمیں بھی خیر سے ہی چاہتی ہوں کہ

یہ دونوں جلد از جلد اپنی اپنی بیویاں سے آئیں آخر کچھ ہمیں بھی تو مصروفیت ملے۔“ بتول شاہ بھی اس کام میں راضی تھیں اور نبیل اور دل اور دونوں ایک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کر کے رہ گئے تھے۔

”بیگم صاحبہ! کھانا تیار ہے نبیل پر لگا دیا ہے۔“ اس سے پہلے کہ وہ دونوں کچھ کہتے مومنہ بی بی ان سب کو بلانے کے لیے آگئی تھیں۔

”چلو جی! اب بقیہ کانفرنس کھانے کی میز پر۔“ عبد اللہ کو بہت بھوک لگی ہوئی تھی اس لیے کسی کا بھی انتظار کے بغیر فوراً اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”کانفرنس یا کبڈی...؟“ دل اور نبیل بھی اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور عبد اللہ کو جان بوجھ کر چھیڑا تھا۔

”کبڈی۔“ عبد اللہ کو کچھ سمجھ نہیں آیا تھا اور وہ دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ پہ ہاتھ مارتے ہوئے قہقہہ لگا کر ہنس پڑے تھے۔

”ارے بھئی! کھانے کی میز پر کانفرنس نہیں ہوتی بلکہ کبڈی ہوتی ہے اور ہر طرف کبڈی کبڈی کی ہی آواز سنائی دیتی ہے۔ اس لیے تمہیں اچھے دیکھ کر ہی احساس ہو رہا ہے کہ تم بھی کھانے کے ساتھ کبڈی کبڈی ہی کرنے جا رہے ہو۔ عراجم خاصے خطرناک لگ رہے ہیں۔“ دل اور کے نشانے پہ آج شاید صرف عبد اللہ ہی تھا لیکن عبد اللہ کو بھلا کیا پروا تھی وہ چاہے کچھ بھی کہتا رہتا۔

”جناب دل اور شاہ صاحبہ! ایک گراؤنڈ کے لحاظ سے دیکھو گے تو پنجاب کا باسی اور ذات کا جٹ ہوتا ہوں۔ کھانے کے ساتھ کبڈی تو کروں گا ہی۔ اب میں نبیل حیات تو ہوں نہیں کہ کھانا بھی کھاؤں تو بڑے طور طریقے اور سلیقے کے ساتھ۔“ عبد اللہ نے اپنے ساتھ نبیل کو بھی گھسیٹ لیا تھا۔

”اف! جہاں یہ تینوں موجود ہوتے ہیں وہاں کسی چوتھے کی کیا گنجائش۔ یہ بھی نہیں دیکھتے کہ کوئی اور بھی پاس ہے یا نہیں؟“ فائزہ بیگم خفگی سے اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتی ہوئی بتول شاہ کے ساتھ اٹھ کر ڈائننگ روم کی طرف بڑھ گئی تھیں اور وہ سب بھی اٹھ کر بیٹھے ہوئے ان کے پیچھے ہی آگئے تھے۔

لیکن جب کرسی پہ بیٹھنے کی باری آئی تھی تو دل اور کے قدم ٹھک گئے تھے کیونکہ وہ دانش بیسن پہ ہاتھ دھونے کے بعد سب سے آخر میں نبیل کی طرف آیا تھا اور تب تک سب اپنی اپنی کرسیوں پہ بیٹھ چکے تھے لیکن عبد اللہ اور نبیل کے ساتھ والی کرسی خالی تھی اور اسی کرسی کے عین سامنے والی کرسی زری کی تھی۔

گویا وہ بیٹھتا تو وہ دونوں آمنے سامنے آجاتے کیونکہ عبد اللہ کے مقابل والی کرسی پہ نگارش تھی اور نبیل کے مقابل والی کرسی پہ مدحیہ تھی ہوئی تھی اس طرح دل اور کے مقابل والی کرسی پہ رزی نظر آرہی تھی اور مشکل یہ تھی کہ وہ جگہ چنچ بھی نہیں کر سکتا تھا اور یوں کھڑا بھی نہیں رہ سکتا تھا۔

”ارے! کیا بات ہے؟ اس طرح کھڑے کیا دیکھ رہے ہو؟“ نبیل نے گردن موڑ کر دل اور کی سمت دیکھا تھا۔

”بس! دیکھ رہا ہوں کہ آج تم دونوں نے مجھے سائیڈ پہ کیوں کر دیا ہے؟ حالانکہ تم لوگوں کو پتا ہے کہ مجھے تم دونوں کے درمیان والی جگہ پسند ہوتی ہے۔“ دل اور کا ذہن اپنے مطلب کا نقطہ نکال ہی لایا تھا لیکن زری اس کے اس نقطے پہ چونک گئی تھی۔ یعنی وہ اس کے سامنے نہیں بیٹھنا چاہتا تھا۔

”لو جی! اس میں بھلا کیا مسئلہ ہے؟ یہ لوہے ہو گئی تمہاری پسند کی جگہ خالی۔“ نبیل لا پرواہی سے کہتے ہوئے اپنی کرسی سے اٹھ کر زری کے سامنے والی کرسی پہ بیٹھ گیا تھا اور دل اور نے مدحیہ کے سامنے والی کرسی سنبھال لی تھی۔

”مختصک یو! اس نے ہسٹلی سے نبیل کا شکریہ ادا کیا تھا۔“

”حالانکہ تھینکس تو مجھے تمہارا کہنا چاہیے۔“ نبیل نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا تھا جسے صرف دل اور ہی سن سکا تھا اور اس کی بات کا مطلب بھی سمجھ گیا تھا کہ اس کا اشارہ زری کی طرف ہے۔

آدھی سن سکا تھا اور اس کی بات کا مطلب بھی سمجھ گیا تھا کہ اس کا اشارہ زری کی طرف ہے۔ جبکہ دوسری طرف زری کا تن من دھواں دھواں ہو گیا تھا۔ اسے دل اور شاہ کا اتنا گریز اور اس طرح کا بے مہر رویہ اندر ہی اندر رکات رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے دل اور کا یہ انداز اسے دیمک کی طرح چاٹ جائے گا اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے کھوکھلی ہو جائے گی۔ اس کے دل کے گوشے وقفہ وقفہ سے بھگنے لگے تھے رم بھیم باہر نہیں لیکن اندر چھڑک رہی تھی اور وہ بڑی مشکل سے کھانے کا نوالہ حلق سے نیچے اتارنے میں کامیاب ہوئی تھی۔ ورنہ اسے تو یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اس کا حلق بھی بند ہو گیا ہو۔

اور ادھر نبیل سمجھ رہا تھا کہ وہ شرم کی وجہ سے سر جھکائے بیٹھی ہے اور اس سے ٹھیک طرح سے کھانا بھی نہیں کھایا جا رہا۔ لیکن اصل مسئلہ کیا ہے؟ وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی انجان تھا۔



اپنے گھر کے دروازے کے باہر گلی میں بائیک رکھنے کی آواز پہ مغرب کی نماز کے بعد دعا مانگتی مریم نے کیوں بری طرح چونک گئی تھی اور اس کا دل بھی کسی انجانے خیال سے بے قابو ہو کر دھڑک اٹھا تھا اور وہ جلدی جلدی چہرے پہ ہاتھ پھیر کر جائے نماز سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی لیکن ابھی وہ جائے نماز پہ نہ کر رہی تھی کہ اتنے میں دروازے پہ زور سے دستک ہوئی تھی اور مریم کا دل اچھل کر حلق میں آگیا تھا اور ٹانگیں کانپنے لگی تھیں۔

اس کا خیال اور وہ ہم دوسو سے جودت آفندی کی سمت ہی گھوم رہے تھے اسے ہر آہٹ پہ اس کا ہی خدشہ ستا رہا تھا اور دل کو طرح طرح کے خوف جکڑے جا رہے تھے کیونکہ دل اور شاہ کے ایکشن کے بعد وہ کوئی بھی کسی بھی قسم کا ری ایکشن دے سکتا تھا اور مریم کو اس کی کینٹینی پہ پورا یقین تھا کہ وہ بدلے کے طور پہ کچھ الٹا سیدھا ضرور کرے گا مگر اتنی جلدی۔؟ یہ اسے امید نہیں تھی۔

”کون سے؟“ دروازے پہ دوبارہ دستک ہوئی تو عابدہ خاتون کچن سے نکل آئی تھیں۔

”امی! دروازہ کھولیں۔ میں ہوں عدیل۔“ باہر سے عدیل کی آواز سنائی دی تھی اور مریم کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کا منہ میں جکڑا ہوا دل ایک دم سے آزاد چھوڑ دیا ہو اور اسے ایک گرمی اور سکھ کی سانس ملی ہو۔ اور وہ اپنے دل پہ ہاتھ رکھتے ہوئے شانت سی ہو گئی تھی۔

”عدیل! اتنے میں عابدہ خاتون نے حیران ہوتے ہوئے دروازہ کھول دیا تھا کیونکہ عدیل نے کبھی بھی اس طرح زوردار دستک نہیں دی تھی۔

”جی! میں ہی ہوں۔ آپ کو یقین کیوں نہیں آ رہا؟“ عدیل کے دونوں ہاتھ چیزوں سے لدے پھندے تھے اور وہ ہنستا ہوا ان کی حیرانی کو انجوائے کرتا ہوا اندر آگیا تھا۔

”تم نے پہلے کبھی اس طرح دستک جو نہیں دی۔“ انہوں نے اپنی حیرانی کی وجہ بتائی تھی۔

”اوس! تو آپ اس لیے حیران ہو رہی ہیں؟ وہ دراصل میرے دونوں ہاتھوں میں شاپرز تھے بڑی مشکل سے دستک دیا ہوں اس لیے میری دستک روٹین سے ہٹ گئی تھی۔“

عدیل نے کہتے ہوئے آگے بڑھ کے دونوں ہاتھوں میں پکڑے ہوئے شاپرز صحن میں رکھی چارپائی پہ ڈال دیے تھے۔

”ارے واقف! اتنی ساری چیزیں۔“ ایمان کمرے سے نکلتے ہی چمک اٹھی تھی۔

”ہوں! اور یہ سب تم لوگوں کے لیے ہیں۔“ عدیل نے اس کا گال تھپکا تھا۔

”مختصک پو بھائی! آپ کتنا خیال رکھتے ہیں سب کا۔“ ایمان اس کی مشکور ہوئی تھی۔
 ”پاکل۔! یہ سب تم لوگوں کی دعائیں ہیں اور کچھ نہیں اور ویسے بھی تم سب کا خیال میں نہیں رکھوں گا تو اور
 کون رکھے گا۔“ عدیل نے ایمان کے سر کو ہلاتے ہوئے مریم کی طرف دیکھا تھا جو برآمدے میں ہنوز ایک ہی
 پوزیشن میں کھڑی تھی۔

”ارے۔! تم اس طرح چپ کیوں کھڑی ہو؟ کیا ہو گیا ہے بھئی۔؟ ادھر آؤ میرے پاس۔“
 عدیل کو مریم کے اس طرح چپ کھڑے رہنے پہ حیرت ہوئی تھی اور اسی حیرت کے مارے اسے اپنے قریب
 بلا لیا تھا اور مریم اپنے وہم اور خدشوں سے چونک کر اپنے دل میں چھپے خوف کو ذرا دیر کے لیے پرے جھٹکتی ہوئی
 جائے نماز برآمدے کی مشافہ پہ رکھ کے عدیل کی سمت آگئی تھی۔
 ”جی۔“ وہ اگر عدیل کے پاس کھڑی ہو گئی تھی۔

”لگتا ہے تم میری دستک پہ اور اتنی ساری چیزوں پہ حیران نہیں ہوئیں۔ اس لیے اب میرا خیال ہے کہ تمہیں
 بھی حیران کرا دیں تو بہتر ہے۔“ عدیل کو سب سے زیادہ مریم کے تاثرات اور اس کی خوشی دیکھنے کی سبب چینی
 ہو رہی تھی۔

”آپ حیران کرنا چاہتے ہیں۔؟ وہ کیسے۔؟“ مریم نے اس کی بات میں دلچسپی لینے کی کوشش کی تھی۔
 ”وہ کیسے۔؟ ابھی بتانا ہوں۔“ وہ مریم کے کندھے کے گرد بازو لپیٹتے ہوئے اسے دروازے کے عین سامنے
 لے آیا تھا عابدہ خاتون اور ایمان بھی نا سمجھی سے دیکھ رہی تھیں کہ وہ آخر کر کیا رہا ہے؟ کام سے آتے ہی عجیب
 عجیب حرکتیں کرنے لگا ہے حیرت ہے۔ پہلے تو ایسا کبھی نہیں کیا اس نے۔

وہ اس کو کھڑا کر کے خود باہر نکل گیا تھا اور دو منٹ بعد وہ بڑی احتیاط سے دروازے کے باہر بنے بیڑھی نما
 چوڑے سے تھڑے پر سے بانیک کو دھکیلتا ہوا اندر آ گیا تھا اور وہ سب حیران کی حیران رہ گئی تھیں۔

”ارے۔! بانیک۔؟ یہ کس کی ہے۔؟“ اب کی بار مریم کو بھی شدید حیرت ہوئی تھی۔
 ”میری۔! عدیل نے بانیک لا کر صحن کے بیچوں بیچ کھڑی کر دی تھی۔

”بچ بھائی۔؟“ ایمان یکدم چمکتے ہوئے اچھل پڑی تھی اور مریم کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا وہ عدیل کو حیران اور
 سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”ہاں جگمگ۔! یہ میرے پاس ہے مجھے دی ہے اور یہ بانیک اب ہمیشہ میرے پاس ہی رہے گی، میری جاب بھی
 اشارت ہو گئی ہے آج۔ اور یہ بانیک بھی اسی جاب کا حصہ ہے۔“

عدیل آج حقیقتاً ”بہت خوش لگ رہا تھا اور اس نے ان سب کو بھی خوش کرنے کی پوری پوری کوشش کی
 تھی۔

”کیا واقعی آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔؟“ مریم کو جیسے ابھی بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔
 ”ارے میری جان۔! مجھے تم لوگوں سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے بھلا۔ مجھے دل آور شاہ کے شوروم

میں فیجر کی جاب مل گئی ہے اور انہوں نے جاب کے ساتھ ساتھ جو ضروری سولیات تھیں وہ بھی مہیا کی ہیں۔ یہ
 دیکھو یہ عدیل نے جیب سے چمکتا ہوا موبائل نکال کر ان کے سامنے کر دیا تھا اور مریم دل آور شاہ کے نام پر ٹھہر

سی گئی تھی اس کا خیال پھر سے دل والے واقعے کی طرف چلا گیا تھا اور اسے اندر سے بے چینی ہوئی تھی کہ کہیں
 دل آور شاہ نے عدیل کو کچھ بتا نہ دیا ہو۔؟ لیکن پھر دوسرے ہی سیکنڈ اسے یہ سوچ کر اپنے آپ کو ڈھارس دینی

پڑی تھی کہ اگر عدیل کو کچھ بتا ہوتا تو وہ اس وقت اتنا خوش نہیں ہو سکتا تھا اور اس وقت اس کے لیے یہ تسلی کافی
 تھی لہذا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اسے بھی عدیل کی خوشی اور کامیابی پہ خوش ہونا پڑا تھا اور اس نے عدیل کے ہاتھ

سے موبائل تھام لیا تھا جسے وہ بڑے اشتیاق سے دیکھنے لگی تھی اور عابدہ خاتون دل اور شاہ کو دعائیں دیتی ہوئی فاروق نیازی کو بتانے چل دی تھیں۔!

”میرا خیال ہے کہ ہمیں اب چلنا چاہیے۔“ ڈر کے ایک گھنٹے بعد عبداللہ نے دال کلاک سے ٹائم دیکھتے ہوئے نبیل سے اجازت چاہی تھی۔

”اتنی جلدی؟“ نبیل نے بھی بے ساختہ کلاک کی سمت ہی دیکھا تھا۔

”یار! ساڑھے گیارہ ہو رہے ہیں۔ یہاں سے نکلنے اور گھر پہنچنے تک ساڑھے بارہ پونے ایک بجے کا ٹائم ہو جائے گا اور ویسے بھی تمہیں پتا ہے کہ گھر صرف ملازموں کے رحم و کرم پہ ہے، حالات اتنے خراب ہیں کہ کسی پر بھی بھروسہ کرنا فضول ہے، اس لیے تم لوگ ابھی بیٹھو۔ انجوائے کرو۔ بس ہم چلتے ہیں۔“ عبداللہ کہتے ہوئے صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”ارے بیٹا! تھوڑی دیر اور بیٹھتے نا۔ پھر دوبارہ کب فرصت ملتی ہے بھلا۔ ابھی تو ہم نے کھل کے باتیں ہی نہیں کیں۔“ بتول شاہ نے عبداللہ کو روکنے کی کوشش کی تھی۔

”واقعی آئی۔! یہ تو آپ صحیح کہہ رہی ہیں۔ ہم نے ابھی تک ٹھیک طرح سے فرصت سے بیٹھ کر باتیں ہی نہیں کیں لیکن خیر کوئی بات نہیں۔ ان شاء اللہ زندگی رہی تو ضرور بیٹھیں گے اور باتیں بھی کریں گے۔ ابھی رات بھی کافی ہو رہی ہے گھر جانے میں ٹائم لگے گا میرے ساتھ یہ دونوں نہ ہوتیں تو شاید میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ بیٹھ ہی جاتا، مگر اب ان کو بھی تو لے کر جانا ہے ویسے بھی مجھے لگ رہا ہے کہ زری کو فینڈ آرہی ہے کھانا کھانے کے بعد سوت ہو گئی ہے۔“

عبداللہ نے زری کے پیچھے پیچھے چہرے کی سمت دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا تھا جس پر باقی سب نے بھی بے ساختہ زری کی سمت دیکھا تھا مگر دل اور نے اپنی نظروں کو اس بے ساختگی سے بھی روک لیا تھا۔ اس نے باقی سب کی طرح زری کی طرف دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

”نہیں! ایسی بات نہیں ہے۔ مجھے فینڈ نہیں آرہی۔ بس سرور کر رہا ہے۔ اس لیے آرام کرنا چاہتی ہوں۔“ زری نے اپنی سستی کی وجہ بتائی تھی اور اس بتانے میں بھی اس کا لہجہ کالی ست تھا۔

”چلو پھر ٹھیک ہے! تم لوگ جاؤ اور آرام کرو۔ ان شاء اللہ پھر بات ہوگی۔ تم سے تو باتیں بھی بہت سی کرنی ہیں۔“ بتول شاہ نے پھر دوبارہ انہیں روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

اور وہ تینوں ان سب سے ملنے کے بعد باہر آگئے تھے۔ نبیل اور فائزہ بیگم انہیں گاڑی تک چھوڑنے کے لیے آئے تھے اور پھر ان لوگوں کے جانے کے بعد فائزہ بیگم، بتول شاہ، مدحیہ اور مومنہ بی بی چاروں ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئی تھیں جبکہ نبیل دل اور کو ساتھ لیے باہر لان میں نکل آیا تھا۔

”آج موسم واقعی بہت اچھا ہو رہا ہے۔“ نبیل نے آسمان پر ٹٹماتے ستاروں کو دیکھتے ہوئے بڑے موڈ پر ہی رنگ میں کہا تھا۔

”ہوں! شاید۔“ دل اور کا لہجہ وہی تھا۔

”شاید نہیں یا! سچ سچ موسم بہت خوب صورت ہو رہا ہے اتنا خوب صورت کہ کسی حسینہ کے سامنے اپنے دل کے سارے جذبات کھول کے رکھ دینے کو چاہ رہا ہے۔ مگر افسوس کہ حسینہ گھر چلی گئی ہے۔“ نبیل آج اپنے سارے راز کہہ دینے اور سارے اظہار کر دینے کے لیے بے قرار ہو رہا تھا۔

”کیا مطلب؟ گھر چلی گئی ہے؟“ دل اور نے انجان بننے کے لیے تھوڑی سی کوشش کی تھی۔

”دل اور! نبیل نے بڑے دل سے اسے مخاطب کیا تھا۔

”ہوں۔“ وہ بمشکل بول پایا تھا۔

”تمہارے خیال میں زری کیسی لڑکی ہے۔“ نبیل کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ سوال کیا کرے۔

”کیا مطلب؟ کیسی لڑکی ہے؟ یہ کیا سوال ہے آخر؟“ دل اور نے خفگی سے پوچھا تھا۔

”یار! میرا مطلب ہے کہ میرے لیے کیسی رہے گی؟ میرے ساتھ۔ میری لافنیار ٹنرین کرے؟“

نبیل کے حواس عجیب بنکے بنکے سے محسوس ہو رہے تھے اور دل اور کو اپنے جیتے جاتے دل کو کسی سروخانے میں رکھنا پڑا تھا تاکہ وہ کسی بھی احساس اور جذبات سے عاری ہو جائے اور اسے کچھ بھی محسوس نہ ہو۔

”ہوں! اچھی ہے اور تمہاری لافنیار ٹنرین کرتا اور بھی اچھی رہے گی۔“

نبیل اس کا دوست تھا اس کا یار تھا اور یار کے لیے کچھ تو کہنا ہی تھا چاہے اس کہنے کہنے میں ہی خود پہ قیامت مگر زری۔

”دل اور! میں۔ میں۔ اس سے بہت محبت کرتا ہوں یا۔ بہت زیادہ۔ اب تو مجھے لگتا ہے کہ میری محبت خاموش عشق وار ہو گیا ہے۔ اسے بس ایک نظر دیکھ لوں اور مینوں خوش رہتا ہوں لیکن نجانے کیا وجہ ہے کہ کبھی کسی کو بتانے کا اور اس کے سامنے اظہار کرنے کا حوصلہ ہی نہیں ہوا مجھے۔ بس اتنے سالوں سے

اپنی خاموشی سے اور اتنے دل سے اسے چاہے جا رہا ہوں۔“

نبیل بہت ٹھنڈا اور پرسکون بندہ تھا۔ لیکن آج اس کا اظہار اس کا انداز اور اس کے الفاظ بتا رہے تھے کہ اس کے اندر کتنی شدت اور کتنی پلچل ہے۔ دل اور گردن موڑ کر اسے دیکھا رہ گیا تھا۔

”لیکن دل اور! اب اسے چاہنے کے ساتھ ساتھ دل چاہتا ہے کہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی زندگی میں لے آوں اور اپنی بے رنگ زندگی کو اس موسم کی طرح خوب صورت بنا دوں۔ مگر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جب

تک تم میرا ساتھ نہیں دو گے تب تک میری زندگی زندگی نہیں بنے گی۔ اس کا ہاتھ عبداللہ سے صرف تم مانگ سکتے ہو ورنہ مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ میں خود ایسا کچھ سوچوں یا پھر اپنے گھر والوں سے کچھ کہوں۔ یہ بات صرف تم کر سکتے ہو کیونکہ عبداللہ وغیرہ فیملی سے باہر شاوی نہیں کرتے اور اس بات سے مجھے ڈر لگتا ہے۔“

نبیل نے بالا خراپنا مدعا بیان کر ہی دیا تھا اور دل اور اس کا یہ مدعا تو بیان کرنے سے پہلے ہی اچھی طرح جانتا تھا۔

اسی لیے تو اس نے اپنے دل کو کسی سروخانے میں ڈال دیا تھا تاکہ نبیل کے دل پر کچھ نہ گزرے۔

”نہیں! ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ عبداللہ تمہارے لیے کبھی انکار نہیں کرے گا مجھے یقین ہے۔“ دل اور نے نبیل کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کا کندھا دبا دیا تھا۔

”عبداللہ انکار نہ کرے مگر زری۔ وہ تو انکار کر سکتی ہے نا۔ اب اس کے دل میں کیا ہے یہ تو اللہ ہی بہتر جان سکتا ہے۔“ نبیل کو اب زری کے دل کی بھی فکر ہو رہی تھی۔

”ہاں! دلوں کے حال تو صرف اللہ ہی بہتر جان سکتا ہے لیکن پھر بھی اللہ سے بہتری کی ہی امید رکھنی چاہیے۔ ان شاء اللہ جو بھی ہوگا بہتری ہوگا۔“ دل اور نے اسے مایوس کرنے کی بجائے تسلی دی تھی اور دل اور کے اسی حوصلے اور تسلیوں کی خاطر ہی تو اس نے یہ کام اسے سونپا تھا۔

”تو پھر تم عبداللہ سے مانگو گے تا زری کا ہاتھ۔“ نبیل یہ بھی تسلی کرنا چاہتا تھا۔

”ہوں! مانگوں گا۔ ضرور مانگوں گا۔ تمہاری خاطر تو بھیک بھی مانگ سکتا ہوں۔ یہ تو پھر بھی زری کا ہاتھ ہے۔“ دل اور نے بڑے حوصلے اور بڑے ضبط سے کہتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

”تھینک بول اور۔۔۔! تھینک بول پوری رات۔۔۔ مجھے پتا تھا کہ جب تمہیں پتا چلے گا تو تم میرا ساتھ ضرور دو گے۔“ نیل کہتے ہوئے دل اور گے گے لگ گیا تھا اور خوشی کے مارے اس کی پشت چھکی تھی۔

”تمہارا ساتھ نہیں دوں گا تو اور کس کا دوں گا۔؟ دن میں بتایا تو تھا کہ تم نیل حیات منہ ہوتے تو ضرور میری محبوبہ ہوتے۔“ دل اور نے اپنے لیے اور انداز کو خوش گوار رکھنے کی کوشش کی تھی۔

”بہت شکریہ جناب۔۔۔ بہت بہت شکریہ۔۔۔ یہ بھی اعزاز کی بات ہے میرے لیے۔“ نیل مسکراتے ہوئے اس سے الگ ہوا تھا۔

”ارے وائس! یہاں تو کچھ اور ہی سین چل رہا ہے؟ خیر تو ہے نا؟“

مدحیہ نے باہر نکلتے ہوئے ان کا گلے ملنے کا منظر دیکھ لیا تھا اور اسے واقعی دلچسپ حیرت ہوئی تھی۔

”ہاں جی۔۔۔! خیر ہی ہے بس تمہاری فرمائش پہ تمہاری بھابھی لانے کا سوچ رہے ہیں۔“ نیل نے مدحیہ کے سر پر چیت لگاتے ہوئے کہا تھا۔

”صرف ایک بھابھی۔۔۔ ہیں نے تو دو کے لیے کہا تھا۔“ مدحیہ خفا ہوئی تھی۔

”دو بھی ہو جائیں گی ابھی تم شروعات تو ہونے دو۔“ نیل مسکرا رہا تھا۔

”اوکے۔۔۔! کرس شروعات۔۔۔ اندھے کو کیا چاہیے دو آنکھیں اور مجھے کیا چاہیے۔ دو بھابھیاں۔“ مدحیہ نے کندھے اچکائے تھے اور اتنے میں فائزہ بیگم اور بتول شاہ بھی باہر آگئی تھیں اب بتول شاہ کا ارادہ بھی گھر چلنے کا تھا۔

لیکن جب سب کو اللہ حافظ کہنے کے بعد دل اور اپنی گاڑی کی سمت بڑھا تھا تو نیل نے اسے ایک بار پھر روک لیا تھا۔

”تو پھر کب کرو گے بات۔۔۔؟“ اسے بے چینی سی بے چینی ہو رہی تھی۔

”ابھی نہیں۔۔۔! ابھی تم لوگ کراچی سے واپس تو آ جاؤ۔ جس روز مناسب لگا بات کر لوں گا اور تم آئی سے کہنا کہ وہ نگارش بھابھی سے بات کر لیں پھر بات کرنے کے بعد باقاعدہ پر پول لے جائیں گے۔“ دل اور نے اسے اتنی جلدی کرنے سے روکا تھا۔

”اوکے۔۔۔! جیسا تمہیں مناسب لگے۔“ نیل کو مانتے ہی بنی تھی اور وہ لوگ ان سب سے مل کر واپسی کے لیے نکل آئے تھے لیکن دلوں پہ بہت سا بوجھ لے کر آئے تھے۔



رات خاصی گہری اور سیاہ ہو رہی تھی جب وہ دونوں ماں بیٹا گھر پہنچے تھے۔

بتول شاہ بنا کہ ہی دل اور کے اندر کی کیفیت جانتی تھیں اسی لیے انہوں نے گاڑی میں بھی اسے مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کی تھی اور گھر پہنچ کر بھی اپنے آپ کو اس کام سے باز رکھا تھا اس لیے گاڑی سے اترتے ہی وہ خاموشی سے اندر چلی گئی تھیں جبکہ دل اور دس پندرہ منٹ گاڑی سے اتر ہی نہیں سکا تھا وہ ڈرائیونگ سیٹ کی بیک سے سر نکالے اور پلکیں موندے نجانے کہاں سے کہاں نکل گیا تھا کہ واپسی کا راستہ ہی بھول گیا تھا۔

مگر اس کے گاڑی سے نہ نکلنے پہ اس کے ہاتھوں میں ڈیوگ کو بے چینی ہو رہی تھی اور اس نے ذرا آہستہ اور متوجہ کرنے والے انداز میں بھونکنے کی دوبارہ کوشش کی تھی اور عجیب عجیب خیالوں میں بھٹکتا دل اور اس کی اس کوشش پہ جہاں بھی تھا واپس لوٹ آیا تھا۔

اور تھکے تھکے انداز میں گاڑی کا دروازہ کھول کے نیچے اتر آیا تھا اس کے قدم اندر کی سمت اٹھ رہے تھے لیکن

میں ذور کے سامنے والی سیڑھیاں چڑھ کر اندر جاتے ہوئے اس کے قدم ٹھنک گئے تھے۔ اسے تلخ سے اندھیرے میں لان کی سیڑھیوں پہ کسی کا ہیولا سا نظر آیا تھا اور یہ ہیولا کس کا تھا؟ یہ اسے سمجھنے کے لیے زیادہ دیر نہیں لگی تھی اور دل اور شاہ کے قدم اس کی سمت ”مز“ گئے تھے۔ وہ انہی تھکے تھکے قدموں سے چلتا ہوا اس کے برابر آ بیٹھا تھا اور علیزے نے اپنا آنسوؤں سے تر چہرہ آستنی سے دوسری طرف موڑ لیا تھا جبکہ دل اور کا چہرہ جھکا ہوا تھا وہ نیچے سیڑھیوں کی سمت دیکھ رہا تھا۔

”تم جانتی ہو علیزے۔۔۔ مرد کتنا بے بس ہوتا ہے؟ رو بھی نہیں سکتا۔“ دل اور کا لہجہ بے حد بوجھل اور بے حد گھمبیر ہو رہا تھا اس کی آواز میں توازن نہیں تھا ہوا میں چوں کی طرح بکھری جا رہی تھی۔

”تم رو رہی ہو اور مجھے تم پہ رشک آ رہا ہے۔“ دل اور کی حالت ہی عجیب سی ہو رہی تھی اور حالت کے ساتھ ساتھ باتیں بھی عجیب سی لگ رہی تھیں۔ علیزے کو ایک پل کے لیے حیرت ہوئی تھی کہ وہ ایسا کیوں کہہ رہا ہے۔ آخر اسے ایسا کیا ہوا ہے کہ وہ اتنا بے بس لگ رہا ہے اور اسے رو لینے والوں پہ رشک آ رہا ہے اور یہ اس کی حیرت ہی تھی کہ وہ اپنا رونا بھول کر اس کی طرف دیکھنے پہ مجبور ہو گئی تھی اس نے چہرہ دل اور کی طرف موڑ لیا تھا لیکن اندھیرا اتنا تھا کہ وہ اس کے چہرے کو واضح نہیں دیکھ پائی تھی تو پھر چہرے کے تاثرات کیسے دیکھ سکتی تھی۔ مگر اتنا ضرور نظر آ گیا تھا کہ وہ اس کے برابر سر جھکائے ہوئے بیٹھا تھا۔

اور اس کا سر جھکا کر بیٹھنا علیزے کے لیے ایک اور حیرت تھی۔

”تمہیں کیا ہوا ہے ڈرائیور۔؟“ آج پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ علیزے نے خود اس سے کچھ پوچھا تھا۔ وہ بھی صرف اس کے متعلق۔۔۔ یوں جسے دونوں میں بڑے دوستانہ سے تعلقات ہوں۔

”میں ہمیشہ ہر عدالت میں ہر گیس جیت کے گھر آتا تھا علیزے۔۔۔ مگر آج۔۔۔ آج میں محبت کی عدالت میں دل کا کیس ہار کے گھر آیا ہوں۔ سب کچھ ہار آیا ہوں۔ سب کچھ چھوڑ آیا ہوں۔ علیزے۔۔۔ میں۔۔۔ میں دوستی پہ محبت دار آیا ہوں۔ آج۔۔۔ آج سب کچھ ختم کر آیا ہوں۔“

انتہائی بے بس انداز میں کہتے کہتے اس کا لہجہ گھمبیر۔۔۔ ہو گیا تھا اور علیزے دم سادھے آنکھیں پھیلائے بے یقین اور حیران پریشان نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

اسے ہرگز یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ ساری باتیں ڈرائیور کہہ رہا ہے؟

”لیکن۔۔۔! تم تو آج اپنے دوست کی طرف دعوت دے انوائٹ تھے تم تو وہاں گئے تھے؟“

علیزے کو پتا تھا کہ وہ اپنے دوست کے گھر دعوت دے گیا ہوا ہے۔ اسے یہ انفارمیشن گل نے دی تھی۔

”ہو نہ۔۔۔! وہ میرے دوست کی طرف سے دعوت نہیں تھی۔ دل لگی تھی۔ دل داری تھی جس میں اس نے اپنے دل کا بوجھ اٹھا کر میرے دل پہ ڈال دیا ہے اور کہتا ہے کہ اب اس بوجھ کو خوشی اٹھاؤ اور خوش نظر آؤ۔“

لیکن۔۔۔ تمہارا علیزے جس دعوت میں انسان کو اپنے ہی دل کا خون پیٹا دے کیا وہ دعوت ہوتی ہے؟

دل اور کی عجیب بھکی بھکی باتیں علیزے کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھیں۔ اسے بھلا کیا اندازہ ہو سکتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور کیا نہیں۔

”بتاؤ نا۔۔۔! علیزے۔۔۔ کیا وہ دعوت ہوتی ہے؟“ اس نے علیزے کی سمت گردن موڑتے ہوئے اسے بولنے پہ اکسایا تھا جواب دینے پر اصرار کیا تھا مگر وہ کیا بولتی؟ کیا جواب دیتی آخر؟ اس کے کچھ پلے پڑتا تھا۔!

”خیر۔۔۔! میں بھی پاگل ہوں۔ تم سے پوچھ رہا ہوں۔ تم سے۔۔۔ جس کا بھی دل سے اور دل کے کسی کیس سے واسطہ ہی نہیں پڑا۔ جسے پتا ہی نہیں ہے کہ عدالت کون سی ہے؟ جرم کس کا ہے؟ کیس کون سا ہے؟ مجرم کون ہوتا ہے اور مدعی کون کہلاتا ہے۔“

اس نے استنہائے سے انداز میں کہتے ہوئے سر جھٹکا تھا جیسے علیز ہے مسکرا رہا ہو۔

”تم بہت اچھی لڑکی ہو علیز۔ بہت اچھی۔ ان ساری باتوں سے کوسوں دور ہو۔ انجان ہو۔ آزاد ہو۔ پتا ہی نہیں کہ یہ سب کیا ہوتا ہے؟ رنکلی علیز۔ بہت خوش قسمت ہو تم۔“ دل اور کہتے کہتے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور دوبارہ اپنے قدم اندر کی سمت موڑ دیے تھے۔

”ڈرامیو۔“ اس نے پیچھے سے بے ساختہ اسے پکارا تھا اور دل اور کے قدم ایک پل کے لیے رک سے گئے تھے۔

”مسوری یا۔! میں نے تمہیں خواہ مخواہ ڈسٹرب کر دیا۔ پلیز کیپ اٹ اپ۔“ وہ اس سے معذرت کر کے مزید رک کے بغیر اندر چلا آیا تھا اور علیز نے پیچھے دیکھتی رہ گئی تھی۔

گڈ مارننگ آذر بھائی۔! آذر صبح صبح تیار ہو کر بیڑھیاں اتر کے نیچے آ رہا تھا جب انوشہ اور کوئل اچانک ہی سامنے آئی تھیں۔

”گڈ مارننگ۔! جواباً آذر نے بھی اسے خوش کیا تھا۔

”کیسے ہیں آپ۔؟“ یہ سوال کوئل کی طرف سے آیا تھا اور آذر آگے بڑھتے بڑھتے ٹھہر گیا تھا۔

”ٹھیک ہوں۔! اللہ کا کرم ہے۔ آپ سنا میں۔“ اسے بھی آخر فارمیٹلٹی تو بھائی ہی تھی۔

”ہوں۔! میں بھی ٹھیک ہوں۔ ڈیڈ لیوے ہیں؟ گھر کب آئیں گے؟“ کوئل جان بوجھ کر بات کو طول دے رہی تھی آخر اتنے دنوں بعد دیکھا تھا اور مونڈ بھی فریش تھا۔

”امید ہے آج شام تک ڈسچارج ہو جائیں گے۔ آپ سب بس دعا کریں ان کے لیے۔“

”لیکن آذر بھائی۔! ماما تو آج اسپتال جانے کے لیے تیار ہیں۔ دانیال بھائی سے کہہ رہی تھیں کہ مجھے بھی ساتھ لے جانا۔“ انوشہ کو ڈیڈ کے ڈسچارج ہونے کا سن کر عائشہ آندھی کا خیال آیا تھا۔

”اے نہیں نہیں۔! اس کی ضرورت نہیں ہے وہ آرام سے گھر پہ رہیں ڈیڈ آج ضرور گھر آجائیں گے۔ وہ گھر پہ ہی مل لیں گی ان سے۔“ آذر نے ان کے جانے کا سن کر نفی میں سر ہلایا تھا۔

”یہ بات اب ماما کو کون سمجھائے۔“ انوشہ نے کندھے اچکائے تھے۔

”اوکے۔! میں بات کرتا ہوں ان سے۔ ابھی ناشتا کر لوں۔“ وہ کہہ کر ڈائننگ روم کی طرف چلا آیا تھا۔

”گڈ مارننگ۔! اس نے اسرار آندھی اور ثروت بیگم کو خوش کیا تھا۔

”گڈ مارننگ۔! جیتے رہو۔ خوش رہو۔ بیٹھو میاں۔“ وہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھیں۔

”تھینک یو۔! وہ ان کے برابر ہی کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا تھا۔

”آفس جار ہے ہو؟“ انہوں نے اس کی تیاری دیکھ کر بڑی نرمی اور پیار سے پوچھا تھا۔

”نہیں۔! اسپتال جا رہا ہوں۔“ اس نے جوس کا جگ اٹھاتے ہوئے نفی میں سر ہلایا تھا۔

”کیوں۔؟ آج تو شاید بھائی صاحب اسپتال سے ڈسچارج ہو جائیں گے نا۔“

”جی۔! ہو جائیں گے۔ تو کیا ان کو پورے دن کے لیے اکیلا چھوڑ دیں؟ اور اسپتال کے جو بلز وغیرہ ہیں وہ کس نے کلکٹر کرنے ہیں؟“ وہ جوس کا گلاس اٹھاتے ہوئے انہاں سے پوچھ رہا تھا۔

”نہیں۔! میں تو بس اس لیے پوچھ رہی تھی کہ دانیال بھی شاید اسپتال ہی جا رہا ہے اس لیے تم آفس جاؤ گے۔“ ثروت بیگم سمجھ گئی تھیں کہ آذر کو ان کا سوال برا لگا ہے اسی لیے انہوں نے جواباً وضاحت پیش کی

تھی۔ ”میں آفس نہیں جاؤں گا دانیال آفس جائے گا۔ پہلے اسپتال جا کر ڈیڈ اور آئی سے ملے گا پھر آفس جائے گا۔ البتہ میں ڈیڈ کے پاس ہی رہوں گا۔“ آذر نے انہیں ذرا تنہما کے بتایا تھا اور وہ سمجھ بھی گئی تھیں۔

”ہوں۔! اچھی بات ہے تمہارا جانا ضروری ہے تم انہیں ساتھ لے کر ہی گھر آنا۔ آفس کی فکر مت کرو میں بھی آفس ہی جا رہا ہوں۔“ اسرار آندھی کہہ کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

”دعوت اور عدید اسکول چلے گئے۔“ آذر نے رجو سے استفسار کیا تھا آج کل آسیہ آندھی کی غیر موجودگی میں عون اور عدید کی ذمہ داری رجو پہ ہی تھی اور ان کے سارے کام وہی سرانجام دے رہی تھی۔

”جی۔! چلے گئے ہیں۔ مبارک خان لے گیا ہے ساتھ۔“ رجو نے اثبات میں جواب دیا تھا۔

”ہوں۔! آٹھک سے میرے ناشتا ختم کرنے تک تم آئی کا ناشتا لے آؤ۔ میں ساتھ لے جاؤں گا البتہ احمد اور زین گھر آکر ناشتا کریں گے۔“ آذر نے ناشتا شروع کرنے سے پہلے رجو کو ہدایت دی تھی اور وہ سر ہلاتے ہوئے واپس مڑ گئی تھی۔

”کب چلنا ہے تم نے۔؟“ آذر کے عقب سے دانیال کی آواز ابھری تھی۔

”بس یہ ناشتا ختم کر لوں۔ کیوں؟ تمہیں کیا جلدی ہے؟“ آذر نے ناشتے کی طرف اشارہ کیا تھا۔

”مجھے جلدی نہیں ہے امی کو جلدی ہے وہ تیار کھڑی ہیں۔“ دانیال نے بے چارگی سے کہا تھا۔

”لیکن دانیال عائشہ پھوپھو کیوں جارہی ہیں؟ ڈیڈ آج گھر تو آئی جائیں گے۔ پھر جانے کا کیا فائدہ۔“ آذر نے خفگی سے کہا۔

”فائدہ اور نقصان کا مجھے نہیں پتا۔ بس وہ جانے پہنچنے ہیں اس لیے میں انہیں منع نہیں کر سکتا ہمیں کیا؟ ابھی چلی جائیں شام کو ڈیڈ اور آئی کے ساتھ ہی واپس آجائیں گی۔“

دانیال نے کندھے اچکائے اور آذر اس کی بات پہ چپ ہو گیا تھا۔ پھر انہیں عائشہ آندھی کو ساتھ لے کر ہی اسپتال جانا پڑا تھا۔

کب تم سے شکایت ہے

اک تازہ حکایت ہے

سن لو تو عنایت ہے

تم کس لیے چونکے ہو

کب ذکر تمہارا ہے

کب تم سے تقاضا ہے

وہ تکیے میں چہرہ چھپائے بیڈ پہ اوندھے منہ پڑا تھا لیکن رات سے اب تک ذہن میں بس یہی الفاظ بار بار چکر رہے تھے اور اس کا دماغ اس حد تک بو جھل ہو رہا تھا کہ اس کا اپنے بیڈ سے اٹھنے اور باہر نکلنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا حالانکہ وہ اتنی دیر تک بستر میں پڑے رہنے کا عادی نہیں تھا وہ تو سیرے ہی بستر چھوڑ کے اٹھ جاتا تھا مگر آج پہلی بار وہ اتنا بے دل ہوا تھا کہ دنیا کو دیکھنے کو ہی دل نہیں مان رہا تھا۔ بہت دیر اسے بونہی پڑے پڑے گزر گئی تھی۔

اور جب بے چینی حد سے سوا ہوئی تو وہ یکدم کبل ہٹا کر اٹھ بیٹھا تھا اور بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ رکھا سگریٹ کا پیکٹ اور اسٹراٹھا کر سگریٹ سلگا لیا تھا بونہی سگریٹ پھونکتے ہوئے موبائل پہ نظر پڑی تھی۔ اس کا دل چاہا وہ

عبداللہ کو کال کرے مگر موبائل اسکرین پہ وہ مسیجوز دیکھ کر اس نے کال کا ارادہ ترک کر دیا تھا کیونکہ یہ مسیجوز عبداللہ اور نبیل کے تھے وہ دونوں کراچی جانے کے لیے روانہ ہو چکے تھے اور جانے سے پہلے انہوں نے باقاعدہ اسے مسیجوز کیسے تھے اس لیے اب راستے میں انہیں کال کرنا فضول تھا۔

”دل آؤ۔! دو روزہ ڈیوٹی لیا۔“ وہ اپنے دھیان میں کم موبائل ہاتھ میں پکڑے دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں سگریٹ سلگائے بیٹھا تھا جب بتول شاہ کی پریشان آواز کے ساتھ دروازے پہ دستک بھی سنائی دی تھی۔

اور دل اور دل نے بے ساختہ چوتھے ہوئے سگریٹ شیش ٹرے میں مسل دیا تھا اور اٹھ کر روانہ کھول دیا تھا۔
”جی۔ السلام علیکم۔“ اس نے کافی ڈھیلے ڈھالے انداز میں سلام کیا تھا۔

”تم ابھی تک تیار نہیں ہوئے؟“ بتول شاہ کافی پریشان اور غلٹ میں لگ رہی تھیں۔

”کیوں۔۔۔ خیریت۔۔۔؟“ اب کی بار دل اور دل بھی ٹھٹھک گیا تھا وہ واقعی بہت پریشان لگ رہی تھیں۔

”ہول۔۔۔ خیریت ہے بھی اور نہیں بھی۔۔۔ وہ دراصل ہمارے کالج کی ایک لیکچرار ہیں مسز وقاص آفریدی۔
آج صبح لاہور آتے ہوئے ان کا ایک سپینڈنٹ ہو گیا ہے وہ اس وقت اسپتال میں ہیں اس لیے مجھے ابھی اسپتال پہنچنا ہے۔ ان کی بیٹی کی کال آئی تھی انہیں پتا تھا کہ میں لاہور آئی ہوئی ہوں۔“ انہوں نے کافی گھبرائے ہوئے لہجے میں بتایا تھا اور دل اور دل کے تنے ہوئے اعصاب پھر سے ڈھیلے بڑ گئے تھے۔

”تو اس میں آپ کو اتنا گھبرانے کی کیا ضرورت ہے؟ گلاب خان کو اپنے ساتھ لیں اور اسپتال پہنچ جائیں۔“
”نہیں بیٹا، گھبرانے والی بات تو ہے نا۔۔۔ وہ دراصل پشاور کی رہنے والی ہیں۔ یہاں لاہور میں ان کا اور کوئی جاننے والا نہیں ہے اور اس مشکل وقت میں ان کی بیٹی نے مجھے آواز دی ہے۔ اس لیے میرا فرض بنتا ہے کہ میں فوراً سے پیسٹران کے پاس پہنچوں۔“

انہوں نے اپنی پریشانی کی اصل وجہ بتائی تھی اور پھر دل اور دل کو بھی ان کی غلٹ کی سمجھ آگئی تھی۔
”ٹھیک ہے آپ گلاب خان کے ساتھ چلی جائیں۔ مجھے فی الحال آفس جا کر ایک کلائنٹ سے ملنا ہے اور فارغ ہوتے ہی میں بھی وہیں اسپتال ہی آجاؤں گا۔“

دل اور دل نے ان کے کندھوں پہ ہاتھ رکھ کے انہیں تسلی دی تھی اور ہلکے سے مسکرا اٹھی تھیں۔ ”جیتے رہو“
سدا آہور ہو۔“ وہ اس کی پیشانی چوم کر باہر نکل گئی تھیں اور دل اور دل نہ جانے کیوں لرز گیا تھا۔ وہ جب بھی کبھی انہیں اس طرح گہری نظر سے دیکھتا تھا تو اس کے دل پہ اسی طرح ایک سایہ سالہا جاتا تھا۔
”اماں۔۔۔! وہ بے ساختہ نہ چاہتے ہوئے بھی انہیں پکار بیٹھا تھا اور وہ سیڑھیاں اترتے اترتے ٹھہر گئی تھیں۔
”ہاں، کو؟ وہ یوں ہی رینگتے رہتے تھے۔ وہ اپنے بیڈروم کے دروازے کی چوکھٹ میں کھڑا تھا۔

”میں آجاؤں آپ کے ساتھ؟“ چاہتا ہی اس کا دل ان کے ساتھ جانے کو چاہتا تھا۔
”ارے نہیں میری جان۔۔۔ تم ابھی آفس جا کر اپنے کلائنٹ سے ملو پھر بعد میں آجانا۔“
”لیکن اماں! میرا دل بہت اوس ہے۔ میں آپ کے ساتھ جانا چاہتا ہوں باتیں کرنا چاہتا ہوں کلائنٹ سے پھر مل لوں گا۔“ دل اور دل نے بچوں کی طرح ان کے ساتھ جانے کی ضد کی تھی۔

”بری بات بیٹا! کام میں کوتاہی نہیں کرتے۔ کلائنٹ بھی آخر مجبور ہوتے ہیں اور تم تو وقت یہ کام کرنے کے عادی ہو۔ یہ سستی تمہیں سوٹ نہیں کرتی۔“ شاہباز تم آفس جاؤ پھر وہاں سے اسپتال آجانا۔“ وہ کہہ کر اس کو نرمی سے دیکھتی ہوئی پلٹ کر سیڑھیاں اتر گئی تھیں اور دل اور دل ایک بار پھر لپک کر سیڑھیوں کی رینگ کے قریب آیا تھا۔

”آپ جا رہی ہیں؟“ اس نے عجیب بے گل سے انداز میں بے تکا سوال کیا تھا۔
اور بتول شاہ راہداری کی سمت بڑھتے بڑھتے ایک بار پھر رک گئی تھیں اور سر اٹھا کر سامنے سیڑھیوں کی رینگ کے قریب کھڑے دل اور دل کو دیکھا تھا۔

”ہاں۔۔۔ جا رہی ہوں۔۔۔ کیوں؟ کوئی کام ہے کیا؟“ انہوں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔ ”ہاں“ کام تو بہت سے ہیں مگر فی الحال آپ سے یہی پوچھنا تھا کہ آپ نے ناشتا کیا ہے یا نہیں؟“ اس نے جیسے مگر سنجیدہ انداز میں

پوچھا تھا اور بتول شاہ اس کی اس قدر فکر مند ہی ہوئی کہ وہ گئی تھیں۔
”نہیں، میں نے ناشتا نہیں کیا۔ صرف ایک کپ چائے کا لیا ہے، لیکن ڈونٹ وری، لٹچ ایک ساتھ ہی کریں گے؟“ انہوں نے اسے مطمئن کرنے کے لیے بھلایا تھا۔

”ہوں! ٹھیک ہے میں بھی ناشتا نہیں کرتا۔ لیکن ڈونٹ وری، لٹچ ایک ساتھ ہی کریں گے؟“
اس نے بھی جواباً ”نہی کے سے انداز میں جواب دیا تھا۔ جس پہ بتول شاہ نے اسے خفگی سے گھورا تھا۔
”شاہ! یہ کیا ضد لگا رکھی ہے تم نے؟ مجھے جانے دو گے یا نہیں؟“ وہ کافی خفگی سے بولی تھیں۔

اور دل اور دل کو ذرا دیر کے لیے لمبھلنا پڑا تھا۔ ورنہ وہ اس پہ غصہ بھی ہو سکتی تھیں۔
”اوکے! اب کچھ نہیں کہتا جائیں آپ۔“ اس نے ان کے جانے کے لیے رضامندی دے دی تھی۔
”نیچے آکر ناشتا کرو اور آفس جاؤ اللہ حافظ۔“ وہ پھر اسے اللہ حافظ کہہ کر آگے بڑھ گئی تھیں اور دل اور دل پھر سے مضطرب ہوا تھا۔ اس کا دل پھر سے ان کے پیچھے لپکنے کو چاہتا تھا اور اس نے پھر سے اس چاہ کو پورا کیا تھا۔
اور حیرتی سے دھڑو دھڑ کر سیڑھیاں اترتا ہوا نیچے آگیا۔ اس کے قدم بتول شاہ کے پیچھے پیچھے ہی اٹھ رہے تھے اور وہ باہر ڈرائیو تک آگیا تھا۔ جبکہ بتول شاہ گاڑی کے قریب پہنچ چکی تھیں۔

”ہاں۔۔۔“ اس نے مین ڈور کے سامنے والی سیڑھیاں اترتے ہوئے پھر پکارا تھا اور گاڑی کا دروازہ کھولتی بتول شاہ خفگی سے جھنجھلا کر واپس مڑی تھیں۔

”ہوں۔۔۔ اب کیا ہوا ہے؟“ وہ دل اور دل کو سرٹاپا دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔
”پلیز اماں اور کچھ نہیں کہنا، بس صرف اتنی سی بات کہنی ہے کہ آپ مجھے آج ایک کام کی اجازت دے دیں صرف ایک کام کی اجازت، پلیز۔“

وہ ان کے قریب عین ان کے سامنے آکھڑا ہوا تھا اور بتول شاہ اس کی اتنی سنجیدگی پہ ٹھٹھک گئیں۔
”کیسی اجازت؟ کس کام کی اجازت؟“ وہ کافی الجھے ہوئے اور نا سمجھ سے انداز میں پوچھ رہی تھیں۔
”علیحدہ کو بڑی حویلی چھوڑنے کی اجازت، پلیز اماں! آپ صرف ایک بار اجازت دے دیں۔ بس پھر سارا معاملہ ختم ہو جائے گا۔ میں اسے آج ہی بڑی حویلی چھوڑ آؤں گا۔ پلیز پھر آپ جو بھی کہیں گی میں کروں گا، کبھی آپ کے سامنے انکار نہیں کروں گا۔ کبھی کسی بات پہ ”اف“ بھی نہیں کروں گا۔ پلیز ایک بار اسے چھوڑنے کی اجازت دے دیں۔“

دل اور دل نے انہیں کندھوں سے تھامتے ہوئے جیسے التجاسی کی تھی۔ وہ آج کے دن ان سے یہ بات منوالینا چاہتا تھا۔ تاکہ وقار آئندی کے ڈسچارج ہونے کے ساتھ ہی وہ اسے بھی بڑی حویلی چھوڑ آتا۔
لیکن بتول شاہ اس کی بات سن کر چپ سی ہو گئی تھیں۔ وہ آخر کیسے یوں کھڑے کھڑے اجازت دے دیتیں کہ چلو ٹھیک ہے، جاؤ جا کر علیحدہ کو چھوڑ آؤ۔ آخر انہیں بھی تو کچھ وقت چاہیے تھا۔ کچھ سوچنے کے لیے، کچھ سمجھنے کے لیے، جبکہ وہ تھا کہ ہسپتال پہ سرسوں جہاں تھا۔

”میری واپسی کا انتظار کرو، آج شام تک یہ فیصلہ بھی ہو جائے گا۔“ وہ اپنے کندھوں سے اس کے ہاتھ ہٹاتے ہوئے خاصے فیصلہ کن لہجے میں بولی تھیں اور پھر آگے بڑھ کے گاڑی کے کھلے ہوئے دروازے سے اندر بیٹھ گئی تھیں۔ گلاب خان پہلے ہی ڈرائیونگ سیٹ پہ تیار بیٹھا تھا اور بتول شاہ کے بیٹھتے ہی اس نے گاڑی اشارت کر لی تھی۔

اور دل اور دل کے دیکھتے ہی دیکھتے گاڑی آہستہ آہستہ پیچھے سرکتی ہوئی گیٹ سے نکلی اور آنکھوں سے او جھل ہو گئی تھی اور وہاں کادیں کھڑا رہ گیا تھا۔

بتول شاہ دل آوری کی باتوں میں الجھ کر مطلوبہ اسپتال کا نام ہی بھول گئی تھیں۔ اور اپنے اندازے کے مطابق ہی دو تین اسپتالز کے چکر کاٹ لیے تھے۔ مگر مسز وقاص آفریدی کا انہیں کہیں بھی پتا نہیں چلا تھا اور جس نمبر سے ان کی بیٹی کی کال آئی تھی وہ نمبر بار بار ٹرائی کرنے پر بھی بڑی جا رہا تھا۔ بتول شاہ گاڑی میں بیٹھی بری طرح جھنجھلا رہی تھیں اور ان کے ساتھ گلاب خان بھی خوار ہو رہا تھا۔ وہ بھی تقریباً ہر اسپتال میں اس نام کی خاتون کا پتا کرتا پھر رہا تھا مگر پتا نہ آ رہا۔

”بیگم صاحبہ! میرا خیال ہے آپ گھر چلی جائیں اور نام و پتا مجھے دے دیں، میں اور بھی اسپتالوں میں جا کر پتا کر لیتا ہوں۔ جب معلوم ہو گیا تو بعد میں آپ کو بھی لے آؤں گا۔“

گلاب خان نے بتول شاہ کی پریشانی کے خیال سے انہیں گھر جانے کا مشورہ دیا تھا۔ مگر بتول شاہ اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے مایوس ہو کر واپس نہیں جاسکتی تھیں۔ کیونکہ اس وقت ان کی کولیگ کی زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔ وہ اس طرح یہ کام اپنے گھر کے ملازم کے ذمے لگا کر خود گھر جانے کو ہرگز تیار نہیں تھیں۔

”فی الحال یہ جو سامنے اسپتال ہے۔ تم وہاں گاڑی روک۔ میں خود پتا کرتی ہوں۔“ انہوں نے سامنے نظر آتے ایک بڑے سے اسپتال کی بلند و بالا عمارت کی طرف اشارہ کیا تھا اور گلاب خان دیکھ کے رہ گیا تھا۔

”بیگم صاحبہ! ایکسپلینٹ کے زخمی کو اتنے بڑے اسپتال میں کبھی بھی نہیں لایا جاتا یا تو لوگ اٹھا کر سرکاری اسپتال لے جاتے ہیں یا پھر کسی چھوٹے موٹے ریسورٹ اسپتال لے جاتے ہیں۔ بڑے بڑے اسپتالوں میں تو قدم رکھنے کی بھی فیس اور اگر بڑی ہے۔ اس لیے اوھر کا کوئی بھی رخ نہیں کرتا۔“

گلاب خان نے واقعی ایک سمجھ دار ملازم ہونے کا ثبوت پیش کیا تھا مگر وہ بھی سمجھتی تھیں تب نا؟

”لیکن پتا کر لینے میں کیا حرج ہے بھلا؟“ انہوں نے اپنی کمی تھی۔

”جی ٹھیک ہے۔ جیسے آپ کی مرضی۔“ گلاب خان نے تابعداری سے کہتے ہوئے گاڑی اسپتال کی پارکنگ میں روک دی تھی اور تیزی سے نیچے اتر کر بیک ڈور کھول دیا تھا اور وہ بھی گاڑی سے اتر آئی تھیں۔ اسپتال کی وسیع و عریض پارکنگ کا احاطہ اور ڈرائیوے کا طویل راستہ تیز تیز قدموں سے طے کرتی ہوئی وہ سیدھی اسپتال کے ریسپشن تک جا پہنچی تھیں۔

وہاں پہلے سے ہی بہت رش تھا۔ کان پڑی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ لیکن پھر بھی بتول شاہ بہت سے لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتی ہوئی۔ ریسپشن پہ کھڑی لڑکی تک پہنچ ہی گئی تھیں۔ جو پہلے ہی اتنے سارے لوگوں کی وجہ سے گھبراہٹ ہوئی تھی۔

”مسز وقاص آفریدی نام کی ریسپشن کا پتا کرنا ہے۔ کیا وہ اسی اسپتال میں ہیں؟“

بتول شاہ نے اس لڑکی کو بڑی مشکل سے اپنی طرف متوجہ کیا تھا اور اس لڑکی نے بے دھیانی سے سر ہلا دیا تھا۔

”یس میڈم۔ وہ اسی اسپتال میں ہیں۔“ اس نے اک نظر سامنے رکھے رجسٹر کو دیکھا تھا۔ کہاں ہیں وہ؟ بتول شاہ کو جیسے ایک دم سے کچھ تسلی اور دھارس مل گئی تھی۔

”جی۔ روم نمبر ایک سو تین۔“ سیکنڈ فلور۔“ اس لڑکی نے جلدی جلدی بتا کر رجسٹر بند کر دیا تھا اور دوسرے ہنگامہ مچاتے لوگوں کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ حالانکہ پہلے اس ریسپشن پہ تین لڑکیاں آن ڈیوٹی ہوتی تھیں۔ لیکن اس وقت وہ بے چاری اکیلی پھنسی ہوئی تھی اور اتنے زیادہ لوگوں کو گائیڈ کر کے اس کے حواس اڑے ہوئے تھے۔ مگر بتول شاہ یہ نہیں جانتی تھیں کہ ان کی اپنی جلد بازی اور عجلت کے ساتھ ساتھ اس لڑکی کی یہ بے دھیانی اور اڑے حواس انہیں کہاں سے کہاں لے جائیں گے؟

”نہ نہ۔ ہم یہاں سے۔“

”نہ نہ۔ ہم یہاں سے۔“

زندگی کا ایک ایسا مقام اور ایک ایسا لمحہ جس سے بچتے ہوئے اور جس سے بھاگتے ہوئے ایک زندگی ہو گئی تھی۔ آج وہی مقام اور وہی لمحہ ان کے سامنے آ گیا تھا۔

وہ اپنی عجلت میں سیکنڈ فلور کے روم نمبر ایک سو تین کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تھیں اور سامنے بیڈ پہ نظر آئے وجود کو دیکھتے ہی پتھر کی ہو گئی تھیں۔ حالانکہ سامنے نظر آتا وجود بھی پتھر کا ہی تھا۔ بس فرق صرف اتنا تھا کہ وہ وجود بستر پہ راقا تھا اور بتول شاہ ابھی اپنے پتھر سے وجود کو لیے اپنے قدموں پہ کھڑی تھیں۔ مگر کس طرح کھڑی تھیں؟ یہ شاید وہ بھی نہیں جانتی تھیں۔

”نہ نہ۔ ہم یہاں سے۔“ وقار آفریدی پہ جیسے نزع کا وقت آن پہنچا تھا۔ ان کی زبان اور ان کے جسم پہ اک لرزا سا طاری ہو گیا تھا اور نشوونے ان کا منہ صاف کرتی آسید آفریدی نے یک دم چونک کر اپنے پیچھے دیکھا تھا اور اپنے پیچھے دیکھتے ہی ان کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

”زہرہ؟“ آسید آفریدی سب کچھ چھوڑ چھاؤں کے لپک کر ان کے قریب آئی تھیں۔

”زہرہ۔ یہ۔ یہ۔ میں کیا دیکھ رہی ہوں؟ یہ۔ تم ہی ہونا؟ تم۔ تم کہاں چلی گئی تھیں؟“

آسید آفریدی نے بتول شاہ کے پتھر وجود کو اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا تھا، لیکن بتول شاہ جواباً ”کچھ بھی نہیں کہہ سکتی تھیں۔ وہ تو جیسے بے حس و حرکت سی کھڑی تھیں۔“

”السلام علیکم؟“ اتنے میں وانیال اور آذر عاتشہ آفریدی کا چپک اپ کروا کر وہیں آگئے تھے۔ لیکن ان کے دیاں آنے تک وقار آفریدی کے روم کا منظر بدل چکا تھا۔ وہاں جو چہرہ نظر آ رہا تھا۔ وہ ان سب کے لیے ہی ناقابل یقین تھا۔ خصوصاً عاتشہ آفریدی اور وقار آفریدی کے لیے۔

”زہرہ؟“ عاتشہ آفریدی بے ساختہ خوشی اور اشتیاق کے مارے بتول شاہ کے گلے لگ گئی تھیں اور عاتشہ آفریدی کا یہ گلے لگنا بتول شاہ کو بائیس سال پیچھے لے گیا تھا اور وہ یک دم کرنٹ کھا کے پیچھے ہٹی تھیں۔ مگر عاتشہ آفریدی نے ان کا اس طرح پیچھے ہٹنا نوٹ ہی نہیں کیا تھا۔

”زہرہ! کہاں چلی گئی تھیں تم؟ میں نے تمہیں کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا؟ کہاں کہاں نہیں گئی میں؟ میں پاگل ہو گئی تھی تمہارے لیے مگر تم کہیں نہیں ملیں، کہیں بھی نہیں کیا اس طرح گم ہو جاتے ہیں؟ کہ اپنوں کو خبر بھی نہ دیں؟ کیا تمہیں کبھی میرا خیال بھی نہیں آیا؟ کیا تم نے کبھی یہ بھی نہیں سوچا کہ تمہاری عاتشہ پہ کیا گزری ہوگی؟“

عاتشہ آفریدی بتول شاہ کو دونوں کندھوں سے تھامتے ہوئے رو پڑی تھیں۔

اور بتول شاہ نے پتھرائی ہوئی نظروں سے پہلے وقار آفریدی کو پھر آسید آفریدی کو اور پھر آذر اور وانیال کو دیکھا تھا ان سب کی نظریں بھی بتول شاہ پہ ہی تھیں۔

”کس پہ کیا گزری؟ میں سب جانتی ہوں، مگر تجھ پہ کیا گزری؟ یہ کوئی بھی نہیں جانتا۔ تم بھی نہیں۔“ انہوں نے عاتشہ آفریدی کے ہاتھ نرمی سے پکڑ کر پیچھے ہٹا دیے تھے اور اوھر وقار آفریدی کے منہ سے خاصی بلند قسم کی کراہ نکلی تھی۔ انہوں نے اٹھنا چاہا تھا مگر بے بسی آڑے آگئی تھی۔ وہ زہرہ بتول شاہ سے کچھ کہنا چاہتے تھے۔ مگر کہہ نہیں پا رہے تھے۔

”نہ نہ۔ ہم یہاں سے۔“

”نہ نہ۔ ہم یہاں سے۔“

”نہ نہ۔ ہم یہاں سے۔“

”نہ نہ۔ ہم یہاں سے۔“

دھواں نکل گیا ہوا اور ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا چھا گیا ہو۔ پھر اس کے بعد اسے نہیں خبر تھی کہ اس کے ہاتھ سے موبائل کب گر اٹھا؟ اسے محسوس کر کہاں لگی؟ وہ گاڑی تک کیسے پہنچا تھا اور اس نے یہ سارا سفر کب اور کیسے طے کیا تھا؟ اس کا دماغ اس گھوم رہا تھا اور پوری دنیا میں جیسے تاریکی چھائی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

وہ اسپتال کی رایداری میں بلبلاتے ہوئے شیر کی طرح چکر کاٹ رہا تھا۔ صبح سے شام ہو گئی تھی۔ لیکن بتول شاہ کو ابھی تک ہوش نہیں آیا تھا۔ وہ آئی سی یو میں مسلسل زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہی تھی۔ لیکن یہ زندگی جیت رہی تھی اور نہ موت ہارنے کو تیار تھی۔

اور دل اور شاہ کی حالت ایسی تھی کہ جیسے جان نزع ہو چکی ہوئی تھی۔ جیسے اب نکلے تب نکلے وہ صبح سے اب تک اس ایک راہداری میں چکر کاٹ کاٹ کر یا گل ہو گیا تھا۔ گلاب خان اور اس کے سوا کسی تیسرے کو ابھی تک اس ایکسپلیمنٹ کی خبر نہیں تھی اور ابھی وہ ٹیبل اور عبد اللہ کو فون کر کے بتانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک ایک ڈاکٹر اور نرس آئی سی یو کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئے تھے اور دل اور تیزی سے ان کے قریب آیا تھا۔

”مبارک ہو! آپ کی مدد ہوش میں آچکی ہیں۔ آپ تھوڑی دیر کے لیے ان سے مل سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ اس وقت زیادہ بات کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔“

ڈاکٹر نے اس کا کندھا ہلکتے ہوئے اسے تسلی دی تھی اور دل اور کے ساتھ ساتھ گلاب خان نے بھی اللہ کا شکر ادا کیا تھا اور پھر وہ تیزی سے آئی سی یو کی سمت بڑھ گیا تھا۔

”اماں! دل اور کی رنگ قسم کی آواز اس وقت بے حد دھیمی اور بے جان سی لگ رہی تھی۔ وہ مرے مرے قدموں سے چلتا ہوا ان کے بیڈ کے قریب آکھڑا ہوا تھا۔ ان کا پورا جسم سفید پیوں میں لپٹا ہوا تھا۔ دو ڈوڈرپس لگی ہوئی تھیں۔ چہرے پر خراشوں کے نشان نظر آ رہے تھے اور انتہائی اذیت سے بند پلکوں کو انہوں نے بڑی مشکل سے کھولتے ہوئے دل اور کی سمت دیکھا تھا۔

اور چہرے پر ایک درد سے گندھی ہوئی مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہو گئی تھی۔

”تمہیں بتا تھا نا؟ آج میری زندگی کا آخری دن ہے۔ اس لیے مجھے جانے سے روک رہے تھے؟ اور۔ اور مجھے بتا ہی نہیں چلا کہ میرا بیٹا کیا چاہ رہا ہے؟ کیوں بے چین ہو رہا ہے؟ ہونہ۔ اور میں سمجھ ہی نہیں سکی۔“ بتول شاہ بڑی مشکل سے اپنی باقی ماندہ ہمتیں مجتمع کرتے ہوئے اس سے بات کرنے کی کوشش کر رہی تھیں ورنہ درد اور تکلیف اتنی تھی کہ ”اف“ بھی کرنا مشکل لگ رہا تھا۔

”پلیز اماں۔ ایسا کچھ مت کہیں۔ آپ ان شاء اللہ جلدی ٹھیک ہو جائیں گی۔ آپ نے ہر حال میں ٹھیک ہونا ہے۔ صرف میرے لیے، میرے لیے جینا ہے۔ آپ نے ورنہ اکیلا ہو جاؤں گا، ہمیشہ کے لیے اکیلا۔“ دل اور نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا تھا۔ اس کی آواز کافی بھگی ہوئی لگ رہی تھی۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں۔ میں۔ تمہیں اکیلا چھوڑ کے کیسے جاسکتی ہوں بھلا؟ اب تک جو زندہ ہوں تو تمہارے لیے ہی تو زندہ ہوں ورنہ تم جانتے ہو کہ نہ جانے کب کی مر گئی ہوتی؟“

بتول شاہ کے آنسو نہ چاتے ہوئے بھی کپٹیوں تک بہہ نکلے تھے اور دل اور کا دل مٹھی میں آگیا تھا۔

”لیکن اماں! آپ کو اب بھی جینا ہے، اب بھی زندہ رہنا ہے، میری خاطر صرف میرے لیے، میری زندگی میں اور ہے ہی کون صرف آپ کے سوا؟ آپ کے بغیر تو میرے لیے زندگی کا تصور بھی سوہان روح ہے۔“ دل اور نے کہتے ہوئے اپنے دائیں ہاتھ سے ان کی آنکھوں سے آنسو صاف کیے تھے۔ مگر اب ان آنسوؤں کو رستہ مل گیا تھا سو وہ ٹھہر ہی نہیں رہے تھے۔

لیکن بتول شاہ کا یہاں رکنا انگاروں پہ لوٹنے کے برابر تھا اور وہ انگاروں پہ کیسے ٹھہر سکتی تھیں؟ اس لیے وہاں موجود سبھی نے انہیں روکنے کی پوری پوری کوشش کی تھی۔ مگر وہاں رک نہیں سکی تھیں اور دیکھتے دیکھتے ہی وقار آندری کی حالت ایک دم سے ابتر ہو گئی تھی۔ آسیہ آندری اور آذروغیرہ ان کی طرف لپکے تھے اور اوسر عائشہ آندری تھیں جو زہرہ بتول شاہ کے پیچھے انہیں پکارتی ہوئی سیڑھیاں اتر آئی تھیں۔ مگر بتول شاہ کی سماعتوں میں گونجی چیخوں کے سوا انہیں کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ کسی آندھی طوفان کی طرح اسپتال کے احاطے سے باہر نکلی تھیں۔

”زہرہ پلیز۔ روکو تو سہی، مجھے بتاؤ تو سہی کیا ہوا تھا۔ تم کیوں چلی گئی تھیں؟ پلیز زہرہ، خدا کے لیے میری بات تو سنو۔“

عائشہ آندری ان کے پیچھے پیچھے انہیں پکارتی ہوئی آ رہی تھیں اور بتول شاہ اندھا وند تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی پارکنگ میں اپنی گاڑی کی طرف جانے کی بجائے باہر روڈ کی سمت آگئی تھیں۔ ان کا چہرہ جھکا ہوا تھا۔ آنسو زار و قطار بہہ رہے تھے۔ سماعتوں میں اپنی ہی چیخوں کا شور گونج رہا تھا اور سامنے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا کہ وہ اس وقت کہاں ہیں؟ اور کس طرف جا رہی ہیں؟ لیکن پیچھے عائشہ آندری ہانپ گئی تھیں۔ ان کو پکار پکار کر بھک گئی تھیں۔ مگر ہوا وہی تھا جو قسمت میں انل سے لکھ دیا گیا تھا۔ حالانکہ ان کو سڑک کی طرف بھاگتے دیکھ کر گلاب خان بھی گاڑی میں چھوڑ کر ان کے پیچھے بھاگا تھا۔

لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی تھی اور فضا میں ان کی چیخ کی آواز اور ٹاپر چڑھانے کی آواز گونجتی رہ گئی تھی۔ گاڑیوں کے اتنے اثر و ہام میں وہ گاڑیاں آپس میں ٹکراتے ٹکراتے پچی تھیں اور تیسری گاڑی بتول شاہ کو ردندتی ہوئی گزر گئی تھی۔ مگر ہر طرف یکدم سناٹا سا چھا گیا تھا۔

گلاب خان اور عائشہ آندری پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتے رہ گئے تھے۔

وہ اپنے آفس میں بیٹھا بتول شاہ کا نمبر ڈائل کر رہا تھا۔ جب اچانک ہی اس کے ہاتھ سے موبائل چھوٹ کر نیچے کارپسٹیم جا گرا تھا اور اس کے منہ سے بے ساختہ ہی اماں کا لفظ اوا ہوا تھا۔

وہ صبح سے ہی بڑا اپ سیٹ تھا۔ اس لیے موبائل کے یوں ہاتھ سے چھوٹنے پر اور زیادہ مضطرب ہو گیا تھا اور اس نے فوراً ”موبائل اٹھا کر دوبارہ ان کا نمبر ڈائل کیا تھا۔ مگر ان کے نمبر پر کوئی رنگ نہیں جا رہی تھی۔ سو تین بار رٹائی کرنے کے بعد اس نے گلاب خان کے نمبر پر رٹائی کیا تھا۔

اور تین چار مرتبہ رنگ نہ آنے کے بعد گلاب خان نے کال ریسیو کر لی تھی۔ لیکن پیچھے بہت زیادہ شور سنائی دے رہا تھا اور اس شور کے درمیان کھڑا گلاب خان درد رہا تھا۔

”گلاب خان۔ کہاں ہو تم؟ اماں کہاں ہیں؟“ دل اور کو عجیب سی بے چینی ستا رہی تھی۔

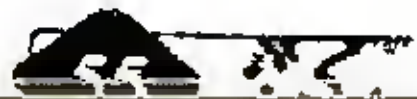
”صاحب۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ بیگم صاحبہ کا ایکسپلیمنٹ ہو گیا ہے۔ صاحب آپ جلدی پہنچو ورنہ دیر ہو جائے گی۔“

گلاب خان نے روتے ہوئے بڑی مشکل سے اسے بتایا تھا اور دل اور یکدم اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی تھیں اور وہ روح تک کانپ گیا تھا۔

”گلاب خان! اماں کو زیادہ چومیں تو ہمیں آئیں؟“ یہ سوال پوچھتے ہوئے اس کی آواز لرز رہی تھی کہ مبادا اسے کچھ اور ہی سننے کو نہ مل جائے۔

”بہت چومیں آئی ہیں صاحب۔ بہت چومیں آئی ہیں۔ بس اللہ سے ان کی زندگی کی خیر مانگیں۔“

گلاب خان دکھ اور اذیت سے جاتے ہوئے بلک رہا تھا اور دل اور کو یوں لگا تھا کہ جیسے اس کے دل و دماغ کا



”ہاں۔ ہاں۔ میں کروں گا ضرور کروں گا۔ آپ کہیں کیا بات ہے؟“ اس نے فوراً اثبات میں سر ہلایا تھا اور ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر اپنے ہونٹوں سے لگایا تھا۔

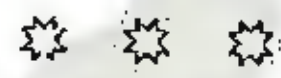
”میں۔ میں۔ نے۔ آج۔ وہ۔ وقار۔ آندری۔ کی حالت۔ دیکھی۔ ہے۔ وہ۔ اپنی سزا۔ اسی۔ دنیا۔ میں۔ بھگت۔ چکا۔ ہے۔ تبت۔ تم۔ اب۔ علیز۔ کو۔ سزا۔ مست۔ ہے۔ میرا۔ خدا۔ گواہ۔ ہے۔ میں۔ نے۔ آج۔ وقار۔ آندری۔ کو معاف کیا۔ معاف کیا میں نے۔“

بتول شاہ کے الفاظ سے عرش فرش کانپ گئے تھے اور دل اور شاہ تو جیسے کھڑے قدم سے ڈھکے گیا تھا۔ اس کی ماں زندگی کی تلخیوں کا آج ایک اور پالہ لی گئی تھی اور وہ زندگی اور موت کے بل صراط پہ جھولتی بتول شاہ کو دیکھ کے رہ گیا تھا۔ دل اور کی سرخ آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے اور وہ انہی آنسوؤں کے درمیان انہیں ہی دیکھتا جا رہا تھا۔

”دیکھو۔ مجھے۔ میری۔ قبر کی۔ ازیت۔ سے آزاد۔ کرو۔ سکون۔ کرو۔ مجھے۔ زری۔ کو۔ تم۔ چھوڑی۔ چکے۔ ہو۔ علیز۔ کو اپنا۔ میری خاطر۔ نکاح۔ کرو۔ اس۔ سے۔ آج۔ ہی۔ ابھی۔ میری۔ نظروں۔ کے سامنے۔ پھر۔ پھر۔ کوئی۔ دکھ۔ کوئی۔ ازیت۔ نہیں۔ رہے گی۔“

نقیات مست سکون میں آجائیں گی۔ اور کچھ نہیں۔ تو میرے ہاتھوں کی لان رکھ لو۔“ انہوں نے انتہائی مشکل سے انک انک کر ٹھہر ٹھہر کر اپنی بات مکمل کی تھی اور بتے آنسوؤں کے ساتھ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے اور دل اور نے تڑپ کر ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے تھے۔ پھر ان کے ہاتھوں کو بڑے ضبط سے تھک کر یک دم پٹا اور آئی سی یو سے باہر نکل گیا تھا اور اسے اس طرح باہر نکلتے دیکھ کر گلاب خان بڑی تیزی سے اس کے قریب آیا تھا۔

”کیا بات ہے صاحب؟ سب ٹھیک تو ہے نا؟ بیگم صاحبہ کیسی ہیں اب؟ زیادہ پریشانی کی بات تو نہیں ہے نا؟“ گلاب خان خاصا تشکر اور پریشان نظر آ رہا تھا۔ کیونکہ دل اور کی حالت ہی کچھ ایسی دکھائی دے رہی تھی۔ ”گلاب خان تم گھر جاؤ۔ اور علیز کے کوئے کر آؤ اسے بتاؤ جا کر کہ میں نکاح کی تیاری کیے بیٹھا ہوں۔“ اس نے جواباً جو کچھ کہا تھا وہ گلاب خان کو حیران پریشان کر دینے کے لیے کافی تھا۔ مگر اس میں اتنی جرات نہیں تھی کہ وہ اس سے کوئی سوال کرتا۔ اس لیے فوراً ”سر جھکا کر حکم کی تعمیل کرنا پلٹ کر چلا گیا تھا۔“



وہ بیسمنٹ کے فرش پہ لگے بستر پہ لیٹی چہرے پہ کلائی رکھے اپنے گھر کی چار دیواری میں موجود اپنے تمام رشتوں کو سوچتی ہوئی ان کے درمیان سانس لے رہی تھی ان کو محسوس کر رہی تھی ان کے ساتھ جی رہی تھی جب اچانک کسی کے قدموں کی آہٹ پہ یک دم چونک سی گئی تھی اور اپنے ہنستے ہنستے گھر کی چار دیواری سے ایک بل میں دل اور شاہ کے بیسمنٹ میں آ پہنچی تھی اور اس نے اپنے چہرے سے کلائی ہٹا کر فوراً ”سامنے دیکھا تھا۔ اس کے سامنے گلاب خان سر اور نظریں جھکائے ہوئے کھڑا تھا اور زبان سے چپ تھا مگر علیز کے کو اس وقت اس کی چپ بھی کافی انہوں ہی چپ لگ رہی تھی کیونکہ گلاب خان کا انداز ہی کچھ ایسا تھا اور اس کے انداز سے ہی علیز کے کی سماعتوں میں عجیب سی خطرے کی گھنٹی بجنے لگی تھی اور وہ یک دم پریشان سی ہو کر اٹھ کے بیٹھ گئی تھی۔

”کیا ہوا ہے گلاب خان؟ سب ٹھیک تو ہے نا؟“ علیز کے اپنے چہرے پر بھی تھکر کے سائے اہرانے لگے تھے۔

”بیگم صاحبہ کا ایک سینٹ ہو گیا ہے۔ وہ صبح سے اسپتال میں ہیں۔ مجھے صاحب نے بھیجا ہے میں آپ کو لینے

”نہیں بیٹا! زندگی میں کوئی بھی ہمیشہ ساتھ نہیں رہتا۔ نہ ماں باپ۔ نہ اولاد۔ اور نہ ہی دوست احباب۔ ایک نہ ایک دن سب ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ لیکن کوئی فرق نہیں پڑتا۔ زندگی پس چلتی ہی رہتی ہے۔“ بتول شاہ کہتے کہتے ذرا دیر کے لیے سانس لینے کو رکھیں۔ ان کی سانس اکٹرنے لگی تھی۔ ”میں جانتی ہوں رشتہ کے حوالے سے تمہارا دامن بالکل کورا ہے بالکل خالی ہے نہ بہن بھائی نہ کزن نہ کوئی اور رشتہ دار۔ کچھ بھی تو نہیں ہے تمہارے پاس۔ تم نے ساری زندگی میرے ساتھ میری طرح تنہا گزار دی زری کو چاہا اور وہ چاہ بھی پوری نہ ہو سکی۔ میرے لیے اس سے بڑی دکھ کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ میرے دل اور کو زری ہی نہ مل سکی۔ وہ زری جس کو میں نے ہزاروں بار دلہن بنے تیرے پہلو میں کھڑے دیکھا ہے۔ ہزاروں بار اسے اپنی دھوکے روپ میں اس کے ہاتھ پہ بوسہ دے کر اپنے سینے سے لگایا ہے اور کل اسی زری کو نیل کا سمجھ کر دل کی بات ہی نہیں کی اور تم کہتے ہو کہ میرے بغیر زندگی کا تصور بھی سوہان رفیع ہے۔ ہو نہ ہو۔ تم زری کے بغیر رہ سکتے ہو تو پھر بتول شاہ کے بغیر بھی رہ سکتے ہو۔ کیونکہ مجھے پتا ہے کہ تمہارا بہت بڑا جگرا ہے۔ تم اپنے دل سے ٹکرا سکتے ہو تو پوری دنیا سے ٹکرا سکتے ہو اور تمہارے ان ہی حوصلوں کو دیکھ کر یہ کہنے کا حوصلہ کیا ہے کہ پلیز علیز سے نکاح کر لو۔ اس کی زندگی داغ دار ہونے سے بچاؤ۔ مجھے سرخرو کرو میری قبر پہ علیز کے کی آہوں کا بوجھ مت ڈالو۔ ورنہ مجھے قبر کا سکون بھی نصیب نہیں ہو گا۔“

بتول شاہ نے بالا خرا سے کہہ ہی دیا تھا۔ مگر تب تک ان کا تنفس تیز ہو چکا تھا اور ان کی سانسوں کی یہ رفتار دیکھ کر نرس نے یک دم تمام ڈاکٹرز کی ٹیم کو الارٹ کر دیا تھا۔

”اماں! آپ ٹھیک تو ہیں نا؟ کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ ادھر میری طرف دیکھیں۔“ ان کی ایسی حالت دیکھ کر دل اور کے چھکے چھوٹ گئے تھے۔ اسے اپنی نظروں کے سامنے زمین و آسمان چکراتے ہوئے نظر آئے تھے۔ ڈاکٹرز نے اس کے ہاتھ سے بتول شاہ کا ہاتھ چھڑا لیا تھا اور دل اور کو لگا جیسے انہوں نے اس کے ہاتھ سے زندگی کا دامن چھڑا لیا ہو۔

”سر پلیز۔ آپ فی الحال تھوڑی دیر کے لیے باہر چلے جائیں؟“ ڈاکٹر کافی پریشانی اور عجلت میں اسے باہر جانے کا کہا تھا۔ مگر دل اور باہر کیسے جاتا۔ اس کا دل بتول شاہ کی طرف کھینچ رہا تھا۔

”آئیے سر! آپ باہر آجائیے۔“ نرس اسے زبردستی چھوڑنے کے لیے باہر دروازے تک آئی تھی اور پھر دروازہ بند کر دیا گیا تھا۔

”شاہ۔“ بتول شاہ نے جیسے تڑپ کے پکارا تھا۔ انہوں نے آئی سی یو سے باہر نکلتے دل اور کی پشت دیکھی تھی اور انہیں بول لگا کہ جیسے وہ ہمیشہ کے لیے ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا ہو۔ اسی لیے وہ تکلیف کے باوجود تڑپا نہیں۔ مگر ڈاکٹرز نے ان کی کنڈیشن کو دیکھنے کے لیے انجکشن دینے شروع کر دیے تھے۔

لیکن وہ اب زندگی کے اس سنگین اسٹیج پر تھیں۔ جہاں ان پہ بے ہوشی اور غنودگی کا انجکشن بھی اثر نہیں کر رہا تھا اور وہ اپنی کراہوں کے درمیان ڈاکٹرز سے التجا کر رہی تھیں۔

”پہ پلیز ڈاکٹر صاحب۔ صرف۔ صرف۔ ایک بار۔ میرے شاہ کو بلا دیں۔ مجھے صرف ایک بار دیکھ لینے دیں۔“ بتول شاہ کی بات سے ڈاکٹر کا دل بھی جیسے دکھ سے بھر گیا تھا اور انہوں نے ساری ٹریٹ منٹ کچھ دیر کے لیے ترک کرتے ہوئے دل اور شاہ کو اندر بلا لیا تھا۔

”اماں! اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟ تکلیف کم ہوئی یا نہیں۔“ وہ لپک کے اس آیا تھا۔

”تکلیف کم ہو سکتی ہے۔ اگر۔ تم۔ کہ۔ تو؟“ بتول شاہ نے ہاتھ اٹھا کر اس کے چہرے کو چھونے کی کوشش کی تھی۔ مگر ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ اس لیے ہاتھ وہیں کا وہیں رہ گیا تھا۔

کے لیے آیا ہوں۔“
گلاب خان اس کے سامنے صاف صاف نہیں کہہ سکا تھا کہ وہ اسے نکاح کے لیے لینے آیا ہے۔
”ڈرائیور کی ماما کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے؟ اور مالی کاؤ؟ یہ تو بہت برا ہوا ہے۔“ علیزے نے اپنا دل تھام لیا تھا۔

اسے واقعی بہت صدمہ ہوا تھا۔ دل اور شاہ بے شک اسے جتنا بھی برا لگتا تھا مگر بول شاہ اسے کبھی بھی نہیں لگی تھیں بلکہ نہ جانے کیا بات تھی کہ علیزے کا ہمیشہ دل چاہتا تھا کہ وہ اس سے بات کریں اور اسے کچھ دیر اپنے پاس اپنے ساتھ بیٹھنے دیں مگر سچویشن ایسی ہوتی تھی کہ اسے کبھی بھی یہ موقع نصیب نہیں ہوا تھا۔ ”برے سے بھی زیادہ برا ہوا ہے بی بی جی لیکن اس وقت زیادہ بات کرنے کا وقت نہیں ہے ورنہ دیر ہو جائے گی۔ آپ جلدی سے میرے ساتھ چلیں۔“

گلاب خان نے اسے پھر چلنے کے لیے کہا تھا اور علیزے ٹھٹھکی گئی تھی۔

”میں چلوں؟ میں؟“ وہ بے یقینی سے پوچھ رہی تھی۔

”جی۔ آپ سید صاحب نے آپ کو ہی بلایا ہے۔“ گلاب خان نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

”لیکن! مجھے کیوں بلایا ہے؟ میرا کیا کام؟“ علیزے کو اتنے مہینوں کے بعد اپنے کہیں جانے کا سن کر سچ بچ یقین نہیں آ رہا تھا۔ یوں جیسے گلاب خان اس کے ساتھ مذاق کر رہا ہو۔

گلاب خان نے اب کی بار اس کے سر پر ہم پھوڑا تھا اور علیزے یک دم ہدک کے رہ گئی تھی۔

”نکاح؟“ اس کے منہ سے ایک اور ناقابل یقین لفظ ادا ہوا تھا۔

”جی ہاں۔ نکاح۔“ گلاب خان اسے بس یقین دلانے جا رہا تھا اور وہ بے یقین ————— ہوتی جا رہی تھی۔

”مگر وہ ڈرائیور کی ماما کا ایکسیڈنٹ؟ وہ تو اسپتال میں ہے؟“ اس نے بات اور عوری بھوڑی تھی۔

”جی! نیگم صاحبہ کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے اور یہ نکاح نیگم صاحبہ کی خواہش پہ ہی ہو رہا ہے اور ہو گا بھی اسپتال میں ہی اس لیے اس وقت آپ کو میرے ساتھ اسپتال ہی چلنا ہے۔“

گلاب خان نے اسے ساری سچویشن بتا دی تھی اور علیزے سن کر چپ کی چپ بت بن گئی تھی۔

آخر اس کے پاس کہنے کے لیے تھا ہی کیا؟ سب کچھ اس مقام پہ آخر ختم ہو گیا تھا۔ اب تو وہ اپنی ذات سے بھی دستبردار ہونے کو تھی۔

لیکن اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اتنی آسانی سے اٹھ کر گلاب خان کے ساتھ چل پڑتی۔ بلکہ اس کا تویہ سوچ کر ہی جسم ٹھنڈا پڑ گیا تھا کہ وہ اپنا آپ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس ”ڈرائیور“ کو سوئپ رہی ہے جو اس کا اس کے باپ کا اور اس کے پورے خاندان کا دشمن ہے اور جس سے علیزے کو خود بے پناہ نفرت ہے جسے وہ دیکھنا بھی نہیں چاہتی جس کو وہ جان سے مار دینا چاہتی ہے۔

لیکن کیا کرتی؟ اس ڈرائیور کے سوا کوئی اس کی عزت بھی تو نہیں دھانپ سکتا تھا۔

اور یہی سوچ کر اس کے قدم زمین سے اٹھے اور آگے بڑھنے لگے تھے اور اس کے پیچھے پیچھے گلاب خان بھی ہسٹنٹ سے باہر آ گیا تھا۔ باہر کھڑی گل اسے دیکھ کر قریب آ گئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں بڑی سی سیاہ رنگ کی ٹیپے جڑی دھاگے کی کڑھالی والی چادر تھی۔ یہ چادر گل نے اپنے میکے سے خاص طور پر علیزے کے لیے منگوائی تھی اور آج علیزے کو نکاح کے لیے جاتے دیکھ کر وہ جلدی سے وہ چادر اٹھالائی تھی۔

”علیزے بی بی! آپ نے کہا تھا جب آپ کو ضرورت ہوگی تو آپ یہ چادر لے لیں گی اور میرا خیال ہے کہ آج

گاڑی سے اترتے ہوئے اس کے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔
اور جسم و جان برف کی مانند سرور پڑ چکے تھے۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ کسی بھی وقت کہیں بھی لڑکھڑا کر گر جائے گی۔ مگر نہ جانے کیسے اور کس طرح وہ اپنے آپ کو سنبھالتی ہوئی گلاب خان کی معیت میں چلتی اندر اسپتال کی راہ داری تک آ گئی تھی۔ جہاں دل اور شاہ زندگی میں پہلی بار فقیرانہ انداز میں لاچار بے بس اور مفلس نظر آ رہا تھا۔ جسے کوئی کر لگ ہی نہیں رہا تھا کہ وہ دل اور شاہ ہے۔

”صاحب جی!“ گلاب خان نے قریب آ کر اسے متوجہ کیا تھا اور دل اور نے اس کی آواز پہ چونک کر اپنے دائیں طرف دیکھا تھا اور گلاب خان کے قریب ہی سیاہ چادر میں لٹی ہوئی علیزے نے بھی اسے ہی دیکھا تھا۔ دونوں کی نظروں کا تصادم ہوا تھا اور دونوں کی نظریں ہی جھک گئی تھیں کیونکہ دونوں ہی بے بس تھے۔ نظریں نہ جھکاتے تو اور کیا کرتے؟ لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ نظروں کے ساتھ ساتھ اپنے اپنے مقام پہ دونوں کی ذات بھی جھک گئی ہے۔ حالات نے انہیں ہرا دیا تھا اور دوبارے ہوئے لوگ زندگی کی جنگ کی شروعات کرنے جا رہے تھے۔

اور اس شروعات سے پہلے اک دوسرے کو دیکھ کر دونوں کے دل میں ہی عجیب عجیب سے ابال اٹھتے تھے مگر یہ وقت وہ نہیں تھا کہ دل میں اٹھنے والے کسی ابال یا کسی درد پہ دھیان دیا جاتا۔ بلکہ یہ وہ وقت تھا جس میں اپنے آپ کو اور اپنی ذات کو بھول جانا ہی بہتر تھا اور ان دونوں نے ایسا ہی کیا تھا۔ بھول گئے تھے سب کچھ۔ سب ہی کچھ۔ گلاب خان۔ اندر آ جاؤ۔ ”دل اور آہنگی سے کہہ کر پلٹ گیا تھا اور گلاب خان اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے علیزے کو اپنے ساتھ لیے اس کے پیچھے ہی آ گیا تھا۔ حالانکہ آئی سی یو میں جانے کی کسی کو بھی اجازت نہیں تھی۔ لیکن محض بول شاہ کی خوشی کی خاطر ڈاکٹرز نے یہ چھوٹ بھی دے دی تھی۔

”آئی۔“ علیزے بے ساختہ تڑپ کر ان کی سمت بڑھی تھی اور انہوں نے اپنی درو سے ٹوٹی ہوئی سانسوں کے درمیان بڑی مشکل بڑی وقت سے پلکیں اٹھا کر علیزے کو دیکھا تھا۔ مگر علیزے کا چہرہ ان کی آنکھوں میں دھندلا گیا تھا ”آئی! یہ سب کیا ہو گا؟ کیوں ہو گیا ہے؟ آپ تو صبح تک بالکل ٹھیک تھیں؟“ علیزے ان کا ہاتھ تھامتے ہوئے روہاسی سی ہو گئی تھی۔

”مم۔ میں۔ نے کہا تھا کہ آج۔ شام۔ تک۔ تمہارے۔ حوالے۔ سے۔ کوئی۔ فیصلہ۔ ہو جائے۔ گا۔ اور۔ دیکھ۔ لو۔ شام۔ بھی۔ ہو گئی۔ ہے۔ اور۔ اور۔ فیصلہ۔ بھی۔“

وہ اپنی آخری سانسوں سے بھی جنگ لڑ رہی تھیں اور علیزے کا دل ڈوب ڈوب گیا تھا۔
”پلیز آئی۔ ایسا مت کہیں۔ آپ کو کچھ نہیں ہو گا۔“ علیزے نے پہلی بار کسی کو تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔

”علیزے۔ میرے۔ دل۔ اور۔ کالے۔ اب۔ اس۔ دنیا۔ میں۔ اور۔ کوئی۔ نہیں۔ ہے۔ تمہارے۔ سوا۔ اس۔ کا۔ ہمیشہ۔ ساتھ۔ نبھانا۔ وہ بھی۔ تمہارا ہی۔ بن کے رہے گا۔ بلکہ۔ اب۔ وہ ہے ہی تمہارا۔ اس نے میری۔ لاج۔ رکھی۔ ہے۔ تمہارے۔ بھی۔ میری۔ بات کی۔ لاج۔ رکھنا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

مجموعہ خاص کیوں نہیں؟

- ☆ ہر ای ٹیک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای ٹیک کا پرنٹ پریویو
- ☆ ہر ایڈسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ سے
- ☆ ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای ٹیک آن لائن پڑھنے
- ☆ کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف
- ☆ سائزوں میں ایڈونٹ
- ☆ ہر ممالک کی ایڈوانس
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور
- ☆ ایٹن صفی کی مکمل رینج
- ☆ ایڈٹری لکس، لکس کو میسے کمانے
- ☆ کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

ڈاؤنلوڈنگ کے لئے ہمیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Likes on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

زندگی کے کسی بھی موڑ پر وہ تمہیں تمہیں چھوڑے گا۔ تمہیں بھی۔ اسے کبھی۔ موت چھوڑنا۔ چاہے زندگی میں کچھ بھی ہو جائے۔

بتول شاہ کا ہاتھ علیزے کے ہاتھ میں تھا اور علیزے کے اپنے ہاتھ کانپ رہے تھے ایسی سنگین اور جان لیوا چیویشن اس نے پہلے کب دیکھی تھی بھلا؟

”آئیے مولوی صاحب! اندر آجائیے۔“ بتول شاہ کے سرہانے کی سائید میں کھڑا دل اور ان کی باتوں کا بوجھ دل پہ لیے مولوی صاحب کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ مولوی صاحب کے ساتھ ایس بی کامران مہدی اور ایک ڈاکٹر صاحب بھی تھے جنہیں اس وقت بطور گواہ بلایا گیا تھا اور وہ بخوشی آگئے تھے۔ مگر افسوس کہ صورت حال بے حد اذیت ناک اور رنج سے بھرپور تھی۔

جو بھی دیکھ رہا تھا اس دکھ کو دل سے محسوس کر رہا تھا۔ خوشی کے یہ لمحات غم کے لہاوے میں لپٹ جائیں گے یہ بھلا کب کسی نے سوچا تھا؟ نہ وقار آفندی نے۔ اور نہ بتول شاہ۔

جس طرح وقار آفندی کو اپنی بیٹی کی شادی دھوم دھام سے کرنے کا شوق تھا۔ اسی طرح بتول شاہ کے دل میں بھی اپنے بیٹے کی شادی کے حوالے سے بہت ارمان تھے۔

مگر اللہ کو کیا منظور تھا؟ یہ کون جانتا تھا بھلا؟ قبولیت کا وقت آیا تو علیزے نے اپنے سامنے کھڑے دل اور کو دیکھا تھا۔ ”ہاں قبول ہے۔“ علیزے نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ اس کا ہاتھ بتول شاہ کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ جیسے وہ اس کی ہمت بندھا رہی ہوں اور بتول شاہ کا ہاتھ دل اور کے ہاتھ میں تھا۔ جیسے وہ ہمیشہ کے لیے انہیں اپنے پاس رکھ لینا چاہتا ہو۔ وہ دونوں آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک دوسرے کو با آسانی دیکھ بھی سکتے تھے۔ مگر دل اور نے پھر بھی اسے ایک بار بھی نہیں دیکھا تھا۔ حالانکہ علیزے نے اسے تین بار دیکھا تھا۔

”ہاں قبول ہے۔“ بتول شاہ نے تیسری دفعہ کہتے ہوئے علیزے کی آنکھوں کے قیدی تیزی سے بازو پھلانگ آئے تھے اور اس کا ضبط کھینچ لیا تھا۔ جس پہ گلاب خان نے آگے بڑھ کے بے حد شفقت سے اور بے حد مان سے اس کے سر پہ ہاتھ رکھ دیا تھا۔

اور جب یہی لمحہ دل اور پہ آیا تو اس کی بھی جیسے پوری کائنات ٹھہر گئی تھی اور دل میں اک لہری اٹھی تھی۔ زری۔ اس کے دل نے بے حد شدت سے پکارا۔ مگر جب اس نے اس پکار پہ یک دم سر اٹھا کر سامنے دیکھا تو سامنے اسے صرف اور صرف علیزے کا چہرہ نظر آیا تھا جو اسے قبول کر چکی تھی اور جس کے ماتھے پہ اب اسی کا نام قسمت بن کر تحریر ہو چکا تھا اور اس چہرے کو دیکھنے کے بعد زری کا چہرہ معدوم سا ہو گیا تھا۔

”آہ۔“ بتول شاہ دل اور کی ہاں کی منتظر تھیں۔ ان کی کراہ اسے واپس کھینچ لائی تھی اور اس نے بتول شاہ کو دیکھتے ہوئے علیزے کو قبول کر لیا تھا اور ساتھ ہی سائن بھی کر دیے تھے۔

”مبارک ہو پیر ستر صاحب! مبارک ہو۔ بہت بہت مبارک ہو۔“ ایس بی کامران مہدی، ڈاکٹر ز اور مولوی صاحب اسے مبارک باد دے رہے تھے۔ مگر دل اور کو بھلا کب ہوش تھا؟ اس کا وہ بیان تو بس بتول شاہ کے ہاتھ کی طرف تھا جو ایک دم سے بے جان سا ہو گیا تھا اور علیزے کا ہاتھ بھی ان کی گرفت سے نکل گیا تھا۔ جس پہ وہ دونوں ہی چونک گئے تھے۔ مگر بتول شاہ کے کلمہ بڑھتے ہوئے سائت ہو چکے تھے اور دل اور کا دل بند ہو گیا تھا۔

”ماں!“ اس نے بڑی مشکل سے اٹھ کر ان کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں تھام کر پکارا تھا۔ مگر وہ کسے جواب دیتیں؟ آخر موت بازی لے گئی تھی اور زندگی چپ چاپ ان کے ہاتھوں میں ہار گئی تھی۔ مات کھا گئی تھی۔

(باقی آئندہ)

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

مہمانوں کیوں ٹھیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ مابانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں ایلوڈنگ
- ✧ سیریم کوالٹی مارل کوالٹی، کپی رایت والی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
- ✧ ایڈ فزبی انکس، انکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر ویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی اپڈیٹنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ٹریڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے نہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہر ویب سائٹ پر آئیں اور ایک لنک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety7

نسیگہ عزیز



بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علی بنو سے تو اپنے بابا کی شخصیت بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیل حیات دہی بہن بھائی ہیں، مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مگر تورپہ رنگ چمکی ہے جس کے پیش نظر فائزہ بیگم، نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں، لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے جس پر نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر اندر چھپ رہا ہے۔

ذریل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے، مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، بے بسی اور مجبور کے اسے تنگ آخر خود کشی کرنے کا سوچتا ہے، لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باؤ اختیار مل جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے جس پر ذریل کافی خوش ہوتا ہے، اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے، وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوس سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل، آذر شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے ذکیوں میں ہوتا ہے، وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے اس نے ر سبھی بار نہیں سیکھا اس کی ماں بٹول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پر بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔

اور زندگی کی اس بات پہ دل اور شاہ تو جیسے پتھر کا ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھ سبدم سے ہو کر ہلو میں آگے سے اور اس کی بے یقینی پتھرائی ہوئی اور پھٹی پھٹی آنکھیں بتول شاہ کے ایکدم سے پرسکون ہو جانے والے چہرے پہ جمی ہوئی تھیں اور وہ دم بخود سا کھڑا بس دیکھتا رہ گیا تھا۔

”دل اور صاحب! آپ باہر آجائیں پلیز۔“ اس کی حالت کے پیش نظر ایس بی کامران ممدی نے تیزی سے اٹھ کر اسے کندھوں سے تھام لیا تھا اور اسے اپنے ساتھ لیے آئی سی یو سے باہر نکل آئے۔

ادھر علیزے بھی ساکت و صامت سی بیٹھی آنکھیں پھیلائے ہوئے بے یقینی سی نظروں سے بتول شاہ کے بے جان جسم کو دیکھ رہی تھی، کیونکہ اسے واقعی یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سے کیا ہوا وعدہ پورا کرنے کے بعد حقیقتاً ”اس دنیا کو خیر باد کہہ چکی ہیں۔“

”علیزے بی بی! آپ بھی باہر آجائیں۔ ڈاکٹر کو اپنا کام کرنے دیں۔“ ڈاکٹر صاحب کے اشارے پہ گلاب خان نے علیزے کو متوجہ کیا تھا اور وہ یکدم چونک گئی تھی۔

”پور آنٹی!؟“ علیزے جیسے باہر جانے کو تیار نہیں تھی۔

”پلیز میم! بس چند منٹ ویٹ کریں، پھر آپ کو ڈیڈ باڈی مل جائے گی، آپ پریشان نہ ہوں۔“ ڈاکٹر نے علیزے کی پریشانی دیکھتے ہوئے خود اسے تسلی دی تھی اور وہ اس تسلی پہ بڑے ضبط سے محض سہلہ کرواں سے اٹھ کر گلاب خان کے ساتھ آئی سی یو کے دروازے تک آگئی تھی، لیکن دروازے تک آکر اس کے دل کو نجات کیا ہوا تھا کہ وہ دوبارہ لپک کر بتول شاہ کے بیڈ کے قریب آئی تھی اور بے اختیار رہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ جھک کر ان کے ماتھے پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ عزت مند عقیقت اور محبت بھرا بوسہ!

”آئی مس یو آنٹی! آئی مس یو! اینٹ! اینٹ! آئی مسکی لو یو۔“ علیزے اپنے جذبات اور محسوسات کو دبا نہیں پائی تھی اور اس کے ایسے اظہار پہ گلاب خان کی آنکھیں بھی بے ساختہ پانی میں بھگ گئی تھیں، البتہ آئی سی یو کے اوپر کھلے دروازے سے نظر آتے اس منظر کو دل اور نے محض خالی خالی نظروں سے دیکھا تھا، مگر کچھ محسوس نہیں کیا تھا۔ کیونکہ وہ واقعی اس وقت اتنے گہرے صدمے سے پتھر کا ہو چکا تھا۔

”علیزے بی بی! گلاب خان نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے اسے ایک بار پھر متوجہ کیا تھا اور علیزے تیزی سے اٹھ کر آئی سی یو سے باہر نکل آئی تھی اور اس کے پیچھے گلاب خان بھی باہر نکل آیا تھا۔



عائشہ آندری نے زہرہ بتول شاہ کا ایکسیڈنٹ اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتے دیکھا تھا۔ وہ شوگر اور بلڈ پریشر کی مریضہ اپنی نظروں کے سامنے ایسا ہولناک منظر دیکھ کر برداشت نہیں کر پائی تھیں اور کھڑے قدم سے تپوڑا کر نیچے زمین پہ آگری تھیں۔ اور محض دوفٹ کے فاصلے سے ان کے پیچھے آنے والے وانیال کے بھی ان کو اس طرح نیچے گرتے دیکھ کر حواس اڑ گئے تھے اور وہ آگے پیچھے کچھ دیکھے بغیر بے ساختہ ان کی طرف بھاگا تھا اور ان کے قریب پہنچ کر ان کو سنبھالنے میں لگ گیا تھا، اس لیے اسے نہیں پتا تھا کہ چند قدم کے فاصلے پہ کس کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے؟ لوگوں کا اتنا ہجوم کیوں جمع ہے؟ اور آخر عائشہ آندری اس طرح اچانک بے ہوش ہو کر کیوں گری ہیں؟ اسے اس وقت بس ان کی فکر ہو رہی تھی، باقی سب کچھ بھول گیا تھا۔ یہ بھی بھول گیا تھا کہ وہ زہرہ آنٹی کے پیچھے اسپتال سے نکلی تھیں تو پھر زہرہ آنٹی کہاں ہیں؟ اور انہیں اچانک کہا ہوا ہے؟

اس کا تو ذہن بس عائشہ آندری کی طرف تھا۔ اس نے انہیں اٹھا کر صرف اسپتال پہنچنے کی کوشش کی تھی ان کی ایسی حالت دیکھ کر اس کے اپنے ہاتھ پیر پھول رہے تھے وہ بڑی ہمت اور بڑی عجلت میں اسپتال پہنچا تھا، جہاں آد

بھی ایسی صورت حال دیکھ کر ایکدم پریشان ہو گیا تھا اور فوراً ”ڈاکٹر کی طرف دوڑا گا دی تھی۔ ڈاکٹر نے وقتاً فوقتاً طور پہ عائشہ آندری کی کنڈیشن دیکھتے ہوئے انہیں اسپتال میں ایڈمٹ کر لیا تھا جس پہ آدرا وانیال اور آسیہ آندری تینوں ہی بے حد پریشان ہوئے تھے کیونکہ ابھی ابھی وقار آندری کی بھی حالت اچانک اتنی بگڑ گئی تھی کہ مجبوراً ”ڈاکٹر کو انہیں نیند کا انجکشن دینا پڑا تھا اور محض چند منٹ میں ہی وہ انتہائی گہری اور پرسکون نیند سو گئے تھے۔ ان کی پریشانی سے نکلے تھے تو عائشہ آندری کی پریشانی نے آگھیرا۔

اسی پریشانی پریشانی کے چکر میں انہیں یہ بھی احساس نہ ہوا کہ آج ان کی علیزے واقعی ان کے لیے ”پرائی“ ہو گئی ہے۔ اتنی پرانی جتنا دل اور شاہ پر لیا تھا۔

وقار آندری کے لیے بھی اور آدرا آندری کے لیے بھی! آج سے ان کا علیزے سے یہ نہ کوئی حق تھا اور نہ کوئی اختیار! اور اس چیز کا اگر انہیں پتا چلتا تو یقیناً ”جیتے جی مرجاتے!“ کیونکہ اصل نکل تو آج ہی ہوا تھا نا؟ اور اس اصل اور نقل کی حقیقت واقعی ماروینے کے لیے کافی تھی۔



نچر کی پہلی اذان ہو رہی تھی جب علیزے اور دل اور شاہ بتول شاہ کی ڈیڈ باڈی لے کر گھر پہنچے تھے اور ان کی ڈیڈ باڈی دیکھتے ہی گل اور زلفی ہچکیوں سے رونے لگے تھے۔

لیکن دل اور کو کچھ احساس نہیں ہو رہا تھا کہ کون رو رہا ہے اور کون نہیں رہا ہے؟ کون چپ ہے اور کون تڑپ رہا ہے؟

خاموشی سے کسی ریموٹ کی طرح ایمو لینس سے اسٹریچر اترا رہا تھا اور اسی ایمو لینس کی آواز پہ آس پاس کے کئی لوگ پریشانی اور تشویش سے گھروں سے باہر نکل آئے تھے اور پھر جس جس کو بھی میر سٹرل اور شاہ کی والدہ ہونے کے ثبوت بتول شاہ کی ڈیڈ باڈی چلا تھا سبھی نے بے حد افسوس کا اظہار کیا تھا اور وہ چپ چاپ سر جھکائے سب کے تعزیتی کلمات سن رہا تھا، حالانکہ سمجھ کچھ بھی نہیں آ رہی تھی کہ وہ سب لوگ کیا کہہ رہے ہیں۔؟ وہ تو بس سن رہا تھا۔ سمجھنے کی صلاحیت نہیں تھی اس میں!۔

اسی لیے اسپتال میں بھی ساری بھاگ دوڑ گلاب خان نے اور ایس بی کامران ممدی نے ہی کی تھی، کیونکہ دل اور تو اس پوزیشن میں تھا ہی نہیں کہ وہ خود یہ ساری بھاگ دوڑ کر پاتا۔ اس لیے اسپتال کی ساری کاغذی کارروائی ایس بی کامران ممدی نے خود مکمل کروائی تھی اور باقی کا چھوٹا مٹوٹا کام گلاب خان نے سنبھال لیا تھا۔

”علیزے بی بی! میرا خیال ہے کہ آپ کا یہاں سب کے سامنے ٹھہرنا مناسب نہیں ہے، آپ فی الحال کمرے میں چلی جائیں، بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔“ گلاب خان نے اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق اسے جو مشورہ دیا تھا وہ اتنا برا بھی نہیں تھا، کیونکہ یہ تو علیزے نے بھی محسوس کیا تھا کہ کئی لوگ اسے بار بار دیکھ رہے تھے اور اسے اس چیز سے الجھن بھی ہو رہی تھی۔

”ٹھیک ہے! میں یہاں سے چلی جاتی ہوں۔“ علیزے نے فوراً اثبات میں سر ہلایا تھا۔

”گل! آجائے علیزے بی بی کو صاحب کے کمرے میں چھوڑ آؤ۔“ گلاب خان نے گل کو آواز دی تھی، لیکن اندر کی سمت پٹی علیزے کے قدم رک گئے تھے۔

”صاحب کے کمرے میں!؟“ علیزے کو بے حس منٹ کی بجائے بیڈ روم کا سن کر حیرت ہوئی تھی اور کچھ عجیب بھی لگا تھا، کیونکہ بیڈ روم جو ”صاحب“ کا تھا۔



”لیکن پھوپھو! آپ کو ہوا کیا تھا؟ آپ اس طرح اچانک بے ہوش کیسے ہو گئیں؟“ ان کے ہوش میں آتے ہی آذر نے انتہائی تشویش بھرے انداز میں سوال کیا تھا اور اس کے اس سوال پہ عائشہ آندھی کی آنکھوں کے سامنے پھر سے وہ منظر تازہ ہو گیا تھا اور وہ بے ساختہ سسک اٹھی تھیں۔

”کیا بات ہے پھوپھو؟ آپ بتا کیوں نہیں رہیں۔؟ کیا ہوا تھا آخر۔۔۔؟“ آذر نے اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے پاس بیٹھتے ہوئے ان کے ہاتھ تھام لیے تھے۔

”مم۔۔۔ میری زہرہ کا ایکسینڈنٹ ہوا تھا اس وقت۔۔۔ وہ میرے آگے آگے روتی ہوئی مجھ سے دور جاری تھی، لیکن پیچھے سے آنے والی گاڑی نے اسے۔۔۔ بے بس۔۔۔ بری طرح کچل دیا تھا۔ اور وہ میری آنکھوں کے سامنے دیکھتے ہی دیکھتے خون میں نہا گئی تھی۔ اور لوگوں کے ہجوم نے اسے گھیر لیا تھا۔ لیکن پھر بتا نہیں کیا ہوا۔؟ اور کیا نہیں۔؟ مجھے تو کچھ خبر نہیں ہوئی۔“ عائشہ آندھی بتاتے ہوئے رو رہی تھیں جبکہ آذر دانیال ششدر سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے تھے۔

”زہرہ آئی کا ایکسینڈنٹ ہو گیا تھا۔۔۔؟ وہ مالی گاڑی۔۔۔ ہم لوگوں کو بتا بھی نہیں چلا۔۔۔؟“ آذر نے پریشانی سے سر تھام لیا تھا اور کچھ ایسا ہی حال دانیال کا بھی ہوا تھا۔

”ہمیں کبھی بھی وقت پر کچھ بھی پتا نہیں چلا۔ ہم ہمیشہ ہاتھ پہ ہاتھ دھڑے بیٹھے رہتے ہیں۔“ عائشہ آندھی کا لہجہ ایک دم جیسے رخ سا ہو گیا تھا ان کے اندر شدید دکھ اور آنسوؤں کا ابال سا اٹھ رہا تھا اور وہ انتہائی اونچی اونچی آواز میں تڑپ تڑپ کر رونا چاہ رہی تھیں مگر یہ اسپتال تھا اور یہاں وہ اپنی یہ بے بس سی خواہش پوری نہیں کر سکتی تھیں، انہیں ہمیشہ کی طرح آج بھی صبر و ضبط سے ہی کام لینا تھا۔

”پلیز! آپ۔۔۔ آپ پریشان نہ ہوں پھوپھو۔ میں ابھی پتا کروا تا ہوں کہ کل اس روڈ پہ جس خاتون کا ایکسینڈنٹ ہوا ہے وہ کہاں ہیں؟ اور کس اسپتال میں ہیں؟ میں کوشش کرتا ہوں کہ ساری انفارمیشن مل جائے۔ بس آپ تھوڑا انتظار کریں۔“ آذر ان کا ہاتھ تھپکتے ہوئے فوراً ”ہاں سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”کہاں جا رہے ہو۔؟“ دانیال نے اسے اٹھتے دیکھ کر بے ساختہ پوچھا تھا۔

”مبارک خان کی طرف جا رہا ہوں۔ اسے بھیجتا ہوں اس پاس سے کچھ پتا کرنے کے لیے۔ تمہیں پتا ہے نا اسی روڈ پہ تین چار اور اسپتال بھی ہیں شاید انہیں وہاں ایڈمنٹ کروا دیا گیا ہو۔؟“ آذر اپنے قیاس کا گھوڑا دوڑاتے ہوئے واقعی زہرہ آئی کے ایکسینڈنٹ کے متعلق تمام معلومات لینے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔

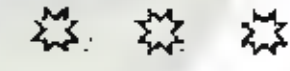
”ہوں۔! ٹھیک ہے جائف۔ لیکن خود کہیں مت جانا۔ تمہیں پتا ہے گاڈیڈ کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے اور ادھر امی بھی بیمار ہیں۔؟“ دانیال نے اسے تاکید کی تھی اور آذر جواباً ”سرہلا کر باہر نکل گیا تھا۔ اور دانیال گردن موڑتے ہوئے دوبارہ عائشہ آندھی کی سمت متوجہ ہو گیا تھا کیونکہ وہ ابھی تک رو رہی تھیں۔

”امی پلیز! کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ اور کتنا روئیں گی آپ؟ اس طرح تو آپ کی طبیعت اور زیادہ خراب ہوگی۔ پلیز! سننا لیں اپنے آپ کو ان شاء اللہ زہرہ آئی کے بارے میں ابھی پتا چل جائے گا۔“ دانیال نے انہیں تسلی دی تھی مگر عائشہ آندھی کو اک عمر ہو گئی تھی ان تسلیوں پہ جیتے ہوئے۔ آخر اور کتنا صبر کرتیں۔۔۔؟

”کب پتا چلے گا اور کس کس چیز کا پتا چلے گا؟ مجھے تو آج تک یہ پتا نہیں چلا کہ زہرہ مجھ سے دور کیوں ہو گئی تھی؟ اس نے پلٹ کر کبھی خبر کیوں نہیں لی؟ اگر مجھ سے خفا ہے تو کیوں خفا ہے؟ وہ میری آواز کیوں نہیں سنتی؟ وہ مجھ سے دور کیوں بھاگتی ہے؟ ایسا کیا ہے اس کے دل میں جس کا مجھے پتا نہیں ہے؟ آخر ایسا کیا ہے دانیال۔۔۔؟“ وہ کہتے

”جی! بی بی جی۔! اب آپ اس گھر کی اور صاحب کے بیڈ روم کی مالک ہیں اور میں اس گھر کی مالک نہیں ہوں۔! میں سسٹنٹ میں بیچنے کی گستاخی تو نہیں کر سکتا نا؟ لہذا اب آپ کی جگہ صاحب کے بیڈ روم میں ہے اس لیے اب آپ کو وہیں جانا ہوگا۔“ گلاب خان نے اسے ذرا گہرائی میں جا کر سمجھانے کی کوشش کی تھی مگر وہ پھر بھی تذبذب کا شکار تھی اس کا دل اور شاہ کے بیڈ روم میں جانے کو۔ نہیں چاہ رہا تھا اور نہ ہی حوصلہ بڑھ رہا تھا۔

”دیکھیے بی بی جی۔! آپ خود سیانی ہیں۔ خود سمجھ سکتی ہیں۔ کہ پہلے کی بات اور تھی اور اب کی بات اور ہے پہلے وہ آپ کے لیے غیر بھی تھے اور نا محرم بھی، لیکن اب وہ آپ کے مالک بھی ہیں اور محرم بھی اب آپ ان کی عزت ہیں اور ان کی عزت ہونے کے ناطے آپ کا وہی مقام ہے جو میں آپ کو بتا رہا ہوں اور یقیناً آپ سمجھ بھی گئی ہوں گی۔“ گلاب خان نے اسے سمجھانے کی خاطر پھر ایک دلیل دی تھی اور وقت کچھ ایسا تھا کہ مجبوراً علیزے کو سمجھنا ہی پڑا تھا اور جب چپ گل کے ساتھ اندر کی طرف قدم بڑھا دیے تھے پھر یہ گلاب خان ہی تھا جس نے نبیل اور عبداللہ کو فون کر کے یہ ہولناک خبر سنائی تھی اور وہ دونوں گہری اور پرسکون نیند سے تڑپ کر اٹھے تھے بلکہ ان کے تو کانوں سے دھواں نکل گیا تھا وہ دونوں ششدر رہ گئے تھے انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایکسینڈنٹ میں اتنا کچھ ہو گیا ہے اور انہیں خبر بھی نہیں ہوئی۔؟



بتول شاہ کی وفات کی خبر نبیل اور عبداللہ کی فیملی پہ بھی کسی دم کی طرح گری تھی۔ فائزہ بیگم مدیحہ، مومنہ بی بی نگارش اور زری کے ساتھ ساتھ الیکٹریشنز کی آنکھیں بھی بتول شاہ کی ناگہانی موت پہ اشکبار تھیں بلکہ یہاں تک کہ نبیل اور عبداللہ بھی خوب اختیار نہیں رکھ سکے تھے ان کی آنکھوں سے بھی آنسو چھلک آئے تھے اور دل اور کو مضبوط بازوؤں کے گھیرے میں سے لے کر دونوں ہی رو پڑے تھے۔ کیونکہ بتول شاہ کی اچانک موت کا وہ انہیں دل اور سے بھی زیادہ محسوس ہو رہا تھا اور لہجہ بہ لہجہ دیکھی کر رہا تھا۔ مگر دل اور تھا کہ ہنوز پتھر بنا بیٹھا تھا۔!

اس کی آنکھ سے تو ایک بھی اشک نہیں ٹپکا تھا۔! وہ آخر پتھر ہو چکا تھا اور پتھر سے اشک کیسے ٹپکتا۔؟ اس کے سامنے سب ہی روئے تھے مگر وہ خود کسی کے بھی سامنے نہیں رو رہا تھا۔! لیکن اس کے آنسو کہاں گر رہے تھے یہ بات سمجھ جانتے تھے۔

سب کو معلوم تھا کہ غم کی شدت نے اسے پتھر کے رکھ دیا ہے۔ اسی لیے تو ان سب کو زیادہ دکھ ہو رہا تھا۔ مگر سب اس کے اس دکھ کو کم بھی تو نہیں کر سکتے تھے نا۔؟

حالانکہ دل اور شاہ کے اس دکھ میں پورا شہر برابر کا شریک تھا اس کے تمام کولیگز سب جاننے والے اور تمام دوست احباب یہ خبر سننے ہی انظار تحریرت کے لیے پہنچ گئے تھے اور اتنے سارے لوگوں کو دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے واقعی پورا شہر وہاں جمع ہو گیا ہو۔ مگر دل اور کی نظر سے کوئی دیکھتا تو احساس ہو تا کہ وہاں کوئی بھی نہیں ہے۔ بس اتنے سارے لوگوں میں وہ اکیلا ہے۔ تنہا ہے۔ کوئی اپنا نہیں ہے۔ سب پرانے ہیں۔ سب غیر ہیں۔

سب دعا سلام کے سا بھی ہیں۔! اس دنیا میں اس کا صرف ایک خون کا رشتہ تھا اور آج وہ بھی ختم ہو گیا تھا اور اسی ایک رشتے کے ختم ہونے کے غم نے اسے بت بنا دیا تھا اور وہ حقیقتاً ”کسی بت کی مانند جوں کا توں بس ایک ہی جگہ پہ بیٹھا ہوا تھا۔

کتنے یکدم ہچکیوں سے رو پڑی تھیں اور دانیال نے انہیں اپنے بازو کے گھیرے میں لے کر ان کا کندھا سہلایا تھا۔
آج خاصی بڑھ چلا ہو رہی تھیں۔

نہ غلاؤں میں مجھے ڈھونڈ تو نہ ہی مقبروں میں تلاش کر
جو سجے ہوئے ہیں صلیب پر مجھے ان سروں میں تلاش کر
یہ الگ کہ خواہش زر نہیں، میرا گھر نہیں، میرا در نہیں
یہ تو نگری، یہ سکندری، میری ٹھوکروں میں تلاش کر
وہ جو ایک کالج کا شخص تھا اسے موسموں نے بدل دیا
اسے آئینوں میں نہ ڈھونڈ تو اسے پتھروں میں تلاش کر
ذرا سا جھک کر بتول شاہ کے جنازے کو کندھے پر اٹھاتے ہوئے دل اور شاہ کے دل میں اک ہو کر سی اٹھی تھی
اور پھر اس نے قدم باہر کی سمت بڑھا دیے تھے اس کے ساتھ بتول شاہ کے جنازے کو کندھا دینے والوں میں نہ
حیات، ملک عبداللہ اور عدیل عمر شازی سرفہرست تھے۔ بتول شاہ کی سرخ پھولوں سے سجی ڈولی کے چاروں پاس
انہوں نے اپنے کندھوں پر تھام رکھے تھے۔ اور آہستہ آہستہ باہر کی سمت بڑھ رہے تھے۔
شام گہری ہو چکی تھی اور مغرب کی نماز کے بعد تدفین کا وقت تھا۔ اس لیے مغرب کی نماز ادا کرتے ہی لو
بتول شاہ کی نماز جنازہ کے لیے جمع ہوتے گئے تھے لہذا اب ذرا دیر کے لیے بھی ٹھہرنا بہت مشکل تھا حالانکہ دل
آدھ کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ گھر سے باہر قدم بھی رکھے۔ لیکن کیا کر سکتا تھا آخر؟ انہیں روک بھی تو
سکتا تھا نہ؟

”ہاں! وہ بے ساختہ نہ چاہتے ہوئے بھی انہیں پکار بیٹھا تھا اور وہ بیڑھیاں اترتے اترتے ٹھہر گئی تھیں۔
”ہاں! کو؟“ وہ یونسی رینگ پہ ہاتھ رکھے ہوئے اس کی سمت مڑی تھیں اور وہ اپنے بیڑوم کے دروازے
چو کھٹ میں کھڑا تھا۔

”میں آ جاؤں آپ کے ساتھ؟“ اچانک ہی اس کا دل ان کے ساتھ جانے کو چاہا تھا۔
”ارے نہیں میری جان! تم ابھی آفس جا کر اپنے کلائنٹس سے ملو، پھر بعد میں آ جانا۔“
”لیکن اماں! میرا دل بہت ادا ہے میں آپ کے ساتھ جانا چاہتا ہوں، باقی کرنا چاہتا ہوں، کلائنٹس سے
پھر مل لوں گا۔“ دل آور نے بچوں کی طرح ان کے ساتھ جانے کی ضد کی تھی۔

”بری بات بیٹا! کام میں کوئی کام نہیں کرتے۔ کلائنٹ بھی آخر مجبور ہوتے ہیں اور تم تو وقت یہ کام کرنے
عادی ہو۔ یہ سستی تمہیں سوٹ نہیں کرتی۔ شایاں تم آفس جاؤ۔ پھر وہاں سے اسپتال آ جانا۔“ وہ کہہ کر اس کو
نری سے دیکھتی ہوئی پلٹ کر بیڑھیاں اتر گئی تھیں اور دل اور ایک بار پھر لپک کر بیڑھیوں کی رینگ کے قریب
آیا تھا۔

”آپ جا رہی ہیں؟“ اس نے عجیب بے کل سے انداز میں بے تکا سا سوال کیا تھا۔ اور بتول شاہ راہداری
سمت بڑھتے بڑھتے ایک بار پھر رک گئی تھیں اور سر اٹھا کر بیڑھیوں کی رینگ کے قریب کھڑے دل اور کوہ
تھا۔

”ہاں! جا رہی ہوں۔ کیوں؟ کوئی کام ہے کیا؟“ انہوں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔
”ہاں! کام تو بہت سے ہیں، مگر فی الحال آپ سے یہی پوچھنا تھا کہ آپ نے ناشتا کیا ہے یا نہیں؟“ اس نے

دھبے مگر سنجیدہ انداز میں پوچھا تھا اور بتول شاہ اس کی اس قدر فکر مند رہی تھی کہ دیکھ کے رہ گئی تھیں۔
 ”نہیں! میں نے ناشتا نہیں کیا۔ صرف ایک کپ چائے کا لیا ہے، لیکن ڈونٹ ڈری، لیج ایک ساتھ ہی کریں گے اور کے؟“ انہوں نے اسے مطمئن کرنے کے لیے بہلایا تھا۔
 ”ہوں! ٹھیک ہے میں بھی ناشتا نہیں کرتا، لیکن ڈونٹ ڈری، لیج ایک ساتھ ہی کریں گے۔ اور کے؟“ اس نے بھی جواباً انہی کے سے انداز میں جواب دیا تھا جس سے بتول شاہ نے اسے خفگی سے گھورا تھا۔
 ”شاہ! یہ کیا ضد لگا رکھی ہے تم نے؟ مجھے جانے دو گئے یا نہیں؟“ وہ کافی خفگی سے بولی تھیں اور دل اور کوزرا دیر کے لیے سنبھلنا پڑا تھا۔ ورنہ وہ اس پر غصہ بھی ہو سکتی تھیں۔

”اور کے! اب کچھ نہیں کہتا جائیں آپ۔“ اس نے ان کے جانے کے لیے رضامندی دے دی تھی۔
 ”نیچے آکر ناشتا کرو اور آفس جاؤ اللہ حافظ۔“ وہ پھر اسے خدا حافظ کہہ کر آگے بڑھ گئی تھیں اور دل اور پھر سے مضطرب ہوا تھا۔ اس کا دل پھر سے ان کے پیچھے لپکنے کو چاہا تھا اور اس نے پھر سے اس چاہ کو پورا کیا تھا۔
 ”اماں! دل اور کے ہونٹ بے ساختہ ذرا سے کپکپاتے تھے اور دل پہ جیسے کرپا کا عالم چھا گیا تھا۔ کیونکہ گھر کے گیٹ سے باہر قدم رکھتے ہی اس کا دل دھاڑیں مار مار کے رویا تھا اور اوھر علیزے کا بھی یہی حال تھا۔ وہ بھی بہت تڑپی تھی۔ اس نے آخری بار بتول شاہ سے ملنے کی اور ان کا چہرہ دیکھنے کی بہت کوشش کی تھی۔ مگر اس کی اس کوشش کے آڑے گل آگئی تھی۔ اس نے اسے باہر نکلنے سے روک دیا تھا۔
 ”نہیں بی بی جی! آپ کا اس طرح سب کے سامنے باہر جانا ٹھیک نہیں ہے۔ پہلے ہی گھر پہ قیامت ٹوٹی ہوئی ہے۔ اب آپ سب کے سامنے جائیں گی تو سب طرح طرح کے سوال کریں گے اور صاحب تو پہلے ہی بہت پریشان ہیں۔ کس کس کو جواب دیں گے؟“ گل نے خود بھی سمجھ داری سے کام لیتے ہوئے اسے بھی سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

”لیکن گل وہ وہ جارہی ہیں۔ میں۔ میں ان سے پھر کبھی نہیں مل سکوں گی۔ پلیز۔ مجھے ایک ماں۔ صرف ایک بار ان سے مل لینے دو۔ میں چادر اوڑھ لیتی ہوں۔ چہرہ دھانپ لیتی ہوں۔ مجھے کوئی نہیں دیکھے گا۔ کسی کو کچھ پتا نہیں چلے گا۔ پلیز گل۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔“ علیزے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے ایک بار پھر تڑپی تھی۔ کیونکہ سب مرد حضرات جنازہ لے کر گیٹ سے باہر نکل چکے تھے۔ لیکن کچھ عورتیں کچھ لڑکیاں تھیں جو گیٹ کے قریب کھڑی ابھی ابھی بھی رو رہی تھیں۔ علیزے کے لیے بے شک وہ سب انجان چہرے تھے۔ لیکن گل انہیں اچھی طرح جانتی تھی۔ اسی لیے وہ نارمل تھی۔

”بی بی جی! میں سب سمجھتی ہوں۔ بس آپ کے سمجھنے کی ضرورت ہے اور دیے بھی اب وہ لوگ جا چکے ہیں۔ آپ اپنے آپ کو اس طرح ہلکان مت کریں۔ آپ آرام کریں میں باہر جا رہی ہوں۔ ابھی مہمانوں کو بھی دیکھنا ہے۔ آپ کے پاس بعد میں آؤں گی اللہ حافظ۔“ گل اسے کندھوں سے تھام کے بیڈ پہ بٹھاتی ہوئی باہر نکل گئی تھی اور اس کمرے میں اکیلی رہ جانے والی علیزے بے ساختہ اپنی بے بسی پہ پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی تھی۔



مبارک خان کافی جگہوں سے پتا کر کے آیا تھا۔ مگر ذہرہ آنٹی کے بارے میں کہیں سے کچھ پتا نہیں چلا تھا۔ جس پر آذر کو بہت مایوسی اور خفگی ہوئی تھی اور ابھی وہ خود کہیں جا کر پتا کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ ڈاکٹر نے وقار آندہ کو ڈسچارج کرنے کے بعد گھر جانے کا مشورہ دے دیا تھا اور آسیہ آندہ فوراً گھر جانے کے لیے تیار ہو گئی تھیں۔ آخر وہ بھی اتنے دنوں سے اسپتال میں رت جگامٹانے کے ساتھ ساتھ قید کاٹ رہی تھیں۔ اس لیے

ان کو دیکھتے ہوئے مجبوراً ”آذر کو بھی گھر جانے کے لیے تیار ہونا پڑا تھا۔
 ”مبارک خان تم گاڑی نکالو ہم ڈیڈ کو لے کر آتے ہیں۔“ آذر مبارک خان سے کہہ کر وقار آندہ کے روم کی طرف بڑھا تھا۔ لیکن دو قدم آگے بڑھنے کے بعد دوبارہ مبارک خان کی سمت پلٹا تھا۔
 ”مبارک خان! اس نے واپس مڑتے مبارک خان کو آواز دی تھی۔
 ”کیا بات ہے؟ تم کچھ پریشان لگ رہے ہو؟“ آذر کی سرسری نظر نے بھی بڑا گہرا کام کیا تھا۔
 ”نہیں صاحب! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ مبارک خان نے آہستگی سے نفی میں گردن ہلائی تھی۔ مگر آذر سمجھ گیا تھا کہ وہ محض اسے ٹالنے کے لیے ایسا کہہ رہا ہے۔

”ایسی بات ہے مبارک خان! کیونکہ میں نے پہلے کبھی بھی تمہارے چہرے پر ایسی پریشانی نہیں دیکھی۔ ہاں تمہارا نہ چاہو تو یہ اور بات ہے۔“ آذر واقعی مبارک خان کے چہرے کی پریشانی کو ٹھیک پہچانتا تھا۔
 ”نہیں صاحب! اب آپ سے کیا پردہ بھلا! بس گھر میں بیوی اور بچے دونوں کی طبیعت خراب ہے۔ وہ مجھے ایک دو دن کے لیے گھر بلا رہے تھے۔ لیکن میں نے انکار کر دیا ہے کہ جب تک صاحب ٹھیک نہیں ہو جاتے۔ میں بھلا کیسے جا سکتا ہوں۔ اس لیے میں ان کی طرف سے تھوڑا پریشان تھا۔ ورنہ اور تو کوئی بات نہیں ہے۔“ مبارک خان کو بالا خرچ بتائی پڑا تھا اور آذر اس کی پریشانی سن کر چپ ہو گیا تھا۔

”ہوں! ٹھیک ہے۔ ابھی تو گھر چلو۔ پھر دیکھتے ہیں کہ کیا ہوتا ہے۔“ آذر آہستگی سے اور پُرسوج سے لہجہ میں کہتا ہوا دوبارہ پلٹ گیا تھا۔ حالانکہ آذر ابھی بھی اس کی بات پہ مطمئن نہیں ہوا تھا۔
 مگر اس وقت صورت حال ہی کچھ ایسی تھی کہ وہ زیادہ پوچھ پڑتال یا پھر کرید نہیں سکتا تھا۔ اسی لیے وقتی طور پر اس بات کو نظر انداز کر دیا تھا اور پھر کچھ دیر بعد وقار آندہ کو ساتھ لے کر واپس بڑی حویلی آگئے تھے۔

”اماں! پاپا! آپ آگئے۔“ عون اور عدید ان کو دیکھتے ہی لپک کر ان سے لپٹ گئے تھے۔
 ”ہاں میری جان! اہم آگئے ہیں۔ ہم بہت مس کر رہے تھے تم دونوں کو۔“
 آسیہ آندہ نے ان دونوں کو لپٹا کر باری باری ان کے ماتھے پر باریک کیا تھا۔
 ”پاپا! وہ کیسے ہیں اب؟“ عدید کا پوچھتے ہوئے لہجہ بھی گلو گیر ہو گیا تھا۔
 ”لے پاپا! سے خود پوچھ لو نا وہ کیسے ہیں؟“ آسیہ آندہ نے اس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے اسے اشارہ کیا تھا اور عدید ان کے اشارے پر سر ہلا کر فوراً ”وقار آندہ کے بیڈ کی طرف بڑھ گیا تھا اور بیڈ کی دوسری سائیڈ پہ عون چا کر کھڑا ہو گیا تھا، لیکن وقار آندہ کل سے نجانے کیوں اتنے ساکت و صامت سے ہو گئے تھے کہ انہیں اب اپنے آپ کو پاس کا بھی احساس نہیں رہا تھا کہ ان کے پاس کون ہے اور کون نہیں ہے؟

کیا کہہ رہا ہے اور کیا نہیں کہہ رہا؟
 وہ کہاں ہیں اور کہاں نہیں ہیں؟
 ان کے توجہ دل دماغ میں بس اپنی ادھوری معافی اور پوری زندگی کا سین گھوم رہا تھا۔
 اور تو کچھ سنا لی دے رہا تھا اور نہ دکھائی۔

بس صرف اور صرف ذہرہ بتول شاہ کا چہرہ تھا جو ساری دنیا پہ نقش ہو گیا تھا اور اس چہرے کے سوا ساری دنیا مٹ گئی تھی۔ بیوی، بچے، بہن بھائی، سب رشتے بھول گئے تھے سب رشتے پیچھے چلے گئے تھے۔ بس اب تو ذہرہ بتول شاہ یاد تھی۔ یا پھر خدا یاد تھا! جن کی نظروں میں وہ گناہ گار تھے اور جن سے انہوں نے معافی مانگنی تھی اور معافی نہیں ملے گی۔ یہ بھی انہیں

یقین تھا اور اسی یقین نے تو انہیں مزید جامد کر دیا تھا۔



مجھے جو بھی ملا فقط ذات خدا سے ملا۔

اے ماں خدا سے جو بھی ملا فقط تیری دعا سے ملا۔

بتول شاہ کی قبر پر مٹی ڈالتے ہوئے اس کا دل رو رہا تھا اور ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ آج اس کے سب خون کے رشتے دھن ہو چکے تھے۔ مٹی میں مل گئے تھے۔ خاک کے ساتھ خاک ہو گئے تھے اور وہ دیکھتا رہ گیا تھا۔ سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ سب ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ وہ تقدیر کے آگے ڈٹ نہیں سکا تھا اور تقدیر سب کچھ ہما کے اپنے ساتھ لے گئی تھی اور اسے تنہا کر گئی تھی۔

”دل آورے۔“ نبیل نے نیچے زمین پر دو زانو بیٹھے دل آور کے کندھے پر اپنا مضبوط ہاتھ جماتے ہوئے اسے متوجہ کیا تھا۔

”اٹھو! گھر چلو تمہیں پتا ہے نا تمہارے ایسے حال۔“ آنٹی کو کتنی تکلیف ہوگی۔ کیا تم انہیں اور تکلیف دینا چاہتے ہو؟“ نبیل نے اسے ذرا نرمی سے سہلانے کی کوشش کی تھی مگر اس کا ہلنا آسان کب تھا بھلا۔

”تم گاڑی نکالو میں اسے لے کر آتا ہوں۔“ عبد اللہ نے نبیل کو اشارہ کیا تھا اور نبیل سر ہلا کر لپٹ گیا تھا۔ ”دل آورے! اٹھو میرے ساتھ گھر چلو تم جانتے ہو نا گھر پہ کتنے مہمان آئے ہوئے ہیں، کتنی دور دور سے مہمان آئے ہیں ان کو کھانا بھی تو کھانا ہے یا پھر بونہی بھوکا بھیج دو گے سب کو؟“ عبد اللہ نے نرمی کی بجائے ذرا سنجیدگی سے پوچھا تھا اور یہ سنجیدگی دل آور کے دماغ پہ جا کے لگی تھی۔

وہ بھلا اپنی ماں کی موت کے افسوس کے لیے آئے مہمانوں کو بھوکا کیسے بھیج سکتا تھا؟ نبیل اور عبد اللہ نے کراچی سے آتے ہی پہلا انتظام یہی کیا تھا مہمانوں کے لیے کھانا آرڈر کیا تھا اور اب سب مہمانوں کو کھانا کھلانے کا وقت تھا کیونکہ سب جنازہ بڑھ چکے تھے۔ اس لیے ان لوگوں کا ذرا جلدی گھر پہنچنا ضروری تھا۔ اور یہی بات سوچتے ہوئے بالا خرو دل آور کو اٹھنا ہی پڑا تھا اور جب چاہ ان کے ساتھ چل پڑا تھا۔

”دل آور صاحب! اب ہمیں بھی اجازت دیجئے ہم بھی چلتے ہیں نا تم بھی کافی ہو گیا ہے حالانکہ آپ کو اس دکھ کے وقت میں چھوڑ کر جانے کو دل تو نہیں چاہ رہا لیکن مجبوری ہے کسی خاص جگہ پر ریڈ کا پلان ہے اس لیے پہنچنا ضروری ہے۔“ ایس پی کامران مہدی قبرستان کے باہر ہی اپنی گاڑی کے قریب کھڑا انتظار کر رہا تھا اور دل آور کو عبد اللہ کے ساتھ قبرستان سے باہر نکلتے دیکھ کر فوراً اس کے قریب آیا۔

”لیکن ایس پی صاحب! آپ کھانا کھائے بغیر کیسے جاسکتے ہیں؟ صبح سے آپ ہمارے ساتھ ایسے ہی گھوم رہے ہیں۔“ عبد اللہ نے ایس پی کامران مہدی کو روکنا چاہا تھا لیکن ایس پی کامران مہدی کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا وہ دل آور اور عبد اللہ سے ہاتھ ملا کر وہاں سے رخصت ہو گیا تھا اور وہ لوگ وہاں سے گھر آ گئے تھے۔

گھر میں اور بھی بہت سے مہمان تھے عبد اللہ اور نبیل کے ساتھ ساتھ عدیل اور شہیار بھی مہمانوں کی خاطر تواضع میں لگ گئے تھے اور دل آور بس سب کو چپ چاپ دیکھ رہا تھا۔

”بھائی! مدحیہ دل آور کو یوں چپ اور عذرا حال سے انداز میں بیٹھے دیکھ کر اس کے قریب آگئی تھی اور دل آور نے محض اسے سراٹھا کر دیکھا تھا اور پھر دوبارہ سر جھکا کر بیٹھ گیا تھا جس پہ مدحیہ کے دل میں عجیب سا بالالٹا تھا اور وہ بے ساختہ صوفیہ اس کے برابر بیٹھ گئی تھی۔

”آپ۔ آپ کچھ بول کیوں نہیں رہے؟ آپ کیوں اتنے چپ ہو گئے ہیں؟ کیا صرف آپ کو ماما کا غم ہے؟ کیا

ہمیں ان کا کوئی غم نہیں ہے؟ کیا وہ میری ماما نہیں ہیں؟ آپ تو ان کے آخری وقت میں بھی ان کے ساتھ تھے ان کے پاس تھے، لیکن مجھے سمجھے تو ان سے بات کرنا بھی نصیب نہیں ہوا۔ آپ سے زیادہ دکھ تو مجھے ہو رہا ہے میں کیا کروں آخر آپ کی طرح چپ اور دکھ کے بیٹھ جاؤں؟ نہ بولوں نہ روؤں نہ دیکھوں نہ سنوں کیا کروں آخر؟ آپ بتائیے۔ کیا کرنا چاہیے مجھے؟“

مدحیہ نے رو ہانے کی بجائے کتے ہوئے دل آور کا کندھا ہلایا تھا اور دل آور نے آہستگی سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا تھا اور بونہی سر جھکائے بیٹھا آہستہ آہستہ اس کا ہاتھ تھپکنے لگا تھا جیسے اسے سلی دے رہا ہو، لیکن زبان سے پھر بھی کچھ نہیں کہا تھا۔

کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ ابھی کچھ کہنے کے لیے لب کھولے گا تو اس کے سارے ضبط ٹوٹ جائیں گے اور سارے حوصلے بکھر جائیں گے اور پھر وہ سب کی لاکھ کوششوں سے بھی سمٹ نہیں سکے گا۔ اس لیے بستی اسی میں تھی کہ وہ اپنے صبر و ضبط پہ قائم رہتا اور اپنے حوصلے بکھرنے نہ دیتا اور سب اس سوچ پہ دنگ تھے کہ وہ بکھرا کیوں نہیں؟ اور وہ ٹوٹا کیوں نہیں؟ آخر یہ غم کی انتہا تھی یا پھر غم کے بعد صبر کی انتہا تھی کہ اس نے اپنی زبان کے لفظ اور آنکھوں کے آنسو پتھر کر دیے تھے اس کی زبان سے نہ لفظ نکلے تھے اور نہ آنکھ سے آنسو!

بس سب کچھ بے حس اور جامد ہو چکا تھا سب کی کوشش تھی کہ اس کی چپ کو توڑا جائے۔ ”بھائی! کیا آپ نے اب بھی نہیں بولنا کیا اب بھی کچھ نہیں کہنا؟ کیا میری خاطر بھی نہیں؟“ مدحیہ کے کتے کتے آنسو بہہ نکلے تھے اور دل آور نے گردن موڑ کر ایک بار پھر اپنے بائیں پہلو میں بیٹھی سسکیوں سے روتی مدحیہ کی طرف دیکھا تھا وہ صبح سے مسلسل رو رہا تھا حال ہو چکی تھی اور چہرہ بھی کافی مرجھایا ہوا سا لگ رہا تھا جسے دیکھ کر دل آور کا دل بھی پکھل گیا تھا وہ واقعی اس وقت اس کے دکھ میں برابر کی شریک لگ رہی تھی۔ اسی لیے دل آور نے اس کے کندھوں کے گرد اپنا بازو پھیلاتے ہوئے اسے اپنے کندھے سے لگالیا تھا اور مدحیہ ہچکیوں سے رو پڑی تھی۔

”بس کرو مدحیہ! چپ ہو جاؤ اور کتنا روؤ گی؟ پلیز مجھے تکلیف مت دو ہمیں سننے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔“ دل آور نے مدحیہ کا کندھا سہلاتے ہوئے اسے چپ کروانے کی کوشش کی تھی اور لاؤنج سے نکل کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوتی زری کے قدم ٹھنک کر رک گئے تھے اس نے صبح سے لے کر اب تک دل آور کو کچھ بولتے یا کچھ کہتے ہوئے نہیں دیکھا تھا، لیکن اب وہ کچھ کہہ رہا تھا تو صرف مدحیہ سے اور مدحیہ مسلسل روئے جا رہی تھی۔

”مدحیہ! چپ ہو جاؤ ورنہ درندہ میں ایسا بکھراؤں گا کہ کوئی سمیٹ بھی نہیں سکے گا۔ پلیز مجھے میرے اختیار میں رہنے دو۔“ دل آور کا لہجہ بہت کمزور ہو رہا تھا اور زری اس کے کمزور لہجے پہ خود بکھرنے لگی تھی اس کی آنکھیں پانیوں سے لبریز ہو گئی تھیں۔ شاید یہ حقیقت تھی یا فسانہ تھا، لیکن جو بھی تھا آج واقعی دل آور شاہ کے دکھ پر ہر آنکھ پر غم تھی ہر آنکھ میں آنسو تھے ہر دل میں دکھ تھا۔ کیونکہ اس کا درد سب نے گہرائی میں جا کر محسوس کیا تھا۔

”سرسہ! ہمیں اب اجازت۔“ عدیل اور شہیار اچانک ہی زلفی کے ساتھ اندر آ گئے تھے، لیکن اندر کا روتا بلکا منظر دیکھ کر قدموں کے دیپ رک گئے تھے اور انہیں شرمندگی ہوئی تھی کہ وہ غلط وقت پہ آ گئے ہیں۔

”اندرا آ جاؤ عدیل! باہر کیوں رک گئے ہو؟“ دل آور ان کی طرف متوجہ ہو چکا تھا اسی لیے انہیں اندر آنے کا کہا تھا اور مجبوراً عدیل اور شہیار کو اندر آنا ہی پڑا تھا۔

”سرسہ! کافی نا تم ہو چکا ہے، ہمیں اب اجازت دیں آپ سے ان شاء اللہ صبح ملاقات ہوگی۔“ عدیل نے دل آور کے کندھے سے لگ کے روتی ہوئی مدحیہ کو اچستی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا اور پھر نظریں جھکا لی تھیں۔ آخر وہ

دل اور شاہ کے سامنے اس کو نظر بھر کے دیکھنے کی جرات کیسے کر سکتا تھا؟

”کھانا وغیرہ کھایا؟“ دل اور نے مختصر سے انداز میں پوچھا تھا۔

”نہیں سرسہ! نبیل صاحب اور عبد اللہ صاحب نے تو بہت اصرار کیا ہے، مگر ہمیں فی الحال بھوک نہیں ہے اس لیے کچھ بھی کھانے کو دل نہیں چاہ رہا۔“ عدیل نے نفی میں سر ہلایا تھا اور خود دل اور بھی اس حالت میں نہیں تھا کہ وہ مزید اصرار کرنا اور کھانا کھانے کے لیے روک لیتا۔ اس لیے اس کی حالت کے پیش نظر ہی عدیل وغیرہ نے اس سے جلدی اجازت چاہی تھی اور وہاں سے رخصت ہو گئے تھے۔

اسی طرح رفتہ رفتہ سبھی مہمان باری باری رخصت ہوتے گئے تھے، البتہ نبیل اور عبد اللہ نے آج رات اس کے پاس ہی بٹھرنے کی کوشش کی تھی، لیکن دل اور نے انہیں منع کر دیا تھا۔

کیونکہ وہ دونوں بے حد تھکے ہوئے تھے، پہلے نبیل کے گھر دعوت، پھر صبح اٹھ کر کراچی جانا، پھر پورے دن کی بھاگ دوڑ، پھر ہوٹل میں رات گزارنے کے بعد افرا تفری میں دوبارہ لاہور واپسی اور پھر یہاں اگر بھی ان دونوں نے ہی سب کچھ سنبھالا تھا اس لیے اب ضروری تھا کہ وہ دونوں اپنے گھر جاتے اور سکون سے آرام کرتے، کیونکہ بے سکونی اور نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے کسی کی بھی طبیعت خراب ہو سکتی تھی اسی لیے دل اور نے انہیں یہاں رکنے سے منع کر دیا تھا کیونکہ یہاں رہ کر وہ بھی اس کی وجہ سے سکون کی نیند نہیں سو سکتے تھے لہذا ایسی بہتر تھا کہ وہ گھر چلے جاتے۔

”عبد اللہ چلا جاتا ہے، لیکن میں رک جاتا ہوں، ڈونٹ ڈری۔ مام اور مدحیہ آسانی سے رہ لیں گی اور ویسے بھی اب تو مومنہ بی بی بھی ہے ان کے ساتھ۔“ نبیل اسے تنہا چھوڑ کر جانے کے لیے تیار نہیں تھا۔

”عبد اللہ پلیزیار! سمجھاؤ اسے کتنی دیر اور کتنے دن رکو گے میرے ساتھ؟ آج؟ کل؟ پھر سولہ؟ ہفتہ؟ دو ہفتے؟ مہینہ؟ دو مہینے؟ سال؟ دو سال؟ آخر کب تک رکو گے؟ یہ میرا گھر ہے اور یہاں میں نے تنہا ہی رہنا ہے کوئی بھلا کب تک ساتھ دے سکتا ہے؟ اور جب کوئی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ساتھ نہیں دے سکتا تو پھر صرف ایک دن کے لیے یا پھر ایک رات کے لیے بھی کیوں؟ یہ رات بھی بس چند گھنٹوں کی رہ گئی ہے ابھی تھوڑی دیر میں ختم ہو جائے گی اور بس۔“ دل اور نبیل کی ضد پہ نبجائے کیوں اتنا بوجھ گیا تھا کہ نبیل نے دوبارہ کچھ بھی نہیں کہا تھا اور اس سے ہاتھ ملا کر عبد اللہ وغیرہ کے ساتھ ہی وہاں سے چلا گیا تھا، لیکن نبیل کا اس طرح جانا بھی دل اور کے دل پہ بوجھ چھوڑ گیا تھا اور اس کا ذہن اور زیادہ اپ سیٹ ہو گیا تھا اور وہ وہیں کا دیں گیٹ کے پاس ہی کھڑا رہ گیا تھا جسے کافی دیر بعد گلاب خان نے آکر متوجہ کیا تھا۔

”صاحب! باہر کافی ٹھنڈ ہو رہی ہے آپ یہ چادر اوڑھ لیں موسم اچھا نہیں ہے آپ بیمار پڑ جائیں گے۔“ گلاب خان اس کی کالے رنگ کی گرم چادر لے کر اس کے قریب آ گیا تھا اور چادر کی تہ کھول کر اس کے کندھوں کے گرد پھیلا دی تھی اور دل اور نے اک گہری سانس کھینچتے ہوئے قدم اندر کی سمت موڑ لیے تھے اور گلاب خان نے گیٹ بند کر دیا تھا۔

”صاحب! آپ کے لیے چائے لے کر آؤں؟“ وہ اندر آ کر ڈرائنگ روم کے بیچوں بیچ کھڑا خالی خالی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا جب گل اس کے پاس آکھڑی ہوئی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس نے گل سے کھانے کا ایک ذرہ بھی زبان پہ نہیں رکھا وہ اتنے گھنٹوں سے مسلسل بھوکا بھی ہے اور پیاسا بھی اور اس کے سب دوست وغیرہ بھی جا چکے ہیں۔ ایسے میں اسے کھانے کے لیے بھلا کون کہے گا؟ اور کون پوچھے گا اس سے؟ اس لیے یہ ہمت گل نے خود ہی کر لی تھی۔

لیکن دل اور کو آج بھلا کسی چیز کی کب طلب تھی آج تو جیسے اس کی پوری ہستی اور پوری ذات ہی مر چکی تھی۔

وہ تو بس خالی کھوکھلا اور خواہشوں سے عاری وجود لیے ہی کھڑا تھا اور تو کچھ بھی باقی نہیں تھا۔

”آپ کہتے ہیں تو کافی بتاتی ہوں۔“ گل نے پھر سوال بدل کر دہرایا تھا۔

”نہیں! کسی چیز کی بھی طلب نہیں ہے۔ تم جاؤ، آرام کرو جا کر تم بھی تھک گئی ہو گی۔“

دل اور نے آہستگی سے اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کر تھکے ہوئے اسے جانے کا کہا تھا اور خود بتول شاہ کے بیڈ روم کی طرف بڑھ گیا تھا جبکہ گل کی آنکھوں سے آنسو بہہ لکھتے تھے دل اور کو یوں تھکے تھکے اور خالی خالی سے انداز میں تنہا بتول شاہ کے بیڈ روم میں جاتے دیکھ کر اس کا دل مٹھی میں آ گیا تھا اور وہ اپنے دوپٹے سے آنسو پونچھتی ہوئی وہاں سے ہٹ گئی تھی اور دل اور بتول شاہ کے بیڈ روم میں آ گیا تھا جہاں سب کچھ ابھی بھی تازہ تھا جیسے وہ بیڈ روم سے ابھی ابھی تیار ہو کر باہر نکلی ہوں اور ان کے لیڈی پرنیوم کی دلفریب سی مسک بیڈ روم کی فضا میں ابھی ابھی رچی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

”شاہ! کس کو ڈھونڈ رہے ہو؟“ اک سرگوشی نما سربراہ بتول اور کی سماعتوں کو چھو کے گزر گئی تھی اور اس نے بے ساختہ پورے بیڈ روم میں ادھر ادھر دیکھا تھا اور بیڈ روم کو خالی پا کر پھر سے دل بھر آیا تھا۔

”صاحب! اب آپ بھی آرام کر لیں تا دیکھیں بہت ٹائم ہو گیا ہے۔ آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔“ گلاب خان بھی اس کی خاطر ابھی تک جاگ رہا تھا کیونکہ جب تک وہ نہ سو جائے ان لوگوں کو بھی بھلا کب سکون تھا؟ اور دل اور نے بڑے حوصلے اور بڑے ضبط کے ساتھ اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے اپنے پیچھے دروازے کی چوکھٹ میں کھڑے گلاب خان کو دیکھا تھا۔

”صاحب! ہم سب جانتے ہیں کہ آپ کا دکھ آپ کا غم بہت بڑا ہے اور اس دکھ کا اور اس غم کا کوئی مداوا بھی نہیں ہے، لیکن یہ دکھ اور یہ غم ایسا ہے کہ ہر کوئی اپنے سینے میں لیے پھر رہا ہے، زندگی میں ہر کسی کو یہ چوٹ لگتی ہے ہر کسی کو یہ درد سہاڑا ہے۔ سال باپ ہمیشہ ساتھ نہیں رہتے اور باپ باپ کے مرجانے سے اولاد مر نہیں جاتی یہ زندگی ہے اور زندگی چلتی ہی رہتی ہے کسی کے چلے جانے سے زندگی رک نہیں جاتی ہاں دل میں دکھ ضرور رہ جاتا ہے اور دکھ تو ہمیشہ انسان کی زندگی کا حصہ بنے رہتے ہیں۔ بس انسان کو حوصلہ رکھنا چاہیے اور سمجھے پتا ہے کہ آپ کا حوصلہ اور آپ کا صبر بہت بلند ہے۔ آپ بہت مضبوط ہیں اس میں کوئی شک نہیں ہے، لیکن آپ کو اپنا بھی خیال رکھنا چاہیے کیونکہ آپ اپنا خیال نہیں رکھیں گے تو اور کون رکھے گا؟“ گلاب خان نے بڑے مدبرانہ اور دوستانہ سے انداز میں دل اور کو سمجھانے کی اور ہمت بندھانے کی کوشش کی تھی جس پہ دل اور محض سر ہلا کر چپ ہو کے رہ گیا تھا۔

”صاحب! آپ اس وقت اپنے کمرے میں جائیے آرام کیجیے یہ دکھ تو اب ہمیشہ ساتھ ہی رہے گا۔“ گلاب خان آگے بڑھ کے اسے کندھے سے تھام کے باہر لے آیا تھا اور بتول شاہ کے بیڈ روم کا دروازہ بند کر دیا تھا۔

”رہنے دو گلاب خان! میں خود چلا جاؤں گا۔“ اس نے بیڑھیوں کے قریب آکر گلاب خان کے سہارے کی بجائے بیڑھیوں کی ریلنگ تھام لی تھی۔

”ٹھیک ہے! آپ جائیں آرام کریں۔“ گلاب خان آہستگی سے پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اور دل اور بمشکل قدم اٹھاتا ہوا بیڑھیاں چڑھنے لگا تھا۔

”صاحب! جی۔“ افسوسہ آپ سے کچھ کہنا تھا۔“ گلاب خان کو اچانک کچھ یاد آیا تھا اور دل اور کے قدم رک گئے تھے اس نے پلٹ کر گلاب خان کو سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

”صاحب! جی۔“ مجھے نہیں پتا کہ آپ کے دل میں کیا ہے؟ اور آپ کے دل میں کیا ہے؟ لیکن جو میرے دل میں تھا اور جو میرے دل میں تھا میں نے وہی کیا ہے اگر آپ کو ناگوار گزرے تو معافی چاہتا ہوں، لیکن میں نے

علیٰ بی بی کا اور آپ کا رشتہ دیکھتے ہوئے انہیں بیس منٹ میں بھیجنے کے بجائے صبح آپ کے بیڈ روم میں بھیج دیا تھا کیونکہ میرے خیال اور میری عقل کے حساب سے دیکھا جائے تو اب وہی ان کی اصل جگہ ہے۔ اور اصل مقام ہے جس میں آپ کی بھی عزت ہے اور ان کی بھی عزت ہے۔ اس لیے اس میں علیٰ بی بی کا کوئی قصور نہیں ہے۔ آپ نے اگر کچھ کہنا ہے تو مجھے کہہ لیں۔ میں آپ کی ہر سزا کے لیے تیار ہوں۔“ گلاب خان نے دل اور کے بیڈ روم میں جانے سے پہلے علیٰ بی بی کو وہاں موجودگی کا مسئلہ کلیئر کر دیا، مگر سمجھا تھا۔

”سزا۔۔۔؟“ دل اور نے زرب دہرایا تھا۔

”جی ہاں صاحب جی سزا۔۔۔ کیونکہ آپ مالک ہیں اور میں ملازم ہوں اور میں نے ایک ملازم ہو کر آپ کی ذاتی زندگی میں مداخلت کی ہے۔ آپ کی اجازت کے بغیر یہ قدم اٹھایا ہے حالانکہ میری اتنی اوقات نہیں ہے کہ میں ایسا کچھ کروں۔ اس لیے آپ کو پورا پورا حق ہے کہ آپ مجھے سزا دیں یا مجھے غصہ کریں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا میں حاضر ہوں۔“ گلاب خان اس کے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا جبکہ دل اور کے دل و دماغ پہ کچھ اور ہی چل رہا تھا۔

”ہاں۔۔۔ اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟ تکلیف کم ہوئی یا نہیں؟“ وہ لپک کے پاس آیا تھا۔

”تکلیف۔۔۔ کم ہو سکتی ہے۔ اگر۔۔۔ تم۔۔۔ کہو۔۔۔ تو۔۔۔“ بتول شاہ نے ہاتھ اٹھا کر اس کے چہرے کو چھونے کی کوشش کی تھی، مگر ڈرپ لگی ہوئی تھی اس لیے ہاتھ وہیں کا وہیں رہ گیا تھا۔

”ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ میں کروں گا۔۔۔ ضرور کروں گا۔۔۔ آپ کہیں کیا بات ہے۔۔۔؟“ اس نے فوراً اثبات میں سر ہلایا تھا اور ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا تھا۔

”میں۔۔۔ میں۔۔۔ نے۔۔۔ آج۔۔۔ وقار۔۔۔ آفندی۔۔۔ کی حالت۔۔۔ دیکھی۔۔۔ وہ۔۔۔ اپنی۔۔۔ سزا۔۔۔ اسی۔۔۔ دنیا۔۔۔ میں۔۔۔ بھگت۔۔۔ چکا۔۔۔ ہے۔۔۔ تم۔۔۔ اب۔۔۔ علیٰ۔۔۔ کو۔۔۔ سزا۔۔۔ مت۔۔۔ دے۔۔۔ میرا۔۔۔ خدا۔۔۔ گواہ۔۔۔ ہے۔۔۔ میں۔۔۔ نے۔۔۔ آج۔۔۔ وقار۔۔۔ آفندی۔۔۔ کو معاف کیا۔۔۔ میں نے۔۔۔“

بتول شاہ کے الفاظ سے عرش فرش کانپ گئے تھے اور دل اور شاہ تو جیسے کھڑے قدم سے ڈھے گیا تھا۔ اور کھڑے قدم سے ڈھے جانے والے دل اور شاہ کے دل و دماغ پہ اب یہی آواز بار بار باز گشت کر رہی تھی۔

”میرا۔۔۔ خدا۔۔۔ گواہ۔۔۔ ہے۔۔۔ میں نے۔۔۔ آج۔۔۔ وقار۔۔۔ آفندی۔۔۔ کو معاف کیا۔۔۔ میں نے۔۔۔!“

”معاف کیا میں نے۔۔۔!“

”معاف کیا میں نے۔۔۔!“

وہ گلاب خان سے کچھ بھی کہے بغیر بیڑھیاں چڑھنے لگا تھا، لیکن ذہن میں وہی الفاظ مسلسل تکرار کر رہے تھے۔

اس کے قدم من من بھر کے ہو چکے تھے اور ایک ایک سیڑھی ایک ایک صدی کی مسافت پہ محسوس ہو رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ بوئی سیڑھیاں چڑھتے نیچے گر جائے گا کیونکہ اس کے قدموں میں ذرا بھی توازن نہیں تھا وہ کسی بھی وقت اپنا توازن کھو سکتا تھا اور اس کے قدم کسی بھی وقت لڑکھڑا سکتے تھے اسی لیے تو اس نے سیڑھیوں کی رینگ تھام رکھی تھی اور اسی لیے تو گلاب خان بھی پیچھے کھڑا اسے چڑھتے ہوئے دیکھتا رہا تھا۔

کل کا پورا دن گزر گیا تھا اور کل کی پوری رات گزر گئی تھی۔

آج کا پورا دن گزر گیا تھا اور آج کی آدھی رات گزر گئی تھی اور وہ دل اور کی طرح مسلسل بھوکی اور بھاسی بیٹھی

www.paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شاندار پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ام ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیننگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ☆ ہر کتاب کا الگ سلیشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ مابانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں ایلو ڈنگ
- ☆ سیریم کو آئی ٹی ڈی، کپریٹ ڈی، آئی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور
- ☆ ابن صفی کی مکمل رینج
- ☆ ایڈفری لکس، لکس کو میس کہا نے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

☆ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

☆ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے ہمیں اور جاننے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

”نہیں! مجھے کسی چیز کی بھی طلب نہیں ہے۔ نہ بھوک ہے نہ پیاس ہے کچھ بھی نہیں ہے۔“ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے علیزے کے ہاتھ اپنے چہرے سے نیچے کر لیے تھے اور پھر اس کے دونوں ہاتھوں کو دیکھ کر وہ عجیب تنگی سے مسکرا دیا تھا۔

”کاش! تم نے میرے مرنے کی دعا دل سے کی ہوتی علیزے! تو آج شاید میں مری چکا ہوتا؟“ اس نے علیزے کے ہاتھ آستکی سے جھٹک دیے تھے اور علیزے کا چہرہ اونچا کر کے اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔

”لیکن! بگڑا اب بھی کچھ نہیں۔ دعا تو تم اب بھی کر سکتی ہو۔ میرے پاس بھی اب کچھ نہیں رہا جینے کے لیے۔ ہاں البتہ میرے مرنے سے اب یہ فرق پڑے گا کہ تم بیوہ کھلانے لگو گی۔“ دل اور شاہ کی بیوہ اور مجھے پتا ہے تمہیں اس لفظ سے کوئی فرق نہیں پڑے گا بلکہ خوشی محسوس ہوگی اور میں تمہیں خوش ہی تو کرنا چاہتا ہوں؟“ وہ عجیب بہکی بہکی باتیں کر رہا تھا اور علیزے اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی اس کے حواس واقعی اڑے ہوئے لگ رہے تھے اس کی باتوں میں بے ربطگی آگئی تھی۔

”ڈرائیو! یہ! یہ! تم کیا کہہ رہے ہو؟“ علیزے کو حیرت ہوئی تھی۔ ”ہو نہ ہو! کچھ نہیں۔“ وہ سر جھٹک کر اس کے سامنے سے اٹھ گیا تھا اور علیزے اس کے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے اپنے ہاتھوں کو اور اپنے دامن کو دیکھتی رہ گئی تھی۔

وہ وہاں سے اٹھ کر راکنگ چیر پر جا بیٹھا تھا اور پلکیں موند کر پھر سے تول شاہ کے لیے تھکنے لگا تھا اور علیزے راکنگ چیر پر جھولتے دل اور کو چند سیکنڈ یونی ویکٹی رہی اور پھر اٹھ کر وہاں سے باہر آگئی۔ اس گھر میں تھوڑا بہت چلنے پھرنے سے یہ تو اسے اندازہ ہو ہی چکا تھا کہ کچن کہاں ہے وہ سیدھی کچن میں جا چکی۔

اس کا ارادہ چائے بنانے کا تھا حالانکہ اس نے آج تک کبھی بھی چائے نہیں بنائی تھی، لیکن آج دل اور کی حالت اور صورت حال دیکھ کر بے ساختہ ہی اس نے چائے بنانے کا سوچا تھا اور وہ اس سوچ پہ عمل پیرا بھی ہو گئی تھی۔

اس نے چند روز پہلے گل کو چائے پاتے ہوئے دیکھا تھا وہ کھانا ہی اس کے کام آگیا تھا اور اس نے سب کچھ ڈھونڈ ڈھانڈ کے آخر کار چائے بنائی تھی اور پھر واپس کمرے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ وہ جس طرح ہوا کے جھونکے کی طرح گئی تھی۔ اسی طرح واپس بھی آگئی تھی۔

”ڈرائیو! اس نے قریب آکر آستکی سے پکارا تھا، لیکن وہ یونی آنکھیں بند کیے پڑا رہا تھا۔

”ڈرائیو! اس نے دوبارہ اسے پکارا۔

”ہوں۔؟“ اس نے بمشکل ”ہوں“ میں جواب دیا تھا۔

”چائے! علیزے کی آواز دھیمی بڑ گئی تھی جبکہ دل اور نے یکدم آنکھیں کھول دی تھیں وہ اس کے سامنے چھوٹی سی ٹرے میں چائے کا کپ لیے کھڑی تھی۔ اور اس کو اس روپ میں دیکھ کر دل اور اپنی پوری ہستی سے شہد رسارہ گیا تھا اور اس کے ہونٹ آستکی سے کپکپاتے تھے۔

”بیوی! اس کے اعصاب یکدم جھنجھٹا اٹھے تھے۔

☆ (باقی آئندہ) ☆

کبھی بارنا نہیں سیکھا اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پر بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔

تیتھیوں قسط

نسیگہ عزیز



بڑی حویلی کے تمام کمپن وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحہ اور نیل حیات وہی بہن بھائی ہیں مدحہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے وہ انگلینڈ کی رنگینوں میں مکمل طور پر رچک چکی ہے جس کے پیش نظر فائرہ بیگم، نیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں لیکن مدحہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے جس پر نیل اور فائرہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ترا اندر پھنپ رہا ہے۔

نیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سراپے حاصل نہیں ہوتا، بے بسی اور مجبوری سے تنگ آخر خود کشی کرنے کا سوچتا ہے لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باوا قیاض مل جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے جس پر نیل کافی خوش ہوتا ہے اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدی ہے وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آذر شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے وہ اپنے قول و فعل کا بہت ریکا آڈی ہے اس نے



کیونکہ یہ لفظ اور یہ خیال اس کے دماغ کی چابک کی طرح چڑا تھا اور وہ جیسے بلبل کے رہ گیا تھا۔
نجانے کیوں اسے اس لمحے بڑا عجیب سا لگا تھا اور بڑی تکلیف بھی ہوئی تھی۔

شاید اسے آپس یا شاید علیزے کی ذات سے
لیکن جو بھی تھا یہ ان کی زندگی کا ایک بہت ہی عجیب ترین موڑ تھا کہ وہ دونوں ہی ایک دوسرے کے سامنے بے
بس و بے اختیار کھڑے تھے اور ایک دوسرے سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ جو کچھ ہوتا تھا وہ تو ان کی اتنی
”نفرت اور نہیں نہیں“ کے باوجود بھی ہو ہی چکا تھا اس لیے اب کچھ کہنے اور کرنے کے لیے تو تھا ہی نہیں۔
بس اب تو وہ دونوں تھے۔ اور ان کی اجنبیت تھی۔
اور اب جو بھی کرنا تھا اسی اجنبیت کی دیوار کے آ پار رہ کر ہی کرنا تھا۔ ورنہ اور تو کوئی حل ہی نہیں تھا زندگی کو
سل کرنے کے لیے۔

شاید اسی لیے دونوں کو شعور آگیا تھا کہ اب زندگی کرنے کی طرز کیا ہوگی؟ اور طریقہ کیا ہوگا؟ دکھ کی بھٹی میں
دونوں ہی جلتے تھے اس لیے صبر بھی دونوں کو ہی آچکا تھا۔ دونوں ہی صابر ہو چکے تھے اور آج اس لمحے سے دونوں پہ ہی
اور اک ہو چکا تھا کہ اب زندگی ”یہی“ ہے اور اسے ہی قبول کرنا ہے۔
چاہے دل مانے۔ چاہے نہ مانے۔!

”ڈرائیو! چائے“ اس نے ایک بار پھر اسے متوجہ کیا تھا۔
”ہوں۔! رکھ دو“ وہ ایک بار پھر چونک کر متوجہ ہوا تھا اور علیزے نے آہستگی سے آگے بڑھ کے چائے کا
کپ ٹیبل پہ رکھ دیا تھا اور خود پلٹ گئی تھی۔
”تھینک یو۔!“ دل اور کی نظریں ٹیبل پہ رکھے چائے کے کپ پہ تھیں اور شکر یہ علیزے کا ادا کر رہا تھا۔
علیزے نے ٹھنک کر گردن موڑ کے اسے دیکھا تھا وہ بڑی خود فراموشی کے عالم میں بیٹھا تھا اور علیزے اسے اک
نظر دیکھ کر صوفے پہ جا بیٹھی تھی کیونکہ اب اس میں اتنی ہمت اور اتنی جرات نہیں تھی کہ وہ اس کے سامنے
دوبارہ جا کر بیڈ پہ بیٹھ جاتی۔ بلکہ وہ تو پہلے ہی اس بیڈ سے بڑی مشکل سے اٹھی تھی اب دوبارہ جا کر بیٹھنا تو ممکن ہی
نہیں تھا۔

”سو جاؤ!“ اس نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے گنبد اور رو جھل سے لہجے میں کہا تھا۔
”نہیں نہیں آرہی۔“ علیزے نے اپنے ہاتھوں کو آپس میں مسلتے ہوئے انتہائی آہستگی سے جواب دیا تھا۔
”کیوں؟ تمہیں نیند کیوں نہیں آرہی۔؟“ وہ چائے کا سپ لیتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔
”نرم بستر پہ سونے کی عادت نہیں رہی۔“ علیزے کے جواب میں وہ ٹھہر سا گیا تھا اور پھر گردن اٹھا کر اسے دیکھا
تھا۔ جبکہ وہ بڑے لا پرواہ اور لا تعلق سے انداز میں گردن جھکائے بیٹھی اپنی گود میں رکھے اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہی
تھی۔

”عادت تو تمہیں میرے ساتھ رہنے کی بھی نہیں ہے؟ پھر کیا کروگی۔؟“ دل اور کا لہجہ عجیب بے تاثر سا ہو رہا
تھا اور اب کی بار اس کے اس لہجے اور سوال پہ علیزے نے بھی چونک کر دیکھا تھا جو اسے ہی دیکھ رہا تھا دونوں کی
نظروں کا تصادم ہوا تو دونوں نے ہی نظریں جھکا لی تھیں۔

”میری عادتوں کو تم سے بستر کوئی بھی نہیں جانتا۔ مجھے فرش پہ سونے کی عادت ہو سکتی ہے تو پھر۔“ علیزے
نے پونہمی اپنے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے اسے جواب سے نوازا تھا لیکن اس اوجھڑے جواب کا مفہوم دل اور بہت
گہرائی سے اور بہت آسانی سے سمجھ چکا تھا۔

”ہوں۔! تو پھر میرے ساتھ رہنے کی عادت بھی ہو سکتی ہے یعنی اس فرش میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں

ہے؟“ دل اور نے آہستگی سے سر ہلاتے ہوئے خود کلامی کے سے انداز میں خود کو جیسے کچھ باور کروایا تھا اور پھر
خاموشی سے دوبارہ چائے کا کپ اٹھا کر چائے پینے لگا تھا۔

علیزے کے ہاتھ سے بنی ہوئی چائے جو اس نے زندگی میں پہلی بار پینا تھا اور وہ بھی صرف اس کے لیے بنائی
تھی اور علیزے اسے چائے پیتے ہوئے دیکھ رہی تھی جبکہ وہ اپنے دھیان میں چائے پی رہا تھا۔
رات بہت حد تک چلی گئی تھی اور وہ دونوں ہنوز اپنی اپنی جگہ پہ اپنی اپنی سوچوں میں گم بیٹھے جاگ رہے تھے
وہ راکنگ چیئر پہ جھول رہا تھا اور وہ صوفے پہ بیٹھی ہوئی تھی اور پونہمی بیٹھے بیٹھے دونوں کی پہلی رات گزر گئی تھی۔
دکھ، درد اور دلیلوں کے بوجھ تلے بی ہوئی رات۔! یعنی ان دونوں کی سہاگ رات۔!!!



دکھ کی رات ڈھل چکی تھی اور دلیلوں کا دن شروع ہو چکا تھا اور ان ہی دلیلوں کے سہارے وہ بھی اپنے آپ کو
ذرا سا سنبھال لینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ علیزے نے فجر کی نماز پڑھ رہی تھی جب دل اور راکنگ چیئر سے اٹھ کر
اپنے بڈ روم کی کھڑکی میں جا کھڑا ہوا تھا اور کھڑکی کھول کر باہر دیکھنے لگا تھا۔

باہر کی تازہ ہوا اس کے بو جھل اعصاب کو کپکپا کے رکھ گئی تھی بالکل اسی طرح جس طرح دعا مانگتے ہوئے
علیزے کے ہاتھ کپکپا رہے تھے اسے شاید کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ دعا میں اللہ سے اگر کچھ مانگے تو کیا مانگے؟
کیونکہ اپنے لیے تو کچھ مانگنے کے لیے تھا ہی نہیں۔ تو پھر کس کے لیے مانگے۔؟ اور اسی مانگنے اور نہ مانگنے کی
کٹکٹش میں بیٹھی علیزے کے دعا کی خاطر پھیلے ہوئے ہاتھوں کو دیکھ کر دل اور کے دل میں دعا کی طلب بے دار ہوئی
تھی۔ اک بلا ارادہ اور بے ساختہ سی طلب!

”علیزے۔! میں نے تمہیں بے سکون کیا ہے، دکھ دیا ہے تمہیں، دل دکھایا ہے تمہارا، تنہا کر دیا ہے تمہیں
اور۔ اور۔ اب خود تنہا ہو گیا ہوں، خود بے سکون ہو گیا ہوں، اب اپنا دل دکھ سے بھر گیا ہے، اب مجھے دعا کی
ضرورت ہے اور یہ دعا تمہارے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا صرف تم کر سکتی ہو۔ پلیز علیزے! میرے لیے دعا کرو۔
دعا کرو اللہ مجھے سکون دے اور صبر عطا کرے اتنا کہ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے شانت ہو جاؤں۔“ وہ علیزے سے
الٹا یہی سے انداز میں کہتا ہوا اس سے ہٹ کے بڈ روم سے باہر نکل گیا تھا۔

علیزے اپنے خالی اور پھیلے ہوئے ہاتھوں کو دیکھتی رہ گئی تھی اس میں اتنا حوصلہ اور اتنا ظرف نہیں تھا کہ وہ
اس شخص کے لیے دعا کرتی جو اس کے خاندان کو اور اس کے دل کو برباد کرنے کا باعث بنا تھا جس نے اسے کہیں کا
بھی نہیں چھوڑا تھا جو اس کی ذات کو دو کوڑی کا کر کے رکھ چکا تھا۔
آخر وہ اس کے لیے دعا کرتی بھی تو کیسے؟

یہ ممکن ہی کب تھا بھلا۔؟
وہ اپنے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچتی ہوئی اپنے ہونٹوں کو سیسے ہوئے چائے نماز سمیٹ کر اٹھ گئی
تھی اور بڑے ضبط سے اپنے آنسوؤں پہ بندھ باندھتی ہوئی اسی کھڑکی میں آکھڑی ہوئی تھی جہاں وہ کھڑا رہا تھا۔



وہ آج بھی اسی جائے نماز پہ بیٹھی تھی جس پہ اس کے دل اور شاہ نے سجدہ کیا تھا، نماز ادا کی تھی اور دعا مانگی
تھی۔

البتہ اس نے تو بتا نہیں کون سی دعا مانگی تھی اور کس کے لیے مانگی تھی؟
مگر ذری کی تمام دعائیں تو بس اسی کے لیے ہوتی تھیں۔

حرف اول سے لے کر حرف آخر تک صرف اس کا نام ہوتا تھا۔
اس کے دل سے نکلنے والا لفظ لفظ جیسے دل اور شاہ کی ہی امانت تھا۔
کسی اور کا تو گزر بھی ممکن نہیں تھا کہ اس کی دعاؤں میں شریک ہو جاتا۔
صرف وہی وہ تھا۔ کل بھی۔ آج بھی۔ آئندہ بھی۔ اور اس وقت بھی۔ اور وہ تھی کہ اس کے لیے
دعا میں مانگے جا رہی تھی کیونکہ کل وہ سب اس کا جو حال دیکھ چکے تھے اسے واقعی دعاؤں کی ہی ضرورت تھی دل
سے اٹھنے والی بے لوث اور شدت آمیز دعائیں جو اس کے لیے صرف اور صرف زری ہی کر سکتی تھی۔ زری کے
سوا کوئی اور ہرگز نہیں کر سکتا تھا۔



”انوشہ! انوشہ! کہاں ہو بھئی؟ می کہاں ہیں؟“
دانیال انیکسی میں داخل ہوتے ہی عائشہ آفندی کے بیڈ روم کی طرف جاتا تھا اس وقت بھی کسی ہوا تھا وہ سیدھا
ان کے بیڈ روم میں ہی گیا تھا، لیکن انہیں وہاں نہ پا کر اس نے انوشہ کو آوازیں دینا شروع کر دی تھیں۔
”جی بھائی! کیا بات ہے؟ خیریت؟“ انوشہ اپنے بیڈ روم میں بیٹھی پڑھ رہی تھی جب دانیال کی آواز پہ سب کچھ
چھوڑ چھاڑ کے باہر نکل آئی تھی۔
”بات کیا ہوگی بھلا؟ تم سب ہی غائب ہو، می کہاں ہیں؟ وہ بھی نظر نہیں آرہی؟“ دانیال عائشہ آفندی کی
طبیعت کی وجہ سے ہر وقت ہی تشویش زدہ سارے رہتا تھا اسے ان ہی کی طرف سے پریشانی گھیرے رکھتی تھی۔
”ہم نے کہاں غائب ہونا ہے بھلا؟ زین شاید جودت اور حماو کے ساتھ نکلا ہوا ہے۔ میں یہاں اسٹڈی میں بڑی
ہوں اور ماما کو سب نے ڈیڈ کے بیڈ روم میں بلایا ہوا ہے اور رہی بات آپ کی تو آپ اپنے آپ سے خود ہی پوچھ کر
بتا سکتے ہیں کہ آپ کہاں تھے؟“ انوشہ نے بھی اسے اسی کے سے انداز میں جواب دیا تھا جبکہ دانیال اس کے
جواب پر ذرا سا ٹھٹھا تھا۔
”می کو سب نے ڈیڈ کے بیڈ روم میں بلایا ہے؟ مگر کون؟“ اس نے مزید تشویش سے پوچھا تھا۔
”یہ تو مجھے نہیں پتا البتہ یہ ضرور پتا ہے کہ آج کی میننگ بہت خاص میننگ ہے، کبھی حکمران وہیں جمع ہیں۔“
انوشہ نے اسے مزید اطلاع دی تھی اور دانیال کے ذہن میں خطرے کا الارم بجنے لگا تھا۔
”خاص میننگ؟ ہوں۔ سمجھ گیا۔“ اس نے فوراً قدم واپس موڑ لیے تھے اس کا ارادہ اب وہیں جانے کا
تھا۔

”کیا سمجھ گئے ہیں؟ کچھ مجھے بھی سمجھا دیں؟“ انوشہ پیچھے سے چل کے بولی تھی۔
”چل جائے گا پتا۔ صبر رکھو۔“ اس نے جیسے اسے تسلی دی تھی۔
”مگر آپ جا کہاں رہے ہیں؟“ اس نے پھر پوچھا تھا۔

”وہیں جہاں کبھی حکمران جمع ہیں۔“ دانیال بڑے سکون سے کہتا ہوا سیڑھیاں اتر گیا تھا اس کے قدموں میں
روانی آگئی تھی وہ جلد از جلد میننگ میں پہنچنا چاہ رہا تھا اور اسی عجلت میں وہ کوریڈور مڑتی ہوئی حرمت سے ٹکراتے
ٹکراتے بھاٹھا۔

”اللہ خیر! کیا ہو گیا ہے آپ کو؟“ حرمت نے خفگی سے کہتے ہوئے بمشکل اپنے آپ کو سنبھالا تھا۔
”سوری! میں نے دھیان نہیں دیا۔“ دانیال خود بھی چل ہو گیا تھا۔

”تو دھیان کہاں ہے آپ کا؟“ اس نے بے ساختہ سوال داغ دیا تھا اور دانیال نے بے ساختہ اس کے چہرے کی

سمت دیکھا تھا وہ چہرے سے ہی نفرت زدہ سی لگ رہی تھی۔

”دھیان بھی بس یہیں کہیں تھا۔“ دانیال نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹا کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا تھا۔
”دھیان کو بن نہیں کہیں نہیں ہونا چاہیے، صرف ایک ہی جگہ۔ ہونا چاہیے۔ ورنہ یہیں کہیں دھیان
رکھنے والے ٹھوکر کھالیتے ہیں۔“ حرمت نے اسے جیسے سمجھانے کی کوشش کی تھی اور پھر اک سائیڈ سے کترا
کے گزر گئی تھی۔ جبکہ دانیال وہیں کھڑا اس کی بات کا مفہوم سمجھتا رہ گیا تھا۔
”کیا بات ہے دانیال بھائی؟ یہاں کیوں کھڑے ہیں آپ؟“ جویریہ لاؤنج سے نکل کر اپنے بیڈ روم میں جا رہی
تھی جب دانیال کو کوریڈور کے کونے پر کھڑے دیکھ کر رک گئی تھی۔

”جہوں! کچھ نہیں بس ایسے ہی رک گیا تھا۔“ وہ چونک کر سر جھٹکتا ہوا ڈیڈ کے بیڈ روم کی طرف گیا تھا حالانکہ
اس کے دل میں کھدبہ ضرور ہو رہی تھی کہ حرمت آخر ایسی بات کیوں کہہ کر گئی ہے؟ ورنہ وہ تو کبھی کچھ بھی نہیں
کہتی تھی۔

”عائشہ! تم کیوں چپ ہو گئی ہو تم بھی تو کچھ کہنا؟ تمہاری کیا رائے ہے؟“
ثروت بیگم کی آواز پہ دانیال دروازے پر دستک دیتے دیتے رک گیا تھا ثروت بیگم عائشہ آفندی سے مخاطب
تھیں۔

”آپ نے بات ہی چپ کروانے والی کر دی ہے، کچھ کہنے کے لیے کیا ہے اب؟ فیصلہ تو آپ لوگ پہلے ہی
کر چکے ہیں۔ اب اس میں ہماری رائے کیا اہمیت رکھتی ہے بھلا۔“ عائشہ آفندی کا دھیما اور بجھا بجھا سا لہجہ بتا رہا
تھا۔ انہیں کچھ اچھا نہیں لگا۔ اب کیا اچھا نہیں لگا یہ تو ان لوگوں میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔
”کیوں؟ تمہاری رائے کیوں اہمیت نہیں رکھتی؟ تمہیں کچھ بھی کہنے کا پورا پورا حق ہے تم کہہ سکتی ہو۔ ہم
سب سن رہے ہیں اور کوشش کریں گے کہ تمہاری رائے کا احترام کریں۔“ اسرار آفندی نے وقار آفندی کی جگہ
بولنے کا حق ادا کیا تھا اور باہر کھڑے دانیال کو بے چینی نے آگھیرا تھا کہ اب اس کی ماں نجائے کیا کہنے والی ہیں کہ
سب کو انتظار ہو گیا ہے؟

”نہیں بھائی صاحب! میں اپنی رائے ضرور سنی کسی پہ مسلط نہیں کرنا چاہتی سب کی اپنی اپنی اولاد ہے اور اپنا اپنا
اختیار ہر کوئی اپنی مرضی ہی کرنا چاہتا ہے آپ لوگوں نے اپنی اولاد کے بارے میں سوچا ہے تو کچھ بہتر ہی سوچا
ہوگا۔“ عائشہ آفندی کا پی آہستگی سے بول رہی تھیں اور وہ بڑی مشکل سے سن رہا تھا۔

”ارے نہیں عائشہ! ایسی باتیں کر رہی ہو تم؟ ہماری اور تمہاری اولاد میں کوئی فرق ہے کیا؟ ہماری اولادیں ہم
لوگوں میں بٹی ہوئی تو نہیں ہیں؟ یہاں سب کچھ ایک ہی تو ہے؟“ اسرار آفندی نے بڑی اپنائیت اور بڑے خلوص
سے اپنی بہن کو مان بچنے کی کوشش کی تھی تاکہ وہ اپنے دل کی بات دل میں ہی نہ رکھ لیں بلکہ دل میں جو بھی ہے وہ
صاف کہہ دیں۔

”نہیں بھائی صاحب! یہاں سب کچھ ایک ہی تو نہیں ہے نا؟ اولادوں میں فرق تو آپ کے اس فیصلے سے ہی
آگیا ہے کہ آپ نے اپنے بچوں کے بارے میں سوچ لیا ہے، لیکن ہمارے بچوں کے لیے کچھ بھی نہیں سوچا۔
آپ کو اذرا اور احمد وغیرہ کی زندگی کا فیصلہ یاد ہے، لیکن دانیال اور زین وغیرہ کی زندگی کا کچھ پتا نہیں ہے۔ کیا ان کے
لیے بھی کچھ سوچا ہے آپ نے؟ کیا ان کے لیے بھی کوئی فیصلہ کیا ہے آپ نے؟ یا پھر لاوارث سمجھ کر چھوڑ دیا
ہے۔“ عائشہ آفندی پہلے ہی زہرہ تول شاہ کے غم میں جلی ہوئی بیٹھی تھیں اور اوپر سے اپنے دونوں بھائیوں کے
اس نئے فیصلے نے انہیں اور بھی جلا کر رکھ کر دیا تھا اور دانیال زندگی میں پہلی بار اپنی ماں کو اتنے سخت لہجے میں بات
کرتے سن کر حیران رہ گیا تھا بلکہ حیران تو وہ کبھی رہ گئے تھے کہ آخر عائشہ کو ہوا کیا ہے؟

”عائشہ! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ یہ سب کیا کہہ رہی ہو تم؟“ سرسراہٹ آندی اور اظہار آندی دونوں ہی تڑپ گئے تھے۔ کیونکہ ان کی بہن نے آج تک ان سے اس طرح بات نہیں کی تھی۔
”میں وہی کہہ رہی ہوں جو آپ لوگ کر رہے ہیں۔ کوئل آپ کو آذر کے لیے پسند آگئی ہے اور حرمت احمد کے لیے مناسب سمجھی جا رہی ہے تو پھر دانیال کے لیے کیا سوچا ہے آپ نے؟ اس کے لیے کہ پسند کیا گیا ہے آخر؟ بتائیے مجھے دانیال کدھر گیا بھلا؟“

عائشہ آندی دکھ کے مارے بھڑ جانے کو تھیں اور دانیال کے قدم جیسے زمین نے جکڑ لیے تھے، حرمت اور احمد کے نام پر اس کا دماغ چکر اُٹھ گیا تھا۔ اسے اچھا خاصا دھچکا سا لگا تھا۔

”تو گویا حرمت کے بچے کی تلخی کی اصل وجہ یہی تھی اور اسی لیے وہ قدرے اکھڑی اکھڑی سی لگ رہی تھی۔“ دانیال کے لیے؟“ وہ سب عائشہ آندی کی بات پہ جیسے ایک دوسرے کو دیکھ کے رہ گئے تھے۔

”ہاں! دانیال کے لیے۔“ انہوں نے بڑے خفگی بھرے لہجے میں کہا تھا۔
”دانیال کے لیے بھی ان شاء اللہ اچھا ہی ہو گا۔ وہ بھی ہمارا ہی بیٹا ہے اس کی شادی بھی اسی گھر میں ہوگی تم فکر کیوں کرتی ہو بھلا؟“ انہوں نے عائشہ آندی کو تسلی دینی چاہی تھی۔

”کیوں فکر نہ کروں؟ میں ہاں ہوں اس کی۔ اس کے دل کو مجھ سے بہتر کون جان سکتا ہے بھلا؟ آپ کا کوئی فیصلہ میرے بیٹے کے دل پہ گراں گزرے میں یہ کیسے برداشت کر سکتی ہوں؟“ عائشہ آندی آج چپ ہونے والی نہیں تھیں۔ جبکہ دانیال کو یہ گوارا نہیں تھا کہ اس کی ماں اپنے بھائیوں سے اس طرح لڑ بھگڑ کر اس کی پسند یا اس کا حق حاصل کرے۔ بلکہ اس سے تو بہتر تھا کہ وہ اپنی پسند اور اپنے دل میں پسند والی محبت سے ہی دستبردار ہو جاتا۔

”تو بتاؤ نا عائشہ؟ ایسا کیا ہے جو اس طرح تم سے برداشت نہیں ہو رہا۔ کچھ بتاؤ گی تو بتا چلے گا نا؟“ وہ لوگ اصرار کر کے تھک گئے تھے اور اس سے پہلے کہ عائشہ آندی بھی تھک ہار کے زبان سے کچھ کہہ دیتیں۔ دانیال ایک دم دروازہ کھیل کر اندر آ گیا تھا اور وہ سب اس کے اس طرح اچانک اندر چلے آئے نہ حیران رہ گئے تھے۔

”السلام علیکم!“ اس نے سب پر اک طائرانہ سی نظر ڈالتے ہوئے سب کو ہی سلام کیا تھا۔ البتہ آسیہ آندی کے چہرے پہ نظر پڑتے ہی اس کی نظر ٹھٹھکی گئی تھی۔ ان کا چہرہ بھیگا ہوا تھا اور اپنے اس بھیگے ہوئے چہرے کو چھپانے کی کوشش میں وہ ذرا سا سر جھکائے ہوئے بیٹھی تھیں۔

”وعلیکم السلام! تم یہاں؟“ عائشہ آندی اسے دیکھ کر ٹھٹھکی گئی تھیں۔ کیونکہ دانیال کے چہرے کے تاثرات کچھ اور ہی کہہ رہے تھے۔

”جی ہاں! آپ کے لیے ہی آیا ہوں۔ آپ کی میڈیسن کا ٹائم ہو رہا ہے۔ آپ کو پتا ہے نا۔ اگر میڈیسن وقت پر نہ لیں تو کتنا مسئلہ ہو جاتا ہے پھر؟ اس لیے آپ ابھی انہیں اور میرے ساتھ چل کر میڈیسن لیں اپنی۔“ دانیال نے بڑے اچھے اور نارمل طریقے سے کہتے ہوئے آگے بڑھ کے ان کا ہاتھ تھام کر انہیں صوفے سے اٹھالیا تھا۔

”ارے نہیں بیٹا! ابھی بیٹھنے دے اسے کچھ ضروری بات کرنی ہے اس سے۔“ اظہار آندی نے روکا تھا۔
”نہیں ماموں ان کی صحت سے زیادہ ضروری بات تو اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی اور ویسے بھی آپ سب ہیں نا۔ آپ بات کر لیں، بس انہیں فی الحال آرام کرنے دیں۔“ دانیال پہلی بار کسی بڑے کے سامنے اپنی من مانی کرتا ہوا ماں کو ساتھ لیے ڈیڈ اور آئی کو اک نظر دیکھ کر وہاں سے نکل آیا تھا اور عائشہ آندی اسے روکتی رہ گئی تھیں مگر اس نے واپس انیکسی میں آکر ہی دم لیا تھا۔



”صاحب! ہا ہر کچھ مہمان آئے ہیں۔“ زلفی اسے اطلاع دینے کے لیے اندر بھاگا آیا تھا۔

”کون مہمان ہیں؟“ دل آور نے اپنے پاس بیٹھے عبداللہ اور نبیل وغیرہ سے توجہ ہٹاتے ہوئے پوچھا تھا۔
”ملک شرافت علی اور ملک اسد اللہ آئے ہیں۔“ عظیم صاحبہ کی تعزیت کے لیے۔“ اب کی بار زلفی نے پورا نام لے کر ان کی آمد کی وجہ بتائی تھی۔ جبکہ وہاں بیٹھے سبھی افراد چونک گئے تھے کیونکہ اس نے ان لوگوں کا نام لیا تھا جن کی انہیں امید ہی نہیں تھی۔

”صاحب! کیا کروں؟ انہیں اندر لے آؤں یا پھر۔“ زلفی نے اسے خاموش دیکھ کر استفسار کیا تھا۔
”نہیں، نہیں ایسا نہیں کرنا، تم انہیں اندر لے کر آؤ۔“ دل آور نے کافی قفل سے کام لیتے ہوئے اسے ان لوگوں کو اندر لانے کا اشارہ دیا تھا اور زلفی تا بعد اری سے سر ہلاتے ہوئے پلٹ کر واپس چلا گیا تھا۔
”گل۔! عبداللہ نے گل کو آواز دی تھی۔

”جی صاحبہ جی؟“ گل ڈرائنگ روم کے سامنے سے گزرتے گزرتے ٹھہر گئی تھی۔
”زری اور نگار شہابی بی بی سے کہو اس طرف آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کچھ مہمان آئے ہیں اس لیے فی الحال اندر ہی رہیں۔“ عبداللہ نے گل سے کہہ کر زری اور نگار شہابی کو اندر آنے سے منع کر دیا تھا۔ تاکہ ان دونوں کا ان سے سامنا نہ ہو اور کوئی بد مزگی پیدا نہ ہو۔

”جی! ابھی کہہ دیتی ہوں۔“ گل فوراً پیغام لے کر پلٹ گئی تھی اور اتنے میں وہ لوگ بھی اندر آ گئے تھے۔
”السلام علیکم!“ ملک اسد اللہ نے اندر داخل ہوتے ہوئے کافی بلند اور دنگ قسم کی آواز میں سلام کیا تھا۔
”وعلیکم السلام!“ دل آور لاکھ شکستہ حال سہی، لیکن اب بھی دشمن کے سامنے ڈٹ جانے کی پوری پوری طاقت رکھتا تھا۔ اسی لیے اتنی شکستگی اور بے دلی کے باوجود انہیں دیکھ کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ آخر وہ اس کی ماں کے اظہار تعزیت کے لیے اس کے گھر آئے ہوئے تھے۔

”کیسے ہیں دل آور صاحب؟ کیا حال ہیں آپ کے؟“ ملک اسد اللہ نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس سے حال چال دریافت کیا تھا۔ حالانکہ اس کا حال کسی سے چھپا ہوا نہیں تھا۔ وہ کس قدر ڈھسے چکا تھا یہ تو صاف نظر آ رہا تھا۔

”اللہ کا شکر ہے۔“ دل آور نے بڑی مشکل، بڑے حوصلے سے جواب دیا تھا۔ کیونکہ اس کا کسی سے کچھ بھی کہنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔
”بیٹھے، تشریف رکھیے۔“ نبیل نے ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے انہیں بیٹھنے کے لیے صوفے کی طرف اشارہ کیا تھا۔

”مہوں، شکریہ“ وہ دونوں باپ بیٹا ان سے مل کر صوفے پہ بیٹھ گئے تھے اور ان کے بیٹھنے کے بعد وہ بیٹوں بھی بیٹھ گئے تھے اور پھر ملک شرافت علی نے فاتحہ خوانی کے لیے ہاتھ اٹھالے تھے اور ان کے ساتھ ساتھ وہاں بیٹھے سبھی افراد نے ہاتھ اٹھا کر فاتحہ پڑھی اور ان کی مغفرت کے لیے دعا کی تھی اور آمین کہتے ہوئے چہرے پہ ہاتھ پھیر لیے تھے۔

”جس گاڑی کے ساتھ ایکسپریمنٹ ہوا کیا اس کے بارے میں کوئی پوچھ پڑتا ہے؟“ ملک اسد اللہ دل آور سے مخاطب تھا جو چپ چاپ سر جھکائے ہوئے بیٹھا تھا۔
”پوچھ پڑتا ہے کیسی؟ یہ سب تقدیر تھی اور تقدیر میں جو کچھ ہو وہ ہو کر ہی رہتا ہے۔“ دل آور کا جواب بہت ٹھہرا ہوا اور بہت سادہ تھا۔ ملک اسد اللہ دیکھ کر رہ گیا تھا۔

”وہ تو ٹھیک ہے کہ تقدیر کا لکھا ہو کر ہی رہتا ہے۔ لیکن اب کوئی ہمارے سامنے ہمارے کسی اپنے کو قتل کر کے چلا جائے تو کیا ہمیں تقدیر کا لکھا سمجھ کر چپ کر کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کے بیٹھ جانا چاہیے یا پھر اس کی کوئی پوچھ پڑتا ہے۔“

بھی کرنی چاہیے۔ ”ملک اسد اللہ نے عجیب طنز سے لہجے میں سوال کیا تھا اور دل اور چند ٹانگیں کے لیے لب بچھنے کے رہ گیا تھا۔

”قتل خود کشی اور رب کی رضا سے آئی موت میں بڑا فرق ہوتا ہے ملک صاحب۔ قتل اور خود کشی کی وجہ سے آنے والی موت یہ صبر نہیں آتا جبکہ رب کی رضا سے آنے والی موت پہ انسان کو خود بخود صبر آجاتا ہے جیسے مجھے صبر آگیا ہے۔ البتہ آپ اگر یہ سمجھ رہے ہیں کہ کوئی ٹیکسی ڈرائیور جان بوجھ کر میری ماں جی کو گاڑی سے ٹکرا کر چلا گیا ہو گا تو ایسا بھی نہیں ہے۔ آخر اس ٹیکسی ڈرائیور کی میری ماں جی سے کیا دشمنی ہے۔ اس لیے مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں خواجہ پوچھ پڑتال کروں اور لوگوں کو سزا میں دوں۔ سزا دینے والی اور بخشنے والی تو اور والے کی ذات ہے۔ ورنہ میں کیا اور میری اوقات کیا۔ ”دل اور کالج بے حد بوجھل اور مضطرب سا ہو رہا تھا۔ جس پہ بے ساختہ اس کے برابر بیٹھے عبداللہ نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اس کا کندھا دیا تھا اور دل اور اس کے ہاتھ کے اس دباؤ پہ سر ہلا کے رہ گیا تھا۔

”خیر چھوڑو ان باتوں کو جو بھی ہوا ہے ہمیں اس پہ بے حد افسوس ہے۔ ماں باپ کا ہمیشہ ہمیشہ کا ساتھ تو کسی کو بھی نصیب نہیں ہوتا اور جن کو ہوتا ہے بہت خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ۔ لیکن وہ اس خوش قسمتی کی قدر نہیں کرتے۔ بہر حال اللہ ماں باپ کا سایہ سب پہ سلامت ہی رکھے تو اچھا ہے۔ ورنہ اولاد برباد جاتی ہے۔ ”ملک شرافت علی نے بھی کچھ بولنے کا فرض نبھایا تھا۔ ورنہ وہ مسلسل چپ ہی بیٹھتے ہوئے تھے۔

”یہ تو واقعی صحیح کہہ رہے ہیں آپ۔“ نیل نے ان کی بات سے اتفاق کیا تھا اور اتنے میں زلفی ان کے لیے چائے وغیرہ بھی لے آیا تھا۔ جس کے وس پندرہ منٹ بعد وہ دونوں باپ بیٹا اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

”چھادل اور صاحب! اجازت دیجیے اب فی الحال اتنا ہی کافی ہے آپ سے ملاقات کا ارادہ تو ہے، لیکن ذرا فرصت سے۔ کیونکہ اس وقت تو آپ کا اپنا غم بھی تازہ ہے اور وقت بھی مناسب نہیں ہے۔ اس لیے باقی کا قصہ پھر کسی وقت پہ اٹھا رکھتے ہیں“ اللہ حافظ۔ ”ملک اسد اللہ نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے اپنے مطلب کا اشارہ بھی دے دیا تھا اور پھر وہاں سے رخصت بھی ہو گئے تھے۔ البتہ ان کے جانے کے بعد دل اور پھر ٹھک ہار کے شکستہ سا صوفے پہ بیٹھ گیا۔



آج بٹول شاہ کا سوئم تھا۔ اس لیے آج وہ سب ہی ذرا جلدی گھر سے آگئے تھے البتہ طبیعت کچھ خراب ہونے کی وجہ سے مدحیہ ذرا لیٹ پڑی تھی۔ اسی لیے اس کے پہنچنے تک مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا اور ابھی وہ باہر روڈ پہ گاڑی پارک کر کے گاڑی سے اتر رہی تھی کہ اس کی گاڑی کے قریب ہی عدیل نے بھی بائیک کولا کر بریک لگا دی تھی اور مدحیہ اس اچانک بریک لگنے پہ چونک گئی تھی۔

”سلام علیکم! کیسی ہیں آپ؟“ وہ بائیک کولا کر بائیک سے اتر آیا تھا۔

”وعلیکم السلام! ٹھیک ہوں میں“ آپ سنا میں؟“ مدحیہ نے کافی دیر سے لہجے میں پوچھا تھا اور عدیل اس کی طبیعت کی اداسی اور سستی اس کے لہجے سے ہی محسوس کر گیا تھا۔

”اللہ کا احسان ہے سب ٹھیک ہے“ البتہ آپ ٹھیک نہیں لگ رہیں؟“ عدیل نے اسے سرتاپا گہری نظروں سے جانچا تھا اور اس کی نظروں کو بڑی تقویت ملی تھی۔ کیونکہ آج مدحیہ کسی الگ ہی روپ میں نظر آ رہی تھی اور عدیل کو آج اس کے سامنے اپنا دل اور اپنی نظریں بے اختیار ہوتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ کیونکہ وہ مغربی طور پر اطوار کی لڑکی اس وقت مشرقی طے میں نظر آ رہی تھی۔ اس نے آج شلواری ٹیڈی پہنی ہوئی تھی اور گلے میں دھنڈا

بھی نظر آ رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اسے آج پہلی بار اس لباس میں دیکھ کر عدیل کا دل چل چلا گیا تھا۔ لیکن دل پہ دھیان کون دے؟ وہ تو کسی بھی وقت کہیں بھی چل سکتا ہے۔

”ہیں ایسے ہی طبیعت کچھ بوجھل سی ہو رہی ہے۔ رات سے سر میں بہت درد ہے۔“ مدحیہ نے آہستگی سے کہتے ہوئے تپنٹی کو سہلایا تھا۔

”تو پھر آپ یہاں کیوں آئی ہیں۔ آپ گھر پہ آرام کر لیتیں۔“ عدیل کو پریشانی ہوئی تھی۔

”یہ آرام کرنے کا دن نہیں ہے نا۔ اس لیے آرام نہیں کر سکتی تھی۔ بٹول شاہ میری پھوپھی یا میری خالہ نہیں تھیں۔ بلکہ میری ماں تھیں اور اپنی ماں کے مرنے کے بعد آرام کیسے آتا ہے۔“ مدحیہ کا لہجہ بھرا گیا تھا۔

”اوہ ایم سوری! میرا یہ مطلب نہیں تھا میں تو محض آپ کی طبیعت کی وجہ سے ایسا کہہ رہا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ وہ آپ کے لیے کتنی اہم تھیں اور مائیں تو ہوتی ہی اہم ہیں۔ اسی لیے تو ان کے چھڑنے پہ اتنا دکھ ہوتا ہے اور آپ کے اسی دکھ پہ تو ہم سب کو بھی دکھ ہو رہا ہے بے حد افسوس بھی ہے مگر اب ہم سب ان کی مغفرت کی دعا کے سوا اور کر بھی کیا سکتے ہیں بھلا؟“ عدیل نے بڑے اچھے طریقے سے اسے سمجھانے کی اور ڈھارس بندھانے کی کوشش کی تھی، لیکن تب تک مدحیہ کے آنسو اس کے رخساروں تک بہہ آئے تھے اور عدیل بے چارہ بے چین سا ہو گیا تھا۔

”پلیز! آپ اس طرح روئیں مت روئے سے کوئی واپس نہیں آجاتا۔ بلکہ اس روئے سے بہتر ہے کہ آپ ان کے لیے جنت الفردوس میں بلند درجات کی دعا کریں۔ جس سے انہیں بھی فائدہ ہو اور آپ کو بھی خوشی اور سکون حاصل ہو۔ یہ روٹا دھونا چھوڑیں پلیز۔ اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔“ عدیل اسے اب ذرا سنجیدگی سے سمجھا رہا تھا اور مدحیہ بالا خر نشو سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کچھ دیر کے لیے سنبھل سی گئی تھی۔

”متھنک یو! میں فی الحال اندر چلتی ہوں۔ آپ بھائی وغیرہ سے مل لیں۔ مہر حضرات کے لیے انہوں نے شاید سامنے گراؤنڈ میں انتظام کیا ہوا ہے۔“ مدحیہ لوگوں کی آمد و رفت دیکھ کر عدیل کو گراؤنڈ کی طرف اشارہ کرتی خود آگے بڑھ گئی تھی۔

”مدحیہ! نیلے پلیز۔“ عدیل نے اسے پیچھے سے پکارا تھا اور مدحیہ کے قدم روڈ کراس کرتے کرتے ٹھہر گئے تھے۔ اس نے آج اسے اس کے نام سے پکارا تھا۔ اسی لیے وہ اسے سوائے نظروں سے دیکھ کے رہ گئی تھی۔

”پلیز اب رویے کا مت ورنہ میرے دل کو پورا دن بے چینی ہوئی رہے گی۔“ عدیل جیسے التجا کر رہا تھا اور مدحیہ اس کی اس التجا پہ اپنے دل کو دھڑکنے سے روک نہیں پائی تھی اور وہ اسے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر اس کے سامنے سے ہٹ گیا تھا۔ آخر وہ دونوں تقریباً ”روڈ کے پتوں پہنچ ہی کھڑے تھے اس لیے وہ بھی ہٹ گئی تھی۔



شام ہو چکی تھی اور بٹول شاہ کے سوئم کا دن بھی تمام ہو چکا تھا۔ سب لوگ سب مہمان رخصت ہو چکے تھے۔ اب صرف عبداللہ اور نیل کی لیمولینز تھیں جو یہاں اس کے پاس موجود تھیں اور وہ ان لوگوں کے درمیان اکیلا اور خاموش بیٹھا ہوا تھا۔

”دیکھو بیٹا! تم خود سمجھ دار ہو تمہیں ہمارے سمجھانے کی تو ضرورت ہی نہیں ہے لیکن پھر بھی تمہیں ایک ماں ہونے کے ناتے اپنی تسلی ضرور دہوں گی کہ بے شک میں نے اپنی کوکھ سے صرف نیل کو پیدا کیا ہے لیکن میری نظر میں تم میں اور نیل میں کوئی فرق نہیں ہے۔ تم میرے لیے نیل ہی ہو اس لیے کبھی بھی اپنے آپ کو تنہا مت سمجھنا۔ نیل اور مدحیہ تمہارے بہن بھائی ہیں تو میں ماں ہوں تمہاری۔ تم ہم سے کچھ بھی کہہ سکتے ہو۔ تمہیں

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

مجموعہ خاص کیوں نہیں؟

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیننگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں ایڈونگ
- ☆ سیریم کوالٹی مائیکرو ایڈونگ
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
- ☆ ایڈٹری لٹس، لٹس کو میب کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

☆ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

☆ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے نہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہمارے سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

کوئی بھی روک رکاوٹ نہیں ہے۔ نہ آج نہ کل نہ پھر کبھی۔ ہاں تم اگر ماں سمجھ کر مجھ سے کچھ کہو گے تو مجھے خوشی ہوگی کہ تم نے مجھے پرایا نہیں سمجھا۔ دل اور کے قریب ہی بیٹھی فائزہ بیگم نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا تھا اور اس کی ہمت بندھانے کی کوشش کی تھی۔ جس پر دل اور محض سر ہلا کے رہ گیا تھا۔

زری اسے اس حال میں دیکھ کر اندر ہی اندر مر رہی تھی۔ اس کا دل اس کا شاہ دیہی تھا۔ اسے تو کچھ سوچہ ہی نہیں رہا تھا۔ وہ تو خود پر بضط کیے اس کا یہ حال اور اس کا یہ حلیہ برواشت کر رہی تھی ورنہ اس پر کیا بیت رہی تھی؟ یہ تو صرف وہ جانتی تھی یا پھر اس کا خدا جانتا تھا۔ کیونکہ دل اور کے اس حال پر اس چلے اور اس دکھ پر اس کا دل کس طرح کٹ رہا تھا؟ یہ صرف خدا ہی جان سکتا ورنہ کسی انسان کے بس کی تو بات ہی نہیں تھی۔

”صاحب! آپ کے لیے فون ہے کسی کا۔“ وہ سب باہر لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جب ہمیشہ کی طرح زلفی پیغام لے کر حاضر ہوا تھا اور دل اور نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

”کس کا فون ہے؟“

”صاحب! شاید جسٹس احمد کریم نام بتایا ہے انہوں نے انگلینڈ سے فون کیا ہے۔“ زلفی نے نام یاد رکھنے کے لیے ذہن پر پورا پورا زور ڈالا تھا اور کامیاب ہو ہی گیا تھا۔

”ہوں۔ ٹھیک ہے میں آ رہا ہوں۔“ اس نے اثبات میں جواب دیا تھا اور کرسی وکیل کر آہستگی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا جبکہ زلفی اس سے پہلے ہی واپس پلٹ گیا تھا کیونکہ فون ہولڈ پر رکھا ہوا تھا۔

”آپ لوگ بیٹھیں میں آپ کے لیے چائے بھجواتا ہوں تب تک میں فون کال سن لوں۔“

”مرے نہیں یا راجائے کی ضرورت نہیں ہے تم فون کال سن لو پھر بات کرتے ہیں۔“ عبد اللہ نے اسے منع کیا تھا مگر وہ سنی ان سنی کرتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا۔

”میرا خیال ہے ہمیں اب واپس چلنا چاہیے۔ دل اور بھائی بھی خاصے تھکے ہوئے ہیں۔ انہیں بھی فی الحال آرام کی ضرورت ہے۔ آپ لوگوں نے جو بھی بات کرنی ہے کل کر لیجیے گا ابھی مناسب نہیں ہے۔“ نگارش نے ان لوگوں کو مزید کوئی بھی بات کرنے سے روک دیا تھا اور عبد اللہ، نبیل اور فائزہ بیگم کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ جیسے ان کی رائے لینا چاہی ہو۔

”ہاں! کہہ تو وہ ٹھیک ہی رہی ہے فی الحال اسے آرام کی ضرورت ہے۔ ہم لوگوں کو چلنا چاہیے۔ باقی باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی۔“ فائزہ بیگم نے بھی نگارش کی بات سے اتفاق کیا تھا۔

”ٹھیک ہے پھر تم لوگ بھی چلنے کی تیاری کر دو“ عبد اللہ نے نگارش اور زری کو اشارہ کیا تھا اور وہ دونوں ہی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ ان کے بیگ وغیرہ اندر رکھے ہوئے تھے اس لیے وہ دونوں آگے پیچھے چلتی ہوئی اندر آگئی تھیں۔ نگارش اس سے آگے تھی۔ اس لیے وہ زری سے پہلے ہی آگے بڑھ کے لاؤنج میں داخل ہو گئی تھی۔

جبکہ نگارش کے پیچھے آنے والی زری کے قدم ڈرائنگ روم کے سامنے سے گزرتے ہوئے بے ساختہ ہی وہیں کے وہیں رک گئے تھے۔ کیونکہ اندر سے فون پر بات کرتے دل اور کی آواز بابت ہر تک سنائی دے رہی تھی اور اس کی آواز سن کر زری وہاں سے گزر جاتی۔ یہ بھی تو ایک ناممکن سی ہی بات تھی نا؟ اور دل اور جو انتہائی مختصر سی بات کر رہا تھا چند سیکنڈ بعد بات کو سمیٹتے ہوئے فون بند کر کے اچانک ڈرائنگ روم سے باہر نکل آیا تھا اور ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے کے عین سامنے کھڑی زری کو دیکھ کر ٹھنک گیا تھا۔

”خیریت؟“ دل اور نے ذرا تشویش سے پوچھا تھا۔

”جی خیریت۔“ زری نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

”آپ نے اندر جانا ہے کیا۔“ دل اور نے قدرے الجھ کر استفسار کیا تھا۔

”نہیں۔“ زری نے نفی میں جواب دیا تھا۔

”تو پھر؟“ اب اس کی الجھن اور بھی بڑھ گئی تھی۔

”مجھے بتول انٹی کے حوالے سے کچھ کہنا تھا۔ مگر اب جب کچھ کہنا چاہ رہی ہوں تو میرے پاس یوں لگ رہا ہے کہ جیسے سارے الفاظ ہی ختم ہو گئے ہیں۔ جیسے کچھ کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں رہا۔ سب ختم ہو گیا ہے۔“ زری واقعی بہت کوشش کر رہی تھی کچھ کہنے کی مگر اس سے کچھ بھی کہنا نہیں جا رہا تھا۔

”ہاں یہ تو سچ ہے سب ختم ہو گیا ہے باقی تو کچھ بھی نہیں رہا۔“ وہ جیسے خود کلامی کے سے انداز میں بولا تھا اور اس کے اس انداز پر زری نے بے ساختہ اس کے چہرے کی سمت دیکھا تھا۔ وہ نظریں جھکائے ہوئے کھڑا تھا۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟ کیا ختم ہو گیا ہے؟ اور کیا باقی نہیں رہا کچھ بتانا پسند کریں گے آپ۔“ اب کی بار زری کو ابھن ہوئی تھی اور اس نے دل آور کو سر ہات بے چین اور مضطرب سی نظروں سے دیکھا تھا۔

”پلیز، راستہ چھوڑیں یا ہر سب انتظار کر رہے ہوں گے۔“ دل آور نے اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے وہاں سے گزر جانا چاہا تھا۔

”میں بھی سراپا انتظار ہوں دوکیل صاحب، آپ کو میرا انتظار نظر کیوں نہیں آتا؟“ زری اس کی سر دھری پہ بھر گئی تھی۔ اس کا دل چاہا وہ اس کے گریبان کو دونوں ہاتھوں میں دبوچ کر چنچھوڑا لے۔ مگر وہ ایسا کر بھی تو نہیں سکتی

تھی۔ نا۔ آخر وہ اس کا اپنا دل تھا۔ چاہے جیسا بھی تھا۔

”پلیس زرن، راستہ چھوڑ س۔“ دل اور نے پھر التجا کی تھی۔

”آپ کا راستہ چھوڑ دوں تو پھر کس کا راستہ لوں وکیل صاحب؟ کوئی تو راستہ دکھائیں؟“ زری اس سے زیادہ بے بسر اور تڑھال لگ رہی تھی اور اس کا لہجہ بھی رومانسایا ہو رہا تھا۔

”زرین! میں نے آج تک آپ سے کبھی کچھ بھی نہیں کہا۔ لیکن آج اگر کچھ کہوں گا تو آپ کو چاہیے کہ آپ میرے اس کہنے سے؟ اس کچھ جائز اور مٹا دے صرف اتنا کہوں گا کہ ”ذرا اور شاہو مدد کا ہے“ نہیں اور کچھ نہیں۔“

دل اور کے بے تاثر؟ جیسی اور سفاک لہجے میں کہے گئے اس جملے نے زرین ملک کی مدح کھینچ لی تھی اور اس کا کلیجہ جسے منہ کو آگیا تھا۔ وہ اپنے سامنے کھڑے دل، آنسوؤں سے بھیستے ہوئے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر سو رہا تھا۔

جیسے منہ کو ایسا تھا۔ وہ اپنے سانسے کھڑے دل اور نوپسی پسی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی کہ وہ یہ سب لیا اور یوں کہہ رہا ہے؟“ اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔

اور اب وہ سارے حرف جوڑنا بھی چاہتی تو نہیں جوڑ سکتی تھی، کیونکہ اس میں سکت ہی نہیں تھی۔

”مہم۔ ویل صاحب اہل اور ساہ مرچکا ہے کو پھر زری یوں زندہ ہے؟“ اس نے بڑی دیر بعد ہوئے ہوئے سے لہجے میں پوچھا تھا۔

”تمہیں کچھ نہیں جانتا زرین میں نے جو کہنا تھا، کہہ دیا ہے، پلیز اب راستہ چھوڑیں۔“ دل اور اس کی سمت دیکھے بتا رہا ہداری کی دوسری سمت دیکھنے لگا تھا جبکہ وہ بری طرح تڑپ اٹھی تھی۔

”راستہ چھوڑ دوں، کیوں دلیل صاحب! کیوں راستہ چھوڑ دوں؟ اک عمر آپ کے راستے میں گزار دی ہے۔ کیوں صاحب اور آپ کہہ رہے ہیں کہ راستہ چھوڑ دوں؟ آخر کیوں؟ کیا وجہ ہے؟ آپ اتنے دنوں سے مجھے اپنے کیوں

ہیں لگ رہے؟ مجھے اتنے دلوں سے کیوں یہ احساس ہو رہا ہے کہ آپ میرے نہیں رہے؟ مجھے کیوں لگ رہا ہے کہ دل اور شاہ نظریں پھیر چکا ہے اور زرین ملک جیتے جی لٹ چکی ہے۔ میں جب جب آپ کو دیکھ رہی ہوں تو

مجھے کیوں احساس ہو رہا ہے کہ میں ایک اجنبی، غیر اور پرانے مرد کو دیکھ رہی ہوں۔ وکیل صاحب میں آپ کو

دیکھوں اور مجھے شرمندگی ہو، ایسا کیوں ہے آخر، کیوں؟ بتائیے مجھے وکیل صاحب، جواب دیجئے مجھے؟“ زری دھواں دھار روتے ہوئے مسلسل ایک ہی تکرار کیے جا رہی تھی اور اسے اپنے آس پاس کا بھی خیال نہیں رہا تھا کہ اگر اچانک کوئی اندر آگیا تو کیا سوچے گا۔

”میں آپ کو اجنبی، غیر اور پر ایسا لگ نہیں رہا، بلکہ میں ہوں، میں اجنبی بھی ہوں، میں غیر بھی ہوں اور میں پر ایسا بھی ہوں، آج سے نہیں، بلکہ ازل سے ہوں اور اب تک ایسا ہی رہوں گا۔ اس لیے آپ کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ

فل اور شاہ مرچکا ہے۔ ”اس نے اپنے اک اک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا تھا اور پھر لب بھینچتے ہوئے اس کی اک ساڑ سے ہو کر گزر گیا تھا اور زری اس کے اس طرح گزر جانے نہ ٹپ ٹپ گئی تھی۔

”وسیل صاحب، یہ کیا کہہ دیا ہے آپ نے؟“ وہ پیچھے سے پوچھنی تھی، لیکن دل آدر راہداری عبور کر کے جا چکا تھا۔

”دیکھ صاحب!“ وہ پھر زور سے چیختی تھی۔ مگر تب تک نگارش اس کے قریب آچکی تھی۔
 ”زیرِ پیلن! سنبھل جاؤ، بے پروا نہ ہو۔“ نگارش کا انا لہجہ بھی ابھگ رہا تھا۔ وہ زور کا تڑپ رہا تھا۔

”بھابھی! وہ کیا کہہ گیا ہے۔ سنا آپ نے۔۔۔ اس نے۔۔۔ تگ کیا کہا ہے؟“ وہ بچکیوں سے روتے ہوئے نگار شہ کا بازو تھام کر مایہ کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔

”ہاں سن چکی ہوں سب سن چکی ہوں اسی لیے تو رو رہی ہوں کہ سب سن لیا ہے۔“ نگار شلاؤنچ سے نکل کر ادھر آ رہی تھی جب ان دونوں کو راہ داری میں کھڑے دیکھ کر وہ بکا بکا ہنسنے لگی تھی۔

”بھابھی! زری بری طرح روتے ہوئے نگارِش کے کندھے سے لگ گئی تھی۔“

”جی! آ رہے ہیں۔“ نگارش زری کو سنبھالتی ہوئی آگے بڑھ آئی تھی اور عبداللہ ان دونوں کو بتول آنٹی کی وجہ سے لڑائی سے بچانے کے لیے آگے آ کر کھڑا ہوا تھا۔

مگر آج اس گھر سے جاتے ہوئے نہ جانے کیوں زرمی کا دل رو رہا تھا اور بڑی شدت سے رو رہا تھا۔

نکاح سے اسے مسئلہ لار کاڑی میں بھجایا گیا اور عبد اللہ نے گاڑی اشارت لروی سی۔ جیل ان سے پہلے ہی گاڑی نکال لے گیا تھا۔ اب بس عبد اللہ کی باری تھی اور وہ بھی اک جھٹکے سے گیٹ عبور کر گیا تھا اور گیٹ سے نکلتے ہوئے منٹا منٹا لباس پہن کر گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی چلا کر لے گیا تھا۔

نہتے ہوئے سامنے ڈرا میو ہے پہ لہڑے دل اور کو دیکھ لڑکاڑی میں نیکی زری لٹ لٹ کر پڑی تھی۔
کوئی ناز تھا جو رہا نہیں
کائنات کی توجہ کا اس پر

کوئی خیال بھاجو کہا نہیں
کوئی آرزو تھی وہی وہی
کہ آج تیرا ہوا میرا

کوئی بوجھ تھا جو ہمارا نہیں
کسی موڑ پر تو وہ ملے مجھے

کونلی موڑ ایسا بتائیں

وہ سب چلے گئے تھے اور وہ اکیلا رہ گیا تھا۔ اب وہ تھا یا اس کی تنہائی تھی اور اس کی اس تنہائی میں صرف سنگین ٹول کا دھواں ہی تھا جو اسے سرخ، آغوش، ہر لہجہ، ہاتھ اور اس کے جسم پر بخیر بھرا ہوا دکھاتا تھا۔

کیونکہ انسان کا دل جل رہا ہو تو انسان خود دھواں ہی ہو جاتا ہے اور دل آور کے ساتھ بھی اس وقت ایسا ہی ہو رہا

تھا۔ وہ گیلی لکڑی کی طرح سلگ رہا تھا اور وہ سگریٹ کی طرح بجھ رہا تھا۔ اس کا سورج کی طرح دکھنا اور چرخہ کی طرح روشن ہونا بہت پیچھے رہ گیا تھا اور وہ اب پیچھے جا کر سب کچھ موڑ کے واپس نہیں لاسکتا تھا۔ کیونکہ اب وہ کچھ پیچھے رہ گیا تھا وہ بس پیچھے ہی رہ گیا تھا۔ بالکل ایسے جیسے زری پیچھے رہ گئی تھی۔ اسے پکارتی رہ گئی تھی۔

اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کی طرف سے آنکھیں کان اور دل بند کر کے وہاں سے چلا آیا تھا اور چھوڑ آیا تھا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اور عمر بھر کے لیے۔

اب اسے آگے کو سفر کرنا تھا۔ وہ سفر جو اس کی اماں اس کے پاؤں سے باندھ گئی تھیں اور جس سے ہٹنا اب اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ کیونکہ اب وہی اس کا سفر تھا اور اب وہی اس کی منزل تھی اور اپنی منزل سے کوئی کب تک دور رہ سکتا ہے آخر بھی نہیں۔

اور یہ سچ تھا کہ دل اور اگر سفر تھا تو علیز سے اس کی منزل تھی۔

اور علیز سے اگر سفر تھی تو دل اور اس کی منزل تھا۔

ان کا تو سفر اور منزل کا سا ساتھ تھا۔

جو شروع سے چلا آ رہا تھا اور جس نے ہمیشہ رہنا تھا۔

یہ پل دوپل کی دوری بھی کوئی دوری تھی بھلا۔

اس نے پلٹنا تو آخر منزل کی طرف تھا سو وہ پلٹ گیا تھا۔

رات کے تین بجے کا وقت تھا جب وہ آخری سگریٹ اپنے بوٹ تلے مسل کر گھری سانس کھینچتا ہوا لان سے پلٹ کر اندر آ گیا تھا۔ گل گلاب خان اور زلفی تو مہمانوں کے جاتے ہی اپنے اپنے کوارٹرز میں چلے گئے تھے۔ اب بس اسی کے لیے اندرونی مین ڈور کھلا ہوا تھا۔ اس لیے اس نے اندر آتے ہی مین ڈور بند کر دیا تھا اور قدم بیڑیوں کی طرف بڑھا دیے تھے۔

بے شک اس کا رخ اپنے بیڈ روم کی طرف تھا، لیکن پھر بھی اپنے بیڈ روم کے حوالے سے اس کا ذہن بالکل صاف اور سلیٹ کی مانند تھا۔ کہیں کوئے کھدرے میں بھی یہ خیال نہیں تھا کہ اس کے بیڈ روم میں کوئی اور بھی موجود ہے۔ البتہ اپنے بیڈ روم کے دروازے کا ہینڈل گھما کر اندر داخل ہوتے ہی وہ یکدم ٹھنک سا گیا تھا اور اس کا صاف سلیٹ کی مانند ذہن پھر سے طرح طرح کی سوچوں اور طرح طرح کے خیالوں سے بھر گیا تھا۔ لیکن اب اور کتنا سوچنا، تنگ آکر سوچوں اور خیالوں کو ذہن سے جھٹکنا ہوا دروازہ لاک کر کے آگے بڑھ آیا تھا اور صوفے کے قریب آکر قدم رک گئے تھے اور نظریں علیز سے ٹھہر گئی تھیں۔

وہ نہ جانے کب یوں ہی صوفے پہ بیٹھے بیٹھے سو گئی تھی اور اس کا سر اور بازو دائیں طرف لڑھک چکے تھے نیند گہری تھی اسی لیے اسے احساس نہیں تھا کہ وہ کتنی بے ترتیب ہوئی پڑی ہے اور دل اور کی نظریں اسے سر سے پاؤں تک دیکھ رہی ہیں۔

شاید اسے احساس ہو تا تو وہ یکدم تڑپ کر اٹھ کھڑی ہوتی۔

مگر بات پھر وہی تھی کہ نیند گہری تھی۔

اور اس کی اس گہری نیند کا دل اور کو بھی احساس ہو چکا تھا۔ اسی لیے وہ قدم اور بڑھا کے سوئی ہوئی علیز کے برابر ہی صوفے پہ بیٹھ گیا تھا اور انتہائی احتیاط کے ساتھ اس کا مرمریں سانا زک ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا اور پھر آہستہ آہستہ اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں دبائے لگا تھا۔ جیسے اسے نری سے سلما رہا ہو اور علیز سے اس

سلانے کسمپاسی گئی تھی۔

”علیز سے“ اس کے کسمپاسے دل اور نے آہستگی سے اسے پکارا تھا لیکن نیند گہری تھی۔ اس لیے وہ نہ سن سکی تھی اور نہ محسوس کر سکی تھی۔ البتہ دل اور اس کے ہاتھ کے لمس کو بڑے بوجھل دل سے محسوس کر رہا تھا۔

”علیز سے“ بات سنو میری۔ میں تمہارا ہوں۔ سنبھالو مجھے۔ نہیں سنبھالو گی تو پچھتاؤ گی۔ آج وقت ہے تمہارے پاس۔ آج میں تمہاری مٹھی میں ہوں۔ آج مجھے قید کر لو۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے پاس رکھ لو۔ میری ہوجاؤ۔ اور مجھے اپنا کر لو۔ علیز سے۔ آج دل اور شاہ کسی کا بھی نہیں تمہارے سوا۔ آج غافل مت رہو۔ جاگ جاؤ علیز، غفلت کی نیند اچھی نہیں ہوتی۔ آج مجھے ضرورت ہے تمہاری۔ میرے ساتھ جاؤ۔ میرے ساتھ بات کرو۔ میرے سینے پہ ہاتھ رکھو۔ مجھے قرار دو علیز۔ میں بے سکون ہوں مجھے سکون دو۔ دعاؤ مجھے۔ علیز سے مجھے دعاؤ۔“ اس نے انتہائی بوجھل اور گھبراہٹ میں کہتے ہوئے اپنے دکھ کی شدت اور اپنے رشتے کی عقیدت تک جاتے ہوئے علیز کے کا وہی مرمریں سا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا تھا اور جہاں اس کے ہونٹوں کی مر سے علیز کے کا وجود معتبر ہوا تھا وہیں علیز کے ہاتھ کے پاکیزہ لمس سے دل اور شاہ کے ہونٹ بھی معتبر ہو گئے تھے۔

علیز سے کا ہاتھ اور دل اور کے ہونٹ ایک دوسرے کو چھو کر جیسے مہک اٹھے تھے۔

کیونکہ یہ ان کا ایک دوسرے کے لیے زندگی کا پہلا لمس تھا۔ جس سے ان کا رشتہ مزید پائیدار ہوا تھا اور ان کی ایک دوسرے پہ مر لگ گئی تھی۔

ہاں یہ اور بات تھی کہ علیز سے اس مر سے اس لمس سے اور اس احساس سے انجان تھی بے خبر تھی۔ وہ اس پہ اپنے حق اور اپنے استحقاق کی پہلی مہر ثبت کر چکا ہے۔ اسے خبر ہی نہیں تھی۔

اور اس کی اسی بے خبری میں دل اور نے اس کا ہاتھ چھوڑ کر آہستگی سے اس کی کمر میں بازو حائل کرتے ہوئے بے حد احتیاط سے اسے اٹھالیا تھا اور صوفے سے بیڈ تک کا فاصلہ طے کرتے ہوئے ذرا سا جھک کر اسے بیڈ پہ لٹا دیا تھا۔ کیونکہ وہ اتنے دنوں سے صوفے پہ ہی سو رہی تھی لیکن اگر گہرائی سے سوچا جاتا تو وہ آخر کب تک صوفے پہ سو سکتی تھی؟

جب ایک رشتہ بن چکا تھا سب کچھ قبول کیا جا چکا تھا تو پھر اس رشتے کی حقیقتوں کو قبول کرنے میں بھلا کیا قیامت تھی؟ وہ صوفے پہ سوئی یا بیڈ پہ بات تو ایک ہی تھی رشتہ تو وہی تھا۔ سو وہ بیڈ پہ ہی سوئی تو بہتر تھا، کیونکہ بیڈ پہ اب اس کا اور دل اور کا برابر کا حق تھا اور وہ اسے یہ حق خود اپنے ہاتھوں سے سونپ چکا تھا۔ اسے بیڈ پہ لٹا کر گہل پھیلا کے اس کے اوپر اوڑھالیا تھا اور خود دوبارہ ٹھکے ٹھکے قدموں سے چلتا ہوا رانگ چیر تک چلا آیا تھا جہاں پچھلے کئی دنوں سے اس کی کئی راتیں تمام ہو رہی تھیں اور آج کی رات بھی یوں ہی تمام ہو گئی تھی۔



علیز سے سو رہی تھی جب گل کی آواز پہ اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اس نے بے ساختہ چھت کی طرف دیکھا تھا اور پھر اپنے دائیں بائیں نظروں ڈالی تھی اور خود کو صوفے کے بجائے بیڈ پہ پا کر اسے جیسے کرنٹ چھو گیا تھا۔ وہ اک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی تھی اور سامنے ہی رانگ چیر پہ بیٹھے دل اور پہ نظر پڑی تھی۔ وہ گل کی طرف متوجہ تھا جو اس کے لیے نیل پہ ناشتا لگا رہی تھی، کیونکہ دل اور کو ناشتے کی طلب ہو رہی تھی اور اس نے گل سے کہہ کر ناشتا ہمیں منگوا لیا تھا۔ اس لیے اس وقت اس کا دھیان ناشتے کی طرف ہی تھا۔

جبکہ علیز سے اسے اپنی سمت متوجہ کرنے کے لیے بے چین ہو رہی تھی، لیکن گل کی موجودگی کی وجہ سے

اسے تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہی رہنا پڑا تھا۔ جس پر وہ مزید پہلو بدل کر رہ گئی تھی۔
 ”ارے علیزے بی بی! آپ اٹھ گئیں۔ کیا آپ کے لیے بھی ناشتا لے آؤں؟“ گل واپس پلٹتے ہوئے اسے دیکھ کر رک گئی تھی۔

”ہوں۔۔۔ نہیں ابھی بھوک نہیں ہے۔“ علیزے نے بے ہوشی میں نفی میں سر ہلایا تھا۔
 ”ٹھیک ہے، آپ فریش ہو جائیں، میں بعد میں ناشتا بنا دوں گی۔“ گل علیزے کو صاحب کے بیڈ پر سوئے ہوئے دیکھ کر دل ہی دل میں بہت خوش ہوئی تھی۔ اسی لیے اب اسے بڑے آرام سے فریش ہونے کا کہہ کر باہر نکل گئی تھی اور وہ دونوں بیڈ روم میں اکیلے رہ گئے تھے۔

علیزے جو اتنی دیر سے اسے اپنی سمت متوجہ کرنے کے لیے بے چین ہو رہی تھی اب تنہائی ملتے ہی چپ سی ہو گئی تھی۔ اسے کچھ سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سے کیسے اور کیا کہے؟ اک عجیب سی جھجک تھی جو اس کے کچھ کہنے کے آڑے آ رہی تھی اور ایسا شاید پہلی بار ہوا تھا۔ ذرا سوچ رہا تھا۔ ”وہ تو ذرا نیورس سے ہر بات بلا جھجک کہہ جاتی تھی۔ شاید پہلے وہ ذرا نیورس کو اپنی برابری سمجھتی تھی اس لیے اور اب وہ خود کو ذرا نیورس کی برابری سمجھ رہی تھی اس لیے اس سے کچھ کہا ہی نہیں جا رہا تھا۔ وہ کچھ پوچھنے کی کوشش کے باوجود بھی اس سے پوچھ نہیں پاتی تھی۔“
 ”گڈ مارننگ!“ بالآخر دل آور نے ہی بولنے میں پہل کی تھی مگر علیزے نے پھر بھی۔ اسے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

”ناشتا کرو گی؟“ دل آور بھی آخر بتول شاہ کا ہی بیٹا تھا زندگی نبھانے والا۔
 ”نہیں“ اور وہ بڑی حویلی کی بیٹی تھی کچھ بھی نہ سمجھنے والی سب کچھ لمبا میٹ کر دیئے والی۔
 ”ہوں، میں جانتا ہوں، تم اس وقت کس سوچ پر ٹھہری ہوئی ہو۔“ دل آور نے اک نظر اسے دیکھتے ہوئے کہا اور جوس کا گلاس اٹھالیا تھا اور ذرا توقف سے گویا ہوا تھا۔

”تم رات کو سو رہی تھیں، تمہیں صوفے سے اٹھا کے بیڈ تک میں لے کر آیا تھا۔“ اس نے انتہائی مضبوط اور تحمل آمیز لہجے میں اس کے ان کے سوال کا جواب دیا تھا، تاکہ وہ الجھتی نہ رہے۔
 ”مگر میرے خیال میں ہمارے درمیان ایسا کوئی تعلق اور ایسا کوئی رشتہ نہیں ہے، جس کے حوالے سے تم مجھے صوفے سے بیڈ تک لے کر آئے ہو؟“ علیزے ڈر اور جھجک کے باوجود بھی بالآخر کہہ ہی گئی تھی اور دل آور جوس کا گلاس ہونٹوں سے لگاتے لگاتے یکدم ٹھہر سا گیا تھا۔

”کیا کہا تم نے؟ ذرا پھر سے کہنا۔“ دل آور نے جیسے اس کی بات پر غور کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر علیزے نے وہی بات دوبارہ کہنے کی کوشش نہیں کی تھی وہ یونہی چپ کی چپ بیٹھی رہی تھی۔
 ”ہوں! تو تمہارے خیال میں ہمارے درمیان ایسا کوئی تعلق اور ایسا کوئی رشتہ نہیں ہے جس کے حوالے سے میں تمہیں صوفے سے بیڈ تک لے کر جا سکوں؟“ اس نے پرسوج سے انداز میں کہتے ہوئے جوس کا گلاس واپس نیل پر رکھ دیا تھا۔ اور آہستگی سے کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”تو پھر اتنے دنوں سے تم کس تعلق اور کس رشتے کے حوالے سے میرے ساتھ میرے بیڈ روم میں قیام پذیر ہو؟ کیوں میرے ساتھ ایک ہی چھت تلے رہ رہی ہو؟ کیوں میرے سامنے میرے لیے ایک تسلی ایک پیلا سا بن کر بیٹھی ہوئی ہو؟ آخر کس تعلق اور کس رشتے کے حوالے سے؟“ دل آور کو علیزے کی بات بری لگی تھی اور اسے اس بات پر غصہ بھی آیا تھا۔

”کیوں کہ میری نظر میں یہ تعلق اور یہ رشتہ ہے مگر تمہاری نظر میں یہ تعلق اور یہ رشتہ کچھ بھی نہیں ہے اس لیے تو میں پہلے بھی قید تھی اور میں آج بھی قید ہوں۔ بس فرق صرف اتنا آیا ہے کہ وہ بیسٹنٹ تھا اور یہ بیڈ روم

ہے۔ وہاں فرش کا بستر تھا یہاں فوم کا بستر ہے۔ وہ سخت تھا یہ نرم ہے۔ کھانا وہاں بھی ملتا تھا کھانا یہاں بھی ملتا ہے۔ میں تب بھی جی رہی تھی میں اب بھی جی رہی ہوں، تم کل بھی مجھ پر حاوی تھے تم آج بھی مجھ پر حاوی ہو۔ اور میں کل بھی تمہارے سامنے بے بس تھی آج بھی بے بس ہوں اور ہمیشہ اسی طرح بے بس ہی رہوں گی۔ میرا وجود میری ذات اور میرا غور نہ کل تھے نہ آج ہیں نہ آئندہ ہوں گے۔“ علیزے کہتے ہوئے بے ساختہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی اور دل آور جن قدموں پہ کھڑا تھا انہی قدموں پہ دم بخود سا کھڑا رہا تھا۔

تو علیزے کے اندر یہ غبار تھا کہ وہ بیسٹنٹ سے نکل کر بیڈ روم میں کیوں قید ہے؟ اور دل آور کو خبری نہیں تھی۔

”یہ تعلق یہ رشتہ تمہارا احسان نہیں ہے مجھ پر یہ احسان ہے تو صرف تمہاری ماما کا جنہوں نے میری عزت کو عزت سمجھا اور مرنے سے پہلے میرا نکا سر ڈھانپ دیا میری خاطر میری عزت کی خاطر تمہاری منت کی منایا تمہیں اس لیے زندگی میں اگر کبھی میں مر کے خاک بھی ہو گئی تو ان کا یہ احسان تب بھی یاد رکھوں گی اور انہیں ہمیشہ دل سے دعاؤں کی مگر تم۔“

علیزے بولتے ہوئے آؤٹ آف کنٹرول ہونے لگی تو بے ساختہ اٹھ کر واش روم میں بند ہو گئی تھی اور دل آور باہر کھڑا دیکھتا رہ گیا تھا۔



وہ ڈرننگ ٹیبل کے سامنے کھڑا آفس جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا جب اس کے بیڈ روم کے دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ ”طیس کم ان۔۔۔“ اس نے ہیر پرش بالوں میں پھیرتے ہوئے آہستگی سے اندر آنے کی اجازت دی تھی اس کے خیال میں انوشہ یا زین ہوں گے، لیکن ان دونوں کی بجائے آذر کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر دانیال خود بھی قدرے حیران ہوا تھا۔

”ہیلو گڈ مارننگ!“ آذر نے ملکہ بھلکے سے انداز میں اسے دس کیا تھا۔

”ہوں سیم نوو!“ دانیال ہیر پرش ڈرننگ ٹیبل پہ ڈال کر اس کی سمت پلٹا تھا۔

”کیسے ہو؟“ آذر دانیال کو غور دیکھ رہا تھا۔

”جھا بھلا ہوں، نظر نہیں آ رہا؟“ دانیال نے کندھے اچکائے تھے۔

”نظر ہی تو نہیں آ رہا؟“ آذر نے کسی اور ہی لہجے میں کہا تھا۔

”کون نظر نہیں آ رہا؟“ اس نے نا سمجھتے ہوئے پوچھا تھا۔

”دانیال وجاہت علی۔“ آذر نے اس کے نام پر زور دیا تھا۔

”مجھے بھی کہیں نظر نہیں آ رہا، مگر اب ارادہ ہے کہ اسے تلاش کروں کیونکہ جب تک اسے تلاش نہیں کروں

گاتب تک اپنی بچان اور اپنی شناخت نہیں ہوگی اور اس دنیا میں شناخت بہت ضروری ہے۔“ دانیال کا لہجہ استہزائیہ سا ہو رہا تھا اور آذر نے اس کا یہ استہزائیہ پن کالی گمرانی سے محسوس کیا تھا۔

”کیا ہوا؟ کسی نے کچھ کہا ہے کیا؟“ آذر کھٹک چکا تھا۔

”یار! ضروری نہیں کہ کوئی دوسرا ہی آپ سے کچھ کہے۔ کبھی کبھی انسان کا اپنا آپ ہی اس سے بہت کچھ کہہ جاتا ہے۔“ دانیال نے سرجھٹکا تھا۔

”انسان کا اپنا آپ بھی اس سے بے وجہ کچھ نہیں کہتا اس کے پیچھے بھی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے اس لیے

تم بتاؤ کہ تمہارے ایسا کہنے کے پیچھے کیا وجہ ہے آخر؟ اور ویسے بھی تم دو روز سے کہیں بھی نظر نہیں آ رہے نہ گھر

سے باخبر تھا۔؟
حالانکہ میں نے کبھی کسی کو کچھ محسوس تو نہیں ہونے دیا۔ پھر بھی۔ پھر بھی۔ می بھی جان گئیں اور آذر بھی۔؟ وہ خود کلائی کے سے انداز میں بیڑا تارہا تو پھر فوم اسپرے کر کے خود بھی بیڈ روم سے باہر نکل گیا تھا۔

”زلفی! دل اور کی آواز پہ زلفی جی جان سے متوجہ ہوا تھا۔

”جی صاحب جی! اہم۔؟“

”گل کہاں ہے؟“

”جی! او تو کوآرٹس میں ہے شاید۔“ زلفی نے ذرا سوچتے ہوئے جواب دیا تھا کہ گل کہاں ہے آخر؟

”اچھا ٹھیک ہے! پھر تم ہی چلے جاؤ۔“ دل اور نے اخبار سمیٹتے ہوئے کہا۔

”کہاں صاحب جی؟“ زلفی نے استفسار کیا تھا۔

”اوپر بیڈ روم میں! علیز بے بی بل سے کو صاحب نیچے بلارہے ہیں۔“ دل اور نے اسے پیغام دیا تھا۔

”بس اتنا ہی کہنا ہے؟“ زلفی جاتے جاتے رک گیا تھا۔

”ہوں! اتنا ہی کہنا ہے۔“ اس نے آستکی سے جواب دیا تھا اور زلفی خوشی خوشی پلٹ کر اوپر چلا آیا تھا۔

مگر صاحب کے بیڈ روم کے دروازے پہ دستک دیتے ہوئے بے چارے کا دل دھڑک دھڑک گیا تھا آخر اتنی

خوب صورت لڑکی کے سامنے جانا بھی تو آسان نہیں تھا؟

ہاں یہ الگ بات تھی کہ اندر سے اس کی دستک کا کوئی بھی رسپانس موصول نہیں ہوا تھا۔ جس کے بعد اس نے

دوبارہ دستک دی تھی مگر پھر بھی اندر سے چپ کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا تھا۔ تب مجبوراً ”زلفی نے ذرا سادروانہ

و تحلیل کر اندر جھانکا تھا اور وہ دلکش سی حسینہ اسے بیڈ پہ بیٹھی ہوئی نظر آئی تھی اس لیے زلفی سارا دروازہ دھکیل کر

اندر آیا تھا۔

”سلام بی بی جی!“ اس نے بڑے اچھے طریقے سے سلام عرض کیا تھا۔

مگر علیز نے اسے سرخ روئی روئی آنکھوں سے دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کہا تھا۔

”موری بی بی جی میں نے آپ کو ڈسٹرب کر دیا ہے۔ وہ دراصل مجھے صاحب جی نے بھیجا ہے وہ آپ کو نیچے بلا

رہے ہیں۔“ زلفی اس کی آنکھیں اور اس کا چہرہ دیکھ کر ہی سمجھ گیا تھا کہ وہ غلط وقت پر آیا ہے اسی لیے اس نے

فوراٰ معذرت بھی کر لی تھی۔

”کیوں؟ کیوں بلایا ہے نیچے؟“ علیز نے کی آواز بھی خاصی بھیگی ہوئی تھی۔

”جی! یہ تو میں نہیں جانتا کہ کیوں بلایا ہے مگر ان کے بلانے کے انداز سے لگتا ہے کہ کسی کام سے ہی بلایا

ہے۔“ زلفی نے دل اور کے سنجیدہ اور بے لچک سے انداز کو نظر رکھتے ہوئے کہا تھا اور علیز نے اس کی بات سن

کر انکار میں جواب دیتے دیتے رک گئی تھی۔

”ہوں! ٹھیک ہے تم جاؤ میں آرہی ہوں۔“ اس نے اپنے آپ کو کنٹرول کرتے ہوئے جواب دیا تھا اور پھر بیڈ

سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”جی بہتر!“ زلفی سرخم کر کے کتا ہوا پلٹ کر باہر نکل آیا تھا اور اس کے پیچھے ہی دو چار منٹ کے وقفے سے

علیز نے بھی نیچے آگئی تھی وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا علیز نے ڈرائنگ روم میں آکر رک گئی تھی البتہ زبان

سے کچھ نہیں کہا تھا مگر دیکھ سوائے نظروں سے رہی تھی۔

میں نہ آفس میں اور موبائل بھی آف مل رہا ہے خیریت تو ہے نا؟“
آذر کو بھی دو دن سے تشویش ہو رہی تھی اسی لیے وہ آج صبح ہی اس کی خبر لینے کے لیے انیکسی میں چلا آیا تھا۔

”ہاں یار! سب خیریت ہے۔ تم پریشان مت ہو اور یہ بتاؤ کہ آج ادھر کارسٹ کیسے بھول گئے؟“ دانیال نے سرسری سے انداز میں کہا تھا۔

”تمہارا پتا کرنے کے لیے آیا تھا کہ تمہیں کیا مینشن ہے؟ کیوں کترائے کترائے سے پھر رہے ہو؟ آخر ہوا کیا

ہے؟ تم کچھ تا کیوں نہیں رہے؟“ آذر نے کافی پریشانی اور تشویش سے پوچھا تھا۔

”ارے یار! مجھے چھوٹو۔ مجھے کوئی مینشن نہیں ہے اور نہ ہی کچھ ہوا ہے تم اپنی کمزور آخر تم کو مل کے ہو ہی گئے

نا؟ کو مل تو بہت خوش ہوگی آج کل؟“ دانیال نے بڑی خوش اسلوبی سے بات کا رخ ہی بدل دیا تھا۔

”دانیال!“ آذر اسے دیکھ کے رہ گیا تھا۔

”تو کیا کچھ غلط کہہ رہا ہوں میں؟“ دانیال نے حیرت سے پوچھا تھا۔

”تم سمجھ بھی تو نہیں کہہ رہے نا!“ آپ کی بار آذر نے سر جھٹکا تھا۔

”وہ کیسے؟“ اس نے آذر کو سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

”وہ ایسے کہ میں اپنے بچوں کے اس فیصلے سے خوش نہیں ہوں، مجھے ان کے دونوں فیصلے ہی پسند نہیں آئے نہ

مجھے اپنے لیے کو مل پسند ہے اور نہ مجھے حرمت کے لیے احمد پسند ہے میں نے ان سے کچھ سوچنے کے لیے وقت

مانگا ہے ابھی کچھ بھی فائنل نہیں ہوا۔ بات ابھی میرے اختیار میں ہے۔“ آذر نے بڑے سکون سے اسے آگاہ کیا

تھا اور دانیال ٹھنک سا گیا تھا اسے آذر کی بات پہ حیرت ہوئی تھی۔

”کیوں؟ تمہیں یہ دونوں فیصلے کیوں پسند نہیں آئے؟“

”کیوں کہ حرمت کے لیے مجھے دانیال وجاہت علی پسند ہے اور اپنی بہن کا ہاتھ میں اسی کے ہاتھ میں دینا چاہوں

گا اس کے لیے چاہے کچھ بھی ہو جائے میں یہ کر کے ہی رہوں گا۔“ آذر نے اچانک اسے اپنی پسند اور اپنا فیصلہ

سنا دیا تھا اور دانیال جیسے دم بخود سا اسے دیکھتا رہ گیا تھا وہ دانیال کے سامنے بیٹھ کر اتنی بڑی بات کہہ گیا تھا اس لیے

دانیال کے لیے تو واقعی یہ ششدر ہونے والی ہی بات تھی۔

”مگر آذر!“ اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی تھی۔

”اگر مگر کچھ نہیں۔ بس میں نے جو سوچ رکھا ہے میں وہی کروں گا۔ البتہ تمہارے ذہن میں کوئی اعتراض ہے

تو تم مجھے بتا سکتے ہو۔“ جھجکنے کی اور ہچکچانے کی ضرورت نہیں ہے اور رہی بات کو مل کی اور میری تو اس کے بارے

میں ابھی میں سوچوں گا تو ہی کوئی فیصلہ کروں گا فی الحال ایک ہی فیصلہ کیا ہے اور وہ میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔“ آذر

کہہ کر صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”لیکن آذر! وہ سب تو بات طے کر۔“ دانیال نے پھر بولنے کی کوشش کی تھی مگر آذر نے ٹوک دیا تھا۔

”جو میں طے کر چکا ہوں تم اس کی فکر کرو باقی سب کو چھوٹو مجھے کوئی پروا نہیں ہے یہ میرا مسئلہ ہے میں

ہینڈل کر لوں گا۔ بس تم خوش رہو اور اپنے آپ کو اکیلا مت سمجھو میں ہر میدان میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تم

ملک وجاہت علی کے بیٹے ہو تو عائشہ آفندی کے بھی بیٹے ہو اور بہت اہم ہو ہمارے لیے۔“ آذر نے اس کا کندھا

تھپکتے ہوئے کہا اور پھر اس کے بیڈ روم سے باہر نکل گیا تھا۔

جبکہ دانیال ہنوز حیران پریشان سا کھڑا اپنے بیڈ روم کے بند دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ کیوں کہ آذر نے اس کے کچھ

کہنے کے لیے تو کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی تھی سب کچھ تو وہ خود ہی طے کر گیا تھا تو گویا آذر بھی میرے دل کی بات

”چادر لے لو اور میرے ساتھ چلو۔“ وہ کہتے ہوئے صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”کیوں؟ کہاں جاتا ہے؟“ علیزے کا سوال بے ساختہ سا تھا۔

”مارکیٹ جاتا ہے۔“ دل اور بھی مختصر سے جواب دے رہا تھا۔

”مگر کس لیے؟“ علیزے کو مارکیٹ کا سن کر حیرانی ہوئی تھی۔

”تمہاری شاپنگ کے لیے۔“ دل اور نے آہستہ سے کہا تھا اور علیزے چونک گئی تھی اس نے یکدم سر اٹھا کر دل اور کے چہرے کی سمت دیکھا تھا، مگر وہ کہیں اور دیکھ رہا تھا نجانے ان دونوں کو کیا ہوا تھا کہ وہ صبح سے اک دوسرے سے اجنبی اور کھینچ کھینچنے سے نظر آ رہے تھے۔

”میری شاپنگ کے لیے؟“ اس نے آہستگی سے خود کلامی کے سے انداز میں کہا تھا۔

”ہوں! تمہاری شاپنگ کے لیے۔ تم چادر لے کر آؤ میں باہر گاڑی میں انتظار کر رہا ہوں۔“ وہ کہہ کر ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے کی سمت بڑھتا تھا۔

”مگر مجھے کسی بھی شاپنگ کی اور کسی بھی چیز کی کوئی ضرورت نہیں ہے، مجھے کچھ نہیں لینا، مجھے کہیں بھی نہیں جانا۔ میں جیسی ہوں، جہاں ہوں، بس ٹھیک ہوں، تم میری فکر مت کرو۔“ علیزے نے دبے دبے لہجے میں اسے ٹوک دیا تھا اور علیزے کی بات پر اس کے قدم رک گئے تھے وہ جاتے جاتے دوبارہ اس کی سمت پلٹا تھا۔

”تمہاری فکر میرا فرض بن چکا ہے مسز علیزے شاہ! اور یہ فرض بنانے والی تم خود ہو یہ رشتہ تمہاری ڈیماڈ تھا اب اگر ڈیماڈ پوری ہوئی ہے تو رونادھو! کس بات کا ہے؟ مجھے تم سے اور تمہیں مجھ سے کوئی محبت نہیں تھی اور نہ ہی ہمارے درمیان کسی قسم کے عہد و بیان کا چکر تھا کہ جس کے پورا نہ ہونے پر ہمیں کوئی افسوس یا رنج ہوگا، بلکہ ہمارا تعلق تو مجبوری کا تعلق ہے جسے اب تم نے بھی نبھانا ہے اور میں نے بھی نبھانا ہے۔ چاہے اس کو نبھانے میں ہمارے دل پر کچھ بھی گزرے۔ الزام ایک دوسرے کو نہیں دیتا۔ بس نبھانا ہے ہر صورت اور ہر حال میں نبھانا ہے نہ تم شکوہ کرو نہ میں شکوہ کرتا ہوں بس جیسے چل رہا ہے ویسے چلتے دو البتہ جو ہو چکا ہے وہ ہو چکا ہے لیکن آج کے بعد میری پوری کوشش ہوگی کہ میں اس تعلق کو اور اس رشتے کو اچھے طریقے سے اور پوری ایمان داری سے نبھاسکوں کیونکہ مجھے اس تعلق اور رشتے میں میری ہاں نے باندھا ہے اور اس لحاظ سے میں اس رشتے کا ہمیشہ احترام کروں گا اور ہمیشہ عزت بھی دوں گا۔ زندگی کے ہر مقام پر اور زندگی کے ہر موڑ پر اس معاملے میں تم بھی مجھے پیچھے نہیں پاؤ گی۔ جو تمہارا حق ہے اور جو تمہارا مقام ہے وہ تمہیں ضرور ملے گا۔ البتہ اس معاملے میں تمہاری کیا سوچ ہے اور کیا نظریہ ہے یہ میں نہیں جانتا مگر پھر بھی باہر تمہارا انتظار کر رہا ہوں پندرہ منٹ کا ٹائم ہے آنا چاہو تو آ جاؤ فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے میری طرف سے کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔“ وہ اسے سب کچھ صاف صاف سنا کر اک جھٹکے سے پلٹا اور باہر نکل گیا تھا اور پیچھے کھڑی علیزے کے گم سم سی دیکھتی رہ گئی تھی۔

اب عروج پر ہے تمہارا موسم خزاں میں تم کو خرید لیں گے
مانگو گے ہم سے رحم کی طلب نہ تم کو مہلت مزید دیں گے
وفا کی لالچ میں ہم نے صدیوں سے خون اپنا سکھا دیا ہے
فریب و مستی کے بدلے تم کو سزا بھی سن لو شدید دیں گے

ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد علیزے چادر اوڑھ کر باہر نکل آئی تھی اور اسے گاڑی کے قریب کھڑے دیکھ کر ایک پل کے لیے اس کے قدم ٹھک کر رک گئے تھے اسے وہ دن یاد آ گیا تھا جب وہ پہلی بار بڑی حویلی کے کوریڈور سے

نکل کر باہر آئی تھی اور وہ اسی طرح اس کی گاڑی کے قریب کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔
”مگر کوئی علیزے کے دل سے پوچھتا کہ تب اور اب میں کتنا فرق تھا اور اس نے تب اور اب کے درمیان کیا کچھ جھپٹا تھا؟“

”دروازہ کھلا ہے آئیے بی بی جی“ گلاب خان نے مداخلت کرتے ہوئے ان دونوں کو ہی چونکا دیا تھا کیوں کہ دل اور بھی اسی خیال میں پیچھے چلا گیا تھا جس خیال کے تحت علیزے کے قدم ذرا فاصلے پر ہی رکے رہ گئے تھے اور وہ چاہہ کر بھی آگے نہیں بڑھ سکی تھی۔
”مگر گلاب خان! انہیں حال میں کھینچ لایا تھا اور وہ سر جھٹکتی ہوئی آگے بڑھ کے گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی تھی اور گلاب خان نے دروازہ بند کر دیا تھا۔“

”آئیے صاحب جی۔۔۔ بی بی جی انتظار کر رہی ہیں۔“ گلاب خان نے اسے بھی متوجہ کیا تھا اور دل اور گہری سانس کھینچ کر اپنی سوچوں کو پیچھے جھٹکتے ہوئے پلٹ کر گاڑی میں بیٹھ گیا تھا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی پھر گلاب خان نے آگے بڑھ کے گیٹ کھولا اور دل اور گاڑی نکال کر روڈ پر لے آیا تھا۔

البتہ اس کا دھیان علیزے کی طرف ہی تھا۔ یعنی وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اس نے بھی ”نبھانا“ ہی ہے۔؟ اس نے اک نظر اپنے برابر فرنٹ سیٹ پر بیٹھی علیزے کو دیکھا اور پھر نجانے کیوں لب بچھیتے ہوئے جیب سے موبائل نکال کر عبد اللہ کا نمبر ڈائل کر لیا تھا اور دوسری طرف عبد اللہ نے فوری کال ریسیو کی تھی۔

”السلام علیکم! کیسے ہو عبد اللہ؟“ دل اور کے لہجے میں بے پناہ ٹھنڈ اور بے پناہ صبر کی جھلک نظر آ رہی تھی۔
”وعلیکم السلام! میں ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ خیریت سے ہونا؟“ عبد اللہ کو اس کی فکر تھی۔
”ہاں! خیریت سے ہوں تم لوگ آج آئے کیوں نہیں؟“ دل اور اپنے مطلب کی بات کرنا چاہ رہا تھا۔

”بس! آج سوچا کہ تم ریسٹ کر لو، ہم کل مل لیں گے۔“ وہ اسے تسلی دے رہا تھا۔
”کل نہیں! آج ملنا ہے تم اور نبیل شام کو میری طرف آرہے ہو وہ بھی اپنی فیملی کے ساتھ۔“ دل اور نے ملنے زور دیا تھا۔

”کیوں؟ خیریت؟ سب ٹھیک تو ہے نا؟“ عبد اللہ کو تشویش لاحق ہوئی تھی۔
”ہاں! سب ٹھیک ہے، بس تم لوگوں کو کسی سے ملوانا ہے آج۔“ دل اور تو جیسے بلا کار سکون نظر آ رہا تھا جبکہ اس کے برابر بیٹھی علیزے بری طرح چونک گئی تھی اس نے بے ساختہ گردن موڑ کر اسے دیکھا تھا۔

”واقعی کسی سے ملوانا ہے کیا؟“ عبد اللہ کو حیرت ہوئی تھی۔
”ہاں! واقعی ملوانا ہے کسی سے، تم نبھانا بھی وغیرہ کو لے کر وقت پہ آ جانا میں نبیل کو بھی کہہ دیتا ہوں اوکے؟“ دل اور نے بات سمیٹی تھی۔

”مہوں! اوکے۔“ عبد اللہ نے پرسوج سے انداز میں کہا تھا اور پھر فون بند ہو گیا تھا جبکہ علیزے ابھی بھی اسے کچھ حیران اور کچھ بے یقین نظروں سے دیکھ رہی تھی مگر وہ اس سے بے نیاز اب نبیل کا نمبر ڈائل کر رہا تھا۔
(باقی آئندہ)

نہیگہ عزیز



بڑی حویلی کے تمام کمین وقار آئندہ سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدھیہ اور نیل حیات دو ہی بہن بھائی ہیں، مدھیہ انتہائی چمکی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے، وہ انگلینڈ کی رنگینوں میں مکمل طور پر رنگ چکی ہے، جس کے پیش نظر فائزہ بیگم، نیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں، لیکن مدھیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے، جس پر نیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے، مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر چھپ رہا ہے۔

نیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے، مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، بے بسی اور بیواری سے ننگ آخر خود کشی کرنے کا سوچتا ہے، لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھانچے میں چائے پیتے ہوئے پاؤ امتیاز مل جاتا ہے، جو اسے کام کی آفر کرتا ہے، جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے، اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے، وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آئندہ سے نوکری مانگنے آتا ہے، وقار آئندہ کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آذر شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے، وہ اپنے قول و فعل کا بہت ریکارڈ ہے، اس نے

تین بار نہیں سیکھا، اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پر بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔

چونتیسویں قسط

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہر ای بک کا وائرٹیکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چینلنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں ایلوڈنگ
- ☆ ہریم کوالٹی مائل کوالٹی، کیریڈر کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از منظر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
- ☆ ایڈ فوری لنکس، لنکس کو پیسے کماتے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

ہم ایک ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

☆ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

☆ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں، ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کانک ویکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

”مریم! کیا بات ہے؟ تم پچھلے کچھ دنوں سے مسلسل پریشان نظر آ رہی ہو مگر تمہیں نہیں؟ کیا وجہ ہے آخر؟ کیا پریشانی ہے تمہیں؟“

وہ کافی بے دلی سے اکیڈمی جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی جب عابدہ خاتون کمرے میں اس کے پاس چلی آئی تھیں اور مریم ان کی بات پر چونک کر متوجہ ہوئی۔

”ارے نہیں امی! ایسی کوئی بات نہیں ہے میں بالکل ٹھیک ہوں مجھے کیا پریشانی ہو سکتی ہے بھلا؟“ اس نے ذرا سا جھک کر بیک کی زپ بند کرتے ہوئے اپنی چادر اٹھائی اور ان کے سامنے لایو نظر آنے کی کوشش کی۔

”پریشانی نہیں ہے مگر کچھ تو ہے نا جس نے تمہیں اس قدر اپ سیٹ کر رکھا ہے؟ تمہارا کسی بات کی طرف دھیان ہی نہیں ہے ورنہ تم تو سب کی طرف دھیان رکھتی تھیں سب کا خیال ہوتا تھا تمہیں؟ مگر پچھلے کچھ دنوں سے تو میں ایسا کچھ بھی نہیں دیکھ رہی؟ تمہیں تو اپنے آپ کی بھی خبر نہیں ہے؟ عدیل بھی اسی بات کو نوٹس کر رہا تھا۔ مگر اس نے تم سے کہا نہیں کیونکہ وہ سمجھ رہا ہے کہ تم شاید جاب کی وجہ سے تھک گئی ہو۔ اگر ایسا ہے تو تم جاب چھوڑ دو ہمارا گزارا ہو رہا ہے اور ان شاء اللہ اپنے رب تعالیٰ سے پوری امید ہے کہ آئندہ سے بھی اچھا اور بہتر گزارا ہو گا۔“ اپنے ذہن پہ کوئی بھی پریشانی سوار مت کرو۔

عابدہ خاتون نے اس کی پریشانی دور کرنے کے لیے اسے تسلی دی تھی اور مریم چادر پھیلا کر اوڑھتے ہوئے رک گئی۔ ”ای پلیز آپ ایسا کیوں سوچ رہی ہیں؟ میں نے کہا میں بالکل ٹھیک ہوں بس یہ موسم کی وجہ سے کچھ سستی سی ہو رہی ہے ورنہ اور تو کچھ نہیں ہے اور جاب کا کیا ہے؟ میں کون سا ہارڈ توڑی ہوں جا کر؟ اکیڈمی میں جا کر پڑھاتی ہوں اور واپس آجاتی ہوں بس اتنی سی جاب ہے میری اور آپ کتنی ہیں کہ وہ بھی چھوڑ دوں؟ ہونہ یہ تو خود گھر آئی روزی رزق کو ٹھکرا نے والی بات ہے۔“

مریم نے انہیں پوری پوری تسلی دینے کی کوشش کی تھی اور عابدہ خاتون اسے سرتاپا دیکھتے ہوئے اس کی بات کا اور اس کے لہجے کا بچہ دھونڈتی رہ گئی تھیں۔

”آپ خواجہ پریشان نہ ہوں! سب کچھ ٹھیک ہے۔ میں بھی ٹھیک ہوں بس آپ کی دعا کے ساتھ ساتھ اب اجازت بھی چاہیے میں اکیڈمی سے لیٹ ہو رہی ہوں پلیز!“

مریم ان کو لندھوں سے تھام کے ایک بھرپور تسلی دیتے ہوئے بولی اور پھر وال کھاک کی سمت دیکھا واقعی کافی لیٹ ہو رہی تھی۔

”ہوں! ٹھیک ہے خیر سے جاؤ اور خیر سے آؤ اللہ تمہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے آمین!“ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کی پیشانی چوم کر اسے رخصت کی اجازت دی تھی اور مریم کے دل کا بوجھ اور پریشانی قدرے کم ہو گئے تھے اس لیے وہ گھر سے رخصت ہوئی تھی اور بڑے سکون سے بس اسٹاپ تک پہنچی تھی مگر بس اسٹاپ تک پہنچتے ہی اس کا سارا سکون رخصت ہو گیا تھا۔

کیونکہ سامنے ہی جوت آئندی چمچاتی ہوئی کار سے ٹیک لگائے کھڑا اسے ہی دیکھ رہا تھا اور جس سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ اسی کا انتظار کر رہا ہے اور جس کو سوچ کر ہی مریم کے چہرے کی رنگت متغیر ہو گئی جسم کانپ گیا تھا اسو نہ آگے بڑھ سکتی تھی اور نہ پیچھے ہٹ سکتی تھی۔

کیونکہ اسے اپنے آس پاس کا بھی خیال تھا آخر یہ بس اسٹاپ ان کے گھر اور محلے سے دور ہی کتنا تھا بھلا اور اگر وہ یہاں کوئی تماشا بنا تو مریم کو انداز تھا کہ اس کے باپ اور بھائی کی عزت چند سیکنڈ میں ہی مٹی میں مل سکتی تھی اور اس کا صاف ستھرا بے داغ دامن بل میں غلیظ اور داغ دار ہو سکتا تھا۔ اسی لیے اس نے اپنے آپ کو کنٹرول میں رکھنے کی اور عقل اور عقل سے کام لینے کی پوری پوری کوشش کی تھی اور خود کو لالچ اور لاپرواہا ہر کرنے ہوئے

اس کے سامنے سے گزر جانا چاہتا مگر وہ اسے گزرتے ہوئے دیکھ کر گاڑی سے ہٹ کر سیدھا کھڑا ہو گیا تھا۔

”سنو!“ اس نے پیچھے سے اسے آواز دی تھی اور مریم کے قدم جہاں کے تھیں جہاں گئے البتہ پیچھے پلٹ کر دیکھنے کا حوصلہ تو پھر بھی نہیں ہوا تھا۔

”میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھو مجھے بس تمہارا تھوڑا سا ٹائم چاہیے۔ مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے۔“

جوت نے شاید پہلی بار سکون اور خل سے بات کرنے کی کوشش کی تھی اور اب کی بار مریم نے بے ساختہ پلٹ کر اسے دیکھا کیونکہ اسے اس لو فر اور آوارہ شخص کی بات کا ذرا بھی یقین نہیں تھا۔

”دیکھو! مجھے غلط مت سمجھو میں اس وقت یہاں تمہیں تنگ کرنے کے ارادے سے نہیں آیا میں واقعی کسی کام سے آیا ہوں۔ میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھو ورنہ مجھے زیادہ نہ سہی مگر تھوڑا بہت تو تم جانتی ہی ہوگی؟ شرافت کی زبان کے علاوہ کبھی مجھے ایک اور زبان آتی ہے جس کو سمجھ نہ آئے اسے وہی سمجھانی پڑتی ہے اور اس چیز کو تم سے بہتر اور کوئی بھی نہیں جانتا جبکہ میں چاہتا ہوں کہ تم شرافت کی زبان ہی سمجھ جاؤ تو بہتر ہے کیونکہ یہ امر یا تمہارا ہے اور میں مجھ سے کچھ الزام سیدھا ہو گیا تو یقیناً ”تمہارے اور تمہارے گھر والوں کے لیے بہت برا ہو گا۔ تم اپنے آپ کو خود بدنام کر دگی اس لیے تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ تم گاڑی میں بیٹھ جاؤ بات ختم ہوتے ہی تم جہاں کو گئی میں تمہیں ڈراپ کر دوں گا۔ تم سے وعدہ کیا والا وعدہ پلیز نرست می۔“

جوت نے اپنی لمبی چوڑی بات پہلے کبھی نہیں کی تھی اور جب کی تو مریم دیکھنے اور سوچنے پر مجبور ہو گئی۔

”لیکن میں تمہارا یقین کیسے کر لوں؟“ مریم نے زبان کھولی بھی تھی تو ذرا سخت لب و لہجے میں۔

”جیسے بھی کرو کرنا تو تمہیں بڑے گا ہی کیونکہ اگر نہیں بھی کرو گی تو مجھے کیا فرق پڑے گا بھلا نقصان الٹا تمہارا ہی ہے۔ یونوزر دوستی کرنا مجھے آتا ہے تمہیں ہاتھ سے پکڑ کر یا بانوں میں اٹھا کر گاڑی میں بیٹھانا مشکل نہیں ہے میرے لیے سو پلیز ڈارلنگ کم آن۔“

اس نے بڑے لاپرواہ اور غیر تنجیدہ سے انداز میں کہتے ہوئے گاڑی کا فرنٹ ڈور کھول دیا تھا جو مریم کے لیے گاڑی میں بیٹھنے کا ایک اشارہ تھا ایک ایسا اشارہ جس پر عمل کرنے کا وہ بھی مریم کے بھی نہیں سوچ سکتی تھی۔ لیکن اس اشارے سے انکار بھی اسے کھڑے کھڑے رسوا کر سکتا تھا اور وہ یہ رسوائی انورڈ نہیں کر سکتی تھی۔

سو اس نے اپنی نگہبانی رب کو سوچتے ہوئے قدم آگے بڑھا دیے اور جوت آئندی کی گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی اور جوت اس کے بیٹھتے ہی گاڑی کا دروازہ بند کر کے خود ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا اور پھر محض چند سیکنڈز میں ہی اس کی گاڑی وہاں سے فرار لے بھرتی ہوئی ہوا ہو گئی تھی۔

اس نے گاڑی فل اسپیڈ پر چھوڑ رکھی تھی لیکن وہاں سے بہت دور آکر اس نے گاڑی کی اسپیڈ کم کر دی اور گردن موڑ کر اپنے ساتھ بیٹھی مریم کو دیکھا وہ بالکل سامنے دند اسکرین کی سمت دیکھ رہی تھی ”کتنی اچھی لگ رہی ہو میرے ساتھ بیٹھی ہوئی۔“ جوت نے اپنے ذہن میں آنے والا خیال صاف کہہ دیا تھا اور مریم کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناء سی دوڑ گئی کیونکہ جوت کا لہجہ ہی کچھ ایسا ہو رہا تھا کہ مریم کو اپنے آس پاس خطرے کا الارم بجتا ہوا محسوس ہوا تھا لیکن اب وہ کبھی کیا سکتی تھی بھلا؟ اب جو بھی تھا وہ برداشت کرنا اور چپ رہنا تھا۔

”دل چاہ رہا ہے تمہیں دور بہت دور لے جاؤں شہر سے بھی دور جہاں تمہارے اور میرے سوا کوئی بھی نہ ہو۔ جہاں میرا شوق اور میری دیوانگی اور تمہارا حسن اور تمہاری پاکیزگی ایک ہو جائیں جہاں سارے فاصلے اور ساری دیریاں مٹ جائیں۔“ جوت بڑے ولبرانہ انداز اور لہجے میں اپنے دل کا حال کہہ رہا تھا اور مریم چپ چاپ سب سن رہی تھی اور اندر ہی اندر ضبط کے گھونٹ پی رہی تھی۔

”کیا خیال ہے تمہارا؟ چلو گی میرے ساتھ جنت کی سیر کو؟“ جوت نے اب کی بار اسے باقاعدہ مخاطب کیا تھا۔

”دیکھو جو دت آفندی! تم نے جو وعدہ کیا ہے اس پر غور کرو! دھرواؤ ہر کی باتیں مت کرو ورنہ اسی گاڑی سے کوڈر
مراؤں گی مجھے اپنی عزت سے زیادہ اپنی جان پیاری نہیں ہے۔“
مریم کا لہجہ اور الفاظ انتہائی سخت تھے اور جوت بے ساختہ اس کی وہم کی پر مسکرا دیا تھا۔
”اؤں! کیسی باتیں کر رہی ہو سوٹ پارٹ ایسے بھلا مرنے دوں گا نہیں تم نے ابھی نہ دکھا ہی کیا ہے نہ دنیا
دیکھی ہے نہ دیوانہ نہ دکھا ہے اور بنا دیکھے تم مراؤ یہ تو مجھے اور بھی دیوانہ کر سنے والی بات ہوگی ہے نا۔“
وہ مریم کو بڑی گہری اور مستانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا اور لبوں کی مسکراہٹ اور بھی مستی بھری ہو گئی تھی۔
”مگر تم نے وعدہ کیا تھا کہ کتنا چاہا تھا مگر جوت نے بات کا شوق ہی نہیں۔“
”ہاں! میں جانتا ہوں کہ میں نے تم سے وعدہ کر رکھا ہے اور اسی وعدے پر تم نے مجھ پر ٹرسٹ کیا ہے اسی لیے
اسی لیے تو ابھی تک دل کے مجبور کرنے کے باوجود بھی تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگایا اور اس پر بھی غور نہیں کیا کہ تم
میرے کتنے قریب بیٹھی ہو حالانکہ بہت عرصے سے شوق تھا کہ تمہاری سانسوں کی خوشبو کو اپنی سانسوں میں
جذب کر کے دیکھوں مگر شکر ادا کرو کہ تم سے وعدہ کر بیٹھا ہوں۔“
جوت نے جیسے آہ بھری تھی اور مریم اس کی بات پر قدرے ریلیکس ہو گئی تھی۔
”لیکن تمہیں اتنا بتاؤں کسی لوفر، آوارہ دیوانے کے وعدے کا بھروسہ نہیں کرنا چاہیے کسی وقت بھی توڑ سکتے
ہیں کیونکہ ان کا خود پہ اختیار جو نہیں ہوتا۔“
جوت نے اگلی بات کہہ کر اسے پھر سے پل میں ہراساں کر دیا تھا اور مریم کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر قہقہہ
لگا کر ہنسنا اور گاڑی کو ایک دم بریک بھی لگا دیے تھے۔
”ارے ڈونٹ وری یار! آؤ اندر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“ وہ گاڑی کا ڈور کھول کر نیچے اتر آیا تھا، لیکن مریم
لاہور کے سب سے بڑے اور مہنگے ترین ریسٹورنٹ کے سامنے گاڑی پارک کر دیکھ کر وہیں کی وہیں بیٹھی رہ گئی تھی۔
”نہیں! تم نے جو بھی بات کرنی ہے یہیں کرو میں اندر نہیں جاؤں گی۔“ وہ اپنی جگہ سے ہلنے کو بھی تیار نہیں
تھی۔
”اف یار! جہاں اتنا بھروسہ کر لیا ہے وہاں تھوڑا سا اور سہی تمہاری قسم میں کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کرنے
والا اور نہ ہی میں نے کوئی روم بک کروا رکھا ہے۔ بس میں نے تم سے بات کرنی ہے اور تو کچھ نہیں۔“
وہ آخر میں خاصے معنی خیز لہجے میں بولا تھا اور مریم شرم سے کٹھ کے رہ گئی تھی۔
”آج آؤ یار! اور نہ مجھے ٹیبل بیس روڈ پر لگوانی پڑے گی۔“ جوت نے جھنجھلا کر اصرار کیا تھا۔
”تو پھر ہم لوگ فیملی ہال میں بیٹھیں گے۔“ مریم نے شرط رکھی تھی۔
”اوکے اوکے! لیکن فیملی کہاں ہے؟“ جوت نے جان بوجھ کر اسے تنگ کرنے کے لیے آگے پیچھے دیکھا اور وہ
انگور کرتی ہوئی گاڑی سے اتر آئی اور پھر جوت اپنے وعدے کے مطابق کوئی بھی ایسی ویسی حرکت کیے بغیر اسے
اپنے ساتھ لیے فیملی ہال میں آگیا تھا۔
”بابا! اتنے بڑے ہال میں بیٹھ کر بات نہیں کرنی چاہیے بلکہ میچ کھیلنا چاہیے قسم سے مڑا آجائے گا۔“
جوت نے ریسٹورنٹ کے فیملی ہال میں داخل ہو کر اسے گھوم پھر کر دیکھتے ہوئے خاصے دلچسپ اور انجوائے
کرنے والے انداز میں کہا تھا۔
”پلیز سیر!“ ویٹرنے اسے متوجہ کرتے ہوئے اسے کرسی پیش کی تھی۔
”ہوں! تھینکس!“ وہ سر ہلا کر اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پلٹ کر کرسی پر بیٹھ گیا تھا کیونکہ مریم اس کے بیٹھنے
سے پہلے ہی بیٹھ چکی تھی۔

”کیا لوگی؟“ جوت اس سے یوں پوچھ رہا تھا جیسے ان دونوں میں یہ سلسلہ برسوں سے چلا آ رہا ہو۔
”نوتھیننگس! میں گھر سے ناشتا کر کے آئی ہوں۔“ اس نے حسب توقع نفی میں جواب دیا اور مجبوراً ”جوت
نے محض جس آرڈر کیا تھا جس کے بعد ویٹروں سے چلا گیا اور وہ دونوں اس ہال میں اکیلے بیٹھے رہ گئے تھے کیونکہ
یہ صبح کا وقت تھا اس لیے فیملی ہال میں ذرا بھی رش نہیں تھا! البتہ سیپوٹ کیبن اس وقت بھی آتا تھا۔
”ہوں تو ذرا مریم بات دراصل یہ ہے کہ میں ایک الجھن میں ہوں جس کو سلجھانے کے لیے میں تم سے کچھ
پوچھنا چاہتا ہوں لیکن اگر تم سچ سچ جواب دو تو۔“ اس نے مریم کو سنجیدگی سے کہتے ہوئے مخاطب کیا۔ اور مریم نے
جواباً ”جی ہوں! سوالیہ نظروں سے اس کے چہرے کی سمت دیکھا اور اس کی الجھن اور سوالیہ نظروں کو دیکھتے ہوئے
جوت کو بات کا سلسلہ جاری رکھنا پڑا۔
”وہ میں دراصل منصور حسین کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں وہ کون ہے؟ کہاں رہتا ہے؟ کیا کرتا ہے؟ بس مجھے
اس کے بارے میں ساری معلومات چاہئیں۔“ اس نے اپنی الجھن آخر کہہ ہی ڈالی تھی مگر مریم کی الجھن ابھی بھی
دور نہیں ہوئی تھی۔
”کون منصور حسین؟“ مریم کا سوال جوت کو چونکا گیا تھا۔
”کیا مطلب؟ کیا تم منصور حسین کو نہیں جانتی؟“ جوت کو حیرت ہوئی تھی۔
”مجھے کیا پتا تم کس کا پوچھ رہے ہو؟ کون منصور حسین؟“ مریم کو جھنجھلاہٹ ہونے لگی تھی۔
”وہی منصور حسین جس نے اس روز میری بائیک کو اپنی گاڑی سے ٹکرایا تھی اور کہیں اپنے ساتھ گاڑی
میں بٹھا کے لے گیا تھا۔“ جوت نے اسے یاد دلایا تھا اور مریم بری طرح چونک گئی تھی۔
”وہ؟“ وہ تو۔“ اس کے منہ سے بے ساختہ دل اور شاہ کا نام نکلنے ہی والا تھا کہ اس نے فوراً طلب بھیج لیے
تھے کیونکہ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ جوت آفندی اس کے بارے میں بالکل بھی نہیں جانتا اور اس کے ذریعے
معلومات لینا چاہتا ہے لیکن مریم بروقت عقل آجانے پر سنبھل سی گئی تھی۔
”کیا وہ تو؟ کون ہے وہ؟“ جوت نے اس کے لفظوں پر غور کیا تھا اور بڑی تیزی سے استفسار کیا تھا۔
”میرا مطلب ہے کہ وہ تو مجھے خود بھی نہیں پتا تھا کہ وہ کون ہے؟ میرے لیے تو وہ اتنا ہی اجنبی تھا جتنے کہ تم۔
بات صرف اتنی تھی کہ اس نے میری عزت کو عزت سمجھا تھا اور میری پہلپ کی تھی اسی لیے وہ میرے لیے اہم تھا،
لیکن میرے نزدیک جو بھی تھا بہت اچھا انسان تھا وہ۔“ مریم نے بڑے مضبوط لہجے میں کہتے ہوئے اس کی تعریف
کی تھی جبکہ جوت تپا اٹھا تھا۔
”جتنا اچھا انسان ہے وہ یہ ہم سے بہتر کوئی بھی نہیں جانتا۔ بس تم اتنا بتاؤ کہ تم اسے کتنا جانتی ہو؟ جوت نے
پھر اس کا جانسنہ زور دیا تھا اور مریم تھی کہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھا۔
”میں کب جانتی ہوں۔“ مجھے کیا پتا کہ وہ کون تھا اور کون نہیں۔؟ اس نے تو مجھے میرے گھر کے قریب
ڈراپ کیا اور چلا گیا۔ نہ اس نے میرا نام پوچھا۔ نہ میں نے اس کا نام پوچھا بس اتنا جانتی ہوں اس کو اب مجھے کیا
پتا اس کا نام منصور حسین ہے یا کچھ اور۔“ وہ خاصے خفگی بھرے انداز میں بولی تھی اور جوت چند ثانئیں کے لیے
چپ سا ہو گیا تھا۔
”دیکھو! وہ ہمارا بہت بڑا دشمن ہے۔ ہمارا بہت بڑا نقصان کیا ہے اس نے۔ اس کے بارے میں جاننا
بہت ضروری ہے میرے لیے۔ پلیز پہلپ کرو میری۔“ جوت نے زنج ہو کر التجا کی تھی مگر مریم دل اور شاہ کو
چھوڑ کر اس کی پہلپ کیسے کر سکتی تھی بھلا۔؟ اس کی نظر میں جو دل اور شاہ کا مقام تھا وہ جوت آفندی کا کبھی مر
کے بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

”گروہ اتنا ہی بڑا دشمن ہے تمہارا۔ تو تم اس کے بارے میں کیسے جانتے ہو؟“ مریم نے نقطہ اٹھایا تھا۔

”کیسا دھوکا۔؟“ مریم اس سے اصل مسئلہ اٹھوانا چاہتی تھی۔

”یہی تو مسئلہ ہے کہ بتا نہیں سکتا۔ اس نے کام ہی ایسا کیا ہے کہ ہم اپنے آپ سے بھی نظر لانے کے قابل نہیں رہے۔ خود کو کچھ بھی بتانہ چلنے پہ خفگی اور جھنجھلاہٹ کا شکار ہونے لگا تھا۔

”علیزے کون ہے؟“ اجانک مریم کے ذہن میں علیزے کا نام گونجا تھا اس نے بے ساختہ پوچھ بھی لیا تھا۔ لیکن خود اس کے سوال پہ تھک گیا تھا۔

”علیزے؟“ تبت۔ تم علیزے کے بارے میں کیسے جانتی ہو؟“

”میں علیزے کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی اس روز تم نے ہی اس آدمی سے علیزے کے بارے میں پوچھا تھا بھی مجھے خیال آیا کہ علیزے کون ہے۔؟ جس کا نام پوچھ رہے تھے۔؟“ مریم نے اسے وضاحت دی تھی اور وہ پھر سے کچھ دھیمار گیا تھا۔

”نہیں! کوئی نہیں چلو میں تمہیں ڈراپ کروں۔“ وہ عجیب الجھے ہوئے اور بے چین سے انداز میں کہتا کر سی و کھیل کر اٹھ کھڑا ہوا تھا اس کے لہجے اور اس کے انداز سے جھلکتی کچھ دیر پہلے والی شوخی و شرارت کہیں غائب ہو چکی تھی وہ واقعی اس معاملے کو لے کر بہت سیریس نظر آ رہا تھا جس پہ مریم حیران ہوتی ہوئی اٹھ کر اس کے پیچھے پیچھے گاڑی تک چلی آئی تھی۔

”کہاں ڈراپ کروں؟ گھر یا اکیڈمی؟“ وہ سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

”اکیڈمی۔۔۔۔۔؟“ اس نے آہستگی سے جواب دیا تھا۔

اور خود اس نے اپنے وعدے کے مطابق گاڑی کا رخ اکیڈمی کی طرف موڑ دیا تھا۔!



وہ خود گاڑی سے اترنے کے بعد اس کی سائیڈ پر آیا اور فرنٹ ڈور کھول دیا تھا۔ اور علیزے بمشکل اپنی تمام ہمتیں مجتمع کرتی ہوئی گاڑی سے اتر آئی اور اس نے گاڑی کا ڈور بند کر دیا تھا۔

علیزے نے بڑی عجیب اور کھوئی کھوئی نظروں سے شاہنگ مال کی بلند و بالا عمارت کو نیچے سے اوپر تک دیکھا اور پھر چند سیکنڈ زودیکھنے کے بعد نظروں کا زاویہ اپنے آس پاس کی طرف موڑ دیا پارکنگ لائٹ میں بہت گہما گہمی تھی بہت رش تھا سچی سے نئی گاڑیاں تھیں نئے سے نئے لوگ تھے۔ اور ان لوگوں کے ہنستے مسکراتے تازہ دم چہرے تھے جو

علیزے کی نظروں کو بہت بھلے لگ رہے تھے وہ ان چہروں کو ان لوگوں کو ان گاڑیوں کو اور اس آزاد اور کھلے ماحول کو بڑی حسرت سے دیکھ رہی تھی اس کا دل چاہ رہا تھا یہ گہما گہمی اور رش بونسی رفتہ رفتہ بڑھتا رہے اور وہ پونہ حسرت سے کھڑی دیکھتی رہے کیونکہ اس کے لیے یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھنا ایک خواب بن گیا تھا۔ اور آج جبکہ وہ یہ خواب واقعی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی تو اسے اپنی آنکھوں پہ ہی یقین نہیں آ رہا تھا۔

”چلو!“ دل آور نے چند سیکنڈ اس کے چلنے کا انتظار کیا تھا مگر جب وہ ایک ہی جگہ یہ کھڑی رہی تو اسے مجبوراً اس کو مخاطب کرنا پڑا اور وہ چونک کر متوجہ ہوئی اس کو اپنے انتظار میں کھڑے دیکھ کر آہستگی سے سر جھکاتی ہوئی اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی تھی۔

وہ اس سے ذرا آگے چل رہا تھا اس لیے شاہنگ مال میں داخل ہوتے ہی اس نے سب سے پہلے ایک بوتھک کا رخ کیا کیونکہ اسے اندازہ تھا کہ لڑکیوں کی شاہنگ کا آغاز ہی ڈرہمز و غیو سے ہوتا ہے اس لیے اس نے سب سے پہلے اسی کام کو ترجیح دی۔

وہ اس سے ذرا آگے چل رہا تھا اس لیے شاہنگ مال میں داخل ہوتے ہی اس نے سب سے پہلے ایک بوتھک کا رخ کیا کیونکہ اسے اندازہ تھا کہ لڑکیوں کی شاہنگ کا آغاز ہی ڈرہمز و غیو سے ہوتا ہے اس لیے اس نے سب سے پہلے اسی کام کو ترجیح دی۔

وہ اس سے ذرا آگے چل رہا تھا اس لیے شاہنگ مال میں داخل ہوتے ہی اس نے سب سے پہلے ایک بوتھک کا رخ کیا کیونکہ اسے اندازہ تھا کہ لڑکیوں کی شاہنگ کا آغاز ہی ڈرہمز و غیو سے ہوتا ہے اس لیے اس نے سب سے پہلے اسی کام کو ترجیح دی۔

وہ اس سے ذرا آگے چل رہا تھا اس لیے شاہنگ مال میں داخل ہوتے ہی اس نے سب سے پہلے ایک بوتھک کا رخ کیا کیونکہ اسے اندازہ تھا کہ لڑکیوں کی شاہنگ کا آغاز ہی ڈرہمز و غیو سے ہوتا ہے اس لیے اس نے سب سے پہلے اسی کام کو ترجیح دی۔

مگر علیزے کے لیے یہ کام بہت ہی مشکل تھا اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا لے۔؟ دل اور کی موجودگی میں اسے اپنا آپ بے بس لگ رہا تھا۔ وہ اسے تذہب کا شکار دیکھ کر اس کی پراہلم سمجھ گیا اس لیے اسے ریلیکس کرنے کی کوشش کی۔

”دیکھو! تمہیں کوئی بھی چیز خریدنے کے لیے کوئی بھی روک رکاوٹ نہیں ہے۔ تم اپنی پسند اور مرضی سے جو بھی چاہو خرید سکتی ہو تمہارا کام ہے چیز پسند کرنا اور میرا کام ہے چیز کی قیمت ادا کرنا۔ آگے پیچھے کی سوچیں تم مت سوچو۔ بس اپنی چیزوں کی طرف دھیان دو۔“ دل آور نے اسے بیسوں کی طرف سے بے فکر بننے کے لیے تسلی دی تھی۔ ”تم۔۔۔ مگر مجھے تو یہ بھی نہیں پتا کہ میرے لیے کیا اچھا ہے اور کیا نہیں؟ میں نے اکیلے تو کبھی کچھ بھی نہیں لیا۔ پہلے تو ممایا پھر رجوہیلپ کر دیتی تھیں۔“ علیزے نے خاصی بے چارگی سے کہا اور دل آور کو اس کی یہ پراہلم بھی حل کرنی پڑی تھی۔

”ہوں! ڈونٹ وری یہ بھی کر کے دیکھ لیتے ہیں۔“ وہ ذرا توقف سے کہتا ہوا آگے بڑھ آیا تھا اور پھر ہند رہ سوٹ اس نے مختلف بوتھکس سے علیزے کے ساتھ مل کر خریدے اور پسند کیے تھے جن کے ساتھ میچنگ لیڈر پیگمز اور میچنگ سینڈلز اور شوز بھی تھے اس لیے اب کپڑوں اور جوتوں کے بعد باقی دیگر چیزیں رہ گئی تھیں۔

”اور کیا کیا لیتا ہے؟ ساتھ ساتھ بتاتی جاؤ۔“ وہ ایک لیڈی کاسمیٹکس شاپ کے سامنے رک گیا اور علیزے تھک گئی اب وہ اسے کیا بتاتی کہ اس نے کیا کیا لیتا ہے۔ اس لیے چپ ہو کر اوڑھو دیکھنے لگی تھی۔

”میں نے کچھ کہا ہے شاید؟“ دل آور نے پھر اسے متوجہ کیا تھا۔

”ہوں۔ ہاں وہ انفیکٹ اپنے لیے کپڑوں اور جوتوں کے سوا کچھ بھی لینے کا مجھے ذرا بھی سہنس نہیں ہے۔“ میرے لیے تو ساری چیزیں رجوہیلپ کر کے لے کر جاتی تھی۔ اس لیے مجھے نہیں پتا کہ کیا کیا لیتا ہے۔“

علیزے نے جواب گول مول کر دیا تھا مگر وہ جو آج گھر سے سب کچھ لے کر آنے کا ارادہ کر کے نکلا تھا وہ کوئی بھی چیز مس کر کے جانے والا نہیں تھا اس لیے علیزے کے معذوری ظاہر کرنے کے باوجود اس لیڈیز کاسمیٹکس شاپ میں داخل ہو گیا تھا اور مجبوراً ”علیزے کو بھی اس کے پیچھے اندر آنا پڑا اور جیسے جیسے وہ اس کے لیے میک اپ اور دیگر ضرورت کی اشیا نکھاتا جا رہا تھا علیزے کھڑے کھڑے پانی ہوتی جا رہی تھی اس کی ہتھیلیوں میں پسینہ پھوٹ آیا تھا اور سیلر گرلز علیزے کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

”سہرا! کیا یہ آپ کی وائف ہیں؟“ جیسے ہی دل آور نے کاسمیٹکس سے بھرے ہوئے دونوں بیگ اٹھائے تھے تو ایک سیلر گرل پوچھنے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

”کیا آپ کو میری یہ شاہنگ دیکھ کر نہیں لگ رہا کہ یہ میری وائف ہیں؟“ اس نے شاہنگ کی طرف اشارہ کیا تھا۔

”ہوں! لگ تو یہی رہا ہے سراسر اس لیے تو پوچھا ہے۔“ وہ سیلر گرل مسکرائی تھی۔

”تو پھر ٹھیک ہی لگ رہا ہے۔ یہ میری وائف ہیں۔“ دل آور نے لا پرواہ اور سرسری سے انداز میں بتایا تھا۔

”پھر تو واقعی بہت خوش قسمت ہیں یہ۔ ایسا کیئرنگ ہیزینڈ کسی کسی کو ہی ملتا ہے۔“

اس سیلر گرل نے خاصے رشک آمیز لہجے میں کہا تھا اور اس کی بات پہ جہاں دل آور کے قدم رکے تھے وہیں علیزے کے دل سے اک ہوک سی انٹھی تھی اور پھر دل آور کی سمت دیکھنے بغیر اس شاپ سے باہر نکل آئی تھی۔

”تھنک یو!“ دل آور بے حد آہستگی سے کہتا ہوا ایٹ کر شاہر زائشا گراس کے پیچھے ہی نکل آیا تھا علیزے کا رخ باہر کی طرف تھا جس کا مطلب تھا کہ وہ اب مزید ٹھہرنا نہیں چاہتی اس لیے دل آور بھی سر جھٹک کر لب بھینچتا ہوا اس کے پیچھے ہی سیڑھیاں اتر گیا اور دونوں کے قدم گاڑی کے قریب آکر ہی تھکے۔ لیکن دونوں کے درمیان

وہ اس سے ذرا آگے چل رہا تھا اس لیے شاہنگ مال میں داخل ہوتے ہی اس نے سب سے پہلے ایک بوتھک کا رخ کیا کیونکہ اسے اندازہ تھا کہ لڑکیوں کی شاہنگ کا آغاز ہی ڈرہمز و غیو سے ہوتا ہے اس لیے اس نے سب سے پہلے اسی کام کو ترجیح دی۔

وہ اس سے ذرا آگے چل رہا تھا اس لیے شاہنگ مال میں داخل ہوتے ہی اس نے سب سے پہلے ایک بوتھک کا رخ کیا کیونکہ اسے اندازہ تھا کہ لڑکیوں کی شاہنگ کا آغاز ہی ڈرہمز و غیو سے ہوتا ہے اس لیے اس نے سب سے پہلے اسی کام کو ترجیح دی۔

وہ اس سے ذرا آگے چل رہا تھا اس لیے شاہنگ مال میں داخل ہوتے ہی اس نے سب سے پہلے ایک بوتھک کا رخ کیا کیونکہ اسے اندازہ تھا کہ لڑکیوں کی شاہنگ کا آغاز ہی ڈرہمز و غیو سے ہوتا ہے اس لیے اس نے سب سے پہلے اسی کام کو ترجیح دی۔

بات پھر بھی نہیں ہوئی تھی اور واپسی کا سفر ہنوز خاموشی میں ہی گزر گیا تھا۔

زری باجاگ رہی ہو؟“ نگارش اس کے بیداروں کے دروازے سے دستک دیتی ہوئی اندر آگئی۔ جبکہ زری کی طرف سے کوئی بھی جواب موصول نہیں ہوا تھا وہ بستر پہ جس کمرے میں تھیں ہوئی تھیں۔ اس کے وجود میں ذرا بھی حرکت محسوس نہیں ہوئی تھی اس لیے نگارش دھیمے قدموں سے چلتی ہوئی اس کے قریب بیڈ پہ ہی آئی تھی۔

”زری!“ نگارش کو ہنسا تھا کہ وہ جاگ رہی ہے اور جان بوجھ کر جواب نہیں دے رہی۔

”زری! میں جانتی ہوں کہ تم جاگ رہی ہو لیکن پھر بھی جواب نہیں دے رہی لیکن اس طرح جب رہنے سے کیا ہو گا؟“ ادھر میری طرف دیکھو تو سہی جواب تو دیا۔ نگارش نے زری کو کندھے سے پکڑ کر اس کا سر اپنی طرف موڑنا چاہا تھا لیکن زری کو ہاتھ لگاتے ہی وہ پریشان ہو گئی۔

اسے بہت تیز بخار تھا اور نگارش کو خبر ہی نہیں تھی۔

”زری! تمہیں اتنا تیز بخار ہے اور تم نے بتایا ہی نہیں؟“ نگارش پریشانی اور تشویش سے اس کے ماتھے کو چھو کر دیکھنے لگی۔

”کوئی بخار نہیں ہے مجھے ٹھیک ہوں میں۔“ زری نے سپاٹ سے لہجے میں کہتے ہوئے کمرے میں بی۔

”مگر زری! یہ کیا پاگل پن ہے؟ اپنے آپ سے کیا دشمنی ہے بھلا؟ خود کو کیوں سزا دے رہی ہو؟“ نگارش نے بغور اس کے چہرے کی سمت دیکھا اور خاصی حقیقی کا اظہار کیا۔

”اپنے آپ سے ہی تو دشمنی ہے اور اب اپنے آپ کو ہی تو سزا دیتی ہے۔ زری کو مار ڈالنا ہے جتنے جی پار ڈالنا ہے۔ اب زندگی جینے کا کوئی سبب بھی تو نہیں ہے نا؟“ زری تنگی کے سارے اچھے کڑا سی نیم دراز ہو گئی تھی اور اپنے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئی اپنی ذہنیاتی آنکھوں کے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کی تھی۔

”زری! یہ کیسی باتیں کر رہی ہو تم؟ زندگی جینے کا یہ کوئی طریقہ بھی تو نہیں ہے نا؟ چھڑنے والوں کے ساتھ دنیا چھڑ نہیں جاتی اور مرنے والوں کے ساتھ مرا نہیں جاتا۔ ملتا ہی کچھ ہے جو انسان کے نصیب میں ہوتا ہے۔ تمہیں جو نہیں مل رہا اس پر صبر کو لو کہ وہ تمہارے نصیب میں نہیں ہے۔ تم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پرسکون ہو جاؤ گی۔ نہیں اپنے نصیب پر صبر آجائے گا بس ایک بار اپنے آپ کو تسلی تو دیا اپنے دل کو سمجھاؤ تو سہی“

نگارش نے ہمیشہ کی طرح آج بھی اسے سمجھانے کی ہی کوشش کی تھی مگر اب وہ سمجھنے والی اسٹیج پہ نہیں تھی۔ اب اس کا دکھ تسلی دلا سوں، صبر حد سے نکل چکا تھا۔ اب اس کے دکھ کے دامن میں محض بے صبری تھی۔ آنسو تھے اور آپہں تھیں۔

اب تو اسے تسلی بھی ایسے گنتی تھی جیسے کوئی لگ گئی ہو۔ اور اسی لیے وہ نگارش کی تسلی پہ بلبلا اٹھی تھی۔ اسے بہت دور ہوا تھا۔

”کیسے سمجھاؤں بھابھی؟ کیسے سمجھاؤں؟ اور کب تک تسلیاں دوں اپنے آپ کو؟ کب تک بسلاؤں اپنے دل کو؟ نہیں بھابھی نہیں اب نہیں بسلا یا جاتا مجھ سے۔ اور اب صبر بھی نہیں ہوتا۔ اب کی بار کوئی لگ نہیں ٹوٹا کوئی دل نہیں ٹوٹا اب کی بار میں خود ٹوٹ گئی ہوں، بکھر گئی ہوں۔ میرا صبر اور میرا ضبط سب کچھ بکھر گیا ہے بھابھی۔ میرے بس میں کچھ بھی نہیں رہا۔ میرے دنوں ہاتھ خالی ہو چکے ہیں بالکل خالی۔“ زری اپنے ہاتھوں کو پھیلا کر دیکھتی ہوئی تڑپ تڑپ کر رو پڑی تھی۔

”پلیز زری! بس کرو تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس طرح رونے سے تو تمہاری طبیعت مزید خراب

ہوگی پلیر سنبھالو اپنے آپ کو۔ اس طرح پاگل بننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ نگارش نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا۔

”بھابھی! جس شخص کی محبت کو آپ نے اپنے تن کا اوڑھنا بچھونا اپنے من کا ہٹنا دینا اور اپنا دین و ایمان سمجھ لیا ہو اپنی دنیا اس کی خاطر تیاگ دی ہو اپنا دل اس کے قدموں کی خاک پہ بھی دیا ہو۔ اور وہی شخص ایک روز اگر آپ سے یہ کہہ دے کہ میں مر گیا ہوں بھول جاؤ مجھ کو میں تمہارا تھا ہی نہیں میں پرایا ہوں راستہ چھوڑ دو میرا تو پھر تو پھر آپ انصاف کریں بھابھی۔ تو ایسے میں آپ پہ کیا گزرے گی؟ کیسے تڑپیں گی آپ؟ اور کیسے روئیں گی آپ؟ کیا سمجھ جائیں گی؟ کیا صبر آجائے گا کیسے ہو گا یہ سب؟ جتنا میں مجھے؟

زری نے نگارش کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے تھے اور اسے جھجھکاتے ہوئے متواتر رو رہی تھی مگر نگارش کے پاس اس کے زخمی سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا وہ بے چاری خوب بے بس ہو چکی تھی۔

”بھابھی! بولے نا؟ آپ جواب کیوں نہیں دے رہیں؟ یا پھر اس کی طرح آپ کے پاس بھی میرے سوالوں کا کوئی جواب نہیں ہے؟ اس نے نگارش کے ہاتھوں کو ایک بار پھر اپنے گرم ہاتھوں سے جھجھکاتے ہوئے کہا تھا۔ ”دیکھو زری! تمہیں اس وقت آرام کی ضرورت ہے۔ تم فی الحال آرام کرو۔ میں تمہارے لیے چائے اور ٹیلیٹ لے کر آتی ہوں۔ اس ٹاپک پہ پھر بات ہوگی۔ نگارش زری سے کہتی اس کے ہاتھوں کو تھک کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ ”نہیں! مجھے کچھ مت دیں۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ اور نہ ہی مجھے کچھ لینا ہے۔ میں ایسے ہی تھیک ہوں۔ ٹیلیٹ نہ لینے سے مر نہیں جاؤں گی۔ زندہ رہوں گی ویکھ بیجے گا مرنے والی نہیں ہوں میں۔“

زری نے نفی میں ہلاتے ہوئے چائے اور ٹیلیٹ سے انکار کر دیا تھا۔

”زری! تم خود سوچو اگر عبد اللہ کو تمہاری اس حالت کا پتا چل گیا تو وہ کیا سوچیں گے؟ کیا خیال کریں گے وہ؟ اس لیے پلیر جو بات جو مسئلہ پروے میں ہے اسے پروے میں ہی رہنے دو۔ ورنہ بہت شاک لگے گا ان کو۔ کیونکہ ایسا کوئی مسئلہ تو ان کے خواب و خیال میں بھی نہیں ہو گا؟“

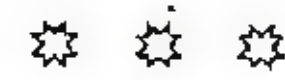
نگارش اسے ہر طرح سے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن وہ سمجھتی بھی تو تھیں نا؟

”بھابھی! مرنے والا بھی یہ نہیں سوچتا کہ میرے مرنے کے بعد کون کیا سوچے گا؟ اور کون کیا خیال کرے گا؟ وہ اس وقت بس یہ ہی سوچ رہا ہوتا ہے کہ وہ مر رہا ہے وہ مٹ رہا ہے وہ ہمیشہ ہمیش کے لیے ختم ہو رہا ہے۔ اور اس ختم ہونے کا غم اسے کچھ بھی سوچنے نہیں دیتا۔ اس لیے مجھے بھی اس وقت یہی سوچ کھائے جا رہی ہے کہ میں اندر ہی اندر مر رہی ہوں مٹ رہی ہوں ہمیشہ ہمیش کے لیے ختم ہو رہی ہوں اور میرے ساتھ ساتھ میرا دل بھی مر رہا ہے۔ اور اس دل میں ملنے والی محبت بھی مر رہی ہے۔ اس لیے مجھے کچھ خبر نہیں کہ کون کیا سوچ رہا ہے؟ یا پھر کون کیا سوچے گا؟ بس آپ مجھے میرے حال پہ چھوڑ دیں۔ مجھے اکیلا چھوڑ دیں۔ مجھے تنہا رہنے دیں پلیر!“

اس نے بے تحاشا روتے ہوئے نگارش کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے اور نگارش چند سیکنڈ یونہی کھڑی اسے دیکھتی رہی اور پھر پلٹ کر ہر نکل گئی حالانکہ وہ زری کو تانے آئی تھی کہ دل اور بھائی نے آج شام کو ان لوگوں کو اپنی طرف انوائٹ کیا ہے اور ساتھ میں یہ بھی کہا ہے کہ انہوں نے کسی سے ملوانا ہے۔

”اب کس سے ملوانا ہے؟ وہ لوگ یہی سوچ سوچ کر تو حیران ہو رہے تھے۔

لیکن زری کی کنڈیشن دیکھ کر نگارش خاموشی سے چپ چاپ کچھ بھی کہے بغیر واپس چلی گئی اور زری اس کے جاتے ہی تنکے میں منہ چھپائے اور زیادہ تڑپ تڑپ کے روئی گئی۔



وقار آندھی کے بیڑ روم میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وہ تنہا نفس اپنی اپنی سوچ اور اپنے اپنے خیال

میں گم ہونے لگے تھے۔ اور لاشعوری طور پر ایک دوسرے کی طرف سے کچھ کہنے کے منتظر تھے۔ مگر کسی کے پاس بھی کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ ان میں سے کوئی کہتا بھی تو کیا کہتا؟

بس وال کلاک کی سوئیوں کی ٹک ٹک بھی جو متواتر ثنائی دے رہی تھی اور اسی ٹک ٹک کے دوران ہی اچانک موبائل کی رنگ بج اٹھی تھی اور آذر نے بے ساختہ چونکتے ہوئے موبائل کی طرف دیکھا اور پھر یونہی ہاتھ بڑھا کے نمبل پہ رکھے موبائل پہ بجتی کال ڈس کنیکٹ کر دی تھی اور ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے دوبارہ سر جھکا لیا۔ مگر اب کچھ کہنے کے ارادے سے سر جھکا یا تھا اور تمہید باندھنے کے لیے الفاظ تلاش کرنے لگا۔

لیکن کبھی کبھی برے وقت میں اچھے دوستوں کی طرح الفاظ بھی انسان کا ساتھ چھوڑ جاتے ہیں تب انسان کو اپنی مدد آپ کے تحت ہی سب کچھ خود سنبھالنا پڑتا ہے سو اس وقت آذر کا بھی یہی حال تھا۔ اسے بھی سب کچھ خود ہی سنبھالنا تھا۔

”ڈیڈ! ان لیکٹ میں آپ کو اپنی فیلنگز اور اپنے اموشنز بیان کر کے نہیں بتا سکتا اور نہ ہی آپ لوگوں میں سے کوئی اس چیز کو سمجھ سکتا ہے۔ اس لیے پلیر میری آپ سے یہی ریکوریسٹ ہے کہ آپ مجھے مجبور مت کریں۔ میں کول سے شادی نہیں کر سکتا۔ میرے دل و دماغ میرا ساتھ نہیں دے رہے۔ میں اس معاملے میں خود کو بہت بے بس پارہا ہوں۔ پلیر آپ می پیاسے بھی کہہ دیں وہ مجھے میرے حال پہ چھوڑ دیں۔“ بالا خراس نے جودل و دماغ میں تھا وہ کہہ ہی دیا۔

اور اس کی بات سے وقار آندھی نے نظروں کا زاویہ بدل کر آسیہ آندھی کی سمت دیکھا تھا جیسے ان سے کچھ کہنے کی التجا کی ہو اور وہ آسیہ آندھی تھیں جو ان کی نظروں کے زاویے بھی سمجھتی تھیں۔

”لیکن بیٹا! تمہیں تمہارے حال پہ چھوڑ دینا اس مسئلے کا کوئی حل بھی تو نہیں ہے نا؟ کول اس گہری بڑی بیٹی ہے۔ اچھی ہے۔ خوب صورت ہے اور سب سے بڑی بات کہ تمہاری ہم عمر بھی ہے۔ تم اس سے شادی نہیں کرو گے تو اور کون کرے گا؟ جوت اور زین وغیرہ تو ہیں ہی اس سے چھوٹے اور وائیال کے لیے تو تم پہلے ہی حرمت کا کہہ چکے ہو اس لیے تم خود سوچو پھر کول کی نسبت کس سے ٹھہرائی جائے۔“ آسیہ آندھی نے اسے ہر اوجھ بچ سے آگاہ کرنے کی پوری پوری کوشش کی تھی۔

”آئی! یہ میرا مسئلہ نہیں ہے میرا مسئلہ اپنی ذات ہے میں دو سروں کو دیکھوں یا اپنے آپ کو دیکھوں؟“ آذر کا لہجہ بے بس سا ہو رہا تھا اور آسیہ آندھی کے ساتھ ساتھ وقار آندھی بھی اسے دکھ کے رہ گئے تھے۔

”میں جانتی ہوں بیٹا! اپنے دل کو اور اپنی ذات کو مارنا بہت مشکل ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی اپنوں کی خاطر انسان کو اپنے آپ کی بھی قربانی دینی پڑ جاتی ہے۔ اپنے جذبات اور احساسات وغیرہ کو دبا کر دو سروں کے جذبات اور احساسات کی قدر کرنی پڑتی ہے۔ اپنے آپ کی بجائے دو سروں کو دیکھنا پڑتا ہے اور یہ سب کچھ کرنے کے لیے انسان کے اندر حوصلہ، ظرف، صبر کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ ورنہ ہر کوئی ایسی قربانی نہیں دے سکتا اور مجھے پتا ہے کہ تمہارے اندر حوصلہ بھی ہے ظرف بھی ہے اور صبر بھی ہے تم اپنے دل کو اور اپنی ذات کو مار سکتے ہو تم یہ قربانی دے سکتے ہو ورنہ یہ گھر جو پہلے ہی اتنا بکھر چکا ہے تمہارے اس انکار سے مزید ٹکنا ٹکا ہو جائے گا اور بڑی حویلی کی تباہی پورا شہر دیکھ گئے گا۔“

آسیہ آندھی اس کو ہر ممکن طریقے سے سمجھانا چاہتی تھیں اور آذر کے دل پہ اک سالیہ سالہرا گیا تھا۔ (اور آذر آندھی کے دل کی تباہی کون دیکھے گا؟) آذر دکھ کی شدت سے شخص سوچ کے رہ گیا تھا۔

”آئی! مجھے کچھ وقت چاہیے میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ اس نے خامسے تھکے تھکے سے انداز میں کہا تھا۔

”کیا کچھ وقت کے بعد تمہاری فیلنگز اور تمہارے اموشنز بدل جائیں گے؟ یا پھر پھر تم بدل جاؤ گے؟“ آسیہ

آندری آج یہ مسئلہ حل کر کے ہی اٹھنا چاہتی تھیں اسی لیے آذر کو دیکھتے ہوئے ذرا توقف سے پھر گیا ہوا تھا۔
”دیکھو بیٹا! یہ بات تم بھی جانتے ہو اور میں بھی جانتی ہوں کہ کچھ وقت کے بعد بھی نہ تمہاری فیملی گزیر اور
اموشی بدلیں گے اور نہ ہی تم بدلو گے اور جب سب کچھ وہی رہتا ہے تو پھر کچھ وقت کی کیا ضرورت ہے؟ تم نے
فیصلہ ہی کرنا ہے نا؟ کل بھی اور آج بھی تو کیا یہ ہنسنے نہیں ہے کہ وہ فیصلہ تم آج ہی کر لو؟“ انہوں نے ڈائریکٹ آذر
کے چہرے کی سمت دیکھتے ہوئے کہا تھا اور آذر نے اک گہری سانس کھینچتے ہوئے سر اٹھا کر آسیہ آندری اور وقار
آندری کی طرف دیکھا تھا۔

”آپ کیا چاہتی ہیں آئی؟ کہ میں یہ شادی کر لوں؟“ اس نے جیسے فیصلہ کن لہجے میں پوچھا۔

اور اس کے سوال پہ آسیہ آندری نے وقار آندری کو دیکھا تھا جن کے چہرے پر اقرار نظر آ رہا تھا۔

”ہوں! تو پھر ٹھیک ہے یہ فیصلہ میں آپ لوگوں پر چھوڑتا ہوں میرے لیے تمہی بیبا سے بدھ کر آپ اور ڈیڈ ہیں
آپ جو بھی فیصلہ کریں گے مجھے قبول ہوگا اگر میری ذات کی تباہی سے بڑی حوصلی تباہی سے بچ سکتی ہے تو آپ لوگ
بجائیں میں قربانی کے لیے حاضر ہوں۔“ آذر یکدم صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور ان دنوں کو اپنے فیصلے سے آگاہ
کرتا ہوا الپٹ کریڈر روم سے نکل گیا تھا۔

”آذر!“ آسیہ آندری نے بے ساختہ پکارا مگر وہ اب ٹھہر نہیں سکتا تھا اور وہ وقار آندری کی طرف دیکھ کے رہ گئی
تھیں جن کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں کیونکہ آذر کو انہوں نے اپنے منگے بیٹوں سے بھی بدھ کے چاہا
تھا اور اس کی تعلیم و تربیت پہ بھی خاص توجہ دی تھی۔

اس لیے آذر کی شخصیت اور ذہانت کا سہرا وقار آندری کے سر ہی جاتا تھا اور آذر کی بھی سب سے زیادہ اٹیچ
منٹ اور انڈر اسٹینڈنگ ان ہی کے ساتھ تھی اسی لیے آذر کے انکار پہ اسرار آندری اور ثروت بیگم نے یہ مسئلہ
ان ہی کے سامنے رکھا تھا اور مجبوراً ”وقار آندری اور آسیہ آندری کو اسے بلا کر سمجھانا پڑا تھا حالانکہ اس کے
جذبات سے وہ دنوں بھی دست اچھی طرح واقف تھے، لیکن وہ بھی کیا کر سکتے تھے بھلا۔

انہوں نے بھی سارے حالات مد نظر رکھتے ہوئے اسے سمجھانے کی پوری کوشش کی تھی جس کے نتیجے میں یہ
ہوا تھا کہ وہ اپنی زندگی کا فیصلہ ان پہ چھوڑ گیا تھا اور انہوں نے اللہ کا نام لے کر یہ فیصلہ کوئل کے حق میں سنایا تھا۔
جس پہ کوئل کے ساتھ ساتھ بڑی حوصلی کے تمام افراد ہی بہت خوش ہوئے تھے اک سوائے آذر آندری کے۔

شام کے قریب زری کا بخار قدرے کم ہو چکا تھا۔ اسی لیے نگارش اسے باہر لان میں بیٹھے دیکھ کر اس کے پاس
ہی چلی آئی تھی۔

”اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟“ نگارش نے قریب آکر باقاعدہ اس کی پیشانی اور کلائی کو چھو کر دیکھا تھا اس کا
جسم ہلکے کے مقابلے میں اب ذرا ٹھنڈا محسوس ہو رہا تھا اس لیے وہ تھوڑی ریلیکس ہو گئی تھی۔

”کچھ کھاؤ گی؟ لے کر آؤں تمہارے لیے“ نگارش کو بتاتا تھا کہ اس نے صبح سے کچھ بھی نہیں کھایا۔
”نہیں! ضرورت نہیں ہے۔“ زری کا جواب تلخ سا محسوس ہو رہا تھا نگارش اس کے سامنے ہی کرسی کھینچ کے
بیٹھ گئی۔

”ہمارے ساتھ چلو گی اس کے گھر؟“

”کس کے گھر؟“ نگارش کے عجیب سے لب و لہجہ زری نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

”تمہارے وکیل صاحب کے گھر۔“

”کیوں؟ اس وقت کیوں؟“ اسے حیرانی ہوئی تھی۔

”یہ تو ہمیں بھی نہیں پتا کہ اس وقت کیوں جانا ہے؟ بس اتنا پتا ہے کہ اس نے صبح فون کر کے ہمیں اور نبیل
بھائی کی فیملی کو انوائٹ کیا ہے اور ساتھ میں یہ بھی کہا ہے کہ ہمیں کسی سے ملوانا ہے اب وہ کسی۔“ کون ہے؟
یہ ہم میں سے کسی کو بھی خبر نہیں ہے؟“ سبھی اپنے اپنے ذہن میں ایک ایک سوالیہ نشان لیے گھوم رہے تھے۔
”بہر حال جو بھی ہے جانا تو ہے ہی۔ اس لیے میں ذرا فریش ہونے کے لیے جا رہی تھی مگر سوچ رہی ہوں کہ تم
بھی ساتھ چلو آخر تم بھی تو دیکھو کہ وہ کس سے ملوانا چاہ رہا ہے؟“

نگارش نے بات کرتے کرتے زری کو بھی حلقے کا اشارہ کیا تھا حالانکہ زری اس کی بات سن کر الجھ سی گئی تھی اور
باقی سب کی طرح اسے بھی حیرانی ہوئی تھی کہ وہ آخر کس سے ملوانا چاہ رہا ہے اور ایسا کون سا رشتہ ہے اس کا جس کو
وہ لوگ نہیں جانتے۔

”کیا خیال ہے تمہارا چلو گی ہمارے ساتھ؟“ نگارش نے الجھی ہوئی زری کو سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔
”نہیں! میں اس کے گھر نہیں جانا چاہتی۔ آپ لوگ چلے جائیں میں یہیں ٹھیک ہوں۔“ اس نے جانے سے
انکار کر دیا تھا۔

”تو کیا تم اب کبھی بھی اس کے گھر نہیں جاؤ گی؟ اور اگر نہیں جاؤ گی تو باقی سب کو کیا جواب دو گی کہ تم اس کے
گھر کیوں نہیں جاتیں مدیہ جاتی ہے میں جاتی ہوں، نبیل بھائی اور عبداللہ جاتے ہیں تو پھر تم کیوں نہیں جاتیں؟ کیا
وجہ بتاؤ گی سب کو؟“ نگارش نے ذرا خفگی سے پوچھا تھا اور زری چپ ہو گئی تھی۔

”لیکن! بلا یا تو اس نے آپ لوگوں کو ہے نا تو آپ لوگ جائیں میرا جانا ضروری تو نہیں ہے۔“ اس نے پھر ذرا
توقف سے جواب دیا تھا۔

”اس نے تمہیں بھی بلایا ہے۔“ اس کے جواب پہ نگارش جھنجھلا کر بولی تھی۔
”مجھے بھی؟“ اب کی بار وہ ٹھٹھکی تھی۔

”ہاں! تمہیں بھی کیونکہ اس نے عبداللہ سے کہا ہے کہ بھابھی وغیرہ کو لے کر وقت پہ آجانا اس لیے اب اس
کی اس بات کا مطلب تم خود ہی سمجھ سکتی ہو کہ بھابھی تو چلوں میں ہو گئی تو پھر بھابھی کے ساتھ یہ ”وغیرہ“ کون ہے؟
ورنہ وہ یہ بھی تو کہہ سکتا تھا کہ بھابھی کو لے کر وقت پہ آجانا“ نگارش نے دل آوری کی بات کا مفہوم اخذ کیا تھا اور
زری کے دل پہ چوٹ پڑی تھی۔

”تو کیا اب میں اس کی باتوں سے اس کے لفظوں کے مطلب ڈھونڈ کر اس کے گھر جاؤں گی؟“ زری کا لہجہ بھرا
گیا تھا۔

”ہاں! یہ تو ہے آخر وہ وکیل صاحب ہیں تمہارے۔ صاف بات کہنے کا تو پیشہ ہی نہیں ہے ان کا۔“ نگارش
ذرا غصہ کھائے ہوئے تھی اور زری پھر سے بھگم گئی۔

”نہیں ہیں وہ میرے وکیل صاحب۔ وہ وقت اور تھا جب مجھے اس کو اس کے نام سے بلاتے ہوئے شرم آتی
تھی میں جھجھکتی تھی اسے دل آوری پھر شاہ کہتے ہوئے اس لیے اسے اس کے پیشے کے حوالے سے بلاتی تھی
مگر اب اب وہ مرجکا ہے تو زندہ میں بھی نہیں ہوں اب وہ بھی میرے لیے کچھ اور نہیں صرف دل آوری شاہ ہے
جیسے سب کے لیے ہے ویسے ہی میرے لیے بھی ہے وہ جو اک ”خاص“ بات تھی وہ ختم ہو چکی ہے اب یہاں کچھ
بھی نہیں رہا۔“

زری بھگمے ہوئے لیے میں کہہ کر رو پڑی تھی اور نگارش عبداللہ کی گاڑی گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر فوراً
اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی تھی۔

کیونکہ عبد اللہ نے اسے گھر آنے سے پہلے کال بھی کی تھی کہ وہ اس کے آنے سے پہلے تیار ہو جائیں لیکن وہ تیار ہونے کی بجائے یہاں زری کے پاس ہی بیٹھ گئی تھی اس لیے اسے اندازا تھا کہ اب عبد اللہ غصہ ضرور کرے گا کیونکہ ٹائم کافی زیادہ ہو چکا تھا۔

”کیا بات ہے؟ تم لوگ ابھی تک ایسے ہی بیٹھی ہو؟ تیار نہیں ہوئیں؟“ عبد اللہ کو اُلجھ ہوئی تھی۔
”وہ بس میں تیار ہونے کے لیے جا ہی رہی تھی کہ زری کو دیکھ کر رگ گئی تھی زری کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے وہ کہتی ہے کہ آپ لوگ چلے جائیں میں نہیں جا رہی۔“ نگارش نے زری کے سنبھلنے تک بات سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔

”ارے کیوں؟ کیا زیادہ طبیعت خراب ہے؟“ عبد اللہ خاصی فکر مندی سے اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔
”ہاں! صبح بہت تیز بخار تھا اسے لیکن اب اللہ کا شکر ہے کہ پہلے سے بہتر ہے۔“ نگارش نے اسے تسلی دی تھی۔

”لیکن پھر بھی ایک بار ڈاکٹر کو تو کھانا لینا چاہیے تھا۔ اٹھو زری ابھی ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں بعد میں کہیں اور چلیں گے۔“ عبد اللہ نے اسے فوراً اٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔

”نہن۔ نہیں بھائی! اس کی ضرورت نہیں ہے میں اب کافی ٹھیک ہوں۔“ زری نے نفی میں گردن ہلائی تھی۔
”کیا واقعی سچ کہہ رہی ہو؟“ عبد اللہ نے پورا یقین چاہا تھا۔

”جی! سچ کہہ رہی ہوں۔“ وہ اثبات میں بولی تھی۔
”ہوں! تو پھر جلدی سے اٹھو اور چینیج کر کے آجاؤ ہمیں بس پانچ منٹ میں نکالنا ہے۔“ وہ کہہ کے آگے بڑھ گیا تھا۔

”گھر بھائی!“ زری التجائیہ سے لہجے میں برپلائی تھی۔
”مگر کچھ نہیں! تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے تمہیں گھر پہ اکیلا نہیں چھوڑا جاسکتا۔ تم ہمارے ساتھ ہی چلو گی بس بات ختم۔“ عبد اللہ نے جاتے جاتے پلٹ کر جواب دیا اور اندر چلا گیا تھا اور زری نگارش کو دیکھ کے رہ گئی تھی جو عبد اللہ کے پیچھے ہی اندر کی سمت قدم بڑھا چکی تھی۔

علیٰ زے کی شاپنگ کا سارا سامان گل نے ہی شاپنگ پیجز سے نکال کر وارڈروب ڈریسنگ ٹیبل اور باتھ روم میں سیٹ کیا تھا اور یہ کام کرتے ہوئے گل بھی اندر سے بہت خوش تھی کہ چلو شکر ہے کہ علیٰ زے لی بی کی زندگی بھی رفتہ رفتہ اپنے اصل مقام پر سیٹ ہو رہی ہے ورنہ وہ لوگ تو اسے دیکھ دیکھ کر اندر ہی اندر جلتے کڑھتے رہتے تھے لیکن اب انہیں بھی تسلی ہو گئی تھی کہ ان شا اللہ اک دن علیٰ زے لی بی بھی اپنے شایان شان زندگی بسر کرے گی اور گزشتہ تمام دکھ تمام اذیتیں اور تمام تکلیفیں بھول جائے گی اور اللہ کی خاص رحمت ہوگی اس کی ذات پر۔

کیونکہ اس کے صبر برداشت کا پیمانہ بہت وسیع تھا۔ اور اک نہ اک دن اللہ انسان کو اس کے صبر برداشت کا صلہ ضرور دیتا ہے سوا سے بھی یہ صلہ ضرور ملے گا ان لوگوں کو پورا پورا یقین تھا۔

”گل! اپنی بی بی جی سے کہہ دو کچھ دیر میں کپڑے چینیج کر کے تیار ہو جائیں میرے کچھ مہمان آ رہے ہیں ان سے ملنے کے لیے۔“ گل وارڈروب بند کر کے پلٹ رہی تھی جب اندر داخل ہوتے دل اور کی آواز پہ ٹھنک کر رک گئی تھی کیونکہ علیٰ زے سامنے ہی تو بیڈ پہ بیٹھی ہوئی تھی لیکن وہ پھر بھی گل کو مخاطب کر کے پیغام دے رہا تھا اور گل

کے لیے تو یہ بھی ایک حیرت کا مقام ہی تھا۔

”گل! اپنے صاحب جی سے کہو میں جانتی ہوں۔ اس لیے آپ فکر نہ کریں میں کچھ دیر میں کپڑے چینیج کر کے تیار ہو جاؤں گی۔“ علیٰ زے نے بھی جواباً اسی کے سے انداز میں جواب دیا تھا اور گل ان کے سوال و جواب پہ ہکا بکاسی رہ گئی تھی۔

”گل! اپنی بی بی جی سے کہہ دو کہ میں نیچے انتظار کر رہا ہوں جب بلاؤں تو وہ نیچے آجائیں۔“ اس نے ایک اور پیغام دیا تھا۔

”گل! اپنے صاحب جی سے کہو آپ جب بھی بلائیں گے میں آجاؤں گی۔“ اس نے فوراً پیغام کا جواب دیا تھا۔

”ہوں! شکریہ“ وہ کہتے ہوئے لب بھینچ کر پلٹا اور بیڈ روم سے باہر نکل گیا تھا اور علیٰ زے گہری سانس خارج کر کے رہ گئی تھی۔

”اب کیا کرنا ہے بی بی جی؟ مہمان تو بس آتے ہی ہوں گے“ گل کو بھی پتا تھا کہ نبیل اور عبد اللہ اپنی فیملی کے ساتھ آ رہے ہیں۔

”تم میرے لیے کپڑے نکال دو میں شاہرے لوں۔“ علیٰ زے سنجیدگی سے کہتی بیڈ سے اٹھ گئی تھی اور گل اثبات میں سر ہلا کر وارڈروب سے اس کے لیے کپڑے نکالنے لگی۔

آج کوئی ہنر، کوئی روش، کوئی طریقہ تو بتاؤ۔
کہ دل ٹوٹے بھی نہ وہ ملے بھی نہ اور چین آجائے۔

ان کی گاڑی ایک جھٹکے سے آکر اس کے گھر کے ڈرائیوے پہ رکی تھی اور زری کے دل سے پھر ایک سایہ سا گزرا تھا کیونکہ وہ آج بھی ڈرائیوے پہ نہیں ان کی گاڑی کے سامنے کھڑا تھا اور عبد اللہ گاڑی کا انجن بند کر کے گاڑی سے نیچے اتر آیا اور ان کے ہاتھ ملائے تھوڑی دیر بعد وہ بھی گاڑی سے اتر آئی تھیں۔

”السلام علیکم دل اور بھائی! کیسے ہیں آپ؟“ نگارش بھی اس کے قریب آکر کھڑی ہوئی۔

”وعلیکم السلام! اللہ کا شکر ہے میں ٹھیک ہوں آپ سنا میں آپ سب کیسے ہیں؟“ اس نے بڑے تحمل اور سکون سے جواب دیا تھا زری اسے اک نظر دیکھ کر سب کچھ سمجھ گئی تھی کیونکہ وہ اسے آج بھی پر ایسا ہی نظر آیا تھا اور اس سے پہلے کہ نگارش کچھ کہتی اچانک ہی دوبارہ گیٹ کھلا تھا اور نبیل کی گاڑی فرارے بھرتی ہوئی اندر آ گئی تھی۔

”لو جی! وہ لوگ بھی آ گئے۔“ عبد اللہ نبیل کی گاڑی دیکھ کر مسکرایا۔

”بڑے وقت پہ نیچے ہو دو نوں“ دل اور کادل اندر سے بے حد افسردہ سا ہو رہا تھا کیونکہ وہ آج اپنے جان سے عزیز اور شہ رگ سے بھی قریب تر دوستوں کو ایک ناقابل یقین دھچکا دینے جا رہا تھا جس کا اسے بے پناہ افسوس تھا اور پھر اس افسوس کے باوجود اسے اپنے آپ کو کمپوز بھی کرنا پڑ رہا تھا اس لیے جس اذیت کا وہ شکار تھا وہ اسے اپنے چہرے سے ظاہر بھی نہیں ہونے دیتا تھا اور یہ بھی اس کے لیے ایک اذیت ہی تھی۔

”کیا خیال ہے بھائی؟ ہم لوگ واپس چلیں؟ دل اور بھائی تو راستہ دینے والے نہیں لگ رہے؟“ مدحیہ نے نبیل اور عبد اللہ کو مخاطب کیا تھا اور دل اور بے ساختہ چونک گیا تھا۔

”ارے نہیں نہیں یار! آپ لوگ اندر آجاؤ میں کافی دیر سے آپ لوگوں کا ہی تو انتظار کر رہا تھا۔“ دل اور

قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی درجی معلومات میں اشاعت اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے عزتی سے نہ ٹھہرائیں۔

فورا رات سے ہٹ گیا تھا اور پھر وہ سب اس کے ساتھ چلتے اندر آ گئے تھے۔

”ارے بیٹا! میں تو تمہارے اس طرح اچانک سب کو ایک ساتھ بلا نے پریشان ہی ہو گئی تھی صبح سے سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ تم نے کیوں بلایا ہے اور آخر کس سے ملوانا ہے؟ میں تو تم سے فون پر ہی پوچھنے والی تھی لیکن نبیل نے ہی منع کر دیا تھا۔“ فائزہ بیگم نے آج پہلی بار کچھ بولنے میں پہل کی تھی اور دل آور نے بمشکل مسکرائے کی ناکام سی کوشش کی تھی ورنہ اس سے نہ تو مسکرایا جا رہا تھا اور نہ ہی منہ سے کچھ کہا جا رہا تھا مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی تھا اب ان کو گھر بلا کر خود چپ ہو کر تو نہیں بیٹھنا تھا۔

”ہوں! ابھی آپ بیٹھیں کھانا کھائیں کچھ ریلیکس کریں پھر آپ کو بتاتا ہوں کہ میں نے آپ کو کس سے ملوانا ہے۔“ دل آور نے بات کو غیر سنجیدگی سے لیا تھا۔

”لیکن بھائی! اس طرح تجسّس کے مارے تو کھانا بھی نہیں کھایا جائے گا؟“ مدیحہ ذرا سا جھنجھلائی تھی۔

”لیکن! اس طرح تجسّس ختم ہو جائے کے بعد بھی تم سے کھانا نہیں کھایا جائے گا۔“ دل آور کو ان سب کے رد عمل کا پہلے سے ہی کافی اچھی طرح سے انداز تھا۔

”ارے! ایسا کون سا تجسّس ہے جس کی دونوں صورتیں ہی خطرناک ہیں، جاننا بھی اور نہ جاننا بھی؟“ مدیحہ جان بوجھ کر دل آور کا موڈ خراب کرنے کے لیے حد سے زیادہ ایکسائیٹڈ ہو رہی تھی۔

”بس ہوتا ہے کبھی کبھی! ایسا بھی ہوتا ہے اپنی دے! آپ لوگ فی الحال کھانا کھالیں کھانا تیار ہے یہ باتیں تو بعد میں بھی ہوتی رہیں گی۔ زلفی! زلفی! کل سے کہو کھانا لگا دے۔“ دل آور مدیحہ سے کہتے ہوئے زلفی کو پکارنے لگا۔

”جی صاحب جی! ابھی کہہ دیتا ہوں۔“ وہ سر ہلا کر فوراً چلا گیا۔

اور پھر ٹھیک دس منٹ کے بعد گل نے کھانا نبیل پر لگا دیا تھا اور وہ سب ڈائننگ روم میں آ گئے تھے۔

”جی صاحب جی! ابھی کہہ دیتا ہوں۔“ وہ سر ہلا کر فوراً چلا گیا۔

”جی صاحب جی! ابھی کہہ دیتا ہوں۔“ وہ سر ہلا کر فوراً چلا گیا۔

کھانے سے فارغ ہو کر وہ واپس ڈائننگ روم میں آ بیٹھے تھے۔

”تمہاری کیسی طبیعت ہے بیٹا؟ بخار کم ہوا؟“ فائزہ بیگم نے زری کی سمت متوجہ ہوتے ہوئے اس کی کلائی کو چھو کر دیکھا تھا۔

”جی! پہلے سے بہتر ہوں میں تو گھر پر ہی رہنا چاہ رہی تھی، لیکن بھائی اور بھابی نے ہی نہیں رکھنے دیا، بخار کی وجہ سے خاصی تھکن ہو رہی ہے۔“ زری کی آواز اور لہجہ بھی خاصا نہ ہال لگ رہا تھا دل آور اس کی بات سن کر سرخ پھیر گیا تھا تاکہ نظر وہ بارہ اسے دیکھنے کی غلطی نہ کرے!

”ہاں! تو اچھا کیا ہے نا انہوں نے، بخار کی حالت میں تمہیں گھر پر کیسے چھوڑ آتے؟“ فائزہ بیگم نے ان کی حمایت میں جواب دیا تھا۔ اور ذرا فاصلے پر بیٹھے دل آور کو مزید شرمندگی ہوئی تھی۔

”ایم سو ری! میری وجہ سے آپ سب کو زحمت اٹھانا پڑی ہے، لیکن مجبوری تھی آپ سب کو یہاں بلانا اور بتانا بھی ضروری تھا کیونکہ آپ لوگ میرے لیے پریشان تھے آپ کو فکر تھی کہ میں اکیلا ہوں حالانکہ ایسا نہیں ہے میں اکیلا نہیں ہوں۔ میرے ساتھ میری تمنا کی اور میرا اکیلا پن شیئر کرنے کے لیے کوئی اور بھی ہے ایک ایسا رشتہ جو انسان کے ہر اچھے اور برے وقت میں اس کے ساتھ ہوتا ہے اور سا بھی کہلاتا ہے اس لیے اپنے اسی رشتے سے ملوانے کے لیے میں نے آپ سب کو یہاں بلایا ہے۔ امید ہے کہ اگر آپ لوگوں کو زیادہ اچھا نہ لگا تو زیادہ برا بھی نہیں لگے گا۔“ دل آور کو زندگی میں پہلی بار کچھ کہتے ہوئے اتنی پریشانی اور پشیمانی کا سامنا ہو رہا تھا۔ ورنہ وہ بات کہتے ہوئے ڈرنے اور جھجکنے والا آدمی نہیں تھا اس کی تو ہر بات کھری اور دونوں ہوتی تھی۔

”دل آور! تم کیا کہہ رہے ہو ہمیں کچھ سمجھ نہیں آ رہا؟“ عبد اللہ کے ساتھ ساتھ باقی سب بھی الجھے ہوئے بیٹھے تھے۔

”ہوں! مجھے پتا ہے کہ تم لوگ کچھ بھی نہیں سمجھو گے اور نہ ہی میں تم لوگوں کو سمجھا پاؤں گا، لیکن پھر بھی بتانا تو ہے۔“ اس نے کہتے ہوئے سب کو چائے سرو کرتی گل کی طرف دیکھا تھا۔

”جاؤ گل! علیزے بی بی کو اپنے ساتھ لے آؤ۔“ اس نے علیزے کو سب کے سامنے لانے کا حکم دے ہی دیا تھا اور وہ سب حیران پریشان سے دیکھ رہے تھے کہ وہ کہہ کیا رہا ہے؟ اور ہو کیا رہا ہے۔

”جی صاحب! ابھی لے آتی ہوں؟“ گل ٹرے اک سائیڈ پر رکھ کے پلٹ کر ڈائننگ روم سے باہر چلی گئی اور پھر محض پانچ منٹ لگے تھے گل کی واپس کو اور ان لوگوں کی آنکھیں خیرہ ہونے کو! کیونکہ گل کے ساتھ علیزے بھی تھی جو ان سب کے سامنے سنگ مرمر کی صورت کی طرح آکھڑی ہوئی تھی۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

شائع ہوئے ہیں

☆ تتلیاں، پھول اور خوشبو	راحت جبین	قیمت: 250 روپے
☆ بھول بھلیاں تیری گلیاں	فائزہ افتخار	قیمت: 600 روپے
☆ محبت بیاں نہیں	لبنی جدون	قیمت: 250 روپے

لے آؤ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ☆ ہر بک سٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیننگ اور اچھے پرنٹ سٹ
- ☆ ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ مایا سٹ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں ایلوڈنگ
- ☆ پریم کوالٹی اندل کوالٹی کیگریڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریٹ
- ☆ ایڈفری لکس، لکس کو میس کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

داعد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

☆ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

☆ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں جاری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک ویکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

”السلام علیکم؟“ علیزے اندر سے بہت کنفیوژ بھی تھی مگر کیا کرتی زندگی کا یہ لمحہ بھی تو اک دن فیس کرتا ہی تھا سو اسے اندر ہمت تولاتی ہی تھی اور وہ لے ہی آئی تھی۔
”وعلیکم السلام!“ انہوں نے بمشکل اس کے سلام کا جواب دیا تھا اور دل اور اپنے آپ کو کنٹرول کرتا ہوا صوفے سے اٹھا اور علیزے کے قریب اس کے پہلو میں آکھڑا ہوا تھا۔
”علیزے! ان سے ملو یہ میرے بہت ہی گہرے دوست فیمل حیات کی مدد میں سفارتہ آئی اور میرے لیے بھی بالکل میری ماں کی طرح ہیں اور سفارتہ آئی یہ ہے علیزے میری بیوی مسزول اور شاہ۔“
اس نے علیزے کو سفارتہ بیگم سے متعارف کرواتے ہوئے باقی تمام افراد پہ جیسے انتہائی تباہ کن ہم پھوڑ دیا تھا اور بیٹھے بیٹھے ان سب کے دل و دماغ کے پرچے اڑ گئے تھے اور اس پاس سب کچھ دھواں دھواں ہو گیا تھا۔
”مسزول اور شاہ؟“ زری کے ہونٹ ذرا سا کپکپائے تھے اور بھرو ہیں کے وہیں ساکت وصامت بھی ہو گئے تھے۔

”دل اورے! یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ تم ہوش میں تو ہونا؟“ عبداللہ اپنی جگہ سے بے ساختہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔
”میں جو کہہ رہا ہوں وہ آپ سب سن رہے ہیں یہ کوئی مذاق نہیں ہے یہ ایک سچ ہے ایک ٹھوس حقیقت ہے یہ میری بیوی ہے اور میں آپ سب کو اپنی بیوی سے ملوا رہا ہوں آج سے چار دن پہلے ہی ہمارا نکاح ہوا ہے اور یہ نکاح صرف نکاح ہی نہیں ہے اسے لوگ لومینج بھی کہتے ہیں اس لیے مجھے یہ بتانے میں کوئی قباحت نہیں ہے کہ یہ میری اور علیزے کی لومینج ہے اور اس لومینج کو اپنے انجام تک پہنچانے میں اماں نے ہمارا ساتھ دیا ہے اور یہ لومینج ان کی آنکھوں کے سامنے ان کی آخری سانسوں کے دوران اسپتال میں ہوئی ہے حالانکہ اماں میری شادی کہیں اور کرنا چاہتی تھیں انہوں نے کسی اور کو پسند کر رکھا تھا۔

مگر مجھے۔۔۔ مجھے علیزے پسند تھی اس لیے اس وقت علیزے آپ سب کے سامنے علیزے دل اور شاہ کے روپ میں موجود ہے۔“ دل اور نے اپنی طرف سے انہیں بہت سکون، ٹھہراؤ اور تفصیل سے جواب دیا تھا اور اس کے جواب پہ وہ سب اپنی جگہ سے کھڑے ہونے پہ مجبور ہو گئے تھے لیکن ان سب میں صرف زری اسی جس سے اپنے قدموں پہ کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا تھا مگر اس کے ہونٹ ابھی تک ایک ہی لفظ یہ اس کے ہونٹ تھے۔
”مسزول اور شاہ۔“ اس کے منہ سے یہ نام یہ حوالہ اک سسکی کی طرح برآمد ہوا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا اور اس کے قدم لڑکھڑاسے گئے تھے۔

”زری!“ ان سب نے بے ساختہ چونک کر زری کی طرف دیکھا تھا لیکن وہ عشق کا پیکر عرش سے فرش پہ گرا اور گر کر ٹوٹ گیا تھا اور وہ سب دیکھتے رہ گئے تھے۔

زری اچانک کھڑے قدم سے تورا کے گری تھی اور منہ کے بل گرنے کی وجہ سے دیکھتے ہی دیکھتے خون میں لت پت سی ہو گئی تھی جس پہ ان سب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں کیونکہ سامنے کا منظر ناقابل یقین تھا۔
”زری!“ عبداللہ رُپ کے اس کی طرف لپکا تھا اور بڑی تیزی سے اسے اپنی بانسوں میں اٹھا کر سیدھا کیا تھا اس کی پیشانی ٹاک اور منہ سے خون بہہ رہا تھا جو عبداللہ کے ہاتھوں کو بھی رنگین کر گیا تھا۔

”زری!“ عبداللہ نے اسے جھنجھوڑا تھا اسے یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے اس کا دل کاٹ کے رکھ دیا ہو۔ اور دوسری طرف دل اور شاہ تھا جسے اپنی رگوں سے زندگی زری کے خون کی طرح بہتی ہوئی محسوس ہوئی تھی جبکہ فیمل حیات عشق کے اس انکشاف پہ جہاں کا تماں پتھر ہوا کھڑا تھا۔!!

(باقی آئندہ)

☆ ☆

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہر ای بک کا وائرلیٹ اور ریڈیو امیل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر پریو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور ایچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ مایا شدہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں ایلوڈنگ
- ☆ ہر کم کو الٹی ڈاٹ کام کی وائرلیٹ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز اور مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
- ☆ ایڈٹری لکس، لکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

☆ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

☆ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے ہمیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایکہ کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

نبیلہ عزیز



بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔
مدھیہ اور نبیلہ حیات دہی بہن بھائی ہیں، مدھیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے، وہ انگلینڈ کی ریجنیوں میں مکمل یورپ رینج چکی ہے جس کے پیش نظر فائزہ بیگم، نبیلہ کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں لیکن مدھیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے جس پر نبیلہ اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔
زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر دبا کر رہ رہا ہے۔
نبیلہ کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، بے بسی اور بیوری سے تنگ آخر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے، لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھانچے میں چائے پیتے ہوئے باز امتیاز مل جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے، جس پر نبیلہ کافی خوش ہوتا ہے، اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔
منصور حسین ایک غریب اور میسرک پاس آوی ہے، وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آندی سے نوکری مانگنے آتا ہے، وقار آندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔
دل آزر شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے، وہ اپنے قول و فعل کا بہت یکا آوی ہے اس نے دل آزر شاہ کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پر بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہے۔

پینتیسویں قسط

اور یہ بات صرف زری کی ہی بات نہیں تھی کہ صرف وہی منہ کے بل گری تھی۔
بلکہ دکھا جاتا تو وہاں موجود کبھی افراد ہی منہ کے بل گئے تھے۔
چوٹ بھی کبھی کوئی تھی اور درد بھی کبھی کوہوا تھا۔

مگر فرق صرف اتنا تھا کہ زری کا خون بہہ نکلا تھا اور ان سب کے دل و دماغ اندر ہی اندر لہلہا رہے تھے۔
لیکن اس چوٹ اور خون کا سلسلہ تو دل اور شاہ کے گھر سے لے کر اسپتال پہنچے تک ہنوز جاری ہی رہا تھا۔
جس کے باعث وہ سب اپنی اپنی ذات اور اپنی اپنی اذیت میں گم ایک دوسرے سے نظریں چرائے ہوئے انجان
کھڑے تھے کسی کو بھی کسی دوسرے کا احساس نہیں تھا سب اپنی ہی تکلیف میں جلا تھے۔
دل آزر کا درد اور تھامس نیل کی چوٹ اور مکی عبد اللہ کے رنج اور تھم۔

وہ تینوں ہی خود کو ایک دوسرے سے نظریں ملانے کے قابل نہیں سمجھ رہے تھے اور اس کرب انگیز عالم میں
اچانک ہی ڈاکٹر لودھی آئی سی یو روم کا دروازہ کھول کر باقی ڈاکٹر ز اور نرسوں کے ساتھ باہر نکل آئے تھے۔
”مسٹر ملک! ڈاکٹر لودھی نے سامنے کھڑے عبد اللہ کو متوجہ کیا تھا اور وہ یکدم چوٹک گیا تھا۔
”ہوں! ہاں! ڈاکٹر صاحب! اب کیسی ہے وہ؟ اسے اسے ہوش آگیا؟ وہ ٹھیک تو ہے
نا؟ اسے کچھ ہوا تو نہیں؟“

عبد اللہ کی آواز جیسے لرزری تھی اور اس نے اپنی پریشانی اور بے چینی کے ہاتھوں مجبور ہو کر بے ساختہ اک
اضطراب کی سی کیفیت میں ڈاکٹر لودھی کا بازو پکڑ لیا تھا اور اپنے اس اضطراب اور بے چینی میں اس نے ڈاکٹر کا
ہاؤس جہز بھی نوٹ نہیں کیا تھا۔

”بتائیں نا ڈاکٹر صاحب! اسے ہوش آیا یا نہیں؟ وہ وہ ٹھیک تو ہے نا؟ اسے کچھ ہوا تو نہیں؟ ڈاکٹر کی خاموشی
پہ عبد اللہ نے کافی گہرا کے پوچھا تھا اور جواباً ڈاکٹر لودھی نے اپنا بازو رکھے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔
”پلیز ملک صاحب! آپ اللہ پر بھروسہ اور تسلی رکھیں وہ ان شاء اللہ جلدی ٹھیک ہو جائیں گی۔“ ڈاکٹر لودھی
نے اس کے ہاتھ کو تھپکا تھا۔

”وہ وہ ٹھیک ہو جائے گی؟ مطلب وہ وہ اب ٹھیک نہیں ہے؟“ عبد اللہ کو مزید جھٹکا لگا تھا اور تشویش کے
مارے اس کا دل تو جیسے ٹھٹھی میں ہی آگیا تھا کیونکہ ڈاکٹر کا دھیمہ اور ست سالہ بچہ ہی بتا رہا تھا کہ بات غیر معمولی ہے۔
”ہوں! ادکے آئیے میرے ساتھ۔ بتاتا ہوں آپ کو۔“ ڈاکٹر کہہ کر اپنے روم کی طرف بڑھ گئے تھے۔
اور عبد اللہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی آگے یا پیچھے ہٹنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

”عبد اللہ! کیا سوچ رہے ہیں آپ؟ جائیے نا۔ ڈاکٹر کے پاس جائیے۔“ نگارش اپنے آنسوؤں سے پوچھتی
ہوئی اس کے قریب آگئی تھی۔

”ہوں! جا رہا ہوں۔“ وہ نگارش کے متوجہ کرنے پر ایک بار پھر ہمت باندھنے پر مجبور ہو گیا تھا اور جانے سے پہلے
بے ساختہ گردن موڑ کر دل آزر اور نیل کی سمت دیکھا جس پہ وہ دونوں چپ چاپ آگے بڑھ کے اس کے ساتھ
ڈاکٹر لودھی کے روم میں آگئے تھے۔

”پلیز! تشریف رکھیے۔“ ڈاکٹر نے کرسی کی سمت اشارہ کیا تھا۔

”تھینک یو! دل آزر نے بے حد استغنی سے شکریہ ادا کیا تھا۔

”مس زریں ملک آپ کی سسٹرن ہیں؟“ ڈاکٹر لودھی کو پہلے ہی پتا تھا لیکن انہوں نے ایک بار پھر کفرم کرنا چاہا

تھا۔

”جی! وہ بمشکل کہہ پایا تھا۔

اور یہ؟“ ڈاکٹر لودھی نے نیل اور دل آزر کی طرف دیکھا تھا۔
”میرے دوست بھی کہہ سکتے ہیں اور میرے بھائی بھی۔“ عبد اللہ نے ایک گہری سانس کھینچی تھی اور سر جھکا
لیا تھا۔ ”مس زریں ملک کے ہنرمند فانی و عیو؟“ ڈاکٹر کے اگلے سوال پہ عبد اللہ نے لب بچ لیے تھے اور اس
وقت اس کی کنڈیشن کو محسوس کرتے ہوئے بے ساختہ دل آزر نے اپنا مضبوط ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ کے اس
کا کندھا ہلکے سے دبا دیا تھا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اس کی یہ تسلی اور یہ ڈھارس عبد اللہ کے لیے کتنی کھوکھلی سی ہے۔
”مسٹر ملک! ڈاکٹر لودھی نے اسے جواب کے لیے اکسایا تھا۔

”نہیں! ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ وہ ان میرٹھ ہے۔“ عبد اللہ نے بڑے صبر اور ضبط سے جواب دیا تھا۔
”تو پھر کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ ان کے دل و دماغ کو ایسا کون سا صدمہ پہنچا ہے کہ وہ کوما میں چلی گئی ہیں۔“ ڈاکٹر
لودھی کے اگلے سوال پہ ان تینوں کو یوں لگا تھا کہ جیسے اسپتال کی بلند و بالا عمارت کی چھت ان کے سروں پہ ہی
آگری ہو۔ اور انہوں نے ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر ڈاکٹر کے چہرے کی سمت دیکھا تھا۔

”کوما میں؟ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“ عبد اللہ نے زیر لب دہرا کے پوچھا تھا مگر ان دونوں میں تو اتنی سی
بھی سکت نہیں رہی تھی کہ زبان سے کوئی لفظ ہی دہرا لیتے۔

”جی ہاں! وہ کوما میں چلی گئی ہیں اور یہ سب کسی گہری چوٹ اور کسی گہرے صدمے کی وجہ سے ہوا ہے۔“
ڈاکٹر لودھی نے اپنے پورے تجربے اور پورے وثوق سے چیک اپ اور ٹیسٹ کرانے کے بعد انہیں یہ
ہولناک خبر سنائی تھی۔

”مم۔ مگر ایسے یہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟ وہ وہ کوما میں کیسے جاسکتی ہے؟ اسے تو بہت معمولی سی چوٹ آئی
ہے۔ ورنہ ورنہ تو وہ بالکل ٹھیک تھی۔“ عبد اللہ روہانے لہجے میں پوچھ رہا تھا اور ڈاکٹر لودھی اس کی کم عقلی پہ
افسوس سے سر جھٹک کر رہ گئے تھے۔

”آپ سے کس نے کہا کہ انہیں بہت معمولی سی چوٹ آئی ہے۔“ ڈاکٹر کا لہجہ کافی استہزائیہ سا ہو چکا تھا۔
اور زرا اسے توقف کے بعد دوبارہ سے بات کا سلسلہ جوڑ لیا تھا۔

”مسٹر ملک! آپ نہیں جانتے۔ آپ کبھی اندازا بھی نہیں کر سکتے کہ انہیں کتنی گہری چوٹ آئی ہے اور کتنا گہرا
صدمہ پہنچا ہے۔ اس وقت صدمے کی اس اسٹیج پر ہیں کہ جہاں انسان کا جسم اس کا دل و دماغ اور اس کی عقل
بیک وقت مفلوج ہو کے رہ جاتے ہیں اور پھر اس اسٹیج سے واپس آنا مریض کے اور ڈاکٹر کے اختیار میں نہیں
رہتا بلکہ اللہ کی طرف سے ایک معجزہ بن جاتا ہے اور اب آپ کو بھی اس معجزے کا انتظار کرنا ہو گا کیونکہ مس
زریں ملک کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہے وہ کسی گہرے اور بہت بڑے شاک میں ہیں ورنہ اتنی سی چوٹ یا اتنے
سے صدمے سے کوئی بھی پرسنٹ کوما میں نہیں جاسکتا۔ بس آپ لوگوں کی دعا اور اللہ کی نظر کرم ہی کچھ عنایت
کر سکتی ہے جس سے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ دونوں میں ہی ہوش کی دنیا میں واپس لوٹ آئیں اور یہ بھی ممکن ہے
کہ انہیں دو سال بھی ہوش نہ آئے۔“

ڈاکٹر لودھی نے انہیں پوری تفصیل سے آگاہ کیا تھا اور وہ تینوں اپنی اپنی جگہ یہ دم بخود سے بیٹھے رہ گئے اور
عبد اللہ کو تو یوں لگ رہا تھا کہ جیسے بیٹھے بیٹھے وہ خود بھی مفلوج ہو گیا ہو اور اس کی عقل بھی پھرا گئی ہو کیونکہ اب
ان دونوں کے سامنے وہ ڈاکٹر کو کیسے بتانا کہ اسے کیا صدمہ پہنچا ہے؟ اور اسے کیسی چوٹ لگی ہے؟ تو اتنی دیر سے
خود اپنی سوچوں اور اپنے خیالات کی نفی کرتا پھر رہا تھا لیکن ڈاکٹر لودھی نے اس کی سوچوں اور خیالات پہ تصدیق کی
مگر گادی کہ وہ جو سوچ رہا ہے وہ سچ ہے۔

زری منہ کے بل نہیں گری۔ بلکہ پاش پاش ہو گئی ہے۔ ٹوٹ گئی ہے۔ بکھر گئی ہے۔ لٹ گئی ہے۔

صرف اور صرف دل اور شاہ کی خاطر۔

صرف اس کی چاہ میں اس کی محبت میں اور صرف اس کے عشق میں اور اس کی اس چاہ اور اس عشق نے عبد اللہ جیسے آدمی کو بھی توڑ ڈالا تھا وہ ڈاکٹر لوہی کے روم سے اپنے قدموں پہ اپنی تلاش کھینچتا ہوا باہر آیا تھا۔



چھ ماہ بعد

باہر موسم بے حد اچھا ہو رہا تھا، ہوا بہت تیز چل رہی تھی اور اس تیز اور ٹھنڈی ہوا میں بھی ہلکی سی نمی محسوس ہو رہی تھی اور بارش کے آثار بھی صاف دکھائی دیتے تھے اسی لیے موسم کا ایسا موڈ اور ایسے تو روکھ کر علیزے جلدی سے چھت پہ دھو کر پھیلائے ہوئے اپنے اور دل اور کے کپڑے انار کر نیچے لے آئی تھی لیکن نیچے آتے آتے بھی ہوا میں برقی نمی کی بدولت اس کا اپنا چہرہ بھی نرم آلود سا ہو گیا تھا اور وہ اپنے دپٹے سے یہ نمی پونجی ہوئی کپڑے باندھ اٹھائے اسے بیڈ روم کی طرف بڑھ گئی تھی۔

حالانکہ پہلے یہ کام گل کی ذمہ داری ہوتے تھے مگر جب سے علیزے کو اس گھر میں بیوی کا درجہ ملا تھا اس نے خود بخود ہی اس گھر کی تمام ذمہ داریوں میں شریک ہونا شروع کر دیا تھا وہ بیڈ روم اور بچن سے۔ یا ہر لان تک تمام کام خود کرنے لگی تھی اور یونی کرتے کرتے ان چھ ماہ میں وہ ہر کام میں طاق ہو گئی تھی۔ برتن دھونے سے کپڑے دھونے تک اور چولہا جلانے سے لے کر دل جلانے تک وہ سب کچھ سیکھ گئی تھی آخر زندگی میں اور کچھ نہیں سیکھا تھا تو پھر یہ تو سیکھنا ہی تھا۔

”ارے علیزے بی بی! لائیے یہ کپڑے میں رکھ آتی ہوں“ گل ٹیرس سے کرسیاں ہٹا کر اوہری آ رہی تھی کہ علیزے کو اتنے کپڑے اٹھائے ہوئے دیکھ کر تیزی سے اس کے قریب آئی تھی۔

”نہیں! تم رہنے دو۔ میں خود رکھ لوں گی۔ بس تم ایسا کرو کہ زلفی یا نگاہ خان سے کوئل ڈوگ کو اس کے روم میں لے جائیں باہر بارش شروع ہونے والی ہے۔“ علیزے نے گل کو نیچے کی طرف اشارہ کیا تھا۔

”جی ٹھیک ہے! کہہ دیتی ہوں۔“ گل سر ہلاتی ہوئی آگے بڑھ کے سیڑھیاں اتر گئی تھی اور اتنے میں دل اور بھی سیڑھیاں چڑھ آیا تھا۔

”اسلام علیکم!“ علیزے نے اس پہ ”سلامتی“ بھیجی تھی اور وہ محض سر ہلا کے اس کے پاس سے گزر کر بیڈ روم کی طرف بڑھ گیا تھا۔

اور ظاہر ہے کہ علیزے نے بھی بیڈ روم میں ہی آنا تھا سو مجبوراً ”ڈھیلے ڈھالے قدم اٹھاتی ہوئی اس کے پیچھے ہی آئی تھی۔ دل اور اپنا بریف کیس اور کوٹ صوفے پہ ڈال کر بیڈ پہ ڈھیر ہو گیا تھا وہ کپڑے لے کر وارڈروب کی سمت بڑھ آئی تھی اور وارڈروب کے درمیانی دونوں پٹ کھول کر اپنے اور اس کے کپڑے تہہ کر کے الگ الگ خانوں میں رکھنے لگی۔

”کپڑے نکال دوں؟“ چنچ کرنے ہیں؟“ علیزے نے بیڈ پہ چاروں شانے جت لیے دل اور کو ایک نظر دیکھتے ہوئے وارڈروب کا تیسرا پٹ کھولا تھا جس میں اس کے تمام پرگن شدہ کپڑے چنگ کیے ہوئے تھے۔ ”ہوں نکال دو۔“ اس نے بے حد آہستگی سے کہہ کر اپنے دونوں ہاتھ بالوں میں پھنسا لیے تھے علیزے اس کا وائٹ شلوار سوٹ نکال کر واش روم میں رکھ آئی اب اس کا ارادہ بچن میں جانے کا تھا، لیکن دل اور کی آواز پہ اس کے قدم ٹھکے تھے۔

”گل سے کو میرے لیے ایک کپ چائے لے آئے میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔“ اس نے پیغام دیا تھا اور

علیزے کچھ بھی کہے بغیر بیڈ روم سے باہر نکل آئی تھی اور یہ تو چھ ماہ سے ہو رہا تھا دل اور نے جو بھی کام کہتا ہوتا تھا وہ گل کا ہی نام لیتا تھا جبکہ وہی کام علیزے کے اس کے سامنے رکھ دیتی تھی۔

اس وقت بھی وہ خود ہی چائے بنا کر لے آئی تھی۔

”پورا سیور“ اس نے قریب آ کر آواز دی تھی۔

”ہوں“ دل اور نے چونک کر دیکھا تھا۔

”چائے“ علیزے نے کپ سامنے کیا تھا اور وہ بے ساختہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

”تھینک یو“ اس نے اس کے ہاتھ سے کپ لیتے ہوئے شکر یہ ادا کیا تھا۔

اور علیزے اسے کپ تھمانے کے بعد جاتے جاتے پھر رک گئی تھی۔

”زری سے مل کر آئے ہو؟“ علیزے کے اچانک سوال پر دل اور نے بھی اچانک سر اٹھا کر دیکھا تھا اس کے چہرے کی رنگت اور اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ علیزے نے چونکی تھی۔

”نہیں۔ اس نے ہمیشہ کی طرح نمی میں گردن ہلائی تھی۔

”کیوں؟ تم تو کہہ کر گئے تھے کہ اس سے مل آؤ گے۔“ اسے تعجب ہوا تھا۔

”یہ تو میں ہمیشہ کہہ کر جاتا ہوں۔“ دل اور کے لہجے میں استہزا کا رنگ تھا۔

”تو پھر ملے کیوں نہیں؟“ وہ جھنجھلائی تھی۔

”کیونکہ میں ملنا نہیں چاہتا۔ کیونکہ مجھ میں حوصلہ نہیں ہے کیونکہ میں اس قابل نہیں رہا۔“

وہ اس سے بھی زیادہ جھنجھلا یا تھا۔

”مگر وہ تو تم سے ملنا چاہتی ہے نا۔“ علیزے نے زری کے چاہنے پہ زور دیا تھا۔

”ہو نہ! پھر تو وہ اور بھی بہت کچھ چاہتی ہے؟“ دل اور کا لہجہ لہوٹکا رہا تھا۔

”تو کرو نا پوری اس کی چاہت جو وہ چاہتی ہے۔“ وہ بہت سپاٹ اور بہت عجیب سی ہو رہی تھی۔

”علیزے پلیز! جاؤ یہاں سے مجھے اکیلا چھوڑ دو۔“ دل اور نے اپنی لہجہ گز سے زچ ہو کر بہت بے بسی سے علیزے کو وہاں سے چلے جانے کا کہا تھا اور علیزے چند سیکنڈ زبونی گھڑی اسے دیکھتی رہی اور پھر وہاں سے ہٹ گئی تھی۔

ابھی وہ بیڈ روم سے نکل کر نیچے ڈرائنگ روم میں آئی ہی تھی کہ لینڈ لائن فون کی رنگ بجنے لگی اور علیزے نے گل کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھا۔

”گل۔ گل کہاں ہو؟ فون بج رہا ہے۔“ اس نے گل کو آوازیں دی تھیں مگر وہ شاید آپس پاس کہیں نہیں تھی اس لیے مجبوراً ”علیزے کو خود ہی کال آئیڈ کرنا پڑی حالانکہ وہ فون کا تڑپت کم آئیڈ کرتی تھی۔

”ہیلو۔“ اس نے بہت دھیمی آواز میں ہیلو کہا تھا۔

”اسلام علیکم میڈم! میں قادر بات کر رہا ہوں صاحب کا مٹی۔“ دوسری طرف سے چھوٹے ہی اپنا تعارف کروایا گیا تھا اور علیزے نے پہلے بھی ایک دو بار اس کا نام سن رکھا تھا اس لیے قدرے ریلیکس ہو گئی تھی۔

”وعلیکم السلام! کیسے کیسے فون کیا آپ نے؟“ علیزے کا لہجہ تھوڑا نارمل ہو چکا تھا۔

”بس میڈم! مجھے پوچھنا تھا کہ صاحب گھر پہنچ گئے؟“ وہ کافی جھجک کے بات کر رہا تھا۔

”جی پہنچ گئے ہیں۔ کیوں خیریت؟ کوئی پیغام دے گیو ہے ان کے لیے۔“ علیزے نے خود ہی اندازاً لگانے کی کوشش کی تھی۔

”نہیں! کوئی پیغام دے گیو نہیں ہے۔ بس میں صرف ان کی طبیعت کی وجہ سے پریشان ہو رہا تھا دراصل وہ جب

یہاں سے نکلے تو انہیں بہت تیز بخار تھا اور اس بخار کی حالت میں وہ ڈرائیو کر کے گئے ہیں اس لیے مجھے پریشانی ہو رہی تھی کہ وہ خیریت سے گھر پہنچے ہیں یا نہیں؟ "قادر اپنی پریشانی بتا رہا تھا اور علیزے اپنی بے دھیانی میں تھی۔ "ڈرائیو کو بخار ہے اور اس نے بتایا بھی نہیں۔" وہ ریسیور ہاتھ میں پکڑے سوچ کے رہ گئی۔ "ہیلو!" اس کی طرف سے خاموشی پا کر قادر کو تصدیق کرنے کے لیے ہیلو کہتا ہی پڑا تھا کہ وہ لائن پہ ہے یا نہیں۔

"جی ہاں! سن رہی ہوں۔ وہ خیریت سے گھر پہنچ گئے ہیں۔ آپ نے ان کے لیے اتنی زحمت کی تھینک یو سوچ۔ میں ان کو بتا دوں گی کہ آپ کی کال آئی تھی۔"

علیزے نے ایک سمجھدار اور سنجیدگی سے ہوئی بیوی ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے قادر کا شکریہ ادا کیا تھا اور پھر اللہ حافظ کہنے کے بعد فون بند کر دیا تھا۔

اس نے اگر اپنی طبیعت کا نہیں بتایا تو مجھے انوالو ہونے کی کیا ضرورت ہے بھلا۔ بخار ہوتا ہے تو ہوتا رہے بلکہ میری طرف سے بھڑ میں جائے۔ اتنے سے بخار سے کون سا مر جائے گا؟

وہ خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑاتی ہوئی اپنے دل میں آنے والی پریشانی کو سر جھٹک کر پیچھے دھکیلتی ہوئی کچن میں آگئی تھی اور پھر واقعی وہ اپنے کام میں لگ کر اس کی پریشانی بھول گئی تھی۔



ضبط کرتا ہوں تو

ہرزخم لبوں سے ہے

آکر رہا ہوں تو

اندیشہ رسوائی ہے

دیکھتا ہوں تو

ہزاروں ہیں میرے دوست مگر

سوچتا ہوں تو

وہی عالم تنہائی ہے!

وہ نبیل حیات جو ہمیشہ بہت ہی فریش اور رومانٹک موڈ میں رہتا تھا۔

جس کی ڈینٹ پر سٹائی اپنی جگہ ایک متاثر کن اثر رکھتی تھی۔

جس کا سکون اور تحمل قابل رشک سمجھا جاتا تھا۔

جس کی محبت میں بھی ایک ٹھہراؤ تھا مگر تقاعد تھی۔

جس نے زری کو ہمیشہ چاہا دل کی گہرائیوں اور شدتوں سے چاہا تھا۔

لیکن اسے جب بھی جہاں بھی دیکھا۔ ٹھہر ٹھہر اور ڈر ڈر کر دیکھا تھا۔

مگر یہ بات بھی سچ تھی کہ اسے دل میں سجاایا بہت تھا۔

کبھی دل کے اس کونے میں رکھا۔ کبھی دل کے اس کونے میں رکھا۔ اور پھر ایک دن آخر اسے اپنا دل ہی بنا ڈالا

تھا۔

مگر اسے کیا خبر تھی کہ وہ دل دھڑکے گا بھی تو کسی اور کے لیے۔

طلب کرے گا تو کسی اور کو۔

تڑپے گا تو کسی اور کے لیے۔

اور نبیل حیات اپنے سینے میں اکس خلائے کر رہے گا۔

اس کے پاس کچھ بھی نہیں رہے گا بالکل خالی ہاتھ ہو جائے گا۔

اس کی نگاہیں اس کی چاہیں اس کے خواب اور اس کی خواہش سب کچھ دل کے طاق پر رکھے گئے تھے۔

اور اسے اک عجیب سی چپ لگ گئی تھی۔

اس کی خاموش محبت نے اسے ہمیشہ ہمیش کے لیے خاموش کر ڈالا تھا۔

سارے اظہار اور ارمان دل میں ہی دم توڑ گئے تھے اور ان مردہ خوابوں اور مردہ ارمانوں کا زہر اس کے دل و دماغ کے ساتھ ساتھ اس کے جسم و جان کو بھی زہر آلود کر رہا تھا۔

وہ دن بہ دن مر رہا تھا۔ زری سے بھی زیادہ تازک حالت اس کی تھی کیونکہ زری تو کما میں تھی اور سکون میں تھی

مگر وہ ہوش میں تھا لیکن حواسوں میں نہیں اور اسی وجہ سے درد تھا کہ بیٹھتا ہی جا رہا تھا چوتھی گہری ہونی جا رہی

تھی اور زخم ہر دن اور ہر رات کے بعد ناسور بن رہا تھا۔

اور ان سب کیفیات کی اذیت سے نبیل کو اکثر اپنی سانس اپنے ہی سینے میں تھمتی ہوئی محسوس ہوتی تھی اور وہ

اپنی اس حالت پر بے بس سا ہو کر اکثر ہی ہاتھوں کی طرح سڑکوں کی خاک چھانٹنے نکل کھڑا ہوتا اور جب بری طرح

تھک جاتا تو دوبارہ واپس لوٹ آتا تھا۔

مگر یہ تو فائدہ نیکم اور مدد دینے جانتی تھیں کہ وہ واپس لوٹ کر بھی واپس نہیں لوٹتا بلکہ باہر ہی کہیں راہوں میں

بھٹکتا رہتا صرف اس منزل کے غم میں جو کسی کا بھی نصیب نہیں تھی۔

جو خود بھی نامراد ٹھہری تھی اور اس کو چاہ کر نبیل حیات بھی نامراد نہیں ہوا۔

وہ اگر عشق کا پیکر تھی تو وہ بھی محبت کا جسم تھا۔

وہ اگر ٹوٹ کر بکھری تھی تو وہ بھی چکنا چور ہو گیا تھا۔

وہ بھی کچیوں کی صورت کئی حصوں میں بٹ گیا تھا اور اس سے بھی اپنا آپ سمیٹا اور سنبھالا نہیں جا رہا تھا

کیونکہ وہ یہ سوچ کر ہی مر جاتا تھا کہ وہ زری کو چاہتا رہا۔ اور زری دل آور کو چاہتی رہی۔ لیکن اپنی اپنی چاہ اور اپنی

اپنی طلب میں کسی کو بھی خبر نہیں ہو سکتی تھی کہ کون کس کو چاہتا ہے؟ اور کس کے لیے لگے ہیں؟

مگر اس چاہ اس طلب اور اس محبت کی دھن میں اب ادراک ہوا تھا وہ سب ہی ایک دوسرے سے نظریں

مٹانے کے قابل نہیں رہے تھے۔ کیونکہ ان تینوں کی دوستی کے بیچ اب محبت کی جگہ ندامت حاکم ہو چکی تھی۔

اب وہ ایک دوسرے سے مسکرا کر اور قہقہے لگا کر نہیں ملتے تھے بلکہ اب تو وہ نظریں اور سر جھکا کر ملتے تھے۔

اور اپنی جھکی ہوئی نظروں اور جھکے ہوئے سروں کا بوجھ وہ اپنے اپنے دل پہ اٹھائے پچھلے چھ ماہ سے بمشکل سب

کچھ نبھاتے پھر رہے تھے حالانکہ اندر سے وہ تینوں ہی کھوکھلے ہو چکے تھے۔

"سر! سر! آپ نے گھر نہیں جانا کیا؟" عدیل نے بڑی مشکل سے اتنی دیر سے اپنے دھیان میں گم بیٹھے

نبیل کو متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی اور نبیل بری طرح چونک کر متوجہ ہوا تھا۔

"ہاں! ہاں! گھر تو جاتا ہی ہے۔" نبیل عجیب سے لہجے میں خود کلامی کے سے انداز میں کہتا اپنی چیئر سے اٹھ

کھڑا ہوا تھا۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟ عدیل کو اس کی کیفیت دیکھ کر تشویش سی ہوئی تھی۔

"ہوں! سب ٹھیک ہے یا سب ٹھیک ہے ڈونٹ وری۔" نبیل کا پیسٹھانہ سے انداز میں کہتے ہوئے اپنی

چیئر کی بیک پر رکھی اپنی جیکٹ اٹھا کر اوپا، اس کے لیے دروازے کی سمت قدم بڑھا چکا تھا اور عدیل وہیں کا وہیں اس

کے پیچھے کھڑا اس کی پشت پر کھتا رہ گیا۔

”سنو!“ نیل دروازے کے قریب جا کر پھر پلٹا۔

”جی کہیے؟“ عدیل پوری طرح سے متوجہ ہوا تھا۔

”سب کو یہ سلی پہنچ گئی؟“ اس نے تمام دروازوں کے بارے میں پوچھا تھا۔

”جی! پہنچ گئی ہے۔“ عدیل نے اثبات میں جواب دیا تھا۔

”اور تمہاری سلی؟“

”جی! مجھے بھی مل گئی ہے۔“

”کسی اور چیز کی ضرورت تو نہیں ہے نا؟ اگر ہے تو بتا سکتے ہو۔“ نیل ہمیشہ ہر مہینے اس سے یہ سوال پوچھتا تھا اور اسے تسلی بھی دیتا تھا لیکن عدیل کی تنخواہ ماشاء اللہ اتنی تو تھی ہی کہ عدیل کی پریشانیاں کافی حد تک کم ہو گئی تھیں اور وہ پرسکون رہنے لگا تھا۔

”تھینک یو سر! اللہ کا احسان اور مہربانی ہے آپ کی۔ کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔“

عدیل نے دل کی گہرائیوں سے اس کا شکریہ ادا کیا تھا اور نیل جواباً ”سر ہلا کر دوبارہ پلٹ گیا۔ مگر عدیل جانتا تھا کہ وہ یہ ساری پوچھ بچھ کرنے کے باوجود بھی ذہنی طور پر سیٹ نہیں ہے کیونکہ وہ ایسی پشویشن میں تو پھنسے کئی مہینوں سے نظر آ رہا تھا اور عدیل بہت چاہ کر بھی نیل کی ایسی کیفیت اور ایسی حالت کے متعلق نہ نیل سے کوئی سوال کر سکا تھا اور نہ مدد سے کچھ کہہ سکا تھا کیونکہ اسے یہ سب مناسب نہیں لگتا تھا اس لیے اس وقت بھی وہ اپنے سارے تجسس اور اپنے سارے سوال اپنے ہی ذہن میں لے کر رہ گیا تھا اور نیل حیات کے تھکے تھکے قدموں سے چلتا دروازہ کھول کر اپنے آفس سے باہر نکل گیا تھا۔!

ضبط لازم ہے مگر دکھ ہے قیامت کا فراز

ظالم اب کے بھی نہ رویا تو مرجائے گا

عبداللہ کی خوبصورت باوا می آنکھیں اب ہمہ وقت سرخ ہوئی رہتی تھیں یوں لگتا تھا کہ جیسے ابھی اس کی آنکھوں سے خون چھلک آئے گا۔ کیونکہ۔

چھ ماہ کا رت جگا۔ اور چھ ماہ کا دکھ اس کی آنکھوں کو زخم زخم کر چکا تھا۔

اس نے چھ ماہ کی راتیں زری کے سرہانے بیٹھ کر اور جاگ کر گزاری تھیں وہ زری کو دنیا و جہان سے بے خبر پڑے ہوئے دیکھتا تھا تو دل ہی دل میں روتا تھا۔

اس نے اس کے لیے کیا کیا نہ سوچ رکھا تھا کہ وہ اس کی پسند سے اس کا رشتہ طے کرے گا۔ اس کی دھوم دھام سے شادی کرے گا۔ ہر چیز میں اور ہر بات میں اس کی مرضی اس کی پسند کو فوقیت دے گا جو وہ چاہے گی وہی کرے گا۔

لیکن یہاں تو سب کچھ ہی مٹی میں مل گیا تھا۔

وہ اس شخص کو چاہ بیٹھی تھی جس کے سامنے عبداللہ اپنا دامن پھیلا کر ٹھیک بھی نہیں مانگ سکتا تھا۔ جس کے پاس دینے کے لیے کچھ بھی نہیں رہا تھا، خود اپنا بھی نہیں رہا تھا، بلکہ کسی اور کا ہو چکا تھا۔ اور جو پہلے ہی کسی اور کا ہو چکا تھا وہ زری کا کیسے ہو سکتا تھا بھلا۔؟

اور بے بسی کی حالت میں اکثر وہ اپنے ہاتھوں کی مٹھیاں اور اپنے لب بھینچ کے رہ جاتا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے ہاتھوں کی اور کپٹی کی رگیں ابھر آتی تھیں اور نگارش اس کی حالت دیکھ دیکھ کر اندر ہی اندر کڑھتی رہتی تھی

کہو نہ ایسی اذیت بھری صور حال میں تو اس کی تسلیاں بھی عبداللہ کے دل کو سکون نہیں دی سکتی تھیں۔ کئی مرتبہ تو ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ وہ دن بات کیے بغیر ہی گزر جاتے تھے۔ اور کبھی کبھی تو عبداللہ وہ دن بھی اسپتال سے گھر نہیں آتا تھا۔

کبھی کبھی نگارش کے دن اور راتیں زری کے پاس بیٹھے بیٹھے گزر جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ وہ دونوں میاں بیوی بھی ایک دوسرے کے لیے اجنبی سے ہو کے رہ گئے تھے۔ ان کا ذہن زری کے غم سے اور اس کی اذیت سے ہٹ ہی نہیں پاتا تھا۔ ان کے دل و دماغ تو اس غم نے دھمک کی طرح چاٹ ڈالے تھے۔ ان کی سوچ ان کے خیال ان کی فکر زری کے گروہی گھومنے لگتی تھی اور ایسے عالم میں وہ باقی سب کچھ بھول کر بس پشت ڈال دیتے تھے کیونکہ ان کے سامنے زری کا بے جاں وجود پڑا ہوا تھا۔

وہ جو جو عشق کی علامت تھا۔

وہ جو جو محبت کی کہانی تھا۔

وہ جو جو ہجر کا آئینہ تھا۔

جسے دیکھ کر جسے سوچ کر جسے چھو کر یاد صبا بھی مک مک جاتی تھی اور آج وہی وجود کسی شجر سے ٹوٹے ہوئے خزاں رسیدہ پتے کی طرح نظر آتا تھا اور دیکھنے والوں کی آنکھیں بھر آتی تھیں۔

”نگارش۔“ نگارش عین زری کے سامنے بیٹھی اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑے غم نظموں سے اسے یک ٹک دیکھ رہی تھی جب عبداللہ دروازہ کھول کے اچانک اندر آ گیا تھا۔

”اؤ میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔“ رات گہری ہو رہی تھی اور موسم بھی کچھ اچھا نہیں تھا اس لیے عبداللہ نے سوچا تھا کہ نگارش کو وقت ہے ہی گھر چھوڑ آئے۔

”مگر میرا دل نہیں چاہ رہا گھر جانے کو۔ میں آج زری کے پاس رکنا چاہتی ہوں۔ کیوں زری تم بھی یہی چاہتی ہو نا کہ میں آج یہیں رک جاؤں؟“ نگارش نے عبداللہ سے بات کرتے کرتے گردن موڑ کر بے ساختہ زری کو مخاطب کیا تھا اور عبداللہ کا دل جیسے مٹی میں آگیا۔ اس کے جسم و جان میں کرب کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔

”بتاؤ نا زری! تم بھی یہی چاہتی ہو نا۔ کہ میں آج یہاں ہی رک جاؤں؟“ نگارش نے جان بوجھ کر زری کو مخاطب کرنے کی اور اپنی بات میں انوار کرنے کی کوشش کی تھی۔

”نگارش پلیز! بس کرو چلو میرے ساتھ میں نہیں گھر چھوڑ کر آتا ہوں۔“ عبداللہ تکلیف سے جھنجھلا رہا تھا۔

”کیوں بس کروں عبداللہ؟ آپ۔ آپ مجھے بات کیوں نہیں کرنے دیتے؟ یہ اتنی لاپرواہیوں ہو گئی ہے مجھ سے؟ کیا اسے ذرا بھی احساس نہیں ہوتا کہ میں کتنی اکیلی ہو گئی ہوں میں کتنی تنہا ہوں اس کے بغیر۔ میری کوئی بہن کوئی کزن کوئی دوست نہیں ہے یہاں اس کے سوا۔ اور یہ۔۔۔ یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان پڑی ہے۔

اسے خبر ہی نہیں کہ میں گھر میں اکیلی پھرتی ہوں تو روتی ہوں۔ اس کی ڈائری، اس کی شاعری اس کے پرفیو مزڈیم ہوں تو دل کٹ جاتا ہے میرا دل میں کئی مرتبہ اس کے جذروم کے چکر لگاتی ہوں اور ہر مرتبہ ہنڈروم خالی دیکھ کر مایوس لوٹ آتی ہوں۔ دل چاہتا ہے یہ پھر سے کوئی نظم پڑھے اور میں اس کے سامنے بیٹھ کر وہ نظم سنوں۔ یہ پھر سے کسی بات پر تڑپ کر روئے اور میں پھر سے اسے خود سے لگا کر بچوں کی طرح چپ کر دوں یہ پھر سے بے یقین ہو جائے اور میں پھر سے اسے یقین دلادلا کر تھک جاؤں کہ زری ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تم نے جو سنا وہ جھوٹ تھا۔ تم نے جو دیکھا وہ خواب تھا اور جھوٹ اور خواب یہ یقین نہیں کرتے۔ تم بھی مت کرو۔ زری پلیز! ہوش میں آ جاؤ“

لوٹ آؤ۔ کسی اور کو نہ سہی ہمیں ضرورت ہے تمہاری۔“

نگارش اس کو بازوؤں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے بچکیوں سے رو پڑی تھی اور عبداللہ بمشکل اپنی آنکھوں میں

اندھے نمکین پانیوں کو ضبط کرتے ہوئے مزید آگے بڑھ آیا تھا۔

”نگارش پلیر! چلو میرے ساتھ۔ وہ تمہاری کوئی بات نہیں سنے گی۔“ عبد اللہ نے نگارش کے کندھے پہ ہاتھ رکھا تھا اور زری کی پلکیں اس کی بات پہ لرز کر رہ گئی تھیں۔

مگر افسوس کہ اس کی پلکوں کی یہ لرزش نہ عبد اللہ دیکھ سکا تھا اور نہ نگارش کو نظر آئی تھی۔ اگر دیکھ لیتے تو انہیں بھی یہ پتا چل سکتا تھا کہ اسے بھی ان کی تکلیف۔ تکلیف ہوتی ہے اسے بھی دکھ ہوتا ہے وہ بھی اندر ہی اندر روتی ہے مگر اس کی تکلیف اس کا دکھ اس کے آنسو کسی کو نظر نہیں آتے۔

وہ سب اپنے اندر کا غبار نکال لیتے ہیں اور وہ چپ پڑی بس سنتی رہتی ہے۔ اگر سننے کی بجائے بول سکتی تو یقیناً ”نگارش کا ہاتھ پکڑ کر اسے روک لیتی۔ مگر افسوس کہ وہ لاچار تھی۔ بے بس تھی بے جان تھی۔ عشق نے اسے مار ڈالا تھا اور وہ مر گئی تھی۔“

عبد اللہ نگارش کے انکار کے باوجود بھی اسے گھر چھوڑنے چلا گیا تھا۔ اور زری اسے روک بھی نہ سکی تھی اور اس بات پہ اس کا دل چھم چھم رہا تھا بارش کی طرح۔!



شام ہوتے ہی بارش شروع ہو گئی تھی اور بارش بھی ایسی طوفانی اور موسلا دھار برسی تھی کہ دیکھنے اور سننے والوں کے دل ہول اٹھے تھے۔ آسمانی بجلی کی کڑک اتنی زوردار ثابت ہو رہی تھی کہ کچن میں کھڑی روٹیاں بناتی علیزے کے ہاتھ اس کی کڑک دار اور خوف ناک آواز پہ کانپ کانپ گئے تھے اور وہ بمشکل روتی تو بے پہ ڈالنے میں کامیاب ہو سکی اور دل ہی دل میں دعا پڑھنے لگی۔

”کیا بات ہے علیزے بی بی؟ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ علیزے کے ہونٹوں کی ذرا سی جنبش سے ہی گل کو اندازا ہو گیا تھا کہ وہ کچھ کہہ رہی ہے۔“

”میں کہہ نہیں رہی بلکہ دعا پڑھ رہی ہوں، درود شریف کا ورد کر رہی ہوں۔ سچ ایسی بارش سے تو خوف آ رہا ہے۔“ علیزے واقعی اندر سے دل چکی تھی اور اس کا دلہنٹا اس کے چہرے سے ہی نظر آ رہا تھا۔

”ہوں! بی بی جی ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ مجھے بھی بہت ڈر لگ رہا ہے۔“ گل بھی بجلی کی کڑک سے سم چکی تھی۔

”میرا خیال ہے جلدی جلدی کام ختم کر کے ہم بھی اپنے اپنے بیڈروم میں جاتے ہیں جاؤ زلفی کو بلاؤ اور اسے کہو کہ صاحب کو بلا لائے۔ کھانا تیار ہے۔“ ان چھ ماہ میں اتنا فرق آیا تھا کہ علیزے نے گھر کے ملازموں کے سامنے اسے ”صاحب“ کہنا سیکھ لیا تھا البتہ اس کے سامنے وہ اب بھی اسے ”ڈورائیور“ کہہ کر ہی مخاطب کرتی تھی اور دل آور نے اسے کبھی منع بھی نہیں کیا تھا کیونکہ اسے اس کا ڈورائیور کہنا برا نہیں لگتا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ واقعی اپنے آپ کو اس کا ڈورائیور ہی سمجھتا تھا۔

”جی! ابھی کہہ دیتی ہوں۔“ گل باہر نکل گئی تھی اور گل کی طرف سے پیغام ملتے ہی زلفی دل اور کوہلانے چل دیا تھا مگر اگلے پانچ چھ منٹ کے بعد وہ یونہی واپس لوٹ آیا تھا۔

”کیوں؟ کیا صاحب نے؟“ علیزے سب کاموں سے فارغ ہو کر ہاتھ دھونے کے لیے سنک کی طرف بڑھ چکی تھی۔

”کہنا کیا تھا تو کچھ بولے ہی نہیں۔ بہت گہری نیند میں ہیں۔ میں دو چار آوازیں دینے کے بعد واپس آ گیا۔“ زلفی نے کندھے اچکائے تھے اور علیزے سے سر ہلا کے رہ گئی کیونکہ وہ واقعی بھول چکی تھی کہ اسے بخار ہے اور

اس کے منشی قادر نے اسے فون کر کے بتایا بھی ہے۔
 ”ٹھیک ہے۔ تم لوگ کھانا کھاؤ۔ میں پھر روزانہ بند کر کے چلی جاؤں گی۔“ علیزے کو اندرونی درد اُزدہ بند کرنے کی فکر تھی کیونکہ دل اور روزانہ رات کو یہ دور بڑی احتیاط اور بڑے دھیان سے بند کر کے سونے کا عادی تھا۔
 ”آپ نے کھانا نہیں کھانا کیا؟“ گل نے ٹھٹھک کر پوچھا تھا۔
 ”نہیں! ابھی بھوک نہیں ہے بعد میں کھالوں گی۔ فی الحال تم لوگ کھاؤ۔“ وہ کہہ کر باہر نکل آئی تھی اور کچھ دیر بعد وہ لوگ کھانا کھا چکے تو علیزے نے تمام دروازے اور تمام لائٹس بند کرنے کے بعد اوپر اپنے بیڈ روم کی طرف رخ کیا تھا لیکن بیڈ روم میں قدم رکھتے ہی اس کے قدم ٹھٹھک کر رک گئے تھے کیونکہ بیڈ روم کی تمام لائٹس آف تھیں اور ہر طرف گہرے اندھیرے کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔
 اور اس اندھے ماحول میں بارش کا شور، بادلوں کی گرج اور آسمانی بجلی کی کڑک دار آوازیں حقیقتاً ”اک بھیا یک ماقصور پیدا کر رہی تھیں جس کی وجہ سے علیزے کے دل میں ایک خوف کی لہر دوڑ گئی۔ اور اس نے بے ساختہ کافی غلٹ سے سوچ بورت پتہ ہاتھ مارا تھا جس سے اچانک بیڈ روم میں کھٹکھٹ کئی روشنیاں جگمگا اٹھی تھیں اور اس سے بڑی بے تابی سے بیڈ کی طرف دیکھا۔ جہاں وہ اوندھے منہ بے سدھ پڑا نظر آیا۔
 ”ڈرائیور!“ اس نے ایک بار پھر اسے پکارا تھا مگر وہ ایسا بے سدھ پڑا تھا کہ اس پہ کوئی بھی آواز اثر نہیں کر رہی تھی۔
 ”ڈرائیور پلیز! اٹھو! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ علیزے نے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی کیفیت بتائی تھی مگر وہ کچھ سنتا بھی تو۔
 ”ڈرائیور پلیز! اٹھو۔“ مجبوراً علیزے کو اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھنا پڑا تھا لیکن اس کے جسم کی حدت سے علیزے کے خوف زدہ سے حواس ٹھکانے پہ آگئے تھے اور وہ بدگ کے رہ گئی اس کا جسم آگ کی طرح تپ رہا تھا اور اس آگ نے اسے بے سدھ کر رکھا تھا۔ اتنا تیز بخار؟ وہ اسے اس طرح بخار میں پھنکتے دیکھ کر ہشیمان سی ہوئی تھی کیونکہ اسے تو عصر کے وقت ہی قادر نے فون کر کے بتادیا تھا کہ صاحب کو بہت تیز بخار ہے لیکن علیزے نے ہی پلٹ کر اس کی کوئی خبر نہیں لی۔
 ”کیوں؟ میں کیوں لگتی اس کی خبر؟“ سے بخار کی بجائے کچھ بھی ہو میری بلا ہے۔“ اس کے اندر کی نفرت پھنکاری تھی۔ تمہارے خیال میں اگر اس طرح نہیں کچھ ہو جاتا تو کیا یہ کہہ سکتا تھا کہ اسے بخار کی بجائے کچھ بھی ہو میری بلا ہے۔ انسان کے سینے کے اندر موجود دل بنیادی طور پہ سرخ خون سے بنا گوشت کا ایک ٹوٹا پھڑا ہے جو انسان کے جذبات احساسات اور حالات کے سرد گرم کے اثر سے جتا اور پھلتا ہے اور وہ اس جھمنے اور پھلنے میں بھی صدیوں اور سالوں کا نہیں بلکہ سیکنڈز کا وقت لیتا ہے پل میں پھل بھی سکتا ہے اور پل میں جم بھی سکتا ہے۔
 اور کبھی کبھی یہ کام انسان کے کسی ایک خیال، کسی ایک سوچ سے بھی ہو جاتا ہے۔
 اوھر کوئی خیال ذہن کو چھو کے گزر جائے اور اوھر دل جیسا لو ٹھڑا پھل جائے۔ علیزے کے ساتھ بھی اس وقت یہی ہوا تھا۔
 اوھر اس کی نفرت پھنکاری تھی اور اوھر ذہن کے اک خیال اور خیال میں لپٹے سوال نے اس کے دل کو پھلا کے رکھ دیا تھا آخر وہ اک موم کی گڑیا تھی اس کا دل پتھر کیسے ہو سکتا تھا؟
 وہ پھر سے اس کی طرف متوجہ ہونے پہ مجبور ہو گئی تھی اور اسے متوجہ ہونے کے بعد احساس ہوا تھا کہ وہ اس

وقت اسے جس جگہ میں چھوڑ کر گئی تھی وہ ابھی تک اس جگہ میں تھا یہاں تک کہ وہ چہنچ بھی نہیں کر سکا تھا حالانکہ وہ اس کے کپڑے نکال کے رکھ گئی تھی لیکن پھر بھی وہ بیڈ سے اٹھ نہیں سکا اور اسی چیز کا علیزے کو افسوس ہو رہا تھا اور اس کے اس افسوس اور ہشیمانی نے اسے دل اور کے قریب کر دیا۔
 ”ڈرائیور!“ اس نے دوبارہ اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے اسے پکارا تھا۔ البتہ اب اس پکار میں خوف نہیں تھا بلکہ فکر تھی، تشویش تھی پریشانی تھی۔
 ”آف اب کیا کروں۔ اسے تو کچھ ہوش نہیں ہے۔“ علیزے کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا وہ اوندھا پڑا تھا اور اسے سیدھا کرنا بھی اس کے لیے محال تھا آخر وہ اتنی ہمت اور اتنی طاقت کہاں سے لائی مگر اس وقت اپنی ہمت اور اپنی طاقت آزمانے کے سوا اور کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔
 اور یہ اس کی ہمت ہی تھی کہ اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا کے دل اور کے گال کو تھپکا تھا اسے چھوا تھا اور اسے ہوش میں لانے کی پوری پوری کوشش کی تھی۔
 ”ڈرائیور! پلیز ہوش میں آؤ۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ پلیز! پلیز! آئیں کھولو۔“
 علیزے نے اس کے چہرے کو اس کے بازو کو اس کے کندھے کو ہلا۔ کد کھاتا مگر جواب نہ دار۔ اور جب وہ کسی طور بھی ہوش میں نہ آیا تو اس نے اپنی ہمت کے ساتھ ساتھ اپنی طاقت بھی آزماؤالی تھی۔ اور اپنے دونوں ہاتھ اس کے کندھے پہ جم کے اسے سیدھا کرنے کی کوشش کی تھی۔
 اور کندھے کو پیچھے کی طرف دھکا لگنے پہ دل اور گہری غنوغی میں ذرا سا کسمکسایا تھا اور اس کی اس کسمکسائے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے علیزے نے اسے فوراً سیدھا کر لیا تھا۔
 جس سے اسے کافی تسلی ہوئی تھی حالانکہ اس تسلی کے چکر میں وہ خود اچھی خاصی ہانپ گئی تھی۔ ”ڈرائیور پلیز! کچھ تو کہو۔ میری طرف دیکھو تو سہی۔ میں اکیلی ہوں کیسے سنبھالوں تم کو؟“ علیزے اس کے مضبوط ہاتھوں اور کشادہ پیشانی کو چھو چھو کر بخار کی شدت محسوس کرتی مزید پریشان ہو رہی تھی کیونکہ اس کا جسم حقیقتاً ”بہت تیز بخار میں“ جھلس رہا تھا۔
 ”ڈرائیور! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ آنکھیں کھولو پلیز۔ تم کچھ کہتے کیوں نہیں؟ پلیز! اس نے دل اور کی ایسی نیم بے ہوش اور بے خبری حالت یہ وہاں سے لہجے میں کہتے ہوئے اس کی شرٹ کا گریبان پکڑ کر جھجھوڑا لایا تھا۔
 ”آف میرے اللہ! میں کیا کروں اب؟“ وہ بیڈ پہ اس کے پہلو میں بیٹھی اپنا سر تھام کے رہ گئی تھی۔
 ”بیٹا! جب بہت تیز بخار ہو جاتا تو پھر برف کی ٹھنڈی پٹیاں بھگو کر رکھتے ہیں اس سے بخار کی شدت کم ہو جاتی ہے۔“ علیزے کی سماعتوں میں آسیہ آندھی کی آواز گونجی تھی بہت عرصہ پہلے عین کو بخار ہوا تھا اور آسیہ آندھی اس کے سر ہانے بیٹھی برف کے ٹھنڈے پانی میں پٹیاں بھگو بھگو کر رکھ رہی تھیں جب علیزے نے حیرت سے سوال کیا تھا اور اس سوال کا جواب آج اس کے کام آگیا تھا۔
 ”برف کی ٹھنڈے پانی کی پٹیاں۔“ اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا تھا اور وہ یکدم اٹھ کھڑی ہوئی۔ بڑی تیزی سے بیڈ روم سے نکل کر نیچے کچن میں آئی اور فریج سے برف کے کیوبز نکال کر ایک بڑے سے باؤل میں ڈال کے کپڑے کی دو تین پٹیاں بنا کر اوپر لے آئی تھی اور اپنے پیچھے بیڈ روم کا دروازہ بند کر ڈالا۔ لیکن اس کے ماتھے پہ پٹیاں رکھنے سے پہلے علیزے کی نظر دل اور کے جگہ کی سمت اٹھی تو اسے بڑی الجھن کا احساس ہوا تھا اس کی شرٹ کے بن گریبان تک بند تھے پینٹ کا بلیٹ بھی ہنوز بندھا ہوا تھا اور بلیک ٹر کی جرابیں بھی اس کے پیروں میں جوں کی توں موجود تھیں۔
 اور اسے بخار کی حالت میں اس طرح ہر طریقے سے جکڑے ہوئے دیکھ کر علیزے سے برداشت نہیں ہوا تھا

اور اس نے مجبوراً خود پہ ضبط کرتے ہوئے ٹھنڈے پانی کا باؤل سائیڈ ٹیبل پہ رکھ کر اپنا لرزنا کا نچٹا ہوا ہاتھ اس کی شرٹ کی طرف بڑھا دیا تھا اور اس نے انتہائی ہمت اور حوصلے سے کام لیتے ہوئے اس کی شرٹ کا پہلا بٹن کھولا تھا مگر اس ایک بٹن کو کھولتے کھولتے اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی تھی۔

بے شک وہ دونوں میاں بیوی ہونے کے باوجود بھی نازک اور گداز جذبات سے ابھی کوسوں دور تھے، لیکن شرم و جھجک سے تو دور نہیں تھے نا اور اس شرم کے ہاتھوں ایسی چوہن میں بھی علیزے یہ اک غذا ب آنوار ہوا تھا جس کو عبور کرنا اس کے لیے ایک اور جان جو حکم کا مرحلہ تھا۔ اور اس مرحلے کو طے کیے بغیر اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

سو علیزے نے اس آزمائش کا بیڑہ بھی اپنے کندھوں پہ اٹھاتے ہوئے ایک ایک کر کے اس کی شرٹ کے سارے بٹن کھول دیئے تھے مگر اس کے اوپر تقریباً ”جھک کر اس کی پینٹ سے بیلٹ کا ہک کھولتے ہوئے اسے دانتوں پسینہ آگیا تھا“ شرم اور جھجک نے اس کے جھکے چھڑا دیئے تھے اور ادھر دل تھا کہ بری طرح دھڑک اٹھا تھا کیونکہ اسے آج وہ کام کرنا پڑ رہا تھا جو وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ لیکن پھر بھی اس نے کربے لیے تھے ہمت نہیں ہاری تھی اور ضبط سے کام لیا تھا۔ ورنہ دل اور کے ایسے کام وہ کرتی۔؟ کبھی ہو ہی نہیں سکتا تھا مگر کیا کرتی سینے کے اندر بیٹھا سرخ خون کا لو ٹھہرا اس وقت کھلا ہوا تھا اور اسے وہ کام بھی کرنا پڑے تھے جو اس کے لیے انتہائی شرم کا باعث تھے۔

اور وہ بڑی ہمت اور بڑی مشکل سے اس کی پینٹ سے بیلٹ کھینچ کر نکالنے میں کامیاب ہو سکی تھی اور پھر ہانپتے ہوئے اس نے اک گہری سانس خارج کی تھی۔

لیکن پھر بھی اس کی مشقت کا وقت ختم نہیں ہوا تھا کیونکہ ابھی اس کے پیروں سے جرابیں اتارنا باقی تھا اس لیے وہ اپنی وھڑکنوں کو اور اپنی سانسوں کو ہموار کرتی ہوئی اس کے پیروں کی سائیڈ پہ آگئی تھی اور پھر ذرا سا جھک کر اس کی پینٹ کے پائینے اوپر گرتے ہوئے اس کی جرابیں اتارنے لگی۔

اور اس کی جرابیں اتارتے ہوئے علیزے کے ہاتھ اس کے پیروں سے بھی ٹپچ ہوئے تھے جس کی وجہ سے اسے دل اور کے پیروں سے بخار کی شدت سے اک بھاپ سی نکلتی ہوئی محسوس ہوتی تھی اور بخار کی شدت اور گرم بھاپ کے احساس کو کم کرنے کے لیے علیزے نے بے ساختہ اپنے ٹھنڈے ہاتھوں کی جان افزا راحت اس کے پیروں کو سونپ دی تھی جس سے دل اور کے جسم میں ایک لہری دوڑتی ہوئی اس کے دل و دماغ اور اس کی روح تک جا پہنچی تھی وہ انتہائی گہری غنودگی سے بھی کسسا گیا تھا۔

”علیزے۔۔۔“ اس کے ہونٹوں سے اس کا نام ادا ہوا تھا غنودگی میں بھی وہ اس کا لمس پہچان گیا تھا۔

”ڈرائیور!“ علیزے اس کے پیروں کو سہلاتے سہلاتے اس کی آواز پہ فوراً ”اس کے قریب آئی تھی مگر وہ اس کے پکارنے پہ اب بھی کوئی جواب نہیں دے سکا تھا۔

اس لیے علیزے باقی سارے کام چھوڑ چھاڑ کے اس کے قریب بیڈ پہ اس کے پہلو میں ہی بیٹھ گئی تھی اور رفتہ رفتہ اس کے ماتھے پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں بھگو بھگو کر رکھنے لگی۔ اور اس کے اس عمل کو ابھی پندرہ منٹ ہی گزرے تھے کہ اچانک ہی لائٹ چلی گئی اور اتنے گہرے اور گہپ اندھیرے میں علیزے اپنی جگہ پہ جیسے جوں کی توں جم کے رہ گئی تھی مگر اس کے باوجود اس نے اندھیرے میں ہی اوہرا ہر دیکھنے کی کوشش کی تھی کہ شاید کوئی ایسی چیز نظر آجائے جس سے وہ کوئی ٹول لائٹ روشن کر سکے۔

شاید اللہ کو اس پہ ترس آگیا تھا کہ اگلے دو سیکنڈ میں دل اور کے موبائل پہ کسی ایس ایم ایس کی مدد ہم سی بی بی کے ساتھ سائیڈ ٹیبل پہ رکھا موبائل روشن ہو گیا تھا۔ اور علیزے کو امید کی کرن نظر آگئی تھی ”اس نے فوراً“

ہاتھ بڑھا کر اس کا موبائل اٹھالیا تھا۔

اور اس موبائل کی روشنی میں اس نے کنڈل اسٹینڈ ڈھونڈنا شروع کر دیا تھا جو اسے سائیڈ ٹیبل کے سب سے نیچے دراز میں سے دستیاب ہوا اور پھر اس کی سگریٹ کے پیکٹ کے ساتھ رکھ لائے موم بتی جلا دی تھی جس کی مدد ہم سی لوبیڈ روم میں لرزنے لگی اور اس لرزتی ہوئی ٹو میں وہ دوبارہ دل اور کی طرف متوجہ ہوئی وہ ہنوز بے سدھ پڑا ہوا نظر آ رہا تھا۔

”ڈرائیور! آنکھیں کھولو نا۔ پلیز دیکھو لائٹ بھی نہیں ہے مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ اور بار بار بارش بھی بہت تیز ہے۔ اتنی خوف ناک سی آوازیں آرہی ہیں۔“

علیزے اپنے ٹھنڈے ہاتھوں سے اس کے چہرے کو چھو رہی تھی اور موم بتی کی لو کی طرح دل اور کی ہلکوں پہ ہلکی سی لرزش ہوتی تھی جس سے علیزے کو مزید حوصلہ ہوا تھا۔

”ڈرائیور! پلیز اب بس کرو ٹھیک ہو جاؤ۔ دیکھو میں تمہک گئی ہوں تمہیں بلا بلا کے ایک بار میری آواز تو سنو میری طرف دیکھو تو سہی۔“

اس نے ایک بار پھر اس کے گالوں کو تھپکا تھا اور اپنے چہرے پہ اس کے نرم ہاتھوں کی تھپک سے دل اور کی ہلکوں پہ پھراک جنبش۔ ہوئی تھی اور اس نے بڑی مشکل سے آنکھیں کھول کر دیکھنے کی کوشش کی تھی مگر اس کوشش میں بھی اس کی آنکھوں میں حیرانی اور بے یقینی تیر گئی تھی۔ موم بتی کی مدد ہم سی روشنی میں علیزے اس کے بے حد قریب اور عین اس کے سینے کے اوپر جھکی آنکھوں میں ہلکی سی نمی لیے بڑی تشویش اور بڑی فکر سے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

”علیزے۔۔۔ تم۔۔۔“ دل اور کے ہاتھوں میں بھی حرکت ہوئی تھی اور اس نے اپنے چہرے پہ رکھے علیزے کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ کر اس کے ٹھنڈے لمس کو محسوس کیا تھا۔

”ہاں! میں ہی ہوں پلیز ڈرائیور! آنکھیں کھولو مجھ سے بات کرو میں نہیں بہت پریشان ہوں تمہارے لیے۔ تم اس طرح کیوں پڑے ہو؟ کیوں تمہک گئے ہو؟ تم۔۔۔ تم اس طرح بالکل بھی اچھے نہیں لگ رہے۔ تم اتنے سے بخار سے ہار گئے ہو یا کوئی اور وجہ بھی ہے۔“ علیزے نے پھر اس کے چہرے کو تھپکا تھا اور دل اور کے چہرے پہ غنودگی کے باوجود بھی ایک استہزائیہ سے احساس کی لہر دوڑ گئی تھی۔

”میں ہار گیا علیزے! میں سب سے ہار گیا میں تم سے بھی ہار گیا۔“ اس نے انتہائی بوجھل آواز میں کہتے ہوئے دوبارہ سے ہلکیں مونڈی تھیں اور علیزے بے چین ہو گئی تھی۔

”ڈرائیور۔۔۔“ اس نے بڑے بے چین سے لہجے میں پکارا تھا اور دل اور نے پھر سے آنکھیں کھول دی تھیں اور ایک بار پھر قرب کی انتہا کو چھوئی علیزے کو دیکھا تھا۔

”نکرنہ کرو۔۔۔ تمہیں اس طرح چھوڑ کر مروں گا نہیں۔ کیونکہ مجھے پتا ہے کہ آج تم بھی مجھے مرنے نہیں دو گی۔ آج تو میری موت کے فرشتے کو بھی سوچ سمجھ کر آنا ہو گا۔“ دل اور نے عجیب بے تکلف اور بے ربط سے لہجے میں کہتے ہوئے علیزے کے چہرے کے دائیں بائیں جھولتے بالوں کو آہستگی سے پیچھے ہٹایا تھا۔

”پلیز! ایسی باتیں مت کرو۔ مجھے پہلے ہی بہت ڈر لگ رہا ہے۔“ وہ خفگی سے بولی تھی۔

”اور مجھے ڈر بھی لگ رہا ہے اور پیاس بھی لگ رہی ہے۔“ دل اور کی نظرس اس کے دھوکے ہو شریا خوبصورتی کو چھو کر رہ گئی تھیں اور علیزے اس مدد ہم اور طلسمی سی روشنی میں بھی اس کی نظروں کی حدت سے وہک اٹھی تھی اور فوراً ”ہی اک جھٹکے سے سیدھی ہو بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ تپ اٹھا تھا۔

”پانی پیو گے۔“ اس نے خود کو اس سنسناتے ہوئے احساس سے نکالنے کی کوشش کی تھی۔

”یلا دو۔“ اس نے بہت ڈھیلے ڈھالے انداز میں کہا تھا اور علیزے بمشکل خود کو سنبھالتی ہوئی گلاس میں پانی اترنے لگی اور پھر اسی مشکل سے اسے پلایا بھی تھا۔
”شکر ہے کہ بخار پہلے سے کم ہو چکا ہے۔“ علیزے کو اس کے جسم کی تپش میں بذرا کی محسوس ہوئی تھی۔
”فسوس کہ کیوں کم ہوا ہے۔“ دل آور نے تھک کر اپنا سر دوبارہ تکیے پر ڈال دیا تھا اور علیزے کی رات یونہی اس کے سرہانے بیٹھے بیٹھے گزر گئی تھی۔
البتہ دل آور کی رات ہوش اور بے ہوشی کے درمیان ڈولتے ہوئے گزری تھی اور اس لیے علیزے کو رات بھر جاگنا پڑا اور اس کی تیارواری کرنا پڑی۔ لیکن فجر کی اذان ہوتے ہی وہ اس کے پاس سے اٹھ گئی تھی اور اسے اکیلا چھوڑ دیا تھا۔



رات بہت اندھی بارش برسی تھی۔ اس لیے آج کی صبح بہت ٹھنڈی اور بہت تازہ محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن اس کے باوجود بھی نجانے کیوں علیزے کو نہ ٹھنڈک محسوس ہو رہی تھی اور نہ تازگی۔ وہ دل آور کے ساتھ صرف اس کی خاطر صرف اس کی فکر میں جاگ کر بہت عجیب سی ہو گئی تھی اس کا ذہن کسی اور سمت میں جھٹک نکلا تھا اور اس جھکے ہوئے ذہن کے ساتھ وہ نماز پڑھنے کے بعد اس کے لیے ناشتا بنا کر لے آئی تھی کیونکہ اسے پتا تھا کہ دل آور نے کل شام سے کچھ نہیں کھایا۔
مگر ناشتے کی ٹرے لے کر بیڈ روم میں داخل ہوتے ہی پورے بیڈ روم میں سگریٹوں کا دھواں بھرا تھا اور باہر کے ٹھنڈے اور تازہ ماحول سے اندر آتے ہی اس کا دم گھٹ گیا تھا اس لیے ذرا سنبھلتے ہی وہ ہاتھ میں پکڑی ٹرے لے کر ٹیبل کی طرف بڑھ گئی تھی اور ٹرے ٹیبل پر رکھنے کے بعد دل آور کے قریب آگئی وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھا سگریٹ پھونکنے میں مشغول تھا۔
”ڈرائیور پلیز ایس کرو تم یہ سگریٹ چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟“ اس نے آج دوسری بار دل آور کے ہونٹوں سے سگریٹ چھین لیا تھا اور اس کا ٹکڑا الٹش ٹرے میں مسل ڈالا تھا۔
دل آور نے بیڈ کے قریب کھڑی علیزے کو دیکھتے ہوئے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھالا سٹراور سگریٹ کا پیکٹ دوبارہ اٹھا لیا تھا۔ جسے دیکھ کر علیزے کو مزید چھین ہوئی تھی۔
”ہو نہہ! سگریٹ اس لیے نہیں چھوڑتا۔ کیونکہ یہ میرے ساتھ ساتھ جلتا رہتا ہے، سلگتا رہتا ہے۔“ اس نے کہتے ہوئے ایک اور سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں ڈال لیا تھا اور اسے ابھی لائٹ سے شعلہ دکھائی رہا تھا کہ علیزے نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔
”پلیز! چھوڑ دو۔“ علیزے کا لہجہ اور انداز ہی کچھ ایسا تھا کہ دل آور نے بے ساختہ اس کے چہرے کی سمت دیکھا تھا۔

”چھوڑ دوں۔“ وہ اس سے جیسے آخری بار اجازت چاہ رہا تھا۔

”ہاں۔! چھوڑ دو۔“ اس نے آہستگی سے سر ہلایا تھا۔

”لو چھوڑ دیا۔“ دل آور نے بڑے سکون اور بڑے اطمینان سے کہہ کر سگریٹ ہونٹوں سے نکال کر دو ٹکڑے کر کے الٹش ٹرے میں ڈال دیا تھا اور پھر لائٹ اور سگریٹ کا پیکٹ اپنی ہتھیلی پر رکھ کے اس کے سامنے کر دیا علیزے نے اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے اس کی ہتھیلی پر رکھالا سٹراور سگریٹ کا پیکٹ اٹھا کر پلٹ کے ڈسٹ بن میں ڈال دیا تھا۔

”اور کچھ۔“ وہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔
”میں گے۔؟ علیزے نے بھی جواباً اسے سوالیہ نظروں سے ہی دیکھا تھا۔
”بہت ہوئی تو باتوں کا وعدہ نہیں کرتا۔“ اس نے کالی ڈھیلے ڈھالے انداز میں کہا تھا۔
”پھر ایک بات کہوں تم سے۔؟“ وہ آہستگی سے چلتی ہوئی کھڑکی میں آکھڑی ہوئی تھی اور کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیے تھے اور دل آور نے اپنا سر بیڈ کراؤن سے ٹکاتے ہوئے اپنے اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیے تھے کہ نجانے اب جو کیا بات کہنے والی ہے کہ جس سے پہلے اس طرح تمہید باندھ رہی ہے۔
”تم ایسا کرو۔ زری کے ہو جاؤ۔“ علیزے نے بے حد آہستگی سے اور بے حد جیسے لہجے میں اتنی بڑی بات کہہ دی تھی کہ دل آور نے یکدم کرنٹ کھا کے اس کے چہرے کو دیکھا تھا مگر وہ اس کی سمت پشت کیے کھڑی تھی اس لیے اس کی نظروں کو نا کالی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

”میں جانتی ہوں تمہیں میری بات عجیب لگے گی کہ پہلے میں ہی کہتی تھی کہ مجھے اپنا لو۔ اور اب میں ہی کہہ رہی ہوں کہ زری کو اپنا لو۔ مگر یہ سچ ہے۔ یہ ایک اہل حقیقت ہے کہ مجھے تمہاری نہیں۔ صرف تمہارے نام کی ضرورت تھی۔ جو مجھے مل چکا ہے۔ جبکہ زری کو صرف تمہارے نام کی نہیں۔ بلکہ تمہاری بھی ضرورت ہے اور نہ ہی میرے دل میں کوئی ایجنڈا لیکن تمہیں تمہارے لیے۔ مگر پھر بھی۔ پھر بھی محض ایک رات صرف ایک رات تمہیں اس طرح بے ہوشی کی حالت میں دیکھ کر میرا یہ حال ہو گیا ہے کہ میں رات بھر سو نہیں سکی۔ میں کھانا نہیں کھا سکی یہاں تک کہ اپنے آگے تم سے دور بھی نہیں رکھ سکی۔

اور تم۔ تم تو زری کو چاہتے بھی ہو تمہیں اس سے محبت بھی ہے اور تمہارے دل میں ایجنڈا لیکن تم بھی ہیں اس کے لیے۔ تو پھر تو پھر تم اسے بے ہوشی کی حالت میں کیسے دیکھتے ہو گے؟ کیسے برداشت کرتے ہو گے؟ کیسے اپنے آپ کو اس سے دور رکھتے ہو گے؟ میرا تم سے نفرت میں یہ حال ہو گیا ہے تو تمہارا اس سے محبت میں کیا حال ہوتا ہو گا؟ ہے نا ذرا سو سو میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا۔“ علیزے نے عجیب بے چین سے لہجے میں کہتی ہوئی اس کی سمت پلٹی تھی۔ مگر دل آور چپ کے سوا کچھ نہیں کہہ سکا تھا۔

”پلیز ڈرائیور! چپ مت رہو کچھ کہو۔ میں تمہارے منہ سے تمہاری زبان سے اور تمہارے الفاظ سے کچھ سنا چاہتی ہوں اور تم جانتے ہو کہ اس وقت چپ نہیں رہنا چاہیے جب کچھ کہنا ضروری ہو؟“ علیزے نے اسے کچھ کہنے پر اکسایا تھا۔

”میں تمہارا ہوں علیزے۔“ دل آور کا لہجہ اور الفاظ انتہائی دو ٹوک سے تھے البتہ آواز کالی گہیر ہو رہی تھی۔
”مگر میں تمہاری نہیں ہوں ڈرائیور! اس کا جواب برکت تھا۔

”ہو نہہ کون میرا ہے اور کون نہیں؟ یہ سوچنا چھوڑ دیا ہے۔ البتہ میں کس کا ہوں۔ اب صرف یہ سوچنا ہوں۔“ دل آور کے سنجیدہ لہجے میں استہزا کی آمیزش تھی۔

”تو پھر تم بہت بڑی غلطی پر ہو۔“ علیزے کا لہجہ بھی استہزائیہ ہوا تھا۔
”میں جب بھی ہوتا ہوں غلطی“ برہی ہوتا ہوں اور میں نے آج تک زندگی میں غلطیاں ہی کی ہیں بہت بڑی غلطیاں کی ہیں اس لیے سمجھ لو کہ ایک غلطی اور سہی۔“

اس نے بڑی لا پرواہی سے کہتے ہوئے دوبارہ اپنا سر بیڈ کراؤن سے ٹکا کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔
”مگر تم کس کے ہو اور کس کے نہیں ہو مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ علیزے اس کی ذات کی نفی کرنے پر تکی ہوئی تھی۔

”لیکن میں کس کا ہوں اور کس کا نہیں ہوں مجھے اس سے بہت فرق پڑتا ہے۔“ وہ اپنی ہی دھن میں تھا۔

”ہاں! سچ کہہ رہے ہو تم۔ فرق پڑتا ہے تمہیں فرق پڑا ہے۔ اس لیے تو یہ حال بتائے بیٹھے ہو دور نہ یہ سگریٹ یہ دھواں یہ حلیہ کس لیے ہے آخر؟ فرق کے لیے تا کیونکہ تم کسی کے ہو تمہیں اس سے بہت فرق پڑتا ہے۔ بالکل ایسے جیسے زری کو فرق پڑا ہے۔ بس تم دونوں کے فرق میں فرق صرف اتنا ہے کہ وہ بے ہوش بستر پہ پڑی ہے اور تم ہوش و حواس میں ہو کر بھی بستر پہ پڑے ہو۔“ علیزے ضبط کرتے کرتے بھی جیسے پھری گئی تھی اور اس کی بات سے بے ساختہ حیران ہوتے ہوئے وہ بیڈ سے اٹھ کر اس کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔

”ہوں! تو تمہارا خیال ہے کہ میں زری کا غم منا رہا ہوں؟“ دل آور نے براہ راست نظریں اس کے چہرے پہ جمادی تھیں اور علیزے خود پہ ضبط کر کے اس کی نظروں کو نظر انداز کرتی ہوئی وہاں سے ہٹ گئی تھی مگر دل آور نے اپنی مضبوط گرفت سے اس کی بازو کلائی دبوچتے ہوئے اسے دوبارہ اپنے سامنے کھڑا کر دیا تھا اور اس افتاد میں علیزے یہ بھی محسوس نہ کر سکی کہ اس کے ہاتھ کی گرفت اب بھی کتنی گرم ہے۔

”جواب دو۔“ اب وہ اسے جواب پہ اکسار ہا تھا۔

”میرا خیال نہیں میرا یقین ہے۔“ وہ اپنے بیان پہ قائم تھی۔

”تو پھر اس بار تم خود بہت بڑی غلطی پر ہو۔ میں کسی کا بھی کوئی غم نہیں منا رہا۔“ اس نے اپنے الفاظ پہ زور دے کر کہا تھا اور علیزے کے ہونٹوں پہ ایک طنزیہ سی مسکراہٹ بکھرنی لگی۔

”ہاں! یہ بات تو میں بھول ہی گئی تھی کہ تم غم نہیں مناتے۔ تم جشن مناتے ہو۔“ اس نے ایک بھر پور طنز کیا تھا۔ اور دل آور نے اس کے طنزیہ لب پہنچتے ہوئے اس کی کلائی چھوڑ کر اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام لیا تھا اور ایک بار پھر براہ راست اس کی گولڈن براؤن آنکھوں میں جھانکا تھا۔

”آج تک تمہاری ذات پہ تو کوئی جشن نہیں منایا میں نے؟ منایا ہو تو بات کرو۔“

دل آور نے بھی جواباً طنزیہ لہجے میں خاصا چبا کر پوچھا تھا۔

”یہ کیوں نہیں کہتے کہ تم نے آج تک کس کس کی ذات پہ جشن نہیں منایا؟ نہ منایا ہو تو بات کرو؟“ علیزے نے اس کا جملہ بدل کے اسے ہی جواب دیا تھا اور دل آور اس کے جواب پہ جھنجھلا گیا تھا۔

”علیزے پلیز! اپنی بات کرو، صرف اپنی بات۔ میں نے کسی کے ساتھ کبھی کچھ نہیں کیا۔ جو بھی کیا ہے تمہارے ساتھ کیا ہے۔ جشن مناؤں گا تو تمہاری ذات کا مناؤں گا۔ غم مناؤں گا تو تمہارا مناؤں گا کیونکہ میں نے اپنی زندگی میں کسی کو اس نظر سے دیکھا ہے تو تمہیں دیکھا ہے۔ کسی کو اس لمس سے چھوا ہے تو تمہیں چھوا ہے۔ میں تم سے چھپا ہوا نہیں ہوں جیسا بھی ہوں تمہارے سامنے ہوں۔ میں مجرم ہوں تو بھی تمہارا ہوں۔ میں مظلوم ہوں تو بھی تمہارا ہوں۔ مجھے سزا دینی ہے تو تم دو۔ مجھے بخشا ہے تو تم بخشو۔ دوسرے کی بات کیوں کرتی ہو؟ دوسروں کی بات مت کرو۔ میں تمہارا ہوں اور صرف تمہارے سامنے جوابدہ ہوں۔“

اس نے کافی بری طرح سے جھنجھلاتے ہوئے علیزے کو ٹوک دیا تھا اور علیزے نے جواباً ”اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔“

”تو تم صرف میرے سامنے جوابدہ ہو؟“ اس نے سنجیدگی سے پوچھتے ہوئے دل آور کے ہاتھ اپنے چہرے سے ہٹا دیئے تھے۔

”ہاں! صرف تمہارے سامنے۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

”تو پھر جواب دو مجھے کہ زری کے ساتھ یہ کیوں کیا تم نے؟“ علیزے نے آج اسے اپنی عدالت کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا تھا اور اس کے اس سوال پہ کٹہرے میں مجرم نے اک جھٹکے سے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

نبیلہ عزیز



بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدھیہ اور نبیلہ حیات دہی بہن بھائی ہیں، مدھیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے، وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل سو رہی ہے، جس کے پیش نظر فائزہ بیگم، نبیلہ کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں، لیکن مدھیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے، جس پر نبیلہ اور فائزہ بیگم سب حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے، مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر بڑا اندر پنپ رہا ہے۔

نیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے، مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، بے بسی اور بھوری سے تنگ آخر خود کشی کرنے کا سوچتا ہے، لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باؤ اختیار مل جاتا ہے، جو اسے کام کی آفر کرتا ہے، جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے، اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میسرک پاس آوی ہے، وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے، وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل کوز شاد کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے، وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آوی ہے، اس نے

کبھی ہارنا نہیں سیکھا، اس کی ماں بٹول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پر بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔

پچھتیسویں قیدِ دل

مگر اس کے اس دیکھنے میں بھی ایک عجیب سا تاثر تھا۔ اک عجیب سی کیفیت تھی۔ جیسے وہ کچھ کہنے کے لیے الفاظ تلاش کر رہا ہو اور اسے یہ الفاظ ذرا دیر کے بعد میسر آنے ہوں۔
”کیا کیا ہے میں نے زری کے ساتھ...؟“ وہ علیحدہ کے سوال کے بعد چند سیکنڈز کے توقف سے گویا ہوا تھا۔

”کوئی وعدہ کیا ہے اس کے ساتھ؟ کوئی قسم کھائی ہے اس کے لیے؟ محبت کا اظہار کیا ہے اس کے سامنے؟ کوئی امید دلائی ہے اسے؟ یا حوصلہ افزائی کی ہے اس کی؟ ہوں! بتاؤ مجھے کیا کیا ہے میں نے اس کے ساتھ۔“ دل اور اس معاملے میں بالکل کھرا تھا اس لیے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بات کر رہا تھا۔
”تو کیا واقعی تم نے زری کے ساتھ کچھ نہیں کیا...؟“ وہ بھی اسے بغور تنقیدی جاچتی ہوئی اور بے یقین سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”نہیں! میں نے واقعی زری کے ساتھ کچھ نہیں کیا... کبھی وعدہ کیا ہے نہ کبھی قسم کھائی ہے نہ اظہار کیے ہیں اس سے... اور نہ ہی امیدیں دلائی ہیں اسے... محبت کے اس سفر میں وہاں تک پہنچی ہے تو کبھی پہنچی ہے... میں تو کہیں تھا ہی نہیں میں نے تو اس سے کبھی بات تک نہیں کی... کبھی میسج نہیں کیا... کبھی کال نہیں کی... آج تک اس سے نظر نہیں ملائی۔ آج تک اسے اشارہ نہیں دیا۔ جب بھی کی ہے اس کی عزت سی کی ہے... جب بھی کیا ہے اس کا احترام ہی کیا ہے ہمیشہ فاصلے سے ہی دیکھا اسے... اور ہمیشہ فاصلے ہی رہا اس سے مگر پھر بھی وہ اس حال کو پہنچی ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے آخر؟“ دل اور بات کرتے کرتے بے بس سا ہونے لگا۔

”تو کیا تم نے محبت بھی نہیں کی اس سے؟“ علیحدہ آج پتا نہیں کن کن سوالوں کے جواب طلب کر رہی تھی اور دل اور اس کے سوالوں پر بار بار ٹھک رہا تھا بار بار ٹھہر رہا تھا۔
”بتاؤ ذرا یور؟ تو کیا تم نے محبت بھی نہیں کی اس سے؟“ اس نے پھر اپنے سوال پہ زور دیا تھا۔
”اس سوال کا جواب ضروری نہیں ہے۔“ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا تھا۔
”کیوں ضروری نہیں ہے؟“ وہ بضد ہوئی۔

”کیونکہ یہ میرا اور میرے دل کا معاملہ ہے، میں کس سے محبت کرتا ہوں اور کس سے نہیں کرتا، میں نے اس چیز کو لے کر کبھی کسی کو ڈسٹرب نہیں کیا، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اس چیز کو لے کر کوئی مجھے بھی ڈسٹرب نہ کرے اس محبت میں، میں جبا ہوں، میں مرا ہوں، میں نے ہمیشہ اپنے دل کی بات اپنے دل تک ہی رکھی ہے، کبھی دماغ تک نہیں لے کر گیا۔ کبھی دل کو دماغ پہ سوار نہیں کیا اور نہ ہی کبھی دنیا پہ ظاہر ہونے دیا ہے کہ اس دل پہ اور اس دماغ پہ کیا بیت رہی ہے؟ تو پھر... تو پھر... وہ کیوں ٹوٹ گئی سب کے سامنے؟ کیوں ٹھہر گئی وہ؟ اس نے اگر محبت کی تھی تو اسے یہ بھی پتا ہونا چاہیے تھا کہ محبت صرف وصال کا اور پھولوں سے جی بیج کا نام نہیں ہے، بلکہ محبت تو ہجر اور کانٹوں سے پروئے ہوئے بستر کا نام ہے... محبت تو شروع ہی موت سے ہوتی ہے... اور محبت کرنے والوں کو شیشے کا نہیں بلکہ پتھر کا ہونا چاہیے... تاکہ محبت کے علاوہ اور کچھ بھی اثر نہ کرے نہ کوئی سرد گرم نہ کوئی ہجر وصال... نہ کوئی زری اور نہ کوئی علیحدہ جس پتھر کے ہو جاؤ اور بے فکر رہو۔“

دل اور نے خاصے بے لچک سے لہجے میں کہتے ہوئے سر جھٹکا اور رخ کھڑکی کی سمت موڑ لیا تھا۔
جبکہ اس کے سامنے کھڑی علیحدہ اس کے جواب پر اور اس کے اطمینان پر اسے دیکھتی رہ گئی اور اس لیے اسے واقعی یہی محسوس ہوا تھا کہ اس کے سامنے کوئی انسان نہیں بلکہ پتھر کھڑا ہے جس پہ واقعی اب کچھ بھی اثر نہیں کر سکتا۔

”کیا بات ہے؟ کہاں کھو گئی ہو؟ دیکھنا کہیں محبت کے اس چکر میں بڑ کر تمہیں بھی محبت نہ ہو جائے؟“ دل اور نے گردن موڑ کر استہزائیہ سے انداز میں کہتے ہوئے اس کا کال تھک کر اسے متوجہ کیا تھا اور وہ اس کے اُتے اچانک لمس پہ چونک گئی تھی اور اسے خاصی ناگوار نظروں سے دیکھا تھا۔

”میں اور تم سے محبت؟ ہونہ کوئی عقل والی بات کرو ذرا یور۔“ اس نے انتہائی زہر خند سے لہجے میں کہہ کر سر جھٹکا تھا اور اس کی بات پہ دل اور عجیب سے انداز میں مسکرا اٹھا تھا۔
”افسوس! جب سے تم زندگی میں آئی ہو ساری عقلیں دھری کی دھری رہ گئی ہیں، رنگ کھا گئی ہیں دماغ میں۔“ اس نے اپنی پٹنی کی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
”بات کو ٹالو مت... میں تم سے زری کی بات کر رہی ہوں اور تم مجھ سے میری بات کر رہے ہو۔ یہ کیا طریقہ ہے بھلا؟“ وہ غصے سے جھنجھلائی تھی۔

”یہی تو اصل طریقہ ہے اور تم اس طریقے کو سمجھ ہی نہیں رہی زری غیر ہے میرے لیے، اس کی بات کیسے کروں اور کیوں کروں؟ جبکہ تم میری ہو۔ اس لیے ساری باتیں تمہاری ہی کرتا ہوں صرف تمہاری۔“ وہ کہتے ہوئے دوبارہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا تھا جہاں ہوا کے ٹھنڈے جھونکے ہلکورے لے رہے تھے۔
”مجھ سے غلط بات مت کیا کرو ذرا یور۔ میں تمہیں اچھی طرح سمجھتی ہوں۔“ اس نے چبا کر کہا۔
”میں نے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ تم سے کبھی کوئی غلط بات نہ کروں، میں تمہارے سامنے ایک کھلی کتاب کی طرح ہوں اور تم ہو کہ سمجھتی ہی نہیں ہو۔ مگر پھر بھی دعوا کرتی ہو کہ تم مجھے اچھی طرح سمجھتی ہو حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر تم مجھے اچھی طرح سمجھتیں تو مجھ سے یہ تھوڑی دیر پہلے والے ادھر ادھر کے سوال نہ کرتیں۔“

دل اور نے بڑے عجیب سے اور مسخرانہ انداز میں کہتے ہوئے سر جھٹکا تھا۔
”ہونہ! تو تم بھی تو کھلی کتاب کی طرح نہیں ہونا؟“ علیحدہ نے بھی چوٹ کی تھی۔
”چلو یہ بھی ٹھیک ہے کہ میں تمہارے سامنے کھلی کتاب کی طرح نہیں ہوں۔ مگر مجھے یہ بتاؤ کہ اگر میں جج کھل جاؤں تو کیا کروں گی؟ کیا اس کتاب کو پڑھنے کے بعد عمل بھی کر سکو گی یا نہیں؟“ اس نے پلٹ کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”ہونہ! مجھے ایسا کوئی شوق نہیں ہے۔“ وہ پھر زہر خند ہوئی تھی۔
”ہوں! تو پھر یہ طے ہے تاکہ میں واقعی ایک کھلی کتاب ہوں لیکن تم مجھے پڑھنے کا شوق ہی نہیں رکھتیں؟“ اس نے کندھے اچکائے تھے۔

”دیکھو! میں بحث میں نہیں الجھنا چاہتی... میں بات کو سمیٹنا چاہتی ہوں۔ بلکہ سب کچھ سمیٹنا چاہتی ہوں۔“
”کیا سب کچھ؟“ وہ پھر سوالیہ ہوا۔

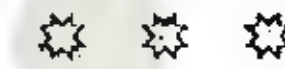
”سب کچھ جیسے زری اور تم۔“ وہ کہتے ہوئے پرسکون تھی۔
”مطلب...؟“ دل اور نے علیحدہ کے چہرے کو جانچا۔
”مطلب وہی ہے کہ زری کو اپنالو۔“ وہ اپنے کہنے پہ قائم تھی۔
”اور تمہیں؟“ دل اور کا یہ سوال بھی برجستہ تھا۔

مگر اب کی بار علیحدہ برجستگی سے کام نہیں لے سکی تھی بلکہ چند ثانے کے لیے چپ سی ہو گئی تھی اور پھر اس نے اک گہری سانس کھینچتے ہوئے اپنا فیصلہ بھی سنایا تھا۔

”مجھے چھوڑ دو۔ طلاق دے دو مجھے میری فکر مت کرو میری زندگی گزر رہی جائے گی۔ لیکن تمہارے بغیر وہ مر جائے گی جو تمہاری خاطر سب کو چھوڑ بیٹھی ہے سب کچھ تیا کر دیا ہے اس نے۔“ علیحدہ کہتے کہتے جیسے زنجیر سی

ہو گئی تھی۔
 ”تمہیں چھوڑ دوں۔ اور زری کو اپنالوں، واہ کیا کمال کا آئیڈیا ہے میری جان۔ یہ آئیڈیا مجھے کیوں نہیں آیا، دل آور نے اک طعنے سا مذاق کرنے کی کوشش کی تھی۔
 ”ہاں! مجھے چھوڑ دوں۔ مگر تم اسے اپنالو۔ پلیز ڈرائیور وہ تکلیف میں ہے اسے۔“
 ”بس علیزے بس! وہ تکلیف میں ہے تو اس سے زیادہ تکلیف میں میں خود ہوں، تم سب کو اپنا اپنی اپنی تکلیفیں نظر آتی ہیں یا پھر ایک دوسرے کی تکلیفیں نظر آتی ہیں مگر میری تکلیف۔ دل اور شاہ کی تکلیف آج تک کبھی کسی کو نظر نہیں آئی۔ کبھی کسی کو میرا احساس نہیں ہوا، نہ کسی زری کو نہ کسی علیزے کو اور نہ ہی کسی دوست کو سب کو ہمیشہ اپنا آپ ہی نظر آیا ہے۔ اپنی تکلیف ہی دکھائی دیتی ہے، میرا درد، میری چوٹ، میرا زخم کسی کو دکھائی نہیں دیا، چاہے وہ تم ہو، چاہے زری ہو، چاہے عبداللہ یا نبیل ہوں سب کو اپنی اپنی پروا ہے، سب کو اپنی اپنی فکر ہے۔ میرے بارے میں میری تکلیف کے بارے میں کبھی کسی نے نہیں سوچا، کبھی کسی کو احساس ہی نہیں ہوا کہ میرے سینے میں بھی دل ہے۔ موسم اور محبت اس پہ بھی اثر انداز ہو سکتے ہیں افسوس اس بات کا نہیں کہ کسی کو میری فکر نہیں ہے، کسی کو میری تکلیف کا احساس نہیں ہے، بلکہ افسوس تو اس بات کا ہے کہ سب کی تکلیف پہ میں کیوں تڑپتا ہوں؟ میں کیوں ہلکان ہوتا ہوں؟ مجھے کیوں چین نہیں آتا؟ اور اس کے باوجود سب کی نظر میں برا بھی میں ہی بنتا ہوں۔“ وہ علیزے کی بات پہ یکدم غصے سے بھر گیا تھا اور علیزے اس کی اس قدر بلند دھاڑ پہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی اسے دل اور کے پھرے ہوئے تیور دیکھ کر خوف آگیا اور وہ اس کے سامنے سے جاتے جاتے پھر ٹھہر گیا تھا۔

”اور ہاں۔ اب جو تم بار بار کہہ رہی ہو تاکہ مجھے چھوڑ دو یہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا تم نے سمجھ رکھا ہے۔ تمہارے کہنے پہ میں سب کچھ چھوڑ سکتا ہوں، مگر تمہیں نہیں چھوڑ سکتا، تم کوئی سگریٹ نہیں ہو جس کو تمہارے کہنے پہ اتنی آسانی سے چھوڑ دوں، تم جیتی جاگتی انسان ہو، بیوی ہو، عزت ہو، میری سگریٹ کا ٹکڑا نہیں ہو جسے میں فوراً اٹھا کر ڈسٹ بن میں ڈال دوں، آج ایسی بات کہی ہے مجھ سے، آئندہ کبھی مت کہنا اور نہ میرا خود پہ اختیار نہیں رہے گا اور انجام تمہیں بھگتنا پڑے گا۔“
 اس نے انگلی اٹھا کر اسے خاصے غضب ناک طریقے سے وارننگ دی تھی اور علیزے چپ کی چپ رہ گئی۔ جبکہ وہ پلٹ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا غصے سے بیڈ روم سے باہر نکل گیا تھا۔



وہ جذلوں کی تجارت تھی یہ دل کچھ اور سمجھا تھا
 اسے ہنسنے کی عادت تھی یہ دل کچھ اور سمجھا تھا
 مجھے اس نے کہا تھا آؤ نئی دنیا بساتے ہیں
 اسے سو بھی شرارت تھی یہ دل کچھ اور سمجھا تھا
 ہمیشہ اس کی آنکھوں میں دھنک سے رنگ ہوتے تھے
 یہ اس کی عام حالت تھی یہ دل کچھ اور سمجھا تھا

اک بے بسی تھی، اک اضطراب تھا جو نبیل حیات کو کہیں بھی بیٹھنے نہیں دے رہا تھا، کئی گھنٹے مسلسل سڑکوں پہ گاڑی بھاگنے کے بعد تھک ہار کے گھر واپس آیا تو اس کا دماغ پھر سے اڑ گیا تھا۔ کیونکہ سامنے کا منظر ہی کچھ ایسا تھا کہ وہ جسم سے لے کر جان تک جل گیا تھا اس کا دواں دواں سلگ اٹھا تھا۔

”بابا! نبیل پوری قوت سے چیخ اٹھا تھا کیونکہ ممتاز حیات کے ہاتھ میں مومنہ بی بی کا دوپٹہ دیکھ کر اس کا دماغ ہی آؤٹ آف کنٹرول ہو گیا تھا۔

جبکہ ممتاز حیات نے فوراً سے پیشتر اس کا دوپٹہ چھوڑ دیا تھا اور مومنہ بی بی ان کی گرفت سے اپنا دوپٹہ آزاد ہوتے دیکھ کر بڑی بے تابی سے لپک کے نبیل کے پیچھے چھپ گئی تھی یوں جیسے وہ کسی آسمانی آفت سے بچنے کے لیے پہاڑ کے پیچھے چھپ گئی ہے۔

”صاحب! وہ بڑے صاحب۔“ مومنہ بی بی کی حلق سے آواز ہی نہیں نکل رہی تھی اس کے حلق میں آنسوؤں کا گولا سا پھنس گیا تھا اور نبیل کے چہرے کی رنگت غصے اور غضب کے بارے نیلی ہوئی ہوئی تھی اور اس کی آنکھوں کا رنگ بھی پل بھر میں۔ سرخ ہو گیا تھا وہ تیر کی طرح ممتاز حیات کی سمت بڑھا تھا۔

”یہ کیا کر رہے تھے آپ؟ آپ کو جرات کیسے ہوئی اس پہ بری نظر ڈالنے کی؟ آپ کو پتا بھی ہے کہ یہ پہلے ہی آپ جیسے کسی زہریلے سانپ کی ڈنسی ہوئی ہے، پہلے بھی ایک درندہ اس کی ذات پہ اپنی درندگی آنا چکا ہے آپ۔ آپ پھر بھی۔۔۔ پھر بھی جانے بوجھتے ہوئے بھی باز نہیں آئے، آپ کو ذرا خیال نہیں آیا کہ آپ کیا حرکت کر رہے ہیں؟ آپ کو ذرا شرم نہیں آتی کہ یہ آپ کی بی بی کے برابر کی ہے۔“ نبیل نے انہیں گریبان سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا تھا۔

”تو خود اسے اپنے گھر میں کیوں رکھا ہوا ہے؟ کیا اپنا دل ٹھنڈا کرتے ہو؟ خوب صورت بھی تو بہت ہے آخر؟“ ممتاز حیات نے نبیل کو طعنہ دے مارا تھا اور وہ اس طعنے پہ نمٹنے پہ کمرٹ کھا گیا تھا۔
 ”بابا۔۔۔“ وہ جیسے گنگ سا ہو گیا تھا۔

”ہاں۔۔۔! ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہوں آخر اس لڑکی کو اپنے گھر میں رکھنے کا مقصد کیا ہے؟ کیوں اتنے مہمان ہو اس کے؟ اگر اتنی ہی مظلوم ہے تو اسے کسی دارالامان میں کیوں نہیں چھوڑ آتے؟ اپنے گھر میں اپنی نظروں کے سامنے کیوں بٹا رکھا ہے اسے؟“ ممتاز حیات نے تو کینٹینی کی حد کر ڈالی تھی اور نبیل یہ سب سن کر ششدر سا ہو گیا تھا۔

”بولو۔۔۔ کیا مجھے؟ چپ کیوں ہو گئے ہو؟“ ممتاز حیات کو نبیل کی چپ پہ اور بھی شہ ملی تھی۔
 ”اس نے اسے اپنے گھر میں اس لیے رکھا ہوا ہے کہ اس میں انسانیت ہے، لیکن تم میں انسانیت نہیں ہے تم نے تو اپنے گھر پہ بھی بری نظر ڈالنے سے گریز نہیں کیا، تم جانور ہو جانور۔ گوشت نوچنے والے جانور تمہیں جہاں گوشت نظر آتا ہے، بھونکنے لگتے ہو، غرانے لگتے ہو، تمہاری آنکھوں کے آگے ہوس کی چلی چڑھ جاتی ہے، تم اندھے ہو جاتے ہو، تمہارا نفس تمہیں ذلیل کر کے رکھ دیتا ہے اور میں ایک ذلیل انسان کے ساتھ اب مزید کوئی رشتہ نہیں رکھنا چاہتی، لہذا میرا فیصلہ یہ ہے کہ مجھے آج اور ابھی طلاق دے دو۔ اور اس گھر سے نکل دو جاؤ۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔“

قائزہ بیگم ان کی اور نبیل کی باتیں سن چکی تھیں اور ساری سچویشن سمجھ بھی چکی تھیں اس لیے انہوں نے کھڑے کھڑے وہ فیصلہ سن دیا تھا جس سے وہ ساری زندگی ڈرتی ہی آئی تھیں اور آج جب یہ ڈر انار کے پھینکا تھا تو وہ سب کچھ کہہ ڈالا تھا جو وہ کہنے کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھیں۔

”نام! نبیل کے ہونٹ کپکپائے تھے۔
 ”بس! اب اور نہیں نبیل اب اور برداشت نہیں کر سکتی۔ ساری زندگی برداشت کیا ہے، اب میری برداشت کی حد ختم ہو گئی ہے، اب میں مر گئی ہوں جیتے جی مر گئی ہوں مجھے اک عمر ہو گئی ہے اس شخص کی ذلتوں کے ساتھ جیتے ہوئے اب میرا حق بنتا ہے کہ میں مر جاؤں۔“ قائزہ بیگم غصے و نفرت اور دکھ سے کہتی ہوئی رو پڑی

تھیں۔ ”گرم! نیل کی زبان ہی اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی وہ کچھ کہنے کی کوشش کے باوجود بھی کہہ نہیں پاتا تھا۔

”اگر مگر کچھ نہیں۔ کسی کو کچھ پتا نہیں چلے گا اور اگر چل بھی گیا تو مجھے کوئی پروا نہیں ہے، میں کسی ملک حق نواز کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔“ انہوں نے ممتاز حیات کو ملک حق نواز کا لقب دے دیا تھا اور نیل ان کا گریبان چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا تھا۔

”مجھے طلاق دے دو ممتاز حیات۔ مجھے اپنے نام کے ساتھ اب تمہارا نام بھی گوارا نہیں ہے۔“ فائزہ بیگم کافی سپاٹ ہو رہی تھیں۔

”وے دوں گا تمہیں طلاق۔ مل جائے گی تمہیں۔“ تھوڑا انتظار کرو۔ ”ممتاز حیات کہہ کر اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھے تھے۔

”یہ گھر میرا ہے۔ آپ یہاں نہیں رہ سکتے۔“ نیل کی آواز پہ ان کے بیڈ روم کی طرف بڑھتے قدم رک گئے تھے۔

”کیوں نہیں رہ سکتا۔ صرف اس لڑکی کی وجہ سے؟“ انہوں نے کافی چبھتی ہوئی نظروں سے مومنہ بی بی کی طرف دیکھا تھا۔

”ہاں! صرف اس لڑکی کی وجہ سے، کیونکہ اب یہ گھر اس لڑکی کا گھر ہو گا، کیونکہ اب یہ مالک ہو گی کیونکہ اگلے چند لمحوں میں اس سے شادی کرنے والا ہوں تاکہ دوبارہ کوئی آپ جیسا ملک حق نواز اس پہ بری نظر نہ ڈالے۔“ نیل نے فائزہ بیگم سے بھی زیادہ سنگین دھماکا کیا تھا۔ جس پہ وہاں موجود تینوں نفوس ساکت و صامت سے ہو گئے تھے۔

”نیل۔؟“ فائزہ بیگم نے چونک کر دیکھا۔

”صاحب۔؟“ مومنہ بی بی کے ہونٹ بھی لرز گئے تھے۔

”یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ کسی کو کوئی بھی اعتراض ہو مجھے پروا نہیں ہے۔ البتہ مومنہ بی بی کو اعتراض ہے تو وہ انکار کا پورا پورا حق رکھتی ہے۔ میں اس کے انکار کا احترام۔ کروں گا۔“ نیل کہہ کر وہاں سے نکل گیا تھا اور پیچھے وہ میٹل دیکھتے رہ گئے تھے۔



کچھ خاص نہیں بس اتنی سی محبت ہے تم سے ہر رات کا آخری خیال ہر صبح کی پہلی سوچ ہو تم

ٹھیک ایک ماہ بعد آذر اور کول کی شادی تھی ہر طرف رونق ہی رونق تھی ہر طرف ہنگامے ہی ہنگامے تھے مگر آذر کو دیکھا جاتا تو یوں لگتا تھا کہ جیسے دنیا بھر کا جود صرف اس کی ذات پہ ہی چھا گیا ہو کوئی بھی رونق کوئی بھی ہنگامہ اس پہ اثر نہیں کر رہا تھا وہ جہاں بیٹھا ہوتا تھا اسے وہاں بیٹھے بیٹھے گھنٹوں گزر جاتے تھے اس کے پاس کیا ہو رہا ہے اسے احساس تک نہیں ہوتا تھا اور اس کی یہ حالت کسی اور کو نہ سہی مگر دانیال کو بہت کھلتی تھی۔

وہ جب بھی اسے اس طرح بیٹھے ہوئے دیکھتا تھا اسے غصہ آ جاتا مگر آج نہ جانے کیا بات تھی کہ اسے آذریہ غصہ نہیں آیا تھا بلکہ ترس آیا تھا، رحم آیا تھا اور وہ نے تلے قدموں سے چلا ہوا اس کے برابر ہی صوفے پہ آ بیٹھا تھا۔

”کیسے ہو؟“ دانیال کے لمبے کے ساتھ ساتھ سوال بھی بہت دھیمسا تھا۔ مگر آذر اپنے ہی کسی خیال میں گم اس

کی آواز اس کا سوال نہیں سن سکا تھا اور دانیال اس کی کیفیت سمجھ گیا تھا۔

”آؤ۔! اب اس نے اسے اس کے نام سے پکارا تھا۔

”ہوں۔! ہاں۔! وہ چونک کر متوجہ ہوا تھا اور اپنے قریب صوفے پہ بیٹھے دانیال کو خالی خالی نظروں سے دیکھا تھا۔

”میرا خیال ہے تم اس وقت اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے ہو جہاں اس وقت تمہارے علاوہ چارچ ولس لوگ اور بھی ہیں لیکن کی آوازیں بھی ہیں شور بھی ہے ہنگامے بھی ہیں مگر تمہیں کچھ دکھائی نہیں دے رہا کچھ سنائی نہیں دے رہا، تمہیں تو یہ بھی نہیں پتا کہ تم بیٹھے کہاں ہو؟ ایسا کیوں ہے بھلا۔ کچھ پوچھ سکتا ہوں تم سے؟ کیا اس لائق سمجھتے ہو مجھے؟“ دانیال نے اس کے گھٹنے پہ ہاتھ رکھ کے اسے متوجہ کیا تھا اور آذر اس کے سوال پہ اس کی صورت دیکھا رہ گیا تھا۔

”اس طرح کیا دیکھ رہے ہو؟ بتاؤ نا میں نے کچھ پوچھا ہے تم سے؟“ دانیال نے پھر اسے جواب دینے پہ اکسایا تھا۔

”دیکھ رہا ہوں کہ تم سب کچھ جانتے ہوئے بھی کس قدر انجان بن رہے ہو؟“ آذر نے خامسے تلخ اور چبھتے ہوئے سے انداز میں کہا تھا۔

”میں انجان نہیں بن رہا بلکہ تم سے مننا چاہ رہا ہوں۔“ دانیال نے تمہ پہ زور دیا تھا۔

”کیا جانا چاہ رہے ہو؟“ آذر نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔

”تمہارے اندر کا حال۔“ اس نے آذر کے سینے کی سمت اشارہ کیا۔

”میرے اندر کا حال تو غالباً تم سے بہتر اور کوئی نہیں جانتا؟“ آذر نے جیسے اپنے حال پہ طنز کیا تھا۔

”اسی لیے تو سب سے زیادہ پریشانی بھی مجھے ہی ہوتی ہے۔“ دانیال واقعی متفکر ہو رہا تھا۔

”پریشانی؟ مگر کس چیز کی؟“ اس نے جان بوجھ کر تعجب ظاہر کیا تھا۔

”تمہارے حال کی۔“ دانیال نے اسے سر تپا افسرہ اور تاسف زدہ نظروں سے دیکھا تھا۔

”ہو نہ! میرے حال کو کیا ہوا ہے بھلا؟ ٹھیک ہی تو ہے بہت خوش ہوں میں آخر میری شادی ہو رہی ہے ایک سے دو ہونے جا رہا ہوں۔ اس سے بڑی خوشی کی بات اور کیا ہو گی میرے لیے؟“ آذر کے لمبے میں طنز تھا ایک گہرا طنز۔ دانیال چند ثانیے کے لیے خاموش ہو گیا تھا۔

”دیکھو آؤ۔! اب طنز کرو یا چوٹ۔ حال بتاؤ یا حلیہ۔ فیصلہ تو ہو چکا ہے شادی تو تم نے کرنی ہی ہے تو پھر اسی طرح۔ اس طرح اداسی کا اشتہار بننے کی کیا ضرورت ہے آخر؟ اس طرح کرو گے تب بھی شادی ہو گی اور اگر نارمل رہو گے تو تب بھی شادی ہو گی مگر اس سے فرق یہ آئے گا کہ سیکنڈ طریقے سے سب کچھ اچھا نظر آئے گا اور سب خوش رہیں گے جبکہ تم فرسٹ طریقے ڈٹے ہوئے ہو۔“

”پلیز دانیال پلیز۔! یہ ساری باتیں صرف کہنے کے لیے ہی ہوتی ہیں کن پہ عمل کرنا پڑ جائے تو جان عذاب میں آجانی ہے، تلے میں چند ایڑ جاتا ہے انسان چکی کے روپاٹوں میں پس کے رہ جاتا ہے امیدیں ختم ہو جاتی ہیں دل دماغ کی مگر حاصل پھر بھی کچھ نہیں ہوتا، الٹا اپنے ہی دل کی لاش اٹھاتا پڑ جاتی ہے اور اپنے دل کی لاش اپنے کندھوں پہ اٹھاتا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ صرف میرا ہی المیہ نہیں ہے سب کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے، کبھی تم پہ گزرتی تو تمہیں احساس ہوتا، مگر خوش قسمت ہو سہ دل کے معاملے میں مطمئن ہو۔ اور اللہ تمہیں مطمئن ہی رکھے آمین۔“ آذر نے کہتے ہوئے آخر میں اس کا کندھا تھپکا تھا اور دانیال کو ایک بار پھر چپ ہونا پڑا تھا۔

”مگر پھر بھی یار میں یہ ہی چاہوں گا کہ تم خوش رہو۔“ دانیال نے ذرا توقف سے دوبارہ کچھ بولنے کا ارادہ پورا کیا تھا اور اس کی بات پہ بے ساختہ لٹی میں سر جھٹکتے ہوئے طنزیہ سے انداز میں مسکرایا تھا۔
”ہونہ! خوش تو ہر حال میں رہ سکتا البتہ خوش نظر آنے کی کوشش ضرور کر سکتا ہوں۔“
”لیکن آؤ! دانیال نے کچھ کہنا چاہا تھا۔“

”ایم سوری دانیال! میں اس وقت کچھ سننے کی پوزیشن میں نہیں ہوں جو جیسا چل رہا ہے چلنے دو بس گہرائی میں مست جاؤ گہرائی میں جانے سے ہمیشہ نقصان ہوتا ہے۔“ آؤ اسے ہاتھ اٹھا کر روکتے ہوئے وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”تم دونوں میں کیا کھسر پھسر ہو رہی ہے؟ وہ بھی اتنے سنجیدہ موڈ میں۔۔۔؟“ عائشہ آندی ان دونوں کے قریب چلی آئی تھیں۔

”کچھ نہیں پھوپھو۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے جس آپ کے بیٹے کو ہر مار گہرائی میں جانے کی عادت پڑ گئی ہے اسے کہیں زیادہ نہ سوچا کرے شادی کے دن قریب ہیں اس لیے اپنے ذہن پہ زیادہ بوجھ نہ ڈالے۔“ آؤ ہلکے پھلکے انداز میں کتنا عائشہ آندی کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

”کیسا بوجھ؟“ اس کی بات پہ عائشہ آندی کو الجھن ہوئی تھی۔
”عجیب الٹی سیدھی باتیں سوچتا رہتا ہے بڑا فارغ نام ہے اس کے پاس۔“ آؤ کے انداز پہ غور کرنے کے بعد عائشہ آندی کو اندازہ ہوا تھا کہ وہ مذاق کر رہا ہے تب انہوں نے کچھ ریلیکس ہو کر دانیال کی طرف دیکھا تھا۔

”فارغ نام تو تم سب کے پاس ہی ہے سوچتے تو تم بھی رہتے ہو اب یہ پتا نہیں کہ کیا سوچتے رہتے ہو؟“ وہ جواباً مسکرائی تھیں اور آؤ کچھ دیر بعد وہاں سے اجازت لے کر باہر نکل گیا تھا اور دانیال پھر کسی سوچ میں پڑ گیا تھا سوہ آج کل مسلسل آؤ کے متعلق ہی سوچ رہا تھا۔



”مجھے ایک بار۔۔۔ صرف ایک بار۔۔۔ بس آخری بار۔۔۔ اور شاید پہلی بار۔۔۔ اس سے اظہار تو کرنا چاہیے نا؟ اس دل میں اس نامراد دل میں یہ خواہش نہ حسرت تو نہ رہے کہ بنا اظہار کے ہی مر گیا؟ نہ اس کے در پہ پہنچانہ سجدہ کیا جس پتھر کی جبین لیے بت بنا رہا گیا۔ ہرگز نہیں کبھی نہیں اس جبین کو ایک بار اس کے در پہ تو ضرور لے کر جاؤں گا۔ بلکہ آج ہی جاؤں گا اور ابھی ہی جاؤں گا آج کے بعد کل کس نے دیکھا ہے بھلا؟ کل یہ رہ جانے والے لوگ خالی ہاتھ رہ جاتے ہیں اور میں میں تو ہوں ہی خالی ہاتھ اب اور خالی ہونے کے لیے تو کچھ بھی نہیں ہے اس لیے اب اس کے در پہ اس کے دل کے در پہ جانا ہی بہتر ہے اور آج میں جاؤں گا ہر حال میں جاؤں گا ابھی جاؤں گا اور اس وقت جاؤں گا۔“ اس نے اندھا دھند سرکوں پہ گاڑی دوڑاتے ہوئے اچانک گاڑی کا رخ ہسپتال کی طرف موڑ دیا تھا۔ اور گاڑی فل اسپڈ پہ چھوڑ دی۔

مگر اس وقت کون جانتا تھا کہ یوں پاگلوں کی طرح ڈرائیو کرتے ہوئے نیل حیات کے رخساروں پہ کتنے آنسو بے آواز سے تھہر کر ادھل کتنی بار صحرا میں بھٹکے مسافر کی طرح ہولایا تھا۔

پاگل تو وہ پہلے ہی ہو چکا تھا مگر اس وقت وہ دل و دماغ کی پورش سے بچ بچ جنونی سا ہو رہا تھا اس کے اندر چھپی سالوں کی تڑپ اس کے رویں رو میں سے نمایاں ہو رہی تھی۔ وہ آج کچھ بھی چھپا نہیں پا رہا تھا جیسے وہ اپنے اختیار میں ہی نہ رہا ہو اس کا اپنی ذات سے ہی اختیار اٹھ چکا تھا وہ بے بس تھا اور اس بے بس اور جنونی سی حالت میں وہ سیدھا ہسپتال جا پہنچا تھا۔

”نیل بھائی آپ؟ خیریت تو ہے نا؟“ نگارش جو ندی کے بیڈ کے قریب ہی کرسی پہ بیٹھی ہوئی تھی نیل کو یوں اچانک بغیر دستک کے اندر داخل ہوتے دیکھ کر حیرانی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔
”میں زری سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔“ اس کا لہجہ اور انداز ایسا تھا کہ نگارش ٹھنک کر دیکھنے پہ مجبور ہو گئی تھی۔

”زری سے بات کرنا چاہتے ہیں؟“ اسے مزید حیرت ہوئی تھی۔
”جی ہاں! زری سے بات کرنا چاہتا ہوں کیا اجازت ہے؟“ اب کی بار اس نے اجازت طلب کرنے کی فارملہ بی بیگانی تھی۔

”جج۔ جی! کر سکتے ہیں۔“ نگارش نے اپنے تاثرات کنٹرول کرتے ہوئے ہاتھ میں پکڑی زری کی ڈائری زری کے سر پہ رکھی اور اک سائڈ پہ ہو گئی۔

”جو بھی بات کروں گا یہ سننے کی نا؟“ نیل نے جیسے تسلی چاہی تھی۔
”ہونہ! ایسی تو افسوس ہے صرف سنی سے بولتی کچھ بھی نہیں۔“ نگارش کے لہجے میں دکھ کی چھین تھی۔
”میں بھی نہیں بولتا تھا صرف سنتا تھا مگر آج یہاں سننے کے لیے نہیں آیا صرف بولنے کے لیے آیا ہوں تاکہ میں بولوں اور یہ سنے۔“

نیل نے زری کی سمت اشارہ کیا تھا مگر نگارش اس کے تیور دیکھ کر لرز گئی تھی۔ کیونکہ اس کی آنکھوں کے سامنے اک اور محبت انکشاف ہوا تھا۔ اور انکشاف جب بھی ہو جس چیز کا بھی ہو ہمیشہ دہلا ہی رہتا ہے اور اس لیے نگارش بھی دھل گئی تھی اور اس کا دل بھی۔

”نیل بھائی! کیا یہ سہ پائے گی؟“ نگارش کو شروع سے ہی شک تھا کہ نیل زری کو چاہتا ہے اس سے محبت کرتا ہے اسے اسٹیل فیلنگز رکھتا ہے مگر کتنا کچھ بھی نہیں اظہار نہیں کرتا ڈرتا ہے جھجکتا ہے لیکن آج وہ سارے ڈر اور ساری جھجک بلائے طاق رکھتے ہوئے اپنے اظہار کا جنون اٹھائے اپنے لفظوں کے موتی لیے اس کے سامنے آکر اٹھ اٹھا تھا اور نگارش کا شک یقین کے سانچے میں ڈھل گیا تھا۔

”میں بھی تو نہیں سہیاد رہا اس لیے تو آج آج سب کچھ کہہ کر آزاد ہو جانا چاہتا ہوں۔“ اس نے کہتے ہوئے ایک گہری سانس خارج کی تھی۔

”تو آپ آزاد ہونے کے لیے آئے ہیں؟“ نگارش نے بھی ذرا توقف سے سوال کیا تھا۔
”ہاں۔۔۔ دل پہ بوجھ اٹھا اٹھا کر تھک گیا ہوں۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

”تو پھر یہ بوجھ کیسے اٹھائے گی۔۔۔ آپ جانتے ہیں نا یہ ایک ایسا بوجھ ہے جو زمین بھی نہیں سہا سکتی اس کے دکھ میں اس کے ہجر میں بھر ہو جاتی ہے اور آپ ایک بجزوہ زمین کو مزید عذاب میں مبتلا کرنا چاہ رہے ہیں؟“ نگارش نے دکھ سے کہا تھا۔

”نیل! میں اسے مزید عذاب میں مبتلا نہیں کرنا چاہ رہا بلکہ یہ بتانا چاہ رہا ہوں کہ یہ اکیلی بجزوہ نہیں ہے اور نہ ہی یہ اکیلی بجزوہ ہے ہم جیسے لوگ بھی اس عذاب کا شکار ہیں ہم بھی اک عذاب جھیل رہے ہیں اور اس عذاب کو جھیلنے کے بعد جی بھی رہے ہیں اس کی طرح دل سے اور دنیا سے غافل نہیں ہوئے۔“

نیل کی ہر بات میں اور ہر لفظ میں دکھ تھا درد تھا چھین تھی نگارش سے مزید سنا نہ گیا اور اس روم سے باہر نکل گئی تھی اور نیل زری کے بیڈ کے پامنتی کی طرف کھڑا ہوا تھا۔

کمرے کا دروازہ بند تھا۔

اور کمرے میں مکمل خاموشی تھی۔

زری سبے ہوش پڑی تھی اور نبیل ہوش و حواس میں کھڑا تھا۔
اور سوچ رہا تھا کہ بے ہوش پڑی زری سے کیا کہے۔ کہاں سے بات شروع کرے۔ اور کہاں پہ بات ختم کرے؟

جبکہ زری مضطرب سی ہو رہی تھی کہ نبیل کیا کہنے والا ہے آخر ایسی کون سی بات ہے جس کو بنا کہے اور ماننے ہی نگارش اتنی پریشان ہو گئی تھی اور ان دونوں کے لبوں میں دکھ ہنسنے لگا تھا۔
”نبیل پلیز! بولے کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟ کیوں اتنے پریشان ہیں؟ کیوں آئے ہیں یہاں؟“ زری اٹھ نہیں سکتی تھی بول نہیں سکتی تھی سوال نہیں کر سکتی تھی مگر اندر ہی اندر پریشان تو ہو سکتی تھی تا سبے چمن تو ہو سکتی تھی؟

”زری۔!“ نبیل کو شاید اس کی بے چینی اور اضطراب کا احساس ہو ہی گیا تھا۔ مگر زری جو پہلے ہی بے جان سی پڑی تھی اس کی اس پکار پہ دھک سے رہ گئی تھی۔
”یہ کیا ہے؟ یہ تو محبت کی آواز ہے؟ یہ تو عشق کا لہجہ ہے؟“

یہ پکار تو قیامت کی پکار ہے۔ اس سے کون بچے؟ اور اس کو کون سنے؟
وہ کوئی دل اور شاہ تھی جس کا کلیجہ محبت کی آواز، عشق کے لہجے اور قیامت کی پکار پہ بھی نہ کانپتا؟ وہ تو موم کا وجود تھی، لیکن پتھر ہو کے رہ گئی تھی۔

”سنا ہے محبت کی رمز محبت کا دکھ تم سے بہتر کوئی بھی نہیں جانتا، کسی کو محسوس ہی نہیں ہوتا اس لیے محبت کی رمز اور محبت کا دکھ تم سے کہنے آیا ہوں، تاکہ تم سنو اور مجھے علاج بتاؤ، حل نکالو میرے درد کا، میری بے بسی کا اور میری اس مفلوج محبت کا جو تمہارے ساتھ پچھلے تھہ ماہ سے اس بستر پہ پڑی ہے اور کوما کا شکار ہے۔“
نبیل کی آواز بے حد گہرے ہو رہی تھی اور گہرے ہنسنے لگا تھا اس نے اپنے دونوں ہاتھ بیڈ کی پائنتی والے اسٹینڈ پہ جما دیے تھے جیسے وہ بے بسی کی انتہا پہ کھڑا ہو۔

”زری پلیز! اور کچھ نہیں تو مجھے صرف اتنا ہی بتا دو کہ اگر کسی کی محبت کو میں چلی جائے تو اسے کیا کرنا چاہیے؟“
اس کا ہر سوال ہی جان لیوا تھا اور زری اس کے ہر سوال کے ساتھ مر رہی تھی۔
”بولو زری! بتاؤ مجھے کسی کی محبت کو میں چلی جائے تو اسے کیا کرنا چاہیے۔ اس انسان کو مر جانا چاہیے؟ پھل جانا چاہیے؟ یا پتھر کا ہو جانا چاہیے؟“

نبیل نے زری کے چہرے کی سمت دیکھا جو بظاہر تو بہت پرسکون تھا مگر اندر کہیں طوفان اٹھ رہے تھے اور اندر کے اس طوفان کو باہر تک آنے میں ابھی کچھ وقت درکار تھا۔ مگر نبیل کو اس وقت کا انتظار نہیں تھا۔ کیونکہ وہ وقت اور انتظار کے اس جملے سے نکل آیا تھا اور اپنے آس پاس کی ہر چیز کو جھٹک رہا تھا جھٹل رہا تھا۔

”ہونہ! مجھے پتا ہے کہ تمہارا جواب کیا ہو گا؟ یہی تاکہ انسان کو پتھر کا ہو جانا چاہیے؟ بالکل ایسے جیسے تم ہو گئی ہو جیسے دل اور ہو گیا ہے ویسے ہی بالکل ویسے ہی مجھے بھی ہو جانا چاہیے کیونکہ ہم تینوں کا آپس میں رشتہ ہی کچھ ایسا ہے کہ ہم تینوں ایک دوسرے سے محبت کریں اور پتھر کے ہو جائیں۔ تو پھر تم خود سوچو زری کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم دونوں محبت کر کے پتھر کے ہو جاؤ اور نبیل حیات محبت کر کے بھی موم کا ہی رہ جائے؟“

ہونہ! نہیں ہرگز نہیں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا دو پتھر لوگوں میں ایک موم کا انسان نہیں رہ سکتا اگر رہتا ہے تو اسے بھی ان کے بیچ پتھر بن کے رہنا ہو گا اور میں آج یہاں یہی بتانے کے لیے آیا ہوں کہ میں بھی آج سے تم لوگوں کی طرح پتھری ہوں اور پتھری کھلاؤں گا۔ مگر اس پتھر ہونے سے پہلے اک اعتراف کرنا تھا اک حسرت پوری کرنی تھی۔

سو اس کے لیے تمہاری خدمت میں حاضر ہونا ضروری تھا۔ اور وہ ہو گیا ہوں۔“ نیل نے کہتے ہوئے سر جھکا لیا تھا اور ذرا توقف کے لیے ٹھہرا تھا۔

”زری! اعتراف یہ ہے کہ نیل حیات کے دل و جان کو ہی نہیں روئیں روئیں کو بھی محبت ہے تم سے اور حسرت یہ ہے کہ میں اپنا حال کہوں اور تم سامنے بیٹھ کے سنو۔ اور یہ حسرت اور یہ اعتراف تب سے اس دل میں لیے پھر رہا ہوں جب تم نے پہلی بار انگلینڈ کی سرزمین پہ قدم رکھا تھا، لیکن اس وقت میں یہی سمجھا تھا کہ تم نے انگلینڈ کی سرزمین پہ قدم نہیں رکھا بلکہ میرے دل پہ قدم رکھا ہے، جہاں تمہارے آنے سے بہار آئی تھی۔ جہاں تمہارے قدم رکھنے سے ہی محبت کا پودا اگ آیا تھا مگر میں نے اس پودے کو ہمیشہ خاموشی سے پالا پوسا اور پروان چڑھایا، سوچا۔۔۔ عبد اللہ نے تمہیں اسٹڈی کے لیے یہاں بلوایا ہے اب اگر میں اظہار کرتا اپنی محبت ظاہر کرتا یا پھر اپنی مام کے ذریعے پر پول دیتا تو یقیناً ”عبد اللہ تم سے بدظن ہو جاتا کہ اس کے یہاں آتے ہی یہ سب بھی شروع ہو گیا ہے؟ اسی لیے“ اسی لیے تمہاری خاطر میں نے اپنے دل کو گونگا، سرور اور اندھا بنا دیا۔ کبھی کبھ بولانہ کبھی کبھ سنا اور نہ ہی کبھی کبھ دیکھا۔

بس اس پودے کو پالنے میں لگا رہا جو صرف تمہارے ایک قدم کی مرہون منت میرے دل کی سرزمین پہ لگا تھا۔ اور اس دھن میں مجھے یہ بھی پتا نہ چلا کہ تمہارے دل کی سرزمین پہ کس کی محبت کے پھول کھل چکے ہیں؟ اگر اس بات کا علم ہو جاتا تو میں اپنے دل سے اس پودے کو بہت پہلے ہی جڑ سے اکھاڑ پھینکتا۔ مگر افسوس کہ پتا اس وقت چلا ہے جب اس پودے کی جڑیں میری نس نس میں پھیل گئیں اور اس کا درد میری رگ رگ میں بہہ رہا ہے۔

میں شکار ہو چکا ہوں، میں چیخ رہا ہوں، چلا رہا ہوں، تڑپ رہا ہوں، بھلا رہا ہوں، مگر سنبھل نہیں رہا، بچ نہیں رہا، مر رہا ہوں، ہر گھڑی ہر لمحہ۔ مگر چاہتا ہوں کہ مرنے سے پہلے اور پھر ہونے سے پہلے تمہاری محبت سے اور اس پودے کی جڑوں سے آزاد ہو جاؤں اور میں یہاں آزاد ہونے کے لیے ہی آیا ہوں اور یہ بتانے کے لیے آیا ہوں کہ آج سے نیل حیات بھی پھر اور اس کے جذبات بھی پھر۔

اب کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں وہی نیل حیات ہوں، اب اچھا سا موم کا پتلا۔ اب میں چلتا پھرتا پھر کا انسان ہوں اور پتھروں پہ کچھ اثر نہیں کرتا۔ چاہے ہجر ہو، چاہے وصال ہو، چاہے زری ہو، چاہے مومنہ بی بی۔“ وہ کہتے کہتے ایک بار پھر ٹھہرا تھا۔

”مومنہ بی بی؟“ زری کا دل دوتے دوتے چونکا۔

”مومنہ بی بی؟ کیا مومنہ بی بی؟ نیل آپ چپ کیوں ہو گئے ہیں؟ بتائیے نا، مومنہ بی بی کا ذکر کیوں کیا؟“ زری کی خاموشی کر لائی تھی۔

”ہاں! مومنہ بی بی۔“ نیل نے یوں اثبات میں سر ہلایا تھا جیسے زری کی خاموشی کی زبان بھی با آسانی سمجھ رہا ہو۔

”زری! میں نے سوچا ہے کہ جب ہم لوگ ایک دوسرے کے نہیں ہو سکتے تو پھر کیوں نہ ہم لوگ ان کے ہو جائیں جن کو ہماری ضرورت ہے جن کی زندگی ہمارے نام سے ہی سہل ہو جائے گی۔ جن کو سارا مل جائے گا۔ جو سنور جائیں گے۔“

”نیل بلیکیز! آگے بولیں۔“ زری کا دل چیخا۔

”سو اسی لیے آج میں نے مومنہ بی بی سے شادی کا فیصلہ کر لیا ہے میں اسے اپنا نام دے رہا ہوں اپنے گھر میں جگہ دے رہا ہوں، مقام دے رہا ہوں، بالکل ایسے ہی جیسے دل اور سنے علیوزے بھائی کو دیا ہے۔“

نیل نے اچانک اور بے ساختہ ہی وہ بات کہہ دی تھی جو بے جان پڑی زری کو بھی ہلا کے رکھ گئی تھی۔

”ہاں زری۔۔۔ یہ سچ ہے اور یہی حقیقت ہے وہ کیسا نہ کہ وہ مانے یا نہ مانے لیکن وہ بے وفا نہیں ہے میں کہتا ہوں میرا دل کہتا ہے، دل اور بے وفا نہیں ہے نہیں ہے وہ بے وفا اس نے وہی کیا ہے جو آج میں کرنے کے لیے آیا ہوں پھر ہو گیا ہے وہ۔۔۔ مرچکا ہے وہ لاش تھپٹ رہا ہے اپنی۔۔۔ جیسے اب میں تھپٹوں گا جیسے تم تھپٹو گی جیسے عبد اللہ تھپٹ رہا ہے، ہم سب اپنی اپنی لاشیں تھپٹ رہے ہیں زری اور یہی ہمارا مقدر تھا اور اب اس مقدر کے ساتھ ہم نے جینا بھی ہے اور زندگی بھی گزارنی ہے۔“

نیل کا لہجہ بھینکنے لگا تھا اور زری کی ہستی نس نس ہو گئی تھی۔

”زری! اگر میری ماں تو وہاں آجائے۔۔۔ واپس ہوش کی دنیا میں لوٹ آئے۔۔۔ یہاں ہوش و حواس میں رہ کر بھی جیا جاسکتا ہے۔ یہاں پتھر بن کے بھی جیا جاسکتا ہے یہاں کسی اور کا ہو کر بھی جیا جاسکتا ہے ضروری نہیں ہے کہ محبت نہ ملے تو بستر سے لگ جاؤ۔

بلکہ ضروری تو یہ ہے کہ تم پھر سے اٹھو، پھر سے حوصلہ کرو، اور پھر سے محبت نبھاؤ۔ کیونکہ محبت میں ہمت ہارنا بہت آسان ہوتا ہے مگر محبت میں حوصلہ رکھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ جیسے میں نے رکھا ہے جیسے دل اور سنے نے رکھا ہے ویسے ہی تم بھی رکھو۔

آخر تمہاری محبت کی شدت تو ہماری محبت سے بھی زیادہ ہے، تمہیں تو اور زیادہ حوصلہ رکھنا چاہیے ہم سے بھی زیادہ۔“ نیل آج جو کچھ من میں تھا وہ سب کہتا جا رہا تھا۔

”مجھے دیکھو میں بھی تو ہوں یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہارے دل پہ دل اور سنے کی دسترس ہے پھر بھی تم سے محبت کرنا کم نہیں کر سکتا۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ میں اب کسی اور کا ہونے جا رہا ہوں، مگر پھر بھی تم سے دل کا تعلق نہیں توڑ سکتا اور یہ بھی جانتا ہوں کہ ہم کبھی مل نہیں سکتے پھر بھی جینے کے لیے تیار ہوں، مرنے سے سنا شاید اس لیے کہ جیوں گا تو تم سے محبت کرتا رہوں گا، مر گیا تو تم آنکھ سے او بھل ہو جاؤ گی پھر کیسے دیکھوں گا؟ کیسے چاہوں گا؟ اور کس سے محبت کروں گا؟“

وہ بے ساختہ کہتے ہوئے پھر گیا تھا اور زری کی سانسوں میں اک پچھلی سی ہوائی تھی۔

”خیر! میں جو بھی کروں یہ میرا مسئلہ ہے اور تم جو بھی کرو یہ تمہارا مسئلہ ہے، ہم ایک دوسرے کو سمجھانے کا اور کسی چیز سے روکنے کا کوئی حق یا کوئی اختیار نہیں رکھتے۔۔۔ سب کی اپنی اپنی زندگی ہے اور سب کا اپنا اپنا اختیار ہے، میرے بس میں جو ہے میں وہ کرتے جا رہا ہوں، تمہارے بس میں جو ہو گا تمہو کر لیتا۔

بس میں آج سے آزاد ہوا۔ میرے دل سے بوجھ اتر گیا کہ میں تمہارے در تک نہیں پہنچا۔ لیکن دیکھو آج پہنچا بھی ہوں، اظہار بھی کر دیا، اعتراف بھی کر لیا اور یہ بھی مان لیا کہ زندگی تمہارے بغیر کچھ بھی نہیں مگر پھر بھی زندگی بسر تو کرنی ہی ہے اور وہ چاہے مومنہ بی بی کے ساتھ ہو جائے، چاہے کسی اور نسوانی وجود کے ساتھ۔۔۔ انسان کی محبت کا پیکر ہی اس کے پہلو میں سجا ہو یہ ضروری تو نہیں؟“ نیل نے کہتے ہوئے غنی سے سر جھکا تھا اور اپنے دونوں ہاتھ اس کے بیڈ کی پانکٹی سے ہٹا لیے تھے اور واپسی کے لیے ارادہ باندھ لیا تھا۔

مگر اس کے قدم واپسی کا سوچ کر ہی لرز رہے تھے اور دل سینے کی قید میں بے قراری سے تڑپا تھا۔

”آئی لو پوزری! آئی لو پوزیج۔“ نیل کے ہونٹوں پہ یہ اک جملہ مچلا اور آنکھوں میں آنسو اٹھ آئے تھے مگر پھر وہاں ٹھہرا نہیں تھا اور اک جھٹکے سے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا تھا۔

”نیل۔۔۔! زری کا من اس کے پیچھے بلند آواز سے چیخا تھا کیونکہ وہ نیل حیات کے درد کو بہت آسانی سے اور بہت قریب سے سمجھ سکتا تھا اور اس درد کو سمجھتے ہوئے اس کی حالت بگڑ گئی تھی اور سب کچھ کنٹرول سے باہر ہو

”سرسرا! مبارک ہو۔۔۔ بہت بہت مبارک ہو۔۔۔ میں زرین ملک ہوش میں آگئی ہیں۔“ ڈاکٹر لودھی نے آئی سی یو سے باہر نکلتے ہی سامنے کھڑے عبداللہ کو بڑی گرم جوشی سے یہ خبر سنائی تھی اور نگارش کے ساتھ ساتھ عبداللہ کی بھی بے چینی سے آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

”آپ سچ کہہ رہے ہیں؟“ عبداللہ نے ہنوز بے یقینی کا ہی مظاہرہ کیا تھا۔

”جی ہاں! میں سچ کہہ رہا ہوں اللہ تعالیٰ نے آپ کی وعائیں سن لی ہیں اللہ نے نواز دیا ہے آپ کو کرم کر دیا ہے آپ پر۔“ ڈاکٹر لودھی خود بھی بہت خوش تھے اور عبداللہ نے سب سے ساختہ آگے بڑھ کے ڈاکٹر لودھی کو گلے سے لگا لیا تھا۔

”تھنک یو ڈاکٹر۔۔۔ تھنک یو سوچ۔“ عبداللہ کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے اور لہجہ آنسوؤں کے بوجھ سے بھگینے لگا تھا۔

”اللہ یہ خوشی آپ کو مبارک کرے اور مس زرین جلدی سے صحت یاب ہو جائیں۔“ ڈاکٹر لودھی نے اس کا کندھا تھپکا تھا اور پھر کسی کام کے لیے اپنے اسٹاف کی طرف بڑھ گئے تھے۔

جبکہ عبداللہ اپنے رب کا شکر ادا کرتے ہوئے وہیں فرش پہ ہی سجدے میں جھک گیا تھا۔ اور نگارش بھی اللہ کا شکر بجالاتی تھی۔

”نگارش! یہ سب کیسے ہو گیا۔؟ مجھے۔۔۔ مجھے یقین نہیں آ رہا۔۔۔ جب ہماری ساری امیدیں ہی دم توڑ چکی تھیں تب وہ ہوش میں آگئی۔؟ آخر یہ سب ہوا کیسے؟ کون آیا تھا اس سے ملنے۔؟ وہ۔۔۔ وہ نرس بتا رہی تھی کہ کوئی آیا تھا۔؟“ عبداللہ کو اچانک ہی نرس کی بات یاد آئی تھی۔ اور نگارش عبداللہ کے اس سوال پہ ٹھنک گئی تھی کہ اسے کیا جواب دے کہ کون آیا تھا۔؟

”کیا سوچ رہی ہو نگارش۔؟ کہاں کھوئی ہو۔؟ بتاؤ نا کیا بات ہوئی ہے۔؟ کون آیا تھا بھلا۔؟“ عبداللہ نے کم سم سی نگارش کو کندھوں سے پکڑ کے متوجہ کیا تھا۔

”میل بھائی آئے تھے۔“ اس نے بے حد ہم آواز میں بتایا تھا۔

”نیل۔؟“ اب کی بار عبداللہ کو حیرت کا شعلین جھٹکا لگا تھا۔

”جی۔۔۔“ نگارش نے بمشکل ہی کہا تھا۔

”کیا کہا اس نے زری سے۔؟“ عبداللہ کا اپنا لہجہ دھیمار پڑ چکا تھا اور آواز کہیں دب چکی تھی۔

”یہ بات آپ زری سے پوچھ لیجیے گا۔“ نگارش کتر آگئی تھی اور عبداللہ کے ہاتھوں کی گرفت اس کے کندھوں پہ ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ اور وہ مرے مرے قدموں سے چلتا ہوا پلٹ کر کارڈ روم میں لگے صوفے پہ بیٹھ گیا تھا۔

اس کے دماغ میں سائیں سائیں ہو رہی تھی وہ باتیں اور وہ چیزیں جو اس نے پہلے کبھی نہیں سنی تھیں اب وہی باتیں اور وہی چیزیں سمجھ کے ہزاروں حصے میں ہی سمجھ آ جاتی تھیں۔ شاید اس لیے کہ اب احساسات حالات کی چوٹ اور ضرر میں کھٹا کر حد سے زیادہ حساس اور نرم ہو گئے تھے۔ نیل یہاں کیوں آیا تھا۔؟ کس وجہ سے آیا تھا۔؟ کیا کہا تھا۔؟ کیوں کہا تھا۔؟ وہ یہ سب نہیں جانتا تھا مگر نیل کے جانے کے بعد زری کی منجمد حالت کسی منہ زور طوفان کی طرح بگڑ گئی تھی اور اس کی طبیعت کا بگڑنا سب کچھ واضح کر گیا تھا۔ اب مزید سوال و جواب کرنے کی یا پھر کچھ جاننے کی تو ضرورت ہی نہیں رہی تھی اسی لیے تو اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر جھکا لیا تھا۔



دل سے دور دراز
دل سے دور دراز ہے
دنیا دور دراز
اشک لبو میں کھل مل جائیں
سینہ سہک سہک سہک سہک
آنسو بے آواز

دور دور تک روح میں گو نجس خاموشی کے ساز
نہ جانے کس نقطہ پہ جا کے کھلے غموں کا راز
ابھی تو ہے آوازنی امڑی ابھی تو ہے آغاز
دنیا دور نہ جانے امڑی دل سے دور دراز

آج نجانے کیا وجہ تھی کہ اس کا دل اداس تھا۔ اور اس اداسی کی وجہ سے طبیعت میں خاصی سستی کھلی ہوئی تھی وہ بے وجہ ہی ڈرائنگ روم میں دائیں سے بائیں گھومتے ہوئے چکر کاٹ رہا تھا۔ اور علیزے بچن سمیٹ کر باہر نکلی ہی تھی کہ ڈرائنگ روم میں مضطرب سے گھومتے دل آور کو دیکھ کر اس کے قدم رک گئے تھے اور عین اسی وقت دل آور کی بھی اس پہ نظر پڑی تھی اور وہ ٹھہر گیا تھا۔

”دہاں کیوں کھڑی ہو۔۔۔؟ اوہر آجائے۔“ اس نے علیزے کو ڈرائنگ روم میں آنے کا اشارہ کیا تھا۔ اور علیزے بھی نجانے کس موڑ میں تھی کہ اس کے ایک اشارے پہ ہی چلتی ہوئی اندر آگئی تھی۔

”بیٹھو! اس نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

وہ چپ چاپ صوفے پہ بیٹھ گئی تھی اور اس کے بیٹھنے کے بعد ذرا توقف سے وہ خود بھی اس کے برابر اور اس کے بے حد قریب ہی بیٹھ گیا تھا اور اپنا سر جھکا لیا تھا جس پہ علیزے نے سر اٹھا کر اپنے دائیں طرف بیٹھے دل آور کو دیکھا تھا وہ سفید شلوار سوٹ میں ملبوس ڈارک براؤن چادر کندھوں پہ پھیلائے سر جھکا ئے بیٹھا عجیب سی کیفیت کا شکار نظر آ رہا تھا۔ ایسی اور یا سیت اس کے انداز سے ہی ظاہر ہو رہی تھی۔ اور علیزے نے لا شعوری طور پہ ہی یہ جاننے کی منتظر ہو گئی تھی کہ آخر اسے ہوا کیا ہے۔؟ وہ کیوں اتنا اداس اور مضطرب لگ رہا ہے۔؟ مگر اسے یہ بھی پتا تھا کہ وہ اسے بنا پوچھے ہی سب کچھ بتا دے گا۔

اپنی اداسی اور اپنا اضطراب سب کچھ کھول کے سامنے رکھ دے گا سوائے زری اور بتول شاہ سے جڑے ماضی کے اور علیزے تھی کہ کبھی چاہ کر بھی اس سے اس کے ماضی کے متعلق نہیں پوچھ سکی تھی۔ ہمیشہ سوال ہونٹوں پہ آ کے دم توڑ دیتے تھے حالانکہ اس کا دل بہت چاہتا تھا کہ وہ زری کے متعلق پوچھے اور بتول شاہ کے متعلق سوال کرے اس کے ماضی کو جانے مگر اس نے کبھی اتنی جرات نہیں کی تھی کہ اپنی زبان پہ چلتے سوال اس کے سامنے رکھ دیتی۔ دل آور نے ہمیشہ جو بھی اس سے کہا تھا جو بھی شیر کیا تھا خود اپنی مرضی اور اپنی رضا سے کیا تھا علیزے نے کبھی کریدنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اور اس وقت بھی ان کے درمیان یہی پتھویشن چل رہی تھی علیزے چپ کھٹی مگر کچھ سنتا چاہتی تھی اور دل آور بھی خاموش تھا مگر کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اور اسی کہنے اور سننے کے چکر میں کئی بل بوتہ پر سرک گئے تھے اور بالآخر دل آور کی طرف سے ہی آغاز ہوا تھا۔

”علیزے۔۔۔ انسان جب اداس ہوتا ہے تو اس کے احساسات اور جذبات اتنے نرم کیوں ہو جاتے ہیں۔؟ کیوں انسان پگھلے ہوئے موم کی طرح ہو جاتا ہے۔؟ کیوں اسے کسی اپنے کے سہارے کی ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے۔؟ کیوں دل چاہتا ہے کہ کوئی سینے کو سہلائے اور دل پہ ہاتھ رکھے؟ کیوں نرم لمس کی طلب ستانے

قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

قرآن مجید کی ہر آیت اور مادہ صحت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے غرضی سے محفوظ رکھیں۔

”علیزے۔۔۔! دل آورنے اسے پیچھے سے آواز دی تھی لیکن وہ پھر بھی رکی نہیں بلکہ ڈرائنگ روم سے نکل کر سیڑھیاں چڑھ گئی تھی اور اس کا رخ بیڈ روم کی طرف نہیں اور پرجھٹ کی طرف تھا کیونکہ اسے پتا تھا کہ وہ اس کے پیچھے بیڈ روم میں ضرور آئے گا اس لیے وہ اوپر پرجھٹ پہ آگئی تھی۔ اور دل آور چند ثانیے کے لیے یونہی جوں کا توں بیٹھا رہ گیا تھا۔“

پھر اچانک نجانے سن میں کیا سہالی تھی کہ ایک جھٹکے سے وہ خود بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا اور اس کے پیچھے ہی باہر نکل آیا تھا لیکن اس کا رخ اپنے بیڈ روم کی طرف تھا جہاں آکر اس نے اپنے برف کیس سے اپنا ریو الور نکالا اور اس میں سے گولیاں چیک کرتے ہوئے بیڈ روم سے نکل کر اوپر پرجھٹ کی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا تھا۔

”علیزے۔۔۔! اس نے پرجھٹ پہ پہلا قدم رکھتے ہی علیزے کو پکارا تھا اور ریٹنگ بے دونوں ہاتھ جمائے گھر کی بیک سائیڈ کی طرف دیکھتی علیزے نے اس کی آواز پہ ایک گہری سانس کھینچی تھی مگر پلٹ کر اسے دیکھا نہیں تھا۔“

”علیزے۔۔۔! بات سنو میری۔۔۔“ دل آور نے قریب آکر اسے بازو سے پکڑ کر جھٹکے سے اپنی سمت موڑا تھا۔ ”تمہارا دل چاہتا ہے نا کہ تم مجھے جان سے مار دو۔۔۔؟ یہ لوجہ یہ پکڑو۔ اور مار دو مجھے۔“ اس نے علیزے کے ہاتھ پکڑ کر ریو الور اس کے ہاتھ پہ رکھ دیا تھا اور علیزے نے تلکچے سے اندھیرے میں بھی اپنے ہاتھ پہ رکھے ریو الور کو دیکھ کر کانپ گئی تھی۔

”علیزے۔۔۔! دیکھ کیا رہی ہو۔؟ اپنا شوق پورا کرو اور مجھے زندگی کے عذاب سے آزاد کرو اور۔۔۔ اور۔۔۔ خود بھی آزاد ہو جاؤ۔“ دل آور نے اسے کندھوں سے تھام کے جھنجھوڑا تھا۔

”علیزے۔۔۔! سوچو مت، میرا ریو الور لوڈ ہے، خالی کر دو اسے، میرا سینہ حاضر ہے۔“ اس نے اسے ہر طرح

لگتی ہے۔؟ اور کیوں انسان پھر بھی اکیلے کا اکیلا ہی رہتا ہے۔؟“ اس نے ذرا سی گردن موڑتے ہوئے علیزے کی طرف دیکھا تھا۔ ”کیونکہ اواسی میں انسان کی ذات پہ تجھے سارے خول اتر جاتے ہیں۔“ علیزے نے انتہائی سنجیدگی سے جواب دیا تھا اور دل آور اس کے جواب پہ دیکھا رہ گیا تھا اس کی بات واقعی سو فیصد درست تھی۔ ”کبھی تمہارے ساتھ ایسا ہوا۔؟“ اس نے مزید سوال کیا۔

”میرے ساتھ تو ہمیشہ ہی ایسا ہوتا ہے، میں تو جو میں گھنٹوں میں بیٹھ گھنٹے اواسی ہی رہتی ہوں اس لیے میری ذات پہ خول بھی ذرا کم ہی رہتا ہے۔“ وہ ذرا سختی سے مسکرائی تھی اور ایک بار پھر دل آور پہ نظر ڈالی تھی۔ ”آہستہ تمہاری بات الگ ہے تمہاری ذات پہ بیٹھ گھنٹے خول ہی چڑھا رہا ہے، صرف چار گھنٹے ایسے ہوتے ہیں۔ جن میں واقعی تم صرف تم ہی نظر آتے ہو اور ان چار گھنٹوں میں تم اگر مجھے بلاؤ بھی تو میں چپ چاپ آکر تمہارے برابر صوفے پہ بیٹھ جاتی ہوں کیونکہ مجھے پتا ہوتا ہے کہ اواسی کے ان چار گھنٹوں میں تمہاری ذات پہ کوئی خول نہیں ہوگا اور تم اپنا کسے نہیں بلکہ پسائی کے گھیرے میں ہو گے اور پسپا ہوئے شخص کی آنکھوں میں ایسا اثر ہوتا ہے کہ مقابل گھٹا کل ہو جاتا ہے، کسی بات سے انکار نہیں کرتا فوراً مان جاتا ہے۔ جیسے اکثر میں مان جاتی ہوں۔ یعنی تمہارے دیکھنے سے ہی گھٹا کل ہو جاتی ہوں۔“ علیزے کی باتیں اب گہرائی لیے ہوئے ہوتی تھیں اور دل آور سوچتا رہ جاتا تھا کہ یہ سب علیزے کہہ رہی ہے؟ وہ علیزے جسے بات کرتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا وہ علیزے جو ہمہ وقت خوف کے حصار میں رہتی تھی وہ علیزے جسے بات کرنا ہی نہیں آتی تھی۔ جو معصومیت اور نا کجی کا پیکر تھی۔

”تم اواسی ہوتی ہو تو کیا دل چاہتا ہے تمہارا۔؟ کیا کرنے کی خواہش ہوتی ہے؟“ دل آور ابھی بھی گردن ترچھی کیے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

”دل چاہتا ہے تمہیں جان سے مار دوں۔“ علیزے نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”اس کے علاوہ۔۔۔؟“ وہ بڑے سکون سے پوچھ رہا تھا۔

”پنے پایا سے ملنے کو دل چاہتا ہے، دل چاہتا ہے ان کے سینے سے لگ کے بہت زیادہ روؤں۔“ وہ بھی جو اس کے دل میں تھا سب صاف صاف بتا رہی تھی۔

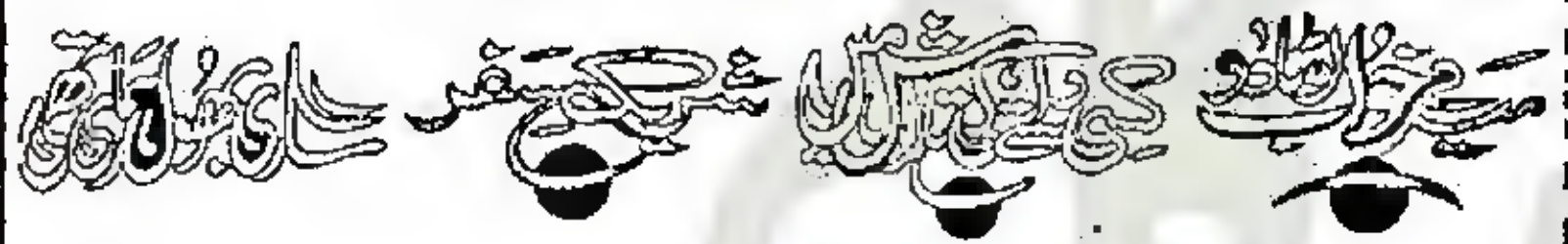
”ہو نہ۔۔۔! یہ تو اسی وقت ہو سکتا ہے نا جب تم مجھے جان سے مار دو۔۔۔؟“

”سی لیے چاہتی ہوں نا کہ تمہیں جان سے مار دوں، تمہیں مار دوں گی تو ان سے ملوں گی نا؟“

”تو پھر مار کیوں نہیں دیتیں۔؟“ دل آور نے بے چینی سے کہا تھا۔ مگر علیزے جواباً ”چپ رہی تھی وہ بہت کچھ کہہ دیتی مگر کہنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔“

”بولو نا علیزے۔۔۔! تو پھر مار کیوں نہیں دیتیں۔؟“ دل آور نے پاس بیٹھی علیزے کا ہاتھ پکڑنا چاہا تھا مگر وہ اک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے 4 خوبصورت ناول



راحت جبین	زکیرہ مختار	بیوہ شکیلہ علی	نیکیت عابدی
قبت - 300/- روپے	قبت - 550/- روپے	قبت - 350/- روپے	قبت - 400/- روپے

منشہ انے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار، کراچی
فون نمبر: 32735021

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ تمام پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کے پیشکش کیلئے ہیں

مجموعہ خاص کیوں ہیں۔

- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو
- ✧ ہر ای بک کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور ایڈجسٹمنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سلیشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی متن مختلف سائٹوں میں ایڈوڈنگ
- ✧ ہر ای بک کی کوالٹی اور ڈیٹا کی کچھل ڈیٹا
- ✧ عمران سیریز اور مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
- ✧ ایڈ فوری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

ماہانہ ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ڈاؤن لوڈ کی جاسکتی ہے

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے نہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہر ای بک سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

سے اکسانے کی کوشش کی تھی۔ مگر علیز سے اسے تھپڑا کوئی مکاتیب نہیں مار سکتی تھی مگر تو بہت دور کی بات تھی۔

”ہو نہ ہو! ضروری نہیں ہے کہ ہم جو چاہتے ہیں وہ کر بھی لیں چاہت جیسی بھی ہو کب پوری ہوتی ہے بھلا؟“ اس نے استہزاء سے انداز میں کہہ کر سر جھٹکا تھا۔

”مگر میں چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے وار کرو۔“ دل آور نے عجیب جنون خیزی سے کہتے ہوئے اس کے ہاتھ میں پکڑے ریوالتور کی نال اپنے سینے پر رکھ لی تھی۔

”مگر میں اپنے ہاتھ تمہارے خون سے نہیں رنگنا چاہتی تمہارا قتل میرے سر ہو گا۔“

”میں اپنا قتل تمہیں معاف کرتا ہوں“ تم مجھے جبری رضا سے مار دو۔“ وہ تو جیسے ابھی کھڑے کھڑے اس کے ہاتھوں مر جانے کے لیے تیار تھا۔

”میں تمہیں اپنی دعا سے مارنا چاہتی ہوں میں دعا کرتی ہوں کہ تم مر جاؤ۔“ علیز نے انتہائی سفاکی کا مظاہرہ کیا تھا۔

”ہو نہ ہو! علیز! کیوں نہیں کہتی کہ مجھے مارنے کے لیے تم میں حوصلہ نہیں ہے ہمت نہیں ہے تم میں۔ تمہیں بھی اس پنجرے اور صبا سے محبت ہو گئی ہے اب اڑنا تم بھی چاہو تو اڑ نہیں سکتی۔؟“ دل آور نے اسے دونوں کندھوں سے تمام کے اس کے سامنے اس کے اندر کی کیفیت بیان کی تھی مگر علیز نے اس کی بات پہ نظریں چرا گئی تھی۔

”میری مجبوری اور میری بے بسی کو میری محبت مت سمجھو ذرا نیو۔! مجھے اس پنجرے سے محبت ہو سکتی ہے لیکن اس صبا سے نہیں۔“ اس نے زہر خند سے لہجے میں کہتے ہوئے نفی میں سر ہلایا تھا اور دل آور نے اس کے انکار پہ اسے اپنے قریب کر لیا تھا۔

”نہیں بھی نہیں چاہتا کہ تم مجھ سے محبت کرو۔“ اس نے بے حد دل جھل سے انداز میں کہتے ہوئے علیز کے اپنے دونوں بازوؤں کے گھیرے میں لے لیا تھا۔ اور علیز نے اس کے حصار پہ لرز اٹھی تھی۔ اس کا ایسا لمس علیز کے لیے بالکل نیا تھا۔

”مگر میں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ تم میرے قریب ہو میرے اتنے قریب کہ تمہارے دل کی دھڑکن میرے دل کی دھڑکن لگنے لگے۔“ وہ اسے رفتہ رفتہ اپنے بازوؤں میں سمیٹ رہا تھا اور اس کے بازوؤں میں لپٹ کر علیز نے بالکل ہی چھپ گئی تھی دل آور کے کندھوں اور بازوؤں پہ پھیلی چادر علیز کے کو بھی ڈھانپ چکی تھی۔

”میں تمہیں محسوس کرنا چاہتا ہوں میرے آس پاس رہا کرو۔“ دل آور کی آواز بھیجتے لگی تھی اور علیز نے اسے پیچھے ہٹانے کی ایک بھرپور سعی کی تھی۔

”پلیز علیز! بس کچھ دیر۔“ وہ جیسے التجا کر رہا تھا جو کسی احساس میں ڈوب رہا تھا وہ پکھل رہا تھا۔ مگر ابھی دو چار منٹ ہی گزرے تھے کہ گھر کے گیٹ پہ نیل کی گاڑی کا ہارن بجا تھا۔ اور دل آور کے ہنکے ہنکے اور بے بس سے اعصاب پھر سے ٹھکانے پہ آگئے تھے وہ چونک گیا تھا۔

”نیل! اس وقت؟“ وہ بے ساختہ علیز سے الگ ہوا تھا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

✧ ✧

نبیلہ عزیز



بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیز سے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدھیہ اور نبیلہ حیات دو ہی بہن بھائی ہیں، مدھیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے، وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل غور پر رنگ چکی ہے، جس کے پیش نظر فائرہ بیگم، نبیلہ کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں، لیکن مدھیہ پاکستان جانے سے باز کار کر دیتی ہے، جس پر نبیلہ اور فائرہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے، مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر دبا کر رہا ہے۔

نبیلہ کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے، مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، بے بسی اور غمورپی سے تنگ آخر خود کشی کرنے کا سوچتا ہے، لیکن ایسے میں ایک روز اسے دھماکے میں چائے پیتے ہوئے باؤ اقیانوس مل جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے، جس پر نبیلہ کافی خوش ہوتا ہے، اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے، وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے، وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آذر شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے، وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے، اس نے سنی ہارٹ نہیں سیکھا، اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پر بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔

۳۷
سینٹیویں قریب

اور علیز سے بھی یکدم چونک گئی تھی۔
”نبیل بھائی؟“ اسے بھی کافی حیرت ہوئی تھی۔

”ہوں۔ وہی ہے۔ تم نیچے بیڈروم میں چلو“ میں اسے دیکھتا ہوں۔“ دل اور اسے کہتے ہوئے بڑے بر سوچ اور پریشان سے انداز میں سیڑھیوں کی طرف بڑھتا تھا۔ مگر نہ جانے کس خیال کے تحت وہ جاتے جاتے پھر رگ گیا اور پلٹ کر دوبارہ علیز سے کی سمت دیکھا۔ وہ وہیں کھڑی تھی جہاں دل اور نے اسے خود سے الگ کیا تھا۔ اس لیے وہ دوبارہ پلٹا اور اس کے قریب آگیا اور علیز سے کہنے لگا اس کا خوب صورت اور دلکش چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

”میرے اندر کی اداسی اور میری ذات کی تنہائی کو میرے نفس کی کمزوری مت سمجھنا۔ میں نفس کے ہاتھوں کمزور اور مجبور ہونے والا انسان نہیں ہوں۔ میں نے تمہیں کبھی حاصل کیا بھی تو تمہاری مرضی تمہاری رضا اور تمہاری اجازت سے کروں گا۔ تمہاری اجازت کے بغیر کبھی کچھ بھی نہیں ہوگا۔ تم بے فکر رہو کتابے لگام بھی نہیں ہوں۔ اپنے نفس کو لگام ڈالنا اور اسے کھینچ کے رکھنا مجھے اچھی طرح آتا ہے۔ اس لیے جو بھی کروں گا تمہاری چاہ سے اور رضا سے کروں گا۔ فی الحال ریلیکس رہو یو ڈونٹ وری اوکے“ وہ بڑے گل اور بڑے ٹھہراؤ سے اسے ایک بھر پور تسلی سے نواز کر اس کے دونوں رخساروں کو اپنے ہاتھوں سے تھپکتا ہوا پلٹ گیا۔ لیکن چند قدموں کے فاصلے پہ جا کے پھر ٹھہر گیا اور ایک بار پھر علیز سے کی طرف پلٹا اور اس کے انتہائی قریب آکر۔

”اور ہاں۔۔۔ اپنے ذہن میں یہ بات یہ سوچ کبھی مت لانا کہ میں شاید کسی اور کے تصور یا کسی اور کی طلب میں تمہارے قریب آتا ہوں۔ بلکہ یہ سوچنا کہ میں تمہیں اپنی ذات کا حصہ سمجھ کر تمہارے قریب آتا ہوں۔ کیونکہ کسی بھی انسان کی ذات کے بنے ہوئے حصے اچھے نہیں ہوتے اس طرح انسان بکھر کے رہ جاتا ہے۔ اسی لیے میں بھی یہ حصے سمیٹنا چاہتا ہوں، یکجا ہونا چاہتا ہوں۔ اس طرح بکھرا ہوا نہیں رہنا چاہتا اور سمیٹنے کے لیے ضروری ہے کہ میں تمہارے قریب آوں۔ میاں بیوی کی قربت ایک دوسرے کے لیے کالے جادو کی طرح ہوتی ہے۔ جتنا عمل تسلسل سے ہوگا اتنا ہی اثر شدید ہوگا۔ لہذا میاں بیوی کا ایک دوسرے کی قربت میں رہنا ہی بہتر ہوتا ہے۔“

اس وقت ان دونوں کے درمیان یہ لمحہ بہت ہی نازک لمحہ تھا۔ اس لیے دل اور نہیں چاہتا تھا کہ اس لمحے اس ازک سی لڑکی کے نازک سے جذبات کو کوئی ٹھیس پہنچتی یا اس کی سوچ کسی غلط سمت میں جاتی۔ اسی لیے وہ اتنی پریشانی اور غلٹ بھرے احساس کے باوجود جاتے جاتے بھی بار بار ٹھہر رہا تھا۔

”تو پھر تم اداس کیوں تھے؟“ علیز سے کا سوال بہت زیادہ معصومیت لیے ہوئے تھا۔
”اپنی تنہائی کی وجہ سے“ اپنے اکیلے پن کی وجہ سے اپنی بالکل خالی اور سیاہ زندگی کی وجہ سے مگر جب تمہیں نظر پڑی تو خیال آیا کہ میں تنہا نہیں ہوں۔ میں اکیلا نہیں ہوں اور میری زندگی بالکل خالی نہیں ہے کیونکہ اس میں تم میرے ساتھ ہو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔

اسی لیے دل چاہا کہ تمہارے وجود میں اپنے آپ کو تلاش کروں۔

تمہیں دل کی گہرائیوں سے چھو کر اور سینے میں چھپا کر محسوس کروں۔

کہ تمہارے دل میں میں بھی دھڑکتا ہوں یا نہیں۔

مگر ابھی دل کی دھڑکن دھڑکننا شروع ہی ہوئی تھی کہ ایک دوسرے سے الگ ہونا پڑ گیا۔ دل اور کو جیسے افسوس ہوا تھا۔ مگر علیز سے اسے ہنوز یک ٹک کھڑی دیکھ رہی تھی۔

”کیا دیکھ رہی ہو؟“ اس نے غلٹ میں بھی سوال کر ڈالا تھا اور علیز سے چہرے پر استہزاء سے لہر لگ رہی تھی۔

”ہاؤ نا؟“
”ہو نہ۔ بس یہ دیکھ رہی ہوں کہ اس وقت واقعی تمہاری ذات پہ کوئی خول نہیں ہے یا میر غلط فہمی ہے؟“

علیز نے اسے اس طعنے سے اندھیرے میں بھی بغور دیکھ رہی تھی۔
”یہ تمہاری غلط فہمی نہیں ہے بلکہ یہ وہی چار گھنٹے ہیں جن میں کسی بھی انسان کی ذات پہ کوئی خول نہیں ہوتا اور اس وقت میری ذات پہ بھی کوئی خول نہیں ہے۔“ دل اور نے واقعی اسے سچ بتایا تھا اور علیز نے اس سے کچھ چپ ہو گئی تھی۔ لیکن اس سے پہلے کہ دل اور کچھ اور کہتا اتنے میں گل سیڑھیاں چڑھ کے اوپر آگئی۔
”صاحب۔۔۔ وہ نبیل صاحب اور مومنہ بی بی آپ سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔“ گل نے آکر اطلاع دی تھی اور نبیل کے ساتھ ساتھ مومنہ بی بی کا سن کر دل اور تشویش سے ٹھٹھکا تھا۔

”مومنہ بی بی بھی ساتھ آئی ہیں؟“ وہ خود کلامی کے سے انداز میں کہتا ہوا پھر علیز سے کی طرف متوجہ ہوا۔
”ٹھیک ہے، تم نیچے چلو“ میں بھی جا رہا ہوں۔ گل تم علیز سے بی بی کے ساتھ آجاؤ۔“ وہ گل کو اشارہ کرتے ہوئے سیڑھیاں اتر کے نیچے چلا گیا تھا اور علیز نے اس کی پشت دیکھتی رہ گئی۔



”السلام علیکم! بہر حال جو بھی تھا وہ ڈرائنگ روم میں بڑے سکون سے داخل ہوا تھا۔
”و علیکم السلام!“ نبیل جو ڈرائنگ روم کی مغربی دیوار پہ لگی ایک بہت ہی خوب صورت مگر انتہائی اداس سا منظر پیش کرتی پینٹنگ دیکھ رہا تھا۔ دل اور کی آواز پہ فوراً اس کی طرف پلٹا اور اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے اس کے قریب آگیا۔

”آج بڑا دل چاہ رہا تھا کہ تمہیں گلے لگا کے ملوں۔ اس لیے دیکھ لو بے وقت چلا آیا ہوں۔“ نبیل نے دل اور سے بغل گیر ہونے کے لیے خود ہی بازو پھیلا دیے تھے اور دل اور اس کی بات پہ حیران ہوتا اس کے گلے لگ گیا۔
”آج ایسی کیا بات ہوئی ہے کہ تمہارا گلے ملنے کو دل چاہ رہا تھا؟“ اور نہیں سبقت آتا پڑا؟“ دل اور نے گلے ملتے ہی سوال کیا۔ اتنے میں گل اور علیز سے بھی سیڑھیاں اتر کر نیچے آگئی تھیں۔

”ڈرائنگ روم سے بھینچو“ تاکہ مجھے پتا تو چلے کہ میں دل اور سے گلے مل رہا ہوں۔“ نبیل کی باتیں ہی عجیب سی ہو رہی تھیں۔ دل اور نے فوراً ہی محسوس کیا۔

”کیوں ویسے یقین نہیں آ رہا کہ تم دل اور کے گلے مل رہے ہو؟“ دل اور نے اس سے الگ ہوتے ہوئے پوچھا تھا اور نبیل آہستگی سے مسکرا دیا۔

”یقین ہے یا نہ سب یقین ہے تمہیں ہی تو یقین ہے۔“ نبیل نے اس کا ہاتھ تھپکا۔

”کس بات کا؟“ دل اور نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”اس بات کا صرف تم ہی تو ہو جو نبیل حیات کو سچے دل سے چاہتے ہو کہنا سمجھتے ہو اور اس کے لیے کچھ بھی کر گزرتے ہو، لیکن آج دیکھو میں بھی کچھ کر گزرا ہوں۔“ نبیل نے مومنہ بی بی کی طرف اشارہ کیا اور دل اور اس کے اشارے پہ چونک گیا۔

”کیا مطلب؟ کیا کیا ہے تم نے؟“ اس کے اتنے تشویش بھرے انداز پہ نبیل ایک بار پھر طنز سے مسکرایا۔

”ارے ڈونٹ وری یا بس ایسا بھی کچھ نہیں کیا میں نے، صرف نکاح کیا ہے اور نکاح کرنا کوئی بری بات تو نہیں ہے نا؟“ نبیل نے بڑے ریلیکس سے انداز میں کہتے ہوئے لا پرواہی ظاہر کی تھی۔

”کیا نکاح؟“ دل اور کے دل پہ چوٹ پڑی تھی اور اس نے کرنٹ کھا کے نبیل کی طرف دیکھا۔

”ہاں۔ نکاح میں نے مومنہ سے نکاح کر لیا ہے۔ گھر سالا ہے تمہاری طرح، مبارک دو مجھے۔“ نبیل کی بات پہ دل اور کاچرو تاریک پڑ گیا اور اسے یوں لگا جیسے اس کا پورا جسم نیلو نیل ہو گیا ہو اور اس کی ذات کھڑے کھڑے رست کے ڈھیر میں تبدیل ہو گئی ہو۔ وہ ڈھسے جانے کو تھا جب علیز سے آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی اس کے پہلو میں آکھڑی ہوئی اور اس کا کندھا دل اور کے بازو سے ٹچ ہوا تھا۔ جس پہ اس نے چونک کر خالی خالی نظروں سے علیز کے سمت دیکھا۔ علیز نے بھی نبیل کی بات پہ بہت شاکہ نظر آ رہی تھی۔

”نبیل؟“ دل اور کے ہونٹ ذرا سے ملے تھے۔

”ارے۔ اتنے حیران کیوں ہو رہے ہو؟ ابھی تو میں نے تمہیں ایک اور گڈ نیوز دی ہے۔“ نبیل بہت ہی ہلکے پھلکے اور فریش موڈ میں نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”گڈ نیوز؟“ دل اور کے بس ہونٹا ہل رہے تھے۔ البتہ سمجھ کچھ نہیں آ رہا تھا۔

”ہاں گڈ نیوز۔۔۔ عبد اللہ کے حوالے سے ہے۔“ نبیل نے بے حد آہستگی سے کہا۔

”نبیل یہ سب کیا کہہ رہے ہو؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا؟ میرا۔۔۔ میرا۔۔۔ دماغ۔۔۔ پھٹ رہا ہے۔“ دل اور کی حالت اس وقت بہت ہی عجیب سی ہو رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اس وقت کسی دلدل پہ کھڑا ہو اور لمحہ بہ لمحہ اس دلدل میں دوھنس رہا ہو اور اس کے پاس اس سے بچنے کا کوئی راستہ نہ ہو۔

”میں مشکل زبان میں تو نہیں بتا رہا۔ آسان سی اردو ہے یا میری طرف سے گڈ نیوز تھی کہ میں نے آج چند کھٹے پیلے مومنہ سے نکاح کر لیا ہے اور عبد اللہ کی طرف سے یہ گڈ نیوز ہے کہ زری کو اسے ہوش میں آگئی ہے۔ وہ اب ٹھیک ہے۔“ نبیل نے کئی بعد دیگرے دھماکے کر ڈالے تھے اور دل اور اس کے ان دھماکوں سے دھجی دھجی بکھر گیا تھا جبکہ علیز بے بری طرح چونک گئی۔

”کیا زری ہوش میں آگئی؟“ علیز نے اس کے چہرے پہ بے پناہ خوشی اٹھائی تھی اور اس نے بڑے بے ساختہ اور بڑے بے تاب سے انداز میں پوچھا تھا۔ جس پہ الٹا نبیل نے علیز سے حیرانی سے دیکھا کہ وہ اتنی خوش کیوں ہو رہی ہے؟ اور علیز سے بھی اس کے یہ حیرت آمیز تاثرات بھانپ گئی تھی کہ وہ اسے اس طرح کیوں دیکھ رہا ہے اور اس کی آنکھوں میں کیا سوال ہلکورے لے رہا ہے؟ اسی لیے پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ علیز نے بے اختیار ہونٹیں مل گئی۔

”زری میری دشمن نہیں ہے اور نہ ہی میرے لیے غیر ہے۔ زری میری اپنی ہے، میری کرن ہے، میرے ماموں کی بیٹی ہے۔ بہن ہے میری اور۔۔۔ اور عبد اللہ بھائی، میرے ماموں زاد بھائی ہیں۔۔۔ میں ان کی پھوپھی آسیہ آفندی کی بیٹی ہوں۔ مجھے۔۔۔ مجھے اس بد نصیب کی خوشی نہیں ہوگی تو اور کس کو ہوگی؟ اس کے درد، اس کی تکلیف کی تڑپ مجھے نہیں ہوگی تو کیا آپ دونوں کو ہوگی؟ آپ دونوں۔۔۔ جو اپنے اپنے جذبات میں جل کر اپنے اپنے دلوں کی تسکین کے لیے نہ جانے کیا کرتے پھر رہے ہیں۔۔۔ ہونٹیں۔۔۔ کبھی کوئی لو میرج کر لیتا ہے اور کبھی کوئی کورٹ میرج اور پھر بھی دونوں کے دونوں پاک صاف اور نیک کے نیک۔ کمال ہے ہمیں تو پتا ہی نہیں تھا کہ محبت اس طرح بھی ہوتی ہے؟ ایسی محبت تو بندہ زندگی میں کئی بار کر لے اور پھر بھی ٹینشن فری رہے۔ آپ دونوں کی طرح آئندہ اگر کسی نے محبت کرنی ہوئی تو ان کو آپ دونوں کا ایڈریس میں دلوں کی اور کھوں کی کہ محبت سے بننے کے لیے نئے اور انوکھے طریقے سیکھنے کے لیے آپ کے پاس کلاسز لیں اور ماہر ہو جائیں، محبت کسی اور سے اور نکاح کسی اور سے کرنے میں۔ کیوں ہے نا سچی بات؟ کرنا چاہیے نا ایسا؟“ علیز نے نبیل کی حیرت دور کرتے کرتے ان دونوں کو اک ایسے کھڑے میں کھڑا کر دیا جہاں ان دونوں کے پاس چپ کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔

”کیوں نبیل بھائی؟ کچھ غلط کہا میں نے؟ غلط کہا ہے تو میں اپنی غلطی تسلیم کر دوں گی۔“ علیز نے نبیل پہ

سوال داغا تھا اور ساتھ ہی اک نظر اپنے برابر کھڑے دل اور کو دیکھا تھا۔

”ہو نہ ہو۔۔۔ آپ لوگوں نے محبت نہیں کی بس محبت کرنے کی کوشش کی ہے اور آپ اس کوشش میں ناکام ہوئے ہیں اس لیے اپنی اپنی جگہ۔۔۔ چپ سا دھ کے بیٹھ گئے ہیں۔ البتہ جو اس کوشش میں کامیاب ہوئی ہے وہ اس وقت اسپتال کے بستر پہ پڑی آپ کی طرح نئی زندگی کے مزے نہیں لوٹ رہی۔“ علیز نے کئی لمحے میں طنز، مسخر اور کاٹ کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا۔ وہ دونوں حقیقتاً ”کچھ نہیں بول پائے اور اپنی جگہ پہ کھڑے رہ گئے تھے۔“

”بہر حال پھر بھی آپ کی اس کوشش پہ میں آپ کو داد دیتی ہوں اور کچھ نہ سہی“ آپ نے کوشش تو کی ہے ورنہ میرے اور مومنہ جیسے لوگ تو یہ بھی نہیں کرتے۔“ آج علیز نے وہ لہجہ اور وہ زبان بول رہی تھی جس کا اسے ڈھنگ ہی نہیں آتا تھا اور سننے والے حیران ہو رہے تھے۔

”غیر انوکھی بات نہیں۔ جس نے بریاد ہونا تھا وہ تو ہو گئی۔ آپ بیٹھے نبیل بھائی آپ کی نئی زندگی کی شروعات کی خوشی میں میں آپ کو اپنے ہاتھوں سے بنی چائے پلاؤتی ہوں اور آپ کا منہ شٹھا کرواتی ہوں۔“ علیز نے کتنی ہونٹیں کی طرف بڑھی۔

”نہیں بھائی، اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ کافی وقت ہو رہا ہے، ہمیں اب گھر چلنا چاہیے۔“ نبیل کی آواز نے اس کے بڑھتے قدم روک دیے۔

”ناہم؟ ہوں نا تم تو واقعی کافی ہو رہا ہے مگر اب آپ اتنی گئے ہیں تو بیٹھے بھی اتنی سی دیر میں کیا ہو جائے گا بھلا؟ صرف چائے ہی تو تیار کرنی ہے۔“

علیز نے لا پرواہی سے کندھے اچکائے تھے مگر نبیل بھلا اس وقت چائے پینے کی پوزیشن میں کب تھا؟ اس کی تو بھوک پیاس علیز نے اڑا کر رکھ دی تھی۔

”نہیں! ہم چلتے ہیں اب بس یہ بے خبر تھا میں اسے خبر دینے کے لیے آیا تھا کہ کل کو یہ اعتراض نہ کرے کہ میں نے اسے بتایا نہیں۔ اب بتا دیا ہے اس لیے امید ہے کہ اسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ لہذا اب اجازت چاہتا ہوں“ آپ بھی آرام کریں، اللہ حافظ“ نبیل دل اور کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہوا مومنہ کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے نکل گیا اور وہ دونوں وہیں کھڑے دیکھتے رہ گئے۔

”مبارک ہو، نبیل حیات آپ کا دوست ہی نکلا۔“ علیز نے ایک اور طنزیہ نشتر پھینکتی ہوئی وہاں سے چلی گئی اور قدرت کی اس ستم ظریفی پہ دھواں دھواں ہونے والا دل اور شاہد ہیں کا وہیں صوفے پہ ڈھسے گیا تھا۔!

عدیل ابھی سونے کی نیت سے اپنے بستر پہ لیٹا ہی تھا کہ اس کی موبائل رنگ بجنے لگی اس نے سر ہانے رکھا موبائل نکال کر دیکھا اس کی اسکرین پہ مدحیہ کا نمبر جگمگا رہا تھا۔

”مدحیہ؟“ اسے اس وقت مدحیہ کی کال دیکھ کر سخت حیران ہوئی تھی۔ مگر اس حیرانی کے باوجود اسے فوراً ”کال بھی ریسیو کرنی پڑی۔“

”ہیلو! اس کا ہیلو بھی حیرت لیے ہوئے تھا۔“

”السلام علیکم! مدحیہ نے بڑی مشکل سے سلام کی رسم نبھائی۔“

”وعلیکم السلام! مدحیہ آپ ٹھیک تو ہیں نا؟“ عدیل اپنے بستر پہ اٹھ بیٹھا تھا۔

”اس وقت؟“ اس نے وال کلاک کی سمت دیکھا جہاں رات کے ساڑھے بارہ بجے کا ٹائم ہو رہا تھا۔
 ”ہاں اس وقت اور ابھی“ مدیحہ نے کبھی بھی اس سے۔ اس طرح کی کوئی ضد نہیں کی تھی اور آج اگر کی تھی تو بہت ہی دو ٹوک۔ اور سرکش سے انداز میں کی تھی جس پر عدیل جزبہ سا ہو گیا۔
 ”لیکن مدیحہ! ٹائم۔“

”عدیل پلیز! میں اس وقت تم سے ملنا چاہتی ہوں، صرف تم سے اگر نہیں مل سکتے تو پھر زندگی بھر نہ ملنا۔“
 مدیحہ نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا اور عدیل پریشان ہوا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ کس طرح کی جذباتی اور جنونی قسم کی لڑکی ہے اگر وہ واقعی نہ گیا تو نجانے کیا کریں گے؟ کیونکہ اس کے جنون کی ایک دو جھلک تو وہ پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔
 ”اف خدا یا! نجانے کیا ہو گیا ہے اس لڑکی کو؟ اللہ خیر کرے سب خیریت ہی ہو۔“ عدیل مجبوراً ”کبمل ہٹا کر اٹھا اور جوتے پہن کر کھڑا ہو گیا۔“

موبائل جیب میں ڈالا اور جرسی پہن کر بانیق کی چابی اٹھا تا ہوا کمرے سے باہر نکل آیا۔

”کون ہے؟“ باہر کھٹکے کی آواز پر غابہ خاتون نے فوراً ”اندر سے آواز دی تھی۔“

”ہی! میں ہوں۔ میں ذرا کام سے باہر جا رہا ہوں کچھ دیر میں آ جاؤں گا۔“ عدیل کافی عجلت میں لگ رہا تھا اور اس کی آواز پر مریم بھی اپنے کمرے سے باہر آ گئی۔

”اس وقت کہاں جا رہے ہیں آپ؟“ مریم پہلے کی دسی ہوئی تھی اسے وہ وقت یاد آ گیا تھا جب پہلے بھی ایک بار یونہی عدیل کچھ دیر بعد آ جانے کا کہہ کر گیا تھا مگر ایک بڑی مصیبت میں پھنس گیا تھا۔

”بس ایک کام سے جا رہا ہوں جلدی آ جاؤں گا۔“ وہ بانیق نکالنے کی غرض سے بانیق کی طرف بڑھا۔

”یسا کون سا کام ہے؟ جو آپ کو یوں آدھی رات کو یاد آ گیا ہے؟“ مریم بھی اس کے پیچھے محض میں نکل آئی تھی۔

”مریم! میں آ کر تباؤں گا پلیز“ اس نے عجلت میں نکل جانا چاہا تھا۔

”نہیں! آپ اس طرح بتائے بغیر کہیں نہیں جائیں گے۔ جہاں بھی جاتا ہے جتا کر جاتا ہے۔“ مریم نے انتہائی ضدی لہجے میں کہا تھا اور عدیل کو عجلت کے باوجود رکتا رہ گیا تھا۔

”مجھے مدیحہ کی کال آئی تھی۔ وہ کچھ پریشان ہے اس نے بلایا ہے اس لیے جا رہا ہوں۔“ اسے آخر تاناہی پڑا تھا۔

”مدیحہ کی کال؟“ وہ بھی اس وقت؟“ مریم بھی چونکی تھی۔

”ہاں! مجھے بھی تو اس بات کی پریشانی ہے کہ اس نے اس وقت کال کیوں کی اور کیوں بلایا ہے؟“ عدیل کہہ کر بیرونی دروازے کا لاک کھولنے لگا۔

ہوں! ٹھیک ہے آپ جائیے لیکن پلیز گھر کے نمبر پر مہیج یا دو منٹ کی کال کر کے خیریت ضرور بتا دیجیے گا۔“
 مریم نے دروازہ کھول کر بانیق باہر نکالتے عدیل کو تاکید کی۔ اور اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”اور ہاں! امی کو بھی بتا دینا وہ بھی پوچھ رہی تھیں۔“ وہ کہہ کے دروازہ عبور کر گیا تھا اور مریم دروازہ بند کر کے اندر آ گئی۔



وہ گاڑی کے اسٹیرنگ پر سر رکھے بے آواز رو رہی تھی جب اچانک اس کے موبائل پر رنگ بجی تھی اور اس نے چونک کر موبائل اٹھا لیا تھا۔

”ہیلو!؟“ اس نے بے حد ہستکی سے ہیلو کہا تھا۔

”کہاں ہیں آپ؟ میں آرہا ہوں۔“ عدیل شاید بانیق پہ تھا اس لیے ہینڈ فری کے ماؤتھ پیس سے اس کی آواز کے ساتھ ہوا کا شور بھی سنائی دے رہا تھا۔

”میں روڈ پہ ہوں اپنی گاڑی میں تمہارے گھر سے ذرا فاصلے پہ۔“ مدیحہ نے اپنے آنسوؤں پہ تھوڑا سا کنٹرول کرتے ہوئے بتایا تھا۔

”کس سائیڈ پہ؟“ عدیل نے اپنی بانیق کو بریک لگا دیے تھے۔

”لہٹ سائیڈ پہ“ مدیحہ اسے جگہ کا بتاتی گئی اور عدیل نے سیدھا اس کی گاڑی کے قریب آ کر بریک لگائے تھے اور بہت تیزی سے اپنی بانیق سے اتر آیا۔ اور اسٹے میں مدیحہ بھی اسے دیکھ کر گاڑی سے نیچے اتر آئی تھی۔

”مدیحہ! آپ ٹھیک تو ہیں! رات کے اس پہر آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟“ عدیل کے لہجے میں بے پناہ تشویش تھی اور مدیحہ جو بار بار اپنے آنسوؤں کو کنٹرول کرنے کی کوشش کر رہی تھی اس کے اتنے پریشان کن اور اپنائیت آمیز سوال پہ بے ساختہ سر جھکانے پہ مجبور ہو گئی۔

”مدیحہ! عدیل کو لہجہ بہ لہجہ مزید پریشانی اور تشویش ہو رہی تھی کیونکہ مدیحہ کا ایسا انداز ایسا رویہ ایسا رویہ وہ پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا اس نے کبھی بھی اس طرح کا کوئی تجسس کمری ایٹ نہیں کیا تھا۔ اور آج اگر کیا تھا تو اسے واقعی پریشانی گھیرے میں لے رہی تھی۔“

”عدیل! ہم... ہمارا... گھر برباد ہو گیا ہے۔ تباہ ہو گیا ہے۔ ہمارے گھر میں تو پہلے ہی کوئی سکون اور کوئی خوشی نہیں تھی مگر اب۔ اب تو اور بھی ویرانی چھا گئی ہے۔ منحوس ہو گیا ہے ہمارا گھر۔“ مدیحہ اس کے پکارنے پہ اس کی طرف پلٹی ہوئی روڑی تھی اور عدیل نے اسے نا سمجھی سے سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

”مدیحہ پلیز! کیا ہوا آخر؟ آپ صاف صاف کیوں نہیں بتا رہیں؟ میرا پریشانی کے مارے داغ ماؤف ہو چکا ہے۔“ عدیل ذرا جھنجھلا کے بولا تھا۔

”کیا بتاؤں؟ اور کس طرح بتاؤں؟ کچھ سمجھ نہیں آرہا مجھے۔ میرے۔ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ میں اپنے گھر کی تباہی کا قصہ بیان کر سکوں۔ اور تباہی سکوں کسی کو کہ یہ ہوا ہے ہمارے ساتھ۔“ مدیحہ اپنی گاڑی سے ٹھیک لگائے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر بے تحاشا رو رہی تھی۔

”نبیل صاحب اور آئی تو ٹھیک ہیں نا؟“ عدیل کا پہلا خیال ان کی طرف ہی گیا تھا۔

”ہاں ہاں سب ٹھیک ہیں مگر سب کی قسمت خراب ہے اور جن کی قسمت خراب ہو وہ لوگ کبھی خوش نہیں رہ سکتے وہ لوگ کبھی سکون سے نہیں رہ سکتے۔ اس لیے ہم لوگ بھی کبھی خوش نہیں ہو سکتے اور نہ ہی کبھی سکون سے رہ سکتے ہیں۔ سوچا تھا دل اور بھائی کے حوالے سے کوئی خوشی ملے گی مگر انہوں نے اپنی پسند سے بتاتے نکاح کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حیرت میں ڈال دیا اور ہم نے ساری امیدوں کا رخ نبیل بھائی کی طرف موڑ دیا تھا اور بانی رہ جانے والی امیدیں ان سے وابستہ کر لی تھیں مگر آج۔ آج انہوں نے بھی سب کچھ جلا کر رکھ کر ڈالا ہے آج انہوں نے بھی وہی جھنڈا لہرایا ہے جو دل اور بھائی نے لہرایا تھا۔ آج انہوں نے بھی نکاح کر لیا ہے۔“ مدیحہ دکھ سے کہتے کہتے سسک رہی تھی بلکہ رہی تھی اور عدیل دم بخود سا رہ گیا۔

”نبیل صاحب نے نکاح کر لیا؟ اتنا اچانک؟ مگر کیوں؟“ عدیل کو واقعی ہچکا لگا تھا۔

”ہاں نکاح کر لیا ہے۔ وہ بھی ملک حق نواز کی ستائی ہوئی مومنہ بی بی کے ساتھ۔ جس کو انہوں نے پچھلے کافی عرصہ سے اپنے گھر میں پناہ دے رکھی تھی اور آج انہوں نے وہی گھر مومنہ بی بی کو سونپ دیا ہے اپنا سب کچھ اسے دے دیا ہے سب کچھ اپنا آپ بھی۔ زری کے لیے کچھ بھی نہیں چھوڑا اس کا انتظار بھی نہیں کیا اور زری آج

ہوش میں بھی آگئی ہے اور۔۔۔ میں اس سے ملنے بھی نہیں جاسکی آخر کس منہ سے جاتی اس کے سامنے؟ ہم لوگوں نے اسے دیا ہی کیا ہے بھلا؟ ہمیں اس کی پروا ہی کب ہے؟ ہم سب نے تو اسے جیتے جی مار ڈالا ہے۔۔۔ بار ڈالا ہے اسے۔۔۔ مدحیہ روتے روتے چیخ اٹھی تھی اور عدیل بے ساختہ گھبرا گیا۔

”مدحیہ پلینز! بس کریں۔ ہم لوگ اس وقت روڈ پر کھڑے ہیں لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے پلینز صبر سے اور حوصلے سے کام لیں۔“ عدیل نے اسے تسلی دینی چاہی تھی۔

”صبر۔۔۔ کیسے کروں صبر۔ کس چیز کا صبر۔۔۔ بت صرف اتنی سی ہوتی تو شاید صبر بھی آجاتا مگر میں تو کوئی ایک نہیں پورا گھبرا ہوا ہے۔“

مدحیہ کا صبر برداشت آج جواب دے چکے تھے اور وہ بات بات پر بھڑکی تھی بلکہ رہی تھی۔

”پورا گھبرا۔۔۔ کیا مطلب؟ کیا ہوا ہے؟ کیا کوئی اور بھی مسئلہ ہے؟“

”عدیل۔۔۔ مسئلہ نہیں ہوا۔ مسئلے کی حد ہو گئی ہے۔ ماما اور بابا میں ڈائیورس ہو گئی ہے۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے الگ ہو گئے ہیں۔ بابا نے گھر چھوڑ دیا ہے۔“ وہ یو نہیں گاڑی سے ٹیک لگائے روتی ہوئی نیچے بیٹھ گئی۔ اور عدیل ایک اور انکشاف یہ وہ بخود سارا گیا۔

”ڈائیورس؟“ اس کی سماعتوں پر یہ لفظ ہتھوڑے کی طرح برساتا تھا اور اس پر مدحیہ کی سسکیاں اور ہچکیاں الگ ضربیں لگ رہی تھیں۔

”اوسے ہوئے ایساں کیا سین چل رہا ہے؟ سو رو میں شکیار۔“ قریب سے ہی تین چار لڑکوں کی آوازیں اور معنی خیزی سیٹھیاں، بجائے کی آوازیں سنائی دینے لگیں اور عدیل کو جیسے کرنٹ چھو گیا اس نے یکدم پلٹ کر ان لڑکوں کی طرف دیکھا تھا۔

”کیا بات ہے یار؟ کیا مان نہیں رہی؟“ وہ کی نے آنکھ دباتے ہوئے انتہائی خباثت سے کہا اور عدیل کے تن بدن میں خون کی لہر دوڑ گئی وہ سر سے پاؤں تک غصے اور غضب ناک سے سلگ اٹھا تھا۔

”یوشٹ اپ! تمیز نہیں ہے تم لوگوں کو؟ کون کیا کر رہا ہے تم لوگوں کو کیا تکلیف ہے آخر؟ اپنے کام سے کام رکھو اور دفعہ بوجاؤ یہاں سے۔“ عدیل نے مدحیہ کے خیال سے ذرا ضبط سے کام لیتے ہوئے انہیں مناسب الفاظ میں دہاں سے جانے کا کہا تھا۔

”ارے یار! غصہ کیوں کرتے ہو؟ ہم تو بس اس لیے پوچھ رہے ہیں کہ اگر نہیں مان رہی تو ہم حاضر ہیں پوری پوری ہیلپ کریں گے تمہاری اور حصہ آؤھا آؤھا۔“ کافی نے وہی سے بھی زیادہ خباثت کا مظاہرہ کیا تھا اور عدیل کی برداشت کی حد ختم ہو گئی تھی۔

”تم گاڑی میں بیٹھو۔“ اس نے مدحیہ کو انتہائی سختی اور آہستگی سے گاڑی میں بیٹھنے کا کہا تھا۔

”عدیل۔۔۔ آپ۔۔۔“ مدحیہ بھی اس کے تیور دیکھ کر رونا دھونا بھول گئی تھی۔ لیکن عدیل اتنے میں ان لڑکوں کی طرف پلٹ چکا تھا۔

”عدیل پلینز اسٹاپ! میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔ پلینز کوئی اور پریشانی کمری ایٹ مت کریں۔“ مدحیہ پیچھے سے اونچی آواز میں چیخی اور عدیل کے قدم نہ چاہتے ہوئے بھی رک گئے تھے کیونکہ اسے اچھی طرح اندازہ ہو چکا تھا کہ مدحیہ حقیقتاً ”گنتی پریشان“ اور اپ سیٹ ہے۔ اس کے کسی بھی جذباتی اقدام پر کوئی بھی نیا مسئلہ کھڑا ہو سکتا تھا۔ مگر اس کے رک جانے پر ان لڑکوں نے یکدم زوردار قہقہے لگاتے ہوئے ہونٹنگ کرنا شروع کر دی۔

”واؤ! بڑا اثر رکھتی ہے یار تمہارا سا ہم پر بھی سہی کیوں جووت؟ کیا خیال ہے تمہارا؟“ وہ کی نے اپنے خبیث خیالات میں اپنے ایک اور خبیث دوست کو شامل کیا تھا جو ان لوگوں سے بے زار اور اکتایا ہوا سا ذرا دور ان سے

ہٹ کے کھڑا تھا۔

”وکی پلینز! چھوڑیہ تماشا چل رہا ہے۔“ جووت نشے کے باوجود خاصی اکتاہٹ کا شکار نظر آ رہا تھا۔

”ہو منہ! چھوڑنے کو دل ہی تو نہیں چاہ رہا۔ چیز ہی کچھ ایسی ہے بل بانٹ کے کھانسنے والی۔“ اس کا اشارہ مدحیہ کی طرف تھا اور عدیل کا ضبط جواب دے گیا وہ یکدم غصے سے پاگل ہوتا تیر کی سی تیزی سے ان لڑکوں کی طرف لپکا اور اس کی نامی لڑکے کو گریبان سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔

”اوہ! تیری تو“ اس نے عدیل کو کوئی گالی دینا چاہی تھی لیکن عدیل کے زوردار گھونسنے نے اس کے منہ سے پھوٹنے والی گالی کو اس کے گلے میں ہی گھسا دیا تھا۔

”ارے یار! چوری اوپر سے سینہ زوری ایک تو رات کے اس پہراتی خوب صورت لڑکی کو ساتھ لے کر سڑکوں پر رو میں کرنا پھر رہا ہے اور اوپر سے کسی کے ساتھ شیئر بھی نہیں کرتا۔“ کافی بھی وہی کی خاطر اپنی شرٹ کے بازو تولد کرتا ہوا میدان میں کود پڑا تھا۔

”کیا تم لوگ اپنی منگیتروں اپنی بیویوں اور اپنی ماں بہنوں کو دوسروں کے ساتھ شیئر کرتے ہو؟“ عدیل نے اپنی طرف بڑھتے کافی کو بھی انتہائی زوردار دھکے سے نیچے پٹخا تھا۔

”بے غیرت گھروں کے بے غیرت لوگ ہو تم۔“ عدیل ان کو مارتے ہوئے دھاڑ رہا تھا اور اس کی بات پر جووت کا میٹر بھی گھوم گیا پھر وہ تینوں تھے اور ان سے سننے کے لیے وہ اکیلا تھا۔

”پلینز! چھوڑو اسے عدیل پلینز بس کرو۔“ مدحیہ لپک کے پاس آئی تھی اور اس نے عدیل کے شکم میں دبوچے جووت کو چھڑانے کی کوشش کی تھی۔

جووت کی گردن کے گرد عدیل کا بازو کسی پھندے کی طرح لپٹا ہوا تھا اور جووت کی آنکھیں باہر کو اٹل رہی تھیں۔

”اور کسی معاملے میں نہیں صرف اتنی سی بات ہے تمہاری غیرت جاگ اٹھی ہے؟ حالانکہ غیرت نام کی تو کوئی چیز ہی نہیں ہے تم میں۔“ عدیل جو منہ میں آ رہا تھا وہ انہیں بکھا جا رہا تھا۔

”دیکھو چھوڑو اسے ورنہ ہم اسے نہیں چھوڑیں گے“ وہ کی نے خونخوار سے لہجے میں کہتے ہوئے جھپٹ کر مدحیہ کا بازو پکڑ لیا اور عدیل مدحیہ کا بازو اس خبیث لڑکے کی گرفت میں دیکھ کر بے بس ہو گیا اور مجبوراً اس نے جووت کی گردن کو پرے جھٹک دیا تھا۔

”لب چپ چاپ جہاں سے آئے ہو وہاں چلے جاؤ۔ یہ لڑکی ہمارے ساتھ جائے گی یہی تمہاری سزا ہے“ وہ کی اور کافی نے مدحیہ کے دونوں بازو اپنی اپنی گرفت میں دبوچ رکھے تھے اور عدیل کو وہاں سے چلے جانے کی وارننگ دی تھی مگر اس سے پہلے کہ عدیل کوئی اور طریقہ آزما تا اسے میں دور سے ہی پولیس جیپ کے سائرن کی آواز سنائی دینے لگی اور مدحیہ نے ان لڑکوں کو پولیس کے خیال سے یکدم چونکتے دیکھ کر زور زور سے چلانا شروع کر دیا اور ان دونوں نے فوراً اس کے بازو چھوڑ دیے تھے کیونکہ سائرن کی آواز اور بھی قریب آتی جا رہی تھی۔

”جووت! چلو نکلو یہاں سے۔“ وہ کی نے لپک کے جووت کو سنبھالا تھا۔

”وہ تو ہم نکل ہی رہے ہیں۔ مگر مسٹر عدیل اتنا یاد رکھنا غیرت اور بے غیرتی کا بڑا لمبا چوڑا حساب دکھاتا ہے تمہاری طرف تیار رہنا ہم ایک چکر پھر گائیں گے۔“ جووت نے جاتے جاتے اسے وارننگ دی تھی اور عدیل نے ان کی طرف سے سختی پھیر لیا تھا اور ان کے جاتے ہی پولیس جیپ بھی ان کے پاس سے زبانی سے گزر گئی تھی۔ جبکہ مدحیہ اس نئے ہنگامے اور اس نئی مصیبت سے چکراتے ہوئے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے روتی ہوئی عدیل سے لپٹ گئی تھی۔

”مدیحہ! عدیل اس کی اس بے بس اور بے اختیار سی حرکت پہ دھک سے رہ گیا تھا۔
”عدیل پلیز ایہ دنیا یہ لوگ یہ ماحول سب بہت گندے ہیں بہت غلیظ ہیں مجھے نفرت ہو گئی ہے سب سے۔ ہر طرف ہوس ہی ہوس ہے ہر کوئی نفس کا ستایا ہوا پھر رہا ہے۔ تمہارے جیسا کوئی بھی نہیں ہے پلیز مجھے اپنا لو مجھے چھپا لو اپنی بانہوں میں۔ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھپ جانا چاہتی ہوں۔“ وہ اس کے سینے سے لگی روئے کہہ رہی تھی اور عدیل اس کی خواہش پہ سر سے پاؤں تک دھڑک اٹھا تھا اور اسی دھڑکن کی شدت سے ڈر کے اس نے مدیحہ کو فوراً ”بہت نرمی اور بہت ہی احتیاط کے ساتھ خود سے الگ کر دیا تھا۔“

”اس وقت بہت رات ہو رہی ہے مدیحہ! اور رات کے وقت گھر سے باہر رہنا لڑکیوں کے لیے مناسب نہیں ہوتا اس لیے پلیز اب تم گھر چلو۔ میں تمہیں ڈراپ کر دیتا ہوں تمہارے گھر والے بھی پریشان ہوں گے۔“ عدیل نے اس کے کندھوں کو تھکے ہوئے اسے سمجھانے کی کوشش کی اور مدیحہ نے اس کی بات کے جواب میں سر جھکا دیا اس لیے عدیل نے گاڑی کا دروازہ کھول کے اسے فرنٹ سیٹ پہ بٹھایا کچھ دور ایک جنرل اسٹور تھا وہاں اس نے اپنی بائیک پارک کی اور مدیحہ کی گاڑی میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا۔



نبیل سخت بے چینی کے عالم میں گھر کے لان میں شل رہا تھا۔
آج کا دن بہت ہی ہنگامہ خیز اور تباہ کن ثابت ہوا تھا۔ بہت کچھ دیکھتے ہی دیکھتے پلٹ کے رہ گیا تھا اور وہ سب خالی ہاتھ رہ گئے تھے۔ ہر کسی پہ کوئی نہ کوئی قیامت ٹوٹی تھی اور کوئی نہ کوئی انگشتاں پیش آیا تھا جس کی وجہ سے سب کے دل دماغ ہی زلزلے کی زد میں تھے اور کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ آخر یہ سب اتنا اچانک کیسے ہو گیا؟
فائزہ بیگم اپنے بیڈ روم میں بند تھیں۔

مومنہ نبیل کے بیڈ روم میں اکیلی بیٹھی اپنی قسمت پہ حیران پریشان ہو رہی تھی۔

مدیحہ نجائے کب سے گھر سے نکلی تھی اور ابھی تک نہیں آئی تھی۔

اور نبیل لان میں شل ہوا ہر طرف سے سوچوں میں گھرا قطرہ قطرہ موم کی طرح پکھل کر ختم ہو رہا تھا۔ لیکن ابھی پوری طرح سے پکھل کر ختم نہیں ہوا تھا کہ باہر گیٹ پر مدیحہ کی گاڑی کا بارن بجا تھا۔ نبیل نے بے ساختہ اپنی گھڑی میں ٹائم دیکھا رات کے سو ادب بجے کا ٹائم ہو رہا تھا نبیل کو ٹائم دیکھ کر سخت خفگی محسوس ہوئی اور وہ چوکیدار کے گیٹ کھولنے تک خود بھی ڈرائیور کے قریب آ گیا تھا۔ لیکن مدیحہ کے بجائے کسی اور کو ڈرائیونگ سیٹ پہ دیکھ کر نبیل کا رنگ متغیر ہو گیا تھا۔ اور اتنے میں گاڑی عین اس کے سامنے آرکی اور اگلے دو سیکنڈ میں اس کے شوروم کا منیجر عدیل عمر نازی مدیحہ کی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ سے اتر کر اس کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔

”اسلام علیکم! سر کیسے ہیں آپ؟“ عدیل نے بے حد شائستگی سے سلام کرتے ہوئے نبیل کی طرف مصافحہ کے لیے ہاتھ بھی بڑھایا نبیل نے بہت مرے مرے انداز میں تھام کر سلام کی رسم نبھائی تھی۔

”ہوں! ٹھیک ہوں!“ اس کا لہجہ اور اس کی آواز بھی جیسے کہیں دب چکے تھے۔

”سر! میں آپ کی فیلنگز اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں کیونکہ میرے گھر میں بھی بہنیں ہیں۔ ایک نہیں بلکہ پانچ پانچ بہنیں ہیں اس لیے بہت اچھی طرح اندازہ ہے کہ بہنوں کے معاملے میں آری کی فیلنگز اور سوچیں کیا ہوتی ہیں؟ کتنی فکر ہوتی ہے ان کے حوالے سے؟ انسان بہت ہی حساس ہو جاتا ہے، لیکن پھر بھی میں آپ کی تسلی کے لیے اتنا ضرور تیار ہونا چاہتا ہوں کہ آپ کی بہن کی عزت ہر طرح سے محفوظ ہے۔ آپ کی عزت سر آنکھوں پہ میں جتنا آپ کا احترام کرتا ہوں اتنا ہی مس مدیحہ کا احترام بھی کرتا ہوں اس لیے پلیز آپ اس وقت کچھ بھی غلط

مت سوچے گا۔ مس مدیحہ کچھ پریشان تھیں ڈپریشن کا شکار تھیں رورہی تھیں کہ وہیں کچھ آوارہ لوفر لڑکوں سے ٹکراؤ ہو گیا اور مجبوراً ”بڑی مشکل سے بچاؤ کے بعد مجھے ان کو گھر ڈراپ کرنے کے لیے آنا پڑا۔ اور مجھے خوشی ہے کہ میں نے انہیں خیریت سے باحفاظت ان کے گھر پہنچا دیا ہے اور مجھے آپ کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا پڑا۔“
عدیل نیت کا سچا کھرا تھا اس لیے اس نے بات بھی سچے اور کھرے طریقے سے کی جس پہ نبیل کے دل دماغ پہ اتر آئے والابوجھ خود بخود ہی کہیں دور ہٹ گیا اور وہ اندر ہی اندر ریلیکس ہو گیا تھا۔

”تھینک یو ویری مچ! تمہارے خیالات جان کر بہت خوشی ہوئی ہے مجھے۔ اگر ہر مرد ایسی ہی سوچ رکھنے لگے تو یہ دنیا غلاظت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پاک اور صاف ہو جائے گی پھر میرے جیسے کسی بھی بھائی کو اس طرح کی کوئی ٹینشن نہیں ستائے گی۔“ نبیل نے عدیل کا کندھا تھکتے ہوئے اسے سراہا تھا اور خوشی کا اظہار کیا تھا۔
”اؤکے سر! مجھے اجازت دیجیے میں اب چلتا ہوں۔ میرے گھر والے بھی پریشان ہو رہے ہوں گے۔“ عدیل نے اس سے اجازت طلب کی تھی۔

”لیکن گھر جاؤ گے کیسے؟ تمہارے پاس تو نہ گاڑی ہے نہ بائیک اور اس وقت تو کہیں سے کوئی سواری بھی نہیں ملے گی؟“ نبیل کو فکر ہوئی تھی۔

”ڈونٹ وری سر! کوئی نہ کوئی سبب بن ہی جائے گا۔“ عدیل نے اسے ریلیکس کرنا چاہا۔

”سبب بنائیں تو بنتا ہے نا؟ تم تھوڑے میں ڈرائیور سے کہتا ہوں وہ تمہیں ڈراپ کر دیتا ہے۔“ نبیل کہہ کر سرونٹ کو آرٹرز کی طرف پلٹ گیا اور عدیل اسے روکنا نہ گیا مگر وہ نہیں رکا تھا۔

”تھینک یو!“ عدیل اپنے دھیان میں سر جھکائے کھڑا تھا جب مدیحہ آہستگی سے گاڑی سے اتر کر اس کے برابر ہی آکھڑی ہوئی اور عدیل نے چونک کر اس کی سمت دیکھا اس کا سر جھکا ہوا تھا۔

”تھینکس؟ مگر کس لیے؟“ عدیل نے اس کے جھکے ہوئے سر کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

”مجھے باحفاظت گھر پہنچانے کے لیے۔“ وہ بہت ہی دھیمے لہجے میں بولی۔

”ہو نہ! آپ کو کیا پتا کہ میں نے کس کو باحفاظت گھر پہنچایا ہے؟ آپ کو یا اپنے آپ کو؟“ وہ کہتے ہوئے مبہم سا مسکرایا اور مدیحہ اس کی بات کا مفہوم سمجھ کر بات بدل گئی تھی۔

”آپ کو کوئی چوٹ تو نہیں آئی؟“ اسے اندازہ تھا کہ جتنی چوٹیں ان لڑکوں کو آئی تھیں اتنی ہی عدیل کو بھی آئی تھیں۔ آخر وہ تین تھے اور وہ اکیلا۔

”آئی تو ہے مگر اب مرہم کون لگائے؟ آپ سے تو مرہم کی امید بھی نہیں کر سکتا کیونکہ آپ نے تو پہلی بار گھر آئے مہمان کو چائے کا بھی نہیں پوچھا اور اتنی سردی میں ٹھہرتے ہوئے گھر بھیج رہی ہیں۔“ عدیل نے جان بوجھ کر اسے چھیڑنے کے لیے شکوہ کیا تھا اور مدیحہ اپنی اس کوتاہی پہ یک دم سراٹھا کر دیکھنے پہ مجبور ہو گئی تھی اور عدیل اس کے اس طرح دیکھنے پہ بے ساختہ ہنس پڑا۔

”تھینک یو! میں نے پی پی لی چائے۔“ اس نے مدیحہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ذرا معنی بات کہی اور مدیحہ نے شرم سے جھپکے ہوئے پلکیں جھکا لی تھیں۔

”ٹوڈر ایور آگیا ہے۔“ نبیل ڈرائیور کو اپنے ساتھ ہی لے کر آیا تھا اور نجائے کیوں مدیحہ اور عدیل کو ایک ساتھ برابر کھڑے دیکھ کر نبیل کے قدم ذرا سے توقف کے لیے ٹھہرے تھے اور اک خیال تھا جو اس کی عقل کو چھو کے گزر گیا تھا مگر وہ اس پہ کچھ بول نہیں سکا بس دل ہی دل میں سوچتا رہ گیا۔

”اؤکے سر! اللہ حافظ۔“ عدیل اس سے ہاتھ ملانے کے بعد ان دونوں کو خدا حافظ کہہ کر گاڑی میں بیٹھا اور وہاں سے رخصت ہو گیا تھا مگر نبیل گئے لیے اک نئی سوچ چھوڑ گیا تھا۔



وہ ابھی سو کر اٹھا بھی نہیں تھا کہ اس کا موبائل بجنا شروع ہو گیا۔ اس نے فون اٹھا کر دیکھا کوئی اجنبی سامنبر تھا اس لیے مجبوراً اسے کال ریسیو کرنا پڑی تھی۔

”اسلام علیکم! اس نے بڑے شائستہ لہجے میں سلام کیا تھا کیونکہ یہ اس کی عادت تھی۔
”ملک اسد اللہ بات کر رہا ہوں۔“ دوسری طرف سے بہت سی نیپنی تلی سی آواز سنائی دی تھی اور دل اور کے ماتھے پر پڑ گئے کیونکہ وہ جان گیا تھا کہ اس نے کال کیوں کی ہے۔

”جیسے جیسے بات میں سن رہا ہوں۔“ دل اور کا لہجہ اس سے بھی زیادہ سخت اور سپاٹ ہو چکا تھا۔
”تم جانتے ہو کہ کل ملک حق نواز کے کیس کی آخری پیشی ہے اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ تم کل عدالت نہ جاؤ۔“ ملک اسد اللہ نے وہی بات کہی تھی جس کی دل اور کو امید تھی۔
”وجہ؟“ اس نے یک لفظی سوال داغا۔

”وجہ یہ ہے کہ تمہارے جانے سے ملک حق نواز کو سزا ہوگی۔“
”پھر تو مجھے کل ہر حال میں جانا چاہیے نا؟ کیونکہ آخر انصاف بھی تو کوئی چیز ہے۔“ دل اور نے تمسخر سے کہا تھا۔

”دیکھو دل اور شاہ! ہم چاہتے تھے کہ تم سے بات کر کے معاملہ سلجھالیں مگر لگتا ہے کہ معاملہ اس طرح نہیں سلجھے گا ہمیں اپنے رنگ میں آکر اپنا آپ دکھانا ہو گا۔“ ملک اسد اللہ کے لہجے میں سراسر دھمکی تھی اور وہ تھا کہ دھمکیوں سے ڈرنا ہی نہیں تھا۔

”آپ نے میرا رنگ بھی نہیں دیکھا ملک اسد اللہ صاحب! میں نے مومنہ بی بی سے وعدہ کیا تھا کہ اسے انصاف ضرور ملے گا اور میں اسے یہ انصاف دلا کر ہی رہوں گا چاہے مجھے اپنی جان پہ کیوں نہ کھیلنا پڑے۔“ دل اور بھی اپنی بات کا اور اپنی ضد کا کتنا پکا ہے؟ یہ ملک اسد اللہ بھی اچھی طرح جانتے تھے اسی لیے ذرا نرمی اختیار کر لی تھی۔
”دیکھو! ہم مومنہ بی بی کو اپنانے کے لیے تیار ہیں۔ ہم ملک حق نواز کا نکاح پڑھوا دیں گے اس کے ساتھ۔“ ملک اسد اللہ نے نیا راستہ اختیار کیا تھا اور اک نئی چال چلی تھی۔

”آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ مومنہ بی بی کا نکاح ہو چکا ہے اور اس کا شوہرا اتنی حیثیت ضرور رکھتا ہے کہ آپ لوگوں سے فکر لے سکے اس لیے ملک حق نواز کی بخشش کا خیال دل سے نکال دیں۔ وہ ذلیل انسان اب تمام عمر جیل میں ہی سڑے گا کیونکہ اس نے ایک مومنہ بی بی کی نہیں بلکہ کئی اور عورتوں اور لڑکیوں کی عزت بھی تباہ کی ہے اور اب وقت ہے کہ خدا کی طرف سے اس پر عذاب نازل ہو۔“ دل اور خاصا چبا کے بول رہا تھا اور ملک اسد اللہ اس نئے انکشاف سے ونگ رہ گیا تھا۔

”اللہ حافظ ملک صاحب کل عدالت میں ملاقات ہوگی۔“ دل اور نے فون بند کرنا چاہا تھا۔

”ٹھہرو دل اور شاہ!“ ملک اسد اللہ نے یک دم اسے روکا تھا۔

”کہہیے؟“ وہ رک گیا۔

”تمہارا آخری فیصلہ کیا ہے؟“ ملک اسد اللہ نے اس کا حتمی فیصلہ جانتا چاہا تھا۔

”میرا آخری فیصلہ ملک حق نواز کی سزا ہے، میرا آخری فیصلہ مومنہ بی بی کا انصاف ہے اور میرا آخری فیصلہ کل عدالت جانا ہے اور اس کام سے مجھے اللہ کی پاک ذات کے علاوہ دنیا کی کوئی اور طاقت نہیں روک سکتی اور امید ہے کہ میری یہ بات آپ لوگوں کے ذہن میں کافی اچھی طرح بیٹھ چکی ہوگی۔ اس لیے اب اللہ حافظ۔“ اس نے پھر

فون بند کرنے کی کوشش کی تھی۔

”رکول اور شاہ! دیکھو ایک بار پھر سوچ لو ہمارے پاس فیصلے کی گھڑی بس یہی ہے اس کے بعد نہ ہم تم سے کچھ کہیں گے اور نہ ہی تمہیں سننے کی زحمت اٹھانا پڑے گی۔“ ملک اسد اللہ نے اسے وقت دینا چاہا تھا۔

”میں نے جو کچھ بھی کہا ہے سوچ سمجھ کر ہی کہا ہے۔ اس لیے اب آپ بھی سمجھ جائیے“ وہ ہنوز نوک بات کر رہا تھا۔

”اوکے دل اور شاہ! رب را کھا۔“ ملک اسد اللہ نے کہہ کر خود ہی فون بند کر دیا اور دل اور نے اپنا موبائل بند ہوتے ہی بیڈ پر اچھال دیا اور خود اٹھ کر وارڈروب کھول لی تھی۔

”کیا ڈھونڈ رہے ہو؟“ اپنا موڈ آف ہونے کے باوجود اسے وارڈروب میں موجود کپڑوں کو الٹ پلٹ کرتے دیکھ کر علیزے رہ نہیں سکی تھی اور بالا خر پوچھ ہی لیا تھا۔

”اپنا آف ڈائنٹ شلوار سوٹ۔“ دل اور بہت بے زار کن لہجے میں بولا تھا۔

”کیوں؟ شلوار سوٹ کیوں؟ تم نے کورٹ نہیں جانا؟“ علیزے کو حیرت ہوئی تھی کیونکہ وہ صبح کے وقت

شلوار سوٹ ذرا کم ہی پہنتا تھا۔

”نہیں! مجھے کہیں اور جانا ہے۔“ اس نے ذرا ٹھہرتے ہوئے جواب دیا تھا۔

”کہاں؟“ وہ بے ساختہ پوچھ بیٹھی۔

”قبرستان!“ دل اور کا جواب چونکا دینے والا تھا۔

”کیا؟ قبرستان؟ مگر کیوں؟“ علیزے ٹھٹھکی گئی تھی اور دل اور اس کے سوال پر دھیمپا دیا تھا۔

”اپنے ماں باپ سے ملنے اپنوں سے ملنے۔“ اس کا لہجہ بہت ہی نرم اور بہت ہی پکھلا ہوا سا لگنے لگا تھا۔

”کیوں؟ یوں قہقہہ صبح اٹھتے ہی کیسے خیال آگیا ان کا؟“ علیزے کا نجانے کیوں بار بار اس سے سوال کرنے کو دل چاہ رہا تھا۔

”رات کو خواب میں دیکھا تھا ان کو! ماں بہت رورہی تھیں اور بابا بھی! او اس تھے اس لیے آج میں نے سب سے پہلا کام یہی کرنا ہے کہ ان سے ملنے کے لیے جانا ہے۔ باقی کے کام بعد میں ہوتے رہیں گے۔“ دل اور کا اپنا

لب و لہجہ بھی کافی اواس لگ رہا تھا۔ اور علیزے نے کچھ کہتے کہتے رک گئی مگر وہ بھانپ چکا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی

”کہو؟ کیا کرنا چاہتی ہو؟“ دل اور نے اسے کہنے سے اکسایا۔

”نہیں! کچھ نہیں۔“ وہ نفی میں سر ہلاتی ہوئی آگے بڑھ آئی اور وارڈروب کے لاسٹ والے حصے سے دل اور کا

آف ڈائنٹ کھدر کا سوٹ نکال کر اس کے سامنے کر دیا تھا۔

”پلیز علیزے! جو کرنا چاہتی ہو وہ صاف صاف کہہ دو میں کوئی اعتراض نہیں کروں گا۔“ وہ بہت اواس مایوس

اور ملول سا لگ رہا تھا۔ علیزے نے زیادہ دیر چپ نہیں رہ سکی۔

”کیا میں بھی تمہارے ساتھ قبرستان جاسکتی ہوں؟ تمہارے بابا وغیرہ کی قبروں پر فاتحہ خوانی کے لیے؟“

علیزے نے بہت آہستگی سے پوچھا اور اس کا سوال ایسا تھا کہ دل اور اسے منع نہیں کر سکتا تھا۔

”کیوں؟ تم کیوں جانا چاہتی ہو؟“

”کیونکہ آج مجھے بھی اپنے ماما اور بابا بہت یاد آرہے ہیں۔ آج اگر وہ نہیں مل سکتے تو تمہارے اماں اور بابا سے

مل لیتی ہوں میرے لیے تو وہ بھی ماما اور بابا جیسے ہی ہیں نا؟“ علیزے کی بات پہ دل اور نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

”ماما اور بابا جیسے؟“ اس نے زیر لب بڑبڑا کے کہا تھا۔

”ہاں! ماما اور بابا جیسے کیونکہ وہ تمہارے ماما اور بابا ہیں! اس لیے میرے لیے بھی تو وہ ماما اور بابا ہی ہیں نا۔“ اور علیزے کی بات پہ دل اور اسے دیکھا کہ وہ گھبرا گیا تھا کہ اس نے کتنی اپنائیت بھری اور کتنی گہری بات کہی تھی۔

”کیا بات ہے؟ کیا میں نہیں جاسکتی؟“ اس نے دل اور کو جیب دیکھ کر دوبارہ پوچھا۔

”نہیں۔ نہیں۔! ایسی بات نہیں ہے، میرے کپڑے چھینچ کرنے تک تم بھی تیار ہو جاؤ۔ تھوڑی دیر میں نکلتے

ہیں۔“ دل اور اسے کہہ کر وہاں سے ہٹ گیا تھا اور علیزے کے چہرے پہ ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔

اسے دل اور کے بابا اور بتول شاہ کی قبروں پہ جانے کا سوچ کر بہت اچھا لگتا ہوا تھا۔ اسی لیے وہ جلدی سے چھینچ

کر کے بڑی سی سیاہ رنگ کی چادر اوڑھ کر فوراً تیار ہو گئی اور وہ دونوں باقاعدہ باد صوبو کر گھر سے نکلے تھے۔

”کیا قبروں پہ چڑھانے کے لیے پھول بھی مل جائیں گے؟“ علیزے نے ذرا میو کرتے دل اور کے چہرے کی

سمت دیکھا تھا۔

”ہاں مل جائیں گے۔“ اسے اس کی تسلی کے لیے جواب دینا ہی پڑا تھا۔

”کیا زری کی قبر پہ چڑھانے کے لیے بھی پھول مل جائیں گے؟“ اس نے اک اور تیر پھینکا۔

”علیزے!“ دل اور نے لب بھینچ لیا تھا۔

”تو اس میں غلط کیا ہے بھلا؟ زری بھی تو تقریباً“ مرہی چکی ہے نا؟ کیا ہوا جو وہ بے ہوشی سے ذرا ہوش میں آگئی

ہے؟“ علیزے بڑی ریلیکس نظر آ رہی تھی۔

”تم مجھے نارح کرنا چاہتی ہو نا؟“ دل اور نے بڑے ضبط کا مظاہرہ کیا تھا۔

”نہیں! میں زری کو اس کا حق دلانا چاہتی ہوں، تم سے اس معاملے کو لے کر علیزے اور زری میں انصاف کروانا چاہتی ہوں دیکھنا چاہتی ہوں کہ تم کتنے انصاف پرست آدمی ہو۔“ علیزے نے اسے چیلنج کیا تھا اور دل اور

نے ایک گہری سانس کھینچی تھی جیسے اس نے بھی کوئی ارادہ باندھ لیا ہو۔

”تھیک ہے! آج تمہیں جس چیز کا یقین نہیں ہے اس چیز کا یقین دلاتا ہوں، لیکن یہ یقین تمہیں زندگی میں

پہلی بار اور آخری بار دلاؤں گا اس کے بعد زندگی میں کبھی بھی مجھ سے کسی ایسے یقین کی امید مت رکھنا او میرے

ساتھ۔“ دل اور نے بہت ہی پتھریلے اور سپاٹ سے انداز میں کہتے ہوئے قبرستان کے باہر والے ایریا میں اک

جھٹکے سے گاڑی کو بریک لگائے تھے اور گاڑی سے اتر آیا مجبوراً اس کے پیچھے علیزے کو بھی اترنا پڑا اور دل اور

اس کے اترتے ہی پھول خریدنے میں لگ گیا۔ تازہ پھولوں کے دو الگ الگ شاپر لینے کے بعد وہ واپس اس کی

طرف پلٹ آیا۔

”یہ لوبہ زری کی قبر پہ چڑھانے کے لیے اور یہ اماں اور بابا کی قبروں پہ چڑھانے کے لیے ہیں۔“ اس نے دونوں

شاپر علیزے کو تھما دیے اور علیزے نے جیب چاٹ چاٹ بھی لیا تھا۔

”او۔“ وہ کہتے ہوئے قبرستان کے چھوٹے سے جالی دار سبز رنگ کے گیٹ کی طرف بڑھا۔ مگر ابھی قبرستان

کے اندر داخل ہوا ہی تھا کہ اس کا موبائل دوبارہ بجنے لگا۔ اس نے موبائل نکال کر دیکھا ایس پی کامران مہدی کی

کال تھی۔ مگر وہ قبرستان میں کھڑے ہو کر فون نہیں سنتا چاہتا تھا اس لیے اس نے ایس پی کامران مہدی کی کال ڈس کنیکٹ کر دی مگر اس کے ڈس کنیکٹ کرنے کے باوجود ایس پی کامران مہدی نے دوبارہ کال کی تھی اور دل اور

آدھنے دوبارہ ڈس کنیکٹ کر ڈالی تھی بلکہ اور تو اور موبائل کو سائلنٹ پہ لگا کر واپس جیب میں رکھ لیا تھا اور

علیزے کا ہاتھ پکڑ کر اوپنی نیچی جگہوں سے گزر تا ہوا تقریباً قبرستان کے وسط میں آگیا اور ایک ساتھ ہی تین

قبروں کے پاس رک گیا۔

”یہ ہے میرے بابا کی قبر۔“ اس نے سب سے پہلے قبر کی طرف اشارہ کیا۔
 ”بابر شاہ ولد منصور حسین شاہ!“ علیزے نے ان کا نام پڑھا تھا اور منصور حسین شاہ کے نام پہ دل اور کے چہرے کی طرف دیکھا جو دکھ اور اذیت سے دھوئیں کی طرح ہو رہا تھا۔
 ”یہ ہے میری اماں کی قبر۔“ اس نے دوسری قبر کی طرف اشارہ کیا۔
 ”بتول شاہ ولد منصور حسین شاہ۔“ علیزے بتول شاہ کا نام پڑھ کر ٹنگ رہ گئی تھی۔
 ”بتول شاہ ولد منصور حسین شاہ۔“ اس نے دوبارہ اور پھر سہ بارہ پڑھا تھا۔
 ”بتول شاہ ولد منصور حسین شاہ۔“ اس کے لب بار بار اہل رہے تھے مگر حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔
 ”ڈرائیور!“ وہ جیسے کسی یا تال سے بولی تھی۔

”ہاں! یہ سچ ہے یہ حقیقت ہے بتول شاہ میری ماں سہی لیکن قبر کے اس کتبے پہ اگر میری پھوپھی بن جاتی ہیں کیونکہ وہ میرے بابا کی سہی بن گئیں۔ لیکن میرے لیے میری ماں تھیں۔ آج بھی نکل بھی اور قیامت کے روز بھی وہ میری ماں ہی رہیں گی۔ وہ میری ماں کی حیثیت سے اور میں ان کے بیٹے کی حیثیت سے پہچانا جاؤں گا۔“ دل اور نے بڑے مضبوط کبجے میں اعتراف کیا مگر علیزے کے قدموں تلے سے زمین سرک گئی تھی۔
 ”تو کیا ڈرائیور کے ماں باپ دونوں ہی نہیں تھے؟ وہ محض اپنی پھوپھی کے سہارے زندگی بسر کر رہا تھا۔“ علیزے کے دل پہ ہاتھ پڑا تھا اور پہلی بار اسے ”اپنے ڈرائیور“ سے ہمدردی محسوس ہوئی تھی۔ اتنی ہمدردی کہ آنکھوں کے گوشے نم ہوتے محسوس ہوئے تھے۔

”اور یہ ہے میری امی کی قبر!“ اس نے بابر شاہ کی قبر کی دائیں سائیڈ والی قبر کی طرف اشارہ کیا۔
 ”فردوس شاہ زوجہ بابر شاہ“ علیزے نے دل اور کی ماں کا نام پڑھا اور پھر گرم سمی ہو کر رہ گئی۔ اس کے لیے یہ انکشاف کچھ کم نہیں تھا کہ بتول شاہ دل اور کی ماں نہیں بلکہ پھوپھی تھیں۔

”یہ ان تین افراد کی قبریں ہیں جو میرے اپنے تھے جو میرے سگے تھے جن سے میرا خون کا رشتہ تھا اور جن کے سوا میرا کوئی نہیں تھا ان کے بعد اس دنیا میں کسی کو اپنا سمجھا تو وہ صرف عبد اللہ اور نبیل تھے اور جب عبد اللہ اور نبیل سے دوستی ہوئی تو تب زری کہیں بھی نہیں تھی۔ ہماری اس دوستی کے درمیان زری کا کوئی وجود نہیں تھا وہ بہت بعد میں آئی تھی۔ میرے لیے وہ سب سے اہم اور سب سے پہلے تھے۔ ہاں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ زری کو دیکھا وہ اچھی لگی تھی پسند آئی تھی اس سے محبت بھی ہوئی تھی اسے چاہتا بھی تھا مگر ابھی اسے پانے کا خیال بھی دل سے نہیں گزرا تھا کہ مجھ سے اور اک ہوا کہ نبیل اسے مجھ سے بھی زیادہ چاہتا ہے مجھ سے بھی زیادہ محبت کرتا ہے وہ اسے مجھ سے بھی زیادہ اچھی لگتی ہے اور وہ اسے مجھ سے بھی زیادہ پسند ہے اور جب کسی ایک انسان کو دوسرے انسان کی پسند کا ادراک ہوتا ہے تو پہلا انسان کشمکش کا شکار ہو جاتا ہے کہ وہ کیا کرے؟ اپنی پسند کو حاصل کر لے یا دستبردار ہو جائے کسی کے دل کو روند ڈالے یا اپنے دل کی بیج سجائے؟ ایک بات۔ صرف ایک بات۔ تم خود سوچو علیزے اور انصاف کرو۔ اگر تم بازار جاؤ اور تمہیں وہاں کوئی چیز پسند آجائے اور تم اسے کسی بھی قیمت پر چھوڑنا نہ چاہو لیکن وہی چیز تمہاری بہن یا تمہارے کسی بھائی کو بھی پسند آجائے اور وہ بھی اسے چھوڑنا نہ چاہے تو تم کیا کرو گی؟ وہ چیز خود لے لو گی یا اپنے بہن یا بھائی کے لیے چھوڑ دو گی؟“ دل اور نے انتہائی سنجیدگی سے کہتے ہوئے اس سے انصاف چاہا تھا اور علیزے اس کے سوال پہ چپ کی چپ رہ گئی تھی۔

”بولو! جواب دو علیزے! وہ چیز خود لے کر اپنے دل کی خوشی پوری کر لو گی یا اپنے بہن یا بھائی کی خوشی کے لیے چھوڑ دو گی؟“ دل اور نے اسے اکسایا تھا۔ اور خود کو دل اور کی جگہ رکھتے ہوئے علیزے کا دل کانپ گیا تھا اور ہونٹوں پہ ہلکی سی جنبش ہوئی تھی۔

”چھوڑ دوں گی!“ جواب بہت مختصر تھا مگر اعتراف بہت بڑا تھا آخر انصاف جو کرنا تھا۔
 ”اس چھوڑ دینے میں تمہاری بزدلی ہو گی؟ یا تمہاری فراخ دلی ہو گی؟“ انصاف کے اس تراز پہ اس کے سوال مسلسل جاری تھے۔

”فراخ دلی ہو گی!“ علیزے نے اک اور اعتراف کیا۔
 ”کیا تمہارے دل میں اس چیز کو دوبارہ پالینے کی کوئی تمنا رہے گی یا نہیں رہے گی؟“ اس کا تیسرا سوال بھی ہنوز سنجیدگی اور انصاف کے تراز میں جھولتا ہوا سامنے آیا تھا۔
 ”نہیں رہے گی۔“ علیزے بھی اس انصاف کے معاملے میں انصاف سے ہی کام لے رہی تھی۔
 ”تو پھر اب اس بات کا بھی انصاف کرو کہ کیا میں زری کو اپنا سکتا تھا؟ جبکہ مجھے یہ بھی پتا چل چکا تھا کہ نبیل اس سے محبت کرتا ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہے؟“ ایک اور سوال آیا۔

”نہیں۔“ وہ بھی منصفی سے کام لے رہی تھی۔
 ”کیا کوئی عزت دار اور غیرت مند مرد یہ بات گوارا کر سکتا ہے کہ اس کی بیوی کو اس کا دوست دل ہی دل میں چاہتا رہے؟ اور وہ یہ بات جاننے کے باوجود بھی اپنی بیوی کے ساتھ خوش رہے؟“ دل اور نے علیزے کے سامنے امتحان اور انصاف کا ہر سوال کھول کے رکھ دیا تھا۔
 ”نہیں!“ علیزے کے ذہن اور عقل کے دروازے ہوتے جارہے تھے اور وہ دل اور کے احساسات کے بہت قریب پہنچ چکی تھی۔

”تو پھر میں زری کے ساتھ شادی کیسے کر سکتا تھا؟ کیسے اس کے ساتھ خوش رہ سکتا تھا کیسے گوارا کر سکتا تھا کہ اس سے شادی میں کروں اور اسے چاہے نبیل؟ جب ہم اپنے کسی بہن بھائی کی پسند کی ہوئی چیز خود استعمال کر لینے کا حوصلہ نہیں رکھتے تو پھر اپنے کسی بہن بھائی کی پسند کے جیون سا بھی کے ساتھ زندگی کیسے گزار سکتے ہیں بھلا؟ اور یہ صرف میری ہی بات نہیں ہے بلکہ میری جگہ نبیل بھی ہوتا تو ایسا ہی کرتا۔ اب یہی دیکھ لو اس نے ایسا ہی کیا ہے۔ اس نے مونہ بی بی سے شادی کر کے زری کی طرف جانے والے تمام راستے بند کر دیے ہیں تاکہ اسے اپنے دل کے ہاتھوں مجبور نہ ہونا پڑے۔ لیکن تم میری اس بات کو غلط مت سمجھنا میں نے زری سے بھاگنے کے لیے یا اس سے دور رہنے کے لیے تم سے شادی نہیں کی۔ میں نے صرف اپنی اماں کی خوشی کی خاطر تم سے شادی کی تھی۔ ورنہ دنیا میں خدا کی پاک ذات کے علاوہ ایسی کوئی طاقت نہیں تھی جو مجھے علیزے آنندی سے شادی کے لیے مجبور کر سکتی۔ میں مجبور ہوا تو صرف اپنی اماں کی وجہ سے۔ ورنہ شادی کرنا ہوتی تو میں کسی اور سے بھی کر سکتا تھا تم سے شادی کرنا ضروری نہیں تھا مگر جب قسمت میں ہی یہی لکھا تھا تو پھر ضروری بھی ہو گیا اور جب قسمت میں لکھا یہ ضروری کام ہو ہی گیا ہے تو اسے پورے دل سے اپنا بھی لیا ہے بغیر کسی کھوٹ اور بغیر کسی ملاوٹ کے۔ اب دل میں تمہارے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے علیزے۔ کچھ بھی نہیں۔“ دل اور نے اپنے دل جذبات کا اور دلی کیفیات کا بہت ہی کھل کے اظہار کیا تھا۔

”اور زری؟“ علیزے نے اسے آخری بار ٹٹولنا چاہا تھا۔
 ”علیزے! میں آج یہاں کھڑے ہو کے قسم کھاتا ہوں کہ زری کو میں بہت پیچھے چھوڑ آیا ہوں وہیں انگلیڈ کی فضاؤں میں۔ چند سال پیچھے اتنا پیچھے کہ اب مڑ کے دیکھنا بھی چاہوں تو وہ کہیں بھی نظر نہیں آئی۔ کیونکہ وہ میرے آس پاس کہیں بھی نہیں ہے نہ دل میں نہ دماغ میں اور نہ ہی سوچ میں ہاں اتنا ضرور یاد ہے کہ اسے چاہا تھا اس سے محبت کی تھی مگر اسے حاصل کیے بغیر اسے وہیں چھوڑ آیا اسے وہیں بھول آیا تھا یہ سوچ کر کہ میں کسی اور سے محبت کروں گا اور کسی اور سے شادی کروں گا۔ وہ ”کسی اور“ تم ہو گی یہ تو مجھے بھی اندازہ نہیں تھا۔ مگر یقین کرو

تمہارے سوا اور تمہارے بعد نہ کوئی اور علیزے ہو سکتی ہے اور نہ کوئی زری۔ میں تمہارے معاملے میں بالکل کھرا ہوں اس لیے مجھے کسی چیز کا کوئی ڈر نہیں ہے اور زری کے معاملے میں میری نیت اور میرا ضمیر بالکل صاف ہیں اس لیے میرے دل پہ کوئی بوجھ نہیں ہے۔ باقی اگر میں کسی معاملے میں قصور وار ہوں تو میں خدا کی عدالت میں حاضر ہوں وہ مجھے جو بھی سزا دے مجھے قبول ہوگی۔" دل آور نے آج ایسی باتیں کہہ دی تھیں کہ علیزے کے پاس جواباً کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں رہا تھا اور وہ چپ کی چادر اوڑھ کے رہ گئی تھی۔ جبکہ دل آور اس کی طرف سے رخ موڑ کر اپنی جیب سے رو مال نکال کر سر پہ باندھتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ فاتحہ خوانی کے لیے بلند کر چکا تھا اور علیزے کی نظروں نے اسے پہلی بار بڑے وہیمان سے یوں سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا اور پہلی بار اسے سامنے کھڑا اپنا "ڈرائیور" برا نہیں لگا تھا۔ جیسے ہی اس نے تینوں قبروں پہ فاتحہ پڑھنے کے بعد چہرے پہ ہاتھ پھیرا علیزے بے ساختہ چونک گئی اور فوراً "سنہلے ہوئے اپنے ہاتھ میں پکڑے شاپر میں سے پھول نکال کر قبروں پہ چڑھانے لگی اور دونوں شاپر خالی کرنے کے بعد اس نے بھی تینوں قبروں پہ فاتحہ پڑھی اور پھر آہستگی سے سر جھکا کر دل آور کے برابر آگئی تھی۔

"سارے پھول ان قبروں پہ چڑھا دیے۔ زری کی قبر پہ چڑھانے والے پھول کہاں گئے؟" دل آور نے اسے خالی ہاتھ دیکھ کر پوچھا تھا۔

"نہیں! اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بکے لے کر زری سے ملنے کے لیے جاؤں گی۔ کیا مجھے لے کر جاؤ گے؟" علیزے نے ذرا ملے پھلے موڈ میں بات کرنے کی کوشش کی تھی۔

"ہاں! ضرور لے کر جاؤں گا بلکہ آج ہی لے کر جاؤں گا۔" اس نے فوراً "ہامی بھری تھی اور علیزے اس کے مان جانے پہ بہت خوش ہوئی تھی۔

"متھنک یو!" اس نے بڑے ریلیکس انداز میں اس کا شکریہ ادا کیا۔

"ویکم!" وہ بھی دھیمے سے لہجے میں کہتا داپسی کے لیے قدم برہا چکا تھا اور اس کے ساتھ ہی علیزے بھی چل پڑی، لیکن ابھی وہ قبرستان سے باہر نکلے بھی نہیں تھے کہ انہیں سامنے سے مبارک خان آتا ہوا دکھائی دیا تھا اور علیزے مبارک خان کو دیکھ کر چونک گئی۔

"مبارک خان۔" علیزے نے زیر لب اس کا نام دہرایا تھا۔

"السلام علیکم علیزے بی بی! السلام علیکم صاحب! کیسے ہیں آپ؟" مبارک خان نے علیزے کو سلام کرنے کے بعد دل آور کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا اور اس سے حال چال بھی پوچھا تھا۔

"وعلیکم السلام! میں ٹھیک ہوں لیکن تم یہاں کیوں؟" دل آور کو کچھ تشویش ہوئی تھی۔

"میں بہت دیر سے آپ کے نمبر پہ کال کر رہا ہوں مگر آپ کال ریسیو نہیں کر رہے تھے تب مجھے گلاب خان کے نمبر پہ کال کرنا پڑی اور اس سے پتا چلا کہ آپ علیزے بی بی کے ساتھ قبرستان آئے ہوئے ہیں اور اس وقت خالی ہاتھ ہیں۔ سو مجھے مجبوراً "آپ کے پیچھے آنا پڑا۔"

مبارک خان کیا کہہ رہا تھا علیزے کے کچھ پلے نہیں پڑا تھا وہ تو بس ماؤف ہوتے مانع کے ساتھ ان دونوں کا اتنا دستا نہ انداز دیکھ رہی تھی اور ان کی گفتگو سن رہی تھی۔

"مگر کون؟" دل آور کو ابھن ہوئی تھی۔

"کیونکہ آپ کی جان کو خطرہ ہے۔ ملک اسد اللہ اور ملک حق نواز کے بندے مسلسل آپ کی تاک میں ہیں وہ کسی بھی وقت آپ پر حملہ کر سکتے ہیں اور یہ حملہ آپ کے لیے خطرناک اور نقصان دہ بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ان کے عزائم کچھ اچھے نہیں ہیں۔" مبارک خان اس کے لیے متفکر ہو رہا تھا اور علیزے پاگل ہو جانے کو بھی اسے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

مہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی متن مختلف
- ✧ سائزوں میں ایلو ڈنگ
- ✧ پیریم کوئی تبدیلی، کپی رائٹنگ
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور
- ✧ ابن صفی کی مکمل ریٹ
- ✧ ایڈمری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے نہیں اور جانے کی ضرورت نہیں جاری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک ویکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

غش آرہے تھے۔
”تمہیں کیسے پتا؟“ وہ یقین کرنا چاہتا تھا۔
”صاحب! آپ کا بندہ ہوں، آپ کا نمک کھاتا ہوں، آپ کے اچھے برے کی خبر نہیں رکھوں گا تو اور کیا کروں گا؟ آپ کی فکر کرنا، آپ کا دھیان رکھنا میرا فرض بنتا ہے اور میں یہ فرض ضرور نبھاؤں گا آپ بس یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں۔ ایس پی کامران ممدی بھی بہت پریشان ہیں آپ کے لیے۔“ مبارک خان واقعی اس کے لیے بہت پریشان ہو رہا تھا۔

اور علیز نے یہ جان کر ششدر سی رہ گئی تھی کہ اس کے ڈیڈ کا اور بڑی حویلی کا بہت ہی خاص اور بہت ہی با اعتبار ملازم مبارک خان کوئی اور نہیں بلکہ دل آور شاہ کا خاص آدمی تھا جس نے ہمیشہ دل آور شاہ کے لیے ہی کام کیا تھا یہاں تک کہ بڑی حویلی میں بھی۔!

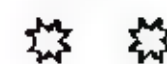
”کیا مطلب؟ کیا کتنا چاہ رہے ہو تم؟“ دل آور بھی چونک گیا۔
”میرا مطلب ہے کہ حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ میں ہر طرف خطرے کی بو محسوس کر رہا ہوں آپ بس علیز سے لی بی کو لے کر یہاں سے جلدی نکلیں ورنہ کوئی بڑا نقصان بھی ہو سکتا ہے۔“ مبارک خان کی ہیشین گوئی کبھی غلط نہیں ہو سکتی تھی اسی لیے دل آور بھی علیز کے خیال سے ایک دم الارٹ ہو گیا اور سر پہ بندھا رومال اتار کر جیب میں رکھتے ہوئے علیز کے کاتھ کا کافی مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔

”چلو علیز۔! جلدی نکلو یہاں سے۔“ اس نے علیز کے کواپنے ساتھ کھینچا۔
”مہم۔ تم۔ یہ۔ مبارک خان۔ یہ سب کیا ہے؟“ علیز نے مبارک خان کے متعلق جاننا چاہتی تھی۔
”یہ سب تمہیں بعد میں بتاؤں گا“ ابھی چلو۔“ دل آور کو اپنے بجائے علیز کے کی فکر تھی اسی لیے علیز کے کو بازو کے گھیرے میں لیتے ہوئے قبرستان سے باہر نکل آیا اور ان کے پیچھے اپنا اسلحہ چادر کے نیچے چھپائے مبارک خان بھی باہر آگیا تھا۔ دل آور کو تیز تیز قدموں سے اپنی گاڑی کی طرف بڑھتے دیکھ کر بڑے سے درخت کے پیچھے چھپے ایک آدمی نے ایک دم فائرنگ کر ڈالی تھی اور فائرنگ کی اتنی ہولناک آواز سے وہ ہشت زدہ سی علیز بے بس ساختہ دل آور سے لپٹ گئی تھی اور اس کے لپٹنے کی وجہ سے جو گولی دل آور کے سینے میں آگری ہوئی تھی وہ علیز کے کندھے میں جا بھسی تھی اور علیز کے کی چیخوں سے پوری فضا گونج اٹھی تھی اور دوسری گولی علیز کے بازو کو چھید کے رکھ گئی تھی۔

”دراپور!“ علیز نے اس کے بازوؤں میں لہرائی تھی۔
”علیز۔“ دل آور کی اس افتادہ آنکھیں پھٹ گئی تھیں وہ اسے خون میں لت پت دیکھ کر پاگل ہوا تھا اور علیز کے کو دیوانوں کی طرح اپنی بانہوں میں جھنجھوڑنے کی کوشش کی تھی۔

”علیز۔! علیز۔!“ وہ زور زور سے پکار رہا تھا مگر علیز نے ہر چیز سے غافل ہو چکی تھی اور دوسری طرف مبارک خان نے ملک حق نواز کے بندوں کو گولیوں سے چھلکی کر ڈالا تھا لیکن دل آور کو علیز کے سوا کچھ نہیں سوچ رہا تھا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا بس وہ تھی اور اس کا بہتا ہوا خون نظر آرہا تھا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)



سمش مارا نہیں سیکھا اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔
—۳۸—
ان تیسویں قسط پہ



نبیلہ عزیز

دردِ دل

بڑی حویلی کے تمام کمین و قار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی محبت بہت ہی متاثر ہے۔
مدھیہ اور نبیلہ حیات دہی بہن بھائی ہیں مدھیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے وہ انگلینڈ کی رنگینوں میں مکمل طور پر رنگ چکی ہے جس کے پیش نظر فائرہ بیگم نبیلہ کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں لیکن مدھیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے جس پہ نبیلہ اور فائرہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔
زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر باندھ کر رہا ہے۔
نبیلہ کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا ہے نبی اور فیورٹی سے تنگ آخر خود کشی کرنے کا سوچتا ہے لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے یاؤ امتیاز مل جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔
منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیجتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔
درا آذر شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے وہ اپنے قول و فعل کا بہت ریکا آدمی ہے اس



جس کی وجہ سے اس کی آنکھیں اور اس کا چہرہ لہو رنگ ہو گئے تھے اور وہ پھرنے لگا تھا۔

”مبارک خان۔ مبارک خان۔ گاڑی کا دروازہ کھولیں۔ جلدی کرو۔“

دل اور خود بے بس تھا۔ وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ علیزے اس کے بازوؤں میں جھول رہی تھی۔ اسی لیے وہ مبارک خان پہ دھاڑا تھا۔

اور مبارک خان نے اسی دہشت زدہ اور افراتفری کے ماحول میں انتہائی تیزی اور ہماروی کا مظاہرہ کرتے ہوئے لپک چمپک آگے بڑھ کے گاڑی کا دروازہ کھول دیا تھا۔

”صاحب۔ جلدی کریں۔“ مبارک خان نے پلیٹ کر زور سے اسے آواز دی اور دل اور گاڑی کا دروازہ کھلا دیکھ کر علیزے کو اپنی بانہوں میں اٹھا کر تیزی سے گاڑی کی سمت لپکا اور اسے گاڑی کی بیک سیٹ پہ لٹا کر خود انتہائی عجلت سے دروازہ بند کرتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔

”مبارک خان تم یہاں اکیلے۔“ گاڑی نکالتے نکالتے وہ اکٹل کے لیے ٹھہرا تھا۔

”صاحب۔ آپ میری فکر نہ کریں۔ میں نشت لوں گا ان لوگوں سے آپ علیزے بی بی کو اسپتال لے کر جائیں۔ کہیں کوئی بڑا نقصان نہ ہو جائے۔ پلیز جلدی جائیں آپ۔“

مبارک خان اسے تسلی دیتے ہوئے اس کی گاڑی کا دروازہ ہاتھ سے بجاتے ہوئے پیچھے ہٹ گیا تھا اور دل اور اس کی تسلی پہ سر ہلا کر گاڑی بڑھانے لگا تھا۔

پھر پیچھے کیا گیا ہوا اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ اسے خبر تھی تو صرف علیزے کی۔

علیزے۔ اس نے بچوں کی طرح پلیٹ کر پیچھے دیکھتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔

مگر وہ ہوش و خرد سے بے گانہ پڑی تھی اور اس کے جسم سے خون مسلسل بہہ رہا تھا۔ اس کے جسم سے بہتے خون کو دیکھ کر دل اور کوئی محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے اپنے جسم سے خون بہہ رہا ہو اور اس کے وجود کی رگیں لمحہ بہ لمحہ خالی ہوئی جا رہی ہوں۔ اس خیال سے اس نے گاڑی کی اسپید اور زیادہ بڑھا دی تھی اور اپنی اس بدحواسی اور افراتفری کے عالم میں اسے یہ بھی دھیان نہ رہا کہ وہ علیزے کو کس اسپتال لے کر جا رہا ہے۔

کیونکہ اس کے حواس ہی ٹھکانے نہ تھے۔ وہ اسپتال کے احاطے کے اندر گاڑی کو بریک لگاتے ہوئے تیزی سے نیچے اتار اور گاڑی کا بیک ڈور کھولتے ہی بے تابی سے علیزے کی نبض ٹٹولی تھی۔

نبض رواں تھی مگر بہت ہی مدھم رفتار سے۔

اور اس کی ڈوبتی نبض کے احساس نے دل اور کو اور بھی یا گل کر ڈالا۔ وہ اسے بانہوں میں اٹھا کر اندھا دھند اسپتال کے اندر کی طرف بھاگا تھا۔

اور سامنے سے آتا عبد اللہ حیران رہ گیا تھا۔ مگر دل اور کے بازوؤں میں خون سے لٹ پٹ علیزے کو دیکھ کر اس کی حیرانی پریشانی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ وہ لپک کے دل اور کی طرف بڑھا۔

”دل اور۔ یہ کیا ہوا ہے علیزے بھابھی کو؟“ عبد اللہ اس کے سامنے آگیا تھا۔

مگر دل اور کے پاس ایک سیکنڈ ٹھہرنے کا بھی وقت نہیں تھا اور نہ ہی جواب دینے کے لیے ذہن حاضر تھا۔ وہ وہاں اس کے بغیر اور کچھ کے بغیر آگے بڑھتا چلا گیا تھا اور اس کے پیچھے پیچھے عبد اللہ بھی اسے اسپتال کا اسٹاف بھی جمع ہو گیا تھا۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے علیزے کو اسٹریچر پہ ڈالا گیا اور فوراً ہی اسے آپریشن تھیٹر میں لے جایا گیا تھا اور دل اور وہیں کا وہیں باہر ہی رہ گیا تھا۔

”دل اور۔ یہ کیا ہوا ہے علیزے بھابھی کو؟ ان کی یہ حالت کیسے ہوئی ہے۔“

عبد اللہ کے دل کو نہ جانے کیوں اکٹ عجیب سی تکلیف کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کا دل علیزے کا خون دیکھ کر خود بخود ہی اس کی سمت ہنچ رہا تھا۔

اور وہ بار بار دل اور سے استفسار کر رہا تھا جبکہ دل اور سر جھکائے چپ چاپ کھڑا تھا جواب ہی نہیں دے رہا تھا۔

”دل اور۔ تم بتاتے کیوں نہیں ہو؟ کیا ہوا ہے علیزے بھابھی کو؟ کس نے یہ۔“

”کیا بتاؤں تمہیں؟ کیا بتاؤں آخر؟ کیا سننا چاہتے ہو؟ یہ کہ علیزے کی حالت تمہارے بھائی ملک اسد اللہ کی کمینگی کا نتیجہ ہے۔ وہ ذمہ دار ہے۔ اس نے کروایا ہے سب کچھ۔ اس نے مجھ پہ قاتلانہ حملہ کروایا ہے مگر نشانہ نہ بن سکی۔“

اس کی گولی کا شکار ہو گئی ہے وہ۔ مار ڈالا ہے اس نے علیزے کو۔ جان لے لی ہے اس کی۔“ دل اور اس کے پوچھنے پہ یکدم پھٹ پڑا تھا اور عبد اللہ کے قدموں تلے سے زمین سرک گئی تھی۔

وہ دم بخود سا رہ گیا تھا اور اس کے کانوں میں سائیں سائیں سی ہونے لگی تھیں۔

”یہ۔۔۔ کک کیا کہہ رہے ہو تم۔“ عبد اللہ کی آواز بے ربط سی ہو گئی تھی۔

”میں جو کہہ رہا ہوں وہ غلط نہیں ہے مگر عبد اللہ میری بات ایک یاد رکھنا کہ اگر علیزے کو کچھ ہوا تو میں اسی علیزے کی قسم کھا کے کہتا ہوں کہ ملک حق نواز اور ملک اسد اللہ کو بیچ چور ہے میں باندھ کر گولیوں سے چھنی نہ کروں تو سمجھ لینا کہ میں بابر شاہ کا بیٹا ہی نہیں تھا۔“

دل اور کی آنکھوں میں غضب ناک کے لال ڈورے تیر رہے تھے اور اس نے وہ قسم کھالی تھی جس کو سن کر عبد اللہ بھی سر سے لے کر پاؤں تک کانپ گیا تھا۔

کیونکہ اسے دل اور کے مزاج کا بخوبی پتا تھا۔ وہ اپنے غیض و غضب اور اپنے انتقام میں کچھ بھی کر سکتا تھا۔ چاہے اس کے بعد اسے پھانسی ہی کیوں نہ چڑھنا پڑ جاتا۔

”دل اور صاحب آپ ٹھیک تو ہیں نا؟“ ایس بی کامران ممدی فل پو نیقارم میں ملبوس بہت سی متفکر سے انداز میں کہتے ہوئے دل اور کے قریب آ کر کھڑا تھا۔

”میں کتنا ٹھیک ہوں۔ آپ میرے حلیے سے دیکھ سکتے ہیں۔“ دل اور نے اپنے خون سے رنگے کپڑوں اور اپنے چہرے کی طرف اشارہ کیا تھا۔

”جی ہاں۔ مجھے اطلاع مل چکی ہے۔ آپ کی وائف کے بارے میں سن کر بہت افسوس ہوا ہے اب کہاں ہیں وہ؟ زیادہ خطرے کی بات تو نہیں ہے۔“

ایس بی کامران ممدی کو خاصی تشویش ہو رہی تھی کیونکہ اسے اندازہ تھا کہ دل اور پہلے بھی ایک عظیم دکھ اٹھا چکا ہے۔ اب ایک اور دکھ سننے کی یقیناً اس میں بھی بہت نہیں ہوگی۔ آپ دعا کریں کہ زیادہ خطرے کی بات نہ ہی ہو تو بہتر ہے ورنہ کسی کے بھی حق میں اچھا نہیں ہوگا۔“ دل اور کے ذہن میں بار بار ملک حق نواز اور ملک اسد اللہ ہی گردش کر رہے تھے۔ وہ انہی کے متعلق سوچ رہا تھا۔

”سوری سر۔ ڈاکٹر صاحب نے آپریشن کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ یہ ایک پولیس کیس ہے۔ آپ پہلے اپنا اسٹیٹ منٹ ریکارڈ کروائیں۔“

ایک لمبا ڈور نے آکر دل اور کو اطلاع دی اور دل اور کے پہلے سے گھومے ہوئے داغ سے شرار سے نکلنے لگے۔ اس نے کیا ڈور کو یکدم گریبان سے دیوچ لیا تھا۔

”کیا کہا؟ ڈاکٹر نے آپریشن سے انکار کر دیا ہے۔“ وہ دانت پیستے ہوئے غریبا تھا۔

”پلیز دل اور۔ یہ کیا کر رہے ہو تم؟ یہ کیا یا گل بین ہے آخر بس کرو سنبھالو اپنے آپ کو۔“ عبد اللہ نے جھنجھلاتے ہوئے دل اور کے ہاتھ سے اس کا ڈور کا گریبان چھڑا کے دل اور کو اپنی سمت کھینچ لیا تھا۔

”پلیز ایس بی صاحب۔ آپ ڈاکٹر سے بات کریں۔ ان سے کہیں کہ آپریشن جلدی شروع کریں بھابھی کی حالت بہت خراب ہے۔ اس طرح لیٹ کرنے سے کوئی بڑا نقصان نہ ہو جائے۔“

عبد اللہ نے دل اور کو سنبھالتے ہوئے ایس بی کامران ممدی سے ریکورسٹ کی تھی۔

”او کے۔ میں بات کر لیتا ہوں، آپ ان کا خیال رکھیں۔ اسی مصیبت اور نقصان کے ڈر سے ہی تو میں باران کے موبائل پر کال کر رہا تھا، مگر انہوں نے میری کال ہی ریسو نہیں کی۔ کیونکہ مجھے ملک حق نواز اور اسد اللہ کے عزائم کی خبر ہو چکی تھی۔“

ایس بی کامران مہدی افسوس کا اظہار کرتا وہاں سے ہٹ کے آپریشن تھٹر کی طرف آگیا اور پھر اگلے منٹ میں علیزے کا آپریشن اشارت ہو گیا تھا۔

”بیٹھ جاؤ اور دعا کرو کہ سب ٹھیک ہو جائے۔“ عبد اللہ نے اسے سہارا دے کر صوفے پر بٹھایا۔

”عبد اللہ۔۔۔ علیزے کو کچھ ہو گیا تو کچھ بھی نہیں بچے گا۔ کچھ بھی نہیں یا میں خود کو ناز والوں کا یا باقی سب موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔ بس علیزے کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ میری اور ملک حق نواز کی اس جنگ کی علیزے کو نہیں ملنی چاہیے وہ بے قصور ہے۔ اسے میں نے سزا نہیں دی تو کوئی کیسے دے سکتا ہے؟ آخر کیسے؟ میری زندگی ہے وہ۔ اتنی کی وجہ سے تو جی رہا ہوں میں۔ ورنہ اس دنیا میں رکھا ہی کیا ہے؟ سب بے کار سب فضول ہے، صرف وہی وہ ہے اور اس کی وجہ سے میں ہوں۔“ علیزے کی موت کے خیال نے دل اور حقیقتاً جیسے پاگل کر ڈالا تھا۔

اس کے منہ میں جو آ رہا تھا وہ بولتا جا رہا تھا۔

لیکن کیا کیا بول رہا ہے اسے خود احساس ہی نہیں تھا۔

مگر عبد اللہ کو اس کے بولنے سے اندازہ ہو چکا تھا کہ اسے علیزے سے کتنی محبت ہے اور اس کی اس محبت کتنی شدت ہے۔

کیونکہ اس کی شدت اور اس کی محبت تو اس کے الفاظ سے ہی ظاہر ہو رہی تھی۔ بلکہ اس محبت اور شدت میں اس کا روال رواں توب رہا تھا۔

جس کو سوچ کر اور محسوس کر کے عبد اللہ نے بے ساختہ اک گہری سانس کھینچی تھی اور دوبارہ سے اسے دینے میں لگ گیا کیونکہ اس وقت دل اور کوسلی اور سہارے کی ہی ضرورت تھی۔



”عبد اللہ! اتنی دیر سے کہاں تھے آپ؟ میں اور زری کب سے آپ کا انتظار کر رہی تھیں۔ زری نے مدھیہ کال کر لی تھی مگر موبائل ہی آپ کے پاس تھا۔“

نگارش عبد اللہ کے ہاتھ کی دستک سنتے ہی برائے روم سے باہر نکل آئی کیونکہ اس کے خیال میں زری چکی تھی لیکن اسے کیا خبر نہیں تھی کہ زری تو محض پلکیں موندے لیٹی ہے۔

”بس دل آورے کے ساتھ بھوڑا بڑی ہو گیا تھا۔“ دروازہ اوٹھ کھلا تھا۔ اس لیے دونوں کی آواز اندر تک دے رہی تھی۔

”دل آور بھائی! کہاں تھے وہ؟“ نگارش چونکی تھی اور زری اس کے نام پر جیسے سنائے میں آگئی تھی۔

”اسی اسپتال میں۔“ عبد اللہ کا انداز بہت دھیمہ تھا جس پر نگارش اب مزید تشویش کا شکار ہوئی۔

”اسی اسپتال میں! مگر کیوں؟ خیریت تو ہے نا؟“

”خیریت نہیں ہے نگارش دل آور۔ اسد اللہ بھائی نے قاتلانہ حملہ کروایا ہے اور اس وقت علیزے بھاہا دل آورے کے ساتھ تھیں جس گولی کا نشانہ دل آور نے کو بٹھا تھا اس گولی کا نشانہ علیزے بھاہی بن گئیں اس وقت اسی اسپتال کے آپریشن تھٹر میں موت اور زندگی کی جنگ لڑ رہی ہیں۔“

عبد اللہ نے نگارش کی سماعتوں پر ہم پھوڑ دیا تھا۔ وہ یہ خبر سن کر ششدر رہ گئی تھی اور یہی حال اندر پڑی زری کا بھی ہوا تھا۔

”نگارش۔۔۔ مجھے نہیں لگتا تھا کہ دل آور علیزے بھاہی سے محبت کرتا ہے۔ مگر آج علیزے بھاہی

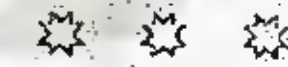
تکلیف یہ وہ کس طرح پاگل اور دیوانہ ہو رہا ہے۔ یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھ کر مجھے احساس ہو گیا ہے کہ وہ واقعی علیحدہ بھاگنے سے بہت زیادہ محبت کرتا ہے۔
عبداللہ نے نگارش کے سامنے اپنی سوچ کو لفظوں کا پیرا بن دیا تھا۔ لیکن اندر بیڈ نہ ویران اور اجاڑ پڑی زری کے من میں دور دور تک اور بھی سنائے جھانکے تھے۔
اور آنکھوں سے وہ آنسو نہ کر اس کی ٹپٹیوں میں جذب ہو گئے تھے۔
”محبت“ زری کے لب کھپکھپاتے تھے۔

”زری سے کہو وہ دل آورے کو اپنی محبت سے آزاد کر دے ہمیشہ کے لیے کیونکہ وہ اس کا نہیں ہے اور نہ ہی کبھی ہو سکتا ہے اس لیے اسے آزادی بخش دے۔ نکال دیے اسے دل سے۔ بھول جائے اسے بھول جائے۔“
عبداللہ نے زری کے اس معاملے میں پہلی بار زبان کھولی تھی۔ مگر وہ بھی بے بسی اور مایوسی کی انتہا کو چھونے کے بعد۔

اور عبداللہ کے لیے اور انداز کی اس بے بسی اور مایوسی کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کرتے ہوئے زری نے یوں ہی لینے لینے ایک گہری سانس خارج کی تھی اور پلکیں کھول دی تھیں۔
”بھائی! میں نے دل اور شاہ کو اپنی محبت سے آزاد کر دیا۔ میں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آزاد کر دیا ہے۔ کیونکہ وہ میرا نہیں ہے اور نہ ہی کبھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے اسے آزادی بخش دی ہے۔ نکال دیا ہے اسے اپنے دل سے۔ بھول گئی ہوں اسے بھول گئی ہوں سچ بھول گئی ہوں۔“ زری نے زری لب کھپکھپاتے لیے اور کھپکھپاتے ہونے سے کہتے ہوئے اپنے لرزتے کانٹے ہاتھ سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے تھے۔
اور اسے یوں لگا جیسے اس کے دل سے کوئی بہت بڑا بوجھ سرک گیا ہو۔
ہمہ وقت دل اور شاہ کی محبت سے بھر رہے والے دل خالی ہو گیا ہو۔
بالکل ایسے جیسے کوئی خالی برتن ہو۔

اب یہ خالی برتن ٹوٹا یا سلامت رہتا ہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔
وہ اسے آزاد کر کے خود بھی آزاد ہو گئی تھی ریلیکس ہو گئی تھی۔ یوں جیسے کوئی مرنے کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پرسکون ہو جاتا ہے۔

خود تم سے ملنے آئی بھی
اور اگر بہت پچھتائی بھی
اب جھیلوں گی خاموشی سے
پوری بھی تنہائی بھی
اگ کھیل کھیل تھا سوچ میں بار گئی
اس کھیل میں بھی رسوائی بھی



تحقیق ہو تو رُوح دو عالم ترب اٹھے
انتظار تیرے بغیر بریشان رہا ہوں میں

آپریشن تھیر کا دروازہ کھلتے دیکھ کر وہ یکدم لپک کے شیر کی سی تیزی سے دروازے کے قریب آیا تھا۔
”ڈاکٹر صاحب! کیسی ہے وہ؟ وہ زندہ تو ہے نا۔“ اس نے ڈاکٹر سے بہت ہی ڈرتے ڈرتے سوال کیا تھا۔
”آپ فی الحال اس سوال کو چھوڑیں اور ان کے لیے بلڈ کا انتظام کریں۔ ان کے لیے بہت زیادہ بلڈ کی ضرورت ہے۔“ ڈاکٹر نے دل اور کے سوال کو سرے سے نظر انداز کرتے ہوئے علیحدہ کے لیے ایک اہم ضرورت کا اعلان کیا تھا اور دل اور اس اہم ضرورت کا سن کر ساکت و صامت سا رہ گیا تھا۔ کیونکہ وہ علیحدہ کا بلڈ گروپ

جانتا تھا۔

”بلڈ۔“ اس نے بے حد آہستگی سے دہرایا تھا۔

”جی ہاں۔ بلڈ ہی کہا ہے۔“ ڈاکٹر نے بھی دہرا کے جواب دیا تھا۔

”لیکن اس کا گروپ تو او نیگٹیو ہے۔“ دل اور کے دل سے دھواں نکلنے لگا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے وہ چمچ ہار میں پھنس گیا ہو اور اس کا ہاتھ علیحدہ کے ہاتھ سے چھوٹ رہا ہو۔

”جی ہاں۔ ان کے بلڈ گروپ کی رپورٹ آچکی ہے۔ اسی لیے ہمارے ہاتھ ساتھ اب آپ کو بھی اس کام کے لیے کوشش کرنا ہوگی۔ ورنہ ان کے بچنے کے چانسز بہت کم ہیں۔“ ڈاکٹر نے کہتے ہوئے جیسے دل اور کے دل پر ہاتھ ڈالا تھا۔

”لیکن ڈاکٹر آپ کو بتا ہے کہ او نیگٹیو تو بہت ہے۔“ اس نے کچھ کہنا چاہا تھا۔

”ہاں۔ مجھے پتا ہے۔ لیکن آپ ان کی فیملی سے رجوع کریں۔ آئی ہوپ کسی نہ کسی کا بلڈ گروپ ضرور میچ کرے گا۔“ ڈاکٹر نے اسے ایک اور مشورہ دیا تھا۔

”فیملی۔“ دل اور کے ذہن میں بڑی جوتی کا نقشہ گھوم گیا تھا لیکن وہاں جاننا یا پھر ان لوگوں سے اب کسی اچھے کام کی یا کسی ہیملپ کی امید رکھنا سراسر فضول تھا۔

”اور ہاں۔ فیملی سے یاد آیا۔ آپ کی مسز کے پیرنٹس کہاں ہیں؟ انہوں نے اتنی تکلیف اور بے ہوشی کے باوجود اپنے بایا کو یاد کیا ہے۔ اگر ممکن ہے تو پلیز۔ آپ ان کے فادر کو یہاں بلا لیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے فادر یا مدر سے مل کر ان کی آواز سن کر زرا جلدی کو کر لیں۔ میں نے ان کے منہ سے دو تین بار بایا کا لفظ سنا ہے۔“ ڈاکٹر کی اس نئی اطلاع پر دل اور دم بخود رہ گیا اور اس کے آس پاس ایک عجیب سی سائیں سائیں کی آواز سنائی دینے لگی۔

”میرا صاحب! زیادہ سوچنے کا ٹائم نہیں ہے۔ آپ کی وائف کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔ آپ نے جو کچھ کرنا ہے ابھی کرنا ہے۔ پلیز بہری اب۔“ ڈاکٹر اس کا کندھا تھپک کر لیٹ گیا۔

”سنیے ڈاکٹر صاحب۔“ عبداللہ کی آواز پر ڈاکٹر کو غفلت کے باوجود رہنا پڑا۔

”میرا دوست اس وقت صدمے کی حالت میں ہے۔ اسے یہ بھی یاد نہیں ہے کہ میرا بلڈ گروپ بھی او نیگٹیو ہی ہے۔“ عبداللہ نے ذرا سا مسکرا کے کہا تھا اور دل اور نے بری طرح چونک کر دیکھا تھا۔

اور عبداللہ کی مسکراہٹ پر اسے یاد آیا تھا کہ ان تینوں نے انگلینڈ میں اپنے بلڈ گروپ چیک کروائے تھے اور تینوں کے گروپ الگ الگ تھے۔ کسی ایک کا بھی ایک دوسرے سے میچ نہیں ہوا تھا۔

”ارے۔۔۔ یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے لیکن صرف ایک پیگ سے کام نہیں چلے گا۔ مزید بلڈ کی ضرورت پھر بھی رہے گی۔“ ڈاکٹر کو سن کر خوشی ہوئی تھی۔

”آپ کو جتنی ضرورت ہے آپ لے لیں۔“ عبداللہ نے دل اور کی خاطر اپنا آپ حاضر کر دیا۔

”تو میرے ہم ایک وقت میں صرف ایک ہی پیگ لے سکتے ہیں۔“ ڈاکٹر نے انکار کر دیا۔

”ڈاکٹر پلیز۔“ ایک نرس نے آپریشن تھیر سے نکلتے ہی ڈاکٹر کو پکارا تھا اور ڈاکٹر ان دونوں کو جلدی کا اشارہ کر کے آپریشن تھیر میں گھس گیا تھا۔

”دیکھو دل اور۔۔۔ پلیز ہوش سے کام لو۔۔۔ ہوش میں آؤ۔۔۔ اس طرح بت بے رہنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ علیحدہ بھاگنے کو تمہاری ضرورت ہے۔ سنبھالو اپنے آپ کو۔۔۔ جاؤ جیسے بھی سہی ان کی فیملی سے کانٹیکٹ کرو۔ اس وقت علیحدہ بھاگنے کو ان کی بھی ضرورت ہے پلیز سمجھو یا۔“

دل اور جوں کا توں کھڑا تھا۔ جب عبداللہ نے اپنے مخصوص مردانہ اسٹائل میں اس کا کندھا تھپکا تھا اور دل اور نے کچھ سوچتے ہوئے بڑے ہی پر عزم انداز میں گردن موڑ کر عبداللہ کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی ویب سائٹ

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

مجموعہ خاص کیوں ٹیلیں :-

- ☆ ہر ای ٹیک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای ٹیک کا پرنٹ پر یو یو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای ٹیک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ مہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں ایڈوڈنگ
- ☆ سیریم کوالٹی، اندل کوالٹی، کمپریٹڈ فائل
- ☆ عمران سیریز، مینار منظر، کلیم اور امین صفی کی مکمل رینج
- ☆ ایڈ فوری لنکس، لنکس کو میسج کمانڈ کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں، ہر ری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

”علیہ کے لیے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں عبد اللہ اور اس کی خاطر آج میں وہ کام کروں گا جو میرا سر بھی کٹ جاتا تو میں نہ کرتا۔“ دل اور نے کہتے ہوئے عبد اللہ کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹا دیا تھا۔

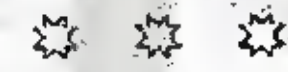
”کیا مطلب؟“ عبد اللہ کو حیرت ہوئی۔

”مطلب بعد میں بتا دے گا۔ ابھی میں کہیں جا رہا ہوں۔“ دل اور نے ایک پر عزم سی سانس کھینچتے ہوئے کہا اور اپنے چہرے پر ہاتھ پھیر کر چہرے کے تاثرات کنٹرول کرتے ہوئے قدم آگے بڑھا دیے۔

”لیکن تم جا کہیں رہے ہو؟“ عبد اللہ ایک بار پھر لپک کے اس کے سامنے آیا۔

”میں آج تم سب کا مقروض ہونے جا رہا ہوں۔ میں انجاد شاہ سے فقیر ہونے جا رہا ہوں۔ میں آج بھیک مانگنے جا رہا ہوں اب دیکھو کہ ہوتا کیا ہے۔“ دل اور اس کا کندھا ٹھپک کے آگے بڑھ گیا تھا اور عبد اللہ پیچھے کھڑا اس کی پشت دیکھتا رہ گیا۔

”سر پلینر۔ آپ میرے ساتھ آئیے۔“ نرس نے قریب آکر عبد اللہ کو متوجہ کیا تھا اور عبد اللہ سر جھٹک کر نرس کے ہمراہ اسپتال کی لیبارٹری میں آگیا تھا۔



شام ڈھل رہی تھی۔ سب اپنے اپنے کام سے واپس آچکے تھے۔ حویلی میں روزانہ کی طرح آج بھی گہما گہمی زور پکڑ چکی تھی اور بچن میں کھانے کی تیاریاں بھی عروج پر تھیں۔ بڑی حویلی میں بہت عرصے بعد زندگی کا احساس دوبارہ سے محسوس ہوا نظر آ رہا تھا اور آذر ان سب کو ایک نظر دیکھ کر واپس پلٹ گیا تھا۔

اور ابھی وہ ڈرائنگ روم سے نکل کر باہر لان میں آیا ہی تھا کہ اس کے پرسکون ہونے ذہن پہ اک اور پتھر آ رہا تھا اور بڑی مشکل سے ٹھہرنے والی سوچ کی لہر اس ایک بار پھر منتشر ہو گئی تھیں۔

کیونکہ ان کی حویلی کے گیٹ کے اندر ڈرائیو دے پہ ایک پراڈو آکر رکی تھی اور اس پراڈو سے اترنے والی شخصیت کو دیکھ کر آذر کا اچھا بھلا پرسکون دماغ ٹھوم گیا تھا۔

”منصور حسین۔۔۔“ آذر نے زیر لب دہرایا تھا۔

”ہیں منصور حسین۔“ اسنے کسی کام سے باہر نکلتی رجو بھی اپنی جگہ پر ساکت و صامت سی ہو گئی تھی۔ بلکہ اسے جو بھی دیکھ رہا تھا یوں ہی اپنی جگہ پر ٹھہر رہا تھا۔ جیسے انہوں نے کسی آفت کو دیکھ لیا ہو۔ جبکہ وہ کسی کی بھی سمت دیکھنے بغیر آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

لیکن ہر بار یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ ان کے پاس سے گزر جاتا اور وہ لوگ یوں ہی ساکت و صامت سے کھڑے رہتے۔

آذر نے جب اسے اندرونی مین ڈور کی طرف بڑھتے دیکھا تو وہ سب کچھ ذہن سے جھٹک کر بہت تیزی سے اس کے قریب آیا تھا۔

”رک جاؤ منصور حسین۔ تمہارا ایک قدم بھی آگے بڑھا تو اچھا نہیں ہوگا۔“ آذر نے یکدم اس کے سامنے آکر اسے روک دیا تھا اور دل اور کے قدم ٹھٹک کر رک گئے تھے۔

”دیکھو آذر آفتدی۔ مجھے اپنی موت کا خوف ہوتا تو میں یہاں کبھی نہ آتا۔ لیکن افسوس کہ مجھے علیہ کے کی موت کا خوف یہاں بھی لایا ہے اور اگر علیہ کے کی موت کے خوف سے میں یہاں آگیا ہوں تو پھر میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ اپنے راستے کی ہر رکاوٹ کو ہٹا سکتا ہوں۔ کیونکہ میں اس وقت سر پہ کنن باندھ کے آیا ہوں۔ اس لیے پلیز میرے راستے کی رکاوٹ مت بنو اور مجھے وقار آفتدی کے پاس جانے دو۔ ہٹ جاؤ میرے راستے سے ورنہ علیہ کے مر جائے گی۔“

دل اور نے بہت ہی دو ٹوک سے انداز میں آذر آفتدی کو اپنی بات سمجھانے کی کوشش کی۔ آذر شاید اس کی

بات سمجھتا ہوں سمجھتا مگر اس کے خون سے رگے کپڑے دیکھ کر اس کی نظریں پھرا گئی تھیں۔ یعنی اس کے کپڑے علیحدہ کے خون سے رنگے ہوئے تھے۔

اور اگر ہوا بھی تھا تو بڑی جوبلی کا اس سے کیا تعلق۔
آخری خیال نے آذر کو پھر سے پھر بنانے کی کوشش کی تھی۔ مگر تب تک وہ آذر کو سائیڈ پر وکیل کر خود آگے بڑھ گیا تھا۔

”منصور حسین۔ روکو میری بات سنو میں تمہارے کسی نئے ڈرامے یا کسی نئی چال میں آنے والا نہیں ہوں۔ میں تمہیں گولی سے اڑا دوں گا۔“ آذر بھنکار رہا ہوا دھاڑتا ہوا اس کے پیچھے آیا تھا۔ اتنے میں بڑی جوبلی کے کئی افراد شور کی آواز سن سکے تھے اور منصور حسین کو ایک بار پھر اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ کر سب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ مگر وہ سیدھا وقار آندہ کے بیڈروم میں جا پہنچا دروازہ کھلنے کی آواز پر وقار آندہ یلدم غنودگی سے ہڑپا گئے اور وارڈروب بند کرکے آسیدہ آندہ کی بھی دل کی تھیں۔

”منصور حسین۔“ آسیدہ آندہ کی چیخ نکل گئی تھی جبکہ وقار آندہ کی حالت غیر ہونے لگی تھی۔
”نہ نہ دل نہ آسیدہ نہ شامہ۔“ انہوں نے بمشکل اس کا نام مکمل کیا تھا۔

اور دل اور کے پیچھے اپنا ریوالتور لے کر آنے والا آذر وقار آندہ کے منہ سے نکلنے والے اس ٹوٹے پھوٹے سے نام پر ہٹک گیا تھا۔
”ہاں۔ میں دل اور شامہ۔ بابر شاہ کا بیٹا اور منصور حسین شاہ کا پوتا زندگی میں ایک بار پھر تمہارے سامنے آ کر ہوا ہوں۔ لیکن وقار آندہ اس دل اور شاہ میں اور اس دل اور شاہ میں بہت فرق ہے۔ تب میں تمہارا دشمن تھا اب میں تمہارا داماد ہوں۔

اس وقت میں تم سے انتقام لینے آیا تھا۔ لیکن آج میں تم سے بھیک مانگنے آیا ہوں۔
آج میں شاہ نہیں ہوں آج میں گدا ہوں۔
آج میری بیوی کی زندگی کا سوال ہے۔ وہ اس وقت اسپتال کے آپریشن ٹیبلر میں موت اور زندگی کی جنگ لڑ رہی ہے۔ اس کا بلڈ گروپ او نیگٹو ہے اور میں اس ایمرجنسی میں کہیں سے بھی یہ گروپ آرٹج نہیں کر پا رہا۔ مجھے اس کے لیے بلڈ کی ضرورت ہے۔ مجھے او نیگٹو کی ضرورت ہے۔“

وہ کہتے ہوئے واقعی بہت سب سے بس اور شکست خوردہ سا لگ رہا تھا۔
”مم۔ مگر میری بی بی علیزے کو۔ ہوا کیا ہے؟“ آسیدہ آندہ تڑپ کے اس کے سامنے آگئی تھیں اور دل اور نے وقار آندہ سے نظریں ہٹا کر ان کی طرف دیکھا تھا۔
”ملک شرافت علی کے بیٹے ملک اسد اللہ اور چچا زاد کرن ملک حق نواز نے مجھ پر حملہ کروایا لیکن فائرنگ کے دوران گولی علیزے کو لگ گئی۔ جس سے وہ شدید زخمی ہوئی ہے اور اس کا خون بہت زیادہ بہہ چکا ہے۔ اس لیے ڈاکٹر بہت زیادہ پریشان بھی ہیں۔ کیونکہ یہ بلڈ کسی بلڈ بینک سے بھی آرٹج نہیں ہو رہا۔“

دل اور دھماکے سے دھماکہ کر رہا تھا اور آسیدہ آندہ نے سب سے سخت اپنے منہ پر دونوں ہاتھ رکھ لیے تھے اور مارے حیرت کے ان کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔
”ملک شرافت علی کے بیٹے ملک اسد اللہ اور چچا زاد کرن ملک حق نواز نے؟ یہ۔ یہ کیا کہہ رہے ہو تم۔“ وہ پاگل ہو جانے کو تھیں کہ یہاں کیا ہو رہا ہے اور۔۔۔ وہ کیا کیا انکشاف کر رہا تھا۔ ان سب کے دماغ جھٹکے سے قاصر ہو گئے تھے۔

اور وہاں موجود آذر وانیال کو مل جودت عاتشہ آندہ اور ثروت بیگم بھی ہکا بکا سے اس کی صورت دیکھ رہے تھے اور اس کی باتیں نا بھی سے سن رہے تھے۔
”سز آندہ۔۔۔ میرا پورا نام میرا شول اور شاہ ہے۔ میرے پاس ایک کیس آیا تھا جس میں ملک حق نواز نے

ایک لڑکی کے ساتھ زیادتی کی اور اس کے نتیجے میں میں نے اسے جیل بھیجوا دیا تھا۔ لیکن اب اسے سزا ہونے والی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ میں کیس سے پیچھے ہٹ جاؤں کیونکہ کل اس کیس کی آخری سماعت ہے۔ اسی لیے میرے انکار پر انہوں نے مشتعل ہو کر مجھ پر حملہ کر دیا اور گولیوں کا نشانہ علیزے بن گئی اور میں علیزے کی خاطر آپ لوگوں کے پاس آنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ پلیز اس وقت میں بہت مجبور ہوں۔ بہت مفلس ہوں۔ مجھے آپ لوگوں کی ہمدردی کی ضرورت ہے۔ میں آپ لوگوں کے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ پلیز خدا کے لیے علیزے کی زندگی بچائیں۔ وہ بے تصور ہے۔ بے گناہ ہے وہ۔ آپ اسے غلط مت سمجھیں۔ غلط تو میں تھا اور میں اپنی غلطی تسلیم کروں گا۔ سب کے سامنے کروں گا۔ لیکن ابھی نہیں۔ ابھی وقت بہت کم ہے۔“

دل اور نے کہتے ہوئے جج ان سب کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے اور وہ سب نے یقین سی نظروں سے اسے دیکھتے رہ گئے تھے۔
”میرا بلڈ گروپ او نیگٹو ہے۔ میں بلڈ دینے کے لیے تیار ہوں۔“ وانیال وجاہت علی ان سب کو پیچھے ہٹا کر آگے بڑھ آیا تھا اور دل اور کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کے وجود میں روح پھونک دی ہو۔

”وانیال۔۔۔ آسیدہ آندہ زیر لب دہرا کے رہ گئی تھیں۔
”آلی۔ علیزے کو اس وقت ہماری ضرورت ہے اور ہمیں اس کی ضرورت ضرور پوری کرنی چاہیے۔ کیونکہ وہ اس گھر کی بی بی ہے اور آپ کے گھر بی بی آئے چاہے داماد نہیں مایوس اور خالی ہاتھ نہیں لوٹانا چاہیے۔ یہ بات مجھے ڈیڈ نے سکھائی تھی اور میں آج اس بات پر ضرور عمل کروں گا۔“

وانیال کے عزم کے سامنے سب کو ہی ہتھار ڈالنے پڑ گئے تھے۔
”چلو کہاں چلنا ہے؟“ اس نے دل اور کو متوجہ کیا تھا۔
”اسپتال۔“ دل اور نے کالی آہستگی سے کہا اور قدم آگے بڑھائے تھے۔
”سنو۔ عاتشہ آندہ کی لرزتی ہوئی آواز یہ دل اور کے قدم ٹھک گئے تھے۔
”جی۔۔۔ وہ ان کے پکارنے سے ہی سمجھ چکا تھا کہ وہ کیا سوال کرنے والی ہیں؟
”ست۔۔۔ تم۔۔۔ زہرہ۔۔۔ بول۔ شاہ کے۔۔۔“ وہ سوال مکمل نہیں کر پالی تھیں۔

”جی ہاں۔ میں بابر شاہ کا بیٹا اور زہرہ بول شاہ کا بیٹھما ہوں۔ دل اور شامہ وہی دل اور شاہ جو آپ کی محبت کا زائقہ اور آپ کی گود کا لہس آج بھی نہیں بھولا سب یاد ہے اور ازیت بھی ای چیز کی ہے کہ سب یاد ہے میں بھولا کیوں نہیں ہوں۔“

وہ دکھ سے کہتا ان سب سے اک طائرانہ سی نظر ڈال کر وقار آندہ کے بیڈروم سے باہر نکل گیا تھا اور اس کے پیچھے پوری جوبلی میں ایک بار پھر اک ہلچل سی مچ گئی تھی۔ جبکہ وانیال تو اس کے ساتھ ہی اس کی گاڑی میں آگیا تھا لیکن باقی سب بھی رہ نہیں سکے تھے۔
باری باری سبھی اپنی اپنی گاڑیاں لٹکالتے چلے گئے تھے۔

عبداللہ بلڈ دینے کے بعد روم سے نکل ہی رہا تھا۔ کہ اتنے میں دل اور بھی وہاں آن پہنچا لیکن اس کے ساتھ دوسری شخصیت کو دکھ کر عبداللہ ذرا سا جھجکا اور اس نے فوراً ہی اپنے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے سوچا تھا کہ اس نے اس شخصیت کو پہلے کہاں سے دیکھا ہے؟ کیونکہ اس کی شکل و صورت بہت سی باتوں سی لگ رہی تھی۔
”یہ میرا دوست ہے ملک عبداللہ۔“ دل اور نے عبداللہ کا تعارف کروایا۔
لیکن وانیال بری طرح چونک گیا تھا۔ اسے شدید ترین حیرت کا دھچکا لگا تھا۔
”اور عبداللہ یہ علیزے کا کرن۔“ دل اور نے وانیال کا تعارف کروانا چاہا تھا۔
مگر وانیال نے اسے روک دیا تھا۔

”ٹھہریے! میں اپنا تعارف خود کروا تا ہوں۔“ اس نے دل اور کچھ بولنے سے باز رکھا۔
 ”اور میں علیزے کا کرن ہوں ملک و انیال و جاہت علی علیزے میری پھوپھی زاد اور ماموں زاد کرن ہے اور میں اس وقت علیزے کے لیے ہی یہاں آیا ہوں کیونکہ علیزے کا اور میرا بلڈ گروپ سیم ہی ہے۔“ وانیال نے کہتے ہوئے عبد اللہ کی طرف مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ جبکہ عبد اللہ ہکا بکا اس کی صورت دیکھ رہا تھا۔
 ”گروپ تو میرا اور علیزے کا بھی سیم ہی ہے یعنی ہم لوگ انجی نہیں ایک ہی سیمج کے دانے ہیں ایک ہی گھر کے فرد ہیں اور ایک ہی نسل اور خاندان کا خون ہیں۔ نہ علیزے غیر ہے نہ ہم غیر ہو تو پھر یہ ہاتھ کیوں بڑھا رہے ہو گلے ملو یا یہ کدھاپہ سینہ حاضر ہے تمہارے لیے۔“
 عبد اللہ نے کہتے ہوئے بازو پھیلادینے تھے اور وانیال کو اس کے گلے لگنا ہی پڑا کیونکہ اس کے انداز میں بڑی چاہ تھی پر دامن تھا۔

”یار! اس سے بڑی خوشی کی بات اور کیا ہوگی کہ آج علیزے نے ہم لوگوں کو ایک دوسرے سے ملا دیا ہے۔“ عبد اللہ وانیال سے مل کر بے انتہا خوش ہوا تھا اور خوش تو وانیال بھی ہوا مگر اس کے ذہن پہ ماضی کا غبار بھی حاوی تھا جو رفتہ رفتہ ہی چھٹ سکتا تھا۔

”وانیال! میری علیزے کہاں ہے؟“ آذر کے ساتھ آسیہ آفندی بھی گرتی پڑتی وہاں آپنجی تھیں اور وانیال بے ساختہ ان کی طرف پلٹا تھا۔

”آئی! ان سے ملیں یہ عبد اللہ ہیں۔ عبد اللہ بھائی آپ کے بڑے بھائی کے صاحبزادے۔“ وانیال نے — اپنے کندھے سے کندھا ملا کے کھڑے عبد اللہ کی طرف اشارہ کیا تھا۔

”عبد اللہ۔“ آسیہ آفندی نے حیرت سے دل اور کی طرف دیکھا تھا کہ وہ تو کہہ رہا تھا ملک اسد اللہ نے اس پہ حملہ کروایا ہے تو پھر عبد اللہ یہاں کیسے؟

”جی ہاں یہ عبد اللہ ہے۔ میرا دوست اور میرا بھائی۔ ملک شرافت علی اور ملک اسد اللہ سے بالکل مختلف۔“ دل اور نے خود اس کا تعارف کروایا تھا اور آسیہ آفندی کے اعصاب قدرے ریلیکس ہو گئے۔

”اسلام علیکم! ایسی ہیں آپ؟“ عبد اللہ نے ذرا سا آگے بڑھ کے انہیں سلام کیا اور آسیہ آفندی نے بے ساختہ بھرائی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے گلے سے لگالیا۔

”سر سبز علیزے شاہ کی کنڈیشن آؤٹ آف کنٹرول ہوتی جا رہی ہے ڈاکٹر صاحب نے آپ کو آئی سی یو میں بلایا ہے۔“ نرس تقریباً بھاتی ہوئی دل اور کے قریب آئی تھی اور دل اور کے چہرے کی ہوائیاں اڑ گئی تھیں وہ نے ساختہ سب کو پیچھے ہٹا کر آئی سی یو کی طرف بھاگا تھا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ بانی سب بھی بھاگے چلے آئے تھے۔



”مڈی میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔“ وہ سوگرا بھی ہی تھی کہ اپنے سیل پہ جیڑی کا مسیج دیکھ کر حیران پریشان رہ گئی اور فوراً ”سے بھی پیٹھراس کا نمبر ڈائل کیا تھا۔“

دوسری طرف بھی فوراً ہی کال رہو ہو گئی تھی۔

”اسلام علیکم!“ مدحیہ جو دوسری طرف سے جیڑی کے اچی پرانے ایسا نکل اور ہیلو ہانے کی توقع کر رہی تھی جیڑی کے منہ سے بڑے غل سے کیا گیا سلام سن کر بے ساختہ ہی چوکی تھی۔

”وعلیکم السلام! جیڑی کہاں تھے تم؟ اتنے مہینے ہو گئے ہیں تمہاری کہیں سے کوئی خبر ہی نہیں مل رہی تم نے کوئی کانٹیکٹ ہی نہیں کیا؟ کہاں چلے گئے تھے آخر؟“ مدحیہ سلام کا جواب دینے کے فوراً بعد ہی شروع ہو گئی تھی۔

”میں مری چلا گیا تھا۔“ جیڑی نے اب بھی کافی سکون سے ہی جواب سے نوازا تھا۔
 ”مری! کیا مطلب؟ تم ابھی تک پاکستان میں ہی تھے؟“ مدحیہ کو سن کر شاک لگا تھا۔
 ”ہاں! میں پاکستان میں ہی تھا جب میں پاکستان سے کچھ حاصل کرنے کے لیے آیا تھا تو حاصل کیے بغیر کیے جا سکتا تھا؟“ اس کی لہجہ گویا انگلش سے اردو میں ڈھل چکی تھی۔ اور مدحیہ کو مزید حیرت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔
 ”واپس ڈیو میں جیڑی؟ یہ کیا کہہ رہے ہو تم۔“ مدحیہ کے کچھ پلے نہیں پڑا تھا۔ وہ اس کی بات کا مفہوم نہیں سمجھ پائی تھی۔

”میں جو کہہ رہا ہوں تمہیں سب بتا چل جائے گا بس ایک بار تم مجھ سے ملو تو سہی۔“ جیڑی نے زور دے رہا تھا اور مدحیہ چند ثانیے کے لیے چپ سی ہو گئی۔ پھر ذرا توقف سے گویا ہوئی۔
 ”جیڑی! کیا تو میں بھی چاہتی ہوں تم سے یہ بتا دو کہ ملو گے کہاں؟“

مدحیہ کالی سنجیدگی سے پوچھ رہی تھی۔
 ”ویں۔ اسی ہو کل میں۔“ جیڑی بھی حد درجہ سنجیدہ لگ رہا تھا۔ مدحیہ کو بے چینی تو ہوئی لیکن پھر اپنا تجسس بھائی۔

”اوکے۔ ایک گھنٹے بعد میں تمہیں وہیں ملتی ہوں۔“ مدحیہ نے کال بند کرنا چاہی۔
 ”اللہ حافظ۔“ جیڑی نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا اور مدحیہ اپنے موبائل کو دیکھتی رہ گئی۔

”اللہ حافظ۔“ وہ خود کلائی کے سے انداز میں بولی تھی۔ لیکن ایک جیسی نتیجہ پھر بھی اخذ نہیں کر سکی کیونکہ وہ بس چونک رہی تھی ٹھنک رہی تھی مگر اپنے خیالات پہ یقین کی مہر نہیں لگا رہی تھی۔



رات گزر چکی تھی صبح کا سورج اپنی کرنیں پوری طرح سے پھیلا چکا تھا۔
 علیزے کے کھروالے اس کے ہوش میں آنے کے انتظار میں پوری رات آنکھوں میں سر کر چکے تھے۔ لیکن وہ بھی کہ ہنوز بے ہوش پڑی تھی اور ڈاکٹر زابھی بھی اس کی زندگی سے مایوس نظر آتے تھے اور دل اور مسلسل سر جھکائے بیٹھا تھا۔

”دل اور سے ناشتا کر لو۔ پلیز۔ تم نے کل صبح سے کچھ نہیں کھایا۔“ عبد اللہ نے قریب آکر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔ لیکن وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”کر لوں گا ناشتا بھی۔ ناشتا مجھے بغیر مرنے نہیں جاؤں گا۔ علیزے زندہ ہے تو سمجھ لو کہ دل اور شاہ بھی زندہ ہے۔“ وہ عبد اللہ کو تسلی دے کر آگے بڑھا مگر عبد اللہ کی آواز نے اسے روک دیا۔

”کہاں جا رہے ہو؟“ عبد اللہ کھٹک گیا تھا۔

”گھر۔“ اس نے بے حد آستنی سے جواب دیا تھا۔

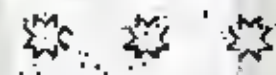
”گھر۔ مگر کیوں؟“ عبد اللہ کو حیرت ہوئی۔

”کیونکہ میں نے کورٹ جانا ہے۔“ اس کا لہجہ انتہائی سرد و سپاٹ سا ہو رہا تھا۔ عبد اللہ کے اعصاب جھنجھٹا اٹھے اس نے یکدم کرنٹ کھانے کی طرف دیکھا تھا۔

”کورٹ سے مگر دل اور سے۔ تمہاری اپنی زندگی کو بھی خطرہ ہے۔ یہ کیا کرنے جا رہے ہو تم۔“ عبد اللہ کو اس کی طرف سے فکر ہوئی تھی لیکن دل اور کو اپنی کوئی فکر نہیں تھی۔

”میرا جو نقصان ہونا تھا وہ ہو چکا ہے اب مجھے ان کی طرف سے کوئی ڈر کوئی خوف نہیں ہے میں نے انصاف کی یہ جنگ لڑنی ہے اور ہر حال میں لڑنی ہے اس کے لیے چاہے کچھ بھی ہو جائے مجھے پروا نہیں ہے۔“ وہ کہہ کر اسپتال کے اس پرائیویٹ روم سے باہر نکل گیا اور عبد اللہ کے ساتھ ساتھ آذر و وانیال عاتشہ آفندی اور آسیہ آفندی سب دیکھتے رہ گئے تھے۔ لیکن دل اور کو خود بھی پتا نہیں تھا کہ ایس پی کامران مندی اور انسپکٹر شہناز نے

”آپ اتنے یقین سے کہنے کہہ سکتے ہیں؟ وہ بری بھی تو ہو سکتا ہے نا؟ اس کی ضمانت بھی تو ہو سکتی ہے نا؟“
 مومنہ اندر سے خوف زدہ ہو چکی تھی اور نبیل اس کا خوف بھاتا گیا تھا۔
 ”مجھے اللہ تعالیٰ کے انصاف اور دل آورے کی صلاحیت اور اس کی محنت پر یوزا یقین ہے۔ اللہ تعالیٰ ضرور انصاف کرے گا اور دل آورے کی محبت اور کوششوں کا صلہ ضرور دے گا۔ آپ بھی اللہ پر بھروسہ رکھیں اور میرے ساتھ کورٹ چلیں۔ میں باہر گاڑی میں آپ کا انتظار کرتا ہوں۔ آپ چادر لے کر آجائیں کہیں لیٹ نہ ہو جائیں۔“ نبیل کہہ کر باہر نکل گیا تھا اور مومنہ بے بسی سے مدحیہ کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔ مدحیہ نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے تسلی دی تھی۔
 ”ڈونٹ وری بھاگی۔ آپ پریشان کیوں ہو رہی ہیں۔ آپ کی حفاظت کی ذمہ داری اب بھائی پر ہے۔ وہ ہیں نا پریشان ہونے کے لیے اور وہاں تو دل آور بھائی بھی ہوں گے۔ سیکورٹی بھی ہوگی۔ پلیز آپ بے فکر ہو جائیں اور کورٹ جانے کی تیاری کریں۔ بھائی آپ کا ویٹ کر رہے ہیں۔“
 مدحیہ کی تسلی یہ مومنہ نے بمشکل اپنی ہمت مجتمع کی تھی اور فائزہ بیگم سے اجازت لے کر چادر اوڑھتی ہوئی باہر پتی گئی تھی اور ان کے پیچھے مدحیہ بھی اپنی گاڑی نکال لے گئی تھی۔



لف اللہ تال ربا دل میرا
 مینوں ”ب“ دی خبر نہ کالی
 ”ب“ بڑھدیاں مینوں سمجھ نہ آوے
 لذت ”الف“ دی آلی
 ”ع“ تے ”غ“ دا فرق نہ جاناں
 ایسے گل ”الف“ سمجھائی
 بدلیا قول ”الف“ دے پورے
 جھوٹے دل دی کرن صفائی
 ”میرا نام اب محمد جہاں زیب ہے۔
 میرا مذہب اب اسلام ہے۔
 میرا ملک اب پاکستان ہے۔“

مجھے عشق اب اس کی پاک ذات سے ہے جس نے مجھے پیدا کیا اور مجھے سیدھی راہ دکھائی۔ مگر میں احسان مند ہوں تمہارا جس کی وجہ سے میں آج ”جھڑی“ نہیں۔ ”محمد جہاں زیب“ ہونے کا اعزاز پا چکا ہوں اور میں شکر گزار ہوں اس لڑکی کا جس نے مجھے ایک انسان سے ایک مسلمان ہونے کا فرق سمجھایا اور میرا ساتھ دیا۔ مجھے جنت اور دوزخ کی تمیز سکھائی اور مجھے جیسے برے اور بد انسان کو گلہ پڑھا کر پاک کر دیا اور میرے اپنے ہی ضمیر کے سامنے معتبر بھی بنا دیا ہے مجھے۔“
 وہ بول رہا تھا اور وہ سن رہی تھی اور جیسے جیسے سن رہی تھی اس کے چہرہ طبق روشن ہوتے جا رہے تھے۔ اپنے گھر سے تو وہ جھڑی سے ملنے کے لیے نکلی تھی لیکن ملاقات محمد جہاں زیب سے ہوئی تھی۔ جس سے ملنے کے بعد مسلسل حیرتوں کی زد میں تھی۔
 ”کیا بات ہے مدحیہ؟ کیا تمہیں یہ سب جان کر خوشی نہیں ہوئی؟“ اس نے گم سم سی بیٹھی مدحیہ کو خود ہی متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی۔
 ”جھڑی۔ مجھے خوشی۔“ مدحیہ کچھ کہتے کہتے یکدم رک گئی اور وہ اس کے چپ ہو جانے پر بے ساختہ مسکرا رہا تھا۔ کیونکہ وہ سمجھ چکا تھا کہ وہ کیوں چپ ہوئی ہے۔

اس کے لیے کتنی ٹاسٹ سیکورٹی کا انتظام کر رکھا ہے۔
 اسپتال سے لے کر اس کے گھر تک اور اس کے گھر سے ہائی کورٹ تک وہ سیکورٹی کے گھیرے میں تھا۔ اسی لیے وہ بہت ہی پرامن اور پر عزم طریقے سے اپنے وقت پہ ہائی کورٹ پہنچ گیا تھا۔



اس نے اپنے بیڈ روم سے نکلنے سے پہلے اپنی ڈریسنگ ٹیبل کے دروازے سے جھپٹی کی دی ہوئی انگوٹھی والی ڈیبا نکال کر اپنے بیگ میں رکھ لی اور اپنا سیل فون اٹھا کر بیڈ روم سے باہر نکل آئی۔
 ”مدحیہ! کہاں جا رہی ہیں آپ؟“ مومنہ کچن سے نکل کر فائزہ بیگم کے بیڈ روم میں جا رہی تھی جب مدحیہ کو دیکھ کر اس نے بے اختیار ہی پوچھ لیا تھا۔
 ”میں اپنے ایک فریڈ سے ملنے کے لیے جا رہی ہوں کیوں خیریت؟ کوئی کام ہے آپ کو۔“ مدحیہ جاتے جاتے رک گئی تھی۔

”من نہیں۔ مہ مجھے بھلا کیا کام ہو سکتا ہے۔“ مومنہ نے فوراً ”نفی“ میں سر ہلایا تھا۔
 ”آپ کو پتا ہے آج سے کچھ عرصہ پہلے جب آپ نئی نئی اس گھر میں آئی تھیں تو ایک روز آپ نے اسی مجھے روک کر مجھ سے پوچھا تھا کہ میں کہاں جا رہی ہوں اور میرے پوچھنے پر آپ نے یہی کہا تھا کہ آپ کو کوئی کام نہیں ہے۔ آپ کو کیا کام ہو سکتا ہے بھلا اور مجھے اس بات پر حیرت ہوئی ہے کہ آپ کو کوئی کام کیسے نہیں ہو سکتا؟ آپ بھی انسان ہیں آخر۔ آپ کی بھی ضروریات ہوں گی۔ آپ کی بھی خواہشات ہوں گی۔ لیکن آپ کتنی کیوں نہیں ہیں؟“ مدحیہ کو مومنہ کی چپا چپی نہیں لگتی تھی۔ اسی لیے وہ آج بول ہی پڑی تھی۔
 ”لیکن مدحیہ! مجھے ضرورت ہوگی تو میں کہوں گی نا۔“ مومنہ آہستگی سے مسکرائی۔

”ضرورت سب کو ہوتی ہے اور ضرورت ہر چیز کی ہوتی ہے۔ اپنی دے۔ کل آپ تیار رہے گا۔ میں آپ کو اپنے ساتھ شاپنگ لے کر جاؤں گی اور اپنی پسند سے شاپنگ کرواؤں گی کیونکہ آپ کو چاہے احساس ہو یا نہ ہو لیکن مجھے احساس ضرور ہے کہ آپ کی بہت سی ضروریات ہیں، جولاڑی پوری ہوئی چاہیں۔ میں بھائی سے بھی بات کروں گی لیکن ابھی میں جلدی میں ہوں۔ ابھی مجھے نہیں پہنچتا ہے اوکے بائیں۔“
 مدحیہ کہہ کر ہاتھ ہلائی ہوئی پلٹ گئی تھی۔ لیکن کچھ یاد آنے پر فوراً ”رک بھی گئی تھی۔“
 ”ستیں بھاگی۔“ اس نے مومنہ کو بے ساختہ اس کے رشتے سے پکارا اور مومنہ سر سے پیر تک کانپ گئی وہ بھلا اپنے آپ کو اس قابل کہاں سمجھتی تھی۔

”جی۔“ اس نے بمشکل جی کہا تھا۔
 ”میں آپ کو اپنے ساتھ پارلر لے کر بھی جاؤں گی۔ میرے بھائی کو ایک فریش فیس نظر آنا چاہیے۔“ مدحیہ کے اس نئے انداز نے مومنہ قدرے جھنجھپ گئی۔
 ”نہیں۔ اسے پارلر لے کر جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وہ ایسے ہی ٹھیک ہے۔“
 نبیل بیڑھیاں اترتا ہوا نیچے آ رہا تھا۔

”تو تھینکس۔“ آپ اپنے خیالات اپنے تک ہی رکھیں۔ میں انہیں ضرور لے کر جاؤں گی۔“ مدحیہ نے ضد کی اور نبیل نے سر جھٹک دیا۔
 ”اوکے۔ یہ بات تو بعد کی ہے۔ فی الحال ہم کورٹ جا رہے ہیں۔ دل آور بھی کورٹ پہنچ چکا ہے۔“ نبیل نے گھڑی دیکھی تھی۔

”کورٹ۔ مگر کیوں؟“ مومنہ یکدم۔ سم گئی تھی۔
 ”آج ملک حق نواز کے کیس کی لاسٹ ڈیٹ ہے۔ آج فیصلہ سنایا جائے گا۔ آج اس کی سزا کا حکم جاری ہوگا۔“ نبیل کا لہجہ پر یقین تھا۔

”اس کے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس نے میرا نام اس لیے محمد جہاں زیب رکھا ہے کہ جیڑی کہنے والوں کو کوئی براہ نام نہ ہو۔ لیکن اس کے باوجود میں یہی چاہتا ہوں کہ سب مجھے محمد جہاں زیب کہہ کر ہی مخاطب کریں۔ جیڑی میں کچھ نہیں رکھا لیکن محمد میں بہت کچھ ہے۔ بہت مٹھنا نام ہے یہ۔ صرف نام لینے سے ہی منہ میں لذت آجاتی ہے۔ اک مٹھاس سی ہے اس نام میں۔“

وہ بہت عقیدت مند اور بہت محبت سے اپنی فیملی گزار رہا تھا اور مدحیہ محض سر جھکائے رہ گئی تھی۔

”خیر۔ اب بولو۔ کیا کہنے والی تھیں تم؟ میں نے تمہاری بات ٹوک دی۔“

اس نے مدحیہ کو دوبارہ سے بات کرنے پر اکسایا تھا۔

”محمد جہاں زیب میں یہ کہنا چاہ رہی ہوں کہ مجھے خوشی ہوئی ہے اور بہت زیادہ ہوئی ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ افسوس بھی ہو رہا ہے کہ یہ کام اللہ نے میرے نصیب میں نہیں لکھا اور اس لڑکی پہ رشک آ رہا ہے جس کے نصیب میں اللہ نے بہت نیک کام کی سعادت لکھ دی۔“

اور میری نظر میں وہ لڑکی بہت ہی خوش نصیب ہے محمد جہاں زیب اور اللہ اسے ہمیشہ خوش نصیب ہی رکھے۔ آمین۔“

مدحیہ نے صدق دل سے دعا کی تھی اور اپنے دل سے اک بوجھ سا ہٹا ہوا محسوس ہوا تھا۔

”وہ خوش نصیب ہی نہیں بہت اچھی بھی ہے۔ اتنی اچھی کہ اللہ تعالیٰ سے پہلی دعا اسی کے لیے کی ہے اسی کو مانگا ہے اور مجھے اللہ پہ بھروسہ ہے پورا بھروسہ کہ وہ میری پہلی دعا

کبھی بھی رو نہیں کرے گا۔“ محمد جہاں زیب کے لہجے میں ایک بھرپور یقین تھا اور مدحیہ اس کے یقین پہ چپ رہ گئی تھی۔

لیکن پھر ذرا توقف سے کچھ خیال آنے پہ اس نے آہستگی سے محمد جہاں زیب کو مخاطب کیا۔ ”کیا نام پوچھ سکتی ہوں اس خوش نصیب کا؟“ اس نے کسی اور ہی خیال کے تحت پوچھا تھا۔

”ہوں۔۔۔۔۔! کیوں نہیں۔۔۔۔۔ فاطمہ نام ہے اس کا۔۔۔۔۔ فاطمہ بدر۔“ محمد جہاں زیب اس کا نام لیتے ہوئے بھی جیسے خوش ہو رہا تھا سرشار ہو رہا تھا۔

”ہوں۔۔۔۔۔ بہت باریک نام ہے۔۔۔۔۔ بہت خوب صورت بھی۔“ مدحیہ نے تعریف کی سراہا تھا اور وہ اس کے سراہنے پہ ساختہ مسکرا دیا تھا۔

”تھینک یو۔۔۔۔۔! اس نے باقاعدہ شکریہ بھی ادا کیا۔ وہ بھی یوں جیسے مدحیہ نے اس کی تعریف کی ہو یا اسے سراہا ہو۔“

”تھینکس کی ضرورت نہیں ہے ہاں البتہ اسے اس چیز کی ضرورت ہے یہ اس کی امانت ہے۔ تم اسے دے دو۔“ مدحیہ نے اپنے بیگ سے وہ چھٹی سی ڈبیا نکال کر محمد جہاں زیب کی طرف بڑھادی تھی اور اس نے بے ساختہ مدحیہ کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔

”نہیں محمد جہاں زیب! تم یہ مت سمجھو کہ میں نے یہ رنگ واپس کرنے کا فیصلہ ابھی کیا ہے۔ حالانکہ تم نے جنب مجھے یہ رنگ دی تھی تو تم نے کہا تھا کہ تم جب واپس لوٹاؤ گی تو میں تم سے وجہ نہیں پوچھوں گا لیکن تمہارے بغیر تو مجھے بھی میں نہیں جا رہی ہوں کہ میں یہ رنگ اس لیے لوٹا رہی ہوں کہ مجھے اس سے کئی گنا زیادہ قیمتی ہیرا مل چکا ہے۔ بلکہ مجھے اس کو قیمتی نہیں انمول کہنا چاہیے جن کی کوئی قیمت ہی نہیں ہے جو میرے لیے سب سے زیادہ اہم ہے سب سے الگ ہے میں اسے کھونا نہیں چاہتی۔۔۔۔۔ اس سارے قصے کے بعد میں اس نتیجے پہ ضرور پہنچی ہوں کہ انسان کسی سے کم نہیں ہوتا کبھی کبھی کسی دکان پہ کھوتا کہہ کر واپس لوٹا دیا جاتا ہے اور کبھی کسی دکان پر کھرا سمجھ کر پاس رکھ لیا جاتا ہے۔ بس فرق یہ ہوتا ہے کہ کھوٹے اور کھرے کی پہچان کرنے والی نظر الگ الگ ہوتی ہے۔ میں نے نہیں کھوتا کہہ کر واپس لوٹا دیا اور فاطمہ بدر نے نہیں کھرا سمجھ کر اپنے پاس رکھ لیا۔“

شاید اس لیے کہ اسے تم جیسے سکے کا انتظار تھا اور مجھے عدیل عمر جیسے سکے کی تلاش تھی اور زندگی کے اس موڑ پہ

دونوں کا انتظار اور دونوں کی تلاش ختم ہو گئی ہے۔ وہ اپنے سکے کو یا کر خوش ہوگی اور میں اپنے سکے کو حاصل کر کے خوش ہوں اور میں شکر گزار ہوں اس رب کی جس نے کسی کو بھی پابوس نہیں کیا اور کسی کے دل پہ کوئی بوجھ نہیں رہنے دیا۔“ مدحیہ کی آواز بھرا گئی تھی اور محمد جہاں زیب نے آہستگی سے سر جھکا لیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ ان دونوں میں مزید کوئی بات چیت ہوتی اتنے میں دروازے پہ دستک ہوئی تھی اور محمد جہاں زیب دستک کے انداز سے ہی پہچان گیا تھا کہ دستک دینے والا کون ہے۔۔۔۔۔؟

”فاطمہ۔۔۔۔۔! اس نے بے ساختہ اس کا نام لیا تھا اور ایک لڑکی دروازہ کھیل کر اندر آ گئی تھی۔“

”السلام علیکم۔۔۔۔۔! فاطمہ نے اندر آتے ہی سلام کیا اور محمد جہاں زیب کے ساتھ ساتھ مدحیہ بھی اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی تھی۔“

”وعلیکم السلام۔۔۔۔۔! ان دونوں نے تقریباً بیک وقت ہی اس کے سلام کا جواب دیا تھا۔“

”مدحیہ۔۔۔۔۔! کیسی ہیں آپ؟“ فاطمہ نے ڈائریکٹ مدحیہ کو ہی مخاطب کیا تھا اور ایک پل کے لیے مدحیہ کو خوشگوار سی حیرانی ہوئی کہ فاطمہ اس کو غائبانہ تعارف سے ہی پہچان گئی ہے۔

لیکن پھر محمد جہاں زیب کے چہرے پہ مسکراہٹ دیکھ کر سمجھ گئی تھی کہ اس نے یقیناً ”فاطمہ کو بھی بتا رکھا ہوگا کہ مدحیہ آنے والی ہے۔“

”اللہ کا شکر ہے۔۔۔۔۔ میں بالکل ٹھیک ہوں آپ سنائیں؟ آپ کیسی ہیں؟“

”ادھر بھی اللہ کا کرم ہے۔ احسان ہے اس پاک ذات کا۔“ فاطمہ مسکرائی تھی۔

”ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی شوق ہوا تھا کہ میں فاطمہ بدر نامی لڑکی کو دیکھ سکوں اور اسے مبارک باد دے کر اس کے ایک نیک کام سے اسے پورے دل سے سراہوں اور دیکھ لیں اللہ نے مجھے جیسے ہی میرا یہ شوق یہ خواہش پوری کر دی ہے اور سچ پوچھیں تو آپ کو دیکھ کر اور آپ سے مل کر واقعی بہت خوش ہوئی ہے اللہ آپ کو بھی ہمیشہ خوش رکھے اور مزید نیکیوں کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔“

مدحیہ نے بہت اچھے طریقے سے اپنی فیملی گزار رہا تھا جس پہ فاطمہ بھی بہت خوش ہوئی تھی اور تھوڑی دیر بات چیت کے بعد ان دونوں سے اجازت چاہی تھی۔

”ارے۔۔۔۔۔! اتنی جلدی کیوں جا رہی ہیں آپ؟ ابھی بیٹھیں۔۔۔۔۔ میں تو محمد جہاں زیب کو یہ گڈ نیوز دینے کے لیے آئی تھی کہ میرے مہمانیہ شادی کے لیے مان گئے ہیں اور انہوں نے آج اسے ملنے کے لیے اسے ہمارے گھر بلایا ہے۔ اس لیے میں اسے شام کھانے پہ انوائٹ کرنے کے لیے آئی ہوں۔“ فاطمہ نے مدحیہ کو روکنے کے ساتھ ساتھ محمد جہاں زیب کو ایک نئی اطلاع دی تھی جسے سن کر محمد جہاں زیب تو خوش ہوا ہی تھا لیکن مدحیہ بھی اس اطلاع پہ بے پناہ خوش ہوئی تھی۔

”ارے دام۔۔۔۔۔! پھر تو بہت بہت مبارک ہو آپ دونوں کو۔“ مدحیہ نے کھل کے خوشی کا اظہار کیا تھا۔

”نفس۔! صرف مبارک ہی نہیں چلے گی۔۔۔۔۔ تمہیں اس سارے تسلسلے میں میرا ساتھ دینا ہو گا۔۔۔۔۔ میری شادی میں میری مدد کرنا ہوگی ورنہ میں تو کچھ بھی نہیں کر سکیں گا۔۔۔۔۔“

محمد جہاں زیب نے مدحیہ سے اس کی مدد چاہی تھی اور مدحیہ نے اس کام کے لیے فوراً ”ہاں“ بھری مجھے منظور ہے تمہاری شادی کی تمام تیاری اور تمام ذمہ داری میری لیکن ابھی اس وقت مجھے اجازت چاہیے آپ لوگ بیٹھیں۔ بات کریں۔۔۔۔۔ اور انجوائے کریں۔ گڈ بائے۔“ مدحیہ ان سے اجازت لے کر محمد جہاں زیب کے روم سے نکل آئی تھی۔

نچانے کیوں اسے اس وقت عدیل سے ملنے کی جلدی ہو رہی تھی۔

لیکن اندر سے وہ محمد جہاں زیب اور فاطمہ کے لیے بھی بہت خوش تھی۔

اسے حقیقتاً ”شلوار قمیص اور دوپٹے میں ملبوس انتہائی سادہ سے انداز والی فاطمہ بہت پسند آئی تھی۔ مگر اسے یہ انداز نہیں تھا کہ یہی انتہائی سادہ سی نظر آنے والی فاطمہ بھی بہت ہی ماڈرن اور فیشن ایبل لڑکی ہوا کرتی تھی۔ مگر

اللہ نے اس کے قدیم سیدھی راہ کی طرف موڑ کر اسے بہت ہی سادہ، نرم دل، خوش اخلاق اور بیا حیا لڑکی کے سانچے میں ڈھال دیا تھا۔

”مبارک ہو سر.....! بہت بہت مبارک ہو۔ ہمیں شروع سے ہی امید تھی کہ یہ کیس آپ کے ہی حق میں جائیے گا۔“ ایڈوکیٹ اولیس اختر نے عدالت سے باہر نکلتے ہی دل اور سے ہاتھ ملاتے ہوئے اسے مبارکباد پیش کی تھی۔

”تھنک یو۔! تھنک یو سوچ۔“ دل اور تمام کاغذی کارروائی بننا کراچی کی گاڑی کی طرف بڑھا تھا اسے ملک حق نواز کی سزائے موت کا حکم سن کر بھی کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی کیونکہ اس وقت اس کے ذہن یہ علیز سے کیے ہوئی کاغذ سوار تھا اور اسے اسپتال پہنچنے کی جلدی تھی اور اس عجلت میں وہ سب کو نظر انداز کرتا ہوا اپنی گاڑی کے قریب آگیا تھا۔

”مبارک ہو پیر ستر صاحب! کہاں جا رہے ہیں۔“ ایس بی کامران مہدی بھی کافی خوشگوار موڈ کے ساتھ اس کے قریب آیا تھا۔

”ہاسپٹل.....!“ اس نے کافی مختصراً جواب دیا تھا۔
 ”ہاسپٹل.....؟ مگر کیوں؟ خیریت تو ہے نا۔“ ان دونوں کے پیچھے آنے والا فیمل بھی وہیں ان کے پاس ہی رک گیا اور اس کے ساتھ چادر میں لپی ہوئی مومنٹی لی کو بھی رکنا پڑا۔

”ارے! آپ کو نہیں پتا؟ کل صبح مسز علی نے شاہ ملک حق نواز کی طرف سے کرواتے ہوئے حملے میں شدید زخمی ہوئی ہیں دو گولیاں لگی تھیں جنہیں آپریشن سے نکال لیا گیا ہے لیکن وہ ابھی تک ہوش میں نہیں آئیں ایس بی کا مران ممدی نے حیرت سے بنیل حیات کی طرف دیکھا تھا کہ وہ ابھی تک انجان ہے۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ اتنا سنگین مسئلہ ہو گیا ہے اور مجھے خبر ہی نہیں کسی نے بتایا ہی نہیں؟“ نبیل کو حقیقتاً بہت بڑا شاک لگا تھا اور مومنہ کے توفد مولیٰ سے زمین سرک گئی تھی۔

”یہ بات نہیں ہے دل آورے۔! تم نے مجھے سچ مچ خود سے الگ کر دیا ہے۔ غیر بنادیا ہے مجھے اسی لیے۔۔۔۔۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔ تم یونہی سمجھ لو۔ لیکن میں اس وقت مزید کوئی بھی صفائی پیش کرنے کی پوزیشن میں نہیں

ہوں۔ مجھے اس وقت ہر حال میں ہاسپٹل پہنچنا ہے۔“

دلہ اور کہہ کر گاڑی کا لاک کھولنے لگا اور پھر بے ساختہ ان کی طرف پلٹا تھا۔

”لیکن پلیز! میری آپ سب سے ریکوئسٹ ہے کہ میری علیزے کے لیے دعا ضرور کریں صرف یہ دعا کہ وہ بچ جائے وہ زندہ رہے میرے لیے میری خاطر۔“

دل تیر کہہ کر گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی نکال کے گیا تھا۔
جبکہ نیبل اور مومنے وہیں کھڑے اسے دیکھتے رہ گئے تھے۔ ایس بی کامران مہدی تو ان کی باتوں کے دوران ہی اپنی

ایک ضروری کال سننے کے لیے پیچھے ہٹ گئے تھے۔

اس نے اپنا سر وہ نول ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔
 ”اوہ مائی گاؤس! تو وہی ہاسٹیل ہے جہاں زری باڈمٹ تھی؟ تو کیا میں علیزے کو بھی وہیں لے آیا ہے؟“

”اف۔ اتو اس لیے عبد اللہ پہلے سے ہی بو میں تھا؟ اور نوبہ کیا ہو گیا مجھ سے؟“

دل اور کے آپ کو بے مروتی تھا۔۔۔ میں آپ کو سزا دے گا۔ جو وہ سزا دے گا وہ آپ کو سزا دے گا۔
بریشان ہونے سے اور اپنے آپ کو کون سے کیا حاصل تھا۔ اسی لیے وہ مجبوراً اپنے بچھتاوے کو کنٹرول کرتا ہوا
خجاری سے اتر آتا تھا۔

اور اس کے پیچھے ہی نیبل کی گاڑی بھی آرکی تھی۔ وہ خود کو دل آورے کی مصیبت اور پریشانی سے دور نہیں رکھ سکا تھا لیکن ہسپتال پہنچ کر اسے بھی اس احساس نے گھیرے میں لیا تھا جس احساس کی پلیٹ میں خود دل آور شاہ بھی آچکا تھا۔

بھئی اس وقت اس کے لیے پوری دنیا سے زیادہ اہم صرف علیزے شاہ تھی اور وہ اس کے متعلق سوچ رہا تھا۔

جیسی ساری احساسات کو جھٹک کر اندر آگیا تھا۔
 "اسلام ٹیکم۔!" اس نے ہسپتال کے برائے یوٹروم میں داخل ہوتے ہی سلام کیا تھا۔

”کیسے؟“ اس نے آذر، جو دت اور اسرار آفندی وغیرہ کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے آئیہ آفندی کو ہی

”اسی حال میں ہے جس حال میں چھوڑ کر گئے ہو۔“ وہ کہتے ہوئے پھر سے روہانسی ہو گئیں اور ان کا لہجہ بھرا گیا

تھا۔ ”دوا کٹر زے نے وزٹ کیا؟“ اب کی بار دانیال سے سوال کیا گیا تھا۔

”جی ہاں۔! کیا ہے اور مزید آؤھا گھنٹہ وٹ کرنے کا کہنا ہے۔ اگر وہ آؤھے کھٹے تک ہوش میں نہ آئی تو خطرہ بھی سکتا ہے۔“ ڈانیل نے بہت ہی نارمل طریقے سے اسے جواب دیا تھا۔

”سر! مبارک ہو آپ کو“ آپ کی مسرہوش میں آگئی ہیں۔“
 رانیال کی بات ابھی ختم ہوئی ہی تھی کہ اچانک پیرس بھگتی ہوئی اندر آئی اور اس کی اس اطلاع پہ وہاں موجود

”سچ۔ علیحدہ ہوش میں آگئی ہے؟“ آسیہ آفندی فوراً ”اٹھ کھڑی ہو میں اور پھر تقریباً“ بسبھی وہاں سے

لیکن ڈاکٹر نے بھی کوٹنے سے روک دیا تھا کیونکہ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ ایک گھنٹے تک وہ مکمل طور پر ہوش میں

تب ان سب کو دوبارہ سے انتظار کرنا پڑا جبکہ دل اور جو پہلے ہی با وضو ہو کر کورٹ میں کیس لڑنے گیا تھا۔

شہزادے کے ہوش میں آنے کی اطلاع سنتے ہی وہیں ہاسپٹل کے روم میں پہنچے ایک جائے نماز پر سجدہ ریز ہو لیا اور شکرانے کے نقل ادا کیے۔

”دل آورے!“ بیل کے ساتھ عبداللہ اچانک اس روم میں داخل ہوا تھا مگر سامنے سجدے میں بیٹھے اور شکرانے کی حالت میں موجود بیل اور شاہ کو دیکھ کر ان دونوں کے ہی قدم اپنی اپنی جگہ پہ جم سے گئے اور ان دونوں

نے ہی بے ساختہ ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا۔
اور انہیں اس لمحے اپنی نظروں کے سامنے دل آور شاہ نہیں بلکہ اس کی محبت خدا کے حضور سجدہ ریز ہوئی

”ماشاء اللہ! مبارک ہو۔۔۔ علیزے بھابھی ہوش میں آگئی ہیں“ سلام پھیرنے کے بعد وہ دعا کے لیے ہاتھ

انسانی ربا تھا کہ میل بے ساختہ بیچ میں ہی بول پڑا اور دل کو اس کی سترارت مجھ لیا کہ وہ اسے چھوڑ کر کے یہ

اسی لیے دل اور وعاما گننے کے فوراً بعد ہی اٹھ کھڑا ہوا اور اس کی طرف پلٹا تھا۔
 ”خیر مبارک سیسہ!“ وہ کہتے ہوئے ان دونوں کے قریب آگیا تھا۔

”اتنا پیار کرتے ہو علمیزے بھابھی سے؟“ نیل جان بوجھ کر ماحول کی سنجیدگی اور ادا سی دور کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”اب تو مجھے خود بھی نہیں پتا کہ کتنا پیار کرتا ہوں اس سے؟ لیکن اتنا احساس ہو رہا ہے کہ جتنا تم سے کرتا ہوں اس سے بھی کئی گنا زیادہ پیار علیز بے سے کرتا ہوں۔“

دل آور نے اعتراف کیا تھا اور نیل نے قہقہہ لگا کر ہنستے ہوئے اسے گلے سے لگا لیا اور عبد اللہ نے ان دونوں کے کندھے ہلکے تھے۔

”یعنی علیز بے بھابھی کو میرا قریب بنا دیا ہے تم نے؟“ نیل مصنوعی خفگی سے بولا تھا۔

”ہی سمجھ لو۔“ دل آور نے کندھے اچکائے تھے۔

”ویسے یا رب! تمہارے سرال والے بہت عجیب سے لگے ہیں مجھے۔ کسی کا بھی موڈ سیدھا نہیں ہے ایک دوسرے سے بھی خفا خفا سے لگ رہے ہیں۔ یہ کن لوگوں میں شادی کر لی ہے تم نے؟“

نیل نے بہت ہی رازدارانہ انداز اپناتے ہوئے دل آور سے سوال کیا تھا جبکہ دوسری طرف عبد اللہ نے کھنکھاتے ہوئے اسے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔

”آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اس کی سرال کے بارے میں ذرا اندر کنٹرول رہ کر بات کرنا کیونکہ اس کی سرال میری بھوپھی کا گھر ہے۔ علیز بے کوئی غیر نہیں میری کرن ہے۔ پھوپھی زاد بہن ہے میری اور میرے چچا ملکہ و جاہت علی کی فیملی بھی ساتھ ہی ہے۔“

عبد اللہ نے نیل پر اک بنا دھا کا کیا تھا اور نیل اپنی جگہ یہ حیران رہ گیا۔

”نہیں۔۔۔ یہ کیا چکر ہے بھلا؟“ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا۔

”بس یا رب! یہ اور کچھ نہیں۔ قسمت کا چکر ہے۔“ عبد اللہ نے کندھے اچکائے تھے۔

”تو کیا پہلے پتا نہیں تھا اس چکر کا؟“ نیل کی حیرانی ختم ہی نہیں ہو رہی تھی۔

”نہیں! بس آج ایک دوسرے سے تعارف ہوا ہے تو پتا چلا ہے یہ شاید پہلے کبھی وقار آندی کا یا بروی حویلی نام لے لیتا تو میں پہچان جاتا مگر ہمارے درمیان کبھی اس ٹائیک پہ بات ہی نہیں ہوتی تو پھر تبا کیسے چل سکتا تھا؟“

”تو اب وہ لوگ کیسے مان گئے؟“ اس نے تو علیز بے بھابھی سے لومین ج کی بھی ٹائی۔

نیل مارے حیرت کے سوال سے سوال کے جواب دیا تھا۔

”علیز بے کو بلڈ کی ضرورت تھی اس کے دل آورے کو ان کی فیملی کے پاس جانا پڑا۔“

اس کے سارے سوالوں کے جواب عبد اللہ دے رہا تھا اور دل آور چپ کا چپ رہ گیا تھا۔

”اوہ۔۔۔ اتنی ماجرا ہے؟“ اب نیل کے کچھ پلے پڑا تھا اور وہ سرسبات میں ہلانے لگا البتہ دل آور عبد اللہ کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

”تھینک یو یا رب! تھینک یو دیری مچ۔ آج تم نے علیز بے کو بلڈ ڈونٹ کر کے مجھے اپنا مقروض کر لیا ہے تمہارے اس خون کا بدلہ میں زندگی بھر نہیں اتار سکتا۔“

اس نے عبد اللہ کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے تھے۔

”نہیں یا رب! میرا تم پر کوئی قرض نہیں ہے اور نہ ہی کوئی احسان ہے تم پر بلکہ آج علیز بے کو بلڈ ڈونٹ کر کے میں نے تم پر ثابت کر دیا ہے کہ علیز بے میری بہن ہے۔ میرے لیے زہری کی طرح ہی ہے اور اس کے ساتھ میرا پہلے بھی خون کا رشتہ تھا اور اب بھی خون کا ہی رشتہ ہے۔“

اس لیے تم اب بھی سمجھنا کہ تمہاری شادی میری بہن سے ہوئی ہے۔ جس کا تم نے ہمیشہ بہت خیال رکھنا ہے اور بہت محبت کرنی ہے اس سے۔“ الناع عبد اللہ نے دل آور کو سمجھانے کی کوشش کی تھی اور نیل قسمت کے اس ہیر پھیر کو دیکھتا رہ گیا تھا۔

”تم بہت اچھے ہو عبد اللہ۔ میری سوچ سے بھی زیادہ اور میری دوستی سے بھی بڑھ کے۔“ دل آور نے اسے بے ساختہ اپنے گلے سے لگا لیا تھا۔

”جب تم سے دوستی ہوئی تھی تو کہا تھا کہ اس دوستی سے بڑھ کے کبھی کچھ بھی نہیں ہو گا۔؟ تو دیکھ لو آج

واقعی اس دوستی سے بڑھ کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔“ عبد اللہ نے اس کو اپنے مضبوط بازوؤں میں جھپٹتے ہوئے اس کے کندھے پر ہلکی دی اور پھر تینوں ہی مسکرا دیے تھے۔

اتنے میں نرس دوبارہ اندر آئی اور ان تینوں کو روم سے باہر بھیج دیا اور اس کے ساتھ ہی علیز بے کو لا کر روم میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔

”علیز بے۔۔۔ آئیہ آندی کی آواز۔ علیز بے نے بے ساختہ چونک کر دیکھا لیکن ان کے ساتھ ساتھ باقی سب کو دیکھ کر علیز بے کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

”مما آپ؟“ اس کے ہونٹ کپکپائے تھے۔

”جی میری جان۔۔۔ میں تمہاری ممما۔۔۔ انہوں نے آگے بڑھ کر علیز بے کا ہاتھ چومتے ہوئے اسے اپنی آنکھوں میں چھپا لیا تھا۔

”آؤ بھائی، دانیال بھائی، امانتشی پھوپھو! سرار انکل۔۔۔ آپ سب۔۔۔“

علیز بے کی آواز کانپ رہی تھی۔ وہ سب سے مل کر خوش ہو رہی تھی، سرشار ہو رہی تھی اس کے آنسو بہ رہے تھے۔ اسے تو جیسے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی تھی۔ لیکن ایک لمبی پہاڑی بے ساختہ گھم سی گئی تھی۔

”نیل!۔۔۔؟“ اس نے ماں کو سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

”نیل!۔۔۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں علیز بے جلدی سے ٹھیک ہو جائے پھر تم لوگ اسے گھر لے آؤ۔“ آئیہ آندی نے اس کے بال سنوایتے ہوئے کہا تھا۔

”لیکن ممایا!۔۔۔ علیز بے کی آواز بھرا گئی تھی۔

”ارے نہیں بیٹا رونا نہیں ہے۔ بس اب جلدی سے ٹھیک ہونا ہے پھر تمہارے پیار بھی ٹھیک ہو جائیں گے۔“ وہ اسے ہلار رہی تھیں، تسلیاں دے رہی تھیں لیکن علیز بے کا دل مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔ وہ وقار آندی کے لیے متفکر ہو رہی تھی۔

”دانیال بھائی!۔۔۔ آپ بتائیں نا پیار کہاں ہیں؟ وہ کیوں نہیں آئے؟“ علیز بے نے قریب کھڑے دانیال کو مخاطب کیا تھا۔

”نیل کی طبیعت خراب ہے علیز بے! وہ یہاں نہیں آسکتے لیکن بہت جلد ہم تمہیں ان کے پاس لے جائیں گے۔“ دانیال نے بھی اسے تسلی دی اور اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔

”را مس۔۔۔“ اس نے وعدہ لیا۔

”لو کے را مس۔۔۔“ دانیال کو وعدہ کرتا ہی پڑا تھا۔

”ثروت آئی کہاں ہیں۔۔۔؟ کوئل آئی، عزت آئی اور جودت بھائی بھی نہیں آئے۔ زمین بھی نہیں ملا مجھ سے اور۔۔۔ اور میرے خون اور عزیز کہاں ہیں ممما۔۔۔؟“ علیز بے بڑے اشتیاق و۔۔۔ بے قرار سے بچے میں پوچھ رہی تھی اور تقریباً ”بھئی گا ہی پوچھتا تھا۔“

اور علیز بے کی اس لا پرواہی اس لا تعلقی اور اس اجنبیت پہ دل آور کا تھوڑی دیر پہلے خوشی کی لہر پہ دھڑکنے والا دل بری طرح اداس ہوا تھا اور ایک دم سے جیسے بجھ کے رہ گیا تھا۔

کیونکہ وہ اس کمرے میں ہونے کے باوجود بھی علیز بے کو کیس نظر نہیں آیا تھا۔

شاید اس لیے کہ آج اسے سب اپنے نظریں آ رہے تھے اور ان سب اپنوں میں وہ اپنے اک بہت اپنے کو بھول بیٹھی تھی یا شاید جان بوجھ کر نظر انداز کر رہی تھی۔

لیکن جو بھی تھا۔۔۔ مگر دل آور شاہ کا دل کرجی کرجی کر گیا تھا۔

وہ علیز بے کی ذرا سی لا تعلقی اور ذرا سی لا پرواہی بھی برداشت نہیں کر پایا تھا، نہ نہیں سکا تھا اسی لیے تو فوراً ہی کمرے سے باہر نکل گیا اور اب کمرے میں یا علیز بے تھی۔ یا پھر علیز بے کے اپنے تھے۔ اور بس۔۔۔!

(بالی آئندہ)

نبیلہ عزیز



بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدھیہ اور نبیلہ حیات دو ہی بہن بھائی ہیں، مدھیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے، وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل غور پہ رہ چکی ہے، جس کے پیش نظر فائزہ بیگم، نبیلہ کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں، لیکن مدھیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے، جس پہ نبیلہ اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے، مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر قزاق اندر پھنپ رہا ہے۔

نبیلہ کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے، مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، بے بسی اور بیوری سے تنگ آخر خود کشی کرنے کا سوچتا ہے، لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باؤ امتیاز مل جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے، جس پر نبیلہ کافی خوش ہوتا ہے، اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آوی ہے، وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے، وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آذر شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے، وہ اپنے قول و فعل کا بہت یکا آوی ہے، اس نے

تکبیز مارنا نہیں سیکھا، اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھڑکاتا ہے۔

—۳۹—
انتالیسویں قسط

”بھابھی۔“

”ہوں۔“

”گھر چلیں۔“ اس نے بڑی معصومیت سے اور بڑی حسرت سے پوچھا تھا۔

”کیوں؟ خیریت ہے؟“ نگارش اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے پھیرتے رک گئی۔

”میں گھر جانا چاہتی ہوں بھابھی۔ مجھے گھر لے چلیں پلیز۔ مجھے گھر لے چلیں۔ میرا دم گھٹنے لگا ہے یہاں

”مجھے مجھے وحشت ہونے لگی ہے اس کمرے سے۔۔۔ پلیز خدا کے لیے مجھے گھر لے چلیں۔ میں اب اور یہاں

”نہیں رہ سکتی میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں“ مجھے یہاں سے لے چلیں۔“

”زری التجائیہ سے انداز میں کہتے ہوئے روپاسی سی ہو گئی تھی اور نگارش اس کی ایسی بے بس اور لاچار سی

”کیفیت پہ دنگ رہ گئی کہ زری اندر سے کتنی گھبرائی ہوئی اور ستائی ہوئی لگ رہی ہے۔ اتنی کہ وہ آخر وہ نہیں سکی

”اور اپنی بے بسی اور اذیت بیان کر ڈالی ہے۔“

”تجھا بھی پلیز! مجھے گھر لے چلیں۔“ اس نے بے چینی سے اور بے بسی سے کہتے ہوئے نگارش کا ہاتھ پکڑ لیا تھا

”اور نگارش اپنے بچہ کے حصار سے نکل آئی تھی۔“

”اوکے اوکے میں عبد اللہ سے بات کرتی ہوں۔ وہ ڈاکٹر سے مشورہ کر لیں گے تو پھر ہم تمہیں گھر لے چلیں

”گے ڈونٹ وری میری جان ڈونٹ وری۔“ نگارش نے اپنے دائیں ہاتھ سے اس کے سر کو تھپکتے ہوئے اس کی

”یشانی پہ بوسہ دیا تھا۔“

”نہیں بھابھی ڈاکٹر اگر اجازت نہ بھی دیں تو بھی مجھے یہاں سے لے جائیں ورنہ میرا دم گھٹ جائے گا

”مر جاؤں گی میں۔“ زری کا لہجہ گلو گلو گھیر ہو گیا تھا اور آنکھیں بھی پانیوں سے لبریز ہونے لگی تھیں۔

”اوکے لے چلیں گے۔“ نگارش نے اسے ایک بھر پور تسلی دی تھی اور اتنے میں ڈاکٹر ز اور ان کے ساتھ وہ

”نرسیں بھی وزٹ پا گئیں اور ان کے پیچھے پیچھے عبد اللہ بھی اندر چلا آیا تھا۔“

”ہیلو مس زریں کیسی ہیں آپ؟“ ڈاکٹر سلطان نے کافی نرم اور فریش انداز میں اسے مخاطب کیا تھا، لیکن وہ

”نظرس جڑا گئی تھی۔“

”ہیلو مس زریں! کیا ہوا؟ کیا ناراض ہو گئی ہیں ہم سے؟ جواب بھی نہیں دے رہیں۔“ ڈاکٹر سلطان کافی خوش

”مزاج آدمی تھے اور زری جب سے ہوش میں آئی تھی وہ اس کے ساتھ بھی اسی طرح بہت فریڈٹی سے انداز میں

”بیش آتے تھے۔“

”وہ آپ سے ناراض نہیں ہے وہ اس ماحول سے اکتا چکی ہے گھر جانا چاہتی ہے۔“

”زری کے بجائے نگارش نے ان کو جواب دیا تھا اور ڈاکٹر سلطان نے کافی اچھے سے زری کی طرف دیکھا تھا۔

”اوہ۔۔۔ اتویہ بات ہے مس زریں گویا آپ ہم لوگوں سے اکتا چکی ہیں خیر کوئی بات نہیں اب ہم اتنے بھی برے

”نہیں ہیں کہ آپ کو زبردستی اس اسپتال کا مہمان بنائے رکھیں گے۔“ ڈاکٹر سلطان نے مصنوعی خفگی کا اظہار

”کرتے ہوئے زری کا پی چیک کرتی نرس کی رپورٹ کی طرف دیکھا تھا بی بی نارمل تھا۔“

”کیا مطلب؟“ زری نے فوراً پوچھا۔

”مطلب یہ کہ آپ ناراض نہ ہوں آپ کے کچھ ٹیسٹ باقی ہیں وہ ہو جائیں تو پھر آپ کو جانے کی اجازت ہے“

”ہم آپ کو نہیں روکیں گے۔“ ڈاکٹر سلطان نے جیسے زری کی ڈوبتی نبضوں کو روالی بخش دی تھی اس نے بے

”اختیار ان کے چہرے کی طرف دیکھا تھا لیکن بے یقین نظروں سے۔“

”آپ سچ کہہ رہے ہیں ڈاکٹر؟“ زری نے بہت ہی اشتیاق سے پوچھا تھا۔

”اللہ معاف کرے مس زریں میں جھوٹ کیوں بولوں گا بھلا۔“ ڈاکٹر سلطان نے عجب سے کہا اور زری ان کی

”طرف سے ایسے سچ اور ایسی تسلی ملنے لگی ہے ساختہ مسکرا دی تھی۔“

”ہوں! گڈ گرل بس اسی طرح ہنسی مسکراتی رہیں شاباش۔“ ڈاکٹر سلطان نے اس کا سر تھپکتے ہوئے کہا۔ پھر

”اس کے چند ضروری ٹیسٹ لکھ کر دیئے اور دوسرے ڈاکٹر کے ساتھ روم سے باہر نکل گئے تھے۔“

”تھینک یو بھابھی! تھینک یو ویری مچ۔“ زری نے ان کے جاتے ہی نگارش کا شکریہ ادا کیا اور اب کی بار

”نگارش مسکرائی تھی۔“

”ارے اس کام کے لیے تھینکس کی کوئی ضرورت نہیں ہے یہ کام تو میں نے اپنے بھلے کے لیے کیا ہے۔“

”میں بھی اس اسپتال سے اور اسے خالی گھر سے اکتا چکی ہوں کیوں عبد اللہ آپ کا کیا خیال ہے؟“ نگارش نے اپنے

”قرب کھڑے عبد اللہ کو بھی اپنی گفتگو میں کھینچا تھا۔“

”بالکل جناب تم دونوں سے زیادہ تو میں اکتا چکا ہوں۔ جس کو دن رات بس یہی فکر ستائے رکھتی ہے کہ گھر جانا

”ہے۔ اسپتال جانا ہے۔ گھر جانا ہے۔ اسپتال جانا ہے۔“

”عبد اللہ کی بات یہ وہ دونوں ہی بس بڑی تھیں کیونکہ وہ بے چارے ہی تو کہہ رہا تھا۔ اسی لیے زری کے ٹیسٹ

”کروانے میں عبد اللہ نے سب سے زیادہ پھرتی دکھائی تھی۔“



”نیل مومنہ کو گھر چھوڑ کر دوبارہ اسپتال آیا تھا لیکن داخلی دروازہ عبور کر کے وہ رانداری کی طرف بڑھ ہی رہا تھا

”کہ اس کے قدم ٹھنک کر رک گئے اسے اسپتال کے بڑے۔ اور کشادہ سے وزٹنگ روم میں کسی کا شک گزرا تھا

”اسی لیے وہ انہی قدموں پہ واپس پلٹا اور دوبارہ وزٹنگ روم میں جھانک کر دیکھا اس کے ذہن سے گزرنے والا شک

”یقین میں ڈھل گیا تھا اور وہ اس یقین پہ دل ہی دل میں حیران ہوتا اندر آ کر اس کے بالکل برابر بیٹھ گیا تھا۔“

”خیریت؟ یہاں کیوں بیٹھے ہو؟“ نیل نے گردن موڑتے ہوئے اپنے برابر سر جھکا کر چپ چاپ بیٹھے دل آور کو

”بڑی اپنائیت سے مخاطب کیا لیکن اس کی طرف سے جواب نہ دیا

”ہیلو! مشرول اور شاہ میں آپ سے مخاطب ہوں۔“ اس نے اس کا پورا نام لیتے ہوئے اپنی بات پہ زور دیا

”جس پہ خاموش بیٹھے دل آور کو اپنے تمام تاثرات کنٹرول کرتے ہوئے مجبوراً اس کی طرف متوجہ ہونا ہی پڑا۔“

”گو؟ کیا کہنا چاہ رہے ہو؟“ دل آور نے ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے پوچھا۔

”یہاں کیوں بیٹھے ہو؟“ نیل نے اپنا سوال ایک بار پھر دہرایا۔

”اکیلا تھا اس لیے یہاں آکر بیٹھ گیا۔“ اس کا جواب بہت نارمل اور بہت نپا تلا سا تھا۔

”اکیلے کیوں تھے؟ علیحدہ بھابھی کہاں ہیں؟“ نیل کھٹک گیا۔

””پنوں کے ساتھ!“ اس کا دوسرا جواب پہلے سے بڑھ کے تھا۔“

”تو پھر تم کیا ہو؟“ اس وقت نیل اسے شل رہا تھا۔

”ایک اجنبی!“ دل آور کو خود بھی پتا نہیں تھا کہ وہ کیا جواب دے رہا ہے۔

”میں تو سمجھا تھا کہ تم شوہر ہو؟“ نیل نے جان بوجھ کر اسے کریدا۔

”ہیویوں کے لیے شوہر سے زیادہ اجنبی اور کوئی نہیں ہوتا۔“ دل آور نے بڑے مضبوط لہجے میں اپنا تجزیہ بیان

”کیا تھا۔“

”وہ کیسے؟“ نیل نے جاننا چاہا تھا۔

”وہ ایسے کہ بیویاں اپنے ماں باپ سے اپنے بہن بھائیوں سے اور اپنی دوستوں سے دل کی ہر بات شیر کر لیتی ہیں، اپنا دکھ رو لیتی ہیں، لیکن شوہر کے سامنے دل کی بات کو دل میں ہی رکھتی ہیں، شوہر چاہے جتنی بھی محبت کرے، بیوی خود بھی چاہے جتنی بھی محبت کرے مگر دل کی بات کو ہمیشہ دل کی بات ہی رکھتی ہے، شوہر تک نہیں جانے دیتی۔“ دل اور کے لفظوں میں اس کا بہت گہرا مشاہدہ بول رہا تھا۔

”تو کیا بیوی کبھی بھی شوہر سے اپنی محبت کا اظہار نہیں کرتی؟“
”کرتی ہے۔ ضرور کرتی ہے مگر اس اظہار کے علاوہ اور کوئی بات نہیں کرتی۔“
”یار! عجیب بات ہے میرے تو کچھ پلے نہیں پڑ رہا اپنی دے چھوڑاں باتوں کو“ اوعلیز نے بھابھی سے مل کر۔
نبیل نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

”نہیں! بھی نہیں ابھی اسے اپنے گھر والوں سے مل لینے دو۔“ دل اور نے انکار کر دیا۔
”ارے چھوڑو یار! مل چکے ہیں وہ لوگ بھی اور کتنا ملنا ہے بھلا! اٹھو اب تم ملو جا کر ویسے بھی تمہارا ملنا اور ہے اور گھر والوں کا ملنا اور۔“ نبیل نے اسے وہاں سے اٹھانے کی کوشش کی۔
”نبیل! پلیز یار تنگ نہ کرو مل لوں گا بعد میں۔“ دل اور جھنجھلا گیا تھا۔
”کیا بھابھی کے ساتھ کوئی خفگی چل رہی ہے؟“ نبیل مسکرایا۔

”ہوں! یہی سمجھ لو“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔
”اوہ! تو یہ مسئلہ ہے اس لیے روٹھے روٹھے سرکار نظر آتے ہیں چلو کوئی بات نہیں ہم صلح صفائی کروا دیتے ہیں“ تم او تو سہی“ نبیل نے پھر اس کا کندھا تھکا۔
”نبیل! مجھے اکیلا چھوڑ دو جاؤ، عبد اللہ کے پاس چلے جاؤ۔“ دل اور خفگی اور جھنجھلاہٹ سے کہا۔ نبیل اسے ہر طرح سے تنگ کرنے کے موڈ میں تھا۔

”نبیل بڑائی نوانڈر اسٹینڈ یار“ دل اور نے اسے گھورا تھا۔
”انڈر اسٹینڈ کر رہا ہوں اسی لیے تو کہہ رہا ہوں او میرے ساتھ اوعلیز بھابھی سے مل کر آتے ہیں۔“
نبیل نے بھی اپنی بات کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا اور دل اور نہ جانتے ہوئے بھی ضبط کر گیا۔
”بہت ذلیل ہو تم“ دل اور بڑبڑاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور نبیل مسکرا دیا۔

”متھینک یو!“ وہ اس نوازش پر اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اٹھ کر اس کے ساتھ ہی باہر نکل آیا تھا۔
”ایکس کیوزی! کیا ہمیں بھی تھوڑی فرصت مل سکتی ہے یا نہیں؟“ نبیل نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دروازے پر دستک دی تھی اور ان سب نے بے ساختہ چونک کر ان دونوں کی طرف دیکھا۔
”پلیز! جس تھوڑی دیر“ نبیل کا اشارہ ان سب کو یہاں سے بھیجے کی طرف تھا جس کو کوئی اور تو نہ سہی لیکن آئیہ آندی ضرور سمجھ گئی تھیں۔

آخر ماں تھیں اور ماں میں ہمیشہ ہر اونچ نیچ کو سب سے پہلے ہی سمجھ جایا کرتی ہیں وہ بھی دل اور کی خاموشی اور جھکے ہوئے سر کو دیکھ کر بہت کچھ سمجھ گئی تھیں اسی لیے انہوں نے سب کو باہر جانے کا اشارہ کیا تھا۔
”دانیال بیٹا! او ہم لوگ باہر چلتے ہیں اتنی دیر میں وہ لوگ مل لیں“ آئیہ آندی کہتی ہوئی خود بھی پلٹ گئی تھیں۔

”مما!“ علیز نے نجانے کس خدشے کے تحت انہیں بے اختیار پکارا تھا۔
”ڈونٹ وری علیز! ہم ہمیں ہیں ابھی تھوڑی دیر میں آجاتے ہیں“ دانیال نے اسے تسلی دی اور آدرو وغیرہ کے ساتھ باہر نکل گیا اس لیے اب کمرے میں صرف وہ تینوں ہی رہ گئے تھے جس پہ نبیل نے گلا کھکارتے ہوئے

کمرے میں اپنی موجودگی کا احساس دلایا تھا۔
”السلام علیکم بھابھی! اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟“ نبیل بڈ کے قریب آتے ہوئے بولا۔
”ہوں! تھک ہوں اب۔ آپ کیسے ہیں؟“ علیز نے پہلی بار کسی کے منہ سے ”بھابھی“ کا لفظ سن کر قدرے جھینپ گئی تھی لیکن پھر بھی اس نے محسوس نہیں ہونے دیا تھا۔
”میں بھی اللہ کا شکر ہے کہ تھک ہی ہوں اور چاہتا ہوں کہ آپ بھی جلدی سے ٹھیک ہو جائیں اور پھر سے اپنی جنت بسا سکیں“

نبیل کی شرارت پر علیز نے بلا ارادہ ہی دل اور کی طرف دیکھا تھا اور اتفاقاً ”دل اور نے بھی عین اسی لمحے علیز کے کی طرف دیکھا تھا۔

”لیکن میرا خیال ہے کہ جنت بسانے سے پہلے آپ لوگوں کو تھوڑی دیر کے لیے اکیلا چھوڑ دوں تو زیادہ بہتر ہو گا۔“ نبیل مزید چھیڑنے والے انداز میں کتا پلٹ گیا مگر ڈواڑے کے قریب جا کر ایک بار پھر ٹھہرا تھا۔
”اور ہاں بھابھی! یہ نہ سمجھئے گا کہ یہ چپ ہے تو اسے آپ کی تکلیف کوئی دکھ نہیں ہے۔ بہت گہرا آوی ہے سمندر سے بھی زیادہ گہرا۔ اس کو سمجھنا ہے تو گہرائی میں اترنا سیکھیں ورنہ اس نے آپ کی زندگی کے لیے اللہ سے جتنی دعا میں مانگی ہیں اور شکرانے کے جتنے بھی سجدے کیے ہیں وہ آپ کو کبھی بھی نظر نہیں آئیں گے اور کبھی بھی احساس نہیں ہو گا۔ اس لیے ایک بار پھر ایک بار میری بات پر غور ضرور کیجئے گا۔“ نبیل علیز کے کو آگاہ کرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا اور علیز نے اس کی بات پر غور کرتی اس کے پیچھے دیکھتی رہ گئی تھی۔
لیکن چند سیکنڈ مسلسل خاموشی کے احساس نے اسے چونکا دیا تھا اور اس نے نظروں کا زاویہ بدلتے ہوئے دل اور کی سمت دیکھا وہ نظر چرائے ہوئے کھڑا تھا۔

”کیسے ہو ڈرا یور؟“ علیز نے بڑے تحمل سے اس کا حال احوال پوچھا تھا جیسے ان کے تعلقات بڑے دوستانہ رہے ہوں۔ دل اور نے بے ساختہ سر اٹھا کر علیز کے چہرے کی سمت دیکھا۔
”میں نے تم سے تمہارا حال پوچھا ہے۔“ علیز نے اپنے سوال زور دیا۔

”حال سے بے حال کر کے لوگ حال ہی پوچھا کرتے ہیں۔“ دل اور ہلکے اور استیغرائی انداز میں مسکرایا تھا۔
”حال سے بے حال تو میں ہو گئی ہوں دیکھ نہیں رہے۔“ علیز نے بے حد آستنی سے اور مدغم آواز میں بول رہی تھی حالانکہ ڈاکٹرز نے اسے زیادہ بات کرنے سے منع کیا مگر وہ آج سب اپنوں کو دیکھ کر تکلیف کے باوجود بھی چپ نہیں ہو پارہی تھی اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ بولتی رہے بولتی رہے اور دل کے سارے غبار نکال دے۔
”دیکھ بھی رہا ہوں اور محسوس بھی کر رہا ہوں کہ کاش یہ تکلیف مجھے اتنی ہوتی کاش یہ گولیاں مجھے لگی ہوتیں کاش اس بسترہ میں ہوتا اور مجھے اتنی تکلیف نہ ہوتی جتنی تمہیں دیکھ کر ہو رہی ہے۔“

دل اور نے آگے بڑھ کے اس کے نازک سے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا اور اپنے جذبات اور احساسات کی گرمی کا احساس دلایا تھا۔

”لیکن میں اپنی اس تکلیف پہ بھی بہت خوش ہوں ڈرا یور کیونکہ مجھے اس تکلیف کے عوض میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی اور سب سے بڑی دولت مل گئی ہے، میرے اپنے سے میرے گھر والے“ علیز نے بڑے دل سے اپنی خوشی کا اظہار کیا تھا۔

”تمہاری زندگی اور تمہاری خوشی کے لیے ہی تو یہ پیالہ پیارے ورنہ ان حالات میں میری جگہ کوئی اور ہوتا تو ایسا ہرگز نہ کرتا کیونکہ ایسا کرنے کے لیے کسی کے پاس اتنا حوصلہ ہی نہیں ہو سکتا۔“ دل اور نے مٹی سے کہتے ہوئے سر جھٹکا تھا۔

دل اور کالج دھیمما اور تلخ ہو چکا تھا۔

علیٰ نے اپنی طرف سے اس کے احسان کا شکریہ

”میں نے شکریہ بھی تو اسی لیے ادا کیا ہے تاکہ تم میری خاطر میرے گھر گئے ہو۔“

”کیوں؟“ میری خاطر کیوں؟ ہمارے درمیان تو ایسا کوئی جذبہ نہیں ہے جس کے بل بوتے پہ تم کچھ بھی کر گزرو؟“ علیزے نقطہ اٹھانے سے رہ نہیں سکی تھی۔

دل اور کے گمیر لہجے میں سچ سچ اس کے بوجھل بھیکے اور مہکتے ہوئے جذبات ہمک رہے تھے۔

دل اور نے پہنچ سے لہا اور کھوڑا ساعلیزے کے اوپر جھک آیا۔ اس پر علی نے بے پیرے سپہا

دل آور بہت بو جھل اور بھیلے سے بچے میں لیتے ہوئے اس کے چہرے پر ذرا اور جھکا ہوا اور علیز کے ہمارے بے

39 مائے مرگ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی ویب سائٹ

یہ تمامہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ام ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو
- ☆ ہر ای بک کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیننگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی متن مختلف
- ☆ سائٹ میں ایڈونٹ
- ☆ سیریم کو الٹی اندل کو الٹی، کیریڈر کو الٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریٹ
- ☆ ایڈ فوری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

☆ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

☆ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

”بھئی! شاید تم سے ملنے کا موقع ہی نہ ملتا اور نہ ہی میں خود کو شش کرنا مگر نبیل نے یہ کوشش کر کے مجھے بہت بڑا احسان کیا ہے اب اس ملاقات کے بدلے اس کا شکریہ ادا کرنا پڑے گا۔“ دل آور کہتے ہوئے آہستگی سے مسکرایا تھا اور اس نے دوبارہ دستک ہوئی اور دل آور اس کے بالوں کو پھیرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

”زری!“ اسے سارا دے کر ابھی وہیں چیر رہا تھا کہ اتنے میں آسیہ آفندی دروازہ کھول کر اندر آگئی تھیں اور زری نے بڑی الجھی ہوئی نظروں سے ان کے چہرے کی سمت دیکھا مگر ذہن پہ زور ڈالنے کے باوجود بھی وہ اس آشنائی صورت کو پہچان نہیں پائی تھیں۔

”آسیہ بھوپھو!“ عبد اللہ نے آہستگی سے نام لیا اور زری کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ وہ تو اسی لیے اس اسپتال سے ڈسچارج ہونا چاہ رہی تھی کہ اس کا کسی سے بھی — سامنا نہ ہو اور وہ چپکے سے یہاں سے چلی جائے مگر آسیہ آفندی اچانک اس کے سامنے آکھڑی ہوئی تھیں۔

”زری! میری جان کیسی ہو؟ یہ کس تکلیف کو جھیل رہی ہو تم؟ کیا ہوا ہے تمہیں؟“ آسیہ آفندی نے آگے بڑھ کر زری کی پیشانی چوم لی تھی اور اس کے قریب جھکتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا۔

”شاید کسی گناہ کی سزا جھیل رہی ہوں۔“ زری استہزائیہ سا بولی۔

”ارے یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟“ آسیہ آفندی تڑپ گئی تھیں۔

”جو بچ ہے وہی کہہ رہی ہوں۔“ کچھ گناہوں کی سزا انسان کو موت کے بعد ملتی ہے اور کچھ گناہوں کی سزا موت سے پہلے اس لیے بھی سمجھ لیں کہ میں موت سے پہلے گناہوں کی سزا جھیل رہی ہوں وہ بھی ایک ایسے گناہ کی سزا جس میں میں خدا کے علاوہ کسی کو خدا مان بیٹھی تھی سو مجھے سزا تو ملنی ہی تھی سنگین سزا۔“ زری کا لہجہ انتہائی سخت ہو رہا تھا اور عبد اللہ سر جھکا کر رہ گیا۔

”انی دے آپ سنائیں علیزے کیسی ہے کچھ بہتر ہوئی؟“ زری نے سر جھکا کر بات کا رخ ہی بدل دیا تھا۔

”ہاں بیٹا! اللہ کا شکر ہے کہ وہ اب پہلے سے ٹھیک ہے کافی بہتر ہے اب ہم سب کو دیکھ کر تو وہ پہلے روزی ٹھیک ہو گئی تھی“ آسیہ آفندی بیٹی کی محبت سے مسکرائی تھیں۔

”اللہ اسے ہمیشہ ٹھیک رکھے خوش رکھے،“ آباد رکھے، سدا سا گن رہے آئین۔“ زری نے علیزے کے لیے دعا کی تھی اور نگارش کا کلیجہ منہ کو آگیا اس نے چونک کر عبد اللہ کی طرف دیکھا مگر عبد اللہ لب بھینچ کر رخ موڑ گیا تھا۔

”ٹھیک ہے اتنی ہم لوگ جلتے ہیں آج ہم گھر جا رہے ہیں بہت عرصے بعد گھر میں قدم رکھنا نصیب ہو گا ان شاء اللہ آپ سے بعد میں بات ہوگی۔“ ان دونوں کو گم سم دیکھ کر زری نے خود ہی بات سمیٹی تھی اور آسیہ آفندی سر ہلاتے ہوئے اک سائیڈ پر ہو گئی تھیں۔

”ٹھیک ہے بیٹا! تم لوگ جاؤ اب تم سے ملاقات تمہارے گھر پہ ہی ہوگی ہم سب آئیں گے تم سے ملنے کے لیے۔“ انہوں نے بہت نرمی اور شفقت سے اس کا سر تھپکا۔

”تھینک یو اتنی!“ زری نے سر جھکا لیا اور پھر عبد اللہ اس کی وہیل چیر دھکیلا ہوا اسپتال کے روم سے باہر نکل آیا اور زری اس روم سے نکلتے ہوئے دعا کر رہی تھی کہ کاش میرا کسی سے بھی سامنا نہ ہو مگر دعا میں کبھی بھی مستجاب نہیں بھی ہوتی۔

انہی وہ سیکنڈ فلور سے گراؤنڈ فلور پہ آئے ہی تھے کہ سامنے سے آتے نبیل حیات اور دل آور شاہ کے قدم وہیں

کے وہیں جم گئے اور عبداللہ اور نگارش کے چہرے یہ بھی تاریکی کا اک سایہ سا گزرا تھا۔ لیکن پھر بھی عبداللہ نے وہاں سے گزر جانا چاہا تاکہ زری کی صحت یہ کوئی برا اثر نہ پڑے یا پھر دوبارہ وہ کسی صدمے کے حصار میں نہ آجائے لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ اب ایسا نہیں ہو گا اب یہ زری وہ زری نہیں رہی اب وہ اس زری کو اس کے دل کو اور اس دل کی محبت کو اسپتال کے اسی بستر کو ماضی میں چھوڑ کے جا رہی ہے جس بستر سے خود اٹھ کر آئی ہے۔ اب زندگی میں سب کے چہروں کے رنگ بدلیں گے صرف اس کے چہرے کا رنگ نہیں بدلے گا صرف ایک ہی رنگ رہے گا۔ کون کا رنگ، صبر کا رنگ اور بے خبری کا رنگ۔ جیسے اس وقت رہا تھا اور اس نے عبداللہ کو آگے بڑھنے سے روک دیا تھا۔

”ٹھہرس بھائی! کہاں جا رہے ہیں آپ؟ ان سے نہیں ملیں گے؟“ زری نے عبداللہ کو روکا۔

”زری! ہم لیٹ ہو رہے ہیں۔“ نگارش نے ایک کمزور سا ہمانہ پیش کیا۔

”گھر میں کون سا میرے ماں باپ میرا انتظار کر رہے ہیں جس کی وجہ سے لیٹ ہونے کا ڈر ہو گا؟“ زری نے نگارش کا ہمانہ ٹال دیا اور نگارش جزبزی ہو گئی تھی جبکہ زری ان دونوں کی طرف خود ہی متوجہ ہوئی تھی۔

”السلام علیکم! نبیل صاحب کیسے ہیں آپ؟ آپ کی بھابھی ٹھیک ہوئیں یا نہیں؟“ زری نے بڑی برداشت اور بڑی ہمدردی کا ثبوت دیتے ہوئے استفسار کیا تھا۔

”وعلیکم السلام! میں ٹھیک ہوں اور اللہ کا احسان ہے کہ بھابھی بھی ٹھیک ہیں اور آپ کو بھی مبارک ہو اللہ نے آپ کو صحت بخشی ہے اور نئے سرے سے زندگی عطا کی ہے۔“ نبیل نے بھی بڑی مشکل سے اپنے آپ کو اس طرح اچانک کمبوڑ کیا تھا کہ اسے اپنے آپ کو ہی داؤد بننے کو دل چاہتا تھا۔

”تھینک یو نبیل صاحب! تھینک یو ویری میچ۔“ آپ سب کی دعاؤں سے ہی تو ٹھیک ہوئی ہوں میں۔“ زری نے آج سچ اپنے آپ کو پتھر بنانے کی انتہا کر ڈالی تھی اور آج سب کے سامنے ثبوت بھی دے رہا تھا۔

”اس سے بڑی خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے بھلا؟“ نبیل نے کندھے اچکائے تھے۔

”خیر! آپ سنائیں مسٹر دل اور شاہ؟ آپ کی مسز کیسی ہیں؟ وہ کب دسپانچ ہو رہی ہیں اسپتال سے؟“ زری کا رخ اب دل اور کی طرف تھا اور دل اور جو ہمیشہ زری کے سامنے اپنا سراور اپنی نظریں جھکا کر بات کرتا تھا آج علیزے کے ذکر پر سر اٹھا کر بات کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

کیونکہ آج زری کے سامنے علیزے کے ذکر کیوں سر جھکا کر کرتا تو شاید علیزے سے کبھی بھی یوں معتبر نہ ہو پاتی جیسے اس کے سر اٹھا کر بات کرنے سے ہو گئی تھی۔

”الحمد للہ! میری مسز اب کافی بہتر ہیں اور ان شاء اللہ بہت جلد اسپتال سے دسپانچ بھی ہو جائیں گی بس آپ سب کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔“ دل اور کا لہجہ انتہائی مضبوط سے تھا گویا وہ سب ہی اپنی اپنی جگہ پہ ”وہ“ نہیں رہے تھے جو وہ ”ہیلے“ تھے۔

”ہاں کیوں نہیں بس اک دعا کا رشتہ ہی تو ہے جو سب کے دلوں کو زندہ رکھے ہوئے ہے اور مر رہے نہیں ہونے دیتا۔“ زری نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

”تھینک یو“ دل اور نے اس کا شکریہ ادا کیا تھا اور زری نے اپنے قریب کھڑی نگارش کی طرف دیکھا۔

”چلیں بھابھی! ہم لیٹ ہو رہے ہیں“ زری پھر بات کو وہیں پہ لے گئی تھی اور عبداللہ اس کی بات پہ چپ چاپ وہیل چیئر دھکیلا ہوا آگے بڑھ گیا تھا لیکن نبیل حیات اور دل اور شاہ وہیں کھڑے وہیل چیئر پر بیٹھی زری کو دیکھتے رہ گئے تھے۔

کیونکہ اب حقیقتاً ”ان تینوں کے دل کچھ اور ہو چکے تھے اور دلوں کے دھڑکنے کی طرز بھی کچھ اور ہو چکی تھی

آج وہ اک دوسرے کے پاس سے گزر گئے تھے اور احساس تک نہیں ہوا تھا۔ آخر یہ بھی تو زندگی کا ایک حیران کن مقام تھا!

”چلو! علیزے کے چیک اپ کا ٹائم ہو رہا ہے ڈاکٹرز آپکے ہوں گے۔“ دل اور گھڑی دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا اور اس کے پیچھے نبیل حیات بھی۔

اس کی بائیک انتہائی فل اسپڈ پہ جا رہی تھی جب اس کے سیل فون کی رنگ بجنا شروع ہوئی تھی اور مجبوراً اسے بائیک روک کر سیل فون جیب سے نکالنا پڑا تھا۔ نمبر کی کا تھا۔

”ہیلو؟“ اس نے اپنے مخصوص اسٹائل میں بیلو کہا۔

”مسلم کے فلیٹ پہ پہنچو۔“ وکی نے اتنا سا پیغام دے کر فون بند کر دیا اور جوت فون کو گھورتا رہ گیا تھا۔

”مسلم کے فلیٹ پہ پہنچو یہ بھی کوئی طریقہ ہے بھلا؟ پوری بات بھی نہیں بتائی۔“ جوت بے زاری سے کہتے ہوئے بڑبڑایا تھا کیونکہ وہ علیزے سے ملنے اسپتال جا رہا تھا اس لیے اب اسے علیزے سے ملنے کا ارادہ بدلنا پڑ گیا تھا۔

اور وہ بائیک کو دوبارہ سے اشارت کرتا ہوا ہو گیا تھا اور ٹھیک دس منٹ میں مسلم کے فلیٹ پہ پہنچ گیا تھا۔

”ہاں بولو! کیا بات ہے؟ اتنی ایمر جنسی میں کیوں بلایا ہے؟“ جوت آتے ہی شروع ہو گیا تھا۔ ”بیٹھو وکی نے بڑے موڈ سے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

”اوکے بیٹھ گیا اب بولو۔“ جوت نے صوفے پہ بیٹھتے ہوئے دوبارہ سوال دہرایا۔

”تمہارے سالے کا پتا لگا لیا ہے ہم نے۔“ وکی نے بڑی خباثت سے آنکھ دہاتے ہوئے کہا۔ ”سالے کا؟“ مطلب؟ میرے تو اس شہر میں بہت سے سالے ہوں گے۔ تم کس کی بات کر رہے ہو؟ جواباً اس نے خود بھی حد کر ڈالی تھی۔

”جو تمہیں آج کل مطلوب ہے اور جس کی بہن کے تم دیوانے ہوئے پھر رہے ہو مگر وہ تمہارے ہاتھ نہیں آ رہی۔“ وکی نے اگلا شو شا چھوڑا۔

”کون؟“ جوت ٹھنکا۔ ”دیوانے کس کے ہو؟“ کامی نے بھی مداخلت کی تھی۔ ”مریم! اس نے جھٹ سے پوچھا۔“ اور وہ ٹھہرا مریم فاروقی نیازی کا بھائی عدیل عمر نیازی۔“ وکی نے انتہائی حیران کن انکشاف کیا تھا اور جوت صوفے سے دوٹو اوپر اچھل کر کھڑا ہو گیا تھا۔ ”کیا؟ عدیل، مریم کا بھائی ہے؟“ جوت کو جیسے بہت برا جھٹکا لگا تھا۔

”جی جناب! عدیل عمر نیازی آپ کی مریم کا اکلوتا بھائی ہے اور تمہارے تو دونوں بہن بھائی کی طرف ہی بڑے حساب نکلتے ہیں؟“ وکی نے جوت کی دکھتی رنگ پہ ہاتھ رکھا۔

”حساب تو واقعی بڑے نکلتے ہیں پارا میں نے اس سے بڑی شرافت سے اور بڑے شریفانہ انداز میں ایک بات پوچھی تھی مگر اس نے نہیں بتائی بلکہ میرے سامنے جھوٹ بول دیا اب اسے اس جھوٹ کا حساب بھی دینا ہو گا۔“ جوت کو اس وقت مریم کا وہ جھوٹ بھی یاد آ گیا تھا جو وہ دل اور شاہ کی خاطر بول گئی تھی۔

”کیسی بات؟“ اور کیسا جھوٹ؟ کچھ ہمیں بھی تو بتاؤ؟“ کامی نے تجسس کے مارے اسے کبید تھا۔

”یار کیا بتاؤں؟ مجھے ایک آدمی کے بارے میں پوچھنا تھا لیکن اس نے نہیں بتایا۔“

”کون آدمی؟“ کامی اور وکی بات کا پیچھا کب چھوڑتے بھلا۔

”ہے ایک آدمی، دل اور شاہ نام ہے اس کا۔ اس کے متعلق پوچھا تھا مگر وہ صاف مکر گئی تھی۔“ جودت کو تاؤ آرہے تھے کیونکہ وہ اب تک دل اور شاہ کو منصور حسین ہی سمجھ رہا تھا اور مریم نے پوچھنے کے باوجود بھی اس کی غلط فہمی دور نہیں کی تھی۔

”ارے! اسی دل اور شاہ کے شوروم میں ہی تو عدیل عمر نازی بطور منیجر کام کر رہا ہے۔“ وکی نے ایک اور ہم پھوڑا اور جودت کو ایک اور کرنٹ چھو گیا تھا۔

”واٹ؟ یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟“

”ارے! تو اور کیا؟ ساری معلومات کس لیے حاصل کی ہیں بھلا۔“

”اوہ ہائی گڈ نیس! تو یہ چکر ہے یعنی وہ واقعی اسے جانتی تھی۔“ جودت کا یقین اب اور بھی پکا ہو گیا تھا۔

”ہنڈ رڈر سینٹ جانتی تھی“ وکی نے جلتی یہ تیل پھینکا۔

”ہوں! وہ اسے جانتی تھی مگر وہ مجھے نہیں جانتی۔“ جودت نے بڑے پرسوج سے لہجے میں کہا تھا۔

”جب تک کسی کو اپنی پہچان نہ کرواؤ کوئی ہمیں نہیں جانتا۔ اس لیے اپنی پہچان خود کروانی پڑتی ہے۔“ کامی نے بھی لگے ہاتھوں مشورے سے نوازا تھا۔

”ہاں کرواؤں گا پہچان! اب اسے پہچان ہی تو کرواؤں گا میں نے اس کے ساتھ بہت نرمی اور بہت رعایت برتنے کی کوشش کی مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا کچھ حاصل نہیں ہوا لیکن اب فائدہ بھی ہوگا اور حاصل بھی بہت کچھ ہوگا۔ اب اور کوئی چھوٹ نہیں رہی اس کے لیے اور اس کے بھائی کو بھی بتا دے گا کہ اس نے غیرت اور بے غیرتی کا طعنہ کس کو دیا تھا اور گالی کس کو دی تھی؟“ جودت نے جیسے دل ہی دل میں کوئی خطرناک عزم باندھ لیا تھا۔

”کیا ارادہ ہے پھر؟“ وکی اور کامی نے ایک دوسرے کو آنکھوں میں اشارہ دیتے ہوئے جودت سے استفسار کیا تھا۔

”تم کیا کہتے ہو؟“ جودت نے اٹا ان دونوں سے پوچھا۔

”وہی ایک دورات کا سبق ہی کافی ہے۔“ وکی نے خباثت سے مشورہ دیا۔

”ایک دورات کا نہیں، پورے ایک ہفتے کے لیے سبق دوں گا۔ ایک دورات میں میرا دل ٹھنڈا ہونے والا نہیں ہے۔“ جودت دانت پیستے ہوئے بول رہا تھا۔

”تو پھر اتنے دن رکھو گے کہاں؟“ کامی کو حیرت ہوئی۔

”ہمیں۔ اسی فلیٹ میں۔ اس سے اچھی اور بہتر جگہ تو اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔“ وہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”لیکن پروگرام کب کا ہے؟“ وکی نے سب کچھ فائنلی پوچھ لیتا جا رہا تھا۔

”سب حالات دیکھ کر بتانا ہوں کہ پروگرام کب کا رہیں کیونکہ گھر میں آذر اور وانیال بھائی کی شادی کے ہنگامے بھی چل رہے ہیں اور میری کزن بھی اسپتال میں ایڈمٹ ہے اس لیے احتیاطاً سوچ رہا ہوں کہ کہیں کوئی مسئلہ نہ کھڑا ہو جائے۔“ جودت نے وجہ بتائی تھی۔

”ارے! یہ تو اور بھی اچھی بات ہے کہ تمہارے گھر میں شادی کے ہنگامے چل رہے ہیں اس طرح مصروفیت میں تمہارے گھر والوں کو تمہاری باہر کی اپنکٹیوٹیز کا پتا بھی نہیں چلے گا اور تمہارا کام بھی ہو جائے گا۔“ وکی نے اسے ایک اور مفید مشورے سے نوازا تھا۔

”چلو ٹھیک ہے پھر دیکھتا ہوں کہ کب ہوتا ہے“ جودت ذرا جلدی میں تھا۔

”لیکن اس کے لیے سارا انتظام کون کرے گا؟“ کامی نے پھر جودت کو روکا۔

”تو تم لوگ کس مرض کی دوا ہو؟“ جودت اس کی طرف پلٹا۔

”مگر کچھ پلاننگ بھی تو ہو؟ کچھ ٹائمنگ کا تو پتا چلے؟ تم ہو کہ ادھر آئے ہو اور ادھر کوچ کو تیار کیا ایسے کام اس طرح ہوتے ہیں؟“ وکی نے جودت کو خفگی سے گھورا تھا۔

”تو کس طرح ہوتے ہیں؟ کیا دن رات سر جوڑ کر بیٹھے رہیں اور پلاننگ کرتے رہیں تو تب ہی ایسے کام ہو سکتے ہیں؟ نارمل طریقے سے بات کر لینے سے کچھ نہیں ہوتا؟“ جودت ان پر خفا ہو رہا تھا۔

”یار! ہم نے ایسا کب کہا ہے کہ ایسے کام نہیں ہو سکتے مگر یار سوچ بچار اور پلاننگ بھی کوئی چیز ہوتی ہے آخر ایسے معاملوں میں ایک دوسرے سے پوچھ کر ہی قدم اٹھانا چاہیے اس طرح معاملہ بگڑتا نہیں ہے۔“ کامی نے اب ذرا تحمل سے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

”اوکے! آئی انڈر اسٹینڈ لیکن تم بس اتنا کرو کہ اس فلیٹ کے سب کھڑکیاں دروازے اور ان کے لاک وغیرہ اچھے سے چیک کر لو اور گاڑی کا انتظام بھی کر رکھو اس کو شکار کرنے کے بس دو ہی ٹائم ہیں ایک جب وہ اکیڈمی جاتی ہے اور دوسرا جب اکیڈمی سے واپس آ رہی ہوتی ہے اور اس کام کے لیے اور بھی جن چھوٹی موٹی چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے وہ بھی لے آؤ باقی سب کچھ فون پر سمجھا دوں گا۔ تم لوگ یہ پیسے رکھ لو چیزیں خریدنے میں کام آئیں گے“ جودت نے جاتے جاتے پانچ پانچ ہزار کے چند نوٹ نکال کر کامی کی طرف بڑھائے اور ان کو ہاتھ ہلاتا ہوا باہر نکل آیا تھا۔

اور پیچھے وہ دونوں خباثت سے قہقہہ لگا کر ہنستے تھے کیونکہ ان کے تو ہر طرح سے مزے ہی مزے تھے۔

اگر تو وجہ نہ پوچھے تو اک بات کہوں؟

بن تیرے اب مجھ سے بھی جیا نہیں جاتا

آج ٹھیک بارہ دن بعد ڈاکٹر نے علیزے کو ڈسچارج کرنے کا فیصلہ سنایا تھا۔ اور یہ فیصلہ سن کر دل اور بہت خوش ہوا تھا کہ چلو شکر ہے کہ علیزے اب گھر جائے گی مگر علیزے کے گھر جانے کی خوشی میں سرشار اور مسرور ہوتے دل اور شاہ کے قدم اسپتال کے ریسیوٹ روم میں داخل ہوتے ہی رک گئے تھے۔

”آپ اس کی تمام چیزیں بیک کر لیں میں گاڑی نکالتا ہوں“ آذر آسیہ آقندی سے کہتا ہوا پلٹا مگر دل اور کو دروازے کے پتوں پہنچ کھڑے دیکھ کر زار دہر کے لیے رک گیا کیونکہ وہ دل اور کے چہرے کا رنگ بھانپ گیا تھا۔

”علیزے اپنے گھر جائے گی“ اس نے اپنے تمام تاثرات کنٹرول کرتے ہوئے ان سب کو اپنا فیصلہ سنایا تھا اور اس کے اس با آواز بلند فیصلے پر وہاں موجود تمام افراد نے بے اختیار چونک کر دیکھا مگر اسے جواب کسی نے بھی نہیں دیا تھا کیونکہ اس کے مقابل آذر کھڑا تھا۔

”علیزے اپنے گھر ہی جا رہی ہے۔“ آذر کا جواب چھین لیے ہوئے تھا۔

”میں اپنے گھر کی بات کر رہا ہوں جو میرا اور علیزے کا ہے“ دل اور نے اپنے گھر پر زور دیا تھا۔

”مگر میں اس گھر کی بات کر رہا ہوں جو صرف علیزے کا ہے۔“ آذر بھی اپنی بات پر اڑچکا تھا۔

”اس کا فیصلہ علیزے خود کرے گی کہ اس کا گھر کون سا ہے؟ اور اس نے کہاں جانا ہے؟“ دل اور نے فیصلہ علیزے پر چھوڑ دیا تھا اور علیزے اس کے اس سوال پر بری طرح سٹپٹا گئی تھی۔

”بس میں نے کہہ دیا علیزے اپنے گھر جا رہی ہے اور اس چیز کے لیے ہمیں تم سے یا علیزے سے پوچھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اب وہی ہوگا جو ہمارا فیصلہ ہوگا اور مجھے امید ہے کہ علیزے بھی اس سے انکار نہیں

کرے گی وہ بھی ہمارے ساتھ حویلی ہی جانا پسند کرے گی کیوں علیزے؟ تم کیا کہتی ہو؟ کہاں جانا ہے تم نے؟ حویلی یا بیرسٹر اور شاہ کے گھر؟

آز نے انتہائی تلخ اور طنزیہ سے انداز میں کہتے ہوئے علیزے کی سمت دیکھا تھا اور علیزے سب کے سامنے بے ساختہ نظریں جھکانے پر مجبور ہو گئی تھی کیونکہ اب سب کی نظروں کا مرکز وہی تھی۔ سب اس کے جواب کے منتظر ہو گئے تھے مگر آزاد کے سوال کا جواب دینا بہت مشکل تھا خصوصاً اس وقت۔

”علیزے! میں تم سے پوچھنا نہیں چاہتا تھا مگر میرا صاحب کی غلط فہمی دور کرنے کی خاطر پھر بھی تم سے پوچھ لیا ہے تاکہ سب کے سامنے تم خود بتاؤ کہ تم کہاں جانا چاہتی ہو؟ حویلی یا اس کے گھر؟ ہمارے ساتھ یا اس کے ساتھ؟ اپنے ڈیڈ کے پاس یا اس کے پاس؟ بولو بتاؤ اب؟“ آزاد اک اک لفظ چبا کر اور کرتا رہا تھا اور علیزے چپ چاپ سر جھکائے سب سن رہی تھی۔ اس نے جواباً ”ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا مگر اس وقت اس کی چپ سے کام نہیں چل سکتا تھا۔“

”علیزے! فیصلہ کرو اور بات ختم کرو تاہم کم ہے کمرہ خالی کرنا ہے۔“ آزاد راغبت سے بولا تھا اور مجبوراً علیزے کو سر اٹھا کر ان سب کی طرف دیکھنا پڑا تھا۔

اور اس کی پہلی نظر آسیہ آندی پر پڑی تھی ان کے چہرے پہ بھی یہی تحریر رقم تھی کہ وہ حویلی چلے

اور اسے سب کے چہروں پہ یہی لکھا نظر آیا تھا کہ وہ ان کے ساتھ حویلی جائے۔ اور حویلی والوں کے چہروں کی تحریر بھی علیزے کے سامنے گھر والے کے چہرے کا لفظ پڑھنا بھول گئی وہ لفظ جو ”محبت“ تھا وہ لفظ جو ”مان“ تھا وہ لفظ جو ”محرم“ تھا اس نے نہیں پڑھا اس نے نہیں دیکھا اس نے نہیں سوچا۔ اور بس ایک نظر آخری نظر اور اجنبیت کی نظر سے سامنے کھڑے بڑے مان اور بڑی محبت سے دیکھتے اپنے ”ڈرائیور“ کو دیکھا اور پھر نظر حویلی جھکا لی اور شاید چھپا بھی لی تھی۔ اور اس کے اس طرح نظریں چرانے اور نظریں جھکانے سے ہی دل اور کے قدموں تلے زمین ایک بار سر کی ضرورت تھی مگر پھر بھی وہ اپنے قدموں پہ جم کے اور ڈٹ کر کھڑا رہا کیونکہ اسے اب بھی امید تھی کہ وہ اس کی امید نہیں توڑے گی لیکن علیزے کے جواب پہ امید تو بھلا کیا ٹوٹی وہ خود ٹوٹ گیا تھا۔

”میں حویلی جانا چاہتی ہوں آپ کے ساتھ اپنے پاس۔“

علیزے نے جو کہنا تھا کہ دیا مگر دل اور کو یوں لگا تھا کہ علیزے نے اس کی شہ رگ کاٹ دی ہو اور اس کا دل اپنے پاؤں تلے مسل دیا ہو اور اسے بچ چکا ہو اسے میں کھڑا کر کے اس کے منہ پر طمانچہ دے مارا ہو۔

اس کی حالت ایسی ہو گئی تھی جیسے کسی نے اس کے جسم سے سارا خون نچوڑ لیا ہو اور وہ بالکل بے جان اور لاش کی مانند سفید پڑ گیا تھا لیکن پھر اس نے کہا کچھ نہیں اور خاموشی سے دروازے کے سامنے سے اک سائیڈ پہ ہٹ گیا۔

کیونکہ اب اس کا آزاد کے ساتھ کوئی اختلاف نہیں تھا کوئی بحث نہیں تھی کوئی جھگڑا نہیں تھا۔ ہاں ایک دل تھا جو یقیناً ”امید“ بھروسے اور مان کی بلندیوں سے گرا اور کرچیوں میں تقسیم ہو گیا اور دل کی اس تقسیم پہ اور ہر کنوں کی اس تباہی پہ دل اور کا دل چاہا کہ دو زانو فرش پر گرے اور زمین میں ہی اتر جائے۔ کیونکہ اس کے پاس کچھ نہیں بچا تھا۔ اب تو وہ صرف دیکھ رہا تھا کسی روٹ کی مانند۔

علیزے کا سامان سمیٹا گیا گاڑی نکالی گئی علیزے کو تیار کروایا گیا اور پھر سب کی سمارے سے چلتی ہوئی وہ ایک سرسری سی نظر دل اور پہ ڈالتی ہوئی اس کے سامنے اس کی آنکھوں کے سامنے اپنے گھر والوں کے ساتھ اسپتال کے اس پرائیویٹ روم کی دلیز عبور کر گئی تھی اور دل اور اس دلیز پر کھڑا کوئی دور سے مرکزی دروازے کی

سمت جاتے ہجوم کو دکھتا رہ گیا لیکن خود واپسی کے لیے قدم آگے نہیں بڑھا سکا تھا۔

اس کے قدم شکستہ تھے کہتے ہیں کہ انسان کی اندرونی کیفیات صرف چہرے سے ہی نہیں اس کے قدموں سے بھی عیاں ہوتی ہیں جیسے انسان کے چہرے کے تاثرات، آنکھیں، اور زبان بولتی ہیں بالکل اسی طرح انسان کے قدم بھی بولتے ہیں۔ اپنے جذبات انہی کیفیات ظاہر کرتے ہیں جیسے کہ انسان خوش ہو تو سرشار قدم، غم زدہ ہو تو بو جھل قدم، بیمار ہو تو بڑھال قدم، عجلت میں ہو تو تیز قدم، نشے میں ہو تو ہلکے قدم، ناکام ہو تو بایوس قدم، بچہ ہو تو لڑکھڑاتے قدم، جوان ہو تو مضبوط قدم، بوڑھا ہو تو کمزور قدم، پر عزم ہو تو ثابت قدم اور زندگی کے کسی اہم مقام پہ آکر ہارا ہوا ہو تو ”شکستہ قدم“ اور آج وہ بھی ایک ہارا ہوا انسان تھا آج اس کے قدم بھی شکستہ تھے۔

آج سے پہلے زندگی میں اس کے قدموں نے بھی ہزاروں ڈانٹے چلے تھے کئی بار سرشار ہوئے تھے تو کئی بار بو جھل اور کئی بار بڑھال ہوئے تھے اور کئی بار ہلکے بھی تھے لیکن شکستہ پہلی بار ہوئے تھے کیونکہ وہ ہارا پہلی بار تھا۔ وہ اس وقت پوری طرح سے ہارا ہوا ایک شکست خورہ انسان لگ رہا تھا اور اس وقت وہ کچھ کہنے اور کچھ کرنے کی پوزیشن میں ہرگز نہیں تھا اس وقت وہ صرف سوچ سکتا تھا کیونکہ اس وقت سوچنے کے علاوہ اس میں اور کوئی سکت نہیں تھی اس کی ہمت و حوصلہ ڈوب چکا تھا شکست کی کسی اتھاہ گہرائی میں۔

وہ اپنے بے دم شکستہ قدموں پہ اپنی غم زدہ بو جھل ذات کا بوجھ بمشکل اٹھا کر اسپتال کے پرائیویٹ روم کی چوکھٹ میں آکھڑا ہوا تھا اور دور تک چھٹی کشادہ اور طویل راہداری میں دیکھنے کی کوشش کی تھی اور اس کوشش کے بعد وہ مضبوط انسان دھواں دھواں ہو کے رہ گیا تھا اور اس دھو میں کی تاریکی اسے سر تاپا اپنے حصار میں گھیرنے لگی تھی وہ اس چوکھٹ میں یوں کھڑا تھا جیسے اس کی دنیا یہیں پہ ختم ہو گئی ہو اور اس چوکھٹ سے باہر اس کے لیے کچھ بھی نہ بچا ہو۔

حالانکہ اب سے تھوڑی دیر پہلے۔ وہ کافی حد تک مطمئن اور خوش تھا شاید اس لیے کہ اس کے دل میں کہیں نہ کہیں ایک چھوٹی سی امید، ”امید“ سانس لے رہی تھی اسے جانے والے بہت زیادہ نہ سہی تھوڑا بہت ”مان“ ضرور تھا۔ لیکن اسے تھوڑی دیر پہلے تک یہ خیال چھو کے بھی نہیں گزرا تھا کہ مان ”اکثر“ ٹوٹ جایا کرتے ہیں اور امیدیں ہمیشہ دم توڑنے کے لیے ہی ہوتی ہیں۔ اگر اس چیز کا خیال اسے ذرا سا پہلے ہو جاتا تو وہ یقیناً ”کبھی بھی اس پہ مان نہ کرتا مگر اب۔ اب کیا ہو سکتا تھا؟ اب تو وہ بہت پیچھے رہ گیا تھا بہت تنہا ہو گیا تھا۔ آج اس کی امید نے ہی دم نہیں توڑا تھا بلکہ اس کا مان بھی ختم ہو گیا تھا۔ اس کی موہوم سی خوشی بھی بجھ کر راکھ ہو گئی تھی وہ اس پرائیویٹ روم کی چوکھٹ میں کھڑا ابھی تک کشادہ راہداری کو دیکھ رہا تھا جو تھوڑی دیر پہلے اتنے زیادہ لوگوں کی بدولت تنگ پڑ رہی تھی اور اب بالکل خالی اور ویران نظر آ رہی تھی بالکل اس کی ذات کی طرح!

”سر کیا میں یہ روم صاف کر سکتی ہوں؟“ اسپتال کی ملازمہ مریض کے ڈسچارج ہوتے ہی روم کی صفائی ستھرائی کے لیے فوراً حاضر ہو گئی تھی شاید اب اس روم میں کسی نئے مریض کو شفٹ کرنے کی تیاری ہو رہی تھی اس لیے ان کو یہ روم از سر نو صاف کرنے کی جلدی تھی اور وہ جواباً ”کچھ بھی کہے بغیر چوکھٹ پہ رکھا اپنا ہاتھ ہٹا کر خود بھی وہاں سے ہٹ گیا تھا لیکن اس کے قدم اس کا ساتھ نہیں دے پا رہے تھے وہ اپنے شکست خورہ قدموں سے چل کر بمشکل اسپتال سے باہر پارکنگ تک آیا تھا۔ پارکنگ میں تھوڑی دیر پہلے اس کی گاڑی کے علاوہ اور بھی چند گاڑیاں کھڑی تھیں مگر اس وقت صرف اس کی براؤڈ موجود تھی۔

آپنی گاڑی کا لاک کھولتے ہوئے اسے اپنے ہاتھوں میں ہلکی سی لرزش محسوس ہوئی تھی شاید تنہا ایسی کے احساس نے اس کی تھکن اس کی تنہائی اس کی شکستگی میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا، کھٹکے کھٹکے انداز سے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس کی نظر پچھلی سیٹ کی سمت اٹھی تھی جس پر سرخ خون کے دھبے اب سیاہی مائل ہونے لگے تھے اس کے ذہن میں وہ منظر وہ لمحہ وہ وقت آج بھی پہلے دن کی طرح تازہ ہوا تھا اس کی سماعتوں میں اس کی دردناک چیخ آج بھی محفوظ تھی اور وہ اس کی تکلیف سوچ کر آج بھی تڑپ اٹھتا تھا آج بھی اس کا دل کسی انہونی کے خیال سے جیسے مٹھی میں آجاتا تھا وہ نجانے اور کتنی دیر یونہی گردن موڑے پچھلی سیٹ کو دیکھتا رہتا کہ اچانک اس کے سیل فون پر ہونے والی وابہریشن نے اسے چونکا دیا تھا مگر چونکنے کے بعد بھی اس نے سیل فون نکال کر دیکھنے یا کال ریسیو کرنے کی زحمت نہیں کی تھی بلکہ لب بھینچ کر سر جھٹکتے ہوئے اسٹیرنگ تھام لیا تھا اور اگلے ہی لمحے گاڑی آگے بڑھائی۔

اسپتال سے گھر کے گیٹ تک آکر بھی اس کی کیفیت میں رتی برابر فرق نہیں آیا تھا وہ اک ٹرانس کی سی کیفیت میں گھر تک پہنچا اور ایسی حالت میں کسی اور چیز کی طرف دھیان دینا ہرگز ممکن نہیں تھا۔

”سلام صاحب“ چوکیدار نے اس کی گاڑی دیکھ کر فوراً ہی گیٹ کھول دیا تھا جبکہ وہ اس کے سلام کا جواب تک نہ دے سکا تھا اور خاموشی سے گاڑی اندر بڑھالے گیا تھا حالانکہ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا کہ وہ اپنے کسی ملازم کے سلام کا جواب نہ دیتا وہ اگر کبھی غصے یا پھر غم کی حالت میں بھی ہوتا تو ہاتھ کے اشارے سے یا پھر سر کے اشارے سے ہی مگر جواب ضرور دیتا تھا لیکن نظر انداز نہیں کرتا تھا۔

شاید اسی لیے آج اس کے چوکیدار کو اس کی گہری چپ سے کسی سنگین مسئلے کا احساس ہو گیا تھا جب تک چوکیدار نے گیٹ بند کیا تب تک وہ گاڑی سے اتر کر اندر چلا گیا تھا اور آگے پیچھے کچھ بھی دیکھے بنا ڈرائنگ روم کے صوفے پر آکر ڈھسے گیا تھا۔

”سلام صاحب جی“ اس کی ملازمہ ڈرائنگ روم کے صوفوں پر رکھے کفن تر تیب دے رکھ رہی تھی۔ اچانک اسے آتے دیکھ کر الارٹ ہو گئی تھی مگر وہ بہت نڈھال نظر آ رہا تھا ملازمہ اسے اس طرح شکستہ حال میں دیکھ کر ٹھنک گئی تھی چوکیدار کی طرح اسے بھی اپنے مالک کی کیفیت کا فوراً ہی اندازہ ہو گیا تھا کیونکہ اس پر چھائی مایوسی اور شکستگی اس کے انگ انگ سے جھلک رہی تھی وہ آج حقیقتاً ”دیکھنے والوں کو بھی“ تنہا لگ رہا تھا اپنی کپٹیوں کو مسلتے ہوئے اس نے ملازمہ کو بیڈ روم سے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر لانے کا کہا تھا اور پھر چند سیکنڈز میں ہی اس نے سگریٹ کو اپنے شیکے کٹاؤ دار عنابی ہونٹوں میں دبا کر لائٹر سے شعلہ دکھادیا تھا اور ایک گہرا کٹھن لے کر دھواں فضا میں چھوڑ دیا تھا۔ اور پھر رفتہ رفتہ سگریٹ کا دھواں ڈرائنگ روم میں ہی نہیں اس کی ذات میں بھی بھرنے لگا تھا۔ ہر سودھوں کے مرغولے پھلتے جا رہے تھے اور ہر سو اس کی تنہائی رقص کرنے لگی تھی۔ ایک کے بعد ایک سگریٹ سلگتا رہا اور دھواں بڑھتا رہا۔

گزشتہ چند دنوں سے وہ اسموکنگ سے کافی حد تک گریز کر رہا تھا وہ اپنی عادت اپنی طلب پہ کنٹرول کرنا سیکھ رہا تھا مگر آج اچانک سب کچھ پہلے جیسا ہو گیا تھا۔ اس کی سوچیں اور وہی عادتیں عود کے سامنے آنے کو بے تاب ہو گئی تھیں آج پھر سگریٹ اس کی شکستہ ذات کو اپنے دھوئیں کی چادر میں لپیٹ رہے تھے اور وہ پور پور دھوئیں میں ڈوب رہا تھا ڈرائنگ روم کا فریش ماحول دیکھتے ہی دیکھتے جس زہر ہو گیا اور اس کے ملازم اسے اس حال میں دیکھ کر بہت پریشان ہو رہے تھے کیونکہ وہ اسے مالک سے بہت پچی تھے اس کا اچھا برا انہیں بھی متفکر کر دیتا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ نہ تو آگے بڑھ کے اسے روک سکتے تھے اور نہ ہی پوچھ سکتے تھے کیونکہ وہ اس وقت اپنی ہی ذات کے نہاں خانوں میں اترا ہوا تھا اور فی الحال اسے ڈسٹرب کرنا ہرگز مناسب نہیں تھا البتہ اس کے حال پر وہ اندر ہی اندر

چلتے کڑھتے رہے تھے۔ وہ شام سے ڈرائنگ روم کے صوفے پہ ایک ہی پوزیشن میں بیٹھا ہوا تھا اور مسلسل سگریٹ پھونکتے ہوئے اذیت ناک کایہ کھیل بھی جاری تھا۔

شام سے مسلسل اس کے قریب پڑی کرٹیل پہ رکھا موبائل لگا تار ہونے والی وابہریشن سے تھرک رہا تھا یوں جیسے کال کرنے والا اس کے لیے تڑپ رہا ہو اور وہ موبائل اسکرین دیکھے بنا بھی جانتا تھا کہ یہ ”تڑپ“ اور یہ کال کس کی ہے؟ لیکن اس وقت وہ اپنے لیے تڑپنے والے سے بھی بات نہیں کرنا چاہتا تھا اس وقت وہ صرف اپنے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔ وہ اپنی تنہائی، اپنی شکستگی کی حد تک کھنا چاہتا تھا اپنے آپ کو آزمانا چاہتا تھا اور اسی لیے اس نے متواتر بجنے والی کال ریسیو نہیں کی تھی اور ایک بار پھر سر جھٹک کر سگریٹ ایش ٹرے میں میل کر دوبارہ سگریٹ سلگا لیا تھا۔ آج نہ تو اس کے ذہن پہ سوار بوجھ کم ہو رہا تھا اور نہ ہی رات آگے سرک رہی تھی۔ ہر چیز پہ ایک جمود سا طاری تھا سب کچھ جیسے پھر سا گیا تھا، لمحات ساکت ہوئے لگ رہے تھے!

صبح کا سورج ابھی پوری طرح سے ظلموع بھی نہیں ہوا تھا کہ نیل حیات کی گاڑی سیدھی اس کے گھر کے گیٹ پر آرکی تھی اور اسے دیکھ کر گلاب خان نے فوراً گیٹ داکر دیا تھا۔

”تمہارے صاحب کہاں ہیں؟“ نیل نے گاڑی سے اترتے ہی استفسار کیا تھا۔

”مندر ہیں مگر بہت برے حال میں ہیں“ گلاب خان نیل سے بھی زیادہ پریشان نظر آ رہا تھا اور نیل اس کی بات سن کر ایک سیکنڈ کی بھی تاخیر کیے بغیر اندر کی سمت بھاگا اور ڈرائنگ روم کے پتوں پر صوفے پہ بندھال اور بے سدھ پڑے دل اور کودکھ کر یکدم قدم ٹھک گئے تھے اور وہ بے ساختہ لپک کے اس کے قریب آیا تھا۔

”دل آورے! دل آورے! آنکھیں کھولو اور میری طرف دیکھو۔“ نیل نے اس کے قریب جھکتے ہوئے اسے جھنجھوڑا تھا۔ اور دل آورے نے اپنے ورد سے پھٹتے سر کو بمشکل حرکت دیتے ہوئے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی تھی۔

”دل آور کیا ہو گیا ہے تمہیں کیا حال بنا لیا ہے تم نے؟“ اٹھو آنکھیں کھولو۔“ نیل کا دل اسے دیکھ کر جیسے مٹھی میں آگیا تھا کیونکہ اس کی حالت ہی ایسی ہو رہی تھی کہ نیل سے بھی ہرواشت کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

اور دل آورے نے نیل کے بازو کا سہارا لے کر اٹھتے ہوئے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور ذرا دیر یوں سر جھکائے بیٹھا رہا تھا۔

”دل آورے۔“ نیل نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا تھا۔

”زندہ ہوں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے تلخی سے کہہ کر وہاں سے اٹھنے کی کوشش کی تھی مگر وہاں سے اٹھ نہیں سکا تھا اور اسے یوں لڑکھڑاتے دیکھ کر نیل نے فوراً اسے تھام کر اسے سہارا دیا تھا۔

”لیکن یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا بھائی کہاں ہیں وہ گھر کیوں نہیں آئیں؟“ نیل رات سے پریشان ہو ہو کر تھک چکا تھا۔

”وہ حوصلی چلی گئی ہے۔ اپنے گھر والوں کے پاس۔“ دل آورے نے کسی رو بوٹ کی طرح جواب دیا تھا۔

”مگر کیوں؟“ وہ اپنے گھر کیوں نہیں آئیں؟ تمہارے ساتھ تمہارے پاس۔“

”کیونکہ اسے یہ گھر پسند نہیں ہے کیونکہ اسے مجھ سے محبت نہیں ہے کیونکہ وہ۔۔۔ وہاں۔“ دل آورے کہتے کہتے بے اختیار رک گیا تھا اور اس نے بے بسی سے لب بچھینچ لیے تھے۔

”بس کرو نیل بس کرو۔ مجھ سے اور کچھ مت پوچھو میرے پاس کچھ نہیں بچا میں اب کچھ بھی کہنے کے قابل نہیں اس لیے بہتر ہے کہ مجھے چپ رہنے دو پلیر مجھے چپ رہنے دو نیل مجھے چپ رہنے دو۔“ دل آورے بے بسی اور شکستگی کی انتہا پہ تھا۔

”کیوں دل آورے کیوں؟ کیوں چپ رہنے دیں تمہیں؟ تم چپ کیوں رہنا چاہتے ہو؟ جو تمہارے دل میں ہے تم کہتے کیوں نہیں ہو کو جو بھی دل میں ہے کو میں سن رہا ہوں۔ تمہاری ہر بات سنوں گا اور سمجھوں گا بھی۔“ نیل نے اسے بولنے پہ اکسایا تھا لیکن دل آورے کیسے بولتا؟ کیسے کچھ کہتا۔؟ اس کے پاس واقعی اب خاموشی اور چپ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

”کیا کہوں۔ کیا کہوں آخر؟ یہی ناکہ میں؟“ ہار چکا ہوں میں صرف علیزے کے چلے جانے سے ہی ہار چکا ہوں۔ تو سنو۔ ہاں میں واقعی ہار چکا ہوں۔ ہار چکا ہوں میں۔ اور مجھے ہرانے والی اور مجھے شکست دینے والی کوئی اور نہیں میری بیوی ہے میری اپنی بیوی نہ بیوی جس کی خاطر میں نے وہ کام بھی کیے ہیں جو یقیناً ”میں مر بھی جاتا تو نہ کرتا۔“ دل آورے کا لہجہ کہتے کہتے مزید گہبیر ہو گیا تھا۔

”انہوں نے ایسا کیوں کیا ہے؟ تم تو کہتے تھے کہ علیزے بھابھی کو تم سے محبت ہے تو میرج کی ہے تم لوگوں نے۔۔۔ پھر یہ۔۔۔ یہ سب کیا ہے؟ کہاں ہے محبت اور کہاں ہے لو میرج۔۔۔؟“ نیل دل آورے کے تسلی اور دلاسوں سے تھک چکا تھا، تنگ آگیا تھا، آج کی پوری رات اس نے بھی بالکل اس طرح جاگ کر گزار دی تھی جیسے کہ دل آورے نے جاگ کر گزار دی تھی۔ وہ بھی اس کے لیے اتنا ہی تڑپا تھا جتنا وہ علیزے کے لیے تڑپا تھا۔

”دل آورے! بتاؤ ناکہ کیا تھا تم نے؟ اور کیا ہو رہا ہے آج؟“

”نیل! میں نے جو کچھ بھی کہا تھا سب غلط کہا تھا۔“ دل آورے کا لہجہ پتھر پڑا ہو گیا تھا۔

”ہم جانتے ہیں کہ تم نے جو بھی کہا تھا سب غلط کہا تھا مگر ہم منتظر تھے کہ تم کبھی سچ بھی کہو گے۔“ عبد اللہ کی آواز پہ نیل اور دل آورے دونوں نے ہی یکدم چونک کر ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے کی طرف دیکھا تھا جہاں عبد اللہ بڑے اطمینان سے کھڑا تھا۔

”عبد اللہ! تم یہاں اس وقت؟“ نیل کو حیرت ہوئی تھی۔

”تم دونوں کیا سمجھتے ہو کہ تم دونوں رات بھر پریشانی اور اذیت میں تڑپ کر گزارتے ہو اور میں اپنے بیڈ روم میں سکون کی نیند سو رہا ہوں۔۔۔؟ مجھے تم دونوں کی خبر نہیں ہوتی۔ یا مجھے تم دونوں کا احساس نہیں ہوتا؟“ عبد اللہ کے سوال پہ وہ دونوں ہی چپ رہ گئے تھے۔

”میں نیل حیات۔۔۔! میں بھی سو نہیں پاتا، میں بھی رات جاگ کر رہی گزارتا ہوں۔“ عبد اللہ تلخی سے کہتا ڈرائنگ روم کے اندر آگیا تھا اور دل آورے کے بالکل سامنے والے صوفے پہ بیٹھ گیا تھا۔

”مگر تمہیں کیسے پتا چلا کہ۔۔۔“ نیل کا اشارہ علیزے کی طرف تھا۔

”مجھے بڑی حوصلی سے کال آئی تھی۔“ عبد اللہ نے دل آورے کو نظروں میں تولتے ہوئے بتایا مگر دل آورے نے کوئی رسیانس نہیں دیا تھا۔

”کس کی؟“ سوال جواب وہ دونوں ہی کر رہے تھے دل آورے صرف سن رہا تھا۔

”دانیال کی۔“ عبد اللہ کا انداز بہت پرسوج اور عجیب سا ہو رہا تھا۔

”پھر کیا کہا اس نے؟“ نیل نے جانتا چاہا۔

”اس نے کہا ہے کہ دل آورے شاہ کے سسرال والے عنقریب طلاق کا مطالبہ کرنے والے ہیں۔“ عبد اللہ نے نیل کے سر پہ ہم پھوڑ دیا تھا لیکن دل آورے یکدم لب بچھینچ کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا۔

”اوکے۔۔۔! وہ دوں کا طلاق۔۔۔ ان سے کو مطالبہ ذرا جلدی کریں میں خود یہ ملک چھوڑ کر جا رہا ہوں۔“

دل آورے بہت ہی مضبوط اور اٹل انداز میں کہتے ہوئے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔ اور وہ دونوں گنگ رہ گئے تھے۔

(باقی آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں)

چالیسویں قسط



نبیلہ عزیز



بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آندری سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیز سے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدھیہ اور نبیلہ حیات دو ہی بہن بھائی ہیں، مدھیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے، وہ انگلیز کی رنگینیوں میں مکمل حور پہ رنگ چکی ہے جس کے پیش نظر فائزہ بیگم، نبیلہ کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں، لیکن مدھیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے، جس پہ نبیلہ اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے، مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصے سے نوکری کی تلاش میں ہے، مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، سب سے بڑی اور مجبوری سے تنگ آکر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے، لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے پاؤ اشیا مل جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے، جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے، اسی خوشی میں وہ کام کی بات پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے، وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آندری سے نوکری مانگتے آتا ہے، وقار آندری کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے، وہ اپنے قول و فعل کا بہت بکا آدمی ہے، اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا، اس کی ماں بٹول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ وہ سرور کو بھی دیتی ہیں۔



”یہ۔۔۔ یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟“ عبداللہ بھی شہد رسا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔
 ”میرا خیال ہے کہ مجھے دوبارہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ دل اور کالجہ حد سے زیادہ مضبوط ہو رہا تھا۔
 ”کیا تمہارے خیال میں شادی بیاہ یا نکاح وغیرہ بھی گڈے گڑیا کا کھیل ہے کہ جب چاہا نکاح کر لیا اور جب چاہا
 طلاق کا شوق پورا کر لیا؟“ وہاں سے عجیب منطق ہے تمہاری۔۔۔؟“
 عبداللہ علیزے کی طلاق کا سن کر خود پہ کنٹرول نہیں کر سکا تھا۔

"طلاق کا مطالبہ وہ کر رہے ہیں۔" دل آور نے اسے یاد دلایا۔
 "تو کیا نکاح کا مطالبہ بھی انہوں نے کیا تھا؟" عبداللہ کے لہجے میں خفگی تھی۔
 "تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" دل آور نے پلٹ کر عبداللہ کے چہرے کی سمت دیکھا تھا۔
 "میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جو کچھ کر چکے ہو اب اسے بھگتو۔ تمہارے اس طرح ہاتھ اٹھا دینے سے اور ملک
 چھوڑ کر چلے جانے سے کچھ نہیں ہو گا۔" عبداللہ الناول اور یہ غصہ ہو رہا تھا اور دل آور کے چہرے پہ اک طنز
 سی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔
 "تم کیا سمجھتے ہو کہ میں جو کچھ کر چکا ہوں میں اسے بھگت نہیں رہا...؟ ہو نہ... غلط فہمی ہے تمہاری، تمہیں
 کیا پتا کہ میں کیا کیا بھگت رہا ہوں اور اس بھگتنے کے چکر میں مجھے کیا کیا بیت رہی ہے؟"
 دل آور نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر تھکتے ہوئے بڑے زورخند سے لہجے میں کہا تھا۔
 "اگر ایسی بات ہے تو تم صاف بات کیوں نہیں بتاتے کہ اصل مسئلہ کیا ہے؟ یہ سارا چکر یہ سارا قصہ کیا ہے
 آخر...؟ کچھ ہمیں بھی تو پتا چلے؟" عبداللہ نے اب کی بار ذرا نرمی سے اپنی جبین پر ہاتھ ٹپکانے کی حرکت کی اور دل آور
 اپنی جگہ یہ کٹرے کٹرے چیپ ہو کے رو گیا تھا لیکن آخر کب تک...؟
 فی الحال کچھ تو کہنا ہی تھا۔ تبھی وہ ایک گہری سانس خارج کر کے رو گیا تھا۔
 "مجھے سننے کا وقت... حضور چند دن کا وقت میرا وعدہ ہے تم سے۔ تمہیں سب کچھ بتادوں گا۔"

دل آور نے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے وعدہ کیا تھا اور وہ دونوں ہی اس کے وعدے پہ اعتبار کرتے ہوئے
 چپ ہو گئے تھے اور رفتہ رفتہ اس چپ کو کئی دن گزر گئے تھے مگر پھر بھی ان دونوں نے دوبارہ اسے کپیدنے کی
 کوشش نہیں کی تھی۔

”جووت۔۔۔ جووت۔۔۔! رکو۔ کہاں جا رہے ہو؟ مجھے چوہر کے پاس جانا ہے۔“ جووت تیار ہو کر بہت جلدت بھرے انداز میں سیڑھیاں اتر کر کوئیڈور کر اس کر رہا تھا جب ثروت بیگم نے اسے پیچھے سے پکارتے ہوئے اس کا موڈ بگاڑ دیا تھا۔

”ایم سوری۔۔۔ میں اس وقت اپنی یونیورسٹی کے کسی کام سے جا رہا ہوں، مجھے اس سائیڈ پہ نہیں جانا جس سائیڈ پہ آپ جا رہی ہیں اس لیے پلیز آپ مبارک خان کو ساتھ لے جائیں، نہ آپ کو واپس بھیجی لے آئے گا، میں تو صرف ڈراپ ہی کروں گا نا؟“

اس نے انہیں ٹالنے کی کوشش کی تھی لیکن ثروت بیگم بھی آخر ماں تھیں، فوراً ہی اس کے گریز پہ کچھ مشکوک سی ہوئی تھیں۔

”اب یونیورسٹی کا کیا کام ہے تمہیں۔۔۔؟ تم تو راج کل یونیورسٹی سے فری پھر رہے ہو؟“ انہوں نے جان بوجھ کر اسے گریہا تھا۔

”بس ہے ایک کام“ اگر تباہوں گا۔۔۔ ابھی میں جلدی میں ہوں۔“ جوہت ان کی بات سنی ان سنی کرتا ہوا چلتا کر ہوا ہو گیا تھا اور ثروت بیگم اس کے پیچھے کھڑی دیکھتی رہ گئی تھیں۔
 ”دیکھ لیتی ہوں تمہارا بندہ رست۔۔۔ بس ایک بار آؤر کی شادی سے فارغ ہو جاؤں۔“ وہ بریدراتی ہوئی مبارک خان کی طرف چل دیں اور وہ انہیں دیکھتے ہی الرٹ ہو گیا تھا۔

”فہم پر مومن۔۔۔ میں تمہیں ڈراپ کر دیتا ہوں۔“ وہ اکیڈمی جانے کے لیے تیار ہو کر نکل رہی تھی جب عدیل نے اسے روک دیا تھا۔

”آج جلدی جا رہے ہیں آپ۔۔۔؟“ مریم حکن میں ہی رک گئی تھی۔
 ”ہاں۔۔۔ وہ دراصل آج مجھے نبیل صاحب کے ساتھ اسلام آباد جانا ہے، شوروم کے کسی کام کے سلسلے میں،“
 عدیل بھی جلدی جلدی تیار ہو رہا تھا اور پھر فاروق نیازی سے ملنے کے بعد باہر نکل آیا تھا۔
 ”اوکے امی! اللہ حافظ۔۔۔ ہم ان شاء اللہ کل شام تک واپس آجائیں گے اور اگر کام ختم نہ ہوا تو ہم لیٹ بھی
 ہو سکتے ہیں، لیکن پلیز آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے میں فون کرتا رہوں گا۔“ عدیل مایہ سے ٹل کر
 انہیں تسکین دیتے ہوئے مریم کے ساتھ ہی گھر سے نکل آیا تھا۔ اور گلی میں نکلتے ہی ہائیک اسٹارٹ کر لی تھی۔
 ”کیا آپ ہائیک یہ اسلام آباد جائیں گے؟“ مریم عجیب اچھا سوال کر بیٹھی تھی اور اپنے اس سوال کے
 بعد خود ہی ہچکچاتی بھی تھی کیونکہ عدیل ایک بھرپور قسم کا قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔
 اور وہ جان ہی تھی کہ یہ قہقہہ اس کی بے وقوفی پر لگایا گیا ہے۔

”ہم نے آفس کے کام کے سلسلے میں اسلام آباد جانا ہے کسی ریس میں حصہ لینے کے لیے نہیں جانا کہ ہم لوگ بائیک لے کر نکل کھڑے ہوں۔“ وہ اس کے اس احمقانہ سے سوال سے جی بھر کے لطف اندوز ہوا تھا۔

”تو پھر بائیک لے کر کیوں جارہے ہیں؟“ اس کے سوال میں اب بھی نا بھگی اور بے وقوفی کی آمیزش موجود تھی

”فپاگل لڑکی۔! میں بائیک لے کر شوروم جا رہا ہوں، وہاں بائیک چھوڑ جاؤں گا اور وہاں سے گاڑی میں ٹیبل صاحب کے ساتھ اسلام آباد جاؤں گا، بس اتنا سا چکر ہے اور تمہیں سمجھ میں نہیں آ رہا۔“

عدیل نے بڑے دلچسپ انداز میں کہا تھا اور مریم بھی سمجھ آ جانے پہ مسکرائی تھی۔

”ٹیبل صاحب کے ساتھ جارہے ہیں تو مدیحہ صاحبہ کہاں ہیں؟ ان سے ملاقات ہوئی؟“

”مال سے ہوئی اور ہوا۔“

”تو انہیں ہماری رہا بھی کب بنائیں گے؟“ مریم نے شرارت سے پوچھا۔
 ”جب تم لوگوں کے فرض سے سبکدوش ہو گیا۔“ عدیل کا جواب سنجیدگی لیے ہوئے تھا۔
 ”ارے نہیں بھائی۔۔۔ ابھی تو بہت دیر ہے۔“ وہ خفگی سے بولی تھی۔
 ”کوئی بات نہیں میں انتظار کر لوں گا۔“
 ”لیکن آپ انہیں پر پوز ٹو کر دیں نا، تاکہ انہیں اور ان کے گھر والوں کو ہٹا تو چل جائے کہ کوئی ان کو کتنا چاہتا ہے۔“ مریم نے اسے ایک ہلکا سا مشورہ دیا تھا لیکن وہ یہ مشورہ ماننے کو بھی تیار نہیں تھا۔
 ”کروں گا پر پوز۔۔۔! لیکن تب جب میں اس کے قابل ہو گیا جب مجھے اس کے گھر والوں سے اس کا ہاتھ ملنے ہوئے شرم محسوس نہیں ہوگی کہ میں اپنی اوقات سے اونچی جگہ پہ ہاتھ مار رہا ہوں۔“
 ”لیکن مجھے نہیں لگتا کہ وہ لوگ ایسی سوچ رکھنے والے لوگ ہوں گے؟“ مریم اکیڈمی کے سامنے پائیک رکھتے

ہی بائیک سے اتر آئی تھی۔
 ”لیکن میں تو ایسی سوچ رکھتا ہوں نا، خیر چھوڑو اس بات کو۔ تم اندر جاؤ ان شاء اللہ کل گھر پہنچے ہی ملاقات ہوگی۔“ عدیل نے اسے خدا حافظ کہتے ہوئے بائیک کا رخ موڑ لیا تھا اور مریم اس کے سفر کی سلامتی کی دعا مانگتی ہوئی اکیڈمی کے گیٹ کے اندر داخل ہو گئی تھی۔
 اور ان کو گھر سے لے کر اکیڈمی تک فالو کرنے والا جوڑت اور اس کے دونوں ساتھی دانت پیٹے ہوئے رہ گئے تھے کیونکہ ان کے ہاتھ سے موقع ضائع ہو گیا تھا اب انہیں دوبچے کا انتظار کرنا تھا۔

ٹھیک سوا دو بجے وہ اکیڈمی سے باہر نکل آئی تھی۔
 اور اس کی تاک میں بیٹھے شکاری فوراً ہی الرٹ ہو گئے تھے۔
 ”اتر۔“ وہی نے جوڑت کو اشارہ دیا کیونکہ مریم بس اسٹاپ کی طرف جانے والے راستے پہ قدم بڑھا چکی تھی۔ اس لیے جوڑت بھی فوراً ہی گاڑی سے اتر آیا تھا اور اس نے بھی مریم کے پیچھے ہی قدم بڑھا دیے تھے اور بالا خراس کے بے حد قریب جا پہنچا تھا۔
 ”چلو! کہاں جا رہی ہو؟“ اپنے عقب میں اور اپنے بے حد قریب ہی جوڑت آندھ کی آواز سن کر وہ چلتے چلتے کرنٹ کھاکے پٹی تھی۔
 ”تم۔۔۔؟“ مریم نے کچھ نہیں کہا کیونکہ وہ اتنی خوف زدہ سی ہو گئی تھی حالانکہ وہ اتنی خوف زدہ پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔
 ”ہاں میں۔۔۔ میں نے سوچا جہاں جا رہی ہو۔ مجھے بھی ساتھ لے چلو۔“ وہ جان بوجھ کر اسے ہراساں کرنے اور خود لطف اندوز ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔
 ”مم۔۔۔ میں۔۔۔ میں تو اپنے گھر جا رہی ہوں۔“ مریم کی چھٹی حس اسے پہلے سے ہی خطرے کے الارم سنانا شروع ہو گئی تھی۔
 ”اوہ یعنی میں تمہارے گھر نہیں جا سکتا۔۔۔ لیکن خیر کوئی بات نہیں تم تو میرے ساتھ جا سکتی ہو نا؟“ وہ خاصی لاپرواہی سے کہہ رہا تھا اور مریم اس کے الفاظ پر چونک گئی تھی۔
 ”میں سمجھی نہیں؟“ اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔
 ”سمجھاؤں گا ایک بار میرے ساتھ تو چلو۔“ اب جوڑت کا لہجہ خیانت میں بدلنے لگا تھا۔
 ”تک کیا مطلب ہے تمہارا؟“ وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی تھی۔
 ”مطلب کہ تمہیں یاد ہو گا کہ ایک بار پہلے بھی میں تمہیں اسی طرح ایک دن گاڑی میں اپنے ساتھ لے کر گیا تھا لیکن بڑی عزت، بڑی دیانت اور بڑی شرافت کے ساتھ۔ مگر تمہیں وہ شرافت، وہ دیانت اور وہ عزت اس نہیں آئی تھی اور تمہیں نہیں پتا تھا کہ منصور حسین کون ہے۔“
 وہ دانت پیس کر بولا تھا اور مریم اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں آج نئے اور غبار کی بجائے غصے کی لالی دیکھ کر مزید خوف زدہ ہو گئی تھی۔
 ”لیکن مجھے تو اب بھی نہیں پتا کہ منصور حسین کون ہے؟“ اس نے پھر سہارے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے۔
 ”اوہ۔۔۔ تو کیا تمہیں یہ بھی نہیں پتا کہ عدیل عمر نازی کون ہے؟“ وہ لفظ چبا کر پوچھ رہا تھا۔
 ”۔۔۔ وہ تو میرے بھائی ہیں۔“ مریم خوب کنٹرول نہیں کر پا رہی تھی۔

”ہوں تو اگر تمہیں یہ پتا ہے کہ عدیل عمر نازی تمہارا بھائی ہے تو تمہیں یہ بھی پتا ہو گا کہ منصور حسین کون ہے اور دل اور شاہ کون ہے؟“ جوڑت کا غصہ ٹھنڈا ہونے والا نہیں لگ رہا تھا اور دل اور شاہ کے نام پہ مریم کا رنگ خیر ہو گیا تھا اور وہ اس سے نظریں چرا گئی تھی۔
 ”گاڑی میں بیٹھو۔“ وہی اور کئی دونوں گاڑی ان کے برابر لاچکے تھے اور جوڑت نے تیر بدلتے ہی اسے گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔
 ”نہیں۔! ہرگز نہیں۔“ وہ بدک کے پیچھے ہٹی لیکن وہ ایک سیکنڈ کی بھی تاخیر کیے بغیر آگے بڑھا اور جیب سے ردال نکال کر اس کے منہ پہ رکھ دیا تھا اور ساتھ ہی اس کی احتجاجی کارروائی سست پڑتے ہی وہ اسے اپنے بازو کے گھیرے میں لے کر گاڑی کے پیچھے دروازے سے گاڑی کے اندر بیٹھ گیا تھا اور مریم اس کے رحم و کرم پہ اس کی گود میں آ پڑی تھی اس کے ہوش و حواس گم ہو چکے تھے۔
 ”چلو۔“ اس نے پچھلا دروازہ بند کرتے ہوئے وہی کو اشارہ کیا تھا اور اس نے گاڑی ہواؤں میں چھوڑ دی تھی اور پھر تینوں ہی تفرقہ لگا کر نکلے تھے۔
 ”مریم فاروق نازی۔۔۔“ جوڑت نے خیانت سے کہتے ہوئے اس کے چہرے سے بالوں کو پیچھے ہٹایا تھا اور پھر اپنی انگلیوں سے اس کے گداز رخساروں کو چھونے لگا تھا۔
 ”بہت ترسایا ہے تم نے۔۔۔ تمہیں چھونے کے لیے بہت ترپا ہوں میں۔۔۔ اور آج تم میرے ہی بازوؤں میں میرے ہی رحم و کرم پر ہو اب میں چاہوں تو کیا کیا نہیں کر سکتا۔“
 وہ بڑی کینگی سے کہتا اس کے کالوں کے قریب سرگوشیاں سی کر رہا تھا اور وہ دونوں مسکرا رہے تھے۔
 ”آج کیا کیا کرو گے۔۔۔؟“ وہی نے گردن موڑ کر جوڑت کو دیکھا۔
 ”نہیں۔۔۔ آج نہیں۔۔۔ آج کچھ نہیں کروں گا۔۔۔ کیونکہ آج میری مام کو میرے گھر سے نکلنے پہ شک ہو گیا ہے اس لیے آج کی رات میں گھر جاؤں گا اور اب جو بھی کروں گا کل رات کو ہی کروں گا۔“ جوڑت نے فوراً ہی انہی میں گردن ہلائی تھی۔
 ”تو پھر آج رات ہمیں دے دو۔“ کامی نے آنکھ دیا کی۔
 ”شکار میں پہلا نوالہ میرا ہی ہوتا ہے میرے پار۔۔۔ بچا کچا کھانے کی عادت نہیں ہے۔“ اس نے کافی سختی سے کہا تھا اس لیے وہ دونوں ہی چپ ہو گئے تھے اور جوڑت اسے ساتھ کے فلیٹ میں چھوڑ کر چابی اپنے ساتھ لے گیا تھا کیونکہ اسے ان کی ہوس پہ کوئی اعتبار نہیں تھا۔ اور وہ دونوں اس کی چالاکی پہ ہاتھ ملتے نہ گئے تھے، انہیں جوڑت آندھ سے اس قدر بے موتی کی امید ہرگز بھی نہیں تھی کیونکہ وہ بڑا فرائڈ دل آدمی تھا لیکن مریم فاروق نازی کے معاملے میں نہیں۔

وہ ابھی کورٹ سے تھکا ہارا واپس آیا ہی تھا کہ اس کے گھر کے لینڈ لائن نمبر پہ رنگ بجنے لگی تھی اور اس نے بیڑیوں پہ قدم رکھنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے پلٹ کر فون ریسو کر لیا تھا۔
 ”السلام علیکم۔۔۔! اس کا لہجہ گھبرایا اور آواز بوجھل سی محسوس ہو رہی تھی۔
 ”وعلیکم السلام۔۔۔ کیسے ہو؟“ وہ سری طرف کی آواز سن کر وہ بری طرح چونک گیا تھا اور یکدم فون سیٹ کی سی ال آئی کی طرف دیکھا، نمبر بڑی جویلی کا تھا۔
 ”تم چپ کیوں ہو گئے ہو؟“ آسیہ آندھ بات کر رہی ہوں۔“ آسیہ آندھ نے اس کی خاموشی فوراً نوٹ کی

تھی۔

”جی... پہچان گیا ہوں آپ جانتیں کوئی حکم؟ اس نے بڑے تحمل اور بڑی شرافت سے استفسار کیا تھا۔
”میں نے تمہیں بڑی حوصلہ شکنی بلانے کے لیے فون کیا ہے۔“ آسیہ آندری بڑا ناپ تول کر بول رہی تھیں۔

”خیریت...؟“ وہ بھی صبر و برداشت کی حد کر رہا تھا۔

”ہوں! خیریت ہی ہے... میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔“

”ہو نہ ہو۔ آپ نے اپنے ہر منٹ سے پوچھا وہ بھی مجھ سے ملنا چاہتے ہیں یا نہیں؟“ اس کے الفاظ نوکیلے ہونے لگے تھے۔

”وہ بول نہیں سکتے...“ آسیہ آندری بھی تحمل کے دائرے میں رہ کر ہی بات کر رہی تھیں۔

”سن تو سکتے ہیں نا۔“ وہ زہر خند ہوا۔

”سننے کے لیے ہی تو تمہیں بلارہے ہیں۔“

”لیکن میں کچھ بھی سناتا نہیں چاہتا آپ نے جو مطالبہ وہاں کرنا ہے وہ آپ یہاں بھی کر سکتی ہیں۔“ دل اور نے جانے سے انکار ظاہر کر دیا تھا۔

”لیکن میں مطالبے سے پہلے کچھ الجھنیں سلجھانا چاہتی ہوں۔“

”مگر میں جانتا ہوں کہ آپ ان الجھنوں کو سلجھانے سلجھانے خود الجھ جائیں گی۔“

”یہ میرا مسئلہ ہے۔“ وہ لا پرواہی سے بولیں۔

”یہ آپ کا مسئلہ ہے اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔“ وہ اپنی بات پہ زور دیتے ہوئے بولا۔

”بہر حال جو بھی ہے میں چاہتی ہوں کہ تم آج رات کا کھانا بڑی حوصلہ شکنی آکر ہی کھاؤ ہم انتظار کریں گے۔“ آسیہ آندری نے اپنا فیصلہ مسلط کرنا چاہا تھا۔

”میں سوری“ اس نے انتہائی مختصر سے الفاظ میں انکار کر دیا تھا۔

”کیوں...“ آخر ایسی کیا بات ہے جو تمہارے قدموں کو بڑی حوصلہ شکنی آنے سے روک رہی ہے؟“ وہ کچھ عجیب سے انداز میں پوچھ رہی تھیں۔

”بھرم۔“ اس نے یک لفظی جواب دیا۔

”بھرم...؟“ وہ ناگہی سے بولیں۔

”ہاں بھرم... کیونکہ مجھے پتا ہے کہ میرے آنے سے بہت سارے بھرم ٹوٹیں گے اور جہاں بھرم ٹوٹے ہیں وہاں دل تو بے آواز ہی ٹوٹ جاتے ہیں اور کانوں کان خبر بھی نہیں ہوتی۔“ وہ طنز سے بولا تھا۔

”میں جانتی ہوں کہ تم وکیل ہو۔“ ان کا اشارہ اس کی باتوں اور اس کی دلیلوں کی طرف تھا۔

”اور آپ یہ بھی جانتی ہوں گی کہ میں ہار بھی چکا ہوں۔“ وہ استغناء سے ساہنسا۔

”تم نے اپنی ہار خود تسلیم کر لی ہے، کسی منصف نے فیصلہ نہیں سنایا ابھی تک۔“ انہوں نے بھی دلیل دی تھی۔

”کیونکہ میں حقیقت پسند آدمی ہوں، وقت کے ساتھ ساتھ ہر چیز کو قبول کر لیتا ہوں چاہے وہ میری ہار ہی کیوں نہ ہو؟“ وہ کافی مضبوطی سے بول رہا تھا۔

”پھر بھی اپنی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت کو فیس کرنے سے گھبرار ہے ہو؟“ وہ حیران ہوئیں۔

”انسان ہوں گھبرا بھی سکتا ہوں کیونکہ حقیقت بہت سفاک ہوتی ہے۔“ وہ بخ ہو رہا تھا۔

”لیکن میں چاہتی ہوں کہ تم گھبراؤ مت اور حقیقت کو فیس کرو کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ تمہارے اندر کچھ ہے

کچھ ایسا جو تمہیں بہت اذیت دے ہوئے ہے۔“ آسیہ آندری کے لہجے میں نرمی جھلکی تھی۔

”مجھے اذیت میں ہی رہنے دیں ورنہ آپ اذیت میں آجائیں گی۔“ اس نے سر جھٹکا۔

”کیا اگر ذہن تمہیں اس طرح بلاتی تو تم تب بھی نہ آتے؟“ یہ ان کا آخری پوائنٹ تھا جس کو انہوں نے بالا خر استعمال کر ہی لیا تھا۔

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“ دل اور کا دل جیسے کسی اتھاہ گہرائی میں جا گرا تھا۔

”میں نے جو کہنا تھا کہ دیا ہے۔“ انہوں نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا اور دل اور ہاتھ میں پکڑے ریسیور کو دیکھتا رہ گیا تھا اور وہ وہیں کھڑے کھڑے یہ سوچنے پہ مجبور ہو گیا تھا کہ آخر انہوں نے کس دعوے سے یہ بات کہہ کر فون بند کیا ہے۔

”آخر کس دعوے سے...؟“

وہ سوچتا ہوا اور سلگتا ہوا سا اوپر اپنے بیڈ روم میں آ گیا تھا اور اپنی کینٹیوں کو مسلتے ہوئے سگریٹ بھی سلگایا تھا۔

نیل اور ایونگ سیٹ پر ارجمان ڈرائیو کر رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی فرنٹ سیٹ پر بیٹھا عدیل گاڑی میں بیٹھے میوزک اور نیل سے ہلکی چٹکی گپ شب سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ اچانک ہی اس کا موبائل بجنے لگا تھا۔

اس نے موبائل نکال کر دیکھا شہیار کا نمبر تھا اور اس نے سی ڈی پلیئر کا ویلوم کم کرتے ہوئے کال ریسیو کر لی تھی کیونکہ شہیار نے بہت دنوں بعد اسے کال کی تھی۔

”ہیلو استاد! کیسے ہو؟“ شہیار کے لہجے سے ہی لگ رہا تھا کہ وہ بہت خوش ہے۔

”ٹھیک ٹھاک... اللہ کا بڑا احسان ہے یار۔“ عدیل بھی جواباً خاصے فریش لہجے میں بولا تھا۔

”مجھے کچھ بتانا تھا اسی لیے فون کیا ہے۔“ شہیار کی خوشی سنجانے نہیں سمجھ رہی تھی۔

”ہاں بتاؤ۔“ میں من رہا ہوں۔“ عدیل ہمہ تن گوش ہوا تھا۔

”مجھے جاب مل گئی ہے۔“ اس نے فوراً خوشخبری سنائی۔

”ارے جی...“ عدیل خوشی سے چکا تھا۔

”ہاں استاد جی...“ وہ بھی اپنی خوشی کا اظہار کافی کھل کے کر رہا تھا۔

”بہت بہت مبارک ہو یار مجھے بہت خوشی ہوئی ہے تمہاری جاب کا سن کر۔“ عدیل کو واقعی بہت زیادہ خوشی ہوئی تھی اور اس کا اندازہ اس کے لہجے سے ہی ہو رہا تھا۔

”خیر مبارک استاد! میرے گھر والوں کو بھی بہت خوشی ہو رہی ہے اور اسی خوشی میں میری اماں آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔ یہ لیں اماں سے بات کر لیں۔“

شہیار نے باتوں باتوں میں ”انا“ ”فانا“ اپنا موبائل لے کر اپنی امی کو پکڑا دیا تھا اور عدیل سفر کے دوران نیل کے ساتھ ماحول کی نزاکت کے خیال سے انکار کرتے کرتے رک گیا تھا کیونکہ تب تک فون ان کے ہاتھوں میں جا چکا تھا۔

”ہیلو۔“ دو سری طرف سے شہیار کی امی کی آواز سنائی دی تھی۔

”السلام علیکم آئی۔“ کیسی ہیں آپ؟ بہت بہت مبارک ہو آپ کو شہیار کی جاب کا مسئلہ حل ہو گیا۔“

عدیل کو مجبوراً بڑی خوش اخلاقی اور خوش دلی سے پیش آنا پڑا تھا۔

”و علیکم السلام بیٹا! میں بالکل ٹھیک ہوں تمہیں بھی بہت بہت مبارک ہو۔“ اللہ نے بڑے عرصے بعد اتنی

بڑی خوشی دی ہے اور اسی خوشی میں ہم لوگ چاہ رہے تھے کہ اگر ایک اور خوشی مل جاتی تو اس خوشی کا مزاد دیا جاتا۔ انہوں نے جیسے تمہیں باندھی تھی۔

”ایک اور خوشی میں سمجھا نہیں؟“ عدیل واقعی نہیں سمجھا تھا۔

”وہ دراصل بیٹا ہم لوگ تمہارے گھر آنا چاہ رہے تھے۔ ایمین بیٹی سے ملنے کے لیے۔“ انہوں نے ایمین کا نام واضح کر دیا ہی مناسب سمجھا تھا کہ عدیل بھی آسانی سے سمجھ جاتا۔

”ایمین بیٹی سے؟“ آنٹی آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں؟ میں سمجھ نہیں پا رہا۔ عدیل اب بھی سمجھ اور نا سمجھی کے دائرے میں ہی ڈول رہا تھا۔

”ارے بیٹا! ایمین کے رشتے کے سلسلے میں آنا چاہتی ہوں میں چاہتی ہوں کہ ایمین میرے شہر پار کی بوس بنے۔ اس لیے سوچا کہ تمہاری امی اور ابو سے بھی ملاقات ہو جائے، آخر ہم نے انہی کے درپے تو سوالی بن کر جانا ہے۔“ انہوں نے آخر صاف لفظوں میں کہہ ہی دیا تھا اور عدیل ان کے منہ سے ایمین کے رشتے کی بات سن کر خوشی اور حیرت سے بے یقین سا ہو گیا تھا۔

”ہیلو بیٹا! تم چپ کیوں ہو گئے ہو۔“

”ارے نہیں نہیں آنٹی۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے، میں دراصل اپنے آفس کے کسی کام کے سلسلے میں اسلام آباد جا رہا ہوں راستے میں ہوں اس لیے فی الحال کچھ نہیں کہہ سکتا، البتہ آپ ہمارے گھر آنا چاہتی ہیں تو موسٹ ویلکم آپ جب چاہیں آ سکتی ہیں باقی باتیں آپ آئیں گی تو وہ بھی ہو جائیں گی۔“ عدیل نے فوراً ہی بات سنبھال لی تھی۔

”ٹھیک ہے بیٹا! تم اسلام آباد سے واپس آ جاؤ تو ہم آ جائیں گے، لیکن مٹھائی کے ساتھ آخر شہر پار تمہارا دیکھا بھالا لڑکا ہے۔“ وہ بڑی اپنائیت سے بولی تھیں اور عدیل مسکرا کے رہ گیا تھا۔

”جی آنٹی! اگر اللہ تعالیٰ نے میری بہن کا نصیب شہر پار کے نصیب سے جوڑا ہے تو میں اپنی بہن کو ایک خوش نصیب لڑکی سمجھوں گا۔ کیونکہ شہر پار واقعی بہت اچھا لڑکا ہے اور میرا دیکھا بھالا بھی ہے۔ وہ بڑا گوارہ ہے ویلنڈر ہے، نمختی ہے، غیرت مند ہے اس لیے ہمیں اور کیا چاہیے، لیکن پھر بھی آخری فیصلہ امی اور ابو کا ہی ہو گا، میں ان سے بات کر کے آپ کو بتا دوں گا۔“ عدیل نے انہیں بھرپور تسلی دی تھی کیونکہ وہ زیادہ تر خیرے دکھا کر یا موزوں کر انہیں بدل نہیں کرنا چاہتا تھا اور نہ ہی اللہ کے سامنے کوئی ناشکری دکھانا چاہتا تھا۔

”ٹھیک ہے بیٹا! ہم دوبارہ فون کر لیں گے۔ تم خیریت سے جاؤ اور خیریت سے آؤ اللہ حافظ۔“ انہوں نے نرمی سے کہہ کر فون بند کر دیا تھا اور عدیل اللہ کی اتنی کرم نوازی پہ دل ہی دل میں شکر گزار ہو رہا تھا کہ چلو شکر ہے کہ کوئی توابتدہ ہوئی۔

”لڑکا کیسا ہے؟“ نیل بھی اس کی ساری گفتگو سن چکا تھا اور اس نے جان بوجھ کر ہی اس کی بات میں انٹرسٹ ظاہر کیا تھا۔

”اچھا ہے۔ بلکہ بہت اچھا ہے میرے ساتھ ہی ورکشاپ میں کام کرتا تھا جیسے ہی ورکشاپ بند ہوئی ہم لوگ بے روزگار ہو کر رہ گئے، لیکن پھر بھی بہت کسی نے بھی نہیں ہاری اور آج اسے بھی جاب مل گئی ہے اچھی جاب ہے وہ مطمئن اور خوش ہے اور اس کے گھر والے اس کی اس خوشی کے بعد اس کا رشتہ طے کرنا چاہتے ہیں۔“ عدیل بتاتے بتاتے آخر میں چپ ہو گیا تھا۔

”تمہاری سسٹر کے ساتھ؟“ نیل جان بوجھ کر ایسے سوال پوچھ رہا تھا۔

”جی! وہ آہستگی سے بولا۔“

”تو پھر کیا خیال ہے تمہارا اس رشتے کے بارے میں؟“ اتفاقاً ہی یہ بات چھڑ گئی تھی تو وہ اس سے اس کے سارے خیالات جاننا چاہتا تھا۔

”میری طرف سے کوئی انکار نہیں ہے اور مجھے امید ہے کہ امی ابو بھی کوئی انکار نہیں کریں گے، کیونکہ ایسے اچھے رشتے بار بار نہیں ملتے۔ کیا ہوا جو وہابی لحاظ سے تھوڑا دیکھ ہے، لیکن باقی ہر لحاظ سے تو بہت اسٹرائٹ ہے نا۔ نیت اور کردار کا کھرا ہے، بس میں اسی چیز پر مطمئن ہوں اور مجھے پتا ہے کہ وہ میری بہن کو ہمیشہ بہت خوش رکھے گا اور اگر نہ بھی رکھ سکا تو اللہ مالک ہے، زندگی میں اب ڈاؤن تو آتے ہی رہتے ہیں، ماں باپ کے گھر میں مشکل اٹھانا پڑے تو لڑکیاں برواشت کر لیتی ہیں تو سسرال جا کر کوئی مشکل آجائے تو انہیں وہ بھی برواشت کرنی چاہیے میرا اور بہت کے ساتھ۔“

عدیل کی باتوں نے نیل کے ذہن کی رعبی سسی کھٹکھٹ بھی دور کر دی تھی اور وہ چند سیکنڈز میں ہی ریلیکس ہو گیا تھا۔

”ہوں۔۔۔ اچھی سوچ ہے تمہاری مجھے بہت خوشی ہوئی ہے سن کر، ہر ماں باپ اور بہن بھائیوں کو ایسی ہی مثبت سوچ رکھنی چاہیے، ان شاء اللہ، اللہ نصیب اچھے کرے گا۔“ نیل نے اس کے خیالات اور اس کی سوچ کو سراہا تھا۔

”ایمین دعا کیجیے گا۔“ عدیل آہستگی سے بولا۔

”اپنے بارے میں کیا سوچا ہے؟“ نیل نے گردن موڑتے ہوئے اسے اک نظر دیکھا تھا۔

”کیا مطلب؟“ عدیل ٹھٹکا۔

”میری شادی وغیرہ کے سلسلے میں۔ کیا پلاننگ ہے تمہاری؟“ نیل اپنے مطلب کی بات جاننا چاہتا تھا اور عدیل اس کے سوال پہ چپ ہو کے رہ گیا تھا۔

”بولو نا۔۔۔ کچھ تو سوچ ہی رکھا ہو گا؟“ نیل اسے بولنے پر اکسارہا تھا۔

”نہیں۔۔۔ ابھی کچھ بھی نہیں سوچ رکھا ابھی مجھے اپنی بہنوں کے فرض سے فارغ ہونا ہے اور ابھی مجھے اپنا گھر امی بھائیوں کے سامنے کرنا ہے اس لیے اپنے بارے میں کبھی بھی نہیں سوچا اور نہ ہی کبھی کوئی پلاننگ کی ہے۔“ عدیل نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا تھا۔

”لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے بارے میں بھی سوچو کیونکہ میں بھی اپنی بہن کے فرض سے فارغ ہونا چاہتا ہوں۔“

نیل نے اسے ہزار والٹ کا کرنٹ لگا دیا تھا اور عدیل نے اس کرنٹ کے ہاتھوں مجبور ہو کر یکدم نیل کی طرف دیکھا تھا وہ ڈراؤن کر تے ہوئے گاڑی کی اسکرین کی طرف دیکھ رہا تھا اور بہت پرسکون نظر آ رہا تھا۔

”نیل۔۔۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“ عدیل ہلکا گیا تھا۔

”میں جو بھی کہہ رہا ہوں بہت زیادہ سوچنے سمجھنے اور پرکھنے کے بعد کہہ رہا ہوں۔“

”مم مگر نیل صاحب۔۔۔“

”میں جاننا ہوں عدیل تم مدیہ میں انٹرسٹڈ ہو اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ بھی تمہیں پسند کرتی ہے، بلکہ یہ کہنا بھی ٹھیک ہی ہو گا کہ تم دونوں ہی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہو۔ اور محبت ایک بے اختیار جاذبہ ہے یہ کہیں بھی کسی کے بھی ساتھ ہو جاتی ہے۔ اس میں انسان کی اپنی کوئی مرضی اور کوئی کوشش شامل نہیں ہوتی اس لیے تم دونوں کی کوئی غلطی نہیں ہے، آخر تم لوگ بھی انسان ہی ہو، لیکن میں چاہتا ہوں کہ یہ محبت ایک مضبوط رشتے میں بدل جائے تو زیادہ اچھا ہے گا اور ہمیں بھی کچھ سکون مل جائے گا۔“

نبیل نے بڑے ہی اچھے اور احسن طریقے سے ساری بات واضح کرتے ہوئے عدیل کو حیران پریشان چھوڑ دیا تھا۔
”کیونکہ اسے یکے بعد دیگرے دو جھکے لگ چکے تھے اور ان دو جھکوں نے ہی اسے چکرا کر رکھ دیا تھا۔“

”کیا بات ہے؟ تم خاموش کیوں ہو گئے ہو کچھ غلط کہہ دیا میں نے؟“
نبیل نے ذرا کی ذرا سامنے اسکرین سے نظریں ہٹا کر عدیل کی سمت دیکھا تھا، عدیل نظریں جھکا گیا تھا۔
”لیکن میں فی الحال خود کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ میں سوالی بن کے آپ کے درپے آسکوں۔“ وہ بہت اہستگی سے بول رہا تھا۔

”تم کس قابل ہو اور کس قابل نہیں ہو میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ باکر دار ہو دیانت دار ہو، مخفی ہو اور کچھ چاہیے ہمیں؟ یہی ساری کوالیٹی ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے گنوائی۔ ہیں اور یہی ساری کوالیٹی تم میں آل ریڈی موجود ہیں پھر تم کیوں ہمارے درپے سوالی بن کے نہیں آسکتے؟

جبکہ میں نے تو تمہیں سوالی بننے کی مہلت ہی نہیں دی، تمہارا ہاتھ بڑھنے سے پہلے ہی تمہارا ہاتھ تھم لیا ہے اور وہ فیصلہ بیٹھے بیٹھے کر دیا ہے جس کو سوچنے میں اور کرنے میں لوگ سالوں اور مہینوں لگا دیتے ہیں، مام سے مشورہ کیا ہے نہ عدیل اور سے۔ کیونکہ مجھے پتا ہے کہ صرف وہی دونوں ہیں جو زیادہ اچھے ہیں اس معاملے سے۔ لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ تمہارے بارے میں میرا یہ فیصلہ سن کر انہیں بھی بہت خوشی ہوگی اور کسی قسم کا کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

نبیل بہت سنجیدگی اور۔۔۔ اپنایت سے بات کر رہا تھا اس لیے اب عدیل کے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا آخر وہ مزید کیا کہتا۔۔۔؟

”تم بے شک فی الحال بارات لے کر نہ آؤ، لیکن ایک رنگ پہنا کر دجیہ کو اپنے نام سے منسوب کر لو تو یہ بھی رشتے کو مضبوط کرنے کے لیے کافی ہو گا اور دونوں فیصلہ میں ایک نئے رشتے کی دُور بھی بندھ جائے گی۔“ اس نے اپنی خواہش ظاہر کی تھی۔

”تھنک یو میں امی اور ابو سے بات کیوں گا؟ وہ باقاعدہ پرنسپل لے کر آئیں گے آپ کے گھر اور پھر کسی روز رسم بھی کر لیں گی۔“ عدیل نے ہائی بھر لی تھی۔

”اوکے۔ تو پھر اب۔۔۔ صاحب نہیں بلکہ نبیل بھائی ہونا چاہیے کیونکہ مجھے بھی تمہاری شکل میں اپنا ایک بھائی نظر آ رہا ہے، چھوٹا بھائی، جواب ہمیشہ ہر غم اور ہر خوشی میں میرے شانہ بشانہ اسی طرح قدم بڑھائے گا اور ہر طویل سفر میں میرا ساتھ دے گا۔“

نبیل نے اس کے اور اپنے درمیان کی اجنبیت اور غیرت مٹانے میں لمحہ بھی نہیں لگایا تھا اور عدیل اس کی بات پہ مسکرا دیا تھا۔

”ان شاء اللہ۔۔۔! عدیل نے بڑے صدق دل سے کہا تھا۔
”کیونکہ آخر اللہ تعالیٰ نے بیٹھے بیٹھے اس کی جھولی خوشیوں سے بھری تھی اور اس کی زندگی کے وہ مشکل ترین کاموں کو اس کے لیے آسان بنا دیا تھا اور اسے ذرا سی بھی پریشانی نہیں اٹھانی پڑی تھی۔“

”اللہ تبارک و تعالیٰ لاکھ لاکھ شکر ہے تو رحیم و کریم تو جو چاہے کر سکتا ہے، مین مانگے بھی مراویں پوری کر دیتا ہے۔“
عدیل کا روتا روتا اللہ کے حضور شکر گزار اور مشکور ہو رہا تھا اور اس کا دل چاہ رہا تھا کہ یونہی راستے سے ہی واپس لوٹ جائے اور امی ابو اور مریم کو یہ دونوں خوشخبریاں جا کر سنائے، لیکن کیا کرنا اسے سفر میں نبیل کا بھی ساتھ دینا تھا اور اسے اب کسی بھی مقام پہ اکیلا نہیں چھوڑنا تھا۔

ایم پلیز۔۔۔! چپ ہو جائیں۔۔۔ اگر ابا کو بھنک بھی پڑ گئی تو ہمارے لیے مزید مسئلہ کھڑا ہو جائے گا ان کی طبیعت بگڑ گئی تو بہت برا ہو گا۔“

ایمن اور ایمان دونوں ہی عابدہ خاتون کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھیں، کیونکہ شام حد سے زیادہ گرمی ہو چکی تھی اور مریم ابھی تک گھر نہیں آئی تھی۔

انہوں نے ایک بار پی سی او سے اور ایک بار ساتھ والی کٹھن کے گھر سے مریم کے نمبر پہ کال کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کا نمبر کئی بار ٹرائی کرنے کے بعد بھی آف ہی مل رہا تھا اور ہر بار پاپوس اور پریشان سی گھرواپس لوٹ آتی تھیں اور جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا اور شام گرمی سے بھی گرمی ہوئی جا رہی تھی تو ان کا دل واہوں اور خدشوں میں ڈھنسا چلا جا رہا تھا اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہتے چلے آ رہے تھے۔ ”تو کیا کروں۔۔۔ چپ ہو کر بیٹھ جاؤں؟ وہ نہیں آئی تب بھی سکون سے کھانا کھا کر اپنے بستر میں جا کر سو جاؤں۔۔۔؟“ انہوں نے روتے روتے سسکیوں کے درمیان پوچھا تھا۔

”ہم ایسا کب کہہ رہی ہیں امی۔۔۔ لیکن پلیز خود کو سنبھالیں اور میرے ساتھ چلیں، ہم دوبارہ فون ٹرائی کرتے ہیں۔“ ایمن نے انہیں سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔

”اور کتنا ٹرائی کریں گے۔۔۔؟ چار بجے سے فون ٹرائی کرنا شروع کیا ہے، لیکن ایک بار بھی رنگ نہیں گئی کال نہیں ملی اور نہ ہی فون آن ہوا ہے پتا نہیں کیا ہوا ہے میری بیٹی کے ساتھ؟ سنبھالنے کس حال میں ہوگی اور کہاں ہو گی ایسا کون سا حادثہ پیش آیا ہے کہ اس کی کوئی خبر ہی نہیں مل رہی؟“ عابدہ خاتون ہلکے ہلکے کر رہی تھیں۔

”تو پھر ایسا کریں کہ بھائی کو فون کریں اور انہیں گھر بلا لیں۔“ ایمان نے دوسرا مشورہ دیا۔

”کیسے بلاؤں اسے؟ اتنے گھنٹے تو اس کے سفر میں ہی کٹ جائیں گے اور یہ شام آدھی رات میں ڈھل جائے گی اور اگر شام آدھی رات میں ڈھل گئی تو ہم خالی ہاتھ رہ جائیں گے، ہمارے پاس کچھ بھی نہیں بچے گا، ہم لٹ جائیں گے برباد ہو جائیں گے، ہمارے پاس کچھ بھی نہیں بچے گا، عابدہ خاتون زار و قطار رو رہی تھیں، ایمن اور ایمان کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے تھے اور اپنی ماں سے لپٹ کر وہ دونوں بھی خوب روئی تھیں۔

اور پھر بڑی ہمت اور حوصلہ مجتمع کرتے ہوئے وہ دونوں ماں بیٹی عدیل کو فون کرنے کے لیے گھر سے نکل کھڑی ہوئی تھیں، پی سی او ان کے گھر سے خاصا دور تھا اس لیے وہ دونوں اندر سے ڈر بھی رہی تھیں، لیکن افسوس کہ قسمت نے اس دفعہ بھی ساتھ نہیں دیا تھا، نبیل اور عدیل دونوں ہی میٹنگ میں تھے اور فون سائلینٹ پہ تھے اس لیے عدیل کو بتایا نہ چلا کہ ایمن اور امی اسے کال کرتی رہی ہیں۔

اور عدیل کی طرف سے پاپوس ہونے کے بعد تو عابدہ خاتون کی کمری ٹوٹ گئی تھی، وہ پاؤں کھینچی ہوئی گھر آئی تھیں اور چارپائی پہ گرنے کے ساتھ ہی ہچکیوں سے رونا شروع کر دیا تھا۔ کیونکہ انہیں اب تاریکی اور اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔



”آپ نے دل اور شاہ کو کال کی تھی؟ کیا کہتا ہے وہ۔۔۔؟“
آز نے آنکھ سے واپس آتے ہی استفسار کیا تھا اور آسیہ آندری نے سیریلیوں پہ ٹپکنے والی کومل کی طرف دیکھا تھا جو اپنی شادی کے دنوں میں بھی ٹھیک طرح سے خوش نہیں ہو پارہی تھی۔

اور وجہ کیا تھی؟ آسیہ آندری بھی جان گئی تھیں۔
”ہاں۔۔۔ کی گئی کال“ آجائے گا کچھ دیر تک۔“ انہوں نے بہت بے تپ سے لہجے میں بتایا تھا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ ابن صفی کی مکمل ریٹ
- ✧ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از منظر کلیم اور
- ✧ ابن صفی کی مکمل ریٹ
- ✧ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

”ٹھیک ہے آجائے تو بہتر ہو گا۔ آخر کچھ تو فائنل ہوئی یہ معاملہ پونی تو نہیں لٹکائے رکھنا ہم نے۔“
آؤر کے لہجے میں غصہ اور خفگی تھی جس پر آسیہ آؤدی نے اک نظر ٹھہرا کر اسے دیکھا تھا۔
”وہ اس گھر میں آپ لوگوں کی لڑائی جھگڑے کے لیے یا پھر دشمنی کے لیے نہیں آ رہا۔ مہمان بن کر آیا ہے“
میں نے اسے کھانے پر الوائیٹ کیا ہے جو بھی بات ہوگی کھانا کھانے کے بعد ہوگی اور ساتھ ساتھ تم سب لوگ یہ
مت بھولو کہ علیزے اب بھی اس کے نکاح میں ہے اس کا حق اور اختیار ہم سے زیادہ ہے وہ چاہے تو اب بھی
بہت کچھ کر سکتا ہے اس لیے پلیز ہم سب کو بہت سوچ سمجھ کر بات کرنا ہو گا۔“ انہوں نے آؤر کے تیور دیکھ کر ہی
اسے پہلے سے سمجھا دیا بہتر سمجھا تھا۔

جس پر آؤر خاموش ہو گیا تھا اور پڑھیوں کی رنگ پر ہاتھ رکھ کے کھڑی کول کو اندر ہی اندر بہت خوشی اور
تسلی ہوئی تھی کہ چلو شکر ہے کہ ابھی کوئی تو امید باقی ہے نا۔
”آئی! آپ بھی یہ جانتی ہیں کہ علیزے اس کے ساتھ خوش نہیں ہے یہ سارا کھیل زبردستی کا کھیل ہے اور
اس نے یہ کھیل کیوں کھیلا ہے یہی تو ہم جانتا چاہتے ہیں اور اسی لیے تو اسے یہاں بلا رہے ہیں“ آخر ہمیں کچھ تو پتا
چلے ہم کیوں اندھیرے میں جی رہے ہیں۔“ آؤر جیس میں آگیا تھا اور خاموش ہو جانے کے بعد بھی ایک بار پھر رول
پڑا تھا۔
”صبر۔۔۔ اور صرف صبر۔۔۔ جہاں اتفاق گزر چکا ہے وہاں تھوڑا سا اور سہی ورنہ کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ
انسان کو لینے کے لیے پڑ جاتے ہیں۔“

انہوں نے آؤر کو کچھ بتایا تھا اور وہ ان کی بات پر مزید کچھ بھی کہے بغیر ضبط کرنا۔ اور اندر ہی اندر سلگتا ہوا سا
آگے بڑھ گیا تھا اور کول کا دل چاہا تھا کہ آگے بڑھے آگے آسیہ آؤدی کو بانہوں میں بھر کر بچھنے لے انہوں نے بہت
حقیقت پسندی سے کام لیا تھا آخر۔

جو ہو فیصلہ وہ سنائیے اسے حشر پر نہ اٹھائیے
جو کریں گے آپ ستم وہاں وہ ابھی سہی وہ یہیں سہی
بلاخر اس نے بڑی حویلی کے گیٹ پہ رکتے ہوئے گاڑی کے بارن پہ ہاتھ رکھ ہی دیا تھا اور اس کی گاڑی کے
بارن پہ جہاں چوکیدار عارف نے ایک دم الرٹ ہو کر گیٹ کھولا تھا وہیں پہ حویلی کے باقی افراد بھی اپنی اپنی جگہ پہ
بڑے ہی غیر محسوس انداز میں الرٹ سے ہو گئے تھے۔
اس کی چمکتی دھکتی سرف بڑی سبک رفتاری سے آگے بڑھتی حویلی کے طول اور انتہائی کشادہ سے ڈرامیوے پہ
آؤر کی بھی اور چوکیدار عارف ”منصور حسین“ کی برخاستگی اور رعب دیکھتا رہ گیا تھا۔ ایک بار اس کا دل چاہا تھا کہ وہ
آگے بڑھے اس سے ملے لیکن پھر اس کا موڈ دیکھتے ہوئے وہ وہیں کا وہیں رک گیا تھا اور دل اور شاہ گاڑی سے
اتر کر اندر کی طرف قدم بڑھا چکا تھا لیکن اس کا ایک ایک قدم اس کی ذات پہ عذاب ثابت ہو رہا تھا۔
اس کے جسم کی رگیں پھٹ رہی تھیں اور داغ میں الگ ابال سے اٹھ رہے تھے۔
لیکن پھر بھی وہ قدم اٹھا رہا تھا اور محشر کے میدان کی طرف بڑھ رہا تھا کیونکہ اس وقت بڑی حویلی اس کے لیے
محشر کے میدان سے کچھ کم نہیں تھی۔

اور اس نے اس سے بچنے کی کوشش بھی بہت کی تھی مگر نہیں۔
اسے اس روز حساب کا سامنا کرنے پہ مجبور کیا گیا تھا اور اسے آنا ہی پڑا تھا!

اور جب وہ آئی گیا تھا تو دیکھنے والوں کو ایک دم پتھر اور سپاٹ نظر آ رہا تھا۔
شاید اسی لیے آسیہ آئندی اسے کوریڈور میں داخل ہوتے دیکھ کر خود کوریڈور کے دوسرے سرے پہ ہی رک گئی
تھیں اور وہ طویل کوریڈور اپنے مضبوط قدموں سے طے کرنا ان کے قریب آ گیا تھا۔
”السلام علیکم۔“ ان کے سامنے رکتے ہوئے اس نے اپنی نظریں جھکا لی تھیں۔
”وعلیکم السلام۔ جیتے رہو۔“ وہ دونوں ہی ایک دوسرے سے ملاقات کی فارمیلٹی نبھا رہے تھے اور یہ بات وہ
دونوں ہی جانتے تھے۔

”آپ کیسی ہیں؟ اور آپ کی صحت۔۔۔؟“ اس نے بات بڑھانے کی کوشش کی تھی۔
”الحمد للہ۔۔۔ ٹھیک ہوں اور صحت بھی اچھی ہی ہے“ اوڑا رنگ روم میں بیٹھتے ہیں۔ ”وہ اسے ڈرائنگ روم
کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی تھیں اور دل آور نے چپ چاپ ڈرائنگ روم کی طرف قدم بڑھا دیے تھے۔
”بیگم صاحبہ! عائشہ بی بی نے کہا ہے کہ دل آور صاحب کو لے کر بڑے صاحب کے کمرے میں ہی آجائیں۔“
ان دونوں کے بڑھتے قدم رنجو کی آواز پر ہی رک گئے تھے اور آسیہ آئندی نے بے ساختہ دل آور کے چہرے کی سمت
دیکھا تھا جبکہ وہ ان کے منہ سے کچھ سننے کا منتظر کھڑا تھا۔
”اچھا ٹھیک ہے، تم چلو ہم آتے ہیں۔“ انہوں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے رنجو کو وہاں سے بھیج دیا تھا اور
پھر دوبارہ اس کی طرف دیکھا تھا۔

”آؤ وہیں چلتے ہیں“ وقار سے بھی ملاقات ہو جائے گی تمہاری۔“ انہوں نے بہت اچھے طریقے سے اسے
اب وقار آئندی کے بیڈ روم کی طرف چلنے کا کہا تھا۔
اور دل آور نے پہلی بار ایک اذیت بھری سانس کھینچتے ہوئے سر خم کر دیا تھا اور ان کے ساتھ چل رہا تھا پھر
دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے وقار آئندی کے بیڈ روم میں داخل ہوئے تھے اور داخل ہوتے ہی اس کے قدم جیسے
اپنی جگہ جم سے گئے تھے کیونکہ سامنے ہی وقار آئندی کے سرانے اس کی دشمن جاں اس کی اپنی زوجہ بیٹھی ہوئی
تھی اور اس نے بھی اندر آتے ہوئے اپنے ”مجازی خدا“ کو نظریں اٹھا کر سر تاپا دیکھا تھا اور نظریں کا تصادم ہوتے
ہی وہ نظریں چرائی گئی تھیں نہ سلام کیا تھا نہ دعا کی تھی۔
بلکہ کچھ اس طرح سے پوز کیا تھا کہ جیسے اسے جانتی ہی نہ ہو اور وہ بھی جو اسے اک نظر دیکھ کر اندر سے یکدم
موسم کی طرح پکھلا تھا۔ اس کے نظریں چرائینے سے فوراً ہی کسی پتھر لے پہاڑ میں تبدیل ہو گیا تھا۔ جس پہاڑ
کچھ بھی اثر نہیں ہو سکتا تھا۔

یہاں تک کہ علیزے کی موجودگی کا احساس بھی نہیں۔
کیونکہ وہ اس سے اور اس کی موجودگی کے احساس سے انجان ہو چکا تھا۔
”السلام علیکم۔“ اس نے ذرا ٹھہرے ہوئے سے لہجے اور ادب کی آواز میں سلام کیا تھا۔
”وعلیکم السلام بیٹا! کیسے ہو؟“ عائشہ آئندی صوفے سے اٹھ کر اس کے سامنے آئی تھیں اور اس کے کندھے
پر بڑی محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کا حال احوال پوچھا تھا۔
”جی ٹھیک ہوں۔“ اس نے بڑے مختصر سے الفاظ میں جواب دیا تھا۔
”او بیٹھو۔“ انہوں نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔
”تھینک یو۔“ وہ کسی روٹ کی طرح آگے بڑھ کے صوفے پہ بیٹھ گیا تھا۔
”السلام علیکم۔“ اچانک وانیال اور جودت بھی اندر آگئے تھے اور وانیال نے دل آور کو دیکھ کر خود آگے بڑھ
کے اس سے بات کا من مصلحہ کیا تھا۔

البتہ آؤ وہاں پہلے سے موجود تھا، لیکن اس نے دل آور سے ہاتھ نہیں ملایا تھا اور نہ ہی دل آور نے خود ایسی
کوئی کوشش کی تھی۔
”بیٹھیں۔۔۔ آپ کھڑی کیوں ہیں؟ پلیز بیٹھ جائیے۔“ دل آور نے آسیہ آئندی کو وقار آئندی کے بیڈ کے قریب
ہی کھڑے دیکھ کر بیٹھنے کے لیے متوجہ کیا تھا۔
”نہیں۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے“ وہ بس میں دراصل چاہ رہی تھی کہ تم پہلے کھانا کھا لیتے تو زیادہ بہتر تھا۔ ہم
بھی تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے۔“ آسیہ آئندی بیڈ روم کے ماحول کی کشیدگی محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکی تھیں۔
”بڑی حویلی کی طرف سے دعوت کا سن کر ساری بھوک ہی اڑ گئی تھی اس لیے فی الحال کوئی بھوک نہیں ہے۔“
اس نے لگی میں گردن ہلائی۔
”تو ٹھنڈا منگوا لیتی ہوں۔“

”تو تھینکس۔ میری پیاس پانی سے بجھنے والی نہیں ہے۔“
”تو پھر آئے کیوں ہو؟“ عائشہ آئندی ناراضی سے پوچھیں۔
”عدالت میں پیشی کے لیے۔“ وہ بھی ڈرنے اور جھجکنے والا نہیں تھا۔
”اور تم جانتے ہی ہو گے کہ فیصلہ بھی آج ہی ہو گا۔“ یہ آواز آؤر کی تھی اور دل آور نے آؤر کی طرف دیکھا تھا۔
”کیسا فیصلہ؟“ اس نے جان بوجھ کر سوال اٹھایا۔
”علیزے کی طلاق کا فیصلہ۔“ آؤر نے طلاق کے فیصلے پہ زور دیا تھا۔
”علیزے کی طلاق کا فیصلہ۔ لیکن وہ کیوں؟“ وہ جیسے سب کچھ ان کے منہ سے سننا چاہتا تھا۔
”کیونکہ علیزے تمہارے ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔“ ان دونوں کے سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔
”کیوں۔۔۔؟ علیزے میرے ساتھ کیوں نہیں رہنا چاہتی؟ کیا میں برا ہوں اس لیے؟“ وہ آؤر کی آنکھوں میں
آنکھیں ڈال کے پوچھ رہا تھا۔

”ہاں شاید۔“ آؤر نے کندھے اچکائے۔
”شاید نہیں یقیناً“ میں بہت برا ہوں، لیکن پھر بھی بد کردار نہیں ہوں اور اس چیز کو میرا خیال ہے کہ علیزے
سے بہتر اور کوئی بھی نہیں جانتا۔“ اس کی بات پہ علیزے کا جھکا ہوا سر مزید جھک گیا تھا۔ کیونکہ اس نے بات ہی
ایسی کہہ دی تھی۔
”تم کتنے با کردار ہو یہ بات علیزے ہی نہیں ہم سب بھی کافی اچھی طرح سے جانتے ہیں۔“ آؤر نے کمرے
میں موجود تمام افراد کی سمت دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

”میں علیزے کو یہاں سے لے گیا تھا تو اس کا مطلب ہے کہ میں بد کردار ہو گیا تھا ہونہ۔ اگر ایک لڑکی کو
سب کے سامنے محض اپنے ساتھ لے جانا بد کرداری ہے تو ایک لڑکی کی عزت سے کھیلنے والے کو کیا نام دیں گے
آپ لوگ؟“
اس نے کہتے ہوئے آؤر اور باقی سب کو بھی ایک سرسری سی نظر سے دیکھا تھا۔ لیکن آؤر کے پاس اس کے
سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔
”بیٹاؤ آؤر آئندی کسی لڑکی کی عزت سے کھیلنے والے کو کیا نام دے؟ برا یا بد سے بھی بدتر؟ اس نے آؤر آئندی کو
بولنے لگا کیا تھا۔

”یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟“ آؤر کے کچھ پلے نہیں بڑھا تھا۔
”نہیں جو کچھ کہہ رہا ہوں، میں یہ کہنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن آپ لوگوں نے صرف آپ لوگوں نے مجھے یہ سب

کہنے پر مجبور کر دیا ہے ورنہ آپ لوگوں کی نظر میں کسی دوسرے کو گرا کر خود سرخرو ہونے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔
لیکن مجھے مجبور کیا گیا ہے کہ میں حویلی آؤں اور اپنی اس گستاخ زبان سے وہ سارے راز عیاں کروں جن کو میں
صرف اپنے آپ کے سامنے عیاں کرتے ہوئے بھی رو پڑتا ہوں۔ اور جل اٹھتا ہوں۔“

دل اور کی شکستہ سی آواز بات کرتے کرتے انتہائی مدھم مدھم گئی تھی اور اپنے بیڈ پر ساکت پڑے وقار آئندی کی
آنکھوں سے بے آواز آنسو بہہ نکلے تھے اور ان کی کنپٹیوں کے بالوں میں جذب ہونے لگے تھے۔
”لیکن میں اور کوئی راز نہیں جانتا چاہتی۔ مجھے بس اتنا بتا دو کہ تم نے میرے ساتھ یہ سب کیوں کیا تھا۔ کس گناہ
کی سزا دی گئی مجھے؟ کیا قصور تھا میرا؟ کیا قصور تھا آخر؟ بتاؤ مجھے؟“

دل اور کی بات سنتے سنتے علیزے پھٹ پڑی تھی اور دل اور نے اس کے سوال پر یکدم نظریں اٹھا کر اسے
بہت ہی زخمی نظروں سے دیکھا تھا یوں جیسے وہ بہت اذیت میں ہو۔

”میں جانتا نہیں چاہتا علیزے! اس بات کو رٹنے دو۔“ وہ پھر بھی گریز سے کام لے رہا تھا۔
”کیوں رٹتے ہو؟ اس لیے کہ تمہارے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے؟ تم جھوٹے ہو۔ بد کردار ہو۔
بد نیت ہو۔“ اور نے بھی سارے ہی نشتر چھو ڈالے تھے۔

”تمہارے دل میں کوئی بات ہے تو تم بتاتے کیوں نہیں ہو؟“ یہ سوال عائشہ آئندی کی طرف سے آیا تھا۔
”کیونکہ مجھے پتا ہے کہ یہاں بہت سارے رشاقوں کے بھرم ٹوٹیں گے۔“ اس نے پھر بھی ان سب کو باز رکھنا چاہا
تھا۔

”لیکن پھر بھی ہم سب سچ سننا چاہتے ہیں۔“ وانیال نے بھی مداخلت کی۔
”سچ سننے کے لیے حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔“ دل اور انہیں بار بار روک رہا تھا۔

”اور سچ بولنے کے لیے ہمت کی اور جرات کی ضرورت ہوتی ہے جوئی الحال تمہارے پاس نہیں ہے۔“
”آؤر آئندی! میری ہمت اور میری جرات کو مت آزماؤ! میں تمہاری اس پوری حویلی کا تختہ الٹ کے رکھ سکتا
ہوں، لیکن پھر بھی میں چاہتا ہوں کہ زبان سے کچھ نہ کہوں جو خدا کی طرف سے سزا جھیل رہا ہے اسے وہی سزا
جھیلنے دوں۔ اب کسی اور سزا کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ خاص طور پر میری طرف سے۔“

”لیکن ہم چاہتے ہیں کہ تمہاراؤ تمہارے کیوں نہیں ہو؟ آخر تم نے ایسا کیا کیوں تھا؟“
آسیہ آئندی بھی گے بغیر نہیں رہ سکی تھیں اور دل اور نے محض اک سرسری سی نظر آسیہ آئندی پر ڈالی تھی
اور پھر وقار آئندی کی طرف دیکھا تھا۔

”اپنے شوہر وقار آئندی سے پوچھیے کہ میں نے ایسا کیوں کیا تھا؟ کس لیے سزا دی تھی؟ کیا قصور تھا علیزے
آئندی کا؟ اس نے وقار آئندی کی طرف اشارہ کیا تھا۔

”وقار آئندی سے؟ مگر ان سے کیوں؟“ ان سب کو تعجب ہوا تھا۔
”کیونکہ یہ گناہ گار ہیں یہ بد کردار ہیں بد نیت ہیں یہ جھوٹے ہیں۔ یہ نفس کی لپیٹ میں آنے والے زانی ہیں۔“
وہ یکدم ہوا ڈاٹھا اور ان سب کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں۔

”تم ہوش میں تو ہو؟ یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟“ اور کو دھچکا سا لگا تھا۔
”ہو نہ۔! میں ہی تو ہوش میں ہوں آؤر آئندی۔ اس لیے تو بے سکونی کی زندگی جی رہا ہوں۔ اور میری زندگی کو
بے سکون کرنے والا شخص یہ ہے۔ یہ وقار آئندی۔ بڑی حویلی کی سب سے بڑی اور معزز شخصیت۔ تم سب کے
سرپرست۔ تم سب کے امیڈیل ڈیڈ۔ اور اس ملک کے کامیاب بزنس مین۔“ وہ وقار آئندی کی طرف دیکھتے ہوئے
کہہ رہا تھا اور چند سیکنڈز یو تھی ان کی سمت دیکھتے رہنے کے بعد اس نے نظروں کا زاویہ دوبارہ بدل دیا تھا اور اب اس

کی نظروں کا مرکز علیزے تھی۔
”تم جانتا چاہتی ہونا کہ میں نے یہ سب کیوں کیا تھا؟ اور تمہیں کس گناہ کی سزا دی تھی؟ تو پھر سنو آج۔“
اس نے ڈائریکٹ علیزے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

”زہرہ بتول شاہ اور بابر شاہ صرف دو ہی بہن بھائی تھے بابر شاہ کی شادی ہو چکی تھی جبکہ زہرہ بتول شاہ کالج میں
رہ رہی تھیں۔ اور ابھی ان کے کالج کا پریڈ حتم بھی نہیں ہوا تھا کہ دل اور شاہ کی پیدائش کے وقت اس کی ماں کا
انتقال ہو گیا تھا اور دل اور شاہ کی ساری ذمہ داری زہرہ بتول شاہ پر آگئی تھی۔ وہ دل اور شاہ کے لیے ایک پوچھی
نہیں بلکہ ماں کی طرح ثابت ہوئی تھیں۔ اور اس چیز کو ان کی بچپن کی سسلی عائشہ آئندی سے بہتر اور کوئی بھی
نہیں جانتا تھا۔

عائشہ آئندی نے ان دونوں ان کی بہت اور حوصلہ برصا نے کی کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اور ساتھ ساتھ
انہیں اپنی تعلیم جاری رکھنے کا بھی مشورہ دیا تھا، لیکن زہرہ بتول شاہ نے دل اور شاہ کی خاطر اپنی مزید تعلیم کا ارادہ
بھی ترک کر دیا تھا، کیونکہ وہ اسے گھر میں ملازمہ کے حوالے کر کے خود یونیورسٹی نہیں جانا چاہتی تھیں۔ اس لیے
عائشہ آئندی نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ اور انہی دنوں ملک و جاہت علی کے گھر سے عائشہ آئندی کے لیے
پروپوزل آیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وقار آئندی اور ملک و جاہت علی کی دوستی رشتہ داری میں بدل گئی تھی۔

دوسری طرف عائشہ آئندی، اسرار آئندی اور اظہار آئندی کو ملک و جاہت علی کی بہن آسیہ علی بہت پسند آتی
تھی اور وہ اسے بھابھی بنانے کا خواب سجا بیٹھے تھے۔

جبکہ وقار آئندی اس رشتے سے انکاری تھے وہ ابھی شادی نہیں کرنا چاہتے تھے مگر جب انہیں یہ پتا چلا کہ ملک
و جاہت علی کی بھی یہی خواہش ہے تو وہ دوبارہ پھر انکار نہیں کر سکے تھے اور شادی کے لیے ہامی بھری گئی اور یوں
دونوں حویلیوں میں شادیوں کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔

اور اپنی دوست کی شادی میں بہک ہونے کے لیے اور ان کی ہولناکی کرنے کے لیے زہرہ بتول شاہ کو وقتاً فوقتاً ”نوفی“
بڑی حویلی آنا پڑتا تھا اور عائشہ آئندی کی ہر خوشی اور ہر کام میں شریک ہونا پڑتا تھا اور اسی شرکت نے ان کی زندگی
بیا کر ڈالی۔ وہ کہتے کہتے ذرا دیر کے لیے رکا تھا اور کمرے میں موجود تمام افراد کا دم گھٹنے لگا تھا ان کی سائیں تک
رک گئی تھیں۔

عائشہ آئندی اور زہرہ بتول شاہ دونوں آسیہ علی کے لیے شایگ کرنے لگی تھیں اور واپسی پر زہرہ بتول شاہ بھی
بڑی حویلی ہی آگئی تھیں اور بڑی حویلی کے ڈرائنگ روم میں انہوں نے اپنی شایگ کا سامان پھیلاتے ہوئے آسیہ
علی کے بائوں کے لیے لایا ہوا پیشہ اپنی دوست زہرہ بتول شاہ کے سر پر ڈال دیا تھا اور وہیں پر وقار آئندی کی نظر کسی
اور نظر میں بدل گئی تھی اور اس کا احساس زہرہ بتول شاہ کو بھی ہو گیا تھا۔

وہ فوراً واپس آگئی تھیں لیکن وقار آئندی کی نظر واپس کیسے آگئی تھی؟

پھر انہوں نے بار بار زہرہ بتول شاہ کے راستے میں حائل ہونا چاہا تھا اور وہ ہر بار دامن بچا جاتی تھیں اور یونہی
گزرتے گزرتے اور دامن بچاتے بچاتے شادی کے دن قریب آگئے تھے وقار آئندی اس شادی سے انکار کر دینا
چاہتے تھے مگر عائشہ آئندی کا خیال آتے ہی وہ اپنی اس حرکت سے رک جاتے تھے۔ کیونکہ اب عائشہ آئندی
وقار آئندی آسیہ علی اور ملک و جاہت علی ایک ہی ڈور سے بندھے ہوئے تھے اور اگر یہ ڈور ٹوٹ جاتی تو وہ چارپوں
کی گھر جاتے جو کہ وقار آئندی کو منظور نہیں تھا اسی لیے نہ چاہتے ہوئے بھی وقار آئندی کو یہ شادی کرنا پڑی تھی
اور یوں عائشہ آئندی بیاہ کر بڑی حویلی سے ملک حویلی چلی گئی تھیں اور آسیہ آئندی ملک حویلی سے بڑی حویلی آگئی
تھیں سب کچھ بظاہر ٹھیک چل رہا تھا لیکن وقار آئندی کا ذہن اب بھی شادی سے پہلے والی خواہش میں انکا ہوا

تھا اور اس خواہش میں چار سال گزر گئے تھے۔
 اور ان چار سالوں میں ان کی کوئی اولاد بھی نہیں ہوئی تھی البتہ عائشہ آئندہ کے ہاں وانیال کی آمد ہو چکی تھی
 اور وہ تین سال تین ماہ کا ہو چکا تھا۔ تب دل اور شاہ کی عمر ساڑھے چار سال ہو چکی تھی اور زہرہ ہوتول شاہ نے بابر شاہ
 سے مشورہ کر کے دل اور شاہ کو اسکول میں ایڈمٹ کروا دیا تھا اور خود فارغ رہنے لگی تھیں اور اسی فراغت سے
 تنگ آکر انہوں نے دوبارہ سے تعلیم کا سلسلہ جوڑ لیا تھا۔ جس کی خبر وقار آئندہ تک بھی پہنچ گئی تھی کیونکہ عائشہ
 آئندہ میکے آئی ہوئی تھیں اور کبھی کبھار زہرہ ہوتول شاہ بھی چکر لگاتی تھیں اور اسی دوران وقار آئندہ نے ایک بار
 پھر زہرہ ہوتول شاہ کی طرف ہاتھ بڑھانے کی کوشش کی تھی اور اب کی بار زہرہ ہوتول شاہ نے کافی بری طرح سے انہیں
 جواب دیا تھا اور کافی عزت افزائی سے کام لیا تھا جس کو وقار آئندہ بوجھے تھے اور اندر ہی اندر لاوے کی طرح جلنے
 رہے تھے۔ اور یہ لاوا لگے چار سالوں میں اتنی بری طرح سے پک چکا تھا کہ وہ انسانیت اور حیوانیت کا فرق بھول
 گئے تھے۔

دل اور بڑے بے حس سے انداز میں سب کچھ کتابدار ہاتھ لیکن بات جب دکھ کی جڑ تک پہنچی تھی تو اس کا کلیجہ
 مٹھی میں اٹھایا تھا۔ اور آہستہ آہستہ بیڈ کا سہارا لیتے ہوئے بیڈ پر ہی بیٹھ گئی تھیں۔ جبکہ علیزے
 لٹھے کی طرح سفید پڑ گئی تھی اور آواز جورت اور وانیال وغیرہ کے چروں پر ہوائیاں سی اڑنے لگی تھیں۔ اور کانوں
 میں سائیں سائیں کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔

”وہ دن بہت ہی بد بخت دن تھا جب وانیال اور زین کا حقیقہ رکھا گیا تھا۔ اور اس شاہدار عقیقہ کی رسم میں حویلی
 کے تمام افراد کو ہی مدعو کیا گیا تھا، لیکن صرف وقار آئندہ تھے جو اس رسم میں شریک نہیں ہو سکے تھے کیونکہ وہ
 سنگاپور گئے ہوئے تھے اور واپس گھر آئے تو گھر خالی پڑا ہوا تھا اور خالی گھر میں چکراتے ہوئے انہیں کچھ نہ سوجھا
 تو انہوں نے ڈرنک کا انتظام کر لیا کیونکہ ان کے ذہن پر زہرہ ہوتول شاہ کا خیال سوار تھا۔

اور اپنے خیال کو ایک گندہ اور غلیظ حل بناتے ہوئے انہوں نے ملازمہ سے بہانا کر کے فون کروایا اور زہرہ ہوتول
 شاہ کو بڑی حویلی بلا لیا کیونکہ عائشہ آئی ہوئی ہے۔
 زہرہ ہوتول شاہ نے سوال اٹھایا کہ عائشہ کے بیٹوں کا تو حقیقہ ہے، لیکن ملازمہ نے بہانا کر دیا کہ عائشہ آئندہ کی
 طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے حقیقہ چند دن کے لیے ملتوی کر دیا گیا ہے۔ وہ پھر رکا تھا اور علیزے کے چہرے کو
 دیکھا تھا جہاں زردیاں با تر رہی تھیں۔

”زہرہ؟“ عائشہ آئندہ نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے منہ پر رکھ لیے تھے کیونکہ ان کے منہ سے بے ساختہ اک
 سکی سی ابھری تھی۔
 ”دل اور شاہ اس وقت ساڑھے آٹھ سال کا تھا جب زہرہ ہوتول شاہ کو عائشہ آئندہ کے نام پر وہو کا دے کر حویلی
 بلایا گیا تھا، حالانکہ حویلی بالکل خالی پڑی تھی، لیکن اس خالی حویلی میں ایک درندہ دل اور شاہ کی پھوپھی کے لیے
 ناک لگائے بیٹھا تھا۔

اور دل اور شاہ کو خبری نہیں ہو سکی تھی وہ بڑی حویلی کے لان میں چکراتا رہا اور اپنی پھوپھی کی واپسی کا انتظار
 کرتا رہا اور اس انتظار میں اس کی بے چینی بھی شامل تھی وہ بار بار ملازمہ سے استفسار کرتا رہا کہ اماں کب آئیں گی
 اور ملازمہ ہر بار اسے اپنی باتوں میں بہلا پھسلا کر کسی اور چیز کی طرف متوجہ کر دیتی تھی، لیکن آخر کار دل اور شاہ
 تنگ آکر اندر آ گیا تھا مگر اندر کوئی بھی نہیں تھا۔

البتہ میٹرچیوں کے نیچے بسنے والے آواز کی آوازیں آرہی تھیں۔
 پھر دل اور شاہ یوانہ وار بھاگتا تھا۔ دل اور شاہ یعنی میں۔ میں۔ دل اور شاہ۔ اپنی ماں کی آواز سن کر میرا

جسم میں کرٹ بھر گیا تھا اور میں سیدھا ہسپتال میں جا پہنچا تھا، مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔ میری ماں سب کچھ
 مٹا چکی تھی اس کا دامن داغ دار ہو چکا تھا اس کی حرمت لٹ چکی تھی۔ درندہ اپنی زندگی آڑا گیا تھا۔
 اور میں پچھلی پچھلی آنکھوں سے اپنی ماں کی حالت دیکھتا رہ گیا تھا جو ہسپتال کے فرش پر بیٹھی رو رہی تھیں اور
 چی رہی تھیں۔

کہتے کہتے اس کی آنکھیں سرخ پڑ گئی تھیں یوں جیسے اس کی آنکھوں سے خون چھٹک رہا ہو اور زندگی کے اس
 اہم ناک مرحلے پر وقار آئندہ نے سچی سے آنکھیں میچھ لیں تھیں اور شدت دل سے اپنی موت کی دعا کی تھی مگر
 وہ نہیں جانتے تھے کہ اللہ نے ان کی سائیں ہی ان کے لیے سزا بنادالی تھیں۔

”میں نے ان ہاتھوں سے اپنی اماں کے بھرے ہوئے وجود کو سنبھالا تھا اور ان سے لپٹ کر انہیں چپ کروانے
 کی کوشش کی تھی اور پھر بڑی مشکلوں سے انہیں اپنے ساتھ لے کر بڑی حویلی سے نکل آیا تھا لیکن بڑی حویلی سے
 نکلنے میں نے دعا کی تھی کہ اللہ وقار آئندہ کو بھی بیٹی دے اور اس کی بیٹی کا بھی وہی حشر ہو جو آج میری ماں کا
 ہوا ہے۔

میں اس وقت بہت چھوٹا تھا لیکن میری عقل، میری سمجھ اور میری سوچ بہت بڑی تھی، مگر میں نے یہ تو سوچا ہی
 نہیں تھا کہ اس ایک دن میں میرا پورا گھر برباد ہو کے رہ جائے گا۔“ دل اور سے اب مزید بولنا مشکل ہو چکا تھا اس
 کے گلے میں پھندا سا لگنے لگا تھا۔

”میں اماں کا ہاتھ پکڑے گھر میں داخل ہوا تھا اور سامنے کھڑے بابا (بابر شاہ) کو دیکھ کر میرا بھی پورا جسم کانپ گیا
 تھا وہ اماں کی حالت دیکھ کر بڑی تیزی سے قریب آئے تھے اور اماں کو دونوں کندھوں سے تھام لیا تھا۔ پھر انہوں
 نے اماں کو اس قدر جھنجھوڑا کہ اماں کا سکتہ ٹوٹ گیا تھا۔

اور وہ ان کے قدموں میں گر کر رو پڑی تھیں، ان کی کوئی بہن نہیں تھی، ماں نہیں تھی، بھابھی نہیں تھی جس
 سے وہ اپنا دکھ کہیں۔ صرف اور صرف ایک بھائی تھا اور اس بھائی سے وہ یہ دکھ کیسے چھپا سکتی تھیں اس لیے سب
 کچھ کہہ دیا تھا اور بابر شاہ جیتے جی مر گئے تھے انہوں نے بہن کو سنبھالا اپنے قدموں سے اٹھا کر سینے سے لگایا اور
 انہیں ان کے بیڈ روم میں چھوڑ کر اپنے کمرے میں گئے اپنا ریا اور نکالا اور گھر سے نکل گئے تھے لیکن گھر سے نکلنے
 سے پہلے وہ یہ ضرور کہہ کر گئے تھے کہ اگر وہ آج کی تاریخ میں وقار آئندہ کو نہ مار سکے تو خود کو مار ڈالیں گے۔ وہ ذرا
 وقت کے لیے رکا تھا۔

”اور پھر ایسا ہی ہوا تھا وہ بڑی حویلی پہنچے تو پتا چلا کہ وقار آئندہ کراچی چلے گئے ہیں اس لیے وہ ناکام اور مایوس
 سے واپس لوٹ آئے تھے لیکن شدت غضب سے داغ میں اس قدر لاپال اٹھ رہے تھے کہ ان سے برداشت کرنا
 مشکل ہو گیا تھا اور انہوں نے راستے میں چلتے چلتے خود کو گولی مار دی تھی۔ اور زندگی سے رہی سہی امید بھی ختم
 ہو گئی تھی۔

بابر شاہ کی میت گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر جہاں اماں باگلوں کی طرح چیختی تھیں وہاں میرا بھی برا حال ہو گیا تھا،
 اور ہم ایک دن میں ہی سب کچھ لٹا کر خالی ہاتھ اور اکیلے ہو گئے تھے۔
 بھری دنیا ہمارے لیے کسی جنگل سے کم نہیں تھی، ویرانی تھی، سناٹا تھا اور ورنہوں کی غراہٹ تھی وہ دن کیسے
 گزرا یہ صرف ہم جانتے تھے۔

لوگوں نے اماں پر الزام تراشی کرنا اور بہتان لگانا شروع کر دیا تھا، اسی لیے مجبوراً انہوں نے گھر چھوڑ دیا اور بابا کا
 مارا کا دیوار بند کروا کے اسلام آباد چلی گئیں اور لاہور شہر سے پیشہ کے لیے تعلق توڑ دیا تھا، اور اپنے آپ کو
 بھانسنے کی اور مضبوط کرنے کی کوشش کی تھی۔

لیکن اس واقعے کے ٹھیک تین مہینے بعد وہ پھر سے ایک عذاب سے گزری تھیں اور جب کچھ نہ بن پڑا تو انہوں نے زہر کا پالہ پیئے ہوئے وقار آفندی کے آفس میں فون کیا تھا اور ان سے ان کا نام مانگا تھا۔ اپنے لیے نہیں بلکہ اس سچے کے لیے جو ناجائز تھا ناپاک تھا حرام تھا۔

عائشہ آفندی کی آنکھوں سے آنسو اکوا تر سے بہہ رہے تھے اور آسہ آفندی کے جسم پہ ایک کچی سی ملاری ہونے لگی تھی۔

”لیکن وقار آفندی نے انتہائی سفاکی سے انکار کر دیا تھا یہ کہہ کر اگر وہ ایسا کچھ کریں گے تو ان کی بہن عائشہ کی زندگی بھی برباد ہو جائے گی میں آسہ پہ کوئی سوتن نہیں لا سکتا اور نہ ہی آسہ کو کوئی دھوکا دے سکتا ہوں اور ویسے بھی میرا ایک اسٹینس ہے اسٹینڈر ہے میں اپنے مقام سے نیچے نہیں آنا چاہتا۔ ہمارے درمیان جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ اور ابارشن کروادو اسپتال کا سارا خرچہ میں انورڈ کروں گا۔“ دل اور ایک بار پھر چپ ہو گیا تھا کیونکہ اس سے بات کا سلسلہ جاری رکھنا مشکل ہو رہا تھا بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔

”اور ان کے اس جواب پہ ماں پہ کیا گزری یہ میں جانتا ہوں۔“

اور ٹھیک دو دن بعد ملک وجاہت علی کو بابرٹ اٹیک ہوا اور وقار آفندی کی بہن کی زندگی بھی برباد ہو گئی وہی زندگی جس کو وہ آباد رکھنے کا بہانا کر رہے تھے پھر عائشہ آفندی پہ کیا گزری یہ وہ بھی اچھی طرح جانتے تھے بلکہ وجاہت علی کے چالیسویں کے بعد ملک شرافت علی کی بری نظر عائشہ آفندی پہ جا پڑی تھی۔ انہوں نے بھائی سے شادی کا شو شامی چھوڑا تھا مگر عائشہ آفندی نے انکار کر دیا تھا۔

اور اسی انکار سے مشتعل ہو کر انہوں نے عائشہ آفندی کی عزت پہ ہاتھ ڈالنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن ان کی قسمت اچھی تھی کہ ملک شرافت علی کی بیوی نے انہیں بچالیا تھا اور وقار آفندی کو فون کر کے عائشہ آفندی کو بڑی حویلی لے جانے کا کہا تھا اور ساری چوبیس بجیں بھی بتائی تھی تب وقار آفندی بہن کو حویلی لے آئے تھے اور حویلی آکر ہی انوشہ پیدا ہوئی تھی لیکن ملک شرافت علی نے ملک وجاہت علی کے بچوں کو جائیداد میں سے خالی کر دینے کا فیصلہ سنایا تھا جس کو وقار آفندی نے فوراً قبول کر لیا تھا اور آسہ آفندی سے پوچھا تھا کہ وہ کہاں رہنا چاہتی ہیں؟ اپنے گھر والوں کے پاس یا وقار آفندی کے پاس؟

تب آسہ آفندی نے گھر والوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر وقار آفندی کا ساتھ دیا تھا اور اپنی نند اور بھانجی عائشہ کی جی بھر کے دیکھتی کی تھی کیونکہ وہ بہت بڑے حادثے سے گزری تھی اور اسی دکھ کے عالم میں انہوں نے زہر کو بھی یاد کیا تھا مگر وقار آفندی ٹال گئے تھے یہ کہہ کر کہ انہوں نے بہت ڈھونڈا مگر زہرہ بھول شاہ کا کچھ ہاتھ نہیں چلا شاید وہ بھائی کی ڈتھ کے بعد گھر بچ کر کسی سے شادی کر کے ملک سے باہر چلی گئی ہیں اور عائشہ آفندی نے ان کے کہے پہ اعتبار کر لیا تھا لیکن انہیں یہ نہیں پتا تھا کہ زہرہ بھول شاہ پہ کیا کیا جیتی ہے۔

ان سب باتوں کی معلومات مجھے بہت سالوں بعد لاہور آنے پہ ملی تھی اور میں نے اندر ہی اندر ملازمت میں بہت کچھ جانا تھا۔

”لیکن وہ بچہ؟“ آسہ آفندی کے ہونٹ کپکپائے تھے۔

”مرہ پیدا ہوا تھا۔“ وہ بہت پھر لیے لہجے میں بولا تھا۔

وقار آفندی نے تو ابارشن کا کہہ دیا تھا لیکن وہ ایسا نہیں کر سکی تھیں وہ بچہ پیدا کرنا چاہتی تھیں اور اس بچے کے ذریعے وقار آفندی کا گریبان پکڑنا چاہتی تھیں۔

مگر اللہ تعالیٰ کو شاید کچھ اور ہی منظور تھا اسی لیے وہ بچہ مرہ پیدا ہوا تھا۔ اور ماں زندگی کا ایک اور بھائی نکلا اذیت ناک رخ دیکھ کر وہ گئی تھیں اور خود کو اللہ کی رضا پہ چھوڑ دیا تھا۔

پھر ان کی زندگی کا مرکز دل اور شاہ کی ذات تھی اور انہوں نے اپنا غم اپنی خوشی اپنے خواب اپنی خواہش سب دل اور شاہ سے وابستہ کر لیے تھے۔

حالانکہ وہ پہلے بھی بہت پار کرتی تھیں اور بہت توجہ دیتی تھیں مگر اب اس پیار اور توجہ میں شدت آگئی تھی ان کی رات اور ان کے دن کا محور ہی دل اور شاہ تھا۔

اور میں بھی سب کچھ بھول کر صرف انہی کی ذات کو ترجیح دیتا تھا کیونکہ وہ میرے لیے ماں بھی تھیں اور باپ بھی۔ اور انہوں نے میرے لیے بہت زیادہ جدوجہد بھی کی تھی پہلے ایک کالج میں لیکچرار رہیں پھر اس کالج میں اپنا پیسہ انویسٹ کر کے پرنسپل کا عہدہ سنبھال لیا مگر سیٹ کیا مجھے پڑھایا لکھایا اور پھر میرے بابا کا شوق پورا کرنے کے لیے مجھے لندن بھیج دیا وہیں پہ میری ٹیبل اور عبد اللہ سے دوستی ہوئی اور زندگی کے پانچ سال اماں سے دور گزارنے کے بعد میں پاکستان آیا تو میرے دل میں صرف ایک ہی عزم تھا لاہور جانا اور وقار آفندی سے انتقام لینا۔

اماں کو جب میرے ارادوں کی خبر ہوئی تو وہ بہت پریشان ہوئی تھیں انہوں نے مجھے روکا بھی تھا مگر میں قسم کھا چکا تھا کہ اگر میں بابر شاہ کا بیٹا ہوں تو ایک بار وقار آفندی کو وہ اذیت دے کر ہی رہوں گا جس اذیت سے بابر شاہ اور زہرہ بھول شاہ گزرے تھے۔ تب انہوں نے مجھے میرے حال پہ چھوڑ دیا تھا اور یوں میں لاہور آیا یہاں گھر لیا، نئے سرے سے لاہور شہر میں اپنا مقام بنایا اور وقار آفندی کو اذیت دینے کے تمام انتظامات بھی کر لیے۔

اور اس انتظام میں پہلا کام یہ کیا کہ مبارک خان کو اپنے ساتھ شامل کیا تھا مبارک خان اسلام آباد میں میٹرک تک میرا کلاس فیلو رہا تھا پھر اس نے اسکول چھوڑ دیا اور اپنے گھریلو حالات کی وجہ سے کام کرنا شروع کر دیا تھا وہ کب اور کیسے لاہور پہنچا یہ میں نہیں جانتا لیکن اسے وقار آفندی کے خاص ملازم کی حیثیت سے دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی تھی وہ بھی مجھ سے مل کر خوش ہوا تھا مگر اس نے میرے لیے کام کرنے سے انکار کر دیا تھا لیکن جب اسے وقار آفندی کی اصلیت کا پتا چلا تو اس نے بھی بغاوت کا اعلان کر دیا۔ یوں خیر و باہا کو پیش آنے والا حادثہ اور میرا نوکری تلاش کرنے کے لیے آنا سب ایک پلان تھا۔ ایک کامیاب پلان۔ اور میں بطور ڈرائیور بڑی حویلی میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

میں چاہتا تو علیزے آفندی کو کونفیم بھی کر دے سکتا تھا اس کے ساتھ برا بھی کر سکتا تھا۔ مگر میری ماں کا حکم تھا کہ وقار آفندی مت بننا۔ وقار آفندی بنوں گا تو وہ مجھے کبھی بخشیں گی نہیں۔ ہاں البتہ وقار آفندی کو اذیت بخشی بھی دیں وہ کم ہے۔

لیکن میں کیا کرتا؟ میں جب جب علیزے آفندی کو دیکھتا تھا میرا خون کھولتا تھا میرے اندر غضب کے ابال اٹھتے تھے مگر میں بے بس تھا میں پابند تھا اس لیے مبرا اور برداشت سے کام لیتا رہا اور اسی دوران مری میں علیزے کے بیڈ روم میں بنے علیزے کے ساتھ کچھ فوٹو گراف بنوائے تھے ان لپکٹ میں علیزے اور وقار آفندی دونوں کو ہی بے بس کر دینا چاہتا تھا میں چاہتا تھا کہ علیزے میرے پاس سے بھاگنے کی احتجاج کرنے کی اور میری بات سے انکار کرنے کی کوشش نہ کرے اس لیے ضروری تھا کہ پہلے اسے کنٹرول کیا جاتا اور میں نے ایسا ہی کیا تھا علیزے کی برتھ ڈے کی ٹائٹ میں اس کے پاس آیا اور اسے کہا کہ وہ میری بیوی ہے۔ وہ حیران ہوئی تھی احتجاج بھی کرنا چاہتا تھا اور انکار بھی۔

مگر اس کی نیند اور اس کی بے ہوشی میں بنوائے گئے فوٹو گراف اسے چپ کر دینے کے لیے کافی تھے اور میری یہ دھمکی بھی کافی تھی کہ میں ان فوٹو گراف کے پوسٹر بھی بنوا سکتا ہوں اور پورے شہر میں چھو بھی سکتا ہوں اس لیے جو میں کہوں وہ کرتی جائے۔ سو ایسا ہی ہوا تھا اور علیزے نے بالا خرہ ہتھیار ڈالتے ہوئے کہہ ہی دیا کہ وہ میری

ہوئی ہے۔ اور ایک ہوی کی حیثیت سے میں اسے آپ سب لوگوں کے سامنے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ لیکن وہاں جا کر میں اسے اپنے گھر کے ہیمنٹ میں ڈال دیا تھا۔

علیزے کے بارے میں پتا چلا تو انہیں بھی اسلام آباد سے آگئی تھیں اور وہ وقفے وقفے سے مجھے یہ تنبیہ کرتی رہی تھیں کہ کسی لڑکی کی عزت سے کھیلنے کا بھی سوچنا بھی مت اگر سوچو گے تو ایک بار میرے بارے میں ضرور سوچ لینا۔

عورت قابل احترام ہستی ہے، عورت محبت کا پیکر ہے، عورت اس دنیا کا زیور ہے، عورت مرد کی ہوس پوری کرنے کے لیے نہیں بنی۔ عورت مرد کا غصہ سنبھالنے کے لیے نہیں بنی۔ عورت مرد کے انتقام کے لیے نہیں بنی، اس لیے تمہیں کوئی اجازت نہیں ہے کہ تم وقار آئندی کا انتقام علیزے آئندی سے لو اور اس کی سزا اسے۔

وہ ایک عورت ہے اور ایک عورت کا وہ مجھ سے بہتر اور کوئی بھی نہیں جان سکتا۔“

دل آؤر نے آؤر عورت اور دانیال کی طرف دیکھا تھا جو دم بخود سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہنوز دل آؤر شاہ کو دیکھتے جا رہے تھے۔

”زہرہ بٹول شاہ ظالم نہیں تھیں۔ بلکہ ایک مضبوط اعلا طرف اور غیرت مند عورت تھیں۔ زندگی سے اتنے زخم اٹھانے کے باوجود بھی انہوں نے سر اٹھا کر زندگی گزاری تھی اور اپنی محرومیوں اور تکلیفوں کا بدلہ علیزے آئندی سے ہرگز نہیں لیا تھا اور جب علیزے نے مجھ سے کہا کہ مجھ سے نکاح کر لو اور مجھے اپنا نام دے دو تو خدا کو اسے کہ میں وقت کے اس میر پھیر اور اللہ تعالیٰ کی بے آواز لاٹھی پہ دنگ رہ گیا تھا۔ علیزے نے میرے پاؤں بھی پکڑے تھے لیکن میں کچھ کہہ نہیں سکا تھا۔ البتہ روح تک کانپ ضرور گیا تھا۔ کیونکہ میں زہرہ بٹول شاہ کا بیٹا تھا اور زہرہ بٹول شاہ نے مجھے ہمیشہ عورت کی عزت کرنا سکھایا تھا احترام کرنا سکھایا تھا کسی عورت کا سراپے قدموں میں جھکانا نہیں سکھایا تھا۔

اسی لیے میں نے جب مسئلہ ان کے سامنے رکھا تو انہوں نے زندگی میں ایک بار پھر مجھے حیران کر ڈالا۔ یہ کہتے ہوئے کہ ٹھیک ہے تم اسے لے کر آئے ہو تمہاری وجہ سے وہ بدنام ہوئی ہے تو تم ہی اسے اپنا نام دے دو نکاح کر لو اس سے۔ تم مرد ہو وہ عورت ہے اور عورت ہمیشہ اپنی عزت کی خاطر مرد کا ہی سہارا لیتی ہے، مرد سے ہی نام ہانتی ہے جو نام نہیں دیتے وہ نام مرد ہوتے ہیں بے غیرت ہوتے ہیں، عورت کی عزت کو عزت نہیں بنا سکتے۔ اور تب میں خاموش ہو گیا تھا واپس لاہور آگیا تھا ان سے سوچنے کے لیے وقت مانگا تھا اور وہ مطمئن ہو گئی تھیں پھر وہ لاہور آئیں اور یونی ایک روز اسپتال میں وقار آئندی سے سامنا ہوتے ہی وہ خود پہ کنٹرول نہیں رکھ پائی تھیں اور ان کا ایکسپلوزیوٹ ہو گیا تھا۔

لیکن اس ایکسپلوزیوٹ کے باوجود اپنی آخری سانسوں کے دوران انہوں نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے تاکہ میں علیزے سے نکاح کر لوں اور میں نے سر جھکاتے ہوئے ان کا کہا مان لیا تھا۔

کیونکہ میں ان کا کہا کبھی ٹال ہی نہیں سکتا تھا اور وہ علیزے آئندی سے کیا ہوا وعدہ پورا کر گئی تھیں وہ جاتے جاتے وقار آئندی کو معاف بھی کر گئی تھیں۔ اور میرے لیے ایک ”اپنے“ کا انتظام بھی کر گئی تھیں۔

ایک ایسا ”اپنا“ جو سب سے زیادہ پرایا نکلا۔ اور جس نے یہ ثابت کر دیا کہ اس کی رگوں میں واقعی ”وقار آئندی“ کا خون ہے۔

دل آؤر شاہ کا یہ جملہ کوئی اور وقت ہوتا تو علیزے کے لیے قابل فخر ہوتا، لیکن اس وقت یہ جملہ اس کے لیے

کسی گالی یا کسی طمانچے سے کم ثابت نہیں ہوا تھا۔

اس لیے علیزے نے یکدم اس طمانچے سے بلبل کر اس کی طرف دیکھا تھا اور وہ تھا کہ اسے ہی دیکھ رہا تھا اور اس کے اس دیکھنے میں کیا کچھ نہیں تھا آخر؟ طنز؟ تمسخر؟ کٹ اور تخی۔ سب کچھ ہی تو تھا۔ اور اس سے بھی بڑھ کر یہ تھا کہ اس کی آنکھوں میں شکوکہ تھا شکایتیں تھیں اور ایک گانہ بن بھی تھا۔

”ہیٹاؤ علیزے! کسی کو معاف کرنا اور اعلا طرف ہونا کتنا مشکل ہوتا ہے۔“

دل آؤر نے ڈائریکٹ علیزے سے سوال کیا تھا مگر علیزے کے پاس الفاظ ہوتے تو وہ جواب دیتی نا کتنا فرق ہے تم میں اور زہرہ بٹول شاہ میں۔

میں نے تمہارے ساتھ کچھ بھی نہیں کیا۔ پھر بھی تم مجھے معاف نہیں کر سکیں۔ اور وقار آئندی نے انہیں جیتے جی مار ڈالا پھر بھی انہوں نے اسے معاف کر دیا۔

میں نے اپنے غصے اور انتقام کے جذبات میں اگرچہ کچھ بھی کیا وہ سب براسی، لیکن پھر تمہاری عزت رکھ لی اور تمہیں اپنا نام دے دیا، مقام دے دیا اپنے دوستوں میں اور اپنے جاننے والوں میں تمہاری عزت بٹائی تمہارا احترام کیا تمہارا بھرم رکھا، لیکن تم سے وفا نہیں ہو سکی اور نہ ہی تم وفا کو سمجھ سکیں۔

شاید تمہیں نہیں پتا کہ عورت ہونا تو بہت آسان بات ہے، لیکن عورت ہونے کو بھانا بہت مشکل کام ہے، عورت تو بہت حساس ہوتی ہے، لیکن تمہیں تو نہ زہرہ بٹول شاہ کی کوئی بات یاد رہی اور نہ ہی دل آؤر شاہ کی۔ وہ تمسخر سے کہتا ہوا پھر رہا تھا۔

”تمہیں یاد ہو گا کہ میں نے تم سے ایک بار کہا تھا کہ محبت بڑی حویلی والوں کی سمجھ کی چیز نہیں ہے۔ تو میری جان میں نے وہ سچ کہا تھا یہ تمہاری سمجھ کی بھی چیز نہیں ہے کیونکہ تم بھی تو اس حویلی کا بیج ہو اس لیے مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے اور نہ ہی تم سے کوئی شکوہ ہے۔“

تم اس حویلی میں رہنا چاہتی ہو رہو۔ تم اپنے پیار کے ساتھ رہنا چاہتی ہو رہو۔ میری طرف سے آزاد ہو، میں تمہیں کل ہی طلاق بھجوا دوں گا کیونکہ تم جانتی ہو نا کہ میں واقعی زور زور سے کا قائل نہیں ہوں جو ہے وہ ٹھیک ہے جو نہیں ہے وہ بھی ٹھیک ہے بس میری تو یہی سوچ ہے اور یہی عمل ہے، البتہ جانے سے پہلے تم سے اتنا ضرور پوچھوں گا کہ تباؤ۔

اس سارے قصے میں دل آؤر شاہ کہاں کہاں غلط ہے؟ اور کہاں کہاں برا ہے؟ اور آج اس قصے کے بارے میں تمہارا انصاف کیا کہتا ہے آخر؟

اس نے آخر میں علیزے کو اپنے سوالوں کی زد میں رکھ لیا تھا اور سوال بھی ایسے تھے جن کے جواب علیزے کو دھونڈنے سے بھی نہیں مل سکتے تھے اور وہ اپنی جگہ پہ لنگ سی بیٹھی رہی تھی۔

”جو لو علیزے آج تمہارا انصاف کیا کہتا ہے آخر؟“ اس نے اپنے سوال پہ زور دیتے ہوئے علیزے کو بولنے پہ اکسایا تھا لیکن علیزے تو جیتے جی زمین میں زندہ گڑھی تھی وہ بولنے کی سکت کہاں سے لاتی؟

”وہ ہونہ! مجھے بھی پتا ہے اور مجھے کل بھی پتا تھا کہ حویلی والوں کے پاس کوئی انصاف نہیں ہے۔“ وہ انتہائی تلخی سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”اور ہاں آؤر آئندی! میری بدکرداری اور بد بختی کے بارے میں کچھ کہنا ہو تو میں اب بھی حاضر ہوں۔ لیکن اپنے حق میں بات کرتے ہوئے اتنا ضرور کہوں گا کہ میں وقار آئندی جیسا ”با کردار“ معزز اور عزت دار نہیں ہوں ہاں اتنا بدکردار ضرور ہوں کہ آپ کی بیٹی جیسی میں یہاں سے لے کر گیا تھا ویسی ہی آج یہاں چھوڑ کر جا رہا ہوں وہ جیسی پہلے تھی آج بھی ویسی ہے اور آج یہاں سے جاتے ہوئے آپ سب کے سامنے میں یہ اعتراف

کرتا ہوں کہ مجھے فخر ہے اپنے مرد ہونے پر کہ میں نے ایک مرد سے نفرت اور دشمنی کا انتقام ایک عورت سے نہیں لیا، حالانکہ میں چاہتا تو آسانی سے اپنا انتقام لے سکتا تھا مگر مجھے وقار آندی بننا گوارا نہیں تھا، کیونکہ میں جانتا تھا کہ میرا اللہ اور میرا ضمیر مجھے ظلمت کرتے رہیں گے اور مجھے سکون سے جینے نہیں دیں گے۔" دل آور نے آخری بات کہی تھی اور سب پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی تھی، ہر چہرے پر دکھ تھا، اذیت تھی، بے یقینی تھی اور سب سے بڑی بات کہ سب کے چہروں پر آنسو تھے۔

مگر ان کا یہ دکھ یہ اذیت اور یہ آنسو اس کے کس کام کے تھے بھلا۔ اسے کیا فائدہ تھا آخر۔ اب سب کچھ کار تھا اسی لیے وہ لا پرواہ تھا۔

"یعنی وہ آپ لوگوں نے دعوت دی، بلایا، کٹہرا سجایا، بہت اچھا لگا، میں تو پہلے ہی عدالتوں کا اور کٹھنوں کا عادی ہوں، ایک عدالت اور سہی۔ خیر اب چلتا ہوں۔ تھینک یو۔"

اس نے الوداعی کلمات ادا کیے تھے اور علیزے نے یکدم سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا اور ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی دل آور اسے ہی دیکھ رہا تھا لیکن جن نظروں سے دیکھ رہا تھا وہ علیزے کو کاٹ دینے کے لیے کافی تھیں۔ "اللہ حافظ۔" اس نے دروازے کا ہینڈل کھما کر دروازہ کھولتے ہوئے خدا حافظ کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا تھا مگر جس نظر سے اسے دیکھ کر گیا تھا۔

وہ نظر علیزے کو علیزے سے اپنی گانہ کر گئی تھی۔ توڑ کر لے گئی تھی اسے اور اس کے یوں سامنے سے ہٹ جانے پر علیزے کو ایسا لگا تھا جیسے دنیا ہی اندھیر ہو گئی ہو، اور ہر سو تاریکی سی چھا گئی ہو، جس سے گھبرا کے وہ بے ساختہ پکاری تھی۔

"ڈورا نیور!" آواز اتنی مدھم تھی جیسے وہ بریداری ہو۔
"ڈورا نیور!" لیکن اب کی بار اس کی آواز بہت بلند تھی اتنی کہ وہ سب بھی ہڑبکا گئے تھے۔
"ڈورا نیور! رکو۔ میری بات سنو ڈورا نیور۔ پلیز رکو۔" علیزے اسے زور زور سے پکارتی ہوئی یکدم اپنی جگہ سے اٹھی اور بیڈ روم سے باہر کی طرف بھاگی تھی۔

اور اس کا یہ بھاگنا کوئی ایسا ویسا نہیں تھا۔ وہ دیوانہ وار بھاگی تھی۔ اور اندھا دھند بھاگی تھی۔ لیکن تب تک دیر ہو چکی تھی۔

حوالی کے کھلے گیٹ سے دل آور کی گاڑی باہر نکل رہی تھی فاصلہ بڑھ چکا تھا گاڑی کے دروازے اور شیشے بزر تھے اس تک آواز پہنچنا مشکل تھا مگر پھر بھی وہ پکار رہی تھی چیخ رہی تھی اور اس کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔
"ڈورا نیور پلیز! رکو یہاں۔ پلیز ڈورا نیور مجھے یہاں سے لے جاؤ۔ مجھے یہاں نہیں رہنا۔ پلیز ڈورا نیور۔ میرا دم گھٹ جائے گا۔ میں مرجاؤں گی۔ مجھے لے جاؤ۔ پلیز۔"

وہ اس کی گاڑی کو آنکھوں سے او جھل ہونے لگی تھی کر بے ساختہ تھک کے رک گئی تھی اور وہیں کوریڈور کے مین ڈور کے سامنے دو زانو بیٹھتے ہوئے دھاڑیں مار مار کر رو پڑی تھی۔ لیکن آج کوئی بھی اسے چپ کروانے کے لیے نہیں آیا تھا۔

کیونکہ آج سب کے دل رو رہے تھے اور سب کے ضمیر پر ایک اذیت ناک سا بوجھ آپڑا تھا۔ آج کسی کو بھی کسی دوسرے کا احساس نہیں ہو رہا تھا، بلکہ سب کی سماعتیں میں دل آور شاہ کی آواز گونج رہی تھی اور سب کا ہی ڈوب مرنے کو دل چاہ رہا تھا۔ انہیں بار بار دل آور کا خیال آ رہا تھا۔

میں تو اسی واسطے چپ ہوں کہ تماشا نہ بنے
اور تو سمجھتا ہے کہ تجھے تجھ سے گل کچھ بھی نہیں

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شاندار پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ٹھیں :-

- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹخ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، ہارل کوالٹی، کمپریڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریٹخ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

۱۰۰۰ ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک ویکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

نہ چھوڑتھو الفت بڑی لمبی کہانی ہے
میں زمانے سے نہیں باری کسی کی بات مانی ہے
رات خاصی گہری ہو چکی تھی۔ اور وہ بہت دیر سے ٹیرس پہ کرسی ڈالے بیٹھی کرسی کی بیک سے ٹیک لگا رہی تھی۔
آسمان کے بدن پہ چمکتے ستاروں کو دیکھ رہی تھی جو آسمان پہ چاند کی غیر موجودگی کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی نمایاں نظر آ رہے تھے۔ لیکن اس کے باوجود چاند کی کمی اپنی جگہ ہنوز تھی کیونکہ ستارے چاند کی کمی کو دور نہیں کر سکتے تھے۔
جس پہ اس کی آنکھوں میں بھی اداسی رات کی طرح گہری ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن کمرے میں اس کے بیڈ پر بڑے موبائل کی رنگ نے اسے بری طرح چونکا دیا تھا۔

رات کے اس پرفون۔ یہ خیال آتے ہی وہ کرسی کا سارا لے کر اٹھی تھی اور جیسے قدم اٹھتی اندر آئی تھی۔
کیونکہ اب اسے بھی اٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے میں دقت ہوتی تھی اس نے اپنے آپ کو بہت جلدی کور کیا تھا لیکن اب بھی ابھی وہ پوری طرح سے ٹھیک نہیں ہوئی تھی۔ کچھ دقت چاہیے تھا ابھی۔
”نوٹش۔“ وہ انوشہ کا نمبر دیکھ کر حیران ہوئی تھی۔
”ہیلو۔“ اس نے فوراً ”کل ریسیو کی تھی۔“

”کیسی ہیں زری آلی؟“ انوشہ کی آواز بہت سست اور سنجیدہ سی لگ رہی تھی۔
”الحمد للہ! میں ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ سب خیریت ہے نا؟“ اس وقت فون کیوں کیا۔؟“ زری اور عبد اللہ کے تعلقات اپنے بچاؤ اور کزنز سے بہت اچھے تھے۔
کیونکہ وانیال، زین اور انوشہ تینوں ہی انہیں بہت زیادہ چاہتے تھے اور ان سے ملنے کے لیے گھر بھی آئے تھے اسی لیے تب سے آپس میں کانٹیکٹ بھی بڑھ گیا تھا اور بے تکلفی تھی۔

”تیند نہیں آ رہی۔“ انوشہ نے بہانا تراشا۔
”تیند نہ آنے کی وجہ؟ زری تھک گئی تھی بیڈ پر ٹک گئی۔“
”دل اور شامہ!“ انوشہ کے لہجے میں اس کے نام کے ساتھ دکھ جھلکا تھا۔
”دل اور شامہ کیا مطلب؟“ وہ ابھی۔
”وہ آئے تھے یہاں۔“ انوشہ خود ہی جیسے بتانا چاہتی تھی دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی تھی۔

”اوہ اچھا۔! پھر؟“ زری کا لہجہ سیدھم پڑ گیا۔
”وہ آئے اور ہمیں ہماری ہی نظروں میں گرا کر چلے گئے اور علیز۔۔۔ وہ تو اب تک رو رہی ہے۔“ انوشہ روتے روتے کھل رہی تھی اور زری یونہی روتے روتے مزید الجھتی جا رہی تھی کیونکہ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ ”علیز سے رو رہی ہے۔ مگر کیوں۔ کیوں رو رہی ہے وہ؟“ زری نے پھر الجھ کر پوچھا تھا۔

(بائی آؤٹ)

دردِ دل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیحدہ تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیلہ حیات دہی بہن بھائی ہیں مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے وہ انگلینڈ کی رنگینوں میں مکمل طور پر رنگ چکی ہے جس کے پیش نظر فائزہ بیگم نبیلہ کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے جس پر نبیلہ اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پھنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصے سے نوکری کی تلاش میں ہے مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا سبب یہی اور مجبوری سے تنگ آکر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے پاؤ امتیاز مل جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔ منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدی ہے وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل اور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے وہ اپنے قول و فعل کا بہت رکا آدی ہے اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پر بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔



”صرف علیزے ہی نہیں باقی سب بھی رورہے ہیں۔“
الوشہ اک عجیب سے افسوس سے دوچار تھی اور زری کو مزید بے چینی اور خفگی ہونے لگی تھی۔
”پلیز الوشہ! کچھ بتاؤ تو سہی کہ ہوا کیا ہے؟ مجھے پریشانی ہونے لگی ہے سب کیوں رورہے ہیں آخر۔“
بھی اس وقت؟“ زری کو سچ سچ بہت زیادہ پریشانی اور گھبراہٹ ہو رہی تھی اس کا دل طرح طرح کے دہم اور
دوسوں کا شکار ہونے لگا تھا اور اس کی یہ پریشانی اور گھبراہٹ دیکھتے ہوئے ہی الوشہ خود بھی بے ساختہ پھوٹ پھوٹ
کر رونے لگی تھی اور پھر انہی آنسوؤں اور ہچکیوں کے درمیان ہی الوشہ نے اسے الف تائے ساری بات بتا ڈالی
”یہ کیا کہہ رہی ہو الوشہ؟ یہ کیا کہہ رہی ہو۔ میرا دل بند ہو جائے گا؟“ زری کی آواز کانپ رہی تھی۔
”یہ سب سچ ہے زری آلی۔ یہ سب سچ ہے ایک اذیت ناک سچ۔ ہم مر گئے ہیں۔ ہم جیتے جی مر گئے ہیں
۔۔۔ آج کی رات کوئی بھی سو نہیں پائے گا۔ آج کی رات سب کی تڑپتے ہوئے گزرے گی اور آج کی رات سب
عذاب سے دوچار رہیں گے۔ کیونکہ آج ہم لوگوں کا غرور، ہم لوگوں کی انا اور ہم لوگوں کا نام کچھ میں مل گیا ہے
ہم غلیظ ہو گئے ہیں، ہم گناہ گار ہو گئے ہیں آلی۔
ہماری آنسو والی سات نسلیں بھی دل اور شاہ کی گناہ گار رہیں گی۔
ہم ان کے سامنے سر اٹھانے کے بھی قابل نہیں رہے۔“

انہوں نے جو کچھ بھی کیا ٹھیک کیا۔ لیکن اس کے باوجود وہ اتنے مضبوط اور بلند کروا رہے کہ انہوں نے ایک
بار بھی علیزے کے ساتھ کوئی غلط حرکت نہیں کی، حالانکہ ان کی جگہ کوئی اور ہو تا تو اپنا انتقام لینے کے لیے کچھ
بھی کر گزرتا، مگر وہ ایسے نہیں نکلے۔ انہوں نے ایسا نہیں کیا انہوں نے ہماری عزت کو عزت ہی رہنے دیا۔“ الوشہ
رورہ کر ہلکان ہو رہی تھی اور یونہی روتے روتے اس نے فون ہی بند کر دیا تھا۔
”دل اور شاہ! اتنی تم اتنی اذیت لیے پھرتے تھے۔ اتنی اذیت“
زری زیر لب کہتی ہوئی ضبط نہیں کر سکی تھی اور اس کے آنسو بے آواز چال چلتے رخساروں پہ بہہ آئے تھے
اور دل اور شاہ کی ذات کا دکھ اس کے دل کی رگوں کو کاٹنے لگا تھا اور اس کا دل چاہا وہ تنہا شاہ کی تباہ شدہ زندگی پہ
دھاڑیں مار مار کر روئے۔!

دل اور شاہ کے یہ الفاظ اتنے کاٹ دار تھے کہ جودت یکدم اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا اور اپنے کمرے میں شیلنے
لگا تھا۔

”اور ہاں آذر آندھی۔! میری بد کرداری اور بد مندی کے بارے میں کچھ کہنا ہو تو میں اب بھی حاضر ہوں، لیکن
اپنے حق میں بات کرتے ہوئے اتنا ضرور کہوں گا کہ میں وقار آندھی جیسا با کردار، معزز اور عزت دار نہیں ہوں۔
ہاں انتہا بد کردار ضرور ہوں کہ آپ کی بیٹی جیسی میں یہاں سے لے کر گیا تھا ویسی ہی آج یہاں بھڑو کر جا رہا ہوں۔ وہ
جیسی پہلے تھی آج بھی ویسی ہی ہے اور آج یہاں سے جاتے ہوئے آپ سب کے سامنے میں یہ اعتراف کرتا ہوں
کہ مجھے فخر ہے اپنے مہر ہونے پہ کہ میں نے ایک مرد سے نفرت اور دشمنی کا انتقام ایک عورت سے نہیں لیا،
حالانکہ میں چاہتا تو آسانی سے اپنا انتقام لے سکتا تھا۔ مگر مجھے وقار آندھی بننا گوارا نہیں تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ
میرا اللہ اور میرا ضمیر مجھے ملامت کرتے رہیں گے اور مجھے سکون سے جینے نہیں دیں گے۔“
اس کے آخری جملے نے جودت کو اور زیادہ مضطرب کر ڈالا تھا اور پھر وہ اک گہری سانس کھینچتے ہوئے اپنے بیل
روم سے باہر نکل آیا تھا اس کا رخ اپنی گاڑی کی طرف تھا۔

لیکن علیزے کو تو یوں لگ رہا تھا کہ اس کا اس ایک رات میں ہی دم نکل جائے گا، وہ رورہ کر اور تڑپ تڑپ کر
باہر ہو گئی تھی اور کی حال عاتقہ آندھی کا بھی تھا۔ وہ بھی اپنے بیل روم میں بیٹھی ہچکیوں سے رورہی تھی دل اور
شاہ کے منہ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ ان کے دل کو چیر رہا تھا اور وہ درد سے نہ حال ہونے لگی تھیں البتہ ایک آہ
آندھی تھیں جو جہاں کی تھاں پتھری ہو کر رہ گئی تھیں اور جن کے احساسات اور جذبات کرب ناکی کی انتہا پہنچ کر
مفلوج ہو گئے تھے۔

ان کے دل و دماغ پہ بے حسی چھا گئی تھی یوں جیسے ان کے جسم سے جان ہی نکل چکی ہو یا پھر پوری کائنات ختم
ہو چکی ہو اور اب ان کے لیے اس زندگی میں اور اس کائنات میں کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا اور وہ سوچ رہی تھیں کہ
دل اور زری کچھ کما تھا اس مسئلے کو سلجھاتے سلجھاتے وہ خود الجھ جائیں گی۔ اذیت میں آجائیں گی اور رشتوں
کے بھرم ٹوٹ جائیں گے۔ اور واقعی ایسا ہی ہوا تھا اب وہ نہ رو سکتی تھیں اور نہ ہنس سکتی تھیں ہاں البتہ گھٹ
گھٹ کر ضرور سکتی تھیں۔



جودت آندھی اپنے بیل روم میں صوفے پر آڑا تر چھا رہا تھا۔
لیکن اس کے دماغ میں ابھی بھی دل اور شاہ کی آواز گونج رہی تھی۔ اور بار بار گونج رہی تھی۔
عورت قابل احترام ہستی ہے۔
عورت محبت کا پیکر ہے۔

عورت اس دنیا کا زیور ہے۔

عورت مرد کی ہوس پوری کرنے کے لیے نہیں بنی۔

عورت مرد کا قصہ سننے کے لیے نہیں بنی۔

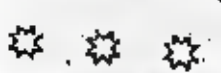
عورت مرد سے مرد کے انتقام کے لیے نہیں بنی۔

اس لیے تمہیں کوئی اجازت نہیں ہے کہ تم وقار آندھی کا انتقام علیزے آندھی سے لو اور اس کی سزا سے دو
جودت ہاتھوں کی مٹھیاں اور لب تشچے دل اور شاہ کی سچی اور کھری آواز کے حصار میں جکڑا ہوا تھا۔ انہوں نے
زندگی میں ایک بار پھر مجھے حیران کر ڈالا یہ کہتے ہوئے کہ ٹھیک ہے تم ہی اسے لے کر آئے ہو، تمہاری وجہ سے وہ
بدنام ہوئی ہے تو تم ہی اسے اپنا نام دے دو نکاح کر لو اس سے۔
تم مرد ہوو عورت ہے اور عورت ہمیشہ اپنی عزت کی خاطر مرد کا ہی سہارا لیتی ہے۔

مرد سے ہی نام مانگتی ہے، جو نام نہیں دیتے وہ نام مرد ہوتے ہیں، بے غیرت ہوتے ہیں، عورت کی عزت کو عزت
نہیں دے سکتے۔

دل اور شاہ کے یہ الفاظ اتنے کاٹ دار تھے کہ جودت یکدم اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا اور اپنے کمرے میں شیلنے
لگا تھا۔

”اور ہاں آذر آندھی۔! میری بد کرداری اور بد مندی کے بارے میں کچھ کہنا ہو تو میں اب بھی حاضر ہوں، لیکن
اپنے حق میں بات کرتے ہوئے اتنا ضرور کہوں گا کہ میں وقار آندھی جیسا با کردار، معزز اور عزت دار نہیں ہوں۔
ہاں انتہا بد کردار ضرور ہوں کہ آپ کی بیٹی جیسی میں یہاں سے لے کر گیا تھا ویسی ہی آج یہاں بھڑو کر جا رہا ہوں۔ وہ
جیسی پہلے تھی آج بھی ویسی ہی ہے اور آج یہاں سے جاتے ہوئے آپ سب کے سامنے میں یہ اعتراف کرتا ہوں
کہ مجھے فخر ہے اپنے مہر ہونے پہ کہ میں نے ایک مرد سے نفرت اور دشمنی کا انتقام ایک عورت سے نہیں لیا،
حالانکہ میں چاہتا تو آسانی سے اپنا انتقام لے سکتا تھا۔ مگر مجھے وقار آندھی بننا گوارا نہیں تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ
میرا اللہ اور میرا ضمیر مجھے ملامت کرتے رہیں گے اور مجھے سکون سے جینے نہیں دیں گے۔“
اس کے آخری جملے نے جودت کو اور زیادہ مضطرب کر ڈالا تھا اور پھر وہ اک گہری سانس کھینچتے ہوئے اپنے بیل
روم سے باہر نکل آیا تھا اس کا رخ اپنی گاڑی کی طرف تھا۔



اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور اس کے منہ پہ شپ لگا ہوا تھا۔

وہ جب سے ہوش میں آئی تھی بے بسی سے پھر پھرتے ہوئے بار بار اپنے ہاتھ پاؤں کھولنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اس کے ہاتھ اس کے پاؤں اور اس کا منہ اتنی سختی سے بندھے ہوئے تھے کہ وہ اپنی جگہ سے ایک انچ کے لیے بھی آنے یا پیچھے نہیں ہٹ سکی تھی اور اسی بے بسی کی حالت میں ہی اس کی پوری رات گزر گئی تھی۔ اور اس گزرنے والی رات کا احساس اسے سامنے ہی دیوار پہ لگے والے کلاک اور گلاس ونڈو سے ذرا سے سر کے ہونے پر دے سے ہوتا رہا تھا جو رات کی سیاہ تاریکی کے بعد اب ملگجی سی روشنی میں بدل رہا تھا۔

اور مریم کے آنسو بے اختیار اس کے رخساروں پہ بہہ آئے تھے کیونکہ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ یہ سیاہ رات اس کی قسمت کے دن پہ حاوی ہو گئی ہے اور پورا دن تاریک پڑ گیا ہے اب کچھ بھی ہو جائے وہ یہ سیاہی کبھی مرے بھی نہیں مٹا سکتی۔ اور اسی سیاہی کے غم نے اسے رلا دیا تھا۔ کیونکہ اسے پتا تھا کہ یہ سیاہی عدیل کو امی کو باجی کو اور اس کی معصوم بہنوں کو نکل لے گی جیتے جی مار دے گی اور وہ لوگ کسی کو منہ دکھانے کے بھی قابل نہیں رہیں گے۔

ابھی وہ اس غم کا اس دکھ کا ماتم منا رہی تھی کہ اچانک ہی اسے دروازے کا لاک کھلنے کی آواز سنائی دی تھی اور اس نے تڑپ کر دروازے کی سمت دیکھا تھا لاک کھلنے کے بعد چند سیکنڈز کے وقفے سے دروازہ بھی کھل گیا تھا لیکن انتہائی آہستگی کے ساتھ۔

حسب توقع جو دت آندی کی ہی صورت نظر آئی تھی جس کو دیکھتے ہی مریم کے جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ مچ گئی تھی اور آنسو بے اختیار بہہ نکلے تھے بلکہ ان آنسوؤں میں روانی آگئی تھی کیونکہ اسے موت کا فرشتہ اپنے قریب سے بھی قریب تر ہوتا نظر آ رہا تھا اور یقین ہو چلا تھا کہ وہ ابھی کے ابھی مر جائے گی۔

جبکہ دوسری طرف وہ تھا جو دت آندی خاموش شرمندہ اور ندامت کا بوجھ کندھوں پہ اٹھائے سر جھکائے ہوئے۔

آہستہ قدموں سے چلتا ہوا اندر داخل ہوا اور بہت ہی بوجھل سے انداز میں آکر بیڈ پہ بیٹھ گیا تھا۔

مریم اس کے بیڈ پہ بیٹھنے سے پھر پھرتی تھی تڑپتی تھی اور اس کی اس مرغ بل کی سی تڑپ یہ جو دت نے گردن موڑ کر اس کی بہت دیکھا تھا اس کی آنسوؤں سے بھیگی متورم آنکھیں وحشتوں کے عذاب سے بھر گئی تھیں اور جو دت کے دل پہ اک اور ملامت کا داغ لگا تھا اک اور طمانچہ پڑا تھا اس کے ضمیر کے منہ پہ۔ اور اس نے آہستگی سے ہاتھ بڑھا کر اس کے منہ پہ لگا شپ کھول دیا تھا اور پھر بونہی آہستہ آہستہ اس کے ہاتھ اور پاؤں بھی کھول دیے تھے جن کے کھلتے ہی مریم یکدم اٹھ بیٹھی تھی اور اپنے اعصاب ٹھکانے پہ آتے ہی ذرا سا توقف لینے کے بعد اوہرا اوہر دیکھتے ہوئے یکدم اک جھٹکے سے اٹھ کر وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی تھی لیکن بھاگ نہیں سکی تھی کیونکہ جو دت نے اس کی کلائی پکڑتے ہوئے اس کی ساری پھرتی ختم کر ڈالی تھی اور وہ ایک ہی جگہ پہ ساکت سی ہو گئی تھی کیونکہ اسے جو دت کے انداز سے اور اس کے ہاتھ کی گرفت سے کچھ اور ہی محسوس ہوا تھا۔

وہ ویسا نظر نہیں آ رہا تھا جیسا کل تھا۔

”بیٹھ جاؤ۔ بات کرنا چاہتا ہوں تم سے۔“ لہجہ دونوں کا تھا نجانے کیوں پہلی بار میں ہی اثر کر گیا تھا اور مریم چند سیکنڈ کے وقفے سے بالا خربٹھ ہی گئی تھی اور جو دت نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔

”اپنے گھر جانا چاہتی ہو۔“ جو دت کا سوال اسے مذاق لگا تھا اس نے گردن موڑ کر اسے بہت ہی عجیب سی نظروں سے دیکھا مگر وہ سر جھکائے بیٹھا تھا جس سے لگ رہا تھا کہ وہ مذاق نہیں کر رہا۔

”لیکن تمہاری زندگی کی ایک رات گھر سے باہر گزر چکی ہے۔“ اس نے ذرا توقف سے کہا تھا۔

”اس ایک رات میں تمہارا بہت کچھ کھو گیا لیکن مجھے بہت کچھ حاصل ہو گیا ہے۔“ جو دت کے لہجے میں بے حد ٹھہراؤ تھا۔

”مجھے عبرت حاصل ہوئی ہے۔“ اس کی اگلی بات بھی عجیب تھی اور مریم اس کی عجیب سی باتوں پہ ابھی بھی اسے ہی دیکھ رہی تھی مگر چپ چاپ۔

اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور ایک گہری سانس خارج کی تھی۔

”مجھے معاف کرو مریم! میں نے تمہیں اور تمہاری پاکیزگی کو سب کی نظروں میں مشکوک اور بے یقین کر دیا ہے میں نے تم سے تمہاری ذات کا غور چھین لیا ہے۔ پلیز مجھے معاف کرو۔“ میں بہت اذیت میں ہوں بہت بچھتا رہا ہوں۔“ جو دت کے اندر کا کرب اس کے لہجے میں اتر آیا تھا اور وہ چند قدم کھڑکی کی سمت بڑھانے کے بعد دوبارہ مریم کی سمت پلٹ آیا تھا اور بے ساختہ اس کے سامنے قالین پہ ہی دوڑا نو بیٹھ گیا تھا۔

”لیکن تم غم نہ کرو اپنی اس غلطی کا مداوا بھی میں ہی کروں گا، تمہیں تنہا نہیں چھوڑوں گا، تمہارا ساتھ دوں گا، عزت دوں گا، تمہیں مقام دوں گا، محبت دوں گا اور وہ سب کچھ دوں گا جس کی تم خواہش کرو گی۔ بدل دوں گا اپنے آپ کو۔ صرف اور صرف تمہاری خاطر۔ تمہارا بن کے جیوں گا، جب تک جیوں گا۔“ جو دت نے اس کے گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ دیے تھے اور مریم بے ساختہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔

”اب کہہ رہے ہو یہ سب۔ اب کیا فائدہ ہے۔“ وہ ہچکچوں سے روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”پہلے نہیں کہہ سکتا تھا، پہلے مجھ پہ میرے اندر کا شیطان حاوی تھا، لیکن اب مجھ پہ میرے اندر کا انسان حاوی ہے، اب میں وہ سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں جو تمہاری بہتری کے لیے ہو، کیونکہ گزشتہ ایک رات نے ہی ہمیں پوری زندگی کے لیے سبق سکھا دیا ہے اپنی اوقات دکھا دی ہے ہمیں اور اپنے گریبان میں جھانکنے پہ مجبور کر دیا ہے۔“ وہ بڑی سختی سے کہہ رہا تھا۔

”مگر اب مجھے کیا حاصل۔“ وہ تڑپتی تھی۔

”ہتانوں کا تم بس ایک بار مجھے معاف کرو۔“ جو دت نے التجائیہ سے لہجے میں کہا تھا اور مریم نے بڑے زخمی سے انداز میں اپنے سامنے دوڑا نو بیٹھے معافی کے اس طلب گار کو دیکھا تھا جس کی غلطی کو گزرنے چوبیس گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے لیکن اس کی چوبیس سالہ زندگی پہ داغ چھوڑ گئی تھی اور مریم نے نفرت سے اس کی طرف سے رخ موڑ لیا تھا جبکہ جو دت نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑ دیے تھے۔

”پلیز مریم۔ ایک بار پھر ایک بار۔ مجھے معاف کر کے تو دیکھو۔“ وہ ابھی بھی ہاتھی تھا اور وہ ایک بار پھر کچھ بھی کہنے کی بجائے رو پڑی تھی اور جو دت نے نیچے قالین پہ گرا اس کا دوپٹا اٹھا کر اس کے سر پہ ڈال دیا تھا جس پہ وہ روتے روتے دم بخود سی ہو گئی تھی۔

عدیل ابھی سو کر اٹھا ہی تھا کہ اس کا موبائل بجنا شروع ہو گیا تھا اس نے شرٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے بیڈ کے قریب آکر موبائل اٹھا لیا تھا، نمبر لاہور کا تھا رات کو بھی اس کے نمبر پہ چند مسئلہ کالز تھیں لیکن اسے پتا نہیں تھا کہ کس کی ہیں۔

”ہیلو۔“

”عدیل! کہاں ہو۔ کہاں چلے گئے ہو۔؟ گھر آ جاؤ۔ میرے بچے گھر آ جاؤ۔“ عابدہ خاتون اس کی آواز سننے ہی بے اختیار شروع ہو گئی تھیں اور ساتھ ہی ان کے رونے کی بھی آواز سنائی دینے لگی تھی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

مجموعہ خاص کیوں ٹھیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ مابانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ پیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیگر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

”امی! کیا ہوا ہے اباجی ٹھیک تو ہیں نا۔“ عدیل کا پسلا خیال فاروق نیازی کی طرف ہی گیا تھا۔

”فہم! ٹھیک ہیں بیٹا، لیکن مریم۔“ وہ بات مکمل نہیں کر سکی تھیں۔

”مریم۔ کیا ہوا ہے مریم کو۔“ عدیل کے دل پہ ہاتھ دڑا تھا۔

”فہم!۔۔۔ کل سے گھر نہیں آئی میں اس کا انتظار کرتے کرتے تھک گئی ہوں بنام گھر آجاؤ۔“ عابدہ خاتون نے عدیل کے سر پہ ہاتھ ڈالے تھے اور موبائل فون اس کے ہاتھ میں لرز کے رہ گیا، بلکہ وہ مضبوط قدموں پہ کھڑا لوکھڑا گیا تھا اور بے اختیار بیڈ پہ بیٹھ گیا۔

”آپ۔۔۔ یہ۔۔۔ لگ گیا کہہ رہی ہیں مریم کل سے گھر؟“ وہ جملہ مکمل نہیں کر پایا تھا۔

”ہم زیادہ ہو گئے ہیں بیٹا۔ ہم کل سے برباد ہو گئے ہیں۔“ عابدہ خاتون نے کہتے ہوئے فون بند کر دیا تھا۔

”عدیل اس طرح کیوں بیٹھے ہو؟ خیریت۔“؟ نیل دروازے پہ دستک دے کر خود ہی اندر چلا آیا تھا کیونکہ ان دونوں نے ابھی کچھ دیر پہلے ہی اکٹھے ناشتا کرنے کا پروگرام بنایا تھا اور ابھی وہ اسی غرض سے اسے بلائے کے لیے آیا تھا مگر اس کے چہرے پہ اڑتی ہوائیاں دیکھ کر نیل بھی متحیر ہو گیا تھا۔

”عدیل۔! میں تم سے مخاطب ہوں اس طرح کیوں بیٹھے ہو؟ کیا ہوا ہے۔ کس کا فون تھا۔“ نیل اس کے ہاتھ میں گئے موبائل کو دیکھ چکا تھا اور اس کا کندھا لگا کر اسے مخاطب کرنے کی کوشش کی تھی۔

”امی کا۔! عدیل کی آواز اتنی بدھم ہو چکی تھی کہ جیسے کسی گھر پاتال میں سے سنائی دے رہی ہو۔

”کیا کہہ رہی تھیں۔؟“ نیل کو مزید پریشانی ہوئی تھی۔

”میری سسٹر مریم۔ کل اکیڈمی گئی تھی۔ اور کل سے ابھی تک واپس نہیں آئی۔“ عدیل کسی روپوشی طرح بتا رہا تھا۔

”کیا۔“ نیل کو یکدم اتنی بڑی بات سن کر جھٹکا سا لگا تھا۔

”ہاں۔! کل میں ہی اسے اکیڈمی ڈراپ کر کے آیا تھا۔“

”اوہائی گاؤ۔! یہ کیا ہو گیا؟“ نیل نے تو جیسے سر ہلایا تھا۔

”ہمارے پاس عزت کے سوا اور کچھ نہیں تھا نیل صاحب۔ اور اور۔۔۔ آج وہ عزت بھی۔“

”بلیز عدیل! اننگینو مت سوچو اور جلدی اٹھو، ہمیں ابھی واپس چلنا ہے۔“ نیل اس کا کندھا تھپک کر بولا۔

”اب۔۔۔ اب کیا ہو سکتا ہے؟“

”اب بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے، پہلے تمہارے گھر پہنچے ہی ساری تفصیل معلوم کرتے ہیں، مگر حل نہ نکلا تو رپورٹ درج کروادیں گے، باقی کام دل اور سنبھال لے گا۔“ نیل سارے کام کا پلان ترتیب دیتے ہوئے غلٹ سے پلٹ گیا۔

”اور ہاں تم جلدی سے اپنا سامان پیک کر لو، میں مل کلیر کرتا ہوں۔“ وہ جاتے جاتے اسے ہدایت بھی کر گیا تھا

وہ اپنے آفس میں بیٹھا اپنے کسی کیس کی فائل میں الجھا ہوا تھا۔ جب اس کا فنی دروازے پہ دستک دے کر ذرا سا اندر کی طرف نمودار ہوا تھا۔ ”سر۔! کوئی لڑکا اور لڑکی آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔“

”لڑکی اور لڑکی۔؟“ دل اور کو حیرت ہوئی۔

”جی ہاں۔! کہتے ہیں کہ آپ کے جاننے والوں میں سے ہیں۔“

”او کے اچھے۔“ اس نے اجازت دیتے ہوئے اپنی ناکل سمیٹنی شروع کر دی تھی۔
 ”السلام علیکم۔“ دو اڑے پہ دستک کے بعد جودت کی آواز ابھری تھی اور دل اور ناکل سمیٹتے سمیٹتے رک گیا تھا کیونکہ وہ جودت کو دیکھ کر بری طرح چونکا تھا۔

”کیا ہم اندر آ سکتے ہیں۔۔۔؟“ اس نے اجازت طلب کی اور دل اور ٹھیک کر متوجہ ہوا تھا۔
 ”ہوں۔۔۔ اہم ان۔“ اس نے آہستگی سے کہتے ہوئے اجازت دی تھی اور اس کی طرف سے اجازت ملنے ہی جودت مریم کو ساتھ لیے اندر آ گیا تھا۔

”بیٹھو۔۔۔“ دل اور نے کرسیوں کی سمت اشارہ کیا تھا۔
 ”تھنک یو۔۔۔“ جودت مرے مرے لہجے میں کتا کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی مریم بھی بیٹھ گئی تھی۔ دل اور نے بے شک اسے صرف ایک بار ہی دیکھا تھا لیکن اس کا حافظہ کمزور نہیں تھا جی تو وہ اسے دیکھتے ہی پہچان گیا تھا کہ وہ عدیل عمر کی بہن ہے۔

”دل اور بھائی! وہ دراصل مجھے آپ کی اہلب کی ضرورت ہے۔“ جودت نے اب اس کے سامنے تمہید باندھنے کی کوشش کی تھی۔
 ”مرکہ کر مخاطب کرو گے تو زیادہ بہتر ہو گا۔“ اس نے بہت سخت لہجے میں اسے تنبیہ کی تھی۔

”لیکن میں آپ کو علیزے کے حوالے سے۔۔۔“
 ”علیزے کا اور میرا خوالہ آج ختم ہو جائے گا اس لیے مناسب یہی ہے کہ کسی بھی حوالے کے بغیر بات کی جائے اور یہ بتایا جائے کہ تم یہاں کیوں آئے ہو؟ اور کسی پیلپ کے لیے آئے ہو۔“

دل اور نے اس کی بات کاٹتے ہوئے بات ہی ختم کر دی تھی اور جودت اس کا اتنا دھوکا انداز دیکھ کر چپ رہا ہو گیا تھا۔
 ”میں انتظار کر رہا ہوں تمہاری بات کا۔۔۔ مجھے کچھ اور بھی کام بنانا ہے۔“ اس نے اسے بولنے سے اکسایا۔

”نہ۔۔۔ وہ دراصل مجھ سے ایک غلطی ہو گئی ہے۔“ جودت نے بمشکل بات کرنے کی ہمت مجتمع کی تھی۔
 ”یہ کوئی نئی بات تو نہیں ہے۔۔۔؟“ دل اور استہزاء سے بولا تھا۔

”نئی بات ہے۔۔۔ اور وہ یہ ہے کہ اپنی غلطی کا احساس پہلی بار ہوا ہے اور وہ بھی آپ کی وجہ سے۔۔۔“ جودت نے اب بات کہنا شروع ہو چکا تھا اور دل اور نے اس کی ساری بات پورے دھیان سے سنی تھی۔ اور ایک گہری سانس لے کر اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ”اس نکاح کے بعد تمہارے گھر والوں کا کیاری ایکشن ہو گا۔“

جانتے ہوتا؟“ جی جانتا ہوں۔۔۔“
 ”پھر بھی یہ نکاح کرنا چاہتے ہو۔۔۔؟“

”جی ہاں۔۔۔ پھر بھی یہ نکاح کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ میں دل اور شاہ کے نقش قدم پر چلنا چاہتا ہوں و قار آئندہ کے نقش قدم پر نہیں۔“ جودت کا لہجہ مضبوط تھا۔
 ”کیا اس لڑکی کے گھر والوں کو فیس کرو گے؟“ دل اور اس سے ہر طرح کی یقین دہانی چاہتا تھا۔

”میں ہر چیز کو فیس کرنے کا سوچ کر ہی آپ کے پاس آیا ہوں ورنہ آسان طریقہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ میں اسے چپ چاپ اس کے گھر چھوڑ کر واپس آجاتا لیکن نہیں۔ میں اسے دفنانے دے سکتا ہرگز نہیں۔“ اس نے نفی میں گردن ہلائی تھی اور اپنی غلطی کے بعد تلافی کے لیے ڈٹ جانے والے جودت کو دیکھ کر دل اور کو یقین آ گیا تھا کہ وہ اس کے لیے اسٹینڈ لے سکتا ہے۔

اسی لیے اس نے اس کا کین او کے کر دیا تھا اور اگلے چند ہی منٹوں بعد ان کے نکاح کی رسم ادا ہو گئی تھی اور دل اور نے عدیل کو فون کر کے اپنے پاس اپنے آفس میں آنے کا کہا تھا وہ اب نیپل کے ساتھ سیدھا اس کے آفس میں آ رہا تھا اور ایسی ہی ایک کال آذر آئندہ کی کو بھی کی تھی۔

☆ ☆ ☆
 ”علیزے پلزیار۔ بس کرو یہ رونا دھونا۔ دل اور بھائی اتنے اچھے ہیں کہ وہ کچھ بھی نہیں کریں گے۔ وہ نہیں اس طرح نہیں چھوڑ سکتے۔“ کومل نے بیڈ پہ بیٹھی گھٹنوں میں منہ چھپائے رات سے بھوکی پیاسی اور مسلسل روتی علیزے کے پاس بیڈ پہ بیٹھے ہوئے اس کے بالوں کو سلا کر اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

”وہ اچھا ہے بہت اچھا ہے۔ حد سے زیادہ اچھا ہے اس کی اچھائی کو مجھ سے بہتر کوئی بھی نہیں جانتا مگر اب میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اب اس کی اچھائی کی حد ختم ہو چکی ہے اب وہ نہیں رہا وہ رات کو یہاں سے جاتے ہوئے کس حال میں گیا ہے یہ میں جانتی ہوں۔ میں۔۔۔ صرف میں۔“ علیزے روتے ہوئے اور کہتے ہوئے یکدم بہت بڑی تھی۔

”تو پھر۔۔۔ اب کیا ہو سکتا ہے علیزے؟“ یہ سارا معاملہ جان لینے کے بعد کومل کا دل بھی نرم ہو چکا تھا اس کے لیے۔
 ”اب یہی ہو سکتا ہے کہ مجھے اس کے پاس جانا ہے مجھے اس کے گھر میں رہنا ہے اور صرف اس کی ہو کر رہنا ہے۔“ علیزے نے اپنا فیصلہ سنایا تھا۔

”لیکن علیزے! کومل نے کچھ کہنا چاہا۔۔۔“
 ”لیکن دیکھ کچھ نہیں۔ مجھے اس کے پاس جانے میں کوئی شرمندگی نہیں ہے کیونکہ میں اس کی بیوی ہوں۔“

مزدل اور شاہ میں خود اسے چھوڑ کر آئی تھی تو اب مجھے خود ہی اس کے پاس جانا بھی ہے۔“ علیزے نے اپنی بات زور دے کر کہا تھا۔
 ”کیا محبت کرتی ہو ان سے؟“ یہ سوال ایک اہم سوال تھا اور علیزے کے آنسو پھر سے رواں ہو گئے تھے۔ مگر وہ کچھ کہہ نہیں سکی تھی۔

”بولانا علیزے! کیا محبت کرتی ہو ان سے؟“ کومل نے سوال دہرایا تھا۔
 ”نہ۔۔۔ وہ ہے ہی محبت کے قابل۔ لیکن افسوس کہ میری اب اتنی بھی اوقات نہیں ہے کہ اس سے محبت کر سکوں۔ کیونکہ وہ سچ کہتا ہے محبت بڑی حویلی والوں کے بس کی اور سمجھ کی چیز نہیں ہے۔ میرے بس کی بھی نہیں ہے۔“ علیزے کہتے ہوئے سسکا اٹھی تھی۔

”لیکن علیزے! بغیر محبت کے تو یہ فاصلے نہیں مٹ سکتے۔“ کومل اسے سمجھا رہی تھی۔
 ”میں جانتی ہوں۔ اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اب مجھے ہر کام محبت سے ہی کرنا ہے۔ محبت سے عقیدت سے اور عزت سے۔ اب وہ ہے تو سب کچھ ہے۔ وہ نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے۔ علیزے بھی نہیں۔“

علیزے نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا تھا اور کومل کو اس کا فیصلہ سن کر خوشی ہوئی تھی۔
 ☆ ☆ ☆

چنانچہ۔۔۔
 آذر نے ساری صورت حال دیکھنے اور سننے کے بعد ایک انتہائی زوردار تھپڑ جودت کے منہ پر رسید کر دیا تھا اور چپ چاپ سر جھکا کر اس کا یہ تھپڑ سہیا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ اس تھپڑ سے زیادہ کا حق دار ہے۔

”تم نے بھی وہی کیا جو آج سے کئی سال پہلے بھی ہو چکا ہے۔ تم نے بھی آخر یہ ثابت کر دیا کہ تمہارے اندر بھی وہی جراثیم ہیں ڈالالت والے، خباثت والے اور بے غیری والے۔“

آز کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ جو رت کو کھڑے کھڑے گولی مار دے یا پھر اسے مار مار کر فنا کر ڈالے۔ لیکن کیا کرتا ہو گا تھا، بے بس تھا، کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ وہاں وہ اکیلا نہیں تھا۔ وہاں دل اور شاہ بھی تھا جس کے سامنے وہ سر نہیں اٹھا سکتا تھا وہاں عدیل عمر نیا ہی بھی تھا جو خود بھی سر جھکائے ہوئے بیٹھا تھا جس کے وہ لوگ گناہ گار تھے وہاں نیل حیات بھی تھا وہاں مریم بھی تھی اور آذر اتنے لوگوں کے سامنے کیا کر سکتا تھا بھلا۔

”بھائی آپ لوگ جانتے ہیں میں رات بھر آپ لوگوں کے ساتھ ہی گھر پہ رہا ہوں میں نے اور کوئی بھی غلط حرکت نہیں کی۔“

”غلط حرکت جو تم کر چکے ہو کیا وہ کم ہے؟“ آذر بے لہجے میں دانت پیس کر بولا تھا۔

”لیکن میں اپنی اس غلط حرکت کا ازالہ بھی تو کر رہا ہوں نا۔“ جو رت پھر بھی جھجکا نہیں تھا۔

”یہ ازالہ نہیں ہے ازالہ میں کروں گا۔“ آذر نے جیسے فیصلہ کر لیا تھا اور کہتے ہوئے عدیل کی سمت پلٹا تھا۔

”عدیل صاحب! میں بہت شرمندہ ہوں آپ سے۔ میں جانتا ہوں کہ ایک عزت دار اور شریف گھرانے میں عزت کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔ اور میں اس وقت آپ کی اسی عزت کی اہمیت کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کر رہا ہوں کہ ہم یہ نکاح خاموشی کی چادر میں چھپا کر نہیں رکھیں گے بلکہ سب کے سامنے آپ کی عزت کو اپنی عزت بنا کر اپنے گھر لے کر جائیں گے اور اسے بھی وہی مقام دیں گے جو ہمارے گھر میں باقی بیویوں کا ہو گا۔ اگر اس میں ذرا سا بھی فرق آیا تو آپ میرا گریبان پکڑ سکتے ہیں۔“

آپ کی بہن کو میں اپنی بہن سمجھ کر اپنی ذمہ داری پہ اپنے گھر لے کر جاؤں گا اور بہت دھوم دھام سے لے کر جاؤں گا۔ آپ بس ایک مہینے کا یا پھر چند دنوں کا وقت دے دیں ان شاء اللہ یہ شادی اب ہماری شادیوں کے ساتھ ہی ہو جائے گی۔“

آذر نے عدیل کے قریب آتے ہوئے معذرت کرنے کے ساتھ ساتھ اسے اپنی طرف بے مریم کے تحفظ کا پورا پورا یقین دلایا تھا جبکہ عدیل سرخ۔ چہرے لیے ضبط کے کڑے مراحل سے گزر رہا تھا یہ آفس اگر دل اور شاہ کا نہ ہو تا تو یقیناً ”جو رت“ آندھی کو کب کا لوہا مان کر چکا ہوتا، لیکن مسئلہ یہ تھا کہ دل اور شاہ کا لحاظ آڑے آگیا تھا کیونکہ یہ معاملہ وہ ہینڈل کر رہا تھا۔

”عدیل! نیل نے آگے بڑھ کے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا تھا اور کندھے پہ ہلکا سا باؤ ڈالتے ہوئے اسے کسی نرم قبیلے پہ اکسانے کی کوشش کی تھی۔

”دیکھیں ہم سے جو غلطی ہو چکی ہے میں اس کے لیے آپ کے سامنے ہاتھ جوڑ رہا ہوں، ہمیں معاف کر دیں۔ آپ یہی سمجھیں کہ آپ نے اپنی سسر کا رشتہ طے کر دیا ہے اور چند دن بعد اس کی شادی ہے ہم شادی کے وقت بھی آپ لوگوں پہ کوئی بوجھ نہیں ڈالیں گے، آپ کو کسی بھی چیز کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“

آذر نے سچے عدیل کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔

عدیل ایک جھٹکے سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا تھا جبکہ باقی کا معاملہ نیل نے خود ہینڈل کر لیا تھا۔

”ٹھیک ہے! آپ جب چاہو بارات لے کر آجانا۔ مریم اب آپ لوگوں کی ہی امانت ہے۔“

آذر کے لیے نیل کی طرف سے اتنی تسلی ہی کافی تھی پھر وہ مریم کے سر پہ ہاتھ رکھ کر خود بھی باہر نکل گیا تھا اور نیل دل اور کے ساتھ مریم کو۔ لیے اپنی گاڑی میں آگیا تھا جہاں عدیل بھی موجود تھا۔



”کیا بات ہے آپ لوگ اتنے پریشان کیوں ہیں؟“

جو رت کے پیچھے پیچھے آذر بھی جھٹکے جھٹکے سے قدم اٹھا تا گھر میں داخل ہوا تھا لیکن کوئل حرمت اور انوشہ وغیرہ کی پریشان دیکھ کر وہ نہ چاہتے ہوئے بھی رک گیا تھا۔

”نفسہ وہ علیزے۔ صبح سے بلکہ رات سے مسلسل رورہی ہے۔ اس نے کچھ کھایا یا پیا بھی نہیں۔ بھوکی ہے رات سے۔“ کوئل کے اشارے پہ حرمت نے ہی بات کہنا شروع کی تھی۔

”کیوں رو کیوں رہی ہے؟“ آذر نے بے ساختہ ہی پوچھ لیا تھا۔

”میں نے گھر جانا چاہتی ہے۔ دل اور بھائی کے پاس۔ کیونکہ اسے ڈر ہے کہ دل اور بھائی اسے طلاق نہ دے دیں وہ رات کہہ کر گئے تھے۔“ حرمت نے جلدی جلدی وجہ بھی بتادی تھی۔

”نہیں۔ وہ ایسا نہیں کرے گا۔ وہ بہت سمجھ دار آدمی ہے۔“ آذر کو دل اور پر یقین پختہ ہو چکا تھا۔

”وہ ایسا ہی کریں گے میں ان کی زبانی سن چکا ہوں وہ کہہ رہے تھے کہ میرا اور علیزے کا حوالہ۔ آج تک ہی ہے آج یہ حوالہ ختم ہو جائے گا یعنی آج وہ یہ رشتہ ختم کر دیں گے۔“

جو رت بھی آگے بڑھتے بڑھتے ان کی یہ بات سن کر رک گیا تھا اور جو رت کی یہ بات سن کر آذر کے ساتھ ساتھ وہ سب بھی ٹھٹک گئی تھیں۔

”کیا وہ ٹھٹک ہی تو کہہ رہی ہے بے چاری؟“ اب کی بار کوئل بھی بول پڑی تھی اور اس نے علیزے کی حمایت کی تھی۔

اور آذر چند سیکنڈ زوہیں کھڑے کھڑے کچھ سوچنے کے بعد ان لوگوں کو وہیں چھوڑ کر میز پر چڑھ گیا تھا۔



”علیزے۔!“

آذر دروازے پہ دستک دے کر اندر آگیا تھا اور علیزے اس کی آواز سننے کے باوجود بھی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوئی تھی گھٹنوں میں منہ چھپائے جوں کی توں بیٹھی رہی۔

”آؤ۔ میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آتا ہوں۔“ آذر نے اس کے قریب آکر اس کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔

علیزے کو یکدم کرنٹ چھو گیا تھا وہ مارے بے یقینی کے فوراً اک جھٹکے سے سیدھی ہو بیٹھی تھی۔

”آہ۔ آپ سچ کہہ رہے ہیں آپ مجھے چھوڑ آئیں گے کیا؟“

”ہاں سچ کہہ رہا ہوں۔ تم انھوں میں گاڑی نکالتا ہوں۔ یہ کام جتنی جلدی ہو جائے اتنا ہی بہتر ہو گا۔ ورنہ یہ نہ ہو کہ ہمیں ایک بار پھر پھرتا پڑ جائے۔“

آذر کل رات والی کہانی اور آج کے دن والی حقیقت سے بری طرح بدظن اور بدگمان ہو چکا تھا اور اب تو اس بات پہ اور بھی زیادہ یقین کامل ہو چکا تھا کہ زندگی میں کہیں بھی کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے وہ علیزے سے کہتا ہوا باہر نکل گیا تھا اور علیزے یوں بے نالی سے اٹھی تھی جیسے کسی نے اسے جنت میں داخل ہونے کی نوید سنائی ہو۔

وہ تیزی سے اپنے آنسو پونچھتی پھل پھل کر دوڑا دوڑھ کر اس کے پیچھے ہی باہر آئی تھی۔ لیکن میز پر اتر کر نیچے آئی تھی کہ وقار آندھی کے بیڑ روم کے سامنے اس کے قدم ٹھٹک کر رک گئے تھے کیونکہ آہ آندھی بیڈ روم سے باہر نکل رہی تھیں اس ایک رات میں ہی ان کی حالت ایسی ہو گئی تھی کہ جیسے وہ ضدیوں کی مریض

ہوں۔
”اللہ حافظ ماما میرے لیے دعا کیجیے گا۔“ علیزے کی آواز بھرا گئی تھی۔

”اللہ حافظ! جاؤ اپنے گھر میں آباد رہو اللہ تمہیں خوشیاں نصیب کرے، لیکن اب اتنا یاد رکھنا کہ اس شخص کو زندگی میں کسی بھی موقع پر دعائے دُعا دینا اور نہ کہیں کی بھی نہیں رہو گی، کیونکہ آج تو شاید وہ تمہیں قبول کرے گا مگر بار بار ایسا نہیں کرے گا آخر وہ بھی ایک انسان ہے۔“

آسیہ آندری نے بڑے دو ٹوک سے انداز میں اسے سمجھایا تھا اور اسے رخصت کر دیا تھا۔ اور علیزے اپنے آنسو روپے سے پونچھتی ہوئی خلی ہاتھ میکے سے نکل آئی تھی اب اس کی منزل وہ تھی جہاں اس کا ”ڈورا نیور“ تھا۔

”وہ بہت اچھا ہے بھابھی! بہت اچھا ہے۔ بہت اعلیٰ ظرف ہے۔ بلند کردار ہے۔ اتنا کہ مجھے خود پر فخر ہونے لگا ہے کہ مجھے اس سے محبت ہے۔ یہ دل اس کے دم پہ دھڑکتا ہے۔ میں نے جی رہی ہوں تو صرف اس کی خاطر۔ صرف اس کے لیے یہ زندگی صرف اسی کی امانت ہے۔ وہ نہیں ملا تو کیا ہوا۔ اس سے محبت کا احساس تو ہے۔“

آخر وہ بھی تو اپنے دل میں اتنے دکھ اتنی اذیتیں لیے جی رہا ہے۔

آخر تول آئی نے بھی تو کاتوں بھری یہ زندگی بسر کی ہے۔

تو پھر میں کیوں نہیں؟ میں کیوں نہیں جی سکتی بھلا۔ میں کیوں نہیں کر سکتی ایسا۔

میں۔ میں کروں گی۔ میں جیوں گی بھابھی۔ میں جیوں گی سب کچھ اپنے دل میں دفن کر کے جیوں گی، خوشی خوشی جیوں گی اور دل اور شاہ کی محبت میں سراٹھا کر جیوں گی اس طرح کہ ہر محبت کرنے والے کو مجھ پر اور میری محبت پر رشک آئے گا۔ کسی کی محبت میں پاگل ہو جانا یا مرجانا ہی کافی نہیں ہوتا بلکہ کسی کی محبت سینے سے لگا کر جی لینا بھی بڑی بات ہوا کرتی ہے۔

میں محبت کا آگ نیا روپ دکھاؤں گی سب کو میں دل اور شاہیہ قربان۔

میرا رب راضی۔ میرا جگ راضی۔ میں دل اور شاہیہ قیامت تک راضی۔ جو دکھ اس نے سہے جو قربانیاں اس نے دیں۔ اس کے آگے تو یہ سب کچھ بھی نہیں ہے۔ بس اب جس حال میں وہ خوش۔ اس حال میں زری بھی خوش۔“

زری نے رو رو کر کہتے ہوئے اپنے آنسو بھی پونچھ لیے تھے اور اس کے اس فیصلے پہ نگارش کے تھے ہوئے اعصاب دھیلے بڑ گئے تھے اس نے زری کے بالوں کو سہلاتے ہوئے گلے سے لگا لیا تھا۔ لیکن جیسے ہی یہ ساری داستان عبد اللہ تک پہنچی تھی وہ سن کر ششدر سا رہ گیا تھا کہ دل اور۔۔۔ کی زندگی کا یہ کون سا باب ہے جو ان لوگوں کی نظروں سے بھی پوشیدہ تھا؟

دل اور شاہ کے گھر کے سامنے ہی گاڑی کو بریک لگاتے ہوئے آؤر نے علیزے کی طرف دیکھا تھا اور علیزے کا دل دھڑک اٹھا تھا اس نے بھی بے ساختہ ہی آؤر کی سمت دیکھا تھا۔

”جاؤ علیزے! اپنے گھر جاؤ ویر مت کرو۔ گھر بسنے میں صدیاں لگ جاتی ہیں، لیکن گھر اجڑنے میں لمحہ بھی نہیں لگتا۔ اور میں نہیں چاہتا کہ تمہارا گھر اجڑے۔ کیونکہ دل اور شاہ جیسے لوگ بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔ اور جن کو ملتے ہیں ان کو چاہیے کہ وہ ان کی قدر کریں۔ اس لیے تم بھی اس کی قدر کرو کیونکہ اب ہم سے بھی زیادہ

تمہارے لیے اس کو اہم ہونا چاہیے۔ اسی کی عزت میں تمہاری عزت ہے اور مجھے پتا ہے کہ تم خود بھی اس چیز کو بہت اچھی طرح سے سمجھ چکی ہو، تمہیں مزید سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ شاباش۔ تمہارا اور خوش رہو۔“

آؤر نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اسے جانے کے لیے کہا تھا اور علیزے سر جھکا کر رہ گئی تھی۔

”تھینک یو آؤر بھائی۔ تھینک یو سوچی۔“ وہ آہستگی سے کہتی دروازہ کھول کر گاڑی سے اتر گئی تھی اور گلاب خان نے اسے دیکھتے ہی بڑے خوشی بھرے انداز میں گیسٹوا کر دیا تھا۔ اور آؤر گاڑی آگے بڑھنے لگا تھا۔

”السلام علیکم علیزے بی بی۔“ گلاب خان کے لہجے سے ہی اس کے اندر کی خوشی جھلک رہی تھی کہ وہ

علیزے بی بی کو دیکھ کر کتنا خوش ہوا ہے۔

”و علیکم السلام! کیسے ہو گلاب خان؟“ علیزے بھی بڑی اپنائیت سے پوچھ رہی تھی۔

الحمد للہ بی بی جی! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آمین۔ آپ اندر آئیں تاہم ہر کیوں کھڑی ہیں؟“ گلاب خان نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اپنی بے پناہ خوشی اور شفقت کا اظہار کیا تھا اور علیزے آہستگی سے سر جھکا کر اندر آگئی تھی لیکن اندر قدم رکھتے ہوئے اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اس گھر

میں پہلی مرتبہ قدم رکھ رہی ہو۔

اور یہ تو واقعی ایک عجیب تھا۔ پہلے جب وہ آئی تھی تو دل اور اسے لے کر آیا تھا اور وہ بے ہوشی کے عالم میں یہاں آئی تھی، لیکن آج جب وہ آئی تھی تو خود اپنی رضا سے آئی تھی اور پورے ہوش و حواس میں یہاں آئی تھی اس لیے دل دھڑکتا تو ایک فطری سا عمل تھا۔

”بہت۔ تمہارے صاحب کہاں ہیں؟“ اس نے گیراج میں محض ایک گاڑی کھڑے دیکھ کر بے ساختہ استفسار کیا تھا۔

”صبح سے آفس گئے ہوئے ہیں، ابھی تک نہیں آئے۔“ گلاب خان نے نفی میں سر ہلایا۔

”کب تک آئیں گے؟“ اس کی بے چینی کا عالم ہی نرالا تھا۔

”بس آجائیں گے تمہاری دیر تک۔ آپ کہتی ہیں تو میں فون کر کے بلا لیتا ہوں۔“ گلاب خان نے اپنا موبائل

نکالا۔

”من۔ نہیں۔ رہنے دو ابھی وہ خود ہی آجائے گا۔“ علیزے نے فوراً اسے روک دیا تھا لیکن علیزے کو دیکھ کر بل ڈوگ نے دور سے ہی بھونکنا شروع کر دیا تھا کہ اسے اس کی موجودگی کا بھی پتا چل جاتا تھا۔

”آؤر علیزے بی بی! یہ آپ کو دیکھ کر خوش ہو رہا ہے۔“ گلاب خان نے اسے متوجہ کیا تھا اور علیزے ہلکے

سے مسکراتی ہوئی لان کے آخری کونے کی طرف آگئی تھی جہاں دیوار میں پیوست کھونٹے سے کسی شیر کی سی

جسامت والا اہل ڈوگ بندھا ہوا تھا، پہلے علیزے کو اسے دیکھ کر بہت ڈر لگتا تھا وحشت ہوتی تھی، جھرجھری آتی

تھی، لیکن آج وہ سب بھی بہت پیچھے چلا گیا تھا آج اسے دل اور شاہ کے گھر کے کتے سے بھی ایک اپنائیت اور

انہیت سی محسوس ہو رہی تھی۔ کیونکہ آج اس کا تن من دل اور شاہ کے نام سے ہی مائل ہوا جا رہا تھا۔

”گلاب خان۔ گلاب خان۔ کس کے ساتھ باتیں کیے جا رہے ہو؟ کون کیا ہے۔“ گل کو ریڈور میں ہی تھی

شاید اسی لیے گیسٹ کھانے کی آواز اور گلاب خان کی باتیں کرنے کی آواز سن کر وہ نہیں سکی تھی اور بار بار نکل آتی تھی

لیکن باہر لان میں بل ڈوگ کے قریب کھڑی علیزے کو دیکھ کر اس کی چیخ نکل گئی تھی اور وہ لپک کر علیزے کے

قریب آئی تھی۔

”علیزے بی بی! گل کا لہجہ جھک سا گیا تھا۔

”کیسی ہو گل۔؟“ علیزے خود ہی اس کے گلے لگ گئی تھی۔

”آپ کیوں چلی گئی تھیں علیزے بی بی۔ کیوں چلی گئی تھیں؟ صاحب کو اکیلا چھوڑ دیا آپ نے؟ ذرا بھی خیال نہیں آیا بڑی بے وفا لگی ہیں آپ۔“ گل نے ایک ہی سانس میں اتنے شکوے دل دیے تھے اور علیزے کی ساری شرمساری ہو گئی تھی کہ گل ایک نوکرانی ہو کر اپنے صاحب کے لیے اتنی حساس ہو رہی ہے اور اس نے اس کی بیوی ہو کر بھی اس کا احساس نہیں کیا تھا بے وقت کر کے چلی گئی تھی اسے۔ ”لیکن تمہارے صاحب کی وفاتیں اتنا اثر ہے کہ وہ وفاتیں یہاں پہنچ لاتی ہے۔“ علیزے گل کا ہاتھ تھپک کر کہتی ہوئی اندر آ گئی تھی۔

”لیکن علیزے بی بی! صاحب آپ سے صرف وفا نہیں کرتے۔ محبت بھی کرتے ہیں۔“ آپ کی بار گل نے بڑے کام کی بات کی تھی۔

”چھاب وہ کیسے؟“ علیزے کہتی ہوئی بیڑھیاں چڑھنے لگی تھی اور گل بھی اس کے ساتھ ساتھ تھی۔

”وہ ایسے کہ جب آپ کو کوئی لگی تھی تو صاحب جی کو دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ پاگل ہو گئے ہیں اور ہر ادھر بھاگتے دوڑتے رہتے تھے اور جب آپ اپنے میکے چلی گئی تھیں تو یوں لگتا تھا کہ صاحب جی کی دنیا ہی اندھیر ہو گئی ہے۔ کمرے میں بند ہو کر رہ گئے تھے۔“

”تم سچ کہہ رہی ہو گل“ علیزے بے ساختہ ریٹنگ پ ہاتھ رکھے ٹھہر گئی اور بڑے دل سے پوچھا تھا۔

”مکھاب خان کی قسم میں جھوٹ کیوں بولوں گی بی بی جی! صاحب جی کو بڑا پیار ہے آپ سے۔ جب آپ چلی گئی تھیں تو اکثر اپنے کام کے لیے آپ کو ہی آواز دیتے تھے اور پھر چپ ہو جاتے تھے اور کئی بار تو مجھے ہی علیزے کہہ گئے۔ بڑی شرم آتی مجھے۔ اور بڑا ترس بھی آیا۔“

گل بھی آج بڑے دنوں بعد اس طرح کھل کے بول رہی تھی اور علیزے تو جیسے دل تمام کے رہ گئی تھی دل اور یہ گزرنے والی کیفیات کا سن کر اس کے اپنے دل کو کچھ ہونے لگا تھا۔

”مجھے مس کرتا تھا وہ۔“ علیزے دردناک کھول کر اپنے اور دل اور کے بیڑوم میں داخل ہوئی تھی۔

”اس دنیا میں انہوں نے صرف آپ کو ہی تو مس کیا ہے بی بی جی۔ رہ مجھے لگتا ہے کہ آج رات نہیں کیا۔“ گل نے کہتے کہتے نفی میں گردن ہلائی تھی۔ علیزے چونک کر متوجہ ہوئی اسے گل کا آخری جملہ کرنٹ کی طرح لگا تھا۔

”تبت۔ تمہیں کیسے پتا کہ اس نے آج رات مجھے مس نہیں کیا۔“

”پتا تو گل تمہیں کیسے پتا کہ اس نے آج رات مجھے مس نہیں کیا۔“ علیزے کی بے چینی عروج پہ تھی۔

”آج میں نے کمرے کی صفائی کی تو سگریٹ کے ٹکڑے بہت کم ملے۔ ورنہ روزانہ تو سگریٹوں کا انبار لگا ہوتا تھا جس سے پتا چلتا تھا کہ وہ رات بھر جاگتے رہتے ہیں۔ اور آپ کو یاد کرتے رہتے ہیں۔ مگر آج۔“ گل کا وہی ایک جواب تھا۔ نفی والا۔ اور علیزے اس کے مشاہدے پر حیران رہ گئی تھی۔

”ہو نہ ہو۔ آج رات میں نے خود اسے بہت مس کیا تھا شاید اسی لیے اس نے مجھے مس کرنا چھوڑ دیا۔“

علیزے افسردگی سے کہتی ہوئی بیڑ پر بیٹھ گئی تھی۔

”کوئی بات نہیں بی بی جی۔ اب آپ آگئی ہوتا۔ اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“ گل بڑے اطمینان سے کہتی نیچے قالین پر بیٹھ گئی۔

”لیکن مجھے سب کچھ ٹھیک کرنا نہیں آتا گل۔ اور ویسے بھی وہ مجھ سے بہت زیادہ خفا ہے۔ وہ تو مجھ سے بات بھی نہیں کرے گا۔“ علیزے کو اس کے گل والے تیور یاد آ رہے تھے۔

”ارے بی بی جی! آپ کو نہیں پتا۔ کوئی بھی شوہر اپنی بیوی سے زیادہ دیر خفا نہیں رہ سکتا۔ اور خاص طور پر اس وقت جب اس کی بیوی اسے مٹانے کے لیے خود چل کر اس کے پاس آتی ہے۔“ گل آہستگی سے مسکرائی تھی مگر

علیزے ہنوز اسے نا سمجھی سے ہی دیکھ رہی تھی۔

”مگر مجھے تو مٹانا بھی نہیں آتا۔“ وہ جھنجھلا گئی تھی۔

”چھی طرح تیار ہونا تو آتا ہے نا۔“ گل نے اس کے حلیے کو دیکھ کر کہا۔

”تیار ہونا۔ کیا مطلب؟“ وہ ٹھٹھکی۔

”مطلب خود ہی سمجھ میں آجائے گا۔ بس آپ نے کپڑے پہن کر سر سے پاؤں تک تیار ہو جائیں۔ صاحب کی ناراضی آپ کو دیکھ کر ہی ختم ہو جائے گی۔ یہ بات تو میں گارنٹی کے ساتھ کہہ سکتی ہوں۔“ گل کا لہجہ معنی خیز سا ہوا تھا اور علیزے کے چہرے پر شرم کی سرخی دوڑ گئی تھی۔

”مم۔ مگر۔ میں ایسا نہیں کر سکتی گل۔“ وہ سن کر ہی جھجک گئی تھی۔

”ارے یہ کیا بات ہوئی علیزے بی بی! صاحب آپ کے لیے اتنا کچھ کر لیتے ہیں اور آپ ان کے لیے تیار نہیں ہو سکتیں؟ بڑے افسوس کی بات ہے یہ تو۔“ گل نے مایوسی اور تاسف سے کہتے ہوئے سر ہلایا تھا اور اس کے سر ہلانے کے ساتھ ساتھ علیزے کا دل بھی مل گیا تھا۔

”گر میں ایسا کروں تو کیا وہ مان جائے گا۔“ اس نے بڑے اشتیاق سے پوچھا تھا۔

”ناراض رہیں گے تو نقصان اٹھائیں گے۔ فائدہ اسی میں ہو گا کہ مان جائیں۔“ گل آج اسے کچھ اور ہی مشورے دے رہی تھی اور علیزے دل اور کو مٹانے کے لیے اتنی بے چین تھی کہ فوراً ہی ہر بات کے لیے مان گئی تھی۔ اور گل اٹھ کر اس کے کپڑے لگانے لگی تھی۔



دو دھپا ہاتھوں پر ریڈ کلر کی نیل پالش اس کے چمکی ہاتھوں کو اور بھی دو آتشہ بنا گئی تھی اور ابھی وہ آخری ناخن پر نیل پالش کا آخری کوٹ لگا رہی تھی کہ باہر گیٹ پر اس کی گاڑی کا ہارن بجا تھا اور علیزے کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ نیل پالش کی شیشی اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے پھٹی گئی تھی۔

”علیزے بی بی۔ صاحب جی آگئے۔“ گل علیزے کی ہدایت کے مطابق فوراً بھاگتی ہوئی آئی تھی اور علیزے یکدم مؤثرنگ نیل کے سامنے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”آپ چلی جائیں۔ میں بھی نیچے جا رہی ہوں۔“ گل تیزی سے کہتی ہوئی سٹاپ سے کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔ اس کا رخ نیچے چمن کی طرف تھا لیکن تب تک دل اور اندر آچکا تھا۔

”و علیکم السلام“ اس نے لا پرواہی سے جواب دے کر قدم آگے بڑھا دیے۔

”جائے بناؤں آپ کے لیے؟“ اس نے بیڑھیوں کی طرف بڑھتے دل اور سے جان بوجھ کر پوچھا تھا۔

”نہیں بھوک لگ رہی ہے کھانا لگا دو میں چھینچ کر کے نیچے ہی آ رہا ہوں۔“ وہ غلٹ سے کہتا ہوا اوپر اپنے بیڑ روم میں آ گیا تھا مگر بیڑ روم میں قدم رکھتے ہی اس کے قدم ٹھٹک گئے تھے۔

کمرے میں نیل پالش کی ایک مخصوص سی خوشبو اسے کمرے میں قدم رکھتے ہی محسوس ہو گئی تھی حالانکہ اپنے کمرے میں یا اپنے کمرے میں اس نے یہ خوشبو پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی لیکن پھر بھی وہ اس سے انجان نہیں تھا کیونکہ اسے اس پاس اکثر خواتین کے پاس وہی خوشبو محسوس کر چکا تھا۔

”ہو سکتا ہے کہ گل نے کمرے کی کوئی صفائی وغیرہ کی ہو۔“ وہ خود کو خود ہی سہانا سر جھٹک کر آگے بڑھ کے بریف کیس نیل پر رکھ کے خود بیڑ پر بیٹھ گیا تھا اور نیچے جھک کر اپنے بوتلوں کے قسے کھولنے لگا تھا۔ اور بوتلوں کے

خواتین ڈائجسٹ میں شائع ہونے والے مقبول ناول

کتاب کا نام	مصنفہ	قیمت
وہ خطی سی دیوانی	آسیہ سلیم قریشی	600/-
آرزو گھر آ کی	آسیہ سلیم قریشی	500/-
تھوڑی دور ساتھ چلو	آسیہ سلیم قریشی	400/-
ایمان، امید اور محبت	عمیرہ احمد	350/-
امر تیل	عمیرہ احمد	600/-
لا حاصل	عمیرہ احمد	250/-
ریگ زار تمنا	ماہا ملک	500/-
اک دیا جلانے رکھنا	ماہا ملک	350/-
میرے خواب ریزہ ریزہ	ماہا ملک	350/-
جو چلے تو جاں سے گزر گئے	ماہا ملک	250/-
شہر دل کے دروازے	شازیہ چوہدری	500/-
تیرے نام کی شہرت	شازیہ چوہدری	250/-
گلے داتا شا	شازیہ چوہدری	250/-
زندگی اک روشنی	رخسانہ نگار عدنان	500/-
خوشبو کا کوئی گھر نہیں	رخسانہ نگار عدنان	500/-
میرے چارہ گر	رخسانہ نگار عدنان	400/-
کوئی دیکھ ہو	رخسانہ نگار عدنان	350/-
بھول بھلیاں تیری گلیاں	فائزہ افتخار	600/-
آئینوں کا شہر	فائزہ افتخار	500/-
پھلاں دے رنگ کالے	فائزہ افتخار	250/-
یہ گھیاں یہ چہارے	فائزہ افتخار	300/-
ستاروں کا آئین	نسیم سحر قریشی	450/-
تو شریک سفر رہا	نسیم سحر قریشی	350/-

تھے کھول کے اور پاؤں دونوں سے آزاد کرتے ہی وہ چند سیکنڈز کے لیے بیڈ پر ڈھیر ہو گیا تھا مگر بازو بیڈ پر پھیلائے ہوئے وہ ایک بار پھر بچھڑکا تھا اس کے ہاتھ سے کوئی ریشمی چیز ٹکرائی تھی اور اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دی تھیں۔ وہ ریشمی چیز علیحدہ سے کاٹھن تھا بلکہ ٹکڑا کاٹھن تھا ایک ٹکڑا کاٹھن تھا ایک ٹکڑا کاٹھن تھا۔ جس کے چاروں اطراف ریڈ ٹکڑے سوئی دھاکے اور چھوٹے چھوٹے نفیس گلوں کا کام بنایا ہوا تھا یہ سوٹ اسی نے علیحدہ سے کوٹ کر دیا تھا جب وہ اسے پہلی بار شاپنگ پہ اپنے ساتھ لے کر گیا تھا لیکن علیحدہ سے لے کر گیا تھا یہ سوٹ اور یہ دھن استعمال نہیں کیا تھا تو پھر آج یہ دھن یہاں کیا کر رہا تھا؟ وہ دھن ہاتھ میں لیے یکدم سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”گل۔ گل۔ کہاں ہو؟“ وہ گل کو آوازیں دیتا ہوا باہر نکل آیا۔

”جی صاحب؟“ وہ بوکھلائی ہوئی یکن سے باہر نکلی تھی۔

”کمرے میں کوئی آیا تھا کیا؟“ وہ اوپر ریٹنگ کے قریب کھڑے کھڑے گل سے پوچھ رہا تھا۔

”جی صاحب جی۔ مہم میں گئی تھی۔ علیحدہ سے بی بی کی ساری چیزیں نکال کر سیٹ کی ہیں۔ اور ابھی کر رہی تھی کہ آپ آگئے۔“ گل بیان کرتی تھی۔

”تو تمہیں کیا ضرورت تھی ان چیزوں کو نکال کر سیٹ کرنے کی؟ جہاں پڑی تھیں پڑی رہتیں یہ چیزیں کل بھی بے کار تھیں اور آج بھی بے کار ہیں۔ چاہے یہاں رکھو۔ چاہے وہاں رکھو۔“ وہ خفگی سے کہتا ہوا وہاں سے ہٹ کے دوبارہ کمرے میں آگیا تھا اور ہاتھ میں پکڑا وہ دھن دوبارہ بیڈ پہ اچھال دیا تھا اور خود اس روم میں گھس گیا تھا۔

لیکن جیسے ہی وہ واش روم سے شاہرے کے کمرے کے دروازے پر گزرا ہوا باہر نکل کر ڈرائنگ ٹیبل کے سامنے آیا اس کے دلخ میں ایک بار پھر کھدبھدھوئی تھی۔

ڈرائنگ ٹیبل کے سامنے ہی نیل پالش پرفیوم، میسرش اور ایک باڈی لوشن پڑا ہوا تھا جن کو دیکھ کر صاف لگ رہا تھا کہ انہیں سیٹ کر کے نہیں رکھا گیا بلکہ استعمال کیا گیا ہے۔ اور استعمال کون کر سکتا تھا بھلا؟ گل سے تو اسے ایسی امید ہی نہیں تھی اور نہ ہی وہ ایسی کوئی حرکت کر سکتی تھی۔ تو پھر کس نے کیا تھا استعمال؟ یہ سوال اس کے ذہن میں سوال ہی رہا تھا جواب نہیں بن سکا تھا کیونکہ جواب لیتا بھی تو کس سے وہ کپڑے وغیرہ بیچ کر کے بیچے آیا اور خاموشی سے کھانا کھانے لگا تھا۔

پچھلے کافی دنوں سے اس کی روٹین چلی آری تھی کہ وہ کھانا کھا کر اپنے کمرے کے پچھلی سائیڈ والے ٹیرس پہ آکھڑا ہوتا تھا جہاں سے اس کے گھر کا سوئنگ ٹول ایک بہت ہی خوبصورت سا منظر پیش کرتا تھا۔ سوئنگ پول میں پڑنے والی روشنیوں کا اثر اتنا تیز تھا کہ ان کا ٹھس دل اور کے چہرے پر بھی پڑتا تھا اور پانی میں لہرائی روشنیوں کا عکس بھی لہرا رہا ہوتا تھا۔ اور اس وقت بھی ایک ایسا ہی منظر دکھائی دے رہا تھا کہ کھانا کھا کر ٹیرس پہ نکل آیا تھا اور دونوں ہاتھ ریٹنگ پہ جمائے سوئنگ پول کی سمت دیکھنے لگا تھا۔

ابھی اسے تقریباً ”پندرہ منٹ ہی گزرے تھے کہ چند لمبی چلی خوشبوؤں کا اک نرم سا جھوٹا اس کی سانسوں میں آسایا تھا اور علیحدہ سے دھڑکتے دل کے ساتھ اس کی پشت پہ اپنی پیشانی ٹکا دی تھی۔

”آئی مس یو ڈرائیور۔ آئی مس یو۔“ وہ عین اس کے عقب میں کھڑی اس کی پشت سے اپنی پیشانی ٹکائے بہت دھیمے اور لرزاتے ہوئے لہجے میں بہت ہی معصوم سا اظہار کر رہی تھی۔ اور دل اور کویوں لگا تھا کہ جیسے کسی نے اسے سر سے پاؤں تک پتھر کا کر دیا ہو وہ چند لمحے اپنی جگہ سے مل بھی نہیں سکا تھا۔

”ڈرائیور! علیحدہ سے اپنے دونوں ہاتھ بھی اس کی پشت پہ رکھ دیئے تھے لیکن اب کی بار وہ برداشت نہیں کر سکا تھا اور یکدم اک جھٹکے سے اس کی سمت پلٹا تھا۔

”تم۔ تم یہاں؟“ وہ غصے اور بے یقینی سے بولا تھا البتہ علیحدہ سے یہ نظر پڑتے ہی چونکا۔ تھا کیونکہ وہ سر تپا اور

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو امیل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور ایڈٹ پر نٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سیریم کوالٹی، ہارل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیگر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

سے اور ہی نظر آ رہی تھی۔
 ”ایم سوری ڈرائیور۔ ایم سوری۔“ علیزے کی آواز بھرا گئی تھی۔
 ”تم یہاں کیوں آئی ہو؟“ وہ بہت ہی پتھر پلے سے لہجے میں بولا تھا۔
 ”تمہارے لیے۔“ علیزے نے کوئی بھی لگی لپٹی رکھے۔ اور جھجکے بغیر کہہ دیا تھا۔
 ”تم گئی بھی تو میرے لیے ہی تھیں نا؟“ وہ نخی سے کتا دوبارہ رینگ کی سمت مڑ گیا تھا۔
 ”تمہارے نزدیک میرے جانے کی اہمیت ہے۔ لیکن میرے آنے کی کوئی اہمیت نہیں ہے؟“ اس نے جیسے شکوہ کیا تھا۔
 ”جب اہمیت تھی تب تم آئی نہیں۔ اور آج جب سب کچھ ختم ہو رہا ہے تو۔۔۔“ اس نے استہزائیہ سے انداز میں کہتے ہوئے سر جھٹکا تھا۔
 ”یہ سب کچھ کیا کہہ رہے ہو تم۔ تمہارے تمہارا کچھ نہیں کرو گے۔“ علیزے کی زبان اور الفاظ بے ربط سے ہو گئے تھے۔
 ”طلاق کے پیچڑ تیار ہو چکے ہیں۔ اب تمہارا اور میرا رشتہ ہیں سے لکھے ہوئے ایک سائن تک رہ گیا ہے۔ اور جیسے ہی یہ سائن ہو گئے۔ ہر چیز ختم۔ ہر بات ختم۔ ہر رشتہ ختم۔ پھر تم بھی آزاد۔ اور میں بھی۔ میں وہی ڈرائیور کا ڈرائیور۔ تم وہی ایم کی ایم۔“
 وہ وانت پیش کر کتا ہوا دوبارہ پلٹا اور اس پر اک اچھٹی سی نظر ڈال کر مضبوط قدم اٹھاتا کرے من گیا تھا۔
 ”میں جانتی ہوں ڈرائیور۔! مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی تھی۔ مجھے تم کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے تھا۔ لیکن میں کیا کرتی۔ مجھے کچھ پتا بھی تو نہیں تھا۔ میں تو ہر حقیقت سے انجان تھی۔ مجھے تو صرف وہ پتا تھا جو میرے ساتھ ہوا تھا۔ اور پھر ہم دونوں کا آپس میں رویہ بھی تو ایسا ہی تھا کہ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے ساتھ خوش نہیں تھے۔ ایسے حالات میں میرا بڑی حویلی چلے جانا کوئی بری بات نہیں تھی۔ ہاں اب اگر میں تمہیں چھوڑ کر جاؤں تو بے شک ناراض ہو جانا۔ بے شک طلاق دے دیتا۔ بے شک گھر سے نکال دیتا۔ لیکن اس بار۔ صرف اس بار معاف کرو۔“ علیزے نے اس کے سامنے بے اختیار اپنے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔
 ”میرے طرف کی حد ختم ہو چکی ہے۔ تھک چکا ہوں معاف کر کر کے۔“ وہ جھنجھلا گیا تھا۔
 ”تمہارے طرف کی حد ہماری سوچ۔۔۔ بھی زیادہ وسیع ہے ڈرائیور۔ پلیز۔“ وہ التجا کر رہی تھی۔
 ”ایم سوری۔ میرے پاس اب کوئی گنجائش نہیں ہے۔“ وہ سنگدل سے کہہ کر سر خم ہو گیا تھا۔
 ”پلیز ڈرائیور! مجھے وقار آندی کی بیٹی نہیں۔ اپنی اماں کی سو سمجھ کر معاف کرو۔“
 علیزے نے کچھ اس انداز میں اور کچھ ان الفاظ میں التجا کی تھی کہ دل اور کوکھڑے کھڑے کرنٹ چھو گیا تھا ایک تو اس نے بات ہی ایسی کہہ دی تھی اور دوسرے اس نے اس کے سامنے ہاتھ بھی جوڑ رکھے تھے اس کا پتھر ہوا کیج ایک بار پھر رنٹ گیا تھا۔ اس نے علیزے کو بڑی کٹھنار نظروں سے دیکھا تھا۔
 ”ٹھیک ہے میں معاف کر دیتا ہوں، لیکن میری کچھ شرائط ہیں کیا وہ پوری کر سکو گی تم؟“
 وہ عین اس کے سامنے کھڑا اس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے پوچھ رہا تھا اور علیزے اب اس اسٹیج پہنچ چکی تھی کہ اس نے ذرا سی بھی تاخیر کیے بغیر اور کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر فوراً ہائی بھری تھی۔
 (بالی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

☆ ☆

دردِ دل

بڑی حویلی کے تمام کمین و قار آئندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور جلیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدیہ اور نیل حیات دہی بہن بھائی ہیں، مدیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے، وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل حور پہ رنگ چکی ہے، جس کے پیش نظر فائزہ بیگم، نیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں، لیکن مدیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے، جس پہ نیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے، مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پھپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصے سے نوکری کی تلاش میں ہے، مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، بے بسی اور مجبوری سے تنگ آکر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے، لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باؤ امتیاز مل جاتا ہے، جو اسے کام کی آفر کرتا ہے، جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے، اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میسر کسپاس آدمی ہے، وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آئندی سے نوکری مانگنے آتا ہے، وقار آئندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل اور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے، وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے، اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا، اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔



”ہاں! کروں گی پوری ضرورت کروں گی، تم شراپا رکھو تو سہی؟“ علیزے نے توجہ جان سے رضامند تھی۔
 ”سوچ لو۔ ایک بار پھر سوچ لو۔“ وہ سنجیدگی سے کہتا تھا۔ اس کے سامنے آ رہا تھا۔
 ”بچھلے چوہے گھنٹوں سے تمہارے سوا اور کوئی سوچ آئی نہیں رہی میں اور کیا سوچوں؟“
 وہ اپنے سامنے کھڑے دل اور کو اس نظر سے دیکھ رہی تھی جس سے اسے یقین تھا کہ وہ اسے کھڑے کھڑے سرخ کر لے گی۔ کیونکہ اس کی یہ نظر زندگی کی پہلی ایسی نظر تھی جس سے وہ کسی مرد کو دیکھ رہی تھی تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ مرد اس کی اس محمور نظر سے بچ جاتا۔ اور اس پر اثر نہ ہوتا۔
 ”تمہاری دنیا سے نانا توڑ لوگی؟ میری خاطر؟ یہاں تک کہ بڑی حویلی والوں سے بھی۔“ وہ اس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

”ہاں۔ توڑ لوں گی۔ سب سے توڑ لوں گی۔ تم سے نانا جوڑنے کی خاطر میں سب سے نانا توڑنے کی ہمت رکھتی ہوں۔ کیونکہ اگر میری ماما آسیہ آئندہ اپنے ہرنینڈ کی خاطر ملک حویلی والوں کو چھوڑ سکتی ہیں تو میں بھی چھوڑ سکتی ہوں۔ بلکہ یہ کہنا بھی ٹھیک ہی ہوگا کہ میں بھی اس وقت بڑی حویلی والوں کو چھوڑ کر ہی آئی ہوں۔ وہ بھی صرف تمہاری خاطر۔“

علیزے نے بڑے سکون اور بڑے اطمینان سے اسے جواب دیا تھا۔ مگر اس کے اس ایک جواب سے دل اور کی تسلی نہیں ہونے والی تھی۔ وہ کچھ اور بھی سننا چاہتا تھا۔
 ”تو کیا ساری دنیا سے کٹ کے رہ لوگی؟ اتنا حوصلہ ہے تم میں؟“ وہ بھی جواباً ”سنجیدگی سے ہی پوچھ رہا تھا۔“ مجھے اتنا حوصلہ بخشنے والے بھی تو تم ہی ہونا؟ میں ساری دنیا سے کٹ کے رہ سکتی ہوں یا نہیں یہ بات تم سے بہتر کوئی بھی نہیں جانتا۔ ہاں یہ بات اور ہے کہ اب کی بار تو میں خود چاہتی ہوں کہ تم مجھے ساری دنیا سے کٹ کر سب سے الگ ہسپتال میں قید کر رکھو۔ جہاں تمہارے سوا کسی کا بھی آنا جانا نہ ہو۔ جہاں صرف علیزے ہو۔ اور اس کا ڈرائیور ہو۔“

علیزے کے ایسے ہنسنے سے اس کے دل کو کچھ ہوا تھا اور اک منہ زور جذبات کی لہر اس کی پس منظر میں دوڑ گئی تھی۔ کیونکہ وہ بڑے ہی اعتماد سے اپنے اور اس کے بیچ کے فاصلے منہ کر اک بالکل ہی نئی اور لودیتی قربت کا حصار سا باندھتی جا رہی تھی۔

”میری بیوی بن کر رہو گی؟ یا میری اماں کی بہو؟“ وہ دو قدم اٹھا تا مزید اس کے قریب آ گیا تھا۔

”تمہاری اماں کی بہو بن کر رہوں۔“ علیزے کے پاس تو ہر جواب پہلے سے تیار تھا۔

”وہ کیوں؟“ اس کی نظریں دل اور کی سوالیہ نظروں سے لپٹ کر جھک گئیں۔

”کیونکہ تمہاری اماں کی بہو بننے میں بڑا فائدہ ہے۔“ اس کے شفاف ہونٹوں پہ بکھرتی بدھم مسکراہٹ دل اور کی نظروں سے مخفی نہیں رہ سکتی تھی۔
 ”کیسا فائدہ؟“ وہ مزید آگے بڑھا۔

”تمہاری اماں کی بہو بنوں گی تو میرا تم پہ رعب رہے گا۔ اور اگر تمہاری بیوی بن کے رہوں گی تو تمہارا مجھ پہ رعب رہے گا۔ اور اس رعب کی وجہ سے میں ہمیشہ تم سے ڈرتی ہی رہوں گی۔“ وہ بڑی دور کی سوچیں سوچ رہی تھی۔

”رعب تو تم مجھ پہ ہمیشہ سے جاتی ہو۔ ہمیشہ تم نے مجھے ڈرائیور سمجھا ہے۔ دل اور نہیں۔“ وہ اور آگے بڑھا۔ اور علیزے اسے اپنے اتنے قریب دیکھ کر بے ساختہ جھجک کر دو قدم پیچھے ہٹی گئی۔
 ”تمہیں کیا پتا کہ اس ڈرائیور میں کیا چھپا ہے؟“ وہ بے ساختہ مسکرا رہی تھی۔

”کیا چھپا ہے؟“ اس کی نظریں علیزے کے چہرے پر گہری ہو گئیں۔

”دل اور۔“ اس کے ہونٹ دھیمے سے کپکپائے۔

”اور دل اور میں کیا چھپا ہے؟“ اس کے چھوٹے چھوٹے سوال بڑھتے جا رہے تھے۔

”علیزے کی محبت۔“ علیزے بھی بڑے جم کے جواب دے رہی تھی۔

”تو پھر اس محبت سے دور کیوں ہٹ رہی ہو؟ قریب آؤ نا۔“ دل اور نے ہاتھ بڑھا کے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

”قریب ہی تو آنا چاہتی ہوں۔“ علیزے کی آواز لرز گئی تھی۔

”کتنا قریب؟“ دل اور کی آواز کی گہیرا بھی کچھ کم نہیں تھی۔ علیزے کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئیں اور اس کی دھڑکنوں سے جیسے پورا ماحول ہی دھڑک اٹھا تھا۔ کمرے میں فسون خیزی بڑھنے لگی تھی۔

”اتنا قریب کہ درمیان کچھ نہ رہے۔“ علیزے کہتی ہوئی اس کے قریب ہوئی تھی۔

”یہ قریب ہونا بھی کوئی قریب ہونا ہے؟“ دل اور نے الحال اسے شرمزلا رہا تھا کیونکہ ان دونوں کے بیچ ایک قدم کا فاصلہ اب بھی حائل تھا اور وہ یہ فاصلہ بھی نہیں چاہتا تھا۔

”تو پھر کیسا قریب ہونا؟ قریب ہونا ہوتا ہے؟“ وہ جھجکتے ہوئے بولی۔

”یہ تو تمہیں پتا ہونا چاہیے۔“ دل اور فوراً ہی لاپرواہ سا بن گیا تھا۔

جس پر علیزے کو اس کی لاپرواہی دیکھتے ہوئے خود ہی ہنچک کاوا اس چھوڑنا پڑا تھا اور وہ اپنے اور اس کے بیچ کا فاصلہ مٹاتے ہوئے بے حد آہستگی سے اس کے سینے سے لگ گئی تھی اور دل اور کو یوں لگا جیسے اس کی صدیوں سے بھٹکی اور تڑپتی روح کو قرار مل گیا ہو جیسے ایک دم سے ہر چیز شانت ہو گئی ہو۔ جیسے اس کی ذات پہ چھائے عذاب پل میں چھٹ گئے ہوں۔

اور اس عذاب سے نکلتے ہی اس کی روح ہلکی پھلکی سی ہو گئی تھی۔ اس کا تن من سرشار سا ہو گیا تھا اور اسی سرشاری اور خماری کے ہاتھوں بکھتے ہوئے اس نے اپنے سینے سے لگی علیزے کو اپنے مضبوط بازوؤں کے شکنجے میں انتہائی زور سے بھینچ لیا تھا۔ اتنے زور سے کہ علیزے کو لگا کہ اس کے سینے میں پیوست ہو جائے گی۔

”اور زور سے۔“ علیزے کی پسلیاں ٹوٹنے کو تھیں مگر پھر بھی وہ چاہتی تھی کہ وہ اسے زور سے بھینچنے کی حد کر ڈالے۔

”مر جاؤ گی۔“ وہ اس کے کان کے قریب سرگوشی سے بولا۔

”مر جانے دو۔“ وہ اس سے بھی زیادہ سرگوشی سے بولی تھی۔

”ایک بار پھر سوچ لو۔“ وہ اسے اپنی بانہوں میں بھرتے ہوئے اور بھینچتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

”سوچ کر ہی تو آئی ہوں۔“ علیزے نے کہتے ہوئے اس کے گریبان میں چہرہ چھپا لیا تھا اور اس کے چہرے کا پس منظر دل اور کے سینے سے ٹکرانے لگا تھا جس سے دل اور کی رگوں میں سرخ شہا جذبات کا جنون اور بھی منہ زور ہونے لگا تھا۔

”میرے جذبات کی شدتوں کو سہہ نہیں پاؤں گی۔“ اس نے علیزے کو بازوؤں کے حصار سے آزاد کرتے ہوئے اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر عین اپنے چہرے کے سامنے کر لیا تھا۔

”تم اپنی شدتیں آزماؤ تو سہی۔“ علیزے کا لہجہ بھی بوجھل ہو رہا تھا اور اس کے الفاظ بھی۔

”میری شدتوں سے پہلے میری شرائط تو تم نے سنی ہی نہیں۔“ وہ اپنے ہاتھوں کے انگوٹھوں سے علیزے کے رخساروں کو سسلا رہا تھا۔

”مجھے تمہاری کسی بھی شرط سے انکار نہیں۔ چاہے تو سائن کرو الو۔“

”سائن بھی کرواؤں گا۔۔۔ عمر آخری شرط کے بعد جو سب سے زیادہ اہم ہے۔“
 ”آخری شرط؟ وہ کیا؟“ علیزے کو حیران ہوئی۔
 ”بیاد دل؟“ وہ تصدیق چاہ رہا تھا۔
 ”ہاں۔۔۔“ اس نے آہستہ میں سر ہلا دیا تھا۔

”میں چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے محبت کرو۔ اور اتنی شدید محبت کرو کہ باقی ہر شے کو بھول جاؤ۔ یہاں تک کہ اپنے آنے والے بچوں کو بھی۔“ دل اور کی شدتیں اس کے اظہار اور اس کے الفاظ سے ہی ظاہر ہو رہی تھیں۔
 ”بچوں کو بھی؟ تو پھر ان سے محبت کون کرے گا؟“ علیزے کو خفگی ہوئی تھی۔
 ”میں کس لیے ہوں آخر؟ میں کروں گا ان سے محبت۔ تم صرف مجھ سے محبت کرو گی صرف مجھ سے۔ شرط منظور ہے تو بات کرو۔“ دل اور کی نظریں اس کے چہرے کے اک اک نقش کو چھو رہی تھیں اور بوسے دے رہی تھیں۔

”لاؤ کاغذ قلم۔ میں سائن کرتی ہوں۔“ وہ یہ شرط ماننے کو بھی تیار تھی۔
 ”کاغذ قلم لانا ضروری تو نہیں۔ سائن تو تم کسی بھی جگہ کسی چیز پر کر سکتی ہو۔ بلکہ یوں کہنا ٹھیک ہو گا کہ ہر بھی لگا سکتی ہو۔“ دل اور کا اشارہ اس کے گلابی شفاف ہونٹوں کی طرف تھا اور علیزے اس کا اشارہ سمجھ کر بے ساختہ ہلک گئی تھی۔

”لیکن ڈرائیور۔“ اس نے احتجاجاً کچھ کہنا چاہا تھا۔
 ”اب تم محبت کی ہامی بھر چکی ہو۔“ دل اور نے کہتے ہوئے اسے کچھ بھی کہنے کی مہلت نہیں دی تھی اور اس کے سارے احتجاج اور سارے الفاظ اپنے ہونٹوں میں سمیٹ لیے تھے اور وہ بھی اتنی شدت سے کہ علیزے اس کی شرٹ اپنی منہیوں میں دبوچتی رہ گئی تھی۔ لیکن پھر بھی اپنا آپ چھڑا نہیں سکی تھی۔
 ”ڈرائیور۔“ بڑی مشکل سے بڑی دیر بعد اس کے کھوئے ہوئے الفاظ واپس آئے تھے اور وہ بڑی کوششوں کے بعد کچھ کہنے کے قابل ہوئی تھی۔

”جی ڈرائیور کی جان۔۔۔ کہو۔ میں سن رہا ہوں۔“ اس نے چکراتی ہوئی علیزے کو ایک بار پھر بانسوں میں لے لیا تھا اور اس کے بعد بے حد سلی بالوں میں ہاتھ پھنساتے ہوئے انہیں سہلایا تھا۔
 ”میں رات بھر نہیں سوئی۔ مجھے نیند آرہی ہے۔“ وہ بیڈ پر لیٹنا چاہتی تھی۔
 ”میرا بھی یہ حال ہے۔“ وہ گہیر آواز میں کہتا اس کے بالوں کو اور گردن کو نرمی سے چھو رہا تھا اور اپنا چہرہ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”تو پھر سونے دو نا مجھے؟“ علیزے۔۔۔ اس کی بانسوں کے لمس سے کسمپاسی تھی۔
 ”اوسلا تا ہوں تمہیں۔“ وہ اسے یوں ہی بانسوں میں لیے بیڈ پر بیٹھ گیا تھا اور بے حد نرمی اور بے حد ہنسٹکی سے اسے بیڈ پر لٹا بھی دیا تھا۔

”اور تم؟“ علیزے کو اب اس کا خیال آیا تھا۔
 ”تم بتاؤ۔ میں کیا کروں؟ جاگتا رہوں یا سو جاؤں؟“ وہ اس کے دائیں بائیں بیڈ پر دونوں ہاتھ جمائے اس کے اوپر ذرا سا جھکا ہوا تھا۔

”سو جاؤ۔“ علیزے نے کہتے ہوئے اس کے گلے میں بازو جمائل کر دیے تھے۔
 ”میں پاگل نہیں ہوں کہ آج کی رات بھی سو جاؤں۔“ وہ استہزائیہ سے تہج میں بولا تھا۔
 ”کیوں؟ آج کی رات کیوں نہیں سو سکتے؟“ وہ نا سنجی سے بولی۔

”کیونکہ آج کی رات میرے پاس میرے سامنے میری بانسوں میں میرے جانے کا سامان موجود ہے۔ آج کی رات سونے سے تو بہتر ہے کہ میں اپنی کپڑی پہ ریو اور رکھ کے گولی ماروں اور مر جاؤں۔“
 ”پلیز۔ ایسا تو مت کہو۔“ علیزے نے بے ساختہ تڑپ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔
 ”تو پھر سلا نا کیوں چاہتی ہو؟“ وہ مصنوعی خفگی سے بولا۔

”میں کب سلا نا چاہتی ہوں؟ میں تو چاہتی ہوں کہ تم خود بھی جاگو اور مجھے بھی جگاؤ۔“ بے حد دھیمی آواز میں کہتے ہوئے اس نے پلکیں جھکائی تھیں اور دل اور نے ساختہ چلا اٹھا تھا۔
 ”علیزے۔۔۔“ وہ انتہائی زور سے اور انتہائی خطرناک تیروں سے دھاڑا تھا اور علیزے کھلکھلاتی ہوئی چہرہ چھپانے لگی تھی۔ کیونکہ دل اور اب پوری طرح سے اس پر حاوی ہو چکا تھا اور وہ بے تماشائی ہستی ہوئی اور کھلکھلاتی ہوئی اس سے بچنے کی کوشش کر رہی تھی اور اس کی کھلکھلا ہونٹوں سے پورا کمرہ گونج رہا تھا۔

”پلیز ڈرائیور پلیز۔ بس کرفس میں پاگل ہو جاؤں گی۔“ علیزے اپنے چہرے پر ہاتھ رکھتے ہوئے احتجاجاً چلائی تھی۔ کیونکہ دل اور نے اسے واقعی پاگل کر ڈالا تھا۔ وہ چند جسامتوں پر ہی بو جھلا گئی تھی۔
 ”اوکے۔ اوکے۔ اب کچھ نہیں کرنا۔ تم بس مجھے سلا نے کی کوشش کرف اور میں تمہیں جگانے کی کوشش کرتا ہوں۔“ وہ معنی خیزی سے کہتا اس کے چہرے کے قریب جھک آیا تھا۔ اتنا کہ ان کی سانسیں ایک دوسرے میں رہنے لگی تھیں۔ جس پر ان دونوں کے ہی اعصاب اک عجب سے محرک زدیں آگئے تھے۔
 ”کیا مطلب؟“ علیزے کے حواس بکھرنے لگے تھے۔ اس کا لہجہ اور اس کی آواز دل اور کو پاگل کرنے کے لیے کافی تھے اور اس کے صبر اور ضبط کا دامن پھوٹنے لگا تھا۔

”آج کی شب میری بانسوں میں رہو۔“ سارے مطلب سمجھاؤں گا۔“ وہ سرگوشی سے کہتا لب کی تیز روشنی گل کر چکا تھا اور علیزے نے بڑے سکون سے اور پوری آمادگی کے ساتھ ایک گرمی سانس کھینچتے ہوئے خود کو ہمیشہ ہمیش کے لیے اس کے حوالے کر دیا اور اس کی اس پردگی پہ کب سے ٹھہری ہوئی کالی رات بھی مسکرا اٹھی تھی۔

کیونکہ ان کا یہ ملن بڑے صبر بڑی برداشت اور بڑے ضبط کے بعد ہوا تھا۔ بڑی اذیتیں اور بڑے عذاب جھیلے تھے انہوں نے اس لیے اس وصال کی رات پہ تو اب پورا پورا حق تھا ان کا اور اس حق کو پورے استحقاق سے وصول کرنے میں وہ دونوں ہی گم تھے۔ اس طرح کہ کائنات کا باہنی ہر احساس ہی پس پشت ڈال دیا تھا۔ سوائے ایک دوسرے کے۔ کیونکہ اس وقت علیزے کے لیے اس کا ڈرائیور اور ڈرائیور کے لیے اس کی علیزے ہی کل کائنات تھی۔



دل کی پوچھتے ہو تو پھر سن لو
 ہم نے بخشا تمہیں قیامت تک

وہ کپڑے چینج کر کے فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد بیڈ روم سے باہر نکل آئی تھی۔ حالانکہ سیرھیاں اترتے ہوئے اور چڑھتے ہوئے اسے اب بھی بڑی دقت ہوتی تھی مگر آج اس کا مؤثر فزیشن اور خوشگوار تھا۔ اس لیے وہ دقت کے باوجود بھی رینگ کا سارا لے کر سیرھیاں اتر آئی تھی۔ اس کا رخ باہر لان کی طرف تھا۔
 اور تبتم آلود گھاس پہ پاؤں رکھتے ہی اس کی روح سرشار ہوا تھی۔ اس کا من صبح کی ایسی تازگی پہ جھوم گیا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ تمامہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ٹھیں :-

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ پیر ای بک کا ڈائریکٹ اور برزیوم ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ابن صفی کی مکمل ریخ
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

تھا اور وہ آہستہ آہستہ پھولوں کی کیا ربوں کے پاس چلتی چند نوخیز پھولوں کو چن چن کر اپنی جھولی میں بھر لے گئی تھی اور اپنی بے دھیانی میں اسے پتا ہی نہ چلا کہ اس نے کتنے ہی پھول چن ڈالے تھے۔

”زری! تم یہاں۔۔۔ تم خود آئی ہو کیا؟“ نگارش بھی تھوڑی دیر بعد نماز وغیرہ سے فارغ ہو کر نیچے آگئی تھی اور نیچے لان میں شلتی زری کو دیکھ کر وہ سخت حیرانی اور خوشگوار مت کا شکار ہوئی تھی۔

”ہاں میں۔۔۔ زری مسکراتی ہوئی اس کی طرف پلٹی۔

”لیکن تم یہاں کیسے؟“ نگارش کو واقعی حیرت ہو رہی تھی، کیونکہ زری ابھی بھی چلتے ہوئے لڑکھڑاتی تھی۔ اس کے قدم ابھی جم نہیں رہے تھے اور نہ ہی ان کی مضبوطی قائم ہو رہی تھی۔

”میں یہاں خود آئی ہوں۔ بغیر کسی سارے کے۔“ زری نے خوشی خوشی بتایا تھا۔

”لیکن کیوں زری؟ تم نے ایسا رسک کیوں لیا؟ اگر تم سیڑھیوں سے گر جاؤ تو۔۔۔“ نگارش کو سوچ کر ہی جھرجھری سی آگئی تھی۔

”ارے ڈونٹ وری بھا بھی۔۔۔ کچھ نہیں ہوتا۔ میں نے یہ رسک اپنے آپ کو آنانے کے لیے لیا ہے۔ اپنی ہمت اور اپنا حوصلہ رکھنے کے لیے کیا ہے یہ سب۔ اگر آج میں کسی قدم نہ گر جاتی تو آپ نہیں جانتیں کہ میں زندگی بھر اٹھ نہیں سکتی تھی۔ سنبھل نہیں سکتی تھی۔ اپنے پیروں پہ چل نہیں سکتی تھی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ میں کہیں بھی نہیں مری۔ اس لیے سمجھ لیں۔۔۔ کہ سنبھل گئی ہوں۔ اور چپنے پھرنے کے قابل ہو گئی ہوں۔ میرے قدم کمزور نہیں رہے۔ مضبوط ہو گئے ہیں۔ اب میں کسی بھی سارے کے بغیر چل سکتی ہوں۔ اکیلے چل سکتی ہوں۔ خود اکیلے۔“ زری نے کچھ اس انداز اور الفاظ میں اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ نگارش فوراً ہی چونک گئی تھی۔ ”کیا بات ہے؟ تم ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟ کیا ہوا ہے؟“ نگارش پوچھے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

”میں اس لیے ایسا کہہ رہی ہوں کہ میں آج بہت خوش ہوں۔ بہت زیادہ خوش۔“ زری کی خوشی ایسی تھی کہ اس کے لہجے سے بھی جھلک رہی تھی۔

”کیوں۔۔۔؟ ایسا کیا ہوا ہے آج کہ تم اتنی خوش نظر آ رہی ہو؟“ نگارش کو حیرت پہ حیرت ہو رہی تھی۔

”کیونکہ علیزے، دل اور شاہ کے پاس واپس آگئی ہے۔ اپنے گھر۔ اپنے شوہر کے پاس۔ اور مجھے اس کے آجانے کی بہت خوشی ہوئی ہے۔ کیونکہ ان دونوں کا گھر ٹوٹنے سے بچ گیا ہے۔ اور دل اور شاہ کو اس کی علیزے واپس مل گئی ہے۔ اسی لیے آج فجر کی نماز کے بعد صرف ان دونوں کے لیے ہی دعا کی ہے کہ اللہ ان کا یہ ساتھ ہمیشہ سلامت رکھے۔ میری پھوپھو کی علیزے ہمیشہ سہاگن رہے، آباد رہے، اور ان کی جھولی ایسے خوب صورت پھولوں سے بھر دے۔“

زری نے کہتے ہوئے اپنی جھولی میں بھرے پھولوں کو بڑی نرم نگاہوں سے دیکھا تھا اور سارے پھول نگارش کی جھولی میں ڈال دیے تھے اور خود جیسے قدم اٹھاتی اندر کی طرف بڑھ گئی تھی۔

”بھابھی! میں سوچ رہی تھی کہ ہم نبیل حیات اور دل اور شاہ کو کھانے پہ انوائٹ کرتے ہیں۔ اس طرح انہیں اپنی اپنی علیزے کے ساتھ آنے کا موقع مل جائے گا اور عبد اللہ بھائی بھی اپنے دوستوں سے مل کر خوش ہو جائیں گے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟“ وہ جاتے جاتے پلٹی تھی اور جواباً ”نگارش محض سر ہلا کر رہ گئی تھی۔

ان پریست ہوں

خندی ہوں

سر پہرا ہوں

مگر مجھے تمہاری محبت بدل بھی سکتی تھی

رات بہت دیر تک جاگنے کی وجہ سے صبح اس کی آنکھ بھی بست دیر سے ہی کھلی تھی اور آنکھ کھلتے ہی اس کی پہلی نظر دل اور کے سوتے ہوئے چہرے پہ پڑی تھی۔ جس کی وجہ سے اس کا دل بڑے زور سے اور بڑے بے ساختہ انداز میں دھڑکا تھا کیونکہ اس کا چہرہ علیزے کے چہرے سے بے حد قریب تھا اور اسے اتنے قریب سے پہلی مرتبہ دیکھنے کی وجہ سے اس کے دل میں عجیب سے عجیب سے جذبات ابھرنے لگے تھے اور عجیب عجیب سے خیالات آنے لگے تھے اور تب اسے احساس ہوا تھا کہ واقعی محبت کیا کچھ نہیں بدل سکتی؟ محبت انسان کی نفرت کو بھی محبت میں بدل سکتی ہے اور اس کا ادراک اسے کل شب دل اور شاہ کا محبت بھرا روپ دیکھ کر ہی ہو گیا تھا۔

”ڈرائیو۔“ علیزے نے اس کی پیشانی پہ بکھرے بالوں کو بے حد آہستگی سے پیچھے ہٹاتے ہوئے سرگوشی نما آواز میں اسے پکارا تھا۔

”ہوں۔“ بولیں۔ کیا دیکھ رہی ہو؟“ دل اور یوں ہی آنکھیں بند کیے بولا تھا اور علیزے اس کے اتنے اطمینان سے بولنے پہ بدگئی تھی۔

”تم جاگ رہے ہو؟“ علیزے کا دل اور بھی بری طرح دھڑکا تھا۔

”سوئے ایک ساتھ تھے تو جاگنا بھی تو ایک ساتھ ہی تھا؟“ دل اور نے آنکھیں کھولتے ہوئے اسے بازو کے حصار میں لے کر اپنے قریب کھینچ لیا تھا۔

”ہماری زندگی کی اک نئی صبح مبارک ہو تمہیں۔“ علیزے نے پلکیں جھکائے اس کے سینے پہ انگلی پھیرتے ہوئے کہا تھا اور دل اور اس کی اس شرمیلی سی آواز پہ مسکرایا تھا۔

”اور تمہیں بھی۔“ اس نے اس کی پیشانی پہ ہونٹ رکھ دیے تھے اور علیزے نے روح تک شانت ہونے ہوئے پلکیں موند لی تھیں۔

”بڑی حویلی چلو گی؟“ دل اور نے بہت سکون سے سوال کیا تھا مگر علیزے نے پٹ سے آنکھیں کھول دی تھیں۔

”کیا؟ بڑی حویلی؟“ اسے شدید ترین حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔

”ہاں۔ بڑی حویلی۔“ مگر اس کا اطمینان ہنوز تھا۔

”مگر ڈرائیو۔“ اس سے بات کرنا ہی مشکل ہو گیا تھا۔

”دیکھو علیزے۔“ اگر میری اماں تمہاری خاطر وقار آئندی کو معاف کرنے کا حوصلہ کر سکتی ہیں تو پھر تمہاری خاطر یہ حوصلہ میں بھی کر سکتا ہوں۔ معاف کر دوں گا تو پوری طرح سے کروں گا کوئی کم طرفی نہیں دکھاؤں گا۔ البتہ رات کو میں نے تم سے جو کچھ بھی کہا وہ بس تمہیں جان بوجھ کر ڈرگمانے کے لیے اور آزمانے کے لیے کہا تھا کہ تم پھرے لیے کس حد تک جاسکتی ہو؟ یا پھر تمہارے اندر میرے لیے کتنا احساس باقی ہے؟ تم مجھ سے محبت بھی کر سکتی ہو یا صرف مجھ سے ہمدردی محسوس کرتے ہوئے یہاں تک آگئی ہو؟ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ تم ڈرگمانی نہیں اور نہ ہی تمہیں مجھ سے ہمدردی ہوئی ہے۔ بلکہ تم یہاں تک میری محبت اور میرے احساس میں آئی ہو۔ کیونکہ مجھے پتا ہے کہ کسی کی محبت دل میں ساری عمر دوائے رکھنے والے بھی اک دن برداشت کا دامن چھوڑ دیتے ہیں اور کھل کے سامنے آجاتے ہیں۔ اور محبت جاننے میں تو صرف اک لمحہ لگتا ہے اور وہ لمحہ ہی پوری زندگی پہ حاوی ہو جاتا ہے۔

اس لیے یہ بات اچھی طرح سمجھ لو۔ کہ میں تمہیں کبھی بھی قید کر کے یا دنیا سے کاٹ کے نہیں رکھوں گا بلکہ تم اپنی پوری آزادی سے اپنی مرضی سے اور اپنی حکمرانی سے زندگی جیو گی۔ یہ گھر تمہارا ہے۔ میں تمہارا ہوں اور میرا سب کچھ تمہارا ہے۔ تم جو چاہو کر سکتی ہو کیونکہ اب تم مالک ہو میری بھی اور میری ہر چیز کی بھی۔“ دل اور نے کوئی بھی لپٹی رکھے بغیر صاف صاف کہہ دیا تھا اور علیزے بے ساختہ اٹھ بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔

”لیکن ڈرائیو۔ میں بڑی حویلی نہیں جانا چاہتی۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

”کیوں؟ کیوں نہیں جانا چاہتی؟“ وہ بھی اس کے برابر ہی اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

”کیونکہ اس طرح جانے سے نہ تمہاری عزت، عزت رہے گی اور نہ میری۔“

”تو پھر۔“ دل اور سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

”اگر بڑی حویلی والوں کو ہماری کوئی قدر یا ضرورت ہوئی تو انہیں ہمارے گھر خود آنا ہو گا۔ ہمیں اپنے گھر بلانا ہو گا۔ ورنہ اس طرح جن بلائے میں بھی نہیں جاؤں گی، کبھی بھی نہیں۔“

اس نے سختی سے کہتے ہوئے انکار کر دیا تھا اور دل اور اس کا اتنا عقل مندانہ فیصلہ سن کر پہلے چند سیکنڈز کے لیے چیپ ہوا تھا۔ پھر حیران ہوا تھا اور پھر بے ساختہ مسکرایا تھا۔

”اس کا مطلب ہے کہ بہت سیانی ہو گئی ہو؟“ وہ اسے قریب کرتے ہوئے بولا تھا۔

”جو عورت اپنے گھر اور اپنے شوہر سے محبت کرنا جان سکتی ہے نا۔ وہ سیانی ہو ہی جاتی ہے۔“ علیزے اس وقت خالصتاً بیویوں والے روپ میں نظر آ رہی تھی اور دل اور کے دل میں عجیب شرارتی سی کھدبہ ہونے لگی تھی۔

”نہ کر دیا رنہ کر۔“ تمہاری ایسی محبت پاش باتوں سے مجھے پھر سے نشہ ہونے لگے گا۔ اور میں بھول جاؤں گا کہ اس وقت صبح ہے یا رات؟“ وہ بے حد گنبدیر لہجے میں کہتے ہوئے اس کے سلکی بالوں میں چہرہ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا اور علیزے اس کے گنبدیر لہجے اور اس کی بات کے مفہوم سے ہی چونک گئی تھی اور یکدم بدک کر بیڈ سے اٹھ بھی گئی تھی جس پہ دل اور قہقہہ لگا کر ہنسا رہا تھا اور واش روم میں کھس گئی تھی لیکن دو سیکنڈ بعد دروازہ کھول کر ذرا سا باہر جھانکتے ہوئے مخاطب ہوئی تھی۔ مگر بڑے ہی شرر سے انداز میں۔

”سو ری ڈرائیو۔ ایک بات تو میں نے کہی ہی نہیں۔ حالانکہ رات سے گننے کی کوشش کر رہی تھی۔“

”کیا بات؟“ وہ بھی کبل ہٹا کر بیڈ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”یہی کس۔“ وہ انگلی۔

”کیا یہی کہ؟“ وہ عجیب ہوا۔

”آئی۔“ سلی۔“ اسے ایک ایک لفظ بڑا ٹھہر ٹھہر کر بولی تھی اور دل اور پیروں میں سیلپر پہنا بھول گیا تھا۔

”کیا۔ کیا کہا؟ ایک بار پھر کو؟“ وہ واش روم کی طرف پلٹتے ہوئے بولا۔

”آئی۔“ سلی۔“ اسے سلی۔“ اسے پھر بولنے سے باز نہیں آئی تھی۔

”ڈر قریب آکر کہو۔ کیا کہہ رہی ہو؟“ وہ دو بے قدموں واش روم کی طرف بڑھا تھا اور علیزے اس کے جھپٹنے کا ارادہ بھانپتے ہی یکدم کھلکھلاتے ہوئے دروازہ بند کر چکی تھی اور دل اور ہاتھ ملتا رہ گیا تھا۔

”علیزے۔“ وہ جھجھکیا تھا۔

”جی علیزے کی جان۔ سن رہی ہوں۔“ علیزے نے اندر سے ہی بڑے محبت بھرے انداز میں پوچھا تھا۔

”باہر آؤ۔ مجھے بھی کچھ کہنا ہے۔“ وہ دواش روم کا دروازہ بجاتے ہوئے بولا۔

”شاور لے لوں۔ پھر آ جاؤں گی۔“ وہ بھی وہیں سے ہی جواب نوازی تھی۔

”بعد میں لے لیتا۔ پہلے میری بات تو سن لو۔“ وہ خفگی سے کہہ رہا تھا، لیکن اندر اب پانی کی آواز کے سوا خاموشی چھا گئی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ شاور لینا اشارت کر چکی ہے، جب ہی دل اور غصے سے دروازے کو گھورتا پلٹ گیا تھا۔

”باہر آؤ۔ پھر پوچھتا ہوں تمہیں۔“ اس کی مصنوعی دھمکی پہ علیز سے کے ہونٹوں پہ بھی مسکراہٹ بکھرنی لگی۔

جودت کے کارنامے کا سن کر بڑی حویلی والوں کو ایک بار پھر سانپ سو گئے گیا تھا اور وہ اپنی اپنی جگہ پہ سن سے ہو کر رہ گئے تھے۔ جبکہ آذر اپنے پورے ہوش و حواس میں ان سب سے یکسر مختلف کیفیت میں گھر اپنے خیالات اور آئندہ کے لیے لائحہ عمل سے آگاہ کر رہا تھا۔

اور اس کا پہلا اعلان یہی تھا کہ کوئی بھی تاخیر کیے بنا آج شام پوری تیاری سے شنگن لے کر مریم آئندی کے گھر جایا جائے۔ کیونکہ اب وہ مریم فاروق نیازی نہیں بلکہ مریم آئندی ہو چکی تھی۔ اب اس گھر کی عزت تھی وہ اس لیے وہ یہ کام جلد از جلد بنانا چاہتا تھا۔

”صرف شنگن لے کر جانے سے کیا ہو گا؟“ اسرار آئندی نے بھی لب کشائی کی تھی۔

”صرف شنگن لے کر جانے سے یہ ہو گا کہ شادی کی ڈیٹ فکس ہو جائے گی اور ہم اس ڈیٹ پہ بارات لے جائیں گے اور دوسری بات یہ کہ ان لوگوں کو آپ سے مل کر تسلی ہو جائے گی کہ ان کی بیٹی محفوظ ہاتھوں میں جاری ہے اور اسے ہر طرح کا تحفظ ملے گا۔“ آذر اب ہر محاذ پر اکیلا ہی جنگ لڑ رہا تھا۔

”حق مریم دو کروڑ کا ماؤنٹ لکھوا کر بھی انہیں ابھی اور تحفظ کی ضرورت ہے کیا؟“ ثمر بیگم نے خفگی سے کہا تھا۔

”ہاں۔ ہے ضرورت۔ کیونکہ ایک شریف اور عزت دار آدمی کی عزت کے سامنے یہ دو کروڑ کچھ بھی نہیں اور ویسے بھی یہ دو کروڑ انہوں نے نہیں ہمارے اپنے صاحبزادے نے لکھوائے ہیں۔ اس کی جگہ میں ہوتا تو دس کروڑ لکھواتا۔ لیکن افسوس کہ یہ نکاح میرے جانے سے پہلے ہو چکا تھا۔“ آذر نے اپنی سانس کو ایک کراڑا جواب دیا تھا۔ جس پہ پانی سب بھی چپ ہو گئے تھے۔

”تو شادی کی ڈیٹ کب کی فکس کرنی ہے؟“ اسرار آئندی بیٹے کی رائے پوچھ رہے تھے، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آذر جو بھی کہہ رہا ہے ٹھیک کہہ رہا ہے اور اب انہیں وہی کرنا ہے جو وہ کہے گا۔

”جب ہماری شادی ہوگی۔“ وہ ہر بات دو ٹوک طریقے سے کر رہا تھا۔

”یعنی تینوں شادیاں ایک ہی ڈیٹ کو رکھنی ہیں؟“

”نہیں۔ پہلے میری اور جودت کی شادی ہوگی۔ اور دوسرے روز دانیال کی۔ کیونکہ حرمت کو رخصت کرنے کے لیے ہمارا فارغ ہونا زیادہ ضروری ہے۔“ آذر کا مشورہ اچھا تھا۔ اس لیے کوئی بھی انکار نہیں کر سکا تھا اور اس نے یہ بھی اعلان کر دیا تھا کہ مریم آئندی کے ساتھ کوئی بھی اجنبیت اور نا انصافی نہیں برتے گا۔ اس کے ساتھ بھی وہی رویہ رکھا جائے گا جو اس حویلی کی بانی بیٹیوں اور سوؤں کے ساتھ رکھا جاتا ہے۔ اپنائیت، شفقت، محبت اور عزت والا۔

اس کے اس اعلان پہ سب نے سر تسلیم خم کر دیے تھے۔ کیونکہ اب اس حویلی کا سارا نظام اور وار و دار اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس لیے ثروت بیگم آج شام مریم کے گھر شنگن لے کر جانے کی تیاری کرنے لگی تھیں۔

”کیا بات ہے عبد اللہ بھائی اور نبیل بھائی سے کوئی کانٹھکٹ نہیں ہے تمہارا۔“ علیز سے ناشتا کرتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

”کیوں؟ تمہیں یہ خیال کیوں آیا؟“ وہ چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے بولا۔

”کل سے ان کا کوئی ذکر۔ یا ان کا کوئی فون نہیں سنا اس لیے۔“ علیز سے جوس پینے لگی۔

”کیا کل سے مجھے تم سے فرصت ملی ہے جو میں ان کا ذکر کرتا۔“

دل اور اس کے مقابل والی کرسی پہ بیٹھا اسے خاصی بے باک نظروں سے دیکھتا ہوا بڑے ذمہ داری سے انداز میں بولا تھا اور اس کی نظروں کی ایسی تپش اور لفظوں کی ایسی معنی نیازی پہ علیز سے کا چہرہ شرم سے گلابی پڑ گیا تھا۔

”لیکن میں نہیں چاہتی کہ تم میری ذات میں گم ہو کر اپنے بھائیوں جیسے دوستوں کو بھول جاؤ۔“ وہ پلکیں جھکاتے ہوئے بولی تھی۔

”اف یار۔ کب بھول رہا ہوں؟ ابھی تمہاری ذات میں گم ہوئے ایک دن ہی تو گزر رہا ہے۔ اور تم سے یہ بھی برداشت نہیں ہو رہا۔“ وہ خفگی سے کہتا چائے کا کپ واپس نبیل پر رکھ چکا تھا۔

”ہاں تو ٹھیک کہہ رہی ہوں نا اگر تم ان کی ذات میں گم ہو کے مجھے بھول جاؤ گے یا مجھے کم ٹائم دو گے تو مجھے تکلیف ہوگی دکھ ہو گا“ اسی طرح اگر میری ذات میں گم ہو کر انہیں بھول جاؤ گے یا انہیں کم ٹائم دو گے تو انہیں تکلیف ہوگی“ انہیں دکھ ہو گا۔ اس لیے میں چاہتی ہوں کہ تم اس چیز میں نیلنس رکھو۔ اور تینوں دوست پہلے کی طرح رہو۔“ علیز نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی اور دل اور مسکراتے ہوئے سمجھ بھی گیا تھا۔

”اوکے ما دام۔ جو آپ کا حکم۔“ اس نے سر خم کر دیا تھا۔

”مومنہ بھابی کے کیس کا کیا بنا؟“ علیز سے کورٹ کے فیصلے سے انجان تھی۔

”سزا ہو گئی ہے ملک حق نواز کو۔“ وہ دوبارہ چائے پینے لگا۔

”اچھا۔ کب؟“ وہ حیران ہوئی۔

”جب تم اسپتال میں تھیں۔“ وہ لا پرواہی سے بتا رہا تھا۔

”کیا سزا ہوئی ہے اسے؟“ وہ جانا چاہ رہی تھی۔

”سزائے موت۔“ اس کا انداز ہنوز تھا۔

”وہ کیوں؟ یہ سزا تو شاید مرڈر کیس والوں کو ہوتی ہے؟“ اسے بھی تھوڑا بہت علم تھا۔

”ہاں۔ مرڈر کیس والوں کو ہی ہوتی ہے اور ملک حق نواز کی گردن پہ چھ لوگوں کے خون کے چھینٹے تھے۔ حالانکہ اس نے کئی بے گناہ اور معصوم لوگوں کی زندگی کا خاتمہ کیا ہے، لیکن تھو لوگ ایسے تھے جن کے لواحقین پولیس اسٹیشن تک بھی پہنچے مگر ملک حق نواز کے بندوں کے ہاتھوں دبوچ لیے گئے تھے۔ اس لیے ان کی فائزر اوپن کروا کر سامنے لائی گئی اور ثبوت اور شواہد اکٹھے کیے گئے تو ملک حق نواز کے لیے عدالت کو سزائے موت کے علاوہ اور کوئی سزا نظر نہیں آئی، جبکہ ملک اسد اللہ ابھی تک اسے بچانے کی تک و دو میں لگا ہوا ہے، جو کہ بہت ہی ناممکن سی بات ہے۔“ دل اور نے اسے ذرا تفصیل سے بتایا تھا۔

”ہوں۔ تو پھر مومنہ بھابی تو بہت خوش ہوں گی آج کل؟“

”ہاں۔ بہت خوش ہیں۔ کیونکہ نبیل نے ان کے ساتھ کوئی نا انصافی اور کوئی کوتاہی نہیں برتی۔ بہت عزت کرتا ہے ان کی۔ اور بہت خیال بھی رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ فائزہ آئی نے پورا گھر ان کے ہاتھوں میں سونپ دیا ہے۔ اب سب کچھ کرنے دھرنے والی مومنہ بھابی ہی ہیں۔ اور دوسری طرف انہیں انصاف بھی مل چکا ہے۔“ دل اور بڑے سکون سے اسے آگاہ کر رہا تھا۔

”اوس یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ پھر۔“ علیزے کو حقیقتاً بہت خوشی ہوئی تھی۔
”صاحب جی! وہ ہر نبیل صاحب آئے ہیں۔“ زلفی کافی غلٹ میں اندر داخل ہوا تھا۔
”بیچے جناب! آگے آپ کے نبیل بھائی۔“ دل اور نبیل کن سے ہاتھ پونچھ کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔
”بٹھاؤ اسے میں وہیں آ رہا ہوں۔ علیزے تم چائے بنا دو اس کے لیے۔“ وہ زلفی سے کہہ کر علیزے کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

”اوس کے بنا دیتی ہوں۔ آپ جائیں۔“ وہ بڑی عزت اور بڑے احترام سے بولی تھی اور دل اور ٹھٹک کر نک گیا تھا۔
”کیا کہا؟ آپ۔“ اس نے آپہ زور دیا۔

”کیا کروں؟ آپ کی عزت کا سوال ہے۔ دوسروں کے سامنے اتنا احترام تو پھر کرنا ہی پڑتا ہے؟“ علیزے نے جیسے مجبوری ظاہر کی تھی۔
”اور اکیلے میں؟“ وہ اس کا اگلا جواب سننے کا منتظر تھا۔

”اکیلے میں احترام نہیں ہوتا۔“ وہ شرارت بھرے لہجے میں کہتی ہوئی آہستگی سے کرسی سے اٹھ کر نبیل کی دوسری سائیڈ پر چلی گئی تھی۔
”تو پھر کیا ہوتا ہے؟“ دل اور کے قدم پوری طرح سے واپس پلٹ چکے تھے۔

”پیار ہوتا ہے۔ محبت ہوتی ہے۔ اور ذرا نیور اور علیزے ہوتے ہیں۔“ اس کا انداز ایسا تھا کہ دل اور کا دل چل گیا تھا اور ابھی وہ اس کی طرف لپکنے ہی والا تھا کہ زلفی دوبارہ آگیا تھا۔
”نبیل صاحب کے ساتھ عدیل صاحب بھی ہیں۔ ان کے لیے بھی چائے بنا دیجیے گا۔“

”اف زلفی۔“ دل اور اس کی مداخلت پہ دل مسوس کے رہ گیا تھا اور علیزے اپنی ہنسی دباتی ہوئی کچن میں کھس گئی تھی۔

”کیا ہوا صاحب جی؟“ وہ اب صاحب جی کی طرف متوجہ ہوا تھا۔
”کچھ نہیں ہوا۔ اوس میرے ساتھ۔“ وہ کہہ کر باہر نکل گیا تھا۔



”السلام علیکم نبیل بھائی!“ علیزے بہت سلیقے سے دوپٹا اوڑھے ان کے لیے چائے لے کر آئی تھی۔
”وعلیکم السلام! کیسی ہیں بھابی۔“ نبیل اسے دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا تھا اور عدیل کو بھی اس کی تقلید کرنا پڑی تھی۔

”الحمد للہ! بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ سنا میں مومنہ بھابی مدیحہ اور فائزہ آئی کیسی ہیں؟ آپ ان لوگوں کو بھی ساتھ ہی لے آتے؟“ علیزے تو یوں بات کر رہی تھی جیسے اس کی ان سب سے صدیوں سے بے تکلفی اور گہرے مراسم چلے آ رہے ہوں۔

”آپ دعوت دیں گی تو ضرور آئیں گے۔“ نبیل مسکرایا۔

”لیکن میرا خیال ہے کہ انہوں کو دعوت دینے کی ضرورت نہیں پڑتی وہ خود ہی چلے آتے ہیں۔ اب تو وہ کافی سمجھ داری والی باتیں کرنا سیکھ گئی تھیں۔“

”یہ بھی ٹھیک کہا آپ نے۔ اوس کے ہم بغیر دعوت کے ہی آجائیں گے۔“
”تھینک یو۔ پلیز بیٹھیے نا۔“ وہ چائے کی ٹرے نبیل پر رکھ چکی تھی۔

”تھینکس۔ پلیز آپ بھی بیٹھیے۔ میں یہاں اسی لیے آیا ہوں کہ آپ دونوں سے بات ہو سکے۔“
”جی۔ کہہیے؟“ علیزے اندر سے جھجکتی ہوئی دل اور کے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھ گئی تھی کیونکہ اس سے ذرا ہٹ کے یا دوسرے صوفے پر بیٹھتی تو یقیناً ”زور“ ہو جاتی۔
”جوروت کے نکاح کا پتا چلا آپ کو؟“ نبیل نے بات شروع کی۔

”جوروت کے نکاح کا؟ کیا مطلب؟ میں سمجھی نہیں؟“ اس نے ذرا الجھ کر دل اور کی سمت دیکھا۔
”میں بتاتا ہوں آپ کو۔“ نبیل نے بات بتانی شروع کی اور پھر اینڈ تک جا کر ہی اسٹاپ لیا تھا۔ لیکن اتنے میں علیزے کی رنگت زرد پڑ گئی تھی۔ اس کے کانوں میں سائیں سائیں کی آواز گونجنے لگی تھی۔

”پلیز آپ پریشان نہ ہوں۔ معاملہ حل ہو چکا ہے۔ بس اب یہ مسئلہ ہے کہ وہ لوگ آج شام کو شنگن لے کر آنا چاہ رہے ہیں اور شادی کی ڈیٹ فکس کرنا چاہ رہے ہیں۔ اس لیے عدیل پریشان ہے اور الجھا ہوا ہے کہ اسے کیا کرنا چاہیے؟ کیا اتنی جلدی یہ سب کرنا ٹھیک ہو گا؟ ہم لوگ تو آپ کی فیملی کو نہیں جانتے۔ لیکن آپ کی فیملی کو آپ دونوں سے بہتر کوئی بھی نہیں جانتا۔ اس لیے زیادہ بہتر مشورہ آپ ہی دے سکتے ہیں۔“ نبیل نے ان دونوں کے چروں کی سمت دیکھا تھا۔

”اس میں زیادہ پریشان ہونے کی اور مشورے کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وہ لوگ شنگن لے کر آتے ہیں۔ آپ شنگن لے کر رکھ لو اور شادی کی ڈیٹ بھی فکس کر دو۔ کیونکہ ایسے کاموں میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ میں نے ان دونوں کا نکاح کروایا تھا تو بہت سوچ سمجھ کر کروایا تھا۔ مہم تمہاری نہیں ہماری بھی بہن ہے۔ اس لیے ہم تمہیں کوئی غلط مشورہ ہرگز بھی نہیں دیں گے۔ باقی رہا شادی کے اخراجات کا مسئلہ تو سمجھو کہ وہ بھی حل ہو جائے گا۔ ہم تمہیں کوئی خیرات نہیں دیں گے۔ البتہ تم ہم سے اوجھار ضرور لے سکتے ہو۔ بعد میں آہستہ آہستہ رقم ادا کرونا۔“ دل اور ہمیشہ کی طرح اصل مسئلے تک جا پہنچا تھا۔

”اس طرح تو تم ایمن کی شادی بھی بننا سکتے ہو۔ شہریار سے کو وہ بھی آج ہی شنگن لے آئے۔“ نبیل کو ایمن کا بھی خیال آیا تھا۔

”مگر۔“ عدیل نے کچھ کہنا چاہا۔

”اگر مگر کچھ نہیں۔ آج یہ دونوں کام نبٹ جانے چاہئیں۔ شہریار کی ای کو کال کرو۔“ نبیل بھند ہوا اور پھر عدیل کو مجبوراً ”یہ کام کرنا ہی پڑا تھا۔“

”ویری گنڈ۔ اب یوں سمجھو کہ تم ان دونوں فرائض سے فارغ ہو گئے اور سرخو بھی۔“ نبیل نے اسے چھکی دی تھی۔

”تھینک یو سر۔ یہ سب آپ لوگوں کی ہیلپ اور حوصلہ افزائی کی وجہ سے ہی تو ہو رہا ہے۔ ورنہ تو۔“ عدیل نے مایوسی سے سر ہلایا تھا۔

”اوسے نہیں یار! ہوتا ہی ہے جو انسان کی قسمت میں ہوتا ہے۔ بس میرے اور تمہارے جیسے لوگوں کو اللہ وسیلہ بنا دیتا ہے۔ حالانکہ ہم کرتے کچھ بھی نہیں بس وسیلہ بنتے ہیں۔ کرنا تو اللہ کی ذات کا کام ہے۔ ہم تو اس کی رضا کے بغیر مل بھی نہیں سکتے۔“ نبیل نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کندھے اچکائے تھے۔

دل اور نبیل اور عبد اللہ جب بھی کسی کی ہیلپ کرتے تھے تو کچھ اس طرح کہ اگلے بندے کے خمیرہ کسی قسم کا کوئی بوجھ نہ پڑتا اور نہ ہی اسے شرمندگی ہوتی۔ عدیل کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی سلسلہ تھا ان کا۔ کیونکہ انہیں پتا تھا کہ وہ غریب ہونے کے ساتھ ساتھ خود دار بھی ہے۔

"میں نے ایک فیصلہ اور کیا ہے دل اور نبیل یہ نہ سمجھنا کہ میں نے تم سے مشورہ نہیں کیا۔ بس سچویشن ایسی تھی کہ مجھے بات کرنا پڑ گئی۔ اگر بہت سوچ سمجھ کر کرتا تو تم سے پوچھتے بغیر نہ کرتا۔" نبیل نے اس بددستی بات کہنے کے لیے تمہید باندھی تھی۔

"یہی ناکہ تم مدیجہ کا رشتہ عدیل کے ساتھ طے کر چکے ہو؟" دل اور نبیل نے اس کی بات کا پرہ خود ہی ہٹا دیا تھا اور نبیل عدیل اور علیزے تینوں ہی بے ساختہ چونک کر دیکھنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

"تمہیں کیسے پتا چلا؟" نبیل کو شدید ترین حیرت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

"تو کیا مدیجہ کے صرف ایک تم ہی بھائی ہو؟ میں کچھ بھی نہیں ہوں؟ ہر بات کا تمہیں ہی پتا چل سکتا ہے مجھے نہیں؟" دل اور نبیل کے لہجے میں خفگی تھی۔

"نہیں۔ نہیں۔ میں ایسا کب کہہ رہا ہوں۔ مگر یہ بات تو۔" نبیل کی حیرت ہنوز تھی۔

"تم مجھ سے کوئی بات چھپا سکتے ہو، مگر مدیجہ نہیں۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

"اوہ۔ تو یہ بات مدیجہ نے بتائی ہے؟" نبیل ریلیکس ہو گیا تھا۔

"ہاں۔ اور مجھے اس کا انتخاب بہت اچھا لگا ہے۔ اس کے حوالے سے اگر ہم بھی کچھ سوچتے تو ایسا ہی سوچتے۔ میری طرف سے ہاں ہے۔ بس اب شادی کے بارے میں کوئی فیصلہ مت کرنا۔ وہ میں خود کروں گا۔"

دل اور نبیل نے آخر میں نبیل کو سمجھا بھی دیا تھا۔ جس پر وہ تینوں ہی مسکرا دیے تھے۔



آج منڈے تھا اور رات کو دل اور اسے تاکید کر کے سویا تھا کہ وہ اسے صبح ذرا جلدی چکاوے کیونکہ اسے ایک کیس کے سلسلے میں کورٹ پانچنا تھا۔ اسی لیے علیزے اسے دوبار آواز دے کر جا چکی تھی، مگر تیسری بار اس نے کوئی اور حربہ آزمانے کی کوشش کی تھی۔

"ڈرائیو۔" وہ آہستگی سے سرگوشی کرتے ہوئے بولی تھی۔

"ہوں۔" وہ گہری نیند سے بولا۔

"ڈرائیو میری جان! کورٹ جانے کا ٹائم ہو رہا ہے۔ اٹھنا نہیں ہے کیا؟" علیزے کی ایسی جان لیوا سرگوشی پہ دل اور نبیل کی ساری نیند ہوا ہو گئی تھی۔

"علیزے۔" وہ خاصی بوجھل آواز میں بولا۔

"ہوں۔" جو اب وہ بڑی نرمی سے پیش آرہی تھی۔

"میری جان! تمہیں پتا ہے نا۔ تمہاری ایسی سرگوشیوں اور تمہاری ایسی آوازیں پہ کیا حال ہو جاتا ہے میرا؟ مجھ سے برداشت نہیں ہو پاتا۔ بالکل ہونے لگتا ہوں میں۔ اور تم صبح ہی صبح میری نیت خراب کرنے کے درپے ہو رہی ہو؟" دل اور نبیل نے جس انداز میں کہا تھا علیزے کے لیے خطرے کی گھنٹی بج گئی تھی۔ اس نے ایک دم دل اور نبیل کے کندھے سے الگ ہونا چاہا تھا، مگر تب تک وہ یک دم کورٹ بند لگے ہوئے اسے اپنے حصار میں جکڑ چکا تھا۔

"اب کہاں؟ اب ہر بار تمہاری چالاکی ہی تو کام نہیں آئے گی نا؟" دل اور نبیل نے اسے اپنے سینے میں جکڑ لیا تھا۔

اور علیزے بری طرح پھڑپھڑاتی تھی۔

"اف۔ پلیز ڈرائیو۔ میں کچن کھلا چھوڑ آئی ہوں۔ پلیز سب کچھ خراب کر دے گی۔" وہ چیخی تھی۔

"اور یہ پلیز صبح سے میر کو سونے نہیں دے رہی؟ اس کا کیا کروں میں؟" دل اور نبیل دیکھتے ہی دیکھتے کئی حیرت انگیز کڑواہٹیں اور علیزے اپنا بچاؤ ہی کرتی رہ گئی تھی۔

"نفل۔" علیزے زور سے چیخی تھی اور دل اور نبیل نے ایک دم اسے اپنی گرفت سے آزاد کر دیا تھا۔ لیکن علیزے کی حالت دیکھ کر بے ساختہ مسکرا بھی دیا تھا۔

"آئندہ کبھی تمہیں جگانے کی کوشش نہیں کروں گی۔" وہ غصے سے تلملائی تھی۔

"میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ کیونکہ اتنے اچھے اور رومینٹک طریقے سے جگانے کی کوشش کرو گی تو کس کا فرکا جائے گا؟ اس سے تو بہتر ہے کہ میں الارم سیٹ کر کے سو جاؤں۔" دل اور اسے چھوڑنے والے انداز میں کہہ رہا تھا اور علیزے خفا ہو گئی تھی۔

"اوکے! انہیں جگاؤں گی۔ لیکن اب اگر جاگ ہی گئے ہو تو پورا مہرانی نیچے آکر ناشتا کرو، مجھے مدیجہ وغیرہ کے ساتھ شاپنگ پہ بھی جانا ہے۔" وہ خفگی سے کہہ کر باہر نکل گئی تھی اور دل اور نبیل آواز سن کر منٹ میں تیار ہو کر نیچے کچن میں آگیا تھا۔

"علیزے چوہے پہ کیتلی رکھے اس کے لیے چائے بنانے میں مصروف تھی، جب دل اور نبیل پیچھے سے آکر بے حد نرمی سے اسے فریب کیا۔

"گڈ مارننگ میڈم!" وہ اس کے بالوں سے ہوسہ دیتے ہوئے بولا جس پر علیزے کو بے ساختہ ہلکی سی گدگدی سی ہوئی تھی۔ مگر اس نے کہا کچھ نہیں تھا۔

"خفا ہو۔؟" دل اور اس کے ہاتھ کو بہت ہی نرمی سے چھو رہا تھا اور علیزے اس کے ہاتھوں میں موم کی طرح پکھلنے لگی تھی۔ کیونکہ اس کی قربت کی اور اس کے ہاتھوں کے لمس کی تپش ہی کچھ ایسی تھی کہ۔

"ہو لو نا۔ خفا ہو مجھ سے۔" دل اور نبیل اسے آہستگی سے بھیجنا۔

"نہیں۔ پتا نہیں کیا بات ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ میں کبھی تم سے خفا نہیں ہو سکتی۔ ایسا کروں گی تو مرجاؤں گی۔" علیزے نے بے اختیار نفی میں سر ہلایا تھا۔

"لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے بار بار خفا ہوتی رہو اور میں تمہیں ہر طرح سے منانے کی کوششیں کرنا رہوں۔" وہ کہتے کہتے ایک شرارت بھی کر گیا تھا اور علیزے بے ساختہ اس کے حصار سے نکل کر اسے گھورتے لگی تھی۔

"لیکن فی الحال مجھے منانے کی کوشش کرنے سے بہتر ہے کہ تم کورٹ جانے کی کوشش کرو، کیونکہ ٹائم زیادہ ہو گیا ہے۔" اس نے کلاک کی طرف اشارہ کیا تھا اور وال کلاک کی سمت دیکھ کر دل اور نبیل گھوم گیا تھا۔

"اوہ مائی گڈ۔ جلدی ناشتا دو۔" وہ سر پہ ہاتھ مارتا فوراً "کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا تھا اور علیزے نے بڑی معاونت منڈ سے ناشتا لگا دیا تھا۔



صبح اور جودت کی شادی سے ایک دن پہلے مدیجہ اور عدیل کی منگنی ارنج کی جارہی تھی اور مدیجہ نے اس پھوسے سے فنکشن کی تیاری کے لیے مومنہ، نگارش اور علیزے کو خاص طور پر انوائٹ کر رکھا تھا اور شاپنگ بھی ایک ساتھ کرنے کا کہا تھا۔ اسی لیے علیزے دل اور نبیل کے کورٹ جانے کے فوراً بعد ہی گلاب خان کے

ساتھ بیل کے گھر آگئی تھی اور پھر نگارش کے آتے ہی وہ لوگ فائزہ بیگم کو ساتھ لیے گلاب خان کی گمرانی میں شاپنگ کرنے چلی گئی تھیں۔ اور دن بھر شاپنگ کے لیے خوار ہونے کے بعد علیزے واپس گھر آئی تو دل اور کمر بے حد آف موڈ کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھے میگزین الٹ پلٹ کرتے دیکھا تھا۔ وہ اس کے تیور دیکھ کر دل سے ہی پریشان ہو گئی تھی۔

”السلام علیکم!“ ڈرتے ڈرتے سلام کیا گیا تھا۔
 ”وعلیکم السلام!“ اس نے بغیر اس کی سمت دیکھے جواب دیا تھا۔
 ”تم کب آئے؟“ وہ آہستگی سے شاپنگ بیگ صوفے پر رکھتے ہوئے خود بھی بیٹھ گئی تھی۔
 ”پانچ بجے۔“ جواب انتہائی مختصر تھا۔

”اور اب سات بج رہے ہیں۔ دو گھنٹے ہو گئے ہیں۔ اور تم ابھی تک ایسے ہی بیٹھے ہو۔“ چنچ بھی نہیں کیا۔
 علیزے کو اچنبھا ہوا تھا۔

”تم صبح سے بے فکر پھر رہی ہو کیا تمہیں میرا ذرا بھی خیال نہیں تھا کہ میرے گھر آنے کا ٹائم ہو رہا ہے؟“ دل اور ایک روایتی شوہر کے سے روپ میں نظر آیا تھا۔
 ”خیال تو تھا۔ لیکن وہ دجسٹ۔“ علیزے نے کچھ جزبہ بڑی ہونے لگی تھی۔

”دجسٹ۔“ مدحیہ اہم ہے یا میں؟“ وہ ایک دم میگزین پلچ کر کھڑا ہو گیا تھا اور علیزے دیکھ گئی تھی اور اس کو یوں دیکھتے دیکھتے کر دل اور لے لے ڈگ بھرتا اور اپنے بیڈ روم میں چلا گیا تھا اور اس کے جاتے ہی علیزے کا دل کچھ فریش ہوا تو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بحال ہوئی اور ذہن میں ایک خیال کوندے کی طرح لپکا تھا۔ اسی لیے دس پندرہ منٹ بعد وہ بھی کمرے میں آگئی تھی۔

”ایم سوری۔“ تمہیں مجھ سے بہت غصہ ہے۔ لیکن میں اس غصے کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ میں بڑی حویلی جاری ہوں۔ گلاب خان سے کہو مجھے چھوڑ آئے۔“

علیزے بہت نارمل طریقے سے کہتی ہوئی وارڈروب کی طرف بڑھ گئی تھی اور اس میں سے بلا وجہ ہی کچھ تلاش کرنے لگی تھی۔

”کیا۔ کیا کیا تم نے؟ تم بڑی حویلی جاری ہو؟“ وہ ابھی ابھی شاور لے کر نکلا تھا اور اس کی بات سنتے ہی تونکہ رگڑتے اس کے ہاتھ ٹھہر گئے تھے۔

”میں نے وہی کہا ہے جو تم سن چکے ہو۔ میں بڑی حویلی جاری ہوں۔ اللہ حافظ۔“ علیزے کہہ کر وارڈروب بند کر کے دروازے کی سمت بڑھ گئی تھی اور دل اور کمرے کے تو جیسے ہاتھوں کے توڑے اڑ گئے تھے۔

”علیزے۔“ وہ ایک دم اس کے پیچھے لپکا اور اسے دروازے کے قریب ہی دیوچ لیا تھا۔
 ”ناگل ہو گئی ہو؟“ اس نے علیزے کو جھنجھوڑا۔

”تو پھر تم غصہ کیوں کر رہے تھے؟ ناراض کیوں ہو رہے تھے؟“ وہ منہ پھلا کر بولی۔
 ”میں تو مذاق کر رہا تھا۔ ستا رہا تھا تمہیں۔“ وہ خفگی سے جھنجھایا۔

”تو میں کون سا سیریس کہہ رہی ہوں؟ میں بھی تو مذاق کر رہی ہوں۔ ستا رہی ہوں تمہیں۔“ علیزے نے بڑی معصومیت سے کہتے ہوئے کندھے اچکائے تھے۔

”واٹس؟“ وہ ایک دم چیخا اور علیزے اس کا رد عمل دیکھ کر یک دم کھکھلا کے ہنس گئی تھی اور دل اور اسے بڑے شاک کے باوجود اس کی ہنسی میں کھو گیا تھا اور یوں ہی ایک دوسرے کو دیکھتے دیکھتے اور ہنسی ہنسی میں وہ دونوں

ایک دوسرے میں کم ہو گئے تھے۔ دروازے سے پشت نکائے کھڑی علیزے کے دونوں ہاتھوں کا لمس دل اور کمرے کے سینے پر محسوس ہو رہا تھا اور دل اور کمرے کے دونوں ہاتھ اس کے دائیں بائیں دروازے پہ جمے ہوئے تھے اور مدھوشی ایسی تھی کہ وہ دونوں ہی ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو پائے تھے کیونکہ اس فسوں خیز اور قیمتی لحات میں توان کی سانسیں بھی ایک ہو چکی تھیں۔ وہ اس سحر سے نکلتے بھی تو کیسے؟

لیکن افسوس کہ مداخلت کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی پہنچ ہی گیا تھا۔ دروازے پہ ہلکی سی دستک ہوئی تھی۔ مگر ان دونوں نے دروازے کے قریب کھڑے ہونے کے باوجود بھی کوئی ٹوٹ نہیں لیا تھا اور نہ ہی جواب دیا تھا۔ اسی لیے پھر دوبارہ دستک ہوئی تھی۔

”علیزے بی بی۔ نیچے آئیے۔ بڑی حویلی والے آئے ہیں۔“ گل نے باہر سے ہی پیغام پہنچا دیا تھا اور اس کے پیغام پہ وہ دونوں ہی چونک کر حواسوں میں لوٹ آئے تھے۔

”بڑی حویلی والے؟“ علیزے ہنسی۔
 ”نہیں اؤکے۔ پہلے فریش ہو جاؤ پھر نیچے جاؤ۔“ دل اور اطمینان سے اس کا گل تھپکتا ڈرائنگ ٹیبل کے سامنے جا رہا تھا اور شرٹ پہن کر بٹن بند کرنے لگا تھا۔

”اور تم؟“ وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔
 (آخری قسط ان شاء اللہ اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں)

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے 4 خوبصورت ناول

میرے خواب لوٹاؤ	کسی راستے کی تلاش میں	شریک سفر	ساری بھول ہماری تھی
نگہت عبد اللہ	میمونہ خورشید علی	زہرہ ممتاز	راحت جبین
قیمت - 400/- روپے	قیمت - 350/- روپے	قیمت - 550/- روپے	قیمت - 300/- روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37 اردو بازار، کراچی
 فون 32735021



بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزوے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدھیہ اور نبیلہ حیات دہی بہن بھائی ہیں، مدھیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں کھل چوریہ رنگ چکی ہے جس کے پیش نظر فائزہ بیگم، نبیلہ کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں، لیکن مدھیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے جس پر نبیلہ اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کالی عرصے سے لوکری کی تلاش میں ہے مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، بے بسی اور مجبوری سے تنگ آکر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے، لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے باوا امتیاز مل جاتا ہے جو اسے کام کی آفر کرتا ہے جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھتا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میسرک پاس آوی ہے وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے لوکری مانگنے آتا ہے وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل اور شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے وہ اپنے قول و فعل کا بہت بکا آدمی ہے اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پر بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دیتی ہیں۔



اور دل اور ڈرنک ٹیبل کے سامنے کھڑے کھڑے اس کے سوال پہ ٹھک گیا تھا۔ کیونکہ وہ سمجھ رہا تھا کہ علیزے کو اپنے دھیان میں اس کا دھیان نہیں رہے گا، لیکن یہ اس کی غلط فہمی تھی علیزے کو اب سارے دھیان ہی اس کے ہوتے تھے اسے بے دھیانی میں بھی اسی کے دھیان رہتے تھے۔

”ڈرائیو بس! اس نے دل اور کو پھر سے متوجہ کیا۔“
”اوکے۔ تم چلو۔ میں بھی آتا ہوں۔“ اس نے علیزے کا یہ مان بھی رکھ لیا تھا۔
”نہیں۔! ہم دونوں ایک ساتھ جائیں گے۔“ علیزے کا فیصلہ اکٹھے جانے کا تھا۔
”اوکے۔ اوکے۔! ایک ساتھ ہی چلتے ہیں۔ تم فریش ہو کر آ جاؤ تب تک وٹ کرتا ہوں۔“ اس نے اسے تسلی دی تھی اور علیزے اس تسلی یہ ریلیکس ہو کر واش روم میں کھس گئی۔



عائشہ آندھی دل اور علیزے کو ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے دیکھ کر ہی یک دم اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی تھیں۔

”السلام علیکم! دل اور نے خاصی بلند آواز میں سلام کیا تھا اور اس کے سلام پہ باقی سب بھی اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے البتہ سب سے پہلے آگے بڑھنے والی عائشہ آندھی تھیں جنہوں نے بے ساختہ اور والہانہ انداز میں دل اور شاہ کو گلے سے لگالیا تھا۔

”وعلیکم السلام! میرے بچے۔ جیتے رہو۔ سدا خوش رہو۔ اللہ میری عمر بھی تمہیں لگا دے تم میری زہرو کے چاند ہو۔ میری زہرہ کے جگر ہو۔ اس لیے اب میری آنکھوں کا نور ہو تم۔ میرے بچے کی ٹھنڈک ہو۔ تمہارے حوصلے بہت بلند ہیں۔ تمہارا ظرف بہت اعلا ہے۔ اس لیے ہم سب کو معاف کر دو۔ ہم معافی کے طلب گار بن کر آئے ہیں۔“ عائشہ آندھی نے اس سے الگ ہوتے ہوئے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے اور دل اور ان کے اس طرح معافی مانگنے پر گھبرا گیا تھا۔ اس نے سپنا کر ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے تھے۔

”پلیز آئی۔! یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟ میں ایسی معافی کے حق میں ہرگز بھی نہیں ہوں۔ آپ کی عزت آپ کا احترام سر آنکھوں پہ لیکن ایسا کچھ میں بھی نہیں چاہوں گا۔“

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے انہیں منع کیا تھا اور عائشہ آندھی کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے وہ بے ساختہ رو پڑی تھیں جس پہ دل اور نے ان کے ہاتھ تھپک کر تسلی دیتے ہوئے انہیں دونوں کندھوں سے تھامے قریبی صوفے پہ بٹھادیا تھا۔

اور پھر باقی سب کی طرف متوجہ ہوا تھا جو اس کے عائشہ آندھی کی طرف سے نارغ ہونے کے منظر تھے۔

”السلام علیکم! سب سے پہلے آگے بڑھنے والا آندھا دل اور نے اس کے مصالحتی کے لیے بڑھے ہوئے ہاتھ اور جھکے ہوئے سر کو اک نظر دیکھا اور پھر یہاں بھی اک اعلا ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے اس سے ہاتھ ملائے کی بجائے اپنے دونوں بازو کھول دیے تھے جس پہ علیزے کے ساتھ ساتھ باقی سب بھی حیران رہ گئے تھے اور آندھ نے بے اختیار اسے اپنے سینے سے لگالیا تھا۔

”تمہیں کت یویا۔! تمہیں کت یوسوچ۔“ آندھ نے بڑے بے ساختہ انداز میں اس اس کا شکریہ ادا کیا تھا۔ پھر باری وانیال، جودت، زین، احمد، حماد، عون، عدید، کول، فرحت، انوشہ، جویریہ، ثروت، بیگم، شمو بیگم، اسرار آندھی، اظہار آندھی اور سب سے آخر میں آسیہ آندھی اس سے ملی تھیں۔ جن سے مل کر دل اور کے دل کو کچھ ہوا تھا کیونکہ ان کی شخصیت ان کی ذات میں اک عجیب سی اداسی مٹی ہوئی نظر آ رہی تھی اور اس اداسی اور اس درد کو

دل اور سے بہتر شاید کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔

”نہیں نے کہا تھا۔! آپ یہ ابھی ہوئی سمجھی نہ سلجھا سکیں۔“ وہ بے حد اہستگی سے بولا تھا۔

”لیکن بے خبری کی زندگی جینے سے آگہی کی اذیت اچھی ہوتی ہے انسان بے وجہ خوش رہنے سے توجہ جاتا ہے نا۔ خوش فہمی تو نہیں رہتی کسی پہ مان تو نہیں رہتا نا۔ جس جو کچھ ہوتا ہے سامنے آ جاتا ہے۔“ آسیہ آندھی کا مشکل سا جواب سن کر دل اور چند سیکنڈز کے لیے چپ سا ہو گیا تھا۔

”لیکن آپ بھی اگر زہرہ بول شاہ اور دل اور شاہ جیسا ظرف بڑا کر لیں تو کچھ بھی نہیں بگڑے گا۔“ اللٹاوا انہیں سچا رہا تھا اور آسیہ آندھی محض سر ہلا کر رہ گئی تھیں۔

”علیزے بیٹا۔! ادھر آؤ۔ ہم تم دونوں کے لیے ہی آئے ہیں۔ ادھر آؤ ہمارے پاس بیٹھو۔“

اسرار آندھی نے سب سے ہٹ کے ذرا فاصلے پہ کھڑی علیزے کو اپنے قریب بلایا تھا۔ اور وہ آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی ان کے پاس آکر بیٹھ گئی تھی اور اسرار آندھی نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کا ہاتھ چوم کر اسے اپنے کندھے سے لگالیا تھا۔

اتنے میں دل اور بھی آذر اور وانیال کے برابر بیٹھ چکا تھا۔ اور سب کے بیٹھنے کے بعد ہی اسرار آندھی نے اپنی بات کہنے کے لیے تمہید باندھنی شروع کی تھی۔

”دیکھو دل اور بیٹا۔! ماضی میں جو کچھ ہو چکا ہے اس کا ہم سب کو ہی بے حد دکھ اور افسوس ہے اور اس دکھ اور افسوس کے باوجود ہم نہ تو کوئی مدد کر سکتے ہیں اور نہ ہی کوئی تلافی ہو سکتی ہے۔ ہم لاکھ معافیاں مانگیں تم سے مگر ہمیں پتا ہے کہ پھر بھی کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ہاں البتہ انسانیت کے ناتے اور اپنے رب تعالیٰ کا خوف اپنے دل میں رکھتے ہوئے تم اپنے ظرف کو کشادہ کر کے ہمیں دل کی گہرائیوں سے معاف کرتے ہو تو یہ تمہارا ہم پہ تاحیات بہت بڑا احسان ہو گا۔ ہم وہ معافی نہیں چاہتے جس کے بعد بھی ہم ایک دوسرے سے فاصلے پہ ہی رہیں بلکہ ہم وہ معافی چاہتے ہیں جس کے بعد ہمارے دلوں کی گدورتیں اور آپس کے فاصلے مٹ جائیں اور ہم ایک دوسرے کے قریب آسکیں۔ ایک دوسرے کی غم اور خوشی میں شریک ہو سکیں۔ ایک دوسرے کو اپنا سمجھ کر اور اپنا بن کر۔“

اسرار آندھی کی تمہید خاصی لمبی ہو گئی تھی کیونکہ وہ دل اور کو اپنے طور پہ سمجھانا چاہتے تھے۔

”ایسی معافی کے حق میں تو میں بھی نہیں ہوں آندھی صاحب۔! دو غلا پن مجھے بھی نہیں آتا میں جب دشمن ہوں تو دشمنی کے سوا کچھ یاد نہیں رکھتا اور جب دوست ہوں تو دوستی کے سوا ہر چیز بھول جاتا ہوں۔ خیر اب کیا چاہتے ہیں۔ آپ وہ بتائیں۔“ اس نے کہتے ہوئے سر جھٹکا تھا۔

اور اسرار آندھی نے باقی سب پہ اک طائرانہ سی نظر ڈالی تھی اور دوبارہ سے سلسلہ کلام جوڑا۔

”ہم چاہتے ہیں کہ تم اور علیزے آذر، جودت اور وانیال کی شادی میں شرکت کرو۔ ہم تم دونوں کو انوائٹ کرنے کے لیے آئے ہیں۔“

انہوں نے صوفے کی سائیڈ پہ رکھا الوٹیشن کارڈ اٹھا کر درمیانی ٹیبل پہ دل اور کے سامنے رکھ دیا تھا اور دل اور کی نظریں اس چمکتے دکتے ریڈ اور سلور کلر کے کارڈ پہ ٹھہر گئی تھیں۔

”اگر تم یہ کارڈ قبول کرتے ہو تو ہمیں بے انتہا خوشی ہوگی۔“ اسرار آندھی نے ایک اور لقمہ دیا تھا۔

”میں علیزے کو قبول کر چکا ہوں تو سمجھیں کہ علیزے سے دلہنشاہ ہر چیز کو قبول کر چکا ہوں۔ یہاں تک کہ یہ کارڈ بھی۔“ دل اور نے ذرا سا آگے جھپکتے ہوئے ٹیبل پہ رکھا وہ کارڈ اٹھا لیا تھا اور اس کی بات پہ وہاں موجود سب علی افراد میں خوشی کی اک لہری دوڑ گئی تھی۔

اور علیزے نے بے ساختہ دل اور طرف دیکھا تھا اور دل اور اس کے دیکھنے سے ہی جان گیا تھا کہ اندر سے کن لپٹنگز کا شکار ہو رہی ہے اور کیا سوچ رہی ہے۔
وہ اس کی آنکھوں کی مشکور سی جنبش سمجھ گیا تھا اور ہلکے سے مسکرایا تھا۔
”علیزے! کیا اپنے میکے والوں کی کوئی خاطر تواضع نہیں کر دگی؟ یا پھر پونی بیٹی بھی رہو گی۔“
دل اور نے ہی اسے متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی اور وہ اس کی بات پہ نچل ہوئی اٹھ کر کچن میں آگئی تھی جہاں گل پہلے سے ہی تیار یوں میں مصروف تھی۔



کون اس گھر کی دیکھ بھال کرے۔

روز ایک چیز ٹوٹ جاتی ہے

”زری! آؤ نا۔ مدد چاہتے ہیں بلاری ہے۔“

عبداللہ نے اپنے دھیان میں کم بیٹھی زری کو متوجہ کیا تھا اور زری چونک کر رہ گئی تھی۔ اور اس کی نظر ملا ازان نگارش اور مومنہ بیٹی بھی ہوئی تھیں۔

جن کو دیکھ کر زری نے بے حد آہستگی سے نفی میں سر ہلایا تھا۔

”نہیں بھائی! وہاں ابھی میری جگہ نہیں۔“ اس کے ہلکے سے انکار پر عبداللہ نے فوراً ”گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا تھا جہاں ان تینوں کی بیویاں موجود تھیں اور تینوں ہی بہت خوش نظر آ رہی تھیں اور جہاں واقعی زری کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی جس پر واقعی عبداللہ کے دل کو کچھ ہوا تھا۔

اور وہ بے ساختہ زری کے قریب بڑی کرسی کھینچ کر اس کے مقابل ہی بیٹھ گیا تھا۔ اور بے حد نرمی اور بے حد محبت سے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے تھے۔

”میں جانتا ہوں کہ تمہیں شاعری بہت پسند ہے اور تمہارا انداز اور تمہارا حافظہ بھی بہت عمدہ ہے لیکن اس کے باوجود میرے ذوق اور میرے حافظے کی سلیٹ پر ایک شعر ابھر رہا ہے شاید کہ یہ شعر ایک دو لفظ کے ہیر پھیر سے کچھ غلط ہو جائے لیکن پھر بھی کوشش کرتا ہوں تمہیں سنانے کی شعر کچھ یوں تھا کہ۔

اس دنیا میں کسی کو بھی مکمل جہاں نہیں ملتا

کسی کو زمین نہیں ملتی تو کسی کو آسمان نہیں ملتا

عبداللہ کے اک عجیب سے لہجے میں کہے ہوئے شعر پر زری کی آنکھوں کے گوشے نم ہو گئے تھے۔

”تو میری جان اس شعر کا مفہوم تو تم سمجھ ہی گئی ہو گی کیونکہ شاعری کی زبان تم مجھ سے زیادہ بہتر جانتی ہو لیکن پھر بھی یہ واضح کرتا چلوں کہ جن لوگوں کو تم دیکھ رہی ہو نا اپنی اپنی جگہ پہ ملے یہ بھی نہیں ہیں! نہیں بھی زندگی میں کسی کو زمین نہیں ملی تو کسی کو آسمان نہیں ملا۔“

علیزے بھابھی اور دل اور کے ماضی سے کیا کیا اذیتیں جڑی ہیں یہ تم بھی جانتی ہو اور میں بھی۔ بے شک وہ لوگ ایک دوسرے کو معاف کر بھی دیں لیکن وقار آئندہ کے نام کا کاٹنا ان کے دلوں میں ہمیشہ چبھای رہے گا جس کو نہ علیزے نکال سکتی ہے نہ دل اور اور نہ ہی ان کے گھر والے اور ایسا ہی ایک کاٹنا بیل اور مومنہ بھابھی کی زندگی میں بھی پیوست ہے وہ بھی ایک دوسرے کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں تو کھپو دماڑ کی بیس پہ۔ ورنہ ان کی زندگیوں میں کیا کچھ ہو چکا ہے یہ بھی ہم سب سے ڈھکا چھپا تو نہیں ہے نا؟

اور رہی بات نگارش کی اور میری تو ہماری زندگی کی محرومی بھی تمہارے سامنے آئینے کی طرح موجود ہے ہم لوگوں نے محبت بھی کر لی اور ایک دوسرے کو حاصل بھی کر لیا لیکن پھر بھی ادھورے کے ادھورے رہے نہ اپنے ماں باپ کی شفقت ملی اور نہ ہی خود ماں باپ بن سکے۔ تمہیں شاید پتا ہو یا نہ ہو لیکن میں نے اکثر نگارش کو اس محرومی پہ اداس افسردہ اور آنسو بہاتے ہوئے دیکھا ہے تنہائی میں وہ بہت اداس ہوتی ہے لیکن جب دنیا کا سامنا کرتی ہے تو بڑے صبر و شکر اور تحمل کے ساتھ پیش آتی ہے اور مجھے یقین ہے کہ اللہ اسے اس صبر و تحمل کا اجر ضرور دے گا۔ اس لیے میری جان میں تمہیں بھی یہی مشورہ دوں گا کہ تم بھی ان لوگوں کی طرح خوش رہنا سیکھو کیونکہ زندگی میں سب کچھ ہمارے لیے ہی نہیں ہوتا اس میں کچھ دوسروں کا بھی نصیب ہوتا ہے جن کا ہمیں علم نہیں ہوتا اور ہم اپنی لاعلمی میں کسی دوسرے کے نصیب کو اپنا حق اور اپنا نصیب سمجھ کر خوش ہوتے رہتے ہیں مگر جب ہماری یہ خوش فہمی ختم ہوتی ہے تو ہم اداس ہوتے ہیں۔ سبب اس میں خسر میں اور رشک پیدا کر لیتے ہیں حالانکہ ایسا کرنا نہیں چاہیے کیونکہ ہر انسان کو اپنے اپنے نصیب کا ملنا ہے چاہے دولت ہو شہرت ہو عزت ہو۔ یا پھر جیون سا بھی ہو۔

جن کو جو ملا سمجھو اسے اللہ نے دیا کیونکہ ہمارے نصیب لکھنے والا تو وہی ہے نا۔ ضروری نہیں ہے کہ جو ہم چاہتے ہیں وہی ہو بلکہ ضروری وہ ہوتا ہے جو اللہ چاہتا ہے اور اللہ جن کو دولت دیتا ہے کبھی بھی ان کی قسمت میں یہ بھی لکھ دیتا ہے کہ یہ دولت انہیں برتنا بھی نصیب نہیں ہو گی جن کو شہرت دیتا ہے ساتھ ہی اس شہرت کا زوال بھی لکھ دیتا ہے جن کو عزت دیتا ہے ان کی رسوائی بھی لکھتا ہے جن کو اولاد دیتا ہے ان کی آزمائش بھی لکھتا ہے اور جن کو جیون سا بھی اچھا ملتا ہے ان کی قسمت میں بے سکونی اور بے چینی بھی ساتھ ہی لکھی ہوئی ہوتی ہے اس لیے اپنی قسمت اور اپنے نصیب پر غور کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ کوئی بھی نہیں۔ اچھا برا وقت ہر انسان کی زندگی میں ہی آتا ہے اور ہر انسان کو جھیلنا پڑتا ہے بس اس جھیلنے کے لیے برداشت کا مادہ ہونا لازمی ہے ورنہ سب کچھ رائیگاں چلا جاتا ہے۔

اب یہی دیکھ لو جب ہم شادی کرتے ہیں تب ہمیں پتا ہی نہیں ہوتا کہ ہمارے ہاں اولاد ہو گی یا نہیں۔؟ اگر ہمیں ان چیزوں کا پہلے سے پتا چل جائے تو شاید ہم یہ کام ہی نہ کریں لیکن ہم پھر بھی یہ کام کرتے ہیں کیونکہ ہم اللہ کی رضا سے انجان ہیں اور جب سب کچھ ہونا ہی اللہ کی رضا سے ہے تو ہمیں افسردگی مایوسی اداسی اور حسرت کا ماسک چہرے پہ سجانے کی ضرورت ہی کیا ہے بھلا۔

”اب یہ نگارش کوئی دیکھ لو اس نے مجھ سے محبت کی بے انتہا اور سچی محبت۔ اس نے مجھے چاہا اور میں اسے مل بھی گیا لیکن پھر بھی وہ محروم ہے۔ روتی ہے۔ مجھ سے چھپ چھپ کر روتی ہے۔ آخر کیوں؟ کیونکہ اسے بھی مکمل جہاں نہیں ملا۔ مجھے بھی نہیں ملا۔ بیل کو بھی نہیں ملا۔ مومنہ بی بی کو بھی نہیں ملا۔ علیزے کو بھی نہیں ملا۔ اور علیزے کے ڈرائیور کو بھی نہیں ملا کیونکہ یہ زندگی ہے۔“

عبداللہ نے اس کے دونوں ہاتھ نرمی سے چھلکے تھے اور زری کی آنکھوں سے دو اشک بہہ آئے تھے جن کو عبداللہ نے اپنی انگلیوں سے بہت نرمی سے پونچھ ڈالا تھا۔

”عشق کرنا اور نامراد رہنا اصل عاشق اور اصل عشق کی اصل نشانی ہوتی ہے۔ تمہارے عشق پر آزمائش اتنی مگر تم ڈگمگاتی نہیں۔ مجھے خوشی ہے اس چیز کی۔ کیونکہ تمہاری نیت میں کوئی کھوٹ نہیں تھا۔ تمہاری محبت تمہارا عشق پاک صاف تھا اسی لیے آج میں ایک بھائی ہونے کے باوجود تم سے اتنے حساس اور گہرے موضوع پر بھی بات کرتے ہوئے شرم محسوس نہیں کر رہا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میری بہن کا ظاہر اور باطن ایک جیسا ہے پانی کی طرح صاف شفاف۔ ورنہ کوئی اور مسئلہ ہوتا تو شاید میں ایسی باتیں تم سے کبھی نہ کرتا مگر

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی ویب سائٹ

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں ایپلوڈنگ
- ☆ سیریم کوالٹی، نارل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریٹ
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

نہیں۔ مجھے تم پر بھروسہ ہے اور تم بھی ہے۔“
عبداللہ کہہ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور نیل کی نظریں آنسو پونچھتی زری یہ فطری معنی تھیں اور دل میں اک ایسی ہوک سی اٹھی تھی کہ سیدھی روح تک گئی تھی اور روح تڑپ اٹھی تھی۔
نہیں۔ اب یہ سب فضول تھا۔ اب بہت کچھ پیچھے رہ گیا تھا اب مومنہ کے ساتھ نا انصافی نہیں کی جاسکتی تھی۔

کیونکہ اس نے جب زری کی طرف سے اپنے دل کو پھیرا تھا تو غور سے بڑے عمدہ کیے تھے۔ اور اب یہ عمدہ ہی سب سے زیادہ اہم تھے۔ دل بے شک تڑپتا یا کھانکھتا ہوتا رہتا۔ ”زری۔ آئیے نا“ یہ مدحیہ بلاری ہے۔ ”بہت ہی خوبصورت ڈریس میں ملبوس مومنہ بی بی اسٹیج سے اتر کر زری کے قریب آگئی تھی اور زری کو سہارا دینے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا تھا جس پر نیل نظریں چرا کر رخ موڑ گیا تھا۔ وہ ایسا منظر نہیں دیکھ سکتا تھا۔

اور زری مومنہ بی بی کا ہاتھ تمام کراچی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔
نیل سے اسٹیج تک کا فاصلہ محض چند قدموں کا تھا، لیکن زری کے لیے یہ چند قدم بھی میلوں کا سفر تھے۔ اس نے طے کیے تھے مگر بڑی مشکلوں کے ساتھ۔ اور ابھی وہ اسٹیج پر چڑھنے کے لیے قدم اٹھا رہی تھی کہ دو سرا ہاتھ علیزے نے آگے بڑھا دیا تھا اور زری نے چونک کر اپنے سے دوڑنے والی کھڑی علیزے کی سمت دیکھا تھا جس کے چہرے پر زری کے لیے محبت ہی محبت تھی اور زری اس کے چہرے کا یہ تاثر دیکھ کر بس دیکھتی ہی رہ گئی تھی۔ جبکہ علیزے اس کا ہاتھ پکڑنے کے لیے دو قدم پیچھے آگئی تھی۔

”میں نے ایک دفعہ ڈراموں سے پوچھا تھا کہ زری کون ہے۔ تو اس نے جواب دیا۔“ علیزے خوب کھلائی کے سے انداز میں بول رہی تھی کہ زری تڑپ کر پوچھ بیٹھی۔

کیا جواب دیا اس نے۔۔۔ سوال بڑا بے قرار تھا۔
”محبت؟!“ علیزے بھی ویسا ہی بولی تھی۔ انتہائی مختصر اور یک لفظی۔

”محبت؟“ زری نے زیر لب دہرایا تھا۔
”میں نے بھی جوابا ”یہی کہا تھا۔ محبت۔۔۔؟“ علیزے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اسٹیج کی میڑھی چڑھنے میں مدد دے رہی تھی اور ساتھ ساتھ اس سے بات بھی کر رہی تھی۔

”پھر؟“ پھر کچھ کہا۔۔۔؟“ زری بمشکل میڑھی چڑھی تھی۔
”پھر کیا۔۔۔ وہ مجھے کہنے لگا۔ تم نہیں سمجھو گی۔ کیونکہ محبت بڑی حویلی والوں کی سمجھ کی چیز نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں ”سمجھ گئی۔“ علیزے مسکرائی اور اسے دوسری میڑھی چڑھنے میں مدد دی تھی۔

”کیا سمجھ گئیں۔۔۔؟“ زری کے سوال بہت بے ساختہ سے تھے۔
”یہی کہ زری محبت کیوں ہے۔؟“ علیزے کا لہجہ بدلا تھا لیکن زری محسوس نہیں کر سکی تھی۔

”علیزے۔۔۔! دل آور کسی سے ملنے کے بعد اپنے وہیان میں اس کے قریب آیا تھا لیکن زری کو اس کے ساتھ دیکھ کر اس کے قدم اپنی جگہ پہ ہی جم گئے تھے۔

”زری کو چھوڑ کر آئی ہوں۔؟“ علیزے نے گردن موڑ کر اسے جواب دیا اور زری کو لے کر آگے بڑھ گئی تھی جہاں بیٹھے مدحیہ اور عدیل اپنی ہی چھیڑ چھاڑ اور شرارتوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

”مدحیہ!“ علیزے نے اسے متوجہ کیا۔
”ارے زری۔!“ مدحیہ اپنا بھاری بھر کم دھڑا سنبھالتی ہوئی بمشکل کھڑی ہوئی تھی اور بڑے والہانہ انداز میں

اور یہ ایک دلکش سین کمرے کی آنکھ میں محفوظ ہو کر رہ گیا تھا بلکہ آج کے دن میں تو ایسے کئی سین تھے جو کمرے کی آنکھ نے قید کیے تھے۔ اور انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یادگار بنا دیا تھا۔

اس سے اگلے ہی روز آؤر ڈائیال اور جوت کی مایوں اور مندی کی رسم تھی۔ اور علیز سے صبح ہی صبح سب لڑکیوں کے بلائے یہ بڑی حویلی چلی گئی تھی حالانکہ دل آور نے بہت شور مچایا احتجاج کیا اور غصہ بھی دکھایا تھا مگر وہ الناس سے ہری جھنڈی دکھائی تھی اور دل آور تھلا کے رہ گیا تھا۔ کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ علیز سے پورا دن گھر پہ رہے اور رات کو ایک ساتھ شادی میں جائیں مگر وہ ہاتھ ہی نہیں آئی تھی اس لیے اس کا موڈ اب آف ہی تھا۔ اور اسی آف موڈ کے ساتھ وہ شام کو بڑی حویلی پہنچا تو تقریباً "سارے ہی نوٹ کیے بغیر نہیں رہ سکے تھے۔ کہ وہ پہلے جیسے موڈ میں نہیں ہے۔

"کیا بات ہے علیز؟" دل آور بھائی کا موڈ بہت آف لگ رہا ہے۔ "علیز بے اپنے بڑے روم میں بیٹھی تیار ہو رہی تھی جب انوشہ دروازہ کھول کر اندر آئی تھی۔

"ڈرائیو آیا ہے؟ کہاں ہے وہ؟ تمہیں کیسے پتا چلا کہ اس کا موڈ آف ہے؟" علیز نے کو اس کا نام سنتے ہی بے چینی سی لگ گئی تھی۔

"نیچے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں، بس مجھے تو ان کے موڈ سے یہی لگے کہ ان کا موڈ آف ہے، اب کیوں آف ہے یہ تو تمہیں پتا ہونا چاہیے۔" انوشہ نے کہتے ہوئے کندھے اچکائے تھے۔

"اس کے پاس کوئی ہے یا نہیں؟" علیز نے کو اس کے اکیلے پن کی فکر ہوئی تھی۔

"ہی اور آئی بیٹھی ہوئی ہیں۔ اسرار انکل تو ممالوں کو ریپو کر رہے ہیں اور بانی سب تو اپنی اپنی تیاریوں میں مصروف ہیں۔" انوشہ اس کا میک اپ الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔

"آف۔۔۔ تو تم اسے اور بلا لو تا اگر اتنی فکر ہو رہی ہے تو۔۔۔"

انوشہ کو بیٹھے بیٹھے ہی شرارت سوجھ گئی تھی۔

"ارے نہیں انوشہ آئی۔۔۔ وہ یہاں آگیا تو میں میک اپ کے بغیر ہی رہ جاؤں گی۔" علیز نے جھنجھلائی۔

"کیا مطلب۔۔۔؟" انوشہ جان بوجھ کر انجان بنی تھی۔

"خیر چھوڑیں آپ نہیں سمجھیں گی۔" علیز نے سر جھٹک کر پھر سے آئینے کی طرف اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گئی تھی اور انوشہ بڑی خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

"السلام علیکم دل آور بھائی۔" انوشہ دوپٹا سر پہ اوڑھے بڑے سعادت مند بچی بنی دل آور کے سامنے آکر جھکی اور مجبوراً "دل آور کو اٹھ کر اس کے سر پہ ہاتھ پھیرنا پڑا تھا۔

"و علیکم السلام۔! کیسی ہو؟" وہ بہت ناز مل سے انداز میں پوچھ رہا تھا۔

"الحمد للہ۔! بالکل ٹھیک ہوں۔ وہ دراصل آپ کے لیے علیز کے کا پیغام ہے، وہ آپ کو اپنے روم میں بلا رہی ہے۔" انوشہ نے بڑی سنجیدگی سے پیغام رساں کاروبار دہرا تھا۔

"روم۔۔۔؟"

دل آور سب کے سامنے ایسا پیغام سن کر ٹھٹھا تھا۔

زری کے گلے ملی تھی۔

"مبارک ہو۔! آخر پاکستان نے تمہیں باندھ ہی لیا ہے۔" زری نے کچھ دیر کے لیے اپنے ذہن سے ہر چیز احساس بھٹکتے ہوئے مدحہ گو بڑی خوشدلی سے مبارکباد دی تھی۔

"خیر مبارک۔! مجھے پاکستان نے نہیں پاکستان کی محبت نے باندھ لیا ہے بہت ایسا ہے یہاں اب کہیں اور جانے کو دل ہی نہیں چاہتا۔" مدحہ عدیل کو دیکھتے ہوئے بڑی دلچسپی سے مسکرائی تھی اور جواباً "عدیل بھی مسکرائی ہوا اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا۔

"اور اب ہم کہیں اور جانے بھی نہیں دیں گے۔" اس نے بڑے استحقاق سے کہا تھا جس پر مدحہ زری کے سامنے ذرا سا جھینپ گئی تھی کیونکہ وہ اسے بڑی گہری اور ذہنی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور مدحہ اس کے یوں بازو اور نظروں پر دیکھنے پر بلاوجہ ہی نموس ہوئی جا رہی تھی۔

"خیر اس بات کوئی اٹھال جانے دیں یہ بتائیں آپ کیسی ہیں۔ طبیعت بہتر ہوئی آپ کی؟" عدیل زری کو سلام کرتا ہوا اس کا حال احوال پوچھنے لگا۔

"الحمد للہ۔! بالکل ٹھیک ہوں۔ اور اگر نہیں بھی ہوں تو ہو جاؤں گی، کیونکہ جلد یادیر کرنا تو اللہ کی ذات ہے۔" زری نے اللہ کا شکر ادا کیا تھا۔

"جی۔۔۔ یہ تو بالکل صحیح کہہ رہی ہیں آپ۔۔۔ آئیے بیٹھیں۔" اس نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ اور مدحہ زری کا ہاتھ پکڑے صوفے پہ آگئی تھی۔

"بھائی۔! نام کافی زیادہ ہو چکا ہے۔ اسی کہہ رہی ہیں کہ رسم کر دینی چاہیے۔" یمن بھی اسٹیج پہ آگئی تھی۔

"عدیل۔! کیا خیال ہے تمہارا رسم ہو جائے۔؟" نیل نے قریب آکر پوچھا۔

"جیسے آپ کی مرضی۔؟" عدیل بھلا کیا کہہ سکتا تھا۔؟

"ہمیں رنگ زری پر سنا لے۔" مدحہ نے یکدم ہی اعلان کیا تھا اور زری گڑبگڑ گئی تھی۔

"مہم۔۔۔ مدحہ۔؟" زری کو مدحہ کے ایسے ارادے کا اندازہ بھی نہیں تھا اور نہ وہ یقیناً اسٹیج پر ہی نہ آتی۔

"زری۔! میں یہ بندھن تمہارے ہاتھوں سے باندھنا چاہتی ہوں یہ میری خواہش ہے۔ اور ہمیں میری زندگی کی پہلی خوشی اور پہلی خواہش سے انکار نہیں کرنا چاہیے ورنہ میرے لیے بدشگونی ہوگی۔" مدحہ نے اس کے ہاتھوں پہ اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا اور زری اس کی بات سن کر کانپ گئی تھی۔

"لیکن مدحہ۔! میں تو خود۔" زری نے کچھ کہنا چاہا۔

"بس تم اپنے محبت بھرے ہاتھوں سے میری زندگی کی ڈوری باندھو۔ یہ لو۔"

اس نے عدیل کی طرف سے لائی گئی انگوٹھی مریم کے ہاتھ سے لے کر دیا سمیت زری کے سامنے کر دی تھی اور واقعی زری سے اس موقع پر انکار نہیں ہو سکا تھا اور زری نے روتے ہوئے دل سے دعا مانگ کر لرزتی انگلیوں سے انگوٹھی تھامی اور نگار شہ عبداللہ، مومنہ، نیل، علیز سے دل آور جوت اور اس کی فیملی، شہیار اور اس کی فیملی، سلو اور جیدی اور محمد حنا زبیب اور فاطمہ کی موجودگی میں سب کے سامنے مدحہ اور پھر عدیل کو انگوٹھی پہنا دی تھی۔

جس پر جی بھر کے تالیاں بجی تھیں اور وہیل چیئر پر بیٹھے عمر فاروق نیازی بھی اپنے اکلوتے بیٹے کی پہلی پہلی خوشی پر مسکرائے تھے۔

"آئی لو یو بھائی۔! مریم، یمن اور ایمان سے چھوٹی زونہ اور زونہ نے مدحہ کو پھول دیتے ہوئے اس کے دونوں رخسار چوم لیے تھے اور مدحہ بے ساختہ کھکھلا اٹھی تھی اور دونوں کو بانوؤں کے گھرے میں لے لیا تھا۔

”جی۔۔۔ آپ ہی کا انتظار کر رہی تھی۔ جیسے اس کی بات سن لیں جیسے پھر تو اور زیادہ رش برپا ہو جائے گا۔“
فنکشن بھی اشارت ہو جائے گا۔“

انوشہ کی سنجیدگی انتہائی تھی اور دل اور جزیرہ ہوتا آئندہ اور عائشہ آئندہ کو دیکھ کر دیا تھا۔
”اگر۔۔۔ کوئی بات نہیں بیٹا۔ جاؤ تم۔ ہم بھی ذرا مہمانوں کو دیکھ لیں۔“ عائشہ آئندہ لاپرواہی سے کہتی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ اور دل اور نے دوبارہ انوشہ کی طرف دیکھا تھا جو بمشکل اپنی مسکراہٹ جاسے کی کوشش میں تھی۔

”جائے نا۔۔۔! دیر کیوں کر رہے ہیں۔۔۔؟“ اس نے اسے ڈرائنگ روم سے باہر کی طرف اشارہ کیا تھا۔
”ہوں۔۔۔! جارہا ہوں۔“ وہ آہستگی سے کہہ کر ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے سے باہر نکل آیا تھا اور طویل ترین کشادہ میزھیوں پر کھڑا علیزے کے روم کے سامنے آ کر کھڑا اور آہستگی سے دروازے پہ دستک دی تھی۔

”بس۔۔۔! ام ان۔۔۔! اندر سے علیزے کی نرم سی آواز سنائی دی تھی۔
اور دل اور اس کی طرف سے اجازت ملنے ہی دروازہ کھیل کر اندر آ گیا تھا جبکہ آئینے کے سامنے کھڑی اپنی دلنشین پلکوں پہ مسکرا لگائی علیزے آئینے میں اس کا عکس ابھرتا دیکھ کر چونک گئی تھی۔

”ڈرائیو۔۔۔ تم یہاں۔۔۔“
علیزے تو بالکل یوں گھبرا گئی تھی جیسے دل اور کو پہلی بار اپنے بیڈ روم میں دیکھ کر گھبرائی تھی۔
”آپ نے خود ہی تو بلایا ہے بی بی جی۔۔۔!“ اسے بھی ڈرائیو کے کمرے میں جانے میں ذرا دیر نہیں لگی تھی۔
”میں نے بلایا تھا۔۔۔؟ مگر کب۔۔۔؟“ علیزے کو اچنبھا ہوا۔

”بھی۔۔۔ چند منٹ پہلے۔۔۔ میں جھوٹ نہیں بول رہا بی بی جی۔۔۔“ وہ دروازے کے قریب بالکل ایسے ہی کھڑا تھا جیسے منصور حسن کے انداز میں کھڑا ہوتا تھا۔

”تمہیں کس نے کہا کہ میں نے تمہیں بلایا ہے۔۔۔؟“ علیزے خفگی سے بولی۔
”آپ کی کزن انوشہ بی بی نے۔۔۔“ ڈرائیو کی معصومیت کی بھی انتہا ہو چکی تھی۔
”وہ۔۔۔ انوشہ۔۔۔؟“ علیزے جب چاپ جانے والی انوشہ کی شرارت سمجھ گئی تھی۔
”اب آپ بتائیے۔۔۔ میرے لیے کیا حکم ہے آخر۔۔۔؟ چلا جاؤں یا کھڑا رہوں۔۔۔؟“

دل اور مسکراتی نظروں سے اسے دیکھ بھی رہا تھا وہ زندگ اور سلور فلر کی کاغذ فرماک اور جوڑی دیا جا رہے تھے۔
ناکمل سی تیاری میں کھڑی سیدھی دل پہ لگ رہی تھی اور دل کی دھڑکنیں بے ربط سی ہونے لگی تھیں۔
”ہوں۔۔۔! کھڑے رہو۔۔۔ جب تک میں نہ کہوں یہاں سے ہٹنے کی بھی کوشش مت کرنا۔“

علیزے دو سیکنڈ سوچنے کے بعد اسے حکم دیتی ہوئی دوبارہ سے ڈرائنگ روم کے آئینے کی طرف ہٹتی تھی۔
”آپ کیسے بند کر لوں یا دیکھ رہوں۔۔۔؟“ اس نے اگلا سوال کیا۔
”دیکھتے رہو۔۔۔“ وہ اطمینان سے اپنے سابقہ کام میں مصروف ہو گئی۔

مگر دل اور وہ نہیں سکا تھا اور اس نے آہستہ آہستہ اپنے قدم علیزے کی طرف بڑھادیے تھے۔
”یہ تو سراسر نا انصافی ہوئی نا بی بی جی۔۔۔ آپ کے حکم کی تعمیل میں کھڑا رہوں یہ تو سیدھا سیدھا ظلم ہوا ایک ڈرائیو پر۔۔۔ آپ کو کم از کم اپنے ڈرائیو کی حالت پر ہی رحم آجانا چاہیے۔۔۔ لیکن انوشہ کہہ رہی ہیں کہ یہ بھی کسی پہ ترس نہیں کھانا۔ اس لیے کسی کے حکم کی تعمیل کرنے سے اور اپنی سعادت مندی ظاہر کرنے سے مترہز کہ بندہ حکم عدول سے کام لے اور بد تمیز اور بد اخلاقی ظاہر کرتا ہوا مہربان کچھ حاصل کر لے۔۔۔ ہے نا۔“

دل اور آہستہ روی سے قدم بہ قدم چلتا علیزے کے قریب پہنچ گیا تھا اور وہ اسے اپنے عقب میں دیکھ کر بے ساختہ چیخ اٹھی تھی۔ دل اور نے فوراً اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

”آپ علیزے بی بی سے پاگل مت بنو۔ گھر مہمانوں سے بھر رہا ہے اور آپ یوں چیخیں مار رہی ہیں۔ لوگ سمجھیں گے کہ ڈرائیو نے اپنی علیزے بی بی پر تشدد شروع کر دیا ہے۔“

دل اور نے اسے سمجھانا چاہا تھا مگر اپنے منہ پر رکھے ہاتھ کی وجہ سے علیزے کی آنکھیں اٹنے کو ہو گئی تھیں جس کا اندازہ دل اور کو اس کا عکس آئینے میں دیکھ کر ہوا تھا وہ دونوں آئینے کے سامنے ہی کھڑے تھے۔

”ارے کیا ہو گیا۔۔۔؟ اس طرح کیا دیکھ رہی ہو۔۔۔؟“ دل اور نے گھبرا کے ہاتھ ہٹا لیا تھا۔
”مہ۔۔۔ میری لپ اسٹک۔۔۔ میرا میک اپ۔۔۔! ڈرائیو۔۔۔“ وہ اس کے ہاتھ رکھنے اور اپنا میک اپ اور لپ اسٹک وغیرہ خراب ہونے کے غم میں روہا سی ہو گئی تھی۔

اور سچ رو دینے کو بھی اور دل اور اسے بچوں کی طرح منہ بسورتے دیکھ کر بے ساختہ مسکرایا تھا۔
لیکن علیزے بری طرح بدک گئی تھی۔

”سو رہی یا۔۔۔؟ یوٹیشن کو بلواتا ہوں۔۔۔“
”میں ٹھیک کر لوں گی تم جاؤ یہاں سے۔ اور نیچے جا کر میرا انتظار کرو۔“ وہ غصے سے بولی تھی۔
”تم تو ایسے حکم دے رہی ہو جیسے سچ سچ تمہارے سامنے تمہارا شوہر نہیں ڈرائیو کھڑا ہو۔“ دل اور نے اسے گھورا تھا۔

”پلیز ڈرائیو۔۔۔! میں لیٹ ہو جاؤں گی۔“ وہ پھر سے روہا سی ہوئی۔
”او کے جاتا ہوں۔۔۔! مگر ایک شرط ہے۔“ اس کے لہجے میں شرارت تھی۔
”شرط۔۔۔؟ کیا۔۔۔؟“ وہ ٹھنک گئی۔

”آج اپنے ہاتھوں پہ ہندی لگاؤ گی نا۔۔۔؟“ دل اور کو نجانے کہاں سے اس نے ہاتھوں پہ ہندی دیکھنے کا شوق آ گیا تھا کہ علیزے ذرا دیر کے لیے ٹھہر گئی تھی۔
”کیوں۔۔۔؟“

”بس ایسے ہی مجھے شوق ہو رہا ہے۔۔۔“ اس کا لہجہ اور انداز ایسا تھا کہ علیزے انکار نہ کر سکی۔
”ہوں۔۔۔ لگاؤں گی۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔
”اور میرے ساتھ گھر بھی چلو گی۔“

”لیکن ڈرائیو۔۔۔!“ وہ اسے سمجھانا چاہتی تھی۔
”پلیز علیزے۔۔۔! اگلے رہنے کی عادت بھول گیا ہوں، صبح سے تم گھر پہ نہیں ہو تو صبح سے اپنا ہی گھر کاٹ کھانے کو دوڑ رہا ہے یہ چند گھنٹے میں نے کس طرح گزارے ہیں یہ میں ہی جانتا ہوں۔“ دل اور کی بات ہی کچھ ایسی تھی کہ سیدھی علیزے کے دل پہ لگی تھی اور اس کا دل تڑپ گیا تھا۔

”اس او کے ڈرائیو۔۔۔ ڈونشوری۔۔۔ میں چلوں گی گھر پہ۔۔۔ فنکشن تو ختم ہو جائے۔“
وہ بھلا اس کی اداسی یا افسردگی کب برداشت کر سکتی تھی۔ فوراً ”ہاں“ بھری تھی۔

”مریم کے گھر بھی جانا ہے عدیل ہمارا انتظار کر رہا ہوگا، نیل کی نیل بھی یہاں سے واپسی پہ عدیل کے گھر ہی جائے گی۔“ اس نے علیزے کو آگاہ کیا۔

”ہوں۔۔۔ ٹھیک ہے۔۔۔ میں بھی تب تک تیار ہو جاتی ہوں۔“ وہ سر ہلاتی پھر سے مصروف ہو گئی۔ ”اور کوئی حکم“ دل اور پھر شرارت سے بولا تھا جس پر علیزے نے اسے گھورتے دیکھا وہ ہنستا ہوا بالکل آ گیا تھا۔

پھر پانی ہو جاتے ہیں
لوگ کہانی ہو جاتے ہیں
ایسا وقت بھی آجاتا ہے
کہ دشمن جلی ہو جاتے ہیں



ان سب کی شادیاں بخیر و خوبی انجام پائی تھیں۔
اور شادیوں کے ہنگامے سرد پڑتے ہی سب کی زندگی روئیں پہ آگئی تھی ہر کوئی اپنی اپنی پریکٹیکل لائف میں مصروف ہو چکا تھا۔

البتہ نئی نئی شادیوں والے ہنوز نئے نئے چوچلوں میں مصروف تھے۔
”کیا خیال ہے ایک چکر مری کا ہو جائے؟“ صبح ناشتے کی میبل پہ یہ شوشا جودت نے جھوڑا تھا۔
”واقف مری۔ کیا خوب آئیڈیا ہے جودت بھائی۔“ لڑکوں نے بہت زیادہ خوشی سے کام لیتے ہوئے اس کے آئیڈیے کو سراہا تھا۔ جبکہ آذر اور دانیال اس کے آئیڈیے پہ ذرا بھی ایکسائیٹڈ نہیں ہوئے تھے۔ چپ چاپ خاموشی سے بیٹھے ناشتا کرتے رہے تھے۔

”کیا بات ہے آپ لوگوں کا مری جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے کیا۔“ جودت نے ان کی خاموشی اور ان کی بے نیازی فوراً نوٹ کی تھی۔

”نہیں۔! ہمارا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ تمہارا ارادہ ہے تو تم جائو۔“ آذر نے لاپرواہی سے کہا۔
”لیکن میں اکیلے جانے کی بات نہیں کر رہا۔ میں نے تو یہ آئیڈیا سب کے لیے دیا ہے۔“
”تو تم اکیلے ہو بھلا؟ مریم ہے نا تمہارے ساتھ۔ شادی تمہاری ہوئی ہے سب کو کیوں انوکھ کر رہے ہو۔“
آذر نے حیرت ظاہر کی تھی۔

”تو آپ کیوں نہیں جا رہے؟“ جودت کا جوش بھگ گیا تھا۔
”کیونکہ ہم سوئٹزر لینڈ جا رہے ہیں اس لیے۔“ آذر کے جواب پہ جودت کے پہلو میں بیٹھی مریم جودت کو بے وقوف بناتے جانے پہ اپنی مسکراہٹ دیا گئی تھی کیونکہ اسے کوئل اور حرمت نے شام کو ہی بتایا تھا کہ وہ لوگ پرسوں کی فلائٹ پہ ہنی مون کے لیے آؤسٹاف کنٹری جا رہے ہیں سوئٹزر لینڈ۔ مگر آپ نے پہلے تو نہیں بتایا۔“
جودت ابھی تک حیرت کے دھچکے سے باہر نہیں آیا تھا۔

”ہم نے سوچا جب جائیں گے تو پتا چل جائے گا۔“ آذر نے کندھے اچکائے۔
”اور دانیال بھائی؟“ اس نے اب دوسرے کپل کا پوچھا حرمت الگ چہرہ جھکائے ہوئے بیٹھی تھی۔
”وہ لوگ جرمنی جا رہے ہیں۔ ہم نے بھی جرمنی ہی جانا تھا مگر کوئل کو سوئٹزر لینڈ جانے کا شوق تھا تو میں نے سوچا ہم سوئٹزر لینڈ ہی چلے جاتے ہیں۔“ آذر کی انفارمیشن کے بعد جودت کی حالت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔
”اور ہم؟“ اس کا اشارہ اپنے اور مریم کی طرف تھا۔

”کیا مطلب ہے؟ تم لوگ تو مری جا رہے ہو نا۔ تم نے خود ہی تو کہا ہے۔“
آذر نے حیرانی سے کہا تھا اور جودت ضبط کا گھونٹ لی کر رہ گیا تھا۔
”مگر میں نے تو یہ آئیڈیا آپ سب کے ساتھ مل کر جانے اور انجوائے کرنے کے لیے سوچا تھا۔ اب اگر آپ نہیں جا رہے تو میں کیسے؟“ جودت بات اور صوری جھوڑ کر چپ ہو گیا تھا۔

”ہوں۔ تو گویا اب تم مری نہیں جا رہے؟ تمہارا ارادہ بدل گیا ہے؟“ آذر چائے کپ میں اٹھلنے ہوئے بولا۔
”ویسے تمہارے لیے میرا خیال ہے کہ سری لنکا یا بنگلہ دیش بسٹ رہے گا۔ وہاں جاؤ ہنی مون کے لیے، بے نا جائزہ۔“ آذر نے کہتے ہوئے ان سب کی طرف دیکھا تھا اور ان سب کے ساتھ ساتھ مریم کی بھی ہنسی چھوٹ گئی تھی۔ وہ لاکھ کو ششوں کے باوجود بھی اپنی ہنسی نہیں روک پائی تھی۔ ”آپ مذاق اڑا رہے ہیں میرا؟“ جودت خفا ہوا۔

”مریم بیٹا! اس سے تو ہمیں کسی بھی قسم کی عقل مندی کی امید نہیں ہے۔ اس لیے اب تم ہی اسے جا کر سمجھاؤ کہ ہم اس کا مذاق اڑا رہے ہیں یا اس کا بھلا سوچ رہے ہیں۔“

آذر ناشتا ختم کرنے کے بعد اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور اس کی تقلید میں کوئل بھی اٹھ گئی تھی۔ کیونکہ آذر آج شادی کے بعد پہلی بار آفس جا رہا تھا۔ اس لیے وہ اسے چھوڑنے گاڑی تک آئی تھی۔

”میری ماں تو اب آفس بھی میرے ساتھ ہی چلو۔“ آذر گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے مسکرایا تھا۔
”میرا بس چلے تو یہ بھی کر لوں۔“ کوئل کے چہرے پہ اک شرکیں سی مسکراہٹ بکھرنی لگی تھی۔

”انی الحال تو تم سوئٹزر لینڈ چلنے کی تیاری ہی کر لو تو بڑی بات ہے۔ باقی باتیں وہیں جا کر ہوں گی۔ آذر کا لہجہ اور نظریں معنی خیز سے ہو گئے تھے۔ اسی لیے کوئل جھینپ کر اسے ہاتھ ہلاتی ہوئی پیچھے ہٹ گئی تھی اور آذر اس کے بلش چہرے سے لطف اندوز ہوتا گاڑی نکال لے گیا تھا۔



جیسے ہی مریم اپنے بیڈ روم میں داخل ہوئی تھی۔
وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے آن وارو ہوا تھا اور مریم کو پتا تھا کہ اسے کیا بے چینی لاحق ہے۔
”مریم بیٹا؟“ آذر بھائی کیا کہہ رہے تھے۔ کیا بھلا سوچ رہے ہیں میرا۔“ اسے تجسس ہو رہا تھا۔
”سہی کہ ہم لوگ مری چلے جائیں۔“ وہ بھی لاپرواہی سے بولی۔

”لیکن میں اب مری نہیں جاؤں گا۔ وہ اپنی بیویوں کو لے کر جرمنی اور سوئٹزر لینڈ جا رہے ہیں تو میں اپنی بیوی کو لے کر مری کیوں جاؤں؟ ہم بھی یورپ ہی جائیں گے۔“ وہ بچوں کی طرح ضد اور مقابلے پہ اتر گیا تھا۔
”کیا یورپ جانا ضروری ہے؟“ وہ بڑے سکون اور بڑے عمل سے پوچھ رہی تھی۔

”ہاں ضروری ہے۔ اب ضروری ہی ہے۔ اب ہر حال میں جاؤں گا۔ اور وہاں جاؤں گا جہاں تمہیں پسند ہو۔“ وہ تو جیسے تپ ہی گیا تھا۔

”ہاں تو ہم وہیں جا رہے ہیں نا جہاں مجھے پسند ہے۔“ مریم نے بڑی لاپرواہی سے جواب دیا۔
”کیا مطلب ہے؟ ہم کہاں جا رہے ہیں؟“ وہ چونکا۔

”پیرس۔ خوشبودوں کے شہر۔“ مریم بہت دھیمے سا بولی تھی۔
”واشنگٹن پیرس۔؟“ وہ حیرت سے اچھل پڑا۔

”ہاں پیرس۔ آذر بھائی نے ہماری ٹیکسٹ پیس کے لیے کفرم کروائی ہیں۔ انہوں نے خود مجھ سے پوچھا تھا کہ تم لوگ کہاں جانا چاہتے ہو۔ تو پھر میں نے ان کے بہت اصرار کے بعد پیرس کا کہا تھا۔“ مریم نے اسے اٹھل بات سے آگاہ کیا۔

”تو تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟ سب کے ساتھ مل کر مجھے بے وقوف بنارہی تھیں؟“ جودت نے مصنوعی غفلت سے اسے گھورا تھا۔

”بے وقوف نہیں بنا رہی تھی، بلکہ یہ دیکھ رہی تھی کہ آپ کو مجھ سے کتنی محبت ہے؟ اور آپ میرے لیے کیا کر سکتے ہیں؟ کیا احساسات رکھتے ہیں آپ؟“ مریم کے دل سے بے رخی کے بادل چھٹ چکے تھے۔ اسے جوہر جیسے سر پھرے کی محبتوں اور شدتوں پہ یقین آچکا تھا۔ اسی لیے وہ اس کی خفگیوں پہ بھی مسکرا رہی تھی۔

”پھر کیا پتا چلا تمہیں؟“ وہ عین اس کے سامنے آکر کھڑا تھا۔

”یہی کہ آپ بے شک تھوڑے سے ضدی ہیں، ہٹ دھرم ہیں، سر پھرے ہیں، کم عقل ہیں، غیر ذمہ دار ہیں لیکن پھر بھی۔۔۔ پھر بھی۔۔۔ میرے معاملے میں بہت سمجھ دار ہیں آپ اور یہ بھی کہ محبت کرنا بھی جانتے ہیں۔“ مریم اس کی شرٹ کے بنٹوں کو چھیڑتے ہوئے بولی تھی۔

”جج میں محبت کرنا جانتا ہوں؟“ وہ یکدم اس کی آخری بات پہ ایکسائینڈ ہوا تھا۔

”ہاں۔۔۔ مگر وہ۔۔۔ نہ نہیں۔۔۔ میرا مطلب تھا کہ۔۔۔“

مریم روتی میں ہاں تو کہہ گئی تھی۔ لیکن اس کی اتنی ایکسائینڈ ٹیپہ نظر پڑنے ہی ذہن میں خطرے کی گھنٹی بج اٹھی تھی، کیونکہ اس کے تیرہ ہی کچھ ایسے تھے۔ مگر مریم کے سنبھلنے تک دیر ہو چکی تھی اور جوہر نے اس کے بچاؤ اور فرار کے تمام ارادے اور راستے مسدود کر دیے تھے۔



وہ کب سے عدیل کے نمبر پہ کال کر رہی تھی، لیکن وہ کال ہی ریسو نہیں کر پاتا تھا اور مدیہ کو بیٹھے بیٹھے پریشانی لاحق ہو گئی تھی۔ اسی لیے وہ گاڑی کی چابی لے کر اپنے بیڈ روم سے باہر نکل آئی تھی۔

”کہاں جا رہی ہو مدیہ؟“ ہمیشہ کی طرح آج بھی اسے مومنہ کی آواز نے ہی روکا تھا۔

”بھابھی۔۔۔ پتا نہیں کیا مسئلہ ہے؟ میں عدیل کو کال کر رہی ہوں، وہ ریسو نہیں کر رہا۔۔۔ ورنہ ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا۔“ مدیہ کی پریشانی دیدنی تھی۔

”ان کی تو طبیعت خراب ہے۔۔۔ نیل بتا رہے تھے کہ آج آفس بھی نہیں آئے۔“ مومنہ نے اسے اک اور پریشان کن خبر سنا دی تھی۔

”چھا۔۔۔ مگر مجھے تو آئی اور ایمن نے بھی نہیں بتایا۔ ابھی دن میں ہی بات ہوئی ہے ان سے۔ انہوں نے شاید مریم سے ملنے کے لیے بڑی حویلی جانا تھا۔ وہ آج شام اپنے ہنرمند کے ساتھ ہنی مون کے لیے پیرس جا رہی ہے۔“ مدیہ کی فکر مندی میں اور سے اور اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

”تو تم خود جا کر پتا کر لو نا؟“ مومنہ نے اک نیک مشورہ عنایت کیا تھا۔

”ہوں۔۔۔ وہ تو میں جا ہی رہی ہوں، مگر عجیب بات ہے کہ نہ اس نے خود بتایا اور نہ ہی اس کے گھر والوں نے بتایا کہ اس کی طبیعت خراب ہے۔“ وہ تذبذب کا شکار مشق سے لہجے میں کتنی وہاں سے نکل آئی تھی اور اس کے پیچھے مومنہ صوفیہ کشن درست کر کے رکھتے ہوئے مسکرا دی تھی۔

”ہیلو۔۔۔ خیریت تو ہے نا؟“ آفس سے واپسی پہ کپڑے وغیرہ چھینچ کر کے نیل واپس ڈرائنگ روم میں آیا ہی تھا کہ مومنہ کو اکیلے مسکراتے دیکھ کر دلچسپ تعجب ہوا تھا۔

”کیا مطلب؟“ مومنہ اپنی مسکراہٹ دیا نہیں سکی تھی بلکہ اور گہری ہو گئی تھی ”یہ اکیلے اکیلے مسکراتا کوئی اچھی علامت تو نہیں ہے غالباً۔“ نیل دلچسپی سے کتنا صوفیہ براجمن ہو گیا تھا۔

”میں اکیلے اکیلے کب مسکرا رہی ہوں؟ میں تو آپ کے سامنے مسکرا رہی ہوں۔“ مومنہ کے انداز میں بھی بیویوں والی اک مخصوص سی ادا تھی۔ جس پہ نیل کو برا اچھوتا سا احساس چھو کے گزرا تھا اور دل کی دھڑکنوں کے

سازند لے تھے۔

”اسا منے مسکرا رہی ہوں۔ مگر میں تو ابھی آیا ہوں۔“ نیل نے اپنے قریب صوفیہ کی طرف اشارہ کیا تھا۔

”نیل۔۔۔ مومنہ اس کی بات پہ جھینپ گئی تھی۔

”اٹھ پار۔۔۔ اتنا عرصہ ہو گیا ہے ہماری شادی کو۔ تم ابھی تک گھبرا جاتی ہو، حالانکہ تم جانتی ہو۔ اب تو ہمیں فریڈ کی طرح بے تکلف ہو کر رہنا چاہیے۔“ نیل جواباً ”خفگی سے بولا تھا۔

”مہ۔۔۔ مگر نیل۔۔۔ وہ بے چاری بھلا کئی تھی۔

”اسی لیے تو تمہیں کہہ رہا ہوں کہ میں تمہارا دوست بھی ہوں۔ اتنا نہیں گھبرایا کرو۔“

”مہ۔۔۔ مگر نیل۔۔۔ وہ۔۔۔ آئی۔۔۔ کیا سوچیں گی۔۔۔ کہ ہم۔۔۔ مومنہ نے اسے ٹالنا چاہا۔

”مومنہ۔۔۔ کیا کہا ہے میں نے۔۔۔ ادھر آؤ۔۔۔ میرے پاس بیٹھو۔“ اب کی بار وہ ذرا جھڑک کر بولا تھا اور مومنہ

مرے مرے قدم اٹھاتی اس کے برابر صوفیہ پہ آ بیٹھی تھی۔

”سیدھی ہو کر بیٹھو۔“ اس نے حکم جاری کیا اور مومنہ آہستگی سے سیدھی ہو بیٹھی تھی اور مومنہ مرنے کیانہ

کرتی کے مصداق رخ اس کی طرف موڑ کر بیٹھ گئی تھی۔

”مومنہ۔۔۔ اس نے تنبیہ کرنے والے لہجے میں بکا رکھا تھا۔

”جج۔۔۔ جی۔۔۔ مومنہ کے حلق سے آواز نکلتا بھی مشکل ہو گیا تھا۔

”نیل بیٹا۔۔۔ اگر تم فارغ تھے تو عدیل کے گھر سے ہی ہو آتے۔ اتنے دن ہو گئے کوئی خبر نہیں لی ان لوگوں

کی؟“ فائزہ بیگم اچانک ہی اپنے دھیان میں باتیں کرتی ڈرائنگ روم میں آ گئی تھیں اور مومنہ ان کی آواز سننے ہی

یک دم اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی تھی۔

اور کوئی بھی بات سننے بغیر سیدھی اپنے روم کی طرف دوڑ لگائی تھی۔ یوں جیسے اسے رہائی مل گئی ہو اور نیل

سیر حیاں پھلا گئی مومنہ کی غجلیت اور سر ہٹ بھاگنے کا انداز دیکھ کر بے ساختہ مسکرا دیا تھا۔

”کیا ہو گیا ہے نیل؟ میں تم سے کچھ کہہ رہی ہوں اور تم مسکراتے جا رہے ہو؟“ فائزہ بیگم نے ذرا سی خفگی سے

کہا۔

”نام۔۔۔ ابھی سچ پوچھیں تو مجھے کوئی بھی بات سمجھ نہیں آ رہی۔ ابھی میرا دھیان آپ کی بہو کی طرف ہے۔

اسے مجھ سے کوئی کام ہے میں ابھی آیا۔“

نیل فائزہ بیگم کے کندھوں پہ ہاتھ رکھے بڑے لاڈ اور پیار سے کہتا خود بھی سیر حیاں کی طرف بڑھ گیا تھا اور

فائزہ بیگم پہلی بار اس کے موڈ کی ایسی شیرارت اور شوخی پر مسکرا کے رہ گئی تھیں اور دل کی گہرائیوں سے اپنے بیٹے

اور بہو کی دائمی خوشیوں کے لیے دعا کی تھی۔



مدیہ نے گھر کے دروازے پہ دستک دی ہی تھی کہ دروازہ کھلتا چلا گیا تھا اور وہ حیران پریشان سی کھلے دروازے

سے اندر آ گئی تھی۔ پورا گھر خالی پڑا بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ صحن۔۔۔ برآمدہ۔۔۔ کمرے۔۔۔ سب خالی تھے۔

”ایمن۔۔۔ ایمان۔۔۔ کہاں ہو تم لوگ؟“ وہ ادنیٰ آواز میں پکارتی ہوئی۔ آگے بڑھی تب ہی پورا گھر اس طرح

خالی پڑا دیکھ کر اس کے دل کو کچھ ہوا تھا۔

”ذونیس۔۔۔ ذونیس۔۔۔“ وہ باری باری سب کو آوازیں دے رہی تھی۔

مگر جواب موصول نہیں ہو رہا تھا۔ بڑے کمرے اور چھوٹے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ البتہ فاروق نیازی کے

کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس لیے وہ جھجکتی ہوئی کمرے کی طرف بڑھی تھی۔
”آئی۔ انکل۔ ہیلو۔“ اس نے پکارتے ہوئے کمرے میں جھانکا تھا۔

کمرے میں عابدہ خاتون تو نہیں تھیں۔ البتہ فاروق نیازی اپنے مخصوص پینک سے سو رہے تھے۔ اس لیے مدیحہ نے دوبارہ آواز دینا اور پکارنا مناسب نہ سمجھا اور کمرے کی چوکھٹ سے ہی واپس لوٹ آئی تھی۔
”جن کو پکارنا تھا۔ بس اسی کو نہیں پکارا۔ باقی سب کو پکار کے دیکھ لیا۔“

وہ صحن میں آئی ہی تھی کہ اسے عدیل کی آواز سنائی دی تھی اور اس نے چونک کر جھٹ کی طرف دیکھا تھا۔
سیمنٹ سے بنے جنگلے پہ دو نول ہاتھ جمائے کھڑے صحن کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔
”باقی سب کہاں ہیں؟“ مدیحہ اس کی بات نظر انداز کر گئی تھی۔
”سب چلے گئے۔ مجھے اکیلا چھوڑ کر۔ مجھے کہا۔ لو گھر سنبھالو اپنا۔“ عدیل کی غیر سنجیدگی اس کی باتوں سے ہی ظاہر ہو رہی تھی۔

”مگر گئے کہاں؟ پلیز مجھے پریشانی ہو رہی ہے۔“ مدیحہ کو اس کے موڈ سے ہی نظر آ گیا تھا کہ وہ اسے صاف جواب نہیں دے گا بلکہ ستائے گا۔
”جو چلے گئے ہیں ان کا مت پوچھو، جو ہیں ان کا سوچو۔“ وہ ہنوز اسی موڈ میں تھا۔
”پلیز۔“ جھنجھلا گئی۔

”تم میرے لیے آئی ہو یا ان کے لیے آئی ہو؟“
”عدیل پلیز۔“ وہ اس کا نام تولے بیٹھی تھی مگر پھر یک دم ہونٹ بھیج لیے تھے اور اس کی یہ حرکت چھت سے کھڑے عدیل نے بھی با آسانی لوٹ کی تھی۔
”کیا ہوا؟“ چپ کول ہو گئی ہو؟“ وہ دیکھنے سے بولا۔
”میں جارہی ہوں۔“ وہ جھنجھلا کر واپس کے لیے پلٹی۔

”جائے شوق سے جاؤ۔ میں بھی جا رہا ہوں ڈاکٹر کے پاس۔“ وہ کہہ کر جنگلے سے پیچھے ہٹ گیا تھا۔
اور مدیحہ کے دایں پلٹے قدم رک گئے تھے اس نے گردن موڑ کر جنگلے کی طرف دیکھا۔ وہ سامنے سے ہٹ چکا تھا اور مجبوراً اسے سیرٹھیوں کی طرف بڑھنا ہی پڑا تھا۔

وہ کشادہ چھت کے بچوں بچ چٹھی چارپائی پر سر جھکائے بیٹھا اپنی ناراضی کا کھلا اظہار کرتا نظر آ رہا تھا۔ مدیحہ آہستہ قدموں سے چلتی عین اس کے سامنے چٹھی دو سری چارپائی پر آ بیٹھی تھی اور سر جھکائے بیٹھے عدیل کی نظریں مدیحہ کے دودھیلاؤں پر ٹھہر گئی تھیں۔ بلیک سینڈ ٹری میں مقید اس کے پاؤں ایسی چھب دکھلا رہے تھے کہ عدیل کو نظریں چڑا دینا ہی مناسب لگا تھا۔

”کیا ہوا تمہاری طبیعت کو؟“ مدیحہ نے طبیعت پوچھنے میں پہل کی تھی۔
”جو تمہاری طبیعت کو نہیں ہو رہا۔“ عدیل نے نظریں اٹھا کر براہ راست اس کے چہرے پر نظریں جمادی تھیں۔

”کیا مطلب۔“ وہ نا سمجھی سے بولی۔
”یہی بے چینی بے قراری اور بے بسی۔“
”میں تمہاری طبیعت کا پوچھ رہی ہوں۔“ وہ اس کی بات پر ابھی تھی۔
”میں بھی اپنی طبیعت کا ہی بتا رہا ہوں۔ ضروری نہیں کہ طبیعت صرف بخار، کھانسی، زکام سے ہی خراب ہو۔ طبیعت کبھی کبھی اس طرح بھی خراب ہو جاتی ہے کیونکہ طبیعت کا سارا دار و مدار دل پہ ہوتا ہے۔ انسان کا دل

خوش تو سمجھو طبیعت بھی خوش۔“ عدیل نے اسے دلیل دی تھی۔
”یعنی تمہیں بخار، کھانسی، زکام کچھ بھی نہیں ہے؟“ مدیحہ نے مصنوعی خفگی سے دیکھا۔

”نہیں۔ میں نے اپنی بیماری بتائی تو ہے۔“
”اور یعنی تم نے مومنہ بھابھی کے ساتھ مل کر بے وقوف بنایا ہے؟“ وہ اب کی بار ان کا سارا ایم سمجھ گئی تھی۔
”بے وقوف نہیں بنایا۔ ایک اچھا کام کیا ہے۔“ اس کے موڈ میں ہنوز شرارت کا عنصر تھا۔ مدیحہ اپنی خفگی دبا

گئی تھی۔
”لیکن کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ اچھا ہونے کی بجائے کام اور بھی بگڑ جاتا ہے۔“ مدیحہ بڑی دلچسپی سے مسکرائی تھی۔
”آثار تو مجھے بھی کچھ ایسے ہی نظر آ رہے ہیں۔ طبیب چاہتا ہی نہیں کہ مریض اچھا ہو۔“ عدیل نے اپنی گدی کے بال کھجاتے ہوئے بڑی آہستگی سے کہا تھا۔ آخر وہ عین اس کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔

”طیب کے ساتھ دھوکے دیے سے کام نہیں لیتا چاہیے نا۔ مرض صاف صاف بتانا چاہیے۔ اس سے شفا جلدی مل جاتی ہے۔“ وہ بھی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ ”طیب اپنا ہوتے ہوئے بھی پڑایا ہو جائے تو پھر ایسے دھوکے دینا مجبوری بن جاتا ہے۔“

”پڑایا۔ مطلب؟“ اس نے نا سمجھی سے دہرا کے پوچھا۔
”مطلب کہ انکج سنٹ سے ملے لگتا تھا کہ ہم ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں، بے تکلف ہیں اور تو اور دو چار ملاقاتیں بھی ہو جاتی تھیں۔ لیکن اب تو دعا سلام سے بھی گئے۔ ملنا چاہو ہانسنے سے بیمار ہونے کی اطلاع پہنچانی پڑتی ہے ورنہ پہلے یہ حالات تو نہیں تھے نا؟ اس سے تو بہتر تھا کہ ہم انکج سنٹ ہی نہ کروا سکتے۔“

عدیل تو مدیحہ سے دوری کی کوفت سے جیسے بھرا بیٹھا تھا ایک دم شکایتوں کا انبار ساتھ لیے پھٹ پڑا تھا اور مدیحہ اس کی صورت دیکھ کر یک دم کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔
”پہلے کی بات اور تھی۔ اب کی بات اور ہے۔ پہلے ہم آزاد تھے۔ اب ہم بندھ چکے ہیں۔ اب ہم میں ایک تعلق ہے، ایک رشتہ ہے۔ اب سب کا دھیان ہماری طرف ہو گا۔ اب سب ہمیں نوٹس دیں گے۔ اس لیے بہتر ہے کہ ہم فاصلے ہی رہیں۔“ اب اکثر ایسا ہوتا تھا کہ مدیحہ ہی اسے سمجھاتی ہوئی نظر آتی تھی۔

”یہ کیوں نہیں کہتیں کہ اس سے تو بہتر ہے کہ ہم شادی کر لیں۔“ وہ خفگی اور غصے سے تپ اٹھا تھا۔
”تم نے ہی کہا تھا کہ ایمین کی شادی کے بعد اپنے بارے میں سوچوں گا۔ تقریباً ایک یا دو سال بعد۔“ مدیحہ نے اسے اس کا بیان یاد دلایا۔

”اف تو یہ کرو۔ چھ ماہ بھی گزر جائیں تو بڑی بات ہے۔ اکیلے بیٹھ کر آہیں بھرنے سے تو بہتر ہے کہ بندہ کسی کو سامنے بٹھا کر آہیں بھر لے۔“

”اور یعنی کہ تم آہیں بھرنے کے لیے شادی کرنا چاہتے ہو؟“ مدیحہ نے پوائنٹ اٹھایا۔
”ظاہر ہے طبیب کو تو فی الحال یہی دھوکا دینا ہے نا۔“ وہ کہتے کہتے معنی خیزی سے مسکرایا۔
”شہر مار کی فیملی تین ماہ بعد شادی کے لیے زور دے رہی ہے۔ لیکن میں نے ان سے چھ ماہ کا دقت مانگا ہے۔

”چھ ماہ میں ایمین کی شادی اور آپ جناب کی رخصتی بھی ہو جائے گی۔ آخر میرے ای ابو بھی ہو جیسی نعمت سے فیض یاب ہونا چاہتے ہیں۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟“ مدیحہ گھبرائی تھی۔
”جو تم سن رہی ہو۔“ وہ البتہ بڑا پرسکون تھا۔

”مگر عدیل سے۔۔۔“ وہ اس کا نام لیتے لیتے رک گئی تھی۔ اب وہ اکثر اس کا نام لینے سے گریز کرتی تھی۔
 ”اب تو تم میرا نام لینے سے بھی گھیں۔ اس کی کوفت ہوتی ہے مجھے۔ اسی لیے تو شادی کر لیتا چاہتا ہوں۔“
 دلچسپی سے کہتا ہوا مسکرایا تھا اور مدحیہ یکدم اس کے سامنے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔
 ”میں چلتی ہوں۔“ جب سے اس کی انگلی منٹ ہوئی تھی۔ اسے واقعی عدیل سے بہت زیادہ شرم آئے تھے۔
 ”اب وہ اس سے بہت کم ہی ملتی تھی۔ اسی لیے تو عدیل کو آج صومنہ کی پہلپ لیتا پڑی تھی۔“
 ”رکومتے“ وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔
 ”پھر آؤں گی۔“ وہ جنگل کی طرف بڑھی۔ ”کب۔“ عدیل بھی اس کے ساتھ ساتھ تھا۔
 ”جب رخصتی کرواؤ گے۔“ مدحیہ نے آسٹلی سے کہتے ہوئے اس پاس کی چھتوں کی طرف دیکھا۔ شام کا
 وقت تھا کافی سے بھی زیادہ لوگ اپنے گھروں کی چھتوں پہ نظر آ رہے تھے۔ ”میں تو چاہتا ہوں کہ آج ہی
 کروالوں۔“ وہ بہت جلدت پسند ہو رہا تھا۔
 ”تو کروالو۔“ اس نے اب کی بار کندھے اچکائے تھے۔ اور وہ بھی کافی لاپرواہی سے۔
 ”جی۔“ عدیل کو اس کی رضامندی یہ کافی ایکسٹنشنٹ ہوئی تھی۔
 ”جی۔“ وہ بھی جواباً ”شرارت سے کتنی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔“
 ”مدحیہ روک بات سنو۔“ وہ پیچھے سے پکارا تھا۔
 ”اب ایک بار ہی سنوں گی جب تم دھوکے سے نہیں بلاؤ گے۔“ وہ سیڑھیاں اترتے ہوئے بولی۔
 ”یا۔۔۔“ کچھ دیر تو روکنا۔ وہ سب مریم سے ملنے کے لیے گئی ہوئی ہیں۔“ عدیل نے دہائی دی۔
 ”جب وہ سب جائیں تو پھر آؤں گی۔ ابھی تم ان کو لینے جانے کی تیاری کرو۔“ وہ سیڑھیاں اتر کر دوبارہ صحن
 میں آگئی تھی۔
 ”میں ان کو لینے نہیں جاؤں گا۔ جودت خود انہیں ڈراپ کروے گا۔“ عدیل کا منہ بن چکا تھا، مگر مدحیہ کو لاش
 لینے والی نہیں تھی۔
 ”اچھی بات ہے۔“ اوکے اللہ حافظ۔“ وہ دروازے کی طرف بڑھی۔
 ”آئی رشتی مس یو یار۔“ اس نے اپنی دلی کیفیت کا اظہار کیا۔ مدحیہ کھکی ہلٹی اور مسکرا اٹھی تھی۔
 ”آئی مس یو ٹو۔“ اس کے لیے میں بھی محبت کا اک بھر پور احساس رچا ہوا تھا۔
 ”کیا۔۔۔؟“ پھر سے کہو۔“ وہ جنگل سے ہاتھ ہٹا کر سیڑھیاں اترنے کے لیے لپکا تھا۔ مگر تب تک مدحیہ تک دم
 کھکھلاتی ہوئی دروازہ کھول کر بلیر عبور کر گئی تھی۔
 اور عدیل کے گھر کا آگن مدحیہ کی ہنسی اور کھکھلاہٹ سے گونج اٹھا تھا۔ جس کو محسوس کر کے خود عدیل بھی
 مسکرایا تھا۔



نہ گلہ ہے کوئی حالات سے نہ شکایتیں کسی کی ذات سے
 خودی سارے ورثی ہو رہے ہیں جدا میری زندگی کی کتاب سے
 زری چپ چاپ بیٹھی تھی۔ جب ان دونوں کی نظریک وقت اس کی طرف اٹھی تھی۔
 ”زری۔۔۔“ ناشتا کرونا بیٹا۔ اس طرح کیوں بیٹھی ہو؟“
 وہ تینوں صبح کے وقت ناشتے کی ٹیبل پہ بیٹھے ناشتا کر رہے تھے۔ لیکن زری کو یوں ہی کم سم سا بیٹھے دیکھ کر

”اب وہ اس کا نام لیتے لیتے رک گئی تھی۔ اب وہ اکثر اس کا نام لینے سے گریز کرتی تھی۔“
 ”اب تو تم میرا نام لینے سے بھی گھیں۔ اس کی کوفت ہوتی ہے مجھے۔ اسی لیے تو شادی کر لیتا چاہتا ہوں۔“
 دلچسپی سے کہتا ہوا مسکرایا تھا اور مدحیہ یکدم اس کے سامنے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔
 ”میں چلتی ہوں۔“ جب سے اس کی انگلی منٹ ہوئی تھی۔ اسے واقعی عدیل سے بہت زیادہ شرم آئے تھے۔
 ”اب وہ اس سے بہت کم ہی ملتی تھی۔ اسی لیے تو عدیل کو آج صومنہ کی پہلپ لیتا پڑی تھی۔“
 ”رکومتے“ وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔
 ”پھر آؤں گی۔“ وہ جنگل کی طرف بڑھی۔ ”کب۔“ عدیل بھی اس کے ساتھ ساتھ تھا۔
 ”جب رخصتی کرواؤ گے۔“ مدحیہ نے آسٹلی سے کہتے ہوئے اس پاس کی چھتوں کی طرف دیکھا۔ شام کا
 وقت تھا کافی سے بھی زیادہ لوگ اپنے گھروں کی چھتوں پہ نظر آ رہے تھے۔ ”میں تو چاہتا ہوں کہ آج ہی
 کروالوں۔“ وہ بہت جلدت پسند ہو رہا تھا۔
 ”تو کروالو۔“ اس نے اب کی بار کندھے اچکائے تھے۔ اور وہ بھی کافی لاپرواہی سے۔
 ”جی۔“ عدیل کو اس کی رضامندی یہ کافی ایکسٹنشنٹ ہوئی تھی۔
 ”جی۔“ وہ بھی جواباً ”شرارت سے کتنی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔“
 ”مدحیہ روک بات سنو۔“ وہ پیچھے سے پکارا تھا۔
 ”اب ایک بار ہی سنوں گی جب تم دھوکے سے نہیں بلاؤ گے۔“ وہ سیڑھیاں اترتے ہوئے بولی۔
 ”یا۔۔۔“ کچھ دیر تو روکنا۔ وہ سب مریم سے ملنے کے لیے گئی ہوئی ہیں۔“ عدیل نے دہائی دی۔
 ”جب وہ سب جائیں تو پھر آؤں گی۔ ابھی تم ان کو لینے جانے کی تیاری کرو۔“ وہ سیڑھیاں اتر کر دوبارہ صحن
 میں آگئی تھی۔
 ”میں ان کو لینے نہیں جاؤں گا۔ جودت خود انہیں ڈراپ کروے گا۔“ عدیل کا منہ بن چکا تھا، مگر مدحیہ کو لاش
 لینے والی نہیں تھی۔
 ”اچھی بات ہے۔“ اوکے اللہ حافظ۔“ وہ دروازے کی طرف بڑھی۔
 ”آئی رشتی مس یو یار۔“ اس نے اپنی دلی کیفیت کا اظہار کیا۔ مدحیہ کھکی ہلٹی اور مسکرا اٹھی تھی۔
 ”آئی مس یو ٹو۔“ اس کے لیے میں بھی محبت کا اک بھر پور احساس رچا ہوا تھا۔
 ”کیا۔۔۔؟“ پھر سے کہو۔“ وہ جنگل سے ہاتھ ہٹا کر سیڑھیاں اترنے کے لیے لپکا تھا۔ مگر تب تک مدحیہ تک دم
 کھکھلاتی ہوئی دروازہ کھول کر بلیر عبور کر گئی تھی۔
 اور عدیل کے گھر کا آگن مدحیہ کی ہنسی اور کھکھلاہٹ سے گونج اٹھا تھا۔ جس کو محسوس کر کے خود عدیل بھی
 مسکرایا تھا۔

ادارہ خاتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہوں کے لیے 4 خوبصورت ناول

میرے خواب لوٹاؤ	کسی راستے کی تلاش میں	شریک سفر	ساری بھول ہماری تھی
گفت عبداللہ	میمونہ خورشید علی	زہرہ ممتاز	راحت جنیں
نبت - 400 روپے	نبت - 350 روپے	نبت - 550 روپے	نبت - 300 روپے

فون نمبر: 32735021

ماہنامہ کرن 163

ساج چھایا تھا، پولیس میڈیا اور جان پہچان کے سب لوگ ایک دم سے جیسے سمندری ریلے کی طرح اٹھ کر آئے تھے اور کانوں پر ہی آواز تک سنائی نہیں دے رہی تھی۔

زندگی ہے یا کوئی طوفان!
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

آج ان کا سوئم تھا۔

بڑی حویلی سے دانیال اور عائشہ آئندہ آئے تھے تو ان کی رکھا دیکھی بڑی حویلی کے باقی سب افراد کو بھی آتا ہی نہ تھا، لیکن جیسے ہی آسیہ آئندہ آئی تھیں زری کے ضبط کا دامن پھر سے چھوٹ گیا تھا اور وہ ان کے گلے لگ کے دھاڑیں مار مار کے روتی تھی۔

کیونکہ آسیہ آئندہ بھی اس گھر کی اکلوتی بیٹی تھیں لیکن رشتوں کی ڈوریوں میں الجھ کر اتنے سال اپنوں سے بچھڑ کر گزار دیے تھے، زندگی کا کوئی سکھ انہوں نے بھی نہیں دیکھا اور زندگی کا کوئی سکھ زری کے نصیب میں بھی نہیں تھا، وہ نصیب اور قسمتوں کے حوالے سے واقعی ایک دوسرے سے کم نہیں تھیں۔

”زری! پلیز بس کریں۔“ علیزے نے رو رو کر بڑھال ہوئی زری کو کندھے سے تھام کر تسلی دینے کی اور سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

”زری! پلیز کیوں رو رہی ہیں آپ۔؟ کیوں۔؟ بس کریں بہت ہو گیا اور کتنا روئیں گی آخر۔؟“ علیزے نے اسے سمجھانے کے لیے اسے جھنجھوڑ رہی تھی۔

”کیا روئیں بھی نہ۔؟“ زری بڑے اذیت بھرے لہجے میں بولی تھی اور علیزے کے دل پہ ہاتھ پڑا تھا۔ وہ چند ثانیہ کے لیے چپ سی ہو گئی تھی۔

پھر جیسی دیر بھی وہ لوگ وہاں رہے تھے علیزے نے دوبارہ کچھ نہیں کہا تھا، وہ شام ڈھلے تک وہاں بیٹھے تھے اور بالآخر نیل اور دل اور کوئی وہاں سے اٹھنے کا اور واپسی کا خیال آیا تھا۔

”علیزے! اگھر چلیں۔؟“ مردان خانے سے نکل کر دل اور زنان خانے کی طرف آیا تھا اور پردے کی اوٹ سے نظر آتی علیزے کو آواز دی تھی۔

”جی۔! آ رہی ہوں بس۔؟“ علیزے نے اسے جواب دیتی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور اسے اٹھتے دیکھ کر زری بھی جیسے اپنے حواسوں میں لوٹ آئی تھی اور اس نے یکدم علیزے کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

”علیزے! ایم سوری۔ میرے منہ سے کوئی غلط یا سخت الفاظ نکل گئے ہوں تو مجھے معاف کر دینا۔ میں تم سے ایسا بولنے کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتی۔ تم میرے لیے بہت اہم ہو بہت عزیز ہو مجھے۔ اللہ تمہیں سدا سہاگن رکھے۔ ہمیشہ خوش رکھے، آباد رکھے۔“ زری نے اسے کھلے دل سے دعا دی تھی اور ماکرہ غلطی کی معافی چاہی تھی۔

جس پہ خود علیزے کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔

اور علیزے نے بے اختیار اس سے لپٹ گئی تھی پھر وہ دونوں ہی اک دوسرے کو بھیج کر بہت زیادہ اور بے تحاشا روتی تھیں۔

”علیزے! دیر ہو رہی ہے۔“ دل آور نے پھر سے آواز دی تھی اور علیزے روتی بلکتی ہوئی زری سے الگ ہوتی تھی لیکن اس سے الگ ہوتے ہوئے بھی علیزے نے اس سے اک ایسی بات کہہ دی تھی کہ زری اپنی

خون اسے سکون نہیں لینے دے رہا تھا۔

”صاحب جی۔ باہر آپ سے کوئی ملنے کے لیے آیا ہے۔“ ملازمہ بوکھلائی ہوئی سی اندر داخل ہوئی تھی۔

”مجھے۔؟ اتنی صبح صبح۔؟“ عبد اللہ کے دل میں خدشے نے سراپا لگایا تھا۔

”السلام علیکم۔“ انسپکٹر شہناز اور ایس پی کامران ممدی ایک ساتھ اندر داخل ہوئے تھے اور ان کے پیچھے ”وعلیکم السلام۔“ خیریت۔ آپ سب یہاں۔“ عبد اللہ سے بولنا مشکل ہو گیا تھا۔ کیونکہ اسے سب سے بہت پریشان نظر آئے تھے۔

”ایم سوری ملک عبد اللہ۔ ہمیں یہ خبر انتہائی افسوس کے ساتھ سنائی پڑ رہی ہے کہ آپ کے بڑے بھائی ملک اسد اللہ۔ ملک حق نواز کو نیل سے فرار کرواتے ہوئے پولیس فائرنگ سے ہلاک ہو گئے ہیں۔ ان دونوں کی باڈیز پولیس اسٹیشن میں ہیں۔ آپ جا کر تصدیق کر سکتے ہیں۔“

ایس پی کامران ممدی نے بہت ہی تحمل سے یہ خبر سننے کی کوشش کی تھی۔ مگر پھر بھی عبد اللہ کے قدموں سے سے زمین سرک گئی تھی۔ وہ کھڑے قدم سے لڑکھڑا گیا تھا۔ مگر ان دونوں نے اسے تھام لیا تھا۔ ”بھائی۔“ عبد اللہ کے ہونٹ کپکپاتے تھے اس نے دل اور اور نیل کو خالی خالی نظروں سے دیکھا تھا۔

”بس یہی اللہ کو منظور تھا شاید۔ صبر سے کام لیں۔“ ایس پی کامران ممدی نے بھی آگے بڑھ کے عبد اللہ کے کندھے پہ ہاتھ رکھا تھا۔

”بی بی جان۔“ زری خاصی بلند آواز سے کر لائی تھی۔ اس کا خواب سچ ثابت ہوا تھا۔

”دیکھیے زریں۔ یہ سب اللہ کے کام ہیں۔ یہ روٹا دھوتا سب فضول ہے۔ ہماری زندگیوں میں جو بھی ہوتا ہے اللہ کی رضا سے ہی ہوتا ہے۔ پلیز سنبھالیے اپنے آپ کو۔ ابھی آپ لوگوں نے یہ ڈیڈ باڈیز لے کر اپنے گھر بھی جانا ہے۔“ انسپکٹر شہناز نے زری کو بہت اپنائیت سے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے تسلی دی تھی۔ بلکہ وہ دونوں سالانہ بیوی ہی ان لوگوں کی دھارس بندھانے میں لگے ہوئے تھے۔ کیونکہ دل اور شاہ کے حوالے سے وہ نیل حیات اور عبد اللہ کی فیملی کی بھی بہت عزت و احترام کرتے تھے۔

اور اب تو وہ دونوں انسپکٹر شہناز اور ایس پی کامران ممدی شادی کر چکے تھے اور ان کا شمار بھی اب دل اور شاہ کے قریبی احباب میں ہوتا تھا۔ اسی لیے وہ ان لوگوں کے غم میں برابر کے شریک نظر آ رہے تھے۔

”عبد اللہ۔! چلو پولیس اسٹیشن بھی جانا ہے اور۔“ دل آور نے اس کا بازو سہلایا۔

”نہیں۔ دل آور۔ نہیں۔ میں نہیں جاسکتا۔ میں بی بی جان کے سامنے اپنے بھائی کی ڈیڈ باڈی لے کر نہیں جاسکتا۔ اتنا حوصلہ نہیں ہے مجھ میں۔“ عبد اللہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

”تم اکیلے نہیں ہو عبد اللہ۔ ہم ہیں نا تمہارے ساتھ۔“ نیل نے اس کا کندھا تھپکا تھا اور عبد اللہ ان دونوں کے کندھے سے لگ کر بے اختیار رو پڑا تھا اور اتنی شدت سے رویا تھا کہ نیل اور دل اور کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں بغیر نہیں رہ سکی تھیں۔

اور پھر یونہی روتے بلکتے ہوئے وہ اسے پولیس اسٹیشن لے کر پہنچے تھے جبکہ زری نے گھر پہ ہی رو رو کر اہل کار رکھا تھا اتنے میں فائرنگ ٹیم، مومنہ بی بی مدحیہ اور علیزے بھی وہاں پہنچ گئی تھیں انہیں دل اور کا خاص کوئی ”مبارک خان“ چھوڑ کر گیا تھا۔

اور جب وہ سب عبد اللہ کے ساتھ ڈیڈ باڈیز لے کر ان کی حویلی اور ان کے گاؤں پہنچے تھے تو ہر طرف اک کھرام

جگہ پہ جی رہ گئی تھی۔ اس کے اعصاب گم سم سے ہو گئے تھے۔

”علیٰ زری کے ہونٹ بری طرح کپکپاتے تھے مگر علیٰ نے نظریں پھیر کر پلٹ گئی تھی۔

”علیٰ زری نے اسے پھر پکارنے کی اور روکنے کی کوشش کی تھی۔

مگر علیٰ نے زنان خانے کا جالی وار پردہ ہٹا کر باہر نکل آئی تھی اس نے زری کی آواز پہ کان نہیں دھری تھی۔

بلکہ آگے بڑھ کر دل اور کے ساتھ ہوئی تھی۔

”علیٰ زری نہ نہ سکی اور ان کے پیچھے لپکتی ہوئی منگے پیرا ہر تک بھاگی آئی تھی۔ وہ دونوں گاڑی کی طرف بڑھ رہے تھے اور زری وہیں حویلی کے برآمدے کے بڑے بڑے ستونوں کے پاس ہی ٹھہر گئی تھی۔ اب اسے بار بار پکارنے کی اسے ہمت ہی نہ ہوئی تھی۔ البتہ ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے دل اور کی ایک بار ارادہ سی نظر اٹھی تھی اور ستون کے ساتھ کھڑی زری کی نظروں سے جا ٹکرائی تھی اس لمحے دل اور کو لگا خویلی سے ان بڑے بڑے ستونوں کے ساتھ زری نہیں بلکہ ”عشق“ کھڑا ہوا۔ سر سے پاؤں تک عشق۔ منگے منگے ہر اور غم کے پتھر ڈوٹا ہوا۔

وہ عشق کی آنکھوں سے آنکھیں چار نہیں کر سکتا تھا اسی لیے نظریں چرا گیا تھا اور نظریں چرانے میں بس ایک لمحہ لگا تھا۔ ہمیشہ کی طرح۔ بس اک لمحہ۔

اور پھر یکدم سر جھٹکتے ہوئے وہ گاڑی میں بیٹھا اور زری کے سامنے ہی گاڑی نکال لے گیا تھا۔ پھر اس کے پیچھے ہی نیل اور مدحیدہ وغیرہ کی گاڑی رخصت ہوئی تھی اور پھر زری کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ سب اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئے تھے۔

شاید ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔



سات سال بعد۔

تیرے عشق میں

ہائے تیرے عشق میں

راکھ سے روکھی گونگ سے کالی

راستہ کٹے نہ ہجراں والی

تیرے عشق میں

ہائے تیرے عشق میں

ہر سو ملگیا سا اندھیرا تھا کیونکہ چاند کی پندیر ہوئی رات تھی اب چاند گھانٹے کے ترانہ میں مل رہا تھا اور چاند کے ساتھ ساتھ وہ بھی دن بہ دن گھٹتی جا رہی تھی اور اسی گھانٹے کی کیفیت میں گاؤں کے کھیتوں میں دور کہیں کسی دل جلے کی جلن ان سروں میں مقید فضا میں گونجتی ہوئی سنائی دے رہی تھی۔

اور زری کا کسی تازہ زخم کی طرح رستا ہوا عشق پھر سے بلبلاتا تھا اور وہ پھر سے درد اور اذیت سے بڑھال ہو گئی تھی۔

اور ان سات سالوں میں تو ایسا کئی بار ہو چکا تھا

جیسے ہی عشق کے زخم پہ صبر کا کھریٹ آئے لگتا تھا پھر کوئی یاد جوت کی طرح لگتی تھی اور کھریٹ پھر سے چھیل کر

جاتا تھا۔ اور وہ پھر سے درد اور اذیت سے بلک اٹھتی تھی اور اس کی آنکھوں کے گوشے تجائی کے لمحات میں پھر سے غم ہونے لگتے تھے۔ حالانکہ بظاہر تو سب کچھ ٹھیک ہی چل رہا تھا۔

دل اور شاہ اور علیٰ نے شاہ کے دو بچے بھی ہو چکے تھے وہ اپنی زندگی میں بہت پرسکون اور مگن تھے ان کی زندگی ایک خوشحال زندگی کی مثال تھی اور سہی حال عبداللہ اور نیل حیات کا بھی تھا وہ دونوں بھی صاحب اولاد ہو چکے تھے اور اللہ کی اس کرم نوازی پہ ہمیشہ شکر گزار بھی رہتے تھے۔

کیونکہ اللہ نے انہیں اپنی رحمتوں اور اپنے نعمتوں سے نوازا تھا کسی بھی شے سے محروم نہیں رکھا تھا اسی لیے وہ بھی انصاف ایمان دار اور رحمتی کا چلن چلتے تھے۔

عبداللہ نے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں آتے ہی واپس لے لیا اور زین کا جائیداد میں سے ان کا حصہ ان کے نام کر دیا تھا اور خود اسد اللہ کے بیوی اور بچوں کے سربہ شفقت بھرا ہاتھ رکھا تھا حالانکہ وہ شہر میں نیل اور دل اور کے ساتھ مل کر کاروبار بھی کرتا تھا مگر پھر بھی گاؤں آنا جانا اور سب کا خیال رکھنا نہیں بھولتا تھا ”خصوصاً“ زری کا۔ البتہ یہ الگ بات تھی کہ زری نے بھی خود کو بی بی جان بلایا جان حویلی گاؤں اور اسد اللہ کے بیوی بچوں میں گم کر لیا تھا اب ان سب کے مسائل ہوتے تھے زری ہوتی تھی۔

ان سات سالوں میں ایک بار بھی نہ وہ شہر گئی تھی اور نہ ہی شہر سے کوئی آیا تھا ہاں سات سال پہلے کا اک منظر آج بھی اس کے دل و دماغ پہ تازہ تھا اور حویلی کے برآمدے کے ستون سے ٹیک لگائے کھڑا اس کا عشق بھی ہنوز تازہ تھا۔ ایسا تازہ جیسے گلاب کا پھول۔ سرخ۔ مہکتا ہوا۔ لودیتا ہوا۔

اور ایسی ہی اک لودیتی ہوئی علیٰ نے شاہ کی سرگوشی بھی اس کے کانوں میں تازہ تھی اور اسی تازہ سرگوشی کا زہر پل پل اس کی رگوں میں اترتا رہتا تھا!

اور وہ پل پل مرنے لگتی تھی۔

کیونکہ علیٰ نے کی سرگوشی ہی کچھ ایسی تھی

زری۔! عشق رنگا ہوتا ہے اور محبت پردہ

محبت کو عشق پہ ڈال دو تو عشق چھپ جاتا ہے

بالکل ایسے جیسے علیٰ کے وجود سے زری چھپ جاتی ہے

اس لیے تم بھی سمجھ جاؤ کہ تم عشق ہو اور میں محبت

میں ظاہر ہوں اور تم چھپ گئی ہو

میں تمہارا پردہ ہوں

کیونکہ یہ سچ ہے کہ دل اور شاہ زری سے ہی عشق کرتا ہے

بس اس نے محبت کا پردہ ڈال دیا ہے

ورنہ عشق تو اسے آج بھی ہے

ورنہ عشق تو اسے آج بھی ہے

ورنہ عشق تو اسے۔!

یہ الفاظ اور یہ سرگوشی اس کے ”درد“ پہ دستک دیتے رہتے تھے اور وہ پاگل ہوتی رہتی تھی۔!!

